مفید کتابیں تصنیف کرنے کے لئے ایک عام فہم زبان استعمال نہیں کی جا سکتی ہے۔
ہمارا خیال ہے کہ ایک ایسی سادہ اور عام فہم زبان جسے ہندوستان کی اکثر آبادی
سمجھ سکے تصنیفی زبان بنائی جا سکتی ہے۔ اور ہم خدا کا نام لے کر اسی زبان کو
ادبی دنیا میں استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اور ادبی دنیا کے ذریعہ اردو
مصنفین اور اہل صحافت کے [illegible] کو ہر چکاں میں یہی زبان پیدا کریں گے۔
اگرچہ ابتدا میں یہ نئی بولی بولتے ہوئے خود ہمارا قلم بھی تتلائے گا لیکن کب تک
تتلائے گا۔ بولتے بولتے کچھ دنوں میں صاف بولنا بھی سیکھ جائے گا۔

(۲)

ادبی دنیا کے اجرا سے دوسرا مقصد اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے
خزانوں سے سرمایہ دار بنانا ہے۔ جو لوگ بصیرت رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اردو
ادب کو مدت مدید تک اس کی ضرورت رہے گی کہ ترقی یافتہ زبانوں کے لٹریچر
کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ اردو کو اوریجنل لکھنے والوں سے بہت زیادہ اچھے
مترجموں کی ضرورت ہے۔
خلفائے عباسیہ دار الترجمہ قایم کر کے یونانی سنسکرت اور دوسری علمی زبانوں
کی کتابوں کا ترجمہ نہ کراتے یا مصری علما فرانسیسی انگریزی اور یورپ و ایشیا
کی ترقی یافتہ زبانوں کے [illegible] عربی میں منتقل نہ کرتے تو آج عربی زبان
عہد جاہلیت کی اس عربی سے مختلف نہ ہوتی جس میں علمی اصطلاحات تو درکنار
چراغ تک کے لئے بھی کوئی لفظ نہ تھا۔ مگر آج مصر کی سرکاری یونیورسٹی (جامعہ مصرا
[illegible]) سائنس، قانون، ریاضی، فلسفہ ہر فن اور ہر علم کی اعلے التعلیم عربی زبان
ہی میں ہو رہی ہے۔ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی اچھی تصانیف عربی زبان
میں دور اسلام سے ترجمہ ہونی شروع ہوئیں اور آج تک بھی برابر یہ سلسلہ جاری
ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اردو کو ترجمہ کرنے والوں سے پہلے اوریجنل لکھنے والوں
سے واسطہ پڑ گیا۔ اور اس افتاد نے اس زبان کو بہت نقصان پہنچایا۔ عربی
فارسی اور انگریزی کتابوں کا تو کچھ ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا بھی لیکن سنسکرت،
ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بلند پایہ تصانیف سے اردو نے
بہت کم فائدہ اٹھایا۔ اتنا کم کہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ نہیں اٹھایا۔ اور اس طرح
علمی داد و ستد کا ہر موقعہ ہم ضایع کرتے رہے۔
ادبی دنیا اس افسوسناک غفلت اور مجرمانہ بے نیازی کی امکانی
طور پر تلافی کر لے گا۔ خدا نے چاہا تو ہم یہ کوشش جاری رکھیں گے کہ
ادبی دنیا میں ہندوستانی زبانوں کے بلند پایہ خیالات مسلسل طور پر شایع
ہوتے رہیں۔ اور اس [illegible] اردو خوانوں اور اردو دانوں کو ہم اصل زبانیں
سیکھنے کی ترغیب دلا سکیں۔

ہم نے ہندوستانی ادبیات کے ترجموں کے ساتھ دوسری مشرقی و مغربی
زبانوں کے لٹریچر سے بھی مفید مضامین کے دلچسپ اقتباسات شایع کرنے کا
مستقل انتظام کیا ہے۔
خوش قسمتی سے لاہور میں ہمیں ایسے بہت سے اہل علم کی امداد حاصل ہو گئی
ہے جو یا تو وہ زبانیں بولتے ہیں اور یا جانتے ہیں جن کے ترجمے آپ پہلے نمبر
میں دنیائے ادب کے زیر عنوان ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اس عنوان کے تحت میں
تمام مندرجہ خیالات براہ راست انہیں زبانوں سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ جن
زبانوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس تحریر کے لکھتے وقت تک ہندوستان اور
دنیا کی بیس زبانوں سے ہم براہ راست ترجمہ حاصل کر سکے ہیں اور دو چار
دوسری زبانوں کے ترجمے ملنے کی ابھی امید رکھتے ہیں۔
ہر ترجمہ کے ساتھ ترجمان یا مترجم کا نام شایع کر دیا گیا ہے۔ ترجمان
سے مراد وہ حضرات ہیں جو اردو لکھ نہیں سکتے۔ ان کی زبان کے مضمون
ان سے مفہوم معلوم کر کے ہم نے اپنی اردو میں ادا کر دیا ہے۔
لاہور کی علمی برادری نے اس اہم کام میں جس توجہ سے ہمیں گراں قدر
امداد دی ہے۔ اس کا اندازہ رسالے کے پہلے ہی نمبر سے کیا جا سکتا ہے۔
ہمیں امید ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مشرقی و مغربی ادبیات
کے اساتذہ اپنے اپنے مضامین سے زندگی افروز خیالات کا ترجمہ کر کے
اس زریں امداد سے ادبی دنیا کو علم ادب کے لئے ایک متاع عزیز بنائیں گے۔

(۳)

ادبی دنیا کے اجرا سے تیسرا مقصد یہ ہے کہ اردو انشا پردازی اور اردو
شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی مضامین کے ذریعہ نوجوانوں اور طلبا میں صحیح ذوق
ادبی پیدا کیا جائے۔
ہمارا دیرینہ تعلیمی تجربہ تو یہ ہے کہ طلبا [illegible] میں
بھی ادبی ذوق کا قحط ہے۔ رسالہ دیرینہ کے دفتر میں [illegible]
نظم و نثر آتے رہتے ہیں۔ ۹۵ فیصدی مضامین کی عبارت مضحکہ انگیز حد
تک غلط اور بے ربط ہوتی ہے۔ اور بے وزن نظمیں لکھنے کی صنعت تو گویا
ان حضرات نے اپنے ہی لئے مخصوص کر لی ہے۔
یہی حضرات طلبا میں اپنی بدذوقی کی وبا پھیلاتے رہتے ہیں [illegible]
ایک طرف کر کے دیکھا جائے تو پنجاب کے اسکولوں کی [illegible]
نثر سے یکسر خالی نظر آتی ہیں۔

اسکولوں سے قطع نظر کالجوں کا حال اُن سے بھی بدتر ہے۔ بی۔ اے کے طلبہ
اُردو شاعری کے اخلاق سوز پہلوؤں پر لیکچر دیتے ہوتے جتنے اشعار مثال میں
پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ طلبہ صرف اُنہیں کو پسند کرتے ہیں۔ اپنی بیاضوں میں
لکھتے اور حافظوں میں نقش کر لیتے ہیں۔ ہم نے تو اس تجربے سے فایدہ اٹھا کر
معیار بنا لیا ہے کہ جو شعر طلبہ کو پسند آجائے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے
درس میں رکھا جائے۔ مضمون نگاری کا یہ حال ہے کہ اکثر حالات میں مڈل سے لیکر
ایم۔ اے تک ایک ہی قسم کی غیر مربوط، بے معنی اور بیہودہ عبارت لکھنے
میں ایسی پختہ مشقی حاصل کر لی گئی ہے کہ انحطاط و ارتقا سے بے نیاز ہے۔
اِس اظہار واقعیت میں ہم نے کسی شاعرانہ مبالغہ سے قطعی کام نہیں لیا
ہے۔ کالجوں کے اُردو اساتذہ اور یونیورسٹی کے اُردو ممتحن اِس افسوسناک
حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

اِس بدذوقی و بدلیاقتی کا باعث غلط طریقۂ تعلیم ہو یا ملکی زبانوں سے
بے پروائی۔ بہرحال اِس کا وجود ہے۔ بلکہ مبالغۃً کہہ سکتے ہیں کہ اِسی کا وجود
ہے۔

ادبی دنیا تعلیمی اداروں سے اِس بدذوقی کو دور کرنے کے لئے مقدور بھر
تعلیمی رہنماؤں کا ہاتھ بٹائے گا۔

ادبی دنیا کی اشاعت کا چوتھا اہم مقصد یہ ہے کہ

(۱) اردو شاعری کو بہت سی غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کرکے آزاد
زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اسمیں اضافہ کیا جائے۔ دوسری زبانوں
کی شاعری کے موزون اور خوشگوار اوزان اور بحریں اس میں داخل کیجائیں
فرسودہ خیالات اور حیا سوز مضامین سے اسے پاک کرکے زندہ قوموں کی
حیات آفرین شاعری کے ہم پلہ بنایا جائے تشبیہات و تلمیحات اور
خیالات کے اعتبار سے اسے ہندوستانی شاعری کا قالب دیا جائے۔

(۲) موجودہ اردو گرامر موجودہ زبان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہذا اِس اصول پر
کہ "گرامر زبان کے ماتحت ہونی چاہئے" کاربند ہوکر مستند اہل قلم کے
مشوروں سے اردو گرامر میں ضروری تغیر و تبدیل اور ایسے نئے قواعد کا
اضافہ کیا جائے جن کی موجودگی میں وہ جدید الفاظ۔ جدید تراکیب اور
جدید محاورات صحیح قرار دیئے جائیں جو اُردو کے شرائین میں خون کی طرح
پھیل گئے ہیں۔

(۳) دوسری زبانوں کے ایسے آسان اور خوشگوار الفاظ اردو میں داخل
کئے جائیں جن کے ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہیں۔ یا جن کا مفہوم
ہم معنی لفظ کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے۔

اُردو ادب کے متعلق یہ انقلابی پروگرام ہم ۱۹۱۸ء سے "انجمن ارباب
علم پنجاب" کے ذریعہ ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں[ا]۔ صرف پیش ہی
نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اسے کامیاب بنانے کی مسلسل کوششوں میں بھی لگے
ہوئے ہیں۔ اور ملک کے اُن اہل بصیرت سے جو بصیرت کے ساتھ انصاف
اور انصاف کے ساتھ اُس کے اظہار کی فراخ دلانہ جرات بھی رکھتے ہیں،
خراج تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اور اب اگر ہمیں کام کرنے دیا گیا۔ تو ادبی
دنیا کے ذریعہ اِس پروگرام کو زیادہ طاقت کے ساتھ کامیاب بنانے کا
ارادہ رکھتے ہیں۔

اہل قلم سے

ہماری مودبانہ گذارش یہ ہے کہ وہ ہمارے پیش کردہ مقاصد اور پروگرام کو اگر اُردو
ادب کے لئے مفید تصور فرماتے ہیں۔ تو اِس کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری
نہیں کہ ہمارا ساتھ دیں۔ بلکہ ہمیں اپنے ساتھ لے چلیں۔ رہنما بننے کی بجائے
ہم راہرو بننے میں اپنے لئے زیادہ عافیت پاتے ہیں۔ اور اِس میں شمہ بھر
بھی تکلف یا انکسار کو دخل نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ پروگرام اُردو
کے لئے مفید ہے تو ہماری ذاتی "حیثیت" کو نظر انداز کرکے اہل قلم اسے کامیاب
بنانے کے سر ہو جائیں۔

ادبی دنیا کے لئے عام فہم اور آسان زبان میں اِس پروگرام کی مختلف
شقوں پر لکھیں اور لکھتے رہیں۔ جو حضرات سلیس نگاری کو ابتدا میں دشوار
تصور فرماتے ہیں۔ وہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کے بعض مشکل الفاظ اور فقروں
کو ان کے خیالات عام اُردو خوانوں تک پہونچانے کی خاطر آسان لفظوں
اور عام فہم فقروں میں تبدیل کر دیا کریں۔ ادبی دنیا کا عملہ ادارۃ اِس بارے
میں ابھی خود بھی اصلاح کا محتاج ہے۔ لیکن ہم رفتہ رفتہ جلد اپنے آپ کو اِس
پروگرام کے مطابق بنانے کی اُمید رکھتے ہیں۔ ہم نے پہلے نمبر کو آسان زبان
میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ جب تک ہم
اپنے پروگرام کے مطابق ادبی دنیا کی زبان کو بالکل آسان نہیں بنالیں گے
اُس وقت تک رسالے کے آخر میں ہر نمبر کے مشکل الفاظ کا فرہنگ شائع

[ا] مدیرانہ حیثیت "اگر ہم" کی بجائے "ہیں" لکھنے کی اجازت دے سکتی تو "میں" زیادہ مناسب تھا ۱۲

کرتے رہیں گے۔ اس اختراع پر ہمیں خود بھی ہنسی آتی ہے۔ تو آپ کو کیوں نہ آئے
گی۔ ہاں ہنسیے اور ضرور ہنسیے۔ مگر ہنس لینے کے بعد اس حقیقت پر بھی غور فرمائیے
کہ چند اردو دانوں کی تحسین حاصل کرنے سے زیادہ اہم بے شمار اردو خوانوں کی
ادبی ضرورت کا پورا کرنا ہے اور یہ کہ یہ پرچہ ادیبوں کے مذاق ادبی کی تکمیل
کے لئے نہیں۔ بلکہ طلبہ اور معمولی قابلیت کے ملکی نوجوانوں میں ذوقِ ادبی پیدا
کرنے کے لئے جاری کیا جا رہا ہے ٭

اربابِ نظر سے

ادبی دنیا کی موجودہ شان، اس کا حجم، اس کی تصاویر، اس کا سرورق، اس کی
یہ خصوصیت کہ کوئی مضمون بے معاوضہ شائع نہیں کیا جائے گا۔ اس کی یہ حیثیت
کہ ہر پرچہ ڈاک خانہ کی رسید لے کر پوسٹ کیا جائے گا۔ اس کی یہ گراں باری کہ
دو پیسے کی بجائے ایک آنہ کے ٹکٹ میں بھیجا جائے گا ٭

ان خصوصیات کے مقابلے میں بارہ آنے محصول ڈاک دو آنے وی۔پی
کا محصول۔ ایک آنہ رسیدوں کا نکال کر دو روپے تیرہ آنے سال بھر کا چندہ
ہوا جس کے معاوضے میں خریداروں کو ۲۶×۲۰ سائز کے سال میں ایک ہزار
صفحے ہر صفحہ ۲۲ سطروں کا۔ اتنے صفحات میں ڈھائی رسالوں کا میٹر آتا ہے
اور اس حساب سے گویا دو روپے تیرہ آنے میں سال میں کم از کم ڈھائی ہزار
صفحات اور کم و بیش ستو سہ رنگی و یک رنگی تصاویر خریدار کو ملیں گی۔

اس سودے پر غور فرما کر بہت ہی تہذیب سے کام لیں۔ تو ہماری تجارت
کو آپ مجرمانہ ناعاقبت اندیشی کا خطاب دے سکتے ہیں۔ اور کسی ماہر تجارت
کے سامنے یہ کاروبار پیش کیا جائے۔ تو ہمارے لئے پاگل خانہ ہی تجویز کریگا۔
ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بھی شبہ ہو کہ کہیں فلبی کی گھوڑ دوڑ کے چھتیس لاکھ
کی لاٹری انہیں کے نام تو نہیں نکل آئی۔ جو یہ تباہ کن تجارت شروع کی ہے۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم بازار میں وہ چیز نہیں لاتے ہیں جس کی مانگ
ہے۔ بلکہ وہ متاع لے کر نکلے ہیں جس کی مانگ ہونی چاہئے۔

ہم جس ادبی پروگرام کو ملک کے لئے مفید سمجھ کر کامیاب بنانا چاہتے
ہیں۔ اس کے لئے ہمیں کچھ ایثار بھی کرنا پڑے گا۔ وقت اور روپے کا
نقصان بھی اٹھانا ہوگا۔ ممکن ہے اس سے زیادہ بھی مشکلات پیش آئیں
تو ان مشکلات کے مقابلے کے لئے بھی ہمیں تیار رہنا چاہئے۔

ہم مستقبل کی ان تمام بھیانک شکلوں کو حال کے آئینے میں دیکھ رہے
ہیں۔ ہمیں کرم فرماؤں کی صفوں کی صف آرائی، اپنی ناکامی پر ہنستی اور تالیاں بجاتی
ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ دوستوں کے دل اور مطعنوں کے تیر مستقبل کی فضا میں
چیرتے ہوئے ہمیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

منطق۔ اصولِ تجارت تجربہ اور لوگوں کی زبانیں اس مستقبل کو حال کی
طرح یقینی اور موت کی طرح قطعی بتلاتے ہیں۔

لیکن نہیں۔ ہم مستقبل کے خطروں کو نگاہ میں نہ لائیں گے ہمیں اس خدا پر
بھروسا ہے جو ماضی و مستقبل کے خطروں سے بالا، ازل و ابد کی سرکشیوں سے
بے نیاز اور جو ہمیشہ سے ہمیشہ کے لئے حوصلہ نواز و کارساز ہے۔

ہم خدا کا نام لے کر خود اعتمادی، استقلال، عزم اور ایک پرامید دیرآزمود
دل کے بلند حوصلے کو ساتھ لے کر اٹھے ہیں۔ اور یہ ارادہ لے کر اٹھے ہیں۔ کہ
ہم خود اپنے لئے ایک کامیاب۔ خوش منظر اور پائیدار مستقبل تعمیر کریں گے۔

ہمارے احباب نے جو اشاعتی کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ادبی دنیا کی
موجودہ شان و شوکت کے مطابق حساب لگا کر بتایا ہے کہ

"اس کے آمد و صرف کی دو لائنیں دس ہزار اشاعت تک متوازی ہی
چلی جاتی ہیں۔ سال کے ختم پر کم از کم پانچ ہزار روپے کا خسارہ بھرنا پڑیگا"

لیکن ہم اپنی بے اعتدالیوں سے واقف ہیں۔ ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ اتنے
صفحات کی تنگ میدانی ہمارے حوصلے کی جولانیوں کے لئے کافی نہ ہو سکے
گی۔ اور پھر خدا کی ذات پر بھروسا کر کے یہ ارادہ بھی رکھتے ہیں کہ دوسرے
سال کے آغاز سے چندے میں تخفیف، اور صفحات و تصاویر میں اضافہ
کریں گے ٭

اس طویل باصرہ خراشی سے حالات کی توضیح کے ساتھ اربابِ نظر کو
یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ادبی دنیا اُن کی رائے میں زندہ رہنے کے قابل ہے
تو اسے زندہ رکھنے میں ہمارے حوصلوں کے ساتھ اپنی مسیحا نظری کو بھی
شریک کر دیں ٭

رہے اس کے ناظرین اور خریدار وہ مطمئن رہیں کہ ہم ایک ایک خریدار
کی روایتی بھیک کے لئے اُن کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ کیونکہ
ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جو شخص اپنے فرائض کو محسوس
کرتا ہے اُسے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

وہ حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سنتے ہیں
یہ جانتا تو پشیمانِ شرمندۂ فغاں ہوتا

اور جسے احساسِ فرض نہیں اس سے التجائیں اور گڑگڑا کر صدائیں بے اثر
اور بیکار رہیں۔ ایسے مردے نفخِ صور سے بھی نہیں بیدار ہو سکتے۔

عملۂ ادارہ کے متعلق

اپنے تعارف کی تو ضرورت نہیں۔ البتہ مولانا حفیظ ہاشمی کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ آپ عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کے ادبیات کا اس حد تک مطالعہ کر چکے ہیں کہ کسی بلند پایہ ادبی رسالے کی ادارتی ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔ اس سے زیادہ ان کی شان میں نثری قصیدہ لکھنے کی نہ اجازت ہے نہ ضرورت اور سچ تو یہ ہے کہ ہمت بھی نہیں۔ ناظرین ان کے مضامین پڑھ کر ان کی بلند ادبی حیثیت کا اندازہ خود کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور ادیب پنڈت میلارام وفاؔ بھی ہماری ادارتی اور انتظامی مصیبتوں میں برابر کے شریک ہیں بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ ادبی دنیا کی بلند حیثیتی اور کم قیمتی کا یہ صحت گداز پروگرام انہیں کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے انہیں سب جانتے ہیں اور جو نہیں جانتا وہ ادبی دنیا کے کسی آیندہ نمبر کا انتظار کریں۔ جس میں ان کی تصویر کے ساتھ ان کی ادبی سرگرمیوں پر ایک تنقید بھی شائع ہوگی۔

خاتمۂ گذارش

سلسلۂ کلام ساعتِ انتظار کی طرح ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا لیکن یہ طویل کلامی ناگزیر تھی۔ کیونکہ ہم اس تلخ نوائی کو زہر کر بنانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ختمِ کلام پر ہم اپنے محترم نگران خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بالقابہ کی اُس پشت پناہی اور گراں قدر رہنمائی کا ممنونیت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں جس کے سبب ہمیں اس خارزار میں خدمتِ زبان کا موقعہ مل رہا ہے۔ سر عبدالقادر کی ادبی خدمات بے نیازِ سپاس ہیں۔ سر سید مرحوم نے ہنگامۂ غدر کے بعد سے اردو ادب کے جس زرّیں دور کی ابتدا کی تھی۔ انیسویں صدی کے ختم پر اُس دور کا خاتمہ ہوگیا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے اُردو کا جو کامیاب دور شروع ہوا اور جس نے اُردو ادب کو اقبال جیسے بین الاقوامی سحر نگار اور ابو الکلام جیسے بے پناہ نادرہ طراز انشا پرداز دیئے۔ سب جانتے ہیں کہ سر عبدالقادر نے مخزن کے ذریعہ اُس گراں مایہ دور کی بنیاد رکھی۔ نہ صرف بنیاد رکھی۔ بلکہ اس بنیاد کو ایک عریض و طویل عمارت میں تبدیل کر دیا۔

حالیؔ و آزادؔ نے جس جدید شاعری کا آغاز کیا تھا عبدالقادر کی کوششوں نے اُس ہلال کو بحدِ کمال پہونچایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع سے اُردو ادب کے جس نئے اسکول کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اسکول بجا طور پر سر عبدالقادر نیو اسکول آف اُردو کہلائے جانے کا مستحق ہے ہمیں اعتراف ہے اور افتخار آمیز اعتراف کہ ہم اسی اسکول کے ایک طالب علم ہیں۔

اخیر میں اپنے معزز معاصرین سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے مفید مشوروں کی خواہ وہ کسی رنگ میں دیئے گئے ہوں دل سے عزت کریں گے۔ ہماری ساری زندگی اِس کی شاہد ہے۔ کہ ہم نے مخالفانہ ابتدا کبھی نہیں کی اور آئندہ بھی اپنے اِسی اصول پر کاربند رہنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ خدا سے یہ دعا بھی مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں حریفِ دشنام و سہیمِ عناد بننے کی ذلت سے بچائے۔ آمین

تاجورؔ

شکریہ و شکایت

ادبی دنیا کا سرورق سر عبدالقادر کا تجویز کردہ تھا۔ اور اس تجویز کی رنگین تعمیل پنجاب کے مشہور آرٹسٹ لالہ رام لال مصوّر کے مُوقلم کی منت پذیر ہے۔ اسکی کتابت منشی عبدالمجید پروین رقم نے کی ہے تصویر "سحرِ موسیقی" یورپ کے ایک بلند پایہ ادبی پرچے میں شایع ہوئی تھی۔ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس کے مصوّروں نے اس میں آرٹ کے نقطۂ نظر سے خامیاں نکالیں اور لالہ رام لال مصوّر نے نئے سرے سے اُسے بنا کر اس میں رنگ بھرے اور وہ خامیاں دور کیں۔ اب یہ تصویر فنِ تصویر کشی کا مکمل نمونہ بن گئی ہے۔ اس میں جان ڈالنی باقی تھی سو یہ مسیحا کاری کا فرض پنڈت میلارام وفاؔ کی نظم نے ادا کر دیا۔ پنڈت واسدیو مینجر کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس اور لالہ گورانتہ مل پروپرائٹر کی سعی اور توجہات سے تصاویر کے بلاکوں کی تیاری اور آفسیٹ مشین پر سرورق کی طباعت میں ہمیں بڑی سہولتیں بہم پہنچی ہیں۔ مرکنٹایل پریس کے مالک و مینجر صاحبان نے وقت پر کام دینا اور اچھا کام دینے کی رسم قائم رکھی۔ ان حضرات کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ منشی محمد حسن کاتب (جموں) نے بڑے عہد و پیمان کرکے ہم سے رسالہ لیا اور وقتِ اشاعت کے قریب ناتمام واپس کیا۔ اسی لئے کئی کاتبوں سے لکھوانا پڑا۔ اسمیں خط اگرچہ متعدد ہوگئے مگر کاتب سب کے سب خوش رقم ہیں۔ اپنے معاصرین کی اطلاع کیلئے یہ واقعہ لکھنا پڑا تاکہ اس قماش کے کاتبوں کے فریبِ عہد و پیمان سے وہ آگاہ ہو جائیں۔ (مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور)

آئینۂ عالم

تعلیم کا مالی معاوضہ

معاصر الہلال (مصر) نے اپنی تازہ اشاعت میں امریکہ کے تعلیمی کوائف پر وہاں کے ایک ماہرِ تعلیم کا تبصرہ شائع کیا ہے۔ تبصرہ نگار تعلیم کے مالی معاوضے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے صوبہ جاتِ متحدہ کے تعلیمی مصارف پر الفاظِ ذیل میں روشنی ڈالتے ہیں۔

امریکہ میں تعلیمات عامہ پر سالانہ چار سو ملین گنی صرف کی جاتی ہے۔

اس رقم میں وہ روپیہ شامل نہیں جو تجارتی و صنعتی مدارس اور ان تعلیم گاہوں پر صرف ہوتا ہے جن کے طلبہ پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے بند ہیں۔

اس رقمِ خطیر کو صرف کرکے امریکن قوم کو مالی منافعہ کی صورت میں جو روپیہ واپس ملتا ہے۔ اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) پرائمری تک تعلیم پانے والا نوجوان اپنی عملی زندگی کے ۴۲ سال میں بارہ ہزار آٹھ سو گنی کماتا ہے۔

(۲) کالج تک تعلیم حاصل کرنے والا ۴۲ سال کام کرکے سترہ ہزار پانسو گنی کما لیتا ہے۔

(۳) لیکن یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ اپنی حیاتِ عملی کے ۴۰ سال میں تیس سے چالیس ہزار گنی تک معاوضہ حاصل کرتا ہے۔

امریکہ کے کوائفِ تعلیمی کی ان زرین تفصیلات کو پڑھ کر خوش قسمت ہندوستان کے تعلیمی مصارف اور ان کے مالی منافع کی گراں قدر تفاصیل بھی درج کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہاں صرف تعلیمات عامہ پر کم و بیش چالیس کروڑ گنی کا سالانہ صرف آتا ہے لیکن یہ ۳۲ کروڑ کی قانع دنیا اٹھارہ پینس کے چند کروڑ روپے ہی میں چشمۂ علم سے سیراب ہو جاتی ہے۔ حرصِ علم اور حرصِ زر میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ دونوں ہی کو شانِ قناعت کے خلاف سمجھتی ہے۔

امریکہ میں پرائمری تک پڑھا ہوا ۴۲ سال کام کرکے بارہ ہزار آٹھ سو گنی کماتا ہے۔ اور اس کے بعد بھی راحت و آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے جیتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں پرائمری تک پڑھا ہوا ۴۲ سال کام کرنا تو درکنار اتنے سال جینا بھی پسند نہیں کرتا۔ پھر بارہ ہزار آٹھ سو گنی؟ اور راحت و آرام کے لئے جینا!! مہاتما بدھ کی جنم بھومی میں ایسے خیالات آدمی کو "نروان" سے محروم کر دیتے ہیں۔

کالج کے تعلیم یافتہ نئی دنیا میں ۴۲ سال کام کرکے ساڑھے سترہ ہزار گنی کما لیا کرتے ہوں گے۔ ہمارے کالجوں کے نونہال تو جوتشیوں اور ہمزاد کا عمل سکھانے والوں کے زریں و دلفریب بلکہ عقل فریب وعدوں پر معاشی تفکرات سے بے نیاز پھرتے ہیں۔

رہے یونیورسٹی کے گریجویٹ تو اُن کی آفرینش کا مقصد فیشن، شادی اور آبائی جائداد کو ٹھکانے لگانے کے علاوہ زندگی کی دوڑ کو سرکاری و غیر سرکاری دفاتر کے دائرے تک محدود کر دینا ہے اور بس۔

لامکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی ہم تو اُدھر ہیں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

امریکہ کے بادہ کش

امریکہ میں جب سے شراب فروشی اور بادہ نوشی کی ممانعت کا قانون پاس ہوا ہے۔ اس نشے کے رسیا مختلف طریقوں سے اس قانون کی مخالفت کر رہے ہیں۔

"پچھلے دنوں ایک امریکن ڈاکٹر نے اپنا تجربہ شائع کیا تھا کہ جب سے شراب خوری کی ممانعت ہوئی ہے۔ امریکہ کے پاگل خانوں میں دیوانوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اسکی رائے میں اس کثرتِ دیوانگی کا واحد سبب یہی بندشِ شراب کا قانون ہے۔"

اب اس مخالفت نے نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہ یہ کہ اس قانون کے مخالف بندشِ شراب کو کثرتِ اموات کا سبب بتانے لگے ہیں۔ کئی امریکن دُردکش ڈاکٹروں نے اعداد و شمار سے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شراب سے قطعی اجتناب کرنے والوں اور اس نشے میں آٹھ پہر سرشار رہنے والوں کی اموات کا اوسط برابر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اعتدال کے ساتھ

شراب نوشی باعثِ طولِ حیات وازدیادِ صحت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قانون کا اثر امریکہ کی مردم شماری پر پڑ رہا ہے۔ کثرتِ اموات پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

واقعتاً اگر صورتِ حال یہی ہے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں تو امریکہ کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے۔ کثرتِ دیوانگی اور اختلاطِ حیات کی رفتار اگر چندے یہی رہی تو کچھ مدت میں سارا امریکہ پاگل خانوں اور قبرستانوں میں تبدیل ہو جائیگا اور اس طرح موجودہ سرمایہ داروں اور قرض خواہوں کی یہ رستی بستی دنیا تیغ خمار کی نذر ہو کر نئے کولمبس کی ضرورت کو اپنا مرثیہ خواں چھوڑ جائے گی۔

سائینس کے لئے دس سال کی تعطیل

پچھلے دنوں رپن کے بشپ نے برٹش ایسوسی ایشن کے جلسے میں سائینس کی خطرناک ترقی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ سائینس کی روز افزوں ترقی اِنسان کو اس درجہ مذہب سے بیگانہ بنا رہی ہے کہ اس کی روح کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔ سائینس نے انسان کی مسرتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ بنا بریں یہ مناسب ہوگا کہ روحِ انسانی کی تعمیر کے واسطے سائینس اور سائینس دانوں کو دس سال کے لئے چھٹی دی جائے۔ سائینس کے معمل (لیبوریٹری) بند ہو جانے سے انسان کو کچھ نقصان نہیں پہونچے گا۔"

اسٹینفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر میر نے بشپ صاحب کی اس تجویز کو غیر معقول بتاتے ہوئے "سائینٹیفک منتھلی" نیویارک میں لکھا ہے کہ

جو لوگ سائینس کے لئے دس سال کی تعطیل کی سفارش کرتے ہیں۔ شاید وہ اس امر کو فراموش کر چکے ہیں۔ کہ تاریکی کے زمانے میں جب زندگی دشوار اور مشکلات سے پُر تھی جب انسان پر ہر سمت سے وبائی امراض کا حملہ اور قحط سالی کا تسلط تھا جب انسان اور درندوں کے درمیان کچھ فرق نہ تھا۔ اس طویل زمانے میں سائینس بہت لمبی چھٹی منا چکا ہے۔ پھر جب انسان کی قوتِ عمل بیدار ہوئی تو سائینس نے جنم لیا۔

اگرچہ سائینس ابھی اپنی ابتدائی حالت میں ہے اب جو حضرات اسے دس سال کے لئے میدان سے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ سائینس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں جو کارنامے دکھائے ہیں وہ فنا نہیں کئے جاسکتے اور ان لوگوں کو سائینس کی مجوزہ تعطیل میں جس کیلئے وہ اس قدر بے تاب ہیں کوئی لطف میسر نہ ہوگا۔

جو لوگ سائینس کے مقدس قصر کی تعمیر میں حارج ہونے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خدا کی قدرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ مذہب کے مصنوعی رہنماؤں کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ سائینس کی روشنی اُن کی اصلیت کے چہرے کو بے نقاب کر دے گی۔ وہ اس تاریک زمانے کو دوبارہ دیکھنا چاہتے ہیں جب تعصب کے ہاتھوں انسانیت تباہ ہو رہی تھی۔ انسانوں کے ساتھ ذلیل اور غلامانہ سلوک کیا جاتا تھا اور صداقت پرستوں کو جرمِ حق پژوہی پر کوڑے لگائے جاتے تھے۔"

ہماری رائے میں تمدنی زندگی کی سہولتیں بہم پہونچانے اور اکتشافاتِ ارضی وسماوی میں لگے رہنے کا جہاں تک تعلق ہے۔ سائینس کو دس سال تو درکنار دس دن کی بھی چھٹی منانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ البتہ میدانِ کارزار کے لئے ہلاکت بار آلاتِ جنگ ایجاد کرنے کی ملعون کوششیں سائینس کا اتنا بڑا جرم ہے۔ جسے انسانی زندگی کبھی معاف نہیں کرے گی۔

بنا بریں جنگی خدمات سے سائینس کو نہ صرف دس سال کے واسطے بلکہ ابدی تعطیل منانے پر مجبور کر دیا جائے۔ تو انسان اور اُس کی دنیا زندگی کے اطمینان سے شادکام ہوں گے۔

آل انڈیا اردو کانفرنس کی ضرورت

ایسی انجمنیں یا سبھائیں جن کے ساتھ "آل انڈیا" کا دُم چھلہ لگا ہوا ہو عام طور پر سال کے گیارہ مہینے ایک طویل اور مسلسل خواب میں گذار کر کانگرس کے نفخِ صور کے ساتھ زندگی کا ثبوت دینے کے لئے بیدار ہو جایا کرتی ہیں سال کا بارھواں مہینہ کسی شہر میں سالانہ اجلاس کی تیاریوں "عظیم الشان" پنڈال کی تعمیر اور سہ روزہ اجلاس کے مظاہروں میں بسر کرکے ان پر اصحابِ کہف کی سی نیند مسلط ہونے لگتی ہے۔ اور نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہوئے لمبی تان کر گیارہ مہینے کے لئے پھر سو جاتے ہیں۔ اس قسم کی آل انڈیا سبھاؤں سے عملی زندگی کی توقع تو بے کار ہے۔ کہ انہوں نے کبھی کام کیا نہ کریں گی۔ البتہ ان کا وجود بھی بے ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر حقوق طلبی کے لئے اجتماعی آواز بلند نہیں کیجاسکتی۔ اپنے متعلقہ حلقوں کی جانب سے اجتماعی مطالبہ پیش کرنے کے واسطے یہ آل انڈیا سبھائیں بلند بانگ نقیب کا کام دیا کرتی ہیں۔ حکومت انہیں کے مطالبوں پر اپنے فیصلے مرتب کرتی ہے۔ پبلک انہیں کی چیخ پکار کو در خورِ اعتنا سمجھتی ہے۔

اُردو زبان کو بھی ایک ایسے ہی بلند بانگ نقیب کی ضرورت ہے۔ جو اُس کے جائز مطالبوں اور واقعی ضرورتوں کا اعلان کر کے پبلک اور حکومت

کی ہمدردیوں کو اس کے لئے بیدار کرے کے انجمن ترقی اردو اگر سال بھر میں ایک مرتبہ کسی صوبے میں اپنے مرکزِ نقل کو بدل دینے پر قادر ہو تو کسی نئی اردو انجمن یا کانفرنس کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کو آل انڈیا بنایا جا سکتا ہے۔ صرف اتنا کام کرنا پڑیگا کہ صوبوں کی کارکن اُردو انجمنیں "ترقی اُردو" سے اپنا الحاق کر کے اُس کے نظامِ عمل پر کاربند ہو جائیں اور انجمن ترقی اُردو اپنا سالانہ اجلاس کسی ایسے صوبے میں کر لیا کرے۔ جہاں اُردو زبان کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

جن صوبوں کے محکمہائے تعلیم، یونیورسٹیاں اور حکومتیں اردو کے واجبی حقوق سے تغافل برت رہی ہوں۔ مرکزی انجمن اپنے سارے نظام کو جنبش دے کر انہیں اپنے مطالبوں پر توجہ دلائے۔

انجمن ترقیٔ اُردو نے اردو زبان کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ دنیائے اُردو ہمیشہ اُنہیں ممنونیت کے ساتھ یاد رکھے گی۔ لیکن ہندوستان گیر بننے کے لئے اُسے آل انڈیا اُردو کانفرنس کے نظام کو بھی اپنے دستور العمل میں شامل کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اُردو زبان کو اپنی ہستی تسلیم کر لینے کے لئے اس وقت ایک کانفرنس کی اشد ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت انجمن ترقی اُردو کے وجود سے پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر انجمن ترقی اُردو سفری زحمتوں اور ہنگامہ کار مصروفیتوں کو پذیرا نہ کرے تو پھر کسی ہنگامہ پرست مردِ کار کو اس میدان کارزار میں اترنا چاہیئے۔ اصلاحات کی تیسری قسط ملنے تک ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ انگریزی زبان ہندوستانی زبان کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ اور اِس وقت ہماری یہ ندامت بے کار ہوگی۔ کہ ہم ہندوستانی زبان کو اس قابل نہ بنا سکے۔ کہ وہ ہندوستان کے لئے "لینگوا فرینکا" بن کر انگریزی زبان کی قائم مقامی کرے۔

اُردو اور ہندی کی حریفانہ حیثیتیں

آج تک اُردو اور ہندی کی حمایت حریفانہ نوعیت کی ہوتی رہی ہے اردو والے جتنا وقت ہندی کے خلاف زہر اگلنے میں ضائع کر چکے ہیں۔ اردو کی خدمت میں صرف کرتے تو اردو زبان کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں۔ اِسی طرح ہندی کے حامی اردو کے خلاف تخریبی پروپیگنڈے کی بجائے ہندی کے واسطے اشاعتی کام کرتے تو ہندی کے لئے زیادہ مفید ہوتا۔

تعصب کی درندگی اِس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ملکی لٹریچر میں بھی مذہب کو در انداز بنا دیا گیا ہے۔ محض رسم الخط کا ہلکا سا حجاب ہندو مسلمانوں کے لئے کس قدر مجروحیوں کا باعث بن رہا ہے۔ سنسکرت اور ہندی ادبیات کے درخشاں خیالات مسلمانوں کی آنکھوں میں دوپہر کے سورج کی طرح خیرگی پیدا کر رہے ہیں۔ اِدھر عربی فارسی اور اردو سے دلچسپی رکھنا ہندوؤں کی اجتماعی حیثیت کے لئے تباہ کن تصور کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس غلامانہ ذہنیّت کو ہندوستانی قوم اپنے دل و دماغ سے دور کر دے۔

ہر قوم دوسری قوم کے لٹریچر سے فائدہ اٹھائے۔ اردو کی ادبی محفلوں میں ہندی ادیب اور ہندی سبھاؤں میں اردو کے انشا پرداز شریک ہوں۔ بلکہ ایک دوسرے کے پروگرام میں حصّہ لیں۔ ہم ایک دوسرے سے الگ رہ کر کچھ نہیں کر سکے، کچھ نہیں کر سکتے۔ اردو ہندی کی حریفانہ حیثیتوں نے دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ پہنچا رہی ہیں۔ اور اگر قائم رہیں تو پہنچائیں گی۔ ہم کوئی سیاسی مشورہ تو دے نہیں سکتے۔ کہ نہ سیاست دان ہیں۔ نہ اس خارزار میں آنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ البتہ ادبی نقطۂ نظر سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ مسلمان ہندی سے پریم رکھکر اردو کو زیادہ ہر دل عزیز بنا سکتے ہیں۔ اور ہندو بھائی اردو کو اپنا کر ہندی کی ترقی کے لئے نئے میدان پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ محبت تلخیوں کو بھی شیریں بنا دیتی ہے اور نفرت سے شہد بھی حنظل سے زیادہ تلخ ہو جاتا ہے۔

روس کے بے خانماں بچّے

فرانسیسی اخبار' ردی دے دسونڈ' کا ایک مضمون نگار روس کے بے خانماں بچوں کی بدحالی کا ذمہ دار سوویٹ گورنمنٹ کو ٹھہراتا ہے جس کا مقصد اخلاق کو تباہ کر کے جماعتی تنفر و حقارت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اس سے گھرانوں کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سیاسی آلات بن جاتے ہیں۔ سوویٹ بجٹ سے مضمون نگار نے اندازہ کیا ہے۔ کہ اسوقت چار لاکھ پانچ ہزار بچوں کی پرورش گورنمنٹ کے ذمے ہے۔ مضمون نگار نے ان آوارہ گردوں کے جرائم کا اندازہ بھی بتایا ہے ۱۹۲۷ میں انتیس ہزار پانسو ستائیس وارداتیں ہوئیں۔ ان میں ایک سو اٹھارہ قتل کی وارداتیں تھیں جن میں سے بیس کا ارتکاب دس سال کی کم عمر کے بچوں نے کیا تھا۔ سوویٹ گورنمنٹ حیران ہے کہ ان جرائم کی روک تھام کیسے کی جائے۔ وہ اپنے آپکو ان بے سر کے نو عمر مجرموں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے قطعاً ناقابل پاتی ہے۔

تاجور

اُردو اور پنجابی

اُردو زبان کے آغاز پر اہلِ قلم کی آراء میں اختلاف ہے۔ مولانا آزاد اُسے شمالی ہند سے وابستہ بتاتے ہیں۔ اور اُردو کی دکنی تاریخیں دکن کو اس کا گہوارہ بیان کرتی ہیں حضرت سرخوش مصنف تذکرہ اعجاز سخن اور پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کی رائے میں اُردو ملتانی زبان سے نشو پذیر ہوئی ہے۔ اور اس کا مولد دکن کی بجائے پنجاب ہے۔

پروفیسر بھوپال سنگھ نے ان تمام آراء پر تبصرہ کرتے ہوئے پنجابی اور اُردو کے ماخذ پر مؤرخانہ بحث کی ہے۔ اس قسم کی مفید تنقیدوں کی اُردو ادب کو سخت ضرورت ہے۔ تنقید کی خوبی یہ ہے کہ کسی بحث پر موافق یا مخالف اظہارِ رائے کرتے ہوئے نقاد ایسا کوئی فقرہ اور کوئی لفظ استعمال نہ کرے جس سے وہ تنقید تنقید کی بجائے تنقیص یا تقریظ میں تبدیل ہو جائے ۔

ایڈیٹر

گو لفظ اُردو زمانۂ حال کے مروّجات میں سے ہے۔ اور سولھویں صدی عیسوی سے پہلے اس کثرت کے ساتھ مروّج نہ تھا لیکن جس زبان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ مسلمان فاتحین کی تسخیرِ ہند اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول اور اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ قدامت اپنے اندر رکھتی ہے پراکرت کے مشہور قواعد دان ہیم چندر نے پراکرت گرامر میں اپنے وقت کی مختلف مقامی زبانوں کے نمونے دیئے ہیں۔ لیکن ان میں ایک مثال بھی ایسی دستیاب نہیں ہو سکتی جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ اُس وقت عربی یا فارسی کا کوئی لفظ مستعمل تھا۔ یہ نمونے اس سے بیشتر کی مُروّجہ زبانوں کے ہیں۔ اور صحیح طور پر انہیں دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کی عام زبانوں کی مثال کہا جا سکتا ہے۔ اگر فارسی آمیز ہندوستانی کا نام ہی اُردو ہے۔ تو ہیم چندر کے اقتباسات کو قدیم اُردو کے نمونے کہنا کسی طرح بھی زیبا نہ ہوگا۔ گو یہ نمونے موجودہ ہندوستانی زبان کے نشو و نما کی ایک ابتدائی درجہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ امر بالکل عیاں ہے کہ گیارھویں صدی کے آخر میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو نہایت محدود تعداد میں علمی اغراض کی بنا پر اختیار کر لیا گیا تھا۔ اسلامی الفاظ کے اخذ کی قدیم ترین مثالیں پرتھی راج راسا میں ملتی ہیں۔ گو اس کتاب کا مستند ہونا خود ایک امرِ متنازعہ فیہ ہے۔ اور اس امر کا محتاج ہے کہ کامل تفتیش و تحقیق کے بعد اس کے غیر معتبر حصص کو خارج کر دیا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ پرتھی راج کی غوری اور دیگر ہندو راجاؤں کے ساتھ لڑائیوں کے واقعات کو بھاٹوں اور گویوں نے اُس کے جیتے جی حیات ہی میں ترتیب دیکر گانا شروع کر دیا تھا۔ اور یہ نظمیں خود اس کے دربار میں بھی گائی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں راسا کے کئی حصص ایسے بھی ہیں جن کو واقعات کی بنا پر آج بھی مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ طویل نظم سولھویں صدی کی تصنیف ہے۔ ایسا ہی دشوار ہے جیسا کہ یہ کہہ دینا کہ اس کا ایک ایک لفظ چند بردے کا لکھا ہوا ہے چند بردے خود لکھتا ہے کہ اس نے اپنی تصنیف میں چھ مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور ان چھ میں قرآن کی بھاشا بھی شامل ہے۔ اگرچہ تیرھویں صدی سے لیکر پندرھویں صدی کے متعلق کافی مصالحہ دستیاب نہیں ہو سکتا لیکن کبیر، خسرو اور ہندوستان کے ویشنو شعرا کی مقبولیت سے جو لوگوں کی زبان ہی میں نظمیں کہا کرتے تھے۔ یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی جس میں عربی اور فارسی الفاظ مخلوط تھے۔ اور جو مقامی اپ بھرنشا ادل کی جگہ استعمال ہونے لگی تھی۔ ہندوستانی زبانوں کی ابتدا کے متعلق ابھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں ہو سکتی لیکن یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی وہ صورت جو عربی اور فارسی الفاظ کے اختلاط سے وجود میں آئی اور بعد میں اُردو کہلانے لگی بارھویں صدی عیسوی کی پیدائش ہے ۔

دوسرا دلچسپ مسئلہ یہ ہے۔ کہ اُردو کہاں پیدا ہوئی۔ مولانا آزاد پہلے قابلِ ذکر مصنف ہیں۔ جنہوں نے اس نظریہ کی اشاعت کی۔ کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ آپ لکھتے ہیں :۔

"برج بھاشا کا سبزہ زار اس کا وطن ہے"

برج ہندوستان کے اس خطہ کا نام ہے۔ جو متھرا کے گرد و نواح میں واقع ہے اور جس کا ذکر کرشن جی کے حالاتِ زندگی میں اکثر آتا ہے۔ یہ چوراسی (۸۴)

کوس کے گھیر میں پھیلا ہوا ہے۔ دہلی کا ضلع اس میں شامل نہیں ہے اور دہلی کے مضافات کی زبان برج بھاشا نہ اب ہے نہ کبھی تھی۔

کچھ آگے چل کر مولانا آزاد فرماتے ہیں "خود اردو دہلی سے نکلی" صفحہ ۶۵۔ دیباچے میں آپ نے اپنے اس خیال کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کہ اردو برج کے سبزہ زار سے پیدا ہوئی۔ بلکہ آپ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں "ایک پچستہ شاہ جہانی بازار میں پھرتا ہے۔ شعراء اسے اٹھالیں۔ اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں" (دیباچہ)

مصنفین کی ایک جماعت یہ بھی مانتی ہے۔ کہ شمالی ہندوستان میں اردو کے ظاہر ہونے سے پہلے وہ دکن میں پیدا ہوئی۔ نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں لکھتے ہیں۔

"ہنوز شمالی چمن کا درخت بار آور نہ ہوا تھا۔ کہ دکنی پودا زمین کی عمدگی اور بروقت آبیاری سے بہت جلد ترو تازہ اور سرسبز و شاداب ہو گیا"

گویا کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ اردو کا بیج شمالی ہندوستان سے ہی دکن میں آیا اور یہاں آکر اس نے پرورش پائی اور بڑا ہوا۔ سید محی الدین قادری نے تو اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ جامعہ دہلی میں دسمبر ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا ہے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اردو اور دکنی زبان کو ایک ہی زبان کہنا علم اللسان اور تاریخ کی رو سے کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

تیسرے خیال کا اظہار کچھ عرصہ ہوا۔ رسالہ مخزن ۱۹۱۸ء میں "شیر پنجاب" کے نام سے کسی ادیب نے کیا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی آپ کے اس خیال پر اُس وقت رد و قدح ہو کر رہ گئی لیکن حال ہی میں اس کی حمایت پروفیسر شیرانی نے ایک کتاب لکھ کر کی ہے۔ اور جو بات کیفی صاحب نے سرسری طور پر کہی تھی۔ اس کو علمی رنگ میں علم اللسان کے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ضرور کار آمد ہے۔ کہ ہندوستانی زبان کے متعلق امور متنازع فیہ مثلاً پرتھی راج راسا اور امیر خسرو کی تصنیفات کا مستند ہونا وغیرہ پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جس خوبی کے ساتھ آپ نے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ "اردو برج بھاشا سے پیدا ہوئی ہے۔ قابل تحسین ہے۔ لیکن ایک غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے آپ ایک اور غلط فہمی کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ وہ یہ کہ اردو پنجاب میں صرف پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کو پنجابی اور ملتانی سے برج بھاشا کی نسبت زیادہ مناسبت ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں "اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریب رکھتی ہے[1]" اور اس کی وجہ آپ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں غزنوی خاندان کی تاسیس سے پہلے سندھ اور ملتان میں ایرانی اور ہندی تمدن ہمکنار ہو گیا تھا۔

آزاد اور اُس کے "تابعین" کا یہ مسئلہ کسی حد تک قابل تسلیم ہو سکتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے پیدا ہوئی۔ کیونکہ برج بھاشا اب تک ہندوستان کے اُن علاقوں کی علمی زبان ہے۔ جہاں کی عام مقامی زبان اس سے بالکل مختلف تھی لیکن ایک صوبہ کی علمی اور مقامی زبان کی گڑبڑ کی وجہ سے ہمیں اس کے آغاز کے متعلق بحث کرنے میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ پنجابی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ صوبہ پنجاب کی مقامی زبان ہے۔ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ پنجابی کو علمی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی پنجابی کو علمی زبان کہنا صریح مبالغہ ہو گا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قدیم میں پنجابی کا وجود مقامی زبان کی حیثیت سے تھا۔ لیکن علمی مطالب کے اظہار کے لئے اس سے شاذ ہی کام لیا گیا ہے۔ پنجابی مصنفین کے کے اکثر اقتباسات جو پروفیسر شیرانی نے پیش کئے ہیں ان سے بھی یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے مثلاً کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر پنجابی کا ہے۔

نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا   برہوں کی آگ میں سینہ جراتا

جو مثالیں پروفیسر شیرانی نے دی ہیں وہ حقیقت میں ہندی شاعری کا نمونہ ہیں جس میں کبھی کبھی پنجابی الفاظ اور ترکیبیں بھی آجاتی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:-

"اس سے قبل ارشاد کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پھیلا دیا ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔" صفحہ ۳۴

آپ نے اس واقعہ کو بہت اہمیت دی ہے۔ کہ غیاث الدین تغلق پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا تھا۔ اور آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پنجابی زبان نے دہلی کی زبان پر لازماً گہرا اثر کیا ہو گا۔ آپ لکھتے ہیں:-

"لیکن ہمارے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہو گا۔ اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہونگے جب نارمنوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لئے اسکی رفتار کو بدل دیا۔ تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دہلی میں ان پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہو گا"

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۸

یہ محض خیال ہے۔ جسے اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ اگر غیاث الدین کے پنجابی لشکر نے دہلی کی زبان کو بدل دیا ہوتا۔ تو لازماً دہلی کی زبان پر ہر نئے حملہ آور کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی۔ نارمنوں کی فتح انگلستان اس واقعہ سے کچھ بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اس سے صرف اس قدر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فاتحین کی زبان کے کچھ الفاظ مفتوحین کی زبان سے خلط ملط ہو جایا کرتے ہیں۔

اُردو اور پنجابی کے عنوان سے جو خاص باب آپ نے لکھا ہے۔ اسمیں اُردو اور پنجابی کی گرامر کی مماثلت پر ایک طویل بحث کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

"گزشتہ سطور کے مطالعہ سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اُردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا۔ اُن کی تذکیر و تانیث جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اس نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے۔ اور جب سیانی ہو گئیں۔ تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے۔ وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے۔ جب اُردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے"

یہ باب تمام تر زبان کی ابتدا اور اُس کے ارتقا کے مسئلہ کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ پروفیسر شیرانی کے نقطۂ نگاہ کو اس امر نے غلط بنا دیا ہے کہ آپ زبان کے مشترک ماخذ کے مقابلہ میں اس کی جائے ولادت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اُردو کے پنجابی کے بطن سے پیدا ہونے پر جس قدر دلایل دیئے جاتے ہیں اُن کا زور اس امر کو پیش نظر رکھنے سے زایل ہو جاتا ہے۔ کہ اُردو اور پنجابی کا ماخذ ایک ہی ہے۔ اگر پروفیسر شیرانی کا طرز استدلال صحیح ہے تو ایک بنگالی بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ اُردو بنگالی سے نکلی ہے۔ اور ایک مرہٹے کو بھی حق حاصل ہے کہ اردو اور مرہٹی میں چند مشترک الفاظ پا کر اسے مرہٹی ہی کا زائیدہ قرار دے۔

دراصل شمالی ہندوستان کی تمام آرین زبانیں ایک ہی والدین کی اولاد ہیں اس لئے اُردو کی پنجابی سے مماثلت کچھ زیادہ باعث تعجب نہیں ہے پنجابی اور اُردو کا رشتہ ماں اور بیٹی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ دو بہنیں ہیں اور جو رشتہ شیرانی صاحب نے برج بھاشا اور اُردو کے درمیان قایم کیا ہے۔ اُسی کا اطلاق پنجابی اور اُردو کے تعلقات پر بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر شیرانی جو کچھ ثابت کر سکے ہیں۔ اُس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ کہ اُردو اور پنجابی میں کچھ الفاظ مشترک ہیں۔ اور ان کی گرامر میں بھی کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پنجابی نے اُردو پر ضرور اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح اُردو بھی پنجابی پر اسی قدر اثر انداز ہوئی ہے جو الفاظ ان دونوں میں مشترک ہیں وہ مشترک ماخذ کا نتیجہ ہیں۔ شمالی ہندوستان کی تمام زبانوں کے الفاظ بہت حد تک سنسکرت۔ پراکرت۔ فارسی۔ عربی۔ پرتگالی اور انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ اگر پنجابی کی گرامر اردو کی گرامر کی مماثل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند کی تمام زبانوں کی گرامروں میں کچھ امور مشترک فیہ ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کا آغاز سنسکرت سے ہوا ہے۔

پروفیسر شیرانی یہ ماننے سے کتراتے ہیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-
"سنسکرت اور پراکرت کی ٹٹی کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبولوایا جا رہا ہے"

ہندوستانی زبانوں کے محقق کے لیے یہ امر محض ناممکن ہے کہ وہ سنسکرت اور پراکرت کو نظر انداز کر دے۔ کیا تعجب ہے کہ ایسا خیال رکھتے ہوئے پروفیسر شیرانی غلط راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔

"بھوپال سنگھ"

محبت

آ۔ اے دوست آ۔ ہم ان تمام مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوں گے۔ جو لبریز اور گنجان اشجار۔ وادیوں۔ پہاڑیوں۔ کھیتوں اور جنگلوں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

"مارلو"

محبت۔ شہرت سے بہتر ہے۔ "شیلر"

محبت رات کی مملکت کو منور کر دیتی ہے۔ "شیلر"

محبت ایک ایسی دنیا ہے۔ جس میں سکون اور اطمینان کے بدلے بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے۔ لیکن اس بے چینی اور اضطراب میں کچھ ایسا کیف پنہاں ہے۔ جو اس دنیا کے سکون اور اطمینان میں نہیں ہے۔ محبت کی بے چینی لطیف لہروں سے مشابہ ہے۔ اور دل اس کا دریا ہے۔

"میری کوریلی"

مجلسِ اقوام میں
داخلۂ جرمنی

میرے دوست [illegible] صاحب کی فرمائش ہے کہ میں "ادبی دنیا" کے پہلے پرچے کے لئے کوئی مضمون اپنے سفرِ جنیوا کے مشاہدات کے متعلق لکھوں میں ۱۹۲۶ء میں اُس وفد میں بھیجا گیا تھا جو ہر سال انجمن اقوام کے سالانہ جلسہ کی شرکت کے لئے ہندوستان سے جنیوا جاتا ہے۔ اب وہ کہانی پرانی ہو گئی اور اسکے بعد دہ وفد اور جا چکے لیکن ۱۹۲۶ء کے واقعات میں ایک تاریخی واقعہ ایسا ہے جو مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ اور جس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اِس کا مختصر سا ذکر کرتا ہوں ۔

عبد القادر

لیگ کا ساتواں سالانہ جلسہ ۶؍ ستمبر ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا۔ اور ۲۵ ستمبر کو ختم ہوا۔ درمیان کے دنوں میں کسی دن جلسۂ عام ہوتا تھا۔ اور کسی دن مختلف کمیٹیوں کے جلسے۔ افتتاح کے دن کوئی بات ایسی نہ تھی۔ جو اس جلسہ کو اس قسم کے کسی دوسرے بڑے جلسہ سے ممتاز کرے۔ سب سے پہلے کونسل کے صدر نے ایک ایڈریس پڑھا اور ممبروں سے درخواست کی کہ وہ دوپہر کے بعد پھر جمع ہوں اور سالانہ جلسے کے لئے صدر کا انتخاب کریں۔ اِس تجویز کے مطابق پچھلے پہر کے مجمع میں صدر کا انتخاب ہوا اور صاحب صدر نے اپنا خطبہ صدارت سنایا۔ اور دوسرے دن کے لئے کمیٹیوں کا اعلان کیا۔ کمیٹیوں کے صدر منتخب کئے گئے اور دوسرے دن کمیٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مگر جس چیز سے ساتویں جلسہ میں تاریخی اہمیت پیدا ہوئی وہ داخلہ جرمنی ہے۔ جرمنی کی درخواست پیش ہونے پر جرمنی کو لیگ کا ممبر قرار دینے اور اُسے مستقل ممبران کونسل میں جگہ دینے کا متفقہ فیصلہ جلسۂ عام میں ہوا۔ اور جرمن وفد بسرکردگی ڈاکٹر سٹریسمان اپنے وزیر امور خارجہ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ اُس دن ہال اور گیلریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اِس دلچسپ واقعہ کے دیکھنے کے اشتیاق میں لوگ دور دور سے آئے تھے۔ وہ قومیں جو چند سال پہلے تک آپس میں لڑ رہی تھیں۔ جن کی کشمکش میں لاکھوں انسانوں کی جانیں تلف ہوئیں اور لاکھوں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ وہ آج امن کی تلاش میں ایک چھت کے نیچے بیٹھنے کو تھیں۔ خاص کر فرانس اور جرمنی کا یکجا ہونا جو کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوتا تھا۔ بہت پُرمعنی تھا۔ جرمنی کی آمد آمد سن کر ایک انتہائی سکوت جو مجمع پر طاری ہو گیا تھا۔ جرمن نمایندوں کے آتے ہی جوش و خروش سے بدل گیا۔ اُن کے خیر مقدم کے لئے تالیاں بجنے لگیں اور بار بار بجتی رہیں۔ ہزاروں شخصوں کا مجمع جس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ موجود تھے۔ گویا آنکھیں مل مل کر دیکھتا تھا۔ کہ آیا جرمن اور فرانسیسی حقیقت میں ایک دوسرے سے دوستانہ مصافحہ کرنے کو تیار ہیں یا نگاہ کو کچھ دھوکا ہو رہا ہے۔ اور جب حقیقت کا احساس ہوتا تھا۔ تو اظہارِ مسرت کے طور پہ تالیاں پھر بجنے لگتی تھیں۔

جب یہ جوش کچھ فرو ہوا اور صدرِ جلسہ نے میز پر ہتھوڑے کی دو تین ضربیں لگا کر حاضرین سے سکوت کی درخواست کی۔ تو لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس نے موزون مگر مختصر الفاظ میں انجمن اقوام کی طرف سے جرمنی کو خوش آمدید کہا۔ اور جرمنی کے نمائندے کو پکارا۔ کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ جرمنی کا نمائندہ اوّل اُٹھا۔ اُس کی صورت اُس کی قومیت کی گواہی دے رہی تھی۔ گول مگر بڑا سر۔ سر کے بال اُڑے ہوئے کھلی اور بلند پیشانی۔ موٹے مگر ممتاز خط و خال۔ عمر کے اعتبار سے ادھیڑ۔ نہ بوڑھا نہ جوان۔ ڈاکٹر سٹریسمان پلیٹ فارم پر آیا۔ اور جلسہ سے خطاب کرنے کو تھا کہ مجمع پھر اظہارِ جوش کے بغیر نہ رہ سکا۔ گونجتی ہوئی تالیوں سے اُس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے سناٹا چھا گیا۔ طلسم سکوت ٹوٹا تو ایسی زبان میں تقریر شروع ہوئی۔ جو نہ فرانسیسی کی طرح خوش آیند تھی۔ اور نہ انگریزی کی طرح عام فہم۔ اسکے بعد پھر خموشی طاری ہو گئی۔ جو لوگ جرمن زبان سمجھتے تھے۔ انہوں نے تقریر کا لطف اٹھایا۔ اور خیالات سے آگاہ ہوئے۔ مگر جو نہیں سمجھتے تھے (اور وہ بہت سے تھے) وہ ترجمہ کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ تقریر لکھی ہوئی تھی۔ اور کوئی غیر معمولی بات مقرر کی طرزِ ادا میں ایسی نہ تھی۔ جو زیادہ دلکش ہوتی۔ ترجمہ ہوا تو معلوم ہوا۔ کہ جرمنی کے نمایندے نے محض رسمی طور پر نہیں۔ بلکہ خلوص کے انداز سے اپنے ملک کی جانب سے لیگ میں شامل ہونے اور اس کے مفید کاموں میں شریک ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر جرمنی بھی امنِ عام اور ترقئ انسانی کے حصول کی کوشش

کرے گا۔ اس تقریر کے بعد فرانس کے نمائندہ اول کی باری آئی اور موزوں بھی یہی تھا کہ اس موقع پر اقوام کی طمانیت کا اظہار فرانس کی زبان سے ادا ہو۔ موسیو بریاں نے جو فرانس کے صیغہ خارجیہ کا وزیر ہے۔ فرانسیسی میں تقریر کی۔ جو اس سال کے جلسے کا ماحصل تھا۔ ایسی تقریریں کبھی کبھی سننے میں آتی ہیں بلکہ بڑے بڑے مقرر بھی ہر وقت نہیں کر سکتے۔ موسیو بریاں اپنے ملک کے بہترین ماہرین فصاحت میں سے ہے۔ اُس نے اپنی عمر میں سینکڑوں اچھی تقریریں کی ہوں گی۔ مگر شاید کوئی ایک آدھ اُن میں ایسی ہو جو فصاحت اور اثر کے لحاظ سے اس تقریر کے درجے تک پہنچ سکے۔ جو اس خاص وقت کی تاثیر سے اس کی زبان سے نکلی۔ کوئی لکھی ہوئی تقریر اُس کے پاس نہ تھی۔ بلکہ کوئی یادداشت یا نوٹ بھی اُس کے ہاتھ میں نہ تھے۔ وہ دیرینہ سال مدبر اپنی بے ساختگی اور قلبی جوش کے بھروسے مجمع کے سامنے آگیا۔ اُس کے سر کے بال سفید اور گردن تک لمبے۔ کسی قدر بے پرواہی سے سنوارے ہوئے قد درمیانہ۔ بدن مائل بہ فربہی۔ لباس سادہ۔ پرانی وضع کے مدبروں کا ایک نمونہ۔ اُس کا پلیٹ فارم پر آتے ہی مجمع کے مکرر اظہار مسرت کے لئے ایک بہانہ بن گیا۔ اور جب تالیاں تھمیں اور اُس نے تقریر شروع کی تو آواز کچھ دھیمی بلکہ تھرائی ہوئی تھی۔ لیکن بتدریج بلند ہوتی گئی۔ اور اُس کا اُتار چڑھاؤ جو جانِ فصاحت ہے۔ ہر موقعہ کے مناسب ہونے لگا۔ جب تک بوڑھے مقرر کے لب مائل گفتار رہے۔ ہر پیر و جوان اور زن و مرد ہمہ تن گوش بنے سنتا رہا۔ اور جب تقریر ختم ہوئی تو ہر طرف سے تحسین و آفرین ہوئی کہ دیر تک یاد رہے گی ٭

عبدالقادر

دو خدا

(اثر خامہ جناب شمبر رسشن جرنلسٹ)

(۱)

شام کا وقت تھا۔ ایک خدا پرست فقیر بازار سے گذر رہا تھا۔ دکانوں کے چراغ جل چکے تھے۔ اور اُن کی مصنوعی روشنی میں دنیا کے فانی چہرے اس طرح چمک رہے تھے۔ جس طرح عہد شباب میں چند روزہ حسن چمکتا ہے۔ دفعتاً ایک بالاخانہ سے کسی عیاش امیر کی پیاری چہیتی محبوبہ نے باہر سر نکالا۔ اور فقیر کے چہرہ پر پان کی پیک تھوک دی ٭

(۲)

فقیر نے اوپر دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر کہ عورت اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے ابھی تک مسکرا رہی ہے۔ اُسے حیرت ہوئی۔ اور اس نے مجذوبانہ انداز سے چلّا کر کہا۔ اے فانی انسان! خدا کے بندوں کی یوں تحقیر نہ کر۔ اُس کی نگاہوں میں تیرا حسن اور تیرا شباب دونوں بے حقیقت ہیں۔

گنہگار حسینہ کا لال چہرہ اور بھی لال ہو گیا۔ اور اس نے عالم آزردگی میں پیچھے مڑ کر اپنے عاشق سے کہا۔ تم نے دیکھا۔ ایک ناچیز گداگر میرے بارے میں حسن و شباب کی توہین کر رہا ہے۔ اور عیاش امیر جو عورت کے فانی رنگ و روغن کے نشہ میں دین و دنیا سے اندھا ہو رہا تھا۔ لاٹھی لے کر تیزی سے نیچے اُترا اور خدا پرست فقیر پر پل پڑا۔ اپنے ہاتھوں۔ پاؤں اور لاٹھی کی پوری قوت سے اُسے اُس کی "زبان درازی" کیلئے زدوکوب کیا۔

فقیر کی چیخیں آسمان میں گونج رہی تھیں لیکن زمین والوں کے کان اسکی طرف سے بالکل بند تھے۔

(۳)

رات کو قدرت کا غیبی ہاتھ حرکت میں آیا۔ اور دوسری صبح کم نگاہ امیر اپنے گناہ آلود بستر پر بیجان پڑا تھا اس عورت نے دل کی آہ کا یہ جیتا جاگتا معجزہ دیکھا اور اُس کا خون اسکی رگوں میں سرد ہو گیا۔ وہ برہنہ پا برہنہ سر شہر کے باہر گئی اور فقیر کے [illegible] پاؤں پر اپنا نازنین سر رکھ کر رونے لگی۔

فقیر نے اُسے دیکھا اور کہا "مائی اُٹھ! میرا خدا اپنے کسی بندے کو ایسی بے بسی کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا!"

لیکن عورت نے پاؤں نہ چھوڑے جسطرح بچہ ڈر کے وقت ماں کی گود نہیں چھوڑتا۔ وہ اب اپنے فعل بد پر نادم تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور اُس کے آنسو فقیر کے پاؤں پر گر رہے تھے۔ اُس نے شدت گریہ سے رک رک کر کہا میں اندھی تھی میں نے قصور کیا۔ میں نے گناہ کیا۔ مجھے گالیاں دیجئے مجھے ماریئے۔ میری کھال ادھیڑ دیجئے۔ لیکن اپنے غضب کی آگ سے بچا لیجئے!

فقیر نے اُسکے عاشق کے انجام کی خبر سنی۔ اور زار و قطار روتا ہوا بولا "مائی یہ میرا اور تیرا جھگڑا نہیں تھا میرے اور تیرے خداؤں کی جنگ تھی۔ تیرے خدا کو غصہ آیا۔ اس نے مجھے مارا۔ میرے خدا کو غصہ آیا۔ اس نے تیرے خدا کو مارا۔ لیکن میرے خدا کے [illegible] وہ جیت گیا۔ اور تیرا خدا (؟) اسکے روبرو کمزور بے حقیقت تھا وہ ہار گیا۔

یہ کہتے کہتے فقیر یکایک ایک تیسرے آدمی کیطرف مڑا۔ اور اپنے سر کو ایک عجیب انداز سے جنبش دیکر بولا۔ تیرا خدا کون ہے؟

وہ آدمی اور وہ عورت دونوں اس سوال سے حیران تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ اس سوال کا مطلب سمجھیں مگر اُنکے فکر کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ فقیر اُٹھا اور انکو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

چند خطوط

یہ افسانہ المِ ہنگری کے زندہ جاوید مصنف مارس جوکائی کے ایک شاہکار سے ماخوذ ہے۔ اس کا ترجمہ یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکا ہے اور انگریزی زبان کی مشہور کتاب "گریٹ شارٹ اسٹوریز آف دی ورلڈ" میں بھی اسے جگہ دی گئی ہے۔ اس کتاب میں جو تعارف یا دیباچہ اس افسانہ کے متعلق لکھا ہے میرے نزدیک اس میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں جنکے ازالہ کے لئے یہ چند سطور قلمبند کی جاتی ہیں:۔

اسی کتاب کے فاضل مرتبین بیرٹ ایچ کلارک اور میکسیم لائبر نے لکھا ہے کہ یہ افسانہ ہنگری کے مشہور ڈرامہ نویس کیرولی کِسفالوڈی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور یہ کہ مسٹر جوزف زیلینی نے اول مرتبہ اس افسانہ کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں ہنگری کے ادبیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیرولی کسفالوڈی کے نام سے کسی شخص کو اس ملک کے ادبیات کے تذکروں میں جگہ نہیں دی گئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ قابل مدیروں کو اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور اُن کی مراد چارلس کسفالوڈی سے ہے جو ہنگری کے مشہور شاعر الگزینڈر کسفالوڈی کا چھوٹا بھائی تھا جیسا کہ صفحہ ۵۹۲ پر انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے[۱] دوسری عجیب بات یہ ہے کہ اس افسانہ کو چارلس کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس نے زندگی بھر میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ اس کا ابتدائی مشغلہ مصوری تھا لیکن بعد میں ڈرامہ نویسی میں اس حد تک اُس نے کمال پیدا کیا کہ ہنگری زبان کے ڈراموں میں دلچسپی پیدا کرنے والا یہ پہلا شخص تسلیم کیا جاتا ہے جس نے ہنگاری اسٹیج سے خارجی عنصر کو دور کر کے صحیح ملکی اور قومی عنصر بھر دیا تھا[۱]۔ البتہ اسکے بڑے بھائی نے کسی زمانہ میں چند افسانوں کا مجموعہ[۲] شایع کرایا تھا۔ جسکے متعلق بھی بوڈاپسٹ یونیورسٹی کے ہنگری ادبیات کے پروفیسر ڈاکٹر رانڈل کا خیال ہے کہ بلحاظ نفسیات کے وہ افسانے نہایت ناقص ہیں۔

"گریٹ شارٹ اسٹوریز آف دی ورلڈ"[۱] کے فاضل مدیروں کا بیان ہے کہ یہ افسانہ فن کے نقطۂ نگاہ سے کامل و اکمل چیز ہے اور اس میں افسانہ نگاری کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک اعلیٰ پایہ کا نقاد ایسے افسانوں میں دیکھنے کا طالب ہوتا ہے اس سے بھی میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس افسانہ کا مصنف کوئی اور شخص ہے۔ کیونکہ چارلس کسفالوڈی جس کے نام سے یہ افسانہ منسوب کیا جاتا ہے ۱۷۸۸ء سے لیکر ۱۸۳۰ء تک زندہ رہا اور اسکی موت کے وقت مختصر افسانہ نویسی کا فن شاید نہایت ابتدائی حالت میں تھا۔ مختصر افسانہ نویسی کے موجد ایڈگر ایلن پو نے چارلس کسفالوڈی کی موت کے بعد یعنی ۱۸۳۲ء کے قریب اپنی سب سے پہلی کہانی "بیرینائس" لکھی جسے نقادانِ فن نے بالاتفاق اصول افسانہ نویسی کی رو سے سب سے پہلا مکمل اور کامیاب افسانہ تسلیم کیا ہے۔ ادھر موپَرسے بالزاک نے بھی ۱۸۳۰ء ہی میں اپنے افسانے تصنیف کرنے شروع کئے[۴]۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مختصر افسانوں کا فن چارلس کی موت کے بعد صرف امریکا اور فرانس میں اول اول رائج ہوا تھا اور یورپ کے باقی تمام ملک اس صنفِ ادب سے قطعی نا آشنا تھے۔

دوسری بات کے متعلق کہ یہ افسانہ سب سے پہلے مسٹر جوزف زیلینی نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جب یہ کتاب شایع ہوئی اُس سے قبل یہ افسانہ سٹرینڈ میگزین میں چھپ چکا تھا اور اسکے بعد اسے "ماسٹر پیس لائبریری آف شارٹ سٹوریز" میں جگہ دی گئی ہے یہ ترجمہ جو مسٹر جوزف زیلینی کے ترجمہ سے زیادہ مکمل اور اصل سے زیادہ مطابق ہے۔ اس کے مصنف مارس جوکائی کے نام سے شایع ہوا ہے جو ۱۸۲۵ء سے لیکر ۱۹۰۴ء تک زندہ رہا۔

اس ثبوت کے علاوہ بھی اگر دیکھا جائے۔ تو گریٹ شارٹ سٹوریز کے مرتبین سے ماسٹر پیس لائبریری آف شارٹ سٹوریز[۵] کے نقاد زیادہ قابلِ وثوق

---

[۱]. اگرچہ یہاں بھی چارلس کو کیرولی ہی لکھا ہے۔

[۱] ہنگرین لٹریچر صفحہ ۱۱۴ - فریڈرک رائیڈل پی۔ ایچ۔ ڈی۔

[۲] "فرام دی پاسٹ آف ہنگری"۔ یہ افسانے زیادہ تر قدیم ہنگری کی شجاعت وغیرہ کے متعلق ہیں۔

[۳] شارٹ سٹوریز آف دی لٹریچرز آف دی ورلڈ جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۱ مرتبہ ہیرالڈ منڈلے گوسے۔ ایل ایل۔ ڈی۔

[۴] شارٹ سٹوری ماسٹر پیسز (فرنچ) جلد اول مرتبہ ڈاکٹر جے برگ ایزنوین۔ لٹ ڈی۔

[۵] ماسٹر پیس لائبریری آف شارٹ سٹوریز جلد ۱۴ صفحہ ۳۴۱ جے لے ہیمرٹن۔

اور انتخاب کرنے والوں کا رتبہ ادبیات عالم میں بہت زیادہ بلند و ارفع ہے۔ جن میں سر ایڈمنڈ گوسے۔ سی۔ بی۔ ایل۔ ایل ڈی پروفیسر برینڈر متھوز لٹ ڈی۔ ڈی سی ایل سر ولیم رابرٹ نکول ایم۔ اے ایل ایل ڈی۔ پروفیسر سر آرتھر کوٹلر کاوچ ایم۔ اے لٹ ڈی۔ پروفیسر جارج سینٹسبری ایم۔ اے ایل ایل ڈی۔ ڈی لٹ اور پروفیسر ڈبلیو پی ٹرینٹ، ایل ایل ڈی۔ ڈی سی ایل جیسے نقادان فن اور متبحر عالم شامل ہیں۔ میں "دی المگامیٹڈ پریس لمیٹڈ لنڈن" اور مشہور آفاق ادیب اور نقاد مسٹر ہیمرٹن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس افسانہ کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی اجازت بخشی۔ کیونکہ اس افسانے کا کاپی رایٹ اور حقوق ترجمہ انکے پاس محفوظ ہیں ؛

چند خطوط

گذشتہ مارچ کی ایک سہانی صبح کو ڈاکٹر سلیمان کے بنگلہ کے سامنے ایک شاندا
آکر رکی جس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا پارسی اپنے مضمحل و بیمار جسم کو سنبھال کر
اور اپنے دو ملازموں کے سہارے شفاخانے کے اندر پہونچا دیا گیا۔ اس وقت
ح کے سات بجے ہونگے۔ ڈاکٹر سلیمان کا مطب آٹھ بجے کھلتا تھا۔ مگر نووارد کے
ں پیغام نے کہ اسے دیکھنے میں ہر لمحہ کی تاخیر اس کی زندگی کے لئے مہلک ثابت
ل۔ شریف النفس ڈاکٹر کو اپنے روزمرہ کے وقت سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے مطب
ں آجانے پر مجبور کردیا۔ ڈاکٹر سلیمان نے ایک لمبا کوٹ پہن لیا اور اپنے ملازم کو حکم
اکہ وہ مریض کو اس کے کمرہ میں لے آئے ؛

نووارد کے لباس اور اسکے اطوار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلےٰ خاندان
فرد اور نہایت متمول آدمی ہے۔ لیکن اسکے چہرہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی
نت تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کپڑے کی ایک پٹی
ے سہارے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اور اپنی جسمانی تکلیف کو چھپانے کی سعی کے
وجود کسی نہ کسی وقت ایک دبی ہوئی آہ اس کے لبوں سے نکل جاتی تھی۔ کمرہ کے
ندر داخل ہوتے ہی اس نے چند لمحوں تک ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر نہایت
ہستہ اور کمزور آواز میں کہنے لگا "آپ ہی کا اسم گرامی ڈاکٹر سلیمان ہے ؟"

"ہاں جناب میرا یہی نام ہے" ڈاکٹر نے نہایت شریفانہ انداز میں جواب دیا۔
"معاف کیجئے گا میں لاہور میں بہت کم آتا ہوں۔ اس لئے آپ کو جاننے کا
شرف حاصل نہیں۔ آپکی شہرت مجھے یہاں کشاں کشاں لے آئی ہے اور ہماری اس وقت
ی ملاقات بھی مسرت افزا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ میرے متعلق آپ کو ایک ناخوشگوار
کام سرانجام دینا ہے"

ڈاکٹر نے یہ دیکھ کر کہ مریض اتنا کمزور ہے کہ اس کی ٹانگیں اسکے نحیف و ناتواں
جسم کا بوجھ سنبھالنے کے ناقابل ہیں۔ نہایت ہمدردانہ لہجہ میں کہا "تشریف رکھئے"
مریض نے بے بسی کے عالم میں اپنے آپ کو ایک کرسی میں گرادیا۔ پھر ایک لمبا
سانس لے کر کہنے لگا "میں بہت تھک گیا ہوں۔ قریباً ایک ہفتہ سے میں مطلق
نہیں سویا۔ میرے دائیں ہاتھ میں کچھ تکلیف ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہے
آیا یہ کاربنکل ہے یا سرطان۔ پہلے پہل درد بہت کم ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ ایک قسم
کی ناقابل برداشت سوزش میں تبدیل ہوگیا ہے اور دن بدن زیادہ ہورہا ہے
اب میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ لاہور چھاؤنی میں بھی میرا کاروبار ہے اور
گذشتہ ہفتہ سے یہیں پڑا ہوں۔ آج نہایت مجبور ہوکر آپ کے پاس آیا ہوں
براہ کرم اس حصے کو فوراً کاٹ ڈالیئے۔ کیونکہ اگر یہی حالت رہی تو یہ جانگسل درد
ایک گھنٹہ کے اندر اندر مجھے دیوانہ بنادے گا"؛

ڈاکٹر سلیمان نے مریض کی باتیں نہایت توجہ سے سنیں اور اسے یقین دلانے کی
کوشش کی کہ وہ نشتر کا استعمال کئے بغیر اس درد کو کسی تحلیل کردینے والی دوا یا
مرہم ہی سے اچھا کردے گا۔

یہ خلاف توقع بات سنتے ہی مریض کے جسم میں عجیب قسم کی حرکت پیدا ہوئی
اور اس کی نیم وا آنکھیں غصہ سے چمک اٹھیں۔ پھر وہ بلند آواز میں کہنے لگا۔
"نہیں جناب نہیں، کسی قسم کا مرہم یا پلستر میرے اس درد میں افاقہ پیدا نہیں
کرسکتا۔ اس کا علاج تو آپ کا تیز نشتر ہی کرسکتا ہے۔ اور میں آپ کے پاس
آیا بھی اسی غرض سے ہوں۔ کہ اس جگہ کو کاٹ کر میرے بدن سے علیحدہ کردیجئے
اس نے میری جان کو اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے ؛

ڈاکٹر نے اسے ہاتھ دکھانے کے لئے کہا۔ مریض نے اس حکم کی تعمیل میں
ڈاکٹر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت وہ اپنے دانت پیس رہا تھا۔ اور
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نوع کے عذاب الیم میں مبتلا ہے۔ جس کی شدت اسے
خستہ و درماندہ کئے دیتی ہے۔ پھر نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے ہاتھ پر لپٹی
ہوئی سفید پٹیوں کو علیحدہ کرکے کہنے لگا، "ڈاکٹر صاحب! میری تکلیف کچھ اتنی
عجیب و غریب ہے کہ شاید آپ کو حیران کردے۔ اگر آپ کو میرے ہاتھ پر کوئی
غیر معمولی بات نظر آئے تو اسے کاٹ ڈالنے میں تامل نہ فرمایئے گا"؛

ڈاکٹر نے مریض کو پھر تسلی دی۔ بطور ایک معالج کے اس کی نگاہ سے بہت
سی عجیب و حیرت انگیز باتیں گذر چکی تھیں۔ لیکن نووارد کے ہاتھ میں اسے

کوئی حیران کر دینے والی بات نظر نہ آئی۔ نہ تو اُس ہاتھ پر کوئی زخم تھا۔ نہ کسی رگڑ کا نشان۔ کوئی غیر معمولی بات بھی اُس سے عیاں نہ تھی اور وہ کسی تندرست ہاتھ کی مانند ایک ہاتھ تھا۔ ایک قسم کے تذبذب کے ساتھ ڈاکٹر نے مریض کا ہاتھ اپنی گرفت سے رہا کر دیا۔ جونہی ڈاکٹر نے اُس کا ہاتھ چھوڑا مریض کے منہ سے درد و کرب کی ایک چیخ نکل گئی۔ پھر اُس نے بائیں ہاتھ سے اپنے اِس دُکھتے ہوئے ہاتھ کو اِس انداز سے سنبھالا کہ ڈاکٹر کو یقین ہو گیا۔ کہ اُس کا مریض کسی قسم کا دھوکا دینے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ فی الحقیقت وہ ایک قسم کی شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نے ترحّم بھری نظروں سے دوبارہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "آپ کس جگہ تکلیف محسوس کرتے ہیں"؟

"یہاں" مریض نے لجائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اپنی انگلی کو دائیں ہاتھ کی پشت پر اُس جگہ رکھا۔ جہاں دو بڑی رگیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ جب ڈاکٹر نے اُس مقام کو اپنی انگلی سے چھوا تو مریض کا سارا بدن کانپ اٹھا اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ ناقابل برداشت درد کی ایک برقی لہر اس کی رگ رگ میں دوڑ گئی ہے۔ "آہ! اسی جگہ پر درد ہوتا ہے، سخت سخت ......" مریض نے جانکنی کی سی حالت میں کہا۔

جب میں اِس مقام پر انگلی رکھتا ہوں تو کیا آپ اِس کا لمس یا دباؤ محسوس کرتے ہیں"؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

لیکن مریض نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کی تکلیف اتنی شدید و ناقابل برداشت تھی ــ "حیرت ہے" ڈاکٹر کے منہ سے نکلا "لیکن مجھے اِس مقام پر کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آتی"۔

اور نہ میں دیکھ سکتا ہوں" مریض نے آہستہ آواز میں کہا "لیکن جو کچھ میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ اتنا تکلیف دہ اور شدید ہے کہ بعض اوقات میں اپنا سر دیوار کے ساتھ مارنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہوں"!

ڈاکٹر نے حیران ہو کر اپنی میز کے دراز سے ایک محدب شیشہ نکال کر اِس مقام کو دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہنے لگا "جلد میں زندگی کے تمام آثار موجود ہیں اور اُس کی عروق میں خون کا دوران بھی باقاعدہ ہے۔ یہاں پر نہ تو کسی قسم کی سوجن ہے۔ نہ اِس کے اندر سرطان کا کوئی وجود۔ دردزدہ مقام اتنا ہی پرصحت ہے۔ جیسے آپکے ہاتھ کے دیگر حصے"!

"لیکن میرے خیال میں یہاں سرخی زیادہ ہے" مریض نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کہاں"؟ ڈاکٹر سلیمان نے چونک کر پوچھا۔

مریض نے اپنی جیب سے ایک پنسل نکالی اور اپنے ہاتھ کی پشت پر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا کر کہنے لگا "جناب اِس جگہ پر"!

ڈاکٹر نے حیرت زدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اجنبی کی پریشان کر دینے والی گفتگو سے اِس نتیجہ پر پہونچنے کے قریب تھا کہ اُس کے مریض کا دل و دماغ درست حالت میں نہیں چند لمحے کے سکوت کے بعد ڈاکٹر نے پھر اُسے مخاطب کر کے کہا "آپ کچھ عرصہ میرے ہاں ٹھیریں۔ میں چند روز میں آپ کی تکلیف رفع کر دوں گا"!

یہ بالکل ناممکن ہے" مریض نے انتہائی مایوسی کے انداز میں کہا "آپ مجھے دیوانہ یا مخبوط الحواس خیال نہ کریں۔ کیونکہ اِس طریق سے آپ ہرگز میرا علاج نہ کر سکیں گے۔ یہ چھوٹا سا دائرہ جسے پنسل سے میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر بنایا ہے۔ مجھے اتنی اذیت اور تکلیف دے رہا ہے کہ کوئی انسان اِسے تصور میں بھی نہیں لا سکتا اور آپکے پاس آنے سے میری غرض یہ ہے کہ اِسے اپنے کسی تیز اوزار سے کاٹ ڈالیئے"۔

"لیکن یہ میں نہیں کر سکتا" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کیوں؟" مریض نے حیرت سے دریافت کیا۔

اِس لیئے کہ علم تشخیص امراض کی رُو سے آپکے ہاتھ میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ وہ جگہ جس کے گرد آپ نے یہ مختصر سا دائرہ کھینچ رکھا ہے، ایسی ہی پرصحت ہے جیسا کہ میرے ہاتھ کا وہی مقام۔

"شاید آپ کا یہ خیال ہو کہ میرے حواس میں کسی قسم کا اختلال ہے۔ یا یہ کہ میں آپ سے مذاق کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں"۔ یہ کہہ کر مریض نے اپنی جیب سے ایک ہزار روپے کا کرنسی نوٹ نکال کر ڈاکٹر کی میز پر رکھ دیا۔ پھر جوش بھری آواز میں کہنے لگا "لیجیئے جناب یہ آپکی فیس ہے۔ اب تو یہ خیال آپ کے دماغ سے محو ہو جانا چاہیئے کہ میں آپ سے کسی قسم کا ٹھٹھا یا تمسخر کر رہا ہوں۔ وہ خدمت جو اِس قسم کے صلے میں آپ میرے لئے سرانجام دینگے۔ نہایت ناگزیر اور ضروری ہے، براہِ کرم میرے ہاتھ کا یہ حصّہ کاٹ ڈالنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کیجیئے"!

ڈاکٹر نے مریض کی یہ التجا سن کر بغیر کسی توقف کے کہا "جناب میں پھر عرض کرتا ہوں۔ کہ دُنیا کے تمام خزانے مجھے انسانی جسم کے کسی تندرست و پرصحت حصے کو بیمار یا خراب کہنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ میں اُسے اپنے کسی اوزار

سے کاٹ ڈالوں۔

"لیکن کیوں نہیں؟" مریض نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیونکہ ایسا فعل میری طبی لیاقت کے متعلق چند در چند شکوک پیدا کر کے میری شہرت و عزت کو سخت صدمہ پہونچائے گا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ بیوقوف تھے اور میں نے آپکی اس حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سخت بد دیانتی کا ارتکاب کیا ہے۔"

"بہت اچھا" مریض نے تھوڑی سی مستعدی اور کچھ حوصلہ مندانہ انداز میں کہا۔ "میں اس حصہ کو اپنے بائیں ہاتھ سے کاٹ ڈالنے کی جسارت کرتا ہوں۔ کچھ مضائقہ نہیں اگر میں اسے ایک مشاق جراح کی طرح عمدگی سے نہ کاٹ سکوں گا۔ آپ سے صرف اتنی التجا ہے کہ عملِ جراحی کے بعد آپ میرے زخم کو احتیاط سے باندھ دیں۔"

ڈاکٹر سلیمان حیران تھا کیونکہ مریض نہایت متانت و سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا۔ چنانچہ دوسرے لمحے میں اُس نے اپنا کوٹ اتار کر پاس کی کرسی پر رکھ دیا اور اپنی قمیص کی آستین کہنیوں تک چڑھالی۔ پھر جیب سے ایک چاقو نکال کر دیکھتے ہی دیکھتے اُسے ہاتھ کی کافی گہرائی تک اُتار دیا۔

"ٹھہرئیے" ڈاکٹر نے چلا کر کہا۔ اُسے خوف پیدا ہوا کہ مبادا مریض ناواقفیت کی بنا پر ہاتھ کے کسی نہایت ضروری حصہ کو نہ کاٹ ڈالے۔ پھر ذرا مجبوری کے انداز میں کہنے لگا "اگر آپ کا ارادہ اسے کاٹ ہی ڈالنے کا ہے تو لائیے اس ناخوشگوار کام کو میں ہی سر انجام دوں۔"

ڈاکٹر نے اُس کے ہاتھ سے چاقو لے لیا اور نہایت قلیل عرصہ میں اپنا سامانِ جراحی درست کر لیا۔ پھر مریض کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں میں لے کر اُسے منہ دوسری طرف پھیر لینے کے لئے کہا کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ بعض طبائع اپنے جسم سے اخراجِ خون کا منظر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں، لیکن مریض نے خلاف توقع جواب دیا "یہ بالکل غیر ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی تو آپ کو بتاؤں گا کہ ہاتھ کا کونسا حصہ ہٹانا چاہیئے۔"

اس عملِ جراحی کو شروع سے لیکر آخیر تک اُس نے نہایت ضبط، تحمل اور حوصلہ سے برداشت کیا۔ اس دوران میں اُس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ زخم کو کتنا گہرا ہونا چاہیئے۔ اُس کا زخمی ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک دفعہ بھی متحرک نہ ہوا۔ برعکس اس کے جب ڈاکٹر سلیمان نے گوشت کا گول ٹکڑا کاٹ کر علیحدہ کر لیا تو اسکے منہ سے ایک لمبی آہ نکلی جو بادی النظر میں یہ بات ظاہر کر رہی تھی کہ مریض نے ایک لطیف تشویش و کرب سے نجات پائی ہے جس نے اُس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جب ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا کہ اب تو کسی قسم کا درد باقی نہیں ہے؟ تو اُس نے مسکرا کر کہا "بالکل نہیں۔ سارا درد اس طرح جاتا رہا ہے جیسے کہ وہ کٹے ہوئے گوشت ہی سے وابستہ تھا۔ زخم سے خون کے نکلنے کی ہلکی اور تھوڑی سی بے چینی کا اگر پہلی جانکنی سے مقابلہ کیا جائے۔ تو یہ ایسی راحت افزا ہے جیسے کہ تپتے ہوئے صحرا سے نکلنے کے بعد سمندر کی ہلکی ہلکی مرطوب ہوا کے جھونکے آرام دہ معلوم ہوتے ہیں۔ خون کا یہ نکاس مجھے نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے، اسے بہنے دیجئے کیونکہ اس کا ہر نکلنے والا قطرہ میرے درد میں کمی اور میرے دماغ میں سکون پیدا کر رہا ہے۔"

مریض اس وقت اپنے ہاتھ سے خون کے بہنے کا منظر یک گونہ مسرت اور اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے اپنے فرائض اور ذمہ واری کو محسوس کرتے ہوئے اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنے ہاتھ پر پٹیاں بندھوا لے۔ چنانچہ پٹی باندھ دی گئی۔ اس عرصے میں اُس کے چہرے کی غمگینی بالکل دور ہو چکی تھی۔ اب وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ تو اُس کی جبین پر اب کوئی شکن تھا۔ نہ وہ دانت پیستا تھا۔ نہ درد و کرب سے اپنے اعضا کو سکیڑتا تھا۔ اُس کے کپاس کے پھولوں کی مانند زرد رخساروں میں خون کی سرخی دوڑ رہی تھی۔

جب اُس کا ہاتھ باحتیاط تمام گلے میں لٹکی ہوئی پٹی میں رکھ دیا گیا۔ تو اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ڈاکٹر کا ہاتھ نہایت گرمجوشی سے دبا کر کہا "میرا شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے میری جان بچائی ہے اور یہ حقیر سا معاوضہ جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ ہرگز اُس خدمت کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو میرے لئے آپ نے سر انجام دی ہے۔ میں اپنی بقیہ زندگی بھر آپ کا غلام بے دام رہوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ کسی طرح اس احسان کا بدلہ اُتار سکوں۔"

ڈاکٹر سلیمان نے ہزار روپے کا نوٹ قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اُدھر مریض اُسے واپس نہ لینے پر مصر تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ایماندار ڈاکٹر جلد ہی غصہ اور جوش میں آنے والا ہے۔ اجنبی نے اُس سے درخواست کی۔ کہ اگر وہ اس روپیہ کو کسی ذاتی مصرف میں لانا نہیں چاہتا تو اُسے اختیار ہے کہ وہ اپنی طرف سے اُسے غربا کے شفاخانہ یا کسی یتیم خانہ میں بطور خیرات دیدے۔ یہ کہکر اُس نے سلام کیا۔ اور کمرہ سے باہر نکل گیا۔

× × × × × × × × × × × × × ×

اس واقعہ کے قریباً تین ہفتے بعد ایک صبح ڈاکٹر سلیمان کے ملازم نے پھر اُسی مریض کی آمد کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر سلیمان کمال مہربانی سے اوقات

مطب سے پیشتر ہی شفاخانہ میں چلا آیا۔ اور مریض اپنا ہاتھ گردن میں لٹکائے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس دفعہ اُس کا حلیہ بالکل تبدیل شدہ تھا اور شدتِ تکلیف سے بالکل پہچانا نہ جاتا تھا۔ بغیر اس انتظار کے کہ ڈاکٹر اُسے بیٹھ جانے کے لئے کہے اُس نے بےبسی کے عالم میں اپنے آپ کو ایک کرسی میں گرا دیا۔ اور اس اذیت و کرب پر غلبہ نہ پاکر جو اُسے نیم بسمل کئے دیتی تھی۔ اُس کے منہ سے ایک قسم کی گڑگڑاہٹ کی آواز نکلی اور بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے اُس نے ڈاکٹر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"کیوں کیا بات ہے"؟ ڈاکٹر سلیمان نے پوچھا۔

مریض نے غمگین اور مری ہوئی آواز میں جواب دیا "یہ زخم شاید اسے کافی گہرائی تک نہیں چیرا۔ یہ درد تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ بیرحمی سے ستا رہا ہے۔ اس نے مجھے بالکل خستہ اور نیم جاں کر دیا ہے۔ میرا بازو دیکھئے کس طرح اکڑ گیا ہے۔ اگرچہ میرا جی تو نہ چاہتا تھا کہ آپ کو دوسری بار بھی زحمت دوں۔ اس لئے میں نے اپنی انتہائی طاقت سے اس امید پر اسے برداشت کیا ہے کہ شاید یہ غیر مرئی ورم بتدریج میرے دل و دماغ پر اثر کرکے میری غمزدہ زندگی کا خاتمہ کر دے۔ مگر افسوس ایسا نہ ہوا درد اس دائرہ سے باہر نہیں جاتا اور نہ میں اس کی شدت و اذیت کو بیان کر سکتا ہوں۔ میرے چہرے کی طرف دیکھئے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس قدر بیدردی سے ہلاک کرنے والا ہے۔"

مریض کا رنگ ایک مومی مجسمہ سے مشابہت رکھتا تھا اور سرد پسینے کے قطرات اُس کی پیشانی پر پھوٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر سلیمان نے اُس کے ہاتھ کی پٹیاں کھول کر دیکھا تو گذشتہ عمل جراحی کا زخم اچھی طرح مندمل ہو چکا تھا۔ اور نئی جلد اُس پر آرہی تھی۔ ڈاکٹر اس بات سے حیران تھا کہ اُس ہاتھ پر کسی قسم کی غیر معمولی چیز نظر نہ آتی تھی۔ مریض کی نبض تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن اُس میں کسی قسم کی حرارت کا نشان موجود نہ تھا۔ باوجود ان باتوں کے مریض کا ہر عضو ارتعاشِ مسلسل کی صورت بنا ہوا تھا۔

"عجیب بات ہے!" ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ "اس قسم کا مریض پہلے میری نظر سے نہیں گذرا"

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ حیران کر دینے والی بات ہے۔ سخت تعجب خیز" مریض نے جواب دیا۔ "لیکن براہِ کرم اس کی وجہ یا سبب دریافت کرنے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ مجھے اس دُکھ سے نجات دلائیے۔ اچھا چاقو لے کر اسے کاٹ ڈالئے یہ گھاؤ زیادہ گہرا ہونا چاہیئے اور یہی میری گلوخلاصی کرے گا"

ڈاکٹر کو مجبوری اپنے مریض کی التجا منظور کرنی پڑی۔ اس نے مریض کے ہاتھ پر دوبارہ عمل جراحی کیا۔ اور زیادہ گہرائی تک گوشت کاٹ لیا۔

ایک دفعہ پھر اُس نے مریض کے چہرہ پر تکلیف سے نجات پا جانے کے آثار اور اُس کی آنکھوں میں اطمینان اور مسرت کی وہی جھلک دیکھی۔ جو پہلے عمل جراحی کے بعد زخم سے سرخ خون کی دھار بہتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ جب اُس کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی گئی تو اس کے چہرہ کی مردنی دور ہوگئی اور رخساروں کی سرخی عود کر آئی لیکن اس دفعہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار نہ ہوئی۔ صرف غمگین سی آواز کے ساتھ اُس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں۔ درد ایک دفعہ پھر جا رہا ہے اور چند دنوں تک یہ زخم بھی بھر جائے گا لیکن ایک مہینہ گذرنے سے پیشتر ہی مجھے اپنے دروازہ پر دیکھ کر کسی قسم کا تعجب نہ کیجئے گا"

"او سیٹھ صاحب! اس وہم کو دماغ سے نکال ڈالیئے" ڈاکٹر نے ہمدردی سے جواب دیا۔

دوسرے عمل جراحی کے بعد ڈاکٹر سلیمان نے اپنے کئی ہم پیشہ اصحاب سے بھی اس مریض کے متعلق ذکر کیا لیکن ہر طبیب کی تشخیص الگ الگ تھی۔ اور ہر شخص اُس پراسرار بیماری کے متعلق نئی توضیح پیش کرتا تھا۔ ایک ماہ کے اختتام پر ڈاکٹر سلیمان کا خیال تھا کہ وہ مریض پھر آئے گا لیکن کئی ہفتے اور گذر جانے کے بعد بھی وہ نہ آیا۔ بالآخر ایک دن کہ ڈاکٹر اپنے دن بھر کے کام سے فراغت حاصل کرکے اور گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے ملازم نے دیگر خطوط کے ہمراہ ایک نیلے رنگ کا لفافہ بھی دیا۔ ڈاکٹر نے لفافے کی مہر سے اندازہ کر لیا کہ یہ خط اُسی مریض کی طرف سے ہوگا۔ خط نہایت طویل اور گنجان لکھا ہوا تھا۔ اس نے مریض کے دستخط سے پہچان لیا کہ یہ اُس کے اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اور اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا کہ مریض نے اُس درد سے نجات حاصل کر لی ہوگی کیونکہ شدتِ درد سے اتنا طویل خط لکھنا اُس کے نزدیک ناممکنات سے تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

"پیارے ڈاکٹر میں نہیں چاہتا کہ آپ کو اور علمِ طب کو اپنی عجیب بیماری کے اسرار سے بےخبر رکھوں، جو بہت تھوڑے عرصہ میں مجھے آغوشِ لحد میں سُلا دے گی۔ گذشتہ ہفتے میں یہ خوفناک بیماری تیسری مرتبہ پھر عود کر آئی لیکن اب میں اس کے دفعیہ یا علاج کے لئے کسی قسم کی سعی نہ کروں گا۔ اس دائرہ پر جیسے آپ دو دفعہ اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ اور جہاں سے ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسیں اُٹھ اُٹھ کر میری رگ رگ کو چیر دیتی ہیں، ایک دہکتا ہوا کوئلہ تار سے باندھ کر اس قابل ہوا ہوں کہ یہ چند سطور سپردِ قلم کر سکوں۔ اس کوئلے کی تکلیف اس درد کے مقابلہ میں نہایت ہی حقیر اور ناقابلِ اعتنا ہے۔"

آج سے صرف چھ ماہ پیشتر میں بھی ایک خوش قسمت اور خوش باش انسان تھا۔ دولت و تنعم کی فراوانی مجھے میسر تھی اور میں ہر شخص کے ساتھ نہایت اخلاص و خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اُن تمام نعمتوں اور مسرتوں سے بہرہ ور تھا جن کے حصول کی ایک متمول آدمی کو آرزو ہو سکتی ہے اور ہر ایسی لذت سے بہرہ اندوز ہوتا تھا جو ایک ۳۰ سالہ آدمی کے لئے قابلِ التفات ہوتی ہیں۔ ایک سال قبل میں نے شادی بھی کر لی تھی، محض رسمی یا دنیا داری کی شادی نہیں۔ بلکہ عشق و معاشقہ کی شادی۔ میری بیوی نہایت حسین و جمیل اور اعلےٰ اخلاق و سیرت کی عورت تھی۔ اُس کا دِل اتنا پاکیزہ و منزہ تھا۔ جتنا کہ ایک نیک عورت کا دِل ہو سکتا ہے۔ شادی سے پہلے وہ راولپنڈی کے مشہور سوداگر سیٹھ فرامجی کی بیوہ کے پاس ملازم تھی اور مجھ سے ایک قسم کا اُنس اُسے ہو گیا تھا۔ وہ اُنس نہیں جو شکر گزاری یا احسان مندی کا نتیجہ ہو۔ بلکہ ایسا اُنس جس کی بنیاد سچی مودت اور حقیقی محبت پر قایم کی گئی ہو۔ شادی کو چھ ماہ گذر چکے تھے۔ اور اِس عرصہ کا ہر اگلا دن یوم گذشتہ سے زیادہ پر سرور اور مسرت خیز ہوتا تھا۔ اگر کسی وقت ایک دن کے لئے بھی میں تجارتی اغراض کے لئے پشاور چلا جاتا تو میری بیوی کے لئے یہ دن کاٹنا پہاڑ ہو جاتا تھا۔ اور وہ راولپنڈی سے دو چار اسٹیشن آگے تک میرے استقبال کے لئے چلی آتی تھی اگر میں کبھی رات کو واپس نہ آتا تو وہ تمام رات میرے انتظار ہی میں بسر کر دیتی اور ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھ نہ جھپکتی۔ کبھی یہ دیکھ کر کہ تمام دن اپنے بنگلے میں بیکار پڑی رہکر وہ اُداس سی ہو جاتی ہے۔ میں نہایت محبت بھرے انداز میں اُسے مخاطب کر کے کہتا "شیریں پیاری، کیا تمام دن اسی طرح اکیلے رہنے سے تمہارا جی نہیں گھبراتا، کسی نہ کسی وقت بائی جی کے پاس چلی جایا کرو۔ وہ مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ میں نے تمہیں ایسا قید کیا ہے کہ کبھی اُن سے ملنے کی اجازت ہی نہیں دیتا"

یہ سنکر وہ مسکرا دیتی اور نہایت معصومانہ انداز سے کہتی "بہت اچھا کل جاؤنگی"

لیکن وہاں جاکر بھی وہ میرے بغیر اُداس ہو جاتی اور دو پہر ڈھلے واپس آجاتی۔ وہ مجھے اِس حد تک چاہتی تھی۔ کہ اگر اُس کا بس چلتا تو تمام دن میں ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے جدا نہ ہوتی۔ میری معیت کے بغیر اگر وہ کسی تقریب پر چلی بھی جاتی تو اپنی اُداسی اور دلگرفتگی کی بدولت خاموش رہکر ساری مجلس کو افسردہ خاطر بنا دیتی۔ غرضیکہ میری بیوی اتنی معصوم عورت تھی۔ جو سوائے میرے دنیا کی کسی چیز سے اُنس نہ رکھتی تھی۔ میرے ساتھ شادی ہونے سے پہلے کے واقعات کو اِس طرح سنایا کرتی تھی۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے جرم کی مرتکب ہو اور ایسے واقعات و تصورات، جو میرے عشق و محبت سے وابستہ تھے، اُن کو اِس لطف انداز طریقے سے بیان کرتی کہ میں اُس کے اندازِ بیان کی حلاوت سے کبھی سیر نہ ہوتا اور تاثراتِ الفت کی موسیقی سے میرے دِل و دماغ مسحور ہو جاتے۔

لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک دِن شیطان نے میرے کان میں کیا پھونک دیا ــــ "فرض کرو۔ کہ شیریں کی یہ تمام محبت، یہ جذبہ وفاداری اور احساس مروّت ایک دھوکا ہوا تصنع اور فریب کاری؟ ــــ مردوں کو میں دیوانہ کہوں گا کہ انتہائی مسرت کے لمحات میں بھی کسی دردِ جانگداز کے متلاشی رہتے ہیں۔ میری بیوی کی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر وہ سینے پرونے کا کام کیا کرتی تھی۔ اُس میز کی دراز ہمیشہ احتیاط سے مقفل رکھتی۔ نہ کبھی اُسے اِس دراز کی کنجی بھول جانے کا اتفاق ہوا نہ اُس نے کبھی اُسے کھُلا چھوڑ جانے کی غلطی کی۔ بس یہ سوال تھا جو میرے دِل و دماغ پر محیط ہو جاتا اور ایک بڑی سی استفہامیہ علامت یوں میری نظروں کے سامنے ہر وقت موجود رہتی؟ وہ اِس جگہ کیا چھپائے رکھتی ہے۔؟

اِس شوقِ تجسس نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ اب مجھے نہ اُس کے چہرہ کی معصومیت نہ اُس کی شرمیلی نگاہوں کی پاکیزگی پر کسی قسم کا اعتبار تھا۔ اور اُس کے افسانہائے عشق اقلیدس و ریاضی کی طرح خشک و پامال مضامین معلوم ہوتے تھے۔ اب مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک دن علے الصبح سیٹھ فرامجی مرحوم کی بیوہ ہمارے مکان پر آئی اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لیجانے کے لئے اصرار کرنے لگی۔ بڑی مشکل سے اُس نے شیریں کو اپنے مکان پر لے جانے اور وہاں صرف ایک دِن بسر کرنے پر راضی کر لیا۔ ہمارا مکان سیٹھ فرامجی کے مکان سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ میری بیوی بیگم فرامجی کے ساتھ اِس شرط پر گھر سے نکلی کہ میں بھی چند گھنٹے بعد وہاں آجاؤں گا۔

جونہیں موٹر میرے مکان کے احاطے سے باہر نکلی۔ میں نے گھر کی تمام کنجیاں جمع کر لیں اور ایک ایک کو اُس چھوٹی سی دراز کے قفل پر آزمانا شروع کیا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ایک چابی نے "کٹاک" کی سی آواز کے ساتھ اُس دراز کا قفل کھول دیا۔ اُس وقت میں اُس انسان کی طرح محسوس کر رہا تھا جو اپنے ضمیر کے احتجاج کے باوجود سب سے پہلا جرم کرنے پر مصر ہو۔ اِس وقت تک میں ایک چور کی حیثیت میں تھا۔ جو اپنی معصوم بیوی کے کسی راز کو دریافت کرنے کی سعی میں مبتلا ہو۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس دراز کو نہایت آہستہ آہستہ

کھینچ لیا اور ہر چیز کو نہایت احتیاط سے الٹ کر دیکھا تاکہ اُن اشیا کی بے ترتیبی میری بیوی کے دِل میں کوئی شک پیدا نہ کر دے۔ میرا دِل دھڑک رہا تھا اور میری زبان خشک ہو کر تالو سے چمٹ گئی۔ یکایک — فیتے سے بندھے ہوئے خطوط کا ایک پلندہ مجھے دکھائی دیا۔ بجلی کی ایک رو تھی کہ میرے دماغ کی تاریکیوں کو مٹاتی ہوئی میرے دِل میں اُتر گئی۔ وہ خطوط ...... وہ خطوط اِس شکل و صورت کے تھے جنہیں پہلی نظر ہی میں پہچانا جا سکتا ہے — خطوطِ محبت!

یہ تمام خطوط نہایت خوبصورت گلابی رنگ کے ایک ریشمی فیتے میں بندھے تھے جس کے کناروں پر روپہلی کام تھا۔ جب میں نے اُس ریشمی فیتے کی گرہ کو کھولنا چاہا تو معاً میرے دِل نے سوال کیا: کیا یہ ایک دیانت دار آدمی کا کام ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں اُس کے کسی ننھے راز کو اِس ذلیل طریقہ سے طشت از بام کرنے کے درپے ہو جائے۔ کیا مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنی بیوی کے اُس وقت کے خیالات و تصورات کا محاسبہ کروں جب وہ مجھ سے وابستہ نہ تھی۔ نہ میں اُسے جانتا تھا۔ نہ وہ مجھ سے واقف تھی؟ کون اس پر اِس قسم کی شہادت قائم کر سکتا ہے؟ کون؟ ...... میں! ...... جس کے ساتھ وہ اِس محبت و اخلاص سے پیش آتی ہے، جسے وہ اپنی حسرتوں کا منتہا کہتی ہے، جس کا دکھ اور رنج اُسے بے چین بنا دیتا ہے۔ اور جس کی خدمت و پرستش کو وہ اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتی ہے؟ میں مجرم ہوں اور سزاوارِ نکوہش

شیطان نے ایک بار پھر میرے کان میں کہا "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ خطوط اُس وقت کے ہوں جب وہ تمہارے ساتھ بیاہی جا چکی تھی۔ اور بطور ایک خاوند کے تمہیں حق حاصل ہے کہ اُس کے تمام خیالات کو سمجھو اور اُس کے نیک و بد کی پڑتال کرو۔" میں نے ریشمی فیتے کی گرہ کھول دی — میرے اِس فعل کو کوئی غماز آنکھ نہ دیکھ رہی تھی۔ میرے سامنے اِس وقت کوئی آئینہ بھی نہ تھا جس میں اپنی عرقِ انفعال سے تر پیشانی اور تمتماتے ہوئے رخسار بھی دیکھ سکتا۔ میں نے ایک خط کھولا پھر دوسرا اور اُنہیں شروع سے آخر تک پڑھ لیا۔

آہ! میرے لئے یہ قیامت کی گھڑی تھی!

اِن خطوط میں کیا لکھا تھا؟ دنیا میں سب سے زیادہ کمینہ حرکت اور غداری جس کا ایک انسان مرتکب ہو سکتا ہے۔ اِن خطوط کا نویسندہ میرا ایک نہایت عزیز دوست تھا۔ اور اُن خطوط کا لہجہ — آہ! کیا کہوں کیسا جذبہ تھا۔ کیسا اظہارِ محبت اور پھر ایسے انداز میں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مکتوب الیہ بھی ویسے ہی جذبات سے سرشار ہے؟ کس طرح اِس راز کو صرف اپنے دِل تک محدود رکھنے کی تاکید تھی! اور یہ تمام خطوط اُس وقت تحریر کئے گئے تھے جب شیریں سے میری شادی ہو چکی تھی۔ اور میں مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا

میں کس طرح لکھ سکتا ہوں کہ اُس وقت میری کیا حالت تھی اور میں کیا محسوس کر رہا تھا؟ اُس مدہوشی اور بے خودی کا تصور ذرا ذہن میں لے آؤ جو کسی مہلک زہر کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اُن تمام خطوط کو پڑھ ڈالا — ہر ایک کو — شروع سے آخر تک۔ پھر میں نے اُنہیں ترتیب سے رکھ کر اُسی فیتے سے باندھ دیا اور دراز کو مقفل کر دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں دوپہر تک شیریں کے پاس نہ گیا۔ تو وہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بیگم فرام جی کے مکان سے واپس آ جائے گی۔ جیسا کہ اُس کا معمول تھا۔ شام کے وقت میں اپنے خیالاتِ پریشان کی الجھنوں میں کھویا ہوا اپنے بنگلے کے برآمدہ میں ایک وحشی درندے کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ جو کٹہرے کی آہنی سلاخوں سے زور آزمائی کے بعد اِدھر اُدھر گھوم کر تھکے ہوئے قوا میں اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے ایک بار پھر اُنہیں توڑ دینے کا تہیہ کر رہا ہو۔ اتنے میں شیریں کی موٹر مکان کے احاطہ میں داخل ہوئی اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ اتر کر میری طرف بھاگی۔ نہایت پیار سے میری پیشانی پر بوسہ دیا — اس کے اطوار و گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے دوبارہ مل کر از حد مسرور و شادماں تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے دِل کے جذبات میرے چہرہ سے عیاں نہ ہو سکیں اور نہ میں اُسے اِس بات سے واقف کرنا چاہتا تھا کہ میرے دِل پر کیا بیت رہی ہے۔ کچھ عرصے تک ہم آرام کرسیوں پر لیٹ کر باتیں کرتے رہے؛ رات کا کھانا بھی مل کر کھایا۔ اِس کے بعد ہم اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ لیکن نیند آج میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رات کا ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے سے بسرعت تمام گزر رہا تھا۔ حتیٰ کہ گھڑی نے ایک بجا دیا۔ میں اپنے بستر سے اُٹھا اور اُس موم بتی کو اٹھا کر جو دس بجے سے انگیٹھی پر جل رہی تھی؛ شیریں کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ ایک نائٹ لیمپ جس کا تقریباً تمام موم جل چکا تھا۔ اور وہ چراغِ مزار کی طرح اپنی مدھم روشنی میں جھلملا رہی تھی۔ شیریں محوِ خواب تھی؛ اور اُس کا خوبصورت و زاہد فریب جسم ایک نرم و نازک تکئے پر پڑا تھا۔ اور بعینہٖ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سفید بادلوں میں کوئی فرشتہ سوتے آسمان پہ پرواز کر رہا ہو۔ میں چند لمحات تک نہایت غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک مجھے خیال آیا کہ کس طرح فطرت نے ایسے معصوم و جمیل چہرے اور ایسے حسین و خوبصورت جسم کی تہ میں ایک غدار و پرفریب دِل چھپا رکھا ہے! میں ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہونچ چکا تھا۔ اور جنون و دیوانگی کے تمام آثار میرے دِل و دماغ پر قبضہ کر رہے تھے۔ انتقام کا

پنہر میری ٹانگ کو مسموم کر چکا تھا۔ بالآخر میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے اسی حالت خواب میں قتل کر دوں۔ میں نے دم توڑنے والی موم بتی کو ایک تپائی پر رکھ دیا جس پر کملاتے ہوئے پھولوں کا ایک چینی گلدان رکھا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن پکڑ کر اپنی ساری قوت سے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں کھولیں جن میں شباب کی مستی اور نیند کا خمار بھر رہا تھا پھر میری طرف حیرت و حسرت کے ساتھ دیکھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا نازک گلا میرے ہی بے رحم ہاتھوں میں تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی سرگلیں آنکھیں میچ لیں اور اپنی گلو خلاصی کے لئے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ کچھ عرصے آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس لیتی رہی حتےٰ کہ اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کی۔ تو خون کا ایک قطرہ اُس کے منہ سے نکل کر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر گرا — آپ کو معلوم ہے کہ کس جگہ اور اس قطرہ خون کو میں نے دوسرے دن تک نہ دیکھا۔ جبکہ وُہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم نے قبل دوپہر ہی اُسے سپرد خاک کر دیا۔ چونکہ ہماری محبت کے افسانے کچھ عرصہ تک عام رشتہ داروں اور دوستوں کی گفتگو کا موضوع بحث رہے تھے۔ اِس لئے میرے اس سفاکانہ فعل کے متعلق کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ حرکت قلب کا رات کو بند ہو جانا ایک عذر تھا اور وہ قبول کر لیا گیا۔ نہ تو شیریں کے والدین زندہ تھے۔ نہ اُس کا کوئی دوسرا قرابت دار تھا۔ جو مجھ سے اِس معاملے کے متعلق مزید استفسار کرتا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے اس مرگ ناگہانی کی اطلاع لوگوں کو عمداً نہ دی۔ تاکہ میرے دوست میت دفن کرنے سے پیشتر نہ آ جائیں۔

قبرستان سے واپس آ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہ تھا۔ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ بے رحمانہ فعل مجھ ہی سے سرزد ہوا ہو گا۔ لیکن وُہ بھی تو اسی کی سزاوار تھی۔ دنیا میں شاید ہی کوئی آدمی ارتکاب قتل کے بعد مجھ سے کم پشیمان ہوا ہو گا۔

میں ابھی اچھی طرح سستانے بھی نہ پایا تھا۔ کہ بیگم فراجی میرے بنگلہ پر آئیں۔ ایک قسم کے خوف اور شیریں کی خلاف توقع موت کی خبر نے اُسے نہایت مغموم بنا رکھا تھا۔ ہمدردی، رنج و الم اور اسی قبیل کے سینکڑوں الفاظ اور فقرے اُس نے میرا غم غلط کرنے کے لئے کہے۔ لیکن نہ تو مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت تھی۔ نہ ایسے مخصوص الفاظ میرے کسی رنج کا مداوا ہو سکتے تھے۔

کیا میں اُس کی گفتگو سن رہا تھا؟ کیا مجھے ایسی ہمدردی اور تسلی کی ضرورت تھی؟ میں ہرگز اداس یا غمگین نہ تھا۔ کچھ عرصہ اسی طرح رسمی باتیں کرنے کے بعد اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور نہایت آہستہ سے کہنے لگی "میں اپنا ایک راز آپ سے بیان کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی شرافت پر مجھے بھروسہ ہے اور میں اُمید کرتی ہوں۔ کہ میرے اِس راز سے آپ کسی قسم کا ناجائز فایدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ کی مرحومہ بیوی کو خطوط کا ایک بنڈل بحفاظت تمام رکھنے کے لئے دیا تھا۔ کیونکہ میں انہیں اپنے مکان پر نہ رکھ سکتی تھی۔ اب میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ تمام خطوط مجھے واپس کر دیجئے۔"

جب وہ مجھ سے یہ بیان کر رہی تھی۔ تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مکان کی چھت مجھ پر گر پڑی ہے۔ اور ہر دفعہ بجلی کی ایک لہر میرے جسم سے کڑکتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ نہایت دھیمی آواز میں مَیں نے اُس سے پوچھا "جن خطوط کو آپ اپنے مکان پر نہ رکھ سکتی تھیں۔ بالآخر معلوم تو ہو ان میں لکھا کیا تھا؟"

اِس استفسار پر بیگم فراجی کی آنکھیں جھپک اُٹھیں۔ وہ خفگی سے کہنے لگی "آپ کی بیوی تمام عورتوں سے زیادہ وفادار اور قابل اعتبار تھی جب میں نے ان خطوط کو اُس کی تحویل میں دیا تو اُس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی بھول کر اُنہیں دیکھنے کی کوشش نہ کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے اِن خطوط کی ایک سطر بھی نہ پڑھی ہو گی۔ اُس کا دل نہایت شریف اور ایماندار تھا۔ . . . ."

"بہت اچھا"، لیکن میں کس طرح بتا سکتا ہوں کہ فلاں خطوط آپ کے ہیں جبکہ گھر میں اور بہت سے خطوط ہوں گے"، کم از کم اُن کی کوئی نشانی تو بتائیے؟" میں نے تحمل اور بردباری سے پوچھا۔

بیگم فراجی نے ذرا شرمیلی آواز میں جواب دیا "وہ تمام خطوط ایک گلابی رنگ کے ریشمی فیتے سے بندھے ہیں جس کے کناروں پر روپہلی کام کیا ہوا ہے ان خطوط کو وہ اپنی میز کی دراز میں رکھا کرتی تھی۔"

"آپ یہیں تشریف رکھئے۔ میں انہیں تلاش کرتا ہوں" میں نے کہا۔ یہ کہکر میں نے اپنی بیوی کی چابیاں اُٹھائیں اور میز کی دراز کھول کر اُسے باہر کھینچ لیا۔ اگرچہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ وہ خطوط کہاں رکھے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں نے چند اشیاء اُلٹ پلٹ کر اس بنڈل کو باہر نکال کر پوچھا "کیا یہی آپ کے خطوط ہیں؟"

"بیشک۔ بیشک" اُس نے بے صبری کے انداز میں کہا۔ پھر اپنے ہاتھ میں اُسے لے کر کہنے لگی "دیکھئے اس کی گرہ میرے ہی ہاتھ کی دی ہوئی ہے۔ اور مرحومہ نے اسے چھوا تک نہیں"

مجھے جرأت نہ ہو سکی کہ اپنی آنکھیں اوپر اٹھاؤں۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ مبادا وہ میری نگاہوں سے پہچان جائے کہ میں نے اُس بنڈل کی گرہ کھول لی تھی۔ اور اس سے بھی کچھ زیادہ .... میں نے اُس سے رخصت چاہی اور وہ نہایت تیزی سے اپنی موٹر پر سوار ہو کر چلی گئی۔

خون کا قطرہ میرے ہاتھ کی پشت سے غائب ہو چکا تھا۔ درد کسی ظاہری نشان یا زخم کی وجہ سے نہ تھا لیکن پھر بھی اُس جگہ جہاں میری بیوی کے خون کا قطرہ گرا تھا ایسا درد اور جلن محسوس ہوتی تھی۔ گویا کوئی نہایت زہریلا جانور اُسے کاٹ رہا ہے۔ یہ درد لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ کسی نہ کسی وقت میری آنکھ تو جھپک جاتی ہے لیکن ایک لمحے کے لئے بھی اُس جانکنی کی تکلیف کا احساس میرے ذہن سے فراموش نہیں ہوتا۔ میں کسی آدمی سے اِس کے متعلق ذکر بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی شخص بھی میری اِس انوکھی اور حیران کن داستان کو باور کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ آپ نے میرے درد کی شدت دیکھی ہے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ دو دفعہ کے عمل جراحی نے مجھے کس حد تک اِس جانگسل درد سے رہائی دلائی تھی لیکن حیرت ہے کہ ہر دفعہ زخم کے بھرتے ہی درد عود کر آتا ہے۔ اِس درد نے تیسری مرتبہ پھر حملہ کیا ہے۔ لیکن اب مجھ میں اِس کے برداشت کی طاقت باقی نہیں رہی — ایک گھنٹے کے اندر اندر میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ صرف اِس بات سے مجھے کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ میری بیوی نے اسی دنیا میں مجھ سے انتقام لے لیا اور شاید وہ ملاء اعلےٰ میں مجھے معاف کر دیگی — جو کچھ آپ نے میرے لئے کیا میں اُس کا ممنون احسان ہوں، خدا آپکو جزائے خیر دے"

چند دن بعد ہندوستان کے قریباً تمام اخباروں میں یہ خبر گشت لگا رہی تھی۔ کہ راولپنڈی کے نہایت متمول اور مجنبر سوداگر سیٹھ دادا بھائی خورشید جی نے خودکشی کرلی ہے عوام نے اِس خودکشی کو اُس کی بیوی کے غم پر محمول کیا اور وہ جو کچھ زیادہ واقفیت رکھتے تھے، کہتے تھے کہ سیٹھ کا یہ اقدام ایک ناقابل علاج زخم کی وجہ سے ہے۔ جو اِس سے بھی زیادہ جانتے تھے اُن کا خیال تھا کہ اُسے ایک قسم کا جنون ہو گیا تھا۔ اور اُس کا لاعلاج زخم صرف اُسی کے تصور و خیال تک محدود تھا۔

محمد ضیاء الدین شمسی

غزل

غمِ محبت میں دِل کے داغوں سے رشکِ لالہ زار ہوں میں
فضا بہار میں ہے جس کے جلووں سے وہ حریفِ بہار ہوں میں

ترے فریبِ ستم کی کیوں یادگار باقی رہے جہاں میں؟
مجھے مٹا دے ترے طلسمِ فریب کی یادگار ہوں میں

چمن طرازیٔ چشمِ خوں بار سے بہار میں ہے جیب و دامن
بہارِ گلشن کو کیا کروں لے کے آپ اپنی بہار ہوں میں

تری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں جلال تیرا
ہوں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں

مٹوں گا مٹنے کو لیکن اے روزگار آشوب! رنج یہ ہے
کہ تیرے ہوتے بھی تختۂ مشقِ گردشِ روزگار ہوں میں

کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں کیسے جلتی ہے مجھ سے دنیا
نہ ہے گرانبارئ محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں

کہاں ہے تو وعدۂ وفا کر کے اومرے بھول جانے والے
مجھے بچا لے کہ پائمالِ قیامتِ انتظار ہوں میں

وہ حسنِ بے اعتماد اے تاجورؔ ہوا التفات فرما
تو زندگی اب سنا رہی ہے کہ عمرِ بے اعتبار ہوں میں

تاجورؔ

شانتی نکیتن

یہ مضمون مسٹر ایڈورڈ تھامسن کی کتاب ٹیگور پوئٹ اینڈ ڈرامالسٹ سے ماخوذ ہے۔ آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی کے لیکچرار ہیں۔ اور کتاب مذکور لندن یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے نصاب میں داخل ہے:۔

شانتی نکیتن بولپور سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ گرد و پیش اونچے خشک اور بے برگ و گیاہ میدان ہیں۔ جہاں برساتی ندی نالوں کی گذرگاہیں ویران اور سنسان پڑی ہیں اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں پریشان ہیں۔ دور افق پر سال کا جنگل ہے اور مغرب کی طرف تاڑ کے درختوں کی ایک قطار ہے جو نہایت خوشنما لگتی ہے۔ بارش کے دنوں میں یہ خشک اور ویران میدان سرسبز علف زار بن جاتے ہیں اور بنگال کی دیہاتی زندگی کا دلکش نظارہ پیدا ہو جاتا ہے بنگال کے اُس حصہ سے جو دریاؤں کے کنارے پر آباد ہے اور بے شمار ندی نالوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ٹیگور اچھی طرح آشنا ہے۔ اس کے اشعار اس خطۂ جنت نشان کے دلکش اور نازک ترنم سے لبریز ہیں لیکن یہ بنگال جہاں شانتی نکیتن واقع ہے قہر و غضب کے دیوتا کی تفرج گاہ اور شعلہ بار سموم کا مسکن ہے۔ اور ہر طرف سال کے ڈراونے درخت اور خار دار روئیدگی اُگ رہی ہے ان مناظر نے ٹیگور کی "قدرت کی شاعری" پر بھی اثر کیا ہے جس کے اولین اثرات نیو دیا میں نمایاں ہیں۔

اس جدید فضا اور ماحول کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ میں ستیش چندر رائے کے روزنامچے کا ایک اقتباس پیش کروں۔ یہ بنگال کے ایک نوجوان شاعر تھے جب ٹیگور نے اس درسگاہ کی ابتدا کی یہ ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور صرف ایک سال خدمت کرنے کے بعد وفات پا گئے۔

بولپور کے نواح کے ان وسیع اور فراخ میدانوں میں آفتاب کی تابناک تمازت اور سرکش ہوا کی زبردست طاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے بادلوں اور بارش کے نظارے کو دیکھ کر راجہ اندر کے دربار کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ چاند اور ستارے اپنی ضیا سے دبیر فلک کے انداز میں جبین ظلمت پر افشاں چھنتے ہیں۔ اس پرسکون مقام پر رہنے سے طمانیت قلب روز بروز عمیق ہوتی جاتی ہے۔

جب میں مضافات کی شدید گرمی میں جاتا ہوں تو میں وہ تپش محسوس کرتا ہوں جو مریخ نے اس وقت محسوس کی ہوگی جب اسے سر پر حلقہ ہائے آتش پہنائے گئے تھے۔ مجھے خیال آتا ہے۔ کہ شاید اس سے کم خیرہ کن چمک میں میں اس تپش ناک آسمان کا منظر نہ دیکھ سکوں۔ جو پگھلے ہوئے سونے کی مانند درخشاں ہے۔ اور یہ سنسان میدان، یہ سرخ تپتی ہوئی سڑکیں جو وسیع اور کھلے کھیتوں میں سے ہو کر جاتی ہیں نظر نہ آئیں۔ سطح کی خفیف سی ناہمواری خشک دریا کی خاکی گذرگاہ کی مانند صاف دکھائی دیتی ہے۔ بہت دور۔ لیکن نمایاں گویا کہ توجہ کو مجبور کر کے اپنی طرف منعطف کرتی ہے۔ اور کہتی ہے "آج تمہیں ضرور مجھے دیکھنا ہوگا" یہاں بولپور میں ہوا دور کے کھلے میدانوں کے اس پار سے ہانپتی ہوئی آتی ہے۔ اور سال کے اشجار سے ایک بدمست شرابی کی طرح ہم آغوش ہو جاتی ہے"۔

مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور[1]

شانتی نکیتن کی تاریخ کا آغاز مہرشی سے ہوتا ہے۔ ان کے زمانے میں یہ میدان بالکل بے آب و گیاہ اور لق و دق تھا۔ صرف جھاڑیاں اور چھاتم کے دو درخت تھے۔ جن کے نیچے بیٹھ کر یہ مراقبہ کیا کرتے تھے۔ یہ درخت اب بھی سرسبز ہیں۔ اور درختوں کے جھنڈوں کے مرکز میں کھڑے ہیں۔ ان پر مالتی کی بیلیں لپٹی ہوئی ہیں جن کے سفید پھولوں کی خوشبو سے خزاں کے ایام میں فضا مہک اٹھتی ہے۔ نزدیک ہی ایک سنگی کتبہ نصب ہے جس پر اس مفہوم کی عبارت لکھی ہے۔ کہ مہرشی اس مقام پر مراقبہ کیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر کئی کتبے اِدھر اُدھر نصب تھے۔ جن پر "اعتقاد و الوہیت" کے موثر کلمات کندہ تھے اور ان اوراق سنگی کے دیکھنے سے دل پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن اب شاعر نے انہیں نامناسبت کے خیال سے برطرف کر دیا ہے۔ دروازے پر کے کتبے کی رو سے کسی ذی حیات کی جان تلف کرنا۔ آشرم کی حدود کے اندر گوشت یا کوئی بت لانا۔

---

[1] ڈاکٹر ٹیگور کے باپ اور برہمو سماج کے پیشوا۔

کسی عبادت یا معبود کا ذکر حقارت سے کرنا اور کسی ناپاک خوشی کی آلائش سے ملوث ہونا اب تک ممنوع ہے۔ سال کے اشجار کی خوبصورت روش اور سیپالی اور آموں کے جھنڈوں کی جنگل کی سی بے ترتیبی نے منظر کو نہایت دلکش اور حسین بنا دیا ہے سیپالی شب کے وقت اپنے پھول گراتی ہے۔ اور جب میں آخری بار آشرم میں ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ خزاں کی صبح کے حسن میں کس قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ جب شانتی نکیتن کے اساتذہ کی نوخیز لڑکیاں ہار پرونے کے لئے ان پھولوں کو چن رہی تھیں۔

شانتی نکیتن کی بنیاد رکھنے سے شاعر کا مقصد صرف ایک مکتب نہ تھا۔ وہ "ہندوستان کی روحانیت" کے لئے اس زمانہ کے طوفانوں کے درمیان جن کی امواج کے تھپیڑوں نے اسے شکستہ کر دیا تھا۔ ایک مسکن بنانا چاہتا تھا "وحدت ہند" اُن فرزندانِ ہند کا بھی خواب رہی ہے۔ جو شاعر سے عظمت میں کہیں زیادہ تھے۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ ہمیں کو اس تکمیل کے ساتھ "واقعیت" میں لانے کے لئے اقدام کر دینا چاہیئے۔ جو اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔

"میرا دم موجودہ زمانہ کے مہیب خواب میں گھٹا جا رہا تھا۔ اس زمانہ کے خواب میں جو اپنے افلاس کی ذلیل خواہشات میں بے معنی ہے۔ میں نے اپنے اندر اپنی "اُمیّت' و مادریت" کی روحانی آزادی میں بیدار ہونے کی کشمکش کو محسوس کیا۔ سیاسی آزادی کے لئے ہماری کوششیں مجھے غیر حقیقی اور اپنی بیچارگی میں کمزور اور ناپائیدار نظر آئیں۔ میں نے محسوس کیا۔ یہ بھی خدا کی برکت ہے۔ کہ "بھیک" ایک عمل ناکام ثابت ہوا ہے اور جس کے پاس ہے صرف اُسے ہی دیا جائے گا۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ کہ ہمیں اپنی "وراثت" تلاش کرنی چاہیئے۔ جس سے ہم دنیا میں اپنے اصلی مقام کو خرید لیں۔"

آج آخری الفاظ صحیح طور پر آشرم کے مقاصد کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اس کے مستقل اور یکساں طرز عمل کے نمائندہ ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں شاعر نے ایک بنگالی دوست کو لکھا تھا "جب تک ہم اپنے تئیں مستحق نہ بنا لیں۔ ہمیں اپنے تئیں چھپا رکھنا چاہیئے۔" لیکن وہ صرف ہندوستان کی روحانیت" کے مسکن کا ہی متلاشی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے تمام اقوام کی "روحانیت" کا مرکز بنانا چاہتا ہے۔ اس کا دل ہمدردی اور بنی نوع انسان کی محبت میں اس قدر ہمہ گیر واقع ہوا ہے۔ کہ وہ کُل کو چھوڑ کر جزو پر قانع نہیں ہو سکتا۔ اس سے اس کی تحریک عدم تعاون کے خلاف زبردست "اختلاف" پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جس پر اس کے ہموطنوں اور خاندان کے اکثر افراد کی طرف سے غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا۔

ٹیگور کے خیال میں ہندوستان قدیم کا سب سے بڑا انعام اس کا سکون تصوف تھا۔ جس کو وہ پھر اسیر کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کا موجودہ طریقہ تعلیم ناقص مشین کا سا اور نصاب کو غیر ملکی زبان میں رٹنا ہے۔ لیکن شانتی نکیتن میں سوائے بارش کے دنوں کے جماعتیں کھلی فضا میں لگتی ہیں۔ اور اگر کوئی طالب علم چاہے تو وہ درخت کی شاخوں پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ شاعر کے اپنے ڈرامے ایام تعلیم کے اواخر اور دیگر مواقع پر کھیلے جاتے ہیں۔ مذہب کو ہر ایک امر کی پایش گاہ (بیک گراؤنڈ) بنایا گیا ہے۔ درس گاہ کا معبد شیشے کا مندر ہے جو ہر طرف سے ہوا کے لئے کھلا ہے۔ یہاں اگر شاعر موجود ہو۔ تو وہ خود ورنہ دیگر اساتذہ ہفتہ میں دوبار دعا کراتے ہیں۔ صبح اور شام مراقبے کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچے کو تصور کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے خاموش رہنے کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ کہ دوسروں کے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔

درسگاہ میں ہندو تہوار نہیں منائے جاتے۔ لیکن دو بار طویل تعطیلیں ہوتی ہیں۔ اور حضرت مسیح مہاتما بدھ۔ حضرت محمد صلعم۔ چیتن۔ راجہ موہن رائے مہرشی اور "دیگر ابطال" کے یوم ولادت پر آدھے دن کی چھٹی منائی جاتی ہے۔

شیکسپیئر؟ ایک بار میں نے اجیت چکراورتی سے پوچھا۔
وہ جواب میں مسکرائے اور سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔
آوان[1] کے "ہنس راج" کو مذہبی رہنما تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

شاعر چاہتا تھا۔ کہ درسگاہ کی تعمیر میں مغرب کے تجربات سے بھی کام لے کھلی ہوا۔ مذہبی تاکید، شاگرد اور استاد کی قربت۔ یہ وہ چیزیں ہیں۔ جو قدیم ہندوستانی درس و تدریس میں روایتی رہیں لیکن وہ آزادی۔ شگفتگی اور خود اعتمادی کی تعمیر چاہتا ہے مختلف طریقہ ہائے تعلیم میں سے اسے "جارج جونیر ریپبلک" کا طرز پسند ہے۔ جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مروّج ہے۔ چنانچہ شانتی نکیتن بھی ایک جمعیت خود اختیاری ہے۔ ڈائری فارم۔ ڈاکخانہ۔ اسپتال۔ معبد۔ کارخانہ۔ ہر ایک وہ چیز جو ضروری ہے۔ طلبہ کی اپنی ہے۔ درسگاہ کا اپنا ایک مختصر سا پریس بھی ہے۔ "ادبیات" کی لائبریری کلکتہ بھر کی لائبریریوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں جرمنی اور فرانس کے قیاصرانہ عطیّے بھی ہیں۔ شاعر نے وہ تمام بے شمار قلمی نسخے جو

[1] دریائے آوان کے کنارے شیکسپیئر کا مولد ہے۔

مشاہیر عالم نے وقتاً فوقتاً اُس کی خدمت میں پیش کئے اس میں داخل کر دیئے ہیں۔

شانتی نکیتن کے طلبہ نے مضافات میں مزدور پیشہ اور نیچی ذات والوں کے لیے "شبینہ مکتب" جاری کر رکھے ہیں۔ اس طرح بچپن ہی میں ذات پات کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور طلبہ وطن کی خدمت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ شانتی نکیتن میں ان کی اپنی عدالتیں ہیں۔ وہ خود ہی سزا تجویز کرتے ہیں۔ کوئی سزا جسمانی نہیں ہوتی۔ کھیل بڑی شد و مد اور غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

دیگر سب اثرات کے علاوہ شاعر کی موجودگی کا اثر نہایت نمایاں ہے لیکن چند سال سے وہ شانتی نکیتن میں موجود نہیں رہ سکا۔

اس کے معاونین بھی نہایت روشن دماغ ہیں۔ میں اجیت چکراورتی کا ذکر کر چکا ہوں۔ جن کی موت بنگال کے علمی طبقہ کے لئے ایک ایک ان پار نقصان ہے۔ درس گاہ میں آرٹ کا شعبہ بھی ہے۔ جس کے مسٹر نندلال باسو، اسیت ہالدار۔ اور دیگر مشہور مصور ہیں۔ اس زمانہ میں جب شاعر خود یہاں موجود تھا۔ اسے مسٹر انڈریوز کی سی بے غرض شخصیت کی خدمات بھی حاصل تھیں۔ مسٹر انڈریوز ہی ان دنوں اس کے کارساز تھے۔ مسٹر ولی پیرسن بھی تھے۔ اور ہر ایک کو ان سے محبت تھی۔ شاعر کے اکثر اعزّہ اقربا نے بھی اپنے تئیں شانتی نکیتن کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شخصی اثر کے لحاظ سے یہ دنیا کی بہترین درس گاہ ہے۔ شاعر نے بھی اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی ہے۔ یہاں تک کہ موت کے بعد بھی یہ اس کی روح کا مسکن ہوگا۔

میں نے شانتی نکیتن کے مقاصد، آئیڈیل اور ذرائع تعلیم کو کسی مدح و توصیف یا نکتہ چینی کے بغیر مجملاً بیان کیا ہے۔ درس گاہ پر ایک انگریز کا پہلا اعتراض غالباً یہ ہوگا۔ کہ طلبہ کی نگرانی حد اعتدال سے زیادہ کی جاتی ہے۔ اور مجلسی راہ و رسم کے تمام اوقات اساتذہ کے زیر نظر ہوتے ہیں۔ جان ویزلی کے اسکول کی طرح جو کنگز ووڈ میں ہے۔ طلبا کے اس حد تک دعا اور استغراق کی توقع کی جاتی ہے۔ جو غیر فطری ہے۔ ملٹن کی "تعلیم کی سکیم" کے متعلق نقادوں نے کہا تھا۔ کہ وہ اس کے اپنے بچوں کے لیے تو مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن کوئی اور اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ شانتی نکیتن بھی شاید شاعر کے اپنے بچوں کے لئے عمدہ ثابت ہو۔ لیکن چونکہ اس درس گاہ کی سکیم ہی ہندوستان قدیم کے نظریات تعلیم کی طرف بازگشت ہے۔ جن کی رو سے شاگرد اور اُستاد کے تعلقات باپ بیٹوں کے سے ہونے چاہئیں۔ یہ اعتراض بالکل سطحی ہے۔ شاعر اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ اس کو بھی یہی مقصود ہے۔ اس لئے شاگرد اور استاد کی اس قریبی مجالست کو آزادی کے مغربی نظریوں کا پیوند لگانے کی کوشش کی ہے۔

میرے خیال میں در یں صورت یہ درس گاہ دو خطروں سے خالی نہیں۔ اولاً طلبا بہت زیادہ خیال پرست ہونگے۔ اور دوسرے یہ آپ ایسے کیریکٹر کی طرف ان کی راہنمائی کرے گی۔ جو دلکشی کے باوجود سخت کام سے گریزاں ہوگا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں خطرے اس وقت موجود ہیں اور ضرورت ہے کہ ان کی نگہداشت کی جائے۔ لیکن جب تک زمانہ کوئی فیصلہ نہ کرے۔ ہمیں اپنی رائے کو محفوظ رکھنا چاہئے۔ اس کی عمر ابھی صرف پچیس سال ہے۔ اور اس کی قدر و منزلت صرف اس وقت ثابت ہو گی۔ جب ہندوستان آزادی حاصل کرے گا۔ اس وقت اس کے قیام و بہبود کا انحصار اس کے فرزندوں کے اعمال پر ہوگا۔ شاعر کی قوم کو سرگرم جوش اور زور و طاقت کی ضرورت ہے۔ اور مجھے امید ہے۔ کہ مصائب کے آنے والے ایام میں اس کے لیڈر شانتی نکیتن سے پیدا ہوں گے۔

(حنیف ہاشمی)
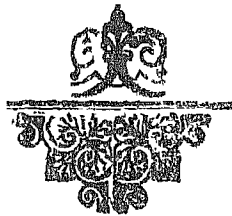
دُعا

رنج و کلفت! کیسے درد ناک الفاظ ہیں۔لیکن انجام کیسا شیریں۔اگر گناہ کی وادیٔ پُرخار میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے۔ تو تکلیف سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔اور ٹھٹھکا دیتی ہے۔کہ راہرو! جس جگہ تجھے خوشنما پھول پتے نظر آتے ہیں۔وہاں پنکھڑیوں اور پتوں کے نیچے کالے ناگ چھپے ہیں۔اگر کوئی کہنہ مشق ہے۔تو غم و اندوہ اُسے خبردار کرتا ہے کہ پیشتر اس سے کہ اجل تیری روسیاہی پر مہر ابدی لگائے۔عصیاں کے داغ کو آنسوؤں کی جھڑی سے دھو ڈال۔ اور پشیمانی کی سفارش لے کر اپنے خالق کے دربار میں داخل ہو۔

شیکسپیئر کے ڈراما ہیملٹ میں جب ہیملٹ کا ناپاک چچا دُعا مانگتا ہے۔تو وُہ محسوس کرتا ہے۔کہ "الفاظ جو میرے مُنہ سے نکلتے ہیں۔بلا شبہ مَیں انہیں بسوے آسمان پرواز کرانا چاہتا ہوں۔لیکن میرے خیالات تو زمین پر مقیم ہیں۔ہاں! ہاں! مَیں نے خوب سمجھا۔اگر الفاظ کو خیالات طاقت پرواز نہ دیں تو الفاظ کی کیا بساط کہ اُس کریم کارساز تک پہنچنے کے لئے پر پھڑ پھڑائیں۔"

جب دل میں درد اُٹھتا ہے۔تو انسان کا بھولا بھٹکا دل اپنے قطب کی طرف رونما ہوتا ہے۔پریئر یا پرارتھنا یا دُعا کی علتِ غائی یہی ہے۔کہ ایک دم کے لئے انسان اور مالکِ ارض و سما کے درمیان وابستگی پیدا ہو جائے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان اس مطلب کے لئے الفاظ استعمال کرتا رہا ہے۔لیکن آج میں ایک انگریزی شاعر جیمز منٹگمری کی انگریزی نظم پریئر کا اُردو ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ بعض حالتوں میں خاموشی ہزار فصاحت کے مقابلہ میں بازی لے جاتی ہے۔

PRAYER	دُعا
Prayer is the soul's sincere desire, Uttered or unexpressed; The motion of a hidden fire, That trembles in the breast	رُوح کی بے ریا خواہش۔ اسی کا نام دُعا ہے۔حرفِ خواہش زبان پر آئے یا نہ آئے۔ آتشِ نہاں جو سینہ میں بے قرار ہے۔اس کا پہلو بدلنا۔یہی دعا ہے۔
Prayer is the burden of a sigh; The falling of a tear;	جب کبھی اور جہاں کہیں دلِ ناتواں سے آہ نکلتی ہے۔ آہ کا غبار دل کی شکل اختیار کرکے اُوپر اُڑتا ہے۔ جب آنسو گرتا ہے۔تو ایک پیغام بسوے آسماں اُٹھتا ہے۔

جب یاس گھیر لیتی ہے - جب انسان اپنے آپ کو
بستی مین سونا پاتا ہے - جب سب طرف سے امید اُٹھ جاتی
ہے - اور آنکھ بے اختیار ہو کر اُوپر اُٹھتی ہے - کہ گویا اس
کی غریب نوازی پر آخری ٹیک ہے - اسی کا نام دُعا ہے -

دُعا کے لئے فنِ تقریر کی ضرورت نہیں - شیر خوار بچّہ
کی لکنت - دُعا اس سے بھی سادہ تر ہو سکتی ہے -
دُعا جس کی عرشِ بریں کے مقیم تک رسائی ہے - موسیقی
کی سی حلاوت رکھنے والی فصاحت و بلاغت کا انتہائی معراج
اس میں پنہاں ہے -

راما

The upward glancing of an eye,
When none but God is near.

—o:O:o—

Prayer is the simplest from of speech,
That infant lips can try;
Prayer, the sublimest strains that reach,
The Majesty on high.

James Montgomery.

غزل

کون کہتا ہے کہ مر جانے سے کچھ حاصل نہیں — زندگی اُس کی ہے مرجانا جسے مشکل نہیں

ہاں یہ سارا کھیل پروانوں کی جانبازی کا ہے — شمعِ روشن پر مدارِ گرمیٔ محفل نہیں

عام ہی کرنا پڑے گا ان کو فیضِ التفات — غیر ہرگز التفاتِ خاص کے قابل نہیں

منتخب میں ہی ہوا مشقِ تغافل کے لئے — وہ تغافل کیش میری یاد سے غافل نہیں

حلقۂ گرداب ہے گہوارۂ عشرت مجھے — ذوقِ آسائش مرا منّت کشِ ساحل نہیں

دیکھئے کیا ہو ہمارے شوقِ منزل کا مآل — پاؤں میں طاقت بقدرِ دوریٔ منزل نہیں

لاکھ دِل قربان اُس چشمِ ندامت کوش پر
یعنی مجھ کو آرزوئے خوں بہائے دِل نہیں

(میلا رام وفا)

پامالِ انجام

عرب کا ایک تاریخی افسانہ

ملٹن نے اچھے شعر کی تعریف یہ کی ہے۔ کہ "سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہُوا ہو۔ اور اصلیت پر مبنی ہو۔"

ملٹن کے بیان کردہ محاسنِ شعری اُن عربی شعراء کے کلام پر زیادہ منطبق ہوتے ہیں۔ جنہیں اہلِ عجم سے اختلاط کا موقعہ نہیں ملا۔ متاخّرین عربی شعراء کا کلام بہت حد تک عجمی مُوشگافیوں کا طلسم بن کر رہ گیا ہے۔ دیوان مُتنبّی کو بغور دیکھنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ابو الطیّب (متنبی) کے عجمی اختلاط ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ اپنے عہد کا بلند ترین شاعر ہونے کے باوجود اس کے کلام میں وہ سادگیٔ جذبات اور سوز و گداز نہیں؛ جو عربی شاعری کی خصوصیات ہیں

عرب و عجم کی شاعریوں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ ایک کا تعلق دماغ سے ہے اور دوسری کا دل سے۔ اس کی بہت سی وجوہات میں سے یہ امر واقعی بھی ہے۔ کہ عجمی شاعروں کی بلند آہنگ عشق نوائیوں میں صنعتی محبوبوں کی خیالی تصاویر کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ غالباً یہی سبب ہے۔ کہ فارسی شعراء اور اُن کی پیروی میں اُردو کے قافیہ پیما "ہفت کرم داشتن" کے طور پر اپنی عشقیہ شاعری کا مخاطب "محبوب حقیقی" کو متعین کر کے عالمِ مجاز سے "حقیقت" کے حدود میں آگھسے ہیں۔ اور اس طرح عجمی لٹریچر میں تصوف اور ویدانت کو پاؤں پھیلانے کا موقعہ مل گیا۔

اس کے برخلاف عربی شعرا کے دلگداز ترانوں کی مخاطب جیتی جاگتی لیلائیں سلمائیں اور عذرائیں نظر آتی ہیں۔ عربی شاعر اپنے پاکیزہ جذباتِ عشق سے مجاز ہی کو اس درجہ بلند کر دیتے ہیں۔ کہ عجمی شعراء کی خود ساختہ "حقیقت" اُس تک نہیں پہنچ سکتی۔

عرب کے سحر طراز عموماً اپنی بیویوں اور منگیتروں کو اشعار میں مخاطب کیا کرتے ہیں۔ عشقیہ قصائد میں بے دھڑک اُن کا نام لے دیتے ہیں۔ اور اپنی مخاطبہ کو بھی اپنے ساتھ زندۂ جاوید بنا دیتے ہیں۔

اسی لئے حسن و محبت کی فرضی کہانیوں کی بجائے عربی ادب میں عشق کے تاریخی افسانے بکثرت ملتے ہیں۔ ذیل میں عرب کے مشہور شاعر قیس ابن ذریح کے سانحۂ محبت کو ہدیۂ نظر کیا جاتا ہے۔

یہ افسانہ پہلی صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ عرب پر اُس وقت امیر معاویہ کی حکومت تھی۔ اس افسانے کا ہیرو قیس صحرائے مدینہ میں بود و باش رکھتا تھا۔ مدینہ پر امیر معاویہ کی جانب سے مروان ابن الحکم حکمران تھا۔

حضرت امام حسینؓ نے قیس کی ماں کا دُودھ پیا تھا۔ اس طرح قیس امام حسینؓ کا دودھ شریک بھائی بن گیا تھا۔

لُبنیٰ قیس کی بیوی کا نام ہے۔ اس سے قیس کو بے حد محبت تھی۔

قاعدہ ہے کہ محبت جب آتی ہے تو اپنے جلو میں مصائب و آفات کے کارواں در کارواں ہنگامے بھی ساتھ لاتی ہے محبّت نے اپنے افسانوں میں ہمیشہ انسانی خون سے رنگ بھرا ہے۔ قیس و لُبنیٰ کے انجامِ عشق نے بھی تاریخ حسن و عشق میں ایک دردناک باب کا اضافہ کیا ہے۔

اس دلگداز انجام کا آغاز اس طرح ہُوا۔ کہ قیس کسی ضرورت سے کہیں سفر کر رہا تھا۔ اثنائے راہ میں لُبنیٰ کے قبیلے کی طرف سے گزرا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی اور پھر ریگستانِ عرب کی گرمی۔ اس پر سفر کی تکان اور پیاس کی شدت۔ ان مصیبتوں نے قیس کو دم بھر آرام لینے پر مجبور کر دیا۔ کاش اُسے کوئی بتا سکتا کہ یہ گھڑی دو گھڑی کا آرام

اُس کی پُوری زندگی کو بے قرار بنا دیگا۔ یہ چند ساعت سائے میں آرام لینا اُس کے سارے مستقبل کو ایک جاں سوز دوپہر میں تبدیل کر رہا ہے۔ یہ پیاس بجھ کر ایک ایسی تشنگی پیدا کرنے والی ہے۔ جو شربت مرگ کے سوا کسی چیز سے نہ بُجھ سکے گی۔ مستقبل کی اذیتوں سے بے خبر قیس اِس قبیلے میں پُہنچا۔

عرب کے صحرا نشین خانہ بدوشی کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ جہاں جانوروں کے لئے چارہ اور پانی پایا۔ وہاں اُتر پڑے بھیڑوں کی اُون کے بُنے ہُوئے کمبلوں کے خیمے لگا دیئے۔ جب تک چارہ اور پانی رہا وہاں رہے۔ جہاں یہ ختم ہُوا، کسی اور طرف چل پڑے۔ اس بے سروسامانی پر بھی مہمان نواز اس قدر تھے۔ کہ خون کے پیاسے دشمن کو بھی اگر وہ مہمان بن کر آئے معاف کر دیتے تھے۔ رات کو ٹیلوں پر آگ روشن کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر روشنی دیکھ کر ان کے پاس آکر مہمان بنے۔

قیس تھکا ہارا اس حال میں پُہنچا۔ کہ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور۔ پیاس سے زبان پر کانٹے جمے ہُوئے۔ چہرہ گرد و غبار سے اٹ رہا تھا۔ ایک خیمے کے پاس جاکر اہلِ خیمہ سے اُس نے پانی طلب کیا۔ اس پر ایک حسین و جمیل دوشیزہ پانی کا پیالہ لئے ہُوئے خیمے کے افق سے طلوع ہُوئی۔ اور نہایت ادب سے مہمان کو پانی کا پیالہ پیش کیا۔ قیس نے ڈگڈگا کر پیالہ پی لیا۔ اور لڑکی کا شکریہ ادا کر کے واپسی کا ارادہ کیا۔

لڑکی نے عربی مہمان نوازی کو مدِنظر رکھ کر قیس سے درخواست کی کہ "آپ گھڑی دو گھڑی ہمارے مہمان بن کر ہمیں سرفراز نہ فرمائینگے؟"

مہمان نے اس استدعا کو منظور کر لیا۔ اور حسین میزبان نے الگ ایک خیمے میں اس کا بستر کر دیا۔ ضروریات کی تمام چیزیں اُسے مہیا کر دیں۔ تھوڑی دیر میں اُس لڑکی کا باپ بھی آگیا۔ اُس نے گھر میں مہمان کو دیکھ کر ایک عربی میزبان کی بشاشت کے اظہار سے اس کا خیر مقدم کیا اور رسم میزبانی کے طور پر اُس کے لئے اپنا ایک اُونٹ ذبح کیا۔ اُس دوشیزہ نے محترم مہمان کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اُس کی مخلصانہ مہمان نوازی نے قیس کے دل پر بہت اثر کیا۔ یہی تاثر دوشیزہ کی درخشاں صورت، طبعی جودت اور فصاحت و بلاغت کی حیرتوں سے مِل جُل کر محبت بن گیا۔ اور اسی تباہ کار محبت نے انجام کار دونوں کی جان لی۔

قیس وہاں سے رُخصت ہونے لگا۔ تو اُسے محسوس ہُوا کہ محبت کا غیر محسوس ہاتھ اُس کے دامنِ دل کو باعصمت دوشیزہ کی جانب کھینچ رہا ہے۔

ڈرتے ڈرتے اس نے مبہم اشاروں میں لُبنیٰ (اُس حسین دوشیزہ کا نام) کو اپنے سوزِ دروں کی اطلاع دی، تو معلوم ہُوا کہ

"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہُوئی"

محبت بُزدل کو بھی جری بنا دیا کرتی ہے۔ پھر عرب کے شیر دل شاعر کو اس بیباک جُرأت کے اظہار سے کون روک سکتا تھا۔ اُس نے خلافِ مذہب و قانون خفیہ ریشہ دوانیوں کی بجائے بے خطر ہو کر لُبنیٰ کے باپ سے اپنا ماجرائے محبت بیان کر کے لبنیٰ کے ساتھ عقد کی درخواست کر دی۔ لبنیٰ کے باپ "حباب" نے کہا۔ دیکھو راہ چلتے مسافروں کو یہ مناسب نہیں ہے۔ کہ زندگی بھر کا فیصلہ گھڑی دو گھڑی میں طے کر لیں بہتر یہ ہے کہ تم لبنیٰ کا خیال چھوڑ دو۔ اپنے عزیز و اقارب میں کہیں اپنی نسبت کا انتظام کرو۔ اس سے مایوس ہو کر قیس نے لبنیٰ کی ماں سے اس بارے میں ہمدردی کی التجا کی اُس نے کہا۔ مَیں اپنے شوہر کے خلاف مرضی کوئی کام کرنا نہیں چاہتی۔ مجھ سے تمہیں اس امر میں کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

قیس ناامید ہو کر مدینے کو روانہ ہُوا۔ اور اپنے برادرِ رضاعی (دودھ شریک بھائی) حضرت امام حسینؓ کو یہ تمام ماجرا سُنا کر اُن کے روحانی اقتدار سے امداد چاہی۔ امام حسینؓ نے اُس کے صدقِ محبت کا اندازہ کر کے لبنیٰ کے باپ (حباب) سے اس کی سفارش کی۔ حباب نے عرض کیا۔ کہ حضور کا ارشاد میری

سر آنکھوں پر۔ حضور قیس کو نیک اور شریف تصوّر فرماتے ہیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر رسم عرب کے مطابق یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ قیس کا باپ ذریح میرے پاس اپنے بیٹے کا پیغام لائے۔ اس پر امام حسین نے ذریح کو یہ واقعہ سُنا کر فرمایا۔ کہ تم قیس کا پیغام حباب کے ہاں لے جاؤ۔

چنانچہ وہ امتثالِ امر کے لئے لبنیٰ کے قبیلے میں پہنچا۔ اور حباب و ذریح کی گفتگو کے بعد قیس کا نکاح لبنیٰ کے ساتھ ہو گیا۔

کم و بیش دس سال تک دونوں کی زندگی راحت و اطمینان سے گزری۔ لبنیٰ کو اولاد کی بڑی آرزو تھی۔ مگر قسمت کسی کی آرزو کی پابند نہیں ہُوا کرتی۔ قیس کے ماں باپ نے جب دیکھا کہ لبنیٰ بانجھ ہے۔ اور اگر ہم نے قیس کی دوسری شادی نہ کی، تو ہماری نسل قیس ہی پر ختم ہو جائیگی۔ تو وہ اس پر مصر ہُوئے۔ کہ بیٹے کا دوسرا بیاہ کریں۔ قیس کو اس امر پر مجبور کرنا شروع کر دیا کہ لبنیٰ کو طلاق دے کر کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لے۔

قیس کا جذبۂ عشق جس قدر بلند تھا اُسی قدر باپ کی اطاعت کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ بنائے ہُوئے تھا۔ اُس نے ہر چند اسے سمجھانا چاہا مگر وہ پوتے کی آرزو کو قیس کی محبت سے زیادہ گرانمایہ تصوّر کرتا تھا۔ اُس نے اس کا عذر پذیرا نہ کیا۔ اِس حیص بیص کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ قیس کے باپ نے قسم کھالی کہ "جب تک قیس لبنیٰ کو طلاق نہ دے میں کسی چھت کے نیچے نہ سوؤں گا۔"

اب قیس بڑی کشمکش میں پڑ گیا۔ دوپہر کے شعلہ ریز آفتاب کی گرم و سُرخ سلاخیں قیس کے بدن کو برماتے دیتی تھیں۔ کیونکہ وہ ہر دوپہر کئی کئی گھنٹے اپنے باپ کو تپش سے بچانے کے لئے سُورج کی جانب سے اُس کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے جسم سے اُس پر سایہ کئے رہتا تھا۔ جب سُورج ڈھلتا اور دُھوپ کی تیزی میں کمی آتی تو لبنیٰ کے پاس جاتا اور اُس کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں رویا کرتا۔ ایک مدت تک وہ موت و حیات کے برزخ میں بسر کرتا رہا۔ اسے مردہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ابھی اُس کے جسم و جان میں ارتباط قائم تھا۔ لیکن وہ زندوں میں بھی شمار کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کی تمام راحتو[ں]

سے محروم تھا۔

باپ کی قسم سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب آ[س] پر مقاطعۂ جوعی (بھوک ہڑتال) کے تشدد کا اضافہ ہو رہا [تھا] اور مستقبل قریب میں باپ کی زندگی موت کے خطرہ تک پہنچ[نے والی] تھی۔ انجام کار مذہبی ماحول اور فطری سعادتمندی نے طاعت کو بیوی کی محبت پر فتح دی۔ اور باپ کی زندگی پر بیوی کو ق[ربان] کر کے قیس نے بادلِ ناخواستہ لبنیٰ کو طلاق دیدی۔ لبنیٰ کے میکے [والوں] نے یہ خبر سُنی تو اُسے آ کر لے گئے۔ اور اب اُس مظلوم اور بے[کس] لڑکی کی زندگی میکے کی بیکس خلوتوں میں بسر ہونے لگی۔

اِدھر اطاعت شعار بیٹے نے باپ کی جان تو بچالی مگر اُس[کو] اپنی زندگی کو گھُن لگنا شروع ہو گیا۔ ان ایام حسرت و فراق [میں] اُس نے جس کرب و اضطراب سے گذارا اُس کا اندازہ اشعا[ر] سے ہو سکتا ہے۔ جو اُس نے لبنیٰ کی یاد میں کہے۔

بے درد لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ لبنیٰ تیرے لئے ایک ف[تنہ] ہے تو اُس کے آنے سے پہلے ہوش و حواس میں تھا۔ بہتری [اسی] میں ہے کہ اُسے طلاق دیدے۔ اور اس پر کبھی ندامت کا اظ[ہار] نہ کر۔

آہ میں نے اپنے دُشمنوں کا کہا مان لیا۔ اور اپنے مخلص ناصح کی بات پر کان نہ دھرا۔ اور اس طرح اپنے آپ کو تباہ کر کے اپنے اُوپر ہنسنے والے دُشمنوں کی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔

بربِّ کعبہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ کہ میں ان ملامت گر[وں] کے حکم سے سرتابی کرتا۔ اور لُبنیٰ کی رضاجوئی کے لئے مشکل [سے مشکل] کی مصیبتیں برداشت کر لیتا۔ لبنیٰ کے لئے زخار سمندر کی گہرائی میں کُودنا اور تھپیڑے مارنے والی لہروں پر رات بسر کرنا پسند کرتا ہوں۔

اخیر میں کس دردناک لہجے میں کہتا ہے۔

"فَتَبْكِيْ عَيْنِيْ بَعْدَهَا كُلَّ مَنْظَرٍ
وَيُكَدِّرُ سَمْعِيْ بَعْدَهَا كُلَّ مَنْطِقِ"

میری آنکھ لبنیٰ کے دیدار سے محروم ہو کر ہر منظر سے [بیزار] ...

...ہے۔ اور میرے کان اُس کی سامعہ نواز گفتگو سُننے کے بعد
...کی گفتگو سُننے سے نفرت کرتے ہیں۔

~~~~~~~~~~

قیس کے باپ نے بیٹے کو زندگی اور موت کی کشاکش میں
...تو سراسیمہ ہوگیا۔ اب اُسے اپنی بیہودہ قسم کھانے پر ندامت
...ئی۔ مگر ندامت کا وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب قیس کی
...ندگی کے لالے پڑ رہے تھے۔ باپ نے لبنیٰ کی جانب
...ے اُس کی توجہ پھیرنے کی غرض سے اسے مجبور کیا کہ وہ
...ں دوسری شادی کر لے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی اُس کی سعادتمندی
...ے ناجائز فایدہ اُٹھاتے ہُوئے ایک بیوی اس کے سر مڑھ
...ا گئی۔ اُس نے اپنی نئی بیوی پر توجہ ضائع نہیں کی۔
... دوسری شادی کے بعد باپ کے حکم سے اُس نے کچھ دن
...سسرال میں گذارے۔ جب وہاں کی بے کیف زندگی
...ے اُکتا گیا تو اُن سے گھر آنے کی اجازت لے کر چل کھڑا ہُوا
...روالیں ہونے کی بجائے سیدھا مدینہ منورہ کا رُخ کیا۔ جہاں
...مارہ مدینہ میں اس کا ایک ہمراز دوست تھا۔ اس کے ہاں
...ٹھہرا۔ اُس دوست نے قیس کو بتایا کہ تیری نئی شادی
...خبر لبنیٰ کو پہنچ چکی ہے۔ اس خبر سے اُسے بہت صدمہ
...نچا۔ اور پہلا فقرہ اُس کے مُنہ سے یہ نکلا۔ کہ "قیس سخت
...وفا ہے۔ میں تو اپنے عزیز و اقارب کو اب تک اُس کی
...بت کا احترام کرتے ہُوئے اپنے نکاح سے روکتی رہی ہوں"
...ن کر قیس کے جنونِ محبت میں اور طغیانی پیدا ہوئی۔ مدینے
... گلی کوچے اِس کے دردناک اشعار سے گونجنے لگے۔ لبنیٰ
... باپ نے جو دیکھا کہ یہ آوارۂ محبت حدودِ معاشرت و
...ین مذہب کو توڑنا چاہتا ہے تو اس کی شکایت امیرالمومنین
...رت معاویہؓ سے کر دی۔ کہ "لبنیٰ کو طلاق دینے کے بعد بھی
...ن اُس کے متعلق فراقیہ اشعار کہتا پھرتا ہے۔"
امیر معاویہؓ نے مروانؓ ابن الحکم والی مدینہ کو لکھا کہ
"اگر قیس لبنیٰ سے کسی قسم کا تعرض کرے تو اُس کا خون
...ال سمجھا جائے۔"
ساتھ ہی لبنیٰ کے باپ کو حکم دیا کہ لبنیٰ کا نکاح ایک
شخص خالد ابن حلنزہ سے کر دیا جائے۔ اُس کے باپ نے
اس حکم کی تعمیل کرتے ہُوئے خالد مذکور سے لبنیٰ کا عقد ثانی کر دیا۔
اس نکاح کی خبر قیس کو ہُوئی تو اُس نے نالہ و فریاد سے سُننے
والوں کے دل ہلا دئے۔ اور آہ و بکا کرتا ہُوا فوراً لبنیٰ کے محلے
میں پہنچا۔ جس کوچے سے لبنیٰ گذرا کرتی تھی۔ اُس کی خاک
پر اپنے رُخسارے رکھ دئے۔ اور بیتابانہ انداز میں اُس کوچے
کی خاک کو چُومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا۔ اِس
اندوہناک منظر کی یادگار ذیل کے اشعار ہیں:۔
"اگرچہ لبنیٰ تک پہنچنے میں بہت بڑی روک حائل ہوگئی
ہے۔ لیکن فضا کی ہوا ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا رہی
ہے۔ ہم دونوں ڈوبتے ہُوئے سُورج کو دیکھ رہے ہیں۔ ہم
دونوں ایک ہی زمین کی سطح پر آباد ہیں۔ دونوں کے سروں پر
ایک ہی آسمان ہے۔ جس میں ستاروں کو چلتے پھرتے ہم
دیکھ رہے ہیں۔"
لبنیٰ کی یاد میں قیس کے درد ریز قصائد مُلک کے گوشے
گوشے میں پھیل گئے۔ اس عالمِ رنج و یاس میں اُس کے
اشعار ذیل پڑھ کر اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اتبكي على لُبنىٰ وانت تركتها
وكنت كآتٍ حتفه وهو طائعُ

ويا قلبُ صبراً واعترافاً بحبّها
ويا حبّها قع بالذي انت واقعُ

ويا قلبُ خبّرني اذا شطّت النوىٰ
بلبنىٰ وبانت عنك ما انت صانعُ

اتصبرُ للبين المشتّ مع الجوىٰ
ام انت امرءٌ ناسي الحياة فجازعُ

كأنّ بلاد الله ما لم تكن بها
وان كان فيها الناس وحش بلاقعُ

افضي نهاري بالحديث وبالمنىٰ
ويجمعني والهمّ بالليل جامعُ

لقد رسخت في القلب منك مودّة
كما رسخت في الراحتين الاصابعُ
~~~~~~~~~~

مطلب

اپنے نفس کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ اے قیس
اب تو لبنیٰ کی یاد میں روتا ہے؟ حالانکہ تو نے ہی اُسے
چھوڑا ہے۔ ہاں تو نے ہی اپنی مرضی سے اپنے لئے قبر
کھودی ہے۔

اے دل لبنیٰ کے دردِ جدائی پر صبر کر! اور اُس کی محبت
کا ہر حال میں اعتراف کرتا رہ۔ اور اسے محبت تو جس دل پر
مسلّط ہے اُس پر تسلط قائم رکھ!

اے دلِ دردمند! مجھے یہ تو بتا کہ تو اُس وقت کیا کریگا۔
جب لبنیٰ اور تجھ میں جدائی حائل ہو جائیگی۔ کیا تو جدا کر دینے
والے دردِ فراق پر صبر کریگا یا اُس آدمی کی طرح جو اپنی زندگی
کو بھول چکا ہو آہ و فریاد کریگا۔

خُدا کے آباد کیئے ہوئے شہر لبنیٰ کے بغیر مجھے سُونے اور
اُجاڑ نظر آتے ہیں۔ مَیں اپنا دن تو لبنیٰ کی یاد اور اُس کی ملاقات
کی آرزوؤں میں بسر کرتا ہوں۔ اور رات کی بیکسی میں اُس کا
غم ہی میرا انیسِ تنہائی بنتا ہے۔ اُس کی محبت میرے دل میں
اس طرح پیوست ہوگئی ہے۔ جیسے ہاتھ کی ہتھیلیوں میں اُنگلیاں۔"

قیس کے بے قرار کر دینے والے فراقیہ قصائد کو عرب
کے مشہور مُغنّیوں۔ غریض۔ معبد اور مالک نے مجالسِ طرب
میں سُنا سُنا کر ساری فضا کو درد سے معمور کر دیا اور پھر تو
ہر شریف رذیل چھوٹے بڑے سب کی زبان پر قیس کی یہ
منظوم زار نالی مُسلّط ہوگئی۔ جس نے بھی سُنا اُسے قیس کے
حالِ زار پر ترس آیا۔

لبنیٰ کے شوہر کو اس رسوائی سے قدرۃً صدمہ ہونا چاہیئے
تھا اور ہُوا۔ وہ سیدھا لبنیٰ کے پاس پہنچا اور خشمگین ہو کر اُسے
تنبیہ کرنے لگا۔ کہ لبنیٰ اپنی رُسوائی سے مجھے تو نے بھی بدنام
کر دیا۔" یہ طعن و تشنیع سُن کر وہ طیش میں آکر بولی۔ ہوش میں آؤ!
تم کس گمان میں ہو؟ مَیں نے تم سے کچھ اس لئے تو نکاح نہیں
کیا تھا۔ کہ مَیں تم سے محبت کرتی تھی یا تمہارے مال و دولت
کی خواہاں تھی۔ مَیں جانتی ہوں کہ تم سے پہلے مَیں قیس کی زوجہ
تھی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اُس سے اُس کی مرضی کے خلاف
زبردستی مجھے طلاق دِلوائی گئی ہے۔ بخدا مَیں نے اس وقت تک
دوسرے نکاح کی ہامی نہیں بھری جب تک حکومت نے
فرمان جاری نہیں کر دیا کہ اگر قیس لبنیٰ کے قبیلے میں دیکھا جائے
تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ مَیں نے اس خوف سے کہ کہیں وُہ
اپنی غلط تمناؤں کے اُکسانے سے اپنی زندگی کو خطرے میں
نہ ڈال دے۔ تم سے نکاح کیا ہے۔ مَیں جب تک تمہارے نکاح
میں ہوں ایک عرب نژاد غیور اور پاکدامن مسلمان لڑکی کی طرح
صرف تمہیں سے واسطہ رکھ سکتی ہوں۔ اب قیس میرے لئے
اور تمام اجنبی مردوں کی طرح ایک مرد ہے۔ البتہ صداقت کے
ساتھ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ کہ دل پر مجھے اختیار نہیں ہے میرا
دل قیس کی ملکوتی محبت سے منور ہے۔ عملاً مَیں اس کی صدائے محبت
کا سکوتِ مطلق میں جواب دے رہی ہوں۔ اور جیتے جی اُس سے
کنارہ کش رہ کر مذہب اور قانون کے احکام کا احترام کروں گی۔
اس پر بھی تم اس کی مجنونانہ حرکات کی باز پرس اگر مجھ سے کرنا
چاہتے ہو تو تم خود مختار ہو۔ مجھے طلاق دے سکتے ہو۔"

یہ مُسکت جواب سُن کر لبنیٰ کا شوہر خاموش ہو گیا۔ اب اُس
نے یہ رویہ اختیار کیا۔ کہ مدینے کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو لبنیٰ
کے متعلق قیس کے فراقیہ اشعار یاد کرا کے اُنہیں اپنے گھر میں
لے آتا۔ لڑکیاں لبنیٰ کے سامنے وہ اشعار گایا کرتیں۔ اس سے
اُس کا مقصد یہ تھا۔ کہ عار دلا کر لبنیٰ کے خیالات کو قیس کی طرف
سے ہٹائے۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہُوئی۔ بلکہ اُس کا اُلٹا
اثر یہ ہُوا، کہ وہ قیس کے دردناک اشعار سُن سُن کر
بے اختیار رویا کرتی۔

اس ڈرامے کا آخری سین یہ ہے۔ کہ لبنیٰ اپنی عصمت
پر ثابت قدم رہ کر دردِ محبت اور رنجِ رسوائی کی تاب نہ لا سکی
اور اسی غم میں گھُل گھُل کر اپنی زندگی کے آخری سانس پورے
کر دئے۔ ۵

رات بھر دردِ تمنّا میں تڑپتے گذری
صبح ہوتے ہی مریضِ غمِ ہجراں نہ رہا

قیس کو اُس شہیدِ محبت کے المناک انجام کی خبر پہنچی۔ تو
بیتابانہ اُس کی قبر پر گیا۔ اور حالتِ درد و یاس میں یہ اشعار کہے

مَاتَتْ لُبْنیٰ فَمَوْتُہَا مَوْتِی
ھَلْ تَنْفَعَنْ حَسْرَتِی عَلَی الْفَوْتِ
وَسَوْفَ اَبْکِی بُکَاءَ مُکْتَئِبٍ
قَضٰی حَیَاۃً وَجْدًا عَلٰی مَوْتٍ

مطلب - آہ پیاری لُبنیٰ مرچکی۔ اُس کی موت درحقیقت میری موت ہے۔ اس سانحۂ جاں کاہ پر میرا زبانی اظہارِ افسوس بے سود ہے۔ اب مَیں یقیناً اس پامالِ غم کی طرح آہ وزاری کرونگا جو اپنی زندگی سے سیر ہوکر جان پر کھیلنے پر تُلا بیٹھا ہو۔"

یہ اشعار پڑھتے ہی اُس کی قبر پر پچھاڑ کھاکر گر پڑا۔ درد والم سے روتے روتے بیہوش ہوگیا۔ اور اُس کے عزیز واقارب لبنیٰ کی قبر پر سے اسے اُٹھاکر گھر لے گئے۔ مگر اس غم نے اسے ایسا دیوانہ بنا دیا تھا کہ کسی تدبیر سے اُس کے حواس ٹھکانے نہ ہو سکے۔ اُسے کچھ ایسی چُپ لگ گئی تھی کہ کسی کو کسی بات کا جواب نہ دیتا تھا۔ انجام کار تیسرے دن موت نے اُس کے مصائبِ زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اور مرنے کے بعد لُبنیٰ کی قبر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

نہ چھوڑا مرتے دم تک ساتھ بیمارِ محبت کا
قسم کھانے کے قابل ہے ترے غم کی وفاداری

تاجور

ہِندی شاعری

ہمارے مکرم ڈاکٹر بنارسی داس صاحب ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی لیکچرار پنجاب یونیورسٹی نے سنسکرت اور ہندی کی شاعری سے انتخاب کرکے ذیل کے نادر گراں مایہ اور پاکیزہ خیالات اردو کے سانچے میں ڈھال کر ادبی دنیا کے لئے عنایت فرمائے ہیں۔ ان خیالات کی رفعت، اثر ریزی اور فطری سادگی کے ساتھ ہندوستانی پن اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اردو شعراء ان اچھوتے خیالات کو اردو کا لباس دیکر انہیں اپنا لیں ہماری رائے میں سنسکرت ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری سے منتخب اور سجے ہوئے نادر خیالات کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھالنا اردو زبان کیلئے (جو سارے ہندوستان کی نمائندگی کی دعویدار ہے) نہایت ضروری ہے۔
تاجور

بُری خصلت نہیں بدلتی

"صنعت تمثیل یا تشابہ میں اخلاقی مسائل بیان کرنا ہندوستان قدیم کے فلسفی شعراء کا خصوصی امتیاز ہے۔ وہ ایک دعویٰ کرتے ہیں۔ اور قانونِ قدرت یا مناظرِ فطرت سے اسکی دلیل پیش کرتے ہیں۔ اکثر اوقات دعویٰ اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں۔ یا دعویٰ مشاہدۂ فطرت کے مطابق اور دلیل شاعرانہ اور خیالی لیکن بعض اوقات اس کا دعویٰ فی نفسہٖ صحیح ہوتا ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں مناظرِ قدرت اور قانونِ فطرت سے جو دلیل پیش کرتا ہے۔ وہ بھی ہر روز کے مشاہدہ کی ہوتی ہے۔ شاعر مذکور بری خصلت کی مذمت کرتا ہے! وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ بری خصلت بدل نہیں سکتی۔ لیکن وہ یہیں بس نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے قارئین کو دور نگاہ فطرت کے ایوان میں لے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے "جو لوگ خدا پرست نہیں انکی صحبت چھوڑ دے۔ کیونکہ ان کی صحبت سے بُرے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے زندگی اور عبادت میں خلل پڑتا ہے۔ یہ خیال مت کر کہ شاید میری صحبت کا اثر ان پر پڑ جائے۔ اور وہ نیک راستہ پر آجائیں۔ ایسا نہ ہوگا۔ دیکھ اگر کوے کو کافور کھلایا جائے تو کیا وہ سفید ہو جائے گا! اگر گدھے کو خوشبودار ابٹن کا لیپ کیا جائے تو کیا وہ خاک میں لوٹنا چھوڑ دیگا۔ اگر بندر کو گہنے پہنا دیئے جائیں۔ تو کیا اس کی شکل اچھی ہو جائیگی اگر کتے پر پہیئے بیٹھ جائیں تو کیا وہ بیٹھ سکیگا۔ اسی طرح سورداس کہتا ہے کہ کھوٹا آدمی کالے کمبل کی طرح ہے جس پر دوسرا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔

موسم بہار

موسم بہار میں کوئی نوشادی شدہ مرد سفر پر جانا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی کو جب اپنے شوہر کے ارادہ سفر کا علم ہوتا ہے۔ تو اُس کے جذبات محبت مچلنے لگتے ہیں اور بے اختیارانہ طور پر موسم بہار کو مخاطب کرکے کہتی ہے۔

اے بہار میں تجھے ابھی برسات بنائے دیتی ہوں۔ اسطرح میرا پتی سفر نہ جاسکیگا۔ میں اپنے نیلے رنگ کے کپڑے پہن لونگی جس سے پانی بھرے نیلے بادلوں جیسی گھٹا دونگی میرے دانتوں کی چمک اب بجلی کیطرح چمکے گی میرے زیوروں میں جڑے ہوئے ہیرے جگنو کیطرح جگمگا ٹمٹمانے میری رسیلی آواز پپیہے کی آواز کا دھوکا دینے لگیگا۔ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہادونگی جس سے راستوں میں کیچڑ ہو جائیگا۔ میری ناک کا بلاق قوس قزح بن جائیگا۔

اے بہار دیکھ میں تجھے ابھی برسات کئے دیتی ہوں اور اپنے بالم (خاوند) کو پردیس جانے سے روکتی ہوں۔
(مصنفہ دیو کوتا کودمی حصہ اول صفحہ ۳۷۸ مطبوعہ سمت ۱۹۸۰)

نوٹ: اس شعر میں خوبی یہ ہے۔ کہ برسات کی علامات بادل وغیرہ کو اپنے جسم کے کپڑوں اور زیوروں سے پیدا کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں موسم برسات کا ذکر ہے۔ مگر ان میں اسی طرح استعارات استعمال کئے ہیں۔ گھنے بادلوں سے چھپا ہوا آسمان اس شور سے گرج رہا ہے کہ اپنی معشوقہ کے فراق میں دکھانا ہو کبھی ڈرنے لگتا۔

(ورنہ بادلوں کی گرج سے مسرور ہوتا ہے) بجلی کی چمک بادلوں میں دیر تک نہیں رہنے پاتی۔ جیسے کہ بُرے آدمی کی محبت دیرپا نہیں ہوتی۔ بادل برس رہے ہیں۔ اور زمین کے نزدیک ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے کہ عقلمند آدمی علم پا کر اخلاق سے جھک جاتا ہے۔ مینہ کی بوندوں کی ضربیں کو پہاڑ اس طرح سہہ رہے ہیں۔ جیسے بھلے لوگ بُرے لوگوں کے طعن یا کھردرے الفاظ برداشت کر لیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں تو پانی سے پُر ہو کر یوں اترانی جاتی ہیں۔ جیسے ایک اوچھا آدمی بہت سی دولت ملنے پر اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ جو تھوڑا سا صاف پانی زمین پر گڑھوں میں بھر گیا۔ وہ میلا ہو گیا۔ اس طرح جیسے کہ پاک روح گویا یعنی لاعلمی یا دنیاوی خیالات لپیٹ کر گھیر لیتے ہیں۔ لیکن جو تھوڑا تھوڑا پانی تالاب کی شکل میں بھر گیا ہے۔ وہ ایسا معلوم دیتا ہے۔ گویا اچھے اخلاقوں نے کسی نیک آدمی کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ ندیوں کا پانی سمندر میں مل کر ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے۔ (یعنی کبھی نہیں سوکھتا) جیسے روح اپنے خالق سے مل کر نجات حاصل کر لیتی اور پھر موت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ موسم برسات میں ہری گھاس اُگ کر راستوں کو اس طرح ڈھانپ دیتی ہے۔ جیسے بے شمار مذاہب سچے مذہب (یعنی راستہ) کو چھپا دیتے ہیں۔

رام چرت مانس عرف رامائن مصنفہ تلسی داس کشکندھا کانڈ

حُسنِ خلق

بحُسنِ خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر
بہ بند و دام نگیرند مُرغِ دانا را

"میں اپنی حسین پنکھڑیاں سمیٹ لونگا۔ یہ پاکیزہ منظر آفتاب اور شبنم کا یہ بوسۂ محبت اور یہ شادابی صرف میرے لئے ہے۔ میں انہیں محفوظ رکھونگا" گلاب کے ایک خود پرست غنچے نے کہا۔ "انہیں ایک آبرو کی نذر کر دینا جو اِن کی قدر و قیمت نہ جانتا ہو۔ ایک تباہ کُن اصراف ہے"۔ لیکن آہ۔ جب اس نے انہیں محفوظ رکھنا چاہا۔ اور اپنی لطافتوں کو دوسروں پر نثار نہ کیا۔ وہ غائب ہو گئی پھول مرجھایا اور خاک میں مل گیا۔

"میں اپنے تئیں نثار کر دوں گا" ایک فیاض گلاب نے کہا "میرا حسن و جمال اور میری مہک ایک راہرو کے لئے ہے"۔ اور دیکھو۔ وہ اس لطافت اس پاکیزگی اور اس منظر کی آغوش میں کھلا جس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ اُس کے پاس ذرا سی مہک تھی۔ لیکن اس نے اُسے بھی مٹا دیا۔ یکایک وہ اِن لطیف نکہتوں سے لبریز ہو گیا۔ جو آفتاب کی زندگی بخش شعاعوں۔ ہوا کی نمی۔ اور زمین کی کیمیاوی قوتوں سے پیدا ہوئیں۔ اور وہ حیران رہ گیا۔

نیکی کرنا۔ کسی نہ کسی کی ہر روز مدد کرنا۔ اخبار والے۔ ہوٹل یا ریسٹورنٹ کے خادم۔ موٹر ڈرائیور۔ حجام سے خوش خُلقی سے پیش آنا۔ گھر پر خادم سے چند حوصلہ افزا الفاظ۔ کسی غریب اور مصیبت زدہ مرد یا عورت سے مکان یا باغ کی روش پر چند گفتگو اور محبت آمیز کلمات کہنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں۔ جو زندگی کو پاکیزہ اور بلند اور سیرت کو گلاب کی طرح خوشنما اور معطر بنا دیتی ہیں۔ یہ طریقہ ہے صرف کرنے کا جس سے ہمیں کئی گنا ہو کر واپس ملتا ہے۔

جہاں کہیں ہم جائیں۔ ہمیں اس طور پر بخشش کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ ہر جگہ ہمیں کوئی مل جاتا ہے۔ جس کو چند حوصلہ افزا کلمات کی ضرورت ہو۔ جس کا دل بھاری بوجھ سے پاش پاش ہو رہا ہو۔ اور جو دستگیری کا محتاج ہو۔ کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ مہربانی کے ایک خفیف ترین عمل کے بیج کا ثمرہ کس قدر شاندار ہے۔ کس قدر دل ہیں جو ایک ناواقف کی سادہ سی مسکراہٹ سے شگفتہ ہو چکے ہیں۔ کس قدر دل شکستہ ارواح تھیں۔ کہ ہمدردی کی ایک نظر۔ آرزو اعانت کی ایک نگاہ اور گرم جوش مصافحے سے دوبارہ امید و عزم سے ہمکنار ہو گئیں۔ ایک محبت آمیز خط اور چند تسلی بخش الفاظ نے بے شمار اشخاص کی زندگی میں جو کہ نا امیدی اور ہلاکت کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان اشیاء کے بیش قیمت میں شائستہ بھی ہیں۔ جو زر و مال سے حاصل کی جاتی ہیں اور ہر ایک انہیں عطا

کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

وہ ننھی لڑکی جس نے اپنے سب پیسے کا غذوں اور ڈاک کے ٹکٹوں پر خرچ کر دیئے اور عید کے موقع پر اپنی دادی کو لکھا "میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ دادی اماں میں آپ سے محبت کرتی ہوں" ہمیں ایک عظیم الشان سبق سکھاتی ہے۔

"دیدو! دیدو!! جو کچھ تمہارے پاس ہے دیدو!!! لیکن اپنے عطایا کے ساتھ اپنے تئیں بھی دیدو۔ دنیا صرف محبت کی بھوکی ہے۔ پھول برساتے چلے جاؤ۔ پھر اس راہ سے تمہارا گذر نہ ہوگا"

عادتاً تمہارے چہرے پر کن اخلاق کی جھلک ہے؟ کیا ترش روئی سرد مہری اور بدمزاجی کی؟ کیا یہ تحمل فرومائیگی اور سختی ہے۔ جو تمہارے بشرے سے مترشح ہے؟ کیا تمہارے چہرے سے کتے کی سی خونخواری گرسنگی، اور حرص و آز ٹپکتا ہے؟ جو پیدا ہوتا ہے۔ دل کی خباثت سے جب تم اپنے احباب اور زیردستوں کے پاس جاتے ہو۔ تو کیا تمہارا چہرہ ناکامی اور ناامیدی سے جھکا ہوتا ہے۔ یا وہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ اس پر ابھی ایک تاریک طوفان آنے والا ہے؟ یا اس پر آفتاب کا نور مسکراتا ہے۔ جو امید اور نیکی کے جذبات کو منور کر دیتا ہے۔ کیا لوگ تمہیں دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ اور پہلے سے زیادہ مسرور نظر آتے ہیں۔ یا وہ تم سے بھاگتے ہیں۔ اور ان پر افسردگی چھا جاتی ہے؟

دنیا میں تمہارے اور تمہارے وابستگان کے تعلقات کا انحصار تمہارے چہرے کے اثرات پر ہے۔

میں نے ایک آدمی کا کام کیا جس کے چہرے پر عادتاً تبسم کھلتا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک بے پایاں دولت کے برابر تھا۔ اس کے دل میں کس قدر ہی غصہ ہو۔ اس کے چہرے کو دیکھکر کوئی نہ بتا سکیگا شاید آتش فشاں پہاڑ پھٹنے کو ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر وہی سکون و اطمینان۔ مسرت اور مسکراہٹ ہے۔ اس کے لبوں کا ایک کنارا ہمیشہ اس طرح اوپر کو خم کھائے رہتا کہ گویا اس نے کوئی بڑی مسعود و مبارک خبر سنی ہے اور اسے سنانے کے لئے بیتاب ہے۔

بے شمار لوگ اس کی کامیابی پر متعجب تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نصرت اور کامرانی اس کی قابلیت سے کیا زیادہ ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں۔ کہ یہ فائز المرامی بہت حد تک اس ناقابل تقلید مسکراہٹ کی مرہون تھی۔ جو اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوتی تھی۔ اس نے بہت سے لوگوں کو اس کا دوست بنا دیا۔ اور بے شمار لوگ اس کے خریدار بن گئے۔

مسکراہٹ مسلسل اور عادتاً ایک طاقت ہے محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ دوستوں کے دلوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ اور بہت سے خریدار بنا دیتی ہے۔ بلکہ اس کا اثر زندگی پر بھی لامحدود ہے۔ اندرونی کشمکش اور تفکرات کے باوجود خوش اور شگفتہ رہنے کی کوشش کرنا۔ متانت اور بردباری کو ہاتھ سے نہ دینا زندگی کی ہیئت تبدیل کرنے میں بڑا اثر رکھتا ہے۔

میں ایک خاتون کو جانتا ہوں جس نے اپنی عادت بنا لی ہے۔ کہ جہاں بھی جاتے افسردگی کی تاریکی کو آفتاب کی شعاعوں سے منتشر کر دے۔ وہ کہا کرتی ہے۔ "ایک سادہ سی مسکراہٹ پر کچھ صرف نہیں ہوتا" لیکن جو [illegible] اس سے ملاقات کرتا ہے۔ یا جس کو اسے ممنون کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسے اپنے حال پر ایک خاص نوازش خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ اس کا صلہ لازمی طور پر دلکش اور زندگی بخش مسکراہٹ ہے۔

اس شخص کی زندگی کس قدر مطمئن اور آسودہ ہے۔ جو مایوسی اور ناامیدی کی بجائے زندگی اور امید بخشتا ہے۔ ناکامی کی ظلمت کو کامرانی کے نور سے دور کرتا ہے۔ کوئی شخص جو اس کے قریب سے گذر جاتا ہے۔ خواہ وہ اخبار والا ہو یا جوتوں کو پالش کرنے والا۔ موٹر ڈرائیور دفتر کا چپڑاسی یا ریسٹورنٹ کا بوائے۔ کوئی ہو۔ نور کی جھلک سے جگمگا اٹھتا ہے۔

اگر تم اخبار خریدتے۔ جوتے کو پالش کراتے یا گاڑی والے کا کرایہ دیتے وقت اجرت کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ بھی دے دیا کرو۔ تو تمہارا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ لیکن وہ لوگ جان جائینگے۔ کہ تم پہلو میں ایک ہمدرد دل اور اس میں مہربانی کے جذبات رکھتے ہو۔

یہ معمولی عادت ہمارے لئے ان چیزوں سے کہیں زیادہ اہم ہے جنہیں لوگوں نے بڑا بنا رکھا ہے۔ یہ زندگی میں معمولی سا تغیر ہے۔ اسے فیاضانہ طور پر دو۔ جس قدر فراخ دلی سے تم دوگے۔ اتنے ہی تمہارے خزانے بھرپور ہوتے جائینگے۔

"سویٹ ماردن" ڈاکٹر احمد اللہ خان

رائے بہادر
پنڈت شو نرائن صاحب شمیم

The Victoria Press,
Ry., Road, Lahore.

سحرِ موسیقی

خوش گُلو ہے کس قدر اے مطربِ نوخیز تو! — کس ادائے محویت سے ہے ترنّم ریز تو!

خاطرِ محزوں ہے تجھ سے جرعہ یابِ محویت — اے سراپا بے خودِ کیفِ شرابِ محویت

قاطعِ رنج و الم بے خود سرائی ہے تری — دافعِ تلخیٔ غم شیریں نوائی ہے تری

شانِ اعجازِ مسیحائی تری تانوں میں ہے — اضطرابِ زیست برپا مُردہ ارمانوں میں ہے

تیری تانیں رونقِ بازارِ آہنگِ نشاط — تیرے نغمے باعثِ ارزانیٔ رنگِ نشاط

حاصلِ آہنگ ہی تیری صدائے دل نشیں — حالِ فرحت ہیں ترے نغمہ ہائے دل نشیں

جس سے دل تسخیر ہوں وہ نغمہ خوانی ہے تری — ہفت اقلیمِ اثر پر حکمرانی ہے تری

تیرے گرد و پیش کا منظر ہے کتنا دل فریب — جس سے کھاتی ہے نگاہِ زاہدِ کامل فریب

جلوہ گر حسنِ بہارِ جاوداں ہے جابجا — جانفزائی کارواں در کارواں ہے جابجا

جابجا سبزے پہ ہیں گلہائے تر چاروں طرف — جنتِ نظّارہ ہے پیشِ نظر چاروں طرف

لیکن اے بیگانۂ فکرِ مآلِ زندگی! — بے نیازِ رنج و اندوہ و ملالِ زندگی!

کیفیت اِن منظروں میں تیری تانوں کی نہیں — دلکشی اِن میں ترے دلکش ترانوں کی نہیں

محو ہو کر گا رہا ہے تو عجب انداز سے
کیفِ موسیقی برستا ہے تری آواز سے

گاتے گاتے وجد میں جس وقت آجاتا ہے تو
کائناتِ شش جہت کو وجد میں لاتا ہے تو

ہو رہی ہے وجد سے حالت عجب اشجار کی
وجد میں آئی ہوئی ہیں چوٹیاں کہسار کی

کوہ و صحرا پر ترے نغموں سے طاری ہے سکوں
صورتِ چشمہ تری بربط سے جاری ہے سکوں

ہو رہی ہے بارشِ تاثیر نغموں سے ترے
گونجتی ہے وادیٔ کشمیر نغموں سے ترے

چرخِ ازرق آئینہ دارِ طلسمِ نغمہ ہے
ہر بُنِ کوہی گرفتارِ طلسمِ نغمہ ہے

اور اک دوشیزہ یعنی غنچۂ باغِ شباب
دامنِ معصومیت ہے جس کا بے داغ شباب

عارضِ گلگوں سے پیدا حیرتِ طفلانہ ہے
ہر ادا مستانہ ہر انداز معصومانہ ہے

ایک شانِ بے خودی سے فرش پر لیٹی ہوئی
ہاتھ اک زیرِ زنخداں۔ تاکمر لیٹی ہوئی

اس ادا سے وہ یکے از سامعینِ نغمہ ہے
آنکھ ہے وقفِ تحیر۔ دل رہینِ نغمہ ہے

کر رہا ہے رقص اُس کا دل تری آواز پر
سحرِ نغمہ ہے عیاں حسن فسوں پرداز پر

سر بسر محوِ صدائے دل پذیرِ نغمہ ہے
بے حس و حرکت ہے یوں۔ گویا اسیرِ نغمہ ہے

نغمے اِس مشتاقِ نغمہ کو سنائے جا یونہی
گاتے جا اے مطربِ نوخیز گائے جا یونہی

میلارام وفاؔ

فاؤسٹ

فاؤسٹ جرمن شاعر گوئٹے کا شاہکار ہے۔ اور اس کا شمار دنیا کی بہترین ادبیات میں کیا جاتا ہے۔ اس میں قلب انسانی کے اُن عمیق جذبات کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ جن کی تابناکی اور ہنگامہ آفرینی نے انسان کو مسجود ملائک بنا دیا ہے۔ حکیم فوسٹ کی اندرونی کشمکش جو ہملٹ کے دل کی خوفناک جنگ کی مانند ہے۔ جنسی اور اخلاقی مبادیات کا مجادلہ اور اس کے تاثرات نہایت بے پناہ طور پر نمایاں ہیں۔ یہ گوئٹے کی تمام عمر کی جد و جہد اور جانفشانی کا ثمرہ ہے۔ کیونکہ اس کی تکمیل کے خیال نے شاعر کی توجہ کو آغاز باب میں ہی اپنی طرف منجذب کر لیا تھا۔ پہلا حصہ مختلف اقساط میں شائع ہوا اور دنیا نے اس کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ چنانچہ ہائنے نے لکھا ہے "اس کے بعض مقامات نہایت دلکش ہیں۔ لیکن اکثر حصے ایسے بھی ہیں جن کو صرف وہی شخص تصنیف کر سکتا ہے۔ جو اپنے سوا باقی تمام دنیا کو احمق سمجھتا ہو۔ پہلا حصہ ۱۸۰۰ میں مکمل ہوا۔ اور دو سال بعد شائع کر دیا گیا۔ لیکن دونوں حصوں کی تکمیل شروع کرنے کے ساٹھ سال بعد ۱۸۳۱ میں ہوئی۔

فاوسٹ اپنے مطالعے میں

اراکین تمثیل

(کریکٹرز)

فاوسٹ — مرتھا — شیطان — والنٹین مارگریٹ کا بھائی
مارگریٹ — فرشتے — ارواح — چڑیلیں۔

ایکٹ پہلا

رات۔ فوسٹ مضطرب اور بے چین اپنے میز پر بیٹھا ہے۔

فاوسٹ۔ آہ۔ زندگی قانون علم الادویات اور فلسفہ و حکمت کے اکتساب میں گذر گئی۔ کس قدر جد و جہد اور جانفشانی سے میں نے انہیں حاصل کیا۔ اور لے علم الٰہیات وہ کیا اہتمام اور ذوق و شوق تھا جس سے میں نے تیرا مطالعہ کیا۔ لیکن آج میرا دل حسرت اور ناکامی کا کاشانہ بنا ہوا ہے۔ عرفان کی شعاعوں نے اس کی ظلمت کو منور نہیں کیا۔ جہل کی وہ تاریکی آج بھی میرے گرد حلقہ کئے ہوئے ہے جس سے گھبرا کر میں نے اکتساب علم کی ابتدا کی تھی۔ زندگی کو گذرنا تھا۔ گذر گئی لیکن آہ! ایک ذلیل کتے کی مانند جو محبوس ہو تنازہی خانہ میں۔ مجھ میں کچھ فرق بھی رونما نہیں ہے۔ بس اب میں "سحر سازی" کو بروئے کار لاتا ہوں۔ ارواح کو طلب کرتا ہوں۔ شاید ان کی دستگیری سے قوانین فطرت کی کلید حاصل کر سکوں۔ اور وہ مجھے کائنات کا راز بتا دیں۔
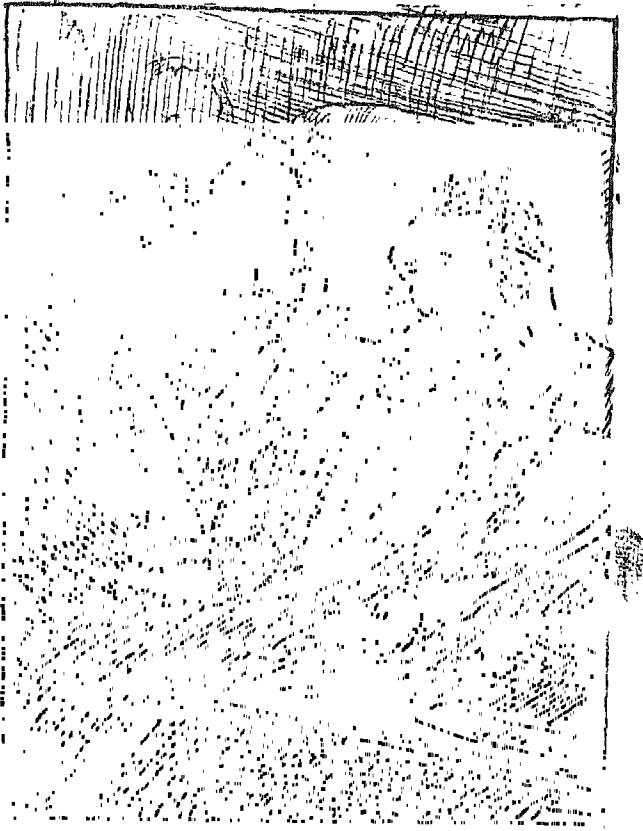
کتاب سحر کھول کر اس کے اوراق بے صبری سے الٹتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نگاہ "روح الارض" کے نقش پر پڑتی ہے۔ اور وہ اسے پر اسرار انداز میں پڑھتا ہے۔ "روح" ایک تابناک شعلے کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ فاوسٹ جھجک کر پیچھے ہٹتا ہے۔ "روح" اُسے حقارت آمیز لہجہ میں مخاطب کرتی ہے اور ان الفاظ کے ساتھ غائب ہو

جاتی ہے۔

روح۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری مانند نہیں ہے۔

فاوسٹ۔ تیری مانند نہیں! کس کی مانند پھر؟ آہ۔ میں یکہ الوہیت تیرے سامنے حقیر ہوں؟ میں جو خدا کی صورت پر ہوں جس کی نگاہیں حقیقت کے درخشندہ اور ابدی آفتاب کو بے نقاب نظارہ کر چکی ہیں۔ اور جو ایک وقت اس جسد خاک سے آزاد زندگی بخش شعاع فردوس میں مستغرق تھا۔ کس قدر ذلیل کن زجر و توبیخ جواب ہے۔ میرے شعلہ نفا خر کا یہ برق صاعقہ کے سے ایک لفظ نے مجھے مجروح کر کے خاک پر گرا دیا — لیکن یہ کیا ہے۔ وہ؟ — اس کونے میں وہ شیشہ کیوں میری نگاہوں کو ایک کہربائی کشش کے ساتھ جذب کر رہا ہے۔ آ۔ اے بادہ گلرنگ کی لاجواب مینا۔ میں تجھے بیحد عزت و احترام کے ساتھ لیتا ہوں۔ اور تیرے بیکیف جرعوں سے سرشار ہو کر انسانی عقل و کمال کی داد دیتا ہوں — یہ امرت ہے جو روح کو مخمور کر دیتا ہے۔

وہ جام اٹھا کر پینا چاہتا ہے کہ گھنٹوں کی آواز اسے چونکا دیتی ہے۔ اور وہ رک جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے۔ کہیں دور کلیسا میں مذہبی گیت گائے جا رہے ہیں

فاوسٹ۔ اے دلکش اور شیریں نغمو! اور اے آسمانی ترانو! تم کیا تلاش کرتے ہو؟ یہاں ایک فانی مخلوق کی کراہٹ اور آہ و زاری کے درمیان یہ گیت بچپن میں طفلانہ لہو و لعب کے درمیان آغاز بہار میں خوشیاں منانے کے وقت گایا جاتا تھا۔ گذرے ہوئے ایام کی یاد نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ اور بچپن کے خیالات ایک پختہ سال انسان پر پھر حکومت کر رہے ہیں۔ آہ۔ گائے جا۔ یہ دلکش آسمانی نغمے گائے جا۔ آنسو امنڈ آتے ہیں۔ اور زمین اپنے مفرور بچے کو واپس بلا رہی ہے۔

فرشتوں کا گیت۔ مسیح جی اٹھا۔

موت کے جانکاہ قید خانے میں سے

اپنی زنجیریں توڑ دے۔

اور اس کے پیچھے ہو لے۔

اُس کے نام سے زندہ رہ۔

اُس کے نام پر محبت کر۔

اُس کے نام پر خیرات دے۔

تو اپنے آقا سے ملے گا۔

ایکٹ دوسرا

سین پہلا۔ فاوسٹ، شہر کے دروازوں کے گرد گھومنے کے بعد اپنے مطالعہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گھونگھر والے بالوں کا ایک چھوٹا کتا ہے۔ جو اس کے عقب میں گھر آ گیا ہے، اور جس کی اجنبی حرکات نے فاوسٹ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گھر آ کر اس کی حرکات اور سکنات اور بھی اجنبیانہ اور غیر مانوس ہو جاتی ہیں۔ فاوسٹ حیران ہوتا ہے۔ کہ یہ کیوں اس کے ساتھ آ گیا ہے۔ اور اس سے کلام کرتا ہے۔ کتا خوف زدہ ہو کر آتشدان کے پیچھے دبک جاتا ہے۔ یکایک بادل نمودار ہوتے ہیں۔ جب وہ فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ آتشدان کی طرف سے شیطان ایک خانہ بدوش عالم کے لباس میں ملبوس ظاہر ہوتا ہے۔

شیطان۔ یہ کیسا شور ہے؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟ بندہ نقدس مآب کے ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہے۔

فاوسٹ۔ تیرا نام کیا ہے؟

شیطان۔ میں ایک جزو ہوں۔ اس ازلی اور سرمدی تاریکی کا۔ جو چاہتی تو ہمیشہ "بدی" ہے لیکن کرتی ہے "نیکی"۔

فاوسٹ۔ یہ ایک معمہ ہے۔ اس کی تفسیر؟

شیطان۔ میں روح ہوں۔ انکار و استکبار کی!

فاوسٹ۔ تو اپنے تئیں ایک جزو کہتا ہے۔ اور یہاں صورت کل میں نمایاں ہے؟

شیطان۔ میں "جزو" ہوں اس "جزو" کا جو سابق میں "کل" تھا۔ جزو ہوں۔ اس تاریکی کا جس کی اولیں مدا سے ماتم سے نور کی تخلیق ہوئی۔ نور کی متکبر، سرکش اور باغیانہ نور کی۔ جو اب اپنے منبع و مصدر — اس سرمدی تاریکی سے انحراف کر کے اس سے پنجہ زن ہے۔ اور چاہتا ہے۔ کہ اس کے جاہ و مرتبہ کے قدیم حقوق کو غصب کر لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر منظور ہو۔ تو ہم وقت کو مناسب شغل میں صرف کریں۔ میں چاہتا ہوں آپ کو حاضرات کے چند عالمانہ کرشمے دکھاؤں۔ کیوں منظور ہے۔

فاوسٹ۔ مجھے یہ تجویز منظور ہے۔ تو شروع کر سکتا ہے۔ شاید تیری کرشمہ بازیوں اور لعبت گریوں سے روح کو کچھ مسرت حاصل ہو سکے۔

شیطان ارواح کو طلب کرتا ہے وہ نہایت دلکش آوازیں گاتی ہیں۔ یہاں تک کہ فاوسٹ پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سو جاتا ہے — فاوسٹ

بیدار ہوتا ہے۔ اور کمرے کو خالی پاتا ہے۔

سین دوسرا۔ فاوسٹ کا مطالعہ۔ فاوسٹ اور شیطان۔

فاوسٹ:۔ کون ہے جو چاہتا ہے۔ کہ میرے سکون میں مخل ہو کر پھر اسے برہم کر دے۔ آ ۔ اندر۔ آ۔

شیطان۔ میں تجھے ایک مفید مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے درمیان مفاہمت ہو سکے گی۔ تیرے پاس ایک جوالمرد آیا ہے۔ کہ ان ناکارہ تخیلات کو پریشان کر دے جنہوں نے تیرے دماغ میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ میرے الفاظ غور سے سُن۔ انکی اہمیت کا تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ تو دیکھتا ہے۔ کہ میرے پہلو میں ایک شمشیر آبدار آویزاں ہے۔ اگر تو کشاکش ہائے پنہاں سے آزاد ہونا چاہتا ہے تو آ۔ تو بھی آ۔ یہ پس و پیش کیوں ہے؟ تفکرات کو جانے دے۔ اور یہی وضع اختیار کر لے۔ دنیا کو کنارہ عرصہ سے تو تو نے دیکھا ہے۔ لیکن زندگی کے سوز و ساز میں شریک کبھی نہیں ہوا۔ آ اور اس میں کھو جا۔ تاکہ لذت حیات سے بہرہ یاب ہو اور جان لے کہ مقصد حیات کیا ہے۔

فاوسٹ۔ زمانہ گذر چکا ہے۔ کھیل اب میرے لئے باعث مسرت نہیں ہو سکتا لیکن میں اس قدر مسن بھی نہیں ہوں۔ کہ دل ہی بجھ چکا ہو۔ اور اس میں کوئی آرزو ہی نہ ہو۔ اب بھی خواہشات ہیں لیکن دبی ہوئی۔ تمنائیں ہیں پژمردہ۔ اور نخل آرزو ہے خزاں رسیدہ۔ آہ دنیا مجھے کیا دکھا کر اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے؟

وہ "الحذر" پکارتی ہے اور "الحذر" پکار۔ یہی ہے میری ہستی غم واندوہ کا ایک بار ہے۔ موت میری بہترین رفیق ہے۔ اور زندگی عدوئے بدسگال

شیطان۔ بس۔ اس آشفتہ خیالی کا کھیل نہ بن۔ جس نے کرگس کی مانند تیری زندگی کو ایک روگ لگی بنا رکھا ہے۔ میں اپنے تئیں پیش کرتا ہوں۔ کہ زندگی کے پیچ در پیچ راستوں پر تیری راہنمائی کروں۔ اگر تو اس مہم میں شریک ہوتا ہے۔ میں بھی یہاں اس مقام پر ایک مضبوط عہد استوار کرتا ہوں۔ کہ تیرے ہمراہ رہوں گا۔ تیرے ہمراہ رہونگا ایک خادم کی حیثیت سے۔ نیند میری آنکھوں کو نہ جھپکا سکیگی اور تیری رضامندی کے مقابلہ میں تساہل و تکاسل مجھ پر غلبہ نہ پا سکیگی۔ اگر تو اُس دنیا میں جب ہماری ملاقات ہو میری خدمات کا معاوضہ ابھی صورت میں ادا کر دے گا؟

فاوسٹ:۔ کم بخت شیطان! تو انسانی روح کے نقش کیسے لئے کیا دے سکتا ہے؟ اگر تیرا کوئی شعبدہ مجھے عروس مسرت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ میری زندگی خواہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے یہ شرط منظور ہے۔

شیطان۔ تصفیہ ہو گیا ہے! ابھی ایک امر باقی ہے۔ کاغذ یا چمڑے کے پُرزے پر چند سطور تاکہ عہد مضبوط رہے۔ اور اپنے دستخط خون میں ثبت کر دے۔

(فاوسٹ کاغذ پر دستخط کرتا ہے۔)

خون عرق ہے لاجواب عزم و ثبات کا۔

ایکٹ تیسرا

سین پہلا۔ اور باسش کا میخانہ۔ برزگ۔ بے فکروں کا ایک ہنگامہ آفریں مجمع۔ مصروف سرود و غنا اور عرق شراب نوشی۔

فاوسٹ اور شیطان داخل ہوتے ہیں۔

شیطان۔ سب سے پہلے میں تجھے یہاں لایا ہوں بزم عیش و طرب میں تاکہ تو مشاہدہ کرے۔ کہ لوگ کس طرح پریشان کن خیالات اور تفکرات سے آزاد رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

فاوسٹ۔ حضرات! تسلیم عرض کرتا ہوں۔

فاوسٹ اور شیطان بھی شریک رنگ و طرب ہو جاتے ہیں۔ شیطان بار لوگوں سے حجت بازی شروع کرتا ہے۔ اور ان کی درخواست پر گاتا ہے۔ پھر شراب کی شکایت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ میں آپ کو شراب پلاتا ہوں۔ اور ان سے برما لے کر میز کے کنارے پر چند سوراخ کرتا ہے۔

شیطان۔ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق شراب کا ذائقہ پائیگا مجھے کچھ موم دو۔ کہ ڈاٹ تیار کروں (سوراخ بند کر دیتا ہے)

انگور کے خوشے انگورستان میں آویزاں ہوتے ہیں۔ اور سینگ بکرے کے سر پر۔ شراب شیرہ انگور ہے۔ انگور کی بیلیں لکڑی ہی ہوتی ہیں۔ لکڑی کے میز سے بھی شراب ناب ٹپک سکتی ہے۔ اب ڈاٹ اتارو۔ اور شراب پیو۔

سب۔ (ڈاٹ اتار کر شراب پیتے ہیں) آہ۔ اے چشمے پاک! آہ۔ اے مقدس چشمہ سار!

(کثرت سے شراب پیتے اور گاتے ہیں)

شیطان۔ اب دیکھ اس بھیڑ کو۔ کیا یہ خوش نہیں ہے؟

فاوسٹ۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ وقت گذر رہا ہے۔

شیطان۔ تھوڑی دیر اور توقف کر۔ ابھی ہم انسان کی صورت میں ایک وحشی اور خونخوار درندے کا مکمل نظارہ دیکھیں گے۔ ذرا ٹھہر جاؤ

مجمع میں سے ایک شخص بہت بے احتیاطی اور کثرت سے شراب پیتا ہے کچھ شراب فرش پر گر پڑتی ہے۔ اور فوراً شعلہ میں منتقل ہو جاتی ہے۔

"جل گئے۔ جل گئے۔ لوگو دوڑو۔ آگ لگ گئی۔ یہاں شیطان ہے۔ موت! موت اور بھیانک جہنم!" سب چاقو نکال کر شیطان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

شیطان۔ آنکھ نقش باطل دکھا۔ کان آواز فریب سن۔ حواس۔ بدل جاؤ۔ جگہ بھی بدل۔ کبھی یہاں۔ کبھی وہاں۔

وہ ایک دوسرے کا منہ حیرانی سے تکتے ہیں اور بے حس وحرکت کھڑے رہتے ہیں۔ گویا کہ ایک برق صاعقہ تڑپ کر ان پر آ گری ہے۔ پھر وہ انگورستان کے عجیب وغریب نظارے دیکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ناک پکڑ کر چاقو تانتے ہیں۔۔۔ شیطان فاوسٹ کو لے کر غائب ہو جاتا ہے۔

سین دوسرا۔ چڑیلوں کا باورچی خانہ۔ دھوئیں میں بندر، لنگور اور مختلف قسم کے جانور، عجیب وغریب آلات پریشان پڑے ہیں۔ فاوسٹ اور شیطان داخل ہوتے ہیں۔

فاوسٹ۔ میں نہیں جانتا۔ اس لایعنی پریشان حالی اور گڑبڑ کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ میں اپنی جان ان نامعقول مجنونانہ حرکات کی دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دوں؟ کیا ایک بوڑھا پاگل میرے لئے وہ شے مہیا کر سکتا ہے جس کی مجھے ضرورت ہے؟ کیا تو خود شراب کو کشید نہیں کر سکتا؟

شیطان۔ آہ۔ یہ مشغلہ کس قدر دلچسپ ہے! لیکن مجھے کئی ایک پل تیار کرنے ہیں۔ علم وفن کی یہاں ضرورت نہیں۔ بلکہ عزم واستقلال کا کام ہے۔

شیطان بندروں سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور آگ کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے۔ اس اثنا میں فاوسٹ آئینہ کو حیرانی سے تکتا ہے۔ کبھی اس کے پاس جاتا ہے کبھی پھر پیچھے ہٹ آتا ہے۔

فاوسٹ۔ میری آنکھیں کیا نظارہ دیکھتی ہیں۔ کس قدر نورانی اور سحرکار پیکر ہے اس سحرکار آئینے میں جس نے میری نگاہوں کو اسیر جلوہ بنا دیا ہے۔ لیکن جب میں چاہتا ہوں۔ کہ ایک قدم بڑھا کر اس کی عطر آگیں فضا سے مشام روح کو معطر کروں۔ تو وہ خواب کی مانند تحلیل ہو کر نظر سے نہاں ہو جاتی ہے۔ آہ۔ یہ انسانی حسن وجمال کا ایک نمونہ ہے۔ یکتا اور لاجواب! کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا یہ محض ایک فرد ہے صنف نازک کا۔

شیطان۔ میں تجھے پری جمال محبوبہ سے ہمکنار کرا سکتا ہوں کہ شادکامی کے ساغر کو لبالب بھر کر نوش کرے۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جس کے حجلۂ عروسی کی یہ گوہر گراں مایہ زینت ہو۔

فاوسٹ آئینے کے سامنے محو تماشا رہتا ہے۔ آتشدان پر سیال جوش کھاتا ہے۔ یکایک ایک شعلہ التہاب بلند ہوتا ہے۔ اور دہشت ناک شور وغل کے درمیان چڑیل ظاہر ہوتی ہے۔

چڑیل۔ کیوں؟ کیا کام ہے مجھ سے؟

شیطان۔ زندگی بخش شراب کا ایک ساغر جس سے بڑھاپے کے خون میں شباب کی سی گرمی اور زندگی عود کر آئے۔

چڑیل (بہت خاطر سے۔ یہ ہے مینائے شراب کیف بار وخمار انگیز ---- وہ ایک حلقہ کھینچتی ہے۔ اور اس کے اندر کئی ایک عجیب وغریب اشیاء رکھ کر ایک مطول کتاب میں سے "سحر" پڑھتی ہے۔ اور شراب کو جام میں ڈالتی ہے جب فاوسٹ اسے اٹھا کر چاہتا ہے کہ لبوں سے پیوست کرے۔ ایک ہلکا سا شعلہ اٹھتا ہے۔

شیطان۔ پی جا۔ تفکرات سے خالی الذہن ہو کر پی جا۔ یہ تجھ کو تیرے دل میں آتش عشق روشن کر دے گا۔

چڑیل حلقہ مٹا دیتی ہے۔ اور فاوسٹ باہر آتا ہے۔

آ۔ تعجیل کر۔ آ۔ اب توقف نہ کر۔

فاوسٹ۔ آئینہ کی طرف جاتا ہے "ہائے نگاہ، الوداعی نگاہ۔ صرف فرصت یک لمحہ، ---- وہ پیکر حسن، پاکیزہ اور منزہ۔ وہ جمال لاجواب"

شیطان۔ نہیں۔ نہیں۔ میری مدد سے تو نسوانی حسن وجمال کا بہترین نمونہ دیکھے گا۔ (ایک طرف) اس سحرانگیز ساغر کے کیف سے اسے معمولی عورت میں بھی حسن ہزار جان کی جھلک نظر آئے گی۔

سین تیسرا۔ راہ گذر۔ فاوسٹ۔ مارگریٹ گذرتی ہے۔

فاوسٹ۔ اے خوبرو اور حسین خاتون۔ کیا میں تیرے حضور میں اپنے

تبش پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟ کہ کاشانۂ حسن تک تیرے
ہمراہ چلوں۔

مارگریٹ۔ میں خاتون نہیں۔ میں حسین بھی نہیں۔ مجھے کسی رفیق کی
حاجت نہیں۔ کہ گھر تک میرے ہمراہ چلے۔

(چلی جاتی ہے۔)

فاوسٹ۔ بخدا، یہ کیا حسن ہے۔ آج تک میری نگاہ ایسی حسینہ سے آشنا
نہیں ہوئی۔ اس قدر با حیا! اور پاک نفس۔ سادگی لیکن شوخی آمیز

(شیطان آتا ہے۔)

فاوسٹ۔ سنا؟ اس لڑکی کو لانا ہوگا۔

شیطان۔ وہ ابھی کلیسا سے "اعتراف" کے بعد واپس آ رہی ہے۔
اسقف نے اسے گناہ کی آلودگی سے مبرّہ و منزہ کر دیا ہے۔ اب
میں اس پہ قدرت نہیں پا سکتا۔

فاوسٹ۔ آہ۔ ہوش و خرد ایک نگاہِ پرفن کے ساتھ رخصت ہو گئے۔
کیا اب دلِ مجروح کی بخیہ گری نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس کا نازک
اور عنبر آگیں رومال ہی لا دے۔ وہ فضا ہو جس سے وہ گذر آئے
چل اس دلفریب پری کے آشیانہ میں لے چل۔

شیطان۔ ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں گے میں منزلِ یار کا راستہ
جانتا ہوں۔ تجھے وہاں لے چلوں گا۔ تاکہ تو شرابِ روح سے مخمور
ہو جائے۔

فاوسٹ۔ کیا ہم اب نہیں جا سکتے؟

شیطان۔ قطعاً نہیں۔ تجھے رات تک انتظار کرنا ہوگا۔

فاوسٹ۔ جا۔ میری راحتِ جان محبوبہ کے لئے کوئی بیش گراں تحفہ
لا۔

سین چوتھا۔ ایک چھوٹا اور مصفّا حجرہ۔ مارگریٹ کاکل مشکیں کی
مشاطگی میں مصروف ہے۔

مارگریٹ۔ خدا جانے یہ کون خوش خلق شخص تھا۔ جس نے آج میرے
سپاس دینا نہ سے اظہار تمنا کر دیا۔ لیکن چہرے سے تو کوئی بڑا عالی
نسب اور جوانمرد نظر آتا ہے۔

(شیطان اور فاوسٹ آتے ہیں۔)

شیطان۔ آہ۔ آہستہ قدم رکھ۔ آ جا۔

فاوسٹ۔ میرے حال پر رحم کر۔ مجھے تنہا چھوڑ دے۔

شیطان چلا جاتا ہے۔

مرحبا اے دلفریب شفق شام۔ مرحبا۔ تو نے اس قربانگاہ میں
اپنا دھندلا سا نقاب پھیلا دیا۔ اور تو اے دردِ عشق جو عزیز تر ہے
میرے دل کو۔ جو شبنم امید پہ زندہ رہتا ہے۔ وہ شبنم جو نہریں پیاس
بجھانے کے لئے غیر مکتفی ہوتی ہے۔ تو میرے دل پر تسلط جماتے
ہوئے ہے۔ کس قدر پر کیف سکون اور خاموشی فضا میں طاری
ہے۔ آہ۔ کیا ثروت ہے۔ اس عسرت میں؟ اور کیا فردوس مسرت
ہے یہ زندان۔

اپنے تئیں ایک چمڑے کے بازو والی کرسی پر گرا دیتا ہے۔ جو پلنگ کے
قریب رکھی ہے۔ شیطان جواہرات اور زیورات کی ایک صندوقچی
لا کر مارگریٹ کی الماری میں رکھ دیتا ہے۔ اور دونوں رخصت ہوتے ہیں
مارگریٹ ہاتھ میں شمع لے کر دروازہ تک انہیں رخصت کرنے آتی ہے۔
مارگریٹ الماری کھولتی ہے۔ اور جواہرات کی صندوقچی کو وہاں دیکھ کر
حیران رہ جاتی ہے۔

مارگریٹ۔ یہ خوبصورت اور دلفریب صندوقچی یہاں کس طرح آ گئی!
کس قدر حیرانی کی بات ہے! آہ کس قدر بیش قیمت زیورات
ہیں جواہرات سے مرصع گلوبند میرے گلے میں کس قدر خوبصورت
معلوم ہوں گے۔ اور یہ زنجیر طلائی!

(زیورات پہن کر قدِ آدم آئینہ میں اپنا عکس دیکھتی ہے کاش یہ بالیاں
میری ہوں۔ یہ طلائی بازوبند میرے ہوتے غریب کا حسن و جمال کس قدر
کا ہے۔ شیدائی مدح و توصیف تو کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نگاہوں سے
رحم کے جذبات ٹپکتے ہیں منزلِ مقصود کی شاہراہ زر ہے۔ زر ہے!
دنیا مال و زر کی دلدادہ ہے۔ کس کام کی زندگی ہے ہم غریبوں کی؟

سین پانچواں۔ ہمسائے کا مکان۔ مارگریٹ مرتھا سے جواہرات
کی اس صندوقچی کا ذکر کرتی ہے۔ جو اسے الماری میں سے ملی
تھی۔ یہ صندوقچی اس کی ماں کی نظر پڑ گئی تھی۔ اور اس نے
جواہرات لے کر کلیسا کی نذر کر دیئے تھے۔ اسی طرح ایک اور
صندوقچی اسی مقام سے اسے پھر ملتی ہے۔ اور مرتھا اسے مشورہ
دیتی ہے۔ کہ اس کو اپنی ماں سے چھپا رکھے۔ شیطان مرتھا
سے ملاقات کرتا ہے اور اس سے بیان کرتا ہے۔ کہ اس کا خاوند
مر گیا ہے۔ اور وہ اس کا آخری پیغام لایا ہے۔ اور وعدہ کرتا ہے

کہ شام کو وہ یہ پیغام اُسے دیگا۔ اور اپنے ہمراہ ایک سپاہی منش جوان کو بھی لائے گا۔ جس کے روبرو اس کے خاوند کی موت ہوئی تھی۔

ایکٹ پانچواں

سین پہلا۔ صحن چمن۔ مارگریٹ فاوسٹ کے بازو پر جھکی ہوئی ہے۔ اور مرتھا شیطان کے ساتھ ہے۔ سب چہل قدمی میں مصروف ہیں۔

مارگریٹ۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ آپ میری محبت میں بہت ایثار کر رہے ہیں۔

فاوسٹ۔ تیری اک نگاہِ الفت اور لفظ محبت کے مقابلہ میں سب علوم ہیچ ہیں۔ میں تو اس مسرت کو چھوڑ کر انہیں قطعاً نہ خریدوں۔

مرتھا۔ کیوں۔ صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اب بھی آپ جگہ بجگہ پھرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ خیال تو ذرا فرمائیں۔ کس قدر بھیانک اور بیکار موت ہے۔ مجرّد آدمی کی؟

شیطان۔ میں اس بدبختی سے خود گریزاں ہوں۔

مرتھا۔ تو خیال رکھئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وقت گذر جائے۔

فاوسٹ۔ تو تنہا رہتی ہے؟

مارگریٹ۔ ہاں۔ گھر کا سامان کچھ زیادہ نہیں۔ خادمہ ہم رکھ نہیں سکتے۔ سب کام کاج مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں ہی جھاڑو دیتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ میرا بھائی فوج میں ملازم ہے۔ میری چھوٹی بہن فوت ہو چکی ہے۔ میری اماں بھی اس وقت بیمار تھی۔ اسے میں نے ہی پرورش کیا تھا۔ میں نے ہی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گھٹتے دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ میری نظر سے چھپ گئی۔

فاوسٹ۔ آہ۔ وہ حور تھی جنت کی۔

شیطان۔ مثل مشہور ہے۔ باوفا بیوی اور رہنے کے لئے آرام کی جگہ دنیا کے زر و مال سے بہتر ہیں۔

مرتھا۔ لیکن میں پوچھتی ہوں۔ کبھی آپ کے دل میں بھی ان کی آرزو ہوئی ہے؟

شیطان۔ جب کبھی یہ تمنا میرے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ فیاض طبیعتیں اسے پورا کر دیتی ہیں۔

مرتھا۔ افسوس آپ میرا مفہوم نہیں سمجھے۔

شیطان۔ مجھے بھی افسوس ہے۔ لیکن آپ کی کرم فرمائی کا بھی معترف ہوں۔

(گذر جاتے ہیں۔)

فاوسٹ۔ اے حورِ محبت جب میں باغ میں داخل ہوا۔ کیا تونے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔

مارگریٹ۔ آپ نے دیکھا نہیں! میری نگاہیں کس طرح شرم سے جھک گئی تھیں؟

فاوسٹ۔ اور کیا تو میری اس جرأت آمیز گستاخی کو معاف کرتی ہے۔ جس کا ارتکاب میں نے تیرے سر بازار تخاطب سے کیا تھا؟

مارگریٹ۔ اس خیال سے میں منفعل ہو جاتی ہوں۔ میں آپ کی آواز سن کر بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ غصہ و غضب مجھ پر طاری ہو گیا۔ لیکن میرے دل کی ایک آواز تھی۔ جو آپ کے حق میں بلند ہو رہی تھی۔

فاوسٹ۔ میری مہ لقا محبوبہ آ۔

مارگریٹ۔ چھوڑ دو۔ مجھے ("نور جشنی" کا ایک پھول توڑ کر اس کی پنکھڑیاں نوچتی ہے۔) اسے مجھ سے محبت ہے۔ ہاں۔ اسے محبت ہے مجھ سے۔ نہیں! (وہ پتیاں بکھیرتی ہے اور دبی آواز سے کہے جاتی ہے) ہاں۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔

فاوسٹ۔ جان من۔ یہ خدا کی آواز ہے۔ پہچانتی ہے۔ اس کو تجھ سے اسے محبت ہے۔ ہاں محبت ہے۔ تجھ سے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

مارگریٹ۔ آہ۔ میرے جسم میں ایک ارتعاش ہے (ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہے۔ فاوسٹ ایک لمحہ خیالات میں محو کھڑا رہتا ہے۔ اور پھر اُس کے تعاقب میں جاتا ہے۔)

مرتھا۔ (آتے ہوئے) رات گذری جا رہی ہے۔

شیطان۔ فراق کی گھڑی آ پہنچی۔ اب ہمیں جدا ہونا ہے۔

مرتھا۔ میں آپ کو کہتی یہیں رہئے۔ لیکن رسوائی کا خوف ہے۔ ہمارے نوخیز رفیق کہاں ہیں؟

شیطان۔ روش کے کنارے بہار کی خوش رنگ اور پُرمسرت تیتلیوں کی مانند پھڑپھڑاتے پھر رہے ہیں۔

مرتھا۔ وہ دل و جان اُس کے حوالے کر چکا ہے۔

شیطان۔ اور وہ بھی کمندِ الفت میں اسیر ہو چکی ہے۔

سین دوسرا۔ آغوشِ چمن میں گرمائی مکان۔ مارگریٹ بھاگ کر دروازے کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ اور لب ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دروازہ میں سے جھانکتی ہے۔

مارگریٹ۔ وہ آ رہا ہے۔

فاوسٹ۔ آہ۔ اے حسن پر فریب! میں تجھے اپنے دل کا اسیر کر کے چھوڑوں گا۔

مارگریٹ۔ اے میرے محبوب! میرا دل تیری محبت کے نشہ سے سرشار ہے۔

شیطان دروازہ پر دستک دیتا ہے۔

فاوسٹ۔ (زور سے پاؤں زمین پر مار کر) کون ہے؟

شیطان۔ دوست!

فاوسٹ۔ وحشی! درندہ!

شیطان۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے۔

فاوسٹ۔ کیا مجھے ضرور جانا ہے؟ الوداع!

مرتھا۔ رخصت!

مارگریٹ۔ رخصت با امید وصال (چلے جاتے ہیں)

"اے خدا وہ لاجواب ہے۔ میں اس کے سامنے شرم سے خاموش کھڑی رہی۔ اور اس کے ہر سوال کے جواب میں ہاں کہا۔ (جاتی ہے)

سین تیسرا۔ مارگریٹ کا حجرہ۔ مارگریٹ چرخہ کات رہی ہے۔

مارگریٹ۔ آہ۔ میرا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ میرا دل زخمی ہے۔ چین اب مجھے نصیب نہیں ہو سکتا۔ سانس میرے سینہ میں گرتا اور ابھرتا ہے۔ میں اس کے انتظار میں کھڑی رہتی ہوں۔ میں اُسے اپنے دل سے لگا لوں۔ اور کبھی جدا نہ کروں۔

سین چوتھا۔ مارگریٹ اور اس کی سہیلی۔ لزبیتھ۔ کوئیں پر پانی کی چھاگل لیے ہوئے ایک اور سہیلی باربرا کی داستانِ عشق پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ لزبیتھ باربرا کو قابلِ ملامت قرار دیتی ہے۔ اور مارگریٹ کو مستحقِ تحسین۔

مارگریٹ۔ (گھر لوٹتے ہوئے) میں بھلا کسی بھولی بھالی لڑکی کو اس کی لغزش پر کیوں ملامت کروں جب میں خود دربارۂ عشق کی مجرمہ ہوں میں نشۂ الفت سے مخمور ہوں۔ اور قریب ہے کہ گناہ کا ارتکاب کروں آہ۔ کس قدر ناقابلِ برداشت لذت ہے گناہ کی!

سین پانچواں۔ دیوار میں ایک محراب۔ غمگین اور مقدس مریم عذرا کا بت۔ مارگریٹ دو زانو ہو کر پھول چڑھاتی ہے۔

مارگریٹ۔ مجھ پر نظر کر۔ اے اُمِّ حزیں۔ تیرا دل پارہ پارہ ہے۔ اور تیری نگاہیں اپنے مظلوم لختِ جگر پر جمی ہوئی ہیں۔ تو آہیں بھرتی ہے۔ اپنے لیے اور اس کے لیے اور انہیں مقدس باپ کے پاس روانہ کرتی ہے۔ ایک بے پناہ الم میرے دل کا رہین ہے۔ میں راتوں کو جاگتی ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اور میں بلک بلک کر روتی ہوں ––– میرا درد بھرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ میں اپنے پھولوں کو جن کے گملے دریچوں میں رکھے ہیں آنسوؤں سے سینچتی ہوں۔ جب میں صبح کے وقت انہیں تیرے حضور میں پیش کرنے کے لیے توڑتی ہوں۔ سورج میرے حجرے میں جیسے نور بہا دیتا ہے۔ افسوس میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے ہیں۔ اور میں محوِ گریہ ہو جاتی ہوں۔ آہ۔ میری فریاد سُن۔ اے اُمِّ حزیں۔

سین چھٹا۔ مارگریٹ کے گھر کا دروازہ۔

مارگریٹ کا بھائی ویلنٹین سپاہی داخل ہوتا ہے۔

ویلنٹین۔ اب مجھ پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ ہر ایک بد تہذیب اور ناشائستہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ میں نے ان کی خوب مرمت کی ہے۔ لیکن ان کو چھوٹا نہیں کر سکتا۔ (ٹھٹک کر) یہ کیا نظارہ ہے۔ یہ کون نابکار دبکا ہوا آ رہا ہے؟ اگر یہ وہی شخص ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ تو اب وہ یہاں سے سلامت نہ جائے گا۔

(چھپ جاتا ہے۔)

فاوسٹ اور شیطان باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں۔ شیطان بربط بجاتا ہے۔ ویلنٹین روبرو آ کر بربط کو تلوار سے دوپارہ کر دیتا ہے۔ فاوسٹ اور ویلنٹین میں جنگ ہوتی ہے۔ شیطان تلوار کھینچ دیتا ہے۔ اور ویلنٹین ایک کراہٹ کے ساتھ گرتا ہے۔ شور و غل سے ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جس میں مرتھا اور مارگریٹ بھی ہوتی ہیں۔ لوگ لبِ مرگ سپاہی کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بہن کو ملامت کرتے ہیں۔

مارگریٹ۔ آہ بھائی۔ مجھ پر جہنم کا عذاب نازل ہو گیا۔

ویلنٹین۔ اب یہ آنسو بے سود ہیں۔ تو نے اپنی عزت کھو کر میرے دل میں ایک گہرا زخم لگا دیا ہے۔ میں مردانہ وار مرتا ہوں۔ تاکہ ایک بہادر

اور وفادار سپاہی کی طرح خدا سے ملاقات کروں۔

سین ساتواں۔ کلیسا نماز ہو رہی ہے۔ ارگن باجا بج رہا ہے اور مغنی گا رہے ہیں۔ مارگریٹ لوگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ اور ایک خبیث روح اسکے پیچھے کھڑی ہے۔

خبیث روح۔ مارگریٹ وہ ایام تجھے یاد ہیں جب تو معصومانہ انداز میں کلیسا میں پھول چڑھاتی تھی۔ اور پرانی کتاب کھول کر زیر لب دعا مانگتی تھی۔

مارگریٹ۔ افسوس۔ کاش میں ان خیالات کو فراموش کر سکتی۔

خبیث روح۔ تجھ پر خوف طاری ہے۔ قرنا پھونکی جا رہی ہے اور درد الفت نے تیرے دل کی خاک سے پھر اس کی تخلیق کی ہے۔

اور اس میں پھر ارتعاش زندگی پیدا ہو گیا ہے۔

گویوں کے گانے کی آواز۔

مارگریٹ۔ دم گھٹ رہا ہے۔ بھاری ستونوں نے مجھے مقید کر لیا۔ گنبددار محرابیں مجھے پامال کرنا چاہتی ہیں! ہوا بند ہے!

گویوں کے گانے کی آواز۔

خبیث روح۔ عابدوں نے تجھ سے رخ پھیر لیا ہے۔ معصوم اور پاکیزہ ہستیاں تیری طرف ہاتھ بڑھانے سے کانپتی ہیں۔ ——

افسوس ہے تیری زندگی پر!

مارگریٹ غش کھا کر گر پڑتی ہے۔

پانچواں ایکٹ

مطلع ابر آلود۔ کھیتوں کے درمیان فاوسٹ اور شیطان

فاوسٹ۔ آہ آسمان مصیبت ٹوٹ پڑا۔ چرخ کہن نے بجلی گرا دی آزادی۔ وسیع اور فراخ زمین پر ایک دشت نورد کی سی آزادی کے بعد اسیری! آہ اے بدنصیب حسینہ۔ اور تو اے غدار اور دغاباز "روح" تو سبب ہے اس سب اوفتاد کا۔ وہ نازک بدن اس ناگفتنی مصیبت میں پڑی ہے۔ اس لئے کہ یاس و ناکامی میں اس کی روح پرواز کر جائے۔

شیطان۔ اس کی مصیبت کوئی انوکھی مصیبت نہیں ہے۔

فاوسٹ۔ ذلیل کتے! لعنت ہے تجھ پر۔ انوکھی مصیبت نہیں؟ کس قدر ہجوم ہے۔ الم و یاس کا کہ انسان کی روح تصور نہیں کر سکتی۔ اس ذلیل روح کی رفاقت سے میں باز آیا۔ جو حیلہ و فریب میں مسرت حاصل کرتی ہے۔ اور جس کو دنیا ہی میں ایک گونہ لطف ملتا ہے۔

شیطان۔ تو بس فیصلہ ہو گیا!

فاوسٹ۔ اسے آزاد کر دے! ابدالآباد تک تجھ پر مکروہ ترین لعنت ہو۔

شیطان۔ اس کو آزاد کر دے! کون ہے۔ جس نے اسے مصیبت میں گرفتار کرایا ہے؟ میں یا تو؟

فاوسٹ۔ مجھے اس تک لے چل! وہ رہا ہو جائے گی۔

شیطان۔ میں تجھے وہاں لے جاؤں گا۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے۔ دریغ نہ کروں گا۔ ذرا خیال تو کر آسمان و زمین پر میری قدرت ہے۔ میں محافظ کے حواس مکدر کر دوں گا۔ تو کنجیاں لے کر اسے باہر نکال لانا۔ میں باہر پہرہ دوں گا۔ طلسمی مرکب طیار ہوں گے۔ اور تو فرار ہو سکے گا۔ بس میں یہی کر سکتا ہوں۔

سین دوسرا۔ قید خانہ۔ فاوسٹ کے ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا ہے اور وہ چراغ لئے آہنی دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔

فاوسٹ۔ میرے جسم میں یہ کیا ارتعاش ہے! کیا تمام دنیا کے غم میرے حصہ میں آ گئے ہیں۔ وہ یہاں ہے۔ اس تاریک اور غمناک غار میں۔ اس کا جرم کیا تھا؟ ایک رنگین خواب؟ —— لیکن وقت گذر رہا ہے۔ موت ہر لحظہ قریب تر آتی جا رہی ہے۔

قفل کو پکڑتا ہے۔ مارگریٹ کے گانے کی آواز آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔

فاوسٹ۔ (آہستہ سے) خاموش۔ میری جان۔ میں تجھے ان زنجیروں سے رہائی دینے آیا ہوں۔

مارگریٹ۔ رحم کر۔ اگر تو انسان ہے۔ اگر تو سالس سے زندہ رہتا ہے۔ مجھ پر رحم کر —— اے جلاد تجھے یہ حکم کس نے دیا ہے۔ کہ آدھی رات کے وقت مجھے قتل کر دے۔ رحم کر مجھے زندہ رہنے دے (کھڑی ہو جاتی ہے) آہ ابھی میں نے شباب کی بہاریں بھی نہیں دیکھیں اور موت آ گئی۔ میری فریاد سن لے۔

فاوسٹ۔ کیا میں تیرے بعد زندہ رہ سکتا ہوں۔ کہ یہ خوفناک نظارہ دیکھوں؟ ——

مارگریٹ۔ اب میں تیرے اختیار میں ہوں۔ خوشی مجھ سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکی ہے۔ خلقت میرے گیت گاتی ہے۔ اور میرا غم افزوں ہوتا ہے۔

فاوسٹ۔ مارگریٹ! مارگریٹ!

مارگریٹ۔ یہ میرے محبوب کی آواز ہے۔ وہ اچھلتا ہے۔ اور زنجیریں گر پڑتی ہیں۔ کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟ میں نے اس کی شیریں آواز سنی ہے۔

فاوسٹ۔ میری پیاری۔ میں حاضر ہوں۔

مارگریٹ۔ کیا تو ہے؟ جواب دے مجھے۔ کیا تو ہی ہے؟ تو مجھے ان زنجیروں سے آزاد کرکے اپنے دل سے لگا لیگا؟

فاوسٹ۔ آ۔ میری محبوبہ۔ آ۔ رات جلدی سے گذری جا رہی ہے۔

مارگریٹ۔ میری ماں موت کی نیند سو رہی ہے۔ بچے کو میں غرق کر چکی ہوں۔ یہ میرے اور تیرے لئے ایک آسمانی نعمت تھی۔ ——

لا۔ اے میرے محبوب مجھے اپنا ہاتھ دے۔ یہ خواب تو نہیں ہے؟ لیکن یہ ہاتھ ابھی تک رنگین ہیں۔ اور ان سے خون ٹپک رہا ہے۔ پہلے انہیں پاک کر۔ اے خدا تو نے کیا کیا ہے!

(شیطان نمودار ہوتا ہے)

شیطان۔ جلدی کرو۔ ورنہ فرصت ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ بے سود ہے یہ آہ و زاری۔ یہ آنسو یہ سسکیاں۔ میرے باد رفتار شبدیز تمہارے منتظر ہیں۔

مارگریٹ۔ یہ کون ہے جو فرش سے بلند ہو رہا ہے؟ آہ یہ تو وہی ہے! اس کا یہاں کیا کام ہے۔ یہاں کی زمین مقدس اور پاکیزہ ہے۔ کیا یہ میرے لئے آیا ہے؟

فاوسٹ۔ نہیں تجھے زندہ رہنا ہے۔

مارگریٹ۔ اے خدا میں اپنی روح تیرے سپرد کرتی ہوں۔

شیطان۔ (فاوسٹ کو مخاطب کرکے) آ ورنہ تیرا حشر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔

مارگریٹ۔ اے باپ میں تیری ہوں۔ مجھے نجات دے۔ اے فرشتو اے مقدس شہسوارو میرے گرد حلقہ کر لو۔

فاوسٹ۔ میری روح تیرے لئے مضطرب ہے۔

شیطان۔ وہ مقہور ہے!

آسمان سے ایک آواز۔ وہ نجات پا گئی۔

شیطان (فاوسٹ سے مخاطب ہو کر) آ۔ اس طرف آ۔

فاوسٹ کو لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ اندر سے مارگریٹ کی آواز آتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ خاموش ہو جاتی ہے۔

فاوسٹ۔ فاوسٹ۔ فاوسٹ

حنیف ہاشمی

سکائی لارک

سکائی لارک انگلستان کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔ اس کے گانے کا انداز نہایت دلکش ہے۔ شاعر کے الفاظ میں "گاتے ہوئے اڑنا اور اڑتے ہوئے گانا" اس کی طرف ہی اشارہ ہے۔ ارض مغرب میں اس خوش آواز پرندے کو قریب قریب وہی رتبہ حاصل ہے جو ہندی شاعری میں چکور اور پپیہے کو۔ جب شاعر کی روح بار الم اور مصائب انسانی کے روح فرسا نظاروں سے افسردہ ہو کر مناظر کائنات میں اپنا مسکن تلاش کرنے نکلتی ہے اس وقت یہ چڑیا نمودار ہوتی ہے۔ اور اسکو شورش گاہ دنیا کی آبادی سے دور آسماں کی طرف لے جاتی ہے شاعر کی مضطرب روح آرام پکڑتی ہے۔ لیکن انسانی ذوق جستجو اسے وہاں بھی سکون میں آنے نہیں دیتا۔ اور وہ مستفسرانہ انداز میں حیرانی سے کہتا ہے۔ اگر زبان یارا دیتی ہے تو محض اسقدر کہہ سکتا ہے۔

"کیا جانے کن اسرار سے ۔ تیری فغاں معمور ہے ۔ سکائی لارک ان جذبات و حسیات کا بہترین آئینہ ہے ، جو اسوقت شاعر کے دل میں موجزن ہوتے ہیں ۔ اور اگر اجازت ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ شیلے کی المیہ شاعری کے جواب میں اگر اور کچھ نہیں تو ہم کم از کم فاخر کی "سکائی لارک" ضرور پیش کر سکتے ہیں:- (ایڈیٹر)

آزاد سب افکار سے آزاد ہے ہستی تری
کیا چیز ہے مستی تری
دُنیا کی شورش گاہ سے ہے دُور تر بستی تری

تیری نوائے شوق سے سارا جہاں مسحور ہے
اور آسماں معمور ہے
کیا جانے کن اسرار سے تیری فغاں معمور ہے

وہ اُڑنا اور آکاس میں نظروں سے چھُپ جانا ترا
وہ دُور کا شانہ ترا
گاتے ہوئے اُڑنا ترا اُڑتے ہوئے گانا ترا

جاتی ہے جب تو عرش پر اپنے حریم ناز سے
آراستہ ہر ساز سے
گرتے ہیں نغمے فرش پہ تیرے پر پرواز سے

تو اک مجسم شعر ہے جذبات کا فوّارہ ہے
اور عشق کا گہوارہ ہے
یا آب و گِل کی شکل میں کوئی صدا آوارہ ہے

ہے لیلیٰ محمل نشیں اور تیرا بن ہے آسماں
دشتِ کہن ہے آسماں
او بادلوں کی نازنیں! تیرا وطن ہے آسماں

تو اُس کی دلدادہ ہوئی وہ چاہنے والا ترا
ہے چاند متوالا ترا
یہ کہکشاں کیا چیز ہے اک منجمد نالا ترا

اک تیر ہے تو وقت کی ٹیڑھی کماں کے درمیاں
جسم اور جاں کے درمیاں
یا ایک نقطہ ہے زمین و آسماں کے درمیاں

یا سازِ موجودات میں اک نغمۂ بے تاب ہے
یا قطرۂ سیماب ہے
یا زندگی کی نیند میں کوئی پریشاں خواب ہے

اک نغمۂ سیال ہے یا رُوحِ آزادی ہے تو
ننھی سی شہزادی ہے تو
جنگل میں منگل تجھ سے ہے صحرا کی آبادی ہے تو

اُڑ کر زمیں سے چرخ پہ تو صورتِ شبنم گئی
رستے میں لیکن تھم گئی
گویا لہو کی بوند تھی جا کر فضا میں جم گئی

تو رفعتِ پرواز سے سوئے زمیں تکتی نہیں
اُڑتی ہوئی تھکتی نہیں
اور اس بلندی تک نظر میری پہنچ سکتی نہیں

کیا آسماں اور کیا زمیں یہ گردشِ ایام کیا
زنجیرِ صبح و شام کیا
تیری نظر میں ہیچ ہے آغاز کیا انجام کیا

ناظر ہریانوی بی۔ اے

عناصر تیاتر

از

محمد عمر نور الٰہی

بہت مُدّت نہیں ہُوئی۔ کوئی دس پندرہ سال کی بات ہے کہ رسائل وجرائد کے ایڈیٹروں کو شائع کرنا تو کجا یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ کوئی ایسا مضمون اُن کی ڈاک سے نکلے۔ جس میں ڈراما اور اس کے متعلقات کا ذکر ہو لیکن اب کچھ ایسی کایا پلٹ ہُوئی ہے کہ اکثر بلند پایہ ادبی پرچے بھی ڈرامے کی ترقی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ڈراما کو تعلیم یافتہ حلقوں میں ایک خاص وقار حاصل ہو رہا ہے۔ اس وقت اگر خداوندان تھیئٹر اپنے اسٹیج کی موجودہ سطح کو ذرا بلند کر دیں۔ تو ان کے ہاں حُسن برس جائے۔ اور سنیما کی چہل پہل ان کے ہاں منتقل ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ مندرجہ عنوان لفظ "تیاتر" ہنوز ٹکسال سے باہر ہے۔ اور بہت کم حضرات اس سے آشنا ہیں۔ اگر لفظ تھیئٹر کی یہ تفریس[ف] وسعتِ معانی کی ضامن نہ ہوتی۔ تو ہم کبھی اسے تھیئٹر کا قائم مقام نہ بناتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہلِ فارس نے اس لفظ میں تھیئٹر کے تمام متعلقات کو داخل کر دیا ہے۔ اس لئے یہ لفظ تزئینِ عنوان کے لئے زیادہ جامع اور موزوں معلوم ہُوا ہے۔ کہ یہ ڈراما۔ اسٹیج۔ ایکٹر وغیرہ سب پر حاوی ہے۔

(۱) ڈراما

ڈراما کیا ہے۔ کب سے ہے اور کیوں ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات خواہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں لیکن اتنی بار بیان ہو چکے ہیں۔ کہ اب ان میں ندرت نام کو بھی نہیں رہی ہے۔ اس لئے ان پر بحث کرنا عبث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ آیا ڈرامے کا اطلاق ہر اس کتاب پر ہو سکتا ہے۔ جسے کوئی ڈرامے کے نام سے تالیف کرے یا کتاب کے علاوہ کچھ اور عناصر بھی ہیں۔ جن کے بغیر ڈرامے کا ماحول تیار نہیں ہو سکتا۔ ڈراما کی تعریف جو بہت جامع خیال کی جاتی ہے یہ ہے کہ :-

"ڈراما وہ کہانی ہے جو (۱) تماشائیوں کے سامنے (۲) اسٹیج پر (۳) تفریح کے لئے (۴) تمثیل کر کے دکھائی جائے۔" اس تعریف کے معیار کے مطابق ہر وہ کہانی جو تمثیل ہونے کی اہلیت رکھے ڈراما ہے۔ جس میں ایسے اجزا الحاد کئے جائیں جو تمثیل ہونے کے مانع ہوں یا تمثیل ہونے کے لئے ان کی ضرورت نہ ہو۔ یا تفریح کے سدِّ راہ ہوں۔ تو وہ ڈراما کی منزلت سے گر جاتی ہے۔ یہ مضمون اسی کلیہ کی مختصر توضیح ہے۔

اس تعریف کے مطابق جب تک کسی کہانی کو اسٹیج پر تماشائیوں کے سامنے تفریح کے لئے عملی طور پر نہ دکھایا جائے۔ ڈراما صورت اختیار نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ ڈراما بیکار ہے۔ جب تک اسے دیکھنے والے نہ ہوں۔ دیکھنے والے تب ہی آئینگے جب اس کی تمثیل میں سامان تفریح کی امید ہو۔ تمثیل وہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ایکٹر اسے اسٹیج پر کھیل کر دکھائیں۔ پس کوئی تصنیف جس میں سینکڑوں جواہر ادبی ہوں۔ مگر اسٹیج نہ ہو سکے ڈراما نہیں۔ اور کوئی تصنیف جو محاسن ادبی سے معرّا ہو مگر اسٹیج ہو سکے قطعاً ڈراما ہے۔ اچھا یا بُرا ہونا علیحدہ بات ہے۔ بنا بریں کسی ڈراما کو صرف ادب کی عینک سے دیکھنا بے معنی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ وہ ڈرامے جو ادبی ڈراموں کے نام سے موسوم ہیں۔ آرٹ کے لحاظ سے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اسی ذیل میں وہ ڈرامے بھی آ جاتے ہیں۔ جنہیں کلوزک ڈراموں کے نام سے صرف مطالعہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ڈرامے کی زبان کیسی ہو؟ تو اس کا جواب بھی اس تعریف میں موجود ہے تماشائیوں میں مختلف استعداد کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ڈرامے کی زبان ایسی ہونی چاہئے جسے چوتھے درجے سے لے کر ارچیسٹرا سٹال تک سب لوگ بلا استمدادِ فرہنگ سمجھ سکیں اور وہ

[ف] غیر فارسی لفظ کو فارسی بنا لینا۔

زبان ہر کیرکٹر کے حسب حال ہو۔ سیدھے سادے روزمرّہ میں مکالمہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اپنے اندر معانی کی ایک دنیا رکھتے ہوں۔ مغلق الفاظ دور از کار تلمیحات اور مذہبی اشارات سے پرہیز کیا جائے۔ چونکہ ڈراما تفریح کے لئے کیا جاتا ہے اسلئے مواعظت کو اس میں براہِ راست کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ڈراما میں کسی واقع کے نتائج و عواقب بیان کرنا ڈرامے کا کام نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ ڈرامے میں ادبیات و پند و نصائح داخل ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ ہو تو ڈرامے کی وقعت ادھوری رہ جاتی ہے۔ یہ سب کے سب ڈرامے میں اس حد تک سما سکتے ہیں۔ جہاں کہ ڈرامے کی ہستی پر اثر نہ پڑے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ڈراما نگار کو اپنی صناعی کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ یعنی تماشائی اسی خیال میں رہیں کہ وہ صرف تماشا دیکھ رہے ہیں اور آپ باتوں باتوں میں تمام نکات بیان کر جائیں۔

(۲)۔ اسٹیج

گو یورپ میں آجکل ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی ہے۔ جو اسٹیج کو عمارت کے بوجھ سے سبکدوش کر کے کھلے میدان میں ڈرامے کرنا چاہتی ہے۔ اور سینری کو بھی رخصت کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن یہ تحریک ہنوز تقریر و تحریر تک محدود ہے۔ تھیٹروں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اور اسٹیج میں آجتک سینری۔ بھروپ بھرنے کا سامان روشنی۔ ملبوسات اور دیگر اشیا شامل ہیں۔ گویا ڈراما تب رونما ہوتا ہے۔ جب اسے ایک خاص مقام پر ایکٹر سینری کی مدد سے بھروپ بھر کر اور موزون کپڑے پہن کر مناسب حال روشنی میں تمثیل کریں۔

(الف) سینری کا مقصد صرف یہی نہیں۔ کہ کسی منظر کو پیش کر دے۔ بلکہ اس سے غرض ایک ایسی فضا پیدا کرنا ہے۔ جو ڈرامے کی کتھا کو ابھار کر دکھائے۔ مثلاً کوئی کیریکٹر بیمار ہے۔ تو سینری میں ایسا سامان داخل ہونا چاہیئے جس سے اسکی خاص بیماری کی طرف اشارہ ہو۔ اسکے لئے مکان کا رنگ ہلکا۔ روشنی مدھم۔ تیمارداری کا سامان دکھائے جائینگے۔ اسٹیج کو غیر ضروری قیمتی اشیا سے بھر دینا محض بدذوقی ہے۔ اس سے ڈرامے کے انکشاف میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ سینری میں ہر چیز موقع و محل کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اسکا گراں بہا ہونا لازم نہیں۔ محمد شاہ کی محفل میں پیرس کے کنٹر۔ نادر شاہ کی فوج میں ہنری مارٹن کی بندوقیں۔ جہانگیر کی بزم میں پیانو۔ اکبر کے محل میں حیات برادرز کے کوچ اور صوفے اور ہمایوں کے پلنگ کے پاس پیچوان بالکل بے معنی چیزیں ہیں۔ سسی پنوں کی فلم ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن اس فلم میں ایک ایکٹر جب سگریٹ پیتا آجاتا ہے۔ تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ سینری کی ترقی نے ڈرامہ نگار کو بہت سی زحمت سے سبکبار کر دیا ہے۔ اگلے زمانے میں طلوع و غروب کے منظر۔ چاندنی رات۔ میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے میں ڈرامہ نگار کو صفحے کے صفحے سیاہ کرنے پڑتے تھے۔ اور ایکٹر کا گلا چلاّ چلاّ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اب ان باتوں کا اہتمام سینری نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اتحادِ ثلاثہ فن ڈرامہ کا مہتم بالشان اصول ہے۔ اسکی ایک شق اتحادِ مکان ہے۔ جسکے رو سے یہ قید لگائی گئی ہے۔ کہ ڈرامے کے تمام واقعات نہ صرف ایک مقام بلکہ ایک ہی کمرے میں ظہور پذیر ہوں۔ سینری نے اسکی گرفت کو بھی ڈھیلا کر دیا ہے۔

(ب) بھروپ بھرنے سے صرف چہرے کی ہیئت تبدیل کرنا مراد نہیں بلکہ اسکے ذریعہ ایکٹر کو کیریکٹر کے لباس۔ زیورات۔ اسلحہ جنگ تک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ لازم آتا ہے۔ کہ وہ اس زمانہ کے حسب حال ہو۔ جس میں کیریکٹر نے زندگی بسر کی تھی۔ اب تو اس فن نے یہ ترقی کی ہے۔ کہ بھروپ بھرنے کے بعد آدمی کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس فن کی ترقی نے اتحاد ثلاثہ کی دوسری شق اتحادِ زماں میں دو چار سال کی وسعت ممکن کر دی ہے۔ ورنہ یہ قدغن تھی کہ کہانی کے واقعات چوبیس گھنٹے کے اندر ختم ہو جائیں۔

(ج) روشنی۔ پہلے زمانے میں جب اسٹیج پر قندیلیں اور لمپ جلتے تھے تو روشنی فقط اجالا کرنے کے کام آتی تھی۔ لیکن بجلی کی روشنی نے اسٹیج میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب دن اور رات تو کیا چوبیس گھنٹے میں ہر ایک گھنٹے کا تفاوتِ وقت دکھانا ممکن ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کے آلے اور عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ جن سے ہندوستانی اسٹیج قطعاً نا آشنا ہے۔ اسکے علاوہ اس روشنی سے اب مختلف النوع شعاعیں نکلتی ہیں جنہیں ایکٹر کے چہرے پر ڈالا جاتا ہے۔ کہ اسکی جذبات نمائی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کوئی لمپ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ روشنی کدھر سے آرہی ہے۔ اسلئے سین فطرت سے بہت نزدیک ہو جاتا ہے۔

(د) لباس:- پہلے زمانے میں جو کپڑا ہاتھ آیا یا جو پسند خاطر ہوا پہنا دیتے تھے۔ ہندوستانی رومن لباس میں اور ایرانی فرانسیسی لباس میں دکھانے سے دریغ نہ تھا۔ بارہویں صدی کا لباس ان کیریکٹروں کو ملتا تھا۔ جو سولھویں صدی میں پیدا ہوئے مگر اب کسی کیریکٹر کے لباس کی ساخت میں اسکے عہد۔ اس کے مرتبے۔ اسکی عمر۔ اسکی قومیت۔ ملک اور میلان طبع کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

(۳) تمثیل کرنا

تمثیل کرنے کیلئے ایکٹر کا ہونا ضروری ہے۔ ایکٹری صرف مصنف کے الفاظ کے دہرانے کو نہیں کہتے۔ بلکہ اسکا کام یہ ہے۔ کہ مصنف کے مفہوم اور کیریکٹر کے جذبات دوبالا کرکے دکھائے۔ ایکٹری کا پیشہ کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی معزز خیال کیا جاتا تھا۔ اور صرف برہمن اسے اختیار کرنے کے مجاز تھے۔ اور یورپ میں تو ایکٹروں کو وہ عزت حاصل ہے۔ جو یونیورسٹیوں کے پروفیسروں تک کو نصیب نہیں۔ مگر آجکل ہمارے ایکٹر ڈوم ڈھاریوں سے زیادہ عزت کے مستحق خیال نہیں کئے جاتے۔ اور سوا پارسی ایکٹروں کے کسی کو سوسائٹی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ماشاءاللہ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس پیشہ کو صرف وہ لوگ اختیار کرتے ہیں۔ جو کوئی اور وجہ معاش نہ رکھتے ہوں۔ علم سے بے بہرہ ہوں۔ حالانکہ یہ کام تعلیم یافتہ اصحاب کا ہے جنہیں علم نفسیات پر پورا عبور ہو۔ اچھے چلن کے ہوں۔ اور سوسائٹی میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے ہوں۔ ایکٹری جہیرالصوت اور بلند آواز ہونے کا نام نہیں۔ ایکٹری تھرکنے کو نہیں کہتے۔ ایکٹری کسی مغنی یا مطرب کا مترادف نہیں بلکہ ایکٹری اس فن کا نام ہے۔ جو صوت اور عمل میں اتحاد پیدا کرکے جذبات قلب کو اسٹیج پر متحرک دکھائے۔ یہ صورت ہاتھ پاؤں مارنے سے نہیں بلکہ آنکھوں اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل بتانا کہ فن ایکٹری کے اصول و قواعد کیا ہیں۔ ایک قصہ طلب بات ہے۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ اسکے متعلق جو مختلف ہدایات قدیم علمائے ہند نے دی ہیں وہ ازحد کارآمد ہیں۔ اور انکے زمانے کا لحاظ کرکے حیرت انگیز خیال کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ نظریات جامع کل ہیں۔ کہ ایکٹر کیریکٹر میں ایسا سمو جانا چاہیئے۔ کہ اسکی اپنی ہستی محو ہو جائے۔ یہ ڈیڈرٹ کا قول ہے دوسرے عالم یہ کہتے ہیں۔ کہ ایکٹر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ کسی کیریکٹر کی نیابت کر رہا ہے۔ اور اسکے جذبات کو اسے اپنے عمل سے ظاہر کرنا ہے۔ اسوقت اس سے زیادہ بیان کی اجازت نہیں مگر اتنا کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہم مؤخرالذکر اصول کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ اسکے بغیر مشہور نظریہ "سہ دیوار" قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) تماشائیوں کے سامنے

پبلک کا وجود بھی ڈرامے کے لوازمات سے ہے۔ کیونکہ جبتک اسے تماشائیوں کے سامنے کھیل کر نہ دکھایا جائے۔ اسے معراج کمال حاصل نہیں ہوتی۔ ڈرامے کی فنا و بقا۔ محاسن و معائب اور اسکے عروج و زوال کی ذمہ دار پبلک ہے۔ جس رنگ۔ جس مذاق۔ جس طرز اور جس اسلوب کا ڈراما پبلک کو پسند ہوگا۔ ویسا ہی ڈراما اسٹیج پر آئیگا۔ لیکن اس پبلک سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جن کی عالی سرپرستی کے طفیل تھیٹر چلتے ہیں۔ اس میں وہ اصحاب داخل نہیں جو خواہ ڈراما کے کتنے عالم ہوں مگر کبھی تھیٹر نہ جاتے ہوں۔ تھیٹر والوں پر صرف انہیں کی آواز اور رائے کا اثر ہو سکتا ہے۔ جو انکے ٹکٹ خریدتے ہوں۔ اور جن کی ناراضی انکی آمدنی پر اثر ڈال سکتی ہو۔ بیرونی پریس پلیٹ فارم اور تنقید کا چنداں اثر نہیں ہو سکتا۔ اسلئے اگر آپ کو ڈراما کا ذوق ہے تو تھیٹر دیکھئے۔ آرام کرسی پر بیٹھکر ڈراما پڑھنا یا اس پر نکتہ چینی تیاتر کی موجودہ ہستی کو بلند نہیں کرتی۔ آجکل ہمارے اسٹیج کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اور یہ اس منزلت سے بھی گر گیا ہے۔ جسپر اسے جمشید جی۔ بالی والا۔ کاؤس جی

کھٹاؤ اور سہراب جی نے پہونچایا تھا۔ اب تو اس کی حالت ہیں منڈل سے زیادہ نہیں ہے۔ اسوقت سب سے بڑی ضرورت ایسے ڈرامہ نگاروں کی ہے۔ جو شکسپیر۔ ابسن۔ برنارڈشا میٹرلنک کو نظر انداز کرکے مولیر لوپ ڈی دے گا۔ کارلٹن اور رابرٹسن وغیرہ کو اپنا نمونہ بنائیں۔ اور ڈرامے میں حشر کا آغاز احسن کا انجام۔ طالب کا وسط اور بیتاب کی سینری کو جمع کرکے ایک نیا رنگ پیدا کریں۔ ورنہ سینما تھیٹر کو فنا کردیگا۔

پس پردہ

سینما جانے والے حضرات ان تمام عظیم الشان اور خطرناک کارناموں کو جو انہیں تاریک کمرہ میں سفید چادر پر ہم آہنگ موسیقی کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔ اطمینان اور محض ایک راہرو کی نظر سے دیکھتے ہیں خواہ وہ ان کے رگ و پے میں کس قدر ہی سنسنی پیدا کیوں نہ کردیں۔ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد کو ہرگز باور نہیں ہوتا کہ یہ حیرت انگیز واقعات اور ڈراما کے ہیرو کے جانفروشانہ کرتب فی الواقع ایکٹ کئے ہوئے مناظر کی تصاویر ہیں۔ برعکس اس کے بآسانی یقین کرلیا جاتا ہے۔ کہ ان کی حقیقت فوٹوگرافی کے کمال، بازیگری اور حیلہ وفن کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ انگریزی رسائل میں بھی "پس پردہ" کے عنوان سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ چنانچہ اب ایکٹروں کو ان کی جانبازی اور سرفروشانہ بے خوفی کی داد بھی لاولضیب نہیں ہوتی۔ جس کے وہ قدرتی طور پر مستحق ہیں۔ ان کے حیرت انگیز کارناموں کو خواہ سچّا یا واقعیّت سے لبریز ہوں کسی کرانے کے مشاق یا ایک بے جان پتلے کی کارستانی کا مرہون سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً سکرین پر اگر کوئی ایکٹر کسی طیارے سے جو آسمان کی رفعتوں میں پرواز کر رہا ہو گرتا ہوا دکھایا جائے۔ تو لوگ اکثر یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ طیارہ لمبا چادر جب تک فضا میں رہی۔ اس میں ایک بے جان پتلا معلّق رہا اور جب وہ زمین پر گری اسی وقت پھرتی سے پتلے کو اٹھا کر ایکٹر کو اسی کی جگہ رکھ دیا گیا۔ یا اگر ایک جنگی جہاز سمندر میں غرق ہوتا دکھایا جائے۔ تو عمداً اس خیال سے دل کو اطمینان ہوجاتا ہے۔ کہ یہ ایک چھوٹی سی کشتی ہے جس کو فوٹوگرافی کے کمال سے ایک ساحل پیکر جہاز بنا کر دکھا دیا ہے۔

فلم کے ستاروں کی زندگی بھی عام طور پر قابل رشک خیال کیجاتی ہے۔ اور غلط فہمی سے یہ فرض کرلیا گیا ہے۔ کہ جس قدر عیش و راحت ان لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ شاید دنیا میں کسی کو بھی نصیب نہ ہوتی ہو۔ ان کے متعلق یہ رائے غالباً پردہ پر کی زندگی کو دیکھ کر قائم کی گئی ہے پردہ کے رقص۔ آرزو انگیزی، تمنا پروری اور رومان کی محویت میں پس پردہ کی مشکلات کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر اوقات شعبدہ بازی کو بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں جب کہ تہذیب و تمدن نے زندگی کے ہر شعبہ کی امتیازی خصوصیت۔ واقعیّت قرار دے رکھی ہے سینما جس کو ہماری یونیورسٹیوں سے ہمسری کا دعوٰی ہے۔ کسی طرح بھی واقعیّت کے لباس سے عاری نہیں رہ سکتا۔ لیکن فلم کی واقعیت کچھ آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے سینما کو بڑی بڑی قربانیاں کرنا پڑتی ہیں۔ ایکٹروں کو خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات ان کے اعضا بیکار ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو اپنی جان بھی انہیں اس "واقعیت" کی بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے۔

یہ خطرات صرف ایکٹروں تک ہی محدود نہیں ہوتے۔ بلکہ ڈائرکٹروں اور سینوٹوگرافروں کو بھی ان کا شریک ہونا پڑتا ہے۔ ایک ڈرامے کے مناظر کی اس کے صحیح ماحول میں تصاویر لینے کے لئے واقعیّت اس کی مقتضی ہوتی ہے۔ کہ فلم کمپنی اس کی تکمیل کے لئے میلوں کا سفر اختیار کرے۔ یوں تو اکثر وہ فلم بھی جو محض تصویرگاہ کی چار دیواری میں تیار کئے جاتے ہیں۔ مشکلات سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن زیادہ خطرات کا سامنا اُس وقت کرنا پڑتا ہے جب کسی طویل منظر کو فلم کرنا ہو۔ ان مواقع پر "ستارے" اپنے ہفتہ وار معاوضہ کا حق جو سینکڑوں اور ہزاروں پونڈ کی صورت

میں ہوتا ہے۔ جانفروشی اور جانبازی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ زائد یا فالتو کارکنوں کی مزدوری ایک پونڈ روزانہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ معاوضہ ان خطرات کے کسی طرح بھی برابر نہیں ہوتا۔ جن کا مقابلہ وہ بڑی جرأت اور استقلال سے کرتے ہیں۔

ایک فلم ساز کو انتہائی مصیبت کا سامنا سفر، سپاہیانہ کارناموں اور میدان کارزار کے مناظر کو فلم کرنے میں کرنا پڑتا ہے۔ یہ اس کے لئے سخت ترین آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ تصویر کی تکمیل کے علاوہ ایکٹروں کی جان کی حفاظت بھی اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ اور ان کی صحت کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے۔

سربفلک ڈھلانوں اور گھاٹیوں کے غیر معمولی طور پر خطرناک زاویہ سے "شوٹنگ" سین تھا۔ دوپہر کے شعلہ ریز آفتاب میں جھلستے جھلستے ریگ زاروں یا منطقہ باردہ کے غیر آباد اور ویران علاقوں میں برف کے تند اور بے رحم چمکتے ہوئے میدانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کسی منظر کی تکمیل کرنا کسی لرزہ خیز ایپی سوڈ (افسانہ در افسانہ) کو عین معرکہ جدال و قتال۔ کوہ پیکر جنگی جہازوں۔ سمندر کی ہولناک لہروں یا فلک شگاف توپوں کی گولہ باری میں فلم کرنا اس قدر خطرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ کہ باوجود سخت ترین احتیاط کے بے شمار جانوں کا اتلاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت فلم ساز۔ اس کے فلمی کیمرے والے اور دیگر معاونین سب کی جانیں خطرے میں ہوتی ہیں۔ اور ایکٹروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ جن کے ذمہ خوفناک کارناموں کو واقعیت اور اصلیت کے ساتھ ایکٹ کرنا ہوتا ہے۔

جانبازی اور جوانمردی کے کارناموں کے فلموں میں سے سب سے پیش پیش Chang کے حیرت انگیز افسانے کا فلم ہے۔ یہ فلم کچھ عرصہ ہوا۔ لاہور میں "ایکسیلسیر" کے سالانہ خصوصی فلم کی حیثیت سے سکرین کیا گیا تھا۔ اس کی تیاری میں جس قدر مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ سینما کے شائقین کے تصور میں شاید ہی آسکیں۔ اس فلم کی تیاری کا سہرا مشہور فلم سازوں یعنی مسٹر آرنسٹ۔ بی مسٹر شوئیڈ سیک اور مسٹر میرین سی۔ کوپر کی اولوالعزمانہ کوششوں کے سر ہے۔ اس کی تیاری میں ان کی زندگی متعدد بار سخت خطرے میں تھی۔ اور ایک بار تو وہ موت کے منہ تک پہنچ چکے تھے یہ دونوں ایک سپاہیانہ عزم اور ایک "مکتشف" کی سی ہمت اور استقلال کے ساتھ سیام کے تاریک جنگلوں میں گھس گئے۔ اور بارہ دن تک اپنے افسانہ کے لئے صحیح ماحول کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں پھرتے رہے۔ اس دوران میں دشوار گذار اور خطرناک گھاٹیوں کو قطع کرنے کے علاوہ انہوں نے ۷ ندیاں اور دریا عبور کئے۔ یہ مسافت انہوں نے خچروں اور کشتیوں کی مدد سے طے کی اور آخر بارہ دن کی دشت پیمائی کے بعد وہ "نین" کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ مقام اُن کے خیال میں جنگل کی زندگی کو فلم کرنے کے لئے بہترین ماحول مہیا کرتا تھا۔

Chang کی تیاری میں بے جان پتلوں یا کسی اور حیلہ و فن کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی۔ کہ نیچر کی زندگی کے مناظر کی تصاویر اسی حالت پر لی جائیں۔ جس طرح وہ جنگل کے درمیان ہے لیکن نیچر آزاد ہے۔ انسان اس کو اپنا قانون بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ نیچر اس کی مطیع و فرمانبردار نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور باوجودیکہ ہر قدم پر نئی نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بڑے صبر و استقلال سے اس کی تاک میں لگے رہے۔

اس فلم میں جس قدر بھی وحشی درندے دکھائے گئے ہیں ہر ایک کی تصویر اس کے مسکن کے نزدیک اسوقت لی گئی ہے۔ جبکہ وہ جنگل میں آزاد تھا

سیام کے جنگل میں اس مقام تک جس کو ڈرامہ کے ماحول کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔ ابھی مغربی تمدن کی روشنی نہیں گئی۔ اس علاقے میں وحشی خونخوار چیتوں کی اس قدر کثرت ہے کہ تین سال میں چار سو اناسی جانیں صرف ان کی خونخواری کا شکار ہوئیں۔ سیام کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں مردہ روحوں کی حکومت ہے۔ اور جو چیتوں کو مارتا ہے۔ وہ اس سے سخت انتقام لیتی ہیں۔ اس عقیدہ کی بنا پر فلم سازوں کو ایک اور مشکل کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جب کبھی ان آدم خور درندوں میں سے کسی کو گولی مارنے کی ضرورت پیش آتی۔ سیامی ہمراہیوں کو بڑی دقت سے اس امر پر راضی کیا جاتا اور انہیں یقین دلایا جاتا کہ وہ ان ارواح کی ایذا دہی سے بری ہیں اور گناہ گر رہے شکاریوں کی گردن پر ہوگا۔ اس جنگل میں تیندوے، ہاتھی، ببر اور زہریلے سانپ بھی بڑی کثرت سے تھے۔ جن لوگوں نے اس ڈرامہ کو دیکھا ہے۔ وہ اس کے سنسنی پیدا کرنیوالے مناظر کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے ایک موقع پر تو ایک خونخوار چیتا مسٹر شوئیڈ سیک کے کیمرہ کے اتنا قریب آ گیا۔ کہ اس کی مشعل کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں اور کیمرے میں صرف چند قدم فاصلہ رہ گیا تھا مسٹر شوئیڈ سیک

نے خوف و ہراس کو بالکل پاس نہ آنے دیا۔ اور بڑی دل جمعی سے تصویر لیتے رہے۔ اس طرح چیتے کی ایک ایسی وحشت ناک تصویر مل گئی۔ جو بصورت دیگر کسی طرح بھی ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف مسٹر کوپر نشست لگائے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی چیتا فوٹوگرافر پر جھپٹا۔ انہوں نے فوراً ہی بندوق داغ دی۔ اور نشانہ خوب کاری بیٹھا لیکن ان سے اگر ذرا بھی چوک جاتا تو مسٹر شوئیڈ سیک کی زندگی معرض خطر میں تھی۔ اور وہ ذرا سی لغزش پر ہمیشہ کے لئے اپنی جان عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

عوام الناس میں مشہور ہے۔ کہ اگر جنگل میں کوئی وحشی جانور مل جائے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی جرأت سے کھڑا رہنا چاہئے۔ اس طرح اس پر رعب پڑ جائے گا۔ اور وہ حملہ کی جرأت نہ کر سکے گا۔ اور سامنے سے کھسک جائے گا۔ لیکن ان دو مشہور فلم سازوں کے تجربہ کی بنا پر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ اگر کسی وحشی جانور سے اچانک سامنا ہو جائے۔ تو اس سے آنکھ ہرگز نہ ملانی چاہئے بلکہ اس کے سر کے کچھ اوپر یا ایک طرف دیکھا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے۔ جانور پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا چاہئے۔ کہ اس کو دیکھ لیا گیا ہے۔ اور اس کی نقل و حرکت کی نگہداشت کی جا رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ صلح کے ساتھ گذر جائے گا۔ کیونکہ صرف خوف اسے انسان پر حملہ کرنے پر اکساتا ہے۔

جنگلی درندوں کے مقابلے کے علاوہ اور بہت سی مشکلات تھیں انتخاب کیا کہ دہ مقام میں ایک نقص یہ بھی تھا۔ کہ وہ ملیریا اور ہیضے کا گھر تھا مسٹر کوپر اور شوئیڈ سیک دونوں پر ملیریا کا حملہ ہوا! اور مسٹر کوپر کا درجہ حرارت یہاں تک بڑھ گیا۔ کہ وہ بخار کی شدت سے مجنونانہ طور پر ہذیان بکنے لگ گئے۔ لیکن باایں ہمہ انہوں نے کام چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اور تمام عرصہ نہایت جانفشانی سے مصروف رہے کام صرف صبح چھ بجے سے لیکر دس بجے تک ممکن تھا۔ اس مقام پر Chang کی تیاری میں اٹھارہ مہینے صرف ہوئے۔ اور اس عرصہ میں سات ہمراہیوں کو ہیضہ ہوا۔ دوسرا فلم جسکی تیاری میں اسکے بنانے والے کو غیر معمولی خطرات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کو مشہور و معروف امریکن سائنٹسٹ ڈاکٹر "شاٹک" نے تیار کیا تھا۔ اس کو دیکھنے والا اس کی گہرائیوں میں بے حد محو ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ تھیٹر کے تاریک کمرہ کی بجائے وسط افریقہ کے قلب میں ہے۔ اور یہ نفس نفیس بونی نسلوں کی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ان بونی اقوام کا کچھ حال ۴۳۶۶ سال قبل مسیح یونان کے نابینا شاعر نے ایلیڈ میں "سکارہ" کی قبر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور اس کے بعد ہیروڈوٹس اور ارسطالیس نے بھی سرسری تذکرہ اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن تاریک براعظم کی اقوام میں غالباً یہی قوم ہے۔ جس کے تمدن کا دنیا کو بہت کم علم تھا۔ آخر متحرک تصاویر نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

یہ اقوام بالکل بچوں کی طرح ڈرپوک ہیں۔ لیکن ڈاکٹر شاٹک نے ان کے ساتھ دوستانہ زندگی بسر کی۔ اور متمدن دنیا کے لئے ان کی لاثانی سرگذشت بہم پہنچائی۔

ملیوں لمبا فلم تیار کرنے میں بے شمار مشکلات در پیش تھیں شروع شروع میں بونوں کو بھی ان پر اعتماد نہ تھا۔ اور وہ ان سے غایت درجہ کی بے اعتنائی سے پیش آتے۔ اور اکثر اوقات مکروفریب سے بھی کوتاہی نہ کرتے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں ان پر اعتماد ہو گیا۔ اور وہ انہیں اپنا دوست سمجھنے لگے۔ اب ان کے سامنے افریقہ کے تاریک اور گھنے جنگلوں کی آفتیں اور بلائیں تھیں۔ اور ان پر قابو پانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ آدم خور درندوں اور زہریلے سانپوں کی بہت کثرت تھی۔ جنگل گھنے اور زمین سیلابی اور مچھروں کی کثرت سے ملیریا کا گھر بنی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ خطرناک افریقہ کی وہ سموم تھی۔ جو راہ چلتوں پر غنودگی طاری کر دیتی ہے۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سلا دیتی ہے۔ ڈاکٹر شاٹک کا سفر خط استوا کے گھنے جنگل کی گہرائیوں میں تھا۔ جہاں آفتاب نصف النہار کی شعاعیں بلند درختوں کی چوٹیوں میں ہی الجھ کر رہ جاتی ہیں اور زمین بوس ہونے کا انہیں کبھی موقع نہیں ملتا۔ راستہ میں اُن کا گذر کئی ایک قریوں میں سے ہوا۔ جو بالکل سونے اور ویران پڑے تھے۔ وہاں کے رہنے والے سب موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور ان میں سے ایک متنفس بھی زندہ نہ تھا۔ گری پڑی شکستہ جھونپڑیوں کے باہر صدہا حبشیوں کے پنجر پڑے تھے۔ اور زہریلی مکھی (ٹیٹسی) جس کے کاٹنے سے جاندار کے جسم پر آبلہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے لاکھوں کی تعداد میں بھنبھنا رہی تھیں۔

(رشید احمد۔ ایم۔ اے)

ظریف کی رام کہانی!

ظریف کی زبانی

(۱)

مولینا تاجور جو ہمارے ہم قوم ہم وطن ہم سبق و ہم طبق، ہم مشرب و ہم مذہب ہونے کے ساتھ ہی قریب قریب ہم زندگی بھی ہیں۔ اور خدا کرے ہم انجام بھی ہوں۔ اُن کا ارشاد ہوا ہے۔ کہ ہم جو اپنی حیات مستعار کو غیر مستعار اور زندگی چندروزہ کو غیر فانی سمجھ کر دنیا اور مستقبل کے لئے ایک خطرہ بن رہے ہیں۔ اپنی سوانح عمری اپنے ہی قلم سے ضبط تحریر میں لے آئیں" اس لئے کہ ایکا ایک دن اُن کے خیال میں ہم بھی دوسروں کی طرح اس خاکدان ہستی کو الوداع کہہ کر ملاء اعلےٰ کو پرواز کر جائیں گے۔ اس واسطے اپنی زندگی کے کارناموں کو بے رحم سوانح نگاروں کے حوالے کرنا کوئی سمجھ کی بات نہیں ہے"

ہماری رائے میں انہوں نے یہ کہہ کر ہماری سیلف ریسپیکٹ پر سخت حملہ کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ اُن کا خیال ہی خیال ہے۔ اس میں اصلیت نام کو بھی نہیں۔ کیونکہ ہم مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ مرنا کوئی ایسا اہم کام نہیں تھا۔ جس کے سرانجام دینے کے لئے ہم پیدا کئے جاتے۔ خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اپنی جان سے سٹر پیر سے دُور اگر ہم مر گئے۔ تو ہماری آفرینش فعل عبث ٹھہرے گی۔ خدا پر الزام اُلٹ آئے گا۔

ہم الگ جان سے جائینگے۔ پھر یہ کوئی عقلمندی میں داخل نہیں ہے کہ دنیا کے سارے ضروری کام چھوڑ کر آدمی کو بیٹھے بٹھائے خفقان اُٹھے اور خواہ مخواہ۔ اور بھی کچھ نہیں۔ مرجائے۔ کیوں مرجائے؟ کس لئے مرجائے؟ ہم کسی کا کیا بگاڑ رہے ہیں۔ کہ مرجائیں۔

اور لو۔ لوگوں نے ہمارا مرنا بھی ہنسی کھیل سمجھ لیا ہے۔ اشرف المخلوقات جس کیلئے ساری ہستی رچائی گئی ہے۔ اس کا ایک ممتاز فرد۔ کون؟ مولینا ظریف انہیں دھمکایا جارہا ہے۔ کہ وہ ایک نہ ایک دن مرجائیں گے۔ کیوں نہیں مرجائیں گے۔ ضرور مرجائیں گے۔ اور نہ مرے تو مار ڈالے جائینگے۔

پھر تو یہاں فرنگی کا راج نہ ہوا " ملنگی" کا ہوا۔ موت نہ ہوئی بچہ سقہ ہو گیا۔ کہ ضرور پہنچے گا۔

واہ خوب کہی "مرجائیں" ہم کیوں مریں؟ کہنے والے جو مرجائیں۔ ہم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے جو مرجائیں۔ نجانے ہماری زندگی سے لوگ کیوں اُکتائے ہوئے ہیں۔ کیوں ہمارا مرنا چاہتے ہیں۔ آخر ہم دنیا کو کیا تکلیف پہنچا رہے ہیں؟ کہ مرجائیں گے تو دنیا مصیبت سے چھوٹ جائے گی۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساری دنیا ہمارے خلاف ایک سازش میں شریک ہے۔ ہمیں ہر شخص مختلف پیرایوں میں موت کی دھمکی دے رہا ہے کوئی کہتا ہے" لاہور میں چیچک پھیل رہی ہے" اچھا بھائی پھیل رہی ہے، پھیلنے دو۔ گلی کوچوں میں ہندو مسلمان کا گاڑیوں بچہ مارا مارا پھرتا ہے۔ پہلے چیچک اُن کا تو جائزہ لے۔ ہم نے تو پہلے ہی ٹیکے لگوالئے ہیں۔ ہمیں یہ نوید مرگ کیوں دی جارہی ہے؟

دوسرا کہتا ہے۔ کہ "شہر میں انفلوئنزا کا بڑا زور ہو رہا ہے" اچھا ہو رہا ہے سُن لیا ہو رہا ہے۔ انفلوئنزا کا زور۔ مطلب آپ کا؟ آپ انفلوئنزا سے زور آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں؟ انفلوئنزا میں مبتلا ہونے کا شوق ہے پھر ہمیں کیوں سنایا جا رہا ہے کہ شہر میں انفلوئنزا کا زور ہے ہم نے کبھی آپ سے خواہش کی تھی؟ کہ کبھی انفلوئنزا کا زور ہو تو ہمیں خبر کیجئے۔ ہم تو ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی باری بھگتا چکے ہیں۔ مرنا ہوتا تو اُس وقت مر چکتے۔ مگر نہیں مرے بچ گئے۔ لوگوں کی خواہشوں کے خلاف بچ گئے۔ ولی والے حکیم نے تو بڑا زور لگایا تھا۔ مگر جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔

ایک صاحب جوتشیانہ انداز میں فرماتے ہیں۔ کہ تین چار سال سے طاعون نے لاہور پر توجہ نہیں کی۔ اس مرتبہ سردی زیادہ پڑی ہے۔ اب کی بار اس کا خطرہ ضرور ہے۔

کوئی اس بھلے آدمی سے پوچھے۔ کہ لاہور طاعون کا وطن ہے؟ جنم بھومی ہے؟ طاعون کا یہاں نال گڑا ہے؟ کیا بات ہے؟ جو وہ ولیس پر ولیس پھر پھرا کر لاہور ضرور آئے گا۔ لاہور کے پچھلے طاعونی عقیدت مندوں

تو ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ چار سال نہیں گذرے کہ لاہور والوں نے ہر پنچایت اور ہر برادری سے قبرستان بھر بھر کے جیتے جاگتے بولتے چالتے لاہوری ان قبلہ کے سر صدقے کر دیئے۔ اب بھی ان کی ہوس پوری نہیں ہوئی۔ جو پھر لاہور میں ان کے آنے کا خطرہ ہو رہا ہے؟

اور ہو رہا ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں کیا۔ آتے دو! شوق سے آئے!۔ آ کے دیکھ لے!۔ دیکھیں تو یہاں سے کیا لے جائے گا۔ اب تو کوئی لاہوری اُس کے ساتھ جانے کو طیار نہیں ہے۔ رہے ہم۔ ہم طاعون تو طاعون۔ کسی بیماری کے ساتھ بھی چلنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور طاعون کی تو مجال ہی کیا ہے۔ جو ہم پر ہاتھ ڈالے۔ وہ ہمارے خالو میاں کو مار کر اترا یا ہوگا۔ وہ خالو میاں ہی تھے۔ جو اس کے ہتے چڑھ گئے۔ ہا۔۔۔ں ہم خالو میاں نہیں ہیں! ہا۔۔۔ں اور اوّل تو وہ آئے گا ہی نہیں۔ جانتا ہے کہ لاہور میں گلی کوچے اخبار نکلتا ہے۔ ہر شخص جسے دنیا رد کر چکی ہے۔ اخبار نویس بنا پھرتا ہے۔ آدمی تو آدمی ایک چوہا بھی کسی گھر کا جاں بحق ہو گیا۔ تو اخباروں کے طاعون نمبر نکلنے لگینگے۔ وہ ہاہا کار مچے گی کہ مجھے آدمیوں کو انتخاب کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکے گا۔ اِدہر لاہور بھر میں چوہے نام کا تو کوئی جاندار جیتا چھوڑا نہیں جائے گا۔ تو میں مفت میں چوہوں کی نسل کشی کا کیوں اپنے سر الزام لوں۔ دوستوں کی دہائی دھمکیوں کے دھڑکے سے اگرچہ ہمارے جسم و جان کے تعلقات ناخوشگوار ہو چکے ہیں۔ مگر یہ لوگ کان کھول کر سُن رکھیں۔ کہ بیماریوں سے مرنے والے ہم نہیں ہیں۔ کبھی مرے تو اپنی مرضی سے ہنستے کھیلتے ڈنٹر پیلتے مر جائیں گے۔ لیکن یہ آئے دن کی چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں۔ اس سے آدمی کو خواہ مخواہ کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔

اور اگر آ گئے ہم ضد پر تو نہیں مرینگے۔ ہرگز نہیں مرینگے۔ ساری دُنیا مر جائے۔ ہم نہیں مریں گے۔ آزما کر دیکھ لو۔ مر کر دیکھ لو۔ وبائیں بلا لو۔ طوفان اٹھا لو۔ زہر پھانک کے مر جاؤ۔ ہم کبھی نہیں مریں گے۔

اچھا جانے دو۔ سنجیدگی سے ہمیں یہ بات سمجھا دو۔ کہ طاعون پھیلے یا چیچک۔ انفلوئنزا کا زور ہو یا ہیضے کا۔ سبھی کے لیے ہے نا! ہم کچھ قدرت کے اشتہاری مجرموں میں تو نہیں ہیں۔ اچھا پھر جب سب لیے لیئے یہ وبائی خطرے ہیں۔ تو پھر یہ ہمارے مہربان صرف ہمیں ہی دردناک بشارتیں کیوں سُنایا کرتے ہیں؟ آخر اس بارہ میل کے آباد شہر میں ان الاکھ زندے اور بھی تو بستے ہیں۔ وبائیں آ رہی ہیں تو سبھی کے لیے آ رہی ہیں؟ پھر ہم تو کچھ ایسے زندوں میں زندے بھی نہیں کہ ہمیں مار کر وبا کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل کر سکے گی۔ یا کسی دربار سرکار سے اس مہم پر اسے تمغہ مل جائے گا۔ ہم تو نہیں سمجھ سکے۔ کہ موت ہمارے پاس کیوں آئیگی

مولانا تاجور نے سوانح عمری کا ذکر کر کے اس وقت ہمارے زخم ہرے کر دیئے۔ سوانح عمری لکھنے کو سو بار لکھی جا سکتی ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ خوف نہ ہوگا۔ کہ ہمارے مرنے کے بعد کوئی سوانح نگار ہمارے متعلق کیا لکھے گا؟

بھلا کوئی لکھ ہی کیا سکتا ہے؟ ہم نے کسی کے ساتھ کیا برائی کی ہے۔ جو ہمارے خلاف لکھے گا۔ اور اگر لکھے گا تو عدالت کا دروازہ کھلا ہے لائبل دائر کر کے اُسے کیفرِ کردار کو پہنچا ئیں گے۔

تو یہ خوف تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہمیں ہے نہیں۔ البتہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ مولینا ظریف کے سوانح حیات میں اولی الابصار کے لئے بہت سی عبرتیں پنہاں ہوں گی۔ اس لئے ان کے حالاتِ زندگی۔ ملک قوم دنیا اور آئندہ نسلوں کے لئے چراغِ راہ بن سکیں گے۔ البتہ یہ وجہ معقول ہے۔ ہمارے سوانح عمری لکھنے کے لئے۔ اگرچہ اس "آئندہ نسلوں" کے لفظ سے ہمیں اختلاف ہے۔ کیونکہ آئندہ تمام نسلوں میں ہم بذاتِ خود اسی جسم خاکی کے ساتھ موجود رہنا چاہتے ہیں۔ آئندہ نسلوں کو محرومی کا خطرہ نہیں ہے۔ لیکن تاہم کس کس سے ہم حالاتِ زندگی کہتے پھریں گے۔ اچھا ہے شائع ہوتے رہیں۔ لوگ پڑھ پڑھ کر مستفید ہونگے۔ ہمیں درازیٔ عمر کی دعائیں ملیں گی۔ گو ہمیں ان دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم ان کے بغیر بھی جیا کریں گے۔

اچھا تو ہم اپنی سوانح عمری شروع کرتے ہیں۔ اپنے حسب و نسب مذہب و مشرب تعلیم۔ پیدائش۔ ملازمت۔ شاعری۔ غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی پر روشنی ڈالیں گے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ جب تک ہم اپنی سوانح عمری چھپواتے رہیں۔ "ادبی دنیا" میں موت۔ مرنا۔ مرنے کے بعد اس قسم کے لفظ شائع نہ کئے جائیں۔ اگرچہ ہم ان لفظوں سے خائف نہیں ہیں۔ پھر بھی کیا ضرورت ہے ایسی بات لکھنا۔ جس سے دل خواہ مخواہ پریشان ہونے لگے۔ گو اُس کی پریشانی بے وجہ ہی ہوگی مگر احتیاط ضروری ہے۔ پھر موت خدا کا کوئی نام نہیں ہے کہ اٹھتے بیٹھتے اس کی رٹ لگائی جائے۔

(باقی آئندہ)

ظریف

موسیقی اور اعصاب

المقتطف (مصر) کے تازہ نمبر میں ڈاکٹر صروف اعصاب پر موسیقی کا اثر بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

بچپن میں ہم کتابِ مقدس کی یونانی قرأت مؤذنوں کی اذان اور مغنیوں کے گانے سے بہت محفوظ ہوا کرتے تھے۔ مگر انگلستان کے گرجوں میں جو انجیل کی قرأت سنی۔ اُس سے نہ تو ہمارے جذبات میں کوئی تحریک ہوئی۔ نہ کسی قسم کا روحانی حظ حاصل ہوا۔ بلکہ وہ آوازیں ہمیں بہت اوپری ہی اوپری معلوم ہوئیں۔ اتفاق سے ہمیں کچھ دنوں اپنے ایک امریکن دوست کے گھر میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ اس گھر کی کھڑکی کے سامنے ایک مسجد کا ماذنہ (اذان دینے کا مینار) تھا۔ اس مسجد کا ایک مشہور مؤذن جب اس ماذنہ میں آکر اذان دیتا تو اس کی خوش آوازی سے ہم بہت متاثر ہوا کرتے۔ مگر میرا امریکن دوست اور اُس کی بیوی اذان کی آواز سنتے ہی جھٹ کھڑکی بند کر کے چٹخنی لگا دیا کرتے تھے۔ ہم مجبور ہو کر دوسری کھڑکی کے پاس جا کر اُس کی اذان دلچسپی سے سنا کرتے۔ میرا دوست ارگن باجہ بجانے میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ اُس کے لئے اذان کی موسیقی ذوقِ سماعت پر گراں بار تھی۔ ادھر ارگن باجہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ کہ ایک کتاب مجھے عربی میں ترجمہ کرنے کیلئے ملی۔ اُس کتاب میں "مذہبی موسیقی اور نفوسِ انسانی پر اُس کا اثر" کے متعلق ایک باب تھا۔ کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے میں جب اس باب پر آیا۔ تو میں نے اس کا ترجمہ کر کے اپنی طرف سے ایک فٹ نوٹ میں اپنی اس رائے کا بھی اظہار کر دیا۔ کہ موسیقی سے جب تک اچھی طرح کان مانوس نہ ہو جائیں۔ وہ مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ تو موسیقی کے حامیوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اظہارِ ناراضی کے ہنگامے برپا کئے۔ یہاں تک کہ ورق جس پر میں نے اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ کتاب سے پھاڑ دیا۔ اِس واقعہ کو کئی سال گذر گئے۔ ہمیں انگریزی اور عربی موسیقی برابر سننے کا موقعہ ملتا رہا۔ ان موسیقیوں کو سنتے سنتے کان ایسے مانوس ہو گئے۔ کہ ہم دونوں قسم کی موسیقیوں سے مساوی طور پر لطف اندوز ہونے لگے۔

اسی سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ دماغ میں موسیقی کے مرکزِ شعور تک پہنچنے کیلئے موسیقی کی آوازوں کو اعصاب کے پیچ در پیچ سلسلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ موسیقی کی آواز پہلے پہلے جب اعصابی سلسلے کو حرکت دیتی ہے۔ تو اعصاب اس آواز سے نامانوس ہونے کے سبب نہ صرف یہ کہ راحت پذیر نہیں ہوتے۔ بلکہ تکان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک مدت تک ان آوازوں کو سنتے سنتے باریک اور نازک اعصاب اپنے آپ میں ان سے مانوس ہونے کی استعداد پیدا کرتے ہیں۔ اس آواز کے تموج کو اپنے احساسات کے موافق بنا کر موسیقی سے تکان اور کراہت کی بجائے لطف اٹھانے لگتے ہیں۔ پھر جب موسیقی کی آواز کے ساتھ دلکش اشعار اور دل پسند کلام بھی ملا لیا جاتا ہے۔ تو اعصاب سماعت (دماغ کے وہ اعصاب جو قوتِ سامعہ سے متعلق ہیں) کے ساتھ دوسرے اعصاب بھی اس سرور میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ تمام نظامِ عصبی میں ایک حرکتِ موسیقیہ پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ اعضا نظامِ عصبی کے زیرِ اثر ہیں۔ اس لئے نظامِ عصبی کے ساتھ ہی اعضا بھی اُس سے اثر پذیر ہو کر اسی حرکتِ موسیقیہ سے رقص کرنے لگتے ہیں۔"

(ارشاد احمد۔ ایم۔ اے۔) المقتطف (مصر)

آہ! اے انتظار اور امید سے شکستہ روح! اپنی بے برگ و گیاہ بہار کا ماتم نہ کر۔ ایامِ غم اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کے بعد خوشی کا زمانہ آئے۔

"ایڈون آرنلڈ"

امید مسرت و انبساط کیسے پردوں پر پرواز کرتی ہے۔

"برنز"

عربوں اور ہندوستانیوں کا فنِ موسیقی

رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم ایڈووکیٹ ہائیکورٹ لاہور۔

قدیم مصریوں کا ہم کو اتنا ہی حال معلوم ہوتا ہے کہ فوجوں کے ساتھ موسیقار اور گانے والے ہوتے تھے۔ مگر راگوں یا سازوں کا پتہ نہیں چلتا۔

قدیم ایرانیوں میں نزولِ الہام کے لئے موسیقی کا استعمال ہوتا تھا حضرت داؤد خوش الحانی سے گیت گاتے تھے جنہیں انگریزی میں سام اور ایرانی میں زبور کہتے ہیں۔ غالباً وہ اسی طرح گائے جاتے ہیں۔ جیسے سام وید کے منتر تین سروں سے زیادہ میں نہیں گائے جاتے۔ یا رومن کیتھلک گرجا میں لاطینی زبان میں "ہم" (Hym) سرود عارفان گائے جاتے ہیں۔

ملک شام۔ اتنا معلوم ہے۔ کہ غلامی کا رواج بہت تھا۔ یہاں کے پیشہ وروں کی غیر ملکوں میں بہت مانگ تھی۔ جو اکثر رقاصہ، مغنیہ اور ساز نواز ہوتی تھیں۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا ان میں راگ کا کوئی سلسلہ تھا۔

عربوں نے موسیقی کو نہایت ضروری ہنر سمجھکر اس میں بہت ترقی کی تھی۔ تلیڈو کے دفتر میں ایک قابل ذکر قلمی نسخہ ملا جس میں الفنزو بادشاہ کے نوٹ ملے۔ جو اس کے قلمی تھے جس کے مطابق گانے گائے جاتے تھے۔ اس میں نہ صرف چھ سُر پائے جاتے ہیں۔ جو ستمبر میں ایک گیوڈو نامی نے دریافت کئے تھے۔ بلکہ ساتواں سُر بھی اس نسخہ میں پایا گیا حتیٰ کہ سروں کے اتار چڑھاؤ کی ترکیب بھی پائی گئی۔ جو عرصہ بعد یورپ کی موسیقی میں رائج ہوئی۔ یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ الفنزو نے عربوں کے علوم سے استفادہ کر کے اور تصنیفیں کی تھیں۔ اسی طرح موسیقی میں بھی لاکلام اس نے فارابی فارجی وغیرہ کی محنتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے ضرور سیول کے مصرایوں اور مطربوں سے ان علماء کی کتابوں کے سمجھنے میں مدد لی۔ حال کی موسیقی کی ترتیب میں عربوں کا بہت بڑا حصہ تھا

اس کی تصدیق اور تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ ہسپانی فرنچ اور دیگر اقوام یورپ اولین سازوں کو انہی کی زبانوں میں مارسک کہتے تھے۔ چنانچہ ساز موسوم چرمیا اور ساز موسوم دلزینہ جو مور لوگ بجاتے تھے۔ جن کا سروینٹس اور اس کے ہمعصر مصنفوں نے بھی ذکر کیا ہے۔ اب تک ولنسیا کے صوبوں میں بجایا جاتا ہے۔

تار والے ساز جو آج کل رائج ہیں۔ ال آود (بزبان ہسپانیہ لاؤد) کے نمونہ پر بنائے گئے ہیں۔ جو عربوں کی اختراع تھی۔ انہوں نے ہی ہسپانیہ کو گٹار یا گنارا دیا تھا۔ جو اس وقت اس ملک کا قومی ساز ہے۔

کئی مصنف موسیقی کے تجویز کر رہے ہیں۔ کہ موسیقی اعداد میں لکھی جائے ان کو معلوم تک نہیں۔ کہ اس طریق کو عرب پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں مسٹر کسی ویڑ ثابت کرتا تھا۔ کہ عربوں کے سپتک میں سترہ وقفے آتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ موسیقی لکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اصول موسیقی حوالہ قلم کیا اور لکھا۔ اور اس طریق کے لئے انہوں نے اعداد سے کام لیا۔ پہلے سپتک میں ۴ تک استعمال کئے۔ دوسرے سپتک میں ایک سے ۵ تک علی ہذا ممکن بلکہ اغلب ہے کہ حال کا کارڈ واحد عدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

قدیم ہسپانی موسیقی جو ملک اندلس میں اب تک جاری ہے جو کین۔ رونڈونا بلیرا وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ در اصل عربوں کا مخترع تھا۔

ایک خانہ بدوش قوم سارے یورپ میں پھرتی رہی ہے جن کے عادات رسم و رواج میں کبھی فرق نہیں آیا۔ یہ سیلانی لوگ ہسپانیہ میں جتانو اطالیہ میں زنگاری۔ انگلینڈ میں جپسی۔ جرمنی میں زگونر اور روس میں تزگنی کہلاتے ہیں۔ اور جو اپنے تئیں فرعون کہتے ہیں تحقیقات سے اب معلوم ہوتا ہے۔ کہ در اصل یہ ہندوستان سے نکلے تھے۔ یو ہمیا اور مصر سے گھومتے گھومتے یورپ پہنچے تھے مسٹر دیاروٹ لکھتے ہیں۔ کہ ان کے گیت کا ایشیائی راگ روس اور ہسپانیہ میں پایا جاتا ہے۔ آس نے الحمرا کے باغوں میں (غرناطہ)

اور ماسکو میں اُن کے گیت سنے تھے۔ جو عربوں کی موسیقی کی گونج معلوم ہوتی تھی۔

ہندو علم الاصنام mythology کے اتنے شایق رہے ہیں۔ کہ ہر شے کو وہ اسی رنگ میں لے آتے ہیں۔

سروں کی ذاتیں بھی انہوں نے قائم کر دی ہیں۔

کھرج پنچم مدہم ——— برہمن ہیں
رکھب دہوت ——— کھشتری ہیں
گاندھار ——— نکھاد ——— ویش
کاکلی ——— شودر (کوئل کا راگ سیاہ ہوتا ہے)

اسی طرح سروں کے خاندان بھی مقرر کئے گئے ہیں۔

کھرج ——— مدہم ——— گاندھار ——— دیوتا کل
پنچم ——— پتر کل
رکھب دھوت ——— اُستی کل
نکھاد ——— دیت کل

جانوروں کی آوازوں سے بھی سُروں کو مشابہت دی گئی ہے

سُر ——— مور کی چیخ
رکھب ——— بیل کی آواز
گندھار ——— بکری کی آواز
مدہم ——— گیدڑ کی آواز
پنچم ——— کوئل کی آواز
دہوت ——— گھوڑے کا ہنہنانا
نکھاد ——— ہاتھی کی گرج

سُروں کو رنگ بھی دیئے گئے ہیں۔

		مقابلہ کے انگریزی سُر		
سُر ——— گلابی	سر	C	ڈو
رکھب ——— زردی مائل سبز	رکھب	D	اے
گندھار ——— نارنجی	گندھار	E	می
مدہم ——— زردی مائل گلابی	مدہم	F	فا
پنچم ——— سُرخ	پنچم	G	سول
دہوت ——— زرد	دھوت	A	لا
نکھاد ——— سیاہ	نکھاد	B	سی

امیر خسرو کا باپ ترکستان کا رہنے والا تھا۔ امیر خسرو خود پٹیالی ضلع ایٹہ ۶۵۱ہجری مطابق ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے تھے غیاث الدین بلبن کے ہاں نوکر رہے۔ بعد ازاں خلجی خاندان نے انہیں امرا کا رتبہ عطا کیا۔ اس وقت سے وہ امیر کہلانے لگے۔ آپ بہت طباع تھے۔ انہوں نے ایرانی مقامات کے ساتھ ہندی راگنیوں کو ملا کر نئی راگنیاں بنائیں۔

راگ درپن مصنفہ فقیر اللہ (زمانہ اورنگ زیب عالمگیر) میں مذکور ہے۔ کہ ذیل کی راگنیاں امیر خسرو کی اختراع ہیں۔ محاذ میں جن ہندی راگنیوں کو اس نے بدلا ہے۔ درج کی گئی ہیں۔

(۱) موہیار — غارا کے ساتھ ایک ایرانی راگنی ملائی۔
ا تم — پوربی کی شکل بدلی ہوئی ہے۔
یمن — ہندی ہنڈول اور ایرانی راگنی موکم کو ملایا ہے۔
سازگیری — پوربی۔ غارا۔ گن کلی ملائی ہے۔
عشاق — سارنگ بسندھا۔ موکم کو ملایا ہے۔
موافق — توڑی ماسری۔ درگاہ حسینی کو ملایا۔
ضلع — کھٹ کی تبدیل شدہ شکل ہے۔
فرغنہ — گن کلی اور غارا ملائے گئے۔
سر پردہ — گوڑ سارنگ موکم۔ بقول بعض جھنجھوٹی اور بلاولی کو ملایا ہے
شاہانہ — اڈانہ کی شکل ترمیم شدہ ہے۔
نیراج
سام خانم — ان کا پتہ نہیں ملا۔

۱۶۱۰ء میں ایک ہندو موسیقی دان نے جس کا نام سوم ناتھ تھا۔ کتاب راگ وبودہ میں اُن راگنیوں کا ذکر کیا ہے۔ جو ہندی موسیقی میں باہر سے آئیں اور اُن کو داخل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً

حسینی۔ زیلف مسالی لازور بکراج خماچ۔ سرپردہ عراق وغیرہ ؞

نیٹشے کا ایک باب

تاریک شب میں خوف و انتشار کے ساتھ تو کہاں دبکا جاتا ہے؟
اے زرتشت! اور یہ کیا ہے؟ جو تو احتیاط کے ساتھ زیر قباء چھپائے ہوئے ہے؟

کیا یہ کوئی خزانہ ہے۔ جو تیری نذر کیا گیا ہے؟ یا بچہ ہے۔ جو تو نے جنا ہے؟ یا تو خود چوروں کے راستے پر جانے لگا ہے۔ اے بدوں کے دوست؟

"سچ ہے میرے بھائی" زرتشت نے کہا "یہ ایک خزانہ ہے۔ جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔ ایک سچائی ہے چھوٹی سی جو میں اٹھائے جا رہا ہوں۔

لیکن یہ شوخ ہے ایک بچے کی مانند۔ اور اگر میں اس کے منہ کو بند نہ رکھوں۔ تو وہ بہت زور سے چلاتا ہے۔

آج جب میں غروب آفتاب کے وقت اکیلا جا رہا تھا۔ ایک بڑھی عورت مجھ سے ملی اور یوں گویا ہوئی۔

"زرتشت نے ہم عورتوں کو اکثر مخاطب کیا ہے لیکن عورتوں کے متعلق ہم سے کچھ نہیں کہا"

میں نے جواب دیا۔ "عورت کے متعلق صرف مردوں کو کچھ کہنا چاہیئے" وہ بولی "عورت کے متعلق مجھ سے بھی کچھ کہہ۔ میں بوڑھی ہوں اور اسے جلد بھول جاؤں گی"۔

پس میں اس بڑھیا کی خواہش پر رضامند ہو گیا اور یوں گویا ہوا۔

مرد عورت کے لئے صرف ایک ذریعہ ہے مقصد ہمیشہ بچہ ہوتا ہے لیکن عورت مرد کے لئے کیا ہے؟

اصل مرد دو چیزیں چاہتا ہے خطرہ اور کھیل۔ اس لئے وہ عورت کو چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ نہایت خطرناک کھلونا ہے۔

مرد کو جنگ کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ اور عورت جنگجو۔ مرد مجاہد کی تھکن دور کرنے کے لئے۔ باقی سب حماقت ہے۔

نہایت ہی شیریں پھل مرد مجاہد نہیں چاہتا۔ وہ چاہتا ہے عورت کو۔ کیونکہ شیریں ترین عورت میں تلخی ہوتی ہے۔

مرد کی نسبت عورت بچے کو زیادہ سمجھتی ہے لیکن مرد عورت کی نسبت زیادہ بچوں کی طرح ہے۔

اصل مرد میں ایک بچہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جو کھیلنا چاہتا ہے۔ اٹھو اے عورتو۔ اور میرے لئے مردوں میں بچے کو بیدار کرو۔

عورت ایک کھلونا ہے۔ پاکیزہ اور ستھرا۔ بلور کی مانند۔ منور اس دنیا کے محاسن سے جو ابھی وجود میں نہیں آئی۔

ستارے کی کرن تمہاری محبت میں درخشاں ہو۔ تمہاری تمنا ہو۔ "میرے بطن سے انسان پیدا ہو"

تمہاری محبت میں شجاعت ہو۔ اپنی محبت کے ساتھ تم اس کا تعاقب کرو۔ جس کی عظمت تمہارے دل پر حاوی ہے۔

تمہاری محبت میں تمہاری عزت ہو۔ ورنہ عورت عزت کا مفہوم بہت کم جانتی ہے۔ لیکن تمہاری عزت ہو "ہمیشہ محبت کرنا اس سے زیادہ محبت جو کی جاتی ہے۔ اور تو محبت میں کبھی موخر نہ ہو۔

مرد کو عورت سے جب وہ محبت کرتی ہے ڈرنا چاہیئے۔ اسوقت وہ ہر قربانی کرتی ہے۔ اور دنیا کی ہر شے اس کی نگاہ میں ہیچ ہے۔

مرد کو عورت سے جب وہ نفرت کرتی ہے۔ ڈرنا چاہیئے۔ کیونکہ مرد صرف اپنی روح میں غضب رکھتا ہے لیکن عورت بری ہے۔

"عورت سب سے زیادہ نفرت کس سے کرتی ہے۔ لوہے نے مقناطیس کو کہا "میں تجھ سے اس وقت انتہا نفرت کرتا ہوں۔ جب تو مجھے کھینچتا ہے لیکن اس قدر طاقت نہیں رکھتا کہ مجھے اپنی طرف کھینچ لے۔

مرد کی خوشی یہ ہے "میری مرضی" عورت کی خوشی یہ ہے "اس کی مرضی" دیکھ جس اسی آن دنیا مکمل ہو گئی ہے" ہر ایک عورت خیال کرتی ہے

جب وہ محبت کامل کے ساتھ حکم برداری کرتی ہے۔ اور عورت مرد کی اطاعت کرے۔ اور اپنی سطح کی گہرائی کو ڈھونڈے۔ سطح عورت کی روح ہے متلوّن اور مضطرب جالا پایاب پانیوں پر۔ لیکن مرد کی روح عمیق ہے۔ اس کی رو زیر زمین غاروں میں رواں ہے۔ عورت اس کے زور کا اندازہ تو کرتی ہے لیکن اس کو سمجھ نہیں سکتی۔

اس پر بوڑھی عورت نے جواب دیا "زرتشت نے بہت عمدہ باتیں کی ہیں۔ خصوصاً ان کے لئے جو جوان ہیں۔

کتنی حیرانی کی بات ہے کہ زرتشت عورتوں کو بہت کم جانتا ہے۔ لیکن اس کی رائے پھر بھی ان کے متعلق صحیح ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔

ہاں بشکریہ کے طور پر تھوڑی سی سچائی مجھ سے بھی قبول کر۔ میری عمر کافی ہے۔ اور اس کو جانتی ہوں۔

اس کو ڈھانپ لے۔ اس کا منہ بند رکھ۔ ورنہ یہ بہت زور سے چلائیگی۔ یہ چھوٹی سی سچائی۔

میں نے کہا "اے عورت مجھے اپنی چھوٹی سی سچائی دے" اور بوڑھی عورت نے کہا۔

"کیا تو عورت کے پاس جاتا ہے؟ اپنے کوڑے کو نہ بھول"۔

یوں گویا ہوا زرتشت۔

ترجمہ از جرمن

فضل کریم خاں دُرّانی

گلِ سُرخ

حوالئے کا پنیال (فرانس) میں "شنو وولاڑ" کی مہمان نوازیاں اور چہل پہل دوران جنگ کی ایک عام خصوصیت تھی۔ اس زمانے میں یورپ کے جوش وطن پرستی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا۔ کہ ہر شخص فوجی لوگوں کی مدارات ودلجوئی کو اپنا قومی فرض سمجھتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو ایک لطیفہ ہی سنا کر ان فداکاران قوم و جاں نثاران وطن کو ہنسا دینے کی کوشش کرتا تھا۔

اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ قصر وولاڑ کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور وہ قرب وجوار کے فوجی افسروں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ اور جس کا ہر اور روز عید اور شب شب برات تھی۔ آج کی شب غیر معمولی رونق و ہنگامہ تھا۔ کیونکہ صبح اس علاقہ کی فوج جرمنوں کے عظیم الشان حملہ کی مدافعت کے لئے بڑھنے والی تھی۔ ضعیف مارکوئس وولاڑ اور اس کی تنہا لڑکی مادموزال نیناں وولاڑ کا ہر ہر لمحہ اسی سعی وفکر میں صرف ہوتا تھا۔ کہ ان بیچے فرزندان وطن کی دلچسپیوں کے تمام ممکن ذرائع فراہم کئے جائیں۔

جنگ عظیم کی ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس نے دنیا کے لئے رومانی ادب بکثرت فراہم کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ بے شمار حقیقی رومانی پیدا کئے۔ اور وہ زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا۔ کہ جب راہ الفت کی کٹھن منزلیں نہایت سُرعت کے ساتھ طے ہو جاتی تھیں۔ یہ فسانہ بھی جنگ کے اسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

مادموزآل نیناں اپنی اٹھارویں بہار سے نزہت کام ہو رہی تھی۔ وہ اپنے حسن صنعت نواز پر مغرور نہ تھی۔ لیکن باخبر ضرور تھی، اپنے شباب شعلہ طراز پر مفتخر نہ تھی۔ مگر احساس ضرور رکھتی تھی۔

لوئی دو دیرسیو زہنوز لفٹننٹ کے عہدے سے آگے نہ بڑھا تھا لیکن لائٹ ہارس کی نیلی وردی میں اس کا پچیس سالہ عنفوان اور مانند تصویر نوائے جسمانی اپالو کے مجسمہ کو شرماتے تھے۔

دیرسیو کی فوج حال ہی میں اس علاقہ میں بھیجی گئی تھی۔ اور ہر چند کہ جنگ کی اسپرٹ نے یورپین رسم وعوائد میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ لیکن نیناں اور دیرسیو ز ہنوز بے تکلف نہ ہوئے تھے۔ نیناں نے غیر شعوری طور پر محسوس کر لیا تھا۔ کہ اس کے جمال صبیح اور شباب کہ جس کی قربانگاہ پر نذر چڑھ جانے کے لئے بیتاب تھے۔ وہ دیوتا یہی ہے۔ اور دیرسیوز بھی اپنے تمام محسوسات کے ساتھ آگاہ ہو چکا تھا۔ کہ اس کے لئے نیناں ہی وہ لڑکی ہے۔ جس کی محبت انسان کو دیوتا بنا دیتی

ہے۔ یہ احساس و آگاہی گو پہلی ہی نظر کا کام تھا۔ لیکن ان کی زبانیں نوجوانِ دل نہ بنی تھیں۔ جس کے لئے دونوں بے چینی کیساتھ منتظر تھے رات زیادہ گذر گئی اور مہمان رخصت ہوئے۔ ویپسیوز باوجود کوئی معقول حیلہ نہ پانے کے پیچھے رہ گیا، اور جب نینان وہلیز تک خدا حافظ کہنے آئی۔ اس سے بات نہ بن پڑتی تھی۔

"تو کیا کل کی جنگ یقینی ہے؟" مشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"قطعی مادموزال!" ویپسیوز نے جواب دیا۔

"تم کب روانہ ہو جاؤ گے؟"

"علی الصباح پانچ بجے۔ فردلو مجھے اطلاع کرنے آئے گا!"

"فردلو عجیب نام ہے!" نینان نے بھی گفتگو جاری رکھنے کے خیال سے کہا۔ "ہاں مادموزال۔ لیکن وہ ایک جوانمرد وفادار سپاہی ہے۔ اُس نے کئی بار مجھے خطرہ سے بچایا ہے!"

"تب تو وہ قابل عزت و محبت آدمی ہے!" نینان بلا ارادہ کہہ گئی اور پھر رنگ انفعال سے رنگین نظر آئی۔

"للہ اجازت دیجئے کہ آپ کا یہ غیر ارادی جملہ میرے دریائے مایوسی کا وہ کمزور تنکا ہے جس کے سہارے سے میں اپنی قوم و ملک کی خدمت کے قابل ہو سکوں گا۔ اور اس سے مجھے جرأت ہوتی ہے کہ میں ایک لطف خاص کی درخواست کروں!"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ ہے کہ میری تمنا ہے کہ صبح جب میں شرکت جنگ کے لئے روانہ ہوں، تم سے مل سکوں!"

"مگر یہ کیونکر ممکن ہے؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے!" ہر چند نینان یہ کہنا نہ چاہتی تھی مگر کہا۔

"اگر یہ ممکن نہیں تو میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکوں گا۔"

اس نے سخت مایوسی اور افسردگی کے عالم میں کہا۔

"نہیں، نہیں موسیو! میں یہ کبھی گوارہ نہ کر سکوں گی کہ تمہارے پاس میری ایسی محزون و الم ناک یادگار رہے! مگر .... اچھا میں صبح پانچ بجے تاریخی صالون کے دروازے پر انتظار کروں گی — لیکن صرف ایک منٹ کے لئے!" کشمکش جذبات کی حالت میں نینان نے اس [illegible] وعدہ کر لیا۔

نوجوان افسر اب خوش تھا اور مسرور!

شوق وصل یاب کا یہ شعر مکمل و دلآویز مصرعہ بن جانے پر مجبور ہوا۔

ایک دوسرے سے رخصت ہوئے اور ایوان عالیشان میں جہاں ابھی ابھی نور و حیات کی دنیا آباد تھی اب سکوت و تاریکی کا دور دورہ تھا۔

قصر حسین کے پائیں میں ایک قطعہ مرغزار، ایک کنج طلسم ساز کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھا، جس کی فضا تخیل نواز اور جس کا سکون شوق آفرین تھا۔

لوئی دو ویپسیوز صرف انتظار تھا۔ صالون کا دروازہ کھلا۔ اور نینان کا چہرہ چاند کی افسردہ روشنی میں چمکا۔

"آہ شہسوار، تم یہاں ہو!" نینان یہ کہتی ہوئی بڑھی لیکن بیگو منتشر لفٹننٹ نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور اپنے ہونٹوں کو اس کے پشت دست پر رکھ دیا۔

"مگر موسیو، تمہاری لیپن جھینتی ہیں!" نینان نے ہنسکر کہا۔

وہ درحقیقت نہایت نازک اندام تھی!

"مادموزال میں نے آپ کو یہ تکلیف اس لئے دی کہ اس وقت جب کہ میں فرانس کے دشمنوں کو ذلیل و پسپا کرنے جا رہا ہوں مجھے ایک ایسی شئے کی طلب ہے۔ جو مجھے اس ارادہ میں یقیناً کامیاب بنا سکے گی۔ اور وہ شئے آپ ہی عطا کر سکتی ہیں۔"

"یعنی ایک بوسۂ محبت؟"

شوق دل کی اس التجائے آخرین، عشق وطن کے اس مطالبۂ صحیح نے نینان کے چہرہ کو جذبات گوناگوں کا مظہر بنا دیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے متامل نظر آئی۔ اعماق دل سے، اپنے ضمیر سے سوال کن نظر آئی۔ اور پھر گلاب کی جھاڑی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور ایک نرم و نازک شاخ توڑ لی۔

شبنم آلود گلاب سرخ کی نکہت رنگین کو ایک طویل سانس کے ساتھ پی لینا چاہا۔ پھول کو ایک بوسۂ مدہوش سے شگفتہ تر بنایا۔ اور ویپسیوز کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ جب وہ بھی اُسے بوسہ دے چکا۔ تو خود ہی اس کے سینہ پر لگا دیا۔

"زندہ باد فرانس! کامیاب واپسی پر جب یہ پھول تم مجھے واپس دوگے۔ اس وقت تمہاری درخواست منظور ہو جائے گی!"

پہنچا نہ ہے - اور ابھی اُس وقت ہو گی - زندہ باد فرانس !"

"شکریہ !"

محبت کے اس عطیہ اور الفت کی اس یادگار کو پا کر نوجوان لفٹنٹ شاداں و فرحاں رخصت ہوا - چیتنے میں اس کی نقرئی کرچ زمین سے لگ کر وہ موسیقی پیدا کرنے لگی جس نے نینان کے حواس کو متاثر کیا - اور جو ہر لمحہ نحیف و کمزور ہو کر آخر معدوم ہو گئی ؛ اور نینان کو ایک نقش حیرت بنا گئی -

اس نے بعد میں احساس کیا - کہ جو فیصلہ اس نے کیا وہ اس کے دل کا فیصلہ نہ تھا - کیونکہ اب اس کا دل ڈوبتا نظر آتا تھا -

---

نوجوان افسر کی نیلی وردی پر سرخ گلاب جبین تر معلوم ہوتا تھا - دفعتہً فرانسیسی فوج میں جنگ کی ہماہمی نمودار ہوئی -

"چارج !" کپتان کی آواز فضا میں گونج گئی - ویرسیوز نے بھی تلوار کھینچ لی - اور فوج باقاعدہ بڑھنے لگی - چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے پیچ و خم سے نکل کر وادی میں داخل ہوتے ہی جرمن بٹالین کا حملہ ہوا - مقابلہ نہایت سخت تھا - اور ویرسیوز غیر معمولی طور پر جنگ میں مشغول تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ اس کے نزدیک اس وقت کی کامیابی کا ذمہ دار صرف وہ ہے -

"زندہ باد فرانس"! فردلو جو بالکل ویرسیوز کے ساتھ فوجی جھنڈہ لئے ہوئے لڑ رہا تھا - گولی کھا کر گھوڑے سے گرتے ہوئے نعرہ زن ہوا - لفٹنٹ لوئی ووویرسیوز کا دستہ فوج منتشر ہو چکا تھا - لیکن اسے اس کا علم و احساس اس وقت ہوا جب اس نے دم توڑتے ہوئے فردلو کا نعرہ "زندہ باد فرانس" سنا تو مڑ کر دیکھا - غیرت و مایوسی کی انتہا نہ تھی - اور اس کی تنہا جان اب ادنیٰ ترین قیمت پانے کی بھی مستحق نہ تھی - زندگی لذات سے مبرا اور موت آباد نظر آنے لگی ، کہ شکست کا اعتراف اور فوج کی فراری دل شکن اور ہمت ربا تھی -

ویرسیوز کو غور و تامل کی مہلت نہ تھی - اس نے پرچم فوجی کو مرتے فردلو کے ہاتھ سے لے لیا - برستی آگ میں اس کی نعش کو اپنے گھوڑے پر لاد لیا - اور بچتا مارتا ایک پہاڑی کے عقب میں پہنچ گیا - ہر چند وہ اس وقت کائنات سے خفا تھا ، اپنی اوقات پر نفرین کر رہا تھا - ظاہر ہے کہ وہ زندہ رہنا نہ چاہتا تھا - لیکن رفاقت ، محبت اور وطن پرستی کی دنیا میں اپنی زندگی کا ان آخری ساعتوں کو یادگار بنا دینا چاہتا تھا - کہ فردلو ، نینان اور فرانس کے لئے ویرسیوز کا نام ننگ و غیرت کا مرادف نہ ہو !

اس کا پہلا کام فردلو کی تدفین تھی - دوسرا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے زخموں کو نہایت کس کر باندھا تاکہ خون کا بہنا بند ہو - اور وہ اس خون سے اپنا نام بہادران قوم و وطن کی فہرست میں لکھ سکے -

ہنوز وہ اس کام سے فارغ نہ ہوا تھا - کہ فرانسیسی سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا دستہ ہزیمت خوردہ ادھر آ نکلا - اس نے ان کو منظم کیا - اور ایک نئے راستہ سے جرمنوں پر حملہ آور ہوا - جھٹ پٹا ہو چکا تھا - جرمن فوج کو اس حملہ کا گمان بھی نہ تھا - ان کو یقین ہو گیا - کہ یہ فرانسیسیوں کی نئی فوج کا غیر متوقع حملہ ہے -

اس یقین کے بعد وہ مدافعت کے لئے طیار نہ ہو سکی - اور سراسیمہ ہو کر بغیر لڑے پسپا ہو گئی -

ویرسیوز نے مورچہ پر فرانسیسی پرچم گاڑ دیا !

"زندہ باد فرانس ! زندہ باد گلاب سرخ !! زندہ باد گلہائے خوں !!!"

اس کے سپاہیوں نے بھی اسی جوش کے ساتھ نعرے لگائے - ہر چند ویرسیوز کا تمام خون حیات بہہ گیا تھا - لیکن اس کا چہرہ اب بھی گلاب کی طرح سرخ و شگفتہ تھا - شاید اس کی رہی سہی سکت ان نعروں کی نذر ہو گئی - اور وہ "کامیاب واپسی پر جب تم یہ پھول مجھے واپس دو گے اس وقت تمہاری درخواست منظور ہو گی .... نینان ! نینان !" کہتا ہوا انڈھال ہو گیا -

وہ ویرسیوز ابھی وادی میں خوابیدہ ہے - اور اس کے سنگ مزار پر "زندہ باد فرانس ! زندہ باد گلاب !! زندہ باد گلہائے خوں !!!" کندہ ہے ہر چند وہ گلاب بھی مرجھا گیا ہے - اور اس کے خون کے پھول بھی ماند پڑ گئے ہیں - لیکن نینان کے صرف سے بنائے ہوئے ویرسیوز اسپتال کی چیف نرس خود نینان جب کسی کے زخم سے خون بہتا دیکھتی ہے - تو اسے دوائی کے ساتھ اپنے آنسوؤں سے بھی دھوتی ہے !

(ماخوذ از فرنچ)

(رانی - اختر)

آہ میں اگر ہمدم بادیہ نشیں ہوتا

صبح و شام کے جلوے میرے آشنا ہوتے
روز و شب کے نظّارے کیسے دل نزا ہوتے

رات اپنے تاروں کو میرے روبرو کرتی
جنگلوں کی خاموشی مجھ سے گفتگو کرتی

عاشقی میں ہر شئے سے لذّت و اثر لیتا
حُسن کی اداؤں کو دل میں جذب کر لیتا

یا کسی گڈریے کی زندگی مجھے ملتی
دائمی مسرت کی چاشنی مجھے ملتی

مُنہ دُھلاتی جب شبنم آ کے سبزہ زاروں کے
گوشِ شوق سے سنتا گیت آبشاروں کے

فصلِ لالہ و گل کی جاں فزا ہواؤں میں
وادی و بیاباں کی دلربا صداؤں میں

فطرتِ حسیں از خود بے نقاب ہو جاتی
زندگی کی ہر خواہش کامیاب ہو جاتی

شہر میں مقیّد ہوں اور خوشی سے بیگانہ
آدمی یہاں پر ہے آدمی سے بیگانہ

دوستی کے پردے میں عام ہے ریاکاری
آہ نسلِ آدم کا کام ہے ریاکاری

بن رہا ہے دنیا کا مرکزِ نظر سونا
چاہتا ہے دھوکے سے آج ہر بشر سونا

آدمی سے کرتا ہے آدمی طلب سجدے
رہ گئے ہیں لے دیکر اپنے پاس اب سجدے

ساہوکار کے گھر میں روز دھن برستا ہے
اور غریب کا بیٹا رزق کو ترستا ہے

چل رہے ہیں گودڑ میں لال بے نصیبوں کے
دیکھتا ہوں میں چہرے زرد ہیں غریبوں کے

پھر بھی نوعِ انساں کے کام آ نہیں سکتا
آہ رونے والوں کو میں ہنسا نہیں سکتا

ہاں اگر خدا مجھ کو لعل و سیم و زر دیتا
میں جہان کو غم سے بے نیاز کر دیتا

آہ سمِّ قاتل ہے شہر کی ہوا مجکو
مل رہی ہے جینے کی مستقل سزا مجکو

کاش شہر والو میں تم سے بے خبر ہوتا
دور شہر سے میرا جنگلوں میں گھر ہوتا

فاخر، بی اے، ہریانوی

تعلیمی حصّہ

ملکۂ انگلستان

انگلستان کے ایک نسوانی رسالے میں ملکۂ انگلستان کے مختصر سے حالات اس نمبر کے خاص مضمون کی حیثیت سے شایع ہوئے ہیں - اس میں بتایا گیا ہے کہ ملکہ میری اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود امور خانہ داری میں کسقدر مسرت کے ساتھ دلچسپی لیتی ہیں اور کس طرح ہمیشہ اس کوشش میں محو رہتی ہیں کہ گھر کو صحیح معنوں میں جنت کا نمونہ بنایا جائے - آپ کی تمامتر توجہ ہمیشہ اپنے ذیشان شوہر اور بچوں کی آسائش اور آرام کی طرف منعطف رہتی ہے - یہانتک کہ بعض اوقات انہیں اپنے آرام کو بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے - وہ جانتی ہیں کہ حقیقی طور پر خاوند اور بچوں کی مسرت اور انکا آرام ہی گھر کی بیوی کے لئے آرام اور مسرت کا باعث ہوسکتا ہے - اور اپنے بچوں کی تربیت میں وہ ہمہ تن اسی طرح مصروف رہتی ہیں - جس طرح اسکول کی ایک معلمہ - اس مضمون کا کچھ حصہ ہم ذیل میں ہندوستانی لڑکیوں کے لئے پیش کرتے ہیں جنہیں بڑے ہو کر قوم کی مائیں بننا ہے - وہ دیکھیں گی کہ دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ کی تربیت کنوارپنے سے لیکر بڑھاپے تک کن اصول پر ہوئی ہے - اور وہ تمام عمر کس مقدس فرض کی ادائیگی میں مصروف رہی ہیں -

"شاہ ایڈورڈ ہفتم نے ایک بار کہا تھا - کہ ملکہ میری انگلستان بھر میں خانگی امور کا بوجہ احسن انتظام و انصرام کرنے والی اور مدبرترین خاتون ہیں - بیشک آپ اس مدح و توصیف کی مستحق ہیں - لیکن شاہ کو اس امر کا احساس تھا کہ میری کی شخصیت ان تعریفی الفاظ سے بلند تر ہے -

جس وقت سے انکی شادی ہوئی ہے انہوں نے اپنے وقت کو خاوند کے آرام و آسائش - خاندان کی نگہداشت اور گھر کے انتظام و انصرام کے لئے وقف کر رکھا ہے - شادی کے اوّلین ایام میں جب وہ ڈچز آف یارک تھیں انکے تمام اوقات بچوں کی نگہداشت میں صرف ہو جاتے تھے - پرنسس آف ویلز ہوتے ہی آپ پر پبلک اور معاشرتی (سوشل) فرائض کا بار آ پڑا - اور آپ نے کمال جانفشانی اور وفاداری سے سر انجام دیا - لیکن مصروفیت کے ان ایام میں بھی آپ کی اولین توجہ اپنے خاوند اور بچوں کی طرف ہوتی تھی اور گھر سے باہر کی نسبت خانہ داری کی مصروفیتوں کے درمیان آپ خوش و خرم رہتی تھیں -

آپ کی انتظام خانہ داری کی قابلیت اور خوش تدبیری کے ایک یا دو پہلو خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

آپ کی پرورش عیش و آرام کے گہوارے میں نہیں ہوئی تھی - اور آپ کا خاندان کوئی متمول خاندان نہیں تھا - ڈچز آف ٹیک "وہائٹ لاج" میں نہایت سادہ طور پر زندگی بسر کرتی تھیں اس زمانہ میں ملکہ میری نے جو اسوقت "پرنسس مے" کہلاتی تھیں اپنی والدہ سے وہ سب کچھ سیکھ لیا - جو ایک مدبر اور خوش انتظام بیوی کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ باعث فخر ہوسکتا ہے - اور اسوقت ہی آپ میں اسقدر انتظامی قابلیت پیدا ہوگئی تھی کہ آپ مختصر سی آمدنی میں کفایت شعاری اور خوش تدبیری سے ایک اچھے گھر کا انتظام کرسکیں -

آپ کی والدہ ڈچز آف ٹیک کہا کرتی تھیں کہ خانہ داری کے اچھے انتظام کا انحصار باورچی خانہ کے مناسب اہتمام پر ہے - اور جب ملکہ میری کو شادی کے بعد اس ذمہ داری کو سنبھالنا پڑا - انہوں نے اپنی والدہ کے قول کو فراموش نہ کیا -

ہر میجسٹی ملکہ میری پہلی پرنسس آف ویلز اور ملکۂ انگلستان ہیں جنہوں نے اس امر کو اپنی عادت کا ایک حصہ بنا لیا ہے کہ باورچی خانے کو ذاتی طور پر جا کر ملاحظہ فرمایا کریں - آپ کی یہ عادت "مار برو ہوس" قلعہ ونڈسر بکنگھم میں متواتر رہی ہے - اور یہ اس طویل تجربہ کا ہی نتیجہ ہے کہ مطبخ شاہی میں کوئی چیز بھی

ضایع ہونے نہیں پائی۔

خدمت پیشہ لوگ مہتمم کی بیجا نکتہ چینی سے اکثر نالاں رہا کرتے تھے۔ لیکن ملکہ میری کو قدرت نے اخلاق و علم کا وہ بیش بہا عطیہ دیا ہے جو صنفِ لطیف کا قابل قدر زیور ہے۔

فرائض عامہ اور خدمت خلق کے دوران میں آپ کو چند ایک ایسے دل شکستہ مصیبت زدوں کو بھی دیکھنا پڑا جن کی امداد کی بظاہر کوئی سبیل نہ رہی تھی۔ لیکن ملکہ انگلستان کی ہمدردی سے وہ محروم نہ رہے۔ اور انکی مصیبت تاریکی کی طرح روشنی سے دور ہوگئی۔

ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں ملکہ انگلستان سے روزانہ ملنا پڑتا ہے۔ میری کی عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔

انکی انتظامی قابلیت جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ انگلستان بھر میں لاجواب ہے۔ ان کی خواہش ہمیشہ یہ ہوتی ہے۔ کہ گرد و پیش کے لوگ بھی حتی الوسع اسی تندہی اور سرگرمی سے اپنے فرائض کو انجام دیں۔

ملک معظم کی بیماری کے ایام میں آپ کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ لیکن آپ نے اس خوبی اور قابلیت سے انہیں سرانجام دیا کہ صرف گرد و پیش کے لوگوں پر ہی نہیں بلکہ تمام انگریز قوم پر ملکہ میری کی عظمت آشکارا ہوگئی۔

رشی رام بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

بزم تحقیق

اس عنوان کے تحت میں اردو زبان کے متعلق سوالات و جوابات، متنازعہ فیہ ادبی مسائل کی بابت تحقیق و تدقیق۔ اردو گرامر کی ترمیم و تنسیخ۔ اردو املا کی تصحیح۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث۔ جدید الفاظ کی اختراع نیز دیگر اختلافی امور پر بحث و تمحیص پر مشتمل مضامین شایع ہوا کرینگے۔ جو اہل قلم ان معرکۃ الآراء ادبی مباحث میں حصہ لینا چاہیں ان سے صرف اتنی گذارش ہے کہ نفس مسئلہ تک مضمون کو محدود رکھیں اور اختصار سے کام لیں۔

ہم نے اہل علم و ادب کی ایک مجلس اسی مقصد کے لیئے قائم کی ہے جو ہر نوعیت کے ادبی مسائل پر بحث و تمحیص کے بعد اپنے فیصلوں کا اعلان کیا کرے گی۔

تجاویز

(۱) ایسے الفاظ جنکے اخیر میں ہائے مختفی ہو جیسے مدینہ نگینہ۔ شبہ۔ فتنہ۔ وغیرہ کے ساتھ جب علامات اضافت کا۔ کے کی۔ حروف جارّہ میں۔ سے۔ پر یا علامت مفعول کو میں سے کوئی حرف یا علامت آجائے تو اخیر کی ہائے مختفی کا لہجہ یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔ "مدینہ" سے مدینے میں۔ مدینے کا۔ مدینے پر۔ مدینے کو وغیرہ۔ ان حروف و علامات کے ساتھ ان الفاظ کا املا دہلی و لکھنو میں دونوں طرح آتا ہے۔ ہائے مختفی کے ساتھ۔ مدینہ "مدینہ میں"۔ اور یائے مجہول کے ساتھ بھی "مدینے میں"۔ لہجے میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ ہر جگہ یائے مجہول کا لہجہ استعمال ہوتا ہے۔ البتہ املا دونوں طرح آتا ہے۔ پنجاب میں

ایسے الفاظ کے ساتھ مذکورہ بالا حروف و علامات آئیں تو املاء میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا۔ پنجاب میں یہ املا دلی لکھنؤ کی تقلید سے رائج ہوا ہے۔ لیکن ایک خرابی اس سے اور پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ ان الفاظ کا ان حروف و علامات کیساتھ لہجہ بھی املاء کے مطابق ہو گیا ہے۔ مثلاً مدینہ کا شہر لکھینگے تو مدینا کا شہر پڑھینگے یہ لہجہ قطعی صحیح نہیں۔ اور عام ہو رہا ہے اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر جگہ ان علامات کے ساتھ ان الفاظ کا املا یائے مجہول کے ساتھ قرار دیا جائے۔ پنجاب میں جہاں مادری زبان اُردو نہیں ہے اس قاعدے کی ترویج نہایت ضروری ہے

(۲) میری اپنی رائے۔ میرا اپنا خیال۔ میرا اپنا گمان۔ میرا کے ساتھ اپنا کا استعمال پنجاب سے شروع ہوا ہے۔ بیرون پنجاب کے اکثر فصحا اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ اس کی جگہ میری ذاتی رائے۔ میرا ذاتی خیال۔ میرا ذاتی گمان استعمال کرتے ہیں۔

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب اس میرا اپنا کو رائج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اب اسکو غیر فصیح تصور نہ کرنا چاہیئے دلی کے مشہور انشا پرداز خواجہ حسن نظامی اور ملک کے بہت سے اہل قلم اس "میرا اپنا" کو بے ارادہ اور بے تکلف لکھنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ہر جگہ میرا کے ساتھ ذاتی کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے۔ لیکن اپنا کو ہر جگہ لا سکتے ہیں۔

(۳) کوسنا۔ بد دعا کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہی اس کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن پنجاب میں سبّ و شتم اور بُرا بھلا کہنے کی جگہ بولا جانے لگا ہے۔ یہ استعمال غیر صحیح اور غیر فصیح ہے۔ پنجاب کے اہل قلم کو اس غلط استعمال سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کوسنا ہمیشہ بد دعا کے معنی میں استعمال ہونا چاہیئے بُرا بھلا کہنے کی جگہ کوسنا نہیں بولنا چاہیئے۔

مذکورہ بالا تجاویز کو تسلیم کرنے میں غالباً کسی کو اختلاف نہ ہوگا لیکن دو تین نمبروں تک انتظار کر کے ادبی دنیا کی "مجلس علمیہ" کا فیصلہ شایع کیا جائے گا۔

ہندوستانی زبان کیلئے رسم الخط کے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ذیل کی تجویز ارسال فرماتے ہیں۔

"ناگری اور فارسی رسم الخط کے جھگڑوں نے ہندوستانی ادبیات کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہی ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلافات کی خلیج وسیع کر رکھی ہے۔ اس نقصان اور ان اختلافات کو دور کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہندوستان کی لینگوا فرینکا کے لئے ناگری اور فارسی رسم الخط کی بجائے "رومن کیرکٹر" تجویز کیا جائے۔

رومن کیرکٹر میں ہندی اور اردو کی بعض آوازوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے ایک ہندوستان کے لئے ایک زبان بن جائے گی۔ اور ہندوستانی لٹریچر سارے ہندوستان کے لئے ہوگا۔ مغربی اقوام کو بھی اس لٹریچر سے فائدہ اٹھانے میں سہولت ہو جائے گی"۔

پروفیسر صاحب کی اس تجویز پر تائیدی یا تردیدی دونوں قسم کے مضامین شایع کئے جائینگے۔ بشرطیکہ مدلل اور مختصر ہونے کے ساتھ ہی بے ضرورت تلخیوں سے پاک ہوں۔

ناجور

اگر ایک ہیرے یا پھول کی بجائے ہم ایک خوبصورت خیال وفادار دوست کے دل کی نذر کر سکیں۔ تو یہ نذرانہ فرشتوں کے عطیے کی مانند ہوگا

"میکڈانلڈ"

حقیقی مسرت دوستوں کی کثرت میں نہیں۔ بلکہ ان کی قدر و منزلت اور انتخاب میں ہے۔

"جانسن"

مسرت ایک ایسا شگفتہ اور معطر پھول ہے۔ جو مہکتا ہے۔ اور بیشمار پژمردہ دلوں کو شاداب اور معطر کر دیتا ہے۔

"بائرن"

مسئلۂ ارتقاء

(از پروفیسر گنگا رام کوہلی ایم ۔ اے دیال سنگھ کالج لاہور)

ہمارے اردگرد چاروں طرف جاندار حیوانات و نباتات کی دُنیا آباد ہے ۔ یہ حیوانات اور نباتات شکل و صورت میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ۔ لیکن اجزا اور خواص کے لحاظ سے آپس میں بہت ملتے جُلتے ہیں ۔ اُن کی آفرینش اور انکے وجود کی نسبت مختلف طبقوں کے عالموں نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں ۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لیکر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ لیکن قدیم زمانہ کے جو پودے اور جانور زمین کھود کر نکالے گئے ہیں ۔ انکو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ حال کے جانوروں اور پودوں سے بہت مختلف تھے ۔ دوسرا خیال یہ ہے ۔ کہ جسطرح زمانہ حال کے جانور اور پودے اپنی ایک شکل و صورت رکھتے ہیں ۔ اسی طرح پچھلے زمانہ کے جانوروں اور پودوں کی اپنی الگ شکل و صورت تھی ۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ زمانہ حال کے جانور اور پودے پچھلے زمانہ کے جانوروں اور پودوں کی اولاد نہیں ہیں ۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چلکر بتائینگے یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے ۔

آخری خیال جو اس بارے میں پیش کیا گیا ہے ۔ اس کا خلاصہ سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ زمانہ حال کی تمام مخلوق زمانہ ماضی کی مخلوقات سے پیدا ہوئی ہے ۔ اور زمانہ مستقبل کی مخلوق کو پیدا کرنیوالی ہے ۔

اب دنیا میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہوگیا ہے ۔ جن کی رائے یہ ہے کہ دنیا کی ہر ایک چیز بتدریج یعنی یکے بعد دیگرے درجہ بدرجہ ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے ۔ یہ لوگ مسئلہ ارتقا کے حامی کہلاتے ہیں ۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہم جو مخلوقات آج دیکھ رہے ہیں ۔ وہ پرانے زمانے کی مخلوقات کی اولاد ہیں ۔ جو شکل و صورت کے لحاظ سے موجودہ زمانے کی مخلوقات کے مقابلہ میں بہت سادہ تھیں ۔ اسی طرح پرانے زمانے کی مخلوقات اس سے بھی زیادہ پرانے زمانے کی مخلوقات کی اولاد تھیں ۔ جن کی شکل و صورت میں اور بھی زیادہ سادگی تھی ۔ اسی طرح سے سراغ لگاتے لگاتے ہم اس زمانہ میں پہنچ جاتے ہیں ۔ جب زندگی کی دنیا میں ہر طرف سادگی ہی سادگی نظر آتی تھی ۔ پہلے پہلے اس خیال پر بڑی نکتہ چینی ہوتی رہی ہے اور ایک حد تک اب بھی ہوتی ہے ۔

زندہ مخلوقات کی بیشمار قسمیں ہیں ۔ اور انکی شکلوں اور عادتوں میں بڑا فرق ہے لیکن اسکے باوجود وہ سب کی سب ایک ہی جیسے مقاصد کے لئے جدوجہد کرتی ہیں ۔ یعنی ان سب کو خوراک کی تلاش رہتی ہے ۔ وہ سب اپنی زندگی کے ساتھی ڈھونڈتی ہیں اور اپنے آرام و آسائش کے لئے مکان بناتی ہیں ۔ مسئلۂ ارتقا میں ان سب باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے

مسئلہ ارتقا بتاتا ہے کہ جانوروں اور پودوں میں باہم مشابہت اختلاف ۔ اور رشتہ داری کی وجہ کیا ہے ۔ اسنے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ سادہ قسم کے والدین کی اولاد تدریجی تبدیلیوں سے گزر کر رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ شکل و صورت اختیار کرتی گئی ۔ اس طرح سے مسئلہ ارتقا کے ذریعے یہ اصول قائم ہوجاتا ہے ۔ کہ آج ہمیں زندگی کی جو مختلف شکلیں نظر آرہی ہیں ۔ ان سب کی ابتدا ایک ہی طریقے پر ہوئی اور ان میں باہم ایک قسم کی رشتہ داری

اصول ارتقا کوئی نیا اصول نہیں - بلکہ اسکا خیال حضرت مسیح سے کئی سو سال پہلے یونانیوں میں پیدا ہو گیا تھا - مسئلہ ارتقا بھی حقیقت میں انسانی فہم کی تدریجی ترقی کی ایک پرانی داستان ہے - لیکن زمانہ قدیم کے سائنسدانوں کی لگاتار محنت اور کوشش کے باوجود ارتقا کا اصول اسوقت تک عام لوگوں کے ذہن نشین نہ ہو سکا - جب تک مخلوقات کی ابتدا کے متعلق ڈارون کی مشہور آفاق کتاب شایع نہ ہوئی - اب تمام سائنسدان مسئلۂ ارتقا کے قائل ہو گئے ہیں - اور عام لوگوں میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہے - جو اس اصول کی تردید یا مخالفت کریں - گو ممکن ہے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں - جنکو اس اصول کے صحیح ہونے کا یقین نہ ہو -

باقی آئندہ

اُردو شاعری

اس عنوان کے تحت میں اردو شاعری پر تعلیمی نوعیت کے مضامین درج ہوا کریں گے شعر کے محاسن - نقائص - پابندیاں جدتیں - نئے اوزان - جدید اسالیب بیان غرضیکہ شعر اور شاعری کے متعلق ہر پہلو پر بحث کی جایا کریگی :

اُردو شاعری نے تقلیدی نشو و نما کے سبب فارسی شاعری کی بے ضرورت پابندیوں اور بے محل فنی قیود سے اپنا بال بال گرفتار کر رکھا ہے - ایمان کی تو یہ ہے - کہ اسکی موجودہ صنعتی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اسے بمشکل ہندوستانی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے - اسکے اوزان و بحور بدیشی - اسکے خیالات و تلمیحات بدیشی اسکے لیلی مجنوں اور فرہاد و شیریں بدیشی - اِس کے بلبل و بہار بدیشی - اسکی ساخت اور اسکا سراپا بدیشی - یہی وجہ ہے - کہ اُردو شاعری میونسپلٹی کے حدود سے باہر نہیں نکل سکی - حالانکہ ملکی شاعری ملک کے دیہاتیوں - بادیہ نشینوں اور شہری زندگی سے بیخبر لوگوں میں پیدا ہوتی ہے - انہیں میں فروغ پاتی ہے - وہی اس کے پیکر میں فطرت کی روح پھونکتے ہیں دیہات اور صحراؤں کی آزاد ہوا اسے راس آتی ہے - میونسپل ایریا میں گھسی اور اپنا بے داغ سادہ اور فطری لباس اتار کر صنعتی رنگینیوں میں ڈوب گئی - بخلاف اُردو شاعری کے کہ یہ تمدن اور تہذیب کے گہواروں میں کروٹیں بدلنے کی عادی ہو گئی ہے - اسے شہر سے نکالنا مچھلی کو پانی سے باہر کر دینے کے برابر زندگی سوز ہے - یہیں سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو شاعری غیر ہندوستانی زندگی بسر کر رہی ہے اسے ملکی بنانے کے لئے ہمیں اصولی تبدیلیاں کرنی پڑینگی - اس کے لیلی مجنوں کی جگہ ہیر رانجھے کو ملنی چاہیئے - اسکے رستم و سہراب کو بھیم و ارجن کے لئے جگہ خالی کرنی ہوگی - اسکی بہار کو برسات سے اس کے بلبل کو کوئل اور پپیہے سے - اسکے مرد میدان ترک کا کسی اصلی یا فرضی بہادر حسینہ سے تبادلہ کر دینے کی ضرورت ہے -

اس سے یہ مطلب نہیں کہ ابتک جو شاعری ہو چکی ہے - وہ دریا بُرد کر دینے کے لایق ہے - قطعاً نہیں - کیونکہ باوجود اس غیر فطری زندگی کے اُردو شاعری میں زندگی کے لئے بہت سی عبرتیں، رفعتیں اور رہنمائیاں پنہاں ہیں - غالب - حالی - اکبر - اقبال اور دوسرے بلند رتبہ اُردو شعرا کے ساحرانہ کارناموں کو ہم کیونکر

فراموش کر سکتے ہیں ۔

ہم جو پروگرام پیش کر رہے ہیں ۔ اسکا مقصد یہ ہے ۔ کہ اُردو شاعری کو ایسے ہندوستانی قالب میں ڈھالا جائے ۔ کہ اسکے چہرے سے ہندوستانیت ٹپکے ۔ ہندوستانی خیالات کی یہ آئینہ داری کرے ۔ اور ہندوستان بحیثیت مجموعی اسے اپنا سمجھنے لگے ۔

اگر دہ سالہ اصلاحاتی اقساط کو ہم حوصلہ آزما صبر کے ساتھ بھی منظور کرتے رہے تو تیسری نہیں تو چوتھی قسط پر یعنی آج سے بیس سال بعد انگریزی زبان کو اپنی حکومتی حیثیت سے دست بردار ہونا پڑے گا ۔ اور پھر ہندوستانی زبان (وہ کسی رسم الخط میں ہو) حکومتی زبان بنے گی ۔

ہمیں اُس خوش قسمت ہندوستان کو ہر وقت نگاہِ یقین کے سامنے رکھنا چاہیئے ۔ جب عبداللہ اور رام چند کے امتیازات مٹ جائینگے ۔ جب ہندو مسلم مفاد کی خونریز فرقہ دارانہ اصطلاحیں لغات سے چھیل کر مٹا دی جائیں گی ۔ اور جب ہندوستان میں صرف ہندوستانی پیدا ہوا کرینگے ۔ جب مذہب کو اجتماعی حیثیت کی بجائے ذاتی عقیدے کی صورت اختیار کرنی پڑیگی اسوقت وہی زبان وہی شاعری وہی لٹریچر ہندوستانی لٹریچر کی حیثیت میں ہندوستان گیری حاصل کر سکے گا ۔ جس میں ہندوستانی قوم کے ملکی خط و خال سب سے روشن نظر آئینگے ۔

اردو ادب اور اردو شاعری کے لئے جو انقلابی پروگرام ہم پیش کر رہے ہیں ۔ اسکا مقصد صرف یہی ہے کہ آزاد ہندوستان کو ہم اسکے شش جہات میں ایک گونجنے والی زبان ۔ ایک زندہ ملکی شاعری اور ایک سرمایہ دار لٹریچر نذر کے طور پر پیش کر سکیں ۔

یہ وقت آئیگا ۔ یہ وقت آنے والا ہے ۔ یہ وقت آکر رہے گا ۔

نوٹ ۔ آیندہ نمبر میں اردو شاعری پر ایک بیانیہ اور نفس شعر پر ایک تعلیمی مضمون شایع ہوگا ۔

ناجور

ترانۂ وحدت

گیا اٹھا لے کے نہ خاک آرزو تیری — ہے میری خاک کے ذرّوں کو جستجو تیری

چمن میں آکے کبھی اپنا ذکرِ خیر تو سُن — کلی کلی کی زباں پر ہے گفتگو تیری

میں ڈھونڈنے تجھے دیر و حرم میں کیوں جاؤں — کھچی ہے دل پہ میرے شکل ہو بہو تیری

نہیں ہیں غنچہ و گل فیض سے ترے محروم — کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

دُھلا رہی ہے چمن میں ہر اِک کا منہ شبنم — کہ پتّہ پتّہ کرے یاد با وضو تیری

وہ کون ہے کہ ہے محرومِ نعمتِ احساس — وہ کون ہے کہ نہیں جس کو آرزو تیری

ابوظفر نازشؔ رضوی

عالم اطفال

پیئر لوتی

مشرق کا یہ شیدائی ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو فرانس کے ایک مقام "راش فور" میں پیدا ہوا۔

بچپن میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ یہ بچہ جوان ہو کر ایک پُر جوش فطرت پرست اور نامور سیاح ہوگا۔ لیکن لوتی کا بیان ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی کا نقشہ بچپن ہی میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر پہروں افق کو دیکھتا تھا۔ وہ دریا سے "شارانت" کو دیکھ کر جو دور سے ایک نقرئی ڈورے کی مانند لہراتا نظر آتا۔ مستقبل کے خیالات میں محو ہو جاتا۔ اور اپنی تمام زندگی کو اس مختصر سے عرصہ میں مشاہدہ کر لیتا۔

لوتی کو بچپن میں ہم عمر بچوں سے کھیلنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اسکے بڑے بھائی کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ اس وقت وہ بحری اسکول کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اور اُسے اس قدر فرصت نہ تھی کہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیل میں وقت صرف کر سکے۔ لوتی بیان کرتا ہے کہ وہ بہت خاموش طبع تھا۔ اور ہمیشہ اپنے کمرے میں مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ لوتی کے دل میں اس کی بڑی محبت تھی مگر وہ شاذ ہی کبھی اس کے کمرے میں گیا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے سپاہی دوستوں کا خیال جو اکثر اسکے پاس آتے تھے اُسے اسکے کمرے میں جانے سے روکتا تھا۔

لوتی کی ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اُس کا نام ماری تھا۔ جس وقت لوتی پیدا ہوا اُسکی عمر ۱۹ سال تھی۔ وہ اس کی ہر وقت کی رفیق تھی۔ لوتی عموماً اُسی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ اس لئے گھر والوں کو اس سے قدرتی طور پر زیادہ محبت تھی۔ یہ محبت ہی کو لوتی نے اس وقت اُسے محسوس نہیں کیا۔ اسے اسکے ہم عمروں سے ملنے کا موقعہ نہ دیتی تھی۔ اور وہ غیر فطری طور پر اس طفلانہ شوخی اور شرارت سے محروم رہا۔ جو بچوں میں لازمی طور پر ہونی چاہئے۔ اس نے اسے اسقدر شرمیلا بنا دیا کہ جب وہ اسکول میں داخل ہوا لڑکوں نے اُس کا نام لوتی رکھ دیا۔ لوتی ایک پھول ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دیکھتے ہی شرما جاتا ہے اور اپنی پنکھڑیاں سمیٹ لیتا ہے۔

لیکن یہی شوخی اور بے ساختگی جس کو بچپن میں ظاہر ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ اس میں محفوظ رہی اور بڑے ہو کر اس اسلوب بیان اور طرز نگارش میں نمودار ہوئی جس نے لوتی کو بلاشبہ اپنے وقت کا بے نظیر مصنف بنا دیا۔ جوان ہو کر بچپن کے واقعات کا ذکر وہ اس شوخی کے ساتھ کرتا ہے جو بچوں میں ہوتی ہے اور پڑھنے والے پر قریب قریب وہی جذبات طاری ہو جاتے ہیں۔

لوتی کا باپ ایک پروٹسٹنٹ مذہب کا عیسائی اور گرجے کا معمولی عہدہ دار تھا۔ مذہب کی پابندی بچوں کو بھی بڑی شدت سے کرنی پڑتی تھی ہر صبح اُٹھ کر انہیں گرجے جانا ہوتا تھا۔ لوتی اس واقعہ کا ذکر بالکل انہیں الفاظ میں کرتا ہے جن کی ایک آرام طلب بچے سے توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے "ہر روز صبح کا اُٹھنا۔ الٰہی توبہ! اُٹھنا! اُٹھنا! اُٹھنا! اُٹھنا نہ ہوا بلائے جان ہو گیا"۔

اپنی دادی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ بہت بوڑھی تھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن عجیب عورت تھی۔ میں نے بارہا اُسے آئینے کا منہ چڑاتے اور اپنے عکس سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ اکثر اوقات وہ مارنے کے لئے تھپڑ بھی تانتی۔ لیکن جب اِدھر سے بھی برابر کا جواب ملتا تو تیوری چڑھا کر ایک طرف ہو جاتی"۔

لوتی کو پڑھنے کا شوق بالکل نہ تھا اور اُسے جماعت میں ایک سست اور ناکارہ لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اس نے جماعت میں کبھی امتیازی درجہ حاصل نہیں کیا۔ لوتی کے والدین نے بھی اس طرف کچھ توجہ نہ کی۔ اور لوتی کتابی علم سے بے بہرہ ہی رہا۔ اس کا ذکر تحریر و تقریر میں اس نے خود بھی بارہا کیا ہے۔ یہاں تک کہ جب اسے ایک فرانسیسی مصنف کی حیثیت سے "فرنچ اکیڈمی" میں لیا گیا۔ اس نے نہایت جرات اور فخر کے ساتھ کہا۔ "Loti ne sait pas lire." لوتی پڑھنا نہیں جانتا۔ فرنچ اکیڈمی کے انتخاب کی خبر اُسے اُس وقت ملی تھی جب اسکا جہاز الجیریا کی بندرگاہ پر ٹھہرا ہوا تھا۔

پڑھنے لکھنے کے برعکس اُسے اپنی ماں کی طرح جانوروں سے بہت محبت تھی۔ اس نے چند بلیاں پال رکھی تھیں جن کے ساتھ وہ کھیلتا رہتا تھا۔

بلیوں سے اُسے مرتے دم تک محبت رہی۔ جب وہ تمام مشرق کی سیاحت کے بعد اپنے گھر "شفورہ" میں واپس آیا۔ اُس وقت بھی اُس کے پاس کئی بلیاں تھیں جنہیں گود میں اُٹھا کر وہ باغ کی سیر کیا کرتا تھا۔

پیئر لوتی کا ایک چچا جہاز پر بھی ملازم تھا۔ وہ مشرق کی سیاحت کر چکا تھا۔ اُس نے لوتی کو کئی ایک خوبصورت گھونگے اور کوڑیاں دے رکھی تھیں۔ جنکو اُس نے ایک طاق میں سجا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا عجائب خانہ تھا۔ جب لوتی کو کوئی خوبصورت چیز ملتی وہ اُس کو اپنے عجائب خانہ میں داخل کر دیتا۔ یہ عجائب خانہ لوتی کی وفات کے وقت کئی ایک کمروں پر مشتمل تھا۔ اور اس میں مشرق کی عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خوبصورت اور شاندار مسجد تھی۔ جسے لوتی نے دمشق کی اس مسجد کے مصالح سے بنایا تھا جس کو چند سال ہوئے فرانسیسیوں کی بربریت اور ننگ انسانیت حرکات نے گولہ باری کر کے منہدم کر دیا تھا۔ لوتی کی یہ مسجد اصلی عمارت سے زیادہ خوبصورت اور دلفریب تھی۔

لوتی سترہ سال کی عمر میں بحری اسکول "لا بوردا" میں داخل ہوا۔ اگرچہ ایک سال پہلے اس کا بڑا بھائی اسی پیشے میں اپنی جان تلف کر چکا تھا۔ لوتی کے والدین اُسے کسی طرح "جہاز رانی" کے اسکول میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتے۔ لیکن گھر کی حالت اس قدر خراب تھی کہ انہیں مجبوراً رضامند ہونا پڑا۔

لوتی نے بچپن میں سمندری سفروں کی بیشمار کہانیاں سُنی ہوئی تھیں۔ اور اس کا دل ہر وقت بیتاب رہتا تھا کہ کبھی وہ بھی سفر کرے۔ سمندروں کی فضا کا لطف اُٹھائے۔ اور مشرق کے عجائب و غرائب کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس کا یہ خواب اَب پورا ہوا۔

لوتی سنہ ۱۹۰۰ء میں ہندوستان بھی آیا۔ اُس کا یہاں آنا سیاحت کی غرض سے نہ تھا۔ بلکہ اس کو ہندوستان کی عظمت مجبور کر کے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے اپنے ملک میں "نروان"۔ "گیان"۔ اور "کرم" کے الفاظ سُن رکھے تھے۔ اس کی روح حقیقت کے لئے تشنہ تھی۔ وہ اسے سیراب کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کے حالات کو سنہ ۱۹۰۳ء میں "Lin de San les Anglais" کے نام سے شائع کیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ انگریزی علاقہ میں سفر نہ کرے لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اسے کہیں کہیں برطانوی ہند سے بھی گزرنا پڑا۔ اودے پور۔ جے پور۔ گوالیار اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں اس نے خوب سیر کی۔ جن کے حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں اس نے لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندو راجاؤں نے میری خاطر و مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ راجہ ٹراونکور نے مجھے دوسرے راجاؤں کے نام چٹھیاں بھی لکھ دیں۔

بنارس میں لوتی ڈاکٹر اینی بسینٹ سے بھی ملا۔ وہ لکھتا ہے کہ تھیوسافیکل سوسائٹی مدراس کی تعلیم سے میرے دل کو کچھ بھی تسلی نہ ہوئی۔ "یہ جملے کہ خدا کیا ہے" "دعائیں مانگی جاتی ہیں" "تم خود خدا ہو" نہایت بیزار کن تھے۔ اور جس مقصد کو لیکر میں ہندوستان آیا تھا وہ یہاں پورا نہ ہوا۔ بنارس میں بہت لائق پنڈت تھے۔ لیکن وہ میرے دل کو جو دوسری دُنیا میں جہاں خدا کا گزر ہو اور مُردوں کا مشاہدہ کرنے اور عزیزوں کی ملاقات کا متمنی تھا تسلی نہ دے سکے۔

جب گذشتہ جنگ عظیم شروع ہوئی۔ لوتی بار ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اور عمر کے لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ اُسے فوج میں دوبارہ رکھا جا سکے۔ اور پھر وہ بیتاب تھا کہ ملک و قوم کی کوئی نہ کوئی خدمت اس نازک وقت میں کر سکے اس لئے بار بار وزیر جنگ کو لکھا کہ اسے معمولی سے معمولی ملازمت بھی منظور ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے فرائض کی ادائیگی کی جگہ میدان جنگ ہو۔ لیکن وزیر جنگ نے اسے منظور نہ کیا۔ اور کہا کہ تم کافی خدمت کر چکے ہو اور دوسروں کو موقعہ دو۔ اس کوشش سے ناکام ہو کر لوتی نے جرمنوں کے خلاف قلم اور زبان کی جنگ شروع کی ایک فرانسیسی مُصنف لکھتا ہے کہ باوجودیکہ اسے پروپگنڈہ کے محکمہ میں تعین کیا گیا تھا اُس نے پروپگنڈہ کا اس مستعدی سے کام کیا کہ کسی تنخواہ دار ملازم نے نہ کیا ہوگا۔ لیکن جنگ کے ختم ہوتے ہی ترکوں کے ساتھ یورپ کی طاقتوں کا ذلیل کن سلوک دیکھتے ہی لوتی پر اصل حقیقت کا انکشاف ہو گیا۔ اور اس نے جرمنوں کیساتھ انگریزوں کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ اور ترکوں کے مصائب کا ذمہ وار فرانس کو بھی ٹھہرایا۔ لوتی کو مشرق اور بالخصوص ترکوں سے تمام عمر محبت رہی تھی۔ اس وقت وہ اس ناانصافی کو برداشت نہ کر سکتا تھا جو ترکوں سے روا رکھی جا رہی تھی۔ اور اس نے یورپ کی ظالمانہ طاقتوں اور مظلوم مشرق کا رونا

"مشرق میں ہمارے پیارے فرانس کی موت"

"مشرق کا شاندار خواب" میں رویا ہے۔

جرمنی۔ انگلستان اور فرانس میں سے جسکے خلاف اسکا قلم زیادہ بے لگام رہا ہے وہ فرانس ہے۔ کیونکہ اپنے پیارے فرانس سے اُسے یہ اُمید نہ تھی۔ ترکوں کے مصائب کی اسکے دل کو اس قدر کاری ضرب لگی تھی کہ اُنکے ذکر پر اُسکی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ لوتی نے اس صدمہ سے نڈھال ہو کر ۱۰ جون سنہ ۱۹۲۳ء کو وفات پائی۔ اسکی موت کے بعد فرانسیسی مصنف موسیو ویرش نے بیان کیا کہ ترکی میں بھی لوتی کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے ٭

(سلیمان خاں)

پیر لوئی، عالم طفلی میں

The Victoria Press
Ry., Road, Lahore.

رالف فیلو اور اس کا جانشین

مشاہیر عالم

اس عنوان کے تحت میں کسی ایسے بلند پایہ شخص کے حالات درج ہوا کریں گے جس نے صرف اپنی محنت وجفاکشی سے اپنی شخصیت کو پستی و گمنامی کی خاک سے اٹھا کر شہرت وعظمت کے آسمان تک پہنچایا ہو۔ یا جس کے علمی کارناموں نے دنیا کی ترقی میں حصہ لیا ہو۔ یا تصنیف و تالیف میں دوست نامِ خلق ہو چکا ہو یا مصلح ریفارمر ہو۔ یا میدانِ شجاعت کا بے نظیر سپاہی ہو۔ یا اپنے وطن اور قوم کے لیئے اُس نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہوں ✤ (ایڈیٹر)

راک فیلر اور اُس کا جانشین

امریکہ کے ایک معمولی خاندان کا لڑکا جان راک فیلر جس کی ابتدائی زندگی گمنامی اور پستی میں بسر ہوئی صرف اپنی محنت جفاکشی اور نیک کرداری کے باعث آج دُنیا کا اسپتی بنا ہوا ہے۔

آزاد ملکوں میں افلاس کی زندگی، انسان میں عزم و استقلال۔ نیک نیتی و نیک کرداری محنت وجفاکشی میانہ روی اور کفایت شعاری پیدا کرتی ہے بخلاف درماندہ ملکوں کے کہ وہاں افلاس شریفانہ جذبات کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ بےغیرتی اور مفلسی گداگری کاہلی اور جرائم پیشگی غلامانہ ذہنیت کے ضروری اوصاف ہیں۔

جان راک فیلر دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور آزاد ملک یعنی امریکہ کا باشندہ ہے۔ دیانتداری اور جفاکشی اور بلند حوصلگی نے اسے کنج گمنامی سے نکال کر شہرت و ناموری کی بلندیوں تک پہنچایا۔ کفایت شعاری اور دیکھ بھال کر خرچ کرنے کی عادت نے اُسے ایک معمولی حیثیت کے آدمی سے دنیا کے سب سے بڑے دولتمندوں میں شامل کر دیا۔

کسی پست قوم اور غلام ملک کے باشندے کو اگر کسی سے دولت ہاتھ لگ جائے تو اسکی بدمستیوں اور عیش پرستوں سے زمین و آسمان توبہ توبہ پکارنے لگتے ہیں اُس کی دولت۔ ڈوم ڈھاریوں۔ رقص و سرود کی محفلوں قمارخانوں اور شراب خانوں کی رونق و آبادی کا سبب بن جاتی ہے۔

لیکن مہذب اور آزاد ملک کا دولتمند اپنی دولت میں اپنے ملک کے غالب موجودوں طالبعلموں یتیموں۔ بیواؤں اور اپاہجوں کو برابر کا حصہ دار بنا تا ہے راک فیلر نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں اپنے ملک کے ہر مستحق امداد کو شریک بنایا۔ اُسکی بےنظیر خیرات کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) امریکہ میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے اُس نے ایک جنرل ایجوکیشن بورڈ ۱۹۰۳ء میں قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر مذہب و ملت کے آدمی کو علم کی نعمت سے فیض یاب کیا جائے۔ راک فیلر نے تیس لاکھ روپیہ دیکر اس بورڈ کو جاری کیا۔

(۲) اعلیٰ تعلیم کے لئے شکاگو یونیورسٹی کے نام سے ۱۸۸۹ء میں ایک بے نظیر یونیورسٹی کے قیام پر راک فیلر کا ایک کروڑ اسی لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ تیس سال کے عرصہ میں اس یونیورسٹی کی توسیع پر دس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ خرچ کیا۔

(۳) راک فیلر انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل ریسرچ کی بنیاد ۱۹۰۱ء میں رکھی گئی۔ اس کا کام سائنس کے متعلق تحقیقات کرنا صحت عامہ کو ترقی دینا۔ غریب اور نادار مریضوں کی امداد کرنا ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں یہ مفید خدمات برابر سر انجام پا رہی ہیں چھ لاکھ روپیہ سے اس کا آغاز ہوا تھا۔

(۴) اس کے علاوہ انٹرنیشنل ہیلتھ بورڈ۔ چائنا میڈیکل بورڈ پیباک یونین میڈیکل کالج کو لاکھوں روپے دے چکا ہے ✤

(۵) ۱۹۱۵ء میں راک فیلر کی بیوی فوت ہوئی تو اُس کی مفید یادگار قائم کی جس پر دو کروڑ پچیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں مفید کاموں پر راک فیلر کروڑوں روپے صرف کر چکا ہے۔ دُنیا کے لاکھوں انسان راک فیلر کی بےنظیر خیرات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

اُس کا قول ہے کہ

اُس شخص کے مرنے پر کوئی مطلق افسوس نہیں کریگا۔ جو باوجود قدرت رکھنے کے اپنی دولت کو نیک کاموں میں صرف نہیں کرتا اور دوسروں کیلئے چھوڑ جاتا ہے۔

راک فیلر بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کا کاروبار اس کا بیٹا راک فیلر جونیئر کر رہا ہے۔ بیٹا محنت اور کفایت شعاری نیکی اور خیرات میں باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے اُس نے بھی اسی قسم کے بہت سے مفید کاموں پر لاکھوں روپیہ صرف کیا ہے۔ ہمارے ہاں قریب قریب یہ ضروری ہو چکا ہے کہ باپ کی خوبیاں باپ ہی تک قائم رہتی ہیں۔ بلند اقبال صاحبزادے بُری صحبتوں سے اپنے اندر اس قدر بُرائیاں پیدا کر لیتے ہیں کہ باپ کی اچھی شہرت اور عزت پر اُن کے

جانشین کی بدقماشیاں بٹہ لگا دیا کرتی ہیں۔ لیکن ہم ایک تہذیب یافتہ اور غلام ملک کے باشندے ہیں۔ مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں بسنے والے لوگ باپ۔ دادا کی عزت قائم رکھنے کے ساتھ ہی اپنی نیک کرداریوں سے اپنی خاندانی عظمت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

جان راک فیلر کو خوش قسمتی سے جانشین بھی ایسا ہی نیک طبیعت اور نیکو کار ملا۔ اس نے باپ کی پیدا کی ہوئی دولت کو عیش پرستیوں میں برباد نہیں کیا۔ بلکہ باپ سے روپیہ قرض لیکر اپنا کاروبار الگ جاری کیا۔ اور جب تک باپ کا قرض حبہ حبہ کر کے نہ ادا کر دیا اُس کا سود ادا کرتا رہا۔ اور اب وہ بھی اپنی محنت جفاکشی اور دیانتداری کے سبب امریکہ کے کروڑپتی دولتمندوں میں شمار ہوتا ہے

راک فیلر جونیر نے ایک مضمون میں اپنے باپ جان راک فیلر کے کچھ حالات بیان کرتے ہوئے اُسکے طریقہ تربیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں اُس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:-

"کلیولینڈ کی مشرقی سرحد پر ہزار ایکڑ زمین ہے۔ جو فارسٹ ہل کہلاتی ہے۔ یہاں راک فیلر کا وسیع اور کشادہ مکان ہے۔ اس کے پہلو میں ایک ندی کے پانی کو روک کر ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ یہاں راک فیلر کے بچے تیرنا سیکھا کرتے تھے۔ اور راک فیلر بڑے استقلال سے ایک اتالیق اور رہنما کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ جب جھیل کی سطح یخ بستہ ہو جاتی تھی تو وہ اسپر سکیٹنگ کیا کرتے تھے۔ راک فیلر جونیر کہتا ہے "سردیوں کی ایک رات مجھے یہ دیکھکر سخت حیرانی ہوئی کہ ابا کچھ مزدوروں کو ساتھ لئے برف کو ہموار کر رہے ہیں۔ تاکہ صبح سکیٹنگ کیا جا سکے۔ جب میں نے آدھی رات کے وقت اُٹھکر کام کرنے کا سبب دریافت کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کل اتوار ہے اور اتوار کو کام کرنا ابا جائز نہیں سمجھتے۔ چنانچہ گھر میں اتوار کو کام کرنے کی کسی کو اجازت نہ تھی میں بھی اگر اسکول کا سوموار کا کام ہفتے کو نہ کر سکتا تو اتوار کی صبح کو جب ابھی گھر میں لوگ سوئے پڑے ہوتے اُٹھکر کر لیا کرتا۔ لیکن اس رات مجھ پر نیند حرام ہو جاتی۔ مجھے اندیشہ رہتا کہ کہیں میں زیادہ نہ سو جاؤں۔ گھر کے لوگ بیدار ہو گئے تو کام نہ ہو سکیگا۔ میرے پاس شیشے کی ایک گھڑی تھی۔ جسکو میں لیمپ کے آگے لٹکا دیتا تھا۔ روشنی میں اس کی سوئیاں اچھی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اُس رات میں بار بار نیند سے چونک کر دیکھتا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے؟ اس طرح میں اتوار کو کام نہ کرنے کا اصول بھی نہ توڑتا۔ اور اسکول کا کام بھی کر لیتا۔ لیکن اس کا اثر میری صحت پر بہت برا پڑتا تھا"۔

کلیولینڈ میں راک فیلر نے چودہ سال کی عمر سے کام شروع کر دیا تھا اور اس نے اپنی ایک علیحدہ "اکونٹ بک[1]" بنائی تھی۔ جو اب تک محفوظ ہے۔ اُس کاپی سے راک فیلر کے اُس وقت کے مصارف اور آمدنی کا پتہ چلتا ہے۔ اِس کے کام کرنے کے پہلے تین مہینوں کی کمائی پچاس ڈالر تھی۔ پھر پچیس ڈالر ماہوار اور کچھ عرصہ بعد پانسو ڈالر سالانہ ہو گئی۔ راک فیلر کہا کرتا ہے کہ جو شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ میں امیر ہو کر بہت سی خیرات کرونگا۔ اُسکو خیرات کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔ اور جو شخص اُس تھوڑی مقدار میں سے خیرات بھی کرتا رہتا ہے جو اُس کے پاس ہے۔ خدا اُسکو اور بھی دیتا ہے تاکہ وہ کثیر مقدار میں بھی اُسکے راستے میں دے"۔

راک فیلر نے شروع سے اسپر عمل کیا ہے اور اُس کی بچپن کی اکونٹ بک اُس کی گواہ ہے۔ اُس نے اُس وقت سے کچھ پس انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اُس کی خیرات اور فیاضانہ عطیے جن کی مقدار اس وقت کروڑوں روپے تک پہنچ چکی ہے۔ اس قلیل سرمایہ میں سے شروع ہو گئی تھی۔ وہ ایک سینٹ ہفتے کے حساب سے سنڈے اسکول کو دیا کرتا تھا۔ ایکبار تو اُس معمولی آمدنی میں سے پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں اس نے پانچ ڈالر اور ۵۰ سینٹ خیرات کر دیئے۔ اکونٹ بک میں وہ اس طرح لکھتا ہے "ایک مہینے میں میں نے غیر ممالک میں عیسائیت کے پرچار کے لئے دس سینٹ دیئے پچاس سینٹ "مائیٹ سوسائٹی" کو دیئے۔ اپنی جماعت کے استاد کو میں نے ۲۵ سینٹ تحفے کے طور پر دیئے۔ گرجا کے نادار لوگوں کو دس سینٹ۔ غیر ممالک میں پرچار کے لئے دس سینٹ۔ پھر گرجا کے نادار لوگوں کی امداد کے لئے دس سینٹ"۔

یہ راک فیلر کی خیرات کی ابتدا تھی۔ جو آج کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی ہے اس کی فراخ دستی اور فیاضی کے بیان سے کہیں زیادہ دلچسپ یہ داستان ہے کہ اس نے اپنے بچوں کی پرورش کس طریق پر کی ہے؟

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے مکان کے پہلو میں ایک ندی کے پانی کو روک کر ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ جہاں بچے تیرنا سیکھتے تھے۔ یہ خدمت راک فیلر خود انجام دیتا تھا۔ اس کا بیٹا راک فیلر جونیر کہتا ہے۔

"اسبات کو تقریباً ۴۰ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی جب میں خیال کرتا ہوں اُس وقت کی تصویر میری آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ گرمی کے دن ہیں ابا کے سر پر تنکوں کی ٹوپی ہے۔ اور وہ ہمارے ساتھ جھیل کے کنارے کھڑے ہیں۔ ابا ہمیں تیرنا سکھاتے تھے۔ لیکن خود اچھی طرح نہ تیر سکتے تھے۔ وہ زیادہ دیر پانی میں بھی نہ ٹھہر سکتے تھے۔ ابا سکیٹنگ بہت اچھی طرح کرتے تھے۔

[1] روزمرہ کے حساب کتاب کی کاپی۔

اور ہم سب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم بھی ابا کی طرح سکیٹنگ کرنے لگیں مجھے یاد ہے میں صبح سویرے اُٹھ کر انکے ساتھ یہ دیکھنے جایا کرتا تھا کہ برف کی تہ کافی موٹی رہی ہے یا نہیں۔ جھیل گہری تھی اور برف کی تہ پتلی ہونے پر سکیٹنگ کرنے میں خطرہ ہوتا تھا۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے ابا ہمارے لئے کچھ انتظام کر دیتے تھے۔ ہم اپنی بغلوں میں لکڑی کے تختے رکھ لیتے تھے۔ کہ اگر کہیں برف ٹوٹ جائے تو کچھ خطرہ نہ ہو۔ اس وقت میں نے ابا کی اس احتیاط کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ انکی عادت راسخ بن چکی ہے کہ وہ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کے حسن و قبح پر اچھی طرح غور و فکر کر لیا کرتے ہیں جب انکو ایکبار کامیابی کا یقین ہو جاتا تو وہ بلا پس و پیش اُسے کر گذرتے۔ وہ اکثر افسوس سے کہا کرتے تھے کہ میرے پاس بچوں کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے انکی تربیت بہت حد تک بچوں کی ماں کو کرنی پڑتی تھی۔ پھر بھی کھیل میں ابا میرے اور میری بہن کے بہترین رفیق ہوتے تھے۔ اور ہم نے جو کچھ اُن سے سیکھا ہے وہ ان کی مثال سے سیکھا ہے۔ انہوں نے ہمیں تعلیم نہیں دی۔"

سکیٹنگ کے لئے چند مزدوروں کو ساتھ لیکر وہ خود برف کو ہموار کر دیا کرتے تھے۔ سکیٹنگ میں ہمارے ہمسائے اور دوست سب شریک ہوتے تھے ہماری خوشی کے لئے ابا بھی دفتر جانے سے پیشتر سکیٹنگ کرتے تھے۔ اس وقت اُنکے سر پر ریشم کی ٹوپی ہوتی تھی۔

کام کرنے کی ترغیب بچوں کو بچپن ہی سے دیگئی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا کہ خوشی کا لطف اُٹھانے کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔ راک فیلر جونیر کہا کرتا ہے "مجھے یاد نہیں مستقل کام میں نے کب شروع کیا"۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم نے ابا سے کام کرنا۔ بچانا اور خیرات کرنا سیکھا ہے"۔ لیکن جس طریق پر راک فیلر نے اپنے بچوں کو یہ سکھایا اُس میں شمہ بھر بھی سختی نہ تھی۔ ان میں سے اگر کوئی دس ڈالر بچاتا تو راک فیلر دس اور دیکر انکو بیس کر دیتا۔ تاکہ وہ بنک میں جمع کرائے جا سکیں۔ گھر میں فرائض کی ادائیگی کے لئے بھی انعام مقرر کر رکھے تھے۔

راک فیلر جونیر جب کام کرنے کے قابل ہو گیا تو باوجود اس کے کہ اسکا باپ دنیا کا ایک مشہور دولتمند تھا۔ اس نے ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ کٹ کٹاتے جاڑوں میں پتھر توڑ کر آری چلا کر اور شاہ بلوط کے سخت درخت کاٹ کر وہ پندرہ سینٹ فی گھنٹہ کماتا تھا۔

راک فیلر جونیر دوسرے امیروں کے بچوں کی طرح "پیپریٹری سکول" میں نہ جاتا تھا۔ وہ نیویارک کے ایک عام سکول میں پڑھتا تھا۔ اور یہ بات کبھی اُس کے تصور میں بھی نہ آئی تھی کہ وہ گھر کی گاڑی میں بیٹھ کر سکول جائے۔ نہیں۔ بلکہ بستہ بغل میں دبا کر اسکول آتا جاتا تھا۔ حالانکہ اُس کا باپ کروڑپتی تھا۔

اسکول کا کام اُس کے لئے آسان نہ تھا۔ وہ متواتر محنت میں لگا رہتا تھا۔ اس محنت کے باوجود بھی اگر وہ جماعت میں کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ کر سکتا تو راک فیلر اُس سے ہرگز باز پرس نہ کرتا تھا۔

اسکول کا کورس ختم ہونے پر راک فیلر جونیر کے سامنے تین راستے تھے۔ جن پر کاروباری زندگی کا سفر شروع کر سکتا تھا۔ راک فیلر نے انتخاب کا کام اپنے بیٹے کی رائے پر ہی چھوڑ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسکا بیٹا اپنا رستہ خود بنانا سیکھے۔ بیٹے نے بھی یہی مناسب جانا کہ قانون کے اسکول یا سیاحت دنیا کی بجائے اپنے باپ کو جس کی عمر اُس وقت ساٹھ سال کی تھی کاروبار میں مدد دے۔ چنانچہ اس نے دفتر میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت اُس کا کاروبار اپنے باپ کے کاروبار سے الگ ہے۔ ہاں اُس نے اپنے باپ سے قرض لیکر شروع کیا تھا۔ اور جب تک قرض ادا نہ کیا۔ اُس کا سود ادا کرتا رہا۔

اب وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا چکا ہے۔ اُس کا بیان ہے:۔

"سب سے بڑا سبق جو میں نے ابا سے سیکھا وہ صاف گوئی اور رواداری ہے۔ ایسا رائے جو وہ قائم کر لیں اُس پر اڑے رہتے ہیں۔ لیکن اس میں ضد کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر جدید حقائق و دلائل کو پیش کیا جائے تو وہ بڑی فراخدلی سے معاملے پر پھر غور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات جو میں نے ابا سے سیکھی وہ انکا استقلال اور ثابت قدمی ہے۔ وہ کبھی غضبناک نہیں ہوتے۔ اور میں انکو تمام حالات میں مطمئن پاتا ہوں کسی محسن کش یا بے انصاف کا ذکر وہ اکثر جوش سے کرتے ہیں۔ لیکن یہ جوش عارضی ہوتا ہے۔ اور وہ خود ہی کہہ دیتے ہیں۔ "خدا جانے وہ شخص کن مشکلات میں ہوگا کہ اُسکو ایسا کرنا پڑا"۔

وہ کوئی بل ادا کرنے سے پہلے اچھی طرح اپنا اطمینان کر لیا کرتے ہیں یہ عادت اُن کی اُس وقت کی ہے جب وہ ایک معمولی بک کیپر (منیم) کی حیثیت میں ملازم تھے۔ لوگ اس کو بخل کہیں۔ لیکن یہ زندگی کا اصول ہے۔

(چھجو لال ماتھر ایم۔ اے)

دنیائے ادب

اس عنوان کے تحت میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات سے منتخب مضامین کے دلچسپ اقتباسات شائع ہوا کرینگے تاکہ اُردو ادب میں جدید اسالیب بیان کا اضافہ ہو۔ اسی کے ساتھ اردو شعرا دنیا کی بلند شاعری کے فرداً فرداً خیالات کو اردو نظم کے سانچے میں ڈھال کر اردو شاعری کو سرمایہ دار اور سرمایہ ناز بنائیں۔

ہندوستانی ادبیات

(سے براہ راست)

اردو - ہندی - بنگالی - پنجابی - گجراتی - مرہٹی - سندھی - کشمیری - پشتو - مدراسی - سنسکرت

اُردو

خوفناک مشاہدہ

میں یکایک ہوگیا کیوں اس قدر نازک مزاج — یہ تخیل مجھ کو کس عالم میں لے آیا ہے آج؟

کس قدر اسرار سے معمور ہے یہ سرزمیں — اِک ادائے دل کشی کے ساتھ ہیبت آفریں

موتیے کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دور دور — یاسمن کے برج میں شبنم کے ایوان و قصور

منجمد کرنوں کی محرابیں قطار اندر قطار — جن پہ ہیں رنگِ شفق کے پردہ ہائے زرنگار

موتیوں کو گوندھ کر لکھے گئے ہیں جن پہ نام — تیرگی کا ہے یہ مسکن، یہ تجلی کا مقام

جائیے جس سمت پڑتا دل پہ نیا القا ہے — یہ ہے غم کی یہ خوشی کے راز کی محراب ہے

اک فرشتہ میرے دل میں نور پھیلاتا ہوا — پھر رہا ہے لو میں محرابوں کی دکھلاتا ہوا

یہ حقیقت شادمانی کی ہے، یہ آلام کی — یہ حقیقت صبح جاں پرور کی ہے، یہ شام کی

"یہ نکاتِ حسنِ شیریں، یہ رموزِ کوہکن — یہ حقیقت ہے شمیمِ گل کی، یہ رازِ چمن"

اے خدا، لیکن اس آگاہی میں ہیں یہ کیا صفات — دلفریبی سے ہوئی جاتی ہے ساری کائنات

اُڑتا جاتا ہے برابر رنگ موجودات کا — جتنا جتنا بڑھ رہا ہے نور معلومات کا

منکشف جس وقت ہو جاتا ہے رازِ جزو و کل — روح فرسا خار میں تبدیل ہو جاتا ہے گل

عقل پا لیتی ہے جس شے کی حقیقت کا سراغ — دل میں ہو جاتا ہے گل اس کی لطافت کا چراغ

جہل کے پھولوں کو اے محمود! مرجھانے نہ دے — آدمی کو بارگاہِ عقل میں جانے نہ دے

جوشؔ، ملیح آبادی

سعدی کا پیرایہ بیان

سعدی کی جس چیز کو ہم پسند کرتے ہیں۔ وہ صرف اس کے معتدل سبقول اور ہمدردانہ نصایح اور شیریں، تبسّم آمیز حکمت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا دل کش پیرایۂ بیان اور بامزہ تشبیہات اور استعارات وکنایات بھی ہیں، جو اس نے اپنے پند ونصائح میں اختیار کئے ہیں، اور نیز مناظر قدرت کا ذوق جن کا بیان اس نے نہایت نزاکت و دلبستگی کے ساتھ کیا ہے، جس طرح کہ کوئی اپنے زیبا اور عزیز محبوب کا کرے ، ذیل میں ایک حمد نقل کرتا ہوں، جو ایک گیت ہے جس میں خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم کو مناظر قدرت کے اندر دکھایا ہے، یہ قطعہ فراخ و باوسعت ہے، جس میں ساتھ ہی ایک قسم کی نزاکت وصفائی ہے، اور بہر محکم اور دلنشیں بھی ہے:-

"کمالات ایزدی کا کون شمار کر سکتا ہے۔ اس کی بیشمار نعمتوں میں سے کسی نے ایک نعمت کا بھی پورا شکر ادا کیا ہے؟ اس نے سراپردۂ عالم کو ٹرا کیا۔ اور مختلف و دلفریب رنگ اس میں پھیلا دیئے، زمین، سمندر، جنگل، سورج، چاند، ستارے سب اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں، اس کی بے نہایت فیاضی نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے۔ اور آسمان کا گنبد اس کے فضل کے سامنے گرد ہے۔ نازک اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی لکڑی میں وہ خوشنما پھول لگاتا ہے، شاخ گلاب میں شکر بھرتا، اور قطرۂ آب سے لولوے درخشاں پیدا کرتا ہے۔ پہاڑوں کو زمین میں بطور میخوں کے قائم کر رکھا ہے، تاکہ پانی برزمین ٹھہری رہے سورج کے عمدہ اثر سے وہ زمین شور کو سبزہ زار بناتا ہے۔ اور صحرا کو نرگس وگلاب کا باغ، بادلوں کے سینے سے وہ باراں بے حساب برساتا ہے، جو مردہ پودوں کو از سر نو زندہ کرتا ہے۔ اور فصل بہار میں وہ برہنہ شاخوں کو سبز اور چمکتا ہوا لباس پہناتا ہے، ایسا کون سا انعام ہے۔ جس کا انسان نے پورا پورا شکر ادا کیا ہے، وہ اپنے انعامات بے دریغ بخشتا ہے لیکن سب سے بڑا سب سے زیادہ مٹنے والا انعام یہ ہے، کہ اس نے ہمارے دلوں میں خوش بخت زندگی کی امید پیدا کر دی ہے۔"

بوستان کے آٹھویں باب میں شکر الٰہی پر مندرجہ اقتباس کے مضمون کو مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے:-

"رات، دن، مہ روشن اور مہر گیتی افروز تیری آسایش کے لئے بنے ہیں، آسمان فراش کی طرح تیرے لئے بساط بہار بچھاتا ہے۔ باد و برف اور باران و میغ رعد غراں اور برق درخشندہ سب کارپرداز و فرماں بردار ہیں۔ جو تیرے تخم کو خاک میں پالتے ہیں، اگر تو پیاسا ہے۔ تو تکلیف سے مت گھبرا کہ سقائے ابر تیرے لئے کاندھے پر پانی لائے گا سب خاک سے رنگ، بو اور پانی پیدا کرتا ہے، جو آنکھ دماغ اور حلق کے لئے تماشا گاہ ہیں۔ مکھی کے ذریعے سے شہد اور ہوا سے حسن پہنچاتا ہے، اور درخت نخل سے خرما اور گٹھلی سے نخل خرما پیدا کرتا ہے، تمام نخلبند حیرت سے ہاتھ ملتے ہیں، کہ ایسا نخل کس نے بنایا، سورج چاند اور پروین تیرے لئے ہیں، اور مکان کے چھت کی قندیلیں ہیں، تیرے لئے خار سے گل، نافہ سے شکر، کان سے زر اور چوب خشک سے برگ تر پیدا کیا، ہے اے خدا! میرا دل خون ہو گیا، اور آنکھیں زخمی ہو گئیں کہ بیان سے بڑھ کر تیرے انعامات دیکھتا ہوں۔ آہ اے سعدی اپنا دفتر بند کر اور زبان کو روک ایسے راستے ہیں کہ جن کی انتہا نہیں۔"

(ادارہ وحیدآباد دکن)

کردار نگاری کا متفرق طریقہ

کردار نگاری کبھی ادبی نزاکتوں پر مبنی ہوتی ہے، کبھی فلسفیانہ خوبیوں پر ادبی کردار نگاری میں زیادہ توجہ ظاہری ڈیل ڈول اور جسمانی بناوٹ کی طرف کی جاتی ہے، لیکن دوسرے طریقہ میں جو کردار پیش کئے جاتے ہیں، وہ شخص قصہ کی قلبی حالتوں کا آئینہ ہوتے ہیں، اور اس لئے مؤخر الذکر قسم کے کردار زیادہ گہرے اور مفید اثرات مرتب کرتے ہیں، قدیم افسانوں میں کردار عموماً ادبی طرز کے پیش کئے جاتے تھے۔ ناول نگار کو کردار نگاری پر تیار ہونے

سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے، کہ حقیقی کردار اور ناول کے کردار میں ایک اصولی فرق ضرور رہتا ہے، ناول میں ایک کردار کی کہانی صرف چند گھنٹوں کے اندر ختم ہو جاتی ہے، ناول کے اثرات جو ہمارے صفحۂ دماغ پر مرتب ہو چکے ہیں، ان میں تبدیلی کا امکان ہے لیکن خود کردار ایک دفعہ مکمل ہونے کے بعد نہ تو بنتے ہیں، اور نہ بگڑتے ہیں ہماری زندگیاں معاصرین کے ساتھ تعلقات اور تبادلہ تاثرات کی ایک تاریخ ہوتی ہیں، ناول کے کردار بھی مختلف افسانوں کے کردار پر مؤثر ثابت ہوتے ہیں، ہمارے ایک محترم دوست نے اپنے خیالات، طرزِ تحریر اور طرزِ گفتگو کو شہاب کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ایک قدیم حکمران کے متعلق بھی مشہور ہے، کہ اس نے "شاہنامہ" کو پڑھ کر رستم ثانی بننے کی کوشش کی تھی، لیکن کسی ذی حیات کردار کے ناول کے کردار پر مؤثر ہونے کا خیال پیدا ہی نہیں ہو سکتا، علاوہ ازیں ناول کا ہر کردار ایک خاص اور معین ماحول کے ماتحت عمل کرتا ہے۔ اشخاص واقعات، خیالات، مقامات، اوقات، ہر چیز معین ہوتی ہے۔ جس کی مجموعی شکل کو ہم پلاٹ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ دراصل ایک ایسی مربوط اور منظم چیز ہے جس کی مثال ہم کو حقیقی زندگیوں میں نہیں مل سکتی، آخر میں یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ کہ ناول نگار کے تجربات جب قصہ کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں، تو ان میں مبالغہ سے دامن بچانا ناممکن ہو جاتا ہے، یہ ایک بڑا فرق ہے، جو اصلی اور ناول کے کرداروں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ "مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد دکن

صلح یا جنگ

جرمن اہل قلم اور ماہرین سپہ گری نے جنگ کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے ان اقوال کو مسٹر ولیم آرچر نے "جرمن حکمت کے پانچ سو موتی" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے۔ ہم ان موتیوں میں سے چند ایک یہاں پیش کرتے ہیں:

جرمنی انسانیت کا مستقبل ہے . . . . جرمنیت کا زوال انسانیت کا زوال ہوگا"۔

جنگ ایک الٰہی ادارہ ہے۔ ایک عالمگیر قانون ہے۔ جو فطرت کے ہر شعبہ میں موجود ہے۔ جنگوں سے مطلع اسی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ جیسے طوفانِ باد و باراں سے . . . . برک ہارٹ

پیہم امن ایک خواب ہے۔ لیکن کوئی خوبصورت خواب نہیں۔ جنگ خدا کا ایک جاودانی ادارہ ہے۔ . . . . جنگ نہ ہو تو انسانیت مادہ پرستی میں غرق ہو جائے . . . . مولکے

جنگ ہمیشہ ہوا کرے گی۔ اور اس کا اعادہ انسانیت کے درد کی حکمی دوا ثابت ہوگا . . . . ٹریشکی

یسوع نے خود کہا تھا "میں زمین پر امن لے کر نہیں آیا۔ بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں" دنیا میں کوئی مذہب مسیحیت سے زیادہ جنگ آزما نہیں ہوا . . . . برن ہارڈی

انسانیت سے، جب وہ بھول گئی ہو کہ جنگ کیونکر کی جاتی ہے بڑی بڑی توقعات رکھنا جنون نہیں تو کیا ہے . . . . . . نیٹشے

جب تک ہم ارتقا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہ کر لیں ہمیں جنگ کی ضرورت کو ماننا پڑے گا ہمیں جنگ کو قبول کرنا پڑیگا۔ وہ ہماری ترقی اور وجود کے ساتھ قائم رہیگی۔ ہمیں جاودانی جنگ کو قبول کرنا پڑیگا . . . . ویگ نر

صرف قبرستان کے سیاہ دروازے پر ہمیں "امن جاوداں" کے الفاظ نظر آسکتے ہیں۔ جو لوگ زندہ ہیں۔ ان کے لئے "جاودانی جنگ" ہی بہترین مقولہ ہے . . . . ویگ نر

دنیا کے نام نہاد امن میں سکون نہیں ہے۔ بلکہ خلفشار ہے . . . . . نیولڈ (ہمایوں لاہور)

دنیوی مسرت کے ساتھ ساتھ ابدی خوشی کا بھی متلاشی رہ۔ (سقراط)

حقیقی راحت آسمانوں کے نیچے صرف ان کو میسر ہوتی ہے جو دوسروں کی راحت کا خیال رکھتے ہیں۔ (بقراط)

مطالعہ

مطالعہ کتب میں امور ذیل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) تعین مقصد۔ ہمارا بہت سا وقت۔ بہت سی قوت دماغی۔ مطالعہ میں بیکار صرف ہوتی ہے۔ کیونکہ مقصدِ مطالعہ معین نہیں ہوتا۔ ہم ایک کتاب لیتے ہیں۔ شروع سے آخر تک پڑھتے ہیں۔ اور پھر ایک جانب رکھ دیتے ہیں۔ دماغ پر چند نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ اور بس۔ یہ علم نہ قوتِ دماغی بنتا ہے۔ اور نہ دل میں کسی قسم کی حرکت پیدا کرتا ہے تعین مُدعا کی وجہ سے غیر ضروری تفصیلات سے سروکار نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے وقت اور توانائی فضول صرف نہیں ہوتی۔ مطالعہ میں دلچسپی ہوتی ہے۔ قوتِ توجہ کام کرتی ہے۔ دل و دماغ کو تکان اور خستگی ضرورت سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی بامقصد مطالعہ آئندہ تلاش و تحقیق کا محرک ہوتا ہے۔ اس مقصد کا قریب ہونا ضروری نہیں تفریح کے لئے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مقصد کا تعین آسان کام نہیں اسکے لئے بہت غور و غوض اور وسعت معلومات کی ضرورت ہے۔ تاہم مطالعہ سے قبل کتب، مصنفوں، مؤلفوں اور مترجموں کے ناموں پر غور و فکر کرنے سے اس کام میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

(۲) انتخاب و اضافہ خیالات۔ مطالعہ میں اس کی بہت ضرورت ہے تعین مقصد کے بعد اس کا نمبر ہے۔ کتاب میں مطالعہ کرتے وقت مصنف کے خیالات کا انتخاب کرتا ہے۔ اپنے معلومات اور تجربات کا ان میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کی باہمی مطابقت اور مخالفت کو دیکھتا ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے والے کا دماغ ایک ایسی لوح سادہ کے مانند نہیں ہوتا ہے جس پر دورانِ مطالعہ میں معلومات منقش ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ وُہ مصنف کتاب کے ساتھ ساتھ سرگرم تفکر ہوتا ہے۔ دو نو محو ہو کر ایک مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ ہر دو اپنی اپنی قابلیت اور علم کے لحاظ سے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کی شخصیت کو اظہار کا موقع ملتا ہے۔ کتب کتنی ہی ضخیم کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی ان میں بہت سے امور تشنہ رہ جاتے ہیں۔ بہت سی باتیں محتاجِ تشریح و توضیح ہوتی ہیں۔ مدارس کی کتب نصاب کی تو اکثر یہی حالت ہوتی ہے۔ اگر مطالعہ کرتے وقت اس انتخاب اور اضافہ کا خیال رکھا جائے۔ تو یہ کتب دلچسپ ہو سکتی ہیں۔ اس سے ایک بڑا فایدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بے سوچے سمجھے رٹنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ یاد کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مزید براں اس طرح مطالعہ کرنے سے پڑھنے والے کے دل میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جو حصولِ علم کا بہترین ذریعہ ہیں۔

(۳) تنظیم خیالات جو معلومات مطالعہ کتب سے حاصل ہوتی ہیں دماغ میں ان کی تنظیم کی بڑی ضرورت ہے۔ ورنہ نہ وُہ حافظہ میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اور نہ قوت دماغ بن سکتی ہیں اس تنظیم کے لئے لازم ہے۔ کہ ایک انبوہ معلومات کو مرتب کیا جائے۔ خیالات کو بہ لحاظ اہمیت جگہ دی جائے ایک خیال کو صدر کا رتبہ حاصل ہو دوسرے خیالات اس کے ارد گرد حسب مراتب مربوط کئے جائیں۔ تمثیلات۔ تشریحات اور توضیحات مناسب مواقع پر جگہ پائیں۔

(المعلم حیدرآباد)

ہندی

چاند اور چکور

چکور

میں تیرے درشن کی پیاسی ہوں۔ اے چندرما! تو میری آس نہ توڑ۔ رات کے آخری حصّے میں اپنے غروب ہونے کو یاد کر اور مجھے نا امید نہ ہونے دے! تو میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ مجھے صرف تیرا ہی سہارا ہے۔ تیرے بغیر مجھے یہ تاروں بھرا آسمان سونا دکھائی دیتا ہے! اے چودھویں رات کے چاند جب تو روپہلی کرنوں کا جال زمین پر پھیلا کر آکاش پر ہنس پڑھتا ہے۔ تو فضا کی تمام سمتیں روشنی سے جگمگانے لگتی ہیں۔ اس وقت جب کہ شام کی منہ بند کلیاں تیری شعاعوں سے کھِل کر پھول بن جاتی ہیں۔ میں تمہارے سُندر روپ کو دیکھ کر اے رات کے راجہ میں تجھ پر نثار ہو جاتی ہوں۔

(سرسوتی) "پروفیسر منی رام گپتا"

بنگالی

ٹیگور کا خط

"یہ خط ٹیگور کی طرف سے مشہور سائنس داں سر جگدیش چندر بوس کو لکھا گیا تھا اس پر کوئی تاریخ ثبت نہیں ہے لیکن مضمون پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان ایام میں لکھا گیا ہے جب سر جگدیش بوس مغرب میں اپنے نظریات پیش کر رہے تھے۔

"دوست

خدا نے تمہاری پیشانی پر نصرت و کامرانی کا تلک لگا کر تمہیں دنیا میں بھیجا ہے کیا تمہیں ہمارے جیسے لوگوں کی ہمت و طاقت کی پروا ہو سکتی ہے؟

تم خواہ کہیں ہو، اور کسی حال میں ہو، مسرت و شادمانی نے تمہارے لئے دامن پھیلا رکھا ہو۔ یا مشکلات اور مایوسی نے تمہارا محاصرہ کیا ہو۔ تم اپنے تئیں بیکار نہیں رکھ سکتے۔ جو تمہارے اندر رہ کر تمہاری ساری زندگی کو کامیابی کی طرف لے گیا ہے۔ اس کے کام کو کون ادھورا رکھ سکتا ہے؟ سیزر کی کشتی کبھی غرقاب نہیں ہوتی روکھے پھیکے اور غیر جاذب ہندوستان کی اٹل استقامت تمہارے کاموں کے اندر تمہاری مدد کرے۔ کوئی خواہش اور کوئی خفیف سی کشش تمہیں تمہارے اس عظیم الشان مقصد سے نہ ہٹا دے!

ہندوستان کے اشو بید کے گھوڑے کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری واپسی پر ہمارا یجن انجام تک پہنچے گا۔ یہاں آکر تم گوشہ نشیں ہو کر تنہائی میں اپنے شاگردوں کو علم کے دشوار گزار قلعہ کا پوشیدہ راستہ تلاش کرنا سکھا دو گے۔ میں اس امید پر بیٹھا ہوں۔ تمہارا کام درس یاد کرانا یا امتحان میں پاس کرانا نہیں جو آگ تمہیں ملی ہے۔ تم ساتھ نہیں لے جا سکتے تمہیں اس کو ہندوستان کے دل میں رکھ کر جانا ہوگا۔ غیر ملکی ہمیں جس قدر علم کی آگ دیتا ہے۔ اس سے زیادہ دھواں دیا کرتا ہے"۔

اس سے صرف ہماری تاریکی ہی افزوں نہیں ہوتی۔ بلکہ نابینائی بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہماری بصارت کو ضرور پہنچتا ہے"۔

میں تم سے علم کے راستے کی توقع رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا اور کوئی راستہ نہیں۔ عبادت و عمل کا راستہ ہمارا راستہ ہے۔ دنیا کو ہم نے بہت کچھ دیا ہے۔ اور یہ اب کسی کو یاد نہیں۔ ایک بار ہمیں پھر مسند استادی پر متمکن ہونا پڑے گا۔ ورنہ منہ دکھانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ تمہیں ہندوستان کے میدان میں اشجار کے سایہ میں اس مسند پر بیٹھنے میں مدد کرنا ہوگی۔ فوج و سپاہ دولت جائداد سرمایہ و تجارت کوئی شے مجھے اس ارادہ سے متزلزل نہیں کر سکتی۔ میدان میں بیٹھ کر اس قدیم اور مقدس مسند کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ خالی پڑا ہے۔ اور ہم بچوں کی طرح اس کی مٹی کی گڑیا بنا کر کھیل رہے ہیں۔ تمہارا ربی"

پرباسی" کلکتہ

مولانا محمد عبد اللہ بنگالی
ایڈیٹر لائٹ"، لاہور

پنجابی

گلچین سے گلاب کے پھول کا خطاب

اے گلچین مجھے نہ توڑ میں نے خوشبو کی ایک ایسی دوکان لگا رکھی ہے۔ کہ جو ادھر سے گزرتا ہے۔ میری مہک سے دل و دماغ کے لئے فرحت حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک میں ڈالی کی زینت بنا ہوا ہوں۔ ہزاروں رہرو۔ میری مست خوشبو سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ اور اگر تو نے مجھے توڑ لیا تو پھر میں تھوڑی دیر کے لئے صرف تیرے دل و دماغ کو مہکا سکوں گا۔ پلک مارتے میری خوبصورتی اور نکہت فنا ہو کر مجھے تجھ سے بھی کھو دے گی"۔

درخت کا شکوہ

اے زمین کے تنگدل بسنے والو! ہم سے کس بات کا حسد کرتے ہو ہم تو زمین میں پھیلنے کی بجائے فضا میں پھیلتے ہیں۔ صرف ایک بالشت زمین ہم نے گھیر رکھی ہے۔ مگر تم پھر بھی ہم سے بیر رکھتے ہو"۔

علم اور غرور

میں اپنے کاسۂ سر کو کاسۂ گدائی بنا کر اہل علم کے آستانوں پر پھرتا رہا در در سے بھیک مانگ کر اس کچکول کو بھرا۔ یہ کاسہ منہ تک بھر چکا تو میں اسکو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اور میں اپنی فقیرانہ اصلیّت کو بھلا کر اپنے آپ کو بہت بڑا عالم اور ودّوان سمجھنے لگا۔ میری رفتار و گفتار سے غرور ٹپکنے لگا۔ ایک دن اِس کچکول گدائی کو مرشد روحانی کے حضور میں لے گیا۔

اِس نے اہل علم کے ان پس خوردہ ٹکڑوں کو جھوٹا بتا بتا کر کچکول کو زمین پر الٹ کر بالکل خالی کر دیا۔ مانجھ مانجھ کر اسے دھویا۔ اور کثافت علم سے صاف کیا۔ تب یہ کچکول گدائی روحانیت کی سیرابی سے کنول کے پھول کیطرح شگفتہ ہو گیا۔

(پھلواڑی امرتسر دگورمکھی)

پروفیسر پرشوتم دت
ڈی ایس کالج لاہور

بادۂ کہن

(الف)

(۱) اے ساس رانی تمہارا بیٹا کیا ہے۔ کہ میری طرف نگاہ بھی نہیں کرتا

(۲) اور جب کبھی بھولے سے اس کی آنکھ مجھ پر پڑتی بھی ہے۔ تو چینِ جبیں کے ساتھ میری حیات کس حساب میں ٹھہری ؟

(۳) اس کے اپنے گھر میں (حسن کی) آگ شعلہ زن ہے۔ مگر وہ ہے۔ کہ جا کر پرائی آگ تاپتا ہے۔

(۴) سنتی ہوں۔ کہ محفلوں میں وہ ہوشیار اور پختہ کار مشہور ہے۔ مگر آہ! میرے لئے تو ابھی خام ہے۔

(جان محمد)

(ب)

(۱) اپنے سجن (دوست) کی تلاش میں ہرگز ترک نہ کرونگی۔ نہ واپس ہی آؤں گی۔

(۲) جب چلتے چلتے پاؤں تھک جائیں گے۔ تو سر کے بل چلنا شروع کر دونگی۔

(۳) اوپر تمازت، آفتاب ہے۔ نیچے ریگ طپاں۔ مگر کیا پروا ہے بیں جستجوئے دوست سے ہرگز باز نہ رہونگی۔

(۴) جب تک میں اس کا دیدار حاصل نہ کر لونگی غمِ فراق میں اس طرح گھلتی جاؤنگی جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے۔

(۵) اے ماں جب تک پریتم تک رسائی نہیں ہوتی تب تک ہوائے فراق سے کیکر کے گیلے چھلکے کی طرح دھواں دے دے کر جلتی رہوں گی۔

(۶) اے دادو وہ مہجور عورت کہتی ہے۔ کہ میرے دشمن غم درد میرا پیچھا تبھی چھوڑینگے۔ جب میں محفل دوست میں باریاب ہونگی۔

(دادو جی)

(ج)

(۱) راجہ بُدّھ ہشٹر کے دم کے ساتھ ہی قدردانی بھی گئی۔

(۲) سخاوت کیش راجہ کرن کے چراغ حیات کے ساتھ ہی شمع جود بجھ گئی، اور رگھوناتھ (راجہ رام چندر) کی روپوشی کے ساتھ ہی محبت بھی دنیا سے معدوم ہو گئی۔

(۳) ارجن گئے تو بہادری بھی گئی۔

(۴) راجہ بکرم حاجت روائی اور مشکل کشائی کو اپنے ساتھ ہی لیتے گئے ٹھیک اسی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات حسرت آیات کیساتھ وضعداری اور آئین پسندی جہاں سے رخصت ہوئی

(نا معلوم)

(پروفیسر موہن سنگھ ایم۔ اے اورینٹل کالج لاہور)

ماہِ نو

۱ــ اردو یا فارسی کے چار حرف پڑھ کر ہم خود کو عالم کیوں کہلوائیں ؟

۲ ـ مشرق یا مغرب سے کوئی مطمح نظر مستعار کیوں لیں۔ اور اس طرح اپنی فردیت کو کیوں ضائع ہونے دیں ؟

۳ــ ترقی روحانی کو ایک طرف رکھ کر حسن ظاہر کی قسم کیوں کھائیں ؟

۴ ـ ہوس پرستی کے قلعے کیوں تعمیر کریں۔ اور عشق حقیقی کہ عطائے مرشد ہے اس کے قصر کیوں مسمار کریں ؟

۵ ـ علم خود شناسی کا نام ہے۔ اور خدا پرستی کا۔

۶ ـ علم محبت نوازی کا نام ہے۔ اور قلب گدازی کا۔

۷ - اپنی عادات کو سنوارنے کا نام علم ہے - اور مذہب کو اس کی اصلی حالت پر لانے کا نام بھی علم ہے "

۸ - علم خدمت خلق بجا لانے کو اور ہر امر پر کافی غور و خوض کرنے اور قواعد کی پابندی کو کہتے ہیں "

(لاجونتی)

علم کی اصلی غائیت بہبودی ہمہ عالم ہے - اور ارتقائے جُملہ اقوام - یہ ترقی ہر پہلو میں نمایاں ہونی چاہئے - یعنی نوع انسان کی روحانی - جسمانی سیاسی - اور خصائل ترقی میں ہم آہنگی ہو - دل و دماغ اور جسم یہ سب برابر نشو و نما پاتے رہیں - جہاں کہیں بھی کوئی انسان ہے - اسے پیچھے نہ رہنے دینے کی سعی میں لگے رہنا ہی صحیح معنوں میں ترقی کے قدم اٹھانا ہے -

گجراتی

من کا مندر

پہاڑ نے تاڑ کے گنجان درختوں کا لباس پہن رکھا تھا - اس کی کمر پر تار یک بادلوں کا پٹکا تھا - لیکن مجھے وہ تنگ اور پیچدار راستہ مل گیا - جو ہر تا پھرتا مندر کو جاتا ہے مندر کی قدیم عمارت میرے سامنے تھی - اس کا کلس آکاس کے دیوتا کی مانند خلا میں اکیلا کھڑا تھا - ہوا پجاریوں کے گانے کی مدہم آواز کو اڑا کر لا رہی تھی - گھنٹو گے بجنے کی آواز صاف تھی - اور شورانگیز طوفان کی طرح پہاڑیوں میں گونج رہی تھی "

میری روح نے زنجیریں توڑ دیں - اب وہ کائنات کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھی "

"آہ - تڑ کا ہو گیا" میں نے چونک کر کہا - میں ایک درخت سے سہارا لگائے کھڑا تھا - اور میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا "

اب مجھے مندر میں جانے کی ضرورت نہ تھی - میرا مندر میرا دل تھا "

"گجراتی"

مولوی محمد اسمٰعیل بھائی سورتی

(دیو بند)

مرہٹی

مایا

یہ نسیم جانفزا جس کو صُبح کی خوبصورت دیوی نے بیدار کر دیا ہے - دوپہر کی یہ تا نباک تمازت - شام و سحر کے دلفریب منظر آرزو پرور آفتاب مغرب کی واپسیں نگاہیں "

یہ کیا ہے ؟ سب مایا ہے "

بادلوں سے صاف آسمان پر ماہ درخشاں کی نور افشانی - برسات کی تمنا پرور بہار کی شورانگیزی - سرسبز اور شاداب سبزہ زار خوش رنگ ہو جائے "

یہ کیا ہے ؟ سب مایا ہے -

"مرہٹی" مسٹر سرت چند سنگر مشین کمپنی (ناگپور)

کشمیری

چرواہے کا لڑکا

میرے باپ نے مجھے بکریاں چرانے بھیجا میں پہاڑی کے اس پار گیا جہاں چنار کے درختوں کی گھنی چھاؤں ہے - اور زعفران کی خوشرنگ کیاریاں ہیں . . . . . یہ کون تھی جو وہاں بکریوں کے درمیان بیٹھی تھی - گھاس کے نرم گدیلے پر - آندھی تھی - لوبان کی خوشبو کی - اس کی آنکھیں قمری کی سی تھیں - اور لمبے لمبے بال . . . . . سیاہ بکری کا ایک ریوڑ پہاڑ کی برف پوش بلندی پر - اس کے سفید دانت خوبصورت بردوں

کی مانند تھے۔ اور ہونٹ ایک سرخ ڈورا۔ گردن سفیدے کے درخت کا سڈول تنا تھی۔

میرے باپ نے مجھے بکریاں چرانے بھیجا پہاڑی کے اس پار جہاں چنار کے گھنے درختوں کی گھنی چھاؤں ہے۔

میرا ایک برّا کھو گیا ہے۔ میں اس کو کہاں ڈھونڈوں۔ وہ میرے ریوڑ میں سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اُس کی آنکھیں ہرن کی سی تھیں۔ لیکن آج صبح سے انہیں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کی اون سفید تھی۔۔۔۔۔ اسکے دانتوں کی سی سفید۔۔۔ اب میں اسے کہاں ڈھونڈوں کل پھر میرا باپ مجھے بکریاں چرانے بھیجے گا۔ پہاڑی کے اُس پار۔۔۔۔ میرا برّا اس کے پاس ہے؟

"کشمیری" (مولوی عبدالرحیم بی۔ اے کاشمیری)

تامل

بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے (پیغمبر اسلام علیہ السلام)

میں نے ایک پھل دار درخت کو دیکھا۔ اسکی شاخیں بار سے جھکی پڑتی تھیں اور بے شمار خوشنما پرندے اِن پر بیٹھے پھلوں کو کھا رہے تھے اور خوشی سے چہچہا رہے تھے درخت کے نیچے چند بوڑھے اور نوعمر بچے بھی تھے جو پھلوں کو لکڑی اور پتھروں سے توڑ رہے تھے

میں نے درخت سے کہا "اے درخت یہ لوگ اس بے دردی سے تجھے لکڑی پتھروں سے مار رہے ہیں۔ اگر تجھے پھل نہ لگتے۔ تو اچھا ہوتا"

درخت نے کہا۔ اے بندہ خدا! یہ لوگ صرف اس پر بس نہیں کرینگے بلکہ جب میرے پھل ختم ہو جائینگے تو مجھے کاٹ کر آگ میں جھونک دینگے۔ لیکن میں ہوں کہ ان سب مصائب پہ شکر کرتا ہوں تو نے مجھ سے مہربانی سے باتیں کی ہیں میں تجھے تین ایسی باتیں بتاتا ہوں جو آجتک میں نے کسی کو نہیں بتائیں"

خدا نے مجھے اسلئے پیدا کیا کہ انسان مجھے دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ جب تمہارے پاس کچھ ہوگا۔ تو بہت سے لوگ تمہارے عزیز و اقارب بن جائینگے۔ اور اگر کچھ نہ ہوگا تو یگانے بیگانے ہو جائینگے۔

جسطرح میں کچھ عرصہ پھل دیکر فنا ہو جاتا ہوں اسیطرح دنیا بھی کچھ عرصہ بعد فنا ہو جائیگی۔ جسطرح میں لوگوں کو باوجود انکی بدسلوکی کے لذیذ پھل دیتا ہوں اسی طرح تم کو چاہیئے کہ اگر لوگ تمہارے ساتھ بدسلوکی بھی کریں تو تم انکو نفع پہنچاؤ"

"دار الاسلام" تامل (مولوی محمد ابوبکر سیلونی اورنیٹل کالج لاہور)

پشتو

اے دوست میں تجھے ہزار بار یاد کرتا ہوں۔ لیکن جب تک تجھے آنکھوں سے نہ دیکھ لوں میرے دل کو قرار نہیں آتا"

اے دوست تو نے دیدار کے کسقدر وعدے کئے؟ اور میں کس قدر منت کش انتظار رہا۔ لیکن آہ! اب مجھے اعتبار نہیں رہا"

اُس بے نیاز سے اُمید نیاز کیا؟ کل میں شاہ خسرو تھا۔ اور آج فرہاد ہوں میں شب و روز ہوا کی طرح لرزاں ہوں۔ محبت کے بغیر مجھے قرار نہیں۔ اے دوست میں دنیا میں نامراد رہا۔ میری ایک بھی امید نہ بر آئی آہ۔ اے دوست کسقدر دلکش انجام ہے غم والم کا یہ خالق حسن و عشق کا عطیہ ہے۔ جو عاشق ناکام کو عطا کیا گیا ہے"

"دیوان رحمان" پشتو۔ (مسٹر احمد عبداللہ خاں صاحب ارشد نجیب آبادی)

سنسکرت

مغرب کی پری کا چہرہ حیا سے سرخ تھا۔ وہ پرندوں کے چہچہوں کے ساتھ ایک مبہم سے انداز میں سورج کا استقبال کر رہی تھی سورج کی نرم و نازک کرنیں اس کے گلابی رخسار پر تڑپ رہی تھیں اسکی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ شرم وحیا سے سمٹی جاتی تھی ادھر گنگا ندی قدرت کے عطا کئے ہوئے زیورات سے آراستہ جسم دانا پر توبکے ہمالہ پربت سے کسی طرح اجازت لیکر اٹھلاتی ہوئی اپنے پریتم کے پاس جا رہی تھی اس سے مغرب کی پری کا اپنے شوہر سے ملاپ دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ صبح سے سورج کو محبوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی اسکو کتنا ہی کیوں نہ روکو وہ اپنی رفیقہ حیات کی ہم آغوشی کے لئے جو اسکی منتظر کھڑی ہے اسطرح نکل جائیگا۔ کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ گنگا کیلئے یہ تجربہ کچھ نیا نہ تھا جب اسنے دیکھا کہ سورج اپنی محبوبہ کے حیاسی گلگوں رخساروں کو دیکھ کر ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ تو وہ بھی جذبۂ بے اختیار سے متاثر ہو کر ایک انداز متانت کیساتھ اپنے وقار سکون اور اطمینان والے خاوند (سمندر) کے پاس جا رہی تھی"

(پرفیسر گوپی چند ورما۔ بی۔ اے شاستری)

اعلان

ادبی دنیا میں آئندہ نمبر سے "اردو ادب کے اہلِ طرز" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون شروع ہوگا۔ جو سال کے بارہ پرچوں تک جاری رہے گا۔

اس مضمون میں اردو زبان کے اُن انشاء پرداز اور شعرا کے ادبی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی جائیگی جو نظم و نثر میں مخصوص طرز (سٹائل) کے مالک ہیں۔

اس کے علاوہ "شعرائے اردو" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون کا آغاز ہوگا جس میں اردو شاعری کے منتخب آنجہانی و این جہانی بلیس شعرا کا تذکرہ شروع کیا جائے گا۔

ایڈیٹر

بیرونی ادبیات سے

براہِ راست

عربی	انگریزی	جاوی
فارسی	فرانسیسی	ڈچ
ترکی	جرمن	ملایا

عربی

عورت کی جماعتی اور اقتصادی حیثیات

نسوانی دنیا کا مرکز اجتماعی اپنے اقتصادی حالات کے زیر اثر ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ جب تک عورت اقتصادی طور پر میراث اور آزادی معاش میں مرد سے کم رتبہ تھی اُسکی اجتماعی حیثیت بھی اسوقت تک پست رہی گھر میں، حکومت میں اور سوسائٹی میں اُس پر مرد کا تسلط رہا۔ لیکن جب وہ میراث اور حقوق اقتصادی میں مرد کی برابری کرنے لگی تو اس کی جماعتی حیثیت بھی بلند ہو گئی۔

یورپ میں عورت پر ایک زمانہ گذرا ہے جس میں اُسے غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑی ہے۔ مشرقی عورت کی پست حالی سے اس کی کم حیثیتی کسی طرح کم نہ تھی۔

لیکن جب وہاں صنعتی تحریک پیدا ہوئی تو کارخانہ داروں کو عورت کی امداد کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس طرح اُس نے معاشی آزادی حاصل کی۔ اور اسکے بعد سے اُسکی اقتصادی حیثیت مردوں کی اقتصادی حالت کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس کی اس اقتصادی طاقت سے مجبور ہو کر حکومت کو بھی مردوں کی برابر اُسے شہریت کے حقوق دینے پڑے۔

جنگ عظیم شروع ہوئی تو سامانِ حرب کی تیاری کے لئے صنعتی کارخانوں کو عورتوں سے بہت امداد ملی۔ اس گراں قدر امداد کے معاوضے میں یورپ کی عورت کو وہ حقوق بھی مل گئے جو ہمیشہ سے بلا شرکت غیرے مردوں ہی کے لئے مخصوص تھے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں مردوں سے دولت اور آزادی حقوق حاصل کرنے کے ساتھ ہی مغربی عورت مردانہ اخلاق و معاشرت میں بھی مردوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ مردوں کی طرح بال ترشوانا، مختصر لباس پہننا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔

مشرقی عورت کی جماعتی ترقی بھی مغربی عورتوں کی طرح اُسکی اقتصادی مساواۃ کے ساتھ وابستہ سمجھنی چاہئے۔

الہلال (مصر)

رُہبانِ اعمدہ

پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں "رہبانیۃ اعمدہ" کے نام سے ایک جانگداز رہبانیت کی اشاعت ہوئی تھی۔ سمعان نامی شام کا ایک راہب اس رُہبانیت[1] کا پروپیگنڈا کرنے لگا۔ اُس نے رُہبانیت (ترک دنیا) اختیار کر کے الطاکیہ کے ایک گرجے میں ریاضت (تپسیا) شروع کر دی۔ مگر وہاں سے گرجے کے راہبوں نے اس واسطے اُسے نکال دیا کہ یہ نہایت سخت قسم کی ریاضتیں کر کے اپنے نفس کو عذاب دے رہا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک کُھلے مکان میں چار گز اونچا اور ایک میٹر مربع چوڑا ستون گاڑ کر اُس پر چڑھ گیا اور ایک بڑی بھاری زنجیر اپنی گردن میں لٹکالی۔ دن رات اس ستون پر چڑھا رہتا تھا۔ پھر اور ترقی کر

[1] رُہبانیۃ۔ ترک دنیا۔ راہب۔ تارک الدنیا۔ اسلام نے رُہبانیۃ کو جائز نہیں رکھا۔ ملخص۔

اُس سے بلند ستون گاڑ کر اُس پر رہنے لگا اس طرح تدریجی طور پر ایک ستون کی بلندی سے دوسرے کی بلندی پر صعود کرتا ہوا آخری ستون جو اس نے تجویز کیا ساٹھ قدم طویل تھا۔ اس ستون کی بلندی پر اس نے اپنی زندگی کے تیس سال گذار دیئے۔ اور اس عرصے میں ایک لمحہ کے لئے بھی نیچے نہیں اُترا۔ اس کے روحانی شاگرد ایک چھکے میں رسی کے ذریعہ دو وقت اُسے کھانا اوپر پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر جاڑا گرمی برسات سے محفوظ رہنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

یہ رہبانیت اطراف ملک میں رائج ہو گئی۔ سمعان کے بعد اس کے جانشینوں میں جو سب سے زیادہ اس رہبانیت میں مشہور ہوا دانیال تھا۔ اُس نے بحیرہ فاسفورس کے کنارے اپنے لئے اسی قسم کا ایک ستون گاڑ کر ۳۳ برس اُس کی بلندی پر گذار دیئے۔ یورپ کے ایک باشندے نے جرمنی میں ۵۸۵ء میں اپنے لئے ایک ستون ریاضت گاڑا تھا۔ مگر وہاں کے راہبوں نے اسے روک دیا۔ یہ رہبانیت بعض مقامات میں سولھویں صدی عیسوی تک باقی رہی۔

رُہبانِ اعمدہ'' کی اس عمودی ریاضت کی غایت یہ تھی کہ زمین سے جدائی حاصل کئے بغیر ترکِ دنیا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کے درمیان معلق رکھتے تھے۔

(الہلال)

مشرقی بیداری

مشرقی دنیا میں نئی قسم کی زندگی پیدا ہو رہی ہے۔ اس زندگی کا ظہور مختلف ممالک میں مختلف صورتوں میں ہو رہا ہے۔ یہی زندگی مراکش اور طرابلس میں آزادی کی آتشین آرزوؤں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ ٹرکی اور افغانستان میں جدت اور قدامت کی کشاکش کے پردے میں نمایاں نظر آتی ہے اس نے چین اور مصر میں اصلاحی مذاہب کی جنگ کا بھیس بدل رکھا ہے۔ ہندوستان اور جزائر ملایا میں حق اور طاقت کی کشمکش کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ مغربی قومیں اس نہضتِ شرقیہ (تحریک مشرقی) کو اتحادِ اسلامی (پین اسلام ازم) کہہ کر ''زرد خطرہ'' کا لقب دیتی ہیں۔ کہیں اس کا نام اتحاد تورانی پڑ گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ زرد خطرہ ہے نہ پین اسلام ازم اور نہ تورانی اتحاد بلکہ حقیقت میں یہ مختلف مظاہر اور نام ہیں۔ اُس مشرقی تحریک کے جو مشرق کو خوابِ گراں سے بیدار کر رہی ہے۔

الرابطۃ الشرقیہ (مصر)۔

فارسی

آزادی و استقلال

۱۔ کسی قوم کا اولین لازمۂ شرافت استقلال ہے۔

۲۔ اقوام کے استقلال کو صرف فضائل اور اخلاقِ عالیہ محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

۳۔ ہر ملت کے استقلال کی حافظ و نگہبان اسکی شجاعت اور قربانی ہوتی ہے۔

۴۔ اگر آزاد رہنا چاہتے ہو تو حق پرستی کو اپنا شعار بنا لو۔

۵۔ حق پرستی کے بغیر آزادی ممکن نہیں۔

۶۔ معارفِ آزادی کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

۷۔ زندہ رہے وہ قوم جو آزادی کے لئے زندگی کو عزیز رکھتی ہے۔

۸۔ ایران ایرانیوں کو ہی آزاد کرانا چاہئے۔

۹۔ چاہئے کہ تو عین آزادی میں مقید رہے۔

۱۰۔ روحِ ملت کبھی شخص پر فدا نہیں ہوتی۔ خادمین کی ارواح کو چاہئے کہ ملت پر فدا رہیں۔

تجدّد و ترقی

۱۔ ترقی کا اولین ذریعہ روح تجدد رکھنا ہے۔
۲۔ ایک زندہ قوم کے لئے لازم ہے کہ ہمیشہ تجدد کی طرف گامزن رہے۔
۳۔ زمانہ کی رو کے خلاف قدم اٹھانا غلط اور محال ہے۔
۴۔ ترقی کرنا ایک فریضہ ہے اور ترقی نہ کرنا موت۔
۵۔ ہم قرنِ حاضر کی اولاد ہیں اور قرن خود کے عاق ہونا نہیں چاہیئے۔
۶۔ جہلا موت کو تبدیل عادت پر ترجیح دیتے ہیں۔

فلسفہ اجتماعی

۱۔ ایک بے تعلق فرد اپنی قوم کے لئے حیوان سے بھی کمتر ہے۔
۲۔ حیات اجتماعی سے بے تعلق ہونا زندگی سے بے تعلق ہوتا ہے۔
۳۔ زندگی ان لوگوں سے ہمیشہ روگرداں اور گریزاں رہتی ہے جو سیاسی زندگی اور حیات اجتماعی سے واسطہ نہیں رکھتے۔
۴۔ حقوق جماعت کے ظالموں پر ترحم کرنا جماعت سے خیانت کرنا ہے۔
۵۔ ممکن نہیں کہ ایک نادان ایک ہی لحظہ میں دانا ہو جائے۔
۶۔ کوئی کارِ عظیم فکر انجام کے بغیر نہیں ہوتا۔

"ایران شہر" برلن (شیخ محمد خیابانی)

ترکی

مئے لالہ گوں

مئے لالہ گوں حرام ہے؟ اچھا حرام ہی سہی۔ دیکھنا زاہد تیرے شوق سجدہ ریزی میں کہیں اس کی آرزو نہ ہو۔
کہتے ہیں شراب حرام ہے۔ وہ کاہلی پیدا کرتی ہے۔ لیکن بہار میں جب ایک ساقئ ماہ وش ساغر بھر کر دے تو میں کیا کہوں؟
شراب کے بیان نے مجھے دیوانہ وار خود رفتہ کر دیا۔ زاہد ساغر میرے ہاتھ پر رکھ دے۔ ورنہ میں شراب (طہور) کا انتظار نہ کروں گا
زاہد مئے لالہ گوں کا بیان توبہ شکن ہے۔ سچ کہنا کبھی پی بھی ہے شراب میری روح ہے۔ لوگ مجھے کیوں ملامت کرتے ہیں۔ میں تو خدا کی قدرت کے تماشے دیکھتا ہوں۔
زندگی ایک چراغ ہے عیش گو وہ مختصر ہی ہو اس کی بتی۔ اور شراب اس کا روغن ہے۔ اے زاہد تو مفلوں کو مستِ مئے ذات ہونے دے سلسبیل کے خوشگوار وعدے رہنے دے۔ جہنم کے شعلے رندوں کو نہیں جلاتے میری شراب صہبائے محبت ہے۔ بازاری شراب نہیں۔

"نجم الزمان" شامی

انگریزی

بغاوت

اے موسیقی خاموش ہو جا۔ نوک خامہ آج میرے لئے جدید تصورات کی تشکیل نہ کرے۔ اے درد محبت بیدار نہ ہو۔ میری درماندہ روح کے ہمیشہ اسیر پرواز بازو ساکت ہو جاؤ۔ اب گلاب مرجھائیگا بلبل اپنا افسانہ درد بھول جائیگی۔ جذبات۔ خواب ہائے رنگین اور روح کی شادابی اور تازگی بلبل کے نغموں اور گلاب کی حسرت کے ساتھ فنا ہو جائیگی۔ آہ میری روح پرواز کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ کیف آمیز غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ میرے حواس ناکارہ ہیں۔ میری

نبض ساکت ہو جائیگی۔ اور میں ایک خیالی پیکر یا ایک ویران سمندری باغ کے پاس سے گذرتے ہوئے جہاز کی مانند جس کی پتوار دور سے دھندلی سی نظر آرہی ہو خاموشی کے ساتھ دریائے وقت کی امواج کے اس پار اتر جاؤنگا۔ اور ایک شکستہ و دریدہ بادبان کی مانند وہاں چلا جاؤنگا جہاں تنہائی۔ موت کی سی تنہائی ہے

"دو ویک مین" لنڈن

نذر الفت

میری محبوبہ دور کی ایک نورانی وادی سے مجھے پکار رہی ہے۔ محبت کی یہ ملکوتی آواز میرے دل کی فضا میں مرتعش ہے۔ یہ نغمے ہیں خوشنما پرندوں کے جو اس کے قہقہوں کی رنگین فضا میں محو پرواز ہیں۔ اور ان کی صداہائے بازگشت ایک ننھی سی نقرئی گھنٹی کے بجنے کی مانند آتی ہیں۔

رنگین خواب اس کی نگاہوں میں رقص کر رہے ہیں اور خیالات محبت خوشی کے لباس میں ملبوس جادۂ فردوس کے رہنما ہیں۔ میری محبوبہ۔ قہقہے لگائے جا۔ میں ایک جاتری کی مانند تیرے آستانہ پر دو زانو ہوتا ہوں۔ میں زر و مال نہیں لایا۔ لیکن یہ دل ہے۔ یہ تیرا ہی ہے۔

"ہندوستان ریویو"
کلکتہ

جاتری

ہم غریب جاتری ہیں۔ ہم بیابانوں اور پہاڑی راستوں کو قطع کرتے جا رہے ہیں۔ ہم غریب ہیں۔ لیکن ہمیں کچھ فکر نہیں۔ ہمارے پاس اس قصر کی کلید ہے جو جنگل کے اُس طرف ایک سنسان گاؤں میں بنا ہوا ہے

ہم غریب جاتری ہیں۔ سرد ہوا اور برف باری نے ہمیں درماندہ کر دیا ہے۔ ہمارے قدم بھاری۔ لیکن ہمارے دلوں میں امید کی چمک ہے شام کے دھندلے چاند کی روشنی میں ہم اس قصر تک پہنچ جائینگے جس کو فرشتوں نے منور کر رکھا ہے۔

ہم غریب جاتری ہیں۔ ہمارے دل میں اب سرفروشی کی خو نہیں رہی۔ ہم ایک خاموش جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی اس قصر حسن کی کلید کو کام میں نہیں لائیگا؟ آہ۔ ہم کانپتے ہیں۔ انجام تو آپہنچا ہے لیکن ہم آزمائش سے خائف ہیں۔

اب ہم امیر جاتری ہیں۔ ہم خانقاہ کے نزدیک آپہنچے ہیں۔ ہماری آرزوئیں بر آئینگی اور اس کی ایک نگاہ ہمیں ابدی جنت عطا کر دے گی۔

"کانٹیمپریری ریویو" لنڈن

فرانسیسی

بچپن کی یاد

میرے دل کی گہرائی میں اب تک وہ آبدار اور پرسکون موج ہے جس کی بے نقاب بلوریں سطح پر موسم گرما کی ایک دلکش صبح تیرا عکس پڑا تھا۔

کیونکہ خوابیدہ پانی کے عمق میں ابھی ہلکا سا ہیجان ہے۔ گویا کہ وہ ایک خواب ہے ماضی کی دلفریبی کا جو اسے بار بار نیند سے چونکا دیتا ہے۔

میری محبوبہ! میرا دل ایک دیرینہ آرزو سے حسرت و یاس کا کاشانہ بنا ہوا ہے۔

یہ یاد ہے ایک بہارِ حسن خوبی کی۔
آہ یہ تیرے لڑکپن کی تصویر ہے۔

"لاماتین" فرانس — حنیف ہاشمی

جب میں شام کے وقت اپنے نرم و نازک بستر پر محو ریلیٹی ہوں۔ میٹھی نیند کا خمار آہستہ سے آجاتا ہے۔
اور میری روح اس کی ظالم محبت کے پرستان کی طرف پرواز کرجاتی ہے۔
میرے دل میں اس کا خیال ہوتا ہے۔

میرے دل میں جس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ میرا مجروح دل درد سے تڑپ رہا تھا۔
آہ اے مقدس خواب! مجھے اپنے ناقابلِ تسخیر سراب میں آزاد چھوڑ دے۔
اگر وہ حقیقی طور پر مجھے نہیں مل سکتا۔
میری غریب اور محبت کی ماری روح کو اپنے فریب کا یہ تاریک عطیہ ہی عطا کر۔

"لامانتین" فرانس

حنیف ہاشمی

جرمن

خلوت

مجھے میرا محبوب مل گیا۔ وہ اس پُرشور ہجوم میں کھو گیا تھا۔ اب تو میرے بازوؤں میں محبوس ہے۔ اب تو میرا ہے اور صرف میرا ہے۔ آدھی رات، بے پایاں وسعت فطرت خاموش سو رہی ہے۔ ہم جاگتے ہیں اور ہر طرف سناٹا ہے جس طرح کہ سمندر کی پُرسکون گہرائیوں میں سمندر کا دیوتا اپنی عروس، سمندر کی دیوی سے ہمکنار ہو۔ دن کا شور و غوغا اب صرف فغاں نہیں ہے کہ تیرے شیریں الفاظ سے مجھے محروم کر دے۔ صرف تیری سریلی اور رسیلی آواز کی جاں بخش سرگوشیاں میرے لئے فردوسِ گوش ہیں زمین تاریکی میں مستور خاموش ہے۔ اس وقت کوئی دیا نہیں ٹمٹماتا۔

صرف یہ مدھم چراغ ہے جو مملکتِ عشق کو روشن کر رہا ہے۔

رات

رات کی تنہائی میں، میں درخت کے تنے سے سہارا لگائے کھڑا ہوں۔ اور بار بار اپنی نگاہیں اس بلند ایوان کی طرف اٹھاتا ہوں۔ وہ میٹھی نیند سو رہی ہے اور دل غریب خواب دیکھ رہی ہے۔

میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ کالے کالے بادلوں نے اسکی نیلگوں سطح کو تاریک کر رکھا ہے لیکن ــ گویا دل اس قدر گھٹتے ہیں۔ چاند کی ایک کرن تڑپتی ہوئی باہر آ رہی ہے۔

جاوی

خوشی

آہ میری روح فضا میں آوارہ پھر رہی ہے
وہ تیری متلاشی ہے
دنیا اس کیلئے سنسان ہے۔
میرا دل بجھ چکا ہے۔

اگر ذراتی ہوتی میرے پاس آ سکے۔
نیلگوں آسمان کے اس پار سے۔
اس پار سے جو تیرا مسکن ہے۔
آ۔ میرا دل دھڑکتا ہے۔

وہ تیرے لئے ایک اتھاہ غار ہے
دو پہاڑوں کے درمیان کا تنگ اور تاریک درہ

تیری عنبریں خوشبو میری روح کا مرہم ہے

میرے دل میں گہرا زخم ہے۔
آ۔ اس پہ چھا جا۔
اس کا آخری وقت ہے۔

"پیتنا" جاوا

محمد زین جاوی (اشاعت اسلام کالج لاہور)

ملایا

اے اندوہ ربا! اے حیات بخش!
اے دریائے بے کنار

طوفان انگیز موجیں اٹھا
غم کی رات چھا رہی ہے

میری کشتی شکستہ ہے
اسے اپنی آغوش میں لے

اے اندوہ ربا! اے حیات بخش!

"بیرساتواں" ملایا

محمد زین جاوی (اشاعت اسلام کالج لاہور)

ڈچ

مجھے بھول نہ جانا۔

جس وقت صبح کی محبوبہ یوں آفتاب کیلئے اپنے قصرِ حسن کا دروازہ وا کر دے تو مجھے بھول نہ جانا۔
اور جب رات کے خاموش خواب پُرنور کا نقرئی نقاب پھیلا دیا جائے۔ تو مجھے بھول نہ جانا۔
جب تیرا یقش دل بیم رقص و سرور کیلئے بے قرار ہو اور شام کے پیکر ہائے سراب تجھے ساتھ اور تنہا اور گنجان جنگل کی تنہائی میں بلا رہے ہوں تیرے کان میں یہ آواز آتی ہو "مجھے بھول نہ جانا"

جب قسمت ہمیں ہمیشہ کیلئے جدا کر دے جب غم و الم جلا وطنی اور آسیب نے دگرگوں میرے قتیلِ محبت دل کو بیس کر غبار کر دے تو "مجھے بھول نہ جانا"۔
تو میری الم رسیدہ محبت کا خیال نہ کرنا اور اس آخری التجا کو بھول نہ جانا۔
زمانہ؛ عدم موجودگی؛ محبت کو ان سے کیا؟ جب تک میرا دل متحرک ہے یہ تجھ سے التجا کرتا رہیگا۔ "مجھے بھول نہ جانا" "وسبی"

بوساطتِ انگریزی!

اطالوی
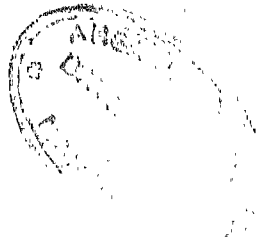
محبّت

میں عندلیب خوشنوا بنا اور اے حسینہ تیری زلفوں کے گیت گائے سورج سے نفرت کرکے میں سایہ دار وادیوں میں چلا گیا۔ تو خود میرے نغموں کا آشنا ہے۔ میں نے کیا نہ کیا یہ ظاہر کرنے میں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے یہ نذرِ عقیدت پیش کرنے کے لئے میں پپیہا بن گیا۔

صرف اس اُمید پر کہ کبھی ہم دونوں باغ کی روش پر آشیانہ بنا سکیں گے۔

"اطالوی"

حسنِ نسوانی

آہ۔ یہ حسین ترین پھول دامنِ کوہ میں شگفتہ ہوا۔ یہ پھول تیرے حسن کا پھول ہے۔ میری محبوبہ!

میں اس کو دیکھتا ہوں۔ میں اسے ہر لحظہ تکتا ہوں۔

میں تیری زلفوں کی پریشانی کو دیکھتا ہوں اے میری محبوبہ اس دلفریب پیشانی کو۔

وہ کون مصوّر ہے جو قدرت رکھتا ہے تیرے نقش و نگار کی تخلیق کی۔

جس نے میری محبوبہ کی تخلیق کی۔ اس حسن و جمال کیسا تھا۔ آہ کسی مصوّرِ ارضی کو یہ طاقت نہیں دی گئی۔ یہ تصویر صرف خدا کی بنائی ہوئی ہوسکتی ہے

"اطالوی"

چینی

فریضۂ وطن

اب جب کہ وطن خطرے میں ہے۔ میں اپنا قلم پھینکتا ہوں تخیلات منتشر کرتا ہوں۔ میری امیدیں مردہ ہیں۔ لیکن میری ہمّت ......

وہ ابھی زندہ ہے۔

پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے میرے پاس لٹھا اور گھوڑے کو تہور دلانے کیلئے چابک ہے۔ میں اپنے تئیں "آسمان کے بیٹے" کی خدمت میں پیش کرنے جاتا ہوں۔ میں باغیوں کے سرغنے کو مضبوطی سے باندھ کر اس کے حضور میں لاؤنگا۔

جب میں اشعار لکھ رہا تھا۔ میری روح خوفناک گہرائیوں پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ محفوظ سی ہو رہی تھی۔ لیکن اب جبکہ میں واقعی ان کو دیکھتا ہوں۔ ان خوفناک اور عظیم گہرائیوں کو۔ میری روح کی کمزوری محسوس کرتی ہے مضبوط دل کے ساتھ میں ان پہاڑوں پر چڑھ جاؤنگا۔ جہاں منحوس پرندے اڑتے ہیں۔

اور میں ان میدانوں کو قطع کرونگا۔ جہاں کالے اور ڈراؤنے بندر چیختے ہیں۔

اب میں مضبوط ارادے کے ساتھ مردِ مجاہد ہوں۔

"اُوی چنگ"

نرگسِ مخمور

نسیم دریائی نرگس کے پھولوں کو جھکاتے دیتی ہے۔ ان کی خوشبو اُڑ کر اس جگہ کو معطر کر رہی ہے۔ جو جھیل کے درمیان اٹھتی ہوئی ہے نیم مخمور رقاصہ کی سی رقص کر رہی ہے۔ پاؤں کی ٹھوکروں سے اس کے تمام جسم میں لرزشیں دوڑ جاتی ہیں۔ وہ لڑکھڑاتی، سفید فرش پر جھکتی اور مسکراتی ہے۔

"لی ٹی پو"

دُعا

اے خوشنما رات! اے روشن چاند! اور سیب کے اشجار کی خوشبو! میری محبوبہ دلکش خواب دیکھے۔ منظور ہو کہ وہ مجھے دیکھنے کیلئے بیتاب ہوجائے وہ گھروم آئے اور میرے دروازے پر دستک دے۔

سیب کے اشجار کی خوشبو! روشن چاند اور اے خوشنما رات! میں اس کے دیدار سے آشنا ہوسکوں۔ اگر مجھ پر کرم کرو۔

"ہنگ سوفان"

صبح مفارقت

گجر بج چکا اور مجھے ضرور جانا ہے۔ میری محبوبہ تو نہ اٹھ۔ مجھے وہ ننھا سا دیا دے۔ کہ تیرے چہرے پر ایک بار پھر نظر ڈالوں اور تجھے تیری تمام تر رعنائیوں اور شادابیوں کیساتھ اپنے دل میں، اپنی روح میں۔ رکھ لوں

تیرے یہ نازک و لطیف لب! میں رات کے چوکیدار کو گجر بجاتے سنتا ہوں۔ دن بھر کے کام کے بعد شام ہوتی ہے۔ اور ہر شام مجھے تیری آغوش میں آتی ہے تیری آغوش میں جو امن ہے۔ میری تکالیف اور مصائب میں۔ دیکھ! پتوں پہ شبنم کے موتی پڑے ہیں۔ اور کسنورہ سیٹی بجا رہا ہے۔ خدا حافظ! آج شام تک خدا حافظ!

”ماہونگ چنگ“

لاطینی

کل کی فکر جانے دے!

جاہ و منزلت کی آرزو عبث ہے۔ اگر تیرے قبضے میں سنگین قلعے اور فلک بوس ایوان ہوں تو کیا ہے؟ عمر عزیز گذری جا رہی ہے اور تیرے آلام میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کے تفکرات سے آزاد ہو کر آ۔ کل کی فکر جانے دے یہ تفکرات کیوں ہیں؟ آہ کس قدر دلکش ہے بہار میں پہاڑ کی ڈھلان کی سبز گھاس پر بے تکان لیٹنا! اس سے زیادہ پرسکون مشغل اور کیا ہوگا گذرتے ہوئے سست رفتار بادلوں کی عجیب و غریب اشکال کا جو کشتیوں کی طرح آسمان کی نیلگوں اور پرسکوت سطح پر تیرتے پھرتے ہیں [illegible] ہے اس سے پہاڑ کی پوشیدہ اور نغمہ خیز آبشار کے شور کی خواب آور آواز سننا۔ پہاڑ کی ان ڈھلانوں پر لیٹ کر جہاں انسانی آبادی سے دور کوہستانی غزال اپنے بچوں کو چراتے ہیں۔

آہ۔ دلفریب آفتاب کے غروب ہونے کا نظارہ پہاڑوں کی ان سر بفلک، خاموش اور اطہر چوٹیوں کے پیچھے جو دریا کے ساحر پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ مگر ان سے زیادہ دلآویز و آلاویز نہیں یہ شغلہ ہے کہ شب ماہ ہو ہمے نوشگوار ساقی اندوہ ربا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دل میں کوئی آرزو نہ ہو۔

”کارپے ڈیم“ لاطینی

ہسپانوی

آہ۔ مجھے ایک دن مرنا ہے

اے سبک پرواز پرندو! جو نیلگوں فضائے آسمانی میں پرواز کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ میں مرنے کے لئے کہاں جاؤں؟

آہ۔ میں لرزاں ہوں۔ کاش تمہاری طرح میرے بھی پر ہوتے۔ میں انہیں سحر آگیں فضا میں پھڑپھڑا کر پرواز ہو جاتا۔

اے زمیں! اے آسماں! جواب دو مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ اس دنیائے عتیق کو ایک دن اور کیوں چاہیئے؟

آہ جب مشرق میں شعلے برس رہے ہوں۔ اے تاریک پانیوالے سر سبز چراگاہو! یہ کیا ہے کہ تم میں، خاموش اور نا آشنائے شعور جس کے نظارے سے دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور سر سجدہ میں جھک جاتا ہے۔

آہ اے زمین تیرے محبوب آفتاب سے کس نے تیری نسبت ٹھہرائی ہے طیور کی نغمہ سنجی کیا کہتی ہے؟ اور شبنم کی اشک ریزی کیا معنے رکھتی ہے تم اپنی محبت سے میرے دل کو کیوں دیوانہ بنا لیتے ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ مجھ سے جسے ایک دن مرنا ہے“

”رولا“

فرہنگ الفاظ

مشکل الفاظ کا فرہنگ تیار کرتے ہوئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کہیں الفاظ کے مرادی معنے لکھنے پڑے اور کہیں لغوی۔ پھر بھی بہت سے مشکل الفاظ عربی۔ فارسی۔ ترکیبیں اور مغلق فقرے معنی بیان کرنے سے رہ گئے۔ کیونکہ اگر مشکل الفاظ کا فرہنگ بنایا جاتا۔ تو پچاس صفحات اس کی نذر کرنے پڑتے۔ کاش اہل قلم مضمون لکھتے ہوئے معمولی اردو خوانوں اور طلبا کی کم سوادی کو بھی پیش نظر کر لیا کریں تو فرہنگ کے صفحات کسی مفید مضمون کو دیئے جا سکیں۔

ایڈیٹر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
(الف)		ازرق	نیلا	بدسگال	دشمن۔ بدخواہ	پس خوردہ	بچے کھچے
استفادہ	فائدہ اٹھانا	اکتساب	حاصل کرنا	بربط نوازی	ستار بجانا	پائمال قیامت	انتظار کی سختیوں سے
الحمرا	اندلس کا شاہی محل جو مسلمان	استکبار	بڑائی اور غرور	بک کبیر	مُنیم	انتظار	تباہ ہونے والا
	بادشاہوں کی یادگار ہے	انحراف	سیدھے رستے سے ہٹنا	بربِّ کعبہ	کعبے کے خدا کی قسم	(ت)	
اعماق دل سے	دل کی گہرائی سے	الحذر	بچو۔ پرہیز کرو۔	بے کیف	روکھی پھیکی	تعیین مقصد	کوئی مقصد مقرر کرنا
آرزو انگیزی	دلی آرزوؤں کو بیدار کرنا	اسقف	پادری	برزخ	وہ مقام جو دوزخ و جنت کے	ترنم ریز	گیتوں کی بارش کرنیوالا
ایپی سوڈ	حصہ	ادنیٰ ترین	چھوٹے درجے کا		درمیان میں ہے۔ مراد درمیانی حصہ	تفاخر	فخر
اتلاف	تلف کرنا	اساتذہ	استاد کی جمع استادان	بکیں خلوتوں	ایسی تنہائیوں میں جہاں	تحلیل	حل کرنا۔ حصے حصے کرنا
ارطالیس	ارسطو حکیم	انحطاط	گھٹنا	ہیں	کوئی ساتھی نہ ہو۔	تقدس مآب	پاکیزہ
اسراف	فضول خرچی	ابطال	باطل کرنا۔ مٹانا	بلند آہنگ	بلند آواز	تفسیر	تشریح
اطلاق	بولنا۔ استعمال	آئیڈیل	نصب العین۔ اصلی مقصد	بلا استمداد فرہنگ	لغات کی مدد کے بغیر	تساہل	بے پروائی
اہلیت	قابلیت۔ استعداد	استغراق	غرق ہونا۔ کسی کام میں	بُشرے	چہرے	تکاسل	کاہلی
آرٹ	فن۔ صنعت		سخت مصروف ہونا۔	بنفس نفیس	خود۔ آپ ہی	تخاطب	کسی سے بات کرنا
اہل عجم	ملک عرب کے علاوہ دوسرے	اعصاب	پٹھے	برسبیل تذکرہ	بات کرتے ہوئے	تا بہ دیگراں	دوسروں کا تو ذکر
	ملکوں کے باشندے	ادارہ	محکمہ	بایں ہمہ	اسکے باوجود۔ اسکے ہوتے بھی	چہ رسد	ہی کیا ہے۔
ابوالطیب (متنبی)	شاعر متنبی کی کنیت	ارتقا	ترقی	بروئے کار آیا	پورا آیا	تختۂ مشق	دنیا کی مصیبتوں کا
امتثال امر	حکم ماننا	افکار	فکر کی جمع	(پ)		گردش روزگار	نشانہ
انصار مدینہ	مدینے کے اصلی باشندے	آکاش	آسمان	پایاب	خشک	تیرا آئینہ دار	یعنی مجھ میں تیری صورت
امیر المؤمنین	مسلمانوں کے خلیفہ کا لقب	آب و گل	پانی اور مٹی	پائین	نیچے	ہوں میں	نظر آنے لگی ہے
اختلاط	میل جول	(ب)		پشت دست	ہتھیلی کی دوسری جانب	تعرض	چھیڑ
اکاؤنٹ بک	حساب کی کتاب	بہارین	بہار والا	پیش و پس	ہچر مچر۔ حیلہ۔ بہانہ	تیاتر	تھیٹر
آہنگ	آواز	بیخود سرائی	مدہوشوں کا سا گانا	پریپریٹری اسکول	بچوں کو ابتدائی تعلیم کیلئے تیار کرنے والے اسکول	تزئین عنوان	عنوان اور مضمون کی سرخی کی زینت

الفاظ	معنی
تمنّا پروری	دلی تمناؤں کی پرورش
تدفین	دفن کرنا
تعاقب	پیچھا
(ج)	
جرعہ یاب	ایک گھونٹ پانے والا
جنّت نظارہ	دیدار کی جنّت
جسد	جسم
جاذب	کھینچنے والا
جذبات کا فوّارہ	جس سے مختلف قسم کے جذبے ظاہر ہو رہے ہوں
جلال	رعب و داب
جلو	ساتھ
جبل پیکر	پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم
جانفروشانہ کرتب	ایسے کرتب جن میں جان جانے کا اندیشہ ہو۔
جذبات گوناگوں	قسم قسم کے خیالات
(چ)	
چیف نرس	اسپتال میں مریضوں کو دیکھنے والی عورتوں کی سردار
چمن طرازی	خون کے آنسو بہانے والی آنکھ کا دامن
چشم خوں بار	پھر بھی آنسوؤں سے باغ کھلا دینا
(ح و خ)	
حامل	اٹھانے والا۔ شامل
حاضرات	بھوت پریت اتارنے کا ایک عمل
خامہ گوہر چکاں	موتی برسانے والا قلم (یعنی اچھے اچھے مضمون لکھنے والا)
حریم ناز	مراد گھونسلہ
حریف بہار	موسم بہار کا مدِ مقابل
حسن و قبح	اچھائی برائی

الفاظ	معنی
حقائق و دلائل	حقیقتیں اور دلیلیں
حدودِ معاشرت	سوسائٹی کے قانون
خفیہ ریشہ دوانیوں	چھپے چوری ناجائز کوششیں۔
حیص بیص	بحثا بحثی۔ سوال و جواب۔ قیل و قال
خیر مقدم	استقبال
خداوندان تھیٹر	تھیٹر کے مالک
خطرناک زاویہ	خطرے سے پُر گوشہ
(د۔ ڈ۔ ذ)	
ڈگڈگا کر پینا	ایک سانس میں پی جانا
درد ریز	جس سے درد ٹپکتا ہو
ڈالر	امریکہ کا سکہ تین روپے
دنیا کی شورش گاہ	یعنی دنیا جہاں ہاہاکار مچی رہتی ہے۔
دوشِ ہستی	دنیا کا کاندھا
(ر۔ ڑ۔ ز)	
زنخداں	ٹھوڑی
رہین	گرو
زجر و توبیخ	جھڑکنا۔ ڈانٹنا
ردائے ماتم	ماتمی چادر
رفعتِ پرواز	اونچی اڑان
زنجیر صبح و شام	یعنی صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح اور یہ سلسلہ زنجیر کی طرح چلا آتا ہے۔
روکش لالہ زار	لالہ زار کی طرح رنگین
زہے گرانباریٔ محبت	اللہ اللہ محبت کس قدر بوجھل ہے۔
روزگار آشوب	جس کے فتنوں سے دنیا میں ہلچل مچی ہو

الفاظ	معنی
زخار سمندر	گہرا سمندر
زندۂ جاوید	ہمیشہ رہنے والا
رسائل و جرائد	رسالے اور اخبارات
زمین بوس	زمین چومنے والا
ریسٹورنٹ	رہائشی ہوٹل
ریگ زاروں	جمع ریگ زار۔ ریگستانوں
رسم و عوائد	رسمیں اور طریقے
رقاصہ	ناچنے والی
زرتشت	آتش پرستوں کا پیغمبر
رومانی ادب	لٹریچر جس میں حسن و عشق کے افسانے ہوں
(س و ش)	
سرود عارفان	خدا شناسوں کے گیت
شباب مسکر	نشہ لانے والی جوانی
سوال کناں	پوچھتے ہوئے
سر بفلک ڈھلانوں	پہاڑ کے بلند ڈھلوان
سپاہیانہ عزم	سپاہی کا سا بہادرانہ ارادہ
سکرین کرنا	پردے پر دکھانا
سموم	زہریلا
سدّ راہ	راستے کی روک
سامعہ نواز	کانوں کو بھلی معلوم دینے والا
سکوتِ مطلق	بالکل خاموشی
سکیٹنگ	برف پر پھسلنا
سینٹ	امریکہ کا سکہ دو پیسے کی ایک
سنڈے اسکول	اتوار کو تعلیم دینے والے اسکول
ساز	گانے کے آلات
سازِ موجودات	دنیا کے ستار ہیں
سرود و غنا	گانا
شرائین	جسم کی وہ حرکت کرنے والی رگیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

الفاظ	معنی
(ص و ض)	
صدا	آواز
صوتِ شبنم	جیسے شبنم غائب ہو جاتی ہے
صاعقہ	بجلی
ضخیم	بہت صفحات والی کتاب۔ موٹی
صلائے محبت	دعوت محبت
صدقِ محبت	محبت کی سچائی
صنعتی محبوبوں	بناوٹی اور فرضی محبوبوں
(ط و ظ)	
طبعی جودت	پیدائشی ذہانت
طباع	ذہین۔ بہت سمجھدار
(ع و غ)	
عارض	گال
عسرت	ناداری۔ فلاشی
غریب الاستعمال	جس کا استعمال کم کیا جاتا ہے
علت غائی	غرض۔ مقصد
عادت راسخ	پکی عادت
عصیاں	نافرمانی۔ گناہ
عجمی موشگافیاں	ایران کے فلاسفروں کی علمی بحثیں یا ایسی علمی باتیں جن میں بال کی کھال نکالی گئی ہو۔
عرب نژاد	عرب کا اصلی باشندہ
عملاً	کام کرتے ہوئے
غریض معبد مالک	عرب کے مشہور گویوں کے نام
عشق نوائیوں	عشق کے راگ الاپنے
عالم مجاز	دنیا
عناصر	عنصر کی جمع حصہ
علم الاصنام	بتوں کی بابت علم
عمیق	گہرا

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
(ف - ق)		لیلائیں سلمائیں	عرب کی معشوقاؤں	مطمح نظر	مقصد۔ پہلو۔ خیال۔ رائے	مبہم	پوشیدہ
فاؤنڈ پوائنٹ سوسائٹی	امریکہ کی کسی سوسائٹی کا نام	عذرائیں	کے نام	مؤذن	اذان دینے والا	مجالس طرب	خوشی کی مجلسیں
فطری سعادتمندی	پیدائشی نیکی	لطافتوں	باریکیوں	مخترع	ایجاد	منظوم زاریاں	شاعرانہ فریاد
قافیہ پیما	شاعر	لہو و لعب	کھیل کود	مجاہد	مذہبی لڑائی لڑنے والا	مقاطعۂ جوعی	بھوک ہڑتال
قطعاً	یقینی طور پر	لعبت گری	گڑیاں بنانا	متمکن	جگہ حاصل کرنے والا	مستقبل قریب	قریب کا آنے والا زمانہ
فرومایگی	کمینہ پن	لیلے	لیلے کی طرح پردہ دار	موسیقار	ایک باجے کا نام	ملکوتی محبت	فرشتوں جیسی پاک محبت
قلب	دل	محمل نشیں	سواری میں بیٹھنے والی	مغنیہ	گانے والی	مسکت	چپ کرا دینے والا
قطعۂ مرغزار	چمن کا تختہ	(م)		محاذ	برابر۔ سامنے	متمول	دولتمند
قارئین	پڑھنے والے قاری کی جمع	مرتسم	نقش کھچے ہوئے	متلون	رنگ بدلنے والا	معراج	ترقی کی انتہا
قرأت	آسمانی کتاب کی عبارت پڑھنا	معمور	بھرا ہوا	محسوسات	حواس سے معلوم ہونے والی چیزیں	محاسن	خوبیاں
قبا	چوغے کی قسم کا لباس	مجسم شعر	سر سے پاؤں تک شعر کی طرح دلکش	متامل	سوچنے والا	منطبق	کسی چیز پر پورا اترنے والا
قاطع	کاٹنے والا			مرادف	ہم معنی	(ن)	
فریب مجسم	ایک ظلم جو بظاہر رحم و کرم نظر آئے	منجمد نالہ	وہ فریاد جو منہ سے نکل کر فضا میں جم گئی ہو	مناظر	منظر کی جمع سین	نصاب	کورس
(ک - گ)		مجذوب	جذب ہونے والا	موضوع	جس کی بابت بحث کی جائے	ندرت	جدت
				مکتشف	علمی تحقیقات کرنے والا	نصف النہار	دوپہر
کاشانہ	گھونسلہ	مستغرق	غرق	مغربی تمدن	یورپ کی تہذیب	نفرین	لعنت
گہوارہ	پنگوڑہ	مخل	خلل ڈالنے والا	منطقۂ باردہ	وہ حصے جہاں بارہ مہینے برف پڑتی ہے۔	نکہت رنگیں	رنگین خوشبو
کاشانۂ ہستی	دنیا	مفاہمت	سمجھوتہ			نزول الہام	خدائی پیغام آنا
جہان		مسن	بڑی عمر کا	متنفس	آدمی	نفس ناطقہ	انسان کی قوت گویائی
کرگس	گیندا	مشام	دماغ کا وہ حصہ جس میں سونگھنے کی طاقت ہوتی ہے	مقطر	سپرٹ	نظام عصبی	جسم کے رگ پٹھوں کا جال
کشمکش جذبات	دلی خیالات کی آپس میں کشمکش			متمدن	ترقی یافتہ	نزول	اترنا
		مطول	طویل۔ لمبا۔	مواقع	موقعے	نوائے شوق	شوق کی آواز
گنج طلسم ساز	طلسم بنانے والا گوشہ	منزہ	پاک	مترشح	چھلکنے والا۔ ٹپکنے والا	نغمۂ بیتاب	بےقرار گیت
کیمیا گری	اصول کیمیا کے طریقے پر	مشاطگی	سجاوٹ کرنا	متنبی	عرب کا مشہور شاعر جس نے اپنی شاعری کے بل بوتے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔	نغمۂ سیال	بہتا ہوا گیت
گرسنگی	بھوک	مکتفی	کافی			(و - ہ)	
گھن لگنا	بیماری لگ جانا	ماؤنٹ سوسائٹی	امریکہ کی کسی انجمن کا نام ہے			ہبوط	گرنا
کرب و اضطراب	بےچینی اور بےقراری	متاع	پونجی	متاخرین	آخر کے لوگ	ہمت ربا	ہمت توڑنے والا
گامزن	قدم اٹھانے والا	ملوث	لتھڑا ہوا۔ آلودہ	موشگافیاں	موشگافی۔ بال کی کھال اتارنا	ہزیمت خوردہ	شکست اٹھائے ہوئے
(ل)		مجالست	پاس بیٹھنا	مفت کرم داشتن	مفت کا احسان رکھنا	ہذیان	بکواس
[illegible]	ادب					وسعت معانی	معنی کی گنجائش
						واقفیت	اصلیت۔

لاہور ٹرنک ہاؤس انارکلی بازار لاہور سے

عمدہ ۔ سستے مضبوط اور خوبصورت ٹرنک ۔ سوٹ کیس

ٹب ۔ بالٹی ۔ آہنی کرسیاں ۔ لیٹر بکس وغیرہ ہر قسم

حسب پسند دستیاب ہو سکتے ہیں

نیلام! نیلام!! نیلام!!!

دی یونائیٹڈ آکشن مارٹ نمبر ۱ ایبٹ روڈ متصل وائی ڈبلیو سی اے لاہور میں ہر اتوار کو ہر قسم کا فرنیچر و دیگر نہایت نفیس خانگی ضروریات کا سامان بذریعہ نیلام فروخت ہوتا ہے اس کے علاوہ ہر روز مقررہ قیمت پر بھی اشیاء فروخت کیجاتی ہے ۔ فروخت کرنیوالوں کا مال نہایت ہی مناسب قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے اور بیچنے والوں کو ماتہ عادت دیا جاتا ہے ہفتہ کے روز آکر مال ملاحظہ فرمائیں فروخت شدہ مال کی قیمت بہت جلد دیجاتی ہے

سید سلامت اللہ شاہ پروپرائٹر دی یونائیٹڈ آکشن مارٹ گورنمنٹ اینڈ میونسپل آکشنر نمبر ۱ ۔ ایبٹ روڈ ۔ لاہور

فیوچر آف اسلام ان انڈیا ۸ عہ

ہندوستان میں اسلام کا مستقبل

یہ کتاب مولانا فضل کریم خاں درانی کے زور قلم کا نتیجہ ہے آپ اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ امریکہ انگلینڈ اور جرمنی میں اشاعت اسلام کے راستہ میں صرف کر چکے ہیں ۔ اور آپ کو وہاں اچھی کامیابی ہوئی ہے ۔ اس کتاب میں آپ نے ہندوستان کی تحریک آزادی پر ایک صحیح رخ نظر ڈالی ہے اور اس مسئلہ کی سیاسی پیچیدگیوں کو نہایت واضح طور پر بیان کرتے ہوئے بتایا ہے ۔ کہ ہم کس طرح اپنے تئیں آزادی کے قابل ثابت کر سکتے ہیں اور سب سے پہلے کن اندرونی اصلاحات کی ضرورت ہے ۔ آپ نے اس میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد کا مقصد مکمل آزادی ہے ۔ کتاب انگریزی میں ہے ۔ قیمت صرف ۸ عہ

ملنے کا پتہ :- مینیجر مسلم انڈیا ۷ پارک لین مزنگ لاہور

دہلی مسلم ہوٹل لاہور

آپ جب کبھی لاہور میں تشریف لائیں تو

دہلی مسلم ہوٹل انارکلی بازار کو یاد رکھیں

جہاں پر آپ کے لئے طعام و قیام کا خاطر خواہ انتظام ہوگا

مینیجر دہلی مسلم ہوٹل انارکلی بازار لاہور

سچے کارخانے دنیا سے کبھی مٹا نہیں کرتے ۔ بلکہ سچائی کی بدولت ان کا ہر ایک خریدار خود اشتہار بن جاتا ہے

بہرا پن کا شرطیہ علاج

روئے زمین پر

کان کی تمام بیماریوں کی ایک ہی بے نظیر دوا

پتہ ۔ کان کی دوا ۔ بلب اینڈ سنز پیلی بھیت ۔ یو ۔ پی ۔

اگر آپ کے کان میں درد ، زخم ، ناسور ، کھجلی ، خشکی کی تکلیف یا کان میں کسی قسم کی بھی کوئی بیماری ہے ۔ تب بلب اینڈ سنز پیلی بھیت کا ایجاد کردہ روغن کرامات استعمال کیجئے جو بہرا پن ، کم سننے ، بالکل نہ سننے طرح بطرح کی آوازیں یا شور ہونے ، کان بند یا بھاری ہونے ، بچوں یا بڑوں کے کان سے خون مواد پانی وغیرہ بہنے پھنسی ، کیڑے پڑ جانے پردوں کی کمزوری اور کان کی تمام بیماریوں پر ایک وہ حیرت انگیز دوا ہے جس پر ہزارہا انگریز اور ڈاکٹر لٹو نظر آتے ہیں ۔ بصرہ ، بغداد اور ٹرانسوال ، افریقہ ، عرب جیسے دور دراز ملک میں بھی جس کی خاصی کھپت ہے ۔ صرف اپنی سولہ سالہ زندگی میں اس اکسیر نے دنیا کو محو حیرت بنا دیا ۔ ہزارہا نامراد بیٹھے بہرے بھی اس اکسیر کی بدولت کھٹا کھٹ سننے لگے قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنہ (۱۴/۱)

کرن بندو { اس دوا سے کان بڑی آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں ۔ زخم کان کو خود بخود صاف کرتی اور اس کی حفاظت کرتی ہے ۔ فی شیشی آٹھ آنہ (۸)

کرن بندو کے استعمال سے کان میں کسی قسم کی گندگی مواد وغیرہ کی نہیں رہ سکتی ۔

وجے ناس ۔ ہر قسم کے سر درد اور زکام کی شرطیہ دوا قیمت فی شیشی چار آنہ (۴/)

بادشاہی منجن ۔ ہلتے دانت جما دیتا ہے ۔ ہمیشہ استعمال کے قابل ہے ۔ دانت کی صفائی کرتا ہے ۔ اور ہر بیماری پر دانت کی اکسیر ہے ۔ قیمت فی شیشی چار آنہ (۴/)

دمہ ۔ (سانس) اور ہر قسم کی کھانسی کی ایک شرطیہ دوا ۔ قیمت ۸ ف ڈھائی روپیہ (۸/۲)

ملنے کا پتہ

کان کی دوا ۔ بلب اینڈ سنز پیلی بھیت ۔ یو ۔ پی

سرکن ٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں طبع ہوا۔ اور مولانا تاجور پرنٹر پبلشر نے دفتر "ادبی دنیا" بازار جج محمد لطیف لاہور سے شائع کیا۔

۶۸۶

رجسٹرڈ — ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) — بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر (۲)

تصاویر:- (۱) ڈانٹے اور اسکی محبوبہ سہ رنگی - (۲) اکبر الہ آبادی - (۳) مادام رولاں - (۴) ایڈگر ایلن پو - (۵) محبت کی آگ - (۶) قیدی - (۷) حافظ عبد المجید صاحب آئی۔ سی۔ ایس

کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

علامہ سیماب اکبر آبادی ایڈیٹر تاج

"ادبی دنیا" موجودہ ماہانہ رسالوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ مفید سب سے زیادہ نظر کش اور سب سے زیادہ طویل و عریض ہے۔ اگر کسی رسالہ کے نام کو رسالہ کی صوری و معنوی حیثیات سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف اسی رسالہ کو ہے جس کے مطالعہ سے واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نگاہیں ایک وسیع ترین دنیائے ادب کا نظارہ کر رہی ہیں۔

افسانے علمی مضامین، سیاسی مضامین، تنقیدی مضامین۔ درسی مضامین ظریفانہ مضامین، ادبی مضامین۔ اخلاقی مضامین، نظمیں، غزلیں، غیر ملکی ادبیات کے تراجم کا ایک ذخّار سمندر ہے جسکی موجیں نگاہِ دل و دماغ پر بیک نظر مسلّط ہو جاتی ہیں۔

مولینا شاہ دلگیر ایڈیٹر نقاد آگرہ

رسالہ "ادبی دنیا" میں نے دیکھا۔ رسائل کی ارتقائی صورت دیکھ کر میری مسرت نا قابلِ اظہار ہے۔ آپ نے ادبی دنیا اس شان سے نکال کر اردو جرنلزم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور سچ یہ ہے۔ کہ کم سواد لوگوں کو اب کسی نئے رسالہ کا نکالنا بہت ہی مشکل کر دیا۔ خدا اسے روز افزوں ترقی دے اور استقلال بخشے ✿

حضرت مانی جائسی

ہندوستان سے جو قابلِ ذکر رسائل شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں اُن سب کا نہیں تو اُن میں سے بیشتر کا جادۂ عمل اور نصب العین پیش نظر ہے ان حالات میں جس کا ذکر ابتدائی سطور میں ہوا، ہر چند کہ میری رائے بہت ہی نا قابلِ وقعت ہوگی۔ لیکن کسی دوسرے کی رائے پر دست برد کا حق بھی نہیں۔ اس لئے چار ناچار اپنی ہی رائے ظاہر کروں گا۔ کہ اتنا مفید کیا اس کے لگ بھگ بھی ابتک کوئی رسالہ اُردو کی دنیائے علم و ادب نے پیدا نہیں کیا۔

اغراض و مقاصد کے تحت میں مجمل اور مبہم انداز سے زبان اردو کی ترویج و ترقی اشاعت و خدمت یا اسی طرح کی دفعات لکھ دینا اور بات ہے، لیکن کوئی لائحہ عمل پیش کرنا یا راستہ دکھا دینا دشوار تھا۔ اس کیلئے یقیناً آپ اور آپ کے معاون شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میں آپ کو نہ صرف اُن تجاویز کی داد دیتا ہوں جو آپ نے اصلاح و ترقی زبان کیلئے پیش کی ہیں۔ بلکہ اُن ابواب کو بھی انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو آپ نے رسالہ میں قائم کئے ہیں اور جن میں سے ہر ایک بجائے خود ہمارے ذوق کو صحیح و سلیم بنانے کا ضامن اور غریب اُردو کو خزائن علم و ادب تک پہنچا دینے کا کفیل نظر آتا ہے۔ پھر جہاں تک میں اس حساب میں غور کر سکا ہوں، نیل مرام کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں، قریب قریب سب پر اس "دنیا" میں "ادبی دنیا" میں نمایاں طور پر داغ بیل ڈالدی گئی ہے۔

مولینا تاجور! مبالغہ نہیں اور نہ مبالغہ کی بحمد اللہ کوئی ضرورت اظہار حقیقت ہے کہ "ادبی دنیا" کو موجودہ مفید اور مکمل حیثیت اور صورت میں لانے کیلئے جن اجزاء و عناصر کی ترتیب سے آپ نے کام لیا ہے انکی بہم رسانی میں آپ کی جستجو کامیاب اور سعی مشکور ہے

ارباب حل و عقد کا آمادۂ رہروی ہونا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے ورنہ منزل کو تو آپ نے بہت آسان کر دیا ہے

حضرت ساغر سیمابی نظامی ایڈیٹر پیمانہ و علی گڈھ پنچ

ادبی دنیا کے مقاصد اتنے جدید اتنے اہم اور ضروری ہیں جتنے کہ ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ میں اُردو کی ترقی کیلئے جو شاہراہِ عمل تیار کی جا سکتی ہے وہ "ادبی دنیا" کے اوراق پر تیار کر لی گئی ہے۔ میں جناب کو اس مبارک اور کامیاب ادبی کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں۔

مولوی عزیز حسن صاحب بقائی ایڈیٹر پیشوا دہلی

خدا سے دعا کرنا پڑتی ہے کہ وہ رسالہ ہذا کو نظر بد سے بچائے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ آپ ادبی دنیا کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں جس کی ملک کو اس وقت میں اشد ضرورت ہے۔

مسٹر ایس۔ ابن علی ایڈیٹر اخبار نیر اعظم مراد آباد

حقیقت میں آپ کے اس رسالہ کے اجرا نے ادبی دنیا میں چار چاند لگا دئے۔ یہ ایسا رسالہ ہے جو اُردو لٹریچر کو معراج کمال پر پہنچا سکتا ہے۔ آپکی اس عالی دماغی اور وسیع نظری کی جس قدر داد دی جائے وہ کم ہے۔ آپکی علمی ہمت میں خدا ترقی دے اور ملک کو اپنے اس بیش بہا رسالہ کی قدر کرنے کی توفیق دے ✿

سید عابد علی صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی ایڈیٹر نیرادوستان۔لاہور

"ادبی دنیا" کا پہلا پرچہ مل گیا۔سرورق کے اُلٹتے ہی احساس ہوا۔ کہ مولٰنا تاجور اور سر عبدالقادر نے ان تمام روایات قدیمہ کو برقرار رکھا ہے جو اُن کے نام کیساتھ وابستہ ہیں۔میرا خیال ہے کہ ادب اُردو کے ارتقا میں (جہانتک پنجاب کا تعلق ہے) ان دونوں صاحبوں نے اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعہ خاص حصّہ لیا ہے۔مقام مسرت ہے کہ ادبی دنیا جس کے نام کی دلکشی اور جاذبیت اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہ رہیگی۔لوح سے لیکر تمت تک ادب العالیہ کا آئینہ دار ہے۔

مولٰنا تاجور اپنی تحریر کی شگفتگی اور متانت کیلئے بہت مشہور ہیں لیکن شاید یہ بات نسبتہً کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وُہ نہایت کامیاب ـــ بھی ہیں۔مجھے امید ہے کہ وُہ ظرافت جو اُن کی گفت گو کو دوسرے ادیبوں کی گفتگو سے مشخص کرتی ہے۔کبھی کبھی ادبی دنیا کے صفحات پر بھی نشاط خیز ہوگی +

پنڈت میلا رام صاحب وفا ایڈیٹر روزانہ ویر بھارت لاہور

"ادبی دنیا" دنیائے ادب میں زبردست انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔میں نے ایسا شاندار رسالہ آجتک کسی زبان میں نہیں دیکھا۔صرف پہلا نمبر دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ادبی دنیا ہندوستان کا ممتاز ترین رسالہ ہے جسے ہم فخر سے دیگر ممالک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ہر ہندوستانی کو اس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی ہے۔

مولٰنا شائق احمد صاحب عثمانی ایڈیٹر روزنامہ عصر جدید کلکتہ

چشم بددور خوب رسالہ ہے۔میں داد دینے سے قاصر ہوں۔شاعر نہیں ہوں۔البتہ شاعروں کی صحبت میں رہا ہوں۔اس لئے جس قدر جذبۂ تحسین دل میں ہے ظاہر نہیں کر سکتا۔اللہ تعالٰی آپکے اس رسالہ کو ترقی دے۔

صاحبزادہ محمد عمر صاحب منصف جموں

جس کورذوقی سے اردو کے رسائل میں تصاویر شائع ہو رہی تھیں اس کا اقتضا تھا کہ "ادبی دنیا" اس بارہ میں ایک عامل معلم کا کام کرے اور بتائے کہ انتخاب تصاویر کے سلسلہ میں کیا کام کرنا چاہئیے۔چنانچہ تصاویر منتخبہ کا جو البم میں نے دیکھا ہے اس میں سے کسی تصویر کی اشاعت کو بے معنی یا بے وزن نہیں کہہ سکتے۔میں اس رسالہ کو ادبی اعجاز خیال کرتا ہوں۔اور حق تو یہ ہے کہ یہ رسالہ ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کا مصداق ہے۔"ادبی دنیا" کا یہ دعوٰی بھی کہ وہ کوئی مضمون بلا معاوضہ قبول نہ کریگا محض دکھاوا نہ نکلا۔بلکہ حقیقی ثابت ہوا۔میں نہایت گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

پروفیسر کنہیا لال صاحب ثاقب ایم۔اے۔گارڈن کالج راولپنڈی

پنجاب میں ادبی رسائل کی افراط جس ادبی انحطاط کا باعث ہو رہی تھی بشرط حیات رسالہ ہذا اس کمی کو پورا کر دیگا۔میں ذاتی طور پر جن خوبیوں اور خاصیتوں کا ایک ادبی رسالہ میں ہونا ضرور جانتا ہوں وہ تمام تر اس میں محیط ہیں۔دوسرے الفاظ میں رسالہ ہذا میرے ایک "ادبی خواب" کی صحیح تعبیر ہے۔

آغا مختار حسین صاحب دہلوی ڈسٹرکٹ انجنیر جھنگ

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپکی یہ علمی کوشش انشاءاللہ تعالٰی نہایت کامیاب ہوگی اور اُردو لٹریچر پر آپ کا عظیم الشان احسان رہیگا۔ جو فرہنگ الفاظ آپ رسالہ کے اخیر میں ایزاد کر رہے ہیں وہ بجائے خود ایک علمی ذخیرہ بنے گا

ڈاکٹر عبدالحق صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس لاہور

اردو رسائل میں ادبی دنیا ہی صرف ایک ایسا وقار متین۔اور پاکیزہ اور صاف رسالہ ہے۔جو ہر عمر ہر خیال اور ہر طبقے کے افراد کیلئے مجموعی حیثیت سے مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔ہمارے بچّے اور بچیاں بھی اسے آزادی سے پڑھ سکتی ہیں۔

جناب منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بی۔اے

فراوانی و بوقلمونی مضامین کے لحاظ سے یہ رسالہ اسم باسمّٰی ادبی دنیا یا لٹریری جواہر پاروں کا مخزن ہے۔اُس پر کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ مضامین کے ایڈیٹ کرنے میں بھی مذاق سلیم سے کام لیا گیا ہے۔شائقین ادب کو اسکی خاطر خواہ قدر کرنی چاہئیے

شیخ محمد اسمٰعیل صاحب انسپکٹر پولیس کرنال

"ادبی دنیا کے محاسن حیطۂ تحریر سے باہر ہیں۔عام رسائل کی عُریاں اور غیر مہذب ادبیت سے بیزار ہو کر میں ایک عرصہ دراز سے اردو لٹریچر سے بالکل متنفر ہو چکا تھا۔لیکن خوش بختی کہئے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے سے تسلی ہوئی۔کہ بحمداللہ اردو ادب میں بھی ایک ایسا وقیع رسالہ شائع ہو رہا ہے جس کی اشد ضرورت ہے میں اس کا ہزار دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

رائے صاحب لالہ مانک چند گلشن از بغداد عراق

میرے چند عرب دوست جو بمبئی (ہندوستان) کے تعلیم یافتہ ہیں ادبی دنیا کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوتے۔اُن کا خیال ہے کہ یہ ہمہ صفت موصوف رسالہ یورپ کے بہترین رسائل سے کسی طرح کم نہیں ہے اپنی دوستوں کی ذاتی تحریک سے سرکاری طور پر بغداد کی لائبریریوں کیلئے منظور ہو چکا ہے

ـــ Conversationalist.

عرضِ حال

ادبی دنیا کا پہلا نمبر دو ہزار چھپکر اشاعت سے سترہ دن بعد ختم ہوگیا تھا اب اُسکی مانگ اسقدر بڑھگئی ہے کہ غالباً دوبارہ چھپوانا پڑیگا۔ دوسرے نمبر کیلئے اخبارات کی ایجنسیوں نے ابتک چھبیس سو پرچوں کے آرڈر بھیجدیے ہیں اسکے علاوہ ایک ماہ کے عرصہ میں چھ سو مستقل خریدار بن چکے ہیں۔ اُردو رسالوں کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ ایک پرچہ جسکی اشاعت کو تیس دن بھی نہ گذرے ہوں دو ہزار کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ نکل جائے

پھر یہ بھی پہلی ہی مثال ہے کہ ایک پرچے کا پہلا نمبر تو دو ہزار چھپے اور دوسرا تین ہزار کی تعداد میں شائع کیا جائے ورنہ عموماً پہلا پرچہ پروپیگنڈے کیلئے ایک ہزار چھاپا جاتا ہے اور پھر ڈھائی سو کی تعداد سے بڑھتے بڑھتے سال کے ختم پر پانسو تک اشاعت جاکر ٹھیر جاتی ہے

اسی طرح پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی زندگی میں بھی یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اُس نے کسی اُردو پرچے کو اُسکی پہلی اشاعت کے دو ہفتہ بعد دو سو کی تعداد میں لینا منظور کیا ہو۔

اور یقیناً اُردو ادب کی عمر کا بھی یہ پہلا ہی دن ہے کہ ہندوستان بھر کے انگریزی اُردو ہندی گورمکھی اخبارات نے ایک اُردو پرچے کا اس تعجب آمیز مسرت سے استقبال کیا ہو ہندوستان کی خبر رساں ایجنسیوں (ایسوسی ایٹڈ پریس اور فری پریس) نے ہندوستان بھر میں ادبی دنیا کے متعلق طویل بیانات دیئے کئی انگریزی اخبارات نے جنہیں ہم نے رسالہ بھی نہیں بھیجا تھا۔ مقامی ایجنسیوں سے خرید کر اس پر نہایت بلند الفاظ میں ریویو کیے

ہندوستان کے مشہور مصری سیاح سید فہمی سابق ایڈیٹر الحقائق (قاہرہ) نے ادبی دنیا کی خصوصیات معلوم کرکے اس رسالہ کی شان میں ایک نہایت بلند عربی قصیدہ لکھا اور اسکی بابت مصری اخبارات کو قابل فخر الفاظ میں اپنی رائے بھیجی۔ ہندوستان کے ہر حصے سے مبارکباد کے پیغامات اتنی تعداد میں موصول ہو چکے ہیں کہ ان سے ایک کتاب بنائی جاسکتی ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک قابل قدر پروفیسر نے لکھا ہے کہ ان خصوصیات کا کوئی ماہوار رسالہ دنیا کے کسی حصے اور کسی زبان میں بھی شائع نہیں ہوتا"

لیکن ادبی تاریخ کی یہ خوشگوار حیرتیں کچھ اس لئے جمع نہیں ہوگئیں۔ کہ ادبی دنیا آسمانی صحیفہ بن کر ہم پر نازل ہوا ہے یا اس صورت میں ہم سے کسی کرامت کا ظہور ہوا ہے یا کسی خدا رسیدہ فقیر کی مقبول دعائیں حاصل کرنے میں ہم کامیاب ہوگئے ہیں۔ نہیں یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ادبی دنیا کی اشاعت بھی تاریخ کا دوسرا واقعہ نہیں ہے۔

آخر اس میں کونسا مبالغہ ہے ؟ کہ اس جیسا شاندار۔ اتنا ضخیم اس قدر مختلف خصوصیتوں کیساتھ اتنا سستا ماہوار پرچہ اردو اور ہندوستان تو ایک طرف یورپ اور امریکہ کی بھی کسی زبان میں نظر نہیں آتا۔

یہ تسلیم! کہ اس سے بہتر اس سے گراں قدر اور اس سے شاندار لٹریری میگزین ولایت میں شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے انکار ہے کہ ان خصوصیات کا اتنا سستا پرچہ دنیا کے کسی حصے میں بھی مل سکتا ہے۔

ولایت کے پرچے لاکھوں روپے کے سرمایہ سے جاری کئے جاتے ہیں تیس تیس لاکھ تک اُن کی اشاعت ہوتی ہے لاکھوں روپے ہر سال اُنہیں اشتہارات کی مد سے مل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ادبی دنیا کی حیثیت کے ولایتی پرچے کی قیمت روپیہ ڈیڑھ روپیہ سے کم نہیں ہوتی۔

ہندوستان بھر کی اخباری ایجنسیوں کے مطالبے کو مدنظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ادبی دنیا اس سال کے ختم تک کم از کم آٹھ ہزار تک پہنچ جائیگا۔ اسکی موجودہ اشاعتی رفتار اُمید سے زیادہ تیز ہے لیکن ہم اشاعت کی اس تیز رفتاری میں بالکل اُسی قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں جیسے خارش کا مریض اپنے جسم کو چھیلنے میں لذت پاتا ہے جسم سے خون بہ رہا ہے مگر وہ جسم خراشی کی لذت میں محو ہے۔

ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ادبی دنیا کی مانگ بڑھ رہی ہے دو ہزار پرچے سترہ دن میں بک گئے۔ ڈھائی ہزار پرچوں کا مطالبہ ایجنسیوں نے کیا ہے! اگلا پرچہ تین ہزار چھپوا رہے ہیں۔ ہر طرف سے مبارک سلامت ہو رہی ہے اور ہم مگن ہیں پھولے نہیں سماتے لیکن ابتدائی انتظامات اور پہلے نمبر کی اشاعت کے بعد جب بجٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ستائیس سو روپیہ صرف ہوچکا ہے اور دوسرے نمبر کی دامن درازی اس سے بھی زیادہ رقم کا مطالبہ کر رہی ہے۔

پہلے پرچہ میں ساڑھے چار سو روپے (۴۵۰) ماہوار کے نقصان کا جو اندازہ کیا گیا تھا۔ وہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ تصویروں کا خرچ اندازہ سے دُگنا ہو گیا اور اس لئے اب موجودہ صورت میں ہر دو ہزار پر پانسو چالیس روپے نقصان آرہا ہے۔ ہم نقصانات کی یہ غیر دلچسپ اور خشک تفصیل بیان کرنیکا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہمارے مہربانوں کی ایک جماعت ادبی دنیا کی زندگی کو اپنی موت خیال کرکے خودکشی پر آمادہ ہو رہی ہے۔

لہذا اس غیر قانونی موت سے اُسے روکنے کیلئے اس دردناک خبر کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔

حالت یہ ہے کہ اس بابرکت جماعت کے ہر فرد نے ادبی دنیا کو اپنا آئینہ بنا کر درحقیقت اپنا نام ادبی دنیا رکھ لیا ہے اور اب زندگی کے ہر ضروری مشغلے کو چھوڑکر ایک سرگرم مشنری ایک اَن تھک پرچارک ایک بےغرض مبلغ کے جذبے کو

لیکر جگہ جگہ ادبی دنیا کا پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔

ہم ادبی دنیا کے اِن آنریری مشنریوں کی خدمت میں یہ عرض کرنیکی اجازت چاہتے ہیں کہ ہم اپنے اور ادبی دنیا کے متعلق اُن کی بے غرض تبلیغی خدمات کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ادبی دنیا کے بجٹ میں جب کبھی گنجائش نکلی ہم اِن تمام احباب کے نام وظیفے جاری کردیں گے۔ کیونکہ ان کا پروپیگنڈا خواہ کسی نیت اور کسی رنگ میں ہو انجام کار ادبی دنیا کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔

ہندوستان بھر کے اُردو اخبارات نے جس سیر چشمی کیساتھ ہمیں مسلسل اشاعتی امداد دی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم اُن کے شکریہ کیلئے الفاظ نہیں پاتے۔ مگر ہمارا دل اُن کی شکرگذاری کے جذبات سے لبریز ہے۔

اِس مقام پر اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا جنہوں نے ادبی دنیا کی طباعت اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کو برقرار رکھنے میں خاص طور پر مدد دی ہے "ڈلنبے" اور اس کی "محبوبہ" کی جو سہ رنگی تصویر اس نمبر میں شائع کی گئی ہے۔ ہمیں مسٹر گوبند سروپ نے اپنے یورپ سے تازہ آتے ہوئے بیش قیمت البم میں سے عنایت کی ہے۔ ان تصاویر کے بلاک کپور آرٹ پرنٹنگ پریس میں تیار ہوئے ہیں۔ اور جس خوبی کے ساتھ تیار ہوئے ہیں اس کا اندازہ تصاویر دیکھ کر ہو سکتا ہے۔

جن معاصرین اور محترم اہل الرائے نے ادبی دنیا کے عملۂ ادارت (ایڈیٹوریل سٹاف) کی زبان مشکل ہونیکے متعلق مخلصانہ اظہار فرماکر ہمیں اسے اور آسان کرنیکا مشورہ دیا ہے ہم انکی اس توجہ اور اس مفید مشورہ کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

دراصل ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ جس قسم کی عام فہم تصنیفی زبان ہم رائج کرنا چاہتے ہیں اُسے ابھی ہمیں بھی سیکھنا پڑیگا۔ ہمنے اپنی اِس خامی کا پہلے نمبر میں یہ کہکر خود اقرار کیا تھا کہ "اگرچہ ابتدا میں یہ نئی بولی بولتے ہوئے خود ہمارا قلم بھی تُتلائیگا لیکن کبتک تتلائیگا۔ بولتے بولتے کچھ دنوں میں صاف بولنا بھی سیکھ جائیگا۔ عام فہم زبان لکھنے کی ہم خود بھی مشق کر رہے ہیں اور اپنے ساتھیوں، بے تکلف ادیب دوستوں، اور دوسرے اہل قلم کو بھی اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

چنانچہ اس نمبر کے مضامین کی زبان پہلے نمبر کے مضامین کی نسبت آسان ہے، اِس بارے میں ہماری کوشش کا اندازہ اس امر سے ہو سکیگا کہ یہ پرچہ لکھا جاچکا تھا۔ کاپیوں کی تصحیح ہو رہی تھی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ فلاں فلاں مضمون کی زبان مشکل ہے ہمنے پرچے کی اشاعت میں دیر کرنا منظور کیا۔ مگر یہ جی نہ چاہا۔ کہ آنکھوں دیکھتے ایسے مضامین چلے جائیں۔ اس لئے اٹھارہ صفحے لکھے لکھائے ردی کر دئے گئے اب تیسرے نمبر میں اُن کی زبان آسان کرکے انہیں شائع کیا جائیگا۔

اکثر اہل قلم اپنے طرز نگارش کو آسان بنانے پر رضامند نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے آجتک مشکل اُردو ہی اچھی اُردو سمجھی جاتی ہے۔ اب جنھوں نے بڑی بڑی مشقوں کے بعد مشکل نگاری میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ آسانی سے اُس شہرت اور قبولیت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ایک نہ ایک دن انہیں ہمارا ہمخیال ہونا پڑیگا اور وہ دن کچھ دور نہیں ہے

راقم حروف (تاجور) اُردو زبان کے کئی شعبوں میں صاحب طرز (سٹائلسٹ) کا رتبہ رکھتا ہے۔ مگر اپنے ادبی پروگرام کے مطابق اپنے طرز تحریر کی اُن خصوصیات کو جو اُسے عام انشا پردازوں سے ممتاز بنائے ہوئے ہیں قربان کردینے پر آمادہ ہے اور اس قربانی کا قطعاً افسوس نہیں ہے کیونکہ ہمارے علم میں اگر زور ہے تو پھر ہم عام فہم اور سلیس اُردو میں بھی انشا پردازی کے جلوہ زار تیار کر سکتے ہیں۔

عذر گناہ

ادبی دنیا کے لئے مضمون لکھنے، مضامین جمع کرنے، اُسے ترتیب دینے اخراجات کے واسطے روپیہ بہم پہنچانیکا کام ہمارے ذمے ہے اور ہم اس فرض کو الحمدللہ وقت پر بلکہ بعض اوقات وقت سے پہلے پورا کردیتے ہیں۔ لیکن لکھائی چھپائی۔ جلدبندی اور اسی قسم کے دوسرے کام ہمیں نہیں آتے۔ اور بدقسمتی سے اِن کے پورا کرنے میں ہماری خوشامدیں التجائیں دعائیں اور کبھی کبھی بے اثر تلخ گفتاریاں ہمیں کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتیں۔

ادبی دنیا کا دوسرا نمبر پریس میں ایک ہجوم بلا کو ساتھ لیکر پہنچا۔ منیجر صاحب کا بیان ہے کہ پریس کی کئی مشینیں ٹوٹ گئیں۔ انجن شکستہ ہوگیا۔ کئی پریس مین بیمار ہو گئے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ نقصان جان کتنا ہوا۔ خدا خدا کرکے رسالہ چھپکر دفتر میں آیا تو معلوم ہوا کہ اشتہارات کیلئے چار رم معمولی اور ہلکے کاغذ کے بھیجے تھے پریس والوں نے رسالہ کے ابتدائی صفحات اُن پر چھاپ دئے ادھر ہیڈ ایڈیٹر صاحب نے اپنے فرائض سنگسازکے سپرد کردیئے نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی کاپیاں غلط سلط چھپ گئیں۔ ہم نے ان پیدا کردہ خصوصیات کو گوارا کرنے کی بجائے خود رسوا ہونا منظور کیا۔ چار رم چھپے چھپائے ضائع کردینے کاپیاں دوبارہ لکھوا کر چھپوائیں۔ اسی وجہ سے جون کا رسالہ ۸ جون کو شائع ہو رہا ہے ورنہ پروگرام کے مطابق ۲۵ مئی کو شائع ہو جانا چاہئے تھا۔ ہمنے دوسرے رسالوں کی انتظامی مشکلات کی معذرتوں کو ہمیشہ تنگ نظری کے ساتھ دیکھا ہے تو ہمارے اس عذر گناہ کو ناظرین ادبی دنیا نفرت، حقارت، شکایت جس نگاہ سے بھی دیکھیں ہم اُس کے سزاوار ہیں۔

خدا ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو اپنے فرائض وقت پر پورا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

ہمارے محترم بزرگ سر عبدالقادر بالقابہ کا مضمون "اکبر کی شاعری" اکبر مرحوم کی زندگی میں ہی پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت انگریزی لیکچر کی صورت میں وجود میں آیا تھا۔ یہاں اس کا ترجمہ شیخ صاحب قبلہ کو دکھانے کے بعد شائع کیا جاتا ہے "تاجور"

تصاویر

ہمارے محترم دوست صاحبزادہ محمد عمر صاحب منصف جموں تحریر فرماتے ہیں

"جس کور ذوقی سے اردو رسائل میں تصاویر شائع ہو رہی تھیں اس کا اقتضا یہی تھا کہ ادبی دنیا اس بارہ میں بھی ایک عامل مصلح کا کام کرے اور بتا دے کہ انتخاب تصاویر کے سلسلہ میں کیا کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ جہاں تک میں نے دیکھا ہے یہ رسالہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کا مصداق ہے۔" ادبی دنیا کی تو اشاعت کا مقصد ہی یہی ہے کہ عروس ادب کی زلفوں کو جنہیں نااہل ہاتھوں نے پریشان کر دیا ہے سنوارے۔ جہاں ایک طرف ملک میں قابل قدر لٹریچر پیدا کرنے کی طرف ہر مضمون کا معاوضہ مقرر کر کے ادبی دنیا نے سب سے پیشتر قدم اُٹھایا ہے وہاں مذاقِ سلیم کیمطابق تصاویر شائع کرنیکو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تمام دنیا ہمارا وطن ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہماری نگاہ بھی اُسی قدر وسیع ہے فن کی خاص تصاویر کے علاوہ دنیا کے ہر اُس شخص کو ادبی دنیا کی آرٹ گیلری میں جگہ دی جائیگی جس نے انسانیت کیلئے کچھ کیا ہے لیکن ہم وطن پرستی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہر ہندوستانی سیاست دان، ادیب، فلسفی، شاعر سائنس دان کو جو اس امر کا اہل ہو گا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت ہم فخریہ دنیا کے سامنے پیش کرینگے اور کسی قسم کا ذاتی اختلاف یا اتحاد ہمارے فیصلہ کو کمزور نہ کر سکے گا۔

ادبی دنیا کی تصاویر کے متعلق اس قدر کہنا اور باقی ہے کہ اول تو ہمیں اس قدر تصاویر شائع کی جاتی ہیں جو اُردو کے کسی رسالہ میں نہیں ہوتیں اور دوسرے ہر تصویر بصرف زر کثیر پیش کی جاتی ہے۔ ہمارے رسالے کا صفحہ اسقدر بڑا ہے کہ ہر تصویر چار تصویروں کے برابر ہوتی ہے۔ اگر ادبی دنیا چھوٹی مروجہ تصویریں شائع کرنا چاہے تو ہر مہینے ہم سہ رنگی اور ۲۰ یک رنگی تصاویر شائع کر سکتا ہے۔ رنگین تصاویر کے اخراجات کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس نمبر کی خاص تصویر "محروم سلام" کی بجائے ہم ہمیں بڑے سائز کی یک رنگی تصویریں شائع کر سکتے تھے۔

"ڈانٹے اور اس کی محبوبہ" یا محروم سلام۔ یورپ کے شہرہ آفاق مصور ہنری ہالی ڈے کا شاہکار ہے فن تصویر کا یہ لاجواب پیکر ڈانٹے کی ہنگامہ خیز نظم وانٹا نوا (نئی زندگی) کے اس حسرت ناک مقام کے مطالعہ سے متاثر ہو کر زیب قرطاس کیا گیا۔ جہاں وہ حسن و عشق کا ماتم گسار بنکر حسرت و یاس کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کس طرح ملکہ حسن بیاٹرائس نے ایک مقام پر گذرتے ہوئے ڈانٹے کو اس سلام سے محروم کر دیا جو اسکی تمام مسرتوں کا مرکز تھا۔ فلورنس کا بازار پونٹی وچیو جو اس تصویر کا مرکزی پہلو ہے۔ آٹھویں عیسوی کے شروع میں سیلاب سے تباہ ہو گیا تھا۔ اور ڈانٹے کے اس المناک واقعہ سے پیشتر اس کی دوبارہ تعمیر کی گئی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں اس کے مکانات کو بھی آگ لگ گئی تھی جس وقت ڈانٹے کی بیاٹرائس سے ملاقات ہوئی۔ اُس وقت یہ عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔

تصویر کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شہر کی مجلس نے یہ فیصلہ کر دیا تھا۔ کہ فلورنس کے کوچہ و بازار میں بھی ان پتھروں کا فرش کر دیا جائے جو اطالیہ کے مشہور شہروں کے بازاروں میں لگ چکے تھے۔ یہ فرش شکستہ حالت میں اب تک فلورنس کے بعض قدیم بازاروں میں نظر آتا ہے۔ ان خوبیوں نے تصویر کی تاریخی اہمیت میں قابل قدر اضافہ کر دیا ہے۔ اور دیکھنے والے کی نظر میں ڈانٹے کے وقت کا فلورنس ایک خواب ہی نہیں۔ بلکہ حقیقت بن جاتا ہے۔

اس نمبر میں پنڈت میلا رام صاحب وفا کی نظم "محروم سلام" ڈانٹے کے پامال شدہ جذبات کی صحیح ترجمان ہے اس موضوع پر پروفیسر بھوپال سنگھ صاحب ایم۔ اے کا مضمون ڈانٹے اپنی جامعیت کے ساتھ اُردو میں پہلا مضمون ہے۔

۲۔ "محبت کی آگ" فرانسیسی مصور ژاں اڈبیر کے نظرت نگار موقلم کا شاہکار ہے اس تصویر میں حسن و عشق کے ان تمام ارتقائی منازل کو دکھا دیا گیا ہے۔ جو دنیا کے دو تہائی لٹریچر کے وجود میں آنیکا موجب ہیں۔ یہ تصویر ہے فردوس گم گشتہ اور فردوس بازیافتہ کی۔

۳۔ "قیدی" یہ تصویر ٹیٹ گیلری میں سے لی گئی ہے اور مشہور مصور الیف فلپ کا مایہ ناز کارنامہ ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں رکھدی گئی ہیں جو انسانی روح کی پیاس کو بجھا سکتی ہے۔

۴۔ ایڈگر ایلن پو۔ پو کی یہ نایاب تصویر ہمیں اپنے محترم دوست شیخ ضیاء الدین صاحب شمسی کی لائبریری سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس تصویر میں وہ بات جس نے اسے پو کی دیگر تصاویر سے خاص طور پر ممتاز بنا دیا ہے یہ ہے۔ کہ اس پر پو کے دستخط ثبت ہیں۔ تصویر پر پو مختصر افسانہ نگاری کا بانی لکھا گیا ہے۔ بانی سے ہماری مراد سراغرسانی کے افسانوں کا بانی اور اس فن کو خاص طور پر فروغ دینے والا ہے۔

۵۔ خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم۔

۶۔ شہیدِ وطن مادام رولاں۔ انقلاب فرانس کے افق کا ایک درخشندہ ستارہ۔

۷۔ حافظ عبد المجید صاحب۔ ایم۔ اے جو اس سال آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان مقابلہ میں ہندوستان بھر میں اول رہے ہیں۔

ایڈیٹر

آئینۂ عالم

زندہ قوموں میں اہل قلم کا احترام

یورپ میں اہلِ کمال کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں؟ اس کا اندازہ ذیل کے سبق آموز واقعہ سے کیا جا سکیگا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے مشہور شاعر و ادیب مسٹر ڈیارڈ کپلنگ اپنی بیوی کے ساتھ کچھ سامان خریدنے کیلئے لندن کی چند بڑی بڑی دوکانوں میں گئے تھے وہاں سے اُنہوں نے بہت سا قیمتی سامان خریدا اور اُس سامان کی نقد قیمت ادا کرنے کی بجائے ہر فرم کے نام اپنے بنک کے چک کاٹ دیے۔

کچھ دنوں کے بعد اس بنک نے حساب بھیجا تو اُس میں ان فرموں کے چکوں کا اندراج نہیں تھا۔ مسٹر کپلنگ نے سمجھے کہ بنک والوں سے حساب میں کوئی غلطی ہوگئی ہے اس لئے اُنہوں نے اپنے بنک کو اس غلطی کیجانب توجہ دلائی۔ بنک کا جواب آیا کہ آپ کا حساب بالکل ٹھیک ہے ہمارے پاس اُن فرموں کا کوئی چک نہیں آیا۔ اُن فرموں سے تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کسی فرم نے بھی اُن چکوں میں سے کوئی چک کیش نہیں کرایا۔ کیونکہ ہر چک پر مسٹر کپلنگ کے ہاتھ کے دستخط تھے۔ اور اُن فرموں نے اپنے سامان کی قیمت روپے کی صورت میں حاصل کرنے کی بجائے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ کپلنگ جیسے بے نظیر ادیب کے دستخط کئے ہوئے چک کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔

ایشیا نے بھی کبھی علم و اہل علم کی قدر شناسی کے یہ خوشنما خواب دیکھے تھے۔ بغداد کی تاریخ اور اُس کے زمین و آسمان کو وہ واقعہ فراموش نہوا ہوگا۔ جب ایک عید کو علامہ رازی اس بات پر مچل پڑے تھے کہ میں عید گاہ اس صورت میں جاؤں گا کہ میری فینس کو بادشاہ اور اُس کے شہزادے کندھا دیکر عید گاہ تک لیجائیں۔

تاریخ کو یاد ہے کہ اقلیم علم کے اس بوریا نشین شہریار کی یہ ضد پوری کی گئی تھی۔ اور اس طرح پوری کیگئی تھی کہ عید گاہ تک اُس کی فینس کے کہاروں میں وہ شہنشاہِ وقت بھی شامل تھا جس کی جنبش ابرو دنیا کے جغرافیے کو بدل دینے کی قدرت رکھتی تھی۔

لیکن ایشیا کے یہ فراموش خواب اب یورپ میں واقعات کی صورت اختیار کررہے ہیں اور ایشیا کی حالت یہ ہے کہ اُس کے بازاروں میں علم کے سوا ہر چیز کی پوچھ ہے۔ یورپ میں اہل قلم کے صرف دستخط ہزاروں روپے میں خریدے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایشیا میں ٹیگور و اقبال کی مطبوعہ کتابوں کے مسودات پر بھی کوئی سو روپے لگانیکو تیار نہ ہوگا۔ نتیجہ کے طور پر یہ سوال بھی حل ہوسکتا ہے۔ کہ ایشیا میں اہلِ کمال کیوں نہیں پیدا ہوتے۔

علم النفس کی تعلیم۔ یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں آجکل علم النفس کی تعلیم پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ کیونکہ اسکے ذریعے انسانی اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے۔ سوئزرلینڈ، جرمن اور امریکہ کے بہت سے اہل علم جو ڈاکٹر واٹسن کے نظریہ "عقل باطن" پر ایمان لائے ہوئے ہیں علم النفس کی تعلیم کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ یال یونیورسٹی نے پندرہ لاکھ پونڈ اسکی تعلیم کیلئے خاص کئے ہیں۔

کیمیائی خوراک۔ مشہور انگریز جوتشی مسٹر مارلس کی رائے ہے کہ آئندہ زمانہ میں انسانی آبادی کیلئے کافی خوراک بہم نہیں پہنچ سکیگی۔ کیونکہ انسانی آبادی روز بروز ترقی کر رہی ہے اور خوراک حاصل کرنیکے وسیلے کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں مہلک وباؤں اور خونریز لڑائیوں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے کہ ان کی کرم عنایت کے صدقے انسانی آبادی کا غیر ضروری حصہ زیر و زبر ہو کر موت کے حوالے ہو جاتا ہے۔ ورنہ انسان کی بے تحاشا پیدائش کو دیکھتے ہوئے بہت ممکن ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آجائے کہ خوراک کی کمی کے سبب انسانوں میں آدمخوری کی لعنت پھیل جائے۔

ڈاکٹر برنارڈ نے انگلستان میں پچھلے دنوں "انسانی آبادی اور خوراک" پر ایک لیکچر دیتے ہوئے مسٹر مارلس کے خیال کی پرزور تردید کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے کہ آئندہ زمانہ میں انسانی خوراک کی فراہمی کا ذمہ دار علم کیمیا ہوگا، نہ کہ فن زراعت، اور اگر زراعتی وسیلے دنیا سے بالکل ہی نیست و نابود ہو جائیں، تو بھی نسل انسانی کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ علم کیمیا کے ماہر انسانی خوراک کے متعلق زراعت پر کوئی اعتماد نہیں رکھتے۔ انہیں یقین ہے کہ جب زمین نسل انسانی کو پرورش کرنیسے عاجز ہوجائیگی تو انسانی خوراک کھیتوں کی بجائے کیمیائی معملوں (کیمسٹری لیبارٹریوں) میں تیار ہونے لگیگی۔ اور جب ایسا وقت آئیگا تو دنیا کے کیمسٹ (ماہرین علم کیمیا) آفتاب کی روشنی اور ہوا سے خوراک کے ذخیرے پیدا کر لیا کرینگے۔ اور بہت ممکن ہوگا کہ ایک کیمیاوی معمل میں صرف تیس آدمیوں کی محنت سے اسقدر انبار در انبار خوراک بہم پہنچ سکے جس قدر کہ پچھتر ہزار ایکڑ زمین میں ایک ہزار کاشتکار زراعتی اصول پر غلہ تیار کرتے ہیں۔

سائنس اگر اس رفتار سے فطرت کو آرٹ میں تبدیل کرنے کے درپے رہا۔ تو کوئی دن میں اصلیت اور فطرت کے الفاظ بے معنی ہی رہ جائیں گے۔ آج ڈاکٹر برنارڈ نے سورج کی شعاعوں اور ہوا سے خوراک فراہم کرنے کی پیش گوئی کی ہے۔ کل کو اُن کے کوئی بھائی ایتھر کی لہروں سے جیتے جاگتے انسان پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کر لیں گے۔ خوراک کے متعلق سائنس کی تحقیقات کی پہلی برکت تو یہ ہوئی ہے۔ کہ دنیا گھی دودھ کی نعمتوں سے محروم ہو گئی ہے ہم اب یہی نہیں معلوم ہو سکتا کہ ہم گائے بھینس کا دودھ گھی استعمال کر رہے ہیں یا بڑ اور ببول کا۔

پچھلے دنوں یورپ سے خبر آئی تھی کہ کوئی ڈاکٹر درخت کی چھال سے انسانی خوراک بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اسی سلسلے میں دہلی سے آٹا فروخت کرنے والی ایک فرم نے اخبارات میں اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں درختوں کی چھال کا ولایتی آٹا آرہا ہے۔ گویا اب کھانے کی تمام لذت اس فکر کی نذر ہو جایا کریگی۔ کہ گیہوں کی روٹیاں کھا رہے ہیں کہ ارنڈ کی! خیر یہ جو کچھ بھی تھا۔ غنیمت تھا۔ کہ کچھ نہ کچھ کھا تو سہی۔ ڈاکٹر برنارڈ کی دھمکیوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ یہ سلے گا نہ وہ۔ برگد کے دودھ اور ارنڈ کی روٹیوں کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن سائنس کی برکتیں زندوں کو دھوپ کھانے اور ہوا پھانکنے پر مجبور کر دیں گی۔ گویا اب جس کی ہزار بار خوشی ہو وہ ہوا پھانکے اور جسے اور جونک بھوں چڑھائے وہ ہوا کھائے اور چلتا پھرتا نظر آئے۔ "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی۔

تہذیب کی طغیانی ۔ پولینڈ میں ایک اسکول جرائم کی تعلیم کیلئے جاری ہوا ہے اس کا ہیڈ ماسٹر ایک پختہ کار جرائم پیشہ ہے۔ اس سکول کی ابتدائی تعلیم جیب کترنے کے متعلق ہوتی ہے ہیڈ ماسٹر اس موضوع پر روزانہ لیکچر دیتا ہے کہ کیونکر کسی آدمی کو غافل بنایا جاتا ہے۔ اور پھر اُس کی بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر کس ترکیب سے اُس کی جیب کتر کے نقدی اُڑائی جاتی ہے۔ جب اس فن میں طلبہ طاق ہو چکتے ہیں۔ تو اسکے بعد یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ عام شاہراہوں اور بازاروں میں سب سے الگ، اور سب میں شامل رہکر کس طرح آنے جانیوالوں کی جیبوں پر نگرانی رکھنی چاہیئے۔ اخیر میں عملی تعلیم شروع ہوتی ہے اور طلبہ کو آپس میں ایک دوسرے کی جیب پار کرنے کے ذریعہ مشق کرائی جاتی ہے۔ جب کورس بھی ختم ہو جاتا ہے تو پھر اُن کا امتحان لیا جاتا ہے اور ہر اُمیدوار کو حکم ہوتا ہے کہ وہ ہیڈ ماسٹر کی کوئی چیز چرا کر دکھائے جو طالب علم اس امتحان میں پورا اُترتا ہے۔ اُسکو ڈپلوما ملتا ہے۔ اور ڈپلوما دے کر کامیاب طلبہ کو آخری نصیحت یہ کی جاتی ہے کہ جاؤ اور اس فریب و دغا کی دنیا میں سادہ لوح دولتمندوں کو تباہ کر کے اپنے لئے زندگی کی راحتیں مہیا کرو۔

تہذیب مغربی کی انہیں طغیانیوں کو دیکھ کر ہمارے شاعر نے کہا ہے کہ ؎
تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کریگی ٭ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ ناپائیدار ہوگا

ایک شہید علم ۔ گذشتہ دنوں انگلستان سے ڈاکٹر مونر کی افسوسناک موت کی خبر آئی تھی۔ ڈاکٹر موصوف شعاعوں کے متعلق اپنی تحقیقات میں مشغول تھے اثنائے تحقیقات میں کسی شعاع سے اُنکی داہنی آنکھ کو صدمہ پہنچا۔ اور وہ بیکار ہو گئی مگر اس فدائے علم نے حوصلہ نہ ہارا اور اپنے تجربے میں بدستور مشغول رہا۔ لیکن علم نے اُنہیں پھر آزمائش میں ڈالا۔ اور اس دفعہ اُن کی ہاتھ کی دو انگلیاں یکے بعد دیگرے اُڑ گئیں اس صدمہ کو بھی اُنہوں نے مسکراتے ہوئے برداشت کر لیا اور جی نہ چھوڑا۔ انجام کار علم کے اس ذوق جستجو نے تیسرے مہلک حملہ سے اُن کی زندگی کو ختم کر دیا۔ اور اس طرح لیلائے علم کا یہ دیوانہ ؎
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا"

سینما اور تعلیم ۔ کولمبو یونیورسٹی کے ڈاکٹر وڈ نے سینما کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق پرائمری کے اُستادوں کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔

اس کانفرنس میں ۱۷۶ اُستادوں نے بارہ ہزار طلبہ پر اس تجربے کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے بتایا کہ سینماٹوگراف کے ذریعے تعلیم دینا بچوں کیلئے مفید ثابت ہوا ہے۔ اُن کے ذہن روشن ہو گئے ہیں۔ اُن کے معلومات میں بہت اضافہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اُنکی طبیعت میں معلومات حاصل کرنیکا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔

اُن کی رائے ہے کہ اسکولوں میں جو میجک لینٹرن کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ تعلیمی سینما نے تعلیم کی ترقی میں کوئی خاص امداد نہیں دی۔ بلکہ سینماٹوگراف تعلیمی اشاعت اور سہولت میں بہت مددگار ثابت ہوا ہے۔

نظام کائنات ۔ نظام شمسی جس مجرہ[1] کا جزو ہے۔ اُس کا طول روشنی کے پندرہ کروڑ سال کے برابر ہے۔ روشنی کے ایک سال سے وہ مسافت مراد ہے جس میں روشنی ایک سال میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے گذرتی ہے ہر مجرہ ایک نظام مستقل ہے جس میں ستارے، سیارے اور دُمدار تارے ہیں۔ ہمارے مجرہ میں دس ہزار ملین ستارے ہیں۔ فضا میں ہمارے مجرہ کے علاوہ ہزاروں مجرے نظر آتے ہیں۔ مگر ہمارے مجرہ کا حجم ان مجرات سے پانچ گنا سے لے کر بیس گنا تک بڑا ہے۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ ٹیلسکوپ کے ذریعے جتنے مجرات کا انکشاف ہوا ہے ان میں وہ مجرہ جو ہم سے سب سے زیادہ دور ہے۔ اُسکی دوری دس کروڑ روشنی کے سال کے برابر ہے۔

تاجور

[1] Planetary system

ڈانٹے

اٹلی کا شاعر اعظم ڈانٹے جس کو دنیا کے عظیم ترین شعرا کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ فلورنس کے قدیم اور معزز گھرانے میں ۱۲۶۵ میں پیدا ہوا۔ اس کے بچپن کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ صرف "بوکاسیو" سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اسے شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ اور قدیم شعرا ورجل، ہوریس اور اووِڈ کا مطالعہ اُس نے نہایت تن دہی اور لگن کے ساتھ کیا تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ڈانٹے نے اٹھارہ سال ہی کی عمر سے فلسفیانہ اور عشقیہ رنگ میں نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ وہ موسیقی کے دلکش ترانوں اور دلآویز نغموں کا بھی بہت شیدائی تھا۔ اور اس کی شیریں آوازوں کے زبردست احساس مسرت میں کھو جاتا تھا۔ انہیں دنوں اس نے اپنے وقت کے مشہور ترین سرودی نظمیں (گیت) لکھنے والے اطالوی شاعر "گدو کاولکانتی" سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ گدو کی الفت کا تذکرہ اس نے اپنی اس شہرۂ آفاق نظم میں کیا ہے جس میں وہ اپنے دل کی اس زبردست خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ کہ وہ اور گدو سمندر کی پرسکون اور نا پیدا کنار سطح پر ایک سحر کار کشتی میں تیر رہے ہوں مطلع بادلوں سے صاف اور سمندر طوفانوں کی شورشوں سے پاک ہو۔ اور جہاں وہاں وہ اطمینان اور سکون حاصل ہو۔ کہ ہم ایک دل کو اپنا مسکن بنا سکیں۔ پھر ہمارا مددگار ساحر ہماری کشتی میں مونا "وانا" اور مونا "بیاٹرس" کو لے آئے اور وہ دائمی مسرت کے ساتھ محبت کی باتیں کریں۔

"واٹیانووا" (نئی زندگی) میں جو اس کی عہد جوانی کی تصنیف ہے وہ بیاٹرس کی الفت کا افسانہ بیان کرتا ہے۔ جب ڈانٹے نے اس کو پہلی بار دیکھا۔ بیاٹرس اپنی عمر کے نویں سال کے آغاز میں تھی۔ اور ڈانٹے کے نویں سال کا آخر تھا وہ لکھتا ہے "وہ نہایت دلفریب ارغوانی رنگ کے لباس میں ملبوس ہوتی۔ میں نے محسوس کیا کہ روحِ زندگی جس کا مسکن دل کی عمیق ترین گہرائی میں ہے — ایک ایسا شدید ارتعاش (لرزش) پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اس کے ساتھ جسم کی رگ رگ لرز رہی ہے۔ اور وہ ارتعاش بہ الفاظ کہتا ہے۔ "دیکھو! یہ دیوتا ہے۔ مجھ سے طاقت ور، جو مجھ پر حکومت کرے گا۔" ڈانٹے کی مغلوبیت اچانک اور مکمل تھی۔ وہ کہتا ہے "اُس وقت سے میری روح پر محبت کی حکومت تھی۔" بیاٹرس اب اس کے لئے ایک فانی انسان کی نہیں۔ بلکہ خدا کی بیٹی تھی۔ ہمیں اس امر کا علم نہیں۔ کہ ڈانٹے کے ایام ملکۂ حسن کی اس ملاقات کے بعد کس طرح گذرے۔ اس کے سوانح نگار اس کے خود نوشت حالات میں جن کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ کچھ اضافہ نہیں کر سکے۔ اپنی عمر کے اٹھارویں سال کے اختتام پر وہ بیاٹرس کو دیکھتا ہے "وہ بے داغ اور پاکیزہ سفید رنگ کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے دونوں طرف دو خاتونیں تھیں۔ جو عمر میں اس سے بڑی تھیں۔

بیاٹرس نے گذرتے ہوئے اس جگہ دیکھا جہاں وہ خائف کھڑا تھا بیاٹرس نے اس کو اس نیکی اور شرافت کے ساتھ سلام کیا کہ اس کو مسرت نامیہ کی حدود نظر آنے لگیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ڈانٹے کے کانوں نے اس کی آواز سنی جس کی شیرینی اور دلآویزی نے ڈانٹے کو محو کر دیا۔ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا۔ اُس کے دل میں اس شریف النفس خاتون کا تصور تھا۔ جو اشعار و ابیات، ٹھمریوں اور غزلوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور ان سے شہر میں ایک شور مچ گیا۔ بڑے بڑے شعرا کی توجہ اس طرف کھنچ گئی۔ اور اُن کی دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ ان اشعار کے گمنام مصنف کی حیثیت سے ایک عظیم الشان شاعر پیدا ہوا ہے۔ اس زمانے میں عشقیہ نظموں کا اٹلی کے شعرا میں بہت رواج تھا۔ جن میں وہ اپنے محبوبہ کی خوبیاں بیان کیا کرتے تھے۔ "نئی زندگی" کی بیشتر نظمیں اسی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ عشق کے زبردست جذبے کا جو اثر ڈانٹے پر پڑا۔ اُس کو اس نے ان نظموں میں بیان کیا ہے۔ اس درد نے اُس کو آزار کی طرح گھلا دیا۔ اور اس کی حالت بہت خستہ ہو گئی۔ وہ نہایت کمزور ہو گیا۔ اکثر دوستوں کو اُس کی یہ حالت دیکھ کر رحم آتا تھا۔ اور وہ اُس سے "وہ سب کچھ پوچھتے جو میں اُن سے چھپانا چاہتا تھا۔" لیکن اُسے جواب دینا پڑتا تھا۔ کہ محبت نے اُس کی یہ حالت کر دی ہے۔ ڈانٹے کہتا ہے "میں محبت کا ذکر کرتا تھا کیونکہ میرے چہرے پر اُس کے اس قدر آثار ظاہر تھے۔ کہ چھپائے نہ چھپتے تھے۔ اور جب وہ مجھ سے پوچھتے کس کی محبت نے تجھے تباہ کیا ہے؟ میں مسکرا کر اُن کا منہ تکتا اور کچھ نہ کہتا۔" معلوم ہوتا ہے ڈانٹے اپنی محبوبہ کا نام ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا لیکن اپنے دوستوں کو اطمینان دلانے کیلئے اُس نے ایک عجیب تدبیر کی۔ اُس نے مصنوعی طور پر ایک اور عورت سے عشق جتانا اور ..... سرِ عام اُسے عاشقانہ انداز میں مخاطب کرنا شروع کیا۔ اُس کے لئے چند معمولی سے اشعار بھی لکھے۔ اور اُس کو اس زبردست محبت کی آڑ بنایا۔ جس کی اُس کے دل پر حکومت تھی۔ ڈانٹے کے نزدیک یہ بناوٹ تھی۔ لیکن لوگوں میں اس کا چرچا اس قدر پھیلا کہ وہ ان کی محبت کو سچ خیال کرنے لگے۔ اور اس مضمون عشق کی رسوائی کے افسانے [illegible] کے کوچہ و بازار میں مشہور ہو گئے۔

اسنے پر نہایت بڑے عیب لگائے گئے۔ اس رسوائی کا اثر یہ بھی ہوا کہ نیک دل اور پاکیزہ بیاٹرائس نے ایک مقام سے گذرتے ہوئے ڈانٹے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُس روز وہ اس دلآویز سلام سے بھی محروم رہا جس میں وہ کہتا ہے "میری تمام مسرت مرکوز تھی"[1]۔ اس ناکامی کا اُس کو اس قدر رنج ہوا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر تنہائی میں جا بیٹھا کہ زار زار آنسو بہائے۔ یہاں وہ پاک نفس بیاٹرائس کو مخاطب کرتا ہے۔ اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے کہتا ہے "میری محبوبہ! اپنے خادم پر کرم کر!" اور ایک بچے کی طرح بلک بلک کر روتا ہوا سو جاتا ہے۔ اس نظم میں ڈانٹے اپنے عشق کی داستان جاری رکھتا ہے۔ اور "نئی زندگی" کے کسی پڑھنے والے سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے سادہ اور صوفیانہ الفاظ کی تہہ میں ایک وہ آتش فشاں کا غضب مخفی ہے جس پر ڈانٹے قابو پانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بسا اوقات اُسے مغلوب نہیں کر سکتا۔ ایک عجیب واقعہ جو وہ اٹھارویں حصے میں بیان کرتا ہے یہ ہے۔ کہ وہ بیاٹرائس کی موجودگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ فلورنس کی چند خواتین نے جو اس پر بیاٹرائس کی موجودگی کے اس اثر سے آگاہ تھیں۔ اُس سے دریافت کیا۔ کہ جب وہ اپنی محبوبہ کی موجودگی کی برداشت ہی نہیں رکھتا۔ تو اُس سے محبت ہی کیوں کرتا ہے؟ اس کا جواب ڈانٹے نے نہایت دردناک الفاظ میں یہ دیا کہ پہلے اُس کی محبت کا مقصد بیاٹرائس کا سلام تھا۔ لیکن جب اس نے اپنی خوشی سے اُسے اس سے بھی محروم کر دیا تو اب اُس کی تمام مسرت سمٹ کر ان الفاظ میں آ گئی ہے۔ جو وہ اس کی تعریف میں کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ڈانٹے اس کے وصال کا خواہاں نہ تھا۔ اُس کی انتہائی مسرت اپنی محبوبہ کی تعریف میں اشعار کہنا تھا۔ اور بس۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حقیقت میں بیاٹرائس کوئی لڑکی نہ تھی۔ بلکہ یہ شاعر کا انتہائی مسرت کا تمثیلی تصور ہے۔ لیکن "نئی زندگی" کو معمولی نظر سے مطالعہ کرنے والا بھی اس امر کو معلوم کر لے گا۔ کہ وہ کسی تصور کی مثال نہیں بلکہ اپنے وقت کی حسین عورتوں کے درمیان حسین ترین عورت ہے۔ اور گو یہ کتاب اپنے زمانے کی نظموں کے مطابق ہے۔ اور صوفیانہ انداز بیان میں لکھی گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ ایک حقیقی افسانہ عشق کی یادگار ہے بیاٹرائس ڈانٹے کے لئے فردوس وجدان و جمال کا مظہر ہے اور اس کا عشق خالق حقیقی کے وصال کا راہنما۔

لیکن ہمیں ڈانٹے کو محض ایک خیال پرست عاشق اور غم و رنج کا سوگوار ہی نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ باوجود ان جذبات کے جن سے اُس کی تمام زندگی رنگین ہے۔ وہ دنیاوی امور میں کمال سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ اُس وقت فلورنس مختلف مخالف جماعتوں میں منقسم تھا۔ پاپائیت اور شہنشاہیت میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ ہر طرف ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ڈانٹے شہر کے معاملات میں نہایت دلچسپی لیتا تھا۔ ایک شائستہ جذبات کا حساس ترجمان اور نغز گو و ہر دل عزیز شاعر ہونے کے علاوہ جب کہ اُس کے اشعار ہر ایک دل میں جا گزیں اور ہر زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ پبلک زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ شہر کی ریاست کے ایک ممتاز عہدے پر بھی فائز رہا۔ اس ریاست کے لئے لڑائیوں میں شریک ہوا۔ دوسری ریاستوں میں سفارت کی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۰۰ء میں جمہوری سلطنت کا افسر اعلیٰ بن گیا۔ القصہ وہ بازار اور پارلیمنٹ کے کسی ہوشیار اور منچلے آدمی کی مصاحبت اور مخالفت سے نہیں ہچکچایا۔ اگر وہ انسانی فطرت کا احساس اور غائر نظر سے مطالعہ کرنے والا نہ ہوتا۔ تو وہ ڈیوائن کومیڈیا (الہامی مثنوی) کو کبھی تصنیف نہ کر سکتا۔ وہ اپنے زمانے کی شورش اور ہنگامہ آرائی میں ہمہ تن غرق ہو گیا۔ اور اس معرکتہ الآرا نظم کے خوبصورت ترین مقامات میں سے چند ایک مقام دنیائے سیاست کے انہی مفید اور وافر تجربات کا نتیجہ ہیں۔

لیکن ان مشاغل کی وجہ سے اسے بہت بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اُس زمانے کی آلودہ سیاسیات میں اس کا شرکت کرنا اس کی جلاوطنی کا باعث ہوا۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ اس کو اس کی بیوی سے — اس میں شک نہیں۔ کہ ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے — جدا کر دیا گیا۔ اب اس کے لئے جگہ جگہ پھرنا تھا۔ جانکاہ رنج و الم کا زمانہ اس نے فلسفے کے مطالعے میں گذار دیا۔ وہ بولوگنا اور پیرس یونیورسٹی میں گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی آیا۔ وہ اپنے رنج و الم کو دقیق علوم کے مطالعے میں فراموش کر دینا چاہتا تھا لیکن اُس میں اُسے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اُس کا دل فلورنس واپس آنے کے لئے بے تاب تھا۔ ایک بار۔ اُسے اس شرط پر کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کر کے معافی مانگ لے فلورنس واپس آنے کا موقعہ بھی دیا گیا۔ لیکن اُس کی جرأت اور حمیت نے اُسے یہ طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہ دی۔ ان مصائب کے حالات جو اُسے ان ایام میں جھیلنے پڑے۔ اُس نے نہایت دردناک الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے "کاش خالق کائنات کی خوشی اس میں ہوتی کہ اس غدر کو وجود میں آنے کا موقعہ نہ ملتا۔ دوسرے مجھے یہ نقصان نہ پہنچاتے! اور مجھے جلاوطنی اور افلاس کی اس غیر منصفانہ سزا کو برداشت نہ کرنا پڑتا۔ چونکہ روما کی مشہور آفاق اور خوبصورت ترین دختر فلورنس کے ساکنوں کی خوشی اس میں تھی۔ کہ مجھے اس کی پیاری آغوش سے جس میں میں پیدا ہوا۔ اور پختہ سالی تک میری پرورش ہوئی اور جس میں میں اپنی درماندہ روح کو راحت دینا اور اس حیات ارضی کی مدت کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ چھین کر باہر پھینک دیا۔ ہر اُس جگہ جہاں ہماری زبان بولی جاتی ہے۔ میں ایک خانہ بدوش قوال کی طرح آوارہ پھرا۔ اور اپنی مرضی کے خلاف اس زخم کو دکھایا جو گردش روزگار نے مجھے . . . . .

[1] میری تمام مسرت کا مرکز تھی۔

پہنچایا تھا۔ ایک بار اُس کو استقلال نے جواب دے دیا اور اپنے شہر میں واپس آنے کے لئے وہ اپنے سیاسی رفقا سے کنارہ کش ہو کر کیب لاش کا شریک ہو گیا۔ لیکن اِس سے کچھ کار برآری نہ ہو سکی۔ اُس کی قسمت میں ہمیشہ کی جلاوطنی تھی۔ جب واپسی کی کوئی صورت نہ رہی۔ تو اُس کی وہ اطالوی نظمیں باعثِ تسکین بنیں۔ جو اُس کی شہرت کا سبب ہوئی تھیں اور جنہوں نے اسے جلاوطنی سے بھی کسی قدر مانوس کر دیا تھا۔

اپنی عمر کے تین بہترین سال اُس نے "راونا" میں اپنے مربی گڈو کی خدمت میں گذارے۔ اُن ایام میں وہ گڈو کا ایلچی بن کر وینس والوں کے پاس بھی گیا۔ لیکن یہاں سے اُسے اپنے مقصد میں ناکام واپس آنا پڑا۔ ایسی سے اس کا دِل ٹوٹ گیا۔ اور بخار سے بیمار ہو کر وہ ۱۴ ستمبر ۱۳۲۱ء کو "راونا" میں اِس جہان سے چل بسا۔

ڈانٹے کے ہم وطنوں نے اُس وقت اِس عظیم نقصان کا اندازہ نہ کیا جو "اُس کی موت سے ملک کو پہنچا۔ اُس کی عظمت کا احساس ان کو بہت دیر میں ہوا۔ دنیا بھی اب تک اُس کی بزرگی اور رفعت کا اندازہ نہیں کر سکی"

نئی زندگی کے علاوہ جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ ڈانٹے نے اور بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ڈانٹے کی اطالوی تصانیف میں سے "کا نویٹو" یا "ضیافت" سب سے زیادہ غیر معروف ہے۔ اسلوب نگارش کے غیر دلچسپ ہونے کے باوجود اس کے بہت سے مقامات نہایت خوبصورت اور بلند ہیں۔ "الہامی مثنوی" اور "مونرکیا" کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کا جاننا ضروری ہے "مونرکیا" بھی لاطینی میں لکھی گئی ہے۔ اِس میں ڈانٹے نے اس نظریہ کی توضیح کی ہے۔ کہ شہنشاہِ روم کی فضیلت دنیا پر رومیوں کی فضیلت کی وجہ سے ہے۔ جو اُن کو براہِ راست خدا کی طرف سے انعام میں ملی ہے۔ ڈانٹے حکومت اور کلیسا کے تعلقات پر بحث کرتا ہوا اِس امر کی توقع رکھتا ہے۔ کہ شہنشاہ پوپ کا حلقہ بگوش بن کر رہے۔

لیکن وہ مہتم بالشان نظم جس کی وجہ سے تمام دنیا کا علمی طبقہ ڈانٹے سے روشناس ہے۔ اور اُسے دنیا کے چھ بڑے مصنفین کے زمرے میں جگہ دیتا ہے۔ "ڈیوائن کومیڈیا" یا الہامی مثنوی ہے۔ یہ لٹریچر میں صحیح طور پر ایک حیران کن پیکر کہلاتی ہے۔ وہ کسی قانون کسی آئینِ تنقید کی پابند نہیں۔ وہ کسی تنظیم کی مقید نہیں ہو سکتی۔ وہ سرود بھی اور رزمیہ ہے۔ وہ شاعر کے عمیق جذبات اور گہرے خیالات کی ترجمانی میں لاجواب ہے۔ وہ تصویر ہے قرون وسطےٰ کی اٹلی کی۔ وہ دوزخ سے جنت تک عقل و ایمان کی رہبری میں روح کے ارتقا و عروج کی تمثیل ہے اور یہ وہ ادب ہے انسانی تخیل کی بلند ترین پرواز کی فطرت کے ہیبت و جلال کے دِل کش ترین بیان کی اور جس موسیقی کی اِس نازک ہم آہنگی کی۔ جو ڈانٹے کے پاس قدرت کا خاص عطیہ تھی۔

جس طرح ہومر کی "ایلیڈ" قدیم یونان اور دنیائے بیگانگت کی تصویر ہے ڈانٹے کی الہامی مثنوی قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے روشن پہلو کا آئینہ ہے۔ یہ ایک خواب اور تمثیل ہے۔ خواب ہے . . . .

. . . واقعات مابعد الموت کا۔ اور اِس پر انسان کی زندگی اُس کے حوادث، نور و ہدایت کی ضرورت اور اُن فرائض کی تمثیل کی بنیاد ہے جو دنیاوی اور روحانی حکومتوں کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ "دوزخ" جہالت، لاعلمی اور بدکاری کی حالت کا اظہار ہے اور "اعراف" ان تائب شدہ گنہگاروں کی حالت کا بیان ہے۔ جو سیزر کی اطاعت اور پیطرس کا احترام کرتے ہوئے توبہ اور نفس کشی میں مصروف رہتے ہیں۔ "جنت" میں عمل و فکر کی اس مثالی زندگی کی نمائندگی کی گئی ہے جس سے دنیا میں بھی آسمانی جلال کے نظارے کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ شاعر کا مقصد اس زندگی میں انسانوں کو ہلاکت سے نجات دلا کر آسودگی کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور اس مقصد کا حصول گناہ کی فطرت کے احساس نفس کی ملامت، اعتراف، اطمینان اور ابدی حقیقت کے تصور سے ہو سکتا ہے۔

اس آسمانی سیاحت میں ڈانٹے کو دو راہبر ملتے ہیں۔ "ورجل اور بیاٹرائس" تمثیل کے طور پر ورجل عقل یا فلسفہ انسانی کا قائم مقام ہے۔ اور بیاٹرائس الہام یا فلسفہ الٰہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ورجل شاہانہ یا دُنیاوی طاقت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور بیاٹرائس کلیسا کے حقوق کے ساتھ۔ اُس مقام پر جہاں ورجل اُسے جنتِ ارضی پر اپنے غمناک مسکن لمبو جانے کے لئے چھوڑ دیتا ہے تمثیل کو کسی حد تک چھوڑ دیا گیا ہے اور اس مقام پر تو تمثیل کو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ جہاں بیاٹرائس جلال و جبروت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ ممکن نہیں کہ اس طویل اور بلند پایہ نظم کا خلاصہ پیش کیا جا سکے۔ یا ناظرین ڈانٹے کی شاعری کی عظمت کا صحیح اندازہ کر سکیں اس مقام پر صرف یہی ہو سکتا ہے۔ کہ ڈانٹے کی دوزخ کی ایک جھلک دکھا دی جائے۔ اور اعراف و بہشت کی سیر کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے۔

اس حیاتِ فانی کے پینتیسویں ۳۵ سال ڈانٹے سیدھے راستے سے بھٹک کر اپنے تئیں ایک تاریک اور گھنے جنگل کے درمیان پاتا ہے۔ پھر چیتے اور چست بدن چیتے کو دیکھ کر چلنے سے رک جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک بھوک سے دبلے شیر کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھ کر خوف سے اُس کی

له قرون وسطےٰ کی اٹلی کی ایک جماعت جو پوپ کی مخالف اور شہنشاہ موافق تھی۔

Paganism ۵۲

جاتی ہے۔ اُس وقت ورجل کی روح جلال اور نور کے ساتھ نمودار ہوتی ہے
س کو تسلی دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ ایک خاتون کے حکم سے جس کی
آفتاب سے بھی زیادہ درخشاں ہیں۔ اُس کی مدد کے لئے آیا ہے۔
سے سیدھے راستے پر ڈال دیگا" ورجل کے ان تسلی بخش الفاظ سے
لی ڈھارس بندھتی ہے۔ اور وہ کہتا ہے۔

"جس طرح صبح جب اُن کی پتیوں پر سپیدہ، نور بکھیرتا ہے۔ ننھے
دل جنہیں رات کی برف بار ہوا نے مرجھا کر جھکا دیا ہو شگفتہ ہو کر پھر کھل جاتے
رے ناتواں جسم میں نئے سرے سے طاقت آگئی"

ڈانٹے ورجل کی رہنمائی میں دوزخ کے دروازے پر جاتا ہے اور وہاں
ل الفاظ لکھے ہوئے پڑھتا ہے۔

"اندر آنے والے! تمام امیدوں کو چھوڑ دے"

اور ورجل اسے سمجھاتا ہے کہ یہاں اُن لوگوں کو عذاب دیا جاتا ہے جو اپنی
ئی اور بدی سے بے پرواہ رہ کر بسر کرتے ہیں"۔ اُس کے بعد وہ دوزخ
لے دائرے میں جو "لمبو" کہلاتا ہے۔ داخل ہوتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا مقام
ہے۔ جو نیک ہونے کے باوجود بپتسمہ سے محروم ہے۔ اس جگہ سے وہ بلند
نغموں کے شہنشاہ ہومر کو بھی دیکھتا ہے۔ دوسرے شعرا اُس کا استقبال
ہم مرتبہ شاعر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اُس کو سقراط بھی نظر آتا ہے۔ جو حکما کے
کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔

دوزخ کے دوسرے دائرے میں داخل ہو کر وہ نفسانی خواہشات کے
اروں کا عذاب دیکھتے ہیں۔ اس موقع پر دوزخ کی ایک زبردست آندھی
ہے اور انہیں غضب میں اُڑا کر چکر دیتی ہوئی پھر ایک جگہ پہنچاتی ہے
وہ بے ننگ و ناموس "سیمی رامیس" اور بدمست کلوپیٹرا اور اُن تمام لوگوں
جن سے زندگی میں محبت نے دغا کی ہے دیکھتا ہے۔ وہ "فرانسسکا" کی
اک حکایت الفت سنتا ہے۔ اور اُس کے جگر خراش انجام پر اس کے آنسو نکل
ہیں۔ وہ اُس کو بتاتی ہے کہ مصیبت کے دنوں میں ایام مسرت کی یاد سے
کر اور کوئی غم نہیں ہے"

دوزخ کا تیسرا دائرہ بسیار خوروں کے عذاب کی جگہ ہوتا ہے وہاں۔ اولوں
اور بدرنگ پانی کے طوفانوں کے ساتھ ہمیشہ ایک دھند چھائی رہتی ہے چوتھے
ے کا بھی یہی حال ہے لیکن وہاں فضول خرچوں اور بندگانِ حرص و آز کو سزا
جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف بڑے بڑے بوجھل پتھر لڑھکاتے
گالیاں دیتے ہیں۔ ورجل ان کی زندگی سے ایک سبق لیتا ہے اور کہتا ہے۔
"وہ تمام سونا جو زمین میں پوشیدہ ہے جو اُس میں سے نکالا گیا ہے۔
درماندہ اور خستہ روحوں میں سے ایک کے اطمینان کے لئے بھی کافی نہیں ہے"

پانچویں دائرے میں وہ جھیل "سٹائجس" کا غضبناک عذاب دیکھتے ہیں۔
اس جھیل کو عبور کر کے وہ "ڈائیس" کے شہر میں پہنچتے ہیں۔ اس شہر کے دروازے
کے محافظ بھوت اور غیور یاں ہوتی ہیں۔ جو ندامت ناکام کا نشان ہیں۔ یہاں سے
ہمیں سبق ملتا ہے "کہ گناہ روح کی موت ہے۔ لیکن نا امیدی سیدھی
جہنم کی تہ میں لے جاتی ہے۔

چھٹا دائرہ شہر کی چار دیواری کے اندر واقع ہوتا ہے اس میں بے دینوں
اور عیش پرستوں اور دنیا کے بندوں کی آتش افروز قبریں ہوتی ہیں۔ ورجل اس سے
اخلاقی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اور ہمیں بتاتا ہے۔ کہ سود اور دوسرے ناجائز ذریعوں سے
روپیہ بڑھانا فطرت کے خلاف گناہ اور خدا کے مقابل سینہ زوری ہے۔

ڈھلوان سے اُتر کر وہ ساتویں دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ تین گول
حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں خون کے ایک اُبلتے ہوئے دریا میں ان لوگوں
کو غوطے دیئے جاتے ہیں جو دوسروں کے خلاف زیادتی کرتے ہیں۔ دوسرے
حصے میں ایک بے راہ جنگل میں اُن لوگوں کو سزا دی جاتی ہے جو اپنے آپ پر زیادتی
کرتے ہیں۔ خودکشی کرنے والوں کو درختوں میں قید کر کے ... اُن سے حیوان خصلت
گنہگاروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ تیسرے حصے میں وہ لوگ رہتے ہیں۔ جو۔ خدا
فطرت اور آرٹ کے خلاف زیادتی کرتے ہیں۔ ان پر ہمیشہ آگ کے تودوں کی
آہستہ آہستہ بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس مقام پر ورجل ڈانٹے کو وہ بات بتاتا ہے
جس کے متعلق وہ کہتا ہے۔ کہ جو کچھ ڈانٹے نے اب تک دیکھا ہے۔ وہ ان سب
سے زیادہ اہم ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ "سونے کے عہد" سے لے کر دوزخ کے تمام
دریا نسلِ انسانی کے آنسوؤں اور گناہوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے لٹریچر میں
ڈانٹے کی اس چیخ سے بڑھ کر جگر پاش فریاد کوئی نہ ہو گی۔ جو "برونٹو" کو پہچان
کر بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

"محترم برونٹو! آپ یہاں ہیں؟"

برونٹو اس کا دیرینہ سال اُستاد تھا اُس نے ڈانٹے کو اس کی آئندہ شہرت
اور واقعاتِ زندگی کے متعلق پہلے ہی سے بتا دیا تھا۔ اُس نے اس کو ادبیت پر فتح
پانے کا راز بتایا تھا۔

"اُس نے کہا۔ اگر تو اپنے ستارے کے پیچھے چلے گا۔ تو اگر میری راستے میں
غلطی نہیں کرتی" تو نہایت بلند اور اعلیٰ رتبے پر پہنچے گا۔
وہ اسے حاسدوں اور کینہ ور دشمنوں سے خبردار رہنے کے لئے بھی کہتا
ہے۔

"شیریں انجیر کے درخت کی شان کے شایاں نہیں ہے۔ کہ اپنا پھل بدمزاج
کیکڑوں کے آگے ڈال دے"

ساتویں سے آٹھویں دائرے میں جانے کے لئے جس کا نام "میل بوگلج"

ل یونانیوں کے علم الاصنام (دیو مالا) میں غصے انتقام اور موت کی تین دیویاں۔

یعنی "کینہ وری کی مملکت" اس کا نام ہے۔ ایک اتھاہ غار کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ دس حصوں پر منقسم ہوتا ہے۔ اور ان دس حصوں کے درمیان ایک گڑھا ہوتا ہے یہ دس حصے مختلف گنہگاروں، اغوا کرنے والوں، خوشامدیوں، کلیسا کے منصب کی خرید و فروخت کرنے والوں، ساحروں، غیر منصفوں، چوروں، گمراہ کرنے والوں، رسوا اور بدنام کرنے والوں اور جھوٹوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہر ایک حصے کی سزا مختلف ہوتی ہے۔ اس مقام کا نظارہ اس قدر گمراہ کن ہوتا ہے کہ ڈانٹے کے اخلاقی خیالات بھی غبار آلود ہو جاتے ہیں۔ اور ورجل کو اسے تنبیہ کرنی پڑتی ہے۔

دوزخ کے نویں اور آخری دائرے میں گڑھے کے کنارے بلند ہوتے ہیں۔ اور اس کے چار حصے ہوتے ہیں ...... یہاں غرور اور حسد کے گناہ گاروں کو سزا دی جاتی ہے ایسے وفائی کو ... انتہائی دغا بازی ... سمجھا جاتا ہے۔ اس دائرے کے تیسرے حصے میں کونٹ "گیینو" بیان کرتا ہے کہ اس کو اور اس کے بچوں کو "پیسا" کے مینار میں قید رکھ کر کس طرح بھوکا مارا گیا تھا۔

ڈانٹے کے خوف اور رحم کے جذبات نے بڑھ کر کونٹ اور اس کے بچوں کی جان کنی کے مصائب کے بیان کو "کومیڈیا" میں ایک ممتاز مقام بنا دیا ہے۔ اس مقام پر خدا کے سب سے بڑے جلالی فرشتے[١] شیطان کی بھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ بدبختی اور زشت صورتی کا مجسمہ ہے۔ اور دنیا کے تین دغا بازوں، یہودا اسکریوتی حضرت مسیح کا شاگرد جس نے انہیں پکڑوایا تھا۔ اور بروٹس اور کیسیس جنہوں نے سیزر پر دغا بازی سے اچانک حملہ کر کے قتل کر دیا تھا۔ وہ ان سب کو اپنے دانتوں اور چنگلوں سے عذاب دیتا ہے۔

جس وقت دنیا میں ایسٹر کی[٢] شام ہوتی ہے۔ ڈانٹے اس لعنتی مقام کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایک عجیب و غریب راستے سے جس میں گناہ کی کشمکش بھی جاری رہتی ہے۔ وہ اپنے راہبر کے ساتھ بے گرد و غبار آسمان میں "اعراف" کے ساحلوں کی طرف پرواز کرتا ہے اور وہ "ستاروں کا مشاہدہ کرنے نکلتے ہیں"۔

بھوپال سنگھ

---

[١] عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ شیطان پہلے ایک فرشتہ تھا لیکن اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے خدا کی درگاہ سے راندہ گیا۔

[٢] عیسائیوں کا تہوار جو وہ حضرت مسیح کے جی اٹھنے کی یاد میں "گڈ فرائڈے" کے بعد اتوار کے روز منایا جاتا ہے۔

غزل

بندۂ تقدیر ہوں راحت کہاں میرے لئے
دہر ہے اک خارزارِ امتحاں میرے لئے

پس رہی ہے آسیائے جور میں ہستی میری
کر رہا ہے روز گردش آسماں میرے لئے

کون سی راحت پہ ہو آبِ بقا کی آرزو
موت ہو جائے گی عمرِ جاوداں میرے لئے

دل تڑپ اٹھتا ہے ہر پامالِ غم کو دیکھ کر
سوچتا ہوں یہ ہے سرگرمِ فغاں میرے لئے

دے گئی ہے غم ہی غم اختر مجھے پیاروں کی موت
ہے یہی اک یادگارِ رفتگاں میرے لئے

عبد المجید اختر

انسانی قانون

(ٹیگور کا ایک مختصر بلند پایہ ڈراما)

لڑائی کے میدان کی بھیانک رات: آما اپنے باپ وناٹکا کو دیکھتی ہے۔

آما۔ آبا!

وناٹکا۔ بے ننگ و ناموس اور بے غیرت لڑکی! تو مجھے ابا کہتی ہے۔ تو جس نے ایک ظالم تاتاری کے محل میں رہنا پسند کر لیا!

آما۔ ابا آپ نے میرے خاوند کو دغا بازی سے قتل کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ میرے باپ ہیں۔ اور میں ایک بیوہ کے آنسوؤں کو آنکھوں میں روکے ہوئے ہوں۔ کہ آپ پر خدا کا قہر نازل نہ ہو۔ کئی سال کی مفارقت کے بعد آج اس میدان میں ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے آپ پاؤں چھونے دیں۔ کہ میں ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت ہو جاؤں۔

وناٹکا۔ آما۔ تو کہاں جائے گی؟ وہ درخت جس پر تو نے اپنا گناہ آلود آشیاں بنایا تھا۔ کاٹ ڈالا گیا ہے۔ اب تو کہاں بسیرا لے گی؟

آما۔ میرا بیٹا ہے!

وناٹکا۔ چھوڑ دے اس کو! گناہ کے نتیجے کو جس کا کفارہ خون سے ادا کیا گیا ہے۔ شوق کی نگاہوں سے مڑ کر نہ دیکھ۔ خیال کر تجھے کہاں جانا ہے؟

آما۔ موت کا کھلا دروازہ باپ کی محبت سے زیادہ فراخ ہے!

وناٹکا۔ جس طرح سمندر دریاؤں کی مٹی کو اپنی تہ میں غرق کر دیتا ہے۔ موت گناہوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے تو آج رات نہیں مریگی۔ موت تجھے لڑائی کے میدان میں نہیں آئے گی۔ تو بے ننگ و ناموس اعزہ و اقربا سے دور مقدس شمبو کا کوئی غیر آباد اور ویران استھان تلاش کر۔ پاک گنگا میں روز نہایا کر۔ اور ایشور کا نام جپتے ہوئے شام کی پوجا کے آخری گھنٹوں کو سن۔ اور منتظر رہ کہ موت تجھے محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ اُس محبت کی نگاہ سے جس سے ایک باپ اپنے خوابیدہ بچے کو جس کی آنکھیں ابھی اشک آلود ہوں دیکھتا ہے۔ وہ تجھے محبت کے ساتھ اپنے پُرعظمت سکوت میں لے جائے گی۔ جس طرح گنگا اپنے پانی میں گرے ہوئے پھول کو ہر آلائش سے پاک کر کے لے جاتی ہے۔ کہ سمندر کو اس کی پاکیزگی کے لائق

نذرانہ پیش کرے۔

آما۔ لیکن میرا بیٹا ——————؟

وناٹکا۔ میں پھر کہتا ہوں۔ اس کا نام نہ لے! اپنے تئیں ایک بار پھر اپنے باپ کی آغوش میں ڈال دے۔ ایک نوزائدہ بچے کی مانند جو فراموشی کے جسم سے "جس نے تجھے دوبارہ جنا ہے" ابھی وجود میں آیا ہو۔

آما۔ دنیا میرے لئے اب ایک فریب ہے۔ میں آپ کے الفاظ تو سنتی ہوں۔ لیکن اُن کو دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔ چھوڑ دیں مجھے ابا! مجھے تنہا چھوڑ دیں! مجھے اپنی محبت میں اسیر نہ کریں۔ اس کی زنجیریں میرے خاوند کے خون سے رنگین ہیں۔

وناٹکا۔ آہ —— پھول ایک بار شاخ سے ٹوٹ کر اپنی جگہ آویزاں نہیں ہو سکتا۔ تو اُسے خاوند کہتی ہے؛ جو تجھے جیواجی سے چھین کر لے گیا۔ جس کے ساتھ تو پوتر دھرم کی رو سے منسوب تھی۔ آہ۔ وہ رات مجھے کبھی فراموش نہ ہو گی! ہم شادی کے ایوان میں بیٹھے تھے مبارک گھڑیاں گذر رہی جا رہی تھیں۔ اور ہم نفکر آمیز شوق سے دولہا کی آمد کے منتظر تھے —— آخر دور مشعلوں کی روشنی نمودار ہوئی۔ خوشی کی تانیں ہوا میں تیرتی ہوئی ہمارے پاس آ گئیں۔ ہم خوشی سے چلا اُٹھے۔ عورتیں سنکھ بجانے لگیں۔ پالکیوں کا ایک جلوس صحن میں داخل ہوا۔ لیکن ہم ابھی پوچھ ہی رہے تھے۔ "جیواجی کہاں ہے؟" کہ اُن میں سے مسلح آدمی طوفان کی طرح نکل پڑے۔ اور پیشتر اس کے کہ حقیقت حال کا ہم کو علم ہو۔ کوندتی ہوئی بجلی کی طرح تجھے اٹھا لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد جیواجی آیا۔ اُس نے ہمیں بتایا۔ کہ ایک تاتاری امیر نے اسے راستہ میں روک کر گرفتار کر لیا تھا۔ اُس رات میں نے اور جیواجی نے اس مقدس آگ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ جو شادی کے لئے روشن کی گئی تھی۔ کہ اس نابکار کو قتل کر کے انتقام لیں گے۔ طویل انتظار کے بعد آج ہم اپنی قسم سے آزاد ہوئے ہیں۔ —— جیواجی کی روح جو لڑائی میں مارا گیا ہے۔ تجھے

جانثر طور پر بیوی کہہ کر پکار رہی ہے۔

آما - ابا ہو سکتا ہے کہ میں نے آپ کے گھرانے کی رسموں کی توہین کی ہو۔ لیکن میری عصمت بے داغ ہے۔ مجھے اپنے خاوند سے عشق تھا۔ مجھے وہ رات یاد ہے۔ جب مجھے دو خفیہ پیغام پہنچے۔ ایک آپ کی طرف سے تھا۔ اور ایک امی جان کی طرف سے۔ آپ نے کہا تھا "میں تجھے خنجر بھیجتا ہوں۔ اپنے تئیں ہلاک کر دے" امی جان کہتی تھی "میں تجھے زہر بھیجتی ہوں۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے" اگر نفسانی جبر و طاقت نے میری عزت کو ہاتھ لگایا ہوتا۔ تو آپ کے دوہرے احکام کی تعمیل ہو جاتی۔ لیکن میرا جسم صرف اس وقت مطیع ہوا جب محبت نے مجھے اپنی تمام تر عظمتوں اور تمام تر پاکیزگیوں کے ساتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح ہمارے خون کا وہ نسلی تعصب مغلوب ہو گیا۔ جو اُسے ایک تاتاری سے ہونا چاہیئے تھا۔

آما کی ماں راما آتی ہے۔

آما - امی جان! مجھے امید نہ تھی کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو گی۔ مجھے اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ لینے دیں!

راما - مجھے ناپاک ہاتھوں سے مت چھوؤ!

آما - میں ایسی ہی پاک ہوں۔ جیسی کہ آپ!

راما - تو نے اپنی عصمت کس کے سپرد کی ہے؟

آما - اپنے خاوند کے!

راما - خاوند! ایک تاتاری! ایک برہمن عورت کا خاوند!

آما - امی جان - میں اس حقارت کی سزاوار نہیں - میں فخر یہ کہہ سکتی ہوں۔ کہ میں نے اپنے خاوند کی کبھی تحقیر نہیں کی۔ اگر آپ کو اپنے خاوند کی وفاداری میں "سورگ" ملے گا۔ تو وہ سورگ آپ کی بیٹی کا بھی منتظر ہے۔ جو ایک باوفا بیوی بن کر رہی ہے!

راما - تو کیا تو واقعی باوفا بیوی ہے؟

آما - ہاں!

راما - کیا تو بیباکی سے مرنا جانتی ہے؟

آما - ہاں! جانتی ہوں!

راما - تو تیرے لئے چتا روشن کی جائے! دیکھ وہ پڑی ہے تیرے خاوند کی لاش!

آما - جیواجی ——؟

راما - ہاں جیواجی - دھرم کی رو سے وہ ہی تیرا خاوند ہے - وہ فریب خوردہ آگ جو شادی کے دیوتا کے حضور میں روشن کی گئی تھی۔ موت کے غضبناک اور گرسنہ شعلوں میں بدل گئی ہے اس شادی کی تکمیل جو

اس رات روک دی گئی تھی۔ آج کی جائے گی!

وناٹکا - مت سن، میری بچی! اپنے بیٹے کے پاس لوٹ جا۔ اپنے آشیاں میں جسے غم نے تاریک کر رکھا ہے۔ چلی جا۔ میں اپنے فرض کو اس کی ظالمانہ انتہا تک پہنچا چکا ہوں۔ اب کچھ کرنا باقی نہیں —— —— بیوی تیرا غم کرنا فضول ہے۔ وہ شاخ جو ہمارے درخت سے زبردستی توڑی گئی تھی۔ اگر ... خشک ہوتی۔ میں اسے آگ میں جھونک دیتا۔ لیکن اس کی جڑیں نئی زمین میں پھیل گئی ہیں اور اس میں پھول اور پھل نکل آئے ہیں۔ اسے ان لوگوں کے تاثرات پر چلنے دے جن کے درمیان اس نے محبت کی ہے۔ آ بیوی۔ اب وقت ہے۔ کہ تمام دنیاوی رشتوں کو قطع کر کے ہم اپنی باقی ماندہ زندگی کسی پر سکون یاترا کی تنہائی میں گذار دیں۔

راما - میں تیار ہوں۔ لیکن پہلے گناہ اور شرم کی ہر اُس کونپل کو جو ہماری زندگی کی مٹی سے پھوٹی ہے۔ خاک میں پامال کر دے! بیٹی کی روسیاہی ماں کی نیک نامی کو کلنک لگاتی ہے۔ یہ ذلت اور رسوائی آج رات بھڑکتی ہوئی آگ کا لقمہ بنے گی۔ اور میری بیٹی کی خاک پر ایک باوفا بیوی کی یادگار کھڑی کرے گی۔

آما - امی جان! اگر آپ مجھے ایک ایسے شخص کے ساتھ متحد کرنا چاہتی ہیں۔ جو میرا خاوند نہ تھا۔ آپ موت کے غیر فانی دیوتا کی بارگاہ کو ناپاک کر کے اپنے اوپر قہر و غضب نازل کراتی ہیں۔

راما - سپاہیو! آگ روشن کرو! اس عورت کو گھیر لو!

آما - ابا!

وناٹکا - مت ڈر! افسوس میری بچی تجھے اپنے "ابا" کو پکارنا پڑا کہ تجھے تیری امی جان کے ہاتھوں سے نجات دے!

آما - ابا!

وناٹکا - میرے پاس آ۔ میری نور نظر محض فریب ہیں یہ انسان کے بنائے ہوئے قانون، جو خدائی قانون کی چٹان پر جھاگ کی مانند ٹکراتے ہیں۔ اپنے بیٹے کو میرے پاس لا! اور ہم اکٹھے رہیں گے میری بیٹی! باپ کی محبت خدا کی بارش کی طرح امتیاز نہیں کرتی۔ بلکہ ایک لامحدود سرچشمے سے بہتات کے ساتھ بہ نکلتی ہے۔

راما - کہاں جاتے ہو تم؟ واپس پھرو! سپاہیو اپنے آقا جیواجی کی وفاداری میں ثابت قدم رہو! اس کے متعلق اپنے آخری فرض کو ادا کرو!

آما - ابا!

وناٹکا - سپاہیو اسے چھوڑ دو! یہ میری بیٹی ہے۔

سپاہی۔ یہ ہمارے آقا کی بیوہ ہے!
ونامکا۔ اس کا خاوند گرا کیب تاتاری تھا۔ اپنے مذہب پہ پکا تھا۔
راما۔ سپاہیو! اس بوڑھے کو بھی حراست میں لے لو!

اما۔ امی جان آپ مجھے مقید نہیں کر سکتیں۔ اور نہ تم اے سپاہیو!
موت اور محبت سے گزر کر میں آزادی سے ہمکنار ہوتی ہوں۔

حنیف ہاشمی

غزل

فروغِ نور ترے حسنِ جلوہ زار میں ہے — بہار تیرے تبسم کے اختیار میں ہے

مری نگاہ میں اک موجِ خوں ہے جلوۂ گل — جنونِ غم کا اثر عشرتِ بہار میں ہے

شراب موت کے ساغر پلا چکی ہے مجھے — وہ دلکشی جو تری چشمِ سحرکار میں ہے

فضائے خلد کے جلوے دکھا چکی ہے مجھے — وہ بیخودی جو تری زلفِ مشکبار میں ہے

قرار کیا مجھے آئے کہ ایک سیلِ جنوں — مہ تمام کے دامانِ زرنگار میں ہے

یہ کس نے دردِ محبت کا ساز چھیڑا ہے — کہ ذرہ ذرہ دو عالم کا اضطرار میں ہے

تمہارے جلوۂ رنگیں کو خوئے رم ہی سہی — بلا کا جذب مرے عشقِ خاکسار میں ہے

دل ان کی برقِ تبسم سے بچ رہا عابد
تو شعلہ ہائے تکلم کے انتظار میں ہے

عابد

اکبر کی شاعری

خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا

سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی جنہیں دنیا اردو کی بہت سی قابلِ قدر نظموں کے ذریعے سے جانتی ہے، بجا طور پر اردوئے جدید کے بہترین انشاء پردازوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ان کی تصنیفات عہدِ حاضر کی روح کا آئینہ ہیں، اور ہندوستان کے بیشمار اربابِ فکر کے دلوں میں اس وقت جو جذبات ہیں، اُن کو بیباکانہ ظاہر کرتی ہیں، وہ اردو میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اور صحیح معنوں میں "لسان العصر" کے لقب کے مستحق ہیں۔ جسے قبولِ عام کی سند حاصل ہو چکی ہے "لسان العصر" ایک پھبتا ہوا کلمہ تھا۔ جو پہلے پہل مخزن کے صفحات میں ان کے متعلق استعمال ہوا۔ اردو کے رسائل نے اسے ایسا پسند کیا کہ سب نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ چنانچہ آج یہ نامور شاعر عموماً اسی لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرتِ اکبر کی نہایت بلیغ تعریف اور اُن کے کلام کی خصوصیات کا بڑی وضاحت سے مظہر ہے۔ اکبر کی شاعری اس ردِ عمل کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو یورپ کے اثرات کے خلاف بالخصوص جہاں تک ان اثرات کا ہندوستان کے مسلمانوں سے تعلق ہے۔ ہمارے زمانے میں جاری ہے، اس حیثیت سے وہ اردو کے طالبانِ علم کے لئے معمول سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔

اس سے بیشتر کہ ہم سید اکبر حسین کی شاعری سے بحث کریں۔ اُن کی زندگی کا ایک مجمل سا خاکہ بے محل نہ ہوگا۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۸۴۵ء میں بمقام باڑہ صوبجات متحدہ میں ہوئی۔ اُن کا خاندان ایک معزز خاندانِ سادات تھا۔ بچپن کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہو، البتہ یہ کہ اوائلِ عمر ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ظاہر تھے۔ اُن کے والد سید تفضل حسین اگلے وقتوں کے بزرگوں میں سے تھے، اور تصوف سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔ اور والدہ بھی نہایت پارسا اور پرہیزگار بی بی تھیں۔ چنانچہ بیٹے نے تدین ورثہ میں پایا۔ اور اس ورثہ کو عمر بھر حرزِ جان بنائے رکھا۔ مذہب کی محبت وہ واحد موضوع ہے جس کی طرف اکبر کی طبیعت بار بار راغب ہوتی ہے، وہ غافل اہلِ دنیا کو جو مادی ترقی کے جاذبِ نظر طلسم میں محو ہیں ہمیشہ یاد دلاتے رہتے ہیں۔ کہ خدا کے بھی کچھ حقوق اُس کے بندوں پر ہیں، اور ایک دن انہیں اپنے اعمال کا حساب اُس کے حضور میں دینا ہوگا۔ یہ اُن کے ساز کا سب سے بلند

آہنگ اور مخصوص نغمہ ہے اور اُسے دُہراتے ہوئے وہ کبھی نہیں اُکتاتے۔

اکبر کی تعلیم بچپن میں نہایت معمولی تھی، لیکن طبعی ذوق اور مستقل ذاتی مطالعہ کی بدولت انہوں نے عربی، فارسی، اور انگریزی سے اچھی واقفیت پیدا کر لی۔ خداداد ذہن و ذکا کا ایک ثبوت اس سے بہم پہنچتا ہے۔ کہ ابھی بمشکل دس سال کی عمر ہو گی کہ نہایت عمدہ خط اردو میں لکھ سکتے تھے اور فارسی کی قابلیت میں اپنے اکثر ہم عمروں سے پیش پیش تھے۔ اُن کے والد نے انہیں انگریزی تعلیم کے لئے مشن اسکول میں داخل کر کے ایک ایسی دور اندیشی اور وسعتِ نظر کا ثبوت دیا۔ جو اس زمانہ میں نایاب شئے تھی لیکن ابھی انگریزی کی چند ابتدائی کتابیں مدرسے میں پڑھی تھیں۔ کہ غدر کا فتنہ بپا ہو گیا، اور گھر کے معاملات نے ایسی صورت اختیار کی کہ تعلیم کا سلسلہ کچھ مدت کے لئے منقطع کرنا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی۔ اور اگرچہ کمسنی ہی کا عالم تھا۔ کہ دنیاداری میں پڑ گئے، لیکن انگریزی کی تحصیل اپنے طور پر جاری رکھی اور مشرقی علوم کا بھی مطالعہ کرتے رہے ۱۸۵۹ء میں بطور نقل نویس ملازمت سرکاری میں داخل ہو گئے۔ ۱۸۶۷ء میں قانون کا پہلا امتحان پاس کیا جس کی بنا پر پلیڈری کی سند حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ پیشہ اختیار کرنے کی نوبت نہ آئی، کیونکہ امتحان پاس کرتے ہی نائب تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائیکورٹ میں ریڈری مل گئی۔ اور اس حیثیت میں رہ کر انہوں نے انگریزی اور قانون کے علم میں معتدبہ اضافہ کیا۔ ۱۸۷۳ء میں الہ آباد ہائیکورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا، اور پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۸۸۰ء میں دوبارہ ملازمتِ سرکاری میں بحیثیت منصف داخل ہو گئے۔ اور کچھ مدت عدالتِ خفیفہ میں مقرر رہے۔ یہ تقرر سر سید احمد مرحوم اور اُن کے رفیقِ کار مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کی خاص درخواست پر عمل میں آیا، کیونکہ یہ حضرات اُس عظیم الشان تعلیمی کام میں جو انہوں نے علی گڑھ میں شروع کر رکھا تھا سید اکبر حسین کی ذہانت اور قابلیت سے مدد لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے غالباً اکبر کے حسنِ لیاقت کا چرچا سن رکھا تھا، اور انہیں امید تھی، کہ یہ نوجوان ایک قوی معاون ثابت ہوگا۔ لیکن اس امید پوری نہیں ہوتی تھی۔ علی گڑھ کا پیر دانا اور نوجوان شاعر ذاتی طور پر بلا شبہ ایک

ے کے محبِ صادق رہے۔ لیکن جہاں تک پبلک زندگی اور تعلیم عامہ کے
ے ہیں اُن کے خیالات اور مقاصد کا تعلق تھا، سرسید اور سید اکبر حسین
تضاد مذاہب خیال کے نمائندے تھے۔ اور ہمارے شاعر کو سرسید کی رائے
بھی اتفاق نہ ہوا۔ بہر حال اکبر کی شاعری کے لئے سرسید کا فیضِ محبت ایک
دست محرک ثابت ہوا۔ چنانچہ اس جلیل القدر شخصیت کا نام اور کارنامے
کی بہت سی دلچسپ نظموں کی شانِ نزول ہیں۔ علی گڑھ میں جس کالج کی
دیں رکھی جارہی تھیں۔ وہ اکبر کی نگاہ میں مغربی خیالات اور اثرات کا زندہ
نہ تھا۔ اور انہوں نے لوگوں کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ کہ اس کی ظاہری دلفریبیوں
مسحور ہو کر روحانی ترقی اور قومی غیرت کی طرف سے غافل نہ ہو جانا۔ شروع
ع میں اُن کی وہ نظمیں جن میں انہوں نے سرسید کے پروپیگنڈے کی
یابی پر اظہارِ خوف کیا تھا، سوائے اُن لوگوں کے جو علانیہ سرسید کے مخالف
ے کسی میں مقبول نہ ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ ہوا کا رُخ بدلا۔ رائے عامہ
رکی موافق ہو گئی۔ اور اکبر کی آواز گو وہ ایک اکیلی آواز تھی، توجہ سے سُنی
نے لگی چنانچہ آج عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ جس رفتار سے بعض تعلیم یافتہ
امانِ مغرب کی کورانہ تقلید کے راستے پر بڑھے چلے جاتے تھے۔ اکبر نے
ں کی سرعت کم کر کے ایک نمایاں خدمت انجام دی۔ تاہم یہ ہرگز نہ سمجھنا
ہیئے۔ کہ سرسید نے اشاعتِ تعلیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے
ب۔ اُن کو اکبر نے نظر انداز کر دیا۔ وہ یہ اعتراف کرتے ہیں۔ کہ سرسید کا
ب العین اپنی قوم کی ترقی تھا۔ اُنہیں اختلاف ہے تو فقط اُس طریق کار
ے جو علی گڑھ میں اختیار کیا گیا۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ فقط کتابی
م یا زبانی جمع خرچ یا مذہب کی ظاہر دارانہ عزت سے نوجوانوں کے دِلوں میں
ہب کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مذہبی معاملات میں بزرگوں کا فیضانِ
بت اُن کے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ کسی
دار سیدہ کا ایک گوشۂ چشم مبذول ہو جانے سے دین کی جو محبت نوجوانوں
ے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ کتابوں یا کالج کی عمارت کے بس کی نہیں
ے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایک اور مقام پر وہ یہ رونا روتے ہیں۔ کہ مغربی تعلیم کے دلدادہ اگرچہ
اپنے آباؤ اجداد سے ظاہری مشابہت قائم رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کی تمام باطنی
خوبیاں ضائع کر دیتے ہیں ؎

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

ان اشعار سے واضح ہے کہ علی گڑھ کالج نے اُن کے خیالات پر کیا
اثر کیا۔ لیکن اس قسم کے اور نمونے ہم آئندہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست
اُن کی زندگی کی بقیہ کہانی بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں سید اکبر حسین سب جج
کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں الہ آباد کی عدالت خفیفہ کے جج مقرر
ہوئے۔ اُسی سال ڈسٹرکٹ اور سشن جج ہو گئے۔ اور الہ آباد، جھانسی، مین
پوری، بنارس، اور سہارنپور میں کام کرتے رہے۔ جوڈیشل محکمے کے سب سے
اونچے زینے پر پہنچنے کا اُن کے لئے موقع تھا۔ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ ہم جسٹس
ابھی ان کی مدتِ ملازمت ختم ہونے پر سید اکبر حسین کو الہ آباد ہائیکورٹ کی
بنچ پر جگہ ملے گی۔ لیکن اس وقت کے آنے سے پہلے آنکھوں کی کسی شکایت
کے باعث انہیں ملازمت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ اُس کے بعد سے
اُن کی زندگی ہمیشہ خدمتِ دین اور مشاغلِ ادبی کے لئے وقف رہی۔ اور انہوں
نے اپنی دانشمندی اور تجربہ کاری کا نچوڑ دنیا کو ایسے اشعار کی صورت میں دیا
ہے۔ جو اتنے ہی پُر اثر ہیں۔ جتنے کہ ظرافت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
اخیر عمر میں ضعیفی اور کہولت نے بہت جلد ان پر غلبہ کیا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ
انہیں اول اپنی زوجہ اور اُن کے بعد اپنے دوسرے بیٹے سید ہاشم حسین کے
انتقال کا صدمہ دیکھنا پڑا۔ لیکن ان ناموافق حالات کے باوجود اُن کا دماغ
تروتازہ اور اُن کا تخیل شاداب رہا۔ اُن کے رشحاتِ قلم میں جو کبھی کبھی رسائل و
جرائد کے صفحات پر نظر آتے رہتے تھے۔ بالعموم کہولت کے آثار دکھائی
نہیں دیتے۔ خط و کتابت کے معاملے میں وہ نہایت باقاعدہ تھے۔ اور
ہندوستان کے بےشمار ادیبوں کے ساتھ اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔
اُن کے خطوط کا اُس ظریفانہ رنگ سے جو اُن کے اکثر اشعار میں نظر آتا ہے۔
بالکل جُدا ہوتا ہے۔ لب و لہجہ میں عموماً سنجیدگی ہوتی ہے۔ نفسِ مضمون زیادہ تر
بڑھاپے کے جسمانی عارضے اور وہ دماغی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ جو بیوی اور بیٹے
کی جدائی کے صدمے کا نتیجہ ہیں۔ اور امورِ دینوی کی بجائے عموماً امورِ آخرت کا
تذکرہ ہوتا ہے۔ اکبر کے بہت سے خطوط میری نظر سے گزرے ہیں، کیونکہ
ان میں ایک معقول تعداد ایسے خطوں کی ہے۔ جو میرے یا میرے دوستوں
کے نام آتے تھے۔ اگر ان کا انتخاب کر کے ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ تو اکبر
کے آئندہ مداحوں کے لئے یہ مجموعہ ان کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر ہوگا۔

اکبر کے کلام کا پہلا مجموعہ کلیاتِ اکبر کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا
تھا۔ اُس کے بعد مطبعِ مخزن کی طرف سے ان کی رباعیات کا ایک ایڈیشن
نکلا۔ جو غزلیں اور نظمیں ۱۹۰۹ء کے مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں
یا بعد میں کہی گئی تھیں۔ وہ ۱۹۱۲ء میں کلیات حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئیں
یہ مطبوعات بڑی حد تک حضرت اکبر کے بڑے بیٹے سید عشرت حسین
کی مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت ہیں۔ سید عشرت حسین کیمبرج کے تعلیم یافتہ

ہیں۔ اور انہوں نے مذاقِ ادب اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔ اُن کا سفرِ یورپ اکبر کی بہت سی دلچسپ نظموں کا موضوع ہے۔ سیّد صاحب نے ایک خدمت بہت بڑی انجام دی ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے موقعہ بموقعہ نظموں کے کہے جانے کی تاریخیں دے کر کلیات کی دلچسپی دوبالا کر دی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اکبر نے بارہ سال کی چھوٹی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، جس سے ظاہر ہے کہ اُن کا ملکۂ شاعری عطیۂ الٰہی ہے۔ بعض غزلیں جو ۱۹ سال کی عمر میں کہی گئی تھیں۔ نمونہ کے طور پر کلیات میں درج ہیں۔ ان غزلوں کی قادر الکلامی صاف پتہ دیتی ہے کہ شاعر ہونہار ہے جن خیالات کی بنا پر اکبر کا شمار بعدہٗ دورِ جدید کے اُستادوں میں ہونے لگا۔ وہ ابتدائی کلام میں نہیں پائے جاتے تاہم اگر اُردو کے پُرانے معیارِ شاعری کے مطابق جانچا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابیاتِ ذیل جو اکبر نے اُنیس سال کی عمر میں کہے، اچھے اچھے کہنہ مشق شاعروں کے لیے بھی باعثِ فخر ہو سکتے تھے ؎

پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو
وحشتِ دل کا ہے ایما راہِ صحرا لیجیے

خوشنما چیزیں ہیں بازارِ جہاں میں بے شمار
ایک نقدِ دل سے یارب مول کیا کیا لیجیے!

شاعری رنگِ طبیعت کا دکھا دیتی ہے
بوئے گل راہِ گلستاں کی بتا دیتی ہے

موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے
کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے

جب اُن کو رحم کچھ آیا صبا نے سمجھایا
بگڑ بگڑ گئی تقدیر میری بن بن کے

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۶۶ء میں جب اکبر نے ایک مشاعرے میں غزل پڑھی اور تحسینِ عام حاصل کی تو پہلی مرتبہ دُنیا سے اُن کا بحیثیت ایک اچھے غزل گو کے تعارف ہوا۔ بعد ازاں چند سال تک وہ عام رنگ کی غزلیں لکھا کئے۔ تا آنکہ جن واقعات کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اُن کے زیرِ اثر اُن کے خیالات نے ایک متعین شکل اختیار کی اور انہوں نے ایک خاص مقصد پیش رکھ کر شعر کہنا شروع کیا۔

قبل اس کے کہ ہم اُن کے ایسے اشعار کے نمونے ملاحظہ کریں۔ جو رائے عامہ کو مختلف صورتوں میں متاثر کرنے کے لئے تصنیف کئے گئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ایک نظم کے متعلق جو سودی کی مشہور نظم "واٹرز آف لوڈور" کا ترجمہ ہے۔ کچھ کہا جائے۔ مُدت ہوئی میں نے یہ ترجمہ کسی اخبار میں دیکھا تھا، اور اسے دیکھ کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا۔ کہ ایک صاحبِ لیاقت آدمی جس کو اپنی زبان پر کافی دسترس حاصل ہو کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اُردو کا ذخیرہ الفاظ چونکہ کچھ ایسا وسیع نہیں، اس لیے بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ انگریزی زبان کی تصنیفات کا اُردو میں کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا محال ہے۔ لیکن اکبر نے سودی کی نظم جیسی مشکل چیز کو جس میں پانی کے پہاڑیوں سے نکل کر وادی میں جانے کا لفظی مرقع کھینچا گیا ہے۔ اس خوبی سے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ اسے پڑھ کر اردو کی قدرتِ اظہار کے متعلق بہت کچھ امیدیں بندھنی ہیں۔

یہ ترجمہ اگر اردو کی ممکنات کو ظاہر کرتا ہے، تو اس سے کہیں زیادہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ کہ اکبر کو اس زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کا شمار مدتوں اردو کی چیدہ نظموں میں ہوگا۔ کیونکہ شاعر نے اس حد تک اسے اپنا بنا لیا ہے کہ اگر وہ خود اس کے ترجمہ ہونے کا اعتراف نہ کرتا تو کوئی شخص جس نے اصل چیز نہیں پڑھی کبھی نہ کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ ترجمہ ہے جسُنِ فطرت کے بیان کی اُردو جہاں تک قدرت رکھتی ہے۔ اُس کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اُردو کے شاعروں نے اگر آج تک اس باب میں کوشش نہیں کی تو اس کی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ اس صنفِ تحریر کی مانگ نہ تھی۔ لیکن اگر آج مناظرِ فطرت کی الفاظ میں مرقع آرائی کرنے کی طرز مقبول ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اردو کے شاعر اس میں دادِ سخنوری نہ دے سکیں۔ انیس کے کلام میں نیچرل شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ اور دورِ جدید کے شعرا میں آزاد۔ حالی اور اکبر نے جب کبھی فطرت کی نقشہ کشی کی طرف توجہ کی ہے۔ تو کافی قدرتِ کلام کا ثبوت دیا ہے۔ اکبر کی ایک نہایت دلچسپ نظم ہے۔ جس میں دو تیتریوں کے اڑنے کی کیفیت دکھائی گئی ہے۔ اور اس منظر کو دیکھ کر شاعر کے دل میں جو خیالات و جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو بیان کیا گیا ہے۔

اکبر کی شاعری کی ممتاز خصوصیات سے میرے خیال میں مختلف عنوانات کے ماتحت بحث کی جا سکتی ہے۔ گو مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کی بعض خصوصیات ایسی لطیف اور نازک ہیں کہ اُن کی مکمل تقسیم امرِ محال ہے۔ وہ عنوان حسبِ ذیل ہیں۔

(ا) ظرافت و بذلہ سنجی بلکہ بعض اوقات تمسخر اور طنز کا بھی شوق۔
(ب) خیالات اور اسلوبِ بیان کی جدّت۔
(ج) تخیل کی گرمجوشی اور حُبِّ وطن کا خاموش جذبہ۔
(د) مذہب کی سچی اور پرجوش محبت۔

ایک اور خصوصیت ہے۔ جس کا تعلق بہ نسبت اُن کی شاعری کی

روح کے جامۂ ظاہری سے زیادہ ہے یعنی انگریزی کے الفاظ استعمال میں لانے کی مہارت۔ بعض اوقات تو وہ کوئی انگریزی لفظ یا جملہ استعمال میں لا کر لطفِ سخن کو دوبالا کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس عادت کی وجہ سے اُنہیں بڑی دِقت پیش آتی ہے چنانچہ وہ متعدد اشعار ایسے کہہ گئے ہیں۔ کہ اُن میں جتنے انگریزی کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ وہ ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور اکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار اُن کی اردو نویسی کی شہرت میں کچھ اضافہ نہیں کرتے ؞

نامناسب نہ ہوگا کہ ہم چند کہ بالاخصوصیات پر فرداً فرداً نظر ڈالیں۔ ظریفانہ لہجہ میں گفتگو کرنے کا مادّہ معلوم ہوتا ہے۔ اکبر کی طبیعت میں فطرۃً ودیعت ہوا ہے۔ وہ اکثر بغیر کسی تصنع کے کوئی لطیفہ کہہ جاتے ہیں۔ گو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ کوشش و کاوش کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور آمد کا لطف جاتا رہتا ہے۔ عورتوں کے پردے کے متعلق اُن کا جو مشہور قطعہ ہے وہ اُن کی بے تکلف ظرافت کا نمونہ ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آج کل اکثر لوگوں کو اشتہارِ ذاتی کی جو بیجا خواہش ہوتی ہے اُس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اور ایسے الفاظ میں کہ ان کا جواب مشکل ہے۔ ؎

دیکھو جسے وہ پانیئر آفس میں ہے ڈٹا
للہ میرا نام کہیں چھاپ دیجئے

ایک اور شعر جو میرے ذہن میں اُن کی ظرافت نگاری کی مثال کے طور پر آیا ہے۔ اُن کی طبیعت کی اُپج اور اسلوبِ بیان کی جدّت کا بھی مکمل نمونہ ہے آپ خوب جانتے ہیں۔ کہ اردو اور فارسی میں شراب کو "دُختِ رز" یعنی "انگور کی بیٹی"۔ اکبر نے شراب کے مضر اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس استعارے کا نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے ؎

اُس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پر
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

مزید لطف یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ جو عام خیال ہے کہ لڑکیاں عموماً طبیعت کی مسکین ہوتی ہیں۔ اور ماں باپ کو دُکھ نہیں دیتیں۔ اور برخلاف اس کے لڑکے عموماً اکھڑ اور خودسر نکلتے ہیں، اُس کی طرف اس شعر میں نہایت لطیف کنایہ ہے ؞

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور جس کا طرزِ ادا اکبر کا طرزِ خاص ہے ؎

وضعِ سابق سے بتِ ہندی کو سیری ہو گئی
ہو مبارک ملک کو دنیا کنسیری ہو گئی

محض یورپی معاشرت کی نقالی کی بجائے مغرب کی حکمتِ عملی سیکھنے کا وہ جس تاکید سے مشورہ دیتے ہیں۔ اُس کا اس شعر سے اندازہ کیجئے ؎

بن گئے صاحب، ہُنر صاحب کا کیا ہے آپ میں؟
کیا کھلیں گی کیں گی سفیدی بنگلۂ خس پوش سے

اکبر کی حب الوطنی کو جہاں میں نے گرمجوشی سے تعبیر کیا ہے۔ وہاں اُسے ایک خاموش جذبہ بھی کہا ہے۔ اخیر کا شعر ظاہر کرتا ہے۔ کہ ان کے دل میں ہندوستان کی مادی ترقی دیکھنے کی کتنی خواہش ہے۔ وہ ملکی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے حامی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آزادی کی حقیقی رُوح ہندوستانیوں کے دل میں پیدا ہو۔ اُن کی آرزو ہے کہ لوگ تجارت سیکھیں اور ملازمت کی بجائے اسے اپنا وسیلۂ معاش بنائیں۔ اُن کی یہ دِلی تمنّا ہے کہ اُن کا ملک دنیا کے ممالک کا ہمسر ہو جائے۔ وہ اپنے ہموطنوں کو اُمید کا پیغام دیتے ہیں اور ہندوستان اور تمام مشرقی ممالک کو اچھے دنوں کے آنے کی خوشخبری سُناتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ فکر اور عمل دونوں میں اعتدال کے معتقد ہیں ؞

رہی اکبر کی مذہب سے محبّت۔ یہ اُن کی تمام تصنیفات میں باستثنا ابتدائی تصنیفات کے سرایت کئے ہوئے ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ ؎

موت کے عشووں کے آگے نازِ منطق کچھ نہ تھا
دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

مذہب کی فلسفیانہ شکل یعنی تصوّف کی زبان میں کہتے ہیں ؎

تصوّف کے بیاں کو ہوش نے رُوح آشنا پایا
معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ کہ انگریزی زبان کے الفاظ اُردو میں استعمال کرنا اکبر کے فن کا ایک کرتب ہے۔ بعض لوگ جو یہ چاہتے ہیں۔ کہ زبان ملاوٹ سے پاک رہے اسے پسند نہیں کرتے، لیکن جن کو معلوم ہے کہ اردو پہلے ہی مختلف زبانوں کا مخلوط مجموعہ ہے۔ وہ انگریزی کے الفاظ داخل کر کے اردو کے سرمایہ میں اضافہ کرنا کچھ بُرا نہیں سمجھتے۔ انگریزی کے متعدد الفاظ اُس وقت تک اردو میں جذب ہو چکے ہیں۔ اور اُنہیں ہر کوئی بے تامل استعمال کرتا ہے۔ تاہم اکبر اُن الفاظ کو جو جزوِ زبان ہو چکے ہیں۔ کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہمیشہ نئے نئے الفاظ کو جن کی سند پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اردو میں کھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں تو خود اُن کا استعمال آئندہ کے لئے سند ہو جائے گا۔ لیکن بعض صورتوں میں زیادہ سے

زیادہ یہ ہوگا۔ کہ اُن کے لئے تو یہ اختراعات قابلِ معافی قرار دے دی جائینگی۔ لیکن کوئی دوسرا اُن کا تتبع نہ کر یگا۔

کلیات کے اس حصہ میں جہاں ظریفانہ کلام درج کیا گیا ہے چند اشعار ایسے ہیں۔ جو شائستگی اور خوش مذاقی کی حد سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں دوستوں کی بے تکلف صحبت میں ہوں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اکبر جیسے شاعر کے مطبوعہ مجموعہ کلام میں اُن کا ہونا معیوب معلوم ہوتا ہے ہمیں توقع ہے۔ کہ آئندہ ایڈیشن میں قطع وبرید کی مقراض زیادہ برتی جائیگی اور کلیات کو تمام ایسے حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے گا۔ جو اکبر سے بلند پایہ شاعر کے شایانِ شان نہیں۔

اگرچہ حضرت اکبر اپنی قوم کے حقوق کے معاملے میں اغیار کو بڑی بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن کیا طبعاً اور کیا بلحاظ تربیت وہ ہمیشہ اہلِ برطانیہ کے دوست رہے۔ اُن کی تصنیفات سے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ وہ برطانوی قوم کی کس درجہ عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے ناواقف نہیں ہیں۔ کہ انگریزوں کے تعلق سے ہندوستانیوں کو کیا نفع پہنچا ہے۔ اور اپنے ہموطنوں سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں۔ کہ مغربی تہذیب میں جو باتیں اچھی اور مفید ہیں۔ وہ بے شک اخذ کر لینی چاہئیں، بشرطیکہ اپنی خوبیاں ہاتھ سے نہ جاتی رہیں۔ بعض امور میں تو وہ بہت زیادہ قدامت پرست واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً میں نے اوپر ان کا ایک قطعہ پردے کے متعلق درج کیا ہے۔ یہ اُن کا دل پسند موضوع ہے۔ ہندوستان کے تعلیمیافتہ مسلمانوں میں بہت ایسے ہیں۔ جو اس بارے میں اکبر کے ہم خیال نہیں اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ کم از کم پردے کی سخت پابندیوں میں کمی ہو جائے۔ لیکن قدامت پسندی کی وہ قوتیں جن کی اکبر نمائندگی کرتے ہیں۔ اب تک غالب چلی آتی ہیں۔ بہر حال اکبر کو اس امر کا احساس تھا کہ بہت ممکن ہے۔ ایک نہ ایک دن زمانے کا ورق اُلٹ جائے اور اسلئے وہ نئی روشنی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے پیشگوئی کرتے ہیں۔ کہ "اکبر بے شک پردے کا حامی ہے۔ لیکن وہ اور اُس کی رباعیاں کب تک؟"

مصوّر

"کھٹ کھٹ کھٹ!"

کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے میں محو تھا۔ اُس نے آواز نہیں سُنی۔ گجری نے آہستہ سے کہا "کوئی آیا ہے"۔

ٹھاکر سنگھ نے تصویر پر برش پھیرتے پھیرتے مسکرا کر جواب دیا "تو چلو! بھاگ کر اپنے گھونسلے میں چھُپ جاؤ۔ نہیں کوئی دیکھے گا۔ تو کہے گا جس کی بیوی کے کپڑے بھی صاف نہیں وہ تصویر کیا خاک بنائے گا"۔

گجری نے رنگ کے پیالے میں انگلی ڈبو کر اپنے شوہر کی قمیص پر داغ لگا دیا۔ اور شوخی سے بولی "پہلے اپنے کپڑے تو دیکھ لو۔ پھر مجھے بھی کچھ کہہ لینا"

ٹھاکر سنگھ چونک کر پرے سرک گیا۔ اور بولا "ارے! میری قمیص خراب کر دی۔ کیسی بیوقوف عورت ہے باہر کوئی ملنے والا کھڑا ہے یہ اندر پھاگ کھیلتی ہے"

گجری نے رنگ سے بھری ہوئی انگلی ٹھاکر سنگھ کے منہ کے قریب لے جا کر کہا "خبردار! تم بولے اور میں نے تمہارا چہرہ رنگ دیا"

ٹھاکر سنگھ "بس میرا ہی چہرہ رنگنا جانتی ہو۔ یا کچھ اور بھی سیکھا ہے"۔ اگر تصویر کا چہرہ رنگ سکو۔ تو چار پیسے نہ کما لو!"

گجری۔ (آگے بڑھ کر) دیکھو جی! تم نے پھر زبان کھولی"

ٹھاکر سنگھ "بہت اچھا جمعدار صاحب! اب کے معاف کر دیں کیا مجال جو اُف بھی کر جاؤں۔ واہ وا! کبھی بیوی تو ہمیں ملی ہے۔ بیوی بھی ہے جمعدار بھی ہے۔ مگر جمعدار صاحب!......"

گجری۔ (مصنوعی غصہ سے) "تم پھر بولنے لگے۔ چُپ رہو۔ کوئی آتا ہے"

ٹھاکر سنگھ بیوی کی اس محبت آگیں ادا پر لوٹ گیا۔ وہ اُسے اُٹھا کر کلیجہ میں سمٹا لینا چاہتا تھا۔ جہاں اُسے دُنیا کی گرم ہوا تک نہ لگے۔ اتنے میں دروازہ پر پھر دستک کی آواز آئی۔

گجری نے دبے پاؤں جا کر دروازہ کی زنجیر کھول دی۔ اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھاکر سنگھ نے بلند آواز سے کہا۔ "چلے آئیے! دروازہ کھلا ہے"!

نووارد بیش قیمت لباس پہنے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی ریاست کا اہلکار ہے شکل صورت سے عیب پرستا تھا۔ اُس نے ٹھاکر سنگھ کو مسکے

ن تک دیکھا اور کہا" میں مسٹر ٹھاکر سنگھ صاحب آرٹسٹ سے ملنا چاہتا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں جھک گئیں۔ خیال آیا۔ میرے کپڑے میلے ہیں۔ ایسے معلوم ہوا۔ جیسے مُنہ پر میل لگ گیا ہو۔ جیسے کسی جلسہ میں بیٹھے ہوئے کپڑا پھٹ گئے۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ آہستہ سے بولا" فرمائیے۔ ٹھاکر سنگھ حاضر ہے"

یہ کہہ کر ٹھاکر سنگھ نے نووارد کے سامنے کرسی رکھ دی۔

نووارد نے کرسی پر بیٹھ کر کہا" خوب! میں سمجھتا تھا۔ آپ بڈھے ہونگے۔ میرا قیاس غلط نکلا۔ آپ تو ابھی بالکل نوعمر ہیں۔ میرا خیال ہے۔ آپ کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہو گی"

ٹھاکر سنگھ۔ (زمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولے" جی نہیں میری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے۔

نووارد۔ اس عمر میں بھی ایسی تصویریں بنا لینا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ میں نے آپ کی چند ہی تصویریں دیکھی ہیں۔ دیکھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ تصویریں نہیں ہیں۔ جاندار چیزیں ہیں بعض وقت شبہ ہوتا ہے۔ کہ ابھی منہ کھول کر بولنے لگینگی۔ بہت مدّت سے خواہش تھی۔ کہ چل کر درشن کروں۔ آج اس اشتیاق نے کھینچ لیا"

ٹھاکر سنگھ" یہ آپ کا حُسن ظن ہے۔ ورنہ میں تو مصور کہلانے کا بھی حقدار نہیں"

نووارد (سُنا اَن سُنا کر کے)" آپ کی تصویریں خوب بکتی ہونگی۔ ایسی عمدہ تصویریں نہ بکیں گی۔ تو کیا بکے گا۔ (پھر کمرہ کا جائزہ لے کر) لیکن آپ نے مکان اچھا نہیں لیا۔ یہ جگہ آپ کی شان کے شایاں نہیں۔ جو دیکھے گا۔ یہی کہیگا کہ نام بڑا اور درشن چھوٹے"

ٹھاکر سنگھ۔ دیکھئے! کوئی موزوں جگہ مل جائے تو اسے چھوڑ دونگا"

نووارد" مال روڈ پر چلئے۔ مال روڈ پر۔ وہاں آپ کا کاروبار بھی چمک اُٹھے گا۔ یہاں جو تصویر سو پر اُٹھتی ہے وہاں اڑھائی سو پر اُٹھے گی مخمل کے ٹکڑے پہ رکھ دینے سے اُس کی آب نہیں بڑھ جاتی۔ مگر قیمت بڑھ جاتی ہے۔ میرا تو خیال ہے۔ وہاں چل کر آپ چند دن میں کہیں سے کہیں پہنچ جائینگے"

ٹھاکر سنگھ" آپ جیسے مہربانوں کی دُعا لگ جائے۔ تو ایک سال میں سونے کے محل کھڑے کر لوں لیکن یہ دنیا اہل زر کی قدر کرتی ہے۔ اہل ہنر کی نہیں۔ یہاں ہنر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے"

نووارد نے نوجوان مصور کی طرف استعجاب کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہا۔ "مگر اُسی وقت تک جب تک کہ کسی اہل دل کی نظر نہ چڑھ جائے"

ٹھاکر سنگھ نے برش ہاتھ میں لیا۔ اور تصویر کی طرف دیکھ کر بولا" لیکن اہل دل اس مکر و فریب کی دنیا میں ہیں کہاں؟ عنقا کی طرح اس چیز کا نام سب نے سُنا ہے۔ مگر دیکھا بہت کم لوگوں نے ہے۔ شاید کسی نے بھی نہیں"

یہ لفظ نہیں تھے۔ مصور کے دل کے گھاؤ تھے۔ نووارد کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اُس پر صورتِ حال روشن ہو گئی۔ یہ باکمال ضرور حادثات زمانہ کا شکار ہے۔ یقیناً اس کا دِل دکھا ہوا ہے۔ ورنہ اِس کے مُنہ سے یہ شکوہ کبھی نہ نکلتا۔

نووارد نے تھوڑی دیر بعد کہا" میں ریاست سکندر پور کا دیوان ہوں۔ میرا نام دیوان ہرجس رائے ہے۔ مہاراجہ صاحب نہایت پاکیزہ مذاق کے آدمی ہیں۔ خصوصاً عمدہ تصویروں کے تو عاشق زار ہیں۔ اُن کو خوش کرنا ہو۔ تو کوئی بڑھیا سی تصویر نذر کر دو۔ پھر جو چاہو۔ کرا لو۔ بلا عذر کر دیں گے۔ ایک ماہ بعد اُن کی سالگرہ کا جشن ہے۔ میں اس موقعہ پر اُنہیں کوئی عمدہ سی تصویر نذر کرنا چاہتا ہوں۔ روپے پیسے کا خیال نہیں۔ میں منہ مانگا انعام دوں گا۔ لیکن تصویر ایسی ہو۔ کہ ایک مرتبہ مہاراج دنگ رہ جائیں۔ خوش ہو جائیں کہیں۔ یہ چیز تجھے کہاں سے مل گئی۔ بس میں مہاراج کے ان الفاظ کا بھوکا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کے دل میں اُمید کی نشاط انگیز گدگدی ہونے لگی دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر بولا" اپنی عُمر میں مجھے پہلی مرتبہ اُس شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس کے پاس آرٹ دیکھنے والی آنکھ اور قدر کرنے والا دل ہے"

دیوان صاحب" ایسی چیز بنائیے۔ کہ مہاراج پھڑک اُٹھیں"

ٹھاکر سنگھ" دیوان صاحب! اپنے مُنہ سے اپنی تعریف کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن میں آپ کو ایسی تصویر دوں گا۔ کہ آپ خوش ہو جائیں"

دیوان صاحب" آپ کی جو تصویریں قبل ازیں دیکھ چکا ہوں۔ اُن سے عمدہ ہو گی نا؟"

ٹھاکر سنگھ۔ آپ مطمئن رہئے۔ راگی کو جب معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اُس کے روبرو راگ کو سمجھنے والا بیٹھا ہے۔ اُس وقت وہ اپنی بہترین چیز گاتا ہے۔ معمولی چیز نہیں گاتا"

دیوان صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے" تو آپ کب تک مجھے تصویر دیدیں گے؟"

ٹھاکر سنگھ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے دِل میں اندازہ کر کے جواب دیا" ایک ماہ سے کم عرصہ میں تو کسی صورت طیار نہ ہو گی"

دیوار پر جلی حروف سے لکھا تھا" نقد و ادھار بند ہے" دیوان صاحب نے یہ الفاظ آتے ہی دیکھ لئے تھے۔ ٹھاکر سنگھ دل میں سوچتا تھا۔ ابھی بٹوا کھولے گا۔ ابھی نوٹ گن کر دے گا۔ دیکھیں کیا دیتا ہے؟ امیر آدمی ہے اسے روپے پیسے کی کیا پرواہ ہے؟ آرٹ کی باریکیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ پانچ

سات سو سے کم کیا دے گا۔ لیکن دیوان صاحب اُٹھے اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ ٹھاکر سنگھ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُمید کے سُہانے بادل دیکھ کر غریب کسان کا دل نہال ہو گیا تھا۔ اُسے کیسی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ کلیجہ بلبوں اُچھلتا تھا۔ لیکن ہوا کے ظالم جھونکوں نے بادل اُڑا دیئے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی نہ برسا۔

(۲)

گجری دروازہ کی آڑ میں کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی۔ دیوان صاحب کے چلے جانے پر اُس نے زینے کا دروازہ بند کر لیا۔ اور آ کر اپنے شوہر کا ہاتھ تھام لیا۔ ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں آب گوں تھیں۔ جیسے کسی کے ہاتھ آئی ہوئی دولت نکل گئی ہو۔ گجری نے ہمدردانہ انداز سے کہا "تم ناحق اپنا دل چھوٹا کرتے ہو۔ اس وقت روپیہ نہیں ملا۔ نہ سہی۔ رنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ بلکہ میں تو خوش ہو رہی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے یہ شخص ہمارا سچا خیر خواہ ہے۔ اس کی ذات سے ہمیں بہت فیض پہنچے گا۔ مگر اُسے کیا معلوم ہے۔ کہ یہ بالکل ہی قلاش ہیں۔ یہ مکان، یہ پردے، یہ فرنیچر یہ بجلی دیکھ کر کسی کو ایسا خیال بھی نہیں آ سکتا"!

ٹھاکر سنگھ نے گجری کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح مجرم عدالت کی طرف دیکھتا ہے۔ اور کراہ کر جواب دیا "گجری! آج کرواچوتھ[۱] ہے اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ ہم بیٹھے نصیبوں کو رو رہے ہیں"

گجری "اب یہ اپنی قسمت ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے۔ اُسے کون مٹا سکتا ہے؟ باقی رہی کرواچوتھ کی بات۔ اس کا تم ذرا بھی فکر نہ ہو۔ کہیں سے آ جائے گا۔ کھا لیں گے۔ نہ آئے گا۔ نہ کھائیں گے۔ بھوکے ہی سو رہیں گے۔ سری واہگورو پہ بھروسہ رکھو۔ جس نے مُنہ چیرا ہے۔ کھانے کو بھی دے گا۔ مگر ہم بھی عجیب آدمی ہیں۔ جو مکان دیکھے فرنیچر دیکھے۔ وہ کبھی خیال بھی نہ کرے کہ ان کے پاس کچھ نہ ہو گا۔ اور تو اور گھر میں تو کچھ بھی موجود ہے"

ٹھاکر سنگھ کو بیوی کی ان باتوں سے گونہ تشفی ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ دیوان صاحب کے جاتے ہی گجری انہیں گالیاں دینے لگے گی قسمت کو بُرا بھلا کہے گی۔ لیکن شوہر کی روحانی اذیت کا خاتمہ کرنے کے لئے وہ امید کی دیوی بن گئی۔ جو مایوس ہونا گناہ سمجھتی ہے۔ ٹھاکر سنگھ نے اسے عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہا "گجری تم سے کیا کہوں۔ جی چاہتا ہے تصویروں کو آگ لگا کے کہیں نکل جاؤں۔ کام کرانے کو سبھی ہیں۔ پیسے دیتے وقت جان نکلتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کل آؤ۔ کبھی کہتے ہیں پرسوں آؤ"

گجری "یہی تو خرابی ہے۔ ورنہ ہمیں ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی۔ خیر تیرتھ گیا ہے۔ ابھی آ جائے گا۔ دیکھیں کہیں سے کچھ لاتا ہے یا نہیں۔ یہ تصویر کس کی ہے"؟

ٹھاکر سنگھ "ایک رسالہ کے ایڈیٹر صاحب ہیں۔ اُن کی ہے"

گجری "کیسے آدمی ہیں"؟

ٹھاکر سنگھ "نہایت شریف"

گجری "کچھ روپیہ پیسہ بھی ہے یا ہمیں جیسے ہیں"؟

ٹھاکر سنگھ "آدمی تو خاندانی معلوم ہوتے ہیں۔ آگے بھگوان جانے"

گجری "تصویر بنا کے لے جاؤ۔ تو فوراً پیسے دے دیں گے نا"؟

ٹھاکر سنگھ "اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں؟ مگر اُمید ہے۔ انکار نہ کریں گے"

گجری "تو اس تصویر کو پورا کیوں نہیں کرتے۔ کتنے روپے طے ہوئے ہیں"؟

ٹھاکر سنگھ "میں نے تیس مانگے تھے۔ اُنھوں نے بیس بتائے میرا خیال ہے پچیس پر فیصلہ ہو جائے گا۔

گجری کے چہرے پر اُمید کی روشنی جھلکنے لگی۔ ہنس کر بولی "جا اتری خالم کو روٹا ہم تو ڑا ہے۔ ورنہ جمعدار صاحب کھاپا ہو جائے گا"

اب وہ پھر وہی ہنس مکھ، وہی بے فکر، وہی بے پرواہ گجری تھی۔ جو بھوکی رہتی تھی۔ مگر غمگین نہ ہوتی تھی۔

ٹھاکر سنگھ نے برش اٹھا لیا۔ اور تصویر بنانے لگا۔ کل شام سے کچھ کھایا نہ تھا۔ صبح کو بھوک معلوم ہوئی تھی۔ مگر اس وقت پیاس بھی نہ تھی۔ جسم میں ایک نئی قسم کی چستی کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی ایک رنگ گھولتا۔ کبھی دوسرا۔ اور تصویر بناتا جاتا تھا۔ آج اس کا ہاتھ کیسا تیز چلتا تھا؟ طبیعت ایسی جمی ہوئی تھی۔ جیسے یار دوستوں میں بیٹھے شطرنج کھیل رہا ہوں۔ اس قدر یکسوئی اس کی طبیعت میں کبھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ شام کے پانچ بج گئے۔ اور اس نے سر نہ اٹھایا۔ دفتر کے بابوؤں کو چھٹی ہوئی پنچھی بھی بسیرا کرنے لگے۔ گائیں اور بھینسیں بھی چراگاہوں سے واپس آ گئیں۔ مگر ٹھاکر سنگھ کو آرام کہاں؟ وہ ابھی تک اُسی جوش انہماک، اُسی سرگرمی سے تصویر مکمل کرنے میں محو تھا۔ امید میں کتنی زندگی ہے، کتنی تحریک، کتنی بیداری! بول کہنے کو ایک کچا تاگا ہے۔ لیکن اسی کچے تاگے میں وقت آنے پر کیسی طاقت آ جاتی ہے؟

---

[۱] یہ ہندوؤں کا بہت مشہور برت ہے۔ اس دن عورتیں سہاگ کا برت رکھتی ہیں۔ اور چاند کو دیکھ کر اور اسے ارگھ دے کر کھانا کھاتی ہیں۔ (مصنف)

اتنے میں تیرتھ آ گیا۔ خاوند بیوی دونوں کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ دیکھیں کچھ لایا ہے یا نہیں۔ ایک شیریں لفظ سن کر دونوں کے دل کے کنول کھل جاتے اور اگر وہ خالی ہاتھ لوٹا ہو تو . . . . آدمی کس قدر حالات میں جکڑا ہوا۔ کس قدر مجبور، کس قدر بے دست و پا ہے۔ ٹھاکر سنگھ کو اس سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ لیکن عورت کمزور ہونے پر بھی حوصلہ نہیں ہارتی۔ اس نے تیرتھ سے پوچھا "تو سارا دن کہاں رہا؟ بول کچھ لایا بھی یا نہیں؟"

تیرتھ نے آہستہ سے جواب دیا "کسی نے بھی نہیں دیا۔"

ٹھاکر سنگھ کے دل میں کسی نے چھرا بھونک دیا۔ اس نے تلملا کر پوچھا۔ "امرت فیکٹری والوں نے کیا کہا؟"

تیرتھ "کہا کہ سردار صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ آئیں گے۔ تو بھجوا دیں گے۔"

ٹھاکر سنگھ "اور بیسٹ واچ کمپنی والے نے؟"

تیرتھ "بولے آج تو پیسے کی بھی بکری نہیں ہوئی۔ کل آنا۔"

ٹھاکر سنگھ "اور رلیے صاحب ہولو رام؟"

تیرتھ۔ "وہ ابھی کراچی سے نہیں لوٹے۔"

ٹھاکر سنگھ "اور تو اس وقت تک کہاں مر گیا تھا۔ روپے نہ ملے تھے۔ تو تو گھر آ جاتا۔ کہیں اور بھیج دیتا۔ اب اس وقت کیا کروں؟"

تیرتھ نے سہم کر جواب دیا "میاں یعقوب کی طرف چلا گیا تھا۔ انہوں نے ٹھہرا لیا۔ کہ ابھی منی آرڈر آتے ہیں لے کر جانا۔ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر اٹھ آیا۔ وہ تو اب بھی نہ آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے۔ ذرا اور ٹھہر جاؤ۔ شاید کوئی دینے والا ہی آ جائے۔ تہوار کا دن ہے۔ خالی ہاتھ جاؤ گے۔ تو سردار صاحب خفا ہوں گے۔"

ٹھاکر سنگھ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔ اور تصویریں لے کر چلا گیا۔ گجری رونے لگی۔ شام ہو گئی تھی۔ بیاہی ہوئی عورتیں اپنے اپنے تھال میں مٹھائی، بادام اور گھی کے چراغ رکھ کر سہاگن لڑکی کی کتھا سننے جا رہی تھیں۔ اسوقت ان کے چہرے کیسے خوش تھے۔ آنکھیں کیسی منور۔ جیسے کنول کے پھول میں دیا جل رہا ہو۔ آج انہوں نے خاوند کی سلامتی کا برت رکھا تھا۔ آج وہ اپنے سہاگ کیلئے دعا کرنے جا رہی تھیں۔ مگر گجری کیا کرے؟ اس کی روح اسیر قفس پرندے کی طرح بیتاب تھی۔ جو اڑنا چاہتا ہے۔ مگر اڑ نہیں سکتا۔ اس نے آہ سرد بھری اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

معاً اس کی پڑوسن نے ساتھ کے جنگلے سے پکار کر کہا "بہن گجری۔ چل کتھا سن آئیں۔"

گجری سسک سسک کر رونے لگی۔ جیسے کسی نے پکا ہوا پھوڑا چھیڑ دیا ہو۔ سوچتی تھی۔ میں کیسی بدقسمت ہوں۔ جو سہاگ کے برت کے دن سہاگ کی کتھا سننے بھی نہیں جا سکتی۔ مگر پھر خیال آیا۔ پڑوسن کیا کہے گی۔ اس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب روک لیا۔ اور اپنی آواز بدل کر جواب دیا "بہن میں تو سن بھی آئی۔"

پڑوسن چلی گئی۔ گجری پھر اداس ہو گئی۔ اسے سنگدل امیروں پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ جو غریب آدمیوں سے کام کرا لیتے ہیں۔ پیسے وقت پر نہیں دیتے۔ اس وقت وہ ایسی خونخوار ہو رہی تھی۔ کہ اگر کوئی امیر آدمی اس کے سامنے آ جاتا تو اس کا خون کر دیتی۔ سوچتی تھی۔ سب نے انکار کر دیا۔ کسی نے اتنا بھی نہ سوچا۔ کہ چلو دے دو۔ تہوار کا دن ہے۔ اسے بھی ضرورت ہو گی۔ ایسے ہی پاپوں کی بدولت تو بارش نہیں ہوتی۔ اسی لئے نت نئے قحط پڑتے رہتے ہیں۔"

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ گجری اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مگر اسے اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ یہ باہر کی تاریکی اس کے دل کی تاریکی کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی تھی۔ کچھ بھی نہیں

اتنے میں تیرتھ نے آ کر کہا۔ بی بی جی! کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

لفظ معمولی تھے لیکن گجری کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جیسے خشک بارود بعض وقت رگڑ سے بھی جل اٹھتی ہے۔ گرج کر بولی "تو آدمی ہے یا الو؟ دیکھتا نہیں ہے کہیں سے بھی پیسے نہیں ملے۔ مروت تو ان لوگوں کو چھو بھی نہیں گئی۔ مالک مرے یا جئے۔ ان کی بلا سے۔ ان کو اپنے کام سے کام ہے۔"

تیرتھ کھانے کے عوض گالیاں کھا کر چپ چاپ اوپر چلا گیا۔ اور اپنی حماقت پر پچھتانے لگا۔ ادھر تھوڑی دیر بعد گجری ہمت کر کے اٹھی۔ اور چھجے پر سے پڑوسن کو بلا کر بولی "بہن! ذرا ایک چونی دینا۔ وہ باہر گئے ہیں میرے پاس دس روپے کا نوٹ ہے۔ ابھی آتے ہیں۔ تو لوٹا دیتی ہوں۔"

اس وقت اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سوچتی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا۔ تو کیا ہو گا؟ عزت خاک میں مل جائے گی۔ مگر اس کے اندیشے باطل ثابت ہوئے۔ پڑوسن نے چونی دے دی۔ اب گجری کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے یہ چونی نہیں، چار سو روپیہ ہے۔ جیسے وہ دریا کے دھارے میں ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی ہے۔ وہ تیرتھ کو بلا کر بولی۔ جا جا کر دو آنے کے چاول لے آ۔ ایک آنے کی جلیبی۔ ایک آنے کا دودھ۔ مگر ذرا جلدی آنا۔ تیری عادت ہے۔ جہاں چار آدمی دیکھے۔ کھڑا ہو گیا۔"

تیرتھ بازار گیا۔ گجری نے جلدی سے آگ جلا دی۔ اور تیرتھ کا انتظار کرنے لگی۔ مگر آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ اور تیرتھ نہ آیا۔ آخر کدھر چلا گیا۔ اتنی دیر کہاں لگ گئی پاس ہی تو دکان ہے۔ دو منٹ کا رستہ ہے۔ ضرور کہیں کھڑا ہو گیا ہو گا۔ کمبخت کو اتنا بھی خیال نہیں۔ کہ آج تہوار کا دن ہے۔ سردار صاحب آتے ہیں۔ تو کہتی ہوں۔ اس لونڈے کو جواب دو۔ میں باز آئی ایسے نوکر سے۔ وقت بے وقت بھی نہیں دیکھتا۔ یہاں آگ جل رہی ہے۔ وہ کہیں وہاں کھڑا وقت ضائع کر رہا ہو گا۔

مگر آدھ گھنٹہ اور گذر گیا۔ اور تیرتھ پھر بھی نہ آیا۔ اب گجری کے غصہ نے فکر و تشویش کی صورت اختیار کر لی۔ سوچنے لگی۔ کہیں کسی گاڑی تلے نہ آ گیا ہو۔ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے۔ سامنے تو دیکھتا ہی نہیں۔ گجری کا دل دہل گیا۔ گویا تیرتھ درحقیقت گاڑی تلے کچلا گیا ہے۔ اتنے میں وہ آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور سسک سسک کر رونے لگا۔ گجری نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا ہے"؟ تیرتھ نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ "چونّی کہیں گر گئی ہے"۔

گجری نے ٹھنڈی آہ کھینچی اور انتہائے یاس سے وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اندھیری رات میں بھولے ہوئے مسافر کو ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ملی تھی۔ کتنی محنت، کس قدر عرق ریزی کے بعد لیکن دیکھتے دیکھتے وہ بھی جھاڑیوں میں گم ہو گئی۔ اب مسافر کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ روشنی کہیں بھی نہ تھی۔

(۳)

اُدھر ٹھاکر سنگھ تصویر لے کر اخبار شوکت ہند کے دفتر میں پہنچا۔ اور ایڈیٹر سے بولا "لیجئے بندہ پرور! تصویر تیار ہو گئی"۔

ایڈیٹر صاحب نے تصویر کو ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ اور بے پروائی سے میز کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا "رکھ دیجئے" اور یہ قدر تھی اُس چیز کی، جسے مصور نے شہکارہ کر دیا۔ کیا تھا جس پر اُس نے اپنی روح چھڑک دی تھی۔ کیا اُس کے لئے اس سنگ دل اندھے کے پاس تعریف و ثنا کے دو میٹھے لفظ بھی نہ تھے؟ صرف دو لفظوں سے اُس کی تسکین ہو جاتی۔ وہ اپنی محنت بھول جاتا۔ سمجھتا دنیا ابھی قدردانوں سے خالی نہیں ہو گئی۔ اہل زر نہیں، اہل نظر تو ہیں۔ صاحب کمال کے لئے یہی بہت کچھ ہے۔ مگر یہاں وہ بھی نہ تھا۔ ٹھاکر سنگھ کے دل میں آیا۔ کہ تصویر اٹھا لوں اور کہوں۔ جناب! میں آپ کے ہاتھ تصویر نہ بیچوں گا۔ اگر آپ کو میرے آرٹ کی پرواہ نہیں۔ تو مجھے بھی آپ کے روپوں کی پرواہ نہیں۔ مگر پھر گھر کا اور گجری کی افسوسناک حالت کا منظر آنکھوں تلے پھر گیا۔ ضرورت نے غیرت کا گلا گھونٹ دیا۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ ذرا دیکھ تو لیجئے"۔

ایڈیٹر۔ "صبح دیکھوں گا۔ اس وقت رہنے دیجئے"۔

ٹھاکر سنگھ "نہایت عمدہ بنی ہے۔ آپ بے حد پسند کریں گے"۔

ایڈیٹر "یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ جس چیز کو ہاتھ لگائیں گے وہی خوبصورت بن جائے گی۔ خوبصورتی تو آپ کے ہاتھ کا میل ہے۔"

ٹھاکر سنگھ۔ (شرما کر) آپ تو مجھے بنانے لگے۔

ایڈیٹر "جی نہیں۔ میرا حقیقت میں یہی خیال ہے"۔

ٹھاکر سنگھ "پورے تین دن میں تیار ہوئی ہے"۔

ایڈیٹر "آپ چاہتے تو ایک دن میں بنا لیتے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے آپ جم کر بیٹھ جاتے۔ تو تین چار گھنٹوں سے زیادہ کا کام نہ تھا"۔

ٹھاکر سنگھ "یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ ورنہ اچھی چیز اچھا وقت کھائے بغیر جوان نہیں ہوتی"۔

ایڈیٹر "ارے! آپ تو شعر بھی کہنے لگے"۔

ٹھاکر سنگھ۔ (مسکرا کر) آپ کی نگاہ کرم ہو گی تو شعر بھی کہنے لگوں گا۔ (ذرا دیر چپ رہنے کے بعد) تو اب اجازت دیجئے"۔

ایڈیٹر۔ بہت اچھا۔ پھر کسی دن تشریف لائیے گا۔ آپ اور تصویر تیار کرائی ہے"؟

ٹھاکر سنگھ "کہئے کل ہی چلا آؤں (ہچکچا کر) اور اس تصویر کے روپے"!

ایڈیٹر۔ (ہنس کر) "اتنی جلدی"!

ٹھاکر سنگھ "صاحب! کیا عرض کروں! ہاتھ بہت تنگ ہے"!

ایڈیٹر "تو دو چار دن تک منگوا لیجئے گا"۔

ٹھاکر سنگھ "اجی صاحب! اس قدر بھی ظلم نہ کیجئے گا۔ بڑی آس لے کر آیا ہوں۔ اسی وقت دلوا دیجئے"؟

ایڈیٹر۔ (کرسی سے اٹھ کر) "دو چار دن سے پیشتر تو کسی صورت نہ دے سکوں گا"۔

ٹھاکر سنگھ "تو اس وقت، پانچ روپے ہی دلوا دیجئے"۔

ایڈیٹر۔ (مسکرا کر) اس وقت پانچ پیسے بھی نہ مل سکیں گے"۔

ٹھاکر سنگھ "لیکن آپ نے تو کہا تھا۔ تصویر بنا کر لاؤ۔ روپے فوراً مل جائیں گے"!

ایڈیٹر "معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں چور سمجھ رہے ہیں۔ جو آپ کی تصویر لے کر روپوش ہو جائیں گے۔ یہاں چھ چھ مہینے تک بل پڑے رہتے ہیں۔ کوئی ایک مرتبہ بھی تقاضا نہیں کرتے۔ آپ آتے ہی سر ہو گئے"۔

ٹھاکر سنگھ "ان کے پاس [illegible]

ہاں مزدوری کرتے ہیں۔ جو آتا ہے۔ کھا لیتے ہیں۔

ایڈیٹر" آپ تو ہنسے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ ایک مرتبہ کہہ دیا۔ اس وقت روپے نہیں ہیں۔ معاف کرو۔ مگر جناب اپنی ہی کہے جاتے ہیں"

اب ٹھاکر سنگھ بھی تیز ہو گیا۔ بولا" اگر آپ کے پاس روپے نہ تھے۔ تو آپ نے کام کیوں کرایا۔ میں کوئی دوسرا کام کر لیتا"

ایڈیٹر صاحب۔ سناٹے میں آ گئے۔ سوچنے لگے یہ شخص کتنا اوچھا ہے؛ کس قدر رذیل؛ اسے میری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بولے" آپ اپنی تصویر لے جائیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں"

ٹھاکر سنگھ نے حیران ہو کر کہا" آپ نے تو خود کہہ کر بنوائی ہے"

ایڈیٹر" مگر جناب مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ آپ ایسی بے معنی اور لغو تصویر بنا لائیں گے۔ اس سے عمدہ تصویر تو اسکول کے طالب علم بنا سکتے ہیں۔ اور مجھے تو شبہ ہے۔ کہ یہ بھی آپ کے کسی شاگرد کی بنی ہوئی ہے۔ آپ کی نہیں چلے ہیں ہمیں جھکمہ دینے۔ لیکن جناب ہم بھی ہاتھ پہچانتے ہیں۔ ہاتھ!"

ٹھاکر سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" لیکن تصویر تو آپ نے ابھی تک دیکھی ہی نہیں"

ایڈیٹر" آتے ہی دیکھ لی۔ مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ رسالہ میں چھاپ دوں۔ تو لوگ کہیں۔ ایڈیٹر پاگل ہو گیا ہے"

ٹھاکر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تصویر لے کر چپ چاپ باہر چلا آیا۔ تو دل میں پچھتاتا تھا۔ کہ ناحق بات بڑھائی۔ آج روپے نہ ملے۔ کل پرسوں مل جاتے۔ اب وہ بھی گئے۔ تصویر ان کی ہے۔ دوسرا کوئی شخص اس کے لئے پیسہ بھی نہ دیگا۔ ٹھاکر سنگھ چاہتا تھا۔ ایڈیٹر واپس بلا کر تصویر مانگ لے۔ تو چپ چاپ دے دوں۔ ذرا بھی عذر نہ کروں۔ مگر وہ دور نکل آیا۔ اور اُسے کسی نے بھی نہ بُلایا۔

اب چاروں طرف نا اُمیدی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ بہت سوچتا تھا۔ مگر کوئی آدمی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو اس وقت امداد دے۔ گھر جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ گجری کیا کہے گی؟ آج کرواچوتھ کا برت ہے۔ ہندو عورتیں چاند کو ارگھ دے کر مٹھائی اور پھل کھائیں گی۔ ہمارے گھر میں آٹا بھی نہیں ہے۔ بدقسمتی تو دیکھو۔ کٹڑیوں کے سوائے سب کچھ ختم ہو گیا۔ ٹھاکر سنگھ شہر سے باہر جا کر ایک کھلے میدان میں بیٹھ گیا۔ اور اپنی کم نصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کبھی سوچتا۔ دریا میں ڈوب مروں۔ اس زندگی سے موت ہی بھلی۔ کبھی خیال آتا۔ سادھو ہو جاؤں۔ گجری باپ کے پاس چلی جائیگی چار دن یاد کر کے رو لے گی۔ پھر ہمیشہ کے لئے بھول جائے گی۔ مگر اس میں بس کے لئے بھی ہمت نہ تھی۔

آخر وہ اُٹھا اور شہر کی طرف روانہ ہؤا۔ جیسے کوئی شخص بھیک مانگنے جا رہا ہو۔ پہلے دھیرے دھیرے چلا پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اُمید کے قریب پہنچکر ہم بیتاب ہو جاتے ہیں۔ ہم میں انتظار کا صبر نہیں رہتا۔ اب ٹھاکر سنگھ کو ایک دوست کا خیال آ گیا تھا۔ شاید اس نا اُمیدی کے وقت میں وہی کام آ جائے!

(۴)

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ کرواچوتھ کا چاند نکلنے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ ہر مکان پر عورتیں کھڑی تھیں۔ بے چین اور مضطرب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کہ چاند نکلا ہے یا نہیں جو کمسن تھیں۔ وہ کہتی تھیں چاند کو بھی آج ہی دیر لینا تھا۔ پہلے تو اتنی دیر کبھی نہ ہوتی تھی۔ جو بڑی بوڑھی تھیں وہ اُنہیں تسلی دیتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ ذرا اور صبر کرو۔

لیکن گجری اپنے تاریک کمرے میں اوندھے منہ لیٹی تھی۔ وہ چاند کا کیا انتظار کرتی۔ اُس کے پاس ارگھ دینے کو کچی لسی بھی نہ تھی۔ نہ برت کھولنے کو روٹی کا ٹکڑا تھا۔ مایوس ہو کر لیٹی تھی۔ اور قسمت کو گالیاں دیتی تھی۔ اتنے میں ٹھاکر سنگھ نے آکر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور پیار سے کہا" لو اُٹھو! چاند نکل آیا ہے چل کر ارگھ دے لو۔ لسی اور گنڈیریاں نہیں نہ سہی۔ ٹھنڈا پانی تو ہے۔ چاند دیوتا کچھ کھانا پینا تھوڑا ہے۔ دل کی عقیدت دیکھتا ہے۔ اور اُس کی تمہارے پاس کمی نہیں"

گجری چپ چاپ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اتنا بھی نہ پوچھا۔ کہ تصویر کے دام ملے یا نہیں۔ سمجھ گئی۔ نہ ملے ہوں گے۔ مل جاتے تو ناچتے ہوئے آتے۔ بیدلی سے خاوند کے ساتھ اوپر چلی گئی۔ اور مُنہ ہاتھ دھو کر بولی" شُدھ جل کا لوٹا منگوا دو تو ارگھ دے لوں"

ٹھاکر سنگھ" وہ دیکھو! پانی کا لوٹا چوکی پر دھرا ہے۔ جاکر اُٹھا لاؤ"

گجری نے چوکی کے پاس جا کر لوٹے میں پانی کی بجائے دُودھ کی کچی لسی دیکھی۔ تو چونک پڑی۔ جیسے چلتے ہوئے صحرا میں کسی نیم جان مُسافر کو بڑھ کا سرد اور سرور بخش سایہ مل جائے۔ چمک کر بولی۔ تم نے مجھے سخت دھوکا دیا۔ پہلے کیوں نہ کہہ دیا۔ (اور چیزیں دیکھکر) ارے! یہ تو بہت کچھ ہے۔ کیا کیا لے آئے ہو؟

ٹھاکر سنگھ" پہلے ارگھ دے لو۔ بعد میں باتیں کریں گے"

گجری" کیسے چھوٹے آدمی ہیں۔ کہتے تھے پانی ہی سے ارگھ دے لو"

ٹھاکر سنگھ (مسکرا کر) مگر اب تو چاول اور گنڈیریاں ہیں"

گجری نے لسی، چاول اور گنڈیریوں سے چاند کو ارگھ دیا۔ اور دونو ہاتھ باندھ کر صدق دل سے شوہر کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کی۔ اس وقت

اُسے چاند مُسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے اُسے آشیرباد دے رہا ہے۔ جیسے اُس سے کہ رہا ہے۔ تم تو ناحق گھبرا رہی تھیں۔ اب گجری کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ہوا میں تیر رہی ہے۔ اُس کے مُنہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ گجری روکتی تھی۔ مگر ہنسی رُکتی نہ تھی۔ ارگھ دینے کے بعد وہ اٹھلاتی ہوئی اپنے مسرور شوہر کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اور بولی "کہو کیا کیا چیزیں لائے؟"

ٹھاکر سنگھ نے مٹھائی کی ٹوکری گجری کے سامنے رکھ دی اور کہا "نمبر ایک"

گجری نے مٹھائی دیکھی تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ تاہم تحمل سے بولی "اتنی کیوں لے آئے؟ دو روپے سے کم کی نہ ہوگی"

ٹھاکر سنگھ "ایک روپے کی تو تنہا میں ہی کھا جاتا۔ اور عجب نہیں اِس سے بھی زیادہ کھا جاؤں۔ کل سے بھوکا ہوں۔ اور کیا۔ دیکھنا کیسے بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارتا ہوں۔ صرف اجازت کی دیر ہے"

گجری (مسکرا کر) اچھا اور کیا لائے؟"

ٹھاکر سنگھ نے پھلوں کی ٹوکری آگے بڑھا کر جواب دیا "نمبر دو"

گجری نے دیکھا کچھ سیب تھے۔ کچھ انار۔ آدھ سیر کے قریب انگور۔ ایک سردا۔ گجری کی طبیعت ہری ہوگئی۔ ادائے بیخودی سے جھومتی ہوئی بولی "اب معلوم ہوا۔ آج کرواچوتھ کا دن ہے"

ٹھاکر سنگھ نے جیب سے ایک بنڈل نکال کر کھولا۔ اِس میں ایک ریشمی ساڑھی تھی۔ گجری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ٹھاکر سنگھ نے کسی مداری کی مانند کہا۔ "نمبر تین"

گجری نے اپنا نازنین سر ٹھاکر سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں موند لیں۔ خوشی کا یہ عالم تھا۔ کہ مُنہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی۔ تمام دن کی پریشانی آنِ واحد میں رفع ہوگئی۔ ٹھاکر سنگھ نے اُس پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب بھی خوش ہوئی یا نہیں"

گجری "زبان سے کیا کہوں۔ میرا چہرہ دیکھ لو" یہ کہہ کر اُس نے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے لگی۔

ٹھاکر سنگھ نے گجری کا مُنہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا "لو اب ہمارا بھی چاند نکل آیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ جانتی ہو کیا کہتا ہے؟"

گجری۔ (شرارت سے) میری طرف دیکھتے رہو"

ٹھاکر سنگھ "نہیں نہیں نہیں۔ کہتا ہے۔ مجھے ارگھ دے لو"

یہ کہتے کہتے ٹھاکر سنگھ نے ایک پیڑا اٹھایا اور گجری کے مُنہ میں دیدیا۔ گجری انکار کرتی ہی رہ گئی۔ لیکن ٹھاکر سنگھ نے ایک نہ سُنی۔ کہا "تم نے اپنے چاند کو ارگھ دیا کہ نہیں۔ ہم اپنے چاند کو ارگھ دیئے بغیر مُنہ جھوٹا کیسے کرلیں؟"

گجری نے بھی ایک پیڑا خاوند کے منہ میں دے دیا۔ دونو خاوند بیوی کھانے لگے۔

اتنے میں نیتر کتھ نے اوپر آکر کہا "میاں یعقوب کا آدمی میں روپے دے گیا ہے"

ٹھاکر سنگھ کا چہرہ اور بھی چمکنے لگا۔ گجری نے نیتر کتھ کے ہاتھ سے روپے لے کر کہا "پہلے مل جاتے تو ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی"

ٹھاکر سنگھ "اُس حالت میں یہ چیزیں اتنی میٹھی کبھی نہ لگتیں۔

گجری۔ (سنجیدگی سے) "یہ تو آپ نے سچ کہا۔ اِس وقت اِن کا ذائقہ ہی اور ہے"

معاً کسی نے نیچے سے آواز دی۔ نیتر کتھ نے پوچھا "کون ہے؟"

"ذرا سردار صاحب کو بھیج دیجئے"

گجری نے مُنہ بنا کر کہا "یہ اِس وقت کون آگیا۔ بیٹھے رہیئے۔ لوگ ذرا بیٹھنے بھی تو نہیں دیتے"

ٹھاکر سنگھ (ہنس کر) "گھبراتی کیوں ہو۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔ دلّی تو نہیں جا رہا۔ ابھی ایک منٹ میں آیا"

گجری "اِس وقت ایک منٹ بھی ایک گھنٹے سے کم نہیں"

ٹھاکر سنگھ نیچے چلا گیا۔ لوٹا۔ تو چہرہ مسرت کے نور سے درخشاں تھا۔ گجری نے پوچھا۔ "کون تھا؟"

ٹھاکر سنگھ "دیوان ہرجس رائے کا آدمی تھا"

گجری "کون ہرجس رائے؟ وہی تو نہیں جو آج دوپہر کو آیا تھا؟"

ٹھاکر سنگھ "بس بس وہی۔ اُسی نے تصویر کے لئے پیشگی روپیہ بھیجا ہے"

گجری کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ جلدی سے ٹھاکر سنگھ کے پاس آکر بولی "کتنا روپیہ بھیجا"

ٹھاکر سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر جواب دیا "صرف اڑھائی سو روپیہ"

گجری کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ بولی "جھوٹ تو نہیں بول رہے آپ؟"

ٹھاکر سنگھ "جھوٹ بولوں گا۔ تو میرا یہ جمعدار مجھ سے ناراض نہ ہو جائے گا۔ یہ لو ڈھائی سو کا چیک رہا"

گجری چیک اور ریشمی ساڑھی لیکر جلدی جلدی نیچے اُتر گئی۔ ٹھاکر سنگھ بھی مسکراتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

سدرشن

دیہات کی صبح

جگمگا اُٹھا وفورِ نور سے ایوانِ صبح
چہچہاتے ہیں درختوں پر بہم مرغانِ صبح

باغ میں پتوں کو آ کر گدگداتی ہے صبا
خواب سے منہ بند کلیوں کو جگاتی ہے صبا

روشنی ہی روشنی حدِ نظر تک چھا گئی
رات کے جاگے ہوئے کتوں کو بھی نیند آ گئی

آ رہی ہے کان میں چکی کی گھر گھر کی صدا
ہے فضا میں منتشر اللہ اکبر کی صدا

ننھے بچے کروٹیں لیتے ہوئے سو کر اُٹھے
اُٹھے لیکن بادلِ ناخواستہ رو کر اُٹھے

لے رہا ہے اس طرح حقے کے تکیہ دار کش
ہر دفعہ کھنکارنے کے بعد ہیں دو چار کش

پھیل کر ہر سمت حقے کا دھواں اُڑنے لگا
آسماں کے نیچے اک اور آسماں اُڑنے لگا

چھیڑتے ہیں نیند کے ماتوں کو آ کر فقیر
پیٹ کی خاطر مرے جاتے ہیں گا گا کر فقیر

اُٹھتے ہی کھیتوں کی جانب چودھری لمبے ہوئے
ہاتھ منہ دھویا ذرا سی چھاچھ پی لمبے ہوئے

وہ جنہیں کچھ ہیر کا حصہ زبانی یاد ہے
اُن کی پُرتاثیر تانوں سے فضا آباد ہے

ق

موجۂ گل کی طرح اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
لاکھ شوخی اور نزاکت سے قدم دھرتی ہوئی

صاف ململ کے دوپٹوں سے چھپائے جسم کو
اپنوں غیروں کی نگاہوں سے بچائے جسم کو

گھر کا دُکھڑا سا کھنوں سے راہ میں روتی ہوئی
مندروں کھیتوں گھروں کے پاس سے ہوتی ہوئی

راہ کی پگڈنڈیوں کے ساتھ ہی بکھرتی ہوئی
کھیلتی ہنستی ہنساتی چھیڑتی کرتی ہوئی

جا رہی ہیں دھوبیاں اشنان کرنے کے لئے
ہاتھ منہ دھونے نہانے اور نکھرنے کے لئے

میلے کپڑوں کی بہت سی گٹھڑیاں لادے ہوئے
اپنے اپنے بیل پر رختِ گراں لادے ہوئے

جا رہا ہے مختصر سا دھوبیوں کا قافلہ
اپنی نوعیت میں ہے یہ بھی انوکھا قافلہ

خوبصورت گھنگھرو ہر بیل کی گردن میں ہیں
وہ جو آغازِ سفر سے حالتِ شیون میں ہیں؟

انکی ٹن ٹن (جس سے کوئی گوش نامحرم نہیں)
سونے والوں کے لئے شورِ جرس سے کم نہیں

جس گلی سے جس محلے سے گذر جاتے ہیں یہ
نیند کے ماتوں کو بس بیدار کر جاتے ہیں یہ

آج بھی کل کی طرح دو چار کتے ساتھ ہیں
پہرہ دینے والے جو بیدار کتے ساتھ ہیں

اور کتوں کی طرح لڑنے کے یہ عادی نہیں
اس لئے کوئی مسافران کا فریادی نہیں

دیکھتے ہیں اس طرح حیرت سے ہر راہگیر کو
جس طرح اک کم سمجھ بچہ کسی تصویر کو

فاخرہ بیابانوی بی۔اے

پرنس بسمارک

فریڈرک اعظم سے پہلے پرشیا کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ جرمنی کی ریاستوں میں بلحاظ رقبہ یہ سب سے بڑا تھا۔ دوسرے جرمن شہزادوں کی طرح اس کے حکمران بھی الیکٹر یعنی منتخب کنندہ کہلاتے تھے۔ اور معمول کے مطابق تاجداران آسٹریا کو سلطنت جرمنی کا شہنشاہ منتخب کر لیا کرتے تھے۔ فریڈرک اعظم پہلا جرمن حکمران تھا جس کے دل میں پرشیا کو ایک خود مختار طاقت بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس میں وہ اپنی ہمت اور قابلیت کی بدولت کامیاب ہو گیا۔ اور پرشیا کا شمار یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں میں ہونے لگا۔ اس کے بعد آسٹریا اور پرشیا کے درمیان اس بات پر جدوجہد شروع ہو گئیں کہ جرمن ریاستوں پر اقتدار کا حقدار دونوں میں سے کون ہے۔ اس طرح سے فریڈرک اعظم کا عروج درحقیقت اس تحریک کا آغاز تھا۔ کہ جرمن ریاستوں پر مشتمل ایک ایسی سلطنت قائم کی جائے۔ جو پرشیا کے زیر قیادت ہو۔

جن لوگوں نے وسطی زمانے کے یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں ایسی تحریکوں کا کامیاب ہونا کس قدر مشکل تھا۔ اور آزادی کے علمبردار خود ان لوگوں کے ہاتھوں کیسی کیسی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ جن کو آزاد کرانا مقصود ہوتا تھا۔ مذہب کی طرح سیاسیات میں بھی عوام کا رجحان قدامت پسندی کی طرف تھا۔ رعایا کی اسی قدامت پسندی سے فائدہ اٹھا کر یورپ کے موروثی تاجداروں نے نپولین اعظم کے خلاف "مقدس اتحاد" قائم کر لیا۔ اور انجام کار اُسے فرانس کے تخت سے محروم کر دیا جس پر نہ صرف میدان جنگ کی لاثانی فتوحات سے بلکہ جمہور کی متفقہ رضامندی سے بھی اُس کا حق ثابت ہو چکا تھا۔ بہرحال جس عمارت کی بنیاد اٹھارھویں صدی میں فریڈرک اعظم کے ہاتھوں پڑی تھی۔ وہ انیسویں صدی میں بسمارک کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ فریڈرک اعظم کا مقصد پرشیا کو ایک ایسی طاقت بنانا تو ضرور تھا جس کو دوست امید کی نگاہوں سے اور دشمن خوف کی نگاہوں سے دیکھیں مگر پرشیا کے زیر قیادت جرمن سلطنت کے قیام کا خیال اس مقصد کی تکمیل کا قدرتی نتیجہ تھا۔ فریڈرک اعظم کے اپنے ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ خیال فریڈرک اعظم کے بعد آسٹریا اور پرشیا کے مابین بنائے رقابت بنا رہا۔ لیکن یہ صحیح تر ہے کہ اس کو عملی صورت میں لانے کی توفیق بسمارک سے پہلے پرشیا کے کسی حکمران یا مدبر کو نہ ہوئی اس طرح سے معزول قیصر کے الفاظ میں سلطنت جرمنی کا بانی درحقیقت بسمارک ہی تھا۔ جس کے سوانح حیات اس مضمون کا موضوع ہیں۔

خاندانی حالات

بسمارک کا خاندان چودھویں صدی سے پرشیا کے طبقہ اراضی داران سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس خاندان کے افراد حکومت ملک کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے ہیں۔ بسمارک کا باپ رسالہ میں کپتان تھا۔ مگر نوجوانی ہی میں ریٹائر ہو گیا۔ اس کی ماں شاہ پرشیا کے کیبنٹ سیکرٹری مینکن کی لڑکی اور قابل تفسیر کیرکٹر کی مالک تھی۔ اس طرح سے وہ نجیب الطرفین تھا۔ اس کا باپ ۱۸۴۵ء میں فوت ہو گیا۔ ماں اس سے پہلے ۱۸۳۹ء میں عالم جاودانی کو سدھار گئی تھی۔ اُس نے برلن کی اعلیٰ سوسائٹی میں پرورش اور تربیت پائی تھی۔ اس لئے وہ اپنی اولاد کی مناسب تربیت پر کبھی بڑی توجہ صرف کرتی تھی۔ بسمارک کے کئی بھائی تھے۔ لیکن برن ہارڈ کے سوا جو ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۳ء تک بقید حیات رہا۔ باقی سب بچپن میں مر گئے تھے۔ بسمارک کی ایک بہن بھی تھی۔ جس کا نام مالونیا تھا۔ وہ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئی۔ اور ۱۸۴۴ء میں آسکر فان ارنم سے اُس کا عقد کر دیا گیا۔

پیدائش تعلیم و تربیت اور ابتدائی ملازمت

بسمارک یکم اپریل ۱۸۱۵ء کو بمقام سکون ہاسن پیدا ہوا۔ جو صوبہ برانڈن برگ میں واقع ہے۔ اس کا پورا نام آٹو ایڈورڈ لیوپولڈ فان بسمارک تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ پہلے برلن کے ایک پرائیویٹ اسکول میں تعلیم پاتا رہا۔ پھر کراڈ کلوسٹر (گرے فرائرس) کے جمنیزیم میں داخل ہو گیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں گوٹنگن چلا گیا اور ایک سال سے زیادہ وہاں کی یونیورسٹی میں رہا۔ اس نے تعلیم کی تکمیل برلن میں کی۔ ۱۸۳۵ء میں سرکاری ملازمت کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ اس کو تعلیم سیاسی ملازمت کی ضروریات کے مطابق دلائی گئی تھی۔ مگر وہ چند ماہ تک ایکسلا چیپل میں انتظامی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد اُس کی خدمات عدالتی صیغہ میں منتقل کر دی گئیں۔ لیکن اس میں نہ تو ضابطہ کا پابند رہنے کی عادت تھی۔ نہ اُسے باقاعدگی سے کچھ اُنس تھا۔ چونکہ ایک سرکاری ملازم میں

ن دونوں باتوں کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اس لئے وہ ملازمت سے جلد ہی بیزار ہو گیا۔ ۱۸۳۹ء میں جب اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ تو اُس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر پومرنیا کی خاندانی جاگیروں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں اس کے باپ کا ستارہ گردش میں تھا۔ کیونکہ اُسے بہت سی جاگیریں جو سکون ہاسن سے ملحق تھیں۔ فروخت کرنی پڑیں۔ ۱۸۴۴ء میں اپنی بہن کی شادی کے بعد وہ سکون ہاسن میں باپ کے پاس جا کر مقیم ہو گیا۔ ۱۸۴۶ء میں اسے ان بندھوں کا نگران افسر مقرر کیا گیا۔ جو دریائے ایلب کے نواحی علاقہ کو طغیانی سے محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کئے گئے۔ اس زمانہ میں اس نے فرانس، انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کا بھی سفر کیا۔

سیاسی زندگی اور سفارتی خدمات

۱۸۴۷ء میں بسمارک نے جوہانا نام ایک عالی خاندان لڑکی سے شادی کی اور اسی سال سے وہ پبلک یا سیاسی زندگی کے میدان میں داخل ہوا۔ سیاسی عقیدہ کے لحاظ سے پکا کنزرویٹو یعنی قدامت پسند تھا۔ اگرچہ شروع میں مال کے وسیع مطالعہ اور اپنی نکتہ چین فطرت کے باعث اس کا رجحان ایک مرتبہ لبرل یعنی آزاد خیال طبقہ کی طرف ہو گیا تھا۔ لیکن فریڈرک ولیم چہارم کے ابتدائی عہد حکومت سے جو مذہبی بیداری ہوئی اُس سے وہ بہت متاثر ہوا اور اُس کی رائے میں بھاری تبدیلی آ گئی۔ ہمسایہ دیہاتی شرفا کی صحبت کے اثر سے وہ ان اصولوں کا زبردست حامی ہو گیا۔ اور عمر بھر انہی اصولوں کا ممتاز ترین علم بردار رہا۔ جن پر شاہی حکومت کے خیال کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے مذہبی اعتقادات جوہانا کے ساتھ شادی ہونے سے اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئے۔ اُس کی سیاسی زندگی کا آغاز اسٹیٹس جنرل[1] کے ممبر کی حیثیت سے ہوا۔ جس میں وہ اپنے ضلع کے امیر طبقہ شرفا کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔

اس سال یعنی ۱۸۴۷ء میں اسٹیٹس جنرل کا اجلاس برلن میں مدعو کیا گیا تھا۔ اسٹیٹس جنرل کی شمولیت کا پہلا موقع تھا جب کہ اس نے پبلک طور پر اپنے سیاسی عقاید کا اظہار کیا۔ وہ بادشاہ کے انتہا پسند حامیوں کی صف میں بیٹھا اور اس نے برلن کے مقابلہ میں بادشاہ اور عیسائی بادشاہت کے حقوق کی حمایت ایسی قابلیت کے ساتھ اور ایسے زوردار الفاظ میں کی کہ موافق و مخالف سب اس کی قوت استدلال کا لوہا ماننے لگے۔ جب اگلے سال ملک میں انقلاب کی ہوا چلنے لگی۔ تو اُس نے انقلاب پسند پارٹی کے خلاف بادشاہ کی حمایت میں سکون ہاسن کے کسانوں کی ایک عظیم جمعیت کو برلن لانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور جب اسٹیٹس جنرل کے آخری اجلاس میں اس بنا پر شکریہ کا ایڈریس پیش کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔ کہ بادشاہ نے ملک کو دستور آئینی عطا فرمایا ہے۔ تو اُس نے اس تجویز کے خلاف رائے دی۔ بسمارک کی انتہائے شاہ پرستی کا اندازہ اس امر واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس تجویز کی مخالفت میں اسٹیٹس جنرل کے صرف ایک ممبر نے اس کی ہمنوائی کا دم بھرا اور اس تجویز کے خلاف ووٹ دیا۔

انقلابی سال کے دوران میں جو اسمبلیاں مدعو کی گئیں۔ ان میں سے بسمارک کسی کے اجلاس میں بھی شریک نہ ہوا۔ لیکن کنزرویٹو پارٹی کی یونین بنانے میں اس نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور چند اور شاہ پرستوں کے ساتھ مل کر کریوز زیٹنگ نامی اخبار کی بنیاد ڈالی۔ جو یورپ کی جنگ عظیم کے خاتمہ تک شاہ پرست پارٹی کا آرگن رہا۔ نئی پارلیمنٹ میں جس کا انتخاب اوائل ۱۸۴۹ء میں ہوا۔ وہ برانڈن برگ کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ اس پارلیمنٹ میں اس نے انتہائی قدامت پسند پارٹی کے آتش بیاں اور فصیح ترین اسپیکر کی حیثیت سے لازوال شہرت حاصل کر لی۔ پرشیا کے لئے دستور آئینی مرتب کرنے کے سوال پر جو مباحثے ہوئے۔ ان میں وہ نمایاں حصہ لیا اور بڑے زور کے ساتھ شاہی اختیارات کی حمایت کرتا رہا۔ اس کی اس زمانہ کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ بحث کرنے میں بڑا قابل تھا۔ اس کی قوت متخیلہ بہت زبردست تھی اور اس کی دلائل ہمیشہ طبعزاد ہوتی تھیں۔

اس نے جرمن ریاستوں کے متعلق پرشیا کی پالیسی پر جو تقریریں کیں ان کی وجہ سے بادشاہ نے فرینکفورٹ کی پارلیمنٹ میں پرشیا کا نمائندہ مقرر کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۱ء کا ہے۔ اس تقرر کو بادشاہ کی خطرناک دلیری پر محمول کیا گیا۔ کیونکہ بسمارک کو سیاسی معاملات کا عملی تجربہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن اُس نے اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ آٹھ سال تک فرینکفورٹ میں رہا۔ اس دوران میں اسے بڑی بڑی اہم سیاسی مہموں پر مامور کیا گیا۔ مثلاً ۱۸۵۲ء میں اسے وائنا بھیجا گیا۔ اس کے بعد ڈیوک آف آگسٹن برگ کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا اہم کام اس کے سپرد ہوا۔ اس نے ڈیوک کو وہ شرائط منظور کرنے پر مائل کر لیا۔ جن کی رو سے وہ شلسوگ اور ہولسٹین کے متعلق اپنے دعاوی سے دست بردار ہو گیا۔

۱۸۵۷ء میں بادشاہ کی وفات پر کونسل آف ایجنسی مقرر ہوئی۔ تو وزارت میں بھی انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب کی وجہ سے فرینکفورٹ میں پرشیا کا کوئی اور نمائندہ مقرر کیا جائے چنانچہ بسمارک کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ اور شروع ۱۸۵۹ء میں سفیر بنا کر سینٹ پیٹرزبرگ بھیج دیا گیا۔ اس زمانہ میں اس نے زار روس کے ساتھ نہایت اچھے تعلقات پیدا کر لئے۔ زار کی والدہ بھی جو خود ایک

---

[1] پہلے جرمن میں پارلیمنٹ نہیں تھی۔ پارلیمنٹ کی قائم مقام جو کونسل ہوا کرتی تھی۔ اُسے اسٹیٹس جنرل کہتے تھے اس کے اجلاس لگاتار نہیں ہوا کرتے تھے۔ رعایا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اعلیٰ۔ اوسط۔ زیریں ہر طبقے سے ممبر چنے جایا کرتے تھے۔ اور اس کونسل کو جس میں یہ ممبر ہوتا کرتے تھے۔ اسٹیٹس جنرل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ (مترجم)

پشین شہزادی تھی۔ اس پر بے حد التفات کرنے لگی۔ مگر اس کے اپنے ملک کی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وزرا لبرل پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کی رائے کو اس لیئے بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کہ وہ پارلیمنٹری گورنمنٹ کا حامی نہیں تھا۔ رہا پرنس ریجنٹ اس کے شاہانہ جذبات کو اس وجہ سے ٹھیس لگی ہوئی تھی کہ بسمارک اطالوی شہزادوں کے حقوق کو نظرانداز کرکے عوام اٹلی کے ساتھ اتحاد کر لینے کی طرف مائل تھا۔ آخر لبرل وزارت کی ناکامی اور لبرل پارٹی کے ساتھ شاہ ولیم کی کشیدگی سے اس پر اقتدار کا رستہ کھل گیا۔ رُون جو ۱۸۵۹ء میں وزیر جنگ مقرر ہوا اس کا پرانا دوست تھا۔ رُون کے ذریعے وہ برلن کی صورت معاملات سے آگاہ رہنے لگا۔ کئی بار اس کے لئے وزارت میں داخل ہونے کا موقع پیدا ہوا۔ لیکن اس کا تقرر عمل میں نہ آیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی۔ کہ وہ خارجہ معاملات میں مکمل آزادی چاہتا تھا۔ مگر بادشاہ کو اتنی آزادی دینے میں تامل تھا۔

۱۸۶۲ء میں ایک موقع ایسا آیا۔ کہ بادشاہ کے لئے بسمارک کی شرائط مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ پارلیمنٹ پرشیا نے وہ روپیہ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ جو بادشاہ نے فوج کی نئی تنظیم کے لئے طلب کیا تھا۔ مگر بادشاہ اور رُون نے پارلیمنٹ کے فیصلہ کو ٹھکرا دیا۔ اس پر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے مابین جھگڑا خطرناک شکل اختیار کر گیا۔ اس موقع پر بسمارک کو برلن بلا لیا گیا۔ لیکن بادشاہ یہ جاننے کے باوجود کہ صرف بسمارک ہی وہ شخص ہے جو پارلیمنٹ کے ساتھ کامیاب جدوجہد کرنے کی قابلیت اور جرأت رکھتا ہے۔ اب بھی اسے وزیر مقرر کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس لئے اس کو عارضی تجربہ کے طور پر پیرس میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ وہاں اسے شہنشاہ نپولین سوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ جس کے لئے وہ ۱۸۵۶ء سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کے لئے انگلستان بھی گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سفر سے کوئی پولیٹیکل نتائج برآمد نہ ہوئے۔

بسمارک وزیر اعظم کے منصب پر

دریں اثنا بادشاہ اور پارلیمنٹ کی کشیدگی روز بروز بڑھتی گئی۔ آخر ستمبر میں پارلیمنٹ نے بڑی بھاری کثرت رائے سے بجٹ نامنظور کر دیا۔ اب بادشاہ کو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس نے رُون کے مشورے پر بسمارک کو پھر برلن بلا لیا اور وزیر اعظم اور وزیر خارجہ مقرر کر دیا۔

وزارت کے فرائض انجام دینے میں بسمارک کو انتہا درجہ کی پریشان کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو اس کے تقرر ہی کو نفرت آمیز تشویش کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ وہ ایک کٹر قدامت پسند کی شہرت رکھتا تھا۔ اور اس معاملے میں بڑا تند خو مشہور تھا۔ پارلیمنٹ کے ایوان عام کی مخالف پارٹی بڑی بھاری کثرت کی مالک تھی۔ اور باشندگان ملک اس کی پُشت پر تھے۔ اس لئے اس کے تقرر کو بادشاہ کی طرف سے نہ صرف ایوان عام کے نام بلکہ عام باشندگان ملک کے نام بھی ایک چیلنج سمجھا گیا۔ اور اس کے خلاف زور دار ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ دربار کی ایک بارسوخ پارٹی بھی جس میں ملکہ اور ولی عہد تک شامل تھے۔ ایوان عام کی مخالف پارٹی کو نہ صرف راستی پہنچتی تھی۔ بلکہ عملی طور پر اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی تھی۔ پھر تقرر کے بعد بسمارک نے جو پہلی ہی تقریر کی۔ اُس نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس تقریر میں اُس نے بڑی خشونت اور بڑے طمطراق کے ساتھ یہ کہا۔ کہ جرمنی کا سوال دھواں دھار تقریروں اور پارلیمنٹ کے فتووں سے حل نہیں ہوگا۔ بلکہ انسانی خون اور فولادی تلواروں سے ہوگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اِدھر بسمارک نے یہ تقریر کی۔ اِدھر کھلم کھلا پیشگوئی ہونے لگی۔ کہ بسمارک کا اپنا زوال تو چند روز کی بات ہے۔ وہ شاہی حکومت کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا اور اس طرح سے اپنی تند خوئی کے باعث پرشیا میں جمہوری حکومت کے قیام کا موجب ہوگا۔ مگر اس نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ بڑی کامیابی سے کیا۔ چار سال تک وہ بجٹ کے بغیر ہی حکومت کا کام چلاتا رہا۔ اس میں اس نے دستور اساسی کی اس فروگذاشت کا فائدہ اٹھایا۔ کہ اس میں یہ واضح نہیں کیا گیا تھا۔ کہ اگر دونوں ایوانوں کے ساتھ بادشاہ کا اتفاق رائے نہ ہو۔ تو اس صورت میں کیا ہوگا۔ بعض اوقات وزرا اور پارلیمنٹ کا باہمی جھگڑا تلخ ترین قسم کے ذاتی عناد کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ ایک مرتبہ ۱۸۶۳ء میں کشیدگی اس قدر بڑھ گئی۔ کہ وزرا نے پارلیمنٹ کے اجلاسوں ہی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی زمانہ میں بسمارک نے اپنے ایک سیاسی مخالف کو جس کا نام درچو تھا۔ ڈوئل یعنی پستولوں سے آمنے سامنے ہو کر لڑنے کا چیلنج بھی دے دیا۔ یہ بات اور ہے۔ کہ عملی طور پر ڈوئل کی نوبت نہ آئی۔

جون ۱۸۶۳ء میں جونہی کہ پارلیمنٹ کا اجلاس برخاست ہوا۔ بسمارک نے چند آرڈیننس یعنی غیر معمولی قوانین جاری کر دیئے۔ جن کا مقصد پریس کی آزادی پر پابندیاں عائد کرنا تھا۔ یہ آرڈیننس اگرچہ دستور اساسی کے الفاظ کے مطابق تھے۔ مگر سپرٹ کے منافی تھے۔ ان کے اجرا سے بسمارک کے خلاف ناراضگی و نفرت کا طوفان اس قدر زور پکڑ گیا۔ کہ ولی عہد نے بھی جو اس وقت تک بسمارک کا خاموش مخالف تھا۔ پبلک طور پر اپنے باپ کے وزرا کی پالیسی سے اپنی بے تعلقی اور بیزاری کا اعلان کر دیا۔ بسمارک اپنی پوزیشن کو قائم رکھنے کے لئے کلیتہً اس امر کا محتاج تھا۔ کہ اس پر بادشاہ کو اعتماد ہو اس کے مخالف اسے اس اعتماد سے محروم کرنے کے لیئے سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل تھے۔ لیکن بسمارک کو الگ کرنا بادشاہ کے امکان سے باہر تھا۔ کیونکہ اس سے لبرل پارٹی برسر حکومت آ جاتی۔ فوج پر پارلیمنٹ کا کنٹرول قائم ہو جاتا اور غالباً بادشاہ کو بھی تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑتا۔ اس لئے

بادشاہ نہ صرف وفاداری کے ساتھ اس کی حمایت کرتا رہا۔ بلکہ اس کی خارجہ پالیسی میں بھی کبھی دخل انداز نہ ہؤا۔ اس طرح پر بسمارک پارلیمنٹ کی مخالفت اور نکتہ چینی کو آسانی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔ اور بادشاہ اس کی پالیسی پر صاد کرنے کے لئے مجبور تھا۔ کیونکہ یہ پالیسی اس کے اپنے تخت و تاج کی ضامن تھی ؎

سلطنت جرمنی کا پیغام

اوپر بتایا جا چکا ہے۔ کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کا جو تنازعہ انجام کار بسمارک کے تقرر کا موجب ہؤا۔ اس کی ابتدا بادشاہ کے اس مطالبہ سے ہوئی تھی۔ کہ فوج کی نئی تنظیم یعنی پرشیا کی جنگی طاقت بڑھانے کے لئے بہت سا روپیہ منظور کیا جائے۔ اور بسمارک اس امر کے باوجود کہ پارلیمنٹ ہر بار بجٹ نامنظور کر دیتی تھی۔ نہ صرف حکومت کا کام چلانے کے لئے بلکہ جنگی طاقت بڑھانے کے لئے بھی حسب ضرورت روپیہ صرف کرتا رہا۔ اور انجام کار اسی جنگی طاقت کی بدولت وہ اس طوفان مخالفت کو فرو کرنے میں کامیاب ہؤا جو اس کے یوم تقرر سے اس کے خلاف برپا ہو گیا تھا۔ فوج کو زمانہ کی ضروریات کے مطابق منظم اور مسلح کر چکنے کے بعد وہ ملکی فتوحات کی طرف متوجہ ہؤا۔ ہولسٹین اور شلسوگ نامی دو جرمن صوبے ایک عرصہ سے ڈنمارک کے زیر حکومت تھے۔ شاہ فریڈرک ہفتم والئے ڈنمارک کی وفات پر ڈیوک آف آگسٹن برگ نے ان صوبوں کا دعوےٰ کیا۔ اس میں ڈیوک کو عام اہل پرشیا کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ کیونکہ وہ ان جرمن صوبوں کو ایک غیر جرمن قوم کے ماتحت دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر بسمارک کی خواہش یہ تھی۔ کہ اگر یہ صوبے ڈنمارک کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ تو پرشیا کو ملیں۔ اس لئے اس نے ڈیوک کے دعوے کی مخالفت کی۔ اور آسٹریا کو اپنا اتحادی بنا کر ڈنمارک کے خلاف اس بنا پر اعلان جنگ کر دیا۔ کہ حکومت ڈنمارک اپنی جرمن رعایا کو تنگ کرتی ہے۔ ڈنمارک کو شکست ہوئی۔ اور عہدنامہ وائنا کی رو سے یہ دونوں صوبے اتحادیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ مگر جب یہ سوال پیدا ہؤا کہ ان صوبوں کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ تو پرشیا اور آسٹریا کی آپس میں چل گئی۔ آسٹریا یہ چاہتا تھا۔ کہ ان صوبوں کو ڈیوک آف آگسٹن برگ کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر بسمارک ان کو پرشیا میں شامل کر لینے پر تلا ہؤا تھا۔

اس جھگڑے نے یہاں تک طول کھینچا۔ کہ دونوں اتحادیوں میں جنگ ناگزیر نظر آنے لگی۔ لیکن چونکہ بسمارک اس حد تک جانے کو تیار نہیں تھا۔ اور وہ جنگ کے خطرے میں اس وقت تک نہیں پڑنا چاہتا تھا جب تک اسے فتح کا کامل یقین نہ ہو۔ اس لئے ۱۸۶۵ء میں عہدنامہ گسٹین کے ذریعے عارضی طور پر سمجھوتہ ہو گیا۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس نے اٹلی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور پھر نپولین سے یہ وعدہ لیا کہ اگر آسٹریا اور پرشیا کی جنگ چھڑ گئی۔ تو فرانس غیر جانبدار رہے گا۔ روس کو وہ اس سے پہلے پولینڈ کی بغاوت کے معاملہ میں خوش کر چکا تھا۔ اس طرح سے جب اس کو اطمینان ہو گیا۔ کہ اب آسٹریا بے یار و مددگار ہے۔ تو اس نے ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس جنگ کا نتیجہ اس کی خواہشات کے عین مطابق نکلا۔ اور اگرچہ معدودے چند چھوٹی چھوٹی شمالی ریاستوں کے سوا باقی تمام جرمن ریاستوں نے پرشیا کی مخالفت کی۔ مگر بسمارک نے اپنے تمام دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دی اور چند ہفتوں کے اندر اندر سارے جرمنی نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ بسمارک نے نہ صرف ہولسٹین اور شلسوگ کے صوبے پرشیا میں شامل کر لئے۔ بلکہ ہیس کیسل، ہیس ناساؤ کے پورے ضلع اور شہر فرینکفورٹ نیز دریائے ایلب کے ارد گرد کی ریاستوں کا بھی الحاق کر لیا گیا۔ جرمن کی جنوبی ریاستوں کو اس نے پرشیا کے ساتھ ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد میں شریک کر لیا۔ اس طرح سے اس صد سالہ جد و جہد کا خاتمہ ہو گیا۔ جو فریڈرک اعظم کے بعد آسٹریا اور پرشیا کے درمیان اس بات پر ہو رہی تھی۔ کہ جرمنی میں کس کا غلبہ ہونا چاہیئے اگر بسمارک چاہتا۔ تو سارے جرمن کو پرشیا کے ساتھ متحد کر سکتا تھا۔ مگر اس سے ایک تو اندرونی مشکلات پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔ دوسرے یہ خطرہ تھا۔ کہ فرانس کے ساتھ جنگ چھڑ جائیگی۔ اس لئے اس نے کسی بہتر موقع کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ جو اسے چار ہی سال کے بعد حاصل ہو گیا ؎

ان شاندار کامیابیوں سے اس کے پولیٹیکل مخالفوں کا زور ٹوٹ گیا۔ اور عام اہل پرشیا اس کو اپنے ملک کی عظیم ترین ہستی سمجھنے اور اس کی ذات پر فخر کرنے لگے۔ اگرچہ پارلیمنٹ میں انتہائی قدامت پسند پارٹی کی مخالفت جاری ہی رہی لیکن اس نے ماڈریٹ کے لبرلوں کی ایک زبردست پارٹی بنا لی۔ جو اسکی نیشنلسٹ پالیسی کی حمایت کرتی رہی۔ ۱۸۶۶ء سے وہ نیشنل پارٹی کے مخالف کی حیثیت سے بدنام تھا مگر اب اس پارٹی نے اسکو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا ؎

میلارام وفا

فلاکت زدہ موسیقی

میں حیران ہوں اس گرسنہ دنیا میں زیادہ محزون کون ہے؟ مغنی یا سامع؟ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ میں نے اپنے مطالعے کے دریچے کے نزدیک بیٹھ کر اس اندوہ و ملال کا کس قدر نظارہ کیا ہے۔ اس حجرے میں میں نے اپنی عمر کے پندرہ سال گذار دیئے ہیں۔ میں دریچے میں سے باہر صحن میں دیکھتا تھا۔ یہاں تو دن کے تمام مفلوک الحال گویوں اور سائلین کو آنے کی اجازت تھی۔ اور مکان کا مالک رحم دل اور فیاض تھا۔

یہ مبتذل نغمہ دن کے تمام اوقات میں یہاں رونے اور منتیں کرنے کے لئے آتا تھا۔ اور تمام حالات میں۔ کبھی تو اس کی رقت انگیز آواز طلوع آفتاب کے وقت سنائی دیتی۔ اور کبھی شام کے جھٹپٹے میں۔

موت کے بھیانک مردانہ اونچے سر ہوتے تھے۔ جو صبر اور استقلال سے ایک پیسے کے لئے اڑ جاتے۔ اور بارش کی بوچھاڑ سے بھی مسخر نہ ہو سکتے۔ طفلانہ نغموں کی آوازیں بھی ہوتیں۔ جو نہ یہ تو گرتی ہوئی برف اور جذبات انگیز ٹھمریوں کی صداؤں میں دب جاتیں۔ بادل گرجتا۔ بجلی کڑکتی۔ ٹھمریاں خاموش ہو جاتیں اور مغنی اپنی آنکھوں کو برق کی خیرہ کن چمک سے بچانے کے لئے ٹھہر جاتا۔ اکثر بار اگست کے دن کی تابناک تمازت میں جب دیواریں شدت تپش سے تپ جاتیں اور تمام مکان شعلہ بار سموم اور عمیق سکوت میں بے خود سا ہو جاتا۔ ایک شامت زدہ کی آواز اٹھتی لیکن گیت کی آواز انکشاف نمائی کرتی کہ آج دن کچھ کھائے بغیر ہی کٹ گیا ہے۔

آہ کس قدر بوقلموں اور درد انگیز ہیں نغمہ آگیں فلاکت کے یہ دن! افلاکت کے جو گانا شروع کر دیتی ہے۔ ان ایام طفلی سے جو تخلیق الفاظ سے قطعاً قاصر ہوتے ہیں۔ اور گانی ہے۔ پیرانہ سالی کے اس زمانہ تک جو الفاظ پیدا نہیں کر سکتا۔

نقاہت، ناتوانی، زشت روئی، بدبختی اور الم پرستی کا ہر پہلو میرے دریچے کے سامنے آتا۔ ایک پہاڑی سے لیکر جو ایک المناک نزانہ گاتا اس زبان میں جس سے صرف کوہ السپس کی وادیاں آشنا ہیں سسلی کے اس نوجوان مغنی تک جس نے جزیرہ نمائے اطالیہ کی طویل مسافت، تمام راستہ گا تے ہوئے قطع کی ہو۔ میں نے اس کے اولیں سروں پر سر اٹھایا۔ اور ایک نیلگوں خلیج کا منظر جس پر سنگترے کے گھنے درخت چھائے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں پھر گیا۔

غربت، افلاس اور نحوست کے آثار آلات موسیقی ہی سے عیاں تھے۔ سارنگی کی درد آمیز اور تھکی ہوئی چیخ، بے آہنگ پر لطف، سنسان اور ویران آواز بانسری، ڈھیلے تاروں کے تونبے جو تھکے ہوئے ہاتھوں میں بھیک مانگنے کے لئے پکڑے ہوتے تھے۔

کبھی کبھی میں ایک دل آویز لیکن کثرت غنا سے شکستہ آواز سنتا۔ یہ گذشتہ عظمت کا ایک نشان ہوتی۔ اور موسیقی کے شیدائیوں کو دریچے میں کھینچ لاتی۔ اُن کے بُشرے پر تاسف کے جذبات نمایاں ہوتے۔ کہ افسوس ایک نعمت عظمیٰ بداحتیاطی سے ضائع ہو گئی ہے۔

سروں کے اتار چڑھاؤ سے پتہ لگ جاتا تھا۔ کہ یہ تھیٹر یا رقص گاہ کا نغمہ ہے۔ اس کی سرگذشت بتانی آسان تھی۔ رقص گاہ سے قہوہ خانہ۔ اور قہوہ خانے سے میکدہ، میکدے سے در میکدہ، وہاں سے اسپتال اور حیرت فزا بات تو یہ تھی۔ کہ مغنی اس فن سے اب روٹی مانگتا تھا جس نے خوش الحانی کے دنوں میں اس کے لئے ہر قسم کا سامان عیش و طرب مہیا کر دیا تھا۔ اب وہ روٹی مانگتا تھا۔ اب جب کہ بے شمار بے آواز بے سماعت لوگوں نے اسے ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ اُن لوگوں نے جو مذاق موسیقی سے قطعاً ناآشنا تھے۔۔۔ آہ کس قدر دردناک تھا۔ وہ منہ جواب کھلتا تو تھا۔ لیکن اس میں سے اب کوئی گیت نہ نکلتا تھا۔ وہ طفلانہ فریب جو معاوضہ میں کچھ دیئے ہوئے بغیر مانگ کر محبت کے جذبات کے آخری احساس کو مجروح نہ کرنا چاہتا تھا۔

نابینا فقیر بھی آتے۔ اُن کی راہنمائی ان کے رفیق کرتے تھے۔ جو دن کی دھندلی سی جھلک دیکھ سکتے تھے۔ اور یہ دونوں کی بصارت کا کام دیتی تھی۔

بوڑھے مرد بھی ہوتے عورتیں بھی۔ ان کا لباس دہقانی ہوتا۔ اور وہ تیز آوازمیں گاتے تیز چیخ کی سی آواز میں۔ ہمیشہ ایک ہی اکتا دینے والا گیت۔ شاید وہی ایک جو وہ اپنے گاؤں میں گاتے ہوں جسم نحیف و زار چہرے پر نحوست اور پژمردگی کے آثار۔ اور حسرت اور حسرت زدہ نگاہیں ڈالتے ہوئے۔ بچے بھی آتے۔ ننھے ننھے شکستہ لباس میں خوبصورت۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئیں۔ اُن کے دُبلے پتلے جسموں کی تمام قوتیں تخلیق نغمہ کی مساعی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کے کام کرتیں۔ آہ۔ کیا زندگی ہو گی ان ننھے نمائندوں

پرندوں کی۔ جو گاتے تو ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ کیا گاتے ہیں۔ گانے تو دوسرے بچے بھی ہیں۔ لیکن جوش و مسرت و انبساط سے اور یہ بھی گاتے ہیں۔ لیکن ان کا گانا ایک عذاب ہے۔

میں نے سُر کے نغمے سنے ہیں۔ اور ناک کے نغمے۔ ٹوٹے ہوئے سُروں کی طرح غیر مسلسل اور بربط کے مہانے کی طرح مرتعش۔ آوازیں۔ وحشت انگیز آوازیں چیختی ہوئی آوازیں جن پر شاید ہی انسانی آوازوں کا گمان ہو سکے۔ بلند مردانہ عمیق سُر۔ نازک اور لطیف زنانہ سُر۔ ناموزونیت کے احساس سے قطعی معرّا۔ اونچے سُر قطعاً ندارد۔ یا اُن کی جگہ لیے خوفی اور دلیری کے ساتھ نقلی سُر رکھے ہوتے۔ ایک عیار کی سی لیے خوفی اور دلیری کے ساتھ جس کو زعم ہو۔ کہ دھوکا دے کر سزا سے مامون رہ سکتا ہے۔ وہ تمام صدمات انسان کے صوتی اعضا جن کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ وہ تمام جرائم جن کا وہ ارتکاب کر سکتے ہیں۔ یہاں موجود ہوتے۔

کس قدر غیر معمولی ہوتے یہ جذبات اور اصوات کے ٹکڑے۔ رقص گاہوں کے دلآویز نغموں سے لے کر ان دردانگیز صداؤں تک جو سنسان دریچوں کے سامنے بلند کی جاتیں۔

”جناب! کچھ نادر سخاوت! ایک بدبخت پر رحم کرو!“

کس قدر نادر اور خارج از قیاس تھے نغمہ کے حرکات اور الفاظ کی پریشانی اور پامالی جس سے طبیعت پر ایک سائرتی المنام مغنی کی اُلجھی ہوئی تانوں یا جنوں نغمہ کی خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اکثر اوقات کنبے کا کنبہ آ جاتا۔ باپ، ماں اور گھونسلا بھر بچے جو صحن کے بیچ میں کھڑے ہو جاتے۔ اور ایک طوفان زدہ کنبے کی طرح جو جہاز کے شکستہ تختوں پر کھڑا دور کے کسی جہاز کو دیوانہ وار مدد کے لئے پکار رہا ہو! اور اپنے اپنے انداز میں منہ پھیلا کر گاتے۔

مجھے ایک بونا کبڑا یاد ہے۔ جو اپنے قد سے بڑا ابتیل کا پیچ دار نرسنگھا بجاتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس میں دم پھونکتا۔ اس میں ایسی مہیب اور سمع خراش آوازیں نکلتیں۔ جن میں باہم ربط نہ ہوتا۔ پھر وہ کچھ عرصہ کیلئے بالکل خاموش کھڑا رہتا۔ نہ کسی کی طرف دیکھتا اور نہ لفظِ سوال زبان پر لاتا۔ گویا وہ اسے اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے۔ اگر اسے کچھ نہ ملتا۔ وہ چلا جاتا اُس کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی۔ اور اس کی خاموشی سے ایک وقار برستا۔

اور جس نے میری طبیعت پر گہرا اثر کیا۔ وہ ایک بوڑھا تھا۔ اس کی اونچی ٹوپی شکستہ تھی۔ سفید اور لانبے بال شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک ملہم کی سی متانت اور عزم کے ساتھ اپنے خاص انداز میں دو شکستہ اور خمیدہ جھانجیں بجاتا تھا۔ اور ان سے ایسا کریہہ شور پیدا ہوتا جو کھڑکیوں کے شیشوں کے لگاتار ٹوٹنے سے ہوتا ہے۔ جب کبھی اس کا تصور میرے ذہن میں آتا ہے۔ میں اس کی ٹوٹی ہوئی جھانجوں کی آواز برابر سنتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ وہ گردش کا مارا حسرت و یاس کا پیکر بنا سر لٹکائے ہوئے ناکام واپس جا رہا ہے۔

آہ۔ اے بدنصیب موسیقی۔ کس قدر جانگداز ہے تیری قربانی تیرا یہ خاتمہ الہامی فن۔ کبھی اس قدر ویران نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ دن کے چند لمحات میں جب وہ گھر کے اُن مصروف افراد کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ جنہیں اس قدر بھی فرصت نہیں۔ کہ رحم و ہمدردی کے جذبات کا اظہار کر سکیں۔ جب تو ساز اٹھا کر گاتی ہے۔ کفش دوز چمڑہ کوٹنے میں مصروف ہوتا ہے۔ آہنگر آہرن پر ہتھوڑے کی ضرب لگاتا ہے۔ وہ اپنے کام میں وقفہ نہیں ڈال سکتے۔ بلکہ مستعدی اور تعجیل کے ساتھ اس میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کی آوازیں لگاتار آتی ہیں۔ جھکڑے آتے اور جاتے ہیں۔ اور آہ —— تیرے نغمے سبزی فروشوں اور خوانچے والوں کی آوازوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ تیرے اشعار، افسانے حسن و عشق، شمس و قمر، اور جنت کے اشتہار صابن کے بخارات اور گھر کے برتنوں کی جھنکار، بچوں کی چیخ و پکار، ماؤں کی گھرکیوں اور روزانہ زندگی کے مشتریت سوز تفکرات میں کھو جاتے ہیں۔

ایک تھکا ماندہ اور بھوکا مغنی اونچے مردانہ سروں میں بالائی منزل کے دریچے میں لٹکتے ہوئے پرندے کے سامنے گاتا ہے۔ زیریں منزل سے اسے مرغ بریاں کی خوشبو آتی ہے۔ اور جب وہ اپنے ستار کے تاروں کو رگڑتا اور کھرچتا ہے۔ کتے کے رونے کی بھیانک آواز بلند ہوتی ہے۔ لڑکے کھڑے ہو کر اُس کی ہنسی اُڑاتے اور منہ چڑاتے ہیں۔ اور متجسس چہرے جن کے منہ نوالوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ دسترخوان سے اُٹھ کر دریچے میں آ جاتے ہیں۔

آہ۔ کس قدر رقت انگیز تفاوت ہے۔ اور کس قدر تلخ زجر و توبیخ! دل کا ایک کشیدہ تار ستار کی ایک دردانگیز چیخ کے ساتھ جواب دیتا ”روٹی کے لئے ایک پیسہ!“

میرا دل ان تمام ناموزوں غیر آہنگ آوازوں، ان تمام سمع خراش آلاتِ موسیقی پر ایک اضطراب اور بے قراری محسوس کرنے کی بجائے اس فوق الانسان فن کی توصیف میں کھو جاتا ہے۔ جو سہارا ہے۔ اس بے خانماں مخلوق کا جو پیرانہ سالی یا کم سنی کے باعث مشقت نہیں کر سکتی۔ اس پامال شدہ خوش الحانی کی تعریف میں جو فلاکت زدہ نسلِ انسانی کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑہ طلب کرتی ہے۔ وہ ٹکڑہ جس کی طلب بصورت دیگر

ابنائے جنس کی سرد مہری سے اکثر ناکام و نامراد رہتی ہے۔ جو سمع خراشی تو کرتی ہے۔ لیکن بھولے ہوئے ایام کی یاد تازہ کر کے اس کا معاوضہ بھی ادا کر دیتی ہے اور دل میں ان کی ہم آہنگ صداہائے بازگشت کو پھر پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر اوقات موسیقی مصیبت زدہ کے اُن مصائب کو جاننے کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔ جن سے یا تو ہم آشنا نہیں ہوتے یا اپنا رُخ محض اس وجہ سے پھیر لیتے ہیں۔ کہ ان کی فریاد خاموش ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی رات کی خاموشی میں ان ہزارہا نغموں کی آوازیں جن کو میں سالہا سال صحن میں سنتا رہا ہوں۔ ایک پریشان ہجوم بن کر مجھے سنائی دیتی ہیں۔ وہ دریچوں کے شیشوں سے موسیقی کے ایک طوفان کی طرح ٹکراتی ہیں اور ان فلاکت زدہ انسانوں کی شفقہ آواز معلوم ہوتی ہیں جو گردشِ زمانہ کی صلیب پر ٹنگے رہے ہیں۔ جو جیتے ہیں۔ دردو کرب میں اور مرتے ہیں حسرت و یاس میں۔

ایک نابینا اور کم سن لڑکا اپنی باریک اور دلکش آواز میں ایک الم ناک گیت گاتا تھا۔ یہ مصرعہ اس میں لوٹ لوٹ کر آتا ہے۔

"آہ - یہ آواز ہاں پہچانتا ہوں میں اسے"

یہ ایک حرمان نصیب عاشق کی کہانی تھی۔ اس کی محبوبہ مر گئی تھی۔ لیکن اس کی آواز اس کے دل میں ایک متواتر اور مسلسل صدائے بازگشت کی طرح لرزاں تھی۔

کیا اس قلاش اور گداگر مغنی کو بھی جو جو تیار نغمہ اندر بھیج رہا تھا۔ ان جذبات کا احساس تھا۔ جو ایک غیر بھری سامع کے دل میں ماضی کی ایک آواز کی طرح پیدا ہو رہے تھے؟ کیا اُس نے ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کیا۔ کہ پسِ دیوار ایک شخص ہے جو بیٹھا آہیں بھر رہا ہے جس نے جب مغنی کو خاموش ہو جانے اور چلا جانے کے لئے کہا اس کے الفاظ بار بار یاد کئے۔ اور چھپ کر ایک سکہ پھینک دیا۔ تاکہ وہ اپنے گیت کو دُہرائے اور شاید پھر کسی وقت آ کر بھرے ہوئے دل میں ہزارہا آوازوں کے ساتھ اِس مرتعش آواز کی المناک یاد تازہ کر دے۔

"آہ - یہ آواز ہاں پہچانتا ہوں میں اسے"

(ماخوذ) حنیف ہاشمی

نغمے

سُنا اے مُطربِ رنگیں نوا وہ کیف زا نغمے
کہ میرے دل میں حشرِ بے خودی کر دیں بپا نغمے

لبِ دریا ہو اور کیف آفریں ہو چاندنی شب کی
مئے گلرنگ ہو ساقی ہو اور عشرت فزا نغمے

ازل سے نامرادِ عشق ہوں، برباد اُلفت ہوں
کریں گے زندہ دل مجھ سوختہ ساماں کو کیا نغمے

عجب حیرت کدہ ہے ہم نشیں عبرت گہہِ عالم
کہیں دلدوز آہیں ہیں کہیں عشرت فزا نغمے

سکونِ قلب کا باعث ہے کیفِ خود فراموشی
ہے میرا چارہ گر مُطرب مرے غم کی دوا نغمے

سفینہ سینۂ دریا پہ ہے محوِ خرام اختر!
سکوتِ شام ہے اور طائروں کے خوشنوا نغمے

عبدالمجید اختر

کہکشاں

کہکشاں ہے؟ یا فلک پر جادۂ زریں ہے یہ — بحرِ اخضر میں کوئی یا موجِ نور آگیں ہے یہ

یا بساطِ آسمان پر جدول سیمیں ہے یہ — شکل بستہ یا فروغ جلوہ رنگیں ہے یہ

پارہ ہائے نور کا یا آتشیں گلزار ہے
جو فضا زچرخ گرداں سے تجلی بار ہے

روشنی لاکھوں ستاروں کی ہے زیب کہکشان — یہ ضیا بخش نظر ہیں کارواں در کارواں

ظلمت شب کے مٹانے کو ہیں یہ جلوہ کناں — قمقموں سے نور کے روشن ہے ایوان جہاں

بجلیاں سی کوندتی ہیں خرمنِ سیماب میں
یا چراغاں کا ہے عالم نور کے سیلاب میں

کہکشاں سے چشم نظارہ کو ہے حیرت کمال — کتنے اوج چرخ پر تاروں کا پھیلایا ہے جال

قوت ادراک کھولے راز فطرت، ہے محال — پست ہے طبقات نورانی میں پرواز خیال

ہر کرشمہ جس کا پیغام و داع ہوش ہے
وہ چمن آرا حجاب نور میں روپوش ہے

برق دہلوی

نظم پنجابی

(نوٹ)

ذیل میں سردار موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم۔اے لیکچرار پنجاب یونیورسٹی کا مضمون پنجابی شاعری پر درج کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی دوسری قسط میں پنجاب کے بلند پایہ پنجابی شعراء کے بہترین اشعار پیش کئے جائیں گے اور اس طرح پنجابی ادب کا شاہکار اردو عنوان کے سامنے آجائے گا۔ اردو کے شعراء پنجابی شاعری کے اچھوتے، گہرے اور کام کے اشعار اگر اردو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس مفید مضمون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے محترم صاحب مضمون سے یہ شکایت بھی ہے کہ انہوں نے مضمون کی زبان ذرا دشوار فہم بنا دی ہے۔ (ایڈیٹر)

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ ۔۔۔ زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

وہ بھی دن تھے جب جادو نگار شعراء کا موقلم پنجاب کی تصویر میں رنگ بھرا کرتا تھا اور کبھی ایسے بھی لوگ تھے جو خطۂ پنجاب کے بارے میں فخریہ کہتے تھے کہ:۔

مزرعِ حسن و دشتِ محبوبی ۔۔۔ گلشنِ ناز و جنتِ خوبی

از ہوائش کہ روح را جان است ۔۔۔ زندگی زندہ کردۂ آن است

زاں ہوا ہر نفس کہ دید فتوح ۔۔۔ تا ابد زندگی کند بے روح

بردہ آبش گرو ز آبِ حیات ۔۔۔ زہر جا گیر رنجِ مرگ ممات

از زمینش ہر آنچہ رستہ بدوں ۔۔۔ ہمہ حسن است و عشق سوز جنوں

یہاں کے پہاڑوں، دریاؤں اور کنوؤں کی تعریف سپردِ قلم ہوتی تھی اور یہاں کے گیہوں کو شاہدِ ادب اپنا خراج پیش کرتا تھا۔

گندم او کہ رستہ از خاک است ۔۔۔ محشر خوشۂ دل چاک است

پنج دریا چو پنجۂ احساں ۔۔۔ سیلِ سیم و زر است در طغیاں

یہی نہیں، اسی لاہور کے دلدادوں کی اتنی کثرت تھی کہ عاشقانِ یوسف کی گنتی ان کے سامنے ہیچ ہے۔ لاہور اور لاہور کی تنگ گلیاں اور تنگ پوش، گلگوں قبا عشوہ گردوں کے حسن کی ایک جھلک دیکھ کر شہزادہ نواب احمد یار خاں پھڑک ہی تو گئے تھے۔

لیک لاہور مصرِ محبوبی است ۔۔۔ یوسفستانِ عالمِ خوبی است

از صفا لوحِ سینۂ ابرار ۔۔۔ صدقِ جنس و دکانِ ہر بازار

صبحِ صادق کہ مطلعِ نور است ۔۔۔ یکے از کوچہ ہائے لاہور است

خوبرویانِ آں بہشت اورنگ ۔۔۔ ہمہ آدم فریب گندم رنگ

مگر افسوس آج وہ دن ہے کہ اہلِ لاہور پیرس اور لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کی خاک چھانتے ہیں اور ایسے لوگ بکثرت نظر آرہے ہیں، جو ہیر و رانجھا، سسی پنوں، پورن بھرتری کے ذکر کو غیر دلچسپ سمجھتے ہیں۔ نہ پنجاب سے پیار ہے، نہ پنجابی سے محبت۔

ادب کی ترقی کے اصول کو بھولنے والے یاد رکھیں کہ کوئی فرد واحد اپنی مجلسی و قومی تہذیب کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتا کہ انفرادی کمالات اور اجتماعی فتوحات کا صحیح اور مستقل رازدار اور دوسرے یہ آئینہ دار ادب ہے نہ کہ تاریخ کوئی ملک کیا کرتا ہے اور کیا سوچتا ہے۔ اس کا دلفریب اور حقیقت آموز عکس بلند پایہ شاعر کے آئینۂ شعر میں دیکھو۔ یہ کہ بہترین پیشکش جو کوئی انسان یا انسانی جماعت بنی نوع کے عجائب گھر میں بطور یادگار چھوڑ سکتی ہے وہ اپنی مادری زبان میں خاص حالات اور مخصوص ماحول سے متعلق رنگ و بو، نغمہ و صور پر شامل ادبِ لطیف ہی ہے۔

پنجابی زبان اور ادب کی قدامت

جس زبان کے ادب کا ذکر ہو رہا ہے وہ تین سے زیادہ صورتیں اختیار کر چکی ہے اور اس سے مراد تین سے زیادہ بولیاں ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی اس سے قبل سے گیارھویں صدی تک پنجابی سنسکرت پر مبنی ایک ایسی پراکرت کی صورت لئے تھی جو دوسری پراکرتوں سے بہت زیادہ مشابہ تھی غرض زیادہ تر لہجہ اور تلفظ کا تھا۔ گیارھویں صدی سے پندرھویں صدی تک پنجابی نے مسلمان فاتحین کے ذریعے سے فارسی، عربی زبانوں سے نہ صرف بہت سے الفاظ محاورات و مضمون کے تکلفات ہی لئے بلکہ صرف نحو اور تلفظ میں غیروں کا رنگ خاصہ اختیار کیا۔ پندرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک ہندوؤں کی مذہبی تحریکوں کے زیر اثر پنجابی ہندی بولیوں کے قریب تر ہوتی گئی۔ اٹھارھویں صدی کے بعد سے آج تک پنجابی ہندی الاصل اور غیر ہندی زبانوں کی قریب قریب یکساں ممنون منت چلی آئی ہے۔ پس اس زبان کی قدامت ایک ہزار سال سمجھ لینے میں غلطی کا امکان نہیں۔ رہا ادب، بالخصوص نظم کیونکہ نظم اکثر زبانوں کے ادب میں نثر سے بہت پہلے وجود میں آئی ہے۔ سو بہر کیف گورو نانک دیو سے پہلے جن کا پنجابی کلام اچھی خاصی عبارت، تنظیم، ہم بستی، اظہار اور دو

عروض کا حال ہے۔ پنجابی نظم ضرور ایک عرصہ سے ترقی پذیر ہو کر عوام کی ضروریات کو پورا کر رہی ہوگی۔ اگر ہم چودھویں صدی کے آخر میں پنجابی نظم کی پیدائش قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نظم پنجابی کی نوعیت

اگر اہل پنجاب نے نظم سے کم کام لیا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے بیچاروں کو سیف رانی سے فرصت نہ ملی۔ وطن کی حفاظت کرتے رہے اور ولائیتوں کی فوج میں بھرتی ہو کر انہیں دوسرے ملکوں یا صوبوں کی فتح میں مدد دیتے رہے۔ اگر صرف و نحو کے لحاظ سے مضامین کی رنگا رنگی اور الفاظ کی بناوٹ کی رو سے اہل پنجاب کی زبان مخلوط ہے تو اس میں ان کی کیا خطا ہے کونسی قوم یہاں نہیں آئی ہے

اگر اہل پنجاب لڑائی بھڑائی سے فرصت کے وقت میں محبت کی دو راگنیاں چھیڑ بیٹھتے ہیں تو اس میں برائی کی کونسی بات ہے کہ عشق بھی ایک طرح کی جنگ ہے۔ ایک محاربہ کو فتح کیا تو دوسرے میں نصرت حاصل کرنے کے درپے ہوئے۔ اگر نظم پنجابی میں تصوف کا عنصر شروع ہی سے غالب اور ہوس کا ابتدا ہی سے معدوم ہے تو یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ آزاد طبع نبرد آزماؤں کو توہمات اور رسومات میں پھنسنے کی فرصت کہاں؟ انہیں تو خدا پر تکیہ بس ہے۔ اگر ادب پنجابی کی بہترین چیز اس کے میٹھے میٹھے گیت ہیں تو اس کی صاف وجہ ہے کہ اصلی پنجاب دیہات میں بستا ہے اور دیہات والوں کو بناوٹی باتوں اور پیچیدہ قواعد سے سخت نفرت ہے۔ وہ تو سیدھی سادی باتیں کرنی اور تصویریں کھینچنی اور نعرے لگانے جانتے ہیں۔

اردو والوں کو شعر کہنے کی ضرورت پڑی تو انہوں نے فارس سے شاہد، مغ بچہ، بلبل وغیرہ کو منگوا لیا۔ ہندی والوں کو ضرورت محسوس ہوئی تو وہ متھرا چلے گئے۔ پنجابیوں کو وطن سے بے حد محبت ہے۔ انہوں نے یہیں کی خاک سے ہیر رانجھا پیدا کر لئے۔ انہی کو کرشن کا رتبہ دے لیا اور انہی کو اپنے عشق تصوف کا تختہ بنا لیا۔ مرثیے کہنے کے لئے عرب نہیں گئے مذہب کی تبلیغ کے لئے علم الکلام کی تشریحیں نہیں کیں۔ ہیر اور سسی نے وصال پایا، پنجابیوں کو مرثیے لکھنے کا موقعہ مل گیا مذہب پھیلانا تھا عوام میں عوام ہی کی زبان میں کیوں نہ ارشاداتِ نبوی اور احکامِ شرعی کو کہہ سناتے۔ کچھ جنگ ناموں کے لئے ضرور اہلِ پنجاب غیر ملکی بزرگوں کے دست نگر ہوئے مگر تینوں ان کو بھی اپنے رنگ میں ایسا رنگا ہے کہ دید نی ہے۔

ہندو فلسفہ تھا یا سکھ بھگتی، اس کی توضیح کے لئے اسے مقامی!! خاص صداؤں کے ہیرو لئے۔ پورن بھگت۔ حقیقت رائے۔ روپ بسنت راجہ رسالو وغیرہ اپنشدوں کے حقائق کے دریا بہا دئے۔ بھلا جس خاک سے دیدوں کے گانے والے اٹھے گیتا معرضِ وجود میں آئی، جہاں بین الاقوامی میل جول اور بقائے نسل کی مجبوریوں نے میل کر روح کو ہمیشہ ..... بقائے optimism دل کو درد آشنا رکھا، وہاں بلا کی تاثیر والی نظموں کی کیوں کر کمی ہو سکتی ہے۔ اور پھر اچھی چیز کیا اور بہتات کیا۔ اچھا شعر لاکھوں میں ایک ہوتا ہے۔ اردو کے پر گو اور زود نویس شعراء کی کثرت کا کیا کہنا۔ ان کی تصنیف کا شمار طاقت سے باہر ہے۔ مگر واقعی جو نیم پیغمبر ہیں وہ کتنے ہیں۔ وہی نا؟ میر اور درد۔ داغ اور غالب، مہر اور سرور کچھ کہہ لیا۔ اس سے مطلب نہیں۔ کہنے کے پس پشت کرنا بھی ہو۔ شاعری زندگی کا آئینہ ہو اور زندگی شاعری کا ثبوت۔

اگر اس پہلو سے دیکھو گے تو نظم پنجابی میں اردو، ہندی کی ٹکر کے شاعر ضرور پاؤ گے۔ گورو نانک، گورو ارجن، بلھے شاہ، وارث شاہ، مسلم فضل شاہ کالیداس وغیرہ۔

پانچ دور

نظم پنجابی کے چار دور ختم ہو چکے ہیں۔ یہ پانچواں دور ہے۔ پہلے دور میں معرفت اور خدا شناسی کی حکومت تھی۔ دوسرے میں شریعت کا راج تھا تیسرے میں عشق کا سکہ چلا۔ چوتھے میں تاریخ تخت نشین رہی اور اب گیتوں اور چھوٹی نظموں کی جمہوریت ہے۔ یہ نہیں کہ جب ایک برسر اقتدار تھا تو دوسرے دل کے ہاتھ پاؤں شل تھے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ بیشتر ایک ہی کے فرمان کی تعمیل ہوا کرتی تھی۔ اوپر کہیں میں نے یہ لکھا ہے کہ آج جسے پنجابی کہتے ہیں اس سے تین بولیاں عبارت ہے۔ اول لہندی یا پوٹھوہاری۔ دوم وسطی و مشرقی پنجابی۔ سوم پہاڑی جو مختلف پہاڑی علاقوں میں کافی تفاوت رکھتی ہے معرفت اور تاریخ وسطی و مشرقی پنجابی میں ملے گا۔ . . . .

. . . . شریعت اور عشق لہندی میں۔ گیت اور متفرق مضامین تینوں بولیوں میں۔ اس وقت کچھ لوگوں کی مخالفت سے لہندی جو اصلی و قدیمی پنجابی کہلانے کی حقدار ہونے کے علاوہ، فارسی کی شیرینی۔ فصاحت۔ رنگینی۔ امارت کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی قرابت اور عام طور پر تلفظ کی پاکیزگی لئے ہوئے ہے۔ ذرا تھنکاری جا رہی ہے۔ مگر بھلا ہو اہل اسلام کا جنہوں نے ہمیشہ نہ صرف اپنایا ہے بلکہ پورا زور لگا کر اسے بہت سی رفعتوں کا مالک بھی بنایا ہے وہ اب بھی اسے حسبِ معمول مالا مال کرتے چلے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے میں لہندی ہی کے شعراء کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔ منتخبات سے معلوم ہوگا کہ کس قدر لطافت اس کے خزانوں میں بھری پڑی ہے۔

عناصرِ شعر

شعر کا معیار پہلے قائم کر لوں تو بہت مناسب ہے۔ میری نظر میں شعر وہ موسیقیت آمیز بیان ہے جس کو سن کر کسی جذبہ کی صداقت کے یقین کے ساتھ ساتھ سننے والے کے دل میں شاعر کے نظم کئے ہوئے تجربہ کا احساس بھی ہو۔ شاعری کے چار عناصر یہ ہیں، موسیقیت۔ صورت کشی۔ تاثیر اور اشارت روحانی۔ موسیقیت سے شاعر گوش ہوش کو مسحور کرتا ہے۔ صورت کشی سے چشم ظاہر چشم باطن کو۔ تاثیر سے دل پر چوٹ لگاتا ہے اور اشارت و بشارت روحانی سے روح کو عالمِ سفلی سے عالمِ علوی کی جانب لے جاتا ہے۔ اگر آپ کہیں گے کہ تم نے جو عناصر کی بات چھیڑی تو عناصر پانچ ہیں۔ درست لیکن شاعری کی حالت میں پانچواں عنصر اشارۃً مذکور ہو چکا ہے۔ صداقتِ جذبہ و حقیقتِ تجربہ۔ جس جذبہ و تخیل یا تصور کو شاعر نظم کرتا ہے، وہ درحقیقت اس کے اپنے احساس کا جزو بن چکا ہو۔ یہ نہایت ضروری بات ہے۔ اردو شاعری پر میرا سب سے بڑا اعتراض اسی وجہ پر مبنی ہے کہ ہزار میں سے فقط دو چار شاعر ہی اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ جن جذبات کو وہ نظم کرتے ہیں وہ خود ان پر گذری ہوئی حالتوں کا عکس ہیں۔ ورنہ ملنگ "تانگے کی چیز" کو کباڑی کی طرح بیچتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی کباڑی ہے تو کوئی رفوگر۔ کوئی پیوند دوز ہے تو کوئی مرکب ساز یا زاہدان خشک ہیں۔ بالفاظ استاذی مولانا حسرت موہانی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
دل میں سنتے ہی جو اتر جائیں

ہم تو حال کے قائل ہیں محض قال کے نہیں
اربابِ قال حال پہ غالب نہ آ سکے
زاہد سے عاشقوں کی امامت نہ ہو سکی

حال ہو تو زبانِ حال سے جو کچھ کہا جائے گا وہ تاثیر و اثر سے لبریز ہوگا خواہ اس میں عبارت کم ہو اور فصاحت بھی کچھ زیادہ نہ ہو۔

کردی زبانِ شوق نے سب شرحِ آرزو
الفاظ میں اگرچہ صراحت نہ ہو سکی

مضمون سے بے حد محبت ہو۔ دل میں شوق اور جوش ہو۔ پھر خواہ شراب کی خوبی بیان ہو خواہ خرابی۔ بیان میں زور ہوگا اور زبان میں روانی۔ معانی کی گہرائی، مطالب کی بلندی۔ خیال کی وسعت اور تصور کی رنگینی، جذبہ کی صداقت اور احساس کا انضباط سب ہی کچھ موجود پاؤ گے۔ ہ

واعظ تری زبان سے اللہ کی پناہ
کیا کیا بیان کی ہے خرابی شراب کی

خصوصیاتِ عروضی

حریت پسندی اور مردانگی پنجابیوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ غایت درجہ کے مہمان نواز اور صاف گو ہیں۔ برتاؤ کی یکسانیت اور ہمواری ان سے مخصوص ہے۔ نہ پردہ ہے نہ تنگ دلی۔ پھر بھلا یہ خوبیاں ادبِ پنجابی میں کیونکر نہ جلوہ طراز ہوتیں۔ سب سے پہلے میں نے گہرائی اور وسعت کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ کوئی بات اٹھا رکھوں ادبی دنیا کے پڑھنے والوں سے بخل برتنا گناہ ہے۔ سو لیجئے ان خصوصیاتِ عروضی کو بھی سن لیجئے جن کی برکت سے پنجابی شاعر آزادی سے اپنے صحیح جذبات کی اور اپنے سچے ماحول کی مکمل و بالتفصیل ترجمانی کرتا چلا جاتا ہے ردیف و قافیہ کو اپنے غلام سمجھتا ہے نہ کہ آقا (Stanza form) کو دریا کے کنارے سمجھتا ہے نہ کہ مٹی کا کوزہ۔ تلفظ کا بیٹا نہیں باپ ہے۔ قواعد کا وضع کرنے والا ہے نہ کہ ساختہ و پرداختہ۔ فارسی ہے خواہ عربی۔ انگریزی ہے خواہ سنسکرت۔ اپنے سانچے میں اس لفظ اور ترکیب کو ڈھال کر ان سے ترکیبیں حسب ضرورت بناتا چلا جاتا ہے اور اپنی زبان اور اپنے طرزِ بیان کے (Genius) کو سب پر فائق و غالب قرار دیتا دوسروں سے اپنا لوہا منواتا چلا جاتا ہے (اول) زیر و زبر کو زیر و زبر کرنا اس کے لئے گناہ نہیں (دوم) مشدد اور بے تشدید کو مشدد کرنا اس کے لئے کوئی گناہ نہیں (سوم) ہم آواز کو ہم قافیہ قرار دینا اس کے لئے مذموم نہیں۔ (چہارم) (Assonance) سے اسے خاص محبت ہے (پنجم) (Alliteration) پر ہندی بالخصوص برج بھاشا والوں کی طرح بے طرح لٹو نہیں۔ حدِ اعتدال سے تجاوز کو ممنوع سمجھتا ہے (ششم)

۱ے لکھاں میں درد اپنے دا فسانہ سسی پنوں دا قصہ کر بہانہ (غلام رسول)

کوئی قصہ کہانی کہہ کے جاہ اپنی جتانی ہے کسی دن حال دل دھو کے تم کو بھی سنانا ہے (حسرت)

مندرجہ ذیل امثال سسی پنوں از غلام رسول سے لی گئی ہیں۔

۱ے جی لڑکی دھر لیسے نام سسی نجومی طالع دی خبر دسی

نظام الدین خادم حبِ غفور نعنیلت موں ہوا ہو طرف مشہور

۲ے اجل اس جاگھر پے چل آئیوں بھلا کر این دے اک گل سہیوں

۳ے طرح جو پنجابی میں طسرحاں یا طسراں ہے اسے مراں کا ہم قافیہ باندھا ہے (دلیوانہ)

۴ے جہاں گلاں دی آہی لاج تینوں ہوئیوں نی بیٹھا وہ لاچار تینوں

۵ے میں مرداں یاد کر کر سیہن تیرے نرکھیاں کا ندیاں دینین تیرے

۶ے سوئیے جاگ آتا نام دھوبی چلاؤ دیا فواں کارن جامہ کوبی

خوشی سے گھر لیا کھوٹے نہانی
دیکھئے صورت پری لٹا کی ابانی

نہ ایرانیوں سے نشیوۂ بیگانگی روا ہے نہ برج باسیوں سے غیریت بجا ہے جیسا کہ جس کو مفید مطلب پاتا ہے ویسا ہی اسے سمجھ لیتا ہے۔ (ہفتم) حروف جار اور حذف اضافت اور واحد و جمع کے قواعد کی خلاف ورزی اور استعمال علامات کے ساتھ حذف فاعل و مفعول ان سے حسبِ ضرورت کام لے لینا ہے کسی پابندی کو جزو ایمان نہیں سمجھنا۔ (ہشتم) ا، ہ، ی، و کا گرانا اور (Slurring) اور (Combining of Sounds) بکثرت مستعمل ہیں۔

(نہم) بالعموم لفظ اسی تلفظ سے باندھے گا جس سے وہ عوام الناس میں رائج ہے۔ کیونکہ ایک بولی ہونے کی حیثیت سے عوام الناس کے تلفظ کا لفظ ہی پنجابی ہے۔ اصلی تلفظ کے ساتھ وہ لفظ غیر زبان کا سمجھا جائے گا (دہم) اہلِ پنجابی کے لیے جو کچھ انہیں ورثہ میں ملا ہے وہ قابلِ عزت ہے اور استعمال کے قابل اور استعمال کا حقدار۔ متروکات کی بیماری سے پنجابی اب بھی پاک ہے (یازدہم) اول تو اضافت سے فطری مناسبت نہیں۔ اگر کہیں اُسے لے بھی آئے تو وہ کسی زبان کا لفظ ہو۔ جب پنجابی دربار میں داخل ہو گیا تو اضافت کا جُوا اٹھانے سے انکار کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔

۵۷ اپنے عشق سے جل بل گیا جی — کہو اس درد دا دارو کراں کی
خدا جانے جدوں دی جا نہاں نہ — میرے بابل تیرے لڑلائیاں میں
میرا دل چھو کیتا درد تے غم — ترحم یا نبی اللہ ترحم

۵۸ بیگانیاں نال ہے پردیس جانا — نہیں پھر نت اس دیس آنا
اگر مقصود ملسی واہ سعادت — دگرنہ مرگ اس راہ ہوں شہادت

۵۹ کرے خیرات ہر شام و صباحیں — دیوں درویش تے مسکین عاجیں

جو ساکن ہو ضلع بگا شریف است — غلام محی الدین اسم لطیف است
کیا آسماں کو ہے سار ہوئی — کسی جگہ نہیں بلدی ہے دُھوئی
خصوصاً چار یار با صفا کوں — جو تھے ارکانِ دین مصطفےٰ کوں

۶۰ کیتی ہیں پریم سیتی عنایت — ہوئی تعمیل کرنے دی ہدایت
محرم ماہ ہوں سردی دے آثار — گیا سو نبر عقوبیں نخیں سٹھ پہ چار
چلا جذبہ الٰہی نوں گرفتار — بحضرت صاحب کوٹھا کے دربار

موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے

غزل

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے — آدمی کثرتِ انوار سے حیران ہو جائے
ذرّے ذرّے سے ترا حسن نمایاں ہو جائے — اُس کی پروا نہیں نظارہ پریشاں ہو جائے
دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے — کہ مجھے شکوۂ کوتاہی داماں ہو جائے
یا تو گلشن میں قفس کو مرے لے جا صیاد — یا یہی کنجِ قفس صحنِ گلستاں ہو جائے
ہاتھ میں تیرے ہے جبتک تری تیغ ہے تیغ — سر پہ میرے جو پہنچ جائے تو احساں ہو جائے

تو جو اسرارِ حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدم رسن و دار کا ساماں ہو جائے

بیدم وارثی

لے گیا تھا۔

جب یہ لڑکا اٹھارہ برس کا ہؤا تو اُس کا باپ چینگ تو میں ناظم تعلیمات کے عہدہ پر سرفراز ہو گیا۔ اور منصور اپنے والدین کے ہمراہ اُسی شہر میں چلا گیا۔ چینگ تو کے قریب ہی نواب جعفر رہتا تھا۔ جو بڑا متمول اور حکومت وقت کا مختار اعظم تھا۔ نواب جعفر کو اپنے بچوں کے لئے ایک لائق معلم کی تلاش تھی۔ اس لئے نئے ناظم تعلیمات کی آمد کی خبر سُن کر اُس سے ملنے چلا گیا تاکہ اپنی ضرورت کے متعلق اُس سے مشورہ کر سکے۔ اس ملاقات کے دوران میں نواب جعفر کو ہارون کے تربیت یافتہ فرزند سے ملنے اور گفتگو کرنے کا بھی موقع ملا۔ چنانچہ نواب اُس کی علمیت اور خوش اخلاقی سے اتنا متاثر ہؤا اُسے اپنے خاندان کا اتالیق مقرر کر دیا۔

چونکہ نواب جعفر کا محل شہر سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا۔ کہ منصور اپنے آقا کے مکان پر قیام کرے گا۔ اس فیصلہ کے بعد نوجوان منصور نے تمام ضروری اشیا اپنے عارضی قیام کے لئے درست کر لیں اور اُس کے والدین نے نہایت محبت سے خدا حافظ کہنے کے بعد بہت سی نصیحتیں کیں اور مشہور چینی شاعر لاتسو اور قدیم دانش مندوں کا یہ مقولہ بھی اسے سُنا دیا گیا۔

"ایک خوبصورت چہرہ عالم کو الفت و محبت سے معمور کر سکتا ہے لیکن آسمانی مخلوق اس سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی عورت مشرق کی جانب سے تمہیں آتی دکھائی دے۔ تو مغرب کی طرف دیکھنے لگو۔ اور اگر اُسے مغرب کی طرف سے آتے ہوئے دیکھو تو اپنی آنکھیں مشرق کی طرف پھیر لو۔"

پھر منصور نواب جعفر کے مکان پر چلا گیا۔ موسم خزاں اور موسم سرما کے خاموش دن اور طویل راتیں گذر جانے کے بعد جب بہار کا دوسرا چاند اور سعادت و مسرت کا وہ دن قریب آ گیا۔ جسے چینی زبان میں "یوم پیدائش صد گل" کہتے ہیں۔ تو اُس کے دل میں اپنے والدین سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بالآخر ایک دن موقع مناسب سمجھ کر اُس نے نیک خصلت نواب سے اپنی خواہش بیان کی۔ نواب جعفر نے نہ صرف گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ بلکہ قریباً پانچ تولہ چاندی بھی اُسے عنایت کی۔ تاکہ اگر وہ چاہے۔ تو اپنے باپ یا ماں کے لئے کوئی چھوٹا سا تحفہ خرید سکے۔ کیونکہ ان دنوں خوشحال لوگوں میں جشن "پیدائش گل" کے روز اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو تحفہ تحائف دینے کا رواج تھا۔

اُس روز ہوا بوئے گل سے سرمست اور خوبصورت تیتریوں کے رنگین و جمیل پروں کی جنبش سے نغمے بپا رہی تھی۔ منصور کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس راستہ پر وہ چل رہا ہے۔ شاید کئی برس سے انسانی قدم نے اُسے نہیں چھوا۔ ہر طرف لمبی لمبی گھاس اُگ رہی تھی۔ سڑک کے دو رویہ بلند قامت درخت اپنے مضبوط تنے پھیلائے اور سرسبز ٹہنیوں کو بڑھا کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ تاکہ راہ چلتا مسافر تپش آفتاب سے محفوظ رہے۔ شاخساروں کے گنجان حصے پرندوں کے چہچہوں سے معمور اور دو رویہ درختوں کا درمیانی منظر ڈھلتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں سے رنگین اور نکہت گل سے اس طرح مہک رہا تھا۔ جس طرح کوئی عبادت خانہ عود و عنبر کی خوشبوؤں سے مہک رہا ہو۔ فطرت کے اس حسین منظر نے منصور کا دل مسرت و فرحت سے سرشار کر دیا۔ پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ٹہنیوں کی چھاؤں میں تہہ بند کلیوں کے دوش بدوش وہ اطمینان سے ٹہل کر روشنی سے دھلی ہوئی اور عطر میں نہائی ہوئی ہوا میں سانس لینے لگا۔ جب اس کا دل و دماغ ابھی دلچسپ اور مست کرنے والی خاموشی سے متاثر ہو رہا تھا ایک ہلکی سی آواز نے اُس کی توجہ اُس طرف پھیر دی۔ جہاں جنگلی شفتالو کے درخت اپنے پورے جوبن پر تھے۔ اُن درختوں میں اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت، جو لالہ و ریحاں کے پھولوں سے بھی زیادہ نازک اور خوبصورت تھی، ان گنجان پتوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگرچہ منصور نے اُسے ایک ہی لمحے کے لئے دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی حور تمثال[1] عورت کے چہرے کی دلفریبی اُس کے چمپئی رُخساروں کی دمک اور خوبصورت آنکھوں کی چمک جو چمکتے ہوئے پیمانوں کی طرح دو ابروؤں کے نیچے سے دیکھ رہی تھیں، اس کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئیں۔ منصور نے فوراً نگاہیں پھیر لیں۔ اور جلدی سے اُٹھ کر تھمکا۔ آہستہ لیا۔ جب اُن زاہد فریب[2] آنکھوں کا اُسے خیال آتا۔ جو پتیوں کی اوٹ سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ تو ایک قسم کا اضطراب اور بے چینی اُس کے بے لوث و معصوم دل پر چھا جاتی۔ اُن آنکھوں کے تصور سے وہ اتنا بے خود و مدہوش تھا کہ اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ نواب جعفر کی عطا کردہ چاندی اُس کی آستین سے کہاں گر گئی۔ چند لمحوں بعد اُسے اپنے پیچھے ہلکے قدموں سے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نسوانی آواز نے اُس کا نام لے کر پکارا۔ حیرت سے اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو ایک قبول صورت لڑکی پر اُس کی نگاہ پڑی جو نہایت ادب و احترام سے اُسے مخاطب کر کے کہنے لگی "جناب عالی" میری مالکہ نے حکم دیا ہے۔ کہ یہ چاندی آپ کو واپس کر دوں۔ جسے آپ نے سڑک پر گرا دیا تھا" منصور نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس سے درخواست کی۔ کہ میرا سلام اپنی مالکہ تک پہنچا دے۔ اُس کے بعد شکیبا خاموشی اور سربلند درختوں کے ترچھے سائے میں جو فراموش شدہ راستہ پر محو خواب تھا۔ تیزی سے اپنا سفر طے کرنے لگا لیکن ہر قدم پر وہ دل کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ جو کسی خوبصورت ہستی کے خیال سے ہر لحظہ اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی تھی۔

اسی طرح کا ایک خوشگوار دن تھا جب منصور اپنے گھر سے لوٹا اور ایک دفعہ پھر اُسی مقام پر ٹھہر گیا۔ جہاں اُس نے ایک لمحہ کے لئے ایک غارت گر ہوش دُختر کو دیکھا تھا۔ لیکن اُن بے شمار درختوں کے درمیان ایک مکان

---

[1] حور جیسی

[2] عقل و ہوش کو لوٹ لینے والی۔

دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ پہلی دفعہ جب وہ اس راستے سے گذرا تھا۔ تو وہاں کسی قسم کی عمارت کا کوئی وجود نہ تھا۔ ایک دیہاتی قسم کا مکان تھا بہت بڑا نہیں، لیکن نہایت خوبصورت و خوشنما۔ اُس کی ڈھلوان اور آری کے دندانوں کی طرح دو منزلہ چھت کی اُجلی اور صاف ستھری کھپریل کا نیلا رنگ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن کی چمک دار نیلاہٹ میں جذب ہو کر ایک خاص قسم کی کشش و جاذبیت پیدا کر رہا ہے۔ اُس کے دروازوں اور ستونوں پہ سنہری اور لاجوردی میناکاری کے کام سے سورج کی کرن میں نہاتے ہوئے سرسبز پتوں اور دلکش و جمیل پھولوں پہ اوس پڑ رہی تھی۔ چبوترے کی سب سے بلند سیڑھی پر جیسے چینی کے بڑے بڑے رنگ پشتوں پر استوار کیا گیا تھا۔ مکان کی مالکہ اپنی اُسی خادمہ سمیت کھڑی تھی۔ جس نے منصور کا پیغام شکر گذاری اُس تک پہنچایا تھا۔ نوجوان آدمی نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی طرف جو گذشتہ چند روز سے اُس کے دل و دماغ پر قابض اور وہم و خیال پر حکمران تھی۔ اور اب اُسے رسیلی آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور سرگوشی کی آواز میں اُس کے متعلق خادمہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔

منصور نے ندامت انداز میں دور ہی سے محبوبیت کے اُس ماہِ کامل کو سلام کیا۔ اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب خلاف توقع نوجوان خادمہ نے اُسے ہاتھ کے اشارہ سے بلایا۔ ایک زنگ خوردہ دروازہ کھول کر جسے نصف سے زیادہ خوشبودار پودوں اور گل انار کی ٹہنیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ منصور جذبات حیرت اور شرم آمیز مسرت کی الجھنوں کے درمیان ایک شاداب راستے پہ ہو لیا۔ جو اُس چبوترے تک پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ جس وقت وہ مکان کے قریب پہنچا۔ خوبصورت عورت اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن خادمہ وسیع سیڑھیوں پہ اُسے خوش آمدید کہنے کے لئے ٹھہری رہی۔ پھر نہایت ادب و ملاطفت سے کہنے لگی!

"بندہ نواز! میری مالکہ کا خیال ہے۔ کہ آپ اِس معمولی سی خدمت کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے بجا لانے کا مجھے حکم ملا تھا۔ وہ درخواست کرتی ہے۔ کہ آپ مکان کے اندر قدم رنجہ فرمائیں۔ کیونکہ آپ کی شہرت پہلے ہی میرے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے ہمکلامی کی عزت بخشیں گے۔"

منصور شرم اور لجاجت سے تمتماتے ہوئے رخساروں کے ساتھ کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ فرش پر بچھے ہوئے قالین اتنے نرم و نازک تھے۔ کہ اُن پہ چلنے سے کسی قسم کی آہٹ یا آواز معلوم نہ ہوتی تھی۔ اب وہ ایک ملاقات کے کمرے میں تھا۔ جو نہایت فراخ، ٹھنڈا، اور تازہ ٹوٹی ہوئی کلیوں اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایک قسم کی دلفریب خاموشی ساری عمارت پر چھا رہی تھی اُڑنے والے پرندوں کا سایہ بانس کی چلمنوں سے آنے والی روشنی پر عکس ڈال کر ایک دلفریب خواب کا سا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ سنہری اور گلناری پروں والی بڑی بڑی تیتریاں درختوں اور روشن دانوں سے گذر کر منقش گلدانوں کے گرد ایک مستانہ رقص کر کے کمرہ سے باہر نکل جاتیں! اور پُراسرار درختوں میں جا کر غائب ہو جاتی تھیں ـــ ایک تیتری کی سی خاموشی کے ساتھ مکان کی نوجوان مالکہ دوسرے دروازے سے کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اور نوعمر لڑکے کو سلام کیا۔ جس نے جواباً سینہ پہ ہاتھ رکھ کر ادب و احترام سے سر جھکایا۔ سمن سروقد، کنول اور سوسن کے پھولوں سے زیادہ نازک اندام تھی۔ اُس کے طویل و سیاہ بال گلاب و نرگس کے پھولوں میں گندھے ہوئے تھے۔ اور اُس کی زرد ریشمیں قبا ہلتے وقت یوں جھلملاتی تھی جس طرح آبی بخارات روشنی کے عکس میں رنگ تبدیل کرتے ہیں۔

جب دونوں اخلاق و آداب کے رسمی جملے کہہ کر بیٹھ گئے۔ تو نوجوان عورت نے کہا "اگر میں غلطی نہیں کرتی۔ تو میرے معزز ملاقاتی کا اسم گرامی منصور ہے۔ جو میرے واجب الاحترام رشتہ دار نواب جعفر کے بچوں کا اتالیق ہے۔ چونکہ میں بھی مختار اعظم جعفر ہی کے خاندان سے ہوں۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اُس کے بچوں کے اُستاد کو اپنا ہی رشتہ دار تصور کروں"۔

"بیگم" منصور نے بغیر کسی تساہل کے پوچھا "کیا میں آپ کے معزز خاندان کا نام پوچھنے اور یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ کہ میرے عالی رتبہ ولی نعمت سے آپ کا کیا رشتہ ہے"۔

خوبصورت بیگم نے جواب دیا "میرا غریب خاندان" "پنگ" کے نام سے مشہور ہے۔ جو چنگ تو شہر کا ایک بہت بڑا ناگھرانا ہے۔ میرا نام شمیم ہے۔ اور میں پنگ خاندان کے ایک نوجوان سے بیاہی گئی تھی جس کا نام سعید تھا۔ اسی شادی سے میرا تعلق آپ کے مربی سے ہوا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد میرا خاوند اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔ اب میں نے اپنی بیوگی کا زمانہ اس غیر آباد مقام پر بسر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

ایک پر کیف ترنم اس کی آواز میں تھا۔ ایسا ترنم جو آبجو کے ولولوں یا نغموں اور چشموں کی وجد آور موسیقی میں پایا جاتا ہے۔ اُس کے انداز گفتگو میں ایک ایسی شان اور تمکنت تھی جس سے منصور کے کان قطعاً نا آشنا تھے۔ یہ معلوم کر کے کہ وہ ایک بیوہ تھی۔ منصور نے غیر مناسب سمجھا۔ کہ باقاعدہ دعوت کے بغیر زیادہ عرصہ تک اُس کے پاس ٹھہرے۔ پھر چائے کی پیالی سے، جو اُسے پیش کی گئی تھی، چند گھونٹ پی کر جانے کے لئے تیار ہو گیا لیکن شمیم اُسے اتنی جلدی چلے جانے کی زحمت میں مبتلا نہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے نہایت محبت بھری آواز میں کہا "اے دوست، ابھی نہیں۔ کچھ دیر اور یہاں ٹھہرو۔ اگر تمہارے عزت نشان مربی کو کسی طریق سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ میرے مکان پر تمہیں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور تمہارے ساتھ ایک معزز مہمان کا سا سلوک یا اتنی خاطر مدارات نہیں کی گئی، جتنی کہ وہ خود یہاں ہوتا اور میں کرتی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت خفا ہوگا۔ کم از کم تمہیں رات کے کھانے تک تو ٹھہرنا چاہیئے۔"

یہ سنکر منصور نے وہاں کچھ دیر اور ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ شمیم اُسے دنیا کی تمام مخلوق سے زیادہ خوبصورت اور حسین معلوم ہوتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک محو گفتگو رہے۔ حتیٰ کہ غروب ہونے والے سورج کی نارنجی روشنی آہستہ آہستہ پھیکی پڑ گئی۔ اور شام کے لمبے لمبے سائے نیلگوں تاریکی میں تبدیل ہونے لگے۔ پھر چاند نے اپنی لطیف کرنوں سے تمام سرزمین کو ڈھانپ لیا۔ رنگین و منقش قندیلیں شمیم کے مکان میں روشن کی گئیں۔ اور خوبصورت کپڑوں سے ڈھکی ہوئی میزیں رات کے کھانوں سے آراستہ ہونے لگیں۔ منصور کو اُس وقت کچھ کھانے کا خیال نہ تھا۔ وہ اپنے میزبان کے حسن و جمال سے اتنا متاثر ہوا۔ کہ اُسے کسی قسم کی اشتہا بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شمیم نے یہ دیکھکر کہ اُس کے مہمان نے اپنے سامنے رکھی ہوئی طشتری سے بہت کم کھایا ہے اُسے شراب پینے کے لئے مجبور کیا۔ پھر انہوں نے مل کر بہت سے جام لنڈھائے۔ گلناری رنگ کی شراب اتنی ٹھنڈی تھی۔ کہ جب پیمانے میں اُسے ڈالا جاتا تھا۔ اُس کے پہلو سے بخارانی شبنم کے قطرات پھوٹ نکلتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ منجمد رگوں کو ایک عجیب قسم کی آگ سے گرما دیتی تھی۔ آتشِ سیّال[2] کے چند ہی پیمانوں نے منصور کی حالت تبدیل کر دی۔ اب اُسے ہر چیز پہلے سے بہت زیادہ روشن معلوم ہو رہی تھی۔ شمعیں کہکشاں کی طرح فروزاں۔ کمرے کی دیواریں اُسے زیادہ فراخ و وسیع اور چھت زیادہ بلند ہوتی نظر آنے لگی۔ شمیم کی آواز اُس کے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھی۔ جس طرح چاندنی رات میں کہسار کی منور وادیوں سے کسی دل چھین لینے والے نغمہ کی رسیلی صدا آ رہی ہو۔ اُس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔ زبان میں لکنت تھی۔ اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا۔ اُس کے بیان کرنے کا زبان کو یارا نہ تھا۔ شمیم خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں تعریفی کلمات سن سنکر مسرت سے مسکرا رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگی "میں نے آپ کی بیشل لیاقت اور کمال ہنر کی بہت تعریف سُنی ہے۔ اگرچہ میں فن موسیقی میں ماہر ہونے کی دعویدار نہیں لیکن مجھے تھوڑا سا گانا ضرور آتا ہے۔ اب اس وقت کہ مجھے موسیقی کے ایک ماہر اُستاد کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے غیر ضروری شرم اور جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں درخواست کرتی ہوں۔ کہ براہِ کرم میرے ساتھ مل کر چند گیت گائیے۔ اور یہ مزید احسان ہو گا۔ اگر آپ میرے گیت دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے"۔

منصور نے شرمیلے انداز میں جواب دیا "معزز بیگم! بہ تعظیم و تکریم!! میں اپنے پاس ایسے الفاظ نہیں پاتا جن سے اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

شمیم نے چاندی کی گھنٹی بجائی۔ اور خادمہ ایک خوبصورت بربط لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور اپنی مالکہ کے حوالہ کر کے رخصت ہو گئی۔ منصور نے نہایت شوق سے اشعار کی بیاض کو دیکھنا شروع کیا۔ کاغذ جس پر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے۔ مکڑی کے جالے کی طرح ہلکا اور پیلے زرد رنگ کا تھا۔ اُس کے حروف نہایت صاف اور روشن تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ چین کے شہرۂ آفاق مصور ہینگ سچے چو کے موقلم نے انہیں صفحہ کاغذ پر نقل کیا تھا۔ اُن اشعار کے نیچے یوں چن، کاؤ ہیئن اور ٹھوڈ موڈ جیسے عالیجاہ شعرا اور مغنیوں کے دستخط ثبت تھے۔ منصور ایسے گراں پایہ اور ایسے بے نظیر اشعار دیکھکر فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ اور یقیناً اس وقت وہ ہر ایسی خواہش یا التجا کو رد کر دینے کے لئے مستعد و آمادہ تھا۔ جو اُس کے ہاتھوں سے خواہ ایک ہی لمحے کے لئے اُن نایاب اشعار کی بیاض لے لینے کے متعلق ہوتی۔ پھر اُس نے باواز بلند کہا "معزز خاتون، یہ تو درحقیقت ایک بے بہا چیز ہے۔ اور تمام بادشاہوں کے خزانوں سے بیش قیمت۔ یہ تو اُن یکتا و یگانہ استادوں کی تحریر ہے۔ جنہوں نے ہماری پیدائش[3] سے پانچسو برس پیشتر اپنے جان بخش نغموں سے مجالس دنیا کو گرما دیا تھا۔ آہ! اِس نظم بے بدل کا جادو اور یہ کاؤ ہیئن کا حیرت میں ڈالنے والا گیت، جو شاعروں کا شاہزادہ اور آج سے پانچ سو برس پیشتر زیچوان کا حاکم اعلیٰ تھا۔

شمیم نے اپنے مخصوص دلربایانہ انداز میں کہا "کاؤ ہیئن۔ پیارا کاؤ ہیئن وہ میرا بھی منظورِ نظر اور دلپسند تھا۔ پیارے منصور آؤ ہم مل کر اس کے اشعار گائیں۔ اُن گذرے ہوئے دنوں کا گیت جب آدمی موجودہ وقت سے زیادہ شریف اور عقلمند تھے"۔

پھر اُن کی رسیلی آوازیں معطر رات کی خاموشیوں میں اس طرح بلند ہوئیں جس طرح "جنت کے پرندے" اپنے نغموں کی دلکش شیرینیوں کو تحلیل کر کے ایک دوسرے میں مدغم[1] کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک ہی لمحے بعد منصور اپنے ساتھی کی آواز کے سحر سے مسحور ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور وجد و مسرت کی حالت میں اُس کے دلربا گیت سننے لگا۔ جب وہ گا چکی تو منصور کی یہ حالت تھی۔ کہ مسرت کے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔ اور کافوری شمعوں کی روشنی اُسے دھندلی نظر آ رہی تھی۔

نو گھنٹے گذر چکے تھے اور وہ ابھی تک باتیں کرنے، ٹھنڈی ارغوانی شراب پینے اور تھینگ کے زمانہ کے گیت گانے میں مشغول تھے۔ ایک دفعہ سے زیادہ منصور نے وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا لیکن شمیم اپنی سحر کار

---

[1] تحلیل ہو جاتی [2] بہتی ہوئی آگ مراد شراب [3] ملا دیتے ہیں

بیٹھے وہ آوازیں ہر بار زمانۂ گذشتہ کے شاعروں کا کوئی افسانہ یا اُن عورتوں کے متعلق کوئی کہانی شروع کر دیتی تھی۔ جن سے وہ محبت کیا کرتے تھے۔ یا کوئی ایسا عجیب و غریب گیت گانے لگتی کہ منصور کے تمام حواس قوتِ سامعہ کے سوا شل ہو جاتے حسنِ محبت کے اس دلکش مکالمے میں رات کی سیاہی صبح کی سپیدی میں تبدیل ہونے لگی۔

اس وقت تک پرندے بیدار ہو چکے تھے۔ اور معصوم حسین کاسبال سورج کی روشنی میں آنکھیں کھول رہی تھیں۔ اب منصور اپنی جمیل ساحرہ کو الوداع کہنے پر مجبور تھا۔ شمیم اُسے چبوترے تک چھوڑنے کے لئے آئی۔ پھر اُس کی پیشانی چوم کر کہنے لگی "پیارے لڑکے، جب کبھی تمہیں فرصت ملے۔ یہاں آ جایا کرو یا جب تمہارا دل تمہیں یہاں آنے کے لئے مجبور کرے۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ تم ایسے اشخاص میں سے نہیں ہو جن پر کسی بھید کو چھپانے کے لئے اعتبار نہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ تم بالکل نوجوان ہو اسی لئے تمہارا بے نیازی سے کام لینا اغلب ہے۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ نیلگوں آسمان پر ٹمٹمانے والے ستارے ہی ہماری محبت کے رازدار ہیں۔ کسی زندہ انسان سے اس بات کا تذکرہ ہرگز نہ کرنا۔ اور اس چیز کو ہماری پرمسرت رات کی نشانی سمجھنا"

یہ کہہ کر شمیم نے ایک نہایت خوبصورت اور نادر الوجود تحفہ اُسے دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا شیر تھا۔ بلی کی طرح بیٹھا ہوا جسے ایک بے داغ سنگ یشب سے تراش کر بنایا گیا تھا — اُس کی نگاہوں کو کھینچنے والی زردی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ قوسِ قزح سے مستعار لی گئی تھی۔ منصور نے نہایت پیار اور ادب سے اُس تحفے اور اُس ہاتھ کو بوسہ دیا۔ جس نے وہ نایاب چیز اُسے عطا کی تھی۔ پھر وفاداری کے لہجہ میں کہنے لگا "پیاری بیگم، اگر میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع دوں تو خدا مجھے سخت عذاب میں مبتلا کرے" اس کے بعد رازداری کے متعلق قسمیں کھا کر وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

اُس صبح کو نواب جعفر کے مکان پر پہنچ کر منصور نے زندگی بھر میں پہلا جھوٹ بولا۔ اُس نے بیان کیا کہ میری والدہ نے کہا تھا کہ میں ہر رات اپنے گھر چلا آیا کروں چونکہ موسم نہایت خوشگوار و فرحت افزا ہے اس لئے سفر کی دوری کے باوجود میں رات کو گھر چلے جانے کے ہر طرح قابل ہوں۔ اور پھر اس لئے بھی کہ آنے جانے کی ورزش اور صاف ہوا میری صحت و توانائی کے لئے بھی مفید ہے۔ جو کچھ منصور نے کہا۔ نواب جعفر نے اُس پر کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ اب نوجوان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی جو اُسے خوبصورت شمیم کے مکان پر راتیں بسر کرنے سے روک سکتی۔ ہر شب وہ انہیں مسرتوں میں بسر کر دیتے تھے۔ جنہوں نے ابتدائی راہ و ربط میں اس قدر لطف اور فریفتگی پیدا کر دی تھی۔ اب وہ گاتے اور ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے شطرنج کھیلتے — وہ طفل و فرزانگی کا کھیل جسے وُو۔ وانگ نے ایجاد کیا تھا۔ اور جو میدان جنگ کی ایک نقل تھی۔ پھر وہ پھولوں، درختوں، بادلوں، کہساروں، بہنے والی ندیوں، پرندوں اور شہد کی مکھیوں پر شعر کہتے۔ لیکن ہر بار شمیم کا کلام منصور سے بدرجہا اچھا رہتا۔ جب وہ شطرنج کھیلتے تو وہ منصور ہی کا بادشاہ ہوتا۔ جو مات کھا جاتا تھا۔ نظمیں کہتے تو منصور یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتا کہ شمیم کے اشعار ترنم رنگینی، سوز اور رفعت تخیل میں اُس سے زیادہ بلند ہیں۔ زمینیں جو شعر کہنے کے لئے انتخاب کرتے نہایت سنگلاخ ہوتی تھیں۔ اور اتنی مشکل جن میں صرف ہیننگ سلسلہ کے شعرا طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ جو گیت گاتے وہ پانچ سو سال پہلے کے گیت تھے۔ یوں چن۔ تھوڈ۔ موڈ اور کاڈپیٹن کے گیت۔ وہ کاڈپیٹن جو ایک عالی رتبہ شاعر اور صوبہ زیچوان کا حاکم تھا۔

اب گرمیوں کے دن ختم ہو چکے تھے۔ اور موسم خزاں کے درخشاں ایام، اپنی تمام دلآویزیوں، نگاہ کو دھوکا دینے والے سنہری بخارات اور اپنے مسحور کر لینے والے ارغوانی سائے کے ساتھ اس غم کی دنیا کو نشاط و کامرانی کی جنت بنانے کے لئے آ رہے تھے۔

پھر ایک دن نواب جعفر منصور کے باپ سے غیر متوقع طور پر ملا۔ تو کہنے لگا "چونکہ جاڑے کا موسم قریب آ رہا ہے۔ اس لئے اب تو تمہارے لڑکے کے لئے یہ ضروری امر نہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ہر شب اتنا طویل سفر طے کر کے شہر جایا کرے۔ صبح کو جب وہ واپس آتا ہے تو تکان سے مضمحل اور درماندہ سا معلوم ہوتا ہے اس برف باری کے موسم میں میرے ہی گھر پر سو رہنے کی آپ اُسے کیوں اجازت نہیں دے دیتے؟"

یہ سن کر منصور کا باپ حیران رہ گیا۔ پھر تیزی سے کہنے لگا "نواب صاحب میرا لڑکا تو شہر میں کبھی نہیں گیا۔ اور نہ موسم گرما ہی میں وہ میرے مکان پر آیا ہے۔ آپ کی باتوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بری عادات اُس نے اختیار کر لی ہیں اور یہ تمام راتیں کسی بری مجلس میں بسر کرتا رہا ہے — شاید قمار بازی میں یا "کشتیِ گل"[1] کی عورتوں کے ساتھ شراب نوشی میں ......"

مختارِ اعظم نے قطع کلام کر کے کہا "نہیں۔ خدا معلوم تمہارا ذہن کس طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے آج تک لڑکے میں کسی قسم کی بری عادت نہیں دیکھی۔ ہمارے آس پاس نہ تو کوئی شراب خانہ ہے نہ "کشتی گل" اور نہ کسی قسم کا کوئی عیاشی کا اڈا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ منصور کو اپنی عمر کا کوئی مزاجدان دوست میسر آ گیا ہے جس کے پاس اُس نے یہ تمام راتیں گذاری ہیں۔ اور شاید اس خوف سے اصل بات چھپا رہا ہے۔ کہ کہیں میں اُسے رات کے وقت

[1] انگریزی مسودے میں بھی یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں+

گھر سے باہر نہ جانے دوں۔ اس لئے یہی مناسب ہے۔ کہ جب تک میں اس تمام بھید کا سراغ نہ نکال لوں۔ آپ اُسے کچھ نہ کہیں۔ میں آج شام ہی اپنے ایک بااعتماد ملازم کو اُس کا پیچھا کرنے کے لئے مقرر کر دونگا تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ آخر یہ جاتا کہاں ہے؟"

ہارون نے نواب جعفر کا یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اور دوسری صبح ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ شام کے وقت جب منصور نواب جعفر کے گھر سے نکلا تو ایک خدمتگار چپکے چپکے کچھ فاصلہ پر اُس کے پیچھے ہو لیا لیکن سڑک کے تاریک ترین حصّہ پر پہنچ کر لڑکا اُس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور اتنی جلدی کہ گویا زمین اُسے نگل گئی۔ پھر بہت عرصہ تک ڈھونڈ تلاش کرنے کے بعد خادم شکستہ دل ہو کر مکان پر واپس آ گیا اور جو کچھ پیش آیا تھا۔ بیان کر دیا۔ نواب جعفر نے اُسی وقت ایک قاصد ہارون کے بلانے کے لئے بھیجدیا۔

اس اثنا میں منصور نے شمیم کے مکان میں داخل ہو کر حیرانی اور نہایت کرب سے معلوم کیا۔ کہ وہ حزن و ملال کی صورت بنی رو رہی تھی "راحت جان" حور تمثال عورت نے منصور سے رقت آمیز لہجے میں کہا "چند وجوہ کی بنا پر جو میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ اب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے والے ہیں۔ آغاز ملاقات ہی سے مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ یہ بات ہو کر رہیگی باوجود اس امر کے کہ میں اسے ایک اتفاقی نقصان غیر متوقع بدقسمتی تصور کرتی ہیں۔ لیکن پھر بھی آنسو ہیں۔ کہ اُمڈے ہی آتے ہیں۔ اور تھمنے کا نام نہیں لیتے اس رات کے بعد، میرے پیارے، ہم ایک دوسرے کو کبھی نہ دیکھ سکینگے۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ جب تک تم زندہ رہو گے۔ مجھے فراموش نہ کر سکو گے۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں۔ کہ تم اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم ہو گے۔ عزت و شہرت اور دولت و ثروت تمہارے قدموں پر نثار ہو گی۔ اور ایک خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی میری جدائی کا غم تمہارے دل سے محو کر دے گی۔ آؤ اب رنج والم کا تذکرہ ختم کر کے اس آخری شب کو مسرت و شادمانی سے بسر کریں تاکہ میری جدائی کا رنج تمہیں زیادہ تلخ اور تکلیف دہ محسوس نہ ہو اور میرے آنسوؤں کی بجائے میرا تبسم اور میرے قہقہے تمہارے حافظہ کی پناہ میں رہ جائیں"

یہ کہہ کر اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کے بعد مینا سے شراب ناب اور ساز ریشمیں تاروں والا بربط اُٹھا لائی تاکہ منصور آنے والی جدائی کے خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے دماغ میں جگہ نہ دے سکے۔ پھر اُس نے پرانے زمانے کا ایک گیت گایا۔ جو موسم بہار میں جھیلوں کی خاموشی اور اُن میں آسمان کی نیلاہٹ کے عکس فگن ہونے کے متعلق تھا۔ دوسرا گیت دل کی خاموشی اور اُس کے سکون کی تعریف میں تھا۔ اُس دل کی تمنا میں جو رنج و کرب کی یورش اور حسن و عشق کی تباہ کاریوں سے پہلے ایک پرانی بستی اور عیش و عشرت کا گہوارہ تھا، جس کے اُفق پر آرزو کی و نامرادی کے تاریک بادل ابھی تک نمودار نہ ہوئے تھے۔ گیت اور موسیقی کی لذت اور گردش بادہ و جام کی دلفریبیوں نے جدائی کا رنج اُن کے دلوں سے یک قلم محو کر دیا تھا۔ اس آخری محفل کی آخری ساعتیں منصور کو پہلی ملاقات کی پہلی لذتوں سے کہیں زیادہ دلفریب اور آسمانی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن جب سپیدہ صبح نمودار ہوا۔ تو اُن کا بھولا ہوا غم لوٹ آیا۔ ایک دفعہ تمیم پھر اُسے جھونپڑے کی سیڑھیوں تک رخصت کرنے آئی۔ اور خدا حافظ کہتے وقت ایک الوداعی تحفہ اُسے دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا صندوقچہ تھا۔ جسے حیرت انگیز صناعی سے سنگ سلیمانی کے ایک بہت بڑے ٹکڑے سے تراش کر بنایا گیا تھا جو فی الحقیقت ایک بلند رتبہ شاعر کی میز پر رکھنے کے قابل تھا۔ پھر وہ آنسو بہاتے ہوئے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

اس وقت تک منصور کو یقین نہ آتا تھا۔ کہ یہ اُن کی دائمی مفارقت تھی۔ وہ بار بار اپنے دل میں کہتا "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں کل ہی اُس سے ملنے آؤں گا۔ کیونکہ اُس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اس بات کا مجھے یقین ہے۔ کہ اپنے گھر میں آنے سے وہ مجھے کبھی نہیں روکے گی" ان خیالات کو دماغ میں لئے وہ صبح کے وقت نواب جعفر کے مکان پر پہنچا۔ جہاں اُس کا باپ اُس کے مربی کے ساتھ چبوترے پر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ پیشتر اُس کے کہ وہ زبان سے کوئی حرف نکالے۔ ہارون نے پوچھا "بیٹا، کس مقام پر تم نے یہ تمام راتیں بسر کی ہیں؟"

یہ معلوم کر کے کہ اس کا جھوٹ سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ اُسے جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ اب وہ اپنے باپ کے سامنے خاموشی اور شرمساری سے گردن جھکائے کھڑا تھا۔ نواب جعفر نے اُسے بُری طرح سے پیٹا اور سارا راز بیان کر دینے کا حکم دیا۔ بالآخر کچھ اپنے والد کے ڈر سے اور کچھ اُس قوت قانون کے خوف سے جس کا مفہوم یہ تھا کہ لڑکا اگر اپنے باپ کے احکام کی تعمیل نہ کرے گا۔ تو اُسے سو دُروں کی سزا دی جائے گی منصور نے اپنے عشق و محبت کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔

لڑکے کی یہ رام کہانی سن کر نواب جعفر نے آنکھیں بدل لیں۔ پھر بلند آواز سے کہنے لگا "میاں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بیشک خاندان سے میرا کوئی تعلق نہیں جس عورت کا حلیہ تم بیان کرتے ہو کم از کم میں تو اُسے نہیں جانتا۔ اور جس مکان کا تم پتہ بتا رہے ہو۔ اُس کے متعلق بھی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں۔ کہ تم ہارون سے کسی قسم کا جھوٹ نہیں بول سکتے اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ اس سارے معاملے میں کچھ عجیب قسم کی غلط فہمی ہے"۔

تب منصور نے وہ تحفے پیش کئے۔ جو شمیم نے اُسے دیئے تھے۔ سنگِ یشب کا شیر اور سنگِ سلیمانی کا تراشا ہوا صندوقچہ۔ علاوہ ازیں اُس حسین عورت کے چند اصلی گیت۔ اب نواب جعفر اور ہارون حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دونو اس بات پر یک رائے تھے۔ کہ سنگِ سلیمانی کا صندوقچہ اور سنگِ یشب کا شیر اُن نادر الوجود اشیا کے ہم شکل تھا۔ جو صدیاں گذریں زیرِ زمین دفن ہو چکے تھے۔ جن کی صنعت کاری کی نقل اُتارنا موجودہ زمانے کے انسانوں کی قدرت سے باہر ہے۔ اور وہ گیت اعلیٰ درجے کی شاعری کا بے مثال نمونہ تھے۔ جنہیں تھینگ سلسلہ کے شعرا کی طرز پر لکھا گیا تھا۔

نواب جعفر نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا "دوست ہارون ہمیں لڑکے کے ساتھ اُس مقام پر چلنا چاہئے جہاں سے اُس نے یہ نادر و نایاب اشیا حاصل کی ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ لڑکا بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ لیکن یہ معاملہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا" اس کے بعد سب مل کر شمیم کی جائے قیام کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب وہ سڑک کے اُس حصے پر پہنچے جہاں آفتاب کی کرنیں درختوں کے گنجان پتوں سے گذر کر زمین تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ جہاں خودرو گھاس نہایت سرسبز پھولوں کی خوشبو حد درجہ دِلآویز اور جنگلی آڑو کے درخت رنگین پھلوں سے آتش پیراہن بنے ہوئے تھے۔ تو منصور نے باغ کے کنجوں پر نگاہ ڈال کر دہشت و خوف سے ایک چیخ ماری — اُس مقام پر جہاں نیلی کھپریل کا خوبصورت مکان کھڑا تھا۔ اب ہوا کے بگولوں خلا کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سنہری اور لاجوردی کام کے چبوترے کی جگہ شاخساروں کے پتے موسم خزاں کی نظر فریب روشنی میں لہرا رہے تھے۔ اور شاداب کنجوں کے عوض ایک شکستہ و ویران مقبرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا ویران اور کائی میں دبا ہوا کہ سنگِ مرقد پر کندہ الفاظ بھی پڑھے نہ جاتے تھے — شمیم کا مکان وہاں سے ناپید ہو گیا تھا۔

دفعتہً نواب جعفر نے اپنا ہاتھ پیشانی پر مارا۔ پھر ہارون کی طرف مخاطب ہو کر اُس نے زمانہ ماضی کے شاعر چنگ کاؤ کا یہ مشہور شعر پڑھا۔ "لا ریب شمیم کے مقبرہ پر آرزوں کے پھول کھلتے ہیں"۔ پھر اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "دوست ہارون جس عورت کے حسن و شباب نے تمہارے لڑکے کو مسحور کیا تھا۔ وہ سوائے اُس کے کوئی نہیں ہو سکتی۔ جس کا مقبرہ ان کھنڈرات میں ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔ غور سے دیکھو اُس شیر اور صندوقچے پر جو بطور تحفہ تمہارے لڑکے کو ملے تھے۔ یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "یہ صنعت جمیلہ کے بہترین نمونے کاؤ کی ملکیت ہیں۔ جو پیہ ہائی شہر کا رہنے والا تھا" اس نام کا شہر اب صفحۂ ہستی سے ناپید ہے۔ لیکن کاؤ پیشین کی یاد ابھی تک لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔ کیونکہ وہ ایک عالی جاہ شاعر اور صوبہ زیچوان کا حاکم تھا۔ جب وہ زندہ تھا۔ تو چنچل شوخ مزاج شمیم اُس کی توجہ کا مرکز تھی۔ جو اپنے وقت کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین و جمیل تھی۔ کاؤ پیشین ہی نے یہ انمول تحائف اُسے دیئے تھے۔ اور ان بے بہا اشعار کی بیاض اُسے عطا کی تھی۔ شمیم دیگر عورتوں کی طرح مر کر گمنامی کی دنیا میں نہیں چلی گئی۔ اُس وقت بھی کہ اس کے خوبصورت اور سڈول بازو خاک ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اس گنجان جنگل میں اس کی کوئی چیز باقی ہے۔ اُس کی رُوح ابھی تک ان سرسبز خاموش کنجوں میں پھرتی رہتی ہے"۔

یہ کہہ کر نواب جعفر خاموش ہو گیا۔ ایک بے معلوم سا خوف تینوں پر طاری ہونے لگا۔ صبح کا ہلکا سا کہر سبزہ زاروں کی وسعت کو محدود اور خوبصورت درختوں کی خاموش فضا میں ایک قسم کا ڈر اور ہیبت پیدا کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا پھولوں کی خوشبو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا آہستہ سے نکل گیا۔ ایسی ہلکی خوشبو جو مرجھا جانے والے پھولوں سے نکلتی ہے۔ یا کسی فراموش شدہ ریشمیں قبا کی سلوٹوں میں محفوظ رہ جاتی ہے۔ پھر ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ درختوں پر ہلنے والی پتیاں آہستہ آہستہ "شمیم۔ شمیم" کہہ کر اُس چھائے ہوئے سکوت میں لرزش پیدا کر رہی تھیں۔

ہارون نے اس خیال سے خوفزدہ ہو کر کہ شمیم پھر اُس کے لڑکے پر ڈورے نہ ڈالنے لگے منصور کو کسی اور شہر میں بھیج دیا۔ جہاں بعد میں اُس نے اپنی علمیت و ذہانت کی بدولت بڑی عزت اور اعلےٰ مناصب حاصل کئے۔ پھر اُس نے ایک معزز خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی۔ جس سے وہ کئی لڑکے اور لڑکیوں کا باپ بن گیا۔ جو اپنے اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے دور دور تک مشہور تھے۔ اگرچہ شمیم کا خیال ہمیشہ اُس کے دل میں رہا۔ لیکن پھر بھی اُس نے کسی آدمی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے بچوں کو بھی اُس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ جو ہر روز اُن نادر اشیا کا افسانہ سننے کی آرزو کرتے جنہیں لکھنے کی میز پر اُس نے رکھ چھوڑا تھا۔ سنگِ یشب کا شیر اور سنگِ سلیمانی کا صندوقچہ۔

محمد ضیاء الدین شمسی

شریف دشمن

۱۹۲۶ء کا موسم گرما میں نے اپنے دوست سید ریاض علی شاہ کی دعوت پر وادیٔ کاغان میں بسر کیا تھا۔ ضلع ہزارہ کا یہ رشکِ ارم خطہ برطانی ہندوستان کا انتہائی شمالی علاقہ ہے۔ جس نے ایک بچر کی طرح مشرق کی طرف سے کشمیر اور مغرب کی جانب سے آزاد پہاڑی قبائل کے علاقہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر رکھا ہے۔

ایک دن بعد دوپہر میں اپنے معزز میزبان کے گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کے لئے نکلا۔ اور ابھی گاؤں سے بہت زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ کہ میں نے ایک نہایت وجیہہ تنومند اور بلند قامت آدمی کو ایک اچھی نسل کے کوہستانی گھوڑے پر سوار جاتے دیکھا۔ چار یا پانچ معمولی ٹٹو جن کی پشت پر کسی قسم کا بوجھ یا سامان نہ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اس خیال سے کہ یہ آدمی اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ شاید مجھے اس بہشت زمین کے متعلق کوئی دلچسپ بات بتا سکے۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے قریب آ گیا۔ اگرچہ اس کا لباس اپنے علاقے کے رواجی لباس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے اس کی شکل و صورت سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے تک ہم خاموش ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلے گئے۔ اگرچہ اسی اثنا میں وہ کبھی میری طرف شبہ کی نگاہوں سے دیکھ لیتا تھا۔ لیکن نہ تو میں نے نہ اس نے کوئی کلمہ زبان سے نکالا۔ آخر کچھ دیر اسی طرح خاموش سفر کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "آپ کہاں سے آ رہے ہیں"؟

"کاغان سے" اس نے نہایت رسیلی آواز میں جواب دیا۔

"اور کہاں جا رہے ہیں"؟ میرا دوسرا سوال تھا۔

"آگے" "وہ میرا گاؤں ہے"!

میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی مجھ سے کچھ دریافت کرے گا۔ اور یوں سلسلہ کلام شروع ہو جائے گا۔ لیکن جب خلاف توقع اس نے کوئی بات نہ کی تو میں نے خود ہی پوچھا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کاغان میں کوئی سامان بیچنے لائے تھے۔ اور اب خالی ٹٹو لے کر گھر واپس جا رہے ہیں"؟

"لایا تو کچھ سامان ہی تھا۔ مگر بیچنے کے لئے نہیں کسی کو دینے کے لئے"!

"کسی کو"؟ میں نے ذرا بے تکلفی سے دریافت کیا۔

"مرحوم پیر علی شاہ کے بچوں کو"!

صرف ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "آپ کا نام"؟

"بوستان خاں"۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"بوستان خاں"! میں نے اپنے دل میں دوہرایا۔ یہ تو اس علاقے کے دلاور گوجر اور نہایت مشہور ڈاکو کا نام تھا۔ جس کے کئی ہولناک واقعات میرے دوست سید ریاض علی نے سنائے تھے۔ میرے دل میں ایک قسم کا خوف پیدا ہوا۔ لیکن خدا معلوم کیا بات تھی۔ کہ یہ خوف کم ہوتے ہوتے ایک قسم کی دلچسپی اور مسرت میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے مرحوم پیر علی شاہ کی شجاعت و بہادری کے قصے بھی سنے تھے۔ اور ان دو حریفوں کی دشمنی کے حالات سے بھی کم و بیش واقف تھا۔ لیکن یہ بات کسی طرح میرے ذہن میں نہ آتی تھی۔ کہ بوستان خاں اپنے دشمن کے بچوں کو کیوں اتنی چیزیں دینے کے لئے لایا ہے۔ بہر حال میں نے اپنی حیرانی دور کرنے کے لئے پوچھا "کیا آپ نے ان سے کوئی چراگاہ یا کھیت ٹھیکے پر لے رکھا ہے"؟

بوستان خاں نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں نیچی ڈال کر کہنے لگا "نہیں! میں ان کا مقروض ہوں۔ میرے سر ان کا بہت قرض ہے"۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور سر جھکا کر اس نے اپنے گھوڑے کی گردن پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ اگرچہ گھوڑا پہلے ہی تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ سمجھدار جانور نے بلا وجہ سرزنش کئے جانے پر ذرا کجروی اختیار کی لیکن مالک کا دوسرا تھپڑ کھا کر پھر سیدھا چلنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے حوصلہ نہ پڑا۔ کہ میں اس سے سید پیر علی کے متعلق کچھ حالات دریافت کرتا۔ چاروں طرف ایک خاموشی سی چھا رہی تھی۔ دیودار اور چیل کے بلند قامت درختوں نے آسمان سے باتیں کرنے والے اونچے پہاڑوں کے دامن میں غروب ہونے والے آفتاب کی سنہری شعاعوں کو روک کر راستے پر اندھیرا کر رکھا تھا۔ اور پھولوں کی خوشبو میں بسی ہوئی ہلکی ہوا کے خنک جھونکے طبیعت میں اداسی ملی ہوئی مسرت پیدا کر رہے تھے۔ ایک مقام پر پہنچ کر جہاں سڑک دو طرف کو نکل جاتی تھی۔ بوستان خاں نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "میرا گاؤں اس طرف ہے۔ آئیے۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ مجھے گھوڑوں کو پانی بھی پلانا ہے"!

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ میں بھی نیچے اترا اور اپنے گھوڑے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ بوستان خاں نے ایک انگڑائی لی اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ وہ خود بھی دوسرے پتھر پر میرے سامنے بیٹھ گیا چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد میں نے پھر سلسلہ کلام جاری کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "آپ پیر علی کے کب قرضدار ہوئے تھے"؟

"بہت عرصہ ہوا"۔

"تو کیا آپ نے ابھی تک اُس قرض میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا"؟

"نہیں۔ پیر علی کا قرض اتارنے کے لئے لمبی مدت درکار ہے"۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "یہ ایک طویل افسانۂ غم ہے۔ اگرچہ اس کا بیان کرنا میرے لئے کسی طرح مسرت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر بھی آپ کی خاطر اُسے سنائے دیتا ہوں۔ شاید آپ دوسرے آدمی ہیں جنہیں اپنی زندگی کا سب سے زیادہ غمناک واقعہ سُنانے لگا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے کہنے لگا: "یہ کاغان کے سید ہی تھے۔ جنہوں نے مجھے ایک شریف گوجر سے ڈاکو بن جانے پر مجبور کیا۔ ہم اپنے جانوروں کے لئے ان کی زمینیں ٹھیکے پر حاصل کر لیتے تھے۔ اور اپنے ریوڑ چراتے تھے۔ سیدوں کے زعم میں یہ سمائی ہوئی تھی۔ کہ وہ ان زمینوں کے مالک ہیں۔ اور جس قسم کا ذلیل سلوک اُن کا جی چاہتا تھا۔ ہمارے ساتھ روا رکھنے میں کسی طرح بھی تامل نہ کرتے تھے۔ ہماری قوم غریب ہی سہی۔ لیکن ناجائز سختیاں اور بلاوجہ کی گالی گلوچ کسی سے بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ میں اور میرے والد نے پیر علی شاہ سے ایک چراگاہ اپنا ریوڑ چرانے کے لئے لی تھی۔ جس کا کچھ حصہ اس نے ذاتی جانوروں کے لئے علیحدہ رکھا چھوڑا تھا۔ ایک دن ہماری چند بھیڑیں اُس خاص حصے میں چلی گئیں۔ جس پر پیر علی نے میرے بوڑھے باپ کو سخت بے عزت کیا۔ اور بُرا بھلا کہا جب یہ خبر مجھ تک پہنچی تو میں اسے برداشت نہ کر سکا۔ میں نے دس بارہ دوسرے نوجوان گوجروں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک جرگہ بنا لیا۔ اور سیدوں کے غرور و فخر کا سر کچلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مالی کا بہت، راجہ پوگی اور مصلے موسےٰ کی بلند پہاڑیاں اور گرد و نواح کے جنگل ہماری لوٹ مار کے اڈے تھے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا جس دن ہماری اور سیدوں کی چھوٹی موٹی جنگ نہ ہو جاتی تھی۔ آخر کار ایک دن میں نے پیر علی شاہ سے اپنا انتقام لینا چاہا۔ اور اپنی چھوٹی سی جمعیت سے اُس کے مکان پر حملہ کر دیا۔ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد ہم پیر علی کے خاندان کے تین آدمی قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن وہ خود صحیح و سلامت جان بچا کر نکل گیا اگرچہ ہم نے ہر جگہ تلاش کیا مگر اُسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم نے گھر کا تمام قیمتی مال و اسباب لپیٹا۔ اور سب کا سب اپنی جائے پناہ میں لے آئے۔

لیکن یہ قتل و خونریزی ہمیں بڑی مہنگی پڑی۔ پیر علی نے ہمارے جتھے سے نہایت طاقتور جمعیت تیار کر لی۔ اور دن رات وادیوں اور جنگلوں میں پیچھا کر کے ہمیں جمبرا کی غیر ہموار گھاٹیوں میں گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ اس پہاڑ کی چٹانیں اتنی ڈھلوان اور دشوار گذار تھیں۔ کہ ایک پہاڑی بکرا بھی بلا خوف و خطر ان پر قدم نہ رکھ سکتا تھا۔ یہاں کچھ عرصے ہم اپنا مورچہ قائم کئے رہے اور فیصلہ کر لیا۔ کہ ہم میں سے ہر شخص اُس وقت تک مقابلہ کرے گا جب تک کہ سُرخ لہو کی ایک بوند بھی اُس کے بدن میں باقی ہے۔ پیر علی اور اُس کے ہمراہی پہاڑ کے چاروں طرف نہایت ہوشیاری سے گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ اور ہمیں جان بچانے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔

دو دن گذر گئے۔ خور و نوش کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ اور بھوک پیاس کی شدت سے ہمارے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ بدن کمزور اور چہرے زرد تھے۔ موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ لیکن میرے ہمراہیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جو اپنے کئے پر پشیمان ہوتا یا اپنی بُری قسمت کے متعلق حرفِ شکایت زبان پر لاتا۔ تمام بہادر سپاہیوں کی طرح ضبط و تحمل سے اس تکلیف کو برداشت کر رہے تھے۔

آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ قوت لاہوت کے بغیر اب ایک گھڑی بسر کرنا بھی دشوار ہے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کر کے کہا "بھائیو! کیا تم میری اس رائے سے متفق نہیں ہو کہ اس طرح بھوک سے مرنے کی بجائے دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور مردوں کی طرح لڑتے لڑتے جان دے دیں۔ جب مرنا ہی ہمارے لئے ناگزیر ہے تو پھر کیوں نہ لڑ کر مریں۔ اور اپنے حریفوں کو قتل کرنے کی آرزو کیوں اپنے دل میں لے جائیں"؟

میرے دوستوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا۔ کیونکہ میں بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کا اور کوئی دوسرا طریقہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

میں نے خدا کا نام لے کر اپنی تلوار سنبھالی اور سب سے پہلے جائے پناہ سے نکلا۔ باقی تمام ہمراہی میرے پیچھے تھے۔ سیدوں نے بندوق کی گولیوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میں نے دو ہمراہیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے گرتے ہوئے دیکھا۔ غصہ و جوش کا خون میری آنکھوں میں اُتر آیا اور میں بے جگری سے دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ مجھے اُس وقت کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں اپنی تلوار ہوا میں ہلا کر گھیرا ڈالنے والوں کی طرف بھاگ رہا تھا —— یکایک پیچھے سے کسی نے میرے سر پر کاری ضرب لگائی۔ اور میں تیورا کر گر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو پیر علی کے مکان میں پایا۔ میں ایک چٹائی پر پڑا تھا۔ اور گاؤں کے کئی سید جن میں پیر علی شاہ بھی تھا، میرے ارد گرد کھڑے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ تو پیر علی شاہ نے جھک کر میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر نہایت نرمی و ملاطفت سے کہنے لگا۔ "کہو طبیعت کیسی ہے"؟

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اتنا درد محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے دوسرا وار مجھ پر کیا ہو —— مجھے ایک بار پھر غش آ گیا۔ کامل ایک مہینے تک میں موت کے دروازہ پر پڑا رہا۔ لیکن اس عرصے میں پیر علی شاہ دم بھر کو بھی مجھ سے جدا نہ ہوا۔ وہ میری تیمارداری اس توجہ اور محبت سے کرتا تھا۔ کہ شاید میرا باپ بھی اس موقع پر اتنی شفقت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرتا۔ وہ ہر روز میرے زخم صاف کرتا اور اپنے ہاتھ سے پٹیاں تبدیل کرتا تھا۔ ایک معصوم بچے کی طرح میری نگہداشت کرتا اور دوائیوں کی طرح کھلاتا پلاتا تھا۔ جب مجھے بھوک نہ ہوتی تب بھی نرمی و عجز سے مجھے چند نوالے کھانے پر مجبور کرتا تھا۔ کبھی کبھی میرے سر کو اپنے زانوں پر رکھ کر مجھے انڈے یا گوشت کھانے کی ترغیب دیتا۔ اور زبردستی ایسی طاقت بخش اور مرغن اشیا میرے منہ میں ڈال دیتا تھا۔

بالآخر میری کھوئی ہوئی طاقت آہستہ آہستہ بحال ہونے لگی اور جب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ اب میں اپنی ٹانگوں کے سہارے کھڑا ہو سکوں گا تو میں اُٹھ بیٹھا۔ اب میں دیوار یا دیگر چیزوں کا سہارا لے کر کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہل سکتا تھا۔ بعض اوقات پیر علی خود میرا بازو تھام کر مکان کے صحن میں لے آتا۔ جہاں ایک درخت کے نیچے میں کافی دیر تک بیٹھ جاتا تھا۔

جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے۔ میں اپنے آپ کو زیادہ قوی محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ دیکھکر حیران رہ جاتا۔ کہ مجھے تندرست ہوتے دیکھکر پیر علی کے چہرے پر کتنی بشاشت نظر آتی تھی۔ ایک دن مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھکر کہنے لگا "اب تو تم اچھی طرح چل پھر سکنے کے قابل ہو گئے ہو گے"؟

میں نے احسان مند نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھکر جواب دیا "جی نہیں ابھی تک ایک قسم کی کمزوری محسوس کرتا ہوں"۔

یہ سنکر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔ "اوفکر مت کرو، بہت جلد تم اپنی پوری طاقت حاصل کر لوگے"۔

چند دن بعد اُس نے یہی سوال پھر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کیا۔ اور اتنا بلند اُچھلا کہ پیر علی کی مسرت سے باچھیں کھل گئیں۔ پھر بلند آواز میں کہنے لگا "اُس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اب ہر طرح تندرست ہو"۔

یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ اور مجھے حیران و ششدر صحن ہی میں کھڑا چھوڑ گیا۔ ایک لمحے بعد وہ دو بھری ہوئی بندوقیں اپنے ہاتھ میں اٹھائے باہر نکلا۔ اُس کا چہرہ بالکل زرد اور آنکھیں کسی زخمی شیرنی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "میں نے تمہیں بالکل تندرست کر دیا ہے۔ اس وقت تم ویسے ہی پرصحت اور توانا ہو جیسے زخمی ہونے سے پہلے تھے۔ اور اس قابل ہو کہ میرا قرض ادا کر سکو جو تمہارے ذمے ہے۔ کیونکہ تم نے میرے دو نوجوان بھائیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ ہو گئیں۔ اور اُس کی صورت سے وحشت برسنے لگی۔ وہ اپنے جذبات کو بمشکل قابو میں لا کر کہنے لگا "اگر میں چاہتا تو اُس وقت بھی تمہیں قتل کر سکتا تھا جب زخمی ہو کر تم میرے مکان میں پڑے تھے۔ لیکن میں نے ایسا فعل ایک سید کی شان کے خلاف سمجھا۔ اس لئے میں نے مصمم اور پختہ ارادہ کر لیا۔ کہ پہلے تمہیں تندرست بنایا جائے۔ پھر قتل کیا جائے پیر علی شاہ نے آج تک کسی کمزور یا بے دست و پا انسان پر حملہ نہیں کیا۔ اور نہ میں تمہیں اپنے اصول سے مستثنیٰ کرنا چاہتا تھا"۔

یہ کہہ کر اُس نے دونوں بندوقیں میرے سامنے رکھ دیں۔ پھر کہنے لگا۔ "دونوں بندوقیں ایک جیسی مضبوط اور ایک ہی قسم کے کارتوسوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں سے جو پسند ہو اُٹھا لو —— چلو اب جنگل کی طرف چلیں اور اپنے آتشیں ہتھیاروں کی قوت کا اندازہ کریں۔

اس کے جواب میں ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔ ایک ایسے انسان کی طرح جس پر جادو کر دیا گیا رنج و ندامت سے گردن جھکائے میں اُس کے پیچھے ہو لیا حتیٰ کہ ہم جنگل میں پہنچ گئے۔ پیر علی شاہ قریباً بیس قدم مجھ سے آگے تھا۔ یکایک وہ ایک جگہ رُک گیا۔ اور حاکمانہ انداز میں کہنے لگا "بس وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ میں اس جگہ کھڑا رہوں گا۔ تاکہ ہم ایک دوسرے کے سامنے رہیں۔ جس وقت "تین" کا لفظ میرے منہ سے نکلے۔ ہم دونوں کو بندوقیں سر کر دینی چاہئیں"۔

اس وقت تک میں اپنے ہوش و حواس پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے اپنی بندوق دور پھینک دی۔ اور الگ کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھکر پیر علی کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ اُس نے اپنی بندوق کا سرا زمین پر رکھ دیا۔ پھر کچھ عجیب ہی انداز میں کہنے لگا۔ "کیوں کیا بات ہے"؟

میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ میں کبھی تمہارے خلاف ہاتھ اٹھا سکوں گا۔ کیا تم مجھے اتنا ہی ذلیل اور کمینہ تصور کرتے ہو کہ بلاوجہ تمہیں گولی کا نشانہ بناؤں؛ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا"

"تمہیں کرنا ہوگا اور ایسا کرنے کے لئے میں تمہیں مجبور کروں گا"۔ اُس نے قدرے بلند اور جوش بھری آواز میں جواب دیا۔ "میں اس لڑائی کو بالکل

طلوع نہیں کرسکتا۔ اور نہ ایک بے ہتھیار آدمی پر حملہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اپنی بندوق اٹھاؤ اور اسے مذاق نہ سمجھو"

یہ سُن کر بھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔

"اپنی بندوق اٹھاؤ" اُس نے چلا کر کہا "ورنہ میں تمہیں بزدل کہونگا" مجھے معلوم نہیں کہ میں کیوں اُس کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔ میں نے جھک کر بندوق اٹھالی۔

"میری طرف دیکھو" پیر علی شاہ نے حکم دیا۔

میں اس کی طرف پھر گیا۔

"مجھ پر نشست لگاؤ" اُس کا دوسرا حکم تھا۔

اُس نے مجھ پر نشانہ باندھا۔ اور میں نے بندوق کا منہ اُس کی طرف پھیر دیا۔ پیر علی شاہ نے لبلبی دبا دی اور بندوق کے چلنے کی صدائے بازگشت جنگل میں سنائی دی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں نے بندوق چلائی تھی یا نہیں کیونکہ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر رہا تھا رنج و افسوس کی ایک چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ اور میں جھپٹ کر اُس کی طرف بڑھا۔ لیکن افسوس اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اُس وقت سے لے کر آج تک ہر سال میں اُس کے بچوں کیلئے گیہوں۔ چاول۔ جَو اور دوسرا خورد و نوش کا سامان لاتا ہوں۔ اور اُن کی گذر اوقات کے لیے حسب ضرورت بھیڑیں بھی دے جاتا ہوں جنہیں فروخت کر کے وہ کپڑے یا زندگی کی دوسری ضروری چیزیں خرید لیتے ہیں۔ میں شہرت یا ناموری کے لئے ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ پیر علی شاہ کا قرض میرے ذمہ ہے ؛ جسے مرتے دم تک ادا کرنا ہے"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ غروب ہونے والے سورج کی ہلکی کرنیں اس کے خوبصورت چہرے کو ارغوانی بنا رہی تھیں۔ اور وہ انتہائی کوشش سے آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک رہا تھا۔ ایک لمحہ بعد جب وہ گھر جانے کے لئے اُٹھا تو میں نے دیکھا۔ کہ دو بڑے بڑے آنسو رخساروں پر بہنے کے لئے اُس کی پلکوں میں مچل رہے تھے۔

(ماخوذ) محمد ضیاء الدین شمسی

پریشانی ہے جی گھبرا رہا ہے۔ کوئی دھیمے سروں میں گا رہا ہے

مری آنکھوں سے ظاہر ہو نہ جائے کہ اِک بادل سا دِل پہ چھا رہا ہے

تصور کی بہ مقصدِ آفرینی میں سمجھا کوئی سچ مچ آ رہا ہے

جو رستہ خلد میں نکلا ہے افسر وہ دوزخ سے گذر کر جا رہا ہے

مجھے فردا کی فکر کیوں کر ہو غمِ امروز کھائے جاتا ہے

سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار دکھ میں اللہ یاد آتا ہے،

حامد اللہ افسر

کلام سورداس کے چند نمونے

ایسا کون ہندی خوان ہے جو سورداس کے نام سے واقف نہ ہو۔ اور جس نے ان کے کلام سے حظ نہ اٹھایا ہو۔ اُن کی زندگی کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں۔ کہ وہ آنکھوں سے لاچار تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ پیدائشی اندھے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ وہ عالم شباب میں کسی عورت پر عاشق ہو گئے تھے۔ اور اپنے تئیں اس کے جال میں پھنسا دیکھ سوئی لے کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔

سورداس بھگوان کرشن کے پورے بھگت تھے۔ اور ان کا تمام کلام بھگوان کرشن کی حمد و ستائش سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا لفظ لفظ اس کی بات کا گواہ ہے۔ کہ ان کی بھگتی کتنی اونچی اور سچی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بھگوان کرشن نے سورداس کو درشن دیئے۔ سورداس نے ان کا بازو پکڑ لیا۔ مگر بھگوان کرشن نے جھٹکا دیکر اپنا بازو چھوڑا لیا۔ اس پر سورداس نے یہ دوہا کہا۔

باہہ چھڑائے جات ہو۔ نبل جان کے موہ
ہردے سوں جب جایہو۔ مرد بد و نگو توہ

یعنی تم مجھے کمزور سمجھکر بازو چھڑا کر تو چلے گئے لیکن میں تمہیں مرد اس وقت کہوں گا۔ جب تم میرے دل سے نکل جاؤ۔

سورداس کا مجموعۂ کلام سُورساگر کے نام سے مشہور ہے۔ جو تقریباً بارہ ہزار چھوٹی بڑی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں کو ہندی اصطلاح میں پد کہتے ہیں۔ ان کا کلام خالص برج بھاشا میں ہے۔ اور بلحاظ صنعت نہایت اعلیٰ ہے۔ لیکن تاہم نہایت سادہ ہے۔

سُورساگر میں بال لیلا یعنی کرشن کے بچپن کے حالات نہایت ہی عجیب ہیں۔ ان میں قدرت کے خلاف کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ تمام واقعات وہی ہیں۔ جو ہر شخص نے اپنے ایام طفلی میں دیکھے ہونگے نظم کے بعد نظم پڑھتے جایئے اور یہی معلوم ہوگا۔ کہ کرشن آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے۔

نمونہ اوّل :- ناظرین جانتے ہونگے۔ کہ کرشن کی پیدائش دیوکی کے بطن سے ہوئی۔ لیکن پرورش نند نامی ایک گوالے کے ہاں ہوئی۔ جس کی بیوی کا نام جسودا تھا۔ اسی وجہ سے کرشن کو اکثر نند لال اور جسودا نندن بھی کہتے ہیں۔ کرشن کو مکھن بہت پیارا تھا۔ اپنے گھر کا مکھن تو کھا ہی جاتا تھا۔ اور گوالوں کے گھر جا کر ان کا مکھن بھی چٹ کر جاتا تھا۔ چونکہ یہ بہت خوبصورت تھا۔ اس لئے سب لوگ خاص کر گوپیاں یعنی گوالوں کی عورتیں اسے دیکھنے کی مشتاق رہتی تھیں۔ ایک دن اپنی ماں سے یہ کہہ رہا تھا۔ کہ "اماں مجھے تو مکھن ہی اچھا لگتا ہے۔ میوہ یا مٹھائی مطلق نہیں بھاتے"۔ اس کی یہ بات کسی گوپی نے سن لی۔ جو پاس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دل میں یوں خواہش کرنے لگی۔ "کاش کبھی کرشن میرے گھر میں آ جائے۔ اور میں اسے مکھن کھاتا دیکھوں۔ وہ میری رئی کے نزدیک آ کر بیٹھ جائے۔ اور میں اسے چھپ کر دیکھتی رہوں"۔ سورداس کہتا ہے۔ کہ کرشن تو انتر جامی تھا۔ یعنی دوسرے کے دل کی بات کو جان لیتا تھا۔ اُس نے گوپی کی اس آرزو کو جان لیا"۔ (سُور سُدھا یعنی انتخاب سُور ساگر۔ مؤلفہ مشر بندھو۔ کاشی سمت ۱۹۸۰ صفحہ ۹۷ پد ۱۰۲)

نمونہ دوم "ایک دن کرشن اسی گوپی کے گھر گیا چپ دیکھا کہ دروازے پر کوئی نہیں ادھر ادھر نظر ڈال کر جھپٹ گھر میں گھس گیا۔ جونہی گوپی نے کرشن کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی کہیں چھپ کر بیٹھ گئی۔ کرشن سونا گھر دیکھ کر رئی کے پاس جا بیٹھا۔ پاس ہی مکھن سے بھری ہوئی اجنی رکھی تھی۔ اس پر جو نظر پڑی ہی مکھن کھانا شروع کر دیا۔ اتنے میں اس گھر کے ہیرے وغیرہ سے مرصع ستون میں اسے اپنا عکس دکھائی دیا۔ لیکن اس سے خوف نہ کھایا۔ (یعنی اسے غیر نہ سمجھا) بلکہ کہنے لگا کہ میں آج پہلے دن ہی چوری کرنے آیا تھا۔ خوب ہوا جو ساتھی بھی مل گیا۔ خود مکھن کھا رہا تھا۔ عکس کو بھی کھلانے لگا۔ مگر مکھن زمین پر گر پڑا عکس کیونکر کھاتا۔ اس پر کرشن نے عکس سے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ لو تو تمام اجنی کی اجنی دے دوں۔ مکھن تو بہت میٹھا ہے۔ اسے گرانے کیوں ہو۔ میں تو تمہیں دیکھکر خوش ہوا تھا۔ معلوم نہیں۔ تم اپنے جی میں کیا سوچ رہے ہو۔ کرشن کی یہ باتیں سنکر مارے خوشی کے گوپی ہنس دی۔ جونہی کرشن نے گوپی کو دیکھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلا"۔ (سُور سُدھا صفحہ ۹۷۔ پد نمبر ۱۰۳)

اسی قسم کے اور بہت سے پد مکھن چرا چرا کر کھانے کے متعلق ہیں۔ اگرچہ ان پدوں میں اکثر باتیں دُہرائی گئی ہیں لیکن باوجود دوہرانے کے ہر ایک پد میں دلچسپی برابر پائی جاتی ہے۔ اور یہ سُورداس کی شاعری کی ایک خوبی ہے۔ کبھی وہ گوپیاں جن کا مکھن کھا لیا جاتا تھا۔ جسودا کے پاس شکایت لے کر آتی تھیں چنانچہ پد نمبر ۱۰۹ میں یوں بیان ہے۔

"برج میں یہ بات گھر گھر پھیل گئی تھی۔ کہ نند کا بیٹا کرشن دوستوں کو ساتھ لے کر مکھن چرا چرا کر کھا جاتا ہے۔ چنانچہ گوپیاں شکایت کرتی ہیں۔ کوئی کہتی تھی۔ ابھی میرے مکان میں دوڑ کر داخل ہوا ہے۔ کوئی کہتی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر دروازہ پر سے ہی بھاگ گیا ہے۔ کسی نے کہا۔ بلا شک کرشن میرے مکان پر آئے اور جتنا مکھن چاہے کھا لے لیکن شرط یہ ہے۔ کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں لے کر زور سے بھینچ ڈالوں گی۔ کوئی کہنے لگی اگر میں نے اسے مکھن کھاتے دیکھا۔ تو اسے رسی سے باندھ دوں گی۔ پھر دیکھوں اسے کون چھڑائے گا۔ غرض کرشن کے ملنے کے لئے گوپیاں قسم قسم کے ڈھنگ سوچتی تھیں۔ اور پرماتما سے دعا مانگتی تھیں۔ کہ وہ کسی طرح ہم سے ملے۔"

(نوٹ) "اصل میں گوپیاں کرشن کو ملنا چاہتی تھیں۔ شکایت ایک بہانہ تھا باندھنے کی سزا سے وہ دیر تک اس کا دیدار کر سکتی تھیں۔"

نمونہ سوم کرشن کا سوتیلا بھائی تھا۔ جو عمر میں اس سے بڑا تھا۔ اور جس کا نام بلرام۔ بلبھدر یا صرف داؤ (یعنی بڑا بھائی تھا) جب یہ دونوں بھائی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتے تو بلرام کرشن کو اکثر چڑانے لگتا۔ جیسے سورداس نے پد نمبر ۲ میں یوں بیان کیا ہے۔

"اماں مجھے داؤ نے بہت چڑایا۔ مجھے کہنے لگا۔ کہ تو تو لیا ہوا ہے۔ جسودا سے تو کا ہے کو پیدا ہوا ہے؟ میں کیا کہوں۔ اسی غصے کے مارے میں تو کھیلنے ہی نہیں جاتا۔ داؤ بار بار پوچھتا ہے۔ تیری ماں کون ہے؟ تیرا باپ کون ہے۔ نند اور جسودا کے جسم تو گورے رنگ کے ہیں۔ لیکن تیرا جسم کالا ہے۔ داؤ سب گوالوں کو سکھا دیتا ہے۔ اور وہ چٹکی بجا بجا کر مجھے چڑاتے ہیں۔ تو بھی مجھے ہی مارنا سیکھی ہے داؤ پر کبھی خفا نہیں ہوتی۔ کرشن کا غصے سے بھرا چہرہ دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر جسودا بہت خوش ہوئی۔ اور کہنے لگی سن کرشن۔ بلرام تو جنم سے ہی چالاک اور شریر ہے مجھے اپنے گودھن یعنی مویشی کی قسم ہے۔ کہ میں تیری ماں ہوں اور تو میرا بیٹا ہے۔"

بنارسی داس اورینٹل کالج لاہور

وحدت الوجود

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے ۔۔۔ کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ ۔۔۔ سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے
تو ہی خلوت میں تو ہی جلوت میں ۔۔۔ کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی ۔۔۔ میزباں تو ہے میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی
جان کہتی ہے جانِ جاں تو ہے۔

امیر مینائی

کلیسا میں بت کی ادا بن گیا تو ۔۔۔ حرم میں پہنچ کر خدا بن گیا تو
یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی ۔۔۔ کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گیا تو
لگائی ہے لو تجھ سے اجڑے ہوؤں نے ۔۔۔ اندھیرے گھروں کا دیا بن گیا تو
ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے ۔۔۔ ہر اک درد و دکھ کی دوا بن گیا تو

بیاں کے سوا تو نے سب سے نباہی
یہیں آن کر بے وفا بن گیا تو

بیان یزدانی میرٹھی

محرومِ سلام

یاد آیا ہے کہ میں تھا کامگارِ زندگی
وقفِ بہجت تھے مرے لیل و نہارِ زندگی

گلشنِ دل میں مرے کھلتے تھے گلہائے مراد
تھی خزاں نا آشنا میری بہارِ زندگی

نشّۂ الفت سے میں سرشار رہتا تھا مدام
میرا حصہ تھی شرابِ خوشگوارِ زندگی

گیت گاتا تھا محبت کے سحر سے شام تک
میں کہ تھا اک عندلیبِ لالہ زارِ زندگی

شوق سے پہروں کھڑا رہتا تھا تیری راہ میں
تیرا شوقِ دید تھا میرا شعارِ زندگی

تو جواب شوق دیتی تھی سلامِ ناز سے
وہ سلامِ ناز تھا میرا مدارِ زندگی

وہ سلامِ ناز تھا میری مسرت کا کفیل
وہ سلامِ ناز تھا میرا قرارِ زندگی

یاد وہ انداز ہیں اب تک تبسم کے مجھے!
میری نظروں میں تھا جن سے اعتبارِ زندگی

تیرا دلدادہ تھا میں اے پیکرِ تنویرِ حسن
تجھ سے پرتو پر تھا میرا دیارِ زندگی

نام تیرا میں نہ لاتا تھا زباں پہ زینہار
گرچہ تھا تیرا تصور غمگسارِ زندگی

پھر بھی اس ڈر سے کہ تو رسوا نہ ہو جائے کہیں
اے متاعِ زیست اے سرمایہ دارِ زندگی

اور اک مہوش سے میں کرنے لگا اظہارِ عشق
چھوڑ کر یکسر زمامِ اختیارِ زندگی

اس قدر اس کی محبت میں ہوا بدنام میں
پڑ گئے دھوکے میں میرے رازدارِ زندگی

آہ تو نے بھی نہ سمجھا میری بدحالی کا راز
کھا گئی تو بھی فریبِ انتشارِ زندگی

کر دیا افسوس تو نے مجھ کو محرومِ سلام
لے گئی تو چھین کر میرا قرارِ زندگی

چھا گیا میری نگاہوں میں اندھیرا یاس کا
ہو گیا تاریک میرا روزگارِ زندگی

میں ہوں اب بے بہرۂ لطفِ بہارِ زندگی
وقفِ کلفت ہیں مرے لیل و نہارِ زندگی

میلا رام وفاؔ

پورس

ژین راسین کے قلم سے

ابتدا میں تو بس اتنا ہی خیال تھا۔ کہ اِس بے مثال ڈراما کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کیا جائے۔ مگر بات سے بات نکلتی آئی۔ اور مضمون میں ایک متنوع دلچسپی پیدا ہوگئی۔ رسائن کا طرزِ نگارش اس کے سوانح حیات۔ پورس کی تاریخی حیثیت اور ڈراما کی کتھا کے ماخذ ایسے مباحث ہیں۔ جو جداگانہ دل آویزیوں کا سامان رکھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اس سازو سامان کے بغیر اس ڈراما کا پیش کرنا اس کی وقعت کھونا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں ڈراما کی حقیقی شان نظر آئے گی۔ اور معلوم ہوگا کہ ٹریجڈی کو اصناف ادبیات میں کیوں یہ بلند منزلت حاصل ہے۔

ژین راسین

لوئی چہار دہم شاہ فرانس کے علم پرور عہد میں فن ڈراما اس معراج پر جا پہنچا۔ جو انگلستان میں اسے ملکہ الزبیتھ کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس سے قبل فرانس میں ڈراما کی حالت بہت مبتذل اور ناقابلِ التفات تھی۔ یکایک اس کا ستارہ چمکا اور کارنیل مولیر اور راسین تین ہم عصر ڈراما نگاروں نے اقلیم سخن میں ٹریجڈی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

راسین ۲۱ دسمبر ۱۶۳۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ نمک پر محصول تحصیل کیا کرتا تھا۔ راسین والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور دادا نے دستِ شفقت سر پر رکھا۔ لیکن وہ بھی دستِ اجل کی نذر ہوا۔ اور دادی نے یہ بار اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا اور ممتا کا حق ادا کر دیا۔ مگر ۱۶۴۳ء میں اس نے بھی سفرِ آخرت کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ راسین کے آفتابِ کمال نے ابھی ابھی سر نکالا تھا۔

ابتدائی تعلیم کے دوران ہی میں اُسے ڈراما سے شغف ہوا۔ اور جس قدر ڈرامے دستیاب ہوئے پڑھ کر دم لیا۔ یونان کے ڈرامہ نگار سوفوکلس اور یوری پیڈیز کے کلام کا اکثر حصہ اُسے ازبر یاد تھا۔ یہ ابتدائی مدرسہ کلیسا کے زیر اہتمام تھا۔ اور اگلے وقتوں کے پادری ڈراما کا مطالعہ اتحاد تصور فرماتے تھے۔ راسین نے یونہی مشقِ سخن کے طور پر چند سین لکھے تھے۔ وہ پادریوں کے ہاتھ آ گئے۔ اور راسین کو یہ سزا ملی۔ کہ اطالوی دعاؤں کو فرانسیسی زبان میں منظوم کرے۔ اُنیس سال کی عمر تھی جب وہ پیرس کے ایک کالج میں فلسفہ اور منطق پڑھنے کے لئے داخل ہوا۔ مگر پیرس کی رنگ رلیوں اور رندمشرب احباب کی صحبت نے مطالعہ کی بہت کم اجازت دی اور وہ دل کھول کر دادِ عیش دینے لگا۔ اس عرصہ میں اُس نے اپنا پہلا ڈراما تیار کر لیا۔ بہتیرا در بدر لئے پھرا۔ پر کسی نے نہ قبولا۔ اس تگ و دو میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کے پاس آمد و رفت کرنی پڑی۔ اور عزیز و اقربا بگڑ گئے۔ انہی ایام میں شاہی شادی... کے جشن کے سلسلے میں قصیدہ لکھا۔ اور گراں مایہ انعام ملا۔ اس کے بعد کچھ وقت قانون اور الٰہیات کے مطالعہ میں ضائع کیا۔ اور آخر ادبیات کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ۱۶۶۳ء میں اُس نے پھر پیرس کا رُخ کیا۔ جہاں اُس کی ملاقات مولیر اور بیولو سے ہوئی یہ واقعہ فرانس کے ادبیات کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بیولو سے اس کے مراسم دوستانہ میں تو عمر بھر فرق نہ آیا۔ لیکن مولیر کی عنایتوں کا جو صلہ اس نے دیا۔ وہ ناقابلِ معافی ہے۔ مگر راسین کی ناشکرگذاری اور احسان فراموشی کی یہ واحد مثال نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل اس جذبہ سے معرا تھا۔ وہی رسائن جس کے ڈراموں کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ مولیر کے طفیل پیرس کی تھیٹر نواز دنیا کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اس سے اس نے کج ادائی کی۔ مولیر نے اس کا پہلا ڈراما اس ٹھک پبلک سے نکالا کہ پیرس میں اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ڈراما زیر بحث یعنی پورس تمثیل کیا اور یہیں سے اُن کا وہ ناخوش گوار تنازع شروع ہوا۔ چونکہ ادبیات خیال کیا جاتا ہے۔ ذکی الحس شاعر کو مولیر کی کمپنی کا طرزِ تمثیل پسند نہ آیا۔ اور اس کی حریف کمپنی کو بیک وقت اس ڈراما کے کھیلنے کی اجازت دیدی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس سے مولیر کی کمپنی کی شہرت کو صدمہ پہنچا۔ مگر بایں ہمہ یہ ایسی بات نہ تھی جس کی تلافی نہ ہو سکتی۔ مگر فتنہ پردازوں کی لگائی بجھائی نے اس شکر رنجی کو عداوت میں تبدیل کر دیا۔ اس پر غضب یہ ہوا۔ کہ راسین اپنے ایک اور ڈرامے کی تمثیل کے لئے مولیر کی کمپنی کی مشہور ایکٹرس "دوپارک" کو نکال لایا۔ ڈراما تو ایسا کامیاب رہا کہ نقاد راسین کو مدِمقابل تسلیم کرنے لگے۔ مگر ایک سچا دوست ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل گیا۔

اب ہر سال راسین کا ایک نیا ڈراما سٹیج پر آنے لگا۔ اور ۱۶۶۷ء

تک اس کے دس ڈرامے تمثیل ہو گئے۔ آخر وہ عزت اور شہرت کی اس منزل پر پہنچ گیا۔ جو پیرس میں قدر افزائی کی حدِ آخر ہے۔ یعنی ۱۶۷۲ء میں اُسے اکیڈیمی کا ممبر بنایا گیا۔ جس کے ممبر ایک وقت میں صرف چالیس چوٹی کے علما ہو سکتے ہیں۔ اس کے چار سال بعد وہ بیہو کی معیت میں شاہی وقائع نگار مقرر ہوا۔ اور ڈرامے لکھ کر روپیہ پیدا کرنے سے بے نیاز ہو گیا۔ تھیٹر سے کنارہ کشی کا دوسرا سبب یہ ہے۔ کہ اس کا ڈراما فدری۔ دچہ دی بولون کی سازش سے ناکام رہا اور اس کا دل تھیٹر کی ریشہ دوانیوں سے پھر گیا۔ بات یوں ہوئی کہ مخالفین نے اس کے ڈرامے کو ناکام کرنے کے لئے جس قدر بھی اچھی نشستیں تھیں محفوظ کرا لیں مگر تماشہ دیکھنے کوئی نہ گیا۔ لوگوں نے یہی سمجھا۔ کہ ڈراما نا معقول ہے۔ اس لئے کوئی دیکھنے نہیں جاتا۔ ادھر اسی موضوع کا ایک ڈراما ایک غیر معروف کتب فروش کے نام پر لکھ کر ایک دوسرے تھیٹر میں تمثیل کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ شرارت بہت دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ مگر اس کی شہرت کا آفتاب تھوڑی دیر کے لئے گہن میں آ گیا۔ انہی دنوں میں اس کی شادی ہو گئی۔ اور دل بہل گیا۔ آخر ناموری اور کامیابی کے مراحل پہنچ کر ۲۱ نومبر ۱۶۹۹ء کو اول منزل پر پہنچا۔

راسین کے کلام میں سوز و گداز راز و نیاز اور گھلاوٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مگر شوکت الفاظ بلند خیالی۔ اور پرواز تخیل کی بھی قلت نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سلاست زبان کے ساتھ ندرت آفرینی جیسی اس کے ہاں ہے اور کسی کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ یہی وہ بات ہے۔ جو مترجم کی قلم کا ناطقہ بند کر دیتی ہے۔ اس کے ڈراموں میں جذبات کا تصادم جا بجا ملتا ہے۔ اور صرف اسی کے بل پر ہولناک اور خون ریز مناظر کا منت کش ہوئے بغیر وہ دل میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ مگر منطقیانہ بحث کا ایجاز پڑھنے میں دوبھر اور سننے میں اجیرن ہو جاتا ہے حیثیت۔ برمحل اور بے تکلف مکالمے کیلئے جی ترستا رہ جاتا ہے۔ اور تقریروں کی طوالت بارِ خاطر ہو جاتی ہے۔ مگر وہ بھی سچا ہے۔ اس وقت رنگ یہی تھا۔ آخر کہاں تک جدت سے کام لیتا۔

رساش نے ارسطو کے اصول اتحاد ثلاثہ کی سختی سے پیروی کی ہے۔ اور اس قید و بند میں طبیعت کی روانی کے جوہر دکھائے۔ اس کے ڈراموں کے پلاٹ سیدھے سادے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور ان میں پلاٹ کی دلآویزی کم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پلاٹ "مثلث" کے معیار پر نہ کسا جاتا تھا۔

والتیر سے کسی نے پوچھا تھا۔ آپ نے کارنیل کے ڈراموں پر تو حاشیہ لکھا۔ مگر راسین کی طرف توجہ نہ کی جواب ملا کہ راسین کے ڈرامے شرح سے بے نیاز ہیں۔ وہ آپ اپنی شرح ہیں۔ انہیں پڑھو اور سچے حسین۔ رقت انگیز اور پرشکوہ لکھتے چلے جاؤ۔ اُستادی اس کا نام ہے۔ دو لفظوں میں دفتر بند کر دیا۔ واقعی جو ڈراما شرح کا محتاج ہو وہ آرٹ کے لحاظ سے ڈراما کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ لوگ ڈراما دیکھینگے۔ یا اس کی شرح ملاحظہ کریں گے۔

ڈراما پورس

اس ڈراما کی کتھا کوینٹس کرٹی آس۔ پلوٹارک اور جسٹن کی تاریخوں سے اخذ کی گئی ہے۔ پہلے یہ پورس کے نام سے شائع ہوا۔ مگر بعد میں اس کا نام "سکندر اعظم" رکھا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ فرانسیسی پبلک کے کان پورس کی نسبت سکندر کے نام سے زیادہ مانوس تھے۔ ورنہ ڈراما کا اصلی بطل (ہیرو) پورس ہے۔ چنانچہ خود راسین لکھتا ہے کہ "پورس کو اس شان سے پیش کر کے میں نے سکندر کے شایانِ شان دشمن پیدا کیا ہے۔ بعض اصحاب نے مجھے مطعون کیا ہے۔ کہ میں نے پورس کو سکندر سے بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے۔ لیکن ایسے نکتہ چین یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ باعتبار فتوحات کے سکندر کا مرتبہ پورس سے بہت بلند ہے۔ اس ڈراما کی ہر سطر اس کی مدح سے پر ہے۔ یہاں تک کہ پورس اور اکیشیا کے طعن و تشنیع میں بھی اس فاتح کی جواں مردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہاں پورس کی مصیبت اور تباہ حالی اس سے ہمدردی ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ بقول حکیم سنیکا یہ ہے۔ کہ ہم فطرتاً دنیا میں اس شخص سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں کر سکتے۔ جو مصیبت کا ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کرے"۔

اس اعتذار کے بین السطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ فرانس کو یہ ناپسند تھا۔ کہ سکندر پر پورس کو ترجیح دی جائے۔ اس لئے راسین کو ڈراما کا نام بدلنا پڑا۔ اور معذرت کرنی پڑی۔ ممکن ہے کچھ رد و بدل بھی کی ہو۔ جس کا ہمیں علم نہیں۔

تاریخی حیثیت

مولانا نظامی گنجوی نے سکندر نامہ میں یورش ہند کے متعلق بعنوان "رفتن سکندر بہ ہندوستان و فیروزی یافتن"۔ ۲۰۷ اشعار لکھے ہیں۔ اور بیان فرمایا ہے۔ کہ جب سکندر ایران کو فتح کر کے غزنی سے بلخ میں آیا۔ تو اُس نے ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اور راجہ کید رائے (بقول مولوی ہادی علی والئی کابل و لاہور) کو اعلان جنگ بھیجا۔ کہ یا تو خراج دینا قبول کرو۔ ورنہ لڑائی کیلئے تیار ہو جاؤ۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ خراج کا اقرار کیا۔ اپنی بیٹی۔ ایک جام۔ ایک حکیم اور ایک عالم بطور تحفہ اُس کی خدمت میں روانہ کئے۔ سکندر بہت خوش ہوا۔ اور راجہ کید رائے کے ملک میں آ کر جشن کر لیا تھا۔ اس کے بعد سکندر نے قنوج کے راجہ فور پر حملہ کیا۔ جس میں راجہ فور مارا گیا۔ (ظاہر ہے کہ فور پورس کا معرب ہے جس نے یونانی میں پورس کی شکل اختیار کی ہے)
(سکندر نامہ مشرح مولوی ہادی علی مطبوعہ مطبع مصطفائی [illegible])

پروفیسر کیبن لکھتے ہیں۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس وقت پنجاب میں بے شمار ہندو ریاستیں تھیں جن میں ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اور ان میں اتفاق و اتحاد کی کوئی امید نہ تھی۔ الا جب وہ دریائے جہلم کے کنارے پہنچا۔ تو ایک مقامی راجہ جسے یونانی پورس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اپنے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ راستہ روکے کھڑا تھا۔ چلیانوالے کے قریب گھمسان کا رن پڑا۔ اور پورس نے شکست فاش کھائی۔ (تاریخ ہند مصنفہ کیبن جلد اول صفحہ ۱۵)

مسٹر سمتھ نے سکندر کے حملہ کا تذکرہ ۴ صفحوں میں ختم کیا۔ جس کی تلخیص حسب ذیل ہے۔ بلخ کو فتح کرنے کے بعد سکندر نے ہندوستان کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ اور ہیپ فس شس اور پرڈکاس کو افواج کا کمانڈار مقرر کیا۔ اور ۳۲۶ قبل مسیح کے موسم بہار میں کوچ شروع ہوا۔ اٹک سے ۱۶ میل اوپر آوہند نام ایک مقام ہے۔ وہاں سکندر نے دریائے سندھ پر پل ڈالا اور ساری فوج آسانی سے پار اتر گئی۔ یہاں سکندر نے ایک ماہ قیام کیا۔ اور فوج کا دل بہلانے کے لئے کھیل تماشے ہوتے رہے۔ اس مقام پر راجہ امبھی والئی ٹکسلا کا سفیر باریاب ہوا۔ اور فرماں روائے وقت کے باپ نے جو اطاعت کی تھی۔ اس کی تجدید کی اور راجہ کی طرف سے ۱۰۰ گھوڑے ۳۰ ہاتھی ۳ ہزار بیل دس ہزار بکریاں اور ۲۰۰ من چاندی بطور نذر پیش کئے۔ راجہ ٹکسلا کے اس قدر جلد اطاعت قبول کرنے کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے ہمسایہ راجوں کے خلاف جن سے اس کی ایک مدت سے دشمنی چلی آتی تھی سکندر سے مدد لینا چاہتا تھا۔ اس وقت ٹکسلا کی حکومت جہلم اور رجوری کے راجہ اور نیز راجہ پورس سے برسر جنگ تھی۔ جس کا ملک اس علاقہ پر پھیلا ہوا تھا جسے آج کل جہلم۔ گجرات اور شاہ پور کہتے ہیں۔ ٹکسلا جس کے کھنڈر حال ہی میں راولپنڈی کے شمال مغرب میں کالا سرائے ریلوے سٹیشن کے پاس برآمد ہوئے ہیں۔ اور میلوں میں پھیلے ہیں۔ اس زمانہ میں مشرق کے ممتاز شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اور شمالی ہند میں علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

جب راجہ امبھی نے سکندر کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا تو اس نے راجہ کو خلعت دیکر اسے اس کے باپ کا جائز وارث قرار دیا۔ شکریہ کے طور پر راجہ امبھی نے سکندر کی خدمت میں ۸۰ من چاندی کے سکے اور سکندر اور اس کے بڑے بڑے اہلکاروں کیلئے سونے کے تاج پیش کئے۔ اس کے علاوہ ۵ ہزار سپاہیوں کا لشکر اس کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ اس عرصہ میں راجہ جھمبر اور رجوری کے ایلچی آئے اور یہ خوشخبری سنائی کہ ان کا راجہ پورس سے ٹوٹ کر سکندر کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہے یہ درخواست قبول ہوئی۔ اب سکندر کو امید بندھی کہ راجہ جھمبر اور راجہ امبھی کی دیکھا دیکھی راجہ پورس بھی اطاعت کرلیگا لیکن جب سفیر اطاعت اور خراج کا مطالبہ کرنے کیلئے گیا تو پورس نے پر وقار جواب دیا کہ تشریف لائیے میں میدان جنگ میں آپ کا استقبال کرنے کیلئے تیار رہوں۔ یہ جواب آیا تو سکندر اور راجہ ٹکسلا کی فوج جہلم کی طرف روانہ ہوئی جس کے دوسرے کنارے پر پورس جنگ کیلئے تیار کھڑا تھا۔ ٹیکسلا سے جہلم تک ۱۱۰ میل کا سفر تھا جو انہوں نے ۴ دنوں میں طے کیا۔ ماہ مئی کے آغاز میں وہ جہلم پہنچے۔ مگر اس وقت دریا طغیانی پر اور ناقابل عبور تھا۔ اور دوسری طرف پورس اور اپنی ۵۰ ہزار کیساتھ لڑنے مرنے پر تیار رہتا تھا۔ آخر سکندر نے سپاہیانہ پیچ کھیلا۔ اور رات کے سیاہ پردے میں پورس کو جل دیکر کسی نامعلوم مقام سے دریا کے پار ہوگیا۔ اس وقت سکندر کے ساتھ ۱۱ ہزار پیادے اور تیر انداز اور ۵ ہزار سوار تھے۔ پورس کے راجکمار نے دو ہزار سوار اور ۱۲۰ رتھوں سے اس کا راستہ روکا۔ مگر شکست کھائی۔

پورس شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ سکندر کے مقابلہ کیلئے بڑھا ۲۰۰ ہاتھی تیس ہزار پیادے ۴ ہزار سوار۔ اور ۳۰۰ رتھ اس کے جلو میں تھے۔ لیکن پھر بھی پورس کو شکست ہوئی اور یہ ساڑھے چھ فٹ لمبا جوان نو زخم کھا کر بیہوش ہوگیا اور اس عالم میں گرفتار ہو کر سکندر کے روبرو آیا۔ سکندر نے پورس سے پوچھا۔ کہ اس سے کیا سلوک کیا جائے۔ پورس نے کہا جو بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں سکندر نے اس سے بھی بڑھ کر کیا۔ نہ صرف پورس کا ملک بحال رکھا بلکہ اسے اور ملک دے کر اپنا نائب السلطنت قرار دیا۔

ڈراما کا پلاٹ راجہ ٹکسلا کی بہن سکندر کے حرم میں داخل ہو چکی تھی اس نے اپنے بھائی کو سکندر کے ساتھ ملجانے پر آمادہ کیا۔ پورس اور ٹکسلا دونوں اکشیا کو چاہتے تھے اور اس رقابت کی وجہ سے ٹکسلا پورس سے برگشتہ ہو کر سکندر سے مل گیا۔ پورس خوب لڑا جب زخمی ہوا۔ تو اس نے اسی حالت میں ٹکسلا کو مار ڈالا۔ سکندر نے پورس کو معاف کر دیا۔ اس کا ملک اس کے حوالے کرکے اکشیا سے اسکی شادی کردی۔

تبصرہ ان سب امور کو زیر نظر رکھکر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کا بیان محض شاعرانہ ہے اور تاریخی تنقید کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مگر ایک بات وہ بتا گیا ہے جو حال کے مورخین کے ہاں نہیں پائی جاتی اور راسین کے ڈراما کی بنیاد ہی اس بات پر ہے۔ کہ راجہ ٹکسلا کی بہن سکندر کے حرم میں تھی۔ ممکن ہے راسین نے یہ واقعہ کسی یونانی تاریخ سے اخذ کیا ہو۔ بہرحال اسکی تائید نظامی سے ہوتی ہے۔ اور سب واقعات قریباً تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اکشیا کا وجود تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور یہ سراسر راسین کی تخلیق ہے اہل فن جانتے ہیں کہ تاریخ میں اس طرح تصرف کر لینا فن کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ ڈراما نگار مورخ کی پیروی کا پابند نہیں۔ اسے ایک جذبہ لینا ہے بس۔ وہ کس طرح بروئے کار آیا یہ دکھانا ڈراما نگار کا کام ہے۔

باقی آئندہ

نور الہی محمد عمر

قیدی

مختصر افسانہ نگاری کا بانی ایڈگر ایلن پو

Edgar A. Poe

ایڈگر ایلن پو

جب ہم کہتے ہیں۔ کہ پو کا تخیل غیر معمولی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ تو اس ہماری مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ فطری طور پر ان اسباب سے اچھی طرح واقف ہے۔ جو ایک مختصر کہانی یا افسانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں مختصر افسانہ اپنے اختصار کی وجہ سے ان واقعات اور تجربات کے بیان سے قطعاً قاصر رہتا ہے۔ جو معاشرتی طور پر اہم خیال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ان غیر معمولی واقعات و حادثات سے بحث کرتا ہے جو آغاز افسانہ ہی سے ہماری توجہ اور اشتیاق کا مرکز بن جاتے ہیں سب سے پہلے فرانسیسی نقاد موسیو "برونیتیر" نے افسانے کے ان معمولی اور غیر ضروری اسباب کی طرف توجہ کی جن پر افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور اس امر کی وضاحت کی کہ افسانے کے مواد کو جذبات کے اس تغیر و تبدل اور خصوصیات میں تلاش کرنا چاہیے۔ جو علم نفس[1] اور علم افعال الاعضا[2] کی نگاہ میں تو اہمیت رکھتے ہوں لیکن معاشرتی لحاظ سے انہیں کچھ وقعت نہ دی جا سکتی ہو۔

موسیو برونیتیر لکھتا ہے۔ کہ افسانے کے لئے واقعات کو زندگی کی شاہراہ میں سے نہیں لیا جاتا۔ بلکہ ان کی تلاش اس کی سرحد پہ کی جاتی ہے۔ موسیو برونیتیر کے الفاظ میں ان واقعات کو لیا جاتا ہے۔ جو "حاشیے یا کنارے پر واقع ہوتے ہیں" "حاشیے پر کے واقعات" کے الفاظ پو کی تخیل سے لبریز تصانیف کیا نظم اور کیا نثر کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ پو کی تصانیف کی حاشیے پر کے واقعات پر بنیاد ہے۔ وہ مرکزی نہیں ہیں۔ ان کی تکمیل زندگی کی شاہراہ پر نہیں۔ بلکہ اس کی حدود پہ کی گئی ہے۔ پو ان تجربات کو بیان کرتا ہے جو ادراک اور فقدان شعور کی سرحد پہ حاصل ہوتے ہیں وہ اپنی غیر معمولی سلاست زبان اور قادر الکلامی سے اعصاب کی آخری مدہوشی کو بھی بیان کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل سطور میں وہ اس شخص کے احساسات بیان کرتا ہے جسے ابھی ابھی موت کا فتویٰ سنایا گیا ہے۔

"فتوائے موت کا خوفناک فتویٰ آخری الفاظ تھے۔ جو میرے کانوں تک پہنچے اسکے بعد ججوں کی آوازیں ایک خواب آلود شور اور بھنبھناہٹ میں گم ہو گئیں اس نے میرے دل میں انقلاب کا خیال پیدا کر دیا شاید اسلئے کہ خیال میں یہ آواز کارخانے کے پہیے کی آواز کے مشابہ تھی یہ بھی نہایت مختصر اور اسکے بعد مکمل سکوت اب میں نے ڈر اور خوف کے جذبات کیساتھ سیاہ لباس والے ججوں کے ہونٹوں کی طرف دیکھا وہ مجھے سفید دکھائی دیتے تھے سفید اس کاغذ سے بھی سفید جس پر یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور نہایت پتلے تھے طبیعت کی مضبوطی ہچنہ ارادے اور انسانی عذاب کی حقارت اور سختی کا اظہار کرتے تھے میں نے دیکھا میری قسمت کا فیصلہ ابھی تک ان پر جاری تھا میں نے انکو خوفناک الفاظ کیساتھ تھرتھراتے دیکھا میں نے اپنا نام سنا اور میں کپکپا گیا۔ وہ پھر خاموش تھے پھر چند لمحے ہوش اور خوف کیساتھ میں نے کمرے کی دیواروں کے سیاہ ہاتھی پردوں کی غیر محسوس اور نرم نرم حرکت کو دیکھا پھر میری نظر میز پر کی لمبی لمبی موم بتیوں پر پڑی ان میں ہمدردی جھلکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ سفید پوش اور نازک تن فرشتے ہیں جو میری نجات کے لئے آئے ہیں لیکن اچانک میری روح پر ایک ناخوشگوار کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے جسم کی رگ رگ لرز رہی ہے گویا کہ میں نے کسی برقی آلے کو چھو لیا ہے اب یہ بتیاں بے رحم دیو معلوم ہوتی تھیں جن کے سر شعلوں کے تھے۔ اور میں نے دیکھا اُن سے مدد کی کوئی توقع نہ تھی۔ پھر موسیقی کے ایک بلند آہنگ نغمے کی مانند میرے ذہن میں یہ خیال آتا۔ کہ قبر میں کس قدر پرسکون آرام میسر ہو گا"

ایڈگر ایلن پو بوسٹن واقع ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹ جنوری ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوا۔ اُس کی تصانیف کی چند خصوصیات اس کے نسلی رجحان یا میلان کیطرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اس کا باپ گو امریکہ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک آئرش گھرانے سے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ والدین کے پیشے کا اثر نسلی رشتے سے کہیں زیادہ اہم امر ہے اُس کے ماں باپ دونوں ایکٹر تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باپ کا تھیٹر کی طرف پیدائشی رجحان تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد منش، اور آوارہ گرد آدمی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی کرنے میں اس نے احمقانہ جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اور یہ امر تو یقینی ہے کہ ایڈگر کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ پو کی عمر دو سال کی تھی۔ کہ اس کی ماں بھی تین بچوں کو چھوڑ کر وفات پا گئی۔ پو ان سب میں بڑا تھا۔ اس کو رچ مونڈ (ورجینیا) کے ایک بے اولاد اور مالدار میاں بیوی ایلنز نے جو سکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے متبنّیٰ بنا لیا۔ اس واقعہ کے چار سال بعد یہ دونوں میاں بیوی آئر لینڈ سکاٹ لینڈ اور انگلستان کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ اور کچھ عرصے کے لئے انہیں انگلستان میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ اور ایڈگر ایلن جس کی عمر اب چھ سال تھی۔ پانچ سال کے لئے سٹاک نیوئنگٹن اسکول میں تعلیم پاتا رہا۔ جب وہ امریکہ سے واپس آئے تو اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ یہاں رچ مونڈ اسکول میں وہ ایک ہوشیار اور ذہین لیکن تند تنک مزاج اور تنہائی پسند اور اپنے الفاظ میں "ایک ایسی قوم کا لڑکا تھا۔ جو اپنی تُرشی فطرت متخیلہ اور فوراً بھڑک اُٹھنے والی طبیعت کے وجہ سے مشہور ہے"۔ پو لڑکپن میں جسمانی ورزش کا بہت شایق تھا۔ بودلیر لکھتا ہے۔ کہ گو اس کے ہاتھ پاؤں نسوانی نزاکت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ وہ اعصابی جد و جہد اور جانفشانی کے ہر طرح قابل تھا۔ وہ اپنے ہم عمر لڑکوں میں تیرنے میں سب پر

---

[1] Psycholog

[2] Physiology

بقت بنے گیا۔ وہ ذاتی وجاہت کا بھی مالک تھا۔ پسندیدہ اطوار اور خوش صورت
نے کے ساتھ قابل ذکر فصاحت اور خوش گفتاری اسے کو فطرت کی طرف سے
لیے کے طور پر ملی تھی۔ ایک بار اس نے کیپٹن کا پارٹ ادا کرتے ہوئے جولینس سیزر
ں سے چند تقریریں پڑھیں۔ اور سننے والوں کو یقین دلا دیا۔ کہ وہ فطری یا پیدائشی
بڑ ہے۔ اس کی قوت بیان کے ثبوت نہایت دلچسپ اور نمایاں ہیں۔ اس کی
مانیف میں شیکسپیئر کا تذکرہ اس امر کی بیّن گواہی دیتا ہے۔

سترہ سال کی عمر میں پو کو ورجینا کی یونیورسٹی میں بھیج گیا یہاں لاطینی اور
یسی زبان کے مطالعہ میں اُس نے اعزاز حاصل کیا۔ لیکن قمار بازی کے کسی
املے کی وجہ سے ایک سال بعد ہی اسے اس یونیورسٹی کو چھوڑنا پڑا۔ ہمیں یقین
لینا چاہیئے۔ کہ پو اپنی عمر کے اٹھارویں سال کو بیکار ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ لٹریچر
مذاق رکھنے والے بے شمار نوجوانوں کی عادت کے خلاف اُس نے اسے یادگار
بنا کر چھوڑا۔ اس نے بوسٹن جا کر نظموں کی ایک کتاب "تیمور لنگ اور دیگر نظمیں"
۱۸۲۷ء میں شائع کی۔ مسٹر ایلن نے بھی اس کتاب میں بڑی دلچسپی لی لیکن اس کی اشاعت
تھوڑے عرصے بعد ہی شاعر اور اس کا مربی چند ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ایک
دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اب ایڈگر ایلن پو ریاست ہائے متحدہ کی فوج میں بھرتی
گیا۔ اور دو سال کے مختصر عرصے میں ہی سارجنٹ میجر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس
ت اُس کی عمر بیس سال کی تھی — اس کی رضاعی ماں مسز ایلن کے فوت
ہونے پر ایڈگر اور مسٹر ایلن میں پھر مصالحت یا ملاپ ہو گیا۔ ۱۸۳۰ء میں وہ ویسٹ
اسنٹ کالج میں فوجی امیدوار کی حیثیت سے داخل ہو گیا۔ اس اثنا میں اس نے
نی دوسری کتاب بھی شائع کر دی تھی۔ یہ "تیمور لنگ، نظر ثانی کے بعد" اور "الاعراف"
مشتمل تھی۔ لیکن فوجی کالج میں اس کا رویہ غیر تسلی بخش اور بے قاعدہ خیال کیا
یا۔ اور ۱۸۳۱ء میں اسے خارج کر دیا گیا۔ اب حالات اور صورت اختیار کر چکے تھے —
مسٹر ایلن نے دوسری شادی کر لی۔ اس بیوی سے اُس کے اولاد بھی ہوئی۔
ایلن ایڈگر ایلن کو نہ جانتی تھی۔ اور وہ اپنے مربی سے ملاقات کرنے پر
مصر تھا۔ لیکن اس ملاقات کا نتیجہ ہمیشہ کی جدائی ہوئی۔

ایلن کے گھر کو خیرباد کہہ کر معلوم ہوتا ہے پو نے ایک جگہ بود و باش اختیار
کے زندگی بسر کرنے کے خیال کو بھی ترک کر دیا تھا۔ یہ حیرانی کی بات ہے کہ
س موقعہ پر اس نے اسٹیج کی طرف توجہ نہ کی۔ حالانکہ یہ شغل اُس کی طبیعت
ر ذاتی جوہر کے عین موافق تھا۔ لیکن شاید اس کے والدین کی زندگی کی
ال نے اس کی طبیعت کو تھیٹر سے متنفر اور بدگمان کر دیا تھا۔ اب اس نے
ی جدید وقت یہ نظموں کی تیسری جلد شائع کی۔ اس کے بعد ہم اسے "بالٹیمور"
عجیب ہیبت کذائی کے عالم میں دیکھتے ہیں۔ وہ "سیٹر ڈے وزیٹر" کے
تر میں اپنے افسانے "بوتل کا مسودہ" کا انعام لینے جاتا ہے۔ اور وہاں
دیکھا جاتا ہے۔ کہ یہ چھپانے کے لئے کہ کوٹ کے اندر بدن پر قمیص نہیں ہے۔
اس کے بٹن مضبوطی کے ساتھ لگا رکھے ہیں۔ اور اینڈرسے سے بیماری،
درماندگی اور خستگی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اسے "سدرن لٹریری
میسنجر" میں ملازمت مل جاتی ہے۔ اور وہ اپنے شہر رچ مونڈ کو واپس آ جاتا
ہے۔ "لیجیا" کی نوع کے خیالات "بریس" اور "مورلا" جو موضوع کے لحاظ
سے "بوتل کے مسودے" اور بلند پایہ "خاندان اشر کی تباہی" سے تعلق رکھتے
ہیں "میسنجر" میں شائع ہوتے تھے۔ پو اس رسالے کے لئے تنقید کا کام کرتا
تھا۔ اور بعد میں اس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی ہو گیا تھا۔ ۲۷ سال کی عمر میں
اس نے اپنی چچازاد بہن "ورجینا کلم" سے شادی کر لی تھی۔ اس کی عمر اس
وقت چودہ سال کی تھی۔

اب رچ مونڈ میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ لیکن نیو یارک میں
کامیابی کی امید پر اس نے اس مقام کو چھوڑ دیا۔ "نیو یارک ریویو" سے اس
کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ اور پو اپنی بیوی کے ساتھ "فیلا ڈلفیا" چلا گیا۔ یہاں
اس نے مختلف افسانے جن میں ولیم ولسن، لیجیا، اور "خاندان اشر کی تباہی"
بھی شامل تھے شائع کئے۔ ۱۸۳۸ اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
Tales of Grotesque and the Arabeque
کے نام سے شائع ہوا۔ اپنی غیر معمولی قوت تجزیہ[1] کی مدد سے اس نے عالم افسانہ
میں ایک جدید چیز "کوچہ مارگ کا قتل" کا اضافہ کیا۔ یہ افسانہ اپریل ۱۸۴۱ء میں
گریہم میگزین میں شائع ہوا۔ اس اثنا میں اس نے فیلا ڈلفیا میں کافی شہرت
حاصل کر لی تھی۔ وہ گریہم میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اور ان افسانوں کے مصنف کی
حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا تھا۔ جنہوں نے لندن اور پیرس میں ہلچل مچا دی
تھی۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے فیلا ڈلفیا کو بھی خیرباد کہا۔ اس کی وجہ ایک ایسا
المناک واقعہ ہے۔ جو ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ دردناک اور رقت انگیز
ہے۔ اس کی بیوی گا رہی تھی۔ کہ خون کی ایک شریان پھٹ گئی۔ پو کو اس کی
صحت کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اسے اس کی موت کی سب عقوبت برداشت
کرنی پڑی۔ لیکن پھر صحت کے آثار نظر آنے لگے۔ اور وہ ایک بار پھر امید و بیم
کی گرفت میں تھا۔ شریان پھر پھٹ گئی۔ یہ واقعہ تین بار ہوا۔ اور آخر وہ بیچاری
اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ پو نے غم سے نجات پانے کے لئے
شراب استعمال کی۔ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ انتہائی محبت تھی۔ ان جذبات
کے ساتھ محبت تھی۔ جو قبر کے اس پار بھی جاتے ہیں۔" وہ لکھتا ہے "میں دیوانہ
ہو گیا۔ آہ خوفناک شعور کے طویل وقفوں کے ساتھ۔ میں نے شراب پی۔ اور
خدا جانتا ہے کس قدر پی۔ میرے دشمن میرے دیوانہ پن کی وجہ شراب
بتاتے ہیں۔ حالانکہ شراب نوشی کی وجہ دیوانہ پن ہے"۔ اس مصیبت میں وہ کام

[1] پو کے افسانوں کے نام ہیں ۵۳ Analytical

نہ کر سکتا تھا۔ گو ہم میگزین کی ادارت یا ایڈیٹری اسے چھوڑنی پڑی۔ اس کی بیوی نے ۱۸۴۷ء میں جب پو کی عمر ۲۴ سال تھی۔ وفات پائی تھی۔ لیکن اس کی زندگی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک ایسی تصنیف کی فکر میں تھا جس میں کائنات کے معنی بیان کرنا چاہتا تھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ Eureka مصنف کے لئے تسکین بخش ثابت ہوئی۔ پو لیر نے اسے بڑی اہمیت دی ہے۔

پو نے ۷ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو وفات پائی۔ اس کا انجام کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں حسرت پرستوں کا انتہائی نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ نیو یارک میں آیا اور چند اوباشوں کے ہاتھ پڑ گیا جو کسی کونسل کے انتخاب میں لگے ہوئے تھے انہوں نے اس بدقسمت مصنف کو پکڑ کر شراب پلائی۔ اور اس کے ہاتھ میں کاغذ دے کر چوک میں گھسیٹتے پھرے۔ اور اس کے دوستوں نے اُس کو ایک بدر رو پہ دم توڑتے دیکھا۔ اب صرف یہ کہنا باقی ہے۔ کہ پو جس شخص کا کام کرتا تھا۔ وہ بھی پو کی طبیعت اور اس کے طرز عمل سے ناخوش تھا۔ اس نے شاعر کے ساتھ اس سختی کا سلوک کیا جس پر کینے اور بغض کا گمان ہوتا ہے۔

"ملخص" حنیف ہاشمی۔

زمانہ حال کی سب سے بڑی دریافت

کوئی نئی دریافت اپنے نتیجے اور کارآمد ہونے کے لحاظ سے بڑی ہو سکتی ہے یہ نتیجے عملی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً چیچک کا ٹیکہ۔ یا سائنٹیفک اور علمی مثلاً نیوٹن کا مسئلہ کشش زمین کہ ہر ایک چیز کو زمین اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ یا تمام ستارے اور سیارے اسی کشش سے قائم ہیں۔ اگر ہم بیکن کے خیال کو صحیح تسلیم کر لیں۔ اور ہمیں یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ "انسان خدا کی قدرت کی ترجمانی کرتا ہے لیکن قدرت کے راز سمجھنے میں اُس کی عقل اور مشاہدات محدود ہیں۔ اور اُس کی سمجھ اور طاقت زیادہ وسیع نہیں ہے"۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ جس دریافت کو ہم بیان کر رہے ہیں۔ وہ بے حد علمی ہے۔

موجودہ زمانے کا فلسفہ بہت پرانے زمانے کے خیالات کی ترمیم شدہ صورت ہے۔ ہر بڑی سچائی اور ہر بڑی ایجاد در حقیقت بہت سے دماغوں کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور بڑے بڑے موجدوں اور عالموں نے سائنس کی ترقی کے راستے میں بیحد محنتیں کی ہیں۔ اور مشقتیں اٹھائی ہیں۔

یہ مسئلہ جو زیر بحث ہے اس کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ دنیا کے تمام مظاہر کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور ہم اس مضمون میں اس کا ہلکا سا خاکہ کھینچیں گے۔

کیمسٹری کا علم ہمیں بتاتا ہے۔ کہ مادے پر جو تبدیلی آئے۔ اس سے مادہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ایک شکل میں ضائع ہو جاتا ہے۔ تو دوسری صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچائی مانی ہوئی ہے۔ ایک ناواقف یا جاہل شخص کے سامنے اگر کہا جائے۔ کہ جو چیز آگ سے جل کر بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ اس کی ہستی موجود ہے۔ تو وہ بیوقوف بنائے گا۔ دیکھو موم بتی جلتی ہے۔ اور جلکر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر ہم نظر نہ آنے والی نئی چیز (کاربن ڈائی آکسائڈ) جو موم بتی جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی ترکیب سے جمع کریں۔ تو اس میں موم بتی کی تمام چیز موجود ہوگی۔ اور موم بتی جل کر آس پاس کی آکسیجن سے مل کر اس نئی چیز (کاربن ڈائی آکسائڈ) میں بدل گئی ہوگی کاربن ڈائی آکسائڈ میں کاربن (کوئلے) کے ذرات شامل ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا کے ساتھ مل کر پودوں تک پہنچتی ہے پودے اور پیڑ گھاس پھوس پھلتے پھولتے ہیں۔ اور کاربن ڈائی آکسائڈ کھا کر بڑھتے ہیں۔ گھاس پھوس کھا کر جانور پرورش پاتے ہیں۔ جانوروں کے جسم میں اس سے چربی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان کے جسم سے چربی حاصل کیجاتی ہے جس سے پھر موم بتیاں بنائی جاتی ہیں۔

اگر غور سے دیکھیں تو مادہ کی ہر چیز میں یہی الٹ پھیر نظر آئے گا۔ ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ مادہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ صورت بدل لیتا ہے۔

اب آپ کہیں گے۔ کہ یہ تو سب کچھ ہم نے سمجھ لیا۔ لیکن ہمیں معلوم نہ ہوا۔ آخر وہ سب سے بڑی دریافت کونسی ہے جس کے لئے اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت پیش آئی۔ تو ہم یہ کہیں گے۔ کہ سب سے بڑی دریافت زمانہ حال کی یہ ہے۔ کہ جیسے مادہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح

بت بھی فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ شکلیں بدلتی رہتی ہے۔ اور نہ پیدا ہی کی جا سکتی ہے جیسے
مادہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کہیں گے۔ کہ یہ بات تجربہ کے خلاف ہے۔
سب سے پہلا سوال یہ ہوگا۔ کہ کیا سٹیم انجن قوت پیدا نہیں کرتا؟ کیا بجلی کی
مشینیں قوت پیدا نہیں کرتیں؟ کیا موٹر کار کا انجن موٹر کو بغیر قوت پیدا کئے
بیٹھے پھرتا ہے؟ جب بندوق چلتی ہے۔ تو بغیر قوت کے گولیاں گولے دور
فاصلے پر پہنچ جاتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ قدرت کی قوتوں (مکینیکل کام یعنی کلوں کا کام۔
حرارت۔ روشنی۔ بجلی۔ مقناطیس اور کیمیاوی عمل) کا آپس میں اس قدر تعلق
ہے۔ کہ ایک قوت دوسری قوت میں یا بہت سی قوتوں میں اپنے آپ کو
بلاواسطہ یا بالواسطہ بدل لیا کرتی ہے۔ اس کو ہم بالکل صاف اور کھلے لفظوں
میں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ رہے۔

بڑے بڑے شہروں میں بجلی کی روشنی بجلی کے پنکھے۔ بجلی سے کمرے
گرم رکھنے کی ہیٹر۔ اور بجلی سے موٹر چلائے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی غور کیا ہے
بجلی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ بڑے بڑے انجنوں کی بھٹی میں سینکڑوں
من کوئلہ پھونک کر حرارت پیدا کی جاتی ہے جس سے بھاپ بنتی ہے۔
اور انجن چلتے ہیں۔ یہ انجن بجلی کی مشینوں کو چلاتے ہیں۔ جن سے بجلی پیدا ہوتی
ہے۔ تاروں کے ذریعہ بجلی شہر کے گلی کوچوں میں پھیلا دی جاتی ہے۔ اب دیکھئے
جب بجلی کی قوت ہیٹر کے تاروں میں سے گذرتی ہے۔ تو ہمیں پھر حرارت حاصل
ہوتی ہے۔ جب لیمپ کے تاروں میں سے گذرتی ہے۔ تو روشنی ملتی ہے۔ اگر
بجلی کی قوت بجلی کے موٹر میں دی جائے۔ تو موٹر گھومنے لگتا ہے۔ اگر تاروں کو
لوہے کے کسی ٹکڑے پر لپیٹ دیا جائے۔ اور ان میں سے بجلی کی قوت گذاری
جائے۔ تو لوہا مقناطیس بن جاتا ہے۔ اور لوہے کی چیزوں کو اپنی طرف کھینچ
لیتا ہے۔ یعنی حرارت سے بھاپ بنی۔ انجن چلا۔ بجلی کی مشین چلی۔ اور اتنی الٹ
پھیر کے بعد بجلی کی قوت پھر حرارت۔ روشنی۔ مقناطیسی طاقت اور مکینیکل طاقت
پیدا کرنے لگی۔ غرض یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پھر کیا ایسی حالت میں کہا جا
سکتا ہے۔ کہ قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ یا قوت پیدا کی جاتی ہے؟

اوپر کے بیان کئے ہوئے حالات سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ جیسے مادہ
فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر تبدیلی کے ساتھ شکل بدل لیتا ہے۔ ایسے ہی کوئی قوت
نہ تو فنا ہوتی ہے۔ نہ پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ ہر تبدیلی پر دوسری قوت کی شکل میں
نمودار ہو جاتی ہے۔

آج سے پہلے سائنسدانوں نے یہ تو معلوم کر لیا تھا۔ کہ مادہ فنا نہیں ہوتا
بلکہ مختلف صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ ہوا تھا۔ کہ قوت بھی اس
بارے میں مادے کی طرح فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسری قوتوں کی صورتوں
میں ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ یہ بالکل نئی قسم کی اور نہایت مفید دریافت ہے جس
نے علمی تحقیقات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور اس دریافت کا نتیجہ یہ ہے کہ
بڑی بڑی کلیں اور مشینیں اسی اصول کے ماتحت بنائی جا رہی ہیں۔ اور
صنعتی دنیا میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہے ؏

سمیع اللہ

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں
زمین قصرِ سلاطین سے آ رہی ہے صدا — کہ آج منزلِ عبرت ہوں کل مزار ہوں میں
پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے — گنہگار یہ کہہ دے گنہگار ہوں میں
وہ کشتہ ہوں کہ میری لاش جس طرف گذری — زمیں پکار اٹھی قابلِ مزار ہوں میں
بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گردِ نومیدی — یہ کس کے در پہ الٰہی امیدوار ہوں میں
وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری — قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

پڑے مزے سے گذرتی ہے بے خودی میں امیر
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

امیر مینائی

ڈاکٹر جانسن!

کیا ہی لطف ہو کہ اردو کی ڈکشنری مولانا تاجور مرتب کر لیں۔ شعرائے اردو کا وہ کلام جسے زندہ رکھنے کی ضرورت ہو مرتب کر لیں۔ "تیاترہ" کے لئے ڈرامے بھی تصنیف ہو جائیں۔ ادبی دنیا کو جانسن کے ریمبلر کے مقابل میں سمجھ لیجئے۔ آئیڈلر کے نمونے کا ایک رسالہ اگر مولانا اور جاری کر دیں جو خانہ نشین کاہل الوجودوں کو مصروف مطالعہ رکھے تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔ شیکسپیئر کے مقابلہ میں شاعری کے نصب العین سے انہیں کا کلام یکجا ہو جائے۔ تو ہم تو مندرنا جور کو جانسن کا رتبہ دے دیں گے۔ اور اگر ہماری یونیورسٹی گورنروں کے علاوہ اہل علم کو بھی ڈگریاں عطا کرنے پر آمادہ ہو جائے اور جیتی قبروں پر پھول چڑھانے کا وطیرہ ترک کر دے۔ تو ہم امید کرتے ہیں کہ ہم تاجور کو ڈاکٹر تاجور پکارا کریں گے۔ کہاں تک کہ ہارے نہ ہمت لب رہے نہ رام سنتھیم کی تو یہی تمنا ہے کہ اہل سخن خوشحال ہوں۔ فائز المرام ہوں۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اہل حرفہ ان سے زیادہ قدر پاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسی ملک میں قدر شناس پبلشروں کا قحط ہے۔ یا قدر دانانِ سخن کا فقدان ہے۔ ابتدا میں ہر ملک میں اہل قلم کو تکلیفیں اور زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ پبلشر مصنفوں کے مکانوں کا محاصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور کاپی رائیٹ کے خریدتے ہیں نیلام کی طرح رقابت کی نوبت آجاتی ہے۔

ادبی دنیا کے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ہم ڈاکٹر جانسن کی سوانح عمری سے صرف وہ واقعات لکھتے ہیں۔ جو اس کی کم بضاعتی اور قدر دانوں کی کمی سے متعلق ہیں۔ اس ملک کے رہنے والوں میں مذاقِ سلیم۔ ذوقِ مطالعہ اور شوقِ معلومات پیدا کرنا ہمارے ادیبوں کا کام ہے۔ اگر پالیٹکس نے ہمارا سارا قیمتی وقت نہ لیا ہوتا۔ تو اب تک اس سفر کی کئی منزلیں طے ہو گئی ہوتیں۔

سیموئل جانسن۔ انگلستان کا مضمون نگار۔ شاعر فلاسفر لغت کا مؤلف ۱۸ دسمبر ۱۷۰۹ء میں ایک چھوٹے شہر لچفیلڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ کتب فروش تھا۔ اور ہمارے شہر لاہور کے لالہ رام کشن کی مانند کتب بینی کا شائق تھا۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں وہ آکسفورڈ کے پمبروک کالج میں بحیثیت کامنر (Commoner) کے داخل ہوا۔ تنگدستی نے اسے مجبور کیا کہ ڈگری لئے بغیر اپنے شہر کو واپس آجائے۔ جب اس کا باپ ۱۷۳۱ء میں فوت ہو گیا۔ تو اپنے ایک ہم جماعت کے پاس چلا گیا۔ جو برمنگھم میں رہتا تھا۔ اس کے ہاں وہ مہمان ہوا۔ یہاں کبھی کبھی پرچوں میں مضامین لکھ کر کچھ کما لیا کرتا تھا۔ اور بس اسی زمانے میں آپ اپنے سے زیادہ عمر کی ایک بیوہ مسز پورٹر پر عاشق ہو گئے۔ جس کے ساتھ ان کی دلبستگی ہمیشہ قائم رہی۔ اس بیوہ کی اپنی آمدنی آٹھ سو پونڈ کی تھی۔ جو جانسن جیسے شخص کے لئے گویا ایک ثروت تھی۔ یہ روپیہ ایک اکاڈمی میں لگا دیا گیا۔ مگر نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر اس نے بیرونجات کو چھوڑنے کا ارادہ کر کے دارالخلافہ لنڈن میں قسمت آزمائی کی تجویز سوچی۔ اس کا ایک نوجوان شاگرد گیرک بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب یہ دونوں لنڈن آئے۔ تو ان کے پاس چند پنس تھے۔ اب جہدِ حیات کا مسئلہ سامنے آگیا۔ رچرڈ سیویج نامی صاحب سے جانسن نے سلسلہ ارتباط پیدا کر لیا۔ جو مدت العمر قائم رہا جس کی سوانح عمری بعد میں اس نے نہایت لطافت اور دلی جوش سے تصنیف کی۔ جانسن اب گرین وچ میں رہنے لگے۔ جہاں کی رصد گاہ مشہور ہے۔ یہاں انہوں نے جوانوں (Juvenals) کی تیسری ہجو (3rd Satire) کے تتبع میں ایک نظم لنڈن نام لکھی۔ اس نظم نے بعد میں بہت شہرت حاصل کی۔ اس سے اسے دس گنیاں ملیں۔ کئی تجویزیں روپیہ کمانے کی اس نے نکالیں۔ لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بہت سے رسالے اس نے پے در پے شائع کئے۔ گریزان (Graysan) کے کتب فروش آسبرن نام نے ان دنوں ارل آف آکسفورڈ کے کتب خانہ کو خرید کر فہرست مرتب کرنے کے لئے جانسن کو مامور کر دیا۔ اس سے بھی اسے کچھ فائدہ حاصل ہوا۔ انہیں دنوں یعنی ۱۷۴۴ء میں اپنے محسن رچرڈ سیویج کی سوانح عمری لکھی۔ اور شیکسپیئر کے کلام کی ترتیب دینے کا اشتہار بھی جاری کیا۔ مگر یہ تجویز بھی بار آور نہ ہوئی۔ اس کی بجائے ایک انگریزی لغات لکھنے کی تجویز کی گئی جس کی مانگ کتب فروشوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ اس تالیف کی اجرت ۱۵ گنی فریقین میں مقرر ہوئی۔ جو باقساط جانسن کو دی جاتی تھیں۔ یہ تجویز لارڈ چسٹر فیلڈ کے پاس بھیجی گئی۔ کئی مرتبہ آپس میں گفت و شنید بھی ہوئی۔ لیکن لارڈ موصوف نے کچھ توجہ نہ کی اس سے بھی مایوسی حاصل ہوئی۔

۱۷۴۵ء کے شروع میں جانسن نے ایک ٹریجڈی Tragedy لکھی۔

ا۔ سر عبدالقادر اور حضرت سنتھیم جب اس التفات سے محروم رکھے گئے تو تلسی رام غریب کی کون پرسش کرتا ہے؟ تاجور [illegible]

نے ڈسوری لین تھیٹر میں ایکٹ کی۔ مگر اس سے کوئی مفاد حاصل نہیں
پسند عام ہوئی۔ ۱۷۵۰ء میں ایک رسالہ ریمبلر Rambler
تک ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوتا رہا۔
ڈکشنری (لغات) ۱۷۵۵ء میں مکمل ہوگئی۔ اور اس کے شائع ہونے
پر آکسفورڈ یونیورسٹی نے ایم۔اے کی ڈگری جان سن کو عطا کردی اب
سٹرفیلڈ نے بھی اس کی جانب نظر توجہ شروع کی۔ مگر جان سن نے ان
لو رد کر دیا۔ شہرت تو خاص حاصل ہوگئی۔ لیکن مالی حالت اب بھی
ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۵۶ء میں پانچ پونڈ کی ڈگری کے سلسلے میں آپ کو
ہونا پڑا۔ رچرڈسن مصنف "کلارسا" سے امداد چاہی گئی جب مخلصی ہوئی۔
ہم ذکر کرچکے ہیں۔ کہ شکسپیر کے نئے ایڈیشن نکالنے کی بھی ایک مرحلے پر
لی تھی۔ لیکن اس نے عملی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ یہی تجویز پھر تازہ
کتب فروشوں نے منظور کرلیا۔ اور چندہ کی فہرست کھول لی گئی۔ اسی اثنا
سن نے ایک اور رسالہ "آئیڈلر" کے نام سے نکالا۔ اس چندے اور اس رسالہ
سے جان سن گذر اوقات کرتا رہا۔
فسانہ ریس لس Raselu جو جان سن کی تصانیف میں شاہکار
تا ہے۔ نہایت دردناک حالت میں لکھا گیا تھا یعنی اس کی ماں مرنے
یب تھی۔ اور غریب جان سن کے پاس لچفیلڈ اپنے وطن جانے کے لئے

کرایہ تک نہ تھا۔ اس حالت میں ریسی لس فسانہ لکھا۔ اور ایک سو پونڈ کو وہ
بکا۔ مگر اس کی قسمت میں نہ تھا۔ کہ وہ اپنی عزیز ماں کی کھلی آنکھیں دیکھ سکتا۔
وہ اس کے پہنچنے سے قبل جاں بحق ہو چکی تھی۔
۱۷۶۲ء کے بہار کے موسم میں سرکار کی طرف سے ادبی خدمت کے عوض
میں تین سو روپیہ سالانہ عطا ہوا۔
مئی ۱۷۶۳ء میں جان سن کو ایک ایسا شخص مل گیا جس نے جان سن کو
زندہ جاوید بنا دیا یعنی باسول اس کا سوانح نگار جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا
رہا۔ شاید ہی کوئی ایسا سوانح عمری لکھنے والا پیدا ہوا ہو۔
دو سال بعد مسٹر تریل سے جان سن کا تعارف کرایا گیا۔ تریل کے خاندان
کا اثر جان سن کی زندگی پر ہمیشہ ہوتا رہا۔
جوہر کب تک چھپتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کی قدر ہو ہی جاتی ہے شکسپیر
کا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ ڈبلن یونیورسٹی نے ایل ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔
چند سال بعد اکسفورڈ نے ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری بخشی۔ اب ہمارے سیموئیل
جان سن ڈاکٹر جان سن کہلاتے۔ ان کی آخری تصنیف "شعرا کی سوانح عمری"
ہے۔ جو کتب فروشوں کی فرمائش پر انہوں نے ۱۷۸۱ء میں لکھی۔
۱۷۸۳ء میں جان سن پر فالج گرا اس کے بعد استسقا ہو گیا اور ۷۵ سال
کی عمر میں اسی مرض میں وفات پائی۔

شیو نرائن شمیم

دوست تا دمِ مرگ راحت افروز جاں رہے گی — زباں پہ جاری رہیگا یہ نام منہ میں جب تک زباں رہیگی
گردش زمانہ حریف عمر رواں رہے گی — حواس خمسہ بجا ہیں جب تک جفائے ہفت آسماں رہیگی
ہیں وہی ہم ہیں جن کے دردِ الفت میں مرمٹے ہم — جہاں والوں کی بے وفائی بھی یادگارِ جہاں رہیگی

وطن پرستی ہے کفر مذہب تو کفر مذہب ہے میرا ایماں
وطن کو سجدے کروں گا تا زیست یاد ہندوستان رہیگی

تاجور

اردو ادب کے اہلِ طرز

اردو زبان کی تصنیفی عمر کم و بیش چھ صدیوں کے لگ بھگ ہو چکی ہے اہلِ دکن نے ساتویں صدی ہجری تک اردو تصانیف کا سراغ لگایا ہے۔ مگر تعجب اور افسوس کی بات یہ ہے۔ کہ اس طویل مدت گذرنے پر بھی اس زبان کو کام کے مصنف بہت کم میسر آئے ہیں۔ اور ایسے اہلِ قلم جو اردو میں کسی خاص طرز کے موجد ہوں، انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔

اس افسوسناک بدنصیبی کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) فارسی زبان سرکار دربار کی زبان تھی۔ اُس میں لکھنا اُس میں بولنا اُس میں کمال حاصل کرنا وقت کی ضرورت اور عزت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج انگریزی کا طوطی بول رہا ہے کبھی فارسی کے ڈنکے بجتے تھے۔ اسلامی حکومتوں میں ہندوستان کی لینگوا فرینکا فارسی بنی رہی۔ اسلامی حکومت کی طرف سے صوبوں کے حکمرانوں راجوں مہاراجوں، نوابوں اور دوسری سلطنتوں کو فارسی زبان میں فرمان اور سفارتی خطوط لکھے جاتے تھے اردو ہمیشہ ایک تفریحی زبان کی حیثیت میں بسر کرتی رہی۔

(۲) اردو کی شاعری اور انشاپردازی کا آغاز فارسی شاعری اور فارسی انشاپردازی کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس تقلیدی زندگی نے اردو کو بہت نقصان پہنچایا۔ فارسی کی غلامی کا یہ فولادی طوق آج تک اردو کے گلے میں پڑا ہوا ہے آزاد فضا میں اڑان کی اردو کو اب تک اجازت نہیں ملی۔

(۳) اس ملک میں اہلِ قلم کی کوئی قدر نہیں۔ کوئی اُن کا پرسان نہیں بے زری اور ناداری اردو مصنفین کا حصہ بن چکی ہے۔ ملک میں اچھی تصنیف اور کام کی کتاب پریس سے نکل کر مفت گیر دوستوں کا تحفہ، بند الماریوں کی زینت اور آخر میں دیمک کی خوراک بن جاتی ہے۔

(۴) سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس ملک میں تنقید سے بڑا جرم اور نقاد سے بڑا مجرم کوئی نہیں سمجھا جاتا۔ اردو نقادوں نے جتنی گالیاں اور جس قسم کی گالیاں کھائی ہیں عجب نہیں کہ شیطان بھی اُن سے محفوظ رہا ہو! اس ملک اور خصوصاً اس زبان کے نقاد کی عزت خطرے میں، روزی خطرے میں، اور بعض اوقات زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے کبھی تصنیف یا کبھی مصنف پہ نہایت بے غرض جانب داری سے اور تنقید کے اصول کو پورے طور پر نظر کے سامنے رکھ کر تنقید کیجئے۔ اُس کی خوبیاں بڑھا چڑھا کر بیان کر دیجئے۔ لیکن مولینا آزاد کی پُر احتیاط زبان میں ایک ہلکا سا اشارہ مصنف کی کسی خامی کی طرف کر جائیے۔ پھر اس جرم کی سزا آپ تک محدود نہیں رہے گی۔ آپ کی قوم، آپ کا خاندان آپ کے اہل و عیال کوئی اُن بے پناہ تیروں سے نہیں بچیگا۔ جو مصنف اور اُس کے عقیدت مندوں کی زبان و قلم کے ترکشوں سے چلائے جائینگے۔

ان حالات میں صاحبِ طرز انشاپرداز اور مخصوص رنگ میں کہنے والے شاعر کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ صاحبِ طرز تو ایک طرف رہے۔ یہاں تو درمیانہ درجے کے ادیبوں کے لئے بھی زندگی کا میدان بہت تنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں نام کے شاعر اور نام نہاد ادیب اس کثرت سے ہیں۔ کہ اردو لٹریچر خرافات کا ایک انبار بن کر رہ گیا ہے۔ مگر کسی اچھے اور بلند رتبہ ادیب کی وفات سے محفلِ علم و ادب میں جو کرسی خالی ہوتی ہے۔ وہ خالی ہی پڑی رہتی ہے۔

اردو خوانوں بلکہ بہت سے اردو دانوں کو تو اس کی بھی خبر نہیں کہ کسی ادیب یا شاعر کے صاحبِ طرز ہونے کا کیا مطلب ہے؛ اور مطلب معلوم ہو جانے کے بعد یہ معلوم کرنا بھی اُن کے بس کی بات نہیں۔ کہ اردو ادب میں کون کون لوگ صاحبِ طرز ہیں؛ اور اُن کے طرزِ تحریر اور طریقہ بیان کی کیا کیا خصوصیتیں ہیں؟

ہمارے طلبہ تو اہلِ طرز کی جماعت سے اتنے ہی ناواقف ہیں۔ جس قدر مریخ کے باشندوں سے۔ ادھر اردو کے ممتحن حضرات طلبہ کی بے لیاقتی اور بے سوادی سے اس درجے منکر نظر آتے ہیں۔ کہ پرچہ بناتے وقت انہیں ایک باخبر ادیب فرض کر لینے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ پچھلے سال آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان مقابلہ میں اردو کے پرچوں میں ایک سوال یہ بھی دیا گیا تھا۔ کہ

"غالب کے ملہمات و مہملات پہ کچھ لکھو!"

طالب علم بیچارے "مہملات اور ملہمات" دونوں کے معنی ہی سے بے خبر تھے۔ کیا لکھتے؟ نتیجہ یہی ہوا۔ کہ دوسرے سال تک اردو ممتحن کی شان میں بے نقط قصیدے پڑھتے رہے۔

دو سال ہوتے ایف اے کے اردو امتحان میں پوچھا گیا تھا کہ

"مشرق و مغرب کی ظرافت کا فرق بیان کرو" ہم نے فورتھ ایئر (بی۔ اے) کلاس میں طلبہ سے اس سوال کا مطلب پوچھا۔ تو اٹھاون طالب علموں کی پوری جماعت کے جوابات کا مختلف الفاظ میں خلاصہ یہ تھا۔

"ایسٹ اور ویسٹ کی سویلیزیشن کا فرق کیا ہے؟ سوشل لائف میں کیا

فرق ہے۔ بی۔ اے کے طلباء کو آپ اردو دان نہ کہیں۔ تو اردو خوان ہونے میں تو اُن کے کلام ہی نہیں۔ لیکن صرف ایک لفظ "ظرافت" نے رجو کوئی مشکل بات بھی نہیں ہے) انہیں سوال ہی سمجھنے سے عاجز کر دیا۔ سوال کا جواب دینا تو بھلا اُن کے بس کی بات ہی نہ تھی۔

اِس بیان سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ یہ سوالات پیچیدہ یا مشکل تھے۔ بلکہ طلبہ کی بے لیاقتی کا اظہار مقصود ہے۔

طلبہ کی انہیں مشکلات کو پیش نظر رکھ کر ہم نے ادبی دنیا میں آسان زبان اور عام فہم طریقۂ بیان میں اردو ادب کے ہر شعبے پر تعلیمی رنگ کے مضامین لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

چوں کہ عام طلبہ اور اردو خوانوں کے لئے یہ لکھا جا رہا ہے۔ اس لئے اس میں بھاری بھرکم الفاظ۔ گرانڈیل ترکیبیں۔ ٹیڑھے ترچھے فقرے۔ اور ادیبانہ انداز بیان کو تلاش نہ کیجئے۔

اس مضمون لکھنے کا بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ طلبہ میں تنقید اور پرکھ کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس مضمون میں خالص تنقیدی زبان استعمال کی جائے گی۔ صحیح تنقید کے اصول کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھا جائے گا یعنی کسی مصنف یا شاعر کے طرز تحریر میں کوئی دلکشی اور خوبی نظر آئیگی۔ تو اُس کے متعلق تول تول کر تعریفی لفظ استعمال کئے جائینگے۔ ہمارے سارے مضمون میں اس قسم کا غیر تنقیدی کوئی فقرہ کسی کی شان میں نہ آئے گا۔ "کہ قدرت نے اس شاعر یا ادیب کو پیدا کر کے بس اپنا کام ختم کر دیا ہے" اور کسی ادیب کے طرز بیان میں کوئی خامی نظر پڑی تو اُسے بھی چھپایا نہ جائیگا۔ اور نہ اس قصور میں اُس ادیب کی گردن مارنے کا فتوے صادر ہو گا۔ نہ کسی سے بیجا رعایت کی جائے گی۔ نہ کسی کو بیجا شکایت کا موقعہ دیا جائے گا۔ جو کچھ جس کے متعلق لکھا جائے گا۔ اُس میں ہمارے دل کی زبان، قلم کی زبان سے ہم آواز ہو گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کم سمجھی سے ہم کسی ادیب کو اُسکی اصلی حیثیت میں نہ پیش کر سکیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہو گا۔ کہ کسی کے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہوئے جان بوجھ کر انصاف کا خون کریں۔

چونکہ مضمون کی سُرخی اردو شاعروں اور انشاپردازوں دونوں پر حاوی ہے اس لئے باری باری سے کبھی کسی شاعر اور کبھی کسی انشاپرداز پر تنقید کی جایا کریگی۔ اور چونکہ مضمون تعلیمی رنگ کا ہے۔ اس واسطے طریقہ بیان بھی تعلیمی قسم کا اختیار کیا جائیگا یعنی سب سے پہلے شاعر یا ادیب کے مختصر حالات، پھر اُس کے طرز تحریر (سٹائیل) کی خصوصیات خوبیاں اور خامیاں اور آخر میں اُس کے کلام یا عبارات کے چیدہ چیدہ حصے اسی سلسلے میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جائیگی۔ کہ اُسکے طرز تحریر کا اسکے ہمعصروں اور بعد کے لکھنے والوں پر کیا اثر پڑا، اور اسکے کامیاب پیرو کون کون ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

(باقی آئندہ)

تاجور

یہ درد دل بھی نہ تھا سوزش جگر بھی نہ تھی
ان آفتوں کی تو الفت میں کچھ خبر بھی نہ تھی

فلک نے کیوں شب فرقت مجھے ہلاک کیا؟
جمال دوست نہیں تھا تو کیا سحر بھی نہ تھی؟!

تمہارے دل کی نزاکت پہ اُس کو رحم آیا
نہیں تو آہ مری ایسی بے اثر بھی نہ تھی

جو آپ ہوتے ہیں منکر تو خیر ہیں جھوٹا
مرا جگر بھی نہ تھا، آپ کی نظر بھی نہ تھی

نگاہِ قہر سے دیکھا یہی غنیمت ہے!
مجھے تو آپ سے اُمید اس قدر بھی نہ تھی

اکبر الہ بادی مرحوم

جانے دو!

ان چیزوں کو جو تمہیں ترقی سے روکتی ہیں۔ اور تمہیں غمگین کر دیتی ہیں۔ جانے دو۔ لعنت، ملامت، جھڑکی، تیوری، غصہ اور نکتہ چینی کو جانے دو۔ خود غرضانہ زندگی کو خیرباد کہہ دو۔ غمگین اور فکرمند زندگی کو چھوڑ دو۔ فضول، بے فائدہ، احمقانہ اور کم عقلی کی باتوں کو جانے دو۔ تصنع، بناوٹ اور فریب کو جانے دو۔ سطحی اشیاء سے پرہیز کرو۔ ظاہری آرائش کے خیال کو ترک کر دو۔ اُن گناہوں کو جو اپاہج بنا دیتے ہیں۔ ان جھوٹے خیالوں کو جو اخلاق خراب کر دیتے ہیں جانے دو۔ اور تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ کہ اب زندگی کی دوڑ میں تم کس قدر سبک، آزاد اور حق پرست رہ گئے ہو۔ اور منزل مقصود تک تمہارا پہنچنا کس قدر یقینی ہے۔

اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آیا ہے۔ تو اُس کو بھول جاؤ۔ اگر تم اپنی تقریر، اپنے گیت، اپنی کتاب یا اپنے مضمون میں ناکام رہے ہو۔ اگر تمہارے ارد گرد کے حالات پریشان کن ہیں۔ اگر ایک غلط قدم اٹھانے سے تمہیں کچھ گزند پہنچا ہے۔ اگر تمہیں رسوا کیا گیا ہے اور تمہیں گالیاں دی گئی ہیں۔ تو اُن کو بار بار یاد نہ کرو۔ ان کی یاد کا کوئی پہلو تمہارے درد کا علاج نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان پرچھائیوں کی موجودگی تمہیں خوشی کے بہت سے لمحوں سے محروم کر دے گی۔ ان میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ انہیں چھوڑ دو۔ انہیں اپنے دل سے ہمیشہ کے لئے محو کر دو۔

اگر تم کوئی حماقت یا ناعاقبت اندیشی کا کام کر چکے ہو۔ اور لوگوں میں تمہارے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اگر تمہاری نیک نامی کو نقصان پہنچا ہے۔ اور تمہارا خیال ہے کہ تم اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ تو ان گھناؤنی اور مکروہ صورتوں کو فراموش کر دو۔ اور ان کھڑکھڑاتے ہوئے پنجروں کو ساتھ گھسیٹتے نہ پھرو۔ انہیں ذہن کی لوح سے مٹا دو۔ انہیں بھول جاؤ۔ نئی تختی سے شروع کرو۔ اور اپنی ساری ہمت اس بات پر صرف کر دو کہ آئندہ یہ دماغی تختی غلطیوں سے ہمیشہ صاف رہے گی۔

ارادہ کر لو۔ کہ آئندہ تم کچھ کرو یا نہ کرو ان مردہ ڈھانچوں کو اپنے پیچھے نہ لگائے پھرو گے۔ تاریکیوں کی پرورش نہ کرو گے۔ تاریکیوں کو منتشر ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کی جگہ سورج کی روشنی لے۔

ارادہ کر لو کہ تمہارے دل میں ماضی کی کوئی خلش باقی نہ رہے گی۔ خواہ وہ کس قدر ہی بڑی اور مشکل سے مٹنے والی کیوں نہ ہو۔ اس کو محو کر دو۔ اس کو بھول جاؤ۔ اسے مٹا دو۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھو۔ غم، فکر، تاسف اور مایوسی جیسے حقیر دشمنوں کو اپنی ہمت پر تسلط نہ جمانے دو۔ کیونکہ تمہاری آئندہ کی کامیابی کا سرمایہ یہی ہے۔

تاریک چہرہ، چڑچڑی صورت، پریشان خیالات اور تنک مزاج طبیعت اس امر کا ثبوت ہیں کہ تم اپنے نفس پر قابو پانے میں ناکام رہے ہو۔ وہ تمہاری کمزوری کے آثار اور اپنے مخالف حالات سے مقابلہ کرنے کی ناقابلیت کا اعتراف ہیں۔ ان کو بھگا دو۔ انہیں برباد کر دو۔ اپنی طبیعت پر خود تسلط جماؤ۔ دشمنوں کو تخت پر نہ بیٹھنے دو۔ تم خود حکومت کرو۔

اپنے دل سے بیماری کے ہر ایک خیال کو نکال دو۔ اگر تم نے اپریشن کرایا ہے۔ تو ہو چکا ہے۔ اب اُس کے خیال کو تاریکی میں دھکیل دو۔ اس کو یاد نہ کرو۔ بار بار اس کا تذکرہ نہ کرو۔

ہر ایک ناخوشگوار امر جس کا خیال تمہیں ستاتا اور دق کرتا ہے۔ جو تمہارے دل کے اطمینان کو برباد کرتا ہے۔ فراموش کر دو، تمہیں اس سے واسطہ ہی کیا ہے؟ تاسف اور تفکرات کی بجائے تمہیں اپنا وقت کسی بہتر کام میں صرف کرنا چاہیے۔ ان ذلیل اور حقیر چیزوں کو جانے دو۔ اگر تم ناکامرانی اور مایوسی کے چنگل میں ہو تو ان کے خلاف جنگ کرو۔ ناامیدی کو بھی اپنے دل سے اسی طرح نکال دو۔ جس طرح ایک چور کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہو۔ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں سب دروازے بند رکھو۔ زندگی اور شادمانی کے آنے کا انتظار نہ کرو۔ خود ان کی تلاش میں نکلو اور ایک بار انہیں حاصل کر کے پھر نہ جانے دو۔

ایک نوجوان لیکن مایوس مصنف لکھتا ہے۔ کہ جب وہ دیہات میں تھا۔ گایوں کو سرسبز چراگاہوں میں چرتے دیکھ کر اس کا دل رشک سے بھر جاتا "میں آہیں بھرتا اور کہتا کاش میں بھی گائے ہوتا!" ایک دن اس نے کسان سے پوچھا۔ یہ اس قدر قانع کیوں ہیں؟

"وہ جگالی کا لطف اٹھا رہی ہیں"۔ کسان نے جواب دیا۔

ہم میں سے بہت سے آدمی اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ کہ وہ ماضی کے تفکرات اور پریشان کن خیالات کو چھوڑ کر حال کا لطف نہیں اٹھاتے وہ انہیں ترک کرنا نہیں چاہتے۔ ایک پھوہڑ اور بدتمیز عورت کی طرح وہ ان پھٹے پرانے چیتھڑوں کو اٹھا کر باہر نہیں پھینکتے۔ بلکہ [illegible]

ے کرکٹ کا ڈھیر بالا خانے میں لگا دیتے ہیں - وہ ان چیزوں کو نہیں
لینے جو انہیں غمگین اور متفکر بنا دیتی ہیں - حالانکہ وہ اُن کے کسی کام کی
ں ہوتیں - گھر میں بشاشت اور اطمینان آمیز زندگی کے حیات افروز
کا کون اندازہ کر سکتا ہے ؟

اندڑیو کارنیجی نے کہا تھا " میرا نوجوان رفیق کام کرتا ہے - اور میں
ہے لگاتا ہوں - میں دعوے سے کہتا ہوں - جہاں قہقہے نہیں - وہاں
یابی کی اُمید بھی نہیں " وہ کارکن جو اپنے کام میں خوش رہتا ہے -
بے آرامیوں اور تکلیفوں کو ہنس کر گذار دیتا ہے یقینی طور پر ترقی
تا -

بہت سے لوگ اپنی پیٹھ کو غیر ضروری اور فضول بوجھ سے جھکا لیتے ہیں - یہ ان کے کسی مصرف کا نہیں ہوتا - بلکہ ان کی ہمتوں کو پست کر کے ان کی روح کو درماندہ کر دیتا ہے -

اگر ہم صرف اُن باتوں کو دِل میں جگہ دیں جو ہمارے لئے کسی صورت میں مفید ہو سکتی ہیں - اور ان فضول ، ناکارہ اور حماقت آمیز باتوں کو دِل سے نکال دیں - جو ہمارے راستے میں حائل ہوتی ہیں - تو ہم صرف ترقی ہی نہیں کرینگے - بلکہ ہماری زندگی بھی خوش اور ہم آہنگ ہوگی -

"سوویٹ مارڈن" — ڈاکٹر احمد اللہ خاں

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر
کہ تھی اِک اِک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اِک اندھیر
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے

شبِ غم صبح ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

یہی کہتا تھا گھبرا کے فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب کہ تھے
مری جانب سے تیرے دِل میں کینے

سو اس ظلمت کے پڑے ہیں کئے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

مری سینہ زنی کا شور سن کر
پھٹے جاتے ہیں ہمسایوں کے سینے

اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے

عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پلائے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو مجھے قرین تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ اتنے میں قریب خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

خاقانیٔ ہند ذوق مرحوم

عالم اطفال

زندہ قوموں کے بچّے

مغرب کی آزاد اور زندہ قومیں اس لئے دنیا میں سب سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ کہ وہاں ہر شخص اپنی قوّت بازو پر بھروسا رکھتا ہے۔ چلتے ہاتھ پاؤں دوسرے کے سہارے جینا حد سے زیادہ شرمناک خیال کیا جاتا ہے۔

کسی خاندان میں اگر دس عورت مرد ہیں۔ تو اُن میں سے کوئی بھی کسی کا دست نگر (محتاج) رہنا گوارا نہیں کرے گا۔ دس کے دس اپنی ضرورتیں اپنی کمائی سے پوری کریں گے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہندوستان میں اگر خاندان کا ایک آدمی کسی اچھے عہدہ پر ہو گیا ہے۔ تو خاندان بھر کی طاقت عمل اور کام کرنے کی ہمت تباہ ہونی شروع ہو جائے گی۔ خانداں کا ہر ممبر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھیگا۔ اپنی بسر اوقات کے لئے اپنی قوت بازو سے کام نہ لے گا۔ بلکہ بیماروں عاجزوں اور لنگڑے لُنجوں کی طرح اُس کی امداد اور دست گیری کو اپنا سہارا بنائے گا۔

خاندان کے لوگ اُس سے حسد بھی کرنے چاہئینگے۔ جگہ جگہ اُس کی برائیاں بھی کرتے پھرینگے۔ اُس کو پھنسوانے کے موقعے بھی ڈھونڈیں گے۔ مگر اتنا نہ ہو سکے گا۔ کہ محنت مشقت اُٹھا کر اُسی جیسی عزت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

باپ اگر کما رہا ہے تو بلند اقبال صاحبزادے جوان ہو کر بھی یہی چاہینگے کہ باپ کی کمائی کے حصہ دار بنے رہیں۔ ایک بھائی اگر بڑے رتبہ پر پہنچ گیا ہے۔ تو دوسرے کو اتنی توفیق نہیں ہو گی۔ کہ اُس کی طرح تکلیفیں برداشت کرے۔ اُس رتبے کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ بلکہ اس کے برخلاف بھائی کے آسرے اور رحم پر زندہ رہنا پسند کرے گا۔ اور اس طرح سست کاہل بن کر اپنے اندر جو کام کرنے کی قوت ہے۔ اُسے بے کار کر دیگا۔ اور اس طرح صرف یہی نہیں کہ اپنی زندگی کو ذلیل اپنی خودداری و غیرت کو بھی تباہ کرے گا۔ بلکہ اپنے وجود سے اپنی قوم اور اپنے ملک کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ کیوں کہ جس قوم اور جس ملک میں اُس جیسے سُست، کاہل، بے غیرت اور تندرست لُنجے ہوں گے۔ وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی اور وہ ملک ہمیشہ دوسروں کا غلام رہے گا۔ آؤ تمہیں زندہ قوموں کے دو بچوں کا حال سنائیں

ان لڑکوں کا حال پڑھ کر تمہیں اندازہ ہو گا۔ کہ ترقی کرنے والی قوم کے بچے کیسے غیرت دار بلند ہمت اور اپنے اوپر بھروسا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پچھلے پریذیڈنٹ مسٹر کولج نے اپنے نوعمر بچے کو اپنے گاؤں میں کسی کاشتکار کے ہاں نوکر رکھوا دیا۔ وہ کاشتکار چھ آنے روز پر اس لڑکے سے اپنے تمباکو کے کھیت کی نگرانی کرایا کرتا تھا۔ ایک دن یہ لڑکا کھیت سے تمباکو کے گٹھے سر پر اُٹھا اُٹھا کر گاڑی پر لدوا رہا تھا۔ گاڑی بھر چکی تھی۔ آخیر بار جو یہ سر پر گٹھا اٹھا کر چلا تو کاشتکار نے مذاقیہ طور پر لڑکے سے پوچھا۔ کہ صاحبزادے! تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ تم کتنے بڑے آدمی کے بیٹے ہو؟ مسٹر کولج جو آج امریکہ کا پریزیڈنٹ اور امریکہ کی تمام ریاستوں کا سب سے بڑا حاکم ہے۔ وہ تمہارا باپ ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ جناب! اس بے فائدہ بات میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس کی بجائے آپ مجھے یہ بتائیے کہ یہ تمباکو کا گٹھا میں کہاں رکھوں؟ میں جانتا ہوں کہ امریکہ کا موجودہ حکمران مسٹر کولج میرا باپ ہے۔ مگر اُس کی کمائی پر میرا کچھ حق نہیں ہونا چاہیئے۔ میں محنت و مشقت اٹھا کر کسی دن خود مسٹر کولج کی جگہ امریکہ کا حاکم بنوں گا۔

(۲)

انگلستان میں بڑے بڑے لائق اور مدبّر آدمیوں کی ایک کمیٹی یہ سوچنے کے لئے بنی کہ یہ معلوم کرے کہ امریکہ جو پہلے وحشی انسانوں کا ملک تھا اور جسے انگریزوں نے تہذیب سکھائی۔ اتنے تھوڑے زمانے میں کس طرح ایسی شاندار ترقی کر گیا۔ کہ آج دنیا بھر کی سلطنتیں اُس کی قرضدار ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے دولت مند امریکہ میں ہیں۔ دنیا کے بے مثل موجد امریکہ میں ہیں۔ جو نئی سے نئی ایجاد ہوتی ہے۔ امریکہ میں ہوتی ہے۔ تعلیم میں امریکہ سب سے آگے ہے۔ اس بات پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی بیٹھی تھی اُس نے چند لائق آدمیوں کو مسٹر فلپ کی سرکردگی (سرداری) میں امریکہ کی موجودہ ترقی کا سبب معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ وفد وہاں کے حالات دیکھتا بھالتا امریکہ والوں کی ترقی اور تہذیب کے اسباب اور وجوہات کا کھوج لگاتا۔ بہت دنوں کے بعد انگلستان واپس آیا۔ اور اپنی تحقیقات کی ایک رپورٹ تیار کی اُس

رپورٹ میں امریکہ والوں کی ترقی کی بہت سی وجوہات بیان کرتے ہوئے مسٹر فلپ نے ذیل کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔ کہ امریکہ کی ایک بڑی ریاست میں ہم گئے۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ ہماری ایک پڑوسن جو انگلستان چھوڑ کر امریکہ میں چلی آئی ہے اس شہر میں رہتی ہے۔ میرا جی چاہا کہ چلوں اُس سے بھی امریکہ کی ترقی کرنے کا سبب معلوم کروں۔ یہ سوچ کر میں پوچھتا ہوا۔ اُس عورت کے مکان پہنچا اُس سے ملا۔ وہ بے چاری بہت خاطر تواضع سے پیش آئی۔ اُس سے باتیں کرتے کرتے میری نظر ایک لڑکے پر جا پڑی۔ یہ لڑکا اُس کے گھر میں سپیدی پھیر رہا تھا۔ میری پڑوسن نے کہا آؤ مسٹر فلپ اس لڑکے سے تمہارا انٹرڈیوس (جان پہچان) کراؤں۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ ایک معمولی مزدور لڑکے سے بات کرنا میری شان کے خلاف ہے۔ اپنی پڑوسن سے کہا۔ کہ ایک معمولی مزدور سے ملنا میرے لئے کوئی عزت کی بات نہیں ہے۔ میری پڑوسن نے سن کر کہا۔ کہ نہیں نہیں یہ لڑکا کوئی معمولی غیر تعلیم یافتہ فرد نہیں ہے۔ بلکہ اس اتنی بڑی ریاست کے گورنر کا بیٹا ہے۔ میں یہ سُنکر بہت حیران ہوا اور اب مجھے اُس کے خیالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میری میزبان نے اُس لڑکے سے میرا تعارف (انٹرڈیوس) کرایا۔ تو میں نے اُس سے پوچھا کہ تم گورنر کے بیٹے ہو کر مزدوری کیوں کر رہے ہو؟ اُس نے کہا جناب! میں گورنر کا بیٹا ہوں۔ خود گورنر نہیں ہوں۔ اپنے باپ پر اپنا بوجھ ڈالنا ایک امریکن لڑکے کے لئے باعثِ ذلت ہے۔

مجھے پڑھنے سے جو وقت بچتا ہے اُس میں اپنے محلے والوں کا سودا سلف لا دیا کرتا ہوں۔ اس کام کی مجھے اتنی اجرت مل جاتی ہے۔ کہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ اتوار یا کسی اور چھٹی کا دن ایسے کاموں میں جو آپ مجھے کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، صرف کرتا ہوں چھٹی کے دن کے کام کی جو اُجرت ملتی ہے اُس سے اپنے کپڑوں اور کتابوں کی خریداری کا انتظام کر لیا کرتا ہوں۔"

تاجور

اِعلان

آرتھر ہلپس کا قول ہے۔ کہ "اگر تم اپنے زمانے کی معاشرت اور خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہو۔ تو اُس وقت کے تصنیف شدہ افسانوں کو پڑھو کیونکہ لوگ اپنے فرضی افرادِ قصہ کے بھیس میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا تامل کہہ دیتے ہیں۔ اگر یہ فلسفہ قابل پذیرائی ہے اور اسے ہونا چاہیئے، تو ادبی دنیا کے آئندہ نمبر میں اٹلی کے نجات دہندے بینی ٹو مسولینی کا ایک معرکتہ الآرا افسانہ ملاحظہ فرمایئے۔ جسے اس عظیم الشان انسان نے اس وقت تحریر کیا تھا جب وہ اپنے ملک کا ڈکٹیٹر بننے کیلئے جدوجہد کر رہا تھا یہ افسانہ مسولینی کی طرح بیباک اس کی ہمت کی طرح بلند اور اُس کے صحیح خیالات و جذبات کا بہترین آئینہ دار ہے۔

جس انسان کی ساری زندگی ہی افسانہ ہو، آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ پھر افسانہ میں وہ کتنی آگ اور دلسوزی پیدا کر سکتا ہے آئندہ نمبر کے مضامین اور حیرت انگیز افسانوں کے ساتھ مختصر افسانہ نگاری کے اس جوہر کو بھی ملاحظہ کیجئے۔

ایڈیٹر

دنیائے ادب

ہندوستانی ادبیات

(سے براہ راست)

اردو ہندی بنگالی پنجابی گجراتی - مرہٹی سندھی - کشمیری - پشتو تلنگو - سنسکرت

نیرنگی

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

ہمارا ملک ہندوستان پندرہ سو میل عرض میں اور اُنیس سو میل طول میں ہے۔ یعنی اس کا رقبہ اٹھارہ لاکھ مربع میل ہے۔ اس میں سات لاکھ پچاس ہزار گاؤں بستے ہیں۔ سات سو کے قریب دیسی ریاستیں ہیں۔ اگر روس کو شمار نہ کریں۔ تو یورپ کے برابر ہے لٹے فیصدی اس ملک میں اَن پڑھ ہیں مسلمانوں میں بھی بہت سی ذاتیں ہیں۔ مگر ہندوؤں میں ذات در ذات اٹھارہ سو ہیں۔ مذہبوں ملتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ دہریہ سے لے کر درخت اور سانپ تک کی پرستش ہوتی ہے بعض فحش علامات بھی قابل پرستش سمجھی جاتی ہیں۔ یہی ملک ہے جس میں پانچ کروڑ اچھوت بستے ہیں۔ اُن کے چھونے سے اعلیٰ ذات کا آدمی پلید ہو جاتا ہے اُن کے اب دن پھرنے لگے ہیں۔ زبانوں کی یہ صورت ہے۔ کہ چھ ماخذی زبانوں میں ۱۴۰ بولیاں اس ملک میں موجود ہیں۔ اِن میں سے بعض ایسی ہیں۔ کہ شمالی ہند کے باشندے قطعی سمجھ نہیں سکتے مثلاً ملیو گو۔ تامل ملیم۔ کناری وغیرہ۔

ساری دُنیا سے اونچے پہاڑ یہاں۔ ساری دنیا کے ملکوں سے زیادہ دریا ندی۔ نالے یہاں صحرا یہاں شاداب اور سرسبز دشت یہاں۔ ہر قسم کی پیداوار یہاں۔ ہر موسم یہاں۔ ہر ٹیبر یہاں۔ بارش کا یہ عالم کہ ایک جگہ ۳ انچ سال بھر میں دوسری جگہ (۴۰۰) انچ سال بھر میں پانی برستا ہے۔

یہ ملک سانپوں مچھروں کا گھر ہے ملیریا ہزاروں جانیں سال بھر میں لے لیتا ہے۔ قوی سے قوی اور ناتواں سے ناتواں اس ملک میں موجود ہیں۔

اس ملک کی طبائع بھی عجیب واقع ہوئی ہیں۔ صبح کو دوستی۔ دوپہر کو سرد مہری۔ شام کو بے اعتنائی دوسرے روز دشمنی۔ اپنے ملک کی نکتہ کم۔ دوسرے ملکوں کے رنج و راحت میں ذہنی شرکت شامل حال رہتی ہے بقول امیر

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اپنے ملک کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا ضروری نہیں کسی تجویز پر غور کرنا لابدی ہیں۔ ہاں گورنمنٹ سے شکل خوباں چھیڑ چلی جاتی ہے۔

نیرنگی کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر پنجاب کی سرحد کا پٹھان کشمیر کا پہلوان۔ پنجاب کا سکھ۔ یوپی کا لکھنوی روہیلا۔ پورب کا باشندہ۔ بنگالی اوڑیہ۔ راجپوتانہ کا راجپوت بھیل گونڈ۔ مدراسی۔ مرہٹا۔ کل ایک قطار میں بٹھا دیئے جائیں۔ اُن سے کہا جائے کہ آپس میں گفتگو کریں۔ تو وہ ششدر رہ جائیں گے۔ اگر اُن کے فوٹو کسی کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ تو ہرگز اُن کو ایک ملک کا باشندہ نہ کہے گا۔ کیونکہ نیرنگی رنگ۔ قد و قامت۔ خط و خال و قوئ جسمانی اس قدر نمایاں ہے۔ کہ کوئی انہیں ایک ملک کا باشندہ نہ کہیگا۔ ایک سراپا باہم مقابلہ کیلئے درج کرتا ہیں

کلاہ اور عمامہ ——— سر ننگا یا دو پلڑی ٹوپی
شلوار پاجامہ ——— لنگوٹی۔ دھوتی۔ تہ بند
پا پوش ——— پاؤں ننگے
داڑھی ——— داڑھی منڈی ہوئی
سر کے لمبے بال ——— سر منڈا ہوا مولوی صاحب یا سنسکرت دان پانڈے کا
برقع یعنی لفافۂ جسم ——— چہرہ برہنہ۔ جسم پر برائے نام کپڑا

ہندوستان میں یکجنسیت ہرگز نہیں نیرنگی بدرجہ غایت ہے۔ نہ زبان ایک نہ ملت ایک نہ جسم ایک نہ لباس ایک۔ نہ معلوم جب راج آئیگا تو اس ملک کی کیا کیفیت ہوگی شاید ایک رنگ میں ڈال کر سب کو ملا دیا جائیگا۔

"نیرنگ"

قاصدِ محبّت

والیولا (ایک لڑکے کے لباس میں حسین خاتون، میرے مالک اور آقا کو تجھ سے محبت ہے؛

ایسی محبت کہ اگر تیرے سر پر یکتائیِ حسن کا تاج بھی ہو تو وہ اس کا معاوضہ ہو سکتی ہے!

اولیویا۔ اُس کی محبت کیسی ہے؟

والیولا۔ اُس کی محبت میں پرستش ہے، شاداب آنسو ہیں، اُس کے نالوں میں محبت کی بجلیاں گرجتی ہیں۔ اور اُس کی آہوں سے آگ کے شعلے برستے ہیں۔

اولیویا۔ تمہارے آقا کو میرے دِل کی بات کی خبر ہے میں اُس سے محبت نہیں کر سکتی؛

پھر بھی میں اُسے نیک سمجھتی ہوں، شریف جانتی ہوں، وہ بڑی جاگیر کا مالک ہے۔ اُس کی جوانی شگفتہ اور بے داغ ہے؛

وہ آزاد، عالم اور بہادر مشہور ہے۔ اور اُس کی فطرت سراپا جود و کرم ہے۔

مگر پھر بھی میں اُس سے محبت نہیں کر سکتی۔ میرا جواب وہ مدتوں پہلے سمجھ چکا ہوگا۔

والیولا۔ اگر میرے دِل میں تمہاری محبت اُس طرح شعلہ زن ہوتی جس طرح میرے آقا کے دِل میں ہے، وہی درد و کرب اگر مجھے بھی برداشت کرنا پڑتا، وہی موت آگیں زندگی اگر مجھے بھی بسر کرنی پڑتی تو میں بھی تمہارے انکار میں کوئی مفہوم نہ پاتا!

میں اسے کبھی نہ سمجھتا۔

اولیویا۔ کیوں، تم کیا کرتے؟

والیولا۔ میں بید کی ایک کٹی تمہارے دروازے کے سامنے بناتا۔ اور میری روح تمہارے گھر میں آ آ کر میری محبت کا تقاضا کرتی۔

میں اپنی حقیر محبت اور وفا کے گیت لکھتا۔ اور آدھی آدھی رات کو بھی انہیں بلند آواز سے گاتا۔ گونجنے والی پہاڑیوں میں تمہارے نام کا شور پیدا کرتا۔ اور ہوا کے باتونی لبوں سے کہلاتا کہ اولیویا! ہوا اور زمین کے عناصر میں رہ کر تمہیں مجھ پر رحم کئے بغیر کیونکر قرار آتا ہے؟

"ہمایوں"

جستجو

میری ہر صبح تیری یاد کے ساتھ شروع ہوتی۔ اور میری ہر شام تیری ہی یاد پر ختم ہوتی ہے۔ اکثر رات کی تاریک پہنائیاں بھی اسی خیال میں بسر ہو جاتی ہیں.....

... صرف اسی تمنا میں کہ تجھے پا لوں۔

پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہوں...... تو نظر نہیں آتا۔

موسیقی کے ترنم میں تجھے ڈھونڈتا ہوں...... تو نہیں ملتا۔

بربط کے تاروں کی دل میں اثر کرنے والی صداؤں سے دریافت کرتا ہوں........ کوئی تیرا پتہ نہیں ملتا۔

پھر مایوس ہو کر دل سے پوچھتا ہوں...... کہاں ڈھونڈوں؟

جواب ملتا ہے "وہاں جہاں خیال کی نازک ترین جنبش کی بھی رسائی نہیں"۔ لیکن مایوسانہ جد و جہد آخر مجھے پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچنے کی آرزو ہے.... تجھے انہیں چیزوں میں دیکھنے لگتا ہوں اور مجھے کائنات کا ہر ہر ذرہ تجھ سے ہی مملو نظر آنے لگتا ہے۔

تجسس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دارِ امکاں میں

"نظام المشائخ"

ہندی

چاند کے ماتھے پر کلنک کیوں ہے؟

قدرت اُس حسین محبوب کے رخساروں کو بنانا چاہتی تھی۔ اُس نے فطرت کی ہر چیز میں چندرما کو سب سے خوبصورت پایا اور اُس کے بیچ میں سے دو حصے کر کے اُس کی اصلی چمک دمک سے اُس محبوبہ کے دو رخسار بنا دیئے۔ اور چاند کی دونوں قاشوں کو اُسی طرح سی دیا۔ چاند کی اصلی چمک دمک محبوبہ کے رخسار میں سما گئی اور چاند میں جو کالے کالے نشان نظر آتے ہیں جنہیں ہم کلنک کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ کلنک نہیں ہیں وہ ٹانکے ہیں جو قدرت نے اُسے شگاف دینے کے بعد سیتے ہوئے لگائے ہیں۔

چاند کی چوری

حسین محبوبہ کھلی چھت پر سویا کرتی ہے۔ چاند چوروں کی طرح روزانہ دبے پاؤں آیا کرتا اور سوتے میں اُس کے چہرے کی چمک دمک کو چرائے جاتا رہا۔ اس طرح چوری لئے ہوئے حسن کو جمع کر کے ایک دن وہ خود بھی جگمگا اٹھا۔ اُس کا چہرہ بھی محبوبہ کے سنہری حُسن کی طرح دمکنے لگا۔ لیکن چوری ایک مہاں پاپ ہے۔ چاند کو اپنے اس پاپ کا خیال آیا۔ تو اس کا مُنہ خوف اور ندامت سے زرد پڑ گیا۔ اور اس گناہ کا کفارہ (پرایشچت) اُس نے اس طرح ادا کیا کہ پاؤں کا ناخن بن کر اس کے پاؤں پر سر رکھا اور اس طرح جرم کی معافی طلب کی۔

ہری چند (سنسکرت)

بسنت

اے سکھی بسنت آگئی مگر پریتم گھر نہیں آئے مرا بے چین دل بار بار دھڑک رہا ہے۔ کوئل کی کوک سے میرے کلیجے میں ہوک اٹھی ہے۔ میں اپنے بہلنے والے نادان دل کو کس طرح سمجھاؤں۔ میں کہاں جاؤں۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی ہے کس کو کہوں کیا کہوں کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے میری جان بچ جائے ورنہ جدائی سے دل بہت دُکھی ہو رہا ہے۔ بسنت کے لئے ساری پھلواڑی دلہن کی طرح سجی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ عورت بناؤ سنگھار کر کے اپنے حسن کو دوبالا کرتی ہے جس کا پیارا شوہر پردیس سے آئے۔

سرسوتی (ہندی)

بنگالی

مُسلمانوں کا اثر بنگالی زبان پر

مسلمانوں کی فتح بنگال نے بنگالی زبان کو وہ دن دکھایا کہ بنگال ہمیشہ کے لئے اُن کا مفتوح ہو گیا۔ وہ ایران توران یا کسی ملک سے ہی کیوں نہ آئے ہوں بنگال فتح کر کے بنگالی بن گئے۔ اور آج بنگال اگر ہندوؤں کی ماتر بھومی ہے۔ تو وہ مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ وہ تجارت کے بہانے اس ملک کی مال و دولت سمیٹنے نہیں آتے تھے۔ بلکہ یہاں آ کر وہ یہاں ہی کے ہو رہے۔ اور اگر بنگالی ہندوؤں کی زبان تھی۔ تو ان سے زیادہ وہ مسلمانوں کی ہو کر رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بنگالی زبان اس ملک میں قدیم زمانے سے رائج تھی۔ یہاں تک کہ بدھ دیو کے زمانے میں بھی بولی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بنگال لٹریچر کے بانی مُسلمان ہیں۔

بہت سے مسلمان نوابوں کے نام سے یکے بعد دیگرے بے شمار ترجموں کو معنون دیکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان نوابوں کی حمایت اور دستگیری کے بغیر آج بنگالی زبان سربلند کر کے عالموں کی مجلس میں کھڑی نہ ہو سکتی۔ بلکہ اس کو گاؤں کے کسی غیر معروف گوشہ میں ہمیشہ کیلئے ذلیل اور فراموش پڑا رہنا پڑتا۔

چنانچہ بنگال میں بنگالی زبان کو قائم رکھ کر مسلمانوں نے ہمارے لٹریچر کو ہمیشہ کیلئے زیر بار احسان کر دیا۔ اور اس میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ فارسی اور عربی کے گہرے اثر نے ہماری زبان کے دل پر وہ نقش آمیزی کی جو اُس سے کبھی بھی محو نہیں ہو سکتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان نوابوں کی توجہ سے بنگالی زبان نے دوبارہ جنم لے کر دو جنمی کہلانے کی عزت حاصل کی۔ بنگالی زبان پر عربی اور فارسی نے ایک نمایاں اثر ڈالا اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے اس ادبی اثر پر ہی بس نہیں کی بلکہ زبان کو گوناگوں شاعرانہ جذبات سے لبریز کر کے آراستہ و پیراستہ کر دیا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہو گا۔ کہ مسلمان نواب ہی بنگالی ادب کے بانی ہیں۔ انہوں نے گراں مصارف برداشت کر کے شاستروں کا

یا۔ اور اُن میں دلچسپی لی۔ عربوں نے بھی سنسکرت کی بے شمار کتابوں کا
یا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ کہ مذہب اسلام کے معتقدین صرف
ِلت کے خیال سے غیر ممالک کو فتح کرتے تھے۔ لیکن یہ کہہ سکتا ہوں۔
ِگوں کو جہاں بھی علم کا خزانہ ملا انہوں نے فوراً لوٹ لیا۔ ابوالفضل
ہیں بدل کرینا میں گیا۔ اور سنسکرت سیکھی اور واپس آ کر شاستروں
لے کے بادشاہ کو خوش کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بنگالی لٹریچر
ں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور بنگالی زبان مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔
ن شعرائے بنگالی زبان میں نظمیں کہہ کر اپنی شاعری کو چمکایا اور پالا"
ہیں انہوں نے اس قدر لطف، قادر الکلامی اور گہرے شاعرانہ
ہ کا اظہار کیا۔ کہ ان کو بنگال کے مصنفین کی پہلی صف میں جگہ ملی۔
ت تو یہ ہے۔ کہ گو آج چند تعلیم یافتہ ہندو بنگالی لٹریچر کے راہنما نظر آتے
ن وہ اب بھی تمام و کمال مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس بیان
کا ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔ . . . .

. . . .

جو لوگ بنگالی زبان کی بجائے اردو کو اس ملک میں رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں مسلمانوں کی مادری زبان بنگالی ہے۔ اور وہ اپنی ماں کی زبان سے سب سے پہلے بنگالی سنتے ہیں۔ اور اس کو ان کی زبان سے بھلانے کی کوشش کرنا دیوانگی ہے۔ جب تک گھر میں ایک زبان ہے۔ اس قسم کی کوشش کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر تم کوئی بڑی چیز دے سکتے ہو تو چھوٹی چیز کو چھوڑ دو۔ اگر گھر کا چراغ بجھانا چاہتے ہو۔ تو پہلے آفتاب کی روشنی لانے کا انتظام کر لو۔ ورنہ جو کچھ اس وقت موجود ہے۔ اس کو گنوا کر تم گھر کو تاریک کر لو گے۔

محمد عبداللہ بنگالی ایڈیٹر "لائٹ" لاہور

گجراتی

میرا دل

میرے محبوب میرا دل ایک آندھی ہے۔ جو تپتی ہوئی دوپہر میں ایک دیوانے
ِلے کر جنگل کے کنارے کے درختوں سے زور آزمائی کرتی ہے۔ لیکن جب
ہیں چلتا۔ تو روتی اور کراہتی ہوئی درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہو جاتی
ے محبوب۔ میرا دل ایک سمندر ہے۔ اتھاہ اور ناپیدا کنار۔ اس میں تاریک
غاریں ہیں سیاہ اور سنگلاخ چٹانیں ہیں۔ پہاڑوں کی سی خوفناک موجیں
ں کی گہرائی میں موتی بھی ہیں۔ پاکیزہ اور چمکدار۔

میرے محبوب میرا دل وادی کا پھول ہے شگفتہ اور خوشرنگ۔ اس کی خوشبو دلآویز ہے۔ تو شام کے بھونرے کی طرح آیا اس کی سمٹتی ہوئی پنکھڑیوں میں مقید ہو گیا۔ رات اندھیری ہے۔ کوہستانی ہوا کے تند جھونکے اس کے تنے کو جھکائے دیتے ہیں۔ لیکن اے محبوب اب تو میرا ہے۔ میرا ہے زندگی کی صبح تک صبح کی ان اولیں ساعتوں تک جب سورج کی گرم اور تیز کرنیں مجھے پژمردہ کر کے ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دینگی۔

پنجابی

لہٰذا میری آنکھیں سر پر لگاتا تو میری نگاہ ہر وقت آسمان پر پڑتی لیکن
ہانے آنکھیں ماتھے کے نیچے لگائی ہیں۔ میرے لئے سوائے اس کے
چارہ نہیں۔ کہ میں ہمیشہ نیچے کی طرف دیکھوں۔ میری نگاہیں اس کے رخ
نیچے رہتی ہیں۔ اور میں اوپر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔
ٹھیک ہے کہ اس نے تیری آنکھیں ماتھے کے نیچے لگائی ہیں۔ لیکن اس
ِ دن کو چمکدار بنا دیا ہے۔ اور تو آزادی سے ہر طرف دیکھ سکتا ہے۔ اگر
ِ اسے استعمال کرتا ہے تو تو مرد کامل ہے۔

سمندر نے ندی سے پوچھا تو ہر طرح کے درخت اور جھاڑیاں بہا کر میرے پاس لاتی ہے لیکن بید کا درخت کبھی نہیں لاتی۔ ندی نے جواب دیا۔ میں اکھڑ اور سرکش درختوں کو تو اکھاڑ سکتی ہوں لیکن اُن پودوں پر جو میری رو کے سامنے جھک جاتے ہیں میرا کچھ بس نہیں چلتا۔

میں نے اُس کو دیکھا۔ اُس کی صورت آنکھوں میں سما گئی۔ اب اس کے خیال سے میرا دل روشن ہے میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ اور اس کو دیکھتا ہوں مجھے اس کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ میرے دل میں موجود ہے۔

"پنجابی" پروفیسر پرشوتم دت۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج"

مرہٹی

"چاند تو نکل آیا"

کیکر کے درختوں کے پیچھے چاند دکھائی دے رہا ہے۔ دھیما شاید کسی کا منتظر ہے۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ اور وہ شرم آمیز خاموشی کے ساتھ پگڈنڈی راستے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کھیتوں کے راستے کی طرف جس کی دونوں جانب سفید سفید پھولوں والے سرکنڈے شام کی ہواؤں میں لہرا رہے ہیں۔ میرے محبوب تو نے کہا تھا۔ "جب چاند نکلے گا" لیکن چاند طلوع ہو چکا اور تو نہیں آیا۔ کیکر کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہے اور اس کی خشک شاخوں کی ہلکی سی سرسراہٹ پر بھی مجھے تیرے پاؤں کی آہٹ کا گمان ہوتا ہے اور میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں میرا دل اچانک دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سنسنی کی ایک لہر گزر جاتی ہے۔

شام کی پوجا کے لئے جوان کنواریاں گھنٹے بجاتی ہوئی مندر جا رہی ہیں اور پجاری سنگھار کر رہے ہیں لیکن میرے من کا مندر خالی ہے میں کس کی پوجا کروں؟ کس کے لئے سنگھار کروں؟ میرے دل کے دیوتا آ اور اپنی داسی کی پوجا قبول کر۔ من کا مندر بغیر دیوتا کے سونا پڑا ہے۔ آہ ۔ تو نے کہا تھا "جب چاند نکلے گا" چاند تو طلوع ہو چکا۔ پہاڑی کا سایہ دار درختوں کے سائے اونچی نیچی زمین پر لہرا رہے ہیں۔ اور میرا دل سہم جاتا ہے۔ لیکن میں دیکھتی ہوں۔ کیکر کے درختوں کے پیچھے چاند دکھائی دے رہا ہے۔

سندھی

پند و نصائح

۱ - میں نے دنیا میں آ کر کوئی اچھا کام نہیں۔ اپنے خاوند سے جو قول کئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی پورا نہ ہو سکا۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ میرا مالک میرے ظاہر و باطن کو اچھی طرح جانتا ہے۔

۲ - جو لوگ خدا کی یاد میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی خاک بھی اکسیر بن جاتی ہے اور وہ زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔

۳ - میرے بھائی اٹھ اور خدا کی جستجو کر۔ نادان ذہن ہوشیار ہو۔ کیا خبر کہ موت کا فرشتہ تجھ کو کس وقت آ دبائے۔

۴ - بیوقوف کی طرف دیکھو۔ اس کے پاس پانی تو ہے لیکن پیتا نہیں۔ اس کے نزدیک خدا ہے لیکن دیکھتا نہیں۔ اور اپنی بدقسمتی کی شکایت کئے جاتا ہے۔

۵ - غافل اٹھ تو کب تک سوتا رہے گا۔ یہ دنیا سونے کے لئے نہیں ہے۔ نیک کام کر ورنہ تو خدا تک نہ پہنچ سکے گا۔

- بیوقوف اصل کو چھوڑ کر نقل کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور دنیا کی خاطر عاقبت بیچ دیتا ہے۔

(شاہ عبداللطیف)

---

۱ - مبارک ہیں وہ لوگ جن کو خدا نے نیک و بد میں تمیز کرنے کی عقل دی ہے اور جنہوں نے اپنے نفس پر قابو پا لیا ہے۔

۲ - بے خبر عاقبت کی تیاری کر۔ وہاں تو تجھ کو ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔ اور تو اس کو بھول بیٹھا ہے۔

۳ - یہ دنیا فانی ہے۔ اس کی تمام چیزیں فانی ہیں۔ اس خدا کی لا متناہی رحمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔

(دیوان گل)

کشمیری

پہاڑی گیت

اے بکریاں چرانے والی لڑکیوں میں سب سے خوبصورت لڑکی۔ تیرا محبوب کہاں ہے؟

کیا وہ ہے جو سوسن کے میدان میں بکریاں چراتا ہے ؟
کیا وہ ہے جو صبح کی اولیں کرنوں کی مانند خوبصورت ہے ؛
کیا وہ ہے جو چاند کی مانند دلآویز اور سحرکار ہے ؛
کیا وہ ہے جو سورج کی طرح درخشاں اور ایک چنار کی طرح تناور ہے۔
کہہ تو سہی کچھ اے چھوکری۔ تیرا محبوب کیسا خوبصورت ہے ؟
وہ کون ہے جس نے تیرے دل پر قبضہ کر لیا ہے ؛
وہ کون ہے جس کی سحر آلود نگاہوں اور لمبی گردن نے تیرے دل کو زنجیروں
میں جکڑ دیا ہے ؟

کیا اس کے ہونٹوں سے مشک اور زعفران کی خوشبو آتی ہے ؛ کیا اس کی زبان کے
نیچے شہد اور دودھ کا چشمہ ہے ؛ وہ چشمہ جسے محبت کا چشمہ کہا جاتا ہے۔
کیا وہ چمنستان کا فوارہ اور زندگی بخش پانی کا کنواں ہے ؛
کہہ تو سہی کچھ اے چھوکری ! تیرا محبوب کیسا خوبصورت ہے ؟
اے تخت سلیماں کی حسین عورتو مجھ سے یہ باتیں نہ کرو۔
میرا محبوب اپنی بکریاں چرانے گیا ہے اور وہ وادی کے پھولوں کا ہار بنا رہا ہے
ہاں ! ہاں وہ میرے لئے ہار بنا رہا ہے۔ وہ میرا ہے اور میں اپنے محبوب کی ہوں۔
اے تخت سلیماں کی عورتو مجھ سے یہ باتیں نہ کرو ۔

(عبدالرحیم بی اے کاشمری)

پشتو

عشق کا انجام

اے دوست اگر دشمن تیرا دوست نہیں ہوتا تو تجھے چاہیئے تو بھی اس کا دوست نہ
بنے۔ اے دوست تو نے دیکھا۔ خضر نے آب حیات پیا لیکن دنیا کے کارخانے میں اس کا
نشان تک نہیں ملتا۔ اور سکندر کو بھی دیکھا ہے۔ اے دوست وہ بہادروں کے دلوں میں
زندہ ہے۔ اے دوست تو نے دیکھا۔ باغ میں پرندے کیا گا رہے ہیں ؛ وہ پھولوں
اور کلیوں کو جگا رہے ہیں۔ کیونکہ زندگی جاگنے کا نام ہے نہ کہ سونے کا۔
اے دوست تو کب تک عشق سازی میں لگا رہیگا عشق میں کیا ہے ؛ دل کا درد ، زرد
چہرہ اور دنیا بھر کی مصیبتیں ، مجنوں کی آوارگی ، کوہکن کی کوہ تراشی۔
اور اے دوست تجھے معلوم ہے عشق بازی کا انجام کیا ہے ، دل کے درد کا اسود
کس قدر جانگداز ہوتا ہے۔ اور چہرے کی زردی کیا جتاتی ہے مجنوں نے جنگل جنگل پھر
کر کیا لیا اور کوہکن نے کس طرح جان دی۔
اے دوست ان سیاہ آنکھوں اور لمبی گردن والے غزالوں سے عشق نہ کر۔ ان
کی نگاہیں محبت کے سوتے تو کھول دیتی ہیں۔ لیکن اس ریگزار کو سیراب نہیں ہونے
دیتیں۔
اے دوست تو میرے کہنے پر اعتبار کر۔ میں اس جور و فریب کا لٹا چکا ہوں اور اس
جال کے اسیروں کی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ اے دوست میرے دل نے محبت سے کوئی
فیض نہیں اٹھایا۔

”دیوان رحمان“، پشتو۔

تلنگو

سکون

آہ۔ یہ کیا لذت ہے مدہوشی آمیز جو لامحدود کائنات پر طاری ہے ہر جاندار
مخلوق مسرت کے گیت گا رہی ہے لیکن کیا یہ صرف میرے لئے ہے۔ کہ مصائب رفتہ کی یاد
سے جو ابھی تک میرے دل میں تازہ ہے۔ آنسوؤں کا خاموش دریا امنڈ امنڈ کر آنکھوں
میں آئے۔
میں اپنی آنسوؤں سے بھرائی ہوئی آواز سے کس طرح تیری عظمت کے گیت
گاؤں۔ پس میں اپنے دل کو تیرے حسن کے امرت سے لبریز کر دونگا۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوسکا۔
تو ایک ناپائیدار پھول کی طرح شگفتہ ہو کر اپنی شاخ سے گر جاؤنگا۔
لیکن اس کے لئے جو تیرے لطف و کرم کا بھکاری ہے۔ اس سکون کا تصور
کافی ہے۔ کیونکہ تیرے پاؤں کی خاک سے میں اپنے محبت بھرے دل پر رنگ آمیزی
کر دونگا۔

سنسکرت

تصویر یار

مندرجہ ذیل اقتباس ہندوستان کے عدیم المثال شاعر کالیداس کے شاہکار شکنتلا سے
لیا گیا ہے۔ راجہ اپنے دوست کو شکنتلا اور اس کی دو سہیلیوں کی تصویر دکھا کر پوچھتا ہے کہ ان میں
شکنتلا کونسی ہے۔
دوست۔ یہ وہ تینوں [illegible] کے درخت سے سہارا لگائے کھڑی ہے۔
وہ آم کا درخت جس کے سرسبز پتوں پر بارش کے پانی کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ جو ابھی
[illegible]
اس کی نازک باہیں نہایت دلآویزی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔
اس کا چہرہ گرمی کی تابش سے تمتمایا ہوا ہے۔ چند پھول بالوں سے گرتے ہیں
جو پریشاں ہو کر گردن تک لٹک آئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور شکنتلا ہوگی۔
راجہ۔ دیکھو ! شہد کی ایک شاخ کھی اس کے پیارے ہونٹوں پر گلاب
کی کلی سمجھ کر بیٹھ گئی ہے۔

بیرونی ادبیات سے

(براہِ راست)

عربی	انگریزی	جاوی
فارسی	فرانسیسی	ملایا
ترکی	جرمن	ڈچ
	ہسپانوی	

فارسی

اشک

"مجھ سے نہ پوچھو کہ میں کیا ہوں ؟ !

میں پانی کا ایک چمکدار اور شفاف قطرہ ہی نہیں۔ بلکہ ننھی سی جان ایک لطیف اور چھوٹی سی عمر والی شے ہوں۔ اگر آپ میری پیدائش اور نشوونما کی کیفیت اور سوانح حیات کی داستان سنیں گے۔ تو بے شبہ آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔

میری سرگذشت آپ کے دل کو تڑپا دے گی۔ اور آپ میرے حالِ زار پر بے ساختہ رو دیں گے ۔ یہی نہیں بلکہ میری بے بسی کا تصور ہی آپ کے دل کو مضطرب کر دے گا۔

میں کم خوش قسمت اور بہت زیادہ بدقسمت واقع ہوا ہوں۔ کیونکہ دنیا میں غم سے بہت زیادہ اور خوشی سے بہت ہی کم مجھے واسطہ پڑتا ہے۔

اور تو اور دنیا میں مجھ سے زیادہ متاثر ہونے والی آج تک کوئی ہستی پیدا نہیں ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ خوشی اور غم کی کیفیت کی ایک لہر مجھے بیک وقت مضطرب اور بے قرار کر دیتی ہے۔ اور میں دیوانہ وار قلب و جگر کی خفیف سے خفیف ارادنیٰ سے ادنیٰ حرکت پر آنکھوں کی کھڑکیوں سے اچھل اچھل کر باہر نکلنے اور کود کر جان دینے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔

(یادگار ایران)

عربی

کاغذسازی

چینیوں نے ۱۰۵ء میں کاغذ سازی کا طریقہ معلوم کیا۔ یہ لوگ آج کل کی طرح چیتھڑوں، روئی، گھاس وغیرہ سے کاغذ بنایا کرتے تھے۔ چھ صدی تک یہ صنعت چین کے رازہائے سربستہ میں شمار ہوتی رہی۔ دنیا میں اور کوئی قوم اس صنعت سے آشنا نہیں تھی۔ دوسرے ملکوں میں مصری چادروں سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا۔ ۷۵۱ء کے قریب سمرقند میں دو ترک حکمرانوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ان میں سے ایک نے عرب سے امداد چاہی اور دوسرا چینیوں سے کمک کا طالب ہوا۔ چینی فوجیں جس کی طرف سے لڑیں۔ اتفاق سے اُسے شکست ہو گئی۔ غنیم کے ہاتھ ان کے بہت سے چینی سپاہی بھی قید ہو گئے۔ ان قیدیوں میں بعض لوگ کاغذ بنانا بھی جانتے تھے۔ امیر سمرقند نے ان کاغذ ساز چینی قیدیوں کی مدد سے ۷۵۱ء میں کاغذ سازی کا ایک کارخانہ بنایا۔

۷۹۴ء میں خلیفہ ہارون رشید نے سمرقند کے بعض صناعوں کو بغداد طلب کیا۔ وہاں بھی کاغذ بنانے کا ایک کارخانہ قائم ہو گیا۔ بغداد سے یہ صنعت دمشق کو منتقل ہو گئی۔ اور وہاں سے مغربی دنیا کے لئے کاغذ کی مقدار کثیر جاتی رہی۔ پھر دمشق سے کاغذ سازی مصر پہنچی۔ اور وہاں سے مصری بادشاہ [illegible]

سے سمرقند وغیرہ بشمالی افریقہ میں جگہ جگہ کاغذ سازی کے کارخانے جاری ہو گئے۔
شمالی افریقہ سے ۱۱۰۰ء میں اندلس پہنچ کر اس صنعت نے بہت فروغ پایا
یورپ بھر میں مشرق اور اندلس سے کاغذ بھیجا جاتا تھا ۱۱۸۹ء میں کاغذ کا فرانسیسی
کارخانہ قائم ہوا۔ اس کارخانے کے لئے بھی اندلس کے صناع بلائے گئے۔
پھر تو آہستہ آہستہ یورپ میں بھی کاغذ سازی کارخانے قائم ہونے لگے
اٹلی میں ۱۲۷۶ء اور جرمن میں ۱۳۹۱ء فرانس میں ۱۴۹۵ء میں کاغذ سازی
کے کارخانے جاری ہو گئے۔

(الہلال، ۱۳ جون)

ترکی

تیتری

ایک دن میں اپنے خیالات میں محو ایک چراگاہ میں پھر رہا تھا کہ ایک
خوش رنگ اور شریر تیتری نے آ کر اپنے کھیل سے میرے تصور کو پریشان کر دیا۔
تو کے اس پروانے کے نیلے اور آتشیں رنگ نے میرے دل میں خوشی
کی ایک کیفیت پیدا کر دی۔ اور میری خواہش ہوئی کہ میں اسے پکڑ لوں۔ لیکن میری
تمام کوششیں ناکام رہیں۔
پس میں نے ایک تدبیر سوچی اور اس سعی ناکام کو چھوڑ دیا۔ میں نے
اپنے ہاتھوں کو حنا اور گلاب کے پھولوں سے چھپا لیا اور وہ ... ان پر آ بیٹھی۔
اب یہ شوخ تیتری میری مٹھی میں تھی۔ اور میں نے اس سے انتقام لے لیا
تھا میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا محنت کے بعد میں نے تجھے پکڑ لیا ہے۔ اب میں فرصت
کے وقت اپنے خوش رنگ حسین قیدی کو ملاحظہ کروں گا۔ لیکن جب میں نے
اپنی مٹھی کھولی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پنکھڑیوں کی شگفتگی پرواز کر چکی ہے اور وہ
رنگ جو اس وقت جب وہ چراگاہ میں اڑ رہی تھی ہیرے کی طرح چمک رہے تھے۔
مدہم پڑ چکے تھے میں نے اپنے دل سے ایک آہ کھینچی اور کہا۔
آہ! تو جو نسیم کے ساتھ پرواز کرتی تھی۔ مسرت سے مشابہ ہے۔ کیونکہ
مسرت بھی جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ غائب ہو جاتی ہے۔

(نجم الزماں شاہی)

انگریزی

ثبات

اے بھینی بھینی دل کش اور نایاب خوشبو والی بنفشہ۔ تیری سرگذشت کیا ہے؟
پانچ ہزار سال پچیس ہزار سال ہوئے تیری خوشبو اسی طرح تھی جیسی
کہ آج ہے۔
موسم بہار سے پہلے شام کے اندھیرے میں میرے دل سے ایک دردناک
چیخ نکلتی ہے۔ جو میرے احساسات میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ مجھے بتا تو بھی
تیری یہ خاموش گفتگو میرے آرزومند دل کو کہاں سے کہاں لے جائیگی؟
آہ۔ اے میری محبوبہ۔ میری پہلی محبوبہ محبت کی تمام تر تمناؤں اور حسرتوں
کے ساتھ میں تیرے پاس آتا ہوں۔ اس سبزوادی میں جو دنیا کی پیدائش سے
اب تک سرسبز ہے میں تیرے پاس آتا ہوں۔ میرے دل میں محبت اور
گیان کا ورود ہوتا ہے میں تیرے فطری حسن کا نظارہ کرتا ہوں۔ اور حیران
ہو کر سوچتا ہوں۔ اسے میرے دل یہاں تباہی کے بعد ثبات ہے۔ خزاں
کے بعد بہار۔ نہیں بہار کے بعد بہار۔

اور تو جواب دیتی ہے "میں تیرا غم نہیں جانتی۔ تو نے اپنے پریشان
خیالات سے اپنے غم کی دنیا بسا رکھی ہے۔ میں تیرے گذشتہ اور آئندہ
حالات نہیں جانتی۔
میں ایک حسین رخ کی جھلک ہوں جو دنیا کے حسینوں کا سرتاج
ہے۔ میرے لئے وقت ایک لافانی لمحہ ہے۔ اور مرجھانے والے پھول صرف ایک
پھول۔

"اٹلانٹک منتھلی" امریکہ

زمین

نسل انسانی زمین کے بطن سے ایک ناپیدا کنار سمندر کی مانند موج در
موج نکلتی ہے۔ اور اس کی فیاض اور فراوان نعمتوں کو اپنے تصرف میں لا کر
خیال کرتی ہے کہ وہ زمین کی سرپرست دیوی اور با اختیار ملکہ ہے۔
وہ مختلف نسلوں، دہقانوں، شہزادوں کی ہم آہنگ موجوں کی ساتھ
گرتی اور ابھرتی ہے اور یہ گمان کرتی ہے کہ وہ زمین کی سطح کو ہمیشہ کی زینت
سے سجاتی ہے۔ وہ اپنے احسان جتاتی ہے۔ اور زمین کو ایسے کوڑے لگاتی
ہے جن کے صدمے سے وہ جانبر نہیں ہو سکتی۔

لیکن زمین صبر و شکر کے ساتھ شور آفرین زمانوں میں اپنے مشاغل
میں محو رہتی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ زمانہ
گذرتا جاتا ہے۔ سہانی اور گہنہ ل بھری ہوائیں چلتی ہیں۔ سمندر کے سینے سے

طوفان کی خوفناک آوازیں اٹھتی ہیں۔ پاکیزہ اور کنواری کنیا کی سی پاکیزہ صبح آتی ہے۔ سورج اس کی پیشانی پر افشاں چنتا ہے۔ اور رات کو لاکھوں ستارے آسمان کی گود میں چمکتے ہیں۔

"سرکل" امریکہ

جنّت

جنت کی ننھی ننھی نہریں قہقہے لگاتی بہی جا رہی ہیں جو آنسو ہم نے زمین پر بہائے ہیں۔ وہاں خوشی اور مسرت کے دلکش چشموں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی آنسو نہیں بہانا۔ ہمارے آنسو دنیا میں ختم ہو چکے ہیں۔

جنت کی دلآویز روشیں حسین پھولوں سے مہک رہی ہیں۔ وہ تمام خوشیاں جو دنیا میں ہمیں نصیب نہ ہو سکیں۔ وہاں بچوں کی طرح سوئی پڑی ہیں۔ اور جب ہم جنت میں جائینگے۔ وہ پھول بن کر ہمارے پاؤں میں شگفتہ ہوں گی۔

اگر میں جنت میں گیا۔ تو خدا سے یہ دعا مانگوں گا۔ کہ جنت میں بھی ہم دونوں اکٹھے رہیں۔ اور دنیا میں جن پودوں کی ہم نے آبیاری کی ہے انکی ثمر چینی بھی ہم دونوں کریں۔

اور آہ۔ اگر تو جنت میں مجھے نظر نہ آئی تو میں راستہ بھول جاؤنگا

"سک مین" انگلینڈ

خیالات

وہ اٹلی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور میں بحیرۂ قلزم کا صاف اور نیلگوں آسمان دیکھتا ہوں۔ دہوپ سے جگمگاتے ہوئے کوچہ و بازار جہاں ایام رفتہ میں دانتے متانت اور سنجیدگی سے چلتا تھا۔ اور ستونوں والے ایوان جن کے دروازوں پر چمکتے ہوئے بتوں والی بیلیں آویزاں ہیں۔ میری نظر میں پھر جاتے ہیں۔

نیلگوں سنہری اور قہقہہ نواز جھیلیں میری آنکھوں میں موجیں لے رہی ہیں۔ وہ اٹلی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور میں مجسم حسن اٹلی کو دیکھتا ہوں۔

آہ! میں یہ خواب دیکھتا ہوں۔ اور ڈبلن کے بیزار کن اور غیر دلچسپ فرش پر کھڑا ہوں۔

"ڈلفی" امریکہ

فیروز حسن بٹ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل

فرانسیسی

ستم پیشہ دیوتا

میں گہری نیند کی ان عمیق ترین گہرائیوں میں پڑی تھی جن سے میں پہلے آشنا نہ تھی۔ کہ ایک عریاں لڑکے نے آکر میرے دروازے کو کھٹکھٹایا اور ایک شور برپا کر دیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ اور بجلی غضبناک ہو ہو کر بار بار چمکتی تھی۔ میرا جو لاابالی دل بہت نرم واقع ہوا ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ لڑکا اپنے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اندر آ گیا۔

میں نے اس سے اس کا نام پوچھا لیکن اس نے کہا میں اپنا نام بھی بتاتا ہوں لیکن میں سردی سے کانپ رہا ہوں۔ مجھے آگ کی ضرورت ہے جو میرے جسم کو گرما دے۔ میں بالکل بھیگ رہا ہوں۔

وہ اپنی کمان کو نہایت احتیاط سے اٹھائے ہوئے تھا۔ اور ایسے ڈر رہا تھا۔ کہ کہیں بارش نے اس کی تانت کو خراب نہ کر دیا ہو۔

وہ کانپ رہا تھا اور مجھ سے آنکھ نہ ملانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دل میں کہا یہ بچہ ہی ہے۔ ڈر کی کونسی بات ہے۔

لیکن اس لڑکے نے شوخی سے اپنے سر کو اس طرح حرکت دی۔ کہ اس کے دلکش، لانبے سنہری بال پیچھے ہو گئے اور گوری گوری پیشانی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے ترکش سے ایک دلآویز تیر نکالا۔ اور پھر خطا نہ ہونے والے نشانے سے میرے سینے میں کھینچ مارا۔

اے ظالم اور بے وفا لڑکے تیرا خوفناک اور مسرت بخش نام میں جانتی ہوں۔ آہ! یہ تو نے میری مہربانی کا اجر دیا ہے۔ شوخ دیوتا شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔

طوفان کی ان شورشوں کے باوجود جن کی اس وقت فضا پر حکومت ہے میری کمان محفوظ ہے لیکن اے بھولی لڑکی کیا تو کہہ سکتی ہے کہ تیرا دل بھی محفوظ ہے۔

جرمن

خواب

ایک بار میں نے اپنی محبوبہ کے سادہ اور پریشان حسن کے شعلوں کا خواب دیکھا۔ خمدار زلفیں دیکھیں۔ مہندی لگے ہوئے ہاتھ دیکھے بے رحم اور ظالم ہونٹوں کا نظارہ کیا۔ ان بے رحم اور ظالم ہونٹوں کا جن پر سُرخی لگی ہوئی تھی۔ ور میں نے گیت سنے، المناک گیت، جن میں دردناک موسیقی موجیں لے رہی تھی۔

مدت کے گذرے ہوئے دنوں کے خواب اب دھندلے۔ زرد اور پژمردہ ہو چکے ہیں۔ میرے خواب کی محبوب ترین تصویر بھی اب مدھم ہے اب یرے پاس کچھ بھی نہیں۔ صرف دل میں وہ حرارت اور آگ ہے۔ جو میں اپنے ردانگیز گیتوں میں برساتا تھا۔

آہ۔ تو آوارہ و پریشان گیت رہ گیا ہے اب تو بھی سفر کا سامان باندھ۔ در رخصت ہو جا۔ اور اپنے خواب کی اس تصویر کو تلاش کر۔ جو مدت ہوئی غائب ہو چکی ہے۔

"ہائنے"

فرانس کی شہیدۂ وطن ژان دارک جرمن شاعر شلر کی نگاہ میں

تو آکاش میں دھنک دیکھتا ہے۔ آسمانوں نے اپنے زرنگار دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور وہ مغنی (گانے والے) فرشتوں کے گروہ میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اور اس کا غیر فانی کارنامہ اس کے سر پر چمک رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے ہیں۔

یہ مجھے کیا ہوا؟ ہلکے ہلکے بادل مجھے اوپر اڑا رہے ہیں۔ میرا بھاری زرہ بکتر ہلکا ہو گیا ہے۔ اور اسے پر لگ گئے ہیں۔

میں بلند سے بلند ہوتا جا رہا ہوں۔ زمین میرے نیچے اڑی جا رہی ہے۔ موت کا یہ درد مختصر ہے۔ لیکن اس کی خوشی غیر فانی۔

(جرمن) "شلر"

ہسپانوی

گیت

ہم سات بہنیں تھیں اور چراگاہ میں رہتی تھیں۔ ایک صبح جب پو پھٹ ہی تھی۔ اور شبنم پھولوں کی پتیوں پر پڑ رہی تھی۔ کوئی ہمارے باپ کو قتل کر گیا۔

اتوار کی رات کو ہمارے سپاہی نیزوں اور تلواروں سے مسلح ہو کر قاتل ٹلاش میں جا رہے تھے وہ تمام رات چلتے رہے۔ جب وہ اس گاؤں کے قریب پہنچے۔ انہوں نے اُسے کھیت میں ہل چلاتے دیکھا "آہ ہم نے تجھے پا لیا۔ ہمارے شتہ دار کا خون بہا ادا کر"

اُس نے کہا "میں تمہیں اپنی زمین اور اپنا سیاہ طویل قامت گھوڑا نگا۔ میں تمہیں اپنی ماہ پارہ لڑکی بیاہ میں دوں گا"

"ہم یہاں گھر بار زمین کے لئے نہیں آئے۔ ہم اس خون کا انتقام چاہتے ہا جو تیرے دائیں ہاتھ نے بہایا ہے"

انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اور اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اڑیوں میں ڈال دیا۔ وہ اس کے سیاہ طویل قامت گھوڑے کے پاس گئے۔ وہاں ہوں نے دیکھا۔ کہ اس کی لانبی اور سبز کی جھڑی کی مانند نازک اندام لڑکی کھڑی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں سونے کا ایک مرتبان ہے۔ اس کنواری لڑکی نے شوخی اور شرارت سے شراب شیشے کے پیالوں میں لنڈھائی۔ اور ہمارے بھائی سے شادی کر لی۔

ہمارے بھائی نے کہا اگر مجھے پہلے تیرے حسن و نزاکت کا پتا ہوتا تو میں ہرگز تیرے باپ کو قتل نہ کرتا۔ اور اس کا خون نہ بہاتا۔

اس نے کہا۔ اگر تو نے میرے باپ کا خون بہایا ہے تو میں تمام عمر اس کے غم میں سیاہ پوش رہوں گی۔ ہمارے بھائی نے اس کو اٹھا کر اپنے باوفا گھوڑے پر سوار کیا۔ اور اس کو اپنی نیلگوں عبا میں لپیٹ لیا۔

وہ چراگاہ میں ہمارے پاس آ گئے۔ اسی وقت پو پھٹ رہی تھی۔ اور شبنم پتیوں پر پڑ رہی تھی۔

جاوی

طفلِ یتیم

میں نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ پودے اسی طرح لگے ہوئے ہیں۔ فرش پر قالین بچھی ہوئی ہے۔ یہ چیزیں میں دیکھتا ہوں لیکن ابا نہیں ہیں۔

اُن کی رُوح ناپید آکار اور نیلگوں آسمان کی طرف پرواز کر گئی ہے۔

اور میں اکیلا بے یار و مددگار رہ گیا ہوں۔ کوئی نہیں ہے کہ مجھے تسلی دے۔ کوئی نہیں ہے کہ میری خبرداری کرے۔ اب میری قسمت میں رونا اور ماتم کرنا ہے۔

ہرن پہاڑیوں پر پیار سے ممیاتے اور اپنے بچوں کو گھاس کھلاتے ہیں۔ ہوا کے پرندے گھونسلوں میں اپنے بچوں کے لئے دانے لاتے ہیں لیکن میں غریب یتیم تنہا ہوں۔ میرا دل سچ ہے۔ اور غم کے بھاری بوجھ سے دبا ہوا ہے۔ کیا ابا اب مجھے کبھی نظر نہ آئینگے؟

یہ ایک پرانا مقولہ ہے۔ جس کو ہر ایک جانتا ہے۔ کہ غم کی مہر پیشانی پر گہری ہوتی ہے۔ آہ۔ میرے بال سنہری ہیں۔

آہ۔ میرا باپ مرچکا ہے۔ اب میں اس کے پہلو میں کھڑا نہ ہوسکوں گا۔

آہ۔ دیوتا کہاں تھے جب وہ مرا۔

محمد زین جاوی

ملایا

محبت کا فرشتہ

محبت کے پر ہیں۔ جن پر وہ پرواز کرتی ہے۔ زنجیریں اسے قید نہیں کر سکتیں اگر اسکو پکڑ کر قفس میں قید کیا جائے تو وہ پرواز کر جاتی ہے۔

میں جس کے ہاتھ سے محبت کا عندلیب اڑ گیا ہے۔ اس قدر جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے۔ جہاں تیرے پاؤں پڑینگے۔ محبت کے بازوں ان کو بوسہ دیں گے۔

لے یہ محبت کا ننھا سا تحفہ لے۔ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھ۔ کیونکہ یہ اُن پاکیزہ اور آسمانی مسرت کی گھڑیوں کی یاد تازہ کرتا ہے جب محبت کے فرشتے نے ہم دونوں کو اپنے بازوں سے چھوا تھا۔

محمد زین جاوی

ڈچ

سکوت

پہاڑیوں کی چوٹیاں اور گھاٹیاں اور ناہموار ٹیلے، پہاڑی ندیاں نیند میں غرق ہیں۔

درختوں کے نیچے اور رینگنے والی مخلوق تاریک، زمین پر سو رہی ہے۔

جنگلوں کے وحشی ہرن، دن بھر ناچنے والی تتلیاں ارغوانی سمندر کی گود میں رہنے والے وحشی جاندار اور سمندری پرندے بھی پر سمیٹے سو رہے ہیں

بہار کا گیت

جب بہار بادلوں اور بارش کے چھینٹوں کو منتشر کر دیتی ہے۔

اور مٹی کے گل پاش چھینٹوں کو جانے سے روک لیتی ہے۔ تو تو اے محبت کی دیوی شاعروں پر اپنے رنگا رنگ کے پھولوں کو نچھاور کرتی ہے۔

اے محبت کی ملکہ! اے انسان کی رحمدل لیکن بے پرواہ دوست تصور یا میں تجھ سے پر سکون آرام کی درخواست کرتی ہوں۔ میں تجھے مخاطب کر کے تیری تعریف کرتی ہوں۔ اور التجا کرتی ہوں کہ مجھے بھی وہ پھول عطا کر جس کا نور اور پیدائش تجھ سے ہے۔

بوساطتِ انگریزی

چینی

بے وفا خاوند

آہ۔ تو تو بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اور ریشم کے بدلے اپنا بننی کا کپڑا دیتا تھا۔
میں تو جانتی تھی۔ کہ تو ریشم نہیں چاہتا۔ تیری نگاہوں میں تو میں ریشم تھی۔
تیرے ساتھ میں ندی کے اُس پار گئی۔ اور ہم پھرتے پھراتے میلوں دُور نکل گئے۔ میں نے کہا، وہ اچھی نہیں، دوست ہمارے بیاہ کا دن مقرر کر دیں۔ میری بات کا بُرا نہ مان۔

میں تیری راہ تکتی اور تیرے انتظار میں کھڑی رہتی۔ کہ تو کب پھاٹک میں سے گذرے گا۔ اور کئی بار جب میں تیرے انتظار میں کھڑی ہوتی۔ اور تو نہ آتا۔ میرے آنسو مینہ کی طرح برستے۔ لیکن جب میں اپنے پیارے کو دیکھتی میں کھلکھلا کر ہنستی اور خوشی میں بلند آواز سے پکارتی۔ تو نے مجھے بتایا۔ کہ نجومی نے ہماری شادی کو مبارک بتایا ہے۔ میں نے کہا "تو ڈولی لا۔ میں تیری دلہن بن کر تیرے ساتھ چل دوں گی۔"

شہتوت کے پتے جنہیں ابھی خزاں کی ٹھٹھراہٹ نے پژمردہ نہیں کیا۔ دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ اے بھولی بھالی فاختہ۔ ان خوش رنگ پھلوں سے جو تیری نگاہوں کو مفتون کر رہے ہیں۔ ہوشیار رہ۔

اے حسین کنواری اپنے چاہنے والوں کے عہد و پیمان اور وعدوں پہ کان نہ دھر۔ مرد قصور کرتا ہے لیکن وقت اپنا سایہ اس کے جرم پر ڈال دیتا ہے لیکن اس عورت کی قسمت میں جو ایکبار اپنے تئیں محبت کے ہاتھوں بیچ دیتی ہے۔ ہمیشہ کی شرمساری ہے۔

شہتوت کے درختوں کے زرد اور پژمردہ پتے زمین پر گر رہے ہیں۔ جب سے میں تیری غربت کی رفیق بنی ہوں۔ سال ہا سال بے معلوم طور پر گذر گئے ہیں۔ لیکن اب میں تنہا اس ندی کے پار اتر رہی ہے۔ میرا دل ابھی تک نہیں بدلا۔ لیکن تیری باتیں جھوٹ نکلیں اور تو نے مجھے اس محبت کا ماتم کرنے کیلئے چھوڑ دیا ہے۔ جواب میری نہیں ہو سکتی۔

میں تین سال تیری بیوی رہی ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے۔ بڑی مصیبت کی زندگی کاٹی ہے۔ میں صبح سے اٹھتی تھی۔ اور بہت رات گئے سوتی تھی۔ ہر روز اسی طرح گذر جاتا تھا میں نے اپنا فرض ایمانداری کیساتھ ادا کیا۔ آہ تو نے میرا دل توڑ دیا میرے بھائیوں کو اصل بات معلوم نہ ہو گی۔ اور وہ مجھے زیادہ لعنت ملامت کرینگے۔ میں غم سے خاموشی میں گھلونگی۔ اور اپنی بدقسمتی کا ماتم کرونگی۔

آہ۔ اسکی بجائے کہ بڑھاپے میں ہم ایک دوسرے کے رفیق ہوتے میں اپنے تلخ ایام بسر کرونگی۔ آہ وہ گذرے ہوئے ایام میں دریا کے دلکش کنارے کی سیر! وہ سرسبز ساحل! وہ کوارپنے کے دن جب میرے سر کے بال کھلے ہوتے تھے۔ اور ہم دونوں دن وہاں گذار دیتے تھے۔ وہ باتیں جو ہم اسوقت کرتے تھے سچی معلوم ہوتی تھیں۔ کیا پتا تھا۔ کہ مجھے پچھتانا پڑیگا۔ مجھے کیا پتا تھا۔ کہ ایک دن آئیگا جب ہمارے عہد و پیمان ٹوٹ جائینگے۔ اور ہمیں جدا ہونا پڑیگا۔

یونانی

غیرفانی شاعر

میں نے ایک یادگار بنائی ہے۔ جو پیتل سے زیادہ مضبوط اور شاہانہ میناروں سے زیادہ بلند ہے۔ جس کو نہ بارش کی سخت بوچھاڑیں اور نہ شمال کی تند ہوائیں گرا سکتی ہیں۔ سالہا سال کا ان گنت سلسلہ اور موسموں کی پرواز اسے شکستہ نہیں کر سکتی۔

میں تمام تر نہیں مرونگا۔ میرا ایک بڑا حصہ محفوظ رہیگا۔ آنے والے دنوں میں جب پجاری خاموش اور مقدس خاتون کے ہمراہ کیپیٹول کے زینے پر چڑھیگا۔ میری یاد نہ روما میں جو میرا مسکن۔ جو کہ نسل حال ہی تھا۔ لوگوں کی مدح و توصیف میں زندہ رہیگی۔ اور میرا نام بلند کیا جائیگا جہاں دریائے "اوفیڈس" شور سے بہتا ہے۔ اور جہاں کے غریب دیہاتیوں پر ڈانوس کی حکومت ہے میں ایک معمولی آدمی سے عظیم الشان شاعر بن گیا۔ جس کے دلکش گیت اطالیہ کے ساحلوں پر گائے جاتے ہیں۔

اے شاعری کی نمگین دیوی۔ اپنا سر اٹھا۔ تیری قدر و منزلت پہچان لی گئی ہے اب تو خوش ہو کہ میرے سر پر سایہ فگن رہ۔

ہوریس

روسی
آخری ملاقات

کس زمانے میں ہم دونوں نہایت گہرے اور بے تپاک دوست تھے......
......لیکن ایک نامبارک گھڑی آئی......... اور ہم دشمن ہو کر جدا ہو گئے۔
اس کو کئی سال گذر گئے......... اس شہر میں پہنچ کر جہاں وہ رہتا تھا مجھے معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں اس کے پاس گیا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوا......... ہماری نگاہیں ملیں۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ آہ بیماری نے اسے کس قدر تبدیل کر دیا تھا۔

اس کا رنگ زرد تھا۔ بدن پر جھریاں، سر گنجا، ڈاڑھی میں چند بال
اس کے بدن پر صرف ایک قمیص تھی۔ جو دانستہ چاک کی ہوئی تھی...... وہ ہلکے سے ہلکے کپڑے کا بار بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا پتلا، دبلا خشک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اور بڑبڑا کر چند مبہم سے الفاظ کہے۔
وہ خوش آمدید کے تھے۔ یا ملامت کے کہا نہیں جا سکتا۔

اس کا خشک سینہ سانس لے لیتا اور ابھرتا تھا۔ اور اس کی چمکدار آنکھوں کی سکڑی ہوئی پتلیوں پر رنج و مصیبت کے دردانگیز آنسو ڈھلک آئے تھے۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس غم خیز اور خوفناک نظارہ سے آنکھیں جھکا کر میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔
مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔
مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اور میرے درمیان ایک لانبی، خاموش عورت بیٹھی ہے۔ ایک لانبا کپڑا اسے سر سے پاؤں تک چھپائے ہوئے ہے اور اس کی عمیق اور زرد آنکھیں خلا میں تک رہی تھیں۔ زرد اور تنگ ہونٹ بالکل خاموش تھے۔

اس عورت نے ہمارے ہاتھ ملا دیئے...... اس نے ہمیشہ کے لئے ہماری صلح کرا دی۔ ہاں موت نے ہماری صلح کروا دی۔

"رورنہی"

ضروری اعلان

ادبی دنیا کا پہلا نمبر دو ہزار کی تعداد میں شایع ہوا تھا جو دس دن کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ اسکے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن پانسو کی تعداد میں چھپا وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اور ابھی تک اسکی مانگ کے دھڑا دھڑ خطوط چلے آ رہے ہیں۔ ادبی دنیا کے شایقین کی خدمت میں فرداً فرداً اطلاع دینے کی بجائے اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ جب تک ان خطوط کی تعداد کم از کم پانسو تک نہ پہنچ جائے۔ اس نمبر کا تیسرا ایڈیشن شایع نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات تک ابھی پہلا نمبر نہ پہنچا ہو۔ وہ جس قدر جلد ہو سکے دفتر میں طلبی کا خط لکھ دیں۔

ابو ظفر نازش رضوی مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

فرہنگ الفاظ

الفاظ	معنی
(الف)	
اقتدار	حکومت
آغاز	شروع
انجام کار	کام کا انجام
التفات	توجہ
اجتناب	پرہیز۔ بچاؤ
استوار	مضبوط
اُمید افزا	امید بر آنیوالا
آئینِ فطرت	فطرت کا قانون
ارتقاء	ترقی
اوائلِ عمر	بچپن
ایماء	اشارہ
اعتراف	اقرار
اغواء	بہکانا
ایثار	قربانی
انبار	ڈھیر
ایامِ طفلی	بچپن
(ب)	
بنائے رقابت	دشمنی کی بنیاد
(پ)	
پایۂ تکمیل	تکمیل کا درجہ
(ت)	
تاجدار	بادشاہ
تکمیل	پورا ہونا
تنازع البقاء	زندگی کیلئے جنگ
نتیجہ	انہیں جن کر دروازہ کو بند کر دیا۔
(ث)	
ثبت	ثابت
(ج)	
جوئے نور	روشنی کی نہر
جمود	بے حسی
جریدۂ عالم	صفحۂ دنیا
جنتِ خوبی	خوبی کی جنت
جُمہور	پبلک
جنبشِ برگ	پتوں کا ہلنا
(ح)	
حمایت	طرفداری
حرزِ جاں	جان کا تعویذ
حائل	روک
حماقت آمیز	بیوقوفی سے بھرا ہوا
حاوی	گھیرنیوالا۔ غالب
حظ	خوشی
(خ)	
خشونت	غصہ
خیرہ کُن	تاریکی پیدا کرنیوالا چُندھیانے والا۔
خونِ ناب	خالص خون
خیرباد	خدا حافظ
خس و خاشاک	گھاس پھونس
(د)	
دستورِ آئینی	حکومت کا دستور العمل
دام تزویر	فریب کا جال
دستِ تقدیر	تقدیر کا ہاتھ
(ر)	
رجحان	میلان۔ جھکاؤ
ریشہ دوانی	سازش
رعنائی خیال	خیال کی خوبصورتی
رگ و پے	تن بدن
(ز)	
زُمرہ	فہرست۔ سلسلہ
زیرِ قیادت	زیرِ حکومت
(س)	
سیل	سیلاب
سیم و زر	چاندی و سونا
سلاسل	بیڑیاں
(ش)	
شاہدِ ادب	محبوبِ ادب
شورش	شور و شغب
شہسواری	فن سواری کی مہارت
شمشیر زنی	تلوار کی لڑائی۔
(ص)	
صحائفِ آسمانی	آسمانی کتابیں
(ط)	
طمطراق	آن بان
طمانینت	اطمینان
طغیان	گمراہی۔ سرکشی۔
(ع)	
علمبردار	حامی۔ شہرت دینے والا
عناد	دُشمنی
عزم	پختہ ارادہ
عبور	طے کرنا
(غ)	
غائر نظر	گہری نظر
(ف)	
فروگذاشت	بھول چوک
فقدان	گمشدگی
فراموش کرنا	بھلا دینا
فلاکت	بے سروسامانی
فراوانی	زیادتی۔ بہتات
(ق)	
قیدِ حیات	زندگی کی بندشیں
قرمزی	ایک قسم کا رنگ
قید و بند	بندشیں
قرارداد	تجویز
(گ)	
گزند	تکلیف
گلشنِ ناز	ناز و انداز کا چمن
(م)	
مشتمل	شامل
مطالعہ	پڑھنا۔ دیکھنا
مابین	درمیان
مدبّر	حالات کے مطابق اپنی تدبیر سے اچھا انتظام کرنے والا۔
ملحق	ملا ہوا
منافی	خلاف
مسمار	ٹوٹا ہوا۔ ڈھایا ہوا
متاسف	افسوس کرنیوالا
مبہم	اُلجھا ہوا
معدوم	نیست و نابود
مفارقت	جُدائی
مضراب	وہ آلہ جس سے ستار بجایا جاتا ہے۔
مہمیز	ایڑ
مدارج	درجے
مرہونِ منت	احسان مند
ماحول	گردوپیش۔ گرد و نواح
مسلّمہ	مانا ہوا
متضاد	ضد
مسحور	جادو کیا ہوا
متحمل	برداشت کرنیوالا
مزرعِ حسن	حسن کی کھیتی
مظاہرہ	اعلان
مہیب	خوفناک
محرک	ترغیب دینے والا
(ن)	
نجیب الطرفین	ماں باپ سے اصل
نمائندہ	ممبر
نمایاں	ظاہر
ناگزیر	ضروری
نشیب	ڈھلوان
ناکامرانی	ناکامی
(و)	
وضاحت	صاف طور سے
والہانہ	عاشقانہ
ودیعت	امانت
(ہ)	
ہم آہنگ	ہم آواز

چار چیزوں کو نہ تھوڑا مانیو!

جیسے آگ کی چھوٹی چنگاری کو تھوڑے سے قرض اور معمولی حقیر دشمن کو بھی خواہ وہ چھوٹے کیوں نہ ہوں ہرگز ہرگز چھوٹے نہ سمجھنا چاہیئے ویسے ہی مندرجہ ذیل چار بیماریوں کو بھی معمولی نہ سمجھ بیٹھیئے۔ وہ اصل ہی سب تکالیف کی جڑھ ہیں!

(۱) زکام ہمیشہ نہیں بار بار ہوتا ہے۔ تو خبردار ہو جائیے۔ اس سے کھانسی۔ بخار۔ دمہ۔ تپ دق۔ متعدد خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہیں کہ جسم کمزور ہو رہا ہے اور فوائد زائل ہو رہے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو تریا کی منگوا لیں یہ زکام کے لئے اکسیر ہے قیمت ۳۲ گولی **ایک روپیہ** نمونہ ۴ر

اگر کھانسی تک نوبت آ گئی ہے تو اور بھی ہوشیار ہو جائیں معمولی کھانسی کے لیے گولی کھانسی پاس رکھیں۔ اگر نہ جائے تو اکسیر بدن منگوا لیں قیمت گولی کھانسی ۱۲ر اکسیر بدن فی شیشی **ڈیڑھ روپیہ** عہ نمونہ بارہ آنے ۱۲ر

(۲) قبض قبض اس بات کی علامت ہے کہ جسمانی مکان کی نالی صاف نہیں ہوتی دائمی قبض سے جسم میں ہر قسم کی بیماری گھر کر جاتی ہے۔ صرف قبض دور ہو جانے سے کتنی امراض خود بخود چلی جاتی ہیں۔ قبض کے مریض آرام جان منگوا کر استعمال کریں عجیب دوا ہے اور نرم مزاج والے سکارا استعمال کریں۔ قیمت آرام جان ۳۲ گولیاں ایک روپیہ عہ۔ قیمت سکارا پانچ تولہ آٹھ آنے ۸ر

(۳) پیشاب کی کثرت کئی اصحاب دن میں بار بار پیشاب جاتے ہیں انہیں اس بات کا دھیان ہی نہیں کہ ذیابیطس کا پیش خیمہ ہے۔ ذیابیطس بیس قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں جسم سے شکر چربی وغیرہ مختلف اجزا زائل ہوتے ہیں اور اس کو کھوکھلا بنا دیتے ہیں۔ کاربنکل پھوڑے بھی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ گرم مزاج والے اکسیر ۱۶ قیمت ۳۲ گولیاں للعہ ۸ گولی (عہ) ذیابیطس والے اکسیر ۲۴۔ ۳۲ گولی للعہ ۸ گولی عہ دوسرے اکسیر ۱۳ قیمت ۳۲ گولی عہ نمونہ ۸ گولیاں چار آنے استعمال کریں ۲۴ الف ۳۲ گولی عہ نمونہ ۸ر ۲۴ ب ۳۲ گولی عہ نمونہ ۸ر استعمال کریں

(۴) دانت میلے رہنا دانتوں کا میلے رہنا بدہضمی کی علامت ہے۔ انہیں میلے رہنے دینا آہستہ آہستہ متعدد امراض مثلاً پیپ۔ خون جانا وغیرہ نہ صرف قوت ہاضمہ ہی کو تباہ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا زہر تمام جسم میں پھیل کر۔ انتڑیوں خون و جوڑوں میں کئی امراض پیدا کرتا ہے۔

پائیوریا:۔ دانتوں کا خطرناک روگ ہے اس لئے پائیوریا پیسٹ منگوا لیں اور بدہضمی کے لئے کرکول استعمال کریں قیمت پائیوریا پیسٹ ۱۲ر کرکول ۴۰ گولی (۱۲ر) نمونہ (عہ)

مجرب جرم کش ادویات میں سے بہترین ہے لہذا اس کے چند قطرے رومال پر ڈال کر دن میں سونگھتے رہنے سے آپ کو نزلہ۔ زکام۔ انفلوئنزا۔ ہیضہ گلے کی خرابی اور متعدی بخار دل نیز دق سل کے مریض کے شریک ہو کر متاثر ہو جانے کے خطرہ سے بچائے گا اور بدہضمی۔ عدم اشتہا قے۔ دست تلی ہیضہ وغیرہ خرابیوں کے لئے بہترین علاج ہے تفصیل کیلئے رسالہ امرت مفت طلب کریں قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے ۲/۸ لطف شیشی ایک روپیہ چار آنے نمونہ کی شیشی ۸ آنے ۸ر قیمت امرت دھارا لوشن فی شیشی ایک روپیہ

خط و کتابت و تار کیلئے اتنا پتہ کافی ہے امرت دھارا ۹۷ لاہور

مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

بادشاہی دسترخوان کے مزے

کھانے کے ساتھ چٹ پٹے مسالے دار اچار کھانے سے معدہ کی قوت ہاضمہ کمزور جگر کے فعل میں نقص اور دائمی قبض کی شکایت پیدا ہو کر جسم صدہا امراض کا گھر بنا رہتا ہے زمانہ اسی فی صدی لوگ بھوک نہ لگنے کے باعث بھانت بھانت کی اشتہاری دوائیاں استعمال کرکے اپنے اپنے معدہ کو حکیم کی دوکان بنا لیتے ہیں لذت مزید حسب ذیل بھوک کے بیمار کو چٹ پٹے مسالوں اور ناکارہ دواؤں سے ہمیشہ کیلئے بے نیاز کردیگا ایک ٹکیہ یوسیہ صرف لذت مزید کی ایک چٹکی صبح و شام جس دال بھاجی یا سالن میں ڈال دی جائیگی وہ مردہ بھوک پیدا کر دیگا اور اسکی بھینی بھینی مہک سے آپکے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری ہو گی جس کا اظہار لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس سالن کے کھانے میں ایسی لذت حاصل ہو گی کہ بہشت کی نعمتوں کو آپ بھول جائیں گے اور بادشاہی دسترخوان پر بیٹھ کر انواع و اقسام کے کھانوں پر ہاتھ صاف کرنے کی ہوس آپکے دل میں نہ رہیگی زبان اس لطف کو برسوں تک فراموش نہ کر سکیگی جو لذت لذت مزید سے تیار شدہ سالن کے چکھنے میں اسے حاصل ہو گا صرف یہی نہیں لذت مزید بلا کا ہاضم ہے یہ آپکے کئی کی بھوک کو دو چند کردیگا جگر اور معدہ کے فعل کو باقاعدہ کرکے انتڑیوں کو صاف کردیگا پاخانہ کھل کر لائیگا نیز دل و دماغ کو تقویت دیگا آنکھوں کی بصارت کو تیز کریگا اور نیند خوب لائیگا مزید لطف کی بات یہ ہے کہ لذت مزید عورت مرد بچہ بوڑھا سب کیلئے یکساں مفید اور بے ضرر ہے اسکے متواتر استعمال سے جسم میں فراواں تازہ خون پیدا ہو گا اور چہرہ کندن کیطرح دمک اٹھیگا لذت مزید کو پانی میں گھول دینے سے ایسی لذیذ چٹنی بن جاتی ہے کہ باید و شاید۔ مونگ کے دانہ کے برابر نہار منہ کھانے سے یہ طاقت کی ایک بہترین اور خوش ذائقہ دوا ہے جس کا مقابلہ سونے چاندی کے کشتے بھی نہیں کر سکتے الغرض کہاں تک لکھا جائے ایک بار تجربہ کر لیجئے اسکی خوبیاں آپ پر ظاہر ہونگی باریک صفات قیمت فی ڈبیہ جو سالہا سال کیلئے کافی ہو گا صرف ایک روپیہ چار آنے (۱۴) محصولڈاک۔ قیمت۔ پرچہ استعمال ہمراہ پارسل ارسال ہو گا مضمون اشتہار رجسٹری شدہ

یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۵ لاہور

سات سیر دودھ روزانہ ہضم کرلو

نہ کوئی دوائی کھاؤ نہ کسی قسم کی ورزش کرو

کتاب دائم المریض اور دبلے پتلے آدمی موٹے اور جسیم ہونے کی خواہش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں انکو واجب ہے کہ مشتہرین کی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسکر اشتہاری دواں پر روپیہ ستیاناس کرنے سے پہلے ایکبار دودھ کے علاج کو آزما دیکھیں دودھیا آبحیات اس فن پر ایک بہترین تصنیف ہے جو ایک سو کے قریب انگریزی کتب کی مدد سے لکھی گئی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ مسٹر فیلڈ نے نیویارک سے کس ترکیب سے ۸ سیر دودھ روزانہ پیکر تین ماہ میں اپنے جسم کا وزن ۳۳ سیر بڑھا لیا تھا مختصر فہرست مضامین ملاحظہ (۱) دودھ سے علاج (۲) دودھ دنیا میں طاقت بڑھانیکی بہترین غذا ہے (۳) دودھ اور سو سال تک جوان بنے رہنے کا راز (۴) دودھ کا صحیح طریق استعمال جس طرح ہم دودھ پیتے ہیں وہ سراسر غلط اور نقصان دہ ہے (۵) دودھ اور لیموں کا رس (۶) دودھ اور فاقہ کشی (۷) دودھ کے بہترین معالج مینکفڈن کی رائے (۸) دودھ سے خطرناک بیماریوں کا ازالہ (۹) امریکہ میں دودھ سے علاج کے شفا خانے اور وہاں کا انوکھا طریق علاج (۱۰) مایوس علاج اور زندہ درگور مریضوں کی دودھ کے علاج سے شفایابی (۱۱) دودھ سے علاج کرنیوالوں کیلئے خاص ہدایات (۱۲) دودھ کس قسم کا اور کتنا دودھ پینا چاہیئے (۱۳) بغیر کسی ورزش یا دوائی کے سات سیر دودھ روزانہ ہضم کرنیکی ترکیب (۱۴) دودھ کے علاج سے جسم کا وزن روزانہ بڑھ سکتا ہے (۱۵) دودھ کے علاج سے دائمی قبض کی شکایت رفع کرنیکی ترکیب وغیرہ وغیرہ مختصراً یہ کتاب بہت دیکھنے کے قابل ہے قیمت صرف ایک روپیہ (۱۲) مع محصولڈاک ضخیم تقریباً ۲۰۰ صفحات مجلد سنہری جلد۔ مقبولیت کا یہ حال ہے کہ تیسرا ایڈیشن جو تین ہزار شائع کیا گیا ہے شاید ایک ماہ میں ختم ہو جائے گا۔

ملنے کا پتہ

یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۵ لاہور شہر

سیالکوٹ کی مشہور و معروف سٹیل ٹرنک فیکٹری کا سامان

مثلاً ہر ایک سائز کے ٹرنک۔ سوٹ کیس۔ یونیفارم کیس۔ ہیٹ بکس۔ کیش بکس۔ ٹب۔ بالٹی ٹرے وغیرہ وغیرہ۔ نہایت عمدہ۔ پائیدار۔ مضبوط اور بکفایت خریدنا چاہیں تو مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیں۔

المشتہر **گوکل چند اینڈ سنز مالکان سٹیل ٹرنک فیکٹری** سیالکوٹ شہر

خوب صورت منظر رکھنے والی حیدری ٹوپیاں
ہمیشہ استعمال کریں!

پیٹنٹ و رجسٹری شدہ ٹوپیاں

SPECIAL RS. 4

No 1, RS. 3-8

No 2, RS. 3-8

No 3, RS. 3

No 4, RS. 3-4

No 5, RS. 2-8

No 6, RS 2-8

NO 7 RS. 4-8

NO 8 RS. 4

شیخ محمد فیاض الدین سن مالک حیدری کیپ ہاؤس

بھاٹی دروازہ لاہور

ایک ماہر دندان ساز لاہور میں

ڈاکٹر فیض محمد خاں اینڈ سنز

جو

دندان سازی کے فن میں چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مستند اور مشہور ڈاکٹر دانتوں کے متعلق صرف آپ ہی سے مشورہ لیتے ہیں۔ مصنوعی دانت لگانے کے علاوہ دانتوں کی کل امراض کا بہترین اور کامیاب علاج کرتے ہیں۔ المعلن سید محمد ظفر رضوی

پتہ یہ ہے۔ ڈاکٹر فیض محمد خاں انارکلی لاہور

ربڑ کی مہریں

ہمارے کارخانہ میں ہر زبان مثلاً انگریزی، اردو ہندی، گورمکھی، عربی، سنگیپیر وغیرہ ربڑ کی اور لاکھ پر لگانے والی پیتل کی مہریں سونے، چاندی کے تمغے، چپڑاسیوں کے پیتل کے بیج، ڈائی امبوسنگ، ڈائی مع مشین، کاپر پلیٹ، پگڑی، بیج نمبر، بیلٹ، خود بخود سیاہی دینے والے، سیاہی، ربڑ کی مہروں کا مکمل سامان، نمبر و تاریخ لگانے والی مہریں، جیبی چھاپہ خانہ ہر سائز، جیب اسپیل کے واسطے کناروں کے نمبر، لکڑی کے بلاک، مہریں رکھنے کے واسطے سٹینڈ، بارہ مہروں والا مکمل سیٹ وغیرہ وغیرہ غرضیکہ ہر قسم کا انگریونگ کا کام کرایا جاتا ہے

منیجر دی لاہور انگریونگ کمپنی

اندرون لوہاری گیٹ لاہور سے خط و کتابت کریں یا خود تشریف لائیے

ارزاں دام پر اچھا کام پائیے

قیمت ۲ روپیہ محصول ڈاک

ویٹ کریم

پانچ منٹ میں بالوں کو صاف کرنے والی

انگلینڈ کی بنی ہوئی

زمانہ کی ڈاکٹروں کی تصدیق شدہ

آج کی پہلی ڈاک میں ہی طلب فرمائیے۔

زمانہ حال کی جدید ترین ایجاد ہے تمام مرد و عورت ہر اعضائے جسم کی صفائی بال کے لئے صرف اسی کو استعمال میں لاتے ہیں اور حسن خوبصورتی میں غضب کا اضافہ کرتی ہیں استرا بالوں کو سخت اور جلد کو کھردرا کر دیتا ہے دوسرا کوئی بال صفا پوڈر ویٹ کریم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یورپ کی فیشن پرست بال صفا استعمال کرتی ہیں استرے سے بال نہیں کٹواتیں بلکہ ویٹ کریم سے اپنے بال نازک تک صاف کرتی ہیں یہ جلد کو پہلے سے زیادہ نرم اور صاف کر دیتی ہے اور ہر قسم کے ضرر سے قطعی محفوظ رکھتی ہے۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ بھیجا جاتا ہے

ملنے کا پتہ:- دی پنجاب یونیورسل کمپنی نمبر ۲ لوہاری گیٹ لاہور

گورے اور خوبصورت ہونے کی شرطیہ ولایتی دوا

پیرس بیوٹی

جس کے صرف چند روزہ استعمال سے کالا یا سانولا ہوا کرخت چہرہ اور جسم مخمل کی مانند ملائم اور گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت اور سرخ ہو جاتا ہے کیل، کانٹے، مہاسے، چھائیوں کے علاوہ چیچک کے داغ بھی دور ہو جاتے ہیں۔

اور چہرہ کا رنگ ۱۶ برس کے نوجوانوں کے مانند ہونے لگتا ہے

قیمت فی شیشی کریم ایک روپیہ۔ تین شیشی دو روپے دس آنے۔

پوڈر فی شیشی دو روپے۔ تین شیشی پانچ روپے ۱۰/

سول ایجنٹ:- بیوٹی ہوس لاہور

سب ایجنٹس: چمن سوپ کمپنی اندرون لوہاری دروازہ لاہور

پنجاب کا مشہور و معروف اور سب سے بڑا کارخانہ

عزیز چک ہاؤس

ہے

جہاں ہر ایک قسم کی عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ مضبوط سبک اور پائدار چکیں ارزاں داموں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

علاوہ ازیں خس کی ٹٹیاں بھی بہت سستی اور حسب منشا بنائی جاتی ہیں

فہرست مفت طلب فرمائیے آزمائش شرط ہے۔

آپ کا خادم

منیجر دی عزیز چک ہاؤس چوہڑ کی ہٹاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

HUSAN-I-USAF SOAP
حسن یوسف
حسن یوسف سوپ
حسن یوسف ہیئر آئل
بال عمر بھر نہیں اگیں گے
شرطیہ
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ مینیجر حسن یوسف برادرز لاہور
ڈاکٹر بیلی رام اینڈ برادر
لاہور میں انگریزی ادویات و ڈاکٹری آلات
کی سب سے بڑی دکان
اپنی عظیم الشان بلڈنگ میں آگئی
یہ بلڈنگ کرنال شاپ کے نزدیک ہے
ہر قسم کی انگریزی ادویات پیٹنٹ و مفرد۔ ڈاکٹری کے جملہ
آلات بہتر سے بہتر ارزاں سے ارزاں قیمت پر خریدنے ہوں تو
ہمارے پاس تشریف لاویں۔
فیوچر آف اسلام اِن انڈیا کا
ہندوستان میں
اسلام کا مستقبل
ملنے کا پتہ: مینیجر مسلم انڈیا، پارک لین مزنگ لاہور
عثمانیہ ہوٹل لاہور
آپ جب کبھی لاہور تشریف لاویں تو
عثمانیہ ہوٹل انارکلی بازار لاہور کو یاد رکھیں
جہاں پر آپ کے لئے طعام و قیام کا خاطر خواہ انتظام ہوگا۔
مینیجر عثمانیہ ہوٹل انارکلی بازار لاہور
ہندوستان بھر کے تمام اردو انگریزی اخبارات و رسائل کے لاہور میں سب سے بڑے ایجنٹ کا پتہ یہ ہے۔
میاں غلام محمد اینڈ سنز ایجنٹ اخبارات چوک انارکلی لاہور
جو صرف لاہور کے لئے "ادبی دنیا" کے واحد ایجنٹ ہیں۔

مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں طبع ہوا۔ اور مولانا تاجور نجیب آبادی پرنٹر و پبلشر نے دفتر "ادبی دنیا" بازار حج محمد لطیف لاہور سے شائع کیا۔

رجسٹرڈ　　　　　　　　　　　　　　　ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء نمبر (۲)

تصاویر:- (۱) حسن معصوم سہ رنگی - (۲) میسولینی - (۳) چشمہ محبت - (۴) ایبری لینگھم - (۵) روت اور نومی - (۶) میر ناظر حسین ناظم - (۷) گوئٹے - (۸) شیخ محمد ضیاالدین صاحب شمسی

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

جناب خان بہادر میاں فضل حسین صاحب ایم۔ اے۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ۔

آپ کے ارادے نیک ہیں۔ اور خاصکر پہلا ارادہ کہ تحریر آسان فہم ہو۔ مگر ارادہ کو پورا کرنا عربی و فارسی کے عالم کے لئے کچھ آسان کام نہیں۔ میں آپکو آپکے ارادوں میں کامیاب ہونے کیلئے دعا دیتا ہوں۔

کپتان نواب جمشید علی خاں صاحب ممبر یو پی لیجسلیٹو کونسل

آجکل اہلِ نظر عام طور پر یہ دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔ کہ ہندوستانی نوجوانوں کا ادبی مذاقِ سلیم نہایت پست ہوتا جا رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یوں تو سینکڑوں جرائد و رسائل میدانِ عمل میں گامزن ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں بہت کم ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں مقاصد جریدہ نگاری کو انجام دے رہے ہوں۔ زبان کے اعتبار سے اگر ان کو دیکھا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا صفحہ نظر آئیگا جسمیں عجیب و غریب تراکیب مشکل و مغلق عربی الفاظ کی کثرت نہو۔ عام اس سے کہ مضمون عام فہم ہو یا نہو۔ سادہ اور سلیس اردو میں نفسِ مضمون ادا ہو سکے یا نہو سکے مگر مضمون نگار کی یہ کوشش ضرور ہو گی کہ شروع سے آخر تک عربی عنصر غالب رہے۔ جب جرائد نگاری کا یہ معیار ہو تو نتیجہ معلوم! یہی لیل و نہار رہے اور یہی روش رہی تو وہ زمانہ دور نہیں جبکہ زبانِ اردو ایک چیستان ہو کر رہجائیگی۔ خیر اس کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔

"ادبی دنیا" کا پہلا پرچہ میری نظر سے گذرا رسالے کے اغراض و مقاصد نہایت صحیح اور درست ہیں جو ذرایع اور انتظامات اس کے کامیاب بنانے میں کئے گئے ہیں۔ وہ قابلِ تحسین و مسرت ہیں۔ خدا کرے کہ "ادبی دنیا" اسم بامسمیٰ ثابت ہو اور کارکنانِ جریدہ کی محنت و جانفشانی ٹھکانے لگے۔ سب سے زیادہ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ رسالے کے لئے خاص طور پر اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے تراجم سلیس اور عام فہم زبان میں شایع کیے جائیں۔

مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری ایڈیٹر روزنامہ مساوات لاہور

"ادبی دنیا" زیر تنقید نمبر اس رسالہ کا پہلا ہی نمبر ہے۔ جسے دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے "ادبی دنیا" اردو زبان میں اپنی نوعیت کا سب سے پہلا رسالہ ہے۔ اجرائے رسالہ کے مقاصد نہایت مہتم بالشان اور ضروری ظاہر کئے گئے ہیں مثلاً اردو زبان کو دوسری زبانوں کی ملاوٹ سے پاک کر کے ایک نکھری ہوئی زبان بنانا۔ عربی۔ فارسی وغیرہ کے مشکل الفاظ کو کم کرنا۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے تراجم شایع کر کے اردو ادب کو وسیع کرنا اردو زبان میں جدید الفاظ کا اضافہ اور قواعد اردو میں موجودہ اردو کے مطابق ترمیمات کرنا متنازعہ فیہ ادبی مسائل کی بابت بحث و تمحیص کے بعد ادبی جماعتوں کے فیصلے شایع کرنا۔ اردو شاعری میں ضروری اور اصولی تبدیلیاں کرنا۔ وغیرہ۔

رسالہ کی ضخامت اور ظاہری صورت اسقدر شاندار ہے کہ بلا مبالغہ کوئی اردو کا رسالہ اسوقت اس کا ہم پلہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے۔ سرورق میں نظر فریبی کے علاوہ خاص جدت ہے۔ ادبی مضامین میں نظم و نثر بھی عمدہ اور بہت سے ہیں۔ افسانوں کا عنصر بھی کافی ہے۔ دنیائے ادب کے زیر عنوان ہندوستان اور بیرون ہند کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی مضامین کے تراجم پیش کئے گئے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں سے ہندی بنگالی پنجابی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ سندھی کشمیری۔ پشتو۔ مدراسی سنسکرت اور بیرونی ادبیات میں سے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جاوی، ڈچ، ملایا۔ کے ترجمے شایع کئے ہیں۔ آخر میں تین صفحوں پر رسالہ کے مشکل الفاظ کی ایک فہرست لگا دی ہے۔ غرض رسالہ بحیثیت مجموعی قابل قدر ہے۔

ڈاکٹر لکشمن سروپ صاحب بی اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی۔

"ادبی دنیا" کے دو نمبر میری نظر سے گذرے۔ میں نہایت وثوق اور مسرت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبی دنیا دنیائے ادب میں ایک قابلقدر اضافہ ہے۔ اس نے اردو صحافت کیلئے ایک جدید راستے کا افتتاح کر دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں یا کسی اور جگہ اس شان کا رسالہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی تنقیدیں اور ادبی مباحثے نہایت عالمانہ ہوتے ہیں۔ زبان نہایت دلکش صاف اور شستہ۔ "ادبی دنیا" کا اسٹاف اس ادبی کارنامے کے لئے صد تحسین و آفریں کا مستحق ہے۔ میں تہِ دل سے اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

ڈاکٹر بنارسی داس صاحب ایم - اے پی - ایچ - ڈی - لیکچرار پنجاب یونیورسٹی -

میں نے "ادبی دنیا" کے دونوں نمبر نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھے ہیں - اسکی شاندار تصاویر اور مضامین کی دلکش ترتیب دل کو اپنا گرویدہ بنائے بغیر نہیں رہتی - "ادبی دنیا" ابھی بچّہ ہے لیکن دنیائے ادب میں جو سرفرازی اسکو حاصل ہے کسی اور کو نہیں ہو سکتی - اس کا ہر ایک مضمون اُن اہل علم و اہل قلم کا لکھا ہوا ہے جو اپنے حلقے میں نہایت ممتاز ہیں - ادبی دنیا کی طباعت نہایت دلفریب ہے اور شاندار ہے - اور اس کے مقابلے میں قیمت نہایت کم ہے - میرے خیال میں اس قسم کے رسالے کی بہت عرصے سے ضرورت تھی جسکو مولانا تاجور نے ادبی دنیا کے اجرا سے پُورا کر دیا ہے - اس رسالے کا ایک لاجواب پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے لٹریچر سے بہترین مضامین کے اقتباس دلکش اور پیاری زبان میں ترجمہ کر کے شایع کئے جاتے ہیں - مجھے امید ہے کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو یہ رسالہ کامیاب طور پر دُور کر دے گا - کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والوں کی اتحاد کی طرف راہنمائی کرتا ہے -

مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتوی ایم - آر - اے - ایس (لنڈن)

"ادبی دنیا" کی دلکشی نے مجھے اپنی جانب کھینچا - میں نے اس میں علاوہ اُس کے پیمانے کے جو ایک امتیازی شان رکھتا ہے متعدد خصوصیتیں دیکھیں - سب سے بڑی اسکا تنوع ہے - یکرنگی کے بجائے اسکی رنگینیاں ایک نیرنگ کا عالم پیدا کرتی ہیں

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مولانا عبد اللہ منہاس ایڈیٹر مسلم راجپوت امرتسر -

اردو اہل قلم کی لٹریری سعی و جہد کا تازہ ترین کارنامہ "رسالہ ادبی دنیا" ہے - جو اردو ادب کے مخلص خدمتگزار حضرت تاجور نجیب آبادی کے زیر ادارت اور قلم و ادب کے پختہ کار اور ثقہ رکن سر عبد القادر کے زیر نگرانی جاری ہؤا ہے - نمبر اول کے مضامین کے تنوع و ترتیب و انتخاب کی عالمگیری رسالہ کے نام کی موزونیت پر گواہ ہے - اور خاص محنت اور تجسّس کا پتہ دیتی ہے - ہمت وسعی اور حسن مذاق کی جو رُوح اس کے صفحات پر نظر آ رہی ہے اس کے پیش نظر ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ اپنے چارگانہ مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جائیگا -

"ادبی دنیا" تصنیفی اردو کو عام فہم اور اردو ادب کو "دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار" بنائیگا - وہ اردو انشا پردازی اور اردو شاعری کے متعلق طلبہ اور نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق پیدا کریگا - اردو شاعری کو بغیر قدرتی پابندیوں سے آزاد اور موجودہ گرامر کی اصلاح بھی کریگا اس لحاظ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ اردو زبان کا یہ نیا رسالہ ایک مخصوص پروگرام کو لیکر میدان میں نکلا ہے - اور اس نے ایک امتیازی وصف کے ساتھ عام سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے - تمام حامیان ادب اردو کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں -

سید بشیر حسین صاحب بی - اے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات

ضخامت - کتابت اور بیحد محنت اور قیمت کا مقابلہ کیا جائے تو اس ایثار کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں - جو قبلہ خان بہادر سر عبد القادر اور آپ جیسے نامور ادیب ملک کے اس درد اور تڑپ سے واقف ہوں - جو آپ دونو اردو کی ترقی کے لئے محسوس کرتے ہیں -

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے چند کاپیوں کی خریداری سے کوئی احسان آپ پر یا اردو پر نہیں کیا - بلکہ ارکان کمیٹی نے اس خریداری میں اپنے ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے - میں آپ کو آپ کی بلند پایہ اور مایۂ ناز محنت و عرق ریزی پر مبارک باد دیتا ہوں - کہ آپ ایک ایسے ادبی رسالہ کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جسکی مدت سے دنیائے ادب کو ضرورت تھی -

حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب (اخبار زمیندار) :-

اہل نظر کا وہ طبقہ جو اردو کے معلّے کو ہندوستان کی سرکاری تعلیمی عدالتی اور کاروباری زبان کی حیثیت سے دیکھنے کا بدل متمنی ہے - یہ سُنکر خوش ہوگا - کہ جناب شیخ (سر عبد القادر) کے زیر نگرانی ایک بلند پایہ ماہانہ رسالہ جس کا نام "ادبی دنیا" ہے - علامہ تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں نکلنا شروع ہؤا ہے - اس کا پہلا نمبر صحافت اور طباعت کے گوناگوں محاسن کے ساتھ مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپ کر ہماری نظر سے گذرا - نظم اور نثر کے متعدد مضامین کے ساتھ جو ۲۰×۲۶ کے پچانوے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں - مشرق و مغرب کے اس جدید و قدیم ادبی مرقع میں سات نفیس تصاویر بھی ہیں - مضمون نگاروں میں ہندو بھی ہیں - اور مسلمان بھی - اور اس لحاظ سے اس رسالہ کو ہندوستان کی آنے والی قومیت متحدہ کا نشان بردار سمجھنا چاہیئے -

ڈیلی کرانیکل دہلی :-

پنجاب اردو زبان اور لٹریچر کی نشو و نما کی جو قابل قدر خدمات سر انجام دے رہا ہے "ادبی دنیا" اس میں ایک اہم اضافہ ہے - یہ بلند پایہ رسالہ اپنی دلکش ترین معنوی اور صوری خوبیوں کے ساتھ اردو صحافت میں ایک قابل ذکر دور کا آغاز کرتا ہے - رسالے کی زبان اُس سرمائے کا بہترین آئینہ دار ہے جو اردو نے ادبیات انگریزی سے حاصل کیا ہے - انداز بیان نہایت دلکش اور دلفریب ہے - مضامین کا تنوع اور ہمہ گیری کے

لحاظ سے اسے موجودہ اردو جرائد میں بلند ترین مقام پر جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بلند پایہ اردو صحافت کے راہنما سر شیخ عبدالقادر کا اسم گرامی سر برآوردہ اردو رسائل کی صف میں اسے ممتاز اور قابل فخر جگہ دیتا ہے۔

اس وقت جو نمبر ہمارے سامنے ہے اس میں مختلف اہم موضوعات زبان، موسیقی ڈراما۔ ادبی تنقید، مجلس اقوام۔ اخلاقیات، ارتقا اور فلسفہ پر بہترین مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں۔ سندھی گجراتی۔ پنجابی، کشمیری، پشتو، مرہٹی، تامل۔ بنگالی سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی۔ جرمن۔ جاپانی، ملایا، ہسپانوی، اطالوی ڈچ۔ چینی اور لاطینی وغیرہ سے دلچسپ اقتباسات کا دلکش ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ادبی دنیا ایک عظیم ترین ادبی مہم ہے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا تاجور اور مسٹر حنیف ہاشمی جو ملک کے ممتاز ادیب ہیں اپنی اس قابل رشک مہم میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ رسالہ کی کتابت وطباعت اور صوری اور معنوی خوبیوں کے مقابلے میں تین روپے بہت ہی کم قیمت ہے۔ اس کی تلافی اُن تمام حضرات کے گرمجوش استقبال سے ہو سکتی ہے جو اردو ادب کی ترقی اور نشوونما میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

جناب اختر سبحانی صاحب بیتاب:۔

"ادبی دنیا" اور پونے چار روپے میں! لوگ کہتے ہیں کہ اسکے مدیر کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟۔

پروفیسر ارشاد احمد صاحب خلیق ایم۔اے۔ ایم او ایل:۔

میں السنۂ مشرقیہ کے ایک استاد ہونے کی حیثیت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے محکمہائے تعلیم کو ادبی دنیا جیسے مفید رسالوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے طلبہ ملکی زبان سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں ملکی لٹریچر سے وہ مغلق نگاری کے سبب کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ "ادبی دنیا" نے جس شاندار اور مناسب طریقے سے طلبہ کی اصلی ضرورت کو پورا کرنے کی جانب قدم اٹھایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا چیف ایڈیٹر ایک کالج کا پروفیسر ہے۔ اور طلبا کی ادبی استعداد کے فقدان سے براہ راست واقف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی دنیا کا مطالعہ طلبا اور ورنیکولر زبانوں کے اساتذہ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔

مولانا نظامی ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین بدایوں:۔

"ادبی دنیا" ایک نیا ادبی رسالہ ہے جو حال ہی میں لاہور سے ماہوار شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کا پہلا نمبر جو بابت مئی ۱۹۲۹ء ہے ہمارے پاس گذشتہ ہفتہ میں پہونچا ہے اس رسالہ کی نگرانی کا کام سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا لاہور نے اپنے ذمہ لیا ہے جن کا نام اردو ادب کی دنیا میں "مخزن" کی وجہ سے اتنی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اب ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس کی ادارت کا بار مولانا تاجور نجیب آبادی جیسے مشہور اہل قلم نے اٹھایا ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ رسالہ اپنے اس وسیع پروگرام کو جو اس نے اپنی زندگی کا قائم کیا ہے پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس پہلے پرچے میں رسالہ کی اشاعت کے مقصد کو چار مدات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کا خلاصہ (۱) تصنیفی اردو کو عام فہم بنانا۔ (۲) اردو زبان کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے مالا مال کرنا۔ (۳) اردو انشا پردازی اور اردو شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی مضامین لکھ کر نوجوان طلباء میں صحیح ذوق ادبی پیدا کرنا (۴) اردو شاعری کو غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کر کے آزاد زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اضافہ کرنا اسی کے ساتھ اردو صرف و نحو میں ضروری تغیر و تبدل کرنا، دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ کو جن کا مفہوم ہم معنی الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے اردو میں داخل کرنا۔

مولنا محشر عابدی سکرٹری ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن حیدرآباد دکن

پرچہ کا سرورق ہی دیکھ کر بیساختہ منہ سے نکل پڑا۔ سے

عمرت دراز باد　　حسنت مدام مانده

یقیناً اس پرچہ (ادبی دنیا) کے اجراء سے دنیائے ادب میں آپ نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اب ہندوستان بھی فخر کر سکتا ہے کہ اس میں بھی ایسے رسائل شایع ہوتے ہیں جو یورپ کے ممتاز رسائل کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کیا بہ لحاظ، مضامین اور کیا بہ لحاظ تصاویر۔

ہندوستان کی انتہائی خوش نصیبی ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد وہ اس قسم کا رسالہ اردو میں شائع کر سکا جس کی ٹکر کا یہاں کسی اور زبان میں ایسا رسالہ موجود نہیں۔ باوجود متعدد برسوں کے کوئی اردو رسالہ، دنیائے ادب میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکا۔ اور نہ کسی نے وہ مقاصد پیش نظر رکھے جو "ادبی دنیا" نے اب ناظرین کے سامنے پیش کئے ہیں۔

"ادبی دنیا" کے مقاصد نہایت مفید اور اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اردو رسائل کو اس کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اور "ادبی دنیا" کے مقاصد مدنظر رکھکر انہیں ترقی دینی چاہیئے۔

میرا دل کبھی رسالہ کی شان و شوکت سے اسقدر جلد متاثر نہوا تھا جتنا "ادبی دنیا" کو دیکھکر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس رسالہ کا مطالعہ نہ کرے۔ اُس سے زیادہ بدمذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھر کی زبانوں

کا ایک کتابی صورت میں مجتمع کرنا۔ یقیناً بہت ہمت اور جرأت کا کام ہے شاید ہم خیال بھی نہ کرسکتے کہ ہندوستان کا ایک رسالہ یہ تمام باتیں مہیا کرسکتا ہے۔ مضامین جس قدر بلند پایہ ہیں وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ تصاویر جسقدر موزوں اور بلند معیار کی ہیں۔ اسکا اظہار بھی ناممکن ہے۔ غرض "ادبی دنیا" اسم بامسمٰی "ادبی دنیا" ہے۔ میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں۔ کہ خداتعالیٰ رسالہ کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ اور خدا کرے "ادبی دنیا" دنیائے ادب میں ہمیشہ برقرار رہے۔

سردار موہن سنگھ صاحب دیوانہ ایم اے لکچرار پنجاب یونیورسٹی

"ادبی دنیا" سر عبدالقادر اور مولانا تاجور کا دنیائے ادب پر تازہ ترین اور گرامی تر احسان ہے۔ محترم شیخ صاحب نے اردو کے حسن طفلی سے ایک عالم کو آگاہ کیا۔ اب ادبی دنیا اس نازنین کے آغاز شباب کے جلوے عیاں کریگا۔ زبان، بیان، مضمون غرض کہ ہر اعتبار سے "ادبی دنیا" اپنے "پنجابی بھائیوں" سے ابھی سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔

مسٹر رشید احمد صاحب ایم-اے-ایم آر اے ایس (لنڈن)

"ادبی دنیا" کا یہ مقصد کہ "ہندوستان کے لئے ایک عام فہم آسان تصنیفی زبان بنائی جائے" اس قدر اہم اور اتنا ضروری ہے کہ ہر بہی خواہ وطن کو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اپنے دل میں قیس عامری کا سا دردِ طلب پیدا کرنا چاہئے۔ ادبی دنیا کی یہ خصوصیت کہ مشرق و مغرب کی علمی زبانوں کے بلند پایہ مضامین سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس رسالے کو نہ صرف اردو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کے تمام علمی رسائل میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

خان بہادر سردار بہادر لفٹننٹ ڈاکٹر احمد اللہ خاں صاحب آئی ایم ڈی-آئی او ایم-او بی-ای-

رسالہ ادبی دنیا کو دیکھ کر بمشکل یہ یقین آتا ہے کہ یہ ہندوستان کا کوئی لٹریری پرچہ ہے۔ یعنی اردو حروف کی بجائے ٹائیٹل پر اگر انگریزی الفاظ ہوں تو "امریکن میگزین" کسموپالیٹین یا لٹریری ڈائیجسٹ کا کوئی نمبر معلوم ہوگا۔ بے شبہ اس جیسا شاندار پُر تنوع اور خصوصیات کا رسالہ ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں شایع ہوتا۔ اور ان خصوصیات کا اسقدر سستا رسالہ تو دنیا کی کسی زبان میں بھی نہ ملیگا۔

ملک سلیمان خاں صاحب بی اے پی سی ایس مجسٹریٹ درجہ اوّل امرتسر

"رسالہ ادبی دنیا" جاری کرکے آپ نے اردو ادب کے ایک نہایت شاندار اور جدید دور کا آغاز کیا ہے۔ دوسرے رسالوں کے مقابلے میں اسکی زبان آسان متین اور سلجھی ہوئی ہے۔ مضامین سنجیدہ دلچسپ اور مفید ہیں۔ پھر لطف یہ کہ لڑکوں، نوجوانوں، ادھیڑوں بوڑھوں۔ مردوں عورتوں سب کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہے۔ ادبی دنیا کو میرے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ میرے گھر کی مستورات بھی پڑھتی ہیں اور میں بھی پڑھتا ہوں۔ اور ہم سب اپنی اپنی استعداد ادبی کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادبی دنیا کے جاری ہونے کے بعد اب کوئی شخص منہ اٹھا کے یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ اردو جرنلزم میں دھرا ہی کیا ہے۔ مولانا! سچ یہ ہے کہ آپ نے جس تندہی اور قابلقدر ایثار سے حاسدانہ فضا اور ناخوشگوار حالات میں ہمارے صوبے میں علمی خدمات سرانجام دی ہیں ہم اہل پنجاب ہمیشہ آپکی گراں مایہ خدمات کو شکر گذاری اور محبت سے یاد رکھیں گے۔

سردار اودے سنگھ شائق بی اے ایل ایل بی وکیل فیروزپور

سرسید کے بعد سر عبدالقادر "فادر آف اردو" کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ سرسید نے اردو کے لئے ایک مناسب فضا پیدا کردی تھی مگر سر عبدالقادر نے اپنی درخشاں ادبی خدمات سے اس فضا کو روشن کر دیا ہے۔ علامہ تاجور علمی سرگرمیوں میں سر عبدالقادر کے ایک بہادر، بلند حوصلہ اور اپنی دُھن کے پکے لفٹننٹ ہیں۔ ان دونوں حضرات نے اپنی رہنمایانہ امداد سے اردو زبان کو یادگار زمانہ مصنف، ادیب اور شاعر دیئے۔ اردو کا تصنیفی دور سرسیّد کے بعد انہیں حضرات کی کوششوں سے نشوونما پا رہا ہے۔ "ادبی دنیا" کی شان اور امتیازی خصوصیات کا پرچہ اس سے پہلے ہندوستان میں جاری نہیں ہوا۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان خوش قسمت نہیں ہے۔ مولانا حنیف ہاشمی کی ہمہ گیر انشا پردازی ادبی دنیا کو اپنے معاصرین سے ممتاز بنا رہی ہے۔

میں اُس گروہ سے (سکھ قوم) ہوں جو سیاسی نقطۂ نظر سے اردو سے غیر مانوس رہنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ملک کے اس قابل فخر رسالے کو دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور دو سو روپے کی حقیر رقم کا چک بطور ہدیہ ارسال خدمت کرکے اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت پیش کرتا ہوں[1]۔

---

[1] سردار صاحب کی ژرف نگاہی اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ میرے لئے یہ مسرت بہت کافی ہے کہ میری ناچیز خدمات کو میرے احباب پسند فرماتے ہیں۔ چک واپس کر رہا ہوں۔　　تاجور

عرضِ حال

"ادبی دنیا" کا یہ قیصر المبر شایع ہو رہا ہے۔ اِسے شایع کرتے ہوئے ہم خدائے برتر کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی بساط کے مطابق کام کرنے کی توفیق عنایت کر رہا ہے۔ اس نمبر کے مضامین دوسرے کی بہ نسبت زیادہ محنت سے تیار کئے گئے ہیں۔ اس کی تصویریں تعداد میں زیادہ، حجم میں بڑی اور شان میں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ خدا ہماری اس دلی خواہش اور تمنّا کو کامیاب فرمائے کہ ہم اسی طرح ہر دوسرا نمبر پہلے نمبر سے بڑھا چڑھا کر شایع کرتے رہیں۔

بعض اہلِ قلم نے ہمارے بھیجے ہوئے زرِ معاوضہ کو واپس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ مشرق کو مغرب بنانا چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔"

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقررہ اصول کے مطابق اپنے سب اہلِ قلم کو معاوضہ بھیجا تھا۔ اور اس اصول پر اس سختی سے پابندی کی گئی تھی کہ ادبی دنیا کے محترم نگراں کی خدمت میں بھی اُن کے گراں مایہ مضمون کا معاوضہ ارسال کر دیا گیا تھا۔

اِن اہلِ قلم میں سے کچھ حضرات نے تو ہمارا حقیر ہدیہ قبول فرما کر ہماری عزت بڑھائی تھی اور کچھ سرپرستوں نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر معاوضہ واپس کر دیا تھا۔

بعض احباب نے معاوضے کے لفظ کو اپنے خلوص کی توہین سمجھ کر آئندہ سے اپنے مضامین کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ کچھ کرم فرما ایسے بھی ہیں جنھوں نے معاوضہ کی رقم کو اپنے مضمون کے مقابلے میں کم بتایا۔ ہمارے محترم رہنما سر عبد القادر مسرے سے اِس اصول ہی کے خلاف ہیں کہ ہر مضمون نگار کو معاوضہ ضرور دیا جائے۔

جن اہلِ قلم نے ہمارے حقیر ہدیہ کو منظور فرما لیا ہے۔ اُن کا شکریہ اور جنھوں نے ہمدردانہ انداز میں اُسے واپس کر دیا اُن کا بھی شکریہ، جو احباب اِس لفظ کو اپنے خلوص کی توہین تصوّر فرماتے ہیں، اُن سے معافی کے طلبگار اور جو گراں مایہ ادیب زرِ معاوضہ کو کم بتاتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں اس حقیقت کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی یہ تمنّا بھی کہ ہم اُنکی قدر کو پہچاننے اور پہچان کر قدرشناسی کا فرض ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔

مضامین پر معاوضے کی رسم ہم نے اس لئے جاری کی کہ جب رسالوں کے مالک رسالے جاری کر کے رسالے کی کمائی میں اپنے ذاتی اخراجات پورا کرتے ہیں۔ کاتب۔ پریس۔ کاغذ۔ ایڈیٹر۔ مینجر۔ چپراسی۔ ڈاک وغیرہ پر صرف کرتے ہیں۔ تو پھر مضمون نگار غریبوں نے کیا قصور کیا ہے؟ کہ ان کے لئے مفت گیر اور مفت خور بنجائیں۔

دوسرے یہ کہ معاوضے کی رسم جاری ہو گئی تو لٹریچر کی پستی دُور ہو جائیگی ادبی رسالے بھرتی کے مضامین شایع کرنے بند کر دیں گے۔ معاوضہ لیکر لکھنے والے بیگاری کی طرح جو کچھ سُوجھا اُسے دھر گھسیٹنے سے قلم کو روکینگے اور معاوضہ دیکر لکھوانے والے ٹھوک بجا کر اچھے اور بلند مضامین چھاپیں گے۔ اور اس طرح ادب اردو "ادب عالیہ" کا رتبہ حاصل کر سکے گا۔

البتہ ہمیں مضامین کا معاوضہ ادا کرتے ہوئے ایک نیا تجربہ ہُوا جسکا ابتدا میں یا تو خیال نہ آیا تھا یا ہم نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کہ بعض مضمون نگاروں کے مضامین اپنے خیالات اور مطالب کی حیثیت سے تو بلند اور مفید ہوتے ہیں۔ مگر کم مشقی کے سبب زبان اور پیرایۂ بیان کی رُو سے وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اُنہیں شایع کیا جا سکے۔ مضامین کو رد کر دینا تو ہونہار ادیبوں کی حوصلہ شکنی ہے۔ اور کانٹ چھانٹ کئے بغیر شایع کرنا رسالے کے معیار کو پست کر دینا ہے ہم نہ اس پر راضی ہیں نہ اُس پر خوش۔

اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ اس قسم کے مضامین کو عام حالات میں بہت کچھ ردّ و بدل کے بعد اور کبھی کبھی از سرِ نو لکھ کر درج کیا گیا ہے اور اُن پر معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اور نہ انصافاً ایسے مضامین معاوضے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ معاوضہ ہم اُنہیں مضمون نگاروں کو دیتے ہیں اور دیں گے جن کے مضامین میں ہمیں برائے نام تبدیلی کرنی پڑے۔ کیونکہ درمیانہ درجے کے مضامین کو معاوضہ دیکر شایع کرنے سے یہ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے اسٹاف میں ایک اچھے ایڈیٹر کا اضافہ کر لیں۔ اور اپنے بلند معیار کے مطابق اُس سے بلند پایہ مضامین لکھوائیں۔

ناجور

آئینۂ عالم

کیا جرمنی میں شہنشاہیت پھر قائم ہو جائیگی؟

کیا جرمنی میں شہنشاہیت پھر قائم ہو جائیگی؟ - وہ دن جب قیصر برلن میں واپس آئیگا جرمنی کی جمہوریت پسند لوگوں کے لئے نہایت پریشان کن ہوگا - اور انکا اور سوشلسٹوں کا خیال ہے کہ یہ دن کبھی نہیں آسکتا - لیکن ملک میں کچھ دنوں سے ایسے آثار نظر آرہے ہیں اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جرمن خیالات کو اُن میں کہاں تک دخل ہے اور یہ امر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جبکہ جرمنی کی قومی پارٹی کی طرف سے قیصر کو گرمجوش اور پُرتپاک مبارکباد پیش کی گئی تھی - چنانچہ جرمنی کا ایک با اثر اور مقتدر اخبار لکھتا ہے :-

"بہت کم جرمن لوگ ایسے ہونگے جو ماضی کے ان ایام کو مُڑ کر افسوس سے نہ دیکھتے ہوں - جب ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے اس والئے ملک کی سالگرہ کے روز جس کو تمام جرمن قوم اپنا شہنشاہ امن کہتی تھی خوشی کے نعرے لگاتے تھے اور اس کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے تھے -

"ہم میں سے اکثر لوگ یہ سننے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے آغاز تک شہنشاہ ولیم ثانی کا عہد حکومت جرمنی کیلئے بہترین اور خوشحال ترین عہد حکومت تھا -

"لیکن اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ اس کے عہد میں ہم ولیم اول اور پرنس بسمارک کے عہد کی مصیبتوں کا ثمرہ اٹھا رہے تھے - تجارت اور صنعت و حرفت ترقی پر تھی - مزدوروں کی کافی آمدنی تھی - بے روزگاری کی صورت بھی نظر نہ آتی تھی - زراعت سرسبز تھی - علم و فن گورنمنٹ کی مدد سے نہایت تیزی سے ترقی کر رہے تھے -

" مالی حالت نہایت اچھی تھی اور ٹیکس اسقدر کم تھے کہ آجکل لوگ اس امر کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان دنوں حکومت کا کاروبار کس طرح چلتا تھا -

"یہ الزام کہ قیصر دوسرے جرمنی شہزادوں کو مٹا کر شہنشاہی کو مضبوط کرنا چاہتا تھا کچھ حقیقت نہیں رکھتا -

" حکومت کی باگ اس عظیم الشان شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی جو صرف اپنی ذاتی زندگی میں ہی لوگوں کے لئے ایک درخشاں مثال نہیں تھا - بلکہ اپنی رعایا کا بہترین حکمران تھا جو جرمنوں کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا - مزدور جماعتوں کی بہبودی کے لئے سوشل خدمات کرنے میں جرمنی یورپ کی سب طاقتوں سے آگے تھا -

"قیصر جرمنی کے جنگی بیڑے کا انتھک سرپرست تھا - وہ اس کو اپنے ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کی سپر خیال کرتا تھا -

" سکاگرکی چٹان کے معرکے میں اس جنگی بیڑے نے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور ہر جگہ یہ جرمنی بیڑا اپنی شجاعت بہادری اور عزم کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز اور قابل تعریف ثابت ہوا تھا - جرمن سپاہ بھی زمانے بھر میں لاجواب تھی - قیصر نے اس زبردست فوج کو اپنے دادا سے وراثت میں لیا تھا اور اپنی فیصلہ کُن شجاعت اور پیش بینی سے اس کی ہیبتناک طور پر توسیع کی تھی اور میدانی فوج کے لئے ایک خوفناک توپخانہ اس کا ذاتی کارنامہ تھا - چنانچہ جرمنی کے لوگوں کی یہ حالت تھی جب وہ شہنشاہی اور جرمنی تخت کے زیر نگیں تھے -

" لیکن شروع ہی سے قیصر کی شخصیت کے خلاف کینہ اور حسد سے بھری ہوئی آواز اٹھائی گئی اور اس امر کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ قیصر کی حکومت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب بسمارک کو انتظام سلطنت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے -

واقعات کو دیکھکر جرمنی کے لوگوں کی نگاہیں اپنے آقا کے خیال سے تیرہ و تار ہو جاتی ہیں اور اس سے بیرونی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے -

ہم اس کی غلطیوں کو چھپانا نہیں چاہتے لیکن جسقدر کمزوریوں کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ تمام اس میں نہیں ہیں"

پریذیڈنٹ ہوور اور قانون

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نیا پریذیڈنٹ مسٹر ہوور نئے قانون کے جاری کرنے اور اہم مسائل کا فیصلہ کرنے کے دعووں کے ساتھ میدان میں آیا تھا - ان تمام وعدوں اور امیدوں کا پیش خیمہ جمہوریت کی قانون شکنی ہے - عام پبلک میں یہ مرض ادب لطیف کی حد تک پہنچ چکا ہے - دیگر قوانین مثلاً "ٹریفک جونز لا" وغیرہ کے علاوہ جن کو توڑنے سے ۲ ہزار

پونڈ جرمانہ اور پانچ سال تک قید کی سزا دی جاتی تھی۔ دیگر مجلسی قوانین اس کثرت کے ساتھ توڑے جاتے ہیں کہ کسی اور ملک میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ "ممانعت شراب" کے قانون کو لاکھوں آدمی روزانہ توڑتے ہیں۔ جمہوریت کے گورنر، میئر، جنرل، وکلاء، سینٹ کے ممبر، قانون ساز۔ اور وہ لوگ بھی جن کا فرض یہاں ہے اس قانون کی نگرانی ہے اس قانون شکنی میں عوام کے ساتھی ہیں۔ اور جام پر جام لنڈھاتے ہیں ممکن ہے کہ موجودہ پریذیڈنٹ کے عہد میں اس قانون کا خاتمہ ہو جائے جس کی بنا ان ہولناک جرموں پر ہے جو شراب نوش سوسائٹی کے ممبروں سے بکثرت سرزد ہوتے ہیں۔ شراب نوشی کے جرائم میں خدا جانے کسقدر اضافہ ہوگا جبکہ آج کل ریاستہائے متحدہ میں قتل کی وارداتوں کی تعداد گیارہ ہزار سالانہ ہے اور قتل کرنے والوں میں سے تقریباً نصف گرفتار ہوتے ہیں جن کا چھٹا یا ساتواں حصہ پھانسی پاتا ہے۔ اگر حساب کیا جائے تو امریکہ میں قتل انسان کی وارداتیں بیس گنا اور چوری کی تیس گنا اور ڈاکے کی پچاس گنا برطانیہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔

اطالیہ اور بحیرہ قلزم

فرانسیسی ترکی معاہدہ جس کی رو سے ان دونوں ملکوں کے تمام اہم مسائل کا فیصلہ ہو جاتا ہے انگورہ پہنچ چکا ہے۔ اب کچھ عرصے بعد پیرس میں دوستانہ گفت و شنید ہوگی اور اس ڈرامے کا آخری سین کاغذات پر دستخط ہونے کے ساتھ ختم ہو جائیگا لیکن اطالیہ کے جدید طرزِ عمل نے فرانس کو نہایت پریشان کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مسولینی کا رویہ اس معاہدے کی تکمیل کے اطمینان سے کہیں زیادہ پریشان کن ہے۔ انگورہ کے جنگی بیڑے کی تعمیر اطالیہ کی بندرگاہوں پر ہو رہی ہے اور ترکی افسروں کی تربیت اور جنگی بیڑے کی نگرانی کے لئے اطالوی بحری مشن کی خدمات جن کو پیشتر ازیں برطانیہ سرانجام دیتا تھا حاصل کی گئی ہیں۔ یونان اپنی ہمسایہ ترکی کی اس تیاری سے خائف نظر آتا ہے اور اپنے جنگی بیڑے کی تعمیر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے۔ اطالیہ اس امر کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یونان کے ساتھ بھی اس کے دوستانہ معاہدے ہیں وہ لازمی طور پر یونان اور ترکی کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کریگا۔ چنانچہ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو ایک وقت آئیگا جب بحیرہ قلزم کی تمام بحری طاقت اس کے اشارات کی سرکردگی میں اس کی پشت پر ہوگی۔

پارلیمنٹ کی جدید شخصیتیں

انتخاب سے پارلیمنٹ میں چند جدید اور دلچسپ شخصیتوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ پارلیمنٹ میں پہلی بار آئی ہیں۔ ان میں مسٹر نارمن اینجل مصنف "گریٹ الیوژن" موجودہ ایڈیٹر "فارن افیرز" اور پروفیسر بی جے نویل بیکر فیلو آف کنگز کالج کیمبرج۔ بین الاقوامی اتحاد اور صلح کے پرجوش مبلغ اور پرچارک ہیں۔ پروفیسر نویل بیکر مجلس اقوام کے اکثر عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیانی عرصہ میں آپ اقتصادیات کے کالج میں بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر تھے۔ برطانوی یونیورسٹیوں کی طرف سے انڈیپنڈنٹ نمائندے کی حیثیت سے مس راتھبو کا انتخاب بھی نہایت دلچسپ ہے مس موصوف تحریک نسواں کی پہلی ممتاز خاتون ہیں جنہیں پارلیمنٹ میں جگہ ملی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے وسیع تجربہ اور علم سے وہ پارلیمنٹ میں ایک نئی فضا پیدا کر دینگی۔ اور یہ امر کہ متحدہ یونیورسٹیوں سے ایک ایسی شخصیت کو اپنی نمائندگی کے لئے انتخاب کیا ہے جو کسی پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اس انتخاب کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے خاتون ممبروں میں مس میری اگینز ہملٹن بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک ممتاز انشا پرداز اور بڑی نقاد ہیں۔ ادبی مذاق کے لوگ آپ کے دلکش انداز بیان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دیگر ممبروں میں مسٹر جے۔ ایف۔ ہورابان۔ کارٹونسٹ مسٹر سانڈرس جس نے مسٹر سکلات والہ کو باترسی میں شکست دی تھی اور نیو لیڈر کا ایڈیٹر مسٹر فابنر براکو بھی قابل ذکر ہیں۔

جاپان اور رومن رسم الخط

مغربی تہذیب و تمدن نے مشرق کو بہت بری طرح پچھاڑا ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ مغرب کی ہر ناروا سے ناروا بات پر بھی اس کو آمنّا وصدقنا کہے بغیر چارہ نہیں۔ تہذیب یا دوسرے الفاظ میں مصنوعی زندگی کی اس ملمع سازی اور ظاہری زرق برق نے نگاہوں کو اسقدر خیرہ کر دیا ہے کہ ہمیں مغرب کے نقشِ قدم کے سوا ترقی کا اور کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ ایشیائی ممالک میں جاپان تہذیب و ترقی میں سب سے پیش ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اپنے آپ کو مغربی گوشت پوست کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ مغربی تہذیب کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لئے وہاں بھی رومن حروف کو روشناس کرایا گیا تھا۔ ابتدا میں تو چند سر پھرے۔ لوگوں نے اس کی مخالفت کی لیکن اب یہ حالت ہے کہ تحریر کا مستند ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے ایک لاکھ صنعتی اسکولوں کی کتابیں ان حروف میں شائع ہوتی ہیں۔ جاپانی لکھنے کے لئے ان حروف کے ٹائپ رائٹر بھی تیار کئے گئے ہیں وہ اسوقت تک سینکڑوں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔

پروفیسر دانیال جونز جو ایک ممتاز انگریز زبان دان اور ماہر صوتیات ہیں

میسولینی

اس سے پیشتر میرے ذہن میں میسولینی کی ایک خود ساختہ تصویر تھی لیکن یہ کوئی دلکش یا دلفریب تصویر نہ تھی بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ آجتک کسی شخص نے اپنے ذہن میں اس کی ایسی تصویر نہ بنائی ہوگی۔ میرے خیال میں وہ ایک مہیب صورت چوڑے شانوں اور چپٹے رخساروں والا انسان تھا۔ اس کی تاریک اور خوفناک ابروؤں کے نیچے دو انگارہ سی غضبناک آنکھیں فروزاں تھیں۔ جن کے تصور سے جسم میں ایک لرزہ خیز لہر دوڑ جاتی تھی۔ چہرے پر ہمیشہ غور و فکر کی افسردگی اور روح کی تباہ کاری جھلکتی تھی۔

میں یہ کہوں گا کہ آجتک کسی شخص نے اس کی اس قدر مہیب تصویر اپنے تصور میں نہ کھینچی ہوگی

لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ مجھے تصور کی اس قسم کی پیکر نگاری میں معذور سمجھا جائیگا۔ .... گو میں نے اسے خود بخود نہیں بلکہ اطالوی آرٹ کے نمونوں کو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔ کئی سال پیشتر جب میں متواتر کئی ہفتے اطالیہ میں رہا میں نے قدیم فن تعمیر کے کھنڈرات پر ایسی تصویروں کو نہایت تاریک نگاہوں اور وحشیانہ انداز میں راہروں کو گھورتے دیکھا تھا۔ ان تصاویر کی دیواروں پر اس قدر کثرت تھی کہ وہ نادانستہ طور پر ذہن میں نقش ہو جاتی تھیں اُن سے بالشت بھر جگہ بھی بچی ہوئی نہ تھی۔ چنانچہ میری میسولینی کی تصویر میں بھی رحم و ہمدردی کے جذبات نہ تھے میں یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ جن نمونوں کو دیکھ کر میں نے اس کی تکمیل کی ہے ان میں بھی یہ جذبات نہ تھے اور اسکے علاوہ خود میسولینی کی تصاویر میں بھی جو میں نے دیکھا تھا شکل و صورت نہایت مہیب ہے۔ رخسار چوڑے ہیں اور ایک بازو اس طرح پھیلا ہے گویا ضرب لگانا چاہتا ہے۔ چہرے کے اندر اور پیشانی کی شکنوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو لڑائی کیلئے للکار رہا ہے۔ اسکی زندگی کے کارہائے نمایاں تھے جو اسکی ذہنی تصویر بنانے میں میرے بہت حد تک شریک رہے تھے میں اسکی زندگی کے دھندلے منظر کی طوفانی موجوں پر غور کرتا تھا جو غیظ و غضب میں دنیا کی ناانصافیوں اور دروغ بافیوں کی چٹانوں پر زور شور سے ٹکراتی تھیں اور اُلٹا پھرنے کی بجائے ان کو پاش پاش کرکے آگے بڑھتی چلی جاتیں۔ میری روح ان کی شورشوں میں محو ہو جاتی اور خیال کا موقلم پیکر نگاری میں لگ جاتا۔ چنانچہ اُن کا نمونہ کا مجمل سا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔

میسولینی ایک گمنام گاؤں میں ایک لوہار کے گھر پیدا ہوا جو خود بھی عمر بھر ان منظم ناانصافیوں اور حق تلفیوں کے خلاف بغاوت کرتا رہا تھا۔ جو موجودہ تہذیب میں قانون کی رو سے روا رکھی جاتی ہیں اور اسی بنی ٹوجورز کے نام پر اُس کا نام رکھا گیا جس نے شمالی امریکہ کی سرزمین میں آخری شہنشاہی حکومت کو پامال کرکے میکسیکو کی جمہوریت قائم کردی تھی۔ گہوارہ سے لیکر اس کی پرورش اور تربیت ایک اشتراکی (سوشلسٹ) کی حیثیت سے ہوئی بچپن ہی سے وہ تلخ اور تباہ کن جماعتی سیاسیات کی خوفناک اور طوفانی موجوں میں کود پڑا۔ اور ایک مالدار شخص کے مقابلہ میں پارلیمنٹ کی نشست کیلئے ایوسانہ جد و جہد اور ناکام کوشش شروع کردی۔ لیکن ناکامیابی انتخاب کو غلط اور ناجائز خیال کرتے ہوئے غیظ و غضب کے ایک بے پناہ جذبے کے ساتھ اُس نے انتخاب کے صندوق کو پاش پاش کردیا اور قانونی سزا سے بچنے کے لئے سوئٹزرلینڈ کو بھاگ گیا۔ لیکن اس گوشۂ امن میں سوئٹزرلینڈ کے ارباب حل و عقد نے اسے زیادہ مدت تک نہ رہنے دیا۔ اُن کے خیال میں یہ شخص نہایت خطرناک اصول کا حامی اور ان کا پھیلانے والا تھا۔ یہاں سے نیم گرسنگی اور نیم برہنگی کی حالت میں بھاگ کر فرانس اور ترال تیلو میں پناہ گزین ہوا۔ یہاں وہ ایک مزدور کی مانند کام کرتا اور معماروں کو پتھر اُٹھا اُٹھا کر دیتا تھا۔ نہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا نہ رات کو سونے کے لئے جگہ۔ اکثر راتیں موسم سرما کے تند اور وحشی آسمان کے نیچے کاٹ دیتا۔ لیکن خوراک سے زیادہ اس کے دل میں حصول علم کی تڑپ تھی جب اس کے ساتھ کے مزدور گپوں میں مصروف ہوتے یا کاہلی سے پڑے اونگھتے وہ سیاسیات مدن کی کتابیں اور بڑے بڑے انقلابیوں کے حالات پڑھنے میں محو ہو جاتا

جلاوطنی کی میعاد ختم ہونے پر اٹلی آیا تو انسانی حقوق کے مطالبے کیلئے ایک اشتراکی اخبار جاری کیا جس کو اسکی پرجوش اور شعلہ نو سرگرمی کی وجہ سے نمایاں کامیابی ہوئی۔ اکثر اوقات وہ گرفتار کیا گیا اور قیدخانوں میں بند کردیا گیا۔ دو بار ہتھکڑیاں پہنا کر گلیوں میں اُس کی تشہیر کرائی گئی ۱۹۱۴ء میں اپنی جماعت سے نکال دیا گیا۔ کیونکہ اس کی وطن پرستی کا جذبہ اسی اپنی جماعت کی عقیدت سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ جس کی سرگرمیاں صحیح قومی نصب العین کے مطابق نہ ہوں۔ اس کے عقیدتمند دوستوں آشناؤں اور شاگردوں کی طرف سے اس پر غداری اور دغابازی کے الزام لگائے گئے

عام لوگوں میں اس کو ذلیل و رسوا کیا گیا اور منافقوں اور نمک حراموں کی طرح اس پر لعنت کی گئی اور ۲۹ سال کی عمر میں صرف ایک رات کے مختصر سے عرصے میں ایک راہنما اور ترجمان کے رُتبے سے گر کر وہ محض ایک بے یار و مددگار اور بے خانماں انسان رہ گیا جس پر ہر طرف سے نفرت و حقارت کے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اُسی وقت اُس نے اتحادیوں کی طرف سے جنگ کرنے کی تائید میں ایک اور اخبار جاری کیا۔ . . . .

. . . ، آتش فشاں مقالات لکھے۔ گرجتے ہوئے اعلانات شائع کئے۔ تمام دشمنان مخالفین پر نہایت وحشیانہ حملے کئے جاتے اور آدھی رات تک بے اعتنا اور دل سرد جلسوں یا کھلم کھلا مخالفین کے مجمعوں میں زور شور سے دھواں دھار تقریریں کی جاتیں۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو اسے ایک رضاکار کی حیثیت سے مقدمۃ الجیش ([illegible]) میں ہو کر لڑنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ آخر کار وہ پیدل دستۂ فوج میں معمولی عہدہ دار کی حیثیت سے بھرتی ہو کر نہایت جرأت و شجاعت کے ساتھ لڑا۔ لڑائی کے دوران میں توپ کا ایک گولہ پھٹنے سے اسکے جسم میں ایک سو زخم آئے۔ جسم سر سے پاؤں تک چھلنی ہو گیا۔ اور وہ لڑائی کے ناقابل ہو گیا۔ بیماری کی حالت ہی میں اشتمالیت (بولشویزم) اور "سرخ" وردی والوں کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ اب یہ حالت تھی کہ کبھی بے کار اور کمزور شاہی خاندان کو ملامت کی جا رہی ہے اور کبھی صلح پسند جماعت کے تار و پود بکھیرے جا رہے ہیں۔ اور آخر کار جدید المالیہ کے تاریک ترین لمحوں میں جبکہ تباہ کن خونخوار اور قتل و غارت کرنے والے بالشویزم کی بڑھتی ہوئی رَو کے خلاف جس کے لئے پیرس و گرد سے سرمایہ بہم پہنچایا جاتا تھا اور جس کی آبیاری لینن اور ٹراٹسکی کر رہے تھے۔ شرفا کی بکھری ہوئی طاقتوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد میسولینی ہمیں سیاہ پوشوں کے کپتان کے لباس میں نظر آتا ہے اور فوراً بعد ہی فتحیاب فسیٹی [illegible] کا بے حریف کمانڈر بن جاتا ہے۔ اب وہ اطالیہ کی اس تمام آبادی کی امن پسند طغیانی کا قائد اور راہنما تھا جس نے اس کو اس کی چالیسویں سالگرہ سے پہلے اطالیہ کا وزیر اعظم اور ملک کی قسمتوں کا مالک بنا دیا۔ اس وقت اُس کے ہاتھ میں وہ طاقت تھی جو اس کے ہموطنوں میں سے کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ لاکھوں کی تعداد میں بت پرستوں کی سی عقیدت کے ساتھ اس کے نقش قدم پر چلنے والے اس کے ہر فعل پر تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے، خوشامدیں کرتے اور چاپلوسیوں میں لگے رہتے۔ مختصر اور سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ قدیم کا یہ شیدائی اور گذشتہ دو دور کی یہ نمایاں ترین انسانی ہستی پندرھویں صدی کے صلیبی معرکوں کا ایک مجاہد ہے جس نے بیسویں صدی میں جنم لیا ہے۔

اس قسم کی طرز زندگی اور تجربہ ان حالات کے آدمی کو اصول کا پکا متعصب خود مختار بلکہ مطلق العنان اور اس کے انداز کو تحکمانہ کیوں نہ بنا دیتے؟ اور اختیارات کی وسعت سے پرشکم ہو کر جو نامعلوم زمانوں سے مطلق العنان متکبروں کی مرغوب غذا رہی ہے میسولینی اپنی کامرانی کی کامیاب ترین ساعت میں آخر کیوں تحکمانہ انداز اور آگے بڑھی ہوئی گھنی تاریک ابروؤں کے سایہ میں تیز چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے سے چھوٹے آدمیوں کو پیشانی کے ایک بل سے نہ لرزا دیتا۔ اور قدیم قیصر کے ایوانوں کی نشست پر بیجا طور پر متمکن ہو کر ایک جدید قیصر کے شایان شان بہادرانہ کارنامے سرانجام نہ دیتا؟ ایک فانی انسان سے جو اپنی مختصر زندگی کے نصف عرصے میں ایسے ایسے کام کرے اور اس قدر پستی سے زندگی شروع کر کے ایسی رفعت پر پہنچ جائے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود غرضی اور خود ستائی کے جنون سے محفوظ رہے۔ اور نپولین کی طرح سیاسی پیچیدگیوں میں نہ پڑ جائے؟

یہ خیالات تھے جو میسولینی کو دیکھنے سے پہلے میرے ذہن میں تھے۔ لیکن اس مضمون کو معرض تحریر میں لانے سے صرف دو روز پیشتر میسولینی کو پرائیویٹ طور پر ملاقات کرنے کیلئے فلورنس سے روما گیا۔ وقت پہلے سے مقرر کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت اور اسی مقام پر میں نے اپنے تمام خیالات پر نظر ثانی کی۔ جو میں اُس کی شخصیت اُس کی ذہنیت اُس کی جسمانی ڈیل ڈول اور روحانی امکانات کے متعلق رکھتا تھا۔

ہدایات کے مطابق میں وقت مقررہ پر چیگی پیلس میں پہنچا جو آج کل کیوری نال سے جہاں بادشاہ رہتا ہے بڑھکر حکومت اطالیہ کا حقیقی مرکز ہے۔ کسی معمولی شاہزادے سے ملاقات کرنے میں جن پر تکلف آداب اور مراتب کا پابند ہونا پڑتا ہے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہاں کے ہر کام میں آزادی کی وہ دلکش شان نمایاں تھی جو ایک معمولی امریکن کو دلفریب ترین طور پر متاثر کئے بغیر رہ سکتی۔

دروازے کے قریب پہلے فرش پر ایک محراب کے نیچے جس کی پشت پر ایک جنگلے والا صحن تھا اور قریب ہی متعدد موٹریں قطاروں میں کھڑی تھیں۔ دو "باتیں" سپاہی ایک سرکاری عہدہ دار سے جو اس وقت شہری لباس میں تھا باتیں کر رہے تھے۔ باوردی آدمی پوچھنے کے لئے آگے بڑھا اور قدیم رومی انداز میں جسے فسیطیوں نے پھر رائج کیا ہے۔ اپنا داہنا ہاتھ آگے کو پھیلاتے ہوئے سلام کیا۔ میں اطالوی زبان نہ جانتا تھا اس لئے میں نے وہ تار نکال کر دکھا دیا جو مجھے فلورنس کے پتہ پر وزیر اعظم

کے ایڈی کانگ کی طرف سے وصول ہوا تھا۔ اُس نے اُسے پڑھا، مسکرایا اور تعظیم سے جھک کر دائیں ہاتھ کے فراخ زینہ کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے فرش پر مجھے ایک اور شخص ملا جو لباس اور انداز سے عرض بیگی معلوم ہوتا تھا وہ مجھے مختلف غلام گردشوں میں سے ملاقات کے کمرے میں لے گیا جہاں کئی ایک شرفا جو متانت اور وقار سے جہاندیدہ سیاست دان معلوم ہوتے تھے خاموش لیکن منتظر بیٹھے تھے۔ ان حضرات کے پاس سے گذرنے کے بعد پہلا عرض بیگی واپس آگیا اور دوسرا میرے ساتھ ہو لیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک وسیع ایوان میں سے گذرنا پڑا جس کے اختتام پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہاں میرے راہبر نے اس کے بند دروازہ کی طرف اشارہ کیا اور نہایت پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

میں کسی بیرونی کمرے یا دفتر میں جانے کی اُمید پر اندر چلا گیا۔ لیکن اس کے بجائے میں نے اپنے آپ کو ایک وسیع ایوان کی دہلیز پر کھڑے پایا۔ جو نہایت مختصر طور پر آراستہ تھا اور بظاہر خالی نظر آتا تھا۔ یہ ایوان یقیناً ستر فٹ مربع ہوگا۔ ترچھے طور پر میرے مقابل ایک کونے کے دریچے کے پاس دیواروں کے زاویے سے لگا ہوا ایک بلند اونچا ہموار سطح کا میز تھا۔ اور اس کے پیچھے سے ایک شخص ساکت بیٹھا میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے اور میرے سوا دوسرا کوئی متنفس اس کمرہ میں نہ تھا۔ جب میں آگے بڑھا وہ پھرتی سے اُٹھا اور مجھے قدیم رومی طور پہ سلام کیا۔ اور چونکہ میں اُس وقت تک اس رسم سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ میں نے بھی اُسی انداز میں سلام کا جواب دیا اور پھر جب وہ تیزی کے ساتھ میز سے میری طرف آیا تو میں نے پہچان لیا کہ وہ مسولینی ہے۔

اسی مختصر سے عرصے میں جب ہم ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے بڑھ رہے تھے میں نے اور چیزیں بھی دیکھیں۔ میں نے دیکھا اور تعجب وحیرانی کی ایک سنسنی کے ساتھ دیکھا کہ وہ چھوٹے قد کا آدمی ہے اور اس پیمانے کے مطابق جس سے ہم امریکہ میں بلوغت تک پہنچے ہوئے مردوں کی پیمایش کرتے ہیں نہایت چھوٹا آدمی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بلی کی سی دلکش تیزی اور شان کی دلفریبی کے ساتھ چلتا ہے جو اگرچہ اس کے لئے بالکل فطری اور تصنع اور بناوٹ سے مبرا ہے۔ لیکن محفل رقص و سرود کے کسی پیکر ناز کے لئے اس کی زندگی کی کم از کم بیس بہاروں کے مطالعے سے اور متواتر مشق کا نتیجہ ہوتی۔ اس کے لباس کو دیکھ کر جو دیگر تفصیلات کے علاوہ ایک بند بٹنوں کے کوٹ۔ استری شدہ خوبصورت پاجامے سیاہ بیٹوں اور نہایت چمکدار جوتوں اور آستینوں کے دو غیر معمولی طور پر پوٹے اور سفید کتان کے کفوں پر مشتمل تھا۔ ذہن فوراً کسی سنجیدہ تمثیل کے پیشہ ور ایکٹر کی طرف چلا جاتا تھا۔ لیکن اس کے سلام کے انداز میں کوئی ایکٹروں کی سی بات نہ تھی۔

اس نے میرے ہاتھ کو نہایت گرمجوشی سے دبا کر مصافحہ کیا اور نہایت سادگی سے صرف یہ الفاظ کہے کہ میں آپ سے ملکر بہت خوش ہوا ہوں۔ وہ اُصول صوتیات کے لحاظ سے تو بہت اچھی طرح انگریزی بولتا تھا۔ لیکن گفتگو کا لب ولہجہ اُس شخص کا سا تھا جس نے انگریزی بولنے والی اقوام کے افراد سے ملنے کی بجائے اسکول کے نصابیہ زبان سیکھی ہو۔

"آپ اطالوی زبان جانتے ہیں؟ —— نہیں!"

اُس نے پوچھا اور میرے سر ہلانے پر خود ہی جواب گھڑ لیا۔

"فرانسیسی —— شاید؟"

میں نے اسے بتایا کہ گذشتہ چند موقعوں پر میں نے فرانسیسی بولنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر چند مہربان فرانسیسی احباب نے مجھے تاسف آمیز الفاظ میں یقین دلایا کہ میں فرانسیسی نہیں بولتا"

اُس نے کہا ہم انگریزی میں گفتگو کریں گے۔ لیکن آپ بالکل آہستہ بولیں تیز نہیں ورنہ میں سمجھ نہ سکوں گا۔ آپ تشریف رکھئے خانہ بے تکلف ہے۔"

جب وہ مجھے وہاں لیجا رہا تھا جہاں اس کے میز کے پاس دو سخت اور اونچی کرسیاں بالمقابل پڑی تھیں مجھے اس شخص کا جائزہ لینے کا ایسا ہی مختصر سا موقع مل گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ سخت چھوٹے اور لچکدار تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مغنی یا مصور کے حساس ہاتھ تھے نہ کہ اُس جفاکش مزدور کے جو ایک زمانے میں نہایت محنت اور مشقت سے اپنی روزی کماتا تھا۔ اُس وقت اُس کی کلائیوں کے غیر معمولی چوڑے کفوں کی ممکن وجہ بھی میرے ذہن میں آگئی۔ میرے خیال میں یہ ایک قابل معافی ذاتی خود نمائی تھی۔ کیونکہ بڑے ہوئے چوڑے کفوں سے اس کے خوبصورت ہاتھ اور بھی چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی جلد میں ایک خفیف سی سبزی مائل جھلک تھی جو پر مشقت کام یا حد سے زیادہ غور و فکر کرنے اور معدہ کی کسی مزمن بیماری سے پیدا ہو جاتی ہے یہ کوئی صحت کی علامت نہ تھی میرا خیال ہے ڈاکٹر اس رنگ کو خرابی صحت پر محمول کرے گا۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کی کمر مضبوط اور پہلوانوں کی سی تھی۔ سینہ گہرا اور شانے پیچھے کو تنے ہوئے ٹانگیں اور بازو قوت اور طاقت کے ساتھ حرکت کرتے تھے اور حرکات سکنات جو وہ ایک اطالوی کی حیثیت سے بہت کم استعمال کرتا تھا ایک ان تھک

جسمانی طور پر مہیب اور چاق چوبند شخص کی سی تھیں۔

یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ میسولینی کیوں اپنے ماتحتوں سے زیادہ عرصہ کام کر سکتا اور تندرست رہ سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوراً فیصلہ کر لینے کی قابلیت کے ساتھ اس کو قدرت کی طرف سے انہماک اور محویت کا بیش بہا قابل رشک عطیہ بھی ملا ہے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ بہت کم غذا کھاتا ہے اور نہایت پرمشقت کاموں موٹر چلانا۔ گھوڑے کی پشت پر سواری کرنا اور شمشیر زنی وغیرہ میں مصروف رہتا ہے۔ اور اپنی فرصت کے اوقات میں سارنگی بھی اچھی طرح بجا سکتا ہے۔

ہم دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ ہمارے زانو تقریباً ایک دوسرے سے چھوتے تھے۔ شام کے آفتاب کی کرنیں اس کے شانوں پر پشت کی طرف سے پڑ کر چہرے کو اور بھی نمایاں کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی ایک بار پھر کوئی انتہا نہ رہی کہ اسکی پیشانی آگے کو جھکی یا اُبھری ہوئی نہیں بلکہ وہ ایک فلسفی یا طالب علم کی پیشانی کی مانند خوبصورت مستقیم اونچی اور ہموار تھی۔ سامنے زیادہ بال نہیں تھے اور کنپٹیوں کے پاس دبا کر ننگا ہو گئی تھی کاسۂ سر صرف پیچھے سے کچھ اُبھر کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایک ثابت قدم مستقل مزاج اور ان تھک مجاہد ہے۔ اس کا چہرہ چوڑا اور پر جلال تھا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کے ہونٹ نازک۔ لچکدار اور ایک فصیح بیان خطیب کے ہونٹ تھے لیکن اُن سے شرمیلے پن۔ تجربہ کاری۔ شرافت اور ہمدردی کی ایک جھلک نمایاں تھی اور وہ خفیف سی حقارت کے ساتھ کناروں پر جھکے ہوئے تھے۔

لیکن آنکھ ذہنی اور قلبی وارداتوں کی صحیح آئینہ دار تھی۔ نگاہ تیز اور خدا جانتا ہے کس قدر تیز تاڑ جانے اور پرکھنے والی تھی۔ لیکن یہ ویران سرد غضبناک اور وحشیانہ آنکھ نہ تھی بلکہ بڑی شربتی آنکھ تھی جس میں مروت اور ہمدردی ملی ہوئی افسردگی اور پژمردگی پائی جاتی تھی اور اگر یہ نہیں تو میرا اندازہ سراسر غلط تھا۔ میں نہیں جانتا میسولینی کی آنکھ میں انسانی کمزوری سے اس ہمدردی اس قوت اور فہم و ادراک اور اس مضبوط ارادے کے آثار بھی موجود ہیں جو لنکن کی آنکھ میں پائے جاتے تھے۔

اس سے پیشتر کہ میں دیگر امور کا تذکرہ کروں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میسولینی اطالوی نہ ہو تو ایک ہجوم میں سے نہایت آسانی سے ایک شامی سمجھا جا سکتا ہے۔ میں حیران ہوں اطالوی لوگ خصوصاً پادری اور راہبہ عورتیں شکل و صورت میں اس قدر کیوں یہودی معلوم ہوتے ہیں اور میسولینی تو اگر سو فیصدی بھی رومی ہو تو بھی چہرے کی ساخت سے شامی نسل کا ہی نظر آئیگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض میرا ذاتی خیال ہو۔

وہ آپ نے مجھے لکھا تھا کہ آپکا ایڈیٹر چاہتا ہے۔ آپ مجھ سے ملاقات کریں"

اُس نے کہا "جناب" میں نے جواب دیا "یہ صحیح ہے"

"خوب" اُس نے کہا "یہ انٹرویو نہیں۔ تو ہم آزادی سے صحیفہ نگاروں کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو آپ سے چند امور کے متعلق پوچھ سکتا ہوں"

چنانچہ اُس نے نہایت بے تکلفی و بے باکی سے ایک تجربہ کار تیرانداز کی طرح جو سیدھا ہدف پر تیر مارتا ہے پوچھنا شروع کیا۔ وہ امریکہ کے مسئلہ عمال پر میری رائے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے امریکہ کی بڑی بڑی زندہ شخصیتوں کے متعلق پوچھا اور دو ایک کے نام بھی لئے۔ پھر بالشویک تحریک کے متعلق سوال کیا کہ اگر امریکہ میں اس کا وجود ہے تو اسے کس قدر خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی اندرونی اقتصادی حالت کیا ہے۔ اور مختلف مسائل میں ہماری قومی حکومت کا کیا [illegible] طرز عمل ہے۔ میرا خیال ہے میں نے اس کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو میں امریکہ کے چند اداروں کے متعلق مدح و توصیف کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ ابھی تک میسولینی نے ہماری کھلم کھلا تعریف شروع نہ کی تھی۔

یہ جواب سُنکر وہ اپنے ہر ایک سوال کو فصیح اور بلیغ اشارات سے واضح کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ نقرئی آواز اور عوام کے مجمع میں آگ لگانے والا میسولینی تقریر کے وقت کیسی کیسی متاثر کن اور پیشہ ورانہ چالیں اختیار کرتا ہو گا۔ میں نے کبھی میسولینی کو عوام میں تقریر کرتے نہیں دیکھا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا اس وقت اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہو گا۔ اور وہ نفسیات کے کس قلعہ شکن اُصول کو برُئے کار لاتا ہو گا اور اپنے دوستوں کو بیدار اور آمادۂ کار کرنے اور مخالفین کو ڈرانے دھمکانے کے لئے کن شاندار حرکات کا مظاہرہ کرتا ہو گا۔ لیکن میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اپنی نجی گفتگو میں وہ ہر قسم کی دانستہ متاثر کن حرکات آوازکے بھرا ور تصنع سے قطعاً آزاد ہوتا ہے لیکن اس سے میری یہ مراد نہیں کہ اس میں ڈرامیت نہیں ہوتی۔

میں نے آجتک ایسا کوئی اطالوی نہیں دیکھا جس میں فطری ڈرامیت نہ ہو۔ لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری تمام گفتگو کے دوران میں اُس نے ایک بار بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے تصنع یا بناوٹ ظاہر ہوتی ہو۔ ذوق و شوق سادگی اور گہری دلچسپی کی تو فراوانی تھی لیکن کوئی ریاکارانہ یا بناوٹ سے پیدا کیا ہوا جذبہ موجود نہ تھا۔

میں نے اپنے علم کی [illegible] کے مطابق امریکن لوگوں کے

اخلاق و عادات کے بیشمار پہلوؤں پر حتی الوسع روشنی ڈالی اور جرأت کر کے یہاں تک بتا دیا کہ اطلانٹک کے اس پار عوام اس کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُس نے تمام باتیں نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ سنیں اور جب میں نے بتایا کہ ہم میں سے اکثر کا خیال ہے کہ اطالیہ سے اشتراکیت کو محو کرنے کے لئے جارحانہ قدم اُٹھا کر آپ نے انگریزی بولنے والے لوگوں کو انارکی کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بچا لیا ہے تو اس کا چہرہ بے تکلفی کی مسرت انگیز مسکراہٹ سے جگمگا اُٹھا۔ میں نے کہا۔

"کیا یور ایکسیلنسی جانتے ہیں کہ کثیر التعداد امریکن آپ کو کس نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آپ کو اطالوی روزویلٹ کہتے ہیں"۔

اس فقرہ پر وہ بہت زیادہ ممنون ہوا۔

اس پر اُس نے کہا "میں بہت خوش ہوں اور فخر کرتا ہوں۔ میں رزویلٹ کا بہت مداح ہوں" اُس نے اپنی مٹھیاں بند کر لیں" رزولٹ طاقت اور قوت رکھتا تھا۔ اُس کا ارادہ مستحکم اور غیر متزلزل تھا۔ وہ جو کام چاہتا تھا ثابت قدمی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ وہ عظمت کا مالک تھا اور میں نے ——— میں نے" یہاں وہ پہلی بار رُکا اور فوراً دلفریب اور شستہ اطالوی زبان کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کے پہلو سے سرگوشی کی سی ایک آواز پیدا ہوئی اور اس وقت مجھے پہلی بار علم ہوا کہ خلا میں سے ایک سکرٹری پیدا ہو گیا ہے۔ "ہز ایکسیلنسی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُنہوں نے سابق پریزیڈنٹ روزویلٹ کی تمام تحریریں پڑھی ہیں"۔ ترجمان نے کہا۔ "یہ ان اولین کتابوں میں سے ہیں جو ہز ایکسلنسی نے انگریزی سیکھنے کے بعد پڑھی ہیں"۔ میسولینی نے اشارہ سے تیسرے آدمی کو چپ کرایا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ اطالیہ میں کیا کرتے ہیں ؟"۔

"میں یہاں یا فلورنس میں سیر کے لئے آیا ہوا ہوں"۔ میں نے کہا۔ "آجکل میرا داماد اور میری لڑکی اطالیہ میں رہتے ہیں۔ ان کا پہلا بچہ سرزمین اطالیہ میں پیدا ہو گا۔ پیدائش کی آجکل میں توقع کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں ہوں۔ میں اور میری بیوی"۔

اس کا چہرہ جگمگا اُٹھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی "خوب میں سُنکر نہایت خوش ہوا ہوں۔ میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میرے دل کی بہترین دعائیں اور اُمیدیں آپ کی لڑکی اور اس کے خاوند کے ساتھ ہیں۔ براہ مہربانی میرا یہ پیغام اُن تک ضرور پہنچا دیجئے"۔

میں نے اُس سے اپنی لڑکی کے لئے ایک ایسے فوٹوگراف کی درخواست

کی جس پر اس کے دستخط ہوں۔

"بطیب خاطر"۔ اُس نے کہا اور سکرٹری جس کے قدم کی آہٹ تک سُنائی نہ دیتی تھی تصویر لینے چلا گیا۔

"تو آپ اطالیہ میں پہلے کبھی نہیں آئے"۔ میسولینی نے پوچھا۔

"ہاں آیا تھا" میں نے کہا۔ "تیرہ سال ہوئے ——— یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے ——— میں ایک مہینے یہاں رہا تھا"۔

"تیرہ سال ؟ کیا آپ اطالیہ کو بدلا ہوا پاتے ہیں"۔

"بہت بدلا ہوا۔ اور بہتر حالت میں"۔

"بدلا ہوا ؟" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ "فرمایئے وہ کیسے"۔ ؟

"سُنئے جناب" میں نے کہا۔ "اطالیہ گداگروں سے پُر تھی۔ ہر طرف گداگر ہی نظر آتے تھے اور مجھے معاف فرمایئے لیکن چونکہ آپ نے پوچھا ہے اس لئے عرض کرتا ہوں چوری بھی کثرت سے تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ بذریعہ ڈاک قیمتی اشیاء بھیجنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گاڑیوں میں مسافروں کا اسباب بزور چھین لیا جاتا تھا اور میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ کوچہ و بازار ریل کی گاڑیاں کثیف اور گندی اور لوگوں کا کثیر طبقہ آوارہ تھا"۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے میں نہایت انہماک کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اور حیران تھا کہ اس وقت نادانستہ طور پر وہ ایک ماہر اشارات[1] بن گیا ہے۔ جب میں نے گداگروں کا ذکر کیا اُس نے دائیں ہاتھ کی پیالی سی بنالی اور پھر اپنی بڑھی ہوئی اُنگلیوں کے سروں کو انگوٹھے کی جڑ سے لگا لیا۔ جیسا کہ دنیا بھر میں مانگنے کا طریقہ ہے۔ جب میں چوروں کا ذکر کر رہا تھا اُس کے ہاتھ جیب کاٹنے کی سی تیز حرکت میں مصروف تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

لیکن اب گداگر تمام غائب ہو چکے ہیں۔ چوری کی وارداتیں اسقدر نہیں ہوتیں۔ میں جانتا ہوں ڈاک بھی محفوظ رہتی ہے۔ لوگ اب اس قدر وحشی۔ اور بداخلاق نہیں۔ کوچہ و بازار پاکیزہ، اور گاڑیاں صاف ستھری ہیں اور ہر طرف جسمانی اور اخلاقی ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔ القصہ میں کہہ سکتا ہوں کہ تیرہ سال پیشتر اطالیہ ایک ایسا ملک تھا جو محض فکر امروز میں زندہ رہتا تھا۔ لیکن اب اسے کل کی فکر مستقبل کا سودا ہے۔ جو میرے خیال میں نہایت شاندار اور پر عظمت ہو گا۔ اس کا مضبوط مُکا پرزور دھماکے کے ساتھ میز پر پڑا اور اس نے ترچھی نظر سے جس میں اطمینان کی جھلک تھی سکرٹری کی طرف دیکھا جو اتنے میں واپس آ چکا

[1] Pantomimist

تھا۔"

"آپ سچا ارشاد فرماتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں خوش ہوں آپ نے ان امور کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ آپ نے اس کا ذکر کر دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے رسالے میں بھی ان امور کا تذکرہ کر دیں گے تاکہ امریکن جدید اطالیہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ آپ اُن کو ہمارے اطالیہ کے حالات سُنا دیں۔" اس نے آخری الفاظ کو اس زور کے ساتھ کہا کہ وہ میرے ذہن میں خاص طور پر نمایاں ہو گئے۔

"اب میں آپ سے اطالیہ کے متعلق اس قدر کہوں گا۔" اُس نے کہا "کام اور تنظیم یہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہے جس کے لئے میں کوشاں ہوں۔ کام ہم کر رہے اور تنظیم ہم سیکھ رہے ہیں۔"

"امریکہ کے لئے بھی یہ بہترین لائحہ عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "من حیثیت القوم ہم کافی طور پر جفاکش ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے ہم اس قدر منظم نہیں ہیں۔ جس قدر ہمیں ہونا چاہئیے۔"

"یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟" اُس نے فوٹوگراف پر دستخط کرتے ہوئے سر اُٹھا کر کہا۔ "امریکہ اس قدر پر عظمت ہے — کیا اس کے پاس حقیقی عظمت کے تمام ضروری ذرائع نہیں ہیں؟"

"میں نہیں کہہ سکتا لیکن ہمیں تنظیم کی بھی ضرورت ہے۔"

"تو اطالیہ بھی منظم ہو گی اور ہم اسے روز بروز زیادہ منظم کرتے جائیں گے۔"

"یور ایکسیلنسی،" میں نے کہا۔ "میں نے عرض کر دیا ہے کہ میں ۱۹۲۲ء کی اٹلی کے متعلق جنگ کی پیشتر کی اٹلی سے مقابلہ کرتے ہوئے کیا خیالات رکھتا ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا عکس اطالیہ کے تمام انتظام و انصرام میں دیکھ کر آپ کے متعلق میرا کیا خیال ہے۔"

"میں سُن رہا ہوں!"

دیگر تمام امور کے علاوہ ایک راہنما اور قوم ساز کی حیثیت سے آپ کے کارہائے نمایاں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں آپ کو دنیائے جدید میں عظیم ترین متجرب کلہ حکومت سمجھتا ہوں۔"

"متجرب؟" معلوم ہوتا تھا اس نئے لفظ نے اس کو حیران سا کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر بل آگیا اور میں نے اس کے چہرے سے اس کے دل کے خیالات کو پڑھ لیا میرا خیال ہے اس کا ذہن خیالات کی رو میں بہتا ہوا اس سرزمین کی طرف چلا گیا تھا جس کی موجودہ سیاسی تعلیم سے اسے سخت نفرت ہے یعنی روس کی طرف "لینن اور ٹراٹسکی بھی متجرب تھے" میں نے اپنے الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "لیکن بالکل ایک مختلف قسم کے وہ عنوان جو بے عنوانی اور تخریب میں ماہر تھے اور آپ" میں کہہ سکتا ہوں تنظیم و تعمیر اور صحیح قوانین کے نفاذ میں ماہر ہیں۔ وہ آگ اور شعلے بھڑکاتے تھے لیکن آپ زخموں کی چارہ سازی فرماتے ہیں۔ وہ دیوانے اور مجنوں تھے لیکن آپ دلیر اور فرزانہ ہیں۔"

میرے اس بیان پر اُس نے شکریہ کا اظہار کیا۔ یہ شکریہ بھی ایسا ہی صدقِ دل اور اخلاص کے ساتھ تھا جس طرح میرے الفاظ بے ریب و ریا تھے۔

"ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "اس سوال کا جواب میں روئداد ملاقات میں لکھنا چاہتا ہوں۔ آجکل یہ ہر جگہ لکھا جاتا ہے کہ اطالیہ کا تمام تر بار آپ کے کندھوں پر ہے۔ آپ گذشتہ چھ سال میں اس کی نئی زندگی کا موجب ہیں اور آپ نے اپنی ذات کو اس امر کا ذمہ دار بنا لیا ہے کہ اطالیہ کی اور شاندار زمانے کی طرف راہ نمائی کریں۔ لیکن فرض کیجئے آپ مر جائیں۔ آج شب کو اس دنیا سے اُٹھا لئے جائیں۔ تو اطالیہ کا کیا حشر ہو گا؟"

اس کی آواز جو شاندار لچدار اور موثر ہے۔ بانگ دہل کی مانند میرے کان میں آئی۔

"آپ میرا یہ جواب لکھ سکتے ہیں۔" اس نے گونج کر نہایت اعتمادِ نفس کے ساتھ کہا۔ "ہر چیز نیا ہے ہر شے منظم ہے۔ اگر میں زندہ رہوں جدید اطالیہ ترقی پذیر رہیگا۔" اور اگر میں مر جاؤں تو اس میں کوئی رکاوٹ ہو گی" میری جانشینی کیلئے لوگوں کی تربیت ہو چکی ہے۔ اور وہ تیار ہیں — اطالیہ ہمیشہ بلند سے بلند تر ہوتا جائیگا۔"

وہ اصرار کر کے دروازے تک میرے ہمراہ آیا اور دروازے پر دوبارہ مجھ سے مصافحہ کیا۔

"خدا حافظ سائنور کوب" اُس نے کہا۔ "آپ اہلِ امریکہ کو یہ بتانا نہ بھول جائیے کہ اطالیہ کیا ہے۔ اس کیلئے میں آپ کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔"

میں باہر آگیا۔ اس کے بعد میں کبھی میسولینی کو خونخوار شیر جنگلی بھینسا یا عقاب تصور نہ کروں گا۔ میرے دل میں اس کا خیال اس انسان اس عظیم ترین انسان کی حیثیت سے ہو گا۔ جس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔

یقیناً ایک انسان کے لئے یہ نہایت تعجب خیز کارنامہ ہے کہ وہ ایک قوم کو تباہی سے بچا لے۔ اور اس سے بڑھ کر حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کو تباہی سے بچاکر اس کے ارتقا کی نشو و نما۔ اسکی بہبود اور سرفرازی کا ضامن ہم کر لینے دماغی توازن، فرزانگی، اور توازن قیام انسانیت کو فراموش نہ کرے۔ اگر آپ دریافت کریں گے کہ ایسا

رسالہ ادبی دنیا لاہور

حسن معصوم

صحبت افروز ہے فروغ جلیں - ہوس سوز ہیں نگاہیں ۲

جمال عصمت سے رخ درخشاں ہے - عفت آموز ہیں نگاہیں

رسالہ ادبی دنیا لاہور

"اٹالیہ کی قسمت کا مالک"
بینی ٹو میسولینی

احساسِ گناہ

اس واقعہ کو جو میں بیان کرنے والا ہوں اور جو میرے افسانہ زندگی کے ناقابل فراموش پر درد واقعات میں سے ہے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور اب میں اپنے تئیں اخفائے راز کے اس اقرار سے آزاد محسوس کرتا ہوں جو میں نے اپنے دل میں کیا تھا۔

میں بنک کے محکمہ مبادلات خارجہ کا افسر اعلٰے ہوں میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اپنی تنخواہ اور اپنے باپ کی جاگیر کی کچھ آمدنی ملا کر میں آرام و آسایش سے زندگی بسر کر سکتا ہوں۔

۱۴ر نومبر ۱۹۰۳ء کو شام کے پانچ بجے میں دفتر سے واپس آ رہا تھا۔ میرا راستہ ایڈلیسن بار کی طرف ہو کر جاتا تھا جو شہر میں شرفاء کی پُر رونق بستی ہے۔ میں ابھی دیا سرمیہ کے سب سے اونچے مقام تک ہی پہنچا تھا۔ کہ میری آنکھوں نے ایک رُوح فرسا نظارہ دیکھا۔ ایک شخص نے تیزی سے کھڑکی کھول کر مکان کی تیسری منزل سے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اپنے تئیں سر کے بل گلی میں گرا دیا۔ میں خوفزدہ ہو کر ایک لمحے کے لئے چُپ کھڑا رہا۔ اور پھر لپکا یک اس مصیبت زدہ کو اٹھانے کے لئے جھپٹا۔ یہ دیکھ کر میرے خوف اور دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ خودکشی کرنے والا میرا آشنا بلکہ میں لکھ سکتا ہوں میرا دوست جارج نریٹی ایک جہازران کمپنی کا مالک تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ایک کاغذ کا ایک پرزہ نہایت مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اُس سے پیشتر کہ دیکھنے والوں میں سے کوئی نزدیک آتا میں نے جلدی سے اس کاغذ کو جیب میں ڈال لیا۔

عمارت کے ایوان میں رونے پیٹنے کی آوازیں گونج اُٹھیں۔ ایک خاتون ہجوم میں بے تابانہ در آئی اور اپنے تئیں لاش پر گرا دیا۔ پولیس کے افسر نے صلیب اخضر کے رضاکاروں کو لاش ہسپتال میں لے جانے کی ہدایت کی۔ جب یہ دردناک جلوس روانہ ہو چکا تو ہجوم نے جو اب تک خاموش تھا رایوں خیالات اور اظہار افسوس کا سلسلہ شروع کیا اور ایک موٹر میں اخبارات کے کئی ایک نمایندے بھی موقعہ پر آ موجود ہوئے۔

گلی کی نکڑ پر جا کر میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا جو میں نے خودکشی کرنے والے کے ہاتھ سے چھین کر چھپا لیا تھا۔ یہ پولیس کمشنر کی طرف تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ کہ یہ اصلی مکتوب الیہ تک نہ پہنچنا چاہئیے میں نے ایک لمحہ لیس و پیش کے بغیر اسکو اپنے بٹوے کی اندر کی تہ میں رکھ لیا۔ لیکن دل کی ایک آواز مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میرا یہ فعل مجرمانہ ہے اور مجھے بھی اس کا اعتراف تھا۔ لیکن پولیس کمشنر اگر اس خودکشی کے اسباب سے واقف نہ بھی ہو۔ تو حرج ہی کیا ہے؟

ایک پولیس افسر کے لئے یہ معمولی تحریر اور کاغذ کا محض ایک پُرزہ ہے لیکن ہو سکتا ہے میرے لئے یہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مجھے تسلیم کرنا پڑیگا کہ مجھ ناکارہ کی زندگی کا کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے۔

میں اُلٹے پاؤں نریٹی کے مکان پر گیا۔ اور دروازے پہ دستک دی۔ ایک خادمہ نے کہا سنتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ملاقات کے کمرے میں ایک اور خادمہ نے جو رو رہی تھی مجھے بتایا کہ سا شورا اس وقت ملاقات نہیں کر سکتی۔ لیکن میں نے اُس کی بات پہ کچھ دھیان نہ دیا اور اندر چلا گیا۔

پہرے کو اُٹھاتے ہوئے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سُنکر میں ٹھٹھکا اور پھر اندر داخل ہُوا۔ نریٹی کی بیوی چاندی کی بڑی صلیب کے سامنے گھٹنوں کے بل سبک سبک کر دعا مانگ رہی تھی۔ اس کا بیٹا گنٹو مجھے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ بیوہ نے کچھ کہے بغیر پھر کر دیکھا اور زیادہ سبکنا شروع کیا۔ میری طبیعت کی شیطنت اور بدفطرتی اسوقت بھی چھپی نہ رہی۔ غم و الم کے اس نظارے نے میرے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ میں اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ گینٹو کے دلفریب اور خوبصورت گھونگر والے بالوں پر پھیرتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر غم بڑھانے والی مسکراہٹ تھی اور میں سوچ رہا تھا خاوند تو مر چکا ہے اور اس کے ساتھ ہر ایک حماقت آمیز ڈر اور خوف کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب میں بے فکری سے ہر آہٹ پر کھٹکے بغیر اپنے تئیں حماقت کی ایک ساعت کے سپرد کر سکونگا۔ میری

a Foregn exchang section

نفس بھی ایک دلکش اطمینان کی صورت اختیار کر چکی تھی ۔ میں نے سوچا
آہ! میری حسین بیوہ کا غم بھی اُسوقت تک ہے جب تک اس کی سیاہ آنکھوں
کا سرمایہ اشک ختم نہیں ہوتا"۔
اور کیا آپ یقین کریں گے ؟ اس ماتمی کمرے میں قہقہہ لگانے
کی ایک مجنونانہ خواہش نے مجھے آپکڑا ۔ غم و الم کی اس تضحیک سے بچنے
کے لئے میں اُٹھ کھڑا ہوا ۔
"خاتون صبر کرو"۔
لیکن ماتم گسار بیوہ نے پھر کر بھی نہ دیکھا ۔
میں ابھی دروازے تک پہنچ چکا تھا ۔ میں نے بدمزہ ہو کر کہا ۔
"خاتون صبر کرو! زندگی ایک رقص ہے اور موت اس موسیقی کا انجام"
زندگی کی اس تعریف پر خودستائی یا اسی قسم کے جذبات محسوس کرتے
ہوئے میں نے گینٹو کو پیار کیا اور رخصت ہوا ۔
دوسری صبح میں نے اس واقعے کو ایک خاص انداز میں ملاحظہ کیا
میں اس دن گھر پر رہا ۔ اور سپرنٹنڈنٹ جنرل دفتر مبادلات خارجہ کو ایک
مختصر سا رقعہ لکھ کر بھیج دیا اور اس میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بیان کرتے
ہوئے جوڑوں کے درد کا بہانہ کیا ۔ میں نے روزانہ اخبارات منگوائے ۔
جہاز راں کمپنی کے مالک نریٹی کی خودکشی کے واقعہ سے کئی کالم پُر تھے ۔
رپورٹروں نے اس کی وجوہات معلوم کرنے میں اپنی تمام تر قوت ایجاد
کو صرف کر دیا تھا ۔
مالی تفکرات ؟ یقیناً نہیں ۔ سائنورنیٹی کے کاروباری معاملات ہمیشہ
کامیاب رہے ہیں ۔ خاندانی تنازعات ؟ نہیں یہ بھی نہیں ۔ ایک
رپورٹر دلکش اور متاثر کن الفاظ میں سائنورا لڈیا کی خانہ داری کی تعریفوں
کے پل باندھ رہا تھا ۔ لیکن اس امر پر سب یک زبان تھے کہ یہ دماغی
خلل کا نتیجہ ہے" پانچویں کالم میں بھی مجھے معمولی تعزیت کے الفاظ کے
علاوہ کچھ نظر نہ آیا ۔ صرف میں اس کی موت کے بھید سے واقف تھا!
اتنے میں اماں کمرے میں آئیں اور کہا کہ تین صاحب تم سے
ملنا چاہتے ہیں ۔
"اماں انہیں اندر ہی بھیج دو"
تین صاحب آئے اور کچھ کہے بغیر بیٹھ گئے ۔ ایک مرحوم کا بھائی
سائنور گیتانو نریٹی تھا ۔ دوسرا ڈاکٹر بیفورشینی ۔ انجمن ارباب
شہنشاہیت کا پریذیڈنٹ ۔ تیسرا افولی اسی انجمن کا اکونٹنٹ اور معتمد
خزانہ ۔
"فرمائیے!"

سائنور بیفورشینی نے کہا "گذشتہ شب جب سائنور نریٹی کی موت
کی المناک خبر شہر میں مشہور ہوئی تو ہماری انجمن کی انتظامیہ کمیٹی نے جس
کا مرحوم بیس سال سے ممبر تھا ایک خاص اجلاس منعقد کیا اور یہ فیصلہ
کیا گیا کہ تجہیز و تکفین اور کفن دفن کے موقعہ پر ہم انجمن کے خاص نشان
کے ساتھ موجود رہیں ۔ قبرستان میں تقریر کرنے کے لئے کمیٹی نے آپ کو
منتخب کیا ہے اور ہم اسی عرض کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے
ہیں"
ان الفاظ پر میں چونک اُٹھا اور اگر مرحوم کے بھائی کی موجودگی کا خیال نہ
ہوتا تو میں یقیناً قہقہہ لگا کر ہنستا ۔ لیکن اب غمگین آواز اور اندوہناک
انداز میں میں نے اس دردناک فرض سے معذرت چاہنے کی کوشش
کی ۔
" آپ جانتے ہیں" میں نے کہا" میں کوئی مقرر نہیں ہوں اور جوش و
خروش ـــــــ"
"او" بیفورشینی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" کسی لمبی چوڑی
تقریر کی ضرورت نہیں ہے ۔ صرف چند الوداعی الفاظ کافی ہیں"۔
" واقعی" افولی نے کہا" الوداع!"
باوجودیکہ نریٹی کے بھائی کی موجودگی نے میری پوزیشن کو نازک
بنا دیا تھا ۔ میں اس ماتمی تقریر کے خیال سے متواتر گریز کرتا رہا ۔ اور
اس سے یہ غالب گمان تھا کہ میں صاف انکار کر دوں ۔ چند لمحوں کی
خاموشی کے بعد اکونٹنٹ افولی نے میری پس و پیش پر غلبہ پانے کے
لئے ایک مضبوط ترین دلیل پیش کی ۔ جماعتی نظام کی خاطر اس بار کو
اٹھانا مجھ پر فرض ہوگیا تھا ۔ اب مجھ پر واضح ہوگیا کہ انکار سے مزید اصرار
بے حاصل ہے ۔ میں تقریر کرنے پر راضی ہوگیا ۔ لیکن معاملات پیچیدہ
ہو رہے تھے ۔ میں دل سے پوچھتا تھا انجمن نے تقریر کرنے کے لئے
مجھے کیوں انتخاب کیا ہے ؟ ان ایام میں میں اجلاسوں میں شریک
نہ ہوتا تھا ۔ انجمن کے اراکین کو بھی نہ جانتا تھا ۔ نہ مقامی اور قومی سیاسیات
میں دلچسپی لیتا تھا ۔ ماتمی تقریر کا تکلیف دہ اور غم آلود فرض کسی اور کے
کیوں نہ سپرد کر دیا جائے ؟ لیکن ان لوگوں کو جو اس قسم کی تقریر کرنے
کے اہل ہو سکتے تھے ایک ایک کر کے دیکھتے ہوئے مجھے معلوم ہوگیا
کہ ان کے لئے کسی نہ کسی وجہ سے ایسا کرنا ناممکن تھا ۔
لیکن میری طبیعت میں بغاوت اور سرکشی کا ایک زبردست
جذبہ تھا ۔ میرا اول قدیم بہانے "اتفاقی بیماری" کے عذر کی تلاش میں

تھا۔ میں تین بار کمرے میں ادھر ادھر ٹہلا لیکن ہاتھی دانت کی ایک ننھی سی صلیب کو دیکھ کر جو دیوار پر لٹک رہی تھی۔ میرے دل میں اچانک حسین بیوہ کا خیال آیا جو غالباً ابھی تک مسیح کے طویل لاغر مجسمے کے حضور میں جو تانبے کی صلیب پر مصلوب تھا محو دعا تھی ....

تمہاری محبت ایک ٹوٹے ہوئے نورانی ستارے کی مانند میری روح کے آکاس پر سے گذر گئی تھی۔ (میں نے ان الفاظ کو اکثر بار تسلی بخش اثر کے ساتھ استعمال کیا ہے) اور مجھے اپنے دل میں اس امر کا اعتراف تھا کہ میں بہت حد تک غریب نریٹی کا ممنون احسان ہوں اور مجھے اس احسان کی ادائیگی کے موقعہ سے بے پروائی نہ برتنی چاہیئے۔

اس کے دل میں اپنی بیوی کی وفاشعاری کے متعلق کئی سال سے پوشیدہ شک تھا لیکن وہ اس کی بے وفائی کے ثبوت فراہم نہ کرسکتا تھا۔ سائمورالڈبا نے قابل داد فہم و فراست کے ساتھ محبت کے تمام ظاہری آثار چھپا رکھے تھے اور اس بدباطن کینہ ور کو بالکل نہتا کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کی وسعت ہماری ملاقاتوں کی معاون تھی۔

تو کیا یہ بالکل اخلاق کا اقتضا ——— ہاں اخلاق کا اقتضا نہیں تھا کہ میں سائمور نریٹی کے متعلق اپنی ممنونیت اور شکر گذاری کے جذبات کا اظہار کر دوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس امر میں مجھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن یہ کس کا قصور تھا؟ بخلاف اس کے کیا یہ ماتمی تقریر ایک ذلت آمیز دیدہ دلیری نہ تھی؟ سینکڑوں کمزور دل میرے خلوص دل کے قائل ہو جائیں گے۔ یہ موقعہ ایک قائم مزاج شخص کی حیثیت سے جس کے سامنے مستقبل کا شاندار میدان ہو میری شہرت کی بنیادیں مضبوط کر دے گا۔ میں خیال ہی خیال میں اپنے ہمسائے کی خیالی حماقت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ کلیسا کا واعظ اور اشبانی خیال و اخلاقیات کا معلم اس قسم کی لطف اندوزی کو یقیناً ذہنی پستی کی پیدائش کہے گا ....

اے تشخیص جرائم کے طالبعلمو! میں اپنا کاسۂ سر تمہارے سپرد کر جاؤں گا۔

تمام جھجک دور ہو گئی۔ میں نے گھنٹی بجائی خادمہ نمودار ہوئی۔

"جیانینا کل میرے لئے ضروری سامان تیار رہے"!

"سائمور ایسا ہی ہوگا۔ کھانا تیار ہے"۔

"بہتر! تم جا سکتی ہو!"

کافی پینے کے دوران میں میں نے اخبارات لانے کا حکم دیا۔ مجھے تقریر کو ترتیب دے لینا چاہیئے۔ لیکن نریٹی کے حالات زندگی نہایت قلیل اور پریشان تھے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہ تھی۔ اس کی تمام زندگی خاموش اور پرسکوت تھی۔ عمر بھر میں بڑے سے بڑا عہدہ جس پر وہ فائز ہوا تھا بورڈ آف ڈائرکٹرز انجمن مالکان جہاز کی صدارت تھی۔ صبح کے اخبار کے تازہ ترین نمبر نے اس کی وصیت کا کچھ حصہ شائع کیا تھا۔ جو اس کے کاغذات کے درمیان پائی گئی تھی۔ میں نے اعداد و شمار کو دیکھنا شروع کیا۔ شاید کوئی فیاضانہ وقف مجھے اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھانے کا موقعہ دے سکے۔ لیکن آہ! یہ بھی ایک سراب تھا۔ مایوس کن سراب ۲۵ لاکھ پونڈ کی رقم کثیر میں سے صرف دو سو پونڈ ملاحوں کے بچوں کے لئے ایک امدادی فنڈ قائم کرنے کے لئے دئے گئے تھے شیطان!

اس وحشیانہ اور خونخوار تنگ دلی نے میرے دل کو خون کر دیا!

لیکن یہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ملاحوں کے بچوں کے خیال سے نہیں بلکہ اپنی تقریر کی کم مائیگی کی وجہ سے تھا۔ میں نے اپنی تقریر کو دوبارہ ترتیب دیا۔ چند نوٹ لکھے اور انہیں دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ میری تقریر نہایت مختصر ہوگی۔

اس صبح قبرستان میں خزاں کے آخری سورج کی شعاعیں مرمریں کتبوں اور سنگی صلیبوں کو بوسہ دے رہی تھیں۔ ہجوم نے ایک حلقے کی صورت اختیار کر لی۔ اور ایک لمحے میں اس موزونیت کے ساتھ اپنی ٹوپیاں اتار لیں گویا اس بات کے لئے وہ کسی اشارے کے منتظر تھے۔ اب چمکدار سروں کا ایک سمندر پیش نظر تھا۔ میرے پندرہ منٹ کی گھنٹی ہونے والی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور دوسرا استین، پُر وقار لیکن غمگین اور آہستہ انداز میں آگے بڑھتا ہوا تھا۔ جو فن خطابت کے مطابق ماتمی تقریر کے ہمراہ ضروری ہے۔

میں نے محسوس کیا۔ ہزاروں نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ تابوت کے قریب جا کر میں بھونچکا سا ہو کر رک گیا۔ مردے کا چہرہ دیکھنے کیلئے صندوق کے آئینے پر ایک چھوٹا سا بیضوی سوراخ تھا جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ مردے کا تمام سر کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ اور سوراخ میں سے جو کچھ دکھائی دیتا تھا وہ دو کھلی آنکھیں تھیں۔

آہ! وہ آنکھیں، وہ سفید آنکھیں جو میں جانتا تھا مجھے گھور رہی ہیں ہاں وہ باریک جھلی کے مہین پردوں میں سے گھور رہی تھیں۔ میری حالت نازک تھی۔ میرے دل میں غیظ و غضب کا طوفان امنڈ آیا۔

"تو تو مرا نہیں! اے بدقماش!"

یہ غضبناک اور ذلیل کن کلمہ میری زبان پر آ کر رک گیا۔ کیونکہ میرا

خیال ہے میں نے ان خوفناک کھلی آنکھوں میں ایک خفیف سی چمک دیکھی۔ کیا یہ حقیقت تھی یا میں ہی غلط فہمی کا شکار تھا۔ میری اس گھبراہٹ کو بیفورشیلینی نے بھانپ لیا اور اس کا خیال ہٹانے کے لئے میں نے تقریر شروع کر دی۔ میں نے مردے پر ٹکٹکی لگا رکھی تھی۔ گویا میں اسے للکار رہا ہوں۔ اس ماتمی تقریر کا آغاز نہایت تکلیف دہ تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں نے پھر ایک بار اپنے اوپر قابو پا لیا ہے۔ آٹھ منٹ میری فصاحت و بلاغت کے ذخیرے کو ختم کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ میں اپنی اس امید کو ظاہر کرنا بھی بھول گیا کہ قبر کی منزل مرحوم پہ آسان رہے گی۔

لیکن میں نے اپنی کھوکھلی آواز میں لاطینی لفظ "ویل" یعنی الوداع کہہ دیا میں نے آخری نگاہ نریٹی پر ڈالی۔ اس کی نگاہوں سے کیا ظاہر ہوتا تھا؟ نفرت و حقارت؟ احسان مندی؟ چند لوگوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے تئیں پھر گاڑی میں پایا اور پکار کر کہا:۔

"سر سیٹ چل اکوچوان!"

دو دن بعد مجھے لڑیا کا ایک رقعہ ملا جس میں صرف ایک لفظ "گستاخ" لکھا تھا۔

اس وقت میں نے خودکشی کا راز معلوم کرنے کا فیصلہ کیا میں نے اپنے تئیں ایک کمرے میں بند کر لیا اور اس فعل کو انتہائی تقدس اور پاکیزگی کا رنگ دینے کا ارادہ کر کے گویا میں کوئی وصیت پڑھنا چاہتا ہوں۔ دو شمعیں روشن کیں۔

آہستہ سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا:۔

"سائنور پولیس کمشنر۔

وہ امر جس نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا میری بیوی کا رویہ ہے میں اس کو اس شخص کے ساتھ جو اس کی خود بینی اور خود آرائی کا موجب ہے قتل کر سکتا تھا۔ وہ مبادلات خارجہ میں میرا مدمقابل بنا رہا ہے لیکن میں خودکشی کو ذلت اور رسوائی پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو آپ ان خیالات یا رایوں کی تردید کر سکتے ہیں جو میری موت کی وجہ مالی مشکلات بتائیں۔"

سہ شنبہ ۱۴ر نومبر ۲ بجے شام۔

جارج نریٹی مالک جہاز۔

آہ! آج بھی میرے لئے ممکن نہیں کہ میں ان گوناگوں خیالات کے الجھے ہوئے تاروں کو کاغذ پر رکھ سکوں جو اس رقعے کے پڑھنے سے میری روح کی فضاؤں میں تن گئے تھے۔ لیکن وہ امر جس نے مجھے گوناگوں بدگمانیوں کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹا دیا۔ ایک نئے راز کا انکشاف تھا۔ نریٹی میری وجہ سے موت سے ہمکنار نہ ہوا تھا۔ بلکہ یہ کسی اور کی کارفرمائی تھی۔ اب اس محفوظ اور قابل اعتماد تحریر کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور تھا کہ میرا کوئی رقیب بھی ہے۔

میں اس واقعہ کو فراموش کرنے کے لئے اپنے جذبات اور احساسات کو مردہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں رات اس خود فراموشی کے عالم میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایڈیلین بار میں مجھے ایسے رفیق مل گئے جن کی میں تلاش میں تھا۔ اس رات میں پُرتکلف رنگ رلیوں میں غرق رہا۔ اور جب گھر جانے کے اٹھا، تو نومبر کی سرد صبح بار کے دریچوں میں سے جھانک رہی تھی۔ میری نیند نے جو اس دن چار بجے شام تک رہی میرے جسمانی نظام کے حیوانی عناصر کے توازن کو پھر قائم کر دیا۔ شام کے وقت میں ذرا چہل قدمی کیلئے باہر نکلا اگرچہ شروع میں میرا ارادہ نہ تھا۔ میں وہاں پہ پہنچ کر ٹھہر گیا۔ نریٹی کے مکان کی کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے دیوار کی محراب کو دیکھا۔ اس پر اب تک خون کے نشان تھے۔ میں کپکپا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ابھی تک نریٹی کو اس کی سفید کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ اب بغض و حسد کی روح نے مجھے پھر عذاب دینا شروع کیا جو تھا شخص کہاں تھا؟ یہ کون تھا؟ مبادلات خارجہ پہ غریب نریٹی کا مدمقابل اور بارگاہِ الفت میں میرا رقیب آخر یہ تھا کون؟

میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کا کھوج لگاؤنگا۔ اس کو معلوم کروانگا۔ اس کو میدان میں للکارونگا اور اپنے تیز چمکدار خنجر کی نوک اس کے دل و جگر میں اتار دوں گا۔ میں نے قسم کھائی کہ اپنا اور مرحوم جارج نریٹی کا انتقام لونگا۔ آہ! میں نے کس قدر مردانہ، جرأت آمیز اور شاندار کارناموں کے سلسلہ کو عمل میں لانے کا ارادہ کیا اور انہیں اپنے بہادرانہ اور تباہ کن غیظ و غضب کا شکار بنانا چاہا۔

چوتھا آدمی دریافت کرنے کے لئے نریٹی کی خادمہ سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔ چند دن بعد میں نے اس سے پبلک مارکٹ کے راستے پر ملاقات کی۔ میں نے اس سے اس کی مالکہ کی خیریت دریافت کی۔

اپنی چالاک آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "سائنورا اچھی طرح ہے!"

"دیکھو مینکا مجھے تم سے ایک نہایت اہم امر کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔" خادمہ نے میری اس پُراعتماد آواز پر حیران ہو کر اپنی بھوری اور کینہ دوز آنکھیں اور بھی کھول دیں۔

"میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ تمہاری مالکہ کے پاس کوئی شخص آتا ہے؟"

"نہیں نہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔"

میں نے سونے کا ایک سکہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ خادمہ نے سامان کی ٹوکری نیچے رکھ دی۔ جیب سے ایک دھاری دار رومال نکال کر سکے کو مضبوطی سے باندھا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

جہاز کا کپتان ہنری ناستارینی نریٹی کی خودکشی سے پیشتر سائمور لڈیا کے پاس اکثر آتا جاتا تھا ——— آپ جانتے ہیں؟

"میلیکا میں تمہارا ممنون ہوں"۔

دوسری شام میں اس کافی خانے میں گیا جہاں ملاح اکٹھے ہوتے تھے۔ میں نے سائمور ناستارینی کے متعلق پوچھا۔ خادمہ نے ایک میانہ قد اور چوڑے سینے والے شخص کی طرف اشارہ کیا جس کی آنکھیں کھنچے دار اور گھنے ابروؤں کے نیچے چمک رہی تھیں۔ اس کا پتلا چہرہ گندم رنگ کا تھا میں نے فوراً اس کا اور اپنا مقابلہ کیا۔ وہ مجھ سے غالباً زیادہ وجیہ اور عمر میں یقیناً بڑا تھا۔ میں نے ہر طرف دیکھا میں وہاں کی تمام چیزوں سے ناآشنا تھا۔

آدھی رات گئے ایک جہاز کا ایجنٹ جو میرا دور کا رشتہ دار تھا آیا۔ میں اسکو ایک طرف لے گیا اور ناستارینی کے متعلق باتیں دریافت کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ بینک کے کاروبار کے لئے ان کی ضرورت ہے۔

وہ تباہ شدہ آدمی ہے۔ آخری ضرب دو سال ہوئے جارج نریٹی نے لگائی تھی۔ ایک عرصے کی رفاقت کے بعد وہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ تھا لیکن کوئی ناستارینی کی شکست کی وجہ نہیں جانتا۔ معلوم ہوتا ہے خاوند کی دوستی گنوا کر وہ اس کی بیوی کی الفت اور محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کیسا عجیب انتقام تھا!

میں نے ناستارینی پر جو ایک دیوتا کے سے سکون اور وقار کے ساتھ ایک موٹا سگار پی رہا تھا قہر و غضب کی ایک نگاہ ڈالی اور دل برداشتہ ہو کر رخصت ہوا۔

میرا دل نفرت و حقارت سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ ناستارینی سے زیادہ میرے دل میں حسین لڈیا سے نفرت تھی جو رنج و غم کے لشکروں میں محصور ہونے کے باوجود حسن و عشق کی رنگینیوں کے لئے وقت نکال سکتی تھی۔

دسمبر اور جنوری گذر گئے۔ ان ایام میں میں باہر نہ نکلا۔ لیکن مجھے اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑیگا کہ جس دن سے ناستارینی اپنے جہاز لانوینیا کے ساتھ ایک طویل سمندری سفر پر روانہ ہوا۔ محبت کی گرفت مجھ پر ڈھیلی ہو گئی۔ اب جبکہ میرا رقیب میرے راستے میں نہیں تھا۔ میں اپنے تئیں مظلوم خیال نہ کرتا تھا۔

مارچ کے آخر میں مجھے نریٹی کی بیوہ سے ملاقات کرنے کا خیال آیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ میرا خیال تھا یہ ملاقات آخری ہو گی اور اس کے بعد میں مرض محبت سے شفا پا جاؤں گا۔

اس ابر آلود اور گرم شام کو لوگ بازاروں میں افسردہ اور خاموش چل پھر رہے تھے۔ گویا تھکان اور گرمی نے انہیں ناکارہ کر دیا ہے۔ میں اپنے خون میں ایک خاموش اور پوشیدہ حرارت کی تپش محسوس کرتا تھا۔ نریٹی کے مکان پر جا کر مجھے معلوم ہوا۔ کہ سائمورا وراثت کے متعلق اپنے قانونی مشیر سے مشورہ کرنے گئی ہے۔ اس اتفاق نے میری طبیعت کو اور بھی مکدر کر دیا۔ میں نے انتظار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ خادم مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ جس سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ وقت گذارنے کے لئے میں نے ایک البم اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ اس کے پہلے حصے میں معمولی بے معنے اور احمقانہ چیزوں کی تصاویر تھیں۔ دوسرے میں عمدہ تصویری کارڈ تھے۔ البم کے آخر میں ایک کارڈ تھا جس نے فوراً میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس پر ناستارینی کے جہاز لانوینیا کی تصویر تھی اور ڈاک کی مہر کی تاریخ ۲۵ / فروری تھی۔ یہ راز معلوم ہونے کے بعد حملے کے لئے میرے ہاتھ ایک اور زبردست آلہ آ گیا۔ اس سے میرے ظاہری غیظ و غضب میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا تھا چند لمحوں کے بعد سائمور نریٹی بھی آ گئی۔

ہم نے نہایت خاموشی سے ایک لفظ تک کہے بغیر ایک دوسرے کو جھک کر سلام کیا۔

"گنیٹو کہاں ہے؟"

"میری ایک بہن کے پاس!"

لڈیا ایک میز کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھ پر اپنی سرد اور بے مہر نگاہیں گاڑ دیں۔ میں نے محسوس کیا میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ شاید یہ میرے دل کی آبادی کے تاریک اور بلند برجوں کی آزادی کے لئے جدوجہد ہو۔

"سائمورا! میں آپ سے جواب طلب کرنے آیا ہوں"۔

"آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟"

"ہمارے ایام رفتہ نے!"

"آہ! میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ اُن کی یاد تازہ نہ کیجئے۔ مجھے نہ ستائیے" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے اسکے نازک ہونٹ درد کی شدت سے

لرز رہے تھے۔

"اور سائنورا ب آپ ان ایام رفتہ کی یاد سے پشیمان ہیں؟ کیا یہ زود پشیمانی بعد از وقت نہیں ہے؟"

"توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ میں ان کو فراموش کر کے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ملامت اور پشیمانی نے میری روح کو پاش پاش کر دیا ہے۔ ایک گہرائی ایک ناپیدا کنار گہرائی مجھے ماضی سے جدا کرتی ہے مستقبل سے جدا کرتی ہے۔ ایک گہرائی جس پر صلیب کا نشان آویزاں ہے؟"

"سائنورا وہ کیا گناہ ہیں جو آپ کی روح کو عذاب دیتے رہتے ہیں؟ کیا وہ جن میں میں آپ کا شریک تھا؟ یا کوئی اور؟ مجھے یقین ہے سائنور ناستاریتی بھی یہاں آتا تھا؟"

اس نام پر وہ چونک پڑی اور جلدی سے بولی "ٹھہریئے! ٹھہریئے"

"تو کیا کپتان ناستاریتی تقریبیں کرنے آتا تھا میری جگہ لینے نہیں؟"

"ٹھہریئے! میں بتاتی ہوں ———— آپ کے شکوک غلط ہیں! غلط!"

"سائنورا میرے پاس آپ کو ملزم ٹھہرانے کے لئے ایک تحریر ہے۔" میں نے اپنے بٹوے سے خودکشی کرنے والے کا رقعہ نکالا۔

"یہ مردہ آدمی ہے جو آپ کی تردید کرتا ہے!" سائنورا لڈیا نے اپنے خاوند کی تحریر پہچان لی۔ اس نے یہ پڑھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"آہ! غریب نریٹی ناستاریتی میری الفت کا خریدار تھا لیکن کبھی اسے نہ خرید سکا۔ میں بے گناہ ہوں"۔

لیکن اس بیان نے مجھے یقین نہ دلایا۔ ہاں حسین لیکن بے وفا بیوہ کے رونے سے میرے دل کو ایک گونہ تسلی ہو گئی۔

"سائنورا اگر آپ تائب ہونا چاہتی ہیں تو مجھے سچ سچ بتا دیجئے۔ آپ جانتی ہیں میں معاف کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے کچھ خیال نہیں اپنے شوہر یا عاشق سے بے وفائی کرنا تو آجکل کا رواج ہے۔ اور محبوبہ کے جرم کی پاداش میں الفت سے دست بردار ہونا جیسا کہ میں کر رہا ہوں ایک بزدلانہ فعل!"

"مجھے معاف کر دیجئے" لڈیا نے رک رک کر کہا "مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں نے آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیا"۔

"سائنورا مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ میں ایک دن اخبار میں جہاز لاتونیا کی اپنے مسافروں اور کپتان سمیت غرقابی کی خبر پڑھنے کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن لڈیا آپ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ لڈیا اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں! میں معاف کرتا ہوں۔ لڈیا آپ کیوں روتی ہیں! اپنی سیاہ آنکھوں کی چمک کیوں کھوتی ہیں ——۔۔۔۔۔۔

الوداع لڈیا! ہر ایک روک کا اٹھ جانا ہمیں زندگی کے فرسودہ تعلقات کے عام پھیر میں لا رہا ہے۔ آہ! کاش ہماری توبہ ایام رفتہ کی یاد کو محو کر دے! لیکن انہیں آلودہ نہ کرے!

میں جلدی سے زینہ سے اتر آیا اب میں بالکل تندرست تھا۔

چراگاہ کے انتہائی سرے پر نریٹی کے خاندان کا مقبرہ ہے وہاں ایک سنگی کتبہ پر یہ الفاظ کندہ ہیں:۔

"جہازران کمپنی کا مالک جارج نریٹی یہاں ابدی نیند سوتا ہے"۔

اس کے پہلو میں ایک اور قبر ہے جس پر یہ کتبہ نصب ہے:۔

"اس کی باوفا بیوی لڈیا ۲۷ مارچ ۱۹۰۶ء کو اس سے جا ملی"

اور یہ اشعار لاطینی زبان میں لکھے ہیں:۔

"کیونکہ میں اپنی بے اعتدالیوں کی معترف ہوں اور میرے گناہ ہمیشہ میرے سامنے ہیں۔ آہ! مجھے اپنی رحمت سے معاف کر دے میں پاک ہو جاؤنگی۔ مجھے دھو ڈال میں برف سے زیادہ سفید نکلونگی"

ان اشعار کا مصنف یقیناً کوئی کلیسا کا راہب ہوگا جس کے سامنے توبہ کرتے ہوئے لڈیا نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہوگا۔

(مسولینی)　　　حنیف ہاشمی

ستارہ

اے غمناک ستارے میں تیری قسمت پر آنسو بہاتا ہوں۔ تیری قسمت پر جس کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سمندر کے تاریک طوفانوں میں ملاحوں کی راہنمائی کرتی ہے۔ اور جس کی شرمگیں نگاہوں نے آسمان کی محفل کو سجا رکھا ہے دیوتا اور انسان دونوں تجھ سے بیزار ہیں۔ تو محبت نہیں کرتا اور نہیں جانتا محبت کس طرح کی جاتی ہے تو فضائے بسیط میں مسلسل رقص کرتا اور پستی کے رہنے والوں کی نگاہوں کو مسحور کرتا ہے لیکن میں محویت کے عالم میں تجھے اور نصف شب کے اس پر سکوت منظر کو فراموش کر چکا ہوں۔

گوئٹے　　　ممتاز

مسولینی کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

"میں ہمیشہ سے ایثار کی زندگی کے گیت گاتا رہا ہوں۔ میں نے بہت سے میدان بھی مارے ہیں لیکن کبھی اپنے ذاتی فائدے کی خاطر جنگ نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ اپنے قومی فوائد کو ملحوظ رکھا ہے۔ لوگوں نے بہت سے موقعوں پر میری تعریف کی ہے۔ کوئی مجھے فاتح کہتا ہے اور کوئی قوم کا نجات دہندہ۔ ان خوشامدانہ اور نمائشی القاب نے میرے دماغ میں نخوت بھر دی۔ لیکن ان بے جا تعریفوں سے میں کبھی مغرور نہیں ہوا۔

میرے اندر اتنی طاقت اور صلاحیت تھی۔ کہ فرانس کے نمونے پر جمہوری طریق حکومت کی بنیاد رکھ دیتا لیکن میں اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ افسران ماتحت جن کے دل میں حسد و کینہ اور شرارت و سازش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی ہمیشہ اس موقعہ کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ کہ مجھے قید و بند کی سلاسل میں جکڑ دیں۔ حکومت دیکھ رہی تھی۔ کہ آئینی قواعد و حدود کے اندر رہ کر میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔

میرا معمول تھا۔ کہ ہر بات کو دیکھتا دوبارہ دیکھتا اور سہ بارہ بنظر غور دیکھتا۔ میں مسلسل کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹتا لیکن وہ راتیں غور و فکر اور عملی تجاویز میں سوچنے کے لیئے وقف ہوتی تھیں۔ اس سونے اور پرانے ہال (پارلیمنٹ) کو میں ایک میدان کارزار بنا سکتا تھا۔ جو مبالغوں سے پٹا پڑا ہے۔ میں پارلیمنٹ کے دروازوں کو تیغہ کر کے بند کر سکتا تھا۔ اونسیٹ (مجسٹریٹی) گورنمنٹ قائم کر سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں سر انجام دینے کی طاقت میرے اندر ودیعت تھی۔

میں نے دنیا کی غیر ضروری آسائش و زیبائش کو ذرہ بھر تاسف کئے بغیر ہمیشہ کے لیئے خیرباد کہہ دیا لیکن کھیل کود اور ورزشی تفریحوں کو میں نے قائم رکھا۔ مجھے ان کا اس لیئے بھی شوق تھا۔ کہ یہ میرے بدن میں چستی اور پھرتی پیدا کرنے کی ذمہ وار تھیں اس سے میری مصروف زندگی کے لئے صحت اور انبساط کے مشاغل بہم پہنچتے تھے۔ ان چھ سال میں ــــ سوائے سرکاری ضیافتوں کے ــــ میں نے کبھی کسی رئیس کے دیوان خانے یا کسی سوداگر کی دوکان پر قدم نہیں رکھا۔

میں اس قدر مصروف کار رہتا ہوں۔ کہ کسی دروغ باف کی ہرزہ سرائی سننے کیلئے میرے پاس قطعاً کوئی وقت نہیں تھا۔

میں تمام کھیلوں سے محبت رکھتا ہوں۔ میں موٹر پورے پورے اعتماد سے چلا سکتا ہوں۔ میں نے کئی مقامات کا دورہ کیا ہے جسے کہنہ مشق اور تجربہ کار موٹر چلانے والوں نے تعجب کی نظروں سے دیکھا ہے۔ میں ہوائی جہاز سے بھی محبت کرتا ہوں۔ جب حکومت کے اندیشوں نے مجھے مشغول کر رکھا تھا۔ تو مجھے ہوائی جہاز کے کپتان کا اجازت نامہ (لائسنس) حاصل کرنے کے لیئے چند اسباق کی ضرورت تھی۔ ایک بار میں پچاس میٹر کی بلندی سے گر پڑا لیکن اس حادثے نے مجھے پرواز کے اشتیاق سے باز نہ رکھا۔

کسی ٹی پارٹی کی تقریب پر شہسواری کرنا بھی میرے لیئے پُر مسرت وقت گذاری ہے۔ اور شمشیر زنی (جس سے مجھے دلی رغبت ہے) کی ورزش سے مجھے سب سے زیادہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے غم و یاس کے عالم میں ارگن میرا رفیق اور مونس تنہائی ہوتا ہے۔

میں تمثیلی چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں۔ اور تمباکو نوشی تک سے بھی بچا رہتا ہوں۔ تاش اور بڑے بڑے کھیلوں مثلاً کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ سے مجھے قطعاً دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے ان لوگوں کی حالتِ زار پر رحم آتا ہے۔ جو اپنا عزیز وقت، مال و دولت اور بعض وقت اپنا تمام سرمایۂ حیات کھیل کود کی نذر کر دیتے ہیں۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے۔ کہ گذشتہ شش سالہ زندگی میں میں نے نہ تو دل کا اطمینان کھویا ہے۔ اور نہ توازن دماغ اور نہ جذبۂ انصاف پروری کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے دیا۔ جب صوبۂ روم میں عام ہڑتال کا خوف طاری تھا۔ تو میں نے فلورنس کے فوجی سپاہیوں کو حکم دے دیا تھا۔ کہ دار السلطنت کی گلی کوچوں میں مظاہرہ کریں۔

مسلح فوج جب جنگی گیت گاتی تھی۔ تو لوگوں میں ترغیب پیدا ہوتی تھی۔ یہ ایک ایسا طریق ہے جس سے عوام کو اپنا ہمنوا بنایا جاتا ہے۔ میں نے اُن مجسٹریٹوں سے تہور آمیز الفاظ میں خطاب کیا۔ جو بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ کہ "ہم اپنے دشمنوں کو خس و خاشاک کا انبار بنا دینگے"۔

میں اور میری زندگی اس چیز سے جو میرے پیش نظر ہے۔ اور جو کچھ میں اب کر رہا ہوں۔ ہرگز ہرگز جدا نہیں۔ مجسٹریٹی حکومت کے ماتحت طلوع آفتاب سے نصف شب تک پیٹ پر پتھر باندھ کر دوسرے دن کی مشقتوں کے انتظار میں گذارہ کرنا سخت مشکل ہے۔ میں اس پر مشقت زندگی کا ایک نمونہ ہوں۔ یہ نظام اور میں ایک ہی جگہ سیئے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے خیال میں جنبش برگ شاید کوئی افسانہ ہے۔ لیکن میں وہ ہوں۔ جسے قسمت اور دست تقدیر نے ایسی ہستی بنایا ہے جس کی آنکھیں، کان اور جملہ حواس خیالات، تمام وقت اور حتیٰ کہ تمام

قوت ملکی زندگی کے دائرے میں محصور ہے۔

میرا افسانہ کوئی عام قصہ کہانی نہیں۔ بلکہ وہ اصول حکمت عملیوں اور کسی حکومت کے مستقبل کا افسانہ ہے۔

میں اپنے لئے کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اور نہ اپنے اقربا کے لئے کسی شئے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ نہ مجھے کسی مادی فائدے یا اعزاز اور شخصی رضامندی کی قرار دادوں کی ضرورت ہے۔ جن سے تاریخ عالم میں شہرت پانے کا خیال پیدا ہو۔

میری غایت و غرض بہت ہی مختصر ہے۔ میں اٹلی کو ہمسایہ اقوام میں بزرگ، معزز اور مہیب بنانا چاہتا ہوں۔ اور بس ؛

(مسولینی) فیروز حسن بٹ ایم اے ایم او ایل

جذباتِ داس مرحوم

آئے کہ تیری ہر لہر صدا　　مشغول ہے قطرہ نوازی میں
تو مست ہے عشوہ طرازی میں　　میں گم تری شعبدہ بازی میں
تو نور و ضیا کا سمندر ہے　　ظلمت سے بھری ہستی ہے مری
تو موج پہ ہے، تو اوج پہ ہے　　مشتاق تری پستی ہے مری
اسوقت کہ دنیا نیند میں ہے　　سنسان ہے سطح سمندر کی
ہے چاندنی پھیلی چار طرف　　دلچسپ فضا ہے منظر کی
کیا سچ ہے کہ تو بھی جلوہ نما　　ہے جلووں کے اس منظر میں
کیا تیری نشیلی آنکھوں نے　　مستی یہ بھری ہے سمندر میں
یہ سچ ہے۔ تو ڈال اے حسنِ ازل　　پرتو مرے اس غم خانے پر
مشتاق ہوں تیرے کرشمے کا　　ہوں شیفتہ تیرے ترانے پر
پہناؤں گا جامہ نظم کا میں　　جب اپنے دل کی صداؤں کو
رگ رگ میں برنگِ برق تپاں　　دوڑاؤں گا تیری اداؤں کو
اے مطربِ رُوح ہو جلوہ فگن　　پھر آج شبِ تنہائی میں
ہے چھیڑتا اپنے ترنم کو　　تو روحوں کی گہرائی میں

(۲)

اس وقت ہے نور سحر کی کرن　　ہے بحر تلاطم خیز عیاں
پھیلی ہیں فضا میں روشنیاں　　دوڑی ہیں ہوا میں روشنیاں
سن سن کے صدائیں مست تری　　موجوں پہ سماں ہے عجب طاری
اُٹھتی ہیں کبھی سب جوش میں آ　　گرتی ہیں کبھی بے خودساری
یہ سچ ہے کہ تیرے ساز میں ہے　　موسیقی کی اک شان نئی
پر ہے یہ کسی کے اشارے سے　　ہر تان نئی ہر آن نئی
پھر بھی مری فکر بلند و رسا　　کر سکتی نہیں اس راز کو حل
ہے کس کا اشارہ مخفی یہ　　ہے کس کا پسِ پردہ یہ عمل
جو تیرے ساز کی تانوں میں　　بھرتا ہے عجب مستانہ دھنیں
دلچسپ دھنیں پُر جوش دھنیں　　سر اپنا دھنیں جو ان کو سُنیں

(۳)

آنکھوں سے زمین و زماں کی سُنی　　ہے ہستی پُر اسرار تری
پر صبح کے نور میں جلوہ نما　　ہے روشنئ رخسار تری
جب انگلیاں تیری چھیڑتی ہیں　　بادِ سحری کے ارگن کو
ہیں کرتی مست سمندر کو　　ہیں رقص میں لاتی گلشن کو
کرتا ہے سروں کو بلند اگر　　تو اپنی چلبلی تانوں میں
ہلچل سی ہے پڑتی آندھیوں میں　　جوش اُٹھتا ہے طوفانوں میں
کیا چیز ہے یہ پوشیدہ بتا　　نغموں میں تیرے ای مست ادا
ہوتی ہے کبھی جو آہ و فغاں　　بنتی ہے کبھی ہنسنے کی صدا
لرزہ میں ہے دنیا کی رگِ جاں　　سن سن کے تری آہنگوں کو
رعشہ ہے امنگوں پر طاری　　ہے جوش دلوں کی ترنگوں کو

(۴)

دی صبح نے بانسری چھیڑ اپنی　　ہے گونج رہی آواز اُس کی
آواز ہے دلکش اور دھیمی　　کم کم ہے ابھی پرواز اُس کی
پھوٹی ہے ابھی سورج کی کرن　　ہے جھلمل جھلمل پانی میں
منہ بند کنول جو تیرے ہیں　　کھلنے پہ ہیں مائل پانی میں
جب کرنیں جھیل کے پانی کو　　چمکا کے سنہری کر دینگی
پھولوں کو ہنسا کے تجلی سی　　پانی کی فضا میں بکھر دینگی
ہے صبح کی سنے میں تیری صدا　　کرتی ہے جو یوں مدہوش مجھے
یہ وجد میں لانے والی ہوا　　رکھ سکتی نہیں خاموش مجھے

وحید الدین سلیم

بسمارک اور فرانس

اگرچہ نپولین سوم نے بسمارک کے ساتھ سمجھوتہ کرکے آسٹریا اور پرشیا کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا منظور کرلیا تھا لیکن اسے اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ پرشیا کی فتوحات کی رفتار اس قدر تیز ہوگی۔ اس لئے کونی گراٹز کی لڑائی کے بعد جب آسٹریا نے اس سے بیچ میں پڑنے کی درخواست کی۔ تو وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔ پھر گفت و شنید کے دوران میں ایک وقت ایسا آیا۔ جب صاف طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آسٹریا کی خاطر پرشیا پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔ بسمارک نے اسوقت تو اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ اور اس طرح پر فرانس سے مسلح کشیدگی کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر جب عارضی صلح کی شرائط طے ہوگئیں تو اس کے فوراً بعد بین ڈیٹی نے گورنمنٹ فرانس کے زیر ہدایت غیر جانبداری کا معاوضہ مانگا اور مطالبہ کیا کہ دریائے رائن کے دائیں کنارے کا جرمن علاقہ فرانس کے حوالے کردیا جائے۔ یہ بات بسمارک کے مصلحت پسند تحمل کے لئے بھی ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے جواب دیا کہ میں اس علاقہ کو فرانس کے حوالے کرنے کی بجائے فرانس سے جنگ کرنا اچھا سمجھونگا۔

اب نپولین اور بسمارک دونوں اس تاک میں رہنے لگے کہ جب فریق ثانی کمزور ہو۔ اسی وقت اس پر حملہ کردیا جائے ۱۸۶۷ء میں لکسمبرگ میں فوج رکھنے کے حق پر جھگڑا ہوگیا۔ اس وقت بسمارک نے وہ معاہدے پیش کر دئے جو اس نے جرمنی کی جنوبی ریاستوں کے ساتھ کئے تھے۔ یہ ایک چیلنج تھا۔ جو تمام جرمنی کی طرف سے فرانس کو دیا گیا۔ نپولین مجبوراً خاموش ہو رہا اور آسٹریا کے ساتھ اتحاد کی بات چیت کرنے لگا۔ جہاں بسمارک کا پرانا مخالف بیوسٹ ان دنوں چانسلر یعنی وزیر اعظم تھا۔ آخر ۱۸۷۰ء میں سپین کی تخت نشینی کے سوال پر جھگڑا بڑھ گیا۔ سپین کے مارشل پرم نے بسمارک پر زور دیا کہ خاندان ہوہنزولرن کے پرنس لیوپولڈ کو سپین کا بادشاہ منظور کرلیا جائے جب نپولین کو اس تجویز کا علم ہوا۔ تو اس نے بین ڈیٹی کی معرفت شاہ پرشیا سے جواب طلب کیا۔ پرشیا کے دفتر خارجہ نے بسمارک کے حسب ہدایت اس تجویز کے متعلق نہ صرف ہر قسم کی ذمہ داری سے انکار کردیا۔ بلکہ لاعلمی کا اظہار بھی کیا۔ شاہ پرشیا نے بین ڈیٹی کو اس سلسلہ میں شرف باریابی بخشا۔ لیکن جب نپولین نے شاہ پرشیا کو جھکتے دیکھا۔ تو اپنے مطالبات میں اضافہ کردیا۔ اور اصرار کیا کہ پرشیا نے سپین کی تخت نشینی کے معاملہ میں جو دست اندازی کی ہے اس کے لئے فرانس سے معافی مانگی جائے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا۔ جس کی تعمیل کرنا پرشیا کیلئے ذلت کا موجب تھا۔ اس لئے جنگ اٹل ہوگئی۔ نپولین نے جنگ کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ فرانسیسی فوجوں نے فوراً پرشیا کے خلاف پیشقدمی شروع کردی۔ لیکن ایسی شکست کھائی کہ چند ہی ماہ کے بعد پیرس پر پرشین فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔

۱۸۶۶ء والی جنگ کی طرح بسمارک اس جنگ کی رفتار میں بھی ذاتی طور پر دلچسپی لیتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً فوج کے ہیڈ کوارٹر کا معائنہ اور فوجی انتظامات کے متعلق محکمہ جنگ سے تبادلہ خیالات کیا۔ گریو ویلٹ کی لڑائی اور سیڈن کی تسخیر اس جنگ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ ان دونوں موقعوں پر بھی وہ بذات خود فوج کے ساتھ تھا۔ جب فرانسیسی فوج نے ہتھیار ڈال دئے تو اس کے بعد ۲ ستمبر کو نپولین کے ساتھ اسکی ملاقات ہوئی۔ جو تاریخ کا ایک قابل یادگار واقعہ ہے۔ وہ شاہ پرشیا کے ہمراہ فاتحانہ حیثیت سے پیرس میں داخل ہوا۔ اور کئی ماہ تک ورسیلز میں رہا۔ یہاں بیٹھکر اُسنے سلطنت جرمنی کا دستور آئینی مکمل کیا۔ ان دنوں اسے اس وجہ سے بڑی تشویش رہی کہ مبادا تھیئرس غیر جانبدار طاقتوں کو فرانس کے حق میں مداخلت کرنے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہوجائے۔ پیرس کو حوالہ کرنے سے پہلے اس نے فرانسیسیوں سے عارضی صلح کی شرائط بھی خود ہی طے کیں۔

فرانس اور پرشیا کی جنگ کے دو اہم ترین نتیجے یہ نکلے کہ فرانس میں شہنشاہیت کی بجائے جمہوری حکومت قائم ہوگئی اور جرمنی پرشیا کی قیادت میں ایک عظیم الشان سلطنت بن گیا۔

۱۸۷۰ء کے بعد

۱۸۷۰ء کے بعد بسمارک کلیتہً ملکی معاملات میں منہمک ہوگیا۔ پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۶۶ء کے بعد آسٹریا کو شکست دینے اور جرمن ریاستوں میں اس کا زور توڑنے کے بعد اس نے اپنے پارلیمنٹری مخالفوں سے سمجھوتہ کیا اور ایک نیشنل پارٹی قائم کرلی۔ اس سے کنسرویٹو پارٹی کے ساتھ اس کی کشیدگی ہوگئی تھی۔ ۱۸۷۰ء کے بعد یہ کشیدگی اس حد تک

بڑھی کہ اُس کے بہت سے پرانے دوست بھی اُس سے الگ ہو گئے۔
۱۸۷۲ء میں وہ وزیر اعظم پرشیا کے عہدہ سے ریٹائر ہو گیا۔ لیکن چند
ماہ کے بعد پھر واپس آگیا۔ ۱۸۷۳ء میں رومن کیتھالک چرچ کے ساتھ
اُس کی جدوجہد شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں اس کے خلاف اس قدر
نفرت پھیلائی گئی کہ ایک نوجوان نے اس پر گولی چلا دی۔ ۱۸۷۷ء
میں اس نے خرابی صحت کی وجہ سے دس ماہ کی طویل رخصت لے لی۔
۱۸۷۸ء میں برلن کانگرس کی صدارت کی اور یورپ کو ایک عالمگیر جنگ
میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ اس کانگرس کی کامیابی کا شمار اُس کی زندگی
کے اہم ترین کارناموں میں کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے چند سال
تک اپنی توجہات تجارتی اصلاحات پر صرف کیں۔ ان اصلاحات کو وہ اس قدر
اہم سمجھتا تھا کہ اس زمانہ میں پرشیا کا وزیر تجارت بھی وہ خود ہی بن گیا۔
۱۸۸۹ء میں ولیم اول کی وفات سے جو شاہ پرشیا کے علاوہ اب قیصر جرمنی
بھی بن گیا تھا۔ بسمارک کی پوزیشن میں بڑا فرق آگیا۔ اگرچہ نیا قیصر فریڈرک
جو زمانہ ولیعہدی سے اس کا مخالف تھا۔ چند ہی ماہ کے بعد راہی عدم
ہوا۔ مگر قیصر ولیم دوم کے ساتھ بھی اس کے اختلافات تھوڑے عرصہ
کے بعد اس قدر نمایاں ہو گئے کہ اس نے ہمیشہ کے لئے ریٹائر ہو جانا
مناسب سمجھا۔ یہ ۱۸۹۰ء کا واقعہ ہے۔

قیصر سے کشیدگی

ریٹائر ہونے کے بعد وہ ہمبرگ کے قریب فریڈرک سرا میں قیام
پذیر ہو گیا۔ یہ ایک عالیشان محل تھا۔ جو اس نے اپنی لائن برگ کی
جاگیر میں بنوا لیا تھا۔ اس کے ریٹائر ہونے سے قیصر بڑی سخت مشکلات
میں گھر گیا۔ ان مشکلات کا نقشہ قیصر نے اپنی یادداشتوں میں ان
الفاظ کیا ہے:۔

"مجھے اس کے جانشین کے تقرر کا مسئلہ سخت پریشان کن
نظر آیا۔ جو کوئی بھی اس کا جانشین ہوتا۔ وہ اس کے سوا
کچھ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس پر چاروں طرف سے نکتہ
چینی کے تیروں کی بارش ہوگی۔ اور اسے ایک ایسے عہدے
کا غاصب سمجھا جائیگا۔ جس کا وہ اہل اور حقدار نہیں۔ یہ
بات یقینی تھی کہ اس کے کسی کارنمایاں کا اعتراف تو
بالکل نہیں کیا جائیگا۔ البتہ وہ عالمگیر مخالفت کا نشانہ ضرور
بنایا جائیگا اور مخالفوں میں نہ صرف وہ لوگ شامل ہونگے۔ جو
بسمارک کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بلکہ وہ بھی
جو اس سے پہلے بسمارک کے مخالف تھے۔ مگر اسکی مخالفت
موثر طریق پر نہیں کر سکے۔ یہ بھی یقینی ہے کہ نئے چانسلر کے
خلاف عداوت کی جو زبردست لہر پیدا ہوگی۔ اس میں خود
بسمارک بھی کچھ کم خطرناک عنصر نہیں ہوگا۔"

آگے چل کر قیصر نے لکھا ہے کہ ان سب باتوں کو مدنظر رکھکر
کسی ایسے شخص کو چانسلر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو بسمارک کے حلقہ
سے تعلق رکھتا ہو۔ جس نے زمانہ ہائے جنگ میں اہم ذمہ واریوں کو سر
انجام دیا ہو اور جو خود بسمارک کے ماتحت حکومت کے کسی ممتاز عہدے
پر سرفراز رہا ہو۔ اس لئے میری نظر انتخاب کپرلیوی پر پڑی۔ اس کا عمر
رسیدہ ہونا اس بات کی ضمانت تھا کہ وہ "تعلیم" اور نوجوان شہنشاہ کا محافظ
اور سکون پسند مشیر ہوگا۔

مگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود بسمارک اور اس کے مداحوں نے
گورنمنٹ پر نکتہ چینی کی بوچھاڑ جاری رکھی۔ خود بسمارک بعض اوقات دوران
گفتگو میں اور بعض اوقات اخبارات کے کالموں میں گورنمنٹ پر ایسی
تلخ نکتہ چینی کرتا تھا کہ کئی مرتبہ اس کے اور قیصر کے درمیان کھلی کشیدگی
پیدا ہو گئی۔ ایک بار یہاں تک نوبت پہنچی کہ کونٹ کپرلیوی نے جرمن سفیروں
کے نام ایک خفیہ گشتی مراسلہ جاری کیا۔ جس میں ان کو متنبہ کیا گیا کہ بسمارک
جو کچھ کہتا ہے یا لکھتا ہے اسکو ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ ایک مرتبہ
جب بسمارک اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں وائنا گیا۔ تو وہاں کے
جرمن سفیر پرنس ریوس کو ہدایت کر دی گئی۔ کہ اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ
لیا جائے۔

وفات

آخر ۱۸۹۳ء میں قیصر کے ساتھ بسمارک کے تعلقات بحال ہو گئے
۱۸۹۵ء میں اس کی سالگرہ سارے جرمنی میں بڑی دھوم دھام سے
منائی گئی۔ ۱۸۹۱ء میں یعنی ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد پارلیمنٹ
کا ممبر بھی منتخب ہو گیا۔ مگر اس کے اجلاسوں میں کبھی شریک نہ ہوا۔ قیصر
کے ساتھ صلح ہو جانے کے بعد وہ عام طور پر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا
رہا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۹۸ء کو بمقام فریڈرک سرا اُسکا انتقال ہو گیا۔

بسمارک کی خدمات کا اعتراف

پہلے بتایا جا چکا ہے۔ شاہ ولیم اول بسمارک کو وزیر اعظم بنانا نہیں
چاہتا تھا۔ کیونکہ بسمارک نے یہ شرط پیش کی تھی کہ امور خارجہ پالیسی میں
شاہ کو دخل انداز نہیں ہونے دونگا۔ لیکن جب پارلیمنٹ سے جھگڑا بڑھ
جانے کی صورت میں اُسے اپنا تاج و تخت غیر محفوظ نظر آیا۔ تو اس کے
لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بسمارک کی شرائط منظور کر

لے ۔بسمارک نے بھی وزارت سنبھالنے کے بعد بادشاہ اور اور ملک کی خدمات ایسی تندہی اور وفاداری سے انجام دیں کہ چار ہی سال کے قلیل عرصہ میں بادشاہ کو پرشیا میں اور پرشیا کو جرمنی میں غلبہ حاصل ہو گیا۔ پھر فرانس کو شکست دیکر اس نے پرشیا کی قیادت میں جرمن سلطنت قایم کی ۔ ان شاندار کارناموں اور دوسری گرانقدر خدمات کی وجہ سے ولیم اول اور عام اہل ملک اس کی اسقدر عزت کرتے تھے کہ وہ متواتر ۲۸ سال تک پرشیا اور جرمنی کا چانسلر رہا ۔ یہ اسکی خدمات کا عملی اعتراف تھا۔ ان خدمات کا دوسرا بڑا اور موثر تر اعتراف وہ پریشانی تھی ۔ جو قیصر ولیم دوم کو اس کا جانشین مقرر کرنے کے سوال پر لاحق ہوئی ۔

مالی طور پر بھی اس کی خدمات کا اعتراف کرنے میں ملک و قوم نے بڑی دریا دلی کا ثبوت دیا ۔ ۱۸۶۶ء میں جنگ آسٹریا کے بعد پارلیمنٹ نے فتحمند جرنیلوں کے لئے ایک گرانقدر رقم منظور کی جس میں سے حصہ رسدی ۶۰ ہزار پونڈ بسمارک کو ملے ۔ اس روپیہ سے اس نے پومرنیا میں ورزن کی جاگیر خریدی ۔ جسے وہ بقیہ زندگی میں سکون ہاسن کی بجائے اپنی دیہاتی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا رہا ۔ اس کی ستروین سالگرہ کے موقعہ پر پبلک چندے سے ۲ لاکھ ۷۰ ہزار پونڈ کی کثیر رقم جمع کی گئی ۔ اس رقم کے نصف حصہ سے سکون ہاسن کی وہ جاگیریں خرید کر اسے واپس دے دی گئیں جن کو اس کے باپ نے چالیس سال پہلے مالی مشکلات کے باعث فروخت کر دیا تھا ۔ باقی رقم سے اس نے سکول ماسٹروں کی امداد کے لئے ایک فنڈ قائم کر دیا ۔

ذاتی اعزاز کے اعتبار سے بھی بسمارک اس بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ جو شاہی خاندان کے اراکین کا حصہ سمجھی جاتی تھی ۱۸۶۵ء میں اسے سفارتی خدمات کے صلے میں کونٹ کا خطاب دیا گیا اور ۱۸۹۰ء میں جب وہ ریٹائر ہوا قیصر ولیم دوم نے اسے ڈیوک آف لائن برگ بنا دیا ۱۸۹۱ء میں اس کو پرنس کا درجہ عطا کیا گیا ۔ ڈیوک آف لائن برگ کا خطاب اس نے کبھی استعمال نہ کیا اور نہ اس کے بیٹے کو ورثے میں ملا ۔

مذہبی حیثیت سے اسکی جو عزت افزائی ہوئی ۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے ۔ کہ وہ پہلا پراٹسٹنٹ تھا ۔ جسے پوپ نے آرڈر آف کرائسٹ عطا کیا ۔ اس عزت افزائی کو اگر اس کشمکش کی روشنی میں دیکھا جائے ۔ جو اس کے اور رومن کیتھولک چرچ کے درمیان پیدا ہو گئی تھی ۔ اور جس کی وجہ سے ایک نوجوان نے اس پر گولی چلا دی تھی ۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا کے مذہبی بادشاہ بھی بسمارک جیسے رفیع الشان مدبروں کو مقدس خطابات دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں ۔

بسمارک کی عظمت

اس میں کلام نہیں کہ بسمارک اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر تھا ۔ روس ۔ فرانس ۔ آسٹریا ۔ اور انگلستان سب اس کا جواب پیش کرنے میں عجز کا اعتراف کرتے تھے ۔ اس کی حکمت عملی کو کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا نتائج کے لحاظ سے اس کی کوئی چال غلط نہ ہوتی تھی ۔ بین الاقوامی گتھیوں کو سلجھانے اور صورت حالات کو اپنے موافق بنا لینے میں کوئی اس کے کمال کا حریف نہیں تھا ۔

ولیم اول نے بسمارک کو نہ صرف مجبور ہو کر چانسلر بنایا تھا ۔ بلکہ ساری عمر اس کو چانسلر بنائے رکھنے پر مجبور رہا ۔ اس نے کئی بار ریٹائر ہو جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن اس کی یہ خواہش ہمیشہ رد کر دی گئی ۔ ایک بار ولیم نے اس سے بڑے زور کے ساتھ یہ کہا کہ میں آپ کو ہرگز ہرگز ریٹائر نہیں ہونے دونگا ۔ بسمارک ولیم کو اپنے کام میں دخل انداز نہ ہونے دیتا تھا ۔ کئی مرتبہ دونوں میں سخت اختلاف بھی ہو گیا ۔ مگر ہر مرتبہ ولیم کو جھکنا پڑا ۔ ایک دفعہ بسمارک کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد ولیم اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی کابینہ کا رکن اعلے جنرل ایلبیڈل اس کے پاس آ نکلا ۔ ولیم کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا ۔ جنرل ایلبیڈل نے جب بسمارک کے ساتھ اس کی جھڑپ کا حال سنا ۔ تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں شہنشاہ کی صحت پر اس کا برا اثر نہ پڑے ۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ کہا "جہاں پناہ ! آپ کو آئندہ کے لئے اس قسم کی کاہشوں کے امکان کا خاتمہ کر دینا چاہیئے اور اگر بسمارک جہاں پناہ کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرنا چاہتا ۔ تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ آپ اسے برطرف کر دیں "۔ اس پر ولیم نے بے بسی کے انداز میں جواب دیا ۔ "تعریف اور شکرگذاری کے ان جذبات کے باوجود جو چانسلر اعظم کے متعلق میرے دل میں موجزن ہیں ۔ میں اس سے پیشتر کئی بار اس کو برطرف کر دینے کا خیال کر چکا ہوں ۔ کیونکہ اس کی خودسرانہ روش اکثر اوقات حد سے زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے ۔ لیکن میں اور میرا ملک دونوں بری طرح اس کے محتاج ہیں ۔ صرف وہی ایک ایسا شخص ہے جو بیک وقت پانچ گیندوں کے ساتھ کھیل سکتا ہے ۔ جن میں سے دو ہر وقت ہوا میں رہتے ہیں ۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کا کھیلنا میری طاقت سے باہر ہے "

اس کھیل سے ولیم کی مراد بین الاقوامی جوڑ توڑ تھی اور پانچ گیندجن کو اوپر پھینکنے اور نیچے سے دبوچنے کا عمل بسمارک کا عزیز مشغلہ تھا ۔ یورپ کی پانچ بڑی طاقتیں تھیں ۔ جن میں انگلستان بھی شامل تھا ۔

بحری طاقت سے بے پروائی

حیرت کا مقام ہے کہ بین الاقوامی سیاسیات کا یہ عدیم النظیر ماہر بحری طاقت کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا جس کی بدولت انگلستان نے دنیا کے ہر حصے میں ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کر لی ہے۔ قیصر ولیم دوم اپنی . . یادداشتوں میں لکھتا ہے :-

"میں نے نوآبادیات کے سوال پر متعدد بار پرنس بسمارک سے گفتگو کی۔ مگر اسے ہمیشہ اس رائے پر قائم پایا کہ نوآبادیوں کو فادرلینڈ[1] کیلئے مفید بنانا یا خام پیداوار بہم پہنچانے والی منڈیوں کے طور پر استعمال کرنا اتنا منفعت بخش نہیں۔ جتنا پولیٹیکل سودوں کی غرض سے کام میں لانا"۔

جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے پرنس کو اس بات پر توجہ دلائی ۔ کہ ہمارے تاجروں اور سرمایہ داروں نے بڑی تندہی کے ساتھ نوآبادیوں کی نشوو ارتقا کا آغاز کر دیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ تاجر اور سرمایہ دار اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے بحری فوج پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس لئے جرمنی کو ایک جنگی بیڑا بنانے کے لئے ضروری تدابیر عمل میں لانا چاہئے ۔ تاکہ جرمنی کے غیر ملکی مفاد غیر محفوظ حالت میں نہ رہیں ۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ چونکہ آپ نے جرمن جھنڈا غیر ممالک میں نصب کر دیا ہے اور باشندگان جرمنی اس جھنڈے کی پشت پر ہیں ۔ لہٰذا اس کی حفاظت کے لئے بحری فوج بھی ہونی چاہئے ۔ لیکن پرنس نے میرے بیانات کو سرسے کانوں سے سنا اور اس کے جواب میں محض یہ فقرہ جو ایسے موقعوں پر اس کا تکیہ کلام ہوتا تھا ۔ استعمال کیا :-

"اگر انگریز ہماری سرزمین پر قدم رکھیں گے تو میرا یہ کام ہوگا ۔ کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے"

"پرنس کا خیال تھا کہ ہم نوآبادیوں کی حفاظت اپنے گھر میں بیٹھکر کریں گے ۔ وہ اس خیال کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا کہ یہ بات جرمنی کے لئے ناقابل برداشت ہے ۔ کہ انگریز بلا مزاحمت اپنی فوجوں کو جرمنی میں اتار سکتے ہیں ۔ کیونکہ ہیلی گولینڈ پر ان کا قبضہ ہے ۔ نہ وہ اس خیال کو خاطر میں لاتا تھا کہ انگریزوں کے لئے جرمنی میں فوجیں اتارنے کو قطعاً ناممکن بنانے کے لئے ہمیں زبردست بحری فوج بنانے اور ہیلی گولینڈ کا قبضہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے"

بسمارک کے ریٹائر ہو جانے پر جب کیپرلوی کے عہدہ وزارت میں مشرقی افریقہ کے دو غیر اہم مقبوضات سے جو جرمنی نے تھوڑا ہی عرصہ پہلے حاصل کئے تھے ۔ ہیلی گولینڈ کا تبادلہ کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور اسوقت کا وزیر اعظم انگلستان لارڈ سالسبری بھی اس تبادلہ کے لئے رضا مند ہو گیا ۔ تو بسمارک نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کر دیا ۔ اگرچہ یہ مخالفت کامیاب نہ ہوئی ۔ لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ بسمارک بحری طاقت کو جرمنی کے لئے کس قدر غیر ضروری سمجھتا تھا ۔

بسمارک کے متعلق قیصر کی رائے

جیسا کہ سطور گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے ۔ پرنس بسمارک معزول قیصر کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے بددل ہو کر ریٹائر ہو گیا تھا اور اس کے بعد بڑے زور شور سے اسکی مخالفت بھی کرتا رہا ۔ اس لئے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق قیصر کی رائے اچھی نہیں تھی ۔ مگر قیصر کے اپنے الفاظ سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے ۔ چنانچہ اپنی یادداشتوں میں وہ لکھتا ہے :-

"ایک مدبر کی حیثیت سے پرنس بسمارک کی عظمت اور پرشیا اور جرمنی کے متعلق اسکی لافانی خدمات اس قسم کے نمایاں تاریخی واقعات ہیں کہ کسی شخص کو خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ ان میں شک کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی ۔ صرف یہی ایک وجہ ایسی ہے جس کی موجودگی میں مجھ پر یہ الزام لگانا محض حماقت ہے کہ میں پرنس بسمارک کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتا ۔ اسی سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے ۔ کہ میں نے جس زمانہ میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کیں وہ بسمارک کے عقیدت مندوں کا زمانہ تھا ۔ وہ سلطنت جرمنی کا بانی اور میرے دادا کے وقت سے چانسلر تھا ۔ ہم سب اسکو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مدبر سمجھتے تھے ۔ اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ جرمن ہے ۔ وہ میرے دل کے مندر کا بت تھا ۔ اور میں اس کا پرستار ۔

لیکن فرمانروا بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے ہوتے ہیں ۔ اور دوسروں کے طرز عمل کے اثرات ان پر بھی پڑتے ہیں"

---

[1] دنیا کی تقریباً ہر ایک قوم اپنے آبائی ملک کو مادر وطن کہتی ہے ۔ انگریزی زبان میں اس کا ہم معنی لفظ مدرلینڈ ہے ۔ مگر جرمنی میں فادرلینڈ کہا جاتا ہے ۔ فادر کے معنی باپ کے ہیں ۔

پانی

یہ واقعہ ترکوں اور روسیوں کی اُس جنگ میں پیش آیا جو قفقاز کے قرب و جوار میں ہوئی تھی۔ ایک مشکوک سی لڑائی کے بعد جس میں ظاہری حالات و قرائن ہمارے خلاف تھے ہم مشہور کوہ سُرخ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ دفعتہً ہماری رجمنٹ صف اوّل کی درماندہ اور تھکی ہوئی فوج کو کمک دینے اور اُسی علاقے کو دشمنوں کے وجود سے بالکل پاک کر دینے کے لئے آگے بڑھی۔ رات کا وقت تھا جب ہمیں کوچ کا حکم ملا۔ نیلگون آسمان کے تابناک ستارے پستی کے رہنے والوں کو پرتبسم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک قسم کا پُر اسرار سکوت میدان کی وسعتوں پر چھا رہا تھا اور شفق کی دُھندلی روشنی میں چمکتے ہوئے نقطوں کی ایک لمبی لکیر نظر آرہی تھی ہم سب جانتے تھے کہ یہ روسیوں کا خیمہ و خرگاہ ہے جن سے دوسرے دن علی الصباح ہمیں لڑنا ہے۔

تمام سپاہی نہایت خاموشی سے چلے جا رہے تھے کسی قسم کا شور کرنے یا تمباکو پینے کی قطعاً ممانعت تھی۔ اگر کسی قسم کی بے پروائی سے سنگینیں بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی تھیں تو افسران بالا کی طرف سے قصور وار سپاہیوں کو دھیمی آواز میں سخت ڈانٹ بتائی جاتی تھی۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی افسر قریب نہ ہوتا تو ہمراہی ہی ایک ہلکی سی کہنی لگا کر خبردار کر دیتے تھے۔

ہماری فوج سانپ کی طرح پیچدار پہاڑی راستہ طے کر رہی تھی اور ریت پر چلنے والے آٹھ ہزار قدموں کی آواز ایک متلاطم ندی کے شور سے مشابہ تھی۔ دوریٔ منزل کی وجہ سے پیدا ہونے والی تکان دلوں میں ایک قسم کی افسردگی پیدا کر رہی تھی اور جتنا ہم اس بد دلی کے خلاف جد و جہد کرتے تھے اُسی قدر اُس سے رہائی حاصل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اپنی بندوق کاندھے پر رکھے اور تسموں کو مضبوطی سے باندھے میں آدمیوں کے اس ہجوم میں قدم بڑھاتے چلا جا رہا تھا۔ اور اس کوشش میں تھا کہ ہر قدم آرام سے اُٹھے تاکہ جس قدر بھی ممکن ہو اپنی کچھ نہ کچھ طاقت بچا لوں۔

میرے پہلو بہ پہلو اسی فوج کا ایک رضا کار رشید بے جا رہا تھا۔ وہ بالکل نوجوان لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ میں رات کی تاریکی میں اُس کی شکل اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے چہرے سے خوف اور تھکاوٹ کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ یکایک اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے بازو پر رکھ کر آہستہ آواز میں پوچھا "کیا ہمیں رات ہی کو لڑنا پڑیگا؟"

میں نے جواب دیا "اگر ایسا ہو بھی جائے تو پھر کیا ہے کیا تم اس بات سے خائف ہو؟"

ایک لمبی آہ اُس کا جواب تھا۔ ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ متفکرانہ اور ایک ساتھ اُٹھنے والے قدموں سے سپاہی اپنا راستہ طے کر رہے تھے۔

بالآخر ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ روسی پڑاؤ کی روشنیاں اب صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دشمن کے کیمپ پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہماری فوج ایک جگہ ٹھہر گئی پھر ہم نے آرام کرنے کی خاطر کمریں کھولدیں۔ سڑک پر چلنے کی نسبت دشمن کے قریب تر ہو کر ہم زیادہ آزادی سے سانس لے رہے تھے۔ اگرچہ ہمارے اور دشمن کے درمیان رات کے اندھیرے کی لامتناہی دیوار حائل تھی لیکن پھر بھی ہمیں معلوم تھا کہ یہ دیوار کیا چیز ہماری آنکھوں سے چھپائے ہے۔ روسیوں کی طرف سے ہوا کا ایک سرد جھونکا دلوں میں مبہم خیالات پیدا کرتا ہوا آہستہ سے گذر گیا۔

رشید بے میرے قریب ہی لیٹا تھا اُس نے آہستہ سے کہا یہاں قریب ہی ایک دریا بہتا ہے۔ لیکن علی مغیث تمہارا کیا خیال ہے کل کچھ زیادہ گرمی تو نہیں ہوگی؟"

میں نے جواب دیا "آسمان ستاروں سے جگمگا رہا ہے، میرا خیال ہے کہ کل ضرور گرمی ہوگی"

یہ سُنتے ہی میرے دوسرے ہمراہی رافت بے نے بغیر کسی استفسار کے کہا "اگر روسیوں نے کل ہم پر حملہ کیا تو سورج کے بغیر بھی کافی گرمی ہوگی۔ ہمیں حکم ہے کہ اس مقام کو اپنے قبضہ میں رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے دوسرا دستہ پہنچنے تک اسی پہاڑ کی مدافعت کریں"

رشید بے نے پھر مجھ سے پوچھا "ہم خندقیں کیوں نہیں کھود لیتے؟"
رافت نے لاپرواہی سے جواب دیا "ہماری چوکی سے کچھ فاصلے پر

خندقیں بھی کھودی جا رہی ہیں۔" پھر ذرا ہمدردانہ لہجہ میں اسے مخاطب کرکے کہنے لگا "تم سو کیوں نہیں جاتے۔ کل تمہیں سارا دن پرمشقت کام کرنا ہوگا۔"

لیکن اس نصیحت کا جس میں ایک قسم کا پدرانہ جذبہ شامل تھا، رشید پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تمام فوج اس لڑکے کے اعلےٰ اطوار و اخلاق کی بدولت اُس کی گرویدہ تھی۔ اس وقت وہ اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھے متفکرانہ انداز سے دشمن کے پڑاؤ میں دور فاصلے پر چلنے والی آگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"رشید بے تمہیں کس چیز نے فوج میں شامل ہونے کیلئے مجبور کیا تھا؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

اُس نے نہایت شریفانہ انداز میں جواب دیا "کیا کہوں عجیب بات ہے۔ کالج میں میں کوئی ہونہار طالب علم نہ تھا اور پڑھنے سے ہمیشہ جی کتراتا تھا۔ میرے ایک ماموں فوج میں ملازم تھے اُن کی دیکھا دیکھی مجھے بھی لفٹنٹ بننے کا شوق چرایا۔ اس امید پر کہ شاید ایک روز میں بھی کسی اعلےٰ عہدے تک پہنچ جاؤں گا۔ بس یہ بات تھی جس نے مجھے فوجی کاغذات میں اپنا نام درج کرانے کیلئے مجبور کیا تھا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ میرے بھرتی ہونے سے چند ہی ماہ بعد لڑائی شروع ہوگئی"۔ پھر نہایت ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہنے لگا "تم سمجھتے ہو میں لڑائی میں آنے کے لئے بیتاب تھا؟"

اس بات کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نازک اندام لڑکے کی طرف جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں اور جس کا معصوم چہرہ آفتاب کی تیز کرنوں کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برضا و رغبت لڑائی پر آنے کیلئے آمادہ نہ تھا اور شاید اس کی یہ معصومیت اور مجبوری ہی تمام سپاہیوں کو اُس کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنیکا باعث ہوئی تھی۔

"بہرحال" اُس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا "میں اپنے کئے پر پشیمان نہیں ہوں۔ کیونکہ اس قسم کی بزدلی ایک ترک کے شایانِ شان نہیں۔ البتہ جب کبھی مجھے اپنے گھر کا خیال آتا ہے تو طبیعت اداس ہو جاتی ہے۔ ہمارے خاندان کے بہت سے افراد تھے۔ لیکن میری والدہ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ میں فوج میں بطور ایک سپاہی کے بھرتی ہوتا۔ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں۔ جہاں لطف و مسرت سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ گاؤں کے قریب ہی ایک خوبصورت دریا ہے۔ اور مجھے مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے۔"

میں اور رشید بے تمام رات آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ سپیدۂ صبح نے رات کی تاریکی پر آہستہ آہستہ غلبہ حاصل کرنا شروع کیا۔ ستارے یکے بعد دیگرے نظروں سے نہاں ہونے لگے اس وقت تک روسیوں کے آلاؤ سرد پڑ گئے تھے۔ اور پہاڑ کی بلند چوٹیوں کے پیچھے سورج کی چوندھیا دینے والی گیند حیرت انگیز خوبصورتی سے بلند ہو رہی تھی۔ سورج بتدریج بالائے افق آنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون میں ڈوب کر نکلا ہے اور دیکھنے والوں کو دیکھتے ہوئے پہاڑ کی طرح جلا کر خاک سیاہ کر دیگا۔

اتنے میں فوج کا کپتان ہمارے نزدیک سے گذرا۔ پھر سپاہیوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا "اگر تمہاری کپیوں میں کچھ پانی باقی ہے تو اُسے نہایت احتیاط و حفاظت سے رکھنا۔ کیونکہ ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں رہا۔ تمام پیپے واپس کر دیے گئے ہیں اور شام سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"لیکن توفیق بے" ایک نوجوان لفٹنٹ نے روسیوں کیجانب اشارہ کرکے کہا "وہاں کافی پانی موجود ہے ایک پورا دریا؟"

"ہمیں اُس طرف ایک سپاہی بھیجنے کی بھی سخت ممانعت ہے۔ کیونکہ ہر ایسا فعل روسیوں کو ہم پر فوراً حملہ کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ فوج کا دوسرا دستہ شام سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اُس وقت تک ہمیں اسی جگہ ٹھیرنا ہے۔"

"پانی ختم ہو گیا ہے" بجلی کی سی تیزی کیساتھ یہ الفاظ ہر سپاہی کے کانوں تک پہنچ گئے۔ ناتجربہ کار رنگروٹ جنہیں اس سے پہلے میدان جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے کا تجربہ نہ تھا، زیادہ متفکر نظر آتے تھے۔ لیکن سرد و گرم چشیدہ سپاہی جانتے تھے کہ ان الفاظ میں کتنی تلخی کتنی پریشانی اور کتنی ہیبت پنہاں ہے۔ اُس وقت تک فوجی جوانوں نے ان الفاظ کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی حالانکہ افسران بالا کے نزدیک یہی الفاظ موت کے مترادف اور ہم معنے تھے۔

ایک نوجوان آدمی نے جو مجھ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا ذرا بلند آواز میں کہا "پانی کے بغیر کتنے عرصے کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ روٹی کے بغیر زندہ رہنا ممکن ہے لیکن پانی کے بغیر ہرگز نہیں!"

"عبدالمجید۔ اس قسم کی احمقانہ گفتگو نہ کرو" رافت نے ذرا ترش لہجہ میں کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں ہر سپاہی اس قابل ہونا چاہیئے کہ سردی، بھوک اور ہر ضرورت کا مقابلہ کر سکے۔"

"بھوک۔ سردی اور دوسری ضروریات برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن چچا رافت

پیاس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا۔ پیاس ہرگز برداشت نہیں ہو سکتی!"

"بیوقوف" رافت نے ذرا حاکمانہ انداز میں کہا "کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہر ضرورت میں پیاس بھی شامل ہے"

سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا اور عبدالمجید کچھ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن یہ خندہ مسرور اُس قہقہے کی مانند تھا جیسے ایک پھانسی پانیوالے گنہگار نے کسی دار پر چڑھے ہوئے مجرم کو دیکھ کر لگایا ہو۔ کس کا دل تھا جو پانی کی عدم موجودگی پر دھڑک نہ رہا ہو اور کس کے حواس تھے جنہیں اس لرزہ خیز خیال نے پران نہ کر دیا ہو۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ جب ہمارے پاس پانی موجود ہی نہیں تو اسے بچائیں گے کیا کیونکہ پانی کا ہر قطرہ گذشتہ رات کے طویل سفر میں سڑک ہی پہ ختم ہو چکا تھا۔

تمام سپاہیوں کے چہروں پر ایک قسم کی اُداسی اور سراسیمگی چھا رہی تھی "پانی ختم ہو گیا ہے! قابل تشویش امر یہ تھا کہ آیا پانی کے بھرے ہوئے پیپے اس پہاڑی خطے میں اتنی تیزی سے واپس بھی لائے جا سکیں گے کہ وہ ضرورت کے وقت یہاں پہنچ جائیں۔ رشید نے خوف و حیرت سے بھری ہوئی طفلانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا "پانی کے بغیر ہم کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں؟ مجھے تو اس وقت بھی پیاس محسوس ہو رہی ہے"

سورج ہر لحظہ بلند ہو رہا تھا اور اُس کی تابناک شعاعیں ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ پانی کے بغیر اتنی شدید حدت و گرمی سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہے۔ اُدھر روسی افواج بالکل خاموش پڑی تھیں۔ انہیں پروا ہی کیا تھی؟ اُن کے پاس پانی موجود تھا۔ ایک پورا دریا اُن کے قدموں میں لہریں لے رہا تھا۔ شاید وہ اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں تمازتِ آفتاب اُن کی مدد کے بغیر کس حد تک ہمیں تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ پتھریلی چٹانیں جن کی اوٹ میں ہم چھپے ہوئے چہرے چھپا رہے تھے، تنور کی طرح دہک رہی تھیں

انتظار اور درد و کرب کی طویل ساعتیں نہایت سُست رفتاری سے گزر رہی تھیں اب گرمی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ سانس لیتے وقت ہوا کی بجائے آگ کے شرارے ناک اور مُنہ میں گھستے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور زبانوں میں اتنی نمی بھی باقی نہ تھی کہ جلے ہوئے لب ہی تر کئے جا سکیں۔ ہر طرف یہی لفظ سُنائی دیتا تھا "پانی! پانی!"

فوج کے کسی سپاہی کو دنیا کی کسی چیز سے کوئی رغبت نہ رہی تھی۔ آفتاب کی حدت و تیزی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بندوق کی نالی پر ہاتھ رکھنا غیر ممکن ہو گیا تھا۔

رشید بے نے ایک قسم کی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا "ہمارا دریا کتنا خوبصورت، کتنا چمکدار، صاف ستھرا اور کتنا گہرا ہے۔ اُس کا ٹھنڈا اور صاف پانی موتیوں کی طرح چمکنے والے خوبصورت رنگین پتھروں پر بہتا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے جس طرح یاقوت و لاجورد کی چٹانوں پر پگھلی ہوئی چاندی۔ پھر وہاں ایک حباب اُٹھتا ہے۔ بڑا بلور کی طرح شفاف کیسی دھیمی رفتار میں ندی کے ساتھ ہی ساتھ تیرتا ہوا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک نوک دار پتھر سے ٹکرا کر پھٹ جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اُس کے کنارے کے قریب نہایت بے پروائی سے تیرتی پھرتی ہیں۔ اگر تم انہیں پکڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھاؤ تو وہ کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح مختلف اطراف و جوانب کو نکل جائیں گی۔ اگر تم پانی پینا چاہو تو نہایت آسانی سے گھٹنے ٹیک کر اپنے چلو میں برف جیسا سرد پانی بھر سکتے ہو"

یکایک کسی نے اشتعال آمیز آواز میں کہا "چپ رہ شیطان، ہم پیاس سے جاں بلب ہیں اور یہ پانی کی مدح سرائی کر رہا ہے"

معلوم ہوتا تھا کہ رشید بے نے اس آواز کو سُنا نہ تھا کیونکہ اسی قسم کی مدہوشانہ گفتگو کے بعد وہ خود بخود چپ ہو گیا۔

سورج کی جھلس دینے والی شعاعیں اب زیادہ تیز اور زیادہ بے رحم و بیدرد بن رہی تھیں۔ بدن دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تپ رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک سال سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا۔ اتنے میں ہمارے کپتان نے ذرا حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا "بھائیو پانی کے پیپے بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ اگر ان پیپوں میں زار روس کے جواہر یا سونا بھرا ہوتا تو شاید اس بے صبری سے ہم اُن کا انتظار نہ کرتے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے خالص پانی آ رہا ہے۔ کیا اس دنیا میں پانی سے بہتر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟"

"پانی! —— پانی!"

بخلاف اس کے روسیوں کے کیمپ میں بالکل سکون تھا۔ صرف گھوڑوں کے ہنہنانے کی دھیمی سی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی تھیں جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ انہیں نہلانے کے لئے دریا پہ لے جا رہے ہیں۔ ہم کتنی بے بسی کے عالم میں تھے۔ دشمن کے ہاں پانی کی اتنی فراوانی کہ وہ جانوروں تک کو نہلائیں اور ادھر اتنی

قلت کہ صرف گلا تر کرنے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہ ہو۔"

"پانی!"

لیکن یہاں اس طرح پڑے رہنے سے حاصل؟" رافت بے نے پرجوش آواز میں کہا اگر وہ صرف دسیوں تک پہنچنے کی ہمیں اجازت دے دیں تو ہم پانی حاصل کر سکتے ہیں! اللہ اکبر! ہم کس شجاعانہ انداز میں لڑیں گے! ہمیں کسی کمک وغیرہ کی ضرورت نہیں!"

میں نے آنکھ اٹھا کر سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ اُن میں سے کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے بازوؤں پر سر رکھے لیٹے ہوئے تھے اور ساکت و جامد دشمن کے کیمپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قاتل آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی تڑپا دینے والی شعاعیں نہایت بیدردی و سفاکی سے ہلاک کر رہی تھیں اور ہم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔

اسی طرح دو گھنٹے گذر گئے۔ آفتاب ابھی تک ہمارے سروں پر تھا کئی سپاہی "صدمۂ آفتاب" سے بیہوش ہو گئے جنہیں اُٹھا کر فوجی ہسپتال میں لایا گیا اور پانی کے چند قطرے اُن کے حلق میں ٹپکا گئے۔ میں سورج سے منہ چھپائے اوندھے مُنہ لیٹا تھا اور ہر لحظہ بڑھنے والی پیاس خون حیات کو میری رگوں میں خشک کئے دیتی تھی۔ اُس وقت میں سوچ رہا تھا کہ آیا پیاس کی شدت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور چیز بھی اتنا دکھ اور اتنی تکلیف دے سکتی ہے۔ میری زبان خشک ہو کر تالو سے چمٹ گئی تھی اور میرا سر فضائے بسیط میں تیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ بایں ہمہ بیرحم سورج ابھی تک بالائے سر چمک رہا تھا۔

اگرچہ مجھ پر بھی کسی وقت ایک نوع کی بیہوشی یا غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی میں اپنے اردگرد کے شور سے واقف تھا۔ میں نے سچ مچ پانی دیکھا۔ اُس کے بہنے کی ترنم ریز آواز سُنی۔ اُسے دھیمے سُروں میں گنگناتے بھی سُنا اور اُس کے ٹھنڈک پہنچانے والے اثرات کو بھی محسوس کیا۔ لیکن جونہی میں نے سر اُٹھایا وہ دلفریب خواب میری نظروں سے غائب ہو گیا اور پانی کی بجائے میں نے گرم اور جھلسی ہوئی ریت دیکھی۔

رشید بے میرے قریب ہی دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے گرد حلقہ کئے بیٹھا تھا اُس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں سے ہراس اور بیماری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نوعمر سپاہی کو دیکھ دیکھ کر میری تکلیف کی شدت میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے نرمی سے دریافت کیا "کیا تم بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہے ہو؟"

اُس نے لجاجت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس میں گفتگو کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ نہایت دقت سے اُس نے جواب دیا۔ "میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ پیاس کی تکلیف اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی ہر چیز میری دھندلی نگاہوں کے سامنے تیر رہی ہے"۔ پھر آنسو آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔

بجلی کی سی تڑپ کے ساتھ ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا لیکن وہ آنسو! میں نے کتنی للچائی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ یہ بھی تو اصلی پانی تھا اور اتنا کہ اُس سے حلق بخوبی تر ہو جاتا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ رشید بے نے یکایک اپنے ہاتھ اُٹھا کر سر پر رکھے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ "صدمۂ آفتاب" ہے

اتنے میں ہمارا فیلڈ سرجن اُسی طرف سے گذرا اور کسی نے چلا کر کہا "ڈاکٹر اسے ہسپتال میں لیجاؤ!" اس کے جواب میں ایک خفگی آمیز آواز نے کہا "ہسپتال میں کیا رکھا ہے۔ خواہ وہ ہسپتال میں جلائے یا جہاں پڑا ہے وہیں رہے اس کے لئے برابر ہے۔ نہ پانی وہاں موجود ہے نہ یہاں دستیاب ہو سکتا ہے"۔

رافت نے جو ابھی ابھی وہاں سے آیا تھا۔ ان الفاظ کی تصدیق کی پھر کہنے لگا "فی الحقیقت پانی وہاں موجود نہیں۔ دوسری طرف پورا دستۂ فوج "صدمۂ آفتاب" سے بیہوش پڑا ہے مجھے ڈر ہے کہ پانی اگر بہت جلد نہ آ گیا اُن میں سے بہت آدمی شدہار جائیں گے!" پھر رشید بے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "اور یہ غریب بھی مر جائیگا۔ آہ۔ ماں باپ کا لاڈلا بچہ"۔

بہادر سپاہی مکھیوں کی طرح گر رہے تھے۔ اگر روسی اُس وقت ہم پر حملہ آور ہوتے تو تھوڑی سی جدوجہد سے ہمیں پسپا ہونے پر مجبور کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گرمی کی اس شدت نے اُن کے حوصلے بھی پست کر رکھے تھے حالانکہ اُن کے پاس حیات بخش پانی کی اتنی مقدار تھی۔

میں بے ہوش رشید بے کے قریب ہی لیٹا تھا کہ کسی نے نہایت سختی سے میرے شانے کو جھنجوڑا اور ایک آواز اس طرح میرے کان میں آئی "پانی! پیپے پہنچ گئے ہیں۔!"

میں اُٹھ بیٹھا ــــ نہیں، صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ کسی نے مجھے اُٹھا دیا اور میں اُڑتا ہوا وہاں پہنچا جہاں پیپوں کے گرد بلبلاتے آدمی ہجوم کئے ہوئے تھے۔ رافت بے میرے ساتھ تھا۔ صرف وہ لوگ

پیچھے رہ گئے تھے جنہیں جہنم نما گرمی نے چلنے سے معذور کر رکھا تھا اور اُن میں رشید بیگ بھی تھا۔

پیپوں کے گرد اتنا ہجوم تھا کہ غیر معمولی طاقت سے بھی کسی کو ہٹا کر آگے نکل جانا ناممکن تھا۔ افسر بے سود طور پر پستولوں سے امن و انتظام قائم کرنے کی سعی میں مبتلا تھے۔ پیاس تادیب و سرزنش سے زیادہ طاقتور تھی۔ اتنی آہ و زاری۔ اتنی چیخ و پکار اور اتنا شور و غل تھا جیسے ہر آدمی دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس ہما ہمی اور ریل پیل میں مجھے رافت بیگ سے بھی پیچھے دھکیل دیا گیا اور ایک لمحے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں سب سے پیچھے کھڑا ہوں۔ زندگی بخشنے والے پانی سے دور۔ بہت دور۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے جان کنی کی سی حالت میں چیخنا شروع کیا۔ اور اُن لوگوں کی پشت پر زور زور سے مکے مارنے شروع کئے۔ جو مجھے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ لیکن سوائے اس کے وہ مجھے گالیاں دیں اور اپنے پاؤں سے ٹھوکریں ماریں کسی نے میری اس شدید تکلیف کا ذرا احساس نہ کیا۔

رافت بیگ کو میں نے ایک بار پھر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاک پر لوٹ کر اُٹھا ہے۔ اُس کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سُرخ اور پسینہ میں تر بتر تھا اُس کی ٹوپی گم تھی اور پانی والی کپّی دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے چھاتی سے لگا رکھی تھی۔ میں نے اُس میں سے قلقل کی آواز سُنی۔ اُس میں پانی تھا۔ لیکن یہ بات میرے ذہن میں نہ آتی تھی کہ اتنے دیوانے ہجوم سے وہ کس طرح پانی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اُس کی طرف تیزی سے بڑھا اور نہایت زاری سے بولا "رافت۔ مجھے تھوڑا سا پانی دو۔ اسکے عوض جو چیز تم طلب کرو میں دینے کو تیار ہوں!

اُس نے میری طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تو کیا تم خود کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے؟ پانی تو بالکل ختم ہو گیا ہے۔ تمام پیپے خالی پڑے ہیں"۔

گرمی و تپش کے باوجود یہ سُنتے ہی میرا بدن سرد ہو گیا۔ میں نے لجاجت آمیز انداز میں بے صبری سے کہا "مجھے کچھ بھی نہیں ملا صرف ایک گھونٹ ہی دیدو۔ جو چیز چاہو میں دینے کو تیار ہوں"۔

رافت نے مستقل مزاجی سے جواب دیا "افسوس میرے پاس صرف اتنا پانی ہے جس سے میری اور رشید کی جان بچ سکے۔ کم از کم میں اُسے ایسی بُری حالت میں مرتے نہیں دیکھ سکتا"۔

میری حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس وقت نہ رشید بیگ نہ کسی اور کی زندگی مجھے اپنی جان سے زیادہ گرامی اور عزیز نظر آتی تھی میں نے سوچا کہ رشید بیگ کو کوئی اور اپنے حصّے میں سے پانی کے چند قطرات دیدیگا۔ آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہو رہا تھا کہ اگر نصف ساعت تک پانی کے دو ایک گھونٹ مجھے میسر نہ آئے تو میری روح جسد خاکی سے پرواز کر جائیگی۔ برق آسا تیزی سے ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ مجھے اس وقت مکاری اختیار کرنی چاہیئے اور رافت کو یقین دلانا چاہیئے کہ رشید مر گیا ہے تاکہ میں اُس کے حصّے کا پانی حاصل کر سکوں۔

جان کتنی عزیز ہوتی ہے! امتحان کے وقت محبت و الفت اور شفقت و مہربانی کے کیسے کیسے دعوے بے بنیاد اور باطل ثابت ہوتے ہیں؟ صرف چند گھنٹے پہلے میں چاہتا تھا کہ اگر تھوڑا سا پانی بھی میسر آجائے تو میں تمام کا تمام رشید بیگ کو دیدوں گا۔ کیونکہ اس تکلیف کو برداشت کرنے کے لئے میں بہتر حالت میں تھا۔ لیکن اس وقت کہ فضائے محیط کرۂ نار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے مہر و مروّت کے جذبات پست اور عنصر اخلاق و تہذیب کمینگی اور فریب کاری میں منتقل ہو رہا تھا میں نے مرتی ہوئی آواز میں اُسے مخاطب کر کے کہا "رافت، رشید تو مر چکا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے دم توڑتے دیکھا تھا۔ اُسے اب پانی کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیا تم ایک مردہ انسان کے لئے پانی بچا رکھنا چاہتے ہو؟ لیکن میں پیاس کے مارے ہلکان ہو رہا ہوں۔ یہ لو دو قرش نصف پانی کے لئے ـــــ خدا کے لئے مجھے پانی دو۔ مجھے پانی دو اُف! پانی! پانی!

یہ کہکر میں دو زانو ہو گیا۔ اور سر جھکا کر اُس کے گھٹنے پکڑ لئے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری حالت زار اُس کے رحم کے جذبات کو بیدار کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن رافت ابھی تک کشمکش و پیچ میں تھا۔ چنانچہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے کہا "اچھا اگر وہ مر چکا ہے تو خدا اُسے خلد بریں میں جگہ دے۔ اور اُس کی روح کو اطمینان نصیب کرے۔ وہ بہت زندہ دل اور خوش اطوار آدمی تھا۔ لیکن کیا کیا جائے سپاہی کی زندگی ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ اب تم مجھے اپنی کپّی دو تو میں اُس میں تھوڑا پانی اُنڈیل دوں۔ اور یہ چاندی کے سکے تم اپنے ہی پاس رہنے دو"۔

جس غرض کے لئے اُس نے میری کپّی مانگی تھی مجھے معلوم تھا۔ اُسے خوف تھا کہ اگر اُس نے اپنی کپّی میرے حوالے کر دی تو میں تمام کا تمام پانی پی جاؤں گا۔ اور اُس کا خیال بالکل صحیح تھا۔

پانی مل جانے کے خیال ہی سے میری آنکھیں چمک اُٹھیں میں نے

اُسی گرم اور گندے پانی کو جس میں سے مٹی کی بُو آ رہی تھی۔ نہایت بے صبری کے ساتھ حلق سے نیچے اُتارنا شروع کیا۔ اپنی ساری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ پانی مجھے اتنا لذیذ۔ اتنا شیریں اور اتنا خوشگوار معلوم ہوا رافت نے بھی چند قطرات منہ میں ڈال لیے۔ پھر اپنی کپّی کو نہایت پیار سے تھپکی دے کر کہنے لگا "اُسے میں سخت ضرورت کے لئے محفوظ رکھوں گا۔ لیکن خدا کے بندے تو کب تک بغیر پانی کے زندہ رہ سکتا ہے"؟

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ابھی اور پانی پینے کی خواہش تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جانگسل پیاس کی شدت اور جانکنی کی سی تکلیف، جس نے دنیا کی ہر چیز کا خیال میرے ذہن سے محو کر دیا تھا، اب مفقود تھی۔ حواس درست ہونے پر میں اپنے خود غرضانہ فعل پر ندامت والم سے زمین میں غرق ہوا جاتا تھا۔ مجھے رہ رہکر غریب رشید کا خیال آ رہا تھا کس طرح وہ اپنے تصوّر میں پانی کی تعریف کرتا تھا۔ اور کس بے کسی اور بے بسی سے غش کھا کر تپتے ہوئے ریگزار پر لیٹ گیا تھا۔ ہمارے قریب ہی مشتعل ہجوم کے افراد ایک دوسرے کو دھکیل کر خالی پیپوں کو اِدھر اُدھر اُلٹ رہے تھے اس موہوم اُمید پر کہ شاید وہ پانی کا صرف ایک ہی قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نے کئی سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ گیلی ریت کو زبان سے چاٹ رہے تھے اور کئی اپنے گرم رخساروں کو پیپوں کے نمدار تختوں سے لگا لگا کر اپنے بے چین دلوں کو دھوکا دینے کی سعی میں مصروف تھے۔

"آؤ اپنی کمپنی میں چلیں"۔ رافت نے کہا "یہاں تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا"۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا پھر ندامت و انفعال آمیز آواز میں بولا "رافت میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ رشید بے زندہ ہے اُسے غش آ گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں ابھی فقرہ پورا بھی نہ کرنے پایا تھا کہ رافت نے ایک لخت اپنا قدم روک لیا۔ اور میں بھی غیر اختیاری طور پر ٹھہر گیا میں نے اپنا سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں۔ لیکن مجھے جرأت نہ ہو سکی کہ اُس کی شعلہ بار آنکھوں کی طرف دیکھوں جو مجھے انتہائی حقارت و نفرت سے دیکھ رہی تھیں میں نے شرم و خجالت کے جذبات سے مغلوب ہو کر پھر اپنا سر جھکا لیا۔

"کمینے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"۔ غیظ و غضب کے لہجے میں اُس کے منہ سے نکلا۔ پھر میرے منہ پر تھوک کر کہنے لگا "تم اُس سے زیادہ طاقتور ہو۔ شام تک پانی کا انتظار کر سکتے تھے۔ ممکن ہے اُس وقت تک کوئی سامان ہو جاتا۔ وہ غریب اب مر جائیگا! کتنا ذلیل اور کتنا شرمناک فعل ہے۔ ایک سپاہی، ایک ترک ایک مسلمان کی شان سے گرا ہوا"۔

یہ کہکر اُس نے منہ پھیر لیا اور دوڑ کر رشید بے کی طرف گیا میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح سے دوڑتا چلا جا رہا تھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کس پدرانہ شفقت سے جھک کر اُس نے رشید بے کے سر کو بس ماندہ پانی سے تر کرنا شروع کیا۔ اور کس محبت و ہمدردی سے اُس کا منہ کھول کر پانی کے قطرات نہایت احتیاط سے اُس کے منہ میں ٹپکائے۔ مبادا تمام دنیا کے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی پانی کا قطرہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ اُس کا یہ ایثار۔ اُسکی نیک نفسی اور اُس کا جذبۂ ترحم میرے دل کو شرم و خجالت کے بے پناہ تیروں سے چھلنی کر رہا تھا۔ اُسے اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔

مجھے جرأت نہ ہو سکی کہ میں اُسکے قریب چلا جاتا میں اُسکی گالیاں اور سب و شتم کی آواز سُن رہا تھا اور فی الحقیقت اسی کا سزاوار تھا۔ اس وقت ایک قسم کی دہشت مجھ پر طاری تھی۔ لیکن اس کے باوجود میری دلی تمنا تھی کہ بہادر سپاہی اپنی چمکدار سنگینوں کے کچوکوں سے مجھے ہلاک کر ڈالیں کیونکہ اس کمینگی اس بزدلی کا احساس نہ صرف اُس وقت نا قابل برداشت تھا بلکہ اب بھی سال ہا سال گذر جانے کے بعد جب کبھی اس روح فرسا واقعہ کی یاد آتی ہے تو شرم و انفعال سے گردن جھکا لیتا ہوں +

ماخوذ محمد ضیاء الدین شمسی

میں اپنے ہوش میں اے فتنہ گر نہیں نہ سہی
تری خبر تو ہے اپنی خبر نہیں نہ سہی

اُن مریضوں میں مرے عیسیٰ نے رکھا ہے مجھے
جن کے حق میں درد اچھا ہے دوا اچھی نہیں

کون ہے بزم کے قابل وہ سمجھ جاتے ہیں
سب نکالے گئے پروانے نکالے نہ گئے

تربیتِ اطفال کا پہلا اُصول

کیا تم کسی ایسے لڑکے کو جانتے ہو جس کی لگاتار نگرانی کی جاتی رہی ہو۔ اور جس کے ہر اک کام میں سختی کے ساتھ کسی خاص قسم کی آمیزش کسی خاص بات کو ڈھونڈا جائے۔ کیا تم نے کبھی ایسا لڑکا بھی دیکھا ہے جس نے اس طرح بہت سی ناخوش آیند عادتوں کو نہ بڑھا لیا ہو۔ کیا تمہیں کسی ایسے آدمی کا کھوج ملا ہے جو اپنے ماں باپ یا اُستاد کے ظن و گمان کی خوردبین کے ہمیشہ سامنے رہا ہو اور پھر اس سے اُمید یہ رکھی گئی ہو کہ وہ کیرکٹر میں فراخ حوصلہ اور سورما بن جائے ہم ہر ایک قاعدہ کی طرح اس میں بھی استثنا ممکن ہے لیکن عام طور پر تم اس بات کو صحیح پاؤ گے کہ جن بچوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا اور ان کو ان کی ذاتی خودداری پر نہیں رہنے دیا جاتا وہ ہمیشہ بڑے ہو کر کمینہ اور ذلیل۔ تنگ حوصلہ۔ وہمی اور شکی مزاج کے مرد و عورت بن کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا کرو ویسا بھرو اور یہ قدرتی قانون ہے الجنس یمیل الی الجنس یعنی ہر چیز اپنی ایسی ہر چیز ہی کی طرف جھکتی ہے کے مطابق نکتہ چین ۔ دوسروں کے عیوب ڈھونڈنے والی اور شکی طبیعت دوسری طبائع میں بھی جن سے اسے واسطہ پڑتا ہے۔ انہی اخلاقی کمزوریوں کو پیدا کر دیتی اور اُن کو بھی ایسی ہی خفیف حرکات کا بلاوا دیتی ہے۔ شکی مزاج آقاؤں کے نوکر بعض اوقات اس لئے خائن ہو جاتے ہیں کہ اُن کے متعلق شکی خیالات کو یہاں تک ترقی دی جاتی ہے کہ وہ بیچارے خود ہی اپنی اعتباری و امانت میں شک کرنے لگتے ہیں اور آخرکار خود بھی اُسی تدبیر میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ کیوں نہ وہ کھیل شروع کر دیں جس کا انہیں کھلاڑی بتایا جاتا ہے۔ وہ بچے جنہیں احساس ہے کہ اُن کے متعلق اُن کے سرپرستوں اور نگرانوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے کام سے جی چُراتے اور اپنے روزمرہ فرائض کی بجاآوری میں سہل انگاری اور بھول سے کام لیتے ہیں۔ یقیناً تھوڑے عرصے بعد خود اُن ہی کا اپنے متعلق یہ خیال ہو جاتا ہے کہ وہ بھروسے کے قابل نہیں اور یقیناً اُن میں سچ مچ بُری باتیں موجود ہیں۔ ورنہ اُن کے ماں باپ یا اُستاد ان کو ایسا کیوں خیال کرتے؟

اگر مضبوط اور شریفانہ کیریکٹر کو نشو نما دینے کے لئے کوئی بات سب سے زیادہ اہم ہے تو وہ آزادی کا احساس ہے۔ اس لئے ایک بچے کو ضروری طور پر یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ اس پہ بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ وہ لگاتار شک و شبہ کا تختۂ مشق نہیں بنایا جاتا۔ اور یہ کہ اُس کے ماں باپ اور اُستادوں کو اُس پر اعتماد ہے۔ وہ اس کی مردانگی و انسانیت اس کے مقصد کی دیانت کو باور کرتے ہیں۔ ورنہ اس کے وہ اچھے اخلاق جو خدا نے اس میں ودیعت کئے ہیں بگڑ کر خراب و برباد ہو جائیں گے۔ اگر تم ہمیشہ اپنے بچے کی تاک جھانک میں لگے رہو گے اور اس پر بھروسہ نہیں کرو گے تو تمہارے اس رویہ کی وجہ سے اُس کے اوصاف جو قدرت نے اسے عطا کئے ہیں۔ کبھی بھی نہیں اُبھر سکیں گے بلکہ بچہ کا یہ خیال کہ تم اسکی جاسوسی کر رہے ہو اسے حساس بنا دیگا۔ اور اس کی طبیعت کی جولانی اور خودمختاری کو برباد اور اس کی سرگرمی اور کام کے ولولے کو افسردہ کر دیگا۔

اپنے بچے کو نصیحت کرو۔ اسے پیار کرو۔ اسکی اُمیدوں اور تجویزوں سے ہمدردی کرو اور اس کو دکھا دو کہ تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ ہمیشہ اچھا کام ہی کریگا اور تمہیں اس پر بالکل اعتماد ہے۔ اگر ایسا کرو تو پھر تم اس کی فطرت میں چھپی ہوئی تمام بہترین اور شریف ترین قابلیتوں کو باہر لے آؤ گے۔ لیکن جتنا تم اسے بار بار دباتے رہو گے اس کی دیانت اور عزت میں شبہ کرتے رہو گے اور اپنے خیال کے مطابق کہ ایک بچے کے لئے کیا مناسب حال ہے۔ اس کی ہر ایک فروگذاشت پر ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کرتے رہو گے تو یاد رکھو کہ تم اسے ہرگز ایک شریف آدمی کی صورت میں نشو و نما پاتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ ایک بُری طرح دبی ہوئی اور غلام بنائی ہوئی نسل نہ تو ترقی و عروج حاصل کر سکتی ہے اور نہ مضبوط کیرکٹر ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح دبایا ہوا۔ غلام بنایا ہوا سوسائٹی کا ایک فرد بھی جو خواہ مرد ہو۔ یا عورت یا بچہ ہرگز ذہنی بلندی اور وسعت نہیں پا سکتا۔

جس وقت ہارورڈ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ اور پروفیسروں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر ایک طالب علم کو آزاد چھوڑ دیں گے اور اس کی نگرانی نہ کرینگے۔ نہ اس کو اس بات کا احساس ہونے دینگے کہ وہ آٹھوں پہر کسی نکتہ چین کی نگاہ میں ہے۔ تو ان پر ملک کی طرف سے بہت سختی سے لے دے ہو رہی تھی۔ اور جب اُنھوں نے اعلان کیا کہ طالبعلموں پہ مجالس وعظ یا کلیسائی عبادات میں شامل ہونا لازمی نہیں ہے تو ملک بھر میں ہارورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کے ماں باپ نے خوف و خطرے

ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہنا شروع کر دیا کہ بس اب تو اُن کے لڑکے آوارہ گرد اور شیطان سے بدتر ہو کر رہ جائیں گے۔ مگر پریزیڈنٹ چارلس ڈبلیو۔ ایلیٹ کا اس سے مختلف خیال تھا کیونکہ اُسے اس کے اپنے پیشے اور فن کے متعلق مشاہدہ اور تجربے نے بالکل مطمئن کر دیا تھا کہ وہ طالب علم جس کی نگرانی کی جاتی ہو کبھی پسندیدہ کیرکٹر اور اعلےٰ اطوار میں نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُس نے مضطرب ماں باپ اور سرپرستوں کو یقین دلایا کہ قدیم لازمی قواعد کی برطرفی سے اُس کا اور ہارورڈ یونیورسٹی کے دیگر ارکان کا یہی مقصد ہے کہ طلبہ کے لئے بہتر صورت حال پیدا کی جائے۔ اُس نے اُن کو بتایا کہ اُس صورت میں لڑکوں کو خود بخود اپنی عزت کا جذبہ محتاط بنا دیگا۔ اور یہ احساس کہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان کو منظم کر دیگا۔ ورنہ اگر ہمیشہ ان کو آہنی ڈنڈے کے نیچے اور نکتہ چین نگاہ ہی میں رکھا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ ڈپلوما سے آراستہ ہو کر تو نکلیں گے اور حیثیتوں سے وہ دل کے کچے اور کمزور ہونگے۔ انہیں اپنی ذات پر بھروسہ نہ ہوگا اور کسی کام میں پہل کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ بالکل دنیا میں جدوجہد کرنے کے ناقابل ہوں گے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ امریکہ میں تمام کالجوں کے طلبہ کی نگرانی کی جاتی تھی اور انہیں اس طرح آہنی قوانین کی چار دیواری میں گھیر کر رکھا جاتا تھا کہ گویا وہ نادان چھوکرے ہیں۔ جو سیلف گورنمنٹ کے ناقابل ہیں۔ یہی حال ہماری دوسری تربیت گاہوں اور مدرسوں کا تھا کہ ہر وقت سپاہی اُن کے پیچھے اس طرح لگے رہتے تھے کہ گویا وہ چور ہیں۔ انہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ نماز اور کلیسا کی عبادات و ریاضات میں حاضر ہوں اور جب کبھی اتفاقاً وہ وعظ و خطبہ کی مجلس سے غیر حاضر رہ جاتے تھے تو ان سے بُری طرح بازپرس کی جاتی تھی۔ باقاعدہ حاضری لی جاتی تھی۔ اس طریق عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنی غیر حاضری کیلئے جھوٹے عذر تراشتے تھے بلکہ جھوٹ بھی بولا کرتے تھے۔ ہر وقت ان سے بالکل اُن غیر ذمہ دار لوگوں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا کہ گویا وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ اندازہ کرلیں اور منظم رہ سکیں۔ ان سختیوں کے باعث جب کبھی بھی طلبہ اپنے پروفیسروں کی نگاہ سے اوجھل ہو جانے کا موقعہ پاتے تھے تو وہ روک تھام کو ایک طرف رکھدیتے اور بدترین قسم کی اوباشیوں میں مبتلا ہو کر ایسی بے اعتدالیوں کے گڑھے میں کود پڑتے تھے کہ جس سے اُن کا نکلنا اکثر ناممکن ہوتا تھا۔

اصلاح کا وہ قدم جو اوّل اوّل ہارورڈ یونیورسٹی نے اُٹھایا تھا آخر کار ملک بھر کے تمام سربرآوردہ تعلیمی مرکزوں میں اختیار کر لیا گیا۔ اور آج تو یہ حال ہے کہ ہمارے بہترین کالجوں نے اپنے طلبہ کو عملاً ہر قسم کی روک ٹوک سے آزاد کر رکھا ہے۔ اُنہوں نے ان کا معاملہ اُن کی انسانیت۔ اُن کی عزت پر رکھدیا ہے۔ اُن پر اعتماد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر قابو پائیں گے۔ اُن کی تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ وہ اپنے عمل اور خیال میں آزادی اور حریت سے کام لیتے ہیں۔ اور اس بات نے ان کو مضبوط اور زیادہ آزاد اور بہت زیادہ باقاعدہ انسان بنا دیا ہے۔ آج اگرچہ ہارورڈ یونیورسٹی کا تعلیمی مرکز پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے لیکن جس وقت پریزیڈنٹ موصوف نے یہ اصلاحات وہاں روشناس کرائی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں اب وہاں کے طلبہ کی گرفتاریاں ان کی بمبازیاں بہت کم ہو گئی ہیں۔

حریت کامل اور انفرادیت کو نشوونما دینے کے لئے آزادیٔ عمل کی نہایت ضرورت ہے کسی ایک لڑکے کے لئے یہ امر ہزار بار بہتر ہے کہ وہ جب اپنی مختار اور ذمہ داری پر کوئی کام کر رہا ہو تو غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ چلے تو سیدھا مگر ساتھیوں کے سہارے پر یا دوسرے کے جبر سے لڑکے کیلئے بہتر ہے کہ وہ تنہا چلتے ہوئے کسی قدر لڑکھڑا بھی جائے بہ نسبت اسکے کہ وہ بالکل سیدھا چلے لیکن اس کی باگ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو سخت ناکامی اور ٹھوکریں کھانیکے بعد بھی مگر یہ بہتر ہے کہ وہ اپنا راستہ آپ چلے بہ نسبت اسکے کہ دوسرے نے اسکی انگلی پکڑ رکھی ہو۔

(سویٹ مارڈن)

(مہر محمد خاں شہاب - مالیر کوٹلوی)

فطرت

آؤ کہ ہم ان مسرتوں کا لطف اُٹھائیں۔ جن کا مزا صرف دانا لوگ ہی اُٹھاتے ہیں۔ آفتاب کی پاکیزہ روشنی ہمیں کھیتوں کی طرف بُلاتی ہے۔ جہاں معصوم اور سادہ مسرت ہماری منتظر ہے۔ آؤ کہ ہم پھولوں سے بھری ہوئی وادی میں چہل قدمی کریں اور اپنے خالق کے گیت گائیں۔ دیکھو نسیم آہستہ آہستہ جھاڑیوں کے ساز پر اپنے راگ چھیڑ رہی ہے۔ ایک ڈالی پر ننھے ننھے گانیوالے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ انکی مسرت بھری آنکھوں میں خوشی کی چمک ہے اور ان کے نرم نرم نغموں میں محبت کا رس بھرا ہے سایہ گھنے کنج! اے وادیو! اور اے پہاڑو! تم پر قدرت کی کس قدر عنایتیں ہیں۔ تمہارا منظر کس طرح پاکیزہ روح کو اطمینان و مسرت بخشتا ہے۔ تمہاری دلکشیاں کسی آرٹ کی محتاج نہیں ہیں۔ اور یہ مناظر چمنستان کی ان رنگینیوں اور شادابیوں سے کہیں زیادہ دلاویز ہیں جس پر انسانی ہاتھوں کو فخر ہے۔

(پرستار فطرت)

پورس

ارکان

سکندر = شاہِ یونان
پورس = ہندوستان کا ایک راجہ
ٹکسلا = ٹکسلا کا راجہ
اکشیانا = ہندوستان کی ایک مہارانی
کلیوفیلا = راجہ ٹکسلا کی بہن
ہیپ فسٹیان سکندر کا سفیر

(دریائے جہلم کے کنارے راجہ ٹکسلا کا کیمپ)

ایکٹ اوّل

پہلا سین

کلیوفیلا۔ ذرا ہوش کی دوائیے اُس بادشاہ کے مقابلے کا دعویٰ جس کے جلال کے سامنے آسمان سرِ نیاز خم کرتا ہے۔ ایشیا کے سب بادشاہ جس کے قدموں سے لگے پڑے ہیں جس نے تقدیر کو بال باندھی لونڈی بنا رکھا ہے۔ یہ خیال خام دل سے نکال دو بھیّا! آنکھیں کھولو اور دیکھو سکندر کس طرح سلطنتوں کو الٹ دیتا ہے۔ کیونکر خود مختار بادشاہوں کو پابزنجیر کرتا ہے۔ اور قوموں کی قوموں کے کانوں میں حلقہ غلامی ڈلد یتا ہے۔ اس لئے زمانہ کی آواز پہچانو۔ اُن کے انجام سے سبق لو اور وقت پر گولی بچاؤ۔

ٹکسلا۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی عالمگیر گرفت سے کانپ کر اپنی گردن پر اس کا جوا رکھ لوں۔ تاکہ سارا ہندوستان ایک زبان ہو کر یہ طعنہ دے کہ میں اپنے ساتھ قوم کو بھی غلامی کے گڑھے میں لے ڈوبا۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ پورس سے منہ موڑ لوں۔ اُن راجوں سے غداری کروں جو وطن کی آزادی کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں جنہوں نے کھلے بندوں۔ ہانکے پکارے کہدیا ہے کہ اُن کی زندگی اور موت راجوں کی شان کے شایاں ہوگی۔ کوئی ایک ہی بتائیے جو سکندر کا نام سُنکر کانپ اُٹھا ہو جس نے لڑنے سے جی چُرایا ہو اور اس کے غلاموں کے زمرے میں داخل ہونے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوں یا خالی زبان ہی سے اسے ہفت اقلیم کا بادشاہ تسلیم کیا ہو۔ اُس کی شہرت سے سہم جانا تو کجا وہ تو یہ جتا کر رہیں گے کہ وہ فتح و نصرت کا واحد اجارہ دار نہیں۔ اور بہن! آپ مجھے اُس سے مدد مانگنے کی صلاح دیتی ہیں جس کے ساتھ دو بدو لڑنے کیلئے میری تلوار میان سے باہر ہو رہی ہے

کلیوفیلا۔ کہتی کچھ ہوں سمجھتے کچھ ہو۔ وہ تو آپ کی رفاقت اور محبت منت سے مانگتا ہے۔ اِس سے کیا واسطہ کہ کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ہائے کس قدر آپ کا پاس ہے کہ جب اس کے قہر و غضب کی بجلیاں کوندتی ہیں تو وہ چپکے چپکے آپ کے بچاؤ کا بھی انتظام کرتا جاتا ہے۔

ٹکسلا۔ مگر حیرت ہے اس شرف کیلئے مجھے کیوں چنا گیا۔ اس کے دشمنوں سے جہلم کا کنارا پٹا پڑا ہے۔ اُن میں سے کسی پر یہ نظر عنایت کیوں نہ پڑی فرمائیے آخر میری جان اُنہیں کیوں اس قدر عزیز ہے کہ مجھے دیکھ کر اپنے شعلۂ غضب کو دامن میں چھپا لیتے ہیں اس لئے تو نہیں کہ انہیں بس ذلت آفرین کرم کا سزاوار مجھ سے زیادہ کوئی نظر نہیں آتا۔ پورس موجود تھا۔ اُسے کیوں نہ کہا؟ شاید سکندر یہ جانتا ہے کہ اس کی ہمت مردانہ وطن فروشی کی روادار نہیں۔ وہ ایسی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ جو مجسم ذلت و رسوائی ہو۔ بس یہی وجہ کہ جو تاج غیور سپاہیوں نے ٹھکرا دیا اس سے مجھے سرفراز کرنا منظور ہے۔

کلیوفیلا۔ وہ اور آپ کو ہیٹا خیال کرے۔ کوئی عقل کی بات ہے

بلکہ اُس کے خیال میں اُن تمام راجوں مہاراجوں میں آپ کی ٹکر کا سورما سپاہی ایک بھی نہیں اُسے یقین ہے کہ اگر آپ صرف اس جنگ سے ہاتھ کھینچ لیں تو باقی آن کی آن میں ہتھیار ڈال دیں۔ اُس کا حسنِ انتخاب موجب ننگ نہیں۔ سرمایۂ افتخار ہے کہ جس دوستی کی آپ کو دعوت دی جا رہی ہے اُسے کوئی بڑے دل گردے کا انسان ہی قبول کر سکتا ہے کم ظرف اس کا لنگر نہیں سنبھال سکتے۔ بیشک وہ ساری دنیا کو اپنے زیرِ نگین دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر یہ اُسے ہرگز پسند نہیں کہ اُس کے حلقۂ احباب میں کوئی غلام شامل ہو۔ بھائی اگر اس کی دوستی سے عار ہے تو آپ نے مجھے اس داغ سے کیوں نہ بچایا جس کی سیاہی روز بروز شوخ ہوتی جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ مجھ پر نت نئی عنایت کرتا ہے لیکن آپ نے کبھی اس سلسلہ کی روک تھام نہ کی۔ آپ جانتے ہیں میں اُس کی منظورِ نظر ہوں اور اُس کے سینکڑوں خفیہ پیغام اس کی محبت کا زندہ ثبوت ہیں۔ میرے فراق میں وہ جو آہیں بھرتا ہے۔ وہ حریفوں کی صفوں کو چیر کر میرے دل تک پہنچ جاتی ہیں۔ آپ کو زیبا تھا کہ آپ میری غیرت و حیا کے جذبات کو بیدار نہ کرتے اور ان تعلقات کو کچے دھاگے کی طرح توڑ کر رکھ دیتے۔ اس کے خلاف آپ ہمیشہ مجھے یہی فرماتے رہے کہ میں اس سے پیار محبت سے پیش آیا کروں خود مجھے اس کی محبت قبول کرنے پر اُبھارا اور بتایا۔ کہ رفتہ رفتہ میرے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو جائیگی۔

ٹکسلا۔ اگر سکندر جیسا جیوٹ سپاہی اس حسن فسوں ساز کی تاب نہ لا سکا تو اس میں لجانے کی کون بات ہے۔ اگر وہ طاقت آپ کے دلپر مسلط ہو گئی جو فرات کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے تو کیا اچنبھا ہے یہ سب درست! پر بہن میری تقدیر اور میرے وطن کی قسمت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جانی بوجھی بات ہے کہ میری رہبری کے بغیر وطن کی نجات محال ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اس کام پر ہاتھ نہ ڈالوں۔ مگر وقت چاہتا ہے کہ آزادی وطن کیلئے سینہ سپر ہو جاؤں۔ جانتا ہوں میری باتیں ناگوار گذر رہی ہوں گی۔ مگر بہن میں بھی تمہاری طرح دل رکھتا ہوں اور اس فانوس میں بھی محبت کی شمع جل رہی ہے۔ آپ ہی کہیں جب اکشیانا کی قہر آلود آنکھیں سکندر پر حملہ کرنے کا حکم دیں تو کس طرح روگردانی کروں۔ اس دلوں کی مہارانی کا حکم ہے کہ اس کی ساری پرجا وطن کی آزادی کیلئے صف باندھ کر کھڑی ہو جائے۔ کون پرجا جسے صرف اس کی زلفِ گرہ گیر اپنے دام میں پھنسا سکتی ہے

کون پرجا جو قید و بند کی دھمکیوں کو مذاق سمجھتی ہے۔ کون پرجا جس نے اپنا سر صرف اُس کی مشقِ ستم کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔ میں بھی اس آبادی کا ایک فرد ہوں۔ اُس لئے میری تلوار پر بھی اکشیانا کا قبضہ ہے اور جس چال وہ چلائیگی اُسے چلنا ہوگا۔

کلیوفیلا۔ تو روکتا کون ہے آپ کو۔ شوق سے بسمل ہو کر اُسے اپنے تڑپنے کا تماشا دکھایئے۔ ایسی تیز و تند آہیں بھریئے کہ آپ کے رقیب کی کامیابی کا راستہ صاف ہو جائے۔ اُس دشمن جان اور حسینِ ساحرہ کے حکموں کی تعمیل میں جان لڑایئے اور اپنے خون سے اپنے رقیب کی کشتِ آرزو کو سینچیے! جایئے بجا لایئے اکشیانا کا حکم ہے۔ کہ پورس کی کامیابی کے لئے معرکہ کارزار گرم ہو تاکہ وہ اکشیانا کے دل کی مملکت پر آرام اور اطمینان سے حکومت کر سکے کون دل؟ جسے آپ اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ٹکسلا۔ ہاں۔ ہاں تو بہن آپ کا مطلب ہے کہ پورس ....

کلیوفیلا۔ کیا آپ کو اس میں کلام ہے کہ اکشیانا پورس پر مرتی ہے۔ کیا آپ کے کانوں نے نہیں سنا کہ وہ کیسے مزے لے لیکر اس کے گیت گاتی ہے۔ کیا آپ کی آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ اُس کی تعریف سُن کر وہ کس طرح مستانہ وار جھومتی ہے اور یہی اس جنگ میں اپنا لہو پانی ایک کر دیں گے۔ اپنی مردانگی کے جھنڈے گاڑ دیں گے مگر دنیا جانتی ہے کہ فتح کا سہرا پورس ہی کے سر رہے گا۔ آپ لاکھ تدبیریں کریں لیکن جب تک پورس سر نہ ہلائیگا ایک بھی نہ چلے گی۔ گویا ہندوستان کی آزادی کا مدار فقط اس کی ذات پر ہے یعنی اگر اس کا قدم بیچ میں نہ ہوتا تو ہماری فصیل مدت کی راکھ کا ڈھیر ہو گئی ہوتی۔ صرف وہی ایک ہستی ہے جو فاتح کی پیش قدمی کے سامنے سد سکندری کا کام دے سکتی ہے اس دلربا راجا کو اکشیانا نے اپنا دیوتا بنا رکھا ہے۔ آپ لاکھ ہا ور نہ کریں مگر میری کہی بھی لکھ رکھئے کہ اکشیانا پورس ہی سے شادی کرے گی۔

ٹکسلا۔ بجا! مگر چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت افسانہ ثابت ہو۔ ایسا لفظ نہیں سننا چاہتا جو شمعِ اُمید گل کر دے۔ مجھے وہ تصویر نہ دکھایئے جس پر نگاہ ڈالنے سے دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو جائے کوشش کیجئے کہ میری آنکھوں پر پردے پڑے رہیں اور میری دلفریب غلط فہمی کے نشے کا تار ٹوٹنے میں نہ آئے جن کو غرور زیب دیتا ہے۔ بس اتنا کہہ دیجئے کہ وہ سب کے ساتھ میرے

جیسا سلوک روا رکھتی ہے۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

کلیوفیلا۔ ناامید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی محبت اس سنگ دل کو موم نہیں کر سکتی یہ آہیں بے سود اور یہ نالے بیکار ہیں۔ آپ جس چیز کو میدان جنگ میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ سکندر خود تمہارے حوالے کئے دیتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو آپ کی جنگ سکندر سے نہیں بلکہ پورس سے ٹھنی ہے جو اس مجسمۂ حسن کو چھیننا چاہتا ہے۔ شہرت نے اوروں کے کمالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور صرف پورس کا راگ الاپتی پھرتی ہے خواہ کام کوئی کرے مگر تحسین ناشناس کا مستحق پورس ٹھہرتا ہے۔ اور آپ سب تو نوکروں چاکروں کی طرح اس کے پیچھے دوڑنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کم بختو! اگر نوکر بننا ہی منظور خاطر ہے تو کیوں نہ بہتر آقا منتخب کرو اور یونانیوں اور ایرانیوں کی صف میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس غلامی میں کئی بادشاہوں کا قرب نصیب ہوگا۔ اور ایک دن پورس ہی نہیں بلکہ دنیا جہان کے فرمانروا تمہارے ساتھ آملیں گے۔ لیکن آپ کو تو سکندر غلام بنانا نہیں چاہتا بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ تاج جس کی ضیاباری آپ کے مغرور رقیب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے آپ کے سر پر چمکتا رہے۔ سکندر نہیں پورس آپ کو غلام بنانا چاہتا ہے اس لئے ابھی وقت ہے اس کے جال کو توڑ کر نکل جاؤ۔

یا دش بخیر آپ کے مہربان تشریف لا رہے ہیں۔

ٹکسلا۔ بہن اس منحوس شکل کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن گواہی دیتی ہے کہ اکشیانا اس کو چاہتی ہے۔

کلیوفیلا۔ وقت زیادہ گفتگو کی اجازت نہیں دیتا جاتی ہوں۔ اب چاہے سکندر کے دوست بنو یا پورس کے غلام۔ آپ کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

سین دوسرا

پورس اور ٹکسلا

پورس۔ مہاراج! اگر میری اطلاع صحیح ہے تو ہمارے مغرور دشمن کی آسانی سے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ سنتا ہوں کہ ہمارے سپاہیوں کی تلواریں سرخرو ہونے کے لئے میانوں میں مچل رہی ہیں۔ فوج کے حوصلے بلند اور ارادے استوار ہیں اور فتح کا جیکارا بلانے کیلئے ایک ایک پر ایک سوار سبقت لینا چاہتا ہے۔ ہر صف فور جوش سے مست ہاتھیوں کی قطار معلوم ہوتی ہے۔ اور بہادروں کے نعرے آسمان کی خبر لا رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے تو صرف اس بات کی کہ انہیں شجاعت کے امتحان کا موقع نہیں ملتا۔ اور وہ کیمپ میں بیکار پڑے وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آخر کب تک انہیں روکے رکھوں۔ مکار دشمن خوب جانتا ہے کہ ہماری غفلت اس کے لئے کس قدر مفید ہے۔ اسے اپنی کمزوری کا علم ہے۔ اس لئے اس نے ہیپ فستیاں کو بھیجا ہے کہ ہمیں باتوں میں لگائے رکھے۔ اور حملہ نہ کرنے دے۔

ٹکسلا۔ مگر مہاراج! مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے شرف باریابی بخشا جائے۔ کیا جانے وہ کیا شرائط لیکر آیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ سکندر صلح کا خواہشمند ہو۔

پورس۔ صلح؟ تو کیا آپ اس کی بخشی ہوئی صلح قبول کر لیں گے۔ جس نے پے در پے حملوں سے ہمارے امن و آسائش کو درہم برہم کر ڈالا ہے۔ بھول گئے؟ مہاراج! وہ وقت جب وہ تیغ بکف بلا وجہ ہمارے ملک میں در آیا اور ان بے گناہ راجوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا جنہوں نے خواب میں بھی اسے میلی آنکھ سے نہ دیکھا تھا۔ یہی صلح جو ہے نا جس نے ہماری آبادیوں کو ویران کر ڈالا۔ جس نے ہماری بستی پر جا کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اور اب دیوتاؤں نے اسے ہمارے بس میں کر دیا ہے۔ تو میں اتنا احمق نہیں کہ اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری زندگی اس کے رحم و کرم پر منحصر ہو۔

ٹکسلا۔ اگر دیوتا اس سے بگڑتے تو اس کا یہ جاہ و جلال نہ ہوتا۔ وہ ابھی تک اس کے پشت و پناہ ہیں۔ مہاراج! ذرا دھیرج سے کام لیجئے۔ وہ بادشاہ جس کے ابرو کے ایک اشارے سے بڑی بڑی سلطنتیں کانپ جائیں ایسا دشمن نہیں جسے کوئی روح حقارت سے دیکھے۔

پورس۔ میں اسے حقیر نہیں سمجھتا۔ اس کی شجاعت کا مداح اس کی ہمت کا معترف ہوں۔ لیکن میں وہ خراج خود لینا چاہتا ہوں جو اس کی خوبیاں مجھ سے طلب کر رہی ہیں۔ مہاراج آپ کیوں فکر کرتے ہیں سکندر اگر آسمان پر جا کر دیوتاؤں کی گود میں پناہ لے تو میں وہاں سے بھی کھینچ لاؤں گا۔ میں اُن ہیکلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا جو انسانوں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اس دیوتا کی یادگار بنائی ہیں۔ آج تک یہی سلوک سکندر نے ان بادشاہوں سے

کیا ہے جن کے ممالک پر آج اس کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اگر ایشیا میں داخل ہونے کے بعد اس کی مردم آزاری میں فرق آگیا ہوتا تو دارا کو یہ زحمت نہ گوارا کرنی پڑتی کہ دم واپسین اس کی شاہنشاہی کا کلمہ پڑھتا۔

ٹکسلا۔ اگر دارا کو یہ احساس ہوتا کہ وہ کس قدر کمزور ہے تو آج اس کے ملک پر اس کی بجائے کوئی اور حکومت نہ کرتا۔ پھر بھی اس کا غرور آپ کی موجودہ حقارت سے زیادہ باسامان تھا۔ اس وقت سکندر کی ناموری کا آفتاب گمنامی کے بادلوں سے نہ نکلا تھا۔ دارا کے کان اس کے نام تک سے ناآشنا تھے۔ اور وہ آسانی سے فتح حاصل کرنیکے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُسے جلد معلوم ہوگیا کہ سکندر کسے کہتے ہیں۔ اس کی بے شمار فوج کے دھوئیں اُڑ گئے اور ایک پنجہ فولادی نے اُسے پیس کر سرمہ بنا ڈالا۔ یہ بجلی پہلے گری ہوتی تو دارا کی آنکھیں کھل جاتیں۔

پورس۔ اچھا تو بتایئے اس صلح کے عوض ہمیں کیا ادا کرنا ہوگا۔ مہاراج آپ کو سینکڑوں قومیں بتائیں گی کہ ایسی صلح کے پھیر میں اُن کے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئیں۔ مہاراج فریب کار مسکراہٹ پر نہ جایئے۔ اس کی دوستی کی دعوت ہمیشہ کیلئے غلام بنا دیگی۔ ادھوری اطاعت کسی کام نہ آئے گی۔ دو ٹوک فیصلہ کیجئے۔ یا اس کے غلام بن جایئے یا دشمن رہیئے۔

ٹکسلا۔ اندھا دھند حملہ کرنے سے منہ موڑنے کو بزدلی نہیں کہتے۔ ممکن ہے کہ سکندر بے ضرر اطاعت پر قناعت کرے۔ گڑ سے مرے تو زہر کیوں دیں۔ باتوں سے مان جائے تو لاتوں کی کیا ضرورت۔ بہلائے جایئے جبتک یہ بلا اوپر ہی اوپر کسی اور ملک کو نہ ٹل جائے بہلائے جایئے۔ اس وقت وہ پہاڑی ندی کی طرح اُمڈا آرہا ہے اور جو چیز اس کے رستہ میں پڑتی ہے اُسے بہا لے جاتا ہے اس سیلاب کے پیٹ میں ہزاروں تباہ کاریوں کے تخم ہیں اور اس ریلے کے غراٹے کی آواز سے دنیا گونج رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محض بیجا غرور کے لئے اُسے جوش دلانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ اس کا تپاک سے استقبال کیجئے۔ اور اُن حقوق سے دست بردار ہو جایئے جنہیں ہم بعد میں پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس چیز کو نہ جانے دیجئے جو مفت ہاتھ آرہی ہے

پورس۔ آپ باور کرتے ہیں مہاراج یہ صلح بغیر کچھ دیئے ہو جائیگی یا آپ عزت کی کچھ قیمت ہی نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں بزدلی کے داغ کے بدلے تاج حاصل کرنا بہت گراں سودا ہے۔ اس کے علاوہ کیا آپ کو یقین ہے کہ اسکندر جیسا بہادر اور ناموربادشاہ اس ملک میں آئے اور اپنی آمد کا کوئی نشان چھوڑے بغیر چلا جائے۔ دیکھ لیجئے جتنے بادشاہ سکندر نے تباہ کئے ہیں۔ اُن کے خطاب محض اس لئے قائم ہیں کہ سکندر کی شان میں اضافہ کریں یاد رکھئے اگر ہمنے خراج دینا قبول کیا تو ہمارے لئے اپنے تاجوں کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ اور اگر کبھی وہ ناراض ہوگیا تو سمجھو کہ حکومت کی باگ ہم سے چھن گئی۔ کون مانیگا کہ وہ یوں ہی ملک بملک مارا مارا پھرتا ہے۔ اور انہیں اپنی حالت پر جوں کا توں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ مہاراج جو گرہ وہ باندھتا ہے اس کی گرفت سے کوئی راجہ نکلنے نہیں پاتا۔ اور وہ مٹی کے مادھو بنا کر انہیں غلاموں پر حکومت کرنے کے لئے مامور کر دیتا ہے۔ مگر میرے ارادے کو ان فضول خیالات سے کیا علاقہ؟ یہ جو کچھ کہا محض آپکا وسوسہ دور کرانے کے لئے تھا۔ پورس سسٹرائڈا صلح پر غور کرنے سے انکار کرتا ہے جب اقبال اس سے ہمکلام ہو تو وہ کسی کی نہیں سُنا کرتا۔

ٹکسلا۔ مہاراج! مجھے بھی عزت کا اسی قدر پاس ہے جتنا آپ کو ہے مگر عزت کا تقاضا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں وطن کو آفت سے بچالوں۔

پورس۔ صرف وطن ہی نہیں بلکہ عزت کو بھی بچایئے۔ آج ہی وہ دن ہے جب آپ حملہ آور پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے بڑھئے۔ اور اس کے لشکر کو تہس نہس کر ڈالئے۔

ٹکسلا۔ عجلت اور حقارت ناقابل اعتبار رہبر ہیں!

پورس۔ بزدل کے حصے ندامت کے سوا کچھ نہیں آتا!

ٹکسلا۔ وہ راجے جو اپنی رعایا کی حفاظت کرتے ہیں ان کے محبوب ہو جاتے ہیں!

پورس۔ مگر اُن کی زیادہ عزت ہوتی ہے۔ جو جانتے ہیں کہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے!

ٹکسلا۔ اس کی تائید غرور کے سوا کوئی نہیں کر سکتا!

پورس راجے اس پر سر دُھنیں گے۔ اور مہارانیاں آنچل میں باندھے پھریں گی!

ٹکسلا۔ مگر مہارانی کی آنکھوں میں تو آپ بس رہے ہیں اُسے تو

کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

پورس۔ وہ سب کچھ دیکھتی ہے مگر اسکی نگاہ کسی غلام پر پڑتی ہے تو نفرت وحقارت دکھائی دیتی ہے!

ٹکسلا۔ ہاں یہ فرمائیے کہ یہ کہاں کی محبت ہے کہ آپ اپنے ساتھ آسے اور اس کی رعایا کو لئے مرتے ہیں۔ میرے خیال میں آپکا یہ قدم مہارانی کی محبت کے لئے نہیں بلکہ سکندر سے عداوت کی بدولت اُٹھ رہا ہے۔

پورس۔ میں مانتا ہوں کہ میری غیرت اسی قدر جنگ کی خواہاں ہے جس قدر آپ صلح کے طالب ہیں۔ یہ آگ ہے جو میرے سینہ میں سلگ رہی ہے اور مجھے اُکساتی ہے کہ اپنی تلوار کا لوہا سکندر کے پُرغرور سر سے منواؤں۔ یقین مانئے جب اس کی بہادری کا قصہ سُنتا ہوں تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ اس مبارک دن کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھر اگئیں ابھی اُسے ہم پر حملہ کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا کہ میں اس کی دست درازیوں کی خبریں سُنکر دانت پیسا کرتا تھا۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ اُس نے اِدھر کا رُخ کیا تو میں دعائیں مانگتا تھا کہ زمین کی طنابیں کھینچ جائیں اور وہ کل کا آتا آج آ جائے۔ بعض اوقات بے صبری مجھے مجبور کرتی تھی کہ سرزمین ایران میں پہنچکر اس کا راستہ روک لوں۔ اب اگر وہ میرے سامنے سے ٹل جانے کی کوشش کرے اور اس ملک سے نکل بھاگنے کی ٹھانے تو میں اس کی ناکہ بندی کرونگا اور اس صلح کے قبول کرنے سے انکار کروں گا جسکی اس وقت وہ ہمیں دعوت دے رہے ہے۔

ٹکسلا۔ ضرور ہے کہ اس قدر عالی حوصلہ اور مستقل مزاج انسان کو تاریخ میں نمایاں جگہ ملے۔ اور گو آپ اس سرفروش کارنامے کی بھینٹ چڑھ جائیں آپ کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہیگا۔ اچھا اب اجازت دیجئے مہارانی تشریف لا رہی ہیں۔ اُن کے سامنے اُس جوش و خروش کی نمائش کا رنگ خوب جمے گا۔ میری موجودگی اس محفل راز و نیاز میں مخل ہوگی اور میری بزدلانہ دوراندیشی آپ کی سرگرمی پر اوس برسائیگی۔

سین تیسرا

پورس۔ اکشیانا

اکشیانا۔ ٹکسلا نے مجھے آتے دیکھا اور رستہ کاٹ کر چلا گیا۔ آخر اسکی وجہ؟

پورس۔ ندامت کے چھپانے کو روپوشی سے بہتر نقاب اُسے مل ہی نہ سکتا تھا۔ حوصلہ ہار کر کس منہ سے آپ کے سامنے آتا۔ مہارانی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ وہ اپنی بہن کو ساتھ لیکر سکندر کی قدمبوسی کو جانا چاہتا ہے۔ تو جانے دیجئے۔ لیکن ہمیں اس مقام سے ہٹ جانا چاہیئے جہاں ٹکسلا اپنے شہنشاہ کی راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہو۔

اکشیانا۔ مگر مہاراج! میں بھی تو سنوں کہتا کیا ہے۔

پورس۔ صاف تو کچھ نہیں کہتا۔ مگر اس کی باتوں سے اس کے دل کی کیفیت آشکارا ہونے سے نہیں رہتی۔ اس کی ذہنیت کا اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ آنجناب ابھی ابھی اُس کی غلامی پر اترا رہے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ مجھے بھی اس نعمت سے ممنون فرمانا چاہتے تھے۔

اکشیانا۔ جوش میں نہ آیئے۔ روٹھے کو منانا مجھے آتا ہے۔ دل شکستہ ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ ہنوز محبت کی چنگاری اس میں دبک رہی ہے۔ خیر خواہ کچھ ہو میں اس سے دو باتیں کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مہاراج! نفرت اور حقارت سے آپ کسی شخص کو اپنا نہیں بنا سکتے!

پورس۔ میں غلط عرض نہیں کر رہا۔ مہارانی! اس آستین کے سانپ پر بھروسہ نہ کیجئے وہ موقعہ ملتے ہی آپ کو سکندر کے حوالے کر دیگا اور پھر آپ کو اس سے انعام میں مانگیگا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ ....

....

.... وہ بیشک مجھ سے وہ نعمت چھین لے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے مگر آپ پر اپنا سر نثار کرنا میری تمنا ہے اور یہ وہ سعادت ہے جسے دیکھ کر اس کی رقیبانہ لاگ ڈانٹ شرمندہ ہو جاتی ہے

اکشیانا۔ تو آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جذبۂ محبت اتنا گر گیا ہے کہ اس کمینہ حرکت کا روادار ہو گا۔ اور میرا دل اس کی حکومت کو قبول کر لیگا؟ مہاراج! یہ الزام لگاتے وقت آپ کو شرمانا چاہیئے۔ بتائیے آجتک آپ نے کبھی میری طبیعت کا میلان اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اگر مجھے دونوں میں سے کسی کو منتخب کرنا ہوتا تو شاید مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہوتی۔ کیا میں نہیں

جانتی کہ اس کا دل بیم و رجا کی کشمکش میں پھنسا ہے اور اگر میں دخل نہ دیتی تو اس کا مغرور دل ایک مدت کا اپنی بہن کی مکاری کی نذر ہو گیا ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ اسکندر کی قید میں رہکر پھر ٹکسلا آئی۔ تو میں فوراً بھانپ گئی کہ وہ بھائی کو اپنا ہم قفس بنانا چاہتی ہے۔

پورس۔ اور باوجود ان باتوں کے آپ کو اس کے پاس رہنا گوارا ہے۔ مہارانی! اُسے اپنے جرم و عصیان کی تاریکی میں پڑا رہنے دیجئے۔ اور ایک راجہ ہاتھ سے جاتا ہے تو جانے دیجئے۔

اکشیانا۔ میں اس کا دل آپ کی فتح کے لئے جیتنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ مدافعت کا سارا بار آپ کے کندھوں پر پڑے۔ اور آپ تن اکیلے اس دیوہیکل دشمن سے دوچار ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ٹکسلا معرکۂ کارزار میں آپ کے ساتھ ہو کر لڑے اور اس کی بہن کی ریشہ دوانیاں طاق پر دھری رہ جائیں۔ مہاراج! کاش دولہ جنگ میں آپ کو کچھ میرا بھی دھیان رہتا۔ مگر ایسی خفیف باتیں شاید آپ کے دل پر اثر ہی نہ کر سکتی ہوں۔ آپ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے دشمن میدان جنگ میں تیغ بکف کام آئیں اور پھر میرا جو بُرا لکھا ہو تو ہوا کرے۔ حیران ہوں کہ آپ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ میں سکندر سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی اور آپ کے رقیب کی ہوسناکی سے کہاں جان بچاؤنگی جب وہ مجھے قید کر کے ذلت میں دیکھے گا تو آپ کے خون کے انعام میں مجھے طلب کریگا۔ مگر آپ کو ان فکروں سے واسطہ۔ جائیے اور میدان جنگ میں اپنے جان سپارانہ کارنامے دکھائیے۔ صرف معرکہ آرائی کا خیال کیجئے۔ اور اپنی جان کی حفاظت کو قطعاً فراموش کر ڈالئے اور یہ بھی بھول جائیے کہ دیوتاؤں نے آپ کے لئے گلشن مسرت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ ممکن ہے اکشیانا بھی جلد آپ کے پاس پہنچ جائے۔ مگر آہ! کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا اچھا۔ خیر۔ سدھاریئے۔ اور فوج کو میدان میں لیجائیے۔ جی بھر کے باتیں ہو چکیں اور شاید آپ بھی تاخیر سے تنگ آ گئے ہوں۔

پورس۔ مہارانی! ذرا ٹھیر جائیے اور میرے دل میں جھانک کر دیکھئے کہ اس میں محبت اور وفا کے کس قدر بیتاب جذبے تڑپ رہے ہیں۔ سر صدقہ اُترنے کے لئے وبال دوش ہو رہا ہے روح قدموں پر نثار ہونے کے لئے ملتیں کر رہی ہے میں مانتا ہوں کہ ناموری میرے دل پر چھا رہی ہے۔ مگر آپ کی اداؤں کو دیکھ کر وہ بھی مسحور ہوئی جاتی ہے۔ میں بھول رہا ہوں کہ مجھے کیا کچھ کرنا ہے بیشک میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اپنی فتح کا علم بلند کر کے اپنے رقیب کا سر ہمیشہ کے لئے نیچا کر دوں مگر ان باتوں کا زمانہ گذر گیا۔ اور اب مہارانی۔ آپ کے حکم کا منتظر ہوں ناموری اور انتقام دونوں آپ کے قدموں پر پڑے ہیں۔

اکشیانا۔ تو اطمینان رکھئے کہ یہ فرمانبردار دل ایسے ہاتھوں میں نہیں پڑا جو امانت میں خیانت کریں اسکی خوشی مجھے اس قدر منظور ہے کہ میں اسے میدان میں فتح کا جھنڈا گاڑنے کی اجازت دیتی ہوں۔ مہاراج! شوق سے دشمن پر حملہ کیجئے۔ مگر اتنا دھیان رہے کہ رفیق ساتھ چھوڑنا نہ پائیں ہر پہلو سے ان کی دلداری کیجئے اور مجھے ٹھنڈے دل سے ٹکسلا کو راہ راست پر لانے دیجئے میرا خیال ہے کہ وحشی رام ہو جائیگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ آپکے جھنڈے تلے کھڑا ہوگا۔

پورس۔ مہارانی میں صدق دل سے [illegible] تعمیل حکم کا عہد کرتا ہوں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ہیپ فستیان کیا رنگ لاتا ہے۔ اس کے بعد تلوار کھینچ لیتا ہوں۔

(نور الٰہی محمد عمر)

اے ہوش تجھکو آنے سے میں روکتا نہیں ساقی کو تیرے آنے کی لیکن خبر نہ ہو

میں عکس ہوں آئینہ امکاں میں تمہارا تم سا جو نہیں کوئی تو مجھ سا بھی نہیں اور

جانتے ہیں تجھے ہم روز ازل سے لیکن یہ نہیں جانتے کیوں کر تجھے ہم جانتے ہیں

وفا کا نقش ہے وہ نقش جو مٹکر اُبھرتا ہے جنہیں دل سے بھلا دوگے وہ پیہم یاد آئینگے

عنبر، مشک اور سیویٹ

سونا۔ چاندی۔ پلاٹینم اور جواہرات بہت بیش قیمت چیزیں ہیں اور جب سے مہذب دنیا ان کی خاصیتوں سے واقف ہوئی ہے ان کی قیمت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا ہے جس کے پاس یہ چیزیں زیادہ مقدار میں ہوں۔ وہی سب سے امیر۔ ان کی چمک دمک امیر و غریب سب کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور دنیا میں کون شخص ہے جو ان کے حاصل کرنے میں دن رات کوشش نہیں کرتا۔ لیکن قدرت نے چند چیزیں اور بھی ایسی پیدا کی ہیں۔ جو دیکھنے میں کالی کلوٹی۔ مگر قیمت میں سونے جواہرات کے ہم پلہ اگرچہ ان کی رنگت دلفریب نہیں ہوتی۔ مگر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ہر امیر و غریب کے دل کو لبھا لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک عنبر ہے دوسرا مشک اور تیسری چیز سیویٹ کے نام سے مشہور ہے۔ عنبر کو ایک مچھلی پیدا کرتی ہے۔ تو مشک ہرن سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سیویٹ افریقہ کی بلی سے۔

عنبر سمندر کے کناروں پر عموماً ملتا ہے اس کی موجودگی اس کی تیز بو سے پہچانی جاتی ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی اندھیری کوٹھری میں چوہوں سے جس قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے کئی درجہ زیادہ وہاں ہوتی ہے انجان شخص وہاں کبھی نہ ٹھہر سکے۔ البتہ جو اس بو سے واقف ہیں ہچکچائے بغیر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہیں۔

بہت کم لوگ ہیں جو اس کے فائدے جانتے ہوں گے۔ عنبر دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسری خوشبوؤں میں جب اس کی تہ دی جائے۔ تو وہ بہت عمدہ خوشبوئیں بن جاتی ہیں۔ اور زیادہ قیمت میں بکتی ہیں مختلف دواؤں کے ساتھ مل کر کبھی تو گلاب کی خوشبو پیدا ہوتی ہے کبھی موتیا چنبیلی کی۔ اور کبھی کئی نفیس اور دل لبھانے والی خوشبوئیں بنائی جاتی ہیں۔ اور یہ تجارتی بھید ہیں۔ جو مشکل معلوم ہو سکتے ہیں۔ بس یہی سمجھ لو کہ جیسے اگلے زمانے میں کیمیاگر سونا بنانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اور کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا تھا۔ البتہ امریکہ اور یورپ والے علم کے زور سے بدبو کو خوشبو میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ان کی کیمیاگری میں آنچ کی کسر نہیں رہتی۔

عنبر سپرم ویل (ایک قسم کی مچھلی جو سمندر میں ہوتی ہے) پیدا کرتی ہے۔ اگر سونا اور جواہرات تلاش کرنے والے جنگل بیابان پہاڑ اور صحرا ایک کر دیتے ہیں تو عنبر کی تلاش میں ملاح سمندر چھان مارتے ہیں۔ عنبر کی پیدائش کے لئے ساتوں سمندر میں اور ہر ملک اور ہر جزیرہ کے کناروں پر یہ ملتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ان ملکوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے جن کے سمندروں میں سپرم ویل کی کثرت ہو۔ سپرم ویل سرد پانیوں کو بہت پسند کرتی ہے۔ عنبر تیرتا رہتا ہے۔ اور اس کے ٹکڑے جو مچھلی کے بدن سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ سمندر میں بہتے بہتے ہوا کے زور سے سینکڑوں ہزاروں میل نکل جاتے ہیں۔ سمندر کی موجیں اور جوار بھاٹا انہیں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے اور ساحل پر بعض اوقات آ کر رہ جاتا ہے۔ تو پڑا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ جو خوش قسمتی سے پہچان لے اٹھا لیتا ہے۔

عنبر دنیا میں کافی مقدار میں نہیں ملتا یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی قیمت کبھی نہیں گرتی۔ نہ کوئی چیز ہی ایسی بن سکتی ہے۔ جو اس کا بدل ہو۔ اور اس کی قیمت کو گھٹا سکے۔ عنبر دو قسموں کا ہوتا ہے۔ سیاہ اور بھورا اور انہی دونوں رنگوں پر اُس کی قیمت کا دارومدار ہے۔ بھورا عنبر اعلیٰ قسم کا خیال کیا جاتا ہے اس واسطے اس کی مانگ بھی زیادہ ہے۔ اور یہ ملتا بھی تھوڑی مقدار میں ہے۔ امریکہ میں بحر اٹلانٹک کے ساحل پر عنبر زیادہ مقدار میں ملتا ہے۔ اور بحر الکاہل کے ساحل پر کم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحر الکاہل میں سپرم ویل کم ملتی ہیں۔ اور بحر اٹلانٹک میں زیادہ۔ عنبر کے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے ملتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بڑے بھی جن کا وزن ۹۰ سے ۲۵۰ پاؤنڈ تک ہوتا ہے۔ سپرم ویل جب پکڑتے ہیں۔ تو بڑی احتیاط سے اسے کاٹتے ہیں۔ اور ذرہ برابر عنبر ضائع نہیں جانے دیتے۔ اس کے بعد عنبر کی تقسیم ہوتی ہے اور حصہ رسدی مالک جہاز اور ملاحوں میں بٹ جاتا ہے۔ بحر ہند اور بحیرہ چین میں بہت ملتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر مچھیرے عنبر کی تلاش میں سمندر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس کی پہچان صرف خوشبو سے ہی ہو سکتی ہے۔ کہیں سے ذرا بھی بدبو یا خوشبو معلوم ہوئی۔ اور یہ لوگ کشتیاں لے کر تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔

سمیع اللہ

پس پردہ

جیساکہ کہا گیا ہے میدانِ کارزار کی فلم لینا بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایکٹروں اور فالتو کیریکٹروں کے علاوہ ان لوگوں کی زندگی بھی معرضِ خطر میں ہوتی ہے جنہیں کیمرہ اور میگافون .... کے پیچھے کام کرنا ہوتا ہے۔

"ورڈن" اس نوع کے فلموں کی لاثانی مثال ہے یہ مشہور میدانِ جنگ کا انگریزی فلم ہے اور گومون برٹش کمپنی .....

نے اسے عین معرکۂ کارزار میں جبکہ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں اور بڑے بڑے تباہ کن گولے ہر طرف لڑھکتے پھر رہے تھے۔ فلم کیا ہے اس کی خوفناک واقعیت اور ہر تفصیل کی صحت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فلمسازی سے عام دستور کے برعکس اس کے لئے خاص طور پر اس غلیظ اور بے کیف موسم کا انتظار کیا گیا جو ایام جنگ میں واقع ہوا تھا۔ تیاری میں اصلی گولے استعمال کئے گئے۔ اور میدان جنگ کو خطرہ وامن کے دو حلقوں میں منقسم کر لیا گیا۔

اس دوران میں کئی ایک حادثات رونما ہوئے لیکن اس سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا۔ دو کیمرے والے منظر کی تصویر لینے میں مصروف تھے۔ کہ ایک بڑے سے گولے کا ایک ٹکڑا اُڑ کر اُن کے پاؤں میں آ پڑا اس ٹکڑے کا طول دو فٹ اور عرض وضخامت ایک ایک فٹ تھی اور وزن میں پندرہ پونڈ تھا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی ممکن احتیاط اُٹھا نہ رکھی گئی تھی۔ نزدیک کی تصاویر لینے کیلئے خندقیں کھودی گئیں۔ ریت کے تھیلے مہیا کئے گئے۔ تاکہ کیمرہ والا اُن کے پیچھے خطرے سے مامون ہو کر اپنا کام کر سکے۔ بایں ہمہ فوٹوگرافر موسیو باتان کے سر میں شدید زخم آیا اور صلیب احمر کی جماعت جو فلم کمپنی کے ہمراہ تھی انہیں موقع پر سے اُٹھا لے گئی تاکہ زخم کی شستشو کرے۔

فلمساز کو اس حصے کی تکمیل میں بھی سخت خطرے کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں ۲۵ آدمیوں سے بھری ہوئی لاری کے ڈرائیور کی تصویر لینا تھا۔ کیمرہ والا اور اس کا ڈائرکٹر لاری کے سامنے کے ایکسل پر کھڑے تھے۔ انہیں صرف آگے کے پیچھے سے کچھ سہارا ملتا تھا۔ لاری انتہائی رفتار پر جا رہی تھی۔ اور وہ فلم لینے میں مصروف تھے اس حالت میں اُنہوں نے ہزاروں میل لمبا فلم تیار کیا۔ تین بار اُن کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اگر اُن کی کمین میں حفاظت کے لئے پہلے ہی سے رسے نہ باندھے ہوئے ہوتے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔

لاہور میں گذشتہ سال کرسمس کے ایام میں ایک زبردست فلم "دی ونگز" دکھایا گیا تھا۔ جن حضرات نے اسے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کا ہر سین کس قدر حیرت انگیز اور سنسنی پیدا کرنے والا تھا۔ لیکن ساتھ ہی بہت کم اصحاب جانتے ہوں گے کہ اسکی تیاری میں کیا خطرات پیش آئے ہوں گے۔ اس امر سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ڈائرکٹر ولیم ولمین کے اس بیان کا ایک اقتباس پیش کیا جائے جو اُنہوں نے اس کے اختتام پر "ہالی وڈ" میں آ کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کبھی خواہ مجھے کوئی لاکھوں ڈالر پیش کرے "ونگز" جیسے خطرناک فلم کی تیاری اپنے ذمے نہ لوں گا۔ کام شروع کرنے سے پیشتر میں نے کمپنی کے ہر فرد سے کہدیا تھا کہ جو شخص خطرے کا نام بھی زبان پر لائیگا میں اسے گولی سے اُڑا دوں گا۔ لیکن جب کام شروع کیا گیا ہم میں سے کسی کا دل بھی خوف سے خالی نہ تھا۔ ایک گہرے دریا کے کناروں پر عمودی سنگلاخ چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور دونوں کے درمیان بہت تنگ فاصلہ تھا۔ رچرڈ آرلین کے ہوائی جہاز کو اس گہرائی میں غوطہ لگانا تھا۔ اس موقعہ پر اُس کی جان بال بال بچی۔ اگر وہ فوراً اس میں سے کود نہ جاتا تو جہاز کے ساتھ جو چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اس کی زندگی کا بھی فیصلہ ہو جاتا۔

ہوائی جہازوں کا جو معرکہ اس میں دکھایا گیا ہے۔ وہ ان تدبیروں اور گھاتوں کا نقشہ ہے جن سے جنگ عظیم میں کام لیا گیا تھا۔ فوج کو منتشر کرنے کے لئے طیاروں کو اکثر بہت دور تک زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ اُڑنا پڑتا تھا۔ ایک موقع پر ایک ہواباز اپنے طیارے ایک

پل کے اس قدر نزدیک لے آیا کہ سپاہیوں کو جو اس پر مارچ کر رہے تھے اپنی جان بچانے کے لیئے دریا میں غوطہ لگانا پڑا۔ اگر ایک ہوائی جہاز اپنے مقررہ راستے سے چھ فٹ بھی ایک طرف ہو جاتا تو کم از کم پچاس آدمیوں کی جانیں تلف ہو جاتیں۔ ہر سین میں سٹرو ہائیمن ایکٹروں کے ہمراہ ہوتے تھے اور تا وقتیکہ خود اس میں حصہ نہ لیتے اُنہیں کوئی خطرناک ایکٹ کرنے کی اجازت نہ دیتے جب ہوائی جہاز زمین سے کچھ بلندی پر اُڑ رہے ہوتے وہ اکثر اُن تک پہنچ جاتے اور ہاتھ لگا کر واپس آتے ہزاروں سپاہیوں ہوابازوں اور فالتو کارکنوں کی حفاظت کا بار ان کی گردن پر تھا اور اس کے علاوہ وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر دولیاں

کیمرہ والوں اور ایکٹروں کی نگہداشت بھی انہیں ہی کرنی پڑتی تھی اُنہوں نے بیجان تیلوں اور دیگر شعبدوں سے کام لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ چنانچہ ہر سین صحیح واقعہ کی تصویر ہے۔ ستر کیمرہ والوں نے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ کوئی انجمن کے ہٹ پر۔ پروپلر سے چند انچ کے فاصلہ پر بندھا ہوا تھا۔ کئی جہازوں کے بازووں سے مربوط تھے۔ اور جہاز کبھی تیر کی سی سُرعت کے ساتھ بلندی پر سے نیچے کی طرف گرتے۔ زمین سے دور بلندیوں پر قلابازیاں لگاتے۔ اور کبھی خرگوش کی مانند ایک سمت چھوڑ کر اچانک دوسری سمت پھر جاتے۔ اور یہ اپنے کیمرے متواتر ٹک ٹک چلاتے جاتے صرف اس امید پر کہ زمین پر صحیح سلامت پہنچ جائیں گے۔ جہازوں کی تیز پروازی اور سریع الحرکتی کا متحمل بننے کے لیئے انہیں کچھ عرصے (studio) سٹڈیو میں کام کرنا پڑتا تھا ایک جہاز نما تختے پر انہیں بٹھا کر ہر ممکن سمت میں آہستہ آہستہ اور تیزی کے ساتھ حرکت دی جاتی۔ یہانتک کہ وہ اس کے عادی ہو جاتے۔

وار ڈن کی طرح "سام" میں بھی اصلی گولے استعمال کئے گئے تھے۔ سپاہیوں کے چلنے پھرنے کی جگہ سوراخوں میں تباہ کن بارود بھرا ہوا تھا۔ جس کو آگ لگنے سے کئی فٹ زمین سخت دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتی تھی ہر سپاہی کو اس کی نقل و حرکت کے متعلق نہایت دقیق ہدایات ملی ہوئی تھیں۔ اس فلم کی تیاری میں کئی ہزار آدمیوں نے کام کیا۔ انتہائی احتیاط کے باوجود ناگوار حادثات بھی وقوع پذیر ہوتے رہے۔ کارپول ویل وی۔ سی۔ جوش و خروش میں ایک پھٹتے ہوئے گولے کے اس قدر نزدیک چلے گئے کہ ان کا تمام چہرہ بُری طرح جھلسا گیا۔

حیرت انگیز بحری فلم "کیوشب" جس کا ہر سین رگ و پے میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے واقعات سے بھرا ہوا ہے جس میں تیار کرنے والوں اور ایکٹروں کی زندگی سخت خطرے میں تھی سب سے زیادہ مشکلات کا باعث پراسرار جہاز "آرمی" ثابت ہوا۔ سین اس امر کا مقتضی تھا کہ اسے غرق ہوتا دکھایا جائے۔ چار بار اس کو ڈبونے کی کوششیں بالکل ناکام رہیں۔ پانچویں دفعہ اس کے بادبانوں کو تیل میں تر کر کے تختوں پر پٹرول بہا دیا گیا اور جوف میں بھک سے اُڑ جانے والا بارود رکھ دیا گیا اور ارد گرد کی کشتیوں سے گولہ بازوں نے گولے برسانے شروع کیئے۔ آگ دکھانے والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ جب جہاز غرق ہونے لگے تو سمندر میں کود کر اپنی جانیں بچالیں۔ لیکن جہاز اس سُرعت کے ساتھ ڈوب رہا تھا کہ دو آدمیوں کی جانیں سخت خطرے میں پڑ گئیں۔ اگر اس وقت کمال دانشمندی سے کام نہ لیا جاتا تو جہاز کے ساتھ وہ بھی نذر آتش ہو جاتے۔

بعض ڈراموں کی تیاری کے لیئے فلم سازوں کو مناظر خود نہیں بنانے پڑتے۔ یہ سین فطرت سے لئے جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ امر بہت آسان نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں بھی موسم کی اچانک تبدیلی سے ہزاروں لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ لارنس سٹالنگ کے مشہور ناول اولڈ آئرن سائڈ کا فلم "مسٹر آف دی سی" تیار کرنے میں ان لوگوں نے جنہیں اسے ایکٹ کرنا تھا امریکہ کے ساحلوں کے سخت خوفناک طوفان برداشت کئے۔ ان میں استھر رالسٹن چارلس فارل، والیس بیری اور جارج بنکرڈ فٹ بھی تھے۔ ایک بار یہ ایک شدید طوفان میں گھر گئے اور متواتر ۷ گھنٹے سمندر میں پھرتے رہے۔ آٹھ جہاز جنہیں تصویر لینے کے لئے فوجی ترتیب سے آراستہ کیا گیا تھا ایک اور طوفان میں غرقاب ہو گئے۔ یہ طوفان اس قدر تند اور سخت تھا کہ بڑے عسکری جہاز کانسٹیٹیوشن کے تین بھاری مستول ٹوٹ گئے اور تختہ پر "ستاروں" سے چند قدم کے فاصلہ پر بڑے دھماکے سے گرے ان میں سے ہر ایک کئی من وزنی تھا۔

فوٹو کے کام میں نیچر کی دست اندازی کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب اس نے لرزہ خیز مناظر کی تصویر لیتے وقت مخل ہو کر جدید خطرات کا اضافہ کر دیا۔ ان میں سے ایک حادثہ تو اُس وقت رونما ہوا جب لیلین گش برف کے عظیم الجثہ اور سمندر میں مسلسل بہتے ہوئے تودے پر ایکٹ کر رہی تھی۔ اس وقت قریب تھا کہ اس کی زندگی ضائع ہو جائے۔ دوسرا حادثہ "فلورا لا برتال" کا ہے۔ جب وہ "جپسی کو بلیز" میں ایکٹ کر رہی تھی اسین میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ فلورا کوچ پر بیٹھی ہے۔ اور اچانک سیلاب آجاتا ہے اور اس کیلیئے کوئی راستہ فرار باقی نہیں رہتی اس نازک موقع پر ہیرو جس کا پارٹ جارج کا رپنیٹر ادا کر رہا تھا۔ ظاہر ہوتا ہے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حیرت انگیز طور پر اسے نجات دیتا ہے سیلاب کا انتظام پہلے ہی سے دریا کے ایک حصے میں بند باندھ کر کیا گیا تھا لیکن جب بند توڑے گئے سیلاب غیر متوقع طور پر نہایت شدت سے آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر معمولی طور پر سخت بارش نے پانی کے حجم میں خوفناک اضافہ کر دیا تھا۔

اور مہتم نے اس کا کچھ خیال نہ کیا تھا۔ جارج کارپینٹر زبردست تیراک ہے لیکن اس سیلاب میں انتہائی جد وجہد کے بعد وہ فلورا کے نزدیک بمشکل اُس وقت پہنچا جب کوچ پانی کی سطح پر چھت سے جا لگا تھا۔

سیلاب کے مناظر کے وہ حصص بھی سخت خطرناک ہیں جن کو اقتضائے افسانہ سے برفانی علاقوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ چچا ٹام کا مشہور فلم جو کچھ عرصہ ہوا لاہور میں دکھایا جا چکا ہے۔ اس میں "الیزا" کا برف کے میدان کو عبور کرنا ایک ایسا سین ہے جس کے دیکھنے سے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے الیزا کا پارٹ مارگریٹ فشر ادا کر رہی تھی۔ اسی دوران میں بے شمار ایسے حادثے درپیش ہوئے جن کا اعادہ قطعاً ناممکن ہے۔ کئی بار برف کے تودوں پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ یخ بستہ پانی میں گر پڑی۔ برف اور ثلج کا طوفان جس کا کئی دن سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ توقع سے بڑھ کر ثابت ہوا اور جماعت کے کئی ارکان زندہ دفن ہو گئے۔ فلم کے ڈائرکٹر کو یخ کے سے سرد پانی میں کئی دن تک متواتر گھنٹوں کھڑے رہنے کی وجہ سے نمونیا اور انفلوانزا کی شکایت ہو گئی اور خون میں زہر پھیل گیا۔ اور اس فلم کی تیاری میں پورے تین ماہ کی تاخیر واقع ہو گئی۔

وہ سین جو موقع اور محل کے لحاظ سے صحرا میں تیار کئے جاتے ہیں فلم کمپنیوں کے لئے گوناگوں مشکلات اور تکالیف کا باعث ہوتے ہیں صنف نازک کو تو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے لیلین گِش نے تو سخت شد و مد کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ وہ پھر کبھی ریگستان میں ایکٹ کرنے نہ جائیگی "دی ونڈ" غالباً اس کا شاہ کار ہے اس کی تیاری میں اسے بارہ گھنٹے روزانہ صحرائے "موجاوی" کی تابناک دھوپ میں کام کرنا پڑا دن کے کثیر حصے میں آندھی جھکڑ چلتے رہتے تھے جب یہ ذرا تھمتے تو ہوائی مشینیں افسانے کا ماحول پیدا کرنے کے لئے ان کا پارٹ ادا کرتیں لیلین گِش کا چہرہ ریت کے تیز اور تپتے ہوئے ذرات سے چھل گیا پاؤں جو اس پارٹ کے مطابق باریک اور نازک جوتا تھا صحرا کی تپش سے جھلسے گئے اور اُن میں چھالے پڑ گئے سورج کی خیرہ کن چمک سے عارضی نابینائی نے کئی بار حملہ کیا۔ ڈائرکٹر اور کیمرہ والا تو موٹے چمڑے کے جوتوں سے محفوظ تھے اور ہوا اور دھوپ کی شدت سے بچنے کے لئے آنکھوں پہ گاگلز اور آفتابے لگا رکھے تھے اور تمام تکالیف اور زحمتیں کمزور اور نازک اندام ستارے کا حصہ تھیں

(رشید احمد ایم اے)

موسمِ برسات ہے جنگل ہے وقت شام ہے
ایک تارا ہے سو وہ بھی رعشہ بر اندام ہے

بادلوں کی سرزمین پر نغمہ ہائے جانفزا
مُرغِ خوش پرواز آزادی ہی کا نام ہے

وہ آ رہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا ہے میرے فسانے کا

ہم جسکو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں کھلتے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جنکو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کھل کر رہ جاتے ہیں

یہ بھی اک تماشہ ہے کارزار الفت میں
دل کسی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلتا ہے

حامد اللہ افسر

مکافاتِ عمل

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

"خیالات تقدیر کا دوسرا نام ہے، اپنی تقدیر کو خود انتخاب کرو۔ اور منتظر رہو۔ کیونکہ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت کا پھل لگتا ہے۔"

——— ایلا ویلر ولکاکس۔

"خوبصورت خیالاتِ شرافت اور ہمدردی کی ان عادات میں رو نما ہوتے ہیں۔ جو جاں بخش اور روشن ساعتوں میں استوار ہوتی ہیں۔"

کس قدر تعجب کا مقام ہے۔ کہ تمام لوگ جانتے ہیں کہ جو تخم زمین میں بوتے یا جس چیز کا پودا لگاتے ہیں۔ زمین سے اُن کو وہی چیز ملتی ہے۔ اور جو بو کر گندم کاٹنا قطعاً ناممکن ہے۔ لیکن جب ذہنی اور دماغی کاشت کا سوال آتا ہے۔ تو اس قانون کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

جب ہم سالہا سال سے ان کے مخالف جذبات کا بیج بو رہے ہوں۔ تو اب مسرت و اطمینان کی فصل کی کس طرح امید رکھ سکتے ہیں؟ جب اس تمام عرصے میں مریضانہ خیالات کی پرورش کی گئی ہو تو اچھی صحت کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اگر کسان کانٹے بو کر گیہوں کی فصل کے انتظار میں ہو تو ہم اسے دیوانہ خیال کریں گے۔ لیکن ہم تخم ریزی تو غم، فکر، خوف اور رشک کے خیالات کو کرتے ہیں۔ اور پھر تعجب کرتے ہیں۔ کہ ہماری زندگی یکساں اور پُر اطمینان کیوں نہیں؟ ہمارے ذہن اور دماغ کی فصل بھی تو اسی قانون کی پابند ہے جو کسان کی فصل پر حاوی ہے۔ کیا تم نے

گندم از گندم بروید جو ز جو

نہیں سنا؟

انسان کی کارکردگی اس کی فصل ہے جس کی کثرت و قلت اور شادابی اور پژمردگی کا انحصار اُس کے خیالات پر ہے جس طرح ایک کسان کانٹے بو کر گندم نہیں کاٹ سکتا۔ وہ آدمی بھی جو ناکامی کے خیالات کی آبیاری کرتا ہے کامیابی کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اگر وہ روشن، پاکیزہ اور زندگی بخش خیالات، راست بازی اور حق پرستی کے خیالات، کامرانی اور فراوانی کے خیالات اور اعتماد در بینی کے خیالات بوتا ہے تو وہ یقیناً فصل بھی ایسی ہی حاصل کرے گا۔ لیکن اگر وہ آوارگی و پریشانی اور نفرت و نفاق کے بیج بوتا ہے۔ تو فصل بھی آوارگی و پریشانی اور نفرت و نفاق کی ہوگی۔

طمانیت قلب طاقت ہے۔ اور پریشانی خیالات کمزوری۔ مایوسانہ خیالات کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ جو اچھی پیداوار کا گلا گھونٹ کر کھیتی کو تباہ کر دیتی ہیں

اگر ہم اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ کہ ذہنی قانون بھی فطری قوانین کی مانند اٹل اور غیر متبدّل ہوتے ہیں۔ تو زندگی کے پیچیدہ مسائل نہایت آسان ہو جائیں ہر خیال جو دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اپنا پودا کانٹا یا گلاب، جو یا گیہوں اُگاتا ہے۔

ہماری زندگی کے واقعات ہماری ذہنی کاشت کا حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم آندھی بوئیں تو بگولہ کاٹتے ہیں۔

اگر ہم کثرت و فراوانی کے خیالات کا بیج بوئیں۔ تو ہم فصل بھی ایسی کاٹتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ذلّت، فلاشی، بیکاری اور ناکامیابی کے خیالات کی پرورش کریں تو فصل بھی فلاش اور فلاکت زدہ ہوگی زندگی خیالات ہی سے بنتی اور خیالات ہی سے بگڑتی ہے۔

جب ہم ایک خود غرض اور نفرت انگیز چہرہ دیکھتے ہیں تو ہم سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ خود غرضی اور بدی کے خیالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن جب ہم ایک پرسکون، مطمئن اور مسرت افروز چہرہ دیکھتے ہیں۔ تو جان لیتے ہیں۔ یہ طمانیت و اطمینان اور امید افزا خیالات کی تخم ریزی کا پھل ہے۔

اگر آئینِ فطرت میں کوئی ایسا آئین ہے۔ جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔ تو وہ ہمیشہ یہ ہے

"گندم از گندم بروید جو ز جو"

ایک شخص جو چاقو لے کر اپنے جسم کو کاٹنا شروع کر دے۔ یہاں تک کہ خون بہ نکلے۔ یقیناً پاگل خانے میں بند کر دیا جائے گا۔ لیکن ہم اپنی ذہنی قوتوں کو ہمیشہ تیز خیالی آلات نفرت، انتقام، غصہ، رشک و حسد سے کاٹتے رہتے ہیں۔ اور اپنے تئیں صحیح العقل سلیم الطبع اور سمجھدار خیال کرتے ہیں۔

ہر خیال ایک بیج ہے جس سے تقریباً اس جیسا ہی ایک ذہنی پودا

پیدا ہوتا ہے۔ اگر خیالات کے درخت کے بیج میں زہر ہے۔ تو اُس کا پھل بھی یقیناً زہر آلود ہوگا جس سے زندگی میں زہر پھیل جائے گا۔ اور اُس کا اثر مسرت و انبساط اور قوت عمل کو تباہ کر دے گا۔

اگر تم اپنے آپکو خواہشات کے ہاتھ میں فروخت کرتے ہو تو تمہیں اپنی شان کے شایاں قیمت کی توقع تو ضرور رکھنی چاہیئے۔ اُس شخص کو جو اپنے تئیں خود غرضانہ زندگی کے لئے فروخت کر دیتا ہے۔ اس خود غرضی کی زندگی کے لئے جو لاڈ لاڈ تو پکارتی ہے لیکن خرچ کرنا نہیں جانتی۔ ایسے شخص کو تو ان کانٹے دار جھاڑیوں اور پرخار پودوں کی شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ جو اس کی کھیتی میں اُگ آتے ہیں۔ زندگی منصف اور عادل ہے۔ وہ ہمیں وہی چیز دیتی ہے۔ جس کی ہم قیمت ادا کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت اُن چیزوں کو طلب کرتے ہیں جن کی وہ قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔

آئندہ انسان جان لے گا۔ کہ اگر وہ کثرت، فراوانی اور آسودگی کی فصل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے ناکامی، افلاس، حوصلہ شکنی اور تذبذب اور تشکک و شبہ کا بیج نہ بونا چاہیئے۔ وہ ان بیجوں کو بوئے گا۔ جو اس کی حسب منشا فصل پیدا کرینگے اگر وہ خوبصورتی، دلکشی اور دلآویزی کے اوصاف کی فصل حاصل کرنا چاہیگا تو وہ محبت، مہربانی اور حوصلہ افزائی کا بیج بوئے گا۔ اس کو علم ہوگا۔ کہ اگر وہ نفرت، تشکک، و حسد، تلخی اور انتقام کی تخم ریزی کرے گا۔ تو وہ فصل بھی ایسی مضر اور خاردار پیدا کرے گا۔

آئندہ انسان خاص آئین و قوانین کے ماتحت رہے گا۔ وہ جان لے گا۔ کہ جسمانی زور و قوت اور کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ان بیجوں کا بوتا ہے۔ جن کی فصل وہ چاہتا ہے ؛

جسم دل کا صرف ایک عکس ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں تو خوبصورت اور محبت آمیز خیالات ہوں اور اس کا جسم اُن کے مطابق نہ ہو۔ یہ صرف وقت کا سوال ہے۔ مدارج کے متعلق اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قطعاً ناقابل تبدیل قانون ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو

یہ ناممکن ہے کہ ایک چور اس شخص کو جس کی وہ چوری کرتا ہے۔ اس سے نصف نقصان بھی پہنچا سکے جو وہ اپنے تئیں پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو اذیت دیتا ہے لیکن اپنے دل میں ایک زہر سے بجھا ہوا خنجر بھی بھونک لیتا ہے۔ ہماری افتاد ہی ایسی ہے۔ کہ ہم کبھی دوسرے کو اُس وقت تک نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جب تک کہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لیں۔ اگر ہم اپنے آپ سے نیکی کرنا چاہیں۔ تو ہمیں دوسروں سے بھی نیکی کرنی پڑے گی ؛

(ترجمہ)

سلیمان خاں بی اے۔ پی سی۔ ایس

مجھ سے لاکھوں خاک کے پتلے بنا سکتا ہے تو
میں کہاں سے ایک تیرا سا خدا پیدا کروں

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہے ترے ہاتھ
لینا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے
گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں
کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

اُن کی یہ خوبی اخلاق کہ وعدہ تو کیا
میری یہ شومئی تقدیر کہ ایفا نہوا

اس شمع تجلّی پہ جھکی جاتی ہیں آنکھیں
نظّارہ جسے کہتے ہیں پروانہ ہے اسکا

عدو سے تمکو جو ربط نہاں ہے کیوں کہو مجھسے
عنایت سے میں باز آیا نہ سمجھو رازداں مجھکو

ایک غلط تاریخی واقعہ

بسا اوقات حسن ظن اپنے ممدوح کیلئے بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اکثر واقعات کی تفتیش میں غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر کسی سیاسی مذہبی پیشوا کی صحیح سوانح عمری دریافت کرنا ہوتی ہے تو ہمیں اس حسن ظن کی وجہ سے کھرے کو کھوٹے سے الگ کرنے میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اصلیت کے گوہر درخشاں نے نقلی موتیوں میں چھپ کر قدر شناس جوہری کو اپنی خریداری سے محروم کر دیا ہے۔ یہی اختلاف کی بنیاد ہے اور قبول حق کے لئے سخت سدّراہ تاریخ میں اس سے تاریکی چھا گئی اور سیاسیات کی فضا پہلے سے بھی زیادہ گرد آلود نظر آنے لگی۔

ایک معزز اخبار نے اپنی قریبی اشاعت میں عدل جہانگیری کے عنوان سے نورجہاں کے بھائی آصف خاں کا ایک غلط واقعہ درج کر دیا ہے جس کی نقل اکثر اُردو اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ اس غلطی کا ازالہ روایۃً درایۃً کیا جائے۔ اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں' وہ معزز اخبار بیان کرتا ہے کہ۔

آصف جاہ نورجہاں کے بھائی اور ممتاز محل کے باپ تھے' جہانگیر کے دربار میں ان کی بڑی قدر تھی بادشاہ نے ان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا تھا آصف جاہ لاہور کی صوبہ داری کے زمانہ میں ایک دن آدھی رات ناچ رنگ دیکھنے کے بعد ابھی سویا ہی تھا کہ پڑوس کے گھر سے جس میں ایک بوڑھا مسلمان ولی محمد نامی رہتا تھا کوئی اولاد نہ تھی اس بڑھاپے میں اللہ نے ایک اولاد بخشی تھی گھر کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے) ترانۂ مسرت کی بلند آہنگی نے والئ لاہور کی میٹھی نیند حرام کر دی۔ آنکھیں کھلیں' اُٹھ بیٹھا اور غیظ و غضب کی حالت میں حکم دیا کہ اس بدتمیز بوڑھے کو جلد پکڑ لاؤ۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی غریب بوڑھا اور بوڑھی پکڑ کر لائے گئے۔ نواب نے غصہ کے لہجہ میں کہا "اتنی رات گئے تم نے شور کیوں مچایا۔ تم جہنم کی سیر کرنا چاہتے ہو؟" اُس غریب بوڑھے نے دست بستہ عرض کی خداوند! بڑھاپے میں میں نے اولاد پائی ہے۔ اس لئے رات کو خوشی منائی گئی۔ دُہائی حضور کی میرا قصور معاف ہو۔ نواب نے ہنس کر کہا' ہاں اس بوڑھے کو لڑکا پیدا ہونے کی اس قدر خوشی ہے۔ اچھا اب اس خوشی کا خاتمہ ہو۔ اُس نے اپنے نوکر سے کہا کہ جا اُس لڑکے کو اُٹھا لا۔ حکم ہوتے ہی نوکر لڑکے کو لے آیا۔ نواب نے حکم دیا۔

"سُن! شیطان جس لڑکے کے لئے تو نے اتنی خوشی کا سامان کیا اس لڑکے کے بہشت میں جانے کا سامان کر۔ ایسا ہونے سے خوشی کی انتہا نہ ہوگی اس بچے کو ابھی گناہ نے چھوا تک نہیں' اسی وقت اس کی جان لینے سے یہ سیدھا بہشت کو جائیگا"

اس حکم سے سب لوگ حیران ہو گئے۔ بوڑھے اور بوڑھی نے خوفزدہ ہوکر آنسو پونچھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر رقت آمیز آواز میں کہا خداوند آپ رعایا کے ماں باپ ہیں قصور معاف کیجئے۔ لیکن اس آہ و زاری پر بھی اس ظالم نواب نے ایک نہ سُنی اور اُن دونوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ہاتھوں معصوم بچے کی جان لیں' مجبوراً اُن دونوں نے نواب کے حکم کی تعمیل کی اور جگر پارے کے سر کو گردن سے الگ کر دیا۔

دونوں گھر بار چھوڑ کر آگرے پہنچے۔ دربار جہانگیری میں حاضر ہوکر یہ دردناک ماجرا بادشاہ کو سنایا۔ بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ فوراً مع خدم و حشم دونوں کو ساتھ لے کر لاہور پہنچا۔ اور دوسرے قلعہ میں ایک بڑا دربار کیا اور بوڑھے بوڑھی کو پوشیدہ رکھا۔ اہل دربار سے پوچھا کہ "حاکم کا سلوک رعایا کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے" آصف جاہ اور اہل دربار نے بیک آواز کہا کہ جہاں پناہ رعایا کی عزت و ناموس اور جان کی حفاظت کیلئے اگر جان بھی دینا ہو تو بلا پس و پیش حاکم اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا سچ ہے۔ اگر حاکم اپنے آرام کی نیند میں خلل پڑنے پر کسی معصوم بچے کی جان لے تو کیا وہ حاکم ظلم عدولی نہیں کرتا؟"

بادشاہ کی یہ بات سُن کر آصف جاہ کانپ اُٹھے اور آنکھیں نیچی کرکے بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے ہنس کر حاضرین دربار سے کہا۔ آپ نے دیکھا میرا بھائی آصف جاہ رعایا کے آرام کا کس قدر خواہشمند ہے۔ رعایا پر ظلم کی بات سُن کر زمین پر بیٹھ گیا۔ نورجہاں سے پوچھا ایسے ظالم کی کیا سزا ہونی چاہیئے نورجہاں نے عرض کیا جس طرح اُس ظالم سنگدل نے والدین کے ہاتھوں ننھے معصوم بچے کو ذبح کرایا ہے اسی طرح اُس ظالم کو اُس کے عزیز کے ہاتھوں ذبح کرانا چاہیئے۔ بادشاہ کے اشارہ سے وہ دونوں مصیبت زدہ دربار میں حاضر کیے گئے۔ اُنہوں نے سن و عن تمام بیتا کہہ سنائی۔ اہل دربار کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے' دل قابو سے باہر ہو گئے۔ واقعہ کے ثبوت پر شہادتیں گذریں اُس وقت نورجہاں بجلی کی طرح تڑپ کر تخت سے نیچے

اُٹھی تیغ کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر بجلی کی طرح گرج کر بولی۔ جو آدمی ایک معصوم بچے کی جان لیتے وقت ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا۔ جو سنگ دل ماں کے ہاتھ سے اُس کے لختِ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، ظالم اور پاپی اس وقت جان کی امان کے لئے دوسرے کے پاؤں پر کتے کی طرح لیٹتا ہے میر غیاث الدین کا فرزند اور نور جہاں کا بھائی ایسا سنگدل اور نامرد نہیں ہو سکتا۔ تلوار نیام سے کوند کر آصف جاہ کے خرمن حیات پر گری۔ اور غرور اور تکبر سے بھرا ہوا سر خاک پر جا پڑا۔

آصف جاہ کے غرور و ظلم کے اس واقعہ کو صحیح ثابت کرنیکے لئے اخبار مذکور اثنائے تحریر میں لکھتا ہے کہ ہندوؤں میں برہمنوں کی ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک مہمان کے بھیک مانگنے پر ایک رانی نے اپنے بیٹے کو کاٹ ڈالا تھا۔ رانی نے اپنے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور راجہ نے تلوار سے اُس کا سر کاٹا۔ ایک مہمان کی یہ تواضع ہو سکتی ہے۔ تو کیا ایک نواب کے حکم سے ایسا نہیں ہو سکتا"

اب قابل غور امر یہ ہے کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ آصف جاہ نامی کوئی نواب یا افسر دور اکبری سے دور شاہجہانی تک دربار مغلیہ میں نہیں گذرا۔

آصف جاہ خطاب کا ایک امیر جس کا اصلی نام محمد شاہ تھا، اورنگ زیب کا تجربہ کار افسر تھا، دکن کی جنگ میں کارنمایاں دکھا چکا تھا، بیجاپور کی گورنری پر معمور تھا، زیادہ تر نظام الملک کے خطاب سے مشہور تھا۔ اس کے اقبال کا ستارا سنہ ۱۷۱۹ء سے سنہ ۱۷۴۸ء تک چمکتا رہا۔

"آصف الدولہ" اودھ کا نواب تھا، دس برس تک اودھ کی حکومت کی اور سنہ ۱۷۹۵ء میں انتقال کر گیا۔

ہاں البتہ "آصف خاں" نامی عہد اکبری سے دور شاہجہانی تک موجود تھا۔ یہ نور جہاں بیگم کا بھائی۔ شاہ جہاں کا خسر۔ ممتاز محل کا والد۔ جہانگیر کا سالہ تھا، دور اکبری میں صوبجات مشرقی کا گورنر تھا عہد جہانگیری کے آخر میں وزیر اعظم مقرر ہوا تھا۔

جہانگیر جب سنہ ۱۶۲۷ء میں انتقال کر گیا تو شاہ جہاں نے سنہ ۱۶۲۸ء میں اپنے خسر آصف خان کی مدد سے حکومت حاصل کی۔ گولکنڈہ کی جنگ میں جو سنہ ۱۶۳۲ء میں ہوئی تھی وہ اس مہم کا سپہ سالار تھا۔ اس کی موت جنگ گولکنڈہ کے بعد ہوئی اور اپنی موت مرا۔

واقعہ نویس نے آصف جاہ کو نور جہاں کا بھائی لکھا ہے۔ حالانکہ آصف جاہ نامی کوئی آدمی دور جہانگیری میں موجود نہ تھا۔ نور جہاں کے بھائی کا نام آصف خاں تھا۔ وہ جہانگیر کے حکم سے نور جہاں کی تلوار کا شکار نہیں ہوا تھا اور اس کی موت جہانگیر کی موت سے پہلے ہرگز نہیں ہوئی۔

جہانگیر سنہ ۱۶۲۷ء میں دنیائے فانی سے عالم باقی کا سفر کرتا ہے۔ آصف خاں جنازے کے ہمراہ موجود تھا۔ شہریار اور شاہ جہاں میں حصول تخت کیلئے رقابت پھیلتی ہے۔ آصف خاں شاہجہاں کی مدد کرتا ہے اور شاہ جہاں آصف خاں کی مدد سے سنہ ۱۶۲۸ء میں تخت حکومت کا مالک ہو جاتا ہے۔

شاہ جہاں بادشاہ ہو کر اپنے خسر آصف خاں کو جو ممتاز محل کا باپ اور نور جہاں کا بھائی ہے وزیر اعظم بناتا ہے۔

کسی فارسی یا انگریزی مورخ نے اس خونچکاں واقعہ کو آصف خاں کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔ مذکورہ بالا اخبار نے اس خونی کہانی کو دور جہانگیر کا واقعہ لکھا ہے۔ حالانکہ عہد جہانگیری کا زبردست تاریخی آئینہ تزک جہانگیری ہے جس میں دور جہانگیری کا ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ قلمبند ہے۔ اس میں اس واقعہ کا کہیں ذکر تک نہیں ہے" انار کلی" کے فرضی واقعہ کا بھی تزک جہانگیری میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ جہانگیر کا عدل بہت مشہور و معروف ہے۔ تاریخ میں بہت سے صحیح واقعات موجود ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں۔ اور یہ عدل جہانگیری کے درخشاں موتی ہیں۔

رہا آصف خاں تو اُس کی رحمدلی کا ہر مؤرخ قایل ہے۔ صرف اس کی وجہ سے شاہ جہاں میں نرم دلی اور رعایا پروری کے اوصاف ظاہر ہوئے نور جہاں جب مہابت خاں کی جان کی گاہک بنی ہوئی تھی اور وہ بھاگا بھاگا پھرتا تھا تو یہی آصف خاں نور جہاں کی حرکت سے متنفر ہو کر مہابت خاں پر رحم کرتا ہے اور اپنے دامن میں اُسے جگہ دیتا ہے۔

اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے سے یہ ماننا پڑے گا کہ آصف خاں جہانگیر کی موت سے پہلے مارا جاتا ہے۔ حالانکہ جہانگیر کی موت کے پانچ سال بعد گولکنڈہ کی لڑائی ہوتی ہے۔ شاہ جہاں اس میں آصف خاں کو افواج سلطانی کا سپہ سالار بنا کر بھیجتا ہے۔ یہ دکنی جنگ سنہ ۱۶۳۲ء میں واقع ہوئی، آصف خاں اس جنگ سے بخیر و خوبی واپس گھر ہوتا ہے۔ اس کی موت گولکنڈہ کی جنگ کے بعد بیماری سے واقع ہوئی تھی۔ ایک دفعہ دربار شاہجہاں میں یہ تذکرہ چلا کہ چار شہزادوں۔ دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب، مراد میں سے کون حکومت کی صحیح قابلیت رکھتا ہے۔ اور دربار نے آصف خاں وزیر اعظم کو اس جوہر شناسی کے امتحان کیلئے مقرر کیا۔ اور اُس نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔

ممکن ہے واقعہ نگار کو خود بھی اس واقعہ کی صحت میں شک ہو۔ اور اس بنا پر اُس نے ایک ہمن راجہ کے واقعہ کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ بھی کسی ظالم حاکم کے حکم سے نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ہندوؤں کے

علم الاصنام کا ایک افسانہ ہے جو سنسکرت کی کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ راجہ کرن ستیہ جگ میں گذرا ہے۔ سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا ایک دن بھگوان نے یہ خیال کیا کہ چلو اس راجہ کی آزمایش کی جائے چنانچہ ایک بوڑھے برہمن کی صورت میں راج دربار میں حاضر ہوا۔ راجہ نے تعظیم دیکر عرض کیا۔ کیا ارشاد ہے؟ برہمن نے کہا میں نے برت رکھا ہے اب تک کچھ نہیں کھایا ہے۔ تیرے گھر برت کھولوں گا تو وعدہ کر کہ میں جو کچھ کھاؤں گا کھلائیگا؟ راجہ نے کہا جو کچھ ارشاد ہوگا بجالاؤں گا۔ برہمن نے کہا میرا یہ عہد ہے کہ میں گوشت سے برت کھولوں گا۔ راجہ نے عرض کیا کہ کس طرح کا گوشت حاضر کیا جائیگا؟

برہمن نے کہا جلدی نہ کرو سنو جب تمنے وعدہ کرلیا ہے تو اب اس کا پورا کرنا فرض ہے۔

تم بی بی شوہر اپنے ہاتھ سے اپنے لخت جگر کو پکڑ کر ذبح کرکے اس کا گوشت پکا کر مجھے دو۔ میں اس سے برت کھولوں گا ورنہ میں واپس جاتا ہوں عہد شکنی کا وبال تیری گردن پہ ہوگا۔ راجہ رانی نے کہا کہ یقیناً ایشور ہمارے امتحان کو برہمن کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ورنہ برہمن اور گوشت کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، لڑکے سے کہا گیا۔ وہ بھی بخوشی تیار ہوگیا۔ لڑکا ماں باپ کے ہاتھوں ذبح کیا گیا۔ گوشت پکا کر دسترخوان پر چنا گیا۔ برہمن نے کہا کہ میری ایک یہ بھی عادت ہے کہ کبھی میں تنہا نہیں کھاتا۔ ایک معصوم بچے کو ضرور شریک طعام رکھتا ہوں، تم اپنے بچے کو بلا لو۔ راجہ نے کہا، وہ کہاں سے آئے، وہ تو ذبح ہو چکا ہے۔ برہمن نے کہا غلط، وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا ہے۔ آواز دی گئی بچہ فوراً دوڑتا ہوا آگیا ماں نے گلے لگایا، برہمن نے آشیرباد دی اور کہا تو سچا ہے"

یہ واقعہ ہے جسے تاریخی واقعات کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے! آصف جاہ کا واقعہ بالکل غلط ہے۔ تاریخی غلطی تو ظاہر ہو چکی ہے۔ مگر یہ عقل کے بھی بالکل خلاف ہے۔ کوئی والدین جابر سے جابر حاکم کے حکم سے اپنے معصوم بچے کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح نہیں کرسکتے۔ اپنی جان دے سکتے ہیں مگر حکومت کے حکم سے اپنی جان بچانے کے لئے اپنے ہاتھوں اپنے ننھے بچے کو ذبح نہیں کرسکتے۔ اور نہ تاریخ میں اس طرح کا کوئی واقعہ موجود ہے۔

محمد عمر زکریا۔ بھاگلپوری

نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غالب

نقائصِ شعری

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ نثر کی نسبت نظم لکھنا زیادہ مشکل ہے کیونکہ نثر میں تو صرف قواعدِ زبان کی پابندی کرنی ہے مگر نظم میں وزن اور قافیہ کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ بسا اوقات اکثر نادر مضامین اور اچھوتے خیالات محض اس لئے نظم ہونے سے رہ جاتے ہیں کہ شاعر ایک نظم کیلئے جو وزن اور قافیہ مقرر کر لیتا ہے۔ اُس میں اُن مضامین اور خیالات کو ادا کرنے والے الفاظ بندھ ہی نہیں سکتے۔ یہ وہ دشواری ہے جس کی وجہ سے فنِ شاعری کے جاننے میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ضرورتِ شعری قواعدِ زبان کی خلاف ورزی کو جائز ٹھیراتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اساتذہ نے ضرورتِ شعری کی حالت میں زبان وغیرہ کی بعض پابندیوں سے آزاد ہو جانا جائز قرار دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی طبیعت رُک جائے وہیں ضرورتِ شعری کا اُصول برت لیا جائے بلکہ ضرورتِ شعری کیلئے قواعدِ زبان سے انحراف کرنے کیلئے خاص قواعد ہیں محض وزن اور قافیہ کی قید اختیار کر کے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ باقی تمام قیودِ سخن کو بالائے طاق رکھدے اور جو کچھ جس طرح اُس کے جی میں آئے لکھ مارے وزن اور قافیہ تو ایسی چیزیں ہیں کہ جو شخص ان کو نباہنے پر قادر نہ ہو اُسے شعر کہنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھانی چاہیئے۔ شاعر کی کم از کم تعریف یہ ہے کہ وہ وزن اور قافیہ کی قید میں رہتا ہوا قواعدِ زبان اور اُصولِ بلاغت کی پابندیوں کو بوجوہِ احسن نباہ سکے۔ ورنہ اگر شعر صرف اُن چند الفاظ کے دو با قافیہ ٹکڑوں کا نام ہو جن کے ملنے سے ایک وزن پیدا ہو جائے تو دنیا ایسے آدمیوں سے خالی نظر آنے لگے گی جن کو شاعر کہلانے سے عار ہو۔

فی زمانہ شعر کے صحیح مذاق کا جو فقدان نظر آ رہا ہے اُس کی ذمہ داری بھی زیادہ تر ضرورتِ شعری کے عذرِ لنگ پر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی اچھے خاصے تعلیم یافتہ انسان کے سامنے یہ کہہ بیٹھیں کہ فلاں شعر میں صبر بروزن خبر بندھ گیا ہے جو غلط ہے تو وہ فوراً یہ جواب دے کر اپنی حاضر جوابی کا ثبوت مہیا کرے گا کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے۔ گویا ضرورتِ شعری ایک ایسی چادر ہے جو تمام عیوبِ شعر کی پردہ پوشی بڑی آسانی سے کر سکتی ہے۔ شتر گربہ تعقید محاورے کا غلط استعمال۔ الفاظ کا ناقص انتخاب۔ غرضیکہ کوئی عیب بھی ضرورتِ شعری کی موجودگی میں عیب نہیں رہ جاتا۔ بلکہ حسن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ضرورت کے صدقے عوام کے نزدیک کسی شعر کا غلط ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا ایک مطلق العنان بادشاہ سے کسی جرم کا سرزد ہونا۔

نثر کی نسبت نظم صرف اس لئے مشکل نہیں کہ نظم میں وزن قافیے کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وزن اور قافیے کی پابندی کے ساتھ ہی ساتھ اُن تمام اُصولوں کا احترام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے۔ جن کے بغیر نثر صحیح معنوں میں نثر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بات تو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کسی شعر کی زبان نثر کے جس قدر قریب ہو۔ اُتنا ہی وہ شعر اچھا سمجھا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی شعر سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو غیر محسوس طور پر ہم اس بات کا اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے لکھنے میں شاعر نے کون کونسی مشکلات پر غلبہ پایا ہے۔ اس طرح سے مشکلاتِ نظم کا مصرف یہ نہیں کہ ان کا عذر رکھ کر ہم شاعری کی زبان کو بالکل بگاڑ دیں اور اسبات کا خیال تک نہ رکھیں کہ ہم جو الفاظ استعمال کرتے ہیں اُن سے ہمارے مافی الضمیر کا اظہار صحیح طور پر ہوتا ہے یا نہیں۔ کسی شعر کو شعر اُسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ نہ تو ضرورت سے زیادہ ہوں نہ ادائے مطلب میں قاصر۔

فارسی زبان کا ایک شعر ہے ؎

صائب دو چیز مے شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

اِس شعر کا حوالہ دادِ سخن کے سلسلہ میں اگرچہ اب بھی کثرت کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ مگر آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ عام شعرا "تحسینِ ناشناس" ہی کو سرمایۂ افتخار جانتے ہیں "سکوتِ سخن شناس" کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ بلکہ اُسے معاصرانہ رقابت پر محمول کرتے ہیں بالفاظ دیگر آجکل "تحسینِ ناشناس" ہی شعرا کی حقیقی رہنما ہے وہ دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں میں اُن کے شعر خامیوں کے باوجود پسند کئے جاتے ہیں اُنہیں بے تحاشا داد مل جاتی ہے۔ کبھی کوئی اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتا اس لئے وہ شعر لکھنے میں محتاط رہنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایسا کرنا تضیعِ اوقات میں داخل سمجھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اُنہیں خامیوں کا احساس بھی نہیں رہتا یہ ایک ایسی خرابی ہے کہ اگر اس کا مناسب اور بروقت تدارک نہ کیا گیا۔ تو خطرہ ہے کہ اُردو شاعری کا معیار کچھ عرصہ کے بعد بہت ہی پست ہو جائیگا۔ اندریں حالات ضروری معلوم ہوتا ہے

کہ عوام میں شعر کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے شعر ناقص ہو جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق دوکاندار اُنہی چیزوں کی نمائش کرتا ہے جن کی خریداری زیادہ ہو۔ اگر عوام میں شعر کی داد دیتے وقت اُس کے حسن و قبح پر غور کر لینے کی عادت راسخ ہو جائے تو شعرا بھی اپنی کوئی نظم عوام کے سامنے پیش کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا کریں گے کہ اس میں کوئی نقص تو نہیں رہ گیا۔

نقائص شعری کی توضیح کرنے کے لئے جو شعر منتخب کئے گئے ہیں۔ اُن کے مصنفین میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی قابلیت مسلم ہے اور جو بجا طور پر آسمانِ سخن کے روشن ستارے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان حضرات سے اگر وہ بقید حیات ہوں، راقم السطور کی گذارش یہ ہے کہ اس مضمون سے کسی کی تنقیص مقصود نہیں۔ بلکہ مذاق عام کی اصلاح مطلوب ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کسی شعر کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ بعض شعروں کے متعلق خود راقم السطور کو بھی یہ معلوم نہیں کہ ان کا وجود کون کون سے شعرا کی کاوشِ فکر کا رہین منت ہے۔ بہرحال ذیل میں ایسے اشعار کے نمونے درج کئے جاتے ہیں جو قواعد زبان اور اُصول فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اُتر سکتے ؎

(۱)
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

اس میں شک نہیں کہ زور بیان اور صفائی زبان کے اعتبار سے یہ شعر ایک امتیازی شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر پہلے مصرعے میں لفظ "بازو" بلاضرورت یا ضرورت شعری سے استعمال کیا گیا ہے۔ نفس مضمون کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے شاہِ حجاز کا حملہ لکھ دینا ہی کافی تھا۔ پھر یہاں بازو کا استعمال محاورے کے بھی سراسر خلاف ہے۔ فوج کا حملہ، شیر کا حملہ۔ امان اللہ خاں کا حملہ تو بولا اور لکھا جاتا ہے۔ لیکن فوج کے قدموں کا حملہ، شیر کے پنجے کا حملہ یا امان اللہ خاں کے ہاتھ کا حملہ کبھی نہیں سُنا۔ اسی طرح شاہ حجاز کے بازو کا بھی ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس کی بجائے اگر شاہِ حجاز کی فوج کے بازو کا حملہ ہوتا تو ایک بات تھی کہ فوج کا جو حصہ باہر کی طرف پھیلا ہوتا ہے اُسے بازو کہتے ہیں۔ لیکن فوج کی رعایت سے جہاز اور جہازی اصطلاحات کو قید نظم میں لانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بازو کا استعمال جہاز اور لنگر کی رعایت سے کیا گیا ہے اور بازو سے مراد مچھلی ہے جس کا گھر جہاز کی طرح سمندر یا دریا ہوتا ہے تو اس میں بھی یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ معمولی مچھلی سے جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اور وہیل مچھلی یا شیار کا وجود الفاظِ شعر سے ثابت نہیں اس کے علاوہ مچھلی کو بازو یا بازو کو مچھلی کے تلازمات میں تو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مچھلی کے معنے بازو یا بازو کے معنے مچھلی لینا کسی طرح بھی جائز نہیں نہ اس قسم کے دور از کار استعارات سے شاعری کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے ؎

(۲)
آئے اجل نہ عیسیٰ بے موت ہی مریں گے
دونوں کو ہو مبارک تاخیر اپنی اپنی

پہلے مصرعے میں "بے موت ہی مریں گے" اس طرح بندھا ہے۔ گویا اجل کی طرح عیسیٰ کا کام بھی ہلاک کرنا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر اجل بھی نہیں آتی تو نہ آئے۔ اور حضرت عیسیٰ بھی تشریف نہیں لاتے تو نہ لائیں ہمیں دونوں میں سے کسی کی پروا نہیں۔ نہ اُن کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم بے موت ہی مر سکتے ہیں۔ مگر مسیحائی جو حضرت عیسیٰ کے دوسرے نام مسیح سے مشتق ہے ہمیشہ زندہ کرنے کی طاقت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اپنی اپنی محض برائے ردیف ہے جسے کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر تاخیر کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ اپنی اپنی لکھنا محاورے کا خون کرنا ہے ؎

(۳)
کون سی راہ چلوں کفر و محبت سچ کہہ
کام آئیگا وہاں مذہب اسلام کہ تو

اس شعر کا شمار ان شعروں میں بھی نہیں ہو سکتا۔ جن کے معنی نہاں خانۂ بطنِ شاعر میں مستور رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ عقیدت مندوں کی آیندہ نسلوں میں سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں سخن فہمی کی ساری طاقتیں اس بات کا سُراغ نکالنے میں زائل ہو کر رہ جاتی ہیں کہ پہلے مصرع میں شاعر کا مخاطب کون ہے۔ اگر خطاب کا نشانہ کفر و محبت کو بنایا گیا ہے تو یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے لئے صیغہ واحد حاضر کیوں استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعے میں ان کو لفظ "تو" سے مخاطب کرنے کا جواز کیا ہے۔ اس کے علاوہ "سچ کہہ" کا محل استعمال بھی غلط ہے شعر کے سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مخاطب سے مشورہ طلب کر رہا ہے۔ حالانکہ جب کسی سے سچ کہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ تو ایک زیر بحث واقعہ کی تصدیق یا تردید کرانا مقصود ہوتا ہے "مذہب اسلام" کی ترکیب بھی شاعر کی بے پروائی کا شکوہ کر رہی ہے جب پہلے مصرعے میں کفر و محبت کو صرف کفر و محبت کہنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ تو دوسرے مصرعے میں اسلام کے ساتھ مذہب کا دُم چھلا لگانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر کفر و محبت شاعر کے نزدیک دو قریب المعانی الفاظ ہیں۔ تو اسلام کے ساتھ کوئی ایسا لفظ بھی لگانا چاہیئے تھا۔ جو قریب قریب اس کا ہم معنی ہوتا

پھر کفر تو مسلمہ طور پر اسلام کی ضد ہے۔ مگر محبت کے متعلق ہر حالت میں یہ فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ عاقبت کے معنوں میں لفظ "وہاں" کا استعمال بھی عجز طبع پر دلالت کر رہا ہے۔ پہلے مصرع میں "کونسی راہ چلوں" لکھنے کے بعد دوسرے مصرع میں "کام آئیگا" لکھنا بھی رعایت لفظی یا معنوی میں داخل نہیں "راہ چلنے" پر کمر باندھی جائے تو "منزل پر پہنچے" کی بات کرنی چاہیئے ۔

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے
(۴) سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

یہ شعر حالیہ شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے قابل ہے شاعر شراب پینے کی عادت میں بُری طرح مبتلا تھا۔ اس عادت نے اسکی صحت کو خطرناک حد تک خراب کر دیا تھا اور انجام کار اس کی جان بھی لے لی۔ حالت نزع میں اس نے اپنے ملازم سے شراب مانگی۔ مگر ملازم نے خیر خواہی کے خیال سے اسے پانی دیدیا۔ شاعر نے ملازم کا مطلب سمجھ لیا۔ اور یہ شعر اس کی زبان سے نکل گیا۔ متکلم کا یہ کہنا کہ ساقی نے مجھے بدحواس سمجھ لیا ہے۔ ورنہ وہ شراب کی بجائے مجھے پانی کا گلاس ہرگز نہ دیتا۔ ایک ایسی رندانہ چوٹ ہے جس کا لطف اُٹھانا ذوق سلیم سے تعلق رکھتا ہے لیکن پہلے مصرعے میں لفظ "اک" محض وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا نقص ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے

حقیقت میں ہو تم دنیا سے اچھے
(۵) حقیقت میں مگر دنیا ہی کیا ہے

بادی النظر میں یہ شعر بہت ہی اچھا ہے۔ دونوں مصرعوں کے شروع میں "حقیقت میں" ایسی برجستگی کے ساتھ آیا ہے کہ لطف تکرار کے ساتھ ہی شعر میں کمال کی صفائی اور روانی بھی پیدا ہو گئی ہے لیکن اگر گوہر معانی کی تلاش کیلئے غور و فکر کے سمندر میں غوطہ لگایا جائے تو مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ تم حقیقت میں دنیا سے اچھے ہو۔ مگر حقیقت میں دنیا ہی کچھ نہیں ہے۔ معشوق کو ایک ایسی چیز سے اچھا ثابت کرنا جو خود اچھی نہ ہو کسی طرح بھی کمال سخن میں داخل نہیں۔ شاعر نے تہیہ کیا تھا اپنے معشوق کی تعریف کرنے کا مگر الفاظ کے پھیر میں آکر کر گیا اُس کی مذمت۔ ایک مستند شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد سے ایسی صریح لغزش ہو جانا بلاشبہ باعث تعجب ہے۔ دھوم دھام کے ساتھ اُٹھنا۔ اور قدم اُٹھانے سے پہلے دھم سے زمین پر گر پڑنا اس کو کہتے ہیں۔ اغلب ہے کہ شاعر کی یہ لغزش غیر ارادی ہو مگر ہے لغزش۔

میلارام وفا
ایڈیٹر روزانہ ویر بھارت لاہور

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک چلی شراب کئی دور ہو گئے

فرنگی سے کہا پنشن بھی لیکر یہیں رہئے — کہا جینے کو آئے ہیں یہاں مرنے نہیں آئے

لے جائیں آہ مجھکو مری بدگمانیاں — ظالم وہاں کہ تیرا پتہ بھی جہاں نہ ہو

شکستوں سے محبت کی اور کیا حاصل — کچھ انفعال تمہیں ہو کچھ انفعال مجھے

کیونکر نہ مریں موت پہ بیمار محبت — ایسا یہ مزہ ہے کہ مکرر نہیں ملتا

دنیا میں وضعدار حسین اور بھی تو ہیں — معشوق اک تمہیں تو نہیں اور بھی تو ہیں

وہاں جھوٹے وعدہ پہ لب ہل گیا — توقع یہاں کس قدر ہو گئی

ایکٹرس

"سائینورا! سائینورا!"
دروازہ کھلا اور خادمہ بیتابانہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ جس کا قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ اور اس کا چہرہ گھبراہٹ سے زرد ہو رہا تھا

"خدایا تیرا شکر! وہ موجود ہے۔"
گوڈٹا نے جو اپنا پیانو کھول رہی تھی۔ اس کا ڈھکنا گر جانے دیا۔ وہ گرا اور پیانو کے سُر گونج اُٹھے۔
اس گھبراہٹ میں اُس آدمی نے دفعتہً ہانپتے ہوئے کہا۔
"لیمبرٹی بیمار ہے۔ مرگئی۔ ختم ہوگئی۔ ہم نے آج رات "رقص بہار" رکھا تھا اور اسے اس میں بشیرو مغنیہ کا پارٹ کرنا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ بھی موجود ہوں گے۔ گوڈٹا تمہارے سوا اس پارٹ کو کوئی نہیں گا سکتا۔ گوڈٹا تمہیں گانا ہوگا! تمہیں آؤ اور اس تمثیل کو پورا کرو۔ ہاں یہ پارٹ تم جانتی ہو؟ کیوں نہیں؟ کیا تمام یاد ہے؟"

"تمام" نوخیز ایکٹرس نے کہا جو پیانو کے قریب ایک ملبوس مجسمے کی مانند کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ منیجر کے چہرہ سے زیادہ زرد تھا۔ "میں "رقص بہار" گا سکتی ہوں اور لیمبرٹی سے بہتر اس پارٹ کو ادا کرسکتی ہوں۔ اس نے میرے لئے میدان چھوڑ ہی دیا نا؟ کیا نہیں؟"

"گوڈٹا۔ کیا تمہیں ریہرسل کی ضرورت نہیں؟ میں ایک منٹ میں آرکسٹرا جمع کئے دیتا ہوں...."

وہ کرسی میں پیچھے کی طرف بے قابو سا ہو کر گر پڑا۔ گویا کانپتے ہوئے گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ وہ تباہی سے بچا لیا گیا تھا۔ وہ گوڈٹا کی بلبل کی سی آواز کو اچھی طرح جانتا تھا۔

"نہیں" اُس نے کہا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں ہر ایک ریہرسل میں موجود رہتی ہوں۔ میں نے اس پارٹ کو اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اسی انتظار میں کہ کوئی معجزہ ظاہر ہو۔ میں ہر ایک انداز نظر۔ ہر ایک تے ہر ایک قدم اور تبسم سے آگاہ ہوں۔ میں گاؤں گی اور ضرور کامیاب بھی ہوں گی۔ لیمبرٹی مر رہی ہے۔ تم یہی کہتے ہو نا؟"

منیجر نے اسے گلے سے لگا لیا اور تیزی کے ساتھ کمرہ سے نکل کر پریس والے کی طرف چلا گیا کہ وہ آج کے تماشے کے اشتہارات میں گوڈٹا کا نام درج کر دے۔ جن کی زمین سبز اور حروف سیاہ ہونا چاہئیں۔ رقص اور نغمے کی ملکہ مر رہی تھی۔ اس کی جانشین گوڈٹا ہی ہونی چاہئے اور ہوگی۔

جس وقت سے گوڈٹا اسٹیج پر آئی تھی وہ اب تک محض خواصوں اور دہقانی لڑکیوں اور ہیروئن کی کسی حقیر اور غیر نمایاں خادمہ کا پارٹ گاتی رہی تھی۔

جس وقت منیجر کمرے سے باہر چلا گیا وہ مجسمہ کی طرح بےحس و حرکت تھی۔ مگر لمبے لمبے سانس لیتی اور نرم نرم سسکیاں بھر رہی تھی۔
"ایلینا سامان باندھ لو"۔ اُس نے خادمہ سے بآواز بلند کہا "سرخ بالوں کی ٹوپی۔ موتی۔ مونگے۔ سرخ ریشمی جوتے۔ سنہرے اور روپہلے کپڑے ان میں سے کوئی چیز رہ نہ جائے۔ میں لیمبرٹی ہی کا لباس پہنوں گی۔ وہ میرے ہی قد و قامت کی ہے۔ اگرچہ میں اس سے زیادہ دُبلی پتلی ہوں۔ تمہیں ٹھہرنا ضرور پہنچنا ہے۔ لو جلدی کرو۔ وہاں تمہیں کچھ سینا بھی ہوگا۔ وقت کیا ہے؟ ابھی پانچ بجے تھے اور تماشا آٹھ بجے ہونا تھا۔ وہ اپنا سنگھار کو ڈالی لو بیٹھ گئی۔ وہ دوسرے ایکٹ کے ابتدائی نغمے کی تان پر گلا بازی کر رہی تھی کہ اتنے میں اُس نے دروازے پر گھنٹی کی آواز سنی۔
"ایلینا کسی کو اندر مت آنے دو۔ خواہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔" وہ ایک صاف لطیف میٹھے سُروں کا دلاویز راگ گا رہی تھی کہ دروازہ اچانک کھل گیا۔

"اوکول! ارے تم کیا چاہتے ہو اوکول؟"
یہ شخص اس کے قدیم مربی شہزادے کا خادم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پرنس سٹیلیو بیمار ہے۔ بہت بیمار۔ کیا اُس کے خادم کی آمد کے یہ معنے ہیں کہ وہ مر رہا ہے۔ اور کیا اسے دوسرا وقت میسر نہیں آیا کہ اسی وقت مرنا ہے۔ غریب خدمتگار کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ غصہ میں گھونسہ تان رہی تھی۔ ہاں تو شہزادہ مر رہا ہے اور اسی وقت مر رہا ہے۔ اُسی نے اُسے بلایا ہے۔ اور اپنے وفادار خدمتگار کو بھیجا ہے کہ وہ اس کو بلا لائے۔ کیا اسے ضرور جانا ہوگا؟ ہاں اسے جانا ہی چاہئے۔ کیونکہ وہی تو اس کے معلموں اس کے موسیقی کے اُستادوں اور دیگر خانگی ملازموں کو تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ اسی نے اُسے زندگی دی۔ اُسے آرٹ سکھایا۔ راگ میں اُستاد بنایا۔ اگر اس کی

سرپرستی اسے حاصل نہ ہوتی تو وہ ابھی تک کہیں وایالار گاہی میں پڑی رنگتر ے بیچ رہی ہوتی۔

"ایلینا"۔ اُس نے کہا "تم تو تھیٹر کو جاؤ۔ اور میں ابھی ایک گھنٹہ میں وہاں پہنچتی ہوں۔ دیکھو سب سامان لیس رہے۔ شہد اور فینل کا ایک مرکب بنا لینا اور ۔ ہاں میرے لئے تین انڈے ۔ اور یوکلپٹس آئیل کے چند قطرے تیار رہیں"۔

اُس نے اپنے چھوٹے خوبصورت سنہرے بالوں پر اوڑھنی سی ڈال لی۔

"سائنورا! موٹر باہر حاضر ہے"۔ ارکول بولا۔

اُس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا کہ اب جب وہ دوبارہ اس کمرہ میں داخل ہو گی تو یہاں کی ہر ایک چیز پہلے سے مختلف ہو گی۔ بادشاہ اُسے مبارک باد کہیگا۔ وہ مشہور ہو گی۔ ہجوم اُس کے نام کے نعرے لگائیگا۔ اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا کہ اُس تغیر سے ملاقات کرے جس کا اُس نے خواب دیکھا ہے۔ اُس کی موٹر روما کی سڑکوں پر سے اُڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور ستون۔ فوارے۔ گرجا گھروں کے دروازے محلات کی فصیلیں بادلوں کی سی تیزی سے اس کے پاس سے گذرتے جا رہے تھے۔ شہر کی مختلف آوازیں شور انگیز موجوں کی مانند اسکی موٹر سے ٹکرائی تھیں۔ آج کے بعد کل اسے ہر ایک شخص کی طرف سے مبارک باد ملیگی۔ سر تعظیم کے لئے اس کے سامنے جھکیں گے۔ لوگ اس کی آمد کی آواز سنتے ہی اس کے لئے راستہ چھوڑ دیں گے۔ آج نہیں کل۔ ....

وہ اُچھل کر موٹر سے نکلی۔ لیکن پرنس سٹیلیو مر رہا ہے۔ مر رہا ہے تو پھر اسے کیا؟ اس کے پاس اب کسی کے لئے وقت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اتنا بھی نہیں کہ وہ اپنے سرپرست سینٹ جیسٹینا سے دعا ہی کر سکے۔ برابر کے کمرے میں ڈاکٹر تھا جو واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"سائنورا میں پھر آتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ غالباً شہزادہ تین گھنٹہ تک اور زندہ رہے گا۔ اب درد کا کچھ احساس نہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا خاموش ہو جانے سے پہلے اس کی زبان پر لگاتار تمہارا ہی نام تھا۔ اس کی آنکھیں تمہیں بند کر دینا چاہئیں۔ اس کے الفاظ ہیں کہ وہ تمہیں دیکھے بغیر نہیں مر سکتا تمہیں ضرور اس کے پاس ٹھیرنا چاہیئے۔

"تین گھنٹے ......"

"میں ایک گھنٹہ میں پھر واپس آتا ہوں اور اب اسے کسی چیز کی ضرورت بھی نہ ہو گی۔ تم خاموشی سے اس کے پاس بیٹھی رہو۔ یہی آخری عطیہ ہے جو اس زندگی میں تم اسے دے سکتی ہو۔ یہی محبت اور فرض کی آخری خدمت ہے۔ تم اسے مرجانے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ سکو گی"۔

گوڈٹا نے ڈاکٹر کی ان باتوں پر کان نہیں دھرا۔ اور بددلی سے کہا۔ "تم نے تین گھنٹے بتائے ہیں"۔

"ہاں قریباً تین گھنٹے۔ سائنورا دنیا کی کوئی چیز تمہیں ان تین گھنٹوں کو کھو دینے پر مائل نہیں کر سکتی۔ آج ہی صبح اُس نے اپنی وصیت مکمل کی ہے اسے پتہ تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ سائنورا اُس نے اپنی آدھی جائداد تمہارے نام منتقل کر دی ہے۔ اور تم جانتی ہی ہو کہ یہ ایک دولتمند شخص ہے"۔

"تین گھنٹے ....."

اس نے تکبر اور حقارت سے بھری ہوئی نگاہ ڈاکٹر پہ ڈالی۔

"بہت اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میرا فرض کیا ہے"۔

اُس نے ڈاکٹر کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ اسے خوب معلوم تھا اس کا بلند ترین فرض کیا ہے۔ آرٹ! آرٹ! آرٹ! وہ ضرور گائے گی۔ وہ ضرور پبلک کے سامنے اپنے رقص کا کمال دکھائیگی۔ قسمت کا معجزہ ہماری زندگی میں ایک ہی بار دکھایا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنا وہ موقعہ کھو دیں تو پھر کبھی دوسرا موقع ہاتھ نہیں آتا۔

وہ کمروں میں سے گذری اُس نے دیکھا کہ پرنس کے خدمتگار دروازوں پہ گھٹنوں کے بل ہو ہو کر گڑگڑاتے سسکیاں بھرتے۔ اور آہستہ آہستہ منتیں مان رہے ہیں۔ سردی کی شام بڑھی چلی آ رہی تھی۔ پہلی بتی ہر شمعدان میں روشن ہو چکی تھی۔

وہ بیٹھ گئی اور حساب کرنے لگی۔ اسے اپنے ڈرائنگ روم میں چھ بجے پہنچ جانا چاہیئے۔ کیونکہ تبدیل لباس اور تیاری کیلئے ایک گھنٹہ سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ اور سٹیج پر جانے سے پہلے آدھ گھنٹہ اسے بغیر کسی قسم کے دغدغے کے پورے طور پر استراحت کر لینا چاہیئے ورنہ وہ گا نہیں سکے گی۔ بدبخت یہ اس وقت کیوں مرتا ہے۔ کیا اس نے اس کو تمام مدد اسی گھڑی کے لئے دی تھی۔ کہ اسے آخری وقت میں اپنی مشقت و جانفشانی کے انعام سے محروم کر دے؟ کیا یہ شہزادے کی طرف سے اسکی سرد مہریوں کا انتقام ہے جو وہ اس سے برتتی رہی اور جس کے چھپانے کی اسے قدرت نہ تھی؟ وہ محبت اور اس کی گرمیاں اور سخاوت۔ یہ سب باتیں اس کے گانے کے کمال کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ بھلا اب وہ ایک آدمی کیلئے گانا کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اسکی زندگی کا سارا جذبہ تو اس کی آواز میں ہے۔ اور پھر کس طرح اس کا دل سرد نہ ہو۔ اور کس طرح کوئی اس سے اس وفا اور شیفتگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جو اس کے فن ہی کیلئے وقف ہو چکی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اسے اس شخص پہ مطلق رحم نہیں آنا چاہیئے جو اس کی پورے پانچ برس کی ریاضت اور شوق و آرزو کا پھل اس سے

چھین کر اسے مایوس اور حرماں نصیب بنا دینا چاہتا ہے۔

شہزادہ اپنی بڑی مسہری پر یوں لیٹا ہوا تھا کہ شمع کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا۔ اور سرخ روشنی کی شعاعیں ابدی راحت حاصل ہونے سے پہلے اس پر پڑ رہی تھیں

ارکول کمرہ سے باہر چلا گیا۔ گوڈٹا ــ ریشمی لباس کی سرسراہٹ کے ساتھ بیمار کے بستر کے پاس گئی۔ اس نے کمرے کے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ فقط مرنے والے کی اُکھڑی اُکھڑی سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شمع کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریاں منقش دیوار و پر حرکت کر رہی ہیں۔ اور روم کے گڈریوں کے محافظ دیوتا۔ محافظت کے لئے اُن کے پیچھے پیچھے ہیں اور عشق کا دیوتا کیوپڈ ان پر مسکرا رہا ہے۔

مرنے والے نے اپنی آنکھیں کھولیں ان میں دھندلا سا جالا آیا ہوا تھا۔ کیا وہ اندھا ہو گیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے۔ گوڈٹا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا کہ اچانک پرنس سٹیلیو نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ اسے دبایا اور بھینچا۔ اب گوڈٹا اس کی گرفت میں تھی۔ گویا کہ وہ ایک وحشی درندے کے جبڑوں کے درمیان ہے۔

"مجھے چھوڑ دو! ورنہ میں تمہارا بازو توڑ ڈالوں گی۔"

لیکن وہ اس طاقت سے بےخبر تھی جو مرنے والوں میں غیب سے آجاتی ہے۔

پرنس سٹیلیو نے اسے اپنی فولادی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اب نہ ہلتا تھا۔ نہ دیکھتا تھا۔ اور نہ سنتا تھا۔ زندگی تمام جسم سے کھنچ کر اس کے بازوؤں کے عضلات میں آگئی تھی۔ آخر گوڈٹا نے جدوجہد چھوڑ دی اور اپنا ہاتھ مرنے والے آدمی کی گرفت ہی میں رہنے دیا۔ اس سے اس کی روح گھلی جاتی تھی۔ اُس نے خیال کیا۔

"مجھے اس کمرے سے آدھ گھنٹہ بعد چلے ہی جانا چاہیئے۔ ورنہ بہت زیادہ دیر ہو جائیگی۔ اب کیپو کے کلیسا سے سوا پانچ بجنے کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے چھ بجے تھیٹر میں حاضر ہونا چاہیئے۔ ورنہ آج کی رات میں نہیں گا سکوں گی۔ ہائے! یہ مر کیوں نہیں جاتا؟"

کیا وہ اپنی مدد کیلئے چلاتی؟ چلاتی؟ تو کون اسے چھڑانے آتا؟ سب لوگ اسی کو مجبور کرتے کہ یہیں ٹھیری رہے۔ جب تک کہ یہ مر چکے۔ مر چکے۔ تین گھنٹوں میں شہزادے کی نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پہچانتا تھا؟ اگر پہچانتا تھا تو اس پر اسرار ساعت میں کس قدر پہچانتا تھا؟ کیا گوڈٹا کے دل کا راز اس پر کھل گیا تھا؟ کیا وہ ان خواہشات اور خیالات کو جو اس کے دل میں بھرے تھے دیکھتا تھا؟ ابھی تک اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ نہیں چھوڑتا۔ گوڈٹا نے اُسے کیا اسی طرح جس طرح کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً اُس نے چلا کر کہا۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ آخر کیوں اور کس لئے میں اپنا مستقبل اپنی زندگی تمہاری بےہوشی کی آخری ساعتوں پر قربان کر ڈالوں؟ واہ کیا تمہاری موت اتنی گراں قیمت ہے جتنی کہ میری شہرت۔ سٹیلیو! میرے لئے ایثار کرو۔ وہ روپیہ جو تم نے مجھ پر اور میرے لئے اُٹھایا وہ تمہارے واسطے کوئی چیز نہ تھا۔ کچھ قیمت نہیں رکھتا تھا تم میری ساری زندگی میں سے صرف دو گھنٹے مجھے دیدو۔ لو معاملہ طے ہو گیا۔ ہاں طے ہو گیا۔ کیونکہ تمہیں نے مجھے بنایا اور پیدا کیا ہے۔ اور آج کی رات تو مجھے گانا ہے۔"

پھر اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے نائٹ ٹیبل کا ایک دراز کھولا۔ اور اس میں سے ایک ڈبہ نکالا جس میں کچھ سفوف رکھے تھے اُن میں سے ایک اُس نے اکثر دفعہ شہزادے کو سُلانے کے لئے استعمال کرایا تھا۔ اور وہ اس کی طاقت سے واقف تھی۔ اس بکس میں اب تین قسم کے سفوف موجود تھے۔ اُس نے ان تینوں کو لیکر ایک گلاس میں ڈالا۔ ان میں پانی ملایا۔ اور پانی کے نتھر جانے کا انتظار کیا۔ مرنے والے کا منہ کھلا تھا۔ گوڈٹا نے اپنے بائیں ہاتھ ہی سے باوجود اس کے بھاری بھرکم ہونے کے اسے بستر ہی میں بٹھلایا۔ اور اس کے سر کو سہارا دیا۔ گلاس اُٹھایا اور مرکب اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ شہزادے نے مرکب کو حلق سے اُتارا۔ کچھ تھوکا۔ پھر پی لیا۔ گوڈٹا کے دل میں رحم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اُس نے پرنس کو مرکب کا آخری قطرہ تک نگل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور خالی گلاس کو دھویا اور پانی پلنگ کے پچھلی طرف کے قالین پر گرا دیا۔ اس کی سانس اور کتنی دیر تک چلیگی؟

فقط بیس منٹ اور اس کے بعد گوڈٹا آزاد ہو جائے گی۔

ایک لرزا دینے والا خوف اس کے دل میں آیا کہ اس کی نغمہ نوازی کا کیا انجام ہوا چاہتا ہے۔ یہ خیال اسکے سر میں تھا۔ زبان پر نہ تھا۔ وہ گانے لگی وہ گا رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک مرنے والے کی گرفت ہی میں تھا۔ اور وہ اس کے بستر پر جھکی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا اور ارکول کا اشک آلود چہرہ نظر آیا۔ گوڈٹا نے اپنا راگ بند کر کے بےصبری سے کہا۔

"اس کی خواہش ہے کہ میں گاؤں۔ تم چپ رہو۔"

ارکول دروازے میں کھڑا رہا۔ گوڈٹا گاتی رہی۔ ہاں وہ گا رہی تھی وہ پیارا راگ جو اسے بہت پیارا تھا۔ اس کی بانسری کی سی آواز کا زیر و بم

آواز کی قیامت خیز لہک، مدھم، نرم ہو کر پھر غائب ہو جاتی تھی۔

ایکٹرس نے گہرا سانس لیا اور اپنا ہاتھ کھینچکر چھڑا لیا۔ پرنس مر چکا تھا گوڈٹا آزاد تھی وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اور کول جو کمرے کے دوسرے سرے سے اس کے چہرے کا تغیر دیکھ رہا تھا۔ دوڑ کر پلنگ کے پاس آیا اور سسکیاں بھرنے لگا۔

"مر گیا"۔ مر گیا! آہ میرا آقا مر گیا"۔

"مر گیا" ایکٹرس نے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا وہ کمرے سے نکلی اور غلام گردش میں سے جھپٹ کر بڑھی چلی گئی

"مر گیا" اس نے گھٹنوں کے بل جھکے دعائیں کرتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے نوکروں کو چلا کر کہا "مر گیا! مر گیا!"

اب وہ سرتاپا قدم کامیابی اور فتح تھی وہ جانتی تھی کہ اس کی آواز میں غیر ارضی حسن اور ترنم ہے۔ وہ آج رات اپنی آواز سے دنیا کو مسخر کریگی۔ اور کل شہزادے کی جائیداد کی وارث شہرہ آفاق ایکٹرس شہنشاہ اور پوپ سے زیادہ مقتدر عورت ہوگی۔

وہ موٹر میں بیٹھی اور بولی "تھیٹر"

ماخوذ مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی

غزل

ہوس سود میں سودائے زیاں کرتا ہوں	جو مجھے چاہئے کرنا وہ کہاں کرتا ہوں
دل پھنکا جاتا ہے پر آہ کہاں کرتا ہوں	کسقدر پاس ترا سوزِ نہاں کرتا ہوں
حال دل کچھ تو نگاہوں سے عیاں کرتا ہوں	اور کچھ طرزِ خموشی سے بیاں کرتا ہوں
شغلِ اُلفت میں کوئی دم بھی نہیں ہے بیکار	اور جب کچھ نہیں کرتا ہوں فغاں کرتا ہوں
ہمنشیں میرے بہت ہیں نہیں ہمراز کوئی	دل کی جو بات ہے کب وقف زباں کرتا ہوں
عقل حیران ہے خود اپنی کہ میں کیا کیا کچھ	دوستی میں تری لے دشمنِ جاں کرتا ہوں
جانتا کیا نہیں میں تیری وفا کو لیکن	صرف رنگینیٔ عنوانِ بیاں کرتا ہوں
شغل مے سے مجھے کیا کام مگر جب ناصح	پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہاں کرتا ہوں

لطف آجاتا ہے اربابِ سخن کو وحشت
جب کبھی تذکرۂ حسنِ بتاں کرتا ہوں

وحشت کلکتوی

تلاشِ مسرّت

دنیا خوشی اور مسرت کی تلاش میں ہے۔ کچھ لوگ اسے بنوں اور جنگلوں انسانی آبادیوں اور دنیا کی شورشوں سے دور ڈھونڈتے ہیں اور کچھ دنیا کے مجلسوں، دولت کے کاشانوں، ناچ رنگ کی محفلوں میں تلاش کرتے ہیں۔ لیکن آہ! مسرت تیرا کہیں بھی پتہ نہیں ملتا۔ غریب خیال کرتے ہیں تو امیروں کے سر فلک ایوانوں اور بادشاہوں کے محلوں میں رہتی ہے۔ اور امیر کہتے ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیاں تجھے مرغوب ہیں لیکن حقیقت یہ ہے یہ دونو تجھ سے نا آشنا ہیں۔ اگر غریبوں کو شکوہ ہے کہ تو ان کی آشنا نہیں بنتی تو امیروں کو بھی شکایت ہے کہ وہ اپنے قارون کے سے خزانوں سے بھی تجھے نہیں خرید سکتے۔ لیکن کام اور مسلسل کام تجھے اسیر کر سکتا ہے جو تجھ سے بے اعتنا ہو کہ کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نامعلوم طور پر آتی ہے اور اس کے سر پہ اپنے بازوؤں کا سایہ ڈال دیتی ہے۔ دنیا والے تیری تلاش میں مایا کے دیوتا کی پوجا ضروری خیال کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند اور سب سے بڑے موجد اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ایڈیٹر۔

کیا مسٹر فورڈ خوش ہے؟

(از ایڈیسن)

میں ابھی وہاں موجود تھا کہ لوگ کس طرح فورڈ کی نئی ایجاد شدہ موٹر کے گرد جمع تھے۔ دنیا بھر میں اس موٹر کا کس شان سے استقبال کیا گیا ہے یقیناً ایک شخص خیال کریگا کہ اس واقعہ نے فورڈ کو بقیہ عمر کے لیے مسرور و شاداں بنا دیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں۔ کیونکہ فورڈ اس قسم کا آدمی ہی نہیں جو زیادہ دیر تک خوش رہ سکے۔ اس کا ذہن ہر وقت کام میں لگا رہتا ہے۔ اسے نظر آتا ہے کہ ابھی کس قدر کام ہے۔ جو اسے کرنا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرتا ہے اور اسے اسمیں کامیابی ہو گئی ہے تو یہ کامیابی کچھ وقت کیلئے اسے ضرور خوش کر دیتی ہے۔ لیکن ایسی خوشیاں فوراً ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ایک اور کام اس کے سامنے آجاتا ہے۔

موجودہ حالت میں نسل انسانی کے حالات کچھ اس قسم کے ہو گئے ہیں۔ کہ ان کے لئے بہت زیادہ خوش رہنا ناممکن ہے۔ ہاں جو لوگ ہمیشہ لگاتار خوش ہی رہا کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دل میں ولولے کم ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام یا معمولی کام کیا کرتے ہیں۔ بھلا وہ آدمی جس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ تیتریاں پکڑتا رہے یقیناً وہ ہمیشہ خوش نظر آئیگا۔ حبشی لوگ بھی حد سے زیادہ خوش رہتے ہیں۔ لیکن مسٹر کولج خوش نہیں ہے۔ برسوں پہلے جب وہ ماسچوسٹس میں رہا کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ریاستہائے امریکہ کا پریذیڈنٹ ہو جائے۔ لیکن اب جبکہ وہ وہائٹ ہاؤس میں مقیم ہے۔ تو اس کی خوشی اسمیں ہے کہ کسی طرح وہ یہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ اس کے عہدے کی ذمہ واریاں اس قدر زیادہ اور بڑی ہیں جنکی موجودگی میں کوئی شخص زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی کا سب سے زیادہ پُرمسرت وقت وہ تھا جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی۔ بس کافی عمر کا تھا کہ جب میں دنیا میں خوش تھا لیکن اتنی عمر کا نہ تھا کہ دنیا کی تکالیف کو سمجھ سکتا۔ اب جب میں

کیا ایڈیسن خوش ہے؟

(از ہنری فورڈ)

مجھے کوئی ایسا انسان دکھاؤ جو اپنے کام میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہو اور جو تنخواہ کے لیے کام نہ کرتا ہو۔ تو پھر میں تمہیں ایک خوش و مسرور آدمی دکھا دونگا۔

مسٹر ایڈیسن کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں لیکن مجھے اس خیال سے کسیقدر اختلاف ہے۔ کیونکہ میں مسٹر ایڈیسن ہی کو بطور مثال کے مسرور آدمی کی حیثیت میں پیش کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ کام کرنا اور اپنے کام سے دلچسپی لینا ہی وہ چیز ہے جو ایک انسان کے لئے کسی دوسری شے کے مقابلہ میں باعث مسرت ہو سکتی ہے۔

بڑے کام کرنے اور اُن کو انجام تک پہنچانے کا ولولہ ہی وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کی بڑی مسرت ہے۔ بطور مثال مسٹر ایڈیسن کی طرف دیکھو کیونکہ میرے علم میں وہ اس بات کی بہترین مثال ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن ہے اور خوش۔ وہ کام کرتے ہوئے دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے باوجودیکہ اس نے اخبار والوں سے یہ کہا ہے کہ وہ کسی مسرور آدمی سے واقف نہیں پھر بھی وہ خوش ہے۔

تم ضرور دریافت کروگے کہ مسٹر ایڈیسن اس قدر خوش کیوں ہے۔ اور اس نے کس طرح یہ خوشی حاصل کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بچپن میں وہ بہت خوش تھا۔ بچپن میں اس نے بڑی خوشی سے وقت گذارا ہے۔ اور ان مسرتوں کی کہانیاں وہ خود بھی سنایا کرتا ہے۔ نوجوانی میں بھی یہ خوش تھا۔ جب یہ تارگھر میں کام کرتا تھا۔ جب یہ ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اور بالآخر جب وہ ایک نوجوان موجد تھا خوش تھا۔ اور محض اس لئے کہ یہ ایک منزل پر پہنچنے کے لئے کام کرتا تھا اور کام میں اسکا ایک نصب العین تھا۔

کام کرنے کی اس کے دل میں ایک لگن تھی۔ ایک حرص تھی۔ اس

اپنے گذشتہ ۴۲ برس کے زمانے پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو میں یہ دیکھ سکتا ہوں۔ کہ اس وقت خوش تھا۔ اور مجھے اسوقت دوسرے لوگوں سے زیادہ خوشی کا موقع حاصل تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے بہت ناخوشی دیکھنی پڑی ہے

مجھے معلوم ہے کہ جب کبھی میں کبھی تکلیف سے دوچار ہوا ہوں۔ تو اس سے نجات پانے کا میرے لئے ایک ہی ذریعہ تھا وہ یہ کہ بہت محنت سے کام کروں۔ اور اس چیز کو بھلا دوں۔ جو مجھے تکلیف دے رہی ہے۔

میرے دماغ میں عجیب عجیب خواب سمائے ہوئے تھے۔ یہ رات کو دن بنا دینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے برقی روشنی کے ذریعہ اپنے خوابوں کو سچا کر دکھایا۔ اس کا ایک خواب یہ بھی تھا کہ یہ انسانی آواز کو ریکارڈ میں محفوظ کرے۔ وہ کام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو گئے۔ ایڈیسن اپنے کام میں ہمیشہ خوش رہا ہے۔

میں جو آدمی اپنے کام سے محبت کرتا ہے وہ عموماً مسرور رہتا ہے۔

ڈاکٹر احمد اللہ خاں آئی۔ ایم۔ ڈی

ننھّی لڑکی

زلفیں یہ ناگنیں سی آنکھیں یہ کالی کالی — لب گل کی پتیاں ہیں صورت ہی بھولی بھالی
نازک بدن ہے اس کا یا نخل گل کی ڈالی — چہرے کا رنگ دیکھو۔ کہدو کہ پھول والی

رُخ پر جو آ رہی ہیں اُڑ کر لٹیں ہوا سے — سر کا رہی ہے ان کو کس ناز کس ادا سے
دلچسپ ہیں ادائیں لیکن یہ بے خبر خود — دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
ماتھا ہے خود شگفتہ لب پتلے پتلے تر خود — بالوں میں بن رہے ہیں گھونگر ادھر اُدھر خود
کتنا دہن ہے پیارا۔ کتنا ہے تنگ دیکھو — آنکھوں میں لال ڈورے لائے ہیں رنگ دیکھو
الجھا ہوا پڑا ہے بالوں میں ایک تُندا — یہ مجھو کھیل میں ہے ہو کان کی خبر کیا
کاجل بہا ہوا ہے اس کو نہیں ہے پروا — یا چھوں میں جم گیا ہے کچھ رنگ پیک کا سا
چوٹی میں بندھ گئے ہیں وہ بال جو بڑے ہیں — کچھ چھوٹے چھوٹے اُڑ کر ماتھے پر آ پڑے ہیں
کیں بند دونوں آنکھیں گرد آئی جب ہوا سے — جھونکا جو آیا پھیرا چہرے کو کس ادا سے
بالوں پہ جمتی ہے گرد۔ اڑ اڑ کے جابجا سے — ذرّے چمک رہے ہیں سر پہ ذرا ذرا سے
کُرتا کریب کا ہے۔ جھاڑی میں اڑ کے اٹکا — دامن پھٹا الجھ کر کھینچا جو دے کے جھٹکا
کُرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی — پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رُخ پہ چھائی
پوچھیگی ماں کہاں سے کُرتے کو پھاڑ لائی — یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرے پہ کیوں ہوائی
کُرتے کو دیکھتی ہے جھاڑی کو دیکھتی ہے — ماں سے یہ کیا کہے گی بس سوچ اسے یہی ہے

شوق قدوائی

اُردو اور اُس کی وسعت

یہ مضمون آج سے پچیس سال پیشتر مولانا محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے تحریر فرمایا تھا۔ اس وقت اردو خصوصاً پنجاب میں اس راستے کی کئی منزلیں طے کر چکی ہے جو اردو کے قافلے کے لئے مولانا موصوف نے تجویز فرمایا تھا۔ لیکن اردو کی موجودہ روش کو دیکھ کر جس پر سنجیدہ اور متین مضامین کی نسبت "ٹیگوریت" اور "ادب لطیف" کہیں کہیں زیادہ غالب ہے اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس آواز کو اُردو کے ایوان میں پھر بلند کیا جائے کسی زبان کا "ادب لطیف" اس کے لٹریچر کے ارتقا کی آخری منزل پر وجود میں آتا ہے لیکن بدقسمتی سے چند خارجی اثرات کی بنا پر خیالات کا یہ انتشار اور پریشانی اردو میں ابھی سے رونما ہو گئی ہے اور یہ روش اُردو کیلئے اس قدر خطرناک ثابت ہوئی ہے کہ نوجوان ادیبوں کا اکثر حصہ سنجیدہ اور متین علمی مضامین پر قلم اُٹھانے کی بجائے "قلبی اثرات" کی اسی نام نہاد "ترجمانی" میں غرق ہے۔ اگر علمی مضامین سے بھی بے پروائی برتی گئی اور ادب لطیف کی طوفانی موجوں کا یہی عالم رہا تو سو سال کے بعد بھی ہنوز روز اول کا نقشہ نظر آئیگا۔ ضرورت ہے کہ نوجوان اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور اردو کے مستقل سرمایہ کی کچھ فکر کریں (ایڈیٹر)

مروّجہ یا معلوم زبانوں میں غالباً اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کا سن ولادت نہیں تو زمانۂ ولادت سب جانتے ہیں۔ اَور زبانوں میں سے کسی کی ہسٹری معلوم بھی ہو تو وہ بھی اُس کے آغاز کی کیفیت ضرور ہوش وحواس کی گرفت سے باہر ہے اُردو کو قدیم زبانوں سے اس بارے میں بھی تفاوت ہے کہ اُس کی ولادت شہر میں ہوئی ہے۔ ورنہ قدیم زبانیں بالعموم ایسے وقت میں پیدا ہوئی ہونگی۔ جبکہ اُن کے موجدوں کو شہریت اور مجتمع آبادی کا ڈھنگ بھی نہ آیا ہوگا۔ کم از کم سنسکرت بولنے والوں کا ہندوستان میں اُس وقت آنے کا پتہ ملتا ہے جبکہ وہ دہقانی اور صحرا دانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی جنگلوں یا چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گذرتی ہوگی اور اس سے بڑھ کر عربی کی نسبت معلوم ہے کہ وہ بدّیوں اور خانہ بدوشوں کی زبان ہے۔ اور اب جبکہ عربی نے شہروں اور ملکوں پر تصرف کر لیا ہے اب تک بھی فصیح زبان بدویوں کی سمجھی جاتی ہے۔ اور شہروں کی زبان خواہ اُسی ملک عرب کے شہر ہوں فصاحت میں کمتر مانی جاتی ہے۔ یہی حال اُردو زبان کا بھی ہوگا جنگل اور ویرانوں میں پیدا ہو کر پہلے زبان میں وہی الفاظ ایجاد ہوئے ہوں گے جن کی صحرائی سادہ زندگی میں ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حال میں زبان کے اندر بہت ہی مختصر سرمایہ اور بہت ہی کم الفاظ ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت سادہ سادہ آلات کشاورزی اور بہت تھوڑی قسموں کے اسلحہ مدافعت یا شکار کیلئے درکار ہوتے ہوں گے اور محض سادہ اجناس یا آلات کا لین دین کرنے کو زبان کی ضرورت پیش آتی ہوگی۔ لیکن پھر عقل وشعور اور تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے پر اور صحرائی سکونت کو سوسائیٹی اور شہریت میں بدلنے پر نئی چیزیں نئے سامان اور نئے کاروبار پیدا ہوتے ہوں گے اور زبان کو ترقی پانے کا موقع ملتا ہوگا۔ اور آیندہ کے لئے وہ قوم جس قدر تہذیب و تمدن میں ترقی کرتی جاتی ہوگی اور نئے معاملات پیش آتے جاتے ہوں گے۔

۔اُسی قدر الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہوگا۔ اور حسب الضرورت استعارے کنائے ضرب الامثال اور اشعار پیدا ہوتے رہتے ہوں گے۔ حتیٰ کہ ایک وقت پر وہ قوم علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے کا شوق کرتی ہوگی۔ اور اس طرح سے زبان میں علمی اور اصطلاحی الفاظ اور عالمانہ خیالات کو ادا کرنے کے قابل محاورات داخل ہونیکے بعد اُس زبان کو وسیع اور مہذب اور مکمل زبان ہونیکا فخر حاصل ہوتا ہوگا۔ اور اگرچہ دنیا میں تکمیل کسی چیز کو حاصل نہیں اور ترقی کا رستہ ہر کمال کے لئے کھلا ہے اور اس لئے کسی قوم اور کسی زمانے کے علوم و فنون اور اُن کے ساتھ اُس وقت کی زبان بھی کسی حد پر جا کر ٹھیر نہیں سکتی بلکہ اور اگر قوم میں جذبۂ ترقی موجود ہے۔ تو ان کے علوم و فنون اور ان کی زبان غیر متناہی ترقی کے قابل ہے اور کسی حالت میں مکمل نہیں کہلا سکتی۔ تاہم جب کسی زبان میں ابتدائی ذرائع زیست یعنی کاشتکاری اور گلّہ بانی کے متعلق اور اعلیٰ مدارج زندگی یعنی شہریت اور اُس کے مختلف کاروبار اور تکلّفات کے متعلق اور روحانی ضروریات یعنی علوم وفنون کے متعلق الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہو۔ اُس کو وسیع اور مدیں وجہ کامل کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنیکے علاوہ اس سے آیندہ مدارج ترقی میں ساتھ دینے اور متوقعہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی اُمید ہے۔

غرض زبان کے وسیع اور مکمل ہونے کی صورت میرے خیال میں

یہی ہے کہ اس میں دہقانی اور شہری اور علمی ضرورتوں کیلئے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہو۔ اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب اُردو کو دیکھیں تو اس میں ابتدا سے شہری ضروریات اور شہری تکلفات کا سامان کثرت سے موجود پاتے ہیں اور اس سے پہلے درجے کا سامان یعنی دیہاتی ضرورتوں کے الفاظ اور زراعت کے متعلق مختلف اصطلاحیں اگرچہ حقیقت میں اُردو کی ملکیت نہیں ہیں کیونکہ وہ شہر میں پیدا ہی ہے تاہم چونکہ شہروں اور گاؤں کا باہم تعلق رہتے۔ اس لئے ضرورت ہو تو وہ الفاظ اُردو میں بخوبی استعمال ہو سکتے ہیں اور آگے کا سلسلہ یعنی علمی اور اصطلاحی الفاظ ان کی جانب ابھی توجہ نہیں ہوئی اور جیسا کہ واویلا کیا جا رہا ہے اور ضرورت محسوس ہوتی ہے اگر کبھی اس طرف توجہ ہوئی تو جس طرح علمی الفاظ اور زبانوں میں ایجاد ہوا کرتے ہیں۔ اُردو میں بھی ممکن ہیں۔ یعنی اُردو زبان میں کچھ تو خود اپنے مصادر اور مادوں سے نئی شکلیں ایجاد کی جاتی ہیں اور کچھ علمی سبقوں کیساتھ غیر زبانوں کے الفاظ سیکھے جاتے ہیں اور اپنی زبان میں برتنے لگتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مصادر سے اُسی قدر الفاظ نکل سکتے ہیں جس قدر مصادر پہلے وضع ہو چکے ہوں اور وہ کسی زبان میں کم ہیں کسی میں زیادہ اور غیر زبان سے لفظ لیتے وقت اکثر زبانیں بہت تامل کرتی ہیں اور اس تامل کی علامت یہ ہے کہ لفظ کو اُس کی اپنی شکل اور تلفظ پر رہنے نہیں دیا جاتا۔ بلکہ خود اپنی شکل اور اپنے تلفظ کا کچھ نہ کچھ سایہ ڈال کر اور معرّب یا مفرّس وغیرہ بنا کر استعمال کیا جاتا ہے اس کے برخلاف اُردو کا یہ حال ہے کہ اس کا اپنے مصادر کا سرمایہ ایک لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ بنی ہی بن بن کی لکڑی جمع کرنے سے ہے۔ اور ایک لحاظ سے جس قدر اندرونی سرمایہ اس کے پاس ہے اور کسی زبان میں کاہے کو ہوگا۔ کیونکہ عربی فارسی اور سنسکرت مین تین وسیع اور علمی زبانیں اس کی امہات میں داخل ہیں اور یہ ان میں سے کسی کا لفظ لے لے تو شیر مادر کی طرح اجنبی نہیں معلوم ہوتا اور اس طرح جس قدر ذخیرے پر اس کو تصرف ہے وہ اور زبان کو کہاں نصیب۔ اور پھر ان تینوں کے علاوہ اور زبانوں کے الفاظ جو علوم یا دیگر کاروبار کے ساتھ آئیں اُردو کو اور زبانوں کی طرح اُن سے کوئی تعصب نہیں۔ چنانچہ اجنبی الفاظ کی جہاں عربی اور فارسی وغیرہ میں ایسی گت بنتی ہے کہ پہچانے نہیں جاتے مثلاً لاندرہ (لنڈن) اطریش (آسٹریا)، دکتور (ڈاکٹر) ستیہ (سٹی)، وہاں اُردو میں ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی اور میلا ہاتھ نہیں لگنے پاتا۔ اور اسی طرح امن و امان سے رکھے ہوتے ہیں گویا اپنے گھر میں ہیں یعنی وہی تلفظ ہے اور وہی لہجہ۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اہل ہند ملکوں کے لب و لہجہ کی نقل کرنے میں جو کمال رکھتے ہیں دنیا کی کسی قوم میں نہیں۔ انگریز ہندوستان میں عمریں بسر کرتے ہیں۔ کابلی ایرانی اور عربی اکثر آتے رہتے ہیں۔ مگر ایک لفظ یہاں کے خاص لب ولہجہ کا ادا نہیں کر سکتے۔ اور ہندوستانی سب نہیں تو اکثر اور سب کچھ نہیں تو بہت کچھ اجنبی زبان کو اس قدرت سے ادا کرتے ہیں۔ کہ اہل زبان کا دھوکا ہوتا ہے اور دوسرے جہاں اور زبانوں میں غیر زبانوں کی بعض آوازوں کیلئے حروف نہیں ہوتے وہاں اُردو میں اکثر مروجہ زبانوں کی قریباً تمام آوازوں کیلئے حروف موجود ہیں اور اسلئے غیر زبانوں کا لفظ آتا ہے تو اسی کی مناسب حال حروف میں لکھا جا کر صحیح بولا جا سکتا ہے

اُردو کے ان اوصاف کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اس میں ترقی کرنے اور تمام کاروباری اور علمی خیالات کو ادا کرنے کی قابلیت اور زبانوں سے زیادہ ہے اور چند ایک زبانوں کے مادی سرمائے پر قابض ہونے اور دیگر زبانوں کے الفاظ کو آسانی کے ساتھ لے لینے کی وجہ سے اس کی دولت لازوال ہے اور ہم لوگ جو افسوس اور حسرت اپنی زبان کے عدم وسعت کے متعلق ظاہر کیا کرتے ہیں اس کا باعث خود ہماری کوتاہی اور غفلت ہے ورنہ کوشش کرنے سے ہم ترقی کے تمام مدارج طے کر سکتے ہیں۔ اور ضرورت ہے تو اسی قدر کہ ہم لوگ علوم کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنی زبان میں لانے کی ٹھان لیں۔ پہلے جو کام کیا جائے مشکل ہوتا ہے۔ مگر عزم صادق کے بعد دیکھیں گے۔ کہ الفاظ کی وجہ سے کسی دقت کا اندیشہ نہیں۔ میں نے ابھی تک اُردو کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور ایک امر میں غور کرنا باقی ہے۔ اور وہی ایک وقت ہے جو میرے خیال میں اُردو کی ترقی کو مانع ہے اور کوشش کرنے والوں کا حوصلہ پست کر دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کا سرمایہ بے شک الفاظ ہوتے ہیں مگر صرف الفاظ ہی پر زبان کا مدار نہیں بلکہ الفاظ کو ترکیب دینا اور کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے رکھ کر کلام کو موزوں کرنا جس کو محاورہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک کام ہے اور اُردو کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص شہر میں پیدا ہوئی ہے۔ اور اُس شہر میں الفاظ کو ترکیب دینے کا جو دستور یعنی محاورہ تھا اس کو اُردو کا جزو لاینفک قرار دے لیا گیا ہے۔ البتہ واقعات نے کچھ مدد کی کہ اُردو کے مولد یعنی دلّی پر آفت آئی اور اہل سخن کی توقیر نہ رہی اور اُدھر لکھنؤ والوں نے قدر افزائی کے دریا بہا دیئے۔ سب باکمال سمٹ کر وہاں جمع ہو گئے۔ اور پھر یہ بھی قانون قدرت تھا کہ دو شہروں کا لب و لہجہ اور محاورہ ایک نہ ہو۔ چنانچہ تخم دلی کا تھا۔ مگر لکھنؤ کی سرزمین میں پرورش پا کر رنگ روپ میں کچھ نہ کچھ فرق آگیا اور یوں اُردو کو ایک شہر کی بجائے دو شہروں کے محاورے مل گئے۔ اگرچہ میر تقی اُس وقت بھی جامع مسجد کی سیڑھیوں اور گدڑی کے بازار ہی کو اُردو کی صحت کا مدار کہتے رہے اور زبان بگڑنے کے ڈر سے راہ چلتے باہر والوں سے بات کرنی گوارا نہ کی۔ مگر زمانے کا ہاتھ زبردست تھا۔ اُن کی بات کون سنتا۔ دلّی کے ساتھ لکھنؤ

برابر کا حق دار قرار پا گیا اور حسین آباد کے مرثیوں نے لال قلعے کی غزلوں جیسا
سند بننے کا استحقاق حاصل کیا۔ اور اس طرح دلّی کی بربادی اور اہلِ سخن کی
جلاوطنی کا یہ خوشگوار نتیجہ بے شک برآمد ہوا کہ جہاں پہلے دلّی کے محاوروں
کے خلاف بولنا غلط سمجھا جاتا تھا۔ وہاں یہ عذر پیدا ہو گیا۔ کہ دلّی نہیں تو
لکھنؤ والے ایسا کہتے ہیں اور محاوروں میں ذرا وسعت آ گئی۔ مگر پھر بھی زبان
کے لئے دو شہروں کی کیا حقیقت ہے وہ چاہے کیسے ہی بڑے شہر ہوں
اور کیسے ہی بڑے بڑے کاروبار کے متعلق بول چال کا اتفاق ہوتا ہو۔ تاہم
وہ محاورے محدود ہیں اور زبان کو وسیع اور علمی زبان بننے کیلئے جس طرح پر
دو شہروں میں استعمال ہونیوالے الفاظ کافی نہیں ہیں۔ اور آئندہ اور الفاظ
ایجاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح الفاظ کے برابر نہ سہی الفاظ سے کم
مگر پھر بھی بہت بڑی مقدار مختلف طرزِ ادا اور محاورات کی درکار ہے۔ اور
الفاظ کی طرح اس غرض کو بھی دو شہر پورا نہیں کر سکتے۔ اور بدقسمتی یہ کہ لکھنؤ
کے بعد کہیں اور اہلِ سخن کا وہ جمگھٹا نہ ہوا۔ اور جدید محاورات نے زبان میں دخل
نہ پایا اور مان لیا گیا کہ اُردو وہ ہے جو دلی اور لکھنؤ کے محاورے کے مطابق
ہو۔ اور اس لئے اور شہروں کا کوئی کیسا ہی قادر الکلام سخن ور ہو اس کے
کلام میں ذرا کوئی محاورہ دونوں شہروں کے خلاف آیا۔ اُسے غلط اور کہنے
والے کو اُردو سے ناواقف قرار دیا گیا اور یہ دلّی اور لکھنؤ کا رعب ایسا بیٹھا
کہ اب اکثر اہلِ علم جو علوم و فنون کے ذخیرے اُردو میں جمع کر سکتے ہیں۔ ترجمہ
کرتے ہوئے یا کتاب لکھتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ہم دلّی یا لکھنؤ کے محاوروں پر
قدرت نہیں رکھتے مبادا غلط اُردو لکھ کر زبان والوں کی ملامت کا نشانہ بنیں
اور واقع میں جو شخص اپنے شوق سے مجبور ہو کر کوئی تصنیف کر بیٹھتا ہے۔ تو
زبان کے ٹھیکہ دار "پنجابی اُردو" یا "دکنی اُردو" کہہ کر اُسے پلے نہیں باندھتے
حالانکہ یہ نہایت دشوار ہے کہ کوئی شخص گاؤں میں پیدا ہوا اور شہر میں
اُس سے بولنے کے وقت دلی کی تقلید میں ذرہ بھر لغزش نہ ہو۔ کیونکہ جس
طرح ہر شہر کے عادات۔ اخلاق اور رسم و رواج میں اختلاف ہوتا ہے اور
ممکن نہیں کہ دو شہر ہر بات میں یکساں ہوں اسی طرح الفاظ کو ترکیب دینے
اور اسماء و افعال کے ساتھ حروف کو ملانے میں ہر شہر کا انداز جدا ہوتا ہے
اور ناممکن ہے کہ اہلِ شہر اپنے شہر کے طرزِ ادا کا اثر ظاہر نہ ہونے دیں۔

غرض زبان جو تمام ملک کی اور اُس کی صحت کا اجارہ صرف دو شہروں
کو دیا جائے۔ اُردو کا یہ ایک ایسا خاصہ بلکہ نقص ہے جو اور کسی زبان میں
نہیں اور یہ پیدا ہوا اسی لئے کہ دلّی اور لکھنؤ جیسے دارالخلافے اُردو کے
مالک قرار پائے۔ اور اُنہوں نے اپنی طرّاری کے آگے کسی کو بات کرنے
کے قابل نہ سمجھا۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربی جنگل میں پیدا ہوئی اور عجب شہر

میں بسے اور شہر والوں نے اُس میں تراش خراش کی تو جنگل والوں کی مجال
نہ تھی جو اُن کے منہ آتے۔ وہ جس طرح شہر والوں کے رسم و رواج اور تکلفات
سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اُن کے طرزِ کلام پر بھی نہ بول سکے۔ اور
ادھر شہر والوں کی چونکہ اپنے گھر کی جائداد نہ تھی اُن کو بھی اُس کے متعلق
تعصب نہ ہوا۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر جو تغیر ہوتا گیا اسے
زبان کی معمولی رفتار جانا گیا۔ اور ایک کو دوسرے کی زبان کو غلط کہنے کی
جرأت نہ ہوئی۔ اور کہیں سے کوئی لطیف استعارہ کہیں سے کوئی باریک
کنایہ زبان میں داخل ہوتا ہوا اس کو وسعت دیتا گیا۔ حتیٰ کہ زبان ایک ملک سے
نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچی اور وہاں کا اثر قبول کرنیکے بعد بھی صحیح زبان
سمجھی جاتی رہی۔ اور گو کوفیوں اور بصریوں کے مباحثے ہوتے رہے اور
عرب و مصر کی نوک جھونک جاری رہی مگر کسی نے اپنی زبان کو ترجیح دی تو
اسی قدر کہ اس کو فصیح کہا اور دوسری کو غیر فصیح۔ لیکن ایک کو صحیح اور دوسری
کو غلط نہیں مانا گیا۔ اور اگرچہ مصر کی زبان عرب کے استعمال اور اس کے قواعد
صرف و نحو و معانی و بیان کو معیار گردان کر دیکھی جائے تو غلط ہے لیکن وہاں
کوئی دلی و لکھنؤ ہوتا اور مصر کی زبان پر غلط اور خلاف محاورہ ہونے کا فتویٰ
صادر کیا جاتا تو آج جس قدر جدید علوم و فنون کا ذخیرہ اور جدید خیالات ادا کرنے
کی قابلیت عربی زبان کو مصر والوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے بالکل نہ ہوتی۔
یہی حال دیگر زبانوں کا ہے میں انگریزی کی نسبت کوئی رائے دینے کے قابل
نہیں مگر اس قدر یقین ہے کہ انگریزی صرف لندن کی زبان نہیں۔ اور ضرور
انگلینڈ کے شہروں اور بستیوں میں باہم محاوروں کا تفاوت ہوگا۔ مگر سب
کی انگریزی انگریزی ہے۔ اور انگلینڈ سے باہر امریکہ کے انگریزی محاورے
یقیناً مختلف ہیں مگر امریکن انگلش کو غلط کہنے کی مجال کسی کو نہیں اور یہی بے
تعصبی ہے جس سے اس زبان کو روز افزوں ترقی حاصل ہے۔ اور اسی
طرح ویدوں کی سنسکرت جو وسط ایشیا سے آئی تھی اور کالیداس کی سنسکرت
جو ہندوستان میں پیدا ہوئی باہم مختلف ہیں لیکن دونوں سنسکرت ہیں۔

شیراز کی فارسی بے شک فصیح ہے۔ مگر ہرات کی فارسی بھی فارسی ہی
ہے اور سعدی کی تعریف کرتے ہوئے جامی پر خندہ زن ہونیکا مجاز کوئی نہیں
اور یہاں لاہور والوں کی غزل دیکھ کر اور ذرا اپنی بول چال سے خلاف پا کر
دلّی والوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور لکھنؤ والے صلاحِ اُردو کی
انجمن بنا کر ملک کے مروّجہ محاوروں کو غلط بنانے اور ان کو اپنے محاورے
کے مطابق صحیح کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور لکھنے والوں کے حوصلے
پست کئے جاتے ہیں۔

غرض میرے خیال میں اُردو کا یہ سب سے بڑا نقص ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے

محاوروں کے خلاف لکھنا غلط سمجھا جاتا ہے اور باہر والوں کو لفظ لفظ پر خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی بات ان دونوں شہروں کے خلاف طبع نہ نکل جائے ورنہ ہماری تحریر اُردو نہ رہے گی۔ اور اس طرح پر جو قابلیت مختلف طبیعتوں میں مضمون کو مختلف اسلوبوں سے ظاہر کرنے کی ہوتی ہے اور زبان کو وسعت دیتی ہے۔ اردو اس کے فائدے سے محروم رہی جاتی ہے لیکن یہ نقص اگرچہ بڑا ہے مگر اُردو کی فطرت میں داخل نہیں بلکہ اہلِ زبان کی تنگ خیالی سے پیدا ہوا ہے دلّی والے "پھول جیسا چہرہ" کہتے تھے۔ لکھنؤ والے "پھول کا ایسا چہرہ" کہنے لگے۔ دلّی والوں کے ماتھے پر بل آیا۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر مجبوراً ماننا پڑا کہ اچھا یہ بھی ایک محاورہ ہے۔ اور ایک مضمون کے لئے دو اسلوب پیدا ہو گئے۔ اسی طرح اگر کسی شہر کے لوگ "پھول کا" لکھنؤ سے اور "جیسا" دلّی سے لیکر "پھول کا جیسا چہرہ" کہنے لگیں اور یہ محاورہ بھی شہرت پا جائے تو دلی والوں کا کیا حرج ہے اور جب لکھنؤ کا رواج قبولیت کا خلعت پہن سکتا ہے تو "جدّت آباد" دو کی جگہ تین اسلوب پیدا کرنے پر کیوں قابل ملامت ہو اور اس کے لئے معیار میرے خیال میں یہ ہونا چاہیئے کہ جو نیا محاورہ کوئی ایک شخص استعمال کرے اور کوئی اور اُس کا ساتھ نہ دیتا ہو اسے غلط سمجھا جائے لیکن جب کوئی اسلوب ایک جماعت میں رائج ہو تو دلّی کا محاورہ نہ کہو مگر اُردو کا ایک محاورہ ضرور سمجھو اور ہنسی میں نہ اُڑاؤ۔ اور اس اُصول کے مطابق اگر خود دلّی کا قادر الکلام اقرار کو قرار یا شمر کو شیمر باندھے تو اکیلا ہونے کے سبب غلط سمجھو۔ اور اگر پنجاب والے "مجھے جانا ہے" کی جگہ "میں نے جانا ہے" استعمال کریں تو کثرتِ استعمال کی وجہ سے "غلط العام فصیح" کی دفعہ عائد کرو اور جواز کا فتویٰ دو۔ کیوں کہ زبان میں وسعت اور تمام ملک کو اُردو بولنے کی جرأت پیدا ہوگی تو اسی طرح۔

اور میں تو اس قاعدہ کو یہاں تک وسیع دیکھنا چاہتا ہوں کہ انگریز جو بولتے ہیں "ویل ہمارا اکاڑی لاؤ۔ باوا لوگ سیر کو جانا مانگتا ہے۔ پھر ٹو فٹر جائے گا۔ میم صاحب ان کے ساتھ جا سکتا ہے" چونکہ یہ طرز بھی ایک جماعت کثیر کی زبان پر ہے اور یورپ والے جس قدر اُردو بولتے ہیں عموماً انہی محاوروں کو استعمال کرتے ہیں اور نہ صرف وہ بلکہ ہندوستانی جنٹلمین جو انگریزی طرز پسند کرتے ہیں وہ بھی اکثر اپنے نوکروں۔ ماتحتوں اور ایسے لوگوں کے ساتھ جن سے انگریزی بولنی نہ چاہیں اسی کھڑی بولی میں بات کرتے ہیں تو میرے نزدیک اس کو بھی اُردو کا ایک محاورہ قرار دینا چاہیئے۔ بیشک یہ دلی کی اُردو یا ہمارا کہ فصیح اُردو بھی نہیں۔ مگر انگریزی فارسی بھی نہیں۔ اُردو ہے۔ کیونکہ الفاظ تمام اُردو ہیں۔ البتہ اُن کے استعمال کرنے کا ڈھنگ اور ہے اور مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے۔ تو پھر اس کو اُردو کا ایک نیا مگر صحیح اسلوب کیوں نہ کہا جائے۔

دلّی والے مصدر کو مذکر۔ مؤنث، واحد۔ جمع کر لیتے ہیں اور "شعر کہنا" "بات کرنی" "قصیدے لکھنے" بولتے ہیں۔ لکھنؤ والے اس تغیر کو ناپسند کرتے ہیں اور "مجھے کھانا کھانا پڑا" "دوا پینا پڑی" "آم کھانا پڑے" ہر جگہ الف برقرار رکھتے ہیں۔ اور مان کا یہ کہنا مان لیا گیا۔ اسی طرح انگریزوں سے "مجھے جانا سکتا ہے" کہکر مصدر کو برقرار رکھنے کی رسم نکالی تو کیا بُرا کیا۔

بے شک اہل دہلی و لکھنؤ دونوں موجد بابِ فصاحت ہیں اور کوئی اردو کو کیا سمجھے گا۔ جیسا وہ سمجھتے ہیں۔ مگر جب وہ کسی اور شہر اور کسی اور جماعت کے کلام کا مطلب ایسا ہی آسانی سے سمجھ سکیں۔ جیسا اپنے شہر کی زبان کا سمجھتے ہیں اور الفاظ بھی بیشتر اُردو کے ہوں اور کلام سے اسی قدر غرض ہے کہ مضمون سمجھ میں آئے تو اسلوب مختلف ہونے کی وجہ سے اس کو غلط اور قابل تضحیک اُردو کیوں کہا جائے۔

کچھ عرصہ ہوا مخزن میں مولانا آزاد کے مکتوبات شائع ہوئے تھے۔ حسرت موہانی اپنے پرچے میں اُن کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملے پر اُلجھے ہیں۔ وہ جملہ کچھ ایسا تھا "لاہور کے ساتھ میرا نکاح تھوڑی پڑھا ہوا ہے" موہانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور غالباً پنجاب میں رہنے کے باعث آزاد کی زبان سے ایسی غلطی ہو گئی۔ یہ ایک مثال ہے اُس نکتہ چینی اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کی جو اہلِ دلی و لکھنؤ باہر کے محاوروں کو زبان سے علیحدہ رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اگر آزاد کا یہ جملہ لکھنؤ یا دلّی والوں کے محاورے کے خلاف ہے اور لاہور والے یوں بولتے ہیں تو میرے نزدیک آزاد نے اُسے بول کر زبان میں ایک اسلوب کا اضافہ کیا ہے۔ یا اسے قبولیت کا خلعت بخشا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بلکہ کرنا پڑیگا۔ اور اگر اُردو تمام ملک کی زبان بنے گی اور اگر اُردو میں وسعت پیدا ہوگی تو اسی طرح کہ یہ صرف دو شہروں میں قید نہ رہے۔ بلکہ ہندوستان کے تمام شہروں کو اس کا حقدار اور ان سب کے محاوروں کو بلکہ بعض بعض الفاظ کو بھی جو پنجابی یا دکنی وغیرہ زبانوں سے کثرتِ استعمال کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں اُردو کا اپنا سرمایہ اور اس کو وسعت اور ترقی دینے کا ذریعہ مانا جائے اور جیسے کسی شعر کو دلی والوں کے سامنے صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہوتی ہے۔ کہ لکھنؤ کا شاعر یوں کہتا ہے۔ اسی طرح کوئی جملہ لاہور والوں کے محاورے پر اور کوئی فقرہ حیدر آباد والوں کی طرز پر ہونے کے سبب صحیح اور با محاورہ سمجھ کر "ایسا" اور "جیسا" اور "میں"۔ اور "سے" کے اختلاف سے باہم دگر تنقید و تغلیط کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ فقط۔

محمود علی رشید ممبر کالج کپورتھلہ

دیہات کی رات

چپکے چپکے گیت خاموشی کے گاتی ہے فضا
دیکھ کر تاروں کی جانب مسکراتی ہے فضا

اوڑھ کر اپنے تنِ نازک پہ چادر چاندنی
بامِ گردوں سے اترتی ہے زمیں پر چاندنی

مسجد و محراب سے شورِ اذاں اٹھتا نہیں
سرد اور خاموش چولھوں سے دھواں اٹھتا نہیں

لیٹ جاتی ہیں گھروں میں بیبیاں آرام سے
آدمی بے فکر ہو جاتے ہیں اپنے کام سے

ساگ لے لے کر گھروں میں پھر نیوالی عورتیں
شوخ اور منہ پھٹ مگر شب رنگ کالی عورتیں

سارا دن چکی پہ محنت کرنے والی لڑکیاں
کم سے کم اجرت پہ پانی بھرنے والی لڑکیاں

بھاری بھر کم اور ضدی گاؤں کے سادہ رئیس
پہلوانوں مجلسوں کتوں کے دلدادہ رئیس

مسجدوں کی کہنہ دیواروں کے رکھوالے امام
آئے دن پردیسیوں سے بھڑنے والے امام

خانقاہوں کے مجاور اور بھک منگے فقیر
ادھ موئے گستاخ، سر اور پاؤں سے ننگے فقیر

موسمی گیتوں سے واقف خوش گلو میراثنیں
ہر کسی سے لڑنے والی تند خو میراثنیں

ڈوم جن کی مبتذل تانوں پہ سر دھنتے ہیں سب
اپنا اپنا من گھڑت شجرہ نسب سنتے ہیں سب

وہ مدرس جن کے دم سے مدرسہ آباد ہے
جن کو سعدیؒ کی گلستاں کچھ زبانی یاد ہے

رفتہ رفتہ نیند سے مدہوش ہو جاتے ہیں سب
اور اس پرکیفیت وادی میں کھو جاتے ہیں سب

آدمی اعمال سے دوچار ہوتے ہیں جہاں
خواب روحوں کے لئے تیار ہوتے ہیں جہاں

(فاخر ہریانوی بی۔ اے)

شہنشاہِ اشوک

سکندر اعظم کے جرنیل سلیوکس سے چندر گپت نے ہندوستان کے چند صوبجات چھین لیئے تھے۔ چندر گپت خاندان موریہ کا بانی تھا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا بندوسار جانشین ہوا۔ اشوک بندوسار کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کے عہد میں اشوک کشمیر وغیرہ ممالک کا والیرائے تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سرینگر اُسی نے بنایا تھا۔ جب اشوک تخت پر بیٹھا تو اُس وقت وہ ہندو دھرم رکھتا تھا۔ اُس نے کلنگا قوم پر دھاوا کرکے انہیں مغلوب کیا۔ جب میدان جنگ کیا اُس نے لاشیں دیکھیں تو کانپ اُٹھا۔ اُس کے دل پہ سخت صدمہ ہوا۔ یہ جنگ اُس کے نویں سال جلوس میں ہوئی تھی۔ تیرھویں سن جلوس میں اُس نے قسم اُٹھائی کہ جنگ سے ملک فتح نہیں کریگا۔ بلکہ دھرم کے پرچار سے دلوں کو تسخیر کرے گا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس کی سلطنت کی حدود صحیح تو معلوم نہیں لیکن پتہ چلتا ہے کہ ہندوکش سے شروع کرکے افغانستان بلوچستان۔ ہمالیہ تک شمالی ہند سے جنوبی ہند نظام حیدرآباد کی انتہائی جنوبی حد تک ۔ سندھ۔ کشمیر۔ نیپال بھی اُس میں شامل تھے۔ سوات کی وادی بھی شامل تھی۔ گویا اُس کی سلطنت کا رقبہ برٹش امپائر سے اگر برابر نہ کردیں تو زیادہ تھا۔

اُس کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے ہندوستان کی ہر سمت میں بودھی بھکشو بھیجے اور بدھ دھرم کا پرچار کیا بلکہ یونان اور مصر وغیرہ ملکوں تک اُس نے ایلچی روانہ کیئے جس کی تفصیل اُس کے کتبوں میں پتھر پر کھدی ہے۔ بہت عرصے تک اُس کے کتبے پڑھے نہیں جاتے تھے آخر اُس کی ابجد دریافت ہوگئی بعض کی عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے اور بعض کی بائیں سے دائیں۔ جس سے پایا جاتا ہے کہ برمی اور خوراشتری حروف میں مضمون کندہ کیئے گئے ہیں۔

اسی شہنشاہ کے عہد میں بہت سے کوئیں کھودے گئے۔ سایہ دار اور ثمردار شجر لگائے گئے۔ ادویہ کے لئے جڑی بوٹیاں غیر ممالک سے لاکر ہندوستان میں بوئی گئیں۔ ممالک غیر میں جغرافیائی یا قومی حدود سے تجاوز کرکے ایلچی بھیجے گئے اور بدھ دھرم پھیلایا گیا بھکشو طبیب بھی ہوتے تھے طبی مشنریوں کا دستور اُس کے عہد سے شروع ہوا۔ ہندو ایک قسم کی تبلیغ ضرور کرتے رہے ہیں لیکن اس طور کی نہ تھی کہ ہر رنگ و ہر نسل ہر قوم و ہر ملک کا ہر شخص دھرم کے دائرہ میں بلا تکلف آسکے ہندوؤں کا طریق تھا کہ وہ اپنا دھرم اور تہذیب پھیلاتے تھے۔ لوگ خود بخود ان کا طرز عمل اختیار کر لیتے تھے۔ باضابطہ دھرم کے دائرے میں آنا اُس کے لئے قاعدہ مقرر کرنا دنیا میں سب سے پہلے بدھ مت والوں نے شروع کیا ہے اُن کے بعد نصارا اور اُن کے بعد اسلام نے زور شور کی تبلیغ کی ہے۔ جماعتی پرستش۔ درگاہوں کا ماننا۔ بزرگوں کے مقبرے بنانا۔ مقدس کتابوں کا غیر زبانوں میں ترجمہ کرنا بدھی زمانہ سے شروع ہوا ہے۔

شہنشاہ اشوک نے اپنے لڑکے اور اپنی لڑکی کو لنکا بھیجا۔ وہ اپنے ہمراہ اُس پیپل کی ایک ٹہنی لے گئے تھے جہاں بدھ کو کشف حاصل ہوا تھا وہ ٹہنی انورادھاپور میں لگائی گئی اور اُس وقت تک وہ پیپل بڑی احتیاط سے رکھا گیا ہے اور وہ دنیا کے موجودہ درختوں میں سے سب سے بڈھا ہے۔ اشوک کے شہزادے اور شہزادی نے شاہ سیلون لنکا کو بدھ بنایا۔ تب سے بدھ دھرم سیلون میں رائج ہوا۔

خود شہنشاہ بھی آخری عمر میں بھکشو ہوگیا۔ اور مذہبی زندگی بسر کرتا رہا۔ مسٹر ولسن لکھتے ہیں کہ حال یا ماضی کا کوئی شہنشاہ اُس کی شان کو نہیں پہنچتا۔ وہ تاریخ میں ایک بے مثل حکمران ہوا ہے۔ بہت سے مورخ متفق ہیں کہ اشوک ایک چمکدار ستارہ ہے جس کے آگے سب شاہ اور شہنشاہ ماند ہیں۔

باوجودیکہ وہ خود بدھ مت کا پیرو تھا لیکن ہندو دیوتاؤں کے مندروں اور برہمنوں کو بھی اُس نے اپنے فیض سے محروم نہیں کیا۔

ہندوؤں کے زمانہ میں کوئی راجہ مہاراجہ نہیں گذرا جس کے زیر نگین ہندوستان کا اس قدر حصہ ہو۔ شمالی ہند اور دکھن اور راجپوتانہ اور پنجاب وغیرہ ممالک میں مختلف راج رہے ہیں۔ صرف اشوک کا ہی ایک زریں اس ملک میں آیا ہے جس کے زیر حکومت ہندوستانی ممالک برطانیہ سے زیادہ ممالک محروسہ ہوں۔ اب ہم کندہ کتبوں سے مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں جو ہم نے ٹراس کی کتاب کے اُردو ترجمہ سے نقل کیئے ہیں۔

ان احکام میں سے جو پتھروں پر کندہ ہیں ہم ایسا مختصر اقتباس پیش کرینگے جن سے مطلب فوت ہوئے بغیر اس شہنشاہ کے اوصاف ظاہر ہو سکیں کہا جاتا ہے کہ بدھ مت اختیار کرنے سے پہلے اس شہنشاہ کی ظالم اور خونخوار ہونے کی شہرت تھی۔

"اپنی مملکت اور اپنے ہمسایوں میں میں نے انسانوں اور مویشیوں

کے لئے معالجے کا انتظام کیا ہے۔ جہاں جڑی بوٹیاں نہ ہوتی تھیں، میں نے باہر سے منگوا کر کاشت کرائی ہیں۔ جو انسانوں اور مویشیوں کے لئے مفید ہیں۔ سڑکوں پر میں نے کنوئیں کھدوائے ہیں۔ اور اُن کے لئے آرام گاہیں بنوا دی ہیں۔ میری مملکت میں اہلکار ہر پانچویں سال دورہ پر جائیں۔ اور علاوہ اور کام کے تقویٰ کا پرچار کریں۔ یعنی۔

"ماں باپ کی اطاعت۔ دوستوں۔ واقفوں۔ رشتہ داروں برہمنوں اور تارکوں کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ نیک کام ہے۔"

"جاندار کے مارنے سے بچنا نیک کام ہے" "کم خرچی اور کم جمع کرنا کار ثواب ہے۔" سرکاری کام میں کچھ عرصہ سے تاخیر ہو گئی ہے۔ اب میں نے یہ انتظام کیا ہے۔ کہ خواہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔ رنواس میں ہوں۔ یا سونے کے کمرے میں۔ یا اپنے خاص کمرے میں ہوں۔ یا گاڑی پر سوار ہوں یا محلات کے باغ میں ہوں۔ سرکاری رپورٹروں کو چاہیئے کہ رعایا کا کام پیش کریں۔ اور میں ہر جگہ رعایا کا کام کرنے کو تیار ہوں کیونکہ مجھے اپنی ذاتی کوشش اور کاربراری پر پورا اطمینان نہیں ہے سب لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ اس کا گر یہ ہے۔ کام سے جی نہ چرائے اور اسے التوا میں نہ ڈالے۔ میں اپنے کام کو انجام تک پہنچاؤں گا۔ سب جانداروں کا دین ادا کروں گا۔ تاکہ وہ سب خوش رہیں۔

"ایں جانب کی خواہش ہے۔ کہ ہر جگہ ہر قسم کے لوگ بسیں۔ وہ سب خواہشوں کو محکوم اور صفائی قلب حاصل کریں۔ لوگ خواہشیں اور میلان مختلف رکھتے ہیں۔ بعض جزواً اور بعض کلاً احکام کی تعمیل کریں گے۔"

ہر شخص کے لئے زیادہ سخاوت ناممکن ہے۔ تاہم اُس کے لئے حواس پر قابو پانا صفائی قلب حاصل کرنا ضروری ہے۔"

"میرے اہلکار ناجائز بند دگر نہ ہونے دیں گے۔ رکاوٹیں دور کریں گے۔ غربا۔ ضعیف العمر۔ بڑے کنبے والے لوگوں کو امداد دیں گے ہر شخص کی عزت کا لحاظ رکھیں گے۔ خواہ وہ غریب ہو یا مفلوک الحال نوکر ہو یا آقا۔"

"پہلے شاہی باورچی خانہ میں سینکڑوں جانور ذبح ہوتے تھے اب ہر روز صرف تین جانور ذبح ہوتے ہیں۔ آئندہ یہ تین جانور بھی ذبح نہیں ہوا کریں گے۔ میری مملکت میں قربانی کے لئے کوئی جانور ذبح نہ ہو۔"

"ایں جانب ظاہری تعظیم یا دان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ ہر فرقہ میں نفس معاملہ کے لب لباب کی ترقی چاہیئے۔ اس کی کئی شکلیں ہیں لیکن سب کی جڑ ضبط کلام ہے۔ بلا کسی وجہ کے اپنے فرقہ کی توصیف یا دوسروں کے فرقہ کی مذمت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دوسروں کے فرقہ کی عزت اپنے فرقہ کی عزت کرنا ہے۔"

"کلنگوں کو ایں جانب نے مفتوح کیا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار اسیر ہوئے ایک لاکھ قتل کئے گئے۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ تباہ ہوئے۔ الحاق کلنگ اور کلنگوں کو مفتوح کرنے سے پشیمانی پیدا ہوتی کیونکہ ملک کی فتح سے کشت و خون ہوتا ہے۔ بہت لوگ اسیر ہوتے ہیں۔ ایں جانب کو اس کا سخت افسوس اور پشیمانی ہے۔"

"اگر کوئی شخص ایں جانب کو اذیت پہنچائے تو ایں جانب جہاں تک ہو سکے گا برداشت کریں گے۔ کیونکہ ایں جانب کی خواہش یہ ہے کہ ہر ایک آدمی امن میں رہے۔ اور سکون اور اطمینان حاصل کرے"

"ایں جانب کی رائے میں سب سے بڑی فتح ۔۔۔ قانون تقویٰ کی ہے۔ اور ایسی فتح سے انبساط حاصل ہوتا ہے۔"

"ایں جانب کو قانون تقویٰ پسند آیا ہے۔"

مسٹر ایچ جی ولسن لکھتے ہیں کہ دنیا کے فرمانرواؤں میں سے صرف اشوک ہی ایک ۔۔ ہے جس نے فتح کے بعد جنگ جوئی بند کر دی تھی۔

"وہ سب لوگ میرے بچے ہیں جیسا کہ میں اپنے بچوں کی خوشی اور بہبودی چاہتا ہوں۔ رعایا کی بھی چاہتا ہوں۔"

شیو نرائن شمیم

رباعی

غافل جو شباب میں نہیں دانا ہے اپنا جو اُسے کہے وہ دیوانہ ہے

رہتی ہی نہیں سبزۂ عارض کی بہار یہ رنگ ہے عارضی وہ بیگانہ ہے

میر ناظر حسین خاں ناظم مغفور

دیوان مغرب

(نغمہ سنجی کی تلاش میں نغمات کی مملکت کو نکل جا اور معنی کو جاننے کیلئے اس کے وطن کی جستجو کر)

گوئٹے اسی مجموعہ کلام کی تمام نظمیں ایرانی انداز میں ہیں اور جس کامیابی کے ساتھ اس مغربی مغنی نے اپنے دل پر تمام تر مشرقی کیفیات طاری کر کے مشرقی شاعری کی روح کو...... ہم آہنگی اور کمال کے ساتھ ادا کیا ہے۔ مشرق کی فلسفی مزاج طبیعتیں اس کی مداح ہو جاتی ہیں۔ ہائنے کو یہ امر نہایت تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ جرمنی زبان اس قدر دلکش اور لطیف اور لوچدار خیالات کے بیان کی بھی طاقت رکھتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ گوئٹے نے اس میں مشرق کی ان تمام دلاویزیوں اور دلفریبیوں کو رکھ دیا ہے جن کو مغربی زبان میں مشرق کی روحانیت کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کی دلاویزی بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ نایاب پودوں کے چمنستانوں سے چنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے عقیدت کے طور پر مغرب کی طرف سے مشرق کی بارگاہ میں پیش کیا گیا ہے...........
.... یہ سرخ گلاب کے پھولوں، داؤدی کے غنچوں اور مہندی کی پتیوں سے تیار کیا گیا ہے جس کے درمیان جرمن بنفشہ کا ایک شاداب شگوفہ ہے۔ یہ گلدستہ مشرق کی طرف یہ پیام لے کر جاتا ہے کہ مغرب اپنی نام نہاد اور افسردہ روحانیت سے بیزار ہو کر اس کے تابناک سینے میں زندگی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی اکثر نظمیں سنہ ۱۸۱۴ء اور سنہ ۱۸۱۹ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی تھیں اور آخری سال انہیں شائع کر دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ کلام بارہ کتابوں پر مشتمل ہے جن میں سے زلیخا نامہ کو جو نغماتِ عشق کا شیریں آوازہ ہے بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی ایک مشہور ترین نظم کو آج پہلی بار اردو میں شائع کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

زلیخا نامہ

میرا خیال ہے کہ ایک سرد رات کے لمحوں میں میں نے خواب میں چاند دیکھا۔ لیکن جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ آفتاب نامعلوم طور پر پانی کی گہرائی سے طلوع ہو رہا ہے۔

اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ زلیخا کو یوسف سے نہایت محبت تھی۔ وہ جوان تھا اور شباب آنکھوں کو بھاتا ہے۔ وہ خوبصورت تھا اور بے انتہا خوبصورت تھا۔ وہ بھی حسین و جمیل تھی اور دونوں حسن و عشق کے متوالے تھے۔

اے تو جو میرے انتظار میں ہے، اور مجھ پر شباب آفرین نگاہیں ڈال رہی ہے تو بھی اپنی محبت سے مجھے سرفراز کریگی؟ آہ میرے نغمے تیرا گیت گائیں گے اور میں تجھے ہمیشہ کے لیئے زلیخا کہوں گا۔

آفتاب طلوع ہو رہا ہے! کس قدر شاندار نظارہ ہے۔ ہلال اس کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ اس حیرت انگیز وصال اور اس معمے کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

میری محبوبہ ان شاداب اور گھنی شاخوں کو دیکھ۔ دیکھ ان کے خوشرنگ پھلوں کو بھی دیکھ۔
ابھی تک وہ خام ہیں۔ انہیں اپنی دلکشی اور دلفریبی کا احساس نہیں۔ صرف ایک لٹکی ہوئی شاخ انہیں جھولا جھلاتی ہے۔
لیکن وہ اندر سے پک رہے ہیں۔ ان کا رنگ سرخ ہوتا جا رہا ہے۔ اب انہیں ہوا کی تمنا ہے اور آفتاب کی خواہش
اب وہ خوشی سے شگفتہ ہو رہے ہیں۔ یہی شان میرے نغموں کی ہے۔ وہ ہر روز تیرے پاؤں پر نثار ہوتے ہیں۔ "روزنی"

میر ناظر حسین خاں صاحب ناظم مغفور تلمیذ میر نفیس لکھنوی مرحوم

The Victoria Press
Ry., Road, Lahore

میر ناظر حسین خاں ناظم

"ناظم الہند" میر "ناظر حسین" کی ولادت ۱۲۷۹ھ میں ہوئی سن ولادت نام سے نکلتا ہے۔ والد کا نام میر ولایت حسین خاں تھا۔ وطن مکرولی ضلع مظفر نگر۔ تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی۔ فارسی میں ایرانیت کی شان نمایاں تھی۔ عربی میں بھی درک رکھتے تھے۔ اور اُردو زبان میں تو وہ کمال حاصل تھا کہ اساتذہ عصر امیر مینائیؒ۔ مرزا داغ اور میر جلال سب آپکی عظمت کے معترف تھے۔ شاعری میں میر انیس کے خاندان سے تلمذ تھا۔ جب آپ پنجاب میں آئے اردو کو یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت عام حاصل نہ تھی جو آج نظر آتی ہے آپ نے اس خلوص اور سرگرمی کے ساتھ اُردو زبان کی خدمت انجام دی کہ وہ زبان جو کچھ عرصہ پہلے صرف اہل علم کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اب عوام بھی اسی کو اپنی زبان سمجھ کر بولنے اور اس میں فکر کرنے لگے۔ یہ ناظم مغفور ہی کا دم تھا جس نے لاہور کی علمی ادبی اور مذہبی مجلسوں کو گرما کر عوام کو اردو کے دلکش اور شیریں ترانوں سے آشنا کر دیا۔ شاعری سے آپ کو فطری لگاؤ تھا بارہ چودہ سال کی عمر ہی سے مجالس عزا میں سوز اور سلام پڑھنے لگے تھے۔ اور پھر تو مشق سخن نے وہ رنگ پیدا کیا کہ آپ کے اشعار سند میں پیش کئے جانے لگے۔ سلاست روانی۔ فصاحت و بلاغت میں معنی آفرینی اور محاورہ کی سادگی آپ کے کلام میں نمایاں ہے۔ غیر مانوس الفاظ سے زبان قلم آشنا نہیں الفاظ کے تکرار سے جو خوبی آپ پیدا کرتے ہیں وہ داغ کے سوا کہیں اور کم نظر آتی ہے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے "نسیم جنت" اور "ناظم الہند" نام کے پرچے مدتوں آپ کی ایڈیٹری میں شائع ہوتے رہے آپ نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی تھیں۔ مگر دستبرد زمانہ سے ضائع ہو گئیں۔ جو باقی ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔ دیوان دار السلام۔ خطبہ بے الف یہ خطبہ حضرت علیؓ کے ایک بے الف خطبہ کا کامیاب ترجمہ ہے۔ جس کے ۴۴ بندوں میں ایک بار بھی الف نہیں نہیں آیا (۳) پنجہ نگارین (۴) مجموعہ مراثی (۵) نعرہ توحید۔ ان تصانیف میں سے جو تلف ہو چکی ہیں ایک دیوان "ساغر خون" تھا۔ جو ناظم مغفور نے داغ کے دیوان کے جواب میں لکھا تھا۔ جسے علامہ تاجور مدظلہ نے بہت عرصہ ہوا ایک ہندو صاحب ذوق کے پاس دیکھا تھا۔ داغ کی ہر غزل کے جواب میں ایک مرصع غزل تھی۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندو حضرات اور ارا کین حکومت سے بھی آپکی راہ و رسم تھی۔ قیام پنجاب کے بعد آپ کئی سال حکومت برطانیہ کی طرف سے سفارت کے عہدہ پر فائز رہے۔ کاغذات میں آپ کو ناظم الہند سفیر گورنمنٹ لکھا جاتا تھا۔ آپکا انتقال ۱۱ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو قلیل عرصہ کی علالت کے بعد لاہور میں ہوا اور وہ چراغ ادب جس سے پنجاب کی محفل ادب کی شمعیں روشن کی تھیں گل ہو گیا۔

انتخاب کلام

حمد

(منقول از خطبہ بے الف)

پوشیدہ حق سے کچھ بھی نہیں وہ خبیر ہے ہر وقت پردہ پوش صغیر و کبیر ہے
بس وہ گرے ہوؤں کیلئے دستگیر ہے رحمت میں بھی نہ فرد ہو کیوں دستگیر ہے
ہے حکم عین عدل مشیت درست ہے
وہ سب کے بعد بھی جو ہے سب سے نخست ہے

نعت

پھیلی ہوئی تھی تیرگیٔ جہل سربسر نحبت سیہ کی شکل تھے کل تیرہ دل بشر
نے خیر کی خبر تھی کسی کو نہ شر سے ڈر ظلمت کدے تھے کفر کی ظلمت سے دشت و در
یہ شکل تھی کہ صورت بعثت عیاں ہوئی
خورشید دیں کے نور سے روشن زمیں ہوئی

ہے تاج سر حمد خدا اسم محمدؐ وارفتہ محمود ہے ترسیم محمدؐ
تاخیر ہے خود شاہد تقدیم محمدؐ قرآن ہے دیباچہ تقدیم محمدؐ
ہے اُن کے تقرب کی گواہی بھی سند بھی
الحمد میں ہے آل بھی احمد بھی احد بھی

آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے پر

آنے کی خبر جس کے تھی تاگاہ وہ آیا اک ہاتھ میں تیغ ایک میں قانون کو لایا
پردہ جو جہالت کا پڑا تھا وہ اُٹھایا امّی نے سبق علم الٰہی کا پڑھایا

شاگرد ہوئے طاق غرض علم و ادب میں
رب رب کی صدا چار طرف گونجی عرب میں

منقبت

دریائے فیض جود علیؑ کی جناب ہے — بحر کرم وصی رسالت مآب ہے
حیدرؑ کے در سے آبرو پانی ثواب ہے — مہر علیؑ سے چشمۂ نور آفتاب ہے

ماہی سے تابماہ ہے جو کچھ گواہ ہے
ہر خشک و تر میں ساقیٔ کوثر کی چاہ ہے

پند و نصائح

فخر حسب کرو نہ غرور نسب کرو — ہنس کر مصیبتوں میں بھی تم شکر رب کرو
ہر دم حضور رب میں عرض عجز سب کرو — معبود سے طلب کرو گر کچھ طلب کرو

کچھ درد ہو کہ غم ہو عطش ہو کہ جوع ہو
ہر وقت حق کی سمت مگر دل رجوع ہو (از خطبۂ بے الف)

حضرت عباس علمدار کی آمد

اس شان سے آئے صف اعدا کے مقابل — ہو قہر خدا جیسے گنہگار پہ نازل
جب فوج سمٹتی ہوئی دیکھی سوئے ساحل — ہنس کر کہا یہ خام خیالی ہے ہے داخل

کس واسطے سب فوج یہ دریا پہ جھکی ہے
گرتی ہوئی بجلی کبھی خرمن سے رکی ہے

تیغ کی تعریف

عالم کے جلانے کا مگر تیغ سبب تھی
جو طور پہ چمکی تھی یہ وہ برق غضب تھی

خنجر جو علم کر کے بڑھا کوئی رسالہ — چوندھیا گیا اُس برق کا دیکھا جو اُجالا
سر تن پہ نہ تھا ہاتھ جہاں باگ پہ ڈالا — میداں میں ہوئے راکب و مرکب تہ و بالا

گر گر کے جو یہ برق غضب کوند رہی تھی
خاکستر خرمن کو قضا روند رہی تھی

لرزاں تھا جو سرکش تو فرس کرتا تھا پامال — ہر وار میں رہتی تھی اجل تیغ کے دنبال
نبار تھے لاشوں کے نہ کر سکتی تھی پامال — دم لیتی تھی دم بھی جو ہوتا تھا بُرا حال

جنات لرزتے تھے ملک کانپ رہے تھے
تھرا کے ملک الموت کھڑے ہانپ رہے تھے

گھوڑے کی تعریف

ہر وقت سواری میں ہا نعل دبہ آتش — ٹاپوں کی صدا سے دل دشمن تھا مشوش

ان تیزروں پر سخت وہاں تھا وہ سرکش — شائستگی ایسی کہ ملک کرتے تھے غش غش

رفتار پہ غش ہونا جو عادت تھی ہوا کی
باگیں نہ تھیں یا نہیں تھیں گلے میں صبا کی

مشک و علم

سوکھی ہوئی وہ مشک لٹکتی تھی علم پر — یاد آئی طوبٰی سے ہم آغوش تھا کوثر
با تشنگیٔ آل محمدؐ کی خبر پر — لائے تھے خضر چشمۂ حیواں کو اٹھا کر

مشکیزہ ہی زیب علم شاہ اگر تھا
ہر چشمۂ خورشید کا نقشہ وہ جگر تھا

قتل گاہ کا نقشہ

موت کی گھاٹ اک طرف اور مرگ کا جال اک طرف — بخت کی ہاں اک طرف اور برگشتہ اقبال اک طرف
ذبح اعظم زیر خنجر خستہ احوال اک طرف — عصمت کبریٰ کے میداں میں کھلے بال اک طرف

شور و شیون اک طرف فریاد زینب اک طرف
یہ اکیلی اک طرف دشمن جہاں سب اک طرف

بھائی کے لئے بہن کی آہ و زاری

چھوڑ دے بھائی کو میرے کاٹ لے میرا گلا — زخمی سینے سے اُتر ظالم تو اب بہر خدا
خاک پہ لیٹے ہیں بھائی بچھی چادر بچھا — زینب زخموں سے چھڑانے آئی ہٹوں ہٹ جا ذرا

چھوڑ دے گیسو نہیں برسے گا خون افلاک سے
پاک کرنے دے ستمگر ریش اقدس خاک سے

ہوش میں زخمی کو آلینے دے سینے سے اتر — حال دل کا بھائی سے کہہ لینے دے اے گبر
سن تو لینے دے وصیت صبر کر اتنا ٹھہر — ساتھ برسوں کا چھڑاتا ہے تو پھر جلدی نہ کر

سر اُڑا دے بھائی سے پہلے تو اس ماں جائی کا
موت سے بدتر بہن کو ہے بچھڑنا بھائی کا

حضرت ناظم مغفور کے ایک مشہور و مقبول اور مرصع مرثیہ المعروف بہ شام غریباں کا ایک بند

اللہ رے شان شام غریبان اہل بیت — مضمون اس کا دست و گریبان اہل بیت
زلف اس کی دود آہ یتیمان اہل بیت — خود رنگ چادر سر عریان اہل بیت

تاریکی اس کی چھائی تھی کون و مکان پر
شال عزا یہ شام تھی دوش جہان پر

(نازش رضوی)

ایثار

میرا خیال ہے دوسری عورتوں کو بھی میرے جیسے حالات پیش آئے ہونگے۔ صرف میں ہی ایک ایسی بیوی نہیں ہو سکتی جسے کئی سال کی ازدواجی زندگی کے بعد اچانک معلوم ہوا ہو کہ اب اس کا خاوند اس کا نہیں رہا۔ لیکن میری طرح ان خواتین کے لئے بھی ان باہمی تعلقات کا خاتمہ کر دینا۔ نہایت مشکل ہوگا جن میں ان کی مشترک مسرتیں اور غم برابر کے شریک رہے ہوں اور فی الواقع اکثر اوقات میں حیران ہوتی ہوں کہ جس وقت میں نے اپنے خاوند سے طلاق لی تو کیا میں نے دل کے ان تمام رشتوں کا بھی خاتمہ کر دیا تھا جن سے گھر کی دلکش فضا پیدا ہوتی ہے۔

میں نے یہ چرچا سنا تھا کہ ول اپنی حسین و جمیل سیکرٹری کو چاہتا ہے۔ لیکن میں نے اس کو بالکل معمولی بات خیال کر کے اپنے دل میں جگہ نہ دی۔ روتھ ایلیسن ایک ہوشیار لڑکی تھی اور ول کے کاروبار میں نہایت سرگرمی سے دلچسپی لیتی تھی۔ میرا خاوند وکیل ہے۔ اس وقت اس کی کافی آمدنی تھی لیکن وہ اپنے پیشے کی کامیابی اور رتبے کے باوجود روتھ کی امداد پر خوش تھا۔ اس کی وجہ سے میں بھی خوش تھی۔ اور اس کے علاوہ مجھے اس لڑکی سے محبت بھی تھی۔

میں اس کو اپنے ساتھ دریا کے کنارے والے مکان میں لے جاتی تھی اور اگرچہ روتھ اور ول وقت کا ایک کثیر حصہ اکٹھے رہتے تھے۔ مجھے ان کی بے ریا دوستی کے سوا کبھی کوئی خیال بھی نہ آیا تھا۔

مجھے یہ علم بالکل اتفاقی طور پر ہوا۔ ان دنوں ول انفلوئنزا کے حملے کی وجہ سے گھر پر رہتا تھا۔ وہ اپنے مقدموں کے متعلق نہایت فکرمند تھا۔ اور روتھ اس کی خواہش کے مطابق شام کے وقت تازہ ترین تفصیلات لیکر آتی تھی۔ اس شام ول اپنے مطالعہ کے کمرے میں روتھ کے انتظار میں شام کے اخبارات پڑھ رہا تھا۔ میں باغ کی روش پر ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے کھڑکی میں سے اُسے دیکھا۔ وہ میز کے مقابل کرسی پر نہ تھا۔ بلکہ کھڑا ہوا دروازے کو اس شوق اور انتظار سے دیکھ رہا تھا جسے دیکھ کر میرا دل سرد پڑ گیا۔ اس کی نگاہوں میں یہ چمک میں نے بارہا دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر ہر بار میرے جسم میں ایک لرزش پیدا ہو جاتی تھی۔ میں جانتی تھی کیا ہونے والا ہے۔ ہاں میں جانتی تھی!

دروازہ کھلا اور روتھ اندر داخل ہوئی۔ اُس نے اپنا مختصر سا کیس ایک طرف رکھ دیا اور بے تابانہ میرے خاوند کی طرف بڑھی۔ اور نہایت محبت سے ہاتھ ملایا۔

ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور پر کوئی عہد و پیمان کرنا چاہتے ہیں۔

میں یہاں زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی اور کھڑکی کے مقابل سے چلی آئی اور اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے مقفل کر لیا۔

صاف ظاہر ہے کہ ول میری موجودگی کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ کیونکہ جب اس نے آکر دروازے پر دستک دی اس بات کو پورا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں دروازہ نہ کھول سکتی تھی۔ میں نے اپنی معمولی آواز میں یہ کوشش کرتے ہوئے کہ کہیں میرے دل کی یہ کیفیت ظاہر نہ ہو جائے۔ کہہ دیا کہ مجھے اس وقت دردِ سر کی شکایت ہے اور میں آرام چاہتی ہوں۔

میرے سامنے مستقبل تھا جس کا جوان کے طوفانی دنوں میں میرے ذہن میں خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ مجھے اس مستقبل سے دوچار ہونا تھا جس میں اس مرد کا پتہ نہ تھا جس سے مجھے محبت تھی۔

دوسری صبح ول شہر کو گیا۔ جب وہ مجھے خدا حافظ کہنے آیا۔ وہ نہایت متفکر تھا۔ وہ پلنگ کے پاس کھڑا رہا اور اس کی پیشانی پر بل تھے۔

"میری پیاری میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں ڈاکٹر بلوا دیا جائے"

یہ کہتے ہوئے اس نے محبت کے پیرائے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹی گذشتہ چند ہفتے کے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان ایام میں اس کا پیار اور محبت ظاہری اور مجبوری کی تھا لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ مرد کی محبت کی کئی ایک حالتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب تک اس کی محبت اور وفاشعاری

پر اعتماد ہو اس کی ہر ادا کا جواب مسکراہٹ سے دیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر اعتماد نہ ہو؟ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے وِل کو اس انداز سے روتھ سے اظہارِ محبت کرتے دیکھا تھا جس کے صرف ایک ہی معنے ہو سکتے تھے۔ اور مجھے کیا کرنا ہے؟

میں نے ارادہ کر لیا کہ میں مات نہ کھاؤنگی۔ میں اپنے رفیقِ حیات کو مقابلے کے بغیر ہاتھ سے نہ دونگی۔ میں نے ٹھنڈے دل سے اپنا اور اس لڑکی کا مقابلہ کیا۔ اور میں کسی لحاظ سے اس سے کم نہ تھی۔ آپ جانتے ہیں میں بھی حسن وجمال رکھتی ہوں۔ اگرچہ یہ خودنمائی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔

اب دوسرا مسئلہ جس کا مجھے فیصلہ کرنا تھا یہ تھا کہ کیا وِل جذبات کے اس اندھا دھند طوفان سے سلامت نکل آئیگا۔ یا یہ لڑکی اس کی زندگی کا مستقل جزو بن کر رہے گی؟

یہ موقعہ توقع سے کچھ پہلے ہاتھ آگیا۔ ایک شام وِل کی بہن سلویا ہمارے ہاں آئی۔ ہم دریا کے کنارے والے مکان کو چھوڑ کر شہر کے پُرمسرت مکان میں چلے گئے تھے۔

سلویا اس بات پر ہمیشہ بجا طور پر فخر کیا کرتی ہے کہ وہ سچی بات کو بلاتکلف کہہ دیتی ہے۔ چنانچہ اس شام بھی اس نے اپنے معمول کے مطابق کیا اور مجھے صاف صاف بتادیا کہ اس نے وِل اور روتھ کو برگٹن میں دیکھا ہے۔ میں نے نہایت بے پروائی سے اس بات کو ٹال دیا اور کہا شاید وہ کاروبار کے لئے وہاں گئے ہوں گے۔

وِل سلویا کو اسوقت ملا جب وہ واپس جارہی تھی۔ اس نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور اُس سے حقارت سے اُس حق بجانب حقارت سے ہمکلام ہوئی جس کو مرد ہمیشہ سمجھتا ہے۔

وِل نے مسکراتے ہوئے یا کانپتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میری! سلویا نے تمہیں کیا کچھ بتایا ہے"؟ وہ کچھ مجھ سے خائف اور ضد پر اُترا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وقت آگیا ہے۔

"میرا خیال ہے تم جانتے ہو"۔

اس نے بے تابی سے ایک پاؤں سے دوسرے پر بوجھ دیتے ہوئے کہا "تمہاری مراد ہے تم ——— روتھ کے متعلق جانتی ہو"

میں نے سر ہلایا "میں اس دن سے جانتی ہوں جب سے میں نے تم کو بنگلے میں دیکھا ہے۔ تم دونوں کو" اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے میری اس بات سے اس کے دل کو سخت اذیت پہنچی۔ اس کا خیال تھا کہ میں جوش وخروش میں کچھ اور کہونگی لیکن میں خاموش رہی اور وہ اپنی خوش قسمتی پر خوش تھا۔

اُس نے کہا "شائد تم مجھے جوان خیال کرتی ہو لیکن ——— میری! میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم جانتی ہو مجھے تم سے کسقدر محبت ہے۔ خطرناک طور پر محبت ہے۔ لیکن آہ تم نہیں جانتیں۔ تم خیال نہیں کرسکتیں۔ روتھ کسقدر سحرکار لڑکی ہے"۔

یہ بات سوچنے میں بڑی حیران کن ہے کہ مرد کے لئے بیوی سے اپنی محبوبہ کا تذکرہ نہ کرنا کسقدر دشوار امر ہے۔ تمام مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس تذکرے سے باز نہیں رہ سکتے۔ وِل مجھ سے میری حریف زندگی کے متعلق اس طرح باتیں کرتا تھا گویا مجھے اس سے یا روتھ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

"میری تم سمجھتی ہونا؟ میرا کیا مطلب ہے"؟

"ہاں وِل میرا خیال ہے میں سمجھتی ہوں روتھ تمہارے لئے شعریت کا پیکر اور رومان ہے"۔

"آہ! وہ آسمانی مسرت ہے میرے لئے!"

میں کیا کہوں۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ میں لڑھکنیاں کھاتی ہوئی ماضی میں چلی گئی۔ اس وقت وہ بالکل وہی تھا جس نے بیس سال ہوئے مجھ سے پہلی بار محبت کی تھی۔ "میری وہ اسقدر پُرتپاک ہے ——— اور اسقدر خندہ رو۔ اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں وہ کام بھی کرسکتا ہوں جس کی مجھ میں قابلیت نہیں ہے"۔

میں نے جواب دیا "میں جانتی ہوں۔ تم اسے چاہتے ہو۔ اس کی تمنا رکھتے ہو۔ تمہیں رومان اور شعریت کی آرزو ہے۔ تم آسمانی مسرت کے خواہاں ہو۔ میرے پیارے میں تمہیں باز نہیں رکھ سکتی۔ رکھ سکتی ہوں کیا؟ میں تمہاری مخالفت نہیں کرونگی۔ اگر روتھ کے دل میں بھی یہ جذبۂ عشق ہے اور وہ بدنامی اور ننگ وناموس کے خیال سے ترساں نہیں ہے۔ تو میں تمہیں جانے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ میں تمہاری منتظر ہونگی اور تمہارے واپس آنے تک انتظار کرونگی"۔

"تم انتظار کروگی میری؟" اس نے بالکل ایک ننھے متحیر بچے کی مانند مجھے دیکھا۔ "تم نہیں سمجھتی میری! آہ میں جانتا ہوں یہ انتہائی درجے کی درندگی

اور سنگدلی ہے۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ - بات یہ ہے میں روتھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ــ ــــــــ تم مجھ سے طلاق لوگی۔ میری"؟

اس وقت ضبط و تحمل کی باگ میرے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اب میں ایک قدیم عورت تھی جو اپنے ہمراہی کے لئے لڑ رہی تھی۔ "طلاق لوں"؟ میں نے کہا تم مجھے یہ کہہ سکتے ہو؟ - میں نے تمہیں آزادی دے رکھی ہے۔ میں نے تمہیں اپنی محبوبہ کے پاس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ اور میں نے طعن و تشنیع کا ایک لفظ تک نہیں کہا۔ لیکن یہ میری رُوح کی برداشت سے باہر ہے۔ اگر میں تم سے طلاق لے لوں تو میرے پاس کیا رہ جائیگا؟ اور میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام کس طرح بسر کروں گی؟

وِل کا انداز اس کشمکش کی آواز پر فوراً بدل گیا "کس طرح بسر کرونگی؟ - تم حسین اور ہوشمند عورت - یقیناً میرے علاوہ تمہارے لئے کچھ اور دلچسپی کا سامان بھی ہو سکتا ہے"؟

ہائے کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ میں نے تنہائی کی زحمت کو بھی فراموش کر دیا ہے؟ میں تنہائی کی مصیبتوں کو بھول گئی ہوں۔ وِل کیا ان ایام رفتہ کی تمہارے دل میں کچھ وقعت نہیں؟ وہ زریں ماضی تمہارے لئے کچھ بھی نہیں"؟ جب میں نے یہ الفاظ کہے میں نے محسوس کیا۔ کہ میں صرف اپنے لئے نہیں بلکہ تمام شادی شدہ عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھا رہی ہوں"!

لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور اُس کے چہرے پر ضد اور شرمندگی کے آثار تھے اور میں جانتی تھی کہ میں جسقدر زیادہ غضبناک ہونگی اتنا ہی وہ سنگدل ہوتا جائیگا۔

میں تمام رات رو رو کر جان ہلکان کرتی رہی۔ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ کس طرح نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن صبح ہوتے ہی کٹھیں لگے ہوئے اور پامال جذبات کا یہ اندھا دھند طوفان اُتر گیا۔ اور میں نے واقعات کو دن کی پاکیزہ اور نور پاش روشنی میں دیکھا۔ میں نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وِل سے طلاق لے لوں ــ

آہ میں اپنے خاوند سے اس امید پر، ہاں صرف اس مجنونانہ امید پر جیسا کہ میں خود محسوس کرتی ہوں۔ دست بردار ہو جاؤں گی کہ اسے دنیادی رسوم کی قیود سے آزاد کر کے پھر اپنی محبت کی سحرکار زنجیروں میں اسیر کر لوں۔ میں نے بیس سال بعد تعلقات کے اس محل کو جس کی تعمیر جوانی کی اُمنگوں اور جذباتِ حسن و عشق کی رنگینیوں نے کی تھی۔ صرف اُسے بچانے کے لئے ڈھا دیا۔

میں نے کہا "وِل میں تم سے طلاق لیتی ہوں"!

آہ! کسقدر خوفناک تھی وہ چمک! جو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں پیدا ہو گئی - وہ خوشی میں آپے سے باہر تھا اور ممنونیت اور احسان مندوں کے جذبات کے سمندر کو جو اس کے دل کی گہرائی میں اُمڈا چلا آرہا تھا روک نہ سکتا تھا۔ میرے اور وِل کے رشتہ دار سخت خفا تھے اور چند احباب کا خیال تھا کہ مجھ سے یہ ایک نہایت احمقانہ فعل سرزد ہُوا ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میری زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے ہیں جن میں مجھے احمق کہا جا سکتا تھا۔ صرف اسی ایک واقعہ کو دیکھ لیجئے۔ وِل کے محض ایک اشارے پر جس نے مستقبل ہی کو نہیں بلکہ ماضی کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت چاروں طرف تاریکی تھی۔ ہر طرف ناکامی اور مایوسی، صرف امید کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا دُور سے دکھائی دے رہا تھا جس پر میری زندگی کا انحصار تھا۔

طلاق کے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پیشتر میں باہر چلی گئی مقدمے کی تفصیلات میرے لئے نہایت تکلیف دہ اور بھیانک تھیں۔ مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا۔ کہ مجھے عدالت میں پیش ہو کر بخوشی اپنی مسرتوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس وقت میری رُوح کی فضا میں یہ زبردست وحشیانہ خواہش ایک بگولے کی طرح پیدا ہوئی کہ میں اس تمام کارروائی کو روک دوں۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ صبر و تحمل کی اس جانسوز آزمائش سے میں کس طرح عہدہ برا ہوئی۔ صرف اسقدر یاد ہے کہ بیست سالہ رشتۂ ازدواج پندرہ منٹ میں تار تار ہو گیا ہو۔

اگلے چھ مہینے میں نے دیہات میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرصے کے بعد طلاق کے کاغذ کی تصدیق ہو جائیگی۔ اور وِل دوسری شادی کر سکیگا" میں سوچتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے میں دوبارہ شادی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ میری شمع حسن کے پروانوں کی کمی نہ تھی۔ اس انبوہ میں دو ایک ایسے بھی تھے جو مجھ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً ایک شخص نے جو مجھے اسوقت سے جب کہ میں نے شباب کی گلپوش وادی میں قدم بھی نہ رکھا تھا جانتا تھا۔ مجھ سے اُس نے کئی بار شادی کے لئے پوچھا اور وہ بھی ایکبار نہیں کئی بار۔

میں خاوند کی حیثیت سے اُس کا تصور کیوں نہ کر سکتی تھی؟ آہ یہاں پھر میرے شیشۂ دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ دوسری شادی مجھ جسر نصیب کے لئے نہ تھی۔ وہ وِل سے ہر لحاظ میں بہتر اور مردانہ حسن کی سحرکاری کا اس سے کہیں بڑھ کر مالک تھا۔ لیکن میں اپنے شباب کی

اوّلین محبت اپنی آرزوئیں اور تمنائیں اور اپنی ناکامیاں، دل کے عشق کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ ہم ایک جان دو قالب تھے اور یہ میرے تصوّر میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی مجھے اس سے جُدا ہونا ہے۔ اور میں اس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ . . . . لیکن آہ! اب مجھے خود جُدا ہونا تھا اس کے رشتہ داروں نے مجھے بتایا کہ وہ روبتھ سے شادی کرنے والا ہے اور مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بھی اس رشتے کے خیال سے مانوس ہوتے جاتے ہیں۔

بالآخر فیصلہ ہوگیا اور اب وِل اور میں قانون کے الفاظ میں میاں بیوی نہ تھے۔ سلویا نے مجھے اطلاع دی کہ اُن کی شادی آنے والی خزاں میں ہوگی۔ آہ! خزاں میں جب کائنات کا ذرّہ ذرّہ کسی نامعلوم کشش سے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد انگلستان میں میرے لئے ٹھہرنا دوبھر تھا میں وہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہ رہ سکتی تھی۔ میں نے اطالیہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اطالیہ کے سبز سبز و شاداب مناظر، نیلگوں کھاڑیوں پر سنگترے کے دلکش اور خوش رنگ کنجوں کا سایہ، جھیلوں کی اٹھلاتی ہوئی موجوں کا زیر و بم کبھی ہمارے عہدِ جوانی کے خوابوں کی زینت رہتے تھے۔ اور اب میرا خیال تھا میں اس سرزمینِ خواب میں زندگی کی تلخیوں کو فراموش کرسکونگی۔ وِل کی شادی ستمبر میں ہونے والی تھی اور یہ اگست کی آخری رات تھی جو میں نے لنڈن میں گذاری۔

میرا خیال ہے میرے دل پر فراموشی کی سی ایک کیفیت طاری رہی ہے کیونکہ اگرچہ اس روز میں تمام دن اس خیال کو دباتی رہی۔ لیکن شام کو میرا دل کشاں کشاں مجھے اس مکان کے نواح میں لے گیا۔ جہاں ہم اسقدر مسرت و اطمینان کے دن بسر کرچکے تھے۔ میری نگاہیں دھندلی ہو رہی تھیں اور میں ایک شخص سے جو دوسری جانب سے آرہا تھا بے اختیار ٹکرانے کو تھی۔

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ وِل تھا۔ میں اس امر کو بالکل بھول گئی تھی کہ اب وہ میرا خاوند نہیں تھا۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ مسکرایا اور اس مسکراہٹ میں کچھ حماقت سی ملی تھی۔

"تم تو بہت جوان معلوم ہوتی ہو" اس نے کہا "تم وہی لڑکی ہو نا جس سے مجھے محبت تھی؟ ——— آؤ کچھ چائے تو پی لیں!"

میں نے اپنی اس ملاقات کا بارہا تصوّر کیا ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی اصلیت معلوم نہ ہوتی تھی۔ ہم نے کچھ دیر بیٹھے باتیں کیں اور قہقہے لگائے اور تمام چیزوں کے متعلق ہنستے رہے اسوقت مجھے اچانک یاد آیا۔

میں نے کہا "اب مجھے ضرور جانا چاہئے۔ مجھے بہت سامان باندھنا ہے۔ میں کل انگلستان سے جارہی ہوں"۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ گویا وہ مایوس ہوگیا ہے۔

"طویل عرصے کے لئے؟"

"میں ——— میں کچھ نہیں کہہ سکتی" ہم بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے "اور تمہاری شادی کب ہوگی؟"

میرے بالمقابل ایک آئینہ تھا میں یہ دیکھ کر اپنے دل میں فخر کر رہی تھی کہ دل کے طوفانِ الم کو دبا کر میں کس آسانی سے مسکرا رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ——— میں تم سے کہنا چاہتا ہوں میری! میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں"؟

"اب ہم اپنے مکان میں نہیں جا سکتے" میں نے جواب دیا "وہاں کوئی آچکا ہے ——— اور میں نہیں خیال کرتی کہ ابھی کچھ باقی ہو"۔

لیکن وِل نے اس بات پر کچھ دھیان نہ دیا۔ وہ میرے ساتھ ہوٹل میں آیا اور مجھے بہت سی باتیں بتاتا رہا۔

"یہ عجیب مضحکہ خیز بات ہے۔ لیکن جب سے تم مجھ سے جدا ہوئی ہو میرے دل میں کسی اور سے زیادہ تمہارا خیال ہے۔ آہ وہ تمہارا بال سنوارنے کا انداز ——— وہ تمہارا بے موقعہ قہقہہ ——— آہ میری! ہم نے محبت سے دن گذارے ہیں"۔

میں نے سر جھکا دیا۔ میری آواز مجھے فریب دے رہی ہے میں بول نہ سکتی تھی۔

"آہ! اس کو فراموش کرنا آسان کام نہیں ہے میرا خیال تھا۔ یہ آسان ہوگا ——— لیکن یہ بہت مشکل ہے اور نئی زندگی شروع کرنا بھی دشوار امر ہے"۔

یہ ہے جو اس نے اُس شام مجھ سے کہا ——— لیکن وہ مجھے اطالیہ میں آملیگا۔ اس نے مجھ سے آنے کے متعلق اجازت چاہی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں انکار کرتی۔ لیکن اگر وہ آیا تو وہ روبتھ سے شادی نہ کرسکیگا ——— میرے دل پر پھر امید کی حکومت ہے۔ میں خیال کرتی ہوں۔ ہاں میرا خیال ہے میں ایکبار پھر خوشی کی مالک ہونے والی ہوں۔ بہت عرصہ ہُوا میرا یہی خیال تھا۔ میں نے اپنے تعلقات کے رنگین قصر کو مسمار کردیا۔

کیا میں نے اسے بچا لیا ہے؟

یہ مجھے اطالیہ میں معلوم ہوگا۔

(رہبری لنگھم) حنیف ہاشمی

چشمۂ محبت

سندھی

پند و نصائح

اگر تم اپنا مکان پہاڑی پر بناتے ہو تو جنگلی درندوں سے کیوں خوف کھاتے ہو؟-
اگر تم اپنا مکان سمندر کے کنارے بناتے ہو تو اُس کی لہروں کا کیا ڈر ہے؟-
اور اگر تمہارا مکان شہر میں ہے تو شور و غوغا سے کیوں خائف ہو؟
اس دنیا میں ہمیں مدح و توصیف اور طعن و تشنیع کو بلا چون و چرا برداشت کرنا چاہیئے -

---

اگر نیک تباہ و برباد بھی ہو جائیں تو وہ نیک ہی رہیں گے -
لیکن اگر بد تباہ ہوں تو وہ کہیں کے نہیں رہتے - اگر سونے کا برتن ٹوٹ جائے تو وہ پھر بھی سونا ہی رہتا ہے -
لیکن اگر مٹی کا برتن ٹوٹ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا

اے وہ جو محنتوں اور مشقتوں سے زر و مال کماتا ہے اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لئے زمین میں دبا دیتا ہے - جب تیری روح اس قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی تو یہ تیرے کس کام آئے گا -

---

سنسکرت

خزاں

کنول کے شگفتہ پھول کی سی آنکھوں کے ساتھ اپنے دلفریب چہرے کو دیکھنے کیلئے خزاں نے اپنی بادلوں کی انگیا میں سے سورج کا آئینہ نکالا

شہد کی مکھی

اے شہد کی آوارہ مزاج مکھی - اب ان پھولدار جھاڑیوں کی طرف متوجہ ہو - جو تیرا بار برداشت کر سکتی ہیں تو بلا وجہ چنبیلی کی ان کلیوں کو کیوں ستاتی ہے جس میں ابھی غبار گُل تک پیدا نہیں ہوا

چاندنی

چاندنی کی سفید روشنی آکاس سے آکر دھرتی پر پڑ رہی تھی - ہاتھی تاریک جنگلوں میں اسے دیکھتا اور پانی سمجھ کر رُک جاتا تھا - بلی چوکیوں اسے دودھ سمجھ کر چاٹتی تھی اور مزا نہ پا کر حیران ہوتی تھی اور ایک کنواری بستر پر اسے اپنا سفید دوپٹہ سمجھ کر اپنے گرم جسم سے لپٹنا چاہتی تھی لیکن ناکام رہتی -

انگریزی

وکٹر ہیگو ایک خوش بیان کی حیثیت سے

۹ بجے کے قریب وکٹر ہیگو کے خیالات نہایت بلند فضاؤں میں پرواز کرتے اس وقت وہ خدا کے صفات اور دعا کی ضرورت الحاد اور مادہ پرستی کی حماقت پر بحث کرتا - "خدا کی ہستی سے انکار کرنا کس قدر حماقت آمیز ہے! خدا موجود ہے مجھے اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی ہستی کا - اگر خدا نے مجھے فرصت دی تو میں ایک کتاب لکھوں گا جس میں دکھاؤں گا کہ دعا مانگنا کس قدر روح پرور اور ضروری ہے - اور میرا تو یہ حال ہے کہ متواتر چار گھنٹے دعا کے ..... بغیر نہیں رہ سکتا -
میں خدا سے کیا مانگتا ہوں؟ مجھے طاقت دے - میں نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہوں لیکن میں کمزور ہوں اور مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہے میں خود اس امر کے ناقابل ہوں کہ جس چیز کو نیک جانتا ہوں اس کو کر سکوں - میں صرف خدا کے سہارے پر زندہ رہتا ہوں - ہمارا وجود اس کے دم سے ہے - ہماری زندگی اور نقل و حرکت غرضیکہ ہر شے صرف اسی کی ہے

وہ خالق عالم ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس نے دنیا کو پیدا کیا وہ ابدی طور پر خلق کرتا ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ وہ لامحدود "انا" ہے وہ۔

تم سو رہی ہو"

یہ الفاظ وہ اپنی بیوی سے کہتا جو کھانے کے وقت سے ایک بازوؤں والی کرسی میں آرام سے بیٹھی ہوتی۔ اپنے خاموش تصورات سے بیدار ہو کر اپنی زخمی معصومیت کی تمام تر قوت کے ساتھ وہ احتجاج کرتی "تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ جتنا عرصہ تم نے باتیں کیں میں سوتی رہی"

ہندوستانی آرٹ

برطانیہ عظمیٰ کی نارمنوں کی فتح کے وقت ہندوستان کی سرزمین میں بھی ایک معرکۂ انقلاب برپا تھا۔ یہ مسلمانوں کا حملہ تھا جو تین ہزار برس قبل کے آرین نوواردوں کی طرح شمال مغرب کے پہاڑی راستوں سے ہندوستان کے میدانوں میں اتر آتے تھے۔ وہ ایک خاص مذہب ایک تہذیب اور فن کے معیار اپنے ساتھ لائے تھے اور ان میں اور ہندوؤں میں باہم بہت فرق تھا ہندوستان کے آرٹ اور خصوصاً فن تعمیر میں اُنہوں نے ایک نمایاں اضافہ کیا۔ اکثر ممتاز ترین عمارتیں۔ آگرہ کا شہرۂ آفاق مقبرہ تاج محل اور دیگر شہروں کی مسجدیں اور محلات ان کی دماغی قابلیت کی اختراع ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے فن مصوری میں بھی اُنہوں نے نہایت قابل قدر اضافہ کیا۔ مغلیہ آرٹ کی تصاویر صحت، تفصیلات کی باریکی اور لطافت کے لحاظ سے نہایت قابلِ تعریف ہیں اور مصوروں نے آرٹ کے اس پہلو پہ خاص طور پر موشگافی کی ہے۔ مغلیہ آرٹ کا خاصہ تصوریت کی بجائے واقعیت ہے، اور مصور ان تمام اشیاء کو نہایت وفاداری کے ساتھ صفحہ قرطاس پر رکھ دیتا ہے جو وہ دیکھتا ہے۔ چنانچہ مغلیہ آرٹ کی کسی فطری منظر کی تصویر میں درختوں کی اقسام کو نہایت آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہی مقام ہے جہاں پر فاتحین کا آرٹ مفتوحین کے دیسی آرٹ سے جس کے نمایاں پہلو تصوف آمیز دلکشی اور سادگی میں۔ تفاوت رکھتا ہے۔ ہندوستانی آرٹ کی اس خاص شان کا انحصار ہندوستانی مصور کے مطمح نظر پر ہے۔ ہندوستانی مصور یا سنگتراش ہندوستانی فلسفی کی مانند مادی عالم کو طلسم فریب سمجھ کر کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ وہ کسی شے کی ظاہری شکل و صورت کی بجائے اس حقیقت کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہے جسے وہ مجاز کے پردے میں دیکھتا ہے۔ جب ایک ہندوستانی مصور کسی دیوی یا دیوتا کی لامحدود طاقت کا تصور ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ایسی صورت بناتا ہے جس کے بازوؤں اور سروں کی تعداد غیر فطری طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مغربی کے لئے جو اس کے انداز بیان سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ تصویر نہایت مضحکہ خیز ہوگی۔ لیکن ایک ہندوستانی کے لئے ایسا نہیں ہے وہ ان خاص تصنع آمیز اشکال سے جن کو مصوری اور ادب میں خاص طور پر برتا جاتا ہے اُن کے روایتی ہونے کی وجہ سے اچھی طرح مانوس ہوتا ہے اور جانتا ہے۔ مثال کے طور پر بھگوت گیتا کا یہ اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ میدان جنگ کا ہیرو کشف کی حالت میں خدا کو اس کی اصلی شکل و صورت کیسا تھ دیکھتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے۔

"اے لامحدود ہستی میں تجھے ہر جگہ تیرے بیشمار چہروں۔ آنکھوں بازوؤں اور سینوں کے ساتھ دیکھتا ہوں"

"ہندوستان ریویو" الہ آباد

یونانی

موت کیا ہے

بادہ خوار جب دنیا کے الائم و مصائب کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر میکدے میں بیٹھتے ہیں پیمانہ گردش میں ہوتا ہے۔ اور ہر طرف سے ناؤ نوش کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اُس وقت یہ آواز جو اُن کے دل سے نکلتی ہے عام طور پر سُنی جاتی ہے "خوشی کی گھڑی بہت مختصر ہے اور یہ پھر ہمیں نصیب نہ ہوگی" گویا کہ موت کے بعد سب سے پہلے انہیں شراب کی تشنگی ستائے گی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش شراب کیلئے ہوگی اور اس کیلئے اُن کا حلق خشک ہو رہا ہوگا لیکن وہ نہیں جانتے کہ جب دل اور جسم ایک مدہوشی کی حالت میں آرام کر رہے ہوں تو کوئی شخص زندگی کی تمنا نہیں کرتا۔ کیونکہ ہماری موت پر ہمارے عناصر میں ایک ہنگامہ اور پریشانی کا آغاز ہوتا ہے اور جسم میں ایک بار موت کی خنکی آ کر وہ پھر بیدار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

لیکن خیال فرمایئے کہ اگر فطرت اشیا اچانک آواز اُٹھا کر ان الفاظ میں ہمیں ملامت کرے "موت تجھ پر اتنی بھاری کیوں ہے اے فانی انسان؟ تو ہمیشہ بیزار کن نالہ و ماتم کی آواز بلند کرتا ہے۔ احمق اگر تیری زندگی بہت پرمسرت تھی اور تیرا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی تو اب تو

ایک مہمان کی طرح جو مجلس سے اُٹھ کر آرام کیلئے خلوت میں چلا جاتا ہے اس عظیم الشان سکون سے ہم آغوش نہیں ہوتا جو موت نے تیرے لئے تیار کیا ہے اور جس میں کوئی فکر و مصیبت نہیں۔ اور اگر تو تمام زندگی اپنے مصائب کا ماتم گسار رہا ہے تو اب اس مصیبت کی زندگی کے ختم ہونے پر یہ کیا چیخ و پکار ہے کیونکہ میرے پاس اب کچھ نہیں ہے کہ میں تجھے دیکر خوش کر سکوں۔ تمام اشیاء اپنی فطرت پر ہیں اور اُن میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اگر تیرا جسم ضعیف نہیں اور اعضا بھی صحیح و سالم ہیں تو کیا ہے۔ ہر ایک شے اپنی حالت پر رہتی ہے۔ اور اگر تو ہزار سال کیا ہمیشہ کیلئے بھی زندہ رہے تو تیرے عناصر میں کبھی تغیر نہ آئیگا۔"

فرانسیسی

نفع نقصان

ایک یونانی فلسفی نے شہر میں تجہیز و تکفین کا سامان فروخت کرنے والوں کو بہت ملامت کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس پیشہ کے آدمی کافی نفع کماتے ہیں اور یہ نفع تاوقتیکہ بہت سے لوگ نہ مریں ان کو نہیں مل سکتا۔ یہ نظریہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جبتک کہ دوسرے کا نقصان نہ ہو اور یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ہر قسم کے نفع کو اپنے لئے اچھا نہیں سمجھتے۔ ایک سوداگر صرف اُسی حالت میں متمول ہوتا ہے جبکہ نوجوان زیادہ شوقین اور فضول خرچ ہوں۔ اور غلہ فروخت کرنے والا اُس وقت خوش ہوتا ہے جس وقت شہر میں کال پڑ رہا ہو۔ یہی حال وکیل کا ہے اسکی چاندی ہمیشہ مقدموں اور لوگوں کے باہمی لڑائی جھگڑے میں ہوتی ہے اور اعزاز و اکرام اور مذہبی رسومات کی بنا ر بھی تو ہماری موت پر ہے

ایک قدیم یونانی مقولہ ہے کہ کوئی حکیم اپنے احباب کو اچھی صحت میں دیکھکر خوش نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح کوئی سپاہی شہروں کے امن و امان اور فوجوں کے سکون سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں ہم میں سے ہر ایک اپنے ضمیر کا جائزہ لے اور وہ دیکھے گا کہ ہماری دلی تمنائیں اور آرزوئیں دوسروں کو نقصان پہنچانے کی اُمید پر پرورش پاتی ہیں۔ میرا خیال روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے کہ تمام قوانین فطرت اس اصول کے ماتحت ہیں۔ لطبا ہمیں بتاتے ہیں کہ پیدائش فراوانی اور زیادتی تبدیلی اور موت کی دلیل ہے۔

جرمنی

موسیقی

لیکن موسیقی کیا ہے؟

رات یہ خیال سونے سے پہلے متواتر ایک گھنٹہ تک میرے ذہن میں رہا میں کہہ سکتا ہوں کہ موسیقی میں کوئی حیرت انگیز اور دلفریب عنصر ہے اور یہ عنصر کیا ہے۔ خیال اور بصر کی حد فاصل یا روح اور مادے کی درمیانی کڑی ہے جو دونوں سے ہم آغوش اور نہ دونوں سے متفاوت ہے۔ یہ ایک روح ہے جسے وقت اور مادے کے بچانے کی ضرورت ہے۔ جو اسے مکان کی قید و شول سے آزاد کرتی ہے ہم نہیں جانتے کہ موسیقی کیا ہے۔ لیکن یہ کہ موسیقی کس قدر عالم فریب ہوتی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں اور یقیناً جانتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ اچھی اور بری موسیقی میں کیا فرق ہے۔ کیونکہ ہم عام طور پر بری موسیقی سنتے ہیں

موسیقی کی تنقید کی بنا ہمیشہ تجربہ پر ہوتی ہے۔ تجزیہ پر نہیں۔ اس سے موسیقی کی اقسام مقرر کی جاتی اور قوانین بنائے جاتے ہیں۔

لیکن موسیقی کے　　بنانے سے زیادہ غیر تسلی بخش اور کوئی شے نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں قوانین اور صحیح قوانین ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قوانین موسیقی نہیں ہوتے یہ صرف ایک مقصد کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں اور فن پیکر نگاری میں جو اہمیت موقلم اور رنگ کی ہے وہی موسیقی میں قوانین کی ہوتی ہے۔ موقلم اور رنگ تصویر نہیں ہوتے بلکہ اس کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

موسیقی کی روح الہام ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موسیقی کی تنقید کی بنا صرف تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے۔

بنگالی

انسان کا مذہب

وہ مذہب جو ہمیں خارجی نوشتوں سے ملتا ہے کبھی ہمارے دل کا مذہب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محض ایک عادت ہوتا ہے جس کی زنجیروں میں ہم جکڑے ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے دل کا مذہب اختیار کرنا انسانی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے انتہائی مصائب اور تکالیف کا رفیق بنتا ہے اور خون حیات پر زندہ رہتا ہے اور پھر خواہ وہ انسان کے دل کو مسرت اور آنند سے معمور کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کی یاترا ضرور خوشی پر جاکر ختم ہوتی ہے۔

ہم اس امر کا بہت کم احساس کرتے ہیں کہ جو مذہب ہم لوگوں سے سنتے یا اپنی زبان سے رٹتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے دل میں حقیقت کا مندر بتدریج تعمیر ہو رہا ہے۔ وہ مذہب کس قدر فریب کار ہے جب ہم اپنی مسرتوں اور غموں سے ایک طرف ہو کر اُن پر نظر کرتے ہیں اور وقت اپنی تیز رفتاری سے اُڑا چلا جاتا ہے۔ ہم اس لافانی قصے کے اسرار معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کی مثال بالکل اس جملہ کی سی ہوتی ہے جس کا مفہوم ہم الفاظ کے گورکھ دھندے میں پڑکر دریافت نہیں کر سکتے۔

جب ایک بار ہمیں اس تعمیر کے قانون کی وحدت کا ادراک ہو جاتا ہے جو ہمارے دل میں ہو رہی ہے تو ہم اپنے اور پر اسرار کائنات کے رشتے سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ہم کو اس امر کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ ابھی ہماری اور آسمان کے نور پاش کرّوں کی تخلیق ہو رہی ہے اور ہماری آرزوئیں اور تمنائیں ایوان کائنات میں اپنا صبح شام تلاش کر رہی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ہم نہ جان سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم خاک کے ایک ذرّے کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کی رو خارجی عالمگیر زندگی کی روح سے ہم آہنگ ہے تو ہماری تمام خوشیاں اور غم سکون اور اطمینان کے ایک رشتے میں منسلک نظر آتے ہیں اس حقیقت کا احساس کہ میں ہوں، میں حرکت کرتا ہوں، میں نشو و نما پاتا ہوں صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس حقیقت سے بھی روشناس ہو جائیں کہ کائنات کی ہر شے میری ہمنوا ہے اور بغیر خاک کا ایک ذرہ بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ خزاں کی اس دلفریب اور دلکش صبح۔ اس عظیم نور سے میری روح کا نہایت قریب کا رشتہ ہے۔ یہ تمام عالم رنگ و بو اور موسیقی میری روح اور کائنات کی مخفی ہم آغوشی کا رازہیں۔ یہ ہم آغوشی جس کا مجھے احساس ہو یا نہ ہو میرے دل کو آمادہ کار رکھتی ہے۔ میری داخلی اور خارجی دنیا اُن کی اس ہم آغوشی سے مجھے مذہب حاصل ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ کم ہے یا زیادہ یہ میری استعداد پر منحصر ہے اور مجھے آسمانی نوشتوں کو اس سے پیشتر کہ میں انہیں اپنا بناؤں۔ اسی رو نما میں دیکھنا ہے۔

تلنگو

برسات

تاریک بادلوں میں سے برق کی رقاصہ نے دیکھا کہ کیاری کے پھول کھل چکے ہیں یا ابھی اس کی کونپلیں ہی پھوٹ رہی ہیں۔ دلفریب مندرا کے شگفتہ پھول فضا میں لہرا کر دلکش آواز میں شہد کی محو پروانہ مکھی کا خیر مقدم کر رہے تھے نوک دار چٹانوں کے پہلو میں کنول کے غنچوں کی سی آنکھوں والی تیز رفتار اور محبت پاش پہاڑی ندی مچل رہی تھی کہ جاکر اپنے پریتم ناپیدا کنار سمندر سے ہم آغوش ہو جائے۔ مدہوش اور مست دوشیزہ زمین کی شرگین ادائیں زمردیں چراگاہوں میں لرزشیں پیدا کر رہی تھیں۔ آہ! کالے کالے بادلوں کی بلند آہنگ موسیقی! مور کا پُر مسرت ناچ۔ آہ یہ حقیقت ہے کہ یہ پُر مسرت کنج خدائے رقص کی رقص گاہ ہے۔

تامل

بوڑھی ماں

ایک بوڑھی عورت کو جس کے جسم پر بڑھاپے کی وجہ سے جھریاں پڑ گئی تھیں اور ہاتھ پاؤں سوکھ کر ہڈیاں رہ گئے تھے بتایا گیا کہ اس کا

بیٹا بزدلی سے میدان جنگ سے اپنے ہتھیار چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ شرم سے بڑھیا کے کلیجے میں برچھی ماری اور اس نے غضبناک ہو کر کہا۔ جری اور بہادر سورماؤں کا یہ بزدل جانشین میرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ واقعی مرنے کے ڈر سے بھاگ نکلا ہے تو میں اپنی چھاتیاں جنہوں نے اسے دودھ پلا کر پرورش کیا ہے کاٹ دوں گی۔ لیکن میرا دل کہتا ہے میرا بیٹا میدان سے نہیں بھاگ سکتا یہ کہتے ہوئے اُس نے غصہ سے دیوانی ہو کر کٹار کھینچ لی اور مجنونانہ میدان جنگ کی طرف بھاگی۔ آہ! یہاں آخر کار لاشوں کے پشتوں میں اسے اپنے بیٹے کی لاش مل گئی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سب کٹ چکے تھے صرف خون میں نہایا ہوا دھڑ باقی تھا لیکن بڑھیا کا دل خوشی اور مسرت سے معمور ہو گیا۔ وہ اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر کر رہی تھی اور اُس دن سے بھی زیادہ خوش تھی جس دن اُس جانباز نے جنم لیا۔

کشمیری

بے ثباتی

ابھی میں نے ایک دریا بہتا دیکھا تھا۔
اب پل ہے نہ کوئی کشتی۔
ابھی میں نے پھولوں سے لدی ایک جھاڑی دیکھی تھی۔
اب پھول ہے نہ کوئی کانٹا۔
ابھی میں نے ایک چولھا جلتا دیکھا تھا۔
اب دھواں ہے نہ کوئی شعلہ
اور آہ! ابھی میں نے تمام پانڈوں کی ماں کو دیکھا تھا۔
اور اب میں ایک کمہار عورت کو دیکھتی ہوں۔

تلاش دوست

غافل پو پھٹ چکی ہے تیزی سے قدم اُٹھا اور تلاش دوست میں کھو جا
دیکھ صبح ہونے کو ہے۔ اپنے پر پیدا کر اور تلاش دوست میں نکل جا۔

میں لالہ اس کی تلاش اور جستجو میں نکلی۔ میں نے اپنی بساط سے زیادہ مشقت کی اور اپنے آپ کو بن بن پھرنے سے تھکا لیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ لیکن اُس کے دروازے مقفل تھے۔ اور وہ میرے اس دل میں تھا جس میں اس کے وصال کی خواہش تھی اور میں کھڑی اُس کے جمال کو دیکھ رہی تھی۔"

"لال دد"

مرہٹی

جس طرح دریا اپنی ہستی کو سمندر سے ہم آغوش ہو کر فنا کر دیتا ہے اسی طرح دلھن بھی خاوند کے گھر میں جا کر غیر نہیں رہتی۔
یہ صرف شادی نہیں ہوتی بلکہ ان کی زندگیاں محبت میں ایک ہو جاتی ہیں اور آسمانی وحدت کی یہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔
محبت کا یہ رشتہ زندگی کے سمندر کی خوشی اور غم کی لہروں میں بھیگ کر ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جاتا ہے۔
خاوند اور بیوی کے دلوں پر کارکنان قدرت ہمیشہ امرت کے چھینٹے دیتے ہیں جس پر خوشی اور غم کا یہ رشتہ زیادہ مضبوط زیادہ الہامی اور زیادہ دلفریب ہو جاتا ہے۔ خاوند اور بیوی کے تعلقات ہمیشہ پاکیزہ محبت سے خوشگوار رہتے ہیں اور محبت کی معطر اور ٹھنڈی ہوا سے ان کی دنیا کی فضائیں معمور رہتی ہیں۔
صرف وہی میاں بیوی کہلانے کے مستحق ہیں جن کی روح ایک ہو گی اُن کے جسم اور خیالات جُدا جُدا ہوں۔
دو زندگی کی گاڑی میں دو پہیوں کی مانند ہیں اور یہ گاڑی کو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر حرکت نہیں دے سکتی
جہاں میاں بیوی کے یہ تعلقات نہیں ہیں وہاں زندگی نہایت بیزار کن ہے
خاوند بیوی کے بغیر اپاہج ہے۔
جب تیل اور بتی دونوں ملتے ہیں تو نور کی لاٹ جلتی ہے۔
صرف روحوں کے اتحاد سے دنیا قائم ہے۔

پالی

آزادی کا سانس

ہر چند میں ضعیف اور کمزور ہوں اور میری جوانی کی بہار رخصت ہو چکی ہے۔ میں اپنے عصا کے سہارے سے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر

چڑھنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔
میں نے اپنی گدڑی اُتار کر پھینک دی ہے اور کشکول اوندھا کردیا ہے۔ میں یہاں چٹان پر بیٹھا ہوں میری روح آزادی کے سانس لے رہی ہے۔ آہ میں نے حاصل کرلیا ہے کرلیا ہے۔ کرلیا ہے۔ وہ گیان وہ عرفان حاصل کرلیا ہے۔ جس کا بدھ متلاشی تھا۔

گھر بار میں چھوڑ چکا ہوں کیونکہ میں نے اپنی دنیا کو بھی تیاگ دیدیا ہے۔ میں نے اپنے بچے کو چھوڑ دیا ہے۔ اپنی خوبصورت اور سفید سفید بھیڑوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ خواہشات سے اب میں آزاد ہوں اور دل کا کینہ اور بغض بھی جا چکے ہیں۔ جہل کی تاریکی منتشر ہو چکی ہے۔ حرص و آز شکست کھا کر میرے پاؤں میں لوٹ رہے ہیں۔ اور میں اب آزاد ہوں۔ میرے دل کو سکون حاصل ہے۔ میں گیان میں مگن ہوں۔

ہندی

آقا

اے جبار آقا! اے چشمۂ مسرت اے کائنات کے محبوب! تیری تعریف ہو۔ تو عالم القلوب ہے۔ دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اے رحمٰن۔

دآیا تیرے حضور میں جھکتا ہے!

تیری لامکان ہستی ابدیت کے عمیق اور ناپید اکنار سمندر کی مانند ہے خوشی کی لہریں متواتر اُٹھتی ہیں!۔

لیکن میرا دل بیکل اور مضطرب ہے۔ تیری ظاہری صورت ایسی ہے کہ دیکھ کر میرے دل کی تمام آرزوئیں پوری ہوجاتی ہیں۔ اور دآیا یہ جمال حیرت انگیز دیکھ کر تیرے حضور میں سر جھکاتا ہے۔

میں اپنے پریتم کی وفادار ہوں۔ سکھی اس میں شرمانے کی کیا بات ہے دن کے وقت مجھے بھوک نہیں لگتی۔ اور رات بے چینی سے آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں۔ میں مصیبتوں اور تکلیفوں کو چھوڑ کر اُس پار چلی جاؤں گی کیونکہ علم کے خزانوں کی کنجیاں مجھے مل گئی ہیں میرے تمام عزیز و اقارب میرے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہیں لیکن میں اپنے پریتم کی داسی ہوں جو دنیا کے بلند پہاڑوں کا مالک ہے۔ اگر کوئی مجھ پر ہنستا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں

گجراتی

قدرت کے بھید

خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جس نے اُن پر غور کیا ہے۔

ان بھیدوں کے جاننے کے بغیر انسان گمراہی سے نہیں بچ سکتا اور جبتک گمراہی دور نہ ہوجائے اعمال اچھے نہیں ہو سکتے۔ اور جبتک اعمال اچھے نہ ہوں یہ بھید معلوم نہیں ہو سکتے اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جس نے ان پر غور کیا ہے۔

ان بھیدوں کے جاننے کے بغیر شکوک دور نہیں ہو سکتے۔ اور شکوک دور ہوئے بغیر کوئی شئے یقینی نہیں۔ کہانی سُنانے سے اس کا مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔ لیکن ان بھیدوں کو جاننے کے بغیر اعلےٰ زندگی محال ہے۔ اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے۔ جس نے ان پر غور کیا ہو۔

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ خدائے مطلق کو جاننے کے بعد کوئی مادی چیز باقی نہیں رہتی۔ صرف لطیف جسم رہ جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ انسان کی آتما۔ اور پرماتما جس سے تمام کائنات زندگی پاتی ہے۔ ایک ہے! میں بھی جانتا ہوں کہ آتما اور پرماتما ایک ہیں۔ لیکن لوگوں کے لئے یہ اعتقاد چھوڑنا بہت مشکل ہے کہ وہ دو ہیں اور خدائے مطلق کے بھیدوں کو صرف وہی جان سکتا ہے جو ان پر غور کرتا ہے۔

عربی

صداقت و امانت

سچائی اور امانت ایک درخت کی دو ملی جلی شاخیں ہیں۔ یا ایک ماں کے دو جوڑواں بچّے ہیں حقیقت یہ ہے کہ امانت سچائی کا دوسرا نام ہے اور سچائی در اصل امانت ہی کا دوسرا پہلو ہے۔ سچائی انسان کی عظمت کی بنیاد ہے امانت باعظمت انسانوں کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔ سچائی مروّت کی روح ہے، شرافت کا جوہر اور بزرگی کا حصّہ ہے۔ آدمیت کی پہلی شرطوں میں داخل ہے ہم اس زمانہ میں سچائی اور صداقت سے زیادہ کسی چیز کے محتاج نہیں ہیں۔

جھوٹ اگرچہ دنیا میں عام ہو رہا ہے۔ مگر ہر جگہ ہر شخص اُسے بُرا سمجھتا ہے اور تو اور خود جھوٹ بولنے والا آدمی بھی جھوٹ کو بُرا خیال کرتا ہے جب جھوٹا آدمی تم سے قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ میں جو بات کہوں گا اُس میں جھوٹ نہ ہوگا تو دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ قابل نفرت گناہ ہے اور سچائی جہاں بھی ہو اچھی صفت ہے۔

جھوٹ دوسرے گناہوں کی بہ نسبت لوگوں میں سب سے زیادہ عام اور اُن کے لئے سب سے زیادہ آسان ہو گیا ہے معاشرت میں بے تکلف اور بے جھجک برتا جاتا ہے۔ اکثر لوگوں نے اُسے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کوئی کسی کو گھر پر پوچھنے آئے تو بے ضرورت کہلا دیا جاتا ہے کہ گھر میں نہیں حالانکہ گھر میں موجود ہوتا ہے۔

رسکن کا قول ہے۔

کہ جھوٹ خواہ کتنا ہی معمولی اور حقیر ہو دل کو ناپاک اور ضمیر کو آلودہ کر دیتا ہے"

جھوٹ کی ایک قسم پولیٹکل صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ملکی مصلحت کیلئے سیاسی رہنما جھوٹ بولنے میں پس و پیش نہیں کرتے لیکن در اصل یہ ایک کمینہ پن درحد درجہ کی بزدلی اور ظلم ہے۔ انسان کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ زبان سے کوئی بات کہتے وقت اس ضمیر کا زیادہ خیال رکھے جو اُس کے دونوں پہلوؤں میں ہے۔

اہل قرطاجنہ رکار تھیج اور رومیوں کی جنگ کے اثنا میں رومیوں کا مشہور لیڈر ریجلیوس غنیم کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ اہل قرطاجنہ نے اُسے اس مقصد سے قید سے رہائی دی کہ ممکن ہے روما جا کر اپنے اہل وطن کو صلح پر مجبور کر دے۔ مگر اُس سے شرط یہ کر لی کہ اگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوں تو تمہیں ہمارے پاس واپس آنا پڑے گا۔

ریجلیوس نے یہ شرط مان کر رہائی حاصل کی اُن کی ایک جماعت کے ساتھ روما آیا۔

جب روما میں پہنچا تو رومی حکومت مجلس میں کھڑے ہو کر اُس نے اہل روما کو جنگ پر اُبھارا اور اس بات پر زور دیا کہ لڑائی مسلسل طور پر جاری رکھی جائے۔ اور یہ کہ قیدیوں کا تبادلہ ہرگز نہ کیا جائے اس کے بعد اُس نے شرط کے مطابق واپسی کا ارادہ کیا تو روما کے بڑے بڑے لوگوں نے اُسے روکا اور بتایا کہ تمہاری قسم ساقط ہو گئی ہے۔ کیونکہ قیدی کی قسم اختیاری نہیں ہوا کرتی اور ایسی قسم ٹوٹ جائے تو اُس پر کچھ گناہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس پر ریجلیوس نے کہا کہ تم روما کی بڑی بڑی شخصیتوں کے لوگ کیا اس لئے جمع ہوئے ہو؟ کہ میری عزت، میری شرافت اور میرے وقار کو زمانے کی گالیوں اور ابدی لعنتوں کے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ دشمنوں میں میری واپسی دردناک عذاب اور قتل میرا منتظر ہے۔ لیکن اس قتل اور عذاب کو میں اپنے واسطے آسان اور قابل برداشت سمجھتا ہوں اس کمینہ پن سے کہ میں وعدہ خلافی کر کے اپنی قسم کو پامال کروں اور اپنے ضمیر کو زخم پہنچاؤں۔

میں دشمنوں کے نرغے میں رہوں یا غنیم کی قید میں ہر حال میں میرے پہلو میں ایک آدمی دل حرکت کرے گا میں نے اُن کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں واپس آؤں گا۔ اب میرا واپس جانا یقینی ہے میں اس قول سے کبھی نہیں پھر سکتا۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے"

غرضکہ ریجلیوس نے وعدہ خلافی کی ذلّت گوارا نہ کی اور اپنی بات پوری کرنے کی دشمنوں کے پاس واپس گیا۔ اہل قرطاجنہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے جا کر اہل روما کو صلح کی بجائے جنگ پر اُبھارا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے بڑے بڑے عذاب دیکر ریجلیوس کو مار ڈالا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہادروں اور مردوں کی زندگی ایسی ہوتی ہے۔

شہنشاہِ مارکوئس اوریلیس کا قول۔ ہے کہ جو شخص ظلم کرتا ہے وہ کافر ہے اور بے دین۔ کیونکہ جب خدائے تعالیٰ نے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنا کر پیدا کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص دوسروں کی راحت کا سبب بنے اور دنیا سے تکلیف اور مصیبت دور ہو تو جو شخص اس خدائی قانون اور الٰہی مذہب کو توڑتا ہے در اصل وہ بہت بڑا کافر ہے۔

تاجور

(البلاغ قاہرہ)

فارسی

ایرانی ماں کا گیت

اُٹھ ماں تجھپر قربان! اُٹھ کہ اب تو بہت سو چکا! اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اُٹھ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا۔ اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُٹھ! کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھپر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

اُٹھ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدان جنگ میں بھیجدوں۔ اُٹھ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُٹھ! میرا دودھ تجھپر حلال ہو اور میری جان تجھپر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے اُٹھ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بیکس ہے بیدادرس ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی اُمیدگاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازہ کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُٹھ! اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر۔! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار ہے! اُٹھ میرے دل کے پر تو اُٹھ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے!۔ آہ! تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھپر حلال ہو! میری جان تجھپر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔

اُٹھ! میری جان کی روح اُٹھ! کیا تو قوم کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کیلئے بُلا رہے ہیں اُٹھ! اور میدان جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سربلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آ! یا اپنے باپ کی جگہ آزادی وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر! اُٹھ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے!۔

مہر محمد خاں شہر مالیر کوٹلوی

جاوی

روشنی

ہم روشنی کی اولاد ہیں! اور روشنی کس قدر ناپیدا کنار ہے ہمارا بیدار ہونا اور سونا سب روشنی میں ہے۔ ہم روشنی میں جیتے ہیں روشنی میں تیرتے ہیں اور ہماری زندگی ایک کھیل ہے۔

ایک عظیم الشان شامیانے کے نیچے ایک عظیم آفتاب کی شعاعوں میں آہستہ آہستہ بہت آہستہ زندگی کے بیشمار لیمپ جلتے ہیں۔ میں ناپیدا کنار روشنی میں رستہ گم کر چکا ہوں اور اس کی خیرہ کن چمک میں میں اندھوں کی طرح پھرتا ہوں۔ ہم واقعی روشنی کی اولاد ہیں تو پھر ہم روشنی کو دیکھ کر اس سے خائف کیوں ہوں؟ آؤ ہم ہر طرف دیکھیں ہمارا کسی کا ڈر نہیں ہے روشنی کے اس ناپیدا کنار سمندر میں اگر کوئی دیا بجھتا ہے: تو بجھنے دو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پھر کبھی روشن نہ ہوگا۔

اطلاع

بیرونی مضامین کی کثرت کے سبب اس بار "اردو ادب کے اہل طرز" کا مضمون شائع نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ نمبر سے شائع ہوگا

(ایڈیٹر)

ہسپانوی

دریا کے اس پار

اے دریا تیرے کناروں پر سرکنڈوں کی قطاریں اُگ رہی ہیں اک لمحے کے لئے اپنے پانی کو ٹھیرا لے مجھے اپنی محبوبہ کے پاس جانا ہے۔ تیرا کوئی پل نہیں ہے۔ نہ کوئی کشتی ہے۔ پار جانے کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں۔ مجھے یاد ہے تو ایک چھوٹی سی ندی تھا۔ اور میں تیرے پار جانے سے نہیں جھجکتا تھا۔ اس وقت تیری سطح کی لہریں بمشکل میرے گھٹنوں تک آتی تھیں۔ لیکن اب تو پہاڑ کے اس درے سے آتا ہے۔ تیری پرورش برف سے ہوتی ہے اور تیرے طوفانی پانی میں کیچڑ ملا ہوتا ہے۔ لیکن اب میری اس جلدی کرنے کا کیا فائدہ۔ کیسا فائدہ ہوا مجھے اس قدر کم عرصہ آرام کا؟　اور رات بھر جاگنے کا اگر میں یہاں ٹھیرا رہوں اور اگر کسی ذریعے سے بھی مجھے تیرے اُس پار جانے کی اجازت نہیں۔

اے دریا اپنے پانی کو ایک لمحے کیلئے ٹھہرا لے۔ ہوا زور کی چل رہی ہے اور تیری موجیں جوش سے بڑبڑا رہی ہیں۔ فضا میں ایک دلفریب موسیقی رقص کر رہی ہے اے سرکنڈوں والے دریا اپنے پانی کو ایک لمحے کیلئے ٹھہرا لے مجھے اپنی محبوبہ کے پاس اُس پار جانا ہے۔

ملایا

میں دل چاہتا ہوں

میں دل چاہتا ہوں اے خدا مجھے لعل و جواہر کے خزانوں کی ضرورت نہیں مجھے حکومت کی ضرورت نہیں۔ میں عزت نہیں چاہتا۔ اگر مجھے دل مل جائے تو میں اپنی زندگی کو ہر چند کہ وہ تیری نظر میں ناکارہ ہے تیرے حضور میں پیش کر دونگا

میں دل　چاہتا ہوں۔ دل ایک قابل پرستش دل۔

میں ایک بچے کا سا معصوم دل چاہتا ہوں۔ اُس کے ہونٹ معصومیت سے لبریز ہوں اور اس کے الفاظ میں بناوٹ نہ ہو وہ یہ بھی نہ جانے کہ لوگوں پر کس طرح آوازے کسے جاتے ہیں اور اُن کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو فراموش کر دے اور وہ تیری محبت سے بھر جائے۔ میں ایسا دل چاہتا ہوں جو آسمانی اور پاکیزہ دل چاہتا ہوں۔

میں خوبصورت اور سحر کار دل چاہتا ہوں۔ وہ پاکیزہ ہو آفتاب سے منور صبح کی مانند اور نرم اتھاہ سمندر کی ہلکی ہلکی آوازوں کی طرح۔ وہ خوشی میں خزاں کے چاند کی طرح ہو اور ایک ایسی جھیل کی مانند ہو جس کو بارش نے کناروں تک بھر دیا ہو۔ میں خوبصورت اور سحر کار دل چاہتا ہوں۔ اس دل سے محبت کرتا ہوں جو محبت کا دیوانہ ہے۔ جو دوسروں سے اُن کی خوشی کی اُمید میں محبت کرتا ہے۔

ڈچ

آرزو

یہ کیا ہے کہ تو اُداس ہے۔ بال پریشان ہیں اور چہرہ سُتا ہوا ہے۔ حالانکہ دنیا کی ہر چیز خوش نظر آتی ہے۔ تیری گلابی آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تو رو رہی تھی آہ کس قدر آنسو بہے ہوں گے۔!

اگر میں روئی تو کیا میرا کوئی شریک غم نہیں ہے صرف میرے دکھ کی فضائیں اس سے معمور ہیں

آہ! جب میرا دل گھٹنے لگتا ہے آنسو یہ کہ میرے دل سے بوجھ اُٹھا دیتے ہیں۔

دیکھ میں تیرا خوش نصیب دوست ہوں اور تجھے بُلاتا ہوں۔ آہ! مجھے اپنے دل کا غم بتا شاید میں کوئی مداوا کر سکوں۔

تو شور و غوغا سے میرے دل کو اور کھیں لگاتا ہے۔ تو نہیں جانتا کیا غم ہے جو اسے کھائے جاتا ہے۔ اور کیا خون شدہ آرزوئیں ہیں جنکا مجھے ماتم کرنا ہے۔

اگر یہ بات ہے تو اُٹھ تو ابھی جوان ہے۔ آرزوئیں پھر زندہ ہو سکتی ہیں اور حسرتوں کی اُمیدیں بن سکتی ہیں۔ تیری ابھی عمر ہی کیا ہے۔

تجھے نہیں پتا مجھے کس شے کی آرزو ہے وہ بہت دور ہے؟ وہ آسمانوں سے بلند اور سمندروں سے گہری ہے وہ ستاروں کی مملکت میں ہے اور شبنم کے کاشانوں میں۔ مشرقی اسکو صحرا کی بلند آوازوں میں تلاش کرتے ہیں اور مغربی اسکو کلیسا کی صداؤں میں

فرہنگ الفاظ

(الف)

- انتقام — بدلہ
- اعتراف کرنا — اقرار کرنا
- افسردہ — مرجھایا ہوا، غمگین (ابر آلود — بادلوں سے گھرا ہوا)
- ابدی نیند — ہمیشہ کو سو جانا، مر جانا
- اہمیت — قدر، رتبہ اور وقعت
- آبیاری — پانی دینا۔
- افلاس — غریبی۔
- اعتماد — بھروسہ
- امید افزا — اُمید کو بڑھانے والی بات
- انکشاف — کھل جانا۔
- اخلاقیات کا معلم — اخلاق کی تعلیم دینے والا۔
- اضافی خیال — اہل فلسفہ کا یہ خیال کہ انسان حوادث طبعی کے علاوہ اور کسی شے کا علم نہیں رکھ سکتا اور یہ علم مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتا ہے۔
- الوداعی تقریر — رخصت ہوتے وقت کی تقریر
- استعجاب — تعجب
- اختصار کرنا — چھوٹا کرنا، خلاصہ کرنا

(ب)

- بارگاہِ الفت — محبت کا دربار
- بتدریج — درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ
- بالائے افق — آسمان کے کنارے کے نیچے
- بدفطرتی — پیدائشی نقص
- بے اعتدالی — حد سے بڑھنا۔
- بدباطن — بری طبیعت کا آدمی
- بسا اوقات — اکثر مرتبہ۔ اکثر دفعہ

(پ)

- پنہاں — چھپا ہوا۔
- پژمردگی — مرجھایا پن۔
- پردہ پوشی — عیب چھپانا، عیب ڈھانپنا۔

(ت)

- تحسین ناشناس — انجان اور جاہل کی تعریف
- توضیح — صاف صاف بات بتانا
- تضیع اوقات — وقت کو بیکار ضائع کرنا۔
- تائب — توبہ کرنے والا۔
- تباہ کن — برباد کرنے والا۔
- تخم ریزی — بیج بکھیرنا۔ بوائی۔
- توازن — برابر سرابر کرنا
- تشخیص — پتہ لگانا۔ حکیم نے مرض کی صحیح تشخیص کی یعنی پتہ لگا لیا
- تعزیت — صبر دلانا۔ پرسا۔
- تفتیش — چھان بین۔ چھان پھٹک

(ج)

- جسمانی نظام — بدن کی بناوٹ، جسم کی مشینری
- جرأت آمیز — جو کام دلیری سے کیا گیا ہو۔

(ح)

- حسن و قبح — اچھائی اور برائی
- حق پرستی — سچائی کی پوجا
- حوصلہ افزائی — دل بڑھانا۔
- حسن ظن — نیک گمان۔

(خ)

- خود ستائی — اپنی تعریف آپ کرنا
- خود بینی — اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔
- خود آرائی — اپنے آپ کو بنا سجا کر دکھانا

(ذ)

- ذہن نشین کرنا — ذہن میں جما لینا۔
- ذلت آمیز — ذلت سے بھرا ہوا۔
- ذوق سلیم — کسی چیز کا اچھا ذوق

(ر)

- راقم السطور — سطروں کو لکھنے والا یعنی خود لکھنے والا۔
- رفاقت — ساتھ دینا۔
- راستبازی — سچائی کی عادت

(ز)

- زود پشیمانی — جلد شرمندہ ہونا۔

(س)

- سخن شناس — بات کو سمجھنے والا۔
- سرمایۂ اشک — آنسوؤں کی پونجی

(ش)

- شادابی — سرسبزی

(ص)

- صحیح العقل — جس کی عقل اور سمجھ درست ہو
- صریح لغزش — کھلی غلطی

(ط)

- طمانیت قلب — دل کا اطمینان

(ع)

- عوام الناس — عام لوگ۔ پبلک۔

(غ)

- غلط فہمی — غلط سمجھنا۔

(ف)

- فراہم — اکٹھا۔
- فقدان — کمی۔
- فراوانی — زیادتی۔
- فلاکت زدہ — مصیبت کا مارا۔

(ق)

- قائم مزاج — مستقل مزاج کا آدمی
- قانونی مشیر — قانون کا مشورہ دینے والا
- قلاش — خالی ہاتھ

(ک)

- کفارہ — گناہ۔ تلافی یا بدلہ۔
- کامرانی — کامیابی۔
- کارکردگی — کارگذاری
- کارفرمائی — کام کو پورا کرنا
- کاسہ — پیالہ

(م)

- مکافات عمل — کام کا بدلہ۔ کرم کا پھل
- مصرف — خرچ کرنے کی جگہ اور محل
- منتخب — چھانٹا ہوا۔ چنا ہوا۔
- مرحوم — جس پر رحم کیا گیا ہو۔ مرے ہوئے کو نیک فالی کے طور پر کہتے ہیں
- مُضر — نقصان دینے والا۔
- مسرت افروز — خوشی بڑھانے والی۔
- مبادلات خارجہ — محکمۂ تبادلۂ سکہ جات
- موزونیت — ٹھیک ٹھیک۔
- محو دعا — دعا میں مشغول
- معاون — مددگار
- مسلم الثبوت — مانا ہوا۔
- مستند آدمی — سند یافتہ۔ مانا ہوا۔
- مستحسن — اچھا۔

(ن)

- نقائص — نقص کی جمع۔ کمیاں۔ کمزوریاں
- نفس پرستی — نفس کی پوجا۔ نفس کے کہنے میں چلنا
- نفاق — ظاہر کچھ اور دل میں کچھ۔ ظاہرداری
- ناآشنا — انجان
- نظرانداز کرنا — خطا سے درگذر کرنا۔ نظر سے گرانا۔
- نغمات — جمع نغمہ۔ راگ۔ گیت
- نغمہ سنجی کرنا — گانا۔ تقریر کرنا
- نفرت انگیز لہجہ — برا لہجہ۔

ریویو

سلطانہ ڈائری - موسومہ حساب خانہ داری - مولفہ سید افتخار حسین صاحب سب ایڈیٹر سلطانہ بیگم چاندنی چوک دہلی - اس میں مفید معلومات درج ہیں جو نہایت کارآمد ہیں مثلاً ڈاک تار ریلوے - سکوں کا تبادلہ - پرسنٹ وزن پیمانے وغیرہ درج ہیں - علاوہ ازیں خانہ داری کے متعلق بھی مختصر ہدایتیں درج ہیں - نقشہ تنخواہ بھی درج کیا گیا - ہم یہ مشورہ دیتے ہیں -

اول تقطیع لٹس ڈائری کے برابر ہونی چاہیئے -

(۲) دھوبی کے کپڑوں کے نقشہ میں اقسام درج کرنے ضروری ہیں - محرم کا لفظ خارج کرنا چاہیئے

(۳) ہر مہینے کے ساتھ نقشہ تنخواہ ضروری نہیں -

(۴) تیس ہدایتیں ڈائری کے اغراض سے بے تعلق ہیں

(۵) نقشہ جنس میں - ہر تفصیل کی ضرورت نہیں پنجاب میں کتنی تیل جھیلی - چھالیہ کا استعمال کم ہے -

(۶) ہر مہینے کے حساب میں برقعہ نوایجاد کا اشتہار ضروری نہیں -

اس ڈائری کی قیمت ہم کو کہیں نظر نہیں پڑی - ہم یہ کہکر اکتفا کرتے ہیں کہ ضخامت ضرورت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے قیمت بھی زیادہ ہی ہوگی -

فن خطابت - مؤلفہ و مرتبہ پیرزادہ سید عزیز حسن صاحب بقائی ایڈیٹر پیشوا دہلی - ابتدا میں مؤلف کا دیباچہ اور پھر تین مشہور ہندوستانی ادیبوں کے فن خطابت پر قابل قدر مضمون ہیں - پہلا مضمون مولینا عبد السلام صاحب ندوی کا ہے جس میں مشرقی خطابت سے بحث ہے اور دوسرا مضمون مولینا کلیم الرحمن بی - اے ایل - ایل - بی کا جس میں مغربی خطابت سے بحث ہے تیسرا مضمون مولینا ڈاکٹر سعید احمد صاحب - آئی - ایم - ڈی کے زور قلم کا نتیجہ ہے - موضوع دلچسپ مضامین مفید اور کارآمد معلومات سے لبریز ہیں - اس کا مطالعہ تقریر سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے ضروری ہے - حجم ۸۸ صفحہ کاغذ سفید دبیز اور کتابت و طباعت عمدہ ہے قیمت (۸/) ملنے کا پتہ مینجر رسالہ پیشوا دہلی -

عورت - اس کتاب کے مؤلف جناب مولوی سردار علی صاحب ہیں جو "شب عروسی" نامی کتاب کا دوسرا حصہ ہے - اس میں دس باب ہیں - اور پھر ان میں بے شمار ضمنی سرخیاں ہیں - تین رنگین اور ۴۳ بلاک کی تصویریں ہیں - ابتدائی حصہ میں مختلف ملکوں کی عورتوں کے حالات ہیں - اور پھر عورت اور اس کے متعلق حالات پر بحث ہے - کتاب کے بعض حصے ذرا ہیجان آور ہیں

مگر مؤلف کا زور قلم قابل داد ہے کہ وہ قادر بیانی کے بل پر پریس ایکٹ کی زد سے دامن بچا کر نکل گیا ہے - کاغذ - طباعت وغیرہ خاصی ہے حجم ۱۹۲ صفحات اور قیمت دو روپے ہے - ملنے کا پتہ منیجر اورنٹیل بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵ دہلی -

چاند (ناول) مصنفہ جناب رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈوکیٹ ہائی کورٹ پنجاب لاہور - یہ ناول اخلاقی معلومات اور دلچسپ خیالات کا مجموعہ ہے حجم ۲۶۳ صفحہ - قیمت (عہ/)

شانتی - ناول - یہ مفید ناول بھی حضرت شمیم کے زور قلم کا نتیجہ ہے ناول کی غرض یہ ہے کہ دولت محنت و دیانت سے کمائی جاتی ہے - زندگی بسر کرنے کا طریقہ سادہ ہونا چاہیئے - اور دولت کا مصرف اغراض نیک ہونا چاہیئے - اس کتاب کے نو باب ہیں اور ۱۰۵ صفحات ہیں - تقطیع چھوٹی ہے کتاب قابل دید ہے - یہ دونوں کتابیں جناب مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہیں -

پتھر سے ہیرا - یہ ایک مختصر اور دلچسپ اصلاحی افسانہ ہے - جسے جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے لکھا ہے رسالہ کا ہر لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور نتیجہ بہت ہی اچھا ہے - اس قسم کے مفید افسانوں کی اردو ادب کو ضرورت ہے - ضخامت ۱۱۲ صفحات کاغذ طباعت وغیرہ خاصی ہے - ملنے کا پتہ منیجر رسالہ نظام المشائخ دہلی -

روحانی ترقی - مؤلفہ لالہ کدارناتھ صاحب میرٹھی - دلچسپ رسالہ ہے - اس میں نظم بھی اور نثر بھی - زبان اور نظم خا[illegible]ل سے خالی نہیں مطالب برے نہیں - دیکھنے کے قابل چیز ہے - بمبئی سے شائع ہوا ہے حجم ۵۳ صفحات قیمت (۶/) ملنے کا پتہ - گوسائیں راجہ لال - منیجر دی انڈین آرٹ سٹوڈیو - کالبا دیوی روڈ بمبئی نمبر ۲ -

مخزن نجات - پہلا حصہ - پیغمبر اسلام علیہ السلام کی چالیس حدیثوں کا منظوم ترجمہ مولینا جامی نے فارسی میں کیا تھا - مولوی شرف الدین خاں صاحب رامپوری نے اردو میں ترجمہ کیا ہے - حجم ۱۶ صفحات سائز چھوٹا - قیمت (۲/) ملنے کا پتہ ریاست رامپور - محلہ کھاری کنواں -

جہنم کے خطوط نمبر ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - یہ خطوط جرمنی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے ہیں اور انگریزی سے اردو میں جناب مولوی شرف الدین خاں صاحب رامپوری نے ترجمہ کیا - نصیحت آمیز مفید خطوط ہیں جیتے جی جہنم کی سیر اگر کرلی جائے تو مرنے کے بعد جہنم میں لیجانے والے عادات و اعمال سے اجتناب کی تحریک ہوسکتی ہے - قیمت فی نمبر (۲/)

ملنے کا پتہ یہ ہے - مولوی شرف الدین خاں - ریاست رامپور محلہ کھاری کنواں -

پہاڑی مقامات کی ملکہ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے جہاں پنجاب کے ذرائع آمد و رفت وسیع کر کے صوبہ بھر کیلئے اقتصادی اور تجارتی ترقیوں کا دروازہ کھول دیا ہے اور صوبے کو ہندوستان کا صحیح معنوں میں مضبوط اور مستحکم دروازہ بنا دیا ہے۔ وہاں ملک کے لٹریچر میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اردو پر احسان کیا ہے تو بیجا نہ ہو گا کیونکہ اردو میں ہندوستانی مقامات کی سیاحت کے متعلق آجتک اس قسم کا لٹریچر پیدا نہیں کیا گیا۔ زیر نظر پمفلٹ بھی اردو کی اس خدمت کے سلسلہ کی ایک کڑی اور اس میں ہر وہ بات نہایت دلکش، سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کر دی گئی ہے جو پہاڑی مقامات کی ملکہ شملہ کے متعلق جاننی ضرور ہے۔ پمفلٹ کے شروع میں حکومت کے اس گرمائی صدر مقام کی جائے وقوع سطح سمندر سے بلندی وغیرہ بیان کر کے مختصر سی تاریخ دی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ریل سے پیشتر اس مقام کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے اور اسے کیا تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد شملہ کے روز و شب کے مناظر کی دلکش الفاظ میں تصاویر کھینچی گئی ہیں اور ان کے مقابل بلاک کی نہایت عمدہ بڑے سائز کی تصاویر میں شملہ کی آب و ہوا اور یہاں کے مشاغل بھی نہایت وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں نوواردوں کی سہولت کیلئے انگریزی اور ہندوستانی طرز کے ہوٹلوں کی فہرست اور کالکا شملہ لائن پر اسباب لے جانے کی ضروری ہدایات درج ہیں تمام پمفلٹ آرٹ پیپر پر چھپا ہوا ہے جا بجا بلاک کی بڑے سائز کی تصاویر نے اسے اور بھی دلفریب بنا دیا ہے۔ ٹائیٹل اعلےٰ درجہ کے ۷۲ پونڈ کے آرٹ پیپر کا ہے اور اس کے دونوں طرف پہاڑی مناظر کی ایک دلکش سہ رنگی تصویر ہے۔ پمفلٹ مذکور نارتھ ویسٹرن ریلوے پبلیسٹی آفس سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

کوہستان کانگڑہ کی دلفریب وادی یہ پمفلٹ بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بھی مذکورہ بالا پمفلٹ کی تمام خوبیاں اور دلفریبیاں موجود ہیں۔ ٹائیٹل نہایت دیدہ زیب طرز بیان نہایت دلکش اور تصاویر نہایت روح افزا نیچر اپنے اصلی لباس میں نظر آتی ہے شہر کی بند فضا میں بیٹھ کر اسے پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ فطرت کی آزاد فضاؤں کی سیر کر رہا ہے۔ یہ بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے پبلیسٹی آفس سے مل سکتا ہے

قیمت درج نہیں

ناٹک کتھا جناب نور الٰہی محمد عمر صاحبان اپنے مخصوص دلچسپ انداز بیان اور شگفتہ اور دلکش طرز تحریر کے لئے اب ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ناٹک ساگر کے علاوہ جو دنیائے اردو میں فن ڈرامہ نویسی کی پہلی تاریخ ہے سر آوردہ مغربی ڈرامہ نگاروں کے ترجمہ کر کے ان دونوں حضرات نے اردو ڈرامہ نویسی میں ایک جدید باب کا آغاز کر دیا ہے۔ شاید آیندہ کسی محفل میں ہم ان تراجم پر فن ڈرامہ نویسی کے نقطۂ نظر سے تبصرہ کر سکیں۔ زیر نظر کتاب جو آٹھ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے ہندوستان قدیم کے ڈراموں سے ماخوذ ہے ایک تاریخی واقعہ افسانے کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ ابتدا میں ایک مختصر دیباچہ اور پنڈت کیفی کے قلم کی تقریب ہے۔ زبان نہایت دلچسپ۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت غیر مانوس الفاظ سے پاک ہے اکثر کہا جاتا ہے کہ مشکل الفاظ اور انداز بیان کے افسانے میں دماں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ عذر لنگ معلوم ہوتا ہے مؤلفین نے سادہ زبان میں نہایت دلکش افسانے تحریر کئے ہیں ہمارے خیال میں سکولوں کی لائبریریوں اور طلبا کیلئے یہ کتاب نہایت مفید ہے طباعت و کتابت ہر طرح اچھی ہے حجم ۱۰۴ صفحے قیمت (۸؍) پتہ محمود برادرس جموں۔

اعلان ضروری ادبی دنیا شروع سے دو قسم کا چھپ رہا ہے قسم اول اور قسم خاص۔ قسم خاص کا ٹائیٹل ۷۲ پونڈ پر فیکٹ آرٹ پیپر اور ۴۴ پونڈ ولایتی کاغذ کا ہوتا ہے قسم خاص کی تصاویر کا کاغذ بھی ۴۰ پونڈ آرٹ پیپر ہوتا ہے جو قسم اول کے ٹائیٹل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ قسم اول اور قسم خاص کی سالانہ قیمت میں ایک روپے کا فرق ہے ہم نے یہ تفصیل اپنے مطبوعہ اغراض و مقاصد کی فہرست میں درج کر دی تھی مگر خریداران نے اسے پڑھنے کی تکلیف نہیں کی اور قسم اول کے خریدار بن گئے۔ اب جب انہوں نے اخبارات کی ایجنسیوں پر قسم خاص کے پرچے دیکھے تو شکایتوں کے طومار باندھ دیئے کہ ہمیں نہیں بتایا گیا کہ قسم خاص کا پرچہ بھی چھاپا جاتا ہے۔ بہت سے خریداروں نے جو قسم اول کے خریدار بن چکے تھے ایک ایک روپے کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے مطالبہ کیا کہ آیندہ سے انہیں قسم خاص کا پرچہ بھیجا جایا کرے یہ سلسلہ بہت طول کھینچ گیا ہے اب جس جس کو قسم خاص کا علم ہوتا جاتا ہے وہ اسی پر اصرار کر رہا ہے کہ اسے قسم اول نہ بھیجا جائے بلکہ قسم خاص ہی کا پرچہ بھیجا جائے اس وجہ سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ سے صرف خاص ٹائیٹل اور خاص کاغذ پر قسم خاص ہی کا پرچہ چھپوایا جایا کرے۔ اور جن حضرات نے قسم خاص کے پرچے کی قیمت کے اضافے کے طور پر ہمیں ایک ایک روپے کے ٹکٹ بھیجے ہیں ہم ان سب کو ٹکٹ واپس کر رہے ہیں۔ اب تک جس قدر حضرات قسم اول کے خریدار بن چکے ہیں انہیں بغیر ایک روپیہ اضافہ کے باقی گیارہ ماہ تک قسم خاص ہی کا پرچہ بھیجا جائیگا۔ اس میں اگرچہ دفتر کو بہت نقصان ہو گا لیکن خریداروں سے ہم اضافہ لینا برا سمجھتے ہیں۔

منیجر ادبی دنیا لاہور

تصاویر

۱- حسن معصوم۔ یہ تصویر مانچسٹر آرٹ گیلری سے لی گئی ہے اور شہرہ آفاق مغربی مصور جان ایورٹ ملاس کے معصومیت کے تصور کا نتیجہ ہے اسے اس کا شاہکار خیال کیا جاتا ہے اس تصویر میں مصور نے حسن فطرت کے ساتھ ان عمیق انسانی جذبات کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو آغاز شباب میں حسینوں کو احساس رعنائی سے غافل رکھتے ہیں اور حقیقتاً اس خود فراموشی اور تغافل کا نام معصومیت ہے۔

۲- چشمۂ محبت۔ لافون تین د امور۔ نوجوان فرانسیسی مصور فراگونار کا شاہکار ہے۔ قدیم یونانی فن پیکر نگاری کی خفیف سی جھلک نے اس کی دلفریبی اور دلاویزی کو دوبالا کر دیا ہے۔ ایک نوجوان مرد اور نوخیز عورت اپنے انتہائی مسرت کے منبع کی طرف دوڑے جا رہے ہیں اُن کے انداز میں ایک وقار ہے اور ایک ثبات۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی ہے۔ صرف اُن کے جسم پر روشنی پڑ کر اُن کے حسن کو نمایاں کر رہی ہے چشمہ کے پاس اشجار بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کے سے بادلوں نے سراب جیسی کیفیت پیدا کر دی ہے اور خداوندان عشق جوان نو واردوں کے لئے جام الفت لئے کھڑے ہیں اگرچہ آسمانی ہستیاں نظر آتی ہیں لیکن انداز میں ایک انسانی چنچل پن اور شوخی ہے

۳- روت اور نومی۔ سرزمین شام کے ایک قدیم مذہبی افسانے کی تصویر ہے۔ نومی کا خاوند مرجاتا ہے اور دو جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے اُٹھ جاتے ہیں۔ غریب الدیار نومی اپنے آبا کی سرزمین کو واپس لوٹتی ہے۔ اس کی دونوں بیوہ بہوئیں روت اور آرپا کچھ راستہ اس کے ساتھ جاتی ہیں جس پر نصیب نومی انہیں اپنی ماؤں کے گھر واپس جانے کیلئے کہتی ہے۔ آرپا اپنی ساس کو بوسہ دیکر رخصت ہو جاتی ہے لیکن روت اس سے لپٹ جاتی ہے اور جُدا ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور سسک سسک کر کہتی ہے "مجھے جُدا ہونے کیلئے نہ کہہ میں تیرے پیچھے آؤں گی۔ جہاں تو جائے گی میں بھی جاؤں گی۔ جہاں تو بسیرا لے گی میں بھی لوں گی تیرے لوگ میرے لوگ ہوں گے اور تیرا خدا میرا خدا ہو گا۔ جہاں تو مرے گی میں بھی مروں گی اور گاڑی جاؤں گی اور موت بھی ہمیں جدا نہ کر سکے گی"۔

۴- میری لنگھم۔ ایک مشہور انشا پرداز حسین کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش ترین خودنوشت واقعہ "ایثار" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ۵- میر ناظر حسین ناظم مرحوم۔ ۶- اطالیہ کی قسمت کا مالک بینی ٹو مسولینی۔ ۷- گوئٹے "دیوان مغرب" کے ایک ورق کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔
۸- شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی۔

پرانی کتابیں

(سیکنڈ ہینڈ بکس) کی سب سے بڑی دکان کا پتہ۔
بٹ بکڈپو سید مٹھا بازار لاہور ہے۔ جہاں سے
آپ کو اسکولوں اور کالجوں کی تمام منظور شدہ کتابیں
نہایت ارزاں داموں پر دستیاب ہو سکتی ہیں مزید برآں
(سیکنڈ ہینڈ بکس) پرانی کتابیں مناسب قیمت دیکر خریدی جاتی
ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ درسی کتب کے علاوہ ہر ایک قسم کے
ناول ڈراموں افسانوں اور شعر وسخن کی کتابیں بھی دستیاب ہو سکتی ہیں

ملنے کا پتہ مینیجر بٹ بکڈپو سید مٹھا بازار لاہور

المعلم

حیدرآباد دکن سے زیر ادارت مولوی محمد سجاد مرزا ایم اے
(کنٹب) ملکی کاغذ پر یہ ماہواری رسالہ بہ سرپرستی سررشتہ تعلیمات
سرکار عالی کئی سال سے جاری

ہو رہا ہے

جنوبی ہند کا واحد اور بہترین تعلیمی رسالہ ہے جس میں شعبہ درس و تدریس کے
دلچسپ مضامین ہوتے ہیں جو اساتذہ اور طلبائے مدارس کیلئے بیحد مفید ہیں
نمونہ کا پرچہ چھ آنہ کا ٹکٹ بھیجنے پر طلب کیا جاسکتا ہے قیمت سالانہ
تین روپیہ آٹھ آنہ ہے

ملنے کا پتہ
دفتر رسالہ المعلم سیفت آباد حیدرآباد دکن

گلشن

لاہور کا پرانا علمی۔ ادبی۔ تاریخی و ظریفانہ مضامین کا ارزاں
ترین ماہواری رسالہ جس میں مشہور اہل قلم حضرات
کے شاہکار درج ہوتے ہیں۔
عنقریب ایک قومی و اخلاقی ناول شمشیر اسلام یا ترکی کپتان
مسلسل شائع کیا جائے گا۔ جس میں جنگ ترکی و یونان کے
سنسنی خیز واقعات غازی انور بے کی حب قومی و اخلاق
حسنہ کے روح پرور مناظر خوفناک کمار اور ترکی خاتون کے
لرزہ براندام سین تصاویر کے ساتھ دکھائے جائیں گے
سالانہ چندہ عہ
نمونہ کیلئے ٹکٹ ۲ اور... نمونہ کیلئے
پتہ: مینیجر گلشن ۔ لاہور

مسلمانوں سے رسول اللہ کی آخری وصیت

یہ ہے کہ وہ قرآن مجید اور اسوۂ اہل بیت کو اپنا رہنما بنائیں خوش نصیب
ہیں وہ مسلمان جو تاجدار مدینہ کے اس حکم کو فراموش نہیں کرتے اگر آپ کے
دل میں بھی عشق نبوی کا شرارہ پوشیدہ ہے تو

ہندوستان کے بہترین رسالہ "پیشوا" دہلی

کے مستقل خریدار بن جائیے یہ آپ کو قرآن مجید کی عملی تعلیم دیگا یہ آپ کو اہل بیت
رسول کا اسوۂ حسنہ بتائے گا۔ مذہبی تعلیمات کے علاوہ رسالہ "پیشوا"
اپنے جس مخصوص رنگ میں سیاسی و تاریخی مضامین۔ روح پرور نظمیں کیف
بداماں افسانے پیش کرتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے اخبار یا رسالہ میں
دستیاب نہیں ہو سکتی علاوہ بریں فخر کائنات کی ولادت مقدس کی یادگار
میں ایک نہایت ضخیم اور مقدس مقالات کے ڈیڑھ سو عکسی علاکوں والا رسول نمبر
شائع ہوگا جو مستقل خریداروں کو مفت دیا جائیگا۔ اور عام طور پر اسکی قیمت دو روپیہ
ہوگی اس لئے آج ہی خریداران پیشوا کے زمرے میں شریک ہو جائیے چندہ سالانہ صرف
دو روپے۔ اتنا ضخیم اتنا دلچسپ اتنا مفید اور اتنا سستا رسالہ ہندوستان میں
کوئی دوسرا نہیں۔ المشتہر: مینیجر رسالہ پیشوا دہلی

پیام تعلیم

طلبہ کا سب سے اچھا اخبار

چندہ سالانہ عار

اُردو کے تمام اخبارات و رسائل میں طلبہ کیلئے پیام تعلیم سے زیادہ
مفید کوئی اخبار نہیں۔ اخبار کیا ہے ایک شفیق استاد ہے جغرافیہ تاریخ
سائنس کے مضامین اور اخلاقی پند و نصائح، کہانیوں نظموں مضمونوں
کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جماعت میں جن مضامین سے لڑکے جی چراتے
ہیں پیام تعلیم میں خوشی سے پڑھتے ہیں۔

پیام تعلیم

سالانہ امتحان میں کامیاب

کر دیتا ہے

تعلیمی ضرورت بھی پوری ہوگئی

کیونکہ

پیام تعلیم میں وہ تمام باتیں ہوتی ہیں جنکی اسکول کے لڑکوں کو ضرورت
ہوتی ہے۔ اس اخبار کی یہی خوبی دیکھکر ماہرین تعلیم نے اسکولوں کے لیے
سرکاری طور پر خرید کیا ہے اور طلبہ کو اردو کے عام گندہ و لٹریچر سے بچانے
کے لئے واحد اخبار تجویز کیا ہے۔ چندہ سالانہ صرف عہ نمونہ مفت

مینیجر "پیام تعلیم" جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

ہندوستان

بھر کے تمام اردو انگریزی اخبارات و رسائل کے لاہور میں سب سے بڑے ایجنٹ کا پتہ
ہے میاں غلام محمد اینڈ سنز ایجنٹ اخبارات چوک انارکلی لاہور
جو صرف لاہور کیلئے "ادبی دنیا" کے واحد ایجنٹ ہیں

ہر ایک قسم کی کتابت مصوری اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائن
بنانے کا کام منشی محمد صدیق خوشنویس کوچہ سرکیبنداں
لوہاری گیٹ لاہور سے کرائیں

رجسٹرڈ — ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۹ع نمبر (۸)

تصاویر :- (۱) کلیوپیٹرا سہ رنگی - (۲) کمسن اور خرگوش سہ رنگی (۳) معصوم دوست (۴) ہیلن کیلر (۵) ڈبگ بے (۶) زار اور زارینہ (۷) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب (۸) مولینا شوق قدوائی۔

کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

شیخ عبدالحق صاحب ریاض سب جج بھیرہ :-

آپ نے ادبی دنیا" کے اجراء سے اردو زبان کی وہ خدمت کی ہیں کہ اردو جاننے والے کبھی اس بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ جسقدر بھی اردو رسالہ جات و دیگر اخبارات ہیں اُن کی مشکل نویسی کی وجہ سے اُردو خواں اصحاب کی ایک کثیر تعداد اردو سے متنفر ہو رہی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اردو کی بجائے ہندی کو پیش کیا جاتا تھا۔ آپ نے اس اعتراض کو دُور کرنے کی جو کوشش کی ہے ہمیں ہر ہی خواہ زبان اردو کا فرض ہے کہ آپ کا ہاتھ بٹائے۔ مجھے خود آسان عبارت میں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے آج محسوس کیا ہے کہ آپ کے راستے میں کسقدر تکالیف ہیں۔ بہرکیف خدا آپکی محنت اور ارادہ کو استقامت عطا فرماسے تاکہ آپ اس کام کو سرانجام دے سکیں جس کا بیڑہ آپنے اُٹھایا ہے۔

خان محمد افضل خاں صاحب سب جج جھنگ :-

آپ کے رسالہ "ادبی دنیا" کے تین نمبر میری نظر سے گذرے ہیں۔ میں نے انکو شوق سے دیکھا اور غور سے مطالعہ کیا ہے۔ رسالہ کے مقاصد قابل تعریف ہیں۔ خدا اسکو ترقی اور کامیابی نصیب کرے۔ میں حتےالوسع اس کی ترقی کے واسطے کوشش کرونگا۔

زبان کی سلاست۔ سادگی اور صحت ایسی چیزیں ہیں جنکو میں عرصہ سے ادب اُردو کے لئے نہایت ضروری سمجھتا رہا ہوں اور جنہیں موجودہ زمانے کے اکثر اہل قلم کے مضامین میں جو عموماً رسائل میں شایع ہوتے ہیں مفقود پاتا تھا۔ اپنی لیاقت کے اظہار کی فضول کوشش۔ عربی فارسی کے غیر مانوس اور مشکل الفاظ کا استعمال اور اکثر غلط اور بیجا استعمال۔ غیر زبانوں خصوصاً انگریزی کے محاورات کو اپنی زبان میں درست طور پر ادا کرنے کی ناقابلیت کے باعث لفظی ترجمہ یا خودساختہ ترکیبوں پر انحصار وغیرہ وغیرہ۔ اصلاح کا طریق صرف یہی ہوسکتا تھا کہ ایک رسالہ ایسا جاری کیا جائے جس میں (۱) صرف ایسے مضامین کو جگہ دی جائے جو اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہوں اور اسطرح سلیس اور شستہ اردو لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے (۲) مضمون نگاروں کو معقول معاوضہ دیا جائے تاکہ وہ جی لگا کر مضمون لکھیں اور اس کام کو نفس بیگانہ سمجھیں اور ایڈیٹر کو بجائے بھرتی کے مضامین شایع کرنے پر مجبور ہونے کے مضامین کے انتخاب کا موقعہ مل سکے۔ اور ان ذرائع سے ان ناپسندیدہ اثرات کو جو ادب اردو پر پڑ رہے ہیں دُور کیا جائے۔ شکر ہے کہ سر عبدالقادر اور آپ کی توجہ اسطرف منعطف ہوئی اور رسالہ ادبی دنیا وجود میں آیا۔ اس کے مقاصد بعینہٖ وہی ہیں جو میں چاہتا تھا اور جن کے ادب اُردو میں دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات خواہشمند تھے۔ یہ باتیں اس رسالہ کو تمام دیگر رسائل سے ممتاز اور ممیز بناتی ہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری مدیر "نگار" بھوپال :-

ادبی دنیا" کا اجراء حقیقتاً ایک ایسا برمحل اقدام عمل ہے جسکی ضرورت کو خود اہل ملک و ارباب ذوق تسلیم کرلیں گے۔ بغیر کسی اجتماعی سرمایہ کے تنہا کسی کا ایسی جرأت کر بیٹھنا۔ اور اسقدر ایثار سے کام لینا، واقعہ یہ ہے کہ میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا۔ مگر ممکن ہے آپ کسی خاص قوت روحانی سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے جن اصول پر کاربند ہوکر رسالہ کا اجراء کیا ہے۔ وہ نہایت مستحکم و مفید ہیں۔ یقیناً آپ نہایت بیجگری سے کام لے رہے ہیں اور قدرتاً "حریفان کار" کو ادبی دنیا کی گرانمایگی مستقبل" سے سراسیمہ ہونا چاہیئے۔ بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ آپ نے تصویروں کا معیار نہایت پاکیزہ قائم کیا ہے۔ جون کے رسالہ میں "محروم سلام" اور "قیدی" دونوں قیامت ہیں۔

سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے (علیگ) مصنف خیالستان سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ :-

"ادبی دنیا" دنیائے ادب کا نوطلوع چاند، شیدایان اردو کیلئے پیام مسرت لایا ہے جس رسالے کے نگراں سر عبدالقادر اور ایڈیٹر تاجور جیسے ادیب ہوں، اس سے جس قدر امیدیں وابستہ ہوں کم ہیں۔ امید ہے کہ یہ امیدیں پوری ہونگی

چوہدری ظفر اللہ خانصاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (لنڈن یونیورسٹی) بار ایٹ لا ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل :-

میں جہانتک ادبی دنیا کے پہلے تین نمبروں سے اندازہ کر سکا ہوں یقین رکھتا ہوں کہ چشم بددور یہ رسالہ میری ان تمام آرزوؤں کو پورا کرنے والا ہوگا جو مدت سے اردو ادب کے متعلق میرے دل میں اٹھتی رہی ہیں۔

خانصاحب میر کریم بخش صاحب ایم۔ اے ورنیکلر ایجوکیشن انسپکٹر صوبہ سرحد :- "ادبی دنیا" اردو زباندانی کے لئے لبسا غنیمت ہے اپنی نوعیت میں لاجواب ہے۔ اور نہایت سستا۔ میرے خیال میں یہ نہایت مناسب ہوگا۔ کہ آپ اس کی قیمت بڑھادیں، تاکہ رسالہ اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکے۔

عرضِ حال

خوش آمدید

اس ماہ سے "ادبی دنیا" کے عملۂ ادارت میں دو قابل قدر اہلِ قلم کا اضافہ ہوا ہے۔

(۱) مولانا حامد الانصاری ایڈیٹر اخبار مہاجر۔ ایک کامیاب اخبار نویس ہونے کے علاوہ جدید و قدیم عربی و فارسی ادبیات پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی توجہ سے ادبی دنیا کے صفحات مشرقی ادبیات کی درخشانیوں سے چمک اُٹھیں گے۔

(۲) مشہور انشاء پرداز پنڈت میلا رام وفا جو اس صوبے کے بلند پایہ روزانہ اخباروں میں چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک مدت سے کام کر رہے ہیں۔

وفا صاحب کی بلند و پاکیزہ اردو نظمیں دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری مسلمانوں کی کوئی میراث نہیں ہے۔

ان کی سادہ مگر بلند قسم کی ادیبانہ نثر نگاری، ان کا بے مثل ذوقِ تنقید، ان کی جدت آمیز انشاء پردازی انہیں ملک کے اُن چند در چند قابل قدر اہل قلم میں شمار کرتی ہے جن پر اہل ملک اور ملکی ادب کو فخر ہو سکتا ہے۔

ریلوے بک سٹال ویلر کمپنی کے مینجر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ ہماری کمپنی کسی ایسے پرچے کی ایجنسی لینے پر آمادہ نہیں جو عام و خاص دو قسم اور دو قیمتوں کا چھاپا جاتا ہو۔

دوسرے ہمارے بہت سے خریداروں نے ایجنسیوں پر قسم خاص کے پرچوں کو دیکھ کر ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ اُنہیں خاص پرچہ بھیجا جایا کرے اور ایک روپیہ زائد خاص پرچے کی سالانہ قیمت کا وصول کر لیا جائے۔

ان حالات کو پیش نظر رکھکر ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے قسم عام کی بجائے قسم خاص ہی کا پرچہ چھپوایا جایا کرے۔ اس مرتبہ دونوں قسم کے پرچے چھپوائے گئے ہیں تاکہ سب کو عام و خاص پرچوں میں فرق کرنے کا موقعہ مل جائے۔

رسالے کا پانچواں نمبر صرف قسم خاص کا چھپوایا جائے گا۔ کیونکہ دو قسم کے نمبر جُدا جُدا چھپوانے میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس نمبر کے بعد سے عام نمبر کی اشاعت بند کی جاتی ہے۔ آئندہ جو خریدار رہیں گے اُن سے قسم خاص کے پرچے کی سالانہ قیمت چار روپے بارہ آنے وصول کی جائے گی۔ جو حضرات اس سے پہلے قسم عام کے پرچے کے خریدار بن چکے ہیں انہیں بھی آئندہ نمبر قسم خاص کا بھیجا جائے گا۔ اور اُن سے کوئی اضافہ نہیں لیا جائے گا۔

ایجنٹ حضرات!

"ادبی دنیا" کے ایجنٹوں کو اطلاع دیجاتی ہے کہ بعض ایجنٹوں کی بدنیتی اور بدمعاملگی کے سبب آئندہ سے یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ صرف انہیں ایجنٹوں کو پرچہ بھیجا جایا کرے گا جو مطلوبہ پرچوں کی قیمت کمیشن کاٹ کر پیشگی بھیج دیا کریں۔

تصاویر

(۱) کلیوپیٹرا۔ ایک فرانسیسی مصور جوشے داکروز کا شاہکار ہے۔ یہ اسوقت کی تصویر ہے جب کلیوپیٹرا اپنی زرنگار کشتی سے اُتر کر ساحل اسکندریا پر فروکش ہوتی ہے اور بارگاہ حسن سے انطونی کے نام حاضر ہونے کا فرمان جاری ہوتا ہے تصویر میں ساحل نیل کے مناظر کو اچھی طرح دکھایا گیا ہے۔ کلیوپیٹرا کے سامنے مصر کی شراب کا پیالہ پیش کیا جا رہا ہے کہ انطونی کے آتے تک قاتل نگاہیں اور بھی خونریز ہو جائیں۔

(۲) معصوم دوست } دونوں تصویریں انگلستان کے مشہور آرٹسٹ
(۳) کمسن اور خرگوش } ڈبلیو۔ ہارن فیلڈ کے موقلم کا کارنامہ ہیں۔

(۴) زار روس اپنی بیوی اور بچوں کے حلقے میں

(۵) ہیلن کیلر۔ دنیا کی ایک مشہور ترین عورت جو اندھی اور بہری ہے۔

(۶) ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (برلن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن۔

(۷) مولانا احمد علی صاحب شوق قدوائی۔

ناتمام

(۸) فن فوٹوگرافی کا موجد ڈیگرے

آئینۂ عالم

جنگِ عظیم کی تصاویر

لنڈن موزیم کو ایک بلجئین سے میدان جنگ کی سات سو تصاویر کا مجموعہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ تصاویر جرمنی کے جنگی بیڑے کے افسروں کی لی ہوئی ہیں۔ اور ان میں انگریزی اور غیر جانبدار حکومتوں کے جہازوں کو غرق ہوتا دکھایا گیا ہے۔

جنگ کے دوران میں کثیر التعداد جرمن افسر اپنے ساتھ فوٹو کے کیمرے رکھتے تھے اور جب وہ سمندر میں کوئی ہنگامہ برپا کرتے تھے تو اس واقعہ کی تصویر لے لیتے تھے اس سے شائد ان کی غرض اپنی کارکردگی کے ثبوت پہونچانا تھا۔ یا وہ ان واقعات کی یادگار اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان تصاویر کو بڑا کرانے کے لئے اس بلجئین کو مامور کر رکھا تھا۔ اسنے یہ خیال کرتے ہوئے کہ جنگ کے بعد یہ تصاویر تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہونگی۔ ان کی نقول اپنے پاس رکھ لیں لیکن ان ایام میں ان کا پوشیدہ رکھنا نہایت مشکل تھا۔ جرمنوں کے خلاف پروپیگنڈا بڑے زور شور سے جاری تھا۔ اور جرمن سپاہی غیر متوقع طور پر خانہ تلاشیاں کرتے پھر رہے تھے۔ فوٹو گرافر جانتا تھا کہ اگر یہ تصاویر میری دوکان سے پکڑی گئیں تو وہ بہت جلد اپنے ان ہم وطنوں سے جا ملیگا جو اس سے پیشتر جرمن سپاہیوں کی خونریزی یا مصلحت اندیشی کا شکار ہو چکے۔ چنانچہ اس نے ان تصاویر کو دکان کے پیچھے کوڑے کرکٹ میں چھپا دیا۔ لیکن اس جگہ کو محفوظ نہ دیکھکر ایک گورکن کی منت وسماجت کرکے اپنے خاندان کے مقبرے میں اُنہیں دفن کر دیا۔ اختتام جنگ کے بعد اب انہیں اس مقام سے نکالا گیا ہے۔ اور اب ان تصاویر کو اسقدر اہمیت دی گئی ہے کہ انہیں لنڈن میوزیم میں رکھا گیا ہے۔

ریڈیم کا اثر موت کے بعد

ریڈیم کے ذرّات جسم میں داخل ہوتے ہی اعصاب، خون اور ہڈیوں پر اشعاع کا تباہ کن اثر طاری ہو جاتا ہے۔ جسم کے یہ تغیرات اکثر بار مشاہدہ کئے گئے ہیں اور ان میں کا ایک تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے اجزاء کو کس احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ حال میں ڈاکٹر اے۔ وی سینٹ جارج، الیگزنڈر او گٹلر اور رالف ایچ ملر نے اس کا مزید تجربہ کیا ہے جس کی بنا پر ان کا خیال ہے کہ ریڈیم کا اثر جسم پر ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی زائل نہیں ہوتا۔

چند سال کا عرصہ ہوا نیو انگلینڈ (امریکہ) کی ایک فیکٹری میں چند نوجوان لڑکیاں گھڑیوں کے ڈائل پر ریڈیم لگانے پر ملازم تھیں۔ اُن میں ایک اطالوی لڑکی بھی تھی جس کی عادت تھی کہ برش کی ڈنڈی کبھی کبھی دانتوں میں پکڑ لیتی تھی۔ اس لڑکی کی عمر ۲۳ سال تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے درد اعصاب کی شکایت شروع ہوگئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے گٹھیا کی بیماری ہوگئی ہے ۱۹۲۲ء میں اس کی حالت اور خراب ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اسے شرمناک بیماریوں میں سے کسی بیماری کی شکایت ہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں یہ لڑکی مرگئی۔ اس وقت اس کو منہ سے خون بھی آتا تھا۔

اس کے بعد دیکھا گیا کہ فیکٹری کی دوسری لڑکیاں بھی ریڈیم کے اثرات سے بیمار ہو رہی ہیں۔ اور ان میں سے ایک دو مر بھی گئی ہیں۔ پانچ سال کے بعد اس اطالوی لڑکی کے ورثا کو ہرجانہ دینے کے لئے قبر کھود کر اس کی لاش نکالی گئی اور پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ اس کے جسم میں ابھی تک ریڈیم کے اثرات باقی ہیں یہ ذرات اس کے جسم کے ہر ہر حصے ہاتھ پاؤں۔ جگر۔ پھیپھڑوں۔ تلی اور دماغ میں موجود تھے۔ الیکٹرسکوپ اور فوٹوگرافی کے شیشوں سے معلوم ہوا۔ کہ ریڈیم کی وہی مقدار اس کے جسم میں محفوظ ہے۔ جو اس کی زندگی میں موجود تھی۔

جذبات کا اثر قوّت ہاضمہ پر

یہ حقیقت ایک عرصہ سے مانی ہوئی ہے کہ شدید جذبات طاری ہونے کی حالت میں معدہ اور مثانے کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی قوت ہاضمہ بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اب ڈاکٹر ڈبلیو۔ سی۔ الوریز نے اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں اس تمام لٹریچر پر نظر ثانی کی ہے جو اس موضوع پر لکھا گیا ہے۔ ان کی رائے بھی یہی ہے۔ کہ جذبات طاری ہونے کے دوران میں بھوک پیاس سب

بند ہو جاتی ہے اور معدہ غذا قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے - اور بھوک کا انحصار جسقدر جسمانی تندرستی پر ہے اسی قدر ذہنی حالت پر ہے -

ڈاکٹر الوریز مشورہ دیتا ہے کہ جب تک جذبات کی آندھی اتر نہ جائے - اور طبیعت کی کسل مندی دور ہو کر ایک سکون حاصل نہ ہو جائے کھانا پینا ملتوی رکھنا چاہیئے - کیونکہ جب اطمینان ہو معدہ اور آنتیں اس رطوبت کو خارج کرتی ہیں جس پر غذا کے ہضم ہونے کا انحصار ہے - اور امعا میں اوپر کی طرف ایک خاص حرکت شروع ہو جاتی ہے - جس حالت میں یہ حرکت نہ ہو کوشش کرنی چاہیئے کہ خیال کو کسی اور طرف لگایا جائے اور ایسی غذا پیش کی جائے جو رنگ و بو کے لحاظ سے اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہو -

اس کے برعکس جب جذبات پیدا ہو رہے ہوں اور آنتوں کی حرکت بند ہو کر معدہ کی رطوبت خشک ہونے والی ہو فوراً کچھ کھا لینا چاہیئے - تاکہ معدہ اور امعا مصروف کار ہو کر جذبات کو طاری نہ ہونے دیں - انگریزی زبان کے اس مقولے کی بنا کہ آرام کا ایک لقمہ بے آرامی کی ضیافت سے بہتر ہے - اسی انسانی تجربے پر ہے - ہماری زبان میں "بھوکے شیر" کی کہاوت اس امر کو دیکھکر بنائی گئی ہے کہ بھوک کی حالت میں غصے کا جذبہ نہایت شدت سے طاری ہوتا ہے -

موٹر سے اچانک موت

اخباروں میں موٹر ڈرائیوروں کی اچانک موت کے واقعات اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں - ڈرائیور نہایت اچھی جسمانی حالت میں ہوتا ہے - اور سڑک کے کنارے موٹر میں مردہ پایا جاتا ہے - اکثر بار موٹر لڑھکتی ہوئی کسی گھاٹی یا دریا میں جا پڑتی ہے - شکاگو (امریکہ) کے ایک اخبار نے اپنی ایک تازہ اشاعت میں ایسے تین واقعات شایع کئے ہیں - پہلا واقعہ ایک ۴۵ سالہ شخص کا ہے وہ موٹر اڑائے جا رہا تھا - کہ دیکھا گیا موٹر فوراً لڑھکتی ہوئی پستی میں جا گری - پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ موت موٹر روانہ ہونے سے پہلے دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے - ہرچند خون کھوپری کے نیچے موجود تھا - لیکن سر کو صدمہ آنے اور ہڈی ٹوٹنے کا کوئی نشان نہ تھا -

دوسری مثال ایک ایسے شخص کی ہے - جس کی عمر ۶۷ سال تھی وہ ایک پختہ سڑک پر موٹر لئے چلا جا رہا تھا - جو لوگ موٹر کے پیچھے آ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ وہ بل کھا کر جانے لگی ہے اور آخر سڑک سے ایک طرف ہو کر ایک گڑھے میں جا پڑی ہے - پہلی بار معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ موت کھوپری پھٹنے اور دماغ کو صدمہ پہنچنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے - لیکن پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا - کہ کھوپری پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں - دماغ کو بھی کوئی صدمہ نہیں پہنچا - اور خون کے ذرات کی تبدیلی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موت دل کی حرکت اچانک بند ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے -

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو دل کی اس بیماری سے جان بحق ہوتے ہیں اکثر کرسی یا گاڑی میں سیدھے بیٹھے مر جاتے ہیں - اور اکثر تو یوں ہوتا ہے کہ پاس بیٹھنے والے کو علم بھی نہیں ہوتا کہ موت کب واقع ہوئی ہے -

مچھر اور مویشی

پورٹو ریکو (امریکہ) میں ملیریا کے انسداد کے لئے جو محکمہ قایم کیا گیا ہے - اس نے حال میں بہت سے تجربے اس کے اسباب دریافت کرنے کے لئے گئے ہیں - ان میں ایک دلچسپ تجربہ یہ ہے - کہ ملیریا کے مچھر انسانی خون کی نسبت دیگر حیوانوں کا خون بہت پسند کرتے ہیں - چنانچہ دیکھا گیا کہ ایک مکان میں جہاں گھوڑے بھی باندھ رکھے تھے - آدمیوں کو بہت کم مچھروں نے کاٹا - اور ان کا ہجوم گھوڑوں کے گرد ہی رہا - لیکن جب گھوڑوں کو اس مکان سے نکال لیا گیا - وہ فوراً آدمیوں پر ٹوٹ پڑے -

ایک اور یورپین ڈاکٹر نے بھی کافی تحقیق اور تجربوں کے بعد محکمہ زراعت کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے :-

مچھر انسانی ہمسائگی کی نسبت حیوانوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں - کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ جو مچھر حیوانوں کے خون سے پرورش پاتے ہیں - ان کی تلوار زیادہ تیز اور مضبوط ہوتی ہے - اگر مویشیوں کو باہر کھلی ہوا میں باندھا جائے تو وہ مکان کے اندر جا کر جہاں اسقدر ہوا نہیں ہوتی انسانی خون پیتا ہے - اور اگر ان کو مکان کے ساتھ ہی ایسی جگہ باندھا جائے جہاں ہوا نہ ہو تو انسان مچھروں سے محفوظ رہتے ہیں -

ایڈیٹر

ہیلن کیلر

میں اندھی ہوں لیکن دیکھتی ہوں
میں بہری ہوں لیکن سنتی ہوں

"وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مجھ پر فطرت کے دروازے بند ہیں حُسن کی اس شاداب دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو میرے لئے سونگھنے اور چھُونے کی قوتوں نے آباد کر رکھی ہے۔ لیکن میں آفتاب، خنک سایوں ہری ہری گھاس اور جھاڑیوں پر شبنم سحر کے چھینٹوں۔ شام کے سکوت اور فطرت کی دوسری دلفریبیوں فرن کی دلکش جھاڑیوں اور رنگین چمنستانوں میں دلفریب بارش گل سب کو دیکھتی ہوں"۔

لوگ اس امر پر اکثر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ میں ایک اندھی اور بہری عورت ہونے کے باوجود فطری مناظر اور باغ و بہار کی دلچسپیوں کا لطف انتہائی مسرت کے ساتھ اٹھاتی ہوں۔ ان کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی بیش بہا دلآویزیاں میرے سر بہر حواس کے احساس سے قطعاً باہر ہیں لیکن قدرت نے اپنے شاہکار کا کثیر حصہ نہایت نمایاں رکھا ہے۔ اور زمین کے لطیف اور دلکش نغمے قوت سامعہ اور قوت باصرہ کی بجائے دیگر روشوں سے مجھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ڈبلیو۔ ایچ ہڈسن کا قول ہے۔

"جو ہم دیکھتے ہیں ہم محسوس کرتے ہیں"

لیکن میری حالت اس کے برعکس ہے۔ جو میں محسوس کرتی ہوں میں دیکھتی ہوں۔

وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مجھ پر فطرت کے دروازے بند ہیں۔ حُسن کی اس شاداب دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو میرے لئے سونگھنے اور چھُونے کی قوتوں نے آباد کر رکھی ہے۔ لیکن میں آفتاب اور خنک سایوں ہری ہری گھاس اور جھاڑیوں پر شبنم سحر کے چھینٹوں، شام کے سکوت اور فطرت کی دوسری دلفریبیوں فرن کی دلکش جھاڑیوں اور رنگین چمنستانوں میں دلفریب بارش گل سب کو دیکھتی ہوں۔

میرے پینے کے لئے بل کھاتی ہوئی ندیوں کا شفاف اور لذیذ پانی ہے۔ میں سنہری سیب اکٹھے کرتی ہوں اور مجھے شاہ بلوط کی ان لچکتی ہوئی نازک شاخوں کا بھی احساس ہے جو ہوا میں رقص کرتی ہیں۔ میں بھینی بھینی رنگوں کو بھی دیکھتی ہوں۔ میرے نزدیک رنگوں کا علیحدہ معیار ہے۔ میں اُسے بیان کرنے کی کوشش کرونگی۔

ہلکے گلابی رنگ سے میرے دل میں کسی بچے کے رخسار یا نرم جنوبی نسیم کا خیال آتا ہے۔ ہلکا ارغوانی جو میری معلّمہ کا دلپسند رنگ تھا میرے دل میں اِن چہروں کی یاد تازہ کر دیتا ہے جن سے میں نے محبت کی ہے اور انہیں بوسے دئے ہیں۔

میرے نزدیک سُرخ رنگ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سُرخ تو وہ ہے جو صحت مند جسم کے گرم خون میں نظر آتا ہے اور دوسرا سُرخ آتش دوزخ اور نفرت و حقارت کا رنگ ہے۔ میں پہلے سُرخ رنگ کو اس کی جان پروری کے باعث بہت پسند کرتی ہوں۔ اسی طرح بادامی رنگ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک زمین کے رنگ کا زندگی بخش گہرا اور دوستانہ۔ دوسرا پرانے درختوں کے کرم خوردہ تنوں یا سوکھے ہوئے دُبلے ہاتھوں کا سا۔

نارنجی رنگ سے میرے دل میں خوشی اور مسرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دوسرے دلفریب رنگوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ زرد رنگ میرے لئے کثرت و فراوانی کا نشان ہے۔ اور اسے دیکھ کر میرے دل میں فوراً آفتاب کی ابھرتی ہوئی کرنوں کا تصور آجاتا ہے۔ یہ نہایت زندگی بخش اور امید افزا ہے اور زمردیں رنگ سراپا شادابی ہے۔ سورج کی گرم کرنوں سے مجھے ایسی خوشبو آتی ہے جس سے ذہن فوراً سُرخ رنگ کی طرح چلا جاتا ہے۔ اور ٹھنڈک سے ایسی مہک محسوس ہوتی ہے گویا میں سرسبز روئیدگی کے درمیان کھڑی ہوں۔

اور سیاہ! سیاہ ناکامی اور مایوسی کی علامت ہے لیکن بھُورا کاندھوں کے گرد لپٹے ہوئے شال کی مانند ہے۔ سفید کے معنے اوج اور سرفرازی کے ہیں۔

ہلکے نیلگوں رنگ سے امید اور گہرے نیلگوں سے مستقل ارادہ

مراد ہے بنفشی نازک، گہرا اور نیم اُداس رنگ ہے۔ ارغوانی ایک پُراسرار رنگ ہے اور قدرت کا یہ فعل نہایت قابل قدر ہے کہ ہمیں آسمان پر ہر جگہ ارغوانی رنگ نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی کی عمیق مسرت اور ایک شاندار کارنامے سے دوسرے کی طرف رجوع کرنے کی علامت ہے اور اس سے ایک نامعلوم محبت کی گہرائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے میرے ذہن میں چمکدار رنگوں کا بھی تصور ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی انگلیوں سے صابن کے ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کو محسوس کیا ہے۔

ان انگلیوں سے جو میرے کانوں اور آنکھوں کے فرائض انجام دیتی ہیں میں نے بیشمار حیران کُن تجربات حاصل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک چنڈول کے گیت سننا بھی ہے۔ میں کالج سے ابھی فارغ ہوئی تھی ہم رینتھم واقع ماسچسٹ کے ایک پُرانے دیہقانی مکان میں رہتے تھے۔ میری معلّمہ مس سیلوین نے جو بعد میں مسز جان اے میلسی ہو گئیں میرے لئے اوپر کی منزل میں ایک برامدہ بنا رکھا تھا جس میں میری خوابگاہ سے راستہ جاتا تھا۔ اور میں جب چاہتی تھی وہاں جا سکتی تھی۔ سدابہار کی بیلیں جنگلے کے اسقدر قریب اُگی تھیں کہ میں اُس پر جُھک کر اس کی سرسراتی ہوئی پتیوں کی موسیقی محسوس کر سکتی تھی۔ برامدے کے جنوبی کنارے پر میں ارغوانی انگوروں کی بیلوں کو چھُو سکتی تھی جو اپنی پیچدار اور طویل انگلیوں سے جنگلے سے لپٹ رہی تھیں اور برامدے کے بالمقابل پائین باغ اور سیب کے درخت تھے۔ جن پر بہار جھُول رہی تھی۔ اور جن کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی! میں ارغوانی انگوروں کی بیلوں کے سایہ میں کھڑی تھی۔ میرے ہاتھ جنگلے پر رکھے تھے اور خیالات بہت دور تھے یکایک جنگلہ غیر معمولی طور پر تھرتھرانے لگا لیکن جنبش نہایت موزوں تھی۔ اور مجھے اس کا تکرار اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا میں نے ایک مُغنی کے گلے پر اُنگلی رکھی ہوئی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ اچانک بند ہو گئی۔ اور میں نے اپنے رُخساروں پر انگور کے شگوفوں کو ایک ننھی سی گُڑیا کے لنگر کی مانند گدگدی کرتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے خیال کیا کہ نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے یا کوئی ننھا سا جانور بیلوں کو حرکت دے رہا ہے۔ اب جنگلا پھر تھرتھرانے لگا۔ لیکن موزوں جنبشوں سے پہلے ایک عجیب طرح کی ضرب محسوس ہوتی تھی جس کا اس سے پہلے مجھے کبھی احساس نہ ہُوا تھا۔ میں نہ کسی قسم کی حرکت کر سکتی تھی اور نہ آواز دے سکتی تھی۔ لیکن یہ آواز مسز میلسی نے بھی سُنی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے نکال کر نہایت خاموشی سے مجھے چھُوا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے بولنا نہیں چاہئیے۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں انگلیوں سے مجھے بتایا "یہ چنڈول ہے وہ جنگلے پر تمہارے اسقدر نزدیک بیٹھا ہے کہ تم اسے چھُو سکتی ہو۔ لیکن ایسا نہ کرنا چاہئیے ——— وہ اڑ جائیگا اور پھر کبھی واپس نہ آئیگا"

اب مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بار بار "چن ——— ڈو ——— ل۔ چن۔ ڈو ——— ل" کہہ رہا تھا۔ میں اس کے موسیقی آمیز سُروں کو سمجھ سکتی تھی۔ یہ نغمے میری قوت لامسہ کو نہایت مسرت بخش معلوم ہوتے تھے۔ اور میں ان کو لمحہ بہ لمحہ بلند اور تیز ہوتے محسوس کرتی تھی۔

مسز میلسی نے مجھے پھر چھُوا اور انگلیوں سے حرف بناتے ہوئے کہا "اس کی محبوبہ سیب کے درختوں پر سے اسے جواب دے رہی ہے۔ وہ وہاں چھُپی بیٹھی تھی۔ اب وہ دونوں ملکر گا رہے ہیں"۔

جب جنگلا تھرتھرانا بند ہو گیا۔ اس نے کہا اب وہ دونوں سیب کے درخت پر سفید اور گلابی پھولوں کے لہراتے ہوئے شگوفوں میں گا رہے ہیں"۔

"طیور خاموش ہیں فضا میں
ازل سے بہرے ہیں کان میرے

مگر میں سنتی ہوں دل کی گہرائیوں میں بیتاب ان کے نغمے" میرا خیال ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو قوت لامسہ کی وسعت کا صحیح اندازہ ہے ان کا خیال ہے کہ یہ صرف انگلیوں کے سِروں تک محدود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکومت تمام جسم پر ہے اور ہر حصہ جسم کی جلد ضرورت کے وقت غیر معمولی طور پر تمیز کر سکتی ہے۔ یہ کہنا تقریباً صحیح ہے کہ جلد کا ہر نقطہ "فیلڈ" ہے جو احساس رکھتا محسوس کرتا اور دماغ کو نتائج مترتب کرنے کے لئے مواد بہم پہنچاتا ہے۔ میرا تمام جسم فضا کے تغیرات کو نہایت باریکی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ دنوں کا اختلاف میرے لئے بھی ویسا ہی نمایاں ہے جیسا کسی اور کے لئے۔

مجھے ان دنوں کا بھی شعور ہے جب ہوا نقرئی غبار کے ترشح میں تار عنکبوت کے نقاب کی مانند لہریں لیتی ہے۔ میں اُن مسرت بخش دنوں کو بھی جانتی ہوں جب آفتاب مژدہ بہار لاتا ہے اور میں اُن دنوں سے بھی واقف ہوں۔ ان شور انگیز دنوں سے جو مجھے چست اور چالاک بنا دیتے ہیں۔ ہوا آ کر مجھے تھپیڑے مارتی ہے اور مجھے کودنے پھاندنے اور کشتی لڑنے پر اُکساتی ہے۔

میرے لئے فطرت کی دلفریب ترین پکار اس کی لامتناہی حرکت ہے جس طرح روح کا اہتزاز چہرے پر زندگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے

اسی طرح حرکت فطرت کی دیوہیئت قوتوں کو نمایاں کر دیتی ہے اور
ہوا زمین کی جان ہے۔ میرے خیال میں یہ درخشاں ترین مناظر کو اور
دلکش اور حسرتناک نظاروں کو منور کر دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ
درختوں، لہلہاتے کھیتوں اور سمندروں کا حسن حرکت کی وجہ سے ہی ہے
جب میں ہوا کو شاید فطرت کی سبز گھاس کی کاکلیں پریشان کرتے یا
پتوں کی دنیا میں اپنے بازو پھڑپھڑاتے دیکھتی ہوں۔ میری انگلیاں
کانپنے لگتی ہیں۔ یہ غیر مرئی سنتیرا اور لامحدود مخلوق جو دور دور سمندروں
اور میدانوں پر بے خانماں پھرتی ہے نشوونما اور ابدیت کا نشان ہے
یہ میری حس لامسہ کے لئے وہی رتبہ رکھتی ہے جو آنکھوں کے لئے
ہے۔ اس سے مجھے لامحدود خلا، سیر کائنات اور بلندی کا احساس ہوتا
ہے۔ ہوا ان مسرتوں، آرزوؤں اور امیدوں کا نشان ہے جن سے
خدائی رُوح میرے دل کی زندگی کو روشن اور منور رکھتی ہے۔

ذاتی آزادی کا انتہائی طمانینت بخش احساس مجھے اسوقت ہوتا
ہے جب میں اپنے تئیں ہوا کا جزو محسوس کرتی ہوں۔ یہ احساس مجھے
پہلی بار اس وقت ہوا جب کیلی فورنیا میں (Deliverance) کے
فلم میں کام کرتے ہوئے مجھے ہوائی جہاز میں پرواز کرنے کا اتفاق
ہوا۔ جب میں اڑتے ہوئے گرد و غبار۔ لہلہاتے ہوئے انگورستانوں
تیز خوشبودار یوکلپٹس کے درختوں کے پاس سے ہوتی ہوئی ہوا ایک
کوہساروں کی بلند چوٹیوں پر اُڑ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ زمین
اور بالائی فضا میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ بلندی کے ساتھ ساتھ
مہک کم ہوتی جاتی ہے۔ جب ہم ہوا کے دوش بدوش جا رہے تھے میں
ارغنوں کی موسیقی، سمندروں کی لہروں کا شور اور دُور کے پہاڑوں
اور لامحدود میدانوں میں ہوا کے فراٹے سن رہی تھی۔ جہاز فضا میں
گرتا اور اُبھرتا۔ میرے لذت آفریں خیالات میں بھی زیر و بم پیدا ہو
جاتا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں دیوتاؤں کے رقص کو محسوس
کر رہی ہوں۔

کیا ہم میں سے بے حس ترین لوگ بھی پانی سے محبت نہیں کرتے؟
کیا یہ ہمارے لئے بمنزلہ ایک دوست کی محبت بھری آواز کے نہیں
ہے؟ آفتاب ہر صبح اور ہر سال بالائے سر چمکتا ہے لیکن ہم اس
سے کبھی نہیں اُکتاتے۔ یہ کہنا "سورج چمک رہا ہے" نہایت مسرت
بخش ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی جیسا کہ میں کئی بار کہہ چکی ہوں "یہ پانی ہے"
نہایت دلکش ہے۔ یہ خدا کی ان بہترین نعمتوں میں سے ہے جنہیں
میں جانتی ہوں آفتاب اور پانی! ـــــ ان کی دلفریبی
اور دلآویزی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

بے بصر ہونے کی وجہ سے میں کوئی دنیا سے نرالی نہیں ہوں۔
شائد یہ امر ان عناصر سے میرے محبت کو اور بھی شدید کر دیتا ہے۔
جو نہایت حیران کن طور پر میری روح کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔
پانی جو مختلف پہلو بدلتا۔ زندگی کے دم بھرتا۔ حدود توڑتا اور ایک
مضبوط ارادہ لئے ہوئے سمندر کی آزادی سے ہمکنار ہونے جاتا
ہے۔ میرے پُر درد احساس کو سکون بخشتا ہے کیونکہ وہ رُوح کی مخفی
آرزوؤں کا ہم آہنگ ہوتا ہے

پانی قوت لامسہ کے لئے ہر جگہ ایک قسم کا نہایت گہرا اور سنسنی پیدا
کرنے والا احساس مہیا کر دیتا ہے۔ ایک جھیل کے کنارے کنارے
چلتے یا ڈھلوان گھاٹی پر چڑھتے ہوئے میں نے سبز کائی سے ڈھکی
ہوئی چٹان سے پانی کے ٹپکتے ہوئے قطروں، ستار کے نغمہ ریز تاروں
کی مانند لرزتی ہوئی ندیوں۔ شور انگیز آبشاروں۔ دھماکے سے پھٹتی
ہوئی دراڑوں اور خاموش پر سکون اور ہمیشہ بہتے ہوئے دریاؤں
اور اس کے دیگر مناظر کی بے شمار تصاویر لے کر اپنے دماغ کے تصویر
خانے میں رکھی ہیں۔

لیکن یہ محبت آمیز جذبات سمندر سے میرے دل میں پیدا نہیں ہوتے۔
اس کی وُسعت اکثر اوقات بے رحم طور پر یاس افزا ہوتی ہے۔ یہ
وسعت آفتاب کی فیاضانہ حرارت یا فضا کی اس غیر محدود لیکن
آشنا چھونے کی سی وسعت نہیں جو میرے گرد اس مسرت آمیز قربت
سے حلقہ کئے ہوئے ہے گویا کہ میں ان عناصر کے پہلو میں ایک درخت
ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تاریکی اور خاموشی کے سمندر سے مسلسل طور پر
مانوس ہونے نے میرے سمندر کے اصلی احساس پر کچھ رنگ چڑھا
دیا ہو۔ جس طرح میں متحرک حسن یا آفتاب میں جگمگاتے ہوئے مصفا
پانی کے تالاب کے کنارے کھڑی ہو کر سانس لیتی ہوں اسی طرح
میں اپنی رُوح کے دل کو بے بصری کی ہیبت ناک فضا کی بجائے
انسانی آنکھ کی ظلمت ربا نور سے آباد کرنا چاہتی ہوں میں بحر اطلانٹک
کی بیدرد طاقت کا زیادہ دیر تک تصور کرتے ہوئے اُکتا جاتی ہوں اور
پُرسکون دنوں میں میں اس امر کے احساس کے بغیر نہیں رہ سکتی
کہ بے رحم بر عکس سکون کے ساتھ بے شمار جہازوں اور انسانوں کو
تباہ و ہلاک ہوتے دیکھتا ہوگا۔ اور وہی بات ہے جس سے دم
گھونٹنے والی خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔

زندہ دلی اور سمندر کے مخاصمانہ مقابلے کے ایسے لمحے بھی ہوتے

ہیں جب میں اس پر تیرتی یا اس کی موجوں میں کود پڑتی ہوں۔ میرے لئے غیر متحرک خشکی سے قدم اٹھا کر سیّال دنیا کو اپنے سامنے سے بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے محسوس کرنا نہایت اطمینان بخش ہے موجیں دیکھکر میرا دل اُچھلتا ہے جب میں ان کو غضبناک ہوکر اپنے جسم سے تھپیڑے مارتے اور تیور بدلتے محسوس کرتی ہوں۔ میرے جسم کی تمام سطح کا خون گاتا ہے سمندری بیلوں کو لہراتے اور اُبھرتے ہوئے دیکھنا۔ گھونگھوں سیپیوں اور کوڑیوں کا پاؤں سے چھُونا اور ہر لمحہ یہ خیال کرنا کہ دوسری لہر مجھے اس خوفناک رات سے دُور لیجائیگی۔ ایک عجیب قسم کا احساس پیدا کرتا ہے۔

جب میں پہلے پہل نیاگرا کے آبشار کو دیکھنے گئی۔ بہت کم عمر لڑکی تھی۔ میں ڈاکٹر الیگزنڈر گرہم بل کے ساتھ چوٹی پر قصر کے کنارے حیران کھڑی تھی اور آبشار کی دنیا کو ہلا دینے والی گونج میرے جسم کے ذرّے ذرّے میں تھرّا رہی تھی۔ اس منظر کی ہوائیں دلفریب [illegible] ہماری روح کو اس نیم خط دھنک کی طرف لے جاتی تھیں جہاں سے بادلوں کی مانند موجیں لیتی ہوئی پھوار اُٹھ کر ہمیں بھیگا لیتی تھی۔ نیاگرا پر قدرت اپنی تمام تر شان و شوکت اور زبردست قوت کا مظاہرہ کرتی ہے یہاں اس میں مختلف متضاد صفات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہیبتناک، دغا باز، دلربا، پتنگیوں کی طرح نرم، خونخوار بھیڑیے کی مانند وحشی ہوتی ہے۔ اور اپنی گہرائی کو قوس قزح کی پھوار سے چھپا رکھتی ہے۔ ہم نے [illegible] معلوم کرنے اور سر کے بل گرتے ہوئے پانی کو مختلف مقامات سے دیکھنے میں کئی گھنٹے صرف کئے۔ ہم ایک عجیب قسم کے جھولے میں سوار ہوکر نیچے اترے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں شور کے ایک سمندر میں غرق ہوں۔ گویا میری دنیا کے گرد کروڑوں گھوڑے دوڑ رہے ہیں جن کے نتھنوں سے بڑے زور شور سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ میں نے پانی کو برف کے گرتے ہوئے تودوں منجمد ندیوں چشموں کی پھواروں۔ سمندر کی موجوں اور دوسری بہت سی صورتوں میں محسوس کیا ہے لیکن پانی کا یہ طوفان ابھی میرے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

جب میں سوچتی ہوں کہ قدرت کی زبان میرے لئے کسقدر واضح ہے میں اپنی معلمہ مسز میسی کے متعلق ممنونیت اور شکر گذاری کے جذبات محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جس نے میری پرورش اور تربیت اس ماحول میں کی جس نے میرے دل میں زمین کے دلکش مناظر۔ سمندر اور ہوا کی غیر فانی محبت پیدا کر دی۔ یہ صرف اس کی ہی ہستی تھی جس نے زمین کے مکتب اور آسمانوں کی یونیورسٹی میں مجھے وہ حقیقی تعلیم دی جسکو آئین زندگی کی صحیح تفسیر کہا جاسکتا ہے۔ اماں بھی چمنستانوں کے مشاغل کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ان کو پھولوں سے زیادہ کسی چیز سے محبت نہ تھی۔ اور پرندوں سے بھی اسے اسقدر ہی محبت تھی جسقدر کہ خوش رنگ پھولوں سے۔ وہ ریتھم میں اپنے گھر کے نزدیک ایک مختصر سے بن میں کئی لمحے پرندوں کی محفل میں بسر کر دیتی تھیں اور نہایت دلچسپی سے انہیں آشیاں تعمیر کرتے۔ بچوں کو دانہ کھلاتے اور انہیں اڑنا سکھاتے دیکھتی تھیں۔

میں نے ملک کے طول و عرض میں کافی سفر کیا ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو شہروں کی اجنبیت سے کبھی مانوس نہیں پایا۔ ہاں جہاں جنگل کی کھلی ہوا ملتی ہے وہاں میرے دل کو ایک عجیب اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ بہار و خزاں، سرسبز چراگاہوں، ندیوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے اس پار سے میرے لئے دلفریب پیام لاتے ہیں۔ میں فضا کی آزادی اور آزاد زندگی کے نغموں کو ہر طرف محسوس کرتی ہوں۔ لیکن ان پُر سکون اور وسیع حسیات کا لطف گاڑیوں اور موٹروں کی بھیڑ یا شہر کے بلند ہوٹلوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں اُٹھانا ناممکن ہے۔ میں اپنے تئیں ہوٹلوں کی زندگی کا کبھی عادی نہیں بنا سکی۔ وہاں کی تصنع آمیز فضا میرے دل کو بیزار کر دیتی ہے۔ وہاں ایسے باغات نہیں مل سکتے جہاں میں تنہائی میں پُر نور اور شاندار ایام کی مسرت کو محسوس کر سکوں۔ اس وقت میں شخصی آزادی کے فقدان کو نہایت المناک طور پر محسوس کرتی ہوں اور اپنے تئیں [illegible] جو بے لطف تنفس کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے [illegible] آدمی جنکو میں جانتی ہوں ـــ اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے ـــ شہر کا خوب لطف اٹھاتے ہیں میرے لئے بھی یہ ایک دل خوش کن تفریح ہے لیکن شہر کے دل میں میں اس کا کبھی لطف نہیں اُٹھا سکتی جہاں پیدل چلنے والوں کا ہجوم۔ گاڑیوں اور موٹروں کا شور ریل کے راستوں کی کھٹا کھٹ میرے حواس کو گھبرا دیتی ہے۔ اور ان پر انتہائی بدحواسی طاری کر دیتی ہے۔ مجھے ہر وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ شور شوں کا ایک عظیم الشان پہاڑ غضبناک ہو کر میری طرف بڑھا چلا آتا ہے گویا وہ میرے جسم کو فنا کر دیگا۔ اگر ایک توپ میں گولہ بھر کر اس کا دہانہ میری طرف کر دیا جائے تو میرا خیال ہے مجھ پر کبھی لرزہ خیز ہیبت طاری نہ ہوگی۔ دیہات میں میرے دل کو گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ مجھے ہر اس چیز میں جو میرے پاؤں سے چھوتی ہے ایک زندگی محسوس ہوتی ہے۔ باغ میں خواہ میں کسی وقت جاؤں، خنک اور پاکیزہ صبح ہو جب مشرق کی طرف آفتاب کے سنہری دروازے کھول دئے جاتے

ہیں اور پتّے سرسراکر آشیانوں میں پرندوں کو ان کی زندگی کا احساس کراتے ہیں یا دوپہر کا وقت ہو جب زندگی کے پھر پھریرے اُڑائے جاتے ہیں۔ اور سورج کی روشنی دنیا کی ہر شے پر ایک شاندار ملمع کر دیتی ہے۔ شام کا سحر پاش سکوت ہو جب سائے چپ چاپ میرے راستے پر پھیل جاتے ہیں پرندے پر سمیٹ لیتے ہیں اور گھاس کی تاریکی میں جگنوں اپنی بیشمار شمعیں روشن کرتے ہیں ——— میں ایک لامحدود مسرت سے معمور ہو جاتی ہوں۔ اور میرا دل اُس خالق کی تعریف کے گیت گاتا ہے جس نے مکان اور زماں کی دنیا میں میرے لئے یہ مختصر سی جگہ بنائی۔ اور میرے تاریک لمحوں کی تسلی کے لئے پھولوں کو پیدا کیا ہے میں ہر موسم میں اپنے باغ کی فضا کا لطف اٹھاتی ہوں۔ سردیاں بھی اپنے دلفریب اور دلچسپ مشاغل سے میرے لئے سامان تفریح مہیا کر دیتی ہیں۔ جب میں باغ کی روش پر خوشی سے معمور ہو کر چلتی ہوں ہوا شاخوں کو ہلا کر مجھ پر ہلکی ہلکی شبنم کی بارش کرتی ہے۔ میں چند چند منٹ کے وقفوں کے بعد دستانے اُتار کر منجمد درختوں اور جھاڑیوں کو چھُوتی ہوں کہ خدا کی صنعت گری کے اس شاہکار کو محسوس کروں جس کو اس نے ہوا اور برف کے انوکھے اوزاروں سے تعمیر کیا ہے۔ اس پختہ راستے پر چلتے چلتے جو دائیں طرف کو مُڑ جاتا ہے میں عموماً درختوں کے کنج میں جا نکلتی ہوں۔ لیکن جب برف ذرا گہری ہوتی ہے باغ کے تمام راستوں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ میرے پاؤں باغ کے تمام فرش کو ہموار محسوس کرتے ہیں۔ میں راستہ بالکل بھول جاتی ہوں۔ اور اندھا دھند راستے کی تلاش میں چل نکلتی ہوں اور ٹھوکریں کھاتی اپنی بے بصری پر ہنستی۔ باڑ تک پہنچ جاتی ہوں جہاں سے روش شروع ہوتی ہے . . . . . .

جب وقت کا ہاتھ کتاب قدرت کے اوراق الٹ کر جون کا صفحہ نکالتا ہے۔ میں اپنا ہر کام خواہ وہ کچھ ہی ہو چھوڑ کر خوشی کی مملکت میں داخل ہوتی ہوں۔ اس وقت فطرت کی بارگاہ میں بہار کے پھُول نذر چڑھائے جاتے ہیں۔ اور ہر آنے والا دن حسن کی اس نمائش گاہ میں حُسن کے اچھوتے نمونوں کا اضافہ کرتا ہے۔ جون کے ایام میں سدا بہار بیلوں کا یہ حلقہ جو میرے باغ کے چاروں طرف کھنچا ہے۔ طبلہ عطار بنا ہوتا ہے۔ سدا بہار اور میدانی گھاس کی خوشبو سوسن اور لالہ کی بھینی بھینی مہک سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ چمکدار اور خوش رنگ پھُول میرے پہلو بہ پہلو چلتے اور اپنے پیارے پیارے چہرے اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ جہاں گھاس زیادہ نرم ہوتی ہے بنفشہ اپنی نیلگوں آنکھیں کھول کر حیرانی سے میرا مُنہ تکتی ہے۔ میں وادی کے بنفشہ اور سوسن کے پھولوں کو خواب آلود پھُول کہتی ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ خواب کے چمنستان میں کھلتے ہیں۔ سدا بہار کی باڑ پر شہد کی مکھیوں کے چھتے قطار در قطار لگے ہوتے ہیں اور اس طرف سے آنے والی نسیم انکی دلفریب خوشبو میں بسی ہوتی ہے۔ یاسمین کی بیلیں اپنی پتلی پتلی نازک شاخیں مجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے آگے بڑھاتی ہیں۔ لیکن جب میں گذرنے کے لئے انہیں ایک طرف جھٹک دیتی ہوں تو اس کے نازک پھُولوں کی بہار لوٹنے والی گستاخ اور بے ادب مکھیاں دھوپ میں چمکتی ہوئی منتشر ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم کے حسین اور طویل پھولوں کے پودے جو جاپان اور جرمنی سے لائے گئے ہیں اس روش کی دونوں جانب اپنے قوس قزح کے سے رنگوں کی بہار دکھاتے ہیں جو مالی نے گرمائی مکان کے گرد ایک ریشمی ڈورے کی مانند بنا رکھی ہے۔ باغ کے ایک گوشے میں سفید پھُولدار درختوں کا ایک جھاڑ ہے۔ جون میں اس کی شاخیں حسن فطرت اور خوشبو سے لد جاتی ہیں اس حُسن فطرت اور خوشبو سے جس کو آج تک کوئی شاعر الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکا۔ اگر روحیں پھولوں میں سما سکتی ہیں تو میری رُوح اس پھول کو زیادہ پسند کریگی۔

مئی کے سارے مہینے اور جون کے اولین ایام میں گل لالہ کا آتشیں طوفان وادی اور سبزہ زار کو ڈھانپ لیتا ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں نرگس اور نیلوفر کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں لیکن میں ہاتھ بڑھا کر سوسن کا پھول بھی توڑ سکتی ہوں۔ آہ! محبت جو اپنی تکمیل اپنے نیازمندوں کو زندگی بخش کر کرتی ہے میرے اس باغ عدن پر اپنا تسلط جما چکی ہے۔

کچھ عرصہ ہُوا دو مہمان آکر ایک سفید پھُولوں اور شگوفوں سے لدے ہوئے درخت پر بیٹھ گئے۔ یہ ان درختوں میں سے ہے جو میرے باغ کے اردگرد لگے ہوتے ہیں۔ صبح شام جب میں اس کے پاس سے بار بار گذرتی ہوں۔ میں اس کی شاخوں کو چھُوتی ہوں۔ دونوں مہمان یعنی چنڈول اب اس درخت پر اقامت گزیں ہیں۔ وہ زندگی کے کاروبار میں نہایت توجہ سے منہمک رہتے ہیں اور میرا خیال ہے اب مجھ سے خائف نہیں ہیں۔

شروع شروع میں جب میں شاخوں کو چھوتی تھی وہ اُڑ کر کسی قریب کے درخت پر جا بیٹھتے تھے اور میں محسوس کرتی تھی کہ وہ نہایت توجہ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میں ان کے لئے دانہ لے گئی اور انہیں اپنے ناموزوں انسانی طریقے پر بتانے کی کوشش کی کہ میں اُن کی دوست ہوں۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی اس بات کو سمجھ گئے۔ کیونکہ وہ اپنے آشیانے میں

واپس آ گئے۔ اور پھر اس طرف توجہ نہ کی کہ میں کیا کرتی ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے دونوں ہاتھ شاخوں پر رکھ کر بہت عرصہ کھڑی رہتی اور اکثر دفعہ پتوں کو لرزتے اور نازک شاخوں کو اپنے ہاتھوں پر جھکتے محسوس کرتی۔ ایکبار میں نے اپنے ہاتھوں کے بہت قریب کچھ حرکت سی محسوس کی۔ اور چند دن بعد ایک ننھے سے بچے کو اپنی انگلی پر چٹکی لیتے دیکھا۔ اب نر نہایت اطمینان سے میرے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جاتا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کوئی پرندہ کسی کے ہاتھ پہ بیٹھ کر خاموش نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ کبھی میرے ہاتھ پہ گاتا اور پھر درخت کی ٹہنیوں پر پھدکتا پھرتا۔ میرا خیال ہے وہ اپنی مادہ کو کبھی میرے متعلق بتاتا ہوگا۔ جب وہ انڈے سے رہی تھی وہ بھی کبھی باہر شاخ پہ آ کر بیٹھتی اور مجھے دیکھتی اسے یہ ضرور یقین ہو گیا ہوگا کہ میں انہیں کوئی گزند نہ پہنچاؤں گی کیونکہ وہ اپنے بچوں کو میری حفاظت میں چھوڑ کر دانے کی تلاش میں نکل جاتی تھی۔

آخیر گرما میں میری ایک نابینا سہیلی مجھ سے ملاقات کرنے آئی۔ ہم مطالعے کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یکایک بادل گرج کر آیا اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ میری سہیلی اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہاں اسے ایک پرندے کی دردناک آواز سُنی اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی۔ "شائد کوئی پرندہ جالی میں پھنس گیا ہے اور اب وہ پھڑ پھڑا رہا ہے"، اس نے کہا۔ اس بارش میں کھڑکی کے باہر کی جالی اتارنا سخت مشکل تھا۔ لیکن ہم اس میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ میرا چنڈول انگوروں کی بیلوں کے نیچے جالی میں پھنسا ہوا ہے۔ چنانچہ جالی اتارتے ہی وہ پھڑ پھڑاتا ہوا میرے ہاتھ پر آ گیا۔ اس کے پر بارش سے بھیگ رہے تھے اور اس سے اڑا نہیں جاتا ہے۔

جب وہ ذرا خشک ہوئے تو اس نے کمرے میں اُڑنا شروع کیا۔ میں تصور کر رہی تھی کہ وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے میرے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لے رہا ہے۔ جب مینہ کی بوچھاڑ ذرا کم ہوئی تو ہم اسے کھڑکی کے پاس لے گئے لیکن وہ ہمیں چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اپنے نوکدار پنجوں سے میری انگلی کو مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔ اس کا جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ گویا وہ کہنا چاہتا ہے "میں باہر جانا نہیں چاہتا۔ تم مجھے کیوں نکالتی ہو"۔ میں نے اسکو دہلیز پر بٹھا دیا لیکن وہ اڑ کر پھر کمرے میں آ گیا۔ اس بار وہ کوچ کے نیچے چھپ گیا اور ہم اس کو نہ پکڑ سکے۔ کیونکہ اس کے لئے دیکھنے والے کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ پھر پھدک کر کھڑکی کی دہلیز پر آ بیٹھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ کہہ رہا ہے "آہ نہیں معلوم ہے میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ اس تردد میں ہوں کہ باہر جاؤں یا یہاں رہوں"۔ بالآخر اس نے آہستہ سے اپنے بازو پھیلائے اور بادل ناخواستہ تازہ اور دھلی ہوئی فضا میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اسکو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ . . . .

آہ! جب میری روح دنیا کے تفکرات سے مغموم ہوتی ہے میں سدا بہار کی روش پر ٹہلتی ہوں اور اس سے میری رُوح کو بہت تسکین ہوتی ہے۔ میں اس پھول کی مانند محسوس کرتی ہوں جو رات بھر کا پالا برداشت کرنے کے بعد صبح کے وقت اپنا سر اٹھاتا اور آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ اور جب میں سبز پوش دوستوں کے حلقے میں پھرتی ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں زمین کی تاریکی میں جڑوں کا گیت سُن رہی ہوں۔ وہ اپنے اس دلفریب شاہکار کو کبھی نہیں دیکھتیں جس کی نشوونما وہ زمین کی سطح کے اوپر کرتی ہیں۔ وہ زمین کی تاریک گہرائیوں میں مخفی رہتی ہیں۔ لیکن ان سے نور کے پھول کھلتے ہیں۔ وہ ذلیل اور حقیر ہیں لیکن پھول اور اشجار پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ " " " " " " " " "

میں جنگل میں گھاس پر ہاتھ پھیر کر ننھی ننھی مخلوق کی رفتار محسوس کرتی ہوں۔ مجھے ان تاریک رستوں سے محبت ہے جن سے سبز اور نمناک گھاس کی بو آتی ہے۔ مجھے وہ تنگ گھاٹیاں اور وادیاں پسند ہیں جن کے درخت اور جھاڑیاں مجھے راستہ چلتے ہوئے چھوتے ہیں۔ میں چھوٹے سے پل پر کھڑے ہو کر اس ندی کے گیت سننا پسند کرتی ہوں جس کی سطح پر گجرے بہتے ہیں۔ ساکن اور منہمک جسم کے ساتھ میں لاکھوں اور کروڑوں آوازیں سنتی ہوں جنہیں میں پہچانتی ہوں مثلاً پتوں اور گھاس کا سرسرانا۔ شاخوں کا اس وقت کا لچکنا جب کوئی پرندہ اُن پر بیٹھا ہو طویل گھاس کے تنکوں کا کسی ننھے سے بھنگے کے بوجھ سے لہرانا اور سرکنڈوں کے پروں کا ہوا میں پھڑ پھڑانا۔ میں ان سب آوازوں کو سنتی ہوں ——— اور میں بہری ہوں۔

اکثر اوقات جب گھر میں سب سوئے ہوتے ہیں میں خاموشی سے پُرسکون اور دُھندلے باغ میں جہاں سوسن اور گلاب کے پھول پہلو بہ پہلو اُگ رہے ہوتے ہیں آ جاتی ہوں۔ میں صبح صادق کے دلفریب دھندلکے میں پھولوں کے سایوں کے پاس کھڑی ہو کر دن کی پیدائش کا انتظار کرتی ہوں۔ زمین کا سینہ بنفشہ کے پر برگ پودوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ آسمان پر اجالا ہو جاتا ہے ——— میں سر اٹھا کر اپنے عاشق آفتاب کو اس کے حسین چہرے کے ساتھ نقرئی اور دھندلے سمندر پر طلوع ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں ——— اور میں اس شے سے ہم آغوش ہوتی ہوں جس کی تمنا اور امید[۱]

(ہیلن کیلر)

[illegible] ہاشمی

۱؎ میرے دل میں دبے سے موجزن ہوتی [illegible]

کلیوپیٹرا

[انٹونی مصر سے اپنی بیوی کی بغاوت اور موت کی خبر سنکر روما واپس آتا ہے لیکن سیزر سے خلاف توقع تعلقات اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور انٹونی کی شادی اس کی بہن اکٹاویا سے ہو جاتی ہے سیزر کا ایک دوست میاسنا انٹونی کے رفیق اینوباربس سے کلیوپیٹرا کے متعلق پوچھتا ہے۔]

میاسنا۔ اگر میری اطلاع صحیح ہے تو وہ بہت اقبالمند خاتون ہے۔

اینو۔ اس نے ساحل نیل پر پہلی ملاقات میں ہی انٹونی کا دل اڑا لیا تھا۔

اگریپا۔ وہاں وہ حسن کا آفتاب جگمگاتی ہوئی نمودار ہوئی۔

اینو۔ میں بیان کرتا ہوں۔ اسکی زرنگار کشتی شعلہ رنگ تخت کی مانند نیل کی سطح پر جگمگا رہی تھی۔ پتوار یکسر سونے کی تھی۔ بادبان اسقدر عطر میں بسے ہوئے تھے کہ سطح دریا کی فضا طبلہ عطار بنی ہوئی تھی۔ چپو چاندی کے تھے وہ بانسری کی آواز کے ساتھ پانی میں گرتے اور ابھرتے تھے۔ پانی کی رفتار ان سے تیز ہو جاتی تھی گویا وہ اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور اس کا حسن؟ الفاظ اس کے بیان سے قطعاً قاصر ہیں۔ وہ سنہری شامیانہ میں جس پر بادلے کے تار پڑے تھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا لباس اطلس اور زربافت کا تھا اور وہ فطرت کے دلفریب تخیل حسن کی دیوی کی مانند نظر آتی تھی۔ اسکی دونوں جانب خوبصورت رخساروں والے چھوکرے مسکراتے ہوئے کیوپڈوں کی مانند زرنگار رنگ کے پنکھے ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے جنکی ہوا سے اسکے رخسار اور بھی تمتما جاتے تھے۔

اگریپا۔ انٹونی کا اقبال!

اینو۔ اور اس کی کنیزیں جن کے انداز میں آسمانی دیویوں کا سا وقار تھا۔ سمندر کی حسین اور نازک پریوں کی مانند اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک نازک اندام پری نہایت دلفریب انداز میں پتوار ریشمی کشتی کے رہی تھی۔ نازک اور پھول کے سے ہاتھ ریشمی بادبانوں کی رسیاں کھینچتے تھے کشتی سے ایک عجیب مست اور دلکش خوشبو اڑ کر ساحل دریا کو مدہوش کئے دیتی تھی۔ اسکندریہ کی تمام آبادی ساحل پر امڈ آئی۔ اور انٹونی میدان شہر میں تخت پر تنہا بیٹھا ہوا کو سیٹیاں بجا کر بلارہا تھا جو کلیوپیٹرا کے حسن کی بہار دیکھنے چلی گئی تھی۔ اور فطرت میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔

اگریپا۔ اے حسن مصر!

اینو۔ جب وہ ساحل پر لنگر انداز ہوئی تو [illegible] اسے کھانے پر بلا بھیجا۔ اسنے جواب دیا کہ وہ چاہتی ہے وہ انٹونی کی مہمان کرے۔ چنانچہ وہ انٹونی جس نے کبھی کسی عورت کی درخواست کو رد نہیں کیا۔ ساحل دریا پر گیا اور ضیافت کے عوض اپنا دل نذر کر دیا۔ . . . . ایکبار وہ شہر کے میدان میں صرف پچاس قدم چلی ہو گی کہ اس کی سانس پھول گئی چہرے پر ایک عجیب سرخی آگئی جس نے اس کے حسن کو اور بھی دلاویز بنا دیا۔

میاسنا۔ اب انٹونی اسے بھول جائے گا۔

اینو۔ کبھی نہیں۔ زمانے کی ناخوشگوار ہوا اس پھول کو پژمردہ نہیں کر سکتی۔ . . . . . اسکی محبت سے جسقدر سکون حاصل ہوتا ہے اسقدر ہی تشنگی بڑھتی ہے۔

میاسنا۔ اگر حسن و جمال فہم و فراست اور حیا پروری سے انٹونی کے دل کو تسکین ہو سکتی ہے تو اکٹاویا میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

[سیزر انٹونی سے بدگمان ہو جاتا ہے اور دونوں کے تعلقات پھر کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ انٹونی کی بیوی اکٹاویا اپنے بھائی سیزر کے پاس آ جاتی ہے اور انٹونی مصر چلا جاتا ہے سیزر فوجیں لیکر مصر پہنچتا ہے لیکن اکثر بار میدان انٹونی کے ہاتھ ہی رہتا ہے۔ انٹونی کو شک پیدا ہوتا ہے کہ کلیوپیٹرا اسے دغا سے سیزر کے حوالے کر دیگی۔ وہ کلیوپیٹرا کو برا کہتا ہوا اپنے کیمپ میں آ جاتا ہے اور کلیوپیٹرا اسکی محبت دیکھنے کیلئے مشہور کر دیتی ہے کہ وہ مر گئی ہے اور مرتے دم اس کے لبوں پر انٹونی کا نام تھا۔ انٹونی میدان میں ہزیمت کھانے سے دل شکستہ ہوتا ہے یہ خبر سنتا ہے تو اپنے کئے پر تاسف کرتا ہے خنجر مار کر مر جاتا ہے کلیوپیٹرا یہ سنکر اور سیزر کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کا خیال کر کے تہ خانے میں چلی جاتی ہے اور ایک زہریلے سانپ سے کٹوا کر جان دینا چاہتی ہے اسکی کنیز ایراس کہتی ہے]

"بیگم وقت آ پہنچا۔ روشن دن ہو چکا ہے۔ اب ہمارے لئے تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

ایراس تاج اور بیش قیمت پوشاک لے کر آتی ہے۔

کلیوپیٹرا۔ لا۔ میرا لباس لا میرے سر پر تاج رکھدے۔ میرے دل میں ازل سے تمناؤں کا ایک طوفان ہے مصر کے انگوروں کا عرق اب ان ہونٹوں کو نم آلود کر دیگا۔ ایراس تیار رہ! شاید میں انٹونی کی پکار سکتی ہوں۔ وہ میرے اس بہادرانہ کارنامے کو دیکھنے آیا ہے میں اسے سیزر کی قسمت پر جو دیوتاؤں کی طرف سے آئندہ قہر و غضب کا عذر ہے ہنستے دیکھتی ہوں۔ میرے آقا میں آتی ہوں۔ میری جرأت مجھے اس خطاب کا مستحق ٹھہراتی ہے۔ میں آتش و باد ہوں۔

چارمین۔ اے گھرے بادلو برسو! موسلا دھار بارش ہو تاکہ میں کہہ سکوں کہ دیوتا اس المناک واقعہ پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ۴۴

---

۴۴ کلیوپیٹرا [illegible] رسانپ کو چھاتی پر ڈسواتی ہے [illegible] زندگی کی اس الجھی ہوئی گرہ کو کھول۔ اسے زہریلے ناگ! احمق [illegible]

چارمین۔ چھوڑ دے۔ چھوڑ دے۔

کلیوپیٹرا۔ بھینی بھینی مہک کی طرح دلکش۔ ہوا کی مانند نرم اور انٹونی کی مانند

قسمت

ایک بلند قامت۔ قدرے سیاہ رنگ شخص جس کے چہرہ پر ایک دُور دراز مقام کے سفر نے وارفتگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ عین اسوقت ایک گاؤں میں داخل ہوتا ہوا دیکھا گیا جبکہ افق کے سنہرے اور رنگین کنارے دن کو الوداعی پیغام دے رہے تھے۔ وہ عصا جس کی ٹیک پر اپنے جسم کی تکان کو دُور کرنے کے لئے وہ کبھی کبھی ٹھہر جاتا تھا۔ ہندوستان کے جنگلات ہی سے اس کے سفر کا رفیق رہا تھا۔ وہ ٹوپی جو اس کے متین چہرہ پر سایہ کئے ہوئے تھی۔ اسے اسپین کے آفتاب کی تابناک تمازت سے بچانے میں معاون رہی تھی۔ اور اس کا چہرہ صحرائے عرب کی جھلس دینے والی سموم سے سیاہی پکڑنے کے علاوہ منطقۂ بارده کی منجمد کر دینے والی ہوا کے اثرات بھی قبول کر چکا تھا۔

وحشی اور خونخوار اقوام کے درمیان عرصہ دراز تک رہنے سہنے سے وہ ابھی تک وہی خنجر آبدار زیب کمر کئے ہوئے تھا جو اس نے ایک دفعہ ایک ترک ڈاکو کے سینہ میں بھونک دیا تھا۔ اجنبی ممالک کی بُود و باش نے اس سے کوئی نہ کوئی امریکن خصوصیت چھین لی تھی۔ اور مختلف اقوام کے ساتھ میل جول اور ارتباط کے باعث اس نے غیر محسوس طور پر کوئی نہ کوئی خصوصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ایک طول و طویل عرصہ کی جہاں نوردی کے بعد ایک دفعہ پھر اس نے اپنے پیدائشی گاؤں میں قدم رکھا تو کوئی اُسے پہچان نہ سکا۔ اگرچہ سب کے سب ایک ایسے انداز سے جس میں اشتیاق اور استعجاب ملے ہوئے تھے۔ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ تاہم جب چلنے میں اتفاقی طور پر اس کا بازو ایک نوجوان عورت کے ساتھ جو شام کا لیکچر سننے کے لئے جا رہی تھی۔ چھُو گیا تو وہ چونک اُٹھی اور ایک ہلکی سی چیخ بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گئی۔

ریلیف کرین فیلڈ! اُس نے دبی آواز میں کہا۔

مسافر نے اس نوجوان عورت پر ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہو نہ ہو یہ عورت فیتھ ایجرٹن ہے جس کے ساتھ میں لڑکپن میں کھیلا تھا۔"

آغازِ ایامِ جوانی ہی سے ریلیف کرین فیلڈ محسوس کرنے لگا تھا کہ خداوند کریم نے اسے ایک نہایت ہی قابلِ فخر زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ خیال اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔ اگرچہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ اس کا خیال پختہ ہونا کسی خواب یا الہام کا نتیجہ تھا یا محض اس کے اپنے والہانہ تخیل ہی نے اس کے دماغ کی فضا کو معمور کر رکھا تھا۔ اور اب وہ اس پر وحی کی طرح یقین رکھتا تھا۔ یہ بات اس کے راسخ ترین عقائد میں شامل ہو چکی تھی۔ کہ تین غیبی اشارات کے ذریعہ اس کو بتایا جائیگا۔ کہ تین نہایت حیرت انگیز واقعات اس کی زندگی میں رونما ہونے والے ہیں۔

ان تین اٹل واقعات میں سے پہلا واقعہ جس پر اس کا خوشگوار تخیل بہت درجہ شیفتگی کے ساتھ بحث کرنے کا عادی تھا۔ اس کے ساتھ اس دوشیزہ کی ملاقات تھی جو یکتائے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے نغمۂ محبت کے ذریعہ اسے محظوظ و مسرور کر سکے۔ شاہد مقصود سے ہمکنار ہونے کے لئے اُسے تمام دنیا کا چکر کاٹنا تھا جتیٰ کہ وہ ایک ایسی خوبصورت لڑکی سے دوچار ہوا جس کے سینہ پر دل کی شکل کا ایک قیمتی ہیرہ آویزاں ہو۔ اس دلفریب اجنبی سے روبرو ہونے کے بعد اُسے اُس سے یوں خطاب کرنا تھا۔ "دوشیزہ! میں تیرے پاس ایک آرزو بھرا دل لایا ہوں۔ مجھے اجازت دے کہ تیرے سامنے اظہارِ تمنا کر کے میں اپنے بوجھ کو قدرے ہلکا کر سکوں" اور اگر حسنِ اتفاق سے وہ دوشیزہ اس کی ہونے والی بیوی ہی ہو۔ اور اگر محبت کی ان دو متوالی رُوحوں کی قسمت میں دنیاوی ملاپ لکھا ہو جو آگے چلکر ابدی زندگی میں اُنہیں "فنا فی العشق" کر دے تو وہ اپنے دل کی شکل والے ہیرے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یوں جواب دیگی "محبت کا یہ نشان جو میں عرصۂ دراز سے پہنے ہوئے ہوں اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ تمہیں اظہارِ تمنا کی اجازت ہے۔"

دوسری بات جو ریلیف کرین فیلڈ کے دل میں جاگزین ہو چکی تھی۔ یہ تھی کہ دنیا کے کسی نامعلوم مقام پر ایک خزانہ دفن ہے جس کی جائے وقوع کے متعلق سوائے اس کے کسی اور کو مطلقاً علم نہ ہو سکتا تھا۔ اس خزانے کی تلاش میں جب اس کے قدم اس مقام پر پڑینگے۔ تو اس کے سامنے کی طرف سے ایک ہاتھ نمودار ہو کر نیچے کی طرف اشارہ کریگا۔ یہ بتانا ذرا مشکل امر ہے آیا وہ ہاتھ سنگ مرمر کا ہوگا یا پہاڑ کی بلندی پر سے کوئی مہیب جسیم چیز ظاہر ہوگی۔ یا فضائے آسمانی میں کوئی شعلہ نظر آئیگا۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ وہ ایک ہاتھ ہوگا جس کی شہادت کی انگلی نیچے کی طرف اشارہ کرتی ہوگی۔ اور اس کے نیچے لاطینی حروف میں لکھا ہوگا "کھودو" اس مقام کے قرب و جوار میں زمین کھودنے سے ڈلوں اور سکوں کی صورت میں سونا

یا قیمتی پتھر اور جواہرات برآمد ہوں گے - یہ دفینہ اس کی تمام کدو کاوش کا صلہ ہوگا -

اس خوش قسمت انسان کے حیرت انگیز واقعات زندگی کا تیسرا اور آخری کارنامہ یہ ہوگا کہ اسے بنی نوع انسان کے درمیان ایک نہایت وسیع اثر و اقتدار حاصل ہوگا قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا آیا اس کی قسمت میں کسی خاندان کا مورث اعلیٰ یا بادشاہ بننا لکھا تھا - یا اس کے لئے کسی ایسی قوم کی کامیاب رہنمائی کرنی تھی جو اسے سرگرمی سے آزادی کی طرف لے جاتے یا اس کے ذمہ تمام آلائشوں سے پاک دین متین کی تبلیغ سپرد کی جانیوالی تھی - الغرض یہ ایک ایسا معمہ تھا جسے آنیوالے واقعات کے سوائے اور کوئی چیز حل نہ کر سکتی تھی - اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے کی طرف سے تین معزز اشخاص رونما ہو کر ایک غیبی اشارہ کے ذریعہ اسے عمل کی دعوت دیں گے - ان کا سردار ایک بالغ النظر اور بارُعب انسان - زمانہ قدیم کے خدارسیدہ بزرگوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں اپنے تقدس اور بزرگی کا نشان ایک موٹا سا عصا لئے ہوگا - اور اس مقدس عصا کی مدد سے فضائے آسمانی میں ایک شکل بنا کر اپنا الہامی پیغام اس پر منکشف کر دیگا - جس کی حرف بحرف پیروی سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہونیکا یقین تھا -

نوجوان کرین فیلڈ شاندار قسمت کے اس دلکش نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس دوشیزہ - خزانے - اور خدارسیدہ بزرگ کی تلاش میں جو اس کو دلوں کو فتح کرنے والی وسیع سلطنت کا تحفہ عطا کرنا تھا اور خدا پر بھروسہ کر کے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا - اور کیا وہ اپنے مقصد کو حاصل کر کے کامیاب واپس آیا تھا؟ نہیں - بلکہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اپنی ماں کی کٹیا کی طرف وہ اس کامیاب انسان کی حیثیت سے لوٹ کر نہیں آیا تھا جو اپنے دیگر ہمعصروں سے کہیں اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو - بلکہ اس کی بازیافت اُس ذلیل انسان کی سی تھی - جس کے چہرہ پر خاص قسم کے مصائب کا متواتر مقابلہ کرتے رہنے کے باعث یاس و افسردگی چھائی ہوئی ہو - وہ اپنے گاؤں کو اس لئے واپس آگیا تھا - کہ تھوڑی دیر کے لئے مقدس رخت سفر باندھ کر علیحدہ رکھ دے - اس امید پر کہ شاید اس مقام پر چند دن رہتے سہنے کے باعث جہاں پر پہلی دفعہ سر گانہ قسمت نے اسے اپنی مستقبل افروز جھلک دکھائی تھی - اس کی موجودہ زندگی کی پژمردگی جوانی کی تر و تازگی میں تبدیل ہو جائے - اس کے گاؤں میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی - کیونکہ وہ کوئی ترقی یافتہ شہر نہ تھا جہاں پر ایک سال کی خوشحال زندگی کی تر و تازگی صدیوں کے تنزل و انحطاط کی پژمردگی کو زائل کر دیتی ہے - بلکہ وہ ایک پرانے طرز کا چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے لمبی لمبی گھاس سے ڈھپے ہوئے مکانات - پرانے درخت - اور بوڑھی - کنواری - عورتیں تمام دیہاتی دلچسپیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے - تبدیلی کے اثرات البتہ ظاہر تھے تو پھل دار درختوں کے جن کی نشو و نما میں ایک پُررُعب رعنائیت پیدا ہو گئی تھی - مختلف موسموں کا مقابلہ کئے ہوئے مکانات پر جن کی چھتیں پہلے سے زیادہ گنجان گھاس کی تہوں سے سج گئی تھیں - یا زیادہ سے زیادہ قبرستان میں جہاں کی قبروں کے کتبوں میں اضافہ ہو گیا تھا - اور جن پر ان اشخاص کے نام کندہ تھے جنہیں اُس نے کچھ سال پہلے بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھا تھا - تاہم اس دس سال کی دُوری کی تباہیوں کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ کرین فیلڈ اسی صبح کو گاؤں سے باہر گیا تھا - اور کچھ عرصہ تک ایک پریشان سے خواب میں محو رہنے کے بعد شام کو واپس آگیا - لیکن اس کا دل گاؤں والوں کی طرف سے افسردہ ہو چکا تھا - کیونکہ انہوں نے اسے بالکل بھلا دیا تھا حالانکہ خود اُن کی یاد ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھی -

"تبدیلی واقع ہوئی ہے تو یہاں" اس نے سسکیاں بھرتے اور اپنے ہاتھوں سے چھاتی پیٹتے ہوئے کہا "کون ہے یہ مایوس تمنا - متفکر - مغموم - جہاں گرد مسافر! - وائے افسوس! - جب یہ نوجوان یہاں سے رخصت ہوا تھا تو کیسا خوش تھا مگر اب اس کی خوشی کیا ہوئی!"

اور اب ریلف کرین فیلڈ اپنی ماں کے چھوٹے سے مکان کے دروازہ کے پاس کھڑا تھا - جہاں وہ عمر رسیدہ خاتون اپنے محدود مگر ضروریات زندگی کے لئے کافی وسائل کی مدد سے اپنے بیٹے کی لمبی غیر حاضری کے زمانہ میں آسائش کے ساتھ اوقات بسر کرتی رہی تھی - اپنے مکان کی حدود کے اندر داخل ہو کر وہ ایک پرانے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا - اس وقت وہ اپنے بے صبری کے جذبات دبانے کی کوشش کر رہا تھا - جیسا کہ لوگ اکثر توقف کے ان لمحوں میں کرنے کے عادی ہیں جب سالہا سال کے واقعات ایک منٹ کے اندر جمع کر دئے جائیں - اس نے اپنے لڑکپن کے دنوں کے اس پرانے دوست (درخت) کے ساتھ جس کے سہارے وہ اس وقت کھڑا تھا اپنی واقفیت کو از سر نو تازہ کیا - اس کے تنے کے ساتھ ساتھ اوپر سے نیچے تک نظر دوڑاتے ہوئے اسے کوئی چیز نظر پڑی جسے دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک مایوسانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی - یہ لاطینی حروف کا ایک چھوٹا سا کتبہ تھا جس کے نقوش اب قریب قریب مٹ چکے تھے "کھودو - کھودو" - اب اُسے یاد آیا کہ یہ الفاظ اس نے درخت کے تنے میں ایک پورے دن کی کدو کاوش کے بعد اس وقت کھودے تھے - جب کہ پہلے پہل اس نے اپنے خوش آئند مستقبل

کے متعلق غور کرنا شروع کیا تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھو۔ کہ رات کی تاریکی میں
ان الفاظ کے اُوپر کا چھلکا جو اپنی جگہ بے فائدہ معلوم ہوتا تھا۔ کچھ کچھ
ہاتھ کے مشابہ تھا جس کی ایک انگلی لفظ "کھودو" کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
ریلیف کرین فیلڈ نے ایک لااُبالیانہ انداز میں اپنے آپ سے کہا "اب
ایک ضعیف الاعتقاد کا سچا اِنسان فوراً فرض کر لیگا۔ کہ وہ خزانہ جس کی تلاش
میں مَیں نے تمام دُنیا کا چکر لگایا ہے عین اس جگہ میری ماں کے مکان
کے دروازے کے پاس دفن ہے۔ یہ ایک نہایت پُر لطف بات ہوگی"
اس نے اس معاملہ پر کچھ زیادہ سوچ بچار نہیں کی۔ کیونکہ اب
مکان کا دروازہ کھُل چکا تھا اور ایک بوڑھی عورت دروازہ پر ظاہر ہو کر
شام کی تاریکی میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کون شخص ہے
جس نے سرِ شام اُن کے مکان پر آ کر دستک دی ہے۔ اور اب درخت
کے نیچے کھڑا دروازہ کے کھلنے کا منتظر ہے۔ یہ ریلیف کرین فیلڈ کی والدہ
تھی۔ ہم ان کے ملاقات کے واقعہ پر کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتے۔ ناظرین
خود اندازہ کر لیں کہ دس سال کے طویل عرصہ کے بعد اپنے بیٹے سے ملکر
ماں کے دل کی کیفیت کیا ہوسکتی ہے! اور آیا کرین فیلڈ کو جیسے دن بھر
کی تکان کے بعد سب سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ محبت و خوشی کے
جذبات کے درمیان .... آرام کی کوئی گھڑی نصیب ہوئی!
جب صبح نمودار ہوئی تو وہ اُٹھا مگر اس کا دماغ پریشان تھا کیونکہ
سوتے جاگتے اُسنے تمام رات خواب دیکھنے میں کاٹ دی تھی۔ اپنی
سہ گانہ قسمت کے معمّہ کو حل کرنے کے اشتیاق کی آگ جو عرصہ سے
اس کے سینہ میں بھڑک رہی تھی اس واقعہ کے بعد ایک بار پھر پوری قوت
کے ساتھ روشن ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایامِ جوانی کے دل خوش کُن
خوابوں کا ہجوم اس کی والدہ کے مکان میں اس کے آنے کے انتظار
میں تھا۔ اور اب وہ ایک طوفانِ بے تمیزی کی طرح اس کی واپسی پر
اسے خوش آمدید کہنے کے لئے امڈا چلا آرہا ہے۔ مکان کے اس مانوس
کمرہ میں جہاں وہ امن و عافیت کی نیند سونے کا عادی رہ چکا تھا۔ آج کی
رات اُس نے وہاں ایسی بےچینی اور اضطراب کے عالم میں کاٹی کہ شاید
کسی بھیانک جنگل کے خوفناک سایہ تلے یا صحرائے عرب کے اندر کسی خیمہ
میں بھی اُسے ایسی خطرناک اور پریشان رات بسر کرنے کا موقع و اتفاق نہ
ہُوا ہوگا۔ رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خیالی دوشیزہ نے اس
کے قریب بستر پر بیٹھکر اُس کے سیماب سے تڑپتے ہوئے دل پر اپنی انگلی
رکھی۔ ہاتھ کی شکل کا ایک شعلہ تاریکی میں نمودار ہوا۔ اور اس نے زمین کے
پُر اسرار دفینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک معمر خدا رسیدہ بزرگ نے اپنا
مقدس عصا ہلایا اور اس سے عزت کے تخت کی طرف اشارہ کیا۔ وہی غیر
متشکل اور نظر نہ آنے والے مناظروں کے وقت بھی اس کی کٹیا کے
گرد چکر کاٹا کئے۔ اگرچہ اس وقت وہ رات کی نسبت کم شوخ تھے اور
مانوس چہروں کے ہجوم کے اندر گم ہو گئے۔ جو کرین فیلڈ کی واپسی پر اُسکے
خیر مقدم کے لئے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک بلند
قامت قدرے سیاہ رنگ۔ بارُعب اور اجنبی وضع قطع کا آدمی تھا حلیم و
خلیق۔ مگر اس کی آنکھ میں کشش اور حضوری مفقود تھی۔ جس سے پتہ چلتا
تھا۔ کہ وہ کبھی کبھی کسی غیر مرئی چیز کی طرف دیکھنے کے لئے اُٹھ جاتی ہے۔
اس اثنا میں کرین فیلڈ کی والدہ مکان کے اندر اُفتاں و خیزاں چلتی پھرتی
اور یہ دیکھکر پھولی نہ سمائی تھی کہ ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے بیٹے کی واپسی
کے باعث ایک دفعہ پھر اس کا دل مادرانہ شفقت اور ہمدردی کے جذبات
سے لبریز ہوگیا ہے اور وہ روزانہ زندگی کی معمولی کاوشوں کی پرواہ نہ کرتے
ہوئے اس کے آرام کی خاطر ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار
ہے۔ دوپہر کا وقت تھا کہ اس نے مکان کے دروازہ سے باہر نکل کر دیکھا
کہ تین معزز شخص درختوں کی گھنی چھاؤں اور دھوپ میں سے گذر کر بازار سے
ہوتے ہوئے اس کے مکان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اس نے اس فخر کے
انداز میں جس میں سرتا پا محبتِ مادری موجیں لے رہی تھی کہا "دیکھو ریلیف
نواب ہیسکوڈ اور ان کے ساتھ دو ہمراہی کسی خاص مقصد کے لئے تمہاری
ملاقات کو آرہے ہیں۔ اب اپنی دلچسپ سرگزشت سُنا کر انہیں محظوظ کرو"
ان تین ملاقاتیوں میں سے نواب ہیسکوڈ سب سے زیادہ ذی عزت معلوم
ہوتا تھا۔ وہ ظاہری شان و شوکت کا دلدادہ ہونے کے باوجود ایک نہایت
خوش بیان عمر رسیدہ اِنسان تھا۔ گاؤں کے تمام معاملات میں اس کی
رائے اور شخصیت کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور گاؤں میں اپنی
شرافت اور نجابت کے لحاظ سے وہ ایک خاص شہرت کا مالک تھا۔ وہ
اس وقت تین کناروں والی ٹوپی پہنے تھا۔ جو ان دنوں رفتہ رفتہ فیشن
سے خارج ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے دستے کی ایک چھڑی
تھی جس سے چلنے میں مدد لینے کی بجائے محض فضائل فخر کے ساتھ حرکت دینے
کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے دو ہمراہی علاقہ کے دو معزز و متموّل زمیندار
تھے۔ جو ملک کی انقلابی پارٹی کے شدید مخالف اور نسبی شان و شوکت کے
زبردست حامی ہونے کے باعث نواب صاحب کی جلو میں چلنے کو خاص عزت
سمجھتے تھے۔

انہیں اپنی طرف آتے دیکھکر کرین فیلڈ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔
اور ایک نیم خود فراموشی کے انداز میں ان کے معروف و مانوس چہروں کو

معین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فریب نفس سے مسکرا کر کہا لو وہ سامنے تین معزز ہستیاں چلی آ رہی ہیں۔ اور ان میں سے پہلا شخص جس کے ہاتھ میں ایک عصا ہے خدا رسیدہ بزرگ معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان بزرگوں کی آمد میری اس خوش قسمتی کا پیش خیمہ ہو؟ جس کا مجھ سے مدت سے وعدہ کیا گیا ہے؟

بوڑھا نواب اور اس کے ہمراہی مکان کے اندر داخل ہوئے۔ ریلیف اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کا استقبال کرنے کے لئے چند قدم آگے بڑھا۔ جب وہ مؤدبانہ طور پر اپنے مہمانوں کی طرف جھک رہا تھا۔ تو اسکی مرعوب کن شکل و صورت سے ایک فطری ہیبت ظاہر تھی۔ جو نواب کے امیرانہ ٹھاٹھ کے مقابلہ میں اپنے اندر ایک خاص شان رکھتی تھی۔ بوڑھے نواب نے قدیم رسم کے مطابق ایک خاص انداز کے ساتھ اپنی چھڑی کو فضا میں حرکت دی۔ پھر اپنی ملاقات کا مدعا و مطلب بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اور میرے ہمراہی"۔ بوڑھے نواب نے کہنا شروع کیا۔ "گاؤں والوں کے منتخب کردہ اہل الرائے ہونے کی حیثیت سے ایک اہم فرض کی ادائیگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم گذشتہ تین روز سے ایک نہایت اہم عہدہ کے لئے کسی موزوں شخص کے انتخاب کے مسئلہ پر غور و خوض کر رہے ہیں۔ یہ عہدہ اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ایسا مہتم بالشان ہے کہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی بلند پایہ شان کے شایاں ہے۔ آپ ہمارے گاؤں کے ایک معزز باشندہ ہیں۔ خدا نے آپکو ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ اور چونکہ اجنبی ممالک کے سفر نے آپ کے عقلی قویٰ کی خاص طور پر تربیت کی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہمیں اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ جوانی کا جوش و خروش اور بے عنوانیاں اب آپ میں نہیں ہیں۔ اس لئے ہم پورے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا نے اپنی قدرت سے عین وقت پر آپکو ہماری مطلب براری کے لئے ہمارے پاس بھیجا ہے"

بوڑھے نواب کی اس ولولہ انگیز تقریر کے دوران میں ریلیف اس پر نظریں گاڑے مبہوت کھڑا رہا۔ اسے اس کی شخصیت میں پر اسرار اور غیبی طاقت محسوس ہوئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی پرشکوہ پوشاک پہننے کی بجائے زمانہ قدیم کے خدا رسیدہ بزرگوں کے سے کھلے کھلے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اس کی یہ حیرانگی بے وجہ نہ تھی کیونکہ فضا میں اُس کی چھڑی کی حرکت بعینہ وہی حرکت کر رہی تھی جس قسم کے اشارہ سے اس خدا رسیدہ بزرگ کا پیغام اس پر ظاہر ہونے والا تھا۔ اور جس کی تلاش میں اس نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔

"ہاں تو مجھے پہلے یہ بتایا جائے۔ کہ آخر وہ کون ایسا عہدہ ہے۔ جس پر میری تقرری مجھے بادشاہوں اور شہنشاہوں کا ہم پلہ و ہم مرتبہ بنا دیگی" ریلیف نے ایک ایسی آواز میں جس میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے مہمانوں سے دریافت کیا۔

"عہدہ؟" بوڑھے نواب نے کہا۔ "میری مراد ہمارے دیہاتی اسکول کے مدرس کی اس ذمہ دارانہ آسامی سے ہے جو مرحوم وائیلسکر کی پچاس سالہ رضاکارانہ خدمات کے بعد اس کی وفات کے باعث اس وقت خالی ہے"

ریلیف نے جلدی سے کہا "میں آپ کی اس تجویز پر غور کرونگا اور تین دن کے اندر اندر آپکو اپنی رائے سے مطلع کر دونگا" تھوڑی دیر کی مزید گفتگو کے بعد گاؤں کے سرکردہ کارکن تو رخصت ہو گئے۔ لیکن ان کی خیالی تصویر ابھی تک کرین فیلڈ کے دماغ میں محفوظ تھی اور جوں جوں وہ ان کی پُر رعب صورتوں پر جیسا کہ وہ خواب کی حالت میں اُن کے سامنے نمودار ہوئی تھیں اور جنہوں نے آگے چلکر بیداری کی حالت میں ایک مانوس شکل اختیار کر لی تھی۔ غور کرتا ان کے نقوش زیادہ روشن اور شوخ ہوتے جاتے تھے۔ اس نے بوڑھے نواب کے خد و خال کے متعلق مختلف انداز میں خیال آرائی شروع کی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ نواب کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ کوئی خدا رسیدہ ہستی ہے اس نے خیال کرنا شروع کیا یہی تو وہ چہرہ ہے جو مصر کے بلند ترین مینار پر جلوہ فگن ہوا تھا یہی تو وہ شکل ہے جس نے غرناطہ کے شاہی محل کے مہیب ستونوں کے درمیان سے اس کی طرف اشارہ کیا تھا! ہاں تو ٹھیک یہی وہ صورت زیبا تھی جس نے فراز کوہ پر سے اترتے ہوئے پانی کے .... گرم چشمے کی تاریکی میں رخ نمائی کی تھی! جوں جوں وہ اپنی یادداشت پر زور ڈالتا اُسے معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں والوں کی چھوٹی سی دنیا کے اس مشہور و معروف۔ خود پسند۔ خوش پوش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے دلدادہ انسان میں وہ سب صفات موجود ہیں۔ جو اس نے خواب میں ظاہر ہونے والے "پیغامبر قسمت" کی شخصیت میں دیکھی تھیں۔ کرین فیلڈ اسی قسم کے خیالات کے ہجوم میں محو سارا دن اپنی کوٹھری میں بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کی والدہ نے اس کے سفر کے واقعات کے متعلق اس سے بیسیوں سوالات کئے مگر یا تو اس نے انہیں سُنا نہیں اور اگر سنا بھی تو ان کے جوابات بالکل بے ربط و مہمل سے دئے۔ غروب آفتاب کے وقت وہ ہوا خوری کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور جب اس پُرانے درخت کے پاس سے ہو کر گذر رہا تھا تو اس کی نظر اس

ہاتھ کی طرف اٹھ گئی۔ جو دھندلے سے کتبے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

جب ریلف گاؤں کے بازار میں سے گذر رہا تھا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس کا سایہ قدم قدم پر پڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ جس طرح اس کا سایہ دور دراز کی چیزوں پر پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اس کی آئندہ زندگی کے واقعات قبل از وقت ہی عکس ڈال رہے ہیں۔ اور جب وہ کسی ایسے مقام کے پاس پہنچا جہاں پر اس کا سایہ پہلے پڑ چکا تھا۔ تو معاً لڑکپن اور جوانی کے مشہور واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ راستہ کا وہ کونسا موڑ تھا جس سے وہ واقف نہ تھا؟ حتیٰ کہ پیشِ نظر مناظر کی عارضی کیفیتیں بھی وہی تھیں۔ جو اس نے ایام گذشتہ میں محسوس کی تھیں۔

وہ گائیں سر راہ چر رہی تھیں جن کے خوشگوار سانس نے اسکی طبیعت میں فرحت پیدا کر دی۔ مالجہ کے جزائر سے چلتے وقت بادِ صبا کے وہ جھونکے جو بہار سے جہاز کو وطن مالوف تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس قدر خوشگوار نہ تھے جتنا کہ ان خوشنُم گایوں کا تنفس ہے۔ اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ قریب کے ایک مکان کے دروازے میں سے ایک ننھا بچہ لڑھکتا ہوا زمین پر آ رہا۔ اور اس کے پاؤں کے قریب آ کر مسکرانے لگا۔ وہ بلند قامت انسان نیچے جھکا۔ اور بچے کو اٹھا کر اس کی والدہ کی گود میں واپس دے دیا۔ اس نے اپنے عہدہ کی تقرری کا خیال کرتے ہوئے کہا "بچے! ہاں! گاؤں کے بچے! ان کی قسمت اب تجھی سے وابستہ ہونے والی ہے"۔

اس وقت جنس لطیف کی محبت کا فطری احساس اس کے دل کی گہرائیوں میں نمودار ہوا۔ اور وہ ایک ایسے مکان کے قریب پہنچا۔ جس کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے کسی قسم کی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ ایک سریلی آواز جو کسی کی روح کی گہرائیوں کا پتہ دیتی تھی۔ مکان کے اندر ایک دلگداز نغمہ پیدا کر رہی تھی وہ سر جھکائے مکان کے چھوٹے سے دروازہ میں سے گذر کر اندر داخل ہو گیا۔ جونہی اس نے دہلیز پر قدم رکھا۔ ایک نوجوان عورت مکان کے اندر سے پہلے قدم بڑھاتی اور پھر ذرا رک رک کر چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی حتیٰ کہ وہ دونو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کی شکل وصورت میں ایک عجیب فرق نمایاں تھا۔ وہ متین و جاذب توجہ جہاں گرد جہاں دیدہ۔ یہ صاف ستھری۔ طرحدار۔ خاموش۔ دنیا کے نشیب و فراز دیکھے ہوئے۔ اور یہ پُرجوش مسرت میں بھی خاموش! ایسا معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کی پُرامن طرز کے ماتحت اس کے تمام جذبات ساکن ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے بظاہر متفاوت چہروں پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری تھی۔ یہ محبت کی دبی ہوئی آگ کی تمازت تھی جو ان کے چہروں کو یکساں طور پر منور کئے ہوئے تھی۔

"تمہیں اپنے وطنِ مالوف کی طرف بخیر و خوبی لوٹنا مبارک ہو" فیبتھ ایجرٹن نے کہا لیکن گرین فیلڈ نے اس سوال کا جواب دینے میں جلدی سے کام نہ لیا۔ کیونکہ اس وقت اس کی آنکھ دل کی شکل والے زیور کی طرف جو ایجرٹن اپنے سینہ پر آویزاں کئے ہوئے تھی۔ دیکھنے میں مصروف تھی۔ یہ جگنی معمولی پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ اور اب اسے یاد آیا کہ یہ اس نے حبشیوں کے ایک ویران کھنڈر کے ایک پتھر سے تراش کر فیبتھ کو دی تھی۔ اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ اس کی شکل بعینہٖ اس زیور کی سی تھی جو اس نے خواب میں دوشیزہ کے گلے میں دیکھا تھا۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت اس نے یہ جگنی فیبتھ کو تحفہ کے طور پر دی تھی۔ آخر کار اس نے کہا "ہاں تو یہ دل ابھی تک تمہارے پاس صحیح وسلامت موجود ہے"؟

"ہاں" فیبتھ نے جواب دیا۔ اور اس کے چہرہ پر گہری سرخی دوڑ گئی۔ پھر حسرت آمیز لہجہ میں بولی۔ "اور تم میرے لئے سمندر پار سے کیا تحفہ لائے ہو"

ایک ناقابلِ ضبط جذبہ کے ماتحت بے ساختہ وہی الفاظ ریلف کے منہ سے نکل گئے "فیبتھ" اس نے کہا۔ "میں ایک حسرت بھرا دل تیرے پاس لایا ہوں مجھے اجازت دے کہ اظہارِ تمنا کر کے اپنے بوجھ کو قدرے ہلکا کر سکوں"۔ محبت کی یہ نشانی جو میں عرصۂ دراز سے پہنے ہوئے ہوں اس امر کی تصدیق ہے کہ تمہیں اظہار تمنا کی اجازت ہے"۔ فیبتھ نے کہا۔

"فیبتھ۔ فیبتھ" گرین نے کہا۔ اور وہ ہم آغوش ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد خواب کا پردہ گرین فیلڈ کی آنکھوں سے اٹھ گیا۔ اور اصلی واقعات حقیقت کی روشنی میں اس پر منکشف ہونے لگے۔ پُر اسرار خزانے کو معلوم کرنے کے لئے اسے اشارتاً بتایا جا چکا تھا۔ کہ وہ اپنی والدہ کے رہائشی مکان کے قرب وجوار میں زمین کھود کر دیکھے کہ اس میں کیا مدفون ہے۔ جنگی احکام جاری کرنے یا شاہی اور مذہبی اقتدار کی بجائے اس کی قسمت میں گاؤں کے بچوں پر روحانی اقتدار و تسلط قائم کرنا لکھا جا چکا تھا۔ اور اس خیالی دوشیزہ کی تصویر اس کے پردۂ تخیل پر سے مٹ کر اس کی جگہ ایام طفولیت کی رفیق ایجرٹن کی تصویر اس کے لوحِ دل پر نقش ہو چکی تھی!

کتنے لوگ ہیں۔ جو اپنی لاحاصل اور بعید از عقل خواہشات کو پورا کرنے کے لئے فضول سرگرداں و حیران نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ذرا سی سوچ بچار کے بعد یہ حقیقت ان پر منکشف ہو سکتی ہے۔ کہ ان کی خوشی۔ فارغ البالی۔ اور فرائض کی ادائیگی کے مواقع خود ان کے اپنے قبضہ میں ہیں! خوش

ہیں وہ لوگ جو بے فائدہ جہاں گردی اور وقت ضائع کرنے کی بجائے
خود اپنے اندر زندگی کا مسئلہ حل نہ ہونے کی عقدہ کشائی کے سامان
مشاہدہ کرتے ہیں! (ماخوذ)

غلام مصطفےٰ بی۔ اے امرتسری

غزل

درماں سمجھ رہا ہوں جنوں کے اثر کو میں
دشمن بناؤں سر کو نہ توڑوں جو گھر کو میں

ہے ننگ عشق اہلِ ہمم گریہ و بکا
نفرت سے دیکھتا ہوں ہر اک نوحہ گر کو میں

دل نذر سوز عشق ہوا بھی تو کیا ہوا
میری چلے تو آگ لگا دوں جگر کو میں

سن اے حریف ملت صبر و رضا ہے یہ
کرتا ہوں پیار خنجر بیداد گر کو میں

ہے سجدہ گاہ اہل تقدس یہ سرزمین
کیونکر کہوں نہ کعبہ تیری رہگذر کو میں

بھولا ہوں رہ مناظر منزل کو دیکھ کر
بدنام کر رہا ہوں عبث راہبر کو میں

روئے سخن ہے مجھ سے نگاہیں عدو پہ ہیں
پہچانتا ہوں خوب تمہاری نظر کو میں

پھر اتصال طالب و مطلوب ہے محال
بیٹھے رہے اُدھر کو اگر تم ادھر کو میں

حیراں ہوں کیا کروں کہ دل آگہی سے ہے بدحواس
دل اپنا دوں کہ اپنی زباں نامہ بر کو میں

جاؤں کہاں بتا تو سہی اس کو چھوڑ کر
کس آسماں سے لاؤں تیرے سنگ در کو میں

قطرہ بھی خون کا دلِ مایوس میں نہیں
پہنچاؤں اب کہاں سے رسد چشم تر کو میں

حیراں ہوں اضطراب دل دردمند سے
سمجھاؤں کس دلیل سے اس بے خبر کو میں

گوہر تمہیں بتاؤ کہ اسکا ہے کیا علاج
سمجھے ہوئے ہوں دشمن جاں چارہ گر کو میں

گوہر

بزم تنہائی

بڑے بڑے شہروں کے تنگ مکانوں میں ہماری زندگیوں کا اکثر حصہ اکیلے ہی گذرتا ہے۔ تھورو (ایک مصنف کا نام) نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ "جو آدمی سوچ رہا یا کام کر رہا ہو وہ ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہو" اور ممکن ہے کہ اگر ہم تنہائی کی جانب زیادہ مائل ہوں تو زیادہ سوچ سکیں اور صحیح سوچ سکیں خواہ ہم پسند کریں یا نہ ہمیں اپنی سوسائٹی کو برداشت کرنا ہی ہوگا اور اس امر کی احتیاط کرنی عقلمندی ہوگی کہ جتنے گھنٹے ہم تنہائی میں گذاریں وہ ہمارے حسب منشا خوشگوار ہوں۔ آدمی مل جل کر رہنے والا جانور ہے اور وہ سوسائٹی کا ممبر رہ کر ہی دنیا کی بہترین چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ کسی شخص نے اکیلے رہ کر کامیابی حاصل نہیں کی۔ زندگی کے بڑے بڑے معاملات میں ہم اکیلے ہی رہتے ہیں اور ہماری اصلی تاریخ کا پتہ دوسروں کو نہیں لگ سکتا۔

اپنی شخصیت کی اصلاح

خود علم حاصل کرنا اپنی اصلاح کی ضروری تمہید ہوا کرتا ہے۔ اس سے ہمیں اپنی قدر آپ کرنی بھی آجاتی ہے۔ اگر آدمی کی زندگی خشک اور بے لطف ہو اور وہ ایسی دوستی کی برکت سے محروم ہو جسے برائی کا خیال ہی نہ آتا ہو تو اسے چاہئے کہ اس دوستی کے حاصل کرنے کی تکلیف گوارا کرے۔ پہلے تو اسے اپنی ہی ہستی کا علم ہونا چاہئے۔ پھر اس کی اصلاح ہونی چاہئے اُسے اپنی تربیت اس طرح سے کرنی چاہئے کہ وہ دنیا میں اس یقین کے ساتھ سیر کیلئے نکلے کہ دنیا اُسے خوشگوار اور دلکش پائے دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہے کہ جب تک حقیقی معنوں میں کوئی شخص اپنا دوست نہ ہو تب تک وہ دوسروں کا دوست نہیں بن سکتا۔ حقیقی دوستی کا انحصار علم پر ہے یا یا اپنی ہی مشق کی بدولت قوت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تھورو قدرے خود پسند تھا۔ مگر اس نے لکھا ہے "میں اپنے آپ ہی کو انسانی ہستی سمجھتا ہوں اور یہی جانتا ہوں کہ خیالات اور جذبات کا نظارا میں ہی ہوں اسی دوئی کا احساس ہے جس کے ذریعے میں اپنے آپ سے اتنا ہی دور کھڑا ہو سکتا ہوں جتنا کسی اور شخص سے خواہ میرا تجربہ کتنا ہی سخت ہو مگر مجھے اپنے ایک حصے کی موجودگی اور نکتہ چینی کا احساس ضرور ہوتا ہے گویا کہ وہ میرا حصہ نہیں ہے بلکہ ایک اور تماشا دیکھنے والا ہوا ہے جو تجربہ میں تو شریک نہیں ہوتا بلکہ اس کو ذہن میں رکھتا جاتا ہے اور وہ میں نہیں بلکہ آپ ہیں۔"

اپنی روح کا کپتان

علم کے بعد تکمیل کا درجہ ضرور آتا ہے۔ ہونسٹین نے لکھا ہے "دنیا میں آدمی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اپنی ہستی کا مالک آپ ہے" ہینلی (شاعر کا نام) اگرچہ قسمت کا مارا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی خوش ہو کر چلا اٹھا۔

کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راستہ خواہ کتنا ہی تنگ ہو
میں تکالیف سے کتنا ہی بدلا ہوا ہوں۔
پھر بھی میں اپنی قسمت کا آپ مالک ہوں۔
میں اپنی روح کا کپتان ہوں۔

مجھے اس بات کا کلی یقین نہیں ہے کہ آدمی اپنی قسمت کا مالک آپ ہو سکتا ہے لیکن ہم میں سے ادنی آدمی بھی اپنی روح کا کپتان تو ہو سکتا ہے موجودہ دنیا نقل کی دنیا ہے ہم ایک دوسرے کی مانند کپڑے پہنتے ہیں ایک دوسرے کی طرح نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کی مانند سوچتے ہیں۔ ہم اپنی برائیوں اور نیکیوں میں بھی ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی نے اپنے ہی جہاز کو چلانا نہ سیکھا ہو اور اس بات کا فیصلہ نہ کیا ہو کہ اُسے کس بندرگاہ تک پہنچنا ہے تو وہ اپنے ہی جہاز میں سوراخ کریگا۔

ہمت اور اولو العزمی کے ساتھ پوری صاف دلی بھی ہونی چاہئے دوسروں کے سامنے جھوٹ بولنا نہایت ہی مکروہ ہے اور اپنے آپ سے جھوٹ بولنا تو سراسر زبوں ہے۔ یہ ظاہر کرنا کہ اپنے افعال میں بے غرض راستی ہوتی ہے اور یہ کہ فلاں شخص بھاگ گیا ہے کیونکہ وہ نہایت ہی نکما آدمی ہے کس قدر غلط ہے۔ صاف دلی مسٹر پیپز کے روزنامچہ کی نہایت ہی دلکش ادا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک کتاب ہے مسٹر پیپز نے اپنے دل کو کبھی بھی یہ نہیں بتلایا کہ اس کی شرارت میں شرارت نہیں ہے اس کی نگاہ بڑی صاف ہے گلبرٹ اور سلیوان کے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کی مانند وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا۔

بُرائی نیکی ہے اور نیکی برائی
اچھی چیز خراب ہے اور خراب اچھی

اعتراف

اگرچہ ہم کسی پیر و مرشد کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اپنے سامنے ان کا اعتراف کرنا صحت بخش ہے کوئی شخص اپنے آپ کو نجات نہیں دلا سکتا۔ لیکن بدمزاجی یا شرانگیزی کا خاموش اعتراف ہماری اپنی سوسائٹی کو ذرا خوشگوار بنا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو جاننے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا وہ بظاہر اس بات سے ڈرتا ہے کہ اُسے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے گی کہ جس کی وجہ سے اس کی اپنی صحت قابل برداشت ہو جائے گی۔

حماقت دغا۔ بیوقوفی۔ ریاکاری۔ بناوٹ اور ہر قسم کی منفیٔی کی تمام صورتیں اور ہر ایسی چیز جو بجائے فخر و مباہات کے ساتھ نوع انسان پر اپنا دباؤ ڈالتی ہے یہ تمام باتیں ہجو کرنے والے کا نشانہ بنتی ہیں اس کے تیروں کے لئے اپنے نشانے ہیں اور اس کے حملے کے شکار ہیں اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ دنیا ایسے شکاروں سے کس قدر معمور ہو رہی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہم خود کس قدر جلدی اکڑنے اور ڈینگ مارنے لگتے ہیں اور جب ہمیں اپنا اکڑپن اور ڈینگ معلوم ہو جائے تو پھر ہم اُن کے مضر اثرات سے بچنے کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں۔

" اعترافات" لگاتار اکڑنے والا تھا حالانکہ اس کی یہ کتاب ایک بہت بڑی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اگرچہ وہ نہایت ہی خود پسند آدمی تھا اور اپنے بارے میں دلچسپی لیتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے آپ کو جاننے سے قاصر رہا۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ اپنے وطن میں اپنے مذہب اپنے خاندان اور دوستوں کی آغوش میں رہکر کسی خوشگوار پیشے کی یکسانیت میں اگر اپنی زندگی اطمینان اور امن سے گذار دیتا۔ میں ایک نیک مسیحی اچھا شہری نیک دوست اور نیک آدمی ہوتا مجھے اپنی حالت کی چاہت ہوتی اور شاید میں اپنی حالت کیلئے باعث فخر ہوتا اور آسودہ گمنامی میں آسودگی کی زندگی بسر کر کے اپنے ہی خاندان کی آغوش میں بڑے امن سے اس دنیا کو خیرباد کہہ جاتا۔

اگر بین جکیں اپنی ہنسی اُڑانے میں ماہر نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی نیک آدمی یا نیک عیسائی نہ ہوتا اور نہ اتنا آسودہ ہو کر امن سے زندگی گذار سکتا۔

سچے خواب

یہ یقین کر لینا سخت حماقت ہے کہ ہم وہ ہیں جو حقیقت میں نہیں ہیں۔ البتہ یہ خیال کرنا کہ ہم وہ ہو جائیں جو کچھ کہ نہیں ہیں فرحت بخش ہے ہم فطرتاً ایک نمونہ کی صورت میں اپنے آپکو ڈھالتے رہتے ہیں اور جس قسم کے خیالات ہمارے دل میں آتے ہیں اُنہیں کے سانچے میں وہ ڈھلتے جاتے ہیں البتہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیرت انگیز نتائج کے ساتھ ہمارے خواب سچے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سٹی ونسن نے ہمیں ان الفاظ میں آگاہ کیا ہے کہ ممکن ہے کہ آدمی خوابوں ہی میں اپنی زندگی گذار دے۔ اور پھر بھی اُن کے حصول کے لئے تیار نہ ہو۔

مگر بعض طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حقیقت میں اپنی تنہائی سے باہر نہیں آتیں یعنی صوفی اور مجذوب لوگ جو دنیا کی شورش سے دور بھاگ گئے ہیں لیکن ہم جیسے لوگوں کے لئے اکیلے رہنا اور غور سے دیکھا جائے تو دوسروں کے ساتھ رہنے کیلئے تیاری ہوتی ہے۔ ہماری اپنی روحیں گویا سنگار کے کمرے ہیں ان میں ہم آراستہ و پیراستہ ہو کر روزانہ زندگی کے ڈرامے میں اپنا پارٹ کھیلنے کے لئے سٹیج پر آتے ہیں "تھوڑی سی کنارہ کشی بیٹھا پھل لاتی ہے"

زندگی کی تماشہ گاہ

یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ ہر شخص کو اپنی ذات کا علم پورا پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہم دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو بہتر جان لیں اور اس علم کی بدولت خود سنبھلی خود اور کسی قدر خود سے کام لیکر اپنا بازو پکڑ لیں اور اس بھروسے کے ساتھ زندگی کے سٹیج پر جائیں کہ جب پردہ گر پڑے تو ہم اُس پارٹ کے ادا کرنے سے قاصر نہ رہیں جو قسمت نے ہمارے لئے تیار کر رکھا ہے۔

سلیمان خاں بی۔ اے۔ پی سی ایس

حقائق

نویں صدی میں کل دنیا کے باشندوں کی تعداد آٹھ سو ملیون تھی لیکن اس وقت کل دنیا کے باشندے ایک ہزار آٹھ سو ملیون ہیں۔
شمالی چین میں بعض ایسے گورے لوگ موجود ہیں جن کا رنگ یورپ کے گوروں سے ملتا جلتا ہے۔
نجد میں ابتک ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے کبھی سبزی کو پکا کر نہیں کھایا۔

دنیا میں بہت سے شاعر ادیب اور عالم موجود ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو دس آدمیوں کی بھی رہنمائی کر سکے۔
حکمت قوموں کے تجربات کا نام ہے
سیاسی انسان کا دل اس کے دماغ میں ہوتا ہے۔ (نپولین)
اس دنیا میں دنیا کی اصلاح کا کام کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے (بالڈون)

شاعر کا گھر

ندی کا ہے کنارا
چھوٹے بڑے ہیں پودے
نکہت سے پُر فضا ہے
پودوں کی ڈالیوں پر
کچھ اُڑ کے جا رہی ہیں

موسم ہے پیارا پیارا
ہر سو کھڑے ہیں پودے
اور جانفزا ہوا ہے
چڑیاں ہیں زمزمہ سر
کچھ مُڑ کے آ رہی ہیں
شاعر پڑا ہوا ہے
یہ حسن کا جہاں ہے

پانی چھلک رہا ہے
پھولوں سے کچھ لدے ہیں
کرتی ہے جس کی جنبش
جو گا رہی ہیں گانے
یاں اک شجر کے نیچے
اور گنگنا رہا ہے
شاعر کا گھر یہاں ہے

سبزہ لہک رہا ہے
باقی ہرے ہرے ہیں
پھولوں کی ایک بارش
دل کو لبھانے والے
بے فکر سب جہاں سے

کہسار کا ہے دامن
جاری ہیں آبشاریں
جھڑتے ہیں یوں شرارے
بادل کا خیمہ سر پر
اور بیچ ایک چشمہ

دلچسپیوں کا مامن
پیاری ہیں آبشاریں
جوں چرخ سے ستارے
سیمیں ہے جس کی جھالر
چھوٹی سی جھیل گویا
شاعر کھڑا ہوا ہے
یہ حُسن کا جہاں ہے

چشمے اُبل رہے ہیں
چلتی ہیں کیا مٹک کر
سرو و چنار خود رو
چو طرف ہیں جٹائیں
اس جھیل کے کنارے
کچھ منہ میں گا رہا ہے
شاعر کا گھر یہاں ہے

فوارے چل رہے ہیں
پتھر سے سر پٹک کر
ہیں کوکنار خود رو
گرتی ہیں تن سے بوندیں
اک سنگ کے سہارے

ہے آدھی رات بن ہے
اک باغ یاسمیں ہے
یہ شاخسار پیارا
قمری کی گا ہے کو کو
گا ہے کوئی پرندا

فطرت بنی دلہن ہے
جنّت کی سرزمیں ہے
فصلِ بہار گویا
دلدوز اور دلجو
رحمت کا یا فرشتہ

اور اس دلہن کا دولہا
راحت برس رہی ہے
یاں مست ہوگئی ہے
اُڑتی ہوئی ہوا میں
جاتا ہے یوں گزر کر

ہے چاند چودھویں کا
رگ رگ میں بس رہی ہے
خاموش سو رہی ہے
کھُل جاتی ہے فضا میں
خط اک صبا کا کھنچ کر

رہ جاتا ہے ہوا پہ

اک خوشنما ہے ٹیلا　　خاموش اس پہ بیٹھا　　ہرسُو بنظرِ غائر　　کچھ ڈھونڈتا ہے شاعر

یہ حُسن کا جہاں ہے　　شاعر کا گھر یہاں ہے

بستی ہے اک نرالی　　اس زندگی سے خالی　　جس کے مکین سارے　　ہیں خواب اور سپنے

مٹی ہے زعفرانی　　پانی ہے ارغوانی　　اک ندی دلستاں ہے　　اور ندی میں رواں ہے

نکہت کا ایک سفینہ　　جس میں کوئی حسینہ　　بیٹھی ہوئی ہے تنہا　　اور عشق کا فرشتہ

نغموں کی جنبشوں سے　　پلکوں کے چپوؤں سے　　نیا چلا رہا ہے　　ساحل کو لا رہا ہے

ساحل ہے داستاں کا　　فردوس جاوداں کا　　اس سحر کی فضا میں　　اس گنبد نوا میں

تخئیل کے پروں پہ　　شاعر سوار ہو کر　　اڑتا ہوا ہے جاتا　　جادو کے گیت گاتا

یہ حُسن کا جہاں ہے　　شاعر کا گھر یہاں ہے

روشن الدین وکیل

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا　　ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی

ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے　　اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی

نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر　　غمِ فنا ہے تجھے! گنبدِ فلک سے اتر

ٹپک بلندیِ گردوں سے ہمرہِ شبنم　　مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی

بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

اقبال

پورس

ایکٹ دوم

سین - ۱

کلیوفیلا ہیپ فستیان

ہیپ فستیان - آپ کے راجوں مہاراجوں کی پنچایت تو اُٹھتی نظر نہیں آتی
کیوں نہ لگے ہاتھوں وہ راز کہہ ڈالوں جن کی بدولت میں یہاں کھنچا آیا
ہوں - میں اُس آقا کا محرم راز ہوں جس کے دل میں آپ کی خواب آلود آنکھوں
نے جذبات کی ایک دنیا پیدا کر دی ہے - پہلے میں انہیں فتنہ خیز آنکھوں
سے پوچھتا ہوں - چاہتا ہوں کہ میرا پیغام صلح اُن کے خیال میں کس اثر کا
مالک ہے اگر وہ لو ہا مان گئیں تو ان راجے مہاراجوں کو ڈھب پر لے
آنا کوئی بات نہیں - آہ ! جس کا ایک لفظ دنیا کو تہ و بالا کرنے کا دم
رکھے - اس کی آتش ریز آہیں اور فلک شگاف نالے ہلکی سی آس تک
پیدا نہ کر سکیں - کامیابی کی توقع یہاں تک کامران ہو کہ آپ کے بھائی کے
مُنہ سے بھی "ہاں" کا گلو گیر لفظ نکل جائے مگر آپ کے شعلہ خو وعدول
کو قرار نہ ہو اور لا اُبالی پن نچلا نہ بیٹھے - رانی جوبان چھڑکے اُس کی جان
کے لاگو ہونا کہاں کا دستور ہے ؟ جو دنیا کی بادشاہت کو لات مار کر آپ
کے لئے دھونی رمائے بیٹھا ہو اس کے ولولوں کو ٹھکرانا کہاں
کی عشوہ گری ہے ؟ یہ صلح و جنگ کا گورکھ دھندا جو کسی کے کھولے
کھلنے میں نہیں آتا محض ایک کھلونا ہے جس کی چابی آپ کے ہونٹوں
میں بند ہے - سو کی ایک کہوں دنیا اور اس کی عقیدت اس کے
نزدیک بے سود ہیں اگر آپ کی چشم عنایت شامل حال نہ ہو -

کلیوفیلا - اپنی طرف دیکھتی ہوں تو جی نہیں مانتا کہ سکندر جیسے مشہور جہان کشا
کو یہ کم مایہ حسن مسحور کر سکے - اُس شان و تمکنت کے مالک کو کیا پڑی
ہے کہ مجھ جیسی ناچیز عورت کے لئے اپنی جان ہلکان کرے - جناب لاکھ
نادان سہی مگر اتنا جانتی ہوں کہ ایسے گریز پا صید دیر تک پابند نہیں
رہتے - نئی چراگاہ دیکھتے ہی زنجیریں توڑ کر نکل جاتے ہیں اور ان کی
چتر نگی امنگیں محبت سے زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتیں - آسمان نے
بارہا دیکھا ہے کہ آفتاب نصرت کا کمال جذبات لطیف کے زوال کا
پیش خیمہ ہوتا رہا ہے - ممکن ہے کہ جب میں آنکھوں کے سامنے تھی
اُنہیں میرا کچھ پاس خاطر ہو لیکن جب میں آزاد ہوئی تو ان کی زنجیریں
بھی کٹ گئیں -

ہیپ فستیان - اگر آپ اسے آتش ہجر میں جلتے اور تارے گن گن کر رات بسر
کرتے دیکھ پاتے تو آپ کو یقین آتا کہ اس کی رگ رگ میں آپ کی
محبت بس رہی ہے - جس موتی کی تلاش میں وہ جنگ کے طوفان میں کود پڑا
وہ آپ ہی کی ذات ہے یہ آپ ہی کی محبت ہے جو اس تاجور فاتح کی گردن
میں رسن ڈالے ایک صوبے سے دوسرے میں کھینچے لئے جاتی ہے اور
اس راہ عشق میں جو چیز آ پڑتی ہے اُس کا آہنی پنجہ اُسے مسل ڈالتا
ہے - یہ جذبہ الفت نہیں تو کیا ہے جو ہمارے اور آپ کے جھنڈے
ایک ہی میدان میں لہرا رہے ہیں - یہ آپ کی ہی کشش ہے جو وہ آپ کے
مورچوں میں کھڑا آپ کے مورچوں پر نظر ڈال رہا ہے لیکن ان کامیابیوں
کے باوجود اس کا متحیر دل اس اندیشے سے سہم جاتا ہے کہ مبادا یہ
سب کچھ بیکار رہا ہے اور آپ سے ملنا ہنوز دلی دور نکلے - یہ یلغار پہ
یلغار کرتے بڑھے آنا عبث ہے اگر آپ کے دل میں گھر نہ کر سکے اور
آپ اپنی تغافل شعاری کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ہر دور اس
کے عہد وفا میں پیچ نکالتے رہیں - آپ کا دل بے اعتمادی . . . .

. . . .

کلیو فیلا۔ افسوس میری بہترین جوابدہی بھی آپ کے شکوک کے آگے ماند پڑ جاتی
ہے۔ ہماری طبیعتیں من مانی خواہشات کو مشتبہ قرار دینے کیلئے ناحق
دلائل سے پریشان ہونے کی عادی ہیں۔ کاش آپ کے آقا میرے
دل کے راز سے آگاہ ہوتے۔ بہرحال ممنون ہوں کہ وہ مجھے اس قدر
چاہتے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا۔ کہیں دن گذرنے سے ان کا جوش مدہم
نہ ہو گیا ہو۔ میں محبت کی بھولی ہوں اور کچھ نہیں جب انہوں نے ہماری
سرحد میں قدم رکھتے ہی مجھے اسیر کر لیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ساری
دنیا پر اُن کا قبضہ ہے تو اس قید کو میں نے مہربانی خیال کیا بات تو
ایسی تھی کہ میں گھل گھل کر مر جاتی۔ مگر مجھے اس قید میں یہ مزا آیا کہ آزادی
ایک پریشان خواب ہو گئی اور اس کے حصول کا امکان موجب پشیمانی
ہونے لگا۔ آپ ذرا خیال کیجئے کہ اُن کی آمد کی خبر سُن کر میرے دل کی
کیا کیفیت ہوئی ہو گی مگر وہ مجھے خونی ہولی دکھانا چاہتے ہیں۔ اور
ایک دشمن کے انداز سے جلوہ نما ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری
آڑ میں وہ مزید نشان و شکوہ کے متلاشی ہیں۔

ہسپفستیان۔ رانی یہ بھول ہے۔ آپ کے حسن فسوں ساز نے اس کا
فاتحانہ جوش مدہم کر دیا ہے۔ اب تو وہ اپنی تیغ آبدار کے جوہروں
کو غلاف میں چھپا رہا ہے اور اُن راجوں کو صلح کی دعوت دے رہا ہے
جو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے وہ اس ہاتھ کے
اُٹھانے سے پرہیز کر رہا ہے۔ جو ان مغرور راجوں کو روئی کی طرح
دھنک کر رکھ دے۔ جانتی ہیں آپ کس لئے؟ محض اس وجہ سے
کہ کہیں اس کا نیزہ آپ کے بھائی کے سینے پر نہ پڑے۔ اسکی شجاعت
آپ کے دل کو ٹھیس لگانے سے ڈرتی ہے اس کا دل فتحیابی کے
اس نشان کو پسند نہیں کرتا جس پر آپ کے آنسوؤں کے موتی ٹکے
ہوں۔ رانی! اس کی محبت جو والہانہ تشویش پیدا کر رہی ہے۔
اُسے پروان چڑھائیے۔ اور اُسے رنجیدہ فتح حاصل کرنے کی زحمت
سے بچائیے۔ اس وقت اُس کا دریائے کرم جوش پر ہے ان راجوں
کو سمجھائیے کہ اس سے اپنے گذشتہ متکبرانہ رویہ کے داغ کو دھوئیں
اور اس لطف خسروانہ کو بصد نیاز قبول کریں۔ جو انہیں صرف
آپ کے صدقہ میں مل رہا ہے۔

کلیو فیلا۔ آہ! کیا بتاؤں میرا پہلے ہی ماتھا ٹھنک رہا ہے جب بھائی کا
دھیان آتا ہے تو میرا تن بدن کانپ اُٹھتا ہے۔ دیوتا نہ کریں کہ ایسے
پیارے دشمن کے ہاتھ اس کے خون میں رنگے جائیں۔ مگر میں
بھائی کے شعلۂ غضب کو مدہم کرتی ہوں تو پورس اور اکشیانا اُسے
اور بھڑکا دیتے ہیں۔ جب میں کچھ کہنا چاہتی ہوں تو ایک راجہ کی ہنسی
اور ایک مہارانی کی چمکدار آنکھیں میرے ہونٹ سی دیتی ہیں۔
تردّدات کے اس ہجوم میں میں جس قدر پریشان ہوں تھوڑا ہے۔
میری ایک آنکھ بھائی کے لئے اشکبار ہے تو دوسری سکندر کے
فکر میں خون رو رہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ سکندر نے سینکڑوں
تاجداروں کو جو اس کے مقابلہ میں آئے تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن
میں پورس سے بھی ناواقف نہیں جس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر
ہماری قوم نے بڑے بڑے حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں وہ
گذشتہ کامیابیوں کے نشہ میں سرشار اور فتح اور موت سے بے پروا ہو کر
اس کی پیروی کیلئے کمربستہ ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے ۔

....

ہسپفستیان۔ آپ ان فضول اندیشوں سے ملول نہ ہوں۔ پورس کو
طیش آئے ہندوستان کی سب ریاستیں اس کی حمایت پر کھڑی
ہو جائیں۔ مگر ایک آپ کا بھائی اُن سے الگ رہے تو۔ لیجئے وہ
آ رہے ہیں۔

کلیو فیلا۔ آپ کے نیک ارادے کامیاب ہوں آپ کی دانائی ان خونخوار
بادلوں کو اُڑا دے۔ بہرکیف اگر طوفان روکے نہ رکے تو آپ کا یہ
فرض ہے کہ اسے اوروں پر گرائیں ہم دونوں پر آنچ نہ آنے پائے۔

سین دوسرا

پورس ۔ ٹیکسلا ۔ ہسپفستیان

ہسپفستیان۔ بیشتر اس کے کہ آپ کی تمام ریاستیں جنگ کے شعلوں
کی لپیٹ میں آ کر ہمارے ممالک محروسہ میں داخل ہوں میرے شہنشاہ
ہنگامہ کارزار گرم کرنے سے احتراز کر کے آپ کو آخری دفعہ دعوتِ
صلح دیتے ہیں۔ آپ کی فوجیں موہوم اُمیدوں کے بل پر فاتح فرات
کی پیش قدمی کو روکنے کا دم بھرتی تھیں۔ لیکن گو وہ ریت کے
ذروں کی طرح پھیل گئیں۔ جہلم نے ہمارے علم کو اپنے کنارے لہراتے
دیکھ ہی لیا۔ یہ علم مدت کے بعد آپ کے مورچوں پر گاڑے جاتے اور
کھیت آپ لوگوں کے خون سے سیراب ہو چکے ہوتے مگر ہمارے
باوقار فرمان روا نے بہادروں کے جوش کو تھام لیا
آپ کو معلوم رہے وہ اس ملک میں جہانگیر اُمنگ لیکر نہیں آیا
اور اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ کو ہراساں کرے۔ وہ نہیں چاہتا

کہ آپ کے کھنڈروں پر کھڑا ہو کر اپنی فتحمندی کا اعلان کرے اُسے ہرگز پسند نہیں کہ آپ کے راجوں کی سمادھوں پر فتح کے مینار تعمیر کرے۔ مگر یہ آپ کا کام ہے کہ کسی غلط اُمید کے بھروسہ پر آپ اُسے جوش دلا کر اپنی شکست کا سامان نہ پیدا کریں۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ تساہل سے کام نہ لیں اور اطاعت پذیری میں جلدی کو رہنما بنائیں۔ پہلے ہی آپ کی غفلت گستاخی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس خطا کو طول نہ دو اور اس کی بے پناہ ضرب کے امتحان میں نہ پڑو۔ آپ کے دل اس کی شجاعت کو مانتے ہیں۔ آپ کو زیبا ہے کہ اس کے قوی بازوؤں کی حمایت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو اور اپنے ملک کے محافظ کی راہ میں آنکھیں بچھاؤ۔ یہ پیغام جہاں پناہ نے دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ خواہ تلوار پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ یا ہتھیار اس کے قدموں پر ڈال دو اس کا منشا آپ پر ظاہر ہو چکا ہے اب جو جی میں آئے کیجئے۔ یا تو اپنے تاج کو ہاتھ سے جانے دیجئے یا انہیں بطور اس کے عطیہ کے قبول فرمائیے۔

ٹکسلا۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ کوئی بیہودہ تکبر ہمیں مانع ہے کہ ہم ایسے بے نظیر انسان کی عزت کریں۔ یا ہماری رعایا جوش غضب سے ایسی اندھی ہو رہی ہے کہ باوجود آپ کی عنایتوں کے آپ کے درپئے آزار ہو۔ حقیقی بزرگی کا اعتراف ہمارا شعار رہے۔ آپ اُن دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں جن کے استھان ہم نے قائم کئے ہیں وہ ناموَر جنہیں آپ فانی انسان خیال کرتے رہے۔ ہمارے ہاں اُن کے مندر بنے ہیں۔ لیکن یہ محض بے فائدہ کوشش ہے کہ ہماری قوموں کی آزادانہ پوجا کو غلامی سے تبدیل کیا جائے۔ یقین مانئے کہ اگرچہ وہ برمحل تحسین سے گریز کرنا وضع کے خلاف خیال کرتے ہیں لیکن اگر کوئی زبردستی سے پیش آئیگا تو وہ مراسم اخلاق کے بھی روادار نہیں ہوں گے۔ آپ نے سیکڑوں ریاستیں فتح کیں۔ ذرا بتائیے تو اُن میں سے کسی کے حکمران نے آپ کی اطاعت قبول کی ان تجربات کے بعد کیا مصلحت وقت یہ نہیں چاہتی کہ سکندر کچھ دوست پیدا کرے۔ یہ قیدی جو اس کا نام سن کر کانپنے لگتے ہیں ایک ایسی نو دولت طاقت کو سہارا نہیں دے سکتے۔ انہیں آزادی حاصل کرنے کے لئے فقط مناسب وقت کا انتظار ہے اس لئے آنکھیں کھول کر دیکھئے آپ کا مسلک خفیہ دشمنوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ لوگ گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے بےتاج بادشاہوں کا ماتم کرتے ہیں۔ اور تمہاری لمبی لمبی زنجیروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ خبردار ہو جائے وہی تباہی آپ کے لئے مُنہ کھولے ہے جس میں آپ ہمیں پھنسانا چاہتے ہیں۔ ہمارے وعدے کو بھی آزما دیکھئے شاید یہ اوروں کے حلف وفاداری سے زیادہ پائدار نکلے۔ ان لوگوں کو آزاد رہنے دیجئے۔ جو مانتے ہیں کہ آزاد رہ کر آپ کے کارناموں کے گن کس طرح گائے جاتے ہیں۔ میں آپ کے مالک کی رفاقت ان شرائط پر قبول کر سکتا ہوں اور میں اس بادشاہ کا شاہانہ انداز سے استقبال کرنے کیلئے تیار ہوں جو میرا دل فتح کرنا چاہے۔ مگر میرے تخت کی طرف ترچھی آنکھ سے نہ دیکھئے۔

پورس۔ میرے خیال میں جب جہلم کے گرد و نواح کے علاقہ سے فوج کے دل بادل اُمڈے آ رہے تھے تو اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم اُس کے کناروں کی حفاظت کے لئے اپنے جسموں کی دیوار بنا کر کھڑے ہو سکتے ہیں اس عظیم الشان معرکہ کیلئے میرے ہمراہ صرف وہی راجے آئے تھے جو ظالموں کے خون کے پیاسے تھے۔ لیکن اب ایک ایسا راجہ پیدا ہوا ہے جو سکندر کی دست بوسی کیلئے بیتاب ہے۔ اور اہل مقدونیہ کے ساتھ مل کر خود اپنی رسوائی کے درپے ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ اُن کی نمائندگی کروں جن کا اعتماد اسکی غداری سے نالاں ہے اور ہندوستان کی طرف سے آپ کے پیغام کا جواب دوں سب سے پہلے یہ بتائیے کہ جس بادشاہ نے آپ کو یہاں بھیجا ہے وہ یہاں کس لئے آیا۔ جو امداد وہ ہمیں دینا چاہتا ہے فرمائیے کہ ہم نے کب اس کی التجا کی تھی وہ کس منہ سے ان لوگوں کو پناہ دینا چاہتا ہے جن کا سوا اس کے کوئی اور دشمن نہیں پیشتر اس کے کہ اس کا غضب جوش میں آکر دنیا کو برباد کرنے کا تہیہ کرے ہندوستان چین کی نیند سو رہا تھا۔ اور جو کبھی کوئی ہمسایہ اس کے سکون میں خلل انداز ہوتا تو مادر وطن کے سپوت سینہ سپر ہونے میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ آخر اس خونخوار حملہ کے معنے! کوئی بتائے ہم نے کون سے وحشیانہ فعل کا ارتکاب کیا جس سے وہ بگڑ گیا۔ کیا ہماری فوجوں نے کبھی اس کے ملک پر حملہ کیا اور ان ملکوں کو تاراج کیا جن کا ہم نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ متعدد ملک، صحرا اور دریا ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ . . . .

. . . . اور آمد و رفت کی کوئی راہ نہیں۔ کیا اُسے یہ گوارا نہیں کہ دنیا کا ایک گوشہ تو باقی رہے۔ جو اس کے نام اور طوق اور سلاسل سے آشنا نہ ہو۔ کیسی عجیب شجاعت ہے جسے صرف

ایذارسانی سے کام ہے۔ اور جہاں تک اس کی پہنچ ہے آگ لگاتے
چلی جاتی ہے۔ جو سوائے تکبر آمیز حقارت کے کسی کے سامنے جھکنا
نہیں جانتی وہ دنیا کو ایک وسیع قیدخانہ بنانا چاہتا ہے جس میں ہمارے
جیسے سب انسان اس کے قیدیوں کی طرح آباد رہیں۔ ملک پر ملک
فتح ہو اور بادشاہ پر بادشاہ اس کا غلام ہوتا چلا جائے۔ اس کے
گنہگار ہاتھ سب کو ایک زنجیر آہنی میں باندھ رہے ہیں۔ اس کی
طمع ہمیں پہلے ہی نگل چکی ہے۔ سینکڑوں تاجداروں سے اب ہم
چند ایک رہ گئے ہیں۔ کیا کہا میں نے صرف ہم چند ایک؟ نہیں
مجھے یہ کہنا چاہیئے صرف میں جس میں سلف کی کچھ شان باقی ہے۔
آہ! اس خیال سے میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ اس وسیع دنیا
کو متزلزل دیکھ کر میں اس لئے خوش ہوتا ہوں کہ اگر یہ ممکن ہے تو
صرف میرا بازو اس کی آزادی بحال کر سکتا ہے۔ جب امن و امان
کا سکہ جاری ہو گا تو سب کہیں گے کہ سکندر اعظم ساری دنیا کو فتح
کر لیتا۔ اگر دور دراز سرحد پر وہ مجھ سے دوچار نہ ہوتا جس نے
اس کی زنجیروں کو گھاس کے تنکے کی طرح توڑ ڈالا۔ اور دنیا کو
آزاد کر دیا۔

ہیپ فستیان۔ کم از کم آپ کے لفظوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے
کہ آپ بڑے شیر دل واقع ہوئے ہیں۔ لیکن اس طوفان کے
روکنے کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس ڈگمگاتے ہوئے
ملک اور خود آپ کی ذات کو صرف آپ کا سہارا ہے۔ بہر حال
میں نہیں کہتا کہ آپ پیش دستی نہ کریں۔ آپ شوق سے میرے بادشاہ
پر حملہ آور ہوں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ کاش آپ اس کے حالات
سے زیادہ واقف ہوتے اور شہرت نے اس کے نصف ہی کارنامے
بتائے ہوتے تو اس صورت میں آپ دیکھتے ....

پورس۔ میں کیا دیکھتا؟ میں جان لیتا؟ یہی کہ مجھے فوراً سکندر کے
پاؤں میں سر رکھ دینا چاہیئے۔ یہی کہ ایران نے ایکدم اسکی اطاعت
قبول کر لی۔ یہی کہ تمہارے اسلحہ خون آشامی سے تنگ آ گئے ہیں۔ لیکن میں
پوچھتا ہوں کہ عیش پسند آرام طلب بادشاہ کو مطیع کر لینا کون فخر کی بات
ہے۔ ایک ایسی بے حس اور بے جان قوم پر غالب آنا کون بڑا کارنامہ ہے
جنہیں اپنی سنہری زرہ بکتروں کا اُٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ جنہوں نے
ذرا مقابلہ نہ کیا۔ آپ کو دیکھتے ہی زمین پر جھک گئے اور آپ کے بادشاہ
کے سد راہ ہونے کے لئے صرف لاشیں رہ گئیں۔ اس کارنامہ کو دیکھ کر
دیگر اقوام کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور عاجزانہ انداز سے سجدہ ریز ہو کر
شرائط صلح کی طالب ہوئیں۔ وہ خوف سے مرعوب ہو کر یہ خیال
کرتے تھے کہ دیوتا کا مقابلہ کرنا دھرم کے خلاف ہے۔ لیکن ہم
جو فاتحوں کو دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خوب جانتے ہیں کہ
دیوتا ظالم نہیں ہوا کرتے۔ پس اس کے غلام اُسے لاکھ آسمان
پر چڑھائیں ہم تو اس پیر مشتری کو محض انسان سمجھتے ہیں۔ ہم اس
کی راہ میں پھول بچھانے کے لئے تیار نہیں اور وہ ہمیں ہر جگہ
مسلح پائیگا۔ ہر قدم پر اس کی فتوحات کا راستہ روکنے والے
کھڑے ہوں گے۔ یہاں ایک چٹان سینکڑوں جانیں لیکر رہیگی
ایران کی ٹڈی دل کو پریشان کرنے میں اتنی زحمت؟ اتنا وقت
اتنے حملے صرف نہ کرنے پڑے ہوں گے جو اس چٹان پر قبضہ کرنے
کے لئے درکار ہیں۔ جس آرام طلبی نے ایران کو برباد کیا۔ اُسے
ہم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ ہمارے ملک کے روپیہ
سے ہماری مردانگی کو رشوت نہیں دے سکتے۔ صرف ایک چیز پر
ہمارا دل للچاتا ہے اور وہ ناموری ہے جس کے لئے میں اور
اسکندر نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ صرف یہی بات ....

ہیپ فستیان۔ اسی کی سکندر کو تلاش ہے۔ اس سے کمتر درجہ کی
چیزوں کی طرف وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ صرف اسی
کے لئے وہ اپنے ملک سے چل کر دارا کے تخت تک آئے۔ اور
اس عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس کے مسلح
حملے نے فتح و نصرت کے تاج و تخت اُس کی تحویل میں دے
رکھے ہیں۔ آپ کا غرور اس معافی کو رد کرتا ہے۔ مگر آپ کی آنکھوں
کو اس کی کامیابی کے نظارے دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ آج
کا دن دیکھ لیگا کہ وہ ناموری کے لئے کس طرح جنگ کرتے ہیں
اور تیغ بکف سرحد فتح تک یلغار کرتے چلے جاتے ہیں۔

پورس۔ تشریف لے جائیے میں اُن کے مقابلے کو حاضر ہوں

سین (۳)

پورس۔ ٹکسلا۔

ٹکسلا۔ اس قدر جوش۔ ایسی بے صبری۔ کیا آپ کا ارادہ ـــ

پورس۔ میں آپ کی اطاعت پذیری میں دخل دینا نہیں چاہتا۔
ہیپ فستیان صرف مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر گیا ہے۔ اور اپنے
بادشاہ کو آپ کی فرمانبرداری سے ضرور مطلع کرے گا۔ مہارانی
اکشینا کی فوجیں میرے ساتھ ہیں اور میرے جھنڈے کے سایہ میں

آغاز جنگ کا انتظار کر رہی ہیں۔ مہارانی کے تخت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ گویا وہ میرا ہی تخت ہے اور آپ میرے اس دعوے کی صداقت میدانِ جنگ میں دیکھیں گے۔ مگر مہاراج اپنے دل کو بچائیے مبادا نئے دوستوں سے گرم جوشِ وفاداری کے اظہار میں وہ آپ کے لئے کوئی نئی آتشِ جنگ مشتعل کر دے۔

سین (۴)

اکشیانا۔ پورس۔ ٹکسلا

اکشیانا۔ مہاراج یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہمارے دشمن اترا رہے ہیں کہ ٹکسلا نے اطاعت کر لی ہے۔ کم از کم اس کا دل تابع ہو گیا ہے اور وہ اس بادشاہ کے خلاف فوج کشی نہ کرے گا۔ جس کی وہ عزت کرتا ہے۔

ٹکسلا۔ دشمنوں کی باتوں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا وقت آپ کے علم میں بہتر اضافہ کریگا۔

اکشیانا۔ تو مہاراج اس افواہ کی تردید کیجئے اور اُن کی گوشمالی فرمائیے جنھوں نے یہ ہوائی اڑائی ہے۔ پورس کی طرح بڑھئے اور اُن کے منہ بند کر دیجئے۔ انہیں بتائیے آپ کا قہر کس غضب کا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ آپ سے بڑھ کر ان کا کوئی دشمن نہیں۔

ٹکسلا۔ مہارانی! میں صف آرا ہوتا ہوں۔ ان افواہوں سے اپنے دل کو پریشان نہ کریں۔ پورس اپنا حق ادا کریگا تو میں بھی اپنے فرض کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کروں گا۔

سین (۵)

اکشیانا۔ پورس

اکشیانا۔ اس کی چین جبین کچھ نہیں کہتی۔ اُس کا اُترا ہوا چہرہ اس درجہ کا معلوم نہیں ہوتا جس کے دل میں فتح کی اُمنگ ہو اور جس پر میں اعتماد کر سکوں۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے اور اس نے اپنی بہن پر ننگ و ناموس اور وطن کو قربان کر دیا ہے۔ ضد کے بارے میں وہ ہمارے زوال کا خواہاں ہے اور اس آرزو کے اظہار کیلئے اُسے صرف جنگ کے وقت کا انتظار ہے۔

پورس۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ٹکسلا کے جانے سے ایک کمزور تنکا میرے ہاتھ سے نکل گیا میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اور اس لئے میں نے اس کی مدد پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ ان آنکھوں نے اس کا تذبذب دیکھا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی اندیشہ رہا کہ کہیں یہ کمزور بازو ہمیں وقت پر دغا نہ دیں۔ ایک غدار اپنی بہن کو خوش کرنے کے لئے الگ ہو گیا خوب ہوا۔ اس نے ہمیں اس قدر کمزور نہیں کیا جس قدر اس کی بزدلانہ مدافعت سے ممکن تھا

اکشیانا۔ جوش میں نہ آئیے۔ آپ کی بہادری ہزاروں دشمنوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ اکیلے دم اس کی ضربوں کو روکنا اور بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کرنا کھیل نہیں

پورس۔ ہیں! کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی غداری کروں اور ڈر کے مارے آپ کو دشمن کے حوالے کر دوں۔ اپنے کیمپ میں چھپ کے بیٹھا رہوں اور اعلانِ جنگ کے بعد لڑنے سے جی چراؤں مہارانی میں اس بات کو باور نہیں کرتا بلکہ بخوبی جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں بھی ناموس و ننگ کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔ بھلا میں یہ فراموش کر سکتا ہوں کہ یہ صرف آپ کی سحر بازی کے طفیل ہے کہ ہمارے تمام راجے میدانِ جنگ کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں جن کی عالی حوصلگی اطاعت سے نفرت کرتی ہے۔ اور صرف اس کو محبت کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہے جو سکندر کو زیر کرے۔ یہی میرا فرض ہے جس کے لئے میں دوڑا جا رہا ہوں اس لئے نہیں کہ میں اس کا قیدی نہ ہوں بلکہ اس لئے کہ آپ کی حراست سے باہر نہ ہو جاؤں۔ مہارانی! میں جانتا ہوں تاکہ اس دل پذیر قید کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔ یا تو میدان مار لیا یا میدان میں کام آیا۔ تیسری کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ اور چونکہ میری آہیں اس دلبر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ جسے ناموری کے سوا کچھ نہیں بھاتا۔ اس لئے میں فتح حاصل کرنے کے لئے نکلتا ہوں جو ناموری کو میرے نام کا طغرا بنائے گی ممکن ہے کہ جوانمردی کی قدر دانی آپ کے دل کو فاتح کی طرف مائل کرے۔

اکشیانا۔ مہاراج! آپ میدان کو سدھارتے ہیں ٹکسلا کے کیمپ کا جائزہ لیتی ہوں ممکن ہے کہ کوئی ایسا شخص نکل آئے جو اپنے راجہ سے زیادہ بہادر زیادہ وفادار ہو۔ میں اپنے سورماؤں کو آمادۂ پیکار کرنے کی آخری کوشش کروں گی۔ پھر آپ کے کیمپ میں جا کر آپ کی مشکلات میں شریک ہو جاؤں گی۔ میرے دل میں جو راز بند ہیں انہیں سر بستہ ہی رہنے دیں۔ اس وقت یہی دعا ہے کہ زندہ رہو اور فتح کے پھریرے اُڑاؤ۔

پورس۔ حالِ دل بتانے میں تاخیر عبث ہے۔ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میری منتیں بامراد ہوئیں اور آپ کا دل پسیجا۔ کیا آپ کا دل پسند کرتا ہے کہ ایک بدقسمت راجہ کو اور بدقسمت بنایا جائے۔ جسے شاید گردشِ تقدیر

اس بت کی یاد سے محروم کر دے جو میری روح کی سجدہ گاہ ہے اور میں بے مراد دنیا سے اُٹھ جاؤں۔

اکشیانا۔ اب میں کیا کہوں۔

پورس۔ میرے دل کی مہارانی! اگر آپ کو مجھ پر رحم آتا ہے تو اپنے دل کو سمجھائیے۔ کہ میری محبت کا تھوڑا سا اعتراف کرے۔ مجھے یا بار فتح کا یقین دلاتا ہے تو یا اعلان ہی کیوں نہیں کرتا کہ وہ ان جگر سوز آہوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی طاقت میں ....

اکشیانا۔ مہاراج حملے کو روکنے کے لئے بڑھئے گو آپ کو میرے دل سے بھی زیادہ مضبوط چیز سے کیوں نہ مقابلہ کرنا ہو مگر آپ بہر صورت کامگار رہیں +

(محمد عمر نور الٰہی)

غزل

گہرے تعلقات ہیں اُس رنگ و بُو کے ساتھ
جنّت رگوں میں دوڑ رہی ہے لہو کے ساتھ

گذریگی جس طرح بھی گذار ینگے زندگی
وعدہ نباہ کا ہے ہر اِک آرزو کے ساتھ

یہ جانتی ہے سوختہ ساماںوں کا راز
صحرا نہ جل اُٹھے مری آوازِ ہُو کے ساتھ

ہے اضطراب اور بلا کا ہے اضطراب
بجلی سی دوڑتی ہے رگوں میں لہو کے ساتھ

بے لطفیٔ حیات کی رُوداد کچھ نہ پوچھ
دن کاٹنے پڑے دلِ بے آرزو کے ساتھ

منّت پذیرِ دیدۂ خونبار ہے بہار
جنّتیں بکھیر رہا ہوں لہو کے ساتھ

الفاظ کو لباسِ حقیقت میں پیش کر
اشکوں کا سلسلہ بھی رہے گفتگو کے ساتھ

میری طرح فضائیں دو عالم کی مست تھیں
وہ انجمن ہی اُٹھ گئی اِک خوش گلو کے ساتھ

ثاقب امیر ہو کہ گدائے فتادہ پا
انسان ہے وہی جو رہے آبرو کے ساتھ

ثاقب جالندھری

انتظارِ ناکام

وہ خالی کمروں میں سے ہو کر ملاقات کے کمرہ کی طرف گئے

"آہ! ملکہ این کی میز یہ رکھی ہے جس کے متعلق میں تم سے باتیں کر رہا تھا" بوڑھے نے کہا "کتنی خوبصورت ہے کیوں نہیں!"

"بہت خوب صورت! بہت عمدہ" ڈیورا نے اسے دیکھ بھال کر تعریف کے لہجہ میں کہا۔ لیکن درحقیقت اس کا یہ خیال نہ تھا کہ میز اتنی خوبصورت ہے اس میں شک نہیں کہ وہ دلچسپ تھی۔ مگر معمولی درجہ کی۔ وہ حیران تھا کہ بوڑھا اس میز کا گرویدہ کیوں ہے۔ بوڑھا ابھی تک اس کی تعریف کرتا چلا جا رہا تھا۔ اور اپنے اس جذبہ کو نہیں دبا سکتا تھا۔

"عجیب میز ہے" فیلڈ نے کہا۔ "بہت عجیب چیز ہے۔ مجھے اتفاقاً پیر کے دن سور ہیمر سٹریٹ میں یہ مل گئی۔ اب کی دفعہ میں نے اس کی قیمت اس سے کم دی ہے جتنی کہ میں نے ۱۸۸۰ء میں ادا کی تھی"

"تو کیا یہ پہلے بھی آپ کے قبضہ میں رہ چکی ہے؟" ڈیورا کے لہجہ میں اشتیاق پیدا ہو گیا۔

"جی ہاں اور اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ بھی ہے۔"

"کیا میں اسے سن سکتا ہوں؟ ..... یا یہ راز ہے"

"اس سے تمہیں اذیت ہوگی۔"

"مسٹر فیلڈ رافیل" ڈیورا کی سیاہ آنکھیں جھوٹی تعریف سے چمک رہی تھیں۔

"تھا تو یہ راز ہی لیکن اس کو اتنی مدت ہو چکی ہے کہ اب اسے پردہ راز میں رکھنے کی ضرورت نہیں میں نے اسی وقت اسے لکھ لیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ کبھی مجھے بھی تصنیف و تالیف کا شوق تھا؟"

"تصنیف و تالیف کا شوق مسٹر فیلڈ۔ کیا ابھی جاننے کی ضرورت ہے؟ میری لائبریری میں تمہاری تینوں کی تینوں کتابیں موجود ہیں"

یہ سن کر بوڑھے کا چہرہ اطمینان سے چمک اٹھا۔ اور پہلے سے زیادہ بچوں کی سادگی اور بھولا پن اس کے منہ پر برسنے لگا۔

"تم چاہتے ہو کہ تمہیں وہ مضمون پڑھ کر سناؤں"

"میں اصرار کرتا ہوں مسٹر فیلڈ!"

آہستگی اور بے ڈھنگے پن سے بوڑھے نے چابیاں نکالیں۔ کتابوں کا خانہ کھولا۔ عینک درست کی۔ اور الماری میں سے ایک چرمی کتاب نکالی۔

"یہ اس رسالے کی پہلی جلد ہے جس میں میں مضامین لکھتا تھا" یہ کہا اور لیمپ کے نیچے بیٹھ کر ورق الٹنے لگا۔ اس وقت اس کا سانس کچھ پھولا ہوا سا تھا۔

"تو یہ ہے۔ میں پیر کی شب کو یہی مضمون پڑھ رہا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مضمون بہت روکھا پھیکا ہے۔ غالباً مجھے واضح کرنے کی ضرورت ہوگی .... نہیں! مضمون اپنا مطلب آپ بیان کرے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے۔ کہ جس وقت میں نے یہ مضمون لکھا تھا اس وقت میرے ادبی ولولے سرد ہو چکے تھے۔"

اس نے اپنی گہری اور خوش آیند آواز میں جو کچھ پڑھا وہ حسب ذیل ہے

"جمعہ کے دن صبح کے وقت میں اپنے قدیم خوبصورت مکان میں اکیلا تھا اور ابھی ابھی میں نے اپنا اسباب ہیری کے پاس جانے کے لئے باندھا تھا۔ مکان میں صفائی کا بھی کوئی اہتمام نہ تھا۔ کیونکہ معماروں کا سامان اور دوسرا کوڑا کرکٹ وہیں ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ ان لوگوں کو ابھی ایک ن ور کام کرنا تھا۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شاید غلطی سے بج گئی ہوگی۔ لیکن جب وہ بار بار بجی تو مجھے ایسا ..... محسوس ہونے لگا کہ گھر بہت بڑا اور خالی ہے میں بالکل اکیلا ہوں۔ خادمہ اس وقت اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ یہاں ٹھیری رہے۔ آخر میں خود ہی نیچے گیا۔ سامنے کے دروازے میں تالا لگا تھا اور چابی میرے پاس نہ تھی۔ کیونکہ کاریگر لوگ حسب انتظام اپنے ساتھ لے گئے تھے اور میرے لئے یہ تجویز کر لی گئی تھی کہ میں ضرورت کے وقت نوکروں کے دروازے سے آیا جایا کروں۔ اس لئے مجھے پہلو کے دروازہ سے نکل کے گرد گھوم کر گلی میں جانا پڑا۔ جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جلوخانہ میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ میں احتراماً اپنی ٹوپی اتارنا چاہتا تھا لیکن اس وقت مجھے یاد آیا کہ میرے سر پر ٹوپی ہی نہیں میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں مسٹر رافیل فیلڈ سے ملنا چاہتی ہوں اور پھر کہا "کیا آپ ہی فیلڈ نہیں ہیں؟" میں نے اپنے اسے پیش آیند حالات بتلائے۔ اور پھر اسے چکر دیکر برابر کے دروازہ کی طرف سے

سیڑھیوں پر جو دوسرے فرش کو جاتی تھیں لے آیا۔ اُس وقت وہاں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت میں نہ تھی حتیٰ کہ فرش پر قالین وغیرہ بھی نہ تھا (مضمون پڑھتے پڑھتے فیلڈ نے کہا "میں اُسے اُس کمرے میں لایا")

کمرے میں دو کمانی کی کرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ میرا ایزل (تصویر بنانے کا تختہ) اور بیٹھنے کی چوکی اور فرش صاف کرنے کا برش۔ اور ملکہ اینی کی میز جو پندرہ دن پہلے ہی مجھے ملی تھی۔ بس یہی کائنات تھی جو اس کمرہ میں موجود تھی۔ اس کے ماسوا کچھ تختے اور ٹوکلیاں بھی پڑی تھیں۔ جنہیں مزدور ابھی اُٹھا نہ سکے تھے۔ وہ بے حد پریشان تھی اور میں بھی کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔

اُس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ آپ میری ایک تصویر کھینچ دیں۔ کیونکہ میں کل انگلستان سے جا رہی ہوں۔ زیادہ نہیں صرف ایک خاکہ ہی بنا دیں۔ میں آپ کے پاس اس لئے تصویر کھنچوانے آئی ہوں کہ آپ نے میرے ایک دوست کی تصویر بنائی تھی۔ میں اپنے اس دوست کی ماں کو اپنی تصویر دینا چاہتی ہوں" لیکن وہ دوست کون تھا۔ اُس کا نام بھی مجھے اُس نے نہیں بتایا۔ بلکہ بتانے سے معذوری ظاہر کی۔

"میں نے اُسے کہا کہ میں ابھی آدھ گھنٹہ تک اگر گاڑی مل گئی لندن سے جا رہا ہوں۔ ہاں کسی دوسرے دن مجھے آپ کی تصویر بنانے کی مسرت حاصل ہو گی۔ وہ خاموش رہی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بول ہی نہیں سکتی آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔ اس نظارے سے میں گھبرا سا گیا۔ میرے جسم میں ایک غیر معمولی سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ اتنے بڑے گھر میں میں ہی اکیلا اس کے ساتھ تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں بہت متاسف اور دل گرفتہ سا ہو گیا ہوں میں ایک کامیاب آدمی ہوں لیکن مجھے حیرت سی ہوئی کہ میں اتنے بڑے مکان کا سامان اور ملازموں کی تنخواہ اور کرایہ اور باقی تمام چیزیں کیسے مہیا کر سکتا ہوں" میں محسوس کرتا تھا کہ میں اس دنیا میں اکیلا آدمی ہوں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ میں ایسا کیوں محسوس کرتا تھا۔

یکایک بغیر کسی ارادے کے میں نے اسے کہہ دیا کہ میں باہر جا کر تار دیتا ہوں کہ میں کل تک لندن سے نہیں آ سکتا۔ اور میں فوراً تمہاری تصویر کا ایک خاکہ بنا دوں گا۔ اُس نے اس کی مخالفت نہ کی۔ اُس نے خاموشی سے روتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میرے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ اور میں نے اس کی حالت محض اس لئے بھرلی تھی کہ وہ بہت ہی حسین اور خوبصورت بالوں والی نوجوان لڑکی تھی۔ اُس نے نیم ماتمی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ اس کے جسم پر زیب بھی دیتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ اس کے متعلق جاننے کی خواہش بھی میرے دل میں نہ تھی۔ بہر حال میں گرجے دوڑتا ہوا گیا۔

اور "ایجنٹ سٹریٹ پوسٹ آفس" میں پہنچا جہاں مجھے ہیری کو تار دیتے ہوئے کافی وقت صرف ہو گیا۔

جب میں پوسٹ آفس سے لوٹ کر آیا تو وہ فرش پر جھاڑو دے رہی تھی۔ بلکہ وہ جھاڑو دے چکی تھی۔ اس کی ٹوپی ایک کرسی کی پشت کی طرف لٹک رہی تھی۔ میں لرز گیا اور ایک لفظ تک منہ سے نہ نکال سکا۔ اور میرے تمام جسم میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ مسکرائی میں نے اُسے کہا کہ تم اپنی ٹوپی اوڑھ لو۔ میں ٹوپی کے ساتھ ہی تمہاری تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے چبوترے پر کرسی رکھ دی اور اُسے کہا کہ وہ ذرا سنور کر بیٹھ جائے۔ جتنا عرصہ میں اپنا تصویر کا تختہ جماتا اور رنگ ملاتا رہا۔ وہ خاموشی کے ساتھ دریچے سے باہر کی طرف دیکھتی تھی۔ دفعتاً اُس نے کہا "اور تصویر کی قیمت کس قدر ہو گی؟" میں نے کہا یہ کوئی بات نہیں اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے یہ باتیں عموماً یونہی کہی جاتی ہیں۔ لیکن اُس نے اصرار کیا کہ میں شروع کرنے سے پہلے قیمت کا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے میں نے اسے کہا۔ کہ تم ہی قیمت مقرر کر لو۔ اُس نے کہا کہ میں پچاس پونڈ ادا کر سکوں گی۔ میں اس پر راضی ہو گیا اور اگر وہ پانچ پونڈ کہتی تو میں اُن پر بھی راضی ہو جاتا۔ اُس نے اپنے بٹوے میں سے نوٹ نکال لئے اور بولی چونکہ تم مجھ سے واقف نہیں ہو اس لئے میں پیشگی اجرت دینا چاہتی ہوں میں نے انکار کیا۔ لیکن اس کھینچا تانی کا خاتمہ تب ہوا جب اُس نے چوکی سے اُتر کر نوٹ چمنی کی کارنس پر رکھ دیے۔

پون گھنٹہ تک تصویر پر کام کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ تصویر خاکے سے کچھ زیادہ ہی ہو۔ اور میں اس پر سارا دن کام کرتا رہوں۔ لیکن بارہ اور ایک بجے کے درمیان مجھے بڑے زور کی بھوک لگی۔ ایسی سخت بھوک پہلے مجھے کبھی نہیں لگی تھی۔ اس لئے میں نے تجویز کی کہ ہم ویری کے ہوٹل میں چل کر کھانا کھا لیں۔ لیکن اُس نے کہا کہ مجھے تو بھوک نہیں۔ اس لئے میں تو کچھ نہیں کھا سکتی۔ اس پر میں نے کہا کہ بھوک تو مجھے بھی کچھ ایسی نہیں اس لئے میں بھی کھانے کے لئے کہیں باہر نہیں جاتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں باورچی خانہ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ آیا وہاں کھانے کی بچی کھچی کوئی چیز پڑی ہے۔ چنانچہ میں سیڑھیوں سے ہو کر باورچی خانہ میں گیا۔ چولھے کی آگ بھی اچھی طرح بجھی نہ تھی۔ خادمہ کا ایپرن ایک کھونٹی پر لٹکا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر ڈھونڈا تو مجھے آدھی روٹی اور تین انڈے مل گئے۔ جب میں نے اپنے پس پشت کچھ کھڑکا سنا تو میں بھونچکا سا رہ گیا مڑ کے دیکھا تو وہ لڑکی کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "اگر کوئی چیز موجود ہے تو لائیے میں آپ کے لئے پکا دیتی ہوں"۔ میں نے وہ چیزیں جو مجھے ملی تھیں

اُسے دیدیں۔ اُس نے اَیپرن باندھ لیا۔ آگ روشن کی اور برتنوں کی الماری کو دیکھا تو کچھ چائے بھی مل گئی۔ اُس نے دیگچی دھوئی اُس کی حرکات میں سادگی کا البیلاپن پایا جاتا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ میری زندگی میں غیر معمولی لمحات تھے۔ وہ نوجوان تھی اور بلا کی حسین و جمیل۔ بال نہایت دلفریب تھے۔ وہ سرتاپا ایک راز تھی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر میں ہیری کو تار نہ دیتا تو یہ میری کس قدر حماقت ہوتی۔ اور اس خیال نے مجھے کچھ بیمار سا بنا دیا کہ اگر آج میں یہاں نہ ٹھہر جاتا تو کیسی نعمت سے محروم رہتا۔

جب کھانا تیار ہو چکا تو اُس نے ہر چیز کو قرینے سے ایک بڑے طشت میں سجایا۔ میں طشت کو اُٹھا کر نیچے لے آیا۔ اور ہم دونوں نے مل کر ملکہ ہی کی میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

رفیلڈ نے پڑھتے پڑھتے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ وہی میز ہے"

ہم میں ایک قسم کی موانست سی پیدا ہو گئی۔ لیکن ہماری تمام باتیں تصویر ہی کے متعلق تھیں۔ اسے بھی تصویر کشی کے فن میں کچھ شدبد حاصل تھی وہ اس فن سے اچھی طرح باخبر نہ تھی۔ لیکن اسے اتنا سطحی علم ضرور تھا جتنا کہ عورتیں ہر شے کے متعلق حاصل کر لیتی ہیں۔ اس سے ظاہر تھا کہ مصوروں سے اس کی جان پہچان ضرور ہو گی۔ میں کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹہ تک برش چلاتا رہا۔ یکایک مطلع ابر آلود ہو گیا۔ روشنی کم ہو گئی۔ مدہم روشنی میں کام جاری رکھنا ناممکن سا تھا۔ ہم نے بادلوں کی گرج سنی۔ اور اسی کے ساتھ بارش کا سخت طوفان آ گیا۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ اس میں بجلی کی چمک پوری تابانی سے نمایاں ہو جاتی تھی اس کا رنگ زرد تھا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت رک گئی تھی۔ صرف کبھی کبھی کسی گھوڑے کے ٹاپ چلنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ہم نے دریچوں سے باہر دیکھا۔ پانی کے دھارے سڑکوں پر چل رہے تھے۔ چند راہگیر مکانوں کی ڈیوڑھیوں میں پناہ گزین تھے چارلس جیمس فاکس کا سنگین مجسمہ بھیگنے کی وجہ سے چمکنے لگا تھا۔ اس وقت نوجوان پراسرار اور خوبصورت بالوں والی حسینہ اور میں دونوں ایک بڑے اور خالی اور غیر آراستہ مکان کی چھت کے نیچے اطمینان سے بیٹھے تھے۔

ہم خیال کرتے تھے کہ بارش تھوڑی دیر میں تھم جائیگی۔ لیکن مینہ لگاتار برستا گیا اس لئے اب کوئی اُمید نہ رہی تھی کہ تصویر کشی جاری رہ سکے گی۔ چھ کے گھڑیال نے گھنٹہ بجایا۔ میں تصویر کے تختے کو دریچے کے پاس لے گیا۔ کہ ہم دونوں تصویر کو جانچیں۔ چنانچہ وہ تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور میں بھی اپنی جگہ مطمئن تھا۔ لیکن تصویر کی تکمیل میں ابھی منزلیں باقی تھیں۔ اُس نے کہا "میں کل پھر آ سکوں گی" میں نے اُسے یاد دلایا کہ "تم تو کل انگلستان سے رخصت ہو رہی ہو" اُس نے کہا "ہاں لیکن دوپہر کے بعد اس خیال سے کہ میں علے الصباح آ سکوں"۔ یوں ہم نے فیصلہ کر لیا کہ کل ایک آخری نشست اور ہو گی۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ مگر شام کا اندھیرا چھا چلا تھا۔ جب ہم نے دریچوں میں سے مڑ کر کمرے میں دیکھا کہ کمرے کے کونوں میں سائے اور تاریکیاں جمع ہو رہی ہیں تو اُس نے اپنا لبادہ اور دستانے پہن لئے اور اپنا جالی دار بٹوا اُٹھایا۔ اور جانے لگی۔ اُس نے مجھے سواری نہ لانے دی اور کہا کہ میں خود ہی کوئی گاڑی رستہ میں لے لوں گی۔ میں ڈیوڑھی کے نیچے تک اس کے ساتھ گیا۔ مکان کا پہلا در جب طے کرنے کے بعد وہ رک گئی اور میں رک گیا۔ اُس نے کہا "مسٹر فیلڈ آپ نے مجھ سے بہت ہی اچھا سلوک کیا ہے اور میں نے آپ کا ذرا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ آپ نے مجھ سے میرے متعلق کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ اس لئے یہ بالکل مناسب ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم ہونا چاہیئے" یہ کہہ کر اُس نے اپنا بٹوا کھولا اور اس کے بعد تار و قطار رونے لگی۔ وہ جیسی انتہا حسین اتنی ہی حلیم المزاج اور اتنی متاثرانہ انداز میں افسردہ۔ اور ایسی فریفتہ کرنے والی اور پراسرار تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں اس کے اتنا قریب تھا کہ بے اختیار میں نے اسے چوم لیا اور اس نے ایک ہلکی سی سسکی لی۔ اس کا منہ نم آلود اور ٹھنڈا تھا۔ میرے اس وقت کے جذبات الفاظ میں نہیں سما سکتے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُس نے میرے ہاتھ میں دیدیا اور آہستہ سے کہا "لو نیچے۔ کل" اتنا کہا اور دوڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی" دروازے کے بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

بوڑھے آدمی کی دلکش آواز رک گئی اُس نے کتاب بند کی اور پھر وہیں رکھدی۔ جہاں سے اُٹھائی تھی۔ ابھی اس کی پیٹھ دیوار کی طرف تھی اُس نے گویا آپ میں آتے ہوئے عذر خواہی کے لہجہ میں کہا۔

اس وقت میری عمر تیس سال سے کم تھی۔

"اور پھر کیا ہوا" ڈیورا نے بے صبری سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ پھر کبھی نہیں آئی۔ دوسرے دن کے ابتدائی لمحے میری زندگی کے پرجوش و مسرت کے لمحے تھے لیکن اس کو نہ آنا تھا اور نہ آئی۔ اُس دن کی آخری گھڑیاں میرے لئے انتہا کی صبر آزما تھیں"

رافیل فیلڈ رکتے ہوئے ہنسا۔

"لیکن تمہارے پاس تو اس کا پتہ تھا"

"مجھے وہ کاغذ کبھی نہیں ملا۔ نہ اُس رات نہ اُس سے دوسرے دن

میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ مجھے خیال تھا کہ میں نے وہ کاغذ جیب
میں ڈال لیا تھا۔ اس لئے میں نے جیب کی سلائی تک اُدھیڑ ڈالی پھر بھی کاغذ
کا پتہ نہ لگا۔ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔"
"لیکن کیا تم نے اس کاغذ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی تھی؟"
"نہیں۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں بیٹھ کر اُس کے متعلق سوچنے
لگ گیا۔ کیونکہ پہلے مجھے اس کے نام کے متعلق کوئی پریشانی پیدا نہ ہوئی تھی۔"
"اور کیا کبھی تمہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ کون تھی؟"
فیلڈ نے جواب دینے سے قبل توقف کیا۔
"تمہیں اولنسن کا واقعہ بھی یاد ہے۔"
"نہیں۔"
"تمہیں کیسے یاد ہوگا۔ یہ تم سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اولنسن بھی ایک
مصور تھا۔ اپنے وقت میں بڑا جمیل آدمی تھا۔ میں نے اس کی تصویر بنائی
تھی۔ اُس نے اپنے تصویر خانہ میں خودکشی کر لی تھی۔ یہ ۱۹۳۵ء کے موسم خزاں
کا واقعہ ہے۔ وہ عجیب طبیعت کا آدمی تھا۔ عموماً عورتوں سے خلا ملا رکھتا
یا افواہ تھی کہ وہ شدید سے آزار محبت میں مبتلا ہے۔ یوں تو صرف محبت بلکہ ہر
چیز میں اس کی یہی حالت تھی۔ لیکن اس بارہ میں تو اس کا جوش و خروش بالکل غیر
معمولی تھا جس لڑکی سے اسے محبت تھی وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ
دیکھتی تھی۔ میرے خیال میں جو لڑکی اس رات میرے پاس آئی تھی وہ وہی تھی
جو اولنسن سے بے التفاتی برتتی تھی۔"
"اچھا" ڈیورا نے کہا۔ "اور اس نے کہا تھا کہ تم نے اس کے کسی دوست
کی تصویر بنائی ہے اور اب وہ چاہتی تھی کہ تمہیں سے اپنی تصویر بنوا کر اپنے اسی
دوست کی ماں کو دے۔ شاید اُس مصور کی ماں اُس لڑکی سے پیار کرتی ہو۔ کیونکہ
اُس کے بیٹے نے اُس کے لئے خودکشی کر لی تھی۔ یہ اغلب ہے کہ لڑکے کی
ماں اور اس کے تعلقات اچھے ہو گئے ہونگے اُس نے مصیبت کے دنوں کو بھلا دیا
ہوگا۔ کیونکہ اولنسن کی خودکشی نے نوجوان عورت کے جذبات کو بری طرح
پامال کیا ہوگا اور شاید اولنسن کی خودکشی ہی کی وجہ سے وہ انگلستان سے
جا رہی تھی۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ محض خیالات ہیں۔ میں نے اولنسن کی
ماں سے ملاقات کرنے کی کوشش کی مگر وہ مر چکی تھی۔ میں نے سبھی جتن کئے۔
مجھے قریباً انیس لڑکیوں کا پتہ چلا جن کے متعلق فرض کیا جاتا تھا کہ اولنسن کو
ان سے محبت تھی۔ لیکن وہ جسے میں ڈھونڈ رہا تھا ان میں سے ایک بھی نہ تھی۔ اور
میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی اُس کا سا حسن و جمال نہ رکھتی تھی۔"
اس کے بعد کمرے میں بالکل سکوت تھا۔
"لیکن وہ دوسرے دن کیوں نہ آئی؟" ڈیورا نے ایسی آواز میں کہا گویا وہ اپنے
آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ "خدا جانے وہ ڈر نہ گئی ہو۔ شاید ادائے فرض کے لئے
اُسے کسی جگہ جانا ہوا۔ ممکن ہے وہ کسی گاڑی کے نیچے آ گئی ہو ہر روز ایسی وارداتیں
ہوتی ہیں۔
اگر وہ اس وقت زندہ ہے تو اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہوگی۔ میں
جانتا ہوں کہ اب اُس کا وہ لڑکپن کا سا حسن و جمال نہ ہوگا۔ وہ پوتے پوتیوں
والی ہوگی۔ یہ چالیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ایسے زمانہ ہو گیا ہے۔
پھر خاموشی طاری ہو گئی۔
"میرا خیال ہے تم نے شادی نہیں کی مسٹر فیلڈ"
ڈیورا نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی غلط رویوں کے لمحات یاد
تھے۔
"نہیں"
یہ اتنے عرصے کی بات ہے کہ میرے خیال میں تمہیں ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ
واقعہ بجائے تمہارے کسی اور کو پیش آیا ہوگا۔"
"جی نہیں ایسا نہیں" فیلڈ نے کسی قدر اختصار کے ساتھ کہا۔ "یہ واقعہ
مجھے ہی پیش آیا تھا۔"
تھوڑی دیر کے بعد ڈیورا جانے کے لئے اُٹھا۔
"ہم نیچے ساتھ ساتھ چلتے ہیں" فیلڈ نے سیڑھیوں کے لیمپ کا بٹن دباتے
ہوئے کہا۔
ڈیورا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ سیڑھیوں کی دیواروں
پر لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کیونکہ فیلڈ نے اسے ابھی وہ تصویر نہ
دکھائی تھی۔
"یہ ہے وہ" فیلڈ نے پہلے طبقہ کی چھت پر آتے ہی رُک کر کہا۔
یہاں یہ غیر مکمل تصویر لٹک رہی تھی۔ ڈیورا نے اس کو توجہ سے دیکھا
شباب کا یہ شاہکار۔ یہ دلفریب مخلوق۔ موزوں لباس اور سائے میں ملبوس۔
آرزو انگیز۔ پر اسرار مجسم دوشیزگی۔ مسرت بخش اور نمناک ہونٹ۔ اگر یہ
تصویر نمائش میں پیش کی جاتی تو اس کی قیمت کم از کم دو ہزار پونڈ ہوتی۔
"میں نے اسے یہاں لٹکا دیا ہے" فیلڈ نے کہا۔ کیونکہ یہی وہ جگہ تھی
بس یہی وہ جگہ تھی۔ جہاں وہ مُڑ کر گئی تھی۔ اور اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں نے اس
سے بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اُس وقت سیڑھیوں پر کوئی قالین یا فرش نہ تھا
مکان کے باہر کی طرف ڈیورا یونانی طرز تعمیر کے مشہور گرجا کے سایہ کو خاموشی سے
کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے سُنا کہ رافیل فیلڈ اندر
سے چٹخنیاں بند کر رہا ہے اسے خیال آیا کہ کل رات کو پھر یہ پیر فانی اپنے قابل تعظیم
تبسم کے ساتھ جس میں بچپن اور بوڑھاپے کی ادائیں ملی جلی ہوں گی پھر اپنی تباہ کن

تنہائی میں اسی کلب میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوگا - کیا زندگی ہے - کیا مستقبل کی حالت میں ہے - کیا کل رات یہ عمر رسیدہ مصور اس مسکراہٹ کے ساتھ جس میں بچوں اور بوڑھوں دونوں کی ادائیں ملی ہوئی ہیں کلب میں تنہا کھانا کھا رہا ہوگا - آہ کیا زندگی ہے اور کیا ایام ہیں! کس قدر حسرتناک یاد ہے ایام رفتہ کی! اُس نے کیسے کیسے شاہکار بنائے - اور ابھی زندہ ہے - ڈیوراچپ چاپ خیالات کے سمندر میں غرق اپنے آراستہ پیراستہ گھر کی طرف جا رہا تھا - اس کے دل میں خیال تھا ہر چند دنیا میں اس کے پاس بہت کچھ ہے - لیکن وہ ہر چیز حاصل نہیں کر سکا - یہ دیکھ کر اس کی طبیعت کا ہیجان اور بھی زیادہ ہو رہا تھا کہ وہ رافیل فیلڈ سے حسد کرتا ہے -

(مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی)

افکار

تیرے کوچے کی لطافت کا ثنا خواں ہوں میں
باغِ فردوس کا اک مرغ خوش الحاں ہوں میں

بے حجابانہ جھلک تو نے دکھائی جب سے
آتشِ عشق اک شعلہ عُریاں ہوں میں

چھیڑتی ہے مجھے قدرت کی فضا رہ رہ کر
کیا کوئی زمزمہ مُرغ خوش الحاں ہوں میں

لن ترانی مرے شعلوں کی زباں پر ہے مدام
کس کے اسرارِ تجلّی کا زباں داں ہوں میں

چاک سے میرے نکلتے ہیں ہزاروں خورشید
صبحِ رخشندۂ فطرت کا گریباں ہوں میں

ہے مصیبت مری آرائش دنیا کا سبب
چہرۂ دہر پہ اک زلفِ پریشاں ہوں میں

رقص کرنا تری موجوں نے ہے سیکھا جس سے
اے امنگوں کے سمندر وہی طوفاں ہوں میں

ڈھونڈتی حُسن کے سورج کی کرن ہے جسکو
شبنمِ عشق کا وہ قطرۂ غلطاں ہوں میں

مَیں ابھی اپنی حقیقت سے ہوں غافل ورنہ
جو ہے مسجودِ فرشتوں کا وہ انساں ہوں میں

کہہ دو تاروں سے کہ آنکھیں نہ ملائیں مجھ سے
وادیٔ عشق کا اک ذرّۂ تاباں ہوں میں

مجھ کو افسردہ نہ دیکھینگے کبھی اہلِ جہاں
بزمِ تصویر کا گلدستۂ خنداں ہوں میں

(وحید الدین سلیم مرحوم)

نظم پنجابی

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

از روئے مضمون نظم پنجابی کی تقسیم ذیل کے نقشہ سے نہایت عمدگی سے واضح ہوگی۔ یوں تو یہ خصوصیات کہ مقررہ موضوعات پر ہر نسل کچھ لکھے۔ ہر ادب میں موجود ہے۔ مگر پنجابی میں یہ حد بعید تک پہنچ چکی ہے۔ متفرق مضامین پر فکر سخن کرنا گذشتہ دس پندرہ برس سے اُدھر کی چیز نہیں۔ اب تک یہ حالت ہے کہ انہیں مقررہ موضوعات میں سے کسی ایک پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ اور کمال کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قید بہت سے عیوب و نقائص کا موجب ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اس سے ایک تو ماضی کے افسانوں اور تہذیب اسلاف کی یاد تازہ رہتی ہے اور دوسرے شخصی کمالاتِ سخن کے مقابلہ و موازنہ کا بہت اچھا موقع شاعر اور سننے والے دونوں کو مل جاتا ہے۔

بلحاظ مضمون نظم پنجابی

(۱) مذہبی

اسلامی (ل) انواع محمدی۔ اسوہ حسنہ۔ فقہ۔ شریعت۔ تصوف۔ مراثی۔ جنگ ہائے اسلام۔ تفسیر و حدیث۔

غیر اسلامی (ب) گیتا۔ راماین۔ مہا بھارت و سری کرشن۔ سکھ شہدا۔ سکھ گورو صاحبان۔ بھگتی۔ راج یوگ۔

(۲) غیر مذہبی

راجہ رسالو۔ بھرتری۔ پورن بھگت۔ گوپی چند۔ شیریں فرہاد۔ سلطان محمود۔ لیلیٰ مجنوں۔ حاتم طائی۔ یوسف زلیخا۔ شاہ بہرام۔ روپ بسنت۔ حقیقت رائے۔ کامروپ۔ گلبدن۔ بیتال پچیسی۔ چندر بدن۔ بکرماجیت۔ سنگھاسن بتیسی۔ مرزا صاحبان۔ سوہنی مہینوال۔ سسی پنوں۔ ہیر رانجھا۔ طب

بلحاظ عروض نظم پنجابی

جھوک۔ سیٹھے۔ دوہڑے۔ کافیاں۔ پینتیس اکھری۔ بارہ ماہ۔ سی حرفی۔

بلحاظ عروض نظم پنجابی کی مزید وضاحت یہ ہے کہ جس طرح ہر ایک مدعی سخن جب تک کہ وہ مقررہ موضوعات سے دو چار پر زور آزمائی نہ کرے دم نہیں لیتا۔ اسی طرح جب تک وہ نصف درجن بارہ ماہہ اور سی حرفیاں وغیرہ اور کچھ دوہڑے یا کافیاں یادگار نہ چھوڑے اس پر آرام حرام ہوتا ہے۔ ان میں کا ہر صنف مضمون وہی ہوتا ہے۔ یعنی عشق یا تصوف۔ مگر ہر ایک شاعر اپنی طرز خاص میں مضمون کو ان مقررہ قالبوں میں ڈھال کر دکھاتا ہے۔

انتخاب کلام

انتخاب کلام شعرائے ہندی تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ بیانِ عشق و معرفت میں اُن ہی کو ید طولے حاصل ہے۔ رہا خود انتخاب یعنی نظر انتخاب کا معاملہ سو بہت ممکن ہے کہ لیلیٰ فرہاد کی معشوق نہ بن سکتی اور ہیر کو دل دینے پر مجنوں ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ جو زید کے لئے حلوا ہے وہ بکر کے لئے سم سے کم نہیں اور جسے احمد دلفریب سمجھتا ہے محمود اُسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ انتخاب کلام اس قدر آسان کام نہیں۔ شخصی اور ذاتی سوال کو جانے دیجئے۔ تین طرح کا فرق تو انتخاب شعر لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اوّل انتخاب بلحاظ حسن معنی۔ دوم بلحاظ حسن بندش و لطفِ بیان۔ سوم بلحاظ کمال عروض میرے لئے ازحد مشکل ہے کہ میں ایسا کلام پیش کروں جو تینوں مطالبات کو پورا کرتا ہو۔ پس جس رنگ وروش کے پسند خاطر ہونے کی وجہ سے کسی شعر کا انتخاب کیا ہے اُس کو ساتھ ہی درج کر دیا ہے تاکہ لفظ "بہترین" باعث اختلاف نہ ہو۔

ہیر رانجھا

اگر کسی ہیر کے قصہ میں شاعر اپنے مشاہدات کی بنا پر خاک پنجاب اور اہل پنجاب سے متعلق تصاویر بہم نہیں پہنچاتا تو اُسے کامیابی سے کالے کوسوں دور سمجھنا روا ہے۔ دیکھئے پنجابی جٹّی (جاٹ عورت) کی روزانہ مصروفیتوں کی۔ اُس کی صحت کی۔ اُس کی بے خوفی۔ ہمت۔ طاقت اور شوہر کی ہمدردی کی کیا دلکش تصویر ہیر کاہن سنگھ میں ملتی ہے۔ ان بزرگ کو مرے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔ آپ کی زبان میں ایک گورو گرنتھ خوان سکھ ہونے کی حیثیت کے وسطی پنجابی کا بھی خاصہ عنصر موجود ہے۔

"سہتی" جوگی کو دھمکاتی ہے - دیکھو جی زبان کو لگام دو -

لکھاہے[۹۱] - ہم جاٹ عورتوں کو "شرم کرتے (لجاتے) نہیں بنتی ہم خود ہی باہر جاکر گائیں بھینسیں چراتی ہیں اور اُن کا دودھ دوہ لیتی ہیں مشکل پڑے تو کمر کس کر خود ہی مرد بن جاتی ہیں - رہٹ کے بیل کو ہانک لیتی ہیں - بیلوں کو جوت لیتی ہیں - گدھوں پر کلّر ڈھو کر لے جاتی ہیں - چرخہ کات کر تانا تیار کر لیتی ہیں - یہاں تک کہ ارنے بھینسے کو نیچے گرا کر اُس کی ناک میں نکیل ڈال لیتی ہیں - ہل چلا لیتی ہیں - بیج بو لیتی ہیں - اگر خدانخواستہ ہمارے مردوں پر کچھ مصیبت آ پڑے اور وہ کام نہ کر سکیں تو ہم خود ہی فصل کاٹ کر جمع کر لیتی ہیں اور ہم حبیبوں کے غرور کو توڑ کر حکمت عملی سے دلوں کو قابو میں کر لیتی ہیں

فراق ہیر[۹۲] (بارہ ماسہ) بیساکھ کا مہینا آیا - شاخیں پھوٹ نکلی ہیں - جنبہ - چنبیلی - اربیل کھیل اُٹھی - سہیلیاں سنگار کر رہی ہیں - عطر پھلیل لگا لگا کر بال گوندھ رہی ہیں - مگر ہائے میں ہوں کہ اس حویلی میں تنہا قید ہوں کھیڑا مجھ کو جبر سے یہاں لے آیا ہے - سوائے اللہ کے کوئی بیلی نہیں - نہ کوئی سہیلی ہے نہ ہمراز -

بھادوں کا مہینہ ہے - دل میں طرح طرح کے وہم و گمان اُٹھ رہے ہیں - آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی ہیں - کبھی زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر فال لیتی ہوں کبھی کوے کو آنگن سے اُڑا کر کبھی پنڈت سے جا کر پوچھتی ہوں کہ وہ کب تک آئیں گے - ایسا کون ہے جو یہاں سے خود جا کر میرے ماہی (محبوب) کو میرے پاس لائے -

ماگھ کے مہینے میں سردی نے تو مار ہی ڈالا - مگر اس کا چنداں خیال نہیں - رونا تو اس بات کا ہے کہ میں تمہاری لونڈی تم سے دور - ہجر میں اشک بہا رہی ہوں - ساس نندیں طعنے دے دے کر سینہ جلا رہی ہیں - کھانا پینا مجھ پر حرام ہے - ایسے میں نیند کس کو آ سکتی ہے؟ کبھی سرہانے کی طرف بیٹھتی ہوں کبھی پائنتی کی طرف - کاش میرا دم نکل جاتا - اور میں اس فراق کے جینے سے رہائی پاتی -

پوس کا مہینہ ہے - سردی بڑے زور کی پڑ رہی ہے - ٹھوڑی کو گھٹنوں میں رکھ کر بیٹھی بیٹھی رات کاٹ لیتی ہوں - آخر کہاں جاؤں، کس سے پوچھوں - بدن میں سکت باقی نہیں - ادھر فرط شوق کا یہ حال ہے کہ یہی جی چاہتا ہے کہ ہر وقت محبوب کے دیدار سے دل کی تپش بجھاؤں کاش کوئی انتظام ہو سکے اور میں اپنے دل کا حال لکھ کر اُس تک بھیج سکوں اور اُسے اچھی طرح سمجھا بجھا سکوں -

سعدیٔ پنجاب

اگرچہ اُستاذی مولانا حسرت موہانی سعدی کے تغزل کو حافظ اور جامی کے تغزل پر بھی ترجیح دیتے ہیں پھر بھی یہ ابتدائی تاثرات کے سبب جو طالب علمی کے زمانہ میں گلستاں اور بوستاں کے مطالعہ سے دل نے قبول کئے سعدی کو ہم ایک بہترین مصلح اخلاق و صاحب پند و عظ سمجھے چلے جاتے ہیں - پنجاب نے بھی سعدی سا معرفت افروز اور اخلاق آموز شاعر پیدا کیا ہے اور وہ کالیداس ساکن گوجرانوالہ ہے جس کے لئے عمرش دراز باد کی دعا ہر پنجابی کی زبان پر ہونی چاہئے - آپ کے کلام کے متعدد خصوصیات اس ایک تقریر سے بخوبی ظاہر ہو جائیں گی قصہ[۹۳] روپ بسنت میں چوکیدار بسنت کو نصیحت کرتا ہے -

"بیٹا! جان بوجھ کر زہر کیوں کھایا جائے - رات کے وقت شیر کے نزدیک کیوں جایا جائے - جو لوگ مردم آزار ہیں اُن کو دیکھنا تک نہ چاہئے پہلے کسی پر حملہ مت کرو - زبردست سے دشمنی فضول ہے اور حاکم سے زور آزمائی کرنا خرابی کا باعث - خدا کی رضا پر صابر رہئے - دیدہ و دانستہ شیش محل اور مندر کو چھوڑ کر قبر میں اپنی سیج کوئی کیوں بچھائے - اپنی نیکی کو کبھی یاد نہ رکھئے اور دوسرے کی نیکی کو کبھی نہ بھلائیے - وہ جو محبت کے مفہوم سے بے بہرہ ہیں اُن سے آشنائی کا رشتہ باندھنا بے سود ہے - اگر چار بھلے مانس کوئی مشورہ دیں تو اُسے ٹھکرانا نہ چاہئے - گرو اور پیر کی حکم عدولی نہایت نقصان دہ ہے - سچ کو دل سے کبھی دور نہ کیجئے - جب تک نین (آنکھیں) اور پران (دم) باقی ہیں مزدوری یا کام کرتے رہنا چاہئے اور "حرام خوری" نہ کرنی چاہئے بخیل سے کچھ بھی نہ مانگئے اور سخی مرد سے مانگتے کبھی نہ شرمائیے - فقط دھرم کی کشتی اُس پار پہنچائیگی - اس لئے پاپ کی ناؤ پر کبھی پاؤں نہ رکھئے - عاجز پر کبھی ظلم نہ کیجئے - اور غریب کا خون کبھی نہ پیجئے - عورت کو کبھی کوئی راز نہ بتائیے اور نیچے سے کبھی پیار نہ بڑھائیے - جو مل جل نہیں سکتا اُس سے میل کی کوشش نہ کرنی چاہئے اور جو آپ سے میل جول کرتا ہے اُس کی رفاقت کو ہاتھ سے نہ دیجئے - جب تک خود کسی کام کو نہ کر لیا جائے دوسرے سے اُس کی تکمیل کے لئے اصرار نہ کیجئے - جب تک پورا گورو (مرشد) کامل) نہ ملے فقر کی راہ نہ اختیار کرنی چاہئے - اور جب تک صبر و شکر کے مالک نہ بن جائے کوئی دُرویشی کا لباس کیوں پہنے؟ دشمن سے

---

[۹۱] دیکھو صفحات ۳۱۶ و ۳۱۷ - ہیر کاہن سنگھ مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۰۰ء

[۹۲] صفحات ۲۴ - ۲۰۵ - ۲۰۶ - ۲۰۷

[۹۳] دیکھو صفحہ ۹۱ - ۱۹۲۸ء ایڈیشن -

ہمیشہ جان بچائیے اور دوست سے کبھی دغا نہ کیجئے۔ جو زندگی سے بیزار ہے اُس سے ہرگز خفا نہ ہوجیئے۔ شاعر۔ عاشق اور فقیر تینوں لا مذہب ہیں۔ ان کو بڑھ کر بڑھ کر شرع نہ سُنائیے۔ جب تک خود کو کھو نہ لیں گے آپ خود کو نہ پائیں گے۔ نفس کے شیر کا شکار کرنے کے لئے اپنی جان کی قربانی کی ضرورت ہے

مسلمان اور ہندی

سائیں مولا بخش محبیٹھوی جن کے کلام کا انتخاب اب دیا جائیگا باوجودیکہ مضافات امرتسر کے ہیں۔ زبان و بیان ہندی کے بہترین شاعر ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان جب کہیں پنجاب سے باہر گئے۔ ہندی کے عروضی و لغاتی تاثرات کو لیتے گئے اور جس جگہ بھی پنجاب میں اب موجود ہیں ہندی کو لو تڈی بنائے ہوئے ہیں۔ سائیں جی کا خزانہ ختم ہی نہیں ہوسکتا۔ اور اس میں ہر طرح کی شئے جواہر سے لیکر سنگریزہ تک موجود ہے۔

۱۔ بیان گذشتن شب و طلوع آفتاب

فرنگیوں کے راج میں ساری رات گھڑیال بجتے رہتے ہیں۔ صبح کا ذب کا وقت آیا۔ چار بجے۔ کسانوں نے ہنڈالیاں اُٹھائیں اور کھیتوں کو چلے۔ عابد اور زاہد بھی ہوشیار ہوئے تہجد پڑھتے ہیں تسبیح پھیرتے ہیں اور وظیفے اور مشاہدہ میں محو ہیں۔ بہت سی عورتیں جاگ اُٹھی ہیں۔ چکی پیسنے لگی ہیں۔ مرغوں نے اذان دینی شروع کر دی ہے۔ پرندے بولنے لگے اور مسافر سفر پر کمربستہ ہوئے۔ دیوی دواروں اور شو دواروں میں سنکھ بجے۔ مسجدوں میں اذان ہونے لگی۔ برہمن اور کھتری عورتیں اشنان کرنے کو باؤلیوں پر گئیں۔ اور جھانجن پہن کر روانہ ہوئیں۔ سپاہیوں کے پہرے بدل گئے اور بہت سے لوگ کاروبار میں لگ گئے۔ رِھنیوں میں دودھا دودھ بلونے والی لکڑی ڈال دی گئی۔ "سورج کی سُرخی آشکار ہوئی"۔ گوجریوں نے اُپلے تھاپنے شروع کئے۔ اور گوجروں نے اپنے بچوں کو کندھوں پر لئے دودھ دوہنا شروع کیا۔ سقّے پانی چھڑکنے لگے۔ خاکروب جھاڑو دینے لگے حکم سرکار سے داروغہ گشت کرنے والا بھی باہر نکلا۔ پھیری والے گھوم رہے ہیں۔ بلوچ اور کمہار جن کو بہت لمبا سفر کرنا ہوتا ہے چل دیئے۔ دوکانداروں نے دوکانیں کھول دیں اور نرخ کے بارے میں گفتار ہونے لگی۔ چڑیاں اور کوے بولنے لگے۔ پرندے اِدھر اُدھر اُڑ کر جانے لگے۔ سورج نکل آیا دھوپ پھیل گئی۔ گوالوں نے اپنے ریوڑ گاؤں سے باہر نکالے۔ امیر سردار باغ کی سیر کو چلے اور ہواخوری کرنے لگے۔ درختوں اور گھاس پر شبنم یوں نظر آتی ہے گویا بے شمار موتی چمک رہے ہیں۔ پھول ایک سے ایک دلکش ایک سے ایک دلفریب دلوں کو لبھانے لگے۔ عاشق لوگ رانجھے کے قول و قرار کے پابند کوچے میں کھڑے ہیں۔ مکھن اور دہی کھا کر اور ناشتہ کر کے لڑکیاں لڑکے سکول اور مسجد کو جانے لگے۔ ایسے وقت میں جس جس نے جوگی کی آمد کو سُن رکھا تھا وہ درشن کرنے کے لئے چلا۔ کیونکہ جوگیوں کے درشن سے خدا تعالےٰ گناہ کی سزا میں تخفیف کرتا ہے۔ بہت سے تحفے لیکر بیاہی اور کنواری لڑکیاں جوگی کو دیکھنے آئیں۔

ہیر کی ماں ہیر کو طعن و تشنیع کرتی اور سمجھاتی ہے کہ رانجھے کے عشق سے باز آ۔

چرخہ کاتنے کی طرف تیرا دھیان نہیں جاتا۔ گوڑھے اور "پونیوں کے چُھبٹ" یوں ہی پڑے ہیں۔ نہ تو دودھ دوہتی ہے نہ گوبر پاتھتی ہے تجھے تو بس "چاک" (غلام) کا عشق مغلوب کئے ہے۔ تیری آنکھیں جلاہے کی طرح تانا تنتی رہتی ہیں۔ جب "ماہی" (رانجھا) باہر سے واڑے واڑے" کہتا بھینسوں کو چرا کر گھر لاتا ہے تو بےچین ہو جاتی ہے۔ مٹھی ناٹن سے تیرا "سہیل پیا" (سہیلی پن) ہے یاد رکھ جو لڑکیاں ماں باپ کا کہا نہیں مانتیں وہ سُسرال میں جا کر اپنے کئے پر پچھتاتی ہیں۔ نہ تو گھر میں بیٹھکر کاتتی ہے نہ "تھنبڈار" (۱) میں۔ تجھے تو ہر دم بے کلی سی ہے۔ اگر تجھ سے کوئی شئے گر جائے یا پھٹ جائے اور اس کی تجھ سے شکایت کی جائے تو تو اُلٹا کوسنا شروع کر دیتی ہے۔ یاد رکھ جو جانور مالک کے کام کے نہیں رہتے اُنہیں قصائی کی چھُری کے تلے ہی جگہ ملتی ہے۔ اے بیٹی سمجھ جا پانی کے بغیر کمہار مٹی نہیں گوندھ سکتا۔ نہ رنجیت سنگھ کے سوا کوئی کابل پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ ہمارے بغیر اور کون تجھکو مت (عقل) دینے والا ہے؟ تجھے کل کو سُسرال میں جا کر بہتیرا کام کرنا ہوگا۔ کالی اور بھوری بھینسیں دوہنی ہوں گی۔ تو اس بات کا دھیان نہیں کرتی؟ جو مجرم اور گنہگار نہیں گے اُن کو عدالت دوزخ میں ڈال دے گی۔ تو جو عشق کر رہی ہے اُس کی پاداش منصور کی طرح دار کے سوا اور کچھ نہیں۔ چوچک سردار کی بیٹی ہو کر تو کمینہ کام کرتی ہے؟ سب لوگ تجھے طعنے دیتے ہیں۔ ذرا ہوش میں آ۔ یہ کیا کرتوت ہیں؟

اے بچّی میں تو تیری برابری ہرگز نہیں کر سکتی۔ تجھے پول کے ساتھ سلام کرتی ہوں۔ تجھ جیسی ہی حوّا نے آدم کو بہشت سے نکلوایا اور الف لام کو ٹیڑھا کیا۔ تجھ جیسی ہی نے اسم اعظم کھو کے ہاروت ماروت دونوں کو اُلٹا کلام کیا۔ تجھ جیسی ہی نے امیر حمزہ کے ساتھ مل کر قتل عام کیا۔ تجھ جیسی ہی نے ابراہیم کو آگ پر بٹھلایا۔ تجھ جیسی نے کورو اور پانڈو لڑوائے اور راون کو مروایا۔

---

(۱) وہ جگہ جہاں لڑکیاں مل کر رات کو چرخہ کاتتی ہیں۔

اور راجا رام اور لچھمن کو خوار کیا۔ تجھ ایسی ہی نے اندر کو بد دعا دلوائی۔ تجھ ایسی ہی راجہ بھوج پر سوار ہوئی۔ رسالو اور سرکپ سے مصیبت اُٹھوائی۔ شیر افگن کو قتل کروایا۔ تو تو سچ مچ فرنگی کی برق ہے۔ غلام سے عشق لگا کر تو نے سب حلال کام حرام کر دئے۔ تجھ ایسی ہی بادشاہوں کو فقیر اور فقیروں کو شاہ کر دیتی ہیں۔ دین و ایمان دولت و آرام کو چھین لیتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے ہم چالاک کی محبت سے توبہ کرو ورنہ کھیڑے تیری ناک کاٹ دیں گے۔

موہن سنگھ دیوانہ

دوست کی قبر

یہی مقام تھا اب تک ہے خوب یاد مجھے — یہی اُداس فضا تھی ہر ایک مرقد کی
کہا تھا تو نے یہاں چند قبریں دکھلا کر — نشانیاں ہیں یہ باقی مرے اب و جد کی

یہ ڈھیر خاک کا جس پر اُگی ہوئی ہے گھاس — میں جانتا ہوں مرے باپ کا مزار ہے یہ
شکستہ سی ہے جو یہ قبر اُس کے پہلو میں — یہ امّی ہاں مری امّی کی یادگار ہے یہ"

یکایک آیا یتیمی کا پھر خیال تجھے — غم دروں سے ترا رنگ زرد ہونے لگا
نہ پوچھ کیفیّت اُس دردناک منظر کی — کہ دیکھ کر تری صورت کو میں بھی رونے لگا

اُسی جگہ پہ کھڑا ہوں میں آج بھی لیکن — اُداس ہوں کہ تو اس وقت میرے پاس نہیں
بتائے کون کہ یہ تازہ قبر کس کی ہے — یہ قبر جس پہ کہیں نام کو بھی گھاس نہیں

فاخر ہریانوی بی۔ اے

زار اور زارینہ

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان دریائے ٹیمز کی بالائی گذرگاہ کے شاداب اور بہار آفریں کنجوں میں اپنی محبوبہ کے دل تک پہنچ پانے گیا۔ عشق کے دونوں نیازمندوں نے محبت کے کئی ایک لمحے بسر کئے اور دریا کے شفاف اور آئینہ گوں پانیوں پر کشتی کھیتے اور بید مجنوں کے روح پرور سایوں میں چپو چلاتے تھے۔ اس نوجوان کی تفریح کیلئے بہت کچھ انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن اس نے اس قنا عذار دیہاتی کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ بلکہ آبادی سے دور تنہائی میں اس حسین و جمیل لڑکی کی رفاقت میں دن بسر کئے جس کو وہ اپنی رفیقۂ حیات بنانا چاہتا تھا۔ یہ لڑکی شہزادی ایلس انگلستان کی شہزادی الائس کی بیٹی اور ملکہ وکٹوریہ کی نواسی تھی۔

یہ افسانہ عشق جس کا آغاز انگلستان کے ایک مرغزار میں اس ولاویزی اور دلفریبی کے ساتھ ہوتا ہے "ایکاٹرن برگ" سنہ ۱۹۱۸ء میں روس کے شاہی خاندان کی ہلاکت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

آہ! یہی وہ خوش رو اور خندہ پیشانی لڑکی ہے جس کا باپ اگرچہ ایک جرمن تھا لیکن اس کی تربیت و پرورش انگریزی طرز پر ہوئی اور اسی کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا اثر اس کے خاوند اور رعایا کی زندگی پر نہایت ہلاکت آفرین تھا۔

زارینہ کے سخت ترین معترضین میں سے کسی ایک نے بھی اس کی خانگی زندگی اور حسن اخلاق پر حرف نہیں لکھا لیکن اس کے بہترین رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہنے کے لئے تیار ہو کہ پرنسس ایلس نے جو بعد میں ملکہ روس بنی۔ کبھی اپنے اختیار کردہ وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کوشش کی ہو۔

نکولس دوئم اور اس کی بیوی کی تاریخی شخصیتوں کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر وہ شاہی خاندان کے بجائے دوسرے غیر مقتدر حالات میں پیدا ہوتے تو وہ نہایت اور پر مسرت زندگی بسر کر سکتے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن جہاں طاقت اور کمزوری باہم دست و گریبان ہوں۔ جہاں صنف نازک اقتدار کی زبردست خواہش رکھتی ہو اور صنف مقابل اس کے ہر قسم کے بے جا مشورہ پر چلتا ہو وہاں ہلاکت اور تباہی یقینی ہے۔

تاریخ میں اکثر ایسی عورتیں گذری ہیں جنہوں نے اپنے اسراف اور بے احتیاطی سے اپنے خاوندوں کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کے دل میں مختار و مقتدر ہونے کی اس قدر زبردست خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی وقت بے وقت کی بے سلیقہ مداخلت سے خاوند کے احباب اور رشتہ داروں میں پھوٹ ڈلوا دیتی ہیں۔

ابھی چند روز ہی کا ذکر ہے کہ اخباروں میں ایک ایسی خودکشی کا المناک واقعہ شائع ہوا تھا جس کا سبب خاوند کے کاروبار میں بیوی کی بے جا مداخلت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اگر زار اور زارینہ کسی کم مقتدر خاندان میں پیدا ہوتے تو یہ قوت و اقتدار کی حماقت آمیز خواہش بھی ان کے خاوند اور بچوں کے لئے جن سے اسے اس قدر محبت تھی خطرناک ثابت ہوتی۔ اس میں کلام نہیں کہ زارینہ اپنے خاوند کی سچی پرستار اور اپنے بچوں کی عاشق زار اور جان نثار کرنے والی ماں تھی۔ زارینہ کی زندگی پر اس کا نہایت زبردست اقتدار تھا۔

تاریخ کے اس خونیں ورق کو مطالعہ کرنے والے کے دل میں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کیا جلا وطنی کے پر درد اور المناک ایام میں زار کو کبھی کبھی اس امر کا احساس ہوا ہوگا کہ روس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر بیوی کو اس قدر اختیار دے کر اس نے ایک شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ محبت شعار خاوند نے ندامت کا ایک لفظ تک نہیں کہا اور جلا وطنی شدہ شاہی خاندان کے آخری حسرتناک دن بھی عشق و محبت اور جاں نثاری و وفاشعاری کا افسانہ بن کر گذر گئے۔ نکولس اور الیگزینڈرا کے درمیاں نہایت گہری الفت و محبت تھی۔ لیکن اس کو خود غرضانہ محبت کہنا چاہیئے۔ وہ اپنی خانگی زندگی میں نہایت خوش تھے۔ انہیں اپنے بچوں اور دیہاتی جاگیروں سے محبت تھی۔ یہ گھر کے اندر کی پرسکون تنہائی کو چھوڑ کر باہر کی وسیع دنیا کے کاروبار میں سرگرم کار دلچسپی لینا نہ چاہتے تھے اور یہ جانتے نہ سکتے تھے۔ لیکن ملکہ اور اس کے خاوند کو عروج و اقتدار کی خواہش تھی۔ وہ اسے بغیر کسی کوشش کے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ روس کی ہولناک تباہی کے وقت سینکڑوں مرد و زن مارے گئے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد میں سے صرف ایک سابق زارینہ بھی ہسپتال میں جا کر زخمیوں کی تسلی و تشفی کرتی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نکولس اور اس کی بیوی سے اس واقعہ کی اہمیت بالکل مخفی رکھی گئی تھی۔ اگر یہ

صحیح ہے تو دربار روس کی حالت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ جس کے لئے اس قدر اہم واقعہ کا چھپانا بھی ممکن ہے اگر زار اور زارینہ رعایا کی جان کو اپنی جان اور رعایا کے آرام کو اپنا آرام سمجھتے تو کوئی اس حقیقت اس قومی مصیبت کو خواہ یہ کس قدر ہی تلخ اور ناخوش گوار ہی کیوں نہ ہوتی ان سے پوشیدہ نہ رکھ سکتا۔

اب ہم پھر شادی کے ابتدائی ایام کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت پرنسس ایلکس اپنے رشتہ کے بھائی پرنس لوئی بیٹنبرگ کے پاس مقیم تھی ملکہ وکٹوریہ اس شادی پر رضامند تھیں۔ ان کی بیٹی ماں کی نواسی نہایت نازک تھی اور ہونے والے زار کی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہ نوخیز شہزادی کو روس کے تخت کے خطروں اور تفکرات کی بھینٹ نہ چڑھانا چاہتی تھیں۔ شاہ الیگزنڈر کو بھی یہ خیال پسند نہ تھا کہ اس کے بیٹے کی شادی لوتھر کی کسی معتقد سے ہو۔ لیکن ان دونوں کی آپس میں اس قدر شدید محبت تھی کہ کوئی روک ان کی شادی کے راستہ میں حائل نہ ہو سکی اور ۲۶۔ نومبر ۱۸۹۴ء کو شہزادی کی شادی اس کے دل کے شہزادے سے ہو گئی۔ زار الیگزنڈر شادی سے تین ہفتے پیشتر فوت ہو چکا تھا اور رفیت کی رسم بیماری کی حالت میں اسی کے پلنگ کے پاس ادا کی گئی تھی۔ روس کے اس حکمران نے مرتے دم بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ اپنی رعایا سے بلا امتیاز مذہب و ملت محبت کرے اُن کے مفاد اور حقوق کی نگہداشت رکھے اور یورپ کے امن و امان کو دنیا کی بہبودی کی خاطر برقرار رہنے دے۔

ان افراد میں سے جنہوں نے اس شادی کی شاندار رسومات میں حصہ لیا تھا صرف ایک المنصیب شخصیت زندہ ہے۔ یہ حسرت نصیب زار کی ماں ہے جو صرف اس لئے زندہ ہے کہ اس عمر میں روس کی ہولناک تباہی دیکھے اور اپنے بیٹے اور پوتوں کی خونریز داستان غم سنے۔ یہ سابق زارینہ اور ملکہ الیگزنڈرا کی بہن ہے جو ڈنمارک میں رہتی ہے۔ اور جس کی تمام زندگی اس ملک کے لوگوں کی بہبودی کی کوشش میں گذر گئی جو شادی کے رشتے سے اس کا ہو گیا تھا۔

لیکن زارینہ تاریخ کے طالب علم کے لئے نفسیات کا ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے کیرکٹر اور طرز عمل میں یکسر انگریز تھی وہ خطوط جو اس نے اپنے خاوند کو لکھے اور جن سے ان دونوں کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے نہ تو اس کی اپنی ملکی زبان جرمن میں لکھے گئے تھے۔ اور نہ اس کے خاوند کی زبان روسی میں۔ وہ اس زبان میں وجود میں آئے تھے جو ان کی محبت اور نجی زندگی کے اتحاد کا واحد ذریعہ تھی۔ شباب کے ان متوالوں کی شادی کے اولین ایام نسبتاً پرسکون تھے۔ زارینہ کشتی کھینے۔ چپو چلانے اور دیگر مشاغل میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور نہایت دلفریب طور پر رقص کر سکتی تھی۔ اگرچہ روس کے شاندار محلات اُن کے لئے موجود تھے۔ لیکن زار اور زارینہ دیہات کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے سینٹ پیٹرزبرگ کے سرمائی محل کو جو نہایت قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ہوتا تھا۔ صرف سرکاری ملاقاتوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور وہ ذاتی طور پر ان غیر نمایاں عمارتوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے جنہیں وہ انگریزی طرز پر آراستہ رکھتے تھے۔ ملکہ کے دل میں تخت کے وارث کی زبردست تمنا تھی۔ لیکن چار دفعہ اسے حسرت و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہر بار لڑکی پیدا ہوتی رہی۔ آخر ۱۹۰۴ء میں جنگ جاپان کے وسط میں اس کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ بچہ پر ماں کے خاندان کی موروثی بیماری کے آثار طاری ہیں ان کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کی بہنیں صحت مند تھیں لیکن تخت کے وارث کی جسمانی حالت اس قدر نازک تھی کہ پیدائش سے لیکر اس کے ساتھ بیماروں کا سا سلوک ہوتا تھا۔

شاہی خاندان کی خانگی زندگی کی دلکش تصویر مسٹر نارد پار نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"خاندان کے بچوں کی پرورش نہایت شدت سے انگریزی طرز پر ہوتی تھی۔ چاروں لڑکیاں الیگزنڈر کی تقلید میں معمولی چارپائیوں پر سوتی تھیں۔ ملازمین ہدایات دیتے ہوئے ان کا انداز تحکمانہ نہیں ہوتا تھا اور ملازم بھی دل و جان سے اُن کے وفادار تھے ماں باپ کی طرف سے جو تحفے تقسیم کئے جاتے تھے وہ بھی نہایت معمولی ہوتے تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اگرچہ انہیں بے خور و فکر نہیں کہا جا سکتا تاہم وہ کوئی علمی قابلیت بھی نہ رکھتی تھیں۔

اکثر اوقات یوں ہوتا کہ کوئی امیر البحر یا جرنیل اُن کے باپ سے ملنے آتا۔ دوران میں سے ایک لڑکی میز کے نیچے چھپ کر اس کی ٹانگوں کی چٹکیاں لیتی اور وہ گدگدی کے باعث بات نہ کر سکتا۔ اس وقت زار ہنستا ہوا اس لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا۔ چاروں لڑکیاں اپنے باپ سے محبت کرتی اور ہر وقت اس کی صحت کا خیال رکھتی تھیں۔"

مسٹر نارد کے یہ الفاظ بالکل صحیح ہیں کہ اُن کے طرز زندگی کو دیکھ کر

یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ زار روس کا خاندان ہے اس کی وجہ اُن کی سادہ زندگی نہیں بلکہ یہ ان کی انصرامی معاملات سے لاپرواہی کا سوال ہے۔ اس امر کی تصدیق روسی معاملات کے مستند مصنف ڈاکٹر ڈلن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے۔ جب تخت کے وارث کی عمر صرف ایک سال تھی۔

"اس سے بڑھ کر جگر خراش واقعہ اور کیا ہوسکتا ہے جو مجھے دربار امرا کے ایک فرد نے سُنایا کہ جب ایک انگریزی جہاز پر روسی امیر البحر کی آتشباری سے روس اور انگلستان کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے۔ زار ایک روز صبح اپنے بچہ کو نہلا رہا تھا۔ امیر البحر ایک دور دراز اور تباہ کن مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ اُس وقت بھی زار یہ الفاظ کہے بغیر نہ رہ سکا" آپ جانتے ہیں اس کا وزن صرف ۱۴ پونڈ ہے" "کس کا جناب"؟ "تخت کے وارث کا" باپ نے جواب دیا۔

یہ الفاظ ایک ماں کے دل کیلئے ہر چند اس کو اس ضرورت احساس ہوکہ باپ کو اسکی بجائے حکومت کے کس اہم امور میں حصہ لینا چاہئے نہایت مسرت بخش ہوسکتے ہیں زارینہ نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ لیکن اس میں ساس کی سی ہمدردی اور نرمی نہ تھی اور ہر وقت کی بیجا شرم اُسے اچھی نہ لگتی تھی۔ دربار میں وہ بہت دق اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی اور اپنی مرضی سے نہ صرف علمی اور ادبی حلقوں سے بلکہ شاہی خاندان کے افراد سے بھی دور اپنے بچوں کے ساتھ تنہائی میں رہتی تھی۔

لیکن روس میں شاہی خاندان کے افراد سے ابھی تک کچھ مذہبی تقدس وابستہ تھا۔ شاید زارینہ بھی حکمرانوں کے ان آسمانی حقوق کی معتقد ہو جن کی رو سے اسے اپنے خاوند کی بے شمار رعایا میں سے چند ایک سے رسم و روابط رکھنا ضروری تھا۔

میرا خیال ہے اگر زارینہ کچھ زیادہ ایثار کرتی اور اس امر پر رضامند ہوجاتی کہ اس کا خاوند اس کی رفاقت سے چند لمحوں کے لئے غیر حاضر رہ کر اپنی رعایا کی مشکلات اور مصائب سے واقف ہوسکے تو روس کی تاریخ آج بالکل مختلف ہوتی۔ اگر وہ اس وقت خلوت پسند اور اپنی رعایا کے مرد و زن سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتی تو نہایت اغلب ہے کہ اس اوباش طبع راسپوٹین کی نام نہاد روحانیت کی اس قدر پر جوش معتقد نہ بن سکتی۔ جو ایک غیر معمولی طور پر مضبوط ارادے والی اور ملکہ کی سی عظیم الشان شخصیت پیدا بنا سکنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

آہ! یہ ایک ماں کا دل تھا۔ جس پر اس اوباش نے پہلی بار اپنی روحانیت کا جادو آزمایا!

اس مقام پر یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ راسپوٹین کوئی خطاب یا لقب نہیں۔ اس کے معنے "اوباش" یا "آوارہ آدمی" کے ہیں اور یہ ریاکار گریگرے کو جو اس نام سے مشہور ہے اس کے دیہاتی ہمراہیوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔ گریگرے کوئی راہب یا کسی خانقاہ کا متولی نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک آوارہ آدمی تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ خدا نے اسے لوگوں کی روحانی تربیت کے لئے مامور کیا ہے۔ اس مفروضہ روحانیت کا شہرہ زارینہ نے بھی سُن رکھا تھا اُس نے اُسے بارہا دیکھا بھی تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک اتفاقی سانحے کی وجہ سے اس کا بیٹا بیمار ہوا۔ اور اُس نے فوراً راسپوٹین کی طرف رجوع کیا۔

راسپوٹین نے نہایت بے اعتنائی سے جواب دیا" یہ بیماری اس قدر خطرناک نہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں کے علاج کی ضرورت نہیں"۔

اتفاق کی بات ہے بیماری جاتی رہی اور اُسی روز سے راسپوٹن کی روحانیت پر زارینہ کا اعتقاد مضبوط ہوتا گیا اور اسے یقین ہوگیا کہ اسے واقعی الہام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا تمام اثر و اقتدار حکومت کے ان وزرا کو معزول کرنے میں صرف کردیا جو اس مقدس آدمی کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرناک خیال کرتے ہوئے اس کی جلاوطنی کے درپے تھے اپنے خطوط میں زارینہ راسپوٹین کا تذکرہ ہمیشہ "ہمارے دوست" کے الفاظ میں کرتی تھی۔

اس امر کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ زارینہ کے وہ خطوط جو اس نے زار کو لکھے اب ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوچکے ہیں اور ان سے اُس کے کیریکٹر پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے مثلاً ۴۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو وہ اپنے خاوند کو "سار کوسیلو" سے لکھتی ہے۔

"میرے دل کے خزانے!

ایک بار پھر تم ہمارے پاس سے جارہے ہو اور میرا خیال ہے خوشی اور مسرت کے ساتھ۔ کیونکہ یہاں باغ کے چند لمحوں کے سوا باقی تمام کام نہایت صبر آزما اور بیزار کن تھا۔ اس عرصہ میں بیماری کی وجہ سے میں تمہارے ہمراہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکی۔ میرے محبوب خدا تیرے ہمراہ ہو اور ہماری فوجوں کو مظفر و منصور واپس لائے۔ مجھے اُمید ہے تم ہیڈ کوارٹر پہنچنے سے پیشتر اس بات کا خیال رکھو گے کہ اگر نکولا شا وکوف سے کسی قسم کی شکایت کرے تو فوراً اس کا انسداد کروگے۔ اور انہیں بتا دوگے کہ آقا تم ہو۔ تم بہت نرم مزاج اور رحمدل ہو۔ لیکن اکثر اوقات کڑی آواز اور تند نگاہی زیادہ مفید رہتی ہے۔ میرے پیارے اپنے نفس پر ذرا زیادہ اعتماد رکھنا چاہئے اور جو بات ہو اس کا فوراً فیصلہ کرنا چاہئے

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ صحیح اور سیدھا راستہ کیا ہے اور جب کبھی تمکو اپنے فیصلہ پر اعتماد ہو اور تمہارے دیگر ہمراہی تم سے متفق نہ ہوں تو کسی کی کچھ پرواہ نہ کرو اور اپنے فیصلے پر کاربند رہو۔"

زارینہ کے خطوط میں ایسی بے شمار ہدایات ملتی ہیں لطیف نسوانی جذبات اور محبت کی داستان بیان کرتے کرتے یہ عجیب عورت اچانک اپنے خاوند کو فوجی اور سیاسی امور میں مشورہ دینے لگ جاتی ہے۔

اگست ۱۹۱۵ء میں لکھتی ہے۔

"کیا میں اپنی آنکھوں پر یقین کر سکتی ہوں۔ میں وہ کچھ دیکھ رہی ہوں جو مجھے دیکھنے کی کبھی توقع نہ تھی میرے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے اور تم اپنا شاہانہ اقتدار دکھا رہے ہو وہ اقتدار جس کی روس کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے گذشتہ طرز عمل کو تبدیل نہ کرتے تو وہ تمہیں اور بھی نقصان پہنچاتا۔ اب صرف ایک راستہ باقی ہے اور وہ اپنے ارادوں میں مضبوط رہنا ہے......

میں اپنی اس گہری محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہوں........

خدا کے مقدس فرشتے تمہارے خواب کے محافظ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے قریب ہوں اور ہمیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ "تمہاری بیوی"

کس قدر المناک ہے کہ ایک عورت جو محبت بھری روح کی مالک ہے، وہ اس روح کو اپنی سیاسی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے استعمال کرے اور اپنے خاوند کو اپنی مرضی بلکہ اوباش راسپوٹین کی خواہشات کے مطابق مشورہ دے۔

ان خطوط میں سے چار سو سے زیادہ شائع ہو چکے ہیں اور ان کے ایسے اقتباس بے شمار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں زارینہ کسی افسر کی معزولی کسی امر کی طرف اقدام۔ کسی کی تقرری اور کسی شخص کی معافی کی خواہش کرتی ہے۔ ایک خط میں زارینہ لکھتی ہے۔ "راسپوٹین آپ سے التجا کرتا ہے کہ کسی کو "ریگا" کی طرف بڑھنا چاہیئے۔" زار کے پردے میں زارینہ کام کر رہی تھی۔ لیکن زارینہ بدمعاش راسپوٹین کے اشاروں پر تھی۔ جس کا نام روس کی تاریخ کے اوراق پر ایک شرمناک دھبہ ہے

زارینہ کی اپنے اختیار کردہ وطن سے وفاداری پر بھی جنگ کے دنوں میں حرف رکھا گیا تھا۔ لیکن جو ثبوت فراہم ہو چکے ہیں اُن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حب الوطنی کا جذبہ نہایت مستقل ہے دستوری اصلاحات یا اصلاحاتی طرز حکومت کی سخت دشمن تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب اس کا بیٹا بر سر حکومت ہو روس کا تخت صحیح سلامت اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اور اس کا خاوند دست اُسی روایتی مطلق العنانی سے حکومت کریں جس کے وہ عرصہ دراز سے زیر نگین رہا ہے۔

وہ ایک نیک عورت تھی۔ لیکن اُس نے اپنی طاقتوں کا استعمال برائی کے لئے کیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کے حالات سے اچھی طرح واقف ہونے سے وہ اپنی طاقتیں بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ صرف کر سکتی۔ لیکن اس حالت میں اس کا استعمال بھی جائز ہوتا۔ صرف حالات اُسے یہ بتا سکتے تھے کہ اب لوگوں کے دلوں میں آزادی کی خواہش ہے اور قدیم روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوئی خواہش اس روح کو دبا نہیں سکتی۔

تاہم اپنے خاوند کی رہنمائی کرنے کی کشمکش میں اُس نے اس کی محبت حاصل کر لی تھی۔ زار کی ابتدائی عمر میں اس کی ماں اس کی راہنمائی کرتی تھی اور شادی کے بعد اس کی بیوی اس کو راستہ دکھاتی تھی۔ زار نازک طبع اور کمزور شخصیت ہونے کی حیثیت سے وزرا کے مشورے سے مطمئن ہو جاتا۔ لیکن بیوی کی محبت اس کو اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی محبت نے روس میں ایک اور طاقت پیدا کر دی تھی جس کا یہ دونوں مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

اس المناک افسانے کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے۔ غلطی پر غلطی ہوتی ہے۔ تباہی پر تباہی آتی ہے۔ یہاں تک کہ راسپوٹین قتل کر دیا جاتا ہے۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں انقلاب برپا ہوتا ہے اور آخر کار شاہی خاندان جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔

زار اور زارینہ کی ازدواجی زندگی کا آخری باب مردانہ شجاعت کا ایک المناک افسانہ ہے میاں اور بیوی کے خانگی تعلقات نے روس کو ایک ایسی شورش پر آمادہ کر دیا تھا جو بہت حد تک انقلاب فرانس سے مماثلت رکھتی تھی۔ ملک کی اس ہولناک تباہی کی ذمہ داری زیادہ حد تک خاندان اور ایک دوسرے کی اس محبت اور وفا شعاری پر عاید ہوتی ہے جو اس شک نہیں کہ بیرونی ذمہ داریاں نہ ہونیکی صورت قابل تعریف و پرستش ہوتی ہے۔ لیکن جب ان پر دوسروں کی خوشی کا انحصار بھی ہو تو وہ نہایت قابل مذمت اور خود غرضانہ شمار کی جاتی ہے۔

یہ صفات تھے جنہوں نے اُنہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی زندگی کے اس حسرتناک واقعہ کا مقابلہ ایک وقار اور شان کے ساتھ کر سکیں جلاوطنی کی زندگی کے حالات ایک فرانسیسی اتالیق موسیو شیلارڈ نے لکھے ہیں جو شاہی خاندان کے ہمراہ "ٹوبولاسک" میں مقیم تھا۔ اپنی اسیری کے دردناک مصائب کو فراموش کرنے کے لئے زار اپنے لڑکے کو تاریخ اور علم ادب کا درس دیتا تھا۔ شام کے وقت خاندان کے

تمام افراد پڑھنے اور گفتگو کرنے کیلئے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ اکٹھے دعا مانگتے تھے اور جب تک قید خانے کے محافظ انہیں اجازت دیتے رہے وہ کلیسا کی عبادت میں ایک دلفریب لیکن رقت انگیز سادگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اُن کی جلا وطنی کا دوسرا مقام ایکاٹرن برگ جہاں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ توبولاسک سے کہیں بڑھ کر خوفناک تھا یہاں اُن کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ اور اُن کی آزادی پر اس قدر پابندیاں عائد تھیں کہ وہ نہ ہونے کے برابر تھی انکو تین تنگ کمروں میں رکھا گیا تھا جنہیں سے دوسونے کیلئے اور ایک دوسری ضرورت کیلئے تھا۔ انکے دریچوں میں سے باہر جھانک کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور مجبوراً انہیں اپنے بدتمیز محافظوں کے وحشیانہ اور شرمناک گیت سننے پڑتے تھے محافظوں کو انسے سخت نفرت تھی اور انکا افسر جو ایک متعصب اشتمالی تھا اچھی طرح جانتا تھا کہ ان حسرت نصیب اسیروں کو کس طرح عذاب دیا جا سکتا ہے جانکنی کے ان لمحوں میں زارینہ کو صرف اپنے مذہبی عقائد میں اطمینان میسر آسکتا تھا اُس نے اسے ان میں تلاش کیا اور پالیا۔ ممکن ہے اس کو اس امر کا احساس ہو گیا ہو کہ اس کا اس کے خاوند اور رعایا کی زندگی پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ لیکن وہ شجاعانہ اطمینان کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد پر ثابت قدم اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔

آہ! جلاوطنی کے ان المناک اور تاریک لمحوں میں ان کی روح کی زندگی کا سہارا صرف وہ محبت تھی جس نے ان دونوں کو مدت ہوئی ایک رشتہ میں باندھ دیا تھا۔ اب مصائب برداشت کرنیکے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ اب روس یا دنیا کی پالیسی کا کوئی مسئلہ اُن کی تاریک زندگی کو زیادہ تاریک نہ بنا سکتا تھا۔ ان کو ایک دوسرے کے سوا مطلقاً کوئی سہارا نہ تھا۔ بیرونی دنیا سے تمام تعلقات قطع ہو چکے تھے۔ صرف دل میں ایک موہوم سی اُمید تھی جو لمحہ بلمحہ کمزور ہوتی جا رہی تھی اور وہ انگلستان میں پناہ لینے کا خیال تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اب بھی اسی طرح وابستہ تھے جس طرح وہ شادی سے پیشتر کی ملاقاتوں خانگی زندگی کے غموں اور مسرتوں۔ بچوں کی پیدائش کی خوشیوں اور بیماری کے ایام کی فکر مندیوں اور ذاتی مصیبتوں کے شریک رہے تھے۔

اگرچہ حسرت نصیب زار اور زارینہ کو رحم و ہمدردی کا مستحق نہ گردانا جاتا تھا لیکن موت کے فتوے کی تعمیل کرتے ہوئے نادانستہ طور پر اس قسم کے انسانی جذبات کا اظہار ہو ہی گیا۔ شاہی خاندان کو اس امر کی اطلاع نہ دی گئی تھی کہ اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائیگا

جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک دن انہیں جلدی سے تہ خانہ میں جانے کیلئے کہا گیا۔ زار نے خیال کیا کہ شاید کہیں سفر پر جانیکی تیاری ہو رہی ہے لیکن اسے اور اس کے غم نصیب ہمراہیوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ سفر آخرت کی تیاری کی جا رہی ہے۔

آہ! بدنصیب زار کا آخری فعل نہایت دردناک تھا۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ وقت آپہنچا ہے اُس نے زارینہ کو حملہ سے بچانے کے لئے اپنے پیچھے کر لیا اور خود سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ زار زارینہ چاروں حسین لڑکیوں اور لڑکے کو گولی مار دی گئی اور اُن کے جسم آگ سے تلف کر دیئے گئے۔ اس طرح تاریخ کی ایک شاندار ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی قدیم روس کے تمام آثار ختم ہو جاتے ہیں۔ نرس کیول کے یہ آخری الفاظ

"صرف حب الوطنی کافی نہیں"

لافانی بن چکے ہیں۔ لیکن آہ زار اور زارینہ کے یہ الفاظ ابدی ہو سکتے ہیں۔

"صرف محبت کافی نہیں"

نازش رضوی

صبح صحرا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوی اوج طور

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور — وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی طینوا اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

"دنیا کی مشہور ترین عورت
"ہیلن کیلر" جو اندھی ہے۔لیکن
دیکھتی ہے۔بہری ہے۔مگر سنتی ہے۔
نیچے کی عبارت اسکے اپنے ہاتھ
کی لکھی ہوئی ہے"　　　(رسالہ ادبی دنیا

ہیلن کیلر

"If you can enjoy the Sun and flowers
and music where there is nothing except
darkness and silence you have proved
The Mystic Sense ___ Helen Keller.

The Victoria Press,
Ry. Road, Lahore
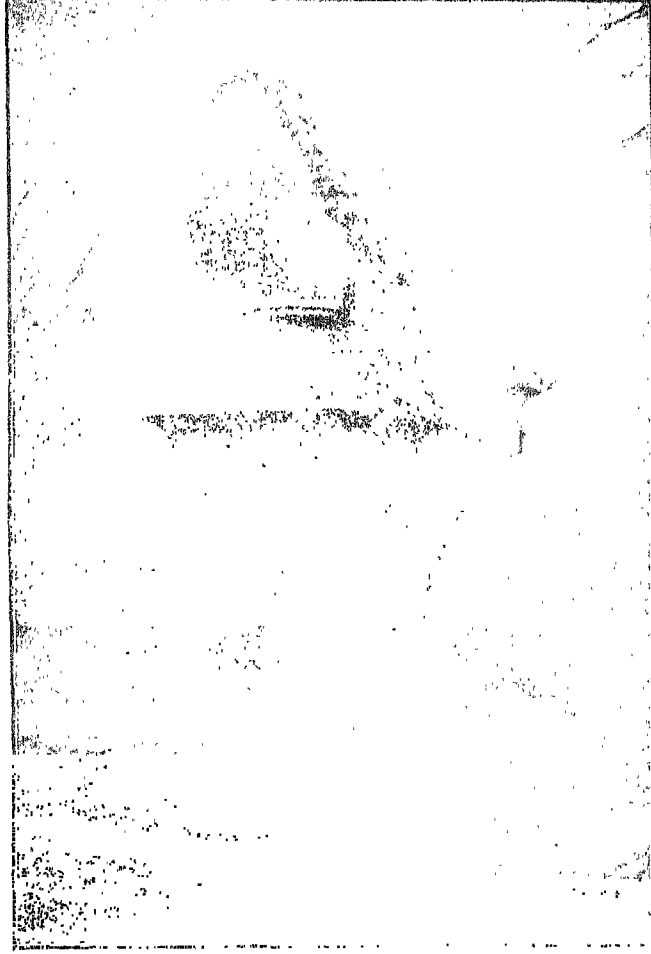
فن فوٹوگرافی کے موجد ڈیگرے کی یادگار
نیشنل میوزیم واشنگٹن کے صحن میں

فوٹوگرافی

فوٹوگرافی کی ابتدا

فوٹوگرافی کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی سائنس کے دوسرے شعبوں کی مانند صرف ایک آدمی کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کی تعمیر کا کام بے شمار کام کرنے والوں نے کیا ہے۔ اور ہر ایک نے اس علم کی عمارت میں ایک ایک اینٹ کا اضافہ کر کے اتنا رفیع الشان بنا دیا ہے کہ یہ تفریح طبع ہی کا سامان نہیں رہی بلکہ ایک مستقل صنعت اور علم بن گئی ہے۔ جن لوگوں نے اس کی ترقی میں جان توڑ کوششیں کی ہیں اُن کے نام سے لوگ بہت کم واقف ہیں۔ لیکن مہذب دنیا نے اُن کو فراموش نہیں کیا اور اُن کی دماغی محنت کا معاوضہ مختلف یادگاروں کی شکلوں میں دیا ہے۔

قدیم مصریوں کو اس بات کا علم تھا کہ کسی بند کوٹھڑی میں اگر کسی چھوٹے سے سوراخ سے روشنی گذرے۔ تو سوراخ کے سامنے والی دیوار پر باہر کے تمام نظارے کا عکس پڑتا ہے۔ اور یہ عکس اُلٹا ہوتا ہے۔ ارسطو نے آج سے ۲۲۰۰ سال قبل بتایا کہ یہ سوراخ خواہ گول ہو یا تکون یا چوکور جب اس میں سے روشنی گذرے گی تو اس کا عکس ہمیشہ دائرے کی شکل میں ہو گا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اس ترکیب سے مصور باہر کے نظارے کا عکس کاغذ پر لے لیا کرتے تھے۔

مصریوں کو معلوم تھا کہ شورے کے تیزاب میں حل کی ہوئی چاندی کا پانی جب کسی چیز پر لگ جائے اور اُس کو روشنی میں لایا جائے تو اس کی رنگت سیاہ ہو جاتی ہے اس کا ذکر ایک عرب کیمیاگر نے ساتویں یا آٹھویں صدی میں کیا ہے اور اس نے چاندی کے مرکب سے چند ایک رنگ بنانے بھی بتائے ہیں۔

سب سے پہلا کیمیاگر جس نے یقین کے ساتھ بتایا کہ چاندی کو سیاہ کرنے والی چیز روشنی ہے۔ جان ہنرچ شلتے ایک جرمن سائنسدان ہے۔ اس نے اپنے تجربات ۱۷۲۷ء میں شائع کئے۔ اس محقق کے بعد انگریز اور اٹلی کے کیمیاگر اس نتیجہ پر پہنچے۔ اگرچہ قیاس یہی ہے کہ اس کا علم بالواسطہ شلتے کی تحقیقات سے ہوا۔

کارل ولہلم شیلے ایک اور جرمن کیمیاگر نے تحقیقات سے معلوم کیا کہ ارغوانی رنگ کی شعاعیں چاندی کو نہایت تیزی سے سیاہ کرتی ہیں اس قسم کی تحقیقات جاری تھی جس میں یورپ کے کیمیاگروں نے بہت دماغ سوزی کی۔ انگریز کیمیاگر تھامس ویج وڈ اور ہمفری ڈیوی کے نام کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے جنہوں نے سلور نائٹریٹ (شورے کے تیزاب میں حل کی ہوئی چاندی) میں کاغذ تر کر کے طرح طرح سے مختلف چیزوں کے عکس لیے۔

اسی زمانہ میں ایک فرانسیسی لوئیس ڈیگرے بھی تجربات کر رہا تھا۔ بے انتہا محنت کے بعد وہ اصلی تصویر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈاگیر پیرس کے قریب ایک گاؤں میں ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ عدالت میں چپراسی تھا اُس نے ڈیگرے کو سکول میں داخل کر دیا۔ ڈیگرے کو مصوری کا بہت شوق تھا سنہ ۱۸۲۵ء میں اُس نے فوٹوگرافی کی طرف توجہ کی اور اسے اس قدر شوق پیدا ہوا۔ کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ چنانچہ اس کی بیوی نے ایک مرتبہ کسی مشہور کیمیاگر سے دریافت کیا۔ اور کہا میں ڈیگرے مصور کی بیوی ہوں۔ کچھ عرصہ سے اُسے خبط ہو گیا ہے۔ کہ وہ کیمرے کے ذریعے تصویر لے سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ رات دن وہ اسی خیال میں غرق رہتا ہے۔ دن کو سوتا ہے نہ رات کو۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس کا دماغ نہ چل جائے۔ آپ ایک بڑے سائنسدان ہیں۔ کیا بتا سکتے ہیں کہ یہ کبھی ہو سکتا ہے۔ یا وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔

ڈومس نے جواب دیا فی الحال میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان تجربات کو کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ ناممکن نہیں رہیگا۔ اس لیے میں اس کو دیوانہ نہیں بتا سکتا"

ڈیگرے کی ترکیب یہ تھی چاندی کی پالش کی ہوئی تختی پر آیوڈین کے بخارات چھوڑے جاتے تھے جس سے سلور آیوڈائڈ بن جاتا تھا سلور آیوڈائڈ پر روشنی اثر کرتی ہے جب کیمرے کے اندر اس تختی کو کھولا جاتا تو اس پر عکس آ جاتا تھا۔ لیکن کچھ دکھائی نہ دیتا۔ لیکن اس تختی کو جب پارے سے بھری ہوئی تھالی پر رکھ دیا جاتا اور پارے کو ہلکی سی حرارت پہنچائی جاتی تو پارے کے بخارات آیوڈائڈ [illegible] سے مل جاتے تھے۔ جہاں زیادہ روشنی پڑی ہے اُتنا ہی زیادہ پارہ اُس جگہ جم جاتا تھا اور جہاں کم روشنی پڑی تھی وہاں کم اس طرح تصویر تختی پر آ جاتی تھی۔

دوسرا دور

سر ہمفری ڈیوی نے چاندی کے پانی سے کاغذ تر کر کے تصویر چھاپنے کی ترکیب تو معلوم کر لی تھی لیکن وہ تصویر زیادہ دیر پا نہ ہوتی تھی جب اس پر روشنی کا اثر ہوتا تو کاغذ کی تمام سطح سیاہ ہو جاتی۔ اسے سادہ پانی سے دھویا گیا۔ [illegible] پانی سے دھویا گیا کامیابی نہ ہوئی۔

آخر کار سر جان ہرشل منجم اور کیمیاگر نے سوڈیم ہائپو سلفائٹ سے تصویر پختہ کرلی۔ اور تب سے یہ دوا فوٹوگرافی میں بہت کام دے رہی ہے۔

۱۸۵۱ء میں موجودہ فوٹوگرافی کی ابتدا ہوئی۔ کلوڈین اسی زمانہ میں ڈاکٹر اپنے کام میں استعمال کر رہے تھے۔ ایک شخص سکاٹ آرچر نے کلوڈین فوٹوگرافی میں استعمال کرنے کے لئے انتخاب کی۔ سکاٹ آرچر مجسمہ ساز تھا۔ اور اپنے کمال کے نمونے محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے فوٹوگرافی سیکھی۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ پائروٹائلین کو ایتھر اور الکحال میں حل کرتا۔ اس میں پوٹاسیم آئیوڈائیڈ اور پوٹاسیم برومائیڈ ملاتا اور اس مرکب کو شیشے کی پلیٹ پر پھیلا دیتا۔ بعد میں پلیٹ کو چاندی کے پانی میں تر کر لیتا جسے کیمرے کے اندر رکھ کر عکس لیتا۔ پھر گیلک ایسڈ میں اس پلیٹ کو دھوتا اور فالتو چاندی کو سوڈا ہائپو سلفائٹ میں دھو لیتا جس سے تصویر پختہ ہو جاتی تھی۔ اس عمل سے بہت عمدہ اور خوبصورت تصاویر بنتی تھیں۔ اور موجودہ زمانے میں جتنے عمدہ لائن بلاک بنتے ہیں۔ سب اسی پر بنتے ہیں۔ اگرچہ یہ ترکیب بہت عمدہ تھی۔ لیکن پھر بھی عکس لینے میں وقت بہت صرف ہوتا تھا اور تصویر اُتارنے سے قبل بہت تیاری کرنی پڑتی تھی۔ سامان اس قدر رکھنا پڑتا تھا۔ کہ ہر ایک شخص اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ آخر کار ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر میڈاکس نے کامیابی کے ساتھ خشک پلیٹ ایجاد کر کے ایک نئی صنعت اور نئے تجربات و تحقیقات کا دروازہ کھول دیا۔ اور جہاں گھنٹوں پلیٹ کو عکس دینا پڑتا تھا۔ وہاں اب صرف ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں عکس دینا ممکن ہو گیا۔

خشک پلیٹ کی ایجاد کے ساتھ ساتھ دستی کیمرے بھی عالم وجود میں آگئے اور اب محقق، سیاح، طالب علم کیمرہ اپنے ہمراہ رکھتا ہے۔ کیمرے نے دنیا کے تہذیب و تمدن پر جس تیزی سے اثر کیا ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے ہر ملک کے رسم و رواج اور واقعات کو فوٹو کی تصاویر کے ذریعے اصل حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اخبارات۔ رسائل۔ تصاویر سے مزین ہیں۔

بچوں کی کتابوں میں بہت اچھی تصاویر دی جاتی ہیں تاکہ ان کی مدد سے تعلیم میں دلچسپی کا پہلو بھی باقی رہے مشکل سے مشکل سوال اس کے ذریعے حل کئے جاتے ہیں۔ فرانس امریکہ اور انگلستان میں نت نئے فیشن نکلتے ہیں۔ وہ فوٹو کی مدد سے دوسرے ممالک میں اشاعت پا جاتے ہیں۔ ادبی رسائل جو مہذب دنیا میں شائع ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ کہ اعلیٰ سے اعلےٰ تصاویر سے مزین نہ ہو جس سے نہ صرف مضمون نگار کے مضمون کی حیثیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ بلکہ ناظرین کی آنکھوں کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اس بات کا تجربہ بچوں پر اچھی طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ جو تصاویر اکثر بازار میں کھنچی جاتی ہیں وہ رسائل اور اخبارات میں شائع نہیں ہوتیں۔ اس کے کئی وجوہ ہیں اوّل جو تصاویر بازار میں اُتروائی جائیں اگر وہ اخبارات میں لگائی جائیں تو خرچ بے انتہا ہو گا۔ اس لئے ایسی ترکیبیں سوچی گئی ہیں جن سے کم خرچ پر بہترین تصاویر زیادہ تعداد میں چھپائی جا سکتی ہیں۔ یہ تصاویر بلاک پر سے چھاپی جاتی ہیں۔ بلاک دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک لائن بلاک کہلاتے ہیں اور دوسرے ہاف ٹون۔ لائن بلاک عموماً جست کے پلیٹ پر بنائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں لکیریں ہوتی ہیں۔ اس واسطے پورے طور پر سفیدی۔ سیاہی اور سایہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے بلاک ہاف ٹون ہوتے ہیں جن میں سایہ سفیدی اور سیاہی باریک جالی سے بنائے جاتے ہیں اور تیسرے رنگین تصاویر کے بلاک جو اگرچہ ہاف ٹون ہی ہوتے ہیں مگر ایک عجیب ترکیب سے تین رنگوں کے شیشوں میں سے رنگ پھاڑ کر بلاک تیار کئے جاتے ہیں اور جب تینوں رنگ چھاپے جائیں تو تصویر مکمل ہوتی ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بلاک کی بنوائی چھپائی کا خرچ بہت کم ہوتا ہے ادبی دنیا کا ایک رنگ کا بلاک تیس چالیس روپے سے کم میں تیار ہوتا ہو گا۔ اور سہ رنگی تصویر پر اس سے کئی گنا خرچ ہوتا ہے چھپائی اور کاغذ الگ رہا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ملک کے فائدہ کیلئے ادبی دنیا کس قدر اخراجات برداشت کر کے جاری کیا گیا ہے۔

(سمیع اللہ)

ذمہ داری کا احساس

تمہارے متعلق کچھ فرائض ہیں اُن کا پورا کرنا کچھ تمہارا فرض ہے تمہارے لئے کچھ حدود مقرر ہیں اُن سے تجاوز کرنا ظلم ہے۔ تمہارے لئے کچھ قوانین ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا ناانصافی ہے

(حضرت علیؓ)

ہماری اصلاح

میرے پاس یہ یقین کر لینے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ ہماری اصلاح کا دارومدار ہمارے ارد گرد کے حالات کی اصلاح پر ہے۔

(جمال الدین مشقی)

نیکی

میں اس کی کوئی وجہ نہیں پاتا کہ نیک کاموں کے اختیار کرنے میں سستی یا تاخیر کی جائے۔

(جلال الدین دمشقی)

مشرق و مغرب

مشرق اپنے ماضی کے فخریہ تذکروں میں گرفتار رہتا ہے۔ اور مغرب اپنے مستقبل پر غور کر کے ترقی کی راہیں دریافت کرتا ہے۔

(المرشد العزلی)

اوّلین محبّت

اس سے میری ملاقات لڑکپن میں ہوئی تھی لیکن لڑکپن سے بے فکری اور حماقت کا وہ زمانہ مراد نہیں جب نوجوان دل زندگی کی مسرتوں کا لطف اٹھانے پر تلا ہوتا ہے۔ بلکہ آپ لڑکپن کے الفاظ سے سترہ سال کے اس نوجوان لڑکے کا تصوّر کیجئے جو زندگی کا آغاز نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کرتا ہے۔ دورِ حاضرہ کا نوجوان جو ایّامِ رفتہ میں شاید اپنے ہم عمروں کی محفل کا ایک بے ہوش و خرد فرد ہوتا ہمارے زمانے میں اگر اس کا تمام وقت خود آرائی اور خود پسندی میں صرف نہیں ہوجاتا اور وہ ابھی اپنی شخصیت کے احساس سے قطعاً ناآشنا ہے فکرمند اور متین و سنجیدہ ہوتا ہے اور اس کے دل میں افق پر طلوع ہونے والے ہر واقع کے لئے احترام ہوتا ہے۔ اس کی متانت اور سنجیدگی اس کی عمر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی ذہن کی فضائیں۔ اس کے مطالعے اور مستقبل کے خیالات، اور خدا، فطرت اور فلسفہ کے تصورات سے لبریز ہوتی ہیں۔ وہ نوجوان ہوتا ہے لیکن وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرتا ہے۔ اس کی ہموار پیشانی خیالات سے پُرشکن اور اس کی طفلانہ نگاہوں میں استفسار کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ اس کے نوجوان ہونٹ جن پر ابھی روئیں تک نمودار نہیں ہوتی اس مسکراہٹ سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ جو اس عمر کو فطرت کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ زندگی کے اہم مسائل کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ ایک ناقابل بیان اضطراب محسوس کرتا ہے۔ وہ پہلی بار اضطراب محسوس کرتا ہے اور اس کی رُوح میں درد و کرب کی ایک تڑپ ہوتی ہے۔

اس کی رُوح ایک بھُولے ہوئے شاعر ایک فنا فی الذات صوفی ایک خالق جذبات مصوّر، ایک فلسفی، ایک سیاست دان اور——— ان عام نوجوانوں کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے شخص کی رُوح ہوتی ہے۔ جو اعتدال پسند ہوکر مفید شہری بنجاتے ہیں۔ لیکن ان تفکرات اور سوچ بچار اور خیالات کے درمیان جو وہ بہت بلند، عمیق اور دقیق نکات کے متعلق رکھتا ہے۔ اور خدا کائنات اور فطرت کے ان متفکرکن تصورات کے درمیان ایک خوش رنگ اور مقدس پھول کھلتا ہے اور وہ اس کی اولین محبت ہوتی ہے۔

ہم دونوں کی عمر سترہ سال کی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملاقات کرتے تھے لیکن جب ہماری نگاہیں ملتی تھیں ہم دل میں محبت اور ہمدردی کی لہر محسوس کرتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ ہم نوعمری کی تمام تر متانت اور حد سے زیادہ متین نوجوانوں کی تمام تر فکرمندیوں کے ساتھ اپنی ان مشکلات کا تذکرہ کرتے تھے کہ لوگوں کی کیا حالت ہے اور خدا ہے یا نہیں۔ ہم اپنی اولین محبت کے متعلق خاص طور پر باتیں کرتے۔ یہ وہ ایام تھے جن پر لعد میں ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اور وہ خیالات، تصورات، شکوک اور جھجک جن کا بعد میں ہم مذاق اُڑاتے ہیں۔ اولین محبت جسے ہم لعد میں حماقت کہا کرتے ہیں۔ آہ جب ہماری عمر سترہ سال تھی یہ باتیں کسقدر اہم اور کسقدر رشا نزار تھیں!

اس نے مجھ سے اپنی اولین محبت کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی محبوبہ کی عمر سولہ سال ہے۔ اس کے بال نہایت خوبصورت ہیں۔ اور موٹی لٹیں کمر تک لٹکتی رہتی ہیں۔ وہ گلابی جرابیں اور دلکش نیلگوں رنگ کا سایہ پہنتی ہے۔ اکثر اوقات وہ سفید قمیص اور سفید ساڑھی میں ملبوس ہوتی ہے۔ اور اس کی بھُوری سنہری زلفیں رخساروں کو بوسہ دیتی ہوئی اس کے متناسب کاندھوں پہ آپڑتی ہیں۔ اس وقت اس کی سادگی اور بھی دلفریب اور دلاویز ہوجاتی ہے۔

لیکن اس کی محبوبہ کی رعنائی اور حسن عالم فریب کے اس بیان نے مجھے چنداں متاثر نہ کیا۔ میرا دل اسکو اپنی اولین محبت کا حال سنانے کے لئے بے تاب تھا۔ میرا خیال تھا میری محبوبہ زیادہ حسین و جمیل اور پُروقار ہے۔ لیکن چونکہ میرا دوست نہایت ذوق و شوق اور گرمجوشی کے ساتھ گفتگو کررہا تھا میں نے قطع کلام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن میں دل میں خیال کرتا رہا کہ [illegible] ظاہر پرست ہے اس نے اپنی محبوبہ کی رُوح کے متعلق مجھے کچھ بھی نہیں بتایا کہ وہ حلیم الطبع ہے یا تند مزاج اس کے دل میں محبت آگیں جذبات ہیں یا نفرت آمیز؟ انداز شوخ و شریر ہیں یا شرم آگیں؟ کیا کبھی اس نے اس کے ساتھ رقص کیا ہے اور ٹینس میں اس کا شریک ہوا ہے۔ دیگر ہم عمروں کے ساتھ وہ اسے لیکر مال روڈ کی سیر کراتا ہوگا لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ باغ کی سایہ دار روشوں کی نا ٹوٹنے والی تنہائی

میں جبکہ سڑک پر موٹروں کی آواز محویت میں سنائی نہیں دیتی۔ گھاس کے زمردیں صوفوں پر بیٹھ کر کبھی اس نے اظہار تمنا بھی کیا ہے۔ اس حالت میں کہ اس کی محبوبہ نے شرماتے ہوئے اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھ دیا ہو۔ جس کی بے طرح دھڑکن سے اس کے نازک جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی ہو اور اس کے رخسار اور بھی تمتما اٹھے ہوں۔

لیکن وہ اس کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف اس فریفتگی اور ذوق و شوق سے کر رہا تھا کہ لارنس گارڈن کی ایک سرد اور سایہ دار روش پر ٹہلتے ہوئے میں قطع کلام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اسکی ہرن کی سی سیاہ آنکھوں۔ بھورے سنہرے بالوں، اس کی مسکراہٹ اور اس کی مستانہ خرامی کی تعریف میں اسقدر محو تھا گویا دنیا میں صرف وہی ایک شانزدہ سالہ دیوی ہے جس کا وہ شباب کی تمام تر اہمیت کے ساتھ عقیدت مند پجاری ہے۔ لیکن لارنس گارڈن کی "وادی کشمیر" کے مغربی پہلو کی روش کے موڑ پر "شیشے کے گلاک" کے قریب جہاں سے ایک اور معطر روش شروع ہوتی ہے اُس نے اچانک میرا بازو پکڑا اور کہا:-

"وہ ہے میری محبوبہ!"

میں نے دیکھا وہ واقعی حسین تھی اس کے ساتھ ایک بوڑھی آتون یا شاید کوئی رشتہ دار اور اس کی چھوٹی بہن تھی۔ بوڑھی عورت کا رنگ قدرے سفید تھا شکل و صورت شائد جوانی میں دلکش ہو لیکن اسوقت چہرہ اسقدر مکروہ اور نفرت سے بھرا تھا کہ اسے دیکھکر میرا دل لرز گیا۔ چھوٹی بہن کے انداز بہت پیارے تھے اس کا رنگ ذرا سیاہی مائل تھا۔ اور آنکھوں میں شرارت آمیز شوخی، انداز میں طفلانہ چلبلاہٹ۔ وہ ہلکے زرد رنگ کا فراک پہنے ہوئے تھی جو اُسے بہت پیارا لگتا تھا۔ چھوٹے سیاہ بال ہندوستانی طرز پر گندھے ہوئے تھے لیکن موجودہ زمانے کی روش کے مطابق اس کی مانگ ترچھی تھی اور ذرا سی چوٹی لپیٹ پر دونوں کندھوں کے درمیان پڑی تھی جسے وہ شوخی سے کبھی کبھی اس طرح پکڑتی کہ اس کی نازک کلائی گول سڈول کندھے کے مقابل ہو کر ایک کمان کی صورت اختیار کر لیتی ـــــــ اور بڑی بہن؟ وہ اپنے اسی بوڑھے بگلے سے سفید۔ اور بے داغ لباس میں ملبوس تھی اور اس کی مستانہ اور نستعلیق چال میں ایک دلفریبی تھی۔ بالکل قمریوں کی سی چال! بال نہایت خوبصورت اور آنکھیں نہایت سیاہ لیکن میرا خیال ہے اس کے چہرے پر کچھ بے اعتنائی اور غرور و تکبر کے جذبات نمایاں تھے اور میں حیران تھا کہ جب ہم اُسے سلام کریں گے یا دُور سے ہوا میں رومال ہلائیں گے تو وہ اس کا جواب بھی دیگی یا نہیں۔

میں جیب سے اپنا رومال نکالکر سر سے بلند کر چکا تھا کہ ایکا یک یہ دیکھکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ہماری طرف دیکھنے کی بجائے کسی اور طرف دیکھ رہی ہے۔ میرے دوست کا رنگ زرد تھا وہ ساکت و خاموش کھڑا تھا اور وہ اپنی "محبوبہ" کے حضور میں سر تک نہ جُھکا سکتا ہے ـــــــ اس کی چھوٹی بہن نے بے خیالی سے ایک شوخ نظر مجھ پر ڈالی اور اس پیاری لڑکی کی محبت کے معصوم جذبات میرے دل میں پیدا ہو گئے ـــــــ ہم گذر گئے۔

میرے دوست کا رنگ اب بھی زرد تھا اور وہ صاف گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا:-

"تم اپنی محبوبہ کو سلام نہیں کرتے؟"

اُس نے اپنی نگاہوں کی تمام تر معصومیت کے ساتھ مجھے دیکھا ان نگاہوں کے ساتھ جو دوسرے اوقات میں زندگی کی باریکیوں اور گہرائیوں میں غرق ہو جاتی تھیں اور لرزتی ہوئی آواز میں جو طفلانہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے بار بار رک جاتی تھی کہا "لیکن میں تو اس سے واقف نہیں ـــــــ .... میں اسے صرف دیکھتا ہوں......... تقریباً ہر روز یہاں ہی .... اسی معطر روش پر ...."

یقین مانئے میں نے قطعاً اس کا تمسخر نہیں اُڑایا۔ یاد رکھئے کہ میں نوجوان تھا اور یہ زندگی کے وہ ایام ہیں جن میں کسی چیز .... خدا ہے اور .... ہماری اولین محبت وغیرہ .... پر تمسخر نہیں اُڑایا جاتا۔ بلکہ انہیں خوفناک متانت کے ساتھ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس اولین محبت کو بھی جس سے ہم آشنا نہیں ہوتے .... نہیں میں نے قطعاً تمسخر نہیں اڑایا۔ بلکہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کے ان تمام جذبات و حسیات کا مطالعہ کرتا رہا جنہوں نے اسے اسقدر مسرور اور مغموم بنا دیا تھا۔ آہ! .... جب میں نے اپنی اولین محبت کا اس سے مقابلہ کر کے دیکھا وہ مجھے بہت حقیر اور غیر دلچسپ نظر آئی۔ اب میں اس کے متعلق اسے کچھ بتاتے ہوئے جھینپتا تھا۔

میں اپنے دوست کا بڑا مداح تھا اور میرے دل میں اس کا احترام تھا ....

اس واقعہ کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ شاید تین یا چار ـــــــ یا شائد پانچ سال۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ـــــــ لیکن کل شام طویل مفارقت کے بعد ہماری ملاقات پھر اسی روش پر

ہوئی۔ اب میں ایک نوعمر شاعر اور افسانہ نگار ہوں اور اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کر چکا ہوں۔ وہ اس عرصہ خاکِ وطن سے دُور اطالیہ، جرمنی۔ اور روس میں آوارہ پھرتا رہا ہے۔ وہ خیالات میں اشتراکی ہے اور دُنیا کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے پروائی سے کپڑے پہنتا ہے۔ خط نہیں بنواتا۔ خدا کی ہستی کا منکر ہے۔ اس کے خیال میں میری نظمیں اچھی نہیں اور میرا خیال ہے وہ صحیح کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے میرے افسانوں میں رنگینی زیادہ ہے۔ اور میں بہت تکلف کرتا ہوں یعنی انسانی درندوں کی خون آشامیوں کے خلاف جو الفاظ میری زبان سے دوران گفتگو میں نکل جاتے ہیں ان کو میں افسانہ میں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اور یہ کہ میں دنیا کی حق تلفیوں سرمایہ داروں کے مظالم، تہذیب مغربی کے خوفناک اثرات اور قدیم مذہبی تصورات کے خلاف زبانی آواز تو اٹھاتا ہوں لیکن تحریر میں ان کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ × × × × × × یہاں شاید وہ غلطی پر ہے۔ اور میرے جدید احباب جانتے ہیں لیکن باتیں کرتے کرتے مجھے اس کی خشک آواز میں وہ نازک لوچ محسوس ہوئی جس نے میرے دل پر اسقدر خوشگوار اور رُوح پرور اثر کیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے ملا کر کچھ سوچتے ہوئے سر جُھکا لیا۔ اور اس انداز میں اسنے پھر مجھے اپنا افسانہ الفت سنایا۔ اس بار اس کی محبت شدید تھی جب میں نے اسے اس کی معطر روش والی نوعمر لڑکی کا واقعہ یاد دلایا وہ افسردگی کے ساتھ ہنسا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ اصلاح کے عالم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے کمزوری محسوس کرتا ہے تو محبت کے یہ جذبات جنکی اب اس کے دل پر حکومت ہے اس کو تھامتے اور اس کے دل مضبوط کرتے ہیں۔

اس نے اپنا افسانہ الفت بیان کیا۔ اور فلسفیانہ الفاظ میں اپنی محبوبہ کے حسن و جمال اس کے ناز و انداز اس کے عمیق ترین خیالات اور اس کی روحانی دلفریبیوں کی مکمل تصویر کھینچی۔

میں نہایت صبر و متانت سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ لیکن اس صبر و متانت سے نہیں جس سے میں نے چند سال پیشتر اس کی حماقت آمیز محبت کی داستان سُنی تھی۔ میں نے اس مدح سرائی میں مداخلت نہ کی۔ یہانتک کہ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور مسکراتے ہوئے کہا:۔

"یہ اسکی تصویر ہے جو میں ہر وقت اپنے دل کے ساتھ رکھتا ہوں۔

اس نے تصویر میرے ہاتھ میں دی۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ وحشی صورت نوجوان جو دنیا سے بیزار ہو چکا تھا چند سال پیشتر کا وہی سترہ سالہ لڑکا تھا جو "وادئ کشمیر" کے مغربی پہلو کی معطر اور سایہ دار روش پر سے گذرنے والی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے تند لبوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے آگے کو جھکا اور اپنی نرم اور گہری آواز میں گویا وہ کسی راز کو بیان کرنا چاہتا ہے یہ الفاظ کہے "چاہے تم مجھے احمق خیال کرو۔ بات یہ ہے کہ جس طرح میں نے اس سفید لباس والی بوڑھیوں کی سی متین لڑکی سے کبھی بات نہ کی تھی۔ اسی طرح اس حور پیکر کے حُسن کا نظارہ بھی نہیں کیا جس سے مجھے اب محبت ہے۔ میں نے اس کی صرف تصویر دیکھی ہے اور یہ اس کی ماں کے بیان کے عین مطابق ہے جس کے گھر میں میں کچھ مہینے ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہتا رہا ہوں۔ ان ایام میں یہ لڑکی ——— میں ڈاکٹری کا مطالعہ کر رہی تھی۔

× — × — × — × — × — × — × — × — × — ×

— × — × — × — × — × — × — × — × — ×

میں خاموش کھڑا تھا۔ میری کانپتی ہوئی انگلیوں میں تصویر تھی۔ یہ اسقدر خوبصورت تھی کہ میں زبان سے ایک لفظ تک نہ نکال سکا۔ اور میرے دل پر وہی رنگین غبار سا طاری ہو گیا جو گرمیوں کی ایک شام "وادئ کشمیر" کے مغربی پہلو پر جب میں نے یہ الفاظ سنے تھے "میں تو اس سے واقف نہیں ہوں"۔ دھنک کے ہلکے ہلکے رنگوں کی مانند میرے حواس پر چھا گیا تھا۔ کیا میں اس کی ہنسی اُڑا سکتا تھا؟ ہرچند میری طبیعت میں اب حقارت کے کچھ جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ اور میری نظمیں اور افسانے اس کے شاہد ہیں۔ لیکن وہ نفرت و حقارت ان انسانی جذبات کے لئے نہیں ہے جو ایک طلسم فریب پیدا کر کے "ایگو" کو مصروف کار کر دیتے ہیں۔ بلکہ وہ ان وحشی اور درندہ خصلت انسانوں کے لئے ہے جن کی زندگی انسانی خون پر ہے اور جو پیٹ کو دنیا کی کمزور ہستیوں سے بھرنا چاہتے ہیں۔

آہ! ہم انسانوں کے لئے بعض مضحکہ خیز چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں وہ طفلانہ جذبات جو عالم شباب میں ہم مردوں اور عورتوں کے دلوں میں رہتے ہیں اکثر اوقات فطرت انسانی کے صحیح آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس شے سے محبت کرنا جو ہم سے بہت دُور ہے اور جس سے ہم اچھی طرح آشنا نہیں۔ فریب میں مبتلا ہو کر اپنے دل کی تمام تر پاکیزگی اور نزاکت کے ساتھ اس سے محبت کرنا اور پھر انتہائے سادگی کے ساتھ اپنے دوست کے سامنے اس کا اعتراف کرنا آسمانی حماقت کی رقت انگیز سادگی ہے جو اگر ہم سب میں نہیں تو چند کے دلوں میں ضرور ہوتی ہے۔ اور ان چند کی تعداد اسقدر ہے کہ اگر وہ سب آپ کے سامنے اعتراف کریں تو آپ حیران رہ جائیں۔"

× × × × × !

حنیف ہاشمی

بہار اور عشق

گلاب کی شگفتگی سے زینت بہار ہے ہوا کی نگہتوں سے کائنات مشکبار ہے

چمن میں ایک سیل رنگ و نور بیقرار ہے فروغ ماہتاب سے نگاہ زرنگار ہے

نگاہ زرنگار ہے فروغ ماہتاب سے

ہجوم لالہ و سمن سے باغ جلوہ خیز ہے لطافت شمیم سے نسیم عطر بیز ہے

نوائے اہل درد سے فضا سرود ریز ہے فسانۂ شباب سے شراب نغمہ تیز ہے

شراب نغمہ تیز ہے فسانۂ شباب سے

لطافتوں کے جوش میں ہے عشق سرنگون غم بلائے اضطراب دل مصیبت جنون غم

نشاط زار زندگی پہ چھا گیا فسون غم بہار کے رباب سے ٹپک رہا ہے خون غم

ٹپک رہا ہے خون غم بہار کے رباب سے

عابد

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

ہاں ہم نہ تھے فریب تمنا سے بے خبر کیا کہئے کیا کیا دل امیدوار نے

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار نے

فانی

محبّت اور اُمّید

صبح کی سُہانی فضا میں ایک سمندر کے ریتیلے کنارے پر "محبت" اور "اُمید" نسیم سحری کے خوشگوار جھونکوں میں کھیل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سورج کی کرنیں نمودار ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ آفتاب آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے لگا۔

"محبت" یہ دیکھ کر وہاں سے متحرک ہوئی۔ سمندر کے بالکل کنارے جا پہنچی اور مسکراتی ہوئی اپنی کشتی میں بیٹھ گئی۔ بیچاری "امید" اکیلی سمندر کے کنارے رہ گئی۔ "محبت" نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سمندر کی تفریح کو تھوڑی دیر کے لئے جا رہی ہوں"۔ یہ کہکر محبت نہایت مسحور کُن ادا سے ہنس پڑی "امید" اس مسکراہٹ سے بہت متاثر ہوئی اور اُس معصوم فطرت، دوشیزہ نے جس کو دھوکا اور جھوٹ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، یقین کر لیا کہ "محبت" ضرور لوٹ کر آئیگی۔

"اُمید" "محبت" کے انتظار میں سمندر کے کنارے ٹہلتی رہی اور بے چین ہوتی رہی۔

شام ہوگئی۔ آفتاب کی مدہم شعاعیں سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیلنے لگیں اُمید ایک خواب جیسی خود فراموشی میں ریت پر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ وہ بار بار "محبت" کا نام ریت پر لکھتی اور بار بار سمندر کی موجیں آکر اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیجاتیں۔

آخر کار سمندر میں بہت دور ایک سنہرا بادبان نظر آیا اور اُس دوشیزہ کی طرف حرکت کرنے لگا اُس نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "یہ دولت کی کشتی ہے جس کا بادبان نظر آرہا ہے۔ بادبان کیسا منور ہے۔ اس کا سنہرا پن سمندر میں کیسا منعکس نظر آرہا ہے۔ لیکن آہ! یہ "محبت" کا بادبان نہیں"۔

"اُمید" بیچاری رنجیدہ ہوگئی ——— تھوڑی دیر گذر گئی۔

دوسرا بادبان نظر آیا۔ دوشیزہ نے پھر ٹھنڈی سانس لیکر کہا "آہ! یہ تو دوستی کا بادبان ہے۔ اس کا چراغ سمندر کی لہروں میں جگمگا رہا ہے۔ اور اس چراغ کی روشنیاں بھی پرسکون ہیں۔ لیکن پیاری "محبت" کی شمع کی تنویریں بہت زیادہ پرسرور، روشن اور پرسکون تھیں۔ مگر افسوس وہ کہاں؟"

تھوڑی دیر اور گذر گئی۔

تمام خلا، وملا، سطح سمندر اور ریگستانوں میں رات نے اپنا سیاہ خیمہ تان دیا سنہرے اور سرخ بادبان نظروں سے اُوجھل ہو گئے۔ اُمید کے رنگین اور طربناک خواب بیداری میں تبدیل ہو گئے۔

"محبت" پھر کبھی واپس نہ آئی۔

(ترجمہ از انگریزی)

محشر عابدی

مدیر "پروانہ"

عشق

عاشق، انسان کامل، کمال وجمال کا متلاشی ہے۔ عاشق روحانیت اور معنویت کے اُس بلند مرکز پر ہوتا ہے۔ جہاں دوسرے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ اس عالم سے اوپر ایک اور عالم ہے وہ عالم روحانی ہے اور پاک روحوں کا مسکن ہے وہاں روحانیت معنویت اور عشق کی تجلیاں ہیں اور بس۔

عشق کے لئے تجسس کا سودا اور جستجو کا جنوں لازمی ہے۔ جہاں عشق ہے وہاں جستجو ہے اور جہاں جستجو ہے وہاں عشق ہے۔

عشق مختلف مناظر میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی حقیقت کی تجلی گاہ میں ضیا افگن ہوتا ہے اور کبھی مجاز کے پردوں سے چھن کر باہر نکلتا ہے۔ اور ایک عالم کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

عشق خواہ کسی رنگ میں ہو اور کسی جگہ ہو اس کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے۔ عشق حقیقی ہو یا مجازی۔ مادی ہو یا روحانی۔ دائمی ہو یا وقتی وہ نور ہے جو ایک ہی روشنی کا پرتو ہے۔

(فارسی)

ترقیِ اُردو

بدقسمتی سے برادرانِ ہنود میں فی زمانہ یہ خیال عام ہے کہ زبان اردو کو مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے اور اسی بنا پر مصنوعی قسم کی ہندی اختراع کرنا چاہتے ہیں جس کے الفاظ اردو سے بالکل علیحدہ ہوں حقیقتاً جس زبان سے اُردو پیدا ہوئی ہے اُس زبان کی ساخت بلحاظ صرف و نحو کے ہندی زبان ہے اور اُس کو مسلمانان زمانۂ مغلیہ نے اس ملک میں عام بول چال کے لئے اختیار کر لیا تھا۔ ابتداً اس میں اور معمولی ہندی میں جو ہنود بولتے تھے مشکل سے امتیاز کیا جا سکتا۔ گو اس زبان میں مذہبی اور انتظامی اصطلاحات فارسی اور عربی سے ماخوذ تھیں۔ اگر قدیم مسلمان شعرا مثلاً ملک محمد جائسی کی تصانیف کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مذہبی اصطلاحات میں بھی ہندی الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جتنی ترقی ہوتی گئی اُتنا ہی یہ امر ناگزیر ہوتا گیا کہ مذہبی۔ ملکی۔ فوجی اور انتظامی اصطلاحات فارسی۔ عربی۔ اور ترکی زبانوں سے لیکر شامل کی جائیں۔ اس لئے کہ یہ باتیں ان مختلف الاقوام مسلمانوں کی تھیں جن کی حکومت ہندوستان میں تھی۔

زمانہ سابق میں اُردو زبان نسبتہً غیر زبانوں کے الفاظ سے پاک تھی صرف جہاں ناگزیر ضرورت لاحق ہوئی ایسے الفاظ لے لئے گئے۔ اس کی نظیر انگریزی زبان کی ترقی میں بھی ملتی ہے۔ اس لئے اس زبان میں بھی ایسی ہی ضرورت سے نارمن الفاظ سیکسن الفاظ کے ساتھ شامل کئے گئے۔ جب تک صرف ایسے ہی بیرونی الفاظ شامل کئے گئے جن کی اشد ضرورت پائی گئی اس وقت تک زبان کا نشو و نما صحت کے ساتھ ہوتا رہا اور اس کے خلاف کوئی خاص اعتراض نہیں ہوا۔ شعرائے ریختہ مثلاً نذیر کا یہ خاص فخر تھا کہ ایسی آسان اصطلاحیں لکھی جائیں جو حتی الامکان عوام الناس کی بول چال سے قریب تر ہوں۔

انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں پھر ایک انقلاب پیدا ہوا۔ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کے قواعد و ضوابط کی بجائے انگریزی یا ہندی قواعد و ضوابط رفتہ رفتہ داخل ہونے لگے جس کا اثر ہندوستان کی زبانوں پر کافی طور سے پڑا۔ قبل ازیں سرکاری دفاتر و اسناد و بین الاقوامی اور دستاویزوں میں نیز قانونی عدالتوں میں ہر جگہ فارسی زبان مروج تھی۔ اس کو اپنے اعلیٰ درجہ سے رفتہ رفتہ اُتار دیا گیا۔ آخر کار عہدِ انگلشیہ میں اس کی جگہ انگریزی زبان لے لی گئی۔

ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں اُس وقت الفاظ کا ایسا سلسلہ موجود نہ تھا جن کا سلسلہ درباروں، عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں آسانی ہو سکتا ہو۔ ہند کی قدیم زبان سنسکرت سے ایسے الفاظ دستیاب ہو سکتے تھے۔ مگر یہ زبان مردہ زبان تھی۔ فارسی کو جب سرکاری زبان کے عہدہ سے معطل کیا گیا تو ہندوستان میں وہ بھی مردہ زبان ہو گئی مستشرقین مثلاً سر ولیم جونس اور اُن کے احباب نے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال تھے یہ کوشش کی کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کے ذرائع پیدا کئے جائیں اور اس کے ساتھ سنسکرت فارسی اور عربی قدیم زبانوں کی بھی تعلیم دی جائے۔ وارن ہسٹنگز اور دیگر مدبران ملک نے ان ہر دو اغراض کے لئے بہت سا روپیہ عطا کیا اور ذی علم پنڈتوں اور مولویوں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی مگر ہمیں اس بات کو ماننا پڑے گا کہ جن ذی علم پنڈتوں اور مولویوں کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کی گئی وہ اصل وہ محدود النظر اور کوتاہ بین عالم تھے اور اُن کی تصانیف میں یہ نقص ضرور پایا جاتا تھا کہ علم کی گراں باری نے اُن کو زمین کی پستی تک پہنچا دیا تھا۔

علاوہ بریں یہ بھی خطرہ پیدا ہوا کہ قانونی کتابیں متعلق شرع و دھرم شاستر اور نیز ہندوؤں و مسلمانوں کا قدیم علم الادب دونوں ایسے عالموں کے مردہ علم کے بوجھ سے غرق ہونے لگے۔ مگر حسن اتفاق سے یورپ کے بعض ایسے وسیع النظر ذی علم افراد سے ہمیں بڑی مدد ملی جنہوں نے ہمارے قدیم علوم کو فنا ہونے سے بچا لیا بطور مثال مصنفین اور مدبرین مثلاً سر ولیم جونس و ہملٹن و مین کے نام قابل ذکر ہیں اور دیگر مستشرقین مثلاً سر ولیم جونس ممدوح الصدر و آوسٹلے و میکس مولر کے نام بھی قابل فراموشی نہیں ہیں۔ اُنہوں نے ہند کے عُلوم کو پڑھا اور اُنھیں کی بدولت قدیم آریہ زبان کے عُلوم حاصل کرنے کا آغاز اور اُس کی ترقی ہوئی اور اہل ہند اور اقوام یورپ کے متحدہ الاصل ہونے کا ثبوت ملا۔ ہر چند اُن کی تصانیف میں سے بعض امور اب غیر صحیح ثابت ہوئے ہیں مگر تاہم اُنہوں نے جس خوبی و اعلیٰ دماغی قابلیت سے رہنمائی کی ہے اُس کا ہم کو تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

ملکی زبانوں کی ترقی میں ان صاحبوں کی امداد اُس قدر دستیاب نہ ہو سکی جس قدر قدیم زبانوں میں حاصل ہو سکی۔ ہندو اور مسلمان علما جو فورٹ ولیم کالج یا مدرسہ کلکتہ یا بنارس کی درسگاہِ سنسکرت میں بُلائے گئے تھے وہ ایسے عالم تھے جو ہند کے قدیم علمی طریقہ میں غرق تھے جن کو وہ قدیم علمی طریقے سمجھتے تھے جب

اُن کو ملازمین ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالعہ کے لئے ہند کی دیسی زبانوں میں کتب درسیہ مرتب کرنے کا حکم ہوا تو اس کام کی انجام دہی میں بدقسمتی سے اُنھوں نے اپنے پرانے خیالات پر عمل کیا جس کا نتیجہ زندہ علمی زبانوں کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ ہر چند انگریزوں کا یہ مقصد نہ تھا کہ ملکی زبانوں میں اور زبانوں کی تقلید کی بجائے۔ لیکن ان علماء کے نزدیک عوام الناس کی مادری زبانوں کی کوئی عظمت نہ تھی تاہم حسب الحکم اُن کو ایسی ہی ملکی زبانوں میں کتابیں تیار کرنی پڑیں اس لئے اُنھوں نے کتابیں ایسی زبان میں نہیں تیار کیں جو عام لوگوں میں فی الواقع بولی جاتی تھیں، بلکہ اپنے ہی خیالات کے موافق زباندانی کے قواعد پیدا کئے جن سے اپنا علم نمایاں ہو۔ ہندو پنڈتوں نے سنسکرت سے بے انتہا الفاظ دیسی زبانوں میں بھر دیئے اور مولویوں نے بھی عربی و فارسی سے ایسا ہی کام لیا۔

اس طریقہ کا خاص اثر بنگالی اور ہندوستانی (یعنی اُردو) ان دو زبانوں پر پڑا۔ بنگالی زبان بالکل سنسکرت کے الفاظ اور محاوروں سے معمور ہو گئی اور اُنہیں کا رواج زمانۂ حال تک رہا۔ حال ہی میں بنگالی ڈراما اور بنگالی اخبار۔ اور بنگالی شاعری اور قصہ نویسی کے جدید اساتذہ نے کوشش کی ہے کہ اس رواج کو مٹایا جائے اور عوام الناس کی اصلی زبان سے علمی زبان بھی قریب تر کر دی جائے ہندوستانی زبان میں ایسے قدیمانہ عمل سے اقوام ہنود و مسلمانوں کے مابین ایک ایسا بُرا اثر پیدا ہوا جو ہنوز اظہر من الشمس ہے۔

سنسکرت کے ماہر پنڈتوں نے ایک ایسی مصنوعی ساخت کی ہندی زبان پیدا کی جس کو صرف ذی علم سنسکرت دان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ادھر مولویوں نے اُردو کی ایسی فارسی آمیز بولی پیدا کی جس کو صرف فارسی کے اچھے جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس طریقہ پر ان ممالک میں دو مختلف قسم کی زبانیں ترقی پانے لگیں، حالانکہ لوگوں کی مادری زبان ایک ہی ہے گو مختلف اضلاع کے خفیف اختلافات ضرور موجود ہیں۔ بہاری لال کے ستئے جو مشہور ہیں اُن کی پر صنلع ہندی دراصل پر زور ہندی ہے۔ مگر جو پر تصنع ہندی کی تصانیف انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شائع ہوئی ہیں وہ درحقیقت اکثر ایک قسم کی غیر مانوس سنسکرت کتابیں جو ہندی لباس میں جلوہ گر ہیں اسی طرح سودا کی پر صنائع اردو کم سے کم فصیح اُردو ہے۔ مگر وہ اُردو شاعری جس کے متعلق مولینا حالی نے صدائے مخالفت بلند کی ہے دراصل ایک قسم کی فارسی ہے جو اُردو کے جامہ میں ملبوس ہے۔

اُردو ہندی کے باہمی امتیاز پر اس قدر قوت صرف کی گئی ہے کہ اب اُن کا سابقہ حالت پر واپس آنا ممکن نہیں میں نے اوپر ثابت کیا ہے کہ اس معاملہ میں قصور صرف ایک قوم کا نہیں ہے، بلکہ دونوں قوموں کا ہے۔ اب ہم صرف اس قدر کر سکتے ہیں کہ حالت موجودہ پر غور کر کے اُن لوگوں کا جو اُردو زبان کے عادی ہیں لحاظ کریں اور زبان اُردو کو ترقی دیں۔ بابائے قومی اُردو علم الادب کے مایۂ ناز کئی مشہور اساتذہ قوم ہنود سے گذرے ہیں اور موجود ہیں مشہور ہندو مصنفان اُردو کی طویل فہرستیں شائع ہو چکی ہیں منجملہ اُن کے بڑے لائق و فائق پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ اُردو کے تذکروں میں سب سے جامع تذکرہ لالہ سری رام دہلوی کا شائع ہو چکا ہے۔ اردو کا ایک ممتاز علمی رسالہ کانپور سے منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ شائع کرتے ہیں ان صاحبوں کے نام لینے سے میرا مقصد یہ ہے کہ بخوبی روشن ہو جائے کہ اُردو زبان اور اُردو علم الادب کی قدر اور ترقی مسلمان صاحبوں کے علاوہ ہندو صاحبان بھی کر رہے ہیں لہذا اُردو کا مسئلہ صرف ایک قوم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اہل اسلام اور ہنود دونوں کا مشترک مسئلہ ہے۔ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اُردو اخبار و اہل علم و شعراء کو ترغیب دیں کہ وہ عام فہم خیالات پر زیادہ رجوع ہوں اور ان ممالک کے عام تعلیم یافتہ اصحاب کی زبان اور خیالات کا صحیح اندازہ کریں۔

بعض اوقات اُردو ہندی کے مسئلہ کو اس پیرایہ میں دکھلایا جاتا ہے کہ گویا یہ حروف فارسی و حروف ناگری کے درمیان تنازع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی زبان کے لکھنے کے لئے سب سے بہتر حروف ناگری کے ہیں۔ اس لئے کہ اس بولی کا خاکہ ہندی کا ہے۔ مگر اُردو یا ہندوستانی دراصل ایک مخلوط زبان ہے، قدیم سے قدیم ہندی کو دیکھا جائے، مثلاً چند بردائی کے اشعار، تو واضح ہوگا کہ اُن میں بھی فارسی اور عربی الفاظ مخلوط ہیں آجکل اگر [illegible] ہندی بولنے والے گنواروں کی زبان پر غور کیا جائے کم سے کم پندرہ فی صدی فارسی عربی الفاظ مخلوط برآمد ہوں گے اور شہروں اور قصبوں میں اس سے زیادہ ایسی زبان کے لئے ناگری حروف ہرگز بے نقص ثابت نہ ہوں گے۔ خالص عربی حروف بھی ہندی کے تلفظ کو ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں مگر اردو حروف بعد ترمیم و اضافہ عربی اور فارسی حروف سے برآمد کئے گئے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ اُردو حروف اُردو زبان کے اغراض کو پورا کرنے کیلئے بہتر خدمت ادا کرتے ہیں۔ عام زبان کے حامی اگر اس امر پر اصرار کریں کہ ناگری حروف ہی استعمال کئے جائیں اور موجودہ حروف اُردو معدوم کئے جائیں تو اُن کی منطقی اور عملی پہلو سے تقویت نہیں مل سکتی۔ مانا کہ منجملہ اُردو حروف کے دو تین حروف ایسے ہیں جن میں کچھ خفیف ترمیم مفید ہوگی خصوصاً حروف علت اُردو طرز تحریر میں بھی بہت سے امور قابل اصلاح ہیں۔ حروف علت کے جہاں جہاں مختلف تلفظ ہیں وہاں ہر تلفظ کے لئے مختلف شکل ہونا لازمی ہے اور ہجا اور املا میں پابندی قاعدہ اور یکسانیت ہونی چاہئے تحریر بھی صحیح اور غیر مشکوک ہونی چاہئے۔ تحریر یا چھاپے کو جلد پڑھے جانے کیلئے ہر قسم کی امداد ایجاد کرنی چاہئے اور چھپائی کی خوبصورتی مدنظر رکھنی چاہئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ میں نے ایک مختصر رسالہ اُردو کی صحت تحریر کی بابت شائع کیا تھا۔ اگر

ایسے مشوروں پر عمل کیا جائے، تو اُردو کے ہر حرف کو، خواہ حرفِ علّت ہو یا حرفِ صحیح ٹھیک طور پر لکھنا اور تلفظ کرنا آسان ہو سکتا ہے۔

گو اُردو کا مسئلہ کسی خاص مذہب و ملّت کا مسئلہ نہیں ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اہلِ اسلام سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے بعض مقامی مستثنیات کو قطع نظر کرکے اُردو تمام سلطنتِ ہند کے مسلمانوں کی اُتر سے لیکر دکن تک اور پورب سے لیکر پچھم تک عام زبان ہے۔ علاوہ اس کے دیگر اسلامی ممالک میں بھی اُردو سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے لہذا ہندوستان کی عام زبان کیلئے اُردو کا حق بہت زیادہ ہے۔ قابل افسوس ہے کہ سر انٹنی میکڈانل کے (جو اَب لارڈ میکڈانل ہیں) زمانے میں اُردو تحریر پر جو حملہ کیا گیا اور جن خیالات کا اظہار ہوا۔ اُن کی وجہ سے اُردو کو بہت کچھ صدمہ پہنچا۔

ہر انجمن اُردو کا فرض ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور پُرنور نظام دکن نے اُردو کو جو فوقیت اور عزت بخشی ہے، اُس کا اعتراف کرے۔ اُنھوں نے اُردو کو اپنی عثمانیہ یونیورسٹی میں ایسی جگہ دی ہے جو ہند کی کسی زبان کو کسی دوسری یونیورسٹی میں اتبک میسر نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں دار الترجمہ کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ عمدہ چھپائی اور عمدہ تصنیف کی ہوئی کتابیں سائنس اور علم الادب کے متعلق اُردو زبان میں شائع ہوں اور اہلِ ملک کیلئے اس زمانہ کے جدید علوم و فنون بآسانی حاصل کرنے کے اسباب مہیا کئے جائیں۔

ہر انجمن کو جس کا مقصد کام کرنا ہوتا ہے لازم ہے کہ ایک مقرر پروگرام میں سے محدود منتخب حصص خاص خاص اراکین کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کرے۔

اُردو کے علم عروض کی تنقیح تاریخی طور پر ہونی چاہئے۔ دریافت سے معلوم ہوگا کہ ابتدائے اردو شعرا اکثر ہندی وزنوں کا بھی استعمال کیا کرتے تھے رفتہ رفتہ فارسی اور عربی زبانوں کا رواج ہوتا چلا گیا اور اب وہ صرف چند محدود وزنوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ شعر کے اصناف اور مضامین بھی بہت محدود ہو گئے ہیں۔ قافیہ و ردیف کے مروّج قوانین سے نظم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ گویا ایک جادوگر الفاظ سے کھیلتا ہو۔ بے قافیہ نظم کی آزادی کا اُردو میں کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ حالانکہ دنیا میں بلند سے بلند نظمیں خواہ یونانی خواہ لاطینی خواہ انگریزی خواہ سنسکرت زبان کی ہوں۔ بغیر قافیہ کے مختلف وزنوں میں لکھی گئی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان سب پہلوؤں کی طرف نظر نہ کی جائے میرے نزدیک ہندی کے اوزان اور قافیہ سے ارد و نظمیں ہماری شاعری کو بہت کچھ نشو و نما دے سکتے ہیں ہمارے شعرا یا تو نئے طریقوں سے بھڑکتے ہیں۔ یا مروّجہ رستہ کے شیدا ہو گئے ہیں میں نے اس معاملہ کا چیدا علائے دماغ اُردو شعرا سے ذکر کیا۔ گو اُن کو ایسی بدعتوں سے نفرت ہے

تاہم وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی ہیں کہ اگر کوئی جدت پسند اُستاد ہندی وزنوں سے کام لے، تو اُس کے ہاتھ سے اُردو شاعری میں نئی رُوح کا پھونکا جانا ناممکن نہ ہوگا۔

سب سے اشد ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے علم الادب کے مضامین اور اصناف زیادہ وسیع کریں۔ موجودہ شاعری قریب قریب قصیدہ اور غزل پر ختم ہے مرثیہ اور مثنوی کے اساتذہ درگور ہیں اور ان اصناف کی موجودہ حالت ابتر ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ کے صنف کی ایک بھی مثال اردو میں نہیں ملتی جس کا اور زبانوں کی رزمیہ شاعری سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ہمارا ڈراما صرف تقلیدی قسم کا ہے۔ (امانت کی اندر سبھا ایک اختراعی تصنیف تھی مگر اُس کے بعد بہت کم ایسے ڈرامے لکھے گئے ہیں) ہم مسلّمہ شعرا اس بات پر مکتفی ہیں کہ عاشقانہ شاعری بطور گلہ و شکوہ کہیں اور کبھی کبھی ہجو یا لطیفے کے اشعار یا قطعے بھی لکھتے ہیں سنجیدہ مسلسل اشعار جن کی رسائی انسانی تخیل کی بلند تر اقلیموں تک ہو جائے اس کی کہیں فکر نہیں ہے۔ اور اس کی کبھی کوشش تک نہ کی جاتی ہے۔ ہاں طول طویل ہرزہ گوئی کی مثنویوں کا شوق ہے مگر اس کو علم الادب نہیں کہتے کبھی اتفاقیہ شعر یا رباعی کہہ دی۔ یہ تو شاعری کے کھلونے ہیں البتہ بعض تصانیف مثلاً اسرارِ خودی (از سر محمد اقبال) کو اردو میں لکھنے سے رونق بڑھ سکتی ہے۔

ایک اور امر تحقیق اور توجہ کے قابل ہماری نثر کی نشو و نما ہے، اور اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنا مناسب ہے کہ کن کن اثرانداز اشیا سے اُس کی ترقی ہوئی ہے۔ ہمارے ہی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کی صرف و نحو اور اصطلاحات و طرز عبارت میں بہت تبدیلیاں ہو گئی ہیں اُن کی تفصیل سے تنقیح ہونی چاہئے۔ ایسی تنقیح سے ہمارے ادبی خیالات کے قاعدے منکشف ہوں گے۔ جو ہمارے لئے اور نیز دیگر اصحاب کیلئے دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ حیدر آباد کے دار الترجمہ کی جدید تصانیف پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس لئے اُن کی عبارت پرانی اور مروّج خیالات کے علما کے نزدیک غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس بات کو قطع نظر کیا جاتا ہے کہ ہر زبان کی روزانہ ضروریات کے مطابق اُس کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اور جن خیالات کا اظہار کرنے کی سعی ہوتی ہے اُنہیں پر عبارت کا طرز منحصر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم کو انگریزی عالم بِل کے خیالات سے واسطہ ہو اور طرز عبارت غالب کی اختیار کریں۔ سیدھی سادی اور غیر آراستہ عبارت اعلےٰ اخبار نویسی قصہ نویسی کے جدید اصناف علم الادب کے لئے بہت موزوں ہے۔ ایسی عبارت کی آرایش خوبصورتی اس بات پر مبنی ہے کہ آیا وہ اپنے اغراض کے لئے بالکل موزوں ہے یا نہیں، اور کمزوری سے بری و چست ہے یا نہیں۔

اب اُردو قصہ نویسی پر ایک نظر ڈالیں۔ اس لئے کہ موجودہ روزمرہ

تصانیف اسی صنف میں شائع ہوتی ہیں۔ جہاں تک مجھکو مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہمارے قصّہ نویس کسی اصول یا قواعد پر نہیں چلتے۔ اُن کے مضامین اور قصوں کے خاکے (پلاٹ) بیرون از فطرتِ دنیا سے لئے جاتے ہیں، یا خلاف واقع ہوتے ہیں اُن کا طرز ایسا ہوتا ہے گویا وہ طفلان آغوش نشیں کو قصّہ سُناتے ہیں شخصیت (کیرکٹر) کی تصویر خام رنگوں میں کھینچتے ہیں۔ سوشل معاشرت کے واقعات پر غور کرنا، اور اُن کی ہنرمندی سے تصویر کھینچنا، جو آیندہ نسلوں کے لئے متوارث فخر کا باعث ہو، اس کی تو محض کوشش ہی بہت کم قصّہ نویسوں نے کی ہے۔ اگر اس صنف پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا جائے تو اُس سے چند عام اصول اخذ ہو سکتے ہیں، جن پر عمل کرنے سے مصنفین اور ناظرین دونوں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ایسے بہت سے امور ہیں جن پر توجّہ اور بحث ہونے کے بعد اُردو علم الادب کی مسلسل اور با وقعت تواریخ لکھنا ممکن ہوگا۔ مگر اسی اثنا میں یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی تواریخ کا کم سے کم ایک خاکہ تیار کرنے کی کوشش کیجاوے جس سے ہماری بھی علم افزائی ہوگی۔ اور بیرونی اقوام کے نزدیک بھی اُردو علم الادب کی قدر بڑھے گی۔

جب کافی تعداد ایسے اشخاص کی پبلک میں پیدا ہوگی جن کا میلان طبع پاکیزہ۔ صحیح منطقی وغیرہ مبہم عبارت کی طرف ہو، اور جن کی دلچسپی مقابلہ الفاظ کی موشگافی اور مصنوعیت کے زیادہ تر خیالات کی بلندی اور محاورہ کی خوبصورتی سے وابستہ ہو تو پھر سمجھنا چاہئے کہ وہ وقت آگیا کہ ہم کامیابی کے ساتھ ایک اردو جماعت العلم (اکاڈمی) کو قائم کریں، جس کے علماء اپنے جلسوں میں متنازعہ فیہ الفاظ و اصطلاحات کے باب میں بطور قضاۃ فیصلہ کریں گے اور مستند لغات مرتب کرینگے۔ اور حدِ اعتدال سے متجاوز عبارات کو روکیں گے۔ اور اُن ہنرمندوں کا حوصلہ بڑھا دیں گے جن کا آلۂ ہنرمندی انسانی زبان ہے۔

یہ خاکہ زمانہ مستقبل کے لئے طویل اور مشکل ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنی قوتوں کی یکسوئی کے لئے عزم کرلیں کہ ہر فرد یا انجمن اس کا کوئی معیّن اور محدود حصّہ اپنے ذمے لے اور اُس پر موثر طریق سے عمل کرے۔ اگر ایک جامع تجویز مدِّنظر رہے، اور ہم کو معلوم ہوتا رہے کہ دیگر افراد اُسی میدان کے اور حصوں میں کام کر رہے ہیں۔ تو ہم کو کم سے کم یہ اطمینان ہوگا کہ گو خود ہمارے جمع کردہ خوشے قلیل التعداد ہیں، تاہم تمام فصل کا غلّہ کثیر المقدار اور بیش بہا ہوگا۔

(عبداللہ یوسف علی)

رباعیات

مانا کاوش تھی کاوشِ غم تو نہ تھی
گریہ تھا مگر نوائے ماتم تو نہ تھی
بچپن میں جو بات تھی جوانی میں کہاں
خندہ بھی تھا، پہ فغانِ پیہم تو نہ تھی

اس دارِ فنا میں مقصدِ دل کیا ہے
منشائے نمودِ حق و باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی
آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

رواں ایم اے

دوست بنانے کا فن

رابرٹ لوئی سٹیونسن نے ایک نظم "قلندر" میں لکھا ہے کہ "مجھے دولت کی تمنا نہیں اور نہ آرزو ہے محبوب کسی واقف حال دوست کی خواہش — مجھے فقط اس بات کی طلب ہے کہ میں آسمان کے نیچے سڑک پر چلتا رہوں" سٹیونسن نے یہ نظم اس لئے لکھی تھی کہ اسے شوبرٹ کی لے میں گایا جائے۔ مگر ہمیں اس پر سنجیدہ نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے دنیا میں ایسے قلندر یا سیلانی لوگ بھی موجود ہوں جن کو زیر فلک سڑک پر چلنے کے سوا کسی اور بات کی آرزو ہی نہ ہو۔ لیکن عام لوگوں کی بہبودی و خوشحالی کا دار و مدار دوستی ہی پر ہے۔ یہ تو مجذوب کی غیر معمولی ہستی ہے جو دن رات اپنے ہی حال میں مگن رہ سکتا ہے ہم درحقیقت ہر ایسے شخص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جس کے ساتھ ہمیں واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ چند مبارک ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے ہمکو ناقابل تشریح وجوہات کی بنا پر وہ برکتیں حاصل ہو سکتی ہیں جو باقی دنیا مل کر بھی ہمیں دینا چاہے تو نہیں دے سکتی

پوشیدہ کشش

دوستی سراسر منطقی ہوتی ہے۔ مونٹین کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص مجھ سے یہ درخواست کرے کہ اس امر کی وجہ بتلایئے کہ آپ مجھ سے محبت کیوں کرتے ہیں تو میرے نزدیک اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں۔ دوستی کی تحریک یقیناً کامیابی یا دولت کی بنا پر نہیں ہوا کرتی بلکہ ناکامی میں خواہ اس میں استحقاق موجود ہی کیوں نہ ہو، دوستی پیدا کرنے کا عجیب و غریب مادہ موجود ہے اگر تم (ایک مشہور آدمی کا نام) دنیا کا دوست تھا تو مکابر (ایک مشہور مصلح) کو بھی تمام دنیا عزیز رکھتی تھی۔ دوست تو خود ہمارے گلے پڑتے ہیں وہ عجیب مواقعات کے ذریعے ناخواندہ مہمان کی طرح ہماری جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ کسی شخص کے حد سے زیادہ دوست نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے بعض دوستوں کے شکرگزار ہوتے ہیں اور بعض کے نہ ملنے پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اکثر ملنسار اصحاب اس دنیا میں ایک دوسرے کو یا تو کھو بیٹھے ہیں یا غیر موزوں حالات میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ جب زمانہ موافق ہو تو ہم اپنے دوستوں کے پاس خوشی منانے کے لئے جاتے ہیں اور جب ناموافق ہو تو

اُن سے تسلی و تشفی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن جبتک آدمی سرگرمی کے ساتھ اس خوشی کا لطف اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہو اُس وقت تک اُسے دوستی کے مناسب حصے کے ملنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ سٹیونسن کے اس قول میں اعلیٰ درجہ کی حکمت چھپی ہوئی ہے "اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی شخص کو اپنی حقیقی ملکیت پر ڈینگ مارتے ہوئے سُننا کس قدر روح پرور ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ آزادی اور خندہ پیشانی سے سُنتے۔

کچھ دینا کچھ لینے سے بہتر ہے

دوستی ہماری اچھی صفات کا خراج تحسین صلہ ہے۔ اس کی بدولت ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ ہم میں خودداری کا مادہ پیدا کرتی ہے اور زندگی کی کشمکش کو ہمارے لئے پرلطف بنا دیتی ہے۔ ممکن ہے محبت کی نسبت یہ کم اشتعال انگیز ہو لیکن وہ اکثر اوقات زیادہ دیرپا ہوتی ہے کولرج نے "شباب اور ضعیفی" کے نام سے جو نظم لکھی ہے اُس میں وہ بیان کرتا ہے "پھول خوبصورت ہوتے ہیں اور محبت بذات خود پھول ہے دوستی پناہ دینے والا درخت ہے۔ چونکہ ہماری زندگی کا دارومدار زیادہ تر دوستی ہی پر ہو سکتا ہے۔ اس لئے دانا آدمی اپنی شخصیت کی تربیت اس طرح کرے گا کہ وہ دوستی جیسی بے بہا نعمت کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے مقناطیس بن جائے۔ جبتک آدمی خود دوست بننے پر رضامند نہ ہو تب تک اُس کو دوست نہیں مل سکتے "لینے کی بہ نسبت دینا بہتر ہے" سچ ہی نہیں بلکہ جو شخص دینا پسند نہ کرتا ہو اس کو کچھ مل بھی نہیں سکتا۔

یہ دنیا حقیقت میں بہت سہانی ہے۔ اس میں دوستی کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اگر بدقسمتی سے ہم کسی کی دوستی سے محروم ہو جائیں تو یہ ہماری ہی کوتاہی کا نتیجہ ہو گا

سخاوت

شرمیلے آدمی اکثر اوقات بلا ضرورت دوستوں کی دوستی سے محروم رہتے ہیں۔ حیا اور شرم حقیقت میں دو بُرائیاں ہیں اور وہ روحانی فخر اور اس عقیدے کا بیّن ثبوت ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی قیمتی چیز موجود ہے جس کو پوشیدہ رکھنا چاہیئے تاکہ ہمارے اردگرد کی دنیا کو اس کا پتہ نہ

نہ لگ جائے۔ عقلمند آدمی کا دل تو ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ سخاوت میں مشغول رہتا ہے وہ زندگی میں سخاوت کرتا رہتا ہے اور پھر اس کو اس کا صلہ بھی ملتا رہتا ہے۔

آپس کی عزت

دوستی کا دارومدار باہمی عزت اور ہمدردی پر ہے لیکن کچھ حد تک اس کا انحصار آپس کے ایک جیسے مفاد پر بھی ہے۔ ہومر کی مشہور نظم "الیڈ" میں دو مصرعے یاد رکھنے کے قابل ہیں اور وہ یہ ہیں

عالی ظرف دوستی میں تو سرد مہری کا نام تک نہیں ہوتا
محبت ایک جھلک سے جل اُٹھتی ہے
ایک چنگاری سے بھڑک اُٹھتی ہے

دوستی میں بُرائی کا تو خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن دوستی کو کبھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ دوستی کا دارومدار باہمی عزت پر ہے اور اس احساس پر کہ گہری اور قوت آمیز دوستی کے علاوہ ہی دوستوں کے دلوں میں ایسے اندرونی تہخانے ہیں جن تک آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی

دوستی کی آزمائش

کسی کے احباب کی بابت حد سے زیادہ پرسش کرنا مضر ہے۔ ان کی اصلاح کی خواہش اور بھی خطرناک ہے۔ ممکن ہے بعض کٹھن گھڑیاں ایسی بھی آجائیں جبکہ دوستی سخت آزمائش میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن ہمیں بلا ضرورت اس کی آزمائش نہیں کرنی چاہیئے ہمارے لئے تو دن کے دھندے کافی ہیں بقول لارڈ ہوٹن

مجھے اپنی ہنسی کا لطف اُٹھانے دو
اور اپنی خوش طبعی کے سایہ میں بیٹھنے دو
اور وہاں لیٹنے دو جہاں تمہارے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہوں
ہاں مجھے اپنی دوستی کی برکت حاصل کرنے دو

دوسروں کی اصلاح کا خیال

یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ ہم دوسروں کی بہتری کیلئے کوشش کریں یہی تو اکثر اوقات پرہیزگاروں کی غلطی ہوتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ گھر میں کسی پرہیزگار آدمی کو تکلیف دہ خیال کیا جاتا ہے۔ پرہیزگار لوگوں کے دلوں میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے ہمسایوں کو نیک بنانے کی کوشش کریں اس کے متعلق اسٹیونسن لکھتا ہے کہ ایک شخص تو خود میں ہی ہوں جس کو مجھے آپ ہی نیک بنانا ہے۔ لیکن اپنے ہمسائے کے متعلق میرا فرض صرف یہ ہے کہ اگر مجھ سے ہو سکے تو میں اپنے ہمسائے کو خوش کر دوں"

ڈاکٹر احمد اللہ خاں آئی ایم ڈی

جوانان قوم

مشہور جرمن شاعر "شلر" کہتا ہے کہ "شباب کی موجیں زندگی کے سمندر کو طوفانی بنا رہی ہیں جوانو! قبل اس کے کہ تمہاری جان گرداب بلا کی نذر ہو جائے اُٹھو اور کوشش کرو"

دنیا میں دور شباب ہی قوت امنگ اور شجاعت کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے "جوانی" آزمائش کے میدان میں عزم و استقلال ہمت و شہامت کی نمائش اور ظہور کا باعث ہوتی ہے اور عالم جوانی ہی جسے "جوانی دیوانی" پکارا جاتا ہے عشق و محبت اور جرأت و دلاوری کا دوسرا نام ہے اور یہی مبارک روح بشریت کی ایک دلفریب جھلک ہے

اگر ہمارے نوجوان اس سعادت یعنی قوت شباب کی اہمیت کو جانتے اور اس کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے۔ اس کو اپنے لئے کارآمد چیز بناتے تو یقیناً آج ہماری زمین خلد بریں کا نمونہ ہوتی۔ ایک قوم کے نوجوان قوت۔ ثروت اور تمام اہم اور بیش نظر حالات کا مرکز ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے حکماء میں سے کسی نے کہا ہے۔ کہ ایک قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو اجتماعی اور سیاسی زندگی یعنی قوم میں انقلابی روح پیدا کرنا اور اس کی حالت کو سدھارنے کے لئے پچیس سال تک آزادانہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پچیس سال کے عرصہ میں وہ سب ایک اُن کے ہم آہنگ اور شریک کار ہوں یا نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں ان کی بہتری کی توقع محض لاحاصل ہے۔

انقلابی تحریک اور سیاسی معاملات کی باگ ڈور مکمل طور سے جوانان قوم کے ہاتھوں ہی میں ہوتی ہے اور اسی سبب سے قوم کی حالت کے بدلنے اور اس کے سرفراز ہونے کا انحصار اس قوم کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔

ابو ظفر نازش رضوی

مسیح کا اُٹھایا جانا

اشخاص:۔ یہودی ۔ مصری ۔ شامی ۔ مسیح

اسٹیج:۔ بیت المقدس کا ایک بالاخانہ، بالاخانے کا نقشہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ ایک دروازہ ہے جس سے ایک دوسرے کمرہ میں جو اندر کی طرف واقع ہے راستہ گیا ہے ۔ ایک دروازہ بائیں جانب ہے ۔ دروازہ میں زینہ ہے جس سے آدمی بازار میں داخل ہوتا ہے بائیں ہاتھ اور عقب میں کھڑکیاں ہیں ۔ یہودی کھڑا ہے مصری ہتھیار لگائے بازار سے داخل ہوتا ہے ۔

مصری ۔ میں نے سُنا تھا کہ تم اکیلے ہو ۔ اس لئے چلا آیا ۔ ہاں شامی کیا ہُوا ؟

یہودی ۔ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ رومی محافظوں کے باوجود لوگوں نے مسیح کی لاش کو مقبرہ سے نکال کر کہیں چھپا دیا ہے ۔

مصری ۔ ان کا یہ خیال ہے کہ دراصل یہودا مصلوب ہُوا ہے ۔

یہودی ۔ یہ تم سے کس نے کہا ؟

مصری ۔ ایک ربّی نے خود بخود بغیر میرے دریافت کئے ۔

یہودی ۔ کیا تم اُس سے ڈر نہیں گئے ؟

مصری ۔ نہیں، اُسے کیا معلوم تھا کہ میں عیسائی ہوں ۔ وہ اس قصّے کو بیان کرنے کا اسقدر مشتاق تھا کہ مجھ سے کہے بغیر رہ نہیں سکا ۔ وہ ایک آدمی سے جو ایک گدھے پر شراب کے مشکیزے لادے جا رہا تھا باتیں کر رہا تھا ۔ اس کے بعد وہ سڑک کی دوسری جانب جہاں کچھ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں چلا گیا ۔

یہودی ۔ کیا اس لئے کہ یہودا اپنے فعل سے پشیمان تھا ۔

مصری ۔ بلاشک، جبھی اس ربی کو غصہ آ رہا تھا کہ ایک آدمی محض اس لئے اپنے آپ کو پھانسی پر چڑھا دے کہ عبرانی قانون کی رو سے وہ اسے اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی تعلیمات نہ صرف خلاف قانون بلکہ نامکمل بھی ہیں ۔

(دُور سے طبل کی آواز آتی ہے)

یہودی ۔ میں صبح سے یہ آواز سُن رہا ہوں ۔ کبھی قریب سے آتی معلوم ہوتی ہے اور کبھی دُور سے ۔

مصری ۔ جب میں ربی سے گفتگو کر رہا تھا تو اسوقت بھی میں نے یہ آواز سُنی تھی لیکن میں اس سے پوچھتا ہُوا ڈرتا تھا ۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم ہو رہا ہے ۔

یہودی ۔ اسے خوش قسمتی سمجھو کہ ہم تم یہاں حفاظت کے لئے موجود ہیں ۔ اگر یہاں بھی مجمع ہو گیا تو ہم اس کو روکے رکھیں گے تاکہ وہ لوگ جو اندر ہیں چھت پر پناہ نہ لے لیں ۔

مصری ۔ وہ گیارہ آدمی ؟ وہ کر کیا رہے ہیں ؟

یہودی ۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جیمس نے ایک تھیلہ میں سے کچھ روٹیاں نکال کر میز پر رکھ دیں تھیں۔ فلپ کو کہیں سے شراب کا ایک مشکیزہ مل گیا تھا۔ انہوں نے دیر سے کچھ کھایا نہیں تھا ۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنا شروع کر دیں ۔ یوحنا اسوقت کا ذکر کر رہا تھا جب انہوں نے آخری بار اسی کمرہ میں کھانا کھایا تھا ۔

مصری ۔ اسوقت ان کی تعداد تیرہ تھی ۔

یہودی ۔ یوحنا کہہ رہا تھا کہ یسوع نے ان میں روٹیاں اور شراب تقسیم کیں ۔ اس کے بعد سب لوگ خاموش ہو گئے ۔ نہ کھانے کی آواز آتی تھی نہ بولنے کی ۔ تم یہاں کھڑے ہو کر ان کو دیکھ سکتے ہو ۔ ذرا پطرس کو دیکھو اسکا سر اس کے منہ پر جھکا ہے ۔ وہ مدت سے بالکل بجھا سا ہے ۔

مصری ۔ کیا یہ صحیح ہے ۔ کہ جب سپاہیوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم یسوع کے پیرو ہو تو اس نے انکار کر دیا ؟ ۔

یہودی ۔ ہاں یہ صحیح جیمس نے مجھ سے کہا تھا کہ پطرس خود بھی یہی کہتا تھا ۔

معلوم تو یہ ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ بیان کردیگا لیکن جب وقت آیا تو سب ڈر گئے - خیر مجھے یہ نہیں چاہئے کہ میں دوسروں کو الزام دوں ممکن ہے اس وقت میں بھی ایسا ہی بُزدل ہو جاتا - آخر ہم سب ہیں کیا؟ کتے جو اپنا مالک کھو چکے ہیں -

مصری - لیکن اگر مجمع سپاہ صیہون تک آگیا تو ہم تم جان دے دینگے لیکن اُسے اندر نہیں آنے دیں گے -

یہودی - یہ الگ بات ہے - میں پردہ ڈالے دیتا ہوں - میں نہیں چاہتا کہ وہ میری باتیں سنیں -

مصری - میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کیا ہے! -

یہودی - ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس بات کو سچ سمجھیں اس لئے وہ اور بھی ڈر گئے - جب یسوع گرفتار ہوا ہے تو انہیں یقین نہیں رہا کہ واقعی مسیح ہے -

مصری - ذرا اسطرف آؤ - یہودا کا دل مدت سے شک وارتیاب کا شکار ہو رہا تھا - اُس کا ایمان کبھی مضبوط نہیں تھا - یہی وجہ ہے کہ اس نے یسوع کے ساتھ غدّاری کی -

یہودی - لیکن کیا میرا اور تمہارا ایمان بالکل مضبوط ہے کیا ہمارا یقین واقعی پختہ ہونا چاہئے - ان بارہ حواریوں نے بھی جنہیں یسوع نے خود منتخب کیا تھا اسکا انکار کیا اور اس پر شک کیا -

مصری - میں نے کبھی شک نہیں کیا - مجھے تو شروع ہی سے یقین تھا کہ وہ سچا ہے - اس کے انداز میں کوئی بات تھی ——— کوئی بات جس سے ظاہر ہوتا تھا ——— یا کچھ ایسا ہی -

یہودی - اوہ - میں مصریوں کے خیالات کو خوب سمجھتا ہوں - غالباً تم سے کہنے والے تھے کہ وہ اور اسکا وجود محض خیالی یا کچھ ایسا ہی تھا - لہذا وہ مرا نہیں بلکہ یہ صرف لوگوں کا خیال ہی خیال ہے - غرضیکہ تم کسی نہ کسی طرح اپنی دلبستگی کے سامان پیدا کر لوگے - میں اگرچہ یہودی ہوں اور اس لحاظ سے خوب جانتا ہوں کہ یقین کیا چیز ہے - لیکن مجھے بھی اطمینان و دلجمعی کیلئے شراب خانوں میں جاکر لڑکیوں سے جی بہلانا پڑتا ہے ——— لیکن ان آدمیوں کی کیفیت اس سے مختلف ہے -

مصری - یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ وہ ہم سے عمر میں کہیں زیادہ بڑے ہیں -

یہودی - نہیں یہ بات نہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب اولیاء اللہ سے ہیں - ورنہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر یہاں اُنکی حفاظت کیلئے کھڑا رہتا -

مصری - تمہارا خیال ہے کہ یہودا یا تو بہترین آدمی ہے یا بدترین،

یہودی - نہیں میرا خیال ہے کہ جب اس کے شکوک پختہ ہو گئے تھے تو اسکی کیا ضرورت تھی کہ اس سونے چاندی کے کچھ سکے دئے جاتے - وہ تو شراب کے ایک جام کیلئے بھی اپنے آقا کے ساتھ غداری کر سکتا تھا -

مصری - میں نے اُسے کئی بار دیکھا ہے - اس کے بال سُرخ ہیں - آنکھوں سے نرمی کا اظہار ہوتا ہے - میرا ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایسا آدمی ہے -

یہودی - ذرا اسکی پست ہمتی کا خیال کرو - جب وہ حواریوں کے زمرے میں شامل ہوا تو اس کا خیال تھا کہ اس کے آقا کی ذات میں داؤد و سلیمان پھر واپس آگئے ہیں - وہ سمجھتا تھا کہ اب یہودی ساری دنیا کو فتح کر لینگے اور اہلِ روما کا خاتمہ ہو جائیگا -

مصری - اہلِ روما کو کوئی شخص نکال نہیں سکتا - بات اصل میں یہ ہے کہ یہودا کھاتا بہت ہے - اور سوچتا بہت کم یہی وجہ ہے کہ وہ غور و فکر کیلئے یونانیوں جیسی کمزور نسل کا محتاج ہے - بہرکیف کسی نہ کسی شخص کی ضرورت ہے کہ اس سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے - میں تو اس کے لئے یہودیوں کو یونانیوں پر ترجیح دونگا - سکندریہ میں کافی یونانی موجود ہیں لیکن یہودی کمزور لوگ ہیں -

یہودی - میں تو یسوع کا ہر حکم بجالانے کو تیار تھا - مجھے وہ اپنے ماں باپ دوست اور دنیا کی محبوب سے محبوب چیز سے بھی زیادہ عزیز تھا - لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جب سپاہیوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہے تو اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی -

مصری - زور سے مت بولو - میں نہیں چاہتا لیطریس ہماری باتیں سُنکر دوسروں سے کہے -

یہودی - یسوع نے اپنے آپ کو دھوکا دیا اور ہمیں بھی - میرے خیال میں اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں کبھی بنی آدم کی محبت نہ تھی - اسمیں کوئی شک نہیں کہ کام کاج و غیرہ کی وجہ سے مجھے اسکی باتیں سننے کا کم اتفاق ہوا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا جیسے ہم سب لوگ خدا کے بیٹے ہیں لیکن جب لوگوں نے اس کے ارد گرد جمع ہونا شروع کیا اس نے اپنا رویہ بدل دیا - شائد اسکو ہماری بری حالت پر اسقدر رنج تھا کہ وہ ہمارا خدا بن جانا چاہتا تھا - غالباً اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ اگر قیامت کے دن وہ ہمارا منصف بنا تو ہمارے

لئے بہت کافی گنجائش رکھ سکیگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس غور و فکر
میں اس کے خیالات منتشر ہو گئے اور بالآخر اس نے یہ دعویٰ کیا
کہ وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بہر کیف اب وہ مر چکا ہے اب ہم کبھی
اس کی صورت نہیں دیکھیں گے۔

(طبل کی آواز قریب آتی جاتی ہے)

اہلو پھر وہی شور ہوا۔ اب تو میں انہیں دیکھ بھی سکتا ہوں۔
یہ عورتیں ہیں ان میں سے کچھ اپنے کاندھوں پر ایک تابوت اٹھائے
آرہی ہیں۔ باقی ڈھول بجا رہی ہیں۔ مجمع میں کچھ لوگ خفا بھی نظر
آتے ہیں لیکن رومی سپاہی انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتے۔

مصری۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ واقعی عورتیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ وہ
اصل آدمی ہیں جنہوں نے عورتوں کا بھیس بدل رکھا ہے۔

یہودی۔ اب وہ بازار کے موڑ سے گذر رہی ہیں۔ اور مجمع کی وجہ سے
نظر نہیں آتے۔ اب میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو
—— ان کی چال بالکل مردوں کی سی ہے۔ انہوں نے گال اور
ہونٹ سرخ رنگ لئے ہیں۔

مصری۔ اور وہ تابوت کسی مردے کا نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے
لکڑی کا ایک آدمی بنا کر اسے مردوں کی طرح رنگ لیا ہے۔ میں
انہیں اسکندریہ میں دیکھ چکا ہوں ابھی یہاں آئے ہیں۔ یہ ایک شرابی
دیوتا کی پرستش کرتے ہیں جسکو یونانی ڈایونی سس کہتے ہیں مارچ
کے مہینہ میں چاند کی چودھویں تاریخ کو یہ لوگ شہر کے باہر کسی
میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھیڑ یا بکری کا ایک
زندہ بچہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے اور دوسرے اس کے ارد
گرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بچے کو درمیان میں
پھینک دیتا ہے۔ اس پر وہ لوگ بچے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اور
ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا
جاتے ہیں۔ ان کا لباس اور سر خون آلود ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے
دیوتا ڈایونی سس کو پکارتے جاتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ وہ
دراصل دیوتا کا گوشت کھاتے ہیں اور اسی کا خون پیتے ہیں۔

یہودی۔ معاذ اللہ۔ یونانیوں ہی کے خیالات ایسے ہو سکتے ہیں۔

مصری۔ اس کے بعد وہ شہر میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے مختلف
حصوں پر بکھر جاتے ہیں بعض اپنے کاندھوں پر مردے کی
ایک تصویر اٹھا لیتے ہیں۔ بعض ناچتے ہیں اور اپنے کپڑے پھاڑ
ڈالتے ہیں۔ اور زور زور سے اپنے دیوتا کو پکارتے ہیں کہ اس
مردے کو زندہ کر دے۔

یہودی۔ ایک کاہن دوسرے سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اب کھڑکی
کے نیچے مجمع میں ملگیا ہے۔ وہ شراب کے نشہ میں چور ہے۔ لوگ
اسکی ہنسی اڑا رہے ہیں اور اسے ادھر اُدھر دھکیل رہے ہیں۔

مصری۔ بعض کاہن ہمیشہ شراب پئے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ
دیوتاؤں کا خون پی کر مست رہنا نیکی کی علامت ہے۔

یہودی۔ اچھا اب اس شرابی نے گانا شروع کر دیا —— وہ اپنے
دیوتاؤں کا خون پیتے ہیں اور اسکا گوشت کھاتے ہیں؟ ابھی تم نے
یہی کہا تھا نہ؟

مصری۔ بیشک وہ اس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے
کہ اس نے انسان کی نجات کے لئے اپنی جان دیدی۔ لوگ کہتے
ہیں کہ ٹیٹن دیوتاؤں سے لڑے تھے۔ اور اولمپس میں جنگلوں کی
آڑ میں ہوتے ہوئے بالآخر وہاں پہنچ گئے۔ جہاں مقدس بچہ کھیل
رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ گھنگھرو لے آئے تھے۔ انکو بجا بجا کر
انہوں نے بچے کو اپنے پاس بلا لیا لیکن جب وہ ان کے پاس آیا
تو انہوں نے اسکو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

یہودی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کاہن ہمیشہ اپنے پاس گھنگھرو رکھتے ہیں۔

مصری۔ کچھ خراب ٹیٹن عورتوں نے جن کی تعداد کے متعلق خیال ہے
بارہ ہیں اس کے بچانے کی کوشش کی۔ اس کی یاد میں یہ کاہن عورتوں
کا سا لباس پہنتے ہیں اور اپنے ہونٹوں اور چہروں کو سرخ رنگ
لیتے ہیں اور اپنی کمر کو ہلاتے ہوئے ناچتے ہیں۔

یہودی۔ ان لوگوں کے شور مچانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ یونانی بھی
مردوں کو زندہ نہیں کر سکتے۔

مصری۔ اس کے بعد وہ دفعتہً مردے کو چھپا دیتے ہیں اور بازار
میں گھومتے ہوئے خوش ہو ہو کر شور مچاتے ہیں کہ مردہ دوبارہ
زندہ ہو گیا۔

(ایک لمحہ کیلئے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ طبل
اور گھنگھرو اب دور ہو جاتے ہیں)

اب ہم اپنے ہتھیار اتار سکتے ہیں۔ بازار بالکل خالی ہے۔ اب
لوگوں کو کاہنوں کا انتظار ہے۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

تھوڑی دیر ہوئی تم نے جو یہ کہا تھا کہ میں یسوع کو محض ایک
خیالی سمجھتا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک مرتبہ جب میں ابھی

بچہ تھا میں نے اسکندریہ کے بازار میں ایک ہندوستانی شعبدہ باز
کو دیکھا تھا جس کے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ اس کے سامنے
ایک میز رکھی تھی جس پر ایک مرغی بیٹھی تھی۔ اس مرغی کی چونچ میں
ایک تنکا تھا۔ یہ دیکھکر میں نے لوگوں سے کہا تم کیا دیکھ رہے ہو
اس پر ایک عورت کہنے لگی تمہیں یہ مرغی نظر نہیں آتی جس کی چونچ
میں اتنا بڑا شہتیر ہے۔ اب میں سمجھ گیا کہ اس ہندوستانی شعبدہ
باز نے ان پر جادو کر رکھا ہے۔ شروع ہی میں جب میں نے مسیح کو
بولتے سُنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ خدا نے بھی اس شعبدہ باز کی طرح
ایک ایسی شکل پیدا کر دی ہے۔ جسے میں مسیح کہتا ہوں ہمارا خیال
ہے کہ سزائے موت دی گئی اسپر مقدمہ چلایا گیا اور اسکو صلیب
دیکر دفن کر دیا لیکن بہت ممکن ہے کہ یہ بھی اسیطرح خیال ہی خیال
ہو۔

یہودی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کے معجزے اس قسم کے ہیں کہ ہم اسے
انسان نہیں کہہ سکتے؟

مصری۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہودی ان باتوں کو ذہن میں رکھیں جو
میں نے اور تم نے دیکھی ہیں تو بالکل ممکن تھا کہ تم ان سے باغ
رومیوں کے حاکم بنجاتے اور یونانیوں کو اپنے ملک سے نکال دیتے۔

یہودی۔ ایک مرتبہ مجھے ایک تجارتی جہاز میں مالٹا تک کے ارغوانی کپڑے
لیکر گئی تھی ادھر جانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن واپس آتے ہوئے
جب ملاح شراب لاد رہے تھے کہ میں اسپارٹا کی سیر کے لئے
چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک بہت بڑا مندر دیکھا جس کے اردگرد
لکڑی اور موم کے بنے ہوئے ہاتھ، پاؤں، آنکھوں، کانوں
اور جسم انسانی کے اندرونی اعضاء کے مختلف نمونے لٹک رہے
تھے۔ یہ اس لئے کہ اس دیوی کے ہاتھ سے بہت سے بیماروں
نے شفا پائی تھی اور وہ اسکا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

مصری۔ خدا نے اپنے کاہنوں کو بڑی قوتیں عطا کی ہیں لیکن مجھے
اس قسم کے معجزوں کا خیال نہیں تھا بلکہ اس کا کہ یسوع ہے کیا؟
میں سمجھتا ہوں کہ وہ خدا کی ناقابل فسق ذات کی تصویر تھا۔ اگر ہم
محض ایک تصویر پر ایمان لے آئیں تو آئندہ نسلیں اپنی قربان
گاہوں میں صلیب کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا آویزاں کر دیں گے جس پر
اُسے پھانسی دی گئی تھی اور کوئی رومی قیصر یہ سمجھیگا کہ اسکی تمام فتوحات
محض اسی کا نتیجہ ہیں۔

یہودی۔ گویا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر ہم محض کسی خیالی وجود یا ظاہری شکل
یا کسی واہمے یا شعبدے پر ایمان لے آئیں تو ہم یونانیوں پر غالب
آ سکتے ہیں؟

مصری۔ کیا یسوع نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر ہم یقین سے کام لیں تو پہاڑ
بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔

یہودی۔ لیکن میں نے تم سے یہ بیان نہیں کیا کہ میں نے اس مندر میں
اور کیا دیکھا۔ رہبر نے ——— وہاں ایک رہبر ضرور موجود رہتا
ہے ——— مجھے ایک نہایت پُرانے چوبی کا ایک ٹکڑا دکھایا جسکو
اوڈیسی نے استعمال کیا تھا۔ ایسے ہی ایک بہت بڑا انڈا تھا
جو قربانگاہ کی چھت میں ایک طلائی زنجیر میں لٹک رہا تھا۔ یہ
لیڈا کا ایک بن سے پاہوا انڈا تھا۔

مصری۔ لیڈا کا ایک بن سہا؟ یہ کیسے ممکن ہے!

یہودی۔ لیڈا ہی کے ایک دوسرے انڈے سے ہیلن پیدا ہوئی تھی
ہیلن اور اوڈیسی اس کی بدولت یونانی ہمیشہ دنیا پر غالب
رہیں گے۔ اس لئے کہ میں نے بھی چوب کے اس ٹکڑے اور انڈے
کو دیکھا تو قربانگاہ کے سامنے سر جھکائے بغیر نہیں رہا۔ اسپارٹا
کے اس خزانہ کا کوئی خیالی وجود مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پیرس نے
ہیلن کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل پایا تھا۔

مصری۔ لیکن اوڈیسی اور ہیلن مر چکے ہیں مسیح کے متعلق خیال ہی خیال
ہے کہ مر گیا ہے۔

یہودی۔ اچھا اب تمہارے ذہن میں کیا بات ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو
کہ ہم یسوع کو پھر دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی موت محض ظاہری
ہے اور اس کا دوبارہ ظاہر ہونا ناممکن نہیں۔

(دور سے طبل کی آواز آتی ہے)

لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دماغ میں اس قسم کے خیالات
بس جائیں۔

مصری۔ تم نے ابھی دل کے متعلق کچھ کہا تھا۔ ایک دھڑکتے ہوئے
دل کے متعلق، خون کا ایک لوتھڑا جو انسان کو خدا سے جدا کرتا
ہے۔ دل کیا ہے؟ محض تغیر اور موت! جہالت اور لاعلمی کا مرکز
——— خوفناک دل ———

یہودی۔ (جو دروازے کے پاس کھڑا سن رہا تھا، خاموش، کوئی شخص باہر
سے دروازہ کی چٹخنی کھول رہا ہے۔ اس کا خیال رکھنا اگر ہم نے
استقلال سے کام لیا تو ممکن ہے کہ کوئی اندر آ سکے۔ میں پھر
نیچے جاتا ہوں۔ دروازہ کا خیال رکھنا ——— ارے یہ تو شامی

ہو ـــ معلوم ہوتا ہے کچھ سُنکر آیا ہے۔

شامی۔ (ہانپتے ہوئے) میری کیفیت اس شخص کی سی ہے جو نشہ میں چور ہو ـــ مجھے چُٹکی بھی نہ ملتی تھی عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ بالکل بعید از قیاس۔ میں تمام راستے دوڑتا ہُوا آیا ہوں۔

یہودی۔ بات کیا ہے؟

شامی۔ مجھے ان گیارہ آدمیوں سے فوراً کہدینا چاہیئے۔ کیا وہ ابھی تک اندر ہیں؟ ہر شخص کو جان لینا چاہیئے۔ ہر شخص کو ـــ ہر شخص ـــ

یہودی۔ دم لے لو اور جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔

شامی۔ میں یسوع کی قبر کیطرف جا رہا تھا۔ کہ مجھے طبریاس کی کچھ عورتیں ملیں۔ مریم یسوع کی ماں، مریم جیمس کی ماں اور کچھ اور عورتیں۔ نوجوان عورتوں کا رنگ مارے تعجب کے زرد ہو رہا تھا۔ وہ ایک سانحہ ملکر کچھ کہنے کو تھیں کہ جیمس کی ماں نے انکو خاموش کر دیا۔ اور مجھ سے کہا کہ دن چڑھے جب وہ قبر کو دیکھنے گئیں ہیں تو وہ خالی پڑی تھی۔ دروازہ پر ایک آدمی کھڑا تھا جسکا سارا بدن چمک رہا تھا۔ وہ ہم سے کہنے لگا "مسیح زندہ ہوگیا"

(طبل اور گھنگروں کی آواز قریب آتی ہے)

جب ہم پہاڑ سے نیچے اتری ہیں تو یکایک ایک آدمی ان کے سامنے آیا وہ خود مسیح تھا۔ اس پر انہوں نے جھُک کر اسکے پاؤں کو بوسہ دیا ـــ اچھا اب مجھے راستہ دو تاکہ میں پطرس، یوحنا اور جیمس سے بھی کہہ دوں ـــ

یہودی۔ میں تمہیں راستہ نہیں دُونگا۔

شامی۔ لیکن کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا آقا پھر زندہ ہوگیا ہے؟

یہودی۔ میں نہیں چاہتا کہ ان گیارہ آدمیوں کو محض عورتوں کے خیالات سے پریشان کروں۔ اصل میں عورتوں کا رنج والم اسقدر شدید تھا۔ کہ وہ جو بھی سمجھ لیں عجب نہیں۔

مصری۔ مجھے یقین ہے کہ عورتوں نے تم سے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہے لیکن یہودی کا خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم یہ بات ان گیارہ آدمیوں سے کہیں ہمیں اس کا یقین ہو جانا چاہیئے۔ اگرچہ ہماری عمر بہت کم ہے لیکن ہم دنیا کو ان سے زیادہ جانتے ہیں۔

شامی۔ لیکن اگر قبر خالی ہے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض خواب ہے۔ عورتوں نے کہا تھا کہ قبر خالی ہے۔

یہودی۔ کل رومیوں نے یہ افواہ سُنی تھی کہ ہم میں سے کچھ آدمیوں کا ارادہ ہے۔ کہ لاش کو چرا لے جائیں۔ اور اسی غرض کے لئے یہ قصہ مشہور کر دیا ہے کہ مسیح زندہ ہوگیا ہے۔

شامی۔ بہرکیف اس بات کو وہ گیارہ آدمی ہم میں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

یہودی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس قصے کے متعلق ان کا خیال بھی وہی ہوگا جو میرا ہے۔ البتہ پطرس کی حالت اور بھی خراب ہو جائیگی میں اسکو تم سے بھی بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ پطرس کو یاد آجائیگا کہ عورتوں میں سے کوئی بھی پیچھے نہ تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آقا کا انکار نہیں کیا۔ اس خواب سے بھی ان کی محبت اور یقین کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے پطرس یہ سمجھیگا کہ وہ دونوں سے محروم ہوچکا ہے۔ اس کا خیال ہوگا کہ یوحنا اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس پر وہ اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیگا۔

مصری۔ تمہارے آنے سے پہلے میں کہنے ہی والا تھا کہ معلوم نہیں مسیح کسوقت ظاہر ہو جائے۔ میں اس کا مقابلہ ہیلین اور اوڈی سی اس سے کر رہا تھا جو اب کبھی زندہ نہیں ہو سکتے۔

شامی۔ یکایک مجھے خیال آیا ـــ اسوقت جب میں دوڑ رہا تھا اس کے کاہن شور کرتے ہوئے گزر چکے تھے ـــ کہ گو کسی نہ کسی بہانے یونان اور ایشیائے کوچک میں لوگوں نے نسلاً بعد نسل ایڈونیس یا ڈایونی سی اس کی موت اور بعثت ثانیہ کی یاد منائی ہے لیکن اب خدا نے رقص و سرود کو واقعی پیش گوئی کی صورت دیدی ہے تاکہ ہماری مصیبتوں میں ایک شان تقدس پیدا ہو جائے لوگ جس چیز کے خواب دیکھا کرتے تھے پوری ہوگئی۔ خدا نے خود جسمانی صورت اختیار کر لی۔

مصری۔ خدا کی صورت ضرور ہے لیکن جسم نہیں۔ نہ اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ چھُوا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا انسانوں سے ایک خیالی جسم کے ذریعہ ہمکلام ہو سکتا ہے۔ ہمارے جہاں اسکندریہ میں سنگتراشوں نے اسکندر اعظم کا ایک مجسمہ بنایا ہے جو ہو بہو اُس سے مشابہ ہے لیکن اس کے پہلو میں کوئی دل نہیں مسیح نے جب اپنی تعلیمات کا وعظ کہنا شروع کیا ہے تو اس کی عمر ٹھیک تیس برس کی تھی۔

شامی۔ اگر مسیح کا وجود محض خیال ہے تو وہ کون عورت تھی جس سے

میں ابھی ملکر آیا ہوں - اور جسکو لوگ "مسیح کی ماں" کہتے ہیں -

مصری - خدا نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ واقعی اس کی ماں ہے تاکہ اصل حقیقت کا پتہ نہ چل سکے - کیا تمکو یاد نہیں یہودی نے ابھی کہا تھا کہ عورتوں کو ہر بات کا یقین ہو جاتا ہے -

شامی - لیکن ـــــ

مصری - میری بات سنو - ھرمیز اعظم کا قول ہے کہ فاسق اور غیر فاسق اختلاط ممکن نہیں - لہذا یہ کہنا کہ خدا ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوا جو اسے بچوں کی طرح پالتی رہی بے دینی کی انتہا ہے -

شامی - گویا تمہارا خیال ہے کہ خدا نے ہمارے لئے جان نہیں دی ؟

مصری - خدا موت سے بالاتر ہے -

شامی - (یہودی سے) تم میری بات سمجھ سکتے ہو لیکن یہ مصری نہیں سمجھ سکتا - اس لئے کہ اس کے خیالات تقریباً یونانیوں کے سے ہیں - ہم اپنی زندگی میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتے ہیں - اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری کوئی حقیقت نہیں لہذا جس عمل سے فائدہ لیکن خدا نے کہا ہے - میں تمہاری مصیبتوں میں حصہ لونگا اور تمہیں بتاؤنگا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری محبت کے لئے کیا ہے - اگر میں ایسا کرونگا تو پھر انسان یہ نہیں سمجھیگا کہ وہ بے حقیقت پیدا ہوا - اسی لئے وہ دنیا میں آیا، پیدا ہوا اور مرگیا، ظاہراً نہیں بلکہ واقعتہً - مجھے کسی خیالی وجود کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے جسکی مصیبتیں محض ظاہری ہوں -

(طبل کی آواز قریب آتی ہے)

مصری - تم جو کچھ کہتے ہو ناممکن ہے - لیکن باہر اسقدر شور ہو رہا ہے کہ میں تمہیں اپنا مطلب نہیں سمجھا سکتا -

یہودی - دونوں باتیں غیر ممکن ہیں نہ تمہارے خیالی وجود کی کوئی حقیقت ہے نہ تمہارے خدا کی جسے کھانے پینے کی ضرورت رہتی تھی - میرے ذہن میں تو صرف ایک ہی بات آتی ہے اور وہ یہ کہ یسوع نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا اور ہمیں بھی اور یہ محض اپنی محبت کی وجہ سے - بہرکیف اب وہ مرچکا ہے -

(کھڑکی کی طرف جاتا ہے)

ڈایونی سی اس کے کاہن مکان کے دوسری طرف ہیں - لیکن اب انہوں نے تابوت کو چھپا دیا ہے - اب غالباً وہ دیوانہ وار چلاّئینگے کہ خدا زندہ ہوگیا - شہر کے ہر گلی کوچے میں یہی کہتے پھرینگے اور جب چاہیں گے اپنے خدا کو زندہ کرلیں گے - جب چاہینگے مار ڈالیں گے -

لیکن وہ اب خاموش کیوں کھڑے ہیں ؟ کیا اس لئے کہ وہ خاموش ناچ رہے ہیں یا یہی ان کی خیالی خوشیوں کا کوئی حصہ ہے - اب وہ قریب آرہے ہیں - اور وہ یم شامیوں کی طرح ناچ رہے ہیں - ذرا دیکھنا وہ اپنی رنگین آنکھوں کو کسطرح حرکت دیتے ہیں - کیا سچے آدمیوں کے جذبات کی یہی صورت ہوتی ہے - لیجئے اب وہ کمرے کے نیچے پہنچ گئے - سنو وہ شرابی کا گیت گارہے ہیں -

یہودی - یہ لوگ یکایک خاموش کیوں ہوگئے ؟ وہ اپنے بازوؤں کو سر پر اٹھائے خاموش اس مکان کو کیوں دیکھ رہے ہیں ؟

مصری - کمرے میں کون ہے ؟

یہودی - کہاں -

مصری - میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کہاں - لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے کمرہ میں کسی کو سانس لیتے سُنا ہے -

یہودی - نہیں نہیں - کوئی نہیں - ہماری اطلاع کے بغیر یہاں کوئی نہیں آسکتا - دیکھو دروازہ بدستور بند ہے -

مصری - وہ دیکھو پردہ ہل رہا ہے -

یہودی - ہرگز نہیں - اس کے پیچھے سوائے خیالی دیوار کے اور کچھ نہیں -

مصری - دیکھو! دیکھو!!

یہودی - بیشک پردہ ہل رہا ہے -

مصری - آہ مصر کے خدا - اسمیں سے یہ کون آرہا ہے -

(وہ پردہ سے دور ہٹ جاتے ہیں شامی اندرونی کمرہ کے دروازہ کی طرف چلا جاتا ہے - یہودی اسٹیج کے پیچھے پردے میں مسیح کی شکل نمودار ہوتی ہے)

یہ مسیح کی شکل ہے - ارے تم ڈر کیوں گئے ؟ مسیح کی لعنت کوئی تعجب خیز بات نہیں - اسے کسی نے پھانسی نہیں دی تھی نہ کسی نے دفن کیا تھا - یہ محض شکل ہے ـــ خیالی وجود ـــ اسمیں نہ گوشت ہے نہ خون میں حقیقت سے واقف ہوں اسلئے مجھے ڈر نہیں لگتا - اور دیکھو میں اسکو چھوتا ہوں ممکن ہے میں اسے چھوؤں تو مجھے سخت معلوم ہو یا میرا ہاتھ اس میں گذر جائے - بہرکیف بس ان باتوں کو سُن چکا ہوں -

(آہستہ مسیح کی شکل کے پاس جاتا ہے اور اُسے ہاتھ سے چھوتا ہے)

ارے اس کا دل دھڑک رہا ہے -

(مسیح کی شکل کے لئے راستہ چھوڑ دیتا ہے مسیح کی شکل اند [illegible]

کمرہ میں داخل ہوتی ہے ۔ شامی پہلے ہی اسمیں چلا جاتا ہے یہودی اسٹیج کے پیچھے دبک جاتا ہے ۔)

کسقدر خوفناک واقعہ ہے ۔ میرا خیال تھا کہ میرا ہاتھ اس میں سے گذر جائیگا ۔ وہ ان کے درمیان کھڑا ہے ۔ ان میں سے کچھ خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اب وہ پطرس اور جیمس کو دیکھ رہا ہے ۔ اور مسکرا رہا ہے ۔ طامس اس سے کچھ کہہ رہا ہے اور وہ جواب دے رہا ہے ۔ وہ اس نے اس کے پہلو سے کفن کو ہٹا دیا ۔ اوہ آہیں تو بہت بڑا زخم ہے ۔ طامس اپنے ہاتھ سے زخم کو دیکھ رہا ہے ۔ اور وہ سب اس کے ارد گرد جمع ہیں ۔ غالباً اس نے پھر کچھ کہا ۔ شائد ڈایونی سی اس کے کاہن ابھی تک ہاتھ اٹھائے بازار میں خاموش کھڑے ہیں ۔

(کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے)

ہاں وہ اسیطرح کھڑے ہیں او مبہوت ہو کر ادیرکی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ شرابی بدستور ناچ رہے ہیں لیکن نہیں کچھ معلوم نہیں ——— وہ طبریاس کی عورتیں مریم یسوع کی ماں اور مریم جیمس کی ماں پہاڑ کے نیچے اتر رہی ہیں ۔ تاکہ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے لوگوں سے بیان کر دیں ۔ انہیں معلوم تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ کیسا تھا ۔ عجیب ہے ۔ آج سے پہلے کسی خیالی شکل کا دل کبھی نہیں دھڑکتا تھا ۔ عجیب بات ہے کسقدر عجیب بات ہے ۔ معلوم ہوتا ہے عقل کا خاتمہ ہو چکا ہے

(بلند آواز میں)

اے اہلِ روما، اے اہلِ یونان ۔ اے اہلِ مصر! جس معجزے کا انتظار تھا آگیا ۔ اب تمہارا خاتمہ ہے ۔ تمہاری خلافِ عقل قوتوں کا خاتمہ ہے ۔ دیکھو ایک خیالی شکل کا دل دھڑک رہا ہے ؛

سید نصیر احمد

یاسمین

تیرہ فامی شام کی اور باغ کا سبزہ اُداس — یاسمیں نے دیکھ کر اک پھول روشن کر دیا
چاندنی ہیں چاند کی خنکی بھی تھی نرمی بھی تھی — تجھ میں کس گلکار نے رنگِ تبسم بھر دیا

چشم و دل ظلمات میں اے پھول اک سورج ہے تو — مدتوں تک تری صورت ان میں غوطے کھائیگی
بانٹ دے اپنا اجالا آج تو بیدار رہے — باغباں کی گود میں کل تجھ کو نیند آجائیگی

۱

مشہور و معروف مصنف نے عنبری سگرٹ اپنے دانتوں میں پکڑتے اور ٹانگیں میز پر پھیلاتے ہوئے کہا" ہلاری جونز" یہ کہکر اُس نے بے خیالی سے وزٹنگ کارڈ میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور سامنے کھڑے ہوئے سنجیدہ اور متین صورت شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا" میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں ؟"

ہلاری جونز نے کہا" نہیں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں مارماڈیوک موزیلی نے اس شخص کی طرف خاص انداز دیکھنا شروع کیا ہلاری جونز نے کہا" آپ ہی مارماڈیوک ہیں - جن کے چھوٹے پلاٹوں کے افسانے، اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں -

یہ سُنکر مارڈیوک نے بہت خلوص کے ساتھ اپنا برف کا سا سفید ہاتھ ہلایا - گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے - وہ دل ہی دل میں خیال کرتا تھا - ہاں میں ہی تو مارماڈیوک ہوں جو اپنے تعجب انگیز افسانوں کی وجہ سے مشہور ہو چکا ہوں - اور ادبی حلقوں میں میرے مختصر افسانوں کی دھوم مچی ہوئی ہے - یہ سوچکر وہ اپنی چرمی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنے سُوٹ کی شکنوں کو ہاتھ سے صاف کرنے لگا -

ہلاری جونز نے کہا" آپ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کی ابتک اجازت نہ دی ؟ یہ کہکر اُس نے ایک افسانہ اپنی جیب میں سے نکالا اور مارڈیوک کو دیتے ہوئے کہا" اس افسانے کو ملاحظہ فرمائیے "

مارڈیوک نے جمائی لی اور ہلاری جونز کے ہاتھ سے چند ٹائپ شدہ اوراق لیکر پڑھنا شروع کیا - یہ ایک مختصر کہانی تھی جسے پڑھ کر اسے سخت حیرت و تعجب ہوا - لیکن اُس نے اس حیرانی کا اظہار نہ کیا اور خاموش رہا -

ہلاری جونز نے جب یہ دیکھا کہ پہلا افسانہ ختم ہو گیا ہے تو دوسرا افسانہ دیا اور کہا" یہ بھی دیکھ لیجئے" مارماڈیوک نے اس افسانے کو بھی پڑھ لیا اور پھر اس شخص کی طرف تیز اور معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد کسی گہرے خیال سے چونک کر پوچھا - آپ کون صاحب ہیں ؟"

پستہ قد شخص نے جواب دیا" ہلاری جونز"

"اچھا اب اس افسانے کو ملاحظہ کیجئے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر اس کو پڑھئے" اس کے بعد وہ کسی قدر ٹھہر گیا اور کچھ سوچ کر کہا" آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی" ؟

مارماڈیوک نے ان سب افسانوں کو پڑھا - اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے، اور افسانوں کے تمام اوراق میز پر رکھ کر اُس نے نووارد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" خوب !

ہلاری نے کہا کیا ارشاد فرمایا ؟"

مارماڈیوک :" افسانے سب - بہت - بہت یعنی بہت ہی اچھے ہیں اور میں نہایت زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سب میری طرز تحریر سے ملتے جلتے ہیں - کیا ------ ؟"

" ہلاری جونز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا" آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی" پھر کہا" جناب جیسے افسانے آپ لکھتے ہیں اسی قسم کے میں بھی لکھ سکتا ہوں اور اگر پبلک ان دونوں قسم کے افسانوں کو پڑھ کر ہرگز امتیاز نہیں کر سکتی - مگر میں جب کسی ایڈیٹر کو اپنے افسانے بھیجتا ہوں تو وہ مجھے واپس روانہ کر دیتا ہے - کیوں ؟ --- "

مارماڈیوک نے سر ہلایا گویا وہ اس سے متفق ہے -

پستہ قد شخص نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا" کیونکہ ہلاری جونز کسی خاص شہرت کا مالک نہیں - ادبی حلقوں میں وہ بالکل گمنام ہے اور اس کی کچھ وقعت نہیں - مگر --- آپ مختصر افسانہ نویسوں میں سب سے زبردست مصنف شمار کئے جاتے ہیں - کیونکہ آپ کے افسانوں میں جس قسم کے پلاٹ نظر آتے ہیں وہ بالکل اپنی طرز کے اور انوکھے ہوتے ہیں - میرے افسانوں کے پلاٹ بھی بالکل آپ کے پلاٹوں کی طرح ہیں مگر پھر بھی میرے ---"

مارڈیوک نے کہا" خیر مجھے اس سے کیا غرض آپ یہ فرمائیے کہ آپ کو میں کس طرح مدد دے سکتا ہوں "

ہلاری جونز نے کہا" نہیں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں - میں خود آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں - سُنئے"

مارڈیوک ہمہ تن گوش ہو گیا -

" آپ نے ابتک مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی" ہلاری جونز نے کہا جناب ! آپ جس قدر افسانے تصنیف کرتے ہیں وہ سب بک جاتے ہیں - لیکن آپ اتنے کافی افسانے نہیں لکھ سکتے کہ ان ایڈیٹروں سے روز افزوں

مطالبے کو پورا کر سکیں جو آپ کے افسانوں کے لئے سینکڑوں روپے دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ آپ کا دن صرف چوبیس گھنٹہ کا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی دن کا کام ہو سکتا ہے اس سے زائد کام کرنے کی آپ میں طاقت نہیں۔ اس لئے ضرورت پوری نہیں کی جا سکتی اچھا۔ اب آپ کو یہ معلوم ہے کہ دنیا میں ایک شخص آپ کی طرح کے افسانے لکھ سکتا ہے اس کا طرز تحریر آپ کے طرز تحریر سے بہت حد تک ملتا ہے اور اکثر اوقات بالکل ایسا منطبق ہو جاتا ہے کہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ جملوں کی ساخت بھی عجیب ہوتی ہے۔ پلاٹ بالکل اچھوتے اور عبارت ظرافت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ آپ نے میرے افسانے پڑھے ہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ آپ جیسی ایک اور شخصیت موجود ہے اگر وہ شخص آپ کو افسانے لکھ دے اور آپ انہیں "مارماڈیوک" کے نام سے شائع کر دیں تو اس طرح چوبیس گھنٹوں کو اڑتالیس گھنٹوں میں تبدیل کر کے آپ اپنے افسانوں کی تعداد دگنی کر سکتے ہیں۔ خیال تو فرمائیے میں آپ کیلئے کس قدر آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہوں۔

مارماڈیوک نے کہا "آپ تشریف رکھئے۔"

ہلاری جونز ایک کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔

مارماڈیوک: "اب ہمیں تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنی چاہئے۔ ان باتوں سے کام نہ چلے گا۔"

وہ بہت دیر تک معاملہ کے ہر ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ جب معاملہ کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کر لیا تو ہلاری جونز نے سگرٹ کا ایک کش لگا کر کہا۔ بس تو آج سے میں آپ کا علمی معاون ہوں اور آپ اب اپنے افسانوں کی تعداد دگنی کر سکتے ہیں۔ میں بیس افسانے ایک ہفتہ میں لکھ دیا کروں گا اور بیس آپ بھی لکھ لیں گے۔ اس طرح چالیس افسانوں کی اوسط ہو جائیگی۔ اور سب افسانے ہر ہفتہ ایڈیٹروں کو بھیج دیے جایا کریں گے جن پر "مارماڈیوک" کا نام تحریر ہوگا۔ ان افسانوں کے معاوضہ میں جو اجرت ملے گی اس کا نصف نصف بانٹ لیا کریں گے۔

مصنف نے کہا "مارماڈیوک آج سے تیس افسانے ہر ہفتہ لکھا کریگا۔ اور آپ کی خدمات کے صلہ میں آپ کو ہر ہفتہ پانچ گنی کی رقم ملا کرے گی۔"

ہلاری جونز گنیوں کا نام سنکر چونک پڑا۔

"کیا؟ مجھے صرف ——"

مارماڈیوک نے کرخت لہجے میں کہا "ہر ہفتہ پانچ گنی ملا کریگی۔"

"لیکن ——"

"اگر آپ اس کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجے ورنہ اپنا راستہ لیجے۔"

"مجھے منظور ہے۔" ہلاری جونز نے دبی زبان سے کہا۔

(۲)

ہلاری جونز نے جو افسانے لکھے تھے۔ وہ مارماڈیوک کے افسانوں سے بالکل منطبق ہوتے تھے۔ لیکن دونوں کے افسانے "مارماڈیوک" کے نام سے ہی شائع ہوتے تھے۔ گو اس کے افسانے مارماڈیوک کے افسانوں سے کسی قدر بہتر ہوتے تھے۔ مگر اتنے نہیں کہ لوگ ان میں کچھ تمیز کر سکیں۔

ایڈیٹروں نے مارماڈیوک کے نام اظہار مسرت و مبارکبادی کے خطوط لکھنے شروع کئے کہ وہ کس طرح اپنی پہلی شہرت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اس عام شہرت سے مارماڈیوک کے افسانوں کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے اور افسانوں کی فروخت دگنی ہو گئی۔ مارماڈیوک کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ایڈیٹر بھی اس کے افسانے شائع کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

ہلاری جونز ہفتہ بھر تک ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ہوا ٹپ ٹپ کرتا رہتا۔ اور سنیچر کے دن تیس افسانے لکھ کر مارماڈیوک کو دیتا تھا۔ اور اس کے عوض میں پانچ گنیاں جیب میں ڈال کر بے چون و چرا اپنے گھر کا راستہ لیتا پیر کے دن پھر صبح کام پر واپس آتا اور ہفتہ بھر کام کرکے پھر پانچ پونڈ پانچ شلنگ (پانچ گنی) لیجاتا اور مارماڈیوک کے اس کیش بکس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا جس میں روزانہ سونے کی گنیاں چھنا چھن پڑتی رہتیں۔

(۳)

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے اور دو ٹائپ رائٹر برابر دن رات ٹپ ٹپ کرتے رہتے اور دونوں ٹائپ رائٹروں میں سے ایسے افسانے نکلتے جن پر "مارماڈیوک" کا نام لکھا ہوتا۔ پبلک اس کے افسانوں سے بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ اور خوش ہو کر ایڈیٹروں کو خطوط لکھے جاتے۔ اور ایڈیٹر بھی مارماڈیوک سے مزید افسانوں کے لئے تقاضا کرتے۔ اور اسے یقین دلاتے کہ اس کے افسانوں کا معیار اب اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ آج تک ایسے بلند پایہ افسانوں کی مختصر افسانہ نویسی کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

اس قسم کے تعریفی خطوط لکھنے والے وہ نئے ایڈیٹر ہوتے۔ جو مارماڈیوک کے افسانوں کے نئے نئے خریدار بنتے۔ ان لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے ہلاری جونز ٹائپ رائٹر پر بیٹھا ہوا "مارماڈیوک" کے نام سے افسانے لکھ لکھ کر دیتا تھا۔

چند ہفتے بعد مارماڈیوک کی تیوری پر بل پڑنے لگے کیونکہ اس کے پرانے ایڈیٹروں کی طرف سے [illegible] رہے تھے وہ اپنا سا [illegible]

کام نئے ایڈیٹروں کے حوالے کر دیتا ہے اور پرانے ایڈیٹر جو اس کے پرانے گاہک اور اس سے دیرینہ تعلقات رکھتے ہیں محروم رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح بارہ مہینے گذر گئے مارماڈیوک ان شکایتی خطوط کی بھرمار سے تنگ آگیا اور ایک دن ہلاری جونز کے پاس آیا۔ ہلاری بھی خوب جانتا تھا کہ وہ اس کے پاس کس غرض سے آیا ہے اور آئندہ معاملہ کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔

مارماڈیوک نے آکر کہا "ہلاری جونز تمہارے دیگر افسانے پرانے ایڈیٹروں کو دیا کروں گا کیا تم افسانوں کی تعداد نہیں بڑھا سکتے؟"

جس قدر آپ چاہیں لے سکتے ہیں"

اب پرانے ایڈیٹروں کو ہلاری جونز کے افسانے بھیجے جانے اور نئے ایڈیٹروں کو مارماڈیوک ہی افسانے تصنیف کر کے بھیجتا۔ مگر دونوں جگہ مارماڈیوک ہی کے نام سے افسانے شائع ہو رہے تھے۔ لیکن جب ہلاری جونز ہفتہ کے آخر میں تنخواہ کے لفافہ کو اٹھا کر دیکھتا تھا تو وہاں وہی پانچ پونڈ ۵ شلنگ ہوتے۔

اب مارماڈیوک کے روپے کی طرف ہلاری جونز کی نظریں بھی للچائی ہوئی پڑنے لگیں کیونکہ وہ برابر کی محنت کا شریک تھا۔ لیکن ابھی تک خاموش تھا کہ کوئی مناسب موقع ملے اور شکایت کرے۔

مارماڈیوک کے نام سے دلکش افسانے اب ہلاری جونز کے ٹائپ رائیٹر سے برآمد ہو رہے تھے۔ اور مارماڈیوک کے پرانے ایڈیٹروں کے لئے کافی تھے کیونکہ اب انہیں پورا اطمینان ہو گیا تھا کہ مارما اپنا سارا عمدہ ذخیرہ ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر لازمی طور پر اب نئے رسالوں کی سرد بازاری شروع ہو گئی اور مارماڈیوک سے شکایتیں ہونے لگیں کہ اب اس کے افسانے اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ جتنے شروع شروع میں ہوا کرتے تھے اور اُن کی مجموعی تعداد بھی بتدریج کم ہو رہی تھی۔

مارماڈیوک نے ایک دن پھر ہلاری جونز سے کہا "آئندہ کے لئے تجویز نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہم دونوں اپنے افسانوں کو ملا جلا کر بھیجیں۔ یعنی ایک ہفتے تک تمہارے افسانے پرانے ایڈیٹروں کو بھیجے جائیں اور نئے ایڈیٹروں کو میرے۔ دوسرے ہفتے تمہارے افسانے نئے ایڈیٹروں کو جائیں اور پرانے ایڈیٹروں کو میں اپنے افسانے بھیجوں اس کے بعد پھر اس طرح سے پبلک تمیز نہ کر سکے گی کہ کونسے ہفتے میں اعلےٰ قسم کے افسانے شائع ہوتے ہیں اور کون سے میں کمتر درجے کے۔"

ہلاری جونز نے کہا "جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں میں اس کی تائید کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن آج سنیچر کا روز ہے کیا آپ میری تنخواہ کا لفافہ مجھے عنایت کریں گے" مارماڈیوک نے یہ سنتے ہی ۵ پونڈ ۵ شلنگ کا لفافہ جونز کے ہاتھ میں دیدیا جسے ہلاری نے دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھایا اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر کرسی پر سے اٹھا ہیٹ اُٹھائی اور تنخواہ مارماڈیوک کی میز پر پھینکی اور دروازہ کھول کر سیدھا روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن پھر صبح کو دروازہ کھلا اور ہلاری جونز کمرہ میں آیا اور مارماڈیوک سے کہا۔

"آداب عرض میرا نام ہلاری جونز ہے"

مارماڈیوک نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا "ہاں بیشک، آپ کا یہی نام ہے لیکن اس سے کیا غرض ہے اور آخر اس تماشہ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے"

"میں مختصر افسانے تصنیف کرتا ہوں" ہلاری جونز نے کہا "آپ نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔"

مارماڈیوک نے کہا "تشریف رکھئے"

ہلاری جونز بیٹھ گیا۔

(۴)

اُس نے نہایت آہستگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "آج کل اخباروں اور رسالوں میں ایک ہی قسم کے دو معیاروں کے افسانے شائع ہو رہے ہیں جو طرز تحریر میں بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور دونوں قسم کے افسانے ایک شخص یارماڈیوک کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ ان فسانوں میں ایک قسم بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور دوسری کسی قدر کمتر۔ اعلےٰ قسم کے افسانے مارماڈیوک خود تصنیف کرتا ہے ——"

مارماڈیوک نے ایک گہرا سانس لیا۔

مسٹر جونز نے کہنا شروع کیا "افسانہ خواں پبلک مارماڈیوک کے افسانے پڑھنے کی بہت عادی ہو گئی ہے اور اسی طرز کے افسانے بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن پچھلے اٹھارہ مہینوں میں ان کا مذاق اچھے اور برے افسانوں میں تمیز کرنے میں بہت بلند ہو گیا ہے اور ایک خاص معیار کے افسانے بہت بلند خیال کئے جاتے ہیں۔ پبلک کی نمائندگی کرنے والی جماعت ایڈیٹروں کی ہوتی ہے اور ایڈیٹر لوگ گنیاں گنواتے ہیں۔ پس اس لئے آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ قائم شدہ معیار اپنی بلندی سے گر جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہو گا؟"

مارماڈیوک نے خود بخود کچھ کچھ بڑبڑانا شروع کیا۔

ہلاری جونز بولا۔ معیار گر جانے کی ایک نظیر ہمارے پاس پہلے تجربہ کی موجود ہے مثلاً آپ کو یاد ہو گا کہ جب میرے افسانے نئے ایڈیٹروں کو

بھیجے جاتے تھے تو پُرانے ایڈیٹروں کو آپ سے شکایت تھی کہ آپ اپنا سارا عمدہ ذخیرہ نئے ایڈیٹروں کو دیتے ہیں اور پُرانے پامال شدہ پلاٹوں کے افسانے پُرانے ایڈیٹروں کے حصے آتے ہیں۔

آپ کو یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ کس طرح جب نئے معیار کے افسانے دیگر پرانے ایڈیٹروں کی دی جبھی کر دی گئی تھی اور نئے ایڈیٹروں کو سلے گلے افسانے دینے لگے تو اس تجربہ کا کیا نتیجہ ہوا۔ غرض آپ معاملہ کے ہر نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں اور مسٹر مارماڈیوک' آپ مطمئن رہئے "ہلاری جونز" اور صرف "ہلاری جونز" ہی ایک شخص ہے جو "مارماڈیوک" کے نام سے منسوب شدہ معیار کو قائم رکھ سکتا ہے۔ میرے سوا دنیا میں دوسرا کوئی شخص نہیں۔ اب آپ میرا مطلب خوب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ فرض کیجیے میں آپ سے کنارہ کشی اختیار کر لوں ایسی صورت میں آپ "مارماڈیوک" کے نام سے بُری قسم کے افسانے پبلک کو دھوکا دیکر زیادہ عرصہ تک نہیں شائع کر سکتے۔ ایک نہ ایک دن پول ضرور کھلیگا۔ پس میرا نیک مشورہ ہے کہ آپ میرے بلند معیار کے افسانوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیے اور میرے ساتھ ملکر کام کرنے کا وعدہ کر لیجئے اگر ایسا نہ کیا تو بعد میں پچھتانا پڑیگا۔

مارماڈیوک ہونٹ چاٹ رہا تھا۔

"ہم ــــــ یا یوں کہنا چاہیے کہ میں آپ کی تنخواہ میں اضافہ کئے دیتا ہوں۔ مسٹر مارماڈیوک موزیلی نے کہا۔

ہلاری جونز اس پر بے اختیار ہو کر ہنس پڑا۔

"کیوں جناب! یہ تنخواہ کیسی ــــــ آج سے تو میں مارماڈیوک ہوں۔" اور "مارماڈیوک" کے نام سے جن معیاری افسانوں کی توقع کی جا سکتی ہے انہیں تصنیف کرنے والی میری اور صرف میری ہستی ہے۔ اب تمہیں اپنے افسانوں کی اجرت کے لئے ہر سنیچر کو میرا دست نگر بننا پڑیگا"

مارماڈیوک نے دبی آواز سے کہا "اجی حضرت! بس غصہ جانے دیجئے۔ لیجئے بیس گنیاں ہر ہفتے لے لیا کیجئے"

پستہ قد شخص آگے جھک گیا اور یوں گویا ہوا۔ ہر دن کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور میں چوبیس گھنٹوں میں صرف چوبیس ہی گھنٹے کام کر سکتا ہوں۔ کیونکہ جو کام جتنے عرصہ کا ہوتا ہے وہ اتنی دیر میں ہی ہوتا ہے میں جتنے افسانے فروخت کر سکتا ہوں اتنے کسی صورت میں نہیں لکھ سکتا اور میرے افسانوں کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ اب اگر مجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو میری طرح اور میری ہی طرز تحریر کے افسانے تحریر کر سکتا ہو تو میں اُس شخص کو ملازم رکھ لوں گا۔ اور اس طرح میں اپنے ایڈیٹر کو دُگنے افسانے دے سکوں گا۔ وہ شخص آپ ہیں۔

مارماڈیوک موزیلی نے کہا "کیا میں ہوں؟"

آپ بالکل مطمئن رہئے سب انتظام ابھی ہو جائیگا اور آپ ہی وہ شخص ہیں"
اچھا معاملہ طے کر لیجئے' بس ہمارے اور آپ کے درمیان یہ طے ہو جانا چاہئے کہ ہم دونوں ملکر جو کچھ کمائیں اس کا نصف نصف تقسیم کر لیں۔ اور ــــــ"

ہلاری جونز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "بس مجھے ہر ہفتے تیس افسانے دیدیا کیجئے گا اور میرا خیال ہے کہ آپ ایسا بآسانی کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی خدمات کے صلہ میں پانچ گنی فی ہفتہ کی شرح سے اجرت ادا کرتا رہوں گا۔

"لیکن ــــــ" موزیلی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

جونز نے آگاہ کرتے ہوئے پھر کہا "آپ اس پر مزید غور فرمالیں آپ کے ذمہ کوئی بڑا کام نہیں ہے اور پانچ گنی کچھ تھوڑی رقم نہیں بس سیدھی طرح سے قبول کر لیجئے۔

"لیکن ــــــ"

"پانچ گنی فی ہفتہ اس سے زائد نہیں۔ ورنہ اپنا راستہ لیجئے۔

"مجھے منظور ہے۔ مارماڈیوک موزیلی نے جواب دیا۔

(مختار)

ظفر قریشی دہلوی

جو شخص چھوٹی کشتی کو نہیں چلا سکتا وہ بڑے جہاز کی ناخدائی کس طرح کر سکتا ہے۔ جو شخص تدبیر منزل میں ناکام رہے وہ کسی مملکت کے انتظام میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے رشتہ داروں کی امداد سے محروم ہو اسکو دوسروں کی امداد کیسے مل سکتی ہے
جس شخص کا بیٹا اُس سے جُدا ہے اُس شخص کے گرد اُس کا شہر کیسے جمع ہو سکتا ہے۔

(عربی)

اے سوار! ٹھیر جا اور لگام کو روک لے۔ زندگی کی سواری کسی غلط راستہ پر تیرے ساتھ نہیں چل سکتی۔ تیرے پاس کشتی ہے لیکن اس کا لنگر کہاں ہے؟ تیرے پاس سواری کا گھوڑا ہے۔ لیکن اس کی لگام کہاں ہے؟ تیرے پاس سواری کیلئے اونٹنی ہے لیکن اس کی نکیل کہاں ہے؟
زندگی کی سواری کو سیدھے راستہ پر لے چل اور اپنے ارادہ کو رہبر بنا کر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جا۔

(عربی)

غارتگرِ عالم

(شرلک ہومز کے شہرۂ آفاق کیریکٹر پیدا کرنے والے سر آرتھر کانن ڈائل کا پہلا سائنٹیفک افسانہ)

پروفیسر چیلنجر خود رفتگی کے عالم میں جنونانہ خود کلامی میں مشغول تھا کہ میں اُس کے دروازے تک پہنچا اور اس کی خشمگین گفتگو سن کر وہیں ٹھٹک گیا لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ٹیلیفون پر بول رہا ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ صبح سے یہ دوسری بار الارم ہوا ہے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ ایک سائنس دان کو انہماک میں تار کے دوسرے سرے سے ایک احمق کا متواتر خلل انداز ہونا کس قدر صبر آزما ہے خصوصاً جبکہ وہ کسی فوق الادراک تحقیق میں محو ہو۔ اچھا مہتمم کو بلاؤ۔

"تم مہتمم ہی بول رہے ہو! تم میرے ان خیالات کو پریشان کرنے کے ذمے دار ہو جس کی اہمیت کا اندازہ کرنے سے تمہارا دل و دماغ عاری ہے اچھا تم مہتمم اعلےٰ سپرنٹنڈنٹ کو بلاؤ۔

"وہ باہر گیا ہوا ہے"۔ اگر تم سے ایسی نازیبا حرکت پھر سرزد ہوئی تو مجھے مجبوراً تمہیں قانون کے حوالے کرنا پڑے گا نہیں! میں تحریری معافی چاہتا ہوں۔ اچھا! میں اسی پر غور کروں گا۔ سلام"۔

اُس وقت میں نے اندر داخل ہونے کی جرأت کی۔ یہ نہایت نازک وقت تھا۔ وہ اسی قدر کہکر مڑا اور میرا اور ایک غضبناک مجروح شیر کا سامنا ہوا۔ اس کی لانبی اور سیاہ ڈاڑھی کے بال غضب کی شدت سے کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بپھر گیا۔ چوڑی چھاتی کا سانس بھرنے لگا۔ اور پھر غرور کی بھری آنکھوں نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور یہ غضبناک الفاظ بارش کی بوچھاڑ کی مانند اس کی زبان سے برسنے لگے "نالائق جہنمی۔ حرامخور۔ بدمعاش۔ بے سبب وقت کو تم تباہ کرنے آئے ہو۔ وہ گرج کر بولا" میں ان کو اپنی جائز شکایت پر قہقہے لگاتے سن رہا تھا۔ یقیناً یہ مجھے خواہ مخواہ دق کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اب سنو کیا تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو یا اس سازش میں تمہاری بھی شرکت ہے۔ لیکن دوست و مربی کی حیثیت سے میں تمہارا خیر مقدم کر سکتا ہوں۔ لیکن ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے تمہاری جگہ اس احاطے سے باہر ہے۔

میں مسٹر مکارڈل کا مراسلہ اپنی جیب میں ٹٹول ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور شکایت کا خیال آگیا اور اس نے میز پر کاغذوں کے پلندے میں سے ایک اخبار کا اقتباس نکالا۔

"تم نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں جو آپ نے میرا ذکر کیا ہوا ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں" یہ کہکر اُس نے وہ اقتباس مجھے پیش کیا۔ یہ مضمون تم نے جدید سورین کے آثار قدیمہ کے عنوان سے لکھا ہے اور اس سوقیانہ مضمون کی ابتدا تم نے انہیں صبر آزما الفاظ سے کی ہے۔

"پروفیسر چیلنجر جو ہمارے عظیم ترین سائنس دانوں میں سے ہے"۔

ایسے حسد انگیز اوصاف کے بیان کرنے میں آپ کے پاس کیا وجوہات ہیں شاید تم دوسرے سائنسدانوں کا نام بتا سکتے ہو جن کو تم میرے برابر یا مجھ سے بہتر خیال کرتے ہو۔ اُس نے کہا۔

میں نے چند لمحے صورت حال پر غور کر کے کہا۔ میں اپنی فروگذاشت پر معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل مجھے یہ الفاظ لکھنے چاہئیں تھے کہ پروفیسر چیلنجر جو اس وقت بے بدل محقق اور سائنس دان ہیں۔

درحقیقت میرا اپنا بھی یہی عقیدہ تھا۔ میرے ان خوشامدی الفاظ نے اُس کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور اُس نے جواب دیا۔ نہیں۔ یہ تمہاری ذرہ نوازی ہے۔ لیکن تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہیں مجبور کر رہا ہوں لیکن چونکہ نامعقول اور جھگڑالو معاصرین مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ میں پیش بندی کے لئے مجبور ہوں میں خود ستائی سے بے نیاز ہوں لیکن اپنے بچاؤ کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔

"پھر مربیانہ انداز میں کہا۔ آپ کے باعث تشریف آوری کیا ہے؟

مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ کس قدر جلد غضبناک ہو جاتا ہے۔ میں نے مکارڈل کا مراسلہ کھول کر کہا "یہ میرے ایڈیٹر کا خط ہے"۔

پروفیسر ہاں میں اُنہیں جانتا ہوں واقعی وہ قابل قدر ہستی ہیں اُس کے دل میں آپ کی بہت قدر و منزلت ہے جب وہ کسی دقیق مسئلہ حل کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے تو آپ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں

ہاں پیش نہیں کرتا ہیں نے دبی آواز سے کہا۔ پروفیسر ایک جسیم پرندے
مانند خوشامد اور چاپلوسی کے اِن الفاظ سے متاثر ہو کر میز پر کہنی ٹیک لی
رکیسے ہاتھوں کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ لانبی ڈاڑھی آگے کو بڑھ آئی۔
نیم وا آنکھوں سے مجھ پر ٹکٹکی باندھ دی۔

"میں آپ کو یہ خط پڑھ کر سناتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے۔ آپ میرے
زیز و لائق مزنی پروفیسر چیلنجر کی ملاقات سے شرف یاب ہو کر مفصلہ ذیل
ئلہ کو حل کرنے کی جدوجہد کریں۔"

مسٹر تھیوڈور نیمر جو وائٹ ڈرانٹر زمینشن ہمپسٹڈ میں مسکن پذیر ہے
عجیب الخواص ایجاد کا دعوی کرتا ہے۔ یہ مشین ہر شئے کو جو اس میں رکھی
ئے پلک جھپکنے کے عرصہ میں ہوا کے ذرات میں تحلیل کر دیتی ہے اور بعد
س رد عمل سے وہی شئے بجنسہ اپنی اصلی شکل و صورت میں نمودار ہو جاتی
ہے۔ یہ دعوی بظاہر غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دلائل سے
اہر ہوتا ہے کہ اس کا یہ دعوی بے بنیاد نہیں ہیں اس اختراع کے تباہ کن
وصاف پر دوران جنگ میں کاری حربہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضروریات پر
بصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی قوت جو جنگی جہاز یا لشکر کو آن واحد میں خاکستر کر دے
نیا پر چھا جائیگی۔ سیاسی و معاشرتی نقطۂ نگاہ سے اس دعوے کی چھان
بین کرنے میں ایک لمحہ کی سہل انگاری بھی مہلک ثابت ہوگی۔

مسٹر نیمر اپنی اختراع کو مشہور کر کے فروخت کرنے کی خواہش رکھتا
ہے۔ اس لئے اس کی ملاقات چنداں دشوار نہیں۔ منسلکہ کارڈ آپ کی
رہنمائی کریگا۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ پروفیسر صاحب کے ہمراہ اس کا معائنہ
کر کے ایک تنقیدی مقالہ سپرد قلم کریں۔ امید ہے آج شام تک آپ تمام
تفصیلات سے مجھے آگاہ کریں گے۔ (آر بکادل)

اس خط کو طے کرتے ہوئے میں نے کہا میں امید کرتا ہوں کہ آپ
اپنی گراں قدر اور قیمتی امداد سے مجھ ہیچ میرز کو مستفید ہونیکا موقع دینگے۔
میں اپنے محدود علم اور قابلیت سے اس دقیق نکتہ کو حل کرنے سے قاصر
ہوں۔

پروفیسر "مبلن یہ سچ ہے۔ ہر چند تم قدرتی فہم و فراست اور قابلیت سے
تہیدست نہیں ہو لیکن میں یہ باور کرتا ہوں کہ تم ایسے فوق الادراک معاملے
کو سلجھا نہیں سکتے۔ ان بے عقل حیوانوں کی حماقت کا رونا کہاں تک روؤں
جنہوں نے صبح سے تار برقی کے ذریعے میرا عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے اور
صبح کے قیمتی لمحے تباہ کر دیے ہیں۔ اس لئے یہ معاملہ مجھ پر بار نہ ہوگا۔ میں
اطالوی سینیر و تی کو جس کی خط سرطان کے کیڑے مکوڑے کی تحقیق
و تفتیش نے میرے دل میں تنفر و نفرت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جواب
دینے میں منہمک تھا۔ اب اس مکار کی عیاریوں کا تار و پود دکھیڑنا شام
تک ملتوی کر سکتا ہوں۔ اور میں اس وقت تمہارے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں
اب میں اور پروفیسر ایک گہری سرنگ میں سے گذر رہے تھے جو شمال کی
طرف پھیلی ہوئی تھی۔

روانہ ہونے سے قبل میں نے ٹیلیفون کے ذریعہ مسٹر نیمر مسٹر محمد عمر کے
مکان پر موجودگی کا علم حاصل کر لیا تھا۔ اور اس کو اپنی ملاقات کی اطلاع
بھی دیدی تھی تاکہ وہ مکان پر موجود رہے۔ وہ ہمپسٹڈ میں ایک فلک بوس
عمارت میں رہتا تھا۔ اس نے ملاقات کے کمرے میں نصف گھنٹہ تک
ہمیں انتظار میں رکھا۔ وہ چند ذی رتبہ ملاقاتیوں کے ساتھ تخلیہ میں گفتگو
کر رہا تھا۔ میں نے نیم وا دروازے میں سے ان کی ایک جھلک دیکھی
جہاں سے میں ان کی شائستگی و وجاہت کا اندازہ کر سکا۔ جب وہ چلے
گئے تو تھیوڈور نیمر ہمارے کمرہ میں داخل ہوا جب میں نے اس کو دیکھا۔
سورج کی تیز اور چمکدار شعاعیں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ اپنے لمبے اور
نحیف ہاتھ ملتا ہوا اور مسکراتی ہوئی مکار زرد آنکھوں سے ہمارا جائزہ
لے رہا تھا۔

وہ پستہ قد کریہہ المنظر اور بدصورت آدمی تھا۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا
کہ کس شئے نے اُسے بدشکل بنا دیا ہے۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں
بلی کی طرح چمکدار تھیں۔ مونچھیں اور لمبی۔ ٹھوڑی سے لیکر آنکھوں
تک صورت نہایت مکروہ و قابل نفرت۔ لیکن پیشانی پر ایک درخشندہ
ہالہ تھا جو میں نے شاذ و نادر ہی کسی انسان کی پیشانی پر دیکھا ہوگا۔ کوئی
شخص سرسری نظر سے اس کی صورت دیکھ کر اُس کو خوفناک باغی تصور کر سکتا
ہے لیکن پیشانی کا ہالہ اس کے دنیا میں لاثانی سائنسدان و صاحب ادراک
ہونے کی دلیل تھا۔

حضرات جیسا کہ مجھے ٹیلیفون پر معلوم ہوا ہے آپ میری ایجاد کی
تحقیق کے لئے تشریف لائے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ اُس نے پوچھا۔

"ہاں جناب" میں نے جواب دیا۔

موجد۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ سلطنت برطانیہ کے نمائندے
ہیں؟"

"ہرگز نہیں میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں اور میرے ساتھی پروفیسر
چیلنجر ہیں" میں نے جواب دیا۔

موجد (مربیانہ انداز سے) پروفیسر صاحب اسم بامسمی ہیں۔ میں یہ عرض
کرنا چاہتا تھا کہ سلطنت برطانیہ اس زریں موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھی ہے
لیکن شاید وہ بعد میں مقصود حاصل کر لے۔ میں اپنی اختراع اس سلطنت کے

ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا تھا جو سب سے زیادہ اس کی قیمت ادا کرنے کی متحمل ہو سکے اور اگر اب یہ ایجاد کسی ایسی طاقت کے ہاتھ آ گئی جس کو شاید آپ ناپسند کریں تو اس کے آپ ہی ذمہ دار ہیں۔"

....

"تو کیا آپ نے اس کو فروخت کر دیا ہے" میں نے دریافت کیا۔

موجد "ہاں جناب"

میں "آپ خیال کرتے ہیں کہ شاید خریدار کو اس پر کامل قدرت حاصل ہو گی"

موجد "یقیناً"

میں "لیکن اُن کے علاوہ اور ماہرین فن بھی ایسی ایجاد کے اسرار سے آشنا ہیں؟"

موجد "ہرگز نہیں" اُس نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ اس کا راز اس صندوق میں ہے جو تمام آہنی صندوقوں سے مضبوط اور ڈاکوؤں کی گزند سے محفوظ ہے ممکن ہے کہ ایک شخص اُس کے ایک پہلو کا راز معلوم کر لے اور دوسرا دوسرے پہلو کا۔ مگر دنیا میں سوائے میرے کوئی نہیں جو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہو"

میں "اور وہ جن کے ہاتھوں آپ نے اس کو فروخت کیا ہے"

موجد "ہرگز نہیں۔ میں ہوش و خرد سے اتنا بیگانہ نہیں کہ بغیر حصول زر کے اس کے تمام اسرار بے نقاب کر دوں۔ ادائیگی رقم کے بعد ان کو میری ذات کا خریدنا لازم ہو گا" اُس نے دوبارہ اپنی پیشانی کو چھوا" تاکہ اس صندوق کے قفل کو کھول کر اس کے مقاصد کو وفاداری اور سنگدلی سے سرانجام دے اور اس کے بعد ایک نئی تاریخ مرتب ہو گی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کو ملا۔ اور اس کی مسکراہٹ ایک بلند بانگ قہقہے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کہا" صاحب معاف فرمائیے" پروفیسر نے جس کے ہونٹوں پر ابھی تک خاموشی کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ اس کی صورت سے نیمر کے خلاف نفرت ٹپکتی تھی" پیشتر اس کے ہم اس موضوع پر سلسلہ بحث جاری رکھیں ہمیں یقین دلایا جائے کہ یہ امر قابل بحث ہے۔ ہم ابھی ایک اطالوی کا واقعہ فراموش نہیں کر سکے جس نے کانوں کو شگاف دینے کی نئی تجویز پیش کی لیکن تحقیق کرتے ہی اس کی عیاری و مکاری کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔ پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" آپ کو معلوم ہو گا کہ میں ایک سائنسدان ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہوں اگرچہ میرے پاس کافی ثبوت موجود نہیں۔ وہ شہر جس کو آپ باشندگان یورپ کی ملکیت تصور کرتے ہیں امریکہ میں بھی اس کی قلت نہیں لیکن سائنس کیلئے احتیاط شرط ہے۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ ہم غور و فکر کریں آپ کو اپنے دعوے کے ثبوت میں کافی دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

موجد "پروفیسر صاحب آپ کو اپنی شہرت پر ناز ہے لیکن یہ عام مقولہ ہے کہ دنیا میں آپ کی ذات آسانی سے دام فریب میں گرفتار ہو سکتی ہے میں اپنے دعوے کا حقیقی ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن قبل ازیں اس کے عام اصول چند الفاظ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ آزمائشی آلہ جو میرے معمل میں قائم ہے۔ صرف ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ اس کے اثر و نتائج بھی اپنی پیمانہ کے مطابق تعجب انگیز ہیں۔ مثلاً یہ آپ کے جسم کو پارہ پارہ کر کے پھر اسی شکل و صورت میں جمع کر سکتا ہے۔ لیکن ایک سلطنت صرف اسی ڈھانچ کیلئے لاکھوں روپے ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ ایک کھلونا اور یہ اپنی تباہ کاری کے جوہر اس وقت دکھائیگا جب اسے اعلیٰ پیمانے پر بنایا جائے گا"

پروفیسر "کیا ہم اس نمونہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

موجد۔ پروفیسر صاحب آپ صرف ملاحظہ ہی نہیں کر سکتے بلکہ آپکی ذات پر اس کا عملی تجربہ بھی ہو سکتا ہے جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہو گی۔ اگر آپ میں اتنی جسارت ہے"

"اگر"۔ پروفیسر چلایا" تمہارا لفظ "اگر" نہایت توہین کن ہے۔

موجد۔ جناب میرا مقصد آپ کی جسارت و مردانگی کی توہین نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو اس کا عملی تجربہ حاصل کرنیکا موقع دوں۔ لیکن پیشتر اس کے اس امر پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

" جب کوئی بلوری شے مثلاً نمک یا مصری پانی میں ڈالی جائے تو وہ گھل کر غائب ہو جاتی ہے اور آپ معلوم بھی نہیں کر سکتے کہ اس پانی میں کوئی شے ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اگر پانی کی مقدار بھاپ یا دوسرے کسی ذریعہ سے کم کی جائے تو وہ شے دوبارہ نمودار ہو جاتی ہے کیا آپ ایسے ہی عمل کا تصور کر سکتے ہیں جس سے انسان کا وجود ہوا میں تحلیل ہو کر رد عمل سے بجنسہٖ اس شکل و صورت میں منظر عام پر آ جائے"

پروفیسر۔ یہ مشابہت بالکل غلط ہے۔ اگر میں ایسے میٹابولک عمل کو تسلیم بھی کر لوں کیونکہ ہمارے اعضا و جوارح بارود وغیرہ سے پارہ پارہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا اجتماع ناممکن ہے"

موجد "آپ کا اعتراض بالکل درست ہے۔ لیکن میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ آپ کا بال بال اسی صورت میں مجتمع ہو جائیگا۔ اس لئے میں ایک ایسی تعمیری صنعت پوشیدہ ہے جو ہر ذرے کو اس کی اصلی جگہ پر قائم کر دیتا ہے۔ پروفیسر صاحب آپ بیشک میرا مضحکہ اڑائیں لیکن آپ کی بے اعتقادی

ونسنر بہت جلد تقین و سنجیدگی سے بدل جائیگا۔

پروفیسر چیلینجر نے اپنا شانہ ہلایا اور کہا" میں اپنے جسم کو اس عمل کیلئے پیش کرتا ہوں"

موجد نے" تو آپ میرے ہمراہ تشریف لائیں"

ہم نیچے اُتر کر ایک باغ کو طے کر کے ایک مقفل کمرے کے پاس پہنچے جس کو اُس نے کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ اس کے اندر ایک اور قلعی شدہ کمرہ تھا جس کی چھت کے ساتھ مکڑی کے جالے کی طرح بیشمار برقی تاریں آویزاں تھیں سامنے ایک مخروطی شکل کا شیشہ تھا جس کی لمبائی تین فٹ اور قطر ایک فٹ ہوگا۔ اس کے دائیں جانب جست کے چبوترہ پر ایک کرسی تھی اور اُس کے اوپر ایک تانبے کی ٹوپی لٹکی ہوئی تھی اور کرسی اور ٹوپی تاروں سے جکڑی ہوئی تھیں۔ کرسی کے ایک طرف پیتل کا دندانے دار چکر تھا جس میں سوراخ اور چند اعداد و شمار بھی لکھے تھے اس کا ہینڈل درجہ نفی پر تھا۔

"بنجر کی ایجاد" موجد نے مشین کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہی وہ نمونہ ہے جس کی قسمت میں اقوام عالم کی طاقتوں کو زیر و زبر کرنے کی شہرت لکھی ہے اس کا مالک دنیا پر مسلط ہوگا۔ اب پروفیسر صاحب یہ معاملہ زیر غور ہے۔ آپ کا نازیبا سلوک حد سے بڑھ کر نا قابل برداشت تھا۔ کیا آپ اس کرسی پر بیٹھنے کی جرأت کر سکتے ہیں تاکہ مجھے اس قوت کے نتائج آپ پر آشکارا کرنے کی اجازت حاصل ہو"

پروفیسر کرسی کی طرف لپکا۔ لیکن میں نے اُس کے بازو کو پکڑ کر اپنی تمام قوت سے اُس کو روک لیا" آپ نہیں جا سکتے" میں نے کہا" آپ کی زندگی گراں قدر ہے۔ آپ کے پاس اپنی زندگی کی بقا اور حفاظت کی ضمانت کیا ہے؟"

"میری زندگی کی بقا کی ضمانت صرف آپکی شہادت کافی ہے" اُس نے جواب دیا۔ اور اگر مجھے کبھی نقصان پہنچا تو یہ شخص قتل انسانی کے جرم کا مرتکب ہوگا"

"لیکن اگر یہ کام جو صرف آپکی ذات سے وابستہ ہے ادھورا رہجائیگا تو دنیائے حکمت کے لئے تسلی بخش ثابت نہ ہوگا" میں نے کہا" پہلے مجھے جانے دیں اور اگر یہ تجربہ بخیر و عافیت کامیاب ثابت ہو تو پھر آپ جا سکتے ہیں"

پروفیسر چیلنجر کبھی کسی ذاتی خطرہ کے وقت خوفزدہ نہیں ہوتا تھا لیکن اس خیال سے کہ اس کی تحقیق و تفتیش ناتمام رہ جائے گی وہ خیالات کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ پیشتر اس کے وہ کسی نتیجہ پر پہنچے میں ایک ہی جست میں کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے موجد کو دستہ پکڑتے ہوئے دیکھا اور ٹک ٹک کی آواز سنی چند لمحوں کے بعد مجھے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ پھر آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی جب فضا صاف ہوئی تو موجد میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے لبوں پر حقارت آمیز تبسم رقصاں تھا۔ اور پروفیسر خشمگین انداز سے اس کی طرف گھور رہا تھا میں نے کبھی پروفیسر کو اس قدر پریشان مضطرب نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آہنی قوت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے حواس باختہ میرے بازو پکڑ کر کہا۔ "میلن" یہ تو بالکل سچ ہے۔ تم واقعی ناپید ہو گئے تھے۔ پہلے ایک دھند سی چھا گئی اور پھر تم غائب ہو گئے۔

"میں کتنا عرصہ غائب رہا" میں نے دریافت کیا۔

"دو یا تین منٹ۔ خوف سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں تمہاری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر اُس نے دستہ کو درجہ دوئم پر گھمایا تو تم صحیح و سالم اسی شکل و ہیئت میں نمودار ہو گئے گو تم پہ پژمردگی چھائی ہوتی ہے۔ لیکن تمہاری تعمیر میں بال بھر فرق نہیں"۔ اُس نے پیشانی کا پسینہ سُرخ رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"جناب اب کیا ارادہ ہے" موجد نے طنزاً کہا" شاید آپ کی مردانگی پہلو بدلنے لگی ہے" پروفیسر نے اپنے جسم پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور میرے ہاتھ کو جو میں نے اسے روکنے کے لئے اُٹھایا تھا ایک طرف اُٹھا کر کرسی پر جا بیٹھا۔ موجد نے فوراً دستہ کو درجہ سوئم تک گھمایا اور وہ آن کی آن میں ناپید ہو گیا"

"یہ کیا دلچسپ عمل ہے" موجد نے کہا" جو شخص پروفیسر کی اعلیٰ شخصیت کا معترف اور عقیدتمند ہو اُس کے لئے یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ وہ اس وقت بادل کا ایک بے مقدار ذرہ ہے۔ جو اس کمرہ کے کسی گوشہ میں لٹکا ہے۔ اس وقت اس کی زندگی کا انحصار میرے جذبہ رحم پر ہے۔

اگر میں اس کو تا ابد اسی حالت میں چھوڑ دینا پسند کروں تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تبدیل کرنے کی قدرت نہیں رکھتی"۔

"لیکن میں آپ کو ایسے روح فرسا ارادہ سے باز رکھنے کا کوئی ذریعہ تلاش کروں گا" میں نے کہا۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا" آپ کا خیال غلط ہے۔ مجھے کوئی اس ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اب تو چیلنجر کا حرف غلط کی طرح مٹ جانے کا خیال کیجئے۔ یہ واقعہ المناک ہے۔ لیکن اس کا سلوک بھی ناقابل برداشت تھا جس کی پاداش کا وہ مستوجب ہے۔

"نہیں ہرگز نہیں" میں نے کہا۔

"خیر یہ عمل آپ کے جریدہ کے لئے ایک دلچسپ مقالہ مہیا کریگا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی بال ریشہ ہائے حیات سے بالکل مختلف ساخت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں اور اڑائے جاتے ہیں۔ میرے لئے اس کی بالشت بھر ڈاڑھی کا صفایا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"وہ دیکھیے!"

اُس نے دستہ گھمایا اور آن واحد میں چیلنجر کرسی پر نمودار ہوگیا لیکن کیا چیلنجر؟ پھر غصے سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن میں ہنسی کو ضبط نہ کرسکا۔ موجد کی شعبدہ بازی مگر اس کا دیوصورت سر نوزائیدہ بچّہ کے سر کی طرح ننگا اور چہرہ ایک لڑکی کے چہرہ کی مانند نرم تھا۔ ڈاڑھی نہ ہونے کی وجہ سے بدصورت نظر آتا تھا۔ لیکن قوی ہیکل جسم پر ایک شکست خوردہ شمشیر باز کی سی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ چیلنجر کا ہاتھ فوراً سر کی طرف لپکا اور اس کو اپنی تبدیل شدہ حالت کا احساس ہوگیا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ جھپٹا اور لپک کر موجد کا گلا گھونٹ دیا۔ اور زمین پر گرا دیا۔

"خدا کے لئے ہوش کی دوا کرو۔ اگر وہ مرگیا۔ تو بگڑا ہوا کھیل کبھی درست نہ ہوگا" میں چلایا۔ چیلنجر غایت درجہ دیوانگی میں بھی دلیل کے سامنے سر جھکا دیتا تھا۔ اس لئے یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے موجد کو زمین سے اُٹھا لیا۔

"میں تمہیں صرف ۵ منٹ کی مہلت دیتا ہوں" چیلنجر نے شدت غضب سے کہا "اگر ۵ منٹ کے اندر میری حالت درست نہ ہوئی تو تمہاری جان کی خیر نہیں"

غیظ و غضب کی حالت میں چیلنجر کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ ایک قوی ہیکل انسان بھی بید مجنوں کی طرح کانپ جاتا تھا لیکن نحیف تو مردوں سے بدتر تھا۔

"بہت اچھا" موجد نے اپنا گلا ملتے ہوئے کہا "یہ تشدد ناگزیر ہے۔ بزم احباب میں عموماً ایک بے ضرر مضحکہ باعث تفریح ہوتا ہے۔ میں اس ایجاد کی قوت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی اس کے صحیح عمل سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد دنیا میں کسی شخص کو گزند پہنچانے کا نہیں"

چیلنجر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میلن تم اس کی حرکات پر نگاہ رکھو اور کسی قسم کی چالاکی نہ کرنے دو۔"

"بہت اچھا" میں نے جواب دیا۔

"اب تم اس معاملہ کو سلجھاؤ۔ یا خمیازہ بھگتنے کیلئے تیار ہوجاؤ۔" پروفیسر نے موجد کو کہا۔ خوفزدہ موجد کانپتا ہوا مشین کے پاس گیا اور اپنی پوری قوت سے ہینڈل کو گھمایا۔ چشم زدن میں چیلنجر کی ڈاڑھی عود کر آئی۔ بالوں کے واپس آنے سے مطمئن ہونے کیلئے وہ اپنی گنجان ڈاڑھی پر شفقت آمیز ہاتھ پھیرتا ہوا سر تک لے گیا۔ پھر کرسی سے نیچے اُترا۔

"تم نے اپنی زندگی دوبارہ حاصل کی ہے۔ میں تمہارے اس بیان سے مطمئن ہوں کہ تمہارا یہ فعل تجربہ پر مبنی تھا۔ کیا میں اس عجیب الخواص ایجاد کی بابت استفسار کرسکتا ہوں" پروفیسر نے کہا۔

موجد "میں آپ کے تمام سوالات کا جواب دے سکتا ہوں"

پروفیسر "کیا اس اختراع کے راز ہائے نہانی تمہارے ہی دل میں مستور ہیں اور کوئی دوسری ہستی اس سے بہرہ ور نہیں۔"

موجد "ہاں جناب"

پروفیسر "کیا کسی شخص نے اس آلہ کے بنانے میں تمہاری مدد کی تھی"

موجد "ہرگز نہیں میں نے تنہا ہی اس کام کو انجام دیا ہے"

پروفیسر "یہ تو تعجب انگیز ہے۔ میں اس قوت کے نتائج و عواقب سے مطمئن ہوچکا ہوں۔ لیکن میں نے اس کی ساخت کا ملاحظہ نہیں کیا"

موجد "جناب میں قبل ازیں عرض کرچکا ہوں کہ یہ صرف ایک نمونہ ہے لیکن اس کی ساخت بڑے پیمانے پر آسان ہے"

پروفیسر "کیا آپ نے یہ اسرار مسرت ایک یورپین سلطنت کے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔"

موجد "ہاں جناب لیکن جب وہ اس کی قیمت ادا کردیں گے تو اُن کے پاس ایک ایسی قوت موجود ہوگی جس کے سامنے دنیا کی تمام سلطنتیں تہی دست ہونگی اور اُن کو اُس کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ لندن کے اس گوشے کا خیال کریں جہاں یہ قائم ہوگی اور پھر اس کی قوت کا" اُس نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ "میں خیال کرتا ہوں کہ دریائے ٹیمز کی جگہ ریت اُڑ رہی ہوگی اور تمام انسان آسمان کی بلندیوں کی سیر کر رہے ہوں گے"

میرے دل پر ایک کاری ضرب لگی۔ لیکن اس کے پریشان کن الفاظ نے پروفیسر پر مختلف اثر کیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے فرط مسرت سے اپنا ہاتھ موجد کی طرف بڑھایا۔ اور یوں گویا ہوا۔

"مسٹر نیمر میں آپ کو اس ایجاد کی کامیابی پر دلی تہنیت پیش کرتا ہوں اگر اس کی جہاں سوزی اور ہلاکت آفرینی روح فرسا ہے۔ اور سائنس اس کی فضیلت نا آشنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کی حیثیت ترکیبی کا معائنہ

کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

موجد" ہرگز نہیں ۔ یہ آلہ ایک جسم کی مانند ہے لیکن اس کی روح کی تحقیق لاحاصل ہے۔

پروفیسر" یہ بالکل درست ہے لیکن اس کی ساخت ہی صنعت کاری کا ایک نمونہ ہے۔" اُس نے اُس کے ارد گرد چکر لگائے۔ چند اجزا کو چھؤا۔ پھر اپنے بھاری جسم کو کرسی پر گرا دیا۔

"کیا آپ دوبارہ عالمِ خیال کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔" موجد نے پوچھا۔

پروفیسر" شاید کچھ عرصے بعد۔ لیکن یقیناً تمہیں معلوم ہوگا کہ کچھ برقی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ میں ایک ہلکی سی رو اپنے اندر دوڑتی ہوئی محسوس کرتا ہوں۔

موجد" ناممکن ۔ کرسی تو بالکل غیر ملحق ہے۔

پروفیسر" لیکن یقین کیجئے کہ میں اس سنسناہٹ کو محسوس کرتا ہوں۔

پروفیسر کرسی سے نیچے اُتر آیا۔ اور موجد فوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔

موجد" لیکن میں بالکل اس سنسناہٹ کو محسوس نہیں کرتا۔"

پروفیسر کیا تمہارے پٹھوں میں جھنجھناہٹ پیدا نہیں ہوتی۔

موجد" نہیں۔"

ایک کرخت آواز پیدا ہوئی اور موجد غائب ہوگیا۔ میں حیرت زدہ پروفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا آپ نے مشین کو چھؤا ہے۔"

اُس نے تعجبانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر زہر خند کیا۔

"مسٹر سیلن ۔ شاید میں اس ہینڈل کو لاپرواہی سے پکڑتا۔" اُس نے کہا اس قسم کے تباہ کن آلہ جات سے بنی نوع انسان کو غایت درجہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ میلین محفوظ رکھنا چاہیئے۔"

"یہ درجہ سوئم پر ہے اور اس درجہ پر انسان معدوم ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا

پروفیسر" اس لئے میں نے اس کا خیال رکھا جبکہ تجربہ عمل ہو رہا تھا۔"

لیکن جب وہ تمہیں واپس لایا تو میں نہایت متذبذب و پریشان تھا۔ اس لئے اس کے ردعمل کو ملاحظہ نہ کر سکا کیا تمہیں معلوم ہے۔" میں نے پوچھا۔

پروفیسر" شاید میں جانتا ہوں میں ان جزوی تفصیلات سے اپنے آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں پر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا مقصد معلوم نہیں اور جن کی آزمائش ناخوشگوار حادثات کا باعث ہوگی۔ اس لئے ان کو اسی حالت میں چھوڑ دینا سودمند ہے۔ مسٹر نیمر نے اپنے وجود کو عالمِ خیال کے ذروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب اس کی ایجاد بے سود ہے۔ اور اس سلطنت کے منصوبوں پر پانی پھر گیا ہے جس نے اسے خریدا ہے۔ اور دنیا اس کے ضرر و تباہ کاری سے محفوظ ہوگئی ہے۔ اب تمہارے رسالہ میں موجد کی ناقابلِ بیان اور حیرت انگیز گمشدگی کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون شائع ہوگا۔ جو اس وقت وجود میں آئی جبکہ اس کا خاص نامہ نگار ملاقات کے لئے موجد کے پاس گیا۔"

پروفیسر نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا واقعی یہ تجربہ بہت دلچسپ ہے اور خشک مطالعہ غیر دلچسپ لمحوں کو خوشگوار بنانے کا باعث ہوگا لیکن زندگی میں مسرت کے لمحوں کے علاوہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ چنانچہ اب میں اطالوی میزونی کی بیہودہ گوئی کا مسکت جواب دینا چاہتا ہوں۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کرسی کے ارد گرد ایک دھندلا سا بادل اُڑ رہا تھا۔"

ہر بنی نوع انسان کا اولین فرض ہے کہ مخلوق کی ہلاکت و تباہی کے اسباب کو نیست و نابود کرنے کی جدوجہد کرے۔" پروفیسر نے کہا۔ "جس کو میں بہت حد تک ادا کر چکا ہوں۔ مسٹر سیلن اب یہ معاملہ مزید بحث کے قابل نہیں۔"

"علاؤالدین"

احمقوں کا خاندان

کہتے ہیں کہ کھوسٹے ہٹے وقت نے جہالت سے شادی کی۔ اُنکے ہاں خیال نامی بیٹا پیدا ہوا جس نے شباب سے شادی کی اور مندرجہ ذیل بچے ہوئے۔

مجھے نہیں معلوم میں نہیں خیال کرتا ۔ کسے توقع تھی۔

کسے توقع تھی نے بے پروائی سے بیاہ کیا۔ ان کے ہاں یہ بچے ہوئے۔ بالکل ٹھیک میں کل کروں گا۔ کافی وقت ہے۔ اگلی دفعہ

کافی وقت نے میں خیال نہیں کرتا سے شادی کی اور حسبِ ذیل بچے پیدا ہوئے میں بھول گیا۔ میں اس کی بابت سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میں اس کی بابت سب کچھ جانتا ہوں نے غرور سے نکاح کیا اُن کے ہاں خوش فہمی پیدا ہوئی جس نے غالباً یہ نہیں ہوگا سے شادی کی اُن کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے آؤ لطف تو اُٹھا لیں اور بدقسمتی۔

بدقسمتی نے ناسمجھی سے بیاہ کیا اور بہت سے بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ یہی کافی ہوگا۔ اُن کا یہاں کیا کام ۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے ۔ یہ ممکن نہیں ہے۔

خوش فہمی بیوہ ہو گئی تو اُس نے حماقت سے شادی کر لی اور اپنی میراث کو صرف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے "صبر کرو آؤ اپنا سرمایہ خرچ کریں اس سال تو مزے اُڑا لیں اگلے سال خداوند بست کر دیگا۔ لیکن دھوکہ انہیں جیل خانہ لے گیا اور مفلسی نے کارخانہ میں پہنچا دیا۔ جہاں سے پھر وہ ملکِ عدم کو سدھار گئے اُن کی میت پر عجیب و غریب رسومات ادا کی گئیں اس موقع پر پانچوں احساس فہم، حافظہ اور قوت ارادی بحالت زار موجود تھیں

چونکہ تو بہ دیر سے آئی تھی اس لئے اُسے کوئی جگہ نہ ملی اور تمام وقت کھڑی ہی رہی۔ حالانکہ تسلی اور قناعت کی نمائندگی ویرانی اور کلفت کر رہی تھیں جو حافظہ کی بیٹیاں ہیں۔

متوفیوں کی پونجی ناکوس کئی دن تک بھیک مانگتی رہی اُسے بمشکل جو پیسے وصول ہوئے اس قسم سے اُس نے ایک رسہ خرید لیا اور اُس نے اپنے گلے میں ڈالا اور ایک......

دنیائے ادب

ہندوستانی ادبیات

(سے براہ راست)

اردو ہندی بنگالی پنجابی گجراتی مرہٹی سندھی کشمیری پشتو تلنگو سنسکرت

استقلال

ہمیشہ وہ اقوام ترقی پذیر ہوئی ہیں جو دنیا کی اسٹیج پر ثابت قدم رہتی ہیں۔ ہمیشہ اُن افراد خاندان نے عروج حاصل کیا ہے۔ جنہوں نے استقلال کو اپنی شاہراہ عمل قرار دیا ہے ہمیشہ وہ شخص کامیاب ہوا ہے جس نے استقلال سے کوئی کام شروع کیا ہے۔ تجارت صنعت وحرفت علوم وفنون غرض ہر شعبہ زندگی میں استقلال کی ضرورت ہے جس کام میں اس کا دخل نہ ہوگا وہ ضرور غیر مکمل رہیگا۔ تاریخ زمانہ کے اوراق اُلٹئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کیسے کیسے پختہ عزم لوگ گذر گئے ہیں اور وہ اپنے ارادوں میں مستقل نہ ہوتے تو آج دنیا اتنی ترقی نہ کرتی۔ اور اُن کا نام صفحہ عالم پر روشن نہ ہوتا۔

ہمارے مشاہدہ میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن کے قیام کی اصل بنا استقلال ہے اُن تمام ہوشربا واقعات کی یاد تازہ رکھنے میں جو گذر چکے ہیں استقلال کا دخل نہ ہوتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ہمیں اُن کا نشان تک نہ ملتا یہ استقلال ہی کی برکات ہیں کہ ہم تمام حالات دنیا سے اس طرح واقف ہیں جیسے ہمارے سامنے کی بات ہو۔ اگر ہمارے متقدمین تاریخی حالات لکھنے میں استقلال سے کام نہ لیتے تو آج ہمارے دلوں پر گذری ہوئی صدیوں کے افسانے منقش نہ ہوتے اور دور رفتہ کی ترقی وتنزل سے ہمارے دماغ کی آنکھیں روشن ہوتیں

ہم جو ارادہ کریں اُسے تکمیل پر پہنچانا ہمارا فرض ہے بشرطیکہ ہم غلطی پر نہ ہوں عزم بالجزم استقلال کی تخم پاشی ہے جب تخم بو دیا جاتا ہے تو پودہ نکلنا بھی ضروری ہے۔ پھر اگر اُس پودے کو مناسب غذا دی جائے تو وہ ضرور سرسبز و شاداب ہوگا

بعض لوگ دنیا کی سرد وگرم ہواؤں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور استقلال پر قائم نہیں رہتے لیکن ایسا کرنا استقلال پر صریح ظلم ہے۔ وہ ہرگز ایسی عمارت نہیں جو بدون تکمیل منہدم ہو سکے۔

کام کرتے کرتے چھوڑ دینا اور مستقل مزاجی پر قائم نہ رہنا تمام کوششوں پر پانی پھیر دینا ہے ایسی صورت میں پہلے فوائد بھی نقصان سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کو اُن کے ناکام نتائج پر ہاتھ ملنا پڑتا ہے۔ کسی امر سے بہت جلد مغلوب ہو جانا اور ہتھیار ہاتھ سے ڈال دینا شیوہ مردانگی نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر کوشش پوری طاقت سے اُس وقت تک جاری رکھنا چاہئے۔ جب تک گرد وپیش کے تمام حالات مخالفانہ صورت اختیار نہ کرلیں۔

نور جہاں

دور اولین کی مسلم خواتین

زینب حضرت جلال الدین سیوطی کی استاد حدیث عبداللہ تنوخی کی بیٹی ایک نہایت عالم فاضل محدثہ تھیں۔ اُن کی کمال علمیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے ام الخیر کے لقب سے مشہور ہو گئی تھیں اور حضرت سیوطی نے نہایت فخر کے ساتھ اُن کا نام اپنے اُستادوں کے ساتھ لیا ہے

ایک اور زینب جو ام حبیبہ کی کُنّیت سے مشہور ہیں اپنے زمانے کی نہایت نامور محدثہ گذری ہیں اُن کے باپ کا نام سعد بن محمد ہے اُن کا وطن مکہ معظمہ ہے یہیں پیدا ہوئیں اور فضیلت علمی حاصل کی اور فن حدیث میں وہ کمال حاصل کیا کہ حضرت سیوطی نے ان سے حدیث بیان کرنے کی اجازت لی۔

خدیجہ عبدالرحمٰن بن احمد کی نہایت فاضل و قابل بیٹی ساتویں صدی ہجری میں پیدا ہوئیں اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے نہایت مشہور ہوئیں اُنہوں نے ایک بہت بڑا مدرسہ حدیث کا قایم کیا تھا جس میں بڑے بڑے موقر عالم داخل ہوئے جن میں ہمیں حضرت جلال الدین سیوطی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔

مُسلم ابن ابراہیم مشہور محدث کی اُستاد حدیث تحیّہ راسبیہ کی رہنے والی تھیں۔ بڑے بڑے علمائے زمانہ ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے اور مسلم کو تو ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

اُمّ یحییٰ کی علمی فضیلت و دماغی قابلیت کو کوئی مرد کیا پہنچ سکتا ہے ام یحییٰ نے چالیس سال سے بجز قرآن مجید کی آیات کے دوسری زبان میں بات چیت کرنا چھوڑ دیا۔ ہر بات کا کافی و شافی جواب قرآن پاک کی آیات سے دیتی تھیں۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک نامور محدثہ کلثوم نامی گذری ہیں جنکی کنیت ام عمرو ہے انہوں نے تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد اپنا حلقہ تحدیث الگ قایم کیا۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالم اُن کی درسگاہ میں زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ جن میں ابن حجر عسقلانی نے نہایت فخر کے ساتھ اپنی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔ ام عمرو حافظ تقی الدین بن رافع اسلامی کی بیٹی تھیں۔ اُن کے باپ کو اپنی بیٹی کی علمیت پر بہت ناز تھا جو بجا تھا۔

رضیہ اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی کی نہایت محبوب ملکہ تھی بادشاہ کے رضیہ کو عزیز رکھنے کا سبب صرف اُس کا حسن و جمال ہی نہ تھا۔ بلکہ اُس میں اُس کے فضل و کمال کو بھی کچھ دخل تھا۔ بادشاہ جب کبھی اس کو دیکھتا تو بے حد خوش ہو کر "نجم السرور" کے لقب سے پکارتا تھا۔ الحکم جیسے عالم بادشاہ کے دل میں اس کی علمیت و قابلیت کی بہت قدر اور وقعت تھی۔

اندلس ہی کی ایک دوسری رضیہ کا حال سُنئیے۔ جو کنیز تھی۔ اپنی قابلیت علمی کے باعث عبدالرحمٰن ثالث کے دل میں نمایاں جگہ پائی تھی۔ عبدالرحمن نے اُس کو آزاد کر کے اپنے پیارے فرزند الحکم کے سپرد کر دیا تھا۔ اس علم دوست بادشاہ نے رضیہ کی صحبت بہت خوشی سے پسند کی۔ رضیہ جیسی عالمہ فاضلہ تھی ویسی ہی مورخہ بے بدل شاعرہ بے نظیر مانی جاتی تھی۔ اس نے الحکم کے ایما سے سیر و تاریخ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور اپنے اشعار کے دیوان بھی مرتب کئے اُس کی کتابیں الحکم کے مشہور کتب خانے کی زینت بنتی تھیں۔ اس کی لیاقت کا چرچا اس قدر ہو گیا تھا کہ وہ الحکم کی وفات کے بعد غم غلط کرنے کی خاطر مشرقی اندلس کا سفر کرنے گئی اُسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ وہاں کے ہر شہر میں اُس کی علمیت کا شہرہ ہو چکا تھا۔

"عصمت"

دہلی

شیخ فریدالدین عطارؔ

معارن ([illegible]) عطار کو ہفت وادی یا منازل روحی کا جنہیں طیور عبور کرتے ہیں موجد بتاتا ہے۔ واقعی دوسرے صوفیوں، مثلاً قشیری و ہجویری کی (جو عطار سے مقدم ہیں) اور سہروردی کی (جو اُس کا معاصر ہے) تصانیف میں اس قسم کا نظام نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا کہ اسے عطار سے کیوں نہ منسوب کیا جاسکے۔

یہ خیالات کہ نظام سات کے عدد اور عام دلفریبی کے لحاظ سے سینٹ تیریسا (SK. Tilereele) کے خیالات سے ملتا ہے عطار کے وادیوں کے نام لکھتا ہوں:۔

طلب، عشق، علم، بے تعلقی، وحدت، حیرت، عدم اور فنا، میں اس جگہ اس روحانی موت یا فنا کی حقیقی نوعیت پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کے متعلق اپنے آرا اپنی کتاب "غزالی" میں ظاہر کر چکا ہوں۔ اور ان آرا میں اس وقت تک کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

میں اخیر میں عطار کے چند لطیف ابیات پر اکتفا کرتا ہوں، جس میں اُس نے اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں روح کی زندگی اور شخصیت کے تمام عوارض و تفصیلات محو ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور صرف وصال خداوندی کا احساس باقی

رہ جاتا ہے۔

وہاں تو ایک روحانی شعاع کے سامنے ہزاروں تاریکیوں کو جو سمجھے گھیرے ہوئے ہیں غائب ہوتے دیکھے گا۔ جبکہ بحرِ ذخار کی موجیں ساکن ہو جاتی ہیں تو وہ نقوش جو پانی پر پڑتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ نقوش محض عالمہائے موجودہ و آئندہ ہیں جس شخص کا دل اس سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتا، اور سکون پا لیتا ہے اس بحرِ ساکن میں بجز فنا کے اور کچھ نہیں ملتا۔ اگر کوئی پاک شے اس سمندر میں گر جاتی ہے تو وہ اپنی مخصوص ہستی کو گم کر دیتی ہے۔ اپنا جداگانہ وجود کھو دینے پر وہ آئندہ بھلی ہو جاتی ہے۔ وہ موجود ہوتی ہے اور نہیں ہوتی ہے یہ کیسے ممکن ہے؟ ذہن اسے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

"اردو" اورنگ آباد

مذہب اور خانگی امور کا انتظام

جس طرح مذہب کا اقوامِ عالم کی زندگی کے انقلابات پر اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح وہ قوموں کے رجحانات۔ اُن کی روحانی ترقی اور اُن کی ذہنیت کا اچھا نمونہ ہے۔ اس لئے ہمیں مصری عورت کا مکمل مفصل حال لکھنے کے لئے مصریوں کے مذاہب کی چھان بین ضروری ہے۔

انسان کی اجتماعی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اگلی قوموں میں ایک مذہبی طریقہ طوطم سے موسوم تھا۔ طوطم غالباً کوئی جانور ہے جسے قومیں پوجتی تھیں۔ اُن کا گمان تھا کہ اُن کی نسل اُسی جانور سے پھیلی ہے۔ اسی قاعدہ کے لحاظ سے مصری اُصولِ عبادت اور اجتماعی نظام پر کاربند تھے۔ لیکن اُن کا نظامِ اجتماعی رفتہ رفتہ بدل گیا۔ لڑکے صرف ماں کے کہلاتے تھے۔ مصری تمدن کے ہر دور میں یہ طریقہ مروج رہا۔ یہاں تک کہ اہلِ یونان غالب ہو گئے جن کی حکومت ۳۲۳ سنہ سے ۳۰ سنہ ق م تک تھی۔ انہوں نے مصر میں یونانی تمدن کا بیج بویا۔ جس نے مصریوں کے مذہب اور اُن کی خصوصیات میں انقلابِ عظیم پیدا کیا۔ باوجود اس ردّوبدل کے بھی قبروں پر ہیروغلیفی خط سے مُردوں کے نام لکھنے کا طریقہ اور اُن کو ماؤں کو منسوب کرنے کا رواج اگرچہ اقلیت کے ساتھ یونانی مصر کے زمانہ تک باقی رہا۔

یونانیوں کے تسلط سے مذہب کا رُخ بھی جانوروں سے پھر کر انسانوں کی طرف آ گیا۔ مصریوں نے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی پرستش شروع کر دی۔ پابیروس انطازی کی کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مصریوں کے صرف تین خدا تھے (غمون) پوشیدہ (رتباک) غیر فانی (را) خالقِ موجودات۔ پھر مصریوں نے ان خداؤں کو ایک چوتھے معبود (اوزیریس) سے جا ملایا۔ اور ان کو اس کا مظہر ٹھیرایا۔ اس قدیم خدا کی طرف اُنہوں نے روشنی اور سورج کو منسوب کیا۔ اس کی بہن (ایزیس) جو اُس کی بیوی بھی تھی۔ شرفِ خداوندی میں اپنے بھائی یا شوہر کے شریک تھی (۲) اولاد کی آرزو میں مصری (اوزیریس) مجسمہ پر آتے تھے (۳) اُن کے علاوہ مصریوں کی ایک اور بھی معبودہ تھی جس کا مرتبہ بتوں میں (ایزیس) کے برابر تھا۔ نام اس کا نیتھ اور مسکن آفتاب تھا۔ نیچر کی پیدائش کا شرف اسی کو حاصل تھا۔

اس بناء پر کہ مذہب قومی اخلاق کا آئینہ ہے مصریوں کا صنفِ لطیف کو جنسِ قوی کی طرح رتبۂ خداوندی تک پہنچا دینا اور انہیں معبودانہ مراسم کی ادائیگی میں شریک کرنا مصری تمدن میں عورتوں کی قدر و منزلت ظاہر کرتا ہے۔

(نیرنگِ خیال)

ترقی

کہا جاتا ہے کہ آجکل کا زمانہ نہایت ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کی معراج کا زمانہ ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی اور آرام و راحت میں بیشی ہو۔ اور میرے نزدیک اس قوم سے بڑھ کر قابلِ الزام کوئی قوم نہیں جو تمدنی زندگی کے ایسے اُصول قائم کرے جن سے نحوست، نکبت، نفاق، نفرت، تنزل و افلاس اور تعصب و جہالت اُسے چاروں طرف سے گھیر لیں اور جن کی بدولت اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی میسر نہ آئے۔ لوگوں کو جو افکار و تردّدات آج کل درپیش ہیں اُن کا عشرِ عشیر بھی اگلے

زمانے میں نہ تھا ہسپتالوں کو دیکھئے بیماروں سے بھرے پڑے ہیں۔ گلی کوچوں سڑکوں، درگاہوں، مندروں میں گداگروں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ الاماں، سفید پوش لوگوں کی اندرونی خستہ حالی اور قلبی پریشانی کی جو کیفیت ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے، ان مصائب اور دردناک مناظر کے اسباب کیا ہیں، اگر زمانے کی تہذیب کو دعویٰ ہے کہ معراج کمال کو پہنچی ہوئی ہے تو ان تکلیف دہ حالات کے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے۔ تہذیب کے معنے تو یہ ہیں کہ گوشۂ عالم میں خوشی کی لہریں دوڑتی رہیں اور خلق اللہ کی راحت میں دمبدم اضافہ ہوتا رہے۔ ایسی حالت کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ملکوں اور قوموں کے سنجیدہ دلوں اور فہمیدہ دماغوں کو غور کرنا چاہئے کہ جس رستہ پر آجکل دنیا چل رہی ہے وہ کہیں اس کی مصداق تو نہیں ع کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است۔ اصل یہ ہے کہ تمدن حال کی بنیادیں اس نظریہ پر قائم ہیں کہ قوی ہستی کمزور کو فنا کر دے صفحۂ دنیا سے جبتک یہ نظریہ نہیں ہٹے گا اور طاقت کی نمائش کم نہ ہوگی اُس وقت تک صحیح انسانی نشوونما کا وجود میں آنا محال ہوگا۔ مجھے یہ اُصول پسند ہے کہ قوی ہستی کمزور کو فنا کرنیکے بجائے اس کی دستگیر اور معاون ہو ایسی دستگیری کیلئے ہم کو اُن تمام اُصولوں کے بدلنے کی ضرورت ہوگی جو نظریہ ماسبق میں مضمر ہیں مزید برآں جبتک اخلاق حسنہ اور جذبات خدا ترسی کی تولید اور قوت عمل صالحہ کو مسلسل جنبش نہ ہوگی اُس وقت تک زندگی خوشگوار پر امن اور راحت افزا و کامیاب نہ ہوگی۔ (کامیابی)

باغ و بہار

کنج دلچسپ ان میں کلیوں اور پھولوں کی بہار
سر پہ سایہ اور پاؤں کے تلے ہے سبزہ زار

ہر روش کے دونوں جانب سبزۂ مخمل کا ہی فرش
ہے نئی دُوب اس سبب سے رنگ میں ہلکا ہی فرش

کھِلتی ہیں شاخوں میں کلیاں جب کھلاتی ہے ہوا
ہلتی ہیں پھُولوں کی شاخیں جب ہلاتی ہی ہوا

ایک گیند اپتیاں خوشرنگ جسمیں سینکڑوں
ایک گل پیش نظر ہیں جس کی قسمیں سینکڑوں

پتیاں ہیں لال لال اور ان میں زیرہ زرد زرد
گرد آگ اور بیچ میں سونا ہے لیکن آگ سرد

حوض بھی نہریں بھی فوّاروں کا جنمیں لطف ہے
بُلبلے شفاف سیاروں کا جن میں لطف ہے

لڑکھڑاتی چلتی ہے ہر موج متوالے کی چال
مچھلیاں پھرتی ہیں اُنمیں پیاری پیاری لال لال

ایں! جو سورج ڈوبتا ہی شوقؔ اٹھو گھر چلو
اس چمن سے کل کے نظارہ کا وعدہ کر چلو

شوقؔ قدوائی

بحرِ دل میں گرچہ طوفاں خیز ہے افسوں ترا — میں حقیقت کو پہنچ کر ہو گیا ممنون ترا

تیری لغزش نے کبھی سجدوں پہ آمادہ کیا — اور بساطِ بزمِ مے کو تو نے سجّادہ کیا

علمِ حق کی شمع افروزی جگر سوزی تری — سیلیٔ اُستاد سی ہے حکمت آموزی تری

خوانِ دل پر شور بختی کی نمکدانی بھی ہے — حُسن کی کشور میں گیسو کی پریشانی بھی ہے

پستی و اُفتادگی میں بھی نمو کا راز ہے — زور سے گِر کر اُبھرنا بھی پرِ پرواز ہے

رازِ پنہاں دہر کا چشمِ حقیقت پر کھُلا — اِک کٹھن منزل ہے تو بھی بر سرِ راہِ ہُدا

کجروی ہوتی نہیں جب باعثِ تسکینِ دل — جانبِ حق کو پلٹ جاتا ہے پھر آئینِ دل

تو نے روشن سب پہ کارِ نیک کا مضموں کیا — تیری تاریکی نے حسنِ نور کو افزوں کیا

شعلۂ حق رزق پاتا ہے ترے خاشاک سے
گلشنِ عُرفاں کے پھول اُگتے ہیں تیری خاک سے

(عبد الحکیم)

انگریزی

عظمتِ برطانیہ

کامیابی کے اُس قلعے کے مقابلہ میں خواہش کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتی ہے۔ جن قوموں کے جج بے انصاف ہوتے ہیں وہی قومیں ذلت کے گڑھے میں گر جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جسے عوام قابل حمایت خیال کریں۔ لیکن جن قوموں سے ہم جیسا سلوک ہوتا ہے وہ گرا نہیں کرتیں وہ اس طرح سے بامِ عروج پر پہنچتی ہیں جس طرح سے ہم پہنچے ہیں اور اس طرح سے چمکتی ہیں جس طرح سے ہم چمکتے ہیں اور اس طرح سے مرتی ہیں جس طرح سے ہم مرے ہیں۔ ہم انصاف کے اس قدر عادی ہیں اور آزادی کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اس زندگی کی پروا ہی نہیں کرتے جو منصفانہ اور آزادانہ ہو۔ اگر میں نے اس حقیقت کی تصویر کھینچنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے تو شہادت کیلئے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں تلوار تو ابھی ابھی نیام میں ڈالی گئی ہے جھنڈا ابھی حال ہی میں لپیٹا گیا ہے طبلِ جنگ کی آخری آواز بھی ابھی مدھم ہوئی ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ اس ملک نے کس قسم کے نظارے کا مظاہرہ کیا تھا ایک ہی دل تھا ایک ہی آواز ایک ہی ہتھیار اور ایک ہی مقصد تھا اور کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ ملک قانون کا ملک ہے۔ اس ملک کا جج کسان اور بادشاہ کا یکساں جج ہے۔ ہر آدمی کی خوشحالی مقررہ قواعد کے ذریعے ظلم اور وہم سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ذرا غور سے تو دیکھو کہ ہم کیا ہیں اور منصفانہ قوانین نے ہمارے لئے کیا کیا ہے۔ اس سرزمین کو سخاوت اور پرہیزگاری کا مرکز بنا دیا ہے۔ گرجے ہسپتال اور قربانگاہیں بکثرت تعمیر ہو گئی ہیں۔ ہم نیک سامریوں اور تمام نوع بشر کا درد رکھنے والی قوم بن گئے ہیں۔ تمام ممالک اور سمندر ہماری شجاعت کا لوہا مان چکے ہیں ہم نے حال ہی میں اُس تلوار کو نیام میں ڈالا ہے جو دنیا کی حفاظت کے لئے میان سے نکالی گئی تھی۔ ہم نے ابھی ابھی وہ ڈھال اُتار کر رکھی ہے۔ جو اقوامِ عالم کی حفاظت کیلئے لگائی گئی تھی۔ خدا نے ہماری زمین کو سرسبز بنا رکھا ہے۔ انگریزی مشین ہر ملک کے لئے محنت اُٹھا رہی ہیں۔ کرہ ارض کے تمام سمندر انگریزی جہازوں سے ڈھکے پڑے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی بدولت ہم شائستہ ہو گئے ہیں انسانی علم ادب سے ہم مہذب بن چکے ہیں علم سائنس ہمارا رہنما ہے اور ایسی قوم جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکتی ہے وہ ان نظیروں اور نیز اُن اصول کیلئے حامیان آزادی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی ہے جو اُس قوم میں زندگی کی روح پھونک کر اُسکی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

عربی

دوستوں کے آداب

وہ شخص تمہارا دوست نہیں ہو سکتا جو بخل۔ چغلخوری۔ کمینہ پن۔ بدگمانی اور غصہ میں مشہور ہے۔

اور نہ تم اُس شخص سے اخلاص کی اُمید کر سکتے ہو جو نہ تمہارے بھیدوں کو چھپا سکتا ہے نہ فضول گوئی سے پرہیز کرتا ہے اور نہ ذلت اور رسوائی کا اس پر کچھ اثر ہے۔

تم سوچو کہ وہ شخص کس طرح دوستی کی ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے جو نہ اخوت کے معنے سے واقف ہے اور نہ اس کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ دوستوں اور بھائیوں کا مرتبہ کس قدر بلند ہوتا ہے؟ اور اخلاص و محبت کے آداب کیا ہیں؟ امام غزالی کا قول ہے کہ جب تم کسی شخص کو اپنی دوستی کیلئے انتخاب کرو تو اس میں ذیل کے پانچ اوصاف کی جانچ ضرور کر لو۔

(۱) سب سے پہلی چیز عقل ہے۔ یاد رکھو کہ کسی احمق کی دوستی کبھی بھلائی کا موجب نہیں ہو سکتی۔ سب سے دلچسپ امر احمق کی دوستی میں یہ ہے کہ وہ تم کو نفع پہنچانا چاہیگا۔ لیکن اس کا ہر وہ کام جو تمہارے نفع کیلئے ہوگا تم کو نقصان پہنچائے گا۔

اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ ایک سمجھدار اور عقلمند دشمن بیوقوف اور احمق دوست سے بہتر ہے۔

(۲) دوست کے اوصاف میں دوسری چیز اچھے اخلاق کا ہونا ہے۔ کیونکہ بداخلاق شخص غصہ اور بیہودگی کے وقت اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھ سکتا اور جو شخص اپنی طبیعت پر قابو نہ پا سکتا ہو اس کی دوستی خطرے سے خالی نہیں۔

(۳) اصلاحِ نفس کیونکہ جو شخص ایسی طبیعت کا مالک ہے۔

جس نے ابھی تک پاکیزہ اوصاف کو قبول نہیں کیا اُس شخص کی دوستی تم کو گمراہیوں اور بُرائیوں میں مبتلا کر دینے کا موجب ہوگی۔

(۴) دوست حریص نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ دنیا میں طبیعتیں ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ تمہارا حریص دوست ضرور اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم کو بھی حرص کی لعنت میں گرفتار کر دے۔

(۵) سچائی۔ کیونکہ جھوٹا دوست سراب کی مانند ہے جو تم کو دھوکے میں ڈال رہا ہے۔ اس کی ہر بات میں دھوکہ ہوتا ہے۔ اور اس کا کوئی فعل دھوکہ سے خالی نہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ تم کو علما۔ حکما، اور عقلمند لوگوں میں سے دوستوں کا انتخاب کرنا چاہئے کیونکہ اُن کی دوستی تمہیں عقل و حکمت اور فہم و ادراک کی دولت سے مالا مال کر دے گی۔

اور تم کو اہل حیثیت سے دوستی کرنی چاہئے اس لئے کہ اُن کی وجاہت سے تم فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔

اور تم کو ایسے لوگوں کو دوست بنانا چاہئے جو مال و دولت کے مالک ہیں کیونکہ اُن کی دوستی تم کو مالی پریشانیوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم کو بہت سے دوست ایسے ملیں گے کہ اُنکے دل کی گہرائیوں میں تو محبت و اخلاص کے جذبات نہ ہوں گے لیکن وہ بظاہر تم کو اپنی دوستی کا یقین دلائیں گے ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ تم ظاہر داری سے پیش آؤ۔ اُن پر مناسب طور سے احسانات کرو لیکن اپنے رازوں کو چھپاؤ اور اپنی خاص باتوں کا اُن سے ذکر مت کرو۔

ایک فلسفی کہتا ہے کہ اگر تم کسی مخلص دوست کو انتخاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی احترام سے پیش آؤ۔ کاموں میں اس کی امداد کرو۔ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ اور اس سے اس طرح ملو کہ تمہارے چہرے پر مسرت و نشاط کے آثار ہوں۔

(جامع الآداب)

حامد الانصاری
غازی

پنجابی

تنقید نگاری

تنقید نگاری زبان کی صحت یا عدم صحت پر بحث کرنے کو کہتے ہیں اخباری تنقیدوں میں اکثر اوقات پرلے درجے کی بے پروائی اور غیر ذمہ داری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس سہل انگاری کے باعث ناظرین کے دلوں میں بھی اُن تنقیدوں کی بے وقعتی گھر کر لیتی ہے۔ ایک کتاب ایک شخص کو تو دلچسپ معلوم ہوتی ہے مگر دوسرا اُس کو بے لطف خیال کر سکتا ہے۔ جس کتاب کو ایڈیٹر دلچسپ کہدیں ممکن ہے کہ وہ مجھے بھلی نہ لگے یا معاملہ اس کے برعکس ہو۔ کسی کو حلوا مزہ دیتا ہے اور کسی کو چٹنی اگر ہم کہیں سے اتنا سُن پائیں کہ باورچی خانہ میں کوئی چٹپٹی چیز تیار ہوئی ہے تو ہمارے دلوں میں بعض اوقات وہم سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جس کتاب پر تنقید لکھنی ہو جبتک اس کی چھان بین اچھی طرح سے نہ کرلی جائے اُس کی خوبیوں اور نقائص کی جانچ نہ کرلی جائے اُس وقت تک وہ ناظرین کی آنکھوں میں جچ نہیں سکتی۔

کسی اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر کے پاس تو طرح طرح کی کتابیں آتی ہیں اُن پر اُن کے مصنفوں نے کافی محنت کی ہوتی ہے کئی کتابوں کا مطالعہ کر کے مواد جمع کیا ہوتا ہے۔ ایڈیٹر اتنے عالم و فاضل نہیں ہوتے کہ ہر بات کو پرکھ سکیں اور نہ اُن کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ اچھی طرح تحقیق کر کے تنقید لکھیں۔ کیونکہ جو بات خوب تحقیق اور غور خوض کے بعد لکھی جائے اس کی خوبی اور خرابی خود بخود ہی ظاہر ہو جاتی ہے اسی کے ضمن میں اس کی توصیف اور نکتہ چینی بھی ہو سکتی ہے۔

اسی لئے بہت سے ایڈیٹر تو صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں "ہمیں اس بات سے اتفاق نہیں ہے" یا "فلاں بات ٹھیک نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تنقیدوں کو تو دور ہی سے سلام ہے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

دیگر زبانوں کی نئی نئی کتابیں دیکھ دیکھ کر ہم آزادی کے ساتھ اُن کی تقلید نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم قدیم المناک ناٹک کو شکسپیر کی ٹریجیڈی ( ) نہیں کہہ سکتے۔ شکسپیر کی ٹریجیڈی میں ہیرو ہمیشہ اپنے کئے کا پھل آپ پاتا ہے۔ اس کے تمام ڈرامے رنج و الم کے زہر سے بھرے ہیں۔ انہیں ہیرو کی حالت زار پر ترس آتا ہے اور وہ ہیرو موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے آخر میں کمیڈی (فرحیہ) کا پارٹ بھی آتا ہے۔

تنقید کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ڈرامے میں نیا رنگ ہے اور المیہ اور فرحیہ کی عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی گئی ہے۔

تنقید دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کو تبصرہ کہتے ہیں اور دوسری کو نکتہ چینی۔ تبصرہ کا رواج تو عام ہو گیا ہے۔ ہر ایک ایڈیٹر اپنی اغراض کو مدنظر رکھ کر چند منٹوں میں تبصرہ لکھ مارتا ہے اور نکتہ چینی کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ نقائص نہ نکالے جائیں بلکہ ہر ایک مصنف کو زبان کی اصلاح ضرور کرنی چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کے شکوے اور شکایت کی بات نہیں ہے۔ جن کتابوں میں زبان کے نقائص چلے آتے ہیں اُن کو اوّل تو کتابوں میں شمار ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہوں بھی تو وہ صحت بخش کتابیں نہیں کہلا سکتیں۔

"پھلواڑی" امرتسر

فارسی

ایران کی تربیت و اصلاح

آج میں اس امید اور اس آرزو کو دل میں لیکر قلم اُٹھا رہا ہوں کہ جس طرح حکومت جرمنی اپنے فرزندوں کی تربیت اور ذہنی و فکری نشو و نما کیلئے سرگرمی کا اظہار کر رہی ہے۔ اسی طرح مملکت ایران کے حساس افراد بھی اپنے نونہالوں اور وطن کے فرزندوں کی تہذیب و تربیت کے لئے خلوص دل، نیت خالص اور مضبوط ارادے کے ساتھ کمر باندھ کر میدان میں آجائیں۔

وطن کے بہی خواہ انسانو! میں تحریری طور پر تمہارے اور تمہارے رفقا کے برابر قدم رکھنا چاہتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ شاید تمہاری رفاقت اور معیت کی برکت ہی سے منزل مقصود پر جلدی پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

کیونکہ راستہ پرخطر اور دشوار گذار ہے۔ جس پر تنہا سفر کرنا پریشانی کا باعث ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایران کی خرابیوں کی اصلاح کی ابتدا کہاں سے اور کس طرح سے کی جائے۔

اور اپنی طبیعت کو مجبور کرتا ہوں کہ ایران کی اصلاح کے بارے میں جن رایوں کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کہاں تک ایران کے مرض کا مداوا کر سکتی ہیں۔

یہ تو ہر شخص کہتا ہے کہ ایران کو یکسر مفاسد سے پاک کر دیا جائے لیکن یہ کہ اصلاح کا کام کس طرح شروع کیا جائے اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو سب کہتے ہیں کہ نغمہ نوازی کرنی چاہیئے لیکن یہ کہ اس نغمہ کے کون سے تار کو پہلے چھیڑنا چاہیئے۔ اس کے متعلق ہر شخص خاموش ہے اور اسی جگہ میری ذہنی اور فکری قوتیں جواب دیدیتی ہیں اور میں حیرت و تردد کے جنگل میں پریشان کھڑا رہ جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کیا اصلاح ایران کے حامی مخلص نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر مخلص ہیں تو کیوں اصلاح کا کام شروع نہیں ہو جاتا اور کیوں ہم ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ اس طویل راستہ کا سرا کہاں ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس صحبت میں اہم اور خطرناک مفاسد کا ذکر کروں تاکہ اُنہیں کی اصلاح سے کام شروع کر دیا جائے۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایرانی باشندوں کے پاس روزانہ معاشرتی امور کے حصول کے لئے ذرائع موجود نہیں ہیں۔ فقر و فاقہ روز بروز ترقی پر ہے۔ غربت زیادہ ہو رہی ہے۔ مفلسی بڑھ رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہے۔ بعض لوگوں کو ورثہ کے طور پر کچھ جمع ملی ہے اور بعض لوگوں نے بینکوں میں روپیہ جمع کر کے کچھ پونجی بس انداز کر لی ہے۔ لیکن افسوس ہے تو یہ ہے اور حسرت ہے تو اس امر پر کہ ایسے لوگوں میں یہ احساس بالکل نہیں ہے کہ یہ روپیہ کس طرح خرچ کیا جائے تاکہ اس سے روزانہ ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔

افراد وطن کی بدبختی اور خستہ حالی کے دوسرے اسباب۔ عدالتی اخراجات۔ داخلی امن و امان کا فقدان۔ اور آفات ارضی و سماوی ہیں

ایران ایک ایسی ہیکل ہے جس میں روح نہیں۔ ایک ایسا جسم ہے جس میں دل نہیں۔ ہمارا وطن ایک بغیر گوشت و پوست کا ڈھانچ ہے اور بس۔

یہ ایک غم انگیز حقیقت ہے کہ ایران میں جو لوگ کل آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے آج اُن کی اولاد اطمینان و سکون اور راحت و آرام کے اسباب سے محروم ہے۔

شہری باشندے بیشک بظاہر اچھی حالت میں معلوم ہوتے ہیں

لیکن ان میں سے اکثر حکومت کے دفتروں اور کمپنیوں وغیرہ میں ملازم ہیں اور اپنی ماہوار آمدنی پوری خرچ کرنے کے بعد روپیہ قرض لیتے ہیں اور قرض خواہوں کی بندشوں میں گرفتار ہیں۔

دیہات اور اطراف کے آدمیوں کی حالت بھی اچھی نہیں۔ فقر و فاقہ نے اُن کی راحت و آسایش کو اور اُن کی آرام و طمانیت کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ ان اطراف کے غریب باشندے ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہیں۔ یہ مسکین اپنی مظلومی کی صدا کو طہران کے ایوان حکومت تک نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ اُن کے پاس نہ ذرائع ہیں۔ نہ اتنا سرمایہ ہی ہے کہ ایران کے دربار میں رسائی حاصل کر سکیں۔

وطن کے بہی خواہو! یہ وہ مفاسد ہیں جن کا ازالہ ہمیں سب سے پہلے کرنا چاہیئے تاکہ ہم اپنے وطن کی اصلاح کے مقدس فرض میں کامیاب ہو سکیں۔

حامد الانصاری (ابو شہر)

اطالوی

روما

میں اُن چند اشخاص میں سے ہوں جنہوں نے وہ سارا زمانہ روما ہی میں گذارا جبکہ روما کے سوال کی بنا پر اٹلی میں سخت سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اُس وقت روما میں پہنچا جبکہ اُسے اٹلی والوں کے ہاتھ میں آئے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ اور وہ اٹلی کا ملکی دارالحکومت بن چکا تھا۔ درحقیقت مجھے روما جانے کا اتفاق صرف ایک ہی دفعہ ہوا ہے اور وہ بھی صرف ڈیڑھ دن۔ مجھے ذرا شرمناک اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں روما کو دیکھ کر مایوس سا ہو گیا۔ مجھے اس کا پست جائے وقوع پسند نہ آیا۔ نہ مجھے اس کی شہری وسعت بھی پسند آئی۔ میں وہاں اتنا عرصہ قیام نہیں کر سکا کہ اس کی غیر معمولی خوبصورتی اور اس کی دلچسپ چہل پہل کا اندازہ کر سکتا۔ میں نے سینٹ پیٹرز کے گرجے کی زیارت صرف ایک ہی دفعہ کی اور سچ پوچھو تو میں اس کی وضع دیکھ کر حیران سا ہو گیا [illegible] وہ خوبصورت تو ہے اور گذشتہ عظمت کی یادگار [illegible] ایک ایک انچ مقدس ہے۔ لیکن وہ اس قسم کا گرجا نہ تھا جس کی توقع میں نے باندھ رکھی تھی۔ میں نے اس سے تھوڑا سے ہی دن پیشتر شہر کولون کا عجیب و غریب گرجا بھی دیکھا تھا اور اسی لئے میں نے کولون کو روما پر ترجیح دی تھی۔ البتہ یہ دونوں عالی شان عمارتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کولون کی طرز تعمیر گوتھک ہے اور روما کی [illegible] دورِ جدید کی ہے۔ کولون کے بڑے بڑے میناروں کے وسیع گھیرے میں شہر روما کی نزاکت کی نسبت زیادہ متاثر ہوا۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص صرف روما ہی میں رہے تو اُسے دنیا بھر کے لوگوں کی اکثر جماعتوں میں سے ایک نہایت ہی دلچسپ جماعت کا پتہ لگیگا۔ یہ جماعت سراسر اطالوی ہے۔ لیکن اس جماعت میں تمام یورپ کی شریف اور مہذب جماعتوں کے نمایندے موجود ہیں۔ جو یہاں کی مجلسیں اور محفلیں بہت ہی دلچسپ ہوتی ہیں۔

مجلسی منافرت

اس جماعت کی کامیابی کے رستہ میں بڑی بھاری رکاوٹ یہ تھی کہ پاپائے روما کی سیاہ پوش جماعت اور گورنمنٹ اٹلی کے خاص اپنی باہمی سیاسی منافرت کا چرچا [illegible] رہتے ہیں۔ اگر آپ اتفاق سے کسی سیاہ پوش محفل میں چلے جائیں تو آپ کو دیگر سیاسی جماعتوں کا کوئی رکن بھی نظر نہ آئیگا۔ اسی طرح سفید پوش جماعت کی محفل میں سیاہ پوشوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ میرا خیال ہے کہ پاپائے روما اور گورنمنٹ اٹلی کی باہمی مصالحت کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تکلیف دہ منافرت کا قلع قمع ہو جائیگا اور روما کی نئی مجلسی زندگی زیادہ خوشگوار ہوگی۔

لاطینی

افلاطون کی روح

عقاب! تو اُس قبر میں کیوں اُڑتا ہے؟ بتا کس شاندار [illegible] اور اُجڑے گھر کی جانب اُڑ رہا ہے۔ میں تو تیز و طرار افلاطون کی روح [illegible]

عکس ہوں۔ میں آسمان پر پرواز کر رہا ہوں۔ انجینیئر کو صرف میری لاش ہی ورنہ نہیں ملی ہے۔

امید کی جھلک

ایک آدمی گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کرنے ہی کو تھا کہ اُس نے ایک بٹوا دیکھ کر رسی کو پھینک دیا۔ مالک جب اپنا مال لینے کے لئے آیا تو اُسے بٹوے کی بجائے رسّی ملی۔ اُس کی اُمید مایوسی میں بدل گئی۔ ایک کو تو ہم بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور دوسری کو لے لیتے ہیں۔ آسمان کے بلند گنبد کے نیچے قسمت ہی تو خدا ہے جو کچھ ہم سہتے اور کرتے ہیں۔ اس کا انحصار خود ہم پر اور حالات پر ہوتا ہے۔

ترکی

مادہ پرستوں کے اعتراضات

مادہ پرست کہتے ہیں کہ روح جسم انسانی میں قطعاً کوئی خارجی وجود نہیں رکھتی۔ بشر کی خلقت ہمہ تن جسم سے مرکب ہے اور تمام ادراکات و شعور کا مرکز وہ قوائے عقلی ہیں جو مغز میں واقع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مغز انسان اُس کے سر سے نکال لیا جائے تو اس کی قوت ادراک کلّی طور پر زائل ہو جاتی ہے اور شعور کا فقدان ظاہر ہوتا ہے چنانچہ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ عقل و ادراک مرکز مغز ہے اور جسم انسانی میں روحی قوت موجود نہیں۔ مادیین یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر روحانیوں کے اس عقیدے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جسم انسانی میں قوی روحی موجود ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ روح جسم کے درمیان قرار پذیر ہوا اور اگر ہو بھی تو وہ جسم کے کس حصّے میں ہو گی۔

اُن کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ترکیبات بدن انسانی کی بنیاد قوائے مردمی ہیں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ روح اور جسم کا آپس میں اختلاط ہوا اور اگر اختلاط ہے تو روح اور جسم کے درمیان کیا تعلق ہے۔

ہسپانوی

دعا

آہ! مجھے وہ روشنی دے جس سے میں اُسے دیکھ سکوں۔ وہ حُسن دے کہ میں اس میں محو ہو سکوں۔ وہ راستہ بتا جس پر چل کر میں اُسے تلاش کر سکوں۔ اُس محبوبہ کو تلاش کر سکوں جس کا حسن اُس کی نجات کا نشان ہے

جہاں سے وہ گذرتی ہے۔ وہاں ستارے جگمگاتے ہیں۔ عورتیں قہقہے لگاتی ہیں۔ دریا تیز خرامی سے بہتے ہیں۔ پانی چمکتا ہے۔ سائے کانپتے ہیں اور ننھی ننھی ندیاں سرکنڈوں کو حرکت دیتی ہیں اور دنیا کی تمام پاکیزہ اور حسین چیزیں جگمگاتی ہوئی اُس کے دل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس کے دل کے بہارستان میں ایک خوش آواز پرندہ گاتا ہے۔

جاوی

خوش آواز پرندہ

گذشتہ رات ایک پرندہ تاریک جھاڑیوں میں چھپا اپنی جذبات انگیز آواز میں گا رہا تھا اور اُن جھاڑیوں پر نیند کی غنودگی طاری تھی ان پہاڑوں کی نیند کی سی غنودگی جو سمندر کے کنارے محو خواب رہتے ہیں اور پانی کی کوہ پیکر موجوں کے تھپیڑوں سے بھی بیدار نہیں ہوتے لیکن میں سمجھ گیا۔ یہ آواز میرے دل میں میری خوابیدہ روح کو بیدار کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ خود نیند کی وادی میں سے آ رہی تھی۔ میرا دل بےچین ہو کر دھڑکنے لگا۔ پرندے کی خوش آیند آواز مجھے کہہ رہی تھی۔ "تو بے جان ہے۔ تجھ میں زندگی نہیں۔ میرا دل کہتا تھا" تو نے مجھے

زندگی دی ہے۔" لیکن وہ آواز برابر مجھے جھٹلاتی تھی تنگ آکر میں نے ارادہ کرلیا۔ کہ میں بھی اسی طرح گاؤں اور سوئے ہوئے انسان کو بیدار کردوں تاکہ ان میں میری زندگی کا نقش ہو جائے

فرانسیسی

شام

وہ آہستہ آہستہ دریا کے کنارے ریت پر پھر رہی ہے اور اس کی پیشانی پر دن کے بوسے کا مدہم سا نشان ہے وہ خاموشی کے ساتھ شفق کی طرف سے آئی ہے اور اس خیال سے مسکرا رہی ہے کہ ابھی صبح بہت دور ہے دن کی مہک اس کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ اس کے بالوں میں سوسن کے شگفتہ پھول ہیں جو موت کے ڈر سے کپکپا رہے ہیں اور شام کی بیٹی نیند جو زمانے کے تفکرات اور خیالات کو دامن میں لئے ہوئے ہے نزدیک پہنچ چکی ہے۔ اُن کی خاموشی کی مسلسل لیکن دھیمی دھیمی آوازیں آوارہ و سرگردان اُس تک آتی ہیں۔ لیکن کیا وہ پھول اُس کی آنکھیں ہیں یا جو شبنم کے قطروں سے شگفتہ ہو جاتے ہیں یا وہ ستارے ہیں جو رات بھر پلک نہیں جھپکتے۔

جرمن

اندھی لڑکی

ایک اندھی لڑکی نے بے تاب ہو کر اپنی ماں سے ہاتھ چھڑایا۔ اور بھاگ کر پائین باغ میں چلی گئی۔ جب چاروں طرف ہاتھ پھیلا کر تسلی کرلی کہ یہاں کوئی موجود نہیں تو بارگاہ خداوندی میں یوں دعا مانگنے لگی

میرے اللہ! سنا ہے تو نے سورج پیدا کیا ہے۔ وہ دنیا کو منور کرتا اور ہر شے کو زندگی بخشتا ہے۔ چاند ستارے بنائے ہیں۔ جو اندھیری راتوں کو دن کی مانند روشن کرتے ہیں کہتے ہیں تو نے رنگا رنگ کے پھول اُگائے ہیں جو اپنی رنگینی اور خوشبو سے دیکھنے والوں کی روح کو فرحت دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے تو نے بلند پہاڑ اور دریا پیدا کئے ہیں۔ جن کا نظارہ روح کو ایک طاقت بخشتا اور اہل ذوق پر تیری عظمت آشکارا کرتا ہے

اے خدا میں ان سب چیزوں کو دیکھنے سے قاصر ہوں۔ لیکن تیری درگاہ میں کوئی شکایت نہیں کرتی۔ میں یہ بھی نہیں مانگتی کہ مجھے ان نظاروں کے دیکھنے کیلئے بینائی دے۔ میرے اللہ میرا دل صرف اسقدر چاہتا ہے کہ میں اپنی ماں کا چہرہ دیکھ سکوں۔

ملایا

نظارہ

کاش میں اُس محبوب جگہ جا سکتا جہاں سے میں آیا ہوں۔ جہاں مجسم حسن کی حکومت ہے۔ جہاں سمندر کے کنارے میں نے اُس روح کو دیکھا تھا۔ جس نے تمام دنیا کو اپنا مفتون بنا رکھا ہے۔ کاش جب ایک بار پھر سر سبز پتوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ گڈریا بھیڑیں چرا رہا ہو اور سمندر کا پانی ساحل سے آکر ہمکنار ہو رہا ہو وہ ایک بار پھر ہمیں نظر آئے۔

آہ! کاش۔ میں ایک بار پھر اُس حسن جہاں سوز کا نظارہ کروں۔ جس سے میرے الفاظ میں الہام کا اثر ہو۔ خوشی کا شعلہ مجھے جلا کر خاک کر دے۔ اور میں کائنات کے بھیدوں سے آشنا ہو جاؤں۔

ہندی

اے بھگوان

اے بھگوان نیا منجھدار میں آن پڑی ہے۔ اب کوئی کھیون ہار نہیں صرف تو ہے جو اس کو پار لگائے

اے بھگوان ساری دنیا خاموش سو رہی ہے۔ زمین چپ ہے۔ آسمان چپ ہے۔ صرف تو جاگتا اور میری کشتی کو ہچکولے کھاتے دیکھتا ہے۔

ساحل پر سخت چٹانیں ہیں۔ سمندر پر اندھیرا چھا رہا ہے۔ اب تو ہی میری کشتی کا رکھوالا ہے۔ اور صرف تو ہے جو اس کو پار لگائے۔ اے بھگوان رات کا رنگ پھیکا پڑ چکا ہے ستارے زرد ہو گئے۔ پو پھٹنے والی ہے لیکن منزل ابھی بہت دور ہے تو ہی ہے جو اسے پار لگائے۔

ڈچ

خوابگاہ

جہاں سورج پوری آب و تاب اور درخشانی کے ساتھ چمکتا ہے شہد کی مکھیاں ہوا میں ہلکا سا ترنم پیدا کر دیتی ہیں۔ زمین کی آغوش میں خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔ جہاں سائے نہایت آہستہ آہستہ بڑھتے اور پرندے شام کی شفق میں گاتے ہیں۔ وہاں وہ لوگ سو رہے ہیں جن سے

ہمیں محبت تھی۔ ہاں سو رہے ہیں۔ انہیں آرام سے سونے دو۔ ہم اُنکے نزدیک بیٹھتے ہیں لیکن ہمارے دلمیں کوئی غم نہیں ہم اُنکے بیدار ہونیکے منتظر ہیں اس باغ میں جہاں وہ سو رہے ہیں آہ و بکا کا شور نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ سنہرے دروازوں سے گذر چکے ہیں۔ اور اب صبح صادق کے منتظر ہیں۔

مرہٹی

آخری الفاظ

ہمارا روح پرماتما کے پاس جاتی ہے میں بزدل نہیں ہوں۔ دنیا کی رنگینیوں کا طوفان [illegible] دل میں افسوس نہیں پیدا کر سکتا۔ میں الیشور کے جلال کو [illegible] میرا دھرم [illegible] [illegible] ہے

اے پرماتما جو میرے سینہ کے اندر ہے! اسے تھام! اور ہر وقت موجود رہنے والے معبود! میری زندگی ختم ہو رہی۔ اور تمام عمر کی تلاش کے بعد آج میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔

دنیا کے ہزاروں [illegible] پر لوگ اس قدر [illegible] ہیں [illegible] بالکل [illegible] اور حقیقت کے [illegible]

میں یہ مردہ دھرم صرف ایک خواب ہیں۔ یہ دلوں میں شکوک پیدا کر کے تیرے پجاری کو تیرے راستے سے گمراہ کرتے ہیں۔ آہ! انسان بے پتوار کی کشتی ہے جو خیالات کے سمندر میں ہچکولے کھاتی پھرتی ہے۔ لیکن تیری محبت ابدی زندگی دیتی ہے۔ اگر زمین۔ آسمان۔ سورج اور چاند ستارے اور انسان فنا ہو جائیں تو تیری [illegible] بھی موجود رہتی ہے۔ تیرے اکیلے کے دم سے کائنات آباد رہتی ہے [illegible] ہر چیز فنا ہو سکتی ہے لیکن تجھے کبھی فنا نہیں۔

شفق شام [illegible] شفق پھیل رہی ہے۔ آفتاب [illegible] غوطہ لگا رہا ہے۔ [illegible] جال لئے دریا کے کنارے کھیل رہے ہیں۔ درختوں پر سبزہ [illegible] سائے دراز ہو رہے ہیں [illegible] تازہ گھاس کی خوشبو ہوا میں پھیل رہی ہے اور گھاس کاٹنے والے باتیں کرتے [illegible] ہوا جھاڑیوں کو حرکت [illegible] رہی ہے۔ اور مکانوں کی کھڑکیوں میں سے روشنی باہر آ رہی ہے۔ اندھیرا زیادہ ہو رہا ہے [illegible] ہمارے دلوں کی ہے۔

فرہنگ الفاظ

الفاظ	معنی
(الف)	
امعاء	آنتیں
اختتام	ختم۔ خاتمہ
انسداد	روک تھام
اہتزاز	خوشی
آثار قدیمہ	پرانے کھنڈرات
اختراع	ایجاد
اساتذہ	استاد کی جمع استاد
اظہر من الشمس	کھلم کھلا
اکتفا	کفایت کرنا بس کرنا
المناک	رنج سے بھرا ہوا
آتش و باد	آگ اور ہوا
ابدیت	ہمیشگی
استعجاب	اچنبھا
اثر و اقتدار	دبدبہ رعب
اعلیٰ و ارفع	بڑا اور بلند رتبہ
ایام طفولیت	بچپن کے دن
ایام رفتہ یا گذشتہ	گذرے ہوئے دن پچھلا زمانہ
امید افزا	امید بڑھانے والا
ارغوانی رنگ	گہرا سرخ رنگ
اوج	بلندی
اشجار	جمع شجر
استفسار	پوچھ گچھ
آتش ریز	جس سے آگ نکلے
اعتراف	اقرار
ارتکاب جرم	جرم کر بیٹھنا
اراکین	رکن کی جمع
(ب)	
بین الاقوامی مجلس	وہ مجلس جسمیں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے شریک ہوں۔
بارگاہ خداوندی	خدا کے سامنے
بے اعتنائی	بے پروائی
بود و باش	رہنا سہنا
بالغ النظر	غور سے دیکھنے والا
بے بصر	اندھا
بالیدگی	بڑھاؤ بڑھنا
(پ)	
پژمردگی	مرجھایا پن۔ بے رونقی
پرشکوہ	دبدبہ و شان والا
پر تصنع	بناوٹی
پاداش	بدلہ۔ سزا
(ت)	
تقلید	قدم بقدم چلنا
تنازع	فساد جھگڑا
تاسف	افسوس
تصور	خیال
تصنع آمیز	بناوٹی۔ بناوٹ سے ملا ہوا۔
تسلط	غلبہ۔ دبدبہ
تغیرات	جمع تغیر۔ الٹ پھیر تبدیلیاں
تقدس	پاکی۔ بزرگی۔ بڑائی
تنزل و انحطاط	اوپر سے نیچے اترنا۔ بلند مرتبہ سے گرنا
تنفس	سانس
تعمیری صنعت	بنانیکی حکمت
تحلیل ہونا	گھل جانا علیحدہ علیحدہ اجزاء کرنا
تبسم فصاں تھا	ہنسی آرہی تھی
تمازت آفتاب	سورج کی سینک گرمی
ترشح	پانی کا چھینٹا
تابناک	چمکنے والا
تخیل	خیال
تذبذب	شک و شبہ تردد
تنقیدی مقالہ	وہ مضمون جس میں کسی پر تنقید کی جائے۔
(ج)	
جسارت	ہمت۔ دلیری
جدت پسند	نئی بات کو پسند کرنے والا۔ روشن دماغ۔
جاذب توجہ	توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والی چیز
جنس لطیف	نرم چیز مراد عورت
جہاز لنگر انداز ہوا	جہاز ٹھہر گیا جہاز نے لنگر ڈال دیا
جائے وقوع	جہاں کوئی واقعہ ہوا ہو یہی اسکی جائے وقوع
جہاں سوز	دنیا کو جلا دینے والا
جہاں گرد و جہاں دیدہ	سیاح دنیا کو آزمائے ہوئے
(ح)	
حتمی	یقینی
حس لامسہ	چھونے کی قوت
(خ)	
خشمگیں	غصہ والا
خودستائی	اپنی تعریف آپ کرنا
خونریزی	خون بہانا
(د)	
دارالترجمہ	وہ مکان جہاں ترجمہ کیا جائے
دل آویزی	خوبی۔ خوبصورتی جو دل کو لبھائے
درخشاں	چمکیلا
دوش بدوش	ساتھ ساتھ
دلگداز	دل کو نرم کرنیوالا
(ر)	
ردعمل	کسی چیز کو بدلکر پھر اصل حالت میں لانا
رازہائے نہانی	چھپے ہوئے بھید
ریڈیم	ایک دھات کا نام جو دنیا کی کل دھاتوں سے زیادہ قیمتی اور کارآمد ہے
رقص	ناچ
رعنائی	خوبصورتی
(ز)	
زنخدان	ٹھوڑی
زیر و بم	موسیقی کی اصطلاح اتار چڑھاؤ
(س)	
سحر پاش نظریں	جادو کرنے والی نظریں
سوقیانہ	بازاری
سرایت کرنا	گھس جانا
سرشار محبت	محبت سے بھرا ہوا
سرفرازی	سربلندی عزت
(ش)	
شمیم	خوشبو
شاہکار	بہترین کام۔ ماسٹر پیس
شاہد مقصود	محبوب مراد۔ منہ مانگی مراد
(ص)	
صحیفہ نگاری	اخبار نویسی
(ط)	
طمانیت	تسلی تشفی

الفاظ	معنی
طیور	جمع طیر، پرندے
طوق و سلاسل	قید اور زنجیر
(ظ)	
ظلمت رُبا	تاریکی کو دور کرنے والا
(ع)	
عواقب	انجام
عطر بیز	جس سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہوں
عشوہ گری	ناز و انداز
عمیق و دقیق	گہرا اور باریک
(غ)	
غوامض	گہرائیاں، باریکیاں
غیر متوقع	اچانک
غدار	دھوکے باز۔ بے وفا۔
غیر مرئی	جو نظر نہ آسکے مگر موجود ہو
غیر متحرک	بے حرکت
(ف)	
فروگذاشت	کوتاہی، غلطی
فوق الادراک	جہاں پر عقل پہنچ نہ سکے سمجھ سے باہر
فراوانی	بہتات
فنا فی العشق	عشق میں مٹا ہوا
فلک شگاف	آسمان کو چیرنے والی
(ق)	
قضات	قاضی کے منصبی کام

الفاظ	معنی
(ک)	
کوتاہ بین	بے سمجھ، معاملہ پر غور نہ کرنیوالا
کنج	گوشہ، کونا
کریہہ منظر	بدصورت
کد و کاوش	تلاش، جستجو۔ کوشش
کرم خوردہ	خراب خستہ جسکو گھن لگا ہوا ہو
کثیر المقدار	بہت زیادہ چیز
(گ)	
گرانباری	بوجھ
گورکن	قبر کھودنے والا
(ل)	
لامحدود	بے انتہا
(م)	
متوارث فخر	وہ عزت جو ورثے میں چلی آرہی ہو
مبہم بات	جس کا مطلب صاف نہ ہو
متنازع فیہ	جھگڑے والی بات
متجاوز ہونا	آگے بڑھنا
ماتھا ٹھنکنا	کسی کام کا انجام کسی علامت سے معلوم ہو جانا
ممالک محروسہ	وہ ملک جو کسی بادشاہ کے قبضے میں ہوں۔
معیار	اندازہ۔ کسوٹی
موانست	محبت

الفاظ	معنی
محبت آگین	محبت سے بھرا ہوا
معصوم جذبات	خواہشوں سے پاک جذبے
مفتون	فریفتہ
مجسم دوشیزگی	سر سے پاؤں تک معصومیت کنوارپن چھایا ہوا
ماخوذ	وہ چیز جو کہیں سے لی جائے۔ جیسے کوئی مضمون کتاب سے لیں تو وہ ماخوذ ہے
مستشرقین	وہ مغربی لوگ جو مشرق میں رہکر وہاں کا سا طرز بود و باش اختیار کرلیں یا وہ اہل مغرب جو مشرقی حالات و ادبیات پر کتابیں لکھیں
مزامیر	جمع مزمار کی، بانسری بجانے کا آلہ
منہمک	ہمہ تن مشغول۔
معلمہ	اُستانی
مُغنّی	گویّا
معمل	تجربہ گاہ، کسی ایجاد کے آزمانے کا کمرہ
مستور	چھپا ہوا
مستوجب	واجب، لائق، سزاوار
معمور	بھرا ہوا۔ آباد
منطقہ بارد	زمین کا وہ حصہ جہاں سورج نہیں پہنچتا۔
منجمد	سردی کی وجہ سے جما ہوا۔

الفاظ	معنی
مروّجہ	جس کا رواج ہو
مخلوط	ملا جُلا
مستثنیات	جو چیزیں اصول یا قانون سے علیحدہ کر لی جائیں۔
مکتفی	کافی
مخاصمانہ	دشمنی کے طور پر
منتشر	پھیلی ہوئی تتر بتر
مورث اعلیٰ	سب سے بڑا مربّی۔ باپ دادا جس سے ورثہ مال پہنچا ہو۔
متفاوت	علیحدہ علیحدہ
مشکبار	وہ چیز جس میں خوشبو ملی ہوئی ہو۔ جیسے ہوائے مشکبار
(ن)	
نشیب و فراز	اونچ نیچ
نقرئی	چاندی کی چیز
نازک اندام	جس کا جسم نازک ہو
نغمہ ریز	جس سے گیت برسیں یا سنائی دیں۔
نیست و نابود کرنا	مٹا دینا
نیلگوں	نیلا
ناگزیر	ضروری۔ لازمی
ناخواندہ مہمان	بن بلایا مہمان
نکات	جمع نکتہ باریک بات
(و)	
وسیع النظر	جس نے بہت سی کتابیں پڑھی ہوں۔

الفاظ	معنی
والہانہ	اندھا دھند محبت میں انتہائی جنون
ولولہ انگیز تقریر	جوشیلی تقریر
(ہ)	
ہمہ تن گوش ہونا	نہایت توجہ سے سُننا۔
ہم آغوش	بغلگیر
(ی)	
یدِ قدرت	قدرت کا ہاتھ
یاوہ گوئی	بکواس
یعنی	مطلب یہ ہے
یقیناً	یقینی طور پر
یاد بخیر	اُس کی اچھی یاد۔ کسی غائب کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی عزت کے لئے کہا کرتے ہیں۔
یمین و یسار	دائیں بائیں
یاوری	مدد
یاد آوری	یاد کرنا
یم	دریا
یاس	ناامیدی
یگانہ	یکتا
ینابیع	جمع ینبوع چشمے
یدِ بیضا	حضرت موسیٰ کا ایک معجزہ
یکتائے روزگار	دنیا بھر میں یکتا
یونائٹڈ پراونس	صوبجات متحدہ
یونین	مجلس احباب

ریویو

چاند ناول مصنفہ جناب رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈوکیٹ ہائی کورٹ پنجاب لاہور
یہ ناول اخلاقی و تاریخی معلومات اور دلچسپ خیالات کا مجموعہ ہے۔ حجم ۲۶۳ صفحہ قیمت (عہ)۔

شانتی (ناول) یہ مفید ناول بھی حضرت شمیم کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ناول کی غرض یہ ہے کہ دولت محنت و دیانت سے کمائی جاتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کا طریقہ سادہ ہونا چاہیئے۔ اور دولت کا مصرف اغراض نیک ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کے نو باب ہیں اور ۱۰۵ صفحات ہیں تقطیع چھوٹی ہے۔ کتاب قابل دید ہے۔ قیمت درج نہیں یہ دونوں کتابیں جناب مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہیں

پتھر سے ہیرا یہ ایک مختصر اور دلچسپ اخلاقی اور سچا افسانہ ہے جسے ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے لکھا ہے۔ رسالہ کا ہر لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور نتیجہ بہت ہی اچھا ہے۔ اس قسم کے مفید افسانوں کی اردو ادب کو ضرورت ہے ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ کاغذ طباعت وغیرہ خاصی ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر رسالہ نظام المشائخ دہلی۔ کوچہ چیلاں۔

روحانی ترقی مؤلفہ لالہ کدار ناتھ صاحب میرٹھی۔ یہ دلچسپ رسالہ ہے۔ اس میں نظم بھی ہے اور نثر بھی۔ زبان اور نظم خامیوں سے خالی نہیں مطالب بُرے نہیں۔ دیکھنے کے قابل چیز ہے حجم ۵۳ صفحات قیمت (۶؍) ملنے کا پتہ:۔ گوسائیں راجہ لال منیجر دی انڈین آرٹ سٹڈیو کالبا دیوی روڈ بمبئی نمبر۲۔

جہنم کے خطوط یہ خطوط جرمن زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے اور انگریزی سے اردو میں جناب شرف الدین خانصاحب رامپوری نے ترجمہ کیا۔ نصیحت آمیز مفید خطوط ہیں۔ جیتے جی جہنم کی سیر اگر کیجائے تو مرنے کے بعد جہنم میں لیجانے والے عادات و اعمال سے اجتناب کی تحریک ہو سکتی ہے۔ ملنے کا پتہ ہم ہے

مخزن نجات پہلا حصہ

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی چالیس حدیثوں کا منظوم ترجمہ مولینا جامی نے فارسی میں کیا تھا۔ اب مولوی شرف الدین خان صاحب رامپوری نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حجم سولہ صفحہ سائز چھوٹا۔ قیمت (۲؍) ملنے کا پتہ۔ ریاست رامپور محلہ کھاری کنواں۔

کتب اورینٹل فیکلٹی پنجاب یونیورسٹی لاہور

منشی سنہ ۱۹۳۰ء

۱- احسن القواعد قیمت عہ
شعر العجم حصہ چہارم عہ
۲- الیف اے فارسی کورس جدید حصہ نثر
الیف اے ۱۹۲۸ء کیلئے ہے مکمل کی قیمت عہ
رقعات عالمگیری قیمت ۳/
نظم نباتات ۴/
۳- الیف اے فارسی کورس جدید حصہ نظم
۱۹۲۸ء کیلئے ہے مکمل کی قیمت عہ
تحفۃ الاحرار جامی قیمت ۶/
رباعیات عمر خیام ۴/
۴- اخلاق محسنی ۸/
۵- ترجمتین
۶- قواعد عربی میر
محمد شاہ رضوانی قیمت ۳/
نحو میر ۳/
سلم الادب ۱۰/

کتب امدادی

خلاصہ شعر العجم حصہ چہارم قیمت ۴/
ترجمہ حکیم نباتات معہ فرہنگ الفاظ ۴/
ترجمہ الیف اے کورس فارسی جدید ۸/
شرح تحفۃ الاحرار جامی فارسی ۸/
ترجمہ رباعیات عمر خیام معہ متن عہ
ترجمہ اخلاق محسنی قیمت ۱۰/
ترجمہ سلم الادب ۴/
تسہیل فارسی ترجمہ قیمت ۱۲/
خلاصہ اخلاق محسنی ۳/
ترجمہ رقعات عالمگیری ۴/
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۸-۱۹۲۷ء ۴/

منشی عالم سنہ ۱۹۳۰ء

رسالہ عبدالواسع قیمت ۳/
عروض سیفی ۳/
شعر العجم حصہ پنجم ۴/
بی-اے فارسی کورس حصہ نثر
کی قیمت عہ
انتخاب وزیر خاں لنکرال ۴/
دولت شاہ سمرقندی طبقہ اول تا پنجم
لسان العجم ۱۰/ مہر نیمروز ۸/
۳- بی اے فارسی کورس حصہ نظم مکمل عہ
مطلع الانوار ۸/ قصائد عرفی ۸/
۴- اخلاق ناصری قیمت عہ
۵- ترجمتین و جواب مضمون فارسی
۶- کتاب الصرف ۱۲/ کتاب النحو ۸/
عربی الیف اے کورس جدید صرف حصہ نثر عہ

اختیاری مضمون

۱- دربار اکبری (تتمہ خارج) ۸/
۲- مجموعہ نظم آزاد ۸/ مسدس حالی ۶/
انتخاب مخزن حصہ اول نظم عہ

کتب امدادی

خلاصہ رسالہ عبدالواسع قیمت ۳/
خلاصہ دربار اکبری قیمت عہ
شرح قصائد عرفی عہ
خلاصہ اخلاق ناصری از مولوی حسن دین صاحب
پروفیسر اورینٹل کالج قیمت عہ
ترجمہ عروض سیفی ۴/ ترجمہ رقعات [illegible] ۴/
خلاصہ شعر العجم حصہ پنجم ۳/
ترجمہ بی-اے کورس فارسی کے لئے
ترجمہ الیف اے کورس عربی حصہ نثر عہ
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۵ء
و ۱۹۲۷ء و سنہ ۱۹۲۸ء ۴/

منشی فاضل سنہ ۱۹۳۰ء

۱- بی-اے عربی کورس حصہ نثر عہ
دبیر عجم [illegible] میخانہ عبدالنبی [illegible]
۲- چہار مقالہ قیمت ۸/
ابوالفضل دفتر اول و سوم ۱۲/
حاجی بابا اصفہانی قیمت [illegible]
مقامات حمیدی مقامہ ۱۷ تا ۱۸
خارج ۱۲/ مرخصین ۱۲/
۳- قصائد قاآنی ردیف الف ۸/
غزلیات نظیری قیمت عہ
رباعیات ابوسعید ابوالخیر قیمت ۸/
ساقی نامہ میخانہ مرتبہ اول [illegible]
۴- تاریخ وصاف عہ ہمایوں نامہ ۶/
سوالات دو لو ادبی و تاریخی
۵- اخلاق جلالی بحث ثانیہ خارج عہ
گلشن راز ۵/ گلشن راز جامی [illegible]
۶- ترجمہ اردو سے فارسی اور
جواب مضمون بزبان فارسی

اختیاری مضمون

۱- روح الاجتماع عہ الفاروق عہ
خیالستان عہ رویائے صادقہ عہ
۲- کلیات دیوان حالی معہ مقدمہ عہ
دیوان غالب اردو ۵/ قصائد ذوق ۴/

کتب امدادی

خلاصہ [illegible] از جناب [illegible] ۸/
پرشین کمپوزیشن از علم الدین ایم اے
جواب مضمون کے لئے از بس مفید ہے عہ
البیان خلاصہ حدائق البلاغت از
مولوی عبدالحلیم منشی فاضل قیمت ۶/
حل معمہ از حضرت شاداں بلگرامی ۱۲/
ترجمہ بی اے کورس جدید حصہ نثر از مولوی
امتیاز علی خاں مولوی فاضل و منشی فاضل عہ
ترجمہ چہار مقالہ از عندلیب موسی
عزیزی [illegible] قیمت ۸/
ترجمہ رسائل [illegible] از مولوی نصیر الدین
صاحب منشی فاضل قیمت عہ
ترجمہ ابوالفضل دفتر اول از وجاہت حسین عہ
مرخصین معہ ترجمہ از حضرت شاداں عہ
فرہنگ حاجی بابا از سید اولاد حسین صاحب
شاداں بلگرامی [illegible] اورینٹل کالج عہ
ترجمہ مقامات حمیدی از [illegible] عہ
ترجمہ قصائد قاآنی از مولوی خوشی محمد
صاحب منشی فاضل قیمت عہ
ترجمہ رباعیات ابوسعید ابوالخیر از
مسٹر عبداللہ صاحب [illegible] بی-اے و
مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں [illegible]
ترجمہ غزلیات نظیری از پروفیسر محمد عنایت اللہ
صاحب گورڈن کالج راولپنڈی [illegible]
عقد لآلی شرح اخلاق جلالی از
مولوی محمد الدین صاحب مرحوم
سابق پروفیسر اورینٹل کالج قیمت عہ
ظہیر الاخلاق خلاصہ اخلاق جلالی از جناب
سید ظہیر حسن صاحب مرحوم منشی فاضل ۱۲/
فرہنگ تاریخ وصاف از [illegible] ۸/
ترجمہ ہمایوں نامہ از پروفیسر باقی ۶/
گلشن راز معہ اردو ترجمہ شرح لاہیجی از
پروفیسر محمد عبداللہ صاحب ایم-اے عہ
مقالات یعنی مجموعہ مضامین فارسی از
[illegible] عالم صاحب منشی فاضل قیمت عہ
الاخلاق خلاصہ اخلاق جلالی از
مولوی عبدالحلیم صاحب منشی فاضل ۱۲/
فلسفہ اخلاق از مولوی محمد سلیم صاحب معلم
ادبیات اردو [illegible] سکول امرتسر ۸/
خلاصہ روح الاجتماع قیمت ۱۰/
خلاصہ الفاروق ۸/
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۵-۲۶-۲۷-۲۸ء ۴/
ترجمہ ابوالفضل سوم از حضرت شاداں بلگرامی

پروفیشنسی ان اردو سنہ ۱۹۳۰ء

۱- مصباح القواعد حصہ صرف عہ
۲- بحر العروض ۴/ تذکرۃ البلاغت عہ
۳- چہار گلزار حالی ۳/ گلدستہ [illegible] ۴/
۴- ابن الوقت عہ نیرنگ خیال عہ
اردوئے معلی قیمت [illegible] عہ
۵- موازنہ انیس و دبیر قیمت عہ
مقدمہ دیوان حالی [illegible]
۶- جواب مضمون
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۵-۲۷-۲۸ء ۴/
خلاصہ موازنہ انیس و دبیر قیمت ۸/
خلاصہ مقدمہ دیوان حالی ۳/

ہائی پروفیشنسی ان اردو سنہ ۱۹۳۰ء

۱- مصباح القواعد حصہ نحو قیمت عہ
۲- آب حیات - قیمت [illegible]
۳- مجموعہ نظم آزاد ۸/
مسدس حالی ۶/
انتخاب مخزن حصہ نظم عہ
قصائد ذوق ۴/
شرح قصائد ذوق از جناب [illegible]
۴- عود ہندی قیمت ۸/
یادگار غالب فارسی حصہ خارج عہ
۵- دربار اکبری تتمہ خارج [illegible]
۶- اردو جواب مضمون
(نوٹ) خلاصہ دربار اکبری موجود ہے عہ
خلاصہ آب حیات قیمت ۸/
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۵-۲۶-۲۷ء ۴/

آنرز ان اردو سنہ ۱۹۳۰ء

۱- روح الاجتماع قیمت عہ
الفاروق عہ
حیات سعدی عہ
۲- چہار درویش ۴/
خیالستان عہ
سیپارۂ دل [illegible]
افادات مہدی [illegible]
رویائے صادقہ [illegible]
۳- دیوان میر درد ۴/
دیوان حالی معہ مقدمہ عہ
دیوان غالب اردو ۵/
قصائد ذوق ۴/
۴- گل رعنا عبدالحی ۵/
آب حیات [illegible]
ناٹک ساگر باب ۱۲ و ۱۳ عہ
تحفہ جاوید از لالہ سری رام [illegible]
۵- بحر الفصاحت نجم الغنی [illegible]
رسالہ تذکیر و تانیث ۴/
۶- جواب مضمون اردو

کتب امدادی

خلاصہ جات از مولوی غلام ربانی
صاحب عزیز آنرز ان اردو
خلاصہ الفاروق از عزیز قیمت ۸/
خلاصہ حیات سعدی ۴/
خلاصہ روح الاجتماع ۱۰/
خلاصہ آب حیات ۴/
مطالب الغالب شرح دیوان غالب
بہترین شرح از مولانا [illegible] مجلد [illegible] بلاجلد [illegible]
خلاصہ بحر الفصاحت نجم الغنی عہ
امتحانی سوالات سنہ ۱۹۲۵-۲۷-۲۸ء ۴/

رجسٹرڈ — ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) — بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء — نمبر (۵)

تصاویر:- (۱) ہمجولی، سہ رنگی (۲) مونالیزا (۳) مسٹر لطیف الدین احمد اکبر آبادی (۴) نواب مرزا داغ دہلوی (۵) سر والٹر اسکاٹ (۶) مولینا رضا وحشت (۷) ڈاکٹر احمد جلال الدین

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہز ایکسیلنسی سرمالکم ہیلی گورنر یوپی

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کا یہ شاندار پرچہ ترقی کرے۔ دورے کی مصروفیتیں نہ ہوتیں تو اس کیلئے کوئی آرٹیکل لکھتا۔

جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم۔ اے ایل ایل۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا فیلو پنجاب یونیورسٹی

ادبی دنیا کے تین نمبر میں نے دیکھے اور میں نہایت خوشی سے اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ رسالہ اردو رسائل میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ اردو ادب کا ارتقا ادبی پروگرام جو آپ نے پیش نظر رکھا ہے وہ فی الحقیقت قابل قدر ہے آجکل اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ تصنیفی اردو کو عام فہم اور ادب اردو کو دوسری علمی دنیا کی زبانوں سے معمور کیا جائے۔ گذشتہ تین نمبر دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے کہ جو لائحہ عمل آپ نے اپنے لئے تجویز کیا تھا اس پر آپ کا ادارہ تحریر کاربند بھی ہے۔ یقین واثق ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں یہ رسالہ دنیائے ادب اردو میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیگا

ادبی دنیا کی یہ خصوصیت کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی علمی زبانوں کے بلند پایہ مضامین کے اقتباسات و تراجم اس میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ کو تمام دوسرے رسائل سے ممتاز کرتی ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے اور ادب اردو کی جو خدمت آپ نے اپنے ذمے لی ہے اس کو آپ بوجہ احسن سرانجام دے سکیں۔

جناب سید حسن عسکری صاحب ایم۔ اے پروفیسر پٹنہ کالج

ادبی دنیا کے متعلق صرف مجھے یہی کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ میری اُمیدوں سے بہت زائد مفید ثابت ہوا۔

مسٹر لطیف الدین احمد اکبرآبادی

تیسرا نمبر ملا۔ ترقی غیر معمولی ہے۔ یقین ہے کہ کامل ہو جائے گا۔

جناب قاضی نذیر احمد صاحب بی۔ اے (علیگ) ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ راولپنڈی

"ادبی دنیا" تعریف و توصیف سے بالا ہے یہ دیانتاً ہے مشرقی رسالوں میں اس کا جواب نہیں مانتے اچھے ارادوں کے ساتھ آپ نے یہ باہمت قدم اُٹھایا ہے کہ اگر آپ پورے نہیں نصف کامیاب بھی ہوگئے تو ہماری مشترکہ زبان کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

سید مقبول احمد صاحب الہ آبادی بی۔ اے۔ پی۔ سی۔ ایس ڈپٹی کلکٹر یوپی

"ادبی دنیا" کا رسالہ دیکھنے کے بعد میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خدا کرے یہ اسی آب و تاب کے ساتھ زندہ رہے اور زندہ دلان پنجاب کا بہترین ثبوت و نمونہ پیش کرے۔ دوسری بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد روز بروز ترقی کرتا رہے تاکہ کم سے کم ہم کو یہ کہتے ہوئے پس و پیش ہو کہ ہم علمی متانت میں بالکل مفلس نہیں ہیں اور ہمارے پاس بھی ٹائمس آف انڈیا کا مدمقابل ایک پرچہ موجود ہے۔

مسٹر ریاض قریشی بی۔ اے ایل ایل بی ایم آر اے ایس۔ پی سی ایس سب جج چونیاں

"ادبی دنیا" کے چار نمبر میری نظر سے گذرے۔ بلا شائبہ تکلف یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جن ضروریات کو اہل مذاق اُردو کے لئے ضروری سمجھتے تھے وہ اس رسالہ نے پوری کر دی ہیں۔ سر عبدالقادر اور علامہ تاجور نے جو لائحہ عمل پیش کیا اُس کے لئے وہ مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

ادبی دنیا اپنی قسم کا پہلا رسالہ ہے جو اُردو لٹریچر کو معراج کمال پر پہنچا سکتا ہے۔ واقعی طور پر یہ دونوں حضرات پنجاب میں "بابائے اردو" کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس خطے میں جو خدمت علم و ادب کی اُنہوں نے کی اور کر رہے ہیں تاریخ علم و ادب میں ہمیشہ درخشاں نظر آئے گی۔

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی۔ بی۔ اے۔

ادبی دنیا کا پرچہ اس کی روز افزوں ترقی کا شاہد ہے۔ آپنے خوب ہی رسالہ

صفحۂ تصاویر

بھولی

بچپن کی بے فکری وہ قدرتی نعمت ہے - جس کو انسان مرتے دم تک بڑی حیرت کے ساتھ یاد کرتا ہے - اس سہ رنگی تصویر میں اس بے فکری کا عالم بڑے موثر پیرایہ میں دکھایا گیا ہے بلیاں اور کتے بڑی عمر میں بھی انسان کے مصاحب ہوتے ہیں - لیکن یہ مصاحبت ایک فریق کی برتری اور دوسرے فریق کی دست نگری پر مبنی اور اس لئے غیر قدرتی ہوتی ہے - قدرتی مساوات یا مساواتی مصاحبت جو اس تصویر میں نظر آتی ہے - بچپن ہی میں امکان پذیر ہو سکتی ہے -

مونالیزا

مصروف زندگی کے موجودہ زمانہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا وقت اور اپنی تمام طاقتیں صرف ایک چھوٹا سا کام انجام دینے کے لئے وقف کر دے تو دنیا اس پر ہنسے گی اور اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھے گی - اور اس بات کو تو یقیناً ایک جرم تصور کیا جائے گا - کہ ایک شخص ایک چھوٹی سی تصویر تیار کرنے میں چار سال لگا دے اور پھر بھی اُسے نامکمل حالت میں چھوڑ دے - لیکن لیونارڈو ونسی نے مونالیزا کی تصویر تیار کرنے میں یہی کیا - وہ مونالیزا کی تصویر اس حالت میں بنانا چاہتا تھا - جب اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس نے کئی سال مونالیزا کی ملازمت میں گذار دئے - اُس نے یہ تصویر مونالیزا کے خاوند فرانسسکو ڈیل گیوکانڈو کے لئے تیار کی - تصویر تیار ہو چکنے کے تھوڑا عرصہ بعد شاہ فرانسیس اول والئے فرانس نے ایک گراں بہا رقم کے عوض اسے خرید لیا - اس طرح سے یہ تصویر پیرس کے مرقع خانہ کی زینت بنگئی - وہاں سے ۱۹۱۱ء میں کسی نے اُسے اُڑا لیا - لیکن تھوڑا عرصہ بعد یہ پھر ملگئی - یہ تصویر اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے دنیا کی بہترین تصاویر میں شمار ہوتی ہے اور فن تصویر کشی کے کمال کا نہایت بیش قیمت نمونہ سمجھی جاتی ہے -

سر والٹر اسکاٹ

انگلستان کے مایۂ ناز شاعر اور ناولسٹ سر والٹر اسکاٹ کی دو چھوٹی تصاویر ناظرین کے دیکھنے میں آئی ہونگی لیکن جو شہرت سر ہنری رے برن کی تیار کی ہوئی تصویروں کو حاصل ہوئی - وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی - لارنس اور دوسرے باکمال برٹش آرٹسٹوں نے بھی سر والٹر اسکاٹ کی تصاویر بنائیں لیکن سر والٹر نے یہ الفاظ رے برن ہی سے کہے تھے :- میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بنائی ہوئی تصویروں کے سوا میری کوئی تصویر صفحۂ ہستی پر موجود رہے - رے برن نے سر والٹر اسکاٹ کی چھ تصاویر کھینچیں اور جو تصویر اس پرچہ میں دی جا رہی ہے وہ ان تصویروں میں سے آخری ہے - رے برن نے اس کو اپنی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۸۲۳ء میں شروع کیا تھا - ہیرولنس برڈٹ کوٹس نے اسکو رے برن کے وارثوں سے خرید لیا - ۱۹۲۲ء میں یہ تصویر لندن میں بذریعہ نیلام عام فروخت کی گئی - جہاں نیویارک کی ایک فرم نے اس کو بعوض ۵۰ ہزار پونڈ خرید لیا - اس کے بعد یہ نیویارک کے مشہور بینکر مسٹر جے - اینچ - ہارڈنگ کے قبضہ میں چلی گئی - جو سر والٹر اسکاٹ کے بڑے مداح ہیں - اور اس فخر روزگار شاعر اور ناولسٹ سے تعلق رکھنے والی اشیاء کو بڑے اشتیاق سے جمع کرتے ہیں -

داغ

نواب مرزا داغ بہ سر عبدالقادر کا ایک بے حد جامع اور بلند پایہ مضمون اس پرچہ کے اوراق کی زینت ہے - داغ کا شمار اردو زبان کے ان چند مایۂ ناز شعراء میں ہوتا ہے - جو صاحب طرز تسلیم کئے گئے ہیں - ان کی غزلیں عام و خاص پسند ہونے کے باعث اردو شاعری میں بہت ممتاز درجہ رکھتی ہیں وہ اپنے زمانہ کے ایک کامیاب اور خوش قسمت شاعر تھے - حضور نظام سے ان کو دو ہزار ماہوار تنخواہ ملتی تھی - اتنی تنخواہ بقول سر عبدالقادر ہندوستان کے کسی شاعر کو بحیثیت شاعر آجتک نہیں ملی - انکی تصویر یقیناً پرچہ کی دلچسپی میں گرانقدر اضافہ کا موجب ہوگی :

وحشت

مولانا رضا علی وحشت زمانہ حال کے ایک سخن نگار اردو شاعر ہیں ہندوستان کے تمام بلند پایہ رسائل ان کا کلام بڑے فخر کے ساتھ شائع کرتے ہیں -

مسٹر ل احمد :- اردو زبان کے ایک باکمال ادیب ہونے کے علاوہ انگریزی کے بھی زبردست اہل قلم ہیں - ان کے مختصر افسانے بڑے دلچسپی کیساتھ پڑھے جاتے ہیں -

ڈاکٹر احمد جلال الدین :- لاہور کے ایک باکمال دندان ساز ہیں "دانت اور انکی بیماریاں" کے عنوان سے انکا ایک مضمون بھی اس پرچہ میں درج ہے - بیدار و وفا

حال و قال

"ادبی دُنیا" کا یہ پانچواں نمبر شائع ہو رہا ہے - اس وقت تک خدا کے فضل سے پندرہ سو مستقل خریدار بن چکے ہیں اور ایجنسیوں کے مطالبے تو پہلے ہی پرچے سے اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ ہم انہیں ابھی تک پورا نہیں کر سکے -

"ادبی دنیا" اپنی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ یہ عجوبہ شان بھی رکھتا ہے کہ اسکی اشاعتی ترقی اس کی مالی مشکلات کو کم کرنے سے قطعاً عاجز ہے - اس کی وجہ یہ ہے - کہ ادبی دنیا کی ہر کاپی پر بارہ آنے لاگت آتی ہے اور اگر دفتری اخراجات بھی لگائے جائیں تو ہر کاپی ایک روپے میں پڑتی ہے - گویا ہر خریدار کے بارہ پرچوں پر بارہ روپے لاگت آتی ہے اور خریدار سے چار روپے بارہ آنے وصول ہوئے تو اس صورت میں ہر خریدار پر سوا سات روپے نقصان کا اندازہ ہوتا ہے -

اب تک نو ہزار سے اوپر روپیہ صرف ہو چکا ہے جس میں سے پانچ ہزار کی رقم محفوظ فنڈ میں سے لی جا چکی ہے - یہ کمی اشتہارات سے پوری ہو سکتی ہے - مگر اشتہار دینے والوں کی نادھندی اُس جرم کی حد سے بھی بڑھ چکی ہے - جو وہ الفاظ کے جادو سے اپنے خریداروں پر جال ڈالنے میں کرتے ہیں - ہم نے ارادہ کیا ہے کہ آئندہ ہندوستانی فرموں میں انہیں فرموں کے اشتہارات لئے جائیں - جن پر لین دین کے معاملے میں اعتبار کیا جا سکتا ہے - عام اشتہار دینے والوں کے اشتہارات بہت کم لئے جائیں گے - انگلش فرموں کے اشتہار حاصل کرنے کے لئے ہم نے ایک یورپین کنویسر کو ملازم رکھ لیا ہے - یہ صورت حال عام ناظرین کو باخبر رکھنے کی خاطر تحریر نہیں کی گئی - بلکہ اُن اہل نظر کی درد آشنا نگاہوں کے لئے لکھی گئی ہے جو ہماری ناچیز ادبی خدمت کو قدر کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنا رسوخ و اختیار استعمال کر کے ہماری مشکلات کو کم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اُن کی صرف اُن کی توجہ کے لئے -

"جو حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سُنتے ہیں" -

ہمارے پاس جو آتا ہے مبارکباد کے انداز میں یہ سناتا ہوا آتا ہے کہ آپ کے "ادبی دنیا" نے دنیائے ادب کو ہلا رکھا ہے - اور ہر ادبی رسالے نے اپنا مرکزِ ثقل چھوڑ دیا ہے - کچھ رسالے دم توڑ رہے ہیں، کچھ دم توڑ چکے ہیں - کہیں ادبی دنیا کی وجہ سے سراسیمگی طاری ہے اور کہیں زندگی اور مستقبل سے ناامیدی" غرض کہ "ہزار منہ ہیں ہزار باتیں"

اِن افواہوں میں شمہ بھر بھی سچائی ہے تو علم و ادب کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت میں سب سے زیادہ رنج ہمیں ہوگا - کیونکہ ہم اپنے لئے اسے ایک لعنت سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی لاشوں پر اپنی زندگی کے فروغ کی تعمیر کریں - اور دلی خلوص کے ساتھ خدا سے یہ التجا کرتے ہیں کہ وہ ادبی دنیا کو معاصرین کی زندگی اور ترقی کا سبب بنائے نہ کہ اُن کی تباہی اور بربادی کا - اگر مکر کی ملاوٹ کے بغیر ہم اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے اپنے حدود میں لٹریچر کی ترقی کے لئے ہر ادبی پرچے کی ضرورت ہے - اُسے زندہ رہنا چاہیئے - اور ہر ادب دوست کا فرض ہے کہ اُسے زندہ رکھے - کون سینے پر ہاتھ رکھکر کہہ سکتا ہے کہ "نیرنگ خیال" اردو کے لئے بے ضرورت رسالہ ہے - مخزن کو بند ہو جانا چاہیئے، عالمگیر بے کار ہے، اور ہمایوں زندہ رکھنے کے قابل نہیں - جو ایسا کہتا یا سمجھتا ہے وہ یا تو لٹریچر کی ضرورتوں سے واقف نہیں اور یا پھر اپنے ضمیر کا گنا ہگار ہے - ان رسالوں نے اپنی اپنی لائن میں اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں - انجام دے رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اس سے زیادہ انجام دیں گے - ادبی دنیا ان رسالوں کے مقابلے میں کل کا بچہ ہے - اسے ان معاصرین کی رہنمائی کی اخیر تک ضرورت رہے گی - اور انہیں کے بالکل انہیں کے سہارے یہ ترقی کی کٹھن منزلیں طے کرنا چاہتا ہے - ہم اُن تنگ دل اور پست فطرۃ لوگوں میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں جو صرف اُسی کام کو زندگی کا حق دینا چاہتے ہیں جو اُن کے ہاتھوں انجام پا رہا ہو - باقی مخلص سے مخلص کام کرنے والے اور اُن کے مفید سے مفید کام ان کے نزدیک فنا کر دینے کے قابل ہیں -

"توبہ توبہ کہ خطاؤں سے مرکب ہے بشر"

اس بار عملۂ ادارۃ میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی ہے - مولوی معراج الدین اور حضرت بیدل ادارتی ذمہ واریوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں - مولوی صاحب کو وفا صاحب کے بدلے روزنامہ ویر بھارت میں بھیجا گیا اور حضرت بیدل انتظامی عملے میں آ گئے - یہ دونوں ہمارے عزیز دوست ہیں -

اور ان سے ہمیں بڑی مدد ملی۔ ہم ان میں ہونہاری کے جوہر دیکھ کر ہم نے انہیں ادبی دنیا کے اسٹاف میں شامل کیا تھا۔ تاکہ یہ ادبی دنیا کے ذریعہ اپنے لئے شہرت اور ترقی کی راہیں پیدا کریں اور اب اسی مقصد کی خاطر ہم انہیں اپنے سے رخصت کر رہے ہیں۔ ہماری رضامندی سے یہ سب کچھ ہوا ہے اور غالباً ہندوستانی کاروباری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ کہ ہم دوستوں کی حیثیت میں انہیں لائے تھے اور دوستوں کی طرح یہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ ادبی دنیا کی جو خدمت جب کبھی ان سے متعلق ہوگی انہیں کے ذریعہ انجام پائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب دفتری حاضری ان کی ضروری نہیں رہی ہے۔ لیکن دفتر میں انکی دلی حضوری ہر وقت لازمی رہے گی۔ اس کے علاوہ ان کے ہمارے تعلقات اس درجے سے بلند واقع ہوئے ہیں جہاں شکریہ کے رسمی اور بے جان الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے ملک کے مایۂ ناز ادیب پنڈت میلارام وفا نے ادبی دنیا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا منظور کر لیا ہے۔ وفا صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ایک بے نظیر اخبار نویس بلند پایہ ادبی نقاد اور غیر معمولی حیثیت کے اردو شاعر ہیں بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی یہ بتانے بیٹھ جائے۔ کہ سورج میں چمک۔۔ پانی میں روانی، اور آگ میں سوزش ہے۔ اس قسم کی قصیدہ خوانی کی انہیں ضرورت نہیں اور ناظرین اس کے بغیر بھی وفا صاحب کی ان امتیازی صفات سے واقف ہیں۔

یوپی کے ادیب حضرت عشرت رحمانی اور صوبہ بہار کے فاضل مولینا صدیق بہاری کی خدمات بھی ادبی دنیا کے عملہ ادارۃ کے لئے حاصل کر لی گئی ہیں۔ اب خدا نے چاہا تو ادبی دنیا صحیح معنی میں مشرق و مغرب کی ادبیات جدید و قدیم کا صحیح مرقع بن جائیگا۔ اس نمبر سے اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

اس نمبر کے اکثر مضامین آپکو آسان زبان میں نظر آئیں گے کیونکہ عملہ ادارۃ (ایڈیٹوریل سٹاف) میں سے ایک ادیب کو صرف اس کام پر مقرر کر دیا گیا ہے کہ وہ مضامین کی زبان درست اور آسان بنا دیا کریں۔ آئندہ سے ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ ان اہل قلم کے مضامین کو بغیر ردّ و بدل شایع کیا کریں جو شہرت کی بلندیوں کو طے کر چکے ہیں اور اس لئے وہ کسی کو اس کا مجاز تسلیم نہیں کرتے۔ کہ کوئی کسی مصلحت سے بھی اُن کی عبارتوں میں تبدیلی کر سکے۔ اس درجے کے انشاپردازوں کے مضامین اس وقت تک بغیر ترمیم شائع کئے جاتے رہیں گے جب تک کہ وقت اور ضرورت خود ہی انہیں اس یقین تک نہ پہونچا دے کہ اُن کے ملک کو ایک آسان زبان کی ضرورت ہے۔ ہم ایسے مضامین کے لئے رسالے کے صفحات مخصوص کئے دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین رسالے کی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایک ہی جگہ خاص حصّے کی سرخی کے ماتحت درج کئے جایا کریں گے۔ اور ان کے لئے فرہنگ کے صفحات ساتھ ہی دیئے جایا کریں گے۔ اس تجویز سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ادبی دنیا کے ناظرین ادبی طبقوں کے کسی بلند پایہ انشاپرداز کے خیالات سے بھی محروم نہ رہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آئندہ جو اُٹھے اپنے مضمون کے ساتھ "میرے مضمون میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے" کا فرمان صادر کر دیا کرے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کشورِ ادب میں کون سا فرمانروا فرمان صادر کرنے کا مجاز ہے۔

بعض اہلِ نظر ادبی دنیا کے مضامین اور تصاویر پر ہمدردانہ نکتہ چینی فرما کر ہمیں ہماری بے خبریوں اور لغزشوں سے واقف کرتے رہتے ہیں۔ ہم اُن کی اس قابل قدر رہنمائی کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اس سے اپنی حیثیت کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ہمیشہ ایسے مفید مشوروں اور رہنمائیوں کے طلب گار اور منتظر رہتے ہیں۔

مشرق و اہلِ مشرق

آئندہ سے ادبی دنیا میں اس سرخی کے ذیل میں اس قسم کے مخصوص مضامین شائع ہوا کریں گے جن میں مشرقی تاریخ، مشرقی تہذیب و تمدن، مشرقی علوم و فنون، مشرق کے آثار قدیمہ، اور مشرق کے ہر شعبے کے قدیم و جدید اہل کمال اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کی جائیگی۔ اس قسم کے مضامین حتی الامکان بالتصویر ہوا کریں گے۔ جو اہل قلم اس سرخی کو قائم رکھنے میں مدد فرمائیں گے۔ ہم اپنی گنجایش کے مطابق اُن کی خدمت بھی کریں گے۔

خاص نمبر

آئے دن رسالوں کے نئے نئے نمبر دیکھ دیکھ کر ہمارے دوست احباب نے ہمیں بھی اکسانا شروع کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں خاص نمبر نکالنے کے بغیر ادبی دنیا نیم زندہ رسالوں میں شمار رہے گا۔ حالانکہ ہمیں خطرہ ہے کہ خاص نمبر نکال کر کہیں یہ نیم زندگی کی پوزیشن بھی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھیں۔ ادھر عملۂ ادارۃ کی متفقہ رائے ہے کہ خاص نمبر سے ادبی دنیا کا سر افتخار آسمان سے جا ٹکرائے گا۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ آسمان سے سر ٹکرانے کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی ہے کہ مبادا آسمان کے اس پار ہو کر مریخ والوں کی نظر چڑھ جائے۔ اور پھر حضرت مسیح سے پہلے زمین پر اترنا نصیب نہ ہو۔

ادبی دنیا کی خطرناک اسکیم پنڈت میلارام وفا کے دماغ سے نکلی تھی اور ہماری ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس جال میں پھنسا کر اب خود تماشائیوں میں کھڑے مسکراتے نظر آتے ہیں۔ خاص نمبر کا سبز باغ بھی انہیں کی جولانی خیال کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنی دیوانگی کی تکمیل کی خاطر اس باغ کی بھی سیر کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یعنی اب خاص نمبر کی تجویز بھی عملی صورت اختیار کر رہی ہے۔ عملہ ادارہ میں مولینا صدیق بھائی مولینا حامد الانصاری اور مولینا غلام ربانی لودھی کو خاص نمبر کی تیاری پر لگا دیا ہے۔ حضرت عشرت رامپوری اہل قلم سے خط و کتابت۔ تصاویر۔ بلاکس وغیرہ کی فراہمی کا کام کریں گے۔ پنڈت میلارام وفا دفتر میں چیف ایڈیٹر کی قائم مقامی کریں گے۔ اور چیف ایڈیٹر مختلف زبانوں کے اہل قلم سے ملاقات اور علمی اداروں کی سیر کے لئے ۲۵ اگست سے ملک کا دورہ شروع کر دیگا۔

خاص نمبر کے متعلق کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا جا سکتا جس کے حدود اربعہ کی تفصیل ہمیں ذمہ داریوں کے ہجوم میں گم کر دے۔ البتہ صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری خواہش اور ارادہ یہ ہے کہ ادبی دنیا کا خاص نمبر ادبی دنیا کے عام نمبروں کا خاص نمبر ہو۔ اس نمبر پر وفا صاحب کے حساب سے دس ہزار روپیہ لاگت آئے گی۔ اور کم و بیش ایک سیر اس کا وزن ہوگا۔ اور غالباً چار آنے محصول ڈاک لگیگا۔

ادبی دنیا کے خریداروں کو اگر وہ طلب کریں گے صرف ایک روپیہ میں دیا جائیگا۔ اس کی عام قیمت کیا ہوگی؟ یہ ابھی ہم نہیں بتا سکتے۔ ادبی دنیا کے جو خریدار خاص نمبر نہیں منگائیں گے انہیں اس ماہ کا عام نمبر بدستور بھیجا جائیگا۔ ایجنٹوں اور خریداروں کی جسقدر فرمائشیں ستمبر کے ختم تک پہونچ جائینگی اُسی قدر پرچہ چھاپا جائیگا۔ اس کے بعد کوئی فرمائش منظور نہیں کی جائیگی۔ جو وقت پر فرمائش بھیجدیں گے پرچہ صرف انہیں کو ملیگا اُن کے سوا کسی کو کسی قیمت پر بھی ہم پہونچانے سے عاجز ہونگے۔ جو ایجنٹ اپنی فرمائش کے ساتھ مطلوبہ پرچوں کی تعداد کے ساتھ علی الحساب ایک روپیہ فی پرچے کے حساب سے رقم پیشگی بھیجدیں گے انہیں کی درخواست منظور کی جائے گی، دوسروں کی بنہج باقی قیمت کا وی پی کیا جائیگا۔

ادبی دنیا کے مئی اور جون کے نمبر بالکل ختم ہو چکے ہیں صرف فائل کی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اس لئے ہم مئی اور جون کے پرچے بھیجنے سے قطعاً عاجز ہیں۔ جو صاحب اپنی خریداری کے ساتھ مئی اور جون کے پرچوں کی شرط لگا دیتے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ہم اُن کی فرمائش کی تعمیل نہیں کر سکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ہزارہا ہزار کاپیاں اس امید پر چھاپ کر دفتر میں انبار لگا دیں کہ ممکن ہے کوئی خریدار انہیں طلب کر لے جبکہ ایک کاپی پر ایک روپیہ ہماری لاگت آجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن ناظرین کی خدمت میں التماس ہے جو ادبی دنیا کے فائل نہیں رکھ رہے ہیں کہ مئی اور جون کے پرچے ہمیں قیمتہً عنایت کر دیں تاکہ ہم اُن خریداروں کو جو ادبی دنیا کا فائل رکھنا چاہتے ہیں ہم پہونچا سکیں۔ مئی اور جون کے جسقدر پرچے ناظرین ہمیں عنایت فرمائیں گے ہم ان پرچوں کے طلب کرنے والوں سے قیمتیں وصول کر کے انہیں بھیجدیں گے۔

چونکہ ادبی دنیا کے اسٹاف میں اچھے انشا پردازوں کا معقول اضافہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اسٹاف کے تیار کئے ہوئے بلند درجے کے مضامین ہر ماہ اتنی تعداد میں تیار ہو جاتے ہیں کہ ہمیں معاوضے والے مضامین لینے کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ بنابریں آئندہ ہم معاوضے کے کسی مضمون کی ضرورت اور گنجائش دیکھیں تو درج کر سکیں گے ورنہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ آئندہ کسی شائع شدہ مضمون پر ہم معاوضے کی گنجائش پائیں گے تو معاوضہ دیں گے ورنہ نہیں۔ لہذا جو انشا پرداز معاوضے کے بغیر مضمون دینا پسند نہیں کرتے انہیں مضمون کے ساتھ اسکی وضاحت کر دینی چاہیئے۔ ہمارے پاس اسٹاف کے تیار کردہ نہایت بلند مضامین ذخیرہ کی صورت میں جمع ہو چکے ہیں۔ جو مضامین ہمارے معیار پر پورے اتریں اور اُن کے معاوضے کی شرط نہ ہو انہیں ہم ضرور شایع کرتے رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا اسٹاف رکھ کر ہم گویا معقول معاوضے پر اپنی پسند اور رسالے کے معیار کے مطابق مضامین حاصل کرنے کا انتظام کر چکے ہیں۔

ڈاکخانے والوں کو ادبی دنیا اسقدر پسند آگیا ہے کہ وہ پرچہ دیکھ کر بیخودی میں قانون کو بھول جاتے ہیں۔ قصبات اور دیہات کے سب پوسٹماسٹر اور عام شہروں کے چٹھی رساں ادبی دنیا پر پہلا حق اپنا سمجھتے ہیں۔ بے تکلف ریپر میں سے نکالا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق پڑھنا شروع کر دیا پھر اگر اُس میں کوئی مضمون دل کو بھایا یا کوئی تصویر زیادہ پسند آگئی تو آخری حق بھی اپنا ہی جما کر اُسے غائب کر دیا۔ اور اگر پڑھ لینے کے بعد خریدار کی خوش قسمتی سے دیانت کا ہیضہ ہونے لگا۔ تو غریب مکتوب الیہ تک پہونچا دیا۔

لاہور سے پرچہ صحیح و سالم روانہ ہو جاتا ہے مگر اپنی اپنی منزلوں پر پہونچنے سے پہلے مقامی ڈاکخانوں میں لُٹنا شروع ہو جاتا ہے حقیقت حال سے بیخبر ناظرین کو جب وقت پر رسالہ نہیں پہونچتا۔ تو ہر نئے سے نیا طعنہ، بدانتظامی اور کبھی کبھی بے ایمانی کی تہمتیں جتنی طبیعت ان کی مدد کرتی ہے تراش کے ہمارے پاس بھیجدیتے ہیں اور ہم بقول حالی "ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر" ھ

جو اُن تمنّوں کو سنتے ہیں اور دوبارہ پرچہ بھیجکر بدانتظامی کے الزام کو اپنے لئے یقینی بنا لیتے ہیں۔ تاجور

آئینۂ عالم

فرانس کالج میں پروفیسری کی شرط

فرانس کے "فرانس ڈو کالج" میں پروفیسر بننے کے لئے یونیورسٹی کی لمبی چوڑی ڈگریوں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے - وہاں پروفیسر صرف وہی شخص بنایا جاتا ہے جو اپنی علمی تحقیق و تلاش سے کوئی نئی ایجاد کرنے میں کامیاب ہُوا ہو، یا اُس نے کسی نئی بات کا پتہ لگایا ہو - پروفیسر کے لئے کالج کی حاضری ضروری نہیں ہے - وہ اپنے طور پر کسی لیبوریٹری (معمل) میں تجربات میں مشغول یا کسی لائبریری (کتب خانے) میں مطالعے میں مصروف رہتا ہے جب کسی تجربے یا کسی تحقیقات یا کسی ایجاد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کالج میں آکر اُس تجربے یا اُس تحقیق و ایجاد کے متعلق طلبہ کو لیکچر دے دیتا ہے - اور پھر کالج سے رخصت ہو جاتا ہے

ہمارے ہندوستان میں پروفیسر بننے کے لئے عام طور پر ڈگریوں کی ضرورت ہے - دماغ کی ضرورت نہیں - کوئی اچھے سے اچھا غیر معمولی قابلیت کا ہندوستانی جو بدقسمتی سے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل نہ کر سکا ہو - خواہ اپنے مضمون میں کتنا ہی قابل اور بے نظیر ہو - اُسے کالج اور یونیورسٹی کے حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے گی - دوسرے مضامین کو چھوڑ دیجئے ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو عربی، فارسی سنسکرت وغیرہ میں نہایت اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں - اتنی انگریزی بھی جانتے ہیں کہ اُس کے ذریعہ یورپ کے اورینٹلسٹوں (مستشرقین) کی علمی تحقیقات سے پوری واقفیت حاصل کئے ہوئے ہیں، اپنے مضمون پر محققانہ تصانیف بھی کر چکے ہیں لیکن چونکہ یونیورسٹی کی ڈگری سے محروم ہیں - اِس لئے یونیورسٹی کی طرف سے وہ رکھشا کھینچیں یا تانگہ جوتیں - یونیورسٹی کی بلا سے - یونیورسٹی انہیں پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوگی -

یہ ہے غلامانہ ذہنیت ہمارے غلام ملک کی - اور یہ ہے وہ یونیورسٹی کی تعلیم جس کے متعلق سر سید کا قول ہے کہ "یونیورسٹی کی تعلیم مخبر تیار کرتی ہے"

شہری اور دیہاتی بچوں کی تندرستی

کلارک یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر برنام فرماتے ہیں کہ دیہاتی باشندوں کی اولاد صاف ہوا اور کھلی دھوپ میں رہ کر فطرت کی گود میں پرورش پانے کے باوجود تندرستی میں شہریوں کی اولاد سے بہت پیچھے ہے -

یہ ایک ایسی بات ہے جسے ماننے کے لئے ہر شخص تیار نہیں ہوگا - لیکن پروفیسر برنام اُن اعداد و شمار کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں - جو دیہاتی اور شہری اسکولوں کے طلبہ کی تندرستی کے باقاعدہ امتحان کے بعد حاصل ہوئے ہیں - پروفیسر موصوف اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دیہاتی بچے ایسی ورزشوں کی مشق نہیں کرتے جن سے اُن کا قد سیدھا، رگ پٹھے گٹھیلے - بدن چھریرا اور لچکدار ہو جیسا کہ شہری بچوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے - اور دیہاتی لڑکے اِس قسم کی ورزشیں اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کے ماں باپ کھیتی باڑی کے کاموں ہی کو خاص قسم کی ورزش کے بدلے کافی سمجھتے ہیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیہاتی کام ورزش کے قائم مقام نہیں بن سکتے - یہی وجہ ہے کہ شہری لڑکوں کے مقابلے میں دیہاتی لڑکے بھدے بھونڈے اور سست نظر آتے ہیں - باقاعدہ ورزش نہ کرنے کی وجہ سے دیہاتیوں کی تندرستی شہریوں کے مقابلے میں خراب ہے "

اپنی اصلیت اپنے خوابوں سے معلوم کیجئے!

نفسیات (علم نفس) کے علماء کی باتیں اگر سچ مان لی جائیں تو ہم میں سے ہر شخص کو قدرت نے جتنی چیزیں عطا کی ہیں اُن میں ہمارا نفس سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے - کیونکہ اس میں ہمارے باپ دادا اور ہمارے اگلے بزرگوں کے تمام تجربے اور تمام واقعات ہُوبہو محفوظ ہیں - اور ہر شخص اپنے خوابوں کے ذریعے سے اِس مدفون خزانے کا پتہ پا سکتا ہے - اگرچہ یہ کام ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہے - کیونکہ خواب ہر شخص دیکھتا ہے مگر بھول جاتا ہے لیکن یاد رکھنے کی عادت ڈالی جائے تو بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے - نفسیات کا سب سے بڑا ماہر انگریز پروفیسر میکڈوگل جو آجکل امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دیتا ہے - کہتا ہے کہ بہتیرے لوگوں

نے اپنے خوابوں سے اپنی اصل نسل اور اپنے حسب نسب کا پتہ چلا لیا ہے کیونکہ اُن کو نیند میں ایسے واقعات نظر آئے ہیں جنہیں اپنی ساری زندگی میں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا - بلکہ وہ کئی پشت پہلے اُن کے دادا، پردادا کے وقت کے واقعات تھے - یورپ کے بہت سے عیسائیوں کو اپنے خواب ہی سے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کسی زمانے میں یہودی تھے - اسی طرح چند لوگوں کو خواب میں اپنے سامنے برف سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے پہاڑ نظر آیا کرتے تھے - اُن کی نسل کی چھان بین سے ظاہر ہوا ہے کہ اُنکے اگلے بزرگ برف سے ڈھکے ہوئے شمالی ملکوں کے رہنے والے تھے -

اگر یہ صحیح ہے تو عنقریب ہمارے خواب ہی ہماری سب سے بڑی دلچسپی کا ذریعہ بننے والے ہیں -

بچوں کی علمی پرورش کا نیا سامان

انگلینڈ کے بعض اخباروں میں ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس کو پڑھکر اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آجکل یورپ کی ہر چیز میں علمی روح کس قدر سرایت کر گئی ہے - یہ اشتہار بعض پرچوں کے چار صفحوں میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک انگریزی یونیورسٹی کو ایک ایسے معلم کی ضرورت ہے جو علمی تحقیق کے اصول سے باخبر اور اُن کو جاری کرانے کے طریقوں سے ماہر ہو - چار چار سال کی عمر کے چند بچے سپرد کئے جائیں گے اور وہ اُس وقت تک اُس کے سپرد رہیں گے جبتک کہ بڑے ہو جائیں - اتنی چھوٹی عمر سے اُنہیں علمی تحقیق کے ایسے طریقے پر پرورش کرنا ہوگا کہ بڑے ہو کر اُنہیں دوسروں کے خیالات کی پیروی کا ذرا بھی اثر نہ ہو - یہ ایک نیا کام ہے اور کسی اہل علم نے اسکو قبول کرنے کی ابھی تک ہمت نہیں کی - یونیورسٹی ایسے شخص کو منہ مانگی تنخواہ دینے کو تیار ہے -

موت کی آواز

آہستہ یا بلند جو کبھی آواز ہم سنتے ہیں وہ درحقیقت ہوا کی موج اور جنبش ہے جو کانوں کے پردے تک پہونچتی ہے اور اس کے اثر کو پردے دماغ تک پہونچا دیتے ہیں اور اسطرح ہم کسی آواز کو محسوس کرتے یا سنتے ہیں لیکن جب آواز بہت زیادہ بلند یا بہت پست ہو تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا -

پروفیسر وڈ نے تحقیق کے بعد اعلان کیا ہے کہ جب کوئی آواز اتنی بلند ہو جس کی وجہ سے ہوا میں موج اور لرزش حد سے زیادہ ہو جائے تو اگرچہ ہم اُسے محسوس نہیں کرتے مگر وہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو مار ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے پروفیسر نے اس درجے کی آواز کو "موت کی آواز" کہا ہے -

آئندہ اس آواز سے صنعت و حرفت کو خاص فائدہ پہونچنے کی امید کیجاتی ہے - ابتدائی تجربہ یہ ہے کہ اگر ہم تیل کو پانی میں ملائیں تو ہرگز نہیں ملتا مگر پروفیسر دونوں چیزوں پر موت کی آواز کو مسلّط کر دیا ہے - تو تیل پانی ملکر دودھ کی طرح بنجاتا ہے - اسی طرح پارہ پانی میں نہیں ملا کرتا - مگر پروفیسر نے تھوڑا سا پارہ پانی کی بوتل میں ڈالکر اسمیں "موت کی آواز" کی رو چھوڑی - تو پارہ اور پانی سیاہ روشنائی کی طرح بنگیا - خیال کیا جاتا ہے کہ "موت کی آواز" کے جدید تجربوں سے دنیا کی صنعت و حرفت میں ایک انقلاب آجائیگا -

یورپ میں شادی بیاہ کی سرد بازاری

یورپ کے ہر حصے میں روز بروز شادی کا بازار سرد پڑتا جا رہا ہے - اور اس صورت حال نے وہاں کے بہی خواہوں کو تشویش میں ڈال دیا ہے - اٹلی کے ایک اخبار نے اس اہم مسئلے کے بارے میں اپنے ناظرین کی رائے دریافت کی تھی - اُس کے پاس بہت سے جوابات آئے - جن میں سے مثال کے طور پر ہم چند جوابات درج کرتے ہیں :-

ایک نوجوان لکھتا ہے کہ "ریشمی جرابوں، نئے نئے فیشن کی ٹوپیوں اور رنگ برنگ کے کپڑوں کی گرانی کی وجہ سے شادی کرنے کی ہمت نہیں پڑتی -

دوسرا لکھتا ہے - کہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ شادی کرنے کے بعد اپنی بیوی کو گھٹنے سے اونچا فراک پہننے اور سینہ، شانے اور بازوؤں کو ننگا رکھنے سے روک سکوں -

ایک اور نے اپنی شادی نہ کرنے کے بہت سے اسباب لکھے ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ "والدین زندگی بھر سارے خاندان کی پرورش کرنے کے باوجود اپنی عمر کے آخری دنوں میں عام طور پر اپنے آپ کو تنہا اور تنگ حالی میں پاتے ہیں -

ایک عورت نے لکھا ہے کہ اس نے رقص گاہوں اور تفریح گاہوں میں نوجوانوں کی جو لغو افعال دیکھے ہیں اور جو مہمل باتیں سُنی ہیں اُنہوں نے اس کے دل میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی ہے - ایک دوسری لڑکی لکھتی ہے کہ شادی سے لڑکیاں اس لئے نفرت کرنے لگی ہیں کہ وہ جس کارخانے میں کام کرتی ہیں وہاں کے اہلکار مرد یا تو بد خلق اور سخت ہوتے ہیں جو ان سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے یا نرم دل اور بدکار ہوتے ہیں - جو ہمیشہ ان کو جھانسے دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں - اسلئے ان لڑکیوں کو مردوں ہی سے نفرت ہو جاتی ہے -

تاجور

(کیا پڑھنا چاہئے اور کیسے پڑھنا چاہئے)

دُنیا میں چاروں طرف کتابوں کی بھرمار ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر اس قسم کی ہیں کہ ان کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے - ہزاروں کتابیں اس قسم کی بھی ہیں جو کسی خاص سبب سے مطالعہ کے قابل مانی جا سکتی ہیں - مگر زمانہ کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ بالکل بیکار معلوم ہوتی ہیں اور ان کے پڑھنے والے لکیر کے فقیر کہلائے جاتے ہیں - یہ کتابیں جس زمانہ میں بھی تصنیف ہوئیں مفید تھیں لیکن آج ان سے دنیا کو کوئی نفع نہیں پہونچ سکتا - اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کسی خاص مقصد یا کسی خاص علم و فن کے لحاظ سے ضرور قابل قدر ہوتی ہیں مگر افسوس کہ وہ صرف اُنہیں حضرات کے مطالعہ کے قابل ہو سکتی ہیں جو ان علوم سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اُن کی زندگی کا خاص شغل اس کے سوا اور کچھ نہیں - غرض دنیا میں اس قسم کی اعلیٰ کتابیں بہت کم ہیں جن میں ہر شخص کی دلچسپی کا سامان موجود ہو - اس لئے علمی میدان میں ترقی کے لئے یا اپنے عزیز وقت کو صحیح طور پر صرف کرنے کے لئے اسبات کی سخت ضرورت ہے کہ انسان کا مشیر کوئی ایسا عقلمند دوست ہو جو اس کے ساتھ ساتھ رہے - اور مناسب و مفید کتابیں اُس کے مطالعہ کے لئے تجویز کرتا رہے - کالج یا اسکول کے کتب خانوں میں کتابیں تجویز کرنے کے لئے ایسے فاضل اور واقفکار پروفیسر کی ضرورت ہے جو الماریوں کو ایسی دلچسپ اور کار آمد کتابوں سے بھر دے جس سے شائقین علوم کے دماغ جگمگا اُٹھیں - عام طور پر کتبخانوں میں کتابوں کے ڈھیر نظر آتے ہیں - لیکن وہ بالکل اُس گچ اور مسالے کی طرح ہیں جو دیواروں سے گر کر خراب حالت میں پڑا ہو - گو اس سے ایک عالیشان محل تیار ہو سکتا ہے - لیکن کار آمد ہرگز نہ ہوگا -

دُنیا کی مشہور و معروف کتابوں کے متعلق تنقید کا یہ موقع نہیں ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان سب کا پڑھنا فائدہ مند ہے لیکن ان کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں -

امرسن - امریکہ کا فاضل انشا پرداز کتبخانہ میں مطالعہ کیلئے بہت کم جایا کرتا تھا وہ اس کا سبب یہ بیان کرتا تھا کہ "میں جب کبھی کتبخانہ میں داخل ہوتا ہوں تو ہمیشہ یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے کہ مناسب کتابوں سے زیادہ بہتر اور مفید علوم کا خزانہ میرے گھر کی چار دیواری یا میرے خاص مطالعہ کے کمرے میں موجود ہے" یعنی کتبخانہ میں جانے کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا - کیونکہ کتابوں کے انتخاب کرنیوالے ایسے قابل نہیں ہوتے کہ بہترین اور کار آمد تصانیف تجویز کریں جس سے انسانی دماغ روشن ہوں اور لطف حاصل کریں - اُس کا مقولہ ہے کہ "بڑی بڑی فہرستوں اور تذکروں کا مطالعہ صرف چند انشا پردازوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے - اور بس - اُن کی زندہ رفیقیں اُن کی تصانیف کی صورت میں ہر علم دوست انسان کے ذاتی کتبخانہ میں ہمیشہ جلوہ افروز رہتی ہیں - یہ کتابیں حقیقت میں صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت ہوتی ہیں - اور دماغوں کے لئے ایک خاص قوت اور دلچسپی کا سامان"

اس مصنف نے اپنے ایک مضمون انگریزی ادب پر تبصرہ کیا ہے اور مشہور مصنفوں کا حوالہ دینے کے بعد ہر علمدوست کے لئے ایک شاہراہ بتائی ہے - اصولی حیثیت سے وہ جس نتیجہ پر پہنچا ہے - یہ ہے کہ جن کتابوں کے بہترین خیالات اور صحیح واقعات پائے جاتے ہیں وہی مطالعہ کے قابل ہیں - ادب قدیم میں ہومر - ہروڈوٹس - ایسچیلس - فلاطون اور پلوٹارک کی کتابوں کا مطالعہ مفید پاتا ہے - اس نے تاریخ - سوانح اور شاعری کو جس میں فسانہ - ڈرامہ، علم العقائد، ناول اور علم مجلسی وغیرہ بھی شامل ہیں - علیحدہ علیحدہ قابل مطالعہ خیال کیا ہے اور اس کا قول ہے کہ "قوت متخیلہ کی بلند پروازی موجودہ زمانہ میں تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے - اگلے زمانہ میں اس مذاق کی کمی کے سبب خشک مزاجی زیادہ پیدا ہو جایا کرتی تھی اس زمانہ میں روح کو انہیں کتابوں سے تازگی حاصل کرنا چاہئے جن میں گہرے خیالات ہوں اور علمی و ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ رنگینی بھی پائی جائے" ہر عمدہ افسانہ یا کسی قسم کے عقائد کے بیان کی کتاب - کوئی سوانحعمری جس کا آغاز مذہبیت کے زمانہ سے ہو یا حسن و محبت کا کوئی باب یا سائنس و فلسفہ خیالی قوتوں کو آراستہ کرتے ہیں - مگر شرط یہی ہے کہ ان کتابوں کی کوئی نقصان یا کمی نہ رہے - ہر حیثیت سے مکمل ہوں -

قریب قریب ہر زمانہ کے مشہور مصنفوں نے بھی اپنی تصانیف میں

انہیں باتوں کا لحاظ لکھا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ اور عمر خیام کی رباعیاں آجتک پرستش کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ ٹینیٹے کی نظمیں شیکسپیئر کے ڈرامے۔ بیکن اور ملٹن کی نثر۔ تلسی داس اور کبیر کے دوہے وغیرہ صحیح اصول پر کامل ہونے کے سبب سے آجتک بیشمار انسانوں کو ترقی کا سبق سکھاتے رہے ہیں اور آئندہ سکھائیں گے۔ اس زمانہ میں افسانہ، ڈرامہ اور ناول وغیرہ کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ مگر ہندوستان میں ان کی کثرت نے ایشیائی دماغ کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اور ان کے صحیح اصول کو نہ سمجھنے کے سبب فائدہ بہت کم۔

اس جگہ اس مسئلہ پر اختلاف آراء کا بیان بھی شاید کارآمد ثابت ہوگا۔ ایک نفسیات کا ماہر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ "افسانہ وغیرہ کے زیادہ پڑھنے سے دو خرابیاں ہوتی ہیں ـــــ پہلی یہ کہ انسان کی طبیعت خیالات کی بے تکی آزادی سے فطرتاً مانوس ہوجاتی ہے۔ اور اس سبب سے مطالعہ کرنیوالے کے خیالات اور اخلاق کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ انسان بے ڈھنگے پن کو پسند کرکے تہذیب و شائستگی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔"

اگر افسانے ایسے مناظر کو پیش کریں جن میں اخلاقی، علمی، تمدنی یا سیاسی عیوب موجود ہوں۔ تو یہ مرض پیدا ہوجاتا ہے کہ اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں رہتا۔ ان افسانوں کے انجام کا اثر زیادہ ہوتا ہے اگر کسی شخص کی سیرت ابتدا وسط میں اچھی دکھائی گئی ہو لیکن آخر میں کچھ اس قسم کے حالات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ کہ انجام دماغوں کو برائی کیطرف مائل کر دیتا ہے۔ یہ صورت نوجوانوں کے لئے سخت مضر ہوتی ہے۔ اور اس نقصان کی تلافی اخلاقی تعلیم سے بہت کم ہوا کرتی ہے۔ مطالعہ کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتے وقت ہمیں الہامی کتابوں پر بھی ایک نظر ضرور ڈالنا چاہئیے۔ عبرانی۔ اور یونانی زبان میں عیسائی مذہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن مجید کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ فارسی میں ژند و پاژند اوستا اور دساتیر اسی نظر سے دیکھنے کے قابل ہیں۔ وید۔ اپنشد منوسمرتی اور بھگوت گیتا وغیرہ سنسکرت میں ہندوؤں کی الہامی کتابیں مانی جاتی ہیں چینیوں کے قدیم علم ادب میں بدھ مذہب کی کتابیں قابل دید ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کتابیں مطالعہ کے لئے مفید ہیں۔ اور ان کتابوں میں اصولی حیثیت سے ہر طبقہ اور ہر مذہب کے آدمی کو نصیحتوں کے قیمتی نگینے ملتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ دنیا کی اکثر فاضل ہستیوں نے صرف اس خیال سے نہیں کہ یہ خدائی کلام ہے بلکہ عام طور پر ان کے متعلق یہی رائے قائم کی کہ ان کتابوں میں۔ عجز و انکسار۔ تہذیب و اخلاق۔ تاریخی نکتے۔ شعر و سخن۔ فصاحت و بلاغت۔ اور حسن بیان یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اس قسم کی مکمل کتابیں آجتک زمانہ نے بہت کم پیدا کی ہیں۔

مطالعہ کی حیثیت سے ترجموں کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اور مختلف زبانوں کا علمی سرمایہ اس ذریعہ انسانی دماغوں میں محفوظ ہوتا ہے۔ عام طور پر ترجمہ کے قابل وہی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ جو حقیقت میں قدر کے لائق ہوں اور انسان کی معلومات میں مفید اضافہ کرسکیں۔

ترجموں کے مطالعہ سے تحقیق کا مادہ روز بروز ترقی کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ کتابیں ترجمہ کے بعد بھی اپنی ذاتی خصوصیات اور معنوی خوبیوں سے لبریز رہتی ہیں۔ امرسن کا قول ہے کہ:-

"اطالیہ والے ترجموں سے خاص رغبت رکھتے ہیں میں بھی لاطینی یونانی۔ جرمن۔ اطالوی اور فرانسیسی زبان کی کتابوں کو ترجموں پر ترجیح نہیں دیتا۔ بلکہ ان سب کو اپنی مادری زبان میں پڑھنا پسند کرتا ہوں"۔

اس مقولے کو پڑھنے کے بعد ہندوستان کی تعلیمی حالت پر اور زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ کہ یہاں کے مطالعہ کرنے والوں کو ترجمے بھی اپنی مادری زبان میں دیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور نہ اس قسم کا سرمایہ ان کے دماغ کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ سرسری معلومات کی کتابوں سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور ایسی باتوں کا مطالعہ ہی بیکار ہے جو معمولی طور پر بیان کیگئی ہوں۔ مشہور انگریزی ادیب ڈاکٹر جانسن بڑی بڑی شاندار دکانوں اور ہوٹلوں میں روزانہ جایا کرتا تھا۔ اور وہاں روشن خیال طبقہ سے ملنے کا موقعہ پاکے مفید معلومات کے سرمایہ سے اپنے دماغ کو روشن کیا کرتا۔

مشہور و معروف لعد کارآمد کتابیں پڑھنے کے دو فائدے ہیں اول تو وقت ضائع نہیں ہوتا۔ دوسرے خرچ کم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں حصول علم کا یہ طریقہ دلچسپ ہونیکے علاوہ بیحد مفید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض موقعوں پر جو بات سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ موجودہ زمانہ کے قہوہ خانوں میں آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ مطالعہ کتب کا عجیب و غریب طریقہ ایک اور بھی ہے جس سے ہندوستان کے لوگ عام طور پر واقف نہیں۔ اس طریقہ کا تعلق زیادہ تر "علمی مجلسیں" بہت کم ہیں۔ مطالعہ کے اس نئے اصول پر امرسن اس طرح تبصرہ کرتا ہے:-

"مفید کتابوں کی تعداد بیشمار ہے۔ ان سب کا پڑھنا اور ان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا انسان کی مختصر زندگی کو دیکھتے ہوئے بہت دشوار ہے اگر ہمارے علم دوست حضرات "امداد باہمی" کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے علم کے کسی خاص حصہ کا مطالعہ کریں۔ اور پھر اس کی معلومات کا خلاصہ کرکے ہمارے ذہن نشین کردیں تو علم و ادب کی اشاعت بہت

آسان ہوجائیگی - فرض کیجئے کہ چند علم دوست نوجوان اس بات پر متحد ہیں کہ کوئی شخص فرانس کی ادبی خصوصیات حاصل کرکے اپنے دوستوں کے سامنے پیش کرے - اور اس کے دوسرے ساتھی برطانیہ اور دوسرے ممالک کے علمی خزانوں سے اپنی سوسائٹی کو مالا مال کرنے پر کمر باندھ لیں - اور ہر شخص اپنے فرائض ایمانداری کے ساتھ ادا کرتا رہے تو ظاہر ہے کہ اس تجویز کا انجام کسقدر مفید ہوگا" یہ ترکیب قابل عمل ہو یا نہو ہمارے لئے تبصرہ کرنے والے نے ایک شاہراہ ضرور بنائی ہے اور ہر طالب علم کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرکے کم از کم اپنی ہم نشینی کے لئے ایسے ہی ماہر علم وفن کا انتخاب کرے - جو اپنے علمی ذوق کے لحاظ سے فضیلت رکھتا ہو اور دنیائے ادب میں ممتاز ہو - یا یوں سمجھئے کہ منطق وفلسفہ کی بیشمار کتابیں بہت کچھ فائدہ مند ہیں - لیکن ہر شخص کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ اُن کے ساتھ سر مارے - اور پھر زبردست منطقی ہونے کی سند حاصل کرے - اس تضیع اوقات سے بچنے کیلئے یہی طریقہ بہتر ہے کہ ہمارے علمی مجلسوں کا ایک ممبر منطقی مسئلوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے تیار ہوجائے - اور منطق وفلسفہ کا مطالعہ شروع کردے - اس میدان کا زبردست شہسوار بنے - پھر جو کچھ حقیقت حال ہو اس کو اپنے تجربات کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرے - اور ہم کو اس کے حالات سے اسیطرح آگاہ کردے جسطرح کہ خود اُس کا دماغ اس کی پستی وبلندی سے واقف ہے - اسی درمیان میں ہم میں کا دوسرا فرد کسی طبقہ کے علم عقائد کا ایمانداری سے مطالعہ کرکے وہ باتیں بتائے جو مذہبیات کا بہترین ماہر بتا سکتا ہے - غرض یہ کہ اس طریقہ سے ایک ہی وقت میں مختلف علوم وفنون کے زبردست ماہر پیدا ہوسکتے ہیں - اور ان کے وسیع معلومات سے فائدہ اٹھانیکا موقع مل سکتا ہے - اس تجویز میں جو بات سب سے زیادہ اہم ہے - وہ اپنے مذاق کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرنا ہے - اور اس کا صحیح فیصلہ وہی شخص کرسکتا ہے - جو اپنے ذوق کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کرے -

مطالعہ کا بہترین طریقہ یہی ہے - کہ کتابوں کا انتخاب اپنے ذوق اور طبیعت کے میلان کے مطابق کیا جائے - وقت مقرر کرکے صفحوں کی مقررہ تعداد کا مطالعہ بھی بیکار سی بات ہے - یہ قواعد تمام بناوٹی اور فضول ہیں - اس قسم کی آزادی سے ہر علم دوست کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے - اور وہ صرف اُنہیں امور کو ضروری خیال کرتا ہے جو اُس کے ملکی مقاصد اور ذاتی ضرورتوں کے لحاظ سے مفید اور کارآمد ہوں - اور

. . . . ادھر اُدھر کی بیکار پابندیاں اُس کے دماغ کو پریشان نہیں کیا کرتیں - ہر شخص کو وہی کتاب پڑھنا چاہئے جو اُس کے لئے خاص طور پر موزوں ہو - اور اپنی ذہنی قوت کو بیشمار اور فضول باتوں کے یاد رکھنے میں ضایع نہ کرنا چاہیئے -

یورپ میں صرف انجیل مقدس ہی ایک کتاب ہے جو ادبی اور مذہبی ہر حیثیت سے عام مذاق کی اصلاح کررہی ہے - اسطرح حافظ یا مولینا روم کی تصانیف نے خاص مرتبہ حاصل کیا ہے - کنفوشس نے چینیوں کے خیالات میں بلندی پیدا کی - اور اسپین میں سروینٹس نے سب کچھ کر دکھایا - خاص طور پر عرب بلکہ کل اسلامی دنیا کو قرآن کریم نے عزت وعروج کے مرتبے بخشے - اسی طرح ہندوستان میں بھگوت گیتا نے ہندوستانی دماغوں کی روحانیت کی اعلیٰ تعلیم دی ہے - غرض انسان کے خیالات ایک ہی کتاب سے بہت کچھ روشن ہوسکتے ہیں - اور اسی لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا - کہ اگر معمولی اور ادنیٰ درجہ کے انشا پرداز دنیا سے مٹ جائیں تو ہم لوگوں کو غیر معمولی فائدے حاصل ہوں - بقول ایمرسن "اسی یورپ میں شکسپیر ملٹن یا بیکن میں سے ایک ہی مصنف کی تصانیف کا مطالعہ ہمارے دماغ کو معلومات کا خزانہ بنا سکتا ہے"۔ بہرحال طالب علم کو اپنے مذاق کی درستی کے لئے اوپر بیان کئے ہوئے اصولوں کے اعتبار سے ایک یا بہت سی کتابیں ضرور پڑھنا چاہئے - اور یقیناً یہ طریقہ ضرور مفید ثابت ہوگا -

ڈاکٹر جانسن کہا کرتا تھا "تم اسی سوچ بچار میں رہ جاؤگے کہ تمہارا لڑکا کونسی کتاب پہلے شروع کرے اور دوسرا لڑکا اسی درمیان میں پہلی اور دوسری دونوں کتابیں ختم کرلیگا - پانچ گھنٹے روزانہ کچھ پڑھ لیا کرو - تمہارا عالم بن جانا یقینی ہے"

ایک زبردست ماہر علم ایک کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے - "مطالعہ دماغ کے لئے روحانی غذا ہے - جس سے عقل کو بڑی قوت پہنچتی ہے - اسی مطالعہ کی مدد سے ہم خدا کو پہچانتے ہیں - الہامی کتابوں سے سبق لیتے ہیں - خود اپنی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسان کی اصلیت کیا ہے - اسی سے تمام دنیا کی خبریں ہمکو پہنچتی ہیں - اور ہمیں تمام حالات وواقعات معلوم ہوجاتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ نہایت بدنصیب ہیں جو پڑھ نہیں سکتے - اور علم کی نعمت سے محروم ہیں -

ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو شخص اس روحانی غذا کو غلط طریقے پر استعمال کرتا ہے - تو پھر یہی زہر بن جاتی ہے - یعنی ایک ہی کتاب کا

مطالعہ ایک شخص کو روشن خیال فلسفی بنا دیتا ہے۔ اور اُسی کتاب کے مطالعہ سے دوسرا شخص جاہل بنا رہتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ پہلا شخص صحیح اصول سے مطالعہ کرتا ہے اور دوسرا ایک بیکار کام سمجھ کر کتاب پڑھتا ہے۔ اس لئے اُس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ مگر یہ شخص اپنی قابلیت کے متعلق اس غلط خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس سے زیادہ قابل کوئی نہیں۔ پھر بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مطالعہ کا ایک خاص مقصد مقرر کرلیں اور ایک خاص اصول کو سامنے رکھ کر کتابیں پڑھیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان سے اکثر ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جو ان کی ذلت کا باعث ہوتی ہیں۔ چونکہ ایسے لوگوں کو معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے خیالات صحیح طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس طرح انسان کے دماغ کو بھی کافی نقصان پہونچتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ صحیح طور پر مطالعہ کی کوشش کرنی چاہئیں۔ محض قواعد کی پابندی بھی زیادہ کارآمد نہیں کیونکہ طبیعتیں ان کی غلام بن کر رہجاتی ہیں اور آزادی سے کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعہ کے وقت جو مقصد ہم نے اپنے سامنے رکھا ہو وہ ہمارے خیال کے مطابق ہونا چاہئے جب یہ مقصد پورا ہو جائے تو پھر ہم دوسری باتوں کی طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ دماغ میں مختلف خیال پیدا ہونے سے بھی عقل کمزور ہوتی ہے۔ اور کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ طبیعت میں جس قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی رغبت پیدا ہوتی وہی دلچسپی سے پڑھی جاسکتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اسباب کی خاص طور پر احتیاط رکھنا چاہئے۔ کہ مطالعہ کا مُدعا صرف یہی ہے کہ خیالات کو کچھ نہ کچھ مدد پہونچتی رہے۔

ہم جب کسی تصنیف کو پڑھتے ہیں تو اس کے مطالعہ سے ذہن میں کچھ خیالات اس قسم کے بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ جنکا اصل مطلب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہم ان بیکار خیالات کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ اور مطالعہ کے اصل مقصد سے ہٹ کر ایک نئے راستے پر پڑتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مختلف راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ ہمیں خود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری تحقیقات کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ برخلاف اسکے اگر ہم مطالعہ ان تمام اصولوں سے ہٹ کر ابتدا ہی سے کسی بڑی کتابوں کو پڑھنا شروع کردیں تو یقیناً ہمیں کامیابی نہیں ہوسکتی بلکہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور ہم کوئی ترقی نہیں کرسکیں گے۔ اس لئے ابتدا سے ہمیں چاہئے کہ ابتدائی علوم کا مطالعہ کریں اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے جائیں تاکہ صحیح طور پر معلومات حاصل ہوسکیں۔ اور آسانی پیدا ہوتی چلی جائے۔ انشا پرداز وں اور مضمون نگاروں کو بھی اپنے مطالعہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اُن کیلئے بھی یہ طریقہ مناسب اور کارآمد نہیں ہوسکتا کہ ابتدائی اور درمیانی سیڑھیاں چھوڑ کر آخری درجہ پر پہونچنے کی کوشش کریں۔ اُنہیں اپنے ذوق کی رعایت سے ابتدائی درجے پہلے طے کرنا چاہئے۔ اور آہستہ آہستہ اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ تاکہ ہر پستی اور بلندی سے کافی طور پر واقف ہو جائیں بہرحال یہ خیالات خاص ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں۔ ہاں جس کو ان کی صحت کا یقین ہو اُس کے لئے ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ انسان کے دماغ کی بناوٹ میں بھی ایسا ہی فرق ہوتا ہے۔ جس طرح جسموں کی بناوٹ میں ہر شخص کا مذاق ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی خاص تجویز جس کا مقصد مطالعہ ہو دنیا بھر کے لئے قابل عمل نہیں ہوسکتی۔ مطالعہ کرنے والے کو پہلے اپنی طبیعت کا مطالعہ کرکے اپنے لئے خود اک شاہراہ بنانا چاہئے۔

بہرحال یہ ظاہر باتیں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں جو کچھ مطالعہ کیا جائے اس کے اندر اتنی توجہ ضرور کیجائے کہ مصنف کی خاص خاص اصلاحات کو دوسروں کے سامنے ٹھیک ٹھیک پیش کیا جاسکے۔ جب تک دلائل اچھی طرح نہ سمجھ لی جائیں کسی نتیجہ کو تسلیم نہ کیا جائے بلکہ اس پر برابر غور کیا جائے اور مختلف سوالات کی بھرمار مختلف پہلوؤں سے کی جائے تاکہ نتیجہ کے صحیح ہونے کا اندازہ اچھے طور پر ہو جائے۔ یہ چند نصیحتیں جو بظاہر بہت آسان معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقتاً ان پر عمل کرنا بہت دشوار ہے یہی حال اور چند اصولوں کا ہے جو ظاہر میں بہت آسان ہیں اور حقیقت میں بہت دشوار سچے دوستوں کی قدر اموشی۔ ملک کی محبت مذہب کی عقیدت جوہر شناسی اور سچائی لفظی حیثیت سے بہت آسان ہیں مگر ان پر عمل بیحد دشوار ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پڑھنا کیا چاہئے۔ ہر شخص کی طبیعت اس سوال کے جواب میں آخری فیصلہ دے سکتی ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے مذاقِ مطالعہ کے مطابق کتابوں کا انتخاب کیا جائے مسٹر پلینی نے ایک عام اصول اچھا بیان کیا ہے۔ بہت زیادہ پڑھنا بے شمار مضامین کے پڑھنے سے مفید ہے یا یوں سمجھو کہ بہترین منتخب تصانیف انتہائی غور کے ساتھ اسقدر پڑھنا چاہئے کہ ان کی معنویت سے دماغ روشن ہو جائے اُنکی آواز بار بار دماغ میں گونجنے لگے۔ اصول پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہاں یہ ضرور عرض کرونگا کہ میری رائے میں عقلی امور میں وہی لوگ ہوشمند کہے جاسکتے ہیں جو مفید باتوں کو تعداد وشمار کے لحاظ سے حل کرتے رہتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو دائرہ عقل کے اندر بھی اپنے خیال کے گھوڑے کو سرپٹ مہمیز دیتے ہیں ان کی غلطیاں بھی جو لگاتار ہوتی ہیں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات مٹ جانے پر بھی نشان ہدایت کی طرح

سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں پروفیسر لاک کا مقولہ ہے کہ:- "میری رائے میں وہ ارباب علم بھی خاص عزت کے مستحق ہیں جو غلطیوں کے مٹانے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے بجائے کوئی صحیح خیال نہ قائم کرتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں"

انٹلکچول لائف (روحانی زندگی) کا مصنف اسی زیر تجویز مسئلہ پہ اک نیا خیال ظاہر کرتا ہے اس کے قول کے مطابق پڑھنے کا فن لطیف صرف اسی پر منحصر ہے کہ مطالعہ جستہ جستہ کیا جائے اس کی رائے ہے کہ تمام لائبریریوں کا بہت آسانی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ہم کو ان خاص مقامات پر پہونچنے کی ضرورت نہیں ہے جو کتابی معلومات کا سرچشمہ ہیں یعنی مطالعہ کا صحیح اور جدید طریقہ یہی ہے کہ غیر متعلق امور کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور جن باتوں کی واقعی ہم کو ضرورت ہو ان کو جستہ جستہ انتخاب کر لیا جائے۔ گو یہ طریقہ کار خارجی اسباب پر منحصر نہیں ہے اور نہ خارجی اسباب کی رہنمائی سے آ سکتا ہے لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی ذہنی ضروریات کو جسقدر ہم خود اچھا سمجھ سکتے ہیں کوئی دوسرا شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر اخبار میں جو ہمارے ہاتھ میں آتا ہے پڑھنے کے قابل دو ہی چار باتیں ہوتی ہیں اب یہ کام فن مطالعہ جاننے والا کا ہے کہ وہ ان دو چار باتوں کو ڈھونڈ کر پڑھ لے اور دوسری باتوں میں اپنا کارآمد وقت نہ ضائع کرے۔

لارڈ بیکن نے بھی مطالعہ کے متعلق بڑا مفید مشورہ دیا ہے اس کا قول ہے کہ "بعض کتابیں صرف چاشنی کے طور پر ذائقہ کیلئے ہیں بعض بالکل نگل جانے کے قابل ہیں اور بعض اس لائق ہیں کہ پہلے ان کی جگالی کی جائے اور پھر ان کو ہضم کیا جائے" اس کی تشریح یوں سمجھنا چاہیئے کہ بہت سی کتابوں کو تھوڑا تھوڑا کہیں کہیں سے پڑھنا چاہیئے۔ بہت سی کتابوں پر یونہیں سرسری نگاہ ڈالنا چاہیئے۔ اور چند کو نہایت غور و توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو کسی دوسرے کی زبانی سنی جا سکتی ہیں ان کے انتخابات ہم کو غیر معمولی فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ صورت جب ہی مناسب ہے کہ کتابیں نیچے درجہ کی ہوں اور دلیلیں کچھ زیادہ اہم نہوں یہی انتخاب مضامین کا مجموعہ روشن آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس کی علمی شعاعیں دل و دماغ کو چمکا دیتی ہیں۔ انسانی مطالعہ کی تکمیل کرتا ہے۔ تربیت و مشورہ ضروریات زندگی کے لئے انسان کو چست بناتا ہے۔ لکھنا۔ انسان کو ٹھیک ٹھیک آدمیت کے دائرہ میں رکھتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص کم لکھے تو اس کو زبردست حافظہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تربیت و مشورہ سے محروم ہو تو دماغ کسی کام کا نہیں رہتا وغیرہ وغیرہ۔ علم تاریخ انسان کو دانشمند بناتا ہے۔ شعر و شاعری خوش مذاقی پیدا کرتی ہے۔ ریاضی سوچ بچار کا مادہ پیدا کرتی ہے فلسفہ اور طبیعیات خیالات کو گہرا بناتے ہیں علم اخلاق سنجیدگی پیدا کرتا ہے منطق اور علم الکلام بحث و مباحثہ کی قابلیت میں اضافہ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانی مذاق کے اندر کوئی رکاوٹ اور جھاڑ نہیں ہے اور اگر ہو تو صحیح مطالعہ کی مدد سے بہت جلد دور کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور ماہر تعلیم کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب شروع سے آخر تک بدترین نہیں ہے۔ اسمیں کچھ نہ کچھ مفید باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر واٹس نے اسی مطالعہ کے مسئلہ پر یہ مشورہ دیا ہے کہ "دیباچہ اور فہرست کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ یہ دونوں چیزیں اصل کتاب کے حاصل پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہیں" یہی ڈاکٹر ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ "مطالعۂ کتب سے ہماری معلومات اور واقفیت میں بڑی وسعت ہو جاتی ہے۔ ماضی و حال کے معاملات و خیالات اور زندہ و مردہ لوگوں کے اعمال اور عادات اسی مطالعۂ کتب کی روشنی میں ہم تک پہونچتے ہیں۔ کتابوں ہی کے مطالعہ سے ہم کو تمام انسانوں کے حالات دریافت ہوتے ہیں۔ مشاہدہ ہمکو صرف وہ باتیں بتاتا ہے جو ہم خود اپنی تحقیق سے معلوم کرتے ہیں اور اکثر اس کا دائرہ اسقدر محدود ہوتا ہے کہ جن اشیاء کو ہم صحیح طور پر نہ جانتے ہوں وہ دیکھنے میں نہیں آتیں ہمیں مطالعہ سے نہ صرف مختلف اقوام اور مختلف زمانوں کے کارناموں اور جذبات کا علم ہوتا ہے بلکہ سب سے زیادہ دانشمند بنی نوع انسان کی ممتاز جماعت یعنی علماء و حکماء کی خصوصیات اور تجربات ہماری طبیعت کے اندر منتقل ہوتے ہیں پھر لطف یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے وطن اور مسکن سے ہم کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یوں تو بے شمار کتابیں ناقابل اور غیر منصف مزاج لوگوں نے بھی تصنیف کی ہیں لیکن اسقدر یقینی ہے کہ جو کتابیں دنیا میں زبردست شہرت حاصل کر چکیں ہیں وہ مختلف زمانوں اور مختلف اقوام کے بہترین اور برتر دانشمندوں کے دل و دماغ کا نتیجہ ہیں۔

جب ہم بہترین تصنیفات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے جذبات اور خیالات بھی صرف اس وجہ سے روشن اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں کہ علمائے فن اُن میں اپنی بہترین معلومات جمع کرتے ہیں۔ یہ لوگ اول تو مطالعہ ہی نہایت محنت سے کرتے ہیں اور پھر نہایت کوشش سے اپنے خیالات لکھتے ہیں۔ ایسے مصنفین بالعموم نہایت وسیع مطالعہ اور کافی تجربہ کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ خصوصیات گفتگو یا کسی کے تقریر سے نصیب نہیں ہو سکتیں تقریر اور گفتگو سے ہم اپنے دوستوں یا ناواقفوں کے خیالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور مانا کہ یہ طریقہ عمل مفید ہی کیوں نہ ہو مگر نا گہانی خیالات جو اچھی طرح پختہ نہیں ہوتے ہمارے لئے یقینی طور پر فائدہ مند نہیں ہو سکتے۔

مطالعہ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے پڑھے ہوئے کو بار بار دہرا سکتے ہیں۔ کتاب سے مشورہ ہر وقت ممکن ہوتا ہے اور اطمینان و سکون کے وقت غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ اس کے خلاف تقریر یا گفتگو اکثر ذہن میں قائم نہیں رہتی اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ جہاں مجلس اٹھی یا دو ایک دن گذر گئے تو یہ سُنے ہوئے خیالات بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا تو زبردست حافظہ ہونا چاہیئے یا سُنی سنائی باتوں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہوں نوٹ کر لینا چاہیئے۔ انہیں طویل وجوہ کی بنا پر یا یُوں سمجھو کہ وقت کی کمی اور معلومات کو نوٹ نہ کرنے کے باعث بہت سے تعلیم یافتہ مفید باتوں کو حل کرنے سے مجبور رہتے ہیں اور پھر ان باتوں کو یاد کر کے دوسروں کو فیض پہونچانے کے کبھی قابل نہیں رہتے ہیں۔

خاص کتابیں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں بالخصوص کسی مستقل مضمون پہ کوئی مکمل رسالہ پہلے پہلے سرسری اور معمولی طور پر پڑھنا چاہیئے۔ اس مطالعہ کا مقصد خاص صرف یہی ہوگا کہ ہم کو انشا پرداز کی ذہانت اور طرز ادا کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین ہو جائے کہ اس سے ہم کس حد تک فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ میری رائے میں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیباچہ پڑھا جائے پھر فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالی جائے اور کتاب کے مطالعہ سے پہلے مضامین کتاب کو اوپر بیان کئے ہوئے طریقہ کے مطابق جانچ لیا جائے۔ اس طرح نہ صرف کتاب کے مطالعہ کرنے میں مدد ملیگی بلکہ دوسری بار اس اصول پر عمل کرنے سے مضامین کے یاد رکھنے میں بیحد مدد پہونچے گی اور مصنف کا مقصد آسانی سے سمجھ میں آجائیگا اور فضول محنت سے نجات مل جائے گی۔ مطالعہ کے وقت جو باتیں نئی ہوں اور پہلے سے معلوم نہوں اُن پر نشان لگانا چاہیئے اور پھر کتاب کے بابوں اور فصلوں کو دُہرانا چاہیئے جس وقت تک کوئی مطالعہ کرنے والا غیر معمولی حافظہ کا انسان نہ ہو میں اس قسم کے مطالعہ کا مشورہ دوُں گا۔ اس کی دلیل صرف یہی ہے کہ کوئی کتاب یا کوئی باب جو ایک بار مطالعہ کے قابل خیال کیا جائے گا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا دوبارہ مطالعہ غیر ضروری ہے۔ بہر صورت نشان کی ہوئی سطروں یا ٹکڑوں کو دوبارہ ضرور دیکھنا چاہیئے اور ان نشانات کے اندر جو چیزیں حقیقتاً قابل قدر ہوں ان کو ضرور یاد رکھنا چاہیئے۔

میری رائے میں کسی کتاب کو بغور پڑھنے سے پہلے اس کو سرسری طور پر دیکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سی دشواریاں جو پہلی بار مطالعہ کرنے میں بآسانی سمجھ میں نہیں آتیں دوسری بار مطالعہ کرتے وقت خودبخود حل ہو جاتی ہیں۔ اس کمزوری کا سبب خاص یہی ہوتا ہے کہ مصنف کی پوری تجویز سمجھ میں نہیں آتی۔

غرضیکہ رسائل اور کتب کا مطالعہ اسی اصول پر کرنا چاہیئے اور معمولی دشواری کو بلاپس وپیش پہلے ہی مطالعہ میں حل کر لینا چاہیئے۔ جب ہم کتاب پر دوبار نگاہ دوڑائیں گے تو یقینی ہے کہ پچھلی حل کی ہوئی دشواریاں یا تو آنے والی دقتوں کو بالکل غائب کر دیں گی یا کم از کم دوسرے مطالعہ میں کافی سہولت بہم پہنچائینگی۔ مطالعہ میں پہلی بار جو باتیں دماغ میں نہ آسکیں یا نہ سمجھی جا سکیں۔ ان پر مزید تحقیقات اور تلاش کے لئے نشان کر کے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اُن کے بعد جو صفحے سامنے ہوں اُن پر پُورا غور کر کے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ پچھلے صفحات پر ان کے مضامین سے کافی روشنی پڑ سکتی ہے یا نہیں۔

بہت سے لوگ اس قسم کے بھی ہیں جو بڑی محنت اور مسلسل مطالعہ کو اپنی زندگی کا اصول خاص بنا لیتے ہیں مگر علم حقیقی کے راستے میں ایک قدم بھی ترقی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ جی ہی جی میں اُن خیالات سے مسرت حاصل کرتے ہیں جو اُن کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہیں یا جنہیں وہ اپنے کانوں سے سُنتے رہیں گویا کہ اُن کا پڑھنا یا سُننا ایک قسم کی دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں جو اُن کے دماغوں میں محض دلچسپی کی خاطر سما سکتی ہیں۔ یہ لوگ نہ تو ان کو خاص طور پر پڑھتے ہیں اور نہ اُن سے مفید نتیجے نکالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نگاہیں صفحوں کو چرتی رہتی ہیں یا یُوں کہنا چاہیئے کہ الفاظ ان کے کانوں پر چکنے گھڑے کی حیثیت رکھتے ہیں پھسلتے رہتے ہیں۔ ایسے خیالات جو اس قسم کے بیکار مطالعہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ رات کی کہانیوں کی طرح یا کسی سبزہ زار پر بادل کے ٹکڑے کی مانند آکر آناً فاناً میں رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

سید یعقوب حسنؓ شاہجہانپوری

لبوں پہ بچپن کی کیا نہ آئے گی اب وہ معصوم مسکراہٹ
ادھورے الفاظ اے جوانی! وہ کیا نہ نکلیں گے اب زباں سے

نہ تھی گرانباری مشاغل۔ نہ تھی یہ پابندی علائق
اسیر زنجیر غم نہ تھا میں، نجات تھی شورش جہاں سے

مرا ہنڈولا تھا عرش اعظم۔ مرے کھلونے تھے چاند سورج
اتار لانا تھا جا کے تارے زمیں پہ راتوں کو آسماں سے

مرا گھروندا تھا گھر کا آنگن۔ اسی میں مہماں تھا میرا بچپن
تجھے بلایا تھا کس نے ظالم؟ شباب! تو آگیا کہاں سے

ڈبلیوٹی ہنلے

ڈبلیوٹی ہنلے ۱۸۱۴ء میں قصبہ مڈہرسٹ علاقہ سسکس انگلستان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ہرن کی کھال کی جرمن بناتا تھا۔ ہنلے کی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا نے پرورش کا بار لیا۔ لیکن وہ بھی زندہ نہ رہا۔ اور دادا کی وفات کے بعد اس کے چچا نے اپنی نگرانی میں لیا۔ ہنلے گیارہ سال کی عمر میں سکول چھوڑ کر اپنے چچا کے کام میں مدد دینے لگا۔ لیکن اسے چمڑے اور دستانے بنانے کے کام میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں اپنے خاندانی پیشہ کو چھوڑ کر قسمت آزمانے کے لئے لندن میں آیا۔ کچھ عرصہ تک تو وہ قلیوں کا کام کرتا رہا۔ اور تقریباً سات برس تک سینٹ کیتھرائن میں مزدوری کی۔ یہاں اس کی آمدنی ۲ شلنگ روزانہ تھی۔ اس رقم میں سے وہ ڈیڑھ شلنگ کرایہ کھانا اور کپڑوں پر صرف کرتا۔ باقی کے چھ پنس بچا کرتا۔ میں۔ اوزار اور تجربہ کیلئے سامان خرید اکرتا۔ تین سال کے عرصہ میں بجلی۔ مقناطیس۔ روشنی۔ علم کیمیا۔ علم حرفت اور قوانین حرکات میں کافی مہارت پیدا کرلی۔ اپنے ہاتھ سے اس نے بہت سے اوزار تیار کئے۔ جن میں سے مشہور لیڈن جار بھی تھا۔ لیڈن جار اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جب یہ تیار ہو گیا تو اس کا تجربہ کرنے لگا۔ لیکن بجلی کا ایسا زبردست صدمہ اسے پہونچا۔ کہ لیڈن جار اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور ٹوٹ گیا۔ لیکن اسے تجربہ ہو گیا۔ اس لئے اس نے ایک نیا لیڈن جار تیار کر لیا۔ اس کے بعد اس نے گیسوں کے تجربے شروع کئے اور ایک بہت بڑا آکسی ہائیڈروجن[1] آلہ تیار کیا۔ لیکن جس مکان میں رہتا تھا اس میں اس گیس سے کئی مرتبہ زبردست دھماکے ہوئے اور ایک مرتبہ تو مکان میں آگ لگ گئی۔ مالک مکان بھلا کب برداشت کرسکتا تھا۔ اس لئے ہنلے نے یہ مشغلہ چھوڑ کر دوسرے خاموش مضامین کی طرف توجہ کی۔ اس عرصہ میں اس نے لوہا خرادنا اور بڑھئی کا کام بھی سیکھ لیا تھا۔ اس واسطے اس نے ارادہ کر لیا کہ سائنس کے آلات بنایا کرے اور اپنے ہاتھ سے ہی لکڑی اور دھات کا تمام کام تیار کرے۔ اس تمام عرصے میں ہفتہ ہفتہ بھر روٹی اور مکھن پر ہی گذارہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی تھوڑی بہت کافی بھی پی لیتا تھا۔ یکشنبہ کے روز کوئی کام نہ کرتا تھا۔ البتہ اس روز کیک بسکٹ اور مٹھائیاں تیار کرتا جس میں اسے کافی مہارت ہو گئی۔

سائنس کے اوزاروں کا کارخانہ قائم کرنے سے پہلے اس نے کچھ جادو کی لالٹینیں تیار کی تھیں۔ اس کا ہر ایک حصہ اس نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ اور ساری عمر اس کی یہی عادت رہی کہ جو چیز بناتا۔ اول سے آخر تک اپنے ہی ہاتھ سے تیار کرتا۔ یہاں تک کہ جب وہ بڑے بھاری کارخانے کا مالک بن گیا۔ تو کچی دھاتیں لیکر انہیں صاف کرتا۔ پھر ان سے اپنے اوزار بناتا اور سٹیڈ کی بجلی مقناطیسی دریافت نے اس کی توجہ بجلی کی طرف پھیر دی۔ اس نے کئی اوزار بنا سئے۔ جنہیں لندن اور وسٹ منسٹر بنک کے صدر مسٹر گیسیاٹ نے دیکھا۔ اور اس سے بہت سے بجلی مقناطیس اور روشنی کے اوزار بنوائے۔ مسٹر گیسیاٹ نے پروفیسر وہیٹسٹون سے اسکی ملاقات کرائی۔ اپنے تمام ابتدائی تجربے اس نے پروفیسر وہیٹسٹون کے ساتھ کئے۔ جس کے نتیجہ میں اس نے اپنی تمام رجسٹریاں فروخت کر دیں۔ اور ۱۸۴۶ء میں بجلی اور تار کی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ ہنلے نے بہت سے مقناطیسی تار رجسٹری کرائے۔ اس نے "سب میرین[2] کیبل" بنانے کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ماہر انجنیر۔ سائنسدان۔ سوداگر اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ سب سے پہلی اور کامیاب لمبے فاصلے والی میرین کیبل تیار کی۔ جسے سر چارلس برائٹ نے ۱۸۶۳ء میں خلیج ایران میں لگایا۔ اس کی لمبائی ۱۴۱۵ میل ہے۔ اس کی کیبل کے بنانے میں اس نے عجیب عجیب ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ جو آج تک کام میں آتی ہیں۔ بحر اطلانٹک میں ایک کیبل ۱۸۵۸ء میں بچھائی گئی تھی۔ لیکن پندرہ یوم کے عرصہ میں یہ بالکل بیکار ہو گئی۔ ہنلے کو اس کے امتحان کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور اس کے بعد اس کی رپورٹ طلب کی گئی۔ کہ کیوں ناکامی ہوئی۔

۱۸۶۵ء میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ کہ بحر اطلانٹک میں کیبل بچھائی جائے۔ لیکن کیبل ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کی تلافی ہو گئی۔ اور ۱۸۶۶ء میں اس نے کامیابی کے ساتھ کیبل بچھا دی۔ جس سے انگلستان اور امریکہ میں تعلقات ہو گئے۔ اور دونوں ملکوں کی تجارت پر بہت عمدہ اثر پڑا۔

اس کے بعد ہنلے نے اور بھی بہت سی سب میرین کیبل سمندروں میں بچھائیں۔ اور ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا جس سے اگر کیبل ایک میل کی گہرائی تک پہونچ جائے تو اسے اٹھا لیا جا سکے۔ (۔۔)

---

[1] ہائیڈروجن گیس کے جلنے سے کافی گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن جب اسکے شعلہ پر آکسیجن گیس پہونچائی جائے تو گرمی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آجکل اس کے ذریعہ سے مختلف دھاتوں کو جوڑنے یا ٹانکا لگانے کا کام لیا جاتا ہے۔

[2] سب میرین کیبل۔ وہ تار جو سمندر میں تہ نشین ہوتے ہیں اور جس پر بجلی کے ذریعے تار برقی کے پیغامات بھیجے جا سکتے ہیں۔

ہمجولی

بہت ہے صحبتِ باہمد گر مرغوب دونوں کو — اسیرِ رشتۂ جذباتِ نامعلوم ہیں دونوں
بہم مل بیٹھنے کا شغل ہے محبوب دونوں کو — گرفتارِ طلسمِ حیرتِ معصوم ہیں دونوں

محبّت ان کی قیدِ جنس سے آزاد ہے یکسر — مفادِ باہمی سے ہے تعلّق بے نیاز ان کا
خوشی سے ان کی دُنیائے خیال آباد ہے یکسر — نہیں ہے دشمنِ عیش آسمانِ فتنہ باز ان کا

ابھی یہ بے خبر ہیں چرخِ دُوں کی دُوں شعاری سے — ابھی ناآشنائے گردشِ ایّام ہیں دونوں
نہیں پالا پڑا ان کو پریشاں روزگاری سے — غرض بیگانۂ اندیشۂ انجام ہیں دونوں

کبھی ناآشنائے گردشِ ایّام تھا میں بھی — نہ غم دیکھا تھا میں نے بھی پریشاں روزگاری کا
کبھی بیگانۂ اندیشۂ انجام تھا میں بھی — یقین تھا مجھ کو بھی دورِ طرب کی پائیداری کا

یونہی بیگانۂ افکارِ جہاں سے آہ میں بھی تھا — کہ بچّے بلیوں کے آہ میرے بھی تھے ہمجولی
یونہی آزاد قیدِ این و آں سے آہ میں بھی تھا — مرا بھی شغل تھا پلّوں سے مل کر کھیلنا ہولی

مجھے اے کاش پھر بےفکریاں حاصل ہوں بچپن کی — میسّر پھر مجھے بچپن کی کامل شادمانی ہو
مرے شغلوں میں محویتیں شامل ہوں بچپن کی — اُسی صورت سے پھر بے لوث میری زندگانی ہو

میلا رام وفا

عرب کی عورتیں اور بدیہہ گوئیؔ[1]

قدرت نے اہلِ عرب کو فصاحت و بلاغت اور قدرت بیان کا جو فطری ملکہ اور ساتھ ہی ذہانت و طباعی اور غیر معمولی ذکاوت و موزونیٔ طبع کا جو جوہر لطیف مرحمت فرمایا تھا اُس کا اثر یہ تھا کہ مرد تو مرد عورتیں تک بعض اوقات باتوں باتوں میں ایسے برجستہ اور موزوں اشعار پڑھ دیتی تھیں جنہیں سُن کر انسانی عقل حیرت میں غرق ہو جاتی ہے۔ بدیہہ گوئی ایک ایسا حیرت انگیز اور دلچسپ کمال ہے کہ مردوں کی زبانی سے جو کلام بدیہہ گوئی کے انداز میں ادا ہو جاتا ہے۔ عموماً ادبی مجلسوں کی گرمی کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ جو کلام عورتوں کی زبان سے بیساختہ ادا ہو گا وہ کس حد تک سُننے والوں کے لئے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا سکیگا محض اسی خیال کی بنا پر میں عرب کی شاعرہ عورتوں کی بدیہہ گوئی کی چند دلچسپ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان اشعار سے جہاں آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ مردوں کی طرح عرب کی عورتیں بھی کس درجہ قادر الکلام اور موزونی طبع ہوتی تھیں۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی کہ عموماً دیہاتی زندگی بسر کرنے کے باوجود اُن کے جذبات کس درجہ گہرے۔ اُن کے احساس کس درجہ پر کیف۔ اور اُن کا مطالعہ فطرت کس حد تک وسیع تھا۔

ابوحسان عباسی اور ایک دوشیزہ

ابوحسان کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں چند ساتھیوں کے ساتھ ایک مقام پر بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک نقاب پوش دوشیزہ آئی اور ہمارے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی کہ۔

اے لوگو تمہیں کچھ خبر بھی ہے میں قبیلۂ عُکل کی ایک لڑکی ہوں جس کی آسائش و راحت کو مصیبتوں کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ زمانہ کے مصائب نے اُن کو بالکل مفلس اور کنگال کر ڈالا یہاں تک کہ اب اُن کے پاس بیٹھنے کے لئے ایک چارپائی اور دودھ پینے کے لئے ایک بکری بھی نہیں ہے۔ تو کیا خدا کا کوئی نیک بندہ ہے جو اُن کی اعانت و امداد کے لئے سخاوت کا ہاتھ بڑھائے اور اُن کی مصیبتوں میں اُن کا مددگار ہو کر آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دوشیزہ نے یہ تقریر کچھ ایسے جادو بھرے لب و لہجہ کے ساتھ کی کہ ہم سب کے دل اُسے سُنکر رحم کے جذبات سے لبریز ہو گئے۔ میں نے کہا کہ کیا تم نے اپنی بدحالی کے متعلق کوئی شعر بھی کہا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں اور پھر یہ دو شعر پڑھے

کف الزمان علیها الصبر والصاب ۔۔۔ شُلّت انا ملها عن الاعراب
قومٌ اذا الجاءَ العفاةُ الیهم ۔۔۔ اعطوا النوال لهم بغیر حساب

ترجمہ۔ زمانہ کے ہاتھ میں ایلوا اور صاب (ایک قسم کا تلخ درخت) بھرا ہوا ہے خدا کرے کہ اس ہاتھ کی انگلیاں ہم دیہاتی لوگوں تک پہنچتے پہنچتے شل ہو جائیں (ہماری) قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جب بھکاری اُن کے پاس آتے تھے تو وہ اپنی بخششیں اُنہیں بے حساب دیدیا کرتے تھے۔"

پھر میں نے کہا کہ کیا تم اپنے چہرے کو ایک لمحے کے لئے بے نقاب کر کے مجھکو اجازت دو گی کہ اُسے ایک نظر دیکھ لوں۔ اس پر دوشیزہ نے جھٹ نقاب الٹ دی۔ اُس وقت میں کیا کہوں کہ دل پر کیا کیفیت طاری ہو گئی بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند کا کوئی ٹکڑا ہے جو آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آگیا ہے۔ یا فردوس بریں کی کوئی حور ہے جو چند دنوں کیلئے اس دنیا کی سیر کرنے کو اُتر آئی ہے۔ حسن و جمال کی ایک مجسم دیوی تھی جو میرے سامنے کھڑی تھی۔ یا قدرتِ صانع کا ایک بہترین نمونہ تھی جسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کے قلم کار نے اپنی صناعی کی ایک ایک خوبی اُس کے اندر بھر دی ہے۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ انسان کے محدود پیرایۂ بیان اُس کے جمال کی تعریف و توصیف کرنے کے حق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ چہرے سے نقاب اُلٹتے ہی اُس نے یہ شعر پڑھے۔

اللهم ابدی صفحة قد صانها ۔۔۔ ابوای قبل تغیر الایام
فتملتو یعلونکم فی حسنها ۔۔۔ واهوا جوار حکم عن الاقدام

ترجمہ۔ آہ! افسوس زمانہ نے اُس چہرہ کو بے نقاب کر دیا جس کو گردش ایام سے پہلے میرے ماں باپ نے چھپا چھپا کے رکھا تھا۔

[1] بدیہہ گوئی۔ پہلے سے سوچے بغیر فوراً شعر کہہ دینا اسے عربی میں ارتجال کہتے ہیں۔ عرب میں بہت سے شعرا بدیہہ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ (ایڈیٹر)

لو اسے تماشائیو اُس کے حسن سے اب اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ

لیکن اپنے اعضا کو گناہوں سے دور رکھو

ان دو شعروں میں خدا جانے کس بلا کا درد تھا کہ سُنتے ہی بیتاب ہو گیا اُن کا ایک ایک حرف معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی طرح نشتر بن کر میری رگ رگ میں اُترا جا رہا ہے میں اُس وقت محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غیر محسوس و غیر مرئی کشش ہے جو مقناطیسی اثر کے ساتھ نہایت سُرعت سے میرے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے یا میں خود بخود بلا کسی سبب کے اُس میں جذب ہو جانا چاہتا ہوں۔

میں نے کانپتی ہوئی زبان سے کہا۔

میں - کیوں ہ تم اُس شخص کے متعلق کیا رائے رکھتی ہو جو تمہیں اور تمہارے قبیلے کو فقر و فاقہ کی مصیبت سے نجات دیدے ؟ -

دوشیزہ ! ہم پانچ نفر ہیں ایک میں ، میری ماں ، میری دو بہنیں - اور ایک بھائی - بھائی کمسن ہونے کی وجہ سے اگرچہ کمائی کرنے کے قابل نہیں ہے - لیکن اللہ کا رزق بہت وسیع ہے اور اُس میں تمام مخلوقات کا برابر حصّہ ہے تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنے نفس کو محض رزق حاصل کرنے کی وجہ سے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں ۔

میں - شاید تم نہیں سمجھیں میں جس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ نکاح ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے - میں نسباً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چچا زاد بھائی ہوں اور مال میرے پاس اتنا ہے کہ شمار میں نہیں آسکتا -

دوشیزہ مجھکو اگر نکاح کرنا ہی ہوتا تو مجھے تمہارے مال کی چنداں ضرورت نہ تھی - کیونکہ صرف تمہارا حسن و جمال ہی ایسا ہے جو دنیا کی تمام ترغیب دلانے والی چیزوں سے بے نیاز کر دیتا ہے - لیکن میں کیا کروں - میں تو اُن عورتوں میں سے ہوں جن کو کسی شخص کا حسن و جمال یا اُس کا مال اُس کی طرف مائل و راغب کر دینے کا ذریعہ نہیں بن سکتا"

میں ! تو پھر اچھا یوں کہو کہ تمہاری قسمت تمہیں اور تمہارے قبیلہ کو افلاس کی آفتوں سے نجات دلانا نہیں چاہتی ہے -

دوشیزہ - نہیں - بخدا نہیں - ہانڈی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو کھا لینا بہت آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ میں ہمیشہ کیلئے اپنے آپ کو کسی کی [illegible] اور اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر کے پابند [illegible] - اور وہ کبھی محض اتنی سی بات پر کہ وہ مجھ پر اور میرے قبیلہ پر [illegible] ایک احسان کرنا چاہتا ہے -

[illegible]

مجھے تو زبانت عمیر بن المورق کی بات بار بار یاد آتی ہے جب اُن سے کہا گیا کہ اگر تم اپنی جوانی و شباب کے دنوں میں اور حسن و جمال کے ایام میں کسی سے نکاح کر لو تو تمہیں زندگی کا حقیقی عیش و آرام میسر آجائے - اور جب تم جانو گی کہ درحقیقت "جوانی" کا زمانہ کیسا پر کیف اور پُر مسرت ہوتا ہے - اس پر زبانے جواب دیا قسم خدا کی میں ایک آزادانہ زندگی اس طرح بسر کرنے کو کہ کوئی میرا مالک نہ ہو اور کسی کی اطاعت گذاری پر مجھے مجبور نہ کیا جائے زیادہ پسند کرتی ہوں بہ نسبت اس کے کہ زمین کے ان گنت خزانوں کی کنجیاں میرے ہاتھوں میں دیدی جائیں اور مجھکو تمام زمین کا مالک بنا دیا جائے - اس کے بعد اُس نے یہ تین شعر پڑھے -

امن بعد ان امسی و اصبح حرۃً ولیس علیّ للرجال یدان

اصیر لنا و جرمثل مملوکۃٍ لہٗ لبئس اذا ما یکتب الملکان

لعیش بضرٍّ او بضنکٍ و حاجۃٍ مع العزّ خیرٌ من صنوف لسانٍ

ترجمہ - کیا اس کے بعد کہ میں آزاد ہوں اور ایسی آزاد کہ مردوں کو میرے اوپر کسی طرح کا اقتدار نہیں ہے میں خاوند کے لیے مثل اُس کی مملوکہ کے ہو جاؤں ؟ یقیناً یہ فیصلہ بہت بُرا ہے جبکہ فرشتے میرے اعمال لکھیں فقر و فاقہ کی زندگی گذارنا - مگر عزت کے ساتھ یہ زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ زمانہ کے حوادث سے دوچار ہونا پڑے -

خدا کرے میں مر ہی جاؤں اگر زبا کی طرح میں بھی "نسوانی خودداری" کو باقی رکھنے کی کوشش نہ کروں -

میں ! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ایسی ایک عورت کا ملنا ناممکن ہے جو سچ مچ مردوں کی طرف رغبت نہ رکھتی ہو -

دوشیزہ ! اگر آپ کا یہی خیال ہے تو یاد رکھئے کہ میں آپ کے "ناممکن" کو "ممکن" کر کے دکھلاؤں گی لو آج تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میں جوان ہوئی ہوں قریب قریب دس نوجوان اور نوجوان بھی کیسے حسب و نسب مال و دولت حسن و جمال ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر مجھ سے نکاح کرنے کی درخواست کر چکے ہیں - لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ میرا دل اُن میں سے کسی ایک کی طرف بھی مائل نہیں ہوا - کیوں ؟ محض مردوں کے ظلم و ستم کے ڈر سے -

اس گفتگو کے بعد دوشیزہ چلی گئی اور میں دل مسوس کر رہ گیا -

ایس - اے

اکبرآبادی

احمد الجمالی الجزائری سے میری ملاقات بلا واسطہ ہوئی۔ میں اپنے قیام پیرس کے زمانہ میں ایک روز مسجد دیکھنے گیا۔ مسجد سے ملا ہوا جو ایک مختصر سا قہوہ خانہ ہے۔ وہاں وہ بھی تھا وہیں ہم ایک دوسرے کے شناسا ہو گئے

الجمالی نے پیرس میں طب کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور وہیں ایک ہسپتال کا انچارج مقرر ہو گیا چند مہینوں میں اس سے میرا ربط بڑھ گیا اور جس روز میں ہندوستان کو روانہ ہو رہا تھا اُس نے مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ وقت کی تنگی کے باعث قرار یہ پایا کہ میں ٹھیک ۱۲ بجے اُس سے ہسپتال ہی میں جا ملوں۔ چنانچہ میں دس پانچ منٹ وقت سے پہلے پہنچ گیا اور ملاقات کے کمرہ میں اُس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنے آخری مریض کے معائنہ میں مصروف تھا۔ ہنوز میں پورے طور سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ دربان نے دروازہ کھولتے ہوئے جمالی کی آگاہی کیلئے "ایک خاتون بغرض ملاقات، جناب!" کہا اور میری نگاہیں ایک کشیدہ قامت نازنین پر جم گئیں اُس کے حسن و جمال کی دلکشی اور انداز لباس آرائی کی دلربائیاں نظرانداز کرسکنا میرے لئے تو کیا کسی کے لئے بھی آسان تھا۔

ڈاکٹر کو خلاف توقع زیادہ دیر ہوئی اور ہم دونوں ملاقات کے کمرے میں زیادہ دیر تک خاموش بیٹھ نہ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ہمت کی اور گفتگو شروع کرنے کے خیال سے اس کی جانب دیکھا۔ اُس نے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ میرے ارادے کی ہمت افزائی کی۔

موسم کے متعلق گفتگو رہی۔ مختلف تماشا گاہوں اور اوپیرا کے متعلق تبادلہ خیالات ہوا۔ گفتگو کے دوران میں مجھے برابر یہ یقین ہوتا گیا کہ وہ سوسائٹی کے معمولی طبقہ سے متعلق نہ تھی۔ اس کا انداز تکلم دلاویز ہی نہ تھا بلکہ اس کے ہر ہر جملے اور ہر ہر لفظ سے شائستگی اور وسعت معلومات کا ثبوت مل رہا تھا۔ لباس کا طرحدار و گراں قیمت ہونا اس کی وضعداری اور متمول کی دلیل اور سلامت ذوق کا آئینہ تھا۔

وہ کافی سے زیادہ سیاحت کر چکی تھی اور وسیع مطالعہ رکھتی تھی۔ یورپ کی مشہور سیرگاہیں اس کے جانے پہچانے مقامات تھے۔ مونٹی کارلو کے میز بھی اب اس کے اندر ہیجان پیدا نہ کرتی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ کے برفستان کوئی نئی چیز نہ تھے۔ اٹلی کی [illegible] دلکشی ختم کر چکی تھیں اور ناروے کے آدھی رات کے چاند کی [illegible]

اپنی ذاتی اسپینو سوٹنا میں یورپ کے بڑے حصے میں سیاحت کر چکی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس کا خیال تھا کہ اپنے وطن سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

ان تمام اطلاعات کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے یہ بیانات فخریا نقلی پر مبنی نہ تھے اور یہ کہ یہ تمام باتیں حقیقتاً اس کی زندگی کا جزو رہ چکی ہیں لیکن یقین کے ساتھ میں متعجب بھی تھا کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو اس کا ہسپتال میں آنا کیا معنی رکھتا ہے!

"میڈم کو ڈاکٹر سے کوئی طبی مشورہ لینا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں، رقص کے بعد میرے گھٹنے میں کسک ہونے لگی ہے"

یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ باوجود اس شان و شوکت کے وہ ہسپتال میں معالجے کی غرض سے آئی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی اور شوق جستجو پیدا ہو گیا۔ میں نے دبے الفاظ میں اپنی حیرت کی وجہ ظاہر کر ہی دی اور ساتھ ہی معذرت آمیز لہجہ میں دریافت کیا کہ آیا وہ کسی تھیٹر سے متعلق تھی۔

مغربی آداب و تہذیب کے دائرے میں میرا اظہار خیال اور یہ آخر کا سوال بے شک بیہودگی پر مبنی ہے لیکن انگریزی شائستگی اور وضعداری میں کسی طرح قابل عفو نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بعد میں میں خود بھی نادم تھا۔ لیکن چونکہ وہ فرانسیسی خاتون تھی اور بات بھی کچھ لگتی ہوئی سی تھی۔ اس لئے میں اس سزا سے بچ گیا جو ایسے موقع پر صرف نگاہوں اور چہرہ کے آثار چڑھاؤ سے دی جاتی ہے۔

اُس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فوراً اس کمزوری کو چھپانے کیلئے تبسم کی رونق سے کام لینا چاہا جو ایک وہم سے زیادہ ثابت نہ ہوا۔ نفسیات کا یہ نکتہ جس قدر دلچسپ ہے اُتنا ہی دلخراش بھی ہے کہ کوئی چھوٹ پڑنے کے لئے ذرا سی ٹھیس کا منتظر ہو۔ اور اس تشریح پر انسان اپنے تئیں مجبور پاتا ہے اور کہہ گزرتا ہے ....

.... جس کے بعد میں اپنے تئیں افسوس و ندامت میں غرق کیا ہوا [illegible] ہے۔ کیونکہ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب کسی کو رازدار بنا لینے کی آرزو نہایت قوی ہوتی ہے۔

"[illegible] اس ابتدائی ملاقات کے متعلق سمجھئے جو سوسائٹی کی [illegible] میں ہمیں آئی۔ طبقہ نسواں کا وہ ذرہ جو قانون کی [illegible] مستقل ملامت کے [illegible] جاتا ہے۔"

پھر اُس نے رُک رُک کر اپنا افسانۂ حیات بیان کرنا شروع کیا۔ اس وقت اُس کی عمر ۲۶ سال کی تھی اور ۱۹ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ فطرت کی ستم ظریفیاں بھی عجیب ہیں۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا شوہر موٹر کے حادثہ سے جان بحق ہوگیا۔ ایسی حالت میں پیرس کی زندگی اُسے دوزخ معلوم ہوئی اور بعض دوستوں کے اصرار پر وہ دیہات میں چلی گئی۔ وہاں ایک صحبت میں ایک عمر رسیدہ مارکوئیس سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اور مارکوئیس کو جب اس کی سوانح حیات معلوم ہوئے تو زیادہ عنایات و ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگا۔ اور ہرچند وہ اپنے خیال میں لذاتِ حیات ختم کر چکا تھا۔ لیکن اس لڑکی سے ملنے کے بعد اُس نے عمرِ رفتہ کو واپس آتے محسوس کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسے اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ اور وہ وہاں رہنے لگی۔

وہ نہایت دولتمند تھا۔ اور فراوانیٔ دولت جراحتِ محسوسات کے لئے جس حد تک تریاق کا کام دے سکتی ہے۔ اُس کے لئے بھی وجہ سکون ثابت ہوئی۔ چھ سال کامل یہ نوواردِ حیات واقعی زندگی کے لطف اُٹھاتی رہی۔ ہر وہ چیز جو روپیہ سے خریدی جا سکتی تھی۔ اس کو میسر تھی۔ اور مارکوئیس یہ جان کر کہ ایک نوشباب نازنین، دولت و تنعم کے علاوہ بھی کچھ چاہتی ہے جو وہ نہیں دے سکتا۔ دولت کے صرف سے ہی اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ مگر آرامِ حیات و آفاتِ دنیا کبھی ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتے چنانچہ اس کا ضعیف العمر سرپرست مارکوئیس بھی اسے دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔ اور اس کے قانونی مشیر نے جائیداد پر قبضہ لیکر اُسے بیدخل کر دیا۔ وصیت میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔

اِس واقعہ کو ابھی صرف تین ہفتے گذرے تھے اور جب یہ مارکوئیس کے مکان سے رخصت ہوئی تو علاوہ ملبوسات کے اس کے بٹوے میں ایک ہزار فرانک سے زیادہ نہ تھے۔ یہاں پہنچکر ایک ایسے لہجہ میں جو نصف آرزو اور نصف سوال تھا کہنے لگی ”میں نے مستقبل کا کبھی خیال نہ کیا۔ میں اس حالت کی متوقع نہ تھی میں کیا کروں؟ میرے پاس صرف سو فرانک بچے ہیں اور یہ سموری کوٹ پہلی چیز ہے جسے رخصت کرنے پر میں مجبور ہوں گی۔ لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہیگا۔ میرا کوئی نہیں۔ میں کوئی کام بھی نہیں جانتی۔ عجب مشکل معمہ ہے۔“

یہ داستانِ حزین اور افسانۂ شوق آموز سنکر میں بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا: ایک نوجوان عورت جو تعلیم یافتہ ہے اور ذہین بھی، شائستہ ہے اور مہذب بھی اور پھر دلکش ہے اور حسین بھی۔ اس معمہ کا حل چاہتی ہے! کمرے سے باہر پیرس کی زندگی۔ ہنگامہ آرائیٔ حیات کی عجیب نمایشوں کا مرکز بنی ہوئی تھی!

”آہ، میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ایک جوان عورت کی زندگی میں جب یہ معمہ پیش ہو جائے تو پھر اس کی تباہی میں شک نہیں رہ جاتا اس کی ناتجربہ کاری حل معمہ کی اہل نہیں اور اگر کسی دوسری طرف سے حل پیش نہیں ہوتا تو اس کے پاس اس کا کیا علاج ہے؟“

ابھی وہ اپنا فقرہ ختم نہ کرنے پائی تھی کہ الجمالی کمرے میں داخل ہوا۔

”میڈم، علاج تو ہر خرابی کا ممکن ہے۔“ اُس نے کچھ تبسم اور کچھ سنجیدگی کے ساتھ کہا اور وہ ڈاکٹر کا یہ جملہ سنکر کچھ ایسی حالت میں مبتلا نظر آئی جس میں نصف انتشار اور نصف توقع ہوتی ہے۔

میں نے الجمالی کو مخاطب کر کے کہا کہ میڈم کے مٹنے میں کھٹک ہے۔ مگر اب دیر اتنی ہوگئی ہے کہ میرے اور کام رہ جائیں گے۔ اس لئے وہ میری بے تکلفی کو نظر انداز کر کے میڈم کو بھی لنچ پر مدعو کرے اور لنچ کے بعد اپنے مطلب میں جا کر میڈم کی شکایات پر توجہ کرے۔

”اگر میڈم ہم دونوں کو لنچ پر اپنی معیت سے مسرور کریں۔ تو مجھے ازحد مسرت ہوگی۔“ یہ کہکر الجمالی اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور میں نے دیکھا کہ تہذیب و اخلاق کا یہ معمولی اظہار حقیقت بن کر اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔

وہ صرف مسکرادی۔

آرمانوویل (پیرس کا مشہور ایسٹورانٹ) میں نہایت پرلطف اور لذیذ لنچ کھانے کے بعد میں اُن سے رخصت ہوا۔ کیونکہ اسی شام کو میری روانگی تھی۔

اسٹیشن پر دونوں مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے آئے۔ حالانکہ میں صرف الجمالی کا متوقع تھا۔ جہاز پر سے میں نے اُسے ایک خط لکھا اور دریافت کیا کہ کیا وہ اس کی شکایت رفع کر سکا۔

اُس کے جواب میں اُس نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اُس کے معمے کے حل کرنے میں مصروف ہے۔

ل۔ احمد

داغ دہلوی

حضرت داغ دہلوی کی شاعری پر عبد القادر کی تنقید

داغ دہلی کے قدیم سکول آف پوئٹری کے ایک شاعر ہیں۔ گو اُن کی تصانیف کا تعلق اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے۔ مگر اُنھوں نے اپنے معاصر امیر کی طرح لکھنؤ اسکول کے قابل فخر نمایندے تھے۔ بڑی احتیاط کیساتھ غزل کے قدیم اُستادوں کی روایات کو قائم رکھا اور زبان کی پاکیزگی کو مغربی اثرات سے ذرا بھی متاثر نہ ہونے دیا جو اُس زمانہ کی نمایاں خصوصیات بن رہے تھے وہ اسی انداز میں داد سخن دیتے رہے۔ گویا ہندوستان میں خالص ایشیائی حکومت تھی مغربی تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو نئے خیالات ملک میں پیدا ہو رہے تھے اُن کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے۔ انگریزی زبان کے جو الفاظ اردو میں داخل ہو رہے ہیں وہ اُن کی شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں جو تراکیب انگریزی محاورات کے نمونہ پر وضع کی گئی ہیں اور جن کا استعمال مسلمہ شہرت کے مصنفین بھی نظم و نثر دونوں میں کثرت سے کرتے ہیں وہ داغ اور امیر کے ہاں نظر نہیں آتیں اُن کے کلام کا طرز اور خیالات کا انداز اخیر تک اُن ہی اُصولوں کے مطابق رہا جو اُنھوں نے زبان کے بارہ میں شروع سے اختیار کر لئے تھے ممکن ہے ایک زمانہ میں جبکہ نئے اثرات کا غلبہ ہو رہا تھا اُن کی قدامت پرستی موروثی روایات اور ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہو۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو اس بارہ میں خاص طور سے اُن پر اثر انداز ہوئی۔ وہ یہ کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ رامپور میں بسر کیا۔ جہاں کے حالات قدیم خیالات کے موافق تھے اور جہاں ان کو مغربی تعلیم اور مغربی علماء سے دوچار ہونے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ داغ رامپور سے حیدرآباد چلے گئے۔ مگر وہاں کی فضا بھی سر سے لیکر پیر تک ایشیائی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں اپنے آخری ایام میں اُن کا میل جول ایسے اصحاب کی تعداد کثیر سے ہوا ہوگا جنہوں نے مغربی تعلیم پائی تھی اور مغرب کا طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ مگر وہ اُس وقت اس قدر سن رسیدہ ہو گئے تھے کہ اُن میں کوئی تبدیلی پیدا ہونا ناممکن تھا مختصر یہ کہ وہ میر۔ غالب اور ذوق کے ایک جانشین کی حیثیت میں زندہ رہے اور اسی حیثیت میں فوت ہوئے۔

نواب مرزا خاں داغ نواب شمس الدین خاں کے بیٹے اور نواب احمد بخش خاں کے پوتے تھے۔ پُرانے وقتوں کے دوسرے معزز خاندانوں کی طرح یہ خاندان بھی اپنی فوجی اور ادبی روایات کے لئے مشہور تھا۔ نواب مرزا کی تعلیم قدیم طریق پر ہوئی اُنھوں نے فارسی غیاث اللغات کے مصنف مولوی غیاث الدین سے پڑھی۔ خوشنویسی کی تعلیم اپنے زمانہ کے دو بہترین خوشنویس یعنی میر پنجہ کش اور مرزا عباد اللہ بیگ سے پائی۔ اس کے علاوہ شمشیر زنی شہسواری اور نشانہ بازی کی تعلیم بھی پائی اور اس طرح سے وہ اُس زمانہ کے معیار کے مطابق چھوٹی ہی عمر میں ایک مکمل نوجوان بن گئے۔ اُس زمانہ میں شعر لکھنے کا فن بھی شرفا کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس فن میں داغ نے دہلی کے مشہور شاعر ذوق کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ جو شاہ دہلی کے ولی عہد کے بھی اُستاد تھے اس تعلق سے انہیں نہ صرف اردو شاعری کے ایک مسلم الثبوت کی رہنمائی حاصل ہو گئی۔ بلکہ ولی عہد سے بھی اُن کا میل جول ہو گیا جو شاعری کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے اور بڑی تن دہی سے اس فن کی تکمیل میں مصروف تھے۔ داغ ابھی لڑکے ہی تھے کہ اُنہیں اُن مشاعروں میں شامل ہونے کا موقع ملنے لگا جو محل کے اندر منعقد ہوا کرتے تھے اور جن میں اُس زمانہ کے باکمال شعرا شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں جہاں بادشاہ بھی خود موجود تھے۔ داغ نے ایک غزل پڑھی جس سے بادشاہ اس قدر خوش ہوئے کہ اُنھوں نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ایک ایسے شاعر تسلیم کئے جانے لگے جس کو شاعری کا ملکہ قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اور جو محض حصول فن یا تکمیل رسم کے طور پر شعر گوئی نہیں کرتا۔ اگرچہ ذوق اوج شہرت پر پہنچ چکے تھے اور غالب جو اوّل اوّل فارسی شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اب ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے بھی نمایاں شہرت رکھتے تھے لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں داغ بھی بڑے بڑے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ گو اُن کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی۔

غدر اور اس کے بعد کی تباہی و بربادی کا المناک افسانہ محتاج بیان نہیں۔ دہلی سے بہت سے علما و فضلا اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کے

دوسرے حصوں میں نقل وطن کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ دہلی کی بڑی بدقسمتی تھی
لیکن اس سے قدیم دہلی کی تہذیب و علمیت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔
بہت سے شعرا نے دہلی کی بربادی پر مرثئے لکھے۔ داغ نے بھی ایک مسدس
لکھا۔ اس مسدس کے اشعار ذیل سے معلوم ہو گا کہ دہلی کی بربادی سے
اُن کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا ہے۔

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
گدا تو شاہ ضعیف و جوان روتا ہے — غرض یہاں کیلئے اک جہان روتا ہے

اس سلسلہ میں یہ امر قابل غور ہے کہ اگرچہ داغ کا دل اپنے پیارے شہر کی
بربادی پر ماتم سرا تھا۔ تاہم شاعرانہ شعلۂ اُمید سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ دوسرے
شعرا کے برعکس اُنھوں نے اپنی نظم کو ذیل کے شعر پر ختم کیا ہے۔

آلہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم — آلہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم

اگرچہ بعد میں اُنہیں تو آباد شدہ دہلی کو دیکھنے کا موقعہ وقتاً فوقتاً ملتا رہا۔
تاہم اُن کے لئے جو ہندوستان کے دارالسلطنت کا بہتر زمانہ دیکھ چکے تھے یہ کافی
نہ تھا۔ وہ ملک کے ایک دور دراز حصے میں فوت ہوئے جسے اُنھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا
اور جہاں وہ کامیابی کی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔

لیکن داغ کے قیام دکن کی داستان بیان کرنے سے پیشتر ہم اُن کی
زندگی کے اُس بہترین حصے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو اُنھوں نے رامپور
میں بسر کیا۔ اس مہمان نواز ریاست کے حکمران اپنے ادبی مذاق اور اپنی ادبی
سرپرستی کے باعث ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔ انقلاب دہلی کے بعد داغ نواب
یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور چلے گئے اور وہاں نواب کلب علی خاں
کے زمانہ تک جو نواب یوسف علی خاں کے بعد گدی نشین ہوئے برابر
راحت و آرام کے ساتھ مقیم رہے۔ انہیں شاہی اصطبل کا داروغہ مقرر کیا
گیا۔ اگرچہ یہ عہدہ بظاہر غیر شاعرانہ تھا۔ لیکن نواب کو ایک خوددار انسان کی
طرح معاش کا ایک معقول وسیلہ مہیا کرنا مقصود تھا۔ یہ امر بھی قابل لحاظ
ہے کہ داغ شروع سے گھوڑوں کے شائق اور خود اچھے شہسوار ہونیکی وجہ سے
اس عہدہ کیلئے ہر طرح سے موزوں تھے۔ پھر اس عہدہ کی ذمہ داریاں بھی
اتنی زیادہ نہ تھیں کہ اُنہیں اپنے عزیز ادبی مشاغل کیلئے وقت نہ مل سکتا۔ اُنھوں
نے اپنے فرائض کو نہایت اطمینان بخش طریق پر انجام دیا اور تا قیام رامپور اس
عہدہ پر ممتاز رہے۔ انہیں والئے ریاست کے مصاحبوں میں شامل ہونے
کا فخر بھی حاصل تھا۔ نواب صاحب اُن کی صحبت کو اُن کے ادبی مذاق کی
وجہ سے بہت ہی پسند کرتے تھے۔ رامپور میں بھی مشاعرے کثرت سے ہوا
کرتے تھے کیونکہ نواب صاحب کے گرد غزل کہنے والوں کا ایک اچھا خاصا مجمع
تھا۔ ان میں سے تسلیم اور امیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر بحیثیت
شاعر داغ کے ایک زبردست حریف تھے۔ داغ اور امیر کی شاعری کے موازنہ
پر دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کے حامیوں میں جو ناخوشگوار بحث ہوتی رہی
ہے ہم اس میں دخل دینا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اب عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے
لگا ہے کہ دور حاضرہ میں دونوں اُردو غزل کے اُستاد ہوئے ہیں اور دونوں میں
اپنی اپنی ممتاز خصوصیات تھیں۔ اس خیال کو اس وجہ سے بھی بڑی تقویت
پہنچتی ہے کہ دونوں اُستاد ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے مشرق کے
عام حریفان شہرت کے برعکس جو ایک دوسرے کی خوبیوں کو نظرانداز کر دیتے
ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے اور زندگی بھر ایک دوسرے کے
دوست بنے رہے۔ یہاں تک کہ آج اُن کی ہڈیاں بھی حیدرآباد کے ایک
قبرستان میں ایک دوسرے کے پاس ہی پاس آسودہ خاک ہیں اور اس بات
کی یاد دلا رہی ہیں۔ کہ وہ اپنے زمانہ کی اُردو شاعری کے بہترین نمایندے ہیں۔

زمانہ قیام رامپور میں ادبی نقطۂ خیال سے داغ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ
امیر کے ساتھ اُن کا مقابلہ تھا۔ اسی مقابلہ میں اُس کے حقیقی جوہر کھلے مقابلہ کی
وجہ سے دونوں کو اپنی طبیعت پر بہت زور دینا پڑتا تھا۔ اُنھوں نے اپنی غزلیات
کا ایک مجموعہ گلزار داغ کے نام سے شائع کیا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ مجموعہ غزلیات
بحیثیت مجموعی داغ کے تمام مجموعہ غزلیات سے بہتر ہے۔ یہ مجموعہ اس کے دوران
قیام رامپور میں تیار ہوا اور اس میں اُس کے امتیازی خصوصیات بدرجۂ
اتم موجود ہیں اس میں جو غزلیں ہیں اُن میں عشق و محبت کے مختلف پہلوؤں کو
بڑے اُستادانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے زیادہ تر غزلیں موسیقی کے لئے بہت
موزوں ہیں۔ اس لئے ملک بھر کے مغنیوں میں اُن کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی
ہے اس میں شک نہیں کہ اُن کے شعروں کی موسیقی بھی اُن کی شہرت اور
ہر دلعزیزی کا موجب ہوئی ہے۔ اور اس سے اُن کا نام زبان زد عوام ہو گیا ہے
بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اگر موسیقی دان داغ کی غزلوں کو نہ لے اُڑتے تو اُنکی
مقبولیت کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اُن کی رائے میں یہ بات بحیثیت شاعر اُن کی شان
سے گری ہوئی ہے۔ لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں۔ اگر داغ کو مغنی اور ماہرین
موسیقی پسند کرتے ہیں۔ تو یہ اُس کے نقص کمال کی دلیل نہیں اُن کی غزلیں
دیکھ کر مغنیوں کو خیال ہوا کہ عوام انہیں پسند کریں گے۔ اُنھوں نے اس خیال
کی آزمایش کی اور یہ صحیح نکلا یعنی اُن کی غزلوں پر عالمگیر پسندیدگی کا اظہار کیا
گیا۔ اس طرح سے اُن پر پسند عام کی مُہر لگ گئی۔ یہ غزلیں طرز بیان کی سادگی
کے ساتھ اپنے اندر تاثیر بھی رکھتی ہیں۔ اپنے رنگ میں فطرت کے عین مطابق
ہیں۔ اور زندگی اور محبت کے مختلف کیفیات کو تصویر کی طرح آنکھوں کے
سامنے پیش کر دیتی ہیں۔

داغ نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد بھی رامپور میں مقیم رہے۔

لیکن ریاست کے اخراجات میں تخفیف ہو جانے کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو آسامیاں بعض شعرا کے لئے نکالی گئی تھیں اُن کو زیر تخفیف لگایا جائے۔ تخفیف کے کلہاڑے کی ضرب داغ پر بھی پڑی۔ اس طرح سے وہ اُس وقت جبکہ اُن کی عمر سینتالیس سال سے اوپر تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر بے یار و مددگار اور قابل اعتبار ذریعۂ معاش سے محروم ہو گئے۔ وہ واپس دہلی چلے آئے۔ تھوڑا عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد اُنہوں نے ریاست حیدرآباد کا رُخ کیا۔ مرحوم نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ اُس وقت حیدرآباد کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ شاعری کے بڑے مشتاق اور خود بھی ایک سلیم المذاق شاعر تھے۔ لیکن اُن تک رسائی حاصل ہونا آسان نہ تھا۔ یہ شرف حاصل کرنے کے لئے ہر شخص کو کافی طویل انتظار کی زحمت اُٹھانی پڑتی تھی۔ داغ پہلے پہل ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد گئے۔ لیکن نظام کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کئے بغیر واپس آ گئے۔ مگر اُنہیں بہت جلد وہاں سے طلبی کا پروانہ آ گیا اور شاعری میں نظام کے اُستاد مقرر کر دیئے گئے۔ حیدرآباد میں اُن کی زندگی کا آغاز ساڑھے چار سو روپے ماہوار گراں قدر مشاہرہ سے ہوا۔ یہ تنخواہ بڑھتے بڑھتے آخر کار دو ہزار روپے ماہوار تک پہنچ گئی۔ ہندوستان میں کسی اہل قلم کو بحیثیت اہل قلم اتنی تنخواہ آج تک کبھی نہیں ملی۔ حضور نظام کی اس فیاضی سے داغ نہ صرف بقیہ زندگی کے لئے فکر معاش سے آزاد ہو گئے۔ بلکہ اُن کے بہت سے ہمعصر اُن کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اُن کی بے نظیر کامیابی اور خوش قسمتی نے اُن کے بہت سے مخالف اور بدخواہ پیدا کر دیئے۔ جو اُن کے اشعار پر نکتہ چینی اور اُن کی مقبولیت کا حسد کرنے لگے لیکن وہ اُن کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ اُن کی شہرت ایسے حملوں سے بالاتر ہو گئی تھی اس لئے اُن کو زوال نہیں ہو سکتا تھا۔ دربار نظام میں بھی اُن کی پوزیشن کا دار و مدار بیرونی رسوخ پر نہیں تھا۔ جو اُن میں اس قسم کے رکیک حملوں سے فرق آ جاتا۔

حیدرآباد میں امیرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے داغ نے اپنی قدیم سادگی اور خوش خلقی کو قائم رکھا۔ اُن کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال حیدرآباد میں بسر ہوئے۔ اس عرصہ میں اُنہوں نے جو کام کیا اُس کو تین عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ کام ایک ایسے شخص کیلئے کافی سخت تھا۔ جس نے اُسکو عمر کے اُس حصہ میں انجام دیا۔ جبکہ عام لوگ زندگی کی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلا اور سب سے اہم کام حضور نظام کی غزلوں میں اصلاح کرنا تھا اس کو داغ کار سرکاری کہا کرتے تھے۔ حضور نظام کی غزلیں سر بمہر لفافوں میں پہنچتی تھیں۔ داغ سے تقاضا کیا جاتا تھا کہ آپ اُنہیں جس قدر جلد ممکن ہو اصلاح کر کے واپس بھیج دیں۔ جو اصحاب یہ جانتے ہیں کہ دوسروں کی نظموں پر اصلاح دینا اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال رکھنا کہ لکھنے والے کا انداز کلام قائم رہے۔ کس قدر مشکل ہے وہ اس کام کی دشواری کا احساس اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال کر لیجئے کہ یہ غزلیں حضور نظام کی ہوتی تھیں۔ جو خود اعلےٰ درجہ کا مذاقِ ادب رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ داغ کو یہ کام سرانجام دینے میں کافی دماغ سوزی کرنی پڑتی تھی۔ اس کام سے جو وقت بچتا تھا اُس میں یا تو وہ اپنی غزلیں لکھتے تھے یا اپنے اُن بے شمار شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دیتے۔ جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے وہ اپنی غزلیں ڈاک میں بھیج دیتے اور داغ اُن کو اصلاح کر کے واپس کر دیتے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کو اس خوش خلق اور نیک سیرت شاعر نے کمال بے غرضی سے اپنے اوپر لے رکھا تھا۔ جوں جوں اُن کی شہرت بڑھتی گئی اُسی طرح اُن کے شاگردوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی گئی۔ اس طرح سے شاگردوں کے کلام کی اصلاح کا کام بجائے خود ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا۔ اُن کے بعض شاگرد ایسے بھی تھے جنہوں نے اُن کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بذریعہ خط و کتابت اُن کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے تھے۔ اس وسیع خط و کتابت سے عہدہ برا ہونے کے لئے داغ نے اپنے زیر نگرانی ایک قسم کا دفتر قائم کر رکھا تھا جس میں اعزازی کام کرنے والے بھی تھے اور تنخواہ دار بھی۔ داغ شاگردوں کے خطوط پڑھتے اور اُن کا جواب لکھوا لیتے تھے۔ غزلوں میں جہاں ضرورت ہوتی تھی اصلاح کرتے تھے اور جو غزلیں اصلاح طلب نہیں ہوتی تھیں اُن کو ضروری ریمارکوں اور تنقیدی اشارات کے ساتھ بجنسہ واپس بھیج دیتے تھے۔ اور دوسری مصروفیتوں یا ناسازیٔ طبع کے باعث خطوط کے جواب بھیجنے یا غزلوں پر اصلاح دینے میں دیر ہو جاتی تھی تو شاگرد یاددہانی کرتے تھے۔ جو بعض اوقات تلخ شکایات پر مشتمل ہوتی تھی۔ اگر داغ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو صاف لکھ دیتا کہ میں اس قسم کی تلخی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ مجھے اس کام سے معاف فرمائیں۔ مگر داغ کی طبیعت اس قدر شیریں واقع ہوئی تھی کہ وہ اکثر اوقات جواب میں معذرت کی چٹھیاں لکھ دیتے تھے حالانکہ انہیں اصلاح کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا تھا۔

ایک مرتبہ جب مجھے حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ تو خوش قسمتی سے حضرت داغ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے دربار دکن کے اس شہرۂ آفاق شاعر سے انٹرویو کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق جیسا کہ اُس وقت تھا۔ اخبار نویسی سے ہے۔ تو وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جو بے شمار لوگ اُن کے ساتھ بغرض اصلاح خط و کتابت کرتے تھے۔ اُن کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

"ایک میں ہوں اور ہندوستان بھر لپٹا ہوا ہے"

(باقی آئندہ)

(ترجمہ)

جہاں کی بزم میں شاعر سرور و نور ہے تو — زمیں کی وادیِ ظلمت میں شمعِ طور ہے تو

خدا نے جاں کو تری وقفِ سوز و ساز کیا — دلِ تپاں کو ترے آشنائے راز کیا

تری نگاہ میں شام و سحر کے جلوے ہیں — شہاب و اختر و شمس و قمر کے جلوے ہیں

کہیں تو گم ہے ہجومِ نجومِ تاباں میں — کہیں غریقِ شعاعوں کے بحرِ رخشاں میں

کہیں ہلال کی کشتی پہ سیر کرتا ہے — ہلورے لے کے یمِ نور سے گزرتا ہے

چمن میں سبزے کے ہمراہ لہلہاتا ہے — زبانِ طیور کی بن بن کے چہچہاتا ہے

گلوں سے ہنستا ہے شبنم کے ساتھ روتا ہے — شریکِ رنج و طرب ہر کسی کا ہوتا ہے

قدم قدم پہ تجلائے نور ہے تجھ کو — تلاشِ جلوہ میں ہر ذرہ طور ہے تجھ کو

مکاں سے تا بحدِ لامکاں وطن تیرا — لباسِ ہستیِ صد رنگ پیرہن تیرا

چمن سے پھول گہر لے کے کان سے آیا — اڑا کے رنگِ شفق آسمان سے لایا

ضیا فگن ہیں جو انوارِ زندگی تجھ پر — سب آشکار ہیں اسرارِ زندگی تجھ پر

چمن سے پھول تو گوہر صدف سے آتے ہیں — لڑی لڑی ترے اشعار کی سجاتے ہیں

ہے ایک سی تجھے الفت گدا و شاہ کے ساتھ — کہ تری واہ رہی ہم ردیف آہ کے ساتھ

زمینِ قلب میں آنسو کا بیج بوتا ہے — اثر کا نخل برومند جس سے ہوتا ہے

اگرچہ رہتا ہے تو مبتلائے دردِ جگر
یہ تیرا دردِ جگر ہے دوائے دردِ جگر

(خواجہ دل محمد۔ ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

سیرِ یورپ

(طبقاتِ شمالی کا ایک افسانہ)

(۱)

انیس کے والد بھاگلپور میں ایک کامیاب وکیل تھے۔ دیوانی مقدمات کی پیروی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اپنے فرائض کے سرانجام دینے میں وہ اپنے ذاتی آرام کی کبھی پروا نہ کرتے تھے۔ اُن کے موکل اُن پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ افسرانِ عدالت کو بھی ان کی دیانت پر کامل طور پر یقین تھا۔ فریق مخالف کے وکیلوں کو ان سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وکالت پیشہ ہونے کے باوجود طبیعت نہایت متین اور سنجیدہ تھی۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ماتھے پر ہر وقت تیوڑی چڑھی رہتی۔ نہیں۔ بالکل نہیں بلکہ اُن کے چہرے سے ہر وقت بشاشت ٹپکتی تھی۔ تمام شہر اور ایک شہر ہی پر کیا منحصر ہے ضلع بھر میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کئی سال سے شہر کی میونسپلٹی کے وائس پریذیڈنٹ چلے آرہے تھے۔

انیس اپنے والدین کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ماں باپ نے اُسکی تربیت بڑی احتیاط سے کی تھی۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ انیس بیرسٹری پاس کرکے ان کی نگرانی میں وکالت کا کام سیکھے اور رفتہ رفتہ اُنکی ذمہ داریوں سے سبکدوش کردے۔ انٹرینس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کے والد نے اُسے بانکی پور کے کسی کالج میں داخل کرانے کی بجائے بھاگلپور ہی میں تیج نرائن کالج میں داخل کرادیا۔ تاکہ کچھ دنوں اور وہ اُن کی زیرِ نگرانی تربیت پاسکے۔ لیکن ایف اے کا امتحان پاس کرنے بعد اُنکی یہ رائے ہوئی کہ اسے پٹنہ کالج بانکی پور میں داخل کرادیا جائے تاکہ انگلستان جانے سے پہلے دو سال میں اسے اپنے عزیزوں سے الگ رہنے کی عادت ہوجائے اور اپنی زندگی کے متعلق مختلف مرحلوں پر آزادی اور ذمہ داری سے فیصلہ کرنے کی قابلیت پیدا کرلے۔ چنانچہ انیس نے اپریل ۱۹۰۱ء میں پٹنہ کالج سے کلکتہ یونیورسٹی کا بی۔ اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کرلیا۔

انیس کی عمر اُس وقت ۱۹ سال کی تھی۔ اپنی عادات و اخلاق میں وہ اپنے باپ کا عکس تھا۔ البتہ اپنی ماں کی تربیت کے اثر سے اُس کا دل رقت آمیز احساسات سے بہت جلد متاثر ہوجاتا تھا اور کسی کے دُکھ اور تکلیف کا ذکر اُسے فوراً بے چین کردیتا تھا۔ انسان کے دل کا وہ جذبہ جو ہر وقت اسے اپنے تئیں قربان کردینے پر اُبھارتا رہتا ہے انیس کے دل میں انسانی ہمدردی کی صورت میں تسلی پاتا تھا۔ محبت کا مفہوم اُس کے دل میں ابھی ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ پیار اور شفقت کے احساسات تک محدود تھا۔

اگست ۱۹۰۱ء میں اُنیس نے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ گھر کے تمام لوگ اسے رخصت کرنے کے لئے بانکی پور تک ساتھ گئے۔ اس کے باپ نے بمبئی تک اُس کی رفاقت کی۔ جہاز روانہ ہونے پر اُنہوں نے دعائیں دیکر اُسے رخصت کیا۔ باپ نے بیٹے کو رخصت کرتے وقت تک ایک بھی کلمہ نصیحت کا نہیں کہا نہ کوئی لفظ پیار کا منہ سے نکالا۔ لیکن بیٹے نے بھی اس کمی کو محسوس نہ کیا کیونکہ اسوقت باپ بیٹوں کے جذبات و احساسات میں اس درجہ یکسانیت اور ہم آہنگی تھی الفاظ کے استعمال کئے بغیر دونوں ایک دوسرے کی دلی کیفیات کو پورے طور پر محسوس کر رہے تھے۔ صحبت کے ان آخری لمحوں میں اگرچہ انیس کے کانوں میں بیرونی آواز نہیں پڑتی تھی۔ لیکن ایک غیر مرئی راز دیکھے، طریق پر اُسکے دل سے ایک آواز اٹھ رہی تھی جس کا مفہوم الفاظ کی زبان میں یہ تھا۔

"لو بیٹا! اب ہم تم سے رخصت ہوتے ہیں۔ جب تک تم ہماری آنکھوں کے سامنے تھے ہم نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی ایک امانت سمجھ کر اس امانت کا حق ادا کرنے کی بساط بھر کوشش کی اور اسوقت بھی کہ تم ہماری نظروں سے کچھ مدت کے لئے اوجھل ہونیوالے ہو ہم تمہیں اُس کے سپرد کرتے ہیں جو ہر ملک اور ہر حالت میں تمہارا رفیق اور نگہبان ہے۔ جس ملک میں اب تم چند سال کے لئے رہائش[1] اختیار کرنے والے ہو اس کے باشندے ہمارے حاکم ہونے کی وجہ سے تمہارے وطن اور تمہارے دین کو حقیر جانتے ہیں۔ اگرچہ اپنی اخلاقی تربیت کی وجہ سے وہ اس امر کا اظہار بہت کم کرتے ہیں۔ لیکن تم اپنی قوم اپنے وطن اور اپنے مذہب کی طرف سے اس ملک میں بطور سفیر کے جارہے ہو۔ تمہارا برتاؤ اُس ملک میں ایسا ہونا چاہئے جو تمہاری قوم تمہارے وطن اور تمہارے دین کی عزت ان لوگوں

---

[1] اقامت اور قیام کے معنی میں رہائش کا لفظ گرچہ اہلِ لغت کے اعتبار سے غلط سہی لیکن ہماری رائے میں اردو میں اسکا استعمال بالکل درست ہے۔ تاجور

کے دلوں میں قائم کرے۔ اگر تم اس سفارت کو ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دو گے تو یہ چند سال کی جدائی ہمارے لئے ہمیشہ کی راحت کے سامان پیدا کر دیگی۔ مغرب کا سفر تمہارے لئے مبارک ہو جس ملک اور جس حالت میں بھی رہو شریفوں کی صحبت اختیار کرو۔ اپنے علم میں اضافہ کرو۔ اپنے اخلاق کو وسیع کرتے چلے جاؤ۔ ہر قوم اور ہر طبقہ میں بعض امتیازی خوبیاں ہوتی ہیں اُن کے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ خطرہ کے ہر مقام سے بچتے رہو۔ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور اُسی سے مدد طلب کرو۔ وہ تمہارا حافظ و ناصر ہو"

انیس کا دل خاموشی سے جواب دے رہا تھا "پیارے ابا جان میں ہر لحظہ اس کوشش میں رہونگا کہ آپکی ہر توقع کو پورا کروں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرے لئے دعا کرتے رہیں۔ قیام یورپ میں میری زندگی کا مقصد یہی ہوگا کہ واپسی پر آپ مجھے ویسا ہی پائیں جیسا مجھے دیکھنے کی آپ کی خواہش ہے۔ آپ سب کا خدا حافظ ہو اور اپنے فضل سے ہم سب کو پھر اکٹھا کرے"۔

گھنٹی بجی۔ باپ بیٹے نے خاموشی سے مصافحہ کیا لیکن ایکدوسرے کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں تختہ کھینچ لیا گیا اور جہاز حرکت کرنے لگا۔ باپ میں صبر کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ بندرگاہ سے جہاز نکل جانے کا انتظار کرتے۔ ایک نظر مڑ کر دیکھا اور رومال سے آنسو پونچھتے بندرگاہ سے باہر نکل گئے۔

انیس کچھ دیر تک تو دوسرے مسافروں سے الگ کھڑا اپنے خیالات میں غرق رہا۔ جب جہاز بندرگاہ سے چل نکلا تو ایک طرف آرام کرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور بمبئی کا آخری نظارہ جو آنکھوں کے سامنے سے گذر رہا تھا دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ابھی بندرگاہ سے نکلے ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ جہاز تلاطم سے ہچکولے لینے لگا اور انیس کی طبیعت بے چین ہونی شروع ہوئی۔ اُٹھا اور جوں توں کر کے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ جہاز کی بے اختیاری حرکت بڑھتی گئی لیکن بستر پر لیٹے رہنے کی وجہ سے انیس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوئی۔ تین دن کمرے ہی میں گذارے۔ کھانے کے اوقات پر وہیں کچھ منگوا لیتا اور لیٹے لیٹے کھا لیتا۔ چوتھے روز سمندر میں پہلے کی نسبت سے کچھ سکون ہؤا۔ اور انیس کی طبیعت قدرے صاف ہوئی۔ اٹھا غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اور عرشے پر جا کر کھلی ہوا میں چند گھنٹے گذارے۔ اس سے طبیعت کو کچھ قرار آیا۔ شام کا کھانا کھانے کے کمرے میں جا کر اور مسافروں کے ساتھ کھایا۔ اُن پر بھی کم و بیش یہی کیفیت گذری تھی۔

پانچویں دن سمندر بھی صاف ہو گیا اور انیس کی طبیعت بالکل ٹھہر گئی۔ بعض دوسرے ہندوستانی طالبعلموں کے ساتھ جو مزید مطالعہ کے لئے یورپ جا رہے تھے واقفیت ہوئی۔ ایک دو یورپین مسافروں کے ساتھ بھی گفتگو کا سلسلہ چلا۔ طبیعت کی پریشانی کم ہوئی۔ اور جہاز کی زندگی پُرلطف ہونے لگی۔ دوسرے دن جہاز عدن پہنچنے والا تھا۔ اکثر حصہ وقت عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھنے میں صرف ہؤا۔ سیاسی اور جنگی لحاظ سے عدن کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن آب وہوا اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اسے کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جہاں تک نظر کام کر سکتی ہے خشک چٹانوں اور جلتی ہوئی ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ بندرگاہ کے قریب چند تجارتی کوٹھیاں اور گودام ہیں۔ ذرا فاصلے پر ریذیڈنسی کے دفتر اور بنگلے ہیں۔ دوسری طرف ڈاک خانہ، تارگھر۔ بحری تار برقی کی کمپنی کا دفتر اور سمندر کے پانی سے پینے کا پانی بنانے کا کارخانہ وغیرہ۔ یہ سب عمارتیں جہاز سے نظر آتی ہیں ان کے پیچھے دیسی بازار ہے۔ چند میل کے فاصلے پر پہاڑی کے اوپر پینے کا پانی جمع کرنے کے تالاب ہیں۔ عدن میں پانی بکتا ہے۔ سبزے کا نام و نشان نہیں۔ دوربین لگا کر بھی دیکھو تو کہیں گھاس کا ایک تنکا یا کوئی سبز پتہ نظر نہ آئیگا۔

چونکہ انیس کا یہ پہلا دریائی سفر تھا اور پانچ دن پانی ہی پانی کا نظارہ کرتے طبیعت کچھ اکتا سی گئی تھی اس لئے وہ بھی چند دوسرے طلبا[1] کے ساتھ شہر کی سیر کو گیا۔ ساحل پر جہاز کی نسبت گرمی بہت زیادہ تھی۔ کہیں کہیں خاک بھی اڑتی تھی۔ بندرگاہ کا نظارہ جو جہاز کے عرشے سے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا پاس پہونچکر بہت مایوس کن نکلا۔ ایک ہی گھنٹہ کی سیر میں طبیعت گھبرا گئی۔ ڈاک خانہ پہنچ کر بخیریت عدن پہنچنے کا باپ کو تار دیا۔ ڈاک لیٹر بکس میں ڈالی اور اپنے ہمراہیوں سمیت واپس جہاز پر چلا آیا۔ جہاز چھ سات گھنٹے یہاں ٹھہرا۔ شام کے وقت بندرگاہ کا نظارہ زیادہ پُرلطف تھا۔ آٹھ بجے شام کے لنگر اٹھا یا گیا اور جہاز سوئیز کی طرف روانہ ہؤا۔ بحیرۂ قلزم میں گرمی کی وہ شدت تھی کہ الاماں۔ بجلی کے پنکھوں سے بھی گرم لو نکل رہی تھی۔ خالص برف کا پانی بھی حلق کو تر نہیں رکھ سکتا تھا۔ البتہ اتنا اطمینان تھا کہ سمندر میں تلاطم نہیں تھا اور جہاز بالکل امن اور سکون کی حالت میں چلا جا رہا تھا۔ رات کو انیس اور اس کے دو تین ساتھی سب سے اوپر کے عرشے پر بستر بچھا لیتے تھے اور رات کے چند گھنٹے کچھ آرام میں کٹ جاتے تھے۔ عدن سے روانہ ہونے کے چوتھے دن بعد بھاری

---

[1] طلبا عربی گرامر کے لحاظ سے درست نہیں اسکی بجائے طلبہ ہونا چاہئے لیکن اردو میں عربی املا پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہماری رائے اردو میں طلبہ اور طلبا دونوں صحیح ہیں۔ — تاجور

سامان پرسر (Purser) کے سپرد کیا کہ پورٹ سعید سے سمندر ہی کے رستہ لندن بھیج دیا جائے۔ پانچویں صبح کو جو اٹھے تو دیکھا کہ جہاز سوئیز کے سامنے لنگر ڈالے ہوئے ہے۔ بمبئی سے رخصت ہونے کے بعد پہلی دفعہ کچھ ہریاول نظر آئی۔ ہوا میں بھی کچھ خنکی تھی۔ جان میں جان آئی چند گھنٹوں کے بعد جہاز نہر سوئیز میں داخل ہوا۔ نہر سوئیز کا مشرقی کنارہ تو بالکل ریگستانی ہے۔ البتہ مغربی کنارہ پر کہیں کہیں درخت نظر آتے ہیں۔ خاص کر نہر کی چوکیوں کے گرد کچھ نہ کچھ درخت ضرور موجود ہیں جسقدر جہاز پورٹ سعید کی طرف بڑھتا ہے مغربی کنارہ پر سرسبزی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ نہر کی نصف لمبائی طے کرنے کے بعد جہاز ایک جھیل میں داخل ہو جاتا ہے جس کے مقابل کے کنارے پر اسماعیلیہ کی سرسبز اور شاداب بندرگاہ نظر آتی ہے۔ جھیل کو طے کر کے پھر نہر کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے یہانتک کہ جہاز پورٹ سعید کی بندرگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بندرگاہ کا منظر بہت دلفریب ہے۔ یہاں یورپ کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن عدن کی مانند پورٹ سعید کا بہترین منظر بھی جہاز ہی سے نظر آتا ہے یہاں بھی جہاز سے اتر کر انیس کو مایوسی ہی ہوئی۔ اور وہ جلد واپس جہاز پر چلا آیا۔ چند گھنٹے ٹھہرنے کے بعد رات کے گیارہ بجے کے قریب جہاز یہاں سے بھی رخصت ہوا اور بحیرہ روم میں داخل ہو گیا۔ پورٹ سعید کی بندرگاہ سے لے کر بحیرہ روم کی طرف ایک لمبی بحری فصیل چلی جاتی ہے۔ اس فصیل کے ختم پر فرانسیسی انجینیر لیسپز (Lesseps) کا بت نصب ہے۔ نہر سوئیز اسی انجینیر کے دماغ کا کرشمہ ہے۔ اس مجسمے کا دایاں ہاتھ نہر سوئیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہر گذرنے والے کو لیسپز کے اس شاندار کارنامے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

انیس کے لئے جہاز کے سفر کا یہ آخری حصہ بہت ہی پرلطف تھا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ جہاز ایک بالکل غیر محسوس حرکت کے ساتھ چل رہا تھا۔ پورٹ سعید سے رخصت ہونے کے تیسرے دن بعد یونان کے جزیرے نظر آنے لگے اور سفر کے باقی حصے میں قریب قریب لگاتار یا تو دائیں طرف یونان۔ مانٹی نیگرو یا سرویا کا ساحل پیش نظر رہتا تھا اور یا بائیں طرف اطالیہ کا ساحل۔ اتنے عرصے میں انیس کسی حد تک یورپین زندگی اور مغربی معاشرت سے مانوس ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک طرح کی بے تکلفی سی پیدا ہو گئی تھی۔ دن کا اکثر حصہ ادبی مطالعہ میں اور باقی حصہ کھیل میں مصروف ہوتا تھا۔ چنانچہ پورٹ سعید سے رخصت ہونے کے چار دن بعد جب جہاز نے آسٹریلیا کی واحد اور مشہور بندرگاہ ٹرلیسٹ میں لنگر ڈال دیا اور سفر کا یہ حصہ ختم ہوا تو انیس کے دل میں کچھ افسردگی ضرور پیدا ہوئی۔ جہاز سے اترنے کی تیاری۔ اجنبی ملکوں میں ریل کے سفر کی مشکلات کا اندازہ۔ جہاز کی زندگی کے لطف کی یاد۔ یہ سب باتیں انیس کو پریشان کر رہی تھیں۔ اس کے تین چار ساتھیوں کا ارادہ بھی اسی کی طرح بے توقف لندن پہنچنے کا تھا چنانچہ جہاز کے لنگر ڈالتے ہی یہ سب لوگ جہاز سے اتر کر ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ جہاں سے ایک گھنٹے کے اندر اندر میونک (Munich) کی جانب گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ ریل کے ٹکٹ بمبئی میں ہی خریدے جا چکے تھے۔ اور انیس کو رستے کے بڑے بڑے اسٹیشنوں کے نام زبانی یاد تھے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ ٹرلیسٹ سے چلکر صرف میونک گاڑی بدلنی ہوگی اور وہاں سے چلکر فرانکفورٹ (Frankfort)۔ کولون (Cologne)۔ برسلز (Brussels) ہوتے ہوئے اوسٹنڈ (Ostend) پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ڈوور (Dover) اور وہاں سے ریل میں لندن پہنچنا ہوگا۔ چنانچہ ٹرلیسٹ ہی کے اسٹیشن سے انیس اور اس کے ساتھی میونک کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور ۵ بجے شام ریل میونک کی جانب روانہ ہوئی۔ ٹرلیسٹ کی سیر کرنے کا تو انیس کو موقع ہی نہیں ملا تھا۔ جہاز سے صرف اتنا دیکھا جا سکا تھا کہ سمندر کے کنارے پہاڑ کی تلہٹی میں ایک نہایت خوبصورت شہر واقع ہے جس کی خوشنما عمارتیں اور خوبصورت باغیچے پہاڑ کے ساتھ ساتھ بہت بلندی تک چلے گئے ہیں۔ ریل نے بھی اس پہاڑ کی چڑھائی شروع کی اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرول (Tyrol) کے نہایت خوشنما میدان میں فراٹے بھرنے لگی۔ انیس کا داخلہ ہی یورپ کے اس حصے میں ہوا جہاں کے دلکش منظر اور دلفریب حسن باقی یورپ کے لئے مقناطیس ہیں۔ جیسے جیسے ریل نہایت تیزی کے ساتھ اس علاقے کو طے کرتی ہوئی خوشنما سین اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتی تھی اور رستے کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اسٹیشنوں پر آسٹریلیا کے حسین ترین چہرے پر اسکی نظر سے گذرتے تھے اسکا دل رقت سے پگھلتا جاتا تھا اور صانع حقیقی کی خوبی صنعت کی داد اسکی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکی نکل رہی تھی۔ انیس کھڑکی کے پاس خاموش بیٹھا اس ہر لحظہ بدلتے ہوئے منظر کا لطف اٹھانے میں محو تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی برآمدے (Corridor) میں کھڑا تھا۔ کوئی دوسرے مسافروں کے ساتھ اشاروں کی مدد سے سوال جواب میں مشغول تھا۔ انیس کو حیرت ہو رہی تھی کہ اسقدر خوبصورتی کا نظارہ کرتے ہوئے بھی اسکا دل شگفتہ ہونے کی بجائے ایک قسم کی افسردگی محسوس کر رہا تھا۔ بیشک اس کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

۔ جہاز کا وہ افسر جس کی نگرانی میں کھانے پینے کا سامان اور کپڑے و دیگر سامان وغیرہ رہتا ہے۔

اور بعض دفعہ کسی خاص منظر کے یکایک سامنے آجانے سے اس کا دل خوشی سے اُچھل پڑتا تھا لیکن اس تمام مسرت اور خوشی کے ساتھ افسردگی کی بھی ایک ہلکی سی ملاوٹ ضرور تھی۔ کچھ تو اسے یہ خیال تھا کہ اگر یہی منظر میں اپنے عزیزوں کی رفاقت میں دیکھ سکتا تو وہ میری خوشی میں حصہ لیتے اور میں اُن کی خوشی میں شریک ہوتا۔ اور یہ لطف دو بالا ہو جاتا۔ برخلاف اس کے ہر نیا منظر اُسے اپنے عزیزوں کی یاد دلاتا اور جدائی کے احساس کو تازہ کر رہا تھا۔ کبھی اُسے یہ حسرت ہوتی کہ کاش میرا وطن بھی قدرت کی سحر کاریوں سے اسی طرح مزیّن ہوتا جس طرح یہ ملک ہے اور میرے ہموطنوں کو بھی اسقدر آرام اور بشاشت کی زندگی نصیب ہوتی جیسی اس ملک کے لوگوں کی ہے قدرتی مناظر[1] کی دلفریبی اور حسن انسانی کی بہتات یوں بھی اُس کے دل کو بیچین کر رہی تھی۔ غرض انہی خیالات میں رات ہو گئی۔ انیس اور اس کے ساتھیوں نے کھانے کی گاڑی میں جا کر کھانا کھایا۔ اور پھر تجویزیں ہونے لگیں کہ رات آرام سے گذارنے کی کیا سبیل نکالی جائے۔ یورپ میں اوّل۔ دوئم درجہ کی گاڑیوں میں بھی لیٹنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ گاڑیوں کے خانے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور نشستوں کی تقسیم اس طور پر ہوتی ہے کہ مسافر لیٹ نہیں سکتا۔ سونے کی گاڑیاں الگ ہوتی ہیں۔ جن میں بستر۔ منہ ہاتھ دھونے کے سامان وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ لیکن اُن کا کرایہ اوّل درجہ کے ٹکٹ کے علاوہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ انیس اور اُس کے ساتھی تو سفر ہی دوئم درجہ میں کر رہے تھے۔ جس کمرہ میں اُنہیں جگہ ملی تھی اُس میں جُوں تُوں کر کے رات گذار دی لیکن تمام وقت بدمزگی اور تکلیف میں کٹا۔ رات بھر میں کئی دفعہ ٹکٹوں کا معائنہ ہوا۔ اور چونکہ انیس اور اس کے ہمراہیوں میں سے کسی کو بھی جرمن زبان سے واقفیت نہ تھی۔ اس لئے اُنہیں ہر معائنے کے بعد تشویش اور پریشانی ہونے لگتی کہ کہیں ٹکٹ کا غلط جزو کاٹ کر نہ لے گیا ہو۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور گاڑی میونک پہونچی۔ یہ شہر۔ تو یریا (Bavaria) کی حکومت کا دارالسلطنت تھا اور اپنی یونیورسٹی فنون لطیفہ کے عجائبات کے مجموعوں اور جَو کی شراب (Beer) کی وجہ سے مشہور تھا لیکن انیس کو چلتی گاڑی میں سے صرف بڑی بڑی عمارتوں کی کھڑکیاں ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں ایک لحظے کے لئے کسی بازار کا نظارہ بھی سامنے آجاتا تھا۔ اگرچہ چلے بجے صبح کا وقت ایک یورپین شہر میں رات کا ہی حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن اُسوقت بھی بازاروں میں بجلی کی ٹرام گاڑیاں چل رہی تھیں۔ دکانیں ابھی بند تھیں۔ بازاروں اور عمارتوں کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ شہر بہت صاف ستھرا ہے۔ میونک کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت نہایت عالیشان تھی۔ لیکن انیس کو یہ دیکھکر بہت حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے اسٹیشن پر بھی پلیٹ فارم بالکل سطح زمین کے برابر ہیں اور گاڑی میں سے اُترنے چڑھنے کے لئے کوئی سہولت نہیں پہونچائی گئی۔ بعد میں اُسے معلوم ہُوا کہ انگلستان سے باہر برّاعظم کے اکثر ملکوں میں یہی حالت ہے۔

میونک پہونچ کر انیس اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی بدلی اور اوسٹنڈ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور تمام دن جرمنی کے زرخیز اور شاداب و سرسبز علاقوں میں سے گذرتی ہوئی شام کے ۸ بجے بلجیم کے دارالسلطنت برسلز میں پہنچی۔ آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد یہاں سے چلکر آدھی رات کے قریب اوسٹنڈ کی بندرگاہ پر عین جہاز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس دن کا سفر نہایت پُرلطف رہا۔ خاص کر تیسرے پہر کا حصہ جب گاڑی کئی میل تک دریائے رائین (Rhine) کے کنارے کنارے چلتی گئی۔ یہ دریا جرمنی کا سب سے مشہور دریا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں سے نکل کر جرمنی کے میدانوں کو سیراب کرتا ہُوا ہالینڈ میں جا پہنچتا ہے۔ یہاں اسکی کئی شاخیں ہو جاتی ہیں اور تمام شاخیں مختلف مقامات پر بحیرہ شمال میں جا گرتی ہیں۔ دریا کا وہ حصہ جو مائنز (Mainz) اور کولون (Cologne) کے درمیان ہے جہاں سے انیس کی گاڑی گذری نہایت خوبصورت اور پُررونق ہے۔ مائنز۔ کوبلینٹز (Coblentz)، بون (Bonn) اور کولون جیسے مشہور اور پُررونق شہر اُس کے کنارے پر آباد ہیں۔ اس کے کناروں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں انگور کے باغوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ہر چند میل کے فاصلے پر پُرانے زمانے کے جرمن سرداروں کے قلعے اور محلات نظر آتے ہیں جن میں سے سب سے خوبصورت شٹولزینفیلس (Stolzenfels) کا محل ہے۔ کوبلینٹز کے قریب جہاں دریائے ——— رائین میں آکر گرتا ہے دونوں کے مقام اتصال (جہاں دونوں آکر ملتے ہیں) پر قیصر جرمنی کی ایک بہت عالیشان یادگار بنی ہوئی ہے۔ کوبلینٹز سے آگے جرمنی کی مشہور یونیورسٹی بون (Bonn) بھی عین لب دریا واقع ہے اور اس کے خوشنما باغیچے ریل سے نظر آتے ہیں۔ بون سے گذر کر چند منٹ کے اندر کولون کی عالیشان عمارتوں کے برج اور کلس نظر آنے لگتے ہیں جن میں سے کولون کے مشہور عالم گرجے کے بہت بلند کلس نہایت غرور کے ساتھ آسمان سے سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ شہر کے قریب پہنچ کر دریائے رائین پر "قیصر ولیم پل" کی جیرت میں ڈال دینے والی محرابیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس پُل کی چوڑائی کم سے کم اسّی فیٹ ہوگی۔

---

[1] مناظر کی جمع ۔ سین اور سینریاں ۔

دنیا کی اسٹیج پر حضرت انسان کا ایکٹ

ذیل کا مضمون ان نظریات کا لب لباب ہے جو میں نے طبیعات کی مختلف کتابوں میں پڑھے۔ اس کے علاوہ میں نے مشہور سائنسدانوں کے اُن مضامین میں سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے جو وقتاً فوقتاً امریکہ اور انگلستان کے رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کائنات عالم کے متعلق میں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں اُن کی بنیاد کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آرتھر ایس اڈنگٹن کے ایک مضمون پر ہے۔ جو ہارپرس میگزین نیویارک میں شائع ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر جے۔ ایچ جینز سیکرٹری رائل سوسائٹی آف آرٹس لندن کی وہ دلچسپ اور پرمغز تقریر بھی میرے پیش نظر ہے جو اُنہوں نے سوسائٹی مذکور کے ایک اجلاس میں کی اور جس میں اُنہوں نے ظاہر کیا کہ نوع انسان کا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار ہے۔

دنیا کی پیدائش سے پہلے کا ذکر ہے کہ سورج کے ساتھ ایک بڑا سیارہ ٹکرا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زہرہ۔ مریخ اور چند دوسرے سیارے سورج سے جدا ہو گئے۔ مگر یہ سب سیارے زمین سمیت سورج پر ایسے قربان ہوئے کہ آجتک اُس کے حسن و جمال کے اشتیاق میں اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ کب تک اسی طرح یہ گھومتے رہیں گے۔

زمین جس وقت سورج سے جدا ہوئی تو یہ لاوا گندھک اور دوسری جلتی ہوئی اور گرم چیزوں کا ایک گولا تھی۔ اُس وقت اُس میں ایک جاندار ہستی بھی موجود نہ تھی۔ اس کے ہوتے ہوتے کروڑوں برس گذر گئے۔ اس کے سرد ہونے سے پانی کی بھاپ جو پرانے زمانے سے سطح زمین پر موجود تھی اب بارش بن کر برس پڑی اور سطح زمین کے بیرونی لاوے اور گندھک کو جما کر چٹانوں پہاڑوں اور پہاڑیوں میں تبدیل کر دیا بعدازاں یہ پانی بحرالکاہل میں یا زمین کے اُن نیچے مقامات میں، جو زمین کے سرد ہو کر سکڑنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے جمع ہو گیا اور اس طرح سے سمندر دریا اور جھیلیں وغیرہ بن گئیں۔

رفتہ رفتہ زمین پر درخت اُگ آئے۔ گھاس پیدا ہوئی۔ دریا و چشمے بہ نکلے بلند پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھک گئیں۔ ٹھنڈی اور پرلطف ہوائیں چلنے لگیں۔ مدتوں زمین کی یہی حالت رہی کہ بہار آتی تھی پھلتے پھولتے درخت [illegible] سبزہ لہلہاتا میوے پکتے۔ ڈالیاں اُن کے بوجھ سے جھک جاتیں مگر اُن سے لطف اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ میوے پک کر گر جاتے۔ بہار آتی اور چلی جاتی۔ پھول کھلتے اور مرجھا جاتے۔ لیکن زمین انسان سے خالی تھی۔ مدتوں بعد میں جانور پیدا ہوئے۔ وہ موجودہ جانوروں سے تقریباً مختلف تھے۔ اُن کی حرکتیں عجیب تھیں۔ اور عادتیں نرالی۔ آج سے تقریباً سات ہزار برس پیشتر کا ذکر ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا۔ یہ بالکل ننگا پیدا کیا گیا تھا۔ سینکڑوں برس تک دنیا [illegible] تھے۔ غار اس کے سونے کے کمرے تھے۔ سبزہ اس کا بستر تھا۔ درختوں کے پھل پتے اس کی خوراک تھے۔ جانوروں کا گوشت اس کی غذا تھی۔ یہ قبیلوں میں رہتا اور جدھر جی چاہتا چلا جاتا۔ یہ پتھر کا زمانہ تھا۔ زمین کے دوسرے رہنے والوں کی طرح سے یہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہا۔ اُس نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر ترقی کرنی شروع کی اُس نے دھات کو پتھروں سے بہتر اور مضبوط سمجھ کر اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔ درختوں کے میوے کھانے لگا۔ درختوں کے ریشوں اور ان کی چھال سے اپنا بدن ڈھانپنے لگا۔ اُس نے دھات کے ہتھیار اور برتن بنائے۔ پتھروں سے آگ پیدا کی۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا لیں۔ یہ زمانہ کب شروع ہوا کب ختم ہوا یہ بتانا آسان نہیں۔ اس کو دھات کا زمانہ کہتے ہیں۔

حضرت مسیح کی پیدائش سے چار ہزار برس پیشتر انسان خانہ بدوشی کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد ہو گیا۔ اور زراعت کرنے لگا۔ اسکو زمانہ قدیم کہتے ہیں اور یہیں سے تہذیب کی ابتدا ہوئی۔

آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی چھوٹے چھوٹے گاؤں بڑھ کر شہر بن گئے اور ان پر بادشاہ حکومت کرنے لگے۔ اُن کی [illegible] میں لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اس زمانہ میں چونکہ آنے جانے کے راستے مشکل تھے اس لئے قوموں کو ایک دوسرے سے سیکھنے کا موقع کم ملتا تھا چنانچہ اگر دنیا کے ایک حصہ میں انسان مہذب تھا آرام سے زندگی بسر کرتا تھا۔ و[illegible] اونچی اونچی [illegible] میں رہتا تھا عجیب و غریب ایجادیں کرتا تھا تو دوسری طرف یہ جاہل تھا۔ [illegible] تھا ناقابل تھا۔ جھونپڑیوں میں رہتا تھا علم سے واقف نہ تھا اور ایجادوں سے ناآشنا۔ اس لئے کوئی ترقی یافتہ قوم اگر [illegible] سے تباہ و برباد ہو جاتی تھی تو اس کے ساتھ اس کی تہذیب بھی فنا ہو جاتی تھی

چنانچہ جب مصر و ہندوستان اور چین کے میدانوں میں انسان متمدن اور مہذب تھا۔ اُس وقت یورپ اور امریکہ میں یہ جاہل اور وحشی تھا۔ اور مصر، چین، ہندوستان کی یہ قومیں تباہ ہوئیں تو ان کی تہذیب بھی فنا ہو گئی۔ اس زمانہ کے موجدوں کے خیالات بھی عجیب تھے۔ وہ اپنی ایجادوں کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے۔ اس لئے موجد کے مرنے پر اُس کی ایجاد بھی دنیا سے مٹ جاتی۔ اس زمانہ میں سیاسیات مذہب کے ماتحت تھیں۔ یہ وسطی زمانہ تھا۔

اُنیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ زمانہ موجودہ یا زمانہ ایجاد کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانہ میں مذہب سیاسیات کے ماتحت ہو گیا۔ اب دنیا کی سٹیج پر انسان کے کمالات کا تماشا دیکھنے والے اُس کے کارناموں پر حیرت کرنے لگے۔ اُس نے اب قدرت کے بیشمار راز بے نقاب کر دیئے ہیں۔ اور جو باتیں زمانہ قدیم میں ناممکن اور محال سمجھی جاتی تھیں۔ وہ اب اُس نے ممکن کر دکھائیں۔ یہ ہوا میں اُڑتا ہے۔ یہ سمندر کے نیچے سفر کرتا ہے۔ اس کے بحری جہاز دن رات سمندر کے پانیوں کو گھنگھولتے رہتے ہیں۔ ہوا کو اس کے بے تار کے آلے حرکت میں رکھتے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں میں اس نے اپنی ریلوں کے لئے سرنگیں کھود ڈالی ہیں۔ تباہ کن دریاؤں کے نیچے سے اس نے اپنے لئے راستہ بنایا ہے۔ اپنے مقاصد کے لئے اس نے دریاؤں کے راستے بند کر دیئے ہیں اور اُن کے رُخ بدل دیئے ہیں اس کے برقی لیمپ آناً فاناً میلوں تک رات کی تاریکیوں کو دور کر دیتے ہیں اس کی موٹریں چار چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہیں۔ اُس نے ایسی زہریلی گیسیں ایجاد کی ہیں جو اس کے ہمجنسوں کو دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سلا دیتی ہیں۔ اُس نے اُس بجلی کا جو برسات کی تاریک اور ڈراؤنی راتوں میں آسمان پر چمک کر آن واحد میں غائب ہو جایا کرتی تھی جواب پیدا کیا ہے اور اب وہ غلاموں کی طرح اس کے کام کرتی ہے۔ اس کی موٹروں کو دوڑاتی ہے۔ اُس کے طیاروں کو اُڑاتی ہے۔ اُس کا کھانا پکاتی ہے اُس کے کمروں کا فرش صاف کرتی ہے۔ اُس کے کمروں کو روشن کرتی ہے اور گرمی کے موسم میں اس کے پنکھے چلاتی ہے۔

استوائی خطوں کے جنگلات۔ شمال اور جنوب کے برف سے ڈھکے ہوئے سمندر۔ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے۔ ٹنڈرا کے سرد علاقے افریقہ کے تپتے ہوئے گرم ریگستان۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں۔ سمندر کی بے پناہ گہرائیاں بھی اس کی پہنچ سے نہیں بچیں۔

مگر ابھی تک اس کی طبیعت سیر نہیں ہوئی یہ سمجھتا ہے کہ ابھی اُسے دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی قدرت کے بہت سے رازوں کو حل کرنا ہے، دنیا کی حالت کو اور زیادہ بہتر بنانا ہے۔ اور اپنی زندگی کو اور بھی زیادہ آرام دہ بنانا ہے۔ ابھی بہت سی باتیں ہیں جو یہ نہیں جانتا۔ اور خدا کی بہت سی دنیائیں ہیں جہاں یہ پہنچ نہیں سکا۔ یہ اپنی آئندہ زندگی کا ایک دل خوش کن خواب دیکھ رہا ہے۔ جبکہ قدرت کے سب پوشیدہ خزانے اس کے ہاتھ میں ہونگے۔ سورج کی وہ طاقت جو آجکل بیفائدہ ضائع ہو رہی ہے اس کے قبضہ میں ہوگی۔ آسمانی بجلی اس کی غلام ہوگی۔ یہ چاند کی کشش سے فائدہ اُٹھائیگا۔ سمندر کی لہروں پر حکومت کریگا۔ چاند کی سیر کریگا۔ مریخ میں فصلیں بوئیگا صبح کو زمین کے طواف کیلئے گھر سے نکلے گا۔ اور شام کو واپس آجائیگا اس کے غبارے ونٹ آپوسٹ سے بھی اونچے اُڑیں گے۔ اس میں زمین کی حرارت استعمال ہوگی۔ دنیا کے بڑے بڑے آبشاروں پر اس کے کارخانے قائم ہو جائیں گے۔ افریقہ کا صحرائے اعظم ایک پرفضا جھیل میں تبدیل کیا جا سکیگا۔ ہوا پر اس کے مکان ہونگے۔ یہ شیشے کے مکانوں میں رہا کریگا۔ اور جنگ و جدل سے اس کو نفرت ہو جائے گی۔ اُس زمانے میں مریخ سے تازہ انگور اور دوسرے میوے کرۂ ارض پر لائے جا سکیں گے اس زمانہ میں ریلوں۔ جہازوں۔ راکٹوں اور کارخانوں کے شور و غل جذب کرنے والے آلات بنائے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک زمانہ آئیگا جب مریخ بھی نسل انسانی سے کرۂ ارض کی طرح آباد ہو جائیگا۔ وہاں بھی نسل انسانی کے لئے جگہ تنگ ہو جائیگی۔ وہاں بھی ہوا میں لٹکنے والے شہر بنائے جائیں گے۔ وہاں بھی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ وہاں بھی بیشمار کارخانے کھل جائیں گے۔ وہاں بھی انسان نہایت خوشی و خرمی سے دن گذاریگا۔ وہاں کے مضر صحت مقامات کو بھی پُرفضا بنایا جا سکیگا۔ اور اس طرح سے قدرت کے آبادی کے قابل دو کرّے نسل انسانی سے غیر معمولی طور پر بڑھنے لگے گی۔ اور حکومتوں کو مجبور ہو کر ایسے قوانین بنانے پڑیں گے جن کی رو سے کوئی شخص اپنی سو برس کی عمر میں ایک بچّے سے زیادہ پیدا نہ کر سکیگا۔ اور وہ بھی اٹھارہ سے تیس برس تک کی عمر میں۔ اس طرح سے زمین اور کرۂ مریخ کی انسانی آبادی کی اوسط ایک سی رہے گی اور لوگ سو سو برس زندہ رہکر نسل انسانی کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہیں گے۔ اس زمانہ کے لوگ سوا سو برس کی عمر میں بھی نہایت طاقتور ہوں گے۔ نہ اُن کے چہروں پر جھریاں پڑیں گی۔ نہ اُن کے دانت ٹوٹیں گے اور نہ اُن کے بال سفید ہوں گے۔ اس طرح سے یہ تجربہ کار اور طاقتور بوڑھے اُس زمانہ کی نئی پود کے جوانوں سے نسل انسانی کیلئے

زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔ اُس زمانہ میں مریخ اور زمین کے درمیان جو خالی جگہ ہے اُس میں ہوا بھر دی جائے گی۔ تاکہ مریخ کا سفر کرنے والوں کو بنائی ہوئی ہوا ساتھ نہ لیجانی پڑے۔ نیز ایسے آلے بھی بنائے جائیں گے جن کے ذریعے سے وہاں کی آواز یہاں پہنچ سکے۔ اس کے بعد ایک اور زمانہ آئیگا جب لاسلکی ہوائی جہاز ریل راکٹ وغیرہ پُرانے زمانہ کی دقیانوسی چیزیں سمجھی جائیں گی اور اُن کی اُس زمانہ کی ایجادوں کے سامنے یہی حقیقت ہوگی جو ایک ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی۔ زمانہ حاضرہ کے بہترین ہوائی جہاز کے سامنے ہے۔

بعض مذہب پرست انسانوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا فنا ہونے کو ہے اور عنقریب قیامت آنے والی ہے۔ مگر سائنس دان کہتے ہیں کہ نہیں ابھی تو دنیا تین دن کا بچّہ ہے۔ ابھی اس کو بچپن، لڑکپن، شباب اور بڑھاپا دیکھنا ہے۔ جب تک سورج باقی ہے ہماری دنیا قایم ہے۔ جب سورج فنا ہو جائیگا۔ اُس وقت اگر ہم بناوٹی سورج بنانے میں کامیاب نہ ہوئے تو البتہ دنیا فنا ہو جائیگی اور سورج آج سے دس کھرب برس بعد بھی اسی طرح زمین پر روشن ہوگا جس طرح یہ آج کل ہے۔ اگرچہ اس وقت دن نسبتاً لمبے ہوں گے اور خدا جانے کیا کیا ہوگا۔

اختر سبحانی بنیاب پٹیالوی۔

میرا کام

میرا کام یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے اخلاقی۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ غرض ہر پہلو سے نہایت عمدہ طور پر بسر کروں۔

میری کوشش یہ ہے کہ اپنا سب سے قیمتی وقت اس طرح بسر کروں کہ اُس کی یاد ہمیشہ باقی رہے۔

میرا کام یہ ہے کہ زندگی کی کشمکش میں جو شخص بھی مجھے زیادہ بوجھ کے تلے دبا ہوا نظر آئے اُسے سہارا دے دوں۔

زندگی کے ہر منٹ اور ہر سیکنڈ مجھے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ بڑی قیمتی چیز ہے اور بیکار نہ ہونے پائے۔ میری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ میں اپنی تمام طاقت سے دنیا اور دُنیا کے لوگوں کو کچھ بن کے دکھاؤں۔

مجھے چاہئے کہ میں فیاض بنوں متحمل مزاج بنوں۔ دور اندیش بنوں۔ مہربان بنوں۔ صابر اور جواں مرد بنوں۔

میری خواہش یہ ہے کہ میرا دل اور دماغ ہمیشہ سچائی قبول کرنے کیلئے تیار رہے اور دنیا کے اچھے اچھے خیالات ہر وقت قبول کروں۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے سچا بنوں

میری نگاہ آنے والے کی طرف ہونی چاہئے۔ نہ کہ گذرے ہوئے کی جانب۔ میری آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھنی چاہئیں نہ کہ زمین میں گڑیں۔ مجھے موقعوں سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ اور ان کی کمی پر ہرگز افسوس نہ کرنا چاہئے۔

میں انسان بنوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں وکیل۔ ڈاکٹر یا سوداگر بنوں میرا پیشہ کیسا بھی ہو۔ مجھے کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنا ہے۔ جو محض روپیہ جمع کرنے سے زیادہ دنیا کے لئے بہتر اور مفید ہو۔

مجھے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔ کہ انسان اپنے خیالات کو بنانے والا۔ اپنے اخلاق اور عادات کو سانچے میں ڈھالنے والا۔ اپنے حالات اور قسمت کو درست کرنے والا ہے۔ سوچ سمجھ کر اپنی جسمانی قوتوں کا استعمال کرنا میرا کام ہے۔

زندگی کی مصیبتوں کا ہنسی خوشی مقابلہ کرنا میرا کام ہے۔ حالات کیسے ہی مایوس کرنے والے ہوں میں ہمت نہیں ہاروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں تمام مشکلات پر جو میرے مقصد کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں پورے طور پر فتح پاؤں گا۔ میرا یہ خیال ہونا چاہئے کہ اپنے فرائض کو وفاداری اور محنت سے انجام دوں۔ زندگی کے لمحوں سے اس طرح جہاں تک ہو سکے اعلےٰ اور عمدہ خدمت لوں۔ جو کام بھی میں ہاتھ میں لوں اُس کو ختم کر کے دم لوں۔ روپے کے ہر معاملے میں پوری دیانتداری سے کام لوں۔ دوستوں کا سچّا دوست بنوں۔ اپنے ساتھیوں سے ہمدردی کا برتاؤ کروں۔ جہانتک ہو سکے اُن کی مدد کروں۔ جہاں تک طاقت ہے اس مقصد اعلےٰ کو حاصل کروں کہ میں شریفانہ زندگی بسر کروں۔ اور اپنے شاندار مقاصد زندگی کو وفاداری سے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہی کام ہے جو مجھے ہر صبح کرنے کو ملتا ہے کہ میں دن بھر اپنی روح کا وفادار رہوں۔ یہ کام کرنیکے لئے میری تمام بہادری اور تمام قوت کی ضرورت ہے۔

"یہی میرا کام ہے اور آج کا دن ہی میرا کام کرنے کا دن ہے۔ کسی کام کو کل کے لئے چھوڑنا غلطی ہے۔

شادمان نظامی

(از-او-ایس-مارڈن)

سزائے موت

مسئلہ ارتقا، نے جہاں قوموں کے خیالات میں اسقدر تبدیلی پیدا کی ہے وہاں (انفرادی حیثیت سے) ہر سوچنے والے انسان کے لئے ایک وسیع میدان عمل استوار کر رکھا ہے - ہر وہ انسان جو ترقی کی ایک منزل طے کر لیتا ہے تو بلا لحاظ اس امر کے کہ اُس کا نصب العین کیا ہے اپنی نگاہ دوسری منزل پر گڑی پاتا ہے - اور جس مُدعا کے حصُول کو کل اپنی زندگی کا معراج سمجھتا تھا آج اُسے اگر حقارت نہیں تو کم از کم لاپروائی کی نگاہ سے ضرور دیکھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کو حریص کہا جا سکتا ہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو اصول آج درست تسلیم کئے جاتے ہیں ممکن ہے کل اُن کو غلط سمجھکر خارج کر دیا جائے اور یہ محض قیاس ہی نہیں بلکہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بعض اصول جن کو چند سال پہلے صحیح طور پر بہترین کیا جاتا تھا آج بیکار سمجھکر رد کر دئے گئے ہیں - اس سلسلہ میں سزائے موت کے جائز یا ناجائز ہونیکا مسئلہ بھی آجکل متمدن دنیا کے ایک حصّے کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں -

تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر آجتک قتل کی سزا موت ہی تجویز ہوتی رہی ہے ایک وقت تو وہ تھا کہ ایک شخص کے قتل کے عوض بعض اوقات سینکڑوں اشخاص کو موت کے گھاٹ اتارنا مقتول کے وارث صرف جائز ہی نہیں سمجھتے بلکہ اپنی دنیاوی وجاہت کو قائم رکھنے کے لئے بھی ضروری جانتے ہیں - اب چند سال سے بعض لوگ اس خیال کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں کہ سزائے موت جو زمانہ جہالت سے ہم کو وراثتاً پہنچی ہے ناجائز قرار دیکر خارج کر دی جاوے اس خیال کی تائید میں ذیل کی دلیلیں پیش کیجاتی ہیں -

(۱) یہ کہ سزائے موت جہالت اور بدتہذیبی کے زمانہ کی رسم تھی - اس لئے اقوام کو اس سے کنارہ کرنا چاہئے -

(۲) یہ کہ جب ایک ذی رُوح کو پیدا کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے - تو انسان کو کسی ذی رُوح کے مارنے کا حق حاصل نہیں ہے -

(۳) یہ کہ ہر سزا کا منشا اخلاق کی درستی ہے - مگر سزائے موت اس منشاء کو پورا نہیں کر سکتی کیونکہ سزا پانیوالا شخص ہی قید سے آزاد ہو جاتا ہے -

(۴) یہ کہ باوجودیکہ سزائے موت کا قانون جاری ہے مگر دنیا سے قتل ناپید نہیں ہوا -

(۵) یہ کہ بعض اوقات قتل ایسے واقعات کے سلسلہ میں ہوتا ہے - کہ سزائے موت میں اور جرم میں کوئی خاص مناسبت نہیں ہوتی -

(۶) یہ کہ سزائے موت سے مقتول یا اس کے وارثوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا -

یہ سبھی دلائل محض معمولی ہیں اور نیچے لکھی ہوئی سطروں میں ان پر غور کیا گیا ہے -

(۱) محض اس خیال سے سزائے موت کو بُرا سمجھنا کہ یہ اس وقت کی یادگار ہے جسے ہم زمانہ جہالت کے نام سے یاد کرتے ہیں کوئی دانائی نہیں ہے ہر ایک اصول کو اس کی اچھائی اور برائی کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ اس اصول کے پیش کرنے والے کی شخصیت کے لحاظ سے فارسی میں اس خیال کی تردید یوں کی گئی ہے

گاہ باشد کہ کودکے ناداں از غلط بر ہدف زند تیرے
گاہ باشد کہ پیر دانشمند بر نیاید درست تدبیرے

اگر محض اسی دلیل پر سزائے موت کی مخالفت منظور ہے کہ یہ جہالت کی یادگار ہے تو باقی وہ تمام عادات جنکا تعلق کھانے پینے اور دوسری اُن ضرورتوں سے ہے جو زمانہ جہالت سے لیکر آج تک برابر انسانی زندگی کے لئے لازمی سمجھی گئی ہیں - ان سبکو ایکدم خارج کیوں نہیں کیا جاتا - اور کیوں انسان کے لئے ایک بالکل نیا نظام زندگی نہیں بنا لیا جاتا -

(۲) اس امر سے انکار نہیں کہ ان تمام انسانی کوششوں کے باوجود یہ ناممکن ہے کہ کبھی انسان ان قوانین قدرت کے خلاف جن سے ہر ادنےٰ اور اعلیٰ واقف ہے - اپنے جیسے دوسرے انسان کو پیدا کر سکے - مگر یہ ناقابلیت اس امر کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی - کہ سزائے موت کو ناجائز قرار دیا جاوے - قاتل خود ایک ایسی ہستی کو دنیا سے ہٹانیکا سبب بنتا ہے جسکو وہ پیدا نہیں کر سکتا - اس لئے قاتل اس بات کا حقدار نہیں کہ اس کے حق میں ایک ایسی دلیل پیش کی جاوے جسکی مخالفت خود اُس کے فعل سے ہو رہی ہے - دراصل سزائے کے جائز ہونیکی بڑی دلیل یہ بھی کہ جو شخص کسی دوسرے انسان کی زندگی کو وقت سے پہلے ختم کرتا ہے وہ

خود بھی مستحق نہیں کہ اس کے بعد اس دنیا کی دلچسپیوں میں تنہا حصہ لے۔

(۳) یہ درست ہے کہ سزا دینے کا مطلب ملزم کے اخلاق کی درستی بھی ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہر سزا دینے والے کا خاص مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے اخلاق کو سنوارے اور وہ عبرت حاصل کریں۔ ایک معلم جب ایک طالبعلم کو کسی قصور کی بناء پر سزا دیتا ہے تو خواہ وہ طالبعلم اپنی طبیعت کی خامیوں کے سبب اس سزا سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے مگر باقی اہل مکتب اس سے ضرور عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اور اس جرم کے ارتکاب سے بچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جرائم کے متعلق قانون بنانے والے اصحاب سزا کو مشتہر کرنا درست اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں زنا کی سزا مجمع عام میں بید لگانا تجویز کی گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کو سزا ملنے سے دوسرے بیشمار اشخاص کا اخلاق سنورتا ہے۔ اور جن لوگوں کو انسانی ذہنیت سے واقفیت ہے وہ اس کی تائید کریں گے۔

(۴) اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سزائے موت کے باوجود قتل کا جرم دنیا سے ناپید نہیں ہؤا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ سزائے موت سے کچھ اچھے نتیجے نہیں نکلتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض طبیعتیں ایسی ہیں جو اس قسم کی سنگین سزا ءسے بھی خوف نہیں کھاتیں۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اگر سزائے موت آج منسوخ کر دیجاوے تو قتل کی واردات بڑھ جاویگی۔ آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی قانونی گرفت ڈھیلی ہوجاتی ہے تو جرائم کم ہوجاتے ہیں۔ عدالتوں کے برتاؤ کا اثر جرائم کی کمی یا بیشی پر ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ بے شک و شبہ سزا کا اثر عوام کے اخلاق پر نہایت گہرا ہوتا ہے۔ اگر سزائے موت منسوخ کر دینے سے انسانی زندگی کی قیمت قاتلوں کی نگاہ میں کاجر مولی سے بھی کم ہوجاویگی اور معمولی سے معمولی بہانہ پر ایک انسان دوسرے انسان کا خون بہانا جائز اور مفید کام تصور کرے گا۔

ان حالتوں میں اگر اس دلیل کو درست تصور کیا جائے تو سزا کا مسئلہ طے ہوجاتا ہے۔ کیونکہ باقی مختلف اقسام کی سزاؤں کے باوجود جو مختلف جرائم کے لئے تجویز کی جاتی ہیں (جرائم دنیا میں بدستور ہو رہے ہیں تو اس دلیل کے ماتحت کل سزائیں نادرست اور ناجائز ہونگی۔

(۵) یہ درست ہے کہ بعض اوقات قاتل کا جرم اسقدر سنگین نہیں ہوتا کہ اس کو سزائے موت کا مستوجب قرار دیا جائے مگر اس کے لئے قانون نے گنجائش رکھی ہے اور ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ واقعات و حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض اوقات سزائے موت کی بجائے قاتل کو کوئی اور سزا دیجاتی ہے۔

(۶) اگر سزائے موت سے مقتول یا اس کے وارثوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ تو ملزم قید لینے سے یا کوڑے لگانے سے مشقت کو کس فائدہ کی توقع ہوتی ہے۔ مقتول کے وارثوں سے پوچھو کہ جب وہ قاتل کو زندہ دیکھتے ہیں تو ان کے دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور قاتل کو سزائے موت ملتی دیکھکر ان کے دل کو کیسی تسکین ہوتی ہے۔

ضروری ہے کہ وہ شخص جو سزائے موت کے ناجائز قرار دئے جانے پر متفق ہے اوّل خود کو کبھی مقتول کے وارثوں کی حالت میں رکھ کر ان کے خیالات کا اندازہ لگائے اور پھر اپنی آخری رائے قائم کرے کہ آیا سزائے موت درست ہے یا نہیں۔ دوسروں سے صبر اور معافی کی توقع کرنا آسان ہے مگر حقیقی معنوں میں وہی شخص صبر اور رحم کی تلقین کا مستحق ہے جو خود اس پر عمل کرنے کی ہمت اور طاقت رکھتا ہو۔

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ سزائے قتل دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے اور کوئی دور اندیش شخص اس کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

عبدالحق ریاض

کنول کا پھول

تجلیاں ہیں تیری زیر آب شعلہ فروش　　کہ آفتاب ہے زیر سحاب شعلہ فروش
فروغ نے سے ہے حسن شباب شعلہ فروش　　مگر ہے آب میں رنگ شراب شعلہ فروش
ہوا میں یا ہے کوئی تو ترانۂ خاموش
فسون ناز کا ہے یا فسانۂ خموش
لب نسیم سحر پر ہے گفتگو تیری　　کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری
ہزار دل سے ہے بھونری کو آرزو تیری　　کہ مست رکھتی ہے صہبائے مشکبو تیری
فضائے آب میں سرمست جام ہے تیرا
شہید لذت شرب مدام ہے تیرا
ترے چراغ پہ پروانہ وار گرتا ہے　　وفور شوق سے بے اختیار گرتا ہے
بلائیں لیتا ہے ہوکر نثار گرتا ہے　　قریب آکے ترے بار بار گرتا ہے
یہ بیخودی یہ بر دو کوشش یہ رغبت شوق
ذرا سے کیڑے میں ہے کس بلا کی وسعت شوق

(شاکر میرٹھی)

نِسوانی حسد

"روزمیری" بڑی شوقین اور فیشن پر مٹنے والی عورت تھی۔ اُس کے بال خوب سنورے ہوئے۔ لباس نہایت خوبصورت اور ستھرا، حرکتیں نہایت شائستہ، وضع قطع بالکل زمانے کے رسم کے موافق اور عمر کوئی اٹھارہ برس کی تھی گود میں ایک پیارا پیارا، بھولا بھولا ننھا سا لڑکا۔ شادی کو مشکل سے ابھی دو سال ہوئے ہوں گے!

"روزمیری" یوں تو کچھ ایسی خوبصورت نہ تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے شوہر کی بڑی چہیتی بیوی تھی، اور اُس کی طبیعت پر پوری طرح قابو رکھتی تھی شوہر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

روزمیری کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا، جدید ادبی کتابوں کا ڈھیر اُس کی میز پر لگا رہتا۔ جس طرح اُس کو مختصر افسانوں سے دلچسپی تھی۔ اُسی طرح اُس کے دماغ میں بھی بہت سی ادبی باتیں جمع تھیں۔ اس مطالعہ کا اثر یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ وہ ہر وقت خاص طور پر عشق و محبت کے خیالات میں محو رہا کرتی تھی۔

روزمیری کے ہاں مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا وہ اپنی ضروریات کا سامان پیرس سے خریدا کرتی۔ پھولوں کی بڑی شوقین تھی گلدستے پر گلدستہ خرید خرید کر لاتی اور اپنے گلدان سجاتی۔ کسی قدر فضول خرچ ضرور تھی کبھی بازار میں جیب خالی ہو جاتی اور ضرورت باقی رہتی تو وہ غمگین چہرہ، رنگ اُڑا ہوا اور اُداس واپس ہوتی۔

گلابی جاڑے کی ایک خوشگوار شام کو روزمیری کی موٹر کار پیرس کے صدر بازار میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کی طرح آہستہ آہستہ جا رہی تھی، تھوڑی دور کے بعد پُرانی یادگار چیزوں کی ایک دوکان کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ روزمیری اس دوکان کو بہت پسند کرتی تھی۔ دوکان بھی کچھ یونہی سی تھی۔ سنسان پڑی رہتی۔ کبھی کبھار کوئی گاہک آجاتا۔ دوکاندار کے خاص خریدار صرف روزمیری ہی تھی۔ جس روز وہ دوکان پر آتی دوکاندار خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ روزمیری سے کچھ دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ روزمیری آتی تو وہ ہونٹوں میں مُسکرا کر اُس کا استقبال کرتا۔ اور جنگلی ہرن کی طرح گردن ہلا ہلا کر بیقرار نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر اور نظریں چُرا چُرا کر اس طرح کہتا "میڈم! آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنی چیزوں سے کس قدر محبت رکھتا ہوں کسی ناقدر دان کے ہاتھوں اپنی چیزوں کو بیچنے کی بجائے میں اس بات کو بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ یوں ہی پڑی رہیں!"

روزمیری یہ بات سُن کر فخریہ انداز سے مُسکرائی۔ اتنے میں دوکاندار نے ایک خوبصورت، چھوٹی سی صندوقچی پیش کی۔ اس صندوقچی کے ڈھکن پر کسی مشہور نقاش کی بنائی ہوئی ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں پھولوں سے لدی ہوئی بوجھی کے سایہ میں مدت کے بچھڑے ہوئے دو عاشق و معشوق گلے ملتے ہوئے دکھائے گئے تھے!

روزمیری تو اس قسم کی خوشنما چیزوں کی شوقین تھی۔ صندوقچی دیکھتے ہی اُس کا ننھا سا دل مچل گیا۔ جب عورت کی صدری پھولوں پر اُس کی نظر پڑی تو بے ساختہ اُس کے مُنہ سے "آہ! غضب؟!" نکل گیا اور وہ دوکاندار کو ہونٹوں میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر بہت شرمائی! ساتھ ہی شوق اور گھبراہٹ کے لہجہ میں اُس کے مُنہ سے یہ لفظ نکلے "تی ... قیمت؟ اس کی قیمت؟؟"

ایک بڑے نرم لہجہ میں جواب ملا کہ "صرف سو پونڈ!"

اس غیر معمولی قیمت نے تو روزمیری جیسی خرچ کرنے والی عورت کو بھی ایک لمحے کے لئے جھنگے اور سستے کی طرف متوجہ کر لیا۔ اتفاق سے اس وقت اُس کی جیب میں اتنی رقم نہ تھی دوکاندار کو حکم دیا کہ یہ صندوقچی ہمارے لئے محفوظ رکھو۔ دوکاندار نے خوشی سے تعمیل کی۔ بلکہ اُس کے چہرے سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ روزمیری کی خاطر عمر بھر کے لئے صندوقچی محفوظ رکھ سکتا ہے!

روزمیری دوکان سے باہر نکل آئی اور زینے پر کھڑی ہو کر آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کچھ دیکھنے لگی۔ شام کا وقت سردی کا یہ عالم کہ ہوا سینے کے پار ہوئی جاتی تھی۔ مینہ کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ قریب ہی روزمیری کی موٹر کھڑی تھی۔ لیکن وہ موٹر تک نہ گئی۔ کسی خیال میں جوں کی توں حیران کھڑی رہی۔ شاید اُسے نفیس صندوقچی کے شوق نے بے چین کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی مایوسی پر افسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اُسے اپنے دل میں ایک درد سا معلوم ہوا اور اُس کے چہرے پر اُداسی سی چھا گئی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مکان پر چل کر جائے بیٹے

اوران پریشان خیالات سے بچنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس ارادے نے اُس کے جسم میں ذرا بھی حرکت پیدا نہ کی!

یکایک اُس کی نگاہ ایک دوشیزہ پر پڑی۔ جو خدا جانے کب سے اُس کے پاس کھڑی تھی! یہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے حسرت اور بیکسی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ٹھٹھرے ہوئے سُرخ سُرخ، نرم نرم ہاتھوں سے کوٹ کا کالر پکڑ کر زور زور سے کھینچ لیتی تھی اور سردی کی وجہ سے اُس کا دانت سے دانت بج رہا تھا۔ جوں ہی اُس کی آنکھیں روزمیری سے چار ہوئیں نیچے سر کر کے شرمیلے انداز میں کہنے لگی۔

دوشیزہ۔ "میڈم! کیا آپ مجھے ایک پیالی چائے کی قیمت عنایت کر کے شکریے کا موقع دیں گی؟"

روزمیری (چونک کر) ایک پیالی چائے کی قیمت! تو کیا تمہارے پاس اتنا بھی؟

دوشیزہ۔ نہیں جناب کچھ نہیں

روزمیری سکتے میں آ گئی۔ دل میں کہتی لے خدا دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جن کے پاس اتنا بھی نہیں کہ چائے کی ایک پیالی خرید سکیں! اب وہ اپنی ساری پریشانی بھول گئی۔ اور اس لڑکی کی مدد کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر آپ ہی آپ سوچنے لگی کہ یہ تو ایک عجیب کرشمہ ہو گا جب میں یہ باتیں ناولوں میں دیکھا کرتی تھی تو مجھے کچھ یوں ہی سا یقین آتا تھا۔ خیر۔ اچھی بات ہے اب میں اس لڑکی کو اپنی کوٹھی پر لیجاؤں گی۔ اور اس کی پرورش کرونگی۔ جب تو میرا نام کہ اس لڑکی کو یہ ثابت کر دکھاؤں کہ دنیا واقعی ایک عجیب مقام ہے۔ یہاں انوکھی سے باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ہو سکتی ہے حقیقت میں دیتی ما ہیں۔ دیومالا کے قصے نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ یہ سوچ کر روزمیری بھکارن لڑکی سے بولی۔

روزمیری۔ چلو کوٹھی پر میرے ساتھ چائے پینا۔

بھکارن یہ الفاظ سُن چونک پڑی اور ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی!۔

روزمیری (بھکارن کی طرف قدم بڑھا کر) گھبراؤ نہیں۔ میں مذاق نہیں کرتی۔ آؤ میری موٹر میں بیٹھ جاؤ۔ مکان پر چل کر چائے پئیں گے۔

بھکارن دوشیزہ ابھی سوچ بچار ہی میں تھی کہ روزمیری نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر موٹر میں بٹھایا اور اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ لباس کے کمرے میں لے گئی اور اُس کا بھیگا کوٹ اور ٹوپی اُتارنے میں خود ہاتھ لگایا۔ پھر گول کمرے میں لا کر آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ اور چائے مانگی۔

چائے آئی۔ روزمیری نے بڑی محبت سے لڑکی کو کیک، خطائی وغیرہ اُٹھا اُٹھا کر دی اور خود بے پروائی سے سگرٹ کا کش لے لیکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تاکہ لڑکی شرم نہ کرے اور اچھی طرح چائے پی لے۔ اس تھوڑے سے ناشتے سے لڑکی کا چہرہ بہت کچھ بدل گیا۔ اُداسی دُور ہو گئی۔ اور وہ نہایت خوش خوش نظر آنے لگی۔

روزمیری اپنی مایوسی کو بالکل بھول چکی تھی۔ اور اب وہ معمول کے مطابق ہنسی خوشی بیٹھی تھی۔ ابھی وہ لڑکی کی پوری حالت سُننے نہ پائی تھی کہ اُس کا شوہر کمرہ میں داخل ہوا۔ اور اس خوبصورت بھکارن کو دیکھ کر روزمیری سے کہنے لگا۔

شوہر "روزمیری"! یہ اجنبی لڑکی کون ہے؟ یہ کیا معاملہ ہے؟؟

روزمیری (قہقہہ لگا کر) میں نے اسے سڑک پر پایا ہے۔ یہ مجھے رستے میں ملی میں اسے موٹر پر سوار کر کے گھر لے آئی۔ میں اسے پالوں گی۔

شوہر۔ یہ۔ یہ۔ یہ۔ اتنی حسین دوشیزہ! ہرگز نہیں کبھی نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

روزمیری (کچھ شرمائی ہوئی سی) حسین! کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے۔

شوہر۔ ہاں حسین، بلا کی حسین ہے! میں تو تمہارے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اُس کے حُسن سے ——— روزمیری! یہ تمہارے لئے۔ یہ غیر معمولی نعمت ایک خطرہ ہے! تم بلا شبہ ایک آستین کا سانپ پال رہی ہو۔

یہ سُن کر روزمیری کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ اور اُس کے سینے میں نسوانی حسد کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مگر اُس نے یہ بات گوارا نہ کی کہ ایک نیم عاشقانہ جذبے کی خاطر اپنے شوہر کی محبت چھوڑ دے اُٹھی، جیب سے چند نوٹ نکالے۔ اور لڑکی کی نذر کئے۔ پھر آہستہ سے اُس کے کان میں کچھ کہکر رخصت کر دیا۔

جب ذرا دم میں دم آیا تو ایک نفیس اور جدید وضع کے لباس میں شوہر سے ملاقات کی تاکہ اُس کے دل سے لڑکی کے حُسن کا اثر مٹ جائے۔ شوہر تو اُس کا عاشق تھا ہی صورت دیکھتے ہی اجنبی حسین لڑکی کو بالکل بھول گیا۔

جوں ہی روزمیری کو یقین ہوا کہ وہ پھر اپنے شوہر کی محبت کی واحد مالک بن گئی ہے اُسے اپنی نقشین صندوقچی یاد آئی اور شوہر سے کہنے لگی۔

روزمیری۔ "آہ! میری نقشین صندوقچی! چلو سیر کو چلیں۔ واپسی پر بازار بھی جانا ہے میں سو پونڈ کی ایک صندوقچی کیلئے فرمائش کر آئی ہوں سچ کہتی ہوں اُس پر ایک بڑی خوبصورت تصویر ہے"!!

(تمکین رام پوری۔ لاہور)

عورت اور جوگی

دور ہر شہر اور بستی سے — دور ہنگامۂ زارِ ہستی سے
عیشِ فانی کی دسترس سے دور — زندگانی کی ہر ہوس سے دور
غم کے پیچیدہ دام سے آزاد — کاہشِ صبح و شام سے آزاد
جام سے اور جم سے بے پروا — معنیٔ بیش و کم سے بے پروا
شورشِ این و آں سے بیگانہ — منعماتِ جہاں سے بیگانہ
کوہ کی اک اداس وادی میں — آبشاروں کے پاس وادی میں
رہتا تھا ایک تارک الدنیا — پارسا نیک تارک الدنیا
رازِ عرفانِ عشق کا جویا — رختِ سامانِ عشق کا جویا

رات دن بندگی و ذکر میں محو
آخرت اور اس کی فکر میں محو

ایک دن ایک نوجواں عورت — دلربا شوخیوں کی جاں عورت
زندگانی کی آگ دل میں لئے — نوجوانی کی آگ دل میں لئے
مرغزاروں کی سیر کرتی ہوئی — آبشاروں کی سیر کرتی ہوئی

تنگ وادی کے پاس جا پہنچی
یعنی لے کر اسے قضا پہنچی

کون عورت تھا وہ پاسبانِ بہار — پیکرِ آب و گِل میں جانِ بہار
متحرک شراب خانۂ حسن — یعنی اک مستقل فسانۂ حسن

گل بدن گل عذار کہیئے جسے — شانِ پروردگار کہیئے جسے
کلکِ قدرت کی خوشنما تصویر — حسن کے آسماں کا مہرِ منیر
عشق کے سوز و التہاب کی روح — موت کی زندگی شباب کی روح

حسن بالذات کی جھلک عورت

عورت اور سر سے پاؤں تک عورت

کوہ کی دیدہ زیب وادی میں — خوشنما دلفریب وادی میں
وہ جہاں آبشار گاتے ہیں — چشمے مل کر ملہار گاتے ہیں
ہے چٹانوں پہ جال پھولوں کا — قرمزی زرد لال پھولوں کا
زیبِ ہر شاہراہ پھول ہی پھول — تا بہ حدِ نگاہ پھول ہی پھول
ہیں جہاں سبز جھاڑیاں گل پوش — پیش و پس سب پہاڑیاں گل پوش
صنعتِ کردگار پھولوں میں — بس گئی ہے بہار پھولوں میں
اب وہاں پر وہ مستِ ذات کہاں — محوِ حسنِ تجلیات کہاں
ہاں مگر ایک مرد رہتا ہے — کوہ پر ایک مرد رہتا ہے
مرد کی دل نواز ہے عورت — مونس و چارہ ساز ہے عورت

اور وہ پرہیزگار غائب ہے
شیخ شب زندہ دار غائب ہے

(فاخر ہریانوی بی۔اے)

ادیب آقا ہے یا غلام؟

(استاذ سلامہ موسیٰ مصری کے گراں مایہ خیالات)

جب یونانیوں کی آزادی چھن گئی اور رومی ان پر حکمران ہو گئے تو ادیب آقائی کے درجہ سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ یونانی ادبا فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اسکی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کیطرف لیجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دُور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤگے جو دل سے چاہتا ہے کہ ان کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں بانظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو کبھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤگے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دھوکے میں رکھے اور ان کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے

بہرحال جب رومی یونانیوں پر غالب آگئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرلے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خریدلے اور اپنی اولاد کو ان کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہل ادب غلام ہوکر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے لیکن اسی طرح جس طرح ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں۔ جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جسطرح ہم اس قلی کی رائے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہمکو ریل پر سوار کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی تابعداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کہتا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا اور برتر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونیکے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر از منہ وسطیٰ کا دور آیا جس میں عرب اور اہل فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کی خود مختار نظام حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یکرنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہو گئے۔ اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں کی خوشامد میں آقائی رتبے سے گر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ بریں اس دور میں ادب اور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتا۔ دوسری ضروریات زندگی۔

ادب کا جو حصہ ضروریات زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقائی کے اس بلند مرتبہ تک نہیں پہونچ سکا۔ جو قدیم یونانی اہل قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اس درجہ میں اُتر آیا جس میں یونانی ادیب غلام ہوکر اُتر آئے تھے۔

بنی عباس کے زمانے میں جسطرح بغداد میں تمکو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملیگی جس نے ادب حاصل کرکے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کردی، اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہر امیر کے پاس ایک شاعر کو اسی کی مدح سرائی میں رطب اللسان پاؤگے۔ غرضکہ از منہ وسطیٰ میں مشرق اور مغرب کے تمام اہل ادب اسی رنگ پر جا رہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ ان کی سب سے بڑی مہم اور ان کا سب سے اہم فرض دولتمندوں اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ ادب امرا کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہوگیا اور اہل ادب کو امرا کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گویوں اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہوگئی۔ جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھایا جو جلسوں میں لوگوں کا دل بہلانے اور ہنسانے کے لئے بہروپئے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد [illegible] پ کی بیداری اور ترقی کا دور آیا اور اس نے قدیم ادب کے [illegible] کو زندہ کرنا اور دامان ادب کو غلامی کے گرد و غبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقائی کا رنگ جھلکنے لگا۔ اس دور کا انشا پرداز تمکو ہنسانے کے لئے تمہارے

سامنے نہ چوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تمکو خوش کرنے کیواسطے بھانڈپن دکھا سکتا ہے - بلکہ وہ تمکو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تمکو بسا اوقات دردمند بنا دیتا ہے اور تم اسی دردمندی میں لذّت اور مزا محسوس کرتے ہو کیونکہ تمکو اس طرح دردمند بنانے سے انشاپرداز کا مقصد محض تمہیں صاحب بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے تمہارے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنیکا دائرہ وسیع ہو جائے -

مگر ہم میں ابتک اہل قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے جس کی ساری ہمت شوخی لسانی اور گرانڈیل الفاظ تک محدود ہے - میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرعوب کر دینے والی صنعت ترصیع کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا - اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا کٹورا سادہ ہی کھلا معلوم ہوتا ہے - ایک حسین و جمیل ہستی لباس سے عریاں اور برہنہ ہو کر ہی زیادہ جاذب نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے - اور ریشمی کپڑا نقش و نگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے - لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہو سکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین و جمیل معلوم ہوتی ہوں - چونکہ کوئی سادہ چیز اسوقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جبتک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو - اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کر سکتا اس لئے ہمکو کبھی لفظی نقش و نگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشاپرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہو جائے - اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہجائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کر لے - میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے کو آقائی کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ، اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اسکو مدّنظر رہے - مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کر سکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے - اور وسعت نظر اسی انشاپرداز کو نصیب ہو سکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر و مستقبل، اس کے رسم و رواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصّے کہانیوں، اس کے علوم و اداب اور اس کی تہذیب و تمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے -

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے - تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہو کر آقاؤں کا لٹریچر بن جائے -

ضیاء درّانی
ایچ - اے

غزل

پا کے تقدیر نے تدبیر کا قائل مجھکو
سو بلاؤں کی بلا سونپ دیا دل مجھکو

حسن خود عشق کی سرکار سے پاتا ہی فروغ
کون کہتا ہے درِ حسن کا سائل مجھکو

حسن کی پہلی نظر ہوتی ہے کیا ہوشربا
کر دیا عشق کے انجام سے غافل مجھکو

ہو نہ جائے کہیں بے لطف یہ ہنگامۂ یاس
آہ کس وقت نظر آئی ہے منزل مجھکو

آج شمشیر ہے شمشیر خوشا لذتِ قتل
آج قاتل بھی نظر آتا ہے قاتل مجھکو

داغِ حسرت کو رسا دل سے مٹاؤں کیونکر
ہے یہی گلشنِ امید کا حاصل مجھکو

رسا جالندھری

امریکہ کے اسکول اور یونیورسٹیاں

بچوں کے لئے جدید اسلوبِ تربیت اور ان کی تعلیم کے نئے نئے طریقے نکالنے میں ان دنوں امریکہ دنیا کی تمام قوموں سے آگے ہے۔ آجکل کوئی قوم اپنی تعلیم پر اتنا خرچ نہیں کر رہی ہے جتنا امریکہ اپنی تعلیم پر صرف کرتا ہے۔ وہاں شاید ہی کوئی دولتمند ہوگا جو مرتے وقت اپنی دولت کا بڑا حصہ کسی یونیورسٹی کو وقف نہ کر جاتا ہو۔ جس طرح ہمارے ہاں کے بعض دولتمند اپنی کچھ جائیداد کسی مسجد یا مدرسے میں وقف کر جاتے ہیں۔

اسوقت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۳۰۰۰۰۰ لاکھ مدرسے ہیں۔ جن میں ۸۰۵۹۳۳ معلم کام کرتے ہیں اور معلموں کی اس بڑی تعداد میں سے ۶۲۸۴۱۷ عورتیں ہیں اور باقی صرف ۱۷۷۵۱۶ مرد ہیں۔ تعلیم پیشہ عورتوں کی اس عظیم الشان تعداد ہی سے ناظرین اپنے ملک کی علمی پستی اور امریکہ کی عظمت اور ترقی کی اصلی وجہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام ملکوں میں طلبا کی سب سے بڑی تعداد ابتدائی مدرسوں ہی میں ہوتی ہے جو عموماً کم عمر بچے یا لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ اور عورت فطری طور پر ماں ہونے کی وجہ سے بچوں سے محبت کرتی ہے، ان کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آتی ہے اور ان کے بچپن کی شرارتوں اور شوخیوں سے درگذر کرتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے بچے موجودہ پردے کی وجہ سے عورتوں کی شفقت آمیز تعلیم سے محروم ہیں۔

یوں تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تمام ممالک اپنی تعلیم اور اس کے انتظام میں بذاتِ خود مستقل اور آزاد ہیں لیکن چند قانون ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ہر ریاست میں یکساں طور پر جاری ہے۔ مثلاً گورنمنٹ کے کسی مدرسے میں دینی تعلیم نہیں دیجاتی۔ ہر ریاست میں پانچ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک جبری اور مفت تعلیم رائج ہے۔ اور ہر ریاست میں تعلیم کے تین درجے مقرر ہیں۔ ابتدائی، ثانوی (سکنڈری)، اور اعلیٰ۔ ابتدائی تعلیم آٹھ سال کی ہے اور ثانوی یا سکنڈری چار سال کی۔ باقی اعلیٰ تعلیم صرف یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے۔

امریکہ کی ہر یونیورسٹی اپنے تعلیمی اور انتظامی معاملات میں ایک تجارتی کمپنی کی طرح خود مختار اور آزاد ہے [illegible] کسی یونیورسٹی میں [illegible] گورنمنٹ کوئی دخل نہیں دیتی۔ ہر یونیورسٹی کے ماتحت کئی کالج ہیں۔ اور ہر یونیورسٹی کی ایک انتظامی کمیٹی ہے جو رجسٹرار اور پرنسپلوں سے مشورہ کے بعد کوئی کام کرتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس قسم کی آزاد یونیورسٹیاں پانچ سو سے بھی زیادہ ہیں اور اس عظیم الشان تعداد ہی سے ناظرین امریکہ والوں کی علم دوستی اور ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ قابل غور اور ہمارے عبرت حاصل کرنے کی چیز ان پروفیسروں کی آزادروی ہے جو ہمارے ہاں سرے سے مفقود ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے تاریخ کا ایک پروفیسر اپنے تجربات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ کے لیکچر میں اوپر سے نیچے آنے کی بجائے [illegible] اوپر جانا طلبا کی دلچسپی، ان کی روشنی طبع اور فن تاریخ پر ان کے قادر ہونے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ لہذا اب وہ اپنا لیکچر روس کی موجودہ انتہا پسندی اور بالشویزم سے شروع کرتا ہے۔ پھر اوپر کی جانب بڑھکر انیسویں صدی کے حالات سے بحث کرتا ہے۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی کو لیتا ہے۔ اور اسی طرح درجہ بدرجہ اگلوں کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کرتا ہوا مصر اور بابل کی ابتدائی شائستگی اور تمدن تک جا پہنچتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر تاریخی نتیجے کے اسباب اور واقعات بھی بتاتا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ تاریخی بدعت یقیناً شاندار نتائج پیدا کریگی۔

امریکن یونیورسٹیاں اپنے تین اہم مقاصد اور بڑے کاموں کے لحاظ سے بھی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں ممتاز ہیں۔

(۱) علوم و فنون کا ذخیرہ کرنا۔ اور اس کے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ایک تو ہر یونیورسٹی کے واسطے ایک بہت بڑا اور تمام علوم و فنون پر حاوی کتبخانہ مہیا کرنا اور دوسرے ان علوم و فنون کو علمی سبقوں اور لیکچروں کے ذریعے سے طلبہ کے لئے آسان اور مفید بنانا۔

(۲) قوم کی تہذیب اور شائستگی کی ترقی کے لئے علمی مذاکرات اور بحث مباحثے کرنا۔ اس مقصد کیواسطے ہر یونیورسٹی نے ایک اکاڈمی قائم کر رکھی ہے جسمیں پروفیسروں کے ضرورت کی تمام چیزیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان اکاڈمیوں میں پروفیسر تبادلہ خیالات اور اپنی تحقیقات پیش کیا کرتے ہیں۔ اور اپنا اوقات ان کی تحقیق علمی دنیا [illegible]

حرفت کے لئے بھی بیحد مفید ثابت ہوتی ہے۔ اکثر یونیورسٹیاں اپنے پروفیسروں کو ہر چھ سال میں ایک سال پوری تنخواہ کے ساتھ پورے سال کی فرصت دیتی ہیں۔ اور اکثر اساتذہ وہ سال غیر ممالک میں علوم و فنون کی تحقیق میں گزارتے ہیں۔

(۳) امریکن یونیورسٹیوں کی تیسری مہم پروفیسروں کے بحث مباحثے کو عام پبلک کے لئے شائع کرنا ہے۔

لیکن مذکورہ بالا تمام خوبیوں کے علاوہ امریکہ کی تعلیم کو تمام دنیا کی تعلیم پر سب سے بڑا شرف اور خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہاں کی تعلیم میں شروع سے آخر تک، جونیر، سینیر اور اعلیٰ ہر ایک درجہ میں تجربہ اور تحقیق کی رُوح شامل ہو گئی ہے۔ وہاں علم صرف کتابوں کے ذریعہ سے رٹایا نہیں جاتا اور اساتذہ طلبہ کے سامنے صرف لیکچر دیکر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو جاتے۔ بلکہ ہر استاد اپنے طرزِ عمل سے شاگردوں کو یہ ذہن نشین کرا دیتا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں ہی علم کے پیاسے ہیں اور تحقیق اور چھان بین دونوں ہی پر لازم ہے۔ کوئی امریکن پروفیسر طلبہ کے معلومات بڑھانے پر اتنی توجہ نہیں کرتا جتنی اپنے علوم و فنون اور اپنی استعداد بڑھانے پر کرتا ہے۔ پروفیسر کا فرض صرف طلبہ کی رہنمائی ہوتا ہے۔ یہ طلبہ کا کام ہے کہ اپنے استاد کے بتائے ہوئے طریقوں سے اپنی علمی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں۔

مثلاً کسی ابتدائی مدرسے کا مدرس اپنے شاگردوں کو اصولِ صحت سے باخبر کرنا چاہتا ہے۔ تو صرف یہی نہیں کرتا کہ انکو حفظِ صحت کے قواعد یاد کرا کے انہیں اُن کا امتحان لے لے۔ بلکہ پہلے ان کے سامنے کسی مرض کی مفصل کیفیت بیان کرتا ہے۔ اُن سے بچنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ پھر ان کو کسی ایسی جگہ پہنچاتا ہے جہاں یہ مرض کثرت سے پایا جاتا ہو۔ وہاں پہونچکر طلبہ وہاں کے باشندوں کی رہائش اور مریضوں کے دکھ رکھاؤ کے طریقے کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق انہیں بیماریوں پر کوئی خاص کتاب دیکھنے کے بعد صحیح نتیجہ پر پہنچنے اور اس مرض سے متعلق درست معلومات حاصل کرنے کے واسطے اپنے معلم سے کافی بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح ایک طالب علم میں ابتدائی کلاسوں ہی میں علمی ذوق و شوق، اپنے مطالعہ اور اپنے تجربہ و تحقیق پر بھروسہ کرنے کی ایک خاص شان اور دنیا کی ہر چیز اور کائنات کے ہر واقع کو ایک چھان بین کرنیوالے محقق کی نظر سے دیکھنے اور اُن سے کارآمد نتیجے نکالنے کا خاص ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی یہی حالت ہے۔ مثلاً تمدن و شائستگی کا ایک پروفیسر طلبا کے سامنے اس فن کے صرف ابتدائی اصول بیان کر دینے پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ امیری و فقیری، جوانمردی و بزدلی، صحت و مرض اور دیہاتی اور شہری زندگی وغیرہ، تمدن کے متعلق تمام جزئیات طلبا کے سامنے کھولکر رکھ دیتا ہے۔ اور ایسی کتابوں اور جگہوں کا بھی انتخاب کر دیتا ہے جن کا مطالعہ اس فن کے پڑھنے اور اسمیں کمال حاصل کرنیکے لئے ضروری ہو۔ پھر استاد اور شاگرد دونوں ہی تحقیق میں لگجاتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں۔ ناظرین یہ سُنکر بالکل تعجب نہ کریں۔ کہ بسا اوقات استاد شاگرد کی تحقیق اور رائے سے بھی نفع اٹھاتا ہے۔

ہمارے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ تعلیم پر دنیا کی تمام حکومتوں سے بہت زیادہ خرچ کر رہا ہے۔ اور ابتدائی تعلیم تقریباً تمام کی تمام عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور تحقیق و تجربہ کی رُوح تعلیم کے تمام درجوں میں یکساں طور پر شامل ہے۔ اور اسی وجہ سے امریکہ عظمت اور ترقی کے میدان میں تمام ملکوں سے پیش پیش ہے۔

(الہلال قاہرہ) صدیق طبیب بہاری

منظرِ صبح

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر

اس لئے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی مہکتے ہوئے سبزے پہ نظر

دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

انیس مرحوم
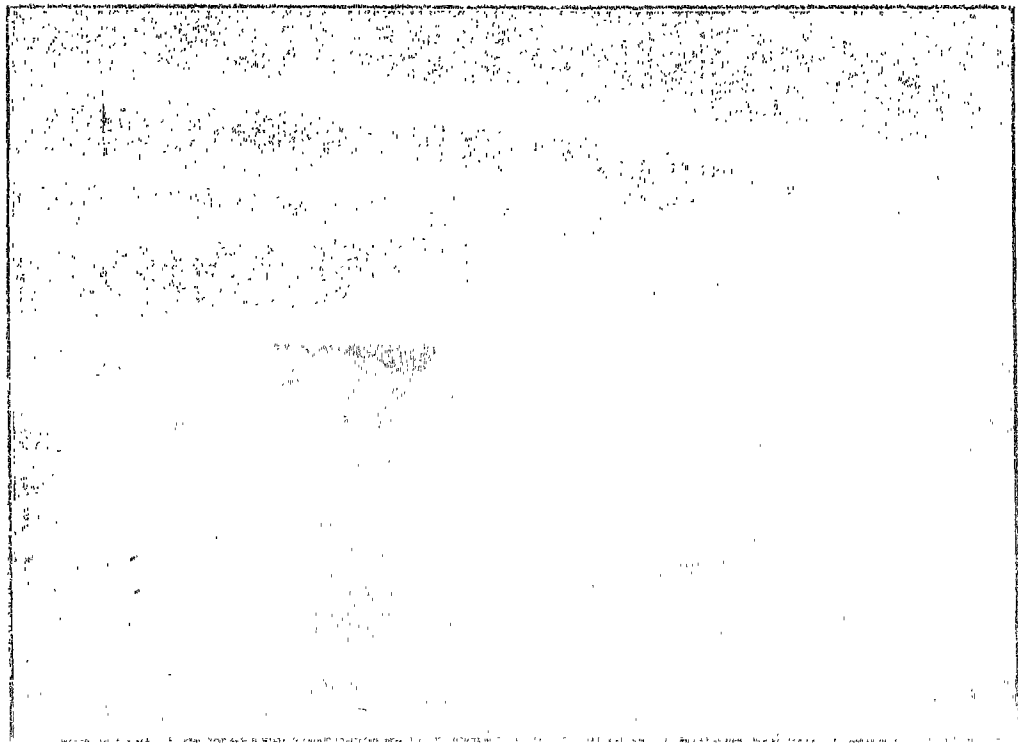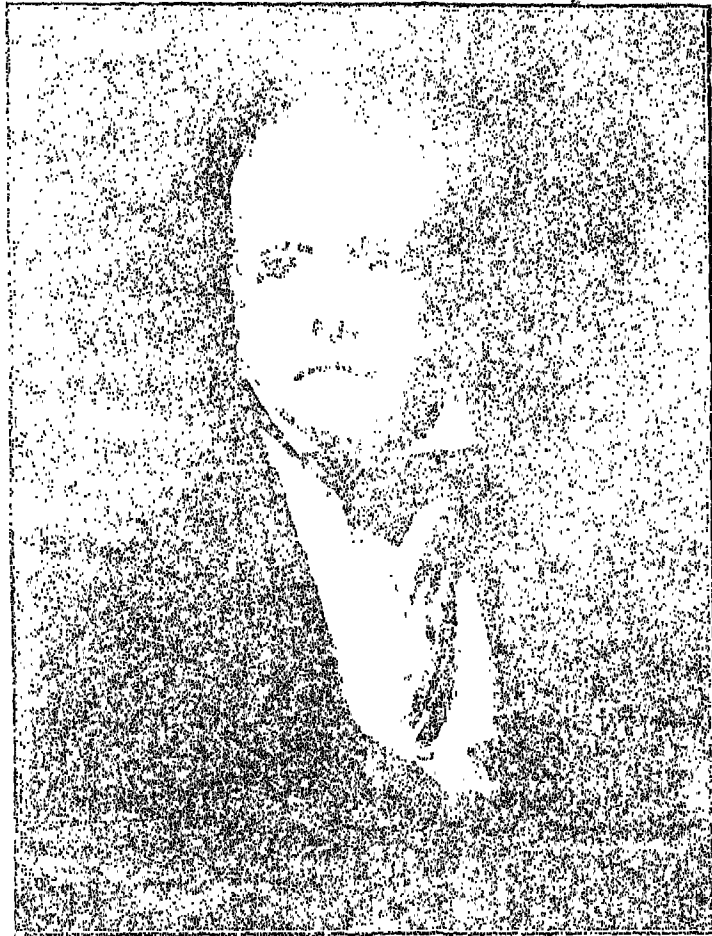
سر والٹر سکاٹ

سر والٹر اسکاٹ

انگریزی داں ادبی دنیا سر والٹر اسکاٹ کے نام سے بخوبی واقف ہے۔ جو شہرت وعزت اس انگریزی ادیب نے پائی اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اڈنبرا میں اس کی ایک عظیم الشان یادگار قائم ہے۔ اور اسمیں اسکاٹ کا مجسمہ رکھا گیا ہے جو اسبات کی صاف دلیل ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے اپنی زبان سے کسقدر انس اور دلچسپی رکھتے ہیں وہ اپنے نامور ادیبوں کی کیسی قدر کرتے ہیں۔ کاش ہم میں بھی وہی ذوق سلیم پیدا ہو۔ ہم اپنی زبان کو اسقدر دلچسپی کا مرکز بناویں اور اسیطرح عروج پر پہونچائیں جسطرح اہل مغرب مثالیں پیش کیں۔

اس مشہور و معروف انگریزی انشا پرداز والٹر اسکاٹ کے حالات و کمالات کا مطالعہ کیجئے۔ اور اس کی ترقی و شہرت کے ہر پہلو پر غور کیجئے کہ وہ کس رتبہ پر پہونچا۔

سوانح عمری والٹر اسکاٹ اپنے باپ کا چوتھا لڑکا تھا اس کے باپ کا بھی یہی نام تھا۔ وہ اڈنبرا میں ۱۵ اگست ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا۔ ڈیڑھ برس کا تھا کہ دانت نکلنے کی تکلیف میں سخت بیمار ہوا اور اس میں اس کی ایک ٹانگ بیکار ہوگئی۔ اور یہ لنگڑا پن اسکی عمر کے ساتھ رہا۔ اسکاٹ کے باپ کا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی ماں ایک خوبصورت نرم دل عورت تھی۔ وہ پرانے قصے کہانیوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس کے اس شوق نے اسکاٹ کے ادبی مذاق کو ابھارا اور یہی [illegible] میں اُس کی ترقی و شہرت کا باعث ہوا۔ قدیم زمانہ کی محبت اور روشن حافظہ اُس کو اپنی ماں سے ورثہ میں ملا تھا۔ اسکاٹ کا خاندان [illegible] اور [illegible] بازی میں خاص طور پر مشہور تھا۔ اُس کا باپ سب سے پہلا شخص تھا جس نے شہری زندگی [illegible] [illegible] میں رہنا پسند کیا۔ چنانچہ اسکاٹ نے سب سے پہلے علم ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اس لیئے اسکی نظم و نثر میں اُس کے خاندانی بزرگوں کے خیالات اُسکی مرغوب اور دلپسند چیزیں ہیں پرانے زمانہ کے مناظر اسوقت کے قلعے اور محل پرانے افسانے اور اس عہد کی [illegible] کے [illegible] اور دلچسپ واقعات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔

سکاٹ کو صحت کی خرابی کے سبب اس کے دادا کے گاؤں سینڈی نوئے[1] میں بھیجدیا گیا۔ جو سیلم کے ویران قلعہ کے قریب [illegible] کے ضلع میں واقع ہے۔ اُس کی ادبی ترقیوں کیلئے یہ ایک خاص اور عمدہ جگہ ملگئی۔ کیونکہ یہاں کے مناظر، نیلگوں آسمان، سیاہ اور اونچے نیچے بلند پہاڑ، یہاں کی مجلسیں، فسانے اور گیت جو اس نے وہاں سُنے، اور سرحد سکاٹ لینڈ کے بہادر ڈاکوؤں کی کہانیاں جو اُس نے اپنی دادی اماں سے سُنیں، ایسی چیزیں نہ تھیں، جو اس ہونے والے شاعر اور ادیب کی چھپی ہوئی قابلیتوں کو نہ ابھارتیں۔ ان سب نے ملکر اس پر یہ اثر کیا کہ وہ بہادری اور شجاعت کا قدردان قدرتی مناظر کا شیدا اور فسانہ نویس بنگیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ بھی پرورش پانے لگا۔ لیکن اُسوقت اُس کے لئے سب سے دلچسپ سکاٹ لینڈ کے سرحد کے گیت اور قصے تھے۔ چنانچہ اُسنے اپنی مشہور نظم کے تیسرے بند کی تمہید کے چند آخری اشعار میں سینڈی نوئے میں اپنے بچپن کی نہایت عمدگی سے تصویر کھینچی ہے۔

اس قوی دل لڑکے نے جو کچھ ضدی اور خود رائے بھی تھا، اڈنبرا ہائی سکول (۱۷۷۹ء تا ۱۷۸۳ء) میں ابتدائی تعلیم پائی۔ جہاں وہ اپنی بے قاعدہ قابلیت کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ عموماً سکول کے کمرہ کی بجائے کھیل کے میدان میں زیادہ وقت گذارتا۔ لنگڑا ہونے کے باوجود وہ کھیلوں پر اپنے سب ہم مکتبوں کا اُستاد تھا اور اکثر انہیں اپنی اور مناسب حال کہانیاں سیوقت گھڑ گھڑ کر سناتا اور انہیں خوش کرتا تھا۔ اسے یونانی زیادہ پسند نہ تھی لیکن لاطینی میں خاص مہارت پیدا کرلی۔ ابتدا سے سکول میں ہی اس کے خیالات میں قدامت پسندی تھی۔ اور اس کا سیاسی عقیدہ [illegible] ہمیشہ ملوکیت پسند رہا۔ اور [illegible] شاہی حکومت کو پسند کرتا رہا۔

کچھ عرصہ بعد [illegible] کلسو کے ایک سکول میں بھیجا گیا۔ جہاں وہ [illegible] اُستاد کا دوست بنگیا۔ اس کے بعد اڈنبرا کے کالج میں داخل کیا گیا [illegible] کا مطالعہ شروع کیا [illegible] قانون کی ابتدائی تعلیم اپنے باپ [illegible] اس کے بعد یونیورسٹی [illegible] میں داخل ہو گیا۔ [illegible] کے وہ [illegible] سال میں [illegible] اس پر [illegible] کا [illegible] ہوا [illegible] سال بعد یہی بیماری اس کی موت کا باعث ہوئی۔

بیماری سے کچھ افاقہ ہونے پر سکاٹ نے اپنی تعلیم پھر جاری کر

[1] ایک بیماری ہے جس میں پیٹھ [illegible]

دی، اور اپنی عمر کے اسی حصہ میں اس نے ادب و انشاء کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ تاریخ، اور خصوصاً فوجی لشکروں اور معرکوں کے حالات کے مطالعہ میں زیادہ وقت گذارا۔ اس نے ہسپانوی زبان بھی سیکھی۔ اور اس زبان میں "سروانٹس" کے افسانے پڑھے، چنانچہ کہتا ہے، کہ "انہی ناولوں نے مجھے پہلے پہل ترغیب دی کہ میں فسانہ نگاری میں کمال پیدا کروں اور اپنے بعد ایک نام چھوڑ جاؤں"۔ سکاٹ نے لاطینی میں ارسطو کے بھی بہت سے فسانے پڑھے وہ دُور دُور سفر کرتا اور بہت سا وقت سیر و سیاحت میں گزارتا تھا، عمدہ مناظر کی تلاش میں رہتا یا ایسی جگہوں کو پسند کرتا تھا، جنہیں کسی خاص تاریخی واقعہ یا کسی فسانہ سے تعلق ہو۔ وہ ایکدن میں تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ میل پیدل چلسکتا تھا۔ اُس کے ساتھ اکثر اس کے ہم عمر ساتھی ہوتے، جن سے وہ نہایت مہربانی اور محبت سے پیش آتا۔ اُس کی گفتگو ہمیشہ متین اور سنجیدہ ہوتی تھی۔ اس کے ماں باپ کو یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے قانونی پیشہ میں کامیاب ہوگا لیکن باوجود اسقدر جوشیلی طبیعت کے سکاٹ ایک نہایت کامیاب وکیل ثابت ہؤا، اور اگر ادب کی خاطر اُس نے اپنا پیشہ ترک نہ کر دیا ہو تو وہ ایک ممتاز اور نامور وکیل ہوتا۔ اگرچہ اُسے اس سے بہت کم آمدنی ہوتی تھی، لیکن سکاٹ نے چودہ سال تک برائے نام وکالت جاری رکھی۔

اُس نے جلد ہی مضمون لکھنا شروع کر دئے مگر پہلے پہل کوئی شایع ہونے کیلئے نہیں دیا۔ اس عرصہ میں سکاٹ کو ایک خاتون مس سٹوارٹ بیلچز سے محبت ہوگئی۔ لیکن اُس خاتون کی شادی سر ولیم فوربز سے ہونے کے بعد جلد ہی سکاٹ نے ایک فرانسیسی خاتون میڈموازیل شارلٹ مارگریٹ کارپنٹر سے شادی کر لی۔ (۱۷۹۷ء)۔ یہ نہایت حسین دوشیزہ تھی۔ اور گو اسکو سکاٹ سے محبت تھی۔ لیکن اس کی فکروں اور پریشانیوں میں اس کی شریک نہ تھی۔

وکالت کے پانچویں سال سکاٹ اڈنبرا والنٹیر کیولری میں داخل ہوگیا۔ اور اس رسالہ کا کوارٹر ماسٹر بنا دیا گیا۔ ۱۷۹۹ء میں وہ لندن گیا، اور وہاں اپنے گیتوں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔

۱۸۰۰ء میں وہ تین سو پاؤنڈ سالانہ مشاہرہ پر سلکرک شائر کے ضلع کا حاکم مقرر ہوا۔ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۱ء تک سکاٹ عدالت سیشن کے ایک بیمار کلرک کی جگہ بلا تنخواہ کام کرتا رہا۔ کیونکہ اسے وہ جگہ مل جانے امید تھی۔

اسکاٹ کی تصانیف

۱۷۹۶ء میں سکاٹ نے سب سے پہلی نظم لکھی جو اُس کی کچھ ابتدائی شہرت کا باعث ہوئی۔ یہ ایک جرمن شاعر برجر کی نظم لینور کا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ترجمہ تھا۔ اور جسے سکاٹ نے "ولیم و ہیلن" کے نام سے معنون کیا۔ یہ نظم اثر اور جوش کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ سکاٹ کی طبیعت کی روانی نے بہت جلد زبانی چیزوں

اور موزوں مضامین کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ کالج کو تعلیم کے شروع زمانہ ہی سے اُسکا ارادہ تھا کہ سکاٹ لینڈ کی سرحد کے مطربوں اور گویوں پر ایک کتاب لکھے۔ اُسی وقت سے اس کے لئے مسالا جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ۱۸۰۲ء میں اس نے دو جلدوں میں ایک کتاب شایع کر دی۔ یہ اُس کی پہلی ادبی کامیابی تھی۔ لیکن اس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ابھی سکاٹ کی قوتوں کی نشو و نما نصف سے بھی کم ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تیسری جلد ۱۸۰۳ء میں شایع کی گئی، جسمیں اُس کا مشہور گیت کاڈیو کیسل بھی شامل تھا جس نے تمام ادبی حلقوں میں سکاٹ کی قوت بیان، شیریں کلامی۔ فصاحت و بلاغت اور زبان محاورے کی پاکیزگی کی دھاک بٹھا دی۔ اسی سال اُس نے دی ڈے آف دی لاسٹ منسٹرل کا پہلا بند لکھا۔ اصل میں سکاٹ کا ارادہ تھا کہ اسے اپنی پہلی کتاب میں ہی شامل کر دے، لیکن وہ اسقدر طویل ہوگیا، کہ ۱۸۰۵ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شایع کرانا پڑا۔ یہ نظم ایک خاتون لیڈی ڈال کیتھ کی تحریک سے لکھی گئی تھی جو نہایت عمدہ فسانہ کی طرز میں ہے۔ اور زبان بے حد سادہ استعمال کی گئی ہے۔ اسی لئے وہ خاص و عام میں مقبول ہوئی اور مصنف کو اس کے صلہ میں آٹھ سو پاؤنڈ وصول ہوئے۔ اُس زمانہ میں یہ بہت بڑی رقم شمار کی جاتی تھی۔

۱۸۱۸ء میں اس کی ایک اور نظم مارمین شایع ہوئی۔ اُسوقت وہ اپنے دیہاتی مسکن "اسیشل" ضلع سلکرک شائر میں رہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اڈنبرا سے تقریباً چھ میل دور لاسویڈ میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ سکاٹ اسیشل میں آٹھ سال رہا اور اس عرصہ میں اس نے انگریزی ادب کی قابل قدر خدمت کی۔

اسکاٹ نے ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۳ء تک بہت نظمیں لکھیں مثلاً دی برسپڑل آف ٹرائرمین۔ دی لیڈی لیک آف لائف آف ڈریڈن وغیرہ۔ ادبی اشغال کے علاوہ سکاٹ حاکم ضلع کے فرائض بھی دیتا رہا۔ اور کچھ مدت تک عدالت سشن کے نائب محرر کا کام بھی کیا۔ اُسوقت اُس کی آمدنی دو ہزار پونڈ سالانہ تھی۔ اور اسکی تصانیف کی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ مئی ۱۸۱۲ء میں اسے اسٹیل سے پانچ میل دُور ٹوئیڈ کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا اور وہاں مکان بنا کر رہنے لگا اس جگہ کا نام "ایبٹسفورڈ" رکھا۔ اُسوقت اُسے عدالت سے پانچ سال کی تنخواہ ملگئی تھی۔ جہاں وہ بلا تنخواہ کلرک کا کام کرتا رہا تھا۔

اسکاٹ شاعری کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک یہ کہ شعر کہنے کی کوشش میں اُس کی اپنی طاقتیں صرف ہو چکی تھیں۔ دوسرے لارڈ بائرن کی شہرت روز بروز بڑھ رہی تھی جس کی بلند پایہ نظمیں عام طور پر زیادہ مقبول ہو رہی تھیں اسکاٹ کی نظم "آقائے جزائر" کی ناکامی نے اُسے مجبور کیا کہ وہ نظم نگاری کے مشکل فن کو چھوڑ کر فسانے لکھنا شروع کرے کیونکہ اس کے خیال میں انہیں بہت آسانیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

سکاٹ کو ۱۸۱۳ء میں ملک الشعرا کا خطاب اور عہدہ پیش کیا گیا۔ لیکن اُس نے اسے منظور نہیں کیا۔ کیونکہ اُس کی خودداری نے اسے اجازت نہ دی کہ وہ دربار کے روزمرہ واقعات پر بدجہ تسیمد سے لکھے، اور اپنے ضمیر کے خلاف کسی کی تعریف و توصیف کرے۔ سکاٹ پرنس ریجنٹ کا ہمراز اور بے تکلف دوست تھا۔ جو بعد ازاں جارج چہارم کے لقب سے تخت انگلستان پر بیٹھا۔ ۱۸۲۰ء میں سکاٹ کو بیرونٹ (نواب) بنا دیا گیا۔ اور اس طرح وہ سکاٹ سے سر والٹر سکاٹ ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ اپنے عروج کی انتہائی بلندی تک پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اُسے زوال آنا شروع ہو گیا۔ سکاٹ کی آخری نظم ہیرالڈ دی ڈانٹلیس ۱۸۱۷ء میں شایع ہوئی۔ ویورلی (پہلے ناول) سیر کے بعد ناولوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا جن کے نام قلتِ جگہ کے باعث یہاں نہیں لکھے جا سکتے۔ البتہ مضمون کے خاتمہ پر درج کر دئے جائیں گے۔

سکاٹ پر ۱۸۲۶ء میں ایک بہت بڑا صدمہ آیا جس سے وہ دیوالیہ اور بالکل نادار ہو گیا کینسٹیبل کمپنی کی اتنی بڑی فرم فیل ہو گئی، جس سے سکاٹ اور بیلنٹائن کے کاروبار کو ناقابل برداشت نقصان پہونچا کیونکہ اس چھوٹی فرم کا تعلق کنسٹیبل کمپنی سے تھا۔ سکاٹ کے لئے یہ مصیبت خصوصاً تباہ کن تھی کیونکہ اس میں اُس کا حصہ ایک لاکھ سترہ ہزار پونڈ کا تھا۔

سکاٹ نے نہایت ضبط اور حوصلہ سے کام لیا۔ اُس نے اپنے قرض خواہوں سے ملکر کسی قسم کی مصالحت کی کوشش نہیں کی، بلکہ اپنی لٹریچر کی مدد سے ہی اپنے قرض کی ادائیگی کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک اس رات دن کام کیا، اور مردانہ وار ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ اس کی اس آخری کدوکاوش اور مستقل و پُرعزم سعی کو صرف موت کا زبردست ہاتھ ہی روک سکا۔

سکاٹ نے اپنا تمام اثاثہ 'ایبٹس فورڈ' فروخت کر دیا، اور خود اڈنبرا میں ایک کرایہ کے مکان میں رہائش اختیار کر لی۔ سکاٹ نے دو سال کے اندر ہی اپنے قرضہ میں سے چالیس ہزار پاؤنڈ ادا کر دیئے۔ صرف اُس کے ایک ناول [illegible] (Woodstock) [illegible]

کے دنوں میں لکھتا رہا تھا) اُسے آٹھ ہزار دو سو اٹھائیس پونڈ کی آمدنی ہوئی۔ اگر اس کی صحت برقرار رہتی، تو وہ آٹھ نو سال میں اپنے تمام قرضے سے فارغ ہو جاتا۔ اس کا ارادہ ایک غیر مغلوب اور آہنی ارادہ تھا۔ اگرچہ اُس کا دماغ رفتہ رفتہ کمزور ہو رہا تھا، اور صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن اُس نے اپنی ان تھک کوششوں کو کبھی سست نہیں ہونے دیا۔ اور .Count اُس نے اسوقت لکھے، جب اُسے رعشہ بُری طرح گھیرے تھا۔ اُس کے قرضخواہ اس سے اسقدر خوش تھے کہ انہوں نے ایبٹس فورڈ کا کتب خانہ، سامانِ آرائش اور وہاں کے نادرات اسے تحفۃً واپس کر دیے۔

رعشہ نے بڑھتے بڑھتے خطرناک صورت اختیار کر لی، اور ۱۵ فروری ۱۸۳۰ء کو سکاٹ پر فالج کا ایک سخت حملہ ہوا۔ اطبا نے اُسے کامل طور پر آرام لینے کیلئے کہا، ایک سرکاری جہاز اُس کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا۔ جس میں اُس نے بحیرۂ روم کا ایک سفر کیا، جو شروع میں سکاٹ کے لئے بہت مفید اور صحت افزا ثابت ہوا، لیکن چند دن بعد ہی اُسکی صحت نہایت سُرعت سے جواب دینے لگی۔ سکاٹ کی خواہش کے مطابق اسے فی الفور ایبٹس فورڈ پہنچا دیا گیا۔ اُس کے حواس بھی آخر آہستہ آہستہ جواب دینے لگے۔ اُسے یہی خیال رہا کہ اُس کا قرضہ تمام و کمال ادا ہو چکا ہے۔ سکاٹ نے ۱۷ ستمبر کو اس دنیا میں اپنے آخری ہوش کے عالم میں، اپنے دوست مسٹر لاک ہارٹ کو بُلایا اور اُسے مخاطب ہو کر کہا:۔

"لاک ہارٹ۔ مجھے تم سے گفتگو کرنے کے لئے شاید ایک منٹ ہی ملے۔ میرے عزیز! اچھے آدمی بنو، پاکباز رہو، مذہب کو پیشِ نظر رکھو۔ اچھے آدمی بنو۔ ...... جب تم یہاں آرام کے لئے آؤگے۔ تو اس کے علاوہ کوئی اور چیز تمہیں راحت و آرام نہیں دیگی۔ .... خدا تم سب کو برکت دے۔"

یہ اُس آخری الفاظ تھے، وہ اس کے بعد چار روز تک زندہ رہا۔ آخر خزاں کے ایک پُر رونق دن کو دوپہر کے ڈیڑھ بجے، جب کمرے کی ہر ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور Tweed کے پانی کی پتھروں پر سے چلنے کی آواز اس کے کمرے میں صاف سنائی دیتی تھی، یہ بلند پایہ ادیب دنیا سے گزر گیا۔ اور اس کے سب سے بڑے لڑکے نے اُسکو بوسہ دیا اور اُسکی آنکھیں بند کیں۔ یہ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۲ء کا دن تھا۔

غالباً یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سکاٹ کی موت کے [illegible] بعد اس کا تمام قرضہ ادا ہو چکا تھا۔ اور یہ آمدنی اس کی کتابوں [illegible]

نظمِ عروسی

ذیل کے چند اشعار اردو کے مشہور انشاپرداز سید سجاد حیدر بی۔ اے کے قلم سے نکلے ہیں۔ سید صاحب کی ایک عزیزہ صدیقہ خاتون کی شادی سر سید مرحوم کے خاندان میں سید محمدؒ مرحوم وکیل میرٹھ کے صاحبزادے سید احمد رشید سے قرار پائی تھی۔
بارات دہلی سے میرٹھ آئی تھی۔ باراتیوں میں سے ایک مجلس میں سخن گو حضرات نے بہت سے سہرے لکھ کر سنائے۔ اس مجلس میں سید سجاد حیدر بھی موجود تھے۔ کسی نے تحریک پیش کر دی کہ سید صاحب بھی کوئی سہرا لکھیں۔ بس پھر کیا تھا ساری مجلس اصرار و اشتیاق کے نعروں میں تبدیل ہو گئی۔ اور مجبوراً سید صاحب کو شاعر بننا پڑا۔ ذیل کے اشعار اُسی مجلس جبر و اختیار کی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ خیالستان میں "مرزا پھویا" والی نظم سید سجاد حیدر کے عہدِ طالب علمی کی یادگار ہے۔ اُس آغاز کی جولانیوں کے بعد انجام کی پختہ مشقی و پختہ کاری بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ تاجور

عصمت کا دُر حیا کا صدف علم و فن کا پھول
گوہر یمن کا ایسا نہ باغِ عدن کا پھول

صدقے میں اس شرف کے کہ ہے بنتِ فاطمہؓ
پاکیزہ سیرتی میں ہے وہ یاسمن کا پھول

آنکھوں میں نور اُس سے معطر مشامِ جان
وہ شمعِ انجمن بھی ہے اور انجمن کا پھول

یارب ہمیشہ زینتِ دستار ہی رہے
غربت میں جا رہا ہے ہمارے وطن کا پھول

اے سروِ باغِ حضرتِ میرِؔ جناں مقام
ہم آج تم کو دیتے ہیں اپنے چمن کا پھول

۱؎ سید احمد رشید صاحب ابن سید محمد میر مرحوم وکیل میرٹھ۔

عرب کا ایک تاریخی افسانہ

وادیٔ عقیق کی سرگذشت

وادیٔ عقیق مدینہ منورہ والوں کے لئے ایک پارک یا سیرگاہ کا کام دیتی تھی۔ خصوصاً موسم برسات میں جب سیلاب آتا اور اس کا جوبن نکھرتا تو صبح و شام اس کی بہاریں دیکھنے کو سارا مدینہ ٹوٹ پڑتا۔ اس میں نہ بوڑھوں کی خصوصیت تھی نہ بچوں کی نہ مردوں کا امتیاز تھا نہ عورتوں کا۔ کہیں نوجوانوں کی جماعت شعر پڑھنے میں مشغول نظر آتی تو اس کے قریب ہی کہیں کنواریوں کی ٹولی تفریح کرتی دکھائی پڑتی۔ لیکن ہر جگہ عربوں کی شائستگی عصمت و عفت اور پاکدامنی کے خیال اور بے لاگ میل جول کا جلوہ نظر آتا ہمارا افسانہ اس تفریح گاہ کی انہی صحبتوں کے اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب عربوں کے تمدن اور شائستگی نے دوپہر کے سورج کی طرح اپنی پوری روشنی سے بغداد سے مدینے تک کی سرزمین کو منور کر رکھا تھا۔ اور ہارون الرشید کی معارف نوازی۔ علم دوستی اور فنون لطیفہ (آرٹ) کی قدر افزائی نے سارے عرب کو علوم و فنون کا خزانہ بنا دیا تھا۔ اس مختصر مگر سچے اور تاریخی افسانے سے تم پر دوسری صدی ہجری کے شہری عربوں کی خانگی زندگی اور سوسائٹیوں کی حالت بخوبی معلوم ہو جائیگی۔ اس سے تمہیں پتہ چل جائیگا کہ مرد اور عورت آپس میں کتنی آزادی سے ملتے تھے مگر پھر بھی ان کو اپنی پاک دامنی اور عزت و آبرو کا کتنا پاس ہوتا تھا۔ اس سے تم پر یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ اُن کا علمی اور ادبی مذاق کس قدر شگفتہ تھا۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کی کس غضب کی قابلیت رکھتے تھے راگ۔ راگنیوں سے کہاں تک دلچسپی لیتے تھے اور ان کے بڑے بڑے درباروں میں گویوں اور راگیوں کی کتنی رسائی ہوتی تھی اور کتنی قدر کی جاتی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ عرب اپنی انتہائی تہذیب اور شائستگی کے زمانہ میں بھی اپنی خاندانی روایات اور باپ دادا کی ریت پر کس سختی سے قائم تھے اور خاص کر شرافت اور عزت و آبرو کے معاملہ میں تو اگلوں کے نقش قدم سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے تھے کہ وہاں کی سوسائٹیوں اور تفریح گاہوں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے کھلم کھلا میل جول اور گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھنے اُٹھنے اور بات چیت کرنے کے باوجود ان کا میل ملاپ نہ کسی کو کھٹکتا تھا اور نہ کوئی اُن کے چال چلن کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ کرتا تھا۔ مگر جب یہ ملنا جُلنا اہلِ عرب کے نقطۂ نظر سے اور اُن کے انداز سے بہت زیادہ ہو جاتا اور ملنے والوں کی آنکھوں میں عشق و محبت کا رنگ جھلکنے لگتا تو دوسروں کی نگاہیں بھی اُٹھنے لگتیں اور سارے شہر میں اسی کے چرچے ہونے لگتے اور اس کے بعد لڑکی کے رشتہ دار اپنی غیرت خودداری اور اپنی بے عزتی کے خیال سے اس کی شادی اُس شخص سے ہرگز نہ کرتے جس کی محبت کا راز عام طور پر فاش ہو چکا ہو۔ کیونکہ اُن کا گمان تھا کہ اس سے شادی کر دینا گویا خود ہی لوگوں کی بدظنی کی تصدیق اور اُن کے شک کو خود ہی سچا کر دینا ہے۔ یہ عربوں کا ایک ایسا رواج تھا جس نے ہزاروں نوجوانوں کو اُٹھتی جوانیوں ہی میں قبر کے گھاٹ اُتار دیا اور ہزاروں حسین کنواریوں کو عشق کی آگ میں جلا جلا کر بھسم کر دیا۔ لیکن اس رواج کی پاسداری کے سامنے اُن کو نوجوانوں کے اس بدنصیب گروہ پر کبھی بھی رحم نہ آیا۔ شاید ہی کبھی کسی عاشق کا نصیبا جاگتا اور بادشاہ یا کسی دوسرے با اثر شخص کو اس کی پاک محبت اور آپے سے گذر جانے کی خبر لگ جاتی اور اُسے اسکی جوانی پر رحم آ جاتا۔ تو وہ اپنے اثر سے کام لیکر اس کی محبوبہ کے رشتہ داروں کو اُس سے شادی کر دینے پر تیار کر دیتا۔ عام طور پر عربوں کی اس عجیب و غریب خصلت اور بے عزتی کے ڈر اور اُن کی اس سنگدلی نے مدتوں اپنے نوجوانوں کا خون بہاتے رہنے کے بعد انتہائی شائستگی کے زمانے میں اس بارے میں بھی نرم نہیں ہونے دیا۔

بہرحال یہ افسانہ اُس زمانے کے عربوں کی شائستگی۔ اُن کی شریفانہ محبت اُن کی خودداری اُن کی عصمت اور آبرو کی نگہداشت اُن کے جذبات کی رقت اور اُن کی طبیعت کی نرمی اُن کی ہر وقت اُن کی داد و دہش اور راگنیوں سے اُن کے دلچسپی لینے کی بہترین مثال ہے عربی ادب کے بڑے بڑے محققوں نے اپنی کتابوں میں اس [illegible] کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کا

سب سے بڑا ماخذ کتاب "الاغانی" اور "نہایت الادب" ہے۔ اس کا راوی معبد یقطینی ہے جو ہارون الرشید کا خاص مغنی اور اپنے فن کا بہت بڑا ماہر تھا

معبد یقطینی بیان کرتا ہے کہ:—

بغداد میں برکیوں کے محلہ میں میرا خوبصورت اور پاکیزہ مکان برکیوں کی بڑی بڑی اونچی کوٹھیوں سے بھی زیادہ شاندار معلوم ہوتا تھا۔ اور میری گھریلو پھلواری اُن کے بڑے بڑے شاہی باغوں سے بھی زیادہ دلکش نظر آتی تھی۔ میں ایک دن صبح کو اپنے مکان کے ایک جھروکے میں بیٹھا ہوا اپنی پھلواری کے انگاروں جیسے سُرخ سُرخ پھولوں سے آنکھیں سینک رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی میرا غلام گیا اور اُس نے آکر بتایا کہ ایک شریف سا نوجوان آپ سے ملنا چاہتا ہے میں نے اجازت دیدی اور اپنے سامنے مردانہ حسن کا ایسا نمونہ کھڑا دیکھا جس سے زیادہ خوبصورت۔ زیادہ پاکیزہ زیادہ خوش پوش اور جس سے زیادہ فیشن ایبل اس قدر دبلا پتلا اور بیمار سا ہونیکی صورت میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سلام کے بعد اُس نے کہا کہ مدت سے آپ سے ملنے کی تمنا تھی مگر اس کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی۔ مجھے آپ سے ایک بہت بڑا کام ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟

اُس نے سر اُٹھایا اور مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ میرے بشرے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کی بات مانوں گا یا نہیں۔ پھر اپنے بیگ سے تین سو اشرفیاں نکال کر میرے آگے ڈالدیں اور کہا کہ آپ کی عنایت ہوگی اگر اسے قبول فرمالیں اور میرے ان دو شعروں کو اپنے راگ میں گا کر مجھے سنا دیں

واللہ یا طرفی الجانی علی بدنی ۔۔۔ لتطفئن بدمعی لوعۃ الحزنی

او لا بوحن حتی یحجبوا سکنی ۔۔۔ فلا اراہ وقد ادرجت فی کفنی

اے میری ظالم آنکھ تو نے ہی میری جان پر ستم ڈھائے اب خدا کیواسطے تو اس عشق کی آگ کو میرے آنسوؤں سے بجھاتی رہ ورنہ میں اپنی اندرونی کیفیت کو ظاہر کردوں گا تو لوگ اس کو پردے میں چھپالیں گے جو میرے لئے باعث تسکین ہے۔ اور پھر میں اُسے مرتے دم تک نہ دیکھ سکوں گا۔

میں نے کہا کہ بہت بہتر لیکن اس کا شعر اور دھن نکالنے کیلئے مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس پر وہ بڑا خوش ہوا اور بہت شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی سی کوشش میں میں نے دھن بنالیا اور اُس کے پاس آکر سنانے لگا۔ میں ابھی گا ہی رہا تھا کہ وہ گر کر ایسا بیہوش ہوا کہ میں نے سمجھا وہ مر گیا۔ پھر تو میں بڑا گھبرایا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آئی۔ اور اس کو ہوش میں لانیکی تدبیریں کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے اُسے ہوش آیا اور وہ ذرا سنبھلا۔ تو پھر گانے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا خدا کی پناہ اب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ تمہاری خوفناک چیخ ابتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور تمہاری ہیبتناک غشی سے اب تک میرا دل لرز رہا ہے۔ خدا کیلئے اپنی حالت پر رحم کرو اور مجھے معاف رکھو۔ کیونکہ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کہیں تمہاری روح نہ پرواز کر جائے۔ اُس نے کہا کہ افسوس! میں اتنا خوش قسمت کہاں ہوں اور میری عاجزی اور خوشامد اس قدر کی کہ آخر مجھے رحم آگیا اور میں نے پھر گانا شروع کیا۔ وہ پہلی بار سے بھی زیادہ تڑپنے لگا اور اتنے زور سے چیخ مار کر بیہوش ہوگیا۔ کہ میں نے سمجھ لیا کہ بس اب کے اس کی جان نکل گئی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میرے خدمت گار بھی گھبرا اُٹھے کہ یہ کیا ہوا؟ لخلخہ سنگھایا گیا۔ مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور بیسیوں تدبیریں کی گئیں تو اُسے کچھ کچھ ہوش آنے لگا اور بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آپے میں آیا تو اُس کی دی ہوئی تمام نقدی میں نے اُس کے آگے ڈالدی اور کہا کہ صاحبزادے اپنی جان پر نہیں تو خدارا مجھ پر رحم کھاؤ۔ اور اپنے خون سے میرے ہاتھ رنگین نہ کرو۔ میں نے تمہاری بات رد نہیں کی۔ اور تمہاری تمنا پوری کردی۔ اب میری جان چھوڑو۔ اپنی یہ اشرفیاں سنبھالو۔ اور اپنا راستہ لو۔ اُس نے کہا کہ آہ مجھے اشرفیوں کی پروا نہیں ہے۔ لیجئے اتنی ہی اور حاضر ہیں۔ پھر اُس نے تین سو اشرفیاں اور نکالیں اور میرے سامنے رکھکر کہا کہ بس ایک بار اور سنا دیجئے۔ اگر میری جان بھی نکل جائے تو آپ کیلئے میرا خون معاف ہے۔

اس عجیب شخص کی حالت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اور اشرفیوں پر کچھ لالچ بھی آگیا۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ کیا اس کا دس گنا بھی نہیں لے سکتا اور نہ پھر گا سکتا ہوں۔ مگر تین شرطوں پر۔ پہلی شرط یہ ہے کہ آج دن بھر یہیں رہو اور آج کی میری دعوت قبول کرو۔ دوسری یہ ہے کہ تھوڑی سی نبیذ پی لو کہ تمہارا غم غلط ہو اور طبیعت میں فرحت اور دل میں قوت آئے اور تمہارا چیخنا بند ہو۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ اپنا راز اور اپنا قصہ مجھ سے بیان کردو۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا کہ خیر آپ جو فرمائیں وہ منظور ہے۔ میں نے اشرفیاں رکھ لیں اور کھانا منگایا۔ برائے نام اُس نے بھی کھایا۔ پھر نبیذ منگائی اور چند پیالے اُس نے پی لئے تو میں نے اُس کے شعر کے ہم معنی دوسروں کے اشعار گانے شروع کئے۔ وہ نبیذ پیتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا آخر اُس نے کہا کہ شرط پوری کیجئے۔ میں نے اُس کا شعر گانا شروع کیا۔ پھر تو وہ بہت ہی رویا بہت ہی بلبلایا۔ مگر بیہوش نہیں ہوا اور نہ وہ خوفناک چیخ سننے میں آئی۔ اس کا اندازہ کرکے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ نبیذ نے اس کو کچھ تسکین دیدی ہے اور اس کا دل قوی کر دیا ہے

اور میں نے اس کے شکریئے بار بار ادا کرنے کے بعد اُس سے کہا کہ تم اپنا راز نہیں بیان کرو گے؟ میں سننے کا بےحد مشتاق ہوں۔

اُس نے کہا اچھا سنئے! میں مدینے منورہ کا رہنے والا ہوں۔ میری بدبختی آئی کہ موسم بہار میں ایک دن اپنے ہم سن دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے وادی عقیق میں جانے کی صلاح ٹھیری اور مشورہ ہوا کہ آج ہر شخص اپنے اچھے سے اچھے کپڑے زیب تن کرے اور اپنے سب سے اچھے گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ یہ صلاح کر کے ہماری پارٹی بڑی شان و شوکت اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے وادی عقیق میں پہنچی۔ وادی میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ دریائے فرات کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھی اور جھاگ پر جھاگ پھینک رہی تھی۔ ہم اُس کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہماری آنکھیں اپنی دلچسپیوں کی تلاش میں مشغول ہو گئیں۔ ساری کی ساری وادی اُس کی بہاریں لوٹنے والوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس میں شرفا، غلام، لونڈیاں، نقاب ڈالے ہوئے اور بےنقاب عورتیں اور لڑکیاں سب یکساں طور پر شریک تھیں۔ ہم بیٹھے آنکھیں ٹھنڈی کر رہے تھے کہ ناگاہ میری نظر چند نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی پر جا پڑی جو سیر کرتی ہوئی آ کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ اور ان میں سے ایک لڑکی کو جو چشمے کے کنارے کے نرگل کی طرح شاداب، تر و تازہ و سیدھے قد کی تھی ایسی جادو بھری آنکھوں سے میں نے اپنی طرف دیکھتے دیکھا کہ ناممکن تھا اُن کو کوئی دیکھ لے اور پلک جھپکانے سے پہلے گھائل نہ ہو جائے۔

ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے اور وہ بھی بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ سارے لوگ چلے گئے تو وہ بھی چلی گئیں اور ہم بھی لوٹ آئے۔ میں اپنے گھر پہنچا مگر کھویا ہوا اور پہلو میں ایسا کاری زخم لیکر جو آج تک بھر نہیں سکا۔ دوسرے دن میں پھر "عقیق" جا پہنچا۔ مگر نہ وہ نظر آئی نہ اُس کی سہیلیاں ہی کہیں دکھائی پڑیں۔ اب مدینے کا چکر کاٹنا شروع کیا۔ شہر شہر بازار بازار میں مارا مارا پھرا۔ گلی گلی پھرتا رہا وادی عقیق کا چپہ چپہ چھان مارا۔ نہ معلوم اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نے اُچک لیا کہ کہیں بھی اُس کی صورت نظر نہ آئی۔ میری ساری تدبیریں بیکار گئیں اور اس کا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ میری ہمت ٹوٹ گئی اور اندرونی آگ کی تپش نے مجھے ایسا جلایا کہ میں بستر سے لگ گیا اور ہر ایک میری زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ایسی حالت میں تقریباً ایک سال گذر چکا تھا کہ ایک عورت میری انا جو مجھ سے بےحد محبت کرتی تھی، میرے پاس آئی اور میری حالت دیکھ کر بےچین ہو گئی۔ وہ تنہائی میں میرے پاس آئی اور اس بیماری کی اصلی وجہ پوچھنے لگی۔ مجھے پہلے تو کہنے والوں پر اور اہل قبیلہ پر اپنے راز کے کھل جانے اور اپنی رسوائی کے خوف سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ مگر جب اس نے بہت دباؤ ڈالا اور

وعدہ کیا اور میرے معاملہ میں کوشش کرنے کا یقین دلایا تو میں نے اپنا پورا قصہ اُس کو سنا دیا۔ اُس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے موسم بہار پہنچ ہی گیا ہے اور یہ سال بھی سرسبزی اور اچھے نچھتروں کا ہے پھر بارش ہونا کوئی بعید نہیں ہے وادی عقیق اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود ہی ہے۔ ذرا بارش ہو جائے تو وہاں چلنا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اُمید ہے کہ وہ لڑکیاں بھی آئیں گی۔ اگر وہ آ گئیں اور میں نے اُسکو دیکھ لیا تو میں اس کا پیچھا کر کے مکان معلوم کر لوں گی۔ اور پھر تم کو اُس سے ملانے اور شادی کرانے کی کوشش کروں گی۔ اپنی مہربان انا کی باتوں میں کچھ ایسا اثر پایا کہ میں واقعی مطمئن ہو گیا اور اس پر مجھے اس قدر بھروسہ ہو گیا کہ میری گھبراہٹ میں بالکل سکون ہو گیا۔ میں روز بروز اچھا ہونے لگا اور چند ہی دنوں میں بالکل اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اُدھر میں نے غسل صحت کیا اُدھر بارش ہوئی اور وادی عقیق میں سیلاب آ گیا۔

پھر کیا تھا۔ عقیق کی طرف لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور ٹھیک وہیں جا کر بیٹھا جہاں گذشتہ سال بیٹھا تھا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ وہ لڑکیاں بھی اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے اپنی انا کو اشارے سے بتا دیا وہ سمجھ گئی اور ہم سے کچھ دور جا بیٹھی۔ میں نے بلند آواز میں اپنے دوستوں سے کہا کہ کسی نے کتنا اچھا کہا ہے ؎

[illegible] [illegible] أقصد القلب [illegible]　　وقلنا [illegible]

میرے دل کو نشانہ بنا کر اُس نے تیر چلایا اور اس میں گہرا اور کاری زخم چھوڑ کر چل دی۔

اُس نے اپنی لونڈی سے کچھ کہا اور وہ اپنی ساتھ والیوں سے کہنے لگی [illegible] کہنے والے نے اچھا کہا مگر اسی نے اس کا جواب کتنا اچھا دیا ہے ؎

[illegible] مالتنکو فصبر [illegible]　　[illegible] [illegible]

ہو بادی [illegible] ستاری [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
کوئی راہ نکل آئے

میں نے اس [illegible] [illegible]
[illegible] ایسی بات [illegible]
پھر جب سب لوگ [illegible]
[illegible] کہ اُس کا [illegible]
[illegible] بھی [illegible]
[illegible] [illegible]

کبھی ملاقات بھی ہو جاتی مگر ہم برابر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اخلاقی دائرے کے اندر رہے اُس کے علم و فضل کی وجہ سے میری محبت اور بھی بڑھ گئی اور میں نے اس سے محبت اور شادی کا وعدہ کرا لیا مگر نہ معلوم ہماری محبت کا راز کیسے ظاہر ہو گیا اور نہ جانے لوگوں کو ہماری باتیں کیسے معلوم ہو گئیں کہ ہماری کیفیت مدینے کی گلی گلی میں مشہور ہو گئی۔ اور اُس کے رشتہ دار اُس کی نگرانی کرنے لگے اس کے والدین نے اس پر سختی کرنی شروع کر دی اور میں ہزار کوششوں کے باوجود اس سے نہ مل سکا۔

میں نے عاجز آ کر اپنی ساری کیفیت اپنے والد سے بیان کر دی اور خواہش کی کہ اس کے ہاں میری شادی کا پیغام لیکر جائیں۔ میری امید کے خلاف وہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور اپنے قبیلے کے معززین کے ساتھ منگنی کیواسطے اس کے ہاں گئے اور اُس کے والد کو پیغام دیا اُس نے کہا کہ اگر یہی خواہش تم نے دونوں کے تعلقات کے مشہور ہونے سے پہلے کی ہوتی تو میں شوق سے شادی کر دیتا۔ لیکن اب تو یہ میری لڑکی کو رسوا کر چکا۔ اب میں اس سے شادی کر کے لوگوں کی افواہ کو سچا نہیں بنا سکتا تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہارے لڑکے کی اس حرکت سے میری شرافت کو کتنا بٹہ لگا ہے اور میری عزت و آبرو کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ میرے ساتھیوں نے جواب دیا کہ ہم اس میں نہ تمہاری عزت پر کسی قسم کی آنچ آتی دیکھتے ہیں اور نہ تمہاری شرافت پر ہم کو کوئی داغ نظر آتا ہے۔ ہماری لڑکیاں کھلے بندوں لڑکوں سے بات چیت کرتی ہی ہیں اور ہم اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ اس کا یقین رکھو کہ ہم کو نہ تمہاری لڑکی کی پاکدامنی میں کوئی شبہ ہے اور نہ اپنے لڑکے پر کسی قسم کا شک ہے۔ تم خواہ مخواہ وہم میں کیوں پڑتے ہو۔ خود سوچو عوام کی ہوائیوں کا کیا اعتبار ہے۔ اگر تم راضی ہو جاؤ تو ساری افواہ دب دبا جائے گی۔ وہ سر نیچا کئے ہوئے سوچتے سوچتے بولا کہ میں نے بہت غور کیا۔ لیکن اس شہرت اور تمام لوگوں کو اس کا علم ہو جانے کے بعد اس سے شادی کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور اگر میں قبول بھی کر لوں تو اس پردے کے پیچھے والی اس کو نہیں مانے گی۔ اُس نے اُس پردے کی طرف اشارہ کیا جس کے پیچھے اُس کی بیوی بیٹھی تھی میں نے اپنے خاندان والوں کو بتایا۔ کیا کہ اُس کی بیوی سے سفارش کریں۔ مگر اُس نے اُن کی پوری بات سننے سے پہلے ہی اپنے شوہر سے بھی زیادہ سخت جواب دیا اور صاف انکار کر دیا۔ آخر ہم ناامید ہو کر چلے آئے۔

اس کے بعد میری حالت پھر بگڑنے لگی اور چند ہی دنوں میں بُری سے بُری ہو گئی میرے والد چاہتے تھے کہ میری شادی کسی دوسری جگہ کر دیں کہ میرا دل بہل جائے اور اس کا خیال چھوٹ جائے۔ مگر مجھ کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس لئے میرے دل میں آیا کہ والد کی خفگی اور لوگوں کی چہ میگوئیوں سے بچنے کے لئے اس وقت کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ لیکن اشتیاق تھا کہ اس سے ایکبار آخری ملاقات ہو جائے اور اس کی بہتیری تدبیریں کیں۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری طرح اس کی بھی صحت خراب ہو گئی اور اس کے والدین نے اسے مدینے سے باہر کسی بدوی (عرب کے دیہاتی) رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح وہاں اپنے سفر اور اپنے عہد پر قائم رہنے اور اس کے دیکھنے کا مشتاق ہونے کی خبر اُسے پہنچا دی وہ اس کو سُنکر کانپ گئی اپنے سفر کی صبح کو مدینے کے باہر اُن خیموں کے قریب جہاں وہ مقیم تھی میں نے آخری بار اُسے دیکھا ..... معبد کہتا ہے کہ نوجوان یہاں پہنچکر رونے لگا۔ پھر کہا۔

تبدت لنا مذعورة من خبائها   وناظرها باللؤلؤ الرطب دامع
اشارت باطراف البنان وودعت   واومت بعينيها متى انت راجع

"وہ ڈرتی ڈرتی اپنے خیمے سے نکل کر ایسی حالت میں میرے سامنے آئی
کہ اس کی آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو ٹپک رہے تھے۔
اُس نے اپنی انگلیوں کے اشارے سے مجھے رخصت کیا اور آنکھوں
کے اشارے سے پوچھا کہ واپس کب آؤ گے؟"

یہاں پہنچکر نوجوان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس قدر رو دیا کہ مجھے بھی رونا آ گیا میں نے اُس کو سمجھایا۔ دلاسا دیا اور مشورہ دیا کہ میرے پڑوس میں رہو اُس نے منظور کر لیا اور میرے پاس ہی ایک مکان میں رہنے لگا جس میں ہم دونوں ہی رہ سکتے تھے۔ میں برابر اس کے بارے میں سوچتا رہا آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی اور اُمید بندھی کہ اب اس کا کام ہو جائیگا

ہارون رشید وزیر جعفر برمکی کے ہاں کھانے پینے کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ مجھ سے گانے کی فرمایش ہوئی اور میں نے اپنے نوجوان کا یہی شعر اسی دھن میں گانا شروع کیا۔ جعفر سُن کر مست ہو گیا اور بول اُٹھا کہ بھئی یہ بیت تو کسی خاص واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ واقعہ سناؤ۔ مجھے اپنا تیر نشانہ پر لگنے کی بڑی خوشی ہوئی۔ اور میں نے نوجوان کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جعفر بہت متاثر ہوا اور اسی وقت نوجوان کو بلایا گیا۔ وہ آ گیا۔ تو اُس کی زبانی سارا قصہ پھر سُنا اور کہا کہ اب تمہاری محبوبہ سے تمہاری شادی کرا دینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ یہ سُنکر

نوجوان کی باچھیں کھل گئیں اور مارے خوشی کے اُس کو اس کا یقین آنا مشکل ہو گیا۔

دوسرے دن جعفر خلیفہ ہارون الرشید کے ہاں گیا۔ تو اُس نوجوان کی پوری سرگذشت اُسے سُنائی خلیفہ نے ہم کو فوراً حاضر کرنیکا حکم دیا اور ہم دونوں پیش کئے گئے۔ مجھے وہی شعر گانے کا فرمان ملا میں نے گانا شروع کیا۔ خلیفہ جھومنے لگا۔ پھر نوجوان سے اس کی داستان دہروائی اور اس کی دلجوئی کی۔ اس کی محبوبہ کو اُس کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ دارالخلافتہ میں حاضر کرنے کے واسطے اُسی وقت حجاز کے گورنر کے نام پروانہ جاری کر دیا۔ ہم دربار سے واپس ہوئے تو معلوم ہوتا تھا کہ نوجوان مارے خوشی کے آسمان پر اُڑ جائیگا۔ بار بار مجھ سے پوچھتا کہ کیا واقعی میری محبوبہ مجھکو مل جائے گی ؟ اور کیا اس کا باپ اس کو قبول کر لیگا ؟۔

نوجوان کے شعر میری دھن کے ساتھ بغداد کی گلی گلی میں مشہور ہو گئے اور ہر جگہ اس قصے کے چرچے ہونے لگے۔ اور آخر صرف اتنے ہی دنوں میں جتنے میں بغداد سے مدینے منورہ اور وہاں سے بغداد جلدی آ سکتے ہیں صرف ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب دارالخلافتہ میں لائے گئے۔ دربار میں لڑکی کے باپ کی طلبی ہوئی۔ وہ خلیفہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ مگر ڈر کے مارے اس غریب کی جان نکلی جا رہی تھی خلیفہ نے اس کی لڑکی کے لئے نوجوان کا پیغام دیا۔ اور اُس کو قسم دلائی کہ اُسے خوشی سے قبول کر لے۔ اُس نے قبول کر لیا اور اُسی وقت اُن کا نکاح ہو گیا۔ خلیفہ نے اس کو ایک ہزار اشرفیاں جہیز دینے کے لئے بخشیں۔ اور ایک ہزار راہ خرچ کے واسطے عطا کیں۔ میرے اور نوجوان کے لئے بھی ہزار ہزار اشرفیوں کا حکم صادر فرمایا۔ پھر ہم پر جعفر کی طرف سے بھی اتنی ہی بخشش ہوئی۔

دونوں میں سے کسی کو بھی اُمید نہ تھی۔ مگر مدتوں کی جُدائی کے صدمے سہنے اور فراق کی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے مل گئے۔ اور پھر ہمارے مدنی جوان نے بغداد سے جانا پسند نہ کیا۔ اور جعفر کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔

اس افسانے کو پڑھ کر عربوں کی اخلاقی بڑائی۔ اُن کے ترقی یافتہ میلانِ طبع، پاکیزہ طبیعت، اُن کے نرم جذبات۔ وفاداری اور پاکدامنی کا مجموعہ اُن کی شریفانہ اور سچی محبت اور اُن کی خودداری اور عزت و آبرو کی ضرورت سے زیادہ پاسداری پر اگر تمہیں تعجب ہو رہا ہے تو ہو۔ اور ایک عاشق کی مصیبت دُور کرنے میں ایک راگی ایک وزیر ایک بادشاہ کو یکساں حصہ لینے پر تمہیں حیرت ہو رہی ہو تو ہو۔ لیکن اس پر بالکل تعجب نہ کرو کہ ہارون رشید نے خلیفہ ہو کر اس معمولی سی بات پر کس قدر توجہ کی کیونکہ خلفاء کی عنایت۔ رعایا پر ان کی توجہ اور ہمیشہ رعیت کی حالت معلوم کرتے رہنے اور ان کی بھلائی اور بہتری کی فکر میں لگے رہنے کی یہ کیفیت تھی اپنے دربار کے خواص کو اکثر یوں مخاطب کرتے تھے کہ ہم نے تم کو اپنے دربار میں اس لئے جگہ دی ہے کہ تم اپنے سے کم رتبہ والوں کو اپنی مجلسوں میں جگہ دو۔ تم کو چاہیئے کہ اُن لوگوں کی ضرورتوں کو ہم تک پہنچاؤ جو ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ہے حکومت کا وہ اعلےٰ نمونہ اور بہترین مثال جس پر اپنی اعلےٰ شائستگی کے زمانہ میں عربوں کی حکومت چل رہی ہے۔

محمد صدیق بہاری

خیالِ یار

کیونکر رکھوں نہ دل میں تجھو ای خیال یار ۔۔۔ میرے لیئے ہے موجب صبر و قرار تو
میں تیرا غمگسار ہوں تو میرا غمگسار ۔۔۔ میں تیرا یار، مرا یار غار تو
بن بن کے اضطراب تمنائے بازدید ۔۔۔ صد بار لے گیا ہے سر رہگذار تو
پھونکی ہے تو نے آتشِ گل لالہ زار میں ۔۔۔ ہے نالۂ ہزار سر شاخسار تو
دشتِ جنوں میں ہم قدمِ قیس تھا اگر ۔۔۔ تھا دل میں کوہکن کے سر کوہسار تو
بے درد سنگدل جنھیں کہتا ہی اک جہاں ۔۔۔ پنہاں ہے ان کے دل میں بہ رنگ شرار تو
شوق تلاش میں لیئے پھرتا ہے جا بجا ۔۔۔ ہے رہبر وفائے غریب الدیار تو

(میلارام وفا)

ولایات متحدہ امریکہ کی بنیادی سیاست

جیمس منرو کا قانون

جنگ عظیم کے زمانہ میں آئین منرو کے متعلق اخباروں اور سوسائیٹیوں میں جو کچھ بحث ہوتی رہی ہے اسکو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم اس مسئلہ کی اہمیت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔

آج امریکہ کی خارجی سیاست کی بنیاد جس قانون پر ہے اسکو ایک صدی ہوگئی ہے کہ جاری ہُوا ہے۔ یہ قانون امریکہ کا بنیادی قانون ہے۔ اس کا بنانے والا ولایات متحدہ کا پانچواں صدر جیمس منرو ہے۔ اسی کے نام کی مناسبت سے یہ قانون آئین منروؔ کے نام سے مشہور ہے۔

جیمس منرو (Manroe) اگرچہ ایک بڑھئی کا لڑکا تھا، لیکن بچپن ہی سے اس میں لیاقت کے آثار پائے جاتے تھے۔

جس زمانہ میں فرانس کے مشہور انقلابی روبسپیئر (کو [illegible] میں قتل کیا گیا تو اسوقت آزادی امریکہ کا حقیقی بانی واشنگٹن ولایات متحدہ امریکہ کی جمہوریت کا پریذیڈنٹ تھا۔

واشنگٹن کا خیال تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ فرانس میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں کسی ایسے شخص کو وہاں کا سفیر مقرر کیا جائے جو اعلیٰ پایہ کی سیاسی قابلیت کا مالک ہو۔

چنانچہ اس اہم خدمت کے لئے جیمس منرو کا انتخاب کیا گیا اور اسکو پیرس میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ اسوقت منرو کی عمر چھتیس سال کی تھی اور وہ امریکہ کی پارلیمنٹ کا ممبر کا تھا۔

چونکہ منرو انقلاب فرانس کا حامی تھا اور جو نئے اصول دُنیا میں پیدا ہو رہے تھے اُن کا فریفتہ تھا اسلئے انگریزی حکومت نے دولت امریکہ سے مطالبہ کیا کہ منرو کو واپس بلا لیا جائے۔ چنانچہ وہ وہاں سے واپس بلا لیا گیا اس کے بعد منرو یورپ اور امریکہ میں مختلف معزز عہدوں پر کام کرتا رہا۔

۱۲۳۳ھ میں نائب وزیر خارجہ مقرر ہُوا۔ اس کے تین سال بعد وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ بالآخر ۴ ربیع الاول ۱۲۳۲ھ میں امریکہ کا صدر جمہوریہ منتخب ہوگیا ہے۔

جب منرو اپنے عہدہ کی مدت چار سال ختم کر چکا تو ۱۲۳۵ھ میں صرف ایک رائے کی مخالفت سے دوبارہ صدر جمہوریہ منتخب ہوگیا۔ اسکا دوبارہ انتخاب اس کی سیاسی قابلیت اور جمہوری امور میں اس کی بےنظیر لیاقت کیوجہ سے عمل میں آیا۔

اس نے اپنے زمانۂ صدارت میں عام پبلک کے کاموں میں بہت حصّہ لیا اور ملکی ترقیات کے لئے اس نے جس سرگرمی سے کام کیا اس نے اسکو ملک میں بہت مقبول بنا دیا۔

جیمس منرو کا یہ ایک زبردست کارنامہ تھا کہ اس نے ملک کی مختلف پارٹیوں میں جو شدید اختلاف تھا اسکو تقریباً ختم کر دیا۔ چنانچہ جب منرو ولایات شمال مشرقی کی سیاحت کے لئے گیا تو وہاں جمہوریت پسندوں نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ حالانکہ منرو کا تعلق ڈیموکریٹ پارٹی سے تھا۔ اور جمہوریت پسندوں اور ڈیموکریٹ پارٹی میں اس سے پہلے شدید اختلاف رہ چکا تھا۔

اسی زمانہ میں جنوبی امریکہ جو اسپین کے مقبوضات میں سے تھا۔ ایک سخت کشمکش کے بعد اس کے قبضہ سے آزاد ہوگیا۔ اور اس نے اپنی ایک مستقل جمہوری سلطنت کی بنیاد رکھکر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ہرممکن قوت کو تیار کرلیا۔

اگرچہ جمہوریت ممالک متحدہ امریکہ ممالک جنوبی کی کامیابی سے بہت ہی خوش تھی لیکن وہ ایک عرصہ تک ان کی آزادی کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتی رہی۔

لیکن ایک عرصہ کے تردد کے بعد ۱۲۳۷ھ میں ان کی آزادی و استقلال کو تسلیم کر لیا گیا اور جانبین سے دونوں دارالحکومتوں میں سفراء مقرر کر دئے گئے۔

ایک سال بعد دولت متحدہ شمالی امریکہ کو معلوم ہوا کہ یورپ کی،

مختلف حکومتوں نے جن میں اٹلی۔ جرمنی۔ فرانس اور روس وغیرہ شامل تھے "اتحادِ مقدس" کے نام سے ایک اہم معاہدہ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ ممالکِ جنوبی کو دوبارہ آزادی کی آب وہوا سے محروم کر دیا جائے۔

مسٹر روٹ (RUTH) نے جو انگلینڈ میں امریکن سفیر تھا اپنی حکومت کو ان حالات کے متعلق ایک مفصل رپورٹ ارسال کی جس میں اس نے ان ممالک پر طعنہ زنی کرتے ہوئے لکھا۔

"کہ یورپ کی مہذب حکومتیں انصاف وانتظام کی جو شدید پیاس رکھتی ہیں اسکو تسکین دینے کے لئے وہ مجبور ہو گئی ہیں کہ نوخیز اور بے تجربہ امریکہ کو طوفان خطرات سے نجات دینے کے لئے سرگرمی سے میدان میں آجائیں"۔

جب امریکہ میں یہ خبر پہونچی تو وہاں کے عوام میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور ہر طرف اس مسئلہ کے متعلق ایک زبردست ایجیٹیشن شروع ہو گیا۔

جیمس منرو نے مسٹر جفرسن (Jefferson) سے جو امریکہ کا ایکسپرسیڈنٹ تھا اور بہت مشہور مدبر تھا۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق مشورہ کیا اور اس سے دریافت کیا کہ اسوقت متحدہ امریکہ کی روش کیسی ہونی چاہیئے۔

جفرسن نے اس کا جواب دیا اور نہایت دانشمندی سے حسب ذیل امور کا اظہار کیا۔

اس نے کہا کہ ہمیں سب سے زیادہ جس چیز کا خیال رکھنا چاہیئے وہ ہمارا باہمی اتحاد واتفاق ہے۔ ممالک امریکہ کے تمام حصوں کو اسطرح وابستہ رہنا چاہیئے کہ ان کو کوئی نہ جدا کر سکے کیونکہ اگر امریکہ میں یورپ کی طرح اختلاف پیدا ہوا تو یہ ہمارے لئے درست نہ ہوگا۔

دوسرے یہ کہ ہم کو کسیطرح بھی امریکہ کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کو گوارا نہ کرنا چاہیئے۔

چنانچہ جیمس منرو نے ۷ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ میں اپنی سالانہ تقریر میں ممالک متحدہ کی پارلیمنٹ کے سامنے نہایت زوردار الفاظ میں اعلان کیا۔

"کہ جو حکومتیں آزادی کی دولت سے مالا مال ہو چکی ہیں ہم ان کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے"۔

اگر یورپ کی کسی حکومت نے یہ قصد کیا کہ کسی آزاد حکومت کو اپنے قبضہ تصرف میں لاکر اسکو آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا جائے تو اسکو سمجھنا چاہیئے کہ یہ طرز [illegible] ہمارے لئے

کھلم کھلا دشمنی کا اعلان ہوگا"۔

یہ قانون جو نہایت اہمیت رکھتا تھا اور جو توجہ کا محتاج تھا بہت عرصہ تک بے نیازی کا مرکز بنا رہا۔ یہانتک کہ امریکہ کی پارلیمنٹ نے بھی بحیثیت قانون اس کو پاس نہیں کیا۔

لیکن ایک مدت کے بعد پارلیمنٹ نے اسکو ولایات متحدہ امریکہ کے بنیادی قانون کے طور پر منظور کر لیا۔

پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد آہستہ آہستہ مختلف ملکوں نے بھی سرکاری طور پر اس کی تصدیق کر دی۔

چنانچہ جب فرانس نے ۱۲۸۴ھ میں شمالی امریکہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے اسکو اپنے ماتحت کرنا چاہا تو ولایات متحدہ کی حکومت نے منرو کے اسی قانون کے مطابق حکومت فرانس کو سخت تنبیہ کی اور حکومت فرانس کو مجبور کر دیا کہ وہ مقبوضہ علاقہ سے علیحدگی اختیار کرے۔

اسی طرح جب ۱۳۱۳ھ میں حکومت انگریزی اور ولایت وینزویلا (جو جنوبی امریکہ کا ایک حصہ ہے) میں تقرر سرحد کے متعلق اختلاف پیدا ہوا تو حکومت متحدہ نے دولت انگریزی کو اسکا بالکل موقع نہیں دیا کہ وہ اس معاملہ میں خود سرانہ روش اختیار کرے اور یہ کہا گیا کہ اس قضیہ کا فیصلہ کیلئے ممالک متحدہ کی حکومت ایک خاص ہیئت مقرر کریگی جو تحقیق کے بعد سرحد کے تعین کا فیصلہ کریگی۔

انگریزی حکومت نے ابتداً اس امر کو تسلیم کرنے میں بہت پس و پیش کیا لیکن دولت متحدہ برابر اس پر زور دیتی رہی کہ حکومت انگریزی آئین منرو کو دولت امریکہ کے بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرے اور اس امر کی تصدیق کرے کہ امریکہ کے معاملات کے تصفیہ کا حق خود امریکہ کو حاصل ہے۔

چنانچہ انگریزی حکومت مجبور ہوئی کہ سر تسلیم خم کرے۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۲ھ میں حکومت انگریزی اور ولایات متحدہ امریکہ میں ایک معاہدہ ہوا جسمیں آئین منرو کو قبول کر لیا گیا اور اس امر کی تصدیق کر دی گئی کہ امریکہ کی مختلف ولایات کی آزادی کی حفاظت ممالک متحدہ کی حکومت کا حق ہے۔

جنگ عظیم کے موقعہ پر یہی بنیادی قانون تھا جس نے ممالک متحدہ کو جنگ میں شرکت کرنے سے حتی الامکان روکے رکھا لیکن جرمنی کی دریائی لڑائی نے اسکو مجبور کر دیا کہ جنگ میں دخل دے۔

لیکن اسوقت تک آئین منرو مختلف حیثیت سے دنیا پر اثر انداز [illegible] یہی قانون ہے جسکی بنا پر دولت متحدہ امریکہ یورپ کے معاملات [illegible] دخل اندازی کرنے سے مجبور ہے۔

اگرچہ حکومت متحدہ نے دنیا میں جو عظیم الشان مالی اور جنگی پوزیشن حاصل کرلی ہے۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اگر امریکہ چاہے تو یورپ کے معاملات میں بے خوف خطر کود سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر کبھی امریکہ کی نیت خراب ہو تو وہ اپنے منافع کی خاطر یورپ سے جنگ و پیکار کے لئے تیار ہو جائے۔

لیکن ابھی تک امریکہ میں آئین منرو کے طرفدار بہت زیادہ ہیں اسلئے مخالفین آئین منرو جو تعداد میں بہت کم ہیں یہ جرأت نہیں کرسکتے کہ اسکی خلاف ورزی کریں۔

آخر میں جبکہ آئین منرو کے متعلق پورے طور پر ہم بحث کر چکے ہیں، ایک خاص واقعہ کا ذکر کر دینا بہت مناسب ہوگا۔ جو منرو کی زندگی میں بہت حیرت انگیز ہے اور اسکی اخلاقی حالت پر خاص روشنی ڈالتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب منرو ۱۸۲۴ء میں اپنے دوسرے انتخاب کی مدت ختم کرکے امور حکومت سے کنارہ کش ہوا تو وہ بہت غریب حالت میں تھا اور اس پر بہت لوگوں کا قرض تھا۔

حقیقتاً یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ منرو اگرچہ بہت سے ممتاز عہدوں پر رہا اور اس کے بعد چار سال تک جمہوریت کی صدارت کے فرائض بھی اس نے انجام دئے۔ لیکن آخر میں اس نے یہی نہیں کہ کوئی سرمایہ چھوڑا ہو بلکہ وہ تہیدست۔ محتاج۔ ضرورتمند اور مقروض تھا۔

(کاوہ برلن)

حامد الانصاری غازی
(فاضل دیوبند)

امام حسینؑ کی تلوار کی روانی

یاں گوشۂ عزلت خم شمشیر نے چھوڑا　　　واں سہم کے چلّے کو ہر اک تیر نے چھوڑا
کس قہر سے گھر موت کی تصویر نے چھوڑا　　　ساحل کو صفِ لشکرِ بے پیر نے چھوڑا
عنقائے ظفر فتح کا در کھول کے نکلا
شہبازِ اجل صید کو پر تول کے نکلا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی　　　ندی ادھر اک خون کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی　　　پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

صرصر کبھی تو موج اس کی روانی کو نہ پہنچے　　　قلزم کا بھی دھارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے　　　خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہنچے
دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بری تھی
برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی۔ چھُری تھی

میر انیس مرحوم

بہادر حریف

صلیبی لڑائیوں کا ایک واقعہ

افراد ڈراما

سلطان صلاح الدین ۔ مسلمانوں کا خلیفہ ۔
کنگ رچرڈ ۔ انگلستان کا بادشاہ
کونٹ ڈیواک ۔ ارل آف کلز لینڈ ۔ کنگ رچرڈ کا خاص مصاحب
پاپائے کنٹربری ۔ صلیبی لڑائیوں میں پاپائے اعظم کا قائم مقام ۔
حکیم عبدالاحد ۔ سلطان صلاح الدینؒ کا خاص حکیم ۔

پہلا منظر

انگلستان کا شاہی خیمہ ؛ جس میں کنگ رچرڈ بخار کی حالت میں نیم بے ہوش پڑا ہے ۔ کونٹ ڈیواک تیمارداری کے لئے قریب بیٹھا ہے ۔

رچرڈ (کراہتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے کہ یہ نامراد بخار اب مجھے لئے بغیر نہیں رہیگا ۔ کیا میری فوجیں لاوارث رہجائیں گی اور فتح یروشلم کا سہرا کسی اور بادشاہ کے سر ہوگا ۔

ڈیواک کونٹ ۔ خدارا ایسی باتیں نہ کہئے ۔ اس لڑائی کا انجام آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے ۔ ارض مقدس کی آزادی کا نشان انگلستانی پھریرا ہی ہوگا ۔ اور وہ دلاور رچرڈ کی ماتحتی میں گاڑا جائیگا ۔

رچرڈ ۔ کیا فلپ (فرانس کا بادشاہ) آزادی کے شادیانے بجاتا ہوا مجھ سے پہلے مقدس صلیب تک پہنچ جائیگا ۔ اور میں یوں ہی بیکار پڑا رہوں گا

کونٹ ۔ پیارے آقا ! شاہ برطانیہ کے بغیر کس کی ہمت ....

(باہر سے) "اللہ اکبر"

رچرڈ ۔ یہ کیا ؟ ہمارے کیمپ میں مسلمان ؟ ......

کونٹ ۔ اٹھئے نہیں ، اس کمزوری کی حالت میں حرکت نقصان دہ ہے میں ابھی باہر خبر لے کے آتا ہوں ۔

(کونٹ چند لمحے کے بعد واپس آجاتا ہے)

کونٹ ۔ عجیب قصہ ہے !

رچرڈ ۔ کیا ؟

کونٹ ۔ سلطان کی فوج کا ایک دستہ ہمارے خیموں کے قریب کھڑا ہے اس کے ہمراہ صلاح الدین نے اپنا شاہی طبیب آپکے علاج کیلئے بھیجا ہے ۔ ایک صلیبی نائٹ بھی ہمراہ ہے ۔

رچرڈ ۔ کیا خوب ؟ یہ بھی کہیں میری جان لینے کے لئے کوئی سازش تو نہیں ؟

کونٹ ۔ ہوسکتا ہے ۔ ان پر فوراً اعتبار کرنا تو بیوقوفی سے خالی نہیں ۔

رچرڈ ۔ اور وہ مسیحی نائٹ ......

کونٹ ۔ ویلز کا سر ایتھم ۔ اپنی جرأت کے سبب مشہور ہے ۔ اس کی تلوار صلیب کی حفاظت میں کئی بے دینوں کو مٹا چکی ہے ۔

رچرڈ ۔ وہ سلطان تک کیونکر پہنچا ؟

کونٹ ۔ اسے مجلس عالیہ نے انگنڈی کے سینٹ کے پاس بھیجا تھا ۔ وہاں امیر کے آدمیوں نے اس سے حکیم کی رہبری کی درخواست کی وہ انہیں یہاں لے آیا ہے ۔

رچرڈ ۔ حکیم کو میرے پاس لے آؤ ، میں اس سے مفصل حالات دریافت کرونگا ۔

کونٹ ۔ عالی جاہ ! آپ کیا بھولی باتیں کرتے ہیں ۔ ان کا خیمہ میں داخل ہونا بھی خطرے سے خالی ۔ یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پیرو بہت چالاک ہوتے ہیں ۔ ایسی ایسی چالیں بنانے میں مہارت رکھتے ہیں کہ اُن کے قریب جانا بھی موت کو پاس بلانا ہے ۔ میں اسے اچھی طرح آزمانے سے پہلے یہاں آنے کی اجازت نہیں دونگا

(پردہ)

دوسرا منظر

(ایک ایشیائی خیمہ جس میں ایک مسلمان بوڑھا ایک طرف بیٹھا مطالعہ میں مصروف ہے۔ دروازے پر ہلال احمر کا نشان لہرا رہا ہے۔ کونٹ پاپائے کنٹربری سمیت داخل ہوتا ہے)

کونٹ (ٹلی پھٹی زبان میں) خوش آمدید۔ آپ ہی سلطان کے بھیجے ہوئے حکیم ہیں۔

عبدالاحد۔ آپ پر سلامتی ہو میں ہی امیرالمؤمنین کے ارشاد کے موافق شاہِ برطانیہ کے علاج کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

پوپ۔ آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟

عبدالاحد۔ ہاں! فخرِ اسلام، جہاں پناہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ایک خط مریض بادشاہ کے نام .....

(کونٹ اس سے وہ رقعہ لے لیتا ہے)

پوپ۔ اچھا ہم شاہی شفاخانہ سے اپنے حکیموں کو بلاتے ہیں۔ آپ اپنے علاج کے طریقے سے انہیں آگاہ کر دیں۔ پھر اُن کی رائے کے مطابق آپ کو بادشاہ کے علاج کے لئے مقرر کیا جائیگا۔

عبدالاحد۔ اس سے آپ کا مطلب؟ میں یہاں بحث مباحثوں کیلئے نہیں آیا۔

کونٹ۔ تو پھر حکمت کے کمال کی کوئی مثال پیش کیجئے۔

عبدالاحد۔ نہایت شوق سے جس مرض میں آپ کے بادشاہ بیمار رہیں اُن بیماروں سے تمام نصرانی خیمے بھرے پڑے ہیں۔ آپ کسی بیمار کو میرے پاس بھیجدیں اور اس علم کو جو اللہ پاک نے اس ناچیز بندہ کو بخشا ہے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لیں۔

کونٹ اور پوپ (ایک زبان) بہت بہتر۔ (پردہ)

تیسرا منظر

شاہ رچرڈ کا خیمہ۔ کونٹ کی واپسی۔

رچرڈ۔ سناؤ بھئی! کیا کر کے آئے؟

کونٹ۔ ایک بخار کے بیمار کو حکیم کے سپرد کر آیا ہوں۔ اس نامراد وبا کے باعث مرنے کے قریب تھا۔ اب دیکھیں حکیم کی حکمت۔

رچرڈ۔ سلطان نے کچھ پیغام بھی بھیجا ہے؟

کونٹ۔ ہاں ہاں! یہ ہے اُس کا رقعہ میں ترجمہ کروا کے لے آیا ہوں۔

رچرڈ۔ سناؤ تو کیا لکھا ہے؟

کونٹ (رقعہ پڑھتے ہوئے) خلیفۃ المسلمین امیرالمؤمنین سلطان صلاح الدین اعظم کی طرف سے سلطان رچرڈ شاہِ برطانیہ کو اگر وہ ہدایت کی پیروی کرے اور دین حق کی طرف توجہ کرے سلام پہنچے (خط سے نگاہ اٹھا کر) ذرا اس مسلمان کا غرور ملاحظہ ہو۔ مقدس باپ اس کو خاک میں ملائے (پھر خط پڑھتے ہوئے) دربارِ عالی میں اُس شیردل جوانمرد کی بیماری کی خبر پہنچی۔ ہماری طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایسا بہادر انسان بخار کی نذر ہو جائے۔ لہذا طبیب خاص علاج کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ خدا کی رحمت اور اس کے رسول کی برکت سے عبدالواحد کا دستِ شفا مرض کے لئے .....

رچرڈ۔ کون رسول؟ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) مجھے اس کی برکت درکار نہیں، موت بہتر ہے۔ پھاڑ دو اس کاغذ کو۔

(ایک نائٹ داخل ہوتا ہے)

کونٹ۔ مسیح کی برکت شامل حال ہو، سرہنری کیا خبر لائے؟

سرہنری۔ سلطانی دستہ کا کمان افسر دو سپاہیوں کے ساتھ آیا ہے۔ اور خیمہ میں داخلہ کی درخواست کرتا ہے۔

کونٹ (ذرا تامل سے) کتنے آدمی ہیں۔ تین؟

سرہنری۔ ہاں، بہادر کونٹ کل تین بے ہتھیاروں کے شخص ہیں دو بڑے بڑے طشت اٹھائے ہوئے ہیں۔ جن میں کچھ پھل معلوم ہوتے ہیں

کونٹ۔ اچھا (سوچ کر) چھ ہتھیار بند نائٹوں کی حفاظت میں انہیں اندر لے آؤ۔

(تین بلند قامت، خوبصورت مسلم نوجوان برہنہ تلواروں کے نیچے سر رکھے خیمہ میں داخل ہوتے ہیں)

مسلمان کمان افسر۔ بہادر شاہِ برطانیہ کو امیرالمؤمنین کا سلام پہنچے (رشہ سے مخاطب ہو کر) کیا نہتے سفیروں پر ننگی تلواروں کا پہرہ فرنگی قانونِ جنگ میں جائز ہے؟

کونٹ (سختی سے) تم بات کرو۔ کیا پیغام لائے ہو؟

مسلمان۔ خلیفۃ المسلمین نے خدا اُن کا حافظ ہو بیمار شاہِ فرنگ کے لئے تازہ میوے ارسال کئے ہیں۔ تاکہ کمزور جسم کو طاقت بخشیں اور خشک حلق کو تر کرنے میں کام آویں۔

کونٹ۔ وہاں میز پر رکھ دو ــــ اور کچھ؟

مسلمان۔ بس اے نوجوان۔

(مسلمان چلے جاتے ہیں)

رچرڈ۔ کیا خوشنما رومال ہیں، ذرا اُٹھاؤ تو دیکھیں در پردہ کیا ہے۔

(کونٹ رومال اُٹھا دیتا ہے۔)

رچرڈ۔ صلیب کی رحمت ہے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے خوشنما پھل

کہیں نہیں دیکھے، یہ طلائی طشت ـــــــ ان میں ہیرے جواہرات ـــــ آہ سلطان کے پاس کس قدر دولت ہے ـــــ کس قیمت کے ہوں گے ـــــ انگور کا ایک دانہ تو چکھاؤ ۔

کونٹ ۔ ایک رکاب کی لاگت ـــــ دس ہزار ـــــ لیکن جواہرات چالیس ہزار اشرفی سے کسی صورت کم نہ ہوگی ۔

(انگور کسی طاقتور عرق سے تر تھے، حلق سے اُترتے ہی بادشاہ کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں)

رچرڈ ۔ چند دانے اور لاؤ ۔ (پردہ)

چوتھا منظر

(دو روز بعد رچرڈ کا وہی خیمہ ۔)

رچرڈ ۔ یہ پھل کھانے سے میرے بخار کی شدت جاتی رہی ہے ۔ آہ کیا لطیف ہیں ۔

کونٹ ۔ ایشیائی لوگ علاج کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے سلطان کے حکیم کے علاج سے وہ مرنے کے قریب سپاہی اچھا ہوگیا ۔ کاش، ایسی مہذب اور عالم قوم کو ہم عیسائی بنا سکتے ۔

رچرڈ ۔ خدا کے لئے اس حکیم کو جلد بلاؤ ۔ میرا دل میدان میں جانے کے لئے بیقرار ہو رہا ہے

کونٹ ۔ لیجئے، ابھی حاضر کرتا ہوں ۔

(ایک خادم کو بھیج کر حکیم کو بلواتا ہے ۔)

عبدالاحد ۔ نصرانیوں کے عالی وقار بادشاہ خدا آپ کی روح اور جسم دونوں پر فضل کرے

رچرڈ ۔ آؤ مسٹر حکیم صلیب کی برکت سے تمہارا آنا ہمارے لئے مبارک ہو

عبدالاحد ۔ کیا بادشاہ کا علاج اب سے شروع کر دیا جائے ؟

رچرڈ ۔ ہاں جلد سے جلد ۔

کونٹ ۔ دیکھو مسلمان حکیم! اگر آپ کے علاج سے بادشاہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچ گیا تو اسی خیمہ میں آپ کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی جائیگی ۔

عبدالاحد ۔ خدا بادشاہ کو صحت دے (نبض دیکھ کر) انشاء اللہ جلد صحت ہو جائے گی ۔

(دوائیں گھول کر بادشاہ کو پلاتا ہے) ۔

(کونٹ سے) دیکھئے اب آئندہ چوبیس گھڑی کیلئے خاموشی ضروری ہے ۔ بادشاہ اب نیند میں رہیں گے ۔

کونٹ ۔ بہت بہتر ۔ سر حکیم ایسا ہی ہوگا ۔

عبدالاحد ۔ لیکن خیمہ کے باہر جو شور مچ رہا ہے ۔

کونٹ ۔ میں سپاہی مقرر کئے دیتا ہوں ۔ چڑیا تک بھی پھٹکنے نہیں پائے گی ۔

(تمام کیمپ خاموش ہو جاتا ہے) (پردہ)

پانچواں منظر

(چار روز کے علاج کے بعد وہی خیمہ اور شام کا وقت)

(رچرڈ سو رہا ہے)

عبدالاحد ۔ آج بادشاہ خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہیں ۔ ذرا جسم کو ہاتھ لگائیے ۔ حرارت بالکل جاتی رہی ہے ۔

کونٹ ۔ واقعی! ۔ آپ کا علاج ہے یا طلسم ۔

عبدالاحد ۔ یہ سب کچھ اُس دو جہان کے رب کا بخشا ہوا ہے ۔

کونٹ (خود کو) اللہ رے مسلمانوں کا ایمان ۔ ہر بات کو خدا سے ملا دیتے ہیں اور اپنی محنت اور ہمت کو کوئی وقعت نہیں دیتے ۔

عبدالاحد ۔ ذرا اس مرکب اکسیر حیات کا اثر دیکھئے ۔ میں بادشاہ کے ماتھے پر اس کا لیپ کرتا ہوں ۔

(کونٹ خاموش ہو کر دیکھتا ہے دوا کا لیپ ہوتے ہی بادشاہ آنکھیں کھول دیتا ہے)

عبدالاحد ۔ بادشاہِ یورپ مزاج کیسا ہے ؟

رچرڈ ۔ جسم بالکل درست ہے معمولی سی تکان، جیسی لڑائی میں بھی ہو جایا کرتی ہے، موجود ہے ۔

عبدالاحد ۔ بس اب تین دن اور لیٹے رہئے ۔ پھر آہستہ آہستہ ورزش شروع کر دیجئے (کونٹ سے) اس ہفتہ ان کی غذا کا خاص خیال رہے ۔ کوئی ثقیل خوراک اُن کے حلق سے اُترنے نہ پائے ۔ میوے جس قدر استعمال کریں بہتر ہے ۔ یہ عرق سے بھرا شیشہ میں آپ کو دے جاتا ہوں ہر دو گھڑی کے بعد ایک ایک گھونٹ پلواتے جائیے ۔ اس سے گئی ہوئی قوت پھر لوٹ آئے گی ۔

عبدالاحد (کچھ دیر بعد رچرڈ سے) عالی جاہا! آپ اب بفضل حکیم مطلق (خدا) بالکل تندرست ہیں، میرا علاج ختم ہو چکا ۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں ۔

رچرڈ ۔ سر حکیم میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں ۔ کیا چیز آپ کی نذر کی جا سکتی ہے ؟

(کونٹ سے) خزانے سے بیس ہزار اشرفیاں [illegible] عالم کو بخشش دی جائیں

ـــــ
۱؎ عادت کے مطابق ہر بڑے شخص کو لفظ مسٹر سے خطاب کیا جاتا ہے ۔

عبدالاحد۔ اے بادشاہ ذی جاہ! مسلمان احسان کو بیچا نہیں کرتے۔ میں اپنے سلطان (خدا اُن کا حامی ہو) کا احسان فروخت نہیں کروں گا۔

رچرڈ (گلے سے سنہری صلیب اُتار کر) اچھا تو یہ صلیب میں تمہیں اپنی یادگار بخشتا ہوں۔ اس کے مالک کے لئے رچرڈ جان اور مال فدا کرنے سے کبھی عذر نہیں کرے گا۔

عبدالاحد۔ اے بادشاہ آپ بھول گئے کہ میں مسلمان ہوں! میں یہ صلیب نہیں لے سکتا۔

کونٹ۔ صلیب کی ہتک۔ منہ بند کر۔ ورنہ ابھی سر قلم کئے دیتا ہوں۔

رچرڈ۔ تلوار کو نیام میں کرو۔ وہ خدا کا گنہگار ہے۔ لیکن میرا محسن ہے

باہر سے "اللہ اکبر اللہ اکبر... اشہد ان محمد الرسول اللہ ...... حی علی الصلوٰۃ ...... لا الٰہ الا اللہ"

عبدالاحد (اذان کے ختم پر) اب میں جاتا ہوں۔ میرے لشکر میں شام کی اذان ہوگئی ہے۔ نماز کے بعد ہمارا قافلہ دار العدل (سلطان کے رہنے کی جگہ) کی طرف واپس ہو جائیگا۔ خدا حافظ

(باہر چلا جاتا ہے)

(پردہ)

نذیر رضوی

غزل

یہ لٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے؟ ۔۔۔ یہ چمن سے کون چلا گیا؟ کہ کلی کلی کو فشار ہے

تجھے مرحبا کہ دلِ نزار بحالِ زار و نزار ہے؟ ۔۔۔ ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیزِ جاں مجھے ہم نفس! ۔۔۔ دلِ داغ دارِ غمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے

تمھیں جاں فروز بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا ۔۔۔ وہ فروغِ بزمِ جمال کون ہے؟ عشقِ نادرہ کار ہے

ترے باغ میں ہے بہار؟ تجکو مبارک اے مرے باغباں ۔۔۔ جو کھبا ہے میری نظر میں پھول۔ وہ انتخابِ بہار ہے

میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں؟ ۔۔۔ تری یہ رضا ہے تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے

غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں ۔۔۔ یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس! کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غمِ دوست دردِ نگار ہے

تاجور

چھوت چھات

جب جنرل سعید عراق کے لفٹنٹ محمود جودت آفندی کورٹ مارشل کے روبرو خود اپنے ہی سواروں کی حراست میں پیش ہوئے تو انہوں نے میجر ——— کو جو کورٹ مارشل کے صدر تھے ایک عجیب و غریب طریقے سے سلام کیا۔ بجائے اس کے کہ انگریزی فوجی طریقے سے سلام کریں۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ہتھیلی کی طرف جھکایا اور پھر اس کو پیشانی پر لیجا کر ایک زاویہ قائمہ بنا لیا۔ میجر نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں محمود جودت سے دریافت کروں کہ یہ طریقہ سلام اُنھوں نے کہاں سے سیکھا ہے۔ اور اس حرکت سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ محمود جودت نے اپنی ترکی میں بگڑ کر کہا کہ کس مسخرے نے صدر کو سلام کیا ہے۔ اُنھوں نے تو صرف اپنی بدبختی کی لوح کو اپنی انگلیوں سے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی جگہ پر قایم ہے یا نہیں۔ صدر عدالت کو میں نے سمجھایا کہ محمود جودت کا سلام ترکی سلام ہے۔ اور محض عادتاً فراموشی کی حالت میں کیا ہے جس کے لئے وہ معذرت مانگتے ہیں۔ میجر نے کہا کہ ترک اس طرح کا فوجی سلام نہیں کرتے۔ میں نے جواب دیا کہ بدقسمتی سے ترک بلغاری۔ ہنگاری اور جرمنی کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔ اور غالباً یہ طریقہ سلام بھی مخلوط سا ہے۔ صدر اور اُن کے ساتھی مسکرائے۔ پھر محمود جودت کو فرد جرم سمجھانے کو کہا گیا۔ فرد جرم یہ تھا۔

(۱) فلاں تاریخ کو جب شیخ محمود قراداغی کی بغاوت شروع ہو گئی۔ اور ملیچہ کو کردی عشائر نے گھیر کر نشانہ لفنگ بنا رکھا تھا۔ وہ رات کے وقت اپنے افسر اعلےٰ کے پاس آئے اور اُن کو بغل میں دبا کر اُن کا بوسہ لینا چاہا۔

(۲) قراداغی کی جنگ میں اُنھوں نے بعض ہندوستانی سپاہیوں کو گالیاں دیں اور ان کو تمنچے سے دھمکایا

(۳) وہ کئی بار اپنے رسالے سے مشتبہ طور سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور دشمنوں سے سازباز رکھتے ہوئے پائے گئے۔

محمود جودت نے اس کا جواب اپنی ترکی میں کچھ اس طرح دیا کہ میں نے اُس کے زیادہ سمجھنے کی کوشش نہ کی اور اُن کی طرف سے عدالت کو جواب دیا کہ محمود بیک کا پہلا فعل حالت اضطراری میں تھا۔ اور افسر اعلےٰ کو غلط فہمی ہو گئی۔ درحقیقت یہ بوس و کنار محض اس لئے تھا کہ خطرے کی صورت میں وہ ہراساں نہ ہوں دوسرے جرم سے نیک نیتی و جائز اشتعال طبع کی بنا پر انکار ہے۔ تیسرے جرم سے قطعی انکار ہے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ اور محمود جودت کو دوسرے جرم کے اثبات پر تین مہینے کی سزا بھگتنے کے لئے مقامی حوالات میں بھیجدیا گیا۔

محمود جودت کا کورٹ مارشل ملیچہ ہی میں ہوا تھا۔ اور وہیں کے حوالات میں بند کئے گئے۔ ترکی قوانین جیل کے مطابق جس کی پیروی انگریزی حکومت بھی کر رہی تھی۔ قیدیوں کو سرکاری طور سے کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کا انتظام خود قیدیوں کے اعزہ و اقربا کرتے تھے۔ چونکہ محمود غریب الوطن تھے۔ اور ان کا کوئی پرسان حال ملیچہ میں نہ تھا۔ میں نے ان کی بھرسائی خوراک کا انتظام خود اپنی جیب سے کر دیا۔ دوسرے روز میں نے ان کو حسب معمول اپنے گھر سے کھانا بھیجدیا۔ مگر محمود جودت نے کھانا یہ کہکر واپس کر دیا کہ وہ ہندی کا کھانا ایسا ہی حرام سمجھتے ہیں جیسا مردار کا کھانا۔ میرے دل کو اُن کے اِن خیالات سے بہت صدمہ ہوا۔ اور میں خود اُن کے پاس صلیت سمجھنے کے لئے گیا۔ بیچارے ایک بدبودار مکان کے سائبان میں اپنے بہت سے بدقسمت ساتھیوں کی طرح کاٹھ کے کندے میں پیر کے ساتھ بندھے ہوئے بیٹھے تھے۔ محمود جودت سے میں نے کہا کہ میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ وہ درحقیقت بالکل بے گناہ ہیں اور اُنکا سوائے اس کے کوئی قصور نہ تھا کہ رات کو شراب کے نشے سے بدمست ہو کر انگریزی کپتان کو گلے لگانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں میں چاہتا تھا کہ شراب کی مذمت پر جو بدقسمتی سے ترکی افسران کی لازمۂ زندگی سمجھی جانے لگی ہے ایک وعظ بھی کہہ ڈالوں۔ مگر محمود جودت کو یہ وعظ بے محل معلوم ہوا۔ میں نے پھر اپنی برائت کے طور پر اُن سے کہا کہ اگر ہم ہندیوں کا یہ قصور ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ ہیں۔ تو یہ ہماری معاشرتی اور سیاسی مجبوری ہے اور اس سے وہ خود بھی بری نہیں۔ اگر ذاتیات کا کوئی سوال ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کورٹ مارشل سے میرا کیا تعلق تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس سے پہلے مجھ سے بے رخی و بے اعتنائی کیوں کی گئی۔ محمود جودت نے کہا کہ ذاتیات کا سوال نہیں۔ مجھے ہندی قوم سے سخت نفرت ہو گئی اور اس کی وجہ میں بیان کئے دیتا ہوں۔

آفندم! میری نفرت کی یہ وجہ نہیں کہ ہندی بالعموم دبلے۔ پتلے

کالے بدصورت ہوتے ہیں اور اُن کی مظلوم و مقہور صورت دیکھ کر اُن پر
بجائے رحم کے غصہ آتا ہے۔ محمود نے اتنی بات کہی تھی کہ میں نے انہیں
روک کر کہا۔ قرنداشی۔ یکا باقی۔ بن دسن ہندی ام۔ اس کے آگے میں یہ
کہنا چاہتا تھا کہ میں بھی ہندی ہوں خود اپنی شکل و جثہ و قد کو مجھ سے
موازنہ کرلو۔ قابل نفرت تم ہوگئے یا میں۔ اس واسطے کہ محمود جودت یورپ
کے تمدن کا نمونہ تھے جو قسطنطنیہ کے محلوں میں اناطول کے دیہات سے زیادہ
نظر آتا ہے۔ چھوٹا قد نحیف و لاغر اندام سیاہی مائل۔ گندم گوں رنگ
جو تہذیب جدید کی بدعنوانیوں۔ لامذہبیت اور کثرت شراب سے مسخ ہو
چکا تھا۔ مگر میں نے ترکی میں اتنا ہی جملہ کہا تھا کہ محمود نے میری بات کو کاٹ کر
کہا۔ ہاں مگر میں یہ نہ جانتا تھا کہ ہندی اپنی ظاہری صورت سے زیادہ باطنی
صفات میں تاریک و مکروہ ہوتے ہیں۔ میرے چہرے پر غصے کے آثار
نمایاں ہوگئے۔ مگر محمود نے اس کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے اپنے سلسلہ
گفتگو کو جاری رکھا۔ میں نے اُن کے باطن کو قراداغ کے میدان جنگ
میں دیکھا۔ ایک کُرد قیدی پیاس سے جاں بلب ہو رہا تھا۔ اُس نے
شدت تشنگی میں اپنے ہندی محافظ سے کئی بار پانی مانگا۔ مگر غالباً وہ سمجھا نہیں
کُرد نے اس کی پانی کی کپی کو ایک مُنہ لگا کر پانی پی لیا۔ معلوم نہیں اُس
ہندی کی نظر میں وہ کیا جرم تھا کہ اس نے پانی کی کپی کو اس کُرد کے مُنہ
سے چھین کر زمین پر پٹک دیا اور اپنی بربری زبان میں ذات دھرم / خدا جانے
کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ تھوڑے اور ہندی سپاہی وہاں جمع ہوگئے۔ میں
دور کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ شاید دوسرے ہندی سپاہی
اپنے ساتھی کی حرکت کو بُرا کہیں گے مگر اُنہوں نے اس سے زیادہ شور
و غوغا مچایا۔ بلکہ ان میں سے ایک آدمی اس قدر آپے سے باہر ہوا کہ اُس
نے اُس پیاسے کُرد کے مُنہ پر پیشاب کر دیا۔ ہندیوں کے شور میں۔ ذات
دھرم خراب۔ ذات خراب کے الفاظ سُنائی دیتے تھے۔ جب میں نے یہ
دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ان ہندی سپاہیوں کے پاس آیا اور
غصے میں اُس مردود پر جس نے پیشاب کیا تھا اپنے طمنچے سے فیر کرنے کا
ارادہ کیا۔ سارے ہندی مجھ سے لپٹ گئے اور مجھے مارتے پیٹتے کمانڈر
کے پاس لائے۔ اگرچہ میں انگریزی فوج کے ساتھ خود اپنی قوم کے خلاف
لڑ رہا تھا۔ مجھ پر ذرا رحم نہ کیا گیا۔ اور نہ میری معذرت کی شنوائی ہوئی
اور آج میں یہاں حبس خانہ میں ہوں۔

میں نے کہا محمود جودت تمہارا بیان بالکل صحیح ہے میں نے خود
بہت سے کُردوں کی زبانی ان واقعات کو سُنا ہے۔ پھر میں نے ان کو
سمجھایا کہ ہندوستان کے ترم مذہب والے عجیب و غریب رسم رکھتے ہیں
وہ اپنے مذہبی خیال کے مطابق اپنے برتن کا پانی کسی غیر مذہب والے کو چھونے
نہیں دیتے۔ لیکن میں ہندوستان کے قدیم مذہب کا پابند نہیں ہوں
میں خدا کے فضل سے مسلمان ہوں۔ اور ہندیوں کا برتاؤ خود اپنے ہم قوم
غیر مذہب سے بھی ایسا ہی ہے۔ چنانچہ میں نے خود ان کو اپنا ذاتی واقعہ
سُنایا جو مجھ پر بصرا کے مارچ پر گذر چکا تھا جبکہ میں تشنگی سے جاں بلب
ہو رہا تھا۔ مگر ایک بنگالی کمسریٹ کے بابو نے اپنی چھاگل کے پاس بھی مجھے
آنے نہ دیا اور اگر ایک پنجابی مسلمان ڈرائیور نہ مل جاتا تو میں وہیں ختم ہو جاتا
اور اس کے بعد میں کمسریٹ کے بابو اور میرا ساتھ دجلہ کے ایک اسٹیمر پر ہوا۔
اُس کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ مگر جب میں نے اپنے کھانے میں سے
کچھ نوالے اُس کو بھی بھیک دیئے تو وہ غرا کر کھا گیا۔ محمود جودت کا قصہ
سُننے کے بعد پھر میں نے کوئی اصرار اپنی مہمانداری کا نہ کیا۔ بلکہ میں نے
ایک کُرد نانبائی کو لگا دیا کہ ان کو دو وقتہ روٹی پہنچا دیا کرے۔

اس ماجرے کو ساتھ آٹھ مہینے گذر چکے تھے۔ اور اس وقت میں
چم چمال میں کام کر رہا تھا۔ دسمبر کے سخت جاڑے میں جبکہ کوہ قراداغ کی پہاڑیوں
پر برف کی سفید چادر بچھ چکی تھی مجھے سلیمانیہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ ایک
سرکاری فورڈ موٹر میں میرا کُردی ملازم ایک ہندوستانی ڈاکٹر جو
ذات کا برہمن تھا۔ اور دو مرہٹے سپاہی کہر و برف میں روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر
سلیمانیہ کے ہسپتال میں سب اسسٹنٹ سرجن ہو کر جا رہا تھا۔ مرہٹے
سپاہی اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے اور میں ترکی زبان
کا امتحان دینے کے لئے۔ ہمارا موٹر درہ بازیان سے نکل کر تھوڑی ہی دور
گیا ہوگا کہ پانی تیزی سے برسنا شروع ہوا۔ تھوڑی دور تک تو موٹر
کیچڑ میں گھسٹتا رہا۔ مگر آخر میں اُس نے بالکل دم توڑ دیا۔ سنسان خشک
پہاڑیوں میں ہم سب تنہا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے مصداق تھے
پانی تھم گیا۔ مگر اس کے ساتھ برف گرنے لگا تھا۔ اور جوں جوں رات
گذرتی جاتی تھی سردی بڑھتی جاتی تھی۔ ہم لوگوں نے کسی طرح گھس بیٹھ کر
کسی طرح موٹر میں رات کاٹی۔ صبح کو جب بدن میں گرمی محسوس ہوئی تو بھوک
لگی۔ کسی کے پاس ایک ٹکڑا روٹی بھی نہ تھی۔ اور سلیمانیہ وہاں سے
اتنا ہی دور تھا جتنا چم چمال۔ سوائے اس کے کہ وہاں سے ہم پیدل روانہ
ہو جائیں اور راستہ میں پہلا جھونپڑا یا خیمہ کسی کُردی کا مل جائے۔ وہیں
ستا کر روٹی مانگیں اور پیٹ بھر لیں کوئی دوسری صورت نظر نہ آئی۔
ہم لوگ روانہ ہوئے گو آفتاب نکل آیا تھا مگر ہوا اس قدر سرد و تند چل
رہی تھی کہ باہر قدم رکھنا محال تھا۔ اُفتاں و خیزاں ہم لوگ چلے۔ کئی
میل کے سفر کے بعد دور ایک پہاڑی کے نیچے ایک کُردی دیہات

نظر آیا۔ اور ہم لوگوں کو اس بات کا قطعی یقین تھا کہ اگر دیہات میں ایک کرُد بھی مل جائیگا تو ہماری روٹی کی فکر ہو جائے گی۔ ایسا ممکن نہیں کہ ہم لوگ دیہات سے بھوکے پھریں۔ دیہات میں گئے تو سب سے پہلے کتوں کا مقابلہ ہوا۔ اور اس منزل کو طے کرنے کے بعد جب دیہات کی عورتوں۔ بچوں کے تماشائی بننے کی دوسری منزل طے کی تو کدخدا (کرُد لوگ کوخہ کہتے ہیں) کی تلاش ہوئی۔ وہ بیٹھے اپنے مکان کے آگے ایک شکار کو چھُری سے بنا رہے تھے میں نے سلام کیا۔ اُنہوں نے سر اُٹھا کر ہم کو دیکھا اور پھر ہماری جماعت کو۔ میں نے اپنا ماجرا سُنایا مگر وہ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے پھر ایک مرتبہ صدا دی۔ مگر پھر بھی فقیر کی آواز خالی ہی گئی۔ اور وہ اپنا سر جھکائے کام میں مشغول رہے۔ ایک بار میں نے کرخت لہجہ میں پھر ان کو بیدار کرنا چاہا۔ اب کی بار اُس نے گالی دیکر کہا کہ اگر تم یہاں سے فوراً دور نہ ہو گئے تو میں اپنا شکاری کتا تم پر چھوڑ دوں گا۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ میں نے کوخہ سے لجاجت کی کہ میں مسلمان ہوں اور حیف ہے کہ ایک مجھ کا مسلمان ایسا برتاؤ اپنے بھائی مُسلمان سے دیکھے۔ کوخہ نے کہا کہ میں ہرگز باور نہیں کرتا کہ تم مسلمان ہو۔ تم ناپاک ہندی ہو۔ اور قبل اس کے کہ تم ناپاک ہندی ہمارے دیہات کو اپنے وجود سے ناپاک کرو یہاں سے نکل جاؤ۔ کوخہ کو سمجھانا اب میرے بس سے باہر ہو گیا میں نے اپنے کرُدی ملازم حمہ گرمیانی کو مدد کے لئے بُلایا اور اس نے کوخہ کو اس قدر نرم کیا کہ وہ صرف مجھکو روٹی اور مٹھا کھلانے پر راضی ہوا۔ مگر ہمارے دوسرے ساتھیوں کے متعلق قطعی انکار کر دیا۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ تم روٹی لاؤ۔ میں ہی کھاؤں گا اور میرے ساتھی اپنا بندوبست اور کہیں کر لیں گے۔ اتنا سُننا تھا کہ ہمارے بقیہ ساتھی ایک دم سے چلّا پڑے کہ ہم لوگ بھی سب مسلمان ہیں اور یہ کہکر کلمے کے جُدا جُدا الفاظ بھی دہرا لئے۔ کوخہ نے کہا ٹھیرو اندر گیا۔ اور اپنی پُرانی بندوق اُٹھا کر لایا اور ایک مرہٹہ سپاہی کو اپنی طرف کھینچ کر زمین پر گرا دیا۔ اور بندوق کی نالی اُس کی طرف کر کے کہنے لگا ذات خراب۔ دھرم خراب۔ اور اس کے بعد عجیب عجیب قسم کے کرُدی الفاظ کا وِرد کرتا رہا جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ غالباً خاص اس موقعے و محل کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اور عام کرُدی لغت میں وہ نہیں پائے جاتے۔

مرہٹہ سپاہی کا مارے ڈر کے پیشاب خطا ہو گیا جس پر ہم سب نے مل کر کوخہ کے پنجے سے اس بیچارے مرہٹہ کو نجات دلائی جو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شیرِ ببر کے ہاتھ میں ایک لومڑی پھنس گئی ہے جب کوخہ کا مزاج کچھ ٹھنڈا ہوا تو اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کتے سے پوچھو کہ اس نے مجھ کو پہچانا بھی یا نہیں میں نے تو اس کو پہچان لیا۔ وہ قرا داغ کے میدان جنگ کا قصہ شاید اس کو یاد نہیں رہا۔ مگر جب میں مڑا کا مرہٹہ سے دریافت کروں کہ کیا ماجرا ہے معلوم نہیں اس کمبخت کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ اسکے ساتھ دوسرے سپاہی کا بھی پتہ نہ تھا۔ ہم اور ہمارے ساتھی سب اسسٹنٹ سرجن کوخہ کے مہمان ہوئے جب اسسٹنٹ سرجن نے روٹی پر ہاتھ مارا تو میں نے کہا پنڈت جی ٹھیرئیے۔ یہ روٹی ایک ناپاک کے ہاتھ کی کھا کر اپنا دھرم نشٹ نہ کیجئیے میں آپ کو آٹے کا کچا سیدھا اور لکڑی لا دیتا ہوں خود آپ اپنی روٹی پکا لیجئے۔ مگر پنڈت جی نے اس کا وہی جواب دیا کہ میں تو ہندووانی چھوت چھات کو ہندوستان کے سمندر ہی میں غرق کر آیا۔ میں نے کہا معاف کیجئے گا۔ صرف یک طرفہ غرق ہوا ہے یعنی لینے کے لئے غرق ہوا ہے۔ دینے کے لئے نہیں۔

ابن اسمٰعیل

تارے

دیدنی شام کے نظارے ہیں　　زینت افزائے چرخ تارے ہیں
آتشیں پھول پیارے پیارے ہیں　　ضوفشاں نور کے شرارے ہیں
ان کی کچھ شان ہی نرالی ہے
نہ ہوں تارے تو رات کالی ہے

تابشِ انجم فروزاں ہے　　کہ شب تار جلوہ ساماں ہے
چرخ پر عالم چراغاں ہے　　گنبدِ نیلگوں درخشاں ہے
تیرگی میں ہے نور کا عالم
جلوۂ برقِ طور کا عالم

کہکشاں ہے کہ جادۂ زریں　　یا فلک پر ہے جادۂ سیمیں
تابش افزائے جلوۂ رنگیں　　بہرِ گردوں ہے مایۂ تزئیں
اس کی صنعت کے نقش سارے ہیں
مہر و مہ کہکشاں کہ تارے ہیں

(برق دہلوی)

۱؎ گاؤں کا مکھیا۔

شبابِ کشمیر

مولوی محمد الدین فوق تعارف کے محتاج نہیں اُنکو تاریخ سے خاص دلچسپی ہے جو کچھ اُن کے قلم سے نکلتا ہے بے شبہ افسانہ نہیں بلکہ تحقیقات پر مبنی ہوتا ہے۔

"شبابِ کشمیر" میں سلطان زین العابدین معروف بڈشاہ یا بٹ شاہ کشمیر کے بادشاہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مورخ موصوف نے مطبوعہ اور قلمی تاریخوں کا بغور مطالعہ کیا ہے بعض مقامات پر انہوں نے بعض مورخوں کے رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ہمارے نوابوں راجوں، مہاراجوں کے لئے ضروری ہے انہیں انتظامی لیاقت، علمی ذوق، رعایا کی بہبودی، مذہبی قیود کی پابندی اور مذہبی رواداری، نیک ضمیری، نیک چلنی، بے تعصبی ملکی فلاح غربا کی پرورش، دینی بزرگوں کا احترام، صنعت حرفت اور زراعت کی ترقی میں سرگرمی، علم دوستی، فنونِ لطیفہ و قدردانی وغیرہ۔ بڈشاہ میں جو صفات موجود تھیں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ بعض روایتوں کے سوا جنکی تاریخی بنیاد نہیں جملہ واقعات مستند تاریخوں سے لئے گئے ہیں۔ مورخ خود کشمیری ہیں کشمیر اور کشمیریوں سے اُنکو اُنس اور اخلاص ہے۔ اکبر کا مقابلہ بڈشاہ سے کرتے ہوئے انہوں نے بڈشاہ کا مرتبہ بڑھا دیا ہے۔

اس کی نسبت ہم صرف اتنا کہینگے کہ دونوں کے زمانے ایک نہ تھے۔ حالات بھی مختلف تھے ممکن ہے کہ جو کچھ بڈشاہ نے کیا اکبر نہ کر سکتا ہو۔ مثل ہے کہ "مقابلے کبھی پسندیدہ نہیں ہوتے"۔ ہم اس تبصرہ میں تُنز ابابوں کا خلاصہ نہیں دیسکتے اوپر کی سطروں میں ان بابوں کا لبِ لباب لکھ دیا ہے۔

مورخ موصوف کا دل تعصب سے قطعی پاک ہے۔ اسلام کے پھیلنے اور پنڈت صاحبان کے کشمیر جنت نظیر سے ہجرت کرنے اور اُن کی واپسی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُن کی تحقیقات اور رواداری کی دلیل ہے۔ ہم یہاں چند فقرے نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے:۔

علیشاہ نے جو بڈشاہ کا بھائی اس سے پہلے بادشاہ تھا منصب وزارت پر اپنے چھوٹے بھائی شاہی خان کو سرفراز کیا اُسوقت ملک کی یہ حالت تھی کہ چاروں طرف ملک سیف الدین کے خوف اور تشدد سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہندو تو بالخصوص سہمے ہوئے تھے اور کھلے بندوں پوجا پاٹ بھی نہ کر سکتے تھے .... شاہی خان نے تھوڑی مدت میں عدل و انصاف کا وہ سکہ بٹھایا کہ ہندو جو ہمیشہ مضطرب الحال رہتے تھے امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے"۔ (صفحہ ۱۱۸)

زین العابدین کے تخت نشینی سے پیشتر ہی اس کے باپ اور بھائی کے زمانہ میں کشمیر کے کئی ہندو بعض جدید قوانین کی تاب نہ لاکر یا تو اسلام قبول کر چکے تھے یا ترک وطن کر کے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ (صفحہ ۲۶)

ایک اور مقام پر مورخ موصوف رینچن کے شاہ کشمیر کے اسلام قبول کرنے کے بعد ذکر یہ فرماتے ہیں:۔

بہت سے ہندو مشایخ کبار کے حسن خلق اور تعلیم اسلام کے تاثرات سے مسلمان ہو گئے۔ کئی ایسے تھے جن کو مصالح ملکی نے تبدیل مذہب پر مجبور کیا۔ ایک کافی تعداد ایسی بھی تھی جو سلطان بت شکن اور اس کے وزیر سیف الدین کے جوش مذہبی کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو تشدد سکندری کی تاب نہ لا سکے اور ہجرت و ترک وطن پر مجبور ہو کر کشمیر سے باہر چلے گئے"۔ (صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۷)

مورخ موصوف لکھتے ہیں کہ بڈشاہ کے زمانہ میں یہ تارکان وطن واپس آ گئے۔ اور اپنے دھرم میں واپس چلے گئے۔ (صفحہ ۱۶۹ - ۱۷۱)

ایک اور امر قابل ذکر ہے:۔

ہندوؤں اور مورخوں نے بڈشاہ کی اس انصاف پروری کی سنہری لفظوں میں داد دی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مذہبی مقدمات کے تصفیہ کے لئے ہندو جج اور مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کر رکھے تھے اور جب مدعی اور مدعا علیہ ہندو اور مسلمان ہوتے تھے تو ان کے مقدمات کا تصفیہ دو جج ملکر کرتے تھے جن میں ایک ہندو ہوتا تھا اور ایک مسلمان۔ یہ وہ انصاف اور وہ عدل ہے کہ آج بھی ہندوستان کو کامل طور پر نصیب نہیں ہو سکا۔ (صفحہ ۱۹۱)

جہانتک ہم نے ہندوستان کے مطبوعہ تاریخوں کا مطالعہ کیا ہمیں کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے کبھی ادھر خیال بھی کیا ہو کہ ہندوؤں کے مقدمات کے لئے ہندو جج مقرر

کریں یا ہندو مسلمان ججوں کے پنچ بنجائیں۔ یہ فخر زین العابدین بڈشاہ ہی کو حاصل تھا۔ جو باب بڈشاہ کے ہندوؤں کے دلجوئی کے متعلق مورخ موصوف نے لکھا ہے وہ ساری کتاب میں زریں باب ہے ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے صرف ایک فقرہ نقل کرتے ہیں۔

"کوئی پنڈت سلطان بُت شکن اور سلطان علیشاہ کے زمانہ میں نہ اپنے آپ کو علانیہ ہندو کہہ سکتا تھا اور نہ اپنی پیشانی پر قشقہ لگا سکتا تھا ...... بادشاہ نے پنڈتوں سے اس مصیبت کو بھی دُور کیا" (صفحہ ۱۹۵)

گیارہویں باب میں موسیقی کا ذکر ہے اسمیں چند غلطیاں واقع ہوئیں ہیں۔

(۱) شمیم نے کشمیری موسیقی پر پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی میں کبھی کوئی مضمون نہیں پڑھا۔ اس نے ایک مضمون کشمیری موسیقی پر زمانہ میں شائع کیا تھا۔

(۲) شرر کے مضمون میں ایرانی راگنیوں کا تو ذکر ہے مگر جہانتک ہمکو یاد ہے کشمیری موسیقی کا ذکر نہیں۔

(۳) حضرت فوق یہ نہیں بتلاتے کہ کون ساز بڈشاہ نے ایجاد کیا تھا انہوں نے ایک ساز کا ذکر طبقات سے بدیں الفاظ نقل کیا ہے :۔

"وکہ یک نقش را بہ دوازدہ مقام ادا می نمود" کم از کم ایسا کوئی ساز کشمیر میں موجود نہیں بلکہ دنیا بھر میں کہیں موجود نہیں۔

(۴) ایک اور مقام پر بھی مورخ موصوف مغالطہ میں پڑ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں نے موسیقی کو خود کبھی حاصل نہیں کیا۔ (صفحہ ۲۰۲)

صفحہ ۲۰۳ پر لودی بٹ مصنف رسالہ "زین" (موسیقی) کا ذکر فرماتے ہیں۔ صفحہ ۲۰۲ میں سوم پنڈت موسیقار اور مصنف رسالہ موسیقی مانکت نامی کا ذکر فرماتے ہیں۔ انکی آگاہی کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ سارنگ دیو کشمیری پنڈت بڑا بھاری موسیقار گزرا ہے۔ جس نے شمالی ہند کی موسیقی کو ترتیب دیا۔ میسور کی لائبریری سے یہ کتاب ملی ہے اور مسٹر کلمنٹ نے کتاب ہندو میوزک میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کشمیری ہندوستان میں موسیقی رفتہ رفتہ شرفا کے مشاغل سے نکل گئی۔

(۵) مسٹر غلام محی الدین صوفی کی کتاب اسلامک کلچران کشمیر میں سے مورخ موصوف عبارت ذیل نقل کرتے ہیں :۔

"وہ فتح پنجاب کے دوران میں اس مقام پر بھی ٹھہرا جسکو آپ امرتسر لکھتے ہیں وہاں اُس نے اپنی قومی ضروریات کی وجہ کنواں کھُدوایا تھا وہ ابتک بڈہ کہوہ کے نام سے مشہور ہے"

اس کے سن وسال سے مورخ موصوف اختلاف کرتے ہیں مگر صوفی صاحب کے بیان کی تردید نہیں کرتے۔ جہاں وہ "بڈہ کہوہ" زین العابدین (بڈشاہ) کا بنوایا ہُوا بیان کرتے ہیں۔ دراصل یہ کنواں بڈکہوہ نہیں کہلاتا بلکہ بٹ کہوہ ہے جو کشمیری پنڈتوں کے قبضہ میں ہے۔ یہ کنواں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں نووارد کشمیری پنڈتوں نے بنوایا تھا اور بٹ کہوہ کہلاتا ہے۔ بٹ کشمیری پنڈت سے مراد ہے۔

مجموعی طور پر ہم حضرت فوق کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنہوں نے شباب کشمیر لکھکر درحقیقت علم تاریخ پر بہت احسان کیا ہے ارباب علم سے ہم اسکے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

شیلو نرائن شمیم

کیفِ برشگال

ہوائیں ٹھنڈی ہیں گھٹائیں کالی کالی ہیں　　عجب کیف آفریں ایام فصل برشگالی ہیں
جدھر دیکھو ادھر سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا ہے　　نگاہیں ہو گئیں شاداب جس جانب بھی ڈالی ہیں
نکل آئی ہیں سینوں سے امنگیں تتلیاں بن کر　　دلوں کی آرزوئیں خوفِ ناکامی سے خالی ہیں
پپیہے کی فغانِ درد ہے یا کوئی نشتر ہے　　دلِ غمگیں کی جس نے آہ چوٹیں پھیل ڈالی ہیں
ڈھلا سورج تو پانی پھر گیا سونے کا سبزے پر　　سنہرے بیل بوٹے پرتو شان جلالی ہیں
شفق آلودہ ٹکڑے بادلوں کے ہیں کہ اے ساقی　　شراب ارغواں کی کشتیاں تو نے نکالی ہیں

یہ دو قوس قزح ہیں جلوہ فرما بام گردوں پر
فلک نے دامِ بجلی کی کمانیں یا نکالی ہیں

جگر بریلوی

مزارِ دوست

پردۂ ظلمت میں پنہاں ہو گیا ہے آفتاب
کلفتِ منزل سے تھک کر سو گیا ہے آفتاب

دہر پر رنگِ سکوتِ شام طاری ہو گیا
آسماں سے چشمۂ ظلمات جاری ہو گیا

مضطرب جذبات کا طوفان ہے دل میں موجزن
رنج و غم کا بحرِ بے پایاں ہے دل میں موجزن

آ گیا ہوں شورشِ ہستی کے ہنگاموں سے دور
زندگی کے شور و شرِ بستی کے ہنگاموں سے دور

منظرِ ناکامئ انساں ہے میرے سامنے
وادئ خاموشِ گورستاں ہے میرے سامنے

موت کی گودی میں رند و پارسا خوابیدہ ہیں
اس سکوں آباد میں شاہ و گدا خوابیدہ ہیں

گونجتا تھا نام جن کا گنبدِ افلاک میں
دفن ہیں اُن سرفرازوں کی اُمنگیں خاک میں

یاس کی عبرت فزا تصویر یہ ویرانہ ہے
صحنِ گورستاں سراسر ایک حسرت خانہ ہے

گور کے آغوش میں اے دوست تو بھی ہے یہاں
میری قسمت کی طرح آسودۂ خوابِ گراں

کر دیا ہے ناوکِ فرقت نے میرا سینہ چاک
اور مرے ارمان تیرے ساتھ ہیں پیوندِ خاک

تو نہیں تو نغمۂ بلبل صدائے آہ ہے
وسعتِ گلزارِ عالم ایک وحشت گاہ ہے

میرا کاشانہ ہے اس دنیا میں بس تیرا دیار
تو ہے جانِ زندگی۔ تربت تری میرا مزار

شب کی خاموشی میں بھی جاری ہے دورِ آسماں
قافلے ہیں چرخ پر لرزاں ستاروں کے رواں

چھا گیا ہے سارے ویرانے پہ افسونِ سکوت
شمعِ مرقد کی طرح میں بھی ہوں مرہونِ سکوت

شمع اور میں دونوں نذرِ سوزِ غم ہو جائینگے
تیرے پیچھے راہئ ملکِ عدم ہو جائینگے

سید عبدالمجید اختر

نقائصِ شعری

"نقائصِ شعری" کے عنوان سے ایک تحقیقاتی مضمون پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ مدیر روزانہ ویر بھارت لاہور کا "ادبی دنیا" ماہ جولائی ۲۹ء میں چھپا ہے۔ جس اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر یہ عمدہ مضمون لکھا گیا وہ قابلِ قدر اور تعریف کے قابل ہے۔ مگر کسی شعر کا نقص دکھلاتے ہوئے شاعر کی شخصیت کو اس کی، یا اس کے مداحوں کی ناخوشی کے خیال سے پوشیدہ رکھنا نہ کچھ مفید ہے نہ زیادہ نتیجہ خیز جسقدر زیادہ باکمال شاعر کے کلام پر تنقید ہوگی اور اس کے نقائص سامنے لائے جائیں گے اتنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ کہ ایسے نقائص سے یا تو آئندہ پرہیز کیا جائے گا یا زبان کی ترقی کے لئے ان کو قبولِ عام کی سند مل جائے گی مثلاً :-

(ا) صفِ ماتم قاعدہ کے اعتبار سے غلط ہے مگر انیسؔ مرحوم فرماتے ہیں ؎

بیٹی کو خبر اسکی نہ تھی یا شہِ عالم
بچھنے کی زچہ خانہ کے اندر صفِ ماتم

(ب) شرابِ طہورا نہ فارسی و اردو میں صحیح ہے نہ عربی میں مسکین مولٰنس مغفور لکھتے ہیں ؎

ہاں ساقیا شرابِ طہورا پلا مجھے
مرتا ہوں اے مسیح دو عالم جلا مجھے

غالباً جناب مغفور نے وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا کو سامنے رکھکر یہ تصرف کیا ہے۔

کسی شاعر کی شخصیت کا اظہار کئے بغیر اگر ہم نے اس کے کلام پر تنقید کی اور کسی دوسرے بزرگ نے اس تنقید کو غلط سمجھ کر اعتراض کیا، اور ہم نے اپنی قابلیت کے موافق اس تنقید کا جواب لکھا، تب بھی تو دو شخص ایک دوسرے کے مخاطب ہوں گے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وفا صاحب نے جو نقائص بعض اشعار میں دکھائے ہیں اور منجملہ ان کے چند میرے نزدیک صحیح نہیں تو میں جناب ممدوح کی تحریر کا حوالہ دیکر ہی کچھ لکھ سکتا ہوں۔ اور اس ... ہوئے اصول یقیناً چھوڑنا پڑیں گے۔ یا اسی شعر پر کہ۔ ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

شاعر کا نام اور تخلص ظاہر کئے بغیر میں یہ اعتراض کرونگا کہ عشرت کی جگہ "ہستی" ہونا چاہیئے۔ تو کوئی عالم اور ماہرِ فن بزرگ "عشرت" کی خوبی اور لطف دکھاتے ہوئے ضرور مجھے مخاطب بنائیں گے۔

اسی مطلب کو دوسری طرح یوں سمجھئے کہ ایک نقاد جب دو شاعروں کے کلام کا مقابلہ کرے گا تو وہ ان شاعروں کی شخصیت کو چھپانا پسند نہ کریگا۔ مثلاً :-

(۱) یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

(۲) دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

(۳) وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

(۴) موت کیوں پوچھیگی پھر آنکھ کے بیماروں کو
جب تمہیں دیکھ کے کہتے ہو کہ حال اچھا ہے

جب تک میں یہ نہ بتاؤنگا کہ اشعار علا و ۳ حضرت داغؔ اور ۲ و ۴ جناب جلالؔ کے ہیں بہت سے پڑھنے والے پورا لطف نہ اٹھائینگے۔ اسی کے ساتھ میرے یہ عرض کرنے پر کہ دوسرا شعر پہلے سے بڑھا ہوا اور چوتھا تیسرے سے گھٹا ہوا ہے داغؔ اور جلالؔ مرحوم کے تعریف کرنے والوں کو برا ماننے کی ضرورت نہیں وہ خاکسار کی رائے کو غلط قرار دیسکتے اور اس کے مناسب دلیلیں پیش فرما سکتے ہیں۔ مگر مجھے الجھکر، اور مجھے برا کہکر، ادب اردو میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتے۔ اوپر لکھے ہوئے چاروں شعروں کے مقابلہ میں مرزا غالبؔ نے سیدھے سادھے الفاظ میں جس اصلی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسکو دیکھکر مرحوم کے خیال کی بلندی کی تعریف کرنے اور اُن کا کمال قبول کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خیر اس بحث کو خاکسار دوسرے قابل حضرات کے لئے چھوڑ کر وفا صاحب کے اعلیٰ خیالات کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہے:-

(۱) حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمین کے جہاز کا

جناب وفاؔ نے اس شعر کے زورِ بیان اور زبان کی صفائی کی تعریف کرتے ہوئے لفظ "بازو" پر اعتراض کیا ہے یہ بیت غالباً میر انیس مرحوم کی ہے کیونکہ دوسرے مرثیہ میں میر صاحب ایک دردناک حالت کا نقشہ دکھلاتے ہوئے ان قافیوں کو اس طرح لکھ گئے ہیں:-

؎ یوں گھر اُلٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

پنڈت صاحب نے "بازو" کو بے ضرورت سمجھا، یا "بضرورت شعری" خیال کیا، حالانکہ اس میں سے ایک بات بھی نہیں۔ شاعر "بازو" کو بدن کے حصے کے بدلے "بھائی" کے معنی میں لکھ رہا ہے اس لئے "فوج کے قدموں کا حملہ"۔ "امان اللہ خاں کے ہاتھ کا حملہ" جس طرح "ذوقِ سلیم کو بُرا معلوم ہے" بازو کا حملہ کیوں ناگوار گزرے گا۔

پہلے ہمیں اس مرثیہ کو دیکھنا چاہیئے جس کے شعر پر بحث ہو رہی ہے اس میں اگر علی اکبرؓ کی لڑائی کا ذکر ہوتا تو بازو کی جگہ "دلبر" لکھا جاتا اور عام لڑائی کی صورت میں "لشکرِ شاہِ حجاز" تحریر ہوتا مگر مرثیہ گو نے چونکہ حضرت عباس علمدار کی لڑائی کا نقشہ کھینچا ہے لہٰذا "بازو" بھائی کے معنوں میں استعمال کیا ہے جبکو دوسرے حضرات بھی بلا تکلف استعمال کر چکے ہیں:-

(صفدر) سقائے اہلبیت ہے بازوئے شاہ ہے
(وحید) کٹ گئے بازوئے شبیر کے بازو ہے ہے
(دلگیر) اُکھاڑا جب درِ خیبر علی نے بولے پیغمبر
ہمارا سا بازو اور یہ زور بازو ہو نہیں سکتا
(مونس) فتح تب ہاتھ آئی جب احمدؐ نے حیدر کو کہا
ہاں مرے بازو جھپٹ کر بابِ خیبر کھول لے
(دلاعلم) پڑھتا ہے آج رن میں رجز بازوئے حسینؓ
آنکھیں سوئے حریف ہیں دل سوئے حسینؓ
جرأت کا جوش ہے یہ علی کے نشاں کو
بھائی حسینؓ اگر کہیں تو الٹ دیں جہاں کو

اردو شاعروں ہی پر منحصر نہیں، فارسی کے استادوں نے بھی بھائی کے معنوں میں "بازو" استعمال کیا ہے۔ چنانچہ مرزا رفیع باذل حملہ میں "اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب" کا رجز یوں تحریر کرتے ہیں:

؎ منم آنکہ پروردگارِ مجید
مرا بہر دفعِ شما آفرید
منم شیرِ یزدان و شمشیرِ دین
منم بازوئے سید المرسلین

شعر زیر بحث میں بازو کی جگہ تاجر۔ یاور۔ عاشق۔ خادم۔ حامی وغیرہ الفاظ آسکتے تھے مگر جو خاص شان اب موجود ہے وہ باقی نہ رہتی عربی میں بازو کو "عضد" کہتے ہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ عضد کس جگہ بھائی کے معنوں میں استعمال ہوا یا نہیں مگر مددگار کے معنی میں ضرور آیا ہے:-

(ا) وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا ہ اور میں نہیں پکڑنے والا گمراہ کرنے والوں کے بازو یعنی مددگار (سورۃ الکہف ترجمہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ)

(ب) اللّٰهُمَّ اَنْتَ عَضُدِي وَنَصِيْرِي۔ الٰہی تو میرا مددگار ہے (دعا کا ابتدائی حصہ)

ایک اور شعر جس کے عیب ظاہر کرنے میں پونا کالم صرف کیا گیا ہے:-

؎ کون سی راہ چلوں کفر و محبت سچ کہہ
کام آئے گا وہاں مذہب اسلام کہ تو

وفا صاحب کے نزدیک "اس شعر کا شمار ان شعروں میں بھی نہیں ہو سکتا جس کے معنی شاعر کے دماغ میں چھپے رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ عقیدت مندوں کی آئندہ نسلیں انکو سمجھتی رہتی ہیں"۔

شعر جس کا کبھی ہو ایسا نہیں جبکو بے معنی سمجھا جائے مگر وہ پنڈت صاحب کے سامنے غلط لکھا ہوا آیا۔ اور صحیح سمجھ لیا گیا۔ اس لئے اس میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے اور انہیں عیوب کو سامنے رکھکر تنقید ضرورت سمجھی گئی۔ اگر جناب وفاؔ "کفر اور محبت" کے بدلے "کفرِ محبت" پڑھیں تو پھر "سچ کہہ" اور "تو" کوئی معمہ نہ رہے۔ اور "کفرِ محبت" جو عاشق کے لئے عین ایمان ہے اس کا مقابلہ اسلام سے درست ہو جائے۔

یہ کفر تو وہ خاص انعام ہے جبکو سرمدؔ نے غمِ عشق بتا کر اس طرح لکھا ہے:-

؎ سرمد غمِ عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار ÷ ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

اور اسی کفر کی ایک معمولی صفت یہ ہے کہ ایک وفادار شخص کو غالب مرحوم گور میں دفن کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ ؎

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غرض کفر محبت کی خاص شان تو محتاج بیان نہیں ہاں اگر اس کے ساتھ کافری حسن کے کرشمے بھی دیکھ لئے جائیں تو پھر اسی قسم کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے فلسفیانہ منطق کی ضرورت نہ رہے ؎

یہ بھی تو سنگ کافری حسن دیکھ لے ؛ واعظ کبھی اُس صنم پہ فدا ہو خدا کرے
(احسان شاہجہانپوری) ؎ وہ کافری حسن وہ لٹنا دل و دین کا
ہم ہو گئے محتاج یہ صدقہ ہے انہیں کا

محمد حسین شوق زیدی سہارنپوری

شیطان کی بستی

جہاں سونے سے تلتی ہے محبت
جہاں ہے حسن اک مالِ تجارت

جہاں معصومیت، دانش، شرافت
ہر اک شے مول لے سکتی ہے دولت

وہی ہے بس، وہی شیطان کی بستی
وہاں خطرے میں ہے انسان کی ہستی

جہاں ہر کام کا مطلب ہے مطلب
گناہوں کا جہاں پردہ ہے مذہب

شوالے، خانقاہیں اور مکتب
جہاں سب پیٹ پوجا کے ہیں کرتب

وہی ہے بس وہی شیطان کی بستی
وہاں خطرے میں ہے انساں کی ہستی

(روشن دین بی اے۔ ایل ایل بی [illegible] سیالکوٹ)

پورس

ایکٹ سوئم

سین اوّل

اکشیانہ - کلوفلا

اکشیانہ - رانی! یہ کیا ہو رہا ہے - میں یہاں قید ہوں؟ اور مجھے اپنی فوج کی پیش قدمی کرتے دیکھنا بھی منع ہے؟ یوں قید رکھکر ٹکسلا مجھی سے اپنی غداری کا افتتاح[1] تو نہیں کرنا چاہتا؟ گویا اُسکی محبّت کا یہی ثمر ہے کہ میرا غلام میرا والی بن بیٹھے - اور میرے تغافل سے اُکتا کر جب دل پر زور نہ چلے - تو پاؤں باندھنے کے درپے ہو جائے۔

کلوفلا - آپ اس کے اندیشہ کی غلط تعبیر کر رہے ہیں۔ ٹکسلا اب تک آپکی نگاہوں کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھُکا - ذرا چشمِ لطف سے دیکھئے - کہ وہ کِس سرگرمی سے آپ کی حفاظت کا اہتمام کر رہا ہے - ہمارے اردگرد جنگجو فوجیں لڑائی میں مصروف ہیں - اور خون بہانے پر تُلی ہیں - کشت و خون کی آگ روشن ہے - اس حالت میں بتایئے آپ کونسی جگہ کس طرح جا سکتی ہیں - جہاں اس طوفان سے پناہ ملے - مہارانی صرف یہی ایک مقام ہے - جہاں جان سلامت رہ سکتی ہے - اس پُرسکون گھاٹ کو ــــــ

اکشیانہ - ایسی ذلیل سکون سے تو مجھے بیَر ہے - میری رعایا اپنی مہارانی کے لئے جان لڑائے - پورس کی بغاوت میں کھیت رہے - اُنکے دمِ واپسیں کی فریاد میرے کانوں میں پڑے - اور مجھے صلح کی گفت و شنید سے مسرور کرنے کی ناروا کوشش کی جائے - ابھی پریس نہیں - مجھے دعوت دی جائے - کہ میں آپ کے بھائی کے کیمپ میں راحت و آرام سے زندگی بسر کروں - رانی! میں خوب سمجھتی ہوں - کہ میری افسردہ خاطر آنکھوں کو عیش و نشاط کے نظارے دکھانے سے فقط یہ مقصد ہے - کہ میرے رنج و غم کا مذاق اُڑایا جائے -

کلوفلا - تو مہارانی! آپ یہ چاہتی ہیں - کہ میرے بھائی کی محبت ایسی عزیز ہستی کو خطرے میں چھوڑ کر الگ ہو جائے - نہیں مہارانی! وہ اپنے فرض کو خوب سمجھتا ہے -

اکشیانہ - اور مجھے اس خطرہ سے بچانے کیلئے اس فیاض دل عاشق نے اپنے کیمپ کو میرا قید خانہ بنا رکھا ہے - اِدھر اس کا رقیب میرے لئے جان جوکھوں میں پڑے - اُدھر وہ صرف اسی پر بس کرے - کہ اس قید خانے کے پاسبان کی خدمت بجا لاتا رہے -

کلوفلا - بلند اقبال پورس! جسکی تھوڑی سی جدائی آپکو خون کے آنسو رُلا رہی ہے - اور آپ اسقدر بے چین ہیں کہ اُس کی تلاش میں میدان جنگ کی خاک چھاننے پر تیار ہیں -

اکشیانہ - بلکہ اس سے بھی زیادہ کوشش کروں - تو کم ہے - میں تو اُس کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کو باعث فخر سمجھتی ہوں - میری سلطنت جاتی رہے بلا سے مگر میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ فاتح کلوفلا کے دل میں بسنے کیلئے کیا قربانی کرتا ہے -

کلوفلا - تو پورس کے لئے آپ کو زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ابھی پابہ زنجیر یہاں آیا چاہتا ہے - ہم تو صرف اس مالِ غنیمت کی حفاظت کر رہے ہیں - جو فاتحانہ عشق نے حاصل کیا ہے۔

اکشیانہ - ابھی تو آپکا دل سکندر کی فتح کے ترانے گا رہا ہے لیکن عشق وقت سے پہلے جو اُمیدوں کا لہلہاتا چمن آپکو دکھا رہا ہے

---

[1] کسی بڑے کام کو شروع کرنے کی رسم۔

اُس سبز باغ کے پھیر میں اپنی آرزوؤں کے دامن کو زیادہ پھیلا دیا ہے ۔ اور آپ آرزو بر آنے کے جھوٹے خواب دیکھ رہے ہیں ۔ ہاں ....

کلوفلا ۔ بھائی جان آ رہے ہیں اور اب ظاہر ہو جائیگا ۔ کہ کون غلطی پر ہے ۔

اکشیانہ ۔ شک و شبہ کی بہت کم گنجائش ہے ۔ اس کی مطمئن پیشانی پورس کی شکست کی دستاویز ہے ۔

سین ۔ ۲

ٹکسلا ۔ اکسیانہ ۔ کلوفلا

مہارانی ۔ اگر پورس ذرا کم جوشیلا ہوتا ۔ ایک دوست کی معقول رائے مان لیتا ۔ تو مجھے اس کے انجام کی منحوس خبر سنانے کا افسوس نہ کرنا پڑتا ۔

اکشیانہ ۔ کیا پورس؟ ....

ٹکسلا ۔ اس کا قصہ ختم ہو گیا ۔ اور جنگ جوئی کی ترنگ میں اس حال میں جا پھنسا ۔ جس سے میں نے بارہا اُسے خبردار کیا ۔ گو وہ میرا رقیب تھا ۔ مگر میں یہ کہنے سے دریغ نہیں کرونگا ۔ کہ اس کی قوت بازو نے حریف کے مقابلے میں ہمت نہیں ہاری ۔ اور دشمنوں کا خون بہانے میں تسمہ نہیں لگا رکھا ۔ اقبال نے پورس اور سکندر میں سے ایک کو منتخب کرنے کے لئے بہت سر دھنا ۔ اور ابھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہونچا تھا کہ پورس کی نگاہ مجھ پر پڑی ۔ بھڑک اُٹھا ۔ اور قوت فیصلہ کا توازن قائم نہ رہا ۔ اندھا دھند حملے کرنے لگا ۔ فوج کا شیرازہ بکھر گیا ۔ اور اُن کے قدم اکھڑ گئے ۔ آپ کی سپاہ برباد ہو گئی ۔ اور اس کے سپاہی بھاگ گئے ۔ آخر پورس بھی اس بھاگڑ میں شامل ہو گیا اور جان بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا ۔ اس زود پشیمانی کی حالت میں اُس نے اُس مدد کی التجائیں کیں ۔ جسے وہ رد کر چکا تھا ۔

اکشیانہ ۔ رد کر چکا تھا ؟ تو پھر ؟ کیا آپ کی حب الوطنی کا جذبہ صرف منت و خوشامد سے بیدار ہو سکتا ہے ۔ جب تک آپ کو جنگ پر مجبور نہ کیا جائے ۔ آپ اپنے ملک کی حفاظت کیلئے اُٹھ نہیں سکتے ۔ ہاں ہم پورس کی باتیں کر رہے تھے ۔ کہ اس نے اپنے قول و فعل سے آپ نے ارادوں کا اظہار نہ کیا تھا ۔ تعجب ہے ۔ کہ اس کے دلیرانہ ارادے نے آپکے دل میں ہمت اور استقلال پیدا نہ کئے ۔ آپکو یہ بھی خیال نہ آیا ۔ کہ اُس کی محبوبہ اور سلطنت معرض خطر میں ہے ۔ خیر جو ہوا سو ہوا ۔ اب تشریف لے جائیے ۔ اور اُس دیوتا کی بندگی کیجئے ۔ جو آپکی بہن نے آپ کے لئے چھانٹا ہے ۔ اس کے کینہ ور احکام کی تعمیل کیجئے ۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکئے ۔ اپنے دلدار کو انہیں زنجیروں سے باندھئے ۔ جن سے آپ کا رقیب جکڑا ہوا ہے ۔ بہر حال آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا ۔ خوب کیا ۔ آپ کے جُرم اور اُسکی شکست نے پورس کو میرے لئے ایک دیوتا بنا دیا ہے ۔ جسکی پوجا میرے دل کے مندر میں ہوتی ہے ۔ میرا ارادہ ہے ۔ کہ غروب آفتاب کے پہلے میں یہ ظاہر کر دوں ۔ کہ میں کسے چاہتی ہوں ۔ اور کس سے بیزار ہوں آپ کے روبرو پورس سے عہد وفا باندھوں ۔ اور اُس کے سامنے آپ سے ہمیشہ کی نفرت کی قسم کھاؤں ۔ اور اگر اب بھی آپ میری محبت کا دعوٰی کریں تو آپ کی مرضی ۔

ٹکسلا ۔ مہارانی ! مجھے بے وفا اور بد عہد خیال نہ کریں ۔ یہ عرض کرتا ہوں ۔ کہ سکندر مہارانیوں کو قید و تعزیر سے ہراساں نہیں کرنا چاہتا ۔ بلکہ خوب سمجھتا ہے ۔ کہ ایسے حسین و جمیل قیدی کس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں ۔ اس کے دریائے کرم کو جوش پر آنے دیجئے ۔ اور اس تخت و تاج کو قائم رکھئے ۔ جنہیں پورس کی خود پسندی نے زوال کے بھنور میں ڈال دیا تھا ۔ پھر میری تلوار ذمہ دار ہے ۔ جو کوئی اس مقدس چیز کو ہاتھ لگانے کی بھی جرأت کرے ۔

اکشیانہ ۔ یعنی دشمن سے سلطنت بھیک مانگ کر لوں اور اُسے برقرار رکھنے کے لئے آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی پھروں ۔ مرتی مر جاؤں پر یہ مجھے گوارا نہیں ۔ کہ جس خونخوار نے مجھ سے تخت چھینا ۔ وہ اب ہاتھ سے پکڑ کر مجھے اس پر بٹھائے ۔

ٹکسلا ۔ آجتک بورا جہ اور مہارانیاں اسکی بے پناہ تلوار کی تاب نہ لا سکیں ۔ اُن کے زخموں پر اُس کے دست شفقت سے مرہم لگایا ۔ دارا کی ماں کے ساتھ ایک سعادتمند بیٹے کے ایسا سلوک کیا ۔ اور اُس کی ملکہ کو ایک جانثار بھائی کا جلوہ دکھایا ۔

اکشیانہ ۔ بہر حال مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا ۔ کہ رفاقت کی عزیز پونجی فروخت کر ڈالوں ۔ ظالموں کی خوشامد کروں ۔ اور سلطنت کیلئے ہاتھ میں کاسۂ گدائی لئے پھروں ۔ ریں ایرانی عورتیں تو وہ میرے لئے قابل تقلید نہیں ۔ کیا آپ کو توقع ہے کہ میں سکندر کے دربار میں جا کر

ے کوئی فیصلہ نہ کرسکا ۔

کی طرح حاضر ہونگی؟ اُس کی جہاں گردی میں اُس کے ساتھ ساتھ لگی پھرونگی۔ اور اس بات پہ ناز کرونگی۔ کہ اُس نے کیسی خوبصورت، ہلکی پھلکی بیڑیاں میرے لئے تیار کی ہیں مہاراج! اگر سکندر کو تاج بخشی کی خواہش ہے۔ تو کیوں نہیں ہمارے تاج اُٹھا کر آپکو دیدیتا۔ اور کیوں آپ کے سر کو مانگی تانگی کلغیوں سے مرصع کرتا۔ کیا پورس کو کوئی بھی اس حاسدانہ نگاہ سے دیکھیگا۔ اور آپ ہم سے زیادہ اُسکی غلامی کے سزاوار ہو جائیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ جب سکندر کو پتہ لگیگا۔ کہ آپ کے ناروا جُرم نے اُس کی فتح کو دھبہ لگا دیا ہے۔ تو وہ اُسے آپ کے خون سے دھونے کی کوشش کریگا۔ ابھی وقت ہے۔ کہ آپ اُس سے ٹوٹ کر کسی اَور سے ملجائیں۔ آپ جیسے زمانہ ساز۔ صرف ایکدفعہ غداری کرنے پر بس نہیں کرتے۔ بلکہ جب تک یہ شراب رَواَتشہ نہ ہو جائے۔ اُن کا سامان سرور ہی نہیں کھوتا۔ اسلئے اس کی عنایات سے سرشار نہ ہو جائیے۔ اور بیوفا ثابت ہونے پر بیچی آنش جس انجام کو پہونچا۔ اُسے ہمیشہ زیر نظر رکھیئے۔ اب الوداع۔

سین - ۳

کلوفلا ۔ ٹکسلا

کلوفلا - اُس کے غضب کی آگ کو چاپلوسی کی اوس سے بجھائیے اس عرصے میں وقت اور فاتح کی عنایات آپ کی کامیابی کو یقینی کر دینگی۔ وہ اس وقت غم و غصہ سے دیوانی ہو رہی ہے۔ اور جو منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہے لیکن وہ وقت دُور نہیں جب وہ تخت نشین ہونے سے انکار نہ کریگی۔ انجام کار آپ نہ صرف اس کی دولت و حشمت بلکہ اُس کے دل کے بھی مالک ہو جائیں گے۔ ہاں یہ تو کہئے۔ کہ آپ فاتح سے ملے تو اُسے کیسا پایا۔ آپ سے ملا۔ تو کیا کہا؟۔ اور ہمیں اُس سے کس سلوک کی امید رکھنی چاہئے۔

ٹکسلا - بہن! میں آپ کے سکندر سے ملا۔ اُس کی اُٹھتی جوانی کی بہار دیکھکر یقین نہیں آتا۔ کہ اسقدر کارنامے اس سے ظہور میں آئے ہیں سچ تو یہ ہے۔ کہ میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کہ یہ عمر اسقدر ناموری حاصل کر چکی ہے لیکن اُن کی پیشانی پہ شجاعت اور اقبال کا ستارہ ضرور چمک رہا تھا۔ اس کی آگ برسانے والی آنکھیں اور شاہانہ انداز چغلی کھا رہے ہیں۔ کہ وہی سکندر ہے۔ اور اس کا بارعب چہرہ بتاتا ہے۔ کہ وہ کسقدر عالی حوصلہ انسان ہے۔ اُس کی طبیعت کا استقلال، اُس کے دعووں کی تائید کرتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانی کیلئے آنکھ اُسکے بازو سے زیادہ بل رکھتی ہے۔ وہ میدان جنگ سے واپس آرہا تھا۔ تو میں اس کا جاہ و جلال دیکھکر کچھ ششدر سا ہو گیا۔ مجھے دیکھکر مسکرایا۔ اور اس تبسم کی اوٹ میں فتح و نصرت کھیلتے نظر آئے۔ وہ اپنے مرتبہ کو بھُول گیا۔ اور اپنے احسان و کرم کے کرشمے دکھانے لگا۔ آخر کار محبّت کی پھانس فتح کی خوشی پر غالب آئیں۔ اور مجھ سے کہا واپس جائیے۔ اور اپنی بہن سے کہئے کہ اپنی من موہنی آنکھوں کو اس فاتح کے دیکھنے کو تیار کرے۔ جو اپنی فتوحات کے پھل کے ساتھ اپنا دل بھی اس کے قدموں پر ڈالنے کے لئے آرہا ہے۔ بہن اسے بس آیا ہی سمجھئے۔ باقی باتیں پھر۔ آپ اپنی قسمت کی مالک ہیں۔ اور میں اپنی قسمت کو آپ کے حوالے کئے جاتا ہوں۔

کلوفلا - اطمینان رکھئے۔ خدا نے چاہا تو آپکی قسمت کا بال بیکا نہ ہوگا۔ اگر فتح مند میرے جال میں پھنس گیا۔ تو ساری دنیا آپ کے اشارہ پر چلیگی۔

سین - ۴

سکندر - ٹکسلا - کلوفلا - ہیپ فیچن

سکندر - ہیپ فیچن! یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ۔ اور پورس کو تلاش کرو۔ جبتک وہ نہ ملیگا۔ مجھے چین نہ آئیگا۔ خواہ اس کی خاطر کئی اور گنہگار کیوں نہ بچ جائیں۔ مگر وہ زندہ گرفتار ہو۔

سین - ۵

سکندر - ٹکسلا - کلوفلا -

سکندر - مہاراج! تو یہ خبر درست ہے؟ کہ ایک گمراہ مہارانی ایک تند مزاج اور ناعاقبت اندیش راجہ کی بہادری کو آپ سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ آپ اس راجہ کی ذرا پروا نہ کریں۔ اور اُس کی ممالک کو اپنا خیال کریں۔ اب آپ کے ہاتھ میں ایک ایسی چیز ہے۔ جسے دیکھکر اس مہارانی کے غرور و تکبر کے بل نکل جائیں گے۔ میں اس کا ملک بھی آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ جائیے۔ اور اپنی محبت کے ہدیہ میں تین تاج اُس کے سامنے پیش کیجئے۔

ٹکسلا - فیاضی کی حد ہو گئی۔ جو سُنا تھا۔ وہ کیا کم تھا۔ مگر آپ اس سے بھی زیادہ نکلے۔

سکندر - فرصت کے وقت شکریہ بجا لائیگا۔ اسوقت جائیے۔ محبّت آپ کے انتظار میں ہے۔ اُسے اُٹھا کر کامیابی حاصل کیجئے۔

سین - ۶

سکندر - کلوفلا

سکندر - رانی! میں اس عشق کی جنگ میں دل وجان سے اسکی مدد کرونگا۔ لیکن جو کچھ میں اس کی محبت کو پروان چڑھانے کے لئے کررہا ہوں۔ کیا اس کا انعام میری شہرت کے سوا مجھے کچھ نہ ملیگا۔ اتنی بڑی فتح کا سارا ماحصل ٹکسلا کے حوالہ کرچکا۔ اور اب ایک ہارے ہوئے کی طرح آپ کے ہاتھ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مشکلات کے پہاڑ چیر کر آپ سے ملونگا۔ تو آپ کو یاد ہے۔ کہ ان گلاب کی پنکھڑیوں سے کیا آواز پیدا ہوتی تھی۔ یہی کہ آپ اس ناچیز کو اپنے خانۂ دل میں مہمان بنائیں گے۔ قوتِ عشق نے میری مدد کی۔ اور فتح نے میری بات کی لاج رکھ لی۔ اس طرح رانی! مجھے شرفِ باریابی ملا۔ دیکھئے جب چاروں طرف سے تابعداری کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں تو آپ کو بھی زیبا ہے۔ کہ آپ کی ہاں میں ہاں ملائیں یا یہ کہدیجئے۔ کہ آپ اپنے اقرار سے پھرنا چاہتی ہیں۔ مگر کیا یہ وعدہ کبھی فاتح وقت سے انکار کا حوصلہ کرسکتا ہے۔

کلوفلا - میرا دل اسقدر مضبوط نہیں۔ کہ جب کوئی مقابلہ نہ کرسکے۔ تو یہ آزادی کے راگ گاتا رہے۔ میں آپ کی طاقت کے آگے سر جھکاتی ہوں۔ کیونکہ آپ کی طاقت نے سینکڑوں بادشاہوں کو آپکے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کو فتح کرنا تو آپکے لئے ایک کھیل تھا۔ آپ بڑے بڑے بہادروں کو شکست دے سکتے ہیں۔ اور آپ کی محبت وبخشش پتھر دلوں کو بھی موم کردیتی ہے۔ مگر جہاں پناہ! میرے لئے یہ مردانگی اور یہ انعام تکلیف اور پریشانی کا سامان ہے۔ مجھے یہ ڈر کھائے جاتا ہے۔ کہ کہیں آپ میرے دل پر قابض ہونے کے بعد سیر نہ ہوجائیں۔ اور مجھے جدائی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ جائیں۔ ان جذبات سے بے پروا ہو کر جو آپ ہی نے بیدار کئے ہیں۔ آپ کا دل اس تسخیر سے بھر جائے۔ جو اتنی آسانی سے ہوگئی۔ حضور جیسے بڑے انسانوں کی محبت بے ثبات ہوتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ ناموری کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ جب آپ ثروت کی نگاہیں بڑھا رہے ہیں۔ آپ کا دل مزید فتوحات کی تدبیروں میں الجھا ہو۔

سکندر - بھولی رانی! محبت کی رمزوں سے آپ کتنی ناآشنا ہیں کیا میری آہیں جو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آپ کے پاس پہونچتی ہیں۔ آپ کے کان میں کچھ نہیں کہتیں۔ مجھے تسلیم کہ معرکۂ جنگ اور فوج کی ترک وتاز کے درمیان میرے دل میں صرف ناموری کی تمنا ہوتی ہے۔ اور میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ شاہ سے لیکر گدا تک میرے مطیع و طابع ہو جائیں۔ مہوشانِ ایران نے اپنے بادشاہوں سے بڑھ کر سخت حملے میرے دل پر کئے۔ لیکن میرے دل نے ان کے تیرِ نگاہ نہ تیوے اور ان کے حسن وجمال کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا۔ اور صرف ناموری کا متوالا بنا رہا۔ وہ اسوقت تک دادِ محبت سے ناآشنا رہا۔ جب تک کہ آپ کی ظالم آنکھوں نے اس پر بنا چرکا نہ لگایا۔ اب اسے فتح کی آرزو نہیں رہی۔ بلکہ اپنی شکست پر ناز کرنے کا متوالا ہے۔ وہ اپنی قسمت پر اترائیگا۔ اگر آپ کی آنکھیں رحم سے اس کامیابی کو شرفِ قبول عطا کریں گی۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ ان آنکھوں کی جہاں کشایانہ اولوالعزمی کی تو کوئی بازپرس نہ ہو۔ اور میرا نعرۂ جنگ سمع خراشی کا مجرم قرار پائے۔ تو کیا آپ کی محبت کی دل آویز زنجیریں بڑے آدمیوں کے لئے وضع نہیں ہوئیں۔ یہ محض عاجزی ہے۔ اب میرا ارادہ عجیب تر کارنامہ دکھانے کا ہے۔ اور دنیا کو اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ سکندر کا دل حضرت عشق کا استقبال کس شان سے کرتا ہے۔ اب میرا یہ بازو آپ کے تابع فرمان ہے۔ اور اسے اپنا پاس ابرو ویسا ہی ہے۔ جیسا میری شان کا [illegible] سے اب ہمارے نام کی ہیبت [illegible] بلند ہوگی۔ اور ایسے مقامات تک پہونچیگی۔ جہاں کسی نے نام تک نہ سنا ہوگا۔ وہاں ہمارے نام پر کلیسے تعمیر ہونگے۔ جہاں آجتک دیوتاؤں کا مندر نہیں بنا۔

کلوفلا - ہاں ہاں فتح آپ کی باندی بنکر آپ کے ہمراہ جائیگی۔ لیکن مجھے شک ہے۔ کہ آیا عشق اس کی پیروی پر آمادہ ہوگا۔ جب سمندر آپ کو اپنی موجوں پر سوار کرکے لے جائیگا۔ [illegible] میرے درمیان کو آپ کے دل سے [illegible] جب تمام دنیا فتح ہو جائیگی۔ جب تمام فرمانروا آپ کے [illegible] کرۂ ارض کا امن آپ کی ہیبت سے [illegible] تو اسوقت کیا آپکو اس بات کا دھیان آئیگا۔ کہ ایک [illegible] رانی [illegible] آپ کی یاد سے دل بہلا رہی ہے۔ اور آپ کے خیال [illegible] زندگی کا مدار ہے۔

سکندر - تو کیا آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ اس [illegible] میسر آئی ہے۔ میں یہاں چھوڑ جاؤنگا۔ [illegible]

ہاتھ سے ایشیا کا تخت آپ کے سامنے پیش ہو۔

کلوفلا۔ مہاراج! آپ جانتے ہیں۔ کہ میری رضا بھائی کی مرضی کی پابند ہے۔

سکندر۔ اگر میری خوشی اس کے ساتھ ہے۔ تو سارے ہندوستان کو اُس کے قدموں پر گرکر میری سفارش کرنا ہوگی۔

کلوفلا۔ مجھے بھائی سے بے غرض محبت ہے۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ اس کے رقیب کو جس نے آج آپ کے قہر کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سے زیادہ خوش نصیب نہ بنائیں گے۔

سکندر۔ بیشک پورس ایک بہادر رقیب ہے۔ بہادری اس سے زیادہ میری تحسین کی کبھی مستحق نہیں ہوئی۔ میں نے اُسے لڑائی کے گھمسان میں دیکھا۔ ہم آمنے سامنے ہوئے۔ مگر اُس نے مقابلہ سے منہ نہیں پھیرا۔ اور ہم ایک دوسرے پر وار کرنے کے لئے مناسب موقع تلاش کرنے لگے۔ قریب تھا۔ کہ ہم میں سے ایک تلوار کے گھاٹ اُترتا۔ کہ فوج کا ایک ریلا آیا۔ اور وہ میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔

سین۔ ۷

سکندر۔ کلوفلا۔ ہِپ فیچن

سکندر۔ ہاں تو کیا وہ گمراہ اور وحشی راجہ گرفتار ہوگیا۔

ہپ فیچن۔ ہر جگہ تلاش کی۔ مگر کچھ پتہ نہ ملا۔ مارا گیا یا بھاگ نکلا۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس کی فوج کا کچھ حصہ بھاگتا ہوا اکھڑا ہوگیا۔ اور مزید تعاقب کا راستہ اٹ گیا۔ ان سے لڑائی جاری ہے۔ مگر اُن کا زندہ گرفتار ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

سکندر۔ ہتھیار چھین لو۔ مگر انہیں زندگی سے مایوس نہ ہونے دو۔ ہمارا مقصد صرف اس ضدی مہارانی کو عاجز کرنا ہے۔ اور رانی! اسطرح مجھے آپ کے بھائی کا دل ہاتھ میں لینا ہے۔ کہ جبتک اس کے دل کو چین نہ آئیگا۔ میرا دل بھی بیقرار رہیگا۔ (باقی باقی)

نور الٰہی محمد عمر

غزل

اعتبارِ منزل کیا۔ ذوقِ جستجو ہی ہے
کامیابیٔ دل کیا۔ کیفِ آرزو ہی ہے

ترکِ جستجو کرکے دل کا مدعا پایا
ترکِ جستجو لیکن فیضِ جستجو ہی ہے

مے بقیدِ ساغر ہے ہم بقیدِ آزادی
جس سے جا کے مل بیٹھیں ساغر و سبو ہی ہے

آبرو جسے کہیئے کچھ نہیں بجز پندار
یاں شکستِ ہر پندار اپنی آبرو ہی ہے

تو حقیقتِ عالم وہمِ غیریت باطل
بلکہ وہمِ باطل بھی حق تو یہ ہے تو ہی ہے

زلفِ مشک بو کا غم دل کو وقف کیوں کر لے
دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے

جس جگہ نظر ٹھیرے وہ حجاب ہے اُس کا
دے نظر کو آزادی پھر وہ روبرو ہی ہے

یہ فریبِ تسکیں ہے ترکِ آرزو معلوم
ترکِ آرزو میکش یہ بھی آرزو ہی ہے

میکش

ہندوستان کی زبانیں اور مسلمان

ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی عناد ہماری آزادی کی راہ میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہے۔ اس عناد کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی جو کتابیں پہلے پہل ہندوستانیوں کو پڑھائی گئیں اُن میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف نہایت بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ ان کتابوں کی بدولت اہلِ ہنود کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں پر طرح طرح کے ظلم توڑے۔ اور اُن کی تہذیب اُن کے لٹریچر اور آرٹ اور اُن کی مذہبی زبان سنسکرت کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی لیکن جب ہم تاریخ کے ورق الٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تیرھویں صدی عیسوی میں بھی بہت سے مسلمان بادشاہ نہ صرف سنسکرت اور ہندی کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے بلکہ خود بھی ان دونوں زبانوں میں کتابیں لکھتے تھے۔ میں یہاں اُن ہزاروں مسلمان ادیبوں اور مصنفوں میں سے چند کے نام بیان کرونگا۔ جنہوں نے سنسکرت اور بھاشا کی خدمت اُس زمانے میں کی جب اہلِ ہنود ان زبانوں کو چھوڑ کر فارسی اور عربی کی طرف راغب ہو رہے تھے۔

سلطان زین العابدین جو اکبر سے کئی سو سال پہلے زعفران زارِ کشمیر پر حکومت کرتا تھا سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اُس نے فارسی سے سنسکرت اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرانے کے لئے ایک دار الترجمہ قائم کیا چنانچہ اسی با مذاق سلطان کے عہد میں مہابھارت پہلی مرتبہ فارسی میں ترجمہ ہوئی اور اکبر کے زمانہ میں اسی ترجمہ کی ترمیم کی گئی۔ والیانِ کشمیر کی ایک بسیط تاریخ راج ترنگینی بھی سلطان... زین العابدین کے زیرِ نگرانی لکھی گئی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق جس کے عدل و انصاف اور جود و سخا کے قصے زبانِ زدِ خاص و عام ہیں سنسکرت کے ساتھ خاص اُنس رکھتا تھا چنانچہ جب اُس نے کانگڑہ فتح کیا تو جوالا مکھی مندر کی عالیشان لائبریری سے بہت سی کتابیں نکلوا کر فارسی میں ترجمہ کروائیں۔ انہیں سے فیروز شاہی علمِ نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ اب تک مشہور ہے۔ یہ ترجمہ مولینا عز الدین نے کیا۔

امیر خسرو کو بھاشا کا پہلا مسلمان شاعر کہتے ہیں لیکن امیر سے ۲۰۰ برس پہلے سلطان محمود غزنوی کے درباری شاعر مسعود مسلمان نے اپنا ایک دیوان بھاشا زبان میں مرتب کیا۔ اب اس دیوان کا نام ہی نام رہ گیا ہے اشعار کا پتہ نہیں چلتا۔

امیر خسرو نے اپنی ایک کتاب میں ایک پورا باب ہندوستان کی تعریف میں ہندو مذہب کی خوبیوں پر لکھا ہے۔

سلطان فیروز شاہ کے بعد جب خاندان تغلق کی سلطنت تغلق کا شیرازہ بکھیر تو شوریدہ سر صوبہ داروں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں چنانچہ بنگال۔ مالوہ۔ گجرات اور دکن وغیرہ سلطنت دہلی سے الگ ہو گئے۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق سنسکرت اور ہندی کو ترقی دینے کے وسائل اختیار کئے۔

سلطان نصرت شاہ کے حکم سے ایک مسلم ادیب نے ۱۴۰۰ عیسوی میں بھگوت گیتا کا ترجمہ کیا اور کاوندری پرمیشور نے پرگل خاں کے حکم سے جو سلطان حسین شاہ کا منہ چڑھا سپہ سالار تھا۔ مہابھارت کا ترجمہ کیا۔ گجرات میں محمود بیگڑہ کے عہدِ سلطنت میں گجراتی زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ اور پہلے پہل یہیں اردو زبان کی داغ بیل پڑی۔

دکن میں ابراہیم عادل شاہ نے مرہٹی کو اپنی درباری زبان بنا کر غربی ہند میں فارسی کا اقتدار توڑا۔ اسی زمانے میں دکن میں بھی یا قدیم اردو میں تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔

شیر شاہ کے عہد میں محمد جائسی اودھ ایک چھوٹے سے موضع میں پیدا ہوا اور پدماوت لکھ کر تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ پدماوت پاکیزگیٔ زبان اور خوبیٔ بیان کے لحاظ سے بھاشا کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ محمد جائسی نے پدماوت کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں بھاشا میں لکھیں۔

شیر شاہ کی موت کے بعد اس کے جانشینوں کے باہمی تنازعات نے اُس کی عمر بھر کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ ہمایوں شاہ طہماسپ سے ... ۱۲۰۰۰ سپاہی لے کر ہندوستان میں آیا اور پھر تخت پر قابض ہو گیا۔ ہمایوں کی موت کے بعد [illegible]

کیا اور اکبر نے خاندان مغلیہ کا کھویا ہوا اقتدار نئے سرے سے قائم کیا۔

اکبر کا عہد مغلیہ سلطنت کا عہد شباب تھا جس میں ہندوستان کے دولت و ثروت کا شہرہ ایشیا سے نکل کر یورپ تک پھیل گیا۔ اکبر کے زمانے میں سنسکرت اور ہندی کو جو فروغ حاصل ہوا بکرماجیت کے بعد کسی بادشاہ کے عہد میں حاصل نہ ہوا تھا۔ اکبر نے سنسکرت کی سینکڑوں کتابیں فارسی میں ترجمہ کروائیں۔ چنانچہ فیضی۔ غلام علی آزاد اور عبدالجلیل بلگرامی اکبری عہد کے مشہور سنسکرت مصنف ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں ملا مسیح پانی پتی نے رامائن کو فارسی میں نظم کیا۔

جہانگیر خود سنسکرت کا بہت دلدادہ تھا اور ہندو سادھوؤں اور پنڈتوں سے خاص عقیدت رکھتا تھا چنانچہ اس نے جودھروپ کو ملنے کے لئے ایک کٹھن سفر کی کلفتیں اٹھائیں جس میں کئی بار پاپیادہ چلنے کی تکالیف بھی شامل ہیں۔

شہزادہ دانیال جہانگیر کا چھوٹا بھائی ہندی میں بھاشا کا بہت بڑا شاعر گنا جاتا ہے۔

عواصی اور ملا نوری دربار جہانگیر کے شاعر تھے۔ بھاشا اور سنسکرت میں کافی استعداد رکھتے تھے لیکن اس عہد کا سب سے بڑا سنسکرت شاعر شیخ شاہ بلگرامی تھا جو حصار کی صوبہ داری پر معین تھا۔

مغلوں کو ہندوستانی زبانوں سے ایسا ہی اُنس تھا جیسا فارسی سے۔ وہ سنسکرت اور بھاشا کے شاعروں سے ایسی ہی دریا دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ پیش آتے جیسے فارسی یا عربی شاعروں سے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ راجہ سورج سنگھ جہانگیر کے دربار میں ایک ہندی شاعر کو لایا۔ جہانگیر کو اُس کی نظم ایسی پسند آئی کہ فوراً ایک ہاتھی انعام اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا۔

اسی زمانہ میں میر ہاشم محترم ایک عربی شاعر نے تمام مہابھارت حفظ کر رکھی تھی۔

عالمگیر جیسے عام مورخین نے ہندوؤں اور ہندو ادب کا جانی دشمن بتایا ہے۔ بھاشا سے بہت محبت رکھتا تھا۔

ضمیر عالمگیری دربار کا مشہور ہندی شاعر ہوا ہے۔ اُس نے اپنا ہندی تخلص نیقی رکھا اور علم موسیقی کی ایک مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

دانا بھی اسی عہد کا بھاشا شاعر تھا۔

بھاشا اورنگ زیب کے عہد میں اس قدر مقبول ہو چکی تھی کہ عربی اور فارسی کے مشہور فاضل اور مذہب و فقہ کے جید عالم اسے پڑھتے اور اسمیں مضامین لکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ غلام مصطفےٰ نے عالمگیری عہد کے ایک بڑے پرہیزگار اور پارسا ولی گزرے ہیں۔ انہوں نے سنسکرت اور بھاشا میں اتنی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل پنڈت بھی ان کا لوہا مانتے اور اُن کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہونا باعث فخر سمجھتے تھے۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب راجہ جے سنگھ والئی جے پور نے اپنا مشہور رسدخانہ قائم کیا تو مشہور عربی فاضلوں نے شرح چغمنی علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ شرح چغمنی علم ہیئت کی ادق ترین کتابوں میں سے ہے اور اس کا ترجمہ کرنے کے لئے ہندی زبان پر پورا اقتدار لازمی تھا۔

سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے بنارس کا سفر کیا۔ انہوں نے چندریکا اور درپھیک سنگھ دو کتابیں علم موسیقی پر بھاشا میں لکھیں۔

رحمت اللہ جو خیرالدین بلگرامی کے فرزند رشید تھے بھاشا کے مشہور شاعر تھے۔

سید غلام نبی فرزند سید محمد باقر بلگرامی جو ۱۱۱۱ ہجری میں فوت ہوئے۔ بھاشا کے مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے بھاشا میں ۱۷۷ اشعار کی ایک نظم لکھی اور اس کا نام مٹی درپن رکھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بلگرام جو اودھ میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمیشہ سے سنسکرت دانی کے لئے مشہور رہ چکا ہے۔ بھاشا کے مسلمان شاعر جتنے بلگرام نے پیدا کئے اتنے شاید ہی کسی اور مقام میں پیدا ہوئے ہونگے۔ ہمارے اپنے زمانہ میں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم جن کی فارسی اور اردو شاعری کی دھاک تمام ہندوستان میں بیٹھی ہوئی ہے سنسکرت کے ایم۔ اے تھے۔

ہمارے زمانہ میں پروفیسر معین الدین میرٹھی جنہوں نے اپنی عمر کے ۲۰ سال سنسکرت کی تعلیم میں گذارے ہیں خلفائے عباسیہ کے کئی مشہور قصے عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً سنسکرت کی مذہبی کتابوں سے مفید حصوں کے ترجمے بھی اخباروں اور رسالوں میں بھیجتے رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا نام ان ہزاروں مسلمان مصنفین میں سے چند کے ہیں جنہوں نے سنسکرت اور بھاشا کے وقار کو اسلامی عہد حکومت میں قائم رکھا اور ہمیشہ اس بات میں کوشاں رہے کہ جہاں ان کی مادری زبان فروغ پائے وہاں ملک کی زبانیں بھی ساتھ ہی ساتھ ترقی کرتی رہیں

میرے خیال میں تو یہ مغلیہ بادشاہوں اور ان کے درباری شاعروں ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جہاں آج پچاس سال سے انگریزی کے سامنے فارسی اور عربی کا چراغ مدھم پڑ چکا ہے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی اور دوسری ملکی زبانیں دن دُونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔

محمد جمیل ایم۔ اے

حزیں اگرچہ ہے دل، ذوقِ انتظار بھی ہے
یہ نااُمید کسی کا اُمیدوار بھی ہے

ہر ایک بات پہ مشکل ہے عذرِ مجبوری
کہ آدمی کو بظاہر کچھ اختیار بھی ہے

فنا کے بعد بھی دو چار دن نمود رہی
اُگا ہے سبزہ بھی، شمعِ سرِ مزار بھی ہے

فریب کھاؤں نہ کیونکر طلسمِ ہستی کا
خزاں کا دور بھی ہے، مدتِ بہار بھی ہے

اگرچہ خستۂ جورِ فلک ہوں۔ پر صد شکر
دلِ ستم زدہ مجروحِ تیرِ یار بھی ہے

جہانِ عشق ہے اک لازوال مے خانہ
سرورِ نشہ بھی ہے تلخیٔ خمار بھی ہے

رُکے تو کیسے رُکے کارِ عشق دنیا میں
کہ ہجرِ یار میں امیدِ وصلِ یار بھی ہے

نگاہِ ناز کے نیرنگ کا ہلاک ہوں میں
محبت اس کی نہاں بھی ہے آشکار بھی ہے

وہ بزمِ عیش میں بیٹھے ہیں، اُن کو یاد کہاں
کہ مجھ سے دور کوئی میرا بے قرار بھی ہے

فریبِ غمزہ سے تیرے عجب ہے دل کا حال
کہ نا امید بھی ہے اور امیدوار بھی ہے

ڈرو نہ دینے سے الزام تم مرے دل کو
گناہ اگر ہے وفا تو گناہگار بھی ہے

یہی نہیں ہے کہ دل ہے بلاکشِ ہجراں
فریب خوردۂ اُمیدِ وصلِ یار بھی ہے

نجات ہوگی نہ ایسے کے دام سے وحشت
کہ بے وفا بھی ہے اور وفا شعار بھی ہے

طلسمی دروازہ

ابھی حال ہی کی بات ہے کہ میں لندن میں کچھ خفیہ تحقیقات کر رہا تھا۔ حالات کے لحاظ سے مجھے مدرسی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ ایک روسی خاندان میں انگریزی پڑھانے کی نوکری مل گئی۔

یہ لوگ اپرا ویرن میں رہتے تھے۔ جو لڑکا مجھ سے پڑھتا تھا اس کا سن اُنیس بیس سال سے زائد نہ تھا۔ ابھی تک مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ نیلی مگر بشاش آنکھوں کی بدولت وہ جرمنی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ابتدا ہی سے اُسکے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا۔ میں اُس کی زبان درست کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا اور وہ تحصیل علم کے لئے فطرتاً نہایت موزوں طبع تھا۔

مسٹر ورچیف بہت بڑے سوداگر تھے جن کا اصلی کارخانہ پیٹرس برگ میں تھا۔ اور شاخیں تمام یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں اُن کی آرزو صرف اس قدر تھی کہ اُن کا اکلوتا اور چہیتا بیٹا پال انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے۔

ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازہ دوبارہ کھلا۔ ایک گھنگر والے بالوں والی نو دس برس کی ہنس مکھ لڑکی اندر آئی۔ اس کے نازک اور خوبصورت چہرہ کی وضع قطع بدلیسیوں کی سی ضرور تھی مگر غیر معمولی حسن کی اُمیدیں اُسکے رخسار وں سے نمایاں تھیں۔

وہ حیران اُچھلتی کودتی کمرہ میں آئی اور اُس نے خالص روسی زبان میں کچھ فقرے کہے جس کے معنے میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکے اس کے بعد وہ کودتی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی اپنے ہاتھ کی موٹی گڑیا اُن کے زانو پر رکھدی ۔ مُڑی اور مجھے دیکھ کر کچھ وحشیانہ انداز سے شرما کر مسکرا دی "پال کے نئے ماسٹر یہی ہیں" پھر میری طرف دیکھ کر ہنسے "میری لڑکی اُلگا بڑی شرمیلی ہے ۔

بوڑھے تاجر کی بیوی مرچکی تھی مگر وہ اپنے بچوں پر دل و جان سے فدا تھا۔ مجھے سبق پڑھانے کے لئے روزانہ جانا پڑتا تھا۔ لہذا خاندان والوں سے ایک خاص اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ مکان پُرانی وضع کا نہایت مضبوط و عالیشان تھا۔ دروازے دوہرے تھے اور دستے چمکدار پیتل کے لگے ہوئے تھے۔ مگر پھاٹک میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اول دن ہی سے مجھے متوجہ کر لیا تھا۔

اس پر سفید رنگ تھا اور براق قلعی کے چاروں طرف سُرخ رنگ کا گہرا حاشیہ تھا۔ دونوں رنگ مل جُل کر عجیب و غریب خوبصورتی پیدا کرتے تھے۔

مگر ایک ہی ہفتہ کے اندر جب میں اپنے وقت پر حسب معمول آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صدر دروازہ پر گہرے ماشی رنگ کی قلعی کی ہوئی ہے۔ میں نے انگریزی قواعد پڑھاتے ہوئے اپنے نازک شاگرد سے رنگ بدل جانے کی وجہ پوچھی۔ مگر اُس نے یہ کہکر میری تسلی کردی کہ والد نے یہ مکان سجا سجایا لے لیا تھا۔ سُرخ اور سفید رنگ اُن کو پسند نہیں آیا۔

ہم میں خلوص و محبت کی پینگیں دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئیں۔ اور جاڑوں کے آتے آتے میں بھی خاندان کا ایک رکن ہو گیا۔ بوڑھا تاجر نہایت خلیق تھا۔ وہ اکثر اصرار کر کے مجھے شام کے کھانے کے لئے روک لیا کرتا تھا اور اس کے بعد قہوہ اور تمباکو نوشی میں بھی ساتھ رہا کرتا تھا۔ سگرٹ پینے کا کمرہ عمارت کی پشت پر تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ ہر چیز کیلئے منطقی دلائل پیش کرتا تھا۔ اور نہایت صحیح رائے رکھتا تھا۔ مگر اس رئیسی شان کے باوجود ایک قسم کی جھلک چہرے مہرے میں موجود تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے مصیبتیں بھی اُٹھائی ہیں۔ سفید چہرے کی جھُریوں سے اُداسی ٹپکتی تھی بعض وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حقیقتاً جتنا بوڑھا نظر آتا تھا۔ اُس سے زیادہ بوڑھا تھا۔ جب کبھی وہ اپنی غریب بیوی کا ذکر کرتا تھا تو اُس کے لبوں سے بیساختہ آہ نکل جاتی تھی اور انگلیاں بے اختیار ابرو پر دوڑ جاتی تھیں۔ گویا غم و الم کو دور کرتا تھا۔ اگرچہ میں چند ہی دنوں میں اُن لوگوں کا گہرا دوست ہو چکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اس شبہ نے گھیر رکھا تھا کہ ہو نہ ہو یہ دروازہ طلسمی ہے۔ اور یہ مکان کرامات کا خزانہ ہے۔ میرے علاوہ صرف ایک آدمی اور وہاں آیا کرتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور تندرست روسی تھا۔ لانبا قد۔ فوجی وضع قطع اور پال کا گہرا دوست تھا۔ لوگ اس کو نکولس زرناف کہا کرتے تھے۔ بوڑھا تاجر مسٹر ورچیف اس جوان کی بڑی قدر کرتا تھا اور اکثر رات کے کھانے پر روک لیا کرتا تھا۔ بوڑھے تاجر کا رکھ رکھاؤ اور اخلاق اچھا تھا۔ وہ زرناف کی ایسی عزت کرتا تھا کہ دیکھنے والے صاف سمجھ لیتے تھے کہ زرناف دولت و عزت میں ورچیف سے کہیں زیادہ ہے۔

نکولس نہایت دلچسپ اور سادہ مزاج جوان تھا' روسی - جرمنی اور انگریزی زبان میں بلا تکلف گفتگو کرتا تھا - وہ جمیس الزبیٹھ میں ایک عالی شان محل میں رہتا تھا - جہاں اُس نے ایک بار مجھے بُلایا تھا - وہ ہمیشہ میرے ساتھ دوستی اور برابری کا برتاؤ کیا کرتا تھا - محض پال درچف کا غریب معلم نہیں سمجھا جاتا تھا -

ایک روز میں بوڑھے تاجر کے ساتھ بیٹھا ہوا قیمتی روسی سگرٹ پی رہا تھا کہ گفتگو کے درمیان میں نکولس کا ذکر آگیا -

بوڑھے تاجر نے کہا وہ امیر ہے - اور نہایت امیر ہے - تم کو شاید یقین نہ آئے کہ وہ دنیا کی سب سے رئیس ہستیوں میں سے ایک ہے -

"نہیں" میں نے شوق و حیرت سے کہا "کیا وہ غیر معمولی امیر ہے ؟

"اُس کی دولت کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا"

اور شریف بھی ہے ؟

اُس نے گھبرا کر کسی قدر مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا - "تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟"

"اُس کے عادات و اطوار شریفانہ ہیں"

"یہ محض آپ کا خیال ہے یا آپ ذاتی واقفیت رکھتے ہیں' مجھسے صاف صاف بتا دیجئے - سچ سچ بتا دیجئے"

"نہیں مجھ سے کبھی پہلے کی ملاقات نہیں ہے"

میں نے اس کے چہرے میں ایک اچانک تبدیلی دیکھی - ایسی تبدیلی جو مجھے بے حد ناپسند ہوئی -

کچھ بھی ہو وہ مکان یقیناً طلسمی تھا - وہاں کی بہت سی کرامات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صدر دروازہ کا رنگ برابر بدلتا رہتا تھا - سفید سے ماشی ماشی سے زعفرانی اور آخر میں گہرے سیاہ رنگ کی قلعی کردی گئی تھی -

ایک روز شام کو نکولس اور ایک دُبلے پتلے یہودی کی دعوت تھی - کھانے کے ختم پر مسٹر درچف بار بار گھڑی کی طرف نگاہیں دوڑانے لگے - مگر رات جیسے جیسے زیادہ بھیگتی جاتی تھی بوڑھے تاجر کو اطمینان ہوتا جاتا تھا - اور دس بجے کے بعد تو وہ بالکل بشاش اور مسرور ہو گئے - جب نکولس اور یہودی چلے گئے تو ہم لوگ بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے - پال اور اُلگا بھی وہیں تھے -

ہم سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ یکایک چند غیر ملکیوں کی گفتگو کی آواز سُنائی دی - خفیف سے دھکم دھکا کے بعد دروازہ تراق سے کھلا - اور تین آدمی روسی پولیس کی وردی میں ہاتھوں میں بھرے ہوئے پستول لئے اندر آئے - اور آتے ہی ہم تینوں کو ایک ایک پستول کی زد میں رکھ لیا -

درچف کود کر اُٹھے اور حیرت و دہشت سے چیخ کر اپنا پستول نکالا پال بدحواس بت بنا بیٹھا رہ گیا - اور اولگا میرے پاس چھپنے کے لئے دوڑ آئی

بوڑھے تاجر نے افسرانہ لہجہ میں پوچھا "اس مداخلت بیجا کے کیا معنی ہیں ؟

"اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تم کو ابون آسٹرن برگ کو پا گئے ہیں - اُن کے اعلےٰ افسر نے جواب دیا اور پستول کی نال زیادہ قریب کر دی" تم سمجھے تھے کہ اب بچ گئے - مگر کیا تم نہیں جانتے کہ مجھ سے چھٹکارا پا جانا ناممکن ہے وہ کاغذات ابھی حوالہ کرو جو تمہاری بیوی کی گرفتاری کے وقت غائب ہو گئے تھے' بتاؤ کہاں ہیں ؟

بوڑھے تاجر نے کڑک کر کہا "لندن میں روسی پولیس کا کوئی اختیار نہیں ہے"

"ہمارا لندن میں بھی ویسا ہی اختیار ہے جیسا پیٹرس برگ میں ہے ہم ان کاغذات کی جستجو میں ہیں اور ڈھونڈھ کر رہیں گے"

خاموشی چھا گئی !

میں نے بوڑھے تاجر کے چہرہ پر وہی خوفناک جھلک دیکھی جس نے دو ایک بار مجھے پریشان کر رکھا تھا - یکایک اس کا پستول والا ہاتھ شل ہو کر زانو سے آلگا اور وہ طیش میں چلا اُٹھا -

"پیٹر نشرڈین تمہاری ہی ذات سے مجھ پر تمام مصیبتیں آئیں - بیوی گرفتار ہو کر شہر بدر ہوئی بیٹی برباد ہو گیا اور ساری جائداد ضبط ہو گئی - تم میرے جانی دشمن ہو' سبب تم کو خوب معلوم ہے - وہ راز مرتے دم تک راز رہے گا - آج تم حرام زادے کی رسی کی طرح یہاں تک کاغذات کی تلاش میں آئے ہو شوق سے ڈھونڈ لو - آج پانسہ تمہارے ہاتھ میں ہے میں نہیں' وکتا جی بھر کے تلاشی لو کل یہ گاڑی ناؤ پہ ہوگی - جاؤ ڈھونڈھو

اُس نے ایک سوکھا سا قہقہا اُڑایا' اللہ تمہارے جیسے خبیث پر حشر تک لعنتیں برسائے جس نے اپنے ہزار ہا بیگناہ بھائیوں کو تباہ و برباد کر دیا

مخاطب مسکرانے لگا مگر خاموش رہا - اور تینوں نے بلا تکلف تلاشی لینی شروع کر دی ایک تین درازوں والی میز نے سب سے پہلے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور دم بھر میں تمام کاغذات فرش پر تتر بتر پڑے ہوئے تھے -

"اخاہ ! میں بھول گیا تھا" بوڑھے تاجر نے ہنس کر کہا "تمکو میرے بکسوں کی کنجیاں مطلوب ہوں گی" "پھینک کر" یہ لو' پولیس والے سرگرمی سے تلاشی لے رہے تھے - پال حیران کھڑا تھا اور کمسن اُلگا اپنی پیاری سوئی گڑیا لئے باپ کے پہلو میں تھی - ننھی ننھی مٹھیاں ہر بار تیزی سے گرلا کر بند کر لیتی تھیں -

ان آدمیوں میں سے ایک شخص دوزانو ہوکر دوران تلاش میں قالین کا ایک حصہ چاقو سے پھاڑ رہا تھا کہ ننھی سی جان اُلگا نے پوچھا "تم میری گڑیا تو نہ چھینو گے؟"

وہ آدمی بچی کی گھبراہٹ پر ہنس کر کہنے لگا۔ "ہم لوگ کاغذات ڈھونڈ رہے ہیں۔ گڑیا گڈے کی تلاش میں نہیں ہیں۔" ان کو تلاشی لینے میں بڑی مہارت تھی تھوڑی ہی دیر میں اُنہوں نے چھت سے زمین تک سب کچھ چھان ڈالا ہر مشکوک جگہ کی جانچ کر لی گرنا کام رہے۔

بوڑھے تاجر نے جھلا کر کہا "لو میرا کوٹ بھی دیکھ لو" اور جھٹ اُتار کر پھینک دیا۔ افسر نے فوراً جیب و دامن دیکھے اور واپس کر دیا۔

اب وہ سر کمرے کی تلاش کرنے لگے۔ ہم لوگ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ اور اُلگا بھی اپنی چہیتی گڑیا لئے ہوئے ہمارے ساتھ تھی۔

جب آخرکار وہ اپنی ناکام تلاشی ختم کر کے جھلاتے ہوئے لوٹے تو بوڑھے تاجر نے کہا "جب میں یہاں کے تھانہ میں رپٹ لکھواؤں گا تب روسی پولیس کو اس ناجائز اور غیر قانونی تلاشی کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ مخاطب اس دھمکی پر ہنس پڑا اور "دیکھا جائیگا" کہتا ہوا طلسمی پھاٹک کھول کر اپنے ساتھیوں سمیت چلا گیا۔

بوڑھا تاجر طوفان جذبات سے زرد ہو گیا تھا وہ مجھے بھی روز والے کھانے کے کمرہ میں لیگیا۔ خود بھی شراب پی۔ مجھے بھی پلائی اور گھبراتے ہوئے نوکروں کو چند لفظوں میں تسلی دیکر رخصت کر دیا۔ اُلگا اب تک اپنی موی گڑیا کو اپنے کلیجے سے چپٹائے ہوئے تھی۔

اُس نے اُلگا کو قریب بُلا کر پیار کیا "پیاری بیٹو تم نے اپنا سبق خوب یاد رکھا۔ تم نے ہم کو بھی بچا لیا۔ ان کو بھی بچا لیا۔

اُس نے کہا "آپ نے جو کہا تھا میں نے وہی کیا" اور اپنی گڑیا باپ کے حوالے کر دی۔

باپ نے گڑیا کے کرتے کو دامن مجنون بنا دیا اور قلمتراش کی نوک سے موم کی تہیں پھاڑ ڈالیں آخر بیچ میں سے زرد رنگ کا ایک تعویذ نکلا۔ نہایت مہین کاغذ پر پوری ایک دستاویز لکھی ہوئی جو اتنی ہوشیاری اور چالاکی سے چھپائی گئی تھی کہ کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

بوڑھے تاجر نے میری طرف مخاطب ہو کر نہایت نرمی سے کہا "آج آپ میرے خاندانی راز سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور اب آپ کو میری کشمکش کا صحیح اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میری غریب بیوی ناحق قیدی بنا کر دنیا کے سب سے خراب قید خانے میں بند کر دی گئی ہے۔ کیا آپ مجھ پر ایک احسان فرمائیں گے آپ روسی نہیں ہیں لہذا آپ پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اس دستاویز کو امانت کے طور پر ان کو پوشیدہ رکھئے اور جان سے زیادہ عزیز رکھئے۔

"بسر و چشم" میں نے فوراً جواب دیا۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو مجھے ایسی بڑی ذمہ داری لینے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ بوڑھے تاجر نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "سارے انگلستان میں صرف آپ ہی کی ایک ذات ایسی ہے جس پر میں اعتبار کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ دیکھئے میں اس پر مُہر کئے دیتا ہوں۔ خطرے کے دور کرنے کے بعد آپ ان کاغذات کو مجھے اسی طرح واپس کر دیجئے گا۔ مُہر ٹوٹنے نہ پائے۔"

اب اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے کاغذات میں سے ایک دبیز لفافہ اُٹھا لیا۔ دستاویز کو اندر رکھکر بڑی بڑی کالی مہریں لگا دیں جب لاکھ سوکھکر جم گئی تو مجھے دیدیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔

"یاد رکھئے اس رازداری سے بہتوں کی جانیں وابستہ ہیں۔ اسے ہمیشہ اپنے قابو میں رکھئے۔ اپنے پاس سے کسی وقت جدا نہ ہونے دیجئے اگر آپ کے قدم ذرا بھی سیدھی راہ سے ڈگے۔ تو میری پال کی کمسن اُلگا کی موت ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی بھی۔"

میں نے قیمتی لفافہ کو لیکر مہروں پر نظر کی اور اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد کوئی ہفتہ تک میں اپنے انمول لفافہ کو سینہ سے لگائے لگائے پھرا کیا۔ میں نے کئی بار روسی پولیس کا ذکر چھیڑا۔ مگر بوڑھے تاجر نے ہمیشہ بغلیں جھانک کر بات کاٹ دی۔ یا گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ اس کو اپنے پہچان لئے جانے سے تھوڑی سی تشویش ضرور ہو گئی تھی اور میرے خوش خصلت شاگرد کو بھی باپ کی پریشانی سے پریشانی تھی۔ اب اُسے انگریزی سیکھنے کا کوئی ذوق باقی نہ تھا اور دو ہی ہفتہ میں میں نے دیکھا کہ طلسمی دروازہ کی قلعی دو رنگوں میں پے درپے بدل دی گئی۔

پھاٹک کا رنگ مسلسل طور پر کیوں بدلا جاتا تھا؟ کوئی خاص بات ضرور تھی مگر مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ نوکر چاکر بھی عجیب سے تھے خصوصاً دربان نہایت نرالا تھا۔ مگر وہ سب ایسی روسی بولتے تھے جو میری سمجھ سے کوسوں دور تھی۔

ایک روز شام کو بڑی سخت سردی تھی۔ جب میں اپنے ایک دوست کے یہاں سے لوٹ کر نو بجے گھر پہنچا تو درجیف صاحب کی ایک تحریر ملی جس میں لکھا تھا کہ لفافہ جو شامل ہے فوراً مکتوب الیہ کے پاس جانا چاہیئے۔

لفافہ پر مہر لگی ہوئی تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا "میڈم ہیلین ۱۰۶ گرانس ویلز گارڈن" میں نے کھانا کھایا۔ اور فوراً ہی خط لیکر روانہ ہو گیا۔

میڈم کا محل قریب قریب کے محلوں میں بہترین تھا۔ میں ایک آراستہ کمرہ میں بیٹھ کر جواب خط کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ ادھیڑ عمر کی ایک لانبی اور

حسین عورت نہایت عمدہ لباس پہنے۔ اندرائی اس کے ہاتھ میں دفتی کا ایک ڈبہ تھا جس پر نہیں مگر مضبوط تاگا لپٹا ہوا تھا۔

ہیں تعظیم کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اُس نے نازک اُنگلیوں سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور کہنے لگی۔

"میں ہی مکتوب الیہ ہوں۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مسٹر چیف اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ میں سر شام سے آپ کی منتظر تھی" طلسمی دروازہ سے آپ خوب سمجھتے ہیں کہ موقع نہایت نازک ہے کوئی جاننے نہ پائے ورنہ میری کوئی سی آبرو خاک میں مل جائے گی۔ یہ ڈبہ لیجئے ابھی درچیف صاحب کے پاس لیجائیے اور انکے سپرد کر کے یاد دلا دیجئے کہ کل چھ بجے شام کو میں چپنی سے منتظر رہوں گی۔ کہیں آپ اپنا وعدہ بھول نہ جائیں"۔

میں نے ڈبہ لے لیا گر وزن پر بڑی حیرت ہوئی۔ اندر جو کچھ ہی ہو ڈبہ بہت بھاری تھا۔ میں نے رخصت کا سلام کیا اور فوراً ایک گاڑی میں بیٹھ کر درچیف صاحب کے پاس پہنچا۔

وہ اور پال دونوں میرے منتظر تھے۔ بوڑھا تاجر بے اختیار دوڑا اور ڈبہ کو میرے ہاتھ سے لیکر میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ ڈبے کو کھولیگا [illegible] گرائی کا سبب پا جاؤں [illegible]

[illegible]

ملائی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

اس کے بعد ہی اُس نے سگرٹ پیش کیا۔" آپ کو ایک گھنٹہ اور ٹھیرنا ہو گا۔ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں"۔

میں رُک گیا۔ اور خیال کرنے لگا کہ کم سے کم ڈبہ کا راز تو مجھے معلوم ہی ہو جائیگا۔ مگر اُس نے ڈبہ کا کوئی ذکر ہی نہ آنے دیا۔

آدھ گھنٹہ کے بعد پال بھی سونے چلا گیا۔ اُنکا پہلے ہی سے سو رہی تھی بوڑھا تاجر بے چینی سے کئی بار اُٹھا کر ادھر اُدھر ٹہلا۔ یکایک مجھے گلاس کا خیال آیا اور میں نے رخصت ہونے سے پہلے اس کو خالی کر دیا۔

جیسے ہی میں نے گلاس رکھا مجھے معلوم ہونے لگا کہ اس میں کوئی خرابی ضرور تھی۔ میرا گلا آگ کی طرح جل اُٹھا۔ میرے جسم سے شعلے نکلنے لگے اور پھر فوراً ہی سارا بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ جب اصلی بات سمجھ میں آئی تو میرا دل خوف سے ڈوب گیا۔

"یہ برانڈی ——— مجھے ——— (رُک رُک کر) یقین ہے کہ زہر آلود تھی"

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر تمام جسم پر فالج گر چکا تھا۔ میں گر پڑا۔ مگر میں نے دیکھا کہ بوڑھے تاجر کے چہرہ پر خوشی کی سُرخی دوڑ گئی۔

اس نے جان بوجھکر مجھے زہر دیا تھا۔ اس کو کس طرح خبر ہو گئی تھی کہ میں خفیہ پولیس لندن سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے چلانا چاہا مگر کوئی لفظ میرے لبوں سے نہیں نکل سکا۔ میری زبان نے حرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے پھر کوشش کی کہ اُٹھ کھڑا ہوں اور موت کی اس سردی سے جو بجلی کی طرح میرے جسم میں پھیلتی جا رہی تھی مردانہ وار مقابلہ کروں۔ مگر سب بیکار تھا۔ میں بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ ہر حصہ جسم شل ہو چکا تھا۔

آخری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ بوڑھے تاجر کا شیطانی چہرہ اور خونی آنکھیں میرے قریب تھیں اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر میری سماعت جواب دے چکی تھی۔ بس اس کے بعد نزع کی تکلیف بھی ختم ہو گئی اور موت کی کالی چادر نے مجھے سر سے پاؤں تک لپیٹ لیا۔

مجھے اس کا اندازہ نام کو بھی نہیں ہے کہ میں زہریلی شراب کے نشے میں کب تک بے ہوش رہا یا بے ہوشی کے عالم میں مجھ پر کیا گذر گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن اچھی طرح نکل آیا اور میں کسی ایسی سخت چیز پر پڑا ہوا تھا جو نہایت ٹھنڈی تھی۔ سر پر ایک ڈھالو چھت تھی۔ کھڑکی بہت اونچی لگی ہوئی تھی جس میں سے سرخ اینٹوں کی [illegible] ایک [illegible] نظر آتی تھی۔ میں بڑی مشکل سے [illegible]

[illegible]

بستر کی جگہ پتھر کا ایک چوکا تھا اور میرے قریب اسی قسم کا دوسرا چوکا بچھا ہوا تھا۔

حقیقت ایک ہی نگاہ میں معلوم ہو گئی۔ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر وہاں ڈاکٹری معائنہ کے لئے اُٹھا لائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے کپڑے سوکھے ہوئے تو تھے مگر مٹی میں بھرے ہوئے تھے اور ان کی شکنیں گواہی دے رہی تھیں کہ میرا جسم کچھ دیر پانی کے اندر ضرور رہا ہے۔ میرے بال بھی گیلی مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اب میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ کھڑکی سے باہر کود گیا اور سڑک پر پہنچکر پتہ چلا کہ میں شہر کے دور بار لنس پل کے پاس ہوں۔ اس لئے میں نے سمجھ لیا اور ٹھیک سمجھ لیا کہ لوگ مجھے دریا سے مُردہ سمجھ کر نکال لائے ہوں گے۔

میری جیب میں چند روپے میری ناچیز ملکیت اب تک پڑے ہوئے تھے میں فوراً ایک سواری پر بیٹھ کر اسکاٹ لینڈ یارڈ پہنچا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس آدمی نے مجھ کو اس بُری طرح زہر دیا تھا وہ قانون کے پنجے سے بلا داغ بچ جائے۔

تھانے پر میں سردی میں اکڑا ہوا آدھ گھنٹہ تک انتظار میں بیٹھا رہا اسکاٹ لینڈ سے معلوم ہوا کہ بیہوشی میں چالیس گھنٹے سے زیادہ گذر گئے۔ دو آدمیوں نے میری داستان سنی خوش تو ہوئے مگر خاموش رہے۔ میری البتہ ابھی نہیں

اوران لوگوں کی سردمہری مجھے اور بھی تکلیف دے رہی تھی۔ اس کے بعد دس منٹ کی تنہائی ہوئی اور یکایک دروازہ دوبارہ کھُلا اور ایک ایسی ہستی داخل ہوئی جسے دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس تلے رہ گئی۔

یہ کون تھا۔ پال کا گہرا دوست نکولس زرناف تھا۔

اُس نے میری حیرت تاڑلی۔ مسکراکر میری طرف بڑھا اور کہنے لگا۔

آج اتفاق سے یہاں ملاقات ہوگئی ہے تو میں اپنا باقاعدہ تعارف کراتا ہوں۔ میرا نام ہنری گورلٹ ہے میں محکمۂ تحقیقات جرائم کا انسپکٹر ہوں۔"

آپ! میں نے چلاکر کہا" آپ۔ جاسوس"

"ہاں" اُس نے سادگی سے جوابدیا اور میں یہاں آپ سے مل کر نہایت خوش ہوا۔ مجھے قوی اندیشہ تھا کہ آپ اب تک ختم ہوچکے ہوں گے۔ آپ کو اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہیئے کہ ایسے زبردست ٹھگوں کے جتھے سے بال بال بچ گئے

میں "کیا وہ چیف ٹھگ تھا؟

وہ پھر مسکرایا اور نہایت بے پروائی سے میز کے ایک گوشہ پر بیٹھ گیا۔

اب اُس نے ایک عجیب وغریب داستان بتائی تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں کیسی مصیبت میں گرفتار تھا معلوم ہوا کہ لندن کی پولیس بوڑھے تاجر سے اور اس کے جتھے سے سالہاسال پہلے سے واقف تھی۔ جو جوہری بن کر بہتوں کو لوٹ چکے تھے

بوڑھا تاجر روسی یہودی اور جتھے کا سردار تھا۔ لندن میں جواہرات کی اکثر چوریاں اسی کے کرتب کا نتیجہ تھیں۔ مگر کچھ اتنا ثبوت نہیں مل سکا جو گرفتاری کے لئے کافی ہوسکتا۔ میرے دوست نے ایک رئیس کا بھیس بدل کر اس خاندان میں اپنی ساکھ بٹھالی تھی۔ پھر بھی پھاٹک کی قلعی کی سلسلہ وار تبدیلی سے قطع نظر اس کو اور کوئی راز معلوم نہیں ہوسکا۔ آخر میں اُس نے مسکراکر کہا "معلوم ہوا ہے کہ بوڑھے تاجر نے آپ کو ایک لفافہ مہر لگا ہوا دیا تھا۔ ذرا دیجئے دیکھیں تو اس میں کیا ہے؟"

میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ لفافہ ابتک محفوظ تھا۔ میں نے چاقو کی نوک سے سیون کھول کر لفافہ نکالا اور مہریں توڑکر دستاویز حوالہ کردیں۔ مگر آپ خود ہماری حیرت کا اندازہ کرسکتے ہیں اس لئے کہ جب کاغذ پھیلائے گئے تو وہ بالکل سادہ تھے۔ ان پر کسی حرف کا نشان بھی نہ تھا۔

"خوب" جاسوس نے ہنس کر کہا "کیا اچھی تدبیر تھی" اُس نے تم کو محض اعتبار قائم کرنے کے لئے کیسا عمدہ دھوکا دیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ تم پر بھروسہ کریگا تو تم بھی اُس پر بھروسہ کروگے۔ وہ تمہیں اپنے کام کا ذریعہ بناکر اپنی زبردست تجویز پر عمل کرے گا۔ مگر افسوس شکار کے انتخاب میں غلطی ہوگئی۔

میڈم نے جو ڈبہ تم کو دیا تھا اُسے لے کر بوڑھا تاجر دوسرے دن ایمسٹرڈم جانے والا تھا۔ لہذا اُس نے چاہا کہ تم کو ہمیشہ کے لئے چُپ کردے۔ اسی لئے زہر دینے کے بعد بارش کے تیز چشمہ میں تمہاری لاش پھینک دی گئی۔ تمہیں کس نے نکالا اور کیسے نکالا یہ بعد کی باتیں ہیں پھر بھی تم پر جو گذری وہ ورچیف سے بہت کم تھی۔

میں نے گھبراکر پوچھا وہ کیسے؟

بات یہ ہے کہ میڈم صاحبہ جسے بوڑھے تاجر نے پھانس کر جواہر لینے چاہے تھے انقلاب پسند جماعت کی تھیں۔ تاجر بھی ایک زمانے میں اس جماعت کا ایک رُکن تھا۔ پھر باغی ہوگیا تھا۔ لہذا اُس نے ڈبہ میں آتشگیر اور پھٹنے والے مادے بھر کر بھیجے تھے اور جیسے ہی بوڑھے تاجر نے جواہر کے لالچ میں دو ڈبہ کھولی۔ بم پھٹ گئے۔ اور تاجر مع اپنے کمرے کے پُرزے پُرزے ہوگیا۔

"کیا وہ مرگیا؟

اُس نے مسکراکر کہا جی ہاں اور طرّہ یہ ہے کہ اُس کی لڑکی جو ہر بات میں اُس کی معاون تھی غضب کی ہوشیار تھی۔

میں "اُس کی لڑکی کس اُنکا"؟

نہیں پال اُس کی لڑکی تھی۔ جسے آپ سبق دیا کرتے تھے۔ اور جو آپ کی نگاہ میں لڑکا تھا۔ وہ بھی ڈبہ کھلتے وقت وہیں تھی۔ اور بُری طرح زخمی ہوکر آج صبح اسپتال میں مرگئی۔ ہم نے اُنکا کو حراست میں لے لیا ہے۔ اور ایک نوکر کو گرفتار کرلیا ہے جو جلدی میں بھاگ نہیں سکا۔

اس نوکر نے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ طلسمی دروازہ کی قلعی برابر اس لئے بدلتی رہتی تھی کہ جتھے کے اور لوگ خبردار ہوتے رہیں جن سے بڈھا تاجر ہوشیاری کی وجہ سے بظاہر کوئی معاملہ نہیں کرتا تھا۔

میں "اور میڈم ہیلرن؟

میں خود اُن کے محل پر گیا تھا۔ مگر وہ لندن سے غائب ہوچکی ہیں بیگم کا انتظام تاجر کی حرکت سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور گو قانون کی نگاہ میں جرم ہو مگر اُس کی وجہ سے یورپ کو دو زبردست نڈر اور بھیانک مجرموں سے چھٹکارا مل گیا۔

"سچ ہے کنواں کھودنے والا خود ہی کنوئیں میں گرتا ہے"

(ماخوذ از ولیم لے کوئے)　　"طالب الہ آبادی"

"دانت اور انکی بیماری"

قدرت نے جتنے اعضاء انسان کے جسم میں بنائے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری دانت ہیں بچپن کے ختم ہونے پر انکی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مرتے دم تک خواہ سو سال کی عمر ہو۔ تمام اعضاء کی نسبت دانتوں کی درستی مقدم خیال کیجاتی ہے۔ عمر کے کسی حصہ میں اگر ان میں کچھ خرابی پیدا ہو جائے۔ تو جسم انسانی کی ساری مشین خراب اور رفتہ رفتہ بیکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ دیگر اعضا کی نسبت دانتوں کی حفاظت کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ کھانے پینے میں دانتوں کے متعلق جب کچھ شکایت پیدا ہو۔ تو اس کو معمولی نہ سمجھتے ہوئے فوراً دانتوں کے مخصوص ڈاکٹر (ڈینٹل سرجن) سے مشورہ کر کے علاج کیطرف متوجہ ہو جانا چاہیئے۔ کچھ دن ہوئے۔ لندن میں پرنس آف ویلز نے دندانسازی کے ایک بڑے ہسپتال کا بنیادی پتھر رکھتے ہوئے اثنائے تقریر میں پبلک کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر آپ اپنی نسلوں کو تندرست رکھنا اور اپنی قوم کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔ تو دانتوں کی نگرانی کیطرف کامل توجہ کریں۔ نہ صرف دانتوں کی بیماریاں بیشمار ہیں۔ بلکہ موجودہ دور ترقی میں جبکہ طبی تحقیقات کمال کے بہت سے منازل طے کر چکی ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ جسم انسانی کے متعدد امراض صرف دانتوں کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ جو انسان کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً دانتوں کو باقاعدہ صاف نہ رکھنے سے میل جم کر رفتہ رفتہ کریڑی کیصورت اختیار کر لیتا ہے جسکی وجہ سے مسوڑھوں پر ورم آجاتا ہے۔ اور پیپ پڑ جاتی ہے۔ جسے انگریزی میں پائیریا کہتے ہیں۔ جب یہ خطرناک بیماری شروع ہوتی ہے۔ تو ابتدا میں اس کی پرواہ نہیں کیجاتی۔ پیپ اور بودار مادہ مسوڑھوں سے نکل کر آہستہ آہستہ معدہ میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ جس کا اثر معلوم نہیں ہوتا۔ مگر قوت ہاضمہ کو خراب کرتا رہتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے متعدد تکالیف خفیف دائمی بخار۔ جوڑوں کے درد۔ بدہضمی وغیرہ امراض کی درد انگیز صورت میں رونما ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت منہ سے بدبو آتی رہتی ہے۔ بعض مرتبہ گلے کانوں اور جسم کے بعض دیگر اعضا میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ مسوڑھے اسفنج یا خمیری آٹے کیطرح پھولے ہوئے رہتے ہیں۔ ذرا سا دبانے سے خون نکل آتا ہے۔ اور دانت ہلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو جسم کے عزیز ترین حصہ ہونیکے باوجود بیکار سمجھ کر قبل از وقت نکلوا دینے پڑتے ہیں ہندوستان کے بدقسمت لوگ۔ جو اپنی صحت کو ایک حقیر ذرہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ ان تمام تکالیف کے اسباب پر غور نہیں کرتے۔ اور انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ تکالیف دانتوں کی خرابی سے ہیں۔ اور یہ سب ہماری اپنی بے توجہی کے باعث ہے

چنانچہ ان حالات میں مریض عام امراض کے حکیموں اور ڈاکٹروں کیطرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی خوش قسمتی سے کوئی نئے طرز کا ڈاکٹر اس کا معالج ہوتا ہے۔ تو چند روز کے تلخ تجربے کے بعد مریض کو کسی ماہر ڈینٹل سرجن (امراض دندان کے مخصوص ڈاکٹر) کیطرف رجوع کرنیکا مشورہ دیکر مریض کے ساتھ اپنی انتہائی ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے ابتدا ہی میں کسی پرانے طرز کے طبیب کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ تو وہ اسکو مدت دراز تک دق کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مرض روز بروز ترقی پذیر ہوتے ہوئے اپنے آخری درجہ میں پہنچکر ہولناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور مریض طرح طرح کے امراض کا شکار بن جاتا ہے۔

علاوہ ازیں دانتوں کو میلا رکھنے سے دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے۔ اور یہی حالت ہوتی ہے۔ جو لکڑی کے گھن لگ جانے سے۔ شروع میں اس موذی مرض سے دانتوں میں کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ دانتوں پر مسوڑھوں کے قریب کسی کسی جگہ سیاہ دھبے سے پڑ جاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ جب یہ بیماری دانتوں کی جڑوں کی طرف پہنچتی ہے۔ تو بے انتہا تکلیف ہوتی ہے۔ اور مریض کا کھانا پینا سونا تک حرام ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسکا باقاعدہ علاج نہ کرایا جائے۔ تو سب دانت ایک ایک کر کے خراب ہو جاتے ہیں مجبور ہو کر نکلوا ڈالنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اگر ابتدا سے تھوڑی سی احتیاط کیجائے۔ تو تمام امراض سے دانت محفوظ ہو جاتے ہیں۔ دانتوں کو صرف صاف رکھنے کیضرورت ہے۔ اور یہ نہایت آسان کام ہے۔ اس کیلئے آپکو ایک دانتوں کے برش اور کسی اچھے سے دانتوں کے سفوف کیضرورت ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے دانتوں کے بیرونی اور اندرونی حصہ کو برش اور سفوف سے صاف کر لینا چاہئے اور اسی طرح رات کو سونے سے پہلے دانتوں کی صفائی لازمی خیال کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دانتوں پر بیماریوں کا اثر زیادہ تر رات کو ہوتا ہے۔ سال میں کم از کم دو ایک مرتبہ ضرور کسی ڈینٹل سرجن کو دانت دکھانے چاہئیں۔ اور اگر کوئی شکایت ہو تو اس کا مناسب علاج کرانا چاہیئے۔ اگر دانت زیادہ میلے ہوں تو پہلے کسی ڈینٹسٹ سے صاف کرا کے پھر برش اور سفوف کا استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ زیادہ میل ہونیکی صورت میں بغیر صاف کرائے پورا فائدہ نہیں ہو سکتا۔

نوٹ۔ دانتوں کو برش کرتے وقت برش کا رخ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کو ہونا چاہئے

تاکہ ہر جگہ صفائی ہو سکے اور برش کو ہر ماہ تبدیل کر دینا ہی مفید اور ایک حد تک ضروری خیال کرنا چاہئے +

ہمیں اُمید ہے کہ مندرجہ بالا ہدایات پر ایک معمولی توجہ سے عمل کرنا بھی ہندوستان کی اس روز بروز گرتی ہوئی صحت کو سنبھالنے کیلئے بیحد مفید ثابت ہوگا +

ولایت کے ہسپتالوں میں میں نے پائیوریا (گوشت خورہ) کے مریض بہت کم دیکھے - اسکی وجہ یہ ہے - کہ وہ پابندی کے ساتھ سونے سے پہلے اور سونے کے بعد دانتوں کو برش سے صاف کرنیکے عادی ہیں - پھر تیسرے یا چھٹے مہینے دانتوں کے ڈاکٹر سے اپنے دانتوں کا معائنہ کراتے ہیں - ولایت میں اکثر ایسے مریض دیکھے جاتے ہیں - جن کے دانت کرم خوردہ ہوتے ہیں - یا اس قسم کے لوگ جن کے دانت آگے پیچھے یا باہر نکلے ہوتے ہیں - یہ لوگ دانتوں کی خوبصورتی کیلئے بدنما دانتوں کو نکلوا کر انکی جگہ بناوٹی دانت لگوا سکتے ہیں - ہندوستان میں ایک یونانی حکیم کو تمام مرضوں کا ماہر سمجھا جاتا ہے - پھیپھڑے کے قابل مرض میں بھی حکیموں سے مشورہ کیا جاتا ہے +

اسی طرح دانتوں کے مرض کا علاج عام حکیموں یا ڈاکٹروں سے کرایا جاتا ہے حالانکہ یہ ایسا غلط فعل ہے - جیسے ایک بیمار دوا لینے کسی وکیل کے پاس جائے اور شفا کی امید رکھے + ولایت میں ہر مرض کا ڈاکٹر علیحدہ ہوتا ہے - جو اپنے خاص فن میں مہارت کامل رکھتا ہے - اور عام طور پر مریض اپنی اپنی شکایتیں مخصوص ماہرین کے سامنے ہی لیجاتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے - کہ انہیں کوئی بیماری زیادہ دن تک الجھائے نہیں رکھتی - بیماری کا حملہ ہوا - اور اس بیماری کے ماہر ڈاکٹر نے اسکی روک تھام کر دی +

ڈاکٹر احمد جلال الدین ڈینٹل سرجن لاہور

برسات

برسات آئی برسات آئی

مینہ سے بیاباں		رنگ گلستاں

پھولوں کی برکھا		دونوں میں یکساں

کوئل کی کوُ کوُ		باغوں میں رقصاں

جگنو کی جگ مگ		بن میں چراغاں

برسات آئی برسات آئی

رت ہے سہانی		نیچر ہے دھانی

بارش کی چھم چھم		آکاش بانی

سرسبز کھیتی		کھیتوں کی رانی

جس سمت دیکھو		پانی ہی پانی

برسات آئی برسات آئی

لالے کی لالی		بن میں دوالی

کالی گھٹا ہیں		گھنگھور کالی

[illegible]		باغوں میں مالی

مالن کے گجرے		پھولوں کی ڈالی

برسات آئی برسات آئی

شب رنگ بادل		مینہ کے ہراول

تپتی زمینیں		پانی سے جل تھل

فرش زمرد		سبزے کی مخمل

برسات سے ہے		جنگل میں منگل

برسات آئی برسات آئی

دلکش سماں ہے		دل شادماں ہے

خوشبوں کا ہر سو		دریا رواں ہے

دل شاد اک اک		پیر و جواں ہے

برسات کی رت		جانِ جہاں ہے

برسات آئی برسات آئی

(تاجور)

دنیائے ادب

صبح ــــ راوی کے کنارے

یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا ۔۔۔ وجد آور وصد کیف بداماں ہے نظارا
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا

بکھرا ہوا ہے چار طرف حسن فراواں! ۔۔۔ میدان میں سارے! راوی کے کنارے!
بکھرے ہوئے موتی ہیں کسی نہر جبیں کے ۔۔۔ کھوئے ہوئے منظر ہیں کسی خوابِ حسین کے
ٹکڑے ہیں مگر کیف گہہ خلد بریں کے

یا رندہیں مستانۂ افلاک میں لرزاں! ۔۔۔ یہ ڈوبتے تارے! راوی کے کنارے!
راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضائیں! ۔۔۔ بیتاب کناں بحر در آغوش فضائیں!
رنگینیٔ فطرت سے ضیا پوش فضائیں!

یہ صبح طرب ریز، لب رود خراماں ۔۔۔ یہ مست نظارے! راوی کے کنارے!
فردوس کی موسیقی سے لبریز ہے دریا ۔۔۔ یا خلد کے نغموں سے جنوں خیز ہے دریا
یا رقص سے حوروں کے طرب ریز ہے دریا

حوریں اجو ہیں آغوش میں راوی کے خراماں ۔۔۔ دلکش ہیں نظارے! راوی کے کنارے
لیکن ہے غم آلود یہ موسیقی رنگین ۔۔۔ نغمات میں راوی کے ہے روداد غم آگین
موجوں کے تبسم میں ہے اک گریۂ خونین!

اور "عہد گزشتہ" کی طرف لہروں کا ہیجان ۔۔۔ کرتا ہے اشارے! راوی کے کنارے
رنگ "مے پارینہ" سے شاداب ہے راوی ۔۔۔ اس "عشرتِ برباد" کا اک خواب ہے راوی
ان "محفلوں" کی یاد میں بے تاب ہے راوی

ہاں، یاد جہانگیر میں راوی بھی ہے گریاں ۔۔۔ لرزاں ہیں ستارے! راوی کے کنارے

(رنگار)

پرستیدۂ خیال

میری آنکھوں میں نہاں اک پیکر تنویر ہے　　میرے دل میں جگر اک حسن کی تصویر ہے
میرے خوابِ شعر کی اِک دل نشیں تعبیر ہے

رات دن میری فضائے روح میں رہتی ہے وہ　　دل کی ہم آغوشیوں کی آفتیں سہتی ہے وہ
اور مجھ سے داستانیں عشق کی کہتی ہے وہ

میری نیندوں کی فضاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!　　میری راتوں کی دعاؤں میں وہی ہے جلوہ گر!
میرے شعروں کی اداؤں میں وہی ہے جلوہ گر!

میرے اشکِ شبنمیں میں یہ اُسی کا نور ہے!　　میری وارفتہ نگاہوں میں وہی مستور ہے!
اُس کے جلووں سے مری دنیائے دل معمور ہے!

جب کبھی راتوں کو مل جاتی ہے تنہائی مجھے　　پاس لیجاتا ہے ذوقِ سجدہ فرسائی مجھے!
اور تصور میں وہ کرجاتی ہے سودائی مجھے!

اُس کی اُلفت کی خلش سینے میں جب پاتا ہوں میں　　جھوم کر پُر درد نغمے عشق کے گاتا ہوں میں!
سازِ حسرت کے فضا میں سوز برساتا ہوں میں

جی میں آتی ہے کہ اُس کی یاد میں کھو جاؤں میں　　اس تصور میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں میں!
یعنی مٹ کر اُس کے جلووں میں فنا ہو جاؤں میں!

(ہمایوں)

ہندی

پھولوں کے ساتھ بیدردیاں

دنیا میں رنگ رنگ کے پھول اور طرح طرح کے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں کوئی پھول تو اتنا خوشبودار اور خوشنما ہوتا ہے کہ اُس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر اس کو ضرور دیکھیں۔ اسی طرح بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اسے توڑ کر گلدستہ کیوں نہ بنایا جائے۔ اور میز پر رکھ کر کمرے کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کے رنگ اور خوشبو کا مزا لیا جائے۔

جس طرح مختلف رنگ و بو کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح آدمیوں کی طبیعتیں بھی جُدا جُدا ہوتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی دلچسپی کیلئے بے چارے پھولوں کی ساری حسرتوں کا خون کر دیتے ہیں۔ باغ میں بلبل کا چہکنا سُن کر کلیاں مارے خوشی کے چٹک اُٹھتی ہیں۔ پھول خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور اپنی چند دنوں کی زندگی پر ناز کرتے ہوئے جیسے ہی بہار کے موسم کا خوشنما سماں دیکھنے کیلئے سر اُٹھاتے ہیں کہ بیدادِ مالی ناگہانی بلا کی طرح اُن پر لوٹ پڑتے ہیں اور آناً فاناً میں اُن کی آرزوئیں مٹی میں ملا دیتے ہیں۔ اور دیکھنے والے افسوس کرتے رہجاتے ہیں۔

غرض یہ لوگ ایسے بیرحم ہوتے ہیں کہ خوبصورت پھول کی نازک نازک پنکھڑیوں کو چٹکیوں سے مسل کر دور پھینک دینے میں ہی سچی خوشی اور دلی آرام محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی خودغرضی۔ بیدردی اور وحشی پن پر کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔

اُن کا دل اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ ہر نازک اور خوشنما چیز پر اُن کی نظر پڑتے ہی اسے مل ڈالنے کے لئے بوکھلا جاتے ہیں۔ کسی کو پھولا پھلا اور خوشنما دیکھ کر اُن کا دل دشمنی اور حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے اور اس کا نام و نشان مٹانے میں یہ اپنی تمام قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اگر کوشش کارگر نہ ہوئی تو اپنی لگائی ہوئی آگ میں خود ہی جلتے ہوئے ایک دن خاک میں ملجاتے ہیں

گورمکھی

ذات پرست ہندو

"ماڈرن ریویو" کے ایڈیٹر مسٹر راما نند چٹرجی نے سورت میں ہندو مہا سبھا کی صدارت کرتے ہوئے ہندوؤں کی ذات پرستی کی خدمت کرتے ہوئے فرمایا "جبتک ہندو سوسائٹی میں پوری پوری سمائی نہیں ہوتی اُس وقت تک ہندوؤں کے سنگھٹن کی تکمیل ایک امر محال ہے۔ ہمیں ہندو سوسائٹی میں اسلام جیسی سمائی اور برادرانہ برتاؤ پیدا کرنا پڑیگا۔ جو شخص اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ ہندو برادری کا حق ادا کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذات پات کے بغیر ہندو سوسائٹی کی عمارت گر پڑے گی۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ اگر دوسرے مذہب ذات پات کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر ہندو زندہ کیوں نہ رہیں گے؟

(پھلواڑی امرتسر)　　مترجمہ　　ایم معراج الدین

بنگالی

جوگی

اے ندیم شاہ میں اُن عورتوں میں سے ہوں جن کو تو نے جنگل میں اس لئے بھیجا تھا کہ جوان جوگی کو گنہگار بنائیں۔

جب نوجوان جوگی دریا پر اشنان کرنے جا رہا تھا۔ تو پو پھٹ رہی تھی اُس کے لمبے لمبے بال اُس کے شانوں پر صبح کی گہری گھٹا کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اور اُس کا جسم سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہا تھا۔

ہم ایک کشتی میں بیٹھے ہنستے اور گاتے ہوئے وہاں سے گذرے۔ سورج نکلا اور پانی کے کناروں پر سے ہمیں غصہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جوش کے ساتھ ہم دریا میں کود پڑے اور اُس کے چاروں طرف گھومنے لگے۔

ایک ننھے دیوتا کی طرح اُس لڑکے نے اپنی آنکھیں کھول کر ہماری حرکتوں کو دیکھا۔ وہ حیران ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں ستاروں کی

مانند چمکنے لگیں۔ اُس نے اپنے جوڑے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے۔ اور قمری کی سی دلکش آواز میں تعریف کا گیت گایا۔ جنگل کا پتہ پتہ اُس کی آواز سے لرز گیا۔ کیونکہ آجتک اس قسم کے الفاظ دنیا کی کسی عورت کی تعریف میں نہیں پیش کئے گئے۔ وہ ایک ایسا گیت تھا۔ جو ویران پہاڑیوں سے نمودار ہونے والی صبح کی سپیدی کے لئے گایا گیا۔

عورتوں نے اپنے مُنہ ہاتھوں سے ڈھانک لئے۔ اور اُن کے جسم ہنسی سے ہلنے لگے۔ نوجوان جوگی کے چہرہ پر شبہ کی وجہ سے چند بل پڑ گئے میں جلدی سے اُس کے پاس آئی۔ میرا دل دردمند تھا۔ میں نے اُس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ "میرے مالک! میری خدمتیں قبول کر!"

میں اُسے پھولے پھلے کنارے پر لائی اور اُس جسم کو میں نے اپنے ریشمی دوپٹے کے آنچل سے صاف کیا۔ میں نے زمین پر دونوں گھٹنے ٹیک دیے اور اُس کے پیروں کو اپنے بالوں سے خشک کیا ——— اور جب اُس نے مجھ سے کہا "تو کون سا نا معلوم دیوتا ہے؟ تیرا لمس کسی غیر فانی جسم کا لمس معلوم ہوتا ہے۔ تیری آنکھیں آدھی رات کے بھیدسے معمور ہیں!"

اے بادشاہ کے بوڑھے مصاحب دنیا کی عقل کی ریگ نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ مگر اُس لڑکے کی معصومیت نے کہر کے دُھند لکے کو چیر کر آسمانی عورت کو دیکھ لیا۔

آہ! کس نئے انداز سے میری روحانی قوتیں اُس پہلی پوجا کے تیز نور سے بیدار ہوگئیں۔ سورج کی کرن ایک بہن کی محبت کے ساتھ بادلوں سے چھو گئی اور ہوا نے آہستگی سے میری پیشانی کو چوما۔

عورتوں نے تالیاں بجائیں اور بُرے انداز سے ہنسیں۔ پھر اُنہوں نے اُس پر پھولوں کی بارش کی، اس حال میں کہ اُن کی نقابیں زمین پر پڑی تھیں اور اُن کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

آہ اے میرے بے داغ سورج کیا میری شرم کہرن کر تجھے اپنے دامن میں نہیں چھپا سکتی؟ ——— میں نے اُس کے قدموں پر گر کر کہا "مجھے معاف کردے!" میں ایک زخمی ہرن کی طرح اندھیرے اور روشنی میں سے گذرتی ہوئی بھاگی اور کہتی رہی "مجھے معاف کردے"! عورتوں کے بیجا ٹھٹھے میرے پاس سے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرح گذرے مگر اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی "تو کون سا نا معلوم دیوتا ہے"!

(رستیندر ناتھ دت)　　　　حقی دہلوی

سنسکرت

شکنتلا ناٹک کے چار شلوک

سنسکرت ادبیات میں ڈرامے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ پُرانے زمانے سے سنسکرت کے شاعر ڈرامے لکھتے رہے۔ اور صدیوں کی محنت سے اسے اس کمال پر پہنچایا کہ شکنتلا ناٹک مصنفہ کالی داس (پانچویں صدی مسیحی) اس وقت دنیا کے اعلےٰ ناٹکوں میں شمار کیا جاتا ہے سنسکرت کے نکتہ چین پنڈت شکنتلا کے چوتھے ایکٹ کو سب سے اچھا خیال کرتے ہیں جس میں کہ شکنتلا اپنے دھرم پتا[1] کنو رشی کے یہاں سے اپنے شوہر راجہ دشینت کے یہاں رخصت ہوتی ہے۔ اس ایکٹ میں بھی چار سلوک نہایت اعلیٰ مانے جاتے ہیں جو آگے لکھے جاتے ہیں۔

(۱) جس روز شکنتلا رخصت ہو رہی تھی اُس روز اُس کا دھرم پتا کہتا ہے "جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آج شکنتلا چلی جائیگی تو میرا دل اُمنڈ آتا ہے محبت کے آنسو روکنے سے گلا گھٹا جاتا ہے اور آنکھوں سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ اگر مجھ کو بھی جو جنگل میں رہنے والا ایک سنیاسی ہوں محبت کی وجہ سے اتنی گھبراہٹ ہے تو گرہستی لوگوں کی بےچینی کا کیا حال ہوتا ہوگا جب اُن کی لڑکیاں اُن سے پہلی بار جُدا ہوتی ہیں (غور فرمایئے۔ اس میں کتنا قدرتی جذبہ ہے جو ہر انسان ایسی حالت میں محسوس کرتا ہے اور جو کسی خاص ملک قوم یا زمانہ تک محدود نہیں)

(۲) شکنتلا نے تپوبن میں پرورش پائی۔ اس لئے ضروری ہے وہاں کے درختوں اور جانوروں سے اس کی ایسی ہی محبت ہو جیسی کہ دوسرے بچوں سے چنانچہ جب وہ رخصت ہوتی ہے تو اس کا دھرم پتا درختوں سے کہتا ہے۔

اے درختو! یہ وہ شکنتلا ہے جو تمہیں پانی دینے سے پہلے خود بھی پانی نہ پیتی تھی۔ جسے اگرچہ زیور (پتوں یا پھولوں کے بنے ہوئے کیونکہ وہ تپوبن میں رہتی تھی) پیارے تھے لیکن مارے محبت کے تمہارے نئے پتے نہ توڑتی تھی۔ جب تمہارے نئے پھول نکلتے تھے تب تو اس کے لئے بڑا اچھا موقعہ ہوتا تھا۔ وہی شکنتلا آج اپنے شوہر کے گھر جاتی ہے۔ تم سب اسے الوداع کہو"(سادہ

[1] شکنتلا کی پیدایش کے بعد اس کی پرورش کنو رشی نے کی تھی۔ اس لئے اس کو شکنتلا کا دھرم پتا یعنی دھرم کا باپ کہتے ہیں۔

لیکن پریم کی زندگی کا نمونہ ہے)

شکنتلا کا دھرم پتا اُس کے شوہر یعنی اپنے داماد راجہ دشینت کے نام پیغام دیتا ہے۔

اے راجہ! اس بات کو اچھی طرح مدنظر رکھ کر کہ ہم تپسی ہیں جن کی دولت صرف تپسیا ہی ہے۔ یہ آپ بہت ہی اعلےٰ خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور شکنتلا کی یہ محبت آپ میں بغیر وسیلے کسی رشتہ دار کے ہوئی ہے۔ ان باتوں کا خیال کر کے آپ شکنتلا کو اپنے حرم کی دوسری رانیوں کی طرح دیکھنا۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب قسمت پر منحصر ہے اور بیٹی والوں کو اپنی زبان پر لانا لازم نہیں۔

(۴) اسی طرح شکنتلا کا دھرم پتا اسے بھی نصیحت کرتا ہے۔

"اے بیٹی تو اپنے سسر اور ساس کی خدمت کرنا۔ اور اپنی سوتوں کے ساتھ بہنوں کی سی محبت رکھنا۔ اگر تیرا خاوند تجھے کسی قسم کا رنج پہنچا دے تو غصہ میں آ کر تو اُس کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ اپنے نوکر چاکروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا اور عروج میں آ کر کبھی مغرور نہ کرنا۔ یہی باتیں ہیں جن سے اچھے گھرانے کی لڑکیاں اپنی سسرال میں عزت پاتی ہیں۔ اور جو اس کے خلاف چلتی ہیں وہ دونوں خاندانوں کیلئے کلنک ہو جاتی ہیں۔

ونا رسیداس ایم اے

گجراتی

غلطی

صبح کا وقت تھا میں باغ میں پہنچا وہاں ایک آدمی پھول توڑ رہا تھا۔ میری آنکھوں کو غصے نے سُرخ بنا دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ تو کون ہے؟ جو اس باغ میں آنے کی جرأت کر سکا۔

وہ مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور ہوا میں ہلتے ہوئے کیلے کے پتے کی مانند سر سے پاؤں تک لرز کر بولا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب دوبارہ یہ خطا نہ ہو گی

یہ کہکر اُس نے اپنی محنت سے جمع کئے ہوئے پھول میرے قدموں پر رکھ دیے۔ اور اُس کی نگاہوں نے مجھ سے معافی مانگی۔

میں نے پھول دامن میں رکھ لئے اور اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں محل کے اندر مہاراج کے پاس پہنچا اور میری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ کہ وہ اجنبی کا بچین خود مہاراج تھے میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ مگر مہاراج میری "اپنی" اور اُن پھولوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

یکایک مجھے اُنمیں اور اپنے آپ میں فرق دکھائی دیا۔ میں غلطی دیکھ کر آگ بھبوکا ہو جاتا ہوں مگر وہ صرف مسکرا دیتے ہیں۔

کشمیری

گیت

تیری تلاش میں میرے محبوب صرف تیری تلاش میں

میں پہاڑوں میں گھوم کر پھری ماری ماری پھری۔ اُن پہاڑوں میں جن کی سر بفلک چوٹیاں سفید برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ہاں انہیں پہاڑوں کی وادیوں میں جہاں ہری ہری گھاس۔ خوشنما پھولوں والی سرسبز جھاڑیاں ہر آنے والے کے دل کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ تم بھی انہیں وادیوں میں کہیں میری طرح سرگرداں ملو گے۔ مگر افسوس تم نہ ملے۔

تیری جستجو میں میرے دوست صرف تیری جستجو میں

میں گنجان جنگلوں ماری ماری پھری اُن جنگلوں میں جہاں بڑے بڑے رشی منی تیری تلاش میں محو رہے۔ اور صدہا برس تک بھٹکتے رہے۔ مگر تجھے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

تیری ملاقات کو ہاں اے میرے عشق صرف تیری ملاقات کو

میں دریاؤں کے شور کرتے ہوئے پانیوں سے تیری کھوج پوچھی جو اونچے پہاڑوں کی گود سے نکل کر گھاٹیوں اور رخنوں سے پھٹتے ہوئے میدانوں میں اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔ مگر تیرا نشان اور مکان اب بھی نہ ملا۔

تیری تلاش سے میرے پیارے صرف تیری تلاش سے

میں مایوس ہو کر اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں آ گئی اور اپنا خود خدا کو سونپ کے خدا کی یاد میں اور بندوں کی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگی۔

تجھے پالیا ہاں اے میرے مطلوب میں نے تجھے پالیا

میرے دل نے تیرے کان میں یہ بھید کہہ دیا کہ تو اُن میں موجود ہے جن کو پہاڑ اور جنگلوں کی تنہائی نہ بتلا سکی جس کی خبر دریا کے روان پانی نہ دے سکے

فارسی

ملامت کے چوگان سے

جب کوئی سالک راہِ خدا میں ثابت قدم اور مستقل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کے سوا دوسری چیزوں کا وجود اُس کی چشم توحید میں معدوم ہو جاتا ہے۔ بس اُسکو اللہ ہی اللہ دکھائی دیتا ہے۔

وہ قلم کی طرح ہر وقت کمر باندھے آمادہ اور سر جھکائے رہتا ہے۔ جو بات پیش آتی ہے سر کے بل قلم کی طرح جھک جاتا ہے۔

اس پر نظر نہ کر کہ کسی ظالم جابر کے ہاتھ سے کسی شریف اور کم آزار پر ظلم ہو رہا ہے۔

بلکہ یہ دیکھ کر کہ ایک دن ظالم بھی شمشیر ظلم و ستم کے گھاٹ اُترے گا۔ اور اپنے کئے کی سزا پائیگا۔ اسی گرداب بے پایاں (دنیا) میں شکم کا بوجھ دل پر نہ رکھو۔ کیونکہ جہاز طوفان کے دن بوجھل ہو جانے سے ہی ڈوب جاتا ہے۔ اس لئے دنیا میں سبکسار اور ہلکا پھلکا رہنا بہتر ہے

اے دلیر ایک عرصہ تک سعی و تگ و دو کی تکلیف اُٹھا تا رہ کیونکہ لوہا بھی سعی پیہم سے ایک دن جام جم اور آئینہ گیتی نما بن جاتا ہے۔ کوشش سے تمام کدورتیں اور دل کے غبار دور ہو جاتے ہیں۔

ایسا آدمی بہت کم منہ موڑتا ہے (یعنی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا) جو راہِ خدا میں گیند کی طرح سر سے پاؤں تک قدم بن جائے تسلیم اور رضا کے میدان میں بادشاہ (خدا) کے گھوڑے کے سم کو وہ شخص دیکھ سکتا ہے۔ جو اپنی پیشانی کو کیل اور نعل کی طرح بنا دے۔ یعنی پیشانی پر سجدہ ریزی سے گٹا ڈال لے اور کمر کو خم کرلے غافل خانہ کعبہ کی جستجو کب تک اس خیال کو چھوڑ جب تو محرم خدا ہو گیا تو پھر تیری ذات خود حقائق و معارف کا قبلہ بن جائیگی۔

کبیرہ گناہ انسان کے راستہ میں بڑے اٹل اور گرانبار پتھر ہیں۔ ایسے پتھر ندامت اور پشیمانی کے سیلاب ہی سے اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں۔

ایسا غم کھانا چاہئے جس کے انجام میں مسرتیں اور خوشیاں حاصل ہوں۔

احمقوں کی طرح ایسی خوشی کے پیچھے نہ پڑ جن کا انجام رنج و ملال ہو۔ تیرے دل میں حرص سمائی ہوئی ہے۔ اس لئے تو دوستوں پر اپنا مال نہیں خرچ کرتا۔

اپنے پیٹ کو نرگس کی طرح خالی کر تاکہ تو ہمہ تن سونا ہو جائے۔

ترجمہ
(قصائد سعدی)

ضیاء درانی

عربی

عرب کے ایک غیرتمند شاعر کے خیالات

جبتک کسی نے اپنی آبرو کو کنجوسی اور لالچ سے میلا نہ کیا ہو اُس وقت تک وہ جیسا کبھی لباس پہن لے بُرا نہ معلوم ہوگا۔ انسان اُس وقت تک نیک اور تعریف کے قابل نہیں ہوتا جبتک وہ طبیعت پر جبر کر کے بُری عادتوں سے نہ رکے

میری بیوی میرے خاندان پر یہ عیب لگاتی ہے کہ تیرے خاندان کا جتھا تو بہت تھوڑا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں ہاں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ بلکہ شریف اور بہادر لوگ تو تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

اُن لوگوں کو کبھی تھوڑا نہ سمجھنا چاہئے۔ جن کے ہم جیسے بہادر نوجوان خونریز لڑائیوں کی آگ سے نکل کر تھوڑے رہ جائیں۔

ہمارے خاندان میں مردوں کی کمی ایسی حالت میں کیا باعث شرم ہو سکتی ہے جب ہمارے ہمسایہ تک، ہمارے رعب سے باعزت مانے جاتے ہیں

قوم میں مردوں کی وہ کثرت کس کام کی جب وہ خود بھی ذلیل اور پڑوسی بھی۔

ہم ایسے ایسے بلند پہاڑوں پر قابض ہیں جن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھیں تو نگاہیں تھک کر واپس آ جائیں۔

ان رفیع اور پرامن پہاڑوں میں صرف وہی لوگ قیام کر سکتے ہیں جن کو ہم پناہ دیں۔

ہم اُس قوم کے بہادر سپوت ہیں جو خوفناک جنگ میں گھس جانیکو اور بہادری سے جان دینے کو اپنی بے عزتی نہیں سمجھتے جس طرح دوسری قومیں۔

موت کو اتنا پیارا سمجھنا ہی تو زندگی کے آخری لمحوں کو ہم سے قریب کر دیتا ہے۔

ہمارے مخالفوں کا موت سے نفرت کرنا اور اُس کے ڈر سے لڑائی کے میدان سے مُنہ موڑنا اُن کی زیادتی اور کثرت کا باعث ہے ایک تو ہمارا کوئی سردار بستر پر پڑ کر ذلت کی موت نہیں مرتا۔

دوسرے ہمارا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس کا قصاص اور بدلہ نہ لیا
گیا ہو۔ کیوں کہ یہ دونوں عیب بہادر قوم کے جوانوں کے لئے بڑی ہتک
و ذلت کا سبب ہیں۔
ہمارے پاکیزہ خون صرف تیز آبدار تلواروں پر بہتے ہیں۔
شرافت خاندان اور صحیح نسب نے میں ہم بارش کے اس پاک و
صاف قطرہ کی طرح ہیں جسکو بلند ترین بادلوں نے برسایا ہو۔
ہمارے خاندان میں سستی اور کنجوسی نام کو نہیں۔
ہم ہر ایک کی بات کو رد کر سکتے ہیں لیکن ہماری بات کو کاٹنے کی کسی میں
ہمت نہیں۔

رات کو آنے والے مہمان کے لئے ہماری آگ اور ہمارے چولہے
کبھی ٹھنڈے نہیں کئے جاتے۔ آجتک ہمارے مہمان نے پیٹھ پیچھے ہماری
برائی اور بدخلقی کا اظہار نہیں کیا۔
ہماری اُن جوہردار فولادی تلواروں نے ہماری شہرت اور بہادری
کا نقارہ مشرق اور مغرب میں بجا دیا۔ جن پر دشمنی کی زرہوں کی مار سے
دندانے پڑ گئے ہیں۔
ہماری قوم کا سردار دوسری قوموں کے لئے چکی کی کیلی کی طرح ہے
جسکے چاروں طرف وہ پاٹ کی طرح گھوم رہی ہیں۔

ضیاء درانی

انگریزی

آفرینش شعر

دنیا کی ابتدا تھی اور رات کا وقت۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی
تھی۔ کبھی کبھی آسمان میں بجلی کوند جاتی اور دریا کے اُس پار ایک ٹوٹا سا
جھونپڑا دکھائی دے جاتا جس میں ایک بوڑھا مگر ہمت کا جوان بیٹھا ہوا
تھا۔
اُس وقت کے لوگ اُس کو شاعر کہتے تھے۔ مگر انہیں خود بھی معلوم
نہ تھا کہ وہ اسے شاعر کیوں کہتے ہیں۔
بادل گرجا اور تھوڑی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔
یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوتا کا انعام کبھی ختم ہونیوالا نہیں جس سے دنیا
بہ جائیگی۔
بوڑھے شاعر کو زیادہ سردی معلوم ہوئی۔ وہ اُٹھا۔ انگیٹھی میں آگ
جلائی اور کرسی کی قسم کی چوکی کھینچ کر آگ کے قریب ہو بیٹھا۔
اتنے میں کسی بچے کے رونے کی غمگین آواز سنائی دی۔ شاعر نے
جھونپڑے کا دروازہ کھولا۔ اور دیکھا کہ ایک بچہ جس کے ریشم کے سے بال
ہیں۔ تیر کمان لئے ہوئے پٹ سے لگا ہوا رو رہا ہے۔
شاعر اُسے اندر لے آیا۔ اور آگ کے قریب بٹھا دیا۔
بچے کے بالوں سے پانی کی بوندیں یوں گر رہی تھیں۔ جیسے صبح کا
فرشتہ آسمانِ رحمت سے محبت کی برکتیں برسا رہا ہو۔
بچہ شاعر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے معصوم ہاتھوں سے محبت
کا تیر کمان میں جوڑا۔ اور شاعر کی طرف نشانہ کیا جو ٹھیک اُس کے دل میں جا اُترا۔
شاعر کے دل میں شاعری کی قوت پیدا ہوئی۔ دل میں اک ہوک اُٹھی
سینہ درد سے بھر گیا۔ موتیوں سے بھری آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ جو دنیا کو درد
میں شعر کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور اپنے قریب اور دور کے مقام کو مست
کرنے لگے۔
اُس وقت شاعر کو معلوم ہوا کہ اُس نے شعر کہا ہے۔

غلام حبیب

ولندیزی

کسی پرندے کا گھونسلہ بھی اس قدر بلند نہیں ہوتا تھا جو وہ اپنے
دوست کیلئے پیدا نہیں کرتا تھا۔ بادلوں میں سے عقاب کا گھونسلہ بھی اُتار
لاتا تھا اور اس کے انڈے اور بچوں کو برباد کر دیتا تھا۔
کوئی ندی خواہ کیسی ہی تیز بہنے والی ہو۔ ایسی نہ تھی جس پر کہ وہ اپنے
محبوب کو لے جاتا ہو۔ اور جبکہ پانی شور کرتا ہوا بہہ رہا ہو۔ تو اس کو اپنے
دوست کی باہیں گلے میں ڈالنا کیسا پیارا معلوم ہوتا ہے۔
وہ موسم بہار کے تازہ کھلے ہوئے پھول اور تازہ پکے ہوئے پھل
اور خزاں کا سب سے پہلا سنہری خزانہ اسی کی نذر کرتا
تھا۔

اطالوی

یہ بڑے شرم کی بات ہے اُس نے مجھے بیحد تکلیف دی ہے۔ ایک بدمعاش لڑکا ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ میں آج ہی اس کو ٹھیک کروں گا کیونکہ میں نے کچھ ایسے آدمیوں کا پتہ نکالا ہے جو پولیس کے واسطے گندے کام کرتے ہیں۔ اور میں نے ان کو اس کام کے لئے اُجرت دی ہے کہ وہ اس کو کافی طور پر دھمکا دیں۔ اگر اُس نے پھر بھی اپنی بُری عادتوں کو نہ چھوڑا تو دوسری دفعہ سچ مچ اس کو سزا دلاؤں گا۔ لڑکی کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کو بار کوشش لے گیا ہے۔ میں نے اُس کے پیچھے آدمی لگا رکھے ہیں جب تک مجھے سچی بات کا پتہ نہ چلے میں نہیں ٹھہروں گا اور جس شخص کا یہ کام ہے خدا کی قسم ہے۔ میں اُس کو اس کا مزا چکھا کر چھوڑوں گا۔

یہ تو نہایت ہی عجیب طرح کی قسم ہے میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا میں عزت دار سوداگر ہی نہیں ہیں۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر ان سے تم ایک غالیچہ اُدھار مانگو تو وہ دو شلنگ فی گز زیادہ لیں گے۔ اُس نے میرے پاس پیشینیہ کی چادر بھیجی اور کہا کہ یہ فلورنتین کی ہے حالانکہ یہ موڈینا کی نکلی۔ اور جب کبھی میں اُسکے پاس روپے لیکر جاتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ اس روپے کا وزن کم ہے اسلئے وہ اُسکے دام کم دیگا۔

ہسپانوی

اس دنیا میں ہمارے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اپنے ہنروں اور خودداری سے کام لیں۔ کیونکہ خودداری کے بغیر ہنر کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جہانتک ہو سکے بہت کم بولا جائے اور جب کبھی بولا جائے تو نہایت متانت سے گفتگو کی جائے اور بولتے وقت ایک شریف آدمی کی سی صورت بنائی جائے جب کوئی شخص تم سے کوئی سوال کرے اُس کو جواب نہایت حیا سے دیا جائے۔ اور اگر تم اپنی مرضی سے منہ کھولو اور کچھ کہو تو یاد رکھو کہ وہ رعب داب کے ساتھ ہو گویا کہ تم ایک لفظ کا تلفظ بیان کر رہے ہو۔ آجتک تم نے صرف اس قدر سیکھا کہ اپنے وسیلوں کو قطع کرو۔ حالانکہ اُس وقت تمہیں اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ انسان کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے کہ کوئی شخص اُسے ایسا مل جائے جو اسکی خوبیاں اُسکو بتاتا ہے۔ کیونکہ جیا انسان کے لئے ایک ہمیشہ پہننے والا زیور ہے اور خود بڑا سمجھنا دیوانہ پن ہے۔ ان دونوں حالتوں کے درمیان رہکر ہم دنیا میں بڑے سمجھے جائیں گے۔ آدمی سوداگری کے مال کی طرح سے ہے۔ اُن کی قیمت اسی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے جس طرح کہ اُن کا بیچنے والا لائق ہو یا نالائق اگرچہ تم ایک کیچڑ سے بھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کے مانند ہو۔ مگر میرے ہاتھوں میں رہکر تم ایک ہیرے کی قیمت پا سکتے ہو۔"

لاطینی

اگر تمہیں نزلہ ہو گیا ہو اور درد کے مارے تمہیں سخت تکلیف ہو۔ یا خدانخواستہ کسی چوٹ کے سبب تم اپنے بستر سے اُٹھ نہ سکتے ہو۔ تو ایسی حالت میں تمہارے پاس کوئی ہوگا جو تمہارے لئے دوائی تیار کرے گا۔ اور ڈاکٹر سے کہیگا کہ وہ تمہارا علاج اچھی طرح کرے تاکہ تم جلد بستر سے اُٹھو اور اپنے بال بچّوں کی نگرانی کرو۔

یہ کیسے؟ تمہاری تو بیوی کبھی تم سے محبت نہیں کرتی۔ نہ تمہارا بیٹا۔ ہر ایک آدمی تم سے نفرت کرتا ہے۔ کیا ہمسائے اور کیا دوست، اور نوکر۔ کیا تم اس بات پر حیران ہو کہ تم کو سب سے زیادہ اپنے روپیہ سے محبت ہے۔ اور تم کسی چیز کو اس کے برابر نہیں سمجھتے۔ اور یہی سبب ہے کہ کوئی تم سے بھی محبت نہیں کرتا جیسی کرنی چاہیئے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ آؤ اس روپے کی محبت کو ہمیں ختم کریں۔ کیونکہ جتنا روپیہ تمہارے پاس زیادہ ہے اُتنے ہی تمہارے فکر کم ہونے چاہئیں جب تم اپنا مطلب حاصل کرو تو اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر دو۔ تاکہ کہیں تمہارا بھی وہی حال نہ ہو جیسا کہ ایک دفعہ امیدلیس کا ہوا تھا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے وہ اس قدر امیر تھا کہ اپنی دولت کو وزن کر کے شمار کیا کرتا تھا۔ اور ایسا کنجوس تھا کہ ایک بھکاری سے بہتر اُس کے کپڑے نہ ہوتے تھے۔ اور مرتے دم اُس کو یہی غم تھا کہ کہیں دولت ختم ہو جانے سے اُس کو بھوکا نہ مرنا پڑے۔ مگر جانتے ہو کہ اُس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ایک آزاد عورت نے کلہاڑی سے اُس کے دو ٹکڑے کر ڈالے"۔

جرمن

جبتک میری رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی دوڑ رہا ہے میں تمہاری مخالفت کرونگی ۔ اصلاح خانہ (جیل) میں میرا بچہ خراب ہو جائیگا ۔ ایک شیطان لڑکا تو وہاں جاکر کچھ اصلاح پا سکتا ہے لیکن ایک نیک خصلت والا بچہ یقیناً وہاں جاکر شیطان ہو جائیگا ۔ جیسے کہ ایک پودا تباہ ہو جاتا ہے جب اس کو سورج کی روشنی اور ہوا نہ ملے ۔ میں اچھی طرح اس بات کو سمجھتی ہوں کہ میں ایسا کہنے میں اس کے واسطے کوئی بُرائی نہیں کر رہی ہوں ۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس نے میری رہبری کی کہ میں اپنے بچے کے دل میں عمدہ اخلاق اور شرافت کا مادہ پیدا کروں ۔ پھر اُس نے ایسا خطرناک کام کونسا کیا ہے ؟ اگر وہ اسکول سے نکالا گیا ہے تو میں اس کو اس طرح اپنے ہاتھوں مصیبت میں نہیں ڈال سکتی ۔ اور اگر اس میں اُس کا قصور بھی ہو تو اُس کی سزا اُس نے کافی طور سے بھگت لی ہے ۔ اور تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو یہ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو ۔ مگر اپنے بچے کی تباہی دیکھی نہیں جا سکتی ۔

مگر اس کا تعلق ہم سے نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جو ہم نے خود بخود اپنے ذمے دوسری خوشیوں کے ساتھ لے رکھا ہے ۔ جو شخص چلنے میں بہت سست ہو اُس کو قافلے والے پیچھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ بھٹکنے والے کو جہاں تک ممکن ہو ٹھیک راستے پر چلانے کی کوشش کریں ۔

ترکی

اوہو ! پھر میرا دل خون سے بھرا ہے ۔ اپنے محبوب سے جُدا ہوتے وقت میں اُس کے پاؤں پر گرا ۔ میرے وحشی دل پر غم اور غصے نے حملہ کر کے اُس کو جیت لیا ۔

محبوب نے آنکھیں پھیر لیں ! میری محبت سے انکار کر دیا ۔ آسمان مجھ سے پلٹ گیا ، رنج و غم کی گھٹائیں چھا گئیں ۔ یار دوست جُدا ہو گئے ! دشمن کا ستارہ روشن اور بلند اور میں بے یار و مددگار رہ گیا ۔ !

دنیا کے باغ میں اگرچہ لوگ خوش نظر آتے ہیں ۔ مگر جب تم غور سے دیکھو تو دنیا رنگا رنگ کی مصیبتوں کا گھر ہے ۔ اگر تم انصاف سے خوش و خرم رہ سکتے ہو تو دنیا میں وہ بہت کم ملتا ہے ۔ کیا ہزار سال میں ایک عاشق بھی محبوب سے ملتا ہے ۔ اگر کسی کو ایسا نصیب ہوا ہے تو اُس کو ناز کرنا چاہئے ۔

اے دل ! ذرا سوچ تو سہی ! افسوس ! پھیرنے والی زمین کے انقلابات ! اگر ایک منٹ آرام کا آتا ہے تو سینکڑوں دن رنج و الم کے ہوتے ہیں ۔ اس لئے دنیا کی بادشاہت پر نہ تو حسد کرو اور نہ اس کا لالچ کرو ۔ کیونکہ یہ سب عیش و آرام اور ملک و سلطنت فنا ہونے والے ہیں ۔

فرانسیسی

تاہم میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرا اعتبار کریں کہ بدمعاش لوگوں کے دلوں میں اس قدر محبت نہیں ہوتی جتنی کہ اُن کی زبان پر ہوتی ہے ۔ آپ یقین جانئے کہ اگر ایک لڑکی ایک ایسے بدمعاش کی محبت میں پھنس بھی جائے تو وہ بجائے کچھ عمر کرنے کے بہنسے گا ۔ مضبوط اور خوشنما پروں والے پرندے جو درختوں کی ٹہنیوں پر بڑے مزے سے چہچہاتے ہیں ۔ اُن کا وہ چہچہانا اُسی طرح بدل جاتا ہے جس طرح کہ اُن کے پروں کے رنگ کی چمک عمر کی وجہ سے گھٹ جاتی ہے وہ اب بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ نہ تو اُن کی زبان میں مزا ہے اور نہ اُن کے پر دلربا رنگ ہے ۔ اُن کی خوبصورتی سب جاتی رہی ۔ مگر ہمیں دیکھو کہ محبت سچی اور پاک محبت میں ہے ۔ ہمارے قدم آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں اور ہماری آنکھیں مدھم پڑی ہوئی ہیں ۔ ہمارے ابروؤں پر بل پڑے ہوئے ہیں مگر دل میں کبھی بل نہیں پڑتا ۔ جب کوئی شخص بڑھاپے میں محبت ظاہر کرے تو اُسے معذور سمجھنا چاہئے کیونکہ دل ہمیشہ جوان ہوتا ہے ۔ میری محبت کوئی شیشہ جیسی کمزور چیز سے نہیں بنی ہے کہ ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔ ایک پاک اور ہمیشہ رہنے والی محبت ہی میری پیدا نسبت تمہارے ساتھ ایسی ہی مضبوط ہے جیسے ایک پہاڑ کی چٹان ۔

یونانی

حکماء کی اولاد کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ بے وقوف لوگوں کے سب کام محبوب ہے ۔ (حقیقت میں وہ خدا کا پیارا ہے ۔ کیونکہ وہ خدا کی یاد کرتا

ناپاک ہوتے ہیں اور جہالت کو وہ دیوانہ پن سمجھتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ اکثر لوگ دیوانے ہیں۔ عقل ہمیں ذرا سا شبہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ آیا عقلمند ہونا بہتر ہے۔ یا دیوانہ ہونا۔ سچائی پر مضبوطی سے قائم رہ کر ہم خدا کے حکموں کی تعمیل عقل کی درستی سے کرتے ہیں اور یہ ہمارا اعتقاد ہے کہ سب چیزوں کا مالک وہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کو ماننا پڑیگا کہ ہم اسکی بہترین مخلوق ہیں اور اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرتے ہیں۔ ہم کو خدا سے سچی محبت ہونی چاہئے۔ اور تمام عمر ایسا کرنا ہمیں اپنا فرض سمجھنا چاہئے۔ اور اگر دوستوں کا مال ملا جلا ہے اور آدمی خدا کا رہتا ہے تو پھر سب چیزوں کا مالک انسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور انسان اور خدا دوست ہیں۔ دوستوں کی ملکیت ملی جلی ہوتی ہے اس لئے دنیا کی تمام چیزوں کا مالک انسان اور خدا ہے لہذا ہمیں اس بات کو ماننا چاہئے کہ صرف خدا سے ڈرنیوالے لوگ ہی امیر اور عقلمند ہیں۔

یہ کیونکر ٹھیک ہو سکتا ہے کہ تم نے خود تو انسان کے لئے قانون بنائے۔ اور خود ہی تم گناہ کے کام کرو۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگرچہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر تم ضرور ایسے گناہ کیلئے جرمانہ ادا کرو۔

ریویو

"پیشوا" کا رسول نمبر

معراج النبی و محفل میلاد کی دھوم دھام نے مسلمانوں میں جو بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے وہ امیدوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ اس مبارک تحریک کی طرف مسلمانوں کا یہ پہلا قدم تھا۔ اسی سلسلہ میں اسلامی اخباروں اور رسالوں نے جو رسول نمبر اور رحمۃ العالمین نمبر نکالے اُن میں ہمارے نقطۂ نظر سے "پیشوا" کے رسول نمبر کو خاص وقعت ہے اسمیں مشہور مقامات مقدسہ مثلاً حرم بیت اللہ۔ مزار رسول پاک و دیگر مزارات مقدسہ۔ اور دنیا کی مشہور مساجد عمارات و قلعہ جات تقریباً ۳۰ عدد فوٹو بلاک نہایت دیدہ زیب ہیں جن سے رسالہ کی شان دوبالا ہو گئی ہے۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور اہل قلم کے بلند پایہ مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔ ہم اس محنت و جانفشانی کی جو رسالہ تزئین و تحسین میں صرف کی گئی ہے۔

پیشوا کے ادارۂ تحریر و تنظیم کو جتنی بھی داد اور مبارکباد دیں کم ہے۔ غرض یہ صحافت اسلامی کا ایک بہترین مرقع ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے ہم ناظرین "ادبی دنیا" سے اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔ اس خاص پرچہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ جو اصحاب دو روپیہ سالانہ چندہ بھیجکر منگائیں ان کو مفت بھیجا جاتا ہے مینیجر رسالہ پیشوا دہلی سے طلب فرمائیں۔

نظام المشائخ کا رسول نمبر

پیشوا کی طرح نظام المشائخ نے رسول نمبر شائع کیا ہے جو عمدگی مضامین میں جن کی اس فتنہ و فتن کے زمانہ میں اشد ضرورت تھی وہ اس رسالہ میں موجود ہیں یہ رسالہ جن مقاصد کو لیکر جاری ہوا تھا انمیں بہ کامیاب رہا ہے۔ جولائی و اگست کا یکجائی نمبر رسول نمبر کے نام سے ۲۴۳ صفحات پر علیحدہ ۸ صفحہ ضمیمہ کے شائع ہوا ہے۔ لکھائی۔ چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس رسالہ میں نبی کریم کے متعلق تقریباً ۳۸ صفحات مندرج ہیں۔ عوام کیلئے اس کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور رسالہ کے مستقل خریداروں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔ مینیجر نظام المشائخ دہلی سے طلب فرمائیں۔

خضرِ راہ: اس نام کا رسالہ نیا گاؤں لکھنؤ سے مولانا حامد علی ندوی کے زیر ادارت نکلا ہے۔ مضامین دلچسپ اور بلند پایہ ہیں۔ ہندوستان کے ادیب مولانا نیاز فتحپوری کی سرپرستی اسکو بام ترقی پر پہونچا دینے کیلئے کافی ہے۔ خضر راہ کا چندہ سالانہ للعہ چار روپے

فرہنگ الفاظ

الفاظ	معنی
(الف)	
اشربہ	شراب کی جمع
ارتقا	ترقی۔ عروج
انفرادی حیثیت	اکیلے پن کی حالت
ابتدائے آفرینش	پیدائش کا شروع
انتشار	پریشانی۔ بے اطمینانی
الوداع کرنا	رخصت کرنا
احترام	عزت۔ بڑائی
اتالیق	استاد
اندازِ تکلم	بات کرنے کا ڈھنگ
اثبات	ثابت کرنا
اعزہ واقربا	اعزہ جمع عزیز کی۔ اقربا جمع قریب
اعتراف	اقرار۔ ماننا
(ب)	
بے نیاز	بے پروا
بوس وکنار کرنا	چومنا اور بغل میں لینا
بدعنوانی	بدچلنی
باطنی صفات	اندرونی خوبیاں
بادی النظر میں	ظاہر میں
بصارت	بینائی
برہم زنِ دیوار	دیوار کو توڑنے پھوڑنے والا
بلند پروازی	اونچا اڑنا
(ت)	
تحسین	خوبصورت بنانا
ترحم	رحم کرنا
ترک وتاز	لڑائی جنگ
تعاقب کرنا	پیچھا کرنا
تنازع بقا	زندگی کی کشمکش
تموّل	امیری۔ مالداری
تابش	چمک
تزئین	سجاوٹ
(ج)	
جبین	پیشانی۔ ماتھا
جراحت	زخم
جدت طرازی	نئی بات پیدا کرنا
(ح)	
حزین	غمگین رنجیدہ
حسبِ معمول	عادت کے مطابق
حالت اضطراری	بے اختیاری کی حالت
(خ)	
خلوت	تنہائی
خوابیدہ	سویا ہوا
(د)	
دورِ طرب	خوشی اور مسرت کا زمانہ
دل آویز	دل کو اچھی معلوم ہونے والی چیز
در آنا	آگھسنا
دوُن	کمینہ
(ر)	
روایات	روایت کی جمع
(ز)	
زینت افزا	خوبصورتی بڑھانے والا
(س)	
سرگرمِ خرام ہونا	نازسے چلنا
سلامت ذوق	طبیعت کی عمدگی
سمع خراشی کرنا	کان کھانا
(ش)	
شرفاء	شریف کی جمع
شدت تشنگی	پیاس کی زیادتی
شوق آموز	شوق پیدا کرنیوالی
شرفِ باریابی	ملاقات کی عزت
شبِ تار	اندھیری رات
(ض)	
ضوفشاں	روشنی ڈالنے والا
ضعیف العمر	بوڑھا
(ظ)	
ظلمت	اندھیرا۔ تاریکی
(ع)	
علم العقائد	انسان کے عقیدوں کا علم
عروج	بلندی۔ ترقی
علم موسیقی	گانے کا علم
(غ)	
غمزہ	ناز وادا
(ف)	
فراوانی دولت	دولت کی زیادتی
فرخندہ	مبارک۔ اچھا
فریب خوردہ	دھوکہ کھائے ہوا
(ق)	
قصرِ آزادی	آزادی کا محل
قشقہ	وہ نشان جو برہمن لوگ ماتھے پر لگاتے ہیں
(ک)	
کورٹ مارشل	فوجی عدالت
کرخت لہجہ	سخت لہجہ
کشیدہ قامت	دراز قد
کلید برداری	دربانی
کاسۂ گدائی	فقیری پیالہ
(گ)	
گنبد نیلگوں	نیلے رنگ کا گنبد۔ مراد آسمان
گردش ایام	زمانہ کا الٹ پھیر
(ل)	
لازمہ زندگی	زندگی کی ضروری چیز
لب لباب	خلاصہ
(م)	
مرصع	جڑاؤ
ملک الشعراء	شاعروں کا سردار
موجزن	موج مارنے والا
مشیر	جس سے مشورہ لیا جائے
مشائخ	بزرگ لوگ
معلق	لٹکا ہوا
مسکرات	مسکر کی جمع نشہ لانیوالی چیز
مہوشان	مہوش کی جمع چاندسی صورت والا مراد محبوب
مقہور	جسپر غصہ وناراضگی ہوئی ہو
مسخ ہونا	صورت بدل جانا
مخلوط	ملا جلا
ملبوسات	ملبوس کی جمع لباس
مغالطہ	غلطی میں ڈالنا
معذرت کرنا	معافی مانگنا
مجروح	زخمی
(ن)	
نقیض	الٹا۔ برعکس
نیک ضمیری	دل کی اچھائی
نقاد	پرکھنے والا
(و)	
وسعت	کشادگی پھیلاوٹ
وعیدوں	وعید کی جمع۔ دھمکیاں

دق کی دوا مفت

حکیم مقبول احمد صاحب تعلیم یافتہ و سند یافتہ مدرسہ طبیہ دہلی و تکمیل الطب لکھنؤ و آصفیہ میڈیکل اسکول بھوپال سابق طبیب ریاست بھوپال کی ایجاد اور سولہ سترہ سال سے ہزاروں بیماروں پر تجربہ کی ہوئی دوا ہے چالیس خوراک دوا کے استعمال اور ہدایت پر عمل کرنے سے دق کے جراثیم نیست و نابود ہو کر پھیپھڑہ کے ٹیوبر کلز ابھار تحلیل ہو جائیں گے کھانسی کو آرام بخار میں کمی ہو جائیگی۔ پھیپھڑہ، معدہ اور آنتوں میں طاقت آجائیگی جس سے خون تھوکنا بلغم گرنا موقوف ہو جائیگا دست اگر شروع ہو گئے ہوں گے تو وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ بھوک بڑھ جائیگی۔ غذا اچھی طرح ہضم ہو کر جزو بدن ہونے لگیگی۔ دق کے تمام عوارض میں پورا افاقہ ہو جائیگا اور مریض تندرست ہو کر تنومند ہو جائیگا۔ یہ دوا بچوں کی علاج بیماری سوکھی سیلی کو بھی جس میں بچہ سوکھ کر لاغر کانٹا ہو جاتا ہے بیحد مفید ہے۔

قیمت امراء سے پانسو روپیہ کا ٹھیکہ معمولی قیمت چالیس خوراک پانچ روپیہ (صہ)

مکان پر علاج کرانے والوں سے اول پانچ روز کی فیس پچاس روپیہ بعدہٗ یومیہ اور پانچ روپیہ یومیہ۔ غریب اشخاص بشرطیکہ بستی کے معزز حضرات تصدیق فرمادیں ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر پندرہ خوراک مفت طلب کریں۔

المشتہر

منیجر دواخانہ حکیم مقبول احمد صاحب گنگوہ ضلع سہارنپور

ہر قسم کے اسلحہ اور کارتوس

ہمارے یہاں فروخت ہوتے ہیں۔ اور اسلحہ کی مرمت نہایت انتظام کے ساتھ کی جاتی ہے ایک مرتبہ کے تجربہ سے خود ثابت ہو جائیگا کہ ہمارے یہاں عمدہ مال کم قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

نرخ بندوق عمدہ

بندوق دونالی کارتوسی ڈلنگن کمپنی کی ولایتی قیمت مبلغ ۹۰ / ۱۴۰ روپیہ

بندوق دونالی کارتوسی آئی ایل ہالبس کی 〃 〃 ۳۵ / ۱۴۰ روپیہ

نوٹ

ریوالور بندوق کارتوسی ٹوپی دار یک نالی و دونالی ہمارے یہاں استعمالی بھی فروخت ہوتی ہیں جن کی قیمت طلب فرمانے پر ارسال کی جاویں گی۔

امپیریل آرمس کمپنی سوداگر اسلحہ شہر میرٹھ

بیداری ہند

یعنی

ینگ انڈیا کا سلیس اردو ترجمہ اور تحریک عدم تعاون کی مکمل تاریخ

یہ اُس مایۂ ناز ہستی کا کارنامہ ہے جس نے ہزار ہا سال کے سوئے ہوئے بتیس کروڑ ہندوستانیوں کو ایک آواز میں بیدار کر دیا تھا اور اُنکے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن کر دی تھی۔

آج دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے افسوس کہ اردو لٹریچر میں اس کا کوئی ترجمہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو محسوس کر کے مہاتما گاندھی کی اُن ہنگامہ خیز اور معرکۃ الآرا تقریروں اور تحریروں کو جن کی اشاعت سے اس قائد اعظم نے تمام دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اور ہندوستان میں قصر حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔

امراء و علماء ادب کے گوہر مائے سے مزین کیا گیا ہے

دیباچہ اٹھاون صفحات پر ختم ہوا ہے جس میں دنیا کے اکابرین اور مشہور اہل قلم حضرات کے وہ خیالات بھی درج کئے گئے ہیں جو انہوں نے اس تحریک اور اسکے بانی کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔

جہد۔ اُس کتاب کا ایک دلکش باب ہے

تقطیع بڑی ۲۶×۲۰ ضخامت چار سو صفحے مرقع دیدہ زیب کاغذ و طباعت نہایت اعلیٰ قیمت (عہ) محصول

دار الاشاعت بیداری ہند میرٹھ

بیکاروں کو مژدہ

سمندر پار نوکری کس طرح مل سکتی ہے

اس کی مشکلیں اور ان کا علاج۔ کیا خرچ ہوتا ہے کس ذریعہ سے مل سکتی ہے۔ سب تفصیل ۹ر کے ٹکٹ آنے پر ارسال ہوگی۔ خط و کتابت کے لیئے ۲ر کا ٹکٹ آنا چاہیئے ورنہ جواب نہیں ملے گا۔

پتہ

اوورسیز سروس اڈوائزر نظام بلڈنگ۔

ریلوے روڈ لاہور

Overseas Service Advisor

امیر کشورِ معنی امیر مینائی

نیرنگ کا خاص معیار علم و ادب کی تنقید ہے

اس مقصد کی تکمیل کیلئے ابتدا سے ابتک جو خدمات انجام دیگئی ہیں اُن سے ارباب نظر واقف ہیں اور معترف ہیں کہ "نیرنگ" نے ہمیشہ روایات کو برقرار رکھا ہے اس لیے جنوری ۱۹۳۰ء میں ملک الشعرا حضرت امیر مینائی مرحوم لکھنوی کے فضل و کمال سے ممنون کرکے نیرنگ کا امیر نمبر شایع کیا جائیگا۔ امیر نمبر جنوری ۱۹۳۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوگا۔ تقریباً دو سو صفحات کی ضخامت ہوگی اور متعدد فوٹو بلاک۔ عکس تحریرات جنمیں حضرت امیر اور اُن کے صاحبزادگان اور ارشد تلامذہ کی تصاویر بھی قابل ذکر ہیں۔ بہترین مضمون پر پچیس ۲۵ روپیہ کا حقیر ہدیہ نیرنگ کی جانب سے صاحب مضمون کی نذر ہوگا۔ مضامین مندرجہ ذیل عنوانات پر ہوں گے:-

(۱) حضرت امیر کے حالات زندگی۔
(۲) امیر کے فضل و کمال اور تصانیف پر تحقیقی نظر۔
(۳) شاعرانہ کمالات اور معاصرین میں امیر کا مرتبہ۔
(۴) کلام پر تبصرہ۔
(۵) تذکرہ تلامذہ۔

ارباب قلم ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک حسب پسند عنوان پر مضمون ارسال فرمائیں، مضامین میں اختصار کے ساتھ جامعیت کا لحاظ ضروری ہے۔ انعامی رقم یکم جنوری ۱۹۳۰ء تک بھیج دی جائیگی۔ مدیر نیرنگ رامپور

ہفتہ وار اتحاد

ہفتہ وار اخبار اتحاد جو مولانا تاجور کے زیر ادارت عرصہ سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس کے مضامین اور خبریں آجتک کسی شخص کو رنجیدہ نہ کرسکیں۔ اسکی پالیسی اور اس کا مسلک ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور مذاہب کے پیرو باہم شیر و شکر ہوکر مادر ہند کی ترقی میں مصروف ہیں یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ باقاعدہ طور پر شائع ہوکر ناظرین کی خدمت میں وقت پر ارسال کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ہر نمبر میں کئی تصاویر ہوتی ہیں۔ اس کا سالانہ چندہ پانچ روپے

المشتہر
مینیجر اخبار اتحاد لاہور

لاہور ٹرنک ہاؤس انارکلی بازار لاہور سے

عمدہ سستے مضبوط اور خوبصورت ٹرنک سوٹ کیس ٹب بالٹی آہنی کرسیاں لیٹر بکس وغیرہ ہر قسم و پسند حسب دستیاب ہوسکتے ہیں

ہر قسم کے سپورٹس کا تازہ سامان۔ کرکٹ۔ ہاکی ٹینس۔ بیڈمنٹن۔ فٹ بال۔ والی بال وغیرہ نہایت سستے نرخوں پر پتہ ذیل سے طلب فرمائیں

نوٹ:- "پرائس لسٹ مفت طلب فرمائیں"

چراغدین اینڈ سنز۔ لاہور سپورٹس ورکس انارکلی لاہور

رجسٹرڈ ۱۹۰۰
تمغہ یافتہ
خاص رعایت
صرف دیہاتی مڈل سکولوں کیواسطے
مکرمی جناب ہیڈ ماسٹر صاحب جی
تسلیم ہم آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے اس دفعہ اپنے کارخانہ میں کھیلوں کا سامان نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا تیار کروایا ہے۔ اور چونکہ ہمارا کارخانہ بہت مدت سے عمدہ اور اعلیٰ درجہ کا سامان کھیل پہنچانے کے واسطے مشہور ہے اس واسطے آزمائشی آرڈر دے کر ہمارے سامان کی عمدگی مضبوطی اور رعایت کی آزمائش فرماویں۔ اور عرصہ چوبیس سال میں ہمارے کارخانہ نے جو شہرت پنجاب و دیگر صوبجات میں حاصل کی ہے وہ صرف مندرجہ ذیل وجوہات سے ہے۔
(۱) کمیشن ۱۲½ فی صدی (۲) اگر کوئی سامان ناپسند ہو تو بخوشی واپس یا تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ (۳) اگر کوئی چیز جلدی ٹوٹ جاوے۔ تو اس کو مفت مرمت کر کے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دھولیہ نمائش ۱۹۱۰ء کا سلور میڈل یعنی تمغہ سینکڑوں سندیں اور سرٹیفکیٹ اور ایچ ایچ دی مہاراجہ اوف ٹراونکور جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کی سپیشل اپائنٹمنٹ ہی ہمارے مال کی پائیداری اور مضبوطی کی وجہ ہے
نام اشیا | درجہ اول | درجہ دوم | درجہ سوم | درجہ چہارم
کرکٹ بیٹ میچ کیواسطے | ۱۰-۰ | ۸-۰ | ۷-۴ | ۵-۰
کرکٹ بیٹ آل کین پریکٹس | ۵-۰ | ۴-۸ | ۴-۴ | ۴-۰
کرکٹ لیگ گارڈ | ۳-۰ | ۲-۸ | ۲-۰ | ۱-۸
وکٹیں فی سیٹ ۶ عدد | ۶-۸ | ۶-۰ | ۵-۰ | ۴-۸
فٹ بال میچ کیواسطے مکمل | ۱۰-۰ | ۸-۰ | ۷-۰ | ۶-۰
فٹ بال پریکٹس کیواسطے مکمل | ۵-۸ | ۵-۰ | ۴-۰ | ۳-۸
فٹ بال بلیڈر | ۲-۸ | ۲-۴ | ۲-۰ | ۱-۸
فٹ بال پچکاریاں | ۵-۰ | ۴-۰ | ۳-۸ | ۳-۰
نام اشیا | درجہ اول | درجہ دوم | درجہ سوم | درجہ چہارم
سکور بک | ۴-۰ | ۳-۸ | ۲-۰ | ۲-۰
ہاکی سٹک ان کین ہینڈل | ۵-۰ | ۴-۸ | ۴-۰ | ۳-۰
ہاکی گیند | ۳-۰ | ۲-۸ | ۲-۰ | ۱-۰
والی بال میچ مکمل | ۷-۸ | ۶-۸ | ۵-۰ | ۴-۰
والی بال بلیڈر | ۱۵-۰ | ۱۳-۸
والی بال جال | ۶-۰ | ۵-۰ | ۴-۰ | ۳-۰
فٹ بال سیٹی | ۱-۴ | ۱-۰ | ۰-۱۲ | ۰-۰
سلوشن بڑی | ۱-۰ | ۰-۱۲ | ۰-۸ | ۰-۴
مال بذریعہ وی۔ پی روانہ ہوگا۔ نزدیک کے ریلوے اسٹیشن کا نام دیویں۔ پتہ خوشخط اور صاف حروف میں لکھویں۔
ملنے کا پتہ
گورند مل اینڈ سنز رائل سپورٹس ورکس شہر سیالکوٹ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد (۱) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء نمبر (۶)

تصاویر: (۱) خواب کی پریاں سہ رنگی (۲) اسپارٹا کے کمزور بچے - (۳) ملکہ رومانیہ (۴) بد قسمت سلطانہ (۵) خدیو مصر (۶) علی شمسی پاشا۔ (۷) سیّد احمد لطفی بک (۸) مصر کا علمی دیوتا (۹) جامعہ مصریہ کا خاکہ۔ ....

دنیائے ادب

اردو - ہندی - گورمکھی - تامل - گجراتی - مرہٹی - بنگالی
پشتو - بلوچی - پالی - سنسکرت - چینی - ترکی - عربی - یونانی
فارسی - انگریزی - فرانسیسی - جرمن - اطالوی - روسی -

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا

علّامہ عبد اللہ العمادی رکن دار الترجمہ والتالیف (عثمانیہ یونیورسٹی)

ادبی دنیا جیسا بلند پایہ رسالہ شائع کرکے آپ نے لاہور کو قاہرہ (مصر) بنا دیا ہے۔

پروفیسر امرناتھ جہا۔ پروفیسر ادب انگریزی الٰہ آباد یونیورسٹی

میں نے "ادبی دنیا" کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہ رسالہ اردو صحافت میں ایک بلند حیثیت حاصل کرے گا۔ امید ہے کہ آپ آئندہ اشاعتوں میں بھی یہی معیار قائم رکھیں گے:

جناب مولوی سیّد مقبول احمد صاحب صمدانی (مصنف "وضاحتِ انیا و موحیاتِ جلیل" وغیرہ)

"ادبی دنیا" کے پانچوں پرچے میں نے کامل توجہ اور امعان نظر سے دیکھے۔ ہر پرچہ اپنے ماسبق سے بڑھا اور زیادہ دلکش پایا۔ رسالہ کی جامعیت اور تنوع مضامین میں شبہ نہیں۔ میں خوش ہوں اور خوش قسمت کہ ایسے اچھے اور مفید رسالہ کا پورا فائل میرے پاس موجود ہے:

شیخ رشید احمد صاحب ایم۔ اے (لنڈن یونیورسٹی) مقیم انگلستان

رسالہ "ادبی دنیا" میری نظر سے گذرا۔ مضامین اعلیٰ۔ تصاویر دلکش۔ سرورق منقش غرضیکہ سرتاپا خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ تصاویر کو چند اصحاب نے (لنڈن میں) بہت پسند کیا ہے۔ مزید برآں قریباً تمام مروجہ علوم میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اور ہر مذاق کے لئے سامان تفریح مہیا کیا گیا ہے مجھے امید ہے کہ محکمہ تعلیم ضرور اس کی سرپرستی کرے گا:

مسٹر من موہن صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ ڈویژنل انسپکٹر مدارس جالندھر ڈویژن

ادبی دنیا کے متعلق میری رائے نہایت عمدہ ہے یہ ایک اعلیٰ درجہ کا اردو رسالہ ہے۔

رائے بہادر مسٹر آتمارام صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس راولپنڈی ڈویژن

ادبی دنیا صورت شکل میں نہائت دلکش اور دلفریب مضامین سے پُر ہے۔ میں نے کبھی اتنا سستا اور دلفریب رسالہ نہیں دیکھا۔ میری رائے میں ورنیکلر استادوں اور طالب علموں کے لئے یہ نہایت ہی فائدہ مند ہوگا:

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس ڈویژنل انسپکٹر مدارس۔ لاہور ڈویژن

ادبی دنیا ملک کے مشہور ادیب مولینا تاجور کی ادارت میں نکلتا ہے۔ مولینا کی شخصیت اس کے بہترین ہونے کی ضمانت ہے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ ان بہترین رسالوں میں سے ہے۔ جو میں نے آجتک دیکھے ہیں۔ سب سے بڑی بات اس کی یہ ہے کہ یہ بہت سستا ہے۔ ملک کے مشہور انگریزی اور دیسی اخبارات نے اس کا شاندار طور پر خیر مقدم کیا ہے۔ میں ہائی اسکولوں، مڈل اسکولوں اور دیہاتی لائبریریوں کے لئے اس رسالے کی خریداری کی بڑے زور سے سفارش کرتا ہوں۔

سیّد اکبر حسین صاحب عزیز رضوی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ کوئٹہ۔ بلوچستان:-

بدقسمتی سے ہندوستان میں ایسی اردو اچھی خیال کیجاتی ہے۔ جسمیں عربی۔ فارسی۔ اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت موجود ہوں۔ لیکن "ادبی دنیا" نے جس مخصوص پروگرام پر زیر ادارت علامہ تاجور عمل کرنا شروع کیا ہے۔ اس سے امید کیجا سکتی ہے۔ کہ زمانہ قریب ہی میں اردو زبان ایک نئے دور میں ہوگی۔ اور وہی انشاپرداز ممتاز گنے جائینگے۔ جو اس نئے تاجور سٹائل (Tajwar style) میں لکھا کریں گے۔

حال و قال

ادبی دنیا کا یہ چھٹا نمبر شائع ہو رہا ہے پہلی جلد اس پر ختم ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن ہم دسمبر کا پرچہ ملا کر پہلی جلد آٹھ نمبروں کی بنانا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ ہر جلد حساب سے جنوری سے شروع ہو کر جون پر اور جولائی سے شروع ہو کر دسمبر پر ختم ہو جایا کرے۔

پرچہ نہ پہونچنے کی شکائتیں اب کم ہو چلی ہیں۔ کیونکہ ہم نے ہر پرچہ پر لکھوا دیا ہے کہ ہر پرچہ کا پوسٹل سرٹیفکٹ لے لیا گیا ہے۔ ادہر ڈاکخانے کی اُن رسیدوں کا الگ فائل دفتر میں موجود رہتا ہے۔ اب جن صاحب کو پرچہ نہ پہنچے ہم اُن کے نام کی رسید جو ہم نے ڈاکخانے کو زائد محصول دیکر حاصل کی ہے بھیجدینگے۔

مقررہ محصول ڈاک کے علاوہ زائد محصول دیکر ہر خریدار کے نام کی رسید حاصل کرنے میں اگرچہ دفتر پر زیادہ خرچ پڑ رہا ہے مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اب کم سے کم ہم اپنے ناظرین کی بدگمانیوں کا شکار ہونے سے تو بچ جائیں گے۔ ادبی دنیا کے ہر خریدار کو یقین کر لینا چاہئے کہ اب اگر کسی کو رسالہ نہ پہنچا تو اس کی ذمہ داری دفتر ادبی دنیا پر نہ ہوگی۔ کیونکہ دفتر سے کوئی پرچہ زائد محصول ادا کرکے رسید لئے بغیر روانہ نہیں کیا جاتا۔ اب کوئی پرچہ کسی کا گم ہُوا تو صرف اسوجہ سے گم ہوگا کہ اس خریدار کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہے۔

اب ہر خریدار کو پرچہ نہ پہنچنے کی صورت میں (۱) اپنے حلقے کے چٹھی رساں اور مقامی ڈاکخانے سے باز پرس کرنی چاہئے۔

(۲) اپنے بے تکلف دوستوں، گھر کے بے پروا ملازموں اور آس پاس کے مفت گیروں پر نگرانی رکھنی چاہئے۔

(۳) بعض حضرات کے پرچہ وصول کرنے کے بعد گم کرنے کی صورت میں دوبارہ مطالبے یاددوفائل رکھنے کی کوشش کا بار دفتر نہیں اُٹھا سکیگا۔

آئندہ کسی خریدار کے پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت آنے پر ہم صرف اتنا کر سکینگے کہ ایک آنے کے لفافے میں اُن کے نام کی وہ رسید جو دفتر نے الگ محصول دیکر حاصل کی ہے اُنہیں بھیجدیں۔ دوبارہ پرچہ آٹھ آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر بھیجا جا سکے گا۔

حضرات اہل قلم ادبی دنیا کے لئے مضمون لکھتے وقت اگر صفحہ کاغذ کے نصف حصے پر مضمون لکھا کریں۔ اور نصف حصہ خالی چھوڑ دیا کریں۔ تو ایڈیٹوریل سٹاف کو ترتیب مضامین میں بہت سہولت ہو جائے۔

نوجوانوں میں مذاق ادبی کی اصلاح، اور اُسے ترقی دینے کی غرض سے ہم اس اصول پر سختی سے کاربند ہیں۔ کہ پست درجے کا کوئی مضمون یا متانت سے گری ہوئی کوئی نظم ادبی دنیا میں شایع نہ کی جائے۔ اِس اُصول کو نبا ہنے کیلئے ہمیں بعض اوقات اپنے مضمون نگاروں کو ناراض کر لینا پڑتا ہے۔ تازہ آئی ہوئی اردو نظموں یا غزلوں میں جب کوئی نظم یا غزل ہمیں اپنے معیار کے مطابق نہیں ملتی تو ہم اردو لٹریچر کی چھان پھٹک کرکے بلند درجے کی نظمیں انتخاب کے بعد شایع کر دیتے ہیں۔ اور اس بارے میں اپنے مہربانوں کی اس طعن و تشنیع کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ کہ ادبی دنیا میں شایع شدہ نظمیں بھی درج کر دیجاتی ہیں۔ کیونکہ ہم تازہ مگر خام اور بے نتیجہ نظموں کی اشاعت کی بہ نسبت پرچے کو بے لفظوں کے شایع کرنا یا اُس میں منتخب بلند پایہ مطبوعہ نظمیں شائع کرنا ہزار درجے بہتر سمجھتے ہیں۔

ادبی دنیا کی زبان پہلے نمبر میں اپنا ادبی پروگرام بتاتے ہوئے ہم نے جہاں اس مقصد کا ذکر کیا تھا کہ ہم ادبی دنیا کے ذریعے ہندوستان کے لئے ایک آسان تصنیفی زبان پیدا کرنا چاہتے ہیں وہیں اس عجز کا بھی کھلے لفظوں میں اعتراف کر لیا تھا کہ شروع شروع میں یہ نئی زبان بولتے ہوئے ہمارا قلم بھی تُتلائیگا۔ لیکن کب تک تتلائے گا۔ بولتے بولتے ایک دن صاف بولنا بھی سیکھ جائیگا۔

اُس وقت سے لیکر آج تک ہم برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خود بھی جو کچھ لکھیں آسان زبان میں لکھیں اور اپنے دوسرے اہل قلم کو بھی سادہ زبان میں لکھنے کے لئے آمادہ کریں۔

ادبی دنیا کے ہر نمبر کے مضامین کا مسودہ دیکھنے سے اسکی تصدیق ہو سکتی ہے کہ اس پہلو میں ہماری کوششیں کس حد تک پہنچ چکی ہیں۔ اصلی مسودات قطع و برید اور ترمیم و تبدیلی کی کثرت سے ایسے ہو جاتے ہیں۔ کہ اُن کا پڑھنا دشوار بنجاتا ہے۔ ہم نے اسٹاف کے ایک رُکن کو صرف اسی کام پر لگا رکھا ہے کہ وہ مضامین کی مشکل زبان کو عام فہم بنا دیا کریں۔

لیکن اس پہلو میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں -

(۱) مشہور اہل قلم اپنے مضامین میں خفیف سی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کرتے حتیٰ کہ بعض اچھے مضامین صرف اس لئے واپس کرنے پڑے کہ ہم اُن میں ایک آدھ لفظ کی تبدیلی چاہتے تھے - اور صاحب مضمون نے اس معمولی ترمیم کو بھی برداشت نہیں کیا -

(۲) ہر مضمون کی زبان اس مضمون کی حیثیت کے مطابق آسان کیجاتی ہے - بہت ممکن ہے کہ آسان زبان میں لکھے ہوئے ایک مضمون سے ہم چشم صہبا فروش کے لفظ کو مست آنکھ سے بدل دیں لیکن ایک مشکل زبان کے مضمون میں اس سے کہیں زیادہ دشوار فہم الفاظ کی کثرت کو کم کرتے ہوئے اس لفظ کو اسی طرح چھوڑ جائیں -

سارے مضامین میں زبان کی یکسانیت پیدا کرنا ابھی ہمارے بس کی بات نہیں ہے - اس کے علاوہ آسان تصنیفی زبان رائج کرنا ہمارا مقصد ہے - دعوےٰ نہیں ہے - یہ پروگرام ختم نہیں ہوچکا - شروع ہوا ہے -

ہاں اس سلسلے میں خدا کا نام لے کر ہم اس واقعیت کا اظہار کرنے کے مجاز ہیں کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں ادبی دنیا کے مضامین کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہوتی ہے -

---

دنیائے ادب "ادبی دنیا" کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی ہے :-

"مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مرقع"

جیساکہ پہلے نمبر میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ہم "ادبی دنیا" میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات سے مفید اور بلند مضامین اور اُن کے جستہ جستہ حصّوں کا ترجمہ شایع کیا کرینگے تاکہ اردو خوان دنیا دوسری زبانوں کے لٹریچر اور اس کی گوناگون خوبیوں سے فائدہ اٹھائے اور اردو ادب میں دلچسپیوں کا اضافہ ہو - اس اعلان کے مطابق ہمارا ہر نمبر مشرق و مغرب اور ہندوستان کی مشہور زبانوں کے بلند اور سیر حاصل مضامین کے ترجموں سے مالامال ہوتا ہے -

رسالے کے اخیر میں ہم تنوع کو پیش نظر رکھکر مختلف زبانوں کے مضامین سے چیدہ چیدہ حصّوں کا ترجمہ "دنیائے ادب" کی سرخی کے تحت بھی اس لئے شایع کردیا کرتے ہیں - کہ لمبے لمبے مضامین پڑھنے سے جو حضرات کتراتے ہیں اُن کے لئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا دینگے - رسالے کے اس حصّے کو ناظرین ادبی دنیا نے بہت ہی پسند کیا ہے - اس کے علاوہ کئی مشہور اہل قلم نے اپنی رایوں میں اس حصّے کو مفید اور دلچسپ بتایا ہے - بعض شعرا نے اس حصّے میں درج کئے ہوئے خیالات کو اردو میں نظم کردیا ہے -

ادبی دنیا کا یہ حصّہ درحقیقت دنیا کی مشہور زبانوں کے مشہور اہل قلم کے زرین خیالات کا آئینہ ہوتا ہے - اس حصے کو پڑھ کر ہم دوسری زبانوں کے بلند خیالات اور ترقی یافتہ ادبیات کا رجحان معلوم کرسکتے ہیں

ادبی دنیا کے ہزاروں ناظرین نے اسے پسند کیا ہے، ملک کے بلند پایہ اخبارات اور مستند اہل قلم نے اس پر اظہار تحسین کیا ہے اسلئے ہم اس حصّے کے خلاف اُن معاصرین کی رائے پر کاربند نہیں ہوسکتے جو اپنی پسند کو ساری دنیا کی پسند کا نمائندہ تصور کئے ہوئے ہیں -

سالنامہ ادبی دنیا کے سالنامے کی ترتیب کے متعلق بڑی سرگرمی سے کام ہو رہا ہے - سَو صفحات کی کتابت بھی ہوچکی ہے - ہندوستان کے مشہور اہل قلم کے مضامین برابر وصول ہو رہے ہیں - تصاویر اور مضامین کی فراہمی کے لئے عملۂ ادارۃ میں سے حضرت عشرت رحمانی ملک کے ادبی مرکزوں میں دورہ بھی کرچکے ہیں - راقم حروف پنجاب، یوپی، بنگال وغیرہ کا طویل دورہ کرکے اسی ہفتے واپس آیا ہے - مختصر یہ کہ ادبی دنیا کے خاص نمبر کو شاندار اور کامیاب بنانے کی کوششیں جاری ہیں - مضامین اور تصاویر کی مطلوبہ تعداد جو ادبی دنیا کے خاص نمبر کے لئے ضروری ہے - جب فراہم ہوجائیگی اُسی وقت ہم تاریخ اشاعت کا اعلان کردیں گے - خریداران ادبی دنیا میں سے جو حضرات اس نمبر کو خریدنا چاہیں اپنا نام جلد سے جلد درج رجسٹر کرالیں - کیونکہ اُنہیں حضرات کو یہ نمبر بھیجا جاسکیگا جن کا نام پہلے سے درج رجسٹر ہوچکا ہوگا - یہ نمبر ہر خریدار کو بذریعہ رجسٹری بھیجا جائیگا - خریداران ادبی دنیا سے ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک لیا جائے گا -

تاجور

آئینۂ عالم

پنجاب کی تعلیمی رفتار

پنجاب کی تعلیمی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانہ کی بہ نسبت پچھلے چند سال میں صوبے کی تعلیم پر بہت زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے اور اس نسبت سے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

ذیل کے نقشے سے مذکورہ بالا تعلیمی رفتار کا اندازہ ہو سکے گا۔

سال	تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد	اخراجات
۱۹۱۵-۱۶ء	۴۰۲۹۵۳	۱۱۲۱۶۷۶۵
۱۹۲۰-۲۱ء	۵۰۰۸۳۷	۱۸۴۰۶۴۴۴
۱۹۲۳-۲۴ء	۷۵۵۸۰۶	۲۱۵۵۳۱۷۵
۱۹۲۶-۲۷ء	۱۰۸۹۰۸۶	۲۸۷۶۵۷۹۳

اسکولوں اور کالجوں کی تعداد

سال	کالج	سکنڈری اسکول	پرائمری اسکول
۱۹۱۵ء	۱۷	۶۸۴	۵۶۷۹
۱۹۲۰ء	۲۷	۱۰۷۵	۶۳۸۶
۱۹۲۴ء	۳۱	۱۷۵۸	۶۶۰۱
۱۹۲۶ء	۲۸	۲۷۴۷	۷۱۴۴

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے تعلیمی ترقی کی یہ رفتار غنیمت ہے اور صوبے کے انسپکٹران مدارس کی کوششیں اس پہلو میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

ابتدائی تعلیم صوبے کے طول و عرض کے مقابلہ میں اگرچہ بہت ناکافی ہے۔ تاہم جنگ عظیم سے پہلے کی بہ نسبت اس تعلیم نے تیز رفتاری کی بجائے تیز پروازی اختیار کر لی ہے۔ ثانوی (سکنڈری) تعلیم بھی وسعت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ مگر کالجوں کی موجودہ تعداد صوبے کی ضروریات کو قطعاً پورا نہیں کر سکتی۔ اگرچہ چند ضلعوں میں انٹرمیڈیٹ کالج جاری کئے گئے ہیں۔ مگر یہ تعداد کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ضلع میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج کھولا جائے۔ اور ہر ڈویژن میں ایک اوّل درجے کا کالج موجود ہو جس میں ایم۔ اے تک تعلیم دی جا سکے پنجاب کونسل کے ممبر پنجاب کی تعلیمی ضرورتوں کا احساس کریں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

ہمارا موجودہ طریقۂ تعلیم ملک کی سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے طریقۂ تعلیم کو تبدیل کریں۔ موجودہ تعلیم ہمارے ملک کے نونہالوں کو دفتر کی کلرکی کے سوا ہر ہنر سے محروم بنا رہی ہے۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں نوجوان انٹرنس۔ ایف۔ اے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کر کر کے نکل رہے ہیں۔ لیکن ان تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملک کے بیکاروں بلکہ ناکاروں میں ہیبتناک اضافہ ہو رہا ہے۔ پڑھے لکھے کسانوں اور کاریگروں کی بجائے ملک میں تعلیم یافتہ غلاموں۔ خدمت گاروں۔ کلرکوں اور انجام کار تعلیم یافتہ مجرموں کی تعداد بے تحاشا بڑھ رہی ہے۔ زندہ قوموں میں تعلیم ختم کرنے کے بعد راحت و آرام کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے بدنصیب ملک میں تعلیم حاصل کر کے ایک ناکام تلخ اور دردناک زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

یہاں اور وہاں تعلیم کے یہ متضاد نتیجے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم نہایت ناقص اور ملکی حالات کے قطعی غیر مطابق ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں ملک کی ضرورتوں کے مناسب تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان ہمارے ملک کیلئے بے کار ہی نہیں بلکہ ایک وبال بنے ہوئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ حکومت اپنی تعلیمی پالیسی کو بدلے اور ملک کے رہنما حکومت کے ساتھ مل کر موجودہ طریقۂ تعلیم کی بجائے کوئی کارآمد مفید اور ہندوستانی ضروریات کے مناسب تعلیمی اسکیم تیار کریں۔ یہ ضرورت ملک کی تمام ضرورتوں سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ اس کی جانب پہلے کی طرح اگر بے نیازی برتی گئی تو ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

یورپ میں اہل علم کی قدر شناسی

انگلستان کے مشہور طبیب ڈاکٹر سر رونالڈ روس نے پچھلے دنوں اپنی علمی تصانیف و طبی تحقیقات کو بیچنے کا اعلان کیا تھا۔ اس اعلان کی ضرورت انہیں اس لئے پیش آئی کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کی جانب سے

مطلق نہ تھے یہ وہی رینالڈ روس ہیں جنہوں نے وبائے ملیریا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینے کے متعلق حیرت انگیز طریقے دریافت کئے ہیں اور جنہیں طبی تحقیقات کے سلسلے میں سنہ ۱۹۰۲ء میں نوبل پرائز مل چکا ہے۔

انگلستان کی علم دوست پبلک پر اس اعلان کا بہت اثر ہوا اور اُس نے قدر شناسی کے طور پر پچاس ہزار پونڈ کی کثیر رقم ڈاکٹر صاحب کو پیش کر کے اُنہیں علم فروشی کی ننگ سے بچا لیا۔ اس واقعہ کے بعد سے یورپ اور امریکہ کی پبلک میں یہ مطالبہ پیدا ہو رہا ہے کہ ملک کے اہل علم کو ضروریات زندگی کیلئے حکومت کے خزانے سے امداد دی جایا کرے تاکہ وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر علمی تحقیقات میں مشغول رہ سکیں۔ یہ ہے زندہ قوموں کی علم دوستی کی داستان۔

مغرب میں اوّل تو کسی اہل علم کو تنگدستی اور ناداری سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ کیونکہ اُسے اپنی تصنیفات سے اس قدر آمدنی حاصل ہو جاتی ہے کہ اطمینان و راحت کی زندگی بسر کر سکے۔ اور اگر شاذ و نادر کہیں کسی کو مالی مشکلات پیش بھی آجائیں تو پبلک اور حکومت دونوں اُسے اُس مصیبت سے نجات دلانے میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن مشرق میں عموماً فقر و فاقہ علم کی خصوصیات میں داخل ہو گیا ہے۔ مشرق کے اہل علم کو اپنی علمی زندگی کی ابتدا سے زندگی کے انجام تک تنگ حالی اور فاقہ مستی سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

امریکہ کا ایک کامیاب اخبار نویس

نیویارک ٹائمز کا مالک مسٹر اوکس اس وقت دنیا کا کامیاب ترین اخبار نویس شمار ہوتا ہے۔ اس کا باپ ایک مفلس مزدور تھا۔ اوکس کی ابتدائی زندگی بھی تنگ دستی اور افلاس ہی میں بسر ہوئی۔ اسی ناداری میں اُس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ دن بھر مزدوری کرتا۔ اور رات کو کبھی نائٹ اسکول میں جا کر تعلیم حاصل کرتا۔ صبح سویرے اُٹھ کر صبح کے تازہ اخبار بیچا کرتا اور اس سے جو آمدنی ہوتی اُسے بچا کر رکھتا۔ باقی دن بھر محنت مشقت کر کے جو مزدوری ملتی اُس سے اپنے اور اپنے گھر والوں کی بسر اوقات کرتا رہا۔ اخبار فروشی کی آمدنی جمع ہوتے ہوتے جب ایک معقول رقم بن گئی تو اوکس اخبار نویسی کے ایک اسکول میں جرنلزم کی تعلیم حاصل کرنے داخل ہو گیا۔ اس تعلیم کے دوران میں بھی اُس کے پاس جو وقت بچا اُسے محنت مزدوری میں گذارتا رہا۔

اخبار نویسی کی تعلیم سے فراغت پا کر اُس نے ایک اخبار کے دفتر میں پروف ریڈری کی ملازمت کر لی۔ اور اس ملازمت سے ترقی کرتے کرتے وہ اس اخبار کے عملۂ ادارۃ (ایڈیٹوریل سٹاف) میں داخل کر لیا گیا۔ اس ابتدا کی انتہا یہ ہے کہ ایک دن وہ اُس اخبار کا مالک بن گیا۔ اس کے بعد اُس نے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز خرید لیا اور رات دن ایک مزدور کی طرح اس اخبار کو دلچسپ بنانے میں لگا رہا۔ نیویارک ٹائمز پر اُس نے بے شمار روپیہ صرف کیا۔ اُسی محنت اور کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اہل امریکہ نیویارک ٹائمز کو سب اخباروں سے زیادہ محبوب سمجھنے لگے ہیں۔ مسٹر اوکس نے اس اخبار کو کامیاب بنانے کی کوئی تدبیر نہیں چھوڑی۔

نیویارک ٹائمز پہلا اخبار ہے جس نے زر کثیر صرف کر کے ریڈیو گراف کے ذریعہ دُنیا کی خبریں حاصل کیں۔ سب سے زیادہ اور سب سے پہلے تازہ خبریں نیویارک ٹائمز میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ مسٹر لینن کے ایک خطبۂ صدارت کو سب سے پہلے شائع کرنے پر اُسے پندرہ ہزار پونڈ صرف کرنے پڑے۔

اب یہ اخبار دنیا کے بڑے بڑے کامیاب اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ گذشتہ تیس سال کی اس اخبار کی مجموعی آمدنی کا اندازہ پندرہ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ لیکن پچھلے سال سے نیویارک ٹائمز نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اور ایک ہی سال میں اس اخبار کے ذریعہ مسٹر اوکس کو بیس لاکھ گنی کا منافعہ ہوا۔

زندہ قوموں کی ترقی کے واقعات ہمارے ملک میں پہونچ کر کہانیوں کی طرح عجیب بنجاتے ہیں۔ یہاں اوّل تو اخبار فروش کا اخبار نویس بننا ہی عجائبات میں سمجھا جائیگا۔ لیکن کسی بدنصیب کو یہ معراج حاصل بھی ہو گئی تو اس ترقی پر اُسے ہمیشہ پچھتانا پڑیگا۔ اُسے شاید زندگی بھر کبھی یہ دن نصیب نہ ہوگا۔ کہ اپنی ایڈیٹری کی تنخواہ کو اپنے اخبار کے کاتب کی اجرت یا زمانۂ اخبار فروشی کی بچت کی برابر کر سکے۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ایک مفید تجویز

نارتھ ویسٹرن ریلوے نے ہندوستانی سیاحوں کے لئے شمالی ہند سے عراق تک ایک تاریخی سیر کا انتظام کیا ہے۔ وسط ایشیا کے مشہور تاریخی مقامات بصرہ۔ بغداد۔ بابل۔ اُر۔ کاظمین۔ کربلا۔ اور عراق کے دوسرے اہم حصّوں کی سیر مجوزہ پروگرام میں داخل ہے۔ یہ تجویز نہایت موزوں۔ دلچسپ اور ایک علمی تجویز ہے۔

پنجاب یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم کو اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اُن طلبہ اور اُن استادوں کے لئے جو تاریخ اور جغرافیہ سے دلبستگی رکھتے ہیں سفری سہولتیں بہم پہونچانی چاہئیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھکر ایک خیالی نقشہ دماغ میں کھینچنے کی بجائے آنکھوں سے اُن مقامات کو دیکھنا تعلیمی پہلو سے بہت زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں ڈاکٹر روس کی سفری یونیورسٹی انہیں اصول پر اپنے طالبعلموں اور پروفیسروں کو دنیا کے ہر حصے کی سیر کرا رہی ہے اور اس تعلیمی سیر کا طلبہ کی تعلیمی ترقی پر بہت اچھا اثر پڑ رہا ہے۔

تاجور

صفحۂ تصاویر

خواب کی پریاں

اپالو دیوتا کی بزم نشاط ختم ہو چکی اور وہ اپنی خوابگاہ (سمندر) میں داخل ہوگیا - اس کی بزم نشاط میں حصہ لینے والی ساری دنیا تکان سے چور ہو رہی تھی- خواب کی پریاں جنہیں اپالو کے بزم میں شرکت کی اجازت نہیں - صبح ہی آسمان پر چلی گئی تھیں اب شام ہوتے ہی زمین پہ اُتر آئی ہیں - اور اپنے بربط کے رنگین نغموں سے ساری دنیا کو مسحور کر لیا ہے - ہر چیز پر محویت طاری ہے- اور کسی کو کسی کی خبر نہیں - سمندر اپنی لہروں سے اپنی بیداری کا ثبوت دینا چاہتا ہے - مگر اس کا جل ترنگ بھی بربط کے مسحور کرنے والے نغموں میں گُم ہو کر رہ جاتا ہے - لالہزار کے آتشین پھول بادۂ شبنم نوش کرنا چاہتے ہیں مگر نغمے کی سرمستی انہیں بھی اُس کی اجازت نہیں دیتی اور شبنم کے قطرے اُن کے لبوں پر جم کر رہ جاتے ہیں - ایک مطالعہ کی شوقین حسینہ کتاب لیکر بیٹھتی ہے مگر خواب کی پریوں کا خواب آلود ترنم اُسے اپنے زیر اثر کر لیتا ہے- کتاب کُھلی کی کُھلی رہ جاتی ہے اور وہ نیند میں کھو جاتی ہے -

اسپارٹا کے کمزور بچّے

قدیم یونان کی ایک ریاست اسپارٹا میں ایک قانون رائج تھا جسکی رو سے ہر سال ایک بار ملک بھر کے بچے خاص ججوں کے سامنے پیش کئے جاتے- جو بچّے انہیں کمزور و ناتوان معلوم ہوتے انہیں وہ مقررہ تعداد میں کوڑے لگانیکا حکم دیتے - بہت سے معصوم اسی طرح کوڑے کھا کر جان دیدیتے- جو سخت جان بچ جاتے انہیں سمجھا جاتا کہ یہ اس قابل ہیں کہ ملک پر بار نہ نہیں اور اسپارٹا کی ترقی میں قوم کا ہاتھ بٹا سکیں۔

اسپارٹا والوں کے اس وحشیانہ قانون اور اپنے ملک کو صرف شہ زوروں کا مسکن بنانے کے خبط نے اپنے ہی لاکھوں نونہالوں کو اس بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا - پھر بھی آج نہ اسپارٹا باقی ہے نہ ان کی ظالم حکومت - ہاں اُن کے ظلم و جور کا یہ مرقع تاریخ کے صفحات میں اب بھی موجود ہے -

بدقسمت سلطانہ

ایک زمانہ تھا کہ سلاطین عثمانیہ دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے فرمانروا تھے - ان کی بخششوں نے لاکھوں آدمیوں کو لکھپتی بنا دیا تھا مگر آج اسی خاندان کی ایک ملکہ کو پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانپنے کے لائق کپڑا نہیں نصیب ہوتا -

خلیفۂ سلطان وحیدالدین جنکو انور پاشا اور مصطفےٰ کمال پاشا کی انجمن اتحاد و ترقی کی سرگرمیوں کی وجہ سے تخت سے دستبردار ہو جانا پڑا تھا جب تک زندہ رہے وطن سے دُور غریبی کی زندگی میں بھی کسی طرح اپنے لواحقین کو سنبھالتے رہے - مگر ان کی وفات کے بعد ان کے وظیفے کی آمدنی بند ہوگئی تو ان کی بیگموں کا خرچ چلنا مشکل ہوگیا - ان کی ایک بیوہ جن کی یہ تصویر ہے فکرِ معاش میں قاہرہ (مصر) چلی گئیں اور دوسری کوئی سبیل نہ نکلنے پر ایک تھیئٹر میں بطور ایکٹرس کے نوکر ہو گئیں - لیکن کہاں ایک سلطانہ اور کہاں ایک ایکٹرس! آخر یہ کام اُن سے نہ ہو سکا اور انہوں نے زندگی سے عاجز آ کر خودکشی کر لینی چاہی - مگر وقت پر بچا لی گئیں اور اب مصر کی مشہور ہمدرد خواتین ہدیٰ خانم شعراوی کے محتاج خانے میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں

ملکہ رومانیہ "باسل نے کیا دیکھا" کے عنوان سے ملکہ کا جو افسانہ اس نمبر میں شریک اشاعت ہے اس کے حرف حرف سے حب وطن کا جذبہ ٹپک رہا ہے - ہم نے تصویر بھی ایسی ہی مہیا کی ہے - جس میں ملکہ اپنے وطنی لباس میں جلوہ افروز ہیں -

خدیو مصر شاہ فواد مصر کے موجودہ فرنروا شاہ احمد فواد کو علم و ادب سے جو عشق ہے اس کے اندازہ کیلئے اسی اشاعت میں جامعہ مصریہ پر علامہ تاجور کا مضمون پڑھیئے -

سیّد احمد لطفی بک آپ پہلے مصر کے ایک مشہور اخبار نویس گنے جاتے تھے - مگر اب مدتوں سے اپنی خدمات جامعہ مصریہ کیلئے وقف کر چکے ہیں -

علی سمشی پاشا آپ حکومت مصر کے وزیر تعلیم ہیں - جامعہ مصریہ کا جدید دستور العمل آپ ہی نے تیار کیا ہے -

مصر کا علمی دیوتا قدیم اہل مصر علم کے دیوتا کی شکل ہُدہُد جیسی یا اس تصویر جیسی بناتے تھے جو شائع کی جا رہی ہے -

جامعہ مصریہ کا مجوزہ خاکہ مصر کی جدید یونیورسٹی کی تعمیر اس خاکے کے مطابق عمل میں آ رہی ہے -

ص ....

خواب کی پریاں

مغرب سے طلوعِ دلکشی ہے (۱) اک موجِ نشاط آ رہی ہے | فطرت کو وہ سُلا رہی ہیں نیندوں کے گیت گا رہی ہیں
دامانِ افق ہوا حمریں رنگ یا کوئی نگارِ آتشیں رنگ | شیریں و سحر کار نغمے رنگین و زر نگار نغمے
کرنوں کی زر نگاریوں سے تنویر کی سحر کاریوں سے | خاموش سی ہو گئیں فضائیں مدہوش سی ہو گئیں ہوائیں
لالہ ایسے دمک رہا ہے گویا شعلہ بھڑک رہا ہے | پھولوں نے سر جھکا لیا ہے غنچوں نے منہ چھپا لیا ہے
دریاؤں کی بیقرار لہریں شفاف گہر نگار لہریں | تاروں کا رقص تھم گیا ہے پانی دریا میں جم گیا ہے
کرتی ہیں رقص والہانہ گاتی ہیں نشاط کا ترانہ | خاموش ہے کائنات ساری اک نغمۂ جانفزا ہے جاری
اُتری ہیں فرازِ آسماں سے فردوس کی بزمِ گلفشاں سے | مستی سی چھائی جا رہی ہے (۲) فطرت کو نیند آ رہی ہے
دو خواب کی پریاں یاسمن پوش فردوس نگاہ جنّت آغوش | صحن گلزار کی فضا میں اس جوشِ بہار کی فضا میں
آنکھوں میں بہار کے فسانے نغموں میں شباب کے ترانے | خوابیدہ ہے اک بہشت پیکر خوشبوئے شباب سے معطّر
خوشبو بالوں کی فتنہ انگیز شاداب جنوں فزا جنوں خیز | چہرہ ماہِ مبیں سے روشن عالم اُسکی جبیں سے روشن
ہاتھوں میں سازِ نغمہ انگیز گلزار طراز نغمہ انگیز | تارے اُسکی ضیا سے لرزاں جیسے پتّے ہوا سے لرزاں
تجسیم جمال ہیں وہ دونوں تصویرِ خیال ہیں وہ دونوں | پریوں کے سازِ گلفشاں نے نغموں کی موجِ ارغواں نے
دو عرشِ ضیا کے ماہ پارے دو صبح بہار کے ستارے | اُس پر جادو سا کر دیا ہے آنکھوں میں کیف بھر دیا ہے
دنیا سے وہ جدا ہوا اسوقت | محوِ خوابِ وفا ہے اسوقت

عابد

غور و فکر کا فن

ایک وقت تھا کہ قوم کے قوم کی فتح و شکست رستم و سہراب کی فتح و شکست کے ساتھ وابستہ تھی - ایک وقت تھا کہ سارے عرب کی موت و حیات شیر خدا اور سیف اللہ کی خدائی تلوار میں لپٹی ہوئی تھی ایک وقت تھا کہ ارجن اور بھیم بڑی سے بڑی سلطنت کا تختہ الٹ دیسکتے تھے لیکن وہ وقت گزر گیا - اب تو دنیا کا سب سے بڑا شہ زور، ہندوستان کا نامی پہلوان رستم زماں گاماں دس ہزار ازبسکو کو ہزار بار چت کر دے تب بھی انگلستان کی برتری ہم پر جوں کی توں ہی باقی رہیگی - ۵۷ء میں ہم نے لاٹھی کے زور سے بھینس پر قبضہ جمانا چاہا تھا لیکن نتیجہ کیا ہوا بھینس کے پیچھے لاٹھی بھی کھو بیٹھے اب پھر ہمارے نوجوانوں کی ایک جماعت "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا خواب دیکھ رہی ہے اور صرف اپنی قوت فکر کی گمراہی اور اپنے سوچ بچار کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے ہماری قومی زندگی کے بہترین لمحے "آزمودہ را آزمودن" میں برباد ہو رہے ہیں - حالانکہ اب قومی زندگی کی تگ و دو میں نہ بلراج کے بم کام آسکتے ہیں - نہ گاما کے پیچ کچھ کر سکتے ہیں - نہ خان کی بندوق کام دیسکتی ہے - نہ سورج بنس کی تلوار ہی سے کچھ ہو سکتا ہے - یہ علی غول کے لشکر، یہ مہا بیر دل کے جتھے سب کے سب فضول اور اسوقت تک بالکل بیکار ہیں جب تک ہم میں سوچنے والوں کی کمی ہے - غور و فکر کرنیوالوں کا قحط ہے - اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے والوں کا کال ہے - آجکل جب دو سلطنتیں کسی اختلافی مسئلہ پر گفتگو شروع کرتی ہیں - اور جھگڑا چکانے کیواسطے ہر ایک اپنا نمائندہ مقرر کرتی ہے تو یہ نمائندے آپس میں دنگل کے دو مقابل جوڑ کی طرح ہوتے ہیں مگر ان پہلوانوں میں جسمانی کشتی نہیں ہوتی - بلکہ دماغ سے دماغ لڑایا جاتا ہے اور آخر فتح اسی کی ہوتی ہے جس کا دماغ اعلیٰ اور قوت فکر خوب پرورش یافتہ ہو - اور سوچ سمجھ کر نتیجہ نکالنے میں اپنے مقابل سے بڑھ جائے - ایک وقت آنے والا ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بساط بچھیگی اور بازی یقینی طور پر ایسکی ہوگی جس کے شاطر شہ پر شہ دینے کی پوری مہارت رکھتے ہوں اور یہ کھیل اپنے مقابل سے کہیں زیادہ سوچ سمجھکر کھیل سکیں - مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انگلستان کی فوجی قوت ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی یا اپنی بنئے پن کو ہم بھول گئے ہیں - لیکن ہمکو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے گذشتہ جنگ عظیم میں کسی بڑی سے بڑی حکومت کو بھی اپنی قوت پر اتنا بھروسہ نہیں تھا جتنا پروپگنڈے پر - ہر سلطنت نے پروپگنڈے پر کروڑوں پونڈ پانی کیطرح بہا دیا - اب آپ ہی بتائیے کہ پروپگنڈے کو قوت فکر کی جنگ کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے -

بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہم ایسے زمانے میں زندگی گذار رہے ہیں جس میں دوسرے زمانے کی بہ نسبت بہت زیادہ غور و فکر اور بڑے سوچ بچار کی ضرورت ہے اور یہ صرف اس لئے نہیں کہ یہ زمانہ قسم قسم کی ایجادوں اور نئی نئی دریافتوں کا زمانہ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس زمانے میں ہمارے قومی اور معاشرتی مسائل کی تعداد حد سے زیادہ ہوگئی ہے اور دوسری قوموں سے مقابلہ پڑنے کی وجہ سے ہمیں اتنی گتھیاں پڑ گئی ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی خاص قابلیت کے بغیر ان کا سلجھانا غیر ممکن ہے - اُدھر فطرت ہے کہ اپنے سارے خزانے ہمارے ہی سامنے اُگل دینا چاہتی ہے - ادھر دنیا ہے کہ اپنی ترقی کی ساری نمائش نصف صدی سے کم ہی میں ختم کر دینا چاہتی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آجکل کسی قوم کے لئے اونگھتے رہنے کا موقعہ نہیں ہے - موجودہ زمانے کے پے در پے انقلابات بتا رہے ہیں کہ ہر آنے والے انقلاب کے لئے ہمکو پہلے ہی سے سوچ سمجھکر تیار رہنا چاہئے - تاکہ یکبارگی پیش آجانیوالے حالات سے ہم بدحواس نہ ہو جائیں - علاوہ بریں علم و ادب کی دنیا بھی روز بروز بدلتی جا رہی ہے اب پہلے زمانے کی طرح صرف نقالی اور لکیر کا فقیر بنا رہنے سے کام نہیں چل سکتا - زندہ قوموں کی قوت فکر نے ان کے لٹریچر میں بھی ایک نئی روح ڈالدی ہے اور آج ہم اپنی دوسری ضروریات زندگی کی طرح لٹریچر کے ایک ایک شعبے میں بھی انہی کے محتاج ہیں - ہم بڑی دون کی لیتے ہیں کہ ہمارے مہا پرش نفس لوجی (علم نفس) کے بانی تھے - ہمارے رشی منی اپنی ساری زندگی سوچ بچار اور نفس کے مطالعہ میں گذار دیتے تھے مگر وہ زمانہ تو گزر گیا اور انقلابوں کی بدحواسی نے ہمکو اگلوں کے خزانے کی حفاظت کا بھی موقع نہ دیا - اب تو بہر حال غور و فکر کا یہ کھویا ہُوا فن ڈارون اور والسن کی ریزہ چینی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے - ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے دنیا کی کایا پلٹ دی مگر ہم اس تھیوری کے متعلق اگر کچھ جانتے ہیں تو صرف اسقدر کہ

کہا منصور نے خدا ہوں میں

ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

آجکل ڈاکٹر والسن کے "نظریۂ عقل باطن" نے یورپ کی علمی دنیا میں

دھوم مچا رکھی ہے اور اس کے ماتحت کئی نئے نئے فن پیدا ہو گئے ہیں مگر ہم میں سے بہت سے ابتک یہ بھی نہیں جانتے کہ اس تھیوری کا مطلب کیا ہے۔ انشاءاللہ کسی آئندہ فرصت میں ہم اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت صرف اس کی ایک شاخ غور و فکر اور سوچ بچار کے فن کے بارے میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ فن کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اور ہم اپنی قوتِ فکر کی پرورش کر کے اپنے دماغ کو ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے کے قابل کسطرح بنا سکتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ جسطرح معدہ کھانا ہضم کرتا ہے اسیطرح دماغ بھی فطری طور پر سوچ بچار میں لگا رہتا ہے پھر اس کو ایک فن کی حیثیت سے جاننے اور اس کی پرورش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہاں آپ کا خیال ایک حد تک صحیح ہے اور اسمیں شک نہیں کہ سوچنے کی قوت آدمی میں فطری اور پیدائیشی طور پر موجود ہے لیکن جس طرح زیادہ کھانے یا کھانے کے سلسلے میں کسی دوسری بے احتیاطی کی عادت ہاضمے کو خراب کر دیتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے غور و فکر کے خراب طریقوں کی عادت ان کی قوتِ فکر کو برباد کر ڈالتی ہے۔ ان کے سوچ بچار کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا اور وہ زندگی بھر دماغ لڑاتے رہنے کے باوجود اس کا پھل نہیں پاتے ہماری کونسی قوت پیدائیشی نہیں۔ دوڑنا ہماری فطرت میں داخل۔ اچھلنا ہمارا طبعی طریقہ۔ بولنا ہماری امتیازی صفت مگر مشق کئے بغیر دوڑ میں کوئی بازی لیجا سکتا ہے۔ نہ ہائی جمپ میں اور نہ بغیر مشاقی کے کوئی ابوالکلام ہی بن سکتا ہے۔ یہی حالت سوچنے کی بھی ہے کہ سوچتے تو سبھی ہیں مگر ہر شخص لائڈ جارج ہر شخص والسن اور ہر شخص ایڈیسن نہیں بنجاتا۔ کیونکہ سیاست دانوں، فلسفیوں اور موجدوں کے غور و فکر کے طریقے ہمارے سوچ بچار کے ڈھنگ سے بالکل جداگانہ ہیں۔

عام طور پر اپنی روزمرّہ زندگی کے معاملات کو ہم جسطرح سوچتے ہیں وہ بھی غور و فکر کی ایک قسم ہے۔ لیکن اسکو نتیجہ خیز فکر اور بارآور غور نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ تجارت، زراعت۔ طبابت۔ اخبار نویسی یا کوئی دوسرا کام جسکو ہم روزانہ اپنے پیشے کے طور پر کرنے کے عادی ہیں اس میں کسی نئے سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ان میں کوئی پیچیدگی پیش آتی ہے تو ذرا سی توجہ سے اُسے اتنا جلد حل کر لیتے ہیں کہ اس کام کو لگاتار کرتے رہنے اور بار بار تجربہ کرنے کی وجہ سے ہم میں جو ملکہ اور اس پیشہ کے ہر ہر جزو پر ہمہ گیری کی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے گویا اس کی طرف سے الہام ہو جاتا ہے اس قسم کے غور و فکر کو فکرِ بدیہی یا سرسری طور پر سوچنا کہہ سکتے ہیں۔ مگر صرف فکرِ بدیہی سے دنیا کا کوئی بڑا کام نہیں انجام پا سکتا اور صرف سرسری طور پر سوچ بچار سے نہ کار آمد ایجادوں سے دنیا روشناس ہو سکتی ہے۔ نہ بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں سُلجھائی جا سکتی ہیں اور نہ اس سے علم و ادب ہی کے ذخیرے میں کوئی کار آمد اضافہ ہو سکتا ہے ان کاموں کے لئے فکرِ نظری اور غور و فکر کے اصول کے ماتحت لگاتار سوچ بچار کی عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عقل اور قوتِ فکر ایک ہی چیز ہے یا یہ کہ آدمی عقل ہی کے ذریعے سے سوچتا ہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ نفس لوجی کے نئے تجربے اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ ہم صرف اپنی عقل ہی سے نہیں سوچتے بلکہ ہمارا پورا جسم یا بلفظِ دیگر ہمارا سارا وجود اور ہماری پوری ذات اس خدمت کو انجام دیتی ہے۔ ہم غور و فکر کیلئے جسم کے محتاج ہیں اندرونی غدود (Glands) کے محتاج ہیں۔ دماغ کے قدرتی شکنوں کے محتاج ہیں۔ دماغ کے خلایا اور خانے (cells) کی مقررہ تعداد اور اس کے معینہ ادج و حضیض اُبھار اور گہرائی کے حاجتمند ہیں۔ اگر ایک غدود بھی کم ہوا اگر ایک شکن بھی خراب ہو یا کرّہ دماغ کی چوٹیوں اور کھائیوں کے تناسب میں قدرت نے ذرا بھی کمی بیشی کر دی ہو۔ یا قدرت نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ رکھی ہو مگر ہماری بے احتیاطی سے ہماری کسی کل میں کمزوری آ جائے تو ہماری قوتِ فکر ضعیف ہو جاتی ہے اور ہم کسی چیز کے متعلق با اصول طریقے پر نہیں سوچ سکتے۔ علاوہ بریں سوچنے سے پہلے سوچنے کی خواہش پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر اس خواہش کا جذبے کی صورت اختیار کرنا بھی لازمی ہے تاکہ لگاتار غور و فکر کی تکلیف ہمت اور استقلال کے ساتھ برداشت کیجا سکے۔ مگر یہ رغبت اور خواہش اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ پہلے ہم میں خوشی یا غمی کی کوئی کیفیت پیدا ہو یا کسی نفع کی امید بندھے یا کم سے کم شہرت پسندی اور نام آوری ہی کا جذبہ دلکو گدگدائے۔ جو لوگ تصنیف و تالیف یا علمی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی قوتِ فکر کی بارآوری، ان کے سوچ بچار کا پھل اور کسی مفید کتاب کی کامیاب تصنیف درحقیقت صرف اسی ابتدائی مسرّت یا اندوہناکی رہینِ منّت ہوتی ہے۔ اور رنج یا غم کی یہ ابتدائی کیفیت ماحول اور آس پاس کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایک مصنف ایک موجد یا ایک فلسفی کسی موضوع کے متعلق صرف اپنی ہی ذات اور اپنے ہی ذہن سے نہیں سوچتا بلکہ اپنی پوری قوم کی ذات اور اپنی پوری قوم کے دماغ سے غور و فکر کرتا ہے۔ آجکل سارے محقق یورپ اور امریکہ ہی میں کیوں پیدا ہونے لگے ہیں؟ ساری کار آمد ایجادیں اور تمام نئی دریافتیں اُنہی کے لئے کیوں خاص ہو گئی ہیں؟ ہم میں کوئی محقق کیوں نہیں پیدا ہوتا؟

ہم میں کوئی موجد کیوں نہیں جنم لیتا؟ صرف اسی وجہ سے کہ وہاں کے اہل علم ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس کی ہلچل ان کی خوشی اور ان کے غم کے جذبے کو بھڑکاتی رہتی ہے۔ وہاں ہندوستان جیسی پژمردگی نام کو بھی نہیں ملتی کہ اہلِ علم مردوں سے شرطیہ ناند ھکر چین سے سو سکیں یقین کیجئے کہ اگر ڈارون جیسا کوئی شخص یا خود ڈارون ہی دوبارہ زندہ کر کے ہندوستان کی سنسان بستی اور یہاں کی خواب آور فضا میں بھیجدیا جائے تو یقینی طور پر وہ بھی اپنی ساری چوکڑی بھول جاتے۔ اور نئے نئے نظریئے تو الگ رہے شاید کسی پرانی تھیوری کے متعلق بھی کچھ سوچنے کی توفیق نہو۔

اگر ہمارے ہاں محقق پیدا نہیں ہوتے۔ اگر ہمارے ہاں موجد جنم نہیں لیتے اگر ہمارا علم و ادب اصحابِ طرز سے محروم ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی علم والا ہی نہیں رہا یا کسی میں استعداد و قابلیت ہی نہیں رہی بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس سونی بستی کے بسنے والوں میں زندگی کے آثار ہی نہیں ہیں اور سرے سے وہ حرکت ہی نہیں پیدا ہوتی جس کی گرمی قوت فکر کے لئے تازیانے کا کام دے۔ اس لئے اولاً تو کسی میں ایسا جذبہ ہی نہیں پیدا ہوتا کہ غور و فکر کی تکلیف اُٹھانے کو تیار ہو جائے اور خیر سے کسی کے دل میں کسی جذبے نے چٹکی بھی لی تو وہ غریب یہی نہیں جانتا کہ اس کے متعلق غور و فکر میں کونسا طریقہ اختیار کرے کہ کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہو سکے کبھی وہ اپنا سارا وقت سوچنے ہی میں کھو دیتا ہے اور کبھی بلا سوچے سمجھے جدھر سینگ سمائے چل پڑتا ہے اور پہلے ہی قدم پر دادِ تحقیق دینا شروع کر دیتا ہے۔ جسکا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے ہی اوندھے منہ گر جاتا ہے۔ بڑے بڑے موجدوں بڑے بڑے مفکروں اور سوچ بچار کر کے دنیا کے سامنے کوئی کام کی چیز پیش کرنے والوں کے حالات پڑھو اور جس راستے پر چلکر وہ کامیاب ہوئے ہیں اس کا کھوج لگاؤ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان تمام بڑے لوگوں کا راستہ ہمارے تمہارے راستے سے بالکل الگ ہے۔ وہ تنہائی پسند گوشہ نشین اور بظاہر سست نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت ان کا باطن سرگرم عمل اور ان کا ذہن خیالات کی پرورش میں لگا رہتا ہے۔ ان کے تجربوں کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بارآور غور و فکر اور پھل دینے والے سوچ بچار میں انکو چار دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ کوئی مفید چیز پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

جب وہ ماحول سے متاثر ہو کر کسی ایجاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا کسی تھیوری کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں یا کسی نئے طرز کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ تو سب سے پہلے استعداد اور قابلیت حاصل کرتے ہیں۔ اور متعلقہ علوم و فنون کا مطالعہ کر کے اگلوں کی رایوں کو پرکھتے اور ان کی چھان بین کرتے ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ وہ ان رایوں کو نہ یاد کرتے ہیں اور نہ مختلف جگہ سے جمع کر کے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں مختلف رائیں ایسی خلط ملط ہو جاتی ہیں کہ صحیح اور غلط میں تمیز غیر ممکن ہو جاتی ہے اور سوچنے والا خبطی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب سوچنے والا سوچتے سوچتے گھبرا اُٹھتا ہے تو دُوسرا دور شروع ہو جاتا ہے جو چند دن سے چند سال تک رہ سکتا ہے اس دور میں سوچنے والا گویا اپنے جاننے میں کچھ نہیں سوچتا بلکہ سوچے ہوئے کو بھی بھول جاتا ہے لیکن درحقیقت ظاہری عقل و حواس کے تھک جانیکے بعد اس کی عقلِ باطن اور سوچنے سمجھنے کی اندرونی قوت اس موضوع کو حل کرنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ ہم کو اکثر خواب میں جو بھولی بسری باتیں نظر آتی ہیں وہ اسی عقلِ باطن کا کرشمہ ہیں۔

پھر یکبارگی تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس موضوع کو حل کر دینے والی کوئی مضبوط رائے اسقدر جلد قائم ہو جاتی ہے کہ گویا الہام ہو جاتا ہے۔ اسے ہم بظاہر الہام سمجھتے ہیں مگر دراصل یہ ہماری عقلِ باطن کی کارگزاری ہوتی ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور غور و فکر کا نتیجہ برآمد ہونے اور چھان بین کر کے اپنے موضوع کا عملی پروگرام مقرر کر لینے کا زمانہ ہوتا ہے۔

پہلے دور کو دورِ استعداد، دوسرے کو دورِ پرورش، تیسرے کو دورِ انکشاف یا کشف اور چوتھے دور کو دورِ تحقیق کہتے ہیں۔

ان چاروں دوروں سے صحیح سلامت گزرنے کے لئے بعض نقصان دہ عادتوں سے بچنا اور چند مفید خصلتوں کا خوگر ہونا لازمی ہے۔

نقصان دہ عادتیں

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ہمارا غور و فکر عام طور پر فکرِ بدیہی ہوا کرتا ہے لیکن کسی نئے کام اور کسی اہم نتیجے کے لئے فکرِ نظری کی ضرورت ہے۔ مگر فکرِ نظری کا مطلب فکرِ عمدی اور ارادہ کر کے سوچنا نہ سمجھا جائے کیونکہ فکرِ نظری اگرچہ ارادہ اور قصد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کی پرورش اسی وقت ہوتی ہے جب سوچنے والا بظاہر اسے بالکل بھول جائے اور قوتِ فکر کو بلا روک ٹوک آزادی کے ساتھ اندرونی طور پر سوچنے کا موقع ملے۔

زندگی کے ہر شعبے میں ہم عام طور پر تقلید اور نقل کے عادی ہیں۔ ہمارے خیالات بھی عموماً وہی ہوا کرتے ہیں جو اپنے خاندان اور اپنے آس پاس سے نقل کرتے ہیں۔ شارعِ اسلام رسولِ اکرم (صلعم) نے اپنے قول کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ وَیُنَصِّرَانِہٖ میں نفسی لوجی کے اسی مسئلے کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے کی پرورش جب ایسی فضا میں ہوتی ہے جہاں ماکانَ علیہ آباءنا اور

اگلوں کی ریت پر بہت زور دیا جاتا ہے تو اس میں نقالی اور قدامت پسندی کی ایسی لت پڑ جاتی ہے اور اس کا ذہن ایسا قید ہو جاتا ہے کہ پھر زندگی بھر میں کبھی بھی اس کی ذات سے آزادانہ غور و فکر کی امید نہیں رکھی جا سکتی - آج ہمارے لٹریچر پر جو سب سے بڑی مصیبت ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے انشا پردازوں میں آزادروی مفقود ہے - خیالات تو الگ رہے ہمارا ایک طبقہ اگلوں کے الفاظ اور ان کے طرز ادا کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا - دوسرا گروہ آزاد ہو کر کچھ سوچنا چاہتا ہے مگر تقلید او پیروی کی عادت بچپن ہی سے کچھ ایسی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے کہ وہ قصر شاپور اور طاق کسریٰ سے اتر تا بھی ہے تو اپنی سرزمین پر نہیں بلکہ ایک ہی چھلانگ میں برجِ بابل اور اہرامِ مصر میں پہونچکر بانگ دینے لگتا ہے - حالانکہ اگلوں کی لکیر کا فقیر بنے رہنے کی عادت قوتِ فکر کو برباد اور بیکار کر دیتی ہے -

تقلید کے علاوہ بعض پیشے بھی ایسے ہیں جو خیالات کی پرورش کا موقعہ نہیں دیتے مثلاً ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ایک موضوع کو کئی کئی سال کی پرورش کے لئے عقلِ باطن کے سپرد کر دے - اس کی زود نگاری اور اخبار کے مقررہ صفحوں کی روزانہ کالم پری اُسے اتنی فرصت نہیں دیتی کہ پہلے کسی موضوع کے متعلق استعداد پیدا کرے پھر اُس کی پرورش کرے اور اس کے بعد کشف ہو جائے تو کچھ لکھنے بیٹھے

زود نگاری اور اگلوں کی پیروی غور و فکر کے حق میں نہایت بری اور بیحد نقصان دینے والی عادتیں ہیں - یہی وجہ ہے کہ کسی تاریک خیال اور قدامت پسند خاندان میں ایسے لوگ مشکل ہی سے ملسکتے ہیں جنکو صحیح معنوں میں صاحب فکر اور سمجھدار کہا جا سکے - اور یہی وجہ ہے کہ روزانہ اخباروں کے بعض ایڈیٹر اعلیٰ قابلیت اور کافی استعداد کے باوجود کسی موضوع کی نئی تحقیق یا کوئی مستقل اور مفید تصنیف نہیں پیش کر سکتے -

اچھی عادتیں

بارآور غور و فکر کے لئے خیالات کی پرورش لازمی ہے اور ہم غور و فکر میں اپنے ذہن کی اعانت اس طرح کر سکتے ہیں کہ دورِ پرورش کے افکار و ارادکو لکھتے جائیں حتیٰ کہ اپنے خوابوں کو بھی نوٹ کر لیا کریں - کیونکہ اس دور میں مختلف خیالات آتے ہیں اور بھول جاتے ہیں اگر ہم ان کو نوٹ کرتے رہیں تو اس موضوع کے علاوہ تحقیق اور چھان بین کیلئے کوئی دوسرا موضوع بھی ملجائیگا - کیونکہ خیالات کا میدان بیحد وسیع اور بہت بڑا ہے اور لیبا اوقات اصل مقصد تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں کوئی دوسرا قیمتی خزانہ ملجاتا ہے - عربوں نے گھٹیا دھاتوں سے سونا چاندی بنانے کی فکر میں کیمیائی تحقیق شروع کی تو اگرچہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے مگر اسی تحقیق کی وجہ سے علم کیمیا میں سونے چاندی سے بھی زیادہ قیمتی معلومات کا اضافہ ہو گیا -

روزمرّہ ایک ہی کام کرنے کی وجہ سے ہمارے اعضا کی طرح ہماری عقل اور ہمارا ذہن بھی سہل پسندی کا عادی ہو جاتا ہے - اس لئے بہتر ہے کہ ہر سال ایک ماہ کے لئے اپنے ذہن کا ماحول بدل دیا کریں - اپنی عادت اور اپنی پسند کے خلاف کتابوں کا مطالعہ کریں - یا ایک ماہ کے لئے پڑھنا لکھنا بالکل بند کر دیں - اگر تبدیلِ آب و ہوا صحت جسمانی کے لئے مفید ہے تو قوتِ فکر کی صحت کے واسطے چند دن کے لئے اپنے علمی ماحول اور ذہنی عادتوں کو بدل دینا صرف مفید ہی نہیں بلکہ لازمی ہے -

اس مقالے کا خلاصہ یہ ہے کہ بارآور غور و فکر اور پھل دینے والے سوچ بچار کے لئے اپنے خیالات کی پرورش ضروری ہے - اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ غور و فکر کرنے والا جلد بازی قدامت پسندی - پیشرووں کا کلام یاد کرنے اور اگلوں کے خیالات کو اپنانے کی بُری عادتوں سے بچے - اور کچھ دن اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دینے اور کبھی کبھی اپنی روزمرّہ کی عادتوں کو ترک کر دینے اور اپنے ذہنی ماحول کو بدل دینے کا عادی ہو -

صدیق طیب

رباعی

پابندئ ذوقِ اہلِ دل کیا معنی
دلچسپئ جنسِ مضمحل کیا معنی
اے ناظمِ کائنات کچھ تو بتلا
آخر یہ طلسمِ آب و گِل کیا معنی

روانؔ ایم اے

باسل نے کیا دیکھا؟

(میری ملکہ رومانیا کے ایک شاہکار کا ترجمہ)

میری ملکہ رومانیا انگلستان کے شاہی خاندان میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں سابق شاہ رومانیا سے بیاہی گئی۔ یہ شروع سے اب تک ان شہزادیوں میں سمجھی جاتی ہے جو لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ شادی کے بعد رومانیا کے دارالسلطنت بخارسٹ میں آئی تو نہ وہاں کی زبان سے واقف تھی۔ نہ وہاں کے عادات و اخلاق سے واقف تھی اور نہ وہاں کی سوسائٹی ہی کے متعلق کچھ جانتی تھی مگر چند ہی دنوں میں ان تمام باتوں پر اس قدر حاوی ہو گئی اور رومانیا کی سود و بہبود سے اس قدر دلچسپی لینے لگی کہ ملک کے سارے عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس نے اپنی تمام قوت عمل اپنی قوم کے لیے وقف کر دی۔ ایک طرف اس کا قلم لوگوں کے اخلاق سنوارنے میں مشغول ہوتا تو دوسری طرف اس کا ہاتھ بیواؤں۔ بے کسوں کی امداد کے لیے کھلا رہتا۔ ۱۹۲۷ء میں شاہ رومانیا کی وفات کے بعد سابق ولیعہد رومانیا کی تخت نشینی کی جد و جہد میں اسے جانگداز صدموں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور سازشوں کی وجہ سے یہ اپنے پنج سالہ پوتے کے بجائے اپنے لڑکے سابق ولی عہد کو تخت و تاج دلانے میں کامیاب نہ ہو سکی اس واقعہ کے بعد یہ ایک دل شکستہ اور بدقسمت ملکہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس حالت میں بھی اس کے قلم سے جو چیز نکلتی ہے وہ اچھوتی اور فن کے لحاظ سے شاہکار ہوتی ہے۔ موضوع کی اہمیت کے ساتھ کشادہ نظری اور وطن دوستی میری کی ہر تحریر میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ذیل میں اس کے جس افسانے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اس میں ہر قوم کے لیے اپنے وطن کی عزت اور اپنے ملک کی حفاظت کے سیکڑوں سبق پنہاں ہیں!

رات کا وقت تھا۔ میدان کے نامعلوم گوشوں تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی ہوا کے جھونکے سنسان فضا میں تہلکہ مچائے ہوئے تھے سردی لرز رہی تھی ستارے کانپ رہے تھے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن زمین پر برف نے سفید چاندنی بچھا دی تھی اس پر تاریکی کا عکس اندھیرے اور اجالے کی ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ میدان کے بیچ کی سڑک ایک سیدھے خط کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس سڑک کے کنارے چند سپاہیوں کی ایک ٹولی آگ کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھی۔ انھوں نے سر سے پیر تک اپنے کو لبادوں میں چھپا رکھا تھا پھر بھی ان کا جسم سردی سے شل ہوا جا رہا تھا۔ وہ کل بارہ سپاہی تھے ان میں سے اکثر پکی عمر کے تھے لیکن ایک شخص بالکل نوجوان تھا۔ وہ جنگ کے چند قیدیوں کی حفاظت کر رہے تھے جو ان کے ساتھ آگ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے آگ بجھی جا رہی تھی۔ سردی نے سب کا برا حال کر رکھا تھا کسی کی نظر قیدیوں کی طرف نہیں تھی صرف باسل کی نظر انھیں پر گڑی ہوئی تھی۔

ایک ... پر پتلے بڈھے نے جو اس ٹولی کا سردار تھا۔ باسل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "آگ بجھی جا رہی ہے۔ سردی غالباً رات ختم ہونے سے پہلے ہی ہمارا کام تمام کر دے گی"

ایک سپاہی نے بات کاٹ کر کہا کہ "اس وقت ادھر ادھر جانے سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ایندھن کی تلاش میں ہم راستہ بھول جائیں"

سردار نے جواب دیا کہ "قسمت میں جو ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔ اس وقت صرف اعتراض کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آگ بجھ گئی اور ہم اسی طرح بیٹھے رہے تو بہت ہمارے بہت سے ساتھی مر چکے ہیں اسی طرح ہم بھی صبح سے پہلے ہی مر جائیں گے"

ایک دوسرے سپاہی نے پوچھا کہ "یہ تمام مصیبتیں کس کی لائی ہوئی ہیں؟"

سردار نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا کہ "ایسا سوال تمھاری بلکہ میری شان کے بھی خلاف ہے"

ایک اور سپاہی جو اب تک چپ بیٹھا تھا بول اٹھا کہ "یہ ساری مصیبت جنگ کی لائی ہوئی ہے اور قطعی طور پر جنگ ہی اس کی ذمہ دار ہے"

سردار غصے میں بھرا ہوا کڑک کر بولا کہ "جنگ! جنگ کی آگ ایک طرف کھیتوں کو جلاتی ہے تو دوسری طرف اس کا سیلاب چٹیل میدانوں کو سرسبز بنا دیتا ہے"

ایک دوسرے شخص نے کہا "مگر اس جنگ میں تو فائدے کے مقابلہ میں نقصان بہت زیادہ ہے"

اب باسل بھی ادھر متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ "مجھے تو ان قیدیوں پر ترس آ رہا ہے"

سارے سپاہی چیخ اٹھے اور باسل پر اعتراض کی بوچھاڑ ہونے لگی "ترس! تم کو کس پر ترس آ رہا ہے؟ کیا ان لٹیروں پر جن کی قوم ہماری آزادی چھیننا چاہتی ہے؟"

باسل نے اپنی بات کا مطلب بیان کیا کہ "مجھے اس لیے ترس آ رہا ہے کہ یہ سب کے سب ابھی بالکل نوجوان ہیں۔ مگر اس نحوس جنگ کی بدولت اپنے رشتہ داروں۔ اپنے دوستوں اور اپنے وطن سے دور آج اس کس مپرسی کی حالت میں یہاں پڑے ہوئے ہیں"

"اور ہم؟ —— کیا ہماری بھی یہی حالت نہیں ہے؟"

"ہم کم سے کم اپنے پیارے وطن رومانیا میں تو موجود ہیں!"

یکبارگی ہوا زور شور سے چلنے لگی چہروں پر برف کے گالے چبھنے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنا رخ پھیرتے ہوئے کہا "خدا کی پناہ! کتنی خطرناک رات ہے؟!"

سردار بولا کہ" باسل! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب پھر کہتا ہوں کہ "اگر تم ہماری مدد نہیں کروگے اور جلاون ڈھونڈھ کر نہیں لاؤگے تو سردی ہم کو مار ڈالیگی"

باسل نے جواب دیا کہ" میں اس انجان بیابان میں ایسی اندھیری میں جلاون کہاں پاسکتا ہوں؟

ایک سپاہی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "تمھاری ٹانگیں لوہے کی ہیں۔ اگر تم چاہو تو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ ہی لا سکتے ہو"

سردار نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا "بے شک۔ بے شک اپنی ٹانگوں لوہو اسے جنگ کرنے پر آمادہ کرو اور کہیں سے لکڑی اور پرکرو کہ ہماری جان بچ سکے"

باسل نے جواب دیا "مگر میرے سپرد تو ان قیدیوں کی نگرانی ہے!"

سردار نے جھنجلا کر کہا کہ" ان کی نگرانی دوسرے بھی کر سکتے ہیں اور کیا تم اس کو بھول گئے ہو کہ میرے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ اپنی بندوق اٹھاؤ اور جاکر جلد سے جلد جلاون ڈھونڈھ لاؤ"

باسل نے "بہتر جناب!" کہتے ہوئے بندوق اٹھائی اور چل دیا۔ وہ جا رہا تھا مگر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کدھر جا رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ کیسے پتہ چل سکتا تھا! اندھیری رات کھلا میدان۔ ہوا کا زور۔ برف کی بارش یہ تمام چیزیں ایک شخص کو مخبوط کرنے کو کافی تھیں وہ چلا جا رہا تھا اور اس کے دماغ میں قسم قسم کے خیالات آرہے تھے بعض ایسی چیزیں بھی سامنے آجاتی تھیں جن کا جنگ اور سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یکبارگی اس کا پیر پھسلا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ برف پر گرنے کی وجہ سے چوٹ تو نہیں آئی۔ مگر دلچسپ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے سامنے کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ گرنے سے پہلے اس کو اپنے آس پاس عشق و محبت کی دیویاں اور حسن و جمال کی پریاں نظر آرہی تھیں۔ مگر اب ہر طرف برف ہی برف دکھائی پڑتی تھی اب اس کو یاد آیا کہ وہ جلاون ڈھونڈنے چلا ہے۔ مگر اس چٹیل میدان میں تو ایک تنکا بھی نہیں نظر آتا۔ یاالٰہی! یہ رات کیسی بھیانک ہے! ہوا کے کوڑے جسم کو چور کیے جا رہے ہیں۔ برف کی سوئیاں چہرے کو چھلنی کیے دیتی ہیں۔ پروردگار! لکڑی کہاں سے اور پر کروں"

وہ سردی سے لرز رہا تھا اور بار بار اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی پیشانی پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا وہ راستہ بھول گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کدھر جائے ہمت کرکے اٹھا ہی تھا کہ قریب ہی تین سفید پوش آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ ڈر گیا اور اس قدر کانپنے لگا کہ چلنا دوبھر ہوگیا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے کو سنبھال کر کہنے لگا کہ "وہم نہ سہی روحیں ہی سہی۔ پھر بھی ان سے ملنا کسی جرمن سپاہی سے دوچار ہونے سے کہیں زیادہ آسان ہے"

اس طرح اپنے دل کو اطمینان دلاکر باسل ان سفید پوشوں کی طرف چل پڑا جو اس کے انتظار میں اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا کہ وہ سفید پوش دراصل لکڑی کی تین صلیبیں ہیں جو برف کی چادر اوڑھے تین قبروں پر کھڑی ہیں۔

باسل نے حسب دستور صلیب کے سامنے گھٹنے ٹیکے۔ قبروں پر فاتحہ پڑھا اور سوچنے لگا کہ یہاں کون لوگ دفن ہیں؟ کیا یہ سپاہیوں کی قبریں ہیں؟ —— یا عورتوں کی ہیں؟ یا بچوں کی ہیں جو اس تباہ کن جنگ میں لاوارث ہوکر بھوکوں مر گئے ہیں؟ ....

پھر اس کو خیال آیا کہ یہ صلیبیں لکڑی کی ہیں ...... بڑی مضبوط اور سوکھی ہوئی لکڑی کی! ہتھیلی پر جان رکھ کر میں لکڑی ہی ڈھونڈھنے تو چلا ہوں!

باسل نے گویا کھویا ہوا خزانہ پالیا ہے مگر صلیبوں کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ لکڑی کے منظر نے اس کی ساری تکلیف بھلادی ہے۔ مگر اس کو چھونے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے چھوڑ کر چلے جانے کو بھی اس کی طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ اسے یاد آتا ہے کہ آگ بجھی جا رہی ہوگی۔ ایک صلیب بھی اکھاڑ کر لے جاؤں تو کئی جانیں بچ جائیں گی۔ ان قبروں میں سونے والے تو اتنی گہری نیند سو رہے ہیں کہ انھیں خبر بھی نہ ہوگی کہ ان کی قبروں پر کیا ہو رہا ہے

یہ سوچ کر اس نے ایک صلیب پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سارے بدن میں سن سے بجلی کی طرح ایک رو دوڑ گئی۔ اس کے خیالات نے فوراً پلٹا کھایا اور وہ ہاتھ کھینچ کر کہنے لگا کہ تو یہ ایسا کرنا مُردوں کی توہین کرنا ہے۔ ان کا احترام زندوں کے احترام پر مقدم ہے۔ وہ اپنی عزت اور اپنی بزرگی کی حفاظت خود نہیں کر سکتے۔ انھوں نے اپنے کو راہ چلتوں کے رحم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اس لیے ایک قبر گرجے کی قربان گاہ سے بھی زیادہ قابل احترام ہے۔

لیکن تجربے نے باسل کے کان میں پھر کہا کہ یہ لوگ اس فانی دنیا کو چھوڑ کر عالم بقا میں جا چکے ہیں۔ سردی۔ گرمی کی تکلیف سے آزاد ہو چکے ہیں انھیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لکڑی کی ایک صلیب ان کی قبر پر رہی تو کیا اور نہ رہی تو کیا مگر یہاں اس وقت کئی زندوں کی زندگی اس لکڑی پر منحصر ہے اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ زندہ بہرحال مردے سے افضل ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ زندوں کو موت کے پنجے میں چھوڑ دینے کا جرم مُردوں کی کوئی چیز لے لینے کے جرم سے یقیناً بڑھا ہوا ہے۔ وہ زندہ بھی کون! رومانیا کی حفاظت کے لیے جان لڑا دینے والے سپاہی! اگر مُردے بول سکتے تو سب یک زبان ہوکر یقیناً یہی کہتے کہ وطن کی حفاظت کرنے والے جانبازوں کی جان بچانے کے لیے ہماری تمام صلیبیں لے جاکر جلا دو!

باسل نے اکھاڑنے کی غرض سے ایک صلیب کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہلانا شروع کیا لیکن اس نے اپنی حرمت اور بزرگی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا۔ اس پر باسل کو غصہ آگیا اور صلیب اس کو اپنا مقابل دشمن نظر آنے لگی جس کو مغلوب کرنا ایک سپاہی کا سب سے اہم فرض ہے اس احساس کے بعد باسل نے اسے اپنے دونوں بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لے کر اتنے زور شور سے ہلایا کہ وہ

چرچرانے لگی۔ آخر انتہائی جد و جہد کے بعد صلیب اکھڑ کر گری۔ اوپر باسل تھا نیچے وہ۔ گرنے کے بعد باسل کو معلوم ہوا کہ اس نے جس دشمن کو مغلوب کیا ہے وہ حقیقت میں لکڑی کی ایک بے جان صلیب ہے!

آگ بجھ چکی تھی۔ راکھ تک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ مگر قیدی اور ان کے نگہبان اسی راکھ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کسی کے اِدھر آنے کی آہٹ سنی پھر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ باسل کوئی بھاری سی چیز گھسیٹتا ہوا لا رہا ہے۔

قیدی اور سپاہی سب لکڑی! لکڑی! کہتے ہوئے باسل کا شکریہ ادا کرنے اور مبارکباد دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ باسل بالکل چپ تھا وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ اس نے واپس آتے ہوئے برف اور ہوا کے جھونکوں سے مقابلہ کرنے میں جو اذیت اٹھائی تھی وہ بجائے خود صلیب اکھاڑنے کی مشقت سے کسی طرح کم نہ تھی علاوہ ازیں ضمیر کا خون اور نفس کی لعنت ملامت ساری مشقتوں سے زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ اس لیے وہ نہ شاباش کی طرف متوجہ ہوا۔ نہ واہ واہ کا جواب دیا بلکہ انتظار کرنے والوں کے قدموں میں صلیب ڈال کر ایک طرف چپ چاپ کھڑا ہو گیا

اس جلادن کی ماہیت سب سے پہلے سردار کو معلوم ہوئی تو وہ چیخ اٹھا
"نعوذ باللہ . . . نعوذ باللہ . . . صلیب! . . صلیب!!"

پھر دوسرے سپاہیوں نے بھی دیکھا اور سب پناہ مانگنے لگے۔ قیدی حیرت اور مایوسی سے سپاہیوں کا منہ تک رہے تھے۔ باسل کو تکان نے گونگا بنا دیا تھا اس نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور برف کے فرش پر گر کر لیٹ گیا۔ سردار اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور جھڑک کر کہنے لگا کہ "آخر تم نے جلانے کی خاطر ایک صلیب لانے کی جرأت کیسے کی؟!"

ایک سپاہی بیچ ہی میں بول پڑا "لیکن بہرحال ہے تو یہ لکڑی ہی اور ہم کو جلانے کے لیے لکڑی ہی کی ضرورت ہے"

"خواہ وہ کسی چیز کی ہو اور خواہ ہم سب کے سب مر جائیں۔ مگر صلیب ہم سے نہیں جلائی جا سکتی"

"صلیب کو جلانا بہرحال صلیب کی بے حرمتی ہے!"

"اور اللہ کی لعنت کا باعث بھی!"

"لیکن ہم سردی سے مرے جا رہے ہیں اور مُردے تو بہرحال مُردے ہیں!"

"کیا وطن کی حفاظت کے لیے ہمارا رہنا ضروری نہیں ہے؟"

"دنیا میں کروڑوں مُردے ہیں جن کی قبر پر صلیب نہیں ہے!"

"تمھیں شرم بھی نہیں آتی جس میں ذرا بھی انسانیت ہو گی وہ کسی صلیب کے جلانے کی جرأت نہیں کر سکتا"

سپاہی آپس ہی میں جھگڑ رہے تھے۔ باسل اور قیدی چپ چاپ ان کی بحث سن رہے تھے تھکے ماندے باسل میں کچھ تو بولنے کی طاقت ہی نہ تھی اور کچھ شرمندہ سا بھی ہو رہا تھا لیکن اس کا واحد عذر یہی تھا کہ کوئی دوسری چیز ملی ہی نہیں۔

سردار کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ "بحث مباحثہ فضول ہے۔ سردی سے ٹھٹھر کر سب مر جائیں مگر مسیح کی صلیب نہیں جلائی جا سکتی"

اس فیصلے کے بعد سب خاموش ہو کر پہلے ہی کی طرح ٹھنڈی راکھ کے گرد بیٹھ گئے۔ باسل ان سے تھوڑی دور پر اسی صلیب پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور زندگی کی مشکلات کے متعلق سوچنے لگا۔

یہ جنگ جس میں لاکھوں نوجوانوں کی جانیں چلی گئیں۔ ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے سیکڑوں شہر برباد ہو گئے۔ آخر یہ جنگ کس لیے ہے؟ جس زندگی کو اطمینان اور چین سے گزارا جا سکتا ہے۔ اس کو اس بے دردی سے ان مصیبتوں اور قربانیوں کے لیے کیوں وقف کیا جا رہا ہے؟ سب ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں پھر مختلف قوموں میں یہ بغض و عداوت اور یہ جنگ و جدال کیوں ہے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ . .

ہوا کا جھونکا آیا۔ باسل نے اپنی پلکوں پر سے برف کی جھاگ دور کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر سوچنے لگا۔ یہ موسم کا چکر کس لیے ہے؟ جھلس دینے والی گرمی کے بعد یہ مار ڈالنے والی سردی کیوں آتی ہے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ . . . . . .

پھر اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ دن کی روشنی کے بعد رات کی یہ تاریکی کس لیے ہے؟ آخر اس سے کیا فائدہ ہے؟ آخری سوال اس کے منہ سے نکل ہی رہا تھا کہ اس کو میدان کے مشرقی کنارے پر ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی جو آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھی سو گئے تھے۔ اس کو بھی نیند آ رہی تھی۔ مگر وہ ابھی جاگ رہا تھا اور اس نے جو کچھ دیکھا اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والا شخص اس کی طرف چلا آ رہا ہے اس کا لباس بھی نورانی ہے بلکہ وہ سر سے پیر تک نور ہی نور ہے۔ اس نے مسیح کو پہچان کر سر کھول دیا۔ ہاتھ پھیلا دیئے گھٹنے ٹیکے اور اپنی ساری تکلیف بھول گیا لیکن مسیح نے اپنے کندھے پر یہ کیا چیز اٹھا رکھی ہے؟ . . . .

"اوہو۔ یہ تو صلیب ہے۔ مسیح نے بھی اپنی صلیب اٹھا رکھی ہے —— کس لیے؟ آخر کس لیے؟"

مسیح۔ باسل کے پاس نہیں ٹھیرے بلکہ قیدیوں اور سپاہیوں کے حلقے میں پہنچ کر اپنی صلیب راکھ کے ڈھیر پر ڈال دی صلیب جلنے لگی اور دیکھتے دیکھتے دہکتے ہوئے انگاروں کا ڈھیر بن گئی۔ وطن کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کی جان بچانے کی خاطر مسیح نے اپنی صلیب جلا ڈالی۔ باسل نے یہ سب کچھ دیکھا اور گھٹنوں کے بل سجدہ میں آگ کے قریب پہنچ کر بے ہوش ہو گیا۔

صبح ہوئی اور سپاہی جاگے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ بجھی ہوئی آگ کیسے روشن ہو گئی۔ سردار نے اپنے دل میں کہا کہ ہو نہ ہو باسل نے اس ... کی خلاف ...

[illegible]

اسرار

(۱)

روح خوابیدۂ الفت ہے تو بیدار نہ کر
قلب ــــ سرشار محبت ہے تو ہشیار نہ کر
لذتِ درد کو ــــ ہم معنیٔ آزار نہ کر
عشق رکھتا ہے اگر دل میں - تو اظہار نہ کر

(۲)

نغمۂ عشق نہیں ــــ دہر میں گانے کیلئے
یہ فسانہ نہیں ــــ دنیا کو سنانے کیلئے
نہ جلانے کیلئے ہے ــــ نہ بجھانے کیلئے
عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کیلئے

(۳)

حسن تو لاکھ حجابوں میں رہے یوں مستور!
اور بے پردگیٔ عشق ــــ ہو تجھکو منظور؟
کیا ملے گا تجھے؟ یہ راز ہوا اگر مشہور!
سامنے ہے ترے ــــ افسانۂ دارِ منصور

(۴)

اشک بنکر بھی نہ عریاں ہو ترا ذوقِ گداز!
ترے جذبات کا گہوارہ ہو خلوت گہ راز
آرزوؤں کو نہ دینا کبھی ــــ اذنِ پرواز
ورنہ ہستی تری ہو جائیگی ــــ مجبورِ نیاز

(۵)

مصحفِ عشق کی تفسیر ــــ نہیں کرتے ہیں!
معنیٔ عشق کو تصویر ــــ نہیں کرتے ہیں!
عصمتِ عشق کی تشہیر ــــ نہیں کرتے ہیں!
یعنی اس خواب کی تعبیر نہیں کرتے ہیں

(۶)

جس طرح نکہت گل ہو ــــ گل رنگیں میں نہاں
جس طرح نشۂ مے ہو ــــ مئے زریں میں نہاں
جیسے گوہر ہو کسی چشمۂ سیمیں میں نہاں
یونہی الفت بھی ہو تیرے دلِ غمگیں میں نہاں

(۷)

شام میں ہو کوئی دھندلا سا ستارہ ــــ روپوش
قلبِ صحرا میں ہو کوئی گل صحرا ــــ روپوش
جیسے فانوس میں ہو شمع تجلی ــــ روپوش
تیرے دل میں ہو یونہی داغِ تمنا ــــ روپوش

(۸)

مشتعل شمع اگر ہو ــــ تو بجھانا اچھا
درد بنجائے اذیت تو ــــ مٹانا اچھا!
جسطرح خواب پریشاں کا ــــ بھلانا اچھا
ہے یونہی جوشِ محبت کا دبانا اچھا

(۹)

جو سراپردۂ الفت کے مکیں ــــ ہوتے ہیں!
خاتم رازِ محبت کے نگیں ــــ ہوتے ہیں!
جو کبھی عشق میں "بیصبر" نہیں ــــ ہوتے ہیں!
وہ "خداوندِ محبت کے امیں" ــــ ہوتے ہیں

روش صدیقی

داغ دہلوی

(حضرت داغ دہلوی کی شاعری پر سر عبدالقادر کی تنقید)

اس ملاقات میں داغ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اقبال کے متعلق دریافت کیا جنہوں نے اپنے زمانہ طالبعلمی ہی میں داغ کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ قائم کرلیا تھا۔ اور جن پر داغ قدرتی طور سے فخر کرتے تھے۔ اس زمانے میں اقبال کی شہرت بحیثیت شاعر ترقی کر رہی تھی۔ اگرچہ اس بلندی پر نہیں پہنچی تھی جس پر اب پہنچی ہوئی ہے۔ داغ نے فرمایا کہ مجھے اقبال کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہونہاری کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن انہوں نے مغربی تعلیم کے زیر اثر اپنے لئے جو راہ نکالی ہے۔ وہ کلیتہً اُن کی اپنی ہے اور پرانی نسل کے لئے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانہ میں داغ نے اپنے آقا (حضور نظام) کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس قصیدہ پر ایک صاحب نے پنجاب کے ایک اخبار میں اعتراضات پر مشتمل ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا۔ اور ایک ایک شعر کو لیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ساری نظم میں ایک شعر بھی ایسا نہیں۔ جو اصول فن۔ قواعد زبان اور محاورہ کے نقائص سے پاک ہو۔ میں نے داغ سے پوچھا کہ کیا آپ نے اس نکتہ چینی کو ملاحظہ فرمایا ہے اور اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ داغ نے فرمایا: "اگر معترض نے میرے بعض اشعار میں نقص دکھائے ہوتے اور باقی اشعار کو درست تسلیم کرلیا ہوتا۔ تو ایک بات تھی لیکن اسے یہ محسوس کرنے کی توفیق بھی نہ ہوئی۔ کہ ایک مسلم الثبوت جس کی ساری زندگی اشعار لکھنے میں گذری ہے۔ اس کے سب کے سب شعر غلط نہیں ہو سکتے"۔

سید علی احسن احسن مارہروی نے جو داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے بڑے مداح ہیں۔ ان کی ایک مختصر سوانحعمری موسوم بہ "جلوۂ داغ" لکھی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر جناب احسن زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتے: تاہم انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ اس سے داغ کی زندگی کے آخری ایام کی سرگرمیوں کا خیال بہت اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے۔ احسن حیدرآباد میں انکے پاس رہا کرتے تھے۔ اس قرب سے ان کا مقصد ایک چھوٹی سی ڈکشنری موسومہ "فصیح اللغات" مرتب کرنا تھا جس میں اشعار داغ سے اردو الفاظ اور اردو محاورات کا محل استعمال بتانا مقصود تھا۔ احسن صاحب نے اس ڈکشنری کا یہ نام اس لئے رکھا تھا کہ داغ کو فصیح الملک کا خطاب حضور نظام کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ اور وہ عام طور پر اسی خطاب سے مشہور تھے۔ اس سے داغ پر مزید کام کا بوجھ پڑ گیا۔ داغ کی تصانیف پہلے ہی بہت تھیں لیکن جب ان میں سے کسی لفظ یا محاورہ کا طریق استعمال ظاہر کرنے کے لئے کوئی شعر نہ ملتا تھا تو حضرت داغ ایک نیا شعر کہہ دیتے تھے۔ تاکہ لغات کی ترتیب کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ میرا خیال ہے اس لغت کی ترتیب کے ذریعے استاد اور شاگرد دونوں نے اردو زبان کی قابل قدر خدمت انجام دی اور ہمارے لئے ایسا قیمتی مواد مہیا کر دیا ہے جس سے زمانہ آئندہ کے فرہنگ نویسوں کو بڑی مدد ملیگی

حضرت داغ کی ان غزلوں کا مجموعہ جو انہوں نے زمانہ قیام حیدرآباد میں تصنیف کیں۔ مہتاب داغ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نفیس کاغذ پر نہایت عمدہ چھپا ہوا ہے۔ اور بیرونی حیثیت سے بھی اس میں دکن کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ داغ کے تین مشہور ترین دیوانوں کی خوبیوں کے متعلق ارا میں اختلاف ہے۔ گلزار داغ جیسا کہ ہم پہلے بھی ظاہر کر چکے ہیں۔ شاعر کی جوانی کے جذبات سے لبریز ہے جبکہ عشق اس کے لئے محض پرواز تخیل کا دوسرا نام نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت کا درجہ رکھتا تھا۔ آفتاب داغ بھی قریب قریب اسی زمانہ کی تصنیف ہے اور یہ ذہنی کیفیات کی روشن تصویروں سے منور ہے۔ مہتاب داغ میں نہ تو گلزار کی سی مسحور کن خوشبو ہے اور نہ آفتاب کی سی خیرہ کن روشنی۔ تاہم یہ اپنے کام کی پوری پوری خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے اور چاندنی کی سی ٹھنڈی روشنی اپنے اردگرد برساتا ہے۔ اور اس طرح سے بڑھاپے کی مطمئن زندگی کی پُرسکون فضا پیش نظر کر دیتا ہے۔ لیکن اس آخری تصنیف میں آپ کو ایک مسلم الثبوت استاد کی پختہ مشقی کے نادر نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں ان خوبیوں کی کمی نہیں۔ جو غزلیات داغ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ داغ کی اس آخری تصنیف کے علاوہ جس کی ترتیب خود اُن کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئی۔ دو اور مجموعے اُن کی وفات کے بعد پبلک کے سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک "یادگار داغ" ہے جس کی فراہمی اس عقیدت کی مرہون منت ہے جو جناب احسن کو مرحوم کی ذات سے تھی۔ دوسرا مجموعہ لالہ سری رام ایم۔اے کی مساعی جمیلہ کا شرمندۂ احسان ہے۔ یہ مجموعہ لالہ سری رام نے مہتاب داغ کے ایک نہایت ہی نفیس ایڈیشن کے ساتھ ضم کرکے خود طبع کرایا تھا۔

ایک اور مجموعہ انوارِ محمدی پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا ۔ اس کا نام دیوان داغ ہے اور اس میں داغ کے جملہ دیوانوں سے منتخب اشعار دیئے گئے ہیں۔ میرے نزدیک ان مجموعوں کی اہمیت جو حضرت داغ کے بعد مرتب کئے گئے۔ زیادہ تر اس مقصد پر مبنی ہے کہ ایسے شہرۂ آفاق شاعر کی تمام غزلوں کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے ۔ کیونکہ داغ کے سینکڑوں مداح جو سارے ملک میں موجود ہیں۔ یہ چاہتے تھے کہ مرحوم کی تمام تصنیفات محفوظ ہو جائیں ۔ ورنہ ان سے داغ کی اس شہرت میں بہت کم اضافہ ہو سکتا ہے ۔ جو پہلے تین دیوانوں کی اشاعت سے قائم ہو چکی تھی ۔ یادگار داغ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی نام کی ایک اور چھوٹی سی کتاب سے بالکل مختلف چیز ہے ۔ جو آگرہ سے محمد اکبر علیخاں صاحب افسوں شاہجہانپوری نے شائع کی تھی ۔ اس کتاب میں مصنف کے حالات زندگی اور منتخب اشعار درج کئے گئے ہیں ۔ داغ کے حالات زندگی پر مشتمل جو مختصر رسالے لکھے گئے ہیں ۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا رسالہ جو سید محمد فاروق کی تصنیف ہے ۔ حالات داغ اور تصانیف داغ کا ایک قابل مطالعہ مختصر مجموعہ ہے ۔

داغ کی تصنیفات پر یہ تبصرہ نامکمل رہیگا ۔ اگر ہم فریاد داغ کا ذکر نہ کریں یہ ایک مسلسل نظم ہے اور مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس نظم کا تعلق حضرت داغ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ سے ہے ۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا ہے کہ داغ کے تینوں سوانح نگاروں نے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ۔ اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ اس پردہ پوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب حضرت داغ اپنے آپ کو کلکتہ کی ایک مغنیہ کی طرف مائل پاتے تھے ۔ یہ مغنیہ نہ صرف گانے کے فن میں ماہر تھی بلکہ شعر بھی کہتی تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے صادر کیا جائے ۔ لیکن اس میں کوئی عجیب بات نہیں تھی اور نہ یہ غیر قدرتی تھی ۔ حجاب بحیثیت ایک مغنیہ کے لازمی طور پر داغ کی غزلوں سے مانوس ہوگی ۔ کیونکہ یہ گانے کیلئے بہت موزوں تھیں ۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ شعر لکھنے میں طرز داغ کی تقلید کرتی ہوگی ۔ داغ جب کلکتہ گئے اور کسی مجلس سرود میں حجاب سے دوچار ہوئے ہونگے ۔ تو دونوں پر ایک دوسرے کی خصوصیات کا انکشاف ہوا ہوگا ۔ حالانکہ دونوں کا میدان عمل ایک دوسرے سے الگ الگ واقع ہوا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوران قیام کلکتہ میں حجاب کے ساتھ داغ کی آشنائی ترقی کر گئی اور ان کے دل پر اس کے دوامی اثرات منقوش ہو گئے ۔ ان اثرات کا اظہار انہوں نے فریاد داغ میں اسقدر آزادی کے ساتھ کیا ہے کہ اس بارے میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہیئے ۔

حجاب نے داغ پر واضح کر دیا تھا کہ میں آپ کی سانولی رنگت اور آپ کے نا ملائم مردانہ خدوخال کی وجہ سے آپ کی مداح نہیں ۔ بلکہ بطور شاعر آپ کو اپنا ممدوح سمجھتی ہوں ۔ داغ نے بھی اس امر کو کمال صفائی کے ساتھ اپنی نظم میں ظاہر کیا ہے ۔ دوسری طرف داغ جوان نہیں تھے کہ حجاب کے ذاتی حسن سے مسحور ہو جاتے ۔ وہ بھی اس کے جذبہ قدر شناسی ہی کے مداح تھے اور سمجھتے تھے کہ اس میں ادبیات سے لطف اندوزی کی اہلیت اور اہل جوہر سے واقفیت بڑھانے کی خواہش موجود ہے ۔ یہ آشنائی ناپائدار ثابت ہوئی ۔ اور داغ کے مختصر قیام کلکتہ کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ اس کے بعد اس سے پیشتر جب داغ کی زندگی خاتمہ کے قریب تھی ۔ اس کے متعلق کچھ دیکھنے سننے میں نہ آیا ۔ اس وقت داغ کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں حجاب ایک زن پیر کی حیثیت میں اپنے ممدوح شاعر کو خراج تحسین ادا کرنے کے لئے حیدر آباد آئی ۔ اگر اس سانحہ کو ان واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مجھے اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے شاعر یا اس کے سوانح نگاروں کو محجوب ہونے کی ضرورت ہو ۔ میں نے اس سانحہ کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ داغ کے بعض اشعار کا پورا پورا لطف اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا ۔ جب تک اس سانحہ کے کچھ حالات معلوم نہ ہو جائیں ۔ کہا جاتا ہے کہ داغ نے اس سانحہ کے متعلق جو مثنوی لکھی ۔ اسکے لکھنے میں انہیں زیادہ عرصہ نہ لگا ۔ اس معاملہ کے اولین اثرات کو اشعار کی شکل میں قلمبند کرنا ان کے لئے قدرتی طور پر اس وقت بہت آسان تھا جب وہ تازہ دم کلکتہ سے واپس آئے تھے ۔ اس نظم میں سادگی کی شان اس حد تک نمایاں ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہر شعر میں جو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہے ۔ جذبات اور محسوسات کا سمندر موجزن نظر آتا ہے ۔ ساری نظم میں آورد کا نشان تک نہیں ۔ اس لحاظ سے یہ پاکیزگی اور سادہ پن کا بہترین نمونہ ہے ۔ حتےٰ کہ اس کا وہ حصہ بھی جو محض رسمی ہے اور اس لئے بالکل خشک ہونا چاہیئے تھا ۔ جدت کی شان اپنے اندر رکھتا ہے ۔ مثال کے طور پر شعرا کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا آغاز اپنے ادبی سرپرست کی تعریف سے کرتے ہیں ۔ جسے وہ ممدوح کہتے ہیں ۔ داغ نے بھی چند اشعار نواب رامپور اور ان کے دارالریاست کی تعریف میں لکھے ۔ جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال کمال راحت و آرام کے ساتھ بسر کئے تھے ۔ لیکن جہاں دوسرے مشرقی شعرا عام طور پر مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں ۔ وہاں داغ نے سادگی ۔ صفائی اور زندہ دلی کا نمونہ پیش کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ؂

ہے عجب شہر مصطفےٰ آباد　　　اس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں　　　ہم تو آرام پور کہتے ہیں

خبر نواب کی مناتے ہیں ؛ جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

جن اشعار میں داغ نے عشق کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسقدر سادہ۔ پُرجوش اور موسیقانہ ہیں کہ ان کے کسی ہمعصر کی تصانیف میں ان کی مثال نہیں ملسکتی۔

اس مختصر اور محدود مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں فریاد داغ کی شاعرانہ خوبیوں پر کوئی طویل تبصرہ یا اس پر تفصیلی تنقید کرسکوں۔ جن اصحاب نے اس نظم کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں اُن سے سفارش کرونگا کہ وہ اس کو پڑھیں اور اس کے متعلق اپنے طور پر رائے قائم کریں۔ اس کے متعلق میری اپنی رائے جیسا کہ میں پہلے ظاہر کرچکا ہوں۔ بہت بلند ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر داغ اپنے پیچھے تین ضخیم دیوان نہ چھوڑ گئے ہوتے۔ تو بھی یہ مختصر سی نظم انہیں ایک اردو شاعر کی حیثیت سے شہرت دوام کا حقدار بنا دیتی۔

محاورات اردو کے مالک کی حیثیت سے نیز ایک شخص کی حیثیت سے جو سادہ ترین الفاظ کو ایک لڑی میں پرو کر ان میں انتہا درجہ کا جوش اور اثر پیدا کرسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کسی ایسی ہستی کا ملنا مشکل ہے۔ جو داغ سے بڑھی ہوئی ہو۔ داغ کے اشعار جہاں ذوق کے انداز کلام کی بہترین خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہاں شوخی اور جدت کے اعتبار سے بدرجہا زیادہ بلند ہیں۔

شعرائے قدیم میں سے بالاتفاق میر اثر ریز اور رقت انگیز ہیں اور سودا کھڑکدار اور مرعوب کُن اشعار لکھنے میں سب سے بڑے استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ داغ کے اکثر اشعار میں ان دونوں قدیم استادوں کی خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں۔ محاورہ بندی کے اشتیاق میں ان کا انداز سخن بعض اوقات سوقیانہ ہوجاتا ہے یہ بات داغ جیسے ذیشان شاعر کی شان کے شایاں نہیں اور اکثر اوقات اسے مخالفانہ تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔ لیکن داغ میں یہ عیب اس قدر کم ہے کہ اس پر بہت زیادہ سختی و سنجیدگی کے ساتھ لے دے کی ضرورت نہیں اسی طرح ان کے دیوانوں میں بعض اشعار ایسے ہیں۔ جن کو معلمانِ اخلاق پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے لیکن ایسے اشعار کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں اور اس امر واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ داغ نے نہ تو کبھی اخلاقی شاعر ہونے کا دعوے کیا اور نہ کبھی ایک معلم اخلاق کی حیثیت اختیار کی۔ اس عیب کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے پھر ان اشعار کو خارج کر دینے کے بعد بھی جن کو کسی حد تک قابل اعتراض سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کے دیوانوں میں کافی سے زیادہ مواد اس قسم کا باقی رہ جاتا ہے جو ادبی لفظ خیال سے بہت بلند۔ اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے وہ اشعار جن میں انہوں نے عدیم المثال کامیابی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتا ہے یا جن میں نہایت موثر الفاظ میں انسانی ادراک و تجربہ کے نتائج بیان کئے ہیں۔ ان کی تصانیف میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور اردو نظم کے شائقین ان سے بیحد حظ اٹھا سکتے ہیں۔

داغ کے پہلے تین دیوان اس قابل ہیں کہ ناظرین اُن سے فائدہ اٹھائیں حقیقت یہ ہے داغ اور امیر اپنے زمانے کے بہترین غزل گو شاعر تھے۔ دنیائے تغزل میں داغ کا درجہ ان کے تمام ہمعصروں نے بلند تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ حالی نے ایک غزل میں قدیم دہلی کی عظمت کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

امیر نے بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں جو داغ کی زمین میں لکھی گئی۔ داغ کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جسکا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

داغ نے زندگی بھر جس انہماک کے ساتھ لٹریچر کی خدمت کی۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ وہ ایک مشرقی شاعر کی حیثیت سے زندہ ہے۔ اور اسی حیثیت میں مرے۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد میں وفات پائی۔ انہوں نے عمر بھی بڑی پائی اور اعزاز و اکرام بھی بہت حاصل کئے۔ ان کی وفات پر ملک بھر کے ادبی حلقوں میں عالمگیر ماتم کیا گیا۔ اور بے شمار مرثیے لکھے گئے۔ ان میں سے موثر ترین مرثیہ پنجاب کے شہرہ آفاق شاعر ڈاکٹر اقبال کا تھا۔ اس مرثیہ میں ڈاکٹر اقبال نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ کے عمل کا دقیق تجزیہ کرنے کی طاقت داغ کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت ہے اور ذیل کے خوبصورت الفاظ میں بتایا ہے کہ دہلی کا یہ آخری باکمال شاعر جذبات عشق کی کیسی کیسی پاکیزہ تصویریں کھینچتا تھا۔ ؎

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے ؛ مے پلائیں گے ندساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائینگی کتاب دل کی تفسیریں بہت ؛ ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت
ہوبہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون ؛ اُٹھ گیا ناوک فگن مارےگا دل پر تیر کون

اس مختصر سے مضمون میں داغ کے مختلف دیوانوں سے اسقدر منتخب اشعار پیش کرنا آسان نہیں۔ جن سے اُس خوبی اور تاثر کا کافی اندازہ ہوسکے۔ جو غزلیات داغ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ البتہ چند غزلوں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آفتاب داغ کے چند افتتاحی اشعار صوفیانہ شاعری کے درخشاں نمونے ہیں۔ اور اردو کے کسی پرانے یا نئے شاعر کے ایسے ہی اشعار کے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کئے جا سکتے ہیں۔ داغ کہتے ہیں ؎

اللہ رے مرتبہ مرے سجدۂ نیاز کا ؛ گویا جواب ہے ترے تکبیر ناز کا
تو مہر لب ہے حکم ترا اس کا کیا علاج ؛ دل بولتا ہے خود بخود آگاہ راز کا

عالم تمام چشمِ حقیقت نگر بنا ۔ ۔ منہ دیکھتا ہے آئینہ ۔ آئینہ ساز کا
جل جل کے تیرے عشق میں گھل جائیں استخواں ؛ مانندِ شمع لطف ہے سوز و گداز کا
دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم ؛ کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

کونین جس کے ناز سے جکڑا رہے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا

اگرچہ اخلاقی شاعری داغ کے افتخار کا حقیقی سرمایہ نہیں اور نہ انہوں نے اختلاف آموزی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ تاہم ذیل کے اشعار سے جو مرحوم کے دیوان سے منتخب کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہوگا کہ وہ اس میدان میں اردو کے کسی شاعر کا مقابلہ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ؎

ڈوبتے ہیں عرقِ شرم میں غیرت والے ؛ ڈوب مرنے ہی پہ جب آئے تو دریا کیسا
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں تو پروا نہ کریں ؛ لوگ کرتے ہیں بُری بات کا چرچا کیسا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا ؛ مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا
نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا ؛ پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

خدا جب دوست ہے اے داغ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

اُن کے بہت سے معمولی اشعار بھی اس قدر پُر معنی ہیں کہ ان کو تقریروں اور تحریروں میں ایسے موقعوں پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا جاتا ہے۔ جن کے لئے وہ ابتداءً مقصود نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ذیل کے ہر دو شعر موجودہ زمانہ کی پولیٹیکل حالت کے بعض پہلوؤں پر نہایت موثر پیرایہ میں چسپاں ہونے کے قابل ہیں۔ ؎

وہ کچھ سنائیں کہ صبا درد مند ہوا ؛ قفس میں بند ہوئے پر بھی میں نہ بند ہوا
مجھے تو شیوۂ آزادگی کمند ہوا ؛ کہ دامِ قطعِ تعلق میں پا سے بند ہوا

لیکن داغ کا مخصوص میدان عشق ہے۔ اگرچہ اردو اور فارسی شاعری میں یہ میدان بہت پامال ہو چکا ہے۔ تاہم داغ نے اپنے جذبات کا اظہار ایسے خوشنما الفاظ میں کیا ہے اور ان الفاظ کو ایسی ندرت اور جدت کے ساتھ ترتیب دیا ہے کہ جو لوگ غزل کا مذاق رکھتے ہیں۔ وہ داغ کے اشعار سے کبھی نہیں اکتا سکتے۔ ذیل کے اشعار سے زیادہ خوبصورت اشعار اور کیا ہو سکتے ہیں؟ ؎

مزا ہر نے کو تازہ ملا ہے عشقِ جاناں کا ؛ نگہ کو دید کا لب کو فغاں کا۔ دل کو ارماں کا
کیا ہے ایک دستِ آرزو نے وار دو جا ؛ زلیخا کے جگر تک چاک ہو یوسف کے داماں کا

تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا ؛ ادھر چمکی۔ اُدھر سُلگی یہاں پھونکا وہاں پھونکا

کبھی بیٹھے کبھی اُٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے ؛ تماشا دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا

ہم ترے کوچے سے اے یار چلے جاتے ہیں ؛ لے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں
گرچہ سو سو ہیں تغافل کہ نہ جانے کوئی ؛ ان نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں
ہم نہیں جانتے کچھ دیر و حرم کا رستہ ؛ ہم مئے عشق میں سرشار چلے جاتے ہیں

ملتے ہی بیباک تھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی ؛ پھر گئی چھپنا کے پلکوں تک حیا آئی ہوئی
میرا یہ دعوے کہ کوئی انکے سوا ملیں نہیں ؛ اُنکا یہ الزام اچھی قیدِ تنہائی ہوئی

داغ کی غزلوں سے ان اقتباسات کو ختم کرنے سے پیشتر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ایک مخمس سے چند بند پیش کروں۔ اس مخمس سے انہوں نے نواب یوسف علیخاں والئے رام پور کی ایک غزل کو مرصع کیا تھا۔ اس غزل میں نواب صاحب نے ان خیالات کی تضحیک کی تھی۔ جو غزل گو شعرا میں معشوق کے متعلق رائج ہیں اور اس طرح اپنی غیر معمولی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس غزل میں معشوق عاشق کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ اردو شاعری میں عشاق اپنے معشوقوں کی جو تعریفیں کرتے ہیں وہ بعض حالتوں میں کیسی لغو اور لچر ہوتی ہیں۔ ؎

کہتے تھے وہ لشکر کو جو دل دے لشکر غلط ؛ دیوانہ ہو کسی کا کوئی یہ سراسر غلط
شامت جو آئی ان کا بیاں جان کر غلط ؛ میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

ہوتے ہیں ایک بات کی تہ میں ہزار جھوٹ ؛ تصدیق کیجئے تو بس انجام کار جھوٹ
اور پھر ڈرائیں پول کے بے اعتبار جھوٹ ؛ تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سحر غلط

یا لب پہ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا ؛ یا کچھ عیاں ہوا اثرِ گرمیٔ غذا
یا جھوٹ بولنے کی خدا نے یہ دی سزا ؛ سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ ۔ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

اس مضمون کو ختم کرنے کے لئے ذیل کے چند اشعار حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں اقبال نے جو داغ کو بجا طور پر دہلی کے آخری شاعر کا خطاب دیتے ہیں نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ اس عالی مرتبہ شاعر میں انسانی جذبات کا دقیق تجزیہ کرنے کی غیر معمولی قدرت تھی۔ ؎

چل بسا داغ آہ میت اسکی زیبِ دوش ہے ؛ آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے
اور دکھلائینگے مضموں کی ہمیں باریکیاں ؛ اپنی فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچکر رلوائیں گے ؛ یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائینگے [۲]

---

[۲] اس چمن میں ہونگے پیدا بلبلِ شیراز بھی ؛ سینکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانہ سے ؛ مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ؛ ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون ؛ اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

فریبِ محبّت

بعض وقت انسان سے ایسے کام ہو جاتے ہیں جن کا احساس خود اُسے اپنی نظروں میں آپ ذلیل کر دیتا ہے یہ کام چاہے جان بوجھکر کئے گئے ہوں یا بے سمجھے، مگر شرمناک اور تکلیف دہ ضرور ہوتے ہیں۔ ایسے کاموں کا باعث عورت ہوتی ہے یا روپیہ۔ آہ! عورت، اُف! روپیہ! ....

افسوس! کون کہہ سکتا تھا کہ مجھ جیسے مخلص، مجھ جیسے ایماندار سے بھی غلطی ہوگی اور پھر ایسی شرمناک غلطی! اُف اس کا خیال مجھے مارے ڈالتا ہے۔ ہائے میں نے کیا کیا؟ لوگ اپنی ریاکاریوں کو چھپاتے ہیں کہ بدنام نہوں لوگ اپنی غلطیوں کو بھول جاتے ہیں کہ بے وقوف نہ بنیں، مگر میں اپنی غلطی، اپنی بوالہوسی، اور اپنی بے وقوفی کی داستان لوگوں کو اپنی ہی زبانی سنانے پر اُتر آیا ہوں کہ عبرت ہو۔

میں جن دنوں "مدرسہ طبیہ" میں تعلیم پا رہا تھا میرے ساتھ ایک اور طالب العلم بھی تھا جو بالکل میرا ہم خیال اور ہم مذاق تھا، ہم نے نہ صرف مدرسہ ہی میں ملکر پڑھنا شروع کیا بلکہ گھر پر بھی دونوں ملکر مطالعہ کرتے، تفریح کو بھی دونوں ملکر جاتے اور تجربے بھی دونوں ملکر کرتے تھے، اس میل ملت نے دوستی اور گہری دوستی پیدا کر دی، ایک دو دن نہیں پورے تین سال تک ایک جگہ اُٹھنے بیٹھنے سے بالکل دونوں ایک ہو گئے، طبی تعلیم ختم ہوئی اور دونوں نے ملکر امتحان دیا، میں نے تمام مضامین میں "صفر" حاصل کیا مگر میرا دوست احمد صرف "تشریح" میں کامیاب ہوا۔ باقی مضامین اس کے بھی رکھے رہے اس ناکامیابی نے کچھ ایسا شرمایا کہ ہم نے طبی تعلیم چھوڑ دی۔ فارسی کیطرف توجہ کی اور ملکر پڑھنے لگے نہ جانے اس طرح کب تک عمر برباد ہوتی مگر بعض ناگہانی حادثوں نے میرے دوست کو اپنی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے پر مجبور کر دیا، وہ اپنے باپ کو دفن کر کے پلٹا ہی تھا کہ ماں موت کے بستر پر پڑ گئی۔ بیچاری کی تیمارداری کرنے نہ پایا تھا کہ خود بھی لیٹ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ طاعون کا اثر نوجوانوں پر بوڑھوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے احمد کی والدہ کے گلٹی نکلنے کے دوسرے روز احمد کو گلٹی نکلی حالانکہ اس کی حالت بوڑھی والدہ سے زیادہ خطرناک تھی مگر وہ بچ گیا اور اس کی ماں جنت کو سدھاری، یہ دونوں حادثے ایسے خلافِ امید اور پریشان کرنیوالے تھے کہ احمد کو روزگار کی فکر کرنی پڑی، اس نے نوکری کرلی۔ اور تنہا زندگی بسر کرنے کی ٹھان لی اگر دوست احباب، عزیز اقارب مجبور نہ کرتے اور بار بار ملیریا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُسے ایک تیماردار کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ یقیناً شادی نہ کرتا مگر اُسے مجبور ہونا پڑا۔ اور شادی کرنی پڑی۔ باہر کی لڑکی ہوتی تو ممکن ہے کہ اسکو کچھ اعتراض ہوتا مگر چچا کی لڑکی تھی جس سے اس کو اُنس بھی تھا، چھ مہینے تک کچھ معلوم ہی نہوا کہ وہ کیس طرح بسر کر رہا ہے۔ اس مدت میں ہماری دوستی برابر قائم رہی شادی سے پہلے یہ دستور تھا کہ احمدؔ صبح سات بجے میرے گھر پر آتا اور ہم دونوں دس بجے تک بیٹھے باتیں کرتے، دس بجے میں مدرسہ جاتا اور احمد مکان جاکر کھانا کھاکر دفتر چلا جاتا، میں چار بجے مدرسہ سے واپس آکر گھر پر اس انتظار کرتا وہ پانچ بجے کچہری سے میرے پاس آجاتا ہم دونوں ملکر چائے پیتے اور ٹہلنے نکل جاتے، ہم دونوں سینما کے شوقین تھے اس لئے نہیں کہ وقت گزاریں بلکہ محض اس لئے کہ سینما کے ذریعے انگریزوں کی معاشی اور سماجی زندگی سے واقف ہوں، چنانچہ ہم نے بزعم خود انگریزوں کے متعلق سینما کے پردے کی حد تک بڑی بڑی تحقیقیں کی تھیں، اگر نئے کھیل کے شروع ہونے کا دن ہوتا تو ہم سینما جاتے ورنہ گھوم گھما کر لوٹ آتے رات کے گیارہ بارہ بجے تک احمد میرے پاس ٹھہرا رہتا۔ مگر احمدؔ کی شادی ہونے کے بعد ہم نے مشورہ کر کے اس نظام العمل میں تبدیلی کر لی تھی۔ یعنے تعطیل کے روز تو احمد صبح کو میرے پاس آجاتا اور دوپہر تک ٹھہرتا مگر دوسرے دنوں میں وہ صبح مجھ سے نہیں ملتا تھا، گھر سے دفتر جاتا اور دفتر سے گھر آکر میرا انتظار کرتا میں مدرسہ سے اس کے مکان پہنچ جاتا اور وہیں چاء پی کر ٹہلنے نکل جاتے سینما دیکھنے ضرور جاتے مگر کم اور تفریح سے واپس بھی جلد ہو جاتے تھے، عموماً رات کو نو بجے تک میں احمدؔ کے پاس ٹھہرتا اور پھر مکان آجاتا۔

ہماری آپس کی دوستی نے اسقدر بے تکلفی اختیار کی تھی کہ کسی قسم کی غیریت محسوس ہوتی ہی نہ تھی احمد کی بی بی مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی وہ مجھے "بھائی" کہا کرتی تھی اور میں اسے "بھابی" کہتا تھا۔ انیس سال کی نہایت ہی حسین، شرمیلی، گداز بدن والی، ہنسمکھ، تیز، تعلیم یافتہ، اور مہذب عورت تھی، اپنے شوہر کے علاوہ اگر وہ کسی سے بے تکلف ہوکر بات کرتی تو وہ صرف میں تھا۔

احمد گو پڑھا لکھا تھا، منشی تک فارسی تعلیم پائی تھی معمولی عربی بھی جانتا

تھا، انگریزی سے بھی اتنا واقف تھا کہ سینما کے پردے کی عبارت روانی سے پڑھ کر سمجھ لیتا تھا، اردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ زبان بھی صاف تھی۔ طبیعت بھی موزوں تھی، کبھی کبھار غزل بھی کہہ لیتا تھا مگر اس کے باوجود ادبیات سے دلچسپی نہ تھی، بخلاف اس کے اس کی بیوی "رشیدہ" صرف اردو جانتی تھی مگر "ادبیات" سے بہت دلچسپی رکھتی تھی، مولانا نذیر احمد کی تمام کتابیں دیکھ چکی تھی، مولوی بشیر الدین کی کتابیں مجھ سے لیکر دیکھتی تھی میرے پاس جسقدر رسائل آتے وہ سب پڑھتی - بعض بعض اچھے ناول بھی میں اسے دیا کرتا تھا جسے وہ بہت شوق سے پڑھتی۔ مجھ سے ہمیشہ ادبیات پر گفتگو کیا کرتی تھی۔ یہی گفتگو ہماری بے تکلفی اور موانست کی وجہ بنی۔ میں اسے اپنی عزیز سمجھتا تھا، اس کی فرمائشات کی تعمیل میں مجھے بڑا مزا آتا تھا، ایک سال تک ہم یوں ہی ملتے رہے، مگر چند ناگزیر وجوہات نے مجھے سفر پر مجبور کیا اور میں چھ ماہ تک گھر سے باہر رہا۔ واپس آیا تو احمد میں بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا اب احمد وہ احمد نہ تھا جو پہلے تھا اب اس نے پانچ وقت کی نماز شروع کر دی تھی، دوہرے پاجامے کی بجائے اکہرا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر تک کا پہنا کرتا تھا، قمیص سے نفرت ہو گئی تھی، کرتے سلوائے تھے۔ شیروانی پہننا ضرور تھا۔ مگر معمولی کپڑے کی، اسیطرح جوتے اور ٹوپی میں بھی اس نے تبدیلی کر لی تھی۔ یعنے "مولویت" کا جزو غالب ہونے لگا تھا صرف داڑھی کی کسر تھی وہ ابھی تک داڑھی منڈوانا تھا البتہ مونچھیں کتروانے لگا تھا، اس یکایک تغیر کا سبب نہ تو مجھے معلوم ہوا۔ اور نہ اسکی بیوی ہی کو، میں نے بھی تعلیمی سلسلہ کو خیر باد کہکر ملازمت کر لی تھی، اپنے پیشے کے مدِ نظر مجھے عموماً "برجس" "کوٹ" اور "سوٹ" پہننا پڑتا تھا جس پر احمد کو اعتراض رہا کرتا تھا مگر یوں ہی سا........ رشیدہ اس کی اس "بیابانیت" سے خوش نہ تھی اس کے اس لباس پر میں نے اسے "بیابانی" کہنا شروع کیا تھا اس خطاب سے رشیدہ کو بھی اتفاق تھا وہ بھی ہنسکر کبھی کبھی کہہ دیتی کہ "آخر یہ بیابانیت کب تک عید کو تو کوئی ٹوٹڈ کی شیروانی سلوا لو اور وارنش کا پمپ شو لے لو"۔ مگر احمد ہنسکر ٹال دیتا، اس کی طبیعت میں بخل پیدا ہو چلا تھا، شادی سے پہلے اس نے سگریٹ کی عادت ترک کر دی تھی۔ اب اس نے سینما بھی چھوڑ دیا، خود بھی معمولی کپڑے پہنتا اور بیوی کو بھی معمولی کپڑے پہنانے کی کوشش کرتا، آمدنی کا تقریباً نصف حصہ اس نے جمع کرنا شروع کر دیا تھا، مکروہات دنیوی نے مجھے کچھ ایسا آلودہ کیا کہ میں بسلسلہ ملازمت مہینوں گھر سے باہر رہنے لگا۔ اور تقریباً تین سال تک اسی طرح بے گھر پھرتا رہا۔ آخر تھک کر میں نے سر رشتہ بدل لیا۔ جب کہیں آرام و اطمینان نصیب ہوا۔ ابھی میں گھر پر مستقل رہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ احمد کو حج کی سوجھی اس نے دو سال کی چھٹی بھی لے لی۔ حج کے بعد عتبات عالیہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا ارادہ بھی تھا، مشکل یہ تھی کہ احمد کے گھر پر سوائے رشیدہ کے اور کوئی نہ تھا نہ تو احمد ہی کے والدین تھے اور نہ رشیدہ ہی کے، رشتے ناطے کے عزیز تو بہت تھے مگر احمد کی کسی سے بنتی نہ تھی، رشیدہ کی تنہائی کے متعلق کئی روز تک احمد اور میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے آخر یہ طے ہوا کہ رشیدہ میرے گھر پر رہے، میرے گھر میں والدہ مرحومہ تھیں اور مجھ سے چھوٹے چار بھائی، والد مغفور ملازمت کی وجہ سے گھر پر نہیں رہتے تھے میں نے والدہ سے تذکرہ کیا اور انہوں نے نہایت خوشی سے رشیدہ کو اپنے گھر میں رکھنا منظور کر لیا۔ نہ صرف یہی بلکہ دوسرے ہی روز ماما کے ذریعہ رشیدہ کو کہلوایا کہ تم اپنے شوہر کے روانہ ہونے سے پہلے ہی ہمارے پاس آ کر رہ جاؤ۔ مگر رشیدہ اس کے لئے آمادہ نہ تھی کیونکہ والدۂ مرحومہ ذرا سخت طبیعت کی تھیں اور پردے کی بڑی پابند تھیں انہیں یہ سنکر بڑا تعجب ہوا کہ احمد کی بیوی مجھ سے پردہ نہیں کرتی، ایک دفعہ کسی تقریب میں رشیدہ ہمارے ہاں آئی تو والدہ نے اس سے کہا کہ تم کو غیر مرد کے سامنے ہوتے کچھ حجاب نہیں ہوتا، چاہے تمہارے شوہر کا دوست سہی مگر میرا لڑکا آخر غیر ہی تو ہے بہتر یہ ہے کہ تم اس سے پردہ کیا کرو ایک جوان عورت کا جوان مرد کے سامنے ہونا، پھر وہ بھی جو غیر ہو اچھا نہیں"۔ رشیدہ نے اسوقت نہ جانے کیا کہا مگر واپس آ کر احمد کے سامنے اس نے والدہ کی شکایت کی اور اسکے بعد دو تین بار بلوانے پر بھی ہمارے گھر نہیں آئی، اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ رشیدہ احمد ہی کے مکان پر رہے اور میں اسکی نگرانی کرتا رہوں!

شعبان کی پہلی تاریخ کو احمد بمبئی روانہ ہوا، میرا خیال تھا کہ بمبئی تک پہونچا آؤں مگر وہ کہنے لگا۔ بھیا! اس میں شک نہیں تم بمبئی تک میری دلچسپیوں میں اضافہ کرتے رہو گے مگر غریب رشیدہ یہاں تنہا کیسے رہیگی میں صرف تمہارے بھروسے پر تو اسے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے مجبوراً خدا حافظ کہا۔ وہ بمبئی میں ایک ہفتہ قیام کر کے جہاز پر سوار ہو گیا۔

رشیدہ احمد کے چلے جانے کی وجہ سے اداس رہنے لگی میں نے اسکی اداسی کو دور کرنے کے لئے زیادہ آنا جانا شروع کیا، صبح سات بجے جا کر نو بجے تک ٹھہرتا اور پھر پانچ بجے جا کر رات کے دس بجے تک اور کبھی کبھی بارہ بجے تک اسی کے پاس ٹھہرا رہتا، گھر، باہر ایک ملازم اندر دو مامائیں اور ایک چھوکری اور ایک چھوٹا سا چھوکرا تھا، مگر اس کے باوجود رشیدہ صرف میرے رہنے تک بیٹھی رہتی اور میرے جاتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ رہتی،

خدا غارت کرے اس پلیگ کو نہ جانے کتنوں کو برباد کریگا۔ احمد کے جانے کے دوسرے مہینے ہی پلیگ آیا اور بڑے زور و شور سے آیا میں نے رشیدہ کو مجبور کیا کہ میرے گھر پر چل کر رہے مگر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی نتیجہ

یہ نکلا کہ ملازم فرار ہوگیا، دونوں ماما ئیں بھاگ کھڑی ہوئیں، عید کے روز رشیدہ کو بخار آیا اور دوسرے روز جنگاسے میں گلٹی نکل آئی، چھوکری کمسن تھی اور چھوکرا اس سے بھی چھوٹا علاج تو معقول ہو رہا تھا مگر تیمارداری کون کرے یہ تکلیف وہ خدمت بھی مجھی کو اپنے سر لینی پڑی، غریب رشیدہ چار روز تک بیہوش پڑی رہی شدت کا بحران چیختی چلاتی، ڈاڑھیں مار مار کر روتی، بستر سے اُٹھ اٹھ کر دوڑنے لگتی۔ میرا یہ حال کہ چوبیس گھنٹے اس کے پلنگ کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اُٹھاتا، بٹھاتا، دوا پلاتا، انتہا یہ کہ لباس بھی بدلتا، وہ بیہوشی میں بڑاتی تو احمد کا اور میرا نام لے لے کر اور بس! خدا خدا کر کے پندرہویں دن گلٹی پھوٹی اور آثارِ صحت رونما ہونے لگے ایک مہینے کے بعد غریب رشیدہ نے غسلِ صحت کیا مگر گھل کر آدھی رہ گئی تھی۔ چہرہ سفید پڑ گیا تھا جسم میں لہو کی بوند نہ رہی تھی، قوت بے انتہا گھٹ گئی تھی۔ اختلاج بھی شدت سے ہونے لگا میں سمجھتا تھا کہ پلیگ سے بچنے کے بعد مجھے چھٹکارا نصیب ہوگا مگر کہاں؟ اس اختلاج کے مرض میں بھی مجھی کو تیمارداری کرنی پڑی گو اس میں زیادہ تکلیف نہ ہوتی تھی مگر رات مجھے رشیدہ کے پاس بسر کرنی پڑتی تھی وہ سوتے سوتے چونک کر اُٹھتی میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتی۔ میں پنکھا جھلنے لگتا اور وہ بے خبر سو جاتی، ایک دو نہیں چار مہینے گزر گئے مگر اختلاج کم نہیں ہوا۔ مس ڈیکاسٹا کہتی کہ رشیدہ کا دل بہت قوی ہوگیا ہے اختلاج کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی، چہرے سے کسی مرض کے آثار نمایاں نہیں ہوتے پہلے ہی کی طرح جسم بھی گداز ہوگیا تھا، چہرے پر بھی رونق آگئی تھی۔ طبیعت میں زندہ دلی اور چُہل پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا سب کچھ تھا مگر رات کو نیند نہ تھی سوتے سوتے چونک کر اٹھنا مجھ سے مذاق کرنا اور پھر زانو پر سر رکھکر لیٹ جانا! ....

مس کیبسٹر نے ایک دفعہ دل کی حرکت اور نبض کی حرکت دیکھ کر کہا بی بی تمہارا اختلاج آسانی سے رفع ہوسکتا ہے بشرطیکہ ہمارے دوست کوشش کریں۔ میں اس اشارے کو سمجھا تو سہی مگر اُلٹا یعنے یہ کہ احمد کو بلانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اُسے تفصیلی خط لکھا اور تاکید کی کہ جلد واپس آجائے۔

گو ناٹک سے مجھے دلچسپی نہ تھی مگر دوست احباب کے جبر سے اور کچھ اس خیال سے کہ بہت دنوں کے بعد ناٹک کمپنی آئی ہوئی ہے جمعرات کی رات کو پہلا کھیل دیکھنے کے لئے میں بھی تیار ہوگیا، چونکہ اس کمپنی کا یہاں پر یہ پہلا کھیل تھا اس لئے لوگ گرے پڑتے تھے ہم نے "جگہ محفوظ" کرا لی تھی دن کو رشیدہ سے ناٹک میں جانے کا تذکرہ کیا تو اس نے مجبور کر کے یہ وعدہ لے لیا کہ "ناٹک سے آکر اسی کے گھر پر سو جاؤں" مکان سے کھانا کھا کر آٹھ بجے نکلنا پڑا۔ نو بجے "تماشہ گھر" میں پہنچا۔ اور ساڑھے نو بجے رات سے کھیل شروع ہوا "ناٹک کا چبوترا" غضب ڈھا رہا تھا اور پچھلے پردے" تو آفت تھے اس پر قیامت یہ کہ "ایکٹ کرنے والی عورتیں" فتنہ تھیں فتنہ "باغِ ایران" کھیل تھا، ٹھیک تین بجے تماشہ ختم ہوا، ہر ایک اپنے اپنے گھر چلا، میں سیدھے رشیدہ کے گھر پہنچا۔ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور خود رشیدہ نے آکر کھول دیا غریب میرے لئے ابتک جاگ رہی تھی صحن میں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے ایک کے چادر کی سلوٹیں ظاہر کر رہی تھیں کہ رشیدہ اس پر لوٹتی رہی ہے، دوسرا پلنگ صاف تھا دس منٹ تک ہم ناٹک ہی کی باتیں کرتے رہے پھر رشیدہ نے مجھے سو جانے کو کہا اور خود بھی اپنے پلنگ پر دراز ہوگئی، چار بجنے کے بعد مجھے نیند آئی بمشکل ہی آدھ گھنٹہ سویا ہونگا کہ چیخ کی آواز نے چونکا دیا۔ دیکھتا ہوں کہ رشیدہ چارپائی پر پڑے ہاتھ پاؤں پٹک پٹک کر چیخ رہی ہے، میں نے اُٹھکر اسے جگایا، وہ آنکھیں کھول کر وحشت آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ پھر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس طرح لپٹ گئی جیسے چھوٹا بچہ ڈر کر لپٹ جاتا ہے، میں نے مجبوراً اسے سینے سے لپٹا لیا اور اس کے برابر لیٹ کر اُسے تسلی دینی شروع کی، آہ! عمر بھر میں پہلی مرتبہ میں نے ایک عورت کو اپنے سینے سے لگانے کی جرأت کی تھی مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے لپٹایا یا وہی لپٹ گئی۔ میرا خیال تک نہ تھا میں نے مجبوراً اسے لپٹایا کراہت کے ساتھ اس کے برابر لیٹنے کی جرأت کی، مگر اس کے بعد وہی بار بار بیچ بیچ کر مجھے اپنے سینے سے لپٹاتی گئی۔ ہائے وہ کسقدر خوفزدہ تھی، مگر اس کا یہ خوف بہت جلد زائل ہوگیا وہ اسی طرح کھل کھلا کر ہنسنے لگی اور پھر ہائے .... اذان کی آواز نے تیر کی طرح دل اور دماغ پر اثر کیا، میرا ضمیر مجھ پر لعنت کر رہا تھا میرے ہاتھ پاؤں، میرے ہونٹ میرا رُواں رُواں مجھ پر ہنس رہا تھا۔ میں نے اٹھکر شیروانی پہنی اور اُسے سوتے ہوئے چھوڑ کر مکان کا راستہ لیا، دو دن سخت ندامت، انفعال، کوفت، پشیمانی رہی مگر تیسرے روز کوئی اثر باقی نہ رہا۔

آہ! چھ مہینے اور گذر گئے اور ....

عورت! اُف عورت!! "پنچ منتر" میں صحیح لکھا ہے کہ "وہ ایک سے بات کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیان تیسرے کی طرف ہوتا ہے جسکو وہ دل میں جگہ دیتی ہے" "ہتوا پدیش" کی یہ نصیحت آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "عورت ہمیشہ بے وفا ہوتی ہے حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کی استریاں بھی ایسی ہی تھیں" ہسپانیہ والے اچھا کرتے ہیں جو یہ دعا مانگتے ہیں کہ "خدا ہمیں عورتوں سے بچائے"

کاش رشیدہ مجھ سے بے پردہ نہ ہوتی — روما کے مشہور فلاسفر "ترتولیان" نے ٹھیک کہا ہے کہ عورت کا دیکھنا سننا چھونا ہر چیز

خطرناک ہے" میں اسوقت تک عورت سے ناواقف تھا میں اسے ایک لطیف چیز سمجھے ہوا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ اسمیں ایسے "چرتر" بھی ہوتے ہیں۔ تلسی داس نے ٹھیک کہا ہے کہ "عورت کے چرتروں کا سمندر ایسا اتھاہ ہے کہ اس کا تھاہ ملنا غیر ممکن ہے" آہ! کسی نے سچ کہا ہے "عورت ایک بلاکت کا گڑھا ہے، اس کا دل جال ہے دونوں ہاتھ ہتھکڑی ہیں اور وہ خود موت سے زیادہ تلخ ہے" آہ! اُس نے مجھے معصیت کے ایک گہرے غار میں گرانے کے علاوہ میرے دل کو سیاہ کرنے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، ایک برس گذر گیا، میں اور وہ اسی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے جس حیثیت سے کہ "احمد اور رشیدہ" کو زندگی بسر کرنی چاہیئے تھی۔

احمد کے خطوط متواتر آتے رہتے تھے مگر آخری خط اُس نے مدینہ منورہ سے رجب میں لکھا تھا کہ وہ آئندہ ہفتے کو وہاں سے کوچ کریگا اس کے بعد سے ذیقعدہ تک کوئی خط وصول نہیں ہُوا، میں اس کی صحت کی وجہ فکر میں پڑا ہُوا تھا مگر رشیدہ مطمئن تھی، احمد کی دوستی اب بھی باقی تھی، میں اُسے اب بھی ویسا ہی عزیز رکھتا تھا بعض بعض وقت اس خیانت کے خیال سے بدحواس ضرور ہو جاتا، مگر رشیدہ بڑے ہی اطمینان سے میرے خیالات بدل دیتی۔ چند دوستوں نے مجھے گلبرگہ شریف کے عرس کے لئے کھینچا میں رشیدہ سے اجازت لیکر گلبرگہ چلا گیا۔ پانچویں دن لوٹا تو گھر پر سامان رکھکر رشیدہ کے ہاں گیا۔ دیکھتا ہوں کہ رشیدہ نہایت اداس بیٹھی ہوئی ہے، چوڑیاں ندارد، جسم پر سفید لباس، میرا ماتھا ٹھنکا میں جوں ہی قریب پہونچا وہ اُٹھ کر لپٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی جب ذرا خاموش ہوئی تو میں نے واقعہ پوچھا، رشیدہ نے پاندان میں سے ایک خط نکال کر دیا جو میرے لئے بھی نہایت رقت انگیز تھا۔ کربلائے معلّے سے کسی شخص نے اطلاع دی تھی کہ احمد نے ہفتہ کو انتقال کیا اور اُس نے وصیت کی تھی کہ اس کے انتقال کی اطلاع دو آدمیوں کو دی جائے۔ گھر آکر میں نے اپنی ڈاک دیکھی تو ایک خط اپنے نام کا بھی اسی مضمون کا اور اسی شخص کا لکھا ہوا ملا۔ احمد کی موت نے میرے دل پر خاص اثر کیا، میں نے رشیدہ کے پاس آنا جانا بھی کم کر دیا، دن میں صرف ایک مرتبہ جاتا اور کھڑے کھڑے لوٹ آتا، رشیدہ بھی ایک "ستی ورتا" کی طرح نہایت ہی اندوہگین رہتی تھی، احمد کا چہلم ہوا، رشیدہ کے ایام عدت بھی گذر گئے۔ مگر اُسکے رنج وغم میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ تو وہ مجھ سے اچھی طرح گفتگو کرتی اور نہ میرے ٹھہرنے یا کم آنے جانے کے متعلق کچھ پوچھتی تھی۔ اندازاً آٹھ مہینے یوں ہی گذر گئے، ایک دفعہ رات کے دس بجے میں رشیدہ کے گھر پہونچا وہ کرسی پر لیٹی ہوئی ناول پڑھ رہی تھی کئی ماہ کے بعد رات کے وقت مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر شاید حیران ہوئی ہو مگر چشم و ابرو سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا، میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا دیر تک ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی، میرا خیال تھا کہ دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس ہو جاؤں مگر بارہ بج گئے اور میں بیٹھا رہا جب چلنے لگا تو رشیدہ کھڑی ہوگئی میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگی "عابد! میرا کیا حشر ہوگا دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی اور نہیں میں تمہاری اور صرف تمہاری ہوں اب تک مجھے بھی مرحوم کا غم تھا اور تمہیں بھی مگر اب خداوند عالم نے دونوں کو صبر دیدیا، کیا تم اسی طرح مجھے رکھنا چاہتے ہو یا کچھ اور خیال ہے؟" میں اس سوال کا جواب دینے کو تیار نہ تھا میری پریشانی دیکھ کر اُس کی آنکھیں بھر آئیں وہ فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھانپ کر رونے لگی، میں نے کہا "جانمن میں صرف تمہارا ہوں تم جس طرح رہنا چاہتی ہو رہو اب کوئی بات ایسی نہیں جسکی وجہ سے ہم جُدا ہوں جب تک میں زندہ ہوں تم سے جُدا نہیں ہو سکتا"۔ اس گفتگو نے اتنی طوالت اختیار کی کہ مجھے رات وہیں بسر کرنی پڑی صبح ہم دونوں اس نتیجے پر پہونچ چکے تھے کہ ہمیں "نکاح" کرلینا چاہیئے۔ میں گنہگار ضرور تھا مگر اس گناہ سے منفعل بھی تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں اس گناہ کا خاتمہ ہو دوسرے روز ہمارا نکاح ہوگیا، نہ تو اس کی اطلاع میرے عزیزوں کو ہوئی اور نہ رشیدہ یا احمد کے عزیزوں کو صرف میرے چار دوست مدعو تھے اور بس۔

گھر پر اس نکاح کی اطلاع پہونچی تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ والد، والدہ اور دوسرے عزیز و اقارب پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے، کیوں کیا؟ کسواسطے کیا؟ کس سے پوچھکر کیا؟ بیوہ سے کیا! شیعہ سے کیا! غیر گھرانے کی لڑکی سے کیا! اپنی مرضی سے کیا! کوئی اعتراض ایسا نہ تھا جو ہم پر نہ کیا جاتا ہو، میں نے اسی میں خیر دیکھی کہ کچھ دنوں اسی احمد والے مکان میں جا رہوں چنانچہ میں چند ہی روز کے بعد گھر سے غائب ہوگیا اور رشیدہ کے پاس رہنے لگا، اِدھر ان لوگوں نے ڈرایا دھمکایا، بلکہ بائیکاٹ بھی کیا مگر تابکے آخر چند روز کے بعد سب ٹھنڈے ہو گئے، ایک روز شام کو والد اور والدہ دونو مل کر ہمارے مکان پر آ پہونچے کچھ لعنت ملامت کی، کچھ سمجھایا منایا اور ہم دونوں کو ساتھ لے گئے چلو قصہ ختم ہوا۔

اسی طرح ڈیڑھ سال گذر گیا ہماری بچی "راشدہ" نو مہینے کی تھی۔ خاصکر دادی کی بیحد پیاری تھی۔ ہم نہایت ہی مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے، احمد ہمارے نزدیک بالکل مردہ تھا اور اس کے مردہ ہونے کا ہم لوگوں اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ اپنے زندہ ہونے کا۔

ایسے وقت میں یکایک اس اطلاع کا ملنا کہ "احمد آگیا" کسقدر حیران کُن ہو سکتا تھا؟ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے رشیدہ کو تو سانپ سونگھ گیا میری والدہ وغیرہ بھی سخت متحیر تھیں کہ یہ کیا ہوا، خیر میں نے

دریافت کیا تو پتہ چلا کہ احمد اپنے خالہ زاد بھائی کے گھر پہ ٹھہرا ہوا ہے وہاں پہنچا تو ملاقات ہوئی، ایک سفید ریش جبہ پوش اور عمامہ بند بزرگ سر سے پاؤں تک عربی لباس میں ملبوس مجھ سے "بھائی عابد!" کہکر لپٹ گئے۔ اگر احمد منہ سے کچھ نہ کہتا تو میں ہرگز نہ سمجھتا کہ یہ ریشائیل شخص احمد ہے غضب خدا کا اتنی لانبی ڈاڑھی اور پھر لطف یہ کہ ایک بال بھی سیاہ نہیں، اس مردہ شخص سے ملکر تعجب اور حیرت کے علاوہ مسرت ہوئی یا رنج ہوا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اس سے ملتے ہوئے شرم ضرور آ رہی تھی میرا ضمیر مجھ پر لعنت کر رہا تھا، خیر میں . . . گھنٹے بھر کی ردو قدح کے بعد احمد کا سامان اٹھوا لیا اور اپنے ہاں لا رکھا، رات کو ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد احمد نے اپنے سفر کا حال بیان کرنا شروع کیا اور بمبئی سے چلنے کے بعد سے کربلائے معلّٰے پہونچنے تک کا تفصیلی حال سنا کر اس نے ایک بنڈل خطوط کا میرے سامنے رکھدیا کہ انہیں پڑھ لو، یہ مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے خطوط تھے جن میں سے بعض احمد کے عزیز تھے بعض رشیدہ کے عزیز تھے اور بعض دوست اور محلے والے سارے خطوط کا مضمون واحد تھا یعنے "رشیدا اور عابد ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں" پھر احمد کہنے لگا،

"عابد! خدا کی قسم مجھے ملال ہوا اور بے انتہا ملال ہوا کہ تم نے میری امانت میں خیانت کی مگر دو تین دن تک متواتر غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ اسمیں زیادتی تمہاری مطلق نہیں، پہلی غلطی میری ہے کہ میں نے پردہ نہیں کروایا، دوسری غلطی بھی میری ہی ہے کہ میں اُسے تمہاری نگرانی میں چھوڑ گیا، تیسری بات یہ سمجھ میں آگئی کہ اسمیں رشیدہ کو بھی دخل ہے اگر وہ آمادہ نہوتی تو تم ہرگز کامیاب نہو سکتے، اس کو محسوس کر کے میں نے یہ طے کر لیا کہ رشیدہ سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا جائے اسی لئے اس مضمون کا خط لکھوایا کہ وہ مجھ سے نا امید ہو کر کسی سے نکاح کر لے چاہے تمہیں کیوں نہو، یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اس سے نکاح کر لیا ہے اور ایک لڑکی بھی ہوئی ہے اور دونوں مسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو مجھے بڑی مسرت ہوئی، خدا تمہیں اسی طرح رکھے"

احمد کا ایک ایک لفظ میرے لئے نشتر کا کام کر رہا تھا میرا دل بھر آیا میں روتا ہوا اس کے قدموں سے چمٹ گیا وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اُس نے مجھے سینے سے لگا کر کہا "عابد! میں نے تمہیں اسی وقت معاف کر دیا جب پہلا خط ملا تھا البتہ آج رشیدہ کو بھی معاف کرتا ہوں، جس روز میں نے خط لکھوایا اسی روز طلاق بھی دیدی تھی اب وہ میری بیوی نہیں بلکہ تمہاری منکوحہ ہے اور میں اس نکاح پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ انہیں الفاظ کو رشیدہ کے کان تک پہونچا دے مگر وہ آمادہ نہ ہوا، وہ یہی کہتا رہا "بے پردگی کے نتائج کا میں تجربہ کر چکا ہوں اب تمہیں کس طرح اس امر کی اجازت دوں کہ ایک غیر مرد کے سامنے اپنی منکوحہ کو بے پردہ کر دو"

احمد اب بھی میرا دوست ہے گو وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا اور بوڑھا نظر آتا ہے۔ مگر شام کے پانچ بجے سے گیارہ بجے رات تک میرے گھر پر رہتا ہے تعطیلات میں دن بھر میرے پاس ہی ٹھہرتا ہے۔ رشیدہ کی لڑکی "راشدہ" کو بہت چاہتا ہے اور جب تک میرے پاس رہتا ہے اُسے گود سے اُترنے نہیں دیتا، رشیدہ اب اسے ایک فرشتہ سمجھتی ہے بعض بعض وقت اُسے خود بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایسے نیک شخص سے بے وفائی کی۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنے حرکات پر منفعل اور نادم ضرور رہتا ہوں مگر احمد سے اسی طرح ملتا ہوں، وہی چھیڑ چھاڑ، وہی دل لگی مذاق وہی فقرے پھبتیاں . . . .

عورت کے متعلق اس کے خیالات بہت خراب ہیں پنچ منتر "تو اپدیش" "تزلولیاں" اور عورتوں کے دشمن پادریوں اور راہبوں کے اقوال اس کے وردِ زبان رہتے ہیں۔ خاص طور پر بقراط کا یہ قول وہ ہمیشہ دُہراتا رہتا ہے کہ :- "عورت خوبصورت درندہ ہے"

تمکین کاظمی

رباعی

اف باغِ امید کے نمو کی تاثیر پتّی پتّی کے رنگ و بُو کی تاثیر
کانٹوں میں بھی دلکشی ہے پھولوں کی سی اللہ ری فریبِ آرزو کی تاثیر

(اردو ایم اے)

وقت کی قدر و قیمت

جب نپولین بونا پارٹ اپنی تھکی ہوئی باقی ماندہ فوج کے ساتھ ویلنگٹن سے لڑانے کے لئے غروب آفتاب سے بہت دیر بعد واٹرلو کے میدان میں پہنچا۔ تو رات کی بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکی اور تنگئ وقت کو محسوس کرتے ہوئے یوں گویا ہوا۔ "میں شیطان کی طاقت حاصل کرنے اور ان دو گھنٹوں کی رفتار کو بدلنے کے لئے سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہوں!"

میں پوچھتا ہوں کتنے آدمی ہیں جو اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ گزرے ہوئے دن اور سال کو واپس لا سکیں یا اسکو ٹھہرا سکیں! لوگ وقت کی تیز رفتار کو ہمیشہ نگاہِ حسرت سے دیکھتے اور ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ اب وقت گیا اور اب وقت گیا لیکن وہ نہیں جانتے کہ ایسا کرنے میں بھی وہ ایسے قیمتی اور بیش بہا لمحات زندگی کو ضایع کر رہے ہیں۔ جو نہایت موزوں طریقوں سے مستعمل ہو سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو بے سوچے سمجھے کسی غلط موضوع پر زور دیتے ہیں۔ زندگی کے اس بے بہا سرمائے کو ایسی بے دردی سے کھو دیتے ہیں۔ گویا اس کی کچھ قیمت ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کثرت وقت ان کے لئے بارِ گراں بن جاتا ہے۔ حالانکہ اپنی اصلاح کا پہلا سبق وقت کی قدر۔ اس کا بچاؤ۔ اور اس کا صحیح صحیح استعمال ہے۔ موقع کی نایابی مساوات کا فقدان اور نا اہلوں پر نوازش کا شکوہ عام ہے۔ لیکن یاد رہے وقت اور تندرستی جو زندگی کی بہترین نعمتیں ہیں کسی خاص شخص کا حصہ نہیں۔

وقت جو سب سے زیادہ گراں بہا اور سب سے زیادہ عزیز چیز ہے کبھی خرید یا فروخت نہیں کی جا سکتی۔ ایک غریب سے غریب اور نادار فقیر کے پاس بھی اتنا ہی وقت ہے جتنا کسی بادشاہ یا صدر کے پاس۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی سونا یا دوسری دھات کی چیزیں بنا لے لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ گذرے ہوئے وقت کو پھر حاصل کر لے۔ اسمیں شک نہیں کہ وقت نہایت سہل طریقے سے ضائع ہو سکتا ہے لیکن ضائع اور برباد کیا ہوا وقت کسی طرح واپس نہیں ہو سکتا۔

مقاطعہ اور ہڑتال کی بلا جو آجکل قومی زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے بے انتہا تضیع اوقات کا باعث ہے۔ ذرا خیال کیجئے کہ ایک گروہ جو لاکھوں افراد پر مشتمل ہے۔ مقاطعہ کی ہٹ پر تلا ہوا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس ضد میں وہ کسقدر وقت جیسی گرانبہا چیز ضایع کر رہا ہے۔ بہتر تھا کہ وہ اس قیمتی وقت کو اپنی اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتا۔ وقت کو ضائع کرنا دنیا میں سب سے بڑی فضول خرچی ہے کیونکہ اس سے ایسی چیز ضائع ہوتی ہے جسکی پھر تلافی نہیں ہو سکتی۔ لوتھر کا قول ہے کہ "انسان کا دل ایک چلتی ہوئی چکی" کے مانند ہے کہ جبتک اس میں کوئی چیز پڑی رہے تو اُسے پیستی رہتی ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو وہ اپنے ہی کو پیس ڈالتی ہے"۔

انسان کی زندگی کا اوسط صرف تین لاکھ پچاس ہزار گھنٹے ہیں۔ اور ان میں سے ایک ایک لمحہ زر و جواہر سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ ہر منٹ جو تم ضایع کر دیتے ہو۔ ہر ایک لمحہ جس سے تم کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے تمہاری زندگی کو کم کر دیتا ہے۔ اور تمہارے لئے بھلائی اور نیکی کا وقت اُتنا کم ہو جاتا ہے۔ اپنے گذرے ہوئے وقت پر ذرا خیال کرو کہ تم نے کتنے قیمتی گھنٹے بیکار کھو دئے۔ بُرے طور پر استعمال کئے۔ کیونکہ جب تم وقت کو ضائع کرتے ہو یا اسکو نا معقول طور پر صرف کرتے ہو۔ تو تم اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارتے ہو۔ اپنے لئے خود گڑھا کھودتے ہو اپنی جسمانی صحت کو برباد کرتے ہو۔ اپنی طاقتوں کو ضائع کرتے ہو اپنے جوش۔ اپنی زندگی کے معیار اور اپنی کامیابی سب کو برباد کر دیتے ہو۔ غالباً تم اس سے ناواقف ہو لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ اگر تم اپنے وقت کو ضایع کر رہے ہو تو یقیناً تم اپنی صحت کو بھی برباد کر رہے ہو۔ کیونکہ صحت کی بنیاد زیادہ تر دماغی آرام و آسائش پر منحصر ہے۔ جو کسی کاہل اور مردہ دل کے لئے کبھی ممکن نہیں۔

فرینکلن کہتا ہے کہ "اگر تم کو زندگی سے محبت ہے تو وقت کو منتشر اور پریشان نہ کرو کیونکہ اسی سرمایہ پر زندگی کا دار و مدار ہے"۔

ہر طرف ہم یہی دیکھتے ہیں کہ جو لوگ دُنیا میں بلندی کیطرف پرواز کرنا نہیں چاہتے وہ موقع نہ ملنے اور بدقسمت ہونے کی شکایت میں وقت کے اپنے قیمتی اور انمول خزانے کو ضایع کر دیتے ہیں۔ ان کو دن۔ مہینے اور سال کے بیفائدہ گزرتے جانے کا مطلق افسوس نہیں ہوتا۔

ہر لمحہ جو تم ضائع کر رہے ہو۔ بے شمار فوائد کو نقصان سے بدل دیتا ہے۔ برعکس اس کے ہر منٹ جو تم مفید کام پر استعمال کرتے ہو۔ سرمایۂ وقت کی منفعت بخش تجارت ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہر ایک بچے کو اس بیش بہا نعمت کی قدر کرنی سکھائی جائے۔ وہ جسکو دولتمند لوگ بھاری رقم ادا کرکے

خریدنے کو تیار ہیں اور جسکو غریب نیچے نکما جان کر پھینک دیتے ہیں۔

مسٹر ایڈیسن نے ایکدفعہ انتہائی جوش مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی مجھے وہ چند گھڑیاں جن کو جنہیں لوگ بے سوچے سمجھے ضایع کر دیتے ہیں کئی لاکھ ڈالر کے بدلے دیدے"۔

میں تجارتی مقامات میں جانا اس لئے گوارا نہیں کرتا۔ کہ میں نوکروں کو وہاں سُست و کاہل یا اس انتظار میں کھڑا دیکھتا کہ شاید کوئی گاہک نکل آئے اور کچھ خریدلے لیپسند نہیں کرتا۔ شاید وہ اس کا احساس نہیں رکھتے کہ ان کے اس طرز عمل میں بہت کچھ نقص ہے اور اس سے بہت سے عالی دماغ لوگ وقت کی بے قدری کا سبق سیکھتے ہیں۔

بہت سے پیشہ ور ایسے بھی ملینگے جنہوں نے اپنی فرصت کے لمحوں سے اپنی زندگی کو ترقی کے اعلٰی رتبے پر پہنچا دیا۔ آندھی و طوفان کے دن جبکہ خریداروں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ لوگ ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور نثر و نظم کے بہترین حصے سے دل بہلاتے اور دماغ میں روشنی اور تازگی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کے پودے کو سوکھنے نہیں دیتے بلکہ اُسے سرسبز بنا کر پھل پھول دینے کے قابل بنا لیتے ہیں۔

انسانی دماغ فطرتاً ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کسی کام کا طالب ہوتا ہے۔ بیکاری سے اُسے نفرت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشمار ایسے طریقے موجود ہیں۔ جن سے پیشہ وروں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کہ ان کے کاروبار میں مخل نہ ہو۔ بلکہ ان کے پیشے کے کارآمد ہونے میں اضافہ کر دے۔

لارڈ نارتھ کلف کو وقت اتنا عزیز تھا کہ پانچ منٹ بھی ضائع کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک منٹ کو اپنی عمر کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔

ایک پوسٹ ماسٹر جنرل کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک پریزیڈنٹ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اور کسی ضروری امر پر بحث کرنے کے لئے آدھ گھنٹہ وقت کی درخواست کی۔ پریزیڈنٹ صاحب چونک پڑے اور کہا "میرے دوست۔ آدھ گھنٹہ! اتنا وقت! تین منٹ کے اندر خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم تباہ ہوگئی ہے۔ تم کو اپنے خیالات مختصر طور پر ظاہر کرنے ہونگے"۔

کسی دوسرے کا وقت ضائع کرنا چوری سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ درحقیقت زندگی کے ایک حصے کی چوری ہی ہے۔ خصوصاً جب وہ شخص ہر ایک لمحہ کو خوش اسلوبی سے صرف کر رہا ہو۔ کیا تم نے کبھی اس بات کا خیال کیا ہے کہ تم اس دنیا کے ایک کارآمد جزو ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں بھی اس ڈرامے میں ایک ایکٹر کی حیثیت سے اپنا پارٹ ادا کرنا ہے؟ اور جو کچھ تم سے خاص ہے اُسے دوسرا نہیں کہہ سکیگا۔ اگر تم اپنی زندگی بغیر کچھ کئے گذار دیتے ہو تو یاد رکھو۔ تم قدرت کے عطیے کو ضایع کر رہے ہو۔ اور ان قوتوں کو برباد کر رہے ہو جن کے زور پر دنیا کا رنگ بدل دیا جا سکتا۔

گلیڈسٹون کہتے ہیں کہ "یقین جانو وقت سوچ سمجھکر خرچ کرنا مستقبل میں تمہارے لئے ایسا منفعت بخش سودا ہوگا جس کا تمہیں ابھی وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

تم دوسروں کا رونا روتے ہو کہ فلاں کی قسمت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کئی لاکھ روپے کا مالک بن گیا ہے مگر اس دولت کو وہ بڑی بے رحمی سے ضائع کر رہا ہے۔ تمہیں افسوس ہوتا ہے کہ امریکہ کے نوجوان روپیہ کو ضایع کر رہے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ روپے کی بربادی ایک نوجوان کی زندگی کی بربادی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ قیمتی وقت کی بربادی مال و زر کی بربادی سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے۔

تم روپیہ ضائع کر دو۔ زمینیں، جاگیریں، مکانات، دولت، ثروت سب کو برباد کر دو۔ مگر اپنے انمول وقت کے ایک منٹ کو بھی رائگاں نہ جانے دو۔ دنیا کی کوئی طاقت تمکو اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ اور کوئی سلطنت اس کے مخفی دفینوں کا معاوضہ نہیں دے سکتی۔

کسقدر تعجب خیز امر ہے کہ جن لوگوں کا واحد سرمایہ "وقت" ہے وہ بھی اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔

اکثر نوجوان سمجھتے ہیں کہ ان کا وقت چنداں قیمتی نہیں ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ وہ جس وقت کو بے دریغ ضایع کر رہے ہیں اس کا کوئی لمحہ ایک گوہر بے بہا ہو۔ اگر تمہارے پاس لاکھوں روپے بھی ہوں پھر بھی تم ایک گھنٹہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر گھنٹہ جو گذرتا ہے تمہاری زندگی سے کم ہو جاتا ہے۔ جب تم وقت کو شطرنج۔ تاش اور ناچ میں ضائع کرتے ہو۔ تو تم خود اپنے لئے گڑھا کھودتے ہو اور اپنی ترقیوں کو بیک قلم صفحہ ہستی سے معدوم کر دیتے ہو۔ تم وہ کام کرتے ہو جو تم کو مقصود زندگی سے کوسوں دُور کر دے۔

تضیع اوقات خسارہ کا سودا ہے کیونکہ یہ اپنے ساتھ دیگر قیمتی اشیاء کو ضایع کر دیتا ہے وقت کا ضایع کرنا اپنی زندگی کی اُمنگوں کا خون کرنا ہے زندگی کے معیار کو گرانا ہے۔ تضیع اوقات کے معنی ہیں۔ نصب العین کو دھواں دھار تاریکی میں چھپانا۔ اپنی آئندہ ترقی کو دبانا اور پیچھے ہٹانا۔ تضیع اوقات تمہاری کامیابیوں، تمہاری خوشیوں۔ تمہاری عملی قوتوں اور تمہارے اچھے ارادوں کو برباد کر دیتی ہے۔ تضیع اوقات تمکو بدنام کرنے والی۔ تمہارا اعتبار کھونیوالی، تمہاری قدر گرانے والی اور تم کو ذلیل و رسوا کرنے والی چیز ہے۔

جو شخص اپنے وقت کو عادتاً ضائع کرتا ہے وہ کبھی بلندی کو نہیں پہونچتا۔ وہ نہ اپنے لئے مفید ہو سکتا ہے اور نہ تہذیب و شائستگی کی ترقی میں اس کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے۔

کارلائل نے کہا ہے کہ "تاریخ بڑے بڑے آدمیوں کی سوانح زندگی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ بڑے لوگ جنہوں نے دنیا کی تاریخ بنائی۔ اور ہمارے سامنے ترقی کا وہ مرقع پیش کیا جس سے ہم آج بہرہ اندوز ہو رہے ہیں نہایت معمولی گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ بڑے بڑے فلسفی، محقق، موجد، ماہر طبعیات، صناع، تاجر، شاعر، ماہر موسیقی، بڑے بڑے اساتذہ سیاسی مدبّر چند کے سوا سب کے سب غریب " " " " " " " " " بچے تھے۔ جنہوں نے محض وقت کے صحیح استعمال اور قدر دانی سے اپنے کو ترقی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ ان کے لبوں پہ قسمت کا شکوہ نہ تھا۔ وہ موقعوں کی انتظار میں ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھے نہیں رہے۔ وہ بیرونی اثرات کے متمنی نہ تھے۔ ہاں تو پھر یہ چڑھائیاں وہ کیونکر چڑھے؟ یہ اعلیٰ مدارج ان کے قبضے میں کیونکر آئے؟ وہ سر بفلک بلندیوں پر کس شعبدہ بازی یا کس جادو کے زور سے پہونچے؟ یہ جادو وقت کی قدر اور صرف وقت کی قدر ہے۔

(سوئٹ مارڈن)

آغا عبد الستار خاں

خیالات

اے وفا کے دیوانے حدّتِ تمنا کیا — بے ثبات ہے دنیا اعتبارِ دنیا کیا

آہِ نارسا کیا ہے - جذبِ دل کی کمزوری — جذبِ دل مکمل کر - آسماں کا شکوا کیا

ہوئی نہ ردّ و بدل عشق کے فسانے میں — تغیرات ہزاروں ہوئے زمانے میں

یہ مصلحت تھی زمانے سے منہ چھپانے میں — کہ میرے ساتھ وہ رسوا نہوں زمانے میں

قفس میں بھی ہے مگر نامِ قید سے موسوم — وہی سکوں جو میسّر تھا آشیانے میں

تم آئینے میں ذرا اپنی شکل تو دیکھو — مبالغہ ہی سہی عشق کے فسانے میں

ہنوز تشنگیٔ دید کی شکایت ہے — تباہ ہوگئے ہم دل کے ناز اُٹھانے میں

تمہارا تیر بھی خوننابۂ جگر پی لے — ابھی شراب ہے میرے شرابخانے میں

نہ دیر کر ارے صیّاد - رُوح مضطر ہے — چھُری چلا کہ پہونچ جاؤں آشیانے میں

دعا یہ مانگ کہ آجائے مرگِ ناکامی — سکون و امن کہاں اے شفا زمانے میں

شفا اکبرآبادی

تاریخ کے اوراق پارینہ

اسپارٹا کی اشتراکی حکومت

اسپارٹا کا مشہور قانون ساز لائیکرگس نویں صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ اگرچہ اکثر مورخین نے اس کے وجود ہی میں شبہ کیا ہے۔ لیکن زمانہ حال کے مورخین کا اتفاق ہے کہ اس نام کا ایک شخص ضرور تھا اور وہ غالباً اسپارٹا کے بادشاہ کا بھائی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت زیادہ سیاحی کی۔ کریٹ مصر وغیرہ کی سیر کی اور غالباً ہندوستان بھی آیا۔ اس کی اس وسیع سیاحت کا ہی نتیجہ تھا کہ اُس نے سپارٹا کے واسطے ایک نیا قانون وضع کیا۔

تمام قوانین اشتراکیت ہی کے قسم کے وضع کئے گئے۔ لیکن زمانہ حال اشتراکیت سے اختلاف رکھتے تھے۔ چونکہ تمام قوانین لائیکرگس نے اپنے ہی وطن کے واسطے وضع کئے تھے۔ وہ اپنی ہمسایہ اقوام کو مثل غلام تصور کرتا تھا۔ لیکن زمانہ حال کا بالشویک ایک غیر ملکی کو بھی مثل اپنے ہم قوم کے اچھا جانتا ہے۔

نہ تو ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس کا حلیہ کیا تھا۔ اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد اُس نے دوبارہ سیاحت کی غرض سے وطن کو خیرباد کہا۔ لیکن پھر واپس نہ آیا۔ غالباً وہ اس طرز معاشرت کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو اُس نے خود سپارٹا کے سر منڈھا تھا۔

لائیکرگس کو اپنی اصلاحات کے جاری کرنے میں سخت مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ تہور پیشہ طبقہ کے ایک نوجوان الکنڈر نامی نے طیش میں آکر اُس کا پیچھا کیا۔ اور اُس کے سر پر ایک لکڑی رسید کی۔ پلوٹارک کی روایت کے مطابق۔ اس حملہ کا سبب ایک مجوزہ قانون تھا جس کی رو سے تمام لوگ ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھانے کے لئے مجبور کئے گئے تھے۔ اور کھانا پکانے کے واسطے ایک قومی باورچی مقرر کیا جانے والا تھا۔ علاوہ ازیں لائیکرگس نے اپنی اور متعدد تجاویز الکنڈر کے سامنے پیش کیں۔ جن کی وجہ سے الکنڈر اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور لائیکرگس پر حملہ کر بیٹھا۔

الکنڈر (حیرت اور غصے کے لہجہ میں) کیا تم تمام زمینداروں کی اراضی چھین لوگے۔

لائیکرگس (مسکرا کر) میں جہاں مناسب خیال کروں گا تلافی بھی کر دونگا۔

الکنڈر۔ میں سمجھ گیا۔ زمینداروں کے نقصان کی تلافی بالکل نہیں کی جائیگی۔

(لائیکرگس نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا بلکہ مسکرایا اور اپنے شانے ہلا کر رہ گیا۔

یہ دونوں شخص محل کے ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ الکنڈر نے سامان آرائش کی طرف اشارہ کر کے کہا "میرے خیال میں یہ تمام خوشنما چیزیں قومی ملکیت ہو جائیں گی"

الکنڈر۔ نہیں۔ بلکہ یہ تمام اشیاء برباد کی جائیں گی۔ ان سے جمہور کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ کوئی ایسی چیز جو عوام کے لئے فائدہ مند نہ ہو اس قابل نہیں کہ دنیا میں باقی رہے۔ خوبصورت کمروں کے واسطے خوبصورت ساز و سامان کی ضرورت ہے اور خوبصورت ساز و سامان کاہلی و عیش پسند زندگی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس واسطے آئندہ تمام عمارات نہایت معمولی قسم کی تعمیر کی جائیں گی اور تزئین و آرائش بالکل نہ ہوگی۔"

نوجوان۔ اس صورت میں سپارٹا صنعت و حرفت میں کچھ بھی ترقی نہ کرے گا۔

لائیکرگس۔ بالکل نہیں۔ حقیقت میں اس کے بعد صدیوں تک سپارٹا نے تہذیب میں کچھ بھی اضافہ نہ کیا

الکنڈر۔ کس قسم کی حکومت تم قائم کرنا چاہتے ہو؟

لائیکرگس۔ دو بادشاہ ہوں گے ایک میرے خاندان سے۔ دوسرا مخالفین کے خاندان سے۔ لیکن اُن کے ہاتھ میں کوئی حکومت یا اختیار نہ ہوگا۔ وہ محض خاندانی سردار کی حیثیت سے رہیں گے اور ایک دوسرے کی زندگی کا نہایت غور سے معائنہ کرتے رہیں گے۔ ایک سینیٹ قائم کیا جائیگا۔ لیکن سینیٹ کی تمام کارروائی پبلک اسمبلی کی منظوری کی محتاج ہوگی اور اس طرح حکومت حقیقت میں جمہوری ہی کے

ہاتھ میں ہوگی۔ تیس سال سے زیادہ عمر کا ہر شخص جس نے مفید کارآمد زندگی بسر کی ہو اسمبلی کا ووٹر ہوگا۔

الکزنڈر۔ "غریب و امیر کیا سب کو یہ حق حاصل ہوگا؟"

"نہ کوئی رئیس ہوگا نہ غریب ہر شخص کے پاس اپنی اراضی ہوگی۔ اپنا مکان اور ضروری ساز و سامان ہوگا۔ روپیہ پیسے کا بازار سرد ہوگا اور خرید و فروخت ختم ہو جائیگی۔"

"ایں تو کیا تجارت بالکل نہ ہوگی؟"

"بالکل نہیں۔ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حکومت ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے واسطے ضروری سامان مہیا کر دے گی۔ میرا ارادہ ہے کہ سرمایہ داری کسی صورت میں بھی دنیا میں باقی نہ رکھی جائے۔"

"اے میرے خدا اسپارٹا کا منظر نہایت غمناک ہوگا۔"

لائیکرگس۔ بالکل نہیں بالکل نہیں۔ میری تجویز ہے کہ ہنسی لازمی قرار دی جائے

الکزنڈر۔ ہمارے واسطے ہنسی کا سامان ہی کیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو تمام ہنسی ہماری ہمسایہ قوموں ہی کے حصے میں ہوگی۔

لائیکرگس۔ اُن میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ ہمارا مذاق اُڑا سکیں۔ ہم سب لڑائی کے واسطے تیار رکئے جائیں گے۔ اگرچہ ہماری لڑائی ہمیشہ مدافعانہ ہوگی میری تجویز ہے۔ کہ بچپن ہی سے سپارٹا کے ہر باشندے کو یہ سمجھا دیا جائیگا کہ اُس کا جسم و جان سب حکومت کی ملکیت ہے اور جمہور کی بہبودی کے واسطے اس کو عمر بسر کرنی ہوگی۔

الکزنڈر۔ یہ بات تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس تجویز کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائیگا؟"

لائیکرگس۔ جب بچہ پیدا ہوگا تو والدین اُس کو ایک کمیٹی کے سامنے پیش کریں گے۔ اگر اس بچے کی صحت خراب ہوگی تو اس کو پھینک دیا جائیگا۔ سات برس کی عمر میں ہر لڑکے کو والدین سے جُدا کر لیا جائیگا۔ حکومت اس کی تعلیم کی ذمہ دار ہوگی۔ درجہ بدرجہ اس کو سختی برداشت کرنے کی عادت ڈالی جائے گی۔ یہاں تک کہ بیس سال کی عمر میں وہ فوجی خدمات کیواسطے کافی طور پر مضبوط ہو جائیگا۔"

الکزنڈر۔ کس طریقے سے تم اس کو مضبوط بناؤ گے؟"

لائیکرگس نے گردن ہلا ہلا کر جواب دیا "اس کے بہت سے طریقے ہیں ان کو کپڑے پہننے کی کبھی کبھی اجازت دیجائے گی۔ ان کو غسل کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ بستر کی بجائے ان کو پیال بچھانی ہوگی جو وہ خود ہی بغیر درانتی کے اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ کر جنگل سے لایا کریں گے اور کبھی کبھی کوڑوں سے اُن کی خبر لیجایا کریگی۔"

"اگر معصوم بچے نیک ہوں گے تو کیا پھر بھی پٹا کریں گے؟"

"یقیناً۔ اُن کی پٹائی گویا ایک قسم کا امتحان ہوگا جو مضبوط ہوں گے وہ اس کو سہ جائیں گے اور زندہ بچ رہیں گے۔"

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم ڈنڈوں سے مار مار کر اُن کی جان کھو دو گے؟"

"ہاں میرا یہی خیال ہے۔ کیونکہ کمزور بچے حکومت پر بار ہوں گے اس کے علاوہ اُن کے اُستاد اُن کو آپس میں لڑوایا کریں گے۔ تاکہ لڑائی کا مادہ اُن میں پیدا ہو۔ اور ان کو چوری کرنا بھی سکھایا جائے گا۔

الکزنڈر نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا "چوری! کیا چیز چرانا سکھایا جائیگا"

"باغوں میں سے سیب۔ کھیتوں میں سے ساگ۔ اور دوکانوں سے روٹیاں وغیرہ۔ اور اگر وہ پکڑے جائیں گے تو اُن کی مرمت کی جائیگی۔"

"لیکن اُن کو سزا کیوں دی جائے گی۔ جب چوری کرنا اُن کو خود سکھایا جائیگا۔"

"سزا اس واسطے دی جائے گی کہ چوری کامیابی کے ساتھ کیوں نہ کی۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لڑائی کے خطرات اور مصیبتوں کے سہنے کے عادی ہو جائیں گے۔

"فوجی خدمات کتنے عرصے تک کرنا پڑے گی"

"بیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک۔ اس کے بعد قومی کام اُن کے سپرد کر دیا جائیگا۔ اور ساٹھ سال کی عمر میں اُن کو خدمات سے سبکدوش کر دیا جائیگا۔"

"اور لڑکیوں کی بابت کیا ہوگا؟"

"لڑکیاں قومی ملکیت ہوں گی۔ مثل لڑکوں کے وہ بھی حکومت کے زیر اختیار ہوں گی اور اُن کو بھی مثل لڑکوں کے مضبوط بنایا جائیگا تمام جلسوں میں اور جلوسوں کے ساتھ ان کو برہنہ چلنا ہوگا تاکہ سردی اور گرمی کی برداشت کی طاقت اُن میں پیدا ہو اور خود نمائی اور ریا کی عادت جو خوبصورت لباس سے پیدا ہوتی ہے اُن میں پیدا نہ ہو"

الکزنڈر (بڑی حیرت سے) شادی کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائیگا؟"

"حکومت ہر نوجوان کے لئے دُلھن منتخب کرے گی۔ شادی کے وقت دُلھن اپنے بال کٹوا دیگی اور اُس کو مردانہ لباس پہنایا جائیگا تاکہ دُلھن کی وجہ سے دولہا میں کمزور زنانہ خیالات پیدا نہ ہوں۔ اور اس کی مردانگی کو ٹھیس نہ لگے۔"

الکنڈر ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا کی پناہ ۔
لائیکرگس ۔ ہم اس کے رفتہ رفتہ عادی ہو جائیں گے ۔
شوہر اپنی بیویوں کو کسی معاملہ میں روکنے ٹوکنے کے مجاز نہ ہوں گے ۔ اور اس طرح مردوں کے دلوں سے حسد اور رقابت کا جذبہ نکال دیا جائے گا ۔
الکنڈر (احتجاجانہ لہجہ میں) لیکن تم اس طریقہ سے خاندانوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دو گے ۔
لائیکرگس ۔ خاندانی اور گھریلو زندگی بالکل نابود ہو گی ۔ تمام دن شوہر اور اس کی زوجہ قومی کام میں مصروف رہیں گے اور چونکہ ہر قسم کی مصنوعی روشنی کا استعمال بالکل ممنوع ہو گا لہذا راتیں سوائے بستر پر سونے کے اور کچھ کام نہ ہو گا ۔"
نوجوان (گھبرا کر) اچھا تو میرے خیال میں سب لوگوں کو ایک ساتھ کھانا کھانا پڑے گا ۔
لائیکرگس ۔ نہیں ۔ بلکہ تمام کھانا قومی ہو گا ۔ ہر شخص کو اپنے حصے کا غلہ ۔ ترکاری ۔ گوشت اور شراب قومی باورچی خانہ میں لانی پڑیگی ۔ اور بعد ازاں وہ قومی دسترخوان پر بیٹھ جائیگا ۔ ایسے لوگ جو عمر رسیدہ ہونیکی وجہ سے بے کار ہو گئے گوشت نہیں کھا سکیں گے ۔ باقی سب لوگ بلاقید عمر قومی کھانے میں شریک ہوں گے ۔
الکنڈر "میرے خیال میں شراب پینا اُس وقت مناسب ہو گا ۔ کیونکہ میں تو دسترخوان پر آنے سے قبل کھانا کھا لیا کروں گا ۔"
لائیکرگس "نہیں ۔ اس کی اجازت نہ ہو گی جو شخص دسترخوان پر پہنچی ہوئی اپنے حصے کی خوراک نہ کھائیگا ۔ ضرور سزا پائیگا ۔ ہم کسی کے ساتھ رعایت نہ برتیں گے ۔"
یہ سنتے ہی الکنڈر نے اپنی لاٹھی سنبھالی اور آستینیں چڑھائیں "تم حد سے گذر گئے ۔" اُس نے دانت پیس کر کہا "اب میں تم کو قومی شوربے کا مزا چکھاؤں گا ۔"
اُس نے لائیکرگس کے ایک لاٹھی ماری ۔ اور وہ کمرے سے بھاگ کر سڑک پر آ گیا ۔ الکنڈر نے اُس کا پیچھا کیا آخر دیر کے بعد اُس کو پکڑ لیا ۔ اور مارتے مارتے ادھ موا کر دیا ۔ لیکن تاہم یہ تمام مجوزہ قوانین عمل میں لائے گئے ۔

محمد حسین خاں زبیری بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی (علیگ)

بچہ

ایک اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تو
کون سی دنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟
کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو؟
یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظارے تجھے
کس لئے حیرت سے یوں ہر اک کا منہ تکتا ہے تو؟
ہم کو بھی معلوم ہے تو ہے مسافر دور کا
ہاں! بتا وہ سرزمین عافیت تھی کونسی!
روشنی ہوتی ہے کیسی چاند سورج کی وہاں

کس وطن کی یاد میں روتا ہوا آیا ہے تو
رونے والے! یاد کس کس کی رلاتی ہے تجھے؟
گلشن فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تو؟
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے
کچھ تو کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں سکتا ہے تو؟
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے ناآشنا
بستی ہے دل میں ترے دلکش وہ بستی کونسی؟
تیرے چہرے پہ ہویدا ہیں ابھی جس کے نشاں!

کس چمن کا گل ہے تو؟ کس عرش کا تارا ہے تو؟
کس قدر ہے پاک و روشن! کسقدر پیارا ہے تو!

تلوک چند محروم

تاریخ کا ایک خونیں منظر

اسپارٹا کی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ اسپارٹا میں ایک شخص بھی کمزور و ناتواں رہے اسلئے کمزور بچوں کو بچپن ہی میں کوڑے مار مار کر آزمایا جاتا تھا۔ اگر وہ مقررہ سزا برداشت کر لیتے تو خیر ورنہ ان کا ہلاک ہو جانا ہی بہتر سمجھا جاتا۔ اس امتحان گاہ کی تصویر اسی رسالے میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ نظم اسی تصویر کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے۔ (ایڈیٹر)

معصوم

یہ درد و غم کی تصویریں بہارِ باغِ یزداں ہیں ۔۔۔ لطافت میں گلستاں ہیں ضیا میں انجمستاں ہیں
فضائیں انکے روئے دلربا سے گل بداماں ہیں ۔۔۔ ہوائیں انکی زلفِ جانفزا سے عنبر افشاں ہیں
نزاکت اُن کی ملّت کو گوارا ہو نہیں سکتی ۔۔۔ مصیبت ہے کہ خود اپنے لئے وہ شعلہ ساماں ہیں
کہوں میں انکو بزمِ حسن کی پُر نور قندیلیں ۔۔۔ جو تہذیب ستم پرور کے دامن میں فروزاں ہیں

یہ اک تعبیر حسرت آشنا ہیں خوابِ وحشت کی
لکھی جائیگی اِن کے خون سے تاریخ ملّت کی

جلّاد

وہ ہیبتناک شکلیں جن سے شیرِ دشت گھرائے ۔۔۔ وہ آتشبار آنکھیں جن سے موجِ برق تھرّائے
وہ انکے تازیانے جن سے جلّاد فلک کانپے ۔۔۔ وہ جن کے پیچ و خم سے اژدہا پر خوف چھا جائے
وہ لائے دشت میں کھینچے ہوئے معصوم بچّوں کو ۔۔۔ وہ اٹھے تازیانے وہ ہوا میں سانپ لہرائے
ہوے وہ اسطرح پیوست معصوموں کے پہلو میں ۔۔۔ گلاب و یاسمن میں جس طرح خنجر اُتر جائے
کھڑی ہیں اکطرف بچّوں کی مائیں غم کی تصویریں ۔۔۔ انہیں کے لعل ہیں جو اژدہائے موت نے کھائے
اگر ان کے سیہ خانے کو روشن کر نہیں سکتا ۔۔۔ چراغِ ماہ اپنی عالم افروزی سے شرمائے
ذرا دیکھے یہ باغِ زندگی کا خونچکاں منظر ۔۔۔ فلک باغِ شفق کی گلفشانی پر نہ اترائے

ہوا ہے بیقرار اتنک فضا ہے سوگوار اتنک
زمیں ہے خون کی رنگینیوں سے لالہ زار اتنک

عابد

فنون لطیفہ میں علم موسیقی کو ایک عظیم الشان درجہ حاصل ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موسیقی جادو ہے، اور اس کے اثرات سحر سے زیادہ یقینی اور حتمی مترتب ہوتے ہیں۔ انسان کے دل و دماغ کو رنج و غم سے آزاد کر کے نہایت اعلیٰ مقام پر پہونچاتے ہیں۔ اور ایسی وجدانی کیفیت طاری کرتے ہیں کہ انسان اپنے گرد و پیش کو بھول جاتا ہے۔ زندگی کے بندھنوں کی اسکو مطلق خبر نہیں رہتی۔ لڑائیوں اور جنگوں میں نغموں نے ایسے کارہائے عظیم کئے ہیں کہ جن پر شجاعت و شہامت کو ہمیشہ ناز رہیگا۔ بسا اوقات اس سے ایسے نرم و گداز اثرات ظہور میں آتے ہیں کہ انسان اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور اسکی دل کی دنیا میں اثر و جذب کے بڑے بڑے طوفان اٹھنے لگتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بنکر ٹپک پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اس کا اثر حیوانات پر بھی نہایت گہرا ہوتا ہے۔ اور دم کے دم میں رام ہو جاتے ہیں۔

موسیقی کو انسانی جذبات سے کچھ ایسا گہرا تعلق ہے کہ اسکی طرف ہر آدمی کی روح کھنچتی ہے۔ موسیقی کا ذوق ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور جس قدر انسان تہذیب و تمدن اختیار کرتا جاتا ہے۔ اتنا ہی اس فن سے لگاؤ اور ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ اور موسیقی ہی وہ فن ہے جسکو ہر متمدن و مہذب قوم نے اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ عروج پر پہونچایا۔ اور باوجود تمام علوم و فنون کھو دینے اور تہذیب و تمدن کے برباد کر دینے کے اس فن سے برابر شغف قائم رکھا۔

ہر انسان کو موسیقی سے فطری دلچسپی ہے۔ اس میں بوڑھے، بچے نوجوان۔ لڑکے۔ عورت۔ مرد۔ جاہل۔ پڑھے لکھے، متمدن اور وحشی غرضیکہ سب انسان برابر ہیں جسطرح امریکہ و یورپ کے لوگ موسیقی پر سر دھنتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ افریقہ کے وحشی اور ہندوستان کے جنگلی۔ کول۔ گونڈ اور بھیل، ڈھول اور اپنے مزامیر پر فرط طرب سے ناچتے ہیں۔

اگر آپ نگاہ اٹھا کر دیکھیں گے تو کسی انسان کو نہ پائیں گے۔ جسکی روح موسیقی کے ساز پر رقص نہ کرنے لگتی ہو۔ اور جس کے دل میں موسیقی کے لیے جگہ نہ ہو۔

اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ انسان کو موسیقی سے فطری مناسبت ہے۔ تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔

موسیقی کی ابتدا کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہوئی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ آفرینش آدم کے وقت ہی سے جب سے کہ اس نے تمدن قبول کیا اسکی بنیاد پڑی۔

ہر انسان فطرۃً موسیقی کا اہل ہوتا ہے۔ بچہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو آپ اس کے سامنے کوئی راگ گائیے یا باجہ بجائیے۔ پھر دیکھئے بچے کی روح کو کس قدر بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال موسیقی کے موجد کے متعلق کوئی خیال درست نہیں، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ "ققنس" یا "موسیقار" کی خوش الحانی پر حکما نے اس فن کی بنیاد ڈالی ہے مگر یہ غلط ہے، ہاں بجا طور سے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اس فن نے سب سے پہلے ترقی اور فنی و علمی حیثیت کب اور کہاں اختیار کی، تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ جہاں سب سے پہلے انسانی تہذیب و تمدن نے ترقی کی ہوگی، کیونکہ اس سے انسان کو طبعی لگاؤ ہے۔

چینی اور مصری تہذیب ہی سب سے قدیم ہے، اس لئے بالکل صحیح طور سے کہا جاتا ہے کہ موسیقی نے چین اور مصر میں سب سے پہلے ترقی کی اور اسوقت بھی جسکو آج سے ہزارہا برس ہوتے ہیں ان ملکوں میں ہر طبقہ کے لوگوں، امیروں۔ رئیسوں، تارک الدنیا جوگیوں، بیچاریوں۔ وغیرہ کا لازمۂ حیات تھا۔ چین کے لوگ اس کے اثرات سے اسقدر واقف تھے کہ قدیم زمانہ میں چینی جب نافہ کے لئے ہرن کو پکڑنے کی کوشش کرتے تو شب کو میدان یا جنگل میں کسی چٹان پر بیٹھکر ایک خاص قسم کا نغمہ گاتے جسکو خاص دھن سے گایا جاتا۔ اس کی مست و پرشور کن زیر و بم تانوں اور سروں سے غزالان دشت ایسے بیحس و حرکت ہو جاتے کہ ان کا پکڑ لینا معمولی بات رہ جاتی۔ اس کے بعد جب تہذیب و تمدن کا گہوارہ یونان بنا تو انہوں نے بھی موسیقی کو خاص اہمیت دی۔

یونانی اس فن میں پوری مہارت رکھتے تھے، اور ہر شخص اس کا دلدادہ شیدا تھا۔ جہاں یونان کے اور کمالات فن تقریر، فن شاعری، وغیرہ دنیا میں پھیلے وہاں ان کے فن موسیقی نے بھی ترقی کی۔ اور انہوں نے

اس کو کمال پر پہونچایا - ان کے ہاں میوزک (موسیقی) نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا - اس میں جملہ علوم و فنون مثل شاعری - ڈراما - تاریخ فصیح بیانی وغیرہ وغیرہ اور دیگر علوم بھی شامل تھے - ان کا مقولہ تھا - کہ :-

"جسم کے لئے ورزش اور روح کے لئے موسیقی ضروری ہے"

ایرانیوں نے بھی اس فن کو کمال تک پہونچایا - ان کی بزمہا سے طرب موسیقی سے خالی نہ ہوتی تھیں - کیونکہ ایرانیوں نے فنون لطیفہ کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا تھا - اور موسیقی فنون لطیفہ کی جان ہے - ان کی شاعری کی بنیاد ہی موسیقی سے پڑی -

ایران قدیم میں شعراء کے لئے ضروری تھا کہ وہ موسیقی میں بھی ماہر اور خوش آواز ہوں - اس کے بغیر کوئی شاعر ارباب ذوق سے داد نہیں لے سکتا تھا - خوش گلوئی سے اشعار پڑھتے ہوئے چنگ و چغانہ کی ہمسازی کلام کی خوبی میں چار چاند لگا دیتی تھی -

ایسے شعرا میں رودکی جس کا نام ابوعبداللہ جعفر بن محمد تھا ، مادر زاد اندھا تھا بیسکن باجہ خوب بجاتا تھا - علم موسیقی کا ماہر اور فارسی شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے - امیر نصر سامانی کا ندیم تھا -

جو شعرا اس فن شریف سے ناواقف ہوتے تھے ان کو اس کام کے لئے نوکر رکھنا پڑتا تھا - انکو "راوی" کہتے تھے - غرضیکہ ایران قدیم میں موسیقی کو خوب ترقی حاصل تھی عرب میں بھی اس کا چرچا تھا ، اور خصوصاً اس زمانے میں جبکہ وہ تہذیب و تمدن سے عاری تھے ، ان کے جلسوں کی گرمی موسیقی سے قائم بھی رہتی تھی - فخریہ اشعار دعوتوں ، میلوں اور جلسوں میں دف اور چنگ پر گائے جاتے تھے - اور اس پر سر دُھنتے تھے - یہی عرب اسلام کی معجزانہ ترقی کے بدولت جب تمام دُنیا میں پھیل گئے - تو عراق ، مصر ، اندلس اور فارس وغیرہ میں جہاں کہیں عرب تھے اور عربی تمدن و تہذیب ترقی کر رہی تھی - موسیقی بھی انتہائی ترقی کر رہی تھی - موسیقی نے انتہائی ترقی کی اور عوام ہی نہیں بلکہ اعلےٰ طبقہ کے لوگ علما و حکما بھی رقص و سرود سے نفرت نہیں کرتے تھے - اور مجالس رقص و سرود میں حکما - علما - رؤسا - اطبا - اور ذی وقار قاضی اور صوبوں کے گورنر نہ صرف شریک ہوتے تھے بلکہ آلات موسیقی کو استعمال کرتے اور اس میں عملی حصہ لیتے تھے -

ہندؤں کے ہاں موسیقی عبادت کا ایک جزو قرار دی جاتی ہے - اور ان کا اعتقاد ہے کہ سنگیت سے پرمیشور کا دیدار نصیب ہوتا ہے -

ہندوستان قدیم کے رشی مہارشی اس کو عبادت کا ایک ذریعہ بتاتے تھے ، اس سے ان کی آتما کو ایک محویت اور لذت روحانی حاصل ہوتی تھی - بڑے بڑے رشی اور اوتار موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے ، کرشن جی کی بانسری میں پرمیشور نے معجزانہ اثر عطا فرمایا تھا - جس کو صرف جادو کے نام تعبیر کیا جا سکتا ہے - غرضیکہ یہ فن جیسا کہ چاہئے قدردانی اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا گیا - اور "بھارت ورش" کی ترقی کے ایام میں اس فن کا خوب چرچا تھا اور عوام و خواص کی "روحانی تفریح" کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا -

موسیقی اصل میں میوزک ہے - جو یونانی لفظ ہے اور میوز سے بنا ہے - میوز کے معنے شاعری کی دیوی کے ہیں - میوزک راگ اور خوش الحانی کے علم کو کہتے ہیں -

راگ کیا چیز ہے - اس کی ماہیت یہ ہے کہ آواز کو ایک خاص ڈھب کی حرکت دیکر مرتب کیا جائے - اگر آواز میں ترتیب اور ہم آہنگی نہ ہو تو اسے راگ نہیں کہا جا سکتا بلکہ "شور" سے نامزد کریں گے -

آواز کی حرکت یا اس کا اُتار چڑھاؤ سات درجوں پر تقسیم کیا گیا ہے - یہ سات درجے موسیقی کے سُر ہیں اور ان کے نام ہندی موسیقی میں یہ ہیں :-

سُر[۱] (یا کھرج) رکھب[۲] - گندھار[۳] - مدھم[۴] - پنچم[۵] دھیوت[۶] - نکھاد[۷] -

ان کے پہلے حروف :-

سا[۱] - رے[۲] - گا[۳] - ما[۴] - پا[۵] - دھا[۶] - نی[۷] -

ان ناموں میں ہی اور یہی ہندی راگ ودیا کے سات سُر ہیں - جنکو اصطلاح میں "سرگم" کہتے ہیں -

انگریزی کے بھی سات سُر ہیں :- جو

ڈو - رے - می - فا - سو - لا - ٹی کہلاتے ہیں -

ان سات سُروں میں تدریجی طور پہ "چڑھاؤ" پایا جاتا ہے - انہی سُروں کو مختلف طریقوں پر نکالنے اور ترتیب دینے کا نام "راگ" ہے -

یہ راگ جو سُروں کے مختلف طریقوں پر ترتیب دینے سے ایک خاص کیفیت لئے ہوتے ہیں - چھ ہیں ، ہر راگ کے حدود مقرر ہیں - ان سے باہر جانا اس کیفیت کو جو سُننے والوں پر طاری ہوتی ہے - زائل کرتا ہے -

ہندی راگ کے چند نام یہ ہیں :-

بھیرو[۱] - مالکوس[۲] - ہنڈول[۳] - سری[۴] - میگھ[۵] - دیپک[۶] -

کہا جاتا ہے کہ راگ مذکر ہستان ہیں اور ہر راگ کی پانچ پانچ راگنیاں (بیویاں) ہیں - اور آٹھ آٹھ پتر سالنگ (لڑکے) ہیں - اس کے علاوہ اور شاخیں ہیں جو سودہ سالنگ کہلاتے ہیں - ان کا شمار نہیں -

ہر راگ اور راگنی کے گانے کا ایک وقت معین ہے - جس پر اسکی کیفیت پوری ہوتی ہے - مثلاً بھیرو کے گانے کا وقت دو گھڑی رات

۱ مقریزی جلد ۲

رہنے سے صبح تک رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض راگ راگنیاں موسمی بھی ہیں۔ جو خاص اُسی موسم میں بہار دیتی ہیں مثلاً موسم بہار میں بسنت بہار دلوی۔ خوب بہار دکھاتی ہے۔ برسات میں میگھ اور ملار لطف دیتے ہیں گرمیوں میں دیپک اور برواروُح کو تڑپا دیتے ہیں۔

یہ قیود ماہرین فن نے لگائی ہیں۔ اور اس کا مطلب ان اثرات کا بخوبی مترتب ہونا ہے ورنہ ہر موقع ہر موسم اور ہر وقت پر گایا جا سکتا ہے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ راگ صرف چھ ہیں، لیکن راگنیوں اور ان کے مشتقات کے نام بیشمار ہیں سنگیرن اُن راگنیوں کو کہتے ہیں جو راگ کے معین اوقات کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ سالنگ۔ راگنیاں وہ کہلاتی ہیں۔ جو ہر وقت گائی جاتی ہیں۔ ان بیشمار راگنیوں کے نام گنانا مضمون کو فضول طوالت دینا ہے۔

تمام راگ اور راگنیاں مختلف صورتوں سے گائی جاتی ہیں۔ انکے ادا کرنے کا نام علیحدہ علیحدہ ہے۔ مثلاً خیال، ٹھمری۔ ٹپہ۔ دھرپد۔ ترانہ وغیرہ وغیرہ۔

جب راگ اور راگنیاں تال اور اصول سے نکالتے ہیں تو گیت کہلاتا ہے۔ تال ایک وزن ہے۔ جس طرح شعر کے لئے بحر عروضی لازمی چیز ہے اسی طرح گیت کے لئے تال کا وزن، اس کے بغیر گیت، گیت نہیں ہوتا۔ بلکہ راگ ایک بدصورت ساڈھانچ نظر آتا ہے۔ تال میں راگ کی صورت تول کر دکھانی پڑتی ہے۔ یعنی تناسب کے ساتھ سُروں کے اتار چڑھاؤ پر مخصوص کیفیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جس سے سامعین پر خوب اثر پڑتا ہے۔ تال کے بغیر راگ کی صحت نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں لطف آتا ہے جس طرح عروض کے اوزان کی تقطیع چند مقررہ الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے اسی طرح تال چند ضربوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ جو کسی ساز پر وقت کے خاص خاص وقفوں کے بعد لگائی جاتی ہیں۔ جس کو اصطلاح میں ماترہ کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آسان سی تال دادرا کو لیجئے۔ اس تال میں چھ ضربیں لگانی پڑتی ہیں۔ یعنی اس تال میں چھ ماترے ہیں۔ ماتروں کے لئے الفاظ مقرر ہیں جن سے تال کا وزن قائم رکھا جاتا ہے جس طرح شعر کی تقطیع [illegible] فاعلاتن وغیرہ ہیں۔

دادرا کے چھ ماترے یہ ہیں :-

دھا - دھِن - نا - تا - تن - نا

اس تمام مجموعہ کو تیزی یا آہستگی سے کسی ساز مثلاً طبلہ وغیرہ پر دہرانے سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نام تال ہے۔ ان ضربوں کا مسلسل اعادہ ایک چکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں بار بار وہی ضربیں پیدا کی جاتی ہیں۔

تیزی اور آہستگی محض وقت کے درجے ہیں اور وقت کی اس کمی کو لَے کہتے ہیں۔ لَے کو گھٹانا بڑھانا اپنی پسند پر موقوف ہے۔ تال کی خاص چوٹ ہوتی ہے۔ جو گیت کے ایک خاص وقفے پر ٹھیک اس جگہ پڑتی ہے۔ جہاں سے تال شروع ہوتی ہے اس چوٹ کو سَم کہتے ہیں۔ تالوں کی تعداد بارہ ہیں، جن میں تین تالہ۔ چوتالہ۔ دادرا۔ یکہ۔ جھپتال۔ سول فاختہ اور سواری جسکو چتالگن بھی کہتے ہیں۔ بڑی مشہور تالیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر تال میں وہی بول بجائے جائیں۔ جو مقرر کر دیئے گئے ہیں بلکہ اسی میں مزید بول دو ماتروں کے درمیان لَے کی پابندی کے ساتھ اور ماترے بڑھا کر زیادہ کئے جا سکتے ہیں جس سے تال علاوہ وقت کے حساب سے پوری پوری اترنے کے خوبصورت اور پر لطف ہو جاتے ہیں۔

مثلاً دادرا کے چار حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ کے چھ ماترے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر حصہ میں چھ ضربیں لگانی پڑتی ہیں۔ کل ۲۴ ماترے ہوئے۔ یہ ۲۴ ماترے بقدر ضرورت اور مشق کے بڑھا کر ۳۶۔ ۴۸ اور ۱۴۴ سے بھی زیادہ بجائے جا سکتے ہیں۔ ہندی موسیقی میں تال کی جداگانہ اور وسیع بحث ہے۔ یوروپین ممالک کی موسیقی میں لَے کی تو پابندی کی جاتی ہے لیکن تال کی نہیں۔ اس کی تکمیل کا سہرا اہل ہند کے سر رہے۔ جس سے انہوں نے موسیقی کو کمال پر پہونچا دیا تھا۔

ہندی راگ ودیا بہت وسیع اور مکمل علم ہے۔ اور حقیقتاً نہایت مشکل ہے لوگوں نے اس میں عمریں صرف کر دیں لیکن خود کو ادھورے سمجھتے رہے۔

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق اسی وقت کو پیش نظر رکھ کر ذوق دہلوی اس شوق سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ایک ماہر فن موسیقی نے انہیں بتایا کہ موسیقی کے لئے تین سو برس کی عمر چاہئے۔ سو برس سیکھے۔ سو برس منتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے۔ پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو سنائے۔

یہ مبالغہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندی موسیقی نہایت [illegible]

ہے۔ خصوصاً موجودہ اہلِ فن نے اس کو اور زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔
دنیا ترقی کر رہی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ وقت کو پیشِ نظر رکھکر اس فن کو بھی ترقی کے میدان میں لایا جائے۔ اور اچھے اصول لیکر بانی سے قطع نظر کر لی جائے۔ اور موسیقی کو صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مطابق بنایا جائے۔

محمد شاہ رنگیلے نے وقت ہی کو پیشِ نظر رکھکر اس فن کی اصلاح کا خیال کرکے ماہرین کی امداد سے خیال کو رواج دیا۔ لیکن یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ کہ سلطنت ہی خواب و خیال ہو گئی۔

بعد کو شاہانِ اودھ نے اور خصوصیت کے ساتھ واجد علیشاہ نے اس میں اور زیادہ رنگینی پیدا کرکے "ٹھمری" کی بنیاد ڈالی لیکن یہ بھی انجام کو نہ پہونچی تھی کہ سلطنت کے تمام ساز ٹوٹ، چھوٹ گئے۔ اور موسیقی ایک عالمِ بیکسی میں پڑی رہی، اور اب بدقسمتی سے یہ فن ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنکی طرف اہلِ علم التفات کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ادھر ان کی قدامت پرستی کا یہ حال ہے کہ یہ ابھی تک خیال اور دھرپد کو کمال فن خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانہ میں یہ ۹۵ فیصدی لوگوں کے مذاق سے گرا ہوا ہے اور وہ اس میں کوئی جاذبیت نہیں پاتے۔ فنونِ لطیفہ میں موسیقی کے بلند پایہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن ضرورت ہے کہ اس کو علمی طریقے سے ترقی دیجائے۔ اور ملک کے شرفا و رؤسا اور اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے مذاق سلیم کے مطابق بنایا جائے۔

موسیقی کا کام زیادہ تر جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔ یہ طبیعت میں ایک جوش پیدا کرتی ہے۔ فوج میں بینڈ باجے کا وجود اسی غرض کے لئے قائم ہے کہ سپاہیوں کو لڑنے مرنے پر تیار کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر یہ جوش پست اور دنیاوی لذت کی طرف مائل کیا جائے تو اس کا مقصد محض عیاشی رہ جاتی ہے، جو اس کا غلط استعمال ہے۔ × × × × × ×

× × × × × × × × × × × ×

موسیقی اگر اچھے اور اعلیٰ اخلاقی مفاد کو مطمح نظر بناکر اور روح کا اضطراب اور خیالات کی پریشانی دور کرنے کے لئے حاصل کی جائے تو ظاہر ہے کہ اسکی تحصیل اچھی نظروں سے دیکھی جائیگی۔

اگر ہم موسیقی کو اعلیٰ اخلاقی اصول کے ماتحت رکھکر اپنی معاشرت میں جگہ دے دیں تو بہت سے فوائد کا موجب ہو جیسی طرح بنگالیوں نے اپنی معاشرت کو خوشگوار بنانے کے لئے اس کو جزو معاشرت قرار دے لیا ہے — وہ لوگ اس شغل کو لازمی سمجھتے ہیں اپنی مستورات کو اس کی تحصیل میں امداد دیتے اور اپنے اپنے گھروں میں اس کی پوری پوری مشق کرتے ہیں۔ وہاں کے شریف ترین خاندان اس شغل کو معیوب نہیں خیال کرتے جس سے آپ دیکھیں گے کہ ان کی معاشرت کس قدر خوشگوار اور دلچسپ ہے۔ اسی طرح اگر ہم بھی اسے معیوب سمجھنا چھوڑ دیں اور اس کو عام کر دیں، تو ہماری بہت سی ذہنی اور دماغی قوتوں کے نشوونما کے ساتھ ہماری بہت سی پریشانیاں اور روحانی اضطراب دور ہو جائے۔

یورپ میں اس کے لئے بہت سے کالج وقف ہیں۔ وہاں کے تمام زن و مرد تھوڑا بہت درک رکھتے ہیں۔ اور کم از کم کسی قسم کا ساز بجانا ضرور جانتے ہیں۔ بہت سے اسکولوں میں موسیقی کی تعلیم ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے ہوتی ہے۔

ابتدائی اسکولوں میں بچوں کی جسمانی اور اخلاقی تربیت میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔ ان کے دلوں میں ابتدا ہی سے قومی جوش، اور نیکی کے گہرے نقوش موسیقی سے بیٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے وہاں ڈرل کرائی جاتی ہے جس سے بچوں میں چستی اور چالاکی پیدا ہوتی ہے۔

اب کچھ دنوں سے ہندوستان میں بھی اس سے دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے۔ بنگالیوں نے ایک حد تک اپنے معاشرت کا جزو قرار دے لیا ہے۔ بمبئی اور مدراس کے علاوہ بھی اسکو ترقی دے رہے ہیں۔

پنجاب کے اہلِ علم حضرات عملی طور سے اس میں حصہ لے رہے ہیں۔
یو۔ پی میں بھی گورنمنٹ نے اس طرف توجہ کی ہے اور لکھنؤ میں "میوزک کالج" اپنے سرپرستی میں جاری کر چکی ہے۔ جو امید ہے کہ ملک و قوم کیلئے مفید ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے ہندی موسیقی کی طرف توجہ کی اور اس میں جدید خیالات کے مطابق اصلاح کا فرض اپنے ذمہ لیا۔ آخر میں افلاطون کا قول جو اس بارے میں ہے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے:-

"جو شخص اس مناسبت روحانی (موسیقی) کو اپنی ذات میں پیدا کرتا ہے اُسے واضح ہو کہ یہ عطیۂ گرانبہا، لذت ناجائز حاصل کرنے کو نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ اس غرض کے لئے کہ یہ اسکی روح کے اضطراب اور خیالات کی پریشانی کو دور کرکے ایک مناسبت میں تبدیل کر دے۔"

یہ مناسبت سوائے اُس لگاؤ کے جو انسان اور خداوند کریم کے درمیان قائم ہے اور کچھ نہیں۔ پس اس علم کی تحصیل میں اعلیٰ اخلاقی اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے اور ہمیشہ افلاطون کے قول کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

محمد منظور فاضل الہ آبادی

حسین جھوٹ

پہلا ایکٹ

گرانؔ بلوار (Grand Boulward -) کا سیاحؔ "کفے دو لاپے"[1] کے سامنے سے گزر گیا۔ جو کچھ دیکھا اُسے اَن دیکھا سمجھا، اور چند روز اپنے آپ کو ناکام دھوکا دیتا رہا، لیکن بالآخر ایک دن وہ اُس کے روبرو بیٹھا نظر آیا۔ حسین منظر سے آنکھیں چراتا تھا ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیتے دیکھا گیا ——— اور وہ "کفے" اس کی جولانگاہ بنگیا۔

دوسرا ایکٹ

اب یہ دونوں ساتھ دیکھے گئے اور اکثر دیکھے گئے، چہروں پر محبت کا غازہ تھا اور آنکھوں میں عشق کا نشہ! ماضی کا ذکر تھا اور نہ مستقبل کا خیال...
...... وہ تو صرف اس لمحے کی زندگی جی رہے تھے!

تیسرا ایکٹ

چند ہی دن گزرے تھے کہ اب وہ گلہ و شکایت سننے پر مجبور تھا — ملزم بنایا جا رہا تھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ کسی کی رنجش اور خفگی اس کے قسموں اور وعدوں پر ختم ہونے لگی۔ اور ضرورت کے تحت شکر ین دروغ ہر وقت اس کے نوک زبان رہنے لگا۔ اب دونوں جانب ماضی کی یاد تھی اور مستقبل کا خیال ——— حال کا کوئی تذکرہ نہ تھا!

ایک دن وہ باغ کی بنچ پر تنہا بیٹھا نظر آیا ——— کیونکہ وہ اُسے چھوڑ آیا تھا!

نتیجہ

مرد معاملاتِ دل میں خصوصیت کے ساتھ احمق واقع ہُوا ہے، اوّل تو وہ اپنے جذبات کو پائیدار یقین کر لیتا ہے۔ اور جب اُسے اس غلطی کا علم و احساس ہوتا ہے تو پھر کر وہ دروغ گوئی اختیار کرتا ہے اور آخر بزدلی کا مرتکب ہو جاتا ہے ——— یعنے جان چھڑا کر بھاگتا ہے! حالانکہ اگر وہ اپنی غلطی کے احساس کے بعد ذرا صبر سے کام لے تو دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ اسے خود بخود نظر آ جائے اور وہ بزدلی کا مرتکب بھی نہ ہو ——— کیونکہ عورت تو بجائے خود ایک عظیم ترین جھوٹ ہے۔ ہر چند حسین ترین بھی!

ل - احمد

[1] پیرس کا مشہور بازار [2] ایک مشہور ریسٹورانٹ جہاں مختلف ممالک کے سیاح ہر وقت نظر آتے ہیں اور جس کی رونق ضرب المثل ہے۔

ایک آرزو

عطا وہ زیست کو میری فروغ کر یارب
کہ نور بنکے ہوں عالم میں جلوہ گر یارب

فلک پہ بنکے مہ و آفتاب چمکوں میں
تپش سے حسن کی زیرِ نقاب چمکوں میں

سوادِ شب میں ستاروں میں ہو ضیا میری
ہر ایک شعلۂ مضطر میں ہو ادا میری

فروغِ آتشِ گل بنکے اس چمن میں رہوں
مثالِ شمعِ فروزاں اس انجمن میں رہوں

گدازِ عشق بنوں دل میں، نور آنکھوں میں
مئے ازل کا ہو یعنی سرور آنکھوں میں

زبانِ شمع پہ ہو شب کو داستاں میری
ہوں ذرے ذرے میں یارب تجلیاں میری

سر والٹر اسکاٹ

سکاٹ کی شخصی حیثیت

سکاٹ کی بچپن ہی سے یہ دلی آرزو تھی کہ وہ اپنے قدیم خاندان کی ایک نئی شاخ کی بنیاد رکھے، اور خود بحیثیت لارڈ ایبٹس فورڈ اسکا بانی ہو ممکن ہے، کہ اس میں اسکی بیوی کا کچھ اثر ہو۔ وہ ایسی عورت نہ تھی جو سکاٹ کو کسی بلند تر تحریک یا اعلیٰ مقصد کا مشورہ دیتی۔ اسی لئے سکاٹ اپنے تصنیف و تالیف کے شغل میں ثابت قدم رہا، اور اُسکی نظموں اور چند ابتدائی ناولوں کی دراصل یہی ایک وجہ تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال میں جو کچھ لکھا، وہ اپنا قرض ادا کرنے کے ارادہ سے مجبور ہو کر لکھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، وہ جیمز بیلنٹائن اینڈ کمپنی کے فیل ہو جانے سے سخت مقروض ہو گیا تھا کیونکہ اُس کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی، اگرچہ انجام کار اُسے ناکامی ہوئی، لیکن اس حد تک اس کے ذرائع اور تدابیر کامیاب رہیں۔

سکاٹ کے پیش نظر کوئی بلند اور اعلیٰ نصب العین نہ تھا، وہ کسی روحانی یا اخلاقی جدوجہد سے بےخبر محض تھا، تاہم مانتے ہیں کہ اُس نے اپنی کوشش سے اپنے آپ کو عالی حوصلہ اور شریف انسان ثابت کیا، اُس کی تصانیف سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ وہ ایک عظیم اور عالی شان ادیب ہے۔ لیکن اُسے خود اس کا علم نہ تھا۔ لٹریچر کو سکاٹ نے بڑی حد تک دنیاوی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ تاہم قدرتی مناظر اور دنیاوی سرشت کی اُس نے بہت عمدہ اور سادہ تصویر کھینچی ہے۔ وہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم قدرت کی دی ہوئی نعمتوں سے محبت کریں، اور زندگی میں ہمیں جو سب سے اچھی چیزیں عطا کی گئی ہیں۔ اُن کی قدر کریں۔

اسکاٹ کی رگ رگ میں ہمت و استقلال بھرا ہوا تھا۔ سکاٹ کے عزم اور حوصلہ کی بلندی کا اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے، کہ اپنی انتہائی مصیبت میں اُس نے کسی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ سکاٹ ایک زبردست طبیعت کا مالک تھا۔

سکاٹ فیاض طبیعت، فراخ دل، بہادر، اور عالی ہمت محب وطن تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ جسمانی تکالیف کا ہنسی خوشی مقابلہ کرتا رہا۔ اُس نے چند کتابیں اپنی بیماری کے ایام میں کسی سے لکھائی تھیں۔ فطرتاً سکاٹ ایک قومی انسان تھا۔ مفلسی نے اس کے جوہر مثلاً عزم، حق شناسی، بردباری تحمل وغیرہ سب ظاہر کر دیئے۔ اور اس موقعہ پر وہ بجائے عیسائی ہونے کسی جبریہ مذہب کا پیرو یا کوئی پختہ ہیراگی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہ ایک راسخ الاعتقاد عیسائی تھا۔ اُس کے دوست لاک ہارٹ نے جب اس سے دریافت کیا کہ کونسی کتاب پڑھنے کے لئے اچھی ہے تو سکاٹ نے جواب دیا کیا تم بھی یہ سوال کر سکتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں صرف ایک ہی کتاب ہے۔

سیاسیات میں سکاٹ اُسی پرانی لکیر کا فقیر اور تبدیلیٔ نظم و نسق حال کا سخت مخالف تھا وہ ملوکیت پسند تھا اور ولیم پٹ کا بہت مداح —

اس کے اکثر دوست ادبی ذوق رکھنے والے تھے، جن میں ارسکن، لیڈن اور سکین خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ سکین چونکہ والنٹیر بھی تھا۔ اس لئے سکاٹ کے اس سے دوہرے تعلقات تھے۔

گھوڑے کی سواری، طول طویل پا پیادہ سیر، اور فوجی نقل و حرکت سے سکاٹ کی طبیعت بہلتی تھی۔ اگرچہ وہ ہر شام اپنے دوستوں کی پر لطف مجلسوں میں شریک ہو سکتا تھا۔ لیکن اپنے وطن کی پہاڑیوں کے بھورے بھورے جنگلوں میں سیر کر کے اُسے انتہائی خوشی ہوتی تھی۔

سکاٹ ایک قابل اور نامی وکیل ثابت ہوتا، اگر اس نے اس پیشہ کو اپنی ادبی سرگرمیوں کی خاطر ترک نہ کر دیا ہوتا، کیونکہ اس پیشہ سے اُس کی فطرت پابند و مجبور اور اس کی آزادی سلب ہو گئی تھی۔ لیکن وکیل ہونے کی حالت میں وہ معدودے چند آدمیوں میں ممتاز نظر آیا۔ حالانکہ ادیب ہونے سے اُس نے اس سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کی، چنانچہ سکاٹ تاریخی فسانہ کا موجد مانا جاتا ہے، اور بلند تخیل اور نیچر کے شاعر کی حیثیت سے اُسکا نام ہمیشہ قائم اور روشن رہیگا۔

سکاٹ بحیثیت مصنف

سکاٹ کے ادبی تصانیف قدرتاً دو حصوں میں منقسم ہوتی ہیں، جس سے اُس کی پہلی اور آخری سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تبدیلی ۱۸۱۴ء کے قریب واقع ہوئی، اگرچہ اُسکی نظمیں دی لارڈ آف آئز لنز اور ہیرالڈ دی ڈاسنٹلیس اس کے بعد شایع ہوئیں، اور اُس کا ناول ویورلی ۱۸۰۵ء میں ہی شروع کیا گیا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ویورلی کی غیر متوقع کامیابی اور The Lord of The Isles کی ناکامی سے سکاٹ نے نظم کہنا چھوڑ دیا اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔ سکاٹ کے مضامین نظم قدیم شاعری اور فسانوں خصوصاً سرحد سکاٹلینڈ کے گیتوں کا مرقع ہیں، اور وہ مناظر قدرت اور معرکوں کی نہایت خوبی سے تصویر کھینچتا ہے اُس کی پرجوش حب الوطنی اس سارے قالب کی جان ہے۔ وہ اپنے تخیل اور ادا میں ہمیشہ بے دھڑک اور آزاد لیکن بہت سادہ رہتا ہے، اُسے اپنے پہاڑوں اور جنگلوں کا بھورا

رنگ بہت محبوب ہے - اور یہاں وہ بائرن کے وہ بالکل مخالف ہے - جو اپنے مضامین کے لئے مشرق کے فطرت کی ہر تصویر میں قوی ترین عنصر انسانی لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، اور بڑی حدتک کامیاب ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ عوام نے اُسے پسند کیا اور جسقدر بائرن کو عروج ہوتا گیا اسیقدر سکاٹ کی شہرت میں کمی ہوتی چلی گئی - بائرن عام بازاری مذاق کا شاعر ہے لیکن سکاٹ سے زیادہ مہذب اور تربیت یافتہ لوگ ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں -

شیکسپیر کی طرح سکاٹ بھی مادی شاعر ہے، وہ قدرت کی تصاویر میں وہی رنگ بھرتا ہے، جو وہ دیکھتا ہے وہ اپنے جذبات وحسیات کو اُس پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا -

شیلے کیٹس، ورڈز ورتھ، اور بائرن سکاٹ کے ہمعصر تھے، ان سب کو مع سکاٹ، فطرت کے پرستار کہا جاتا ہے - اور ان میں سے ہر ایک اپنے علیحدہ اور خاص انداز میں اپنا فرض پورا کرتا ہے - شیلے کا کلام مشکل مضمون خیز اور نہایت عمدہ خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے - وہ فطرت کو اطالوی مناظر کے رنگ میں پیش کرتا ہے - اور اُسکا اپنا دماغ اُسے بہت بڑی حدتک بلند تخیل کر دیتا ہے - کیٹس بھی فطرت کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس میں اُس کے ملال اور افسردگی کا کچھ رنگ نمایاں ہوتا ہے - بائرن ہمیشہ اپنی ہی شخصیت، اپنے ہی حسیات وجذبات اور اپنی بیقراری ورنج بیان کرتا ہے - وہ سمندر، جنوبی یورپ، کوہ ایلپس، یونان اور مشرق کی خوبصورتیوں اور رعنائیوں کو دل سے چاہتا ہے - ورڈز ورتھ فطرت کے پُرسکون امن وامان سے نہایت عمدہ اخلاقی سبق سکھاتا ہے - سکاٹ دنیا کی تصویر اسی رنگ میں کھینچتا ہے جسطرح وہ اسے بظاہر دیکھتا ہے - سکاٹ کی تصاویر ہمیشہ رنگین ہوتی ہیں - چنانچہ رسکن لکھتا ہے :- "حسن کو چاہنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ اُن میں رنگینی کی داد دینے کی صلاحیت ہو خواہ موجودہ تعلیم کتنی ہی ناقص اور خراب کیوں نہ ہو، سکاٹ کا صحیح دماغ رنگینی قدرت کی شوخی سے سرور حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا - اگرچہ وہ ٹرانٹے کی اس عمدگی سے رنگ نہیں بھر سکتا تھا، لیکن اس کی قوتوں اور خوشیوں کا انحصار اُسی طرح رنگینی پر ہی تھا - اور عموماً اگر کسی چیز کے متعلق وہ زیادہ کہنا نہیں چاہتا، تو وہ اپنے مختصر بیان کو ایک مخصوص انداز میں رنگیں بنا دیتا ہے - اور اس رنگ کو استعمال کرتے وقت وہ اپنے کمال اور قوت بیان کا ثبوت دیتا ہے یہاں تک کہ بظاہر وہ معیوب دکھائی نہیں دیتا -

سکاٹ کے مذاق کی رنگینی کی وجہ اُسکی قوت خیال کی دقت اور شستگی ہے - اس کے دوسرے حواس درجۂ اوسط سے کم تھے - لیکن نظر اوسط سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی - موسیقی سے سکاٹ کو بہت کم دلچسپی تھی - (لاک ہارٹ)

سکاٹ کی نظموں اور فسانوں میں انتہائی سادگی کا رنگ ہوتا ہے، وہ فطرتاً پیچیدہ اور مشکل مضامین پسند نہیں کرتا تھا - زندگی، محبت، معرکہ یا موت کے سے سادہ اور فطرتی جذبات اُس کی طبیعت کا خاصہ تھے یہی رنگ ہمیں اس کے کلام، طرز تحریر، عبارت میں نظر آتا ہے -

حُب الوطنی

سکاٹ کی حُب الوطنی صرف سکاٹلینڈ تک ہی محدود ہے - یہاں وہ اپنے ہمعصروں، شیلے، کیٹس، اور بائرن سے بالکل مختلف ہے - ورڈز ورتھ کی طرح وہ صرف سکاٹلینڈ کو ہی اپنی حُب الوطنی کا مرکز قرار دیتا ہے، اور یہاں کی ہی کہانیوں اور افسانوں کو اپنا مضمون بناتا ہے - اور یہیں کے مناظر سے وہ تماشا گاہ کا کام لیتا ہے -

رزمیہ شاعری

جنگجو اور بہادر خاندان سے اور خود ایک والنٹیر سپاہی ہونے کے باعث سکاٹ رزمیہ نظمیں لکھنے کے لئے خصوصاً موزوں تھا، بلند خیال اور فطرتی شاعر ہونے کے علاوہ وہ معرکوں کی تصویر کھینچنے میں اپنے سب ہمعصروں میں ممتاز نظر آتا ہے - دی لے آف دی لاسٹ منسٹرل، دی لیڈی آف لیک اور دی لارڈ آف آئزلز میں سکاٹ نے بہت سے معرکوں کا بڑی خوبی سے نقشہ کھینچا ہے - لیکن ان سب سے بڑھ کر اُس نے اپنی نظم مارمین میں فلوڈین فیلڈ کی لڑائی نہایت ہی دلفریب اور دلنشین طرز سے بیان کی ہے - ہومر کی یونانی نظم الیڈ کے بعد آجتک سکاٹ کی اس رزمیہ نظم کے پایہ کو کوئی شاعر نہیں پہونچ سکا -

کئی مبصر بڑے افسوس سے کہتے ہیں کہ سکاٹ یونانی زبان کا عالم نہ تھا لیکن ہمارے خیال میں یہ سکاٹ کی خوش قسمتی تھی - یونانی تخیل جو بجائے خود وحشت کا مرقع اور غیر مستند ہے، سکاٹ کے طرز ادب کو تباہ کر دیتا -

سکاٹ بڑا زود نویس مصنف تھا لیکن اُس کی نظم مارمین اس سے مستثنےٰ ہے - اگرچہ اس کے کئی حصے بہت تیز لکھے گئے تھے، مگر وقتاً فوقتاً سکاٹ اسے ایک طرف رکھ دیتا تھا - اور کئی کئی روز تک ہاتھ نہ لگاتا تھا - وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ وہ بہت لاابالی مزاج رکھتا تھا جس کی بہت سی مثالیں ہمیں اُس کی نظموں میں ملتی ہیں -

سکاٹ ایک کامل اور کہنہ مشق ادیب تھا، اگرچہ وہ سرتاپا جوش اور جذبات سے بھرا ہوا تھا - تاہم وہ ایک محتاط اور محنتی شخص بھی تھا - سکاٹ اپنے زمانہ میں جس طرح ہر دلعزیز ہوا اسی طرح اُس کے دوستوں اور دشمنوں نے اُس پر مخالف اور موافق تنقیدیں بھی کیں - مارمین اُس کی سب سے

زبردست نظم ہیں لیکن اس پر سب سے اوّل سخت اور زبردست اعتراض ہوئے۔ اس کا دوست جیفرے اُس کے ہمعصر نقادوں میں سب سے زیادہ اعتراض کیا کرتا تھا۔ اُس کے بعد کے نقادوں میں سے کارلائل نے سکاٹ کی خوبیوں کا اندازہ غلط اور نہایت تنگدلی سے کیا ہے۔ لیکن تھیکرے نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ رسکن جو سب سے بڑا نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ سکاٹ کے متعلق لکھتا ہے کہ "وہ ہم میں عظیم ترین انسان پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اُس کا حق ہے کہ ہم اُسے اپنے زمانہ کے ادبی دل و دماغ کا عظیم ترین نمائندہ کہیں"۔

فسانہ نگاری اس میدان میں سکاٹ کی طبیعت کی جولانیاں ویورلے کی اشاعت اور کامیابی کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہیں۔ نثر کی خاطر نظم لکھنے کے وجوہ ہم اچھی طرح بیان کر چکے ہیں۔ اُس کے ناول عموماً برجستہ اور برمحل ہوتے ہیں۔ جو بغیر کسی خاص احتیاط یا محنت کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُس کی زندگی کے آخری سالوں میں جو ناول لکھے گئے، ان سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا، کہ اُس کے بیان میں کمی ہوئی تھی۔ البتہ آخری دو فسانے جو اُس وقت لکھے گئے، جب اُس پر فالج کا سخت حملہ ہو چکا تھا، سکاٹ کے جسمانی اور دماغی انتشار کو ظاہر کرتے ہیں۔

سکاٹ اپنے ناولوں میں عام پبلک کی دلچسپیوں اور عوام کے جذبات کو بیان کرتا ہے، وہ کسی شخصی یا ذاتی جذبہ کو بیان نہیں کرتا، اُس کے ناول کے تمام فرد قومی اور اخلاقی سرگرمیوں میں پورا حصّہ لیتے ہیں۔ سکاٹ کی نظموں اور فسانوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر خالص تخیّل کا نتیجہ ہیں لیکن فسانے روزمرّہ کے واقعات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ زندگی کے خیالی پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ کارلائل کا یہ اعتراض کہ سکاٹ اپنے ناول کے افراد اور سیرتوں کو بظاہر دیکھ کر ہی جو شکل چاہتا ہے انہیں دے دیتا ہے، لیکن کبھی اُن کے دل کی تہ تک نہیں پہنچتا بالکل نامناسب اور انصاف سے دور ہے، اور اگر بفرض محال صحیح بھی ہو تو صنفِ نازک کے افراد پر عائد ہوتا ہے، جہاں سکاٹ نے ان کی نامکمل تصویر پیش کی ہے، اور جس کا بڑا سبب اُس کی بہادرانہ اور غیرتمند فطرت ہے جو اُسے اُن لوگوں کا سختی سے کھوج لگانے سے منع کرتی ہے۔ جن کی وہ عزت کرتا ہے۔ اس کے خلاف وہ مردوں کی تصویر نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کرتا ہے۔

سکاٹ اپنے ناولوں کی بنیاد نہایت آزادی سے تاریخ کو قرار دیتا ہے۔ اور اپنے مقصد کے مطابق واقعات سے کام لیتا ہے۔ وہ کوئی مورخ یا تذکرہ نویس نہیں بلکہ "فسانہ نگار" ہے۔ اُس نے مزاحیہ مضامین لاجواب لکھے ہیں۔ جو روتوں کو ہنسا دیتے ہیں، لیکن اُس کا تمسخر یا ٹھٹھا کسیقدر ثقیل ضرور ہے چنانچہ مسٹر ہٹن اسے "گینڈے کی کاوٗلوں سے جو کسی سدھائے ہوئے اور شائستہ گھوڑے کی اچھل کود کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہو" تشبیہ دیتا ہے۔

دلسوز اور غمگین واقعات کا احساس سکاٹ کا حصّہ نہیں ہیں۔ اُسکی قابلیت اور طاقتِ بیان صرف سادہ طبیعت مردوں اور عورتوں تک ہی محدود ہے، یا وہ روحانی کیفیت کو چھوڑ کر فطرتِ انسانی کو ظاہر نگاہ سے ہی دیکھتا ہے، رُوح کا خفیہ عمل اُس کے سمجھ سے باہر ہے۔

تاریخی ناول سکاٹ کی ہی ایجاد ہے، اور اس طرح اُس نے علم ادب کی ایک اور شاخ پیدا کر دی ہے، اُسے تاریخی ناولوں کا بادشاہ کہا گیا ہے اُس نے کل تئیس افسانے لکھے جن میں مندرجہ ذیل خصوصاً مقبول ہوئے۔

(۱) ویورلی۔ سنہ ۱۸۱۴ء
(۲) دی اینٹیکویری۔ سنہ ۱۸۱۶ء
(۳) آئیوانہو۔ سنہ ۱۸۱۹ء
(۴) دی پائیریٹ۔ سنہ ۱۸۲۱ء
(۵) ریڈ گانٹلیٹ۔ سنہ ۱۸۲۴ء
(۶) ٹیلس آف دی کروسیڈرس سنہ ۱۸۲۵ء
(۷) وڈاسٹاک سنہ ۱۸۲۶ء

مضمون مندرجہ ذیل مصنفین کی کتابوں کی امداد سے مرتب کیا گیا ہے:۔ مسٹر ہٹن۔ پروفیسر پالگریو۔ مسٹر لاک ہارٹ۔ پروفیسر ریچ پروفیسر ولیمز۔

امیر حبیب اللہ خاں نظامی۔ آفتاب احمد خاں مضطر

زندگی کا کھیل

(مشہور فرانسیسی اہلِ قلم مارسل بانئل کے قابلِ دید ڈرامے (Jazz) کا خلاصہ و ترجمہ)

ہمارا عنوان فرانسیسی عنوان کا بجنسہ ترجمہ تو کیا اس کا قریبی ترجمہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ فرانسیسی عنوان اس خاص کھیل کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو آجکل امریکہ میں جاز بینڈ Jazz - band کے نام سے مدت سے زیادہ رائج ہے۔ مگر ہمارے عنوان کی طرح فرانسیسی عنوان سے بھی قصّے کے واقعات یا اس کا خلاصہ یا اس کا کوئی اہم جزو سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ یہ عنوان ایک ایسی چیز کو واضح کر رہا ہے جو اس قصّہ میں عارضی طور پر پیدا ہو گئی ہے ناظرین یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ مصنف نے اس ڈرامے کے لئے یہ عجیب عنوان کیوں پسند کیا۔ اور کوئی ایسا عنوان کیوں نہیں رکھا جو قصّے کے موضوع اور اس کے اشخاص کے مناسب ہو؟ مگر اس قصے میں عجیب بات صرف یہی نہیں ہے بلکہ سارے قصّے کی یہی حالت ہے۔ اس کے واقعات اس کا تخیل اس کا پلاٹ اور اس کا نتیجہ ہر چیز عجیب و غریب ہے لیکن پھر بھی کوئی چیز لُطف سے خالی نہیں اور قصہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ اس کو دو تین بار پڑھیں۔ اس لئے نہیں کہ اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ کیوں کہ اس کا سمجھنا بالکل آسان ہے۔ اور نہ اس لئے کہ آپ فن کے لحاظ سے اس کی خوبیوں کا اندازہ کر سکیں کیونکہ اس کا اندازہ آپ کو شروع کرتے ہی ہو جائے گا۔ بلکہ اس کو بار بار اس لئے پڑھیں کہ جس مقصد یا جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مصنف نے اسے لکھا ہے وہ آپ پر اچھی طرح واضح ہو جائے مگر پھر بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ آپ مصنف کی خاص غرض اور اہم مقصد کو سمجھ جائیں گے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اُس نے کوئی خاص مقصد اور خاص غرض اپنے پیش نظر رکھے بغیر صرف اپنے خیالات اس قصّے کے پیرایہ میں ظاہر کر دیے ہوں اور غرض و مقصد یا نتیجہ اپنے ناظرین کے لئے چھوڑ دیا ہو کہ جو چاہیں نکالیں ◆

بہر حال خواہ کچھ بھی ہو اس قصّے میں آپ دو چیزیں محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ اُن علماء کا بے حد رونا رویا گیا ہے جو اپنی زندگیاں صرف علم اور ایک خاص قسم کے ادب کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اس قصّے کا ہیرو بھی جس نے اپنی زندگی یونانی ادب کیلئے وقف کر دی ہے ایسے ہی علماء میں ہے دوسری چیز جو آپ کو اس میں نمایاں نظر آئے گی وہ خشک، بے لذت علمی زندگی اور دنیا کی لذتوں اور تفریحوں کی لگاتار کشمکش ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے قصّہ نویس کا مقصد لوگوں کو ایسی خشک علمی زندگی سے نفرت دلانا ہے جس کے راستے میں بعض اہلِ علم اپنے جذبوں اپنی خواہشوں اور اپنی انسانی ضرورتوں کا خون کر دیتے ہیں۔ اور زندگی کی تمام دلچسپیوں اور دنیا کی ساری لذتوں سے کنارہ کش ہو کر ایک زاہد یا راہب کی طرح بن جاتے ہیں؟ یا قصّہ نویس کی غرض یہ ہے کہ علم و ادب کی کسی خاص قسم پر زندگی وقف کر دینا درست ہے بھی تو وہ قسم ہزاروں سال کی دفن شدہ کسی قدیم زبان کی ایک خاص طریقے پر تحقیق اور چھان بین نہیں ہے جس کے خبط میں ہمارا ہیرو اور اس کی طرح سینکڑوں اہلِ علم اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں؟ یا اس کی غرض کالجوں کے طلبہ اور پروفیسروں کو اس موضوع کی طرف متوجہ کرنا ہے؟ یا اس کی خواہش صرف یہ ہے کہ اس علمی بحث کو دلچسپ اور عام پسند اسلوب سے بیان کر دے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ تینوں باتیں بیک وقت اس کے پیش نظر تھیں اور اُس نے اپنے ڈرامے میں ان تینوں چیزوں کو بہترین طریقے پر ظاہر کر کے غور کے ساتھ مطالعہ کرنے والوں کے واسطے بڑا دلچسپ اور بے حد مفید بنا دیا ہے۔

اس ڈرامے کے قابلِ ذکر اشخاص چار ہیں۔ پہلا شخص کالج کا پروفیسر جان بلیز (Jean Balaise) ہے اس وقت اس کی عمر ستاون سال کی ہے۔ اُس نے نوجوانی سے اس وقت تک کی اپنی ساری قوت یونانی زبان کے سیکھنے میں خرچ کر کے اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ عوام میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ خواص اس کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ فرانس گورنمنٹ نے بھی اس کی عزت افزائی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اب عنقریب فرانس کی سب سے ممتاز علمی اکیڈیمی کا ممبر اور سار بون یونیورسٹی کا پروفیسر بنایا جانے والا ہے۔ مگر علمی میدان میں یہ رتبہ حاصل کرنے کے واسطے اُس نے اپنے نفس پر قسم قسم کی سختیاں کی ہیں اور اپنی زندگی کو سینکڑوں پابندیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ محبت کرنے سے تو

کرلی ہے۔ عورتوں اور زندگی کی دوسری لذتوں کو بھلا دیا ہے۔ اور اپنا اپنے کو ان تمام چیزوں سے بالا۔ اور اس پسندیدہ گروہ میں سے سمجھتا ہے جو لوگوں کی رہبری اور انسانیت کو ترقی دینے ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اپنی موجودہ حالت پر بظاہر خوش اور مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب اُس نے دائمی زندگی حاصل کر لی ہے اور دنیا میں اس کا نام اُس کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کو ایک قسم کی اندرونی خلش ہمیشہ ستاتی رہتی ہے اور وہ برابر اپنے علم اور فطری خواہشوں کی جنگ میں لگا رہتا ہے۔ ظاہر تو یہی کرتا ہے مگر درحقیقت اپنے نفس اور اپنی خواہشوں پر ہمیشہ کے لئے وہ اب تک غالب نہیں آسکا ہے۔ اس کی علمی ہوس اور فطری خواہش کی اس جنگ نے اتنا طول پکڑا ہے کہ ہم کو اس کا ظاہری اثر پہلی فصل میں اس کی خفقانی اور اضطرابی کیفیت کی شکل میں صاف نظر آرہا ہے جس کو اس کی خادمہ معدے کی خرابی کا اثر بتاتی ہے مگر اُس کا دوست تنہائی اور دل بہلانے والی چیزوں سے کنارہ کشی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قصہ نویس نے پروفیسر جان کی موجودہ شخصیت یا ذات کو دو شخصوں کا مجموعہ قرار دینے میں کمال کر دیا ہے۔ اُن میں سے ایک تو یہی عالم ہے جس سے ہم کو ابھی روشناس کرا چکے ہیں۔ اور دوسرا شخص اُس عالم کی جوانی ہے جسے قصہ نویس نے ایک نوجوان کے روپ میں لاکر جوانی کی خواہشوں کو دبا دینے کی نظر نہ آنے والی اندرونی کیفیت کو ہر شخص کے دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

دوسرا شخص کالج کا عمر رسیدہ پرنسپل ہے۔ اس کی علمی لیاقت خاصی ہے اور بظاہر اپنے علم پر ایمان اور بھروسہ بھی رکھتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا سینہ بھی شک و شبہ سے خالی نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی اپنے کو علم کے فریب میں پھنسا ہوا پاتا ہے۔ اس میں بھی وہ تمام عیوب موجود ہیں جو اُن عالموں میں ہوا کرتے ہیں جو کسی عہدے پر ممتاز ہوتے ہیں اور اپنے افسروں کو خوش رکھنے اور پبلک پر اپنا علمی رعب جمانے کی فکر ہمیشہ ان کو ستاتی رہتی ہے۔ یہ شخص بڑا حاسد اور پرلے درجے کا منافق اور حد سے زیادہ بزدل ہے۔

تیسری ایک نوجوان لڑکی ہے جس کا نام سیسل بواسیہ (Cecille Bassana) ہے۔ یہ کالج میں لاطینی اور یونانی پڑھتی ہے۔ یہ غضب کی حسین و جمیل ہے مگر غریبی اور زندگی کی دوڑ دھوپ اُسے اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسری جوان لڑکیوں کی طرح عشق و محبت کی طرف توجہ کرے۔ اپنی خواہشوں کی قربانی کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے اور محبت کے اثر کو اس وقت تک قبول نہیں کر سکتی جب تک کہ اسکی قوت برداشت جواب نہ دیدے اور وہ اُس کے لئے مجبور نہ ہو جائے۔

چوتھا شخص سٹیپا نوویٹش ( ) نامی ایک سروی جوان ہے جو پہلے کہیں مدرس تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اُسے یونانی سیکھنے کا شوق ہوا تو وہ فرانس آکر اس کالج میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک شریف طبع جفاکش اور بڑا محنتی آدمی ہے۔ اپنی ضرورت اور تعلیمی خرچ کیلئے بوجھ ڈھونے اور قلی کا کام کر لینے میں بھی نہیں شرماتا۔ محبت کے معاملے میں بڑا نرم دل ہے لیکن اپنے جذبے کو چھپانے کی عجیب قابلیت رکھتا ہے۔ محبت کرتا ہے۔ مگر اُس کو اُس وقت تک ظاہر نہیں کرتا جبتک ظاہر کرنے میں کوئی خرابی نظر آتی ہو۔ لیکن جب وہ جان لیتا ہے کہ اب اُس کا اعلان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو بے دریغ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

بس یہی چار شخص اس ڈرامے کی جان ہیں۔ اب دیکھو کہ کس طرح اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

(۱)

ہم فرانس کے ایک بڑے شہر میں پروفیسر جان کے گھر میں موجود ہیں وہ اپنا لیکچر دینے کالج گیا ہوا ہے۔ اس کی خادمہ اُس کے ایک دوست سے باتیں کر رہی ہے۔ اتنے میں کالج کا پرنسپل آتا ہے۔ اُس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ کوئی بُری خبر لایا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی چہرے پر اُسکی دلی مسرت کا رنگ جھلک رہا ہے۔ پروفیسر سے ملاقات ہونے کی وجہ سے پھر دوبارہ آنے کی اطلاع دے کر چلا جاتا ہے۔ تنہائی میں خادمہ پروفیسر کے دوست سے کہتی ہے کہ پروفیسر رات کو اکثر بےچین رہا کرتا ہے۔ اور اس پر خفقان کی سی کیفیت طاری رہتی ہے اور یہ غالباً اُس کے معدے کی خرابی کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پروفیسر کا دوست کہتا ہے کہ نہیں جی! یہ سب کچھ اس کی تنہائی اور مجرد زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہے۔

پھر پروفیسر آتا ہے اور صاحب سلامت کے بعد اپنے دوست کے ساتھ باتوں میں لگ جاتا ہے۔ دوران گفتگو میں ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ پروفیسر کبھی مصر گیا تھا۔ وہاں کسی گرجے سے لاطینی زبان میں انجیل کا ایک بہت ہی پرانا نسخہ اس کو ہاتھ آگیا اور اس میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ انجیل لکھنے سے پہلے اس کے صفحوں پر یونانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا پروفیسر نے کیمیائی عمل کے ذریعے سے مصالحہ کی وہ پرت دور کر دی جس پر انجیل کے حروف قائم تھے۔ اور اندر سے یونانی عبارت نکل آئی لیکن اس پر ہزاروں سال گذر جانے اور پالش کی دوسری پرت چڑھا کر اُس پر انجیل لکھ دینے سے اصل یونانی کتاب کی حالت ایسی ردی

ہوگئی تھی کہ ساری کتاب میں ایک سطر بھی بالکل صحیح سالم نہیں بچی تھی۔ پروفیسر ایک خاص انداز سے زور دیکر اور اپنے دوست کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے اس کے پیچھے اپنا دن رات ایک کردیا اور کئی سال کی لگاتار محنت مشقت کے بعد آخر پوری کتاب کو مکمل اور صحیح کردیا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب جس کا نام فائیٹن ([illegible]) ہے افلاطون کی ایک بہترین تصنیف ہے۔ پھر میں نے دنیا کے فائدے کے لئے اس کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ پریس سے نکلتے ہی علمی دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی اور سارے اہل علم یک زبان ہوکر بول اُٹھے کہ کیا باعتبار زبان۔ کیا باعتبار ادب اور کیا باعتبار فلسفہ ہر لحاظ سے اس نے افلاطون کی ایک بہترین یادگار سے دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ پھر پروفیسر نے بتایا کہ فرانس گورنمنٹ نے بھی .... اس کی محنت اور اس علمی دیانت کی قدر کی ہے اور وہ عنقریب ساربون یونیورسٹی کا پروفیسر مقرر ہونیوالا ہے۔ پروفیسر اپنی ساری رامائن سُنا گیا۔ مگر اس کے دوست کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ سیتا جی عورت تھیں یا مرد۔ وہ ایک تجارت پیشہ آدمی ہے۔ اور یہ چیزیں غالباً اُس کی سمجھ سے بالا ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اِدھر پروفیسر داد کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ مگر اُدھر سے "اچھا" اور "خوب" کے سوا کچھ بھی سُننے میں نہیں آتا۔ آخر پروفیسر جھلا کر اُس پر بگڑ بیٹھتا ہے اور دونوں میں خوب تو تو میں میں ہولی ہے۔ اُس وقت اُس کے علمی غرور کے ساتھ ہی ہم پر اُس کی ایک اور کیفیت بھی نمایاں ہوجاتی ہے پروفیسر ہمیشہ یہی سمجھتا رہا ہے کہ ایک اہل علم کی حیثیت سے اس کی ذات دنیا اور اس کے ہر بسنے والے کے لئے مفید ہے اور ہر شخص اس کا ریزہ چین اور خادم ہے۔ لیکن اس وقت اس کے دوست کی طرز عمل نے اُسے شبہ میں ڈال دیا ہے وہ سوچ رہا ہے کہ کیا ایسا نہیں ہے! .... دنیا کی ساری دلچسپیوں کو چھوڑ کر اور عورتوں سے منہ موڑ کر صرف علم و ادب کا ہو رہنے کا بدلہ کیا یہی ہے!!

دونوں اسی حالت میں بیٹھے تھے کہ پروفیسر کی شاگرد سیسل او اسیمین آجاتی ہے اور پروفیسر سے ایک کتاب مانگتی ہے کہ چند دنوں میں دیکھ کر لوٹا دے گی۔ پروفیسر بغیر کچھ کہے کتاب دیدیتا ہے۔ دونوں چپ ہیں۔ مگر سیسل کی طرف پروفیسر کے ایک خاص قسم کے میلان اور مہربانی کے جذبے کو اس وقت ہم اچھی طرح محسوس کررہے ہیں سیسل بھی اس کی اس خلاف عادت دریا دلی پر متعجب سی نظر آرہی ہے۔ وہ دراصل کتاب مانگنے نہیں آئی تھی۔ وہ اس لئے آئی تھی کہ پروفیسر سے عرض کرے کہ اُس کا جماعتی دوست (کلاس فیلو) سروی جوان سٹیپانو ویلٹش یہاں کا خرچ برداشت نہیں کرسکتا اور ہر طرف سے نا اُمید ہوکر اب اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہے۔ اُس کے دوستوں نے زاد راہ خرچ کے لئے یہ رقم جمع کردی ہے۔ مگر اس کی خودداری اور غیرتمندی سے اُمید نہیں ... کہ وہ اسے قبول کرلے۔ اس لئے طلبہ چاہتے ہیں کہ یہ تھیلی پروفیسر اپنی معرفت اس کے حوالے کردے۔ پروفیسر تھیلی واپس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ سروی جوان کے یہیں رہنے اور تعلیم ختم کرنے کے خرچ کا کوئی نہ کوئی سامان کردیگا۔ پھر سیسل کو ملامت کرنے لگتا ہے کہ اس نے یونانی زبان کا جو موضوع دیا تھا اس پر سیسل کا مضمون کسی کام کا نہیں ہے۔ اسے یونانی پر خاص توجہ کرنی چاہئے۔ اس کے بعد سیسل چلی جاتی ہے اور اس کے جاتے ہی سروی جوان پروفیسر سے رخصت ہونے کے واسطے آتا ہے۔ پروفیسر اس کو کچھ بولنے کا موقع نہیں دیتا اور اس کے بیٹھتے ہی کہنے لگتا ہے کہ وہ عنقریب کزنیوفون کی ایک کتاب شائع کرنے والا ہے اس کی شرح اور حاشیہ تیار کرچکا ہے۔ لیکن مسودے کے اوراق پریشان اور بکھرے ہوتے ہیں۔ ان کو ترتیب دیکر اس کی ایک خوشخط نقل لینی ہے۔ اور یہ کام سروی جوان کے ذمے لگا کر اس کا آدھا محنتانہ اُسی وقت پیشگی دیدیتا ہے۔ سروی جوان اس کو غنیمت سمجھ کر چپ چاپ قبول کرلیتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنی غیرت اور خودداری کو ٹھیس لگائے بغیر اپنی تعلیم ختم کرکے امتحان میں بھی شریک ہوسکتا ہے۔

سروی جوان کے جانے کے بعد پروفیسر پھر اپنے دوست کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہی تھا کہ پرنسپل آجاتا ہے۔ پروفیسر جبراً قہراً اس سے ملتا ہے۔ پرنسپل بلا توقف کہنا شروع کردیتا ہے کہ افسوس ایک بُری خبر لیکر آیا ہوں آپ کی محنت اکارت جانیکا مجھے بھی بے حد صدمہ ہے۔ مگر ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کسی اہل علم کو ان باتوں سے بددل نہیں ہونا چاہئے۔ پروفیسر نئی خبر سُننے کے لئے بے چین ہے۔ مگر پرنسپل اپنی الاپنا جارہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے بڑی مشقت اُٹھائی۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں تھا لیکن اُس کو بالکل صحیح نسخہ مل گیا ہے۔ بالکل صحیح! ایک دم عجیب! آپ کے نسخے کی ایک سطر بھی صاف نہیں آتی اور اس کے نسخے کا حرف حرف روشن ہے۔ پروفیسر گھبرا کر اُٹھتا ہے اور مطلب کی بات کہنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ آخر بڑے اصرار کے بعد پرنسپل بیان کرتا ہے کہ مشہور انگریزی محقق کونسٹن (   ) مصر گیا تھا وہاں سے اُس نے فائیٹن کا ایک نسخہ حاصل کیا ہے جو بالکل اچھی حالت میں ہے۔ اس کو پڑھنے سے دو باتیں معلوم ہوئی ہیں ایک تو یہ کہ یہ کتاب افلاطون کی نہیں ہے بلکہ اسکندریہ کے ایک نحوی کی تصنیف ہے جو افلاطون کا پیرو تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں افلاطون کے چار سو سال بعد اُس نے یہ کتاب لکھی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ پروفیسر جان نے اپنے نسخے میں الفاظ کی صحت جملوں کو پورا کرنے اور متن کو درست کرنے میں جتنی اصلاح کی ہے وہ سراسر غلط

اور اصل نسخے کے بالکل خلاف ہے۔ کولسن عنقریب اپنا نسخہ شائع کرنے والا ہے۔ لیکن عام پبلک میں پیش کرنے سے پہلے اُس نے اپنے نسخے کی یہ نقل پروفیسر کے مطالعے کے لئے بھیجی ہے۔ پرنسپل سے مسودہ لیکر پروفیسر پڑھنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسکی بے چینی بڑھتی جارہی ہے۔ آخر اس کے چہرے سے وحشت ٹپکنے لگتی ہے۔ اس کا دوست اور پرنسپل دونوں اس کو اسی حالت پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اسی درمیان میں ایک نوجوان ظاہر ہوتا ہے۔ نہ معلوم یہ دیوار پھاڑ کر نکل آیا ہے یا چھت سے ٹپک پڑا ہے۔ صورت بتا رہی ہے کہ اس کے سینے میں سینکڑوں جذبے دفن ہوچکے ہیں۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غم اور غصے کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر کے پیچھے کھڑا ہو کر وہ نہایت غمگین نظروں سے اس نقل کو دیکھ رہا ہے گویا پروفیسر کے ساتھ ساتھ اُس کو وہ بھی پڑھ رہا ہے۔

(۲)

اس واقعہ کو کچھ دن گذر چکے کولسن کا نسخہ بازار میں آچکا اور پروفیسر جان بُری طرح رسوا ہوچکا۔ اس سے عقیدت رکھنے والے اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانیوالے اہل علم اور عوام اب دو گروہ میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک پروفیسر کو نرا جاہل سمجھنے لگا ہے اور دوسرا گروہ اس کو بے سر پیر کی ہانکنے والا خیال کرتا ہے۔ پروفیسر کو اس بے عزتی کا اتنا صدمہ ہے کہ ہفتوں سے نہ کالج جاتا ہے اور نہ کسی سے ملتا جُلتا ہے۔ مگر آج اُس نے اپنے حواس کچھ ٹھکانے کرکے اپنا لیکچر شروع کرنے کی اطلاع کالج میں بھیجدی ہے۔ فائیڈن کے بارے میں پبلک کی طرح طلبہ کی رائے بھی مختلف ہے۔ مگر پروفیسر کو دیکھنے اور اس کا اس وقت کا لیکچر سُننے کے سب کے سب مشتاق ہیں۔ لیکن پرنسپل چاہتا ہے کہ ابھی اس کا سلسلہ شروع نہ ہو — ایک چپراسی کو اشارہ کردیتا ہے کہ لڑکوں کو لیکچر ہال میں جانے سے باز رکھے۔ اور ان میں مشہور کردے کہ پروفیسر نے فی الحال لیکچر ملتوی کردیا ہے۔ مگر اکثر طلبہ اُٹھ جاتے ہیں اور لیکچر ہال میں جا بیٹھتے ہیں۔ پرنسپل جب سمجھ لیتا ہے کہ اب لیکچر رُکتا نظر نہیں آتا۔ تو لڑکوں کے پاس آکر تعزیت اور غمخواری کے لہجے میں اُن کے پروفیسر کے عیوب بیان کرنے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا مرثیہ ختم کرکے چلا جاتا ہے۔

پروفیسر آتا ہے اور اپنا گون پہنکر اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔ بیٹھا ہی تھا کہ پروفیسر کے سامنے والی آخری کھڑکی میں وہی نوجوان نظر آتا ہے۔ جس کو ہم نے پہلی فصل کے اخیر میں پروفیسر کے کمرے میں دیکھا تھا۔ پروفیسر بولنے لگتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ فائیڈن افلاطون کی تصنیف نہیں ہے اُس کی تحقیق غلط اور سراسر غلط ہے اور اس کی ترتیب صحیح تو کیا، صحت کے قریب بھی نہیں۔ مگر اسی کتاب نے جو غلطیوں سے بھری ہوئی ہے اُن تمام عالموں کو دھوکا دیدیا جو ہمیشہ یونانی ہی پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔ تمام ماہرین لغت نے، تمام ادیبوں نے اور سارے فلسفیوں نے اسے بیحد پسند کیا اور اس کا ایک ایک حرف صحیح مان لیا۔ حالانکہ اس میں آٹھ سو سے بھی زیادہ غلطیاں ہیں۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنا شروع کرتا ہے کہ علم کوئی چیز نہیں۔ علم نام ہے بے شمار وہموں کا! علم نام ہے لاتعداد گمراہیوں کا! علم نام ہے خود فراموشی کا! علم نام ہے کچھ نہ جاننے کا! اور اہل علم کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے کسی تاریک جگہ کے مخفی خزانے کا پتہ پایا اور اسے حاصل کرنے کے لئے چراغ لیکر چلا۔ مگر خزانے تک پہنچنے کی بجائے چراغ کی بتی ہی نیچے اوپر کرنے میں پھنسا رہگیا۔ انسانی عقل بھی چراغ ہی جیسی ہے۔ اس میں اگر علم کی بتی روشن ہوگئی تو دنیا کی دلچسپیوں اور زندگی کی لذتوں کے خزانے تک پہنچنے کی بجائے اہل علم اسی کے نیچے اوپر کرنے میں پھنسے رہجاتے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر اپنے شاگردوں کو علم پر لعنت بھیجنے اور لطف کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر یکایک رگی گھڑے ہوکر پروفیسری کا گون اُتار پھینکتا ہے اور اُن کے سامنے اعلان کردیتا ہے کہ وہ استعفا دے رہا ہے۔

(۳)

اسی شام کو ہم پروفیسر کے مکان میں موجود ہیں۔ اس کا کمرہ اب کتابوں سے بالکل خالی ہوچکا ہے۔ وہ اپنے کتب خانے میں بیٹھا کاغذات اُلٹ پلٹ رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر پھاڑتا جارہا ہے۔ اسی حالت میں پرنسپل آتا ہے اور پروفیسر سے کہتا ہے کہ آج اُس نے اپنے لیکچر میں جو کچھ کہا ہے وہ کسی اہل علم اور کسی پروفیسر کے لئے مناسب نہیں ہے۔ پروفیسر اس پر کوئی معذرت نہیں کرتا اور چپ چاپ پرنسپل کو اپنے استعفے کا کاغذ دے دیتا ہے۔ پرنسپل واقعی مخلصانہ لہجے میں اصرار کرتا ہے کہ وہ اس پر پھر غور کرکے اور اسے واپس لے لے۔ یہاں ہم پر پرنسپل کی شخصیت کا روشن پہلو نمایاں ہوجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے

کہ وہ اپنے علم اور اپنے عہدے کو دنیا کے دوسرے پیشوں کی طرح صرف روزی کمانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کو نہ علم پر بھروسہ ہے نہ کالج پر اس کو بھروسہ ہے تو صرف اپنی بیوی بچوں والی پر لطف زندگی پر۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے تو بجا طور پر خوش اور اگر ناکام رہتا ہے تو بیوی بچوں میں دل بہلا کر ناکامی کے صدمے کو جلد ہی بھلا دیتا ہے۔ پروفیسر اپنے استعفے پر اڑا ہوا ہے اس لئے پرنسپل کاغذ لیکر

چلا جاتا ہے۔ اُس کے جانے کے بعد پروفیسر کے سامنے وہی نوجوان کھڑا نظر آتا ہے جس کو ہم گذشتہ فصلوں میں دیکھ چکے ہیں۔ پروفیسر میں اور اُس میں نہایت دلچسپ اور پراثر جھڑپ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان دراصل پروفیسر کی جُوانی ہے۔ جس کو وہ عشق و محبت سے زبردستی روک کر صرف علم میں لگے رہنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اب موقع پاکر پروفیسر کے سامنے اپنی جوانی کی بربادی اور ترس ترس کر دن کاٹنے کی داستان دہرا رہا ہے۔ بڈھا پروفیسر اس سے جان چھڑانے کی ہزار کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آخر آہستہ آہستہ پروفیسر بھی اُس کے ساتھ اُسی پُرانے قصے کی یاد میں محو ہو جاتا ہے......!

وہ دیکھو! پچھلی رات کو کس قدر سویرے اُٹھ کر یونانی زبان کے پڑھنے لکھنے میں لگ گیا ہے۔ آفتاب نکلتے ہی کالج جا رہا ہے۔ بازاروں، تفریح گاہوں اور اپنی طرف مائل کرنے والی شہر کی سج دھج سے بچنے کیلئے بندۂ خدا نے آبادی سے باہر باہر کا کتنا لمبا راستہ اختیار کیا ہے۔ دیکھو! وہ خوبصورت سی نازک اندام عورت جو اس کے پہلو سے گذر رہی ہے اُس سے کتنا کترا رہا ہے، کیسی آنکھیں چُرا لی ہیں، اور اس کی طرف سے کس طرح مُنہ پھیر لیا ہے مگر دیکھو وہ یقینی طور پر اپنے اندر محبت کی جلن محسوس کر رہا ہے۔ پھر بھی اپنے نفس کو دھوکا دیکر اس کو ظاہر کرنے سے کیسا انکار کر رہا ہے۔ اور اپنی طرف اس حسینہ کے مائل ہونے سے بھی جان بوجھ کر انجان بنا جا رہا ہے۔ مگر ذرا یہ بھی دیکھنا کہ حسینہ نے جاتے جاتے ایک پھُول اس کی طرف پھینک دیا ہے تو اُس نے اُسے کیسے مزے میں اُٹھا لیا ہے۔ وہ پھُول بیس سال سے ابتک پروفیسر کی میز پر گلدان میں رکھا ہوا ہے وہ اسے ہمیشہ حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مگر چھوتا کبھی نہیں کہ کہیں اس کی سوکھی ہوئی پنکھڑیاں بکھر نہ جائیں۔ ذرا سُنو! وہ اس نوجوان سے کیا عذر گڑھ رہا ہے کہ وہ نہ خوبصورت تھا نہ اس میں کوئی کشش تھی۔ پھر کوئی عورت اس کی بیوی بننا کا ہیکو پسند کرتی۔ لیکن نوجوان اپنے شانے کو ایک بار جھٹک دیتا ہے تو پروفیسر شرمندہ ہو جاتا ہے اور اُسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ میں تو خاصا خوبصورت اور ہاتھ پیر کا بھرپور تھا۔ اور مجھ سے ہر عورت محبت کر سکتی تھی۔ پھر نوجوان اپنی جوانی کا البم کھول کر پروفیسر کے آگے رکھ دیتا ہے۔ وہ تمام منظر ایک ایک کرکے دکھا رہا ہے۔ پروفیسر بدحواس ہوتا جا رہا ہے اور آخر خبطی سا ہو کر نوجوان پر جھپٹتا ہے اور چلانے لگتا ہے۔ خادمہ دوڑی آتی ہے۔ مگر یہاں پروفیسر کے سوا اور کسی کو نہیں پاتی۔ پروفیسر بیچارا چونک کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ہی سیبل آ جاتی ہے اور نہایت تعجب سے پروفیسر سے استعفا کے متعلق دریافت کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ واقعی میں نے استعفا دیدیا ہے۔ وہ بار بار التجا کرتی ہے کہ استعفا واپس لے لے مگر وہ برابر انکار کرتا جاتا ہے بڑی دیر تک دونوں میں اسپر بحث ہوتی رہتی ہے۔ طرفین گفتگو بتا رہا ہے کہ بڈھا پروفیسر سیبل کو چاہتا ہے۔ مگر جب اس محبت کی گرمی اپنے اندر تلاش کرتا ہے اور اُس کا پتہ نہیں پاتا تو نرمی و سختی اور خواہش و قوت کی کشمکش سے گھبرا کر مایوس ہو جاتا ہے اور سیبل جانا چاہتی ہے تو اجازت دیدیتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پھر وہی نوجوان پروفیسر کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ اور پروفیسر کو ملامت کرتا ہے کہ اُس نے سیبل کی طرف مائل ہونے کے باوجود اسے جانے کی اجازت کیوں دیدی حالانکہ اسکو ابھی بٹھا سکتا تھا اور اس پر اپنی محبت ظاہر کر سکتا تھا۔ پروفیسر پہلے سرے سے محبت ہی سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اقرار کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا سن بہت زیادہ ہو چکا ہے اور اب بڑھاپے کی آفتیں اسے گھیرے جا رہی ہیں۔ لیکن نوجوان اس کو دلاسا دیتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ ابتک اس میں کافی قوت موجود ہے اور زندگی کے مزے اب بھی بخوبی لوٹ سکتے ہو۔ سیبل ابھی واپس آئے گی۔ وہ اپنا بٹوا یہیں بھُول گئی ہے۔ اور اس لئے بھُول گئی ہے کہ وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔ اُس کے آتے ہی دل کی بات کہہ ڈالو اور اس کی دلجوئی اور اپنی شیریں کلامی اور لسانی سے اس کا دل موہ لو۔ سیبل اپنا بٹوا ڈھونڈتی ہوئی آتی ہے تو پروفیسر اس کو تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرا لیتا ہے وہ بیٹھ جاتی ہے۔ تو مختصر سی تمہید کے بعد اس کو اپنی محبت کی خبر دیتا ہے وہ سُنکر حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ پھر اُس سے شادی کرنے کی خواہش کرتا ہے وہ گھبرا اُٹھتی ہے۔ آخر مایوس ہو کر کہتا ہے کہ اگر قبول نہ کرے گی تو یہ خودکشی کرے گا۔ سیبل ڈر کر نرم پڑ جاتی ہے۔ پروفیسر نزدیک آکر اُس کا بوسہ لینا چاہتا ہے تو وہ ہٹ جاتی ہے اور بھاگنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر وہی نوجوان آگے بڑھ کر پروفیسر کی طرف سے سیبل کی دلجوئی شروع کر دیتا ہے اور جس بوسے کی تمنا میں وہ سیبل کی طرف بڑھا تھا اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مانوس اور مطمئن ہو کر پروفیسر کے پہلو میں بیٹھ گئی ہے اور اپنا سر اس کے کندھے پر ڈال کر اس پھُول کو سونگھ رہی ہے جو بیس سال سے خشک پڑا تھا۔ مگر اس وقت تر و تازہ ہو گیا ہے۔

(۳)

کئی دن گذر گئے۔ پروفیسر میں اور سیبل میں شادی کا اور شادی سے پہلے چند دنوں پروفیسر کے پاس رہنے کا عہد و پیمان ہو گیا۔ اب وہ پروفیسر ہی کے ہاں رہتی ہے۔ چند دن کے بعد پروفیسر اس کے ساتھ اُس کے

وطن کو جائیگا اور وہیں شادی ہوگی - پروفیسر کے چہرے پر اب جوانی کی تروتازگی نظر آرہی ہے - اس کے لبوں پر کامیابی کی مسکراہٹ کھیل رہی ہے اور بڑے اطمینان سے کمرے میں ٹہل رہا ہے - پرنسپل آتا ہے - اور اس کو خبر دیتا ہے کہ سیبل کو اپنے پاس رکھنے کی وجہ سے اُس کے متعلق شہر میں بڑی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں - اخبارات نے بھی اس کے بارے میں نہایت برے نوٹ لکھے ہیں اور اس کی وجہ سے سارے کا سارا کالج بدنام ہورہا ہے لوگ کالج اور کالج کے پروفیسروں سے اس قدر بھڑک گئے ہیں - پروفیسروں پر سے اعتماد اتنا اُٹھ گیا ہے اور کالج کی ساکھ اتنی بگڑ گئی ہے کہ خود اُس کی بیوی تک اب اُسے اکیلے کالج جانے دینے کی روادار نہیں ہے - لیکن پروفیسر نہ پرنسپل کی بات کا کوئی خیال کرتا ہے نہ اُسے اخبار والوں کی کوئی فکر ہوتی ہے اور نہ پبلک کے بگڑنے کا اُسے کوئی رنج ہوتا ہے - وہ چند ہی دنوں میں اس شہر کو - اس کے کالج کو - اس کے بسنے والوں کو اور یہاں کے اخباروں کو سب کو خیرباد کہدیگا - اُسے کسی کی پروا نہیں کیونکہ اس وقت سب سے بڑا خوش قسمت یہی ہے اور کیوں نہ ہو سیبل جیسی نوجوان اور حسین لڑکی اب اس کی بیوی بننے والی ہے -

پرنسپل ٹلا تو پروفیسر کی خادمہ اس سے بھی زیادہ بگڑتی ہوئی آتی ہے اور کیوں نہ بگڑے وہ اس بڑھاپے کی رات میں جوانی کے دن منا رہا ہے ایک جوان لڑکی کو جو نہ اس کی بیوی ہے نہ منگیتر ہفتوں سے گھر میں چھپا رکھا ہے - کل ہی دودھ میوے والی آئی تھی تو اس کو کتنا بُرا بھلا کہہ رہی تھی - اور وہی کیا سارا شہر تھو تھو کر رہا ہے - مگر ہمارے پروفیسر کی بلا سے اُس کا نہ میوے والی کچھ کر سکتی ہے نہ اُس کی خادمہ اُس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ شہر والے اس کا کچھ لے سکتے ہیں کیونکہ اب تو سیبل اس کی بیوی بن کے رہے گی خواہ سارے کے سارے اسی جلن میں مر جائیں -

خادمہ کے جاتے ہی ہمارا وہی نوجوان پھر نمودار ہوتا ہے اور پروفیسر کو پھر ملامت کرنے لگتا ہے کہ کیا وہ سیبل کا عاشق نہیں ہے ؟ اور کیا وہ اس سے محبت نہیں رکھتی - پھر یہ کیا ہے کہ اُسے اُس چیز کی طمع تک نہیں ہوتی جس کے لئے سارے عاشق مرتے رہتے ہیں - اور آخر وہ اُسے اُس کے کمرے میں تنہا چھوڑ کر خود اپنے کمرے میں اکیلا پڑا رات بھر کروٹیں کیوں بدلتا رہتا ہے حالانکہ جس طرح اِس کو جوانی گھنٹے محبت بےچین کئے رہتی ہے - اسی طرح اُس کو ہمیشہ جوانی ستاتی رہتی ہے - جوانی بڑھاپے کو اُکسا رہی ہے - اور پروفیسر ان خیالات کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے - مگر دیکھو ! آخر نوجوان کا برانگیختہ کرنا بیکار نہیں گیا اور پروفیسر سیبل کے کمرے تک جا پہنچا - کمرے کے اندر قدم رکھنا چاہتا ہی ہے کہ بچی بچائی شرافت اور انسانیت کا خیال اس کو اُلٹے پاؤں لوٹا دیتا ہے - اور وہ جس ارادے سے گیا تھا اُس کو شادی ہونے تک کیلئے اُٹھا رکھتا ہے - اس کے بعد سیبل اپنے کمرے سے نکل کر اُس کے پاس آتی ہے - وہ نہایت کشادہ پیشانی سے مسکراتا ہوا اس کو خوش آمدید کہتا ہے - باتوں باتوں میں سیبل کہتی ہے کہ ہم کو یہ شہر چھوڑنے سے پہلے یہیں شادی کرلینی چاہئے - اور سروی جوان کو ہماری شادی کے گواہوں میں ہونا چاہئے پھر سروی کی خوبیاں بیان کرنے لگتی ہے اور اس کے جنگی کارناموں کا ذکر اس انداز سے چھیڑ دیتی ہے کہ پروفیسر کو سروی جوان کی نسبت کچھ شبہ سا ہو جاتا ہے کہ یہ شاید اُس کو چاہتی ہے - اس ذکر کو ٹالنے کے لئے کسی کام کے بہانے پروفیسر کہیں باہر چلا جاتا ہے -

پروفیسر کے جانے کے بعد سروی جوان اس کے ہاں آتا ہے - کہ اس کی کتاب کا مسودہ اور اس کی اُجرت واپس کر دے - کیونکہ اب وہ یہاں سے کوچ کرنے والا ہے سیبل اس سے گفتگو کرنے لگتی ہے اور اسی دوران میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں سے اس لئے نہیں جا رہا ہے کہ اس کی تعلیم ختم ہوگئی یا خرچ کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہاں نہیں ٹھیر سکتا - بلکہ اس لئے جا رہا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دوسرے کے پہلو میں نہ دیکھ سکے اور دوسری جگہ جا کر اپنی پہلی محبت کی ناکامی کے غم کو بھلا دے پہلی بار دیکھنے کے دن ہی سے وہ سیبل سے محبت رکھتا تھا - مگر اُس نے اپنی محبت کی خبر اُسے نہیں دی اور اب وقت نکل گیا سیبل اُس کو جانے سے روک رہی ہے اور اپنی طرف سے اس کی دلی کیفیت نہ معلوم ہونے کا عذر کر رہی ہے - اور پروفیسر کے بڑھاپے کی وجہ سے اس کی جانب سے بددلی کا اظہار کر رہی ہے - سروی جوان جانا چاہتا ہے - مگر وہ اس کو روک لیتی ہے دونوں میں بہت دیر تک گفتگو رہتی ہے - آخر جب سروی کو یقین ہو جاتا ہے - کہ پروفیسر اور اس کے درمیان میں کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا ہے تو دونوں میں محبت اور وفاداری کا عہد و پیمان ہو جاتا ہے -

پروفیسر واپس آگیا - سروی جوان مسودہ اور محنتانہ کی رقم اس کو واپس کر دیتا ہے - اور بڑی نرمی سے جو درحقیقت سختی سے خالی نہیں کہتا ہے کہ کہ پروفیسر سیبل سے شادی نہیں کر سکتا سیبل وہاں سے اُٹھ کر چلی جاتی ہے - ان دونوں میں خوب بحث ہو رہی ہے - سروی جوان ہے اور اس لئے لڑ رہا ہے کہ اس کی آیندہ زندگی لطف اور اطمینان سے گذرے - پروفیسر بڈھا ہے اور اس لئے جھگڑ رہا ہے کہ ساری زندگی برباد ہو گئی - اب بھی تو اس کی عمر کا کوئی حصہ کامیاب ہو جائے بحث کو ختم کرنے کے لئے دونوں ملکر سیبل کو اپنا ثالث اور حکم مقرر کرتے ہیں - وہ بلائی جاتی ہے اور پروفیسر اس کو اختیار دیتا ہے کہ دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرلے

سیسل پروفیسر سے پوچھتی ہے کہ تم کس صورت میں اکیلے رہجاؤ گے؟ پروفیسر سہم جاتا ہے۔ دیکھو وہ اس وقت مایوسی اور نامرادی کا مجسمہ معلوم ہو رہا ہے۔ اس کو اسی حالت میں چھوڑکر وہ دونوں چلے جاتے ہیں۔

اُس نوجوان کو دیکھو پروفیسر پہ بگڑتا ہوا نہ معلوم کدھر سے نکل پڑا وہ اس وقت ناصح یا دوست بن کر نہیں آیا ہے۔ بلکہ معلوم ہو رہا ہے کہ غصہ میں بھرا ہوا اپنی برباد شدہ جوانی کا انتقام اور بدلہ لینے چلا ہے۔ یہاں پہنچکر اسٹیج کی حالت بدل جاتی ہے اور ہم گانے بجانے کی ایسی آوازیں سُننے لگتے ہیں جس کی طرف خواہ نخواہ دل کھنچے جا رہے ہیں۔ نوجوان پروفیسر کو اُدھر لیجانا چاہتا ہے۔ مگر گانے والیوں کی کشش خود بھی اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ پروفیسر اُدھر چل پڑا ہے مگر شرافت اور عزت کا خیال اُسے یہاں بھی اُسی طرح لوٹا دیتا ہے جس طرح سیسل کے کمرے کے دروازے سے اُلٹے پاؤں لوٹا دیا تھا۔ اب نوجوان اُسے زبردستی ڈھکیل رہا ہے اور اس کو خبر کر دیتا ہے کہ جس طرح اس نے اُس کی جوانی کا ناس کیا ہے اُسی طرح یہ اُس کے بڑھاپے کا ستیاناس کر کے دم لیگا۔ لیکن بڈھا پروفیسر پھر بھی اُدھر نہیں بڑھتا۔ اور میز پر پڑی ہوئی ایک کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔ جس طرح جوانی میں اُس نے اپنی پہلی محبت میں ناکامی کے بعد علم کی گود میں پناہ لی تھی۔ اسی طرح اب بھی غالباً اپنا کھویا ہوا اطمینان کتابوں میں ڈھونڈ رہا ہے۔ لیکن نوجوان اس کی جان چھوڑنے کا نام نہیں لیتا اور دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگتی ہے۔ آخر نوجوان بڈھے پروفیسر کو گرا دیتا ہے۔ گرنے کا دھماکا سُن کر خادمہ دوڑی آتی ہے۔ اُس کو دیکھ کر پروفیسر کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اُسے کسی ڈاکٹر کو لانے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اُس کے چلے جانے پر پروفیسر اپنا پستول نکالتا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کتاب ہے دوسرے میں پستول۔ وہ کبھی کتاب کو دیکھتا ہے کبھی پستول کو۔ نوجوان پھر ظاہر ہوتا ہے اور ناچنے گانے کی آواز پھر اسی طرح آنے لگتی ہے وہ بڈھے پروفیسر کو پھر ویسے ہی ڈھکیل رہا ہے۔ آخر پروفیسر جھلا کر نوجوان پر فائر کر دیتا ہے۔ مگر پستول تو نوجوان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اور نوجوان ہی کے ہاتھ سے چلایا گیا تھا۔ دیکھو! آخر نوجوان نے بڈھے پروفیسر سے اپنی بربادی کا انتقام لے لیا۔ پروفیسر گولی کھا کر گرتا ہے اور نوجوان کے قدموں میں جان دیدیتا ہے۔

صدیق طبیب

حسرتِ شباب

نہ چال میں ہے وہ شوخی نہ قد میں رعنائی — کہ تیرے ساتھ گئی آہ! شانِ برنائی
کہاں چھپا ہے تو اے محوِ جلوہ آرائی — بیا کہ باز بہ بینم جو پردہ بکشائی
زمین پہ فرشِ رہِ انتظار ہیں آنکھیں
کہ دیکھنے کو تجھے بیقرار ہیں آنکھیں

نہ چھیڑ مطربِ رنگیں نوا ترانۂ عشق — مجھے دماغ کہاں جو سنوں فسانۂ عشق
گیا شباب کے ہمراہ کارخانۂ عشق — کہ مجھ سے گیا آہ! آستانۂ عشق
جگر میں وہ تپش دردِ جانگزا نہ رہی
سوار سر پہ جو تھی، عشق کی بلا نہ رہی

وہ دل بغل میں جو تھا شیشۂ مئے انگور — ہوا وہ سنگِ حوادث پہ گر کے چکنا چُور
وہ سر پہ طرۂ کج ہے نہ وہ کلاہِ غرور — کہ بارِ خاطرِ نازک ہے اب قبائے سمور
گرائے دیتا ہے رعشہ زمیں پہ پیری کا
اجل سے کہہ دو کہ موقع ہے دستگیری کا

سرور جہان آبادی

عالمِ خیال

(ایک عورت کا شوہر پردیس میں ہے - وہ اُسکی یاد میں محو اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے)

آج او میرے خیال تو، کہاں کہاں گیا - دل بھی تیرے ساتھ تھا، تو جہاں جہاں گیا
تُو نے رُخ جدھر کیا، دل کا رُخ اُدھر پھرا تو پھرا جو پاس سے، دل بھر آیا، سر پھرا
جب سے وہ جدا ہوئے تب سے اُن کا دھیان ہے اُن سے مجھکو اُنس ہے - اُن میں میری جان ہے
جا کے پھر مری خبر، کیوں نہ لی ستم کیا میری یاد میری چاہ، کیوں نہ کی ستم کیا
مجھسے کیوں خفا ہیں وہ پھر گئی نظر تو کیوں دِل نہیں اِدھر تو کیوں، رُخ نہیں اِدھر تو کیوں
میرے رُخ سے دور ہے، وہ نگاہ اب کہاں اُن کا پیار اب کہاں، اُن کی چاہ اب کہاں
ساون اور یہ گھٹا میں کہیں ہوں وُہ کہیں حُسن یہ اُنہیں کا ہے، اور وہ دیکھنے نہیں
ساتھ والیوں کے ساتھ، جھولنے کو جاؤں کیا- دل وہاں ہے وہ جہاں، بیدلی سے گاؤں کیا
پینگ آئیں جائیں گے، اور ہلے گا دل مرا- مل کے کیا میں گاؤں گی، کیا ملے گا دل مرا
کھُل پڑیگی خود بخود، چاہ ہر صدا کے ساتھ مُنہ سے باہر آئیگی، آہ ہر صدا کے ساتھ
کرتی ہیں جگر کا خون، ہمنشیں جو ساتھ ہیں وہ لگا رہی ہیں آگ جن کے لال ہاتھ ہیں-
اور بھی لگائی آگ، ساوُنی نے پھُول کر- پیڑ پہ مری نظر، پھر پڑے نہ بھُول کر
زیور اب پہن چکی، جی سے اب اُتر چُکا- جائے بھاڑ میں سنگار، دل اب اس سے بھر چکا
کس سے ناز اب کروں میرے ناز اٹھائے کون روٹھنے کو روٹھ لوں، لیکن اب منائے کون
کس سے اپنے دل کا بھید، اب میں کھل کے کہہ سکوں کس کے ساتھ بے جھجک، اب میں ملکے رہ سکوں
دل میں اب لگی ہے آگ، دل لگی وہ لے گئے اب ہنسی کا منہ کہاں، سب ہنسی وہ لے گئے
کام کچھ نہ کر سکا، اور خیال جا کے تو مجھ سے کچھ نہ کہہ سکا - اُن کا حال آ کے تو
تُو نے میرے دل کا درد اُن سے کچھ کہا بھی تھا اُن سے ملکے تجھکو یاد، میرا غم رہا بھی تھا
کیا میں تجھ سے پوچھ اٹھی - تو پیامبر نہیں تجھ میں گو رسائی ہے - گفتگو مگر نہیں
گفتگو نہ ہو تو خیر، دل پہ تیرا بس تو ہے- دل کی دل کو دے خبر، ہاں یہ دسترس تو ہے
پھر کے اُن کے دل کے گرد، گھیرنا ضرور تھا اُن کے دل کو میری سمت، پھیرنا ضرور تھا
اُن کے دل میں میری جا، شاید اب نہیں رہی چھن گئی مری جگہ، اور میں یہیں رہی-
کاش او خیال تو اب نہ آئے میرے پاس کاش اُن کی یاد تو، اب نہ لائے میرے پاس
یا مری نظر کو لے، اور اُن کے پاس جا مجھ سے تو جگر کو لے اور اُن کے پاس جا
دیکھ لے نظر انہیں، دیکھ لیں جگر کو وہ آ ئے مجھ پہ کچھ ترس، آئیں اپنے گھر کو وہ

گھر کا نام خاک لُوں - بن کے یہ بگڑ چکا،
اس پہ اوس پڑ چکی، مٹ چکا، اجڑ چکا

شوق قدوائی مرحوم

مشرق و اہلِ مشرق

جامعہ مصریہ

گذشتہ اشاعت میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ "ادبی دنیا" میں مشرق و اہلِ مشرق کی سُرخی کے ماتحت اس قسم کے مخصوص مضامین شایع ہوا کریں گے جن میں مشرقی تاریخ، مشرقی تہذیب و تمدن، مشرقی علوم و فنون، مشرق کے آثارِ قدیمہ اور مشرق کے ہر شعبے کے قدیم و جدید اہلِ کمال اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کیجائیگی۔ اس وعدے کی پہلی قسط مصر کی جدید یونیورسٹی کے حالات و کیفیات کی شکل میں پیش کیجارہی ہے۔ مصر کو مختلف حیثیت سے ہندوستان سے جو مناسبت ہے اسکی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "ادبی دنیا" میں اس سرخی کے افتتاح کے لئے دوسرے مشرقی ممالک کے مقابلے میں ہم نے مصر کا انتخاب کرکے بالکل صحیح ابتدا کی ہے۔ کسی ملک کی تعلیمی جدوجہد سے باخبر ہونا وہاں کی تہذیب و تمدن سے واقف ہونے کا بہترین ذریعہ ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ ہم نے مصر کے دوسرے شعبوں کو نظر انداز کرکے وہاں کی علمی زندگی سے بحث کرنے میں بھی صحیح انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔ مصر کے ساتھ مشرق کی اُس قوم کی سیزدہ صد سالہ روایات وابستہ ہیں جو کسی وقت تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں تمام اقوامِ عالم سے پیش پیش تھی جس کے کھنڈروں پر آج مغرب کی عظمت و رفعت کی بنیادیں قائم ہیں اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر مصر کے قدیم و جدید نظامِ تعلیم کے ضمن میں ان عربوں کی تعلیمی جدوجہد کا سرسری تذکرہ بھی کردیا جائے جنہوں نے کلدانیوں مصریوں اور یونانیوں کی تہذیب و تمدن کے فنا ہو جانے کے بعد دنیا میں ایک نئے تمدن کی داغ بیل ڈالی اور جن کے علوم و فنون کے آفتاب نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے مشرق و مغرب کو روشن کردیا۔

مشرق کی علمی جدوجہد کی اجمالی تاریخ

تعلیم کو عوام و خواص سب کے لئے عام کرنے اور ایک نظام کے ماتحت درسگاہیں کھولنے کا سہرا کلدانیوں اور قدیم مصریوں کے سر ہے۔ ان کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ رومیوں کے عروج سے پہلے سکندر نے ملکِ مصر بطالسہ کے سپرد کردیا تو انہوں نے اسکندریہ میں ایک کتبخانہ اور ایک بہت بڑا مدرسہ جاری کیا جو سات سو سال تک علوم و فنون کا مرکز بنا رہا۔ سات سدی کے بعد اس منارۂ علم کی روشنی بجھ گئی اور حکمت و فلسفہ کا یہ گہوارہ اہلِ علم سے خالی ہوگیا۔ اہلِ فارس اور عرب علم کی خدمت کے لئے آگے بڑھے اور اپنے زیر اثر ممالک کے چپے چپے میں مدرسوں کا جال پھیلا دیا۔ ۲۵۰ء میں نوشیرواں نے طب و حکمت کی ایک درسگاہ قائم کی جو عباسیوں کے زمانے تک بڑی شان و شوکت سے چلتی رہی۔ پھر خلیفہ منصور عباسی نے اسی کے آثار پر بغداد میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی جسے ہارون رشید نے دنیائے علم کا آفتاب بنادیا اور سارے ملک میں اس کی شاخیں جاری کردیں۔ اس کے بعد مامون نے اس نظام کو اور بھی وسعت دی اور بغداد۔ دمشق بصرہ۔ بخارا۔ اسکندریہ۔ قاہرہ۔ مراکش۔ فاس اور اندلس وغیرہ میں لاتعداد مدرسے جاری ہوگئے۔ اندلس کے ایک شہر قرطبہ میں بہترین کتابوں کے ستر کتبخانے تھے اس کے علاوہ ہر قصبے میں ایک بڑا مدرسہ اور ایک کتبخانہ موجود تھا۔ اس وقت کی علمی رُوح کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۲۶۰ء میں قرطبہ میں ۱۵۰ مدرسے میں بادن ۵۲۔ بر تقال میں پچپن ۵۵ مدرسے میں اکہتر ۷۱ اہلِ علم صرف تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ اشبیلیہ۔ غرناطہ اور بلنسیہ کے مصنفوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ علامہ مقری نے لکھا ہے کہ عربوں کے عروج کے زمانے میں تیرہ سو ایسے مورخ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی کوئی تاریخی تصنیف بطور یادگار چھوڑی۔

خلیفہ مستنصر کا علمی شغف اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس نے افریقہ۔ مصر۔ فارس اور بلادِ عرب میں اپنے سینکڑوں کارندے صرف کتابیں جمع کرنے کی خاطر چھوڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے مصنفوں کو انکی تصانیف حاصل کرنے کے لئے اپنے قلم سے خط لکھا کرتا تھا۔ اور اس طرح صرف اپنی خلافت کے ایام میں اس نے چھ ہزار کتابیں جمع کرلی تھیں۔

ابوالفرج نے قاضی صاعد بن احمد اندلسی سے نقل کیا ہے کہ "عربوں نے ابتدائے اسلام میں اپنی زبان اور احکامِ شرع کے علاوہ اور کسی علم کیطرف توجہ نہیں کی۔ بنی امیہ کے دورِ حکومت تک یہی حالت رہی لیکن عہدِ عباسی نے ان کی غفلت دُور کردی اور انکی فطری ذہانت اپنے جوہر دکھانے لگی۔ بنی عباس کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور فقہ اسلامی کی مہارت کے ساتھ ہی فلسفہ اور ہیأۃ میں بھی کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے اہلِ علم کی ہمت افزائی دوسری زبانوں سے علوم و فنون کو عربی میں منتقل کرنے اور تحقیق و تنقید کے ذریعے کھرے کھوٹے کو پرکھنے ملک میں ان کو پھیلانے کا نظام

ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا کہ اس کے بعد اسمیں برابر ترقی ہی ہوتی چلی گئی۔ اور آخری عباسی کے خلیفہ معتصم مامون نے اپنے دادا منصور کی ابتدا کو انتہا تک پہنچا دیا۔"

اس کے بعد بھی عباسی خلفا اپنے آبا و اجداد کے قدم بقدم چلتے رہے۔ مصر میں فاطمی اور اندلس میں اموی حکمران بھی انہی کی پیروی کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں مشرق میں سمرقند و بخارا تک اور مغرب میں فاس اور قرطبہ تک مدرسوں اور کتبخانوں کا جال بچھ گیا سلاطین اور امرا جس فراخ دستی اور کشادہ دلی سے اپنی دولت ان علمی مرکزوں پر صرف کرتے تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انگریز مورخ گبن لکھتا ہے کہ "بغداد میں ایک وزیر نے ایک جامعہ (یونیورسٹی) کے افتتاح پر دو لاکھ دینار (تقریباً ۱۸ لاکھ روپے) صرف کئے۔ اور پندرہ ہزار دینار (اندازاً ۱۳۵۰۰۰ روپیہ) سالانہ آمدنی کی مستقل جائداد اس پر وقف کر دی (یہ وزیر غالباً نظام الملک طوسی ہے اور جامعہ سے مراد اس کا مدرسہ نظامیہ ہے)

دسویں صدی عیسوی میں قاہرہ (مصر) کے ایک کتبخانے میں مختلف علوم و فنون کی ایک لاکھ کتابیں موجود تھیں جن کا ہر شخص مطالعہ کر سکتا تھا۔

اپنے موضوع کے لحاظ سے عربوں کی علمی خدمات اور ان کے مدرسوں اور کتبخانوں کی تفصیلات بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے نویں اور دسویں صدی عیسوی کا مندرجہ بالا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور تفصیل کسی دوسری صحبت کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

جب گیارہویں صدی آئی تو علم و فن کا آفتاب مشرق سے ڈھلکر مغرب کی طرف مائل ہو چکا تھا سب سے پہلے اسکی شعاعیں اٹلی پر پڑیں اور دیکھتے دیکھتے بارہویں صدی تک اس کی روشنی سے سارا یورپ جگمگا اٹھا۔

نویں صدی میں اٹلی میں سالرنو کا مدرسہ جاری ہوا۔ جس کی طبی شاخ گیارہویں صدی میں اتنی ترقی کر گئی کہ سارے یورپ کے طلبا طب کی تعلیم کے لئے وہیں جمع ہونے لگے۔ دسویں صدی عیسوی کے اخیر میں بولونیا میں ایک اسکول قائم ہؤا جو دو سو سال میں ترقی کر کے یونیورسٹی بنگیا۔ اور ۱۲۰۰ء میں اس کی طرف سے طب۔ قانون اور فلسفہ میں ڈاکٹر کی ڈگری دیجانے لگی۔ پھر پیرس میں ایک سکول جاری ہؤا جو تیرہویں صدی کے اوائل میں یونیورسٹی بنگیا۔ اور اس کے چاروں شعبے۔ قانون طب۔ فنون (آرٹ) اور فلسفہ اپنے کمال اور خوبی میں آپ اپنی مثال شمار ہونے لگے۔ اس کے بعد ۱۲۰۶ء میں سارلون یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ چودہویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے فرانس میں چالیس کالج جاری ہو گئے ۱۲۴۲ء میں سالومنکا میں ایک مدرسہ جاری کیا گیا جو پانچسو سال تک ہسپانیہ کے فخر و امتیاز کا باعث بنا رہا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی ابتدا کے متعلق کسیکو کوئی علم نہیں قطعی طور پر صرف اسقدر معلوم ہے کہ بارہویں صدی کے شروع میں آکسفورڈ کی درسگاہ ایک سکول کی شکل میں موجود تھی۔ کیمبرج کی تعلیمگاہ ۱۲۳۳ء میں یونیورسٹی بنائی گئی۔ اس کے بعد یورپ میں درسگاہوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اور آجتک بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ امریکہ نے بھی اپنے یورپین اسلاف کی پیروی کی اور جیسا کہ ناظرین ادبی دنیا کی گذشتہ اشاعت میں پڑھ چکے ہیں۔ امریکہ والے یونیورسٹیاں جاری کرنے اور تعلیم پر اپنی دولت صرف کرنے میں اپنے اسلاف پر بھی سبقت لیگئے ہیں۔

جامعہ مصریہ کا افتتاحی دور

مشرق اپنے علوم و فنون کی ساری متاع مغرب کے سپرد کر کے گیارہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک خرگوش کی نیند سوتا رہا لیکن آخر سونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی میں موت و حیات کے سوال نے اُسے بیدار ہو جانے پر مجبور کیا تو مغرب کی روشنی سے اس کی آنکھوں میں چکا چوندسی پیدا ہو گئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ جنہیں اس نے کبھی تیراندازی سکھائی تھی وہ آج اسیکو نشانہ بنانے پر تُلے بیٹھے ہیں۔

مصر مشرق و مغرب کے محل اتصال پر واقع ہے۔ اس لئے دوسرے مشرقی ممالک کی بہ نسبت اُسے اپنے پوزیشن کی نزاکت کا احساس بہت زیادہ ہؤا۔ نپولین کے حملے نے اس کی رہی سہی غفلت بھی دُور کر دی لیکن صدیوں کی تلافی چند دنوں میں غیر ممکن تھی۔ اس لئے بہی خواہانِ ملک نے ابتداءً اسی میں مصلحت سمجھی کہ جن علوم و فنون کی بدولت آج مغرب کے جادوگر مشرق کو اپنے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے ہمیں انمیں مہارت حاصل کرنی چاہئے۔ اس کے بعد ہماری زنجیریں خود ہی ڈھیلی ہو جائینگی۔ اس فیصلے کی بنا پر گذشتہ صدی کے آخری حصے میں مصری طلبا تعلیم کی غرض سے یورپ جانے لگے۔ اور اس طرح چند ہی سال میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو ملک کے بھلے بُرے کی تمیز کر سکتی تھی۔ ان نوجوانوں نے محسوس کیا کہ مصر کی ساری مصیبت کا واحد علاج مصریوں کی جہالت دُور کرنا اور گھر گھر علم کی روشنی پہنچا دینا ہے مگر یہ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ مصریوں کی تعلیم کا انتظام خود مصر میں ہو۔ دس بارہ سال تک یہ خیالات تعلیم یافتہ طبقے کے دماغ میں پرورش پاتے رہے۔ آخر ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملک کے سربرآوردہ اہل علم سعد زاغلول پاشا مرحوم کے مکان پر جمع ہوئے۔ اور قاہرہ میں جامعہ مصریہ کے نام سے ایک قومی یونیورسٹی جاری کرنے کے لئے پاشائے موصوف اور قاسم امین بک کی سرکردگی ایک مجلس قائم کر دی گئی۔ اور اسی وقت بانیوں کے چندے

سے ۵۸۵۴ پونڈ کی رقم بھی جمع ہو گئی۔ پھر مجلس نے قوم کے نام اپیل شایع کی جسکا خاطر خواہ اثر ہوا۔ قوم نے دل کھولکر چندے دئے اور جامعہ کا بنیادی کام شروع ہوگیا۔ مگر حکومتِ مصر اور اس کے اہل کاروں کے توجہ نہ کرنیکی وجہ سے دوسرے ہی سال اس تحریک کی رفتار سُست پڑ گئی۔

موجودہ صدی کے ابتدائی حصے میں دوسرے مشرقی ممالک کی طرح مصر میں بھی ملکی سیاست میں دخل دینا حکومت کی برسراقتدار جماعت کے نزدیک ایک جُرم سمجھا جاتا تھا۔ اور جس کام میں ایسے سیاسی مجرموں کا ہاتھ ہو اس کا پنپنا دشوار اور اس کے لئے حکومت کی ہمدردی حاصل کرنا غیر ممکن تھا۔ اسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس تحریک کے بانیوں نے جامعہ کے بنیادی اصولوں میں اُس کی تشریح کر دی تھی کہ جامعہ کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور اس کے لئے کسی سیاسی آدمی کی خدمت قبول نہیں کیجائیگی۔ لیکن اس علمی تحریک کے روحِ رواں سعد زاغلول پاشا اور قاسم امین بہر حال مصر کے سیاسی لیڈر سمجھے جاتے تھے جس کی وجہ سے آخر وہی ہوا جس کا بانیوں کو پہلے ہی خوف تھا اور جس کے لئے انہوں نے سیاست سے ایسی بے تعلقی کا اظہار کیا تھا۔ ابتداءً تحریک بڑی کامیاب رہی لیکن دوسرے ہی سال اسمیں سیاسی گتھیاں پڑ گئیں اور قاسم بک امین کو جامعہ کی بھلائی کی اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ جامعہ کو شاہزادہ احمد فواد (موجودہ خدیوِ مصر) کے سپرد کر دیں۔

۲۰ مئی ۱۹۰۸ء کو شاہزادہ احمد فواد کی صدارت میں جامعہ کی مجلس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اور شاہزادہ موصوف جامعہ کے امیر (چانسلر) منتخب ہوئے۔ جامعہ کے لئے سرمایہ مہیا کرنے پر اس انتخاب کا اثر بہت اچھا پڑا۔ اس کے متعلق حکومت کی پہلی رائے بھی بڑی حد تک بدلگئی اور وہ ۲۰۰۰ پونڈ سالانہ امداد بھی دینے لگی۔ محکمہ اوقاف نے بھی ۵۰۰۰ پونڈ سالانہ کی رقم جامعہ کیلئے منظور کر لی۔ آخر ۲۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو جامعہ کا افتتاح ہوا جسمیں اپنے خطبے کے دوران میں شاہزادہ احمد فواد نے فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے اور ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ مصری نوجوانوں کی تعلیم کا سامان خود مصر میں کیا جائے اور ہم ہمیشہ دوسرے ممالک کے محتاج نہ بنے رہیں ہم نے جامعہ کے متعلق غور و فکر میں بہتیری راتیں جاگ کر صرف اس لئے گزاری ہیں کہ ہمارے نوجوان ترقی کریں اور مصر کا درجہ ان ممالک کے برابر ہو جائے جو آج اپنے علم و فضل کی وجہ سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں"۔

دوسرا دور

جامعہ مصریہ کی کارگزاری عام علمی لکچروں سے شروع ہوئی۔ جن میں روزانہ امیر الجامعہ شاہ فواد بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ جامعہ نے اپنے ابتدائی دور میں کالجوں کیلئے ملکی زبان کے پروفیسر تیار کرنے کی خاطر مصر کے چھنے ہوئے ۴۴ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے یورپ روانہ کئے اور ایک بہترین کتبخانہ مہیا کرنے کے بعد ایک کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) جاری کر دیا۔ کلیۃ الآداب کے لئے ایک خاص عمارت کی ضرورت تھی۔ اور جامعہ کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ مگر جب کوئی قوم کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو خدا اسی قوم میں ایسی ہستیاں پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعے سے ظاہری رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر علوی پاشا نے مرحومہ امیرہ فاطمہ بانم اسماعیل کی توجہ ادھر مبذول کرائی اور مرحومہ نے اس غرض کے لئے اپنے لاکھوں روپے کے جواہرات جامعہ کو عطا کر کے مغرب پر ایکبار پھر ثابت کر دیا کہ جس قوم میں فاطمہؓ جیسی عورتیں موجود ہیں وہ جلد فنا نہیں ہو سکتی۔

کلیۃ الآداب اپنی طبعی رفتار سے چل رہا تھا۔ اگرچہ اس کے مستقل طلبہ کی تعداد بہت کم تھی مگر ناانصافی ہوگی اگر کلیہ (کالج) کی کارگزاری اور نفع رسانی کو طلبہ کی تعداد پر قیاس کیا جائے۔ حق یہ ہے کہ اسمیں داخل ہوئے بغیر اس کے لکچروں میں شامل ہونے والے نوجوانوں کی کثیر تعداد کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو کہنا پڑیگا کہ آج مصر میں جو علمی چہل پہل نظر آرہی ہے وہ اسی کلیۃ الآداب کی پیداوار ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کا اثر دنیا کے دوسرے اداروں کی طرح جامعہ پر بھی پڑا۔ اور آمدنی کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی ترقی رُک گئی۔

۱۹۱۷ء میں حکومتِ مصر نے قوم کو اعلیٰ تعلیم اپنے ملک میں حاصل کرنے کی رغبت دلانے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس نے اپنی رپورٹ ۱۹۱۷ء میں پیش کی۔ اس رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ ملک کے تمام مدارس عالیہ (کالجوں) کو ایک ادارے کے ماتحت کر دیا جائے۔ اور اس طرح ایک جدید جامعہ کی بنیاد ڈالی جائے ۱۹۲۳ء میں خدیوِ مصر شاہ فواد نے اپنے وزیرِ تعلیم علی شمسی پاشا کو کمیشن کی سفارش کے مطابق جدید جامعہ کا نظام تیار کرنے کی اجازت دی۔ پاشائے موصوف نے جامعہ قدیمہ (سعد زاغلول پاشا اور قاسم امین بک کی جاری کردہ یونیورسٹی) کے کارکنوں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی جامعہ کو جدید جامعہ میں ضم کر دیں جسے حکومتِ مصر اپنی نگرانی میں جاری کرنا چاہتی ہے اور اسطرح ملک کی تمام ترقی یافتہ درسگاہیں ایک نظام کے ماتحت ہو جائیں۔

تیسرا دور

۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء سے جدید جامعہ کے دستور العمل کی اشاعت کے ساتھ جامعہ مصریہ کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس دستور العمل کی رو سے "جامعہ مصریہ"

اب ایک جدید جامعہ کا نام رکھا گیا جسمیں قدیم جامعہ مصریہ، کلیۃ الحقوق ۔ (لا کالج) کلیۃ الطب (میڈیکل کالج) اور اس دستور العمل کی رو سے جاری ہونے والا کلیۃ العلوم (سائنس کالج) سب شامل ہو گئے ۔

کلیۃ الآداب

مذکورہ بالا دستور العمل کے مطابق اب کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) چھ شعبوں میں تقسیم ہو گیا ہے :۔

(۱) عربی اور سامی زبانوں کا شعبہ ۔ (۲) آثار مصریہ کا شعبہ ۔
(۳) فلسفہ اور علم اجتماع کا شعبہ ۔ (۴) تاریخ و جغرافیہ کا شعبہ ۔
(۵) زندہ زبانوں کا شعبہ ۔ (۶) یونانی اور رومانی ادب کا شعبہ ۔

ان تمام شعبوں میں پوسٹ گریجوٹ کی مدت تعلیم چار سال ہے اس کے بعد ایم ۔ اے کی ڈگری صرف ان طلبا کو دیجاتی ہے جو اس تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دو سال کے اندر کوئی ایسی تصنیف پیش کر سکیں جسے کلیہ پسند کرے ۔ ڈاکٹر کی ڈگری صرف ان طلبا کو دیجاتی ہے جو پوسٹ گریجوٹ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد تین سال کے اندر دو ایسی کتابیں تصنیف کریں جنہیں کلیہ بہترین تصنیف سمجھ سکے ۔

کلیہ میں کل ۲۲ مدرس ہیں جن میں گیارہ پروفیسر ہیں ۔ ان میں سے ۹ غیر ملکی اور صرف ۲ مصری ہیں ۔ پروفیسروں کے ۴ معاونوں میں سے ایک غیر ملکی ہے اور سات لکچرروں میں سے ۳ غیر ملکی ہیں ۔ اس کے طلبہ کی تعداد ۵۰۱ ہے ۔

کلیۃ العلوم

اس کالج میں ریاضی ۔ کیمیا ۔ علم الحیوان ۔ علم النباتات اور جیالوجی کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ہر شعبے کی مدت تعلیم بھی چار سال ہے ۔ فی الحال صرف بیچلر کی ڈگری دیجاتی ہے ۔ مگر دستور العمل کے مطابق عنقریب ماسٹر اور ڈاکٹر کی ڈگریاں بھی جاری ہونیوالی ہیں ۔

اس کالج میں مدرسین کی مجموعی تعداد ۲۶ ہے ۔ اس کے سات پروفیسروں میں سے ایک مصری اور چھ غیر ملکی ہیں ۔ دو معاون پروفیسر مصری ہیں ۔ تیرہ لکچرروں میں سے ۵ غیر ملکی اور ۸ مصری ہیں ۔ باقی ۴ مدرس معاون لکچرر ہیں ۔ جو سب کے سب مصری ہیں ۔ کلیۃ العلوم کے طلبہ کی تعداد ۳۷۸ ہے ۔

کلیۃ الحقوق

اس کالج میں قانون کی تعلیم دیجاتی ہے ۔ پہلے صرف ایل ایل ۔ بی کی تعلیم ہوتی تھی ۔ اب ایل ایل ۔ ڈی کا شعبہ بھی جاری کر دیا گیا ہے ۔ ایل ایل ۔ بی میں لیکچر عربی میں ہوتے ہیں مگر ایل ایل ۔ ڈی میں فرانسیسی اور انگریزی میں ۔

اس میں ۲۴ مدرس تعلیم دیتے ہیں ۔ جن میں ۷ غیر ملکی اور ۳ مصری پروفیسر ہیں ۔ معاون پروفیسر ایک غیر ملکی اور ۵ مصری ہیں ۔ باقی ۹ لکچرر اور ان کے معاونوں میں سے ایک غیر ملکی اور ۸ مصری ہیں ۔

کلیۃ الحقوق بالکل یورپین کالجوں کے طرز پر چلایا جا رہا ہے ۔ اور کوشش کیجاتی ہے کہ طلبہ میں قانون کے متعلق پورا ملکہ پیدا ہو جائے ۔

اس کلیہ کے ۵۹۹ طلبہ میں سے ۹۵ طلبہ ایل ۔ ایل ۔ ڈی کے شعبے میں ہیں ۔

کلیۃ الطب

یہ میڈیکل کالج بھی انتظامات اور طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے یورپ کے کسی ترقی یافتہ کالج کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے ۔ جامعہ میں ضم ہونے سے پہلے اسمیں دانت اور آنکھ وغیرہ کے متعلق مستقل شعبے نہیں تھے ۔ مگر اب اُن کی مستقل شاخیں قائم کر دی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ طب کی ہر شاخ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام بھی ہو چکا ہے ۔

اس کلیہ میں ۸۵۸ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں جنمیں سے ۶۳۳ شعبہ طب و جراحت میں ۔ ۹۲ طب الاسنان (دانتوں کی بیماری کے متعلق) میں اور باقی شعبۂ صیدلہ (عطاری ۔ کمپونڈری) اور شعبہ ممرضات (ڈریسری) میں ہیں ۔

اس کلیہ کے ۱۵ پروفیسروں میں ۵ مصری ہیں ۔ پانچوں معاون پروفیسر بھی مصری ہیں ۔ باقی ۴۷ لکچرر اور ان کے معاونوں میں سے صرف ۴ غیر ملکی اور ۴۳ مصری ہیں ۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار کے حساب سے اسوقت جامعہ مصریہ کے استادوں کی تعداد ۱۷۵ اور طلبہ کی تعداد ۲۳۴۱ ہے ۔ ان میں سے ۱۲ فیصدی طلبہ سے کوئی فیس نہیں لیجاتی اور ۲ فیصدی طلبہ کی آدھی فیس معاف ہے ۔

جامعہ کے بڑے حصے کا ذریعۂ تعلیم عربی زبان ہے اور باقی کا فرانسیسی اور انگریزی لیکن پالیسی یہ اختیار کی گئی ہے کہ آہستہ آہستہ عربی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے جہانتک مغربی ممالک کی علمی تحریک سے فائدہ اٹھانے میں مانع نہ ہو ۔

جامعہ کے لئے اس کی شان کے مطابق کئی عمارتوں کی ضرورت تھی ۔ حکومت نے اس غرض کے لئے ۱۳۰ ایکڑ زمین عطا کی ہے اور ۷ رفروری ۱۹۲۸ء کو خدیو مصر شاہ فواد کے ہاتھوں نئی عمارتوں کی بنیاد بھی رکھدی گئی ہے ۔ نئی عمارتیں حکومت ہی کے خرچ پر تعمیر ہو رہی ہیں ۔ اور اس سلسلۂ تعمیر میں چاروں کالجوں کے علاوہ ہسپتال اور دو ہوسٹل بھی شامل ہیں جنمیں ایک ہزار طلبہ جا کر[۲]

---

[۲] زندگی بسر کر سکیں ۔ [۳] ابتداءً حکومت صرف دو ہزار پونڈ سالانہ مدد دیتی تھی ۔ مگر اب جامعہ پر ۱۳۴۵۰۰ پونڈ سالانہ صرف کر رہی ہے ۔ اور شاہ فواد نے اپنی ولیعہدی کے زمانے میں ملک کی جس ضرورت کو محسوس کیا تھا اسکو پورا کرنے کی فکر میں آج تک لگے ہوئے ہیں ۔ انہوں نے جامعہ کی سرپرستی محض رسمی طور پر نہیں کی بلکہ سعد زغلول پاشا اور قاسم امین

خدیو مصر شاہ فواد جامعہ مصریہ کی لیبوراٹری میں

احمد لطفی بک رجسٹرار جامعہ مصریہ

علی شمسی پاشا وزیر تعلیم مصر

جامعہ مصریہ کا مجوزہ خاکہ

مصریوں کے علمی دیوتا کی تصویر جو جامعہ مصریہ کی بنیاد میں
بطور یادگار رکھی گئی ہے

دُنیائے ارواح سے سلام و پیام

میں ۱۹۲۷ء کے موسم گرما میں لندن کے ایک انگریز خاندان میں مقیم تھا۔ اس گھر کی باگ ڈور ایک نہایت شستہ اور ہوشمند خاتون کے ہاتھ میں تھی جس کا خاوند کسی تجارتی مہم پر آسٹریلیا گیا تھا اور وہیں فوت ہو چکا تھا۔ اب کنبے میں صرف اُس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ مجھے اس گھر میں ٹھیرے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا گو اجنبیت باقی نہ تھی مگر ابھی گفتگو اور مراسم میں پوری آزادی اور بے تکلفی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

ایک روز ہم شام کے کھانے سے فارغ ہو کر قہوہ پی رہے تھے اور اِدھر اُدھر کی بات چیت کا دلچسپ شغل جاری تھا۔ گھر والی نے (جسکو اس مضمون میں ف کے نام سے یاد کیا جاویگا) باتوں ہی باتوں میں "روحانیت یا علم الارواح" کا ذکر چھیڑ دیا۔ شام کا اخبار اُس کے ہاتھ میں تھا۔ سکاٹ لینڈ کے کسی مشہور آدمی کی خودکشی اس روز کی خاص خبر تھی۔ شاید اسی بات نے 'ف' کا ذہن "زندگی کے بعد کے حالات" کی جانب منتقل کر دیا۔ اس نے معمول سے کسیقدر زیادہ شوق اور جوش کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال شروع کیا لیکن ابھی اس نے مشکل سے دو چار ہی جملے کہے تھے کہ میں ایک غیر مہذبانہ جلد بازی اور ایک مُفتیانہ شان کے ساتھ بول اُٹھا کہ "یہ روحانیت کا قصہ سراسر لغو ہے اور روحانیوں کا یہ فرقہ "چند پاگلوں اور سر پھروں کا جتھہ ہے"۔

میرے الفاظ ابھی ختم بھی نہ ہونے پائے تھے کہ میں نے محسوس کر لیا کہ مجھ سے بڑی بھونڈی غلطی ہوئی ہے اور میں نے آداب گفتگو کا دامن بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ دوسروں کی طرف دیکھا تو بڑی لڑکی (م) کی نگاہوں نے بھی مجھے ایک ہی اشارے سے ہلکی سی ڈانٹ بتائی اور معذرت کا مشورہ بھی دیدیا۔ لیکن جب میں نے بڑی بی یعنی ف کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرہ کی کیفیت سے معلوم ہوا کہ وہ کسی معذرت کا اظہار نہیں چاہتی یعنی خفگی کی جگہ وہاں کامل سکون اور شگفتگی موجود تھی۔ پیشانی اس طرح بے شکن تھی کہ گویا میرے کلمات مطلق سُنے ہی نہ تھے۔ بات کاٹنے کی نیت سے 'ف' نے ساتھ والے کمرہ سے خادمہ کو بلایا اور کسی کام کے متعلق کچھ حکم دینے لگی۔ غالباً اسی مقصد کیلئے اُس کالڑکا اُٹھا اور ایک چھوٹی سی میز کمرے کے ایک کونے سے اُٹھا کر درمیان میں لگا دی اور اس پر گراموفون رکھ کر بجانا شروع کر دیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد 'م' اپنے کمرے میں گئی اور وہاں سے کپڑے بدلکر ہمارے پاس آکر کہنے لگی۔

"مسٹر احمد۔ میں ایک سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں۔ آپ سٹیشن تک میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے؟"

میں۔ ہاں۔ ہاں بڑی خوشی سے۔

یہ کہہ کر میں اُٹھا اور جلدی سے اپنے کمرہ میں پہونچا۔ بڑا کوٹ پہنا اور م کے ساتھ چلدیا۔ ہمارے مکان سے لندن کی زمین دوز ریلوے کا نزدیک ترین سٹیشن ویسٹ کنسنگٹن تھا ابھی ہم چند ہی قدم گئے ہونگے کہ "م" مجھ سے یوں مخاطب ہوئی:۔

"مسٹر احمد۔ آپ کو یاد ہے کہ گذشتہ اتوار کو ہم ایشیا اور یورپ کے خصائص کا مقابلہ کر رہے تھے اور اس طویل مگر دلچسپ گفتگو کے خاتمہ پر آپ نے مجھے اجازت دیدی تھی۔

م کے آخری الفاظ کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ طنز کی بُو آرہی تھی لیکن میں نے اس کا خیال نہ کیا اور جواب دیا۔

"ہاں۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اپنے مغربی نقطۂ خیال سے اگر میری کسی بات کو آپ اعتراض یا اصلاح کے قابل سمجھیں تو ضرور مجھ سے کہہ دیا کریں"۔

م۔ "اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اس کے لئے بہت ہی شکر گذار ہونگے؟"

میں۔ "ہاں میں نے ضرور کہا تھا۔ اور اب بھی یہی کہتا ہوں"۔

م۔ "تو میں آپ کو اسوقت شکر گذاری کا ایک عمدہ موقع دینے کے ارادے سے ساتھ لائی ہوں"

میں۔ "آپ فرمایئے اور شوق سے فرمایئے۔ میں واقعی ممنون ہونگا"۔

م۔ "آپ نے "روحانیت" کے متعلق کوئی کتاب پڑھی ہے؟"

میں۔ "کتاب تو کوئی نہیں پڑھی۔ البتہ اخباروں میں دو تین مضمون نظر سے گزرے ہیں"۔

م۔ "آپ روحانیوں کے فرقہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص سے

واقف ہیں؟

میں۔ "نہیں"۔

م۔ "آپ کو روحانیت کے کسی شعبے کا کوئی ذاتی تجربہ ہے جس کی بنا پر "روحانیت" کے دعووں کو سچا یا جھوٹا ثابت کر سکیں؟"

میں۔ "میرے تجربے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا۔"

م۔ "تو پھر آپ نے کس طرح میری ماں کی بات رد کر دی۔ اور وہ بھی اتنے زور اور یقین کے ساتھ کہ گویا آپ ایک ماہر و مبصر ہیں اور اس مضمون پر آپ کی رائے آخری رائے ہے۔"

میں۔ "واقعی میں نے غلطی کی۔ یہ میری بے خیالی کا نتیجہ تھا اور مجھے خود ہی افسوس ہو رہا ہے۔"

م۔ "غضب تو یہ ہے کہ میری ماں خود روحانیوں کی جماعت میں شامل ہے اور لندن کی مرکزی انجمن کی سرگرم رکن ہے۔ آپ نے سارے گروہ کو پاگلوں اور سرپھروں کا ایک جتھا بتا کر میری ماں کو بڑی تکلیف پہنچائی اسی خیال سے کہ شاید دوسروں کے عقاید مختلف ہوں ہمارے ملک میں بات کرنے والا اپنی رائے ایسے طریقے پر ظاہر کرتا ہے کہ اس سے اختلاف رکھنے والوں کو اظہار اختلاف میں پوری آزادی اور آسانی رہے اور بات چیت ناگوار نہ ہونے پائے۔"

میں۔ آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اور میرے لئے یہی سزا کافی ہے۔ اور وہ طریق گفتگو جسکی آپ نے تعریف کی ہے کسی ملک کیلئے مخصوص نہیں۔ ہر جگہ سمجھدار اور شایستہ لوگ اسی طور پر کلام کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے ہاں تو اس سے بھی دو قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ ہر اظہار رائے کے ساتھ انکسار کے طور پر اپنے خیال کو حقیر۔ ناقص اور ناچیز بتلاتے ہیں۔ باقی آج شام کا واقعہ تو میری ایک ذاتی غلطی تھی جس کی نسبت میں صبح ہی کسی نہ کسی طرح آپ کی والدہ محترمہ سے معذرت کرونگا۔

اس کے بعد "م" نے اس ذکر کو فوراً ختم کر دیا اور اپنے شام کے پروگرام سے مجھے آگاہ کیا۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ کسی تماشاگاہ میں جا رہی تھی اور رات کے ایک دو بجے واپس آنے کا قصد تھا۔ میری دلجوئی کے لئے اس نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ کسی جگہ تفریح کے لئے چلا جاؤں اور سرِشام ہی بستر پر نہ جا لیٹوں۔ اتنے میں ہم سٹیشن پر پہونچ چکے تھے۔ وہاں زمین کے نیچے جانے والی گاڑیاں ہر پانچ سات منٹ کے وقفہ سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور ہم نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔

اگلی صبح جب ہم ناشتہ کے لئے اکھٹے ہوئے تو میں نے بغیر کسی تمہید کے "ف" سے اپنی جلد بازی کی معافی چاہی جس پر اس نے فوراً ہی کہا۔

ف۔ آپ اس کا ذکر نہ کریں۔ آپ نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا ہے۔ بے شک مجھے ایک خفیف اور عارضی ملال ہوا تھا مگر میں جانتی ہوں کہ آپ کا ارادہ مجھے رنجیدہ کرنے کا نہ تھا اور آپ کے اخلاق کی بنا پر مجھے بالکل یقین ہے کہ اگر آپ میرے عقاید سے آگاہ ہوتے تو کبھی مجھ پر اور میری جماعت پر دیوانگی کا فتوے نہ دیتے۔

میں۔ میں آپ کی فراخ دلی کا شکر گزار ہوں۔ گو آپ نے اس ناگوار واقعہ کو بالکل دل سے نکال دیا ہے۔ لیکن میری تسلی کے لئے "روحانیات" کے متعلق مجھے بھی کچھ واقف کیجئے۔

ف۔ میں ابھی ناشتے سے فارغ ہو کر آپ کو ایک چھوٹا سا رسالہ دونگی جس کے مطالعہ سے آپ علم الارواح کے ابتدائی اصول اور اس کی موجودہ ترقی یافتہ کیفیت سے آگاہ ہو جائیں گے۔ اور اگر آپ نے واقعی اس چیز کی جستجو کا ارادہ کر لیا ہو تو پرسوں اتوار کے دن ہماری انجمن کے جلسے میں چلیں۔ وہاں آپ بہت کچھ دیکھ سکیں گے اور اس مضمون پر کتابیں بھی کثرت سے ملجائینگی۔

میں نے وہ رسالہ اسی دن سرسری طور پر پڑھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان خیالات و عقائد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ روحانیوں کے دعوے کسی مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے تھے۔ اور میرے دلمیں ان سے ایک خاص نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ رسالے کے پڑھنے سے اتنا ضرور ہوا کہ میں اپنی نفرت کی وجہ تلاش کرنے لگا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پوشیدہ سی نفرت جو مجھے اس گروہ سے ہے آخر اس کا سبب کیا ہے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد بھی کوئی معقول وجہ ذہن میں نہ آئی۔ لیکن ساتھ ہی دل کے کسی کونے میں کوئی چیز کھٹکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ نفرت بلا سبب نہیں ہے۔ اس دن کا زیادہ حصہ اسی ادھیڑبن میں گزرا۔ اور شام کو جب لیٹا تو اس کے بوجھ کو گویا سینے پر رکھ کر سو گیا۔

رات کو کارکنانِ خواب کی مدد اور عنایت سے میں لاہور پہونچا۔ اپنے پرانے کالج (فارمن کرسچین) کی عمارتوں کا چکر لگا رہا تھا۔ اپنے ایک پروفیسر سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف سے کچھ باتیں بھی ہوئیں لیکن وہ یاد نہ رہیں۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو سینے پر سے وہ بوجھ اٹھ چکا

تھا اور مجھے قطعی طور پر یاد آگیا تھا کہ میرے وُہی اُستاد جو مجھے وقتاً فوقتاً اپنے دین پر مائل کرنے کے لئے جناب مسیح علیہ السلام کے پاک حالات سنایا کرتے تھے میری اس نفرت کے ذمہ دار تھے کیونکہ ان کو "رُوحانیت" اور اسی قسم کے بعض دوسرے مضامین (مثلاً کرسچین سائنس) سے بے حد نفرت تھی اور اس کے متعلق ایک دو مرتبہ انہوں نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا میں اپنے لائق استاد کی دل سے عزت کرتا تھا اور اس کے علاوہ عمر کے اُس حصّے سے گزر رہا تھا کہ جب ہر اچھوتا یا غیر معمولی خیال دماغ پر گہرا اثر کرتا ہے بلکہ ایک طرح سے ہمیشہ کے لئے وہاں گھر بنا لیتا ہے گو اُسے عارضی طور پر دوسرے خیالات کے بوجھ کے نیچے دب جانا پڑے۔

اتوار (۵ - ۶ - ۲۲۷) کی سہ پہر کو میں 'ف' کے ساتھ روحانیوں کے جلسے میں پہنچا یہ جلسہ اوِلی بن ہال میں ہوا جو لندن کے ایک نہایت مشہور بازار باند سٹریٹ میں واقع ہے مسٹر ووٹ پیٹر جو روس کے ماہر "رُوحانیت" ہیں اس جلسے کے صدر تھے۔ پہلے انہوں نے پنٹی کاسٹ کے متعلق تقریر کی (یہ عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی عید ہے جس کے ذریعے رسولوں اور شاگردوں پر مقدس روح کے نازل ہونے کی یاد منائی جاتی ہے) اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اُن کے عقاید مسیحی دین کی تعلیم سے کسی طرح جدا نہ تھے۔ اس کے بعد عبادت کے طور پر بعض گیت گائے گئے جو خدا کی حمد اور مسیح کی توصیف پر مشتمل تھے۔

جونہی یہ گیت ختم ہوئے۔ مسٹر پیٹر اُٹھے اور ذیل کا اعلان کیا جس سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"دوستو۔ اب میں دنیائے ارواح کے بعض پیغام آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں، اس ہال کے اندر بہت سی روحیں موجود ہیں اور مجھ سے خواہش کر رہی ہیں کہ آپ میں سے جس جس کے ساتھ انہیں کوئی لگاؤ ہے اُس تک اُن کے پیغام پہنچا دوں۔"

یہ کہہ کر مسٹر پیٹر نے حاضرین میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ کے قریب دائیں طرف ایک رُوح کھڑی ہے یہ ایک نوجوان ہے جو جنگ کے زمانے میں فرانس کی سرزمین پر مارا گیا تھا اس کا قد لمبا ہے۔ بدن کسی قدر دُبلا ہے۔ رنگ گورا ہے۔ ہلکے بھورے بال ہیں۔ آنکھیں چھوٹی اور نیلی ہیں۔ ڈاڑھی صاف ہے۔ مونچھیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ کیا آپ اس شخص کو پہچانتے ہیں؟

وہ شخص — "ہاں پہچان گیا ہوں"۔

پیٹر — وہ نوجوان آپ سے کہنا چاہتا ہے کہ میں بالکل خوش ہوں کسی کاغذ پر دستخط کرنے کے واسطے آپ پر زور دیا جا رہا ہے - یہ آپ کے لئے مضر ہو گا۔ دھوکا نہ کھانا۔ میرا ایک دوست ہسپتال میں ہے۔ آپ اس کے پاس جایا کریں اور اُس کی خبر گیری کیا کریں۔

یہ کہہ کر مسٹر پیٹر نے اس شخص سے پوچھا۔

کیا آپ یہ پیغام سمجھتے ہیں؟

وہ شخص - جی ہاں - میں سمجھ گیا۔ آپ کا شکریہ۔

پھر مسٹر پیٹر نے سامعین میں سے ایک عورت کو جو ہال کے ایک دوسرے حصّے میں بیٹھی تھی اس طرح خطاب کیا۔

"خاتون - آپ کے پیچھے بالکل قریب ایک مرد کی رُوح کھڑی ہے جو عمر میں ستر اسی سال کے درمیان ہے۔ سفید ڈاڑھی ہے سر کے بال لمبے ہیں۔ ناک اونچی اور پتلی ہے۔ اور آنکھیں سیاہی مائل - قد میانہ - جثہ نحیف۔ وہ فالج کے مرض سے کوئی دو سال ہوئے فوت ہو چکا ہے۔ کیا آپ اس شخص کو جانتی ہیں؟"

خاتون - جی ہاں - یہ میرے خُسر تھے۔

پیٹر - یہ رُوح آپ سے کہنا چاہتی ہے کہ گھبراؤ نہیں۔ عنقریب بنک والے تم کو روپیہ ادا کر دیں گے اور تمہاری دُوسری مشکلیں بھی دور ہو جائینگی - میں ہر روز تمہارے پاس آتا ہوں۔ چھوٹی لڑکی اب باقاعدہ اسکول نہیں جاتی جس سے میرا جی کڑھتا رہتا ہے۔

کیا یہ پیغام آپ کے نزدیک بامعنی ہے؟

وہ خاتون - جی ہاں - خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

اسی طرح مسٹر پیٹر نے قریب پندرہ بیس آدمیوں کو مختلف قسم کے پیغام دئے اور ایک مرد کے سوا باقی سب نے ان پیاموں کو سمجھنے اور بھیجنے والوں کو پہچاننے کا اقرار کیا - اُس ایک آدمی نے کہا کہ وہ نہ تو روح کو پہچان سکا ہے نہ اُس کے الفاظ کا مطلب سمجھ سکا ہے۔

اس وقت میرے دماغ میں شک اور حیرت نے ایک تلاطم برپا کر رکھا تھا - پہلے یہ خیال آتا تھا کہ شاید یہ لوگ جو حاضرین کے درمیان بکھرے ہوئے ہیں "روحانیوں کے ایجنٹ ہیں اور اُن کا جال پھیلانے اور اس تماشے کو فروغ دینے کے لئے ایک رٹا یا ہوا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ پھر خیالات پلٹا کھاتے اور میں سوچتا کہ یہ پندرہ بیس آدمی اپنے لباس اور شکل و شباہت سے اہل علم اور شائستہ نظر آتے ہیں - ان کو ایسے مجرمانہ فریب میں شریک ہونے کی کیا ضرورت تھی - اور جس تحریک کی بنیاد ایک باقاعدہ دھوکے پر رکھی جائے وہ کے روز چلے گی؟ کہاں تک فروغ پائیگی؟ پھر لوگوں کو اس طرح فریب دینے میں ان لوگوں کا فائدہ ہی کیا ہے۔ آخر ایک آدمی نے [illegible] کر دیا [illegible] پیغامات میں اُن کے [illegible]

ہوتا تو ایک سے زیادہ آدمی اس کا اعلان کر دیتے -

یہاں پہونچ کر میرے دل میں ایک زبردست خواہش پیدا ہوئی - کاش مجھے کوئی پیغام ملے تاکہ میں خود فیصلہ کر سکوں کہ اُن کی حقیقت کیا ہے - یہ خواہش میرے دل میں لہرا رہی تھی اور میں بیچین ہو رہا تھا کہ اچانک مسٹر پیٹر نے میری طرف دیکھا - میری گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی - موصوف نے میری طرف اشارہ کر کے کہا -

"وہ ہندوستانی دوست"

ان الفاظ سے میں کانپ سا گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں کسی جادوگر کے پنجے میں پھنس رہا ہوں - اُس وقت کے جذبات کی بالکل صحیح تصویر میرے قلم کی قدرت سے باہر ہے لیکن وہ کیفیت کچھ ایسی تھی جیسی اس عورت کی ہوگی جو رات کے وقت اکیلے کسی مکان میں داخل ہو اور اس کے یقین کے مطابق وہاں بھوت پریت بسے ہوئے ہوں اور وہ اپنے قریب کسی کے چلنے کی آہٹ سُنے یا کوئی نظر آنیوالی ہستی اپنے قریب محسوس کرے - میں بلا ارادہ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا - لیکن فوراً ہی اسکو بے معنی سمجھکر بیٹھ گیا - اتنے میں مسٹر پیٹر نے مجھ سے کہا -

"میرے دوست - آپ کے پاس ایک رُوح کھڑی ہے جسکی عمر....."

مسٹر پیٹر نے ایک ایسی ہستی کا نقشہ کھینچا جو مجھے بہت محبوب تھی اور عرصہ ہوا کہ لندن سے کئی ہزار میل دور یعنی پنجاب کی سرزمین میں دفن ہو چکی تھی - مجھ سے وُہی سوال دہرایا گیا کہ آیا میں اس رُوح کو جانتا ہوں - میں نے اس کا اقرار کیا پھر مجھے اس کا ایک پیغام سنایا گیا جس کے سچے اور بامعنی ہونے کا بھی مجھے اقرار کرنا پڑا -

اگرچہ میں اپنے پیغام بھیجنے والے کا حُلیہ اور اُس کے پیام شوق کی تفصیلات لکھنے سے معذور ہوں (جس کے لیے میں معزز ناظرین سے معافی چاہتا ہوں) تاہم اسقدر کہہ سکتا ہوں اور پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ حُلیہ اور وہ پیام بناوٹی نہیں ہو سکتے تھے - میں خوب جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں کے پیشہ ور رمالوں کے طریق پر بعض ایسے حُلیے اور ایسے جُملے تیار کیے جا سکتے ہیں جو سَو میں سے اسّی آدمیوں کو مطمئن کر دیں گے کیونکہ انسانی جسم اور حالات میں ایک بڑی مشابہت و یکسانیت موجود ہے - اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو فریب دینا کچھ دشوار نہیں لیکن اس دن مجھے یاد کرنے والے کے حلیے اور پیغام کے بعض حصے ایسے تھے کہ ان کا تصور سے پیدا ہونا قطعی ناممکن تھا -

جلسے کے بعد جب میں اور "ف" گھر پہنچے تو اُس نے مجھ سے پوچھا -

ف - "اب آپ کی رائے کیا ہے ؟"

میں - "رُوحانیت" کے اس پہلو کی نسبت تو آپ نے مجھ پر کامل فتح پالی ہے"

ف - "آپ کا کیا مطلب ہے ؟ کیا آپ ہماری انجمن کے رُکن بننے پر آمادہ ہیں ؟"

میں - "جی نہیں - اس کی تو سردست مجھے فرصت نہیں - اور نہ میں اسقدر جلدی یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں - البتہ یہ ماننے کو تیار ہوں کہ آج اس ہال میں رُوحیں ضرور موجود تھیں - میرا دل اس کی بزور شہادت دیتا ہے"

ف - "یہ ایک اچھی علامت ہے - اس لئے کہ میرے خیالات میں بھی پہلی تبدیلی بالکل اسی طرح ہوئی تھی - میرا خاوند مجھ سے بہت دور اور بڑے دردناک حالات میں مر گیا تھا اور میں غم کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی کہ میرے ایک غمگسار نے مجھے "رُوحانیت" کے دامن میں پناہ لینے کا مشورہ دیا - میں نے کچھ تامّل کے بعد یہ مشورہ قبول کر لیا اور مجھے اپنے خاوند سے پیغام ملنے لگے جن سے مجھ کو بڑی تسکین ہوئی اور رفتہ رفتہ میں رُوحانی عقاید اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئی"

بعد میں دریافت پر معلوم ہُوا کہ رُوحانیوں کی جماعت میں بعض "معمول" ایسے ہیں کہ اُن کے ذریعے سے ارواح کا جسمی شکلوں میں نظر آنا بھی ممکن ہے یعنی آپ رُوح کی آواز سُن سکتے ہیں اور اُس سے گفتگو کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے میری مشغولیت نے مجھے اس کی تصدیق کی مہلت نہ دی اور میں اس کے بعد جلد ہی انگلستان سے چلا آیا -

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے - اُس نے مجھے "ترجمانِ حقیقت" کا ہم خیال بنا دیا ہے یعنی ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

قاضی نذیر احمد

دیاسلائی

آگ کی دریافت اور ترقی تمدّن پر اُسکا اثر

جن سیّاحوں نے زمین کے دُور دراز اور دشوار گزار گوشوں کی سیر کی ہے ان کا بیان ہے کہ کرۂ زمین کے بعض حصّوں میں اب تک ایسی وحشی قومیں رہتی ہیں جو آگ کا استعمال تو درکنار اس کے نام تک سے ناواقف ہیں۔ ان سیّاحوں نے مبالغہ آمیزی و افسانہ طرازی سے کام لیا ہو یا یہ واقعہ ہو بہرحال یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ آگ نے تہذیب و تمدّن کی ترقی میں خاص اثر کیا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدائے آفرینش ہی سے آگ کا بیحد محتاج رہا ہے۔ البتہ ضرورت کے اسباب حالات کے اعتبار سے بدلتے رہے ہیں۔ کبھی سردی سے بچنے کے لئے ضرورت ہوئی، کبھی کھانا پکانے کے لئے اور کبھی جان کی حفاظت کی غرض سے۔ کچھ دنوں پہلے تک عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ آگ کو نوعِ انسان کے سب سے پہلے فرد نے دریافت کر لیا تھا۔ لیکن نئی تحقیق اور سیّاحوں کے بیانات نے اب یہ خیال قائم کر دیا ہے کہ انسان کی پیدائش آگ کی دریافت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ یہ یقینی ہے کہ دُوسری تمام معلومات اور ایجادوں کی طرح انسان نے آگ کو بھی اتفاقیہ طور پر رفتہ رفتہ دریافت کیا۔ علماء و محققین اس امر پر متفق ہیں کہ پہلے انسان نے آگ کو "رگڑنے" کے اصول پر غور کر کے دریافت کیا ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ طبعاً ہر ایک مادہ میں آگ کا عنصر موجود ہے، اس لئے جب ایک مادہ اپنی قسم کے دوسرے مادہ سے رگڑ کھاتا ہے تو اس کے نتیجے میں لازمی طور پر آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ شروع شروع میں لکڑی کے دو خشک ٹکڑوں یا آتش فشاں سنگریزوں کی رگڑ سے آگ پیدا ہوئی ہوگی۔

غالباً انسان کو سب سے پہلے شعاعِ آفتاب کی حرارت محسوس کر کے آگ کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے یہ بھی دیکھا ہو دوپہر کی سخت دھوپ میں کبھی کبھی خشک گھاس میں شعلہ اُٹھا اور خود بخود اس میں آگ لگ گئی۔ جیسا کہ گرم ممالک میں اکثر ہوتا ہے، جب یوں اس نے پہلی مرتبہ آگ کو دیکھا اور اس کے حالات و فوائد کا کسی قدر اندازہ ہوا تو اسی وقت سے یہ کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح آگ پیدا کی جائے اور اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

انگریزی پروفیسر مسٹر ٹیلر نے لکھا ہے کہ ابتدائے پیدائش میں انسان کو آگ پیدا کرنے کا جو بہترین و مقبولِ عام طریقہ معلوم تھا وہ یہ تھا کہ آتش گیر خشک لکڑی کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر آگ پیدا کی جائے۔ بعد میں اس نے ایک اور ترقی یافتہ طریقہ دریافت کیا۔ لکڑی کی ایک مختصر سی تختی لیکر اس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنایا پھر ایک قوس نما لکڑی کا ایک سرا اس سوراخ میں رکھ دیا اور دوسرے سرے کو اپنے ہاتھ سے مضبوط پکڑ لیا۔ اب اسے دوسرے ہاتھ سے برمے کی طرح تیزی سے گھمانا شروع کیا جس سے گرمی پیدا ہوئی اور بالآخر شعلے نکلنے لگے۔ یہ طریقہ آج تک ہندوستان، افریقہ اور امریکہ وغیرہ کی وحشی قوموں میں عام طور پر جاری ہے۔

جب انسان نے تہذیب میں کسی قدر اور ترقی کی تو اس نے آگ سے شعلے نکالنے کا ایک اور بہتر طریقہ ایجاد کیا۔ اور وہ سنگِ چقماق کی آگ پیدا کرنے والی قوت کا استعمال ہے۔ جس عہد میں انسان نے یہ طریقہ دریافت کیا اُسکی مدت مقرر کرنے میں علما کی مختلف رائیں ہیں لیکن کثرتِ رائے اسی طرف ہے کہ اُس زمانہ کی تاریخ نامعلوم ہے اور یقیناً اس کا تعلق آغازِ تمدن کے بالکل ابتدائی دور سے ہے۔ اسی لئے ایک بڑے طبقے کا فیصلہ ہے کہ تمدن حقیقتاً اُسی دن سے شروع ہوا جب سے کہ انسان نے اس نورانی عنصر کو دریافت کیا۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان اس کے استعمال کا زیادہ عادی ہوتا گیا یہاں تک کہ اب اس کیلئے آگ سے پرہیز قطعاً غیر ممکن ہے کیونکہ وہ ضرورتِ زندگی میں شامل ہو چکی ہے اور آج گرمی حاصل کرنے، کھانا پکانے، جان کی حفاظت اور روشنی کے لئے قدم قدم پر آگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

پُرانی یونانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفاسٹوس آگ کا دیوتا ہے۔ رومی اس کے مقابلے میں فولکانوس کو مانتے ہیں۔ یونانیوں کی یہ بھی روایت ہے کہ ایک بحری دیوتا پرومیتھوس پر زفس دیوتا کا عتاب نازل ہوا۔ جس کی وجہ سے زفس انسان سے ناراض ہو گیا۔ اور اس کو آگ سے محروم کر دیا۔ پرمیتھوس خفیہ طور سے دیوتاؤں کے مسکن کوہ اولیمپوس پر گیا اور وہاں سے ایک نلکی میں آگ کی چند چنگاریاں چھپا کر انسان کے پاس لے آیا۔ زفس نے اس کی پاداش میں اُسے قید کر کے ایک بلند پہاڑ پر موت کے منہ میں ڈال دیا۔ جہاں جنگل کے گوشت خور پرندوں نے اس کا کام تمام کر ڈالا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ پرمیتھوس انسانی تمدن کا بانی ہے۔

کیونکہ اس نے جزیرہ ملنوس میں آگ کے دیوتا ہفاستوس کے پاس سے آگ چرائی اور اسی آگ سے انسان کی ایجادات و معلومات کی ابتدا ہوتی ہے یہ آگ کی اصل اور اس کی ابتدائی تحقیق کے متعلق اہم روایات کا خلاصہ ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی ایام تک انسان آگ اس طرح حاصل کرتا تھا کہ فولاد کا ایک ٹکڑا چقماق پر مارا جاتا، اور ان کے درمیان مٹی کا تیل (روغن نفط) لگا کر خشک گھاس رکھ دی جاتی۔ رگڑ سے جو چنگاری پیدا ہوتی وہ اڑ کر گھاس پر گرتی اور آگ روشن ہو جاتی۔ یا گھاس کے بدلے کسی قسم کا تیل چھڑک کر کپڑے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا اور کسی آگ پکڑ نیوالے مادہ سے کام چلا لیا جاتا۔

دیاسلائی کی ایجاد

موسیو شانسل پروفیسر پیرس یونیورسٹی نے ۱۸۰۵ء میں آگ نکالنے کا ایک جدید طریقہ ایجاد کیا۔ اس کی لوازم میں ایک چھوٹی سی شیشی ہوتی جس میں اسبسٹوس اور گندھک کے تیزاب کا مرکب ہوتا شیشی کے ساتھ گندھک میں غوطہ دی ہوئی لکڑی کی سلائیاں ہوتیں، اور ان کے سروں پر پٹاس اور شکر سے بنا ہوا ایک قسم کا مسالا لگا ہوتا جب سلائی اس مرکب سے مس ہوتی تو شعلہ نکلتا اور آگ پیدا ہو جاتی۔

اسی سال پیرس میں "فاسفورس کی سلائیاں" بھی ایجاد ہوئیں جو بہت جلد روشن ہو جاتیں اور ان سے بہت تیز آگ پیدا ہوتی ۱۸۰۹ء میں پروفیسر ڈریپا نے فاسفورس کی سلائیوں کا خطرہ کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد موسیو ڈیروزن نے ۱۸۱۶ء میں ایک قسم کی دیاسلائی ایجاد کی۔

* * * * * لیکن انہوں نے رواج نہ پایا۔ ان کا مسالہ فاسفورس اور گندھک کے مساوی اجزاء سے مرکب ہوتا تھا۔ ان دونوں کو ایک شیشی کی نلکی میں اچھی طرح بھر کر نلکی کا منہ خوب بند کر دیا جاتا تھا جب آگ جلانے کا ضرورت ہوتی تو اس میں سلائی کو ڈبو کر اس کے سرے پر تھوڑا سا مسالہ نکال لیا جاتا۔ اور جونہی سلائی کو ہوا لگتی وہ جل اٹھتی۔

غالباً موجودہ دیاسلائی سب سے زیادہ اسی دیاسلائی سے مشابہ ہے جو ۱۸۲۷ء میں انگلستان کے ایک شخص جان واکر نامی نے بنائی۔ یہ مضبوط پتّوں کی بنی ہوئی سلائیاں ہوتی تھیں۔ ان پر گندھک کی ایک تہہ چڑھی ہوتی اور انہیں سلفٹ، انٹیمون، پٹاس، اور گوند کے پانی میں غوطہ دیا جاتا۔ ان سلائیوں کی ایک ڈبیہ جسمیں ۸۴ سلائیاں ہوتیں ایک شلنگ میں فروخت ہوتی۔ اس کے ساتھ ایک خاص قسم کے کاغذ کا ٹکڑا بھی دیا جاتا جس پر رگڑنے سے سلائی جلا کرتی تھی۔

۱۸۳۰ء میں لندن کے ایک باشندہ مسٹر جونس نے ایک دوسری قسم کی دیاسلائی ایجاد کی جس کا نام "پرومیتھوس کی سلائی" رکھا۔ اس کی یہ صورت تھی کہ کاغذ کے ایک ڈبے میں ایک جانب پٹاس اور شکر کا مرکب رکھا ہوتا اور دوسری طرف کانچ کی ایک گول شیشی میں تھوڑا سا گندھک کا تیزاب ہوتا۔ جب یہ تیزاب اس مرکب سے ملتا تو شعلہ پیدا ہو جاتا۔

موجودہ دیاسلائی کا استعمال ۱۸۳۳ء سے قبل نہیں پایا جاتا۔ غالباً یہ ایک ہی وقت میں متعدد جگہ ایجاد ہو کر رواج پا گئی۔ میو سیو پریشیل آسٹروی کا ایک دیاسلائی کا کارخانہ تھا جس میں کئی قسم کی دیاسلائیاں بنتی تھیں۔ موسیو مولدنہور (باشندہ ڈرمسٹاڈ (جرمنی)) کا بھی اسی قسم کا ایک کارخانہ تھا۔ آسٹریا اور جنوبی جرمنی ممالک ایک عرصہ تک اس صنعت کے مرکز بنے رہتے۔ پھر دوسرے ملکوں میں بھی متعدد کارخانے قائم ہو گئے۔ اور یہ صنعت رفتہ رفتہ ترقی پا کر موجودہ صورت تک پہنچ گئی۔

اس صنعت کے خطرات

دیاسلائی کے مسالے کا خاص جز فاسفورس ہے۔ اور یہ ایک مہلک زہر ہے۔ اس سے بہتیرے کاریگر موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ دیاسلائی کے کارخانوں میں کاریگروں کو ہمیشہ فاسفورس کے بخارات سے سابقہ رہتا ہے اور وہ اکثر جان مار و بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی ہڈی تک کاٹنے کی نوبت آجاتی ہے لیکن اصول حفظان صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صفائی، روشنی اور تازہ ہوا کے کافی انتظام سے ان خطروں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اکثر ماہرین فن نے کوشش کی کہ کوئی اس قسم کی دیاسلائی ایجاد کریں جس کے مسالہ میں فاسفورس کا عنصر نہ ہو۔ لیکن انہیں ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مگر جب سے کہ پروفیسر شروٹر آسٹروی نے ۱۸۴۵ء میں "کبریت احمر" کو معلوم کیا اور اسے دیاسلائی کی اس قسم میں استعمال کیا جسے "سیفٹی ماچس" (محفوظ دیاسلائی) کہتے ہیں، فاسفورس کے خطرات بہت کم ہو گئے ہیں۔ اس دیاسلائی کا موجد سویڈن کا باشندہ لنڈسٹرم نامی ایک شخص ہے۔ اور دیاسلائیوں کی جملہ اقسام کی بہ نسبت اس میں مضر اجزا بہت کم ہیں۔

دیاسلائی بنانے کی کیفیت

مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں دیاسلائی بڑی مہنگی فروخت ہوتی تھی۔ یعنی ایک ڈبیہ کی قیمت جس میں صرف ۸۴ سلائیاں ہوتیں ایک شلنگ تھی لیکن آج ایک شلنگ میں تین ہزار سے لیکر پانچ ہزار سلائیوں تک خریدی جا سکتی ہیں۔ اور سگریٹ بیچنے والے

تو گاہکوں کو دیا سلائی مفت ہی دیتے ہیں۔ جس سے اسکی ارزانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے کارخانے سینکڑوں قسم کی دیا سلائیاں بناتے ہیں جن کی پوری پوری تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ دیا سلائی بنانے کا صرف وہ طریقہ بیان کر دیا جائے جو سب سے زیادہ مقبول اور اہم ہے۔

جب ہم دیا سلائی کے کارخانہ میں داخل ہونگے تو سب سے پہلے وہاں ایک خاص قسم کا مسالہ تیار ہوتا ملیگا۔ جو سلائیوں کے سروں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ مسالہ کارخانے کے ایک دوسرے حصے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ کارخانے کے ایک درجہ میں بڑی بڑی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں چرخی (دولاب) پر تقریباً تین انچ چوڑی مال پڑی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر تقریباً چار انچ لمبا ایک برتن ہے جس میں سلائیاں بھری ہوئی ہیں جب مال چرخی پر گھومتی ہے تو سلائیاں جلد جلد نہایت ترتیب کے ساتھ گرنا شروع ہوتی ہیں۔ اس طرح کہ ایک دوسری سے مس نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ ہر ایک برابر فاصلہ پر سیدھی گرتی چلی جاتی ہے۔ اور جس طرح برش کے بال جمے ہوتے ہیں۔ اسیطرح برابر برابر سجتی جاتی ہیں۔ جب مال کی پوری گردش ختم ہو جاتی ہے تو ایک بنڈل تیار ہو جاتا ہے۔ جس کا قطر تقریباً ۱۸۔ انچ ہوتا ہے۔ اور جس میں چار ہزار کے قریب سلائیاں ہوتی ہیں۔ سلائیوں کے سرے بنڈل کے ہر دو جانب کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک دوسری مشین کے ذریعے سلائیوں کے سرے برابر کر لئے جاتے ہیں، پھر انہیں لوہے کے گرم پتروں پر ڈال کر خشک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں سوڈیکے پانی میں غوطہ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سلائیوں میں جلنے کی قوت بڑھ جاتی ہے

اس کے بعد سلائیاں کارخانے کے دوسرے درجے میں پہونچا دی جاتی ہیں جہاں اس کے سروں میں شعلہ پیدا کرنے والا مسالا لگایا جاتا ہے۔ یہ مسالا لئی کی طرح گاڑھا اور لیسدار ہوتا ہے۔ اور ایک اتھلے برتن میں رکھا ہوتا ہے اسے برقی قوت سے گرم کر لیا جاتا ہے۔ کاریگر ایک چھری لے کر برتن پر پھیرتا ہے تاکہ مسالے کی سطح برابر ہو جائے۔ پھر سلائیوں کا ایک بنڈل لیکر ان کے سروں کو مسالے میں غوطہ دیدیتا ہے۔ چونکہ برتن بہت ہی اتھلا ہوتا ہے اس لئے سلائیوں کے صرف سرے ہی ڈوبتے ہیں جب کاریگر بنڈل کو غوطہ دے چکتا ہے تو اسے خشک ہونے کیلئے لٹکا دیتا ہے اور دوسرا بنڈل لیتا ہے۔ اسی طرح تمام بنڈلوں میں ایک جانب مسالا لگا دیا جاتا ہے جب ایک طرف کا مسالہ خشک ہو جاتا ہے تو دوسری جانب یہی عمل ہوتا ہے۔ اس دوران میں کاریگر جب ایک بنڈل کو غوطہ دے چکتا ہے تو چھری سے مسالہ کی سطح پھر برابر کر دیتا ہے۔

بنڈلوں کو خشک اس طرح کیا جاتا ہے کہ انہیں اس مقصد کے لئے تیار کی ہوئی گرم بھاپ والی کھڑکیوں میں لٹکا دیتے ہیں۔ ان کی گرمی خاص قسم کے برقی پنکھوں کے ذریعے سے محفوظ کر دی جاتی ہے۔ جب سلائیاں اچھی طرح خشک ہو جاتی ہیں تو بنڈل کارخانے کے ایک دوسرے درجے میں پہنچا دئے جاتے ہیں جہاں انہیں کھول کر سلائیاں لڑیوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ اور ایک مشین میں رکھ کر ان کے دو دو ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ پھر انہیں ڈبیوں میں بھر دیتے ہیں۔

یہ دیا سلائی بنانے کے ایک طریقے کا خلاصہ ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی طرح تیار ہوتی ہیں جن کا قلت گنجائش کی وجہ سے اس جگہ ذکر مشکل ہے۔

منظور حسین سروش
(ایصوبالی)

رباعی

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے　　آزادئ دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے باز آئے ہم　　فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

رواں ایم اے

کرشمۂ غیبی

ہمیں اُس مردود پر فتح پانا لازمی ہے۔ اگرچہ کنسولیڈیٹڈ واٹر کمپنی کی تحویل کی آخری پائی تک کیوں نہ خرچ ہو جائے۔ شراب خانہ گولڈن ایگل (سنہری عقاب) کے مالک نے یہ کہہ کر لکھنے کی میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ جس کے سامنے وہ بیٹھا تھا۔

"اچھا ــــ" ایک شخص نے جو بائیں طرف بیٹھا تھا آہستہ سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ کچھ سائے میں چھپا ہوا تھا ــــ "ایک بڑی رقم کی قطعی ضرورت ہوگی اور پھر بھی مجھکو اطمینان نہیں ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے"

ــــ "جو کچھ بھی ہو۔ ہمیں کامیاب ہونا ضروری ہے اور یہ تمہارا فرض ہے" پہلے شخص نے تیزی سے یہ جملہ کہا اور میز کی طرف جھک کر اپنا سگار جلاتے ہوئے برقی بٹن دبا دیا گویا کہ معاملہ ختم ہوگیا۔ خانساماں کو برانڈی کی بوتل لانے کا حکم دیا بوتل آئی اور ایک گلاس لبالب بھر لیا۔ دوسرا شخص للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ــــ "نہیں، تم کو ایک قطرہ کبھی نہ ملے گا ــــ" شراب خانے کے مالک نے گویا دوسرے شخص کی آنکھوں کی خاموش درخواست کا جواب دیا "جب تم برانڈی سے بھر جاتے ہو تو بالکل بیکار رہ جاتے ہو۔ اور اگر تمہارے پاس کافی روپیہ ہو تو تم ہر وقت مست اور سرشار رہو۔ فوراً جاؤ اور سُلّی وان سے ملو۔ (جھک کر اور آہستہ آواز میں) اُس سے کہو کہ ہم اس کی تجویز منظور کرتے ہیں روپیہ تیار ہے۔ تین ہزار ووٹ جو اس کے اختیار میں ہیں اگر اُن ووٹوں میں شامل کر دئے جائیں جنکو ہم خرید سکتے ہیں تو ہم یقیناً کامیاب ہو جائینگے۔ پیٹرسن! ہم کو فتح پانا لازمی ہے۔ ورنہ جدید صدر بلدیہ کو فیصلہ کن ووٹ کا حق ہو جائیگا ہمارا اسٹیا خارج کر دیا جائیگا۔ پانی کے محکمہ کا جدید قانون تیار کیا جائیگا اور کنسولیڈیٹڈ کمپنی کے حصے ان کاغذوں کی قیمت کے بھی برابر نہ ہونگے جن پر وہ لکھے گئے ہیں۔

غریب پیٹرسن نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے شہر کے نقشے کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں آدھے گھنٹے تک اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس کے بعد پیٹرسن نے نقشے کو تہ کر کے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور سر پر ٹوپی رکھ کر جانے کو تیار ہو گیا۔ دروازے پر پلٹ کر اُس نے بوتل کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

ــــ بہت اچھا کرنل صاحب! اگر یہ روپیہ کا معاملہ ہے تو غالباً ہم آپ کو منتخب کرانے کے لئے کافی ووٹ خرید سکینگے لیکن اپنے برسوں کے دوست کو ایسی رات میں تین میل کے سفر کو تھوڑی سی شراب کے بغیر بھیجنا میری رائے میں حق دوستی کے خلاف ہے۔

یہ کہہ کر وہ دروازے کو زور سے بند کرتا ہوا غائب ہوگیا۔

آنریبل ولیم بل کراس بین شراب خانہ گولڈن ایگل اور قمار خانے کے مالک، واٹر کمپنی کے پریزیڈنٹ۔ شہر کرافٹ (نیو میکسیکو) جاگیردار اور اس شہر کی صدارت بلدیہ کے امیدوار نے جانے والے کی یہ بات گویا سُنی ہی نہیں۔ بڑی دیر تک وہ میز کے سامنے اس پر پیر رکھے ہوئے بیٹھا ایک کے بعد دُوسرا سگار جلا کر خاموشی سے پیتا رہا۔ غالباً اس کے خیالات دل خوش کن نہیں تھے۔ کیونکہ اس کا سر سینے کی طرف جُھک گیا اور ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ اس کے دماغ میں پرانے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی جب وہ پچیس برس پہلے کسی دن اس شہر میں داخل ہوا تھا۔ افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ ریاست ارکینساس کے کسی ضلع کا پولیس افسر اس امر کو واضح کرے کہ کراس بین ملک کے مغربی حصے میں پناہ لینے یکایک دو دن میں کیوں فرار ہوگیا"

سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کے پاس ہر وقت ریوالور رہتا ہے، پہلے تو پیٹی میں رکھتا تھا اس کے بعد جیب میں رکھنے لگا اگر کوئی شخص اس کو نشانہ بنانا چاہتا تو وہ تو اپنا ریوالور نکالتا ہی رہتا لیکن کراس بین کا ریوالور نکل آتا تھا کئی شخصوں نے یہ ارادہ کیا لیکن ان میں سے ہر شخص بے خوف اور نڈر بل کراس بین کے خطا نہ کرنے والے نشانے سے زمین پر ڈھیر ہو کر رہ گیا، اسی وجہ سے سب اس سے خوف کھاتے تھے اگرچہ کسی کے دل میں اس کی عزت نہ تھی۔ عموماً وہ خاموش رہا کرتا تھا اور بظاہر خطرناک نہ تھا لیکن اس شہر میں جہاں وہ چھ مہینے تک آکر رہا۔ وہاں کے سب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ اس بڑی مونچھوں والے جوان سے جو نہ معلوم کہاں سے آیا ہے نظر ملانا آسان نہیں ہے خصوصاً جب اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی فولادی چمک پیدا ہوتی ہے تو اُسوقت ڈائنامیٹ سے کھیلنا آسان ہے۔ مگر اس سے آنکھیں چار کرنا بہت مشکل۔

پہلے اس نے ایک شراب خانے میں ساقی گری کی ملازمت کی جہاں اُجڈ دیہاتی بہت آیا کرتے تھے۔ اس جگہ شراب میں کسی چیز کا ملا دینا تو کچھ ایسی اہم بات نہ تھی لیکن ان اوباش اور بدقماش لوگوں کا شراب خانے سے باہر نکالنا ذرا خطرناک فرض تھا جو جھگڑا فساد برپا کرتے رہتے تھے۔ مگر کراس مین نے ان دونوں فرائض کو اس قابلیت سے انجام دیا کہ چند ہی روز میں اس شراب خانہ میں امن قائم ہوگیا اور خوب آمدنی ہونے لگی۔
ان ایام میں کراس مین شاذ و نادر ہی شراب پیا کرتا تھا اس کی ساری توجہ ڈالر جمع کرنے پر مبذول رہا کرتی تھی اور وہ دن رات اسی دُھن میں رہتا کہ کسی طرح دولت پیدا کی جائے آخر ایک ہی سال میں اس نے اسقدر روپیہ جمع کرلیا کہ ایک برس کے بعد شراب خانے میں نصف کا مالک ہوگیا اور شراب خانہ کُلیتاً اس کے اختیار میں آگیا۔ شراب خانے کے مالک نے آدھا حصہ اصلی قیمت سے بہت کم داموں پر فروخت کیا تھا۔ اور جو آدھا حصہ باقی رہ گیا تھا اس کے متعلق کراس مین نے اس کو دھمکی دی کہ "اگر یہ بھی میرے ہاتھ فروخت نہ کروگے تو بہت جلد قبر میں سونا پڑیگا۔ اور یہ ایسا ڈرامہ ہے جس میں مجھکو خوبی سے پارٹ کرنا آتا ہے"۔ اس شراب خانے کا مالک بھی غریب پیٹرسن تھا جو وہسکی کے ایک جام کے لئے گولڈن اینگل کے دوسرے مالک کی عنایت کا محتاج تھا اور اب کراس مین بہت مالدار ہوگیا تھا۔
ان دنوں وہسکی بہت قیمتی چیز تھی جو گوالوں .... سونا تلاش کرنے والوں، جنوبی کالی فورنیا کو گھوڑا گاڑی سے تجارتی مال لے جانے والوں اور انڈینز کے لئے جو گردونواح میں آباد تھے لوازمات زندگی میں سے تھی۔ انڈینز کو شراب بیچنے کی قانوناً ممانعت تھی لیکن کراس مین اس خلاف قانون کارروائی کی سزاؤں سے ہمیشہ محفوظ رہا۔
کراس مین نے اپنے شراب خانے میں ایک کمرہ قمار بازی کے لئے بھی مخصوص کردیا کہ شراب کے گاہک جو روپیہ وہسکی میں صرف نہ کرسکیں وہ تاش کے مختلف کھیل "رولٹ" اور "سٹڈ پوکر" وغیرہ میں ہار جائیں۔ اسی زمانے میں شہر کے قریب ایک کوئلے کی کان دریافت ہوئی جس کی وجہ سے آہنی پٹڑیاں کراکٹ تک بچھادی گئیں اور زمین کے ٹکڑوں کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ کراس مین نے جو کافی روپیہ جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اور ممالک متحدہ امریکہ کی عجیب رسم کے مطابق کرنل کا خطاب پاچکا تھا۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس نے جو قطعات زمین خریدے تھے وہ مشرقی ریاستوں نے بڑی بڑی قیمتیں دیکر خرید لیں۔ اسکے بعد ان قطعوں کی قیمت بہت گھٹ گئی پھر وہ اس موقع کا منتظر رہا کہ مناسب قیمت کی اور زمین بھی خرید لے چنانچہ اس کو وسط شہر کے بہت سے قطعات ملگئے۔
کراس مین کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ رفتہ رفتہ شہر کی آبادی بڑھنے لگی اور اس نے جو قطعات زمین خریدے تھے ان میں سے بہت سے نہایت گراں قیمت پر بیچدئے باقی پر اس نے دکانیں اور رہنے کے لئے مکان تعمیر کرلئے کہ جن سے ہر مہینے معقول کرایہ آتا رہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک شاندار محل بھی بنوایا جو کل ریاست میں قابل دید چیز تھا۔ اس محل کی دوسری منزل پر تاش کھیلنے کا بنا کمرہ تھا جہاں جوئے میں بڑی بڑی رقمیں لگائی جاتی تھیں۔
چند سال کے بعد ایک کمپنی قائم ہوئی کہ شہر میں پانی پہونچانیکا انتظام کیا جائے لیکن اس کمپنی کے پاس کافی سرمایہ نہ تھا۔ بعض رکاوٹوں کی وجہ سے شہر سے سات میل کے فاصلے پر پانی کا بند بنانا دشوار تھا۔ کمپنی نے کام بند کردیا کیونکہ اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ مشکلات پر غالب آسکتی۔
کرنل کراس مین نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بہت سے حصے خرید لئے ساتھ ہی اس نے اپنے آپ کو کمپنی کا صدر منتخب کرا کے اُسے مالی بنیاد پر قائم کردیا۔ پانی پہنچانے کا انتظام بہت جلد رائج ہوگیا اور اعلان کردیا گیا کہ اگر کراکٹ کے باشندے زیادہ قیمت ادا کریں تو اچھا پانی ان کے گھروں تک پہونچایا جا سکتا ہے۔
اس وقت تک زمانہ کراس مین کے بہت موافق تھا۔ وہ نیو میکسیکو میں ایک ڈالر بھی لے کر نہیں آیا تھا لیکن اب یہ ۵۴ سال جوان ریاست میں سب سے زیادہ دولتمند تھا اور تندرست ہونے کے علاوہ وہ ایسا عقلمند تھا کہ اس کو وہ تمام ناگوار معاملات پریشان نہ کرسکے جو اس کی حصول دولت کا ذریعہ تھے۔
کرنل کراس مین نے اب تک شادی نہیں کی تھی بہت سی عورتیں جو ریل کے جاری ہونے سے پہلے اس حصۂ ملک میں آئیں وہ اس کو اپنی طرف مائل نہ کرسکیں اور ان سے یہ رائے قائم کی کہ وہ عورت کی جنس کا دشمن ہے۔ کرنل کراس مین نے اس الزام کی کوئی تردید نہیں کی اور کبھی یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ عورتوں کی سوسائٹی کو پسند کرتا ہے جن سے ملنے کا اسے کبھی کبھی اتفاق ہوجایا کرتا تھا۔
کراس مین کی زندگی اطمینان سے بسر رہی لیکن بالآخر اس کو مصیبتوں کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ واٹر کمپنی میں کثیر روپے کی ضرورت پیش آگئی۔ پانی لے دوڑ خیروں نے بند اور شہر کے درمیانی نل توڑ ڈالے۔ اس لئے نیا بند بنانا اور نل لگانا لازمی ہوگیا اور جب کرنل کراس مین نے پانی کی قیمت بہت بڑھا دی کہ جو روپیہ خرچ ہوگیا ہے وہ وصول ہوجائے اور کراکٹ کے باشندوں نے اس کے خلاف دعوے دائر کردیا۔ تو واٹر کمپنی سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کا مطالعہ کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمپنی کو قیمت بڑھانے کا حق ہے لیکن خوش قسمتی سے اس میں [illegible] بھی تھی کہ اہل شہر کو اپنے پانی کے انتظام میں

خود بھی دخل دینے کا حق ہے - اس پر شرفاء شہر نے کمپنی سے درخواست کی - کہ وہ نئے نظام کا ٹھیکہ لے لے لیکن کرنل نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور معاملہ نہایت اہم ہو گیا -

تقریباً دو سال قبل کرنل نے دو شاہ راہوں پر چند تجارتی گودام بنانے چاہے - وہ جس زمین میں یہ گودام بنانا چاہتا تھا اُسے اپنا ہی سمجھ رہا تھا لیکن جب خاکہ تیار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا مسٹر لیک کی بیوہ کا ہے جو بیچاری ایک معمولی مکان میں رہا کرتی تھی اور سلائی پر اپنا اور اپنے لڑکے کا گذارہ کیا کرتی تھی - اس کا شوہر گٹھیا کا مریض تھا اور یہاں اس امید میں آیا تھا کہ تبدیل آب وہوا سے اس کے مرض میں افاقہ ہو جائیگا لیکن اُسے کچھ صحت نہ ہوئی اور یہیں اُس کا انتقال ہو گیا - اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ رہنے لگی - کچھ عرصے کے بعد یہ عورت بھی مرگئی اور چونکہ اُس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا اس لئے اُس نے اپنا مکان اور زمین مسٹر لیک کی بیوہ کے نام لکھدی تھی جب کرنل کراس بین کے گماشتے نے اس سے کہا کہ یہ مکان اور زمین فروخت کر دے تو اُس نے انکار کر دیا - اس کے بعد کرنل کراس بین کی طرف سے وقتاً فوقتاً قیمت میں اضافہ ہوتا رہا لیکن اُس بیوہ نے اقرار نہیں کیا - کرنل کراس بین کی عمارت بغیر اس زمین کے تیار نہیں ہو سکتی تھی اس وجہ سے وہ خود اس بیوہ کے یہاں گیا، اُس نے کراس بین کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا اور نہایت خاموشی سے اس کی درخواست سنتی رہی - کراس بین نے اس سے کہا کہ "آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جب تک آپ اپنا قطعۂ زمین میرے ہاتھ فروخت نہ کرینگی اُس وقت تک ہم وہ گودام تعمیر نہیں کر سکتے جس کی ہم نے تجویز کی ہے - میں آپ کے مکان کی بہت بڑی قیمت پیش کرتا ہوں اس رقم سے آپ کسی دوسری جگہ بہت اچھا مکان خرید سکتی ہیں - آپ کو شہر کی جائز دلچسپیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی کسی ذاتی غرض کا خیال نہ کرنا چاہئے - اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوگا - مناسب ہے کہ آپ یہ روپیہ قبول کر لیں اور ہماری مزاحمت سے دست بردار ہو جائیں"

—— "جناب! مجھے بیحد افسوس ہے کہ میں آپ کی تجویز قبول نہیں کر سکتی - میری محسن اسکاچ خاتون کی یہ وصیت تھی کہ میں یہ مکان کبھی نہ فروخت کروں، نہ اسے گرانے دوں - اور یہ جگہ میرے کام کے لئے بھی بہت موزوں ہے - اس لئے میں یہ مکان نہیں چھوڑ سکتی" - کرنل نے بہت کچھ بحث کی لیکن وہ اپنے ارادہ پر قائم رہی - کرنل نے غصے کا اظہار کیا تو وہ مسکرا دی - اُس نے دھمکی دی تو اُس نے اُسکو دروازے کی طرف جانیکو اشارہ کر دیا -

کرنل انتقام کی قسم کھاتا ہوا چلا گیا اور اپنے دفتر میں جاکر بیٹھا اُس وقت وہ غصے میں بھرا ہوا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا - آج اس کو ایک نیا تجربہ ہوا کہ مرد تو اس سے ڈرتے ہیں لیکن یہ عورت ذرا نہیں ڈرتی مرد اُس کی خوشامد کرتے اور اس کی مرضی کے موافق ہر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں لیکن یہ عورت مقابلے کو کھڑی ہوتی ہے - کرنل کراس بین کچھ نہ سمجھ سکا لیکن یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ وہ بیوہ ابھی جوان ہے - صورت کی بھی اچھی ہے اور آزاد عورت ہے - بظاہر وہ اس سے بالکل نہیں ڈرتی اور وہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے - یہ خیال کر کے دوبارہ اس بیوہ کے ہاں گیا اور اپنی گذشتہ بدسلوکی کی معافی چاہی - بیوہ نے خوشی کے ساتھ معاف کر دیا اور نہایت عزت سے اُس کو رخصت کیا - اس وقت کرنل کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا کہ اس خاتون سے شادی کیوں نہ کر لی جائے - اس طرح ایک اچھی بیوی بھی مل جائے گی اور وہ زمین بھی ہاتھ آجائیگی -

اب پہلی مرتبہ کرنل کراس بین کو شبہ ہوا - کہ آیا وہ حقیقتاً ایک ممتاز آدمی ہے یا نہیں - اس نے بہت کم تعلیم پائی تھی اور اچھی سوسائٹی کے آداب اور طریقوں سے ایسا ہی ناواقف تھا جیسا ایک گاؤں کا رہنے والا - لیکن اُس کے پاس کافی دولت تھی اور باوجودیکہ وہ پینتالیس۴۵ سال کا تھا اس علاقے میں اس سے زیادہ خوش رو اور خوش پوشاک کوئی نہیں تھا - اُس نے بیوہ سے شادی کی درخواست کی دل میں ٹھان لی اور اسی خیال سے وہ اُس خاتون کے ہاں گیا اور اس کا گرویدہ ہو گیا - اس نے شہر کی اپنی بڑی جائیداد زمین کے ٹکڑے عمارتیں، کھیت، دس ہزار بھیڑیں اور نفع والے پانی کے کارخانہ کا ذکر کیا - بینک میں جسقدر روپیہ جمع تھا اور شراب خانے اور قمار خانے کا حال بھی بیان کیا اور آخر میں اس بیوہ کی مسکراہٹوں سے دھوکے میں آکر بے تکلف کہا :-

—— "مسز لیک! آپ خوب واقف ہیں کہ میں کافی دولت مند ہوں البتہ مجھے بیحد افسوس ہے کہ مجھکو تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ کبھی نہیں ملا - نہ میں مہذب دنیا کے آداب اور رسموں سے واقف ہو سکا - تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ روپیہ سب پر فضیلت رکھتا ہے - اگر آپ میرا ہاتھ اور دل قبول کر لینگی تو مجھے بیحد مسرور کرینگی اور آپ میری نصف دولت کی مالک ہو جائینگی" -

مسز لیک پر بجلی سی گر پڑی ایک لمحہ تو وہ اس ہتک پر بُت بنی بیٹھی رہی غالباً وہ نہیں سمجھتی تھی کہ کرنل اُس سے شادی کی درخواست کریگا لیکن اس کی زبان سے یہ شرمناک باتیں سُن کر کھڑی ہو گئی -

—— اُس نے بلند آواز سے کہا - "میں خیال نہیں کرتی تھی کہ تم ایک شریف بیوہ کی ہتک کی جرأت کروگے" "تم اور مجھ

سے شادی کرو۔۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ کیا تم کو خیال ہے کہ تمہارا روپیہ مجھ کو بہکا سکتا ہے؟ تم غلطی پر ہو، میں خریدی نہیں جا سکتی۔ مجھے تمہاری دولت کی خواہش نہیں، اور نہ مجھے تمہارے ان ڈالروں کی ضرورت ہے جن میں سے ہر ایک خون سے رنگین ہے تم نے اپنی زندگی میں ایک فرانک بھی ایمانداری سے نہیں کمایا۔ پہلے تم اپنے شکار کئے ہوئے شخص کا دماغ شراب سے بیکار کر دیتے ہو پھر تاش کے کھیلوں سے اس کا روپیہ چرا لیتے ہو۔ کرنل میں تم کو جانتی ہوں۔ میں اور تم سے شادی کروں۔ نہیں، نہیں ایسطرح ممکن نہیں نہ تم کو میرا جھونپڑا مل سکتا ہے، نہ زمین کا ٹکڑا۔ یہ دروازہ ہے تم چلے جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا میں تم کو آگاہ کرتی ہوں فوراً چلے جاؤ۔ غریب بیواؤں کی توہین کرنے والے چلے جاؤ۔

ایک مرتبہ جب کرنل اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا اور پیٹرسن ابھی گھر سے سلی وان کو پیام پہونچانے گیا تھا تو یہی خیالات اس کے دماغ میں آرہے تھے وہ یہ بھی یاد کر رہا تھا کہ اس کے نکالے جانے کے تین ہی ہفتے کے بعد اس غریب اور بےکس بیوہ کا مکان کس طرح جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اس کو یہ واقعہ بھی یاد آرہا تھا کہ اس بیوہ کا جوان لڑکا آگ کے شعلوں سے بچنے کے لیئے دریچے میں سے کودنے لگا تو بیچارہ سر کے بل گرا۔ اور اس وقت سے اُس کی دماغی حالت صحیح نہیں رہی۔ وہ بیوہ گھر جل جانے سے مفلس ہوگئی تھی اور مکانات کے کرائے بہت بڑھ گئے تھے ان واقعات کی یاد کرنل کا دل خوش کر رہی تھی لیکن جب اس کو یہ واقعہ یاد آیا کہ ندی کے پار اس بیوہ کو ایک نووارد پادری صاحب کے قریب رہنے کے لیئے مکان مل گیا اور پادری صاحب نے اس سے شادی کرلی۔ اور اب اس بیوہ کی زندگی آرام اور اطمینان سے گزر رہی ہے تو اس کا چہرہ اداس ہوگیا۔ یہ خیال آتے ہی کرنل کھڑا ہوگیا اور اپنے دفتر میں ٹہلنے لگا۔

پانی کے کارخانہ کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی اور آخرکار ایکٹن شہر کے ممبروں نے یہ تجویز پیش کی کہ پانی پہونچانے کا نیا قانون تیار کیا جائے۔ اس تجویز کے موافق اور مخالف ممبروں کی تعداد برابر تھی صدر موجود نہ تھا۔ جو اپنے فیصلہ کے ووٹ سے تجویز منظور یا نامنظور کر دے وہ علاج کے لئے نیویارک چلا گیا اور وہیں مرگیا۔ اب نئے صدر کے انتخاب کی ضرورت پیش آئی اور جو مسئلہ کہ سب سے زیادہ غور کے قابل تھا وہ نئے قانون کے بنانے کا تھا۔ کارخانہ کے حصہ داروں نے کرنل کراس مین کو کھڑا کیا اور ان کی مخالف پارٹی نے پادری جان لیکلے کو جس نے اس بیوہ خاتون سے نکاح کرلیا تھا۔

جان لیکلے نہایت شریف اور مہذب شخص تھا اور کمپنی کی ناجائز کارروائیوں کے خلاف جد و جہد کیا کرتا تھا۔ کرنل کراس مین بخوبی جانتا تھا کہ اس جنگ میں شکست کے یہ معنی ہیں کہ اس کی نصف بلکہ اس سے زیادہ دولت برباد ہو جائے کیونکہ بہت سے لوگ چاہتے تھے کہ نشہ والی چیزوں کی خرید و فروخت اور قمار بازی کی ممانعت کر دی جائے۔

کراس مین اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا یہی منصوبے کر رہا تھا یکایک وہ کھڑا ہوگیا اور مہمل الفاظ بکنے لگا۔ اُس نے بجلی کا لیمپ روشن کیا اور برانڈی کا ایک گلاس چڑھا لیا۔ عین اسیوقت پیٹرسن واپس آیا اور کہا سلی وان ہموار ہے۔ اس کے بعد کراس مین کے دوسرے ساتھی بھی جمع ہوگئے اور تمام رات تجویزیں سوچتے اور بحث کرتے رہے۔

دس دن تک دونوں فریقوں کی کوشش جاری رہی۔ جان لیکلے ہر شام کو تقریریں کیا کرتا تھا اور اس کے سننے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ قریباً اس قصبے کے تمام اہل معاملہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ جان لیکلے کی تقریروں میں یہ واقعہ بھی تھا کہ کراس مین کو علم ہے کہ وہ آگ کہاں سے آئی جس نے مسز لیک کا مکان جلا کر خاک کر دیا۔ ایک روز کرنل کراس مین اپنے مخالف سے راستے میں ملا اور اس سے پوچھا کہ کیا تم نے اس قسم کا الزام مجھ پر لگایا ہے؟ جان لیکلے نے کہا بیشک۔ کراس مین کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور بے اختیار اس کا ہاتھ ریوالور نکالنے لگا جان لیکلے بجلی کی طرح لپکا۔ اور کراس مین کو اس زور سے ایک دھول رسید کیا کہ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور کوئی دس منٹ تک اس کے حواس درست نہ ہوئے۔ اتنے میں اس کے دوست آگئے اور اس دولتمند شخص کو اس کے شراب خانے میں لے گئے۔ اس کے بعد سے جان لیکلے بھی بغیر محافظوں کے اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

انتخاب کا دن آگیا۔ سب ووٹر سویرے اپنا اپنا ووٹ ڈالنے کے لئے روانہ ہوئے۔ شہر کی جماعت کو پورا اطمینان تھا کہ ہماری کامیابی ہوگی قریباً بارہ بجے تک اس کے امیدوار کے ووٹروں کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن افسوس ان کا اندازہ غلط تھا۔ کرنل نے ایک بھی تقریر نہیں کی نہ کوئی جلوس نکالا۔ البتہ چند جلسے ضرور کئے باوجود اس کے وہ خاموش نہ تھا۔ اس کے گماشتے تمام دن ووٹ سے ووٹ پھرتے تھے اور ان شخصوں سے جا کر ملتے تھے جن کی نسبت ان کو شک ہوتا تھا ان گماشتوں کا شہر پر بہت اثر تھا۔

جب شام کو ووٹ شمار کئے گئے تو شہری جماعت کے دل ٹوٹ چکے

تھے کیونکہ کراس بین نے جان لیکلے سے ۳۷ ووٹ زیادہ پائے اور وہ صدر منتخب کر دیا گیا۔

کامیاب کے شراب خانے میں بڑی خوشی منائی گئی اور شراب کے خم کے خم لنڈھائے گئے۔ پیٹرسن کی مراد بر آئی اور اس کو بھی اتنی شراب ملی کہ چھلک گیا۔

تین دن کے بعد انتظام کا جلسہ ہوا کیونکہ نئے صدر کے ہاتھ میں فیصلہ کا ووٹ تھا۔ اس لئے نئے انتظام کی تجویز خارج کر دی گئی۔ اس کے بعد کرنل کراس بین کے یہاں دوسری دعوت ہوئی اور آج یہ کرنل صاحب اس قدر خوش تھے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے جی بھر کے شراب پی اسقدر کہ جب وہ میز کے پاس کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے تو بار بار ہچکیاں لیتے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ کنسولیڈیٹڈ کمپنی (کمپنی کا نام) نے ایک بہت بڑی گارڈن پارٹی دینے کی تجویز کی ہے جو شہر کے سب سے بڑے مقام پر پارک کے قریب ہوگی اس لئے آپ سب حضرات آئندہ شنبے کو اس دعوت میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ حاضرین جلسہ نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں۔

شنبے کے دن جو شاندار دعوت ہوئی اس کی مثال اس سے پہلے اس شہر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پہلے مختلف قسم کے باجوں کے ساتھ ایک جلوس نکالا گیا۔ پھر پارک کے قریب میدان میں بیشمار میزوں پر قسم قسم کے بڑھیا سے بڑھیا کھانے چنے گئے۔ جب لوگ کھانے کھا چکے تو صدر صاحب تقریر کے واسطے کھڑے ہوئے اس پر تمام حاضرین نے بہت زور زور سے تالیاں بجائیں۔ جناب صدر کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا جب تالیاں ختم ہوئیں تو خوش نصیب صدر صاحب یوں گویا ہوئے:-

حضرات! میں مقرر نہیں ہوں لیکن میں امید کرتا ہوں کہ سامعین آج کی دعوت سے سمجھ گئے ہونگے کہ ان سیاسی کوششوں میں جو ابھی ختم ہوئی ہیں۔ آپ نے میری بہت مدد فرمائی اس پر میں دل سے آپ کا شکر گذار ہوں۔ (تالیاں) اس کے بعد کراس بین نے جو شراب انگوری کی کئی بوتلیں چڑھائے ہوئے تھا اپنے مخالف لوگوں کو برا بھلا کہا اور اس الزام کا تذکرہ کیا کہ میں نے مسز لیک کی بیوہ کا مکان جلوایا۔ میرے دوستو! میں خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ الزام سراسر جھوٹ اور بہتان ہے اور اگر جھوٹ نہیں ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ابھی ہلاک کر دے ۔۔۔ یہ کہہ کر کرنل رک گیا۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا اور ایک لمحہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا ....

اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا یکایک کرنل نے اپنا بایاں ہاتھ چہرے کی طرف اٹھایا ایک سکنڈ تک اس کا جسم کانپا اور فوراً دھڑ سے زمین پر گر پڑا۔

جلسے میں ایک شور مچ گیا اور اس کے دوستوں نے اٹھا کر اسے میز پر لٹا دیا۔ ایک ڈاکٹر نے جو اس وقت موجود تھا ایک منٹ تک نبض وغیرہ دیکھ کر کہا کہ صدر کی روح جسم سے جدا ہو چکی ہے۔

اس واقعہ سے ایک بےچینی پھیل گئی اور حاضرین جلسہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگے۔ بھاگنے والوں نے یہ سمجھا کہ خدا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ صرف ڈاکٹر اور خانساماں باقی رہ گیا۔ انہوں نے ایک گاڑی منگوا کر لاش اس میں رکھی اور "سنہری عقاب" کو لے گئے۔

لاش کے امتحان سے ظاہر ہوا کہ کرنل کراس بین کی موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے، بلکہ ایک گولی اس کے منہ سے ریڑھ کی ہڈی تک چلی گئی ایسی حالت میں موت کا واقع ہونا لازمی تھا۔ اس کے بعد گولی دیکھی گئی تو یہ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اس قسم کی گولی اس ملک میں کبھی نہیں دیکھی گئی وہ ایک انچ لانبی اور معمولی پنسل کی طرح موٹی تھی سیسے کی بنی ہوئی اور اس پر نرم فولاد چڑھا ہوا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ یہ موت کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔ لیکن یہ گولی کہاں سے آئی؟ جس وقت وہ گولی چلائی گئی۔ کرنل کا چہرہ اس وادی کی طرف تھا جو تقریباً دو میل چوڑی تھی۔ جدھر سے گولی آئی اس سمت سے کوئی آواز نہیں سنی گئی۔ بہرحال کرنل کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا اور جب دو روز کے بعد اس کے دفن کی رسمیں ادا کی گئیں تو صرف بارہ شخص اس کے جنازے کے ساتھ تھے۔ اس قدر جلد اس کی شہرت اور نیک نامی نفرت اور حقارت سے بدل گئی۔ اس کے بعد فوراً نیا انتخاب ہوا کیونکہ اپنے سردار کے نہ ہونے سے کنسولیڈیٹڈ کمپنی کے حصہ دار کمزور ہو گئے تھے۔ جان لیکلے پھر کھڑا ہوا اور قریباً بلا مخالف صدر منتخب ہو گیا اب پانی کی کمپنی ایسا قانون بنانے پر مجبور ہوئی جس سے اپنا نظام آب رسانی شہر کے معمولی لوگوں کو کم سے کم قیمت پر پانی دیا جا سکے۔

کرنل کراس بین کی موت پراسرار رہی لیکن شہر کے لوگ یہ کہتے تھے کراس نے اپنے کیئے کی سزا پائی وہ اسی کا لائق تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ کرنل کراس بین کی موت تین سال تک ایک معمہ رہی آخر ستمبر ۱۸۹۰ء میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ سے جان لیکلے کے لڑکے کا ایک خط آیا جہاں وہ علاج کے واسطے بھیجا گیا تھا۔ یہاں اسکو سیر و تفریح کی اجازت تھی۔ ایک روز وہ ایک سیب کے درخت پر چڑھا مگر وہاں اپنا بوجھ نہ سنبھال سکا۔ اور گر پڑا اس کے سر میں ایسی سخت چوٹ آئی کہ وہ زندہ نہ رہ سکا اور چند گھنٹے بعد مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس کا دماغ

بہت تیز ہوگیا تھا۔ اسوقت اس نے کرنل کراس بین کے عجیب و غریب موت کے حالات اس طرح بیان کئے:۔

"مشہور دعوت کے جلسہ سے ایک دن پہلے ایک فوجی افسر کپتان فورلس اپنے پرانے دوست جان نکلے کی ملاقات کے لئے اری زونا جاتے ہوئے کراکٹ بن آئے۔ اُن کے ہاتھ میں نئی قسم کی بندوق کا کیس تھا انہوں نے جان نکلے کو دکھا کر کہا کہ آسٹریا کی فوج میں یہ بندوقیں دی گئی ہیں اور میں اری زونا اس غرض سے جا رہا ہوں کہ وہاں کے فوجی افسروں سے اس کی بابت رائے پوچھوں۔ کپتان فورلس نے جان نکلے سے اس بندوق کی حالت پوچھی اور اس کے چند فیر بھی کئے۔ کپتان نے اس بندوق میں ایک دُوربین بھی لگائی تھی کہ بندوق زیادہ فاصلے تک نشانہ اُڑا سکے۔ بارُود نئی قسم کی تھی جس کا دُھواں نہیں ہوتا تھا جس طرح کی بندوقوں کا آجکل رواج ہے۔ اس قسم کی بندوقیں ریاستہائے متحدہ میں بالکل نئی تھیں۔ کپتان نے بندوق پھر غلاف میں رکھدی اس کو خبر نہیں تھی کہ ایک خبطی لڑکا بڑے شوق سے بندوق اور اس کے پرزے دیکھ رہا ہے۔

دُوسرے روز پادری اور اس کا دوست علی الصباح بانی کے بند کے قریب ندی پر مچھلی کا شکار کھیلنے چلے گئے اور مسز نکلے کو بھی ان کی ایک بیمار سہیلی نے اپنے یہاں بلا لیا تھا۔ یہ لڑکا گھر میں اکیلا رہ گیا اور تیسرے پہر تک معمول کے موافق سیر و تفریح کرتا رہا جب اُس نے وہ بندوق کا غلاف دیکھا تو اُس نے احتیاط سے بندوق نکال لی اور کھڑکی کی طرف اسکی نال کر دی اور دُوربین میں سے .... دیکھا تو دُور کی چیزیں اس کو صاف نظر آئیں جس سے اس کو بڑا تعجب ہوا۔ اس پادری کا مکان اس پارک سے جہاں دعوت ہو رہی تھی کئی سو فٹ بلندی پر تھا۔ اُس لڑکے کی آنکھوں نے اُس جشن کا رنگ بھی دیکھا، دُوربین میں سے جلسے کے لوگوں کی حرکتیں بھی دیکھیں۔ آخر میں اُس نے دیکھا کہ کرنل کراس بین میز کے قریب آیا اور اُس نے تقریر شروع کی اس کے دل میں ایک آگ بھڑکنے لگی اور اُس کو خیال ہُوا کہ یہ وُہی شخص ہے جس نے میری ماں پر ظلم کیا اور یہ بندوق اُس کی جان لینے کو کافی ہے۔ اُس لڑکے نے جلدی سے لیبل دار کارتوسوں میں سے ایک کارتوس نکالا اور نال میں رکھ کر صدر کی طرف نشانہ لگایا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ دیدبان بالکل صحیح لگایا گیا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ اُس کا نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ بہرحال جب اُس نے لبلبی دبائی اور بندوق نے اس کے شانے کو دھکا دیا تو اُس نے کرنل کراس بین کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔

اس نے فوراً بندوق غلاف میں رکھدی اور جب وہ دونوں دوست ندی سے گھر واپس آئے تو کپتان نے غلاف اٹھایا اور اسٹیشن کو روانہ ہوگیا کیونکہ ریل گاڑی سینٹی دے رہی تھی روانہ ہونے کے بعد اس نے کارتوسوں کا خیال کبھی نہیں کیا کہ ان میں سے ایک کم ہوگیا ہے۔

محمد احمد مکی

زمانے کو ہے دعوائے محبّت۔ اے تری قدرت ‖ محبّت ہے کہ اربابِ محبّت کو ترستی ہے

مری فریاد پر خدّامِ میخانہ کے طعنے ہیں ‖ مئے دیدار مہنگی ہے شرابِ شوق سستی ہے

فطرت کا تصادم ہو۔ یُوں کام نہیں چلتا! ‖ میں حسن سے واقف ہوں وہ عشق سے بیگانہ

عشق سے پہلے تو جینے کی تمنّائیں تھیں ‖ موت کے نام سے اب جان میں جان آتی ہے

میری نگاہِ شوق کا چرچا نہ کیجئے ‖ دل لیجئے مگر مجھے رسوا نہ کیجئے

ہر جنبشِ نظر سے لرزتی ہے کائنات ‖ بدلی ہوئی نگاہ سے دیکھا نہ کیجئے

(شفا اکبرآبادی)

سیرِ یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

گذشتہ سے پیوستہ

قیصر ولیم پل کی چوڑائی کم سے کم اسّی فیٹ ہوگی۔ دو سڑکیں دو ٹریموے کی پٹریاں اور چار ریل کی پٹریاں ساتھ ساتھ اس پل پر سے گزرتی ہیں۔ پل کو عبور کرتے ہی دوسری طرف ریل کولون کے اسٹیشن میں داخل ہو جاتی ہے۔ دریا کے اس حصے پر آمدورفت کی اتنی کثرت ہے کہ یہ دریا اسباب اور مسافروں کے جہازوں اور کشتیوں سے لدا ہوا نظر آتا ہے اور کچھ فاصلے سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہازوں کے چلنے کے لئے ذرا بھی جگہ باقی نہیں

اس سفر میں انیس کو پہلی دفعہ ہل میں گھوڑے جُتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ اور ایک دفعہ ایک گھوڑے اور ایک بیل کو ایک ہی ہل میں جُتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار اس کو ہنسی آگئی۔ یہاں کی زراعت کی ترقی اور ملک کی زرخیزی کا اندازہ کرکے انیس کو حیرت بھی ہوئی اور حسرت بھی۔

یہ سفر نہایت سرعت کے ساتھ طے ہُوا۔ میونک سے چل کر ریل صرف بڑے بڑے سٹیشنوں پر ٹھہری۔ اور ان میں سے بھی بعض پر اس کا قیام دو تین منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ فرانکفورٹ اور کولون کے سٹیشنوں پر دس دس منٹ کے قریب قیام رہا۔ اور برسلز کے سٹیشن پر نصف گھنٹہ۔ یہ آخری قیام سب سے لمبا تھا۔ جرمنی میں تو جہاں کہیں ریل کھڑی ہوتی تھی فوراً پلیٹ فارم سے بیرا بیرا کی آوازیں آنی شروع ہوتی تھیں اور اکثر مسافر کھڑکیوں سے ہی بیر کے بھرے ہوئے بلور کے مگ پکڑ کر منہ سے لگا لیتے تھے۔ جرمنی میں بیر کی نہایت ارزانی ہے۔ لیمونیڈ کی بوتل چھ آنے کو ملتی ہے۔ اور بیر کا گلاس جس میں لیمونیڈ کی تین بوتلیں سما سکیں ایک آنے میں۔ کولون سے رخصت ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تاریکی ہونے لگی اور انیس بیلجیم کے مناظر کا کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ اوسٹنڈ پہنچتے ہی تمام مسافر جہاز پر سوار ہوگئے۔ اور انیس جو تکان اور بے خوابی سے چور ہو رہا تھا فوراً سو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ چند ہی منٹوں میں جہاز ڈوور پہنچ گیا ہے۔ گو اصل مسافت تین گھنٹے سے زیادہ کی تھی۔ یہاں ریل گاڑی جہاز کے بالکل پاس ہی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو کر صبح ۸ بجنے کے قریب انیس لندن کے سٹیشن

چیرنگ کراس پر پہنچا۔ جوں جوں لندن قریب آتا تھا انیس کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوتی تھی کہ ریل سے اُتر کر قیام کا کیا انتظام ہوگا۔ اس کے پاس اس کے والد کے بعض دوستوں کی دی ہوئی کچھ تعارفی چھٹیاں تھیں۔ لیکن اُسے یہ بات بہت دوبھر نظر آتی تھی کہ ریل کے اسٹیشن سے نکلتے ہی گاڑی پر اسباب لاد کر لندن کے مختلف حصوں میں ان شرفا کو تلاش کرتا پھرے جن کے نام کی چھٹیاں اس کے بکس میں تھیں۔ اور پھر انہیں میں سے کسی سے درخواست کرے کہ وہ اس کے قیام کا انتظام کریں۔ اسی تشویش اور سوچ بچار میں چیرنگ کراس سٹیشن آگیا۔ اُس کے دو ساتھیوں کے استقبال کو ان کے ایک دوست آئے ہوئے تھے۔ جب یہ سب گاڑی سے نکل پڑے تو انیس کے ایک ساتھی نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں قیام کرینگے اس نے جواب دیا کہ ابھی تو کوئی انتظام نہیں ہے لیکن کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائیگا۔ ساتھ ہی اس اجنبی شہر میں اپنے تئیں بالکل تنہا محسوس کرکے انیس کے دل کو سخت ٹھیس لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ لیکن اُس نے بہت ضبط سے کام لیا اور اپنی گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے دیا۔ یہ احساس گو ایک لحظہ بھر ہی رہا لیکن انیس کو بے چین کر گیا۔ اتنے میں اس کے ساتھی کے دوست نے کہا کہ اگر آپ پیشتر سے کہیں انتظام نہیں کر چکے اور آپ پسند فرمائیں تو ہمارے ساتھ ہی چلے آئیں جس مکان میں میں رہتا ہوں اسمیں آپ کے لئے بھی انتظام ہو جائیگا۔ انیس کو کچھ حوصلہ ہُوا۔ اور اُس نے نہایت خوشی سے اس تجویز کو منظور کر لیا سٹیشن سے باہر نکل کر چاروں کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنے عارضی میزبان کی جائے اقامت کیطرف روانہ ہوئے۔ چیرنگ کراس سے ٹریفالگر اسکوائر، سینٹ جیمزز پارک ہائیڈ پارک کارنر۔ نائٹس برج کنسنگٹن روڈ اور ہیمرسمتھ براڈوے ہوتے ہوئے اپنی جائے قیام پر پہنچے۔ جس سڑک پر یہ مکان واقع تھا اس کا نام دی گروو تھا۔ اس سڑک پر دورویہ درخت لگے ہوئے تھے جو قریب کی دوسری سڑکوں سے اس سڑک کو ممتاز کر رہے تھے۔ انیس نے دنیا کے

اس مرکز کا پہلا نظارہ ایسے وقت میں کیا جب اس کے اکثر باشندے ابھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تھے۔ صرف مزدور پیشہ لوگ اپنے اپنے کاموں کو جا رہے تھے۔ بازاروں میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ دوکانیں بند تھیں۔ لندن کی اکثر عمارتیں باہر سے سیاہ رنگ کی ہیں اس لئے انیس کا یہ پہلا نظارہ بہت مایوس کن تھا۔ ہاں ٹریفالگر اسکوائر میں لارڈ نیلسن کی لاٹ البتہ سر بفلک نظر آئی۔ سینٹ جیمز پارک میں پھولوں کا نظارہ خوشنما تھا۔ ہائڈ پارک کارنر سے نکل کر ہائڈ پارک کے بڑے بڑے درخت بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کنسنگٹن روڈ پر شہزادہ البرٹ کی یادگار اور اس کے عین مقابل البرٹ ہال کسی قدر توجہ کے مستحق معلوم ہوتے تھے۔ پھر بھی انیس نے لندن کو وہ نہ پایا جو ذہن میں تجویز کر چکا تھا۔ ہیمر سمتھ براڈوے میں داخل ہوتے ہی سامنے کی عمارت پر انیس کو بورل کا ایک بہت بڑا اشتہار نظر آیا جس کے حروف رات کے وقت زنگار رنگ کی برقی روشنی سے منور ہو جایا کرتے تھے۔ اور تعجب ہے کہ بعد میں جب کبھی انیس اپنے اس داخلۂ لندن کو یاد کیا کرتا تھا تو سب سے اوّل اُسے یہ اشتہار یاد آجاتا اور جب کبھی براڈوے سے گزرتے وقت اس کی نظر اس اشتہار پر پڑتی۔ اُسے لندن میں اپنے قیام کا پہلا دن یاد آجاتا تھا۔

غرض مکان پر پہنچے۔ گھر کے باقی لوگ ابھی سو رہے تھے۔ اُن کے میزبان نے باہر کا دروازہ کھولا اور نہایت خاموشی کے ساتھ گاڑی سے اسباب اتروا کر اندر رکھوا دیا۔ اپنے اپنے بیگ اٹھا کر تینوں نئے مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ انیس کے حصّے میں مکان کا سب سے چھوٹا کمرہ آیا جس میں صرف ایک پلنگ، ایک کپڑے لٹکانے کی کھونٹی اور ایک چھوٹی سی لکھنے کی میز موجود تھی۔ منہ ہاتھ دھونے اور سنگار کے لئے ایک خانہ دار الماری رکھی ہوئی تھی۔ اسی الماری کے اوپر ایک آئینہ رکھا ہوا تھا جس کی مدد سے الماری کے اوپر کا حصّہ ڈریسنگ ٹیبل کا کام دیتا تھا۔ پلنگ کی پائینتی میں پلنگ اور کھڑکی کے درمیان صرف اتنی جگہ خالی تھی کہ اس پر جائے نماز بچھائی جا سکے۔ کمرہ اگرچہ بہت چھوٹا تھا لیکن کمرہ اور اس کا سامان نہایت صاف تھا۔ اور ہر چیز اس قرینے سے رکھی تھی کہ اگر کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہلا دیا جائے تو کسی دوسری جگہ اس کا رکھنا ممکن نہیں تھا۔ انچ انچ جگہ کا پورے سے پورا فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ یہ کمرہ سڑک کی طرف واقع تھا اور کھڑکی سے سڑک کا پورا نظارہ ہو سکتا تھا۔ انیس نے بیگ سے ضروری اشیا نکال کر الماری میں رکھیں۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ اور اتنے میں حاضری کی گھنٹی ہو گئی۔

انیس نیچے اترا۔ کھانے کے کمرہ میں مالکۂ مکان اپنی میز پر چائے کی پیالیوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ انیس کا اور اس کے دونوں ساتھیوں کا تعارف اس سے کرایا گیا۔ اتنے میں دو اور خاتونیں یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ مالکۂ مکان نے نئے مہمانوں کا تعارف ان سے کرایا اور سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہوا۔ مالکہ مکان کوئی پچپن سال کی عمر کی خاتون تھیں۔ اُن کا نام مسز فائزن تھا۔ انیس کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بیوہ ہیں۔ ان کے والد ایک پادری صاحب ریورنڈ مسٹر ونٹر تھے جو فوت ہو چکے تھے۔ ان پادری صاحب کے چھ بچے تھے۔ پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ علاوہ اپنے عہدہ کے فرائض سر انجام دینے کے پادری صاحب نے اپنے مکان میں بچّوں کا ایک اسکول بھی کھول رکھا تھا۔ اس اسکول میں مسٹر فائزن جو لندن یونیورسٹی کے ایم۔ اے تھے بطور پادری صاحب کے نائب مدرس کے کام کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی شادی پادری صاحب کی تیسری صاحبزادی مس ایلس ونٹر کے ساتھ ہو گئی۔ پادری صاحب کی وفات کے بعد مسٹر اور مسز فائزن نے اسکول جاری رکھا۔ چند سال کے بعد مسٹر فائزن بھی بیوہ اور ایک چھوٹا بچہ (Hubert) چھوڑ کر فوت ہو گئے۔ مسز فائزن کی جائداد صرف گھر کا سامان اور ایک قلیل رقم بصورت نقد تھی۔ انہوں نے گروو میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اسے اپنے سامان سے آراستہ کر کے ایک بورڈنگ ہاؤس کھول دیا۔ لندن یونیورسٹی کے محکمہ داخلی کے رجسٹرار نے ان کی اتنی مدد کی کہ اُن کے مکان کا پتہ یونیورسٹی کی طرف سے شایع شدہ رہائشی مکانوں کی فہرست میں درج کر دیا جس کے نتیجے میں کبھی کبھی یونیورسٹی کا کوئی طالب علم ان کے ہاں آکر مقیم ہو جاتا تھا۔ ان کا لڑکا ہیوبرٹ قریب قریب انیس کا ہم عمر تھا لیکن انیس کے لندن پہنچنے سے چند ماہ پیشتر وہ تلاش روزگار میں آسٹریلیا چلا گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد وہاں سے جنوبی افریقہ چلا گیا۔ مسز فائزن کی سب سے بڑی بہن کی شادی سکاٹ لینڈ کے مشہور شہر ابرڈین کے رہنے والے ایک صاحب مسٹر پرچرڈ سے ہوئی تھی۔ ان سے چھوٹی مس برتھا ونٹر اپنی والدہ کے پاس ایک دوسرے محلہ میں رہتی تھیں اور اُن کی خبر گیری کرتی تھیں۔ سب سے چھوٹی بہن مس نیلی ونٹر بھی اُنہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ چوتھی بہن ایک صاحب مسٹر ایلسن سے منسوب ہوئی تھیں۔ اور مقام ہوو (Hove) میں رہتی تھیں جو انگلستان کے جنوبی ساحل پر واقع ہے اور شہر برائٹن کا ہی ایک حصّہ ہے۔ ان کے دو صاحبزادے لندن میں پڑھتے تھے۔ مسز فائزن کے بھائی مسٹر فریڈ ونٹر مسز فائزن سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ان کی طبیعت نہایت سنجیدہ ہوئی تھی۔ مذاق نہایت علیم

تھا۔ادبیات سے بہت لگاؤ تھا۔ خود ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے لیکن بدقسمتی سے بچپن سے ہی ان کی ریڑھ کی ہڈی کو کوئی ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بہ جسمانی طاقت کا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جب ان کا مرض لاعلاج ثابت ہُوا تو یہ لندن کے ناقابل علاج مریضوں کے ہسپتال میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔ لیکن کبھی کبھی مسز فائزن کے ہاں آیا کرتے تھے۔

مسز فائزن کے ان تمام عزیزوں کے ساتھ بعد میں انیس کی ملاقات وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی۔ مس نیلی ونٹر اور مسٹر فریڈ ونٹر سے ملکر انیس کو خاص خوشی ہوتی تھی کیونکہ یہ دونو ادبی مذاق رکھتے تھے اور ان کی گفتگو میں انیس ایک مسرّت محسوس کرتا تھا۔ دوسری دونوں خاتونوں میں سے ایک کا نام مسز بیکر اور دوسری کا نام مس پارسنز تھا۔ مس بیکر بیوہ تھیں اور عارضی طور پر مسز فائزن کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کی طبیعت نہایت سلیم تھی۔ اور پچاس سال کی عمر میں بھی ان کا رنگ اور ناک نقشہ بیحد خوبصورت تھا۔ مسز فائزن کی گفتگو سے انیس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسز بیکر کی منکوحہ زندگی کچھ زیادہ خوشی میں نہیں گذری تھی۔ ان کی ایک نوجوان شادی شدہ صاحبزادی تھیں جو لندن سے باہر کسی مقام پر رہتی تھیں اور کبھی کبھی اپنی والدہ سے ملنے آیا کرتی تھیں۔

مس پارسنز نارفورک کے شہر کنگز لِن کی رہنے والی تھیں گو بعد میں ان کے والد نے کیمبرج میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے بڑے بھائی کنگز لِن میں سولیسیٹر (Solicitor) تھے اور ایک چھوٹے بھائی ڈیون شائر کے شہر برکسہم (Brixham) میں سولیسیٹر تھے۔ ایک بھائی انڈین سول سروس میں تھے اور صوبہ مدراس میں متعین تھے۔ ان کی دو بہنیں ان سے چھوٹی تھیں۔ ایک تو کرنل بلینبرج سے شادی شدہ تھیں۔ اور دوسری مس ایلس پارسنز لندن کے سب سے بڑے ہسپتال میں آپتھیلمک سسٹر یعنی آنکھوں کے وارڈ میں نرسوں کی نگران تھیں۔ مسز بلینبرج کی داستانِ حیات بڑی المناک تھی۔ ایک نہایت حسین اعلیٰ تربیت یافتہ اور ذکی الحس خاتون تھیں۔ ان کے خاوند کرنل بلینبرج ایک متمول اور شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے اور بڑے بہادر افسر تھے۔ لیکن شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسز بلینبرج یہ معلوم کر کے بیحد پریشان ہوئیں کہ ان کے خاوند کی دماغی حالت درست نہیں ہے اس کا کوئی ظاہری اثر نظر نہیں آتا تھا کہ کرنل بلینبرج کا دماغ درست نہیں ہے لیکن کبھی کبھی کوئی ایسی حرکت ان سے سرزد ہو جاتی تھی جس سے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ان کے دماغ میں فتور ہے۔ اوّل

اوّل تو مسز بلینبرج نے اس امر کا علم صرف اپنے تک محدود رکھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہیں۔ حتیٰ کہ اپنے والد اور بہن بھائیوں پر بھی اس کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ لیکن آخر یہ کبتک پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ ایکدفعہ ان کی بڑی بہن مس پارسنز ان سے ملنے کے لئے گئیں اور چند دن انکے ہاں مہمان رہیں۔ ایک روز سہ پہر کو کرنل بلینبرج اپنی بیوی اور سالی کو گاڑی میں بٹھا کر سیر کرانے کے لئے لے گئے۔ سیر سے واپسی پر گھر سے ایک میل کے قریب فاصلہ پر کرنل صاحب نے گھوڑے کی باگ تھام لی۔ اور خود گاڑی سے اُتر گئے۔ اُن کی بیوی اور سالی نے خیال کیا کہ شائد کسی ضرورت کو اُترے ہونگے۔ ابھی وہ دریافت بھی نہ کرنے پائی تھیں کہ کرنل صاحب نے گھوڑے کی پیٹھ پر زور سے ایک چابک رسید کیا اور گھوڑا گاڑی کو لیکر ہوا ہو گیا۔ مسز بلینبرج تو مارے خوف کے قریباً بے ہوش ہو گئیں مس پارسنز نے حوصلہ کر کے باگیں سنبھال لیں اور اگرچہ گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا لیکن بغیر کسی حادثے کے گاڑی مکان پر پہنچ گئی۔ اس واقعہ کے بعد مسز بلینبرج اپنے خاوند کی دماغی حالت کو اپنی بہن سے چھپا نہیں سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ لیکن انگریزی قانون کے ماتحت اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ مسز بلینبرج سمجھتی تھیں کہ بعض دفعہ ان کے خاوند کے ہاتھوں ان کی زندگی خطرہ میں ہوتی ہے لیکن ان کے خاوند کا اس خطرناک مرض میں مبتلا ہونا ملک کے قانون کے مطابق انہیں نکاح کی گرہ سے آزاد کرانے کیلئے کافی وجہ نہیں تھا۔ اس پر مصیبت یہ تھی کہ کرنل صاحب کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جوں جوں اُن کا مرض ترقی کرتا تھا وہ دوسرے مشاغل سے توجہ ہٹا کر موسیقی کو اپنا مستقل شغل بناتے جاتے تھے ان کے خادموں میں ایک چینی خادم بھی تھا جسے ان کی طبیعت پر بڑا قابو حاصل تھا۔ اور جس پر یہ بہت اعتماد رکھتے تھے۔ دوران مرض میں صرف یہی چینی خادم انہیں سنبھال سکتا تھا۔ چند سال کے بعد ان کی طبیعت میں ایسا جوش آیا کہ وہ انگلستان کی رہائش ترک کر کے اپنے چینی خادم کیساتھ کسی امریکن جزیرے میں چلے گئے جہاں ان کے وقت کا اکثر حصہ موسیقی کے شغل میں گذرتا تھا۔ جس وقت انیس لندن پہنچا کرنل بلینبرج کو اس جزیرے میں سکونت اختیار کئے دو تین سال ہو چکے تھے۔ مسز بلینبرج ان کی جائداد کا انتظام کرنے کی خاطر سال کا کچھ عرصہ ان کے آبائی جائے قیام پر گذارتی تھیں لیکن اکثر حصہ لندن میں اپنے والد یا اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک کے پاس رہتی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر قریباً پینتیس سال کی تھی مس پارسنز نے انیس کا تعارف ان سے کرایا اور رفتہ رفتہ انیس کی ان کے ساتھ بھی ویسے ہی بے تکلفی ہو گئی۔ جیسے مس پارسنز کے ساتھ ہو چکی تھی اور یہ بھی انیس

دنیائے ادب

یورپ کی زبانیں

گزشتہ صدی میں یورپ کی مختلف زبانوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے خصوصاً انگریزی زبان کو تو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ شائد اس وقت دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے۔ جہاں اس کے جاننے والے کافی تعداد میں موجود نہ ہوں ذیل کے اعداد و شمار سے مختلف یورپین زبانوں کی ترقی کا حال ظاہر ہوگا۔

نام زبان	ایک صدی پہلے بولنے والوں کی تعداد	آجکل کسقدر آدمی بولتے ہیں	سمجھنے والوں کی تعداد
انگریزی	تقریباً دو کروڑ	تقریباً سولہ کروڑ	ہر ملک میں سمجھی جاتی ہے
جرمنی	″ ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ	″ ۹ کروڑ	تقریباً ۲ کروڑ
فرانسیسی	″ ۳ کروڑ ۲۴ لاکھ	″ ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ	۷۵ ہزار
اسپینش (اسپانوی)	تقریباً ۳ کروڑ ۲۵ لاکھ	تقریباً ۵ کروڑ	......
لاطینی	″ ۲ کروڑ ۱۴ لاکھ	″ ۴ کروڑ ۱۵ لاکھ	......
ڈچ	″ ۶۳ لاکھ	″ ۷۵ لاکھ	......
سویس (سویڈن کی زبان)	″ ۳۲ لاکھ	″ ″	......
ڈینش	″ ۲۱ لاکھ	″ ۶۰ لاکھ	......

پچھلے سو سال کے اندر ترکی زبان کو غیر معمولی طور پر زوال ہوا ہے۔ اب سے سو سال پہلے تقریباً تین کروڑ آدمی ترکی بولتے تھے۔ مگر آج کل ان کی تعداد دو کروڑ ۴۰ لاکھ کے قریب ہے۔ (زمانہ)

ملازمت کا شوق

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے دست و پائی کے متعدد اسباب ہیں۔ مگر صحیح تربیت سے اس کا علاج ممکن ہے۔ اس رخ میں پہلا قدم تو یہ ہے کہ ہم اپنی راہ کی دشواریوں کو معلوم کریں .... بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے بسی کا سبب ہندوستان کا طریق تعلیم ہے۔ مگر ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ اس خصوص میں کسی اور چیز کی بہ نسبت عوام کی ذہنیت زیادہ ملامت کے قابل ہے۔ گو یہ حیرت انگیز ہے مگر امر واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی چھوٹا لڑکا پہلے پہل مدرسے کو جاتا ہے تو اس کے والدین اسی وقت سے اس کی آیندہ کے سرکاری مرتبہ کے موہوم سے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنے مستقبل کی نسبت اس لڑکے کے خیالات بھی اسی دائرے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ ذہنیت معدوم ہے۔ ہمارے ملکی حالات ایک حد تک　　اس افسوسناک ذہنیت کی تشکیل کے باعث ہوئے ہیں۔ اس ملک میں تعلیم یافتہ اور شائستہ طبقات سرکاری ملازمت حاصل کرنے یا کسی نہ کسی قسم کا ادنیٰ کام کرنے کی عام طور پر کوشش کرتے ہیں۔ وہ بطور خود ایک طبقہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ وہی چیزیں اختیار کرتے ہیں جنھیں علمی پیشہ کہا جاسکتا ہے اور ان کے سوا کسی اور کام کا ان میں میلان ہی نہیں ہوتا۔ یہ اطمینان بخش صورت حالات نہیں ہے۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ذہنیت کو بدلنا اور خیال و عمل کی اس موری سے باہر نکلنا چاہیئے۔ (العلم حیدر آباد)

مولانا روم کی فلسفیانہ شاعری

صوفیائے کرام کے شاعرانہ خیالات ان کے متبرک مکتوبات اور ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بہت سے صوفیانہ فکر و عقائد کی بنیاد یونانی فلسفہ پر رکھی چنانچہ وحدت فی الکثرت کا مسئلہ زینو کے فلسفہ سے لیا گیا ہے۔ اس کے قبل کسی نے ذات باری تعالیٰ کی ایسی توضیح نہ کی تھی۔ مولانا روم کی شاعری میں بعض خیالات ایسے ہیں جو ارسطو اور زینو کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں ایک تناسخ کا عقیدہ بھی ہے جو یونانی فلسفہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور ہندی فلسفہ میں تو فقرہ یہی ہے کہ فلاسفۂ ہند نے تناسخ کو ذرا الجھی ہوئی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک ارتقاء و انحطاط اور علاوہ تخفیف کیلئے ترتیب ضروری نہیں بلکہ ان کے عقیدے میں تناسخ کے بعد ہبوط اور پستی کے بعد بلندی ہوتی رہتی ہے۔ یونانی فلسفہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ خدا تعبیر ہے عالم مادی کی علت غائی اور مقصد غایات۔

اور کائنات اسی انتہائی نقطہ پر پہنچنے کا مقتضی ہے۔ ارسطو کے نزدیک عروج کے بعد زوال نہیں۔ مولانا نے اپنی مثنوی میں ڈارون کے فلسفہ کی بنیاد پہلے رکھ دی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

از جمادی مُردم و نامی شدم وز نما مُردم بحیوان سر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم

ان اشعار میں مولانا نے تناسخ کا فکر و عقیدہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے البتہ "پس چہ ترسم کے ز مردن کم شدم" کہہ کر ہندی فلسفہ سے اپنے تخیل کو ممتاز کر لیا ہے جو ارسطو سے ملتا ہوا اور ڈارون کے بالکل مطابق ہے۔

(نگار)

بابل کے کھنڈر

آج جو شہرت پیرس۔ لندن۔ نیویارک اور پیکن کو حاصل ہے۔ اس سے بدرجہا زیادہ کبھی شہر بابل کو حاصل تھی۔ پیرس کی خوبصورتی اور لندن کی آبادی امصار عالم پر فوقیت رکھتی ہے۔ مگر بابل خوبصورتی۔ آبادی اور عجائبات کی جملہ خصوصیات کا مظہر اتم تھا۔ آسمان کے فرشتے اس کے والہ و شیدا تھے۔ بابل کے جن کھنڈروں کو یورپ کے محققین تہ و بالا کر رہے ہیں دریائے فرات کے کنارے پانچ چھ میل کے محیط میں آباد تھا۔ اس کا بانی شاہ میرلیس تھا جس نے سب سے پہلے ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ پھر بخوکدنصر بادشاہ نے جس کا ذکر بائبل میں آیا ہے۔ اس شہر کی رونق بڑھائی اور بقول ہیروڈوٹس اس کی فصیل ۶۰ فٹ لمبی اور ۳۶۵ فٹ بلند کر دی گئی۔ اس پر چھ رتھ پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے شہر مربع تھا۔ ہر ایک پہلو میں ٹھوس پیتل کے پچیس دروازے تھے۔ اس کی تین چیزیں یگانۂ روزگار تسلیم کی گئی ہیں

ایک شاہی محل جو آٹھ میل کے دائرے میں بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف تین دیواریں تھیں۔ اندرونی دیوار پر خوشنما پچی کاری کا کام تھا۔

دوم عجیب چیز باغ معلق[1] سطح زمین سے معلق تھا جو بخوکدنصر[2] بادشاہ نے اپنی بیگم کے لیئے بنوایا تھا جہاں وہ اکثر سیر کے لیئے آیا کرتی تھی۔ یہ بیگم میڈیا[3] کے خاندان سے تھی جو اس زمانہ میں بہشت کا نمونہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ بیگم موصوف جب بابل کے سنسان میدانوں کو دیکھتی تھی تو وطن کی یاد اس کے دل کو بے قرار کر دیتی تھی۔ اس پر بخوکدنصر بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر کے قریب ایک ایسا باغ تیار کیا جائے جو میڈیا کے دلکش مناظر کی یاد دلوں سے محو کر دے۔ چنانچہ اس غرض کے لیئے بڑی بڑی محرابیں تعمیر کی گئیں اور ان پر سنگین چھتیں ڈال کر ایک ایسا باغ تعمیر کیا گیا۔ جو سطح زمین سے ہی بلند نہ تھا بلکہ اس میں پھل پھول۔ درخت۔ ندی۔ نالے اور پہاڑوں کے نظارے بھی موجود تھے گویا یہ میڈیا کے پہاڑی مناظر کی نقل تھی۔

سوم۔ بابل کے عجائبات میں ایک مشہور مینار تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد لوگ اس قدر خائف تھے کہ انھیں ہر لحظہ ایک ایسے ہی غارت گر طوفان کا اندیشہ دامنگیر رہتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ ایک ایسا مینار تعمیر کیا جائے کہ طوفان کی حالت میں ہم سب اس پر چڑھ کر مامون و مصئون رہیں اور غرق ہونے سے بچ جائیں۔ مگر خدائے واحد نے ان کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا اور سوائے با۔ با کرنے کے کچھ نہ بول سکتے تھے۔ اس لیئے یہ مینار نامکمل رہ گیا بابل کی وجہ تسمیہ بھی زبانوں کے اختلاف کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ یہ مینار مذکورہ بالا غرض سے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ بیعل نامی ایک بت کا بت خانہ تھا اور یہ بت اس میں موجود تھا۔ جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔

ہیروڈوٹس نے اس بت کی قیمت کا اندازہ دو کروڑ دس لاکھ اشرفی لگایا ہے اس مینار کی بلندی کے متعلق مبالغہ آمیز روایات ہیں۔ یہودیوں کی روایت کی بموجب اس کی بلندی بارہ میل بیان کی گئی ہے۔ جیروم کے معاصرین چار میل بیان کرتے ہیں۔ مگر سٹریبو کی شہادت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مینار کی بلندی چھ سو ساٹھ فٹ تھی۔

اگرچہ بابل زمانہ کے زبردست ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے عجائبات ہمیشہ کے لیئے نابود ہو گئے۔ مگر پھر بھی عرصۂ دراز تک یہ ایشیا میں اپنی طرز کا عجوبۂ روزگار شہر رہا ہے

جب شاہان اسیریا نے سلوشیا کو اپنا دارالحکومت بنایا تو بابل کی رہی سہی عظمت بھی جاتی رہی اور اکثر باشندے نئے دارالحکومت میں جا کر آباد ہو گئے۔

ساسانیوں کے عہد میں بچی کھچی آبادی بغداد میں منتقل ہو گئی۔ اب بابل کھنڈروں کا ایک ڈھیر ہے +

(صلائے عام دہلی)

---

[1] معلق اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے ملحق نہ ہو۔
[2] بخوکدنصر انگریزی ترجمہ شاید "بخت نصر" کا ہو جو شاید "بخت نصر" کا ہو جو شاہان بابل میں بہت ظالم گزرا ہے۔ یا بخت نصر کے بیٹے۔ بل شازر کے باپ کا نام بخوکدنصر ہو۔
[3] میڈیا ایک مقام کا نام ہے۔ میڈیا کے حکمراں سیرس نامی نے بابل پر فوج کشی کی اور بابل کو تباہ اور بل شازر کو قتل کر کے کلدانیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

ہندی

موت اور زندگی کا فرق

زندگی میں ہر شخص دوستی کا دم بھرتا تھا جان دینے کے دعوے کرتا تھا - ہر شخص ہمدردی اور اخلاص کا پتلا نظر آتا تھا لیکن آہ موت کے بعد کیسا انقلاب آ گیا - مرنے والے کا چہرہ وہی ہے جسے زندگی میں چاند کا لقب دیا جاتا تھا - وہی بازو ہیں جن سے بہادری کے بڑے بڑے کارنامے ظاہر ہوئے - آہ! وہی پاؤں ہیں جن پر بہت سی پیشانیاں جھک جاتی تھیں - وہی سڈول جسم وہی سحر کار زبان جس کی شیرینیٔ گفتار امرت کا کام دیتی تھی - وہی ہاں وہی دل و دماغ ہے جس میں عالی جذبات اور بلند ترین خیالات جگہ پا رہے تھے - سب چیزیں وہی ہیں صرف اک جان کی گمشدگی سے وہی پیارا جسم زمین پر پڑا ہوا ہے - آہ زندگی میں جسکو سب پیار کرتے تھے جو سب کا دل لبھاتا تھا صرف ایک جان کے نہ ہونے سے اسے سب دہکتی ہوئی آگ میں جلانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں - اُف جن کی نزاکت پھول کے بوجھ کی بھی متحمل نہ تھی جنہیں دردِ سر کی بھی سہار نہ تھی آج ان کے جسم پر بھاری بھاری لکڑیوں کا ڈھیر ہے - ان کے سروں کی کپال کریا ہو رہی ہے جنہوں نے اپنے عزیز و اقربا کو کبھی نہ چھوڑا تھا آج سب انہیں چھوڑے جاتے ہیں - آہ وہ آنکھیں چیل کووں کی غذا بن رہی ہیں جن کی جنبشِ التفات کبھی بڑے بڑے راجاؤں کی امیدوں کا مرکز تھی جو اپنی بہادری اور فتوحات کی وجہ سے ساری دنیا میں بھی نہیں سما سکتے تھے آج دو گز کفن میں منہ چھپائے پڑے ہیں - اب راجا اور پرجا کا کوئی فرق نہیں رہا - وقت نے سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا اس وقت خوبصورت و بدصورت - امرت اور زہر - ایک ہی قیمت رکھتے ہیں راجہ پرجا اور راجہ دو ہیچ موت نے کسی کا نشان نہیں چھوڑا - صرف کتابوں میں نام کی زندگی بسر کر رہے ہیں -

(رما دیوی)

گورمکھی

کانشی رانی[1]

پردیس گئے خاوند کی یاد میں بارہ ماہ کانشی رانی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہتا رہتا ہے - ساون بھادوں میں پانی پیتم کی آمد پر کبھی کبھی اس کا جوبن نکھرتا ہے - تو وہ بھی پہر دو پہر کے لئے - مگر کانشی رانی کے اس تھوڑے ہی سے پانی میں اس کے پتی ناگے پرتاپ (خاوند پرستی کی ریاضت) کی وجہ سے کچھ ایسی برکت ہے - کہ کنارے کی ساری کھیتیاں ہمیشہ سرسبز رہتی ہیں - ہزار ہا گندے لوگوں کی گندگی صدیوں سے دھو رہی ہے - پھر بھی خود کیلاش (آسمان) سے ٹپکنے والی امرت بوند (قطرۂ آب حیات) کی طرح ٹھنڈی - صاف اور نرمل ہے - جب تک برکھا نہیں ہوتی کانشی رانی کی چوڑی اور پتھریلی چھاتی پر اُداسی گھر کیئے رہتی ہے - دن کو سنت پور کی لڑکیاں تیرنے اور اپنی منموہن بالوں سے اس کا دل بہلانے چلی آتی ہیں - مگر شام کو جب گھروں میں سُہاگ کے چراغ جلنے لگتے ہیں تو اُسوقت پیتم پانی کی جُدائی میں اس کی حالت اور بھی زیادہ نازک ہو جاتی ہے - رات کی سنسان فضا میں اس کے دل پر جل دھارا کے چلنے کی آواز صاف سُنائی دیتی ہے - برف سے ڈھکے پربت (پہاڑ) اُسے جوگیوں کی طرح ہتیرا اوپدیش کا گیان دیتے ہیں - مگر پیتم کی جدائی میں کانشی رانی کا رونا پیٹنا رات بھر بند نہیں ہوتا قدرت کا کلنکی چندرماں (شرمیلا چاند) اس کے ساتھ کلیل کرنے کے جتن کرتا اور کھیلتا ہے - مگر کانشی رانی کو اپنی دھن سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ جل دیوتا کے سوا کسی اور چیز کا نظارہ کر سکے -

(پھلواڑی)

تامل

اے ظالم دریا! اے پتھر سے زیادہ سنگدل! اے بھیڑیئے سے زیادہ وحشی! تو گوروندل کے چیلے کو نگل گیا جس کا سب احترام کرتے ہیں - جس کی ہر جگہ پرستش ہوتی ہے - جس کو ساری دنیا سلام کرتی ہے - بدبخت کیا تجھ میں اتنی جرأت ہے - اے بھالو کے بچے اور درندے کی اولاد کیا تو اس کے بعد بھی اپنی ٹھنڈی ندی کو بہاتا رہے گا -

. . . .

---

[1] پنجاب کی ایک پہاڑی ندی جو ضلع راولپنڈی میں بہتی ہوئی جہلم میں جا ملتی ہے -

گجراتی

صبح کا وقت تھا، میں مہاراج کے باغ میں پہنچا - وہاں ایک آدمی پھول توڑ رہا تھا -

میری آنکھوں کو غصہ نے سُرخ بنا دیا - میں نے آگے بڑھ کر اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا - اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا - تو کون ہے؟ جو اس باغ میں داخل ہونے کی جرأت کر سکا -

وہ مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا - اور ہوا میں ہلتے ہوئے کیلے کے پتے کے مانند سر سے پاؤں تک لرز کر بولا - مجھ سے غلطی ہو گئی - اب دوبارہ یہ خطا نہ ہو گی

یہ کہہ کر اُس نے اپنی محنت سے جمع کئے ہوئے پھول میرے قدموں پر رکھ دیئے - اور اُس کی نگاہوں نے مجھ سے معافی مانگی -

میں نے پھول گلے میں ڈال لئے - اور اُسے دھکے دیکر باہر نکال دیا - تھوڑی دیر کے بعد میں محل میں مہاراج کے پاس پہنچا - اور میری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا - وہ اجنبی خود مہاراج تھے -

میں خوف سے کانپ رہا تھا - مگر مہاراج میری اپنی اور اُن پھولوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے -

یکایک مجھے اُن میں اور اپنے میں فرق دکھائی دیا - میں غلطی دیکھ کر آگ بھبوکا ہو جاتا ہوں - مگر وہ صرف مُسکرا دیتے ہیں -

(سندری سوبھاگیہ گجراتی)

بنگالی

اے جاتری! تھکے ماندے سال کی رات گذر چکی - چمکنے والا سورج ترے رستے ملک الموت کی آواز کو لے آیا - وہ آواز جو گئے گذرے زمانے کے گناہوں کے لئے ایک آتشیں تازیانہ ہے - فاصلے کی اک باریک سی لکیر رستے کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہے - جیسے کسی گم گشتہ راہ طلب فقیر کی اک تاری بانسری کی اونچی باریک سُر!

تو رستے کی بھوری گرد کو اپنی دایہ بنا لے - خدا کرے وہ تجھے اپنی گود میں اُٹھا لے - اور تجھے دامنگیر تامل کی گرفت سے بچا کر لے چلے! گھر کا راگ، چراغ شام کی روشنی - دربان عاشق کی منتیں ٹکٹکی یہ تیرے لئے نہیں - تو ہمیشہ تحفہ حیات کا آرزومند رہا ہے - اور تحفہ خوشی یا سکون و آرام میں نہیں ملتا - تیرے لئے وقت آ گیا ہے - کہ ہر در سے دھکیل دیا جائے -

جفاکار آ پہنچا ہے - تیرے دروازے کی بھاری آہنی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں - تیرا شراب کا پیالہ چکنا چور ہے - اُس کا ہاتھ پکڑ لے جسے تو نہیں جانتا - جسے تو سمجھتے بھی ڈرتا ہے -

اے جاتری! ہرگز نہ ڈر! ——— سچائی کے تشدد سے کنارہ نہ کر - نقل کے کالے بھوت سے راہ نہ کترا - اُس سے جو سب کچھ چھین لیتا ہے - اپنا آخری تحفہ قبول کر لے!

کیا طول طویل رات تمام ہو چکی؟ تو ہو چکنے دے؟! (ٹیگور)

سنسکرت

ایک شہنشاہ اولوالعزم اس قدر عزت کبھی حاصل نہیں کر سکتا جس قدر کہ ایک عالم متبحر کو حاصل ہوتی ہے - کیونکہ شہنشاہِ اولوالعزم کی عزت اُس کی سلطنت میں ہوتی ہے - اور عالم متبحر کی ہر جگہ - !!

شریف لڑکا - جھاڑی ایک خوشبودار درخت سے معطر ہو جاتی ہے - اسی طریقہ ایک شریف الطبع متدین لڑکے کے وجود سے اُس کے خاندان کی عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں -

شریر لڑکا - جس طرح ایک گھنا جنگل ایک چھوٹی سی چنگاری سے جل کر خاکستر ہو سکتا ہے - اسی طرح ایک بداطوار لڑکے کے وجود سے اُس کا خاندان تباہ ہو جاتا ہے - !!!

بدمعاش آدمی - شریر آدمی سے ہمیشہ احتراز کرو - خواہ وہ کیسا ہی عالم ہو - اُس کی مثال بعینہٖ اُس سانپ کی ہو گی جس کے سر میں ایک چمکتا ہوا من ہو - !!!

لیکن کیا وہ اس حالت میں خطرناک نہیں ہے؟

(علامہ چانکیہ)

مرہٹی

وہ حسین تھی اُس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ اُس کا چہرہ چودھویں کا چاند تھا۔ اُس کا قد رعنائی کا نادر نمونہ تھا۔

مگر وہ بدنصیب تھی وہ بیوہ تھی

ایک دن وہ مندر میں گئی۔ دیوی نے خوش ہو کر کہا۔ تو جو کچھ مانگے گی میں تجھے دوں گی۔ تیری بھگتی نے میرا دل ہلا دیا ہے۔

اُس نے دولت کا مطالبہ نہیں کیا ؟ اُس نے صحت کا عطیہ نہیں مانگا اُس نے حکومت کی خواہش نہیں کی۔

وہ بدنصیب تھی ——— بیوہ تھی۔

اُس نے اپنا پھول سا چہرہ حسین ادا کے ساتھ اوپر اُٹھایا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا حسن۔ میری عمر۔ میری قدر و منزلت میری مسرت سب کچھ لے لو میں اور کچھ نہیں چاہتی۔

دیوی نے حیرت سے دریافت کیا" یہ الفاظ تو ...."

ہاں میں نے کہے ہیں کیونکہ میں ہندو بیوہ ہوں"

دیوی نے اُس پر رحم کیا اور اپنی سنگین اُنگلی سے موت کے فرشتے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

صبح ہوتی لوگ اُس کے لاشے پر اشکباری کر رہے تھے وہی لوگ جو اُس کی زندگی میں اُس کو دیکھ کر چراغ پا ہو جاتے تھے۔

وہ اب خوش قسمت تھی موت نے اُسکی جان کے ساتھ ہی اُس کی بدنصیبی کو بھی قبض کر لیا تھا۔

پشتو

اگر میں تجھ سے محبت کرتی اور تو مجھے پیار کرتا! تو یہ ہنگامہ زار دنیا میرے لئے کس قدر عیش و راحت کا گہوارہ ہوتی۔

یہ نیلگوں آسمان۔ یہ روشن آفتاب۔ یہ مہتاب سراپا نور۔ اندھیری رات میں ستاروں کی پُر رونق مجلس۔ خوابیدہ رات میں سوئے ہوئے درخت کی جھاڑیاں ہمہ تن سکوت کسی کی خلوت میں غیر مخل پرندے۔ چمن اور اُس کی فانی بہار۔ پھول اور پھولوں سے گلے ملتی ہوئی عطر بیز پہاڑی ہوا ہماری مسرتوں اور فرحتوں میں شریک ہوتے۔ حزن و ملال کی تیز و تند آندھی سے ہماری زندگی کے شیریں نغمے منتشر نہ ہوتے۔ اے میری روح کے شریک لوگ کہتے ہیں کہ حبیب اور محبوب کوسوں دوری پر بھی آپس میں دل ہی دل میں ہمکلام ہوا کرتے ہیں مگر میری خاموش آواز دل اور زیر لب آہوں کا کیوں جواب نہیں ملتا۔ میری دعائے نیم شبی کیوں بیکار جاتی ہے۔ میری خاموش آہ برسات کے مجنوں شیدائی پپیہے کے لئے شُنی اور تڑپ کر بولا کا محبت کے درخت بار آور نہیں ہوتے! ورنہ اُمید کا پھول نہیں کھلتا۔

بلوچی

اے خدا تو ہزاروں لاکھوں کی حفاظت کرتا ہے۔ تو اپنے بندوں کو رزق دیتا ہے تیرے حکم سے ٹھنڈے مینہ والے بادل سمندر سے چل کر زمین پر ادھر اُدھر گرتے پھرتے ہیں۔ گھاس سر سبز ہو جاتی ہے۔ اور اے خدا تو ہمارے لئے قسم قسم کے اناج پیدا کرتا ہے۔ بیدل

چینی

ہم لوگ چین میں اپنی گورنمنٹ کو موجودہ تہذیب کے معیار پر لانا چاہتے ہیں اور قریب قریب یہی حال ہندوستان کا ہے جہاں کی پرجوش اور نوجوان جماعت حکومت و نظام حکومت کیلئے مغربی معیار کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایک اُصولی غلطی ہے کیونکہ قومیت کا سیاسیات و نظام حکومت سے اختلاف ہے اور مشرق میں وہی حکومت باعث امن و خیر ہو سکتی ہے جو مشرقی تہذیب کی حامی ہو جس طرح مغرب کی حکومت مغربی تہذیب کے دوش بدوش ترقی کر سکتی ہے ضرورت ہے کہ جو ملک ترقی کرنا چاہتا ہے وہ اپنی ہی زمین کے تجربات و مشاہدات اپنی ہی قوم کے دیرینہ روایات اخلاق و تہذیب پر حکومت کی بنیاد قائم کرے۔ ورنہ حقیقتاً اختلاف مذاق الگ ایسا اختلاف ہے کہ باوجود تمام کوششوں کے اُن میں تصادم ہو جانا ضروری ہے۔

ترکی

محبوبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ قسم ہے تم کو میری محبت کی تم ہتھیاروں سے سجے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا مردانہ حسن اس وقت پورے شباب پر ہے۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میں تمہارے لب نازک کو اپنے لبوں سے مس کروں یا تمہاری خوبصورت تلوار کو بوسہ دوں۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ تم اس وقت اس درجہ حسین ہو کہ میں نے تمہیں اتنا حسین کبھی نہیں دیکھا۔ کیسا دلکش اور نظر فریب وہ وقت ہوگا جب تم میدان جنگ سے فتح حاصل کرکے واپس آرہے ہوگے تمہارے زخموں سے میری محبت کا رس بہ رہا ہوگا۔ اُس وقت میں تمہیں اپنے زانو پر لٹاؤں گی اور تمہارے لئے ایک ادنیٰ نرس بن جاؤں گی۔

عاشق نے محبوبہ کی دلفریب داستان سُنی اور اُس نے کہا کہ پیاری تم حسین ہو اور بلا کی حسین۔ لیکن میدان جنگ میں جب میں سینہ سپر ہوکر بڑھتا ہوں تو فتح کی دیوی تم سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے میں اُس کے رنگ روپ میں تمہیں دیکھتا ہوں اور تم مجھے اُس کے رنگ روپ میں دکھائی دیتی ہو۔ جب میں گولیوں کی بوچھاڑ میں بے باکانہ بڑھتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوں کیونکہ میرے نزدیک محبوبہ اور فتح دو چیزیں نہیں ہیں۔ میں جاتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں مبارک ہے تمہارا خیال جو میدان جنگ میں میری رگوں میں جرأت کی روح دوڑا دیتا ہے۔

عربی

کسی زبان کا امتیاز

کسی زبان کا امتیاز دوسری زبانوں سے اُس کے اسم فعل کی وجہ سے نہیں قائم ہے۔ بلکہ جو چیز ایک زبان کو دوسری سے جُدا کردیتی ہے وہ اس زبان کی صرف۔ نحو۔ اور بیان ہے جن سے خاص زبان کے خاص الفاظ کے تغیر و تبدل کے قاعدے۔ اُن کے بنانے اور ایک لفظ سے کئی لفظ مشتق کرنے کے طریقے اور لفظوں کو جوڑ کر جملے بنانے کی ترکیبیں معلوم ہوتی ہیں ترکی زبان میں عربی کے لاکھوں الفاظ مل گئے ہیں۔ ترکی میں بیس لفظوں کی دو سطریں بھی پڑھو تو ان میں تم کو قطعی طور پر دس لفظ عربی کے ملیں گے لیکن پھر بھی وہ تمہارے نزدیک ترکی ہی ہوں گی جن کو تم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جبتک کہ ترکی زبان سے واقف نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ اس کا علم صرف علم نحو اور علم معانی و بیان عربی سے جُداگانہ ہے۔ عربی کے جو الفاظ اس میں داخل ہوگئے ہیں۔ اُن کی وجہ سے ترکی ترکیت سے نہیں نکلی اور نہ اس کا رتبہ کم ہوا بلکہ اُس کے خزانۂ الفاظ میں ترقی ہوگئی۔ اور ترکی بولنے والے اپنے مافی الضمیر اور معانی کے ادا کرنے پر زیادہ قادر ہوگئے۔ یہی حال انگریزی اور فرانسیسی کا ہے۔ لاکھوں الفاظ دونوں میں مشترک ہیں لیکن پھر بھی دونوں الگ الگ مستقل زبانیں ہیں حتیٰ کہ ایک فرانسیسی کیلئے بغیر سیکھے ہوئے انگریزی سمجھنا اور کسی انگریز کے لئے بغیر پڑھے فرانسیسی سمجھنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ لغات مرتب ہونے سے پہلے عربی میں یونانی۔ قبطی۔ فارسی۔ سُریانی وغیرہ کے ہزاروں الفاظ داخل ہوچکے تھے مگر اس سے عربی زبان کی شرافت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی عربی میں ہمیشہ نئے نئے الفاظ داخل ہوتے رہے۔ اور اس سلسلے کا قطع ہونا اُس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک عربی زبان کا شمار زندہ زبانوں میں ہے اور عربی بولنے والے دوسری زبان والوں سے ملتے جلتے اور بات چیت کرتے ہیں۔

(المقتطف)

ص ......

یونانی

اے خدا کے جانشین بادشاہو! میری بات کان لگا کر سنو! اُن لوگوں کے لئے جو اس جنگ میں مارے گئے ہیں میرا دل خون ہو رہا ہے۔ وہ میری خاطر اس خونخوار جنگ میں شریک ہوئے۔ ان کے ماں باپ اور گھر بار ان کی واپسی کی برکت سے محروم ہوگئے ہیں۔ قسمت نے ہزاروں نوجوانوں کو جوانی ہی میں مار ڈالا۔ کاش ان سے پہلے موت کا ہاتھ مجھ پر پڑ جاتا۔ اور مجھے ان کی لاشیں اکھٹی کرنی نہ پڑتیں۔

بیدلؔ

فارسی

میری منگیتر

چھ سال کی جدائی کے بعد اس سے ملاقات ہوئی - اس کی بیگناہ آنکھوں میں محبت کی بجلی اب تک چمک رہی تھی - دوران خون کی وقتی تیزی نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو ارغوانی بنا دیا تھا - اس کے دل کی حرکت دور ہی سے سنائی دے رہی تھی ایک حسرت بھری آہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی - اور اس پاس کی ہوا میں مل کر اردگرد کی ساری فضا کو المناک اور اُداس بنا دیا - اس کی شادی ہو چکی تھی - اور اس کی گود میں ایک بچہ بھی موجود تھا - پھر بھی وہ میری طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی - معلوم ہوتا ہے - کہ اس کی آہ اور اس کی بد دعا مجھکو جوانی کی لذّتوں سے محروم ہی رکھے گی ۔

وہ میری منگیتر تھی، ہمارے درمیان کئی سال تک رشتہ محبت قائم رہ چکا تھا - وہ بلا شبہ مجھکو اپنا سمجھ چکی تھی - ہمارے رشتہ داروں نے شادی بیاہ کا سامان بھی شروع کر دیا تھا - یکبارگی میری طبیعت نے پلٹا کھایا - اور میرے خیالات نے مدتوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کی پر شکوہ عمارت کو آن کی آن میں زمین کی برابر کر دیا -

اگر کسی بُرے ہمسائے سے تمھارا کام پڑ جاتا ہے - اگر کسی بد دیانت شریک سے تمھارا سا جھا ہو جاتا ہے - اگر کسی بدچلن آدمی سے تمھارا میل جول ہو جاتا ہے - تو تم جلد سے جلد ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہو - مگر مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا - کہ چند دنوں کے بعد عہد وفا کو توڑ کر اپنی شریک زندگی کو طلاق دینے کے لئے تیار رہوں - میں نے اس کو اچھا نہیں سمجھا - کہ ایک عورت کی عمر کے بہترین حصے اور اس کی پُرارمان جوانی کو اپنی ہوس رانی پر قربان کر دوں - رات کو خوشبو کے مزے لے کر صبح ہی گل بشو کی طرح مسل کر پھینکدوں - میں نے اس کو پسند نہیں کیا - کہ ایک عورت کی زندگی کے راستے میں ایک گہرا کنواں کھود دوں - اور محبت و رفاقت کے بہانے اس کو اپنے ساتھ لے کر یکبارگی اس میں ڈھکیل دوں -

میری منگیتر ان پڑھ تھی وہ نہ لکھ سکتی تھی نہ پڑھ سکتی تھی - کیا میرا اور اس کا نباہ ہو سکتا تھا؟ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے جس کی بے چین روح تربیت کی گرویدہ اور تہذیب کی مشتاق ہو - کیا ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا آسان ہے ؟ کیا اس صورت حال نے میری جوانی کے ساتھ میری ساری زندگانی کو برباد نہیں کر ڈالا ؟

پیاری ! میرا ضمیر ہمیشہ مجھے ملامت کرتا رہتا ہے - میری روح سدا حسرت و افسوس کی آگ میں جلتی رہتی ہے - اور میرا دل ندامت اور غم کے ناقابل برداشت بوجھ سے خون ہوا جاتا ہے - تو اپنے موجودہ شوہر پر مجھے ترجیح دے رہی ہے - کسی وقت تو نے اپنی خاوندی کے لئے مجھے پسند کیا تھا - اور میں نے بھی تجھ سے وعدہ کیا تھا - یہ سب کچھ سچ ہے - لیکن مجھ کو نفرت اور حقارت سے نہ دیکھ کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے - تو پھر بھی مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ کم سے کم ایک شریک زندگی تو رکھتی ہے - اور زندگی کے بھنور سے تیری کشتی کو پار لگانے والا کوئی نہ کوئی موجود تو ہے - مگر . . میں تو . . . . !

میں گنہگار نہیں ہوں - مجھکو حقارت سے نہ دیکھ - مجھکو ملامت نہ کر - ان نامرادیوں اور بدبختیوں کی ساری ذمہ داری اس تاریک پردے پر ہے - جو تیری جنس کی تعلیم و تربیت پر ڈالا گیا ہے - اس میں سارا قصور اس رواج کا ہے - کہ لڑکوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے - اور لڑکیاں جاہل اور غیر مہذب رکھی جاتی ہیں - اور جب دونوں بڑے ہوتے ہیں تو پڑھے لکھے لڑکے ان پڑھ لڑکیوں کے ساتھ کسی طرح گذارا ہوتا نہیں دیکھتے - اور میری طرح انگاروں پر لوٹ لوٹ کر زندگی کے دن کاٹتے ہیں - محبت کے غیر فانی احساس کو اپنا سفارشی بناتا ہوں - اور معذرت کی ساری ندامتوں کو تیری غمگین روح کی پیشگاہ میں پیش کرتا ہوں - اور عہد گذشتہ کے پاکیزہ جذبات کے صدقے میں تیری انسانیت کی بارگاہ سے اپنی معافی کا طلبگار ہوں - مجھے ڈر ہے - کہ تیری آہ میری زندگی کو خراب و برباد نہ کر دے ؞

(ایران شہر) ص . . . . .

انگریزی شاعری کے عہد ترقی کے چند نمونے

عام طور پر جرمنی کو فلسفیوں کا ملک - فرانس کو نزاکت و آرائش کا گہوارہ اور انگلستان کو شاعری کی دنیا کہا جاتا ہے - اور یہ واقعہ ہے کہ انگلستان نے صرف گذشتہ صدی میں اتنے گراں پایہ شاعر پیدا کئے ہیں کہ اور بہت سے ممالک میں مجموعی طور پر بھی اچھے شعرا اتنی تعداد میں نہیں پیدا ہوئے -

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جب کسی ملک میں بہت سے اہل علم کسی خاص فن سے دلچسپی لیتے ہیں تو وہ فن اس ملک کا قومی شغل بنجاتا ہے - گزشتہ دو صدیوں میں انگلستان کا قومی شغل عموماً فسانہ نگاری اور خصوصاً شاعری رہی ہے - جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں کبھی آپ کسی کباڑی کی دکان میں چلے جائیں یا کسی پرانی وضع کے کتبخانے میں ورق گردانی کریں تو بعض اوقات قصہ کہانیوں اور شعر و شاعری کے ایسے ایسے جواہر پارے آپکی نظروں سے گذرینگے کہ اُس قوم پر لفریں کرنے کو جی چاہیگا - جسکی بدذوقی کی وجہ سے ایسے انمول موتی اس طرح کباڑخانے میں پڑے ہوئے ہیں - مگر دراصل بات یہ ہے کہ اُسوقت شاعروں کے امنڈتے ہوئے طوفان میں شہرت اور ہر دلعزیزی صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے تھے جو غیر معمولی تخیل کے مالک ہونے کے ساتھ ہی غیر معمولی زبان بھی استعمال کر سکتے ہوں بلکہ وہ بھی ناقدوں کی دل آزار تنقید سے بچ نہ سکتے تھے - کیونکہ شاعروں کے سیلاب کے ساتھ ہی تنقید نگاروں کا ایک بڑا گروہ بھی پیدا ہوچکا تھا جن کا خیال تھا کہ زیادہ شعر کہنے کے مقابلے میں اچھے شعر کہنا لٹریچر کی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی شاعری کا عروج چاسر (Chaucer) کے زمانہ سے شروع ہوا ہے - بعض کہتے ہیں اسے شیکسپیر نے بام ترقی تک پہنچایا - اور یہ خیالات ایک حد تک صحیح بھی ہیں کہ انگریزی شاعری کی صحیح ابتدا چاسر ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور شیکسپیر نے اس میں بلندی اور پرواز پیدا کر دی تھی لیکن پھر بھی اِن دونوں کے زمانے کو انگریزی شاعری کے عروج کا ابتدائی زمانہ نہیں کہا جاسکتا -

چاسر انگریزی زبان کا پہلا شاعر کہلانیکا مستحق ہے مگر اس کے اشعار میں رہتی دنیا تک مقبولیت حاصل کرنیوالے عناصر بہت کم ہیں - شیکسپیر نے انگریزی ادب میں اچھوتے تخیل اور انوکھے طرز بیان کا اضافہ کیا - اس کی تصانیف میں لوگوں کو اپنی شخصیتیں پنہاں ملتی ہیں - اس کے ہیملٹ میکبتھ اور آتھیلو صرف فرضی انسان نہ تھے - بلکہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں - وہ لوگوں کے جذبے کی صحیح ترجمانی کرتا تھا جو حقیقت میں شاعری کا انتہائی عروج ہے - اس کے باوجود ہم اس زمانے کو بھی انگریزی شاعری کی صحیح ترقی کا زمانہ نہیں کہہ سکتے - پہلے تو ہمیں شیکسپیر کو شاعر کہنے ہی میں تامل ہے - کیونکہ اُس نے جس ادب کو کامیاب بنایا اس کو شاعری اور فسانہ نگاری کا مجموعہ ہونیکے باوجود شاعری نہیں کہا جاسکتا - مگر چونکہ شیکسپیر کا شہرہ تمام دنیا میں ایک ایک ڈرامہ نویس کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے ہوچکا ہے، اور آج اُسے شاعر نہ کہنا گویا ساری دنیا سے جھگڑا مول لینا ہے - اس لئے ہم بھی اُسے شاعر ہی مان لیتے ہیں مگر پھر بھی یہ کہنا سراسر خلاف واقعہ ہے کہ شیکسپیر نے انگریزی شاعری میں چار چاند لگا کر بام ترقی کے بالکل قریب کر دیا تھا - کیونکہ علم و ادب کے کسی شعبے کا عروج کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے - عروج نام ہے قوم کے مذاق کے مطابق اترنیکا - اور قوم نام ہے افراد کا - جو چیز افراد میں مقبول ہوگی وہی ترقی یافتہ کہی جا سکے گی - مگر حالت یہ ہے کہ خود شیکسپیر کے زمانے میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو اس کی صحیح عظمت کو پہچان سکتے - اسکی تصنیفوں پر جسقدر تنقیدیں ہوئی ہیں انہیں ایسا حصہ بہت کم ہے جو انیسویں صدی سے پہلے لکھا گیا ہو - ان امور کی بنا پر ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شیکسپیر اپنے زمانہ سے تین صدی قبل پیدا ہوچکا تھا -

انگلستان کی شاعری کا صحیح عروج کلاسیکل ایج[1] (Classical Age) کے اختتام پر اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہوا - کلاسیکل ایج میں جذبات و خیالات سے زیادہ اہمیت وزن اور قافیہ کو دیجاتی تھی - اس کی وجہ یہ تھی کہ بلینک ورس[2] (Blank verse) کی ابتدا شیکسپیر سے کچھ قبل ہوچکی تھی اور اندیشہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد خیالات میں سے شاعری کا وہ عنصر فنا نہ ہو جائے جو نظم کو نثر سے ممتاز کرتا ہے - لیکن اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد کی نظم صرف الفاظ کا مجموعہ بنکر رہ گئی - اور بلند خیالی بالکل مفقود نہیں تو کم ضرور ہوگئی - اگر صرف یہ کمزوری ہوتی تو کوپر - بلیک اور پوپ کا کلام شیکسپیر اور کیٹس سے ٹکر کھاتا -

اٹھارہویں صدی تک لوگوں کا مذاق نکھر چکا تھا اور بہت سے ایسے شاعر پیدا ہوگئے تھے جو وزن اور قافیہ کی زنجیر میں مقید رہکر بلند پروازی سے لطف اندوز نہ ہوسکتے تھے - اس لئے مروجہ طرز شاعری میں فوری

---

[1] وہ زمانہ جبتک انگریزی پر لاطینی اور یونانی زبانوں کا اثر بہت گہرا رہا - [2] بے قافیہ کی شاعری -

انقلاب کی ضرورت محسوس کیجانے لگی۔ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ورڈس ورتھ۔ کولرج اور سدے نے باہمی مشورہ سے لریکل بیلڈس (Lyrical Ballads) لکھ کر رومینٹک پوئٹری کی بنیاد رکھی اور ایک ایسی شاعری وجود میں آئی۔ جسمیں وزن اور قافیہ کی تمام پابندیاں نغمہ اور جذبات کے جادو میں کھو گیئں، ورڈس ورتھ کی سادگی۔ شیلے کی نیچر پرستی کیٹس کا درد۔ کولرج کی بلند پروازی۔ براؤننگ کی باریک بینی اور ٹینی سن کی معصومیت وہ چیزیں ہیں جو باہم ملکر اس نے ملنے کو ایک ایسی تصویر کا ہمشکل بنا دیتی ہیں۔ جسمیں قسم قسم کے رنگ استعمال کئے گئے ہیں۔ جس کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ایک مستقل تصویر ہے۔ اور جس کا ہر نقطہ ایک لامتناہی وسعت کا مالک ہے اور اسی عہد کو ہم بلا خوف تردید انگریزی شاعری کے شباب کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں اسی دور کے چند شاعروں کے کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم بہت سے ایسے حصے اس انتخاب میں شامل نہیں کر سکے جو طویل ہونے کے باوجود بیحد دلچسپ ہیں۔

روشن ستارے

اے روشن ستارے۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں تیری طرح ثابت مقام ہو جاتا۔

مجھے اس کی آرزو نہیں کہ تیری طرح ایک تنہا شوکت وعظمت کے ساتھ بر سرِ شب معلق ہو جاتا۔ اور بہتے ہوئے پانی کو ایک زاہدانہ انداز میں زمین کے انسانی ساحلوں کا وضو کراتے دیکھتا رہتا ——— اس حالت میں کہ فطرت کے محرومِ خواب مریض ایریمائیٹ کی طرح، میرے غلافہائے چشم ہمیشہ وا رہتے۔

میری یہ بھی خواہش نہیں کہ تیری طرح حیرت سے ٹکٹکی باندھے اُس برفانی نقاب کو آہستہ آہستہ گرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ جو پہاڑوں اور مرغزاروں پر محیط ہے۔

لیکن پھر بھی کیا اچھا ہوتا اگر میں ناقابلِ تغیر اور ثابت مقام بنکر اپنی خوبصورت محبوبہ کے سینہ پر سر رکھے ایک حیات سرمدی کا مالک بنا دیا جاتا۔ کہ ہمیشہ اس کے لطیف مدّوجزر کو محسوس کرتا رہوں۔ ایک خوشگوار درد کے ساتھ ہمیشہ بیدار رہوں اور کبھی نہ ختم ہونے والی فرحت تک اس کے نازک تنفس کی آواز سُنتا رہوں ——— یا بیہوش ہو کر موت سے ہم آغوش ہو جاؤں۔

(کیٹس)

ہمارا دل

ہم اپنے پاس بہت کم چیزیں ایسی پاتے ہیں، جنہیں اپنا کہہ سکیں۔
ہم نے اپنے دل بھی ناچیز ہدیہ بنا کر کھو دئے ہیں۔
یہ سمندر جو اپنا سینہ کھولکر چاند کو دکھا رہے ہیں۔
یہ ہوائیں جو ہر وقت مصروفِ نزاری ہیں۔ اور خوابیدہ پھولوں کی طرح جمع ہو رہی ہیں۔
ان سب کے واسطے ہمارے دل کھوئے ہوئے ہیں

(ورڈس ورتھ)

سکونِ نیم شبی

لمبے دن کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ وسیع کھیت دُھندلے پڑ جاتے ہیں۔ رات اپنا سیاہ پردہ تمام عالم پر ڈالدیتی ہے۔ تاریک گلی کوچے تمام صداؤں سے خالی ہیں۔ سفید سفید خودرو پھول گیاہ نودمیدہ کے سیاہ سلسلے کو قطع کر رہے ہیں۔ معطر زمین خاموش آسمان سے شبنم کے جُرعے پی رہی ہے ——— جو نرم ترین ہم آہنگی سے بھی زیادہ شیریں ہے۔ میدان شبِ تاریک کی محبت بھری گود میں بیخبر سوئے ہوئے ہیں۔

(چیپمن)

کتابیں

میری امیدیں مُردوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ بعد میرا مقام بھی اُن کے ساتھ ہوگا۔ اور میں اُن کے ساتھ ایک لامتناہی مستقبل پر مصروفِ سفر ہونگا۔ مگر ایک ایسا نام چھوڑ جاؤنگا جو کبھی خاک آلودہ نہ ہوگا۔

(ساؤتھی)

اُن کے ساتھ آخری سیر[۱]

میری ملکہ نے اپنی بھوؤں کو سکیڑا۔ اُس نے وہ نگاہ جس میں رحم کے ساتھ ساتھ غرور کا عنصر بھی موجود تھا۔ میرے اوپر لمحہ بھر کے لئے جما دی۔ ——— ترازو کے ایک پلڑے میں زندگی تھی دوسرے میں موت

——— "اچھا!" ———

خون یکایک میری رگوں میں کھولنے لگا ——— آہ میری آخری توقع غلط نہ تھی۔

میں اور میری ملکہ پہلو بہ پہلو سیر کے لئے جانے والے تھے۔

اس طرح میں ایک دن اور زندہ رہگیا۔ اور کون جانتا ہے کہ آج رات دنیا اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیگی ——— ؟

(براؤننگ)

---

[۱] جذباتی شاعری۔ [۲] انگلستان کا رواج تھا کبھی کبھی عاشق و محبوب ایک ہی گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ مگر چونکہ ہمارے ملک میں انگریزی لفظ Ride کا ہم معنی لفظ موجود نہیں ہے۔ اس لئے سیر اس کا موزوں ترین ترجمہ ہے۔

احساسِ مسرت

اگر تم بادلوں کو دیکھتے، جو اُبلتے ہیں، جو چاند سورج اور شام کے ستاروں سے کسبِ نور کرتے ہیں۔ اور اُن کے سامنے احترام میں جُھکے ہیں۔ اور اُنہی بادلوں کی طرح تم بھی کسی سے محبت کرتے۔ اور اپنے دل میں ایک ایسے جذبے کی موجودگی محسوس کرتے جو تم پر غروبِ آفتاب، طلوعِ قمر، اور ستاروں کے نور سے چھاور کرتا ــــــ اس حد تک کہ جسمانی اثر مفقود ہو جاتا اور جنت تمہارے روبرو ہوتی۔ تو باور کرو کہ اس نے مجھے وہی مسرت بخشی۔ جبکہ وہ میرے سینے پر لیٹی ہوئی تھی۔

(براوننگ)

میرا خواب

مَیں نے ایک رات خواب میں ایک عورت کو ساز لئے ہوئے دیکھا۔ وہ الوسینا کی ایک دوشیزہ تھی، اور اپنے ساز پر کوہ ایبورا کی مدح میں ایک دلکش گیت گا رہی تھی۔

اگر میں اس گیت کی بازگشت کو اپنی آواز میں تازہ کر سکوں تو وہ مجھے مسرت کے اس گہرائی تک پہنچا دے۔ کہ مَیں طویل و بلند نغموں سے اس چمکدار گنبد اور ان برفانی غاروں کو ہوا میں معلق دکھا دوں ــــــ اور سامعین کہیں "خبردار! خبردار! اُس کی ساحرانہ آنکھوں سے ڈرو۔ دیکھو اس کے بکھرے ہوئے بال اُس کے چہرے کے گرد تین حلقے کئے ہوئے ہیں۔ اپنی آنکھیں ایک تقدس مآب خوف سے بند کر لو۔ کیونکہ اس نے شبنم پر پرورش پائی ہے۔ اور بہشتی دودھ پیا ہے۔"

(کولبرج)

اُس کا حُسن

وہ بنفشہ کے اُس پھول کی طرح (نازک) تھی! جو سبز پوش پتھر کے قریب نگاہ سے نیم پوشیدہ اُگ رہا ہو۔ اور اس ستارہ کی طرح جو آسمان پر تنہا چمکتا ہو۔

(ورڈس ورتھ)

ایک التجا

اے وہ جو حریص نگاہوں سے میری ضیافت (زندگی) کو ختم کئے دے رہی ہے! جس کی نگاہیں میرے چاند سے چہرہ کو فخر آمیز بیباکی سے دیکھ رہی ہیں ــــــ اپنے ہاتھ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہ کر۔ محبت کے شعلے کو بھڑکنے دے۔

اپنے دل کا رجحان میری جانب سے نہ پھیر۔ اور مجھ پر رحم کھا کر اپنی نبض کی تیز ترین حرکت میرے واسطے وقف کر دے۔

ہاں! پیاری محبوبہ وقف کر دے۔ خواہ وہ ان تتلیوں ہی میں رقص کیوں نہ ہو۔ جنہیں نغمۂ گرم فضا کے سپرد کر دیتا ہے۔

(کیٹس)

جھیل

درختوں کی پرچھائیاں جھیل کے پانی پر متحرک ہیں۔ چاند اور زمین بالمقابل ہیں۔ اور زمین ایک گہری نیند سے ہم آغوش ہے۔ لہروں کی آواز اس کے خوابوں کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ جو اس کی نیند میں اس کی صبح کا تعاقب کر رہی ہے

(ایلزبتھ برٹ)

معین الحق حقی دہلوی

فرانسیسی

کیا تجھے وہ دن یاد ہے۔ جب میں ہچکچاتے ہوئے قدموں سے تیرے نیم وا دروازے پر پہنچا اور رعبِ حُسن سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے تیرے حضور میں شرفِ باریابی کا طلبگار ہوا۔

تو اُس وقت مسکرا رہی تھی

میں تیرے سامنے گیا اور اپنی زندگی کے بیش بہا تحفے تیرے قدموں پر ڈال دیئے۔ اُن میں معصومیت تھی، ایمان تھا، محبت تھی، صداقت تھی اور ان سب پر ہوا کی مانند چھائی ہوئی محبت تھی۔

تو نے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اور بچوں کیسے اضطراب سے پوچھا۔ "کچھ اور"؟

میں نے تیرے برف سے سفید چہرے کی طرف نگاہ کی میرا دل دھڑکنے لگا میری زندگی کے دیرینہ خواب مایوسی میں تبدیل ہو گئے۔

تو نے جواب دیا یہ اشیا میرے کس مصرف کی ہیں؟

میں نے اپنے نامنظور شدہ تحفوں کو اُٹھایا اور روتا ہوا جنگل کو چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک درخت کے نیچے ان سب کو دفن کر دیا۔ اور اپنی زندگی کے خوابوں کو اُس کے ساتھ بہنے والی تیز رفتار ندی کے پانی میں بہا دیا۔

اب تو مجھے دیکھتی ہے تو تیرا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا ہے۔ مگر کیا تجھے وہ دن یاد نہیں یاد نہیں جب میں اپنی زندگی کے بہترین تحفے لیکر تیرے پاس گیا تھا۔ اور تو نے اُن سب کو نامنظور کر دیا تھا۔

جرمنی

شاعر کا مقام

ایک دن خداوند تعالےٰ نے عرش معلےٰ پر سے ندا دی - کہ میرے بندو! میں نے تمھارے لئے زمین پیدا کی - اور تم کو قیامت تک اس مٹی اور پانی کا وارث بنا دیا - اٹھو اور اس کو آپس میں برادرانہ طور پر تقسیم کر لو -

اِس آواز کے سُنتے ہی ہر بوڑھے اور جوان نے جس کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے دوڑنا شروع کیا ..... بوڑھے نے ایک کشت زار پر قبضہ کر لیا - امیر زادوں نے شکار کے لئے جنگل کو پسند کر لیا - سوداگر نے جس قدر زمین مل سکی مال و دولت سے بھر لی - زاہد نے شراب کا پیالہ اُٹھا لیا - اور بادشاہ راستوں اور پلوں پر قبضہ کر کے کہنے لگا - کہ لوگو تم نے جسقدر لیا ہے اُس کا دسواں حصہ مجھے ملنا چاہئے -

جب زمین بٹ چکی تو شاعر پہنچا - مگر اسے کوئی چیز بچی ہوئی نظر نہ آئی - اس نے عرش کی طرف رخ کر کے فریاد کی -

افسوس! اے میرے مالک! میں تیرا ہوں - کیا یہ ممکن ہے - کہ اس طرح تنہا اور بے خانماں رہوں؟ یہ کہہ کر وہ گر پڑا -

عرش پر سے آواز آئی - یہاں زمین بٹ رہی تھی - تو تو خیالات کی سیر میں مصروف تھا - اب تیرا گلہ شکوہ فضول ہے -

شاعر نے کہا -

میرے خدا میں اس وقت تیرے سامنے تھا - میری آنکھیں تیرے رخ پر جمی ہوئی تھیں - اور میرے کان تیرے ترانے سے بھرے ہوئے تھے - میں تیرے بادہ وصل سے سرمست ہو رہا تھا - اور مجھے اس کا ہوش ہی نہ تھا - کہ زمین کی لوٹ میں حصہ لوں - میری معذرت قبول کر اور میرا گناہ معاف فرما -

خدا نے جواب دیا -

اب کیا ہو سکتا ہے؟ زمین ہاتھ سے نکل چکی - چشمے - جنگل شکار گاہیں - اور بازاروں کا تعلق مجھ سے نہیں رہا - اگر تو چاہتا ہے تو آ اور میرے ساتھ زندگی بسر کر - ہر وقت میرے پاس رہ - میری بارگاہ تیرے لئے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے -

(شیلر)

(تمکین کاظمی)

اطالوی

کیا خارجی اشیا تجھکو بہت پریشان کرتی ہیں؟ ذرا صبر سے کام لے تفکرات دنیا سے جدا ہو کر جدید اور مفید سرمایۂ معلومات بہم پہنچانے کیلئے اپنا عزیز وقت کام میں لا - لیکن اس حال میں بھی اعتدال سے باہر نہ جا - کیونکہ وہ اشخاص جو اپنے حرکات و سکنات میں - خیالات و عادات میں کوئی خاص مدعا پیش نظر نہیں رکھتے وہ اپنی تمام سعی کو ضائع کرتے ہیں *

روسی

حیف ہے سچائی کی روشنی پر کہ وہ حاسد اور شریر لوگوں کو خوش کرنے کی فضول کوشش کرتی ہے - نہیں ہرگز نہیں - میری آنکھیں اس دھوکا دینے والی سچائی سے خیرہ نہیں ہو سکتیں - ہم شاعر لوگ جذبات کے لئے پیدا ہوئے ہیں - لوگوں کو نصیحت کرنے اور اُن کی غلطیوں کو دور کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے -

پالی

اے انسان! اگر تو اس دار المحن میں آرام کی زندگی بسر کرنے کا طالب ہے - اگر مسرت کا متلاشی ہے - اور سچی خوشی کا شیدائی ہے - تو اُٹھ اور نفسانی خواہشوں کے خلاف جہاد کر - اور دنیاوی تمناؤں کی گندگی سے دل کی کٹیا کو صاف کر دے -

(مہاتما بدھ)

تبصرہ

مبصر

یہ علمی و ادبی ماہوار رسالہ جناب حکیم ابوالعلا صاحب ناطق کی ادارت میں لکھنؤ سے ۲۰×۳۰/۸ کے ۶۴ صفحات پر شایع ہو رہا ہے۔ گذشتہ نمبروں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ رسالہ جن مقاصد کے ماتحت شایع ہوتا ہے ان میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس کے علمی اور ادبی مضامین بہت اچھے ہوتے ہیں۔ نظمیں اور افسانے بھی بُرے نہیں ہوتے۔ مگر نظم کا حصہ اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی سالانہ قیمت چار روپے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

خضر راہ

یہ رسالہ بھی لکھنؤ سے مولوی حامد علی صاحب ندوی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی اعلےٰ درجے کی ہوتی ہے۔ کاغذ بھی عمدہ لگایا جاتا ہے۔ مضامین بھی اچھے ہوتے ہیں۔ مگر علمی و ادبی مضامین کی بہ نسبت مسلسل افسانوں کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت چار روپے ہے۔

تفریح

یہ رسالہ قاضی محمد رفیق صاحب کی ادارت میں بجنور سے شایع ہو رہا ہے۔ ہر ماہ میں اس کے ناظرین کی تفریح کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ اب تصویریں بھی دیجاتی ہیں۔ مگر یورپ پر طعن کرنے کے بہانے ننگی تصویروں کی اشاعت خود بھی قابل اعتراض ہے۔ کاغذ معمولی قسم کا لگایا جاتا ہے۔ لیکن لکھائی چھپائی اور ۲۰×۳۰/۸ کے ۳۲ صفحات کو دیکھتے ہوئے سالانہ قیمت عہ بہت تھوڑی ہے۔

نئی روشنی

یہ ماہوار رسالہ گذشتہ ماہ سے مولینا زاہد القادری کی ادارت میں دہلی سے جاری ہُوا ہے۔ اجراء کی غرض و غایت خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے روشن خیال اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ اور آج اسلام کی صحیح تعلیم سے ناواقفیت اور مغربی تعلیم کے اثر سے مسلمانوں کی ذہنیت میں جو تاسف انگیز انقلاب رونما ہے اس کی روک تھام کی جائے۔ اور اس کے اجراء کا مقصد یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے لئے موثر جد و جہد کی جائے۔

مولانا زاہد القادری ایک کہنہ مشق مضمون نویس ہیں۔ اور انہوں نے نئی روشنی کے پہلے پرچے میں اسلام کے جمال معنوی کے جو خد و خال دکھائے ہیں وہ قابل داد ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی فلم ایکٹرس مس سلطانہ اور مس زبیدہ کی تصویر اور کئی صفحے سینما کے جمالِ ظاہری پر محض اس لئے وقف کر دینا کہ "آجکل اس کا شوق عالمگیر ہو رہا ہے" کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس طرح بیک وقت دو کشتیوں پر سوار ہونے کی بجائے کسی ایک کو منتخب کر لیا جاتا اور نئی روشنی میں صرف دینی مضامین شایع ہوتے یا صرف ادبی۔ ورنہ کم سے کم ایک ایسے رسالے کو "جو مذہبی تعلیمات کو بالکل حقیقی رنگ میں پیش کرنے کے لئے جاری ہُوا ہے" "ادب لطیف" کی لعنتوں سے تو ضرور پاک رکھا جائے۔

اس کی لکھائی چھپائی کاغذ ہر چیز اچھی ہے۔ پہلا پرچہ ۲۰×۳۰/۸ کے ۵۶ صفحات پر شائع ہُوا ہے۔ سالانہ قیمت سے۳ رکھی گئی ہے۔ جو کسی طرح زیادہ نہیں۔

ماڈرن بک کیپنگ اردو

مصنفہ سیّد ہادی حسین صاحب رضوی۔

ہندوستان تجارت میں تمام ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے ہے۔ اس لئے تجارتی حساب کتاب کا ہندوستانی طریقہ بھی بالکل ناقص ہے۔ مگر جدید طریقے سے عام واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ہندوستان کی کاروباری دنیا میں یہی ناقص طریقہ رائج ہے۔ اس کمی کو محسوس کر کے ہندی میں بہی کھاتے کے جدید طریقے پر کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ اردو میں بھی اس فن کی دو تین کتابیں چھپ چکی ہیں مگر اپنے موضوع کی کامیابی میں یہ کتاب پہلی تمام کتابوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ معمولی اردو پڑھا لکھا آدمی صرف اس کتاب سے بہت اچھی طرح بہی کھاتہ لکھنا، تجارتی لین دین اور کاروبار کو سنبھالنا سیکھ سکتا ہے۔ اسکول کے طلبہ بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ حجم ۱۷۴ صفحہ۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ حکیم غلام مصطفےٰ بک سیلر۔ حکیم منزل۔ کندیگران اسٹریٹ لاہور۔

ص ۔۔۔۔۔۔۔

رجسٹرڈ

فہرست مضامین

ایل نمبر ۲۴۸۲

جلد (۱۱) بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ نمبر (۵)

تصاویر: سیفو۔ سہ رنگی (۲) پروفیسر روس اور ان کے شاگرد (۳) مسٹر گرنیبے (۴) سفری یونیورسٹی میں مصوری کی تعلیم (۵) پیرا کی مشق (۶) سلطان خلجی کا مقبرہ (۷) چمپا باولی (۸) شاہی محل کا نظارہ (۹) زار روس کی بھتیجی۔

دنیائے ادب میں ایک انقلاب عظیم

اُفق صحافت پر ایک روشن اور زرنگار ستارے کا طلوع

"اُدبی دنیا" کا سالنامہ

ہم انتہائی مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بہترین ادبی رسالے کا سالنامہ جس کا نام ہی اس کے مقصد کی دلیل ہے زیر ترتیب ہے۔ ادبی دنیا کے عام نمبروں کی بہار آفریں اور حیات افروز نظمیں۔ دلکش اور ترنم ریز غزلیں دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانے۔ گرانقدر علمی اور تحقیقی مضامین۔ اور اس کی بے لاگ تنقیدیں تمام اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ادبی دنیا کا خاص نمبر کیسا ہوگا۔

سالنامہ مرتب ہو رہا ہے اور اس کے لئے جو مضامین حاصل کئے جا چکے ہیں ان کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے انقلابی پروگرام کا کامل مظہر ہوگا۔ ہندوستان تو کیا یورپ میں بھی دنیا بھر کے علم و ادب کا اس سے بہتر مجموعہ شائع نہ ہوا ہوگا۔ گرانقدر معاوضے پر مشہور اہل قلم سے جس پائے کے خاص مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ اور لکھوائے جا رہے ہیں۔ ان کی تفصیل بیحد مسرت انگیز ہے۔ مگر قبل از وقت ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے البتہ اتنا پھر کہہ سکتے ہیں کہ

"ادبی دنیا کا خاص نمبر ———— ادبی دنیا کا خاص نمبر ہوگا۔

یہ نمبر صرف اتنا ہی چھپیگا جتنے کی فرمائشیں درج رجسٹر ہو چکی ہونگی۔

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ خریداروں کو محصولڈاک کے علاوہ صرف ایک روپیہ میں ملیگا۔

اگر آپ بھی اس نمبر کی دلچسپیوں میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں تو جلد سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں ورنہ شائع ہو جانے کے بعد یہ نمبر کسی قیمت پر بھی نہیں ملسکیگا۔ ایجنٹ حضرات بھی جتنے پرچے منگانا چاہیں ان کی تعداد جلد سے جلد درج رجسٹر کرالیں۔

مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور

"ادبی دنیا" کا بے نظیر خیر مقدم

"ادبی دنیا" کے پہلے نمبر پر سب سے پہلے ہندوستان کی مشہور خبر رساں ایجنسیوں (ایسوشی ایٹڈ پریس اور فری پریس) نے شاندار الفاظ میں ایک ریویو کر کے زبانِ برق کی معرفت ہندوستان بھر کے روزانہ اخبارات میں شائع کرایا تھا۔

اُس وقت سے اب تک کہ رسالے کے چھ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی دنیا کی شہرت سے ہندوستان کا آباد حصہ روشناس ہو چکا ہے۔ ملک کے مقتدر انگریزی اخبارات میں سے بمبئی کرانیکل۔ ڈیلی کرانیکل۔ انڈین نیشنل ہیرلڈ انگلشمین، ٹائمز آف انڈیا۔ پاینیر۔ لیڈر ہندوستان ٹائمز۔ ٹریبیون مسلم اوٹ لک۔ سول ملٹری گزٹ وغیرہ نے بلند لہجے میں ادبی دنیا پر اظہار رائے کیا۔ ٹریبیون نے دو مرتبہ اور سول ملٹری گزٹ نے تین بار مختلف نمبروں پر ریویو کیا۔ اردو اخبارات و رسائل میں سے شاذ و نادر ہی کوئی پرچہ ہوگا جس نے اپنے ریویو میں ادبی دنیا کو اردو ادب کا بہترین پرچہ نہ بتایا ہو۔ گورمکھی اور ہندی کے پرچے ہمارے مضامین کا ترجمہ شائع کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم منتخب اہلِ علم اور اہل الرائے جن میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر کونسلوں کے ممبر، حکومت کے وزیر۔ تعلیمی رہنما۔ ملکی لیڈر بھی شامل ہیں۔ اپنی رایوں میں ادبی دنیا کی اشاعت کو اردو ادب میں ایک نئے دور کے آغاز سے تعبیر کر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا طبقات کے افراد کی بیش قیمت رائیں ہر نمبر میں شائع کی جاتی رہی ہیں۔ اس مرتبہ ہم پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے قابل عزت پریذیڈنٹ جناب آنریبل خان بہادر چودھری شہاب الدین صاحب، قبلہ پنجاب کے مشہور شاعر خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظر سابق گورنر کشمیر اور گورنمنٹ کالج لاہور کے قابل قدر استاد قاضی فضل حق صاحب ایم۔ اے کی قابل فخر رائیں شائع کر کے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

آنریبل خان بہادر جناب چودھری شہاب الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ پریذیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل

میں نے آپ کا مرسلہ رسالہ "ادبی دنیا" بڑی مسرت کے ساتھ مطالعہ کیا۔ آپ کے اس نادر تحفے کا شکریہ جس قدر ادا کیا جائے کم ہے!

میری ذاتی رائے ہے کہ "ادبی دنیا" اپنے صوری و معنوی محاسن کے اعتبار سے اردو دنیا کی ایک بالکل نئی چیز ہے! نثر کا لہجہ قدرتی، زبان شستہ اور سلیس ہے۔ نظم کی بحروں میں ہندی موسیقی اور دیسی تلمیحات کی چاشنی اردو کو اپنے من بھاتے لباس میں پیش کرتی ہے اور یہ رُوپ یقیناً تمام اہلِ ملک کے لئے (ہندو ہوں یا مسلمان) یکساں طور پر مرغوب اور جاذبِ نظر ہونا چاہیئے۔ اردو رسائل کی ترقی کے میدان میں غالباً یہ سب سے پہلا مؤثر اور جادہ شناس قدم اٹھا ہے جس کے نقوش میں ادبی اور ملّی یگانگت کے ذرّے چمکتے نظر آتے ہیں!

خصوصیت سے اُس کالم نے مجھے محظوظ کیا ہے جس میں نہ صرف ہندوستان کی علمی زبانوں سے اردو میں اقتباس کیا گیا ہے بلکہ ادبیات عالم کے لطیف و نظیف شہ کارے اور اُن کے اسالیبِ نفیسہ کے مرقعے اردو ترجمے کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں!

اس ہندوستانی رسالے کی ظاہری شان بھی یورپ اور امریکہ کے ادبی رسائل کی ہم شبیہ ہے! آپ کی یہ ادبی خدمت بجا طور پر تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کی سعی مشکور ہو اور آپ کا رسالہ مقبول!

چودہری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔ اے سابق گورنر کشمیر:-

رسالہ "ادبی دنیا" نظر سے گزرا اس کا ظاہر دلکش اور باطن دلنواز پایا۔ ادبی دنیا کے اضافے سے اب لاہور یقیناً ادبی دنیا کا ہیڈ کوارٹر ہو گیا ہے میں تہ دل سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

قاضی فضل حق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور:-

واقعی "ادبی دنیا" اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے "ہنگامی جرائد" پر تفوق رکھتا ہے اور میری دعا ہے کہ جن مقاصد عالیہ کو مدّنظر رکھ کر آپ نے اس جریدے کو جاری فرمایا ہے انہیں آپکو بوجہ اتم کامیابی حاصل ہو۔ آمین ثم آمین۔

حال وقال

"ادبی دنیا" کا یہ نمبر مضامین کے لحاظ سے پہلے نمبروں سے بہت بلند ہے۔ عملہ ادارۃ (ایڈیٹوریل سٹاف) کی قابلیت وسعت مطالعہ، اور رسالے کو اپنا سمجھ کر دل سے کام کرنے کی کوششوں کا ہر مضمون پتہ دے رہا ہے۔ مولینا صدیق بہاری رکن ادارۃ عربی لٹریچر سے بلند ترین مضامین کا اس خوبی سے ترجمہ کرتے ہیں کہ انداز بیان میں اصل ونقل کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ ملک کے مشہور شاعر اور اُس سے زیادہ مشہور افسانہ نگار سید عابد علی بی۔ اے ایل ایل۔ بی سابق ایڈیٹر ہزار داستان کو ہم نے مجبور کر کے گجرات سے لاہور کھینچ بلایا ہے۔ اب وہ اپنی تمام تر توجہ ادبی دنیا کے معیار کو بلند کرنے پر صرف کر رہے ہیں۔ اُن کے بلند پایہ افسانے، شگفتہ نظمیں اور مغربی ادبیات سے منتخب مضامین کے ترجمے ادبی دنیا کے ہر نمبر کو گراں پایہ بنا رہے ہیں۔ مولینا حامد انصاری رکن ادارۃ نے ایرانی ادبیات سے ایسے مضامین ترجمے کئے ہیں کہ اردو ادب میں اس پائے کے بلند مضامین بہت کم ملیں گے۔ مولینا عشرت رحمانی اگرچہ چند مجبوریوں سے ابھی تک لاہور نہیں پہنچ سکے لیکن اُنکے دماغ کی زریں مصروفیتوں میں ادبی دنیا سب سے زیادہ حصہ دار بن رہا ہے۔ غرضیکہ اسٹاف کا ہر ممبر ادبی دنیا کو دلچسپ بنانے میں سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔ عملہ ادارۃ کو بڑھانے میں اگرچہ اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ لیکن ادبی دنیا کے بلند معیار کو قائم رکھنے کے لئے ہمارے اسٹاف نے مشرقی ومغربی ادبیات سے اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ کر کے ایک ذخیرے کی صورت میں جمع کر دئے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ادبی دنیا کا اسٹاف ایسے مشہور ومنتخب انشا پردازوں پر مشتمل ہے جو مشرقی ومغربی زبانوں کے ماہر علم وادب کے نقاد اور اردو زبان کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

اہل نظر اور اہل رائے ادبی دنیا کی بے نظیر خصوصیات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو نظر رکھتے ہیں اُنہیں بتانے کی ضرورت نہیں اُن کے لئے تو یہ اظہار حقیقت خود ستائی اور اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کے ہم معنی ہوگا۔

ہم بھی جانتے ہیں کہ خود ستائی کوئی اچھی چیز نہیں لیکن جان بوجھ کر اس برائی کو اختیار کرنے پر حالات نے مجبور کر دیا ہے کیونکہ آنکھوں والوں میں اہل نظر بہت کم ہیں۔ اصل ونقل، نور وظلمت حقیقت اور نمائش میں فرق کرنے والے اکسیر کی طرح نایاب رہے ہیں۔ پروپیگنڈے کا طلسم صدف کو گوہر اور خزف کو جواہر میں تبدیل کر رہا ہے۔ ایسے بے حس لوگوں سے واسطہ پڑ رہا ہے جو مشک کو خوشبو سے معلوم کرنے کی بجائے عطار کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔

تصاویر:۔ ادبی دنیا کی تصاویر کے متعلق ہمارے مخالفین کو بھی اعتراف ہے کہ ادبی دنیا کی تصویروں نے رسالوں میں تصاویر کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ ہماری رنگین تصاویر تو عموماً رسالے سے نکال کر فریم میں لگائی جاتی ہیں۔ تصویروں کے انتخاب میں ہم نے ابتدا سے بڑی احتیاط برتی ہے۔ کسی تصویر سے چھچھورپن نہ ٹپکے، بازاری رنگ نہ پیدا ہو جائے۔ کوئی ایسی تصویر نہ ہو جو عموماً تصویری کارڈوں پر ہوتی ہیں۔ کسی تصویر میں عریانی اور حیا سوزی کا عنصر نہ ہو۔ تصویر چھوٹی اور بے حیثیت نہ ہو۔ غرضیکہ جتنی احتیاطیں ممکن تھیں انکو پیش نظر رکھ کر تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔

محترم خان محمد افضل خاں صاحب سب جج جھنگ (پنجاب) تصویری آرٹ میں خاص مہارت رکھتے ہیں ادبی دنیا کی تصویروں کے متعلق اُنکی ہمدردانہ تنقیدوں اور مشوروں نے ہمیں بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

مسٹر گوبند سروپ کپور (عطر چند کپور اینڈ سنز) نے نہ صرف اپنے بے نظیر البموں میں سے ہمیں اعلیٰ درجے کی تصاویر ہی بہم پہنچائیں بلکہ اپنے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور کے باکمال ایکسپرٹوں سے تصاویر کے نہایت اچھے بلاک بھی بنوا کر ہماری تصویری مشکلات کو حل کرتے رہتے ہیں۔

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس میں کلکتے کے ماہر بلاک میکر بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے ہیں۔ اور اب یہ پریس جہاں اپنی اعلیٰ طباعت کے لئے صوبے بھر میں سب سے بازی لے گیا ہے وہاں بلاک بنانے میں بھی کلکتہ کا مقابلہ کر رہا ہے۔

ایک پتلے دُبلے دائم المرض منتظم لالہ گوبند رام کپور نے اپنی انتظامی قابلیت سے دستی پریس سے شروع کر کے اِس پریس کو صوبے کا واحد پریس بنا لیا ہے۔

تاجور

ناظرینِ "ادبی دنیا" اور ایجنٹ حضرات

(از مینیجر رسالہ ادبی دنیا-لاہور)

اخبارات کے ایجنٹوں کی بدمعاملگی اور نادھندی کے حالات عموماً اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سے اخبارات صرف اپنے ایجنٹوں کی نادہندی کے سبب بند ہو چکے ہیں۔ چند خوش معاملہ ایجنٹوں کو الگ کر کے عام طور پر ایجنٹوں کی ذہنیت یہ ہے کہ چونکہ اخبارات و رسائل کے مالک ایجنٹوں سے بہت دور رہتے ہیں۔ اس لئے ہم خوش معاملگی دکھائیں یا بدمعاملگی۔ اخبارات کی فروخت سے جو روپیہ آئے اس میں سے جتنا جی میں آئے رکھیں جتنا چاہیں بھیج دیں کبھی بھیجدیں کبھی نہ بھیجیں بالکل ہی نہ بھیجیں اس بارے میں اپنے دل کے مختار ہیں۔ مالک اخبار کو نہ اتنی فرصت ہوگی نہ اتنی زحمت اٹھائیگا کہ تھوڑی سی رقم کے لئے نالشیں کرتا پھرے۔ اسی یقین کی بنا پر اخبارات کے ایجنٹ اخبارات کے مالکوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں اور چونکہ اخبارات و رسائل کی فروخت زیادہ تر ایجنسیوں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ایجنٹوں کے ستم رسیدہ اخبارات کبھی نہیں پنپتے۔ اور کبھی کبھی تو صرف اسی وجہ سے کوئی اخبار بند ہو جاتا ہے کہ بے رحم ایجنٹوں نے واجب الادا رقموں کی ادائیگی کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ادبی دنیا کو بھی ایک لقمۂ تر سمجھ کر ان حضرات نے دست درازیاں شروع کی تھیں مگر چونکہ ادبی دنیا کی زندگی کسی پہلو سے بھی ایجنسیوں کی منت گزار نہیں ہے۔ اس لئے ہم ایجنٹوں کی غارتگری سے بہت حد تک بچے رہے۔ ادبی دنیا کے پرچے دفتر سے اُسی ایجنٹ کو بھیجے جاتے ہیں جو یا تو مطلوبہ پرچوں کی قیمت پیشگی بھیجدے یا وی۔پی بھیجنے کی اجازت دے۔ اب کچھ دنوں سے وی پی منگوانے والے ایجنٹوں کا بھی تلخ تجربہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ بعض ایجنٹ جو وی پی کے ذریعہ پرچے طلب کرتے ہیں ریلوے والوں سے اسٹامپ دیکر پرچوں کا پارسل تو چھڑا لیتے ہیں مگر ریلوے کی رسید کا لفافہ جو وی پی کے ذریعے پہنچتا ہے اسے واپس کر دیتے ہیں اور اس طرح دفتر والوں کو بےبس کر کے من مانا کمیشن وصول کر لیتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ (۱) صرف انہیں ایجنسیوں کو پرچہ بھیجا کریں گے جو کمیشن کے دام کاٹ کر مطلوبہ پرچوں کی قیمت پیشگی بھیجدیا کریں گے۔ (۲) اگلے نمبر سے ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جائیگا۔ (۳) جو ایجنٹ ڈاک خانے کی معرفت پرچے منگائیں گے انہیں آدھا محصول ڈاک بھی ادا کرنا پڑے گا۔ (۴) کسی ایجنٹ سے کوئی پرچہ واپس نہیں لیا جائیگا۔

"ادبی دنیا" کے ناظرین میں سے جو حضرات مقامی ایجنسیوں سے پرچہ خرید اکرتے ہیں وہ اگر کسی مہینے اپنے شہر کی ایجنسی پر ادبی دنیا کو نہ پائیں تو سمجھ لیں کہ مقامی ایجنسی کی کسی بدمعاملگی کی وجہ سے دفتر سے پرچہ نہیں بھیجا گیا۔ بدمعاملہ ایجنٹوں نے ایک اور شرارت یہ شروع کی ہے کہ جب ان کی نادھندی کے سبب انہیں پرچہ بھیجنا بند کر دیا جاتا ہے تو یہ مشہور کرنے لگتے ہیں کہ (خاکش بدہن) ادبی دنیا بند ہو گیا ہے۔ اس لئے ناظرین ادبی دنیا کو کسی ایجنٹ کی بات پر اعتبار کرنے سے پہلے دفتر ادبی دنیا سے معلوم کرنا چاہیئے۔ اور ایسی صورت میں سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ براہ راست ادبی دنیا کے دفتر سے پرچہ طلب کیا جائے کیونکہ دفتر سے جو پرچہ روانہ کیا جاتا ہے ڈاک کا ٹکٹ لگانے کے علاوہ اُس کا محصول دے کر ڈاک خانے سے اُس پرچے کی رسید بھی لی جاتی ہے۔

سید امام علی نازش نے صرف دو ڈھائی ماہ تک ادبی دنیا کے انتظامی عملے سے متعلق ہو کر کام کیا تھا اس کے بعد وہ ہمارے لئے اور ہم اُن کے لئے غیر ضروری ہو گئے۔ اسی بنا پر ان کی ملازمت کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں پوسٹروں میں کبھی اخباروں میں اُن کے نام کے ساتھ "ایڈیٹر ادبی دنیا" کا ضمیمہ بھی لکھا جاتا ہے۔ اس سے ادبی دنیا کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ نازش صاحب ادبی دنیا کے ایڈیٹوریل سٹاف سے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وابستہ نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اُنکی ملازمت کا تعلق مینیجنگ اسٹاف سے تھا اور اب چار ماہ سے ادبی دنیا کے کسی عملے سے اُن کا کوئی تعلق نہیں

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ادبی دنیا کے ایک پرچہ پر ایک روپیہ لاگت آتی ہے مگر ہم صرف اپنے ادبی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے نوسو روپے ماہوار کے نقصان پر اس کو چلا رہے ہیں۔ اِدھر یہ حالت ہے اُدھر ایجنٹوں کا تقاضا ہے کہ کمیشن پچیس فی صدی کر دیا جائے اور ان کی اسی روز روز کی ہائے ہائے سے مجبور ہو کر ہم نے آئندہ ماہ سے پرچے کی قیمت میں ایک آنہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ دسمبر سے ادبی دنیا ایجنٹوں سے نو آنے میں ملا کریگا۔ البتہ جو صاحب دفتر سے طلب کریں گے ان کو بدستور سابق صرف آٹھ آنے میں بھیجا جائیگا۔

مینیجر

آئینۂ عالم

پنجاب یونیورسٹی اور تصانیف شبلی

سر سید اسکول کے ممبر مغربی ادبیات اور ان کی ترقیوں سے بے خبر رہتے ہوئے بھی اُردو زبان میں جس پائے کی کتابیں لکھ گئے گئے۔ چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد بھی اب تک اردو بولنے والوں میں کوئی ایسا مصنف نہیں اٹھا جسے شبلی۔ حالیؔ۔ نذیر احمد اور آزاد کا جانشین کہا جا سکے۔

اہل علم و فضل کی اس برگزیدہ جماعت میں یوں تو ہر فرد بجائے خود یکتائے روزگار تھا۔ لیکن خصوصیت سے علامہ شبلی مرحوم کی بلند پایہ تصانیف تو نہ صرف اردو ادب اور نہ صرف ہندوستانی لٹریچر بلکہ مشرقی ادبیات پر بین الاقوامی تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن نے شبلی کی شعر العجم کی ایک جلد کا ترجمہ کرا کے اُسے اپنی کتاب "ہسٹری آف پرشیا" کا حصہ بنا لیا ہے۔ پروفیسر براؤن اس وقت دنیا میں ایرانی ادبیات کا بے نظیر مبصر اور اسپیشلسٹ خیال کیا جاتا ہے۔

اس واقعے سے ہندوستان کے ایک یوریا نشین اور یورپی تحقیقات سے بے خبر مولوی کے تصنیفی رتبے کا اندازہ کرو کہ دنیا کا ایک بے نظیر مستشرق یورپ میں بیٹھ کر ہندوستان کے ایک دیسی مصنف کی تحقیق و تنقید کے سامنے قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔ اس سے جہاں براؤن کی وسیع الخیالی اور قدر شناسی قابل صد ہزار تحسین ٹھہرتی ہے وہاں بحیثیت ایک مصنف و محقق کے شبلی بھی ہندوستان اور ایشیا کیلئے مایۂ عزت و افتخار بن جاتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ اردو مصنفوں۔ نقادوں اور انشا پردازوں میں سے کون شخص ہے جو ایمانداری سے یہ کہہ سکے کہ میں نے شبلی کی کتابوں سے کچھ نہیں سیکھا؟ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے مشرقی نصاب شبلی کی تصانیف کے بغیر نامکمل رہ جاتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی جس کے جاری کرنے کا اہم مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ اسکے ذریعے مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کو زندہ کیا جائے گا۔ یوں تو مشرقی لٹریچر کی زندگی اور ترقی سے اس کی بے پروائی ایک حقیقت بن چکی ہے لیکن سر سید اسکول کے مصنفوں سے تو اسکی بے نیازی بہت افسوسناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔

مولانا آزاد کے بعد اب اس یونیورسٹی کی الوداعی توجہات علامہ شبلی کو اپنا مرکز بنا رہی ہیں۔

شبلی کی جس بے نظیر تصنیف شعر العجم سے یورپ کے اہل علم رہنمائی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں پنجاب یونیورسٹی سے اُسے رفتہ رفتہ رخصت کیا جا رہا ہے۔ کل تک جو شعر العجم دوسری یونیورسٹیوں کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات اور فارسی کے ایم۔ اے تک نصابوں کا ضروری عنصر تھی آج اُس کا صحیح قائم مقام تلاش کئے بغیر اُسے ان نصابوں سے خارج کیا جا رہا ہے۔ اور یونیورسٹی کے "سٹڈی بورڈ" کی ضرورت سے زیادہ توجہ فرمائی سے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ علامہ شبلی کی کتابوں کا پنجاب یونیورسٹی کے حدود میں داخلہ بند ہونے والا ہے۔ بہر حال مولوی عبد الحق صاحب علمی دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ شبلی کے خلاف اُن کے اجیر کی ریشہ دوانیاں پنجاب میں حسب مراد کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔

بچوں کا عجائب خانہ

کسی ملک کا عجائب خانہ بھی ایک خاموش مدرسہ ہوتا ہے۔ لیکن اوقات اس کی تعلیم دوسرے مدرسوں سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

امریکہ والے کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے عجائب خانوں کو پبلک کے فہم کے مطابق بنا دیں۔ تاکہ لوگ اُن کی طرف کھنچیں اور ان سے درس حاصل کریں۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے کئی عجائب خانے کھولے ہیں۔ جن کی رنگ برنگ چڑیاں اور دوسری چیزوں کو اسکول کے بچے اپنے گھر لے جا کر کئی کئی دن رکھ سکتے ہیں۔

امریکہ کے ایک مخیر امیر مسٹر جون نے اُن کے منتظموں کو پینتالیس لاکھ روپیہ اس غرض سے عطا کیا ہے کہ اُن میں ایک تاریخی منظر کا سامان کیا جائے جس میں انسان کے عصر حجری (The Stone age) سے لیکر اس وقت تک کی درجہ بدرجہ ترقی کو بہ یک وقت بچوں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں بھی عجائب خانے اور چڑیا گھر ہیں اور روزانہ ان میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ پھر کتنے ہندوستانی بچے، اور کتنے بچوں کے باپ ہیں جو کبھی ان عجائب گھروں سے ایک بے معنی حیرت کے سوا کسی قسم کی معلومات لائے ہیں؟

آبادی کے لحاظ سے تصنیف و تالیف کے اعداد و شمار

گذشتہ اعداد و شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف میں ڈنمارک تمام مہذب ملکوں میں سب سے آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا۔

ہر دس ہزار آبادی پر ایک کتاب کے لحاظ سے

ڈنمارک	۱۱ر۴
ہالینڈ	۹ر۰
جرمنی	۵ر۲
فرانس	۳ر۸
انگلستان	۳ر۰
امریکہ	۰ر۸۵

اسی جدول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ تصنیف و تالیف میں سب سے پیچھے ہے۔ مگر اس کے باوجود امریکہ والے مطالعے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ تصنیف و تالیف میں کمی کی وجہ ہی ہے کہ وہاں سے اخبار و رسالے اسقدر نکلتے ہیں کہ انہی کے پڑھنے سے لوگوں کو فرصت نہیں ملتی۔ اور بعض ہفتہ وار اخبارات کا وزن کئی کئی کتابوں کے برابر ہوتا ہے۔

بچوں کی تربیت

یورپ کے ایک مشہور ماہر تربیت سے پوچھا گیا تھا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدین پر عاید ہوتی ہے یا استاد پر؟ اس نے جواب دیا ہے کہ دونوں اس کے ذمہ دار ہیں کیونکہ آدمی جبتک بچہ ہوتا ہے اور لکھنے پڑھنے پر قادر نہیں ہوتا تو وہ جو کچھ سیکھتا ہے اپنے والدین سے سیکھتا ہے۔ مگر چار یا پانچ سال کا ہو جانے کے بعد اس کے اخلاق کی تعمیر کا کام استاد کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور اس عمر کو پہنچ کر بچے اپنے استادوں ہی کا اثر لیکر جوان ہوتے ہیں۔

یورپ کے ولادتی اعداد و شمار

پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ پیدائش کی تعداد میں کمی کی شکایت صرف فرانس کو ہے۔ مگر گذشتہ اعداد و شمار نے انگلستان اور جرمنی کو بھی اسی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔ انگلستان کی روزانہ پیدائش کی تعداد ۱۸۵۵ء سے بھی کم ہو گئی ہے۔ حالانکہ اُس وقت آبادی تقریباً دس لاکھ کم تھی۔ اسی طرح جرمنی کی پیدائش ۱۸۸۰ء میں ہر ایک ہزار خاندان میں ۳۰ر۷ تھی۔ مگر اب صرف ۱۳۸ ہے۔

اس کمی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اب خود والدین نہیں چاہتے کہ ان کے زیادہ اولاد ہو، اور ان کی حسب منشا پرورش نہ ہو سکے۔

دنیا کا سب سے پرانا اخبار

دنیا کا سب سے قدیم اخبار چین کا اخبار "پیکن" ہے جسے جاری ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس طویل مدت میں جتنے اہل قلم اس میں کام کر چکے ہیں اُن میں سے ابتک ۱۵۰۰ آدمیوں کو باغیانہ تحریر کی پاداش میں قتل کی سزا دیجا چکی ہے۔ ملک چین کی یہ عجیب صفت ہے کہ ہر چیز کی طرف پہلا قدم وہی اٹھاتا ہے۔ مگر انتہا تک پہنچنے سے پہلے ہی اس سے مستغنی ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چین ہی نے پہلے پہل کاغذ بنایا۔ اُسی نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔ اُسی نے سب سے پہلے اخبار بھی جاری کیا۔ مگر اُنکی ترقی اور انتہا تک پہنچانیکا کام یورپ کیلئے چھوڑ دیا۔

خود بخود جلنے والا چراغ

ایک الیکٹرک کی انگریزی کمپنی نے ایک ایسا لمپ ایجاد کیا ہے جس کو کہربائی مرکز سے کوئی تعلق نہیں بلکہ جب کہر پڑتی ہے تو اس کا مشتعل ہونیوالا حصہ اس سے متاثر ہو کر خود بخود روشن ہو جاتا ہے۔ کہر والے دنوں میں یہ لمپ اسکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔

ملیریا ہندوستان میں

ڈاکٹر روس لندن کی ایک علمی تقریر میں فرماتے ہیں کہ سیلون کے تین حصوں میں سے دو حصے صرف اس لئے غیر آباد ہیں کہ وہاں ملیریا کا دَور دورہ رہتا ہے۔ آباد حصے میں بھی بہت سے مقامات کی آبادی اس کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ چند سال پہلے وہاں کی آبادی ۸۰۰۰۰ تھی مگر ملیریا کی وجہ سے اب صرف ۲۳۰۰ رہ گئی ہے۔

تاجور

سیفو

یونان کی مشہور شاعرہ

امشب آتشیں روئے گرم زندخوانی ہاست　(غالب)

رنگینیٔ شباب کی دنیا کہوں اسے　　باغ نشاط کا گلِ رعنا کہوں اسے

یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا　　رعنائیٔ "بہارِ نظارا" کہوں اسے

اس جسمِ زرنگار سے جاری ہے موجِ رنگ　　شادابیوں میں جلوۂ مینا کہوں اسے

اس چشمِ سحرکار میں لرزاں ہیں مستیاں　　آئینہ دارِ عشرتِ صہبا کہوں اسے

روشن ہے اسکے عشق سے تصویر کائنات　　اک پرتوِ چراغِ تجلّیٰ کہوں اسے

اسکے فروغِ حسن سے ذرے ہیں رقص میں　　مستی کا ایک فتنۂ برپا کہوں اسے

اسکی سہیلیوں کو کہوں انجمِ نشاط　　اور ماہتابِ آئینہ سیما کہوں اسے

وہ گیت گا رہی ہے بہارِ شباب کے　　اس انجمن کی انجمن آرا کہوں اسے

اشعار اس کے نورِ ترنم میں غرق ہیں　　نغموں کی لرزشِ طرب افزا کہوں اسے

یہ حسنِ باوقار ہو صرفِ نیازِ عشق　　سرگشتۂ جنونِ تمنّا کہوں اسے

یہ روئے شعلہ کار ہو رہنِ گدازِ عشق　　وارفتۂ فسونِ تماشا کہوں اسے

تو آپ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لے

اے عشق پائے ناز میں زنجیر دیکھ لے

(عابد)
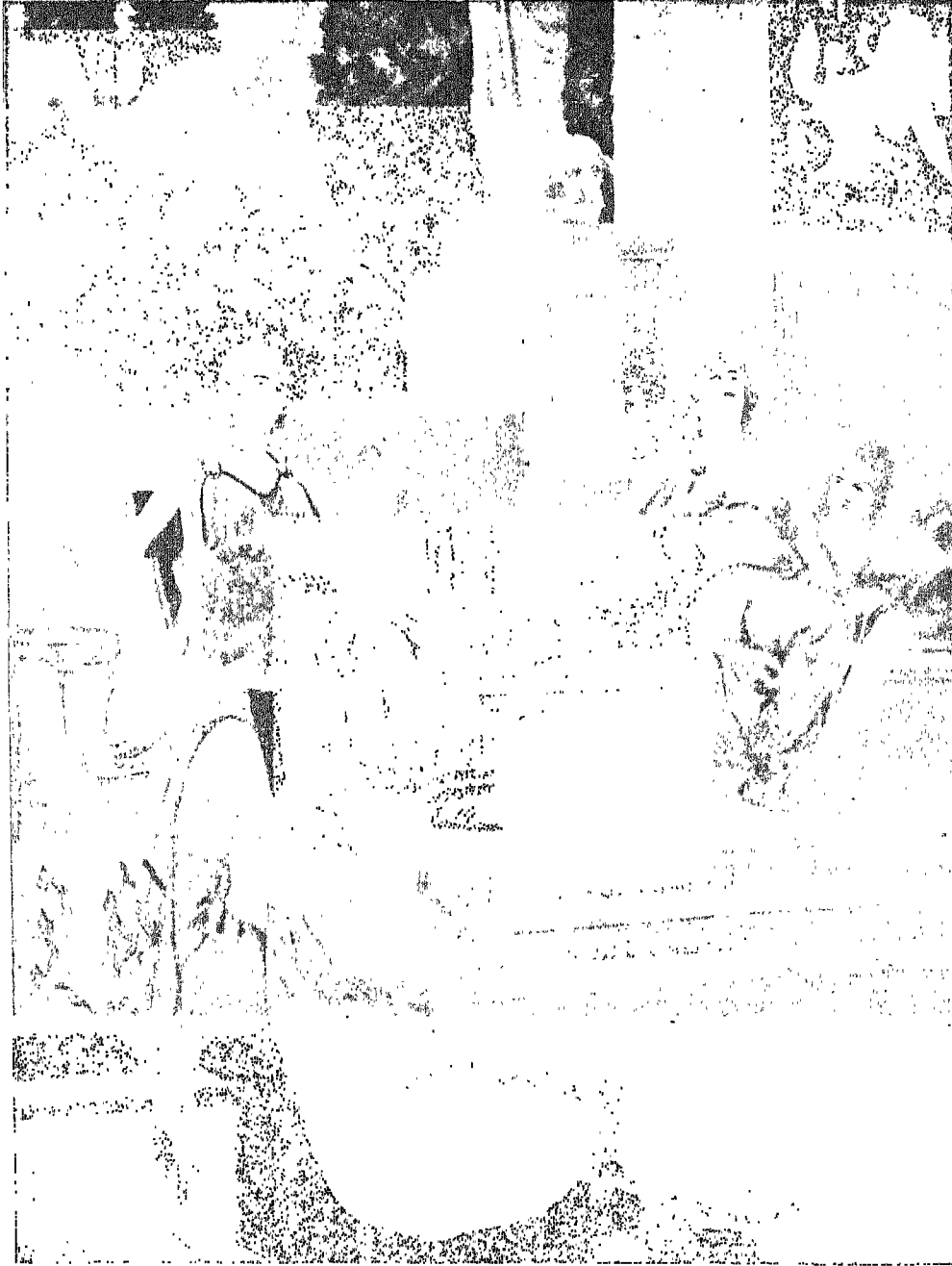
یونان کی مشہور عالم شاعرہ سیفو جو اپنے غلام سے محبت کرنے کے
جرم میں قتل کر دی گئی تھی

مغربی یونیورسٹی میں مصوری کی تعلیم

پروفیسر روس اور اُن کے شاگرد

مسٹر گوالے کلاس میں لیکچر دے رہے ہیں

مغربی یونیورسٹی کے جہاز میں یوگا کی مشق

سفری یونیورسٹی

گذشتہ دنوں امریکہ کی سفری یونیورسٹی کے ساتھ ڈاکٹر روس کلکتہ پہنچے تو خیال ہوا کہ دُنیا کے اس بڑے سیاح اور فلسفۂ عمران کے سب سے بڑے ماہر سے ملکر امریکہ کے متعلق کچھ سنوں اور ہندوستان کے متعلق کچھ سناؤں ۔ مغرب کے وقت یہ سوچکر گھر سے چلا کہ ہوٹل کے کسی گوشۂ تنہائی میں ان کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھونگا وہ مجھ سے ہندوستان کی حالت پوچھیں گے میں اُن سے امریکہ کی کیفیت دریافت کرونگا ۔ اور ڈیڑھ دو گھنٹے پُر لطف علمی صحبت رہیگی ۔

لیکن ڈاکٹر روس نے مجھ سے ملنے کا جو سامان کر رکھا تھا وہ میرے خیال اور میری آرزو کے خلاف نکلا ۔ میں ہوٹل میں پہنچا تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملے مگر جب میں نے ادرگرد دیکھا تو کئی اور اہل علم بھی بیٹھے نظر آئے ۔ جو غالباً میری ہی جیسی تمنا لیکر اُن سے ملنے آئے تھے ۔ میں کسی مناسب گوشے میں بیٹھنے کی فکر میں لگا ہوا تھا کہ ڈاکٹر روس نے کہا " میں اپنی یونیورسٹی کے طلبہ کے ایک گروپ کے سامنے آپ حضرات سے ہندوستان کے متعلق کچھ بات کرنی چاہتا ہوں " یہ کہکر ہم کو ایک بڑے کمرے میں لے گئے ۔ جو خاصا لیکچر ہال معلوم ہو رہا تھا ۔ ساٹھ طلبہ جن میں تقریباً نصف لڑکیاں تھیں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ ہم اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ۔ تو ڈاکٹر روس نے ایک فہرست نکالی ۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کے متعلق سینکڑوں سوالات پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے ۔ انہوں نے اس میں سے دیکھ دیکھ کر ہم سے سوال کرنا شروع کیا ہم اُن کے سوال کا جواب دیتے پھر طلبہ اور پروفیسر ہم پر جرح کرتے جب اُن کی تشفی ہو جاتی تو دوسرا سوال ہوتا ۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے اسی سوال جواب میں مصروف رہنے کے بعد ہمیں فرصت ملی اور میں یہ سوچکر چلا آیا کہ کل جب ہم سائل ہونگے اور ڈاکٹر صاحب جواب دینے والے ۔ تو آج کا بدلہ لے لیا جائیگا ۔

ڈاکٹر روس کو فلسفہ اور علم اجتماع میں کافی شہرت حاصل ہے ۔ اور ان دونوں علوم پر بائیس ۲۲ کتابیں لکھ چکے ہیں ۔ یہ امریکہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے بچپن میں والدین کے ساتھ کاشتکاری میں مشغول رہے جب ذرا ہوش سنبھالا تو ایک سکول میں داخل ہو گئے ۔ اور وہاں کی تعلیم ختم کر کے کالج کی تعلیم حاصل کرنے لگے ۔ اس کے ساتھ ہی کالج کا خرچ پورا کرنے کے لئے ایک سکول میں نوکری کر لی ۔ یونیورسٹی کی ڈگری مل گئی تو مختلف زبانوں کی تحصیل کے لئے جرمنی گئے مگر برلن پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ زبان سے فلسفہ افضل سمجھا جاتا ہے ۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنا خیال بدل دیا ۔ اور صرف فلسفہ کی تکمیل میں لگ گئے ۔ امریکہ واپس آئے تو سٹانفورڈ یونیورسٹی میں اقتصادی سیاست (پولیٹیکل اکانومی) اور علم اجتماع کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ اسی درمیان میں ایک واقعہ رونما ہوا ۔ جو ہماری عبرت پذیری کے قابل ہے ۔ یونیورسٹی نے ان کو اپنے عہدے سے اس جرم میں برخاست کر دیا کہ وہ دوسروں کی تحقیقوں اور رایوں سے بے پروا ہو کر اپنے ضمیر کی رہنمائی میں درس دیا کرتے ہیں ۔ لیکن ان کی برطرفی کے بعد یونیورسٹی کے تمام پروفیسروں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی حد تک مقید ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنی رائے نہیں ظاہر کر سکتے ۔ سات پروفیسروں نے احتجاج (پروٹسٹ) کے طور پر استعفا بھی دیدیا ۔ اخبارات نے بھی اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور سارے ملک میں شور مچگیا کہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر اپنی تحقیق اور اپنے نظریئے کے خلاف درس دینے پر مجبور کئے جاتے ہیں اور جو اپنے ضمیر کے مطابق بولنے کی جرأت کرتا ہے وہ برطرف کر دیا جاتا ہے! آخر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا ۔ آزادی نے فتح پائی ۔ ڈاکٹر روس اور دوسرے پروفیسر دوبارہ یونیورسٹی میں اپنے اپنے عہدوں پر واپس آگئے ۔

ڈاکٹر روس اقتصادیات اور فلسفۂ اجتماع کے اُن چند مصنفوں میں سے ہیں جو اپنی تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس کی بنیاد حقیقی زندگی اور اس کے مشاہدات پر رکھتے ہیں ۔ یہ صرف نئے نئے نظریئے نہیں پیش کیا کرتے ۔ بلکہ دنیا کی سیاحت کرتے ہیں ۔ شہروں کو دیکھتے ہیں ۔ دیہاتوں میں جاتے ہیں ۔ ہوٹلوں اور گھروں کی زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ خود وہاں کے رہنے والوں سے وہاں کے حالات

سنتے ہیں۔ اس کے بعد کسی ملک کے متعلق کچھ لکھتے یا بولتے ہیں جنوبی امریکہ۔ یورپ اور جنوبی افریقہ کی کئی بار سیاحت کر چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جمہوریت کے اعلان کے بعد چین گئے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کے متعلق ایک جامع کتاب شائع کی۔ سوویٹ گورنمنٹ قائم ہو جانے کے بعد ۱۹۱۷ء میں روس تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے آکر روس کے ماضی، حال اور مستقبل پر تین جلدوں میں ایک بہترین کتاب لکھی۔ اتنی علمی پختگی کے بعد بھی وہ ہمیشہ علم و معرفت کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ اور صرف عقلی اور نظری ہی معرفت کے نہیں بلکہ ایسی بار آور اور نتیجہ خیز معرفت کے جو مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی معاشرتی زندگی سے اخذ کیا گیا ہو

سفری یونیورسٹی

دوسرے دن وقت مقررہ پر میں پھر ہوٹل پہنچا اور ڈاکٹر روس سے امریکہ کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ جن میں سے بعض یہ تھے:۔

میں نے پوچھا کہ "آپ نے یہ دنیا کا چکر کاٹنے والی سفری یونیورسٹی کی بدعت خوب جاری کی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ "اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کتابوں کے دائرے سے نکلکر کرۂ ارض کے مشاہدات پر قائم ہو۔ اور طلبہ علم جغرافیہ کتابوں اور لکچروں سے حاصل کرنے کے بجائے خود دنیا کی سیاحت کر کے حاصل کریں۔ اور جہاں جہاں جائیں وہاں کی سیاسیات اقتصادیات اجتماعیات۔ وہاں کی تاریخ۔ وہاں کے مذاہب اور تہذیب و تمدن کے متعلق سنی سنائی باتوں کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کریں۔ ہماری یونیورسٹی کے طلبہ ہندوستان کی تاریخ یہاں کی سیاست۔ یہاں کی سوسائٹی اور یہاں کے اجتماعی مسائل پر خاص خاص کتابیں پڑھ چکے ہیں اب خود یہاں آئے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکینگے۔ وہ تقریباً ایک ماہ ہندوستان میں رہینگے۔ یہاں کی کیفیت یہیں کے مشہور رہنماؤں اور بڑے بڑے لوگوں سے سنینگے یہاں کی تاریخی یادگاروں اور یہاں کی عظمت رفتہ کے نقوش اپنی آنکھوں سے دیکھینگے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم دنیا کا ہر ملک اور کسی ملک کا ہر حصہ نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے ہم نے ایسے ملک اور ایسے مقامات منتخب کر لئے ہیں جو اپنے اردگرد کے طرز معاشرت کی نمائندگی کرتے ہوں۔ ہم امریکہ سے چل کر جزائر فلپائن میں پہنچے۔ ہمارے طلبہ نے وہاں کے باشندوں اُن کی طرزِ معاشرت ان کے آپس کے خاندانی تعلقات۔ ان کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج اور امریکہ کے ساتھ اُن کے تعلقات کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر چین آئے اور وہاں کے حالات دیکھے۔ چینی راہنماؤں سے وہاں کی کیفیات سنیں۔ اس کے بعد ہم سیام پہنچے اور وہاں سے ہندوستان آرہے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر مصر جائیں گے۔ وہاں سے فلسطین اور ٹرکی جائیں گے۔ اس کے بعد یورپ کا دورہ کریں گے۔"

"اس یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ۱۱۵ ہے جن میں تقریباً نصف لڑکیاں ہیں۔"

"ہر طالب علم سالانہ ۵۹۰ پونڈ فیس ادا کرتا ہے۔ جس میں اس کی رہائش۔ تعلیم اور سیاحت کے تمام اخراجات شامل ہیں۔"

"امتحان ہم جہاز ہی میں لیتے ہیں یا ان شہروں میں جہاں اترتے ہیں۔"

"جب تک جہاز میں رہتے ہیں۔ لکچر دوپہر سے پہلے اور دوپہر کے بعد ہوا کرتے ہیں۔ مگر جب کہیں اترتے ہیں۔ تو دوپہر سے پہلے ہی ختم کر دئے جاتے ہیں۔ تاکہ طلبہ وہاں کی سیر کر سکیں اور فطرت کے لکچر میں شامل ہو سکیں۔"

جی ہاں! امریکی حکومت اس یونیورسٹی کے ڈپلومہ کو معتبر سمجھتی ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کر چکی ہے۔

میں نے پوچھا کہ "ایسی یونیورسٹی جاری کرنے کا خیال آپ کو کیسے اور کب ہوا؟"

ڈاکٹر روس نے جواب دیا کہ "۱۸۷۵ء میں ایک شخص نے ایک خیالی افسانہ لکھا جس میں اُس نے دکھایا تھا کہ ایک یونیورسٹی کے طلبہ دنیا کے مطالعے کے لئے کتاب دیکھنے اور پڑھنے کی بجائے خود دُنیا کا چکر لگا رہے ہیں۔ یہی تخیل تھا جس نے ۱۹۲۶ء میں عملی صورت اختیار کی جب ۵۰۰ طلبہ کی ایک جماعت امریکہ سے ایک جہاز میں بیٹھکر دنیا اور دنیا والوں کے مطالعے کو چلی۔ لیکن اس وقت مطالعہ اور درس کا کوئی خاص نظم نہیں تھا۔ صرف چند اساتذہ اُن کی رہنمائی کے لئے ساتھ تھے۔

گذشتہ سال رسالہ "ایشیا" کے ایڈیٹر مسٹر گرینیے نے سوچا کہ اس جدت کو رواج دینے اور کامیاب بنانے کے لئے ایک باضابطہ سفری یونیورسٹی جاری کرنی چاہیئے۔ پبلک نے بھی ان کی آواز پر لبیک کہا اور یہ نئی یونیورسٹی ظہور میں آگئی۔ جو اپنی پہلی سیاحت میں آپ کے سامنے ہے۔ مسٹر گرینیے آجکل اس کے رجسٹرار ہیں۔"

امریکہ اور یورپ کے تمدن کا فرق

میں نے کہا کہ آپ کی یونیورسٹی غالباً خاص امریکن تمدن کی پیداوا

ہے کیونکہ میرے خیال میں یورپ میں ایسی یونیورسٹی نہیں جاری ہو سکتی - پھر امریکہ اور یورپ کے تمدن میں خاص فرق کیا ہے ؟"

انہوں نے جواب دیا کہ " امریکن تمدن یورپ ہی کے تمدن کی بنیاد پر قائم ہے لیکن وہ یورپین تمدن سے آگے بڑھ گیا ہے اور قدامت پرستی کو بالکل ترک کر چکا ہے - ہم امریکہ میں کسی کا احترام اُس کے اصل و نسل کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے کرتے ہیں - ہم خاندان اور حسب و نسب کے اُن جھگڑوں کو جانتے تک نہیں جو یورپ میں رائج ہیں - علاوہ بریں ہم کسی ایسے پیشے اور دستکاری کو حقیر نہیں سمجھتے جس میں کسی حد تک ذہنی مہارت بھی شامل ہو اور محض جانوروں کے عمل کی طرح صرف جسم اور رگ پٹھوں تک محدود نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے اکثر طلبہ اپنی روزی اپنے گاڑھے پسینے سے حاصل کرتے ہیں - اس سفری یونیورسٹی میں بھی لڑکے تو الگ رہے بعض لڑکیاں ایسی ہیں جو ہمارے کپڑے دھو کر اپنا خرچ نکالتی ہیں - جب میں سٹانفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے موجودہ پریذیڈنٹ مسٹر ہوور وہاں کے ایک غریب طالب علم تھے - اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا کرتے تھے - اور پڑھنے سے جو وقت بچتا اس میں دوسروں کا کام کر کے اپنے اخراجات پورے کرتے تھے - امریکہ میں علمی روح یورپ سے بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے - اسی کی وجہ سے وہاں صنعت بھی بہت ترقی کر گئی ہے - اور یورپ سے بہت زیادہ عام ہو چکی ہے - ہم میں اور یورپ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے - کہ ہم خوشحالی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں - رہبانیت اور فقر و فاقہ کے فضائل پر ایمان نہیں لاتے اور ہم اُس شخص کا احترام کرتے ہیں - جو مالدار ہونے کے لئے کچھ کام کرتا ہے - جب وہ مالدار ہو جاتا ہے تو اس کا احترام بھی ہمارے لئے اسوقت غیر ممکن ہے - جب وہ کوئی کام نہ کرے اور امریکن قوم کا ایک عضو معطل بن جائے - اس لئے ہم میں کوئی بیکار نہیں رہتا - نہ کوئی بھوکوں مرتا ہے اور نہ کوئی بیٹھ کر عیش اڑاتا ہے"

غربت اور فقیری کا علاج

میں نے کہا " لیکن آپ میں جو غریب ہیں اُن کا آپ کیا سامان کرتے ہیں ؟"

انہوں نے جواب دیا کہ " امریکہ میں ایک مزدور کی اُجرت ساری دنیا کی مقررہ اُجرت سے زیادہ ہے پھر بھی ہم ہمیشہ مزید اضافے کی فکریں لگے رہتے ہیں - ہمارا اعتقاد ہے کہ امریکہ کی عام خوشحالی اسی مزدوری کی زیادتی پر موقوف ہے - وہاں اُجرت اتنی کافی ملتی ہے کہ ایک مزدور مزے میں کھاپی کر اپنی بیکاری اور بیماری وغیرہ کیلئے کچھ پس انداز بھی کرسکتا ہے - میکسیکو میں مزدوروں کی کمائی قمار بازی کی نذر ہو جاتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے ہیں - مگر ہم نے قمار بازی قانوناً بند کر دی ہے - اس لئے ہمارے پاس کافی دولت جمع ہو گئی ہے - روپیہ جمع کرنے کے وسایل بھی ہمارے ہاں بہت ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم بیمہ کمپنیاں ہیں جو اس وقت ۳۰ ملین (تین کروڑ) امریکیوں کی غربت - مرض اور موت وغیرہ کی ضامن ہیں - اس کے علاوہ ہم فقر و فاقہ کا علاج تعلیم سے کرتے ہیں - ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں ۱۴ سال اور اکثر میں ۱۶ سال کی عمر سے پہلے کوئی لڑکا مزدوری نہیں کرسکتا - ہر ریاست میں ابتدائی اور ثانوی (سکنڈری) تعلیم جبری ہے - لڑکے اپنی ۱۴ یا ۱۶ سال کی عمر تک قانوناً تعلیم میں لگے رہتے ہیں - اور اسی درمیان میں کوئی کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں - حالات اجازت دیں تو ان میں سے ذہین طلبہ یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں - آجکل ہماری یونیورسٹیوں میں ایک ملین (دس لاکھ) طلبہ تعلیم پا رہے ہیں اور یہ ایسی تعداد ہے کہ ساری دنیا کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ کی مجموعی تعداد بھی اس سے کم ہے - غریبوں کی امداد کے لئے امریکہ میں سیکڑوں انجمنیں قائم ہیں - کہیں صورتوں میں حکومت بھی ان کی مدد کرتی ہے - لنگڑے - لولے اور دائمی مریضوں کے لئے خاص خاص جائے پناہ بنی ہوئی ہیں - امریکہ کی سڑکوں پر آپ کو کوئی بھیک منگا تلاش کرنے پر بھی نہیں ملسکتا - لاوارث بچوں اور غریب ماؤں کو حکومت کی طرف سے ضروریات مہیا کی جاتی ہیں -

عورتوں کی آزادی

میں نے دریافت کیا کہ " امریکہ کی عورتوں پر نئے حالات کا کیا اثر پڑا ہے ؟"

ڈاکٹر روس نے جواب دیا کہ " آجکل امریکن عورت روسی عورتوں کے سوا تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ آزاد ہے - اس کے لئے امریکہ میں مردوں کی طرح ہر کاروبار کا دروازہ کھلا ہوا ہے - اس لئے ایک امریکن عورت کے نزدیک طلاق کوئی اہم چیز باقی نہیں رہی ہے - اس وقت وہاں طلاق کی اوسط ہر سات شادی میں ایک ہے - طلاق کے طلبگاروں میں ایک تہائی مرد ہیں اور دو تہائی عورتیں - پہلے کی

بہ نسبت اب عورتوں کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی ہے - آجکل کوئی عورت گھر کی خدمتگاری بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی مشکل ہی سے قبول کرتی ہے - عورتوں کی آزادی کا ظاہری اثر یہ پڑا ہے کہ وہاں کے مرد پہلے سے زیادہ صاف ستھرے اور زیادہ پاکیزہ نظر آتے ہیں - اور عورتوں کو رجھانے کے لئے بننے سنورنے اور چہرے کی صفائی کا بہت خیال رکھتے ہیں:

شراب کی بندش

میں نے پوچھا کہ شراب کے خرید و فروخت کی بندش کا کیا اثر ہوا ہے؟ رائے عامہ اس کے موافق ہے یا نہیں؟ اور اس بندش کی وجہ سے نشے کی دوسری چیزوں کا رواج تو نہیں بڑھ گیا ہے؟

اُنہوں نے جواب دیا کہ "نہیں - شراب کی جگہ دوسری چیزیں نہیں رائج ہوئی ہیں - بلکہ ایک امریکن پہلے جو روپیہ شراب میں برباد کرتا تھا اب اُسے اپنی بہبودی پر صرف کرتا ہے - اس لعنت سے نجات پانے کی وجہ سے آرام سے اچھے مکان میں رہتا ہے - اچھا کھاتا ہے - اچھا پہنتا ہے - آمد و رفت میں وقت ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایک موٹر خرید لیتا ہے - اور پھر اتفاقی ضروریات اور بڑھاپے کے لئے کچھ پس انداز بھی کر لیتا ہے - مختصر یہ کہ شراب کی بندش کی وجہ سے امریکہ کی خوشحالی بہت بڑھ گئی ہے - اور وہاں کی معاشرت بہت بلند ہو گئی ہے - اب امریکہ شراب کو بھول چکا ہے اور نہیں چاہتا کہ یہ مصیبت پھر واپس آئے - بعض لوگ اس مصیبت کو پھر دعوت دینا چاہتے ہیں مگر وہ ملک کے لئے باعث ننگ و عار سمجھے جاتے ہیں - مالدار ہونے کے باوجود ملک میں ان کی کوئی وقعت نہیں ان کو سوسائٹی کا ایک بیکار رکن اور ملک کی دولت ناجائز طور پر صرف کرنے والا خیال کیا جاتا ہے - فقط انہی لوگوں کے لئے شراب کی ناجائز درآمد کی جاتی ہے - ورنہ عام باشندے ہر طرح اس بندش پر راضی ہیں اور اخلاق کو برباد کرنے والی اس لال پری کو منہ نہیں لگانا چاہتے"

صدیق طبیب

بیسویں صدی کے خدا سے

بندے پکارتے ہیں کہ خالق کوئی نہیں — ایک اور آب و گل کا تماشہ بنا تو دے

ایک شور ہے کہ بعد فنا زندگی نہیں — پردے اُٹھا کے حشر کا منظر دکھا تو دے

جنّت بنی ہوئی ہے خود آرائیِ خیال — کوثر کی ایک موج جہاں میں بہا تو دے

یوسف کا حسن قصّۂ پارینہ ہو گیا — دنیا تڑپ اُٹھے کوئی ایسا بنا تو دے

دنیا کو آستانۂ وحدت پہ پھیر دوں — مالک مجھے رموزِ الٰہی سکھا تو دے

عالم کی بے رُخی پہ نہ جائیں تو محو ہوں
کچھ عہدِ ماسلف کے فسانے سنا تو دے

سید ہاشم لکھنوی

حاصلِ عمل

(۱)

اُس کا مدعا تھا کہ "انسان کو آسانی سے جنت مل جائے۔" اسی لئے بڑی جستجو اور سعی کے بعد اُس نے عمر جاودانی پانے کا منتر سیکھا۔ اسی منتر کے عمل میں اب وہ تنہا جنگل میں رہتا ہے۔ اسی جنگل کے ایک گوشے میں لکڑی بیچنے والی ایک لڑکی رہتی تھی۔ وہ عامل کے لئے اپنی گود میں پھل بھر کر لایا کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ عمل اتنا سخت ہو گیا کہ وہ پھلوں کو کبھی ہاتھ نہ لگاتا، پرندے آتے اور کھا جاتے تھے۔ یوں ہی کچھ دن اور گذر گئے اب اُس نے پانی پینا بھی چھوڑ دیا۔ چشموں کا شفاف پانی پتوں میں خشک ہو کر رہ جاتا اور اُس کے لبوں تک نہ پہنچتا۔

لڑکی سوچنے لگی۔ "اب کیا کروں؟ میری یہ خدمت بیکار ہو رہی ہے"۔

اس کے بعد وہ پھول توڑ کر عامل کے قدموں پر رکھ جاتی، لیکن عامل کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ دوپہر کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو وہ اپنا دامن پھیلا کر اُس پر سایہ کرتی۔ مگر عامل کے لئے دھوپ کیا اور سایہ کیا؟ رات کے وقت جب اندھیرا زیادہ ہوتا تو وہ بیٹھی جاگتی رہتی۔ عامل کو خوف کیسا؟ پھر بھی وہ پہرہ دیتی۔

(۲)

ایک دن ایسا بھی آیا جب عامل نے لڑکی سے بڑی محبت سے پوچھا۔ "تم اچھی تو ہو؟"

لڑکی بولی۔ "میرے لئے اچھا اور بُرا کیا؟ مگر تمہاری خبر گیری کرنے والی کیا ماں بہن کوئی نہیں؟"

عامل نے کہا۔ "ہیں تو سب لیکن کیا وہ ہمیشہ میری خبر گیری اور حفاظت کر سکتے ہیں؟ کیا وہ مجھے ہمیشہ بچہ ہی بنائے رکھیں گے؟"

لڑکی بولی۔ "زندگی ہمیشہ قائم نہیں رہتی، پھر بھی اس جان کے لئے کتنی فکریں ہوا کرتی ہیں؟"

عامل نے کہا۔ "میں تو ایسا ہی طریقہ تلاش کر رہا ہوں کہ جس سے ہمیشہ زندہ رہوں اور میں انسان کو ہمیشہ کی زندگی بخشونگا۔"

عامل نے یہ جو کچھ کہا وہ گویا اس نے خود اپنے ہی سے کہا۔ اس کا مطلب سمجھتا کون؟

لڑکی نے کچھ نہ سمجھا لیکن آسمان پر بادل کی گرج سُنکر جس طرح مورنی کا جی تڑپ اُٹھتا ہے بس وہی کیفیت اُس کے دل کی بھی ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد عامل نے خاموشی کا عہد کیا۔ وہ لڑکی سے بولتا تک نہ تھا۔ کچھ دنوں کے بعد تو اُس کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ اب تو وہ لڑکی کو دیکھتا بھی نہ تھا۔

لڑکی اپنے دل میں محسوس کرنے لگی کہ وہ عامل ہے عمل کی سیکڑوں منزلیں ہیں۔ اُسے ہزاروں سال میں اس فاصلہ کو پار کر کے قریب پہنچنے کی امید نہ تھی۔

اب تو کوئی آس ہی نہ رہی۔ پھر بھی وہ گھبراتی نہ تھی سوچتی۔ کہ "اگر دن میں ایک بار بھی وہ پوچھ لیتے کہ تم کیسی ہو تو اُسی سے میں دن کاٹ لیتی۔ ایک مرتبہ بھی وہ پھل کھا لیتے اور پانی پی لیتے تو مجھے بھی کھانے پینے میں مزا آتا۔"

(۳)

اُدھر اندر لوک میں خبر ہوئی کہ انسان فانی دنیا چھوڑ کے جنت کی فکر میں ہے۔ اس کو اتنی ہمّت ہو گئی!

اندر نے ظاہرا غصّہ اور غضب کا بہت کچھ اظہار کیا لیکن دل ہی دل میں وہ ڈرنے لگا۔ سوچا۔ "دیو اپنی قوت بازو سے عالم بالا کو فتح کرنا چاہتے تھے، اُن کے ساتھ جنگ ہوتی تھی۔ لیکن انسان عالم بالا کو لینا چاہتا ہے، دکھ کی قوت سے، تو کیا اُس سے ہار ماننی پڑیگی؟"

مینکا کو بلا کر اندر نے حکم دیا "جاؤ۔ اس کے عمل میں خلل ڈالدو"۔

مینکا نے کہا "اے دیوتاؤں کے راجہ! اگر فانی دنیا کے رہنے والے کو آسمانی طاقتوں سے مغلوب کیا گیا تو اس سے عالم بالا ہی کی ہار ہے کیا انسان کی موت کا تیر عورت کے ہاتھ میں نہیں ہے؟"

اندر نے کہا "یہ بھی سچ ہے"

(۴)

جیسے بہار کا جھونکا کھا کر مادھوی کی بیل شگفتہ ہو جاتی۔ اسی طرح ایک دن اس لکڑی بیچنے والی کو بھی نندن بن (اندر کا باغ) کی ہوا لگ گئی۔ اشتیاق سے اس کا دل بیقرار ہو گیا۔ جی میں اُمنگیں پیدا ہونے لگیں۔

عین اُسی زمانہ میں عمل کی ایک منزل طے ہوئی۔ اب اُسے پہاڑ کے ایک سنسان غار میں جانا پڑیگا۔ اُسنے آنکھیں ملیں۔ سامنے دیکھا لڑکی کے

جوڑے میں اشوک کا شگوفہ ہے اور جسم پر بسنتی رنگ کی ساڑھی ہے ۔وہ پہچان میں آتی تھی اور نہیں بھی، گویا وہ الیسا راگ تھی جس کی لے سے کان آشنا تو ضرور تھے ۔لیکن گیت یاد نہ تھا ۔

عامل اپنے لبستر سے اُٹھا اور بولا "میں بڑی دور جاؤنگا ۔"

لڑکی نے پوچھا ۔"کیوں جائیں گے ؟"

عامل ۔"عمل پورا کرنے کے لئے"

لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔"مجھے اپنی زیارت کی سعادت سے کیوں محروم کرتے ہو؟"

عامل پھر اپنے لبستر پہ آبیٹھا اور کچھ سوچنے لگا ۔زبان سے کچھ نہ کہا ۔

(۵)

عامل نے لڑکی کی التجا قبول کر لی ۔مگر یہی بات اس کے دل میں کھٹکنے لگی ۔ وہ سوچنے لگی "میں ایک معمولی لڑکی ہوں ۔میری التجا نے انہیں کیوں روک لیا ؟"

اسی رات وہ پتوں کے لبستر پر اکیلی پڑی ہوئی خود بخود اپنے آپ سے ڈرنے لگی ۔

دوسرے دن سویرے وہ پھل توڑ کر لائی ۔ عامل نے ہاتھ پھیلا کر لے لیا ۔اس نے پتے میں پانی لا کر دیا ۔ عامل نے پانی پیا ۔خوشی سے لڑکی کا دل پھول اٹھا مگر اس کے بعد ندی کے کنارے سرشل کے جھاڑ کے سایہ میں اُس کی آنکھوں کے آنسو نہ تھمتے تھے ۔معلوم نہیں وہ کیا سوچنے لگی ؟ ۔

دوسرے دن اُس نے عامل کو آکر سلام کیا اور کہا "مجھے دعا دیجئے"

عامل ۔"کیوں ؟"

لڑکی ۔"میں بڑی دور جاؤنگی ۔"

عامل نے کہا ۔"تمہاری مراد پوری ہو !"

(۶)

ایک دن عمل پورا ہو گیا ۔ اندر نے کہا ۔"جنت پر تمہارا حق ہو گیا ہے ۔"

عامل ۔"مجھ کو اب جنت کی ضرورت نہیں"

اندر نے پوچھا ۔"پھر کیا چاہتے ہو ؟"

عامل نے جواب دیا ۔"میں اسی جنگل کی لکڑی بیچنے والی لڑکی کو چاہتا ہوں ۔"

خاک نشین
رنگون

غزل

جب دل کی بے کلی کا سبب پوچھتا ہوں میں
کہتا ہے کوئی درد نہیں ہوں دوا ہوں میں

ہوں میں بھی اپنے ڈھونڈنے والوں میں دیکھنا!
شاید یہ ہوش ہے کہ کہیں کھو گیا ہوں میں

یا کر دیا ہے یاس نے مجبور ضبط پر
یا پھر یہی ہے سچ کہ بہت بے وفا ہوں میں

خودداریاں یہ میرے تجسس کی دیکھنا
منزل پہ آکے اپنا پتہ پوچھتا ہوں میں

اُن پیاری پیاری آنکھوں پہ الزام کیا رکھوں
دل سے ستم ظریف کا مارا ہوا ہوں میں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

افسرؔ ہو کیوں کوئی مری رندی پہ حرف زن
میں نے یہ کب کہا کہ بڑا پارسا ہوں میں

ہندو فلسفے کی تعلیمات

(از رایٹ آنریبل پنڈت سر سرینواس شاستری)

چار ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں دریاؤں کے کنارے عظیم آرین خاندان کی ایک شاخ آباد تھی، فطرت نے انکی خورد و نوش کے ذرائع اس کثرت سے بہم پہونچائے تھے کہ انہیں بہت کم جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی کیونکہ کھانے پینے کی تمام اشیا انہیں آسانی سے حاصل ہو جاتی تھیں۔ گھنے جنگلوں کی کامل اور مہیب خاموشی نے اس زمانے کے رشیوں کو فطرت کا رازدار بنا دیا تھا۔ ان کے اور فطرت کے درمیان ایک روحانی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور وہ فطرت کے رموز و اسرار کو اس طرح سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں کو اس کا خواب وخیال بھی نہیں آسکتا۔ وہ اندنوں فطرت کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ اور دنیا محو حیرت تھی۔ ہندوستانی دماغ خصوصیت سے تفکر و تدبر میں ممتاز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ مابعد الطبیعیات کی گرہیں کھولنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اُندنوں فلسفے کے بہت سے سکول قائم ہوئے اور آخر کار اُن میں اختلافی مسایل اسقدر بڑھ گئے۔ کہ ہر سکول ایک علیحدہ نام سے موسوم ہو گیا۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے تھے۔ کچھ متشککین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ کچھ مادیین کہلاتے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو دنیا کی ہر شے کو فانی سمجھتے تھے۔ اور عالم خواب و خیال کہتے تھے۔ ایک گروہ تھا اپنے آپ کو محققین کا لقب دیتا تھا۔

ان تمام لوگوں میں ایک بات مشترک تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ یہ لوگ تفکر و استدلال کی بجائے ادراک باطنی سے کائنات کی صداقتوں تک پہنچتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ادراک باطنی میں اور استدلال کے طریقوں میں کون کون سے اختلافات تھے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ "رشی" کسی فطری منظر یا مظہر کو دیکھکر فوراً اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق فطرت سے اسقدر گہرا ہوتا تھا کہ ان کی نظر فوراً تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔

ان رشیوں کے انکشافات کتابوں میں نہیں لکھے جاتے تھے۔ بلکہ سینہ بہ سینہ استاد سے شاگرد کی طرف منتقل ہوئے تھے۔

انہیں انکشافات کا نام "وید" ہے۔ جس کے لغوی معنی "علم" کے ہیں۔ "وید" ان "انکشافات" سے متعلق ہے جو ادراک باطنی اور زہد و عبادت سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کو ایک مقدس اور الہامی کتاب تصور کیا جاتا ہے۔

جو کچھ اس کتاب مقدس میں درج تھا۔ اسے ناقابل تردید اور قاطع تصور کیا جاتا تھا چنانچہ کسی شخص کو اجازت نہ تھی کہ وہ فلسفے کے ایسے مسایل پیش کرے جن کی تائید میں وہ وید مقدس سے ثبوت نہ لاسکتا ہو۔

بلاشبہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس کتاب کی الہامی نوعیت سے انکاری تھے مثال کے طور پر بودھ مذہب کے پیرو پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تاہم ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی کتاب مقدس کی پیرو تھی۔ ہمیں اس زمانے کے صرف دو فلسفیانہ مذاہب کا حال معلوم ہو سکا ہے۔ پہلا مذہب صرف ان رسم و رواج سے متعلق تھا جو وید مقدس میں درج ہیں۔ اور اس اعتبار سے اس کا تفصیلی تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

دوسرا مذہب "ویدانت" نام سے موسوم ہے۔ جس کا مطلب "انتہائے علم" ہے۔ اور یہی شے ہے جو "وید مقدس" کے انکشافات کا مقصد ہے۔ چار مسایل ایسے تھے جن کی صداقت پر تمام مذاہب متفق تھے۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ انسان کے جسم میں ایک لطیف شے موجود ہے جسے "روح" کہا جاسکتا ہے۔

اس شے کو فنا نہیں۔ چنانچہ خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم رشیوں کی روحیں زندہ ہیں۔ اور ابد تک رہینگی۔

دوسرے یہ کہ انسان کے افعال و اعمال سے خاص اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ جو ایک نہ ختم ہونے والے چکر کے ساتھ گردش کرتے رہتے

ہیں اور علت و معلول کا ایک سلسلہ قائم کر دیتے ہیں ہم مختلف نہ نظر آنے والے محرکات سے اثر پذیر ہو کر خاص اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال سے چند نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ایک چکر قائم ہو جاتا ہے۔

یہی وہ نظریہ ہے جس کو "کرم" کہتے ہیں۔ اور "کرم" کے لغوی معنی بھی "عمل" کے ہیں۔ انسان کا کوئی ایسا فعل نہیں تھا۔ جو اس نے شعوری حالت میں کیا ہو۔ اور پھر خود بخود ہی اس فعل کی سزا یا جزا نہ پالی ہو سزا اور جزا خود ہر فعل کی سرشت میں داخل ہیں۔ اسی "چکر" کا ایک لازمی نتیجہ "تناسخ" ہے۔ روح اس بات پر مجبور ہے کہ اپنے اعمال و افعال کا خمیازہ بھگتے۔ اور مختلف صورتوں میں منتقل ہو کر گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔ موت "روح" کی فنا کے لئے ناکافی ہے۔ موت صرف "جسم" کے فنا کا نام ہے۔

چوتھا مسئلہ بہت اہم تھا۔

یہ عالم اسباب لازمی طور پر ایک "دنیائے الم" تھا۔ کیونکہ دیکھا جاتا تھا کہ انسان پیدا ہوتا تھا اور مر جاتا تھا۔ نہ اس کے پیدا ہونے کا کوئی مقصد سمجھ میں آتا تھا۔ نہ اس کی موت کی کوئی غایت معلوم ہوتی تھی۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ بلکہ ایکبار فنا ہو کے انسان کی روح پھر کئی شکلوں میں منتقل ہو جانے پر مجبور تھی۔ اور اس طرح یہ بے رحم چکر ازل سے ابد تک قائم تھا۔

اس کرب و الم سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے؟ یہی وہ ضروری سوال تھا جو تمام فلسفیوں کو دعوت عمل دے رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ جب تک انسان "خلقت و فنا" کے دائرے سے نکل نہ جائے "الم" ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہر مذہب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اس قسم کی ہدایات دی جائیں کہ وہ اس زندگی اور موت کے چکر سے آزاد ہو جائے۔

ان مذاہب میں سب سے زیادہ اہم تعلیمات "ویدانت" ہی کی ہیں۔ سن عیسوی کے آغاز میں "شنکر" نے جو ایک وسیع النظر عالم تھا۔ پرانے فلسفہ کی تفسیریں شائع کیں۔ میں اسی عالم کے فلسفے سے بحث کرونگا۔

شاید بعض جگہ میں اپنا مطلب واضح نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سکول میں فلسفے کی تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ اپنی عمر کے مختلف حصوں میں شوقیہ اس کا مطالعہ کیا ہے۔

ہماری شعوری حالت اور اس حالت کا ہر ایک فعل دو عناصر میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ خارجی۔ اور باطنی یا فاعلی اور انفعالی۔

یہ دونوں عناصر ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان جو تعلق قائم ہے وہ ایسا پیچیدہ کہ تمام دنیا کے فلسفی شروع ہی سے اس کے متعلق تفکر کرتے رہے ہیں۔

"شنکر" نے جو نظریہ پیش کیا وہ حسب ذیل ہے۔

اس کا خیال ہے کہ فاعلی اور انفعالی۔ خارجی اور باطنی دونوں کیفیات واقعی اور حقیقی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ یہ دونوں کیفیتیں شعوری حالت کا ایک فعل ہیں۔ اس کے خیال میں ہمارے شعوری حالت کے ذہنی تصورات اور دنیا کے مادی مناظر دونوں ایک ہی انسانی تجربے کے مختلف پہلو ہیں۔ تمام اشیا کی تہ میں ایک روشن صداقت پوشیدہ ہے۔ مادہ۔ روح۔ اور تمام خارجی مناظر و مظاہر اسی روشن حقیقت کے عکس ہیں۔ یہی صداقت ہے جو ہندوستانی ادب میں "براہمان" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

یہ صداقت ازلی اور غیر محدود تھی۔ اس کے علاوہ باقی تمام اشیا محدود تھیں۔ ہمارا ذہن اور ہمارا علم مشروط تھا۔ مقید تھا۔ دوسری ہی چیزوں پر منحصر تھا۔ لیکن یہ حقیقت تمام شرائط اور پابندیوں سے ماورا تھی۔ مکان و زمان کی قیود۔ اور علت و معلول کی زنجیریں اس صداقت کے لئے بے معنی تھیں۔

ہمارے الفاظ۔ ہمارے تصورات و احساسات۔ ہمارا تخیل جو نادیدہ اشیاء و حقائق کی تجسیم کرتا ہے۔ یہ تمام صفات اس حقیقت کو واقعتاً سمجھنے اور دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہ شے دونوں جہان سے بالاتر تھی۔ نہ الفاظ میں ادا ہو سکتی تھی نہ ذہن میں آ سکتی تھی۔ اس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا تھا کہ "وہ موجود ہے"۔ اور بس۔ اس کی تعریف صرف نفی سے کی جا سکتی تھی۔ جب اس کی تعریف کسی اثباتی پہلو سے کی جاتی تو وہ صداقت مکان و زمان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آتی۔

دنیا میں سوائے اس حقیقت کے اور کچھ نہیں۔ کائنات کی تمام اشیاء۔ روحانی ہوں یا مادی۔ اس نور ازلی کا پرتو ہیں۔

مادہ مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ روح کے احساسات عجیب عجیب نوعتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ تمام کے تمام اس صداقت ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر

وہ روشن حقیقت ناقابل تغیر ہے۔ تو اس کے مظاہر میں اسقدر تغیر کیا معنی رکھتا ہے۔ کسی شخص کو اس کا جواب معلوم نہ تھا۔

ہندوستانی فلسفیوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ مادے کے یہ تمام تغیرات یہ فریب یہ نقاب۔ جو حقیقت کی روئے روشن کو چھپائے ہوئے ہے "مایا" ہے۔

اور ہم آفتاب حقیقت کی درخشندگی کو اسی پردے کے ذریعے دیکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ "مایا" کی جسمانی صورت ایک دغاباز خوبصورت نازنین کی بنائی جاتی ہے۔ کیونکہ قدیم زمانے کے رشیوں کا خیال تھا کہ "دغا" اور "فریب" عورت کی فطرت کا ایک جزو لازمی ہے۔

اس اعتبار سے "مایا" ایک ایسی چیز ٹھہری جس میں کچھ حصہ آفتاب حقیقت کی شعاعوں کا تھا اور کچھ عالم اسباب کی ظلمت کا۔ اسی وجہ سے یہ شے مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

شنکرا کی تعلیم تھی کہ "مایا" ایک نقاب ہے۔ جو ظلمت جہل کا دوسرا نام ہے۔ انسانی رُوح نے اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت اور زندگی کے چکر سے رہا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایکبار انسان اپنی روحانی آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے معلوم ہو جائے کہ "مایا" کی حقیقت کچھ نہیں۔ اور اس احساس لوہیت کے ساتھ ہی الم و کرب کے تمام پردے چاک ہو جائیں۔

عام طور پر مغربی فلسفی "ویدانتا" کی تعلیمات کو یاس آشنا تصور کرتے ہیں۔ لیکن "شنکرا" کی تعلیم اس بات کو جھٹلاتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ انسانی رُوح کی جلا "علم" پر منحصر ہے۔ لیکن یہ "علم" وہ نہیں جسے ہم کتابوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ نور ازلی کی ایک شعاع ہے کہ جب اس کا عکس آئینۂ دل میں آجاتا ہے تو کائنات کے تمام رموز حل ہو جاتے ہیں۔ اور روح "کرب والم" کی دشواریوں سے چھوٹ جاتی ہے۔

"ویدانت" کی تعلیمات کا مقصد یہ تھا کہ بجائے کتابی علم کے علم الٰہی حاصل کرنے کے طریقے سمجھائے جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ "شنکرا" کے فلسفے میں "اخلاقیات" کی کوئی تعلیم نہیں لیکن یہ بات غلط ہے۔ شنکرا نے اس بات کی تخصیص کر دی ہے کہ نور حقیقت کو وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے دل پاک و صاف ہیں جو تمام عمر نیک کام کرتے رہے ہیں۔ اور جنکا خیال کبھی گناہ کے تصور سے آلودہ نہیں ہوا!

یہی وہ لوگ ہیں جو "مایا" کو مفتوح کر کے اپنی رُوح کو نور ازلی میں گم کر سکتے ہیں۔

توقعاتِ بہار

پھر جھوم کے وہ سحاب برسا   اترائے چمن شباب برسا

یوں رحمتِ کردگار برسی   پانی کے عوض بہار برسی

ہر قطرۂ آب گل بدامن   ہر بوند کی کف میں روحِ گلشن

شورش سے فضا ہوئی ہم آغوش

پانی سے خلا ہوئی ہم آغوش

فہمی

لاہور کا نغمہ

پچھلے دنوں مجھے موسیقی کے کیف و ترنم سے متاثر ہو کر خیال ہوا کہ جس طرح کائنات کی تمام اشیا میں باہم ایک خاص متناسب رابطہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف مشہور اور حسین شہر بھی ذہن پر ایک خاص اثر مترتب کرتے ہوں گے۔ اس اعتبار سے تخیل کو آوارہ چھوڑ دیا گیا تو ذہن میں عجیب عجیب کیفیات پیدا ہوئیں میں نے کوشش کی کہ شہروں کے مجموعی تاثرات کو کسی مادی چیز سے تشبیہ دی جائے اور ان کا کوئی مفہوم خارجی مقرر کر لیا جاوے۔

انسان شاعر کے وجدانی نغموں کو مادی نام دے سکتا ہے تنقید میں ان کو کبھی ایک بحر ذخار سے۔ کبھی ایک جوئے کم آب سے۔ کبھی ایک خودرو چشمے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

انسان حسین و جمیل پھولوں کی زبان بھی سمجھ سکتا ہے۔ محبت کی رنگینیوں نے مختلف پھولوں سے مختلف جذبات ادا کرنے کا کام لیا ہے۔

انسان نہایت مشکل اور پیچیدہ معمے حل کر سکتا ہے ریاضی کے اشکال اور فرعون کی قبر کے حروف و نشانات اس بات کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

انسان فطرت کے مناظر و مظاہر کی رموز کو منکشف کر سکتا ہے چشم تخیل سے ستاروں کو رقص کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ شہر جو نغمہ پیدا کرتے ہیں انسان صرف اسی کو سمجھنے سے قاصر ہو؟

یہ مقصد مد نظر رکھ کر میں نے مختلف شہروں کی سیر کی!

بمبئی کا سواد نازآفریں سب سے زیادہ دلکش ثابت ہؤا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک نازنین اپنی گذشتہ جوانی کے ایام بہار کو یاد کر رہی ہے چہرہ نقوش غم سے پاک ہے مگر دل میں ایک میٹھا میٹھا درد ہے جس کے اثرات آنکھوں میں ایک موج افسردگی کی صورت اختیار کر چکے ہیں اُن کے ہاتھوں میں ایک رباب ہے۔ جو مشرقی اور مغربی تاروں کی آمیزش سے بنایا گیا ہے۔ اس کے نغمے کبھی مشرق کی سحر کار پاکیزگی سے لبریز ہوتے ہیں۔ کبھی مغرب کی بے عشرت کاریوں سے۔

کلکتہ ایک خوبصورت دلہن ہے جو شوہر کے انتظار میں چشم براہ بیٹھی ہے اس کا چہرہ ساری کے ایک رنگین آنچل میں چھپا ہؤا ہے۔ مگر رُوئے روشن کی تابانی چاند کی کرنوں کی طرح مجروح دلوں پر آبپاشی کر رہی ہے اس کے گیت انتظار کے سوز و گداز سے ایک شعلہ جانسوز بن گئے ہیں۔

دہلی ایک سالخوردہ مدبر خاتون ہے۔ جس نے حوادث زمانہ سے دانشمندی اور تجربے کا سبق سیکھا ہے اس کی عمر شباب کی خطرناک اور روح سوز راہوں سے گذر چکی ہے۔ مگر اس کے چہرے پر مٹی ہوئی خوبصورتی کے نشان باقی ہیں اس کے سفید بال اور پیشانی کی جھریاں تقدس اور پاکبازی کے اثرات سے پُر ہیں۔ اس نے اپنے بچوں کو خون کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس کے گراں وقار اور شاندار نغمے امید کے رنگین پیغام سے لبریز ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ نغموں کی رہبری میں ایک درخشان مستقبل کی طرف جا رہی ہے *

ان تمام شہروں کے نغمے میں نے پہچان لئے۔ مگر جب لاہور کی باری آئی تو مجھے احساس ہؤا کہ اس شہر میں ایک ایسی شئے ہے جو الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسی کیفیت ہے جو مادی اشیا کے قفس میں مقید ہونا نہیں چاہتی جسے چھُوا جائے تو نظر نہ آنے والے پروں پر سوار ہو کر کہیں دُور جا چھپتی ہے۔

آخر کار میں نے اپنے عزیز دوست حامد سے اس پریشانی کا تذکرہ کیا۔

"میں نے کہا" یا تو لاہور کے نغمے بے معنی ہیں۔ یا میری عقل کی رسائی اُن انتہاہ گہرائیوں تک نہیں ہوتی۔ تم تو لاہور میں بچپن سے رہتے ہو۔ کیا تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان شہر رات کی ہیبت ناک خاموشی میں دن کے خوفناک ہنگامہ ہائے کار میں تم سے کیا کہتا ہے؟ مجھے اس گنجینۂ معنی کو کھولنے کا طلسمی حرف نہیں ملتا۔

حامد نے بے پروایانہ جواب دیا "طلسمی حرف! طلسم ہوشربا کیوں نہیں پڑھتے؟"

مجھے حامد کی بے نیازی دیکھ کر کچھ غصہ سا آ گیا۔

حامد! تم بالکل کور ذوق ہو کیا تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ ہر

شہر اپنے چاہنے والوں سے کچھ راز کی باتیں کہتا ہے مگر تمہیں کیا معلوم ہو سکتا ہے تم نے کائنات کی تمام دلچسپیاں صرف اپنی ذات میں جمع کرلی ہیں تمہیں دنیا میں کوئی شئے اپنے آپ سے زیادہ دلکش اور نتیجہ خیز نہیں نظر آتی۔

حامد مسکرایا اور پھر کہنے لگا۔ "بھائی میرے لئے تو تمام شہر ایک ہی طرح کے ہیں"

میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "اس دنیائے حُسن وعشق میں بنی آدم کا ایک بہت بڑا گروہ سنجات .... یا تباہی کی طرف چلا جارہا ہے۔ اور تم ہو کہ ان تمام لوگوں سے بے پروا اپنی ایک علیحدہ دنیا بنائے ہوئے ہو۔

میں ایسا بدذوق نہیں۔ اب تک مجھے اس جستجو میں ناکامی ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کیا ہوگا لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر انسان اس راز کو بے نقاب کرسکتا ہے تو وہ انسان میں ہونگا۔" وہاں سے میں ایک شرابخانے کے دروازے پر پہونچا۔ شراب خانے کے "پیر مغاں" باہر کھڑے ہوئے تھے میں نے بے تابانہ ان سے سوال کیا "حضرت! آپ ہر رنگ کے آدمی سے ملتے ہیں۔ لاہور کے لوگ آپ کے سامنے مصنوعی تہذیب کا لبادہ اتار دیتے ہیں کچھ آپ کو معلوم ہے کہ لاہور کو کس شئے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور اس شہر کے نغموں میں کیا بات ہے جو دوسرے شہروں سے مختلف ہے"

وہ میری طرف دیکھ کر ایک انداز تفوق سے مسکرائے پھر ایک "میخوار" کو آتے ہوئے دیکھ کر اندر چلے گئے۔ لیکن جاتی دفعہ جو نگاہ انہوں نے مجھ پر ڈالی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سڑی تصور کرتے ہیں۔

میں بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو کر مال روڈ کے چوراہے پر جا پہونچا۔ پولیس کا سپاہی اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے آمدورفت کے انتظام میں مصروف تھا۔ میں نے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا:-

"دوست لاہور کے امرا تمہارے سامنے سے تیز رفتار موٹروں پر موج برق کی طرح گذر جاتے ہیں مگر قانون نے تمہارے بازو کو یہ طاقت بخشی ہے کہ جب چاہو اپنی ایک جنبش نادری سے ان کی موٹروں کو روک سکتے ہو۔ کیا تم نے کبھی اسبابت پر بھی غور کیا ہے کہ لاہور کے نغموں کو کس شئے سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے؟

سپاہی نے میری طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ "دوست میری اپنی کوئی رائے نہیں۔ میری وہی رائے ہے جو میرے افسروں کی رائے ہے"

یہ کہکر وہ پھر آمدورفت کے انتظام میں مشغول ہوگیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب گاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ذرا رُک گیا۔ اُس نے میرے کان میں رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میری شادی کو صرف ایک ماہ ہُوا ہے ذرا یہاں ٹھہرے رہو تو میں بیوی سے مل آؤں میرا گھر قریب ہی ہے"

یہ کہہ کر وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں مشرق کی طرف غائب ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آگیا۔ اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "لاہور کے نغمے؟ ہاں۔ آجکل باہر سے ایک کمپنی آئی تو ہوئی ہے سنتا ہوں وہاں ایک دو اچھے گانیوالے ہیں"

یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ میری طرف سے پھیر لیا۔ گویا کمپنی کے متعلق اطلاع دے کر وہ مجھے اس تکلیف کا کلی معاوضہ دے چکا تھا۔ جو میں نے اُس کے لئے برداشت کی تھی۔

وہاں سے چل کر میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے کے پاس سے گذر رہا تھا کہ یکایک سامنے سے جناب عاشق نمودار ہوئے۔ وہ شاعر تھے اور خود بھی سراپا شعر تھے۔ ایک خود فراموشانہ انداز میں وہ میری جانب بڑھے چلے آرہے تھے۔ اور اگر میں نے راستہ نہ دیدیا ہوتا تو یقیناً وہ مجھ سے ٹکرا جاتے۔

میں نے انہیں روک لیا:-

"عاشق صاحب" میں نے کہا۔ "آپ ایک نہایت اہم ادبی مسئلے میں میری مدد کرسکتے ہیں؟ آپ خاموش بے زبان فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور آپ کی نگاہ دُور بین قطرہ میں خورشید کا لہو دیکھتی ہے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ لاہور بے زبان اور خاموش لاہور۔ اگر گویائی کی طاقت رکھتا تو اپنے منہ سے پہلا لفظ کیا نکالتا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ لاہور کے نغمے کس شیریں پیغام کے حامل ہیں"

میری اس تقریر کے دوران میں وہ نہایت بیتابی سے میری تقریر کے ختم ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ کیونکہ میرے خاموش ہوتے ہی انہوں نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کے کہنا شروع کیا "فضاؤ- رنگین ہوجاؤ- ہواؤ - عطر برساؤ- ایک شاعر- اپنی منگیتر اپنی محبوبہ کے رخ درخشاں سے شادکام ہونے والا ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی ٹائی کی طرف دیکھا- پھر مجھ سے پوچھا

" ذرا دیکھنا۔ ٹھیک ہے نا؟" اور جواب کا انتظار کیئے بغیر اپنی راہ لی۔

میں مایوس ہو کر آگے بڑھا۔ پھر ....

ایسا معلوم ہُوا گویا آسمان میرے سر پر آ رہا۔ دماغ چکرا گیا ....

مجھے ہوش آیا۔ تو میں ایک صاف ستھرے کمرے میں لیٹا ہُوا تھا۔ میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا تمام محسوس کرنے والے اعصاب دماغ میں جمع ہو گئے ہیں اور کوئی انہیں کند سوئیوں سے کرید رہا ہے۔

فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس میں کوئی ناگوار عنصر بھی ملا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔

اتنے میں میرے اوپر ایک فرشتۂ رحمت جُھک گیا اُس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اور بالوں کا رنگ سنہری تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ہمدردی اور رحم جھلک رہا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا لیکن اُس نے مجھے روکا پھر کوئل کی سی شیریں آواز میں کہا:—

آپ لیٹے رہیں آپ کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ آپ ایک موٹر کے نیچے آ گئے تھے۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ درد یکبارگی رفع ہو گیا۔

میں نے جواب دیا۔ " مجھے کوئی تکلیف نہیں اور اگر ہو بھی۔ تو اس تکلیف پر ہزاروں راحتیں قربان ہیں۔ میں نے اس تکلیف کے ذریعے لاہور کا راز معلوم کر لیا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ لاہور ایک شوخ چنچل لڑکی سے مشابہ ہے جو بظاہر دنیا سے بالکل بے پروا نظر آتی ہے مگر اس کے دل میں انسانی ہمدردی ایک سمندر کی طرح موجزن ہے۔ لاہور کے نغمے ایک وحشی کے ہیبتناک گیتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان میں گداز اور محبت بھی موجود ہے"۔

نرس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا۔ شاید اُسے اس قسم کے مریض سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

ع ...

ڈل دھرم سالہ

دھرم سالہ سے سات آٹھ میل اوپر ایک نہایت ہی مصفا اور شفاف جھیل ہے۔ جس کے چاروں طرف بلند پہاڑ اور دیودار کے خاموش اور حسرت بار درخت کھڑے ہیں۔ پانی کی ساکن سطح پر کبھی کبھی ہلکا سا تموج ہوا سے پیدا ہوتا تھا اور کبھی کبھی ہلکی سی بدلی اوپر سے گذر کر پہاڑ کی درمیانی گہرائیوں میں غرق ہو جاتی تھی:

لہرا رہا ہے چار طرف سبزہ زارِ حسن — اللہ رے سحر کلک زمرد نگارِ حسن
اے وہ کہ تیرے جذبے سے ہے بیقرار حسن — چل اُٹھ کے دیکھ شوکتِ شانِ بہارِ حسن
یہ ڈل نہیں ہے معجزۂ کردگار ہے
محبوبۂ جمیل دلِ کوہسار ہے

منظر سکوت خیز اِدھر دیو دار کے — اور سلسلے بلند اُدھر کوہسار کے
جلوے نشاط کارِ فصلِ بہار کے — شاہد ہیں حسنِ صنعتِ پروردگار کے
ہلکی سی ایک بدلی جو آ کر بکھر گئی
جذباتِ حسن و عشق کو بیتاب کر گئی

وہ زیرِ آب عکس رُخِ آفتاب کا — وہ حُسن دلنواز خرام سحاب کا
موجِ ہوا سے ٹوٹ کے مٹنا حباب کا — عالم وہ سطحِ آب پر اک اضطراب کا
میرے سکونِ شوق کو بیتاب کر گئے
سرمایۂ شکیب کو سیماب کر گئے

ہر منظر اک نقش ہے ذوقِ وجود کا — یا آئینہ ہے فطرتِ جوشِ نمود کا
قائم اسی سے سلسلہ ہے ہست و بود کا — یہ ڈل کہ انتخاب ہے بزمِ شہود کا
یہ ڈل نہیں ہے پیکرِ رعنائے حسن ہے
پانی نہیں ظہورِ تمنائے حسن ہے

خالد بٹالوی ایم۔ اے۔ پی سی ایس

ترجمہ کرنے کا فن

معیاری ترجمہ اور صحیح لٹریچر کا ترجمہ (برعکس سائنٹفک کتابوں اور اس کے متعلقہ رسالوں کے ترجمے کے کہ جن کا ترجمہ کرنے میں نسبتاً زیادہ دشواری پیش نہیں آتی -) کن کن اجزائے ترکیبی سے مرکب ہوتا ہے ایک ایسا سوال ہے کہ جس پر خیالات و آراء کا سخت اختلاف ہے -

مسٹر جارج برنارڈ شا (انگلستان کے مشہور انشا پرداز) نے اُن مسائل کی اہمیت کو سمجھ کر جو مترجمین کو پیش آتے رہتے ہیں "نوبل پرائز فنڈ" کو چھ ہزار پونڈ اس غرض سے عطا کئے ہیں - کہ "انگلو سویڈیش فونڈیشن" کو سویڈن کی زبان کے شاہکاروں کے انگریزی تراجم شایع کرنے کے لئے دے جائیں - چنانچہ ان کے اس گرانقدر اور ہمت افزا عطیہ کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہونا شروع ہو گیا ہے - جس شخص کو بھی تھوڑا بہت ادبی مذاق ہو اس کے لئے ترجمہ کا فن توجہ و مطالعہ کا مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے اور بھی کہ فی زمانہ بیسیوں کتابوں کے تراجم آئے دن شایع ہوتے رہتے ہیں -

ترجمہ کرنے کا فن حد درجہ مشکل ہے اور اس خیال پر کہ کوئی "مکمل ترجمہ" موجود ہے یا ہو سکتا ہے بیسیوں اعتراضات کئے جا سکتے ہیں - جو مترجم کسی مصنف کو مخلصانہ طور پر اس کے رنگ و روپ میں ظاہر کرنا چاہے - اس کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ اس کام کے لئے موزوں بھی ہو - یعنی یہ کہ وہ بھی مصنف کی طرح کا مزاج اور اُسی جیسی طبیعت رکھتا ہو - اس کے خیالات و آراء میں شریک ہو سکے - نیز اس کا سٹایل (طرز) بھی مصنف کے سٹایل پر منطبق ہو سکے - مترجم کو اپنا کام شروع کرنے سے پہلے بہت سے ابتدائی مراحل طے کر لینے چاہئیں - یعنی یہ کہ اس بات کا خیال رکھنا کہ اس کا مصنف کس وقت اور کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور جہانتک اس کی تحریر پر اثر ڈالنے کا تعلق ہے - اس زمانے کی قومی، ملکی، ادبی و معاشرتی خصوصیات کیا کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ -

مکمل ترجمہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مترجم کو مصنف کے اصل خیالات کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے اور جب وہ ان خیالات پر پوری طرح عبور حاصل کر لے تو پھر ان خیالات کی ترجمانی کا کام نہایت آزادی کے ساتھ اُسی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ ان کے اظہار کے وقت ان کی مناسب تکمیل و تزئین کر سکے - یہاں پر ان لوگوں کی رائے بھی ظاہر کر دینی چاہیئے جو اس کے برعکس یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مخلص مترجم کو ترجمہ کرتے وقت نہ صرف مصنف کی عبارت کا اصل الاصول (Substance) ظاہر کر دینا چاہیئے بلکہ جہانتک ممکن ہو سکے اس کی طرز تحریر کو بھی ہر پہلو سے نباہنا چاہیئے -

اکثر اوقات تحت اللفظ ترجمہ بدترین ترجمہ ہوتا ہے - کیونکہ اس وقت مترجم لفظی ترجمہ کرنے میں باوجود سخت محنت و دماغ سوزی کے بھی مصنف کی رُوح کو برقرار نہیں رکھ سکتا -

ترجمہ کرتے وقت اگر کوئی مترجم اوریجنل (طبعزاد تحریر) کا طرز اختیار کرتا ہے تو ایک وقت یہ آپڑتی ہے کہ ممکن ہے وہ جس طرز کو اختیار کرتا ہے - وہ اس کی زبان کے معیار پر پُورا نہ اُتر سکے اور اس کی زبان میں اس قسم کا یا اس قسم کے طرز کا استعمال جائز نہ ہو - لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی مترجم اپنے ترجمہ کو اپنی قوم کے مخصوص ادبی رنگ میں رنگنا چاہتا ہے - تو یہ خطرہ ہے کہ وہ اصل مصنف کے خیالات میں اُلجھن پیدا کر کے کہیں خبط مطلب، یا خلط مبحث، نہ کر دے اور لبسا اوقات ایک بالکل نئی کتاب ہی نہ پیدا کر دے -

اس لئے ایک مکمل ترجمے کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس میں اوریجنل کی رُوح کو نہایت ایماندارانہ طریقے سے ظاہر کر دیا جائے، اور محاورہ اور اسالیب بیان کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر کے مصنف کی طبعزاد عبارت کے طرز کا پورا پورا تتبع کیا جائے - علاوہ بریں مترجم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے - کہ اس کا یہ "جبریہ طرز" آخر تک نبھ جائے اور اس میں کہیں بھدا پن نہ پیدا ہونے پائے - اور اپنی طرف سے ترجمہ میں جگہ جگہ مناسب زیب و زینت بھی دیتا رہے - تاکہ اس میں بھی اوریجنل تصنیف کی مانند روانی اور قوت بیان کی قدرتی شان جھلکنے لگے -

مکمل ترجمے کی تعریف میں یہ بھی شامل ہے کہ ترجمہ میں اوریجنل کی قومی خصوصیات کو بھی اُبھار کر اور کافی نمایاں طریق پر ظاہر کیا گیا ہو - کیونکہ اصل میں ترجمہ کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم غیر زبان کے مصنفوں کو اپنی زبان میں منتقل کریں ان کے جذبات و حسیات کو بخوبی سمجھیں اور ان کے مطمح نظر (Out look) کو جانیں اور ان کے سٹائل کا کوئی صحیح تصور قائم کر سکیں - ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب مترجم اپنے ذاتی و قومی وجود کو بھلا کر اوریجنل میں محو نہ کر دے -

اور ساتھ ہی ... اپنی انفرادی "خودی کو بھی ضائع نہ ہونے دے"۔

اشعار کا ترجمہ ڈرامہ یا ناول کے ترجمے سے اشعار کا ترجمہ کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ شاعری میں قومی و ملکی خصوصیات کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ مگر پھر بھی مترجم کو لٹریچر کی دیگر شقوں کی مانند یہاں بھی تقریباً اسی طرح کا کام انجام دینا ہوتا ہے لیکن ہم سرجون ڈینہم کی اس بات سے ہرگز متفق نہیں ہو سکتے کہ "اشعار کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ان کی دقیق روح بالکل اُڑ جایا کرتی ہے اور جب تک مترجم ان میں اپنی طرف سے ایک نئی رُوح نہ پھونکے وہ ایک بے جان قالب کی سی حیثیت رکھتے ہیں"۔

یہ بیشک مانا جاسکتا ہے کہ اشعار کا ترجمہ کرنے میں "دقیق روح" کا بہت کچھ حصہ اُڑ جایا کرتا ہے۔ مگر ایک اچھا مترجم وہی سمجھا جاتا ہے جو ترجمہ کرتے وقت اس "روح" کو کم سے کم اڑنے دے اور ساتھ ہی اس میں اپنی روح بھرنے کی کوشش نہ کرے۔

ممکن ہے بعض اوقات ترجمہ بذات خود اور یجنل سے بہتر ہو جائے اور فن شعر کی ایک بہت بڑی یادگار رہ جائے۔ لیکن اگر اس میں یہ نئی رُوح پھونک دی گئی تو پھر اس کی ترجمہ کی شان باقی نہ رہیگی۔ اور اسے ترجمہ کہنا ہی غلط ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی مترجم کا ایک فرض خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ترجمے میں حتی الامکان اصل کی روح کو کامیابی کے ساتھ شامل کئے رکھے لیکن اگر وہ بدقسمتی سے اس روح کو برقرار نہیں رکھ سکتا تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ ترجمہ کو ہاتھ ہی نہ لگائے۔

ظفر قریشی دہلوی

چاند اور ہم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی　چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر　منتشر ہے چاندنی کے فرش پر
کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں　جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے　حسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے　نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
بے سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال　یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے　بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اس کے دم سے ہے
اور محبت اس کو افسرؔ ہم سے ہے

افسر میرٹھی

بچّے کا خواب

دونوں خوردسال بچے فطرت کی طرف سے ایک عجیب دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ ہر چیز کو ایک خاص گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ قدرت کی لطیف صنعتیں مثلاً پھولوں کی رنگینی، نیلگوں آسمان کی بلندی، شفاف پانی کی گہرائی ہمیشہ اُن کے لئے تعجب کا باعث ہوا کرتی تھیں۔

وہ اکثر ایک دوسرے سے کہا کرتے "فرض کرو روئے زمین پر کے تمام بچے مرجائیں، تو کیا یہ پھول، یہ سمندر، یہ آسمان مغموم نہ ہوں گے؟ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور غم محسوس کریں گے، کیونکہ کلیاں پھولوں کے بچے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما ندیاں جو پہاڑوں کے دامن میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہتی ہیں سمندر کی اولاد ہیں۔ اور یہ چمکدار ننھے ننھے دھبّے جگنو جو تمام رات فضا میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں ستاروں کے بچے ہیں۔ جب وہ اپنے محبوبوں یعنی انسان کے بچوں کو نہ پائیں گے تو یقیناً مغموم ہونگے۔

ہر شام گرجے کی چوٹی کے نزدیک قبرستان کے اوپر سے ایک صاف جگمگاتا ہؤا ستارا نظر آیا کرتا تھا، یہ نسبتاً بڑا اور چمکدار تھا۔ وہ بلا ناغہ دریچے میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُسے دیکھا کرتے۔ دونوں میں سے جسے پہلے دکھائی دیتا وہ چلا اٹھتا۔ "وہ دیکھو ستارا" اور کبھی کبھی دونوں بیک آواز انگلیوں سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے "وہ دیکھو ستارا"

انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ کس وقت اور کس جگہ سے طلوع ہوگا۔ وہ اس سے اسقدر مانوس ہوگئے تھے کہ سونے سے پیشتر ایک بار اسے ضرور "دیکھتے" اور جب بستر پر لیٹتے تو کہتے "پیارے تارے خدا تمہیں برکت دے"۔

اتفاق ایسا ہؤا کہ بہن بیمار پڑگئی۔ اور اتنی کمزور ہوگئی کہ اپنے بھائی کی معیت میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر ستارے کو دیکھ نہ سکتی تھی، بچے کو اس کا بے حد افسوس تھا۔ وہ جب ستارے کو دیکھتا تو بہن کی طرف منہ موڑ کر کہتا۔ "وہ دیکھو ستارا" یہ سُنکر بہن کا کمزور مگر مسکراتا ہؤا چہرہ یوں گویا ہوتا "خدا میرے بھائی اور ستارے کو برکت دے"

وہ وقت جلد ہی آپہنچا جب بچہ تنہا رہ گیا، جب بستر پر بہن کا پیارا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ جب قبرستان میں ایک ننھی سی قبر کا اضافہ ہوگیا۔ اور جب ستارے نے اپنی لمبی شعاعیں اکیلے بچے ہی پر ڈالیں اور اس نے اُسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اب شعاعیں پہلے کی نسبت زیادہ روشن تھیں، اُن کے زمین پر پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان تک ایک روپہلی راستہ بن گیا ہے، بچہ جب اپنے بستر پر سویا تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ "لوگوں کا ایک تانتا لگا ہؤا ہے، جو اس درخشاں راستے پر روحوں کی معیت میں چل رہے ہیں، اور ستارہ نور کی ایک وسیع دنیا ہے۔ جہاں بیشمار روحیں اُن لوگوں کے استقبال کیلئے کھڑی ہیں۔ تمام منتظر رُوحوں نے اپنی نگاہیں آنیوالوں پر گاڑ رکھی ہیں۔ بعض جو زیادہ بے تاب تھیں اپنی اپنی قطاروں سے نکل کر اُن سے لپٹ گئی ہیں۔ اور اُن کی پیشانیوں کو چومنے لگی ہیں"۔

ان کی یہ ملاقات ایسا دل خوش کُن منظر تھا کہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور فرطِ مسرت سے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

لیکن بہت سی روحیں ایسی بھی تھیں جو اُن لوگوں کے ساتھ نہیں جاتی تھیں، اور اُن میں سے ایک کو وہ پہچانتا بھی تھا —— ایک کمزور اور زرد چہرہ جو کبھی بستر علالت پر دکھائی دیا کرتا تھا —— یہ اُس کی بہن تھی۔

اُس کی بہن کی رُوح دروازہ ہی پر انتظار کرتی رہی، اس نے رہنما (جو لوگوں کو اس نور کی دنیا میں لایا تھا) سے دریافت کیا۔

"کیا میرا بھائی آگیا ہے"؟

جواب ملا "نہیں"

وہ امید وارانہ پیچھے کو مڑی۔ بچّے نے فرطِ اشتیاق سے اپنے بازو پھیلا دئے اور چلّایا

"پیاری بہن! میں یہاں ہوں مجھے بھی لے جاؤ"

ننھی بچّی نے اپنی روشن نگاہیں اپنے بھائی پر ڈالیں اور اُس کی آنکھ کھُل گئی —— رات تاریک تھی، ستارہ اپنی طویل و درخشاں شعاعیں کمرے میں ڈال رہا تھا اور وہ پُرنم آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

بہن کی وفات کے بعد جب وہ ستارے کی طرف دیکھتا تو اُس کی آنکھوں میں مسافر کی اُن حسرت پاش نگاہوں کی جھلک پائی جاتی تھی جو دشت غربت میں بار بار اپنے وطن کی طرف اٹھتی ہوں ——— اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔

اُس نے خیال کیا کہ اُس کا تعلق صرف زمین ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ ستاروں سے بھی ہے۔ اور جب اُسے اپنی بہن کی روح کا خیال آتا جو ستارے کی طرف پرواز کر گئی تھی تو اس کے خیال کو مزید تقویت پہنچتی

کچھ عرصے کے بعد اُن کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا جو اُس کا چھوٹا بھائی کہلایا لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا ہی تھا اور اس نے ایک لفظ بھی بولنا نہ سیکھا تھا کہ دنیا سے سدھار گیا۔

بچے نے دوبارہ خواب دیکھا "ستارے تک شعاعوں کا ایک راستہ بنا ہوا ہے، لوگ رُوحوں کی معیت میں اُس پر چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی بہن کی رُوح نے انہی سے دریافت کیا ہے "کیا میرا بھائی آگیا ہے؟"

انہی نے جواب دیا "وہ نہیں بلکہ دوسرا"

جب بہن نے اس ننھے بھائی کی رُوح کو اپنے بازوؤں میں محبت سے لپٹایا تو بچہ چلا اُٹھا

"بہن میں یہاں ہوں مجھے بھی لے چلو"

اس نے جواب میں اس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور مسکرا دی ———

——— ستارہ اس کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بچہ اب نوجوان تھا۔ ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ بوڑھا خادم داخل ہوا اور عرض کیا۔

"جناب کی والدہ قضا کر گئی ہیں، میں اُن کی آخری دعائیں اور برکتیں آپ کے لئے لایا ہوں" رات کو خواب میں اُسے پھر وہی منظر نظر آیا اور حسب سابق اس کی بہن کی رُوح نے رہنما سے دریافت کیا

"کیا میرا بھائی آگیا ہے؟"

جواب ملا "بھائی نہیں تمہاری والدہ آئی ہیں"

ماں کے اپنے دو بچھڑے ہوئے بچوں سے دوبارہ جا ملنے پر ستارے کی فضا میں ہر طرف مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ ذرہ ذرہ جوش مسرت سے رقصاں نظر آتا تھا۔ بچہ اس منظر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دئے اور چلا اٹھا "امی جان! پیاری بہن! پیارے بھائی! میں یہاں اکیلا پڑا ہوں مجھے بھی بلا لو۔"

انہوں نے جواب دیا "تمہارے آنے کا ابھی وقت نہیں آیا"

——— ستارہ حسب معمول چمک رہا تھا ———

وہی بچہ اب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کے بال دن بدن سفید ہو رہے تھے۔ آتشدان کے سامنے کرسی کے بازو پر کہنی ٹیکے مغموم بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک بار پھر ستارہ اور اسکی وسیع فضا اُس کے سامنے تھی۔

اس کی بہن کی رُوح نے رہنما سے پوچھا

"کیا میرا بھائی آگیا ہے"

جواب ملا ...... "تمہاری بھتیجی آئی ہے"

اُس ادھیڑ عمر کے آدمی نے جو کبھی بچہ تھا اور جس نے تھوڑی دیر ہوئی اپنی شفقت بھری گود سے قضا و قدر کے حکم سے اپنی پیاری بیٹی کو جُدا کیا تھا۔ دیکھا وہ متبرک روح اُن تینوں کے ساتھ ہے۔ وہ بولنے لگا

"میری بچی کا سر میری بہن ...... کے سینے پر ہے۔ اُس کے بازو میری والدہ کی گردن میں حمائل ہیں۔ اور اس کے پیروں کی طرف میرا ننھا بھائی بیٹھا ہے۔ اب میں اُس کی جدائی کو برداشت کر لونگا اور یہ سب خدا کی مہربانی ہے جس کے لئے سب تعریفیں ہیں"

——— ستارہ فضا میں حسب معمول جگمگا رہا تھا"

وہ بچہ اب ایک پیر مرد تھا اُس کے صاف، خوبصورت چہرہ پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے اور اُس کی کمر جھک گئی تھی۔

ایک رات وہ بستر پر پڑا تھا، اُس کے بچے اُس کے گرد کھڑے تھے، وہ اپنے بچپن کے لہجے میں چلایا

"وہ دیکھو ستارا"

اُس کے لڑکے بالے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

"افسوس ابا جان کا آخری وقت آگیا"

پیر مرد نحیف آواز میں

"میں اب مر رہا ہوں، میری عمر کا لباس اب اُتر رہا ہے اور میں ستارے کی طرف ایک بچے ہی کی طرح جا رہا ہوں۔ اے خدا! تیرا ہزار ہزار شکر ہے، میں اب اُن سے جا ملونگا جو میرے انتظار میں ہیں"

——— ستارہ اسوقت بھی چمک رہا تھا، اور اب بھی اسکی قبر پر چمکتا ہے ———

(چارلس ڈکنز)

حمدی

عربوں کا نقدِ شعری

نقد کے معنی ہیں پرکھنا اور کھرا کھوٹا الگ کرنا - روپے پیسے میں کھرا کھوٹا جانچنے کو نقدِ دراہم اور اشعار میں اچھے برُے کی تمیز کو نقد شعر کہتے ہیں -

فنِ نقد کی حیثیت دوسرے علوم و فنون کے مقابلے میں ایک محافظ اور نگہبان کی ہے - کیونکہ اسی کی بدولت دوسرے فنون خرافات اور رطب یابس سے محفوظ رہتے ہیں - اور اسی کا خوف اہلِ کمال کو صرف اچھی چیز پیش کرنے پر مجبور کرتا ہے - اسی طرح ناقد بھی اہلِ علم کو گمراہی سے بچانے والا اور سیدھے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرنے والا محافظ اور رہنما سمجھا جاتا ہے - مگر ہر فن کے ناقد کیلئے ضروری ہے کہ وہ اُس فن میں پوری مہارت رکھتا ہو اور اس کے رموز و نکات سے خود مصنف سے کہیں زیادہ واقف ہو - اس کے ساتھ ہی نقد کے مختلف اسلوب میں بھی کامل دستگاہ رکھتا ہو - اور موقعہ کے مناسب ایسے طرز پر تبصرہ کر سکتا ہو کہ مصنف پر اس کا اثر پڑے اور وہ اپنی کجروی ترک کرنے پر تیار ہو جائے -

ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں شاعروں کی کمی نہ تھی مگر ناقد مفقود تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی شاعری سے اخلاقی عنصر فنا ہوگیا - سخاوت اور شجاعت کی خوبیاں اگر کچھ باقی بھی رہ گئی تھیں - تو ان پر بداخلاقی اور فحش نگاری کے پردے پڑ چکے تھے - کوئی نہیں تھا کہ ان کی روک تھام کرے - اور شاعروں کی بیجا خرچ ہونے والی قوتِ فکر کو قوم کی فلاح و بہبود کی طرف مائل کر سکے - ظہورِ اسلام کے بعد عرب کے شاعروں کی سب سے پہلی گرفت خداوند تعالیٰ کی طرف سے کی گئی اور اس آیت کے نزول کے ساتھ نقد کی بنیاد پڑی :-

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ - اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ -

شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (اچھے برُے کی تمیز کئے بغیر) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں -

اس آیۂ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد صحابۂ کرام نقد شعر کی طرف متوجہ ہوئے - اور مذموم اشعار کی مذمت اور اچھے اشعار کی مناسب تعریف سے شعر و شاعری سے بداخلاقی کے عناصر کو تقریباً فنا کر دیا -

اسلامی علوم و فنون کے ساتھ شاعری بھی ترقی کرنے لگی اور پہلی صدی ہجری ہی میں اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ شعر کے محاسن اور عیوب کو کتابوں کی صورت میں جمع کر دیا جائے تاکہ شاعر بھی گمراہی سے بچیں - اور ناقدوں کے لئے بھی آسانی ہو جائے - اس خیال کے ماتحت عربوں نے اس فن پر بہت سی کتابیں لکھیں جن کے رواج پا لے کے بعد نقد کے علاوہ شعر گوئی میں ان سے مدد لیجانے لگی - اور اب تو ساری شعر و شاعری کا دارومدار انہی کے مقرر کردہ اوزان و قوافی پر ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فن ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا - اس کے ثبوت میں بعض روائتیں بھی بیان کیجاتی ہیں جو چنداں قابل اعتماد نہیں ہیں - مثلاً اس فن کی کئی کتابوں میں دورِ جہالت کے نقد و تبصرہ کا ایک واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ نابغہ ذبیانی (ایک جاہلی شاعر) نے حضرت حسان سے ان کا یہ شعر سُنا :-

لَنَا الْجَفَنَاتُ الْغُرُّ يَلْمَعْنَ فِي الضُّحٰى
وَاَسْيَافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَّجْدَةٍ دَمَا

(ہماری شرافت کی نشانی، ہماری لمبی لمبی چمکدار پلکیں ہیں جو آفتاب کی روشنی میں چمکا کرتی ہیں اور (ہماری شجاعت کی علامت) ہماری تلواریں ہیں جن سے خون ٹپکتا رہتا ہے -

تو کہا کہ اگر تم اَلضُّحٰی (روشن دن) کے بجائے اَلدُّجٰی (تاریک رات) کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا - کیونکہ دن کو تو ہر چیز چمکتی ہے تمہاری پلکیں چمکیں تو کون بڑا کمال ہوا - اسی طرح یَقْطُرْنَ کی جگہ یَجْرِیْنَ کہنا چاہیئے تھا - تلوار سے قطرہ قطرہ خون ٹپکنا کونسی بڑی بات ہے - شجاعت تو جب معلوم ہو - کہ اُس سے خون کی دھاریں نکلے -

قُدامہ بن جعفر اپنی کتاب "نقد الشعر" میں نابغہ کی تردید میں لکھتے ہیں کہ اَلضُّحٰی کی جگہ اَلدُّجٰی کو بہتر بتانا اور یہ کہنا کہ دن کو ہر چیز چمکتی ہے واقعہ اور مشاہدے کے سراسر خلاف ہے - دن کو تو صرف وہی چیز چمکتی ہے جو بیحد صاف اور اتنی چمکدار ہو کہ آفتاب کی روشنی اور چمک میں فنا نہ ہو سکے - رات کو البتہ معمولی چمک والی چیزیں جگمگانے لگتی ہیں - چاند ستارے - چراغ - آگ اور درندوں کی آنکھیں وغیرہ آفتاب کی روشنی

ہیں اپنی معمولی چمک کی وجہ سے خیرہ ہو جاتی ہیں - مگر سورج ڈوبتے ہی سب روشن نظر آنے لگتی ہیں - ظاہر ہے کہ روشن آفتاب کے مقابلے میں چمکنا ایک کمال کہا جا سکتا ہے - نہ کہ رات کی تاریکی میں ٹمٹمانا - اسی طرح نابغہ کا یہ کہنا کہ یَقْطُرْنَ کے بجائے یَجْرِیْنَ بہتر ہوتا محاورے کے خلاف ہے - کسی کی شجاعت اور بہادری بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سَیْفُہٗ یَقْطُرُ دَمًا (اس کی تلوار سے خون ٹپکتا رہتا ہے) یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ سَیْفُہٗ یَجْرِیْ دَمًا (اس کی تلوار سے خون جاری رہتا ہے) اگر حسانؓ یَقْطُرْنَ کی جگہ یَجْرِیْنَ فرماتے تو یہ شعر محاورے سے خارج ہو جاتا -

قدامہ نے نابغہ کے نقد پر جتنا اچھا نقد کیا ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا مگر ہمیں تو روایت ہی سرے سے من گھڑت معلوم ہوتی ہے - ایسے لفظی جھگڑے اُس زمانے کی پیداوار ہیں جب اگلوں کی فصاحت و بلاغت کا دور ختم ہو چکا تھا - اور معانی تو الگ رہے پچھلے الفاظ تک میں غلطیاں کرنے لگے تھے - اسی شعر کے متعلق بعض دوسرے راویوں کی روایت سے ہمارے خیال کی اور بھی تائید ہوتی ہے - وہ بیان کرتے ہیں کہ نابغہ نے یہ شعر سنکر حضرت حسانؓ سے یہ بھی کہا تم نے اَلْجَفَنَاتُ اور اَسْیَافُ کہکر اپنی پلکوں اور اپنی تلواروں کی تعداد گھٹا لی ہے - گویا نابغہ کو سو سال بعد پیدا ہونے والے نحویوں کا اختلاف معلوم تھا - اور سیبویہ (ایک مشہور نحوی کا نام) کے مذہب کو ترجیح دیکر اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جمع[1] مونث سالم جمع کثرۃ نہیں جمع قلتہ ہے - اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو ابن مالک کی الفیہ کا یہ شعر بھی یاد تھا - ؎

اَفْعِلَۃٌ اَفْعُلُ ثُمَّ فِعْلَۃٌ
ثُمَّتَ اَفْعَالٌ جُمُوْعُ قِلَّۃٍ

(یہ سارے وزن جمع قلتہ کے لئے خاص ہیں -)

واقعہ یہ ہے کہ نابغہ کے مرکھپ جانے کے سیکڑوں سال بعد نحویوں میں اختلاف پیدا ہوا - اور بعضوں نے حضرت حسان کے شعر کے لفظ جَفَنَاتٌ سے جمع مونث سالم کو جمع کثرۃ ثابت کرنا چاہا تو جھٹ ان کے مخالف نابغہ کے نقد کی حکایت گڑھ کر جمع مونث سالم کو اسی شعر اور اسی لفظ سے جمع قلتہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے کیا نابغہ جیسا بڑا شاعر ان وزنوں سے اسقدر ناآشنا تھا؟ یا کیا حضرت حسانؓ کو اس کی خبر نہ تھی؟ یہ سب کچھ نہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ حکایت بھی نحویوں اور لغویوں کے سیکڑوں جھوٹوں میں سے ایک معمولی سا جھوٹ ہے - ورنہ کہاں نابغہ کا زمانہ اور کہاں ایسی لفظی گرفتیں! شروع سے عہد عباسی کی ابتدا تک عربوں کی فصاحت و بلاغت اپنے اصلی رنگ میں قائم تھی اور اس سے پہلے ایسے لفظی نقد کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی تھی - یہ تو جب اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور عجمیوں کے میل ملاپ سے عربوں کی فطری سادگی اور بدوی فصاحت و بلاغت میں فرق آنے لگا تو لفظوں اور وزنوں کی گرفت کرنے والے ناقد بھی پیدا ہو گئے - دور جہالت میں تو نقد و تبصرہ کا نام و نشان ہی نہ تھا - ابتداء اسلام میں اس کی طرف توجہ بھی کی گئی تو صرف معنوی حیثیت سے - اور اس وقت ضرورت بھی صرف اسی کی تھی -

اسی قسم کی ایک اور جھوٹی روایت یوں بیان کیجاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا قول اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ (تم اور جن چیزوں کو تم پوجتے ہو وہ دوزخ کا ایندھن ہیں) نازل ہوا اور مشرکوں نے سنا تو ایک نے دربار نبوت میں حاضر ہو کر بطور اعتراض دریافت کیا - کہ حضرت عیسیٰؑ کو عیسائیوں کے بعض فرقے پوجتے ہیں - تو کیا وہ بھی دوزخ کا ایندھن ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ "تم اپنی قوم کی زبان سے کسقدر ناواقف ہو - کیا تمہیں معلوم نہیں کہ "ما" غیر ذی العقول (عقل والوں کے سوا) کیلئے آتا ہے -

اس روایت کو گھڑنیوالا بھی کتنا احمق اور کیسا جاہل تھا - کاش وہ اس افترا سے پہلے خدا تعالیٰ کے قول سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (خدا کی پاکی بیان کی ان تمام چیزوں نے جو آسمان میں ہیں اور ان تمام چیزوں نے جو زمین میں ہیں) پر غور کر لیتا - اسمیں تو "ما" غیر ذوی العقول کے ضمن میں ذوی العقول (عقل والوں) کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے - کیا معترض کو جو عرب کے فصحا میں سے تھا - اپنی زبان کے ایسے مشہور اور بار بار آنے والے لفظ کا محل استعمال معلوم نہ تھا - یا کیا رسول اکرم صلعم جو تمام فصیحوں سے فصیح تھے - نعوذ باللہ منشاء وحی سے ناآشنا تھے - کاش انہیں معلوم ہوتا کہ صحیح روایتوں کی بنا پر تو اس

[1] جمع مونث سالم اس جمع کو کہتے ہیں جو مفرد پر الف اور ت بڑھا کر بنائی جائے - اور جمع کثرۃ وہ جمع ہے جسمیں ایک ہی قسم کی دس یا اس سے زیادہ چیزیں شامل ہوں لیکن جمع قلتہ اسے کہتے ہیں جو دس سے کم پر بولی جائے - جمع مونث سالم کے متعلق بعض نحویوں کا خیال ہے کہ جمع قلتہ ہے اور بعض اسے جمع کثرۃ سمجھتے ہیں -

[2] حضرت حسانؓ کے شعر کا لفظ اسیاف اسی وزن پر ہے اور یہ وزن ابن مالک کے نزدیک الفیہ کے اس شعر کے دوسرے وزنوں کی طرح جمع قلتہ کیلئے ہے - مگر ان کے نزدیک جمع مونث سالم قلتہ کے لئے نہیں ہے - اور سیبویہ کے نزدیک اسیاف (افعال) کا وزن جمع قلتہ کے لئے نہیں آتا - مگر نابغہ نے گویا آدھی سیبویہ کی پیروی کی - اور آدھی ابن مالک کی - اور حضرت حسان کے شعر پہ اعتراض جڑ دیا - چہ خوش!

اعتراض کا جواب خود وحی سے یہ نازل ہوا تھا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ

جن لوگوں کے حق میں ہماری طرف سے پہلے ہی بلند درجے (یا بھلائیاں) مقرر ہو چکے ہیں وہ یقینی طور پر دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔

نحویوں۔ لغویوں اور خود غرض راویوں کی اس قسم کی بیسیوں من گھڑت روایتیں مشہور ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر اتنی سطحی ہیں اور جھوٹ ایسے بھونڈے پن سے بولا گیا ہے۔ کہ نا قد اس زمانے کی ادبی اور لغوی ترقی کے مدارج اور اس وقت کے افکار و خیالات سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہو تو بڑی آسانی سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہے۔ ہماری نظر سے تو ظہور اسلام سے قبل کی نقد شعری کے متعلق یا اس کے ضمن میں جتنی روایتیں گزری ہیں سب تقریباً اسی طرح لغویوں اور نحویوں یا لغویوں کی خانہ ساز معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے ناقدانہ مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ ایام جاہلیت میں عرب میں فن نقد کا سرے سے وجود ہی نہ تھا مسلمانوں کے ہاتھوں اس کی بنیاد پڑی اور انہی کے ہاتھوں یہ پروان چڑھا۔ مگر اسلام کے ابتدائی ایام میں جبکہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت نے ہر شاعر و غیر شاعر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ انسانی کلام کی طرف چنداں توجہ نہیں کی گئی۔ بلکہ جب مسلمان کلام الٰہی پر اچھی طرح حاوی ہو گئے اور مخالفین اسلام کی مدافعت اور غزوات سے بھی ایک حد تک فرصت ملگئی تو کلام الٰہی کی روشنی میں عربی شاعروں کے دیوانوں کی چھان بین اور ان پر نقد و تبصرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور سو سال کے اندر اندر عہد عباسی کے ابتدائی دور میں یہ فن اپنی ترقی کے آخری زینے تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد جیسے جیسے عربوں میں عجمی تمدن و تہذیب کا دخل ہوتا گیا۔ ان کی زبان بھی عجمیت سے متاثر ہونے لگی۔ صرف یہی نہیں کہ عربی کے عجمی شاعروں کی زبان خراب تھی بلکہ ان کے اثر سے خاص عربوں میں بھی پہلی سی وہ فصاحت و بلاغت اور ان کی امتیازی سادگی باقی نہ رہی۔ اور اس طرح لفظی اور بلاغتی غلطیوں کی وجہ سے زیادہ تر لفظی حیثیت ہی سے نقد و تبصرہ ہونے لگا۔ اور صحابہ کرامؓ یا تابعینؒ نے اس فن کے ذریعے سے شعر و شاعری میں اخلاقیات داخل کرنا اور اشعار سے اصلاح قوم کا جو کام لینا شروع کیا تھا اس کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی حقیقی معنوں میں عربوں کے سیدھے سادے معنوی نقد کا دور ختم ہو گیا۔

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ شعر سے ایک طرف سلطنتیں پلٹ جاتی ہیں تو دوسری طرف اس سے ذہنیتیں بدل جاتی ہیں۔ اور بسا اوقات تو اس کا نشہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ بادۂ کہن سے بھی اتنی کیفیت نہیں حاصل ہو سکتی۔ شعر کے اس جادو بھرے اثر سے عرب مدتوں سے واقف تھے۔ صحبت نبوی صلعم کی تربیت کے بعد انہوں نے اس کو گمراہی اور کذب و افترا کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اور بغض و عداوت کا باعث رہنے دینے کے بجائے لوگوں کے دلوں میں حسین اخلاق اور حق و صداقت کا بیج بونے کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اس طرح جو قوت "دارۃ جلجل" جیسی شرمناک صحبتوں کے شرمناک واقعات کے فکر کرنے میں صرف ہوتی تھی وہ حکمت اور فلسفۂ الٰہی اور درس اخلاق کے نظم کرنے میں خرچ ہونے لگی۔ سوق عکاظ اور دوسرے میلوں کے مشاعرے۔ سوقیانہ شاعری کے بلند بانگ مقابلے۔ عریاں نگاری اور بے حیائی کے مظاہرے بند ہو گئے۔ شاعروں اور ان کے راویوں کے جو ترانے پہلے مختلف قبیلوں میں آتش فساد مشتعل کر دیا کرتے تھے۔ ان کا جو تغزل پہلے کنواروں اور کنواریوں کے جذبات شہوانی میں ہیجان برپا کر دیتا تھا۔ وہی اب ان کو اخلاق و مروت کا درس دینے لگا۔ اسی سے اب ان کے کینہ بھرے سینوں میں خلوص و محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ پہلے شاعروں کو اپنی زبردستی کی محبوبہ کو آفتاب کی روشنی میں اس کی ہجولیوں کے سامنے ننگا کر کے اس کے حسین محبوب کی ایک ایک کیفیت ٹیلے پر کھڑے ہو کر بھرے میلے کے سامنے بیان کرنے پر جو داد ملا کرتی تھی اب وہ کلمۂ حق اور فلسفۂ الٰہی کی تفسیر پر ملنے لگی۔ جب داد دینے والے اور نقد و تبصرہ کرنے والے ہی بدل جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر نہ بدل جائیں گے۔ ان کی نکیل تو دراصل ناقدوں اور داد دینے والوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر ان کا ذوق نکھرا ہوا ہو تو غیر ممکن ہے کہ ان کے عہد میں کوئی بدمذاق یا لغو گو شاعر پنپ سکے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار بنی غطفان کے وفد سے گفتگو فرماتے ہوئے پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا ہے:۔

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً

وَلَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبُ

میں نے تو خدا کی قسم کھالی اور تمہارے لئے شک کی گنجائش چھوڑی ہی نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ کے سوا اور کسی طرف جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔

ارکانِ وفد نے جواب دیا کہ یہ شعر نابغہ ذبیانی کا ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا کہ اور یہ کس نے کہا ہے :۔

أَتَيْتُكَ عَارِيًا خَلَقًا ثِيَابِي   عَلَى وَجَلٍ تَظُنُّ بِيَ الظُّنُونُ
فَأَلْفَيْتُ الْأَمَانَةَ لَمْ تَخُنْهَا   كَذَلِكَ كَانَ نُوحٌ لَا يَخُونُ

میں پھٹے پرانے کپڑوں میں بے سَتری کی حالت میں ڈرتا ڈرتا تمہارے پاس پہنچا۔ (میری بدحالی کی وجہ سے) میرے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کی جارہی تھیں (اور تم میری امانت کو دبا لیتے تو نہ میں خود وصول کرسکتا تھا اور نہ دوسرے اس میں میری امداد کرسکتے تھے۔ مگر) میں نے اپنی امانت جوں کی توں پالی اور تم نے اس میں ذرا بھی خیانت نہیں کی۔ حضرت نوح بھی اسی طرح کسی کی امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے تھے۔

انہوں نے جواب دیا کہ یہ اشعار بھی نابغہ ہی کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تمہارے شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے (هُوَ أَشْعَرُ شُعَرَائِكُمْ)

کسی شاعر کو دوسرے شاعروں کے مقابلے میں فضیلت دینا بھی دراصل نقدِ شعر ہی میں داخل ہے کیونکہ اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے اشعار دوسروں کے اشعار سے اچھے ہیں حضرت عمرؓ کے اسی نقد سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ابتداءِ اسلام میں نقدِ شعری کا معیار کیا تھا اور کس قسم کے اشعار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اصحابِ نظر ایسے اشعار کی کتنی داد دیتے تھے جن میں کسبِ فضائل اور ترکِ رذائل کے لئے برانگیختہ کیا گیا ہو۔

اس قسم کی اخلاقی شاعری سے مسلمانوں کی دلچسپی اس لئے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ بعض اوقات شاعروں کی بروقت فکر قوم اور رہنمایانِ قوم کو بڑی بڑی غلطیوں اور نقصانوں سے بچا لیتی تھی۔ حضرت عمرؓ علمیت فقاہت اور سیاست میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مگر بسا اوقات وہ بھی شاعروں کی یاد دہانی اور شعر کے اثر سے متاثر ہوجایا کرتے تھے۔ مالک بن انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عُمّالِ حکومت کے پاس بے انتہا دولت جمع ہوگئی تھی۔ رعایا کو یہ بات بُری معلوم ہوئی اور ایک شاعر نے دربارِ خلافت میں یہ اشعار لکھ بھیجے :۔

نَحُجُّ إِذَا حَجُّوا وَنَغْزُو إِذَا غَزَوْا
فَأَنَّى لَهُمْ وَفْرٌ وَلَسْنَا بِذِي وَفْرِ

إِذَا التَّاجِرُ الْهِنْدِيُّ جَاءَ بِفَأْرَةٍ
مِنَ الْمِسْكِ رَاحَتْ فِي مَفَارِقِهِمْ تَجْرِي
فَدُونَكَ مَالَ اللهِ حَيْثُ وَجَدْتَهُ
سَيَرْضَوْنَ إِنْ شَاطَرْتَهُمْ مِنْكَ بِالشَّطْرِ

وہ (عمالِ حکومت) حج کرتے ہیں تو ہم بھی حج کو جاتے ہیں وہ جنگ میں شریک ہوتے ہیں تو ہم بھی شریک ہوتے ہیں (احکامِ اسلام پر عمل کرنے میں ہم اور وہ برابر ہیں) مگر ان کے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ہم غریب کے غریب ہی ہیں۔

ہندوستانی تاجر مشک نافہ لیکر پہنچ جاتا ہے تو ان کی مانگیں مشک ہی مشک سے لیسی رہتی ہیں۔

اللہ کا مال آپکو جہاں بھی ملے اس پر قبضہ کرلیں اگر آپ اپنے عاملوں کی دولت تقسیم کرکے نصف خود (بیت المال میں) لے لیں تو رعایا کی خوشی کا باعث ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے یہ اشعار سنکر زبانی داد تو نہیں دی مگر اس پر عملی تقدیق کیا کہ شاعر کی آرزو کے مطابق تمام وابستگانِ خلافت کی نصف دولت بیت المال میں داخل کرلی۔

حضرت علیؓ ذیل کے شعر کو بیحد پسند فرمایا کرتے تھے اور میدانِ کارزار میں جاتے وقت اکثر پڑھا کرتے تھے۔

أَيَّ يَوْمَيَّ مِنَ الْمَوْتِ أَفِرّ   يَوْمَ لَا يُقْدَرُ أَمْ يَوْمَ قُدِرْ
يَوْمَ لَا يُقْدَرُ لَا أَرْهَبُهُ   وَمِنَ الْمَقْدُورِ لَا يُنْجِي الْحَذَرْ

موت سے بچنے کے لئے کس دن بھاگ سکتا ہوں جس روز اجل مقدر نہیں اس دن سے یا جس روز مقدر ہے اس سے؟

تقدیر میں جس دن مرنا نہیں ہے اس دن کا مجھے کوئی خوف ہی نہیں اور جس دن مقدر ہے اس روز میرا خوف اور میرا کترانا موت سے مجھے بچا ہی نہیں سکتا۔ (باقی آئندہ)

تاجور

قسمت

فرعون مصر کے شاہی محل کے دروازے کے آگے دو سپاہی گشت کر رہے ہیں کچھ وقفے کے بعد دونوں ٹھہر جاتے ہیں۔

پہلا سپاہی۔ ہوا بند ہے۔ دن کا سانس گھٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا۔ میرا جی چاہتا ہے جس وقت پھلوں سے لدے ہوئے درخت دریائے نیل پر اپنا گہرا سایہ ڈالیں۔ تو میں اس کی ٹھنڈی لہروں میں اپنے آپ کو غرق کر دوں۔

پہلا۔ شاید بجلی کڑکے گی۔ یا کوئی بادشاہی خاندان برباد ہو گا۔

دوسرا۔ شام کو کچھ ٹھنڈک ہو جائے گی۔ فرعون کہاں ہے؟

پہلا۔ اپنی سنہری کشتی میں دریا کی سیر کر رہا ہو گا۔ یا اپنے سپہ سالاروں سے آئندہ لڑائیوں کے متعلق مشورہ کرنے میں مصروف ہو گا۔

ابھی ستارے اس پر رحم کرتے ہیں۔ ابھی ستاروں نے اُسے آزاد چھوڑ رکھا ہے۔

دوسرا۔ تم نے یہ کیا کہا؟ ستارے اس پر رحم کرتے ہیں؟ ستاروں نے اُسے آزاد چھوڑ رکھا ہے؟

پہلا۔ میں نے یہ اس لئے کہا ہے۔ کہ جب ستارے کسی بادشاہ کو سزا دیتے ہیں۔ تو اس کا تمام ملک۔ اس کی تمام رعیت اس سزا میں شریک ہوتی ہے۔ اس کے ارد گرد کی چیزیں بھی فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا محل زمین پر آ رہتا ہے۔ اس کے مکانوں اور قلعوں کی دیواریں گر پڑتی ہیں جنگل سے بندر بھاگتے ہوئے شہر میں آ جاتے ہیں۔ صحراؤں سے وحشی درندے نکل آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کبھی کوئی بادشاہ تھا ہی نہیں۔

دوسرا۔ لیکن ستارے بادشاہ کو کیوں سزا دیں گے۔

پہلا۔ اس لئے کہ اس نے کبھی ستاروں کو خوش رکھنے کی کوشش نہیں کی۔

دوسرا۔ ہاں میں نے اس کے متعلق یہ بات اور لوگوں سے بھی سُنی ہے۔

پہلا۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ستاروں کی پرواہ نہ کرے۔ طاعون۔ زلزلے۔ بجلیاں سب بلائیں انہیں کے اختیار میں ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ ہر وقت دوسرے ملکوں کے سفیر موجود رہتے ہیں۔ اس کے سپہ سالار دور دور سے اس کے قانون ساز دارالخلافے میں آ کر قانون بناتے ہیں۔ لیکن ستاروں کے راز دار۔ ستاروں کے عالم ستاروں کو جاننے والے کبھی نہیں دیکھے جاتے۔

دوسرا۔ سنو! کیا یہ بجلی کا کڑکا تھا؟

پہلا۔ یقین کرو۔ ستارے فرعون سے ناخوش ہیں۔

ایک اجنبی داخل ہوتا ہے۔ وہ فرعون کے دروازے تک پہنچنا چاہتا ہے۔ سپاہی اپنے بھالے اونچے کر لیتے ہیں۔

دونوں۔ جاؤ۔ واپس چلے جاؤ۔

اجنبی۔ کیوں؟

پہلا سپاہی۔ فرعون کے دروازے کو ہاتھ سے چھونا موت ہے۔

اجنبی۔ میں مصر کے جنوبی حصے سے آیا ہوں۔ اور اجنبی ہوں۔

پہلا سپاہی۔ اجنبی بھی اُسے نہیں چھو سکتا۔ وہ بھی مارا جائے گا۔

اجنبی۔ تمہارا دروازہ حیرت انگیز طور پر مقدس ہے۔

اجنبی واپس چلا جاتا ہے۔

دو بچے داخل ہوتے ہیں۔

لڑکا (سپاہی سے) میاں سپاہی میں فرعون سے ایک گیند مانگنا چاہتا ہوں۔

سپاہی مسکراتا ہے

لڑکا دروازے کو دھکیلتا ہے۔

(لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر)

میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔

(سپاہی سے) میں گیند دروازے ہی سے نہ مانگ لوں؟

سپاہی۔ ہاں ٹھیک ہے۔

— دوسرے سپاہی کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ برآمدے میں کوئی نظر آتا ہے؟

دوسرا۔ (آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کرتے ہوئے) نہیں۔ دور میدان میں ایک کتا نظر آ رہا ہے۔ اور بس۔

پہلا۔ تو آؤ۔ ذرا ٹہلیں اور کھانا کھا لیں۔

لڑکا۔ دروازے! دروازے! مجھے گیند دے۔

سپاہی کھانا کھاتے ہیں۔

لڑکی۔ (سپاہی کی طرف اشارہ کر کے) میرے ابا اس سے زیادہ لمبے ہیں۔

لڑکا۔ میرے ابا لکھ سکتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے لکھنا پڑھنا سکھا ہے۔

لڑکی۔ کوئی لکھنے پڑھنے سے نہیں ڈرتا۔ میرے ابا سپاہی ہیں۔
لڑکا۔ میرے پاس ایک سونے کا ڈلا ہے۔ میں نے ندی میں سے نکالا تھا۔
لڑکی۔ میرے پاس ایک نظم ہے۔ میں نے اپنے دماغ سے نکالی ہے۔
لڑکا۔ کیا یہ نظم لمبی ہے۔
لڑکی۔ نہیں۔
لڑکا۔ کھلا سناؤ تو
لڑکی۔ (پڑھتی ہے)

اِک نغمہ ریز طائر۔ پر جس کے ارغواں تھے
عرشِ بریں کی جانب۔ پرواز کر گیا ہے۔

لڑکا۔ "مر گیا ہے"
لڑکی۔ یہ میری نظم کے مصرعوں سے چھوٹا مصرع ہے۔
لڑکا۔ کیا ہرج ہے؟
لڑکی۔ تمہیں میری نظم پسند آئی؟
لڑکا۔ پرندے ارغوانی نہیں ہوتے۔
لڑکی۔ لیکن میرے والد کا پرندہ تو ارغوانی ہی تھا۔
لڑکا۔ اوہ!
لڑکی۔ تمہیں میری نظم پسند نہیں؟
لڑکا۔ کیوں نہیں!
لڑکی۔ تم غلط کہتے ہو۔ تمہیں یہ نظم ذرا بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔
لڑکا۔ نہیں نہیں۔ مجھے یہ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔
لڑکی۔ تو پھر تم نے کہا۔ کیوں نہیں؟ میں جانتی ہوں۔ تم اس کو پسند نہیں کرتے۔
لڑکا۔ لو میں تمہیں خوش کرنے کے لئے نظم دیوار پر لکھ دیتا ہوں خفگی جانے دو۔
لڑکی۔ تم لکھ سکتے ہو؟
لڑکا۔ ہاں میں لکھ سکتا ہوں۔
لڑکی۔ تو ضرور لکھو۔ دیکھوں بھلا دیوار پر لکھی ہوئی میری نظم کیسی معلوم ہوتی ہے۔

لڑکا نظم لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لڑکی دیکھ رہی ہے۔

پہلا سپاہی۔ عنقریب کسی اور ملک سے ہماری لڑائی چھڑ جائیگی۔
دوسرا سپاہی۔ معمولی سی لڑائی ہوگی۔ پہاڑی قوموں سے ہم ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ لیکن معرکے کی جنگ کوئی نہیں ہوتی۔
پہلا۔ جب کوئی شخص لڑائی کے لئے جاتا ہے۔ تو اس کی آنکھوں اور مستقبل کے درمیان پردے زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ لڑائی کس طرح شروع ہوگی اور کس طرح ختم ہوگی۔ کتنے آدمی کام آئینگے۔ کیا نتیجہ ہوگا۔
دوسرا۔ لیکن پہاڑی قوموں سے تو جو بھی لڑائی ہو۔ اسے معرکے کی جنگ نہیں کہنا چاہئے۔
پہلا۔ ہاں، لیکن کبھی کبھی دیوتا ہنستے ہیں۔
دوسرا۔ کس پر ہنستے ہیں۔
پہلا۔ بادشاہوں پر۔
دوسرا۔ تمہیں پہاڑی لوگوں سے لڑائی کا اتنا کیوں فکر ہے۔
پہلا۔ اس لئے کہ ہمارے فرعون کے پاس اپنے باپ دادا سے زیادہ دولت جمع ہو گئی ہے۔ اس کے پاس ان گنت جنگی گھوڑے ہیں۔ لاتعداد خزانے ہے بیشمار فوج ہے۔ فرعون بہت طاقتور ہو گیا ہے۔
دوسرا۔ تو وہ پہاڑی لوگوں کو بہت جلدی مغلوب کر لے گا۔
پہلا۔ جب بادشاہ بہت طاقتور ہو جاتے ہیں۔ تو ستارے رشک کرتے ہیں۔

لڑکا۔ لو میں نے تمہاری نظم لکھدی۔
لڑکی۔ سچ مچ۔
لڑکا۔ میں تمہیں سناتا ہوں۔

محل کی دیوار پر لکھی ہوئی نظم پڑھتا ہے۔

اک نغمہ ریز طایر
پر جس کے ارغواں تھے
عرشِ بریں کی جانب
پرواز کر گیا ہے
مر گیا ہے!!

لڑکی۔ آخری مصرع چھوٹا ہے۔
لڑکا۔ کیا ہرج ہے؟

دبے پاؤں ایک سپاہی داخل ہوتا ہے۔
پھر یکایک غایب ہو جاتا ہے۔

لڑکی۔ اُف۔ میں تو ڈر گئی۔
لڑکا۔ کیوں؟ وہ تو ایک معمولی سپاہی تھا۔
لڑکی۔ مجھے سپاہی بڑے معلوم ہوتے ہیں۔
لڑکا۔ تو آؤ۔ گھر بھاگ چلیں۔
سپاہی (بچوں کو دیکھکر) بچو۔ بھاگ جاؤ۔ فرعون آ رہا ہے۔ وہ تمہیں کھا جائے گا۔

لڑکا سپاہی کی طرف ایک پتھر پھینک کر بھاگ جاتا ہے۔ ایک اور سپاہی

داخل ہوتا ہے۔ دیوار پر لکھی ہوئی نظم پڑھ کر اُلو کی طرح چیخ مارتا ہے۔ ایک دوسرا سپاہی آجاتا ہے۔ نظم پڑھ کر وہ بھی چیخ اٹھتا ہے۔ پھر دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔

فرعون مصر اور حاجب داخل ہوتے ہیں۔

فرعون نے ایک ارغوانی قبا پہنی ہوئی ہے۔ سپاہی اپنے بھالوں کو بائیں ہاتھ میں تھام لیتے ہیں اور پھرتی سے جنگی سلام کرتے ہیں۔

پہلا سپاہی۔ (فرعون کے قدموں پر جھک جاتا ہے۔) شہنشاہِ زماں! دروازے پر کچھ لکھا ہوا ہے؟

حاجب۔ اسی دروازے پر!

فرعون کسی احمق کا کام ہے۔ کل سے آج تک یہاں کون کون آیا ہے۔

پہلا سپاہی۔ (سوچ کر) کوئی نہیں۔ عالیجاہ۔ صرف جنوبی مصر کا ایک اجنبی آیا تھا۔

فرعون۔ کیا اُس نے دروازے کو چھوا تھا؟

سپاہی۔ نہیں عالیجاہ۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ دروازے کو چھوئے لیکن ہم نے اُسے اپنے بھالوں سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

فرعون۔ وہ کہاں تک آیا تھا؟

پہلا سنتری۔ ہمارے بھالوں کی زد میں آ چکا تھا۔

فرعون۔ تمہیں کچھ معلوم ہوا۔ کہ وہ دروازے کو کیوں چھونا چاہتا تھا۔

سپاہی۔ نہیں عالی جاہ۔

فرعون۔ وہ کس طرف کو گیا تھا۔

سپاہی۔ (اشارہ کرتے ہوئے) اس طرف!

بادشاہ ایک سپاہی کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ سپاہی واپس چلا جاتا ہے۔

فرعون۔ (باقی ماندہ سپاہیوں سے مخاطب ہو کر)

اس تحریر کے کیا معنی ہیں۔

ایک سپاہی۔ عالیجاہ۔ ہم نہیں پڑھ سکتے۔

فرعون۔ سپاہی کو ہمہ دان ہونا چاہئے۔

دوسرا سپاہی۔ عالیجاہ۔ ہم نگرانی کرتے ہیں۔ حفاظت کرتے ہیں ہم بھالوں کے معنی جانتے ہیں۔ قدموں کے نشان پہچانتے ہیں۔ اور پراسرار جگہوں میں جو باتیں چپکے چپکے ہوتی ہیں۔ انہیں بھی سن لیتے ہیں۔ لیکن ہم پڑھ نہیں سکتے۔

فرعون۔ (حاجب سے) دیکھو۔ یہ کیا لکھا ہے۔

حاجب۔ (پڑھ کر) عالیجاہا۔ یہ صریح بغاوت ہے۔ تحریر تمام باغیانہ ہے۔

فرعون۔ پڑھو۔

حاجب پڑھتا ہے۔

ایک نغمہ ریز طائر

پر جس کے ارغواں تھے

عرش بریں کی جانب

پرواز کر گیا ہے

"مر گیا ہے"

سپاہی۔ (اپنے آپ سے) ستاروں نے فیصلہ سنا دیا۔

فرعون۔ اجنبی کے علاوہ کوئی اور بھی یہاں آیا تھا۔

سپاہی۔ (جھک کر) نہیں عالیجاہ۔ کوئی نہیں۔

فرعون۔ تم نے اور کچھ نہیں دیکھا۔

سپاہی۔ نہیں۔ عالیجاہ۔

حاجب۔ عجیب ماجرا ہے۔

فرعون۔ شاید یہ کوئی غیبی اور پراسرار پیغام ہے جو میری تنبیہ کے لئے بھیجا گیا ہے۔

حاجب۔ تحریر باغیانہ ہے۔

فرعون۔ یہ پیغام ستاروں کا ہے۔

حاجب۔ نہیں۔ عالی جاہ۔ یہ ستاروں کا نہیں کسی انسان کا کام ہے تاہم تحریر کا مطلب سمجھنے کی کوشش ضروری ہے۔ ارشادِ عالی ہو تو ستاروں کے عالم طلب کئے جائیں۔

فرعون سپاہیوں کو اپنے قریب طلب کرتا ہے۔

فرعون۔ جاؤ۔ ستاروں کے رازداروں کو بلا لاؤ۔ (حاجب سے مخاطب ہو کر) شاید اب ہم کبھی نیل کی سیر نہ کر سکیں گے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم نے ستاروں کی نسبت اپنی رعیت کا خیال زیادہ رکھا ہے۔ اور جوئے کہکشاں پر جوئے نیل کو ترجیح دی ہے۔

حاجب۔ عالی جاہا! یہ تحریر کسی احمق نے لکھی ہے۔ حضور پر نور کے سپاہی اس باغی کو گرفتار کر لیں گے۔ اور پھر یہ تمام پریشانی رفع ہو جائے گی۔

فرعون۔ شاید۔ مگر سپاہیوں نے کسی شخص کو یہ تحریر لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

حاجب۔ دیکھئے حضور والا۔ وہ دو عالم آ رہے ہیں۔ وہ حضور کی تشفی کر دیں گے۔

دو عالم داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔

فرعون۔ کسی فقیر نے میرے دروازے پر کچھ شعر لکھ دیئے ہیں۔ اور ہم نے آپ کو طلب کیا ہے۔ کہ آپ دیکھیں آیا ان اشعار میں کوئی معنی ہیں؟

حاجب۔ بے معنی تحریر!

عالم تحریر کا مطالعہ کرتے ہیں۔

پہلا عالم۔ بچے ادہر آ۔ جا ہمارے سرخ جبے لے آ۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ تحریر کا مطلب کیا ہوگا۔ شاید ایسا ہو کہ ستاروں نے فرعون کو مسرت اور کامیابی کا پیغام بھیجا ہو۔ اور دیکھ ہمارے سبز قبا بھی لیتا آ۔ شاید ستاروں نے فرعون کو ان نئی خوبصورت چیزوں سے آشنا کرنا چاہا ہو۔ جو اسے آئندہ حاصل ہونے والی ہیں۔ سن بچے۔ ہمارے سیاہ ملبوس بھی لیتا آ۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ستاروں نے فرعون کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا ہو۔

پہلا عالم۔ (تحریر کو غور سے پڑھتا ہے)

ستاروں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ تحریر خالص سونے سے لکھی ہوئی ہے۔

پہلا عالم سیاہ لباس پہن لیتا ہے۔

فرعون۔ کیا کہتے ہیں ستارے؟

پہلا عالم۔ کچھ پتا نہیں۔ لاہی۔ لاہی۔ الیرتھون۔ الیاب۔ ایرلیولز۔ چلا جاتا ہے۔

فرعون۔ (دوسرے عالم سے) آپ دیکھئے کیا کہتے ہیں ستارے؟

دوسرا عالم۔ (تحریر پڑھتا ہے)

ستاروں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

فرعون۔ کیا کہتے ہیں ستارے؟

دوسرا عالم۔ کچھ پتا نہیں۔ لاہی لاہی۔ لاری مونزا۔ الیاب۔ ایرلیولز۔

فرعون۔ دو عالموں نے سیاہ لباس پہن لئے۔ اب لوگ انکو دیکھینگے تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ستارے مجھ سے ناخوش ہیں۔

حاجب۔ عالیجاہا! میں ستاروں کے سب سے بڑے عالم کو طلب کرتا ہوں۔ حضور تسلی رکھیں! تحریر کا مطلب ضرور حل ہوگا۔

فرعون۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ وہ بھی ان دونوں کی طرح سیاہ کپڑے پہنکر سر جھکا کر۔ واپس چلا جائے۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتے کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

حاجب۔ عالیجاہا! یقین فرمایئے کہ یہ کام کسی بیوقوف کا ہے جس نے حسرت سے جمع کئے ہوئے سونے کے ڈلے حماقت سے ضائع کر دیئے ہیں۔

فرعون۔ آہ! میں نے ویران اور بنجر زمینوں کو آباد کیا۔ جہاں وحشی درندے بستے تھے۔ وہاں انسانوں کو بسایا۔ میں نے اپنے ملک کی حدیں لڑائیوں سے وسیع کیں۔ اور رعیت کو امن کی برکتوں سے بہرہ ور کیا۔ میں نے دانشمندانہ قانون وضع کئے۔ کہ میری رعیت خوش رہے۔ اور ستارے مجھ سے ناخوش ہو گئے۔ آہ!

ستاروں کا سب سے بڑا عالم داخل ہوتا ہے۔

فرعون۔ یہ تحریر پڑھو اور مجھے اس کا مطلب سمجھاؤ۔ میں تمہاری گردن میں فیروزے کا ہار ڈالونگا۔ اور ان نیلموں سے مالامال کر دونگا۔ جو میرے ملک کی سرحد پر برف سے منجمد پہاڑوں میں دفن ہیں۔

عالم سیاہ لباس پہن لیتا ہے۔

عالم۔ کون ہے۔ جس کا لباس ارغوانی رنگ کا ہے۔

فرعون۔ کون ہے جو آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے۔

فرعون۔ کون ہے جس نے ستاروں کو فراموش کر رکھا ہے۔

فرعون مصر!

فرعون۔ یہ تحریر کس نے لکھی ہے۔

عالم۔ کسی دیوتا نے۔ خالص سونے سے لکھی ہے۔

کسی ایسے دیوتا نے جو امیر ستاروں میں رہتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ (اپنے آپ سے) کل ایک ستارہ شعلہ برساتا ہوا زمین کی طرف گر رہا تھا

عالم۔ لاہی۔ لاہی۔ لاری مونزا۔ الیاب۔

فرعون۔ میں نے اپنی رعایا کو خوشحال رکھا ہے۔ ستارے کیوں مجھ سے خفا ہیں۔ میرا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں۔ آئندہ نسلیں کہینگی۔ فرعون مصر کو کوئی انسانی طاقت نہ مٹا سکی۔ آخر ستاروں نے ایک دیوتے کو بھیجا۔

عالم۔ ستاروں کو فراموش کرنا گناہ ہے۔ بہت اچھا تھا۔ اگر فرعون رعیت کی بجائے ستاروں کا زیادہ خیال رکھتا۔

فرعون۔ میں ستاروں کو قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر ستارے اپنا فیصلہ بدل دیں۔ تو میں ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو ایک حسین لڑکی کی قربانی چڑھاؤں گا۔ اور دوسرے تاروں پر ایک تنومند لڑکے کا خون قربان کرونگا۔

سنا جاتا ہے۔ ستارے بچوں کو پیار کرتے ہیں۔

عالم (ملازموں سے)

قربانی کے چاقو تیز کرو۔

(دوسرے عالموں سے) قربانی کا پتھر لے آؤ۔

فرعون۔ کیا یہ قربانی کافی ہوگی۔

عالم۔ شاید۔

فرعون۔ تو ممکن ہے۔ کہ اس قربانی کے باوجود ستاروں کا حکم بحال رہے

عالم۔ ہو سکتا ہے! بہتر ہوگا۔ اگر فرعون بچوں کے خون سے زیادہ قیمتی چیز کی قربانی کرے۔

فرعون۔ کس شے کی؟

عالم۔ اپنے غرور کی۔

فرعون۔ کس طرح؟

عالم۔ اپنے تاج کی قربانی کرو۔ کیونکہ تمہیں صرف اسی تاج کے غرور کی وجہ سے سزا مل رہی ہے۔

فرعون۔ میں بسر چشم تیار ہوا۔ میں اپنا تاج قربانی کے پتھر پر رکھ کر چلا دونگا۔ اور تمام عمر بغیر تاج کے بادشاہت کرونگا۔

عالم۔ نہیں۔ اس تاج کو آہنی دروازے کے پاس رکھ دو۔ جب عذاب کا دیوتا رات کو تمہیں سزا دینے کے لئے آئیگا۔ تو وہ اس تاج کو دیکھیگا۔ شاید اس کے دل میں رحم آجائے۔ کیونکہ تم نے اپنے سر سے اس مایۂ غرور کو اتار کر ستاروں کی نذر کر دیا ہے۔

فرعون۔ تاج اتار کر پتھر پر رکھ دیتا ہے۔ پھر عصائے شاہی بھی وہیں رکھ دیتا ہے۔

فرعون۔ اے تاج سلطنت۔ خدا حافظ۔ بادشاہوں نے تیری تمنا کی ہے۔ ستاروں نے تجھ پر رشک کیا ہے۔ خدا حافظ۔

عالم۔ دیکھو ستاروں سے انکار کرنے والا آفتاب غروب ہو گیا ہے۔ دیوتا زمین پر اُترنے والے ہیں۔ چلو۔ یہاں سے لوٹ چلیں۔

فرعون۔ (سپاہیوں سے) دیکھو۔ تمام رات کسی شخص کو تاج کے قریب نہ آنے دو۔

سپاہی۔ ایسا ہی ہوگا۔ عالیجاہا۔

پہلا سپاہی۔ فرعون پر ستاروں کی بجلی گرنے والی ہے۔ چلو بھاگ چلیں۔

دوسرا سپاہی۔ اگر ستاروں نے تاج کو قبول نہ کیا تو کیا ہوگا۔

پہلا۔ مصر برباد ہو جائے گا۔ ایسا معلوم ہوگا۔ گویا کبھی کوئی بادشاہ تھا ہی نہیں۔

دونوں بھاگ جاتے ہیں۔

لڑکا داخل ہوتا ہے۔

دروازے! دروازے! میرا گیند دے۔

لڑکا دروازے کے پاس جاتا ہے۔ تاج کو دیکھکر متحیر رہ جاتا ہے۔ پھر عصائے شاہی کو اٹھا لیتا ہے۔ اور اس سے تاج کو گیند کی طرح رولتا ہوا لے جاتا ہے۔

دو سپاہی داخل ہوتے ہیں۔ تاج کو نہ دیکھکر متحیر رہ جاتے ہیں۔

پہلا۔ دیوتا زمین پر اتر آئے۔

دونوں بھاگ جاتے ہیں۔

فرعون۔ اور حاجب داخل ہوتے ہیں۔

فرعون۔ ستارے خوش ہیں۔ انھوں نے میری نذر قبول کر لی

عابد

ہو گیا اب دلِ گُم گشتہ کا مِلنا معلوم خاک اُڑتی نظر آتی ہے جدھر جاتے ہیں

دُودِ دل کا شبِ فرقت میں کچھ اندازہ نہ پوچھ تیرے گیسو مرے شانوں پہ بکھر جاتے ہیں

مجھ گرفتارِ بلا کو یہ بتا دے کوئی زندہ رہتے ہیں محبّت میں کہ مر جاتے ہیں

موجِ رفتار اگر تیغ نہیں ہے تو کیا ہے جب وہ جاتے ہیں تو بسمل مجھے کر جاتے ہیں

ہے محبّت میں یہ کس رات کی آمد یارب شامِ غربت نظر آتی ہے جدھر جاتے ہیں

وصلِ دلدار کی بیباکؔ تمنا کیسی خارِ حسرت بھی کھٹکتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

بیباکؔ شاہجہانپوری

انسانی عقل تجربے کی کسوٹی پر

نفس لوجی (علم النفس) کے ماہر ہمیشہ عقل کی تحلیل اور آزمائش میں لگے رہتے ہیں۔ اور لبسا اوقات ان کے تجربے کے ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ہمارے گمان اور مشہور خیالات کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر لیرڈ نے جو اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں ذیل کے چند نتائج کا ذکر کیا ہے:۔

۱۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جلد بازی سے کام خراب ہو جاتا ہے مگر عقلی کاموں میں تجربہ اس کے خلاف ثابت کرتا ہے کیونکہ ہم غور و فکر میں جتنی جلدی کرتے ہیں اتنا ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جس کا حافظہ اچھا ہوتا ہے اس کا ذہن اچھا نہیں ہوتا۔ مگر نفس لوجی کے ماہروں کے تجربے ثابت کر رہے ہیں کہ اچھے حافظے والے ہی ذہین ہوتے ہیں۔

۳۔ حافظہ یا ذہن کو کسی ایک موضوع میں صرف کرنا دوسرے موضوع کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ مثلاً ایک شخص جبر یا مقالہ میں مشق بہم پہنچائے تو یہ مشاقی جغرافیہ اور تاریخ میں اس کی ذرا بھی مدد نہیں کر سکتی۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم حافظہ کو کسی ایک ہی موضوع کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کو کلی موضوع پر صرف کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔

۴۔ ہر سو آدمیوں میں تین چار آدمی سرخ اور سبز میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اور یہ نقص عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

۵۔ پڑھنے کا سب سے بہتر زمانہ ۱۶ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان کا ہوتا ہے۔ مگر چالیس سال کی عمر میں بھی پڑھنے کی قابلیت بیس سال کی عمر کی بہ نسبت تھوڑی ہی سی کم ہوتی ہے۔

۶۔ دماغ کی چھوٹائی بڑائی اور شکل کو عقل کی کمی بیشی سے برائے نام تعلق ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے کہ بڑے دماغ والا بڑا عقلمند ہوتا ہے۔

۷۔ قوت تقریر کو لبسا اوقات قوت تحریر سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور ایک بہترین مقرر ممکن ہے کہ ایک سطر بھی درست نہ لکھ سکے۔

۸۔ مشاقی قوائے عقلیہ میں مزید بُعد کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً دو فنوں سے ناآشنا ہونے کی صورت میں اگر دونوں میں ۱۰ درجے کی دوری فرض کی جائے تو دونوں کو سیکھنا اور دونوں سے مساوی حیثیت سے آشنا ہونے کے بعد ان دونوں کی دوری ۳۰ سے ۴۰ درجے تک بڑھ جاتی ہے۔

۹۔ ہمارا سن جتنا زیادہ ہوتا جائے ہمارے دماغ کے کیسۂ حیات (Cells.) کم اور ناقص ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ ۷۵ سال کی عمر میں دماغ کا وزن سو گرام کم ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے انسان کی قوت حافظہ اور قوت ایجاد کمزور ہوتی جاتی ہے۔

۱۱۔ عورت کے حواس مرد سے ضعیف ہوتے ہیں مگر اس کا حافظہ مرد سے قوی ہوتا ہے۔

۱۲۔ عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں اختلاف زیادہ ہوتا ہے یعنی عقلمندی اور بیوقوفی کے اختلافات عورتوں سے مردوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۱۳۔ بچوں کے قوٰی پر والدین کی عمر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۱۴۔ انسان کو ایک کامیاب باورچی بننے کے لئے ایک کامیاب کاشتکار بننے کی بہ نسبت زیادہ بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔

۱۵۔ شہری سکولوں کے طلبہ دیہاتی سکولوں کے طلبہ سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں حالانکہ دونوں جگہ نصاب اور تعلیم کا معیار ایک ہے۔

۱۶۔ تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی کام میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ کسی خاص کام کے لئے ایک مناسب شخص لبسا اوقات دوسرے کاموں کے لئے بالکل غیر مناسب ہوتا ہے۔ نپولین کو کسی کی ہجو کرنی نہیں آتی تھی۔ لیکن اس نے مشہور ریاضی داں وزیر کی ہجو شروع کر دی مگر اس فن میں پورا نہیں اترا۔

۱۸۔ اندھا آنکھ والوں سے زیادہ نہیں سنتا۔

۱۹ - تقریباً ہر شخص کی عقلی قوت میں کچھ نہ کچھ ضعف ہوتا ہے -

۲۰ - مختلف آدمیوں میں عقل کی کمی بیشی خون کے اجزا کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوتی ہے -

۲۱ - انسان کی ساری قوتیں بچپن سے آہستہ آہستہ نہیں بڑھتیں بلکہ بعض قوتیں ایسی حالت میں بڑھ جاتی ہیں کہ دوسری قوتیں اپنی کمزور حالت میں پڑی رہتی ہیں -

۲۲ - ۱۲ سال کی عمر میں لڑکیوں کا ذہن یکبارگی بہت ترقی کر جاتا ہے مگر لڑکوں کا ذہن ۱۶ - ۱۷ سال کی عمر ترقی کرتا ہے -

۲۳ - اکثر مجرموں کی عقل ناقص ہوتی ہے - خواہ ان کے جرم میں بظاہر کتنی ہی عقلمندی نظر آئے -

۲۴ - گوری قوموں کی بہ نسبت کالے جلد بالغ ہوتے ہیں - اور ان کی عقل بھی جلد پختہ ہو جاتی ہے -

۲۵ - بعض اوقات کسی شخص میں کلوں کے بنانے کا سلیقہ ہوتا ہے - پھر بھی وہ کچھ زیادہ عقلمند نہیں ہوتا -

ص ....

غزلیات

نگاہِ لطف گر اے ساقیٔ مے خانہ ہو جائے — میں بن جاؤں شرابِ ناب دل پیمانہ ہو جائے
دلِ مضطر پہ رحم آتا ہے اور ہوتی ہے وحشت بھی — کہیں رسوا نہ کر دے اور خود رسوا نہ ہو جائے
کروں ایجاد وہ رنگِ محبت بزمِ دنیا میں — طریقِ راہ و رسمِ قیس اک افسانہ ہو جائے
مری مٹی میں اک برقِ تپاں ہے دیکھ کر چلنا — غبارِ راہ میں فتنہ کوئی برپا نہ ہو جائے
بقدرِ وسعتِ دل اور دنیا خلق کرتا ہوں — مگر ڈر ہے کہ دل اس سے بھی بے پروانہ ہو جائے

مرا جینا ہے جینا یاس مرنا ہو مرا مرنا
اگر یہ زندگی صرفِ رہِ میخانہ ہو جائے

یاس

جرأتِ پروانہ ہے تکمیلِ بیدادِ جنوں — لوگ کہتے ہیں کہ جوشِ ہمتِ پروانہ ہے
ذوقِ مستی سے ہیں مرے ہاتھ لرزاں ساقیا! — یا اثر سے ساز کے شوقِ لغزشِ مستانہ ہے
کر چکا ہوں حشر میں اُن کی شکایت کیا کروں — کاش وہ کہہ دیں خدا سے یہ کوئی دیوانہ ہے
میری توبہ محفلِ زہّاد تک محدود ہے — میکدے میں دل کو پاسِ مشربِ رندانہ ہے

جنتِ امید ہے خوابِ طلسمِ آرزو — کامیابی کا ہوا جاتا ہے کیوں دھوکا مجھے
جرأتِ اظہارِ الفت اور اُن کے سامنے؟ — کر دیا ہے اضطرابِ شوق نے رسوا مجھے
زیبِ ویرانہ ہے خاکِ کامگارانِ جنوں — داستانِ عشق ہے ہر ذرّۂ صحرا مجھے

ہو گیا ہے دل کو پھر اختر جنونِ آرزو
آ گئی امید دینے کے لئے دھوکا مجھے

سید عبدالمجید اختر

ایک دن

داناؤں نے کہا ہے۔ کہ جب تک کوئی شخص غربت محبت اور لڑائی کے مزے نہ چکھ لے وہ زندگی کے رموز سے بے خبر رہے گا۔

جو لوگ فلسفے سے ذوق رکھتے ہیں۔ وہ یقیناً اس مقولے کی سچائی اور اختصار سے متاثر ہونگے۔ مندرجہ بالا تینوں چیزیں اس نوعیت کی ہیں۔ کہ کائنات کی تمام کیفیات انہیں سے تعلق رکھتی ہیں شاید کوئی معترض یہ کہے کہ اس مجموعے میں "دولت" کو شامل کر لینا چاہیئے۔ ورنہ زندگی کے عناصر نامکمل رہینگے۔ لیکن یہ تجویز غلط اور محض غلط ہے۔ جب کوئی مفلس اپنی جیب میں غیر متوقع طور پر ایک روپیہ پڑا ہوا پاتا ہے جسے جیب میں ڈالکر بھول گیا تھا۔ تو اسے اس قدر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ کسی کروڑ پتی کو لاکھوں کے حصول سے نہ ہوتی ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مشیت خداوندی نے یہ اٹل قانون مقرر کر دیا ہے۔ کہ عالم اسباب کا کوئی فرد ان تینوں اشیا سے ناآشنا نہ رہے۔

چھوٹے چھوٹے قصبوں میں یہ چیزیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں غربت کی تکلیف نسبتاً کم محسوس ہوتی ہے۔ محبت میں جوش نہیں پایا جاتا۔ لڑائی صرف مرغیوں اور بچوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور عام طور پر زبانی نزاع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس مقولے کی سچائی اس وقت صحیح معنوں میں ثابت ہوتی ہے۔ جب بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ بھی مجبوراً فطرت کے قانون کے آگے جھک جاتے ہیں۔

یہ سب سچ ہے۔ مگر اس بات کا فخر صرف خورشید انور ہی کو حاصل ہے۔ کہ ایک دن کی مختصر ساعتوں میں وہ زندگی کے تمام مراحل کو طے کر گیا۔

خورشید انور ریلوے کے دفتر میں ایک معمولی کلرک تھا۔ ہزاروں دوسرے کلرکوں کی طرح اس کی زندگی فرسودگی اور تسلسل کے ایک چکر سے عبارت تھی۔ صبح ناشتہ۔ دفتر کی تیاری۔ کھانا۔ دفتر۔ سہ پہر کا ناشتہ۔ شام کا کھانا۔ سونا۔ صبح کا ناشتہ . . . . .

ماہ و سال اسی طرح ختم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُسے اپنے مستقبل کے افق پر کوئی روشن تحریر نظر نہیں آتی تھی۔

بعض دفعہ وہ تنگ آ کر سینما چلا جایا کرتا۔ اور وہاں کے تخیلی مناظر دیکھ کر اس کے دل میں عجیب عجیب خواہشات کا طوفان اٹھتا تھا۔

اس کا جی چاہتا تھا۔ کسی طرح وہ بھی غربت اور ذلت کی زنجیروں سے آزاد ہو کر محبت کی رنگین فضا میں داخل ہو جائے۔ رات کو اکثر وہ اپنے بستر پر لیٹا سوچا کرتا۔ بارالہا! میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ کہ مجھے آرام نصیب نہیں ہوتا۔ کاش مجھے تعلیم نہ دلائی گئی ہوتی۔ اور اگر تعلیم دلائی گئی تھی۔ تو حساس دل نہ عطا ہوا ہوتا سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو جاتا۔ اور جب اس کی نیند بالکل اچاٹ ہو جاتی تو وہ اپنی بیوی کے بستر کی طرف دیکھتا۔

اس کی بیوی وفا شعار۔ ایشیائی بیوی۔ نہایت آرام کی نیند سو رہی ہوتی۔ خورشید کا جی چاہتا تھا۔ اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے چہرے کے تبسم کو اپنے ناخنوں سے مجروح کر دے۔ اس کے اطمینان قلب۔ اس کی آرام کی نیند دیکھکر خورشید کے دل میں اپنی بے آرامی کا احساس اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا۔

ایک شام کا واقعہ ہے۔ خورشید دفتر سے واپس آ کر چائے پی رہا تھا۔ اور تھکی ہوئی آنکھوں سے ان تصویروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں اس قسم کی تھیں کہ خورشید کا ذوق سلیم انہیں ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا مگر اسے اپنی بیوی کی خاطر داری منظور تھی جو انکو کمرے کا ایک جزو لازمی تصور کرتی تھی۔

انگیٹھی کے پاس ایک بلی خر خر کر رہی تھی۔ خورشید کی بیوی مشین پر کپڑے سی رہی تھی مشین کی مسلسل آواز نے خورشید کے تھکے ہوئے دماغ کو تقریباً مختل کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کیطرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گھر سے باہر نکل گیا ناظرین کو علم ہوگا کہ لاہور عجیب و غریب کوائف و سوانح کا مخزن ہے۔

ممکن ہے کہ آپ دریا کے کنارے آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہوں تو اپنے ایک ایسے دوست سے ٹکرا جائیں۔ جو بیس سال سے مفقود الخبر ہے۔ جس کو آخری بار آپ نے آسٹریلیا کے پتے پر خط لکھا تھا۔

ممکن ہے کہ آپ شہر کے باہر کوئی خودرو پھول دیکھ رہے ہوں تو ڈاکو آپ پر دھاوا بول دیں۔ اور آپ کا تمام مال و متاع لے کر رفو چکر ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ شہر کے گنجان بازاروں میں سے گذر رہے ہوں۔ آپ کو کوئی حادثہ پیش آ جائے اور آپ ہسپتال کی نرس سے شادی کر لیں۔

ممکن ہے کوئی مالدار پری پوش آپ پہ عاشق ہو جائے۔ اور اپنی شاندار فٹن میں بٹھا کر اپنے عالیشان مکان کی طرف روانہ ہو جائے۔

الغرض لاہور میں "ممکنات" کا دائرہ اس قدر وسیع ہے۔ کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔

جب خورشید نے باہر کی ہوا میں سانس لیا تو اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ ہوا میں ایک خوشگوار خوشبو ملی ہوئی تھی۔ جو تھکے ہوئے دماغوں کے لئے پیغام سکون تھی۔

گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ اور اُن کی چیخ پکار میں بھی نغموں کا سا تناسب پایا جاتا تھا۔

خورشید لاہور کے بارونق بازاروں میں سے گذرتا ہؤا انارکلی جا پہنچا۔ ایک ہوٹل کی جگمگاتی ہوئی عمارت نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس طلسمی محل میں داخل ہو جائے۔ اور ایک بار اس "زندگی" کے مناظر بھی دیکھ لے۔ جو اسے ناولوں اور افسانوں میں نظر آتی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

"ڈائننگ ہال" میں خوش پوش۔ خوش ادا آدمیوں کا مجمع تھا۔ جو مہذبانہ بے معنی باتوں میں مصروف تھا۔

وہ ایک خودفراموشی کے سے عالم میں ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اور "آئیس کریم" کی ایک پلیٹ طلب کی۔

جب وہ قیمت ادا کرنے کے لئے خزانچی کے قریب پہنچا۔ تو اسے جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد محسوس ہؤا۔ کہ وہ گھر سے کوئی نقدی ساتھ نہیں لایا۔

اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پیشانی پر ندامت کا پسینہ آ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہؤا گویا اس کا گلا بیٹھ گیا ہے۔ اور کسی نے دہکتے ہوئے چمٹے سے اس کی زبان کھینچ لی ہے۔ اُس نے التجا کے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے میرے پاس اس وقت کوئی نقدی نہیں ہے۔ میں اپنا بٹوا گھر بھول آیا ہوں۔ میں کل ہی آپ کا قرض چکا دونگا"

خزانچی نے اس تقریر کو خاموشی سے سُنا۔ پھر بلند آواز میں پکارا "شبیر خان"

ایک ہٹا کٹا تنومند نوجوان جس کے چہرے کی سُرخی شانوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور لباس کی وضع قطع اس کے پٹھان ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ اور جو اسی کام کے لئے مخصوص تھا۔ کہ خورشید جیسے گاہکوں کی خبر لیا کرے۔ دور سے آتا ہؤا دکھائی دیا۔

خورشید نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے پاؤں گویا سنگ مرمر کے فرش پر جم گئے تھے۔ اتنے میں شبیر خان آ پہنچا۔

خورشید بھی جوان تھا صحتمند تھا۔ اور بڑی بات یہ کہ حق پر تھا۔

دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ مکوں اور گھونسوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ اسی طرح الجھے ہوئے وہ کمرے کے وسط میں آ گیا۔ ایک میز الٹ گئی۔ اور شراب کے بلوریں کنٹر گر کے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے دونوں علیحدہ ہوئے۔ خورشید نے پاس ہی سے ایک گملا اُٹھا لیا۔ اور تاک کر مارا۔ مگر شبیر خان۔ اپنی فطری چالاکی سے کام لے کر عین وقت پر جھک گیا۔ گملا ایک کھڑکی میں لگا شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پھر نیچے سے راہگیروں کا شور بلند ہؤا۔ اور ہوٹل کے کارپردازوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ اس لڑائی کا حلقہ صرف ہوٹل تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اس کا اثر بازار تک بھی جا پہنچا ہے۔ مہذب خوش پوش آدمی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے دوسرے ملازمین بھی آ گئے۔ مگر اس اثنا میں خورشید اور شبیر خان اپنے جوش میں دروازے سے باہر نکل چکے تھے۔ کچھ عرصہ لڑائی زور و شور سے بازار میں جاری رہی۔ یکایک ایک پولیس کا سپاہی آ گیا۔ شبیر خان خورشید کو چھوڑ کر ہوٹل میں گھس گیا۔ خورشید ساتھ ہی ایک گلی تھی۔ اندھا دھند اس طرف مُڑ گیا۔

پولیس کا سپاہی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اور خورشید اس قدر تیز دوڑ رہا تھا۔ گویا اس کے پاؤں کے ساتھ پہئے بندھے ہوئے ہیں۔

آخر خورشید سپاہی سے بہت آگے نکل گیا۔ اس دوڑ کے دوران میں اُسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ ایک سرخ رنگ کی موٹر اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

جب فوری خطرے سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس کے قدم ذرا سست پڑ گئے۔ تو اس نے دیکھا کہ شوفر نے اسے موٹر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ خورشید بن سوچے سمجھے کود کر موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہوئی۔ پانچ منٹ کے بعد خورشید نے اپنے آپ کو گنجان بازاروں سے باہر راوی روڈ کی کھلی اور نسبتاً ٹھنڈی ہواؤں میں پایا۔ شوفر ابھی تک موٹر کو نہایت تیز رفتار پر لئے جا رہا تھا۔

خورشید نے ہانپتے ہوئے شوفر کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ تھوڑے عرصے کے بعد موٹر ایک عالیشان کوٹھی کے بیرونی دروازہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

شوفر اُترا۔ اس کا چہرہ سنجیدگی نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ اس نے

بڑی سیاہ عینک لگا رکھی تھی، اور اُسکے چہرے کا نچلا حصہ ایک اونی مفلر میں لپٹا ہوا تھا اُسنے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف لے چلئے۔ ایک مصیبت زدہ خاتون آپ کی انتظار میں ہے"

"حیرانی" اس قدر فرسودہ لفظ ہو چکا ہے کہ خورشید کے جذبات کو اس سے موسوم کرنا شاید ناکافی ہو۔ اسکا دماغ چکرا رہا تھا۔ "مصیبت زدہ خاتون"! "انتظار" یہ لفظ اُسکے دل میں ایک طوفان تحیر پیدا کر رہے تھے۔ اس نے کوٹھی کی طرف غور سے دیکھا۔ راوی روڈ کی طرف وہ اکثر آتا تھا۔ اور یہاں سے بھی ضرور گذرا ہوگا۔ مگر اس نے کبھی اس جگہ کی طرف خیال نہ کیا تھا۔

بیرونی دروازے سے اندر کا باغ صاف نظر آتا تھا۔ اور ایک روش سیدھی کوٹھی کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اب شام ہو چکی تھی۔ مگر پھولوں کے رنگ پہنچانے جا سکتے تھے گلاب و نارنج کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ خورشید گویا دیوانہ سا ہوگیا۔ وہ خود فراموشی کے سے انداز میں شوفر کے پیچھے چل دیا۔ شوفر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور خورشید کو محسوس ہوا گویا۔ اُسکے افق حیات پر ایک درخشاں ستارے کا طلوع ہوا ہو کمرے میں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جنکے نقوش و خطوط کا رنگ صوفوں کے رنگ سے متناسب تھا۔ اور ایک صوفے پر ایک موج رنگ و بو پر ایک شعاع ماہ جلوہ ریز تھی۔

وہ ایک مہتاب مثال نازنین تھی۔ جسکے چہرے پر کائنات کی مسرتیں تبسم بنکر کھیل رہی تھیں۔ اسکی سیاہ۔ گہری سیاہ آنکھوں میں دنیا کی تمام عشرتیں رقص کر رہی تھیں۔ اسکے بالوں میں وہ بال جو شبہائے مصیبت سے زیادہ تاریک تھے۔ نکہتوں نے آکر پناہ لی تھی۔

شوفر نے عینک اتار دی۔ مفلر کو الگ کیا۔ اور پھر ایک عجیب انداز میں چھاتی پر ہاتھ رکھکر جھک گیا۔

وہ مسکرا رہا تھا۔

"محترم خاتون! شاہد صاحب دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ اسلئے حاضر نہ ہو سکے۔ انکی جگہ میں انکو (خورشید کی طرف اشارہ کر کے) لے آیا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے سے زیادہ اور طاقتور آدمیوں سے مقابلہ کرنے میں یہ اپنا جواب نہیں رکھتے اور انکی تیز رفتاری تو شاید آیندہ کیلئے ضرب المثل ہوگی۔"

یہ کہکر شوفر؟ واپس چلا گیا۔

خاتون نے انور کی طرف دیکھا۔ آہ وہ نگاہ! خورشید کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں۔ اس نگاہ کے ساتھ کھنچی ہوئی چلی گئیں اسے معلوم ہوا گویا وہ جسد بیجان رہ گیا ہے۔ گویا اُسکی روح ان سیاہ پتلیوں میں سما گئی ہے۔

خورشید نے اپنے دل کی گہرائیوں میں اس جذبے کو محسوس کیا جسے "عشق" کہا جاتا ہے۔

خاتون نے کہا۔ (آہ وہ آواز نغمے اس آواز کے اتار چڑھاؤ میں لرز رہے تھے اور خورشید کو تو اب محسوس ہوتا تھا گویا دنیا تمام لرز رہی ہے) "میں نے اپنے شوفر (شوفر کا لفظ کہتے ہوئے اسکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی) کو بھیجا تھا کہ وہ میرے چچازاد بھائی شاہد حسین کو بلا لائے۔ بات یہ ہے کہ اسوقت یہاں ایک بدتہذیب مرد موجود ہے۔ جس نے میری توہین کی ہے۔ میں نے اسبات کی شکایت اپنی والدہ سے کی۔ مگر وہ صرف مسکرا کے چپ ہو رہیں۔ اسلئے مجھے شاہد حسین صاحب کو بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ افسوس ہے کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔

اس زمانے میں شجاع اور غیور مردوں کی کمی ہے۔ کیا میں آپ کی مدد پر بھروسہ کر سکتی ہوں"

خورشید کے دل میں ایک طغیان غرور برپا ہو گیا۔

اُسنے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے وہ بدتہذیب شخص دکھایئے اور اُسکے بعد جو اُس کا حشر ہوگا وہ آپ دیکھینگی"

خاتون نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اُس کمرے میں وہ موجود ہے۔ آپ ڈرتے تو نہیں"

خورشید جواب دینے کی بجائے اس کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اسوقت اژدہا اور شیر سے لڑنے کے لئے تیار تھا۔ انسان کی کیا بساط ہو سکتی ہے۔ کمرے میں ایک نوجوان خوشرو۔ بلند بالا۔ ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا

خورشید نے جاتے ہی طعنے کے لہجے میں کہا "مناسب ہے کہ تم تہذیب و آداب معاشرت پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں صرف وہی پڑھا کرو۔"

نوجوان نے نظر اُٹھا کے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تعجب کے آثار

پیدا ہوئے پھر اُسنے خورشید کے پیچھے خاتون کو بھی داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور پھرتی سے خورشید کی باہوں کو ایک ایسی آہنی گرفت میں تھام لیا کہ خورشید باوجود کوشش کے حرکت کرنے سے معذور ہوگیا۔ اسی طرح تھامے ہوئے نوجوان خورشید کو باہر کے دروازے تک لے گیا۔ اور دروازہ بند کرنے کے بعد واپس اسی کمرے میں آگیا۔

پھر خاتون کی طرف دیکھکر کہنے لگا۔

"سلمیٰ! تمہارے دل میں یہ کیا سمائی ہے کہ بالکل اجنبی آدمیوں کو بلالیتی ہو"

سلمیٰ: "تم بہت برے آدمی ہو۔ پہلے تم نے میری کتاب اس بہانے آگ میں جھونک دی کہ میرے لئے بہت پڑھنا مضر ہے۔ اور اب تم میرے مدد گاروں کو "اجنبی" کہکر پکارتے ہو۔ وہ تو شکر کرو شاید حسین موجود نہ تھا ورنہ . . . . "

وہ خاموش ہوگئی۔

نوجوان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اچھا! یہ غصہ تھا۔ دیکھو سلمیٰ تم انگلستان سے واپس آئیں اور پردہ اُتار دیا۔ تو میں نے اعتراض نہیں کیا۔ میں خود پردے کے خلاف ہوں۔ مگر تاریخی ناول پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ اسقدر خراب ہوگیا ہے کہ تم پرانے زمانے کے افسانوں کو زندگی میں دہرانا چاہتی ہو۔ اس پر مجھے اعتراض ہے۔ تمہیں کہو۔ ڈاکٹر نے منع نہیں کیا کہ تمہیں کوئی دماغی کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ مجھے تمہارا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے کچھ کوئی حق بھی ہے یا نہیں؟

سلمیٰ خاموش ہوگئی۔

عابد

سیاست اور ارباب سیاست

(مشہور اطالوی مؤرخ فریرو کے ایک مضمون کا خلاصہ)

جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی سیاست پر صرف مالداروں اور اونچے طبقے والوں کا قبضہ تھا مگر جنگ نے دنیا کی کایا پلٹ دی مزدوروں اور صناعوں کی قدر وقیمت بڑھ گئی۔ اب آہستہ آہستہ سیاست بھی انہی کے ہاتھوں میں چلی جارہی ہے۔

گزشتہ دنوں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پریزیڈنٹی کے لئے مسٹر ہوور کے انتخاب نے ہر شخص کو مزدور اور سیاست کے تعلق کی طرف متوجہ کردیا ہے۔ مسٹر ہوور ایک مہندس ہیں اور انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ مشرق اقصیٰ کی کانوں میں گزارا ہے۔ جنگ عظیم کے موقعہ پر یہ معادن سے نکلکر میدانِ سیاست میں آگئے۔ اور امریکہ میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اب وہاں کے پریزیڈنٹ ہیں۔

مسٹر ہوور سے پہلے امریکہ کے چھ پریزیڈنٹ ایسے ہوچکے ہیں جن کو ذہنی کام کرنے والا کہا جاسکتا ہے اور سیاسی تدبر سے ان کا واسطہ بظاہر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر کولج ایک وکیل تھے۔ مسٹر ہارڈنگ ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مسٹر ولسن ایک یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ مسٹر ٹافٹ بھی وکیل تھے۔ مسٹر روزفیلٹ ایک مشہور اخبار نویس اور ادیب تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ اپنے پیشے کے لحاظ سے ارباب ذہن میں سے تھے۔ لیکن مسٹر ہوور جدید سیاست کے ایک رمز جدید ہیں۔ کیونکہ وہ نہ اونچے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور نہ ارباب ذہن میں سے ہیں بلکہ وہ مزدور جماعت کے ایک فرد ہیں جو جنگ عظیم کی پیداوار ہے۔

جنگ عظیم نے اس میں شریک ہونے والی ہر قوم کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے تمام ذرائع سے فائدہ اٹھائے۔ اور مزدوروں کی جماعت سے بھی کام لے۔ جرمنی نے دوسرے کاموں کی طرح اس میں بھی سبقت کی اور حکومت کی باگ ایک الیکٹرک کمپنی کے منیجر کے ہاتھ میں دیدی انگلستان اور بعض دوسرے ممالک نے بھی ایک حد تک اس کی پیروی کی۔ مزدوروں کی آنکھیں کھل گئیں انکو اپنی سیاسی قابلیت اور دنیا کا سب سے اہم جزو ہونیکا احساس ہُوا۔ جس کے نتیجے میں آج ہمیں امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کا پریزیڈنٹ ایک مزدور مہندس نظر آرہا ہے۔

گزشتہ چند سال سے پہلے سیاست صرف اونچے طبقے

کیلئے اسی طرح خاص تھی جس طرح بادشاہی مخصوص خاندانوں کیلئے۔ مگر مزدوروں کے نئے طبقے کے ظہور کے بعد اپنے قدیم اجارہ داروں کے ہاتھ سے نکلکر نئے عناصر کی طرف منتقل ہوگئی ہے اور اب بڑے بڑے زمینداروں اور خاندانی شرفا کے بدلے دارالعوام اور وزارت خانوں میں اخبار نویس طبیب - پروفیسر مہاجن تاجر اور مزدور نظر آتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ سیاست کسی ایک جماعت کیلئے خاص ہونے اور مالدار طبقے کا جس کے لئے دنیا میں دوسرا کام نہیں ہے مشغلہ بننے کے بجائے ہر شخص کے لئے عام ہوگئی ہے۔ اور اب حکومتوں کو ایسے لوگ سنبھال رہے ہیں جو صرف اسی کیلئے خاص نہیں ہیں - بلکہ سیاست کی تعلیم اپنے اُن پیشوں کے ساتھ ہی حاصل کرتے ہیں - جن سے اپنی روزی کماتے ہیں - گویا ۱۸۷۰ء سے پہلے یورپ میں جس طرح فوج سیاسیات کی درسگاہ بنی ہوئی تھی - اسی طرح اب کارخانے سیاسیات کے مدرسے بنگئے ہیں - اسوقت سمجھا جاتا تھا کہ ملک کی ترقی اور حفاظت کا ضامن سپہ سالاروں اور ماہرین جنگ سے زیادہ اور کوئی نہیں ہوسکتا - اس کے بعد ہم نے خیال کیا کہ ملک کے لئے سب سے زیادہ مفید ذہنی کام کرنے والے لوگ ہوسکتے ہیں - اور سیاسیات کی گتھیاں انہیں کے ناخن تدبیر سے سلجھ سکتی ہیں - مگر اب حالات ہمکو یہ مان لینے پر مجبور کر رہے ہیں کہ سیاست کا کوئی اہل ہے تو وہ صرف مزدور ہے - کیونکہ پیشے کے تجربے - گرم و سرد کی برداشت حسن انتظام اور کفایت شعاری کی وجہ سے وہی ملک و قوم کی سستی رہنمائی کرسکتا ہے - اور ان باتوں کی وجہ سے فوج کے ناعاقبت اندیش بے رحم سپہ سالاروں اور اپنی ساری زندگی خالی خولی عقلی نظریوں میں "برباد" کردینے والوں کی بہ نسبت قوم کے لئے ایک مزدور زیادہ مفید ہے - اور اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کرکے حکومت اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود اس کے سپرد کردیجائے - لیکن دیانتداری کے ساتھ نئے اور پرانے سیاست دانوں میں مقابلہ کیا جائے تو ہم کو اعتراف کرنا پڑیگا کہ پرانے سیاست دان نئے سیاست دانوں سے زیادہ بہتر اور اپنے وقت کی سیاست پر زیادہ حاوی تھے - کیونکہ ان کو صرف شاہی خاندان اور انکے وزیروں کے اغراض و مقاصد کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا اور اسمیں ان کو بہت جلد مہارت پیدا ہوجاتی تھی - مگر آجکل کے سیاست دانوں کے لئے دنیا کی مختلف قوموں کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے - مختلف جماعتوں اور پارٹیوں کے خیالات اور معتقدات سے باخبر ہونا لازمی ہے - اسیطرح ان پر یہ بھی فرض ہے کہ بین الاقوامی سیاست کے تمام ایسے مسائل کا بھی مطالعہ کریں جن کا تقریباً کوئی حل نظر نہیں آتا - اسی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ آجکل کے سیاست دانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ قدیم سیاست دانوں کو نہیں پیش آتی تھیں - اور وہ اپنے وقت کی سیاست پر ان کی بہ نسبت زیادہ حاوی ہوا کرتے تھے -

علاوہ بریں مزدور جماعت سے تعلق رکھنے والے اصحاب کارخانوں میں مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں - ان کی کارگزاری مقرر - ان کا وقت معین - اور ان کی صنعت آزمودہ ہوتی ہے - کبھی بھی ان کو ذہن سے کام نہیں لینا پڑتا - اس لئے نہ تو وہ خود جذبات کے مالک ہوتے ہیں اور نہ ان کو اسی کا موقعہ ملتا ہے کہ دوسروں کے جذبات - دوسروں کی خواہشوں اور تمناؤں سے باخبر ہوں - کارخانے میں انہیں جن ہم پیشہ لوگوں سے تعلق ہوتا ہے ان سے بھی ان کا واسطہ ایک مشین کے مختلف پرزوں کے آپس کے تعلق سے بڑھا ہوا نہیں ہوتا - ایسے لوگ جب میدان سیاست میں آتے ہیں تو ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہمارا تو عقیدہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود اصحاب ذہن کی طرح قوم کے جذبات اور طبائع سے بخوبی واقف نہیں ہوتے - آجکل ایک ماہر سیاست کے لئے سب سے زیادہ لازمی امر یہ ہے کہ وہ عوام کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو مگر مزدور جماعت کے افراد کو نہ اس کا موقع ملتا ہے اور نہ ان میں اس کا احساس ہی ہے - حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اصحاب ذہن ہوں یا ارباب عمل اگر وہ سیاسیات میں پڑنا چاہیں تو ان کو نہ انکی ذہانت کام دیسکتی ہے - نہ انکی جرأت کام دے سکتی ہے اور نہ ان کی قوت برداشت اور ان کے حسن انتظام ہی سے کچھ ہوسکتا ہے - کیونکہ سیاست میں سب سے اہم چیز قوم کے حالات کا مطالعہ اور اس کے ایک ایک جزو پر حاوی ہونا ہے - اور یہ چیز اسی شخص کو نصیب ہوسکتی ہے جو اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کردے - اور تعصبات سے بالکل آزاد ہوکر قوم کی ہر ہر چیز کا مطالعہ کرے -

میلارام وفا

صیدِ ایجاد

جب میں اس کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ سُنا چکا تو اس نے مُسکراتے ہوئے کہا "معاف کیجئے ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگی اس قسم کے واقعات سے پُر ہو، یہ واقعہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتا۔ ایک واقعہ جو میں آپ کو سُناتا ہوں میری زندگی کے عجیب واقعات میں بیحد حیرت انگیز ہے۔ یہ واقعہ ایک راز ہے اور آپ ہی پہلے اور آخری شخص ہیں جس کو میں اس راز میں اپنا شریک کر رہا ہوں۔

پھر ہپناٹائیزر نے میرے چہرے پر اپنی تیز نظریں جما کر کہا:-

"مسٹر بشیر عمل کے وقت معمول کی رسائی بہت دُور دُور تک ہوتی ہے۔ اور عامل کے حکم سے وہ ایسی چیزیں دیکھ سکتا ہے جو معمول کو بھی نظر نہیں آتیں۔ مثلاً اگر میں اپنے معمول سے پوچھوں کہ نیویارک کی فلاں سٹریٹ کے فلاں مقام پر کیا ہو رہا ہے۔ یا فلاں مریض کی کیا حالت ہے۔ یا میرا فلاں دوست کیا کام کر رہا ہے تو وہ ہر سوال کا صحیح صحیح اور ٹھیک ٹھیک جواب دیگا" وہ تھوڑی دیر رُکا پھر کہنے لگا:-

"ایک دن میں معمول کے سرہانے کھڑا ہوا۔ اس سے مختلف سوال پوچھ رہا تھا اسی دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ میرے دوست رشید کا کیا حال ہے اور وہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں میں اس سے کسی غیر معمولی جواب کے سننے کی امید نہ رکھتا تھا۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت رشید اپنی لیبارٹری میں بیٹھا ہوا مریخ جانے والے راکٹ کو مکمل کر رہا ہوگا۔ لیکن معمول نے جو میرے اس سوال کا جواب دیا اس نے مجھے متعجب اور پریشان کر دیا۔

معمول نے کہا کہ رشید اور ظہیر پر بجلی گری ہے اور رشید کا مکان جل رہا ہے۔ اتنا کہہ کر معمول چیخا کہ میں آگ کے شعلوں کی زد میں آگیا ہوں مجھے بچاؤ۔ یہ سُنکر میں نے رد عمل کیا اور معمول کو بڑی مشکل سے ہوش آئی۔

میں نے کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا، لوگ دوڑ رہے تھے۔ فائر بریگیڈ بڑی تیزی سے جا رہا تھا خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی، ہر شخص کی زبان پر "آگ لگ گئی، آگ لگ گئی" کے الفاظ تھے اور یہ سب باتیں معمول کے بیان کی تائید کرتی تھیں۔ لیکن میں متعجب تھا کیونکہ صرف آدھ گھنٹہ پہلے میں رشید سے ملکر آیا تھا۔ اور اُسے اس کی لیبارٹری میں صحیح و سلامت چھوڑا تھا۔

میں نے آتشزدگی کی اصل وجہ معلوم کرنے کی ٹھان لی اور آخرکار کامیاب ہوا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہُوا وہ میں نے اپنے روزنامچے میں لکھ لیا۔ اب میں آپ کو اپنے روزنامچے سے رشید سے اپنی ملاقات کا حال اور پھر آتشزدگی کے اصل حالات پڑھ کر سناتا ہوں"

اس نے میز پر سے اپنا روزنامچہ اٹھاتے ہوئے کہا:-

"مسٹر بشیر میرا روزنامچہ بھی بڑا دلچسپ ہے مجھے پورا یقین ہے کہ میری وفات کے بعد جب یہ چھپے گا تو لوگ اسے حیرت اور تعجب کے ساتھ پڑھیں گے۔ یہ اپنی قسم کا یکتا روزنامچہ مانا جائیگا۔ اور اخبارات اس پر شاندار ریویو لکھیں گے۔ اچھا اب میں آپ کو اس کا وہ حصّہ پڑھ کر سناتا ہوں جو اس واقعہ سے متعلق ہے"۔

"آج میں اپنے دوست رشید سے ملنے گیا۔ رشید ایک گمنام مُوجد ہے اور اس کی ایجادیں ابھی عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن اس کی قوتِ ایجاد کا مقابلہ یورپ اور امریکہ کے موجد بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ جب اس کی ایجادیں منظرِ عام پر آئینگی تو دنیا انہیں حیرت اور تعجب سے دیکھے گی۔ دنیا بھر کے موجد اس کی قوتِ ایجاد کا لوہا مان جائیں گے اور ہندوستانی رشید دنیا کے موجدوں کا سرتاج سمجھا جائیگا۔

اس وقت رشید پردہ گمنامی میں ہے۔ وہ اپنے عالیشان مکان میں اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی اپنے مکان سے باہر نکلتا ہے اور اپنا سارا وقت اپنی لیبارٹری میں گذارتا ہے جو اس کے مکان کے بالائی حصے میں ہے۔ لیبارٹری کی چھت کے نیچے کی طرف اس نے بیشمار تاروں کا جال بچھا رکھا ہے۔ ان میں سے بعض انگلی کے برابر موٹی ہیں۔ اور بعض مکڑی کے جالے کی طرح باریک ہیں چھت کے اوپر کئی چھوٹے چھوٹے کھمبے کھڑے ہیں۔ لیبارٹری میں چاروں طرف شیشے کی الماریوں میں کیمیاوی مرکبات اور دھاتوں کے چھوٹے

بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں مختلف دھاتوں سے کئی صندوق
بھرے رکھے ہیں ۔ ایک طرف خالص پارے کے کئی پیپے سجے ہوئے
ہیں ۔ لیبارٹری کے وسط میں ایک بڑا میز ہے جس پر رشید تجربے
کرتا ہے ۔ یہیں پر تین سو گرام ریڈیم رکھا ہوا ہے لیبارٹری میں کئی
بڑے انجن ہیں جن کو وہ مختلف اوقات پر مختلف مقاصد کے لئے
استعمال کرتا ہے ۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں ہیں
کئی مہین پرزے ہیں جو خالص فولاد کی نہایت باریک تاروں سے
بنائے گئے ہیں ۔ ہال کمرے سے متصل اور بھی بہت سے فراخ
کمرے ہیں جن میں سے ایک میں بہت سی فولادی کلیں اور ایک
عجیب دھات کے بہت سے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے
ہیں ۔

اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ۔ اس کے بھائی اور والدین
مکان کی نچلی منزلوں میں رہتے ہیں لیکن وہ کسی کو بھی اپنی لیبارٹری
میں داخل نہیں ہونے دیتا ۔ حتیٰ کہ اگر اس کے والدین بھی ایسا کرنا
چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی نہایت سختی سے پیش آتا ہے ۔

جب میں اس کے مکان پر پہنچا تو اس کے والد مجھ سے
بڑے تپاک سے ملے ۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ میں رشید کا
دوست اور اس کا ہمراز ہوں ۔ اس کے والد نے مجھے بتایا کہ اسے
نیچے اترے ہوئے چھ ماہ گذر چکے ہیں ۔ آخری دفعہ وہ آدھ گھنٹے
کے لئے نیچے آیا تھا ۔

مجھے اس کے والد سے معلوم ہوا کہ وہ اس سے ملنے کے لئے
ٹیلیفون کے ذریعے سے اجازت لیتے ہیں میں نے بھی ٹیلیفون
کی گھنٹی بجائی اور ریسیور کو کان سے لگایا ۔

"ہاں ہاں ـــ کیوں ؟ کیا ہے ؟ .... احمقو !
یاد رکھو اگر تم بار بار مجھ کو تنگ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو میں
ٹیلیفون ہی کو توڑ ڈالونگا ۔ تم میرے خاندان کے لوگ ہوتے ہوئے
بھی میری مدد کرنے کی بجائے مجھے تکلیف دیتے ہو ۔ افسوس
تم کو معلوم نہیں کہ میرے پیش نظر کتنے اہم مقاصد ہیں ۔ اور
میرے ارادے تمہارے سطحی خیالات سے کسقدر زیادہ بلند
اور کسقدر ارفع و اعلیٰ ہیں ۔ تم تم ...."

"مسٹر رشید میں تو آپ کا دوست موہن ہوں"

"اچھا ! اچھا !! مسٹر موہن آپ ہیں ...... ہاہا ...... دس
برس بعد آپ ہی پہلے شخص ہیں جو مجھ سے ملنے کی غرض سے میرے
مکان پر تشریف لائے ۔ بیشک آپ بہت عقلمند ہیں ۔ آپ میرے کنبے
والوں سے بدرجہا زیادہ عقلمند ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ طول طویل گفتگو
میں میرا وقت ضایع نہ کریں گے ۔

"آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے کسقدر اُنس ہے اور آپ کی ایجادوں
سے کسقدر دلچسپی ہے"
کیا آپ چند منٹ کے لئے مجھے اپنی لیبارٹری میں بلا کر مجھ سے
بالمشافہ گفتگو کرنی پسند فرمائیں گے ۔

کچھ دیر خاموش رہنے اور بڑبڑانے کے بعد

"اچھا ! اچھا !! خیر آج تو میں آپ کو بلا لیتا ہوں کیونکہ مجھے بھی
آپ سے کچھ پوچھنا ہے ۔ لیکن آئندہ آپ مجھے اس قسم کی کوئی تکلیف
نہ دیں اور میرا وقت ضایع نہ کریں ۔ آپ اس لفٹ میں بیٹھ جائیں
تاکہ میں اسے اوپر کھینچ لوں"۔

میں لفٹ میں بیٹھ گیا لفٹ اوپر اٹھی اور جب یہ ٹھہری تو میں
نے رشید کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا ۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور
مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا ۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا
میں اور وہ خود میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا ۔

"مسٹر موہن آپ ایک زبردست عامل مسمریزم مانے جاتے
ہیں اور آپ کی اعلیٰ قابلیت کا دُور دُور شہرہ ہے ۔ کیا آپ اپنے معمول
کی مدد سے مجھے بتائیں گے کہ میں مریخ جانے میں کامیاب ہو جاؤنگا
یا نہیں ۔ لیکن ٹھہریے میرا یہ سوال بے سود ہے ۔ میں خوب جانتا ہوں
کہ جو راکٹ میں بنا رہا ہوں وہ مجھے ضرور منزل مقصود تک پہنچا دیگا ۔
اچھا آپ مجھے یہ بتائیں کہ سطح مریخ پر جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے
خطوط ہیں وہ کیا ہیں ؟ آپ جانتے ہیں کہ مجھے آم بہت پسند
ہیں ۔ مجھے مریخ میں آم ملیں گے یا نہیں ؟
میں کرۂ مریخ میں لنگڑا ، سندھوری ، سفیدہ ، وغیرہ آموں
کے درخت پاکر بہت خوش ہونگا ۔ مسٹر موہن ...."

"ڈیئر رشید ! میں ان سوالات کا جواب دینے کی نسبت یہ پسند
کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی لیبارٹری کی سیر کرا کے اپنی ایجادوں کا حال
سنائیں ۔

"کیوں صاحب ! اس کا مطلب یہی ہے نا کہ آپ ان سوالات کا
جواب نہیں دے سکتے ؟ نہیں دے سکتے ۔ اس نے منہ بنا کر کہا "محدود
ہے ـــ محدود ہے ۔ آپ کا علم یہ محض شعبدہ بازی ہے ۔ لیکن
پھر بھی میں آپ کی عزت کرتا ہوں کیونکہ آپ میرے بے تکلف دوست

ہیں - میرے کہنے والوں سے بہت زیادہ عقلمند ہیں - آپ اسقدر پرانے اور بے تکلف دوست ہونے کے باوجود بھی مجھ سے برسوں کے بعد چند منٹ کے لئے ملنے آئے ہیں - مسٹر موہن میں آپ کا مشکور ہوں "

پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا - اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا -

"میرے مقاصد اعلیٰ ہیں - میں ——— میں" اس نے پر جوش لہجے میں کہا - "دنیا پر ثابت کرونگا کہ ہندوستان میں محض بیوقوف تنگ خیال اور کمزور لوگ ہی نہیں بستے اور ایجاد و اختراع یورپ اور امریکہ کی قسمت میں ہی نہیں لکھی بلکہ ہندوستانیوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نادر روزگار دماغ رکھتے ہیں اور ہندوستانی بھی ایسی ایسی ایجادیں کر سکتے ہیں جو یورپ اور امریکہ کے موجدوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتیں" "جب میں بڈھا ہو جاؤنگا جب میرے قویٰ سخت کام کرنے کے لائق نہ رہیں گے، جب میرا دماغ تھک جائیگا، اس وقت ——— ہاں اسوقت میں اپنی ایجادیں دنیا کے سامنے پیش کرونگا - میری ایجادیں دنیا میں تہلکہ مچا دینگی - اس وقت دنیا میری طرف دوڑیگی - یورپ اور امریکہ کے متعصب لوگ مان جائیں گے کہ ہندوستانی قوم بھی ہم سے کسیطرح کم نہیں ——— حکومتیں مجھے مدعو کرینگی تاکہ وہ میرے دماغ سے فائدہ اٹھائیں لیکن یہ بیفائدہ ہوگا - میرے اعضا کام کرنے کے لائق نہ ہونگے - میں بڈھا ہو چکا ہونگا، اور اسوقت میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ مادر وطن کی عزت و شہرت اور بنی نوع انسان کے آرام اور آسائش پر قربان کر چکا ہونگا -

میں ذاتی شہرت سے نفرت کرتا ہوں - شہرت خوشامدی اور غرض پرست لوگوں کو دوست بنا دیتی ہے - اور اپنے پیش نظر مقاصد کی تکمیل مشکل ہو جاتی ہے - اگر آج میں اپنی ایجادوں کو دنیا کے سامنے پیش کر دوں تو شہرت میرے قدم چومے - میرے گرد خوشامدیوں کا اور غرض پرستوں کا جمگھٹا لگ جائے اور میں اصل راہ سے بھٹک جاؤں - پس میں چاہتا ہوں کہ یہ کمبخت شہرت اسوقت میرے پاس آئے جب میں اپنے پیش نظر مقصد کی تکمیل کر لوں "

میں اس کے اس خیال کی تردید کرتا لیکن مجھے اس نے اس کا موقعہ ہی نہ دیا - اور ایک کھڑکی کو کھولتے ہوئے کہا :-

مسٹر موہن آپ اس جگہ سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک جہاز کے مستول دیکھتے ہیں" اس نے قریب کی ایک چھوٹی سی مشین کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لیکن اس مشین کے ذریعہ سے آپ اس کے ہر چھوٹے بڑے حصہ کو نہایت اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں - اور میں اسی مشین کے ذریعے سے اس جہاز کو یا اس کے کسی حصہ کو گولے بارود کے بغیر محض ایک برقی رو کے ساتھ تباہ کر سکتا ہوں "

پھر اس نے مجھے مشین کے ایک سوراخ میں سے جہاز کے مختلف حصے اور مسافر دکھائے اور کپتان کی شکل دکھا کر کہا "آپ کپتان کی کلائی پر ایک گھڑی دیکھ رہے ہیں - میں کپتان کی کلائی کو کچھ تکلیف پہونچائے بغیر ہی اس گھڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیسکتا ہوں" میرے دیکھتے دیکھتے رشید نے ایک چکر گھمایا اور گھڑی کپتان کی کلائی سے ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑی - اس پر کپتان کی حیرانی اور پریشانی دیکھ کر میں خوب ہی ہنسا - رشید بھی مسکرا دیا - پھر رشید نے کھڑکی بند کر دی - بعد ازاں اس نے مجھے وہ آلہ دکھایا جسکے ذریعہ سے وہ سیاروں کا درجہ حرارت معلوم کرتا تھا - اسی آلہ کے ذریعے سے اس نے مجھے بتایا کہ سورج کا درجہ حرارت چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ ہے - اس نے لیباریٹری کے وسط میں پڑے ہوئے مخروطی گولے کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ وہ راکٹ ہے جس کے ساتھ میں پندرہ منٹ میں ساری دنیا کے گرد گھوم چکا ہوں - میں نے اس کا نام براق رشید رکھا ہے - اسکے استعمال کے لئے میں بعض اوقات شمسی بھٹی کی حرارت سے بھی فائدہ اٹھاتا ہوں شمسی بھٹی کیا چیز ہے؟ یہ تو میں آپ کو پھر بتاؤنگا - پہلے اس چیز کو دیکھیں جو پندرہ منٹ میں اپنے موجد کے ساتھ تمام دنیا کے گرد گھوم چکی ہے - پہلے یہ تیر کی طرح زمین سے اٹھتی ہے - حتیٰ کہ زمین کی کشش ثقل سے باہر نکل جاتی ہے - اگر یہ وہاں پر ٹھہر جائے تو زمین چوبیس گھنٹے میں اس کے سامنے سے نکل جائے - یا یہ زمین کے گرد ۲۴ گھنٹے میں گھوم چکے لیکن نہیں - اسکا دو ہزار گھوڑے کی طاقت رکھنے والا انجن زمین کی حرکت سے مخالف سمت میں پوری رفتار سے دوڑتا ہے - اور اس طرح سے پندرہ منٹ میں زمین کے گرد ایک پورا چکر ختم ہو جاتا ہے - افسوس اسوقت دن ہے اگر رات ہوتی تو میں اپنے قیمتی وقت کے پندرہ منٹ ضائع کرکے آپکو دنیا کی سیر کرا دیتا - لیکن اس وقت دن ہے - میرے مکان کی چھت سے "براق رشید" کو آسمان کی طرف ناقابل تصور رفتار سے جاتے دیکھکر کراچی کے باشندے حیرت میں پڑ جائیں گے - اور میرا راز فاش ہو جائے گا -

مسٹر موہن اب میں آپ کو شمشی بھٹی دکھاتا ہوں۔ کمرے کے وسط میں یہ جو ایک عجیب وغریب دھات کا بنا ہوا بڑا سا صندوق ہے۔ یہی دراصل شمشی بھٹی ہے۔ اس کے درجہ حرارت کو میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچا سکتا ہوں۔ جو سورج کا درجۂ حرارت ہے۔ اس لئے میں اس کا نام شمشی بھٹی رکھا ہے۔ یہ بہت کار آمد چیز ہے۔ اسکے ذریعے ایک انجن کی مدد سے میں ہر دھات کو بخارات میں تبدیل کرسکتا ہوں۔ لیکن جس دھات کی یہ بھٹی بنی ہوئی ہے وہ اس کی حرارت سے نہیں پگھلتی۔ نہ اس پر گرمی اثر کرتی ہے۔ نہ سردی، نہ یہ ٹوٹتی ہے اور نہ مڑ ہی سکتی ہے۔ اسی دھات کا ایک راکٹ بنا رہا ہوں جس میں مریخ کا سفر کرنے کا ارادہ ہے۔

اس بھٹی کے ایک حصہ میں میں نے آسمانی بجلی کو قید کرلیا ہے۔ آپ لیبارٹری کی چھت میں دو لاکھ باریک اور موٹی تاریں، اور اس کے اوپر چھوٹے کھمبے دیکھتے ہیں یہ بجلی کو قید کرلیتے ہیں۔ موسم برسات کی تاریک، اور ڈراؤنی راتوں میں چمک کر غائب ہوجانے والی بجلی کئی کروڑ وولٹ کی طاقت رکھتی ہے۔ اور اس کی اس طاقت کو دیکھکر یورپ اور امریکہ کے سائنسدانوں کے منہ میں پانی بھر آیا کرتا ہے۔ لیکن یہ بجلی میری غلام ہے۔ رات کو جسوقت بادل آتے ہیں اور بجلی کڑکتی ہے۔ یہ کھمبے بلند ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ بادلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے بجلی آتی ہے اور شمشی بھٹی کے ایک حصے میں جمع ہوجاتی ہے۔

اس بھٹی نے مجھے ورکشاپ سے بے نیاز کردیا ہے۔ اگر اسکو دس میل لمبی، چوڑی، اور گہری جھیل میں رکھکر وہ خانہ کھولدیا جائے جس میں دھاتیں بخارات میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ تو جھیل کا پانی صرف آدھ گھنٹے میں بالکل خشک ہوجائے۔

مسٹر موہن! میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ تشریف لیجائینگے۔ چونکہ میں مریخ جانے راکٹ کو بہت جلد مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں وہ راکٹ بھی آپ کو دکھاتا لیکن ابھی وہ نامکمل ہے۔ اب مریخ سے واپس آنے کے بعد ہی دیکھیے گا۔ باقی یہاں ہر طرف عجیب وغریب چیزیں پڑی ہوئی ہیں جن کو دکھانے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں۔

میرے والدین سمجھتے ہیں کہ میں لیبارٹری میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں کرۂ ارض کے گرد پندرہ بار گھوم چکا ہوں۔ کئی گھنٹے ریڈیم کے تجربات کرنے کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ پر گذار چکا ہوں۔ سمندر کی بے تہاہ گہرائیوں کی کئی بار سیر کرچکا ہوں۔ اور اکثر اوقات رات کے وقت میں انہی ہوائی موٹروں میں مختلف دھاتیں اور مرکبات خریدنے جاتا ہوں۔

ان باتوں کے باوجود بھی میری ایجادوں سے میرے رشتہ داروں کے اور تمہارے سوا سب لوگ ناآشنا ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی کے مشہور موجد ظہیر کے کانوں میں میری ایجادوں کی کچھ بھنک پڑ گئی وہ چھپ کر میری لیبارٹری میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھ لیا اور برقی رو کے ذریعہ سے اس کا دایاں بازو شل کردیا۔ وہ بھاگ گیا۔ اور پھر کبھی نہیں آیا —— اچھا اب آپ تشریف لیجائیں آپ نے میرا آدھ گھنٹہ ضائع کردیا۔ میں مدتوں کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا۔ یہ کہتا ہوا وہ مجھے لفٹ تک لایا اور جونہی میں اسمیں کھڑا ہوا اس نے بٹن دبایا کہ مجھے نیچے اتار دیا۔

جسدن میں رشید سے ملنے گیا اسیدن کراچی کے مشہور سائنسدان ظہیر نے رشید کی لیبارٹری میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کی اور کامیاب ہوگیا۔ تجربہ کرنے کی بڑی میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس نے "براق رشید" "شمشی بھٹی" اور دیگر ایجادوں کے متعلق ہماری ساری گفتگو سن لی۔

میرے جانے کے بعد رشید نے شمشی بھٹی کو کھولا۔ پھر کچھ سوچکر اسے بند کردیا۔ اور لفٹ میں بیٹھ کر نیچے اتر گیا۔ اس کے جانے کے بعد ظہیر میز کے نیچے سے نکلا اور شمشی بھٹی کی ساخت پر غور کرنے لگا۔ اس نے دو ہینڈل دیکھے۔ پہلے ہینڈل کو دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ اس خانہ کو کھولنے کے لئے ہے جسمیں بخارات میں تبدیل کرنے کے لئے دھاتیں ڈالی جاتی ہیں اور دوسرے ہینڈل کے متعلق اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کے گھمانے سے بھٹی میں چھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ کی حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا۔ وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی تھیں دراصل ایک بٹن کے دبانے سے کھلتا تھا۔ اور ڈھکنا تو بند تھا مگر اس پر پیچ نہیں لگا ہوا تھا۔ پہلا ہینڈل شمشی بھٹی میں کئی ارب وولٹ بجلی داخل کرنے کے لئے تھا۔ اور دوسرا ہینڈل اس بھٹی کو سورج کی چار مربع گز سطح سے اٹھنی والی شعاعوں کو فوکس بنا دیتا تھا۔ ظہیر پہلے ہینڈل کو دبا کر دھاتیں ڈالنے کے خانے کو کھول کر اس کی ساخت دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ رشید کمرے میں داخل ہوا اور شمشی بھٹی کے پاس ظہیر کو دیکھکر غضبناک ہوگیا۔ وہ شعاعی پستول کے ذریعہ سے ظہیر کو ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ ظہیر نے رشید کو دیکھے بغیر پہلا

ہینڈل دبا دیا وہ سمجھتا تھا کہ اب وہ خانہ جس میں دھاتیں ڈالی جاتی ہیں کھل جائیگا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ کئی ارب وولٹ بجلی بیس ہزار گھوڑے کی طاقت کے انجن کے ذریعے سے دس گنی طاقت حاصل کر کے بھٹی میں داخل ہوئی اور وہ ڈھکنا کھل گیا جو پیچ لگائے بغیر معمولی طور پر بند تھا۔ چھت میں لگی ہوئی لاکھوں تاریں جل اٹھیں۔ اور رشید وظہیر بھی جلکر خاک ہو گئے۔ رشید کا مکان بھی جلنے لگا۔ بغل میں روئی کا ایک کارخانہ تھا وہ بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ رشید کے مکان کو بھی اسی کارخانے سے آگ لگی ہے۔ اس طرح سے کراچی کی زبردست آتشزدگی وقوع پذیر ہوئی جس کی دور دور مثال نہیں ملتی۔ اور جس کی اصل وجہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

بوڑھے ہسپانا ٹائیزر نے اسقدر پڑھکر اپنا روزنامچہ بند کر کے مجھ سے مخاطب ہؤا۔ اب رشید کو آپ کے اور میرے سوا کوئی جانتا بھی نہیں! اس کے بدقسمت والدین اس کے ساتھ ہی اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے۔

اختر سبحانی

شامِ تاریک

چھائی ہے جہاں پر شامِ تاریک   سر پر آنچل سیاہ و باریک
دریا ہیں ظلمتوں کے جاری   خاموش ہے کائنات ساری
طائر سب آشیاں میں روپوش   خوابِ معصومیت سے مدہوش
گلزار و ہزار و سار خاموش   یعنی ساری بہار خاموش
رنگینیٔ زرفشانِ انجم   شادابیٔ کاروانِ انجم
نورِ مہتاب کا تبسم   دریا کے خرام کا ترنم
گلہائے نظر نواز کے رنگ   گلہائے چمن طراز کے رنگ
تاریکیٔ انتظار میں گم   اندوہ غم آشنا میں گم
مطرب کا ساز سو گیا ہے   نغمہ خاموش ہو گیا ہے

(۲)

انوارِ سیاہ جاگ اٹھے ہیں   عشرت کے گناہ جاگ اٹھے ہیں
روشن ہے دیا عیش کوشی   رندی مستی۔ شراب نوشی
نغمے رقصاں ہیں عاشقی کے   شہرے ہیں طریق آذری کے
غلبہ مستی نے پا لیا ہے   نیکی نے منہ چھپا لیا ہے
برسیں گے یہاں گناہ کے پھول   عشرت کی جلوہ گاہ کے پھول
تم زینتِ شامِ زندگی ہو

کچھ نشہ فضا میں پیرتا ہے   شیطاں ہوا میں تیرتا ہے

(۳)

وہ حسنِ سیاہ کار نکلا   وہ غیرتِ صد بہار نکلا
اک بار چمک اٹھیں فضائیں   اک بار مہک اٹھیں ہوائیں
شاداب و کامران و گل پوش   رنگینیٔ عاشقی سے بیہوش
پیراہنِ ریشمی بدن پر   گلرنگ و مرمریں بدن پر
اندازِ شباب گل بدامن   آنکھوں میں شمعِ حسن روشن
ہر ایک ادا ہوس کا پیغام   ہر ایک نگاہ عشرت انجام
شانوں پہ فتنہ خیز گیسو   بکھرے ہوئے مشک ریز گیسو
ہر عشوہ بیقرار عریاں   ہر غمزہ سحر کار عریاں
بالکل سرشار ہیں نگاہیں   شاداب بہار ہیں نگاہیں
پاؤں میں لچک جوانیوں کی   بارش ہے گلفشانیوں کی
ہونٹوں پہ موجزن تبسم   گویا کہ چمن چمن تبسم
اس حسن سے ہے بہارِ ہستی   رنگینیٔ زرنگار ہستی
ننگ و ناموس کو بھلا کے   بس میں ہو تو میں کہوں یہ جا کے
تم صبحِ دوامِ زندگی ہو

عابد

مشرق واہلِ مشرق

رُوپ متی اور باز بہادر کے غیرفانی عشق و محبّت کی سرزمین مانڈوگڑھ

ہر عروج میں زوال اور ہر ترقی میں انحطاط پنہاں ہے۔ ہر بہار کے بعد خزاں اور ہر تعمیر کے بعد انہدام لازمی ہے۔ ہر عظمت کے لیئے ذلت اور ہر بلندی کے واسطے پستی ضروری ہے۔ فطرت کی کرشمہ سازیوں کو یکرنگی نہیں بھاتی۔ قدرت کی نیرنگیاں کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتیں۔ کل جو بالکل وحشی تھے آج مہذب بن گئے ہیں۔ کل جو مہذب تھے آج نری بدتمیز نظر آ رہے ہیں۔ مغرب کے ملاحوں کی جھونپڑیاں فلک بوس قصروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ مشرق کے بادشاہوں کے محل زمیں بوس کھنڈروں سے بدل گئے ہیں۔ کل جہاں اُلّو بولتے تھے آج وہاں گلستاں نظر آ رہا ہے۔ کل جہاں چمن تھا آج وہاں گدھے لوٹ رہے ہیں۔

مانڈو۔ روپ متی اور باز بہادر کے عشق و محبت کی سرزمین مانڈو جو کبھی اپنی سرسبزی و شادابی۔ اپنی آبادی و چہل پہل۔ اپنے قلعے اور فصیل۔ اپنی قوت و نزاکت اور اپنی عشق و محبت کی بناء پر عالمگیر شہرت رکھتا تھا۔ آج اس کی گمنامی کی یہ حالت ہے کہ اسی ملک میں بسنے والے بہت سے لوگ اس کا نام تک نہیں جانتے۔ ممکن ہے آپ بھی اس نام سے ناآشنا ہوں اور اس کی عظمتِ رفتہ کی کیفیت سن کر متحیر ہو جائیں۔ مگر نہیں اس پر تعجب نہ کیجیے۔ تعجب کیجیے مشرق کی خود فراموشی پر۔ تعجب کیجیے اسلاف کے عروج اور اپنے زوال پر۔ تعجب کیجیے ان کی عظمت اور اپنی ذلت پر!

بے شک بہار کے بعد خزاں لازمی ہے یقیناً ہر مد کے بعد جزر ضروری ہے مگر یہ کیا ہے کہ ہماری خزاں ختم ہونے کو نہیں آتی۔ صدیاں گزر گئیں مگر جزر کی پستی۔ مد کی بلندی سے بدلنے کا نام نہیں لیتی۔ ایک وہ تھے کہ مٹتے مٹتے بھی ان کی عظمت کے آثار اب تک باقی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ان کی مستحکم بنیادوں پر بھی کوئی معمولی سی عمارت نہیں بنا سکتے۔ آپ مانڈو اور اس کے گڑھوں پر تعجب کر رہے ہیں۔ حالانکہ عموماً سارے مشرق اور خصوصاً دیوتاؤں کی سرزمین ہندوستان کا چپہ چپہ اسی قسم کی قیمتی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے ——— یہاں مصریوں کا تمدن دفن ہے ——— یہاں عربوں کی تہذیب مدفون ہے ——— یہ یونانیوں کی شائستگی کا مزار ہے ——— یہ ایرانیوں کی ترقی کے آثار ہیں ——— یہ آریوں کی عظمت کے نقشے ہیں ——— یہ اشوک نے بنوایا تھا ——— اسے چندر گپت نے تعمیر کیا تھا ——— یہ مغلوں کی یادگار ہے ——— یہاں سلطنت کے لیئے بھائی بھائی میں جنگ ہوئی تھی ——— یہاں باپ بیٹے لڑ پڑے تھے ——— یہ ممتاز کا تاج ہے ——— یہ سارے قلعوں کا سرتاج ہے ——— یہ رائے پتھورا کی راجدھانی ہے ——— یہاں عدل و انصاف کے چشمے بہتے تھے ——— یہاں خون کا دریا رواں تھا ——— یہ مانڈوگڑھ ہے۔ یہاں قاف کی پریاں رہتی تھیں۔ اب اس میں چمگادڑ بستے ہیں! یہ روپ متی کی عشرت گاہ تھی۔ اب ابابیلوں کی خواب گاہ ہے! ——— یہ باز بہادر کا محل تھا اب درندوں کا مسکن ہے۔

متحیر کیوں ہو رہے ہیں؟! اگر آپ اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہیں تو ہم نے آپ ہی کی واقفیت کے لیئے "ادبی دنیا" کے چند صفحے ہر ماہ "مشرق و اہلِ مشرق" پر وقف کر دیئے ہیں۔ اور اگر آپ مشرق کی فراموش شدہ عظمت سے واقف ہیں تو بھی آپ کے زخم ہائے جگر کی تواضع کے لیئے ان قصہ ہائے پارینہ کو ماہ بماہ دہرانا ہم اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں کوئی تدبیر کام نہیں دیتی وہاں یہ کچھ کے باثر ثابت ہوں اور ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو نہ بھی پائیں تو کم سے کم اس کے حصول کا خیال ہی پیدا ہو جائے۔

مانڈوگڑھ۔ بندھیاچل کی ایک شاخ کی کشادہ سطح پر واقع ہے جو سمندر کی سطح سے دو ہزار ۹۷ فٹ بلند ہے۔ قدرت نے اپنے آسمانی اوزاروں سے اس پہاڑی کی چٹانیں کاٹ کر اس کے پہلو کچھ ایسے سیدھے بنا دیئے ہیں کہ یہاں کے قلعوں کی ایک قدرتی فصیل تیار ہو گئی ہے۔ مانڈوگڑھ کی ابتدائی تاریخ پردۂ خفا میں ہے اس کی معتبر تاریخ کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ جب رائے مہالک دیو اس قدرتی قلعے پر قابض اور اردگرد کے علاقے کا حکمراں تھا۔ سنہ ۱۳۰۴ء میں عین الملک کے ہاتھوں پہلی بار مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور مدتوں شاہانِ مالوہ کا دار السلطنت بنا رہا۔ ہوشنگ شاہ غوری نے سنہ ۱۴۰۵ء سے ۱۴۳۵ء تک اپنے ایام سلطنت میں اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ عظیم الشان قلعے تیار کیئے۔ شاندار مسجدیں بنائیں۔ ان میں مدرسے جاری کیئے۔ خوبصورت بازار سجائے سرسبز تو پہلے ہی سے تھا۔ اس نے چمن بندی کر کے اسے باغ ارم کا ایک ٹکڑا بنا دیا۔ گجرات کے فرمانروا ہمیشہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر ہوشنگ شاہ غوری کی زندگی میں کسی کی پیش نہ گئی۔ اس کی وفات کے بعد والیانِ گجرات نے کئی حملے کیئے۔ آخر

۱۵۱۸ء میں مظفر شاہ کا حملہ کامیاب ہوا اور مانڈوگڑھ۔ والی گجرات کے زیر اقتدار آگیا لیکن جب مالوہ پر بہادر شاہ کا قبضہ ہوگیا تو ایک خوفناک معرکے کے بعد ۱۵۳۱ء میں مانڈوگڑھ پر بھی اسی کا اقتدار قائم ہوگیا۔ مگر اس کی حکومت بھی کچھ پائدار نہ ثابت ہوئی اور ۱۵۳۵ء میں قادر شاہ نے مالوہ کو فتح کر کے اس پر بھی قبضہ کرلیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیسی طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی منٹ منٹ پر بادشاہوں کی سیاست بدلتی تھی۔ جان توڑ کوشش کے بعد ایک جگہ کو فتح کرتے تھے۔ مگر بسا اوقات جنگ کی تکان دور ہونے سے پہلے ہی ان کی رائے بدل جاتی تھی اور جس کے لیئے ہزاروں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا دیا تھا اس کو خود ہی چھوڑ کر دوسری جگہ چل دیتے تھے۔

موجودہ معنوں میں قومیت اور وطنیت کے الفاظ گزشتہ صدی کی پیداوار ہیں۔ اگر اب سے تین چار سو سال پہلے یہ الفاظ ان ہی معنوں میں موجود ہوتے تو غالباً ایسی خانہ جنگیاں وجود میں نہ آتیں اور کوئی اسلامی فرماں روا کسی اسلامی حکومت پر۔ کوئی ہندو راجہ کسی ہندو ریاست پر چڑھائی نہ کرتا۔ اب چاہے خود غرض مورخ گزشتہ واقعات کو کسی رنگ دیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جنگ محض مال و دولت اور حکومت کی شان و شوکت کیلیئے ہوا کرتی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ اپنی سلطنت بڑھانے کے لیئے اگر موقع پاتا تو مذہب سے بے پرواہ ہو کر دوسری سلطنت پر حملہ کر دیتا۔ اس کو اس کا کوئی خیال نہ ہوتا تھا کہ مقابل مسلمان ہے یا ہندو۔ اس کو تو اپنا علاقہ وسیع کرنے کی آرزو ہوتی تھی مسلمان کے قبضہ سے ملے یا ہندو کے۔ اسی طرح ایک ہندو راجہ مال و دولت اور ملک گیری کی تمنا میں موقع پاکر جیسے ایک اسلامی سلطنت پر حملہ کرتا اپنا جائز حق سمجھتا تھا ویسے ایک ہندو راج پر بیدریغ چڑھائی کرنے میں بھی اسکے نزدیک کوئی برائی نہیں تھی۔ آج جن خیالات کو زبردستی مردوں کے دماغ میں ٹھونسنے کی کوشش کی جارہی ہے ان کو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ ان کی جنگ صرف مال و دولت کے لیئے ہوتی تھی اور صرف سلطنت کے لیئے۔

فتح کے چند ہی دنوں بعد قادر شاہ مانڈوگڑھ چھوڑ کر چلا گیا اور ملو خاں نے میدان خالی پاکر اس پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ مگر ابھی قدم بھی نہ جمانے پایا تھا کہ ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ سوری مالوہ جا دھمکا۔ ملو خاں اپنی جان لے کر بھاگا اور مانڈوگڑھ شیر شاہ کے صوبہ دار مالوہ شجاول خاں کا دارالحکومت قرار پایا۔ سوری خاندان کا آفتاب اقبال جس سرعت سے نصف النہار پر پہنچا تھا اسی تیزی سے غروب بھی ہوگیا۔ شجاول خاں کے عاشق مزاج بیٹے باز بہادر نے اپنے باپ کے بعد خود مختاری کا اعلان کردیا۔ مگر ایک عاشق سے اور سلطنت سے کیا واسطہ ؟! اور عاشق بھی باز بہادر جیسا! جس کے عشق کے افسانے اب تک وسط ہند میں جذبات کا تلاطم برپا کیئے رہتے ہیں اور جو کوہ سار مانڈو کا لیلیٰ روپمتی کے مقابلے میں اب تک مجنون مالوہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۵۶۱ء میں مانڈوگڑھ سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا۔ ۱۵۹۸ء میں اکبر نے مانڈو کو اپنے قدوم سے مشرف کیا اور سیر و شکار کے لیئے پندرہ دن تک وہاں ٹھیرا رہا۔ ۱۶۱۷ء میں قدرتی مناظر کا شیدائی جہانگیر اور اس کی محبوبہ دل نواز نورجہاں مانڈوگڑھ کے دلفریب مناظر سے کئی دن لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان کے ساتھ شاہ انگلستان کا سفیر سر ٹامس راؤ اور پادری ٹیری بھی تھا۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں بڑے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ اس سیاحت میں نورجہاں نے چار شیر شکار کیئے۔ ۱۶۱۷ء میں مانڈو کی دلچسپیوں نے جہانگیر اور نورجہاں کو پھر اپنی طرف کھینچا اور وہ مہینوں وہاں ٹھیرے رہے جہانگیر نے تین لاکھ روپے کی لاگت سے پرانے محلوں کی تعمیر و تجدید کرائی۔ شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے باپ سے سرکشی کی تو اس کو کوئی جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ آخر ۱۶۲۵ء میں مانڈوگڑھ نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ ۱۶۹۵ء میں اس پر مرہٹے قابض ہوگئے مگر وہ بھی چین سے اس سلطنت نہ کرسکے اور کئی معرکوں کے بعد ۱۷۳۲ء میں مانڈوگڑھ مہاراجہ دھار کے قبضہ میں آگیا اب بھی اس پر اسی خاندان کی ریاست ہے۔ مگر اس کی پرانی شان و شوکت مدت ہوئی فنا ہوگئی۔ اب نہ وہ محل ہیں۔ نہ وہ سیرگاہیں ہیں۔ نہ وہ شوکت ہے نہ وہ عظمت ہے۔ اب مانڈوگڑھ نام ہے پھوس کی چند بے ترتیب جھونپڑیوں کے مجموعے کا جہاں کبھی باز بہادر کی معشوقہ روپ متی رہتی تھی۔ آج وہاں درندے بستے ہیں۔ جہاں کبھی جہانگیر اور نورجہاں ٹھیرتے تھے آج وہاں گھوسیوں اور گوالوں کی گائیں بھینسیں بندھتی ہیں۔

انسان کی بنائی ہوئی دلفریبیاں ایک ایک کر کے ختم ہوگئیں۔ مگر قدرت کی دلچسپیاں اب تک جوں کی توں موجود ہیں۔ اس کی سرسبزی و شادابی آج تک خوابیدہ جذبات میں ہیجان پیدا کرتی رہتی ہے۔ پرشوکت عمارتیں زمین کے برابر ہو کر اپنی معشوقیت کھو چکی ہیں اور ہرے بھرے جنگلوں میں فطرت کے پرہیبت حسن میں خوفناک اضافہ کررہی ہیں۔ اور دگر دخراسانی املی کے گاؤدم تنے والے درختوں کی قطار ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا قدرت نے اپنے حسن کی نگہبانی کے لیئے اپنی آسمانی فوج کے لاتعداد سپاہیوں کو پہرے پر مقرر کر دیا ہے۔ اس علاقے کے لوگ اسے خراسانی املی کہتے ہیں مگر یہ دراصل افریقہ کا ایک جنگلی درخت ہے جسے عہد اسلامی کے کسی شوقین فرمانروا نے ابی سینیا سے منگا کر یہاں لگایا تھا۔

آج کل مانڈوگڑھ سے ۲۴ میل جنوب مشرق کی جانب سی۔ پی (وسط ہند) کی ریاست دھار کا صدر مقام شہر دھار واقع ہے۔ مانڈوگڑھ کی سیر کرنے والے عموماً یہیں سے ہو کر جاتے ہیں۔ مانڈو کی فصیل کا گھیر تقریباً تیس میل ہے۔ جامع مسجد اور ہوشنگ شاہ کا مقبرہ دور ہی سے دکھائی پڑتے ہیں۔ شہر کے اندر داخل ہونے پر قدم قدم پر شوکت دیرینہ کے نقوش نظر آتے ہیں۔ کوئی عمارت اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے۔ مگر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ہی ان کی ساری داستان سنا کر دیکھنے والے کے سامنے انسانی کارناموں کی بے ثباتی کا حسرتناک نقشہ پیش کر دیتے ہیں گنبد گر چکے ہیں مینارے پست ہو چکے ہیں۔ دیواریں ننگی ہوگئی ہیں۔ کوئی نہیں ہے جو ان کی تجدید و تعمیر کرائے۔ صرف جنگلی درخت اور خودرو سبزے کی ہریالی ان کی پردہ پوشی کر رہی ہے۔

خلجی بادشاہوں (پٹھانوں) کی یادگاریں ہنڈولا محل۔ جہاز محل اور چمپا باؤلی کہ سوگوار اور سنجیدہ نغمے سیاحوں کو مبہوت بنا دیتے ہیں مغلوں کے عشرت کدوں کی فرسودہ

نقش و نگار کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ چمپا باؤلی کا پانی جو کبھی حسن و جمال کی خوش ادائیوں کا مرکز تھا۔ اب کالے ناگ کی طرح کاٹنے دوڑتا ہے۔ اس کے کنارو کے محل جو کبھی بیگمات کے سرد خانے تھے اب بھیڑیوں کے نشست بنے ہوئے ہیں۔ تالاب کے وسط میں ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کنول کے پھول کی بھی پتیاں بکھر چکی ہیں اور اس کی یادگار صرف ایک دیوار اور چبوترے کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ باز بہادر اور روپ متی کا محل اب تک ان کے عشق و محبت کی داستان دہراتا رہتا ہے۔ یہ اگرچہ بہت بڑا نہیں۔ مگر اسکے گوشے گوشے سے ایک عاشق کا پاکیزہ مذاق نمایاں ہے۔ روپ متی کی حسین چھتری بھی اب تک اپنے مکین کے حسن کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

مانڈو گڑھ صدیوں مختلف قوموں اور مختلف خاندانوں کے بادشاہوں کی جولاں گاہ بنا رہا۔ جو پہنچا اس نے حسن کی اس دیوی کو اپنے مذاق کے مطابق سنوارنے کی کوشش کی۔ مگر نہ وہ رہے نہ ان کی آرائشیں رہیں۔ البتہ ان کے کھنڈر اب بھی ان کی عظمت و شوکت کا پتہ دینے کو موجود ہیں اور پچھلوں کو گلوں کے کارنامے سنا کر عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ کاش! کوئی سنے اور اپنے اسلاف کی پیروی کرکے مشرق کو ایک بار پھر تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دینے کیلئے سرگرم عمل ہو جائے؎

میلارام وفا

خاکستر مشتعل

آج پھر کیا چیز ہے سینے کے اندر مشتعل
میں سوائے خاک پاتا ہی نہ تھا دل کا نشان
لے کے جن چنگاریوں کو شعلہ ساماں کر دیا
یا مجھے بیگانۂ سوزِ محبت دیکھ کر؎
مشقِ تخلیقِ شرارِ بے نشاں کرنے لگا
آگ پیدا کی شعاعِ عشوہ و انداز سے؎
یا یہ فطرت حسن کی ہے جو بروئے کار ہے
واقعی ذوقِ نمائش اقتضائے حسن ہے
برق پاشیِ جلوہ کو اس کی ذرا پروا نہیں
یا یہ صورت ہے کہ دل آئینہ ہے تو آفتاب
کیوں نہیں تو حسن ہے تیری طبیعت فیض ہے
آئینہ کیا، جب نوازش تیری آئے جوش میں؎
کوئی صورت بھی ہو، استعداد لازم ہے مگر
آبِ نیساں ہے گہر، لیکن صدف کیواسطے
کیا اُگا نامیہ، زمیں میں جب نہ تھی روئیدگی
مجھ میں استعداد کیا، ایسی بلا کی بے حسی
تو نے اس عالم میں کیونکر سوز پیدا کر دیا
سحر ہے یہ، خرقِ عادت ہے، یہ وہ اعجاز ہے
آسمانِ حسن کی زہرہ! ہے وہ قدرت تجھے
تو لگائے آگ پانی میں کہ چھا جائے دھواں
آہ تو اور مانیؔ ناکام کی بزمِ حیات
پھر خدا جانے کہاں سے آگیا پہلو میں دل
تجھ کو خاکستر میں کیونکر مل گئیں چنگاریاں
داغ روشن کر دیئے یکسر چراغاں کر دیا
جوشِ غیرت میں غرورِ حسن نے ڈالی نظر
اس طرح اپنے اثر کا امتحاں کرنے لگا
آگ میں بھڑکا دیئے شعلے ہوائے ناز سے
جلوہ افروزی بشوقِ گرمیِ بازار ہے؎
کس کو تاب یک نظر ہے یہ صلائے حسن ہے
ہوش کھو بیٹھے کوئی یا آگ لگ جائے کہیں
یوں ہوئی آغوشِ دل جلوے سے تیرے کامیاب
تیری زینت ہے محبت تیری طینت فیض ہے
تیرے پرتو سے ہو تابش ذرۂ روپوش میں
جوہرِ قابل ہو تب ہوتی ہے ترتیبِ اثر
ہے سعادت مہر میں برجِ شرف کے واسطے
کیا جلائی برق، خاکستر میں اہلیت نہ تھی
بے دلی میں یاس کے ہاتھوں بنا جس کی پڑی
دل تو خاکستر تھا، کیسے دل کو شعلہ کر دیا؎
جس کی حال ایک تیری ہی نگاہِ ناز ہے۔
نذر دیتا ہے فرشتہ ہدیۂ اُلفت تجھے
تو جھکائے عصمتِ قدسی کو بابل کا کنواں
کیا ترے جلوے کو کم تھی یہ فضائے کائنات

مانی
جائسی
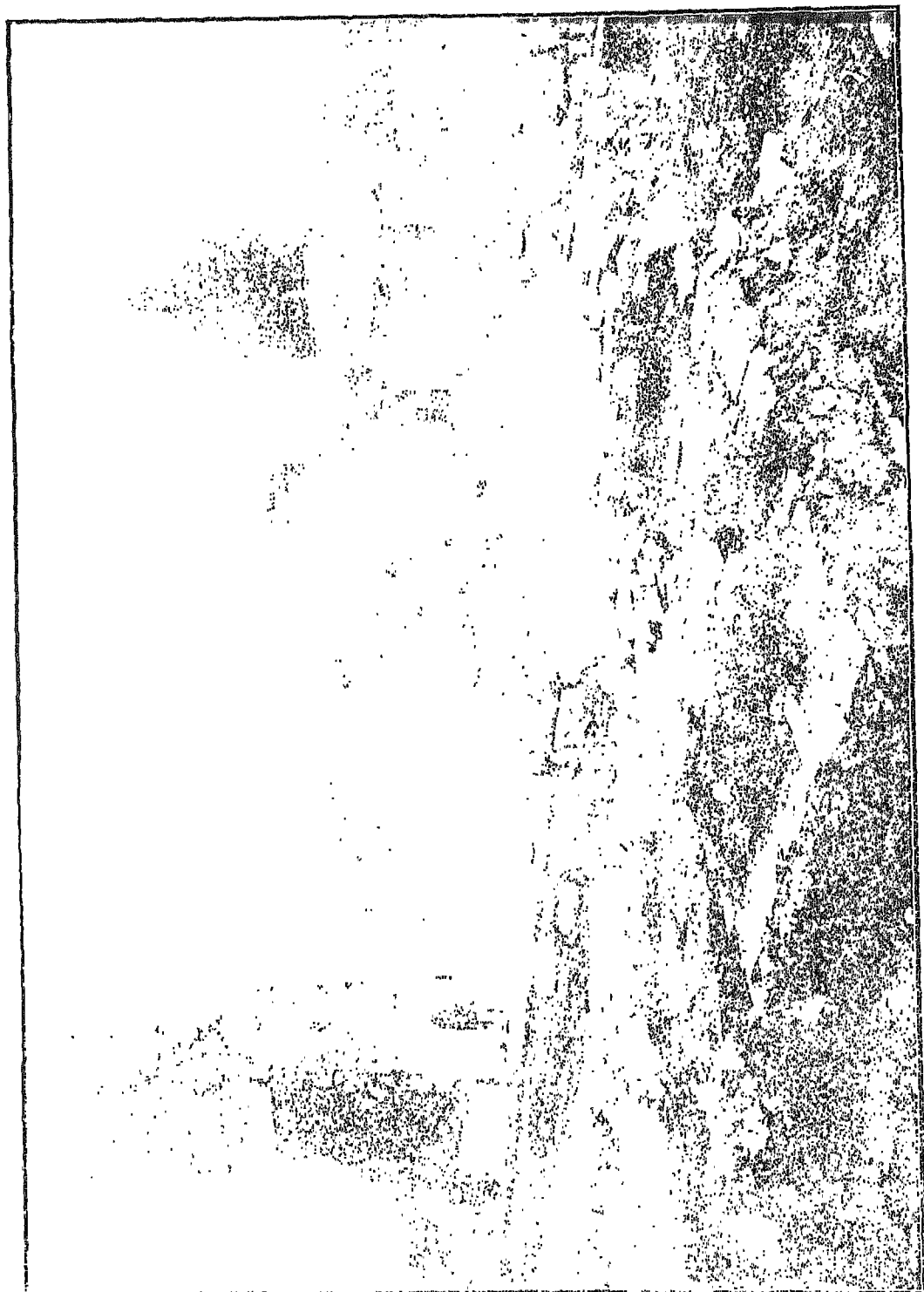
مانڈو گڑھ میں سلطان خلجی کا خستہ مقبرہ

مانڈو گڑھ شاہی محل کی مشہور جھیل "چمپا باولی" کا
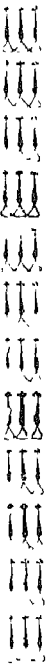
مانڈو گڑھ کی دوسری جھیل سے شاہی محل کا نظارہ

اردو کی سب سے پہلی شاعرہ

چندا

اردو کے ساتھ جہاں اور بے اعتنائیاں کی گئیں وہاں ظلم بھی کیا گیا کہ کسی نے کوئی عمدہ اور سنجیدہ تذکرہ اردو شعر کہنے والی عورتوں کا آج تک نہیں لکھا — لالہ سری رام نے "خمخانۂ جاوید" - مولوی عبدالحئی نے "گل رعنا" - مولوی عبدالسلام نے "شعر الہند" اور مختلف اصحاب نے مختلف طریقوں سے انتخابات تذکرے وغیرہ لکھ کر مردوں کی شاعری کی تدریجی ترقی ظاہر کی مگر عورتوں کی شعر گوئی کی طرف کوئی نظر اعتنا نہیں کی گئی - گذشتہ پچاس سال کے عرصے میں بعض لوگوں نے اردو فارسی شعر کہنے والی عورتوں کے اکثر تذکرے لکھے مگر اسی پرانی طرز اور اسی قدیم روش پر جدید طریقے سے کسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی - حال میں نولکشور پریس سے ایک تذکرہ اردو و فارسی شعر کہنے والی عورتوں کا شایع ہوا ہے - مگر بالکل ناقص اور بیحد غلط سلط - ہم نے ڈیڑھ سال کی محنت میں اس کے متعلق کافی مواد جمع کر لیا ہے - اور تلاش جاری ہے انشاء اللہ بشرط حیات ایک مستقل تذکرہ شایع کر کے مردوں کے دامن سے بے اعتنائی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کریں گے -

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اردو میں سب سے پہلے خاں کی دکنی کی بیوی نے شعر کہے ہیں اور دوسری چند عورتوں نے بھی، مگر اردو زبان میں دیوان ترتیب دینے کا فخر ماہ لقا بائی چندا اور صرف چندا کو حاصل ہے - چندا کون تھی - یہ ایک آسان سوال ہے مگر اس کا تشفی بخش جواب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، تقریباً تمام تذکرے نویسوں نے اس خصوص میں بدحواسیاں کی ہیں - کسی نے چندا اور ماہ لقا کو الگ الگ شاعرہ قرار دیا ہے - کسی نے کچھ اور بدحواسی کی ہے - بہر حال ایک اچھا خاصا مواد اس کے متعلق جمع ہو گیا ہے -

۱۸۴۷ء میں منشی کریم الدین نے "طبقات الشعراء ھند" لکھی تو انہوں نے غالباً ہندوستان کو سب سے پہلے چندا کو روشناس کرایا - لکھتے ہیں کہ :-

چندا :- تخلص معشوقہ شیریں شمائل نیکو خصائل محبوبۂ بازاری رقاصۂ روشن اندام مہ لقا نام کا ہے کہتے ہیں کہ یہ حیدر آباد میں نہایت ترفہ تنعم سے ایام بسر کرتی ہے - قریب پانسو آدمی سپاہی اور شاگرد پیشہ وغیرہ کے لازم رکھتی ہے اور عشوہ و ناز سے آدمیوں کے دلوں کو چھین لے جاتی ہے لیکن سر اس کا کسی سے نیچا نہیں ہوتا - شعراء دوں مزاج اس کے مدح میں اشعار کہہ کر لیجاتے ہیں - جائزات[1] اچھی پاتی ہے اور وہ رنڈی بطور مردوں کے ورزش کرتی ہے - گھوڑا دوڑاتی ہے اور ناوک بازی و سنان کاری مژگاں سے گذر کر تیر اندازی اور نیزہ بازی سے میدان میں مشغول ہوتی ہے - غرض کہ نہایت ہوشمند پختہ کار نادر العصر اور عجوبۂ روزگار ہے - اور دیوان مرتب مشتمل اوپر اکثر انواع سخن کے رکھتی ہے اور اپنی فکر کے عروسوں کو نظر شیر محمد خاں ایمان سے گذارتی ہے - یہ دو بیت اس کے جو میرے ہاتھ آئیں ہیں لکھتا ہوں صاحب دیوان ہے ایک جلد اس کی سرکار کمپنی کے کتب خانہ میں درمیان انگلینڈ کے موجود ہے - یہ کتاب اپنے تاریخ میں کپتان ملکم صاحب کو اس نے بطور نذر پہلی اکتوبر ۱۷۹۹ء کو دی تھی -

(دیکھو طبقات الشعراء ہند منشی عبدالکریم صفحہ ۳۲۷)

اسی تذکرے میں ماہ لقا کا حال دیکھیے تو غریب چندا عورت کی بجائے مرد نظر آتی ہے - لکھا ہے کہ -

ماہ لقا :- مصنف ایک دیوان اردو کا جس کی ایک جلد حیدرآباد کے راجہ چندولال کے کتب خانہ میں موجود ہے - اور ایک بڑی دلچسپ مثنوی بنام "قصۂ خاور شاہ" جو دکھنی زبان میں شاہ عالم کے وقت میں تصنیف کی تھی اس میں اس کی مدح اور صوبہ دار کی بھی اور صوبے کی جہاں وہ تصنیف ہوئی ہے -

(دیکھو صفحہ ۱۳۶)

دراصل دیوان اور مثنوی دونوں کا تذکرہ کرنے میں غلطی کی ہے مثنوی ایک اور شخص کی ہے جس کے نام کا ایک جزو "ماہ" ضرور ہے مگر ماہ لقا نہیں انشاء اللہ ہم آئندہ کسی فرصت میں اس مثنوی کو پیش کریں گے اور اس وقت یہ بھی ظاہر کریں گے کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟

---

[1] انعام و اکرام -

چندا کے انہیں حالات کو مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف طور پر
بیان کیا ہے کسی نے چندو لعل کی محبوبہ ظاہر کیا ہے اور کسی نے نواب علیخاں
بہادر کی منظورِ نظر لکھا ہے چنانچہ رائے درگا پرشاد تذکرۃ النساء نادری کے
صفحات ۱۰ و ۹۳ و ۹۴ پر اور صاحب مشاہیر نسواں صفحات ۲۱۱ تا
۲۱۲ پر مولف حدیقۂ عشرت صفحہ ۵۳ و ۵۴ پر، مرتب ماہ درخشاں
صفحہ ۱۵ و ۱۶ پر مصنف شمیم سخن صفحہ ۹۸ پر مالکِ بہارستان ناز
صفحہ ۳۸ و ۳۹ پر سخن شعراء میں مولوی صاحب نے صفحہ ۵۷۳ پر یہی
لکھا ہے۔ اور سب کو یہی دہوکا ہوا ہے کہ ماہ لقا الگ ہے اور چندا جدا!
مگر غضب کیا ہے تذکرۃ الخواتین مطبوعۂ نولکشور پریس کے مرتب حضرت
آسی نے کہ سب تذکرہ نویسوں سے ہٹ کر ارسطوجاہ کا نام لے دیا چنانچہ
لکھتے ہیں۔

چندا۔ تخلص بھی یہی ہے اور نام بھی یہی ہے ۱۷۹۹ء
میں جبکہ صوبہ دار ارسطوجاہ کے رفعت وصولت کا بازار
دکن میں گرم تھا یہی زمانہ تھا کہ چندا کی شاعری آفتاب
نصف النہار بنکر دکن کے آسمان شہرت پر چمک رہی تھی۔
انتہٰی　　(دیکھو صفحہ ۴۵ و ۴۶)

یہی نہیں بلکہ اور ایک غضب یہ بھی کیا ہے کہ ماہ لقا کے نام سے بھی
ملاحظہ ہو۔

ماہ لقا (ط) یہی تخلص تھا اور یہی نام تھا حیدرآباد دکن کی
شاہد بازاری تھی جو راجہ چندو لعل کی سرکار میں ملازم رہ کر
متمول ہوگئی تھی۔ اور اسی صحبت نے اس کو شاعر بھی بنادیا تھا۔
(دیکھو صفحہ ۱۴۷)

اسی تذکرے کے دوسرے حصے میں فارسی شعر کہنے والی عورتوں
کے حالات لکھتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ

ماہ لقا۔ اس شاعرہ کا اصلی نام چندا بی بی تھا، حیدرآباد
کی رہنے والی تھی، گانے بجانے والی عورت تھی نواب نظام
علیخاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی نوکر تھی، الخ
(دیکھو صفحہ ۲۵۴)

۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ) میں مولوی غلام صمدانی گوہر نے "حیات ماہ لقا" کے نام سے
چندا کے حالات زندگی کتابی صورت میں (۳۴) صفحات پر شائع کئے ہیں
مگر افسوس ہے کہ اس رسالے کو قطعاً شہرت نصیب نہیں ہوئی اس
کے ساتھ ساتھ "گلزار ماہ لقا" کے نام سے "انتخاب دیوان چندا" بھی
(۴۸) صفحات پر کتابی صورت میں شائع کیا مگر وہ بھی گوشۂ گمنامی میں
پڑا رہا۔ مجھی مولوی ظفریاب خان صاحب سابق مدیر ادیب (حیدرآباد
دکن) نے انجمن ارباب اردو سرورنگر حیدرآباد دکن کے آرگن رسالہ
"تحفہ" بابت ماہ صفر ۱۳۴۳ھ میں ایک مختصر مضمون چندا کی شاعری اور سوانح
کے متعلق لکھا مگر افسوس ہے کہ اُسے بھی شہرت نہیں ہوئی، رسالہ انقلاب
(لاہور) بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں کاظمہ بیگم نے ایک مضمون چندا کی شاعری
پر لکھا مگر وہ بھی مشہور نہ ہوا۔ انتہا یہ کہ نولکشور پریس تک بھی اس
لاہوری مضمون کی رسائی نہ ہوسکی۔

اب ہم ماہ لقا بائی چندا کے حالات زندگی لکھ کر اس کی شاعری
کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱۲۳۵ھ میں منشی غلام حسین جوہر نے ماہ لقا بائی کے کتب خانے
سے فائدہ اٹھاکر ایک تاریخ ترتیب دی ہے۔ اور اس کا نام "ماہ نامہ" رکھا
ہے۔ اس میں ماہ لقا کے خاندانی حالات تفصیل سے لکھتے ہیں چنانچہ اس
کا ایک قلمی نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ کی ملک ہے اور فہرست میں فن تاریخ
۱۱۴ پر موجود ہے۔ ہمارے پیش نظر ہے، یہ تاریخ ماہ لقا بائی کی فرمائش
پر لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اختتام پر جو قطعۂ تاریخ مولف نے لکھا ہے اس سے
یہی ثابت ہوتا ہے ؎

شکرِ حق فرمائش ماہ سپہر دلبری　　ماہ نامہ گشت لامع چوں مہ بدرالدجی
سال اتمامش چو جوہر جست از ماہ ملک　　گفت گویا مشرق انوار حسن مہ لقا

ابوالفتح نصیرالدین محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانۂ حکومت میں خواجہ
محمد حسین نامی ایک شریف نوجوان دہلی آکر ملازمت سرکاری کا خواستگار ہوا
اور کسی کی سفارش پر احمدآباد گجرات میں کروڑگیری (کسٹم) میں ملازم ہو
گیا۔ چند روز کے بعد خواجہ زادگان کاٹھیاواڑ کے خاندان کی ایک لڑکی سے
عقد بھی ہوگیا۔ اور اس نے مستقل طور پر گجرات میں سکونت اختیار کی، قدرت
نے فیاضی سے ایک دو نہیں انیس ۱۹ لڑکے لڑکیاں دیں۔ جن میں سے اکثر مرکھپ
گئے اور پانچ لڑکے لڑکیاں باقی رہ گئیں (۱۔ غلام حسین، ۲۔ غلام محمد ۳۔
نوربی بی ۴۔ بول بی بی ۵۔ مبیدہ بی بی) یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت کا انتظام
یوں ہی سا تھا، نگرانی بھی برائے نام ہوتی تھی محمد حسین نے بھی خوب ہاتھ
رنگے۔ سرکاری روپیہ کو شیرمادر سمجھ کر نگلنا شروع کیا۔ مگر تابکے، آخر ناظم
کو اطلاع ملی اور ان کے دفتر کی پڑتال شروع ہوئی چونکہ بے حساب روپیہ غبن
کیا تھا اور سخت سزا کا احتمال تھا اس لئے نہایت سراسیمگی کے عالم میں گھر بار
بیوی بچوں کو چھوڑ کر فرار برقرار کیا اور کہیں جاکر روپوش ہوگیا۔ ناظم نے

۱ و ۲ یہ دونوں کتابیں مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔

پڑتال کی ہزاروں روپیہ کا غبن ثابت ہوا۔ مال و اسباب ضبط ہوگیا بس عورت معہ بچوں کے گھر سے باہر کردی گئی۔ اس زمانے میں خیانت بڑا جرم تھا خائن کی امداد اور اس کے لواحقین کی مدد کرنا سخت معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ بچے کب تک فاقہ کشی کرتے جس جگہ حکومت کی تھی وہاں بھیک مانگنا بھی گوارا نہ ہوا۔ بچوں کی ماں نے ہجرت کی، ادھر اُدھر کی خاک چھان کر قصبۂ دیولیہ پہنچی تو خدا ترس بھگتیوں نے اُسے پناہ دی اور اس کی لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دینے لگے۔ قصبہ کے حاکم سالم سنگھ کو اطلاع ملی تو اُس نے ان غریبوں کو رہنے کے لئے مکان دلوادیا اور ہر طرح خبر گیری بھی کرنے لگا۔ مگر اللہ میاں سے ڈر کر نہیں بلکہ

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

کے اصول پر میدہ بی بی کی ہم آغوشی کی تمنا میں، چنانچہ اپنی شہرت و عزت حسن و جمال، سخاوت و مہربانی کے اثرات سے میدہ بی بی کو اپنی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھایا اور میدہ بی بی میدہ بائی بنگئی۔ میدہ بائی کو راجہ سالم سنگھ سے ایک لڑکی مہتاب بائی بی تولد ہوئی اور راجہ کی پہلی بیوی نے اس پر جادو کرانا شروع کردیا۔ چنانچہ میدہ بائی شدید علالت کے بعد مرتے مرتے بچی۔ اور اس کے بعد اس کی ماں نے انتقال کیا۔ چونکہ میدہ بی بی راجہ کی بیوی سے سہمی ہوئی تھی اور اُسے خوف تھا کہ کہیں رانی جادو وغیرہ کرکے مار نہ ڈالے اس لئے اپنی بہنوں اور چند بھگتنیوں کے ساتھ اس نے دیولیہ چھوڑ کر مالوہ کا رُخ کیا۔ یہاں کچھ ایسی بے ترتیبی ہوئی کہ اس کے دونوں بھائی غلام حسین اور غلام محمد اس سے جُدا ہو گئے۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں سنہ ۱۱۶۱ھ میں برہان پور پہنچ گئی۔ نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر برہان پور میں مقیم تھے لشکر دکن بھی تھا امراء و رؤسا سب موجود تھے یہاں بھگتیوں کے مشورے سے نام بدلے گئے اور میدہ بی بی، راج کنور بائی، نور بی بی، برج کنور بائی بولن بائی، بولن کنور بائی اور مہتاب بائی، مہتاب کنور بائی بن گئیں۔

نواب لسالت خاں بہادر بخشی فوج کی نظر انتخاب نے راج کنور بائی کو تاکا اس سے شادی کرلی۔ لشکر کیساتھ یہ گروہ" حیدرآباد دکن آرہا اور احتشام جنگ رکن الدولہ بہادر نے مہتاب کنور بائی کو اپنے عقد نکاح میں لیکر "صاحب جی صاحبہ" خطاب دیا اور یہ "عورت" مدار المہام دکن کی منکوحہ ہوگئی۔

راج کنور بائی کے بطن سے ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۱۸۱ھ کو حیدرآباد میں چندا بی بی تولد ہوئی منشی غلام صمدانی لکھتے ہیں کہ "تولد کے وقت دفعتاً ایسی روشنی ہوئی کہ حجرہ منور ہوگیا"[۱]۔

نواب لسالت خاں نے دل بھر کر چاؤ چونچلے کئے چھٹی اور چلہ بڑی دھوم سے کیا اور مہتاب کنور بائی "صاحب جی صاحبہ" نے چندا بی بی کو لاولدی کی وجہ سے گود میں لے لیا۔ چندا کی پرورش ایوان وزارت میں ہوئی اور اعلے پیمانہ پر تعلیم و تربیت دلائی گئی۔ حضرت غفران مآب آصف جاہ ثانی کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ چنانچہ سفر کولاس سنہ ۱۱۹۶ھ، میں معرکۂ نرمل سنہ ۱۱۹۷ھ میں اور مہم پانگل سنہ ۱۲۱۱ھ میں حضور والا نے چندا بی بی کو ساتھ رکھا تھا، آخر الذکر مہم سے فراغت پاکر دار الخلافہ کو مراجعت فرمائی اور جشن فتح آراستہ کیا تو چندا کو "ماہ لقا بائی" خطاب اور نوبت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہر مجرے کے لئے ایک ہزار روپیہ مقرر ہوا۔ نوبت سے بھی معزز فرمایا۔ چنانچہ کسی نے اس کی تاریخ بھی کہی ہے۔

نوید آمد لعالم مہ لقا را ہ   نوازش کرد از نوبت شہنشاہ
ترانہ ساز سالش گفت ناہید   بلند آواز نوبت باد دلخواہ

اس کے بعد فیل و عماری نالکی پالکی اور جاگیر و منصب سے بھی سرفراز ہوئی ماہ لقا بائی نہایت حسین و جمیل تھی ایک تصویر ہمارے ایک کرم فرمانے ہمیں دی ہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ "غضب کی عورت" تھی گو وہ تصویر اس وقت پیشِ نظر نہیں مگر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ سرو سا قد، بھرا ہوا جسم، سُرخ و سپید رنگ، نمایاں خط و خال، ستواں ناک، گول تھوڑی، بھرے بھرے رخسارے، صاف چوڑی پیشانی تنگ دہاں۔ پتلے پتلے ہونٹ بڑی بڑی مخمور آنکھیں گھنی پلکیں، جٹی بھویں۔ چہرے سے بجائے شوخی کے متانت اور تمکنت ہویدا۔

ہند و دکن میں بے شمار طوائفیں گذری ہیں جو رقاصہ اور مطربہ ضرور تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ گرہستی یا اہل خانہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ماہ لقا بائی کا بھی یہی حال تھا گانے بجانے کے لئے وہ امراء و رؤسا کے پاس ضرور جایا کرتی تھی مگر کسی سے ناجائز تعلقات نہ تھے۔ البتہ بعض امراء اس پر بُری طرح مٹے ہوئے تھے، جہاں تک میں نے دیکھا ہے طوائفوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہندو طوائفیں پوجا پاٹ بھی کرتی ہیں اور فاتحہ و نیاز بھی دلاتی ہیں بعض بعض دل چلی تو نمازیں بھی پڑھ لیتی ہیں۔ اسی طرح ماہ لقا بائی کا بھی کوئی مذہب نہ تھا نہ تو وہ شیعہ تھی اور نہ سنی البتہ مسلمان ضرور تھی۔ کوہ مولا[۲] کے عرس میں خاص طور پر حصہ لیتی تھی۔ اس کے ہاں "مجالس حیدری" "مجالس عزاداری" خاص اہتمام سے قائم ہوتی تھیں اور دوسرے کاروبار میں بھی پوری شیعیت کا اظہار کرتی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ

---

[۱] یہی نہیں بلکہ منشی جی نے چندا کی ماں کے کرامات اور خرقِ عادات بھی لکھے ہیں۔ گویا وہ بھی کوئی "رابعۂ عصر" تھی العجب ثم العجب (تمکین)

[۲] حیدرآباد دکن میں اس نام کا ایک عظیم الشان پہاڑ ہے جس پر امیر المومنین علیہ السلام کا چلہ ہے اور شیعہ گروہ اس کا عرس بڑی دہوم دھام سے کرتا ہے۔ حیدرآباد دکن کا یہ میلہ نہایت مشہور ہے۔ (تمکین)

کی مشہور نیاز گیارہویں بھی بڑے ہی خلوص عقیدت اور تزک و احتشام سے کرتی تھی، اور دیگر بزرگانِ اہلِ سنت کی نیازیں بھی دلواتی تھی، نماز کی سخت پابند تھی اور شیعی طریقے پر ادا کرتی تھی ۔ بعد نمازِ فجر تلاوت قرآن اور وظائف کا بھی شغل رہتا تھا ۔ اور پھر تیر اندازی، شہسواری، تلوار، لکڑی، بانک ۔ پٹا وغیرہ کی مشق بھی کرتی تھی ۔ چونکہ خود فارسی اور معمولی عربی جانتی تھی اور علمی ذوق موجود تھا اس لئے شعراء اور علماء کی قدر دانی بھی کرتی تھی ۔ اہلِ علم کا مجمع بھی درِ دولت پر موجود رہتا ۔ کچھ لوگ گلچینیٔ گلشنِ جمال کرتے کچھ روپے پیسے سے دامن بھرتے، حاجت مندوں اور فقیروں کو بھی بہت کچھ ملتا تھا ۔ سادات و مشائخ سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے ۔ کتابوں کا بہت شوق تھا، ایک عمدہ ترین کتب خانہ بھی جمع کر لیا تھا چنانچہ مولف ماہ نامہ نے اپنے وطن بیدر سے آکر اسی کتب خانہ سے فائدہ اٹھایا اور ماہ نامہ ترتیب دیا ۔ لباس نہایت پُر تکلف پہنتی تھی اور پہننا بھی چاہیئے ۔ اوقات کی پابندی بھی مشہور ہے کہتے ہیں کہ بہت پابند وقت تھی ۔ موسیقی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی مگر روزانہ "تعلیم" بھی ہوتی تھی حیدرآباد کے مشہور گوئیے خوشحال خاں اس کے استاد تھے، ماہ لقا کی تین سو کنیزیں تھیں اور تقریباً سب کی سب گانے بجانے والی تھیں، ان میں سے حسن افزا اور حسین لقا بہت مشہور ہوئیں، محبی مولوی ظفریاب خاں نے اپنے مضمون میں حسین لقا کو ماہ لقا کی لڑکی لکھا ہے مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے ماہ لقا کے کوئی لڑکی یا لڑکا نہ تھا ۔

ماہ لقا بائی کے عزت و احترام اور تموّل کا یہ حال تھا کہ آج تک ہندوستان بھر میں نہ تو یہ عزت کسی طوائف کو نصیب ہوئی اور نہ یہ امارت ہی، مواضعات پنپال، سید پلی، حیدر گوڑہ، چندا پیٹہ، پتلے پہاڑ ۔ علی باغ، اڈی میٹہ[۵]، جاگیرات اور مقطع تھے بہ اسقدر سیر حاصل دیہات ہیں ۔ کہ آجکل اگر کسی کو یہ مل جائیں تو آمدنی کے لحاظ سے مہاراجہ اور پھر ہز ہائنس کا خطاب ضرور ہی ملجائیگا ۔ ماہ لقا بائی کی وفات کے بعد اس کی دولت کا جائزہ لیا گیا تو علاوہ باغات مکانات و زیورات کے ایک کروڑ روپیہ نقد برآمد ہوا ۔ یہ روپیہ تجارت سے جمع کیا ہوا نہیں تھا بلکہ فیاضی دریادلی سے خرچ کرنے کے بعد بچ رہا تھا ۔

تعمیر کا شوق بھی ماہ لقا بائی کو بہت تھا چنانچہ زندگی ہی میں اپنا شاندار مقبرہ بنوا لیا تھا ۔ جو اب تک موجود ہے ۔ کوہ مولا پر پختہ دالان بھی اسی کی یادگار اور عرس کوہ شریف کے تماشبینوں کے لئے موجب آسائش ہے وہیں گذرگاہ پر حوض بھی ابتک موجود ہے کسی نے اسی حوض کی تاریخ بھی تھی ۔

انتخاب زمانہ ماہ لقا   درجہاں شد بکار خیر کفیل
سال ایں چشمہ خضر گفت ہمیں   یاد جاری بہ آب فیض سبیل

کمان ایلچی بیگ کی شاندار حویلی بھی اسی نے بنوائی تھی ۔ ایک مسجد بھی اس جگہ بنوائی تھی ۔ جس کی یہ تاریخ مشہور ہے ۔

چو محرابش سجودِ خاص و عام است   فلک گفتا کہ ایں بیت الحرام ست

حضور بندگان عالی ماہ لقا بائی کی بہت عزت کرتے تھے ۔ اور بے انتہا پسند فرماتے تھے ۔ چنانچہ حضرتِ مغفرت منزل فرمایا کرتے تھے کہ

"مانند ماہ لقا بائی دیگری بہ ایں کمالات پیدا شدن مشکل است"

حضور نے اکثر مقامات کے سفر میں ہمراہ رکاب رکھا تھا، کوئی مجلس یا بزم طرب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں ماہ لقا بائی حاضر نہ ہو ۔ سیر و شکار میں بھی ساتھ ہی ساتھ رکھا کرتے تھے ۔ حضور بندگان عالی کے ہاتھی کے پیچھے دوسرا ہاتھی ماہ لقا بائی کا ہوا کرتا تھا ۔

نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر مدار المہام بھی بہت چاہتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے ۔ عموماً ان کے بزم نشاط کی رونق بھی یہی ہوتی تھی میر عالم بہادر تو بُری طرح مٹے ہوئے تھے ۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ

"جلیس باتمیزے بہ ایں حدّتِ طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا بائی کم دیدہ شد"

ایک سراپا بھی تحریر فرمایا تھا جس میں سوا دو سو ابیات ہیں چنانچہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ۔ دیکھئے لفظ لفظ سے بے قراری ظاہر ہے ۔

اے ماہ سپہر آشنائی   از سرتاپا تو دل ربائی
اے مردمِ دیدۂ محبت   سرتا قدمت طلسمِ الفت
اے ماہ لقائے ماہ پیکر   دے ماہ جبیں و ماہ منظر
اے مہ رخ و ماہ طلعتِ من   اے طلعت تو صداقتِ من
بردہ و ہشت ز ساحر بہا   تیرنگ گرد ز ساحر بہائے
درچاہِ ذمن بہ سحر کامل   آتش کدہ گشت شہر بابل
بازوئے تو محو کشتن سوئے عشق   بازوئے تو زور بازوئے عشق
از جلوۂ آں کفِ نگاریں   باشد اشکم ہمیشہ رنگیں
اے ناز تو فتنۂ زمانہ   اندازِ تو فتنہ را بہانہ
اے روئے تو رشکِ ماہ و خورشید   آغوش تو صبح زار امید
از عکس رخ تو سینہ یکسر   غرق دریائے آب گوہر
خیر نامہ کمر نشاں نہ پیوند   خیر آنکہ بہ قتل من کمر بند

۵ جو آجکل "اڈک میٹ" کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اب جامعہ عثمانیہ کی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی ہے ۔ (تمکین)

سرحلقۂ حیائے دانش آرا — ازموئے میان لست تاپا
اے حسن تو در جہاں فسانہ — دل گرمئی عشق را بہانہ
ابروئے تو می کند کمان ساز — چشمت بہ نگاہ ناوک انداز
پنہاں پنہاں بگوش آں ماہ — القصہ بگو و قصہ کوتاہ

نواب میر عالم بہادر کا ایک والہانہ خط ماہ لقا کے نام لکھا ہوُا ایک خاتون نے ہمیں دیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ کئی دنوں کی تلاش کے باوجود نہیں مل رہا ہے۔ یہ خط کسی تحفہ کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور نواب صاحب نے دل کھول کر اظہارِ الفت کیا تھا۔

مہاراجہ چندو لال بہادر بھی ماہ لقا بائی کو بہت پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ اپنے دربار میں بیٹھنے کے لئے مسند مرحمت فرمائی تھی۔ جب شاہ و وزیر مدار المہام اور پیشکار کا یہ حال ہو تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اور امراء و رؤسا کسقدر عزت و احترام نہ کرتے ہونگے۔

ماہ لقا بائی نے ساٹھ برس کے سن میں ۱۲۴۰ھ میں ہیضہ سے انتقال کیا۔ اور حیدر آباد سے ۶ میل کے فاصلہ پر کوہ مولا کے دامن میں اپنے بنائے ہوئے مقبرے میں جس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوُا تھا۔ مدفون ہوئی۔ مزار پر قطعۂ تاریخ کندہ ہے جس کا مادہ ہے۔

راہئی جنت شدہ ماہ لقائے دکن

ماہ لقا بائی کے مقبرے کے عرس کے لئے سالانہ پانچسو روپیہ اور عاشور خانے کے لئے سالانہ ایک سو روپیہ شاید اب تک جاری ہے۔

ماہ لقا بائی کے انتقال کے بعد لاولدی کی وجہ سے اس کا مکان وغیرہ سرکاری نگرانی میں لے لیا گیا۔ جاگیرات ضبط کر لی گئیں۔ اس کے متعلقین میں سے نائکاؤں کو فی نائکہ دس روپیہ ماہوار اور فی کنیز پانچ روپیہ ماہوار اور خانہ زادوں کو فی نفر سات روپیہ ماہوار تنخواہ اجرا ہوئی۔ ۱۲۴۲ھ میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے حسن افزا اور حسین لقا بائی کو ماہ لقا بائی کی وارث قرار دیکر مکانات زیورات وغیرہ زیورات مرحمت فرما دئے۔ اور جاگیرات بھی دونوں کے نام پر بحال فرمائی گئیں۔ اسٹیشن حیدر آباد (بڑی لائن) کے قریب محلہ نامپلی میں حسین لقا کا ایک باغ اور مکان اب تک موجود ہے اور محلہ لنگم پلی میں حسن افزا کا مکان اور باغ بھی باقی ہے۔

حسن افزا نے بھی بہت سی لڑکیاں پال رکھی تھیں جن میں سے نگینہ بائی کامنی بائی، سالو بائی مشہور ہوئیں۔

ماہ لقا بائی نہایت طبیعت دار زندہ دل تھی اور یہی زندہ دلی موزونی طبع کی صورت میں اس کی شاعری ثابت ہوئی حیدر آباد کے مشہور شاعر شیر محمد خاں ایمان کو اپنا کلام دکھلاتی تھی ۱۲۱۳ھ میں دیوان ترتیب دیا جسمیں (۱۲۵) غزلیات ہیں اور ہر ایک غزل پانچ پانچ شعر کی ہے نہ صرف پنجتن کے نام کے پانچ شعر کہے ہیں بلکہ تمام غزلوں کے مقطعے منقبت میں ہیں۔

کہتے ہیں کہ ضلع جگت مٹھکڑ حاضر جوابی لطیفہ گوئی میں بھی وہ آپ اپنی نظیر تھی سینکڑوں لطیفے اس کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک دفعہ ماہ لقا بائی پالکی میں بیٹھی ہوئی جا رہی تھی نہ جانے خاص دان الٹ گیا یا کیا ہوُا کہ چونے کی سنہری ڈبّی لڑھک کر نیچے گر گئی۔ ایک صاحب جو قریب سے جا رہے تھے مسکرا کر کہنے لگے "بائی جی! انڈا گرا" ماہ لقا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کیا خوب گرتے ہی بانگ دینے لگا"

اب ہم دیوان چندا سے خاص خاص اشعار نقل کرتے ہیں۔ مقطع کے متعلق ہم نے قبل ازیں لکھا ہے کہ عموماً منقبت میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند مقطعے نقل کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ چندا محبت امیر علیہ السلام والفت اہل بیت میں کسقدر ڈوبی ہوئی تھی۔ ؎

یا علی قلزمِ خونخوار ہے دنیا مشہور — کہا وے چندا نہ کبھی اسکے بھنور میں غوطہ
روشن رکھو جہاں میں مولا مثالِ مہر — چندا کے منہ سے نور کو تم دُور مت کرد
کنیزی سے ہے مرتضیٰ کی میسّر — جو چندا پہ لطفِ اتم دیکھتے ہیں
عمر بھر یوں رہے حسن کا جلوہ چندا — آرزو رکھتے ہیں یہ حیدر کرار سے ہم
ہے گلشن نجف میں نیرے ہاتھ یا علیؑ — چندا سی عندلیبِ غزلخواں کی احتیاط

حضرت امیر سے استمداد بھی چاہتی ہے تو اس انداز سے کہ جی لوٹ جاتا ہے، دیکھئے۔ ؎

یہی امید ہے چندا کو خوبرویوں میں — رکھے ہمیشہ تیرا یا علی کرم گستاخ
چندا کے خیر خواہ کو عزت ہو یا علیؑ! — اس کا سدا رہے سرِ بدخواہ سوئے تیغ
گرمی وہ ہو وے حسن میں چندا کے یا علیؑ — جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق
گنجِ کرم سے بخشئے چندا کو اس قدر — مولا نہ ہو وے پھر کبھی زردار کی تلاش

اب ذرا غزل کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، مطلع دیوان اور پہلی غزل یہ ہے۔

کہاں طاقت ہے راہِ حمد میں جو ہو زباں گویا — کہ یاں جز عجز و خاموشی نہیں ہے اک جہاں گویا
نہ ہو نعتِ محمدؐ میں کسی سے محفل آرائی — بجا رکھ ہرزہ گوئی سے زبانکو شمع ساں گویا
ثنائے راہ ہرگز نہ پہونچے پائے قاصد کو — چلا اس دشت میں سر سے اگر پیر و جواں گویا
رسائی کب ہے اندیشہ کو یاں جز نارسائی کے — زباں کو بند رکھ اشک گہر ہو وے رواں گویا

بجز حق کے کوئی کب واصفِ وصفِ ائمہ ہے؟
رہا چندا فلک پر بھی یہی نکتہ نہاں گویا

دیگر

اے حضرتِ دل! کیجئے نہ آہنگ خرابات — کچھ ان دنوں بگڑا ہے بہت رنگ خرابات

یوں اسکے مرے نشہ میں ہے صلح کا عالم   جسطرح کہ مستوں میں ہے جنگ خرابات
انگور کا دانا ہے ہر اک آبلۂ پا   طے ہوتے ہیں کس لطف سے فرسنگ خرابات
غش کھاتے ہے جی سنتے ہی لہرائے ہے دل بھی
بجتی ہے عجب لے سے نَے وچنگ خرابات

یا ساقی کوثر یہی چندا کی دعا ہے
یہ دور رہے اس سے جو ہو تنگ خرابات

دیگر

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے   ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے
کبھی صیاد کا کھٹکا ہے کبھی خوف خزاں   بلبل اب جان ہتھیلی پہ لئے بیٹھی ہے
تیر و تلوار سے بڑھ کر ہے تیری ترچھی نگہ   سیکڑوں عاشقوں کا خون کئے بیٹھی ہے
تیرے رخسار سے تشبیہ اُسے دوں کیونکر   شمع تو چربی کو آنکھوں میں دئے بیٹھی ہے

تشنہ لب کیوں رہے اے ساقی کوثر ا چندا
یہ تیرے جام محبت کو پئے بیٹھی ہے

دیگر

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے   دل تو جاتا ہی رہا، اب جان کے لالے پڑے
ہجر میں روتا ہوں تیرے رات دن میں اسقدر   خون سے دل کے بہے جاتے ہیں پر نالے پڑے
چاند سا منہ اپنا دکھلا دے کبھی او گلبدن   سیکڑوں در پر تیرے ہیں دیکھنے والے پڑے
دست اس شانے تجھے یک مو نہیں اس زلف تک   جسکی ہر لٹ میں لٹکتے ہیں سدا کالے پڑے

آئی چندا آپ کے در پر ہے وہ یوں یا علی!
تکمے ہوں الماس کے اور لعل کے بالے پڑے

دیگر

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے   قتل کو پاس سپاہی کے تلوار بھی ہے
کفر و اسلام میں ثابت رہے دل کس پہ بھلا   صاحب سبحہ بھی ہے مالک زنار بھی ہے
گرچہ راحت تیرے ملنے سے ہے سوزش ہے وہی   جس جگہ گل ہے مری جان وہی خار بھی ہے
کچھ سمجھ کر ہی کیا اسنے تملق اے دل!   رحم پر صرف نہ جا اس کے ستمگار بھی ہے

حال دل کس سے یہ چندا کہے ہر مشکل میں
یا علی! تیرے سوا کوئی مددگار بھی ہے؟

ان غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ چندا کی غزل گوئی کا کیا حال تھا یہ غزلیں ہم نے بلا انتخاب سرسری طور پر درج کر دی ہیں - اگر دیوان کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو بہترین شعر ملیں گے -

چندا کے پورے دیوان میں صرف چند مدحیہ شعر ہیں ایک غزل اور چند شعر علیا حضرت بندگان عالی کی مدح میں ہیں دو غزلیں نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کی شان میں اور بس نہ تو چندولال بہادر کی مدح کی ہے اور

نہ کبھی میر عالم کی تعریف ہی کی ہے، کسی اور کا ذکر ہی کیا؟
سدا پلتے ہیں چندا سے ہزاروں جسکے سائے میں
نظام الدولہ و شاہ دکن ہے رستم دوراں

اور یہ بسنتی غزل کسی موسمی جشن کے موقع پر شائد کہی گئی ہے - ۵

بسنت آئی ہے موج رنگ گل ہے جوش صہبا ہے!   خدا کے فضل سے عیش و طرب کی اب کمی کیا ہے؟
بیاں میں کیا کروں اسکے شبستاں کا تعال اللہ   قضا و قدر جس کے جشن کا اب کارفرما ہے
سخاوت میں کوئی ہمسر نہ ہوا اسکا زمانے میں   وہی کرتا ہے پورا جسکے دل میں جو ارادہ ہے
خضر کی عمر ہو اسکی تصدق سے ائمہ کے   نظام الدولہ آصف جاہ جو سب کا مسیحا ہے

یہی خوان کرم سے ہے سدا امید چندا کو
کسی کی بھی نہ ہو محتاج تم سے یہ تمنا ہے

غالباً یہ غزل اُسی بسنت میں ارسطو جاہ[1] بہادر کے لئے کہی گئی ہے -

بہار عیش لیکر باغ میں اب یوں بسنت آئی   کہ بے تکلیف ہے شبنم سے گل کی بادہ پیمائی
ضیاء اسکے لئے آئینہ دار چشم بلبل ہے   ہجوم تو عروسان چمن کی ہے خود آرائی
کسی نے مجھ سے پوچھا ہی یہ چرچا ترم کا کس کی؟   کہا میں نے یہ دی ہے حاتم ثانی نے زیبائی
قدم رستم نہ چومے کیوں کہ میدان شجاعت میں   ازل سے تا ابد مشہور ہے اب جسکی مولائی

دیا جو شرط کھی بخشش کی تسپر بھی ہر اک دم میں
برنگ مہر ہے چندا یہ جس کی جلوہ فرمائی

ایک اور بسنتی غزل میں ارسطو جاہ بہادر کا ذکر بھی کیا ہے، یہ غزل بھی منقولہ بالا غزل کے ساتھ کی معلوم ہوتی ہے -

جب ہوا صحن چمن میں خسرو گل کا گزار   عندلیبوں نے کئے ہر سمت سے مجرا بکار
سنکے یہ آواز خوش دل نے کہا مجھ سے کہ اُٹھ   چل بسنتی پوش ہو کر تو بھی اب دیکھیں بہار
الغرض پہنچا ہے اس جشن فریدوں فر تلک   مسند آرا اس جگہ دیکھا امیر نامدار
وہ نتیجہ ہے کئے[2] و خسرو جس کے روبرو   رعب سے نام سخاوت سے نہ حاتم زینہار

مدعا چندا کا ہے اب یہ ارسطو جاہ سے
فیل و زر بخشش تو کی جاگیر کا بھی ہو شمار

ایک اور غزل میں بھی ارسطو جاہ کی منزلت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے - جس کا ایک شعر دیکھئے -

---

[1] ارسطو جاہ نواب اعظم الامراء بہادر دیوان دکن - تاریخ سرفرازی دیوانی ارشوال ۱۱۹۵ھ م ۳۰ ستمبر ۱۷۸۱ء وفات ۲۸ محرم ۱۲۱۹ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۰۴ء مدت دیوانی (۲۴) سال،

[2] نواب ارسطو جاہ بہادر کیانی النسل تھے اس شعر میں "نتیجہ کے خسرو" سے مراد شائد وہی خاندانی سلسلہ ہے -

(تمکین)

ارسطو جاہ وہ فرخ نژادِ اہلِ عالم ہے
کہ جسکے فیض وبخشش کا جہاں میں ہے علم برپا

یہ صرف وہ شعر تھے جو منقبت یا مدح میں کہے گئے۔ اب ذرا متفرق شعر بھی سُن لیجئے۔

نازِ چندا کو نہ ہو کیوں نوجوانی پر فلک
جس کو ہر دم ہے بھروسا مرتضےٰ سے پیر کا

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا

چندا کے دیکھنے کی جو خواہش کرے کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں وہ عزو جاہ کا

ہوا ہے اس طرح زندانِ غم میں گھُل کے کاہیدہ
ترے مجنوں پہ خنداں حلقۂ زنجیر ہوتا ہے

اٹھانا جور بے حاصل جو ایسا ہی مقدر تھا
مجھے تنہا ہی رہنا آپکے ملنے سے بہتر تھا

آیا نہ ایک دن بھی تو وعدے پہ رات کو
اچھا کیا سلوک تغافل شعار! خوب!!

آگے تھے یک فسانے پہ چڑیا کے ہم سے خوش
کرنے لگے ہو اب تو سوال و جواب خوب

پھر لَو لگی ہے مجھ کو کس شمع رُو کی ہے ہے
دل اندنوں رہے ہے کچھ بے قرار ہر شب

نہیں ہے زُلف کی لٹ اُس رُخ معّرق پہ
یہ اوس چاٹنے نکلا ہے ماہتاب میں سانپ

روبرو چندا کے ہووے کیا عجب
مشتری و زہرہ و پروین کو مات

نہیں ہے کچھ میرا نقصان گو غیروں کے ملنے سے
نہیں ملتے ہو مجھ سے کیا سبب کیا وجہ کیا باعث

دل میں میرے پھر خیال آتا ہے آج
کوئی دل بر بے مثال آتا ہے آج

ہوئے خیالات میں اب تک نہ تیرے ہم گستاخ
خدا کے واسطے ہم سے نہ ہو صنم گستاخ

اب مژدہ بہار آنے کا سنتے ہی قفس میں
تڑپا یہ کہ کچھ بال و پر اپنے نہ رکھا صیاد

جو پوچھے ہجر کی حالت مری وہ بے وفا ہنسکر
تصدق ہو کے کہ باآہِ سرد و چشم تر قاصد

آئینہ سکندر کا نہیں دل کے برابر
ظالم نہ سمجھنا کہ ہے یہ سِل کے برابر

ہے صراحی غنچہ ساغر گل ہے صحن باغ میں
بادِ ساقی ہو برستا ہو وے ابر نو بہار

کوہکن پہ بھی کیا جور مگر شیریں نے
تو نے اس طرح کیا ہے مجھے بیزار کہ بس

اشارہ پھر اسی ابرو سے چاہے ہو یہ دل میرا
کہ جس چشم سیہ نے سیکڑوں کے پل میں گھر گھالے
کہاں سمجھائے سے سمجھے ہے ناداں قدر تو دل کی
نہ تو جب تک پڑے ظالم کسی بے درد کے پالے

گر دام سے اپنے ہمیں آزاد کرو گے!
پھر کس سے یہ کنج قفس آباد کرو گے؟
ناشاد کئی دل ہیں نہ ملنے سے تمہارے!
ایسا بھی کبھی ہوگا انہیں شاد کروگے

رہی ہے ہم کو کیفیت سے اُن آنکھوں کی خونباری
چمن میں منت ساقی سے گذرے جام سے گذرے
رُخ و گیسو و خال و طاقِ آبرو دیکھ کر اس کے
نماز و روزہ و تسبیح صبح و شام سے گذرے

داغ کا مطلوب بھی مٹھی میں دل لئے جاتا ہے اور چندا کا محبوب بھی ہتھیلی میں چھپا کر لے بھاگتا ہے۔

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی (داغ)

تقریباً یہی مضمون چندا بھی باندھتی ہے ؎

گر مرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم
کھول دے بند ہتھیلی کو دکھا ہاتھوں کو؟

چندا کے استاد شیر محمد خاں ایمان نہایت پُرگو اور اچھے خاصے شاعر تھے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے ایسے استاد اور ایسی شاگرد کو رکاوٹ کیا تھی ایمان نے ایمانداری سے مشورہ دیا۔ اور چندا نے بھی خوب جی کھول کر فکر سخن کی، یوں تو چندا کے بعد سے سیکڑوں عورتوں نے شاعری کی اور اب تو بلا مبالغہ اردو شعر کہنے والی عورتیں اتنی ہی کثرت سے پیدا ہو گئی ہیں جتنے کہ ادبی اور علمی رسائل ہندوستان میں شایع ہوتے ہیں۔ مگر چندا نے جو بات پیدا کی وہ کسی کو نہ ہوئی۔

دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا
اللہ بس

ماخذ

۱۔ دیوان ماہ لقا چندا قلمی موجودہ کتب خانہ آصفیہ ۳۲۸/ن ن
۲۔ تاریخ ماہ نامہ قلمی مولفہ غلام حسین خاں جوہر آصفیہ ۱۸۲/ن ن
۳۔ تاریخ گلزار آصفیہ " " مطبوعہ صفحہ ۷۲۳
۴۔ حیات ماہ لقا، مولفہ غلام صمدانی گوہر مطبوعہ صفحہ ۶۳۹
۵۔ گلزار ماہ لقا " " " " " "
۶۔ طبقات الشعراء ہند مولفہ منشی کریم الدین مطبوعہ صفحہ ۳۲۶ و ۳۲۷۔
۷۔ دکن میں اردو مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ صفحہ ۳۳۱
۸۔ تذکرۃ النساء نادری مولفہ درگا پرشاد مطبوعہ صفحہ ۱۸۲ و ۱۸۴ تا ۱۸۴
۹۔ بہارستان ناز مولفہ فصیح الدین رنج " " ۳۸
۱۰۔ ماہ درخشاں مولفہ حکیم قاسم مطبوعہ " ۱۵ و ۱۶
۱۱۔ رسالہ نیرنگ رامپور بابت جون و جولائی ۱۹۲۹ء مضمون تمکین کاظمی صفحہ ۳۳ تا ۴۳ و ۳ تا ۱۰
۱۲۔ شمیم سخن، مولفہ عبدالحی صاحب صفا، مطبوعہ صفحہ ۸ و ۹
۱۳۔ تذکرۃ الخواتین مولفہ عبدالباری آسی " " ۲۵۴ و ۱۸۶ و ۲۵۴
۱۴۔ مشاہیر النسواں مولفہ منشی فاضل محمد عباس بی۔ اے مطبوعہ صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۲
۱۵۔ قاموس المشاہیر مرتبہ نظامی پریس بدایوں جلد اول " ۱۹۰
۱۶۔ سخن الشعراء ——— مطبوعہ صفحہ ۳۷۵
۱۷۔ حدیقۂ عشرت، مولفہ درگا پرشاد مہر مطبوعہ صفحہ ۵۳ و ۵۴
۱۸۔ رسالہ تحفہ مرتبہ انجمن ارباب اردو سرور نگر بابتہ صفر ۱۳۴۷ھ مضمون مولوی ظفر یاب خاں صفحہ ۷۱ تا ۷۸
۱۹۔ رسالہ انقلاب لاہور بابتہ دسمبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۷۵ مضمون کاظمہ بیگم صاحبہ۔
۲۰۔ جنتری مطابقت سنین و کیفیت وزرائے دکن وغیرہ مرتبہ مولوی ناظم علی قلمی۔

تمکین کاظمی

رباعی

ہے اتنی غرض دہر کے افسانے کی
جو کچھ کر، صاف کر، بدی یا نیکی
ہوشیار کہ زندگی دو روزہ ہے رواں
نکلی ہوئی جان پھر نہیں آنے کی

رواں
ایم۔ اے

سمندر کی بُوندوں کا جشن

ایک بڑی خلیج کے کنارے جو سبزے سے زمرّد کا تختہ بنا ہُوا تھا۔ اور خلیج آنکھ کی طرح فضاء لامتناہی کی طرف کھُلی ہوئی تھی۔ اسی کے قریب لکڑی اور لوہے سے بنی ہوئی ایک بھُول بھُلیاں تھی جس میں ہر دم ایک شور و غوغا مچا رہتا تھا۔ اور جہاں رات دن سیاہ نقطوں کے غول (انسان) گردش کرتے تھے۔

ایک دن صبح کو ان نقطوں میں سے ایک نیچے اُتر کر آیا اور سمندر کی طرف مُنہ کر کے ریت پر بیٹھ گیا۔ سمندر اس وقت ساکن تھا۔ آسمان بھی صاف اور خنداں تھا۔ موسم بہار کا آفتاب بھی اپنی چمک دمک دکھا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے سبزے اور پھولوں سے آراستہ تھے۔ نو بہار فضائے لامتناہی سے فرحت بخش نکہت لا رہی تھی۔ اس آدمی نے اس شاندار منظر پر ایک نگاہ ڈالی۔ آہستہ آہستہ ایک لہر اس کے پیروں تک آئی اور ایک سُریلی آواز کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر قریب آئی اور پیچھے ہٹی تو ایک ننھی سی بوند نے عجیب پیاری زبان میں تقریر شروع کی:-

میں تمہاری ننھی بہن ہوں۔ میرے عزیز تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم میرے بھائی ہو۔ سنو! میں یہاں سے بہت دور پیدا ہوئی ہوں۔ بہت ہی دور نشیبوں میں چٹانوں کے اندر جہاں نہ انسان نظر آتے ہیں نہ پرندے۔ وہاں دفعتاً ایک سُورج کی شعاع داخل ہوگئی۔ اس کے ساتھ میں کھیلتی رہتی اور اس کی دلچسپی کے لئے میں "قوس قزح" کے سات سات رنگوں سے اپنی آرائش کرتی۔ روزانہ صبح کو اس سے ملا کرتی اور شام کو جس طرح ایک سہیلی اپنی پیاری سہیلی کو رخصت کرتی ہے، رخصت کر دیتی۔ ایکدن اس نے مجھ سے فضاء لامتناہی اور روشنی کی دوسری دنیا کا تذکرہ کیا۔ جہاں کی ہر چیز پاک صاف اور آزاد ہے۔ اس نے اپنے سرچشمہ سورج اور پھولوں کا حال بیان کیا۔ اسی وقت سے میرے دل میں ایک نئی حرکت پیدا ہو گئی۔ میں نے اس سے دائمی محبت کا عہد و پیمان کر لیا۔ اور میں نے قسم کھائی کہ میں اس عجیب دنیا کو دیکھنے کے لئے اپنے قید خانے سے بھاگ چلونگی۔ آخر ایک دن بے خود ہو کر اس کے ساتھ ایک بھاؤ میں کود پڑی۔ میرے پیچھے میری بہنیں بھی کود پڑیں۔ سب میری طرح آزادی کی پیاسی تھیں۔ اور بیحد خوش تھیں کہ اب ہماری ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ لیکن ہماری یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔

...... "بوند" یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک لہر نے اُس کی پیاری آواز بند کر دی۔ آدمی نے اپنے دل میں کہا بیشک یہ میری بہن ہے۔ اس کے دماغ میں گذشتہ زمانے کے واقعات تازہ ہو گئے۔ ایسے بچپن کی پیاری باتیں یاد آگئیں جبکہ اس نے لامعلوم زندگانی میں پہلا قدم اُٹھایا تھا۔ کن کن چیزوں سے خوشی ہوتی تھی۔ بچپنے کی کیا کیا تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ کس طرح وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بوند نے پھر اپنی آپ بیتی شروع کی۔

ہماری خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ نیچے وادی میں ہمکو کیچڑ اور گھاس میں رُک جانا پڑا۔ یہاں ہم سب اپنی نغمہ سرائی بھول گئیں۔ ہمکو اوپر سے آنیوالی بہنوں کی خوشی کی آواز نے اور بھی غمگین کر دیا۔ ان بیچاریوں کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ ہمارے لئے یہاں ایک عذاب یہ بھی تھا کہ گھونگے مینڈک ہر طرف سے حقارت کے ساتھ ٹرا رہے تھے۔ اس وقت ہم کہہ رہے تھے۔ کہ کاش ہم شام سے پہلے ہی ہوا پر سوار ہو کر یہاں سے روانہ ہو جاتے۔ اور اس عذاب سے چھٹکارا پاتے .... اس وقت گھاس نے آہستہ سے ناصحانہ انداز میں کہا "اے نادان بوندو! چُپ رہو! اور صبر کرو! زندگی صبر ہی کا نام ہے! تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم کو دیکھو کس طرح ایک ہی جگہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تم بھی اسی طرح زندگی گذار دو۔ صبر کرو! شور و واویلا سے کچھ نہیں ہو سکتا"! افسوس وہ کیا جانتے تھے کہ ہم ان کی طرح گھاس نہیں ہیں۔ اور ہمارے دلمیں ہمیشہ جد و جہد کرنے اور زندہ رہنے کا ولولہ ہے۔ آخر ایک روز جب ہماری بے قراری اور بےچینی حد سے بڑھ گئی۔ تو ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس تنگ جگہ سے نکل کر بھاگ جائیں۔

اس موقع پر پھر ایک لہر نے ننھی بوند کی کہانی میں خلل ڈال دیا۔ اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا:- بیشک یہ میری بہن ہے اس کو یاد آیا کہ پہلی مرتبہ گاؤں کی بدتہذیبی اور دہقانیت سے کس طرح میرے

دل میں بیزاری پیدا ہوئی تھی اور میٹرک اپنی ٹراہرٹ سے کسطرح ناک میں دم کئے رہتے تھے۔

اس کو اپنے باپ کا یہ واقعہ بھی یاد آیا کہ وہ اسکو ایک مدت کے لئے مویشی چرانے کی خدمت سپرد کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنے دو ہمعمروں کے ساتھ نزدیک کے شہر میں بھاگ گیا۔ کہ وہاں لکھنا پڑھنا اور کوئی کام سیکھ لے اور اپنی روزی خود پیدا کر سکے۔ اور اگر روزگار نہ بھی ملے تو کوئی پروا نہیں۔ گاؤں میں غلام بنے رہنے سے فاقوں مرجانا اچھا ہے۔ .... یہ سب سمندر کی ننھی بوند کی کہانی سے مشابہ ہے۔

بوند نے پھر اپنی کہانی شروع کی:۔

اس طرح ہم نے اس تنگ جگہ سے بھاگ جانے کی دلمیں ٹھان لی۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ پیچھے ہم کو ہماری اور بہنیں بھی مل گئیں جو ہماری طرح بھاگ کر آئی تھیں۔ ایک چھوٹے سے بہاؤ پر ہم گاتے بجاتے خم دار پہاڑ کے درے میں رواں ہو گئے .... ہمارے راستے میں بہت سے پتھر۔ درخت اور فصیلیں تھیں ...... اگرچہ ہم ان کو توڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن ہم ان پر سے پھسل گئے اور ان کو پھاند گئے اگر پھاند نہ سکے تو ان کا چکر کاٹ کر نکل گئے۔ آخر ہم ایک میدان میں پہنچ گئے۔ وہاں گاؤں اور شہروں نے اپنی گندگیوں سے ہم کو بھی گندا کر دیا اور ہم اپنی پہلی صفائی اور پاکیزگی پر حسرت کرنے لگے لیکن ایک دن ہم کو ایک چیز روشن اور بے پایاں نظر آئی۔ تو ہم اسی طرف بڑھے ہے چلے گئے ....

اب پھر ایک لہر نے کہانی میں خلل ڈالدیا:۔

اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا:۔ بے شک یہ میری بہن ہے۔ اور اس کو گاؤں سے بھاگنے۔ برسوں ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھومنے مشکل سے روٹی دستیاب ہونے اور ذلت و اہانت کے واقعات یاد آ گئے۔ اسکو یہ بھی یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہاں جا کر کیا کرونگا۔ یہاں شہروں میں اگرچہ مشکلات ہیں لیکن یہاں وہ محنت کرتا ہے اس کی عقل روشن ہو گئی ہے۔ زندگی کی جنگ کے لئے اس کا ذہن قوی ہو گیا ہے۔ اب وہ بھولا بھالا دہقانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک مزدور ہے جو سوچتا ہے اور سمجھتا ہے جس طرح سمندر کی ننھی بوند کو کوئی روشن اور بے پایاں چیز نظر آئی تھی* اسی طرح ایک دھندلا لیکن بے خود کرنے والا نصب العین اس کے خیال میں منکشف ہوتا جا رہا تھا۔

"ننھی بوند" نے پھر اپنی تقریر شروع کی:۔

پہلے مجھکو سمندر سے خوف پیدا ہوا۔ اس کی وسعت اور گہرائی دیکھکر میں گھبرا گئی۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہاں میری ہستی فنا ہو جائیگی مجھے آندھی سے بھی ڈر معلوم ہوا۔ لیکن بہت جلد میرا ڈر جاتا رہا۔ میرے ساتھ اور سب بہنیں بھی بےخوف ہو گئیں۔ صاف اور تازہ ہوا اور سورج کی شعاعوں نے جلد مجھ میں تازہ جان پیدا کر دی۔ اور میں اب پھر ویسی ہی پاک صاف ہوں۔ جیسی پہلے کسی زمانے میں تھی.... اب مجھے واپسی کا خیال بھی نہیں آتا .... میری زندگی اب ماضی میں نہیں ہے بلکہ مستقبل میں ہے۔ میں زمین کے کسی ٹکڑے میں نہیں ہوں۔ بلکہ سمندر میں ہوں۔ یہاں میں ایک نازک بوند نہیں ہوں۔ جسکو سرپتی اور کنکری روک دے اور راستے سے ہٹا دے۔ یہاں میں ایک قوت ہوں اور قوت بھی خوفناک کیونکہ میری لاکھوں بہنیں میرے ساتھ ہیں بہت سی چٹانیں ہمنے چکنا چور کر دیں۔ اور آئندہ بھی جو چٹان ہمارے راستے میں حائل ہوگی اس کو پاش پاش کر دینگے۔ ہمارا تھپیڑا انسان کے آہنی گھن سے بھی زیادہ زبردست ہے اگر ہم چاہیں تو پانچوں براعظموں میں داخل ہو جائیں۔ اور پورے کرۂ ارض پر چھا جائیں۔ ہاں ہم عظیم الشان طاقت ہیں۔ ہم سمندر کی ناقابل تسخیر قوت ہیں۔

یہاں ایک لہر نے پھر اس کی جوش بھری تقریر میں خلل ڈالدیا

اس آدمی نے اپنے دلمیں کہا:۔ بیشک یہ میری بہن ہے اور اس کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ میں بھی ایک بڑے تجارتی شہر کو دیکھکر ڈر گیا تھا۔ جہاں میں قفل سازی کے لئے آیا تھا اور رفتہ رفتہ میں مانوس ہو گیا۔ آج میں ۲۵ سالہ قوی جوان ہوں اور اپنے فن میں استاد۔ اب میں بھی ایک قوت ہوں۔ یہاں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ ہمارے ہزاروں ہم پیشہ موجود ہیں۔ ہم سب ایک قوت ہیں اور جب ہم زندگی میں متحد ہو جائیں گے تو ہم میں ایک نئی جان پڑ جائیگی۔ سمندر کی ننھی بوندوں کی طرح دنیا کے مزدوروں کا اتحاد بھی ایک طوفان ہے۔

سمندر کی ننھی بوند نے پھر اپنی کہانی شروع کی:۔

سال میں ایک دفعہ جب آسمان صاف اور خنداں ہوتا ہے۔ جب موسم بہار کا آفتاب اپنی چمک دمک دکھلاتا ہے۔ جب سمندر کے کنارے سبزے اور پھولوں سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم باہمی اتحاد اور قوت کا جشن مناتے ہیں۔ اس دن ہم اپنے

ماضی کی یاد اور اپنے مستقبل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

"میرے بھائی آج وہی دن ہے"

اس آدمی کے دل میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ مزدوروں کا جلوس چیونٹیوں کی قطار کی طرح شہر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ فضا میں ایک شاندار ترانہ بلند ہوا ہر لمحہ جشن منانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ شہر کے راستے گرد و نواح کھیت، میدان اور تمام دنیا انہی سے بھر گئی .... ان کی تعداد سمندر کی بوندوں کی طرح لاتعداد تھی اور سمندر کے ترانے کی طرح ان کا ترانہ بھی زور اور قوت سے بھرا ہوا تھا۔

آج تقریباً ساری دنیا کے معاملات کی باگ انہی مزدوروں کے ہاتھ میں ہے۔

فاطمہ بیگم انصاری

اُڑتی چڑیا سے

خوش باش! مسرت کی دیوی! خوش باش!! آسمان کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی دلی تمناؤں کا مینہ برسائے جا، گائے جا، ہاں وہی گیت سنا جو موسیقی کے کانوں نے اب تک نہیں سنا! چل، اُڑتی چل، ایک شرربار بادل کی طرح زمین سے صعود کر، ہاں آسمان کی نیل گوں فضا میں مشقِ پرواز کئے جا۔ گائے جا، اُڑے جا۔ اُڑے جا، گائے جا!

ارغوانی کرنیں تیری پرواز کے گرد چکر لگا رہی ہیں اور تو اُن میں پوشیدہ ہے۔ جیسے دن کی چمکیلی روشنی میں آسمان کا تارا۔ لیکن میں تیرا گیت اب بھی مسلسل سن رہا ہوں! جیسے تاروں کی تیز کرنیں صبحِ صادق کے نور میں تحلیل ہو کر ستارۂ صبح کو نقاب پوش بنا دیتی ہیں ویسے ہی تو صرف میری نظروں سے پنہاں ہے۔ غیر محسوس ہرگز نہیں کیونکہ تیری میٹھی راگنیاں تیری کرنیں ہیں!

صحنِ زمین اور فضائے آسمان میں تیری رس بھری موسیقی کی لہریں کیا ہیں۔ گویا ایک برہنہ رات میں کسی تنہا اور خاموش بادل سے چاندنی کی پھوار پڑ رہی ہے اور آسمان کی کشتی اُس پر تیر رہی ہے!

میں نہیں جانتا کہ تو کیا ہے، کون ہے اور کس چیز سے زیادہ مشابہ ہے؟! رنگین بادلوں سے اتنے چمکدار قطرے ہرگز نہیں ٹپکتے جتنی بلوریں اور خوش الحان بارش تیرے نورانی پروں سے ہو رہی ہے! اچھا، گائے جا، اُس خود فراموش شاعر کی طرح جو اپنے خیالات کے روشن پردوں میں چھپ گیا ہو۔ نئے نئے ترانے گائے جا، گائے جا۔ اس وقت تک کہ دنیا ایک مبہم سی امید و بیم کے ساتھ عالمگیر ہمدردی کا کاشانہ بن جائے!

تو ایک معصوم دوشیزہ ہے جو اپنے فلک نما محل پر سکتے کے عالم میں بیٹھی محبت کی میٹھی اور رسیلی راگنیوں سے اپنا دل بہلا رہی ہو۔ تو ایک سنہرا جگنو ہے۔ جو کسی شبنم پاش وادی کے سبزے میں چپکے چپکے اپنے پروں سے ہلکا ہلکا گلال اُڑا رہا ہو اور خود اس میں رل مل کر نظروں سے پنہاں ہو گیا ہو! تو گلاب کا ایک پھول ہے جو اپنی دھانی کونپلوں کی سیج پر سو رہا ہو۔ جس کی خوشبو ہوا کے جھونکے چرا اُڑا کر لے گئے ہوں اور پھر مست ہو کر بادہ خواروں کی طرح لڑکھڑا کر گرے پڑتے ہوں! زعفران زاروں میں ترنم ریز چڑیوں کی جھنکار، مرغزاروں میں موسیقی نوش پرندوں کی چہکار ——— بہار پر بہار ——— تیری نغمہ سنجی ان سب چیزوں سے زیادہ رسیلی اور نازک ہے! ہاں، ہاں، گائے جا، گائے جا!

ننھی سی چڑیا! ——— پریم کی دیوی! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے بھی اپنا راز داں بنا لے۔ میں نے محبت اور شراب کی تعریف بارہا سنی ہے۔ لیکن امنگوں کا ایسا بے دریغ سیلاب میرے عمیق قلب سے کبھی نہیں اٹھا جیسا کہ آج تیرے طوفان خیز راگوں نے برپا کر دیا ہے!

شادی کے گیت جلنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ فتح کے ترانے اتنے ہی تمکین اور چٹکیلے، لیکن جب ان سے تیری موسیقی کا موازنہ کرتا ہوں تو ان میں ایک غیر محسوس سی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے! نام؟ اس چیز کا نام مجھ سے نہیں لیا جاتا!! اچھا تو خود ہی بتا کہ تیرے اس ساحر گیت کا سرچشمہ کیا ہے؟ ——— میدان ہے؟ دریا ہے؟ پہاڑ ہے؟ آخر کیا ہے؟ کیا آسمان و زمین کا کوئی خاص سماں ہے؟ یہ بھی نہیں تو کیا پھر خدا کی طرح پاک اور نورانی محبت ہے؟! بتا، جلد بتا، وہ کیا چیز ہے؟

تیری خالص مسرتیں الائش و آمیزش کا نام نہیں، تکلیف کا سایہ تیرے قریب نہیں آسکتا! تُو نے محبت کا اصلی روپ نہیں دیکھا! رعنائیاں دیکھیں، اَلم نصیب ادائیں کیوں دیکھتی، اور قاتل نگاہوں کا شکار کس دل کو بناتی؟!

آہ! ہم ناگفتہ بہ ماضی اور ناگفتنی مستقبل کا تردد ہماری قسمت ہے! ہمارا کوئی ترانہ سکھ، دکھ کی چاشنی سے خالی نہیں! ہمارے سب سے زیادہ شیریں گیت وہی ہیں جو سب سے زیادہ دُکھ بھری واردات کی داستان سنائیں! ہاں چل، ٹھہر نہیں، گائے جا!

مگر اے میری موسیقار چڑیا! اگر میں ایسا آفت پرست کلیجہ لے کر پیدا نہ ہوتا، اگر میرا دل جو یائے غم نہ ہوتا۔ اگر میری آنکھیں آنسو بہانا نہ جانتیں تو پھر تو ہی بتا کہ تیرے یہ فتنہ انگیز گیت کون سنتا؟!

تیری زمزمہ ریزی میرے لئے تو اس دولت سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے جو زمین کے سینے میں محفوظ ہے، بلکہ ان شہوار موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے جن کی لڑیاں کتابوں کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں! ہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے ——— میرے خانہ بدوش قلب کے لئے تنہا مایۂ مسرت و شادمانی ہے! کاش تو مجھے بھی اپنی خالص مسرت کا ایک جام پلا دیتی! ہائے، پھر کیا ہوتا؟ کچھ ایسی نشیلی باتیں میرے لبوں سے ٹپکتیں کہ دنیا مخمور ہو جاتی ——— مجبور ہو جاتی! اسی طرح مجبور ہو جاتی جس طرح میں تیرے لئے مجبور ہوا ہوں! چل اُڑتی چل، گائے جا، محبت ——— مسرت ——— محبت کا مینہ برسائے جا!

تمکین رامپوری

فطرت میں ہے شانِ خودنمائی

وہ دیکھ اُفق ہُوا فروزاں — آثارِ سحر ہوئے نمایاں
تاریکیٔ شب ہوئی ہے روپوش — خورشید ہے نور سے ہم آغوش
تازہ ہوا شورِ سازِ ہستی — وہ نغمۂ دل نوازِ ہستی
دریاؤں میں آ گیا تلاطم — لہروں میں پڑی ہے شورشِ قم
گلزار کی خوشنما فضا دیکھ — اشجار کی دل رُبا ادا دیکھ
عُریاں ہے جمالِ دشت و صحرا — آزاد خرام ہے صبا کا
دل چھین رہی ہے ہر کلی کا — نرگس کی نگاہِ بے محابا
آغوش کُشا کلی کلی ہے — ہر گل میں خلشِ نمود کی ہے
قدرت ہوئی بے نقاب یکسر — اک جلوہ ہے بے حجاب یکسر

ہر ذرہ ہے محوِ جلوہ زائی
فطرت میں ہے شانِ خودنمائی

اب تو بھی نقاب کو اُٹھا دے — پردے کو حجاب کو اُٹھا دے

تبسم

موجودہ بنگالی علم و ادب کی تاریخ

موجودہ بنگالی لٹریچر کا زمانہ انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اصل مضمون کے مطالعہ سے پہلے انیسویں صدی میں بنگال کے سوشل حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے پہلے میں اسے مختصر طور پر بیان کر دیتا ہوں۔

راجہ رام موہن رائے اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں برھمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے بنگال کے سب سے مشہور آدمی تھے۔ سوسائٹی کے لئے اُنہوں نے جو تحریک شروع کی تھی۔ اسی کا نتیجہ برھمو سماج ہے۔ اس تحریک کے ذریعے انیسویں صدی کی ابتدا میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ سوسائٹی اور مذہب کی خدمت کے ساتھ ساتھ قوم کی ہر قسم کی اصلاح کو بھی اُنہوں نے مدِّنظر رکھا تھا۔ بنگالی زبان اور لٹریچر بھی انکی توجہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ پہلے زمانے میں بنگالی لٹریچر صرف نظم تک محدود تھا۔ لیکن رام موہن رائے نے اس کو نثر کی صورت میں رائج کیا۔ انہوں نے خود بہت سی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ اور نثر میں بھی ان کی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ اس موحد شخص نے ہندو مذہب اور سوسائٹی کی برائیوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے توحید کو قائم کرنا چاہا۔ توحید کی تعلیم کے ذریعے سے انہوں نے بہت سے جوشیلے نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ان میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان سب نے مل کر برھمو سماج کی تحریک کو اتنی شدت کے ساتھ جاری رکھا کہ تمام بنگال میں اس نے ایک طوفان کی طرح اپنا اثر پھیلا دیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا۔ کہ لوگوں کے دلوں میں ایک احساس پیدا ہوا۔ لوگ بیدار ہو گئے۔ اور اپنی اصلاح کے لئے مغربی قوموں کی طرف نظر ڈالنے لگے۔ مغربی لٹریچر کو دیکھ کر ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اپنے لٹریچر کو اپنے فخر کا باعث بنا لیں۔

لٹریچر کی تیاری چونکہ برھمو سماج کی تحریک دراصل ایک مذہبی تحریک تھی۔ اور اس کا مقصد توحید کو قائم کرنا تھا۔ اس لئے راجہ رام موہن رائے اور ان کے پیرووں نے اپنشد کا ترجمہ شروع کیا۔ کیونکہ اپنشد میں توحید کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ بعد میں اور لوگوں نے دیگر مذاہب کی کتابوں کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ گرش چندر سین نے جو ایک مشہور برھمو مبلغ تھے عربی تعلیم حاصل کر کے بنگالی میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ شائع کیا۔ اسی طرح تحریر و تقریر کے ذریعہ سے برھمو مبلغین نے بنگالی لٹریچر کو ترقی دی۔ لیکن نہ صرف مذہبی لٹریچر ہی اُنہوں نے پیدا کیا تھا۔ بلکہ حقیقت میں جس کو لٹریچر کہا جاتا ہے۔ اس کیلئے بھی انہوں نے بنگالی زبان کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ اسی طریق پر انیسویں صدی کا نصف حصہ گذر گیا۔

اس وقت تک بنگالی قوم بڑی حد تک بیدار ہو چکی تھی۔ ایک طرف برھمو سماج کی تحریک اور اس کے ساتھ نوجوانوں کا جوش و خروش اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بنگال میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کی کوشش۔ اسکول اور کالج قائم ہونے لگے طلبہ کو موجودہ زمانے کے علوم سے واقفیت ہوئی۔ کثرت سے اہلِ قلم پیدا ہونے لگے اور بنگالی لٹریچر کی ترقی کے قسم قسم کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ یورپین زبانوں سے ترجمے کئے گئے۔ اور ان کے طرز پر اصل کتابیں بھی بنگالی زبان میں شائع ہوئیں۔

ودیا ساگر انیسویں صدی کے آخری حصے میں کثیر تعداد میں اہلِ قلم پیدا ہوئے ان میں سب سے زیادہ مشہور ایشور چندر ودیا ساگر۔ اکشے چندر دت، بنکم چندر چٹرجی۔ سورنا کماری دیوی۔ مائیکل مدھو سودھن دت۔ ہیم چندر بنرجی۔ گرش چندر گھوش۔ نوین چندر سین تھے۔ ودیا ساگر نے بنگالی لٹریچر میں نثر کو سب سے زیادہ ترقی دی۔ یہ بھی سوشل اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور بڑی دلیری اور اخلاص کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے ہندو بیواؤں کی افسوسناک حالت کو بہت محسوس کیا۔ اور خود سنسکرت زبان اور ہندو شاستر کے عالم ہونے کی وجہ سے شاستروں سے دلیل دے کر ثابت کیا کہ بیواؤں کا دوسرا نکاح جائز ہے۔ انہوں نے شکسپیر کی کومیڈی آف ایررز کا اور سنسکرت شاعر کالی داس کی کتاب ادگیان شکنتلا کا ترجمہ شائع کیا۔ مہابھارت کے کچھ حصے کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا۔ بدھوا بواہ (شادی بیوگان) نام کی مشہور کتاب انہیں کی تصنیف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں انہوں نے لکھی تھیں۔ ہندی بیتال پچیسی کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا تھا۔ بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے انگریزی سے ایسپز فیبلز (حکایات لقمان) کی کہانیوں کو بنگالی طبیعت کے موافق بنا کر کتھا مالا کے نام سے شائع کیا۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے چند کتابیں انہوں نے لکھی تھیں۔ وہ آج تک مکتبوں میں بچوں کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

بنکم چندر چیٹرجی بنکم چندر کلکتہ یونیورسٹی کے ابتدائی گریجوایٹوں میں سے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود بنگالی لٹریچر کی جو خدمت انہوں نے کی ہے۔ بہت کم آدمیوں نے کی ہوگی۔ بنگالی میں بلند پایہ ناولوں کی بنیاد اُنہیں نے رکھی تھی۔ اُنہوں نے اپنی کتابوں میں بڑی حد تک سر والٹر سکاٹ کا طرز اختیار کیا۔ یہاں تک کہ ان کے ناول درگیش نندنی میں سکاٹ کے مشہور ناول آئیون ہو کا پلاٹ ہو بہو ظاہر ہوتا ہے۔ ان کو بنگال کا سکاٹ کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا نقص یہ تھا۔ کہ اپنی تصنیف میں جابجا مسلمانوں پر بے جا حملہ کیا کرتے تھے۔

بنکم چندر کی تصنیفیں صرف ناولوں تک محدود نہیں ہیں۔ وہ بہت بڑے علامہ تھے سنسکرت میں ان کو کافی عبور حاصل تھا۔ اُنہوں نے گیتا کا ترجمہ اور مختصر شرح شائع کی۔ سری کرشن کی مفصل سوانح عمری لکھی جس میں سری کرشن کے زمانہ وغیرہ کے متعلق بڑی عالمانہ کاوش (Research) موجود ہے۔ اور بھی بہت سی کتابیں انہوں نے شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ "بنگا درشن" بھی جاری کیا تھا۔ جو انیسویں صدی کے بنگالی لٹریچر میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔

گریش چندر گھوش پچھلی صدی کے سب سے مشہور ڈرامہ نویس تھے انہوں نے شکسپیر کے چند ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ بنگال میں تھیٹر کا رواج بہت دنوں سے ہے تھیٹروں کی ترقی کے لئے جن لوگوں نے کوشش کی ان میں گریش چندر صفِ اوّل میں ہیں۔ آجکل بنگال کے تھیٹر میں بڑی حد تک یورپ کے تھیٹر کا نظارہ پایا جاتا ہے۔ پہلے بنگالی تھیٹر میں عورت کا پارٹ بچوں سے کرایا جاتا تھا لیکن اب یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ ڈرامے اور تھیٹروں کا اس حیثیت تک پہنچنا۔ گریش چندر کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔

نوین چندر۔ ہیم چندر۔ مدھو سودھن وغیرہ پچھلی صدی کے مشہور شاعروں میں سے تھے۔ اُس عہد کے ادبی مصنفوں میں چند عورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ جن میں سرنا کماری دیوی کا نام خصوصیت سے نمایاں ہے۔ جو ٹیگور کی بہن ہیں۔ اور اب تک زندہ ہیں۔ تاریخ اور فلسفہ کا چرچا بھی ان دنوں میں بہت ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی (۲۰) بیسویں صدی کی ابتدا سے بنگال کی ادبی دنیا میں مشہور مصنف۔ شاعر۔ مورخ فلسفی۔ سائنس دان۔ وغیرہ بکثرت ظہور میں آ رہے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ بڑے بڑے مصنف اتنے موجود ہیں کہ ان کے نام درج کرنے کے لئے خاصی لمبی فہرست چاہیئے۔ اس لئے میں صرف چند بہت زیادہ مشہور مصنفوں کا ذکر کر دینے پر کفایت کرتا ہوں۔

رابندر ناتھ ٹیگور انیسویں صدی کے آخیر میں اپنی تصنیفات کے ذریعے سے اُن کو کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی بیس سال کی عمر سے پہلے بھی اُنہوں نے جو کتابیں اور نظمیں لکھی تھیں۔ اُن کا طرز اور تخیل قابلِ تعریف ہے۔ اس صدی میں آج تک اُن کی جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کو شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ کیا نظم اور کیا نثر میں۔ سوسائٹی اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو انہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں بیان کیا ہے۔ اگر کسی تصنیف میں بہت بڑے فلاسفر کی حیثیت میں انہوں نے بڑے بڑے خیالات کا اظہار کیا۔ تو کسی دوسری تصنیف میں نہایت چھوٹے چھوٹے بچوں کی طبیعت کے موافق کہانیاں بھی لکھ دیں۔ ایک طرف ان کی ایک نظم کی کتاب "شیشو" (بچہ) میں بچوں کی دلی کیفیت، اُن کے حرکات اُن کی گفتگو کا طرز ان کا کھیلنا کودنا، پڑھنا، وغیرہ بالکل آسان اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ تو دوسری طرف سے "گیتانجلی" "نے ویدیا" "کھیا" "بلدیکا" وغیرہ کتابوں میں بہت بلند فلسفیانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ اُن کی ظریفانہ کہانیاں اور نظمیں بھی بہت مشہور ہیں۔ ٹیگور نے اپنی تصنیفات میں سوسائٹی کی حالت بیان کرتے ہوئے جابجا اُس کی برائیوں کو بیان کیا ہے۔ اور ان کی اصلاح کیلئے اپنا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ گیتانجلی۔ اور "نے ویدیا" میں توحید کی تعلیم تقریباً ہر صفحہ میں نمایاں ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بہت سے گیت بھی موجود ہیں۔ جن میں ویدانت فلاسفی بیان کی گئی ہے۔ ویدانت فلاسفی اور تصوف کے درمیان بڑی مشابہت ہے اس لئے بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔ کہ ٹیگور نے اپنی تحریر کے ذریعے سے جس طرح ویدانت فلاسفی کی تعلیم دینی چاہی ہے۔ اُسی طرح تصوف کیطرف بھی انہوں نے لوگوں کو مائل کرنا چاہا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے خصوصاً بنگالی کے مسلمان یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ ٹیگور کے والد مہارشی دیوندرا ٹیگور۔ جو راجہ رام موہن رائے کے مشہور احباب میں سے تھے۔ فارسی زبان کی بہت اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ اور "دیوانِ حافظ" ہمیشہ ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ مہارشی صوفیوں کے خیالات کو بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ اور اُن کی بہت تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ اور ٹیگور بھی بچپن میں زیادہ تر اپنے صوفی والد کے ساتھ شانتی نکیتن میں رہتے تھے۔ اس سے اُن پر بچپن ہی سے حافظ کی نظموں کا بڑا اثر ہوا۔ اور اثر کا اظہار ٹیگور کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک ممکن ہے۔ لیکن اسی کی وجہ سے ٹیگور کے تخیل اور ان کی خیالات کی بلندی کے خلاف ایک حرف بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بنگال میں ٹیگور کا اثر تعلیم یافتہ بنگالیوں خصوصاً نوجوانوں میں ٹیگور کی تعلیم بہت مقبول ہوتی ہے۔ ٹیگور کا گیت ہر جگہ گایا جاتا ہے اپنی تصنیفوں میں ٹیگور کی عبارت نقل کرنا لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ خاص کر

برہمو سماج میں تو ٹیگور کو ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ان کو ایک حد تک امام کی حیثیت دی جاتی ہے لیکن چونکہ ٹیگور اور برہمو سماج موحد ہیں۔ اور بت پرستی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے بعض تنگ دل ہندو ٹیگور کی تعلیم سے مستفید ہونا باعث توہین خیال کرتے ہیں۔ اس قسم کا خیال شروع میں بہت غالب تھا۔ مگر جب سے ٹیگور کی شہرت ساری دنیا میں ہو گئی اور ان کو نوبل پرائز بھی مل گیا۔ اس وقت سے ایسے لوگ بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ مسلمان نوجوانوں میں بھی ٹیگور کی قدر ہندوؤں سے کم نہیں ہے۔

ٹیگور کے خیالات ٹیگور کے خیالات کے متعلق اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے میں اختصار کے ساتھ چند جملے عرض کر دیتا ہوں۔ انیسویں صدی کی تصانیف پرانے زمانے کی ہندوستانی تہذیب و تمدن پر کثرت سے ٹیگور کے مضمون اور نظمیں موجود ہیں۔ موجودہ صدی کے ابتدائی چند سال میں جب کہ سودیشی تحریک شروع ہوئی۔ اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے لئے سرندرناتھ بنرجی اور ان کے پیروؤں نے جدوجہد شروع کی۔ تو ٹیگور نے بھی بہت سے قومی گیت لکھے۔ جو آج تک سیاسی جلسوں میں گائے جاتے ہیں۔ لیکن آج کل کی تصنیفیں تقریباً تمام ہی فلسفیانہ ہیں۔ ان دنوں ٹیگور کی خاص توجہ ایک اور موضوع کی طرف ہے۔ جس کا مفہوم "دشوا بھارتی" کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ بنی نوع انسان کو ہر طرح سے ایک حیثیت پر لایا جائے۔ جس طرح آجکل مغربی قومیں مشرقی ممالک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ یا جس طرح طاقت ور قوم کمزور و ناتواں قوم پر ظلم کرتی ہے۔ اور اس کی بہبودی کیلئے امداد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ ٹیگور کو پسند نہیں ہے۔ "گیتانجلی" کی ایک نظم میں اس دنیا کی تمام قومیں ہندوستان کے سمندر کے کنارے پر اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اس ملک کا تمدن زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اور بیرونی ممالک سے بہت سی حملہ آور قومیں یہاں آ کر قدیم باشندوں میں رل مل گئی ہیں۔ اس لئے ہندوستان اس کے لئے سب سے مناسب ہے۔ کہ ساری دنیا کی تمام قوموں کو اسی ملک میں ملا دیا جائے۔ اس نظم میں یہ دعوت دی گئی ہے۔ کہ مغربی اور مشرقی، مسلمان اور عیسائی، برہمن اور اچھوت، اس پاک مقصد کے لئے اکٹھے مل جائیں۔

بابو شرت چند چیٹرجی موجودہ بنگال کے سب سے مشہور ناولسٹ ہیں۔ ان کی کتابیں دوسرے تمام ناول نویسوں کی کتابوں سے زیادہ مقبول اور مشہور ہیں۔ شرت چیٹرجی کی ناولوں میں جمہوریت کے خیالات بہت غالب ہیں۔ اور اُن کی کتابوں میں سوسائٹی کے صرف اعلیٰ طبقے کا ہی ذکر نہیں آتا۔ بلکہ عام لوگوں کی سوسائٹی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ خواہ وہ شہری ہوں۔ خواہ دیہاتی۔ معمولی کاشتکار اور زمیندار کا معاملہ ساہوکار اور قرض خواہ وغیرہ کا ذکر ان کی کتابوں میں بہت ہے۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں جس کا نام "دیہاتی سوسائٹی" (دیہاتی سماج) بنگال کے دیہات کی زندگی کو اس قدر صحیح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ کتاب پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام واقعات ہماری موجودگی میں ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کو خود مصنف نے ڈرامے کی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔ جو کلکتہ میں کئی بار دکھایا گیا ہے۔ "چرترہین" میں جو ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے دکھایا ہے۔ کہ عام لوگوں کے خیال میں جو چیزیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ چیزیں حقیقت میں بھی بُری ہوں۔ اور تھوڑی سی کمزوری یا گستاخی کی وجہ سے سوسائٹی جن لوگوں پر لعنت بھیجا کرتی ہے۔ اُن کے اندر بھی جواہر پارے موجود ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے سے اس مشہور مصنف نے اخلاقی فضا میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ گو اس کی وجہ سے اُن پر بڑے بڑے اعتراضات بھی کئے گئے ہیں۔ اور کتابوں میں بھی اس قسم کے خیالات موجود ہیں۔ مگر اختصار کی خاطر اُن کا الگ بیان نہیں دے سکتا۔

شرت چیٹرجی کی کتابوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ ان میں مسلمانوں پر بے جا حملہ نہیں کیا گیا ہے۔ جو بہت سے ہندو مصنف اپنی تنگدلی سے کیا کرتے ہیں۔ اور دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ فطری جذبات کا بیان آسان الفاظ میں اس خوبی سے کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے۔

مسلمان مصنفوں میں سے مولانا اکرم خان ایڈیٹر "محمدی" مولوی عبدالکریم "ساہتیا وشارد" شیخ فضل الکریم، ڈاکٹر محمد شہید اللہ پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی، قاضی نذر الاسلام وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ قاضی نذر الاسلام "باغی شاعر" کے نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی سیاسی اور سوشل آزادی پر ان کے ناول اور ان کی نظمیں بہت پرجوش ہوتی ہیں۔

بنگال کی خواتین میں سے بھی بہت اچھی اچھی لکھنے والی پیدا ہو چکی ہیں۔ ٹیگور کی بہن شریمتی سورنا کماری دیوی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ناول اور افسانہ لکھنے میں انورپا دیوی۔ نروپا دیوی۔ سرسی بالا دیوی، اندرا دیوی، سیتا بالا دیوی، مسز آر۔ ایس حسین وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ سوسائٹی اور عورتوں کی تعلیم کے اصلاح کے لئے سیتا بالا دیوی۔ جیوترمی دیوی، وغیرہ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اور ان کی جدوجہد کے نتائج بہت خوشگوار اور امید افزا برآمد ہو رہے ہیں۔ مسلمان خواتین میں آر۔ ایس حسین نے اس کام میں بہت حصہ لیا ہے۔

اخبارات اور رسالے بعض بنگالی اخبارات مضمون، کاغذ، چھپائی قیمت اور اشاعت کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کے انگریزی

اخبارات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر روزانہ "لبومتی" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رسالوں میں سے مضامین، تصاویر اور اشاعت وشہرت کے لحاظ سے "پرا واسی" "بھارت ورش" اور "بھور لبومتی" کے نام سب سے مقدم ہیں مسلمانوں نے بھی کئی رسالے نکالے ہیں جن میں سے "محمدی" اور "سوغات" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نظموں کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے۔ خاص ادبی مضمون سے لے کر ناول، ڈرامہ سائنس، فلسفہ، تاریخ، تعلیم موسیقی، مذہب، سیاست صحت۔ علم طب وغیرہ کسی کو چھوڑا نہیں جاتا۔ رسالے بیشمار شائع ہوتے ہیں۔ اور مضمون نگار بھی ہندو مسلمان۔ مرد و عورت بیشمار ہیں۔

کئی سال سے خاص سائنس کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ "پراکرتی" بھی شائع ہوتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی سائنس پر مضمون لکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ چرن لاہا بانی اور ایڈیٹر ہیں۔

بنگال کی اقتصادی حالت کی اصلاح کیلئے بھی ایک رسالہ نکالا گیا ہے جس کا نام آرتھک گنتی (اقتصادی ترقی) ہے۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر پروفیسر بنیائے کمار سرکار ہیں جو تیرہ سال تک مختلف ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ اور اقتصادیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

بنگالی ادبی سوسائٹی

بنگالی ادب کی اصلاح و ترقی کے لئے مدت سے ایک سوسائٹی قائم ہے۔ جس کو "بنگیا ساہتیا پریشد" کہتے ہیں۔ بڑے بڑے مشہور اہل قلم اس کے ممبر ہیں۔ اس کا رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کے اغراض پر غور کرنے کے لئے ہر سال ایک کانفرنس ہوا کرتی ہے۔ جو بنگالی ادبی کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کانفرنس کی خاص شاخیں چار ہیں۔ ادب تاریخ۔ فلسفہ اور سائنس۔ پوری کانفرنس کا ایک عام صدر ہوا کرتا ہے۔ اور پھر ہر ایک شاخ کے لئے الگ الگ صدر بنایا جاتا ہے۔ یہ کانفرنس تقریباً پچیس سال سے قائم ہے۔ اور ہر سال ایک بار منعقد ہوتی ہے ؂

عبداللہ بنگالی

دریائے راوی

ہے سکوتِ شب میں راوی نازسے محوِ خرام
یا کوئی شمشیر صحرا میں پڑی ہے بے نیام

چاند کی کرنوں سے لہریں شوخیاں کرتی ہوئیں
ساحلِ خود دار کی اُلفت کا دم بھرتی ہوئیں

پتھروں سے بار بار آ کے ٹکراتی ہیں یہ
شاید اس خاموش ویرانے میں گھبراتی ہیں یہ

کشتیاں ہیں نیل سطحِ آب پر بکھری ہوئی
کچھ اِدھر بکھری ہوئی ہیں کچھ اُدھر بکھری ہوئی

ہیں فضا میں منتشر آزاد ملاحوں کے گیت
کرتے ہیں دل پر اثر آزاد ملاحوں کے گیت

یہ کنارے پر مگر کس کا مزارِ پاک ہے
جس کے ماتم میں فرشتوں کا گریباں چاک ہے

یادگارِ عہدِ رفتہ ہے یہ ایوانِ کہن
ہے نمایاں ہر در و دیوار سے شانِ کہن

سو رہا ہے اس میں اک خوابیدہ اختر تاجدار
خاندانِ مغلیہ کا عدل پرور تاجدار ؂

صاف آتی ہے نظر ٹوٹی ہوئی بارہ دری
رو رہا ہوں دیکھ کر ٹوٹی ہوئی بارہ دری

ایک فرسودہ عمارت کے کھنڈر میں سامنے
کر دیا پامال جس کو گردشِ ایام نے ؂

وہ کھجوروں میں نہاں ہے، آصف الدولہ کی قبر
شکوہ سنجِ آسماں ہے آصف الدولہ کی قبر

اور اس کے متصل نورِ جہاں کی قبر ہے
کعبۂ اربابِ دل نورِ جہاں کی قبر ہے ؂

ہیں یہ سب سامان لیے دل تیری عبرت کیلئے
سرمۂ عرفاں ہے یہ چشمِ بصیرت کے لئے

عارف

جنتِ جدید

مذہب کی گوناگوں بشارتوں۔ برکتوں اور وعیدوں میں جو دل آویزی۔ جذب اور کشش جنت کو حاصل ہے۔ وہ بحیثیت مجموعی شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔ حضرت غالب نے اسے محض دل کے بہلانے کا سامان خیال کریں تو کریں۔ ورنہ دنیا کے کثیر حصے کی مصیبت اس کی دلکش یاد میں کٹ جاتی ہے۔ جنت کا واہمہ یا خیال یا اعتقاد جو کچھ بھی ہو۔ کسی ایک مذہب سے خاص نہیں۔ بلکہ دنیا کے جملہ مذاہب کی مجالس اس شمع کے دم سے روشن ہیں۔ فطرتِ انسانی کے ایک ماہر صناع کی طرح مذہب نے بھی حقیقت جنت کو بے نقاب کرنا نظر فریبی کے منافی خیال کیا۔ اور استعارہ اور تشبیہ کے پردۂ زنگاری کی اوٹ سے ایک ایسی جھلک دکھا دی۔ کہ اس زنبیلِ عمر عیار میں ہر ہر درجہ کے انسان کی ضیافتِ طبع کا سامان نظر آیا۔ ہم حقیقتِ جنت پر فقیہانہ یا فلسفیانہ انداز سے نظر نہیں ڈال رہے۔ اس لئے اس موضوع پر کسی "عبدالحق نما" تبصرے کی توقع عبث ہے۔ یہ مذہبی پیشواؤں اور شب زندہ دار زاہدوں کا کام ہے۔ رند تباہ حال کو اُن کے احاطۂ اختیار میں در آنے کی نہ ضرورت ہے۔ اور نہ اجازت۔ ہمیں امید ہے۔ کہ اس طرح یہ حضرات بھی ایک فسانہ نگار کی خلوت کا احترام فرمائیں گے۔ اور ایسی جگہ قدم رنجہ کرنے کی زحمت نہ اٹھائیں گے۔ جہاں اُن کے نزولِ اجلال کی نہ ضرورت ہے۔ اور نہ اجازت۔ در جنت کی کلید برداری انہیں مبارک لیکن بیان و معانی کے وسیع میدان میں جولانیٔ طبع سے ہمیں اُن کا کوئی حربۂ تکفیر سے لیکر رجم تک۔ نہیں روک سکتا۔ احسان فراموشی کی اور بات ہے۔ ورنہ ہم نے تو باسی پھولوں کے ہار اُتار کر کھلائے نو دمیدہ کے گلدستے رکھدئے ہیں۔ اگر ناگوارِ طبع ہو تو شامتِ قابل علاج ہے۔ ہم سزاوار دار نہیں۔ جنت کی پُر اسرار حقیقت کو احساس ظاہری کی عینک سے دیکھیں۔ تو اس میں ہمیں آب زلال کے چشمے۔ دودھ اور شہد کی نہریں۔ خمر بالشکر کے عوض۔ حور و غلماں کا جھرمٹ۔ ذرا سے اشارے پر قدموں میں ہونیوالے میوہ دار درخت نظر آئیں گے۔ مگر دراصل بجنسہٖ یہ چیزیں نہیں۔ بلکہ ان کے تاثرات کی رُوح ہمیں جنت میں ملیگی۔ اور اس پردے میں کیا ہوگا۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ تہذیب و تمدن کے موجودہ دور کو ملحوظ رکھکر اگر ان تشبیہات کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے۔ تو ایک لطیف جدت طرازی کے علاوہ وسعت نظر کا باعث ہوگا۔ زمانہ کی ذہنیت کے ساتھ اگر جنت کا ہیولیٰ بھی بدل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ع۔ تو بھی بدل کہ اب تو زمانہ بدل گیا۔

شاید ہم ان حدود سے تجاوز کر رہے ہیں جن سے آگے بڑھنے کا فنِ فسانہ نگاری روادار نہیں۔

لق و دق سنسان جنگل میں جو آمد و رفت کے تمام وسائل سے محروم ہے ایک رفیع الشان مکان آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ اوّل تو کوئی آنکھوں والا اُدھر سے گذرتا ہی نہیں۔ اور جو دیکھو کوئی مجنوں و فرہاد کا جانشین جوشِ جنوں میں آ ہی نکلے۔ تو درخت اور بیلیں اسطرح پر گھٹا ٹوپ چھائی ہیں۔ مجال کیا کسی کو اس گنبدِ سبز پوش پر مکان کا گمان ہو۔ صبح کی تازہ دم ہوا۔ اور تو طلوعِ آفتاب کی زندگی بخش کرنیں کھڑکیوں سے مکان کے پُرتکلف کمروں میں گھوم رہی ہیں۔ محفلِ شب کی گو اگلی سی باتیں نہیں رہیں۔ پھر بھی خمار آلودہ آنکھیں کسی کی انگڑائی پر تڑپ جانے کو موجود ہیں۔ شمع روشن تو ہے مگر روزِ روشن کے سامنے اس کا چراغ نہیں جلتا۔ میز پر کھانے پینے کا سامان موجود مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اہتمام کسی پھوہڑ بیگم کے ہاتھ میں ہے۔ جو سلیقہ سے کام لینا اپنی روایات کے لقیض خیال کرتی ہے۔ میز کے گرد عورتوں اور مردوں کا جماؤ ہے۔ ان کے چہرے بتا رہے ہیں کہ اس وقت سرور و مسرت سے سیر ہو گئے ہیں۔ اور انہیں پھر سے نزاعِ بقا کی الجھنوں میں پھنسنے کا ردِ عمل مطلوب ہے۔ آخر صدرِ محفل نے محسوس کیا۔ کہ عیش و عشرت کا خمار شروع ہوگیا۔ تو وہ بطور دعائے خیر آخری تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ شمپین کے کاگ اُڑے اور ارغوانی جام اٹھنے لگے۔

میرے احباب کو نوروز مبارک! سب سے پہلے اس فرخندہ روزگار جماعت کی صحت کا جام! جس نے اس تھوڑی سی عمر میں اپنے اراکین کو فکر فردا سے نجات دلا دی ہے۔ یہ رہی جسوا کی صحت! جس نے پولیس کو ناک چنے چبوائے ہیں۔ اور دن دہاڑے کو ٹھیوں کا اوڑھنا بچھونا تک غنیمت میں حاصل کیا ہے۔ ہم ایسے بہادر۔ جفاکش۔ اور ہمدردِ بنی نوعِ انسان (قہقہہ) بھائی پر جسقدر ناز کریں بجا ہے۔ میرن نے جیبوں کو روپے پیسے۔ گھڑی زنجیر سے سُبکبار کرنے میں سماج کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے۔ محتاجِ بیان نہیں۔ دہلی میں آج آپ کے کمال کے جھنڈے لڑے ہیں۔ جسونت کے خنجر آبدار کی ہندوستان بھر میں دھوم ہے۔ کون ہے۔ جو اس کا لوہا نہیں مانتا۔ دس انسانوں کا خون بہا کر بھی۔ اللہ رے انکسار۔ ہنوز اپنے تئیں سرخرو خیال نہیں کرتا۔ زمین نے جن اور

بیدانی کے لباس میں بیگمات کی تفریح طبع کا سامان بہم پہونچایا۔ وہ مضحکہ خیز تو ضرور ہے۔ لیکن عملی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ کہ دس ہزار کی گرانقدر رقم خزانۂ عامرہ میں داخل کی ہوئی ہے۔ اس طرح مثواکی کے عشوہ و ناز۔ راز۔ و نیاز اور لاگ لگاوٹ سے امیرزادوں کا جو روپیہ ضائع ہونے سے اس کی تعداد اسوقت تک پچاس ہزار سے آگے نکل گئی ہے۔ سب کی خدمات کا جداگانہ اعتراف وقت کی لبساط سے باہر ہے۔ لیکن وہ یقین رکھیں۔ کہ ہمارے دلی جذبات تشکر و احسان سے لبریز ہیں۔ اور ان کے وجود کو یہ جماعت رحمت پروردگار خیال کرتی ہے۔ لیکن معراج کمال پر پہونچنے کے لئے ابھی بہت محنت اور سرگرمی کی ضرورت ہے۔ حکومت کے خزانے۔ بنک۔ جوہریوں کی دکانیں۔ ارباب نشاط کے زیورات وہ چیزیں ہیں۔ جن کا ہمارے پاس کوئی نمونہ موجود نہیں۔ ہمارے اس سالانہ جلسہ کے آئندہ انعقاد میں ابھی ایک سال کا طویل عرصہ پڑا ہے۔ کون مرے کون جیئے۔ مگر ہمیشہ یاد رکھو۔ کہ موت کا پنجۂ آہنی بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا۔ جنت نہ سہی۔ دوزخ تو کہیں نہیں گئی۔ جہاں چار دوست مل بیٹھیں گے۔ دوزخ رشک بہشت ہو جائیگی۔ اٹھائیے"

سب نے گلاس اٹھائے۔ مگر دو ایک کانپ رہے تھے۔ اور چار پانچ کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ لیکن یہ زردی زعفران سے نہیں۔ سکرات سے ملتی تھی۔

* * * * * * *

سالار اور زینتن کی موٹر اپنا راستہ آپ بناتی نکل گئی۔ اور شہر کے ایک خولبصورت بالاخانے کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ زینتن اُتری اور پائدان پر کھڑے کھڑے بولی:۔

"ایک دفعہ نہیں بارہا کہہ چکی۔ کسی کا پابند ہو کر رہنا میری سرشت کے خلاف ہے۔ لیکن یہ شادی کا جھگڑا ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اگر یہ زندگی مجھے پسند ہوتی۔ تو اسوقت میری موٹر قصر آزادی سے نہ آئی ہوتی"۔

"لیکن مجھ سے شادی آپکی آزادی میں مخل نہ ہوگی۔ اور ہم ایک جان ہو کر ساری جماعت کو مٹھی میں لے آئیں گے"۔

"تو کل جواب دونگی"

"ضرور"

"بلا تساہل"۔

سالار اپنے مسکن کے قریب پہنچا۔ تو دروازے سے ایک کریہہ صورت بر لے درجے کی غلیظ لڑکی نکلی۔ اس کے ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ اور دوسرے میں دودھ کا ایک پیالہ۔ اسے دیکھکر سالار کی نفرت اور حقارت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی شکل نے سالار کی نظر کو ایذا پہونچائی۔ پیشانی کا چمڑہ کھنچ گیا۔ اور سُرخ آنکھوں نے غصّہ کی گہرائی کا پتہ دیا۔ لڑکی سالار کی واحد خادمہ تھی۔ اور ہر ممکن طریق سے مالک کو دق کرنا اس نے اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ سالار اسکے ہاتھوں سے تنگ آگیا تھا۔ کئی دفعہ جواب دیا۔ گھر سے نکال باہر کیا۔ لیکن اُسے نہ جانا تھا نہ گئی۔

—— اور سالار کے سینہ پر مونگ دلنے کیلئے اس گھر میں اپنی موجوگی کو لازم بنا دیا۔ لڑکی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور زمین پر چل رہی تھی۔ اس حرکت کا یہ نتیجہ لازم تھا۔ کہ وہ ٹھوکر کھائے۔ چنانچہ اس نے ٹھوکر کھائی۔ اور عین اسوقت گری جب ایک موٹر لاری بھی وہاں آ کر الٹ گئی۔ سالار نے جھپٹ کر لڑکی کو زد سے بچا لیا۔ اور خود لپیٹ میں آگیا۔ لڑکی تو اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔ مگر سالار ہسپتال جا پہونچا۔

* * * * * * *

سالار صبح سے گھوم رہا تھا۔ خدا جانے کتنے میل نکل گیا۔ مگر وہ تازہ دم تھا۔ ذرا تھکان محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ مگر دھوپ میں چلنا بھی گراں نہ گذرتا تھا۔ سب خوش و خرم نظر آتے تھے۔ ایک بھی تو ایسا نہ ملا۔ جسے گردش زمانہ کی شکایت یا دنیائے وطن سے شکوہ ہو۔ سالار نے دو ایک رنگیروں کی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر انہوں نے مسکرا کر خود ہی اپنی جیبیں خالی کردیں۔ حیران تھا یہ کون مقام ہے۔ دہلی؟ شائد!!

بھوک محسوس ہوئی۔ تو ایک ہوٹل میں گیا۔ داخل ہوا۔ تو ایک خانساماں ملا۔ جس سے اسکی پہلے کی جان پہچان تھی۔ حیران تھا۔ کہ وہ یہاں کیسے آیا۔ کھانا کھا کر چپکے سے نکل آیا۔ مگر کسی نے بل کیلئے اس کا تعاقب نہ کیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو سگریٹ کی ڈبیہ نکل آئی۔ ایک عدد نکالا سلگایا۔ اور ایک پارک میں بیٹھ کر کش لگانے لگا۔ اتنے میں چند رقاصہ آگئیں۔ گایا۔ بجایا۔ ناچیں۔ کودیں۔ اور چلی گئیں۔ سالار بہت محظوظ ہُوا۔

* * * * * * *

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مگر سالار ہنوز سرگرم خرام تھا۔ ایک لمبی سڑک سامنے تھی جس کے دونوں طرف صنوبر کے درخت جھوم رہے تھے۔ اور ان میں جا بجا بجلی کے ہنڈے اور گیلسن لیمپ روشن تھے۔ سڑک ایسی سیدھی تھی کہ حدِ نگاہ تک سے دو قدم آگے نکلتی تھی۔ پرسکون اور پھولوں میں بسے ہوئے ہوا کے جھونکے مشام جان تک کو معطر کر رہے تھے۔ مگر اُسے مطلق یاد نہ تھا۔ کہ اس نے ابتک کیا کیا۔ کہاں کہاں پھرا۔ کیا کھایا اور وقت کا حساب کیا تھا۔ خیال آیا۔ ذرا گانا سنیں۔ اور قسمت آزمائیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو اشرفیاں موجود تھیں۔ اس جیسے گھاگ قمار باز کے لئے یہ کافی سے زیادہ سرمایہ تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو قمار خانہ سامنے تھا۔ وہ حیران تھا۔ کہ کس نے ماضی کا ر لو کا تختہ اٹھا

کر یہاں لا رکھا۔ جبروہ داخل ہُوا۔ داؤں لگانے شروع کئے۔ اور تھوڑی دیر میں اس کے سامنے اشرفیوں کا انبار لگ گیا۔ اتنے میں اُس نے سُنا کوئی اس کا نام لیکر پکار رہا ہے۔ پھر کے دیکھا۔ تو ابراہیم تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ارے میاں ابراہیم بموقعہ خوب ملے۔ ذرا یہ تو بتانا:

میں ہوں کہاں آخر! کبھی سمجھتا ہوں۔ دہلی ہے۔ کبھی مانٹی کارلو۔ اور چاروں طرف سے مہ جبیں۔ گل اندام لڑکیاں آکر ناچنے گانے لگیں ان کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے۔ اور ہر ایک آگے بڑھکر نہایت ادب سے سالار کے آگے پیش کرتی تھی۔ اور وہ چڑھاتے جاتا تھا جب سب گلاس ختم ہوگئے تو وہ چلی گئیں۔ سالار نے کہا۔ رنگ دبو تو خوب تھے۔ مگر حرام ہے۔ جو ذرا بھی سرور ہو۔ اونچی دکان پھیکا پکوان! ۔ کم بخت یہاں بھی پانی پلاتے ہیں۔ آبکاری والے خدا جانے کہاں مر گئے۔ کوئی نہیں پوچھتا"۔ ابھی سالار نے اپنا لیکچر نہ سمیٹا تھا کہ ایک شخص وردی پہنے پر تلہ لگائے آیا۔ اور فرشی سلام کرکے کہنے لگا۔ کہ حضور کو اشربہ سے کیا شکایت ہے۔ ابراہیم نے بات کاٹ کر کہا "اجی نئے آئے ہیں۔ یہاں کی معاشرت سے آگاہ نہیں۔ آہستہ آہستہ جان جائیں گے۔ آپ جائیے۔ کوئی بات نہیں"۔ سپاہی مسکرا کر چلا گیا۔

سالار۔ حیرت پر حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ بھیّا! یہ کیوں نہیں کہتے۔ کہ کہاں ہوں۔ ظاہرا عالم خواب تو معلوم نہیں ہوتا"۔

ابراہیم۔ اسے جنت کہتے ہیں۔

سالار۔ ارے جنت! مجھے کیسے بار ملا یہاں۔

ابراہیم۔ ایک بیکس یتیم لڑکی کی پرورش اور جان بچانیکے صلہ میں۔

سالار۔ بس۔ اور میرے گناہ۔ حرف غلط ہوگئے۔ اور میری ایک نیکی نے اتنا بڑا دفتر دھو ڈالا۔ سچ ہے تیرے بخشنے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔

نور الٰہی محمد عمر

طاؤس

یہ کیف گہِ دشت یہ برسات کا موسم ⁂ یہ وجد کا عالم
ہے رقص میں طاؤس کہ اک رنگِ مجسم ⁂ رقصیدۂ پیہم

سینا ہے کلیمی ہے کہ ہے سینۂ زریں ⁂ یا چشمۂ سیمیں
جنبش میں ہے اعجاز سے اک وادیٔ رنگیں ⁂ یا گردنِ پر خم

نیلوفری دم پر ہیں یا پاشیدہ جواہر ⁂ یا چرخ پہ اختر
یا نیند سے جاگے ہوئے سبزے کی جبیں پر ⁂ ہے رقص میں شبنم

موسیقیِ صحرا تو نہیں وجد میں رقصاں ⁂ صد رنگ بداماں
یا نغمہ سرا ہے کوئی طاؤس خراماں ⁂ برہم زنِ عالم

اے جانِ ترنم! یہ تیری زمزمہ سازی ⁂ جذبات نوازی
یہ سلسلۂ مستیٔ الحانِ حجازی ⁂ یہ نغمۂ پیہم

مدہوشیٔ "محویت کامل" سے جو جھوما ⁂ طاؤس نہیں تھا
میں نے ہی نہیں آج تو فطرت نے بھی دیکھا ⁂ نغمے کو مجسم

روش صدیقی

سیر یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

گذشتہ سے پیوستہ

مس پارسنز کی عمر اس وقت قریب چالیس سال کے تھی۔ انیس کو حیرت ہوا کرتی تھی کہ ایک ایسی خوبصورت تربیت یافتہ اور سنجیدہ مزاج خاتون نے اس عمر تک شادی کیوں نہیں کی۔ پہلے ہی دن سے یہ خاتون انیس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں اور رفتہ رفتہ اُن کی آپس میں اسقدر بے تکلفی ہوگئی تھی۔ کہ انیس انہیں خالہ کہہ کر پکارتا تھا یہ بھی ہر مرحلے پر اس کی رہنمائی کرتیں اور کوشش کرتیں کہ غیر ملک کی رہائش اسے اداس نہ کرے۔ بعض دفعہ جب ان دونوں میں اختلاف رائے ہوجاتا۔ تو مس پارسنز تحکم کے ساتھ بھی اپنی بات منوا لیتیں۔ انیس کو بھی ان کا اسقدر پاس خاطر ملحوظ تھا کہ وہ ہر بات میں ان کا مشورہ لیا کرتا اور ان کی رائے کے مطابق عمل کیا کرتا۔ جب ان دونوں میں سے کوئی لندن سے باہر جاتا تو متواتر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ چنانچہ خط و کتابت ہی کے سلسلہ میں انیس کو معلوم ہوا کہ پارسنز کی دو دفعہ نسبت ہوئی تھی لیکن دونو دفعہ نکاح کے دن سے دو چار روز پہلے ان کا منسوب کسی حادثہ کا شکار ہو کر مارا گیا۔ دوسرے واقعہ کے بعد ان کی طبیعت شادی کے نام سے ہمیشہ کے لئے ڈر گئی۔ اور انہوں نے اپنی زندگی دینی کاموں کے لئے وقف کردی۔ جب انیس لندن پہنچا تو یہ انجمن اشاعت انجیل کی ایک شاخ کی سیکرٹری تھیں۔ ان کا دفتر گرد و ہی میں واقع تھا۔ اسی سہولت کی وجہ سے انہوں نے اس مکان میں رہائش بھی اختیار کر رکھی تھی۔

جو صاحب انیس اور اس کے دونوں ساتھیوں کو سٹیشن پر ملے تھے۔ وہ بھی بیرسٹری کے طالب علم تھے اور کچھ عرصے سے اسی مکان میں رہتے تھے۔ چند دن کے بعد انیس کے دونوں ساتھی تو کیمبرج چلے گئے۔ اور یہ کسی دوسرے مکان میں تشریف لے گئے۔ ان کے بعد مسز بیکر بھی اپنی صاحبزادی کے پاس چلی گئیں ان کی جگہ اور مہمان آتے جاتے رہتے۔ کوئی چند دن ٹھہرتا۔ کوئی کچھ زیادہ عرصہ تک قیام کرتا۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ مناسب مقامات پر آتا رہیگا۔ انیس کے ساتھی جب کیمبرج چلے گئے تو انیس کو رہائش کے لئے ایک بڑا کمرہ مل گیا۔

پہلے دن ناشتے کے دوران میں انیس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ سب سے پہلے اُسے یہ تشویش ہوئی کہ یہاں سب کے لباس ایک طرح کے ہیں۔ اور سب کی شکل و شباہت بھی ایک ہی جیسی ہے۔ مجھے تو انہیں شناخت کرنا بھی مشکل ہُوا کریگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ سڑکیں بازار اور چوک بھی قریب قریب ایک ہی جیسے ہیں۔ میں اپنا راستہ کیسے معلوم کرونگا۔ جہاز کے کھانوں کی فہرست کے مطابق اس کا خیال تھا کہ عام گھروں میں بھی کھانوں کی ویسی ہی افراط اور کثرت ہوا کریگی۔ اس میں بھی اس کو مایوسی ہوئی۔ کیونکہ کھانا گو اچھا اور کافی تھا لیکن جہاز کی طرح قسم قسم کا نہیں تھا ایسے ہی مختلف خیالات کے ساتھ ساتھ اُسے مکان کی مالکہ اور دوسری دونوں خاتونوں کے سوالات کا جواب بھی دینا پڑتا تھا۔ سفر کیسے کٹا؟ تکان تو نہیں ہے؟ اداسی تو نہیں معلوم ہوتی؟ آب وہوا تو موافق ہے نا؟ کیوں یورپ کیسا پسند آیا؟ وغیرہ۔ وغیرہ۔ انیس کو حیرت ہوئی کہ اتنی سنجیدگی اور اصرار کے ساتھ یہ باتیں پوچھی جارہی ہیں۔ کچھ عرصہ انگلستان رہ چکنے کے بعد اسے معلوم ہُوا کہ اس قسم کے سوالات مہمان کی تواضع کا ایک ضروری جزو ہیں۔ چنانچہ دوسری صبح جب انیس ناشتے پر آیا۔ تو مقررہ سلام کے بعد مالکہ مکان نے دریافت کیا کہ رات سوئے تو اچھی طرح؟ اجنبیت کی وجہ سے نیند میں خلل تو نہیں آیا؟ اور بڑی خوشی کے لہجہ میں کہا کہ موسم تو آج اچھا ہے۔ سورج نکلا ہُوا ہے! انیس نے مسکرا کر ہاں کہدیا لیکن پھر اُسے

تعجب ہوا کہ بھلا یہ کونسی خصوصیت کے ساتھ بتانے کی بات تھی کہ سورج نکلا ہوا ہے۔ لیکن جب انگلستان کے موسم خزاں اور موسم سرما کا کچھ تجربہ ہو چکا تو اُسے معلوم ہو گیا کہ یہاں سورج کا چمکتے ہوئے نظر آنا واقعی ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر طبیعت میں بشاشت پیدا ہو جاتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کو اس پر مبارکباد دی جائے۔

ناشتے کے بعد انیس کے ساتھیوں سے ملنے کے لئے ان کے ایک ہندوستانی دوست آ گئے۔ اور تجویز یہ ہوئی کہ کک کے دفتر میں جا کر اپنے روپے کا پتہ لگایا جائے کہ اب تک آیا ہے یا نہیں اگر آ گیا ہو تو بنک کا حساب کھول دیا جائے۔ اور ڈاک کے لئے پتہ بھی لکھوا دیا جائے۔ چنانچہ ہیمرسمتھ کے سٹیشن سے سب لوگ ڈسٹرکٹ ریلوے پر سوار ہو کر پبلک فرانس سٹیشن تک گئے۔

گویہ ریلیں بازاروں کی سطح سے نیچی چلتی ہیں اور بعض جگہ سُرنگوں میں سے ہو کر مکانوں کے نیچے سے بھی گزرتی ہیں۔ لیکن ٹیوب ریلوے کی طرح یہ زمین دوز نہیں ہیں۔ دونوں قسم کی ریلیں برقی طاقت سے چلتی ہیں۔ اور دونوں "انڈر گراؤنڈ" ہیں فرق یہ ہے کہ موخرالذکر تو محض بازاروں کی سطح سے نیچی چلتی ہیں۔ اور ٹیوب گاڑیاں بعض بعض جگہ کئی سو فیٹ سطح زمین سے نیچے گویا زمین کے پیٹ کے اندر چلتی ہیں۔ لندن کے نیچے ان دونوں قسم کی ریلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ شہر کے باہر کے حصوں میں جہاں آبادی کھلی کھلی ہے یہ ریلیں زمین کے اوپر آ جاتی ہیں لیکن شہر کے پرانے اور گھنی آبادی والے حصوں میں سب زمین کے اندر ہی چلتی ہیں۔ ہوبورن کے سٹیشن پر پکاڈلی ٹیوب کی ریلیں سطح زمین سے قریباً تین سو فیٹ نیچے چلتی ہیں۔ چیرنگ کراس اور واٹرلو کے سٹیشنوں کے درمیان ہیکر لو ٹیوب کی ریلیں دریائے ٹیمز کے نیچے سے بھی گزرتی ہیں۔

انڈر گراؤنڈ ریلوں کے سلسلوں میں سے دو بڑے سلسلے ڈسٹرکٹ ریلوے اور میٹروپولیٹن ریلوے کے ہیں۔ اوّل الذکر کی ریلیں ومبلڈن۔ رچمنڈ۔ ہونسلو۔ ایلنگ۔ ہیرو اور آکسبرج سے چلکر شہر کے مرکز کو جاتی ہیں۔ اور مرکز سے نکل کر مشرق کی طرف بارکنگ اور سوتھینڈ تک پہنچا دیتی ہیں۔ میٹروپولیٹن کی ریلیں لندن کے نیچے ایک حلقے میں چکر لگاتی رہتی ہیں جسے انر سرکل یعنی اندرونی حلقہ کہتے ہیں۔ ایک شاخ ہیمرسمتھ سے چلکر اندرونی حلقے کو جاملتی ہے اور ایک شاخ بیکر سٹریٹ سے نکلکر ویمبلے ہیرو اور سٹڈبری کو چلی جاتی ہے۔

ٹیوب ریلوں کے سلسلوں میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں:۔

پکاڈلی ٹیوب۔ جو ہیمرسمتھ سے چل کر سوتھ کنسنگٹن اور پکاڈلی سرکس ہوتی ہوئی فنسبری پارک کو چلی جاتی ہے۔

سنٹرل لندن ریلوے پہلے وُڈ لین سے بنک تک جاتی تھی لیکن اب ایک طرف تو بنک سے لورپول سٹریٹ تک اور دوسری طرف وُڈ لین سے ایلنگ براڈوے تک وسیع کی جا چکی ہے یہ لائن آکسفورڈ سرکس برٹش میوزیم اور چانسری لین وغیرہ سے گزرتی ہے۔

بیکرلو ریلوے اب جنوبی لندن سے شروع ہو کر ہیمپسٹڈ ہائی گیٹ گولڈرس گرین اور اب مورڈن تک جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی سلسلے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ہر سلسلے کی ریلیں مرکزی لندن کے نیچے سے گزرتی ہیں جہاں دوسرے سلسلوں کے ساتھ ان کے مقامات اتصال ہیں۔ تاکہ مسافر زمین کے اندر ہی اندر سلسلہ بدل کر لندن کے جس حصے میں چاہیں پہنچ سکیں۔

بازاروں میں ان ریلوں کے سٹیشن دکانوں کی قطار میں بنے ہوئے ہیں۔ صرف باہر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ فلاں سٹیشن ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے ٹکٹ لینے کی کھڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اکثر سٹیشنوں پر ٹکٹ لینے کی مشینیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ایک آنہ۔ دو آنے۔ تین آنے کے ٹکٹوں کی الگ الگ مشینیں ہوتی ہیں۔ مسافر کرایہ کی مقررہ رقم مشین میں ڈال دیتا ہے اور ٹکٹ خود بخود مشین سے نکل آتا ہے۔ البتہ اگر ریزگاری واپس کرانی ہو تو کھڑکی سے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے ٹکٹ لیکر مسافر لفٹ یعنی مسافروں کو اوپر نیچے لے جانے والے برقی پنجرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ پنجرے ایک ایک منٹ کے بعد نیچے اوپر جاتے رہتے ہیں۔ نیچے پہنچ کر کئی سرنگیں نظر آتی ہیں جن میں برقی روشنی سے دن چڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے ان میں بہت سے نشان لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ فلاں طرف کی ریل پر فلاں راستے سے جاؤ۔ پلیٹ فارم پر نہ کوئی سٹیشن ماسٹر ہوتا ہے۔ نہ ٹکٹ کلکٹر نہ قلی۔ ٹکٹ کلکٹر کی تو اس لئے ضرورت نہیں کہ مسافر صرف لفٹ سے داخل ہو سکتے ہیں۔ اور لفٹ ہی سے نکل سکتے ہیں۔ اور لفٹ میں داخل ہوتے یا اس سے نکلتے وقت ٹکٹوں کا معائنہ ہو جاتا ہے۔ قلی کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ ریلیں صرف شہر کے نیچے چلتی ہیں۔ اکثر مسافروں کو بھاری اسباب

ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ اور جو تھوڑا بہت سا سامان کسی وقت لیجانا بھی پڑے تو مسافر اُسے خود اٹھا لیتے ہیں ۔ دو۔ دو تین تین منٹ کے وقفے پر ریلیں آتی جاتی رہتی ہیں ۔ ریل کے کھڑے ہوتے ہی دروازے خود بخود برقی طاقت سے کھل جاتے ہیں ۔ پہلے اُترنے والے مسافر اُترتے ہیں اور جب تک تمام مسافر اتر نہ لیں کوئی مسافر چڑھنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ جب تمام اترنے والے مسافر اُتر جاتے ہیں تو چڑھنے والے مسافر نہایت اطمینان سے سوار ہو جاتے ہیں ۔ اس ترتیب کے اختیار کرنے سے دس پندرہ سکنڈ میں بیسیوں مسافر ہر سٹیشن پر اُتر جاتے اور سوار ہو جاتے ہیں ۔ نہ کسی قسم کا شور و غوغا ہوتا ہے ۔ نہ کسی قسم کی بے چینی پیدا ہوتی ہے ۔ جب سب مسافر سوار ہو چکتے ہیں تو ریل کے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں اور ریل روانہ ہو جاتی ہے ۔

ٹکٹ لیتے وقت ۔ لفٹ میں داخل ہوتے وقت ۔ لفٹ سے نکلتے وقت بھی ہر شخص ترتیب اور باری سے چلتا ہے اور اس طرح تمام کاروبار اطمینان سے چلتا رہتا ہے ۔ سُرنگوں میں اور پلیٹ فارموں پر مصنوعی طور پر پیدا کی ہوئی تازہ ہوا ہر وقت تیزی سے چلتی رہتی ہے اس لئے طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا ۔ اور تنگی کا احساس نہیں ہوتا ۔ برقی ریلوں کے علاوہ ٹریم اور موٹر بس کے ذرائع آمد و رفت بھی ہر جگہ موجود ہیں ۔ ایک دو مقامات پر ٹریم کو بھی زمین کے نیچے سے گذرنا پڑتا ہے ۔ موٹر بس ہمیشہ زمین کے اوپر ہی چلتے ہیں ۔ برقی ریلوں ۔ ٹریم اور بسوں میں کرایہ بالکل سستا ہے اور سوائے ڈسٹرکٹ اور میٹروپولیٹن ریلوں کے جن میں دو درجے ہوتے ہیں باقی سب میں ایک ہی درجہ ہوتا ہے ۔ مرکزی لندن میں انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ دو تین آنے میں پہنچ سکتا ہے ۔ اور دور کے حصوں میں زیادہ سے زیادہ چھ سات آنے ہیں ۔

شہر کے جس حصے میں بھی کسی کی رہائش ہو ۔ ٹریم یا بس کی کوئی لائن یا برقی ریل کا سٹیشن ضرور اس کے قریب ہی ہوگا ۔ بلیک فرائرس سٹیشن سے باہر نکل کر انیس کی نظر جب بازار پر پڑی تو وہ بیحد متحیر ہوا ۔ اس جگہ چار سڑکیں ملتی ہیں ۔ اور چونکہ یہ جگہ مرکزی حصے میں ہے ۔ اس لئے یہاں آمد و رفت کی اتنی کثرت تھی اور ہر قسم کی گاڑیوں کا اسقدر ہجوم تھا کہ چوک کے ایک طرف سے دوسری طرف پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا ۔ لیکن انیس کو معلوم ہوا کہ سڑک کے اوپر سے گزرنا لازمی نہیں ۔ چوک کے نیچے ایسے راستے بنے ہوئے تھے جن کے ذریعے سڑکوں کے نیچے ہی نیچے مسافر دوسرے پار جا سکیں ۔ ان راستوں کو "سب وے" کہتے ہیں ۔ چنانچہ انیس اور اس کے ساتھی نچلے رستے سے ہو کر سڑک کی دوسری طرف پہنچ گئے ۔ اور دو تین فٹ کے بعد لڈگیٹ سرکس میں داخل ہو گئے ۔ جہاں کک کا دفتر واقعہ تھا ۔ اس چوک میں بھی آمد و رفت کی بڑی بھیڑ تھی ۔ لیکن اس کے باوجود ہر چیز ایک ترتیب اور اطمینان کے ساتھ حرکت کر رہی تھی ۔ چوک کے وسط میں دو سپاہی کھڑے تھے جو آمد و رفت کو ایک مقررہ نظام کے ماتحت چلا رہے تھے اور ہر گاڑی والا ان کے بازو کے اشارے کے مطابق حرکت کرتا یا رک جاتا تھا ۔ اسباب کی گاڑیوں کے آگے جو گھوڑے جُتے تھے وہ اس قدر جسیم اور خوبصورت تھے اور ایسے وقار کے ساتھ چلتے کہ انیس کا دل چاہتا کہ گھنٹوں کھڑا اس نظارے کو دیکھتا رہے ۔

کک کے دفتر میں روپے کا انتظام کرنے کے بعد یہ لوگ اسی دفتر کے ڈاک کے محکمے میں گئے ۔ انیس کے نام کا صرف ایک خط اس کے ایک دوست کی طرف سے آیا تھا ۔ گھر والوں کی جانب سے کوئی خط نہ تھا ۔ اور اگرچہ اسے معلوم تھا کہ اس کے رخصت ہونے کے بعد جو خط لکھے گئے ہونگے وہ ابھی آئندہ ڈاک میں ملیں گے ۔ پھر بھی اسے مایوسی سی ہوئی ۔

کک کے دفتر سے نکل کر لڈگیٹ ہل پر یہ لوگ ہوپ برادرس کی دوکان میں گئے اور کچھ رومال ۔ جرابیں ۔ کالر ۔ نکٹائی ۔ بنیان ۔ دستانے وغیرہ خریدے ۔ سامنے سینٹ پال کے گرجے کی عالیشان عمارت نظر آ رہی تھی ۔ لیکن چونکہ ابھی کچھ ضروری امور انجام دینے تھے اس لئے انیس نے سیر کے خیال کو فی الحال ملتوی کر دیا ۔

(باقی آئندہ)

رباعی

رازِ رحمت کسی کو معلوم نہیں
اسکی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیرِ دامِ نیرنگِ نمود
اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

روآں
ایم ۔ اے

دنیائے ادب

حسن و عشق کی داستان

یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ اُس وقت کی بات ہے جب دنیا بالکل نئی نئی تھی لوگ لباس کی بندشوں سے آزاد اور حسن و عشق کی دل فریبیوں سے ناآشنا تھے۔ اُس وقت اس دنیا پر نہ مشرقی تمدن چھایا ہوا تھا۔ اور نہ مغربی تہذیب کی سحر کاریاں تھیں۔ دنیا والے انتہائی سکون کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ اور اگرچہ حسن و عشق کے کیف سے محروم تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ فراق و ہجر کے نشتروں سے بھی ان کے جگر محفوظ تھے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ زندگی بڑے امن کی زندگی تھی۔

جب دنیا کو پُرسکون اور بے کیف زندگی گذارتے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا تو قدرت کی طلسم کاریاں حسن و عشق کو عالم وجود میں لائیں حسن کو عشق سے اور عشق کو حسن سے جدا رکھا گیا۔ ان دونوں میں ہزارہا میل کا فاصلہ تھا۔ اور یہ دونوں بالکل ایک دوسرے سے ناآشنا تھے۔ لیکن قدرت کا یہ فیصلہ تھا کہ جس روز حُسن کی مستانی کیفیات عشق کی بیچینی سے ہم آغوش ہو جائیں گی اُس روز دنیا پر حُسن و عشق کی حکومت ہوگی۔

خیال کے حدود سے بہت دور ایک خوشنما جزیرے میں ایک غیر معمولی گلاب کی کلی دیکھی گئی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس گلاب کے شگفتہ ہونے کے بعد حسن کی پیدا ہوگی۔ انسان اس روز سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس خوشنما جزیرے کے خوشنما پرندوں کے کان میں چپکے سے کوئی یہ راز کہ گیا تھا۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ ہر صبح کو طائران خوش الحان اس گلاب کی کلی کے گرد مستانہ وار گاتے ہوئے پرواز کیا کرتے تھے۔ جس وقت یہ ننھے پرند عالم کیف میں رقص کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اس غنچہ کے شگفتہ ہونے کے لئے بےچین ہیں۔

اس جزیرہ سے بہت دور لامحدود فاصلے پر ایک ایسی جگہ جہاں سمندر میں طلاطم برپا رہتا تھا۔ اور بنی نوع انسان کا وہاں گذار دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ ایک کنول کا ناشگفتہ پھول پانی پر تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ سمندر کی موجیں اس ناشگفتہ پھول کو اپنی آغوش میں لئے اِدھر سے اُدھر پھرتی تھیں۔ اور اس کے متعلق مشہور تھا۔ کہ شگفتہ ہونے کے بعد اس پھول سے عشق پیدا ہوگا۔ سمندر کی موجوں کا طلاطم عشق کی پیدائش کا راگ سالہا سال تک اسی طرح گاتا رہا۔ اور بےچین سمندر کی موجیں عشق کے دیدار کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ لیکن ابھی اس کی پیدائش کا وقت دور تھا۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ آخرکار ایک صبح کو خوشنما جزیرے میں جہاں گلاب کا ایک نیم شگفتہ غنچہ معطر فضا میں پھیلا رہا تھا۔ ایک پُرسکون ہلکی روشنی رونما ہوئی — اس روشنی میں صد ہا حُسن کے مجسمے فضا میں رقص کرتے ہوئے دکھائی دئے — عین صبح صادق کے وقت گلاب کی کلی کھلی۔ اور اس میں سے ایک پیکر جمال نے مستانہ انداز کے ساتھ اس زمین پر قدم رکھا جس پر قدرت کی گلکاریوں نے پھول کی پتیوں کا فرش بچھا رکھا تھا۔ اس کا حسن انسانی آنکھ کو خیرہ کر دینے کے لئے ایک طلسم و رعنائی کا مجسمہ تھا۔ حسن کی ملکہ تھی۔ جوں ہی اس پیکر جمال نے اپنے چہرہ کو بے نقاب کیا مست خوشبوئیں دنیا میں پھیل گئیں۔ اور اس کے حسن کی شعاعوں نے لطیف کرنوں کا جامہ پہنکر دنیا کو منور کر دیا۔

حسن کی لطیف کرنوں نے سمندر کی آغوش میں رہنے والے ناشگفتہ پھول کی سوئی ہوئی پنکھڑیوں کو چھوا ہی تھا۔ کہ سمندر میں ایک زبردست طوفان آیا۔ کچھ دیر کے بعد سمندر کا بے شمار پانی ایک جگہ جمع ہوا۔ اور جمع ہوکر وہ سطح آب سے ناشگفتہ پھول کو لئے ہوئے غیر معمولی بلندی پر اُٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ناشگفتہ کنول کے ناشگفتہ پھول کی پنکھڑیوں کے اندر ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اور اس جنبش کے بعد ناشگفتہ پھول شگفتہ پھول کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ اور اس سے ایک جوان رعنا پوری شان دلبری کے ساتھ نکل کر سطح سمندر پر اس طرح کھڑا ہوگیا جیسے کوئی پتھر کی چٹان پر کھڑا ہو جاتا ہے جس جگہ یہ جوان رعنا کھڑا تھا۔ ہاں سمندر بالکل ساکت رہا۔ لیکن چاروں طرف طوفان پر طوفان آنے شروع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا اس طوفان میں غرق ہو جائے گی۔ مردانہ حسن کی شعاعیں فضا میں پھیلیں اور وہ حسن کی شعاعوں سے ہم آغوش ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک کو دوسرے کا کوئی علم نہ تھا۔

حسن مجسم سالہا سال تک ایک پیکر جمال دوشیزہ کی طرح جزیرہ میں رہا حسن کی ملکہ اپنے حسن کی شعاعوں سے دنیا کو منور کر رہی تھی۔ لیکن اس کا دل تڑپ

اور چینی محسوس کر رہا تھا۔ اور ہمیشہ جزیرہ کے ساحل پر کسی کی تلاش میں گھنٹوں بالوں کو فضا میں پھیلائے ہوئے انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن ابھی اس کی بے چینیوں کے ختم ہونے کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ حسن مجرد مست خوشبو بنکر سمندر کے ساحل پر لوٹتا تھا۔ اور اس کے دل کی تڑپ کسی کو پیام وصل دے رہی تھی لیکن اس کیلئے ابھی دیر تھی۔ اضطراب عشق کی نباہیوں نے سمندر کے اندر ایک طلاطم برپا کر رکھا تھا۔ اور جوان رعنا کی بے چینیاں اسے اس جزیرے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ لیکن قدرت کی مجبوریوں نے اس جوان رعنا یعنی عشق کو پابند کر دیا تھا۔ اور اس میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ پانی کی گرفت سے آزاد ہوکر اپنی تمناؤں کے مرکز کو تلاش کر سکے۔ کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

آخر وہ زمانہ آگیا جب حسن مجرد عشق سے ہم آغوش ہونے والا تھا۔ اور عشق حسن مجرد سے زندگی کا کیف حاصل کرنے کا منتظر تھا۔ جزیرہ حسن میں ایک صبح کو ہزاروں پیکر جمال حسن کی دیویاں پھولوں سے نمودار ہوئیں۔ اور ان مہ جبینوں نے نازک پھولوں سے بہت سی کشتیاں تیار کیں۔ اور ایک کشتی کو ضرورت سے زیادہ آراستہ کرکے پھولوں سے سجایا۔ حسن کو اس کشتی میں بٹھایا اور سمندر کا لطف حاصل کرنے کے لئے یہ حسین جماعت سمندر کی سطح پر تیرنے لگی۔

اس طرف بحر عشق میں سمندر کے قطروں سے ہزارہا جوان رعنا پیدا ہوگئے اور انھوں نے سمندر کی لہروں پر بیٹھ کر دنیا کی سیاحت کا ارادہ کیا ایک صاف شفاف خوشنما سمندر کی لہر پر عشق بیٹھا۔ اور اس کے بعد سمندر میں نہایت سکون کے ساتھ یہ لہریں عشق اور ہزاروں نوجوانوں کو لئے ہوئے آگے بڑھیں۔

آسمان پر ایک خوشنما ہلکا گلابی رنگ کا ابر چھایا ہوا تھا۔ اور اس ابر سے خوشنما پھولوں کی پتیاں سمندر پر برس رہی تھیں۔ دنیا کے تمام خوشنما پرندے رقص کر رہے تھے۔ فضا نے موسیقی کا ایک کیف پیدا کر دیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں حسن و عشق کا اتصال ہونیوالا تھا۔ حسن نے عشق کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ عشق نے حسن کی جلوہ گری کا نظارہ کیا۔ اور حسن و عشق کے بیڑے اس سمندر میں جہاں پھولوں کی بارش ہو رہی تھی آکر ملے۔ حسن بیتابانہ عشق کی طرف بڑھا۔ اور عشق نے بیتابانہ حسن کی جانب رخ کیا۔ حسن و عشق ایک دوسرے سے ملے۔ دونوں پر ایک بیخودی کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سالہا سال سے ایک دوسرے کے لئے بیتاب تھے۔ حسن کی سہیلیوں نے عشق کے ساتھیوں کو پہلو کی زینت بنایا۔ اور عشق کے ساتھیوں نے حسن کی سہیلیوں کی گردنیں بیتابانہ باہیں حمائل کردیں۔ ایک بیچینی پیدا ہوئی اور فضا نے حسن و عشق اور حسن و عشق کے ساتھیوں کو اپنی آغوش میں لیکر تمام دنیا میں پھیلا دیا۔ یہ عشق اور حسن کی ابتدا ہے جس کے چرچے تمام دنیا میں سُنے جا رہے ہیں۔ اور آج دنیا کا کوئی حصہ اس سے خالی نہیں ہے۔ اور یہ چرچے اسوقت تک رہیں گے جبتک دنیا باقی ہے۔ (دین و دنیا)

لالہ زاروں پر برستی ہے مئے ناب جنوں ۔۔۔ چاند کی رنگیں شعاعیں ہیں کہ سیلاب جنوں

حسن مخمورِ مسرت حسن معمورِ بہار ۔۔۔ عشق بربادِ تمنا عشق بیتاب جنوں

جام کی رنگینیوں سے شمع کا لیتے ہیں کام ۔۔۔ کیف سے کرتے ہیں روشن دلکو ارباب جنوں

جانتا ہوں میں کہ وحشت ہے مآلِ آرزو ۔۔۔ دیکھتا ہوں میں کہ خواب عشق ہے خواب جنوں

جوش آتا ہے بہارِ لالہ و گل دیکھ کر ۔۔۔ مٹ چکا ہے دل مگر قائم ہیں آداب جنوں

عشق کی بیتابیاں ہیں مجھکو سامانِ نشاط ۔۔۔ حسن کی رعنائیاں ہیں مجھکو اسباب جنوں

کرلیا دنیا کو آنکھوں نے تری مسحورِ ناز ۔۔۔ ہوگئی دنیا میں ارزاں جنس نایاب جنوں

دیکھتا ہوں دل میں عابد پرتوِ انوارِ حسن ۔۔۔ (مطبوعہ) ضوفشاں ہے سوز میں نور مہتاب جنوں

عابد

ہندی

اے میرے مالک! رات گذر چکی ہے۔ صبح صادق کی سفیدی وسعت فلک پر نورانی چادر پھیلا چکی ہے۔ سیارے ساری رات کی گردش سے تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ ان کی خواب آلودہ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی ہیں۔ باغوں میں کلیاں خواب عشرت سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ اور جوش طرب سے کھل کر پھول بنتی جا رہی ہیں۔ مگر میں بدنصیب ابتک محو انتظار ہوں۔

اے میرے پتی میں تجھے کہاں ڈھونڈوں! تیری تلاش میں کہاں کہاں نہ گئی۔ تیری جستجو میں کون کون سی جگہ نہ چھانی۔ میں نے کن بیابانوں کو طے نہ کیا۔ کن دریاؤں کو عبور نہ کیا۔ کن پہاڑوں پر نہ چڑھی۔ کن جنگلوں اور کن وادیوں میں نہ گھومی۔ مگر افسوس! تجھے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ او مجھے بھول جانے والے اب تو خود ہی مجھ حرماں نصیب کی خبر لے۔ آ۔ او میرے دل کی پیاس تیرے دیدار سے بجھے۔

بنگالی

یادِ محبوب

میرے پیارے! آؤ اور دیکھو کہ تمہاری۔ آہ! صرف تمہاری سندرا کسطرح اداس بیٹھی ہے، میرے دل کے دکھ کی دوا آؤ۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ وہ کتنی غمگین ہے۔ اسکے پھول سے گال زرد ہو چکے ہیں، اسکے خوبصورت بال بکھر کر پریشان ہو رہے ہیں۔ میری جان! آؤ۔ ذرا دم بھر کے لئے آؤ اور اسکی بری حالت دیکھ جاؤ

تمہاری جدائی کا غم میری جان کا روگ بن گیا ہے، میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو چکا ہے۔ میری آنکھیں روتے روتے اپنا حسن کھو چکی ہیں، مگر آہ! اب بھی تمہاری آمد کے انتظار میں کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں ابھی تک محبت جھلکتی ہے۔ مگر ہائے دل میرے اختیار سے باہر ہوا جاتا ہے۔ میں جتنا ضبط کرتی ہوں، اتنی ہی اسکی بے قراری بڑھتی ہے، میں جتنا اس کو روکتی ہوں، اتنا ہی رہ رہ کر تمہیں ڈھونڈتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ دنیا کے رسم و رواج کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں، جوگن بنکر چپہ چپہ چھان ماروں۔ اور تمہیں ڈھونڈ نکالوں یا راہِ طلب میں جان سے گزر جاؤں۔

میرا یہ خوبصورت گورا بدن میرے یہ سیاہ اور لانبے بال جنہیں تمہارا پیارا ہاتھ معطر کرتا رہتا تھا۔ آج تمہاری جدائی میں خاک آلودہ ہو رہے ہیں

میری یہ کالی ناگنیں یہ گھونگروالی زلفیں جنہیں تم چوما کرتے تھے آج تمہارے فراق میں فقیروں کی لٹوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ میرا سینہ جس پر تم اکثر اپنا سر رکھا کرتے تھے، آج بیٹھا جا رہا ہے۔ اف! میں نے اس قدر پیٹا ہے کہ ضرور پھٹ گیا ہوگا۔ پچھلی بہار کا تحفہ۔ گزشتہ محبت کی نشانی۔ فراموش شدہ پیار کی یاد۔ میری یہ چوڑیاں جو تم نے مجھے دی تھیں۔ اب فقیروں کے کڑے بنگئی ہیں۔ اور تھالی جس میں ہم تم کھایا کرتے تھے میرے در بدر بھیک مانگنے میں کاسۂ گدائی کا کام دے رہی ہے

میری جان۔ میرے دل آرام میں اس دنیا سے تنگ آگئی ہوں، جب تم ہی نہ رہے بھلا میرا یہاں کیا کام؟ میری ماں مجھے روکتی ہے۔ میرا حسن۔ میری جوانی۔ آہ! تمہاری دولت۔ تمہاری امانت مجھے باہر نہیں جانے دیتی۔ ورنہ میری دیوانگی کا تقاضہ ہے۔ کہ اس دنیا کو چھوڑ کر تمہاری تلاش میں جنگل کی راہ لوں لیکن میں مجبور ہوں لاچار ہوں بے بس ہوں۔ مگر تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ میں تمہاری ہو چکی ہوں اور ہمیشہ کیلئے تمہاری ہو چکی ہوں۔ میں تمہاری یاد میں آنسو بہاتی ہوں اور ہمیشہ بہاؤنگی۔ مگر تم کیا مجھے بالکل ہی بھول گئے۔ میرے مالک۔ میرے پتی تم نہیں آسکتے تو کبھی کبھی سپنے ہی میں درشن دے جایا کرو۔

گجراتی

عالم بیخودی میں تیری مدھ بھری سُریلی آواز کو سنتی ہوں تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ میرے مردہ جسم میں زندگی کی رو دوڑ جاتی ہے اسوقت تیری آواز ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ میرا سارا وجود مسرت کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔

مگر آہ جب چونک اٹھتی ہوں تو یہ ساری باتیں خواب و خیال معلوم ہوتی ہیں۔ خوشی کے سال گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں۔ مگر فراق کی گھڑیاں صدیاں معلوم ہوتی ہیں۔ تیرے انتظار میں ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہوں۔ پلک جھپکانا میرے لئے حرام ہو گیا ہے۔ میرے مالک اب بھی تو آ۔

تامل

اے سرمایہ دارو تم جو رات دن مکاریوں سیہ کاریوں حرام کاریوں سے دولت اکھٹی کرتے رہتے ہو۔ اور غریبوں کی دستبرد اور زمانے کی ہوا سے بچانے کیلئے زمین میں دفن کرتے جاتے ہو۔ یاد رکھو کہ ایک دن طائر روح قفس سے پرواز کر جائیگا۔ تم مٹی کا ایک ڈھیر رہ جاؤ گے اور تمہاری دولت غریبوں ہی کے ہاتھوں میں چلی جائیگی

تلنگو

اگر تم سنسان جنگلوں اور ویران وادیوں کے باشندے ہو تو تمھیں جنگل کے خونخوار جانوروں کا ڈر کیسا ؟

اگر تم سمندر کے کنارے پر بسنے والے ہو تو تمھیں لہروں کے بے پناہ سیلاب کا خوف کیوں ؟

اگر شہروں کی گنجان اور پرشور محلوں کے رہنے والے ہو۔ تو تمھیں دلخراش آوازوں کی پروا کیسی ؟

ہر حالت میں زندگی بسر کرنے کی خو پیدا کرو۔ جدھر ہوا کا رخ دیکھو ادھر ہو جاؤ شہرت اور بدنامی کو ٹھنڈے دل سے سننے کے عادی بن جاؤ ◆

مرہٹی

اگرچہ پروردگارِ عالم ظاہری وجود سے پاک ہے۔ مگر پھر بھی میری متلاشی آنکھوں نے اسکے پر جلال جلوے کو دیکھ لیا ہے۔ اسکی عظمت، اسکی شان کی تصویریں میرے دل کی آنکھوں پر کھنچ چکی ہیں جنکو دنیا کے تمام توہمات بھی نہیں مٹا سکتے۔

اگرچہ الفاظ اسکے اوصاف نہیں بیان کر سکتے، اور استغفار سے اسکی کیفیت نہیں سمجھا سکتے پھر بھی وہ مجھ میں پنہاں ہے۔ تو چاہے تو اسکو دل کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ مگر پہلے اپنے میں شوق جستجو پیدا کر اور یقین کامل کی روشنی میں اسکی تلاش میں کھو جا۔

سنسکرت

مجھے اس سے محبت ہے، جو جمنا کے سرسبز کناروں پر ٹہلتا ہے جس نے کنس کو قتل کیا، جو برائیوں کا دشمن ہے،

مجھے اس سے محبت ہے، جسے برج کے تمام گوالے پیار کرتے ہیں، جسے گوپیاں محبت بھری شرمیلی آنکھوں سے تاکا کرتی ہیں۔

مجھے اس سے عشق ہے، جس کا سر مور کے نورانی پروں سے سجا ہوا ہے۔ جسکے خوبصورت بال گھنگریالے ہیں، اور جسکے سڈول بازو بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میں اس دیوتا کی پوجا کرتی ہوں جو تمام دکھوں کا علاج ہو جسکی بانسری مصائب و تکالیف کے تاریک پردوں کو چاک کر دیتی ہے

پالی

چار بار۔ نہیں! پانچ بار۔ میں اپنی کٹیا سے تلملا کر نکلی۔ میں مسرت کو ڈھونڈتی تھی۔ خوشی کو تلاش کرتی تھی۔ مگر آہ! یہ نعمت میری قسمت میں نہ تھی۔

میں نے کھیتوں کی وسعت میں اسے ڈھونڈا، میں ان میں گھومی بار بار چکر لگایا۔ مگر میں نے قلب کی یکسوئی کو کہیں نہ پایا، آہ! خوشی مجھ سے کوسوں دور ہی رہی

ایک دن بیٹھے بیٹھے میرے دل کے منجدھار میں خواہشوں کا طوفان اٹھا

اف! اسقدر بیتابی تھی؟ کتنی بے قراری تھی مگر سب بیکار گئی اور میں خوشی کے پاس بھی نہ پھٹک سکی، ہاں میں نے دور سے مسرت کی دیوی کو دیکھا۔ اور حسرت سے ہاتھ ملکر رہ گئی۔

مایوس ہو کر میں نے مسرت کی تلاش ہی ترک کر دی، میری خواہشوں کا خاتمہ ہو گیا، میری امیدیں ابھر ابھر کر مٹ گئیں، کہ اچانک مجھے دائمی خوشی بخش دی گئی، میرا مالک مجھ سے خوش ہو گیا، اور اب میں مسرت کی دنیا میں بے فکری کے ساتھ گامزن ہوں ◆ (اقبال)

کشمیری

یہ عالم رنگ و بو مختلف انسانوں، متضاد طبیعتوں اور عجیب الخلقت الانواع کے لوگوں کا مرکز ہے۔
ہزاروں ایسے ہیں کہ محوِ خواب ہیں پھر بھی انکے دل بیدار ہیں۔
لاکھوں ایسے ہیں کہ بظاہر ہوشیار ہیں مگر حقیقتاً خوابِ غفلت میں سرشار ہیں

لاانتہا ہستیاں ایسی ملینگی کہ وہ جمنا چھوڑ گنگا میں بھی اشنان کریں تو بھی وہ ناپاک ہی رہینگی
اور سینکڑوں ایسی شخصیتیں بھی ملیں گی جو دنیا میں منہمک رہ کر اور دنیاوی الجھنوں میں پھنس کر بھی پاک و صاف ہیں +

عربی

میں دیکھتا ہوں کہ سراب امید کی جھلکیاں تیرے ساتھ مسخر کر رہی ہیں۔ اور تو امید موہوم کی بنا پر عظیم الشان قصروں کی تعمیر میں مشغول ہے۔ کیا تجھے کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ اگلوں نے اس سے بڑے بڑے محل بنوائے تھے۔ مگر آخر وہ کیا ہوئے۔ اور اُن کی کوششوں کا انھیں کیا صلہ ملا۔ جا عاد و ثمود کی شکستہ قبروں پر جا اور پوچھ کہ اُن کے تخت و تاج کیا ہوئے۔ ان کی مضبوط بنیادیں کہاں گئیں۔ پوچھ کہ ان کا لاؤ لشکر کہاں گیا۔ ان کی ہما ہمی کدھر گئی۔ قصر شاہی کے وہ حور و غلمان کیا ہوئے۔ محافظ ہمیشہ ان کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ مگر موت کے فرشتے کے سامنے کسی کی کچھ پیش کیوں نہ گئی۔ ہر شخص کی ہوس ختم ہوگئی۔ تیری ہوس کب تک نہ ختم ہوگی۔ فانی دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے کی غلط آرزو میں اپنا عزیز وقت کیوں برباد کر رہا ہے۔ تجھے سیری نہیں ہوتی مگر سوچ تو سہی کہ یہ لاانتہا دولت تیرے بعد آخر تیرے کس کام آئیگی۔ جمع ہی کرنا ہے تو بھلائیاں کیوں نہیں جمع کرتا۔ جو دنیا میں تجھے دوامی زندگی بخشیں گی۔ اور آخرت میں بھی تیرے خالق کے سامنے تجھے سرخرو بنائیں گی

(المشرق۔ بیروت)

فارسی

دساتیر اور اوستا

ایران قدیم کا ذخیرۂ علمی و ادبی

اوستا ایران قدیم کی ایک مشہور کتاب ہے جو باختری زبان میں لکھی گئی ہے۔ ضرورت تھی کہ ایران علمی اور ادبی حیثیت سے اس کی طرف توجہ کرتا لیکن افسوس ہے کہ معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔

نہ صرف یہ کہ اس مشہور کتاب سے وہ لوگ ناواقف ہیں جن کو دوسرے مذاہب کی معلومات سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ لوگ جو ایران میں بحیثیت ایک مشہور ادیب اور فاضل کے روشناس ہیں انہوں نے بھی اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

حالانکہ ایران کے فاضل ادیبوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ایران کے قدیم اور جدید علمی کارناموں کو کوشش سے تلاش کرتے اور اُن کی بقا کے مسئلہ پر توجہ کرتے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جو اوستائی، پہلوی یا کسی ایسی زبان سے واقف ہو۔ جس کا تعلق ایران قدیم سے ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ قابل تعجب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنی قدیم زبانوں کے مسئلہ پر غور کرتے اور اوستا کی زندگی کے سوال کو اٹھاتے۔ ہمارے سامنے ایک نئی کتاب آجاتی ہے

اس کتاب کا نام دساتیر ہے اس کی زبان عجیب قسم کی ہے اور اس کو ہندوستان میں چھاپا گیا ہے۔

تعجب ہے کہ ایک مجہول الصفت کتاب کی طرف اہل علم حضرات دست طلب دراز کر رہے ہیں۔ اور اس کی اشاعت سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کو ایران قدیم کی تاریخی۔ مذہبی اور لغتی معلومات کا ماخذ قرار دے رہے ہیں۔

سب سے پہلے ۱۱۸۰ھ میں ملا کاؤس نامی ایک شخص اس کا ایک نسخہ ایران سے ہندوستان لے گیا۔ اور ۱۲۳۳ھ میں اس کے لڑکے ملا فیروز نے انگریزی ترجمہ کے ساتھ اس کو چھاپ کر شائع کرا دیا +

لطف یہ ہے کہ ایران کے آخری دور کے ادیبوں نے اس بے اصل اور جعلی کتاب کی خوب قدر کی۔

حتیٰ کہ "دبستان المذاہب" کے مصنف نے تو یہ غضب کیا کہ ایران کے مذہب قدیم کے متعلق اس سے نتائج اخذ کئے۔ اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ امر ہے کہ ماہرین لغت اور ایران کے ادیب لوگ بھی اس کو ایران کا صحیح اور اصلی لغت تصور کر رہے ہیں اور اس کے لغات کو فرہنگوں۔ اور لغات کی کتابوں میں داخل کر کے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر متاخرین کے لغات میں کسی لفظ کی تحقیق کی جائے تو اس وقت اس پر یقین نہ کیا جائے جب تک متقدمین کے اشعار سے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہ مل جائے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ جس لغت کی تم تحقیق کر رہے ہو وہ فرہنگوں میں دساتیر کی مصنوعی اور جعلی زبان سے لیا گیا ہو جس کے لغات سے متاخرین کی فرہنگیں بھری پڑی ہیں کتاب دساتیر کو ہرگز وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا جو اوستا کو حاصل ہے کیونکہ غالب خیال یہ ہے کہ یہ فرقہ اسمٰعیلیہ کی بنائی ہوئی کتاب ہے یہ یقین کر لیجئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ یہ کتاب بالکل من گھڑت۔ نقلی اور جعلی ہے جس کا ایران کی قدیم ادبیات سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ضروری ہے کہ ایران کے فاضل ادیب اور مورخ اس سے لغات کے استنباط اور تاریخی واقعات کے استخراج سے محترز ہیں۔

(نگار) حامد انصاری

ترکی

اے میرے بیٹو! تم امیر باپ کے لخت جگر ہو۔ اس کی آنکھوں کا نور اور سرور ہو، عیش کرو۔ خوشی کی زندگی بسر کرو تمہارے باپ کا دل مردہ ہوچکا ہے۔ سفید بالوں کی سپیدی نے اسکے جذبات کے رنگین گھٹا کو روشن کر دیا ہے آہ! یہ دل جو کبھی عیش و عشرت کی جولانگاہ تھا آج اسمیں خاک اڑ رہی ہے، تم مجھے نہ چھیڑو۔ میرا خون سرد ہوچکا ہے اور تمہارا خون گرم ہے، جاؤ! تم زندگی کی سردی میں اپنے خون کی گرمی کو آزماؤ۔ یہ تمہارا وقت ہے میں تمہیں نہیں روکتا جاؤ میدان زندگی میں سرگرم عمل ہو جاؤ۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اسی میں خوش ہوں۔ وہ وقت اب خواب و خیال ہو گیا جب ہم عطر میں بس کر نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کی انگلیاں ہماری طرف اٹھا کرتی تھیں دزدیدہ نگاہوں سے کسی کا دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر مسکرانا دل میں ایک قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اب مجھے پھولوں سے نفرت ہے۔ خوشبو سے نفرت ہے دوستوں کی محفلوں سے نفرت ہے۔ بلکہ مجھے خود اپنے سے بھی نفرت ہے۔

اب میں اپنے باقی دن سادگی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ مجھے نہ ستاؤ۔ موت کے پیغام کو لبیک کہنے کی تیاری میں لگا ہوا ہوں۔

قبطی

میری محبوبہ دریائے نیل کے اس پار رہتی ہے۔ اس سے ملنے کے لئے میرا دل بیقرار ہے۔ ہم دونوں کے درمیان پانی کا خوفناک اژدھا حائل ہے۔ مگر مجھ اپنے لذیذ شکار کی تاک میں چھپا بیٹھا ہے مگر میری محبت ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ محبوبہ سے ملنے کی آرزو نے مجھے نڈر بنا دیا ہے۔ ہاں۔ محبوبہ نے سلامتی کے ساتھ دریا عبور کرنیکے لئے ایک تعویذ بھی تو دے رکھا ہے۔ پھر مجھے خوف کیسا۔ میں دریا میں کودتا ہوں۔ . . . . . لہریں میرے پاؤں تلے خشک ریگ سی معلوم ہو رہی ہیں۔ اے محبت میرا ساتھ نہ چھوڑ! تیری ہی وجہ سے مجھ میں کس قدر طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی محبوبہ کے تعویذ کی برکت سے میں صحیح سالم پار اتر جاؤنگا۔ وہ تعویذ کیا ہے۔ اسکی صبح صادق جیسی پاک محبت۔

جاوی

زندگی کی کشمکش سے دور دنیا کے ہنگاموں سے الگ میں نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی ہے۔ دنیا کی آرزوئیں، اور نفسانی خواہشوں کا یہاں تک گزر نہیں ہوتا۔ میری جھونپڑی خوشی راحت اور اطمینان کا گہوارا ہے میرا گھر آمد و رفت اور میل ملاپ کی قیود سے آزاد ہے، اسکے گرد آسمانی فرشتوں کی جماعت طواف کرتی ہے، اسکے اندر مالک حقیقی کا نور جلوہ گر رہتا ہے۔ شاید تم نہیں جانتے میری جھونپڑی میرا دل ہے۔

بابلی

(اب سے پانچ ہزار سال پہلے کی اہل بابل کے خط میخی کی ایک لوح پر لکھی ہوئی مناجات)

اے خدا میرے گناہ بہت بھاری ہیں۔ میں نے حرام چیز کھائی ہے۔ جن گناہوں کا مرتکب ہوتا ہوں تجھے انکی خبر ہو جاتی ہے۔ خدایا مجھ سے خفا ہو کر میرے پاس سے واپس نہ جا۔ اور مجھے معصیت کی تاریکی میں پھنسا ہوا نہ چھوڑ۔ تیری مدد کے بغیر میں اپنے کو کیسے بچا سکتا ہوں۔ تو میرا خدا ہے میں تجھی سے فریاد کرتا ہوں اور تیرے ہی حضور میں اپنی دعا پیش کرتا ہوں۔ خدایا اپنے خادم ستارے کو میری نگرانی کے لئے بحال کر دے۔ گناہوں کے خوفناک سیلاب میں بہا جا رہا ہوں تو میرا ہاتھ پکڑ اور میرے گناہوں سے درگزر کر کے مجھے برکت دے۔

خدایا ہوا کو حکم دے کہ میری خطاؤں کو اڑا لے جائے۔ اے خدا آسمان میں تجھ سے بڑا کون ہے؟ تو ہی سب سے بڑا ہے۔ زمین پر تجھ سے کون بڑا ہے؟ تو ہی تو ہے۔ آسمان پر تیری آواز کڑکتی ہے تو سارے دیوتا فرش خاک پر گر جاتے ہیں۔ زمین پر تیری آواز گونجتی ہے تو روحیں خاک چاٹنے لگتی ہیں۔ دیوتا جو تیرے بھائی ہیں انہیں تجھ جیسا کون ہے؟ تیرے حکموں کو ٹالنے کی کس کی مجال ہے؟ تیرا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ اے خدا۔ اے میرے خالق تو ہی مجھے سہارا دے تو میرے منہ کے دروازے پر نگہبان رہ۔ اور میرے ہاتھوں کو بدکاریوں سے محفوظ رکھ۔ تو نور کا خدا ہے۔ *

~~~~~~

یونانی

دیدار الٰہی کا شوق ہے تو چشم بصیرت کھول۔ اپنی تمام قوت سے اپنے دل کی آنکھ کو اس پہ جما دے۔ اور دلیری سے اس وقت تک ٹکٹکی باندھے رکھ جبتک کہ ساری کائنات کے فرمانروا کو نہ دیکھ لے۔ ان فانی آنکھوں کی فانی پتلیوں سے تو اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اسکے اردگرد بادل کا حلقہ ہے۔ تیری یہ کمزور آنکھیں تو زمین کو بھی نہیں دیکھ سکتیں۔

روسی

کاش! موتیوں کے انبار، سونے کی اینٹیں، ریشمی لباس، حسن کی جلوہ افروزیاں، مسخر القلوب تقریریں، انقلاب انگیز تحریریں، نوبہاران ناز کی ادائیں میرے دل کی تسلی کا باعث بن سکتیں۔

کاش! یہ مدبر اصحاب، یہ شہرہ آفاق ہستیاں، یہ حسین چہرے، یہ دلوں کو مسحور کرنے والے مقرر۔ یہ خوابیدہ جذبات کے جگانے والے مصنف محبت بھرا دل بھی رکھتے۔

کاش! انکے سینے الفت و پیار کی روشنی سے منور ہوتے اور کاش انکے دل پاک محبت کے چشموں کا مخزن ہوتے، مگر افسوس! صد افسوس! یہ تمام حسین شکلیں، یہ سارے رہنما، یہ خضر صورت ہستیاں اور نیکی کے یہ مجسمے بے لوث محبت سے بالکل خالی ہیں، یہ ظاہری شان و شوکت کے دلدادہ ہے نام و نمود پہ مٹے جا رہے ہیں۔

میں ان سے تنگ آگیا ہوں۔ میرے دل کی آنکھوں نے ان کے پوشیدہ جذبات کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے دنیا انہی بد مذاقوں سے بھری ہوئی ہے اسلئے میں دنیا ہی سے اکتا گیا ہوں۔ کاش! میرا مسکن وہاں ہو جہاں سبزہ لہلہاتا ہو۔ پھول کھلتے ہوں۔ فضا مہکتی ہو جہاں گھنے درختوں کی قطاریں اپنی بہار دکھا رہی ہوں۔ جہاں پہاڑ نالے اپنے دلکش نغموں سے ساکن فضا میں تہلکہ برپا کر رہے ہوں اور جہاں خوش الحان چڑیوں کے جانفزا ترانوں نے دھوم مچا رکھی ہو۔

بس الوداع! اے جہاں بے رنگ و بو کے بسنے والو! الوداع! الوداع! اے ظاہر پرست انسانو! الوداع الوداع! اے دنیا کی مرغوب ترین چیزو! الوداع! اے بدی کی شاہراہو! الوداع! میں تم سے اکتا گیا ہوں اور اب پہاڑ کی خاموش چوٹی سے تمہاری بدنصیبی، بے بسی، مکاری، ظاہر پرستی، اور تمہاری خود غرضی، کو ایک معنی خیز نظر سے دیکھ کر صرف مسکرا دیا کرونگا *

سندھی

عورت جب ایک بار ہمارے تصور پر قبضہ پالیتی ہے۔ تو پھر ہم کو ہر طرف اسی کا جمال نظر آتا ہے۔ پہلے اسکے ابرو کی دلفریبی اپنا گرویدہ بنالی ہے پھر اس کی بھیگی آنکھیں ہم پہ ڈورے ڈالتی ہیں، پھر اسکی شرم و حیا ہمیں فریب دیتی ہے۔ اسکے بعد اسکا کھلکھلا کر ہنسنا اور اس کی پیاری ادائیں ہمیں اپنا مفتوں بنالیتی ہیں۔
~~~~~~

چینی

میرا دل تو جوں کا توں ہے۔ مگر نہ معلوم تمھارا دل کیوں پھر گیا۔ میں تین سال تک تمھاری بیوی رہی۔ اور تم کو آرام پہنچانے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ صبح سب سے پہلے اُٹھتی۔ رات کو سب سے بعد سوتی۔ میں نے اپنے عہد کو دل و جان سے نباہنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ مگر تم نے جو اقرار کئے تھے وہ اب جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں۔ میں اپنے بھائیوں کو صورت حال سے آگاہ نہیں کرتی اور اندر ہی اندر جلتی اور کُڑھتی ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ہم دونوں خلوص کے ساتھ مِلکر اپنے مستقبل کی تعمیر میں مشغول ہوتے۔ مگر افسوس! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی ہی میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے ——— ہم دونوں دریا کے کنارے کیسے مزے کی سیر کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت ہم جو باتیں کرتے تھے وہ کتنی سچی معلوم ہوتی تھیں۔ اسوقت میرے سان گمان میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ تم عہد و فا کو یوں بھول جاؤ گے۔ اور مجھے جدائی کے یہ دن دیکھنے پڑینگے اور رو رو کر زندگی گذارنی ہوگی۔

جاپانی

بہار کا خوشگوار موسم ہے۔ ہر شخص مسرور نظر آرہا ہے مگر میرے دل کے زخم اور بھی ہرے ہو گئے ہیں۔ میری کائنات میرے شور گریہ میں کھو گئی ہے۔ مجھے اپنے نالہ و شیون کے سوا اور کوئی صدا سنائی نہیں دیتی۔ جسطرح ریشم کا کیڑا اپنے خول کے اندر بند پڑا رہتا ہے اسی طرح میں بھی اپنے جگر شگاف آہوں کے حلقے میں بیٹھا آنسو بہا رہا ہوں۔ رات کے سیاہ پردے پھیلتے جارہے ہیں اور میری سفید آستینیں آنسو سے تر ہوتی جارہی ہے۔ کسی سے بولنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اپنے محبت کی دردناک داستان کس کو سناؤں میرا دل تیرے لئے بے قرار ہے۔ اگر تیرا دل بھی میرے لئے بیچین ہے تو تا خیر اور یہ حیلے بہانے کیوں ہیں۔ کوئی راہگیر اس آہ و زاری کی وجہ پوچھ بیٹھا تو تو ہی بتا کہ کیا جواب دونگا۔ کہیں تیرا پیارا نام منہ سے نکل گیا تو میرے چہرے کی شرم آلود کیفیت سے ہماری محبت رسوا ہو جائیگی۔ مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں کہدونگا کہ چاند دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں جو اس پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہو رہا ہے۔ راہگیر تو مان جائے گا مگر میرا دل تیرے بغیر کیسے مان سکتا ہے!

فرانسیسی

قسمت

ابتدائے ازل سے عام لوگ یہ کہتے آئے ہیں، کہ قسمت بھی ایک پوشیدہ طاقت ہے، انسانی خیالات، انسانی جذبات، انسانی دماغ، انسانی عقل و فہم کو انسانی حوادثات میں کوئی دخل نہیں، کشتئ حیات حوادث میں قسمت ہی کے بے پناہ تھپیڑوں کے بس میں ہے، مصائب کی بھیانک راتوں میں قسمت ہی انسان کی مددگار ہوتی ہے۔ انسانی ادراک کی پرواز صرف معمولی واقعات کی سطح تک ہوتی ہے، اسکے آگے انکی رسائی امر محال ہے۔ دنیا کے تمام واقعات صرف قسمت ہی کے ممنون ہیں عدل و انصاف کا انسانی دنیا میں کوئی دخل نہیں۔ جو ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور جو ہونے والا ہے وہی ہوگا۔

مگر عقلمندوں کے نزدیک قسمت کوئی چیز نہیں یہ صرف انسانی توہمات کی تصویر کا ایک رُخ ہے یہ صرف لفظوں کا مجموعہ اور انداز بیان کا ہیر پھیر ہے۔ ہم بزرگوں کے مقولوں داناؤں کی تدبیروں اور اگلوں کے خیالات کی پیروی اُسی حد تک کرتے ہیں جہاں تک اُن سے ہم کو فائدہ پہنچ رہا ہو، انکی اُسی وقت تک قدر کیجاتی ہے جب تک وہ خوشی راحت اور آرام و آسائش کا باعث بن سکیں اور اگر وہی باتیں تکالیف و مصائب کا ذریعہ بنجائیں تو یہ ہماری قسمت کا قصور، ہم اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو اس کامیابی کو اپنے شب و روز کی محنت کا ثمر بتاتے ہیں ناکام رہیں تو اسکو قسمت کے سر تھوپ دیتے ہیں　　(اقبال ؟)

انگریزی

فنِ مصوّری کے متعلق ایک مشہور ادیب کے خیالات

بعض اوقات انسان کو اپنے معتقدات میں یکسر تبدیلی کرنا پڑتی ہے - مجھے یاد ہے کہ میں کہا کرتا تھا "مصوّری اپنے عروج کے آخری زینہ تک پہنچ چکی ہے - کوئی ایسی جمیل شے نہیں جس کو مصوّر کے موقلم نے غیر فانی نہ بنا دیا ہو - کوئی ایسا حسین منظر نہیں جسے انسان کی چابکدستی نے فطرت کے خزانے سے چرا نہ لیا ہو - نقوش و رنگ کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو کاغذ پر منتقل نہ ہو چکا ہو - یہ صنعت اب انحطاط و زوال کی طرف جا رہی ہے"

یکایک ۴۰ سال کی عمر میں مجھے محسوس ہُوا کہ میری رُوح الفاظ کے علاوہ کسی اور مظہر کے تلاش میں سرگرداں ہے میرے احساسات حروف کے مجموعے میں اپنی نہ ختم ہونے والی تشنگی کو سیراب نہیں کرسکتے - اور نقوش کے پُراسرار موزونیت میں گُم ہو جانا چاہتے ہیں -

میں نے بارہا اپنے آپ سے سوال کیا ہے - کیا وجہ ہے کہ میری رُوح اظہارِ احساس کے لئے رنگ آمیزی کی محتاج ہے ؟ ۲۰ سال کے عرصے سے میری شخصیت مترنم الفاظ کے آبشار میں کھو جاتی رہی ہے یکایک میری رُوح کو اس شیریں موسیقی سے کیوں دلبستگی نہیں رہی ؟

لیکن دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے - گردشِ روزگار انسان کی تدبیر سے متاثر نہیں ہوتی - اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں اکثر اس کے خلاف ظہور پذیر ہوتا ہے -

بارش ہو رہی تھی - اور مجھے اپنے کمرے میں سے باغ کا کچھ حصّہ نظر آتا تھا کائنات پر ایک افسردگی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مینہ کی بوچھاڑ گھبرائے نازنین کو طمانچے مار رہی ہے -

اتنے میں ایک شکستہ حال فقیر نے دروازے پر دستک دی - اس طوفانِ باراں میں دروازہ نہ کھولنا گویا اس کے قتل میں معاون ہونے کے برابر تھا - وہ اندر داخل ہوا - اس کے پاس تصویری کینوس (canvas) کے چار ٹکڑے تھے - نہایت صاف دودھیا رنگ - میں نے انہیں خرید لیا -

کچھ رنگ - اور چند موقلم - اور میرے پاس موجود تھے - میں ایک ٹکڑے کو سامنے لیکر بیٹھ گیا - اسوقت کے احساسات کی تشریح نہیں ہوسکتی - موقلم کو رنگ میں ڈبو لیا - اپنے خیالات کا ایک دھندلا سا خاکہ میں اس طرح کھینچ سکتا ہوں اور یہ کہوں کہ میرے سامنے ایک بحرِ ذخار تھا - اور میں ان میں غوطہ زن ہونا چاہتا تھا - خدا جانے مجھے سمندر کی تہ میں خوفناک آبی جانوروں سے پالا پڑیگا یا کوئی جگمگاتا ہوا لعل بے بہا ہاتھ آئیگا -

اس بحرِ ذخار میں غوطہ لگا کر انسان فوراً اپنی جان بچانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ماہر مصوّر کی تیز نظر ہر ایک فنی اصول کی خلاف ورزی کو ایک ناقابلِ معافی گناہ تصور کرتی ہے - اور ایک تیز سوئی کی طرح عیوب کو کرید کر نکال لیتی ہے -

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصوری کے شاہکار مشق اور صنعتی اصولوں کے پیروی سے تخلیق نہیں کیئے گئے - بلکہ وجدان ذوق کے کیف آفریں اثرات کا نتیجہ ہیں - میری پہلی تصویر "ایک مقدس خاندان" محض ایک وجدانی کیفیت کی آواز بازگشت ہے - یہ تصویر آدھ گھنٹے میں مکمل ہوگئی - ایک معمر شخص ایک ادھیڑ عمر کی عورت - ایک بچّہ نیلگوں لباس پہنے ہوئے - کمرے فضا میں کچھ تاریکی سی - عصرِ حاضرہ "واقفیت" کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے - ہم سب کچھ جانتے ہیں - لیکن ہمارے احساسات بالکل مردہ ہیں - شاید ہی کوئی ایسا شعلہ بدامن جذبہ ہوتا ہو جو ہمارے دل میں کوئی شرارِ احساس مشتعل کرتا ہو -

مصوّری کا فن بھی اسی مردہ دلی کا شاکی ہے - فن کے متعلق نظریئے قائم کیئے جاتے ہیں - مگر کوئی شخص فن کی رُوح کو واضح نہیں کرسکتا - شاید یہی وجہ ہے کہ مصوّری میں "شاہکار" ایک لفظ بے معنی ہوگیا ہے - آجکل کا فن نقوش و سطوح کے ایک مہمل مجموعے کا نام ہے - میں کہتا ہوں نظریئے قائم کیئے جاؤ مگر جب کسی حسن و جمیل شے کے عکاسی کرنے لگو تو سوائے اپنے احساسات کے دنیا کی ہر شے کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لو -

میں اصول فن کا قائل نہیں - شاید میں "مصور" نہیں - مگر اتنا میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں تصویر کھینچ سکتا ہوں - اور میرے لئے یہی کافی ہے -

ہزاروں مصور ایسے ہیں جو "کینوس" کے خدا ہیں لیکن مصوری سے انہیں کوئی تعلق نہیں - وہ "کینوس" پر ہر طرح کے نقوش بنا سکتے ہیں - نادر رنگ آمیزی کر سکتے ہیں - مگر ان کے نقوش میں "زندگی" نہیں وہ شعلہ جو صفحہ تصویر کو ازل سے روشن کرتا ہے - مفقود ہے اگر تصویر میں "مسرت" کی چمکتی ہوئی بجلی نہیں - یا "غم" کی گہری ظلمت نابود ہے - تو گویا تصویر مردہ ہے -

"مصور" ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی رُوح میں جلا ہو - ورنہ اصطلاحی اصول اور فنی نکات بالکل بے کار ہیں - صنعت کے ہر مدرسے کے دروازے پر یہ لکھ دینا چاہئے - "مبارک ہیں وہ لوگ جن کی روح مجلی اور روشن ہے - کیونکہ آسمانی بادشاہت انہیں کی ہے"

یہ ضروری نہیں کہ "مصور" خوش اخلاق ہو - یا "زہد" کے امتیاز سے زبان زد خلائق ہو - اگر وہ ایک سیب کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اس کا رنگ "زندگی کے جوش سے جگمگا اُٹھے - تو یقیناً اس کی رُوح کو "مجلی" کہنا پڑیگا -

"روح کی جلا" "نیکی" کی ہم معنی نہیں - لیکن اس سے متضاد بھی نہیں - "رُوح کی جلا" تو ایسی شے ہے کہ اس کے ڈانڈے "الوہیت" سے ملے ہوئے ہیں -

"الوہیت" فطرت کی حقیر اشیا میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے - مجھے تو یہ شے گلاب کی نازک گلابی پتیوں اور ان کی زوال پذیر فطرت میں متاثر ہو کر کسی گلاب کے پھول کی تصویر کھینچوں تو یقیناً وہ مصوری ہے - ورنہ نقالی سے زیادہ نہیں - کاش صنعتی مدرسوں میں مدرس بجائے یہ کہنے کے

"یہ نقوش غلط ہیں - متوازی نہیں - بے پروایانہ انداز سے کھینچے گئے ہیں"

یہ کہا کریں "یہ نقوش ذوق سلیم کے منافی ہیں انمیں "زندگی" کی تڑپ نہیں ہے"-

افسوس ہے کہ صنعت کو ایک سائنس تصور کیا جاتا ہے - حالانکہ صنعت مذہب کا ایک شعبہ ہے - جن "دس احکام" کی پیروی اشد ضروری ہے - صنعت ایک کامل وحدت ہے جو ایک درمیانی کڑی کی طرح "تخلیق" اور "خالق" میں ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرتی ہے - (ماخوذ سٹوڈیو)

جرمن

یہ زندگی - ہاں یہ خوشنما زندگی موت سے کم نہیں - اگر اشعار کی چاشنی سے لطف اندوز نہ ہو - شعر خوابیدہ جذبات کا ترجمان ہے حسیات کے خاموش ستار کے لئے مضراب ہے - شعر فطرت کے پوشیدہ جمال کا آئینہ ہے - اور شاعر اس کا رازدار - شعر ابد اور ازل کے واقعات کا خزینہ ہے - شعر انسانی خیالات کی تصویر ہے - شعر ہم کو دائمی بہار عیش و عشرت کے زمانے - خوشی و مسرت کی دنیا - اور لازوال حسن کی کائنات بخش دیتا ہے - کسی وارفتہ سے پوچھو کہ شعر کیا ہے ؟ شعر آئینہ ہے تصویر حسن کا - شعر شوخی ہے تحریر الفت کی شعر قطرہ ہے خون جگر کا - اور شعر دفتر ہے اثر و تاثیر کا - شعر پیکر فرقت کا نالہ بھی ہے اور لطف انتظار کی شرح بھی - شعر ہی تنزل کی دوا ہے - اور مردہ قوموں کے لئے صور اسرافیل بھی ✣

تبصرہ

سیرِ عراق:۔ دنیا کے قدیم تمدن کا مرکز ہونیکی حیثیت سے عراق کا جو مرتبہ ہے مدت ہوئی اس کا اندازہ ایک حد تک الہامی کتابوں اور آسمانی صحیفوں سے کر لیا گیا تھا مگر اب علوم و فنون کی ترقی اور آثار یات (آرکیالوجی) کے ماہروں کی کوششوں سے اس کے پنہاں گوشے بھی نمایاں ہو چکے ہیں۔ کلام الٰہی اور جدید تحقیق کی مطابقت نے اہل ایمان کے لئے روحانی تسکین اور اپنے مذہب کی حقانیت کی مزید تصدیق کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کا یہ خطہ قدرت کے جلال و جبروت اور فطرت کی نیرنگی کا ایک مظہر ہے۔ کتنے بڑے بڑے نامور اس سرزمین سے اٹھے مگر آخر فنا ہو کر کس طرح گمنامی و بے نشانی کے پردے میں چھپ گئے۔

اسلام نے بھی اس سرزمین میں پہنچکر کوئی معمولی ترقی نہیں کی۔ اسلامی علوم و فنون کے آفتاب کے لئے یہی خطہ خط نصف النہار ثابت ہوا مگر اسلام کی خونی روایتیں بھی سب سے زیادہ اسی سرزمین میں دفن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی سیاحت متضاد کیفیات کی حامل ہوتی ہے۔ کلدانیوں کے آثار۔ بخت نصر کی یادگاریں سکندر کی عظمت اور اس کے قبر کی بے نشانی انسان کو مرعوب کر دیتی ہے۔ ہارون و مامون کی یاد۔ علوم و فنون کی تابانی کا خیال۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی سرزمین کی زیارت طبیعت میں مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہدائے اسلام اور ائمہ کرام کی خونیں داستان سے منتشر اوراق خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ در و دیوار شجر و حجر بلکہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ انسان کو حق پرستی اور ایثار و قربانی کی دعوت دینے لگتا ہے۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو کم سے کم اس خطۂ پاک کی سیاحت کرنے والا فطرت کی چیرہ دستی کا بچشم خود مطالعہ کر کے اپنے میں ایمان و ایقان کی ایک پائدار اور تسلی بخش کیفیت محسوس کرتا ہے۔ لاکھوں آدمی جب دنیا کی آلائشوں سے گھبرا اٹھتے ہیں تو روحانی تسکین کی گراں مایہ جنس کی تلاش میں اسی منبع کی طرف دوڑتے ہیں۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے شائقین کی سیاحت کیلئے ایک بے نظیر پروگرام تیار کیا ہے اور کرسمس کی چھٹیاں عراق کی مقدس سرزمین کی سیر و سیاحت میں گزارنے والوں کے واسطے برٹش انڈیا سٹیم نیویگیشن کمپنی اور عراق ریلوے سے ملکر ہندوستان سے عراق تک کے سفر کا سامان مکمل کر دیا ہے۔ سیاحوں کی آسانی کیلئے اخراجات کی پوری تفصیل کے علاوہ اس تاریخی سیاحت کے مشہور مقامات کی مختصر مگر جامع تاریخ بھی ایک رسالے کی شکل میں جمع کر دی ہے۔ یہی رسالہ اسوقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اسمیں بصرہ۔ بغداد۔ کربلائے معلےٰ۔ نجف اشرف۔ کاظمین شریفین۔ بابل۔ کش۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مولد شہر ار وغیرہ کی قدیم و جدید کیفیت نہایت شگفتہ زبان میں بیان کیگئی ہے۔ یہ رسالہ پبلسٹی آفیسر نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور سے مفت ملسکتا ہے۔

دین دنیا:۔ یہ رسالہ ۱۹۲۱ء سے دہلی سے نکل رہا ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ ہی اردو کی ادبی خدمت میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ کلام الٰہی کے اسرار۔ مدنی کا فلسفہ عارفانہ سرمستیاں حافظ کا میکدہ۔ گلستاں کے پھول۔ علم و عمل وغیرہ اس کی مستقل سرخیاں ہیں۔ انشاء لطیف کے ماتحت جو چیزیں لکھی جاتی ہیں ان میں ادب کی چاشنی کے علاوہ غور و فکر اور عبرت و بصیرت کا کافی سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ تقریباً ہر پرچے میں التزام کے ساتھ دلچسپ انداز بیان میں مغربی تہذیب و تمدن کے "برکات" پر روشنی ڈالکر مشرق کو اس کی آفتوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چند صفحات صنف نازک کے لئے مخصوص ہیں۔ جن کے ذریعے سے بہو بیٹیوں کو مذہبی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم دیجاتی ہے۔ اور انہیں نسوانی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے طریقوں کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دلکش افسانے بھی بڑے دلچسپ اور عموماً اخلاقی ہوتے ہیں "علم و ادب کی روح" کی سرخی کے ماتحت ہر مہینے ہندوستان بھر کے رسایل کی روح کھینچکر رکھدی جاتی ہے۔ وقتی مسائل پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کیجاتی ہے۔ ہر پرچے میں کم سرمایہ والوں کے لئے روزی حاصل کرنے کے چار پانچ آسان طریقے بتائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ۸۰ صفحے کے اس رسالے میں دین و دنیا کے متعلق اتنا کچھ بھر دیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ عام طور پر مذہبی رسالے زبان کی صحت اور اسلوب بیان کی جدت کا خیال نہیں رکھتے مگر "دین و دنیا" کے ایڈیٹر مفتی شوکت علی فہمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مذہب اور ادب دین اور دنیا کو کامیابی کے ساتھ ایک جگہ جمع کر کے نہ صرف اردو کی

خدمت کی ہے بلکہ اُن لوگوں کے لئے اسلام کے مطالعے کا سامان کر دیا ہے۔ جو خشک مذہبی رسائل اور ان کی شکستہ اور پراگندہ زبان کے پڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ رسالے کی ظاہری شکل و صورت بھی بیسیوں میں ایک ہوتی ہے۔ اگرچہ کتابت بہت باریک ہوا کرتی ہے مگر صاف ستھری ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں وقت نہیں ہوتی۔ کاغذ سفید اور چکنا لگایا جاتا ہے۔ بلاک کا چھپا ہوا رنگین ٹائٹل ہر دیکھنے والے کو رسالے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت قابل تعجب حد تک کم یعنی صرف دو روپیہ سالانہ ہے۔

چمن:- یہ ادبی رسالہ مسٹر چمن لال سیوک کے زیر ادارت تین سال سے امرتسر سے نکل رہا ہے۔ پہلے طرف نو مشق شاعروں اور نوجوان مضمون نگاروں کی جدت طرازیوں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب سے سردار پورن سنگھ ہنر کی نگرانی میں آیا ہے۔ بڑے بڑے کہنہ مشق مشاہیر کے مضامین بھی اس میں نظر آنے لگے ہیں۔ اور موجودہ علمی و ادبی حیثیت کے لحاظ سے پنجاب کے بہت سے پرانے رسالوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اور اس کی تدریجی ترقی کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی روز بروز اس کا معیار بلند ہوتا جائیگا۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ ہر چیز اعلے درجے کی ہے۔ ٹائٹل بھی دیدہ زیب ہے۔ ہر پرچہ ۲۰×۳۰/۸ کے ۸۴ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ فوٹو بلاک کی دو ایک تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ سالانہ چندہ ۱۲/۸ رہے۔

ص...

فرہنگ

الفاظ	معانی
الف	
اجتماعی -	سماجی
آرایش -	سجاوٹ
آمیزش -	ملاوٹ
اعتراف -	اقرار
انحطاط -	زوال
آبشار -	جھرنا
اُلوہیت -	خداپن
آستانہ	دہلیز
اضطراب	بےچینی
انہدام -	گرنا - مٹنا
آثار	نشان
استدلال	دلیل لانا
ادراک باطنی	اندرونی طور پر سمجھنا
انکشاف باطنی -	اندرونی پر کسی چیز کے راز سے واقف ہونا -
الہامی -	خدا کی طرف سے بھیجا ہو
الم -	غم - تکلیف
ازل -	جس کی ابتدا کوئی نہ ہو
ابدی -	جسکی انتہا کوئی نہ ہو
انفعال -	اثر قبول کر لینا -
ب	
بلوریں -	بلور کی طرح
بیم -	خوف
بسمل -	تڑپنے والا
پ	
پس انداز -	بچایا ہوا
پنہاں -	چھپا ہوا
ت	
تسخیر	فتح کرنا
تکمیل	پورا کرنا
تحت اللفظ	لفظ بلفظ
تخلیق -	پیدا کرنا
تفکر -	سوچنا
تدبّر -	سوچنا
تناسخ -	جون بدلنا
تصور -	خیال
تعاقب -	پیچھا کرنا

الفاظ	معانی
ترنم ریز	نغمہ برسانے والا
تحلیل ہونا -	حل ہو جانا
تعمیر -	عمارت بنانا
ج	
جاودانی -	ہمیشہ رہنے والی
جلا -	صفائی - روشنی
ح	
حسرت	افسوس
حتی الامکان -	جہانتک ہو سکے
حمائل کرنا -	لٹکانا
حریم -	چاردیواری - خلوت
خ	
خردسال	کم عمر
خود فراموش -	اپنے کو بھول جانے والا بھلکڑ
د	
دہقانیت -	گنوارپن
دقیق -	نازک - باریک
دشت	میدان - جنگل
دوشیزہ	کنواری
دارالخلافہ	حکومت کا صدر مقام
دود -	دھواں
ر	
رائے عامہ	پبلک کی رائے
رموز -	باریک باتیں - اشارے راز - رمز کی جمع
رسوا -	بدنام
س	
ساکن	ٹھہرا ہوا
ساحر	جادوگر
ش	
شاہکار -	کارنامہ - ماسٹر پیس
شعاع -	کرن
شرربار -	آگ برسانے والا
شبنم -	اوس
شہ وار -	قیمتی
شعلہ بداماں -	مضطرب - بےچین

الفاظ	معانی
شرار	چنگاری
شمائل	شکل - صورت
شراب ناب	خالص شراب
شعوری -	وہ چیز جو دماغ اور ذہن سے تعلق رکھتی ہو -
ع	
عمران	آبادی
عامل	تجربے کرنے والا - حاکم
عروج	ترقی
عالم اسباب	دنیا
عناصر	عنصر کی جمع - جن سے دنیا بنی ہے - (آگ - ہوا - پانی - مٹی)
غ	
غیر محسوس	جو معلوم نہ ہو
غیر فانی -	امر - ہمیشہ رہنے والی
غیر متوقع -	جس کی امید نہ ہو -
ف	
فلک نما	آسمان جیسا
فضا	سماں
فانی	مٹ جانے والا
فطرت	نیچر
فلک شگاف -	آسمان میں سوراخ کرنیوالا بلند
فاعلی -	کام کرنیکی حالت - اثر ڈالنے کی حالت
ق	
قصر	محل
ک	
کاشانہ	گھر
کائنات	سارا جہان
کیف آفریں	نشہ پیدا کرنے والا
کوثر	جنت کی ایک نہر
کامگار -	کامیاب
کرب	تکلیف
ل	
لامتناہی -	ختم نہ ہونے والا
لطیف	نازک - باریک

الفاظ	معانی
لغزش	غلطی - [illegible]
م	
معاشرتی	سما[illegible]
منظر -	نظر آنیوالی چیز[illegible]
مظہر -	کسی چیز کے ظاہر[illegible]
منکشف -	کھلا[illegible]
مترجم	ترجمہ کرنے[illegible]
معیت	سا[illegible]
متبرک	پاک - [illegible]
معصوم -	بےگن[illegible]
موسیقار -	ایک [illegible]
مایہ مسرت -	خوشی کا س[illegible]
مخمور -	مست
معتقدات -	وہ چیزیں جن [illegible] لایا گیا
موزونیت	مناسبت [illegible]
معاون	مد[illegible]
مجلّٰی	صاف -
مترنم	جس میں ترنم پا[illegible]
مدفون	چھپا ہوا - دفن[illegible]
منجمد	جما ہوا - [illegible]
متشککین -	شک کرنے و[illegible] فلسفیوں کا ایک فرقہ - جو کس[illegible] حقیقت پر کوئی یقینی رائے
مادی -	دنیوی - مادہ [illegible]
مآل	بیشتر [illegible] انجام
مسحور	جس پر جادو [illegible]
ن	
نظریہ -	تصو[illegible]
نکہت	خو[illegible]
نشیب	نیچی [illegible]
نصب العین	مقصد
و	
واویلا	رو[illegible]

رجسٹرڈ

ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۱ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۹ع | نمبر (۸)

تصاویر: (۱) نشاط باغ (سہ رنگی)۔ (۲) شالامار باغ کشمیر (۳) مس ایفل بینن (۴) زندگی کا معمہ (۵) ریمزے میکڈانلڈ۔ انکے صاحبزادے اور صاحبزادیاں (۶) لارڈ اِرون کی صاحبزادی (۷) فرانس کی زندہ جاوید شہید جون آف آرک (۸) ایک مصری شہزادی (۹) گم شدہ حلقہ ٭

حال وقال

کرامت اور معجزہ

کوئی خدا رسیدہ انسان اپنی روحانی طاقت سے کوئی حیرت انگیز کام کر دکھائے تو مذہب کی اصطلاح میں اُسے کرامت کہتے ہیں - اور اگر یہی کام کسی نبی سے نبوت کے دعوے کی تائید میں ہو تو اُسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہا جاتا ہے -

"ادبی دنیا" کا پہلا نمبر نکلا تو ایک مشہور ادیب نے کہا تھا کہ

"اردو ادب میں اس شان کا پرچہ جاری کرنا کرامت سے کم نہیں ہے - اور اس کا قائم رکھنا تو قطعاً معجزہ ہو گا"

ان کے خیال میں چونکہ ہم پیمبر نہ تھے اور نہ بن سکتے تھے - اس لئے ادبی دنیا کے قائم رکھنے کا معجزہ بھی کبھی ہم سے ظہور میں نہیں آ سکتا تھا -

ادھر ہمارے بہت سے مہربان جو ادبی دنیا کے دفتر سے ہر بُری خبر سننے کیلئے اپنی ہر مسرت قربان کر سکتے ہیں - وہ بھی ہر نمبر کی اشاعت پر اسی رائے کا اظہار کرتے رہے ہے کہ ادبی دنیا کا بس یہ آخری نمبر ہے اس کے بعد کوئی نمبر شائع ہوا تو معجزہ ہی ہو گا - خدا کی شان دیکھئے کہ آٹھ ماہ سے ہر تیس دن کے بعد یہ معجزہ ہم سے ظاہر ہو رہا ہے - لیکن دوست دشمن کسی کی طرف سے ہماری پیمبری کی تائید میں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی - پیمبری کی عزت دینا تو درکنار - گرامی مرحوم کی زبان سے یہ اعتراف کرنے کو بھی کوئی تیار نہیں ہوا کہ

"پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت"

بہر حال - ادبی دنیا کی اشاعت معجزہ ہو یا کرامت - حالات کی بنا پر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ قدرت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ دوستوں کے اندیشوں اور دشمنوں کی آرزوؤں کے خلاف ادبی دنیا ضرور جاری رہیگا -

"ادبی دنیا" کا محفوظ سرمایہ

اردو ادب کے متعلق اپنے انقلابی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے ہم نے "ادبی دنیا" جاری کرنے سے پہلے مستقبل کے مشکلات کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا ہمیں معلوم تھا کہ اس تجارت میں بیحد ایثار کرنا پڑیگا - وقت اور روپے کا نقصان بھی اٹھانا ہو گا - لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی خود اعتمادی اور استقلال کی بنا پر اسکا بھی یقین تھا کہ "ادبی دنیا" کامیاب ہو کر رہیگا - احباب نے ہماری تجارت کو مجرمانہ ناعاقبت اندیشی بتایا - ماہرین تجارت نے ہمارے لئے پاگل خانہ تجویز کیا - مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اشاعتی کام پہلی بار نہیں شروع کیا تھا - ہمیں معلوم تھا کہ اچھی جنس پیش کی جائے تو غیر ممکن ہے کہ اس کے خریدار نہ پیدا ہوں - ہمیں اس کا بھی تجربہ تھا کہ سرمائے کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا - ہم یہ بھی جانتے تھے کہ درخت لگانے کے دوسرے ہی دن پھل نہیں حاصل ہوا کرتا - ہم نے اس کا بھی حساب لگا لیا تھا کہ ابتدائی پانچ سال تک کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ خسارہ بھرنا پڑیگا - ہمارے حوصلے خواہ کتنے ہی بلند ہوں مگر یہ ساری باتیں جان بوجھکر سرمائے کا انتظام کئے بغیر اس صبر آزما تجارت کی جرأت کیونکر کیجا سکتی تھی - ہم نے خدا پر بھروسہ کر کے مستقبل کے خطروں سے بے نیاز ہو کر اپنے تمام ذرائع آمدنی کے علاوہ پانچ سال کے خسارے کی رقم "ادبی دنیا" کے لئے وقف کر دی جس میں سے ابتک تقریباً آٹھ ہزار روپے خرچ بھی ہو چکے ہیں -

خسارہ ہمارے اندازے سے بڑھ گیا - اور سال بھر میں پانچ ہزار کے بدلے ہمارے حوصلے کی جولانیوں کے طفیل میں صرف آٹھ ماہ میں ادبی دنیا کے محفوظ سرمائے کے آٹھ ہزار روپے صرف ہو گئے - مگر اس کے ساتھ ہی خسارے کی مدت بھی کم ہو گئی ہے ابتدا میں ہمارا خیال تھا کہ دس ہزار خریدار پانچ سال میں مہیا ہو سکینگے مگر اب حالات بتا رہے ہیں کہ انشا اللہ یہ تعداد ڈیڑھ دو سال میں پوری ہو جائیگی - پہلے ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ادبی دنیا کا آٹھواں نمبر چار ہزار چھپوانے کی ضرورت محسوس ہوگی اور اردو صحافت میں ادبی دنیا اتنی جلد ریکارڈ قائم کر دیگا - اب ہم اپنے پروگرام کی تکمیل کا وقت قریب آ جانے پر متحیر بھی ہیں اور مسرور بھی - کامیاب اور خوش منظر مستقبل نے اب ہمارے حوصلے اور بھی بلند کر دئے

ہیں - اور خدانخواستہ تین سال تک مسلسل دس ہزار روپے سالانہ نقصان ہوتا رہا تو بھی ہم ہمت نہیں ہار سکتے اور جس سفر کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں اس سے منہ نہیں موڑ سکتے -

خاموش چیلنج

ہم نے جس ادبی پروگرام کو ملک کے لئے مفید سمجھا اس کو ادبی دنیا کی صورت میں پیش کر دیا - حاشا و کلا - اس کے اجرا سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ دوسرے رسالے فنا ہو جائیں یا انکی زندگی خطرے میں پڑ جائے - مگر ادبی دنیا کی غیر معمولی بلند معیاری اور غیر معمولی شان و شوکت کو بعض ہمعصروں نے بجا طور پر ہمارا خاموش چیلنج خیال کیا - اب وہ اپنی زندگی کو خطرے میں محسوس کر کے "ادبی دنیا" کے متعلق عجیب و غریب افواہیں اڑا رہے ہیں اور اپنے خریداروں کو ٹوٹتا ہوا دیکھکر اپنی زندگی کا یقین دلانے کی بجائے ادبی دنیا کی موت کی خوشخبریاں سنا رہے ہیں - کاش وہ اپنی قوت عمل کو ہمارے خلاف پروپیگنڈے پر صرف کرنے کی بجائے اپنے پرچے کی بہتری پر خرچ کرتے تو اردو ادب کا دامن بدمذاقیوں سے پاک ہوتا - اور وہ بھی نفع میں رہتے - مگر اب معلوم ہو رہا ہے کہ مٹی کے تیل کے ان چراغوں کی صبح نمودار ہو چکی ہے اور "ادبی دنیا" کے آفتاب کے سامنے اندھیری رات کے جگنوؤں کو حشرات الارض کے انجام میں شریک ہونا ہی پڑیگا -

"ادبی دنیا" کے تین ہزار مستقل ناظرین میں سے تقریباً نصف وہ لوگ ہیں جو ادبی دنیا سے پہلے کسی دوسرے پرچے کے خریدار تھے - ادبی دنیا کے دفتر میں آکر ہر شخص اس واقعہ کی تصدیق کر سکتا ہے - ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور خریدنے والوں کے سیکڑوں خطوط اس قسم کے دفتر میں موجود ہیں کہ

"ہم فلاں رسالے کے خریدار ہیں اسکی میعاد خریداری فلاں مہینے ختم ہو جائیگی - اسکے بعد ہم اس کی بجائے ادبی دنیا کے خریدار ہونا چاہتے ہیں - اس لئے فلاں مہینے کا ادبی دنیا ہمارے نام وی - پی کے ذریعے بھیج دیا جائے -"

اُدھر ہمارے بعض ہمعصر اپنے میں ہماری طرح جرأت اور ایثار کا مادہ نہ پاکر محسوس کرتے ہیں کہ "ادبی دنیا" کی موجودگی میں ان کے نمائشی پرچوں کی جعلی زندگی کا برقرار رہنا غیر ممکن ہے تو انکو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر ہی نہیں آتا کہ "ادبی دنیا" کی تخریب اور اسکی شہرت کو نقصان پہنچانے کے ہر ممکن ذریعے سے کام لیں -

ادھر خدائے برتر نے ہمیں یہ توفیق عنایت کر دی ہے کہ ہم اپنے ناکام حریفوں کی تخریبی کوششوں سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی تعمیر و ترقی میں لگے رہیں - پھر جب ہم میں اُن میں تفاوت یہ ہے تو قدرت کو اپنے اس اٹل قانون پر کاربند ہونے سے کون روک سکتا ہے - کہ اپنی ترقی کے لئے دوسروں کی تخریب کرنے والے ترقی کی مسرتوں سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں -

ہماری گزشتہ کارگزاری

ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ابتک اپنے پروگرام پر مکمل طور پر عمل نہ کر سکے مگر اس کے باوجود آٹھ ماہ کی مختصر مدت میں ادبی دنیا نے علم و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ ارباب نظر کی نگاہ میں بیحد وقیع اور آپ اپنی نظیر ہے - ادبی دنیا میں ابتک ۲۹۴ مضامین نثر و نظم شائع ہو چکے ہیں - جن کے متعلق اہل ذوق کی رائے ہے کہ گزشتہ آٹھ ماہ میں ان بلند پایہ مضامین جیسا صرف ایک ہی مضمون شائع ہوتا تو بھی ادبی دنیا اپنے مقاصد میں کامیاب سمجھا جاتا چہ جائیکہ ۲۹۴ -

اتنی قلیل مدت میں ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کے اتنے گرانقدر مضامین کی اشاعت اردو صحافت میں پہلی مثال ہے - ان مضامین کو کتابی صورت میں لکھا جائے تو دو دو سو صفحات کی نو کتابیں تیار ہو جائیں گی - اور دو سو صفحے کی قیمت ایکروپیہ بھی رکھی جائے تو مجموعی قیمت نو روپے ہو جائیگی - مگر ادبی دنیا کی سالانہ قیمت چار روپے میں ابھی چار پرچے اور بھی باقی ہیں -

کثرت تعداد اور گرانقدری کے ساتھ ہی ہر نمبر میں تنوع اور دلچسپی کو قائم رکھنے کی مثال بھی صرف ادبی دنیا ہی کی خصوصیت ہے - ذیل کے اعداد و شمار سے ادبی دنیا کے گزشتہ آٹھ ماہ کے مضامین کے تنوع کا ایک حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

افسانے	۴۰	ڈرامے	۱۰
علمی مضامین	۲۲	ادبی مضامین	۲۳
تعلیمی مضامین	۲۳	اخلاقی مضامین	۱۵
تنقیدی مضامین	۱۷	سیاسی مضامین	۶
غزلیں	۳۰	نظمیں	۵۷

متفرق مضامین ۵۱
شذرات اور دنیا کی ۴۳ زبانوں کی ادبیات کے ۲۱۹ انتخابات ان کے علاوہ ہیں۔

ادبی دنیا کی تصاویر

تصاویر کے سلسلے میں عام رسالوں میں جس کور ذوقی کا ثبوت دیا جارہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ادبی دنیا کا دامن اس سے پاک رہا۔ اور آٹھ ماہ کی آرٹ کی ۳۱ تصاویر میں سے کوئی تصویر بھی ایسی نہیں ہے جو مشرق کے لئے کسی حیثیت سے بھی معیوب کہی جا سکے۔ اس کے علاوہ مشاہیر اور مناظر کی تصاویر میں بھی ادبی دنیا یورپ کے ترقی یافتہ رسالوں سے پیچھے نہیں رہا۔ ابتک ۹ سہ رنگی اور ۵۵ دو رنگی و یکرنگی تصاویر شائع ہو چکی ہیں اور یہ ایسی تعداد ہے جس کی دوسری مثال اردو صحافت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہم نے ہر نمبر میں آٹھ آٹھ اور نو نو تصاویر اور ہر نمبر میں رنگین تصویر اپنے پر لازم کر کے اپنی مشکلات میں کافی اضافہ کر لیا ہے۔ ابتک صرف تصاویر پر اتنی رقم خرچ ہو چکی ہے کہ اس سے بحسن وخوبی ایک مستقل رسالہ شائع ہو سکتا تھا۔

آئندہ کی تیاریاں

ہماری گذشتہ کارگزاری کچھ بری نہیں ہے مگر آئندہ کیلئے ہم نے اس سے بھی زیادہ تیاریاں کی ہیں۔ دفتر میں نہایت دلچسپ اور فن کے لحاظ سے قابل قدر افسانوں۔ ڈراموں اور گرانقدر علمی و ادبی مضامین کا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ دنیا کے مشہور مصنفوں کی بہترین تصانیف ادبی دنیا کے لیئے اردو میں منتقل کیجا رہی ہیں۔ اگلے ماہ سے ہم جو علمی اور تنقیدی مضامین شایع کرنے والے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو میں بالکل نئی چیز ہونگے۔ اور ان میں سے ہر ایک ریسرچ کا شاہکار کہلانے کا مستحق ہوگا۔ آئندہ اشاعتوں کے لئے دنیا کی مختلف زبانوں کی ادبیات کے جن منتخب حصوں کے ترجمے کئے گئے ہیں وہ ان زبانوں کے شاہکار ہونے کے علاوہ ان کے لٹریچر کے کامل مظہر بھی ہیں۔

"ادبی دنیا" میں ابتک آرٹ کی جتنی تصویریں شائع ہوئی ہیں۔ وہ فنی حیثیت سے دنیا کی بہترین تصویریں سمجھی جاتی ہیں اور ان میں سے بعض بعض کا اوریجنل ہزار ہزار پونڈ ہیں بھی ارزاں خیال کیا جاتا ہے۔ مگر آئندہ اشاعتوں کے لئے ہم نے مشرق و مغرب کے قدیم وجدید آرٹ کے جو نمونے مہیا کئے ہیں وہ ان سے بھی گرانقدر ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ گذشتہ اشاعتوں میں ہم نے تصاویر کا جو بلند معیار قائم رکھا ہے وہ آئندہ اور بھی بلند ہو جائیگا۔

مسلسل مضامین

افسوس ہے کہ گذشتہ نمبر کے مضمون "عربوں کا نقد شعری" کا بقیہ اس نمبر میں نہ جا سکا۔ اور کتابت شدہ ہونے کے باوجود اس کے لئے گنجائش نہ نکل سکی۔ انشاءاللہ جنوری کے پرچے میں شائع ہو جائیگا۔

جنوری سے ادبی دنیا کی دوسری جلد شروع ہوگی اور ہر چھ ماہ کی ایک جلد ہوا کریگی۔ اس نئی جلد سے نظریۂ ارتقا پر ایک جامع اور قابل دید مضمون کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگا جو دوسری جلد کے خاتمے کے ساتھ چھ ماہ میں ختم ہوگا۔

"ادبی دنیا" کے ایک معاونِ خصوصی علامہ شبلی کی شعر العجم پر ایک تنقید لکھ رہے ہیں جس میں مسٹر محمود شیرانی کی تنقید سے بحث کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ شیرانی صاحب کے ماخذ کون کونسے ہیں اور جس چیز کو آج کی ریسرچ بتایا جا رہا ہے وہ اب سے کتنے سال پہلے کی شائع شدہ تحقیق ہے۔ اس مضمون کا سلسلہ جنوری یا اس کے بعد شروع ہوگا اور دوسری جلد کے اندر ہی اسے ختم کر دینے کی کوشش کیجائیگی۔

آسکر وائلڈ انگریزی ادب کی ایک زندہ جاوید شخصیت ہے جس کے نظریۂ حیات وصنعت نے اس کی زندگی ہی میں ادبی حلقوں میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ادبی دنیا کے ذریعے اسکے تمام شاہکاروں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ اسکی ایک مرصع تحریر کا ترجمہ "جھوٹ کا زوال" اس نمبر میں شریک اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ڈرامے "ایک مثالی خاوند" (An Ideal Husband) کا ترجمہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔ جو آئندہ اشاعت سے مسلسل چھ ماہ کی چھ قسطوں میں شائع ہوگا۔

تاجور

مینجر کی دفتری اطلاعیں صفحہ ۲۰ پر ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

آئینۂ عالم

پیرس کا وطنی کتبخانہ

یورپ کی ترقیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے کے وقت غالباً ہم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ صرف وہاں کے علمی ذخیروں کا نتیجہ ہیں جب تک مشرق کی ادھر توجہ تھی اور ہمارا گھر علوم وفنون کا مخزن تھا ہم نے بھی اپنے دائرے کے محدود ہونے کے باوجود تہذیب وتمدن کی ترقی کے سلسلے میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ اغیار بھی آجتک انگشت بدنداں ہیں. مگر ہم جلد ہی سیر ہوکر ساری ترقیوں کی کلید علمی ذخیرے کی طرف سے بے پروا ہوگئے اور اپنی علمی عظمت کو ایسا بھول گئے کہ آج مغرب نے ہمارے ہی مسلکر پھینکے ہوئے پھولوں سے جو گلدستے سجائے ہیں انکی ایک ایک پنکھڑی ہمیں محو حیرت کردیتی ہے - کسے یقین آئیگا کہ پیرس کے کتبخانے کی قلمی کتابوں میں سے تقریباً تین چوتھائی کتابیں مشرقی زبانوں کے جواہر پارے ہیں - اور ہمارے ہی گھروں سے حاصل کی گئی ہیں. ہم تو اس کتبخانے کی کتابوں اور نادر اشیاء کی مجموعی تعداد ہی سے متحیر اور مرعوب ہوئے جارہے ہیں:-

چھپی ہوئی کتابیں - ۴۲۰۰۰۰۰ جلد
رسالوں کے فائل - ۴۰۳۵۲ ״
قلمی کتابیں - ۱۲۲۰۰۰ ״
سکے اور نادر اشیا ۲۳۴۰۰۰
تصاویر ۳۰۱۵۰۰۰

ٹائپ رائیٹر

کسی زبان کے عروج کے لئے نشرواشاعت اور کتابت و طباعت کی آسانیاں اسیقدر ضروری ہیں جسقدر روح کے لئے جسم - یوروپین زبانوں کے انتہائی عروج میں لاطینی رسم الخط اور طباعت کی سہولت کا کچھ کم دخل نہیں ہے - یہ قدآدم سائز کے تیس تیس اور چالیس چالیس صفحات کے انگریزی روزنامے اسی ترقی یافتہ رسم الخط اور ترقی یافتہ طباعت کے ممنون منت ہیں - اولاً ہمارا رسم الخط ہی کچھ پیچیدہ واقع ہوا ہے - پھر ہمارے نستعلیق پن نے اسے اور بھی پیچیدہ بنادیا ہے - اہل ملک نوک پلک کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ٹائپ میں نوک پلک کا جوڑ بیٹھا ہوا کوئی جنم نہیں لیتا - پھر اردو دوسری زبانوں کی طرح میدان ترقی میں آگے بڑھے تو کیونکر - لیتھو کی چھپائی سے تو یہ ہمہ گیر ہوتی نظر نہیں آتی -

عربی رسم الخط کی نستعلیق طرز تحریر ایرانیوں کی ایجاد تھی - مگر اس کی طباعت کی مشکلات کو دیکھکر انہوں نے بھی اسے خیرباد کہدیا - ٹرکی نے انہی جھگڑوں کی وجہ سے سرے سے عربی رسم الخط ہی کو اپنے حدود سے خارج کردیا مگر ہندوستان والے نسخ اور نستعلیق کے درمیانی رسم الخط پر بھی اترنے کا نام بھی نہیں لیتے -

رسم الخط ہی کی دشواریوں کی وجہ سے ابتک اردو کا مکمل ٹائپ رائیٹر تیار نہ کیا جاسکا - شاید آپنے محسوس نہ کیا ہو مگر دفتروں میں اردو ٹائپ رائیٹر نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار کے نقصان کے علاوہ خود اردو زبان کا بھی بیحد نقصان ہورہا ہے - ٹائپ رائیٹر پر ایک کلرک دن بھر میں جتنا کام کرسکتا ہے اتنا چار کلرک بھی دن بھر قلم گھسکر نہیں کرسکتے - دفعتہً اس نقصان کو برداشت بھی کرلیں تو کام ویسی صفائی سے نہیں ہوسکتا جیسا ٹائپ کی صورت میں ہوتا ہے - دنیا کی صرف کاروباری ہی نہیں بلکہ علمی ترقی میں بھی ٹائپ رائیٹر نے بیحد مدد دی ہے درآمد وبرآمد کے اعداد وشمار سے بیکار ٹائپ رائیٹرں کی تعداد کو حذف کردینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ آجکل امریکہ میں ساڑھے چار کروڑ اور یورپ میں چالیس لاکھ ٹائپ رائیٹر زیر استعمال ہیں - اسی تعداد سے اندازہ کیجئے کہ ان کی زبان ترقی کرسکتی ہے یا ہماری جو صرف دفتر کی مجبوریوں کی وجہ سے اردو کی جگہ بھی انگریزی استعمال کرتے ہیں

حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کا نام تہذیب وتمدن کے مختلف شعبوں کی طرح اردو کے مجدد اعظم کی حیثیت سے بھی تاقیامت روشن رہیگا کہ اعلیٰ حضرت کی سرپرستی میں اردو ٹائپ رائیٹر ابتدائی شکل میں تیار ہو گیا ہے - اگرچہ عوام کے لئے اس کا پڑھنا دشوار ہے مگر بہر حال ابتدائی کوشش کا یہ ابتدائی نتیجہ بھی حوصلہ افزا ہے - مگر اس کے ساتھ

ہی ضرورت ہے کہ عوام کو ٹائپ کی چھپی ہوئی تحریر پڑھنے کا عادی بنایا جائے۔ ورنہ اس ٹائپ رائیٹر کا رواج پانا مشکل ہے۔ اور ہمیں تو خوف معلوم ہو رہا ہے اردو میں ٹائپ کی طباعت جلد سے جلد رائج نہ کی گئی اور پتھر کی چھپائی کی مشکلات اور اردو کی ترقی میں اس کے حائل ہونے کا احساس ترقی کر گیا تو سرے سے اس رسم الخط ہی کے خلاف تحریک شروع ہو جائیگی۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی زبان کے ہمارے نوجوانوں کے جوش کے سامنے ہمارا احتجاج کچھ کام دے سکیگا۔ اور ٹرکی کی طرح ہندوستان سے یہ رسم الخط رخصت نہیں ہو جائیگا۔

ڈارون کا گھر

ڈارون کی زندگی میں خود اس کے اہل وطن اس سے تمسخر کرتے تھے اور اس کے نظریے کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ مگر اب اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور انگلستان اس پر فخر کرتا ہے۔

میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ ایکدن میں لندن کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ ایک معمولی سے مکان پر کھدا ہوا دیکھا:-

"اس مکان میں ڈارون سنہ سے سنہ تک مقیم رہا"۔

ان کا خیال ہے کہ یہ مدت دو سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن صاحب خانہ نے اس کو اسقدر باعث فخر سمجھا کہ پتھر پر کھود کر دروازے پر لگا دیا۔

گزشتہ دنوں سر کیتھ نے ایک تقریر میں تحریک کی کہ ڈارون کا مکان قوم کے چندے سے خرید کر قوم کے لئے وقف کر دیا جائے۔ تاکہ لوگ اس کی زیارت کر سکیں اور اس کمرے کو دیکھ سکیں جس میں ڈارون درس دیا کرتا تھا۔ ابھی سر کیتھ کی تحریک کا اخبارات میں اعلان بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ان کے پاس ڈاکٹر براؤن کا تار آیا کہ "مکان کی پوری قیمت (۱۵۰۰ پونڈ) میں دونگا۔

خیر یہ تو خود ڈارون کے ہموطنوں کی علم دوستی اور علم نوازی کی کیفیت تھی ہمارے ہاں ابتک اُسی مضحکہ خیز آواز کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے جو ڈارون کی زندگی میں اس کے وطن سے بلند ہوئی تھی "ارباب علم" کے ایک رکن صوفی جی کے خیال میں ڈارون کی جو تصویر ہے وہ اسی رسالے میں ملاحظہ فرمایئے۔

اعلیٰ التعلیم

تعلیم کے ماہر خصوصی ڈاکٹر فانس فرماتے ہیں کہ اعلیٰ التعلیم کی طرف عام رجحان قابل ستائش نہیں ہے۔ کیونکہ یونیورسٹیوں میں داخل ہونیوالوں میں سے تقریباً دو تہائی طلبہ اعلیٰ تعلیم کے قابل نہیں ہوتے اور ناکامی کی وجہ سے درمیان ہی میں تعلیم چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور زندگی بھر کے لئے ان کے دماغ میں یہ خیال قائم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے والدین کا فرض ہے کہ اپنے لڑکے کو یونیورسٹی میں داخل کرنے سے پہلے اچھی طرح اپنی تشفی کر لیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ ورنہ داخلے کے بعد نا اہل ثابت ہونیوالوں کی علو ہمتی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

انسان کی قیمت

انسان کس چیز سے بنا ہے اور اس کی مادی قیمت کتنی ہے؟

ایک امریکن ڈاکٹر نے اس کا جواب دیا ہے کہ انسان کے جسم میں جتنی چربی ہے اس سے صابون کی چھ ٹکیاں تیار ہو سکتی ہیں۔ جتنا لوہا ہے اس سے ایک متوسط قسم کی کیل بن سکتی ہے۔ جتنی قند ہے۔ اس سے ایک پیالی چائے میٹھی ہو سکتی ہے۔ جتنی فاسفورس ہے اس سے ۲۲۰۰ دیاسلائیاں بنائی جاسکتی ہیں۔ جتنا میگنیشیم ہے اس کی روشنی سے ایک فوٹو تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ تھوڑی سی گندھک اور پوٹاس بھی ہے اور ان ساری چیزوں کی مجموعی قیمت پچیس فرانک ہوتی ہے۔

عورت اور تعلیم

میوسولینی نے عورتوں کو سکنڈری سکولوں میں تعلیم دینے سے روک کر ان کا دائرہ صرف پرائمری سکولوں تک محدود کر دیا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اٹلی کے نوجوانوں کو جرأت اور بہادری کی ضرورت ہے جو مرد معلموں سے حاصل کیجا سکتی ہے نہ کہ عورتوں سے

مینارِ تمدن

آرکنسس ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک متمول شخص اپنے ملک میں موجودہ تمدن کی یادگار ایک مینار کی شکل میں تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جس میں جدید تمدن کی تمام اشیا اور تمام شائع شدہ کتابوں کا ایک ایک نسخہ بطور یادگار بند کیا جائیگا۔

ص۔۔۔

کشمیر — نشاط باغ

کشمیر جنت نظیر جسے جہانگیر تمام ہندوستان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا یقیناً مغل بادشاہوں کو بہت پیارا ہوگا۔ کیونکہ اس کی سرد آب و ہوا انہیں اپنے برفانی وطن کی یاد دلاتی ہوگی۔ یوں تو یہ ملک اپنے طول و عرض میں بہت وسیع نہیں ہے۔ مگر اس کے چپے چپے پر رعنائی اور دلکشی کے ایسے ایسے خزانے موجود ہیں کہ ناظر اس فردوس نظارہ میں جاکر ایک خواب کی سی دنیا میں آجاتا ہے۔

جن دنوں مغل بادشاہ اس خلد ارضی کو اپنے بابرکت قدموں سے مشرف کیا کرتے تھے۔ ان دنوں باربرداری اور رسد کی مشکلات اور دوران سفر کے خطروں کے باعث یہاں صرف وہی شہزادے اور امراء آسکتے تھے جن پر بادشاہ کی نظر عنایت ہوتی تھی۔ کشمیر تک پہنچنے کے تین پرانے راستے ہیں۔ ایک تو بھمبر اور پیر پنجال کی طرف سے ہوکر جاتا ہے۔ دوسرا ویری ناگ اور جمنا کی جانب سے۔ اور تیسرا ایک دور دراز کا اور پیچیدہ راستہ ہے جو کشن گڑھ اور جہلم کی وادیوں میں سے گزرتا ہے۔

حسن ابدال۔ جہاں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ ایک مشہور مقدس مقام ہے۔ جہاں بے شمار چشمے تہ زمین میں سے پھوٹتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اس جگہ کی خوبصورتی کو دیکھ کر اکبر اس قدر متاثر ہوا تھا۔ کہ اس کے منہ سے بے اختیار "واہ باغ" نکل گیا تھا۔ اور اسی نام سے یہ باغ آج تک مشہور ہے۔

مورکراونٹ جو آج سے ۹۰ سال پہلے "واہ باغ" کی طرف آیا تھا لکھتا ہے:۔

"یہ باغ ½ ۱ دو میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے ارد گرد دیواریں کچھ شکستہ سی حالت میں موجود ہیں۔ دروازے بھی گر گئے ہیں"

بارہ مولے سے داخل ہوکر پانی کا راستہ سفر دریا کے ذریعے طے ہوتا تھا جھیل ولر جو ہندوستان کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ طے کرنے کے بعد شاہی قافلہ "سوم پل" ٹھہر جاتا تھا۔ سب سے پہلے اکبر کشمیر کے دلکشا مناظر سے لطف اندوز ہوا۔ اور سری نگر کا مشہور قلعہ ہری پربت اسی کا تعمیر کردہ ہے۔ اسی نے نسیم باغ بھی تعمیر کرایا تھا۔ جو اپنی فضا کی لطافت اور موجہائے نسیم کی عطر انگیزی اور دل افروزی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے۔

مشہور عالم شالامار باغ ڈل کے پرلے سرے پر واقع ہے لوگوں میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ شہر سری نگر کے بانی نے ڈل کے کنارے ایک محل اور تفریح باغ تعمیر کیا تھا۔ جسے اس نے "شالامار" کا نام دیا تھا سنسکرت میں شالامار کے معنی "سرائے محبت" کے ہیں۔

امتداد زمانہ کے ہاتھوں وہ محل اور تفریح باغ برباد ہوگئے۔ تو جو گاؤں ان سے ملحق تھا وہ بھی شالامار کہلایا۔ جہانگیر نے سنہ ۱۶۱۴ء میں اسی جگہ اپنے نئے باغ شالامار کی بنیاد رکھی۔ یہ باغ دراصل ایک شاہی سیرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں گرمیوں کے دنوں میں جہانگیر اپنا دربار کیا کرتا تھا۔

باغ کا اندرونی حصہ دو بالاخانوں پر مشتمل تھا۔ اور وسط میں دیوان خاص تھا۔ عمارات تو زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے فنا کردی ہیں۔ لیکن تا حال ایک چبوترا باقی ہے۔ جس کے ارد گرد فوارے نصب ہیں۔ شاہ جہاں کی بنائی ہوئی بارہ دری کے سنگ سیاہ پر پانی کا عکس پڑتا ہے تو ایک عجیب منظر پیدا ہوتا ہے اور یوں بھی درختہائے سرو کے گہرے سبز رنگ کے ساتھ سنگ سیاہ کے رنگ اور پانی کے عکس کو ایک خاص قسم کا تعلق ہے۔ اس بارہ دری کے ارد گرد باغ کے تمام خزاین رنگ و بو جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں سے مہادیو کی برف دکھائی دیتی ہے۔ اور مناظر کے ترتیب نقوش و رنگ میں ایک اور دلکشی کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ مغل بادشاہ خوب سمجھتے تھے کہ نقوش اور رنگوں سے کس طرح ایک صناعانہ اثر پیدا کرنا چاہیئے؟

یہ خوبصورت بارہ دری چاروں طرف جھرنوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور رات کو جب کائنات ایک سیاہ پیراہن حریری اوڑھ لیتی ہے۔ اور محرابی طاقوں میں جو جھرنوں کے پیچھے واقع ہیں

چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں۔ نور رنگ و بو اور موجہائے آب
کے اس لطیف اجتماع کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پرستان
کا کوئی ٹکڑا زمین پر لا کر رکھ دیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ موجودہ صنعت تعمیر کے زیر اثر کشمیر کے باغات
میں سے سایہ دار روشیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں
پرانی بیلیں زمین پر بھورے سانپوں کی طرح بل کھاتی ہوئی دکھائی
دیتی ہیں۔

بعض اوقات تو ان باغات کی شکستہ عمارات اور کئی جگہ سبزہ
و گل کے غیر منظم ہونے کو دیکھ کر غالب کا شعر یاد آتا ہے ؎

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

تمام باغ پر سکون اور سکوت کا ایک طلسم چھایا ہوا معلوم ہوتا
ہے۔ ہوا کبھی چپ چاپ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی معلوم
ہوتی ہے۔ گنجان درخت وسیع خوبصورت چبوترے اور فوارے۔
آبشار کا باوقار اور حسن خیز ترنم۔ چوڑی چوڑی نہریں جن میں سرو
اور چنار کے سایے محو خواب ہیں۔ تمام ایک میٹھی نیند میں ہوئے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں نشاط باغ میں ایک اور ہی عالم دکھائی
دیتا ہے۔ یہ باغ نور جہاں کے بھائی آصف خاں نے تعمیر کرایا
تھا۔ اس کے نام ہی سے عیش و عشرت کے رنگین خواب۔ اور
سرمستی و نکہت کے زرین ایام آنکھوں کے آگے آ جاتے ہیں۔ حقیقت
یہ ہے کہ یہ باغ اسم با مسمیٰ ہے۔ اس کے بارہ طبقے ہیں۔ ایک
ہنگامہ آفریں نہر خوبصورت اور منقش جھرنوں میں سے گذرتی ہوئی جہاں
افروز نغمے پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک حوض میں فوارے چلتے ہیں۔
اور باغ کی فضا میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ دھوپ کی زرنگار
روشنی میں رنگی ہوئی ماہتابیاں۔ گلاب یاسمن۔ نارنج۔ نافرمان نسترن
اور سوسن کے رنگ برنگ دل افروز پھول۔ ایسی چیزیں ہیں کہ یکبار
دیکھ کر انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

خزاں میں جب سرو ترشے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
اور چنار سیاہ۔ تاریک پتھروں کے آگے شعلہ کی طرف بھڑک اٹھتے
ہیں۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دنیا کی تمام رعنائیاں حسن
کی تمام کیف آفرینیاں عشق کی تمام سرمستیاں۔ شراب کی تمام سرمستیاں
نشاط باغ کی فضا میں جذب ہو کر رہ گئی ہیں۔

۱۶۳۳ء میں شاہ جہاں نے اس باغ کو اپنے قدموں سے مشرف
کیا تھا۔ وہ اس باغ کے خوشنما مناظر سے اسقدر متاثر ہوا کہ
اس نے کئی بار آصف خاں کے سامنے اس کی تعریف کی۔ آصف خاں
سمجھتا تھا کہ اس تعریف کا مقصد یہ ہے کہ وہ باغ کو بادشاہ کے
حوالے کر دے۔ مگر وہ جان بوجھ کر چپکا ہو رہا۔ آخر کار بادشاہ نے
حکم دیا کہ نشاط باغ کو پانی دیا جانا بند کر دیا جائے۔

آصف خاں اس وقت نشاط باغ ہی میں مقیم تھا۔ پانی کے
بند ہو جانے سے باغ پر جو ہیبت ناک اداسی چھا گئی اس کی تصویر
الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ آصف خاں کا دل شکستہ ہو گیا۔
اسی مایوسی اور الم و کرب کے عالم میں وہ بیہوش سا باغ کی ویران
روشوں پر ٹہل رہا تھا کہ اسے نیند آ گئی۔ یکایک کسی شور سے
اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ باغ پھر اپنی دلربائی کی شان
میں جلوہ افروز نظر ہے۔ فوارے چل رہے ہیں۔ نہریں پانی سے
بھری ہوئی ہیں۔ نونہالان چمن نے ہرے ہرے لباس پہن لئے
ہیں۔ اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ آخر کار دریافت کرنے
سے معلوم ہوا کہ آصف خاں کے کسی وفادار ملازم نے اپنے آقا کے
رنج و غم کو دیکھ کر بادشاہ کی خفگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بند توڑ
دیا تھا۔ آصف خاں نے اپنے ملازم کو تنبیہ کی اور فوراً بند پھر لگا
دیا۔

جب شاہجہان کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو اس نے گنہگار ملازم
کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ ملازم کی عجیب حالت تھی۔ ہیبت
خسروی سے اس کے بدن میں خون خشک ہو گیا تھا۔ مگر شاہجہان
نے حقیقی شاہانہ مروت سے کام لیا۔ اور نہ صرف ملازم کو معاف کر
دیا۔ بلکہ اسے ایک گراں بہا خلعت سے سرفراز فرمایا۔ اور ساتھ
ہی آصف خاں کو ایک دوامی سند مرحمت کی جس کے رو سے اُسے
شالامار کے پانی سے اپنے باغ کو پانی دینے کا حق عنایت کیا گیا
تھا۔ نشاط باغ میں ایک خصوصیت قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے
کہ تقریباً ہر چبوترے کے پاس ایک تخت بچھا دیا گیا ہے۔ جو
سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔

نشاط باغ کی روشوں کے اردگرد پہلے پہل دو رویہ سرو اور
دوسرے ثمر آور درخت لگائے گئے تھے۔ آجکل بھی کوشش
کی جا رہی ہے۔ کہ باغ کی عمارات اور روشوں کو از سر نو درست
کیا جائے اور شکستہ عمارات کو تعمیر کیا جائے مگر اس معاملے میں اس

بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے - کہ مغل بادشاہوں نے ترتیب رنگ و بو کا جو خاص تناسب قائم رکھا تھا - اس سے انحراف نہ کیا جائے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ سیب اور بہی کے درختوں کے نیچے نرگس اور دوسرے متناسب رنگ کے پھولوں کے پودے نصب کرائیں جائیں - ناشپاتی اور کنار کے درختوں کے سایے میں گلہائے لالہ کے شعلہ آفریں پودے لگائے جائیں تاکہ رنگ کا وہ تناسب قائم ہو جائے - جس پر مغل بادشاہ جان دیتے تھے۔

کشمیر میں آج تک پھولوں کے تین تہوار منائے جاتے ہیں - تہوار کے موقعے پر بیشمار لوگ ڈل کے کنارے جمع ہوتے ہیں اور رنگ رلیاں مناتے ہیں - بارہ دری میں بیٹھکر ارباب ذوق اور معاشران محبت باغ کے دلکشا مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں سب سے زیادہ دلکش میلہ گلاب کا میلہ ہوتا ہے - یہ میلہ عام طور پر شالامار میں منعقد ہوتا ہے - لوگ جوق درجوق اپنی عورتوں اور بچوں کو ہمراہ لاتے ہیں - عورتوں کے رنگین ریشمی ملبوسات - اور ان کے سفید نقاب تضاد کا ایک عجیب لطف پیدا کرتے ہیں - پھر کشمیر کے معصوم بچے - میرا خیال ہے کہ کشمیر کے بچوں سے زیادہ دنیا میں کہیں حسین بچے نہیں ملیں گے - ان کے گورے - سرخ و سپید رنگ - چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں - کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے - سبز ٹوپیوں میں سے باہر نکلنے والے سرکش گھنگریالے بال - یہ تمام چیزیں اسقدر دلکش ہوتی ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے - سوچنے لگتا ہے کہ پھول زیادہ خوبصورت ہیں یا بچے زیادہ دلکش ہیں۔

جولائی میں کنول کھلتا ہے - ہندو اسے مقدس تصور کرتے ہیں - چین اسی طرح جس طرح مسلمان شعرا کے کلام میں گلاب کا ذکر اکثر پایا جاتا ہے - ہندو شعرا کے دیوان کنول کے ذکر سے پر ہیں - اگر ان پھولوں کو فطرت کی پوری بہار میں دیکھنا مد نظر ہو تو ضروری ہے انسان صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے نشاط باغ کی طرف کشتی کھینا ہوا چلا جائے - جہاں باغ دھندلے نیلے رنگ کے سایوں میں ملفوف نظر آتا ہے - اور پانی کا رنگ بھی کچھ ارغوانی کچھ نارنجی سا دکھائی دیتا ہے - پھر وہاں بڑے بڑے پتوں کے درمیان انسان کشتی میں بیٹھا رہے - اور اس وقت تک انتظار کرے جب سورج کی پرنور کرنیں کنول کے غنچہ خاطر کو کھلا دیں - جب مہر عالمتاب کی شعاعوں سے کنول کے نازک گلاب رنگ - پتیاں آہستہ آہستہ کھلینگی اور کنول کا سنہری دل ظاہر ہوگا - اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی سب سے پرانی دعا کیوں ان الفاظ پر مشتمل ہے -

اوم - مانی - پادمے - ہم

اے صانع مخلوقات - کنول میں جوہر ہے -

مغلوں کے تمام باغات میں بارہ دریوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - ان کا مقصد محض آرائش و تصنع ہی نہیں ہے - بلکہ اس کے علاوہ وہ باغ کی صنعتی ترتیب میں ایک ضروری اور خوبصورت عنصر ہیں - ان بارہ دریوں کا رعنا جمال اسی وقت پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے - جس وقت آپ خود ان میں چار پانچ دن رہکر دیکھیں - اچھا بل تفرج گاہیں اس طرح تعمیر ہوئی ہیں - کہ دوپہر کا وقت خواب شیریں میں صرف کیا جاسکے - وہاں آبشاروں کی میٹھی آواز لوری دیتی ہے - اور جھاگ کا ابھار آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے - جوں جوں سایے طویل ہوتے جاتے ہیں چنار کے درختوں کے نیچے غالیچے بچھا دئیے جاتے ہیں - شام کو بارہ دریاں استعمال کی جاتی ہیں -

بلندیوں سے چاول کے کھیتوں کی طرف دیکھا جائے تو شفق کی سرخ روشنی تمام میدان کو سونے کے ڈلے میں تبدیل کر دیتی ہے - دور پیر پنچال کی چوٹیاں کسی حصن حصین کے برجوں کی طرح کہر اور دھند میں لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - اور بادلوں کے ٹکڑے کسی عاشق کے دل کے بخارات غم و رنج معلوم ہوتے ہیں -

رات کو وسیع بارہ دری کے پیچھے سے باغ ایک پراسرار تاریک اور بیبتناک شکل اختیار کر لیتا ہے - چنار کے درخت عفریت اور دیو دکھائی دیتے ہیں - کہیں کہیں نہروں میں تارے کی چمک کا مدھم سا عکس معلوم ہوتا ہے - اور کبھی کسی آبشار کی ہلکی سی دلدوز آواز آتی ہے -

رات کو مغل باغات میں ایک حیرت انگیز اثر پیدا ہو جاتا ہے - مغل صنعت تعمیر اور فن باغبانی مغل مصوری کی طرح خاص مضامین کا حامل ہے - اور پرانی ایرانی کہانیوں کے خواب آلود طلسم اور سحر آفریں موسیقی سے لبریز ہے - لیلیٰ اور مجنوں کے افسانہ عشق کو باغات کی تعمیر میں بہت اہمیت دیجاتی ہے - گلہائے نازنین کے قطعات کے درمیان بعض اوقات دو درخت نصب کر دئیے جاتے ہیں - ان سے گویا لیلیٰ اور مجنوں کی تشکیل جسمانی مقصود ہوتی ہے - مجنوں کے لئے بید مجنوں تو معبود جسمی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے - اور عام

طور پر بید مجنوں کے ساتھ ہی ۔ لیکن اس کے دست شوق کی حدود سے باہر ۔ نیلوفر پایا جاتا ہے ۔ لیکن لیلیٰ کا سب سے حسین اور سلسلہ جنباں خیالی مظہر گلاب کا پھول ہے ۔ جسکا پودا نسبتاً ذرا بلند جگہ پر نصب کیا جاتا ہے ۔ اور جس سے محمل لیلیٰ مراد ہوتی ہے ۔

ساربان نے آہ ! کیا پتے کی بات مجنوں سے کہی
میرے دل میں کون ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

گلہائے بنفشہ سے لیلیٰ کے بالوں کی نزاکت اور اس کی جان پرور خوشبو کا اظہار مقصود ہوتا ہے ۔ یاسمن سے گلوئے مصفیٰ مراد لیجاتی ہے ۔ سرو نازک اس کی کمر ہے ۔ گلاب اس کے لب یاقوت رنگ ہیں ۔ اور نرگس اس کی کٹیلی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اس کے علاوہ باغوں اور پودوں کے نصب کرنے میں اور بھی رموز پنہاں ہیں ۔ جن کا انکشاف نئی دنیا کے انکشاف سے کم نہ ہوگا ۔ مگر افسوس ہے کہ یہ صنعت توجہ کے فقدان کے باعث فنا ہو رہی ہے ۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مشرق کے رموز و اسرار سے واقف ہوں تو ضروری ہے کہ باغ کی تعمیر میں جو اسرار صرف ہوتے تھے ان سے کلی واقفیت بہم پہنچائیں ۔

اچھابل میں گرمی کے موسم میں پھولوں کے رنگ سبز ۔ سفید ۔ اور خاکستری ہوتے ہیں ۔ اور خزاں میں بھی کے درخت کی بارآور شاخیں نہروں کے کنارے جھکی ہوئی دل کو ایک طلسم خواب میں مسحور کرلیتی ہیں ۔ ثمر آور درختوں کو پانی کے کنارے نصب کرنا ایک نہایت حسین و جمیل طریقہ تھا ۔ انگلستان میں یہ طریقہ معیوب تھا ۔ لیکن مشرقی روایات کے علم بردار یعنی جاپان نے مغرب کو بھی اس طریقے کے دل افروز رموز سکھا دئیے ہیں ۔

تاجور

نشاط باغ کی ہے وہ نظر فریب بہار کہ جسکو دیکھ کے دل میں خروش پیدا ہو
ہر آبشار کی موجوں سے اور نغموں سے بہشت دیدہ و فردوس گوش پیدا ہو
وہ اونچے اونچے شجر ہیں کہ سائے میں اُنکے ہر ایک دل میں نوائے سروش پیدا ہو
وہ سبز پوش ہے فرش چمن کہ مشکل سے زیادہ اس سے کوئی سبز پوش پیدا ہو
ادھر وہ پھولوں کا نظّارہ سرور انگیز کہ جس سے طبع فسردہ میں جوش پیدا ہو
اِدھر وہ ڈل کا نظّارہ کہ آپ اگر دیکھیں تو دل میں آرزوئے ناؤ نوش پیدا ہو

پھر اس پہ قہر ہو جب گوشہ چمن سے کوئی
عدوئے دین و دل و عقل و ہوش پیدا ہو

میر ولی اللہ

مشورہ پر عمل

جارج فکر میں پڑگیا۔ یہ اس کی بدنصیبی کا ایک کرشمہ تھا۔ کہ اس کا رقیب ایک موقع پر شیلا کی جان بچاکر اس کی نظر میں سرخرو ہوگیا تھا۔ شیلا اور جارج پہاڑ کی ایک چڑھائی کو طے کر رہے تھے کہ یکایک شیلا کا گھوڑا بدکا اور ڈرکر پوری رفتار سے ایک خطرناک غار کی طرف دوڑنے لگا۔ شیلا نے روکنے کی ہزار کوشش کی۔ مگر لاحاصل۔ جارج بچانے کے لئے دوڑا۔ مگر قبل ازیں کہ وہ وہاں پہنچے۔ اس کا رقیب نمودار ہوا۔ اور اپنی جان سے بے پرواہ ہوکر غار سے ایک گز کے فاصلے پر لگام کو پکڑکر پوری قوت سے اپنی جانب کھینچنے لگا۔ شیلا کو دیڑھی اور نہایت گرمجوشی سے اپنے بچانے والے کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

شیلا بیس سال کی حسین لڑکی تھی۔ مگر اس کی نسوانیت اسکی مردانہ ورزشوں میں شریک ہونے میں حارج نہ ہوسکی۔ جہانتک جارج کو علم تھا شیلا ہر قسم کے مردانہ کھیلوں کی ماہر تھی۔

"نہیں"، جارج نے اپنے دل میں کہا۔ میں اس معمولی سے واقعہ سے نا امید نہیں ہوسکتا۔ ایک بار اور کوشش کرنی چاہیئے۔ جس سے اس کے دل میں زیادہ نہیں تو کم ازکم اس پاجی کے برابر تو وقعت ہوجائے دفعتاً اسکو نفسیات کا ایک عجیب مسئلہ یاد آگیا جو اس نے کلب میں اپنے کسی ملاقاتی کی زبان سے سنا تھا۔

"مجھ سے سنو۔ میرے دوست" اُس کا ملاقاتی پوری داستاں سننے کے بعد اُس کو مشورہ دینے لگا۔ اگر تم چاہتے ہوکہ اپنے رقیب کو شکست دو۔ تو شیلا کو ایک موقعہ ایسا بہم پہنچاؤ جس میں وہ تمھاری جان بچاسکے رحم سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ دیکھو تو سہی پھر کیا ہوتا ہے۔

بس یہ بہترین ترکیب ہے لیکن اس کو عمل میں کیسے لایا جائے؟ جارج کو اپنے دوست کا خیال آیا جس کے مشورے کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ مگر آجکل تو وہ کشمیر کی جھیلوں میں کشتی کی سیر کا لطف اُٹھا رہا ہوگا۔ کشتی کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑگئی شیلا کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر کسی پر فضا مقام کی تفریح میں وہ پیر پھسلنے کا بہانہ کرکے دریا میں گرسکتا ہے۔

یہ بات کہ وہ خود تیرنا نہ جانتا تھا اسے اس ارادہ سے باز نہ رکھ سکی۔ اس کو یقین تھا کہ شیلا اس کو کسی نہ کسی طرح ضرور بچالیگی اس نے ٹیلیفون پر شیلا سے گفتگو کی۔ بڑا پر فضا مقام ہے۔ میں نے سارا انتظام کرلیا ہے۔ کشتی میں خود کھے سکتا ہوں۔ بہت خوب ٹھیک دو بجے میں تمھارے گھر پر آجاؤں گا۔ پتوار کو حلقے سے اٹھاتے ہوئے جارج فتحمند نظروں سے شیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ جو تکیوں کا سہارا لیے کشتی کے دوسرے کونے میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ آبادی سے بہت دور نکل گئے تھے۔ دہار پر کشتی تیزی سے بہی چلی جارہی تھی۔ ان کے آس پاس بالکل سناٹا تھا۔ حتیٰ کہ ہوا کا چلنا تک موقوف ہوگیا۔ جارج کے ارادوں کے عمل میں لانے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ جارج نے کہا یہ مقام کتنا خوش نما ہے؟

جواب ملا "واقعی بیحد خوشنما ہے"

جارج نے پتوار کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پھر اسے پکڑنے کی بیکار سعی کرتے ہوئے ایک جانب جُھکا۔ اور تیزی سے سر کے بل پانی میں لڑھک گیا۔ یہ سب کچھ اتنی صفائی اور پھرتی کے ساتھ وقوع میں آیا کہ شیلا کو سمجھنے تک کی مہلت نہ مل سکی۔ منٹ بھر کے اندر تیز دہار جارج کو بہاتی ہوئی بیچ دریا میں لے گئی۔ وہ غوطہ کھاکر اُبھرا "مدد" وہ زور سے چلانے لگا۔ "بچاؤ"

شیلا کشتی میں بدحواس کھڑی فرط غم سے دونوں ہاتھ مل رہی تھی۔

سسکیاں لیتے ہوئے بولی "مجھے تیرنا نہیں آتا"

گمنام

ہندوستان کی علمی بیداری

سرجادوناتھ سرکار وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی

پہلے پہل ہندوستان میں پرتگیز آکر آباد ہوئے - اور انھوں نے کسی حد تک ہندوستانی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں توسیع کی ہے - اس کے علاوہ ہندوستان کا فن طبابت بھی ان کا مرہون منت ہے - پہلے آباد کاروں کی اولاد ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی - اور مغلیہ عہد میں ہندوستان کی آبادی میں انکا اچھا خاصہ حصہ ملا ہوا تھا -

پرتگیزی حکومت کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا - کیونکہ اپنے ظلم وتعدی اپنے مذہبی تعصب قیام محکمۂ احتساب اور اپنی بد اخلاقی کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد ہندوستانیوں کی ہمدردی کو کھو دیا - عام رعایا انہیں بنظر حقارت سے دیکھنے لگی ۔ انھوں نے سانتا ورگی کے مندروں کو گرجوں میں تبدیل کرکے جس مذہبی جنون کا ثبوت دیا تھا اس کی وجہ سے ملک میں عام طور پر ان کے خلاف عداوت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی -

ہندوستان کا بہت تھوڑا علاقہ انکے زیر حکومت تھا - اور رقبہ بھی تھا وہ ہندوستان کے غیر معروف حصوں میں تھا یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی پر پرتگیزوں کا بہت کم اثر قائم رہا ہے -

ہندوستان میں نئے خیالات کا اثر تمامتر انگریزوں کی وجہ سے ہوا ہے - اور یہ اثر کسی صوبے سے خاص نہیں - بلکہ تمام ہندوستان اس سے متاثر ہوا ہے -

مغربی اقوام نے ہندوستان کے غیر محفوظ ساحلوں سے فائدہ اٹھایا ہے ان کی طاقت کے قیام کی واحد شرط یہ ہے - کہ ان کی بحری قوت سب سے زبردست ہو - اور وہ صرف اسی صورت میں ہندوستان پر قابو رکھ سکتے ہیں کہ اپنے وطن سے انھیں اکثر مدد ملتی رہے - یہی وجہ ہے کہ دوسری فاتح اقوام کی طرح انگریزوں نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا - وہ صرف یہاں رہتے ہیں - ہر سال نوجوان کارگزاروں - اور بوڑھے تجربہ کاروں کے آنے جانے سے ایک تانتا سا بندھا رہتا ہے - لازماً اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے - کہ ہندوستان میں انگریزوں کا عروج ان کے وطن کے اقتصادی اور فوجی معاملات پر منحصر ہے - ان کا وطن ہی وہ مرکز ہے جس سے عملی حکومت کی تمام تاریں نکل کر بر اعظم ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں -

ایک طرح تو انگریزوں نے صرف اس کام کو جاری رکھا ہے - جو مغلیہ بادشاہوں نے شروع کیا تھا - مگر انھوں نے اس کام کے دائرے کو زیادہ وسیع کردیا ہے - اور اب یہ کام پہلے سے زیادہ عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے -

ہندوستان پر انگریزی اثرات اسقدر گہرے ہیں - اور انھوں نے ہندوستانیوں کی زندگی اور ان کے ذہنی معتقد ات میں ایسے انقلاب عظیم برپا کئے ہیں کہ ہم انھیں صرف قدیم آریوں کے اثرات سے تشبیہ دے سکتے ہیں - جو اپنی شدت اور سرگرمی کی وجہ سے بہت کچھ انگریزی اثرات سے ملتے جلتے ہیں -

ہندوستان پر انگریزوں کا پہلا احسان یہ ہے - کہ انھوں نے ملک کو امن کی برکات سے مالا مال کیا - اندرونی نزاع اور بیرونی حملوں سے نجات بخشی - اور تمام ملک کے طول وعرض میں اطمینان وسکون کی ایک لہر دوڑا دی - اگر ہم مغربی ہند کی انیسویں صدی سے قبل کی حالت کا بغور مطالعہ کریں تو ہم پر واضح ہو جائیگا - کہ امن و اطمینان ملک کی قومی ترقی کے لئے کس قدر فائدہ مند ہے - ہندوستان تمام اور جو ممالک اس کے مشرق ومغرب کی طرف اس سے متصل واقع ہیں ان سب پر انگریزی قبضہ ہے - اور باوجود اس وسعت کے ان تمام ممالک میں امن وچین ہے انگریزوں کے عہد حکومت سے پہلے اسقدر ہمہ گیر امن ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا -

انگریزوں نے اس عظیم الشان کام کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے - جو اکبر نے شروع کیا تھا - اور جس کو اس بد امنی اور فسادنے روک دیا تھا - جو نادرشاہ کے حملوں کی وجہ سے ظہور میں آیا تھا -

انگریزوں کا دوسرا احسان یہ ہے کہ ان کے عہد حکومت میں ہم باہر کی دنیا کے کوائف سے آشنا ہوگئے ہیں - اس میں کوئی شک نہیں - کہ ایران - عرب - زنگبار - ملایا وغیرہ ممالک کے ساتھ مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کا آمد و رفت اور رسل ورسائل قائم تھا - اور وسط ایشیا سے بھی ان کے تعلقات تھے - مگر اس رسل ورسائل اور ان تعلقات کا دائرہ بہت محدود تھا -

جب مغلیہ حکومت کو زوال آگیا تو ایران خراسان اور بخارا کے سوداگر ہندوستان میں آنا بند ہوگئے - انگریزوں نے ہمیں بیرونی دنیا سے واقف

کر دیا ہے۔ اور ان کے ذریعے ہم دنیا کے دوسرے ممالک سے اس طرح آشنا ہو گئے ہیں کہ مغلیہ عہد کے دنوں میں کبھی کسی کو خواب میں بھی اس قسم کا خیال نہ آتا تھا۔

اب ہندوستان کو بیرونی واقعات سے ملا دیا گیا ہے۔ اور ہر اقتصادی اور تمدنی انقلاب ہندوستان کو متاثر کرتا ہے۔ تا اینکہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے لئے بھی اب ایسی زندگی ناممکن ہو گئی ہے۔ جو ہر طرح سے الگ تھلگ ہو۔ آج پیرس میں کوئی علمی انکشاف ہوتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان بھی اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔ پولینڈ یا کینیڈا میں گندم کم پیدا ہوتا ہے تو یہاں گندم کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان کی منڈیوں پر باہر کی کیفیات کا اثر پڑتا ہے اور لائل پور میں بیٹھا ہوا ایک کسان بیرونی دنیا کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔

انھیں بیرونی واقعات سے متاثر ہو کر ہم لوگوں میں حب الوطنی اور قومیت کا جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے اب ہم آہستہ آہستہ ایک قوم بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اگرچہ منزل مقصود ابھی دور ہے تاہم ٹھیک راستہ انتخاب کر لیا گیا ہے۔ اور کسی دن ضرور ہم اپنی امید کے خواب کی تعبیر دیکھ سکیں گے۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی بات جو انگریزی اثرات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم میں ترقی کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے فلسفی اور عالم اب صرف پرانی تعلیمات کو دوہرانا ہی اپنا نصب العین نہیں سمجھتے۔ بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کو بہتر بنائیں۔ وہ موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی یہ بے اطمینانی ابدی ہے۔ وہ کبھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ملک کے عروج کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اب وہ دور نہیں کہ ہمارے بزرگ موجودہ نسل کو کوسنے۔ بداخلاق اور کم مایہ کہکر چپ ہو جائیں۔ اور ازمنہ قدیمہ کے سنہری اور رنگین خوابوں میں غرق رہیں۔ بلکہ ان کی نظریں اب ہندوستان کے درخشاں مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

انہیں اثرات کا نتیجہ تھا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں وہ تحریک احیا شروع ہوئی جس کی وجہ سے ہندوستان میں علوم و فنون اور تمدن و تہذیب کے سرچشمے پھوٹنے لگے۔ موجودہ عہد کی تمام ترقیاں اسی تحریک کی پیدا کردہ ہیں۔

پہلے پہل تو یہ تحریک صرف ایک ذہنی بیداری کا نام تھی۔ اور علم وادب صنعت و حرفت تعلیم و تربیت پر اپنے گہرے نقش چھوڑتی چلی جا رہی تھی

مگر دوسری نسل سے یہ طاقت ایک اخلاقی قوت بن گئی۔ جس نے ہمارے مذہب و اخلاق کو مصفیٰ اور مجلّے کر دیا۔ اور اس کے بعد تیسری نسل سے اس تحریک نے ہندوستان کے معاشی اور اقتصادی حالت کو نئے خیالات سے متاثر کر دیا۔

اس تحریک کی تاریخ بے انتہا دلچسپ ہے۔ اور ایک مستقل مفصل مضمون کی محتاج ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ کہ ہندوستانیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی علوم و فنون کی تصنیفات سے متاثر ہو کر تراجم کے ذریعے اپنے ملک کو ان علوم و فنون کے بے انتہا خزائن سے مالا مال کرنے لگا۔

راجہ رام موہن رائے پہلے ہندوستانی ہیں۔ جنھوں نے انگریزی میں کتابیں لکھیں۔ ان سے پہلے انگریزی تعلیم صرف اس غرض کے لئے حاصل کیجاتی تھی کہ انگریزی دفاتر میں نوکری ملے۔ اور اسے مدنیت کا ایک عنصر نہیں سمجھا جاتا تھا۔

سر چارلس ٹریویلین "ہندوستان میں تعلیم" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ ۱۸۳۴ میں ہندوستانیوں کے دل میں یہ اشتیاق پیدا ہو چکا تھا۔ کہ وہ انگریزی تعلیم کے فوائد سے بہرہ ور ہوں۔ چنانچہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہندوستان کے ہر حصے میں ترقی کر رہا ہے۔ گنگا میں جو دخانی کشتیاں چلتی ہیں وہ تمام کی تمام ہندوستانی لڑکوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ جو اپنی تعلیم کے لئے دردناک طریقے سے بھیک مانگتے ہیں۔

۱۸۳۵ سے حکومت نے ان سکولوں کو سرکاری امداد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے بعد انگریزی اسکول بہت بڑھ گئے۔

احیائے علوم و فنون کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اس کے پہلے اثرات ادب پر مترتب ہوئے۔ اور اب ہمارا ادب تقریباً انگریزی ادب کی ہمسری کا دعوےٰ کرسکتا ہے۔ علم ادب میں پچھلے چند سالوں میں ایسا ارتقا ہوا ہے۔ کہ صدیوں کا کام اس مدت میں سما گیا ہے۔ اگرچہ میں نے اپنی مثالیں بنگالی ادب سے لی ہیں۔ تاہم ناظرین خود بمبئی اور مدراس کی تصنیفات میں اس قسم کی چیزیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔

پُراسرار کان

ساون کا مہینہ تھا - اور دوپہر کا وقت - دھوپ کڑاکے کی پڑ رہی تھی - ہم پندرہ بیس آدمی گاؤں کے دیوان خانے میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے - گفتگو کا موضوع زیادہ تر فصلوں کی حالت سے متعلق تھا -

گاؤں کے نمبردار نے کہ جس کی دوراندیشی گرد و نواح میں مسلم تھی - وثوق کے ساتھ کہا کہ "اگر چند دن اور برکھا نہ ہوئی تو کھیتیاں سوکھ کر ایندھن ہو جائینگی -

دوسرا شخص بولا "بے چارے زمینداروں کی شامت گذشتہ خشک سالی کے ہاتھوں ابتک قحط کی کڑیاں جھیل رہے ہیں - دیکھئے اس سال کن مصائب کا منہ دیکھنا پڑتا ہے"

اتنے میں ایک اجنبی بوڑھا نہایت رعب و داب سے اندر داخل ہوا - اور ایک خالی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "رحمت خدا وندی سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے - ذرا باہر نکل کر تو دیکھو - ٹلے کی جانب سے اودی اودی گھٹائیں کس تیزی سے بڑھتی چلی آرہی ہیں - امید ہے موسلا دھار بارش ہوگی پھر دیکھنا گذشتہ سال کی کسر کس طرح پوری ہوتی ہے"

اجنبی کی پُراسرار شخصیت، اور عجیب و غریب شکل و شباہت نے ہم سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا - اس کا لمبا قد - چوڑا سینہ اور پُرجلال چہرہ صاف صاف بتا رہے تھے - کہ وہ کسی زمانے میں گرانڈیل جوان ہوگا - مگر اس کے لمبے لمبے کانوں نے کہ جو اس کے رخساروں پر لٹک رہے تھے ہم سب کو مبہوت کر رکھا تھا - اور حاضرین میں اشاروں ہی اشاروں میں ان کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں

اس نے ہماری نگاہوں کو بھانپتے ہوئے کہا کہ ان کانوں کا بُرا ہو - یہ میرے لئے سخت پریشانی اور تکلیف کا باعث واقع ہوئے ہیں - جہاں جاتا ہوں مجھ پر انگلیاں اٹھتی ہیں - کئی بار میں نے ارادہ کیا - کہ انہیں سرے سے کٹوا ہی دوں - مگر اس خوف کے مارے - کہ اس حالت میں لوگوں کی انگلیاں پہلے سے بھی زیادہ اٹھیں گی - اس ارادے سے باز آتا رہا - علاوہ بریں یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ میں ان کانوں کو کٹوا دوں - جو اس وقت کی یادگار ہیں جب پہلے پہل میں نے نجات کی راہ پائی تھی -"

اسی اثناء میں بادلوں نے آسمان کو اپنی سیاہ چادر میں ڈھانپ لیا - ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی - اور ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے دیوان خانے کی کھڑکیوں میں سے آکر پیغام مسرت دینے لگے - اور دوپہر کی جھلستی ہوئی لو اور کڑاکے کی گرمی کی بجائے اب نہایت خوشگوار سماں پیدا ہو گیا -

"نمبردار نے اجنبی سے درخواست کی - امید ہے آپ ہمیں ان کی سرگزشت سے محروم نہیں رکھیں گے"

ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں "ہرگز نہیں ہرگز نہیں" پہلے تو اجنبی نے کچھ لیت و لعل کی مگر ہمارے بار بار کہنے پر راضی ہو گیا - اور اپنی کہانی یوں شروع کی :-

"دوستو میں نہیں چاہتا تھا - کہ یہ راز کسی پر ظاہر کروں - مگر آپ لوگوں کے پیہم اصرار نے مجبور کر دیا ہے - کہ سب کچھ بلاکم و کاست کہہ دوں - مجھے یہ کہتے ہوئے از حد ندامت محسوس ہو رہی ہے - کہ میں جوانی میں ایک نامور ڈاکو تھا - وہ زمانہ یاد کر کے میرا کلیجہ دہل جاتا ہے - میں ایک خونخوار بھیڑیئے کی طرح کہ اپنی مطلب براری کیلئے انسانوں کو نہایت سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا - میں ایسا نڈر اور بے باک ہو گیا تھا کہ پچاس پچاس میل دور لوٹ مار کر کے راتوں رات واپس آجاتا - میرا دل پتھر ہو گیا تھا - مجھ میں انسانی محبت اور ہمدردی کی بُو تک باقی نہ رہی تھی -

"ہاں تو ایک موسم گرما کا ذکر ہے - میں چوری کی غرض سے اُدھر (شمال کو) ہمالہ کے دامن کی طرف نکل گیا - اگلے دن میں ایک نہایت سرسبز اور شاداب علاقے میں پہنچا - میں برابر چلتا گیا - حتیٰ کہ دوپہر ہو گئی - مگر کوئی آبادی نظر نہ آئی - مجھے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور پیاس سے الگ نڈھال ہو رہا تھا - آخر میں نے ارادہ کیا کہ سامنے والی پہاڑی پر چڑھ کر نظر دوڑاؤں - شاید کوئی انسانی مسکن پاؤں چوٹی پر پہنچ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی - جب میں نے اس کے

دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں دیکھا - میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچا - وہاں کے گاؤں ہمارے ان گاؤں کی طرح نہیں ہوتے - وہ لوگ اپنے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر بناتے ہیں۔ کچھ توقف کے بعد میں نے ایک گھر کا رُخ کیا - ایک نوجوان عورت دالان میں جھاڑو دے رہی تھی - میں نے کہا "بہن بھوکا ہوں - ہوسکے تو کچھ کھانے کو دلواؤ۔"

اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا "بھائی خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے - آؤ دل کھول کر کھاؤ پیو - اس نے عزت کے ساتھ چارپائی پر بٹھایا - چند باسی روٹیاں اور مکھن میرے آگے رکھدیا - میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا - اور تھوڑی چھاچھ بھی پی - کھانا کھانے کے بعد میرے حواس بجا ہوئے تو مجھے اپنے مقصد کا احساس ہوا میں نے ایک نظر گھر پر ڈالی - پانچ سات بھینسیں - ایک گھوڑی - بیلوں کی دو تین جوڑیاں درختوں کے سائے میں بندھی تھیں - نوجوان عورت خود بھی زیورات سے لدی ہوئی تھی - گھر بھی اجلا اور سجا ہوا - میں نے ارادہ کیا کہ آج کی رات یہیں قسمت آزمائی کرنی چاہیئے - چنانچہ میں نے اس سے پوچھا -

"بہن یہاں والے اپنے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر کیوں بناتے ہو - کیا تمہیں چور ڈاکو کا خطرہ نہیں"

"اس نے حیرت سے جواب دیا - چور ڈاکو! کسی کی کیا مجال ہے جو یہاں دم مار سکے۔"

"تمہارا خاوند یہیں کھیتوں میں کام کرتا ہوگا"

"نہیں وہ باہر کام کو گیا ہوا ہے - شاید کل آجائے"

"تو تم اکیلی ہو"

"ہاں"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا"

"ڈر کا ہے کا"

اس گفتگو کے بعد میں چلتا بنا - اور باقی دن ادھر ادھر گھوم کر گزار دیا - رات کو جب تمام لوگ سو گئے - اور گاؤں پر خاموشی چھا گئی تو میں اس گھر کی طرف چلا - نوجوان عورت آنگن میں محو خواب تھی - میں نے زیورات اتارنے شروع کئے - وہ بے حس و حرکت پڑی رہی - زیورات اتار لینے کے بعد میں چاہتا تھا کہ گھوڑی پر سوار ہو کر نکل جاؤں - کہ نوجوان عورت نے اچک کر میرا بازو پکڑ لیا "اب کہاں جاتے ہو"

میں نے چھڑانا چاہا - مگر بے سود، وہ بدستور بستر پر لیٹی رہی - اور میرا بازو قابو میں کئے رکھا - مجھے بھی اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا - بہتیرا زور لگایا - مگر بازو نہ چھوٹنا تھا نہ چھوٹا - آخر ہار کر بیٹھ گیا "بھاگنا چاہتے ہو تو بھاگ دیکھو" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا - اور مجھے آزاد کر دیا - میں موقع کی تاک میں رہا اور آنکھ بچا کر بھاگ نکلا - مگر چند قدم ہی چلا تھا - کہ میرا بازو پھر اس کی آہنی گرفت میں تھا - اب میں اس کے رحم پر تھا - اس نے رات کی تاریکی میں مجھے غور سے دیکھا - اور مجھے پہچانتے ہوئے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی "واہ بھائی - تم نے ناحق اتنی تکلیف کی - تم نے مجھے کل ہی بتا دیا ہوتا - میں اپنا سارا زیور تمہارے حوالے کر دیتی - اب تمہیں آرام کرنا چاہیئے تمہیں رات بھر بے خوابی رہی ہے" - اس کے الفاظ سے ہمدردی اور خلوص ٹپکتا تھا - مجھے اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی - اور میرے دل میں ایک نامعلوم سی کشمکش برپا ہو گئی -

یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی - میں نے سوچا شاید مذاق کر رہی ہے میرے دل میں بھاگنے کا خیال پیدا ہوا - مگر اُس کی شجاعت اور خود اعتمادی نے مجھے اسقدر مرعوب کر دیا - کہ اپنی جگہ سے ہلنے کی جرأت نہ ہوئی "شاید منت سماجت کرنے پر چھوڑ دے"

اتنے میں وہ ایک خوبصورت اور صاف ستھرا بستر لئے آموجود ہوئی - اور اسے ایک چارپائی پر بچھا کر کہا "لو اب آرام کرو"

میں نے رکتے رکتے اور نہایت مدھم آواز سے کہا "بہن میرے حال پر رحم کرو - اور مجھے جانے دو"

نرمی سے کہنے لگی "فکر کو دور کر دو - اور آرام کرو"

میں حیران کھڑا رہا - مگر اس نے اصرار کیا - اور میں چارپائی پر لیٹ گیا - لیکن مجھے نیند کہاں -

اسی کشمکش میں کافی رات گزر گئی - کسان بیلوں کو لئے کھیتوں کو جانے شروع ہو گئے - اور بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے فضا گونجنے لگی - نوجوان عورت بھی دودھ بلونے میں مشغول ہو گئی - مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ گویا خواب دیکھ رہا ہوں - میرے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا - میں رہ رہ کر اپنے انجام کے متعلق سوچتا - صبح ہونے پر اس نے مجھے دیہاتی ناشتہ دیا - جو باسی روٹی کے ایک ٹکڑے اور پاؤ بھر مکھن پر مشتمل تھا اور گھر کے کاروبار میں مشغول ہو گئی - کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد وہ

فارغ ہوئی - اور پھر کھانا پکانے میں لگ گئی - اس نے پُر تکلف دیہاتی کھانے پکائے -

میں نے سمجھا کہ شاید اس کے شوہر کے ساتھ مہمان آنیوالے ہیں - جو یہ اسقدر اہتمام کر رہی ہے - اس کے شوہر کا خیال کر کے میرے حواس باختہ ہوگئے - اور میرا غم بڑھ گیا - اتنے میں وہ کھانوں کو چنتی ہوئی پھر لوٹی -

"بھائی تم متفکر ہو - ان کی ملاقات کے لئے تیار رہو" مگر میرا بے چین دماغ یہ سمجھنے سے قاصر رہا - کہ یہ الفاظ کس جذبے کے ماتحت کہے گئے ہیں -

اتنے میں گھوڑی ہنہنائی، اور دوسرے مویشیوں نے اپنے تھانوں پر چکر کاٹنے شروع کر دیئے - میری نگاہ فطرتاً دروازے پر اٹھ گئی - ایک خوش وضع مقبول صورت اور وجیہہ نوجوان اندر آ رہا تھا - خوف کے مارے میرے جسم میں کپکپی آگئی - کیونکہ چوپایوں کی حرکت سے صاف ظاہر تھا - کہ وہ ان کا مالک ہے - نوجوان عورت اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی - اور کہنے لگی "یہ میری چھوٹی پھوپھی کا بیٹا ہے - مدت سے باہر گیا ہوا تھا - چند دن ہوئے واپس آیا ہے - اور اب میری ملاقات کو آیا ہے" -

اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا - کہ میرے دل سے برائی کی آلودگیاں اور گناہ کی آلائش غائب ہو رہی ہیں - میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا - کہ محبت کی روشنی میرے دل کو منور کرنے لگی -

نوجوان بڑے تپاک سے مجھ سے بغلگیر ہوا - اور کہنے لگا "بھائی تمہیں دیکھکر بڑی خوشی ہوئی - کچھ دن ہمارے پاس رہو گے نا -

اتنے میں نوجوان عورت نے دسترخوان پر کھانا چن دیا - اور ہم دونوں نے کھانا شروع کیا - رات بھر کی تشویش نے مجھکو اسقدر اداس بنا دیا تھا کہ ان کی دلجوئی کے بعد بھی میں پریشان سا معلوم ہو رہا تھا - ان دونوں نے مجھے خوش کرنے کی انتہائی کوشش کی - نوجوان سمجھ رہا تھا کہ میں اس جگہ سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہوں -

میں دو دن تک وہاں رہا - اور انہوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا - تیسرے دن میں نے ان سے اجازت چاہی - تو نوجوان بولا "بھائی ہم تو چاہتے تھے کہ تم کچھ دن اور ہمارے پاس ٹھہرتے" لیکن میں نے اصرار کیا - تو وہ کہنے لگے "خیر آپکی مرضی" اور اس نے کھیتوں کی راہ لی - جب کھانا کھانے کے بعد میں تیار ہوا - تو نوجوان عورت نے اپنے تمام زیورات اتار کر میرے آگے رکھ دئے اور کہنے لگی "لو کوئی اور کام شروع کرنا - چوری اب ہرگز نہ کرنا" پھر وہ میری طرف بڑھی، اور میرے دونوں کان پکڑ کر اس زور سے کھینچے - کہ میرے رخساروں پر ڈھلک آئے - "اور یہ میری نشانی ہے - یہ تم کو لگا ہے - تمہیں اپنی بہن اور اس کی نصیحت یاد دلاتی رہیگی - جاؤ خدا حافظ"

بھائیو یہ میری اس بہن کی مہربانی ہے - کہ اس نے یہ کان مجھ پر در بان بٹھا دیئے ہیں - جب کبھی مجھے پرانی عادت کا خیال آتا ہے یہ مجھے ہلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - گویا کہ مجھے منع کر رہے ہیں -

اس کے بعد ہم سب نے باہر نظر ڈالی - تو اسقدر بارش ہو چکی تھی، کہ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا -

عزیز مراد پوری

رباعیات

سب مجھ سے اگر ہوں خوش تو میں شاد نہیں
منسوب جہاں میں غم سے آزاد نہیں
اچھے اچھا کہیں، بُرے مجھکو بُرا
جب میں جانوں کہ زیست برباد نہیں

مجھکو دن رات جستجوئے دل ہے
میری ہر بات گفتگوئے دل ہے
اصلاح کی کیا اُمید احباب سے ہو
تنقید حیات آرزوئے دل ہے

ر - وال - ایم - اے

تصوّف اور اسلام

سرزمین مشرق میں صوفیانہ خیالات کی ابتدا کو ایک ہزار سال سے زیادہ مدت ہوتی ہے۔

ایران کے اکثر علماء، حکما، ادیب، شعراء بلکہ تمام وہ لوگ جو صحیح ذوق اور عقل سلیم کے مالک ہیں تصوّف سے دلچسپی لیتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ انہوں نے تصوّف کو ایک علمی اصول یا عقیدہ سمجھکر اختیار کیا ہو بلکہ وہ عملاً تصوف کی راہ پر چلتے رہے ہیں۔

تصوّف کو اسلام سے جو تعلق ہے اس کی اہمیت تو بالکل ظاہر ہے لیکن اسلام کے علاوہ ایران سے تصوّف کو جو تعلق رہا ہے اس کی بنا پر اس کو فلسفۂ ایران کے نام کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ حکیموں، عالموں اور حکمت طبعی اور ریاضی کے پیروؤں کی تعداد مشرقی ملکوں میں کافی رہی ہے مگر پھر بھی وہ کچھ ایسے زیادہ نہیں۔ اور اُن کے عقیدوں نے مشرقی فلاسفروں کے خیالات میں شروع سے وہ اثر نہیں کیا جو تصوف نے کیا ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے سے لے کر اس وقت تک تصوّف نے جو خاص اثرات مختلف طبقوں میں کئے ہیں۔ جب ہم ان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے اشراقیین سے لے کر بڑے بڑے مشائخ، خانقاہوں کے درویش اور پُرانے عقیدے کے پیرو جیسے کہ ابراہیم ادھم رح، رابعہ عدویہ رح، حسین بن منصور حلاج رح، غزالی رح، محی الدین ابن عربی رح، ملا صدرا رح، خواجہ حافظ شیرازی رح، جلال الدین رومی رح، عمر ابن الفارض رح یہ تمام حضرات اسی تصوّف کے سلسلے میں شامل ہیں۔

غرض کہ یہ عقیدہ تمام اسلامی ملکوں میں اور خاص اور پر ایران میں بغیر کسی خصوصیت کے تمام اسلامی فرقوں میں تعلیم اور رہدایت کا مرکز بنا رہا ہے۔

ایک ایسا خیال جو ایک ہزار سال سے زیادہ مدت سے دُنیا کے ایک بہت بڑے حصّے میں بہت زیادہ پھیل رہا ہے بے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ محققین یورپ نے ہمارے زمانے میں اس پر اپنی تصانیف میں بحث کی ہے۔ جن میں پروفیسر براؤن کے خیالات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبی ایران" میں تصوف کے متعلق ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس کا ترجمہ پیش ہے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ

"اگرچہ یہ عرفانی مسلک جس کی بُنیاد توحید، حکمت الٰہی اور عقیدہ معنوی پر ہے اور جو مسلمانوں میں تصوّف کے نام سے مشہور ہے کوئی زیادہ قدیم عقیدہ نہیں ہے مگر جب ابن الندیم کی کتاب الفہرست تالیف ہوئی اس وقت اس عقیدے کے اصولی خیالات مرتب ہو چکے تھے۔

اس اعتبار سے صوفیانہ عقائد اور خیالات کے جاننے کے لئے فارسی شعروں کو عام طور پر اور پُرانے شاعروں کے کلام کو خاص طور پر سمجھنا اور اُن کے معنوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

خصوصیت سے ان شاعروں کے کلام میں زیادہ غور کی ضرورت ہے جو حکیم سنائی رح، شیخ عطار رح، جلال الدین رومی رح سے پہلے گزر چکے ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر رح سب سے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں صوفیانہ خیالات لکھے گئے۔ شیخ صاحب کی رُباعیات ڈاکٹر اِتھ کی تصنیف کا ایک بہترین موضوع ہیں۔ ان رُباعیات کا ترجمہ پروفیسر ژوکوفسکی نے بڑی محنت سے کیا ہے۔

لفظ "صوفی" کی تحقیق کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے مگر اب تک تحقیقی طور پر جو کچھ مانا گیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ "صوفی" "صوف" سے نکلا ہے کیونکہ فارسی میں "صوف کا کپڑا پہننے والے" کو اہلِ تصوف میں مانا جاتا ہے۔

کمبل پوشی ابتدائے اسلام سے سادگی اور درویشی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور ان لوگوں کے متعلق جو کمبل اوڑھے ہوتے ہیں یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہ لوگ دُنیا کی بُرائیوں سے بچتے ہیں اور پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے طریقوں پر چلتے ہیں۔

لفظ ابتدا میں مسعودی نے "مروج الذہب" میں پیغمبر کے پہلے چاروں خلیفوں کے لئے استعمال کیا۔ اس کے بعد پارسا اور گوشہ نشین لوگوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔

جس طرح انگلستان میں کویکر کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو سادہ لباس کو دُنیا کی بُرائیوں سے بچنے کی علامت سمجھتے ہیں

اسی طرح صوفی کا لفظ بھی اسلام میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے +

اسلام میں اس لفظ کا استعمال دوسری صدی ہجری کے درمیان سے پہلے نہیں ہوا۔ کیونکہ مولٰنا جامیؒ نے اس کی تشریح کی ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے ۱۶۰ھ میں ابوہاشم شامیؒ کے لئے استعمال کیا گیا ہے +

میرے خیال میں یہ رائے بہت صحیح ہے کہ صوفی "صوف" سے نکلا ہے۔ مگر بعض لوگوں نے اس کے علاوہ اور بھی ایسے دلچسپ الفاظ کا ذکر کیا ہے جن سے یہ لفظ نکلنا بیان کیا جاتا ہے +

ایک خیال یہ ہے کہ یہ ایک یونانی کلمہ "سوفوس" سے مناسبت رکھتا ہے +

(مولانا) جامی کہتے ہیں کہ "صفا" سے نکلا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اہلِ صفہ سے اس کو مناسبت ہے +

قشیری نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ کلمہ سب سے پہلے دوسری صدی کے ختم ہونے سے کچھ پہلے استعمال کیا گیا ہے +

کتاب الفہرست کے مصنف نے لکھا ہے کہ جن لوگوں کو پہلے لفظ صوفی کا لقب دیا گیا ان میں یحیٰی بن عباد الرازی سب سے پرانا شخص ہے +

اگرچہ شروع زمانے میں جو لوگ صوفی مشرب تھے ان کو اس وقت صوفی کے لقب سے یاد نہیں کیا گیا مگر بعد میں ان کے پیرو ان کو اسی لفظ سے پکارتے رہے ہیں۔ جن میں ابراہیم ادھمؒ (وفات ۱۶۱ھ) داؤد طائیؒ (وفات ۱۶۵ھ) فضیل عیاضؒ، رابعہ عدویہؒ زیادہ مشہور ہیں +

اب ہمیں تصوّف کی ماہیت، اصل تصوف، منشائے تصوّف اور تصوّف کے بعض دوسرے اصول کے متعلق بحث کرنی ہے +

(۱) صوفیا کے نزدیک تصوف کی ماہیت اور حقیقت کی بنیاد رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ظاہری اور باطنی تعلیم کا مظہر ماننے پر رکھی گئی ہے۔ اس عقیدے کا سبب یہ ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانانِ عالم کی قلبی محبت کا مرکز ہیں:

اگرچہ یہ عقیدہ پیروانِ فرنگ کے لئے کسی قدر تعجب خیز ہے مگر ایسا مہمل اور بے حقیقت سمجھے جانے کے قابل نہیں جس قدر کہ اہلِ یورپ سمجھتے ہیں، کیونکہ اس عقیدہ کا مانند "كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِكَي أُعْرَفَ" و "كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْءٌ" "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" اور اسی قسم کی دوسری روایات پر ہے۔

جب ہم پیغمبرِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے تاریخی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اُن کو صرف ایک صوفی مشرب انسان سمجھیں +

مگر اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوفیا کا عقیدہ معتدل پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس لئے علمائے متکلمین جن میں حضرت غزالیؒ جیسے عظیم الشان افراد بھی شامل ہیں صوفی مشرب رہے ہیں +

(۲) اصل تصوف کے متعلق اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ یہ بعض آریائی خیالات کے مخالف اور مقابلے پر نکالا گیا ہے +

اسلامی تصوّف کی بنیاد ایرانی تصوف یا ہندی روحانیت پر رکھی جا سکتی ہے +

موجودہ تصوف پر جب ہم غور کرتے ہیں اور ہندی تصوف کے اصول کو سامنے رکھتے ہیں تو ہماری توجہ اس طرف ہوتی ہے کہ ان دونوں روحانی طریقوں میں کچھ مناسبت ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دو مختلف طریقے ہیں جن کی منشا ایک ہے +

ہمارے اس خیال پر جو بڑا اعتراض کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں چھٹی صدی عیسوی میں نوشیرواں کے زمانے میں ہندوستان اور ایران میں آپس میں علمی بحث جاری رہی ہے اور دونوں ملکوں میں تعلقات قائم رہے ہیں۔ مگر ہم ابتدائے اسلام میں ایران کے اندر ہندی تصوف کے اثرات بالکل نہیں پاتے +

جب تک ایران میں موجودہ تصوف کے طریقے کا رواج نہیں ہوا اُس وقت تک ہندوستان کے روحانی عقائد نے وہاں اپنا کوئی اثر نہیں قائم کیا تھا +

مسلمانوں میں سب سے پہلے البیرونی نے سنسکرت، جغرافیۂ ہند، تاریخ ہند، ادبیاتِ ہند اور ہندوستانی خیالات اور عقائد کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اُس نے اپنی تاریخی زندگی کے مشہور و معروف خیالات لکھے +

البیرونی کی تعلیم اور ہندوستانی خیالات و عقائد کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد تصوف کو ہندی روحانیات کی امداد ملی ہو۔ چنانچہ کریمر نے اپنے اس خیال کو ظاہر کیا ہے:-

وہ لکھتا ہے "یہ بالکل ممکن ہے کہ البیرونی کے عہد کے بعد ہندوستانی عقائد نے تصوف کی ترقی میں بہت جلد اپنے اثرات سے کام لیا ہو۔ مگر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے کے تمام صوفیا ایرانی نسل ہی کے نہ تھے بلکہ ان میں محی الدین ابن عربیؒ، ابن الفارضؒ وغیرہ اشخاص بھی تھے جو خاص عربی ہیں اور ان کی تصانیف پر تصوف کا بڑی حد تک دارومدار ہے +

چنانچہ اوحدالدین کرمانیؒ اور مولانا جامیؒ، ابن عربیؒ کی کتابوں سے

نشاط باغ

دیوان عام (شالامار باغ)

برافادہ کرتے رہے ہیں۔ اس زمانے میں بھی محی الدینؒ کی تصانیف مصوفین ایران کے مطالعہ میں رہتی ہیں۔ جن میں "فصوص الحکم" کا خاص درجہ ہے +

(۳) یونان کے فلسفۂ "اشراق" کو منشائے تصوف قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے اس کا اخذ و اقتباس یونانی فلسفۂ اشراق سے کیا گیا ہو + چنانچہ میرے دوست اور شاگرد نکلسن نے اپنی کتاب "منتخبات دیوان شمس تبریزی" میں اس عقیدے کو بیان کیا ہے مگر فلسفۂ اشراق کے بانی پلوٹینوس کے متعلق نکلسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اس کو سرزمین مشرق میں کوئی شخص نہیں جانتا۔ کیونکہ کتاب الفہرست میں اس کا نام "صفحہ ۲۰۰" پر موجود ہے +

"شہرستانی" نے بھی کتاب الملل میں اس حکیم کا ذکر کیا ہے۔ شہرستانی اور اس کے علاوہ دوسرے مشرقی مصنفین اس کو یونانی کے نام سے یاد کرتے ہیں +

اس میں شک نہیں کہ تصوف اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے اس میں اور یونان کے فلسفۂ اشراق میں بہت سی وجوہ سے ایک قسم کا تعلق پایا جاتا ہے +

اگرچہ طریقۂ اشراق اور عقیدۂ تصوف کے درمیان بہت سے ایسے ملے جلے مسائل ہیں جن سے ان دونوں کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے مگر ان میں سے اکثر کو ہم حل نہیں کر سکتے اور اُن کے جوابات ہم سے بن نہیں پڑتے۔ مثلاً پہلی چیز یہ ہے کہ:۔

(۱) اشراقی فلاسفہ نے سرزمین مشرق خصوصاً سرزمین ایران سے اپنے فلسفے کے لئے کیا اخذ کیا ہے؟ کیونکہ پلوٹینوس کے متعلق پورفیری نے اس کے حالات زندگی میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ فلسفۂ ایران کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایران گیا تھا +

(۲) بیزانس کے وہ سات اشراقی فلاسفہ جنہوں نے جلاوطن ہو کر نوشیرواں کے زمانے میں ایران میں پناہ لی تھی انہوں نے وہاں اپنے عقائد پھیلائے اور اس کام کے لئے کوئی مدرسہ یا مکتب قائم کیا یا نہیں؟

ہم اس سوال کو (کہ "تیسری صدی ہجری میں جو اسلام کے عروج کا زمانہ ہے دانشمندان اسلام میں فلسفۂ اشراق کے اثرات موجود تھے؟") اس وقت تک حل نہیں کر سکتے جب تک پہلے دو سوالوں کا جواب ہمارے پاس موجود نہ ہو +

یہ سوال کہ آیا "تصوف" اسلام میں ایک مستقل عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے اسی ضمن میں باقی رہ جاتا ہے!

نکلسن کہتا ہے کہ "اتحاد اور اعتقاد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک کا وجود دوسرے سے پیدا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ دونوں ایک سبب یا چند اسباب سے پیدا ہوں +

جس شخص نے وگون کی کتاب "ساعتے با صوفیاں" کا مطالعہ کیا ہے وہ بہت آسانی سے اس امر کا اندازہ کر سکتا ہے کہ صوفیا کے کلمات اور مختلف مذاہب کے کلمات میں ایک خاص مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ہم یہ بھی جسارت کر سکتے ہیں کہ اکارٹ ۔ ٹولر ۔ سنٹ ٹرزا کے کلمات کا اگر فارسی ترجمہ کیا جائے تو وہ مشائخ صوفیہ کے کلمات سے بہت مشابہ پائے جائیں گے +

حامد انصاری

اپنی محنت اور خدا کے سوا کسی کا آسرا نہ ڈھونڈو۔ خدا محنت کو کامیاب کرتا ہے +
(ڈکنس)

ہمیں اُن معدودے چند لوگوں میں شامل ہونا چاہئے جنہیں اپنے فرائض کا صحیح احساس ہے +
(ڈکنس)

محنت کرو اور اُس کے پھل کا انتظار! تمہارا دامن انعامات سے جلد مالا مال ہو جائے گا +
(لانگ فیلو)

انصاف

. . . کی گلیوں میں سب سے زیادہ تاریک اور غلیظ گلی میں ایک شکستہ مکان ہے۔ میں نے اس مکان کو ایک بار اتفاقاً وہاں سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اب تک اس ہیبتناک مایوسی کا اثر میرے دل پر قائم ہے میرے ایک مہربان جو بفضل خدا دولت دنیا سے بہت بڑی حد تک بہرہ ور ہیں۔ اپنے ایک غریب دوست کی تیمارداری کرنے کے لئے اس طرف تشریف لیگئے۔ تو مجھے بھی ہمراہ لے لیا۔ وہ تو ذرا آگے چلے گئے۔ اور میں ان کے انتظار میں اس شکستہ مکان کے قریب کھڑا رہا۔ دروازے پر ایک معصوم بچی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کی عمر پانچ یا چھ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے کپڑے دیکھ کر چیتھڑوں کا مطلب سمجھ میں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر غربت نے چند ایسے نقوش ثبت کئے تھے۔ کہ اس کمسنی میں بھی اس کے بشرے سے تدبر و عظمت کے آثار عیاں تھے۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں، تیکھے نقش۔ کھلتا ہوا رنگ اور متناسب اعضا میری نظر میں اس امر کی دلیل تھے کہ وہ کسی غریب مگر شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد قریب کے مکانوں سے چند اور بچے نکل آئے ان میں کچھ لڑکے تھے اور کچھ لڑکیاں

میں نے انسانی روح کو بہت ذلیل حالت میں دیکھا ہے۔ مگر جسطرح کا خبث باطن ان بچوں کے چہرے پر نظر آتا تھا اُسے دیکھ کر میں اپنے دل میں خوف محسوس کرتا تھا۔

غریب اور ذلیل آدمیوں کی اولاد۔ تنگ اور غلیظ گلیوں میں پلے ہوئے۔ افلاس کے تربیت کئے ہوئے۔ مکاری اور دغابازی کی فضا میں رہنے والے۔ سیاہ سے سیاہ جرائم سے آشنا۔ یہ بچے (میں انھیں کس طرح بچے کہوں) جن کے نحیف بدنوں میں شیطانی خباثت حلول کر گئی تھی۔ یہ شیطان لڑتے جھگڑتے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔

وہ معصوم بچی جو میرے قریب کھڑی ہوئی تھی ان میں مل گئی۔ اور عین اسی طرح جس طرح ایک قطرہ بحر ذخار میں ملکر اپنی شخصیت کھو دیتا ہے۔ خود بھی انھیں بچوں کی طرح ان کے غلیظ کھیلوں اور گالیوں میں شامل ہو گئی۔

پھر مکان کا دروازہ کھلا اور ایک قد آور شخص باہر نکلا۔ اسکے کپڑے تمام مشین کے تیل سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اور چہرے پر بھی کئی جگہ تیل کی سیاہی کے نشان موجود تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریلوے ورکشاپ کا ملازم تھا۔ کیونکہ اس کے مضبوط ہاتھ۔ کپڑوں کی تراش اور سیاہی کے رنگ سے میں یہی اندازہ کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے گلی میں ادھر ادھر دیکھا بچے کھیلتے ہوئے کسی اور گلی میں جا چکے تھے۔

اس نے بلند اور کرخت آواز میں پکارا "نسیم"

مگر "نسیم" وہ معصوم بھی تو ایک شیطانی رو کے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ وہ غالباً جا کر اپنی لڑکی کو ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ مگر خدا جانے کیا خیال آیا کہ وہ واپس مڑ گیا۔

واپس مڑتے ہوئے اس نے مجھ پر ایک گہری اور حقارت آلود نگاہ ڈالی۔ لوہے اور آگ سے کھیلنے والا نوجوان میرے کمزور بدن اور نمائشی لباس کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید اس عرصہ میں جو اپنی بیوی کو نسیم کی غیر موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا۔ پھر اس کی آواز سخت لہجے میں بلند ہوئی۔ اور اسکے ساتھ ہی مجھے ایک نسوانی آواز بھی سُنائی دی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ کیوں تم اس ملعون کی بچی کو باہر جانے سے نہیں روکتیں۔ میں اسوقت آرام چاہتا ہوں اور تم مجھے باہر بھیجتی ہو۔ کہ اسے واپس لاؤں۔ خدا جانے وہ خبیث اسوقت کہاں ہوگی۔ اچھا آنے دو دیکھو میں اسکی کیسی خبر لیتا ہوں۔

پھر وہ نسوانی آواز سُنائی دی

"ہاں خبر ہی تو لوگے تم"۔ میں لوگوں کے بچوں کو دیکھتی ہوں باپ سے کسقدر مانوس ہوتے ہیں۔ تمھیں کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی لڑکی کو پاس لیکر بیٹھو۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کھیل کو دل چاہتا ہے۔ اگر تم اُسے اپنے پاس بٹھلا کر بہلایا کرو تو وہ کبھی باہر نہ جائے۔ مجھے تمام دن گھر کے کام سے فرصت نہیں۔ خدا جانے کس وقت آنکھ بچا کر باہر نکل جاتی ہے۔

وہ دیکھتی ہے تمھیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ باہر نہ جائے تو کیا کرے بس مار پیٹ ہی جانتے ہو یا کبھی تمھیں بچی پر پیار بھی آتا ہے۔ وہ پیار کے لئے ترستی ہے۔ تم اُسے پیار کرو اپنے پاس بٹھلاؤ۔ تو اُسے مارنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

"ہاں" خاوند نے کرخت لہجے میں کہا۔ پاس بٹھلا کر اُسے بہلاؤں۔

حقہ نہ پیوں - باہر نہ جاؤں - اپنی چار دیواری میں مرجاؤں - یہ ٹھیک ہے تم مجھے زہر ہی کیوں نہیں دیدیتیں -

پھر اس کی بیوی کی آواز سُنائی دی - کہ یہ بات ہے تمہیں گھر بیٹھنا زہر معلوم ہوتا ہے -

اس کی آواز بھرا گئی اور رونے کی دل خراش صدا میرے کانوں میں آئی میرے دوست لوٹ آئے - اور اُن کے ہمراہ میں گھر واپس آگیا -

اسی رات میں نے ایک خواب دیکھا

قیامت کا دن ہے - نور ازلی کی شعاعوں سے کائنات روشن ہے - عرش مقدس پر ایک ضیا ریز نور جگمگا رہا ہے -

عرش کے دونوں طرف قہار اور جبار فرشتے آتشیں گرز اُٹھائے ہوئے کھڑے ہیں -

یکایک ایک ہیبتناک فرشتۂ عذاب ایک حسین عورت کو کھینچتا ہوا لے آیا - اور میں نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا - "جوان نسیم" بالکل ایسی شکل کی ہونی چاہئے - فرشتے نے کہا " یہ نسیم ہے "گناہ کی بیٹی - اس نے تمام عمر ابن آدم کو گناہ کے تاریک راستوں کی طرف مائل کیا ہے - اور طوائف کے رذیل نام سے موسوم رہی ہے -

قہار فرشتوں نے اپنے گرز بلند کرلئے - نور ازلی میں سے ایک آواز آئی :-

اسے رہا کر دو حقیقی گنہگار یہ نہیں - گنہگار وہ ہے جو اسے آوارہ چھوڑ کر حقہ پینے میں مصروف رہتا تھا - جس کی ایک نگاہ التفات اسے بدی کے راستوں سے نیکی کی طرف لیجا سکتی تھی - جس نے اپنی لڑکی کی روح پر اپنے عارضی آرام کو ترجیح دی - اسکے باپ کو لے آؤ - میری آنکھ کھل گئی ٭

جواد حیدر ایم - اے

پیغام عمل

ہم نفس! عہدِ سلف کی یاد خوانی ہو چکی ۔ چھوڑ اس قصے کو - رنگیں داستانی ہو چکی

گردشِ گردوں کا شکوہ بخت واژوں کا گلہ ۔ داستانِ انقلابِ دارِ فانی ہو چکی

تا بکے آخر رہیگا شغلِ یادِ رفتگان ۔ دورِ ماضی کی بہت کچھ نوحہ خوانی ہو چکی

کام کے میداں کی اب کھائیے چلکر ہوا ۔ یعنی سیرِ باغِ الفاظ و معانی ہو چکی

ترجمہ کیجے عمل میں بھی اپنے علم کا ۔ نکتہ سنجی ہو چکی معجز بیانی ہو چکی

آشتی کرنی پڑے گی انقلابِ دہر سے ۔ روٹھے رہیئے گا کہاں تک؟ سرگرانی ہو چکی

ہاں خلافِ موجِ ایں دریا شنا کردن چہ سود
خویشتن را غرقۂ بحرِ فنا کردن چہ سود

میر نیرنگ

مذہب کی محبّت

اتھیل مینن امریکہ کی مشہور انشاپردازنے مندرجۂ ذیل سطور میں مذہب کی محبت پر اظہار خیال کیا ہے مقام مسرت ہے کہ نئی دنیا کی کفر آشنا فضا میں بھی اس قسم کی عورتیں موجود ہیں۔

اس سے پیشتر کہ میں اس بات سے بحث کروں کہ مذہب زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ مذہب کی جامع تعریف وضع کی جائے۔ مذہب ایک ایسا مبہم اور لچکدار لفظ ہے کہ موجودہ زمانے کے اشخاص نے اس لفظ کے ہزار ہا معنے نکالے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جہاں تک "محبت" اور "جو ہر قابل" جیسے الفاظ کا تعلق ہے انکا ابہام اور ان کے لچکدار ہونے کی خاصیت نے ان معانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جن پر یہ دلالت کرتے ہیں۔ لیکن مذہب ایسا لفظ ہے۔ کہ اسے لازماً ہونا چاہیئے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مذہب ایک خاص طریقہ کار کا نام ہے۔ جو ہمارے اعتقادات سے متعلق ہے تو بھی "حسن" کی طرح مذہب کے اتنے پہلو ہوں گے کہ ہر شخص کے لئے اس میں سب کچھ نہاں ہوگا۔

بعض اشخاص کے لئے مذہب "قادرِ مطلق" پر اعتقاد کامل رکھنے کا نام ہے۔ یا کسی برگزیدہ بندے کی پیروی کرنے سے مترادف ہے۔ بعض اسے افادہ بنی نوع انسان کا ضامن تصور کرتے ہیں۔ اور جس طرح جمالیات میں ایک ہی شے بعض اشخاص کے لئے زہر اور بعض کیلئے شہد ہوتی ہے۔ اسی طرح مذہب میں بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ایک مذہب کی صداقت اور قیمت کا معیار یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اسکے اصولوں سے بنی نوع انسان کو اپنی زندگی میں کتنی مدد ملی ہے۔

میرے خیال میں اس بات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کہ کوئی شخص مذہب کا پیرو ہے۔ اہمیت تو اس بات کو حاصل ہے کہ آیا اس مذہب کے اصولوں سے اس شخص کو واقعی محبت ہے۔ اور کیا وہ محبت اس درجے تک پہنچی ہوئی ہے کہ اس کی زندگی میں سب سے بڑا عنصر وہی محبت بن گئی ہے۔ کیا اس محبت نے اس زندگی کو خوشگوار اور نتیجہ خیز بنا دیا ہے؟ کیا اسنے اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ کر اپنے آپ کو پا لیا ہے؟

خدا کی تمام تعریفات باطل ہیں۔ یہ کتنی مہمل بات ہے۔ کہ قادرِ مطلق کی ازلی اور ابدی شخصیت کو الفاظ کے مجموعے میں مقید کرنے کی کوشش کیجائے۔ خدا کی تعریف وضع کرنا اسی طرح ہے جس طرح کوئی شخص ایک درخت کو دیکھ کر جنگل کے تمام درختوں کی نوعیت اور عظمت کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ الوہیت اسی میں ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ ازلی اور جامع ہے۔ وہ کائنات کے لئے اسطرح ضروری ہے جس طرح زمان و مکان۔ مگر انسانی ذہن اپنے تخیّل کی بلند پروازی میں بھی اسے چھو نہیں سکتا۔ خدا وہی ہے جو ہمارے ذہن میں کبھی نہیں سما سکتا۔

نقاب اُٹھاتے جاؤ۔ اور نقاب پیدا ہوتے جائیں گے۔ خدا کو صفات انسانی سے مقید کرنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس وقت خدا سے بہت نزدیک ہو جاتے ہیں جب ہمیں اس بات کی سمجھ آجاتی ہے کہ خدا ہمارے ذہن میں کبھی نہیں آسکتا۔ اس وقت مذہب ہمارے لئے مہر و ماہ سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب میں شمع ہدایت ہونے کی صلاحیت نہ ہو تو اسے مذہب نہیں کہہ سکتے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے خیال میں مذہب انسان کی جستجوئے الوہیت کا ردعمل ہے۔ صرف مذہب ہی ایک ایسی شے ہے جو ہمیشہ ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مذہب سے قطع نظر کرو تو دنیا ایک بجلی کی چمک ہے۔ جو انسان کے غم و رنج کو زیادہ نمایاں کر کے دکھاتی ہے +

سلیمان خاں
پی ۔ سی ۔ ایس

امریکہ کی مشہور انشا پرداز اور مصنف ایتھل مینن

ایران اور جرمنی کے قدیم سیاسی تعلقات

(شاہ اسمٰعیل صفوی کا ایک تاریخی خط کارل پنجم کے نام)

ایران اور جرمنی کے قدیمی سیاسی تعلقات پر ایک تاریخی نظر ڈالنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان تعلقات کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ کس زمانے میں ہوئی۔ اور کون سے بادشاہ کی طرف سے ہوئی؟ کیونکہ ان امور کے معلوم کر لینے سے اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑے گی +

ایران اور جرمنی کے تعلقات کی ابتدا ایران کے صفوی خاندان کے بادشاہ اسمٰعیل اول اور اُس کے لڑکے بادشاہ طہماسپ اول کے زمانے میں ہوئی ہے +

شاہ اسمٰعیل کی حکومت کا زمانہ ۹۰۶ھ سے ۹۳۰ھ تک اور اُس کے جانشین شاہ طہماسپ کی حکمرانی کا زمانہ ۹۳۰ھ سے ۹۸۴ھ تک پورا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایرانی اور جرمنی تعلقات پہلی مرتبہ قائم ہوئے +

اُس وقت کارل پنجم جس کو فرانس والے "چارلس کونٹ" کے نام سے یاد کرتے ہیں جرمنی کا بادشاہ تھا +

ہمیں جرمنی اور ایران کے قدیم تعلقات کا حال سب سے پہلے کارل پنجم کی "خط وکتابت" سے معلوم ہوتا ہے +

اس کتاب میں وہ تمام خطوط درج ہیں جو کارل پنجم نے مختلف امیروں، سرداروں اور بادشاہوں کو بھیجے تھے +

اسی کتاب میں وہ خط بھی موجود ہے جو شاہ اسمٰعیل اول نے شاہ جرمنی کو لکھا ہے۔ یہ خط ایک نہایت قدیم اور اہم تاریخی سند ہے اس کی اہمیت اسوقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خط کی اصل بھی اچھی حالت میں موجود ہے +

یہ خط شاہ اسمٰعیل کے مرنے سے چھ سال پہلے ۹۲۴ھ میں لکھا گیا ہے +

شاہ اسمٰعیل صفوی ایک جری، باہمت نوجوان بادشاہ تھا۔ اس نے بہت تھوڑی سی مدت میں اپنے مخالفین کو شکست دے کر ان پر غلبہ حاصل کر لیا تھا کہ ایران کے جو حصے چنگیز خانی بادشاہوں کے حملوں سے جدا ہو گئے تھے ان کو اس نے دوبارہ اپنی حکومت میں ملا لیا +

اس نے ۹۱۴ھ میں بغداد پر حملہ کیا اور اس کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسمٰعیل کی اس بڑھتی ہوئی قوت سے ترکی کے عثمانی بادشاہوں کو خوف معلوم ہوا۔ کیونکہ اس وقت ان کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ اور وہ یورپ تک اپنی حکومت کو پھیلا رہے تھے۔ اس لئے ان کو یہ فکر ہوا کہ اگر اسمٰعیل کا اقتدار اسی طرح بڑھتا رہا تو کسی دن یہ عثمانی حکومت کے لئے بہت نقصان کا باعث ہوگا +

جبکہ یورپ میں وہ اپنی حکومت کو پھیلا رہے تھے اُسی وقت انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایشیا میں اپنے کسی دُشمن کی قوت کو بڑھنے نہیں دینگے +

چنانچہ ترکی کے مشہور بادشاہ سلیم خان اول نے ۹۲۰ھ میں اپنی حکومت کو چار ہزار شیعوں کو قتل کرا دیا۔ اس کارروائی کا منشا یہ تھا کہ ایران کے جوان ہمت بادشاہ کو مقابلے پر آمادہ کیا جائے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو فنا کر دیا جائے +

سلطان سلیم اپنا لشکر لے کر ایران کی طرف بڑھا۔ چالداران جو علاقہ خوبے میں واقع ہے ان دونوں کی لڑائی کا مقام بن گیا۔ اگرچہ شاہ اسمٰعیل نے پوری بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مگر عثمانی بہت مضبوطی سے میدان جنگ میں قدم جمائے ہوئے تھے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کو شکست ہوئی اور سلطان سلیم تبریز میں داخل ہو گیا۔ اور آرمینیہ کو بھی اپنے قبضے میں لے آیا +

اس لڑائی کے بعد شاہ اسمٰعیل نے عثمانی خطرے کا پورا احساس کیا اور اُس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس طرح ہو سکے مشرق میں ترکی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یورپ کی حکومتیں بھی عثمانی قوت سے ڈر رہی تھیں۔ اور عثمانیوں کی ترقی روز بروز ان کو پریشان کر رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا جہاں انہوں نے عثمانی حکومت کو

وہانے کے لئے اور بہت سی تدبیریں کیں اور تجویزیں سوچیں وہاں اس موقع پر شاہ اسمٰعیل سے کام لینے کی اہمیت پر بھی نظر رکھی۔ چنانچہ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریا کے بادشاہ نے شاہ اسمٰعیل صفوی کے پاس اسی سلسلے میں ایک سفیر بھیجا جو ایک خط بھی لے کر گیا تھا۔ اگرچہ ابھی تک صحیح طور پر نہیں معلوم ہوا ہے کہ اس خط میں کیا مضمون تھا۔ مگر یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلے اور آسٹریا اور ایران کے اتحاد کے متعلق پیام بھیجا گیا تھا۔ اس خط سے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے کسی دوسرے بادشاہ نے بھی شاہ ایران کو اتحاد کی اور عثمانیوں سے جنگ کرنے کی دعوت دی تھی۔ غالب خیال یہ ہے کہ یہ بادشاہ فرانسس اول مشہور شاہ فرانس ہے +

یہ خط جو تاریخی سند کے طور پر اب تک محفوظ ہے کارل پنجم شاہ جرمنی کے نام لاطینی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا فارسی ترجمہ "کارل کے مجموعۂ خط و کتابت" سے لے کر درج کرتے ہیں (یہ الفاظ اخبار "کاوہ برلن" کے ہیں جو فارسی میں نکلتا ہے ہم یہاں اس کا اردو ترجمہ درج کر رہے ہیں)

"شاہ اسمٰعیل کے خط کا اردو ترجمہ"
"فیلپ کے لڑکے کارل کے نام"

"اگر خدا نے چاہا اور یہ خط تم تک پہنچ گیا تو تم یہ معلوم کر لو گے کہ شاہ آسٹریا نے ہمارے پاس "فریطرس" کو سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ میں نے شاہ آسٹریا کے خط کو پوری مسرت کے ساتھ پڑھا۔ میں اس شخص کو تمہارے پاس بطور سفیر بھیج رہا ہوں مجھے امید ہے کہ تم میرے خط کو دیکھ کر بہت خوش ہو گے۔ میں نہایت سختی سے اس امید پر قائم ہوں کہ تم میری استدعا پر کان دھرو گے۔ ہمارا اور تمہارا فرض ہے کہ دونوں طرف سے اپنے دشمن پر حملہ کریں۔ عثمانی ہم دونوں کے دشمن ہیں اس لئے اپریل کے شروع میں ایک طرف سے تم اور ایک طرف سے ہم حملہ کریں۔ تاکہ ہم خدا کی مدد سے کامیاب ہو جائیں +

سوز سانی (؟) بادشاہ کی طرف سے بھی تبریز کے راستے سے ایک سفیر آیا تھا میں نے اس کو بھی اس سفیر کی معرفت خط بھیجا ہے مگر ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا +

میں نے ترکی رعایا کے بہت لوگوں سے سنا ہے کہ عیسائی بادشاہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ اس طریقے سے دشمن قوت پکڑ سکتا ہے میں نے شاہ آسٹریا کو بھی لکھ دیا ہے کہ وہ آپ سے لڑائی کی جو تیاریاں کر رہا ہے اس سے ہاتھ اٹھا لے +

شاہ آسٹریا نے بہت مرتبہ ایلچیوں اور خطوں کے ذریعے مجھ سے اتحاد کی خواہش کی مگر میں نے اس کی ان خواہشات کو ہمیشہ رد کر دیا۔ اب چونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ برائی اور بھلائی میں تمہارا شریک ہوں اس لئے میں اس سے اتحاد پر آمادہ ہوں +

میرا خیال ہے کہ جو شخص ان تعلقات سے علیحدہ رہے گا اور اس اتحاد کی پرواہ نہیں کرے گا اس پر خدائے قہار کا غضب نازل ہو گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ تمام سامان تیار کیا جائے۔ اور فوجوں کی تیاری کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کیا جائے +

مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم کو غالباً دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی +

چونکہ تمہاری حکومت سے یہاں تک بہت فاصلہ ہے اور یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پہنچنا بہت مشکل ہے خاص وقت یہ بھی ہے کہ دریا پر اکثر جگہ عثمانیوں کا قبضہ ہے اس لئے اسی شخص کو ایلچی بنا کر بھیج رہا ہوں +

یہ ہمیشہ خیال رکھو کہ بے وفا عثمانیوں کا کبھی اعتبار نہ کیا جائے کیونکہ سلطان ترکی وفاداری کی قسمیں کھانے کے بعد بھی وعدوں کو توڑ دینے میں تامل نہیں کرتا +

مجھے پورا یقین ہے کہ یہ بڑا دشمن شاہ جرمنی کے سامنے بھی کسی قول و وعدہ کو پورا نہیں کر سکتا + شوال ۹۲۴ھ الحمد للہ رب العالمین آمین آمین

تمہارا صادق شاہ اسمٰعیل صفوی پسر حیدر"

حامد انصاری

کسی ہاتھ میں ایسی گھڑی بنانے کی قدرت نہیں جو میرے گذرے ہوئے گھنٹے بجا سکے +

(ڈکنس)

محبت سب سے کرو اعتبار چند ہستیوں کا۔ اور بدی کسی کے ساتھ روا نہ رکھو!

(شکسپیر)

اپنے فرائض انجام دو۔ اور باقی حالات خدا کو سونپو۔ بہتری ہی بہتری ہے +

(لانگ فیلو)

بندر کا پاؤں

افراد

محمد اکرم — ایک غریب کاشتکار
کریم — اُس کا لڑکا
محمد اعظم — مریم کا بھائی - کریم کا ماموں
مریم — اکرم کی چہل سالہ بیوی

منظر

مزنگ کے ایک کچے شکستہ مکان کا ایک کمرہ - کمرے کے وسط میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے - پاس ہی ایک بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی ہے - ایک طرف کھانے پینے کے برتن رکھے ہیں -

(۱)

پردہ اٹھتا ہے - مریم ایک چہل سالہ ادھیڑ عمر کی عورت کپڑے سی رہی ہے - اسکے چہرے سے شرافت و نجابت کے آثار ظاہر ہیں - چٹائی پر اکرم اور کریم بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں - اکرم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بازی خراب ہو چکی ہے - اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں - اور ماتھے پر تیوری ہے - اس کا لڑکا کریم ایک بست سالہ نوجوان ہے - جسکے انداز سے جوانمردی اور دلیری ظاہر ہے - وہ اطمینان سے اپنی چال چلنے کے بعد غور سے شطرنج کی بساط کی طرف دیکھ رہا ہے - اکرم چال چلنے کا ارادہ کرتا ہے پھر کچھ سمجھکر نہیں چلتا - سردیوں کی تیز اور جانگزا ہوا کمرے میں آ رہی ہے - باہر درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے -

اکرم (چال چلا) یہ لو - مارلیا نہ میدان - اب کیا خیال ہے ؟

کریم - بہت خوب - بڑی گہری چال تھی - کمال کر دیا ہے آپ نے -

مریم - (حیرانی سے) کریم آخر تمھارے ابا نے تمھیں مات کر ہی دیا -

کریم - مات - توبہ کرو - یہ کیا مات کریں گے - میں نے قصداً ایسی چال چلی تھی - کہ وہ دھوکے میں آکر اپنی بازی خراب کرلیں - ذرا دیکھنا اب کونسی شہ مات ہوتی ہے -

اکرم - سمجھ گیا ہوں - بھئی یہ چال مجھے واپس دے دو

کریم - چال واپس دینا اصول کے خلاف ہے -

اکرم - (کچھ غصے میں) ہم شطرنج اسلئے کھیلتے ہیں کہ ذرا تفریح ہو - تم نوجوانوں کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے - کہ اس میں بھی اصول اصول کی رٹ لگاتے رہتے ہو - (کریم کی توجہ ہٹانے کی غرض سے) ذرا ہوا کی آواز تو سنو کسقدر خوفناک معلوم ہوتی ہے -

کریم - (خشک لہجے میں) ہاں شہ بچئیے -

اکرم - (پھر اسی قصد سے) میرا خیال ہے شاید تمھارے ماموں آج نہ آئیں گے -

کریم - شاید - یہ شہ مات لیجئے -

کھڑا ہو جاتا ہے - اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتا ہے

اکرم بھی کھڑا ہو جاتا ہے - اُسے شطرنج کی بازی ہار جانیکا بے حد غصہ ہے

اکرم - (غصے میں) خدا کی پناہ - یہ قرضہ خدا جانے ہمارے سر پر سے کب اُترے گا - ایک ٹوٹا ہوا مکان ہے - اور اس پر بھی پانسو روپے کا بوجھ ہے - میں کہتا ہوں جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ اپنا روپیہ کہاں صرف کرتے ہیں -

مریم - (ہنستے ہوئے) ہار دی نہ بازی - اچھا کوئی بات نہیں - خفگی کی کیا ضرورت ہے - کل تم جیت لوگے -

اکرم - (مصنوعی ناراضگی سے) کیا کہہ رہی ہو - ہار دی نہ بازی - میں قرضے کو رو رہا ہوں - تم بازی کا ذکر کرتی ہو -

(خود بخود ہنس پڑتا ہے)

اکرم - بھئی میں اب کبھی کریم سے نہیں کھیلوں گا - آجتک میں نے ایک بازی بھی نہیں جیتی -

کریم - اچھا - ماموں کو آنے دیجئے - دیکھئے آپ ان سے بھی جیتتے ہیں یا نہیں -

اکرم - اچھا باتوں کا ذکر چھوڑو - یہ تو کہو تمھیں ترقی ملی یا نہیں - آج فیصلہ ہونا تھا نا ؟

کریم۔ ہاں۔ افسروں نے وعدہ تو کر لیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ابھی تک بجلی کا اچھا کام کرنے والے ورکشاپ میں بہت تھوڑے ہیں۔ اسلئے ہم لوگوں کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے۔ خیر۔ آج منیجر نے مجھے بلایا تھا اور کہا تھا۔ کہ اور دو ماہ کے بعد جون میں تنخواہ میں مزید اضافہ کر دیا جائیگا۔

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے

اکرم۔ لو آگئے تمھارے ماموں

کریم۔ شطرنج کی بساط کو اٹھا دیتا ہے۔

مریم۔ دیکھئے آج ماموں جان کونسی کہانی سناتے ہیں

مریم اٹھکر دروازہ کھولتی ہے۔ ہوا کا ایک تیز اور سرد جھونکا آتا ہے

اکرم اور کریم کانپنے لگتے ہیں۔

اکرم۔ دروازہ بند کرو۔ فوراً۔ سردی میری روح میں گھسی جا رہی ہے۔

محمد اعظم داخل ہوتا ہے

وہ فوج میں حوالدار ہے۔ اور اس نے فوجی وردی پہن رکھی ہے۔ چہرے پر فطری طور پر خشونت اور اکھڑپن کے آثار نمودار ہیں۔ بلند بالا۔ وجیہ۔ اور قبول صورت آدمی ہے۔ عمر تقریباً ۳۵ برس کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ شاید ایک دو سال کا فرق ہو۔

اعظم۔ السلام علیکم۔

اکرم۔ اور کریم۔ وعلیکم السلام

کریم۔ ماموں جان کہئے مزاج کیسے ہیں؟

اعظم۔ الحمد للہ۔ اچھا ہوں۔ تم ہو۔ (مریم سے مخاطب ہوکر) آپا جان آپ اچھی ہیں نا

مریم۔ شکر ہے بھیا!

اعظم بیٹھ جاتا ہے

اعظم۔ باہر سرد فضا میں سے آکر اس کمرے کی خوشگوار گرمی کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

آگ تاپتے ہوئے

اُوہ۔ مجھے چترال کی لڑائی یاد آگئی۔ تو بہ ہے۔ کبھی ویسی سردی کہیں نہیں کھائی۔ اب بھی وہ منظر یاد کرکے میرے بدن میں سردی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ہم خندقوں میں تھے۔ اور مینہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ مینہ ہی نہیں گولیاں بھی جھٹپٹاتی ہوئی بارش کے قطروں کی طرح مسلسل برس رہی تھیں۔ اوفوہ۔"

سوچنے لگتا ہے

مریم۔ تو بھیا تمھیں سرکار چھتریاں نہیں دیتی تھی؟

اعظم۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) چھتریاں۔ یہ خوب رہی۔ سُنا بھائی جان آپ نے۔ چھتریاں۔ کریم تم نے اپنی امی کی بات سُنی۔ لڑائی میں چھتریاں

پھر ہنستا ہے

(پھر سنجیدہ ہوکر) آپا سپاہی کے لئے چھتریاں کہاں۔ اگر بارش کے قطروں کے ساتھ موت برس رہی ہو پھر بھی چھتریاں نہ دی جائیں گی۔ سپاہی کا فرض تو تکالیف کا برداشت کرنا ہے۔ تاآنکہ آخری تکلیف یعنی موت اُسے دنیا کی ہر تکلیف سے نجات نہ دیدے۔

مریم۔ (اعظم کے کٹے ہوتے بازو کی طرف اشارہ کرکے) شکر ہے بھیا تمھاری جان بچ گئی۔ اور صرف ایک بازو ہی اس قیمتی چیز کے نذر ہوا

اعظم۔ ہاں مجھے اس کٹے ہوئے بازو کی عوض ایک تمغہ ملا تھا۔

تمغہ نکالکر دکھاتا ہے

(کریم سے مخاطب ہوکر) کیا کرتے ہو آجکل تم؟

کریم۔ میں ریلوے ورکشاپ میں بجلی کا کام کرتا ہوں۔

اعظم۔ بہت خوب کس قدر اچھا کام ہے۔ تم اپنے ہاتھ کی ایک جنبش سے تاریکی میں نور اور نور کو تاریکی میں تبدیل کرسکتے ہو۔ تمھارے انتظام سے گاڑیاں چھوٹتی ہیں اور پنکھے چلتے ہیں۔ گویا یہ جادو کا کارخانہ سب تمھارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

کریم۔ (مریم کی طرف دیکھ مسکراتا ہے) ہاں جادو کا کارخانہ۔ اور میں سمجھتا ہوں ماموں جان کہ جس جادو کا آپ ذکر کرتے رہتے ہیں میرا جادو اس سے زیادہ طاقتور اور حیرت انگیز ہے۔ آپ کا جادو تو صرف کہنے کا ہے۔ مگر میں کرکے دکھاتا ہوں۔

اعظم۔ (یکبارگی سنجیدہ ہو جاتا ہے) ایسا نہ کہو۔ کریم میں نے جادو کے بہت عجیب و غریب کرشمے دیکھے ہیں۔ اور اگر وقت ہو تو میں تمھیں ایسے ایسے عجیب افسانے سنا سکتا ہوں کہ . . . .

خاموش ہو جاتا ہے

اکرم۔ بھائی میں تو ان سب چیزوں کو بکواس خیال کرتا ہوں (ہنستے ہوئے) اگلے دن وہ تم کیا بندر کے پاؤں کا قصہ سُنا رہے تھے۔

اعظم۔ (سنجیدگی سے) کچھ نہیں۔ کم از کم وہ افسانہ ایسا نہیں جو سُنانے کے قابل ہو۔

مریم۔ (تعجب سے) بندر کا پاؤں۔ بھیا کیا قصہ ہے وہ؟

اکرم۔ تمھارے بھائی مجھے بتا رہے تھے کہ . . . . . .

اعظم۔ (ہاتھ کے اشارے سے اکرم کو روک کر) خاموش!

مریم۔ (اپنے نسوانی اشتیاق سے مجبور ہوکر) بھیا یہ قصہ ضرور سناؤ۔

اکرم- کیا اب بھی وہ پاؤں تمھارے پاس ہے؟

اعظم- ہاں!

ایک گہرے سوچ میں غرق ہوجاتا ہے

اعظم- مجھے خوف آتا ہے- اگر میں نے اس پاؤں کو اپنے پاس سے جدا کر دیا- تو ضرور کوئی نہ کوئی آفت آئیگی-

اکرم- تو یہ پاؤں کس کام آتا ہے؟

اعظم- اگر میں تمھیں اس کا اصلی قصہ سناؤں تو تم کبھی یقین نہیں کروگے

کریم- مجھے سنائیے ماموں جان میں حرف بحرف اس پر یقین کرونگا-

اعظم- اچھا-

جیب سے بندر کا ایک سوکھا ہوا پاؤں نکالتا ہے جس کا چمڑا خشک ہو چکا ہے- مریم اس پاؤں کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے

اعظم- خوف کی کوئی بات نہیں-

مریم- کیا اس میں کوئی جادو بھرا ہوا ہے؟

اعظم- ہاں! سادھو نے اس میں جادو بھر دیا ہے- وہ ۱۵ سال تپسیا کرتا رہا- اور آخرکار جب اسے معرفت حاصل ہوگئی تو اسے معلوم ہوا کہ تقدیر اٹل ہے- اور دنیا کے تمام کام تقدیر ہی سے انجام پا رہے ہیں انسانی تدابیر کی کوئی وقعت نہیں- دنیا کا ہر ایک واقعہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے- اور جو شخص اپنی تدبیروں سے تقدیر کو بدلنا چاہتا ہے- اُس پر ضرور کوئی آفت نازل ہوتی ہے- اُس سادھو نے اس پاؤں میں جادو بھر دیا ہے- اور اب اس میں یہ صفت پیدا ہوگئی ہے کہ تین شخص تین تین بار اس پاؤں کی مدد سے اپنی منہ مانگی مراد حاصل کر سکتے ہیں-

مریم کے علاوہ باقی سب ہنسنے لگتے ہیں-

لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اگرچہ اس کے ذریعے انسان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے لیکن بعد میں آدمی کو افسوس ہوتا ہے- کہ میں نے کیوں اس قسم کی مراد مانگی-

مریم- لیکن مرادیں کس طرح حاصل ہوتی ہیں؟

اعظم- یہ معلوم نہیں- مراد اس طرح نظری طریق سے حاصل ہوتی ہے گویا اتفاق ہوگیا ہے- اور اس میں جادو کو کوئی تعلق نہیں-

کریم- تو ماموں جان آپ نے خود بھی یہ جادو آزمایا ہے یا نہیں؟

اعظم- ہاں-

کریم- اور وہ تینوں پوری ہوگئیں؟

اعظم- (آگ کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں-

کریم- کسی اور نے بھی اِسے آزمایا ہے؟

اعظم- ہاں- جس شخص سے میں نے یہ پاؤں پایا تھا- وہ اپنی تینوں مرادیں حاصل کر چکا تھا- مجھے اس کی پہلی دونوں خواہشوں کی اطلاع نہیں- لیکن اس کی تیسری اور آخری خواہش موت کی تھی-

یہ کہ کر کسی گہرے سوچ میں گم ہو جاتا ہے

کریم- مجھے تو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے- آدمی کو اپنی مراد حاصل ہونے کے بعد کیا رنج ہو سکتا ہے-

اعظم- سر ہلاتے ہوئے یہ نہ پوچھو!

مریم- بھیا- اگر تم اپنی تینوں مرادیں حاصل کر چکے ہو- تو تم اسے رکھ کر کیا کروگے؟

اعظم- میں نے کئی بار سوچا ہے کہ اسے بیچ دوں- پھر کوئی خیال مانع آجاتا تھا- اور میرا ارادہ رہ جاتا تھا- اس پاؤں کی وجہ سے بہت سے لوگ تکلیف میں مبتلا ہو چکے ہیں- اور علاوہ ازیں میرا خیال ہے کہ کوئی اسے خریدنا بھی پسند نہیں کرے گا-

مریم- اگر تمھیں اجازت دیجائے کہ تم ایک بار پھر اپنی تین مرادیں اس کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو تو تم اس کی مدد لوگے؟

اعظم- سوچتے ہوئے- میں کہہ نہیں سکتا-

یکایک پاؤں کو دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ڈال دیتا ہے کمرہ میں ایک ناگوار سی بو پیدا ہو جاتی ہے-

مریم- پاؤں کو جلدی سے انگیٹھی میں سے نکال لیتی ہے- پھر کچھ سوچ کر واپس پھینک دیتی ہے-

اکرم- خود آگے بڑھ کر پاؤں نکالنا چاہتا ہے-

مریم- جلنے دو- اس ناپاک چیز کو جلنے دو-

اکرم- نہیں نہیں- اگر یہ تمھارے کام کی نہیں تو مجھے دے دو-

پاؤں کو انگیٹھی میں سے نکال لیتا ہے

کریم ہنستا ہے

کریم- کیا بچوں کا کھیل ہے-

اکرم- اچھا بھائی- اعظم- تو مرادیں کس طرح مانگی جاتی ہیں؟

اعظم- اسے دائیں ہاتھ میں مضبوط تھام لو- اور پھر اپنی مراد مانگو- لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ کام نہ کیجئے- اس میں خطرہ ہے- اور آخرکار آپ پچھتائیں گے-

مریم- یہ تو الف لیلہ کا سا افسانہ بن گیا ہے- اچھا بھلا یہ مراد مانگو- کہ میرے چار ہاتھ ہو جائیں-

اعظم- اگر آپ کو ضرور کوئی خواہش کرنی ہے- تو ایسی کیجیئے- جو آپ کیلئے

فائدہ مند ہو - یہ چار ہاتھ پاؤں کا کیا فائدہ -

یہ کہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے - اور جلدی سے مکان سے باہر نکلنا چاہتا ہے

کریم - ٹھہرئیے ماموں جان - مجھے ورکشاپ جانا ہے - میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں

اعظم - نہیں میں انتظار نہیں کرسکتا - چلا جاتا ہے

اکرم - میں سوچتا ہوں کہ اسے آگ میں ڈال دوں یا اپنی مراد مانگوں؟

مریم خاموش رہتی ہے

اکرم - اب ہم امیر کبیر ہو جائیں گے - اور ہمسائے ہماری دولت و حشمت کو حسد کی نگاہوں سے دیکھیں گے -

کریم - ابا جان - آپ پہلی مراد تو یہ مانگئے کہ مکان کا زر رہن ادا کرنے کے لئے آپ کو پانسو روپے کی رقم مل جائے -

اکرم - (خوش ہوکر) ہاں یہ ٹھیک ہے -

اکرم پاؤں کو ہاتھ میں تھام کر بلند کرتا ہے - اور کہتا ہے

مجھے پانسو روپے کی ضرورت ہے مہیا ہو جائے -

یکبارگی اکرم کے ہاتھ سے پاؤں زمین پر گر پڑتا ہے - اور ایک عجیب قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے -

کریم - اور مریم - کیا بات ہے ؟

اکرم - اس کمبخت میں حرکت ہوئی تھی -

کریم - نہیں ابا - آپ کا وہم ہے -

مریم - ہاں - ہاں تمھیں اب محسوس ہوا ہوگا - بھلا اب اس میں کچھ جان باقی رکھی ہے - اچھا مجھے تو نیند آرہی ہے میں جاکر سوتی ہوں

دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے

کریم - لیجئے میں بھی چلتا ہوں - آج رات مجھے زیادہ کام کرنا ہے - کیونکہ کل ایک انگریز افسر بجلی کا معائنہ کرنے کیلئے آئیگا - امید ہے کہ جب کل صبح میں آؤں گا تو آپ کے پاس کہیں نہ کہیں سے پانسو روپے کی تھیلی آگئی ہوگی -

اکرم - (کسی گہرے سوچ میں) میں سچ کہتا ہوں کریم کہ اس پاؤں میں حرکت ہوئی تھی -

کریم چلا جاتا ہے

اکرم واپس آکر چارپائی پر متفکر و مغموم بیٹھ جاتا ہے - اُسے کوئلوں میں عجیب عجیب شکلیں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - اس کا دماغ قریب قریب مختل ہو جاتا ہے اور وہیں سو جاتا ہے -

پردہ گرتا ہے

۲

دھوپ درو دیوار پر پھیلی ہوئی ہے - مریم روٹی پکانے میں مصروف ہے - اکرم کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا کسی گہرے سوچ میں کھویا ہوا ہے

مریم - میرا خیال ہے - کہ کریم کے آنے کا وقت ہوگیا ہے -

اکرم - خاموش رہتا ہے -

مریم - سنتے ہو ؟ کریم کے واپس آنے کا وقت ہوگیا ہے نا ؟

اکرم - (چونک کر) ہاں اب تو نو بجنے والے ہوں گے - اور وہ ہمیشہ آٹھ بجے واپس آجایا کرتا تھا -

مریم - رات کو شاید تم سوئے نہیں - تمھاری آنکھوں میں سرخی آئی ہوئی ہے -

اکرم - میں اس پاؤں کے متعلق سوچتا رہا -

مریم - چھوڑو بھی - بھلا اعظم کی باتوں پر جاتے ہو خدا جانے کیا کا کیا سنا گیا ہے -

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے

مریم - (چونک کر) یہ کون ہے ؟

اکرم - ڈاکیہ ہوگا -

مریم - (ایک عجیب لہجے میں) چھٹی لایا ہے ؟

اکرم - (ہنس کر) تو اور کیا کوئلے لاتا -

مریم - شاید اس چھٹی میں پانسو روپے ہیں

اکرم - (خوش ہوکر) شاید

مریم - دیکھنا آہستہ آہستہ کھولنا - کہیں کوئی نوٹ پھٹ نہ جائے -

اکرم - ہاں - ہاں -

آہستہ آہستہ خط کھولتا ہے پڑھتا ہے

جناب من ! آپ کے مکان کے زر رہن کا سود مبلغ دس روپے وصول پایا - رسید لکھدی کہ سند رہے -

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں -

مریم - واہ وا - اچھے نوٹ نکلے -

اکرم - (ناراضگی سے) تمھیں کہتی تھیں اس میں نوٹ ہیں - مجھے تو معلوم تھا - کہ اس میں کچھ نہیں -

مریم - اور بندر کا پاؤں ہاتھ میں تھام کر مراد کس نے مانگی تھی ؟

اکرم - (یکبارگی تند لہجے میں) چپ کر زبان دراز عورت !

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے

اکرم دروازہ کھولتا ہے - ایک شخص سر سے لیکر پاؤں تک مشین کے میل اور

اور تیل کے زنگ میں بھرا ہوا داخل ہوتا ہے۔

نووارد۔ کیا یہ مکان اکرم کا ہے؟

اکرم۔ ہاں۔

نووارد۔ میں ریلوے ورکشاپ سے آیا ہوں

اکرم۔ شاید تم کریم میرے بیٹے سے ملنا چاہتے ہو۔ بس وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اُس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

نووارد۔ نہیں نہیں میں بجلی کے کارخانے سے آرہا ہوں۔

اکرم۔ تو شاید تم کریم کے ساتھ آئے ہو؟

نووارد۔ (آہستہ سے اکرم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) نہیں میں اکیلا ہی آیا ہوں۔

مریم۔ کیا بات ہے؟ (گھبراہٹ سے) کیا کریم کو کوئی ...

نووارد۔ مجھے بیحد افسوس ہے۔

مریم۔ کیا کریم کے کہیں چوٹ آئی ہے؟ (رونے لگتی ہے) کیا بات ہے؟

نووارد اپنا سر جھکا لیتا ہے۔

مریم۔ (روتی ہوئی) کیا وہ بہت تکلیف میں ہے؟

نووارد۔ نہیں اُسے بالکل کوئی تکلیف نہیں۔

مریم۔ خدایا تیرا شکر۔

یکایک اسکے دماغ میں کوئی خیال بجلی کی سی تیزی لیئے گزر جاتا ہے

اور وہ کہتی ہے۔ کیا کریم ...

نووارد۔ ہاں!

مریم۔ انتہائے رنج وغم میں۔ آہ میرا بچہ۔ میرا لاڈلا۔

غش کر جاتی ہے

نووارد۔ آپ کا لڑکا کسی بندر کے پاؤں کا افسانہ سنا رہا تھا۔ کہ اس کا دھ[illegible]شین کی طرف سے ہٹ گیا۔ اور وہ بجلی کی مشین کی لپیٹ میں آگیا۔

اکرم۔ (کچھ کھویا ہوا سا) بندر کے پاؤں کا افسانہ۔ مشین کی لپیٹ میں ...

آہ!

نووارد۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ ورکشاپ کے منیجر کی طرف سے میں آپکو اُنکی ہمدردی کا یقین دلاتا ہوں۔ اور قلیل رقم جو انھوں نے آپ کے عظیم نقصان کے ایک حقیر معاوضے کے طور پر بھیجی ہے آپ کے حوالے کرتا ہوں۔

ایک لفافہ اکرم کے ہاتھ میں دیدیتا ہے

اکرم۔ (کھویا ہوا سا) ہمارا عظیم نقصان .... معاوضہ ....
(یکایک چونک کر) اس لفافے میں کیا ہے؟

نووارد۔ کمرے میں سے باہر ہوتے ہوئے۔ پانسو روپیہ

اکرم۔ ایک وحشیانہ قہقہہ لگاتا ہے۔ اور اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھا کے ٹٹولتا ہوا آگے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ یکایک ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے۔

پردہ

۳

رات کا وقت ہے کمرے میں ایک شمع جل رہی ہے۔ جسکی مدھم روشنی میں کمرہ اور بھی تاریکی میں گھر گیا ہے۔ مریم کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی ہے۔ اور اُس نے اپنی نظریں باہر کی تاریکی میں گاڑ رکھی ہیں اکرم چٹائی پر بیٹھا ہوا ہے۔

اکرم۔ مریم۔

مریم۔ کیا ہے؟

اکرم۔ کہاں ہو تم؟

مریم۔ کھڑکی کے پاس۔

اکرم۔ وہاں کیا کر رہی ہو؟

مریم۔ سڑک کو دیکھ رہی ہوں۔

اکرم۔ (درد انگیز لہجے میں) اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ مریم۔ آج سات دن ہوتے ہیں کہ ہم نے اُس کے جسم کو سپرد خاک کر دیا۔ اب وہ کبھی اس گھر میں داخل نہ ہوگا۔ ادھر آجاؤ تمھیں سردی لگ جائیگی۔

مریم۔ جہاں میرا بچہ سو رہا ہے وہاں اور بھی سردی ہے۔

اکرم۔ آہ!

مریم۔ میرا بچہ۔ وہ مر گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی ہماری تمام آرزوئیں اور مرادیں بھی مر گئیں۔

یکایک یہ لفظ کہکر وہ چونک اُٹھتی ہے اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر کمرے کے وسط میں آجاتی ہے۔

مریم۔ اکرم!

اکرم۔ کیا ہے؟

مریم۔ بندر کا پاؤں کہاں ہے؟

اکرم۔ (کانپتے ہوئے) خدا کے لئے چپ رہو۔ اب اس پاؤں سے تمھیں کیا واسطہ ہے۔

مریم۔ لاؤ مجھے دو۔

اکرم۔ کیا کروگی اُسے تم؟

مریم۔ (وحشیانہ لہجے میں) چپ رہو۔ پاؤں ڈھونڈ کر مجھے دو۔

اکرم۔ (ڈھونڈ کر پاؤں تھام لیتا ہے) کیا کروگی پاؤں کو؟

مریم۔ کیا کروں گی (دیوانہ وار ہنستی ہے) اکرم تم اس پاؤں کے ذریعے اپنی دوسری دو مرادیں کیوں نہیں حاصل کرتے؟

اکرم۔ (گھبرا کر) کیا؟

مریم۔ ابھی تو تمھاری صرف پہلی مراد حاصل ہوئی ہے۔

اکرم۔ کیا وہ کافی نہ تھی؟

مریم۔ نہیں۔ کم از کم ایک خواہش ہم اور کریں گے۔

اکرم۔ کیا۔

مریم۔ یہ کہ ہمارا بچہ پھر زندہ ہو جائے۔

اکرم۔ اللہ اکبر۔ عورت تو دیوانی ہو گئی ہے؟

مریم۔ ہاں میں دیوانی ہو گئی ہوں۔ لو یہ رہا پاؤں۔ خواہش کرو۔

اکرم۔ جا۔ عورت۔ سو رہ۔ تو نہیں جانتی تو کیا کہہ رہی ہے؟

مریم۔ ہماری پہلی مراد حاصل ہو چکی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ دوسری حاصل نہ ہو۔

اکرم۔ آج سات دن ہوتے ہیں ہم اُسے دفن کر آئے ہیں۔ او مریم خدا کی پناہ۔ میں نے۔ میں جو اس کا باپ ہوں اُسے ان کپڑوں سے پہچانا تھا۔ جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ اب تم اُسے کس طرح پہچان سکوگی۔ تم اُس کا کچلا ہوا جسم۔ اُس کا زخمی چہرہ برداشت کر لوگی؟

مریم۔ ہاں میں کر لوں گی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں خود اپنے جسم کے ایک حصے کو نہیں پہچان سکوں گی۔

اکرم۔ میں اپنے آپ میں یہ ہمت نہیں پاتا۔ کہ اس پاؤں کو چھوؤں۔

مریم۔ خواہش کرو اکرم۔ خواہش کرو۔

اکرم۔ (پاؤں کو ہاتھ میں لے کر) کریم زندہ ہو جائے میں خواہش کرتا ہوں۔ مریم بھاگ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔ شمع بجھ جاتی ہے کمرے میں مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔

چاند کی روشنی چھا رہی ہے۔ سڑک پر درختوں کے سائے بھوتوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ ہوا کسی غمزدہ کی طرح کراہ رہی ہے۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے تیر رہے ہیں۔

مریم۔ (باہر دیکھ کر) کوئی نہیں سڑک پر کوئی نہیں۔

اکرم۔ شکر ہے خدایا۔ تیرا شکر ہے

مریم۔ آہ میری زندگی میں اب کچھ نہیں۔ کچھ نہیں سوائے پچھلے دنوں کی مہلک یاد کے۔

اکرم۔ میں اس تاریکی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اُٹھ کر شمع جلاتا ہے

دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ۔ بالکل آہستہ

مریم۔ یہ کیا ہے؟

اکرم۔ کوئی چوہا ہوگا

مریم۔ نہیں نہیں (چیخ کر) یہ میرا بچہ ہے۔

اکرم مریم کو پکڑ لیتا ہے

مریم۔ (زور لگاتے ہوئے) چھوڑ دے چھوڑ دے بے رحم انسان۔ مجھے اپنے بچے کے پاس جانے دے۔

اکرم۔ (مریم کو مضبوط تھامے ہوئے) خدا کے لئے جانے دو۔ اس کام کا ارادہ چھوڑ دو۔ دروازہ نہ کھولو۔ خدا جانے کیا چیز ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

مریم۔ وہاں کچھ نہیں۔ کوئی نہیں۔ صرف میرا بچہ۔ میرا خون ہے۔

اکرم مریم کو چھوڑ دیتا ہے

مریم۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) آ رہی ہوں میں کریم۔ آ رہی ہوں۔

اس اثنا میں دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی بھاری بھرکم جسم دروازہ سے ٹکرا رہا ہے۔ اور اُسے اندر دھکیلنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

مریم دروازے کی کنڈی کھولنا چاہتی ہے۔ لیکن باہر کے دباؤ کی وجہ سے اسے مشکل پیش آتی ہے۔

مریم۔ ادھر آؤ۔ اکرم دروازہ کھولنے میں میری مدد کرو۔

اکرم۔ (اپنے آپ سے) کہاں ہے بندر کا پاؤں۔ وہ کمبخت پاؤں کہاں ہے۔

مریم۔ سنتے ہو ادھر آؤ۔

اکرم دیوانہ وار پاؤں کو ڈھونڈھنے میں مصروف ہے۔ آخر پاؤں اُسے مل جاتا ہے) اب دروازہ اسقدر زور سے کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ کہ اب محسوس ہونے لگتا ہے کہ چولیں اکھڑ جائیں گی۔

مریم۔ ٹھہرو۔ کریم ٹھہرو۔ تمھاری ماں آ رہی ہے۔

اکرم بندر کا پاؤں تھام لیتا ہے۔ مریم انتہائی کوشش سے

دروازے کی کنڈی کھولدیتی ہے۔
اکرم۔(پاؤں ہاتھ میں تھام کر) میرا لڑکا مر جائے۔ میری یہ خواہش ہے
میں چاہتا ہوں کہ اس کی روح آرام سے رہے۔
یکایک دروازے کے کھٹکھٹانے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔
مریم۔(دروازہ کھول کر) کریم!۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باہر چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ خلا۔ اکرم۔ سر سجدہ ہے۔ مریم
نیم غشی کے عالم میں دہلیز پر گر پڑتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے
سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آتا ہے۔ سڑک پر درختوں کے سائے
دیوانہ وار بھوتوں کی طرح رقص کر رہے ہیں ❖

عابد

زورقِ ماہتاب

ہوا ہے مہر ابھی نہاں
ابھی شفق ہے ضوفشاں عجیب یہ بھی ہے سماں!
فروغِ لالہ زار ہے۔ بہار ہی بہار ہے
سکوتِ شام میں کوئی نگار جلوہ بار ہے
کھڑے ہیں سرو صف بصف
ہجومِ گل ہے ہر طرف کہ ہیں شہید سر بکف
بچھا ہے سبزہ سو بسو یہ کس کا انتظار ہے
کہ فرش مستِ رنگ ہے تو عرش میگسار ہے
افق کا سینہ چیر کر
ہوا ہے نور جلوہ گر جہاں تہاں ادھر ادھر
یہ چشمہ رُک سکا نہ جب تو یک بیک ابل پڑا
افق سے نورِ ماہ کا بہ رنگِ موج اچھل پڑا

یہ نور کا وفور ہے
کہ ذرّہ ذرّہ طور ہے فروغِ سیلِ نور ہے۔
یہ سیل اپنے ساتھ ہی مجھے بہا کے لے گیا
خبر نہیں کہاں کہاں مجھے اڑا کے لے گیا

حامد علی خاں۔بی۔اے

سینما تعلیمی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے

سینما جس تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کر رہا ہے اُس نے اسے موجودہ زمانے کے اہم ترین سوالات میں جگہ دیدی ہے۔ سینما کی تعلیمی اہمیت اس کی ایجاد کا ایک اہم ترین پہلو ہے۔ لیکن میرے خیال میں سینما کے تعلیمی فوائد پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص ٹیکنکل مضامین کی تعلیم کے لئے سینما بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اسکے ذریعے امریکہ اور انگلستان کی مختلف مشینیں۔ اُن کے پرزوں کے پیچ بآسانی سمجھائے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم تعلیم کے زینے پر اُترتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پرائمری تعلیم کے لئے سینما کسی کام نہیں آسکتا۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ سینما کسی جگہ بھی تعلیم کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ عوام اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو روزمرہ کی اہم باتوں سے آگاہ کرنے کے لئے سینما سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ جو لوگ تعلیم سے نا آشنا ہیں۔ بیہودہ توہمات اور خوش اعتقادیوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں انہیں سائنس کے معمولی اصول سمجھانے۔ اور اس قعرِ جہالت سے نکالنے کے لئے سینما جس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ مگر ہمارے ہاں اب تک سینما کے اس پہلو پر پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ یہاں تعلیمی فلمیں اب تک رائج نہیں ہوئیں۔ پٹیل برادرز۔ گورنگا برادرز۔ اور حیدرآباد سندھ کے کرم چند۔ مول چند اسی کی شکایت کرتے ہیں۔ کہ ہم تعلیمی مضامین کی فلمیں تیار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں لیکن ہمیں ان سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا"۔ ہمارے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پٹیل برادرز اور دوسری کمپنیاں مطالب کو ایسی دلچسپ شکل میں لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکیں جس سے وہ اُن کی فلموں کو پسند کرنے لگیں۔ امریکہ اور جرمنی میں اس قسم کے اہم مسائل جن کا علم عوام کے لئے ضروری ہے کہانیوں کی شکل میں فلم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً "عجائبات روزگار"۔ "میاں داماد اور موٹے آلو"۔ دو نہایت ہی دلچسپ تعلیمی فلمیں ہیں۔

حکومت کو بھی سینما کے اس پہلو کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے اور میونسپلٹیاں بھی عوام کو فلمیں دکھانے کے لئے اپنے ہال بنائیں۔

حکومت ہر سال لاکھوں روپیہ اخلاقی پروپگنڈے پر خرچ کرتی ہے لیکن سینما سے بہتر پراپگنڈے کا کوئی مفید ذریعہ نہیں۔

اگر حکومت اس کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو لوگوں کے اطوار اور معاشرتی حالات کی بڑی حد تک اصلاح کر سکتی ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ کہ ہر سینما میں کم از کم ۱۵ منٹ کا پروگرام تعلیمی فلموں کا ہو۔ یہ تعلیمی فلم مرکزی بورڈ مختلف کمپنیوں میں مفت تقسیم کرے۔ اگر کوئی کمپنی کوئی خاص تصویر لینی چاہے تو اُس کا کرایہ ادا کرے۔ دوسرے ملکوں سے تعلیمی فلمیں عاریتاً لینے اور انہیں اپنی فلمیں دینے کا رواج بھی ضروری ہے۔

اب ہم سینما کے اخلاقی پہلو کو لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں سینما کے بُرے اثرات پر جتنے اعتراض ہوئے ہیں اُن کا ہر ایک کو علم ہے۔ قدامت پسند کہتے ہیں کہ سینما نے ہندوستان کے نوجوانوں پر جتنا برا اثر ڈالا ہے شاید ہی کسی چیز نے ڈالا ہو۔ اُن کا یہ کہنا کسی حد تک درست بھی ہے لیکن صرف سینما کو اپنے نوجوانوں کے اخلاقی تنزل کا باعث ٹھہرانا بڑی بے انصافی ہے۔

سینما کے مخالفین کہتے ہیں کہ امریکن فلموں میں جو زندگی لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ انہیں دیکھ کر مغربی معاشرت کے تمام بُرے پہلو اختیار کر کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ سینما کا عوام پر بھی کوئی بُرا اثر ہوا ہے یا نہیں۔ مغربی معاشرت صرف اُن معاشرتی فلموں میں لوگوں کو نظر آتی ہے جن کے خلاف سینما کے مخالفین اپنی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ باقی رہیں تاریخی فلمیں اُن کا عوام کے اخلاق پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عوام معاشرتی فلموں کو بالکل پسند نہیں کرتے چنانچہ ہندوستان میں جو فلمیں زیادہ مقبول ہوئیں وہ ڈگلس فیربنکس کی "رابن ہڈ"، "بغداد کا چور" اور دوسری تاریخی فلمیں ہیں۔

تعلیم یافتہ لوگ جو معاشرتی فلموں کو دیکھتے ہیں اُن میں ۲۵ سال سے زیادہ عمر والے مغربی معاشرت کے سیاہ و سپید سے بخوبی واقف

ہوتے ہیں - اور اُن پر سوشل فلمیں زیادہ اثر نہیں کر سکتیں - لیکن اس سے کم عمر کے طلبہ پر ان کا جو بُرا اثر پڑتا ہے اُس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا

ایک صاحب فرماتے تھے کہ سینما نے طالب علموں کو بہت سی بد اخلاقیوں اور آوارہ گردی سے روک لیا ہے - میں یہ مانتا ہوں لیکن اس کی جگہ اُن کے دلوں میں حسن و عشق کا جو شوق جگہ پکڑ گیا ہے - وہ کسی طرح بھی ہندوستان کی اخلاقی حالت کے لئے اچھا نہیں - ہمارے نوجوانوں میں مغربی محبت کے طرز کی پیروی کرنے اور رومانی زندگی بسر کرنے کا اسقدر شوق پیدا ہو چلا ہے کہ غالباً ہم چند دن میں مغرب کی بیحیائی سے بھی دو قدم آگے بڑھ جائیں گے - اس کے آثار پنجاب اور بمبئی میں نمودار بھی ہو گئے ہیں - مگر باقاعدہ تنقید اور فلموں میں سے ایسے اشتعال انگیز حصوں کو نکال دینے سے ان برائیوں کا بخوبی انسداد ہو سکتا ہے -

ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوان عاشقانہ زندگی کے نظاروں اور بوسہ بازی کے لمبے لمبے وقفوں سے جسقدر متاثر ہوتے ہیں - اتنا کسی دوسری چیز سے نہیں متاثر ہوتے -

ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ اظہار جذبات محبت میں انتہا پسند واقع ہوئے ہیں - اور ذرا سی بات بھی ہمارے اس جذبے کو بھڑکا دیتی ہے - ہماری افتادِ طبیعت بھی کچھ ایسی ہے - کہ ہم عقل اور متانت کو چھوڑ کر فوراً جذبات کا دامن پکڑ لیتے ہیں - جو ہمیں عام طور پر ایسے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں جس سے نکلنا محال ہو - اسلئے حکومت کو چاہیئے کہ فلموں کی تنقید میں سختی اختیار کرے - اور ہیجان انگیز فلموں کو کسی حالت میں بھی پیش نہ ہونے دے -

ایک دوسرا اعتراض جو عام طور پر انگریز سینما پر کرتے ہیں یہ ہے کہ امریکن فلمیں انگریزی طرز معاشرت کو ایسے رنگ میں پیش کرتی ہیں جو اصلیت سے کوسوں دور ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام میں انگریزی اخلاق اور معاشرت کی نسبت غلط خیال قائم ہو جاتا ہے - اس اعتراض کا اصلی مقصد غالباً یہ ہے - کہ امریکن فلموں کا ہندوستان میں آنا کم کر دیا جائے - اور انگریزی فلموں کو یہاں ترقی دیجائے -

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عوام معاشرتی تصویریں بہت کم دیکھتے ہیں - اسلئے اُنپر ان فلموں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا - اس کے علاوہ جسوقت ایک غیر تعلیم یافتہ شخص سینما دیکھنے جاتا ہے - تو اس سے انگریزی معاشرت کی نسبت کوئی نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کرتا - وہ صرف قصے کے لئے جاتا ہے - اور اس میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے - کہ اُسے کسی دوسری چیز کا خیال نہیں رہتا - مشاہدہ تو یہاں تک بتاتا ہے کہ بعض فلموں میں جہاں ہیرو انگریز اور بدمعاش ہندوستانی دکھائے گئے ہوں لوگوں کی تمامتر ہمدردی ہیرو کے ساتھ ہوتی ہے - اسلئے اس بات کا خیال کرنا کہ عوام میں ان فلموں سے انگریزی معاشرت کی نسبت غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں محض وہم ہے -

علاوہ ازیں جیسا کہ ایک انگریز نے مجھ سے کہا تھا - کہ فلموں کی ترقی لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دے گی - اور وہ خود بخود انگریزی معاشرت کی اصلیت کو سمجھنے لگیں گے - مگر بہرحال ایک طرز تہذیب کو دوسری تہذیبوں کی طرح نامکمل یا خلاف واقعہ صورت میں پیش کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں -

ایک اور الزام جو عموماً سینما پر عائد کیا جاتا ہے یہ ہے - کہ جرائم کے مختلف طریقے دیکھنے سے بدمعاشوں میں جرائم کا شوق زیادہ ہو جاتا ہے - اور ان طریقوں سے نئے نئے جرائم میں کام لینے لگتے ہیں - اسکی روک تھام کے لئے با اصول تنقید پر کاربند ہونا کافی ہے -

علاوہ ازیں کلکتہ پولیس کے تجربے شاہد ہیں کہ سینما کا جرائم پر کوئی اثر نہیں پڑتا - باقی رہا ایک اور خیال کہ انقلاب فرانس کے سین دکھانے سے لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں یہ ایک ایسا لغو اور پوچ وہم ہے کہ اسکی نسبت کچھ کہنا ہی لاحاصل ہے -

ان تمام اعتراضات کے مقابلے میں سینما کے فوائد اسقدر زیادہ ہیں کہ اُن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - سینما عوام کو بہت سی نئی نئی باتیں دکھا کر اُن کے خیالات میں وسعت پیدا کرتا ہے - جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں لوگوں نے کیسی کیسی عالیشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں - کیسی کیسی مشینیں ایجاد کی ہیں - تو ہمارے دلوں میں بھی ترقی کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے -

ہمارے تنقیدی قوانین تین ایکٹوں پر مبنی ہیں - اول سینما ایکٹ ۱۹۱۸ء - دوسرا سینما ایکٹ ۱۹۱۹ء اور تیسرا ڈیوولوشن ایکٹ ۱۹۲۰ء - ان ایکٹوں کی رو سے ہر صوبے میں ایک جدا سنسر بورڈ قائم ہے - پچھلے سال ان بورڈوں نے ۱۳۰۰ فلموں پر تنقید کی - اور اُن میں سے کسی کو ناقابل اشاعت بتایا - مختلف صوبوں میں مختلف تنقیدی بورڈوں سے ایک بڑا نقصان ہو رہا ہے کہ بعض فلموں کو ایک بورڈ پاس کر دیتا ہے - اور دوسرا فیل - اس سے فلم کمپنیوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے - ہماری سمجھ میں نہیں آتا

کہ ایک امریکن یا کوئی دوسری بیرونی فلم جو ایک صوبے کے لئے موزوں ہو۔ دوسرے کے لئے غیر موزوں کس طرح بنجا سکتی ہے۔ پھر بھی اس پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ ان بورڈوں نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ اور ایسی فلمیں عوام کے سامنے بہت کم پیش ہو سکی ہیں جنکا اثر بُرا اثر پڑ سکے۔ مگر یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ بمبئی میں جہاں فلموں کا بہت بڑا حصّہ ملک میں داخل ہوتا ہے ایک مرکزی بورڈ قائم کیا جائے جس کی ہر صوبہ میں ایک شاخ ہو۔ اس مرکزی بورڈ میں سینما کے بہترین نقاد رکھے جائیں۔ اس بورڈ کو معمولی مذہبی یا اخلاقی اعتراضات کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی فلم کسی کے مذہبی اعتقاد کے خلاف ہو تو اُس کو سرے سے فیل نہیں کر دینا چاہیئے۔ بلکہ اُس قابل اعتراض حصّے کو فلم میں سے نکال دینا چاہیئے۔ حال ہی میں ایک نہایت اچھی فلم کو صرف اس بنا پر بند کر دیا گیا کہ اس میں نورجہاں کو بے نقاب دکھایا گیا تھا۔ اس طرح سینما ہندوستان میں کبھی نہیں پنپ سکتا۔ اور ملک کی ترقی میں سینما سے جس بہترین امداد کی امید ہے۔ وہ ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی۔

جمیل

رامائن کا ایک سین

راجہ رام چندر کا ماں سے رخصت ہونا

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کو زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی!
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ!
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا!
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا!
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا!
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا!
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں کس لئے آئے ہو تم یہاں!
سب کی خوشی یہی ہے کہ صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیجدوں

چکبست

تحفۂ خواب

میرا کوئی بیسواں سال ہوگا جب یہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں سینٹ ژاں میں اُس ویران مکان کو دیکھنے جا رہا تھا جس کے سائے میں میرے آبا و اجداد دو صدیوں سے رہتے چلے آئے تھے۔ دسمبر شروع تھا اور صبح سے برفباری ہو رہی تھی۔ سڑک جو دو گہری کھاڑیوں میں سے گزرتی تھی، جابجا خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے مجھے اور میرے گھوڑے کو خندقوں سے بچنے میں بہت جد و جہد کرنی پڑی۔

میں سینٹ ژاں کے ضلع میں کوئی پانچ چھ میل چلا ہونگا کہ چڑھائی شروع ہوگئی۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور برف میرے چہرے پر تازیانے برسا رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے قطار در قطار درخت بھوتوں کی طرح پیچھے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ اُنہوں نے میرے دل میں ایک قسم کا خوف پیدا کر دیا۔ اور بے اختیار مجھے وہ قصہ یاد آگیا جو ایک ہرکارے نے سینٹ مارسل ڈارنی میں بیان کیا تھا۔ لی نوبیج کے اِن شکستہ کہنہ سال درختوں میں سے ایک پیچھے دو صدی سے برہنہ کھڑا تھا۔ اور مینار کی طرح کھوکھلا ہوگیا تھا۔ ۲۴ فروری ۱۸۴۹ء کو بجلی گری اور پُھنگی سے جڑ تک ایک شگاف ہوگیا۔ بہتوں نے شگاف میں سے ایک آدمی کا ڈھانچہ دیکھا تھا جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں تسبیح تھی۔ ایک گھڑی پر جو اُس کے پاؤں کے پاس پڑی تھی کلاڈ نوزیر کا نام کندہ تھا۔ یہ کلاڈ ——— میرے باپ کا چچا ——— اپنے زمانے کا بہت بڑا ڈاکو تھا ۱۷۹۴ء میں وہ اس جتھے میں شریک ہوگیا جس کا سردار ژرپٹن تھا جو عام طور پر ژاہبی دی آرگن کہلاتا تھا۔ بُری طرح زخمی ہوکر اور جمہوریت پسندوں کے تعاقب سے بچکر، اُس نے اس پُرانے کھوکھلے درخت میں پناہ لی۔ دوست اور دشمن سب اُس کے انجام سے ناواقف تھے۔ اور اُس کے مرنے کے پچاس سال بعد تک یہ راز معلوم نہ ہوسکا۔ بڈھے کلاڈ کی قبر بجلی کے ایک جھٹکے سے کھُل گئی۔"

بے برگ درختوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے اس کا قصہ یاد آگیا اور میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ جب میں سینٹ ژاں پہنچا تو کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ سرائے کا سائن بورڈ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا۔ اور تاریکی میں اُس کی زنجیروں سے آواز آ رہی تھی۔ اپنے گھوڑے کو تھان پر باندھکر میں کمرے میں داخل ہوا۔ اور آتشدان کے قریب ایک پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنا جسم سینک سینک کر گرم کرنے لگا۔ آتشدان کی روشنی سے سرائے والی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ بڈھی اور بیحد بدصورت تھی۔ اس کے خد و خال قبرستان کے گرد و غبار سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے کا سب سے زیادہ ناقابل برداشت حصہ اُس کی پچکی ہوئی ناک اور سُرخ کناروں والی آنکھیں تھیں۔ میں اجنبی تھا۔ وہ مجھ پر ترچھی اور بے اطمینان نگاہیں ڈال رہی تھی۔ اُس کے اطمینان کے لئے میں نے کہا کہ میرا نام نوزیر ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس نام سے واقف ہے۔ مگر اس نے سر ہلایا اور کہا نوزیر خاندان کے لوگ تو ختم ہوچکے۔ بہرحال اُس نے مجھے کھانا پکا دینے کا وعدہ کیا۔ اور آتشدان میں ایک لکڑی ڈال کر کمرے سے چلی گئی۔

میں تھکا ہوا تھا اور قلبی بے چینی کے ناقابل بیان احساس سے میرے دل پہ ایک بار سا محسوس ہو رہا تھا۔

گنجان خیالات، تاریکی اور اضطراب کے مناظر میرے تخیل کو تہ و بالا کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میں اونگھنے لگا۔ بیچین نیند میں آتشدان میں ہوا کی آواز سنائی دینے لگی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتشدان سے راکھ اڑا کر میرے جوتوں تک پہنچا دیتا۔

چند لمحوں کے بعد میں نے آنکھ کھولی اور ایسا منظر دیکھا جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر سفید دیوار پر میں نے ایک بے حس و حرکت سایہ ——— ایک نوجوان لڑکی کا سایہ دیکھا۔ سائے میں اسقدر نزاکت۔ خلوص۔ اور حُسن جھلک رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ میری ساری تھکن تعجب اور مسرت میں تبدیل ہوگئی۔

میں سائے کو کب تک دیکھتا رہا۔ غالباً ایک لمحے تک ——— یا شاید کچھ کم یا زیادہ دیر تک، کیونکہ میرے پاس وقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر میں مڑا کہ دیکھوں کون ہے جس کا سایہ بھی

استقدر خولصورت ہے۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔۔۔۔۔۔ صرف بڈھی سرائے والی دستر خوان بچھا رہی تھی۔ پھر میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ سایہ غائب تھا۔

پھر عاشقانہ بیتابی کی طرح کسی احساس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔

میرا دل پورا فلسفی تھا۔ چند منٹ تک میں اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ پھر سرائے والی کی طرف مڑ کر میں نے سوال کیا۔

"اماں — ابھی دو تین لمحے پہلے یہاں کون کھڑا تھا؟"

بڈھی عورت نے تعجب کے لہجے میں جواب دیا کہ اُس نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ شدید برفباری ہو رہی تھی۔ اور زمین پر سفید موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی نقش قدم نظر نہ آیا۔

"اماں کیا تمکو یقین ہے کہ گھر میں کوئی عورت نہیں؟"

بڈھی عورت نے جواب دیا کہ گھر میں میں بالکل اکیلی ہوں۔

میں نے احتیاطاً پوچھا کہ کوئی عورت ہمیشہ اسی طرح دیوار پر سایہ ڈالتی ہے؟" یہیں پر میں نے اُس کا سایہ دیکھا تھا۔ میں یقین دلاتا ہوں"

بڑھیا اپنے ہاتھ میں قندیل لیئے ہوئے بڑھی اور اپنی خوفناک خاموش آنکھیں، میرے چہرے پر جما کر کہنے لگی:۔

"اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھے دھوکہ نہیں دے رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم توزیر خاندان سے ہو۔ غالباً تم ژاں توزیر کے بیٹے ہو جو پیرس میں ڈاکٹر ہے؟ میں نوجوان ژینی کو جانتی ہوں جو اُس کا چچا تھا۔ وہ بھی ایک عورت کو دیکھتا تھا۔ جو دوسروں کو نظر نہیں آتی تھی۔ یقیناً یہ بلا، خدا نے اس خاندان پر اُس جرم کی وجہ سے مُسلط کی ہے جو کلاڈ سے سرزد ہُوا تھا جو ایک نانبائی کی جورو کے ساتھ بھاگ گیا تھا"

"غالباً تمہاری مُراد اسی کلاڈ سے ہے۔ جس کا ڈھانچہ، کھوکھلے درخت میں بندوق اور تسبیح لیئے ہوئے پایا گیا۔"

"ہاں میاں، یہ تسبیح اس کے لئے بیکار تھی۔ وہ اپنی روح ایک عورت کے پیچھے برباد کر چکا تھا"

بڑھیا نے پھر مجھ سے اس معاملے کی نسبت کچھ نہ کہا مگر میں بمشکل روٹی اور انڈے کھا سکا۔ جو اس نے میرے سامنے رکھے تھے۔ میری نظریں برابر دیوار پر پڑ رہی تھیں جہاں میں نے سایہ دیکھا تھا۔ اس میں نزاکت تھی، اور وہ کانپتی ہوئی آگ یا دھوئیں سے بھری ہوئی قندیل کے ڈالے ہوئے سایے سے زیادہ صاف تھا۔

دوسرے دن میں نے جا کر وہ مکان دیکھا جس میں کلاڈ اور ژینی اپنے زمانے میں رہتے تھے۔ میں نے پڑوس میں چھان بین کی۔ پادری سے جرح کی مگر اس لڑکی کی حقیقت نہ معلوم کر سکا جس کا بھوت میں نے دیکھا تھا۔

اب بھی مجھے یقین نہیں کہ بڑھیا کا بیان صحیح تھا یا نہیں۔ شاید اس کا کہنا صحیح تھا اور تی لوبج کے مزار علین کو جنکی اولاد میں میں ہوں۔ یہ سایہ نظر آتا ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ یہ وہ خاندانی سایہ ہو جو میرے غیر تعلیم یافتہ وہم پرست آبا و اجداد کے سامنے نظارۂ بہیم کی عزت بخشنے کو نظر آتا رہا ہو۔

سینٹ ژاں کی سرائے میں جو سایہ میں نے دیکھا وہ شاید بھوت نہیں تھا۔ بلکہ غالباً وہ ایک نشانی تھی جو سرما کی رات میں میری زندگی کی سب سے بڑی نعمت کے طور پر مجھے عطا کی گئی تھی۔ یا فطرت نے اپنے تمام تحفوں میں سے سب سے قیمتی تحفہ یعنی "تحفۂ خواب" مجھے عنایت کیا تھا؟

(اناطول فرانس) عزیز احمد

رباعیات

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں
اُس کی حکمت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیالِ دین و دنیا ہیں رواں
اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

دن صرف جمالِ روئے تصویر رہا
شب بھر دلِ محوِ خواب تعبیر رہا
تھی صبح سے صبح تک ہوس دامنگیر
کل عمرِ رواں اسیرِ زنجیر رہا

رواںؔ ایم۔اے

جھوٹ کا زوال

ایک مکالمہ

انور - (دریچے کی راہ سے برآمدے کی جانب سے اندر آتے ہوئے) صدیق دن بھر کتب خانے میں قیدیوں کی طرح نہ بیٹھے رہا کرو۔

شام نہایت دلربا ہے۔ درختوں پر ایک رنگین دھند چھائی ہوئی ہے۔ گویا بیر کے درختوں پر ایک ارغوانی شگفتگی ہے۔ آؤ۔ ذرا ہری ہری دوب پر بیٹھیں، سگرٹ پئیں اور فطرت (نیچر) سے لطف اٹھائیں۔

صدیق - فطرت اور لطف - میں بہت خوش ہوں کہ مجھ میں سے فطرت سے لطف اٹھانے کی صلاحیت سلب کر لی گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صنعت (آرٹ) ہمیں فطرت سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ فطرت کے رموز کو منکشف کرتی ہے۔ مگر میرا ذاتی تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ جتنا ہم صنعت کا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں فطرت سے بے نیاز ہوتے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعت (نیچر) فطرت کی بے ترتیبی - خام کاری - حیرت انگیز فرسودگی، اور اس کی غیر مکمل نوعیت کو روشن کرتی ہے۔

بقول ارسطو فطرت کے ارادے نیک ہیں۔ لیکن وہ انہیں تکمیل تک پہنچانے سے قاصر ہے۔ جب میں کسی فطرتی منظر کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے تمام عیوب مجھ پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے فطرت غیر مکمل ہے۔ ورنہ صنعت کا وجود معدوم ہوتا۔ صنعت انسان کی صدائے احتجاج ہے۔ صنعت وہ کوشش ہے جس کے ذریعے انسان فطرت پر حیثیت واضح کرتا ہے۔ جہاں تک فطرت کے لاانتہا تنوع کا تعلق ہے۔ یہ شے بالکل افسانہ ہے۔ اس کا وجود یا تو وہم اور تخیل کے نہاں خانوں میں پایا جاتا ہے۔ یا پھر ان لوگوں کی خود ساختہ کور چشمی میں جو اس شے پر یقین رکھتے ہیں۔

انور - بہتر۔ تم کسی فطری منظر کی طرف نہ دیکھو۔ تم نرم گھاس کے سبزے پر بیٹھکر اس کا لطف اٹھاؤ۔

صدیق - لیکن فطرت بہت تکلیف دہ بھی تو ہے۔ سبزہ نم آلود ہے۔ اذیت رساں ہے۔ اور کیڑوں مکوڑوں سے پُر ہے۔ ایک معمولی بڑھئی فطرت سے زیادہ آرام دہ نشستگاہ تیار کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اگر فطرت آرام دہ ہوتی تو انسان کبھی صنعت تعمیر کی طرف راغب نہ ہوتا۔ مجھے کھلی ہوا سے زیادہ مکان کی تنگ فضا پسند ہے۔

مکان میں ہر شے میری مرضی کے مطابق ہے۔ وہ خودی کا احساس جو وقار انسانی کے لئے ضروری ہے۔ اسی جگہ قائم رہتا ہے۔ کھلی ہوا میں انسان کی شخصیت بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ پھر فطرت بالکل بے پروا ہے۔ اسے انسان کے کاروان زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ظاہر ہے کہ فطرت کو دماغی قابلیت سے دشمنی ہے۔ یہی وجہ ہے سوچنا دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک بیماری ہے۔ اور اس کا نتیجہ لازماً موت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہ عادت ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو ہے اور ہماری تندرستی کا انحصار اسی بیماری سے محفوظ رہنے میں ہے۔

خیر! اب میں تمہیں رائے دونگا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ میں ایک مضمون کی تصحیح کر رہا ہوں۔

انور - کیا تم کوئی مضمون لکھ رہے ہو؟ یہ بات تو تمہارے عقاید سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

صدیق - کون ہے جو معتقدات و احساسات میں ایک ہی راہ پر چلنا چاہتا ہے "عمل کی یکرنگی" صرف بیوقوف اور بے ذوق لوگوں کا وطیرہ ہے۔ اور پھر میرے مضمون کا موضوع بالکل انوکھا ہے۔ اگر میری ہدایات پر عمل کیا جائے تو یقیناً صنعت ایک شباب تازہ سے آشنا ہو جائے۔

انور - موضوع سخن کیا ہے؟

صدیق - جھوٹ کا زوال - ایک صدائے احتجاج -

انور - میرا خیال تھا کہ جھوٹ کی روایات قدیمہ کو ہمارے

a Protest of Variety

سیاست دان حضرات نے برقرار رکھا ہے؟

صدیق - ہرگز نہیں - وہ تو صرف غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بحث و استدلال کی ذلت گوارا کرتے ہیں - اور یہ بات اس ماہر فن سے کوسوں دور ہے - جسے حقیقی معنوں میں "دروغ باف" کا لقب حاصل ہے - وہ تو بے خوف ہوکر - اپنی ذمہ داری سے قطعاً بے نیاز ہوکر، جھوٹ بولتا ہے - اور اُسے ثبوت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی - وہ فطرتی طور پر ثبوت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے -

باقی رہا وکلا کا گروہ - اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اپنے جذبات پر اختیار کلی حاصل ہے - اور جب چاہتے ہیں مصنوعی اور بناوٹی جذبات کے زیر اثر اپنی گفتگو کو با اثر بنا لیتے ہیں - جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھاتے ہیں - لیکن یہ لوگ بھی حقیقت میں اس گرانقدر عہدے کے سزاوار نہیں - کیونکہ تم نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات یہ لوگ قانونی نظائر کا حوالہ دیکر اپنے جھوٹ کو فروغ دینا چاہتے ہیں - یہیں سے ان میں اور ایک حقیقی دروغ باف میں فرق شروع ہوجاتا ہے - جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں - جو شخص اصل معنوں میں دروغ باف ہے وہ کبھی اپنی بات کے ثبوت میں تائیدی دلایل استعمال نہیں کرتا -

اخباروں کے مدیر بھی اس عالیشان لقب کے مستحق نظر نہیں آتے - کیونکہ موجودہ زمانے کی تباہ کن "صداقتوں" نے ان پر بھی اثر کیا ہے - صفحے کے صفحے الٹتے چلے جاؤ - صرف سچی باتیں نظر آئینگی - کہیں بھی وہ رنگین و دل آویز شے محسوس نہیں ہوتی جسے "جھوٹ" کہا جاتا ہے

علاوہ ازیں میرا مقصد یہ ہے کہ صنعت میں جھوٹ کے عناصر بہت کم ہوگئے ہیں - اب میں تمہیں وہ مضمون پڑھ کر سناتا ہوں -

"جھوٹ کا زوال - ایک صدائے احتجاج"

موجودہ ادبی دور کے تصنیفات میں جو فرسودگی اور عمومیت پائی جاتی ہے - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ جیسا فن لطیف انحطاط پذیر ہے - نہ تو اسے بطور ایک فن لطیف کے برتا جاتا ہے - نہ سائنس کے طور پر اس کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ معاشرتی حالات میں اس سے کام لیا جاتا ہے -

پرانے مورخ ہمیشہ افسانوں کو واقعات کے رنگ میں پیش کرتے تھے - آجکل کے ناول نویس واقعات کو افسانوں کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں -

ایسا معلوم ہوتا ہے - گویا عہد حاضرہ کی تصنیفات کا انداز تحریر ریلوے ٹائم ٹیبل کے انداز تحریر سے متاثر ہوا ہے - آجکل کے مصنف کی عادت ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے اپنے موضوع کے متعلق کامل واقفیت بہم پہنچاتا ہے - کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے - پھر افراد قصہ کی تخلیق سرسر اس کے اپنے تجربوں پر مبنی ہوتی ہے - نتیجتاً صنعت کو اسقدر نقصان پہنچتا ہے - جس کی تلافی محال نہیں تو مشکل ضرور ہے -

عام طور سے یہ خیال رائج ہے کہ شاعر اور دروغ باف پیدا ہوتے ہیں - مگر ماننا پڑتا ہے کہ یہ مقولہ غلط ہے - شاعری اور دروغ گوئی صنعتیں ہیں - جو افلاطون کے خیال میں ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ رکھتی ہیں - اور جو لوگ ان دونوں صنعتوں میں کمال بہم پہنچانا چاہتے ہیں - ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہایت تندہی استقلال اور یکسوئی سے کام لیں - سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں صنعتوں کی بھی اصطلاحی اور فنی نوعیتیں ہیں - عین اسی طرح جس طرح مصوری اور سنگتراشی میں موجود ہیں - ان دونوں صنعتوں میں بھی کچھ ذوقی راز ہیں - کچھ صنعت کے باریک نکتے ہیں کچھ فن کے صنعتی طریقے ہیں - جو سوائے ماہرین کے کسی اور کو معلوم نہیں ہو سکتے - جس طرح فطری شاعر اپنے اشعار کی موسیقی اور اثر آفرینی سے پہچانا جا سکتا ہے - اسی طرح "دروغ باف" بھی اپنے کلام کی گراں وقاری اور تناسب الفاظ سے ممتاز ہوتا ہے -

ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں اتفاقی القا و الہام سودمند نہیں ہوسکتا - بلکہ مشق اور مہارت تکمیل فن کے لئے ضروری ہے - حالانکہ آجکل یہ حالت ہے کہ شاعری تو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے لیکن دروغ بافی کے نشانات مٹتے چلے جارہے ہیں -

بہت سے نوجوان ادیب ایسے ہیں - جنہیں فطرت کی طرف سے "مبالغہ آرائی" کا وصف عطا ہوتا ہے - اور اگر اس گلبن ادب کی آبیاری خوشگوار فضا میں کسی ماہر فن دروغ باف کے ہاتھوں ہوتی رہے تو یقیناً یہ نوجوان ادیب عظیم الشان دروغ باف حضرات کا تتبع کرتے ہوئے بام عروج کے انتہائی زینوں تک پہنچ سکتے ہیں -

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ ایسے ہونہار ادیب ماحول کی وجہ سے برباد ہوجاتے ہیں - آہستہ آہستہ ان پر اپنے معاصرین کا اثر پڑنا شروع ہوجاتا ہے - اور آخر کار یا تو غفلت کی وجہ سے وہ سچ بولنے لگ جاتے ہیں - اور یا پھر ان کا میل جول ان لوگوں سے زیادہ ہوجاتا ہے - جنہیں سچ بولنے کی قبیح عادت ہے اور جن کی واقفیت بہت وسیع ہے - یہ دونوں عناصر تخیل کیلئے سم قاتل سے کم نہیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی نوجوان

ادیب جن سے ہماری اتنی توقعات وابستہ تھیں - ایک معکوس ذہنیت کے زیر اثر "حقگوئی" جیسی خلاف فطرت عادت سے مسحور ہوجاتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جو ادعا اس کی موجودگی میں کیئے گئے ہیں - ان کی تحقیق کرلی جائے - اسے اپنے سے کم عمر اصحاب کی تردید کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا - اور آخرکار وہ ایک ایسا افسانہ لکھتا ہے جس میں واقعات اور احساسات کی ترجمانی ایسے فطری طریق سے کی گئی ہوتی ہے کہ کوئی بھی ان واقعات کے امکان کا قائل نہیں ہوتا - یہ صرف ایک مثال ہے، اور اگر صداقت کی یہ کافرانہ پرستش فوراً ہی روک نہ دی گئی - تو یہ صنعت بانجھ ہوجائیگی - اور حسن کی نگاریں اپنے سبک و نازک پروں پر پرواز کرجائیگی -

مسٹر رابرٹ لوئیس سٹیونسن بھی جن کی نثر کی لطافت اور جن کی دل آویز پرواز تخیل زبان زد خلائق ہے - اس عیب سے نہیں بچ سکے - کسقدر افسوسناک واقعہ ہے کہ "سیاہ تیر" میں ایک بھی تاریخی غلطی نہیں ہے - اور میاں جیکل اور ڈاکٹر جیکسن کی معما کا تجربہ معلوم ہوتا ہے -

مسٹر رائیڈر ہیگرڈ نے اوائل عمر میں "دروغ بافی" کے بہترین اصولوں پر عمل کیا تھا اور ان کی کتاب "عاذرا" فن دروغ بافی کا ایک ناقابل تقلید نمونہ ہے - مگر افسوس ہے کہ وہ انداز کو قائم نہ رکھ سکے - صنعت کا منشا یہ ہے کہ اپنی قوت تخلیق سے کام لیکر "حسن" اور "تخیل" کے بہترین نمونے پیش کرے نہ یہ کہ ہمیں مبتذل آدمیوں کے حالات وسوانح سے آشنا کرے - دنیا میں انہیں شخصیتوں کو بقا حاصل ہوگی جنہیں صنعت نے پیدا کیا ہے اور جن کی تخلیق میں فطرت نے بالکل حصہ نہیں لیا - اگر کوئی ناول نویس اپنی تصنیفات میں معمولی آدمیوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرے - تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے افراد کا خالق ہے - وہ صرف "نقال" ہے - اور "نقال اور "خالق" کا فرق ارباب ذوق پر روشن ہے -

کسی افسانے کے افراد اس امر کو ثابت نہیں کرتے - کہ دنیا میں اسی قسم کے اور افراد بھی موجود ہیں - ان کی تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ظاہر کردیں کہ مصنف کی اپنی ایک شخصیت ہے جو عام آدمیوں کی فطرت سے مختلف ہے -

عہد حاضرہ میں ہر طرف سے یہ آواز بلند ہے کہ ہمیں فطرت کی طرف لوٹ جانا چاہیئے - فطرت صنعت کے بہترین عناصر کی تجدید کریگی - لیکن ظاہر ہے کہ اس معاملے میں تمام لوگ غلطی پر ہیں - فطرت صنعت سے صدیوں پیچھے ہے -

اگر فطرت کو بیرونی مظاہر و مناظر کا مجموعہ قرار دیا جائے - تو یہ حقیقت محتاج ثبوت نہیں رہتی - کہ جو "حسن" ہم فطرت میں دیکھتے ہیں وہ تمام تر خود ہمارے ذہن و دماغ کی کیفیات ہیں - صنعت کی ابتدا حسین تصورات اور دل افروز تخیلات سے ہوتی ہے - جو غیر مادی اور فرضی اشیا سے متعلق ہونے چاہئیں - جب "فطرت اور "زندگی" اس نادر تخلیق کو دیکھتی ہے - تو وہ مسحور ہوجاتی ہے - اور اس طلسم میں خود بھی داخل ہونا چاہتی ہے - اس مرحلے پر صنعت فطرت کی خام جنس کو لیکر نئے نئے طریقوں سے استعمال کرتی ہے - اور اس استعمال میں "حقیقت" اور "صداقت" سے بالکل بے پرواہی ہے - صنعت صناع اپنے ذہن کی رنگین طلسم کاریوں سے کام لیکر حسن کے نادر کارنمونے تخلیق کرتا ہے - ایک بہتر اور فردوس نژاد دنیا کے خواب دیکھتا ہے - لیکن "حقیقت" اور "صنعت" کے درمیان ہمیشہ "صنعتی انداز تحریر" کی وسیع اور ناقابل عبور خلیج حائل رہتی ہے -

پھر ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب صنعت فطرت کی نقالی پر مجبور ہوجاتی ہے - یہی وہ وقت ہے جب صنعت مردہ ہوجاتی ہے -

جہانتک انگلستان کی آرائیشی صنعتوں کا تعلق ہے - ان کا ارتقائی دور "مشرقیت" اور "نقالی" کی جنگ سے موسوم ہوسکتا ہے مشرق نقالی کو بلا تامل رد کردینے کا عادی ہے - صناعانہ روایات کو برقرار رکھتا ہے - اور کسی خارجی منظر یا منظر کی عکاسی "صداقت و حقیقت" کے اصولوں پر نہیں کرتا - اس کے برخلاف مغرب فطرت کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے -

کوئی شک نہیں کہ اس صدی کے اختتام سے پہلے حالات بدل جائیں گے - کیونکہ صنعت زیادہ عرصہ فطرت سے مغلوب نہیں رہ سکتی -

صرف "صنعت" کے حدود ہی میں نہیں - معاشرتی زندگی میں بھی دروغ باف کا بہت اہم حصہ ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ دروغ باف کے بغیر کوئی معاشرتی جلسہ کامیاب نہیں ہوسکتا -

صنعت کے کمال کو خارجی حالات اور اثرات سے جانچنا غلط ہے - صنعت ایک آئینہ نہیں بلکہ ایک نقاب ہے - وہ اس دنیا کے علاوہ عالم رنگ و بو تخلیق کرتی ہے - جسمیں آرزوؤں اور امیدوں کی دیوی چاندنی کی کرنوں کی طرح دلوں پر سکون کے مہینہ برساتی ہے صنعت چاہے تو مہر و ماہ کو زمین پر اتار لے - اور کائنات کو ایک

ناقابل بیان ظلمت میں غرق کردے۔

صنعت کی نگاہ میں فطرت کا کوئی قانون نہیں۔ فطرت اندھی ہے۔ صناع کے تخیل کے سامنے معجزے کی کوئی وقعت نہیں، تخیل اور واہمہ چاہے تو بحر ذخار کی تہ میں سے وحشتناک جانوروں کو کھینچ بلائے۔ اور چاہے تو موسم زمستاں میں گلاب کو شگفتہ کردے۔ اس کا حکم ہوتا ہے تو برف کی کانپتی ہوئی انگلیاں دل گرما کو منجمد کر دیتی ہیں۔ اور پہاڑوں کی کھوؤں میں سے پردار گھوڑے نکل کر فضا میں پرواز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس وقت اس امر کی بیحد ضرورت ہے۔ کہ "دروغ بافی" کے فن کو زندہ کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانے زمانے میں "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" پر ایک حد تک عمل ہوتا تھا۔ لیکن وہ عمل بھی کسی حد تک خام تھا۔ اور صنعتی اصول پر مبنی نہیں تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ اس فن کے اصول مدون ہونا شروع ہوئے۔ تا اینکہ اسی موضوع پر بہت گرانقدر ادبی تصانیف لکھی گئیں۔

اسوقت بھی "اخباری دنیا کے جھوٹ" کسی حد تک اس فن کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے مدرسوں میں جس جھوٹے اخلاق کی تعلیم دیجاتی ہے۔ وہ بھی نہایت گرانقدر ہے لیکن یہ تمام جھوٹ کسی مقصد کے ماتحت بولے جاتے ہیں۔ اور "مقصد" صنعت کے لئے زہر سے کم نہیں۔ "جھوٹ" صرف وہی صنعتی کہلا سکتا ہے جو صرف جھوٹ بولنے کی خاطر بولا جائے۔

اگر دروغ بافی کا فن پھر فروغ پذیر ہوا تو دنیا ایک نئے رنگ میں رنگی جائیگی۔ صداقتیں مسترد کردی جائینگی اور "روحانیت" کی غیر مرئی روح صنعت میں ساری ہوجائیگی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے دنیا کے تمام خزائن بے نقاب ہوجائیں گے۔ اور ہم بہار کی رنگینیاں محسوس کر سکیں گے۔ غم ہوگا اور ہم اسے نشاط خیال میں تبدیل کر سکیں گے۔

(آسکر وائیلڈ)

شمس الہدیٰ بی۔ اے

"مشاہدات و ارادات"

ناز ہے نادان تجھ کو طالع بیدار پر
سرسری ہی اک نظر آئین فطرت کی طرف

اور میں غمگیں کہ یہ نقش حسیں مٹ جائے گا
کھل چکا جو غنچۂ خوشرنگ اب مرجھائے گا

تو نے مے پی، اور زمانہ کی نظر سے گر گیا
میں نے دیکھا اک شکستہ حال کو دم توڑتے
جب مگر تیری نگاہوں سے یہ گزرا ماجرا
تو نے تسکیں دی، سنوارے اسکے اوضاع حیات

میری حق کیشی سے دنیا نے مری تعظیم کی
اور صبر و شکر کی خوبی اسے تعلیم کی
بند تھیں گو تجھ پہ راہیں کوثر و تسنیم کی
یعنی کچھ بکھرے ہوئے اوراق کی تنظیم کی

قدسیوں کو گیت تیرے وصف میں گاتے ہوئے
میں نے دیکھا تیرے سر پہ پھول برساتے ہوئے

گو بدی کتنی ہی چھوٹی ہو مگر چھوٹی نہ جان
رفتہ رفتہ پھیلتے ہیں یوں جراثیم بدی

شوق شغل مے سے پہلے تلخی عہد خمار
چیونٹیاں جس طرح جاتی ہوں قطار اندر قطار

سید علی اختر

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ

وزیر اعظم دولت برطانیہ

مسٹر جیمز ریمزے میکڈانلڈ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جب انگلستان معاشرتی اور سیاسی دور انقلاب میں سے گذر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال سکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقے میں بسر کئے۔ جہاں ان انقلاب انگیز تحریکوں اور ہنگامہ خیز واقعات کی کوئی صدا نہ پہونچتی تھی جو اسوقت انگلستان میں رونما ہو رہے تھے۔ ان کی زندگی اس قسم کے حالات میں گزر رہی تھی۔ کہ کوئی شخص بہ گمان نہ کرسکتا تھا۔ کہ وہ سیل بے پناہ جو قدیم روایات کے بند توڑ رہی تھی انہیں بھی اپنے دوش پر بہا لیجائیگی۔ انہوں نے خود ایک عظیم مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ان کی زندگی اس طرح سے گذر رہی تھی گویا وہ کاشتکار بننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں جس شئے نے انہیں وزیر اعظم کے جلیل القدر رتبے تک پہنچایا۔ وہ اس بیداری کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔ جو اسوقت انگلستان کے ہر طبقے اور خصوصاً مزدوروں کے طبقے میں پیدا ہو رہی تھی۔

اٹھارہ سال کی عمر تک وہ لوسی موتھ میں رہے۔ سکول گاؤں سے بہت دور تھا۔ اور اکثر سکول جاتے ہوئے انہیں خیال آتا۔ کہ وہ کسی دلکشا مقام کی سیر کے لئے چلے جائیں۔ مگر وہ اپنے ماں باپ کی غربت کا احساس کرکے اس ارادے سے باز آجاتے۔

اب انہیں سائنس کا شوق پیدا ہوگیا تھا— اور وہ لوسی موتھ کے مختلف مظاہر دیکھکر گھنٹوں ان پر غور کیا کرتے تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں اپنی ذہانت۔ وسعت نظر اور طلب علم کی بدولت ایک سکول میں استاد مقرر ہوگئے۔ انہیں دنوں ان پر ان تمام تحریکات کا ایک گہرا اثر پڑا۔ جو ان کے گرد و پیش کام کر رہی تھیں۔ ان کے دل میں سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اب انہوں نے مقامی سیاسیات میں دخل دینا شروع کیا۔ ایک دربار میں انہوں نے تقریر بھی کی۔ اور ایک مقامی اخبار سے ایک مختصر افسانے کے لئے انعام بھی حاصل کیا۔ انہیں دنوں وہ "انجمن جمہور" کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ مگر وہ محسوس کرتے تھے کہ ان بلند کی نظری جو کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے گاؤں میں کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸ سال کی عمر میں لندن جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

۱۸ سال سے لیکر ۲۸ سال کی عمر تک انہوں نے اپنی زندگی گمنامی اور غربت میں بسر کی۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اس دوران میں انکی ذہنی طاقتیں ترقی کر گئیں۔ پہلے پہل وہ مختلف تجارتی فرموں میں کلرک کا کام کرتے رہے۔ جہاں سے انہیں بمشکل ۵۰ روپے ماہوار حاصل ہوتے تھے۔ وہ اپنا خالی وقت کسی کتب خانے میں مطالعے میں صرف کرتے تھے۔

شروع ہی سے ان کی ہمدردی نئی سوشلسٹ تحریک کے ساتھ تھی ۱۸۸۸ء میں وہ مسٹر تھامس لو کے سیکرٹری مقرر ہوگئے جو پارلیمنٹ کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ چار سال تک انہوں نے اس جگہ کام کیا۔ اور اس دوران میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوت تحریر کے ذریعے بھی روپیہ کما سکتے ہیں۔ چار سال سیکرٹری رہنے کے بعد وہ لندن کے مختلف اخباروں اور رسالوں کے دفتر میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آخر کار جب ۱۸۹۳ء میں "حزب العمال" قائم کی گئی تو وہ اس کے رکن ہوگئے۔ اور بڑی فراخدلی سے اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں دورہ کرکے سوشلزم کا پروپگنڈا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ "حزب العمال" کے کارکنوں نے انہیں دورہ کے لئے بھیج دیا۔ اس دوران میں قوت تقریر نے بہت ترقی کی۔ ان کی تقریر سے متاثر ہوکے سوتھیمپٹن کے سوشلسٹ لوگوں نے انہیں دعوت دی کہ وہ پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے کھڑے ہوں۔ ۱۸۹۵ء کے انتخاب عمومی میں "حزب العمال" نے انہیں بھی انتخاب کے لئے نامزد کیا۔ اس مرحلے پر انگلستان کے لوگ عام طور ان کی قدر و قیمت محسوس کرنے لگے تھے۔

ان کی اس وقت کی تصاویر دیکھکر معلوم ہوتا ہے گویا انکے چہرے پر نور سا برس رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب ان کے جذبات ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتے۔ مگر اس

وقت ان کی آنکھیں ان کے احساسات کا آئینہ تھیں - ۳۰ سال کی عمر میں ان کی شادی ڈاکٹر ایچ ہال گلیڈسٹون کی دختر نیک اختر سے ہو گئی -

مسز مکڈانلڈ بھی شروع سے "حزب العمال" سے ہمدردی رکھتی تھیں - بدقسمتی سے مسٹر میکڈانلڈ کو صرف ۱۵ سال اپنی بیوی کی محبت سے مسرت اندوز ہونا تھا - اپنی بیوی کی موت کے بعد انہوں نے جو کتاب لکھی ہے وہ اسقدر دردناک اور لطیف ہے کہ شاید دنیا میں کوئی کتاب قاری کے ذہن پر اس قدر اثر مترتب نہیں کر سکتی -

اس کتاب کے مطالعے سے ان کی زندگی کے اکثر رموز بے نقاب ہو جاتے ہیں - اس میں انہوں نے اپنے سفروں کا مفصل حال قلمبند کیا ہے - اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چھ بچے تھے - ۱۹۱۱ء میں موت نے اپنا پنجۂ مثال ہاتھ بڑھا کے اس مسرور خاندان کے ایک نونہال کو چھین لیا - مسٹر میکڈانلڈ ہندوستان سے واپس آئے ہی تھے کہ ان کا لڑکا ڈیوڈ پانچ سال کی عمر میں فوت ہو گیا - اسی سال کے آخر میں ان کی بیوی نے داعی اجل کو لبیک کہا -

اس حادثے نے انہیں متاثر کیا - اور بہت عرصہ وہ غم و الم کی شدت سے نڈھال ہو رہے پڑے رہے - مگر بچوں کی محبت طوفان غم پر غالب آئی - اور انہوں نے ایک عورت کی سی شفقت اور محبت سے اپنی مرحوم بیوی کے یادگاروں کی پرورش کیا -

۱۸۹۵ء سے لیکر ۱۹۰۶ء تک مسٹر میکڈانلڈ اپنے تحریک کے لئے پروپگنڈا کرنے میں مصروف رہے - ان کا قلم ان کی زبان سے کم نہ تھا - چنانچہ وہ تحریر و تقریر دونوں ہی کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں سوشلسٹ تحریک کو پھیلا رہے تھے -

پارلیمنٹ میں داخل ہو کر انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ حزب العمال کے اراکین کو ایک منظم و مرتب شکل دیدی - اور ان کے لئے ایک لائحہ عمل تجویز کیا - ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا - اور اسی مقصد کی تکمیل میں وہ تمام عمر کوشاں رہے ۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ بہت ہنگامہ آفریں تھا - اس دوران میں انہیں دوست و دشمن کے طعن طنز برداشت کرنے پڑے مگر وہ اپنے رستے سے بالکل نہیں ڈگمگائے - اور برابر تندہی اور جانفشانی سے کام کرتے رہے - ۱۹۱۴ء میں وہ سانحہ عظیم رونما ہوا جسے جنگ فرنگ کا لقب دیا جاتا ہے -

مسٹر میکڈانلڈ اور ان کے ساتھ مزدور پارٹی لڑائی کے خلاف تھی - ظاہر ہے کہ اگر اسوقت موصوف دیگر ارباب سیاست کی طرح برطانیہ عظمیٰ کی لڑائی میں شرکت کی مخالفت نہ کرتے تو انہیں کابینہ وزارت میں کوئی اہم عہدہ مل جاتا - لیکن ان کی ایماندارانہ روش اور ان کی مخلصانہ طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے ملک کو ایک ایسے کام میں شریک ہونے کا مشورہ دیں جسے وہ اس کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں -

اسی طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ وہ ۱۹۱۸ء کے انتخاب عمومی میں منتخب نہیں ہوئے - کیونکہ لڑائی کے دوران میں ان کے دشمن ان کے خلاف ناپاک اور زہریلا پروپاگنڈا کرنے میں مصروف تھے -

۱۹۲۲ء کے انتخابات میں وہ منتخب ہوئے - اس وقت مزدور اراکین کی تعداد ۱۴۲ تھی - انہیں متفقہ طور پر اپنی پارٹی کا قائد تسلیم کر لیا گیا - ۱۹۲۳ء میں ان کی حالت پہلے سے بہتر تھی - اور انہوں نے اسی سال اپنا پہلا کابینہ وزارت ترتیب دیا - اور اسطرح پہلی بار ایک مزدور جماعت کا رکن انگلستان کا وزیر اعظم مقرر ہوا -

ان کی زندگی کے واقعات کو ختم کرنے سے پیشتر ناظرین کی دلچسپی کے لئے میں مختصر لفظوں میں ان کے کردار کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں - وہ ایک فطرتی مقرر ہیں - ان کا فعل ان کے تدبر سے اور ان کا تدبر ان کے فعل سے بڑھا ہوا ہے - ان کا دماغ سائنس اور فلسفے کے رموز سمجھانے میں مشتاق ہے - جیسا کہ انکی مختلف تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے - وہ اپنی رائے بہت سوچ بچار کے بعد دیتے ہیں - وہ اپنے آپ کو سیاسی تحریک کا ایک عنصر تصور کرتے ہیں - اور سمجھتے ہیں کہ اگر اپنے مقصد کی تکمیل میں ان کی جان چلی جائے تو یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے - انہوں نے کتابوں کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے - اور ان کا مطالعہ محض "چار پائے بر و کتابے چند" کا مصداق نہیں ہے - بلکہ انہوں نے اس مطالعے سے بہت سے ایسے فوائد حاصل کئے ہیں - جو عام دل و دماغ کے لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتے - ان کی تحریر و تقریر میں صناعانہ دلکشی اور دل افروزی پائی جاتی ہے - ان کی ظاہری شکل و صورت بہت جاذب نظر ہے - ان کا رنگ نسبتاً اسقدر گورا نہیں جتنا عام انگریزوں کا ہوتا ہے - مگر ان کی آنکھیں موجہائے حیات سے اسقدر لبریز ہیں - کہ اُن کا پورا چہرہ موزوں اور درخشاں نظر آتا ہے ایک مصنف نے ان کی آنکھوں کو بجلی کی چمک سے تشبیہ دی ہے - ان کے ماتھے پر غم و کرب کی جھریاں ہیں جن کی وجہ سے انکے اندازہ ہیں

تدبر و تفکر کا ایک ایسا پہلو شامل ہو گیا ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا - اُن کی آوازیں بیحد پُرترنم اور دلکشی ہے وہ اگر چاہیں تو فلسفہ کے کسی مسئلے کو شاعری کے کسی شاہکار کی طرح دل افروز اور دلچسپ بنا سکتے ہیں -

وہ محنت کے اس قدر عادی ہیں کہ ۲۴ گھنٹے کام کر سکتے ہیں کئی بار ایسا ہوا کہ کئی دن تک وہ مسلسل کام کرتے رہتے ہیں - اور اس اثنا میں انہوں نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھ نہیں جھپکائی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جسم ان تھک ہے -

وہ اپنے دماغ کو ارد گرد کی چیزوں سے بالکل علیحدہ کر سکتے ہیں - چنانچہ ان کے ارد گرد چاہے ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو پھر بھی وہ سکون اور اطمینان سے مضمون لکھ سکتے ہیں - یا کسی اہم سیاسی مسئلے پر غور کر سکتے ہیں -

میلا رام وفا

شمعِ مزار

بیٹھی ہے کس سکوت میں شمعِ مزار تو — اے شمع کس شہید کی ہے تکیہ دار تو
سوئے سحر پہ گوش بر آواز کیوں ہے تو — پچھلے پہر سے مائلِ پرواز کیوں ہے تو
کیا تیرا دل بھی میری طرح دردمند ہے — تجھ کو بھی کنجِ شامِ غریبی پسند ہے
اے نامراد جوگ لیا تو نے کس لئے — کس کا یہ غم ہے سوگ لیا تو نے کس لئے
کیا تجھ کو یاد آئے ترے کشتگانِ ناز — جاں دادگانِ پاک نظر اور پاک باز
بیٹھی ہے اُن کی فاتحہ خوانی کے واسطے — تو رو رہی ہے اُن کی جوانی کے واسطے
تیرا سکوت نائے نواہائے راز ہے — سوز و گداز میں ترے در پردہ ساز ہے
گونجا ہے یوں ہوا میں تری روشنی کا راگ — جیسے کہ بھیگی رات میں گائے کوئی بہاگ
یا جیسے پھول کیوڑے کا کھل جائے باغ میں — اور پھیل جائے اس کی مہک باغ و راغ میں
اونچے درخت تکئے کے نزدیک اور دور — اس طرح کر رہے ہیں ترا اقتباسِ نور
گویا کہ چھانتے ہیں ملک روشنی تری — اور پھینکتے ہیں سوئے فلک روشنی تری
سنگِ نشانِ قبر ہیں باندھے ہوئے قطار — گویا کھڑے ہیں تیرے مریدانِ باوقار
کرتے ہیں غور سلسلۂ کائنات پر — یا محو ہیں مشاہدۂ بے ثبات پر
کیا یہ بھی محوِ جلوۂ حسنِ قدیم ہیں؟ — اے برقِ طور کیا ترے اتنے کلیم ہیں؟

اس تیرہ روزگار و پُرآشوب دور میں
دو تیرے دردمند ہیں اقبال اور میں

نادر کاکوروی

زندگی کا معمّہ

؟

بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل (غالب)

یہ زندگی کا منظرِ حیرت فزا ہے کیا؟ — یہ دلکشی کا جلوۂ طاقت رُبا ہے کیا؟
یہ دلگدازیٔ نفسِ شعلہ زا ہے کیوں؟ — یہ سحر کاریٔ نگہ سرمہ سا ہے کیا؟
مسند نشینِ انجمنِ رنگ و بُو ہے کون؟ — رعنائیٔ بہارِ نسیم و صبا ہے کیا؟
محفل فروزِ میکدۂ آرزو ہے کون؟ — کیف آفرینیٔ چمنِ مُدعا ہے کیا؟

میرا الم نشاط ہے میری حیات موت — اِس دردِ لاعلاج کی آخر دوا ہے کیا؟
رنگیں ہیں خونِ عشق سے رخسارِ حُسن کے — رنگینیٔ جمال کی یہ انتہا ہے کیا؟
گویا کوئی مرے تو کسی کی ہو زندگی — ہنگامۂ حیات میں یہ ہو رہا ہے کیا؟

کیا چیز ہے جو خون میں ہر میرے موجزن؟ — آخر یہ شعلہ ریزیٔ برقِ فنا ہے کیا؟
آخر کدھر رواں ہے یہ کشتی حیات کی؟ — آخر یہ قہر خیزیٔ سیلِ بلا ہے کیا؟

یہ التہاب موت ہے یہ اضطراب موت
دیگی مرے سوال کا آخر جواب موت

عابدؔ

ADABI DUNYA.

مسٹر ٹیمپل کلارڈ اؤٹ لینگ، بیگم صاحبہ، صاحبزادے اور صاحبزادیاں
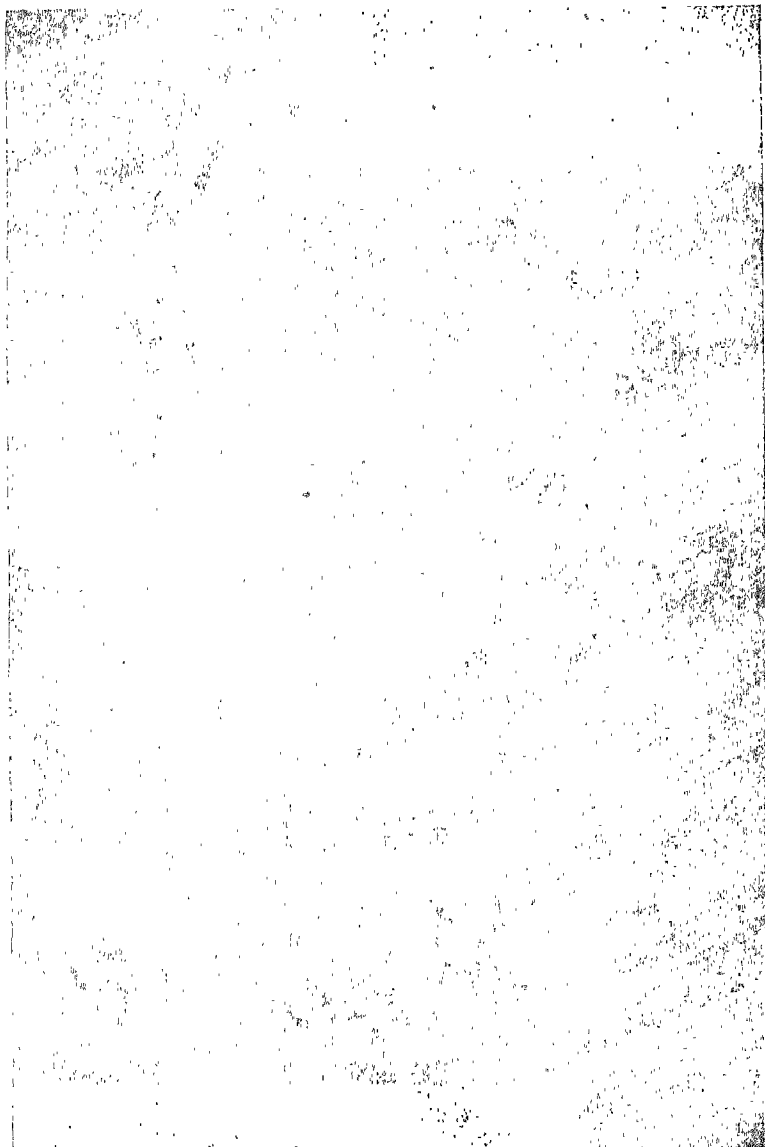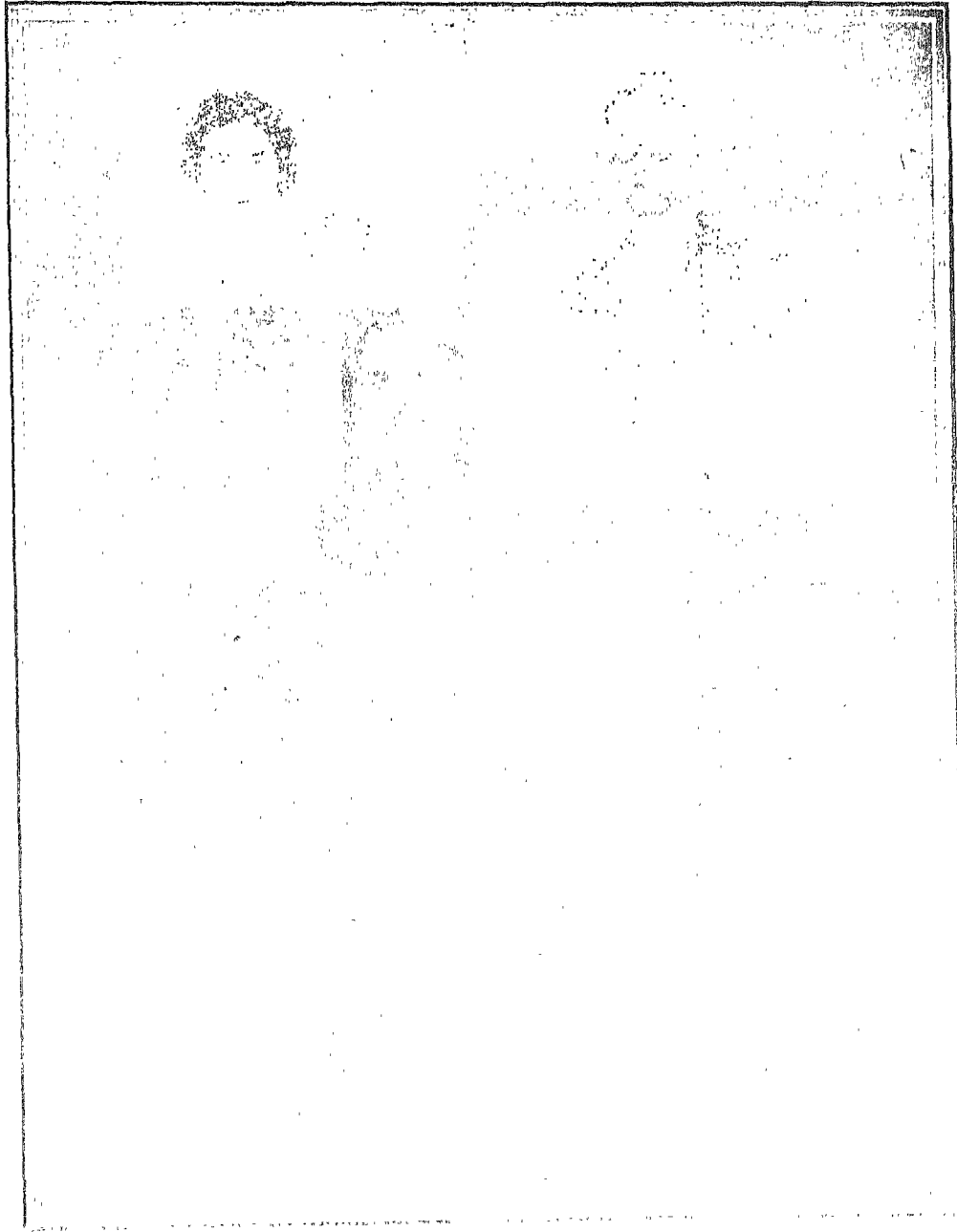
شجرِ عشق

شام کے ٹھنڈے وقت میں اُسے ہمیشہ دیکھتا تھا ۔ دوسری عورتوں کے ہمراہ وہ دریا کی طرف سے آیا کرتی تھی ۔ وہ عجیب وقت تھا وہ منظرِ حُسن جو تمام دن میرے دل میں رہتا تھا ۔ میری آنکھوں کے آگے آ گیا ۔

اپنے باپ کے گھر میں داخل ہو کر بعض اوقات وہ میری نظروں سے غائب ہو جاتی تھی ۔ بعض اوقات وہ دوسری عورتوں کی معیت میں ایک جھونپڑی کے آگے بوڑھے افسانہ خواں کے افسانے سُنا کرتی ۔ اور اس کی آنکھوں میں ان افسانوں کے تاثرات اسی طرح ہوتے تھے ۔ جس طرح پُرسکون پانی میں درختہائے خرما کے سایے ۔

کبھی کبھار وہ میرے ہاتھ ملکر چلاتی ۔ اور مجھ سے گفتگو بھی کرتی ۔ وہ شامہائے عشرت اپنے اثرات وجد و غم کی وجہ سے میرے حافظے پر ثبت ہیں ۔ ایکدن مَیں افسانہ خواں کے پاس گیا ۔ اس کا رنگ سیاہ تھا ۔ اس کی قومیت میری قومیت سے مختلف تھی ۔ اور وہ دور کسی اور ملک سے دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا آیا تھا ۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آیا تھا ۔ مَیں نے اس سے کہا ۔

" میری درخواست ہے کہ آپ آج شام ہمیں اپنے افسانے سنائیے "

اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کے معنی یہ تھے کہ اسے اس درخواست کے قبول کرنے سے انکار ہے ۔ لیکن جب مَیں نے اسے وہ تحفہ دکھایا جو مَیں اس کے لئے ساتھ لے گیا تھا تو اس کا انکار اقرار میں بدل گیا ۔ میری درخواست کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل اپنی محبوبہ کے لئے بیقرار تھا اور گوارا نہ کر سکتا تھا کہ آج شام وہ میرے پاس سے جلد جلد چلتی ہوئی گزر جائے ۔

جب بوڑھے افسانہ خواں نے اپنی چھڑی سے ریت پر نقش و نگار بنانا شروع کئے اور اس دور دراز ملک کے افسانے چھیڑے جہاں سے وہ آیا تھا تو میری محبوبہ بھی ان عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی جو اس کے افسانے سننے کے لئے جمع ہوئی تھیں ۔

اور مَیں اس کی طرف اس تشنہ کام کی طرح دیکھ رہا تھا جس کی روح پیاس سے بیتاب ہو رہی ہو اور جسے دُور سے پانی کی چمکتی ہوئی لکیر نظر آ رہی ہو ۔ اس نے یہی شجرِ عشق کا افسانہ سنایا ۔ اس کا بیج چاندی کی طرح چمکتا ہے ۔ اور حجم میں انسان کی مٹھی کے برابر ہوتا ہے اگر اس بیج کو زمین میں بو دیا جائے تو دو سال تک کچھ پیدا نہ ہوگا ۔ اور پھر ایک معجزہ ہوگا ۔ کیونکہ دو سال کے بعد ایک دن طلوع و غروبِ آفتاب کے درمیانی وقت میں درخت مکمل نشو و نما پا جائیگا ۔ اس کی بلندی انسانی قد سے دگنی ہوگی ۔ اور اُسی دن مرجھا بھی جائیگا ۔

اس مختصر عمر میں یہ درخت ابنِ آدم کے خون کا پیاسا ہوتا ہے ۔ اور اس سے ایک اس قسم کی تیز و تند خوشبو نکلتی ہے جسکا نتیجہ نیند اور موت کی حرارت میں نمودار ہوتا ہے ۔ اس کی شاخیں انسان کے جسم کو تازیانے کی طرح ضربیں لگاتی ہیں ۔ اسکی ہر ایک شاخ کے سرے پر منہ ہوتا ہے ۔ جس کے ذریعے یہ درخت انسان کا خون چوستا ہے ۔

اور پھر افسانہ خواں نے ہمیں ایک عورت کی بے وفائی اور ایک مرد کے انتقام کا افسانہ سنایا ۔ رات کو تاریکی میں ۔ چھپکر مرد نے اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں شجرِ عشق کا بیج بو دیا ۔ لیکن جب درخت اُگا تو اُس کی شاخوں نے عاشق کی بجائے اس کی معشوقہ کا خون چوس لیا ۔ صبح کو لوگوں نے اس کے مرجھائے ہوئے پتوں کے نیچے سے عورت کی لاش نکالی اور وہیں سے وہ درخت کے تین بیج بھی ملے ۔

افسانہ خواں نے کہا " تمام دنیا میں صرف تین بیج اس شجرِ عشق کے باقی ہیں ۔ درخت یہ درخت اس قدر ہولناک ہے کہ آجتک وہ بیج نہیں بوئے گئے "

اس نے اپنی انگلیاں پھیلائیں اور پھر بند کر لیں ۔

" ہاں اسوقت سے اسوقت تک بیس بار دریا چڑھ اتر چکا ہے ۔ اور پانچ سال تک بیجوں کی احتیاط لازمی ہے ۔ پھر ان بیجوں میں سے بدی کی طاقت سلب ہو جائیگی ۔ اور وہ صرف غیر مضر کھلونے رہجائیں گے ۔ اور اس کے بعد کوئی مرد یا عورت شجرِ عشق کے نظارے کو نہ دیکھ سکیگی ۔ "

میں نے اس کے افسانے کو مختصر کر دیا ہے - اس نے افسانے کو ایسے الفاظ میں بیان کیا تھا کہ میری آنکھوں کے آگے درخت کی تصویر کھنچ گئی تھی - اور جو کچھ ہوا تھا - ہم اسے دیکھ اور سن سکتے تھے -

اس دوران میں میری نظر محبوبہ کے چہرے پر جمی رہی - اسکی حالت عجیب تھی - ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ بیہوشی کے عالم میں ہے - وہ گہرے سانس لے رہی تھی - اس کی انگلیاں ارغوانی پھولوں کی پتیوں کو نوچ رہی تھیں - اور پتیاں ریت پر اس طرح معلوم ہوتی تھیں گویا خون کے قطرے ہیں - اس شام شفق کا رنگ بھی خونیں سرخ تھا -

افسانہ خواں خاموش ہو گیا تو دور سے ایک گیدڑ کی آواز سنائی دی - اور پھر ایک لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا " بڈھا بڑا جھوٹا ہے "

افسانہ خواں نے یکایک غصے میں آ کر کہا کتے کے بچے میں جھوٹ نہیں بولتا میں نے وہی باتیں بیان کی ہیں جو میں نے دیکھی اور سنی ہیں - میں نے انہیں ہاتھوں میں شجر عشق کے بیجوں کو تھامے رکھا ہے - ہاں وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی -

"کیا وہ میں ہی نہیں تھا جس نے اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں شجر عشق کا بیج بویا تھا "

ہم تمام خاموش تھے - اور وہ چپ چاپ چلا گیا - اس دن پہلی بار میری محبوبہ نے میری طرف دیکھا - اور ہاتھ سے اشارہ کیا - میں اس کے پیچھے چل دیا - اور ساحل دریا پر بیٹھ کر ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے - جبکہ چاند - چمکتا ہوا چاند اپنے عروج پر تھا -

(۴)

اس نے کہا " تم میری تعریف کرتے ہو - اور کہتے ہو کہ میں بہت خوبصورت ہوں - ممکن ہے یہ غلط ہو - ممکن ہے درست ہو - دونوں صورتوں میں مجھے یہ تعریف بھلی معلوم ہوتی ہے -

تم مجھے تحفے دیتے ہو - اور تحفے اچھے معلوم ہوتے ہیں - تم نے افسانہ خواں کو بھی ضرور کوئی انعام دیا ہے - کیونکہ وہ اور لوگوں کی نسبت تمہاری زیادہ عزت کرتا تھا - اور یہ بات تم نے باقی سب باتوں سے اچھی کی ہے کیونکہ ہمارے لئے ایک دن بالکل دوسرے دن کی طرح ہے - اور ہم ایک ہی چکر میں بندھے ہوئے ہیں - عین اس بیل کی طرح جسکی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوتی ہے - اور جو باغ کے لئے کوئیں میں سے پانی نکالتا ہے -

لیکن افسانوں میں ایک دلکشی ہے جسکی وجہ سے ہم اس زندگی کو بھول جاتے ہیں - اور اپنے آپ کو نئی دنیا میں پاتے ہیں - اور ہماری زندگی بدلتی رہتی ہے -

پھر تم نے مجھ پر اپنی محبت نچھاور کر دی ہے - اور تم چاہتے ہو کہ میں بھی تم سے محبت کروں - میں تمہیں کس طرح ایسی شے دوں جو میرے پاس نہیں - میں بہت کم عمر ہوں - اور ممکن ہے کسی دن میرے قلب میں بھی یہ شعلہ بھڑکنے لگے - لیکن اس وقت تم محبت کا تذکرہ کرتے ہو تو میں ایسا محسوس کرتی ہوں گویا میں کسی ایسی تحریر کی طرف دیکھ رہی ہو جس کو پڑھ نہیں سکتی - میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں -

"کہتی جاؤ - تمہاری آواز کسقدر شیریں ہے " -

" میں افسانے کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں - میرا خیال ہے کہ یہ افسانہ اگر تمام و کمال نہیں تو کسی حد تک ضرور صداقت پر مبنی ہے میں تمہیں اس کی وجہ بتاتی ہوں - دو سال ہوئے ایک بوڑھی عورت اپنے گھر دم توڑ رہی تھی - اور اس کے تیماردار تمام خوف کے مارے بھاگ گئے تھے - میں اس کے لئے دریا سے پانی لیکر آئی - بوڑھی عورت نے پانی کو بہت بے تابی سے پی لیا کیونکہ وہ بخار سے جل رہی تھی پھر اس نے مجھے کہا کہ میں تھوڑا سا پانی اپنے بائیں ہاتھ کے چلو میں ڈال لوں - تاکہ وہ پانی کی طرف دیکھ سکے - وہ پانی کی طرف دیکھتی رہی تاوقتیکہ میرا ہاتھ کانپنے لگا - اور پھر اس نے ایسی بات کہی جو میں نے کسی کو بتائی ہے - اور نہ بھولی ہوں - اس کے الفاظ یہ تھے :-

" مرنے والی نے اس دنیا کے ماوراء دیکھ لیا ہے - اور جو کچھ میں کہتی ہوں وہ ہو کر رہیگا - تمہارے عاشق کے پاس ایک گیند ہوگا جو چاندی کا نہیں مگر چاندی کے رنگ کا ہوگا - اور اس گیند میں موت اور حیات پوشیدہ ہوگی "

آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ گیند شجر عشق کا بیج ہوگا - میں نہیں جانتی کہ وہ بیج کہاں ہے - بوڑھے افسانہ خواں نے کہا کہ بیج کو بہت حفاظت سے رکھا جا رہا ہے - ممکن ہے اس کی تلاش میں آدمی کو لمبے اور خطرناک سفر پر جانا پڑے - خون بہے - اور اس کی بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑے - لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ جس دن تم میرے پاس وہ بیج لے کر آؤ گے میرے قلب میں تمہاری محبت اس طرح جوش زن ہوگی کہ مرا سر جھک جائیگا - میری آنکھیں بھر جائینگی

اور میرا جسم اور میری رُوح تمہارے اختیار میں ہوگی۔"

میں نے گلوگیر آواز میں کہا "اور تم نے ابتک کسی کو یہ راز نہیں بتلایا؟"

"کیا میں نے پہلے ہی یہ بات نہیں کہی - اور اگر تم قسم کھاؤ کہ تم اس بیج کی تلاش میں جا رہے ہو تو میں اسوقت تک کسی اور شخص کے آگے اس بات کا تذکرہ نہیں کرونگی جبتک مجھے پتہ نہ ملجائے کہ تم ناکام رہے ہو - میں نے تمہیں بہت سے وجوہات پر انتخاب کیا ہے - تم نرم دل ہو - اور جب میری خوبصورتی زائل ہوجائیگی اور تمہاری محبت بھی فنا ہوجائیگی تو تم مجھے نہیں مار دو گے - تم اسقدر مالدار نہیں - جسقدر میرے دوسرے عاشق مالدار ہیں - مگر تم ان کی طرح کنجوس بھی نہیں ہو - کیا تم نے میری دلچسپی اور مسرت کے لئے افسانہ خواں کو انعام نہیں دیا؟"

"تمہاری مسرت کے لئے اور تمہارے حسن سے اپنی آنکھوں کو مخمور مسرت کرنے کے لئے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا - اور اگر تم بوڑھے افسانہ خواں کو نہ بلاتے تو مجھے کبھی شجر عشق کے بیجوں سے واقفیت نہ ہوتی - اور اگرچہ مجھے تم سے قطعاً محبت نہیں ہے لیکن میں پہلے تمہارے ہی پاس آتی ہوں - کہیں اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ کام بہت خطرناک ہے .... تو"

میں نے کہا "ٹھہرو - میرے دل میں*کہیں اس قسم کا بیج موجود ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسے ڈھونڈ کر رہونگا - اور سوائے موت کے اور کوئی چیز مجھے اپنے ارادے کے پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

اس نے کہا "کافی ہے! تم بیج کو کبتک لے آؤ گے"؟

"وقت کا معیّن کرنا مشکل ہے - کیا تم میرے لئے ایکسال تک انتظار کر سکتی ہو -"

"ہاں - ایک سال کے لئے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ محبت اس سے بھی کم عرصے میں فنا ہوجاتی ہے - جس وقت تم بیج کو پالو اور تمہیں محسوس ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی - تو پھر بیج کو میرے پاس لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے - ممکن ہے اس حالت میں تم کو بھی ہمراہ لاؤ۔"

میں نے دریا کی طرف اشارہ کیا -

"دریا ہمیشہ سے رواں ہے - اور ہمیشہ رواں رہیگا - اسی طرح میری محبت بھی کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔"

اس نے کہا "بیج میرے لئے تقدیر کا اشارہ ہے - اگر تم بیج لے آؤ - تو میں تم سے محبت کرونگی - اور اگر تم اپنے مقصد میں ناکا[م] رہے تو یقیناً کوئی اور کامیاب ہوجائیگا - اور میں اُسی سے محبت کرو[نگی] اور بیج تو آگ کے لئے ایندھن کا کام دیگا - کیونکہ اس میں بدی کی قوتیں پوشیدہ ہیں - ممکن ہے میں اُسے حفاظت سے رکھ چھوڑ[وں] تا اینکہ اس کی بدی کی طاقت زائل ہوجائے - اور پھر وہ بیج مر[ے] بچوں کے لئے کھلونے کا کام دیگا"

اس رات مجھے نیند نہ آئی - مجھے غم بھی تھا اور مسرت بھی - مسرت اس بات کی کہ اس نے سب سے پہلے مجھی کو انتخاب کیا - رازدار بنایا - اور اپنی محبت کو حاصل کرنے کی ترکیب بتائی - غم یہ [تھا] کہ اُسے مجھ سے قطعاً محبت نہ تھی - اور اگر میں اپنے مقصد میں ناکا[م] رہا تو وہ کسی اور کو چاہنے لگیگی - ہاں - بوڑھے نے کہا تھا کہ ابھی تک تین بیج باقی تھے - ممکن ہے کہ کوئی اور شخص مجھ سے پہلے ایک [بیج] کو پالے - اور اس کی محبت کا مستحق ہوجائے - پھر اگر تقدیر میں لکھا ہے کہ بیج مجھے ملجائیگا تو کوئی غیبی طاقت از خود اس بیج کو میرے قبضے میں لے آئیگی - اور اگر تقدیر کا منشا یہ ہے کہ میں ناکام رہوں تو میری انتہائی کوششیں بھی بے سود ہونگی - اور آخر کا[ر] میں مشرقی دانائی کے اس ناقابل تردید مقولے تک آپہنچا کہ "ہو[نے] والا کام ہو کر رہیگا"۔

پھر اگر میری محبوبہ مجھے نہ ملی تو میں زر و جواہر اور مال و اسباب کو لیکر کیا کرونگا اس کے بغیر زندگی بے لطف اور بے حاصل تھی - [میرا] ارادہ مستقل ہوگیا - میں نے سُنا ہوا تھا کہ جو شخص محبت کے لئے کو[ئی] عظیم الشان قربانی کریگا اسے اپنے ایثار کا پھل ملیگا -

(۳)

میں نے بوڑھے افسانہ خواں کو اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے پایا - وہ کافی طاقتور تھا - مگر اس نے اپنی روزی کمانے کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا - جو کچھ وہ افسانے سنا کر انعام لیتا تھا اُسی پر اس کا گذارہ تھا - اگر کوئی شخص افسانے کی فرمائش کرتا تو اُسے زیادہ انعام دینا پڑتا تھا - روشن دھوپ کے مقابلے میں اُس کی جھونپڑی تاریک معلوم ہوتی تھی - تھوڑے سے عرصے کے بعد میں نے اسے پہچانا - اس نے ایک لمبی عبا پہنی ہوئی تھی - اور قریب ہی کھڑاؤں کا ایک جوڑا رکھا ہوا تھا - مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ چیزیں اسے کس نے انعام کے طور پر دی ہیں - رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے کہا -

"میں تم سے ایک نہایت اہم کام میں مشورہ اور مدد لینا چاہ[تا ہوں]"

* (margin note) اس سے پہلے کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا - اگر دنیا میں

ہوں۔"

اگر تم مجھے مدد دے سکو تو میں تمہیں زر و جواہر سے مالا مال کر دونگا۔ آؤ - باغ میں چلیں - وہاں ہم اطمینان و آرام سے باتیں کر سکتے ہیں - سایہ بھی بہت خوشگوار ہے - اور نارنج کے درخت پچھلے سال کے پھلوں سے بوجھل ہو رہے ہیں۔"

وہ کھڑاؤں پہن کر میرے پیچھے ہو لیا - نارنج کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے میری قیمتی کافی کا مزہ چکھا - لیکن نارنج کو اس نے اپنی عبا کے دامن میں لپیٹ کر رکھ لیا -

میں نے کہا - "کل رات تم ہمیں شجر عشق کے افسانے سنا رہے تھے"۔

اس نے کہا " یہی وجہ ہے کہ آج صبح میرے پاس ایک عورت کافی کا پیالہ لیکر آئی تھی - اگرچہ وہ کافی اسقدر لذیذ نہ تھی"

"کیا وہ عورت خوبصورت تھی؟"

"وہ ایک لغزش عشق تھی - مگر بدقسمتی سے میں بوڑھا ہوں - جب میں کھا چکا تو باہر جا کر میں نے اس کتے کے بچے کو جس نے مجھے جھوٹا کہہ کر پکارا تھا - اپنی کھڑاؤں سے خوب ہی مارا - میں نے تو صرف انہیں باتوں کا تذکرہ کیا تھا جو واقعی سچی ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے بعض باتیں اس قسم کی بھی سنائی ہیں - جو حقیقت میں واقع نہیں ہوئیں - مگر جن کے واقع ہونے کا امکان ہے - ہم چھوٹوں کو بڑوں کی تذلیل کا کوئی حق حاصل نہیں ہے - آپ کس معاملے میں میری مدد چاہتے ہیں؟"

"میں شجر عشق کے بیج چاہتا ہوں - ان بیجوں کے مقابلے میں میری دولت کوئی وقعت نہیں رکھتی - بلکہ میری زندگی بھی - مجھے وہ بیج ضرور ملنا چاہیئے - میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کہ مجھے بیج کی تلاش میں کس طرف جانا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے"۔

"اگر کوئی شخص جلد سے جلد پہنچنا چاہتا ہے اسے اور کسی بات کی پروا نہ ہو - تو وہ چار ماہ کے عرصے میں وہاں جہاں بیج ہیں جا پہنچیگا"۔

"تو پھر میں چار ماہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤنگا؟"

"راہ میں خوفناک درندے ہیں - ہیبتناک ڈاکو اور قزاق ہیں"۔

"مجھے ان سے ڈر نہیں ہے" اور میں نے اسے اپنا خنجر نکال کر دکھایا -

"مگر آخر تم ایک ایسے ملک میں پہنچو گے جہاں اجنبی کو مشتبہ تصور کیا جاتا ہے - اور جس جگہ وہ بیج رکھے ہوئے ہیں وہاں تو کسی اجنبی کو جانے کی اجازت ہی نہیں - اور اس کی حفاظت کے تین سامان مقرر ہیں - پہلے ایک دائرہ - پھر اس دائرے میں ایک اور دائرہ - پھر اس میں ایک اور دائرہ - تم اپنی جلد کو میری جلد کی طرح سیاہ رنگ کر سکتے ہو لیکن ان لوگوں کی زبان نہیں سیکھ سکتے - نہ ان کے طریقوں سے واقف ہو سکتے ہو - اور اگر تم چاہو کہ اپنا مقصد جبراً حاصل کر لو تو یہ بھی ناممکن ہے - کیونکہ تم کروڑوں آدمیوں کے مقابلے میں تنہا ہوگے - اگر تم وہاں جاؤ تو دو باتیں ضرور واقعہ ہونگی - ایک تو یہ کہ تم بیجوں کو کبھی نہ دیکھ سکو گے - اور دوسرے یہ کہ تمہاری موت بہت جلد واقع ہو گی -

"کیا میرے لیئے اس سے بہتر کوئی مشورہ نہیں جو تم مجھے دے رہے ہو؟"

"ممکن ہے کوئی اور راستہ نکل آئے - تم نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ کام بہت اہم ہے - یہ ایسا کام ہے جس پر کافی سوچ بچار کی ضرورت ہے - اگر تم اجازت دو تو میں واپس چلا جاؤں - اور اس معاملے پر غور کروں - کل میں اسی وقت پھر آؤنگا"۔

میں نے اسے انعام دیکر رخصت کر دیا -

دوسرے دن پھر آیا - اور کہنے لگا "صرف ایک راستہ ہے ممکن ہے میں تمہیں وہ چیز لا دوں - لیکن یہ بھی یقینی نہیں - اگر تم بیج حاصل کرنا چاہتے ہو تو دو باتیں ضروری ہیں - اول تو یہ کہ تمہیں مجھ پر اعتبار کامل کرنا ہوگا - بھائیوں سے بھی زیادہ اعتبار - دوسرے یہ کہ تمہیں بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑیگی - جس وقت تمہیں وہ بیج ملینگے تمہارے پاس دولت دنیا میں سے شاید کچھ بھی باقی نہ رہے"۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہی ایک راستہ کھلا ہے"۔

"ہاں - صرف یہی ایک راہ ہے"۔

"اچھا مجھے منظور ہے۔"

تم نہیں جا سکتے - لیکن تمہاری جگہ میں جاؤنگا - مجھے جانے میں کوئی انکار بھی نہیں - بلکہ میں خوش ہوں - میں ان لوگوں کی زبان جانتا ہوں - یوں بھی مجھے یہاں ۲۰ سال ہو گئے ہیں - اور اب میرا وطن مجھے یاد کر رہا ہے - میں ان لوگوں کے طور طریقوں سے بھی خوب واقف ہوں - علاوہ ازیں میں مندر کا محافظ بھی رہ چکا ہوں - اور جو راز باقی لوگوں سے پوشیدہ ہیں وہ مجھ پر ظاہر ہیں - اگر دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے جو وہ بیج حاصل کر سکے تو وہ صرف میں ہوں لیکن

اس کام کے لئے ضروری ہے کہ میرے پاس بہت سے آدمی اور خادم ہوں - اور اس بات کے لئے روپے کی ضرورت ہے "

"تم کب واپس آؤ گے"

"آج سے پورے نو ماہ کے بعد یا تو میں خود بیج لے کر آؤنگا یا کسی معتبر قاصد کے ہاتھ بیج روانہ کر دونگا"

"تم پر مجھے اعتبار ہے - اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں - مگر کیا اس قاصد کا بھی اعتبار کر لوں جسے تم روانہ کرو گے ؟"

"کوئی مبالغہ نہیں اس قاصد کو اپنا انعام اس وقت تک نہیں ملیگا - جبتک وہ بیج تمہارے حوالے نہ کر دے - اس کے علاوہ اسے معلوم ہوگا کہ اگر اس نے دغا بازی کی تو اس کے عزیز ترین رشتہ داروں کی زندگی اور خود اس کی اپنی زندگی اس گناہ کا کفارہ ہوگی -

"سفر بہت لمبا ہے اور تم بوڑھے ہو"

"میرے جسم میں کافی طاقت ہے کیونکہ میں نے اس طاقت کو کام کاج میں صرف نہیں کیا - اس کے علاوہ دو قسم کے لوگ ہیں جو بہت تیز سفر کرتے ہیں - وہ نوجوان جو اپنی محبوبہ کے پاس جاتے ہوں - اور وہ بوڑھے جو اپنے وطن کی طرف سفر کر رہے ہوں"

"اسبات کا تو کوئی خوف نہیں کہ تم لوٹے جاؤ گے ؟ تمہارے پاس بے اندازہ دولت ہوگی"

"اگر میرے ساتھ مال و اسباب سے لدے ہوئے اونٹوں کی ایک قطار ہو تو یقیناً خطرہ ہوگا - لیکن میری دولت تمام ایک پیٹی میں بند ہوگی جو میری کمر کے گرد لپٹی ہوئی ہوگی - اور یوں بھی میں ایک غریب مسافر معلوم ہونگا - ممکن ہے کہ کسی نہ کسی طرح میری موت واقع ہو - لیکن اس خطرے کا برداشت کرنا ضروری ہے"

"تمہیں کس طرح معلوم ہے کہ بیج ضرور مل جائیں گے - شائد کسی نے انہیں بدی کی طاقت کے مظہر سمجھ کر ضائع کر دیا ہو"

یہ ناممکن ہے کیونکہ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بدی کی طاقت خود بخود سلب ہونی چاہئے - جو شخص جبراً اس طاقت کو ضائع کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطانی قوتیں اس کے سر پر ضرور کوئی بلائے عظیم لائینگی"

"تم نے خود وہ بیج اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں بوئے تھے - کیا وہ بھی تم نے منار ہی سے لئے تھے ؟ اگر یہ سچ ہے تو تمہارے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ تم ان بیجوں کو حاصل کر سکو -"

"منار کی بہت حفاظت کی جاتی تھی - مگر میں خود اس کے محافظوں میں سے ایک تھا - اس وقت بیج وہاں نہ تھا - اور نہ کسی شخص کو ان بیج کی نوعیت اور وقعت کا اندازہ تھا - میں نے وہ بیج کسی اور طریقے سے حاصل کیا تھا - اور میں درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھ سے اس بات کے متعلق کچھ نہ پوچھو - جس طرح میں نے بیج حاصل کیا ہے - وہ طریقہ بہت شرمناک تھا"

اسی طرح کے میں نے اس سے بہت سے سوالات پوچھے - اور ان سب کے جواب میں اس نے فیصلہ کن جواب دئے - ظاہر ہے کہ میری قوت فیصلہ بہت پست حالت میں تھی کیونکہ میرا دل اپنی محبوبہ کے خیالات و تصورات سے لبریز تھا -

اس کے بعد کچھ عرصے تک میں اپنے جواہرات کو فروخت کرتا رہا - تا وقتیکہ بوڑھے افسانہ خواں نے کہا "بس کافی ہے" اس کے بعد ہم دونوں ایک بڑے آباد شہر میں گئے - اور مشہور مشہور تاجروں سے ملاقاتیں کیں - ہم نے نیلم - زمرد - الماس اور موتی خرید کئے - موتیوں میں ایک جوڑی ایسے موتیوں کی تھی جو رنگ وزن اور شکل میں بالکل ایک ہی طرح کے تھے - جب وہ تمام جواہرات اپنی پیٹی میں باندھ چکا تو افسانہ خواں نے مجھے اس جوڑی میں سے ایک موتی دیا - اور بہت حفاظت سے رکھنے کی تاکید کی -

اس نے کہا "میں بوڑھا ہوں - اور ممکن ہے میں اپنے باپ دادا کے شہر میں مرجانا پسند کروں - جس قاصد کے ہاتھ میں بیج روانہ کرونگا - وہ ہمارے قوم کی سب سے مقدس قسم کھائیگا - کہ وہ اپنے کام میں غفلت - فریب اور غیر فرمانبرداری کا مرتکب نہیں ہوگا - اگر کوئی شخص ایسی قسم کھا کر پھر اُسے توڑ دے تو دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں پوشیدہ رہ کر وہ اپنے آپ کو موذی اور خوفناک انتقام سے بچا سکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ میری قوم کا کوئی فرد ایسی قسم نہ کھائیگا - جب تک اسے بہت بھاری رقم رشوت کی نہ دی جائے -

میں نے کہا "یہ انصاف ہے"

"میں اُسے موتیوں کی جوڑی کا دوسرا موتی دیدونگا - اور جب وہ تمہیں بیج دیدے تو جو موتی تمہارے پاس ہے اس کا بھی مستحق وہی ہوگا - واپس آکر وہ تمہیں دونوں موتی دکھائیگا - اور یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے - اور بعد ازاں میں اسے قسم کی بندشوں سے رہا کر دونگا"

اسے ایک کشتی مل گئی جس پر کنا لدا ہوا تھا - اور وہ اگلے گاؤں

کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۴)

جسدن بوڑھا افسانہ خواں رخصت ہوا میں نے اپنے دل میں حساب لگایا۔ میرے پاس ایک مکان تھا۔ اور ایک باغ۔ اس کے علاوہ ایک ماہ کے لئے کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ ان چیزوں کے ماسوا میری تمام دولت جواہرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور وہ جواہرات ایک بوڑھے افسانہ خواں کی کمر کے گرد بندھے ہوئے تھے۔ ایک ایسے افسانہ خواں کی کمر کے گرد جس کی شکل مجھے اس کے بعد نظر نہ آئیگی۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ ایک ماہ کے عرصے میں جو لوگوں کو نوکر رکھتا تھا کسی شخص کی نوکری کرنے پر مجبور ہونگا۔

شاید اور اشخاص کے لئے اس قسم کے تصورات اندوہ انگیز اور کاہش افزا ہوتے۔ اور ممکن ہے وہ لوگ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے اور بال نوچ لیتے لیکن میرے لئے یہ تمام باتیں مخزن مسرت تھیں۔

میں اپنے دل میں سوچتا تھا" میں نے اپنی محبوبہ کے لئے ایک عظیم الشان قربانی کی ہے۔ اور اب مجھے میرے ایثار کا پھل ملیگا"!

اس شام حسب معمول میں اپنی محبوبہ کو دیکھنے کے لئے دریا کے کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔ گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد وہ واپس آکر میرے پاس بیٹھ گئی۔

اس نے کہا" پچھلے دنوں سے میں نے بوڑھے افسانہ خواں کے متعلق اور تمہارے متعلق بہت بے سروپا باتیں سنی ہیں۔ لوگ غلط انداز سے قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اس قفل سربستہ کی کلید نہیں ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ تم سننا چاہتے ہو میں کیا جانتی ہوں؟

"میرے لئے تمہارے الفاظ موسیقی سے زیادہ شیریں ہیں"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ افسانہ خواں کسی دوسرے گاؤں میں افسانے سنانے کے لئے چلا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال کہ وہ اپنے وطن چلا گیا ہے۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے لئے کوئی نیا مکان خریدنے گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ چلا گیا ہے۔ اور اس کی جگہ آج اس کی جھونپڑی میں کوئی اور آدمی سوئیگا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ شجر عشق کا بیج لینے گیا ہے۔ حالانکہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم خود وہ بیج لینے جاؤ گے۔ چاہے اس معاملے میں تمہیں موت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے"!

یہ بات سنکر میں نے اسے تمام واقعات بتلائے۔ اور اس نے کہا

"اگر کوئی شخص عورت کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے تو اس سے زیادہ قربانی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کوئی دانا اپنا روپیہ دیکر دوسرے شخص کی دانائی خرید لے تو اس سے زیادہ دانشمندانہ کام نہیں ہو سکتا۔ تاہم کئی دوسری باتوں میں تم نے دانشمندانہ طریقے سے عمل نہیں کیا۔ ممکن ہے بوڑھا مر جائے۔ یا وہ چور ثابت ہو۔ اور اگر وہ وفادار ثابت ہو تو بھی اس بات کا امکان ہے کہ بیج اسے نہ ملیں۔ اس اثنا میں میرے لئے کوئی افسانہ خواں نہ ہوگا .... اور میرے والد .... میرے ساتھ تلخ کلامی سے پیش آئے ہیں ...."

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر شکن اس کے ماتھے سے رفع ہو گئے اور وہ ہنسنے لگی۔

"میرے الفاظ پر دھیان نہ دو۔ اگر واقعی تقدیر میں لکھا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو جائے تو ایسا ہی ہوگا۔ آج ہوا میں ایک خاص قسم کی گرانی پائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری روح پر بھی ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ اور میں تم سے اس طرح کی باتیں کر رہی ہوں۔ اور صرف میں ہی ہوا کی گرانی سے متاثر نہیں۔ بلکہ دریا کی لہریں بھی مضطرب و بیقرار ہیں۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج کا چہرہ خشمگیں معلوم ہوتا ہے۔ آج رات کہیں ضرور کوئی حادثہ۔ غم افزا اور ہیبتناک حادثہ پیش آئیگا۔

اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔

کیونکہ اسی رات ایک بھونچال آیا۔ اور میں ایک گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔

میرے کمرے کے دو گلدان ٹوٹ گئے۔ اور زمین میرے قدموں کے نیچے رقص کرنے لگی۔ اردگرد کی جھونپڑیاں زمین پر آرہیں۔ اور صبح تک گاؤں میں غوغا اور شور برپا رہا۔ میرا خیال تھا کہ بھونچال کا تمام زور صحرا میں صرف ہوا ہوگا۔ دوسری صبح کو میں ایک گدھے پر سوار ہو کر صحرا کی طرف گیا۔ ہوا میں شگفتگی سی تھی میں نے سیر کا لطف اٹھایا۔ اور میں نے دیکھا کہ رات میں ایک پتھر کی حالت بدل گئی ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پتھر درمیان

میں سے پھٹ گیا ہے اور ایک قبر کا دہانہ نمودار ہو گیا ہے - میں اُتر کر اندر گیا - مگر اندھیرا گھپ تھا - اور کچھ نظر نہ آتا تھا - اس رات جب تمام گاؤں مصروف خواب تھا میں اپنے ساتھ ایک پھاوڑا اور ایک لالٹین لیکر قبر کے پاس جا پہنچا -

میرا خیال ہے کہ قبر شاہی خاندان کے کسی فرد کی تھی - کمروں پہ عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے - سیڑھیوں پر ریت گری ہوئی تھی - اور شکستہ سی حالت میں تھی - اور وہاں اب خزانہ تھا - جو میں نے کبھی نہیں دیکھا - انگشتریاں - پیالے - ساغر - صراحیاں - تمام کی تمام زر خالص کی تھیں - میں نے کئی راتیں اس خزانے کو مختلف جگہ مدفون کرنے میں گذار دیں - اور آخر کار تمام کا تمام خزانہ اس طرح پوشیدہ کر دیا - کہ سوائے راز دار کے کسی اور شخص کو اسکا علم نہ ہو سکتا تھا -

اب پھر ضروری ہو گیا - کہ میں مشہور و معروف تاجروں سے ملاقات کروں - رات کو میں نے دو اونٹ خزانے سے لاد دیئے - اور یہ ظاہر کیا کہ ان پر چارہ لدا ہوا ہے - اور ان باتوں کے باوجود میں نے اپنا خنجر اپنے ہمراہ لیا - اور اونٹوں کو تازیانے مار مار کے تیز رفتاری سکھائی - لیکن تقدیر میں لکھا ہوا تھا کہ میں حفاظت سے پہنچ جاؤں - آخر میں نے اپنا خزانہ انہیں مشہور و معروف تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا - جن سے پہلے جواہرات خرید سے تھے -

اس طرح میری قربانی کا پھل مجھے مل گیا لیکن میرا دل غیر مطمئن تھا - مجھے خیال آتا تھا کہ شاید میری قربانی مقبول نہیں ہوئی - اور جو کچھ میں نے دیا تھا وہ مجھے واپس مل گیا ہے - میرا خیال تھا کہ بوڑھا افسانہ خواں ضرور بھونچال کے صدموں سے کسی ریت کے ٹیلے کے نیچے دب گیا ہو گا -

اسی رات میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو بوڑھے افسانہ خواں سے مل چکا تھا - اور مجھے یقین ہو گیا کہ تقدیر کا لکھا ہو کر رہیگا -

اسی رات میری محبوبہ پھر مجھے ملی -

اُس نے کہا -

"گاؤں میں لوگ تمہارے متعلق عجیب عجیب باتیں مشہور کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ تم نے تمام چیزیں بیچ دیں - اور اب خرید رہے ہو - اور وہ کہتے ہیں کہ تمہیں اس سودے میں منافع رہا ہے - یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اس طلسم سربستہ کی کلید نہیں ہے - لیکن میں جانتی ہوں - میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنی تمام دولت بوڑھے افسانہ خواں کے سپرد کر دی ہے - اور مجھے خوف تھا کہ شاید میرے والد اپنی لڑکی کو ایک غریب آدمی کے سپرد کرنا پسند نہ کریں - پھر تمہارے پاس یہ دولت کہاں سے آئی - یا تو تم نے میرے سامنے جھوٹ بولا تھا - اور یا پھر تم نے کوئی معجزہ کیا ہے - اگر تم نے بوڑھے افسانہ خواں کو کوئی روپیہ نہیں دیا تو پھر مجھے بیچ کی طرف سے ناامید ہو جانا چاہیئے - اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر مجھے بھی بتاؤ کہ آخر تم نے کیا معجزہ کیا ہے ؟ تاکہ میں اپنے والد کو خوش کر سکوں اور اپنے لئے ایک نئی طلائی چوڑی خرید سکوں -

"میں نے جھوٹ نہیں بولا - میں نے معجزہ بھی کوئی نہیں کیا - تم نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا ہے - اس لئے میں تمہیں ایک اور راز کی بات بتاتا ہوں - تقدیر میں لکھا تھا کہ مجھے اپنی گمشدہ مال و دولت کے عوض اور زیادہ دولت میسر ہو - بس اور کچھ نہ پوچھو - اچھا یہ تو بتاؤ - تم طلائی چوڑیاں اور نئی پوشاک کیا کرو گی ؟"

"میرے ایک رشتے کی بہن ہے - وہ بہت خوبصورت ہے لیکن اتنی خوبصورت نہیں جتنی تمہاری نظر میں میں خود ہوں"

وقت آ گیا ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے - ہم نہیں جانتے کہ اس کا خاوند کون ہو گا - خود اسے بھی اس بات کا علم نہیں ہے - مگر وہ ایک فرمانبردار لڑکی ہے - اور اس نے شوہر کے انتخاب کا مسئلہ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ رکھا ہے - بلاشبہ اس کے لئے کوئی امیر شوہر چنا جائیگا - اور پھر دعوتیں اور ضیافتیں ہونگی - عورتیں ناچینگی اور گائینگی - بلاشبہ مجھے بھی وہاں جانا ہو گا - اور میں نہیں چاہتی کہ وہاں جا کر شرمندہ ہوں - میرے والد غریب ہیں اور مجھے زیور نہیں دے سکتے"

"کل میں ایک ٹوکری میں انار بھر کر تمہارے والد کے گھر بھجوا دونگا - تمہارا فرض ہے کہ اس میں سے سونے سے بھرا ہوا بٹوا نکال لو"

"سنو - تمہاری محبت اس صحرا کی طرح وسیع اور لاانتہا ہے - اور میری محبت ایک ریت کے ذرے کی طرح بھی نہیں - کیا تم اس بات کے باوجود "ٹوکری بھجوا دو گے"

"ہاں"

اس نے کہا "اگر عورتوں کو اس بات کا پتہ چل گیا - تو میری تشہیر کا موجب ہو گا"

وہ ہنسنے لگی - واقعی وہ بہت کمسن تھی لیکن میں دیکھ رہا تھا اسکی

پُرسکون آنکھوں میں محبت سو رہی تھی - اسی طرح جس طرح تالاب کی تہ میں سنہری مچھلیاں سو رہی ہوتی ہیں - اور جاگنے کا وقت قریب آ رہا تھا -

(۵)

جس شخص کے ایام مسرت و عشرت میں کٹتے ہیں اسکو اس بات کا احساس ہوسکتا ہے کہ وقت کس طرح پر لگا کر اڑ جاتا ہے اور جو شخص کاہش انتظار میں مبتلا ہوتا ہے - اسے معلوم ہوسکتا ہے کہ وقت کے پاؤں کس طرح دکھنے لگتے ہیں - بوڑھے افسانہ خواں کو گئے ہوئے آٹھ ماہ ہوچکے تھے اور اس نے کہا تھا کہ نویں مہینے جب درخت پھلوں سے بوجھل ہونگے - اس کا قاصد پہنچ جائیگا -

مجھے قدموں کی ہر چاپ - قاصد کے قدموں کی آواز معلوم ہوتی تھی - میرا خون رگوں میں کھولنے لگا - جس طرح کسی تپ زدہ کا خون کھولنے لگ جاتا ہے - نیند میری آنکھوں میں سے اڑ گئی - رات بھر میں اپنے باغ میں ٹہلتا رہا -

نویں مہینے کی نویں رات کو لیکن دُور - گانے بجانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں - میری محبوبہ کی بہن کی شادی ہو رہی تھی - صبح کے قریب آوازیں بند ہوگئیں - لیکن میں اسی طرح باغ میں ٹہلتا رہا - اور یکایک مجھے ایک خاص قسم کی آواز آئی - اور کسی نے میرا نام لیکر بلایا - میں نے دروازہ کھولا - اور میری محبوبہ داخل ہوئی - اس نے ایک نئی زرق برق پوشاک پہنی ہوئی تھی - اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی طلائی چوڑیاں تھیں - صبح کی دھندلی اور خوفناک روشنی میں بھی اس کا چہرہ حسین و جمیل معلوم ہو رہا تھا - مگر اس کے انداز میں کچھ بات بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی -

میں نے کہا "تم تھک گئی ہو"

اس نے کہا "ہاں"

میں نے کہا "شادی کی ضیافت کا وقت طویل تھا - تمام رات میں موسیقی کی صدائیں سنتا رہا ہوں - اور تمہاری آنکھوں میں ابھی تک خواب ہے" اور میں نے اس کے لئے ایک درخت کے نیچے ایک ریشمی قالین بچھا دیا - مجھے تعجب تھا کہ اسوقت وہ میرے گھر کیوں آئی تھی -

وہ قالین پر جھک گئی - اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا -

اس نے کہا "میں ضیافت میں موجود نہ تھی - آہ! مجھے کیا کچھ کہنا ہے! اور میری داستان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے تم معاف کرسکو - وعدہ کرو کہ تم آخر تک میری داستان سنو گے - اور پھر اس کے بعد جو تمہارے دل میں آئے وہی کرنا -"

میرا دل بیٹھ گیا - اور تقدیر کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی - اور میں نے کافی عرصے کے بعد کہا

"ہاں کہو - میں تمہاری داستان آخیر تک سنونگا"

وہ قالین پر لیٹ گئی - اور اس نے کہنا شروع - اس طرح جس طرح کوئی معصوم بچہ اپنے سبق دہراتا ہے -

اس نے کہا "کل میں نہانے کے لئے دریا کے کنارے گئی - تو دور سے ایک نوجوان ایک سفید گھوڑے پر سوار میری طرف آ رہا تھا اس کا رنگ سیاہ تھا - لیکن بوڑھے افسانہ خواں کے رنگ سے سیاہ تر نہ تھا - اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بات پڑھی جو تمہاری اور دوسرے چاہنے والوں کے آنکھوں میں پڑھتی ہوں - مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے شدت سے چاہتا ہے لیکن اس کی نگاہوں کا میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا - ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میری آنکھوں کے سامنے کہر چھائی ہوئی ہے - اس نے مجھ سے تمہارا پتہ پوچھا - وہ رک رک کر باتیں کرتا تھا - گویا ہماری زبان سے ناآشنا ہے -

میں نے کہا - میرے پیچھے آؤ - میں تمہیں وہاں لیچلتی ہوں"

اس نے کہا "اور اس کے بعد! اس کے بعد کیا ہوگا - تم ہی وہ برق ناز ہو جس کے لئے میرے دل نے اسقدر عرصہ انتظار کیا ہے - تم دنیا کی تمام حسین عورتوں سے زیادہ حسین ہو - اور میں نے اپنے آپ کو تمہارے لئے وقف کر دیا ہے"

میں ہنس پڑی - کیونکہ میری آنکھوں کے آگے ابھی تک دھندھیالی تھی -

میں نے کہا "بعد میں دیکھا جائیگا - تمہیں اس آدمی سے کیا کام ہے جسے تم ڈھونڈتے ہو"

اس نے میری طرف سے آنکھیں موڑ لیں - گویا مجھے دیکھتے ہوئے اسے خوف محسوس ہوتا تھا -

اس نے کہا "میرے لئے اس موضوع پر بات کرنا گناہ ہے -"

یقین کرو - کہ میں تقدیر کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھی - اور میری آنکھوں پر جہالت کی دھند تھی - ورنہ میں کبھی یہ لفظ استعمال نہ کرتی جو میں نے کئے -

میں نے کہا

"تم مجھے چاہتے ہو - اور میری باتوں کا جواب دینے سے انکار بھی کرتے ہو - یہ خوب محبت ہے۔"

بہت عرصہ وہ میری طرف دیکھتا رہا - اس نے گہرے سانس لئے - اور یکایک اس نے اپنی قبا میں سے کوئی چمکتی ہوئی شے نکالکر کہا۔ "اگر تم ضرور جاننا چاہتی ہو - تو لو - یہ چیز ہے جو میں اسے دینے جا رہا ہوں۔"

اور یہ کہکر وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا - اس کے ہاتھ میں ایک گیند تھا - جو چاندی کا نہ تھا - مگر چاندی کے رنگ کا تھا - اور اسمیں موت وحیات دونوں جلوہ گر تھیں - شروع سے اٹل تقدیر میں یہی لکھا تھا - ابھی ستارے ظلمت عدم میں تھے - اور زمین ایک کرہ نار تھی کہ یہ فیصلہ ہو چکا تھا - میری آنکھوں کے آگے سے دھند غائب ہوگئی - مجھے محسوس ہوا کہ اس کا حسن دنیا کے تمام حسن سے برتر ہے - جب وہ بات کرتا تھا تو میں اس کی آواز کے نشے سے بیہوش ہو جاتی تھی - اور میرے سینے میں محبت کا بے پناہ شعلہ بھڑکنے لگا - اس نے کہا "دیکھو - میں نے اپنی مقدس قسم توڑ دی ہے - اور جلدی ہی موت مجھے اپنے چنگل میں پکڑ لیگی - میری زندگی کے لمحے گنے ہوئے ہیں - لیکن یہ لمحے محبت میں گزرے تو میں نے موت کوئی ایسی گراں قیمت پر نہیں خریدی - کیا مجھے تم سے محبت نہیں ہے؟ کیا میں تمہاری پرستش نہیں کرتا؟"

میرا سر جھک گیا - میری آنکھیں جوش مسرت سے بھر گئیں - اور میں اپنے گھٹنوں کے بل جھک گئی - "میری زندگی کے مالک"

میں نے کہا "میری روح کے آقا"

وہ رونے لگی - اور اس نے پہلو بدل لیا -

کچھ عرصہ میں خاموش رہا - پھر میں نے کہا "کیا تم نے اپنا افسانہ ختم کردیا؟ تمہاری داستان مکمل ہوگئی؟"

"نہیں نہیں"

"پھر کہو - کہے جاؤ - اور میں تمہاری منت کرتا ہوں - کہ جلدی کرو۔"

وہ کھڑی ہوگئی - اور ایک درخت سے سہارا لگا لیا - پھر بولی

"نوجوان صحرا کے راستے آیا تھا - اور شام کو صحرا میں شکستہ قبر کے پاس ہم نے ایک شام عشرت گزاری - میری روح اس کی محبت میں جذب ہوگئی اور میں نے اپنے آپ کو اسکی محبت کے لئے وقف کردیا - اس نوجوان نے اپنی سب سے مقدس قسم - میری محبت کے لئے توڑ ڈالی - اور پھر ضروری ہوگیا کہ میں تمہارے پاس آؤں"۔

وہ خاموش ہوگئی اور اس نے میری طرف دیکھا - پھر بولی

"تمہاری آنکھوں میں نہ غصے کی جھلک ہے نہ رحم کی - ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تم پتھر کے بت بن گئے ہو - اور تمہاری آنکھیں بھی پتھر کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں"

کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا -

"میرے محبوب نے مقدس ترین قسم توڑ ڈالی - اور اس کی سزا یقینی ہے - تھوڑے عرصے کے بعد اس کے پاس ایک نامعلوم شخص آئیگا اور کہیگا "مجھے موتیوں کی جوڑی دکھاؤ - کیونکہ صرف وہی جوڑی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے" اور اگر میرے محبوب کے پاس موتی نہ ہوئے تو اسے فوراً قتل کردیا جائیگا - اس کے علاوہ اس کی ماں بھی جو وطن میں بیٹے کی واپسی کے انتظار میں ہے مار دی جائیگی - کیونکہ اس نے اپنے بیٹے کے ایفائے عہد کی ضمانت دی تھی - اور کیا میرے محبوب کی موت میری موت نہیں ہے؟" اس کے پاس ایک موتی ہے دوسرا تمہارے پاس موجود ہے - اب تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ اس وقت تمہارے قبضہ قدرت میں ۳ آدمیوں کی جانیں ہیں - ممکن ہے تم کہو کہ میری کمسنی میرے لئے ایک سامان عفو ہے - ممکن ہے تم خیال کرو کہ تقدیر کے لکھے کے برخلاف جنگ کرنا بے حاصل ہے - ممکن ہے تم سوچو کہ میں قسمت کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھی جس سے یہ خوفناک کھیل کھیلا گیا ہے - میں کہتی ہوں کہ اگر ایسا ممکن ہو تو مجھے دوسرا موتی دیدو - اور دنیا میں شاید اس سے بڑھکر اور کوئی شریفانہ کام نہیں ہوسکتا - میں اپنے محبوب کے ساتھ اس کے وطن کو چلی جاؤنگی - ہوسکتا ہے کہ تم اس خواہش کو بیجا تصور کرو - اس صورت میں اگر تم پسند کرو کہ میں تمہاری بیوی یا غلام بن کر رہوں تو مجھے یہ بھی منظور ہے - میں تو صرف دوسرا موتی چاہتی ہوں - اس کے علاوہ اگر تم کہو تو میں اپنے محبوب کے پاس کبھی نہ جاؤنگی تا وقتیکہ موتی بھی اسے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ بھجوا دونگی -

علاوہ ازیں اس نے ایک حد تک اپنے عہد کو پورا بھی کردیا ہے - یہ لو میرے ہاتھ اس نے شجر عشق کا بیج بھی بھیج دیا ہے - خدا کے لئے مجھے جواب دو۔"

سچ تو ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس کی باتوں کا کیا جواب دوں - اس نے شجر عشق کا بیج - ایک چمکتا ہوا گینہ نکالا - اور میرے سامنے پیش کیا - میں نے اپنا خنجر نکالا - اور فوراً اس کے قلب پر ایک کاری وار کیا - وہ میرے قدموں میں گر پڑی - اس کا جسم ایکبار کانپا اور پھر .... موت ....

میرا اضطراب رفع ہوگیا - میں نے اپنے دماغ میں ایک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا -

میں نے باغ کے ایک کونے میں اس کی قبر کھودی - اس کی لاش کو عبا میں لپیٹ دیا - اور پھر اسے شجر عشق کے بیج کے ساتھ دفن کر دیا - زمین کو برابر کرنے کے بعد میں نے اپنا خنجر صاف کیا - باغ کی زمین اس طرح معلوم ہوتی تھی جس طرح اس خوفناک قتل سے پہلے تھی - اور میرے گناہ کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا - پھر میں صحرا کی طرف چل دیا تاکہ اپنی محبوبہ کے محبوب سے ملاقات کروں - لیکن میں دیر سے پہنچا - عاملان انتقام اپنا کام کر چکے تھے - اس کی لاش قبر کے دروازے پر موجود تھی - اس کے گلے میں ایک خنجر پیوست تھا - اس کے قریب گھاس پھوس سے ایک بستر سا تیار کیا گیا تھا اور پاس ہی پانی کا ایک جگ اور تانبے کا ایک پیالہ پڑا ہوا تھا - اس کے ہاتھ میں موتی چمک رہا تھا - میں واپس آگیا - اس کی لاش کو گدھوں اور گیدڑوں کے سپرد کر کے میں واپس آگیا -

اس رات میں نے ایک مہلک زہر پی لیا - میرا خیال تھا کہ میری نیند موت کے ساتھ ختم ہو گی - مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا - زہر نے مجھ پر کوئی مہلک اثر نہ کیا - مجھے نیند ضرور آگئی - مگر دوسرے دن دوپہر کے وقت میری آنکھ کھل گئی - مجھے خواب میں القا ہوا کہ میری موت زہر سے واقع نہ ہو گی - ابھی میرے لئے انتظار کے دو طویل سال باقی تھے - تاوقتیکہ شجر عشق پھل لے آئے - اور عشق کے منہ سے موت پیدا ہو -

(۶)

گاؤں میں مشہور تھا کہ میری محبوبہ کسی اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے - لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان دونوں کو دریا کی لہروں نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے - جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں - میری طبیعت میں انقلاب پیدا ہوتا جاتا تھا - اب حسن میرے لئے ایک بے معنی لفظ ہوگیا تھا - کسی نازنین کا جمال میرے دل کو متاثر نہ کر سکتا تھا - اگر تمام دنیا کی دولت میرے سامنے رکھ دیجاتی تو میں کبھی اسکو لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھاتا - میری تمام خواہشات مر چکی تھیں - صرف اکیلا رہنے کی خواہش باقی تھی - میرے گھر میں نہ کوئی مہمان آتا تھا - اور نہ کبھی نغمے بلند ہوتے سنائی دیتے تھے -

میری نیند اُڑ گئی - صرف ایک دو گھنٹے کے لئے مجھے اُونگھ سی آجاتی تھی - اور مجھے ایسے عجیب و غریب خواب آتے تھے کہ میں پہروں سوچا کرتا تھا - آیا میرا دماغ خراب ہوگیا ہے ؟ مجھے اپنی محبوبہ کا خیال ستا رہا تھا - میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُسے ایکبار زندہ کر دوں - اور اُسے کہوں کہ میں نے اُسے معاف کر دیا ہے - مجھے اس بات سے رنج ہوتا تھا کہ اُسے کبھی اس بات کا احساس نہ ہوگا کہ اب میرے دل میں رشک و حسد کی جگہ جنوں نے لے لی ہے - مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری محبوبہ تقدیر کے ہاتھ میں ایک پرکاہ ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی تھی -

انتظار کے پہلے سال میں بعض اوقات جب میں شام کے وقت باغ کی سیر کرتا تھا تو وہ مجھے ایک سایے کی طرح نظر آتی تھی جس طرح دھواں ہوا کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے - جب دوسرا سال ختم ہونے کے قریب آیا تو اس کی شکل نسبتاً زیادہ صاف نظر آتی تھی - مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی -

ایکبار وہ نارنج کے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی - اپنے عبا کا دامن اٹھایا اور اپنی چھاتی کے زخم کی طرف اشارہ کیا -

اس نے کہا " تم نے مجھے زخمی کیا ! تمہارا جی کس طرح چاہا کہ تم اپنی محبوبہ کو زخمی کر دو "

آخر کار وہ دن آگیا جب شجر عشق میرے خون کے لئے بیتاب ہوگیا -

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ میں نے اپنی محبوبہ کی قبر کو غور سے دیکھنا شروع کیا - میں نے دیکھا کہ قبر میں سوراخ ہوگئے تھے - جو سورج کی کرنوں کی طرح چمکتے تھے - اور کوئی طاقتور چیز اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی - وہ شے اوپر سے گول تھی - اور اس کا رنگ سیاہی مائل سبز تھا - جس میں ارغوانی رنگ کی آمیزش بھی معلوم ہوتی تھی - اور اس کی سطح پر پانی کے قطرے نمودار تھے گویا اسے طاقت خرچ کرنے کے باعث پسینہ آ رہا ہو - میں واپس چلا آیا - نہا دھو کر میں نے سفید لباس پہنا - پھر میں نے دروازے بند کر دیئے - اور قبر کے قریب جا کر بیٹھ گیا - اب درخت ڈیڑھ دو فٹ بلند ہو چکا تھا - میرے آنکھوں کے سامنے اس کی ایک شاخ بلند ہوتی چلی جا رہی تھی جب اسکی بلندی قد آدم سے کچھ بڑھ گئی تو کئی شاخیں اس کے تنے سے

جدا ہو کر زمین پر گر پڑیں - اور اُن کا بڑھنا بند ہو گیا - لیکن ان شاخوں میں سے کئی اور پتلی پتلی شاخیں پیدا ہوئیں - جو سانپ کی طرح بل کھاتی تھیں - غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان شاخوں کے منہ بالکل انسانی منہ سے مشابہ تھے - درمیانی شاخ بلند ہوتی چلی گئی - اور مجھے محسوس ہوا کہ اس شاخ پر شجرِ عشق کا پھل لگیگا - دوپہر ہو گئی -

تنے سے پتلی پتلی شاخیں برابر پیدا ہو رہی تھیں - میں ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا جس جگہ میں پہلے بیٹھا ہوا تھا - وہ جگہ اب تمام کی تمام ارغوانی سیاہی مائل گہرے سبز رنگ کی شاخوں سے پُر تھی - یکایک تنا تین حصّوں میں پھٹ گیا - اور تینوں حصّوں سے اور نئی شاخیں پیدا ہوئیں - اب درخت اس طرح ہل رہا تھا - گویا کوئی شخص وفورِ درد سے بیقرار ہو -

اس وقت تک مکمل خاموشی طاری تھی - یکایک درمیانی شاخ پھٹ گئی - اور اس طرح کی آواز پیدا ہوئی - گویا کوئی عورت کراہ رہی ہے - اور اس شاخ پر ایک سفید - دودھیا سفید - پھول نمودار ہوا - نہایت جمیل و حسین - پھول سے طلائی ذروں کی بارش ہو رہی تھی - یہ طلائی ذرّے زمین پر گر کر اس طرح جگمگاتے تھے - جس طرح جواہر - اور ان کی خوشبو - کیف انگیز - نشہ پرور - خوشبو استقدر تیز تھی کہ برداشت نہیں ہو سکتی تھی -

میں نے چلا کر کہا

" اے شجرِ عشق! تیری شاخوں نے میری محبت اور میری محبوبہ کے خون سے پرورش پائی ہے - لے اب میرا خون بھی چوس لے - تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل جائیں - اور زندگی کی تکلیف کے بعد مجھے ابدی آرام نصیب ہو - اے شجرِ عشق - لے میں آیا! "

میں آگے بڑھ گیا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا - دوبارہ ایک عورت کے کراہنے کی آواز آئی - اور دو پھول - سفید - دودھیا سفید - نمودار ہوئے - طلائی ذرّوں کی چمک نے میری آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دی - اور تیز خوشبو نے میرے حواس کو مختل کر دیا - میں ان شاخوں میں گھر گیا - جو سانپ کی طرح بل کھا رہی تھیں - اور یوں مجھے ابدی نیند .... موت نصیب ہوئی -

یہ داستان میں نے لکھی ہے - میں جو ہزاروں سال سے مر چکا ہوں - ایک ایسے آدمی کے ذریعے جسے میری روح نہیں جانتی - ایک ایسی زبان میں جس سے میں ناواقف تھا ....

عابد

جامِ مہتاب

مہتاب کا روشن جام لئے مغرب سے شام نکلتی ہے
یہ جام چھلکتا جاتا ہے مے فرحت بخش اُچھلتی ہے
پھر چاندنی آ کر گلشن میں سائے کے ساتھ ٹہلتی ہے
کچھ گھیرا گھیری ہوتی ہے وہ پھرتا ہے یہ ڈھلتی ہے
کیا ڈھلنا پھرنا چھایا کا خود عمر ہماری ڈھلتی ہے
یہ چاند نہیں آفاق پہ یہ ایّام کی کشتی چلتی ہے

خواجہ دل محمد ایم اے

بڑے آدمی

علامہ گولڈ اسمتھ کا ایک مضمون زیر مطالعہ تھا۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے پہلے فقرہ پر آپ ناک بھوں چڑھائیں گے۔ آپ کہیں گے گولڈ اسمتھ اور علامہ ؟ یہ خوب رہی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہی تو آپ میں کمزوری ہے۔ ورنہ آج آپ ایک بڑے آدمی ہوتے۔ ہماری طرح۔

آپ کہیں گے گولڈ اسمتھ علامہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک سنار تھا۔ جو الفاظ کی بے چک دہات کو دماغ کی شعلہ زا بھٹی میں تاؤ دے کر مضامین کے نادر زیورات تیار کیا کرتا تھا۔ اور بس۔ اس کے پاس حقیقی دہات یعنی الفاظ کا ذخیرہ نہایت ہی تھوڑا تھا۔ البتہ بمبئی کے ایک جوہری کی طرح اس تھوڑی سی دہات کو جوڑنا توڑنا خوب جانتا تھا۔

ہاں آپ یہ سب کچھ کہیں گے۔ اور نہ معلوم اور کیا کیا کہیں گے۔ لیکن ہمارا دعوےٰ ہے کہ گولڈ اسمتھ اتنا ہی بڑا علامہ تھا۔ جیسے خیام ایک بہت بڑا شاعر یا عطار ایک بہت بڑے ولی تھے۔ یا رحیم خاں ایک بہت بڑے پاگل ہیں۔ آپ ان کو کچھ ہی سمجھ لیں لیکن ہم ان سب کو ان کے اپنے اپنے محکمے کے بڑے آدمی تصور کرتے ہیں۔ خیر یہ تو معترضہ جملے تھے۔

تو ہم علامہ گولڈ اسمتھ کا ایک مضمون آنکھوں سے لگل رہے تھے۔ کہ اس دوران میں چند ایک فقروں نے ہماری شاندار ہستی کو خاص طور پر اپنی طرف راغب کیا۔ لکھا تھا بعض پیدائشی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بعض بڑائی محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں سے بڑائی زبردستی چپٹائی جاتی ہے۔

غور طلب بات یہ تھی کہ ان میں اسکندر اعظم اور ہم خود اس تقسیم کے کس حصہ میں آتے ہیں ؟ سر رابندرا ناتھ ٹیگور پیدائشی بڑے آدمی ہیں۔ علامہ تاجور نے بڑائی جد وجہد سے حاصل کی۔ شکسپیر پر بڑائی زبردستی چپٹائی جاتی ہے۔ یہ تو سب ہوئے لیکن اسکندر اعظم ان میں کہیں بھی نہیں آیا۔ وہ ایک پیدائشی بڑا آدمی نہیں تھا۔ کیونکہ ایک معمولی سے بادشاہ کا بیٹا تھا۔ اس نے بڑائی اپنی قوت سے حاصل نہیں کی۔ کیونکہ جہلم پار ہمارے وطن گجرات شریف میں قدم رکھتے ہی جب اس کی فوجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ تو بیچارے سکندر اعظم کو واپس لوٹنا پڑا۔ تو گویا یہ تمام فتوحات اس کی فوج کی بڑائی اور شان ظاہر کرتی ہیں۔ نہ کہ اس کی ذات کی۔ خیر اسکندر اعظم کا بھی کسی تقسیم کے تحت میں کھینچ کھانچ کر لے آنا گو مشکل بھی لیکن ممکنات میں سے ضرور ہے

مگر ہمارا پتہ نہیں چلتا۔ کہ ہم کس زمرے میں ہیں۔ اور ویسے ہیں ہم ایک بڑے آدمی کیونکہ آج تک ہم نے کبھی علی الصبح نو دس بجے چائے پینے سے پیشتر منہ ہاتھ نہیں دھوئے۔ ناشتے کے ساتھ چاکولیٹ کھاتے ہیں۔ مضامین ہم ہمیشہ رسالوں کے لئے چکنے کاغذ پر صرف ایک طرف لکھ کر دیتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ شائع بھی ہو جاتے ہوں گے۔ اب کوئی ان کو پڑھتا ہے یا نہیں بھئی یہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ،، چونکہ یہ ہم کبھی معلوم نہ کر سکے اسی لئے ہم نے عالم الغیب ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا۔ ورنہ بقول شخصے ،، دیوان حافظ،، کوئی ہم سے بڑے آدمی نہ تھے۔ اس کے علاوہ ہر روز ڈاک میں با تصویر فہرستیں مختلف کارخانوں کی۔ دکانوں کی بیسیوں کی تعداد میں ہمارے پاس آتی رہتی ہیں۔ کیونکہ جب ہم کسی اشتہار کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ ،، درخواست آنے پر فہرست اشیاء خوبصورت چکنے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے مفت ارسال خدمت ہوگی ملاحظہ فرماتے ہیں تو ہم خطوط کی گڈی میں سے ایک کارڈ نکال کر (جو اسی مقصد کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ہیں) اشتہاری فرم کے پتے پر ارسال کر دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر ہم یہ بھی بتا دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ کہ ان تمام فہرستوں میں موٹر کاروں کی فہرستیں سب سے زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔ لیکن آپ متعجب ہوں گے اور ہماری عالی دماغی کی داد دیں گے۔ جب آپ سنیں گے کہ اگرچہ سوائے ایک دفعہ برات میں شامل ہونے کے۔ یا کبھی کبھار شام کے وقت منہ چھپا کر جب موقع ہوا لوہاری دروازے سے اسٹیشن تک پانچ پیسے دے کر ساتھیوں کے تلے لوٹتے ہوئے جانے کے علاوہ شاید ہی ہمیں اس برق وش پر سوار ہونے کا موقع ملا ہو تاہم ہم کو ہر قسم کی موٹر کی قیمت۔ اس کی طاقت۔ رفتار۔ اور موٹر کاروں کے حلقہ میں اس کی وقعت کی نسبت اتنی ہی واقفیت ہے جتنی کہ مسٹر فورڈ کو ہونی چاہئے یہ نہایت مفید بھی ہے۔ کیونکہ جب کبھی ہم اپنے احباب کے حلقے میں بصد شان وشوکت اپنی واقفیت عامہ کے پھول برسا رہے ہوتے ہیں۔ تو اس وقت کوئی شخص محسوس بھی نہیں کر سکتا (جو ہماری ذات شریف کی حقیقت سے واقف نہ ہو) کہ ہم ایک کمترین موٹر باز ہیں۔ کیونکہ ہم اسوقت نہایت فصیح الفاظ میں موسلادھار برستے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر خوبصورتی۔ نفاست۔ طاقت اور شان درکار ہو تو کرسیلر موٹر کار خریدیے۔ طبیعت عظمت جلال اور شوکت کی طرف مائل ہو تو ہیوک سکس سلنڈر۔ ڈاج ؟ کیا کہا آپ نے۔ ڈاج۔ انجن چھوٹا ہے لیکن

شاندار چیز ہے۔ شورلٹ سب سے سستی ہے لیکن ایک محتاط جیب کے لئے بیٹیک درست ہے۔ اور بھئی ہاں تم نے کیا کہا۔ بڑی موٹریں۔ بڑی موٹرکاروں کی کیا بات ہے۔ سن بیم کو ہی دیکھ لو جیسے ہاتھی مور بنکر ناچتا چلا آئے۔ اور رولز رائیس تو سڑک پر راج ہنس کی طرح تیرتی چلی آتی ہے۔ لیکن پھر قیمت سے بھی آگاہ ہیں جناب آپ۔ رولز رائیس کا تو صرف ڈھانچہ ہی چالیس ہزار اکیسو پینتیس روپے چودہ آنے چھ پائی میں آتا ہے۔ اس پر کلکتہ تک کا کرایہ اور محصول وغیرہ نو ہزار دو سو بیس اور بڑھا لیجئے۔ اور پھر اس پر اس کی باڈی لگوائیے تو دیکھئے قیمت کہاں جا پہنچتی ہے۔

تو ذرا غور فرمائیے آپ ٹھنڈے دل سے" جس طرح لیڈر لوگوں کو غور کرنے کے لئے کہا کرتے ہیں۔ پھر بھی آپ کہیں گے کہ ہم ایک بڑے آدمی ہیں بڑے آدمی تو ہم ہوئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم مقررہ اقسام میں سے کس قسم کے تحت میں آتے ہیں۔

ان مشکل ترین اوقات میں جب ہماری رہی لامحدود واقفیت جو یقینی طور پر اشتہاری دنیا میں ایک بلند ترین پایہ رکھتی ہے۔ جواب دے چکتی ہے۔ تو ہمارے دوست حضرت حامد جو حقیقت میں ہمارے اُستاد کہلانے کے مستحق ہیں۔ اکثر اوقات ہماری مدد کو نزول فرمایا کرتے ہیں۔ اور ایسے اوقات میں ان کا نزول نزلہ کے اخراج سے کم فرحت بخش ثابت نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک بڑے آدمی ہیں۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے تو ہم خود ان کو ایک بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ اور اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر ہم یہ کہہ ڈالیں گے کہ اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ہم نے خاص طور پر کسی کو نہیں سُنا۔

ہمیں عالت فکر میں غوطہ زن دیکھ کر انھوں نے اپنے انوکھے انداز میں پوچھا۔ کیسے ہو؟ ہم نے معمولاً جواب میں "اچھا ہوں" کے سے مختصر الفاظ استعمال کئے۔ لیکن تا ایں معمہ ویسے کا ویسا لاینحل تھا۔ یعنی ہم بڑے آدمیوں کے کس فرقے میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔

حامد صاحب نہایت خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو کر ایک تصویر کو جو صرف چند بے ربط لکیروں سے عالم وجود میں آئی تھی بغور دیکھنے لگے۔ پھر بائیں آنکھ کو ذرا سا بند کر کے ہونٹوں کو اوپر اُٹھا کر جھیڑی ٹانگوں پر مارتے ہوئے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ذرا سا سر ہلا کر۔ "انتہائے کمال ہے"۔ آرٹ اگر دیکھنا ہو تو انہیں مصوروں میں دیکھو۔ تصویریں دیکھا؟ سفید سفید برف کے گالے پڑے ہیں گدھے کے کان ملاحظہ ہوں نیچے ڈال رکھے ہیں۔ گدھے پر لدی ہوئی لکڑیاں خود سردی سے کانپ رہی ہیں۔ نتھنوں کی بھاپ نکلتے ہی بادل بنتی چلی جاتی ہے۔

ہم نے ان کی طرف ایک نظر استحسان سے دیکھا۔ گویا دبی زبان میں یہ ہماری اپنی تعریف تھی۔ حقیقت میں آج تک ہمیں اس تصویر میں کبھی کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اور سوائے اس کے کہ ہم نہایت وثوق سے کہ سکتے تھے کہ یہ ایک ایسی تصویر تھی جسے کوئی ہرگز ہرگز پسند نہیں کریگا۔ اور کوئی بات اس میں قابل قبول دکھائی نہیں دی تھی۔ اور اس لئے میں نے اس کو دیوار پر سب سے واضح جگہ پر آویزاں کر رکھا تھا۔

ہاں! ہم نے کہا خوب تصویر ہے لیکن عامۃ الناس کے لئے معمہ ہے۔ لفظ معمہ پر وہ پھر میری طرف مخاطب ہوئے۔ اور غور سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذرا بھویں تنتے ہوئے۔ ہاں مجھے یاد آیا" انھوں نے کہا غالباً تم کسی معمے کو حل کر رہے تھے جب میں آیا تو تمھارے بُشرہ سے ہی عیاں تھا۔

ہم نے نہایت خامشی سے برخوردارانہ طور پر اعتراف کیا۔ اور پھر سر سے پاؤں تک معمے کی شکل ان کے سامنے ڈال دی۔

ہاہاہا۔ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔ انھوں نے کہا۔ یہ تو کوئی ایسی پریشان کُن بات نہیں۔ دوست اپنے آپ کو بڑے آدمیوں کی فہرست میں کسی عنوان کے تحت میں نہیں پاتے۔ اور پاؤ گے کیسے۔ گھٹا گھنگور تُلی کھڑی ہو تو اس سے یہ تھوڑا ہی ضروری ہے کہ زمین بھی تر ہو گی۔ اس کے لئے تو بادل کا برسنا لازمی ہے نا؟ بھائی حقیقت یہ ہے کہ زمانہ ترقی پذیر ہے۔ نت نئی معلومات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جب ڈارون اور نیوٹن جیسے مہا سائنسدانوں کے نظریئے غلط ثابت ہونے پر تُلے کھڑے ہیں تو پھر یہ تھیوری کہ بڑائی صرف تین طرح سے حاصل کیجاتی ہے۔ غلط ہو جائے تو کون بڑی بات ہے "حضرت" انھوں نے فرمایا۔ کہ اب ایک چوتھا راستہ بھی ماہرین علم منطق نے ہمارے لئے کھول دیا ہے۔ اسی کے تحت میں تم آتے ہو۔ علاوہ ازیں گولڈ اسمتھ ہندوستانی لیڈر اور انگریز سیاست داں اسی طریقہ کے پیرو ہیں یعنی وہ لوگ جو بڑائی کے پیچھے لپکے چلے جا رہے ہیں" تم بھی منزل پر پہنچ جاؤ تو اپنے تئیں بڑا آدمی محسوس کرو گے لیکن ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"، یہ ماشاءاللہ ضرور ہے۔ کہ اگر کوشش کرو دل لگا کر تھوڑی سی تو ہماری طرح ایک بڑے آدمی بن سکتے ہو "لیکن" فرمانے لگے "تمھیں کوئی اُستاد بھی تو کمبخت کام کا نہیں ملا ہدایت کے لئے ورنہ جیسی جیسی نشانیاں تم میں دیکھتا ہوں مثلاً نوٹ بھنوانے کے بعد رقم کو گنے بغیر جیب میں ڈال لینا اردو بولتے وقت انگریزی الفاظ کا استعمال بکثرت کرنا۔ کمرے میں متعدد پرانے زمانے کے مصوروں کی بدہیئت تصاویر کا آویزاں رکھنا۔ اور ان پر آدھ آدھ انچ گرد کا جما ہونا۔ ایک ہی رومال سے بوٹ اور منہ پونچھنا وغیرہ وغیرہ۔ واللہ اگر تم بھی کسی کی نگرانی میں رہتے تو ایک بڑے آدمی ہوتے۔

لیکن پھر ارشاد ہوا" ابھی تم میں خامیاں ہیں۔ مثلاً جب میں کمرہ میں داخل ہوا تھا۔ تو تم کو محسوس بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کہ کوئی آیا ہے۔ جب بناوٹ سے ہی سہی اور پھر ایک آدھ منٹ کے بعد ایک بے پروایانہ انداز سے میری طرف نظر اٹھا کر کہنا چاہئے تھا۔ آخاہ۔ آپ ہیں۔ میں ذرا مصروف ہوں آجکل۔ اس لئے آپ کی حاضری معلوم نہ کرسکا۔ معاف فرمائیگا۔ پھر سگرٹ نکال کر مجھے پیش کرنا چاہئے تھا۔ اور پھر خود جب تم سگرٹ سلگاتے تو پہلے ہی دیا سلائی سے سگرٹ جلا لینا درست نہیں تھا۔ کیونکہ سگرٹ کی شان دیا سلائی کی رگڑ میں۔ اس کے جلنے میں اور پھر پہلی بار منہ سے دھواں نکال کر دیا سلائی کے پھینک دینے ہی میں ہے۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ سگرٹ پیتے وقت آنکھوں کو جیسے دھواں لگنے کے وقت قدرے بند کیا جائے۔ منہ کو کچھ بگاڑا جائے لیکن ایسے نہیں کہ فیشن میں فرق آئے۔ اور کبھی کبھی سگرٹ کو دیکھتے ہوئے ایک طرف کرکے سگرٹ کی راکھ پہلی انگلی سے جھاڑی جائے اس طور پر کہ نظر سگرٹ کی راکھ کی طرف ہو لیکن گفتگو کا سلسلہ نہ ٹوٹے ایسے ماہر فن کی رائے بہت وزن دار ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ سالہا سال کے تجربے کا نچوڑ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس روز سے ارادہ کرلیا۔ کہ انشاء اللہ آج سے شاہراہ عظمت پر جلد جلد قدم رکھتے چلیں گے۔ اور اپنے تئیں ایسے یکتائے روزگار استاد کی شاگردی میں سونپ دینا باعث فخر خیال کیا۔

چندے توقف کے بعد جس عرصہ میں زیادہ تر بڑائی اور بڑے آدمیوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کیونکہ ایک بڑا آدمی بننے کے لئے بڑے آدمیوں کا تذکرہ کرتے رہنا بھی ایسے ہی ضروری ہے۔ جیسے تصوف کے لئے صوفیا کا۔ یا شادی کے لئے بیویوں کا۔ موجودہ زمانے میں اس پرانی روش کو بہ نظر حقارت دیکھا جاتا ہے۔ جب غالب کا ذکر سنکر حضرت خاکستر آگ ہوجایا کرتے تھے۔ اور اُن کے ہر شعر میں سو سو عیب دھرتے تھے۔ اب یہ طریقہ ہے کہ اگر آپ اپنے کو نہایت صحیح المذاق بڑا آدمی ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو کلام سمجھ سکتا ہے تو آپ کو ہر ممکن طور پر غالب کی تعریف کرنی پڑیگی۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں واہ! واہ! غزل کا تو استاد ہے۔ قصیدہ کا ماہر۔ اور مکتوبات کا طرز تحریر تو ایسا آسان ہے کہ جی چاہتا ہے نگلے چلے جائیے۔ یہ اور جو جو خرافات آپ چاہیں بکتے چلے جا سکتے ہیں۔ آپ یقین فرمائیے کہ کوئی شخص جب تک وہ بھی ایک بڑا آدمی نہیں ہے آپ کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کریگا۔ اور غور کیجئے تا یہ طریقہ ہے بھی نہایت محفوظ۔ مثلاً اگر آپ غالب میں نقائص نکالنا چاہیں تو یہ نہایت ضروری ہوگا۔ کہ آپ اس کی کلیات کو بہ نظر غائر مطالعہ فرمائیں۔ اور پھر نقائص نہایت چھان بین سے علیحدہ کریں۔ کتنا وقت طلب معاملہ ہے؟ اور پھر ممکن ہے کہ جس چیز کو آپ اس کی کمزوری سمجھتے ہوں وہی حقیقت میں صنعت ہو۔ کیونکہ آخر ہم اور آپ کتنے ہی بڑے آدمی سہی۔ لیکن ہماری بھی قابلیت کا سمندر بے کنار تھوڑا ہی ہے۔ اسلئے بہتر یہی ہے کہ ادھر غالب کا نام آیا اور آپ نے رٹ لگانا شروع کی

یہ کس کا میرے خدایا زباں پہ نام آیا ۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس کے بعد ہم کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ آج ہمیں معمول کے خلاف لباس میں بھی جابجا درستی کرنا پڑی۔ ایک استاد کامل کی جلو میں چلنے کے لئے یہ لازمی امر تھا۔ ایک نظر حقارت سے ہماری طرف انھوں نے دیکھا۔ اور کہنے لگے۔ یہ لوہے کی چھڑی جو تم ہاتھ میں رکھتے ہو صرف یہی تمھیں ذلیل کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ اس کا نام لکڑی ہے۔ کیوں ہے نا؟ تو پھر لوہے کی کیوں ہے۔

جب ہم بہت سا راستہ طے کر چکے تو ہم نے کہا۔ بھئی ہم کہاں جا رہے ہیں؟ حامد صاحب نے ارشاد فرمایا۔ میں تمھیں بڑے لوگوں کی آرامگاہ کی طرف لیجا رہا ہوں۔ تاکہ عظمت کا پہلا سبق وہیں سے پڑھو۔

تنگ و تاریک گلیاں گذر کر ایک بند کوچے میں پہنچے۔ سامنے کے دروازے پر موٹے موٹے مٹے مٹے سے حروف میں ایک بورڈ پہ لکھا تھا۔

بڑے آدمیوں کی آرامگاہ GREAT MENS RETREAT

بورڈ جو کبھی کبھی اتفاقی حادثہ سے یا شاید آندھی کے جھونکے سے ترچھا ہو چکا تھا۔ اسی زاویہ پہ قائم تھا۔ کواڑ شکستہ۔ دیواریں بوسیدہ۔ ڈیوڑھی میں سے گذر کر ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ چند کرسیاں ایک بڑی گول میز کمرے کے وسط میں۔ کچھ کرسیاں کونوں میں ایک آدھ آتشدان کے پاس ایک دھواں دار شمع۔ ایک چرخہ یہی اس کمرہ کی کائنات تھی۔

مجھے میرے راہبر نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اغلباً لوگ یہاں اشاروں ہی میں باتیں کرتے تھے۔ دوسری کرسی پر وہ خود بیٹھ گیا۔ کمرہ میں اور کوئی نہ تھا۔

اس سنسان خاموشی میں میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی دہکتے ہوئے کوئلے کے چٹخنے کی آواز یا جھینگر کی چیں چیں اس خاموشی کو توڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی دروازہ کھلا۔ میں ٹھٹکا۔

ایک ریش پوش ادھیڑ عمر کے آدمی۔ سوٹ زیب بدن جو کبھی استری کے قریب نہ لایا گیا تھا۔ نکٹائی توکل بخدا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ موزوں ناک۔ پستہ قد۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ لکڑی ہاتھ میں لئے داخل ہوئے۔ کسی کو مخاطب کئے بغیر چھڑی کو کرسی پر آرام سے رکھ کے کونے میں جاکر منہ دیوار کی طرف کرکے کھڑے ہو گئے۔

ہم سمجھا اب کوئی کام کریں گے۔ لیکن جب میری برداشت سے زیادہ وقت گذر چکا۔ اور لکڑی اور ان حضرت میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ تبدیل

کرنے کا ارادہ نہ ظاہر کیا۔ تو اُستاد سے پوچھا بیٹے۔ اُستاد؟ میں نے کہا یہ کون؟

ہاں۔ یہ بھی اپنے زمانہ کے ایک بڑے آدمی تھے۔ دیکھا تم نے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ لکڑی کو کونے میں رکھیں گے۔ اور خود آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن واہ ری محویت۔ دیکھا نتیجہ۔ اگر رات بھر ان کو نہیں چھیڑو گے تو اپنی جگہ نہیں بدلیں گے انتہا ہے محویت کی چلتے چلتے سو جانا۔ اور سوتے سوتے چل دینا ان کا کام ہے افسوس ہو رہا ہے ان کی حالت دیکھ کر بھئی۔ ہاں لیکن یہ ایک بڑے آدمی تھے کبھی۔

پھر دروازہ کھلا۔ ایک ساتھ دو صورتیں داخل ہوئیں۔ دونوں خاموش سروں پر کھال کی ٹوپیاں۔ کھدر زیب بدن۔ بغلوں میں قرآن۔ ہلال کی صورت ٹوپیوں پر۔ صورتوں سے نہایت پریشانی ٹپکتی تھی۔ حسرت و یاس کے پتلے۔ ایک کونے میں سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اوہو۔ ٹھنڈی سانس بھر کے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ بھائی کوئی امید نہیں ہندوستان کے لئے میں نے اپنے راہبر کی طرف ایک متجسسانہ نگاہ ڈالی۔

ہاں۔ بڑے آدمی تھے کبھی یہ بھی۔ یہ بھائی ہیٹ میں بھی دیکھا ہے میں نے ان کو سوٹ میں بھی دیکھا ہے ان کو۔ ہاں بڑے آدمی تھے کبھی یہ بھی لیکن انتہا ہے۔ دستہ گھومایا۔ چرخے میں آہستہ آہستہ چکر آنے لگے۔ میری نظر غیر محسوس طور پر اُس طرف جا پڑی۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ چرخے کے قریب ہی ایک بوریا بچھا ہوا تھا۔ ایک شخص جس کی ساری دنیا ایک لنگوٹی اور ایک چرخہ تھا۔ اُسنے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ چرخے کا دستہ ہلا۔ چکر میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور ایک بار ایک تار بائیں ہاتھ سے نکل کر اُٹھنے لگا۔ اے آزادی کے دیوتا کیا ہندوستان تیری پوجا نہیں کرے گا۔ اس شخص کے کمزور ہونٹوں میں سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔ تار ٹوٹ گیا۔ ایک بھدی سی گھر ر سے سے چکر تھما۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ چرخہ کہتا تھا۔ بدقسمت ہندوستان نے اس راز کو نہ جانا۔ یہ بڑائی کی انتہا تھی۔ میں ششدر رہا تھا۔ جو اس باختہ کانوں میں گویا جھینگر بول رہے تھے۔ میں نے بہتیرا بولنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ ان خاموش تصویر نما ہیئتوں کو دیکھ کر سہم گیا۔ اُستاد نے کہا۔ ہاں بڑے آدمی تھے کبھی یہ بھی۔ دنیا ان کے کہنے پر ٹھہر جاتی۔ آسمان جھک جاتا تھا۔ لیکن انتہا ہے۔ انتہا ہے یہ بڑائی کی انتہا ہے میرا سر چکرانے لگا۔ . . . . غنودگی چھا گئی . . . . . آنکھیں بند . . . . ہو گئیں . . . . . . سو گیا۔

صبح جو ہم اُٹھے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ٹائم پیس ٹھیک نو بجا رہا ہے۔ اور جولیس (خاندانی کتا) نہایت محبت بھرے ہونٹوں اور الفت بھری زبان کے ساتھ ہمارے گالوں کو چوم رہا ہے۔ لاحول ولاقوۃ

سید سجاد حیدر

مناظر

یہ جوشِ لالۂ صحرا یہ سبزۂ کہسار | یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ نسیمِ عنبر بار
یہ شاخ شاخ پہ اندازِ زمزمہ خوانی | یہ طائرانِ ترنم سرا یہ فصلِ بہار
یہ چھاؤں تاروں کی کم کم یہ نور کا تڑکا | گلوں پہ شبنمِ تر کے یہ گوہرِ شہوار
نظر فریب یہ منظر شفق کا گردوں پر | ہوائے شاہدِ گل جس طرح سے ہو گلنار
فضائے عرش میں نغمہ طرازیِ قدرت | ہوا کے پردوں میں بانگِ سرودِ موسیقار
سفیدۂ سحری کا یہ دل فریب سماں | فضائے دشت کا عالم ہرے ہرے اشجار
کلی کلی میں حجاب و سکوت کے انداز | گلوں میں جلوۂ رعنائیِ عروسِ بہار

یہ دل فریبیِ دریا کا دل ربا منظر
دمِ خرام یہ موجوں کی خوبیِ رفتار

شاکر میرٹھی

اربابِ علم

ایک علمی افسانہ

واقعی عجیب مجلس ہے ہر خیال اور ہر مشرب کے اہل علم وہاں جمع ہو جاتے ہیں سردی ہو یا گرمی۔ کیا مجال کہ کسی غیر معمولی حادثے کے بغیر کوئی یہاں آنا ناغہ کر دے۔ شام ہوئی اور صوفی جی کے مکان پر سارے احباب اکٹھے ہو گئے۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ شہر کے چرچے ہوئے علمی گفتگو ہوئی بحث مباحثے ہوئے۔ نوک جھونک بھی ہوئی مگر ہنگامی، یا نہ اور اسی وقت ختم ہو جانے والی۔

جس دن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس سے چار پانچ ہی روز پہلے اس مجلس کے سرگرم رکن پروفیسر عبدالقادر یورپ کی سیاحت سے واپس آئے تھے صوفی جی کے ہاں شام کو کئی دن سے یورپ ہی کی دلچسپیوں اور علمی سرگرمیوں کا تذکرہ رہتا ہے کل وہاں کے عجائب خانوں کا ذکر آ گیا تو پروفیسر صاحب نے وعدہ کیا کہ کل ہم گھر سے ان قدیم درختوں کے فوٹو لیتے آئیں گے جو اب پتھر ہو گئے ہیں۔ اور طبقات الارض کے ماہروں نے زمین سے نکال کر یورپ کے عجائب خانوں میں لا رکھا ہے۔

سبھی منتظر بیٹھے تھے کہ پروفیسر صاحب بغل میں ایک فائل (لبستہ) دبائے ہوئے تشریف لائے۔ ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ صوفی غلام نبی صاحب نے پوچھا کہ کیوں پروفیسر صاحب وہ فوٹو لیتے آئے ہیں نا؟

"جی ہاں —— دیکھئے یہ درخت جڑ سے پھنگی تک نرا پتھر ہو چکا ہے —— اور یہ دیکھئے جنگل کا جنگل ہی پتھر بن گیا ہے اور وہ بھی نہایت سخت اور بے حد مضبوط پتھر۔"

صوفی جی۔ یہ پہلے لکڑی تھا اور اب پتھر بن گیا —— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو محال ہے —— اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی حالت میں پیدا ہی کیا ہوگا جس طرح جاوا میں بعض درخت آدمی کی صورت کے پیدا کیے ہیں۔ اور بعض مچھلیوں کو انسان کی صورت عطا کی ہے۔ اسی طرح پتھر کے ایک ٹکڑے کو درخت کی شکل میں پیدا کر دیا ہے۔ اس میں بات ہی کونسی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمجید۔ "نہیں چچا جان (صوفی جی)، میں یورپ گیا تھا تو اپنی آنکھوں سے اس جنگل کو دیکھا تھا۔ اور میں بھی پروفیسر صاحب کی تصدیق کرتا ہوں۔ بے شک یہ پہلے لکڑی کے درخت تھے۔ مگر اب ان کی نوع بدل گئی ہے اور سارا جنگل پتھر ہو گیا ہے۔"

صوفی جی۔ تو اس جنگل پر کبھی عذاب الٰہی نازل ہوا ہوگا اور سارے ہرے بھرے درخت خشک پتھر بن گئے ہوں گے بھئی۔ خدا کی شان بہت بڑی ہے آن کی آن میں جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

پروفیسر صاحب۔ نہیں صوفی جی ان پر یکبارگی عذاب نہیں نازل ہوا ہے آپ ہی کے خیال کے مطابق ناگہانی عذاب تو اس پر نازل ہو سکتا ہے جس کو خدا نے اچھے برے کی تمیز کے لیے عقل دی ہو۔ پھر بھی وہ کوئی بہت بڑا گناہ کر بیٹھے۔ ہم تو جہاں تک جانتے ہیں درخت سے کوئی برائی نہیں سرزد ہوتی۔ اگر آپ کو علم ہے تو آپ ہی اس کے گناہ کی نوعیت بیان فرمائیں۔

صوفی جی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ جمادات۔ نباتات۔ حیوان۔ انسان شجر حجر۔ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ پھر یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ یہ درخت اس کی یاد سے غافل ہو گئے ہوں اور ان پر آسمانی عذاب نازل ہوا ہو۔

ڈاکٹر صاحب۔ چچا جان یہ تو ایک قسم کا مبالغہ ہے اور اس طرح ہم حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

پروفیسر صاحب حقیقت تو یہی ہے کہ یہ درخت لکڑی کے تھے اور آج کل کے درختوں کی طرح ان میں بھی پھل پھول لگتا تھا۔ مگر ان پر فضائی انقلابات طاری ہو گئے اور یہ قانون ارتقا کے ماتحت بتدریج نباتی نوعیت سے نکل کر جمادات کی نوع میں داخل ہو گئے۔

مسٹر فاروقی۔ اوہو۔ صاف صاف یوں نہ کہیئے کہ آپ ڈارون ازم کے حامیوں میں ہیں۔

پروفیسر صاحب۔ آپ جو چاہیں فرض کر لیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نظریے

کو سب سے پہلے ڈارون نے دریافت نہیں کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی بہیترے علما کو اس کا پتہ چل گیا تھا۔ میں بھی اس نظریہ تک محض اپنے مطالعہ اور زندہ کائنات کے مشاہدے کے ذریعے پہنچا ہوں۔

صوفی جی۔ اچھا مثال دیجئے۔ کون سے جانور آپ کے نزدیک اس نظریئے کی صداقت کی دلیل ہیں؟

پروفیسر صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کبھی کسی عجائب خانے میں نہیں گئے ہیں۔

صوفی جی۔ کیوں نہیں کئی بار گیا ہوں۔ وہاں ہاتھی اور قسم قسم کے بندر دیکھے ہیں۔ تو کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم آدم و حوا کے بدلے اس ذلیل مخلوق کی اولاد ہیں۔ توبہ کیجئے۔ توبہ۔ ایسی بری بات ...

مسٹر فاروقی۔ بس یہی تو آپ میں عیب ہے کہ پوری بات سننے سے پہلے ہی کچھ اپنے پاس سے بڑھا کر اس کی تردید شروع کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایسی فضول کج بحثی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس بحث کا تو مقصد یہ ہے کہ ہم حقیقت تک پہنچ سکیں۔ مگر آپ لوگ اصل موضوع کو چھوڑ کر جزئیات میں الجھنے لگتے ہیں ——— دین علم کے خلاف نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر دین علم کے خلاف ہو تو معقولیت یہ ہے کہ دین کو چھوڑ کر علم کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اللہ نرا بھلائی ہے اور نری بھلائی ہی کا نام علم ہے۔ پھر یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ جو دین اس نے بھیجا ہے وہ اس علم کے خلاف ہو جو اس کے صفات میں داخل ہے۔

پروفیسر صاحب۔ بے شک بے شک۔ آپ نے بحث کو ایک مضبوط ترین بنیاد پر قائم کر دیا ہے۔

(صوفی جی سے مخاطب ہو کر)

اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آپ ان جانوروں کی ترتیب پر غور فرمائیں جنھیں آپ نے عجائب خانوں میں دیکھا ہے تو آپ بھی اس نظریئے کی تائید فرمانے لگیں گے۔ آپ جس عجائب خانے میں چلے جائیں۔ دودھ پلانے والے انڈے دینے والے۔ ریڑھ والے بکھروں والے سیموں والے جانوروں پرندوں اور مچھلیوں وغیرہ کی سیکڑوں قسمیں نظر آئیں گی۔ سب سے قطع نظر کر کے صرف دودھ پلانے والے جانوروں کو لے لیجئے اور زرافہ سے لے کر چھوٹی سی چوہیا تک کے سلسلے اور ایک دوسرے کی مشابہت پر غور کیجئے۔ تو آپ کے سامنے قانون ارتقا (EVOLUTION) اور نظام ترقی آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب۔ بالکل صحیح ہے چچا جان اب آپ بھی اس نظریئے کو مان لیجئے۔ قرآن کریم بھی تو اس کی تائید کرتا ہے وَلَن تَجِدَ فِي خَلْقِ اللّٰهِ مِن تَفَاوُتٍ (تم خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں کسی قسم کی بے ترتیبی ہرگز نہیں پا سکتے)

صوفی جی۔ یہ تو وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے۔ خدا ہمارے ایمان کو سلامت رکھے۔ میں وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے سایے سے بھی بھاگتا ہوں۔ اسی عقیدے کی وجہ سے فارابی کی طرح بہیترے گمراہ فلسفی کافر ہو گئے ہیں۔ امام غزالی نے اپنی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" میں اس کی پرزور تردید کر کے اس کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

مسٹر فاروقی۔ وحدۃ الوجود؟ یہ کیا چیز ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ جناب ان باتوں کو وہی سمجھتے اور جانتے ہیں جو ان کے اہل ہیں۔ یہ ہم لوگوں کے بس کی باتیں نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ چچا جان جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں نصف صحیح ہے تو نصف خلاف واقعہ بھی ہے۔ اصول یہ ہے کہ دین اور علم میں اختلاف ہو تو دین کو ضعیف اور غیر مکمل سمجھ کر چھوڑ دینے یا اختلاف اور علم کی طرف سے بے پروا ہو جانے سے بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کی مناسب تاویل تلاش کی جائے۔

پروفیسر صاحب۔ علمائے سلف میں امام غزالیؒ اور علامہ ابن خلدونؒ کا جو مرتبہ ہے وہ آپ کو معلوم ہو گا۔

صوفی جی۔ تو کیا وہ بھی نظریۂ ارتقا کے قائل ہیں؟

پروفیسر صاحب۔ امام غزالی اپنی کتاب "المضنون بہ علی غیر اہلہ" میں جو "تہافۃ الفلاسفہ" کے حاشیہ پر چھپی ہے فرماتے ہیں:۔

> "اگر اس کتاب میں ایسی چیزوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا جن سے اپنے موروثی عقائد میں تمھیں شک پڑ جاتا تو بھی اپنی نفع رسانی کے لحاظ سے یہ کتاب مکمل اور قابل قدر ہوتی کیونکہ جس شخص کے عقائد میں شکوک نہیں واقع ہوتے۔ وہ غور و فکر کا عادی نہیں ہوتا اور جس کو غور و فکر کی عادت نہیں ہوتی اس کو بصیرت نہیں حاصل ہوتی۔ اس کی ساری زندگی اندھے پن اور حیرت میں گزر جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب۔ اور مجھے یاد آ رہا ہے کہ ابھی جو میں نے بیان کیا ہے کہ دین علم کے خلاف نہیں ہوتا یہ بھی امام غزالی ہی کا قول ہے۔

صوفی جی۔ لوگوں نے علمائے سلف کے متعلق بہت سی غلط روایتیں یاد کر لی ہیں۔

مسٹر فاروقی۔ آپ کو حق ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی نقل کردہ روایت کو غلط کہہ دیں۔ مگر قرآن۔ حدیث اور فقہائے اسلام کی تمام روایتوں کا دارومدار درحقیقت یاد ہی پر ہے۔ لیکن راویوں کی اس یادداشت کی وجہ سے ان چیزوں کی وقعت نہیں کم ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب۔ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چچا جان جیسے ہمارے بزرگوں کی عادت ہی یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی عقلی دلیل بیان کرو تو فرمائیں گے کہ عقل

کا کیا اعتبار۔ اس کا نتیجہ صحیح بھی ہوتا ہے غلط بھی اور کوئی نقل پیش کر دو تو کہیں گے کہ یہ بناوٹی ہے۔ راویوں نے تحقیق کیے بغیر یاد کر لیا ہوگا اور مؤلفوں نے ان سے سن کر کتابوں میں لکھ دیا ہوگا۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں طریقوں کے علاوہ اور کس طرح ایسے حضرات کی تشفی کی جا سکتی ہے۔

پروفیسر صاحب۔ امام غزالیؒ صوفی تھے قطب تھے فلسفی تھے۔ استاد تھے جامعہ نظامیہ کے شیخ تھے سیاح تھے مصنف تھے اور دینی و دنیوی علوم میں اپنے زمانے کے مجتہد تھے۔ مگر ان تمام صفات کے باوجود صوفی جی کی تشفی کے لیے ہم ان کے قول سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور علامہ ابن خلدون کا قول پیش کرتے ہیں جو اسلام کے مشہور متاخرین میں ایک روشن آفتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔

صوفی جی۔ بے شک وہ ایک بہت بڑے عالم اور اسلام کے سب سے بڑے مورخ تھے۔ وہ نظریۂ ارتقا کے متعلق کیا لکھتے ہیں؟

پروفیسر صاحب نے اپنے فائل سے مقدمہ ابن خلدون کا ایک نسخہ نکالا اور تھوڑی سی عبارت پڑھ کر سنائی جس کا ترجمہ یہ تھا۔

"میں نے کائنات کی تکوین (پیدائش) پر غور کیا کہ معادن سے ابتدا ہوئی۔ پھر نباتات پیدا ہوئے۔ پھر حیوانات پیدا ہوئے اور یہ تدریجی ترقی کس خوبی سے ہوئی ——— معادن کے افق کا آخری حصہ افق نباتات کے ابتدائی حصہ سے۔ نباتات کے افق کا آخری حصہ افق حیوانات کے ابتدائی حصہ سے متصل ہے اور اس اتصال کا مطلب یہ ہے۔ ہر ایک کے افق کے آخری حصے میں اپنے بعد والے کے افق کا ابتدائی حصہ بننے کی عجیب و غریب صلاحیت موجود ہے۔ کائنات نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے حیوان کو پیدا کیا۔ حیوان تدریجی ترقی کرتے ہوئے لاکھوں قسموں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے جس قسم نے انتہائی ترقی کی وہ صاحب عقل و ہوش انسان بن گیا۔"

پروفیسر صاحب نے مقدمہ ابن خلدون کی اس عبارت کو فاتحانہ لہجہ میں پڑھ کر ختم کر دیا۔ ساری مجلس پر خاموشی چھا گئی۔ صوفی جی تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بار صوفی جی کی طرف دیکھتے تھے۔ دوسری بار پروفیسر صاحب کی طرف۔ مسٹر فاروقی بھی متحیر سے نظر آ رہے تھے۔

آخر بہت دیر کے بعد صوفی جی بولے۔ ہاں مگر اس کی بھی تاویل ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ لازمی طور پر میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اتنے بڑے علامہ کا کلام صرف ظاہری معنی میں نہیں لیا جا سکتا یقیناً اس کا مطلب ایسا ہوگا جسے ہماری سطحی عقل نہیں حل کر سکتی۔

مسٹر فاروقی۔ پروفیسر صاحب نے جو کچھ پڑھا ہے وہ عربی میں لکھا ہوا ہے۔ ہم تو معمولی سی عربی بھی نہیں جانتے مگر صوفی جی آپ تو اس کے ماہر ہیں۔ اس عبارت کی تفسیر اگر کچھ اور ہو سکے تو بیان فرمائیے۔

پروفیسر صاحب۔ مطلب صاف ہے۔ اب آپ اس کی تفسیر کیا چاہتے ہیں میں تو نہیں سمجھتا کہ اس کی صوفیانہ تفسیر کچھ اور ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ اور اس عبارت میں تصوف کا دخل ہی کیا؟

صوفی جی۔ تمھیں نے تو ابھی کہا ہے کہ اس کے مطلب کو ہماری سطحی عقل نہیں حل کر سکتی۔

ڈاکٹر صاحب۔ یہ تو اب بھی کہتا ہوں اور اس لیے کہتا ہوں کہ ایسی باتوں کو ہر شخص نہ لے اڑے اور علم ذلیل و بے قدر نہ ہو جائے۔ خدا کی قسم چچا جان۔ ہم آپ کیا ہیں بعض علوم ایسے ہیں کہ پہاڑ بھی ان سے لرزتے ہیں۔ ان کے متحمل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو قدرت نے غیر معمولی عقل اور غیر معمولی ذہن عطا کیا ہے ہم ان باتوں کے متعلق زبان نہیں کھول سکتے۔

صوفی جی۔ تو کیا تم بھی اس میں پروفیسر صاحب کے موافق ہو کہ ابن خلدون کے قول کا مطلب وہی ہے جو بظاہر الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کیا تمھارا یہ خیال نہیں ہے کہ ان کا مقدمہ سیکڑوں ہاتھوں میں پڑ کر مسخ ہو چکا ہے اور ادل بدل کے بعد اب اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں ہے۔

مسٹر فاروقی نہیں نہیں مقدمہ حرف بحرف اصلی حالت پر موجود ہے۔ یورپ کے مستشرق بھی اس کی اصلیت میں کلام نہیں کرتے۔ وہاں کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے LAFAMEUSE PROLEGOMENE کا میں نے بھی مطالعہ کیا ہے۔ مترجم نے اپنے دیباچہ میں اس کا بالکل اظہار نہیں کیا ہے کہ اس میں کوئی تحریف ہوئی ہے۔

صوفی جی۔ یہ "فامز پرجامن" کیا بلا ہے اور اسے ہماری بحث سے کیا واسطہ؟

پروفیسر صاحب۔ (ہنستے ہوئے) "فامیز پرولیجومین" یعنی مشہور مقدمہ ابن خلدون۔

صوفی جی۔ نبی (صلعم) عربی تھے اور دین کی باتوں کا فیصلہ عربی ہی سے ہو سکتا ہے۔ انگریزی والے ان باتوں کو کیا جانیں؟

ڈاکٹر صاحب۔ چچا جان فاروقی صاحب کی ان باتوں سے نہیں گھبرانا چاہیے جو کسی قوم کی زبان جانتا ہے وہ ان کے مکر و فریب سے محفوظ ہوتا ہے۔ آپ شاید جانتے ہیں کہ مسٹر فاروقی بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ فرانس میں رہے۔ وہیں تعلیم پائی اور فرانسیسی گویا ان کی مادری زبان ہو گئی ہے "فامیز پرولیجومین" انگریزی نہیں ہے بلکہ مقدمہ ابن خلدون کے فرانسیسی ترجمہ اور تنقید کا نام ہے۔

مسٹر فاروقی۔ یہاں میری ذات کا یا انگریزی اور فرانسیسی کا سوال نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے انکار روا خیالات صوفی جی کے پرانے دماغ

ہیں بھرنا چاہتے ہیں اور یہ تقریباً غیر ممکن ہے۔ اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور سب سے پہلے ہنسنے والے خود صوفی جی تھے جس سے ان کی کشادہ دلی کا پتہ چلتا تھا۔

پروفیسر صاحب۔ آپ لوگ اس نظریے کو جتنا مشکل سمجھ رہے ہیں۔ یہ دراصل حقیقت اتنا مشکل نہیں ہے اور علوم طبعیہ یعنی "طبقات الارض" "نباتیات" "حیوانیات" اور "انسانیات" کے علماء نے اس کو بڑی حد تک ثابت کر دیا ہے۔ ان علوم کا سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو اس کی صداقت اچھی طرح روشن ہو سکتی ہے۔

مسٹر فاروقی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں عربی سے بالکل ناواقف ہوں البتہ فرانسیسی یا انگریزی کچھ جانتا ہوں۔ مگر اس نظریے کے متعلق اب تک کوئی مستقل کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان علوم کا نام انگریزی یا فرانسیسی میں بتائیے تو میں بھی ان کا مطالعہ کروں۔

پروفیسر صاحب۔ GEOLOGY, BOTANY, ZOOLOGY, AUTHROPOLGY.

مسٹر فاروقی۔ نعوذ باللہ کیا نباتیات، حیوانیات وغیرہ انھیں کی اردو ہے؟

پروفیسر صاحب۔ جی ہاں بعض لوگوں نے ان اصطلاحات کو اردو میں اسی طرح وضع کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ اور بعض لوگ انھیں علم طبقات الارض، علم النبات، علم الحیوان، علم الانسان کہتے ہیں۔

مسٹر فاروقی۔ LOGY کا مطلب تو ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی نہیں ادا ہوا۔

پروفیسر صاحب۔ کیا کیا جائے اردو میں اتنی وسعت ہی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ وسعت آپ سے آپ تو پیدا ہونے سے رہی۔

مسٹر فاروقی۔ LOGY آخر انگریزی یا فرانسیسی زبان کا لفظ بھی تو نہیں ہے۔ مگر ان زبانوں نے اس کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دوسری زبان کا لفظ ہے اور اب تو اسے عربی والے بھی استعمال کر رہے ہیں پیرس میں اپنے ایک مصری دوست کے پاس فزیالوجی کی ایک کتاب دیکھی تھی جس پر اوپر ہی نفس لوجی لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح اردو کے مصنف بھی نفس لوجی، انسان لوجی، حیوان لوجی وغیرہ کیوں نہیں استعمال کرتے۔

ڈاکٹر صاحب۔ بوالعجبی تو دیکھیے کہ خود عربی زبان والوں کو LOGY یا اس قسم کے دوسرے الفاظ کا مطلب ادا کرنے کے لیئے عربی میں کوئی لفظ نہیں ملتا اور مشکلات تلفظ کے باوجود مغربی زبانوں کے الفاظ عربی میں مجبوراً داخل کر رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کے اصطلاحات گھڑنے والے سیدھے سادے الفاظ کو زبردستی عربی بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور لطف یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ زبان کی خدمت کے سلسلہ میں بڑا کام کیا۔ مگر اس عربی سے بھی اصل مطلب ادا ہو جاتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ اردو میں عربی کے الفاظ بھرنے کا الزام بھی سہنا پڑتا ہے اور مطلب بھی نہیں ادا ہوتا۔

پروفیسر صاحب۔ آپ لوگوں نے تو لسانیات۔ یا مسٹر فاروقی کی اصطلاح کے مطابق زبان لوجی کی خاصی بحث چھیڑ دی۔

مسٹر فاروقی۔ معاف فرمائیے۔ ہم اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گئے ہاں تو آپ نے جن علوم کا نام بتایا ہے یہ آج کل یورپ میں بہت اہم سمجھے جاتے ہیں اور ان کی بعض کتابوں کا میں نے بھی مطالعہ کیا ہے۔ مگر اب تک انسان کی اصلیت کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکا ہوں۔

پروفیسر صاحب۔ ان علوم کے ماہروں نے ثابت کیا ہے کہ انسان کی مجموعی بناوٹ STRUCTURE HOMOLOGY اس کی تدریجی ترقی جنسیتہ اور اس نوع میں آنے کے ابتدائی آثار کا اب تک باقی رہنا بتا رہا ہے کہ انسان کسی ایسی زندہ نوع کی ترقی یافتہ صورت ہے جو موجودہ انسان سے کم درجے کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب۔ یہ صحیح ہے۔ مگر میں نے پڑھا ہے اور آپ جیسے فضلا سے سنا بھی ہے کہ ان علوم کے ماہر اصحاب جن میں ڈارون سب سے پیش پیش ہے ...

مسٹر فاروقی۔ نے جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا، پروفیسر صاحب میں چاہتا ہوں کہ ان کتابوں کے صفحات تک سے واقف ہو جاؤں جن کو دیکھ کر آپ نے اس نظریے کے متعلق رائے قائم کی ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ DOCUMENTS (دستاویز کاغذات ثبوت) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر صاحب۔ ڈارون کی کتاب "اصل انسان" THE DESCENT OF MAN کا صفحہ ۹ اور اس کے آگے پہلی فصل کا بقیہ۔ ہکسلے کی کتاب THE PLACE OF MAN IN NATURE کا صفحہ ۳۴ و ۹۷ اور ان کے بعد کے صفحات۔

صوفی جی۔ (گویا یکبارگی ہوش میں آکر) فاروقی صاحب آپ نے قطع کلام کر کے پروفیسر صاحب کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا اور بحث کا فائدہ اور لطف جاتا رہا۔

پروفیسر صاحب نہیں نہیں۔ فرمائیے ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہہ رہے تھے؟

ڈاکٹر صاحب۔ میں کہہ رہا تھا کہ علوم طبعیہ کے علما جن میں ڈارون اور ہکسلے سب سے پیش پیش ہیں اس بات کے قائل تھے کہ "انسان کے ارتقا اور حیوانیت سے انسانیت کی طرف درجہ بدرجہ ترقی اور انتقال کی کوئی ایسی دلیل دینی غیر ممکن ہے جس سے ترقی کے پورے سلسلے اور ہر درجے پر یکساں روشنی پڑ سکے۔

"ڈارون اور ہیکیلے مرگئے۔ مگر وہ یا ان کے پیرو آج تک زنجیر ارتقا کے اس گم شدہ حلقے MISSING LINK کو نہیں پا سکے جس کا حیوان اور انسان کا سلسلہ ملانے کے لیئے درمیان میں ہونا ضروری ہے اور جب دلیل ہی غائب ہے تو . . .

مسٹر فاروقی۔ یورپ والوں کو کیسے معلوم ہوتا مگر کیا آپ بھی نہیں جانتے ارتقا کا "گم شدہ حلقہ" . . . ہی میں موجود ہے . . . صاحب احباب کے حلقے میں اسی لقب سے تو مشہور ہیں کیونکہ بندر ان کو انسان سمجھ کر ان سے بھاگتے ہیں اور آدمی انھیں بندر سمجھ کر ان سے ڈرتے ہیں (مسٹر فاروقی کے ساتھ صوفی جی کے سوا ساری مجلس ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

پروفیسر صاحب لیکن فطرت نے ۱۸۹۳ء میں ہالینڈ کے مشہور محقق پروفیسر یوجین ڈیبوبو کے ہاتھوں علمی دنیا کو ایک بڑی نعمت عطا کی طبقات الارض کے علما کی رائے قرار پائی کہ جزیرہ جاوا انسان کی ابتدائی جائے پیدائش ہے پروفیسر موصوف اس جزیرے کے طبقات ارض کی کھدائی میں مشغول تھے کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ملا اور خاص طور پر اس ڈھانچے کی حقیقت معلوم کرنے کے لیئے اس فن کے ماہرین کی ایک مجلس مقرر کی گئی جو تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ یا تو اسی "گم شدہ حلقہ" کا ڈھانچہ ہے جس کا حیوان اور انسان کے درمیان میں اب تک پتہ نہیں چلتا یا انسان کا ہے۔

صوفی جی۔ ابتدائی۔ بالکل ابتدائی انسان ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام ہرگز نہیں۔ وہ تو مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں۔

پروفیسر صاحب۔ صوفی جی میں آدم نہیں کہہ رہا۔ میں ابتدائی انسان کہہ رہا ہوں جس نے پہلے پہل حیوانیت کو الوداع کہہ کر انسانیت کی طرف رخ کیا اور چار پیروں پر کھڑے ہونے کو ترک کرکے دو پیروں سے چلنے پھرنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب۔ مگر یہ مزید تشریح کا محتاج ہے۔ آخر ان کے نزدیک کیسے ثابت ہوگیا کہ سلسلۂ ارتقا کا "گم شدہ حلقہ" یہی ہے۔

صوفی جی۔ اور اس میں تو تناقض ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ ان کی قبر مکہ معظمہ میں ہے۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ ابتدائی انسان جاوا میں مدفون تھا۔ کہاں مکہ معظمہ اور کہاں جزیرہ جاوا۔

پروفیسر صاحب۔ روایتوں کی تو کہیئے نہیں۔ بلا سوچ سمجھے تفسیروں میں درج کر دینے سے ایسی روایتیں بھی قرآن کریم کی طرح خدائی وحی نہیں بن جاسکتیں۔ اور ان کا مرتبہ بنی اسرائیل کے علما و احبار کی خوش گپیوں سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر صاحب۔ سب کچھ تسلیم۔ مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ جاوی ڈھانچہ ارتقا کی زنجیر کا "گم شدہ حلقہ" ہے۔

پروفیسر صاحب۔ اس ڈھانچے کی حقیقت معلوم کرنے کے لیئے جو مجلس مقرر کی گئی تھی۔ اس میں اس فن کے چھ ماہر شامل تھے۔ ان میں سے تین تین نے الگ الگ تحقیق کی۔ چھان بین کے بعد تین ممبروں کی رائے یہ تھی کہ یہ کسی ایسے بڑے بندر کا ڈھانچہ ہے جو کسی حد تک انسان جیسا تھا اور تین کی یہ رائے تھی کہ یہ فطری انسان کا ڈھانچہ ہے جو کسی حد تک بندر جیسا تھا۔ پھر جب دونوں پارٹیوں نے اپنی رائے ایک دوسرے پر ظاہر کرنے کے بعد اجتماعی طور پر تحقیق کی تو متفقہ رائے وہی قرار پائی جو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

* * *

ایک خادم اس مجلس کے سب سے زیادہ احباب نواز ممبر حکیم صاحب کے ہاں سے ایک صینی میں چھنے ہوئے قندھاری انار، چمن کے انگور اور کشمیر کے سیب لے کر پہنچا۔ حکیم صاحب آج کسی ضروری کام میں پھنس جانے کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے ہی سے بمبئی کے ہرے کیلے اور کابل کا سردا لا رکھا تھا۔ مسٹر فاروق آج ڈیوموم کا آم لیئے آئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے جیب سے یورپ کے تحفے۔ حلوائی اور چاکلیٹ کا پیکٹ نکالا۔ صوفی جی کے گھر میں سے چائے آئی اور سلسلۂ کلام نظریۂ ارتقا کو ماتحت آسمان۔ زمین۔ شجر۔ حجر۔ حیوان۔ انسان سے منتقل ہوتا ہوا۔ کیلے، آم، انگور، انار سیب۔ اور سردے کی مختلف قسموں کے مختلف مزوں کی تشریح و تفسیر اور سیلون اور دارجیلنگ کی چائے کے موازنہ پر ختم ہوا اور تمام احباب کل آنے کا وعدہ کر کے چاکلیٹ چوستے ہوئے اپنے اپنے گھر چل دیئے۔

صدیق طبیب

رسید کتب

ریویو کے لیئے دفتر میں بہت سی کتابیں آچکی ہیں۔ جن میں بقائے دوام مصنفہ ایم اسلم صاحب۔ مطلع انوار مصنفہ مہاراج بہادر برق دہلوی گرنتھ باسکا گھر مسلم یونیورسٹی پریس۔ سزائے عیش مصنفہ قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اب تک ان پر ریویو نہ ہوسکا۔ انشاء اللہ آیندہ اشاعت میں ان تمام کتابوں پر نقد و تبصرہ ہوجائیگا +

"گم شدہ حلقہ"

مسٹر ڈارون انسانی زندگی کی پہلی منزل میں

؎ کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

مصری شہزادی یورپین لباس میں

فرانس کی زندہ جاوید شہید جان آف آرک

لارڈ ارون وائسرائے ہند کی صاحبزادی

سیر یورپ

(طبقات شمالی کا ایک افسانہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

خرید و فروخت کے دوران میں انیس پر انگریزی دکانداروں کے اخلاق کا بہت اچھا اثر ہوا۔ دکان میں داخل ہوتے ہی ایک شخص نے سلام کر کے دریافت کیا کہ جناب آپ کو کونسی چیزیں درکار ہیں؟ جب اُسے بتایا گیا تو وہ "بہت بہتر جناب" کہہ کر انہیں دکان کے اس حصّے میں لے گیا۔ جہاں یہ چیزیں بکتی تھیں۔ یہاں جو شخص ان چیزوں کی فروخت پر متعین تھا اس نے بھی سلام کر کے پوچھا کہ "جناب کونسی چیزیں پیش کروں؟" یہ جو جو چیز بتاتے گئے وہ نکال کر پیش کرتا گیا۔ اگر چیز پسند نہ ہوتی تو وہ معذرت کر کے دوسری نکال کر دکھاتا۔ اور اگرچہ کئی دفعہ ردّ و بدل ہوا لیکن ہر بار بیچنے والا معذرت کرتا اور شکریہ ادا کرتا۔ جب کوئی چیز انتخاب کر لی جاتی تو بھی شکریہ ادا کرتا۔ جب رد کر دی جاتی تو بھی مشکور ہوتا۔ اسے قیمت ادا کی گئی تب بھی اُس نے شکریہ ادا کیا۔ جب اس نے رسید اور ریزگاری واپس کی۔ اس وقت بھی شکریہ ادا کیا۔ غرض ہر لحظہ اس کا رویہ اور اس کے الفاظ ایسے تھے کہ خریدار کی طبیعت ذرا بھی پریشان نہ ہو اور خریدنے کا ارادہ نہ بھی ہو تو بھی وہ کچھ نہ کچھ لے لے۔

سامان خرید اچکا تو دکاندار سے کہدیا گیا کہ یہ سامان فلاں پتہ پر بھیج دیجئیگا۔ اور تاکید کی گئی کہ آج ہی پہنچ جانا چاہئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ آج ہی پہنچا دیا جائیگا۔

اس دکان کے قریب ہی بوٹوں کی دکان سے بوٹ خریدے گئے۔ اور اُسی طرح انہیں مکان پر پہنچانے کا فرض بھی دکاندار کے ذمے ہی رہا۔

نیو گیٹ سٹریٹ میں ڈیوز بری اینڈ سن کی دکان پر کپڑے سینے کو دئے گئے۔ اقرار ہوا کہ چوتھے روز کپڑے پہنا کر دیکھے جائیں اور ساتویں دن تیار ہو جائیں۔ یہاں بھی دکان کے تمام آدمی ویسے ہی اخلاق اور تحمل سے پیش آئے۔ انیس کو یقین ہو گیا کہ یہ طریقہ اس ملک میں دکانداری کی تربیت اور اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے۔

یہاں سے نکل کر انیس نے ان ہندوستانی صاحب سے جو کمال مہربانی سے اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ لنکلنز اِن کا راستہ دریافت کیا۔ بیرسٹری کی سند کے لئے انیس کا ارادہ اسی اِن میں داخل ہونے کا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ مکان پر واپس جانے سے پہلے داخلہ وغیرہ کی شرطیں دریافت کر لے۔ اِن کا پتہ معلوم کر کے انیس سینٹرل لندن ریلوے کے سٹیشن پوسٹ آفس سے ریل پر سوار ہو کر اگلے اسٹیشن چانسری لین پر اُتر گیا اور بآسانی لنکلنز اِن پہنچ گیا۔ یہاں سے پوری معلومات بہم پہنچا کر وہ ہولبورن کے سٹیشن پر گیا۔ اور پکاڈلی ٹیوب کی ریل پر سوار ہو کر ہیمرسمتھ پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے چند منٹ میں مکان پر آ گیا۔ اس سفر میں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے بڑی جرأت اور دلیری کی ہے کہ پہلے ہی دن لندن کی ریلوں پر اکیلے سفر کر رہا ہے۔ حالانکہ ہندوستان کی ریلوں پر سفر کرنے کی نسبت لندن کی برقی ریلوں پر سفر کرنا بہت آسان امر ہے انیس کو یہ بھی اطمینان ہو گیا کہ لندن میں انسان راستہ نہیں بھول سکتا۔ ہر سڑک پر کئی جگہ اس سڑک کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں یہ خوف ہو کہ میں راستہ بھول گیا ہوں آدمی نزدیک ترین کانسٹیبل سے دریافت کر سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ نہایت وضاحت اور اطمینان کے ساتھ راستہ بتا دیتا ہے۔ پھر نقل و حرکت کے ذرائع کی اس قدر کثرت اور سہولت ہے کہ انسان کہیں بھی ہو آسانی سے اپنی قیامگاہ پر پہنچ سکتا ہے۔

مکان کے قریب پہنچنے پر انیس نے وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے لئے وہ دیر سے پہنچا ہے۔ مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ باقی سب لوگ کھانا کھانے میں مشغول ہیں۔ اسے بہت ندامت ہوئی۔ لیکن مسز فائزن نے اسے شفقت کے ساتھ اندر بلا لیا اور اس کے دیر سے آنے کو مذاق میں ٹال دیا۔

سہ پہر کو صبح کی خریدی ہوئی چیزیں بھی پہنچ گئیں اور انیس نے

کچھ وقت اپنے کمرے میں اپنا سامان سجانے پر صرف کیا۔ سہ پہر کے ناشتے کے بعد وہ تھوڑی دور سیر کرنے کے لئے گیا لیکن ابھی اپنے مکان کے گرد و نواح سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی واپس آ گیا۔ یوں بھی بازار میں پھرنے اسے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی اور بار بار اسے خیال ہوتا تھا کہ شاید اور لوگ میری طرف دیکھ رہے ہوں کہ اس ملک میں یہ کیسا انسان آ گیا ہے۔ اس خیال سے اسے پسینہ آ جاتا تھا۔ اور وہ گھبرانے لگتا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد یہ جلد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن طبیعت نہ لگی۔ پھر اچانک خیال آیا کہ میں نے بخیریت لندن پہنچنے کا تار والد کو نہیں دیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی عزیزوں کی جدائی کا خیال ستانے لگا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹ گیا۔ کچھ عرصہ تو یوں محسوس ہوا کہ طبیعت کے بے چینی اور افسردگی نیند کو نزدیک نہ آنے دیگی۔ لیکن سفر کی تکان کی وجہ سے قدرت غالب آ گئی اور جلد سو گیا۔ اس طرح لندن میں اس کا پہلا دن ختم ہوا۔

دوسرے دن صبح کے ناشتے کے بعد سب سے پہلے قریب کے تار گھر سے والد کو اپنی خیریت کا تار دیا۔ اور پھر شیپرڈس بُش سٹیشن سے ریل پر سوار ہو کر چانسری لین اور وہاں سے لنکنز ان گیا۔ اور بیرسٹری کے داخلہ کا انتظام کیا۔

بیرسٹری کی تعلیم کے لئے کسی یونیورسٹی کا انتظام نہیں اور نہ کوئی کالج ہی اس کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی تعلیم انز آف کورٹ میں ہوتی ہے۔ یہ ایک قسم کی چار قانونی انجمنیں ہیں جن کے ممبر جج اور بیرسٹر ہیں اور انہی کے ہاتھ میں ان کا انتظام ہے۔ چاروں انز کی عمارتیں الگ الگ ہیں۔ اور ان کا انتظام بھی الگ الگ ہے۔ لیکن لیکچر چاروں کے ایک ہی جگہ ہوتے ہیں۔ لیکچرار بھی مشترک ہیں۔ اور امتحانات بھی چاروں کے اکٹھے ہی ہوتے ہیں۔ ان چاروں کے نام "انر ٹیمپل ان" "مڈل ٹیمپل ان" "لنکنز ان" اور "گریزان" ہیں۔ ان میں سے عمارات اور تعداد طلبا کے لحاظ سے لنکنز ان سب سے بڑی ہے۔ اوّل الذکر تین کی فیسیں ایک جیسی ہیں۔ گریزان کی کچھ کم ہیں لیکن فرق برائے نام ہے۔ بیرسٹری کے امتحانات کے لئے لیکچروں میں حاضری لازمی نہیں۔ البتہ مقررہ تاریخوں کے اندر جنہیں ٹرم کہتے ہیں چھ دفعہ ان کے ہال میں دوسرے طلبہ اور بنچرس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا یا کم سے کم کھانے پر حاضر رہنا لازمی ہے۔ سال میں چار ٹرم ہوتے ہیں۔ اور بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے لئے بارہ ٹرم پورے کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ گویا کل ۷۲ کھانے لازمی ہیں البتہ جو طلبا کسی یونیورسٹی میں بھی داخل ہوں وہ اگر تین کھانے بھی ٹرم میں کھالیں تو ان کا ٹرم پورا ہو جاتا ہے۔

امتحان کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں چار مضامین ہوتے ہیں۔ اور دوسرے میں تین۔ پہلے حصے کے مضامین کا امتحان ایک ایک کرکے بھی دیا جا سکتا ہے۔ اور دو تین یا چاروں کا ایک ساتھ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر الگ الگ امتحان دیا جائے تو کسی خاص ترتیب میں کسی مضمون کا امتحان دینا ضروری نہیں۔ دوسرے حصے کے تمام مضامین کا امتحان ایک ہی وقت میں دینا اور پاس کرنا ضروری ہے۔ اور جب تک پہلے حصے کے تمام مضامین کا امتحان پاس نہ کر لیا جائے۔ دوسرے حصے کے مضامین کے جوابات کے پرچوں کا معائنہ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے حصے کے جس مضمون کا جب چاہے طالب علم امتحان دے لیکن دوسرے حصے کا امتحان چھ ٹرم پورے کرنے سے پہلے نہیں دیا جا سکتا۔ امتحان پہلے سال بھر میں چار دفعہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب تین دفعہ ہوتا ہے۔ گویا اب بھی ہر طالب علم کو ۹ دفعہ امتحان دینے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ اگر اتنے عرصے میں بھی امتحان پاس نہ ہو جائے بیرسٹری کی سند نہیں مل سکتی لیکن ۱۲ ٹرم پورے کر لینے کے بعد مزید ٹرم پورے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنے یا کسی خاص خدمت کے عوض یا بیماری کی وجہ سے ٹرموں کی تعداد میں تخفیف بھی کر دی جاتی ہے۔

اگرچہ انیس کے والد کی غرض انیس کو انگلستان بھیجنے میں صرف یہ تھی کہ وہ بیرسٹری کی سند حاصل کر لے۔ لیکن انگلستان پہنچ کر انیس کو خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہو تو سول سروس کے امتحان کی تیاری بھی کی جائے۔ اس خیال سے اُس نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کا ارادہ کیا لیکن ساتھ ہی اُسے خیال آیا۔ کہ بعض طلبہ سول سروس کے امتحان کے لئے بیحد محنت کرنے کے بعد اور امتحان میں کامیابی حاصل کر لینے کے باوجود کسی نقص کی وجہ سے اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ اس لئے کسی طور پر یہ اطمینان کر لینا چاہیئے کہ آیا میری محنت کا بھی تو یہ حشر نہ ہوگا۔ چنانچہ اسے مشورہ دیا گیا کہ وزارت ہند کے دفتر میں جو طبی بورڈ مقرر ہے۔ اس کی فیس ادا کر کے ابھی سے طبی معائنہ کرا لیا جائے۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کی دقت پیدا نہ ہو اور کوئی خدشہ باقی نہ رہ جائے۔ انیس نے فوراً اس مشورہ پر عمل کیا اور دو گنی فیس ادا کر کے انڈیا

آفس کے طبی بورڈ سے معائنہ کرایا۔ معائنہ کا نتیجہ اُسے یہ بتایا گیا کہ تمہاری دائیں آنکھ کی نظر صرف اسقدر کمزور ہے کہ گو عام اغراض کے لئے تمہاری بینائی میں کوئی کمی نہیں لیکن طبی معائنہ کے قواعد کی رو سے تمہیں معائنہ میں رد کر دیا جائیگا۔ اس لئے تمہیں کسی مقابلہ کے امتحان کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ نتیجہ سُن کر انیس کو قدرے افسوس ہوا لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی کہ بہتر ہوا میں نے ابھی سے معائنہ کرا لیا ورنہ امتحان کی پوری تیاری کے بعد اس کمزوری کا علم ہوتا تو تمام محنت اکارت جاتی۔ اس کے بعد اُس نے اپنی تمام توجہ قانون کے مطالعے کی طرف لگا دی اور اپنے امتحانات میں اور بعد میں اپنے پیشے میں خاص امتیاز حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اسی خیال کے ماتحت اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کی کوشش ترک کر دی اور لندن یونیورسٹی کی ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کرنے کی نیت سے وہ کنگس کالج لندن میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ اُسے بتایا گیا تھا کہ لندن یونیورسٹی کا ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان برطانیہ بھر میں قانون کا مشکل ترین امتحان ہے اور طلبا کی قانونی لیاقت کا اعلیٰ ترین معیار۔

اگرچہ انیس کا داخلہ کنگس کالج میں ہوا لیکن لیکچر سننے کے لئے اُسے یونیورسٹی کالج اور لندن سکول آف ایکونامکس میں بھی حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کیونکہ مختلف مضامین کے لیکچر مختلف درس گاہوں میں ہوا کرتے تھے۔

کالج میں داخلہ کے لئے انیس اکیلا ہی گیا۔ اس کی طبیعت میں کچھ پریشانی تھی کہ خدا جانے یہاں کے کیا کیا قواعد ہیں اور نہ معلوم دفتر والے کس طریقے سے پیش آتے ہیں۔ اسے تو پٹنہ کالج کا تجربہ یاد تھا کہ فیس ادا کرنے کے لئے یا کسی امر کی دریافت کے لئے اگر دفتر میں جانا پڑتا تو ہیڈ کلرک صاحب اور ان کے عملہ کے آدمی سیدھے منہ بات بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کالج میں پہنچ کر کچھ تامل کے بعد اور کسی قدر ڈرتے ہوئے دفتر میں داخل ہوا۔ اور دروازے کے سامنے ہی جو کلرک نظر آیا اس کے قریب پہنچ کر نہایت دبی آواز سے کہا کہ میں ایل۔ ایل۔ بی کلاس میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ یہ کلرک گو عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے چہرے سے بشاشت ٹپک رہی تھی۔ اور بڑی پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ مسکراہٹ کے ساتھ انیس کی طرف متوجہ ہوا اور داخلے کے متعلق۔ اس کے سوالات کا جواب دینا شروع کیا۔ انیس کو یہ دیکھکر بہت حیرت ہوئی کہ یہ کلرک عمر میں اس قدر بزرگ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اسقدر نرمی سے پیش آ رہا ہے اور ہر فقرہ میں اسے جناب کے لفظ کے ساتھ مخاطب کرتا ہے۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد اس نے انیس کو ایک فارم پُر کرنے کے لئے دیا۔ اور ساتھ ساتھ فارم بھرنے کے متعلق اسکی ہدایت کرتا گیا۔ جب فارم بھر چکا تو یہ انیس کو اپنے ساتھ سیکرٹری کے کمرے میں لے گیا۔ اور سیکرٹری سے اس کا تعارف کرایا۔ سیکرٹری بھی انیس کے ساتھ نہایت خوش خلقی سے پیش آئے۔ اور چند ضابطہ کے امور دریافت کرنے کے بعد اس کے فارم پر داخلہ کی منظوری دیدی۔ انیس کلرک کے ساتھ دفتر میں واپس آیا۔ اور ایک سال کی فیس ادا کر کے داخلہ کا ٹکٹ حاصل کر لیا۔ اسی کلرک نے انیس کو لیکچروں وغیرہ کے اوقات کے متعلق بھی پوری پوری ہدایات دیدیں۔ اور کالج کے پراسپکٹس کا ایک نسخہ اس کے حوالے کیا۔ کلرک نے اس کا شکریہ ادا کیا اور یہ کلرک کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے باہر آیا۔ اس چھوٹے سے واقعے نے انیس کی طبیعت پر بہت گہرا اثر کیا۔ اور جہاں اسے انگلستان کے باشندوں کی خوش اخلاقی پر رشک آتا تھا۔ وہیں اپنے ہموطنوں کی تنگ ظرفی پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ کہ اس کے اپنے ملک میں اگر کسی شخص کو ذرا سا اختیار بھی حاصل ہو جائے تو وہ بجائے اس کے کہ اپنے اختیارات کو اپنے ہموطنوں کی خدمت اور ان کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے میں صرف کرے۔ وہ ہر موقعہ پر اپنے اختیارات اپنے ابنائے وطن کو تکلیف دینے اور ان پر حکومت کرنے میں صرف کرتا ہے۔

کالج میں پہلے دن انیس کو قانون روما پر لیکچر سننے کا [illegible] ہوا۔ اس مضمون کے پروفیسر ایک معمر قانون [illegible] دوسرے پروفیسروں کی طرح وکالت کے پیشے کے [illegible] میں لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ انہیں اس مضمون پر لیکچر دیتے [illegible] ہو چکے تھے۔ اور اپنے مضمون پر اسقدر عبور حاصل تھا کہ لیکچر دیتے وقت معلوم ہوتا کہ کوئی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ گو انیس کے لئے یہ مضمون بالکل نرالا تھا لیکن اسے لیکچر سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ پہلے دن کا لیکچر محض [illegible] صاحب نے اپنے مضمون [illegible] اپنے طریقہ تعلیم [illegible] ہدایات دیں۔ انہیں [illegible] کے متعلق [illegible] کے مطالعہ کرنے کی ہدایت [illegible] صاحب نے جن پانچ کتابوں [illegible] کی وہ پانچوں لاطینی زبان میں تھیں اور انیس لاطینی کا ایک لفظ بھی

نہیں جانتا تھا۔ لیکچر ختم ہونے پر انیس پروفیسر صاحب کی میز کے پاس گیا۔ اور ان کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب آپ نے جن کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت کی ہے وہ تمام کی تمام لاطینی میں ہیں۔ اور میں لاطینی بالکل نہیں جانتا۔ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

پروفیسر (مسکرا کر) "نہیں؟ بی۔ اے اور لاطینی سے ناواقف!"

انیس۔ "جناب واقعہ یہی ہے۔"

پروفیسر "تو بی۔ اے میں تم نے کونسی قدیم زبان کا مطالعہ کیا تھا؟"

انیس۔ "جناب عربی کا۔"

پروفیسر۔ "بیشک یہ تمہارے لئے ایک مشکل ہے لیکن ان کتابوں کی ترتیب ایسی ہے کہ لاطینی متن کے ساتھ ساتھ انگریزی ترجمہ بھی دیا ہوا ہے۔ اور حواشی تو تمام انگریزی ہی میں ہیں۔ اگر تم لاطینی زبان کے قواعد سے اتنی بھی واقفیت پیدا کر لو کہ الفاظ کی بندش اور ترکیب تمہیں معلوم ہو جائے اور اصل مضمون کے متعلق خوب محنت کرو تو تعجب نہیں کہ ممتحن تمہیں پاس کر دیں۔"

انیس۔ "جناب محنت تو میں خوب کرونگا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ لاطینی بہت مشکل زبان ہے۔"

پروفیسر "بس تم فوراً لاطینی گرامر کی کتاب خرید لو اور کسی سے پڑھنے کا انتظام کر لو۔ دو تین مہینے میں تمہیں کام چلانے کے لائق [illegible] ہو جائیگی۔ ساتھ ساتھ مضمون کے متعلق خوب محنت [illegible] کے ساتھ ساتھ کرو۔"

[illegible] "جناب میں آپ کی ہدایات پر پورا پورا کاربند ہونے [illegible]"

[illegible] انیس پروفیسر صاحب سے رخصت ہوا۔ اب اس کے مطالعے کے مضامین میں ایک مضمون کا اضافہ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے جس مکان میں وہ ٹھیرا ہوا تھا اس میں چند دن کے بعد ایک جرمن طالب علم بھی آکر [illegible] گزیں ہوا۔ اور اس کی مدد سے انیس نے لاطینی زبان سے معمولی سی واقفیت پیدا کر کے [illegible] بیرسٹری اور ایل ایل بی کی جماعتوں [illegible] کرنے کے قابل ہوگیا۔

انیس کی زندگی ایک مقررہ روش پر چلنے لگی۔ سردی [illegible] ہو جانے کے باوجود انیس تمام گھر میں سب سے پہلے [illegible] موسم شروع [illegible] غسل اور نماز سے فارغ ہو کر سیر کے لئے چلا جاتا۔ جب تک یہ سیر [illegible] ہوتے ہیں۔ اور [illegible]

سے واپس آتا ناشتہ کا وقت ہو جاتا۔ تمام گھر کے لوگ اکٹھے ناشتہ کرتے اس کے بعد ہر ایک اپنے اپنے کام پر چلا جاتا۔ اور انیس مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ ۱½ بجے لنچ (دوپہر کے کھانے) پر گھر کے اکثر لوگ پھر جمع ہوتے۔ لنچ کے بعد انیس ظہر اور عصر کی نماز ادا کرتا۔ کیونکہ سردی کے موسم میں انگلستان میں سورج اس قدر جلد غروب ہو جاتا ہے کہ ان دونوں نمازوں کے الگ الگ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ دسمبر میں تو پونے چار بجے ہی سورج ڈوب جاتا ہے اور ۴ بجے مغرب کا وقت ہو جاتا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر انیس پھر مطالعہ میں لگ جاتا۔ اور چائے کے وقت یعنی ۵ بجے تک مطالعہ جاری رکھتا۔ اس اثنا میں نماز مغرب کا وقت آجاتا تو نماز ادا کرتا۔ ۵½ بجے چائے پی کر کالج جاتا۔ پہلے سال میں انیس کے تمام لیکچر ۶ بجے شام کو شروع ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ۵½ بجے گھر سے چل کر زمین دوز ریلوے کے ذریعے وہ آسانی سے ۶ بجے تک کالج پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکچر کبھی ۷ بجے ختم ہوتا کبھی ۸ بجے اور کبھی ۸½ یا ۹ بجے۔

کالج سے واپس آکر شام کا کھانا کھاتا۔ شام کے کھانے کے بعد سردیوں میں تو عام طور پر باقی وقت لوگوں کے ساتھ گفتگو میں یا کسی کھیل کے مشغلہ میں صرف ہوتا۔ گرمیوں میں کبھی کبھی سیر کو چلا جاتا۔ عموماً دس اور گیارہ بجے کے درمیان عشاء کی نماز ادا کر کے سو جاتا۔ ہفتہ کے روز لنچ کے بعد مطالعہ ترک کر دیا جاتا۔ اور چونکہ اس روز کالج کی حاضری بھی نہ ہوا کرتی تھی۔ اس لئے انیس کسی دوست کو ملنے یا سیر کو چلا جاتا۔ اتوار کو بھی مطالعہ بند رہتا اور یہ دن کسی تفریح یا سیر میں صرف ہوتا۔ کسی دعوت یا دوسری تقریب میں شمولیت کی خاطر بعض دفعہ اس معمول میں تبدیلی ہو جاتی۔ ورنہ عام طور پر اپنے تین سال کے قیام لنڈن کے دوران میں انیس اسی تقسیم اوقات کا پابند رہا۔ البتہ تعطیلات میں مطالعہ ترک کر کے وہ لنڈن یا انگلستان سے باہر چلا جایا کرتا۔ اور تعطیلات کے ایام مختلف علاقوں اور ممالک کی سیر اور ان کے حالات کے مطالعہ میں صرف کیا کرتا تھا۔

(باقی آئندہ)